طاہر جاوید مغل

کالا * لال

ابتدائے عشق میں ہنستے وقت لقابوں، پھولوں، خوشبوؤں بارشوں کی رم جھم، سرمئی بادلوں کا سایہ، بھیگی رُتوں کا موسم طاری رہتا ہے... بقائے حیات کا کارواں جاری و ساری رہتا ہے... اور اس تسلسل کو برقی رو کے مانند برقرار رکھنا ہے... محبت کا جوہر... ایک ایسے ہی نوجوان کی سرگزشت جس کی زندگی میں شکست خوردگی کی بازگشت رہ گئی تھی... اس کی محبت کا گھیراؤ اور پھیلاؤ سمٹا تو اس کی زد میں آکر اس کی روح... زمین و آسمان سب عاجز، بے بس ہو کر رہ گئے...

محبت کے محاذ پر ٹکرائے ہوئے شخص کی جدوجہد... اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

ثروت مجھ سے بات کرتے کرتے ایک دم خاموش ہوگئی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر سایہ سا لہرا گیا تھا۔ میں نے اپنا رخ پھیر کر اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور چونک کر رہ گیا۔ وہ چار لڑکے اسنیک بار میں داخل ہو رہے تھے۔ لڑکوں میں ان کا سرغنہ راجد عرف راجی بھی شامل تھا۔ راجی کم

طرف امیرزادوں والا حلیہ۔ لمبے چکیلے بال، گلے میں سونے کا لاکٹ اور کھلے گریبان والی امپورٹڈ شرٹ۔ وہ بڑی مستی سے چلتا ہمارے پاس سے گزرا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک دراز قد لڑکا کوفر سے انڈین گانے کی دھن پر سیٹی بجا رہا تھا۔ اس کا حلیہ بھی راجی سے ملتا جلتا تھا۔

وہ چاروں ہم سے کچھ فاصلے پر ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ثروت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "چلو آؤ چلیں یہاں سے۔"

میں نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں، اس طرح اٹھنا ٹھیک نہیں۔ بس یہ دو گھونٹ چائے رہ گئی ہے، پی لو۔ پھر اٹھتے ہیں۔"

ثروت کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اب اسے چائے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے اور نہ مجھ سے باتیں کرنے میں۔ اب یہاں جو بھی وقت گزرے گا، وہ سخت تکلیف میں گزرے گی۔ میں نے کپ اٹھا کر چائے کی چسکی لی تو مجھے لگا کہ ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اس لرزش کو ثروت کی نگاہ سے چھپانے کے لیے میں نے کپ پھر نیچے رکھ دیا۔

ثروت میری منگیتر تھی۔ وہ بی ایس سی کر رہی تھی۔ میں ایم ایس سی کے آخری سال میں تھا۔ ہم دونوں لاہور میں رہتے تھے اور رشتے دار بھی تھے۔ واجد عرف واجی لڑکا جو ابھی اپنی ٹولی کے ساتھ اسنیک بار میں داخل ہوا، پچھلے کئی ماہ سے ثروت کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اس بس اسٹاپ کے گرد بکھرا رہتا جہاں سے ثروت کالج جانے کے لیے سوار ہوتی تھی۔ وہ ثروت کا محلے دار بھی تھا۔ شروع میں تو وہ اخلاق کے دائرے کے اندر رہا۔ پھر ایک دو بار اس نے ثروت کو اپنی ڈبل سائلنسر والی موٹر سائیکل پر لفٹ دینے کی کوشش کی مگر جب ایک روز اس نے مجھے اور ثروت کو مال روڈ کے شیزان ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تو وہ کچھ جارحانہ موڈ میں آگیا۔ وہ اب ثروت کے کالج کے متواتر چکر بھی لگا رہا تھا اور شیزان ریسٹورنٹ میں بھی دو بار ہمارے پیچھے آیا۔

ہم نے شیزان میں ملنا چھوڑ دیا۔ پچھلی بار ہم اسی جگہ کے اس اسنیک بار میں ملے تھے۔ تب تو خیریت گزری تھی لیکن آج پھر واجد اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ یہاں آدھمکا تھا۔

ہم جیسے تیسے چائے ختم کر کے اٹھنا چاہ رہے تھے۔ میں نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کر دیا تھا لیکن وہ ابھی کاؤنٹر پر مصروف تھا۔ واجد نے ہمیں سنانے والے انداز میں زور سے کہا۔ "یار شکیل! چائے پینے کے لیے تو کافی سستی جگہ ہے۔"

شکیل بولا۔ "بھئی جب تم جیسے چیتے ہوں تو ایسی ہی جگہ ڈھونڈنی پڑتی ہے۔"

واجد نے کہا۔ "اتنا سوہنا مکھڑا ایسی جگہ پر ہو تو لگتا ہے کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہوا ہے۔"

"یہ کہو کہ ٹاٹ میں مخمل کا پیوند۔" دراز قد لڑکے نے لقمہ دیا۔ اس کا نام قادر تھا۔

واجد میز پر ہاتھ کا طبلہ بجانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ گنگنا رہا تھا۔ دل توڑنے والے دیکھ کے چل... ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں... راہوں میں۔

ثروت تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو تابش!" اس نے ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ جی چاہتا تھا کہ ان خبیثوں کے منحوس چہرے نوچ لوں، حلیے بگاڑ دوں ان لوفروں کے لیکن... اس لیکن کے آگے کئی ایک سوالیہ نشان تھے۔

میں نے خود کو سنبھالا اور کاؤنٹر پر بل ادا کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ ثروت مجھ سے ایک قدم آگے تھی۔

ہمارے عقب میں کورس کی شکل میں آواز لگائی گئی۔

"ہائے آؤٹ... ہائے آؤٹ!"

مجھے اندیشہ تھا کہ شاید یہ لوگ فوراً ہی پیچھے باہر آئیں گے اور سڑک پر بھی بدتمیزی کریں گے لیکن فوری طور پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ پھر بیکری کے عقب میں واقع پارکنگ میں پہنچے۔ میں اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا تو پتا چلا کہ اس کے عقب میں واجد اور اس کے دوستوں نے موٹر سائیکلیں پارک کی ہیں۔ ایک زبردست قسم کا [illegible] بنا کر رہ گیا۔ یہ واجی وغیرہ کی ہی شرارت تھی۔ ابھی ہم پارکنگ والے سے بات ہی کر رہے تھے کہ واجی اور اس کے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔

پارکنگ لاٹ والے لڑکے نے واجی سے کہا۔ "سر جی! آپ کی موٹر سائیکل... انہوں نے اپنی گاڑی نکالنی ہے۔"

"اوہ... اوہ...!" واجی نے چونکنے کی اداکاری کی پھر مسکینی سے بولا۔ "غلطی ہو گئی۔ میں نے سمجھا تھا کہ یہ گاڑی تھوڑی دیر یہاں رکے گی۔ ابھی لو جی... میں ہٹا لیتا ہوں موٹر سائیکل۔"

اس نے جیبیں ٹٹولیں مگر چابی نہیں ملی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے۔ وہ دراز قد قادر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کہاں گئی یار! چابی تیرے پاس تو نہیں ہے؟"

"میرے پاس تو میری چابی ہے اور یہ بھی میرے تالے میں لگتی ہے۔" قادر معنی خیز لہجے میں بولا۔

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ کچھ چابیاں ایک سے زیادہ تالوں میں لگتی ہیں؟"

"کیوں نہیں یار! ہوتی ہیں ایسی بھی۔ یہ چابیاں رنگ برنگے تالوں میں لگتی رہتی ہیں۔ ان کو ہرجائی چابیاں کہتے ہیں۔"

واجد عرف واجی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیوں بھائی! تمہارے پاس ہے کوئی ایسی چابی؟"

"کک... کیا مطلب؟" میں نے خود کو بمشکل سنبھالا۔

شکیل مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ آپ کی شکل و صورت سے لگتا ہے کہ آپ کے پاس رنگ برنگے تالوں میں لگنے والی چابی ہے۔"

"یعنی ہرجائی چابی۔" قادر نے لقمہ دیا۔

"تم تمیز سے بات کرو اور یہ موٹر سائیکل پیچھے ہٹاؤ۔" ثروت تلملا کر بولی۔

"چابی کے بغیر کیسے پیچھے ہٹا لوں مس صاحبہ؟" شکیل نے کہا۔

میں نے بڑھ کر موٹر سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے گھسیٹ کر پیچھے کرنا چاہا۔

"نو... ڈونٹ ٹچ۔" واجی نے خطرناک لہجے میں کہا۔

"تو پھر اسے پیچھے ہٹاؤ۔" میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

"میں کہہ رہا ہوں ڈونٹ ٹچ اٹ۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا اور اس کے ساتھ ہی مجھے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے گیا۔

غصے اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت نے مجھے سرتاپا جلا دیا۔ مجھے لگا کہ میرا دل سینہ پھوڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بہتر ہوا کہ اسی موقع پر ثروت میرے سامنے آ گئی۔ وہ چلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں تابش! نہیں ان سے جھگڑا نہیں کرنا۔" وہ مجھے دھکیلتی ہوئی چند قدم ادھر پیچھے لے گئی۔

میں سرتاپا لرز رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، ایک بار تو اس خبیث واجی پر ٹوٹ پڑوں۔ دوسری طرف واجی بپھرا ہوا شیر نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین لگتا تھا کہ وہ میری کوئی پیش چلنے دے گا۔ بہتر ہوا کہ شکیل اور قادر نے اس کا راستہ روک لیا۔ شکیل، واجی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "چھوڑو یار! اسکول پکنک بند ہے۔ ضائع [illegible] نہ ہو جائے۔"

پتا نہیں، میرے منہ میں کیا آیا اور میں نے کیا کہا۔ بہرطور یہ کوئی متاثر کن الفاظ نہیں تھے۔ میں اپنے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھال کر پیچھے ہٹ آیا۔ واجی کے دوستوں نے دونوں موٹر سائیکلیں پیچھے ہٹا دیں۔ واجی بدستور میری طرف خشمگیں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لوگ موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر چلے گئے تو ہم بھی گاڑی میں آ بیٹھے۔

گھر آ کر میں دیر تک اپنے کمرے میں بند رہا۔ کمرے کے اندر ہی بے قراری سے ٹہلتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ میرے ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا

رنگینی

"آپ کی کہانی میں رنگینی بہت زیادہ ہے۔ معذرت خواہ ہیں ہم اسے نہیں چھاپ سکتے۔" ایڈیٹر نے مسودہ مصنف کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

"رنگینی؟" مصنف نے حیرت سے کہا۔ "میری کہانی میں آپ کو رنگینی کہاں نظر آ گئی؟"

"پہلے صفحے پر ہیروئن کے باپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ دوسرے صفحے پر ہیروئن کے دانت سردی سے نیلے پڑ گئے۔ تیسرے صفحے پر ہیرو کے دوست کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ چوتھے صفحے پر ہیروئن شرم سے سرخ ہو گئی۔ پانچویں صفحے پر ولن کا چہرہ غصے سے سیاہ نظر آنے لگا۔ چھٹے صفحے پر لڑائی میں ہیرو کے چہرے پر نیل پڑ گئے۔ اس سے زیادہ رنگینی اور کیا ہو سکتی ہے؟" ایڈیٹر صاحب بولے۔

آیا تھا۔ میں تین بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ والدین کا لاڈ پیار مجھ سے بہت زیادہ تھا۔ والد محترم آبکاری میں آفیسر تھے لیکن چونکہ ایمان دار آفیسر تھے اس لیے مشکل سے ہی گزر بسر ہوتی تھی۔ کوئی دو سال پہلے ان کا انتقال ہوا تو اندیشہ تھا کہ ہم معاشی دباؤ میں آ جائیں گے لیکن والد صاحب کی دوراندیشی نے ہمیں سنبھال لیا۔ انہوں نے اپنے وقت میں ایک بڑی سڑک کے کنارے دو کنال زمین لی تھی۔ کچھ زمین خالی چھوڑ رکھی تھی۔ باقی میں گھر تعمیر کیا تھا مگر اس طرح کہ اگر ہم اوپر کی منزل پر شفٹ ہو جاتے تو گراؤنڈ فلور پر دس بارہ دکانیں تعمیر کر کے کرائے پر چڑھائی جا سکتی تھیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس کے علاوہ والد صاحب کی پنشن نے بھی ہمیں فائدہ دیا۔

میں بچپن میں جسمانی لحاظ سے خاصا کمزور واقع ہوا تھا۔ لڑکپن تک پہنچتے پہنچتے جسم پر تھوڑی بہت بوٹی آ گئی۔ اس کے باوجود ہم عمر لڑکوں میں مجھے سنگل پسلی ہی سمجھا جاتا تھا۔

لڑائی جھگڑا کبھی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر لڑکپن اور جوانی میں بارہا ایسے واقع آئے جب میرے لیے لڑنا ضروری تھا۔ ایسے موقعوں پر اکثر میری ہمت جواب دے جاتی تھی۔ ٹانگوں سے جان نکلنے لگتی، زبان گنگ ہو جاتی اور دل ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دھڑکنے لگتا۔ اپنی اس خامی پر قابو پانے کی میں نے بہت کوشش کی لیکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ آج کل پھر وہی صورت حال درپیش تھی۔ شومئی قسمت ثروت کے محلے کا ہی یہ لڑکا اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس کی ہمت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

اس دن کمرے میں بے قراری سے ٹہلتے ٹہلتے میں نے فیصلہ کر لیا کہ دو تین ماہ کے لیے ثروت سے میل جول بالکل بند رکھوں گا اور ثروت سے بھی کہوں گا کہ وہ بس میں کالج جانے کے بجائے ناصر بھائی کے ساتھ موٹر سائیکل پر چلی جایا کرے۔

پچھلے دو چار سالوں میں مجھے جب بھی کہیں اپنی جوانی کے سبب ہزیمت اٹھانا پڑتی یا شرمندگی کا سامنا ہوا، میرے اندر ایک خواہش بڑی شدت سے پیدا ہوئی... اور وہ یہ کہ میں خود کو جسمانی طور پر مضبوط کر لوں۔ کم از کم اتنا تو کر سکوں کہ اپنے جیسے کسی بندے کی زیادتی کا مناسب جواب دے سکوں۔ ان دنوں مارشل آرٹ کا کافی شور تھا۔ کراٹے کے کلب کھلے ہوئے تھے۔ میں بھی گو بے ہنگم اور بازار کے قریب واقع ایک کلب میں جاتا رہا تھا اور ہاتھ پاؤں چلاتا رہا تھا۔ بہرحال، میری اس مصروفیت میں مستقل مزاجی کی کمی تھی۔ عموماً دو چار ہفتے کلب جانے کے بعد میری توجہ ہٹ جاتی تھی۔ دھیان کسی اور طرف چلا جاتا تھا۔ دھیان دوبارہ کلب کی طرف تب آتا تھا جب پھر کسی جگہ شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ جسمانی تنومندی علیحدہ چیز ہے بلکہ لڑائی بھڑائی والا مزاج رکھنا دیگر بات ہے۔

اسنیک بار والے واقعے کے بعد میں نے ایک بار پھر شدومد سے مارشل آرٹ کلب جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں ہمارا کلب اردو بازار کے قریب سے تبدیل ہو کر انارکلی کی طرف چلا گیا تھا۔ منشی عارف صاحب ہمارے استاد تھے۔ وہ بڑی محنت سے ہمیں داؤ پیچ سکھایا کرتے تھے۔ میں چھ سات ہفتے تک باقاعدگی سے گیا لیکن پھر انہی دنوں مجھے ناگہانی ہوا اور کلب جانے کا سلسلہ ایک بار پھر منقطع ہو گیا۔

میں جنوری کی وہ ٹھٹھرتی ہوئی سہ پہر کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لبرٹی مارکیٹ سے شاپنگ کر کے گھر واپس آیا تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔

دوسری طرف ثروت کی چھوٹی بہن نصرت تھی۔ اس نے اشک بار لہجے میں کہا۔ "بھائی جان! باجی کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ انہوں نے بارہ بجے آنا تھا۔ اب تین بج گئے ہیں، وہ کالج میں بھی نہیں ہیں۔"

میں سرتاپا لرز گیا۔ "تو کہاں گئی وہ؟"

"ابو اور ناصر بھائی پولیس اسٹیشن گئے ہیں۔ کسی نے انہیں خبر دی ہے کہ باجی کو شاید... باجی کو شاید..." نصرت جملہ مکمل نہ کر سکی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

اسی دوران میں ثروت کی پھوپھو نے ریسیور تھام لیا۔ انہوں نے بھی روتے ہوئے کہا۔ "تابش بیٹا! جلدی سے تھانے جاؤ۔ پتا چلا ہے کہ گھر کے پاس والی سڑک سے کچھ لوگوں نے ثروت کو زبردستی گاڑی میں ڈالا ہے اور لے گئے ہیں۔"

میری نگاہوں کے سامنے زمین آسمان گھومنے لگے۔ ریسیور پھینک کر میں تیزی سے گیراج کی طرف بڑھا۔ امی آوازیں ہی دیتی رہ گئیں۔ "کیا ہوا؟ تابش؟"

"آ کر بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور لرزتے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر آ گیا۔ میرا دھیان سیدھا راجی اور اس کے یاروں کی طرف جا رہا تھا۔ حالانکہ چند دن پہلے بھی میں نے فون پر ثروت سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ آج کل راجی نظر نہیں آ رہا۔ مجھے اس وقت بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ شاید وہ مجھے پریشانی سے بچانا چاہتی ہے اور آج کے واقعے نے تو میرے بدترین اندیشوں کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا۔ میں سیدھا تھانے پہنچا۔ ثروت کے والد، خالو عثمان اور ان کے دو تین دوست اور ناصر بھائی تھانے میں ہی موجود تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے خالو عثمان اور تھانے دار میں تلخ کلامی ہوئی ہے۔ کشیدہ کشیدہ سے ماحول میں تھانے دار رپٹ لکھ رہا تھا۔

خالو عثمان بتا رہے تھے۔ "یہ دو تین بندے تھے۔ ان میں سے ایک شاید ڈرائیور تھا اور وین کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے چہرے مفلر وغیرہ میں چھپا رکھے تھے۔ میری بچی کو گھسیٹ کر وین میں پھینکا ہے۔ یہ دیکھیں... وہاں سے اس کی کتابیں ملی ہیں۔" خالو عثمان نے لرزتے ہاتھوں سے دو کتابیں تھانے دار کی میز پر رکھیں۔

بے شک یہ ثروت ہی کی کتابیں تھیں۔

تھانے دار نے کتابیں بھی اپنی تحویل میں لے لیں۔

"نمبر پلیٹ پڑھی ہے کسی نے؟" تھانے دار نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ پر گاڑی کا رنگ اور میک وغیرہ دو تین بندوں نے دیکھا ہے۔"

تھانے دار کے پوچھنے پر خالو عثمان کے دوست وہاب صاحب نے تفصیل سے گاڑی کے بارے میں بتایا۔

تھانے دار کی ہدایت پر ایک اے ایس آئی وائرلیس سیٹ پر پٹرولنگ کاروں سے رابطے میں مصروف ہو گیا۔ خالو عثمان کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں انہیں ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو جائے۔

میں نے ناصر بھائی کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ یہ انہی لڑکوں کا کام ہے۔"

"کون لڑکے؟"

"وہی... راجی، اقبال اور قادر وغیرہ۔ میں نے آپ کو ان کے بارے میں بتایا تھا۔"

"نہیں تابش!" ناصر بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ یہ ان کا کام ہے۔ جس وقت یہ معاملہ ہوا، راجی وغیرہ اپنے گھر کی چھت پر تھے۔ پتنگ اڑا رہے تھے۔ میں صبح سے ان کو وہیں دیکھ رہا تھا۔ ویسے بھی لوگوں نے جن تین بندوں کے بارے میں بتایا ہے وہ اپنے حلیے سے بڑی عمر کے لگتے تھے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ راجی وغیرہ نے کسی دوسرے سے یہ کام کروایا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ کرب کی شدت سے میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

"ابھی کیا کہا جا سکتا ہے... ویسے راجی کے والد سراج صاحب تو خود رپورٹ درج کروانے ابو کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ وہ دائیں طرف کریم کلر کی شلوار قمیص میں ہیں۔" ناصر بھائی نے ایک صحت مند شخص کی طرف اشارہ کیا۔

پولیس والوں نے قاعدے کی کارروائی کر کے اور ہمیں تسلی دے کر روانہ کر دیا۔ میں خالو وغیرہ کے ساتھ ہی ان کے گھر چلا گیا۔ گھر کا ماحول سخت افسردہ تھا۔ ثروت کی والدہ مسلسل جائے نماز پر بیٹھی اور سجدے میں گری ہوئی تھیں۔ خالہ صفیہ کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ وہ کسی بھی امید افزا اطلاع کے لیے ٹیلی فون سے لگی بیٹھی تھیں۔ محلے کی دو تین عورتیں بھی موجود تھیں۔ میں نے خالہ صفیہ کو تسلی دی تو وہ میرے گلے سے لگ کر سسکنے لگیں۔

پتا نہیں کیوں میرا دھیان بار بار راجی اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہی جا رہا تھا۔ میں ان سے ملنا اور بات کرنا چاہتا تھا لیکن پھر یہ خیال بھی ذہن میں آتا تھا کہ کہیں بگڑا ہوا معاملہ اور نہ بگڑ جائے۔ صرف شک کی بنیاد پر راجی وغیرہ پر اتنا بڑا الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

میں نے فون کر کے والدہ اور چچی کو بھی خالہ صفیہ کے گھر ہی بلا لیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ان کے پاس رہیں اور دلاسا دیں۔

وہ رات جس مشکل اور کرب میں گزری، میں ہی جانتا ہوں۔ میں گاڑی لے کر دیوانہ وار سڑکوں، اسپتالوں اور پولیس اسٹیشنوں پر گھومتا رہا۔ میرے کالج کے ایک دوست زبیر خان کے بھائی پولیس افسر تھے۔ زبیر خان سے فون پر بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ آ جاؤ۔ ابھی جا کر بھائی سے ملتے ہیں اور مشورہ کرتے ہیں۔

صبح کے پانچ بجے تھے۔ ابھی اندھیرا پوری طرح چھٹا نہیں تھا۔ میں خالہ کے گھر سے نکلا اور گاڑی پر زبیر کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی میں اندرونی سڑکوں سے نکل کر بڑی سڑک پر مڑنے ہی والا تھا کہ سامنے سے آنے والے ایک رکشے کی وجہ سے رفتار دھیمی کرنا پڑی۔ دھند تھوڑی تھی اور میں چاہ رہا تھا کہ رکشا آسانی سے گزر جائے۔ اچانک میری نگاہ رکشے کے اندر بیٹھی سواری پر پڑی اور میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ ثروت تھی۔ اس نے سر پر دوپٹا لیا ہوا تھا اور دوپٹے کے پلو نے دو تہائی چہرے کو نقاب کی طرح چھپایا ہوا تھا۔ میں نے ہی ثروت کو نہیں دیکھا، اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے گاڑی روک لی۔ رکشا بھی رک گیا۔ میں دروازہ کھول کر بلاتاخیر ثروت کے پاس گیا۔ وہ رکشے سے اتر آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ صبح کے ان اولین لمحوں میں یہ اندرونی سڑک تقریباً سنسان ہی تھی۔ ثروت میرے کندھے سے لپٹ گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔

میں نے رکشے والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا اور ثروت کو لے کر گاڑی میں آ بیٹھا۔

"ثروت تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

ایک دو راہ گیر عجیب سی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میری گاڑی کا رخ بڑی سڑک کی طرف تھا۔ میں نے گاڑی کو اسی رخ پر آگے بڑھایا اور تین چار منٹ ڈرائیو کرنے کے بعد ایک چلڈرن پارک کے عقب میں روک دیا۔

میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ثروت آنکھیں بند کیے مسلسل سسک رہی تھی۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور تسلی بخش لہجے میں کہا۔ "ثروت! تم زندہ سلامت ہمارے سامنے ہو۔ اس سے بڑی اور کوئی بات نہیں۔ باقی سب کچھ بے معنی ہے۔ مجھے بس اتنا بتا دو، وہ کون لوگ تھے جو تمہیں لے کر گئے تھے؟"

وہ بدستور روتی رہی۔ اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ کچھ نہ بتاؤ۔ اگر تمہارے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے تو نہ بولو... میرے لیے یہ خوشی ہی کچھ کم نہیں ہے کہ میں تمہیں صحیح سالم اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ خالہ، خالو بہت پریشان ہیں تمہارے لیے۔ ایک ایک لمحہ ان پر بھاری گزر رہا ہے۔ چلو گھر چلتے ہیں۔"

مجھے لگا کہ واجی کچھ گڑبڑ کر رہا ہے۔
"کیا بات ہے ثروت؟ جو کہنا ہے بلاجھجک کہو۔"
اس نے آنسو پونچھ لیے اور قدرے حوصلے میں نظر آنے لگی۔ آنسوؤں کے چند گھونٹ بھر کر وہ بولی۔ "مجھے مارنے والے واجی اور اس کے دوست تھے۔"
یہ انکشاف دھماکا خیز تھا۔
"لیکن... میرا مطلب ہے ثروت... وہ تو آپ کے ... دوست نہیں تھے۔ ناصر بھائی نے بتایا ہے کہ وہ..." میں ہکلا کر رہ گیا۔
"ہاں... انہوں نے خود کچھ نہیں کیا۔ کسی سے کرایا ہے۔"
"ہُم... مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ ثروت! شروع سے بتاؤ کیا ہوا تھا؟"
اگلے پانچ دس منٹ میں ثروت نے اشک بار لہجے میں اور رک رک کر مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔
تقریباً آٹھ دس روز پہلے ثروت کے بھائی ناصر کو کسی کام سے اسلام آباد جانا پڑا تھا۔ ان دنوں دو تین بار ثروت حسب سابق بس میں کالج گئی۔ ایک دن بس اسٹاپ پر واجی نے پھر ثروت سے بدتمیزی کی۔ اس نے دو تین شرمناک جملے کسے جس کے بعد ثروت بھی طیش میں آگئی۔ اس نے اسے بری طرح ڈانٹا... دھکا دیا اور کہا کہ تم گندی نسل سے ہو۔
اس سے پہلے کہ لوگ اکٹھے ہو جاتے، واجی اپنی ڈبل سائیکل/موٹر سائیکل پر وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ بہتر تھا کہ ثروت اس واقعے کے بارے میں گھر والوں کو بتا دیتی لیکن وہ یہ سب کچھ پی گئی۔ اس نے امید کی کہ شاید اس واقعے کے بعد واجی کو عقل آجائے گی اور وہ اس معاملے کو مزید خراب نہیں کرے گا۔
مگر یہ سب کچھ "خیالِ خام" ثابت ہوا۔ کل صبح ثروت کو پھر بس میں کالج جانا پڑا۔ شاید واجی اور اس کے ساتھی کسی ایسے ہی موقعے کی تاک میں تھے۔ جب وہ دوپہر کے وقت کالج سے واپس آرہی تھی، اچانک دو ہٹے کٹے افراد نے اسے گھسیٹ کر اسٹیشن ویگن میں ڈال لیا۔ اس کے منہ پر ایک بدبودار رومال رکھا گیا۔ ثروت کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بالکل بیگانہ ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو شام ہونے والی تھی۔ وہ ایک نامعلوم کمرے میں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ نائیلون کی رسی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک فوم پڑا تھا اور کونے میں الماری رکھی تھی۔ ثروت کا سر بھاری ہو رہا تھا اور جی متلا رہا تھا۔ اس نے مدد کے لیے پکارنا شروع کیا اور بند دروازے کو ٹھوکریں ماریں۔ تھوڑی دیر بعد
دروازہ کھلا اور واجی اندر آگیا۔ اس نے ثروت کو دھکیل کر فوم پر پٹخا اور چاقو نکال کر اسے دھمکایا۔ اس کے ساتھ ہی بولا کہ وہ جتنا مرضی چلا لے۔ یہاں دور دور تک اس کی آواز سننے والا اور کوئی نہیں۔ ثروت کے ہاتھ رسی کی سخت بندش سے بندھے ہوئے تھے۔ واجی نے چاقو کی دھار سے رسی کاٹ دی۔
ثروت نے اس کی منت سماجت کی۔ اس سے معافی مانگی۔ اس سے کہا کہ وہ اسے جانے دے۔ واجی نے جواب میں کہا کہ وہ "گندی نسل" کا ہے اور اس کا تھوڑا بہت ثبوت دیے بغیر وہ اسے یہاں سے جانے نہیں دے گا۔
ثروت نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ بولا۔ "میں بھی تو ایک سال سے تمہارے آگے پیچھے پھر رہا ہوں۔ تمہاری منتیں ترلے کر رہا ہوں لیکن تم ٹس سے مس نہیں ہوتی ہو۔ جس کے ساتھ گل چھرے اڑاتی ہو اس میں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو مجھ میں نہیں ہیں... باقی میں نے تمہیں یہاں رکھنا نہیں ہے۔ چھوڑ دینا ہے لیکن چھوڑنے سے پہلے تھوڑی سی سزا ضرور دینی ہے۔"
ان باتوں کے دوران ہی اچانک کہیں آس پاس پولیس گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ واجی کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور نکلتے ہوئے دروازے کو باہر سے لاک کر گیا۔ تاہم ثروت کے ہاتھ اب بندھے ہوئے نہیں تھے۔ اندھیرا رکھا تھا۔ کسی ساتھی سے اس کی آواز آئی کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ پھر وہ سارے افراتفری میں کہیں چلے گئے۔
ثروت مدد کے لیے زور زور سے چلاتی رہی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پولیس کی گاڑی آگے سے نہ نکل جائے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ثروت کی مدد کے لیے کوئی نہیں آیا۔ گاڑی غالباً آگے نکل گئی تھی۔ ثروت کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ لاہور میں ہے یا لاہور سے باہر... اور یہ کون سی جگہ ہے۔
جب دروازہ پیٹ پیٹ کر اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور چلا چلا کر گلا بیٹھ گیا تو اسے یوں لگنے لگا کہ شاید اب دوبارہ کوئی نہیں آئے گا۔ وہ نڈھال ہو کر اس کی چیخیں کمرے کی چاردیواری میں گونج کر رہ جاتی تھیں۔ بس دم سادھے بیٹھی رہی۔ شدید پریشانی اور خوف کے باوجود ثروت اپنا دماغ استعمال کرنے لگی تھی۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ اس کمرے سے کیسے فرار ہوا جا سکتا ہے۔ کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے باہر آہنی گرل لگی ہوئی تھی اور کمرے کی چھت بھی مضبوط نظر آتی تھی۔ اٹیچ باتھ روم میں بھی ایک چھوٹی کھڑکی موجود تھی اور وہاں بھی مضبوط آہنی گرل لگی تھی۔

ثروت نے الماری کھولی۔ وہاں سے اسے چھوٹے سائز کی ایک ہتھوڑی مل گئی۔ وہ اس ہتھوڑی کے ساتھ کمرے کی کھڑکی کی گرل پر ضربیں لگانے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس آہنی گرل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تاہم اسے امید تھی کہ اگر کوئی باہر موجود ہوا تو اس حرکت کے بعد سامنے ضرور آئے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ ثروت نے ہمت کی اور دروازے کے بالکل پاس کھڑی ہو گئی۔ ایک شلوار قمیص والا شخص رائفل بدست اندر داخل ہوا۔ ثروت نے اندھا دھند اس کے سر کے پچھلے حصے پر ہتھوڑی کی ضرب لگائی۔ اس ایک ضرب نے ہی پچاس سالہ شخص کو زمین بوس کر دیا۔ یہ کوئی پٹھان چوکیدار تھا۔ ثروت اس کی طرف دیکھے بغیر باہر بھاگی۔ یہ ایک فیکٹری تھی۔ رقبہ زیادہ نہیں تھا۔ یہاں شاید بسوں کی باڈی بنائی جاتی تھی۔ تین چار نامکمل بسیں یہاں وہاں کھڑی تھیں۔ ثروت ڈھانچوں کے درمیان بھاگتی گیٹ تک پہنچی اور باہر نکل آئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ جی ٹی روڈ پر لاہور کے مضافات میں ہے۔ یہاں سے ایک شریف کار والے نے اسے لفٹ دی اور راوی کے پل تک پہنچا دیا۔ وہاں سے رکشا پکڑ کر وہ میرے پاس پہنچ گئی۔
میں نے ثروت کی یہ ساری روداد سنی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے وہ اس نے من و عن مجھے بتا دیا ہے۔ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں رہے۔ جب غنڈوں نے اسے اسٹیشن ویگن میں ڈالا تو ثروت کے جسم پر کئی خراشیں آئی تھیں۔ اس کی پنڈلیوں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ اس کی یہ خونی خراشیں دیکھ کر میرا دل ہول گیا۔ میری نگاہوں میں واجد عرف واجی کا منحوس چہرہ گھومنے لگا۔ جی چاہا کہ میرے پاس پستول ہو اور میں اس کو گولیوں سے چھلنی کر دوں۔ شدید طیش کے عالم میں مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ بدن لرزتا تھا اور سینے میں دھڑکن کے گولے چھوٹتے تھے۔ دماغ بہت کچھ کرنے کو چاہتا تھا مگر جسم ساتھ دینے سے انکار کر دیتا تھا۔
اس وقت بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا۔ ہمیں گاڑی میں بیٹھے پندرہ بیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے واپس گھر کی طرف موڑ دی۔ دس منٹ بعد ہم گھر کے اندر تھے۔ ثروت کو دیکھ کر گھر میں تہلکہ مچ گیا۔ خالہ صفیہ نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا اور تشکر کے آنسوؤں سے بھگو دیا۔ باقی اہل خانہ بھی شدید حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں تھے۔ ثروت کو اندر کمرے میں پہنچایا گیا۔ اسے
پانی وغیرہ پلایا گیا تاکہ وہ نارمل حالت میں آ سکے۔ کمرے میں ہجوم زیادہ ہو گیا تھا۔ خالو جان کے کہنے پر باقی افراد باہر نکل آئے۔ صرف خالہ صفیہ، نصرت، امی اور چچی وغیرہ وہاں رہ گئیں۔
ڈرائنگ روم میں جا کر میں نے خالو اور ناصر بھائی وغیرہ کو تفصیل بتائی کہ ثروت کے ساتھ کیا ہوا ہے اور وہ کس طرح شاہدرے کے قریب ایک فیکٹری سے بھاگ کر یہاں پہنچی ہے۔ یہ انکشاف سب کے لیے تکلیف دہ تھا کہ یہ اسی محلے کے رہنے والے واجی اور تاجو وغیرہ کا کام ہے۔
ناصر بھائی ایک دم آگ بگولا نظر آنے لگے۔ انہوں نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں اس بدمعاش کی طرف... اسے لاش بنا کر ہی واپس آؤں گا۔"
وہ پستول لینے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ ہم سب نے انہیں بمشکل روکا۔ خالو جان نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہماری بچی صحیح سلامت واپس آگئی۔ اب ہمیں قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر معاملے کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔ ہم جو کریں گے قانون کے مطابق کریں گے۔ ہم ابھی تھوڑی دیر میں تھانے جاتے ہیں۔"
خالو جان نے ایک دو جگہ فون کیے۔ میں نے بھی اپنے دوست زبیر کو بلا لیا۔ ہم تھانے پہنچے اور متعلقہ تھانے دار اشرف ساہی کو تفصیل کے ساتھ ساری بات بتائی۔ تھانے دار یہ سب کچھ ثروت کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ ثروت کا بیان لینے کے لیے وہ اسی وقت ہمارے ساتھ گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔
میں نے کہا۔ "جناب! ابھی وہ شاک کی حالت میں ہے۔ اسے سنبھلنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیں۔ اس دوران میں آپ اپنی کارروائی شروع کریں۔"
"آپ کی یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے... پر مجھے قانون قاعدے کے مطابق چلنا ہے۔ کارروائی متاثرہ کے بیان کے بعد ہی شروع ہو گی۔"
مجبوراً ہمیں تھانے دار اشرف ساہی کو گھر لے جانا پڑا۔ میں اس سے پہنچنے سے دس پندرہ منٹ پہلے ہی گھر پہنچ گیا اور ثروت کو بیان دینے کے لیے تیار کیا۔
تھانے دار کے آنے کے بعد بھی میں، خالو جان اور ناصر بھائی کمرے میں موجود رہے۔ بات کرتے ہوئے ثروت کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ بہرحال، اس نے وہ سب کچھ تھانے دار اشرف کے گوش گزار کر دیا جو وہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے مجھے بتا چکی تھی۔

تھانے دار اشرف ماہی نے پوچھا۔ "آپ نے واجد عرف واجی کو خود دیکھا ہے مگر اس کے ساتھیوں کے بارے میں آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں؟"

"میں نے ان کی آوازیں سنی ہیں جی۔ میں تو واجی اور ایک دوسرے لڑکے کالیا کی آواز اچھی طرح پہچانتی ہوں۔"

"تنگ تو آپ کو واجی کرتا تھا۔ دوسرے لڑکوں کی آوازیں آپ کیسے پہچانتی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جناب! آپ وقت ضائع کرنے والے سوال کر رہے ہیں۔ وہ دونوں خبیث بھی واجی کے ساتھ ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ سب ایک ٹولی کی شکل میں تھے۔"

تھانے دار اشرف نے گھور کر مجھے دیکھا۔ "تو جب یہ لوگ ان کو تنگ کرتے تھے آپ کیا پاس ہی ہوتے تھے؟"

میں ایک دم گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ "ایک دو بار ایسا ہوا ہے کہ ہم ریسٹورنٹ میں اکٹھے چائے پینے گئے اور یہ لوگ آ ٹپکے۔"

تھانے دار نے اپنے سوالات کا رخ خوامخواہ میری اور ثروت کی طرف موڑ دیا۔ خالو عثمان اسے بہ مشکل واپس اصل موضوع پر لا سکے۔ بیان قلم بند کرنے کے فوراً بعد تھانے دار اشرف اپنے عملے کے ساتھ پیدل ہی واجی دلیرا کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک گلی چھوڑ کر ایک دو منزلہ شان دار کوٹھی تھی۔ ہم نے ساتھ جانا چاہا مگر تھانے دار اشرف نے منع کر دیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد پولیس کے اس چھاپے کا نتیجہ سامنے آ گیا اور یہ نتیجہ ہمارے خدشات کے عین مطابق تھا۔ گھر میں فون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف تھانے دار اشرف ماہی خود تھا۔

اس نے خالو عثمان کو بلانے کا کہا۔ میں نے بتایا کہ وہ واش روم میں ہیں۔ تھانے دار اشرف نے کہا۔ "چاروں لڑکے اپنے اپنے گھروں سے غائب ہیں۔ ہم انہیں ان کے دوسرے ٹھکانوں پر ڈھونڈ رہے ہیں۔ شام تک پوزیشن صاف ہو جائے گی۔"

"چوکیدار زخمی ہوا تھا، اس کا کچھ پتا نہیں چلا؟"

"ابھی تک نہیں۔ بہرحال ہم رابطے میں رہیں گے۔ جیسے ہی کوئی خبر ملی آپ لوگوں تک پہنچ جائے گی۔"

میں نے فون پر بات ختم کی ہی تھی کہ اندر سے خالہ صفیہ کی آواز آئی۔ وہ مجھے بلا رہی تھیں۔ میں اندر پہنچا۔ امی اور چچی کے علاوہ محلے کی ایک دو عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ خالہ صفیہ نے پوچھا۔ "کس کا فون تھا؟"

"پولیس اسٹیشن سے تھا۔ انسپکٹر بتا رہا تھا کہ ہم لڑکوں کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

خالہ صفیہ نے اسی انداز میں کہا۔ "بیٹا! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ پیسے والے بھی ہیں۔ ان سے دشمنی پڑ گئی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

چچی کلثوم نے تنک کر کہا۔ "ہائے ہائے... کیسی بات کرتی ہو آپا! اب جس پر ظلم ہوا ہے وہ بولے بھی نہ۔ بھولی سی بچی تھی ہماری۔"

"بچی تھی" کے الفاظ چچی نے اس طرح ادا کیے کہ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ایک محلے دار عورت بول پڑی۔ "ایسے لوگوں پر تو کتے چھوڑ دینے چاہئیں۔ زندہ گاڑ دینا چاہیے۔ عورت کے پاس عزت آبرو کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ ہائے ظالموں کو ذرا ترس نہ آیا۔"

چچی نے بڑے تاسف سے ثروت کو سر تا پا دیکھا۔ "بچی کو تو زخم زخم کر کے رکھ دیا ہے۔ بھلا کیا قصور تھا؟ یہی کہ ان بدمعاشوں کے منہ لگنا نہیں چاہتی تھی۔ اس جرم کی اتنی بڑی سزا؟ مت جوگوں نے ساری عمر کا روگ دے دیا ہے۔"

ہمدردی کے اس انداز نے ثروت کو سر جھکا کر سسکنے پر مجبور کر دیا۔

ثروت کی چھوٹی بہن نصرت نے جھلا کر کہا۔ "چچی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ! اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپا صحیح سلامت گھر واپس آ گئی ہیں۔ اللہ نے ہم پر کرم کیا ہے۔"

"اللہ کے کرم سے تو انکار نہیں ہے بیٹی۔ پر اپنے دل کو کیسے تسلی دوں؟ اس کی اجڑی بگڑی صورت دیکھتی ہوں تو دل خون روتا ہے۔"

میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ میں نے دبے دبے غصے سے کہا۔ "چچی! آپ سب لوگ کچھ دیر کے لیے باہر بیٹھ جائیں۔ اسے ذرا آرام کرنے دیں۔"

چچی نے مجھے گھورا۔ میں پاؤں پٹختا ہوا باہر آ گیا۔

ان عورتوں کی باتیں میرے سینے میں تیروں کی طرح لگی تھیں۔ خاص طور سے چچی کی باتیں۔ میں چچی کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ شروع سے ہی میرے اس رشتے کے خلاف تھیں۔ وہ میرے لیے اپنی سگی بھتیجی کو لانا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایڑی چوٹی کی کوششیں بھی کی تھیں۔ اب یہ معاملہ ختم ہو چکا تھا مگر وہ غصہ ابھی تک چچی کے دل میں موجود تھا۔ اب شاید یہ موقع ملا تھا تو وہ اپنے اندر کی عداوت کو چھپا نہیں پا رہی تھیں۔ بہ ظاہر انہوں نے ہمدردی کے بول بولے تھے مگر ان بولوں کے پیچھے دشمنی

دو روز بعد ثروت کی حالت بہتر ہونے لگی تھی۔

نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ امی جان بھی ثروت کی واپسی کے بعد سے کچھ چپ چپ ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک آدھ دن مزید یہاں رہیں گی اور ثروت کی دل جوئی کریں گی مگر وہ اگلے ہی روز طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے گھر واپس چلی گئیں۔ کہنے والوں نے درست کہا ہے کہ بندوق چلانے والوں کے ہاتھ پکڑے جا سکتے ہیں مگر بولنے والوں کی زبانیں نہیں۔ اگلے ایک دو روز میں مجھے صحیح معنوں میں اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اگر کسی لڑکی کے ساتھ ثروت جیسی صورت حال پیش آ جائے تو اس پر کیا بیتتی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ ثروت جیسے گئی تھی ویسے ہی واپس آ گئی تھی مگر ارد گرد کے لوگ یہ بات ماننے کے لیے دل سے تیار نہیں تھے۔

ثروت کے گھر میں اگلے روز میں نے پھر ایک عورت کو اس طرح کی بات کرتے سنا۔ یہ بھی کوئی محلے دار ہی تھی۔ شکل سے پڑھی لکھی لگتی تھی اور اپنی طرف سے اظہار ہمدردی کے لیے تشریف لائی تھی۔ اس نے رونی صورت بنا کر ثروت کو گلے سے لگایا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے کے بعد خالہ صفیہ سے بولی۔ "میں تو کہتی ہوں اس بات کو ختم سمجھ کر چپ رہنا بھی گناہ ہے۔ آپ اس معاملے کی پوری چھان بین کریں۔ بچی کا ڈاکٹری معائنہ کرایا ہے آپ نے؟"

نصرت نے تلملا کر کہا۔ "آنٹی! ہم کیوں کرائیں ڈاکٹری معائنہ۔ کیوں اپنی بے عزتی کا اشتہار دیواروں پر لگائیں؟ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے ہمارے اوپر۔"

"ہاں بیٹی! یہ تو بڑا کرم ہے کہ یہ زندہ سلامت واپس آ گئی ہے مگر ان بدمعاشوں نے جو کیا ہے اس کی سزا تو انہیں ملنی چاہیے نا۔ لڑکی ایک رات گھر سے باہر رہ آئے تو اس بے چاری کے پلے کیا رہ جاتا ہے۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے، ڈیفنس میں ہماری برادری کی ایک لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔ بے چاری یتیم تھی، پر اس کی ماں بڑی ہمت کے ساتھ ڈٹ گئی۔ کہنے لگی کہ ہمارے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا، پر اب ان غنڈوں کو پھانسی تک پہنچا کر دم لیں گے۔ پولیس اور کچہریوں کا بھگتا اور جانے کیا کیا۔ اب وہ دونوں غنڈے جیل میں ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو سیشن کورٹ سے پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔"

اس عورت کی گفتگو کے دوران میں ہی نصرت، ثروت کو لے کر باہر نکل گئی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید جھلاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

دو روز بعد میں گھر گیا تو امی بجھی بجھی نظر آئیں۔

"کیا بات ہے امی! آپ چپ چپ ہیں؟" میں نے ناشتے کی میز پر پوچھا۔

"کچھ نہیں... بس ویسے ہی... ثروت کی طرف بار بار دھیان چلا جاتا ہے۔ اچھی بھلی ہنستی کھیلتی لڑکی تھی۔"

"کوئی بات نہیں امی! پھر اسی طرح ہو جائے گی۔ ابھی تو شاک میں ہے نا۔"

"اسی طرح کہاں ہوا جاتا ہے بیٹا! جب اس طرح کی بات ہو جائے تو پوری زندگی پر اثر پڑتا ہے۔" امی نے طویل آہ بھر کر کہا۔

پھر وہ اٹھیں اور الماری میں سے ایک دن پہلے کا اخبار نکالا۔ اخبار والے نے حسب روایت ثروت والی خبر کو خوب مرچ مسالا لگا کر بیان کیا تھا۔ ثروت کی ایک پرانی تصویر بھی موجود تھی جو نہ جانے کہاں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس تین کالمی خبر کی سرخیاں پڑھ کر میری رگوں میں انگارے سے بھر گئے۔ خبر نویس نے خبر کو دلچسپ اور سنسنی خیز بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ خبر کے آخر میں پولیس ذرائع کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ مذکورہ فیکٹری کے ایک کمرے سے امپورٹڈ سگریٹ، انڈین شراب کی دو بوتلیں اور ویڈیو کیمرا وغیرہ بھی ملا ہے۔ ان شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاروں ملزمان لڑکی کی ویڈیو بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اور ممکن ہے کہ ویڈیو بنائی بھی گئی ہو۔ اس قسم کی اور بھی کئی باتیں خبر میں موجود تھیں۔

میں نے اخبار کو پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور ناشتا کیے بغیر باہر نکل گیا۔ امی بھی میری کیفیت دیکھ کر گم صم کھڑی رہیں۔

آج تھانے دار اشرف نے خالو عثمان اور ناصر بھائی وغیرہ کو مشورے کے لیے تھانے بلایا تھا۔ میں بھی اپنے دوست زبیر خان کو لے کر پہنچ گیا۔ تھانے دار اشرف سے کسی اچھی خبر کی توقع نہیں تھی اور ایسا ہی ہوا۔ پتا چلا کہ چاروں ملزمان میں سے ابھی تک کسی کا کھوج نہیں ملا ہے۔ دو تین پولیس پارٹیاں مختلف علاقوں کی طرف روانہ کی گئی تھیں جو ناکام واپس آئی تھیں۔ آخر میں تھانے دار اشرف نے سگریٹ سلگاتے ہوئے خالو عثمان سے کہا۔ "عثمان صاحب! کل ایک ایم این اے صاحب کا فون آیا ہوا تھا۔ ایم این اے مشتاق گورایا صاحب کا نام تو سنا ہوگا آپ نے؟"

خالو عثمان نے اثبات میں سر ہلایا اور ان کا پریشان چہرہ کچھ مزید پریشان نظر آنے لگا۔ تھانے دار اشرف نے

کہا۔ ''ایم این اے صاحب کی خواہش ہے کہ یہ معاملہ مزید نہ بگڑے۔ وہ مانتے ہیں کہ لڑکوں سے ایک بڑا جرم ہوا ہے۔ اپنی بے وقوفی سے انہوں نے قانون کو پیچھے لگا لیا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بچی صحیح سلامت گھر واپس پہنچ گئی ہے۔ اس صورت حال میں اگر کوئی درمیانی راستہ نکال لیا جائے تو دونوں پارٹیوں کے لیے بہتر ہوگا۔''

ناصر بھائی نے تپ کر کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! یہ کوئی زمین کے ٹکڑے کا جھگڑا نہیں جس میں دو پارٹیاں آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ یہ اغوا کا سنگین ترین جرم ہے۔ ایم این اے صاحب اس کا درمیانی راستہ کیا نکالیں گے... کیا ہمیں کوئی معاوضہ دیں گے؟ خدا کا خوف کرنا چاہیے انہیں۔ ہماری جو بدنامی ہو رہی ہے اور ہم جس اذیت میں ہیں، اس کا مداوا کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی تھوڑا بہت مداوا ہے تو یہی ہے کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو۔ واجی اور اس کے یاروں کو ان کے کیے کی پوری سزا ملے۔''

تھانے دار اشرف کا گندمی چہرہ ایک دم سرخ ہوا پھر وہ ذرا تحمل سے بولا۔ ''دیکھو برخوردار! مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے۔ لیکن مصیبت کے وقت تحمل مندی اور حوصلے سے کام نہ لیا جائے تو مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانونی کارروائی تو ہو ہی رہی ہے، تم لوگ اپنے سامنے دوسرے راستے بھی کھلے رکھو۔ تمام راستے بند نہیں کرنے چاہئیں۔''

میں نے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! اس طرح تو یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ یہ چاروں لڑکے کہیں ایم این اے صاحب کے پاس ہی پناہ لیے ہوئے ہوں۔''

''بالکل ایسا ہوسکتا ہے۔'' ناصر بھائی نے فوراً کہا۔ ''اور اگر وہ اس طرح کرتے ہیں۔ ایسے میں ہم ایم این اے صاحب سے بات چیت کریں گے تو بے وقوف ہی کہلائیں گے نا۔''

تھانے دار اشرف کا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہوگیا۔ وہ خالو شان سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''دیکھو شان صاحب! آپ کے بیٹے ہر بات کو الٹا لے رہے ہیں۔ آپ ان کو سمجھائیں ورنہ معاملہ خراب بھی ہوسکتا ہے... مجھے آپ سے ہمدردی ہے اس لیے یہ باتیں کہہ رہا ہوں۔ نیمو سراج کو پتا ہے کہ ان کے بچے سے جرم ہوا ہے۔ اس لیے ان کی نظر نیچی ہے لیکن جب ان کو اپنے بچے کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی تو ان کا رویہ بدل جائے گا۔ وہ مثال تو آپ نے بھی سنی ہوگی کہ بلی کو جب اپنے بھاگنے کا کوئی رستہ نظر نہ آئے تو وہ گھیرنے والے کی آنکھوں کی طرف آتی ہے۔ میں خدانخواستہ آپ کو ڈرا نہیں رہا ہوں، صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے کے ہر پہلو پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر خالو شان نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر منع کر دیا۔ یہ بات عیاں ہوتی جارہی تھی کہ تھانے دار اشرف سانی مخالف پارٹی کا اثر قبول کر رہا ہے۔ یہ اثر دباؤ کی شکل میں ہوسکتا تھا اور لالچ کی شکل میں بھی۔

گھر میں بھی عجیب تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ یہ چوتھے یا پانچویں روز کی بات ہے، امی جان نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میری چھوٹی بہن فرح کالج گئی ہوئی تھی۔ مجھ سے چھوٹا نا طف سویا ہوا تھا۔

امی جان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ کہنے لگیں۔ ''تابش بیٹا! پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ ہم تیری خالہ صفیہ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھا نہیں سکیں گے۔''

''آپ کس وعدے کی بات کر رہی ہیں؟''

امی نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ ''دیکھو تابش! صفیہ رشتے میں میری بہن ہے مگر میں اسے سگی بہنوں کی طرح ہی سمجھتی ہوں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں ثروت کو بہن بنا کر اس گھر میں لاؤں۔''

میں نے لرز کر کہا۔ ''تو اب کیا ہوگیا ہے امی! کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟ ثروت اس گھر میں دلہن بن کر آئے گی اور ضرور آئے گی۔''

امی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تابش! تو ابھی بچہ ہے۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔ دیکھ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد ہمیں بہت کچھ سوچنا پڑے گا اور ہم نے کون سا شامیانے لگا کر منگنی کی تھی... یا انگوٹھیاں پہنائی تھیں۔ بس ایک منہ زبانی بات ہی تھی نا۔''

''امی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے منہ میں شاید چچی جان کی زبان آگئی ہے۔ کیا... منہ زبانی بات کوئی بات نہیں ہوتی؟ زبان پر تو لوگ جانیں دے دیتے ہیں۔ آپ کو اس طرح ہرگز نہیں سوچنا چاہیے۔''

''میں سوچنے پر مجبور ہو رہی ہوں تابش! ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم یہ رشتہ چھوڑ دیں۔ اب تو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ۔ تیری چھوٹی بہن ہے، بھائی ہے۔ ہم نے اگلے ایک دو سالوں میں ان کے رشتے بھی ڈھونڈنے ہیں۔ ہم نے ثروت کا رشتہ کرلیا تو ثروت کے ساتھ ہی بدنامی بھی ہمارے گھر کا راستہ دیکھ لے گی۔ پھر تیری بہن کے لیے یہاں کوئی رشتہ آئے گا اور نہ

تیرے بھائی کو ڈسٹنگ کا رشتہ ملے گا۔"

"امی جان... خدا کے لیے... خدا کے لیے یہ دقیانوسی باتیں نہ کریں۔ ثروت ویسی ہی ہے جیسی وہ پہلے تھی۔ وہ پاک اور معصوم ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہیں ہوا ہے امی۔ اور اگر خدانخواستہ کچھ ہو بھی جاتا تو اس کا معصوم ہی رہتا تھا۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں، بہت چاہتا تھا۔ آپ پلیز ایسی باتیں نہ کریں، میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔"

اسی دوران میں ایک ہمسائی ہمارے گھر میں داخل ہو گئی۔ وہ بھی غالباً ثروت والے واقعے پر ہمدردی جتانے کے لیے آئی تھی۔ مجھے اور امی کو خاموش ہونا پڑا۔

میں چکرایا ہوا سا اپنے کمرے میں آ گیا اور بے جان سا ہو کر بیڈ پر گر گیا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ امی جان کے رویے میں جو تبدیلی تھی وہی تبدیلی میں چھوٹے بھائی عاطف میں بھی دیکھ رہا تھا۔ ہاں چھوٹی بہن فرح کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ ثروت سے بڑا پیار کرتی تھی۔ بہرحال، اس سانحے کے بعد سے وہ بھی کچھ چپ چاپ ہو گئی تھی۔ باقی رہے چچا، چچی اور ان کے بچے... سو وہ بھی اس رشتے کے حق میں ہونے ہی نہیں تھے۔

مجھے اندیشہ تھا کہ اس طرح کی باتیں کبھی ثروت کے کانوں تک پہنچ گئیں تو وہ بہت زیادہ اثر لے گی۔ میرا دل چاہا کہ میں ایک بار اکیلے میں اس سے ملوں اور اسے ہر طرح اپنی غیر مشروط اور غیر متزلزل محبت کا یقین دلاؤں۔ یہ یقین ہی تھا جو اسے دکھ اور مایوسی کے بھنور سے ابھرنے میں مدد دے سکتا تھا۔

میں ابھی ثروت کی طرف جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر بیل ہوئی۔ چھوٹے بھائی عاطف نے باہر جا کر دیکھا اور مجھے بتایا کہ کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔

میں باہر پہنچا تو سات آٹھ معزز صورتوں والے افراد باہر گلی میں کھڑے تھے۔ میں نے ان سے فرداً فرداً مصافحہ کیا۔ ایک سفید ریش، بھاری تن و توش والے شخص نے کہا۔

"میرا نام حاجی فیروز ہے... شاہ عالمی بازار میں سیٹھ سراج میرا ہمسایہ ہے۔ یہ باقی لوگ بھی بازار کے ہی ہیں۔ ہم آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

طوعاً و کرہاً میں نے ان حضرات کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ویسے بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہ حضرات کس لیے تشریف لائے ہیں۔ جلد ہی مدعا حاجی فیروز کی زبان پر آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ "جو کچھ ہوا ہے، بہت برا ہوا ہے۔ ہم سب بہنوں، بیٹیوں والے ہیں۔ اس دکھ کو بڑی اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک طرف سے اللہ کا شکر بھی ہے کہ بچی صحیح سلامت گھر واپس آ گئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "حاجی صاحب! یہ بات ہم پہلے بھی بہت واضح کر چکے ہیں۔ آپ نے جو کہنا ہے صاف صاف لفظوں میں کہیں۔ لیکن اگر آپ یہ بات کہنے کے لیے آئے ہیں کہ ہم سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے سے کسی طرح کی صلح صفائی کر لیں... تو یہ ایک نہ ہونے والی بات ہے۔ میں اس کے لیے آپ سے بہت بہت معذرت چاہتا ہوں۔"

حاجی فیروز نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "دیکھو بیٹا! تم عثمان صاحب کے ہونے والے داماد ہو۔ اس گھر میں تمہاری بات سنی بھی جاتی ہے۔ عثمان صاحب اور دیگر گھر والے تو اس وقت زیادہ صدمے میں ہیں لیکن تم انہیں اس معاملے کی اونچ نیچ سمجھا سکتے ہو۔ اس طرح کے کیس جب کورٹ کچہری تک پہنچتے ہیں تو پھر جگ ہنسائی اور پریشانی کے بہت سارے مرحلے نکلتے ہیں۔ پولیس کا تو سب کو پتا ہی ہے، وہ ایسے معاملوں کو کس طرح اچھالتی ہے۔ پھر عدالت میں جرح کے دوران عورت سے جس طرح کے سوال پوچھے جاتے ہیں وہ بھی سب جانتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ..."

"آپ اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہے ہیں جی... لیکن کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ شرمندگی اور جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے اس طرح کی ساری مظلوم لڑکیاں اپنی زبانوں کو تالے لگا لیں اور ظلم کرنے والے سینہ تان کر دندناتے پھریں اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے لیے نئے نئے شکار ڈھونڈتے رہیں؟"

حاجی فیروز کے ساتھ آنے والے ایک معزز شخص نے شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ "شاباش بیٹا! جرم کی سنگین نوعیت سے تو کسی کو انکار نہیں لیکن سیٹھ سراج کا لڑکا عادی مجرم نہیں ہے۔ وہ بس بری سوسائٹی کا شکار ہوا ہے۔ اگر اسے ایک بار سدھرنے کا موقع مل گیا تو وہ سدھر کر دکھا دے گا۔"

"سزا بھی تو سدھارنے کے لیے ہی ہوتی ہے چاچا جی!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"سزا تو بہت مل رہی ہے۔ اسے بھی اور اس کے گھر والوں کو بھی... لیکن جس سزا کی تم بات کر رہے ہو، وہ کسی کو سدھارتی نہیں ہے بلکہ بگاڑتی ہے۔ جیل سے اچھے بھلے لوگ بھی مجرم بن کر باہر نکلتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تم لوگ بہت بڑی نیکی کرو گے اگر ان لڑکوں کے لیے دل میں کسی طرح کی

نرمی پیدا کر لو گے۔"

میں نے کہا۔ "آپ سب مجھ سے زیادہ بڑے اور سمجھ دار ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کے لیے یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ ہمارے زخم ہرے ہیں۔ آپ ان پر نمک پاشی نہ کریں تو بہتر ہے۔"

یہ بزرگ دس پندرہ منٹ تک مزید میرے پاس بیٹھے۔ وہ مجھے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ میں کم از کم ایک بار اپنے خالو عثمان اور سیٹھ سراج کی ملاقات کا اہتمام کر دوں۔ بہرحال، میں کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو رخصت کرنے میں کامیاب رہا۔

شام کو مجھے پتا چلا کہ یہ "مصالحتی ٹیم" خالو عثمان اور ناصر بھائی وغیرہ سے بھی ملی ہے۔ تھوڑی محبت اور تھوڑے دباؤ کے ساتھ انہوں نے خالو عثمان کو کیس کی پیروی سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔

یہ بڑی تلخ صورت حال تھی۔ ایک گھرانے کو شدید ترین اذیت سے دوچار کرنے کے بعد اب اس کو دباؤ کا شکار بنایا جا رہا تھا... میری رگوں میں خون کھول رہا تھا اور پورے جسم میں زہر بن کر پھیل جاتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ناانصافی کرنے والوں کی گردنوں تک اپنا ہاتھ پہنچاؤں اور انہیں گھسیٹ کر چوراہوں میں لے آؤں۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے جو طاقت اور توانائی درکار تھی وہ میرے اندر نہیں تھی۔

اگلے روز صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ میں ثروت سے ملنے خالو کے گھر پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ خالو عثمان اور ناصر بھائی وغیرہ گھر میں نہیں ہوں گے۔ خالہ صفیہ کی اجازت سے میں ثروت کے ساتھ چند باتیں کر لوں گا۔

گم صم خالہ سے علیک سلیک کرنے کے بعد میں ثروت کے کمرے میں پہنچا تو وہ چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ بیڈ پر سرہانے کی طرف اس کی ایک خوب صورت تصویر آویزاں تھی۔ یہ گھر کے پھولوں بھرے لان کا منظر تھا۔ وہ آف سفید قمیص میں تھی اور واٹر پائپ کے ذریعے اپنے چھوٹے بھتیجے پر پانی پھینک رہی تھی۔ پانی کی پھوار کے پیچھے وہ خود کسی جل پری کی طرح نظر آتی تھی۔ ہوا سے اڑتے بال، لکیروں جیسے دانت اور رخساروں پر بکھرے ہوئے پانی کے قطرے جیسے گلاب پر شبنم کا بسیرا ہو۔ کتنی سونی اور خوشی سمٹ آئی تھی اس ایک لمحے میں اس کے اندر۔ یہ میری بھی پسندیدہ تصویر تھی اسی لیے ثروت نے اسے اپنے بیڈ روم میں لگائی تھی۔

"ثروت!" میں نے ہولے سے آواز دی۔

وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے چادر اپنے اوپر سے ہٹائی اور سوجی سوجی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تحیر کا رد عمل ہوا اور وہ دوپٹا سنبھالتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے عقب میں پھولوں بھرے لان والی تصویر تھی۔ کتنا فرق تھا ان دونوں مناظر میں۔ ایک میں خوشی کا عروج، ایک میں اداسی اور غم کی انتہا... اداس دلوں میں ہی صدیوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیسی ہو ثروت؟"

وہ سسکی اور منہ پھیر کر بولی۔ "اب کوئی کسر رہ گئی ہے... جو تم نکالنے آئے ہو۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جو کچھ ہوا ہے، تمہیں بھی ضرور پتا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری مرضی بھی اس میں شامل ہو۔"

"قسم سے ثروت! مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ کچھ بھی پتا نہیں۔"

"کل تمہاری امی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے امی سے پتا نہیں کیا باتیں کی ہیں، وہ کل شام سے رو رہی ہیں۔ نہ کچھ کھایا پیا ہے، نہ کسی سے بات کرتی ہیں۔"

"لیکن پتا تو چلے ثروت! بات کیا ہوئی ہے؟"

"تم انجان بنتے ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ تمہیں بھی اندازہ ہو گیا ہو گا۔"

"کہیں تم اپنے اور میرے رشتے کی بات تو نہیں کر رہی ہو؟"

ثروت نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اپنے گھٹنوں پر ماتھا ٹیکا اور چہرہ چھپا کر سسکیوں کے درمیان بولتی چلی گئی۔ "میری طرف سے تم آزاد ہو جابر! میں تم پر کوئی روک نہیں لگاؤں گی۔ نہ گزرے دن یاد دلا کر تم سے کوئی شکوہ شکایت کروں گی۔ میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ بس مجھے معاف کر دو۔ میں بدنصیب ہوں۔ خود کو تمہارے لائق نہ رکھ سکی۔ اب جو سزا مجھے ملی ہے، وہ میں اچھی طرح جان گئی ہوں اور یہ بھی جان گئی ہوں کہ اس نابات سے یہ سزا معاف نہیں ہوگی۔ اسی لیے میں قبول کرتی ہوں، سب کچھ قبول کرتی ہوں۔" وہ روتی چلی گئی۔

میرا دل کٹ کر ٹکڑے ہو گیا۔ میں ثروت کی حساس طبع کے بارے میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت اس کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ثروت! تم کسی کی باتوں پر نہ جاؤ۔ شادی میری اور تمہاری ہوگی اور یہ ضرور ہوگی۔ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ امی جان کو بھی راضی کر لوں گا۔ میں جو چاہوں گا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

"میرے لیے کس کس سے لڑو گے؟ کس کس کی زبان بند کرو گے؟ میں تمہاری زندگی کو عذاب میں ڈالنا نہیں چاہتی تابش... تم وہی کرو جو تمہارے بڑے کہتے ہیں۔" اس کا چہرہ بدستور آنسوؤں پر بھیگا رہا۔

"ایسا نہیں ہوگا ثروت! اور نہ ہوتا ہے۔ ہاں، یہ ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہونے میں تھوڑا سا وقت ضرور لگے گا۔ تب اس تھوڑے سے وقت کو ہم نے ہمت اور حوصلے سے گزارنا ہے... تم دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میری طبیعت خراب ہے تابش! اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو... پلیز... پلیز!"

میری آنکھوں میں نمی تھی۔ میں اس کے ہاتھ کو تسلی بخش انداز میں تھپک کر باہر آ گیا۔ خالہ صفیہ اور نصرت وغیرہ میں سے کوئی میرے سامنے نہیں آیا اور نہ کسی نے بات کی۔

میں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کسی لڑکی کے ساتھ پیش آنے والا اس طرح کا واقعہ اس کی اور اس کے وارثوں کی زندگی میں اس طرح کا طوفان بپا کر سکتا ہے۔ تب بہت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ امی لان میں تھیں۔ میرا چہرہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں۔ "کیا ہوا تابی؟" انہوں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"یہ تو آپ بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟"

"میں سمجھی نہیں؟"

"آپ نے کل خالہ صفیہ کو فون کیا ہے۔ اس کے بعد سے ان کا رویہ اور گھر کا برا حال ہے۔"

امی نے محبت سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مجھے ایک طرف کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"تابش! مجھ سے قسم لے لو جو میں نے کوئی ایسی ویسی بات کی ہو۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں ابھی آ نہیں سکتی کیونکہ فرح کے پیپر ہو رہے ہیں، اس لیے مصروف ہوں۔"

"آپ ذرا غور تو کریں امی! جس دن سے یہ واقعہ ہوا ہے آپ صرف ایک دفعہ خالہ کے گھر گئی ہیں۔ فون بھی آپ نے بس ایک آدھ بار ہی کیا ہوگا۔ اگر اب خالہ صفیہ نے آنے کا کہا تھا تو آپ چلی جاتیں مگر آپ نے مصروفیت والی بات کہہ دی۔ اور میں سمجھتا ہوں امی کہ بات سے بھی زیادہ وہ لہجہ اہم ہوتا ہے جس میں بات کہی جاتی ہے۔ آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ...."

"تابش! کوئی بات نہیں بولی۔" امی نے تیزی سے میرا جملہ کاٹا۔ "بس صفیہ محسوس زیادہ کر گئی ہے۔"

"اگر آپ کو پتا ہے کہ وہ زیادہ محسوس کرتی ہیں تو پھر آپ کو زیادہ احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ ان کی ذہنی حالت آج کل جیسی ہو رہی ہے آپ کو بھی پتا ہے۔"

امی خاموشی سے میری بات سنتی رہیں۔ ان کے چہرے سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "امی! آپ جو بھی سوچتی ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ میری مرضی کا خیال رکھیں گی۔ بچپن سے لے کر آج تک میرے لیے ہر چھوٹی بڑی چیز آپ نے ہی پسند کی ہے۔ ثروت کو بھی آپ نے ہی پسند کیا تھا۔ یہ آپ ہی کا دکھایا ہوا راستہ ہے جس پر میں چل رہا ہوں۔"

میں اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے بیڈ پر اخبار پڑا تھا۔ اس میں پھر جلیل سراج کے مفرور صاحب زادے اور ثروت کے بارے میں ایک مختصر خبر موجود تھی۔ خبر کے آغاز میں ہی یہ خیال آرائی موجود تھی کہ متاثرہ لڑکی "ث" کی دوستی ماضی میں واجد عرف واجی سے بھی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس اخبار کو جلا دوں اور اس کے ساتھ ہی اس دفتر کو بھی جہاں سے یہ اخبار شائع ہوتا ہے۔ جانے کیوں ہم لوگ دوسروں کی پگڑیاں اچھالنے کے لیے اتنے مستعد کیوں ہوتے ہیں؟ میں سوچنے لگا کہ اگر اس اخبار والے کی اپنی بیٹی یا بہن کے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہوتا تو کیا پھر بھی وہ اسی طرح کی سرخیاں جماتا؟

میں نے اخبار پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ امی جان تو ایسا نہیں کر سکتی تھیں... یقیناً یہ چچی یا چچا کا کام ہی تھا جو اتنے اہتمام سے یہ اخبار میرے بیڈ پر رکھا گیا تھا۔

کمرا بند کر کے میں بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ ثروت کی روتی ہوئی صورت بار بار آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ چند ہی روز میں وہ کملایا ہوا پھول لگتی تھی۔ گزرے ہوئے دنوں کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن میں چمکنے لگا۔ پہلی بار میں نے ثروت کو پورے دھیان سے شادی کی ایک تقریب میں ہی دیکھا تھا۔ اسی تقریب میں امی جان نے بھی اسے خاص نظروں سے دیکھا اور میرے لیے منتخب کر لیا۔ خالہ صفیہ اور پھر خالو عثمان وغیرہ سے بات ہوئی اور دونوں طرف سے "ہاں" ہو گئی۔ منگنی کی باقاعدہ تقریب کا بھی ارادہ تھا مگر وہ پروگرام ٹلتا رہا۔ دراصل دونوں گھرانے ایک دوسرے کے اتنے قریب آ چکے تھے کہ اس قسم کے کسی تکلف کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

شروع میں ہمارے درمیان جھجک تھی۔ پھر عید کے موقع پر میں نے ثروت کو ایک خوب صورت سا عید کارڈ بھیجا۔ ثروت نے بھی فرح کے ذریعے مجھے کارڈ ارسال کیا۔

اس کے بعد کبھی کبھی فون پر ہماری مختصر بات ہونے لگی۔ ثروت عام کالج گرلز کی طرح اکھڑ مزاج نہیں تھی۔ اس کی گفتگو میں ایک طرح کا وقار اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اس کا یہی انداز مجھے زیادہ اچھا لگا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ بالغ اور سمجھ بوجھ رکھتی تھی۔ وہ خداداد ذہانت کی مالک تھی۔ انگلش اور اردو کی بے شمار شاعری اسے زبانی یاد تھی۔

دھیرے دھیرے فون پر ہماری گفتگو بے تکلف ہوتی گئی۔ پھر کبھی کبھی ہم گھر سے باہر بھی ملنے لگے۔ ہمارا ٹھکانا زیادہ تر شیزان ہوٹل یا شاہراہ قائداعظم کا ایک آئس کریم بار ہوتا تھا۔ ثروت ایک دھیمی لیکن مسلسل بارش کی طرح میری ذات میں سرایت کرتی چلی گئی... ہم نے سرما کی سنہری دوپہروں، بہار کی خوشبودار شاموں اور گرما کی چاندنی راتوں میں ایک ساتھ بہت سے خواب دیکھے۔ کبھی کبھی تو ہم مستقبل میں اس قدر کھو جاتے کہ اپنے گھر کی آرائش اور اندرونی آرائش کی تیاریاں تک ہونے لگتیں۔

یہ جیسے کل ہی کی آوازیں تھیں جو میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ہم ریسٹورنٹ کے پرسکون ماحول میں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ "مجھے ٹی وی لاؤنج وغیرہ میں ذرا سا گہرا رنگ پسند ہے۔"

"اس معاملے میں میری پسند تھوڑی سی مختلف ہے۔ ٹی وی لاؤنج یا کامن روم میں مجھے ایپل وائٹ بڑا اچھا لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ہلکے سبز پردے ہوں اور فرنیچر میں بھی اسی کلر کا ٹچ ہو۔"

"لیکن یار! یہ ہلکا رنگ گندا بھی جلدی ہو جاتا ہے، خاص طور سے ٹی وی لاؤنج میں۔"

"تو بندہ ذرا احتیاط کر لے۔" وہ بات کی [illegible] لے کر مسکرائی۔

"بندہ تو احتیاط کر لیتا ہے... اور کرنے کو بھی... لیکن بچوں کا کیا کیا جائے۔ یہ تو چند ہفتوں بلکہ دنوں میں گل کاریاں کر دیتے ہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر شفق کا رنگ لہرا گیا۔ اس نے پریشان نظروں سے دائیں بائیں دیکھا... پھر سنبھل کر بولی۔ "بچوں کو سکھایا جائے تو وہ سب کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ یہ بڑے ہی ہوتے ہیں جن کی عقل میں کوئی بات نہیں آتی۔"

"اگر بڑوں سے مراد میں ہوں، تو میں نے کون سی ایسی بے عقلی کی ہے؟"

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ ہر وقت تو ستاتے ہو۔" وہ بچکانہ شوخی سے بولی۔

میرے اندر کہیں بیٹھا بیٹھا وہ جاگ اٹھا۔ "اچھا، کوئی ایک بے عقلی تو بتاؤ۔" میں نے لطف لینے والے انداز میں کہا۔

"ایک بے عقلی تو جناب اب بھی فرما رہے ہیں۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ ریسٹورنٹ میں آہستہ بولا کرو۔"

"زیادہ آہستہ بولنے سے بھی لوگ شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کا تو کام ہی شک کرنا ہے۔"

...اور اس طرح کی بہت سی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میں کمرے میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ پہلے والی ثروت کتنے عرصے میں واپس لوٹے گی... اور لوٹے گی بھی یا نہیں... میری رگوں میں اندھیرا سا اترنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہت حساس ہے۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ اس کے ارد گرد جو سرگوشیاں ابھر رہی تھیں، وہ اسے مزید توڑ پھوڑ رہی تھیں۔

واجی اور اس کے تینوں دوست ابھی تک لاپتا تھے۔ ان کا لاپتا ہونا بھی ہماری مایوسی میں اضافہ کر رہا تھا اور اس سے بھی بڑی مایوسی یہ تھی کہ مقامی پولیس کا رویہ حوصلہ شکن تھا۔ تھانے دار اشرف واضح طور پر ملزم پارٹی کی سائیڈ لے رہا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ کل خالو عثمان اپنے دوست احباب صاحب کے ساتھ تھانے دار اشرف سے ملنے گئے تو اس کے اے ایس آئی نے ان سے درشت لہجے میں بات کی اور ایک گھنٹا باہر بٹھائے رکھا۔ بعد میں بتایا کہ اشرف صاحب ایک ضروری میٹنگ میں چلے گئے ہیں۔

میں رات آخری پہر تک جاگتا رہا اور اپنی ہی سوچوں سے نبرد آزما رہا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے معاشرے میں کمزور آدمی کو انصاف حاصل کرنے کے لیے برف اور آگ کے سات سمندروں میں سے کیوں گزرنا پڑتا ہے؟ وہ مظلوم و مضروب ہو کر بھی ادھ موا کیوں ہے؟ کیوں ہر دستک پر چونکتا ہے؟ کیوں ہر فون بیل پر اس کا دل ہولتا ہے؟ عدل کی زنجیر ہلانے سے پہلے اس کے دونوں ہاتھ کیوں کانپ جاتے ہیں؟

اگلے روز میں ایک دفتر میں نوکری کے لیے انٹرویو دے کر واپس آ رہا تھا۔ گاڑی عاطف لے کر گیا ہوا تھا اس لیے میں پیدل ہی تھا۔ علامہ اقبال ٹاؤن کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ ہوٹل ذیشان کے سامنے سے نکلا تو ایک شخص نے

آواز دے کر مجھے بلایا۔ "سنو بھائی جان!"

میں نے بائیں طرف دیکھا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں ایک چمچماتی ہنڈا اکارڈ کے قریب اس کا ڈرائیور کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے میرے قریب آیا۔ "صاحب بلا رہے ہیں۔" اس نے اپنے عقب میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا اور چونک گیا۔ یہ سیٹھ سراج تھا۔ یہ سیاہ گاڑی بھی اسی کی تھی۔ سیٹھ سراج سفید لٹھے کی کڑکڑاتی شلوار قمیص میں تھا۔ وہ ایک بھاری جسم کا شخص تھا۔ جسم کے مقابلے میں سر کافی چھوٹا تھا۔ گھنگریالے بالوں میں خوب تیل لگا کر رکھتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق یہ شخص چٹا ان پڑھ تھا۔ میں چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پاس پہنچا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بتیسی دکھا کر بولا۔ "تمہارا نام تابش ہے نا؟"

"جی فرمایئے۔" میں نے کہا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ اچھا اتفاق ہے کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔" وہ گلابی اردو میں بولا۔

"کہیے، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"یہاں کھڑے کھڑے کیا خدمت ہو سکتی ہے بابا جی۔ تم سے ایک بہت ضروری گل کرنی تھی۔ اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو آؤ ذرا دو منٹ اندر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"لیکن میں ذرا جلدی میں تھا۔ دراصل..."

"یار بابا! یہ دراصل، لیکن، چنانچہ، اگر مگر سب بے کار کے لفظ ہیں۔ بس دو منٹ کی بات ہے۔ چائے کا ایک کپ پیتے ہیں۔ پھر تم چلے جانا۔"

اس نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر رکھ دیا۔ چار و ناچار میں سیٹھ سراج کے ساتھ چلتا ہوا ہوٹل کے نیم گرم ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ اس ہوٹل کی اندرونی سجاوٹ گاؤں کے انداز کی تھی۔ یہاں جدید کھانوں کے علاوہ دیہات کے سارے پکوان بھی ملتے تھے۔ ہم رنگین پایوں والی نواڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ "جی کہیں، آپ کو کیا کہنا ہے؟"

میری سنی ان سنی کرتے ہوئے سیٹھ سراج نے بیرے کو بلایا اور کہا۔

"بس وہی روز والا... لیکن ڈبل۔"

بیرا ادب سے جھک کر واپس چلا گیا۔ سیٹھ سراج ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے کئی بار چاہا کہ وہ کام کی بات کی طرف آ جائے مگر وہ ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ کھانا آ گیا۔ کھانا کیا تھا، سات آٹھ آدمیوں کی خوراک تھی۔ چھوٹے پائے، روسٹ مچھلی، ہانڈی گوشت، کڑاہی گوشت اور پتا نہیں کون کون سے گوشت۔ ساتھ میں نمکین لسی سے بھرا ہوا جگ اور تندوری پراٹھے وغیرہ۔

سیٹھ سراج کے بے حد اصرار پر میں نے چند لقمے لیے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس بکھیڑے کا اینڈ جلد ختم ہو اور میں اس سے جان چھڑا کر باہر نکل سکوں۔ کھانے کے بعد صابن سے ہاتھ اور ٹھوڑی وغیرہ صاف کرنے کے بعد سراج نے دو طویل ڈکاریں لیں اور اچانک بولا۔ "بابا! تم شکل سے سمجھ دار لگتے ہو۔ تم ہی اس معاملے کا کچھ کرو۔ منڈروں سے گڑبڑ ہو گئی ہے، پر ہر غلطی کی کوئی تلافی بھی تو ہوتی ہے نا۔ کورٹ کچہری میں جائیں گے تو ساروں کی بدنامی ہو گی اور لڑکی کی زیادہ ہو گی۔ وہ جیسے عثمان صاحب کی دھی ہے، ویسے ہی میری بھی دھی ہے۔ ہم اس بات کو اور بڑھانا نہیں چاہتے۔"

"بات تو اب بڑھ چکی ہے سیٹھ جی۔ جو بدنامی ہونی تھی ہو رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی۔ باقی رہی تلافی والی بات تو اس کو آپ لڑکی کے وارثوں سے پوچھیں۔"

"پر تم اس گھر کے ایک اہم بندے ہو۔ وہ بابا، تم کہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔ اپنے خالہ صاحب کو بہت کچھ سمجھا سکتے ہو۔ بدلے میں تم جو کام مجھ سے لینا چاہو، میں حاضر ہوں۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے بابو یار۔ اگلے وقتوں والے کہتے ہیں نا کہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو دھوتا ہے۔"

میرا خون کھول اٹھا لیکن میں بولا کچھ نہیں۔ سیٹھ سراج حماقت کے زعم میں مجھے اپنی راہ پر لانا چاہ رہا تھا۔ اسی دوران میں سیٹھ کے ڈرائیور نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا۔

"تمہاڑی کال اے جی۔"

ان دنوں موبائل فون کم لوگوں کے پاس تھے۔ سیٹھ سراج نے کال اٹینڈ کی۔ ڈرائیور ادب سے اٹین شن حالت میں پاس ہی کھڑا رہا۔ سیٹھ سراج کچھ دیر تک کال سنتا رہا اور "ہوں ہوں" کرتا رہا۔ آخر میں بولا۔ "تم فکر نہ کرو ڈاکٹر صاحب! ہمارے ہوتے ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔"

فون بند کر کے اس نے ایک اور نمبر ملایا پھر بولا۔ "ایم این اے صاحب سے بات کراؤ۔" چند لمحے بعد ایم این اے سے اس کی بات چیت شروع ہو گئی۔ "ادھر ایک کوئی سفارشی لگ آ گیا ہے گورابا صاحب! ڈاکٹری کی نوکری جی اس کو ملی تھی۔ اب اسے پیچھے ہٹا کر اپنی کسی پھوپھی جانی کو آگے لانا چاہتا ہے۔ آپ نے یہ کام نہیں ہونے دینا ہے کسی بھی طرح... ٹھیک ہے... ہاں جی ٹھیک ہے... بالکل ٹھیک ہے۔

میں خود جاؤں گا۔ سلاما لیکم۔"

گفتگو ختم کرنے کے بعد اس نے آدھا گلاس لسی پی اور مونچھیں صاف کر کے بولا۔ "یار یہ گورابا صاحب بڑے کام کے بندے ہیں۔ اپنے شہر کی ساری نہیں تو آدھی نوکریوں پر ضرور ان کا زور چل جاتا ہے۔" پھر وہ ذرا چونک کر میری طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ "ہاں، مجھے ایک دن عثمان صاحب سے پتا چلا تھا کہ تم بھی نوکری شوکری ڈھونڈ رہے ہو؟"

میں خاموش رہا۔

وہ بولا۔ "آج کل گورابا صاحب کا جتھہ بہت اچھے ٹک جا رہا ہے۔ اگر تم کہو تو میں آج ہی تمہارے بارے میں ان سے گل کر دیتا ہوں۔"

"مجھے ایسی سیاسی نوکری نہیں چاہیے جو اگلے الیکشن کے بعد چھوڑنی پڑے... اب مجھے اجازت دیں۔ کھانے کے لیے بہت شکریہ۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"یار بابا! تم بڑے روکھے بولتے ہو۔"

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں... دراصل..."

"پھر وہی دراصل... تمہیں کہا ہے نا یہ دراصل... لیکن... اگر... مگر بولنے والے بندے مجھے زہر لگتے ہیں۔ سیدھی سیدھی گل کرنی چاہیے۔"

"کیا سیدھی سیدھی گل کروں؟"

"تم اس معاملے میں کچھ کر سکتے ہو یا نہیں؟"

"جی نہیں۔"

"جی بھی... اور نہیں بھی۔ تم دوغلی گل کر رہے ہو اور دوغلی گل کرنے والے بندے چنگے نہیں ہوتے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کی تیوریوں سے چڑھی ہوئی تنگ پیشانی کے نیچے اس کی آنکھوں میں دو چنگاریاں سی چمکیں۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، وہ اپنے ڈرائیور سے بولا۔ "چلو فتح محمد۔" بیرے کو کوئی ٹپ دیتا ہوا وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں دوسرے دروازے سے پچھلی سڑک پر آ گیا۔

سات آٹھ روز اسی طرح گزر گئے۔ صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ جو دو افراد ثروت کو سڑک سے اٹھانے والی کارروائی میں شریک تھے، ان کا پتا چل گیا۔ یہ ویگن (ڈبی) چلانے والے کرائے کے غنڈے ہیں۔ انہیں اس کام کے لیے پندرہ پندرہ ہزار روپے فی بندہ دیا گیا تھا۔ پانچ ہزار پیشگی، دس ہزار کام کے بعد ملا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ انعام وغیرہ بھی تھا۔ ان دونوں افراد کے ساتھ تیسرا بندہ راجی کا یار "نور لمبا" ہوتا تھا۔ اسٹیشن ویگن بھی راجی وغیرہ نے ہی فراہم کی تھی۔ ان دونوں افراد کی نشان دہی پر پولیس نے راجی کے چوتھے ساتھی ابدال کو پکڑ لیا۔ پولیس نے ابدال کو عدالت میں پیش کر کے اس کا سات روزہ ریمانڈ لیا تھا۔ لیکن ابھی تک اس سے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا یا شاید پولیس نے ٹھیک طرح سے پوچھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ابدال کا موقف تھا کہ وہ راجی وغیرہ کا دوست ضرور رہا ہے لیکن مذکورہ واردات میں اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔

ان سات آٹھ روز میں ثروت سے بھی میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ ہمارے اپنے گھر میں بھی صورت حال کچھ کشیدہ سی تھی۔ امی اور فرح میرے لیے پریشان رہتی تھیں۔ ایک روز صبح سویرے گھنٹی بجی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ فون ثروت کے گھر سے ہے اور وہاں سے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔

میرا اندیشہ درست نکلا۔ نصرت نے روتے ہوئے بتایا کہ ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ اسپتال میں ہیں۔

یہ تشویش ناک صورت حال تھی۔ خالو عثمان کو انجائنا کی ہلکی پھلکی تکلیف تو پہلے سے تھی۔ ڈاکٹر نے انہیں انجیوگرافی کا مشورہ بھی دیا تھا لیکن وہ مسلسل نظر انداز کر رہے تھے۔

ہم بھاگم بھاگ اسپتال پہنچے... اس وقت تک خالو عثمان اپنے خالق حقیقی سے مل چکے تھے۔ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں کہرام مچا ہوا تھا۔ خالہ صغریٰ بے ہوش تھیں۔ نصرت، ثروت اور ان کی پھوپھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ دیگر عزیز بھی اشک بار کھڑے تھے۔

ثروت کی پھوپھی جان زینب نے مجھے دیکھا تو روتے ہوئے کہا۔ "میرے بھائی کو بچی کا دکھ لے گیا۔ اللہ غارت کرے ان بدمعاشوں کو جنہوں نے میرے بھائی کی جان لے لی۔ ہم کہاں انصاف مانگیں... کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں؟"

خالو عثمان کی تجہیز و تکفین کے دوران میں عجیب سی کیفیت طاری رہی۔ خالو عثمان کو فجر کے وقت دل کی تکلیف شروع ہوئی تھی۔ وہ پہلے تو اسپتال جانے سے کتراتے رہے پھر جب درد بڑھ گیا تو انہیں اسپتال لے جایا گیا جہاں پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر ختم ہو گئے۔ میں نے خالہ صغریٰ اور ناصر بھائی وغیرہ سے بہت پوچھا کہ کوئی ایسی خاص بات تو نہیں ہوئی تھی جس کا خالو نے اثر لیا ہو۔ انہیں کوئی ایسی بات معلوم نہیں تھی۔ مگر میرے دل میں نہ جانے کیوں کھٹکا سا تھا کہ ثروت کے حوالے سے ہی کوئی خاص بات ہوئی ہے جس کا

دکھ انہیں پہنچا ہے۔ میرا دھیان بار بار تھانے دار اشرف ساہی اور سیٹھ سراج وغیرہ کی طرف ہی جاتا تھا۔

☆☆☆

خالو عثمان کی وفات کے بعد خالہ صفیہ بھی بستر سے لگ گئیں۔ انہیں مسلسل بخار رہنے لگا تھا۔ یہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ ناصر بھائی بینک میں ملازم تھے۔ اپنی ڈیوٹی میں سے وقت نکالنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ نصرت گھر کا کام کاج سنبھالتی تھی، ثروت خود بیمار ہونے کے باوجود ماں کی تیمارداری میں لگی رہتی تھی۔ خالو عثمان ایک پرائیویٹ سروس کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ چند سال پہلے تک کپڑے کی فروخت کا کام بھی کرتے رہے تھے۔ ان کی تنخواہ آنی بند ہوئی تو گھر پر معاشی دباؤ بھی آ گیا۔ لیکن ان سارے مصائب سے بڑی وہ مصیبت تھی جو بدنامی کی صورت میں خالو مرحوم کے گھر پر سایہ فگن تھی۔

ایک دن ناصر بھائی نے مجھ سے کہا۔ "یار تابش! کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ یہ گھر چھوڑ دیں۔ کہیں اور مکان لے لیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ مکان بیچ دیں؟"

"ہاں، ایک مہک سی بھی لگ رہی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے وہ وہ... میں اس جگہ سے کچھ الرجک سا ہو گیا ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آتے جاتے سیٹھ سراج یا اس کے گھر کا کوئی اور فرد نظر آ جاتا ہے۔ ان لوگوں کو دیکھتا ہوں تو خون کھول جاتا ہے۔"

"سراج کی صورت تو مجھ سے بھی نہیں دیکھی جاتی۔ خالو کے جنازے پر آیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا قبرستان میں ہی اسے پکڑ لوں اور مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں۔ میں تو کہتا ہوں یہی بندہ خالو کی موت کا ذمے دار ہے۔ یہ مسلسل انہیں ذہنی اذیت پہنچا رہا تھا۔"

"آپ کس کس پر الزام دھریں۔ ایک طرف وہ ایس ایچ او اشرف ہے۔ وہ صاف طور پر مخالف پارٹی کی حمایت لے رہا ہے۔ پھر وہ ایم این اے گورایا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تینوں لڑکوں کو پناہ بھی اسی نے دی ہوئی ہے۔ کسی دن میں گھوم گیا تو پستول لے کر نکل جاؤں گا اور ایک ایک کو شوٹ کر دوں گا۔"

میں ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ شوٹ کرنے اور جان سے مارنے والی باتیں میں بھی کئی دفعہ سوچ چکا تھا لیکن ایسی سوچوں کو عملی جامہ پہنانا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور سے ہم جیسے لوگوں کے لیے۔ سوچ اور عمل کے درمیان بے شمار رکاوٹیں اور مصلحتیں آن کھڑی ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں ناصر بھائی اس معاملے میں مجھ سے بہتر تھے لیکن کوئی بڑا جھگڑا کھڑا کرنے یا کسی کو شوٹ کرنے کی حد تک وہ بھی نہیں جا سکتے تھے۔

ہم دونوں گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ اندر سے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ ہم بھاگتے ہوئے صحن میں پہنچے۔ منظر دل دوز تھا... خالہ صفیہ سیڑھیوں کے قریب بے سدھ پڑی تھیں۔ ان کا سر ثروت کی گود میں تھا۔ ثروت مسلسل چلا رہی تھی۔ "امی جی... آنکھیں کھولیں... امی جی۔"

خالہ صفیہ کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور نچلا ہونٹ بری طرح پھٹ گیا تھا... یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ وہ سیڑھیوں سے گری تھیں، قریب ہی صابن کی ٹکیہ اور چھوٹا تولیا پڑا ہوا تھا۔

"انہیں اسپتال لے جائیں!" نصرت دل دوز آواز میں بولی۔

ہم نے فوراً خالہ صفیہ کو ہاتھوں میں اٹھایا اور کسی نہ کسی طرح موڑ کی گاڑی تک لے آئے۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھیں۔ ثروت بھی والدہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ میں نے تیزی سے گاڑی چلاتے ہوئے انہیں قریبی اسپتال پہنچایا۔ راستے میں ثروت نے روتے ہوئے بتایا۔ "نیچے کا باتھ روم خالی نہیں تھا۔ وہ بخار کی حالت میں اوپر گئی تھیں اور واپس آتے ہوئے گر گئیں۔"

قریبی اسپتال والوں نے کہا کہ ان کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ انہیں فوراً جنرل اسپتال لے جاؤ۔ وہاں ان کے سر کا سی ٹی اسکین وغیرہ ہوگا۔ ہم انہیں لے کر جنرل اسپتال پہنچے۔ بہت بھاگ دوڑ کر کے سی ٹی اسکین ہوا۔ معلوم ہوا کہ دماغ میں خون کے دو لوتھڑے ہیں جو زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپریشن کی ضرورت ہے۔

اسی روز رات کو خالہ کا آپریشن ہو گیا لیکن وہ دو روز بے ہوش رہیں۔ ثروت اور نصرت کا رو رو کر برا حال تھا۔ ابھی باپ کی موت کا صدمہ تازہ تھا کہ یہ آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ خالہ صفیہ کی بے ہوشی طویل ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ہماری پریشانیاں بھی بڑھ رہی تھیں۔ آخر ایک صبح ڈاکٹر نے یہ منحوس خبر سنائی کہ وہ کوما میں چلی گئی ہیں۔

وہ اپنے اردگرد کے تمام دکھوں اور مسائل سے پیچھا چھڑا کر بے ہوشی کی اوٹ میں اوجھل ہو گئی تھیں۔ میں ان کا چہرہ دیکھتا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ اس عالم بے خبری میں بھی اپنی

مصیبت زدہ بیٹی کے لیے دعا گو ہیں۔ ان کے لبوں کی خفیف لرزش کبھی ایسی ہی دعا کی نشان دہی کرتی تھی۔

اب ہم بھی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ان کی زندگی کے لیے، ان کی واپسی کے لیے... ایک دن ناصر بھائی نے مجھے زبردستی گھر بھیجا کہ میں چند گھنٹے آرام کر لوں اور تازہ دم ہو جاؤں۔ شام کے وقت میں نے ناصر بھائی کو فون کیا اور پوچھا۔ "میں کتنے بجے تک پہنچ جاؤں؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ناصر بھائی پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ "وہ چلی گئیں تابش... وہ ہمیں چھوڑ گئیں۔"

میں پتھر کا بت بنا بیٹھا رہ گیا۔ تقریباً بارہ دن بے ہوش رہنے کے بعد وہ بھی سفر آخرت پر روانہ ہو گئی تھیں۔

ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اس گھرانے پر دیکھتے ہی دیکھتے کئی آفتیں ٹوٹ پڑی تھیں۔ کسی وقت میں خود کو بھی بری طرح ملامت کرنے لگتا۔ میں سوچتا کہ شاید آفتوں کے اس سلسلے کا سبب میں ہی بنا ہوں۔ میں نے گھر سے باہر ثروت سے ملنا جلنا شروع کیا۔ میں اسے ریسٹورنٹ میں بلاتا رہا۔ اس میل جول کی وجہ سے ہی سراج شیر ہوا اور زیادہ شدت سے ثروت کے پیچھے پڑ گیا۔

میں ایک بار پھر ثروت کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی جھیل سی آنکھوں کی چمک لوٹانا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے اکیلے پن اور دکھوں کا یہ حصار توڑنا چاہتا تھا۔ دل کرتا تھا میں اس کے گرد اپنی بانہوں کا حصار بنا دوں۔ وہ میرے سینے میں چہرہ چھپا کر آنکھیں بند کر لے۔ میں اس کی طرف بڑھنے والے ہر رنج و الم کا رخ موڑ دوں۔

خالہ صفیہ کے چالیسویں کے موقعے پر قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ امی تو قرآن خوانی کے بعد جلدی ہی واپس چلی گئیں، میں وہیں موجود رہا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح ثروت سے بات کرنے کا کوئی موقع مل جائے۔ فون تو وہ اٹھاتی ہی نہیں تھی۔ پچھلے ایک مہینے میں، میں درجنوں مرتبہ کوشش کر چکا تھا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں گئی تو میں بھی کچھ دیر بعد اس کے پیچھے ہی چلا گیا۔ وہ مصلے پر بیٹھی نماز اور سلام پھیر کر فارغ ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا چونک گئی۔ میں نے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ثروت! اگر میرا کوئی گناہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں ہر طرح کفارہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"کسی کا کوئی گناہ نہیں۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے میری وجہ سے ہو رہا ہے۔" اس نے حسب سابق اپنا سر پھر گھٹنوں پر جھکا لیا۔

"ثروت پلیز! خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرو۔ ناصر بھائی بہت پریشان ہیں۔ اگر تم لوگ خود کو نہیں سنبھالو گے تو وہ بھی بکھر جائیں گے۔"

"میرے بس میں کچھ نہیں۔ اپنی جان لینا حرام ہے، ورنہ شاید ایسا کر لیتی۔"

"مایوسی بھی تو حرام ہے... کفر ہے۔"

"پلیز تابش! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ بھول جاؤ... کہ کبھی کوئی ثروت تمہاری زندگی میں آئی تھی۔ اب ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے۔"

"لیکن ثروت..."

"پلیز... خدا کے لیے... خدا رسول کے لیے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میری تکلیف کو اور مت بڑھاؤ۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرا خیال دل سے نکال دو... جیسے تمہاری امی کہتی ہیں اور بڑے کہتے ہیں، وہ کر لو۔"

وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ اسی دوران میں نصرت کی آواز سنائی دی۔ وہ "آپی آپی" پکارتے ہوئے اوپر آ رہی تھی۔ میں آنکھوں کی نمی کو چھپاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس رات میں دیر تک دیوانوں کی طرح ادھر ادھر کی سڑکوں پر پھرتا رہا۔ میرے اندر ایک جوالا مکھی تھا۔ ایک جی چاہتا تھا ہر قانون، ہر رشتے کو اپنے ہاتھ سے بہا لے جا... جلا دینا چاہتا تھا۔ مگر میری جسمانی طاقت اور میری فطرت اس جوالا مکھی کی تاب لا سکتی تھی اور نہ اس سے پھیلنے والی تباہی کی۔ اس رات سڑکوں پر گھومتے گھومتے میں نے کئی بار سیٹھ سراج کو قتل کیا... کئی بار ایم این اے گورایا کی جان لی اور کئی بار تھانے دار اشرف کو بدترین انجام سے دوچار کیا۔ میرے جیسے لوگ ایسے حالات کا شکار ہو کر یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ اپنے تصورات کا سہارا لے کر دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کبھی سراب سے بھی پیاس بجھا کرتی ہے؟ اس سے تو خوابوں کا دکھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

کسی وقت دل چاہتا کہ خود فراموشی کا سہارا لوں۔ خود کو شراب میں یا کسی اور نشے میں غرق کر لوں۔ مجھے پتا ہی نہ چلے کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے یا پھر ویسے ہی کسی طرف نکل جاؤں۔ کچھ عرصے کے لیے اردگرد سے ناتا توڑ لوں۔ آگیا جنگل بیابان و جنگل... بس اس طرح کی لاتعداد سوچیں

تھیں جو باغ کو مکمل مکمل کر رہی تھیں۔

اسی دوران میں چند روز بعد مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مناسب جاب مل گئی۔ جاب ملنے سے جہاں خوشی ہوئی وہاں ایک طرح کے دکھ نے بھی دل کو چیر ڈالا۔ ثروت کو میری جاب کا بڑا چاؤ تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ جب تم پہلے دن جاب پر جاؤ گے تو ہم اس دن کو سیلیبریٹ کریں گے۔ ریسٹورنٹ میں ہائی ٹی لیں گے اور پھر دریائے راوی میں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھیں گے۔

آج میری جاب کا پہلا دن تھا... مگر ریسٹورنٹ نہیں تھا، ہائی ٹی بھی نہیں تھی اور راوی میں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر بھی نہیں تھا۔ سب کچھ ایک دھندلکے میں گم ہو گیا تھا۔

اس شام میں اکیلا ہی شیزان ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ وہی میز تھی جہاں ہم اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ دائیں طرف ایک گملا رکھا تھا اور شفاف کھڑکی میں سے سڑک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ دل میں آس پیدا ہوئی۔ ”دل ڈھونڈتا ہے“ دور دراز کے امکانات کو ذہن میں لانے لگا۔ یقینی بات تھی کہ ناصر بھائی کے ذریعے ثروت کو بھی میری جاب کی خبر ہو چکی ہوگی۔ شاید اسے یہ بھی پتا ہو کہ آج میری ڈیوٹی کا پہلا دن تھا اور آج اس ریسٹورنٹ کی موسیقی بکھیرتی فضا میں... ایک نیم تاریک گوشے میں ہم نے اکٹھے بیٹھنا تھا۔ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامنے تھے اور ایک ساتھ مسکرانا تھا۔

میں سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ دیوانہ دل یہ سوچتا رہا... کیا پتا وہ آ جائے۔ اپنی گلابی پھولوں والی چادر کو سنبھالتی ہوئی، اپنے شولڈر بیگ کو بائیں ہاتھ سے تھامے ہوئے متوازن چال چلتی ہوئی۔ خزاں کے سارے رنگ ایک دم بہار کے رنگوں میں بدل جائیں۔

میری آنکھیں منتظر رہیں لیکن کوئی نہیں آیا... کسی کو آنا ہی نہیں تھا۔ جب فاصلے پیدا ہو جائیں تو ایک گھر میں رہتے ہوئے ملاقات نہیں ہوتی... یہ تو پھر 60 لاکھ کی آبادی والا شہر تھا۔

میں نے اکیلے ہی چائے پی اور سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ مایوسیوں کی دھند مجھے ڈھانپتی رہی۔

اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ”السلام علیکم!“ کسی نے دلکش آواز میں کہا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے آرسہ کھڑی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ آرسہ چچی سلطانہ کی وہی بھتیجی تھی جس کا رشتہ وہ ماضی میں مجھ سے کرنا چاہ رہی تھیں۔ یہ لوگ جنڈی میں رہتے تھے۔ میں آرسہ کو یہاں دیکھنے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

”تم کب آئیں یہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”آج ہی۔ جناب تو صبح کے گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ اس لیے خبر کیسے ہوتی۔ ابو امی بھی ساتھ آئے ہیں۔ ابو کی چھٹیاں ہیں۔ اب ایک دو ہفتے آپ کے پاس رہیں گے اور آپ کا ناک میں دم کریں گے۔“ وہ چہکی۔

میرا دماغی ناک میں دم ہونے لگا۔ آرسہ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔ میں نے اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم یہاں کیسے پہنچیں؟“

”میں فرح کے ساتھ تھوڑی سی شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ اچانک ہماری نظر آپ کی گاڑی پر پڑ گئی۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ آپ یہاں بیٹھے ہوں گے۔“ اس نے بڑے ناز سے اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”فرح کہاں ہے؟“

”وہ سامنے رکشا میں بیٹھی ہے۔“ اس نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں فرح اور آرسہ کو لے کر واپس گھر جا رہا تھا۔

آرسہ خوب صورت تھی لیکن اس کی خوب صورتی دوپہر کی طرح تھی۔ چمکیلی، بھڑکیلی اور کبھی کبھی جلاتی ہوئی۔ اس کا رنگ غیر معمولی سفید تھا۔ آنکھیں براؤن، بال شہد رنگ اور جسم متناسب۔ وہ بڑی تیزی سے بولتی تھی۔

اس کا موازنہ ثروت سے کیا جاتا تو ثروت کی خوب صورتی کو چاندنی سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ بے شک چاندنی دھوپ سے کم روشن ہوتی ہے لیکن اس کا ایک اپنا حسن اور اپنا پن ہوتا ہے۔ ایک پُر وقار ٹھہراؤ، ایک ٹھنڈک اور ایک جذب ہو جانے والی صلاحیت۔ اسی لیے آرسہ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی تھی اور اس کی بے موقع آمد اور بھی بری لگی۔

وہ پورے گھر میں رونق لانے لگی۔ بلاوجہ میرے کمرے میں بھی آ جاتی تھی۔ خاص طور پر وہ آنٹی کلثوم والدہ کے ہمراہ بہت گھوم رہی تھی۔ ایک دن میں دفتر سے لوٹا تو میرا پورا کمرا بڑی اچھی طرح سنوارا ہوا تھا۔ آرسہ میرے ہی بیڈ پر اوندھی لیٹی انگلش میوزک پر ہولے ہولے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اس نے ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔

میری چاپ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ”یہ کیا ہے آرسہ؟“ میں نے ناگواری کا اظہار کیا۔

”تمہارا کمرا سجا دیا... اور یہ میں اور تم۔“ وہ بستر پر نیم دراز ہو کر بولی۔

”مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا آرسہ۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”تمہارا مطلب میرے لباس سے ہے؟“

”میرا مطلب تمہاری ہر چیز سے ہے۔“

اس کے چہرے پر رنگ سا لہرایا مگر وہ ڈھیٹ بن کر مسکرائی۔ ”پتا نہیں اس فقرے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

میں سٹپٹایا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ ذہنی سکون پر پانی کے چھینٹے مار کر باہر نکلا تو وہ جا چکی تھی۔

امی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ”یہ تو کیا بول رہا تھا آرسہ سے؟“

”وہ میرے کمرے میں کیوں آ جاتی ہے؟“

”میں نے ہی کہا تھا اسے کہ ذرا تیرا کمرا دیکھ لے۔“ امی نے کہا۔

میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے امی کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا...

”امی! مجھے صاف صاف بتائیں آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ کیوں اس بائی گرل کی مثال دے رہی ہیں؟ میں اتنا انجان نہیں ہوں۔ میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔“

”پاگل! تم بھی باتیں کرتے ہو۔ وہ تو چند دن کے لیے یہاں آئی ہے پھر چلی جائے گی۔ تمہیں پتا ہے کہ اس کی طبیعت ذرا شوخ ہے۔ اگر اس نے...“

”مجھے ایسی شوخیاں نہیں چاہئیں امی۔“ میں نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔ ”پلیز! اسے کہہ دیں کہ میرے کمرے میں نہ آیا کرے۔ میں اس کے منہ لگنا نہیں چاہتا۔“

”اچھا آہستہ بول۔ کوئی سن لے گا۔ میں سمجھا دوں گی اسے۔ لیکن آرسہ کے ابو امی کے پاس تو دو چار منٹ بیٹھ جایا کرو۔ وہ کیا کہیں گے کہ اچھے مہمان آئے ہیں۔“

”ان کے بیٹے چچا کافی ہیں۔ میرے اپنے بہت سے مسئلے ہیں۔ کام کا بوجھ ہوتا ہے۔ میں نے کئی دن سے ناصر صاحب کے گھر بھی نہیں جا سکا۔ ان کا فون بھی نہیں آتا۔“

”فون تو میں نے بھی ایک دن کیا تھا۔ بس بیل ہوتی رہی۔“

”لیکن امی! کیا اگر فون نہیں لگا تو ہم ان کا پتا ہی نہیں لیں گے؟ ہنستا بستا گھر تھا، ویران ہو گیا ہے۔ وہ دونوں بالکل تنہا اور بے سہارا ہو گئے ہیں۔ ہمیں تو ہر گھڑی ان کی خبر رکھنی چاہیے اور... آپ... کہہ رہی ہیں کہ ایک دن فون کیا تھا۔“

ایک دم امی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔ پھر بولیں۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ کل ان کی طرف جائیں گے۔ فرح کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔“

”صرف جانے سے کچھ نہیں ہوگا امی۔ پہلے ہم سب اپنا ذہن صاف کر لیں۔ یہ بات اچھی طرح اپنے دماغ میں بٹھا لیں کہ ہمیں ان حالات میں ان لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑنا۔ ان کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو نبھانا ہے۔ ثروت وہی ہے جو آج سے چند ماہ پہلے تھی... اور اگر خدانخواستہ اس واقعے میں ان کے ساتھ کچھ ہو بھی جاتا تو میرے لیے...“ میری آواز بھرا گئی اور میں فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

امی نے کہا۔ ”اچھا تو دل چھوٹا نہ کر۔ ہم کل چلیں گے ان کی طرف۔“

”لیکن مجھے اس طرح نہیں جانا جس طرح ہم پہلے جاتے رہے ہیں۔ ہم ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے انہیں مزید گھبرا کر کے آ جاتے ہیں۔ جو کچھ اس بے چاری کے ساتھ ہوا ہے وہ خدانخواستہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے... تو کیا ہم اسے دھتکار دیں گے، ٹھکرا کر ایک طرف دھکیل دیں گے؟ اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں گے؟“ میرے سینے میں گھٹن تھی۔ میں بولتا چلا گیا۔

اس روز میرے اور امی کے درمیان آدھا پون گھنٹا بات ہوئی۔ پتا نہیں کہ میں انہیں کس حد تک قائل کر سکا مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ ثروت کے ہاں خوشدلی سے جانے اور ان سے رابطہ برقرار رکھنے پر آمادہ ہو گئیں۔

اگلے روز گھر سے نکلنے سے پہلے فرح نے پھر ثروت کے گھر فون کیا۔ حسب سابق بیل ہوتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ ہم روانہ ہو گئے۔ راستے سے ہم نے آئس کریم اور فروٹ وغیرہ لیا۔

ثروت کے گھر پہنچ کر دیر تک بیل دیتے رہے... پھر گیٹ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی برآمد نہیں ہوا۔ ساتھ والے پڑوسی نے دروازہ کھولا۔ مجھے پہچان کر ٹھیک سائیک کی طرح بتایا کہ ناصر صاحب اور ان کی فیملی تو یہاں سے جا چکے ہیں۔

”کہاں... کب؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تقریباً آٹھ دس دن ہو گئے۔ آپ کو نہیں پتا؟ وہ کوئی دن سے تیاری میں تھے۔“

”کہاں گئے ہیں؟“

”جرمنی... نانا فرینکفرٹ میں۔“

میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ امی اور فرح بھی میرا منہ دیکھ

رہتی تھیں۔ سینے میں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ پڑوسی نے کہا۔
''آپ آئیے نا... ہماری طرف آ جائیے۔''
''نہیں شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''ان کا کوئی رابطہ نمبر وغیرہ؟''
''انہوں نے کہا تھا کہ وہاں سے جا کر بھیج دیں گے لیکن ابھی تک تو نہیں آیا۔ آپ کونے والے پراپرٹی ڈیلر حاجی صاحب سے پوچھ لیجیے۔ شاید ان کا رابطہ ہوا ہو ناصر سے۔ کل ایک گاہک بھی آیا ہوا تھا حاجی صاحب کے پاس۔''
''کس چیز کا گاہک؟'' میں نے پوچھا۔
''یہی ناصر صاحب کے گھر کا۔ وہ اس کی فروخت کے لیے حاجی صاحب ہی کو کہہ کر گئے ہیں۔''
''یعنی وہ مکان بھی بیچنا چاہ رہے ہیں؟'' امی نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں جی، کچھ ایسا ہی سلسلہ لگ رہا ہے۔ شاید اب وہ جلدی واپس نہیں آئیں گے۔''
میں چکرا کر رہ گیا۔ میں نے پچھلے دنوں ایک دو بار ناصر بھائی کی زبانی یہ تو سنا تھا کہ وہ یہ گھر چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یہ ملک ہی چھوڑ جائیں گے اور وہ بھی اس طرح کہ کسی عزیز رشتے دار کو کانوں کان خبر نہ ہو۔
ناصر بھائی سے چھوٹا حماس پچھلے تین چار سال سے جرمنی میں ہی مقیم تھا۔ وہ سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ ایک بار پہلے بھی ناصر بھائی سیر و تفریح کے لیے اس کے پاس جرمنی جا چکے تھے۔ والد کی وفات پر حماس جرمنی سے آیا تھا اور دس پندرہ روز رہ کر لوٹ گیا تھا۔ شاید انہی دنوں میں گھر کے اندر کوئی مشورہ وغیرہ ہوا تھا اور اب ناصر بھائی نے ثروت اور نصرت سمیت جرمنی کا رخ کر لیا تھا۔
فرح نے پریشانی سے کہا۔ ''مجھے تو یقین نہیں آ رہا بھائی... ایک دم... بغیر کسی کو بتائے ہوئے۔''
امی نے کہا۔ ''حاجی صاحب ہیں ان سے پوچھو۔ شاید کوئی اتا پتا دے گئے ہوں۔''
ہم نے حاجی صاحب سے پوچھا لیکن ان کے پاس بھی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ہم مایوسی کے عالم میں واپس ہوئے۔ گھر کے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اچانک میری نظر گیٹ کے نچلے حصے کی درز میں گئی۔ اندر کی طرف ایک براؤن لفافہ سا پڑا ہوا تھا۔ میں نے گاڑی کو بریک لگا دیا۔ گیٹ پر جا کر میں نے ہاتھ نیچے سے اندر گھسایا اور لفافہ نکال لیا۔

گاڑی میں آ کر میں نے دیکھا، یہ کوئی سرکاری نوٹس تھا۔ ایڈریس میں مرحوم خالو عثمان کا نام لکھا ہوا تھا۔ امی سے مشورے کے بعد میں نے لفافہ کھولا۔ یہ ایک سمن تھا... تحریر سے پتا چلتا تھا کہ اس سے پہلے بھی دو نوٹس بھجوائے جا چکے ہیں جن کی تعمیل نہیں ہوئی ہے۔ سمن میں کسی ایسے پلاٹ کا ذکر تھا جو خالو عثمان نے دکان کی تعمیر کے لیے حاصل کیا تھا لیکن بعدازاں قانون شکنی کرتے ہوئے اسے فروخت کر دیا تھا۔ اب یہ معاملہ عدالت کے زیرِ غور تھا۔
''پتا نہیں یہ کس پلاٹ کا ذکر ہے۔'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔
امی نے تفصیل پوچھی۔ میں نے انہیں بتائی۔ امی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا... پھر جیسے انہیں ایک دم کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگیں۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ... کیمیکل کی مارکیٹ والا پلاٹ ہوگا۔''
''کون سی مارکیٹ؟''
''دراصل یہ جھگڑا کوئی آٹھ دس سال پہلے شروع ہوا تھا۔ کیمیکل بیچنے والی دکانیں شہر میں بکھری ہوئی تھیں۔ گورنمنٹ نے کوئی سروے کروایا تھا اور پھر ان سب دکان داروں کو عام آبادی سے ہٹ کر ایک ہی جگہ پر پلاٹ دیے تھے۔''
''وہ کس لیے؟'' فرح نے پوچھا۔
''اس لیے کہ یہ خطرناک کام عام آبادی کے اندر نہ ہو بلکہ کسی کھلی جگہ پر کیا جائے۔ اس کام میں آگ وغیرہ لگنے کا خطرہ رہتا ہے نا۔'' امی جان نے وضاحت کی۔
''اس کے بعد کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔
''مجھے زیادہ پتا نہیں، ایک بار سنا تھا کہ عثمان کو بھی پلاٹ ملا تھا لیکن اس نے بعد میں بیچ دیا۔ شاید یہ کوئی وہی چکر ہے۔''
ایک دم میرے ذہن میں آیا کہ اس قسم کی بات میں نے بھی سنی تھی۔
وہیں پر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ جب ہم سڑک کے موڑ سے گزر رہے تھے تو میں نے سیٹھ سراج کی سیاہ چمکیلی گاڑی دیکھی۔ وہ اپنے گھر کی طرف مڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ پچھلی نشست پر اسی کی طرح کا ایک بنا سنورا شخص بیٹھا تھا۔ دونوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ سیٹھ نے مجھے نہیں دیکھا لیکن میں نے اسے دیکھ لیا۔ سینے میں ایک بار پھر وہی آتشیں لہر دوڑی جو میرے سراپا کو راکھ کر دیتی تھی۔
گھر آ کر میں دیر تک اس دردناک صورتِ حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ ناصر بھائی جس طرح پاکستان چھوڑ کر بھاگے تھے، وہ بے حد تکلیف دہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ کسی سے بھی کوئی رابطہ ہی رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ انہوں نے میرے کانوں میں بھی اس ''ہجرت'' کی بھنک تک نہیں پڑنے دی تھی۔ شاید وہ یہاں سے اپنا ہر نشان تک مٹا دینے کے خواہاں تھے۔
''تو کیا انہیں ایسا کرنا چاہیے تھا؟'' میں نے بے زبان خاموشی سے خود سے پوچھا۔
اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل تھا۔ ناصر بھائی کو کلی طور پر غلط بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہاں جس طرح ثروت کی جدائی ہوئی تھی اور میڈیا نے جس طرح اس واقعے کو اچھالا تھا... اور اس کے بعد قانونی کارروائی میں جس طرح کی دل شکنی ہو رہی تھی، ناصر بھائی کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا۔
''تو کیا اب میں کبھی ثروت کو اپنا نہیں سکوں گا... اسے دیکھ نہیں سکوں گا؟'' یہ سوال تیر کی طرح میرے سینے میں لگا اور نڈھال کر گیا۔
میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس وقت میری نظر اس براؤن لفافے پر پڑی جو میں ناصر بھائی کے گھر سے لے کر آیا تھا۔ میں نے لفافہ اٹھا لیا اور سوچنے لگا کہ... کیا جو پریشانیاں خالو عثمان کی بے وقت موت کا باعث بنیں، ان میں یہ پریشانی بھی شامل تھی؟
پتا نہیں کیوں مجھے شک گزرنے لگا کہ اس پریشانی کا کچھ نہ کچھ تعلق ثروت والے واقعے سے بھی تھا۔ میں نے سمن کی تحریر کئی بار پڑھی اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ سارا کیا معاملہ ہے۔
اگلے روز میں ابو جان کے دوست وکیل سلیم جہانگیر صاحب سے ملا۔ انہوں نے میری پوری بات سننے کے بعد مجھے ایل ڈی اے کے ایک صدیقی صاحب کے پاس بھیج دیا۔ صدیقی کافی باخبر بندہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ ''گورنمنٹ نے کیمیکل کا کام کرنے والوں کو مخصوص پلاٹ الاٹ کیے تھے تاکہ وہ آبادیوں میں اپنا کام ختم کر دیں۔ ان لوگوں نے پلاٹ تو لے لیے مگر اپنی پرانی جگہوں پر کام بھی کرتے رہے۔ بعدازاں کچھ لوگوں نے کیمیکل مارکیٹ کے وہ پلاٹ فروخت کر دیے۔ ان میں آپ کے خالو عثمان صاحب بھی شامل تھے۔''
''تو کیا ان پر کوئی کیس وغیرہ بن گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں، کئی افراد پر کیس بنے۔ آپ کے خالو اور دو دیگر دکان داروں نے ایک مشترکہ وکیل کے ذریعے اپنا دفاع کیا۔ یہ معاملہ دب گیا اور پھر سرد خانے میں چلا گیا۔ مگر کچھ دن پہلے ایک صحافی صاحب نے اس معاملے کو پھر تازہ کر دیا۔ آپ کے خالو اور ان کے دونوں ساتھیوں کے خلاف انکوائری پھر شروع ہو گئی۔ میرے خیال میں یہ کام کسی نے جان بوجھ کر اور دشمنی کی وجہ سے کیا ہے۔''
''آپ کا مطلب ہے کہ وہ صحافی کسی کے کہنے پر حرکت میں آیا تھا؟''
''میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے۔ آپ کل تشریف لائیں تو میں اس بارے میں آپ کو مزید تفصیل بتا سکوں گا۔''
اگلے روز میں صدیقی سے ملنے اس کے دفتر پہنچا۔ اس نے حسبِ وعدہ اس معاملے کی پوری تفصیل اکٹھی کر لی تھی۔ میرے بدترین خدشے حقیقت میں بدل گئے۔ اس سارے کام کے پیچھے ایم این اے گورایا کے ایک پی اے کا ہاتھ تھا۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ایم این اے گورایا کا تعلق سیٹھ سراج سے ثابت تھا اور سیٹھ سراج جس قسم کا شخص تھا، وہ میں دیکھ ہی چکا تھا۔ ذیشان ہوٹل میں اس نے مجھے جو زبردستی لنچ کرایا تھا، وہ مجھے ابھی تک یاد تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھلکنے والی وہ چنگاریاں ابھی تک بھولی نہیں تھیں۔ وہ بظاہر بڑے تحمل اور دوستانہ لہجے میں بات کرتا رہا تھا لیکن یہ چنگاریاں اس لب و لہجے سے بالکل جدا تھیں... یہ چنگاریاں اپنے پیچھے ایک الاؤ کا پتا دیتی تھیں۔
مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ نرم اور پولیس میں ناکام ہونے کے بعد یہ لوگ خالو عثمان پر کسی اور طریقے سے دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ آج اس دباؤ کا پتا چل گیا تھا اور یقیناً یہی دباؤ تھا جس نے آخرکار خالو عثمان کی زندگی چھین لی تھی۔ نہ صرف ان کی زندگی بلکہ خالہ صفیہ کی بھی... اور یہی نہیں بلکہ ایک بستے بستے گھر کو تالا بھی لگا دیا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے ان گنت پریشانیوں کے ریلے میں بہہ کر تتر بتر ہو گئے تھے۔
مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس پلاٹ والی اچانک پریشانی کے بارے میں خالو عثمان نے گھر والوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید وہ ان کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے خود ہی سارا بوجھ اپنی جان پر لیا تھا اور اپنی حرکتِ قلب بند کر لی تھی۔
صدیقی کے انکشافات کے بعد میرے دل کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ مجھے اپنے آپ سے اور اپنی ناتوانیوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ میں کیوں کچھ کر نہیں سکتا؟ کیوں انصاف کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا؟ جن لوگوں نے زیادتی کی ہے وہ میرے سامنے ہیں لیکن ان کے گریبانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے ہاتھ کانپ کر نیچے

کیوں کر جاتے ہیں؟

یہ بہت سنگین موقع تو ضرور تھا لیکن "پہلا" نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی بہت دفعہ ایسا ہوا تھا۔ بہت ناانصافی ہوئی تھی لیکن میں قرار واقعی مزاحمت نہیں کرسکا تھا۔ مجھے بچپن کی وہ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی یاد تھیں جن کا نتیجہ اکثر میری شرمندگی اور بے بسی کی صورت میں ہی نکلا کرتا تھا۔ محلے کا ایک پولیس ظفر نامی لڑکا اور اس کی ٹولی ابھی تک مجھے بھولی نہیں تھی۔ یہ لوگ گاہے بگاہے مجھ سے لڑائی مول لیتے تھے اور میری زندگی اجیرن کیے رہتے تھے۔ پھر اسکول کے زمانے کے وہ چھوٹے بڑے واقعات جب عموماً مجھے اپنی فطری کم ہمتی کی وجہ سے ہی ندامت اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کالج کے دور میں مجھے اپنے دو شریر پڑوسی بھی یاد تھے جو کرائے دار کے طور پر آئے تھے اور انہوں نے دو ڈھائی سال تک ہمارا اور خاص طور سے میرا جینا حرام کیے رکھا تھا۔

بے شک لڑائی دنگا کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے لیکن ایک عام شخص کی زندگی میں کئی موقعے ایسے آتے ہیں جب اس کی ساری ذہانت، سوجھ بوجھ اور فراست ایک طرف دھری رہ جاتی ہے۔ اس وقت اسے کسی ہٹ دھرم کے ہاتھوں بے عزت ہونا پڑتا ہے یا پھر نگاہیں جھکا کر اور عرق ندامت میں ڈوب کر ایسا ہونا پڑتا ہے۔

میں نے اس سے پہلے جو مارشل آرٹ اور کراٹے کلب وغیرہ کا ذکر کیا تھا، اس کے پیچھے بھی میری یہی ناکامیاں، محرومیاں اور ہزیمتیں وغیرہ شامل کرتی تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میں جسمانی طور پر مضبوط ہو جاؤں گا تو میرے لیے لڑائی معاملات سے نمٹنا آسان ہو جائے گا اور موقع پڑنے پر میں کسی کے "ہتھ چھٹ" کو بھی روک سکوں گا۔ لیکن اب دھیرے دھیرے یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ مارشل آرٹ وغیرہ کی سرگرمیاں کسی لڑاکے کو تو مزید لڑاکا بنا سکتی ہیں لیکن کوئی ایسا شخص جس کی فطرت میں مار دھاڑ اور مارا ماری نہیں ہے، مارشل آرٹ کی اعلیٰ سندیں حاصل کرکے بھی ٹکراؤ اور مارکٹائی کی صورت حال سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

تازہ ترین مثال میرے سامنے تھی۔ [illegible] انکشافات کے بعد میرا دل چاہتا تھا کہ میں دندناتا ہوا سیدھا سراج کے پلازا پر پہنچ جاؤں۔ کچھ اور نہ بھی کر سکوں تو کم از کم اسے گریبان سے ضرور پکڑوں، اسے جھنجوڑوں اور پوچھوں کہ اس نے ظلم کے اوپر ظلم کیوں کیا؟ بچی کے ابھی زخم نہیں بھرے تھے کہ اس نے باپ کو بھی موت کی سزا سنا دی۔

لیکن یہ کرنے کے لیے اور اس کے بعد کے دوسرے اقدام کرنے کے لیے جس ہمت اور سختی کی ضرورت تھی، وہ میرے اندر نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔ میں سوچتا تھا اور اپنے ہی سینے میں ڈوبنے لگتا تھا۔

اگلے روز میرے اندر کے طیش نے شدید ابال کی صورت اختیار کی اور میں بنفس نفیس بات کرنے کے لیے اس کے پلازا پر پہنچ گیا۔ میں اس سے لڑنا نہیں چاہتا تھا، نہ ہی کسی طرح کی مارکٹائی کا ارادہ رکھتا تھا لیکن میں اس سے اتنا ضرور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے خالد عثمان کے زخموں کا مداوا کرنے کے بجائے ان کی جان کیوں لے لی؟ اس بات میں اب شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ پلاٹ والا معاملہ صرف سیٹھ سراج کی وجہ سے سنگین ہوا ہے۔ بے شک اس پلاٹ والے معاملے میں چند سال پہلے خالد عثمان سے غلطی ہوئی تھی اور ایسی غلطی بہت سے دوسرے لوگوں سے بھی ہوئی تھی۔ اس قسم کی غلطیاں تقریباً ہر شخص کی زندگی میں موجود ہوتی ہیں لیکن جو سزا خالد عثمان کو ملی تھی، وہ اس کے ہرگز حق دار نہیں تھے۔ میں نے اپنی گاڑی سیٹھ کے "سراج پلازا" سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی اور سوچنے لگا کہ اس سے کس طرح بات کروں اور بات کو کہاں تک محدود رکھوں کہ ہاتھا پائی تک نوبت نہ پہنچ جائے۔

بے شک میں لڑنے کے لیے نہیں جا رہا تھا لیکن ایسے معاملات میں تلخ کلامی اور ہاتھا پائی کے درمیان بس ایک موہوم سی لکیر ہی ہوتی ہے۔ سیٹھ کے لیے میرے اندر جو طیش تھا، وہ میری جسمانی برداشت سے بہت بڑھ کر تھا۔ میں گاڑی کے اندر ہی اپنا لائحہ عمل مرتب کرتا رہا۔ جوں جوں میں سوچتا گیا، میرے طیش پر میرا اندرونی خوف غالب آتا گیا۔ بات بہت بڑھ گئی تو کیا ہوگا؟ نجانے کچہری تک پہنچ گئی تو کیا ہوگا؟ کیا میں سیٹھ کے روبرو ٹھیک سے بات کر پاؤں گا؟ کہیں میرے اعصاب جواب تو نہیں دے جائیں گے؟

میں جوں جوں سوچتا گیا، میری پیشانی پسینے سے تر ہوتی گئی۔ سینے میں دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجانا چاہتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹانگوں میں لرزش نمودار ہو چلی ہے اور اگر میں چل کر پلازا کی دکان کی طرف گیا تو لڑکھڑا جاؤں گا۔

یہ عجیب کیفیت تھی اور یہ ہمیشہ سے میرے ساتھ تھی۔

"کیا ارادہ ہے یارا! کیا یہیں پر رات گزارنے کا ارادہ ہے؟" کھڑکی کے قریب سے آواز آئی اور میں چونک گیا۔

ایک درمیانی عمر کا شخص تجسس اور طنز کی ملی جلی کیفیت سے گاڑی کی کھڑکی میں جھکا ہوا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ "بھائی جی! کہاں پہنچے ہوئے ہو [illegible]

آگے کروں۔"

تب مجھے احساس ہوا کہ عقب میں ہارن سنائی دے رہے ہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا... میری گاڑی درمیان میں کھڑی تھی اور عقب میں دو تین گاڑیاں راستہ ملنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ "بس... سوری جی۔" میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا اور گاڑی آگے کر لی۔

جب میرے اعصاب جواب دینے لگتے تھے تو مجھے خود پتا چل جاتا تھا... اور میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ اپنے تمام تر اندرونی غلبے کے باوجود میں سینو کا سامنا نہیں کر سکوں گا۔ اپنے ہی پسینے میں ڈوبا ہوا میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں نے بڑی تیز رفتاری سے گاڑی چلائی۔ کئی جگہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔ میں ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ مرا جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ سخت کرب اور ذہنی کے عالم میں اپنی بند مٹھی پارک کے پتھریلے بنچ سے ٹکراتا رہا اور ہاتھ کی کھال چھیل لی۔ انگلیوں سے خون نکلنے لگا...

تب ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھا اور آندھی طوفان کی طرح انارکلی پہنچ گیا... میں مارشل آرٹ کے کلب میں۔ دل و دماغ بڑی شدید ہیجان میں تھے۔ جذباتی کیفیت میں تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ اپنی ساری کم ہمتی اور ناتوانیوں کو اپنے اندر سے اکھاڑ کر پھینک دوں۔ کچھ ایسا کروں کہ خود ختم ہو جاؤں یا پھر اپنی سب بے بسی کو ختم کر دوں۔ میں سوچنے لگا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے آپ کو مارشل آرٹ میں فنا کر دوں؟ اتنی محنت کروں، اتنی اذیت جھیلوں کہ بس پتھرا جاؤں۔ پھر اس پتھر کو درد کا احساس رہے نہ کسی ہزیمت کا اندیشہ...

میں گاڑی میں تھا اور جیسے فیصلے کی سولی پر لٹک رہا تھا۔ ان دنوں مجھے کلب چھوڑے ہوئے پھر تین چار ماہ ہو چکے تھے۔ اب پھر کلب کا دروازہ میرے سامنے تھا اور میں اس کے اندر جانے کا تہیہ کر رہا تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹے تک یہ شدید جذباتی کیفیت جاری رہی پھر میں نے اپنے ہی خیال کو رد کرنا شروع کر دیا۔ ذہن نے معروضی انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے بھی تو کئی موڑ آئے تھے جب میں نے پوری تن دہی اور مستقل مزاجی کے ساتھ مارشل آرٹ سے ناتا جوڑنے کا تہیہ کیا تھا۔ بڑے بڑے ارادے باندھے تھے لیکن ہوا کیا تھا؟ ہر بار جب کچھ وقت گزر گیا تھا، ذہن میں ہزیمت، ٹینشن اور پسپائی وغیرہ کے اثرات مدھم پڑ رہے تھے... سارے ارادے اپنی طاقت کھونے لگے تھے اور آخر ختم ہو گئے تھے۔

تو کیا اس بار بھی یہی ہوگا؟

ذہن سے جواب آیا... ہاں، اس بار بھی یہی ہوگا۔ تم وقتی طور پر قرار حاصل کر لو گے لیکن پانی کے سارے ارادے اس کے نیچے رہیں گے۔ تم کبھی نہیں بدلو گے... میں نے اس انداز میں سوچنا شروع کیا تو مارشل آرٹ والی سوچ مجھے بچکانہ لگنے لگی۔ "تو پھر کیا کروں؟" میں نے بے زبان خاموشی خود سے پوچھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد میں والد صاحب کے دوست ایڈووکیٹ سلیم جہانگیر کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ میرے سوہا صاحب کا تذکرہ بھی چلا۔ سلیم جہانگیر کے ساتھ میری تفصیلی بات ہوئی۔ میں نے اس معاملے کے سارے قانونی پہلوؤں پر ڈسکس کیا۔ میں نے جہانگیر صاحب سے پوچھا کہ اگر ہم اس کیس کی تفتیش تبدیل کرانا چاہیں یا پھر راجی کے باپ پر کسی طرح کا مقدمہ کرنا چاہیں تو اس کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

ایڈووکیٹ جہانگیر صاحب نے جو طریقہ کار بتایا وہ خاصا صبر طلب تھا۔ اس میں وقت اور پیسا، دونوں کی وافر ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ جوابی کارروائی کے اندیشے بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کی توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی کہ شمد بیا بند اپنے اوپر ہونے والے اٹیک کے بعد خاموش بیٹھا رہے گا۔

ایڈووکیٹ سلیم جہانگیر صاحب سے ملنے کے بعد جب میں گھر واپس پہنچا تو خود کو پہلے سے زیادہ نڈھال اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ سیٹھ جیسے بندے کے خلاف قانونی چکروں میں پڑنا اور پھر ڈٹے رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔ خاص طور سے اس صورتِ حال میں کہ مقدمے کے اصل مدعی بھی اب پاکستان میں نہیں تھے۔

رات کو کھانے کی میز پر سب ہی موجود تھے۔ آرمہ بھی آئی ہوئی تھی۔ ویسے تو وہ بیاہی ہوئی سہاگن تھی لیکن کسی وقت فرخ کے کہنے پر اپنے میکے چلی آتی تھی۔ میرے ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی دیکھ کر امی بری طرح چونکیں۔ "یہ کیا ہوا ہے بنی؟"

"کچھ نہیں امی! دفتر میں شیشہ لگ گیا تھا۔"

امی نے بے تابی سے ہاتھ دیکھا۔ "لیکن ہاتھ تو سوجا ہوا ہے تمہارا؟"

"لگتا ہے کہ کچھ چھپایا جا رہا ہے ہم سے۔" آرمہ نے حسبِ عادت شوخ انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھور کر بیزار لہجے میں کہا۔

وہ مجھے نظر انداز کر کے امی سے بولی۔ "آنٹی! لگتا ہے کہ جناب نے کہیں لڑائی شروع کی ہے۔ ان کی آنکھیں بھی دیکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔"

"ہائے کہیں لڑائی ہوئی ہے؟" امی کی بے قراری بڑھ گئی۔ "کہیں چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟"

"اوہو... آپ پریشان نہ ہوں آنٹی! یہ مار کھا کر نہیں آئے، مار کر آئے ہیں... میرا تجربہ کہتا ہے کہ انہوں نے مارا ہے کسی کو۔ جو مار کھا کر آتا ہے اس کی آنکھ یا ناک وغیرہ پر چوٹ لگتی ہے... جو مارتا ہے اس کے ہاتھ کے باہر کی طرف... اور اب دیکھیں ذرا انہیں چوٹ کہاں لگی ہوئی ہے۔"

"تم بتاتے کیوں نہیں؟" امی نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

آرمہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ "یہ میرے سامنے کچھ نہیں بتائیں گے اور ان کو غصہ بھی کافی آ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ اٹھ کر چلے جائیں، میں ہی چلی جاتی ہوں۔"

وہ فرخ کو بائے کہتے ہوئے مڑی۔ وہ گھر میں بھی جینز پہنتی تھی۔ تراشیدہ بال شانوں پر لہراتے رہتے تھے۔

"امی! آپ اس کو کیوں بلاتی ہیں یہاں؟" میں نے تڑخ کر کہا۔

"میں نے بلایا تھا بھائی! غلطی ہو گئی، چلو معاف کر دو۔ ایسے بھی یہ لوگ بنگال تک چلے جائیں گے۔" فرخ نے ایسی بے کیفی سے کہا کہ میرا پارا کافی حد تک نیچے آ گیا۔

امی کی سوالیہ نظریں بدستور مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں اپنی چوٹ کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی اور کافی حد تک کامیاب رہا۔

یہ گہری مایوسی اور کرب کی گھڑیاں تھیں۔ میں رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ گھر کی چھت، دیواروں اور بالکونیوں میں پھرتا رہا۔ سیٹھ کا نخوت چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آتا۔ اس کا تیل میں چپڑا ہوا سر، چھوٹی چھوٹی اجڈ آنکھیں اور آنکھوں میں دبی دبی سی چنگاریاں!

اگلے روز میں اس امید پر ناصر بھائی کے سابقہ مکان پر گیا کہ شاید پراپرٹی ڈیلر حاجی صاحب کے پاس ناصر بھائی کی کوئی خبر ہو۔ فرحت کی ماڑی کے سامنے سے گزرا تو ایک عجیب سی اداسی نے مجھے گھیر لیا۔ خالی دکانوں کو باہر سے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں کوئی مکین نہیں ہے اور... در و دیوار ویرانیوں کے حوالے ہیں۔ چھت اور بالکونیوں کی ویرانی دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ کبھی کوئی یہاں سے مجھے دیکھ کر مسکراتا تھا۔ چاندنی کے پیچھے چھپتا تھا اور پھر ظاہر ہوتا تھا۔ اس کی پازیبوں کی چھن چھن، اس کی ہنسی، اس کی سرگوشیاں وہ سب کچھ اب درد و غم میں جذب تھا۔ مجھے لگا کہ یہ مکان بھی اچانک اٹھ جانے والے مکینوں کا سوگ منا رہا ہے اور میری ہی طرح بے پناہ شدت سے پیار کر رہا ہے۔

میں حاجی صاحب کے پاس پہنچا۔ ان کے پاس چند لوگ بیٹھے تھے۔ وہ چلے گئے تو میں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔ "ناصر بھائی کی کوئی خیر خبر آئی ہے؟"

"پرسوں ناصر کا فون آیا تھا۔" حاجی صاحب نے اپنی عینک صاف کرتے ہوئے کہا۔ "بتا رہا تھا کہ وہ فرینکفرٹ کے پاس کسی قصبے میں ہے۔ اس کا بھائی بھی آج کل وہاں کسی فرم میں کام کر رہا ہے۔ اپنے گھر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ ایک دو گاہک تو لگے ہیں لیکن ابھی پورے پیسے نہیں لگا رہے۔"

"اور کیا کہہ رہے تھے؟"

"یہی کہہ رہا تھا کہ پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہاں کوئی چھوٹا فلیٹ خریدا ہے اس نے۔ اس کے پیسے دینے ہیں۔ اس کے علاوہ شاید اپنی بہن کی شادی وغیرہ بھی کر رہا ہے۔"

"شادی؟" میرے سر پر جیسے ہزاروں من کا بم پھٹ گیا۔

"ہاں ہاں، وہاں کوئی پاکستانی فیملی ہے۔ بتا رہا تھا بہت اچھے لوگ ہیں۔ کراچی کے رہنے والے ہیں۔ وہ اپنے دوالی میں لے گئے۔"

میں نے خود کو بمشکل سنبھالا اور اٹکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ان کی... بہنیں ہیں نا... کس کی بات کر رہے تھے؟"

"ابھی تو بڑی کی بات ہی کر رہے تھے لیکن... بتا رہے تھے کہ بڑے محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرا رشتہ بھی ان کی طرف ہی ہو جائے۔ بڑے خوش تھے۔" حاجی صاحب نے کہا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "چلو اللہ نے کرم کیا ہے ان پر۔ یہاں تو ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہی ہے۔ نیک معصوم بچیاں کی خبریں اخباروں میں چھپ گئیں۔ مصیبتوں نے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ دو چار مہینوں میں گھر اجڑ کر رہ گیا۔ اللہ پاک ہر ایک کو ایسی آفتوں سے بچائے۔"

حاجی صاحب بول رہے تھے اور ان کی آواز میرے کانوں تک بہت کہیں دور سے پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ یہ ملک اب بھلے انسانوں کے رہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں۔ اللہ معاف کرے جس کسی کا ہسپتال یا تھانے کچہری سے واسطہ پڑتا ہے اسے دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔"

وہ بول رہے تھے اور کرب و آزار میری رگ رگ میں گھوم رہے تھے۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا کہ میں کب اپنی جگہ سے اٹھا اور کب گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر چلی گئی۔

ان لوگوں کو اتوار کے روز واپس پلٹ جانا تھا مگر عمران کے قیام میں ایک ہفتے کا اضافہ ہو گیا۔ اب پتا نہیں کہ یہ اضافہ آرسہ کی خواہش پر ہوا تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ بہرحال، چچی نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ اب اگلے سوموار کو واپس جائیں گے۔ میں مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا اور سکون بخش گولیاں بھی کھا رہا تھا۔ پہلے ان والے واقعے کے بعد آرسہ اکثر موقع دیکھ کر میرے کمرے میں چلی آتی تھی اور تھوڑی سی "دھینگا مشتی" کر کے لوٹ جاتی تھی۔ زیادہ تر اسے دوپہر کو موقع ملتا تھا جب فرح اور عاطف کالج میں ہوتے تھے اور امی سبزی وغیرہ لینے مارکیٹ جاتی تھیں۔

وہ میری ٹوٹ پھوٹ سے فائدہ اٹھا رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ چمک آ جاتی تھی۔ اس روز بھی وہ امی کے بازار جانے کے بعد میرے کمرے میں آ گئی۔ میرے ذہن میں گولیوں کا غبار سا بھرا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں بھاری ہو رہے تھے اور ہر طرح کے تفکرات دور کہیں کسی اوٹ میں چھپ گئے تھے۔ وہ بہت اشتعال انگیز لباس میں تھی۔ اب دن گیارہ بج چکے تھے لیکن اس نے ابھی تک ایک ہلکی سی نائٹی پہنی ہوئی تھی۔ ڈیپ گریبان دعوت نظارہ دیتا تھا۔

میں بیڈ پر نیم دراز سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس نے میری بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا پھر سگریٹ میرے ہونٹوں سے نکالتے ہوئے بولی۔ "اچھے بچے سگریٹ نہیں پیتے۔"

"اچھے بچے کیا کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اچھے بچے اپنی امی سے بات کرتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ وہ ساری پچھلی باتیں بھول بھال کر اب شادی کرنا چاہتے ہیں۔" وہ میرے اوپر لدی گئی۔

"لیکن اگر اچھے بچے شادی کرنا ہی نہ چاہیں تو؟"

"تو پھر ان کے پاس نہیں بیٹھنا چاہیے۔ اس میں خطرے ہوتے ہیں۔" وہ ذرا سنجیدگی سے بولی۔

میں خاموش رہا... وہ دوبارہ بولی۔ "تو میں جاؤں؟"

"اس کا مطلب ہے آج تم جانے کے لیے آئی ہو؟"

"میں تو نہیں جا رہی... آپ جناب مجھے بھیج رہے ہیں۔" وہ ادا سے بولی۔

"میں کہاں بھیج رہا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ابھی... اسی وقت تم سے شادی کر گزروں۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

تین چار منٹ ہم ایک دوسرے میں الجھے رہے۔ وہ ایک ماہر "فن کار" کی طرح آہستہ آہستہ میری پیاس بڑھاتی گئی اور پھر ایک دم سراب بن کر اوجھل ہو جاتی تھی۔ اس کے قرب میں ایک آگ سی تھی۔ اس آگ میں جلتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے بار بار ثروت کی قربت یاد آ جاتی تھی۔ ثروت کے لمس میں وہی چاندنی کی سی ٹھنڈک تھی جو دھیرے دھیرے دل پر اثر کرتی ہے اور روح میں اتر جاتی ہے... بے شک دھوپ جتنی روشن نہیں ہوتی مگر اس کا حسن جدا ہی رکھتا ہے۔ ثروت کے ساتھ تنہائی میں گزارے ہوئے وقت کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے میری زندگی کا سرمایہ تھے۔

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ میں مزید ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ میں نے دفتر میں چھٹی کی درخواست بھیج دی تھی۔ اب پتا نہیں وہ منظور ہوئی تھی یا نہیں۔ میں سارا دن گھر میں پڑا اینٹھتا رہتا۔ اپنے لباس اور حلیے کی طرف سے بھی بالکل بے پروا ہو گیا تھا۔ کسی وقت فریج کھول کر کھانا شروع کر دیتا۔ گلے تک خوراک ٹھونس لیتا، پھر کمرا بند کر کے ڈی وی ڈی پلیئر پر الٹی سیدھی فلمیں دیکھتا رہتا۔ امی بہت پریشان تھیں۔ ایک روز ان کے اصرار پر میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ جرمنی میں ثروت کی شادی ہونے والی ہے۔

یہ خبر سننے کے بعد امی مجھ سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اس میں ان کے رویے کا بھی کافی دخل ہے۔ وہ خود سے پشیمان دکھائی دیتی تھیں اور اندر سے بہت دکھی بھی تھیں۔ لیکن اب تو جو کچھ بھی تھا، کمان سے تیر نکل چکا تھا۔

ایک شام مجھے آرسہ کے قرب کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ عاطف کرکٹ کھیلنے گیا ہوا تھا۔ امی اور فرح بازار گئی تھیں۔ اگر اس وقت وہ آ جاتی تو کچھ وقت خود فراموشی میں گزارا جا سکتا تھا۔ درحقیقت ان دنوں میں ہوش و حواس سے بہت دور تھا اور اخلاقی حالت پست تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں آرسہ کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر گیا۔ چچا چچی کی رہائش اسی بالائی پورشن میں ہی تھی۔ سیڑھیوں کے درمیان ایک گیلری سی تھی۔ جب میں اس گیلری کے قریب سے گزر رہا تھا اندر سے آرسہ کے باتیں کرنے کی مدھم آواز آئی... وہ کسی سے موبائل پر مصروف گفتگو تھی۔ میں اپنی سیڑھیوں کی نیم تاریکی میں کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے کان لگا کر سننے لگا۔

وہ بڑی بے تکلفی سے بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں شوخی اور ترنم تھا۔ وہ راز دارانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "جو کچھ ہوا ہے، پچھلے دس پندرہ دن میں ہوا ہے۔ یار! وہ کہتے ہیں نا کہ جو شاخ جھکتی نہیں، وہ کڑچ کر کے ٹوٹ جاتی ہے۔"

پھر کچھ دیر تک آرسہ دبی آواز میں ہنستی رہی پھر بولی۔ "ہاں ہاں... یار! پہلے تو یوں گردن اکڑا کر پاس سے گزر رہا تھا جیسے شہزادہ چارلس سے بھی آگے کی شے ہو۔ پر اب ایک دم سیدھا ہو گیا ہے۔ دو دو گھنٹے کمرے میں میرا ویٹ کرتا ہے۔ جاتی ہوں تو پالتو بلے کی طرح گردن جھکا کر سر میری گود میں رکھ دیتا ہے۔ ایک دم سرنڈر کر رہا ہے... ہاں ہاں... کیوں نہیں... ابھی اور سیدھا کروں گی اسے۔ دو چار دن اور ہوں یہاں۔ ایک دم PET بنا کر جاؤں گی۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ آرسہ سنتی رہی پھر جواب میں بولی۔ "ارے تمہیں تو پتا ہی ہے۔ یاسر تو خود بھی فلرٹ کرتا رہا ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ قریباً دو مہینے سے تو ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے اس سے۔ اب تو سنا ہے کہ وہ بھی تیرے کا ابا ہے، جمشید کی طرح انگلینڈ جا رہا ہے..."

پھر کچھ دیر تک آرسہ اپنی دبی آواز میں ہنستی رہی۔ پھر شاید بیلنس ختم ہو گیا! بہرحال جواب دے کر وہ "ہیلو ہیلو... ہیلو فریال" کہہ کر خاموش ہو گئی۔

میں جلدی سے سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ آرسہ کے الفاظ زہر بجھے تیروں کی طرح کانوں کو زخمی کر رہے تھے۔ اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اپنی دوست سے میرا ہی ذکر کر رہی تھی۔ مجھے کبھی بھی یہ خوش فہمی نہیں ہوئی تھی کہ آرسہ میرے ساتھ شروع ہونے والے "جذباتی تعلق" میں مخلص ہے۔ لیکن اب اپنے کانوں سے اس کی باتیں اور اس کا لب و لہجہ سن کر سینے میں آگ سی بھڑک اٹھی۔

جی چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو تو میں اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔ ان دنوں میں جس شدید ہیجان اور اخلاقی گراوٹ کے دور سے گزر رہا تھا، اس میں سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس رات میں نے معمول سے زیادہ ٹیبلٹس لیں اور معمول سے زیادہ سگریٹ پھونکے۔ حقیقت یہ ہے کہ شراب وغیرہ تک میری پہنچ نہیں تھی، نہ ہی کوئی اس طرح کا دوست تھا، ورنہ ہو سکتا تھا کہ ان دنوں یہ "خانہ خراب" بھی میرے منہ کو لگ جاتی۔

اگلے روز دوپہر کو آرسہ سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس کا انداز ہمیشہ کی طرح بے باک تھا۔ وہ حسب معمول مجھے اپنے لمس سے آشنا کرتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ مجھ پر زور دیتی رہی کہ میں اپنے گھر والوں سے بات کروں۔ وہ بھی اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کرے گی اور یوں "محبت میں ٹوٹنے پھوٹنے والے دل" ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔

میں خاموشی سے اس کی منافقانہ باتیں سنتا رہا اور دل ہی دل میں کھولتا رہا۔

میرے ساتھ تنہائی میں اس کی حرکات و سکنات نہایت کم عمر لڑکیوں جیسی ہوتی تھیں۔ اس سے پہلے نہ جانے وہ کہاں کہاں منہ مارتی رہی تھی۔ کسی وقت تو بڑی معصومیت سے پکار پکار کر کہنے لگتی تھی کہ وہ ایک آبرو باختہ لڑکی ہے۔

اگلے روز وہ پھر آ گئی۔ جوں جوں اس کے جانے کا دن قریب آ رہا تھا، وہ دباؤ ڈالتی جا رہی تھی اور اس کی کوشش یہی تھی کہ مجھ سے شادی کے بارے میں کوئی پختہ عہد و پیمان لے لے۔ میں بھی اس دوغلے پن سے فائدہ اٹھانے لگا۔ آج وہ امی کے ساتھ بازار سے مہینے بھر کی شاپنگ کر چکی تھی، ہمارے پاس ٹائم بھی زیادہ تھا۔ ہم نے قربت کے سفر میں کئی مرحلے تیزی سے طے کیے۔ وہ مجھے ایک ایک سیڑھی چڑھنے کا موقع دیتی تھی اور ہر سیڑھی پر اپنی قدر و قیمت میں اضافے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس نہایت جذباتی اور سنسنی خیز ملاقات میں ایک موقع ایسا آیا کہ وہ میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی حیثیت اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئی... ایسی کتاب جس کو میں جہاں سے جتنا چاہے پڑھ سکتا تھا۔ لیکن اسی دوران میں بازار سے امی کا فون آ گیا کہ سامان زیادہ ہے۔ میں گاڑی لے کر آ جاؤں اور انہیں لے جاؤں۔ یہ بڑا "بے وقت" فون تھا۔ سارا کھیل درہم برہم ہو گیا۔ ہمارے درمیان طے ہوا کہ ہم کل گیارہ بجے کے فوراً بعد پھر ملیں گے۔

انسان کے اپنے ارادے ہوتے ہیں اور قدرت کے اپنے... اور ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ عجیب سی صورت حال رہی۔ رات تک تو مجھے اگلے دن کی ملاقات کا شدید انتظار رہا۔ جسم میں سنسناہٹ جاگتی رہی اور شہوانی خیالات دل و دماغ کو اتھل پتھل کرتے رہے۔ لیکن صبح جب میں سو کر اٹھا تو اندرونی کیفیت کچھ بدلی بدلی محسوس ہوئی۔ اس تبدیلی کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ علی الصباح میری نگاہ کیلنڈر پر پڑی۔ آج ثروت کی سالگرہ کا دن تھا۔ اس دن کی نسبت سے ایک دم مجھے بہت کچھ یاد آیا... اس کے ساتھ ہی ثروت کی پچھلی سالگرہ کا دن نگاہوں میں گھومنے لگا۔

ہم اس روز دریائے راوی پر گئے تھے۔ عاطف، فرح اور ثروت کی چھوٹی بہن نصرت بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ چاندنی رات تھی۔ ہم نے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ دور تک واک کی تھی۔ پھر ایک ریتلا کنارہ دیکھ کر ٹھہر گئے تھے۔ باقی لوگ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگے تھے۔ ہم ان کی آنکھوں سے ذرا دور دریا کے کنارے بیٹھ گئے تھے۔ دریا کے پُرسکون منظر

میں چاند کے ابھرنے کا منظر دل آویز تھا۔ ثروت نے ٹیپ ریکارڈر پر اپنا پسندیدہ گیت لگا دیا تھا۔

مجھے دل سے نہ بھلانا... چاہے روکے یہ زمانہ
تیرے بن میرا دیوانہ دل کچھ نہیں... کچھ نہیں

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ بڑی نرمی سے میرے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا تھا۔ اس کے لمبے خوشبودار بال ٹھنڈی ہوا سے اڑ رہے تھے اور میرے چہرے کو چھو رہے تھے۔

اس ماحول میں اس گیت نے جو اثر کیا وہ بیان سے باہر تھا۔

جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے، میری ہی طرح آج کے دن کو یاد کر رہی ہے۔ نم ریت، دریا کی لہریں اور ابھرتے ہوئے چاند کی کرنیں اس کے تصور میں بھی چمک رہی ہیں اور شاید وہ گیت آج بھی اس کی زبان پر ہے۔

مجھے دل سے نہ بھلانا... چاہے روکے یہ زمانہ

پُرحرارت سفلی جذبات کی جگہ میرے دل میں عجیب سا حزن آمیز گداز اترنے لگا۔ آرزو کی چمکیلی بھوری آنکھوں کی جگہ ثروت کی سیاہ جھیل آنکھیں نگاہوں میں گھومنے لگیں۔ ان آنکھوں کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ مجھے لگا میں بھٹک رہا ہوں۔

تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟

کیا آرزو سے نہیں ملنا چاہیے؟

لیکن آرزو سے بچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ سفلی جذبات کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے اور جب پانی اتنا قریب ہو تو پیاس کو صحرا زیادہ دیر تک برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں جیسے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ جب کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو میں گھر سے نکل کھڑا ہوا... امی نے مجھے بیرونی دروازے کے قریب دیکھا اور گھبرا کر پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو بابی؟“

”ذرا کام ہے۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”ناشتا نہیں کرو گے... اور... ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو۔ کیا ہو جانے والا حال ہے تمہارا؟“

”بس جو حال ہے... یہ آپ لوگوں نے ہی کیا ہوا ہے۔“ میں نے بیزاری سے کہا اور باہر نکل آیا۔

بازار میں تھوڑا گھومنے کے بعد میں نے ایک جنرل اسٹور سے جوس لیا اور اس جوس کے ساتھ سکون بخش (SEDATIVE) دوا بسن کی تین چار گولیاں نگل لیں۔ جنرل اسٹور کے ہی ایک آئینے میں، میں نے اپنی صورت بھی دیکھی تھی۔ امی ٹھیک کہتی تھیں۔ واقعی میرا حلیہ بدترین تھا۔ آنکھیں سرخ، شیو بڑھی ہوئی، بال الجھے ہوئے اور لباس شکن آلود۔

میں گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر دور ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ پارک پہلے کافی وسیع تھا لیکن اب بے شمار دوسرے پارکوں کی طرح اسے بھی ایک طرف سے قبضہ گروپ کے عفریت نے نگلنا شروع کر رکھا تھا۔ میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس طوفان کی لہروں میں سے اپنے دل کی کشتی کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا جس نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

گھڑی کی سوئی آہستہ آہستہ گیارہ کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پروگرام کے مطابق آرزو نے گیارہ بجے مجھ سے ملنے آنا تھا۔ اس ملاقات کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا اور وہ بھی سمجھتی تھی۔ شاید وہ اپنے کیے وعدے کے مطابق مجھے اپنا اس قدر عادی بنا لینا چاہتی تھی کہ میں اس کی گرفت سے نکل ہی نہ سکوں۔ لیکن یہاں سوال یہ تھا کہ کیا میں اس سے یہ رنگین و سنگین ملاقات کر سکتا ہوں؟ ثروت کے ساتھ اپنی وفا کو مٹنے والا داغ لگا سکتا ہوں؟ یہ ایک جان لیوا کشمکش تھی۔ نفسانی لذت کی منزل بالکل سامنے تھی لیکن ”محبت“ ایک گہری دھند میں گم ہوئی تھی اور بہت دور دراز کی چیز نظر آتی تھی۔

میں ایک دوراہے پر تھا اور اپنی ہی شدت سے پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ گھڑی کی حرکت دس گیارہ کے ہندسے پر پہنچی مگر میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔ سکون آور گولیوں کے اثر سے ہاتھ پاؤں بھاری ہو رہے تھے۔ ایک عجیب غنودگی سی کیفیت تھی۔ اچانک میں چونکا۔ پارک کے آخری سرے پر جہاں ایک باڑ کے لیے کھدائی وغیرہ کا کام ہو رہا تھا، مجھے ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ یہ بڑے خوب صورت اور تنگ پیشانی والا ہٹا کٹا شخص بدلو سراج تھا۔

سیٹھ کے ساتھ دو بندے اور تھے۔ وہ بھی سفید کڑکڑاتی شلواروں قمیصوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیح تھی۔ کسی بات پر وہ تینوں گونج دار آوازوں میں ہنسے اور ایک شخص نے سیٹھ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

سیٹھ کو خود سے چند گز کے فاصلے پر دیکھنے کے بعد میرے دل کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ مجھے زبردستی کا نکاح اور آنکھوں میں رلی ہوئی وہ چنگاریاں یاد آئیں۔ پھر وہ سب کچھ بھی یاد آیا جو ”ابن آدم“ کے صدیقی نے بتایا تھا اور اس کے بعد ثنا عثمان کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ چھوٹی چھوٹی نیم سفید داڑھی، اجلی زرد رنگت اور نیم وا آنکھیں۔ وہ جیتے جاگتے حیران تھے کہ ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے انہیں موت کے سفر پر کیوں روانہ ہونا پڑا۔ اس صورت حالات میں شاید میں پہلے ہی کی طرح اپنے اندر ہی اندر ابل کر رہ جاتا لیکن فی الوقت کیفیت کچھ اور تھی۔ دل و دماغ پہلے ہی طوفانوں کی آماج گاہ بنے ہوئے تھے۔ ٹرینکولائزر کا اثر بھی تھا۔

ایک دم میں طیش کے عالم میں اٹھا اور سیٹھ سراج کی طرف بڑھا۔ میرا پورا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ سیٹھ کے سامنے جاتے ہی میرے اندر کی آگ شعلہ بن کر بھڑکی اور میں نے ایک زناٹے کا تھپڑ سیٹھ کے چوڑے چکلے منہ پر جڑ دیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ سیٹھ ذرا سا لڑکھڑایا پھر مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں حیرت اور غصے سے پھیل گئیں۔

”اوئے... اوئے۔“ اس نے عجیب بے ڈھنگے انداز میں کہا۔

جب تک میں دوبارہ اس پر جھپٹتا وہ سنبھل چکا تھا۔ اپنے گریبان کی طرف بڑھنے والے میرے ہاتھوں کو اس نے پکڑا اور پیچھے کی طرف جھٹک دیا۔

”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے۔ میں تیری جان لے لوں گا۔ میں تجھے برباد کر دوں گا۔ تو نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میں تیری زندگی کو آگ لگا دوں گا۔“ میں پھر پوری شدت سے سیٹھ کی طرف لپکا۔

تب تک سیٹھ کے ساتھی بھی حیرت کے دھچکے سے سنبھل چکے تھے۔ ایک شخص نے میرے منہ پر الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ دوسرے نے مجھے عقب سے دبوچ لیا۔ میں نے خود کو چھڑانا چاہا مگر دم بدم بڑھنے والے سیٹھ کے زوردار ہاتھ نے مجھے پکڑ ڈالا۔ سیٹھ بھیانک آواز میں دھاڑا۔ ”بچہ اٹھا ہے حرامزادے... تجھے گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ تجھکو چھیک کر دوں گا تیرے پورے ٹبر (خاندان) کو۔“

وہ دیوانہ وار مجھ پر جھپٹ پڑا۔ کھدائی کی نگرانی کرنے والے کارندے بھی دوڑتے ہوئے آئے اور مجھ سے چمٹ گئے۔ اس وقت مارشل آرٹ کی ساری تکنیکیں بے کار ہو گئیں۔ میں نے اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلائے لیکن کوئی پیش نہیں گئی۔ مجھے زمین پر گرا لیا گیا اور بری طرح مارا جانے لگا۔ مجھے بس یہی لگ رہا تھا کہ میں ہوا میں اڑ اڑ کر گر رہا ہوں۔ میری ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں اور آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی آتش بازیاں سی بکھر رہی ہیں۔

چند ہی لمحوں میں میری قمیص تار تار ہو گئی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میری پتلون بھی ایک جھٹکے کے ساتھ بیلٹ سمیت کھینچ لی گئی ہے اور مجھے اس سے پیٹا جانے لگا ہے۔ لوہے کا وزنی بکل میرے جسم کو لہولہان کرنے لگا۔ مجھ پر ٹھوکریں بھی برسائی جا رہی تھیں۔ میں گھاس پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ جلد ہی میرے ہونٹوں سے بے ساختہ آہ و بکا بلند ہونے لگی۔ مجھے لگا شاید مجھے اسی جگہ قتل کر دیا جائے گا۔

اپنے ارد گرد مجھے بے شمار لوگ دکھائی دے رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو آگے بڑھ کر مجھے چھڑا سکتا۔ ان میں سے بہت سے لوگ مجھے بچپن سے جانتے بھی ہوں گے لیکن ان میں سے کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے سر پر پاؤں رکھ کر میرے چہرے کو گراؤنڈ کے کیچڑ میں لتھڑ دیا گیا۔ پھر مجھے ایک ٹانگ سے پکڑ کر بے دردی سے گھسیٹا گیا۔

سیٹھ کے ایک ساتھی کی غضب ناک آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ ”تھانے پہنچاؤ اس کتے کو۔“

ایک دوسری آواز نے کہا۔ ”تھانے بھی پہنچا لیں گے، پہلے دو چار ہڈیاں برابر کر لیں۔“

ایک کارندہ لمبے دستے کی کسّی لے کر میری طرف بڑھا۔ غالباً وہ الٹی کسّی کی ضربیں لگا کر میری ٹانگوں کو بے کار کر دینا چاہتا تھا۔

میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا قریبی مسجد کے امام صاحب نے آگے بڑھ کر اسے روکا اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ”جانے دو شیخ جی۔ بہت ہو گئی ہے اس کے ساتھ۔ اب باقی کسر تھانے جا کر پوری ہو جائے گی۔“

ایک اور دبی دبی آواز آئی۔ ”جانے دو جی۔ بڑا ہی کمینہ ہے۔ تو مر جائے گی یہ سب دیکھ کر... گندی اولاد ماں باپ کو بھی ذلیل کرتی ہے۔“

”ذلیل کرنا چاہیے ایسے ماں باپ کو... بلکہ اولاد سے بڑھ کر ذلیل کرنا چاہیے۔ دوسروں کو سبق تو ملے۔“ سیٹھ کا ایک اور پالتو دہاڑا۔ ”حرامزادہ اوارہ چلتا ہے بدمعاشی دکھاتا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر میرے جسم پر بھتوڑے جیسی ضربیں لگنی شروع ہو گئیں۔ ارد گرد کی ہر شے میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ آوازیں دور دراز سے بھنبھناہٹ کی صورت کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک گاڑی قریب آئی اور مجھے تختہ زمین پر گھسیٹ کر گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ ایک انجن دہاڑا۔ امام صاحب غالباً ابھی تک منت سماجت کر رہے تھے کہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔

بہر حال، گاڑی مجھے لے کر روانہ ہو گئی۔ سر سے بہنے والا خون میری آنکھوں میں بھر رہا تھا۔ میں کسی جانور کی طرح وحشیوں کے درمیان ٹارچر سہہ رہا تھا۔

سیٹھ کے ایک ملازم کی آواز آئی۔ غالباً وہ سیٹھ کو مشورہ

پتا نہیں کہ اس بندے کے لب و لہجے میں کیا بات تھی کہ میں اس سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا تھا۔ کوئی انجانی سی کشش تھی جو مجھے وہاں سے نہیں ہٹنے دے رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ جلدی سے بولا۔ ”یار! ایک آدھ گھنٹا کوئی زیادہ وقت تو نہیں ہوتا۔ اس کے بعد تم ہر کام کے لیے آزاد ہو گے... بلکہ تمہارے کسی بھی ارادے کو پورا کرنے میں، میں تمہاری مدد بھی کروں گا۔“

میں چند لمحے شدید تذبذب میں رہا۔ وہ بڑی متاثر کن نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے صاف ستھری پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں سفید جوگرز تھے۔ وہ زندگی، امنگ اور ترنگ سے بھرپور نظر آتا تھا۔

اس میں کسی کو قائل کرنے کی صلاحیت تھی۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”ہم یہیں کسی چائے خانے میں بیٹھ کر بات کر سکتے ہو؟“

”نہیں۔ اس بات کے لیے ذرا پُرسکون ماحول کی ضرورت ہے۔ اگر تم کہو گے تو میں واپس تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔“

”کہاں جانا ہوگا؟“

”آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے کمال بے تکلفی سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک رکشے والے کو دیکھ کر ہانک لگائی۔ ”او بھائی رکشا۔“

رکشا والا رک گیا۔ وہ مجھے لے کر رکشا میں بیٹھ گیا۔

”مینارِ پاکستان چلو۔“ اس نے کہا۔

اب دوپہر ہونے والی تھی۔ ہم ٹریفک کے اژدہام سے گزرتے، دھواں پھانکتے اور ہچکولے کھاتے تقریباً پون گھنٹے میں مینارِ پاکستان پہنچ گئے۔ راستے میں ہم تقریباً خاموش ہی رہے تھے۔ مینارِ پاکستان کو دیکھ کر وہ میری طرف جھکا اور مسکراتے ہوئے لہجے میں دبی آواز کے ساتھ بولا۔ ”ویسے خودکشی کرنے کے لیے یہ بھی اچھی جگہ ہے۔ یار لوگوں نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اس سے۔“

میں نے پرخمش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بیزاری سے منہ پھیر لیا اور رکشا سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ اپنے فقرے پر خود ہی مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی عجیب تھی۔ وہ نظر کو اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔

اب اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ میری ذہنی کیفیت سے آگاہ ہے اور میرے خطرناک ارادے سے بھی کلی طور پر بے خبر نہیں ہے۔ میرا یہ اندازہ درست تھا کہ جب میں نے میڈیکل اسٹور میں جا کر بے ڈھنگے طریقے سے گولیاں رکھنا کی تھیں، وہ میرے بالکل قریب موجود تھا اور میری بات سن رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ نہر والے پُل پر بھی شاید گزرا تھا۔ میں نے سوچا۔ کہیں یہ کوئی سی آئی ڈی والا تو نہیں؟ میں نے سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ خودکشی یا اقدامِ خودکشی جرم ہے اور قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہے۔ کہیں یہ بندہ مجھے تھانے وغیرہ تو نہیں لے جا رہا تھا...

اسی دوران میں اس کی شیریں آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ ایک بار پھر میری طرف جھکا اور مدھم لہجے میں بولا۔ ”لگتا ہے میری بات تمہیں بری لگی ہے۔ معاف کر دو یار! میں تو ایک جنرل بات کر رہا تھا۔“

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”جا نہیں رہے، پہنچ گئے ہیں۔ وہ سامنے بجلی کا ٹرانسفارمر دیکھ رہے ہو... وہیں رکنا ہے۔“

تب اس نے یہی بات رکشے والے کو بھی بتا دی۔ رکشا سے اتر کر اس نے کرایہ دیا۔ ساتھ ہی بیس روپے ٹپ بھی دے دی۔ رکشا والا سلام کر کے رخصت ہوا۔ ہم راوی روڈ کے ایک بارونق علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہاں دو رویہ دکانیں تھیں اور یہ ہوٹل وغیرہ بھی تھے... یہاں میرے اس ساتھی کو کئی لوگ پہچانتے تھے۔ دو چار لڑکوں نے اسے ”ہیرو بھائی“ کہہ کر سلام کیا۔ دو تین دکان داروں نے بھی اس کی حیثیت وغیرہ کا لحاظ کیا۔ وہ یہاں خاصا ہر دلعزیز تھا۔ لوگ میرے حلیے کو بھی تعجب سے دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ پھر ایک تھڑے پر بیٹھے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ”ہیرو پتر! تیری ماسی یاد کر رہی تھی تجھے۔ ایک چکر گھر کا لگا آنا۔“

”ہاں چاچا! آؤں گا۔ میں زیتون کا تیل لاؤں گا ان کے لیے۔ ان کے گھٹنوں کو بڑا فائدہ دے گا۔“

چاچے کے قریب بیٹھے ایک نیم بہرے شخص نے کہا۔ ”خاتون کا تیل؟ یہ خاتون کا تیل کیا ہوتا ہے؟“

”خاتون کا نہیں زیتون کا تیل وڈے بھائی۔“ میرے ساتھی نے وضاحت کی۔

چاچے نے مسکراتے ہوئے اپنے نیم بہرے دوست کو چھیڑا۔ ”دو خاتونوں کا تیل تو تم نکال چکے ہو۔ دونوں بے چاری قبرستان میں ہیں۔ اب بھی تمہیں خاتون ہی دکھائی دیتی ہے۔ کچھ خدا کا خوف کر نذیرے۔“

میرا ساتھی مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ نے ایک بار پھر اپنے اردگرد نیکلی شعاعیں سی بکھیر دیں۔ وہ نیم بہرے نذیرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”وڈے بھائی کو خدا کا خوف ہے چاچا! اسی لیے تو وہ تیسری شادی کی بات کرتے جھجکتے ہیں ورنہ لوگ آج کل کیا کیا گل نہیں کھلا رہے۔“ پھر اس نے نذیرے کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ”وڈے بھا! آپ فکر نہ کریں۔ اگلے ہفتے آپ کو ہسپتال لے کر جاؤں گا۔ وہاں ایک ڈاکٹر اپنا بڑا پکا واقف ہے۔ اس سے آپ کے دونوں کانوں کی اوور ہالنگ کراتے ہیں۔“

نذیرے کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ ”میں کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ تجھ سے یہ بات کروں گا۔ اب تم نے خود کہہ دیا ہے۔ اللہ تجھے حیاتی دے۔ تو بڑا خیال رکھتا ہے ہم سب کا۔“

”لو وڈے بھا! اب آپ نے بیگانوں جیسی باتیں شروع کر دیں۔ بس ٹھیک ہے۔“ میرے ساتھی نے کہا اور میرا بازو تھام کر آگے بڑھ گیا۔

چھت پر کھڑے ایک لڑکے نے زور سے کہا۔ ”ہیرو بھائی! آ کیچ۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک سیب اس کی طرف اچھال دیا۔ اس نے سیب کیچ کیا اور اسے چکھ چکھ کر کھاتا ہوا ایک کوٹھی نما گھر کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ جیب سے چابی نکال کر اس نے دروازہ کھولا۔ گیراج میں ایک عجیب وضع کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ وہ مجھے برآمدے سے گزار کر اندر لے آیا۔ یہاں چاروں طرف بے ترتیبی تھی کہ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس گھر میں عورت کا گزر نہیں ہے۔ بہرحال، گھر میں ساری سہولتیں موجود تھیں۔ یہ قریباً دس مرلے کا گھر تھا اور اچھا بنا ہوا تھا۔ اگر یہاں سلیقہ اور ترتیب ہوتی تو یہ خوب صورت نظر آتا۔ اسی دوران میں پڑوس کی طرف سے آواز آئی۔ کسی شخص نے دیوار کے اوپر سے ”ہیرو بھائی“ کہہ کر پکارا۔

وہ ”جی زاہد بھائی“ کہتا ہوا بغلی راہداری میں چلا گیا۔ پڑوسی نے پوچھا۔ ”یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟“

”اپنا دوست ہے زاہد بھائی... بچپن کا دوست۔“

”اسے ہوا کیا ہے؟ کافی چوٹیں لگی ہوئی ہیں۔“

”دراصل ابھی کچھ دیر پہلے ہی لاہور اسٹیشن پر ٹرین سے اترا ہے۔ اسٹیشن کی سیڑھیوں سے پھسل کر گر گیا ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ کوئی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی۔“ ہیرو نے بڑی روانی سے کہا۔

”ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟“

”ہاں ہاں، بینڈیج وغیرہ کروائی ہے۔“

کچھ دیر بعد ہیرو پھر میرے سامنے تھا۔ چہرے پر وہی دلنشیں سی مسکراہٹ لیے۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ہاں اب بتاؤ۔ کیا کہنا ہے تم نے؟“

”نہیں، اس طرح نہیں۔ پہلے تمہیں اپنا حلیہ ٹھیک کرنا ہوگا۔ کپڑے بدلنے ہوں گے اور کچھ کھانا پینا ہوگا۔ میں تمہاری صورت دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ تم نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔“

”دیکھو، مجھے ناشتے وغیرہ کی بالکل ضرورت نہیں۔ تم...“

”اچھا چلو ٹھیک ہے لیکن ذرا اپنا حلیہ درست کر لو۔ دیکھو تمہاری پنڈلیاں بھی اب تک خون سے داغی ہو رہی ہیں۔“

میں اسے روکتا ہی رہ گیا مگر وہ صابن تولیہ لے کر آ گیا۔ اس نے اصرار کے ساتھ میرا منہ دھلوایا۔ میری ٹھوڑی کی جزوی بینڈیج اپنے ہاتھ سے کی اور میرے ایک زخمی پاؤں پر بھی پٹی باندھی۔ پھر وہ میرے لیے اپنا ایک استری شدہ جوڑا لے آیا۔ پتلون کے اندر بیلٹ وغیرہ بھی موجود تھی۔ میرے انکار کی پروا کیے بغیر اس نے مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا۔ میں نے باتھ روم میں کپڑے بدلے۔ کپڑے بدلتے ہوئے جسم کے مختلف حصوں سے ٹیسیں اٹھیں۔ چڑیں ٹھوڑی دکھتی تھی اور جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں باہر آیا تو وہ میز پر کھانے پینے کی اشیا سجائے بیٹھا تھا۔ میز پر کے کلڑے، چکن رول، کوکونٹ اور اورنج جوس وغیرہ۔ اس نے بہت اصرار کیا مگر اس بار میں نے اس کی نہیں مانی۔ میں اس قابل ہی نہیں تھا کہ منہ میں لقمہ رکھ سکتا۔ مجھے لگتا تھا کہ الٹی ہو جائے گی۔

”ہاں، اب بتاؤ... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ میں نے بے حد رکھائی سے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟“ اس نے الٹا سوال کیا۔

میں نے خاموشی سے دانت پیسے اور گہری سانس لے کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم بس میرا اور اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے پاس کوئی کام کی بات ہے اور نہ تم کرو گے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب سیدھا سادا ہے۔ تم نے مجھے میڈیکل اسٹور میں دیکھا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں گولیاں وغیرہ کھا کر اسپتال پہنچ جاتا اور مر سکتا ہوں۔ اب تم خدائی فوج دار بن کر میرے سر پر مسلط ہو گئے ہو اور مجھے ایک لمبا چوڑا لیکچر پلانے کا ارادہ رکھتے ہو۔“

”لیکچر؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں لیکچر... تم پہلے مجھ سے میری پریشانیوں کا حال پوچھو گے پھر دکھی چہرہ بنا کر میرے بدترین حالات پر افسوس کرو گے۔ اس کے بعد تم عبدالستار ایدھی بننے کی کوشش کرو

نہایت فضول قسم کے سینما میں، نہایت فضول سیٹوں پر بیٹھ کر، نہایت ہی بور قسم کی فلم دیکھی جائے اور برائی زدوں کو ترجیح دیا جائے... بس اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو... پروگرام تبدیل کر دیتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ میں کچھ بھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن ادھر ادھر گھومنے کے بجائے کسی چار دیواری میں بیٹھنا اور اپنے سب پناہ رکھو میں زندہ رہنا مجھے بہتر محسوس ہوا۔

میں ذرا چپ ہوا تو وہ مجھے بازو سے پکڑ کر سینما ہال کی طرف بڑھ گیا۔ درحقیقت وہ اپنے مخاطب کو زیادہ سوچنے اور پھر کچھ ظاہر کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ سینما ہال میں گنڈیریاں لے جانا منع ہوتا ہے لیکن وہ بڑی آسانی سے گیٹ کیپر کی نگاہیں بچا کر لے گیا۔

کہتے ہیں کہ سینما ہال کا اندھیرا الم بیتی کو کچھ دیر کے لیے باہر کی دنیا اور دنیا کے دکھوں سے کاٹ دیتا ہے۔ اور اگر فلم بھی ہو تو کچھ نہ کچھ تو اثر ہوتا ہی ہے۔

میں نے سکون آور دوا کی تین گولیاں سینما ہال میں ہی نگل لیں اور اپنی آنکھیں موند لیں... سوچوں سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند گھنٹوں میں حالات کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ آج تک میں اس فیصلے کی دہلیز پر اٹکا رہا تھا کہ مجھے آ... سے ملاقات کر لینی چاہیے یا نہیں اور اب میں اس فیصلے کی دہلیز پر تھا کہ مجھے زندہ رہنا ہے یا مر جانا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید سینما ہال میں انٹرول کے دوران یا فلم کے دوران میں عمران مجھ سے بات چیت کرے گا اور میرے حالات کو کریدنے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

فلم ختم ہوئی۔ عمران نے مجھے ایک بار پھر اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر بٹھایا۔ تب میں نے پہلی بار دھیان سے موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ دیکھی۔ نمبر پلیٹ کے نیچے سیاہ پینٹ سے موٹے حروف کی لکھائی نئی ہوئی تھی اور اس کے نیچے لکھا تھا ...کنگ آف اسپیڈ!

کنگ آف اسپیڈ نے موٹر سائیکل کو ایک بار پھر ہوا میں اڑانا شروع کیا۔ میں نے ایک بات نوٹس کی۔ وہ بے انتہا تیز تو ضرور چلا رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے حد محتاط بھی تھا۔ گاڑیوں کے درمیان سے وہ اسی طرح راستہ بنا کر نکل جاتا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم نئی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہاں شالامار باغ کے قریب ایک بڑا سرکس لگا ہوا تھا۔ اس معروف سرکس کمپنی کے اشتہارات اکثر اخبار اور ٹی وی پر دیکھے جاتے تھے۔ عمران نے موٹر سائیکل سرکس میں کھڑی کر دی۔ یہاں بھی اس کے بہت سے لوگ جاننے والے تھے۔ ورا سے ہیرو بھائی اور عمرانی بھائی کہہ کر سلام کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھے بھی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ چکیلے لباس میں ملبوس ایک آرٹسٹ بازی گر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے عمران سے پوچھا۔ "بھائی صاحب کون ہیں اور کیا ہوا انہیں؟"

"پرانے بار بیلی ہیں۔ آج سویرے لاہور اسٹیشن کی نامعقول سیڑھیوں سے گر گئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہڈی وغیرہ بچ گئی ہے۔"

وہ مجھے سیدھا سرکس کے اس حصے میں لے گیا جہاں سرکس کے فن کار شو سے پہلے مختلف تیاریوں میں مصروف تھے۔ کوئی آہنی کڑے اچھال رہا تھا، کوئی گیندوں سے کھیل رہا تھا۔ ایک کوتاہ قد جوکر کندھے پر بندر کا بچہ بٹھائے ایک پہیے والی سائیکل چلا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر انکشاف ہوا کہ یہ عمران کا ہی تجربہ ہے۔ پانچ گھنٹے سے مجھے اپنے ساتھ اڑائے پھر رہا ہے، دراصل اس سرکس میں کام کرتا ہے۔ ہر رات کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ موٹر سائیکل کو چلانے کے بجائے "اڑاتا" کیوں تھا۔ اس نے شاید پورے لاہور شہر کو موت کا کنواں سمجھ رکھا تھا۔ وہ یہاں سرکس میں بھی بڑا ہی مقبول تھا۔ سرکس کی رنگیلی لڑکیاں اس سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ یہ ب لڑکیاں کی، ویسے یہ لڑکیاں اصل سے زیادہ جاذب نظر دکھائی دیتی تھیں۔ میں اپنا دھیان بٹانے کی بہت کوشش کر رہا تھا لیکن جس طرح کالے بادلوں میں رہ رہ کر برق تڑپتی ہے، یہ خیال بار بار ذہن میں آتا تھا کہ اس وقت میرے گھر کا منظر کیا ہوگا۔ والد اور بہن بھائی کس کرب سے گزر رہے ہوں گے۔ عمران نے اسسٹنٹ منیجر سے کہہ کر میرے سامنے فروٹ اور مشروبات وغیرہ کا انبار لگا دیا۔ پھر کپڑے بدلنے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے کھسکنے کے لیے یہ موقع مناسب ہے... لیکن اسی دوران میں ایک لڑکی میرے قریب آ بیٹھی۔ وہ یقیناً جمناسٹ تھی۔ سرکس کی عام لڑکیوں کے برعکس اس نے زیادہ بھاری میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ نہایت چست لباس میں اس کا جسم نمایاں ہو رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران اس لڑکی کو میری نگران بنا کر چھوڑ گیا ہے۔ وہ مجھ سے ادھر ادھر کے سوال پوچھنے لگی۔ اس نے میری چوٹوں کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ لڑکی کا نام شاہین تھا۔

اسی اثنا میں عمران ایک چمکیلا سا نیا لباس پہن کر واپس آ گیا۔ اس لباس میں اس کا کسرتی جسم جھلک دکھا رہا تھا۔

شاہین نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ وہ بے باکی سے اس کی طرف جھکا اور سرگوشی میں بولا۔ "ایسی نظروں سے مت دیکھا کرو جانِ من... کسی دن موٹر سائیکل سمیت سر کے بل گر جاؤں گا۔"

"تمہاری طرف تو دیکھنا بھی گناہ ہے۔" وہ بولی۔

"اور یہ گناہ تم روز ہی کرتی ہو... وہ بھی عین اس وقت جب میری انٹری ہونے والی ہوتی ہے۔ کیوں اپنے ہونے والے بال بچوں پر ظلم کرتی ہو؟ ٹوٹ گیا تو... کرا دیا۔"

عمران کے فقرے پر شاہین کا رنگ گلابی ہوا۔ وہ پہلے کی طرح شرمائی پھر کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل پکڑ کر بولی۔ "یہیں سر توڑ دوں گی تمہارا۔"

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ دل کے بعد اب سر کی باری ہی تو آئی ہے۔" شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں اس کی نظر ٹیبل کیلنڈر پر پڑ گئی۔ اس نے غور سے دیکھ کر تسلی کی اور بولا۔ "آج پانچ تاریخ ہے نا... چلو یہ بھی ٹھیک ہوا۔"

"پانچ تاریخ" والا فقرہ اس نے پچھلے پانچ چھ گھنٹوں میں کم از کم چار بار دہرایا تھا اور ہر بار اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔

سرکس کا پنڈال اور موت کا کنواں ایک دوسرے سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر واقع تھے۔ دونوں جگہوں سے تماشائیوں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ میوزک کی آواز بھی ابھر رہی تھی۔ "میرا نمبر کا شو تیار ہے؟" عمران نے اسسٹنٹ منیجر عباس سے پوچھا۔

"ہاں عمران بھائی! ایک دم ریڈی۔ سرکس میں آپ کی انٹری ساڑھے نو بجے کے قریب ہے۔"

اسسٹنٹ منیجر اور عمران کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ عمران موت کے کنویں کے علاوہ سرکس کے جھولوں پر بھی کام کرتا ہے۔ اس کے جسم میں ایک اچھے جمناسٹ کی خصوصیات موجود تھیں... نظر بھی آئی تھیں۔

ہم جس جگہ بیٹھے تھے، یہ ایک بڑا شامیانہ تھا۔ اس شامیانے کو ہی ایک نئے لکڑی کے پارٹیشن سے رفتہ کی صورت دی گئی تھی۔ شامیانے میں مختلف فنکار وارم اپ ہونے میں مصروف تھے۔ موت کے کنویں کی طرف سے رہ رہ کر تالیوں کی آوازیں ابھرنے لگیں جس سے اندازہ ہوا کہ وہاں چھوٹا موٹا تماشا شروع ہو چکا ہے۔ دو ملازم لڑکے عمران کی موٹر سائیکل چیک کرنے میں مصروف تھے۔ عمران نے میری طرف دیکھا اور اپنے مخصوص مسکراتے لہجے میں بولا۔ "بیٹھو گے میرے ساتھ؟"

"نہیں۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"چلو تماشا تو دیکھو گے نا؟" اس نے کہا پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک پٹھ کٹے شخص سے بولا۔ "سینڈو... انہیں گراؤنڈ میں لے جاؤ۔"

منا چٹ سر والے سینڈو نے میری طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو... آؤ جی میرے ساتھ، ہیرو بھائی کے کمالات دیکھو۔

شامیانے کے ایک جانب راستہ سا تھا۔ اس راستے کی دیواریں قناتوں سے بنی ہوئی تھیں۔ موت کے کنوئیں میں کرتب دکھانے والوں کو اسی راستے سے گزر کر کنوئیں میں داخل ہوتا تھا۔ میں سینڈو کے ساتھ اندر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن چار و ناچار چلا گیا۔ اوپر سے تو موت کے کنوئیں میں کئی بار جھانکا تھا لیکن آج میں کنوئیں کے اندر تھا۔ یہاں درمیان میں لوہے کی تین چار کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ہی چھوٹا سا ڈیک تھا جس سے ابھرنے والی موسیقی تین بڑے اسپیکروں کے ذریعے کنوئیں میں اور کنوئیں سے باہر گونج رہی تھی۔ کنوئیں کے کنارے پر روز مائی سے تماشائیوں کے بے شمار چہرے نظر آ رہے تھے۔ کنوئیں کے اندر دو لڑکیاں اور دو ہیجڑے بھی موجود تھے۔ انہوں نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے اور چہروں پر سرخی پاؤڈر تھوپا ہوا تھا۔ یہ سب الٹے سیدھے ڈانس کر رہے تھے۔ ایک پرانا گانا بج رہا تھا... وے بلوری اکھ والیا۔

مجھے لگا کہ کنوئیں کے اندر میں خود بھی ایک تماشا ہوں اور ان گنت بلوری آنکھیں مجھے بھی گھور رہی ہیں۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر ان ہزاروں تماشائیوں میں سے کوئی میرا شناسا بھی ہوا تو مجھے اس حال میں اس کنوئیں کے اندر دیکھ کر کیا محسوس کرے گا۔ شاید وہ یہ سمجھے کہ میں نے بھی موت کے کنوئیں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے اور میرے جسم پر جو پٹیاں نظر آ رہی ہیں، وہ اسی "کام" کے سلسلے میں لگی ہیں۔ ایک بار پھر جی میں آئی کہ کسی طرح یہاں سے کھسک جاؤں لیکن عمران نے میرا پکا انتظام کر کے ہی مجھے اندر بھیجا تھا۔ لڑکی شاہین کی طرح سینڈو بھی میرا میزبان تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ نگران بھی تھا...

لڑکیوں اور ہیجڑوں کو گانے کی دھن پر بے ہودہ ڈانس کا اچھا رسپانس ملنے لگا۔ اوپر سے نوٹ پھینکے جانے

گے۔ اسی دوران میں عمران کی عجیب الخلقت موٹر سائیکل انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی۔ اس کی آواز نے قرب و جوار کی ہر خوب صورت و بدصورت آواز کو ڈھانپ لیا۔ تماشائیوں نے ابھی موٹر سائیکل کو دیکھا نہیں تھا مگر ان کے اندر ہوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ موسیقی بند ہوگئی اور ڈانسرز نے کنواں خالی کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد عمران کنوئیں میں داخل ہوا۔ لوگوں نے پُرجوش تالیاں بجائیں۔ اس نے ہاتھ لہرا کر جواب دیا پھر اس نے رفتار تیز کی اور اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

اگلے پانچ چھ منٹ میرے لیے بے حد تحیر خیز تھے۔ خاص طور سے آخری دو منٹ۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ موت کے کنوئیں کا تماشا میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا بلکہ کنوئیں میں کاریں بھی چلتی دیکھی تھیں مگر عمران نے جو آئٹم پیش کیے وہ حیران کن تھے۔ پوری SWING میں چلتی ہوئی موٹر سائیکل پر اوندھا لیٹنا، الٹا بیٹھنا، گھٹنوں کے بل بیٹھنا، ایک گھنٹا ٹیک کر دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا دینا... ہر گھڑی یہی لگا کہ وہ احمقانہ جوش کا مظاہرہ کر رہا ہے اور ابھی کسی حادثے کا شکار ہو کر نیچے گر جائے گا۔ اس کا گرنا اس کے لیے ہی نہیں، کنوئیں کے اندر موجود چار افراد کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا جن میں، میں بھی شامل تھا۔ موٹر سائیکل کے زور سے لکڑی کا بنا ہوا پورا کنواں بُری طرح ہل رہا تھا۔

شو کے آخری حصے میں ایک اور موٹر سائیکل سوار بھی عمران کے ساتھ شامل ہوگیا۔ دونوں سواروں نے اپنے پیچھے دو لڑکیاں بھی بٹھائیں۔ ان میں عمران کے پیچھے وہی بھوری آنکھوں والی شاہین بیٹھی۔ بہرحال، تماشے کے اس آخری حصے میں بھی عمران کو ہی مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ تماشائیوں نے اس کی ہر خطرناک ادا پر دل کھول کر تالیاں بجائیں۔ آخر میں وہ چند سیکنڈ کے لیے میرے پاس رکا۔ اپنے مخصوص انداز میں میری طرف جھک کر بولا۔ "آجاؤ یار! دو منٹ کے لیے تم بھی اس راؤنڈ کا مزا لے لو۔ سچ کہتا ہوں، نشہ ہو جائے گا۔"

"سوری!" میں نے حتی الامکان اپنے چہرے کو سخت رکھا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، اپنی چمکیلی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر ہولے سے بولا۔ "ڈرتا ہے تو مرتا ہے، جو مرتا ہے تو پھر ڈرنا کیا؟"

"تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں؟" میں اٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے ایک دم اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے۔ "ارے... نہیں، بیٹھو بیٹھو۔ ایک تو تم غصے میں ایک دم... آجاتے ہو۔ اچھا، اب کچھ نہیں کہوں گا تمہاری مرضی کے خلاف۔ اب ایک آخری آئٹم ہے، اس کے بعد چلتے ہیں اور اگر..."

اسے بات کرتے کرتے اچانک رکنا پڑا کیونکہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور ہولے سے بولا۔ "ہاں جی، عمران اسپیکنگ۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جو اس نے دھیان سے سنا پھر جواب میں بولا۔ "پر ملک صاحب... آپ (ایچ او) سے تو ہمیشہ آپ ہی بات کرتے ہیں... ہمارا کام تو اندر کے معاملے سنبھالنا ہوتا ہے... جی ہاں... جی ہاں... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن پچھلی بار بھی تو بات ہوئی تھی۔ دوسرے ہفتے میں پیسے بھی بڑھا دیے تھے آپ نے۔"

جواب میں پھر کچھ کہا گیا جو عمران نے دھیان سے سنا اور آخر میں بولا۔ "تو پھر کیا کیا جائے... کٹ بڑھا دیا جائے؟... نہیں... نہیں... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" بات کرتے کرتے وہ موٹر سائیکل سے اترا اور کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ پھر فون کان سے لگائے لگائے وہ کنوئیں سے نکلا اور غالباً پبلک ٹوائلٹ کے عقب کی طرف گیا تھا۔

اس نامعلوم فون کال کے بعد میں نے پہلی بار عمران کے چہرے پر تھوڑی سی سنجیدگی دیکھی تھی۔ میرے قریب کھڑا سینڈو اور دیگر افراد بھی قدرے سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میری چھٹی حس کہنے لگی کہ یہاں کچھ چھپایا جا رہا ہے۔ اس تماشے کے ساتھ ساتھ یہاں کوئی زبردست قسم کا گھپلا ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ کوئی ایسا کام جسے کرنے سے پہلے یہاں کے اہم افراد تناؤ کی کیفیت میں ہیں۔ کیا یہ کوئی خطرناک کام ہے؟ کیا کوئی سنگین قسم کی قانون شکنی ہونے والی ہے؟ یا پھر...

میرے ذہن میں ایک بار پھر یہ بات آئی کہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔ میں کوئی ان کا قیدی نہیں تھا۔ میں اب تک صرف عمران کے اصرار کی وجہ سے یہاں رکا ہوا تھا۔ سینڈو اور دیگر افراد آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے کھسکنے کا موقع مل سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا لیکن اسی وقت عمران پھر مسکراتے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس کی مسکراہٹ بھی عجیب چیز تھی...

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

اس قلم کار کی تحریر جس کے ہر لفظ میں جذبات کا رنگ اور محسوسات کے سُر تال بجتے ہیں

طاہر جاوید مغل

للکار

۲ دوسری قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق اک غبارِ جاں ہے جو یہاں وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں مصروف رہتا ہے..... مگر آج عشق کی انداز میں تبدیلی..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے۔ کچھ بھی کہیں..... عشق کا منظر نامہ بدل گیا ہے..... کردار میں بھی تبدیلی آئی ہے..... سر پھرے عاشق نے ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محنت کے علاوہ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے..... ایسے عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر..... عقل و شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ہے..... ایک للکار ہے۔

اس عاشق صادق کا احوال جو للکار بنتے اور للکارنے کا دھنی تھا

وہ اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر بیٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور بے خوفی تھی۔ تب وہ ایک بار پھر کنوئیں کے اندر موٹر سائیکل دوڑانے لگا۔ موٹر سائیکل کا شور بے پناہ تھا۔ عمران نے پوری رفتار سے چلتی موٹر سائیکل پر چند اور نہایت خطرناک کرتب دکھائے۔ ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ اعتماد کا شکار ہے اور اپنا کوئی نقصان کر بیٹھے گا۔ دیکھنے والوں کے سانس سینے میں اٹکے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ساتھ وہ تالیاں بھی پیٹ رہے تھے۔

آخر عمران کا تماشا ختم ہوا اور وہ زبردست تالیوں کے شور میں نیچے آگیا۔ اس کی موٹر سائیکل ملازمین نے سنبھال لی اور وہ تماشائیوں کی طرف ہاتھ لہراتا ہوا ایک کونے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی بنے ٹھنے سینڈی کے ساتھ واپس شامیانے میں آگیا۔

”کیسا لگا میرا تماشا؟“ اس نے پوچھا۔

”بہت اچھا۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

میں رات دو بجے تک اس شخص کے ساتھ رہنے کا وعدہ کر چکا تھا مگر اب یہ وعدہ نبھانا مجھے مشکل نظر آرہا تھا۔ ایک تو میری جسمانی چوٹیں مجھے مسلسل تکلیف دے رہی تھیں، دوسرے میری ذہنی تکلیف جسمانی تکلیف سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں کوئی خاموش جگہ ہو... گہری، تاریک اور بالکل تنہا۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤں اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر اپنی زندگی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرلوں۔ فیصلہ کرلوں کہ مجھے زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ اگر مرنا ہے تو کس طریقے سے... اور اگر زندہ رہنا ہے تو پھر کس طرف کا رخ کرنا ہے... یہ بات تو میرے تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ میں پھر اپنے گھر کی طرف لوٹوں گا۔ ان سب لوگوں کا سامنا کروں گا جو میری بے مثال ذلت و رسوائی کے شاہد تھے یا اس بارے میں جانتے تھے۔

عمران اپنے معمول کے کام بھی کر رہا تھا اور سائے کی طرح میرے ساتھ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا کاسٹیوم بدلا اور کچھ ہی دیر بعد مجھے ایک بار پھر سینڈی اور شاہین کے حوالے کر کے اپنی دوسری ”انٹری“ کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کی یہ ”انٹری“ سرکس میں تھی۔ پنڈال کے اندر کافی تعداد میں تماشائی موجود تھے۔ کچھ پورشن تو کچھ کچھ بھرے ہوئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ویک اینڈ کی شام تھی۔

اس مرتبہ عمران نے جھولوں پر اپنے کمالات دکھائے۔ اس کے ساتھ پانچ چھ مزید بازی گر بھی شامل تھے۔ ان میں تین لڑکیاں بھی تھیں۔ یہاں بھی عمران کا رول اہم رہا۔ اسے اور ایک دوسرے بازی گر سلیمان عرف شہزادے کو خوب داد ملی۔ یہ نہایت پُرخطر آئٹمز تھے۔ بہرحال ان کے تحفظ کے لیے جھولوں کے نیچے جال وغیرہ موجود تھے۔

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ شو ختم ہو گیا۔ تماشائی جوق در جوق پنڈال سے نکلنے لگے۔ شو میں حصہ لینے والے انسان اور جانور بھی سبکدوش ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے... سرکس کے اردگرد موجود فالتو روشنیاں بجھائی جانے لگیں۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ابھی ”کھیل“ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ ابھی یہاں کچھ باقی ہے اور جو باقی ہے، وہ اس سارے کھیل سے زیادہ اہم ہے۔ عمران، شہزادے اور اس کے دیگر ساتھیوں نے انیکسی شامیانے میں پُرتکلف کھانا کھایا اور الائچیوں والی سبز چائے پی۔ عمران کے بے پناہ اصرار کے باوجود میں نے ایک لقمہ نہیں لیا... لے ہی نہیں سکا۔ میرے خونچکاں سینے میں تو کچھ اور طرح کی جنگ جاری تھی۔

ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ اکا دکا گاڑیاں آکر سرکس کی پارکنگ میں رکنے لگیں۔ یہ سب شاندار گاڑیاں تھیں۔ ہنڈا، ٹویوٹا اور پجارو وغیرہ۔ دوسری طرف اسسٹنٹ منیجر عباس اور انتظامیہ کے دیگر افراد سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور خاص انتظامات میں مشغول تھے۔ عمران نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”بس یار! اب تمہیں ایک خاص تماشا دکھاتے ہیں۔ ویسے تو اس تماشے کا ٹکٹ عام تماشے سے تقریباً پندرہ بیس گنا ہے لیکن تمہارے لیے تو یہ پہلے کی طرح مفت ہے۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ہی مزے کرو گے یار...“ اس نے میرا کندھا تھپکا۔

شاید وہ اور بھی کچھ کہتا لیکن میں نے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے بات بدل گیا۔ ”بس اب زیادہ دیر نہیں یار... پانچ دس منٹ کا انتظار رہ گیا ہے۔“

دس منٹ بعد ہم ایک بار پھر پنڈال میں تھے۔ اس بار پنڈال تقریباً خالی تھا۔ صرف بیٹھک کی جگہ تھی جہاں قالین بچھے تھے اور صوفے وغیرہ رکھے تھے۔ تقریباً پچیس تیس تماشائی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی تعداد پچاس ساٹھ تک پہنچ گئی۔ ان میں سے زیادہ تر نوجوان امیرزادے نظر آتے تھے جو ٹولیوں کی صورت میں آئے تھے۔ کچھ بڑی عمر کے لوگ بھی تھے جو اپنے لباسوں اور چہروں سے بے فکرے

ٹاپ کے دولت مند... لگتے تھے۔ میں اسپیشل کلاس کی تیسری قطار میں بیٹھا تھا۔ سینڈی میری دائیں جانب اور شاہین بائیں جانب تھی۔ پھر میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ جھولوں کے نیچے سے دونوں حفاظتی جال ہٹا لیے گئے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے شاہین سے پوچھا۔

”آپ دیکھتے رہیں۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

بازی گر رسّی کی طویل سیڑھی کے ذریعے تقریباً پچاس فٹ اوپر جھولوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان میں عمران اور شہزادہ سب سے آگے تھے۔ اس مرتبہ بازی گر لڑکیوں کے لباس بھی زیادہ ”بولڈ“ تھے۔ ان کی پوری ٹانگیں عریاں تھیں اور بالائی جسم پر بھی مختصر ترین لباس تھا۔ ہیجان خیز میوزک نے ماحول کو گرمانا شروع کر دیا۔ پنڈال کے اندر عجیب سی سنسنی محسوس ہونے لگی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ اس سرکس میں چوری چھپے غیرقانونی شو چلایا جا رہا تھا۔ ایک ایسا تماشا جس میں زندگی کا کوئی تحفظ نہیں تھا اور بلندی پر مظاہرہ کرنے والے بازی گر ہر گھڑی موت کے نشانے پر تھے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ شاید یہی سنسنی اور ہیجان تھا جس کی خاطر کچھ لوگ بھاری معاوضہ دے کر تماشا دیکھنے کے لیے یہاں موجود تھے۔

تماشا شروع ہوا تو پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ سوئی بھی گرے گی تو آواز آئے گی۔ بازی گروں کے چہروں پر بھی سخت تناؤ کی کیفیت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جھولا چھوڑ کر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے اور دوسرا جھولا پکڑتے ہوئے ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو اس کا مطلب ہوگا، بلندی سے زمین پر گرنا اور موت کے قریب تر چلے جانا۔ میں نے دیکھا کہ بازی گروں میں کسی کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ موجود تھی تو وہ عمران تھا۔ وہ نہ صرف بڑے سکون سے اپنے آئٹم پیش کر رہا تھا بلکہ ساتھیوں کی حوصلہ افزائی بھی کر رہا تھا۔ جب بازی گر کوئی اسٹیپ مکمل کر لیتے تو تماشائیوں کا سکتہ ٹوٹتا، وہ شور مچاتے اور تالیاں پیٹتے۔ ایک خطرناک فارمیشن مکمل کرتے ہوئے عمران کے ساتھی شہزادے کی ”ٹائمنگ“ ذرا سی غلط ہو گئی۔ ہوا میں دو قلابازیاں کھا کر اس نے عمران کی ٹانگیں پکڑنا تھیں جو خود بھی جھول رہا تھا۔ شہزادے کے دونوں ہاتھ عمران کی پنڈلیوں پر نہیں پڑ سکے۔ ایک ہاتھ پھسل گیا۔ بہرحال دوسرے ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ خود کو گرنے سے بچانے میں کامیاب رہا۔ اس دو سیکنڈ کی ہلچل نے تماشائیوں کو پنجوں پر کھڑا کر دیا۔ ان کے ہونٹوں سے بے ساختہ ”اوہ“ کی مشترکہ آواز نکلی۔

یہ کھیل تقریباً تیس منٹ کا تھا۔ میری دھڑکنیں زیروزبر ہوتی رہیں اور ہتھیلیوں پر پسینا آگیا۔ ہر لحظہ یہی لگا کہ ابھی کوئی خوفناک حادثہ پیش آجائے گا اور ہم سب خود سے چند میٹر کے فاصلے پر ایک شخص کو مرتے ہوئے دیکھیں گے۔ یہ واقعی زبردست تھا۔

خدا خدا کر کے نہایت سنسنی خیز تماشا ختم ہوا اور تالیوں کی گونج میں بازی گر رسّی کی سیڑھی سے نیچے اترنے لگے مگر ابھی یہ کھیل مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا، بس اس کا ایک مرحلہ اختتام پذیر ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سرکس کے جوکر ٹائپ ملازمین پنڈال کے وسط میں نمودار ہوئے۔ انہوں نے اپنی الٹی سیدھی حرکتوں سے تماشائی حضرات کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیریں۔ تب وہ چند کرسیاں اٹھا لائے اور انہیں ترتیب سے ایک اسٹیج پر رکھنے لگے۔ کرسیوں کے سامنے ایک میز رکھی گئی اور میز پر لکڑی کا ایک منقش باکس۔

سب سے پہلے شہزادہ اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے جھک کر حاضرین کو سلام کیا اور پھر متانت سے چلتا ہوا درمیان والی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے لکڑی کا باکس کھولا اور اس میں سے ایک سیاہ کولٹ ریوالور نکال لیا۔ باکس میں سے کچھ گولیاں نکال کر اس نے میز پر سجائیں۔ یہ اسٹیج پنڈال کے درمیان نہیں تھا بلکہ حاضرین کے بالکل سامنے تھا۔ بمشکل دس بارہ میٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔ سلیمان عرف شہزادے نے ریوالور کے چیمبر میں ایک عدد گولی ڈالی اور چیمبر کو تیزی سے گھما دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں ایک اور طرح کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ تماشائیوں میں موجود چند امیرزادے کچھ شرطیں لگا رہے تھے۔ ان شرطوں کا بھاؤ پہلے اوپر نیچے ہوتا رہا پھر ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اب یہ ایک کے مقابلے میں چھ تھا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے اپنے پہلو میں بیٹھی شاہین سے پوچھا۔

وہ تو کچھ نہیں بولی تاہم دوسری طرف بیٹھی سینڈی نے اپنی بھاری مگر کم آواز میں کہا۔ ”یہ گیمبلنگ ہے جی۔ ایک کے مقابلے میں چھ۔ شہزادہ صاحب اس ریوالور کی نال اپنے جسم پر رکھ کر گولی چلائیں گے۔ گولی نہ چلی تو شرط لگانے والوں کو پچاس ہزار روپیا دینا ہوگا۔ اس میں سے پچیس ہزار شہزادہ صاحب کو ملیں گے۔ گولی چل گئی تو شرط لگانے والے دو بندوں کو تین لاکھ دینا ہوگا۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال

تھی۔ اس قسم کے کھیلوں کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا لیکن آج میں اپنی آنکھوں کے سامنے ایک جیتا جاگتا منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک جیتا جاگتا شخص تھا جو مجھ سے تقریباً دس میٹر کی دوری پر اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کا تناؤ میں اتنی دور سے بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔

جب شرط پوری طرح طے ہو گئی تو شہزادے نے ایک بار پھر ریوالور کی چرخی گھمائی اور اس کی نال اپنے پیٹ پر پہلو کی طرف رکھ لی۔ ایک ریفری نما شخص نے آگے بڑھ کر نال کے مقام اور رخ کو چیک کیا۔ اس کے بعد شہزادے نے آنکھیں بند کیں اور اطمینان سے ٹریگر دبا دیا۔ "ٹرچ" کی آواز ابھری اور تماشائیوں میں سے کچھ افراد اٹھ کر تالیاں پیٹنے لگے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے گولی نہ چلنے پر شرط لگائی تھی۔ سلیمان عرف شہزادہ بھی ایک طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا اور اس نے تماشائیوں کی طرف دیکھ کر کورنش بجایا۔ تب وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب شرط کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس میں ریوالور کے چیمبر میں دو گولیاں ڈالی گئیں۔ ایک بار پھر شرط باندھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پندرہ بیس نوجوانوں کی دو ٹولیاں تھیں جو آگے بڑھ بڑھ کر بولی دے رہی تھیں۔ ان کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ نئے نہیں ہیں، پہلے بھی اس پُرخطر کھیل کو انجوائے کرتے رہے ہیں۔ اس مرتبہ شرط کا ریٹ سوا ایک اور تین کا تھا۔ جو شرطیں لگی تھیں، ان کے مطابق گولی نہ چلنے کی صورت میں تقریباً ایک لاکھ روپے ادا کیے جانا تھے اور چلنے کی صورت میں دو لاکھ چالیس ہزار۔ گولی نہ چلتی تو پھر لاکھ میں سے پچاس ہزار روپے شہزادے کو مل جانے تھے۔ شہزادے نے دونوں گولیاں حاضرین کو دکھانے کے بعد چرخی کے خانوں میں آمنے سامنے ڈالی تھیں اور چرخی کو اچھی طرح گھما دیا تھا۔ سنسنی ایک بار پھر عروج پر پہنچ گئی۔ دھڑکنیں زیروزبر ہونے لگیں۔ آخری عمل کرنے سے پہلے شہزادے نے حاضرین کی فرمائش پر اپنی قمیص اور بنیان اتار دی۔ اس کا کسرتی جسم ٹیوب لائٹس کی روشنی میں دمکنے لگا۔ تاہم مجھے اس کے پہلو میں ایک گول سیاہ داغ بھی نظر آیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ اس کھیل کے دوران میں ایک بار پہلے گولی کا شکار ہو چکا ہے۔ حاضرین کی طرف دیکھنے کے بعد شہزادے نے ریوالور کی نال کو اپنے پہلو میں مقررہ مقام پر رکھ دیا۔

"اگر ان کو گولی لگ گئی تو کیا ہوگا؟" میں نے سرسراتی آواز میں سینڈرا سے پوچھا۔

"یہاں ایک ڈاکٹر موجود ہے جی... اور دوا دارو کا سامان بھی۔" سینڈرا نے سرگوشی کی۔

"اگر گولی لگ گئی تو دوا دارو سے کیا ہوگا؟"

سینڈرا کے بجائے شاہین بولی۔ "یہاں اس کو فرسٹ ایڈ دیں گے۔ پھر گاڑی پر قریب کے اسپتال لے جائیں گے۔ سارا انتظام پہلے سے موجود ہوتا ہے۔"

پنڈال میں ایک بار پھر گہری خاموشی تھی۔ شہزادے نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور پھر آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ایک بار پھر ٹرچ کی آواز ابھری اور تالیوں کے شور سے پنڈال گونج گیا۔

ٹریگر دبنے کے فوراً بعد ہی کیش وغیرہ کا تبادلہ کر لیا گیا۔ سلیمان عرف شہزادے کے حصے کی رقم فوراً ہی اس کو دے دی گئی۔

سرکس کا اسسٹنٹ منیجر عباس اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور حاضرین کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ "ہمیشہ کی طرح آپ معزز حضرات میں سے بھی کوئی اگر اس کھیل میں حصہ لینا چاہے تو وہ یہاں آ سکتا ہے۔ کھیل کے اصول آپ سب جانتے ہی ہیں۔"

تماشائیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ تقریباً ایک منٹ کی اضطرابی کیفیت کے بعد لمبے بالوں والا ایک نوجوان اسٹیج پر آ گیا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے ایک دو پرانے نشان اس کی گرم مزاجی کو ظاہر کرتے تھے۔ اس نے جینز اور سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے لباس اور شکل وصورت سے عیاں تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ وہ اطمینان سے آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کی حرکات وسکنات سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی اس کھیل میں حصہ لے چکا ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ تھرل اور ڈرامے کے لیے تھا ورنہ ایسے نوجوانوں کو پیسے کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔

اس لڑکے نے بھی اپنے لیے دو گولی والا کھیل چنا۔ دو تین منٹ کے اندر ایک بار پھر شرط باندھنے والا عمل ہوا۔ اس مرتبہ بھی ریٹ تقریباً وہی تھا۔ جواریوں نے اپنی اپنی رقوم اسسٹنٹ منیجر عباس کے سامنے میز پر رکھ دیں۔

لمبے بالوں والے نوجوان نے چرخی گھما کر ریوالور کی نال قاعدے کے مطابق اپنے پہلو پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکے سے گولی چلی۔ حاضرین چلا اٹھے۔ لمبے بالوں والے نوجوان کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا اور وہ اوندھے منہ سامنے میز پر گرا۔ اس کی کراہ دور تک سنائی دی تھی۔ ملازمین جو پہلے سے تیار تھے، دوڑ کر زخمی تک پہنچے۔ اسے اسٹریچر پر

لٹایا اور اسٹریچر اٹھا کر ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ زخمی تکلیف کی شدت سے بل کھا رہا تھا۔ اس کے پہلو سے نکلنے والا خون اسٹیج پر ایک لکیر کی صورت میں دکھائی دینے لگا۔ سب حاضرین اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔

تاہم یہ سارا اضطراب صرف تین چار منٹ کے اندر ختم ہو گیا۔ اسٹیج پر سے خون کے دھبے تیزی سے صاف کر دیے گئے۔ کچھ دیر بعد یوں لگنے لگا جیسے یہاں کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب میں نے دیکھا کہ عمران خود اسٹیج پر نمودار ہوا ہے۔ وہ ابھی تک بازی گری والے کاسٹیوم میں تھا اور دلکش دکھائی دیتا تھا۔ وہ میز کے پیچھے اسی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جہاں سے تین چار منٹ پہلے خون میں لتھڑے نوجوان کو اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا گیا تھا۔ کتنی جلدی ہوا تھا وہ سب کچھ۔ صرف آدھ پون منٹ پہلے وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تالیاں بجا رہا تھا اور ہلا گلا کر رہا تھا اور اب کوئی گاڑی اسے تیز رفتاری کے ساتھ اسپتال کی طرف لے جا رہی تھی... جس کرسی سے وہ اٹھایا گیا تھا وہاں اب مسکراتے چہرے والا عمران بیٹھا تھا۔

ایک بار پھر شرطیں باندھنے کا عمل شروع ہوا۔ اب اس عمل میں پہلے سے زیادہ سنسنی خیزی اور جوش پایا جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اس اضافی جوش کی وجہ معلوم ہو گئی۔ سینڈرا کے ذریعے مجھ پر انکشاف ہوا کہ عمرانی بھائی "تین چھ کا کھیل" کھیلیں گے۔ تین چھ کے کھیل سے مراد یہ تھی کہ تین خانے خالی، تین خانوں میں گولیاں۔ میں نے عمران کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور مجھے لگا کہ میں اسے مزید مسکراتے نہیں دیکھ سکوں گا۔ یہ بے پروائی کی حد تک دلیری کا مظاہرہ تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بھی موت کو ڈھونڈ رہا ہے لیکن اس کی تلاش کا انداز ذرا مختلف ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی موت کا الزام اپنے سر لینے کا خواہش مند بھی نہیں ہے۔ اس نے یہ الفاظ غیر سنجیدگی سے کہے تھے تاہم اب اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ اتنے غیر سنجیدہ بھی نہیں تھے۔ حساب بالکل صاف تھا۔ عمران کے بچنے کا امکان پچاس فیصد اور گولی لگنے کا امکان بھی پچاس فیصد تھا۔ حاضرین آگے بڑھ بڑھ کر شرطیں لگا رہے تھے۔ ہر چہرہ سنسنی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میری نظر عمران کی نظر سے ملی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا... "ہے نا مزہ آ رہا ہے یا نہیں؟"

اس کی دلی کیفیت کے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم اس کا چہرہ حسب معمول مسکرا رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ریوالور ہاتھ میں لیے اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک مجھے شک تھا کہ شاید اس کھیل میں کوئی گھپلا وغیرہ کیا گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ریوالور میں نقلی گولیاں ہوں یا کھلاڑی نے اپنے لباس کے نیچے کوئی جیکٹ وغیرہ پہن رکھی ہو... مگر یہ دونوں شکوک ابھی تھوڑی دیر پہلے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ یہاں پر اصلی گولی چلی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے سلیمان عرف شہزادے نے اپنے کھیل میں اپنی قمیص بھی اتار کر دکھا دی تھی۔

شہزادے سے تو لوگوں نے قمیص اتارنے کی فرمائش کی تھی مگر عمران نے بغیر فرمائش کے ہی اپنا بالائی لباس اتار دیا۔ اس کا نہایت مضبوط اور سڈول جسم دعوتِ نظارہ دینے لگا۔ شرطیں باندھنے کی گرما گرمی میں تقریباً دس منٹ صرف ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عباس کے سامنے رکھی ٹیبل پر کرنسی نوٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا۔ یہ ساڑھے تین اور ڈھائی کا ریٹ تھا۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں تقریباً سات لاکھ روپے ادا کیے جانے تھے جس میں سے اندازاً تین لاکھ روپے عمران کی جیب میں جانے تھے۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں پانچ لاکھ مخالف گروپ کو ادا کیے جانے تھے۔

تقریباً تین لاکھ روپے کی خاطر عمران زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ اپنی جان کو اپنے ہاتھ سے داؤ پر لگا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح لوگ رقوم حاصل کرنے کے لیے اپنے جسمانی اعضا گردے وغیرہ سرجنوں کے حوالے کر دیتے ہیں... لیکن ان معاملوں میں صرف ضرورت پیشِ نظر ہوتی ہے، یہاں تفریح اور سنسنی خیزی کا عمل دخل بھی تھا۔

مجھے لگا کہ میری ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئی ہیں۔ دل کی دھڑکن بہت تیز ہو چکی تھی۔ ریفری نما شخص نے آگے بڑھ کر معائنہ کیا کہ عمران نے ریوالور کی نال اپنے پہلو میں درست مقام پر رکھی ہے یا نہیں۔ پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈال میں موت کا سا سکوت چھا گیا۔ عمران نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور آنکھیں بند کر لیں۔ پنڈال میں موجود ہر فرد پتھر کی طرح ساکت تھا۔ ریوالور کے تین خانوں میں گولیاں تھیں اور تین خانے خالی تھے۔ اب "ہیمر" کے سامنے کون سا خانہ تھا، یہ آنے والے لمحوں میں معلوم ہونا تھا... ایک زوردار دھماکا یا ٹرچ کی آواز!

اور پھر عمران نے ٹریگر دبا دیا۔ بہت سے لوگ اٹھ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ ریوالور سے گولی نہیں چلی تھی۔ کئی افراد اسٹیج پر چڑھ گئے۔ انہوں نے عمران کو گلے لگایا اور اپنے جوش وخروش کا اظہار کیا۔ شرط ہارنے والے افراد بھی کچھ زیادہ اداس نہیں تھے۔ ان کے لیے بھی شاید پیسے سے زیادہ

اچانک میرے اندر پھلجھڑی سی چھوٹ گئی... مجھے آج صبح پیش آنے والے سارے اذیت ناک واقعات یاد آئے اور مجھے لگا کہ میرے لیے عمران کی بات ماننا کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ ایک خانے میں گولی... پانچ خانے خالی۔ گولی چلنے کا امکان بہت کم تھا اور... اگر چل بھی جاتی تو... کیا ہوتا؟ اس ساری ناقابلِ برداشت صورتِ حال سے نجات مل جاتی۔ ساری نارسائیاں، مجبوریاں اور بے چارگیاں میرے ساتھ ہی ایک پُرسکون اندھیرے میں چھپ جاتیں... ایک پُرسکون اندھیرا جو زندگی کی سرحد سے آخری سرے پر مجھے آواز دے رہا تھا۔ ایک دم مجھے لگا کہ یہ کھیل کھیلنا میرے لیے کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔

عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری ہمت بندھائی۔ مجھے اپنے جسم میں عجیب سی توانائی بھرتی محسوس ہوئی۔ سیٹھ سراج، اس کے کارندوں اور اس کے بیٹے واجد کے مکروہ چہرے میری نگاہوں میں گھومے اور میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرے اس فیصلے پر تھوڑی دیر کے لیے عمران بھی حیران ہوا۔ وہ مجھے آمادہ تو کر رہا تھا لیکن حقیقت میں شاید اسے بھی یقین نہیں تھا کہ میں آمادہ ہو جاؤں گا۔ حاضرین میں سے کئی ایک مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد میں ایک عجیب سی کیفیت کے زیرِ اثر اسٹیج پر موجود تھا۔ روشنی براہِ راست میرے چہرے پر پڑ رہی تھی اور تماشائی نیم تاریکی میں نظر آ رہے تھے۔ ایک عدد اسپاٹ لائٹ میں میز کے اوپر بھی جہاں سیاہ پستول اور اس کی گولیاں رکھی تھیں۔ نیم ہال کے اندر میں نے جو سکون بخش گولیاں چبائی تھیں، ان کا اثر ابھی تک حواس پر موجود تھا۔ میں ہاتھ پاؤں میں ہلکا سا بھاری پن محسوس کر رہا تھا۔

شرطیں باندھنے کا عمل ایک بار پھر شروع ہوا۔ عباس کے سامنے رکھی میز پر کرنسی نوٹ حرکت کرنے لگے۔ شرط کا ریٹ سب سے پہلی شرط والا یعنی ایک چھ ہی رہا مگر رقم تھوڑی سی بڑھ گئی۔ یعنی گولی نہ چلنے کی صورت میں ساٹھ ہزار کی ادائیگی ہونی تھی جس میں سے تیس ہزار سیدھے میری جیب میں آنے تھے۔ گولی چلنے کی صورت میں مخالف پارٹی نے تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے دوسری پارٹی کو ادا کرنے تھے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی تاہم حواس پر عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں خود کو اذیت دینے کے لیے تیار تھا، چاہے یہ اذیت مجھے موت کے منہ میں ہی کیوں نہ لے جاتی۔ ایک بھونڈا سا کاغذ لایا گیا جس پر کچھ لکھا تھا اور مجھے دستخط کرنے تھے۔ تبھی عمران آگے آیا۔ اس نے کاؤنٹر لانے والے کو اپنی ضمانت دے کر واپس بھیج دیا۔

میرا منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زبان تالو سے چپک رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے دل میں آیا کہ واپس چلا جاؤں مگر جہاں تک پہنچ گیا تھا، وہاں سے واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے میز پر رکھی ایک گولی اٹھائی اور اسے سب کے سامنے ریوالور کے چیمبر میں رکھ دیا۔ ریوالور کو بند کر کے میں نے اس کی چرخی کو تین چار بار زور سے گھمایا اور پھر اسے پیٹ کی دائیں سائڈ پر رکھ دیا۔ ریفری نے آگے آ کر بیرل کی پوزیشن درست کی اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تماشا دیکھنا اور بات ہوتی ہے، تماشا بننا اور بات۔ بے شک چیمبر میں صرف ایک گولی تھی، تاہم مجھے یہی لگ رہا تھا کہ یہ گولی "ہیمر" کے سامنے آئے گی اور ایک دھماکے سے میرے پیٹ میں چلی جائے گی۔ میں اس اذیت کو تصور میں لانے کی کوشش کر رہا تھا جو گولی کے پیٹ میں گھسنے سے مجھے محسوس ہونے والی تھی۔

ایک بار پھر میں نے سیٹھ سراج کا منحوس چہرہ اپنی نگاہوں کے سامنے کیا اور ہیجانی انداز میں ٹریگر دبا دیا۔ "ٹرچ" کی فرحت بخش آواز کانوں سے ٹکرائی اور مجھے اپنا وجود ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ شرط جیتنے والے لوگ خوشی سے جھومنے لگے۔ ان میں سے دو چار کے بازوؤں میں بالی گرل جیسی لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں ان کے ساتھ نہیں آئی تھیں بلکہ یہیں سے فراہم کی گئی تھیں۔ جیت کی خوشی میں ایک لڑکے نے اپنی ساتھی لڑکی کو آغوش میں بھینچ کر چٹاچٹ کئی بوسے لیے اور آوازے بلند کرنے لگا۔ اس کے ساتھی نے ڈانس شروع کر دیا اور پھر ڈانس کرتے کرتے اسٹیج پر آ کر مجھے تھپکی دی۔

قریباً دو منٹ کے اندر ہی پورے 30 ہزار روپے کے کرارے نوٹ میری جیب میں پہنچ گئے۔ عمران نے اسٹیج پر آ کر میری پیٹھ تھپکی۔ "دل خوش کر دیا جانِ جگر! دیکھو، تم ایک دم کتنے بہادر ہو... "

میں خاموش رہا۔ اس نے ایک بار پھر میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "بس... یا اور کھیلو گے؟"

اس کے پوچھنے کا انداز بالکل رسمی تھا۔ یقیناً وہ یہی سوچ رہا تھا کہ میں اور نہیں کھیلوں گا۔ اسی لیے میں نے جو جواب دیا، اس نے عمران کو ششدر کر دیا۔ میں نے کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو تو اور کھیل لیتا ہوں۔"

"کیا... ارے کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہی جو تم سن رہے ہو۔" میں نے بدستور مدھم لہجے میں کہا۔ "اگر تم چاہتے ہو تو میں ایک بار "دو گولی" کے ساتھ کھیل لیتا ہوں۔"

"زبردست... خوش کر دیا جانِ جگر۔" عمران کا رنگ سرخ ہو گیا۔

اسسٹنٹ منیجر عباس بھی وہاں پہنچ گیا۔ عمران اور عباس کے درمیان چند سرگوشیاں ہوئیں اور پھر اناؤنسمنٹ ہو گئی کہ میں ایک بار "دو چھ" کا کھیل کھیلوں گا۔

میرے دل و دماغ میں ایک دھند سی بھر گئی تھی۔ پہلی کامیابی نے میرے حوصلے کو ایک دم زبردست بڑھاوا دے دیا تھا۔ اس حوصلے کو میرے اندر کا غم و غصہ بھی مہمیز کر رہا تھا۔

ایک بار پھر شرطوں کا عمل شروع ہوا۔ ساتھ ساتھ بیئر کے چند گلاس بھی گردش کر رہے تھے۔ سگریٹوں کا دھواں اور الکحل کی بو میرے نتھنوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ میں نے ریوالور کھول کر اس میں ایک اور گولی ڈالی۔ کھیل کے ضابطے کے مطابق یہ گولی دو خانے خالی چھوڑ کر ڈالی گئی۔ یعنی دونوں گولیاں آمنے سامنے تھیں۔ چیمبر کو بند کر کے میں نے لرزتے ہاتھوں سے چرخی کو تین چار بار گھمایا اور تیار ہو گیا۔ اس مرتبہ شرط کی رقم ایک لاکھ پچاس ہزار تک پہنچی تھی۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں مجھے اس میں سے قریباً 75 ہزار روپے ملنے تھے۔ مجھے رقم کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ میرا اصل مسئلہ میرے اندر کا وہ شدید اضطراب اور انتشار تھا جس سے میں کسی صورت پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میری ہتھیلیوں پر پسینہ آ رہا تھا اور منہ ایک بار پھر خشک لکڑی کی طرح ہو گیا تھا۔ دل کی رفتار بے حد تیز تھی۔ ریفری نما شخص کی ہدایت پر میں نے ریوالور کی نال کو پیٹ کی مقررہ جگہ پر رکھا اور انگلی ٹریگر پر جما دی۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔

یہی وقت تھا جب اسسٹنٹ منیجر عباس مجھے غور سے دیکھتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا۔ اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ "حضرات! ہم یہاں حسبِ دستور کھیل میں تھوڑی سی مزید دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ تابش صاحب چرخی کو گھما چکے ہیں، اب یہ دوبارہ نہیں گھما سکتے۔ کوئی بھی نہیں گھما سکتا۔ ہر شرط میں سے تھوڑی دیر کے لیے پانچ سب الگ نکل جائیں گے۔ صرف کھلاڑی تابش اور عمر حیات صاحب رہ جائیں گے۔ عمر حیات صاحب ریوالور دیکھنے کے بعد تابش کو رضاکارانہ طور پر کچھ رقم آفر کریں گے۔ اس رقم کے بدلے تابش کو کھیل یہیں چھوڑنا ہوگا۔ اگر وہ کھیل نہیں چھوڑنا چاہے گا تو پھر پہلے والی شرط بحال ہو جائے گی۔ تو آئیے جناب عمر حیات صاحب..."

چالیس بیالیس سالہ ایک تنومند شخص اسٹیج پر چڑھ آیا۔ وہ کوئی خوش حال فیکٹری اونر سا لگتا تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور واسکٹ زیبِ تن کر رکھی تھی۔ عباس نے ریوالور میرے ہاتھ سے لیا اور بغیر دیکھے عمر حیات کی طرف بڑھا دیا۔ عمر حیات نے چشمہ لگا کر ریوالور کی چرخی کو چھیڑے بغیر اس کا معائنہ کیا اور عباس کو واپس دے دیا۔ عباس نے اسے میرے پیٹ سے لگایا اور دستہ مجھے تھما دیا۔

عمر حیات کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس صورتِ حال میں انجوائے کر رہا ہو۔ اس کے علاوہ چہرے پر سرخی بھی تھی جو سنسنی کا نتیجہ تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "برخوردار! تم نئے آئے ہو اور کافی گھبرائے ہوئے بھی ہو۔ تمہاری جان بچانا میرا فرض ہے اور مجھے ہمیشہ یہ کام کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے، حالانکہ پیسے میری اپنی جیب سے جاتے ہیں۔ تو بیٹا جی! میں نے دیکھ لیا ہے۔ ریوالور کی نیت تمہارے بارے میں ایک دم خراب ہے۔ بہتر ہے کہ تم یہ کھیل یہیں پر چھوڑ دو۔ جیتنے کی صورت میں تمہیں 75 ہزار روپے ملنا تھے۔ میں تمہیں اپنی جیب سے دس ہزار روپے آفر کرتا ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ اس طرح میرے اعصاب کو ٹیسٹ کیا جا رہا ہے۔ بے شک عمر حیات نے ریوالور کو دیکھا تھا اور ریوالور کی سائڈ سے چرخی کو بغور دیکھا جائے تو گولیوں کی پوزیشن کا اندازہ ہو جاتا ہے مگر اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے۔ یہ سب کچھ صرف "تھرل" بڑھانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا... پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں، میں کھیلنا چاہتا ہوں۔"

"پندرہ ہزار۔" عمر حیات نے رضاکارانہ آفر کی۔

"نہیں۔"

"دیکھو برخوردار! لالچ اچھی چیز نہیں۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ میری بات مان کر تم فائدے میں رہو گے۔ جنہوں نے تمہارے حق میں شرط لگائی ہے، وہ بھی تمہیں دعا دیں گے..."

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بھی ہلا دیا۔

"تمہاری قیمتی جان بچانے کے لیے بیس ہزار۔" عمر

حیات نے بولی رہنے والے انداز میں رقم بڑھائی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہاں جاؤ بچے، ہاں جاؤ۔ یہ کام تمہیں مہنگا پڑنے والا ہے۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

جن لوگوں نے میرے حق میں شرط لگا رکھی تھی، وہ کورس کی شکل میں مجھے مشورہ دینے لگے۔ "نہیں... نہیں... نہیں۔"

عمر حیات مزہ لیتے ہوئے بولا۔ "اچھا تمہاری خوب صورت جوانی کی خاطر پانچ ہزار روپے مزید۔ پچیس ہزار روپے کم رقم نہیں ہے۔ ایک زبردست ڈنر... ایک ولایتی بوتل اور ایک گرما گرم لڑکی۔ سب کچھ آ جائے گا اس میں۔"

مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ میری زندگی بچانے میں جو دلچسپی لے رہے ہیں اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ... لیکن میں اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہوں۔ پیسوں کی کمی بیشی میرے لیے کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔"

درحقیقت میرا دل گھبرانا شروع ہو گیا تھا۔ اس شخص کا دباؤ اور اس کا سنسنی بڑھانے کا انداز مجھے بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "ٹھیک ہے بھئی! اگر تم اپنی زندگی سے کھیلنا ہی چاہتے ہو اور تم نے ارادہ ہی کر رکھا ہے تو میں تمہیں کیسے روک سکتا ہوں۔ بہرحال، اس مصیبت سے بچانے کے لیے میں تمہیں ایک آخری آفر کر دیتا ہوں اور کھیل کے قاعدے کے مطابق میں اس سے زیادہ آفر کر بھی نہیں سکتا... پورے چالیس ہزار روپے۔ اگر تم چالیس ہزار لے کر یہ کھیل یہیں چھوڑ سکتے ہو۔ دونوں طرف کے لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ خبر نہیں کہ وہ سچ بول رہا تھا یا جھوٹ؟ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اگر وہ سچا نہیں تھا تو پورے یقین کے ساتھ اسے جھوٹا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ میں نے مدد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ ان لمحوں میں وہ بھی ذرا تذبذب میں نظر آیا۔ یہ تذبذب، تحیر اور تجسس تقریباً ہر چہرے پر نظر آ رہا تھا اور شاید یہی کیفیات تھیں جن کے حصول کے لیے یہ من چلے جواری اس سرکس کے ایسے پرائیویٹ شوز میں شرکت کرتے تھے۔

اچانک ہی مجھے اپنے اندر کی ہیجان خیز تازگی کم ہوتی محسوس ہوئی۔ مجھے لگا کہ ریوالور کے دستے پر میری گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ میں اچانک جیسے ایک دوراہے پر آ گیا۔ یہ شخص بھی شاید یہی چاہتا تھا کہ میں دوراہے پر آ جاؤں۔ میرا تذبذب تماشائیوں کو لطف دے رہا تھا۔ تب میری نظر ایک بار پھر عمران پر پڑی۔ جونہی ہماری نظریں چار ہوئیں، عمران نے سر کے اشارے سے مجھے کھیل چھوڑنے کا عندیہ دیا۔ پتا نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا لیکن جو کچھ بھی تھا، اس کا یہ اشارہ میرے لیے مددگار ثابت ہوا۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ریوالور میز پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی لوگوں کو کھیل چھوڑنے پر افسوس ہوا۔ کئی ایک نے تالیاں بجائیں۔ عمران نے اسٹیج پر آ کر میرا کندھا تھپکا۔ عمر حیات نے اسی وقت چالیس ہزار روپے کا ایک چیک کاٹ کر مجھے دیا جو میں نے عمران کو تھما دیا... عمر حیات نے [illegible] کرنے والے انداز میں کہا۔ "پیارے ساتھیو! اب ہم دیکھتے ہیں کہ برخوردار نے گھاٹے کا سودا کیا ہے یا فائدے کا۔ اسے 35 ہزار روپے مزید ملنے تھے یا 38 بور کی گولی ملنی تھی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ریوالور اٹھایا اور اسے اسٹیج کے سامنے کی کچی زمین کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ "ٹرچ" کی آواز کے بجائے ایک دھماکا ہوا اور گولی زمین میں پیوست ہو گئی۔ میں اندر سے لرز کر رہ گیا۔ کچھ افراد نے تالیاں بجا کر اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ کچھ منہ لٹکائے جواری افسردہ نظر آئے۔ عمران نے ایک بار پھر جوش سے میری پیٹھ تھپکی۔ اسسٹنٹ منیجر عباس نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ حاضرین میں سے کوئی اور اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہے؟ لگتا تھا کہ اب کوئی نہیں اٹھے گا۔ ویسے بھی گھڑی کی سوئیاں رات ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ عباس نے یہ محفل برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"کیسا لگا یہ سب کچھ؟" عمران نے پوچھا۔

"میں اس پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔

"تمہارے ذہن میں ایک سوال تو ضرور ابھر رہا ہوگا۔ فلموں وغیرہ میں جب ہم یہ ریوالور والا کھیل دیکھتے ہیں تو اس میں ریوالور کنپٹی پر رکھا جاتا ہے۔ یہاں پیٹ پر رکھا جاتا ہے۔ آخری پسلی سے قریباً ایک انچ نیچے... دراصل بات یہ ہے کہ اس طرح ہم نے اس کھیل کو تھوڑا سا کم خطرناک کیا ہے۔ گولی چلنے کے بعد بندے کے بچنے کا امکان موجود رہتا ہے۔ پچھلے چھ مہینے میں صرف تین بندوں کی جان گئی ہے۔ دس پندرہ ایسے ہیں جو گولی چلنے کے باوجود بچ گئے۔ اپنا یہ سلیمان عرف شہزادہ بھی ان میں شامل ہے۔ اسے پانچ مہینے پہلے گولی لگی تھی۔ اب یہ بھلا چنگا ہے اور سرکس میں اپنے سارے

آئٹم پورے کر رہا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ تین بندوں کی جان چلی جانا معمولی بات ہے؟"

"موت تو ہر جگہ موجود رہتی ہے یار! راہ چلتے ہوئے ٹھوکر لگنے سے بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ لوگ مر رہے ہیں۔ دہشت گردی سے، ٹریفک حادثوں سے، لڑائی جھگڑوں سے، بیماریوں سے اور... خودکشیوں سے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

اسی دوران میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ کچھ دیر تک 'ہوں ہاں' میں جواب دیتا رہا پھر فون بند کر دیا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "لو، آج لاہور شہر میں جو ڈیڑھ دو سو بندہ مختلف طریقوں سے مرا تھا، ان میں ایک کی کمی واقع ہو گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"[illegible] جو یہاں گولی سے زخمی ہوا تھا، اب خطرے سے باہر ہے۔ امید ہے کہ وہ ایک آدھ دن میں زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔"

"اور اگر وہ نہ لوٹتا تو پھر؟ اس کا خون کس کے سر ہوتا؟"

"اگر مجھے یا تمہیں گولی لگ جاتی تو ہمارا خون کس کے سر پر ہوتا؟ ہمارے اپنے سر پر ہی ہوتا۔ آج صبح یا کل کے اخبار میں چھوٹی سی خبر آتی کہ عمران ہیرو نام کا ایک لڑکا جو فلاں سرکس میں موٹر سائیکل کے کمالات دکھاتا تھا، اپنے ریوالور کی صفائی کرتے ہوئے گولی چلنے سے شدید زخمی ہوا اور فلاں پرائیویٹ اسپتال میں دو گھنٹے بعد فوت ہو گیا۔ بس حادثاتی موت... نہ کوئی ایف آئی آر، نہ مدعی، نہ ملزم..."

"اگر ان تماشائیوں میں سے کوئی مخبری کر دے تو؟ یا ان تماشائیوں میں ہی کوئی اخباری رپورٹر وغیرہ موجود ہو؟"

"تو بھی کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں سے بہت سے لوگوں کو تنخواہیں وغیرہ جاتی ہیں یار! اوپر تک سلسلہ ملا ہوتا ہے۔ اب جو جو رقمیں ہم نے جیتی ہیں یا کمائی ہیں، ان میں سے 20 فیصد ہمیں یہاں دینا ہوگا۔ اسپیشل شو کے اسپیشل ٹکٹ سے اکٹھی ہونے والی رقم علیحدہ ہے۔ میری جیب میں اس وقت تین لاکھ روپے آئے ہیں۔ پنڈال چھوڑنے سے پہلے ساٹھ ہزار روپے مجھے یہاں جمع کرانے ہیں۔ اسی طرح تمہارے پاس ستر ہزار روپے آئے ہیں۔ ان میں سے چالیس ہزار کا چیک ہے۔ چیک کا حساب بعد میں ہو جائے گا۔ تیس ہزار میں سے چھ ہزار روپے تم ابھی یہاں جمع کرا دو گے۔ یہ سب کچھ سسٹم کے ساتھ چلتا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم پھر موٹر سائیکل پر سوار تھے اور کھلی سنسان سڑک پر جا رہے تھے۔ جب اس سرکس میں آیا تھا تو میری جیب میں صرف آٹھ دس روپے تھے۔ اب میری جیب میں تقریباً چوبیس ہزار کے کرنسی نوٹ تھے۔ اس کے علاوہ چالیس ہزار روپے کا اوپن چیک تھا۔ میرے دل و دماغ کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی قریباً ایک گھنٹا پہلے میں اپنی مرضی کے ساتھ ایک نہایت خطرناک مرحلے سے گزرا ہوں۔ میں نے ایک ریوالور کے ذریعے اپنے جسم پر دو بار گولی چلانے کی کوشش کی ہے۔

عمران نے موٹر سائیکل کو پھر ہوائی جہاز بنا رکھا تھا۔ اب تو لاہور کی سڑکیں بھی بالکل خالی تھیں۔ رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ ہر دم چلتا اور شور مچاتا شہر تاریکی کی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ تیز ہوا میری جسمانی چوٹوں کو تکلیف دے رہی تھی مگر پتا نہیں کیا بات تھی، جسمانی اذیت مجھے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ذہنی اذیت کو کم کرنے کے لیے میں نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے سکون بخش دوا کی دو گولیاں مزید نگل لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔

"ہاں میرے یار! اب کیا پروگرام ہے؟ میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کے مطابق اب تم آزاد ہو۔ اگر جانا چاہو تو جہاں جی چاہے اتر جاؤ... لیکن اگر ابھی میرے ساتھ رہنا چاہو تو بسر و چشم۔ میرا گھر اور میرا دل تمہارے لیے حاضر ہیں۔"

ذرا دیر کے لیے تو دل چاہا کہ اسے رکنے کے لیے کہوں اور یہیں گڑھی شاہو کے آس پاس کہیں اتر جاؤں لیکن پھر ذہن میں آیا کہ اتنی رات گئے، ایسی حالت میں کہاں جاؤں گا، کیا کروں گا؟ میں خاموش رہا... وہ چہکا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ خاموشی نیم رضامندی کی ہے۔ زبردست... بڑا اچھا فیصلہ ہے۔ اگر وہ نہیں تو کم از کم آج رات کے لیے تو ضرور رکو۔ کل اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔ بندے نے جتنا بڑا فیصلہ کرنا ہو اس کے لیے اتنا ہی زیادہ وقت بھی استعمال کرنا چاہیے۔"

راوی روڈ کی طرف جاتے جاتے اس نے ایک دم موٹر سائیکل ریلوے اسٹیشن کی طرف گھما دی۔ "ادھر کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تھوڑا سا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

میں سمجھا کہ وہ نوائنٹ وغیرہ کی بات کر رہا ہے لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ اس نے اسٹیشن کے پاس اپنی موٹر سائیکل ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان کے سامنے روکی۔ دو تین بار کال بیل بجائی پھر لرزے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص پاجاما کرتہ پہنے باہر نکلا۔ عمران کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکیں۔ میں آٹھ دس قدم دور کھڑا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص نے مدھم لہجے میں کچھ کہا۔ جواب میں عمران نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ یہ یقیناً کچھ کرنسی نوٹ تھے۔ ادھیڑ عمر شخص کو نوٹ دکھائے بغیر عمران نے اس کے کرتے کی جیب میں ڈال دیے۔ ادھیڑ عمر شخص حیران تھا اور بے حد خوش بھی۔ وہ عمران سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرا رہے تھے۔ عمران نے اسے بولنے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر دوبارہ موٹر سائیکل پر آ بیٹھا۔ موٹر سائیکل ایک بار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ قریباً دو... کلومیٹر آگے آنے کے بعد عمران نے ایک اور حرکت کی۔ وہ ایک شاپنگ مارکیٹ کے سامنے رکا۔ مارکیٹ کے برآمدوں میں بہت سے مزدور ٹائپ لوگ میلے کچیلے کمبل اور چادریں وغیرہ اوڑھے سو رہے تھے۔ تاہم یہاں دس پندرہ افراد ایسے بھی تھے جو ایک کونے میں الاؤ روشن کیے بیٹھے تھے۔ یہ مزدور پیشہ لوگ جیسے یہاں عمران ہی کے انتظار میں تھے۔ جونہی عمران کی عجیب الخلقت موٹر سائیکل کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی، وہ جوش کے عالم میں اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے۔ عمران نے موٹر سائیکل ان کے بیچوں بیچ جا روکی۔ "سلام پیر بھائی... سلام بھائی جان... سلام جی۔" بہت سی ملی جلی آوازیں ابھریں۔

عمران نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالا۔ یہ پانچ سو والے نوٹ تھے... وہ بڑی تیزی سے ایک ایک نوٹ ہر شخص کے ہاتھ میں تھماتا چلا گیا۔ شور سن کر کچھ سوئے ہوئے افراد بھی جاگ گئے اور بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ دو تین منٹ کے اندر عمران نے پانچ سو کے نوٹوں کی شکل میں تیرہ چودہ ہزار روپے تقسیم کر دیے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کا رخ سیدھا گھر کی طرف تھا۔

"سلطانہ ڈاکو کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟" اس نے موٹر سائیکل چلاتے چلاتے بلند آواز میں پوچھا۔

"کیوں، کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"سلطانہ ڈاکو میرے پردادا کے چچیرے بھائی کی بہن کا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میرے پرنانا کی بہن کا [illegible] بھی لگتا تھا۔ سلطانہ ڈاکو امیروں سے مال لوٹ کر غریبوں میں بانٹتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی اس سے ملتا جلتا کام کرتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ امیروں پر پستول تان کر ان کو لوٹتا تھا اور میں خود پر پستول تان کر ان کو لوٹتا ہوں... بلکہ آج تو تم نے بھی اس سے ملتا جلتا کام کیا ہے۔ بھئی واہ... میں بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ تم "دو چھ" کھیلنے کی بازی بھر لو گے۔ جینا اسی کا نام ہے میری جان... آگے بڑھ کر جیو... سانس تو سب ہی لیتے ہیں مگر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سانس لینے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

وہ بے پرکی اڑا رہا تھا اور اس سے زیادہ رفتار کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل اڑ رہی تھی۔ جلد ہی ہم راوی روڈ کی گنجان آبادی میں داخل ہو گئے۔ رات کے اس پہر بازار سنسان پڑا تھا۔ ایک چوکیدار اور دو تین آوارہ کتوں کے سوا کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ عمران نے حسب سابق چابی لگا کر گھر کا دروازہ کھولا اور میرے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ بہرحال، اس نے ایک احتیاط یہ کی تھی کہ اپنی شور مچاتی موٹر سائیکل کو بازار میں ہی بند کر دیا تھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اڑوس پڑوس والے اس شور کو شور محشر سمجھتے ہوئے کلمہ پڑھ کر بیدار ہو جائیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نیم گرم کمرے میں کمبل اوڑھے اپنے اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ میں جاگ رہا تھا اور میرے ساتھ عمران بھی جاگ رہا تھا۔ یقیناً وہ میرے بارے میں اور میرے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے وہ مجھ پر کسی طرح کا دباؤ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جیسے یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ بس ہم کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ رات آخری پہر میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ بیدار ہوا تو دن چڑھ آیا تھا۔ گھر سے باہر کا مخصوص شور سنائی دے رہا تھا۔ اس چار دیواری سے باہر زندگی ہر طرف رواں دواں تھی۔

نتھنوں سے کھانے کی خوشبو ٹکرائی۔ دیکھا تو سامنے میز پر ایک بھرپور ناشتا چنا ہوا تھا۔ ڈبل روٹی، مکھن، فرائی انڈے، حلوہ پوری، چنے اور دودھ وغیرہ۔ عمران میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اسی نے میرے شانے کو ہلا جلا کر مجھے جگایا تھا۔ میں انگڑائی لے کر بے ساختہ کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ کل جو کچھ میرے ساتھ اور میرے جسم کے ساتھ ہوا تھا، وہ اپنی موجودگی کا پورا پورا احساس دلا رہا تھا۔ ایک ٹانگ تو چوٹ کے سبب بالکل اکڑ گئی تھی۔ میں کل بھی سارا دن لنگڑا کر ہی چلتا رہا تھا مگر آج یہ

لنگڑاہٹ ضرورت سے زیادہ تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے والے گہرے کٹ سے بھی خون رستا ہوا تھا۔ یہاں میری اپنی ہی بیلٹ کا آہنی بکل لگا تھا۔ اس بیلٹ نے میرے جسم پر کئی اور جگہ بھی گہرے نشان چھوڑے تھے۔ کل کے سارے واقعات ایک دم ذہن میں آئے اور سینے میں گاڑھا سیاہ دھواں سا بھر گیا... امی کیا سوچ رہی ہوں گی؟ عاطف میری تلاش میں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا؟ فرح کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا ہوگا۔ ان سب کا درد و کرب میرے تصور میں آیا اور دل خون بن کے آنسو رونے لگا۔

عمران کے بے حد اصرار پر میں نے منہ ہاتھ دھو کر چند لقمے زہر مار کیے اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" عمران نے مہربان لہجے میں پوچھا۔

"میرا ایک کام کر دو۔" میرا لہجہ بکھرا ہوا تھا۔

"بس ایک کام؟ یار! تم ایک ہزار کام کہو تو میں ابھی کرنے کو تیار ہوں۔ تم کچھ بولو تو سہی۔"

"میں تمہیں ایک نمبر دیتا ہوں۔ یہ میرے گھر کا نمبر ہے۔ اس پر ایک فون کر دو۔ وہاں سے جو بھی بولے اسے میرے بارے میں بتا دو کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور ایک دو دن میں ان سے رابطہ کروں گا۔ وہ پریشان نہ ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں بتانا۔ بس یہ اطلاع دے کر فون بند کر دینا۔"

"لیکن یار! یہ کام تم خود کرلو تو زیادہ اچھا نہیں؟"

"اس کا مطلب ہے... کہ تم کرنا نہیں چاہتے؟"

"ارے نہیں یار! ایک تو تم بار بار خفا ہو جاتے ہو۔ لو میں کر دیتا ہوں فون۔"

اس نے فوراً موبائل نکالا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے گھر کا نمبر بتایا۔ وہ کال ملانے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ "نہیں... یہاں نہیں... دوسرے کمرے میں جا کر کرلو۔ لیکن ان سے کوئی اور سوال جواب نہیں کرنا۔ جو کچھ پوچھنا ہے... مجھ سے پوچھ لینا۔"

"واقعی؟" اس نے حیرت آمیز خوشی سے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں میرا حوصلہ ایک دم اتنا ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے گھر والوں کا سامنا کرنا یا ان سے بات کرنا تو دور کی بات ہے، مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ عمران میرے سامنے ان کو کال کرے۔

دو تین منٹ بعد عمران واپس آیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کا تاثر تھا۔ "کس نے بات کی؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری والدہ تھیں۔ بس روئے جا رہی تھیں۔ خدا رسول کا واسطہ دے رہی تھیں کہ میں تم سے بات کرا دوں۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کتنی ہی دیر میں نے کوئی بات کی نہ عمران نے۔ آخر اس نے انگلیاں چلا کر اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور بولا۔ "لگتا ہے کہ بہت دکھی کر کے آئے ہو اپنے گھر والوں کو۔ تم شکل سے تو ایسے نہیں لگتے۔ کیا کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو گیا تھا؟" اس کی آواز میں ہمدردی اور محبت کا ایسا رچاؤ تھا کہ میری آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔

وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "غم بانٹنے سے ہلکا ہوتا ہے۔ اگر مجھے کسی قابل سمجھتے ہو تو مجھے بتاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

میں نے پچھلے چوبیس گھنٹے میں عمران سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ شخص مجھے اپنے بہت قریب لگ رہا تھا۔ کوئی خاص بات تھی اس شخص میں۔ ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں نے خود کو اس بات پر آمادہ پایا کہ اسے اپنے حالات کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا دوں۔

جب یہ موضوع شروع ہوا تو پھر باتیں کھلتی چلی گئیں۔ درمیان میں وہ مجھ سے سوالات بھی کرتا رہا۔ اس کا انداز اتنا اخلاص بھرا تھا کہ میں جو کچھ اس سے چھپانا چاہتا تھا وہ بھی چھپا نہیں پا رہا تھا... قریباً دو گھنٹے کی گفتگو کے بعد عمران میرے بیشتر حالات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اپنی اور ثروت کی محبت کے بارے میں بتایا۔ داجی اور ان کے غنڈا صفت یاروں کے بارے میں بتایا اور پھر ان حالات کے بارے میں بتایا جن کا شکار ہو کر ثروت، اس کے بھائی اور بہن کو اچانک بیرون ملک جانا پڑ گیا تھا۔

عمران میری ان جسمانی چوٹوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو چوبیس گھنٹے پہلے میرے جسم پر آئی تھیں اور اس واقعے کے بارے میں جس نے مجھے مرنے کی حد تک مایوس کر دیا تھا... میں نے اسے اس بارے میں بھی بتا دیا۔ اپنے گھر کے قریب واقع پارک میں اچانک سیٹھ سراج سے میری مڈبھیڑ، میرا سیٹھ سراج کو طمانچہ رسید کرنا اور سیٹھ سراج کے کارندوں کا مجھے مار مار کر نیم جان کر دینا... میں نے سبھی کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا۔ وہ سنتا رہا اور اس کے چہرے پر عجیب سی سختی نمودار ہوتی رہی۔

میری روداد ختم ہوئی تو وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ

رہا تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا ذہن بڑی برق رفتاری سے کچھ سوچ رہا ہے۔ آخر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"یہ سراج جیسے لوگ ہی ہیں جنہوں نے زندگی کو سزا بنا رکھا ہے۔ یہ عام بندے کو جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ ان کے سامنے سر جھکاؤ تو یہ جھکے ہوئے سر کو اور جھکاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناک زمین پر رگڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور اگر ان سے ٹکر لو تو پھر یہ اپنی طاقت استعمال کرتے ہیں۔ ٹکر لینے والے کو دوسروں کے لیے عبرت کی مثال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر اوچھا ہتھکنڈا، ہر وحشیانہ حربہ بروئے کار لاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اس کی گہری نظریں بدستور میرے چہرے پر تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ اچانک بولا۔ "کیا چاہتے ہو... ایک بار مزہ چکھا دیا جائے اس سیٹھ کو؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دیا جاسکتا ہے لیکن اینٹ کا جواب کم از کم اینٹ سے تو ہم دے ہی سکتے ہیں۔ میرے پاس ایک دو بندے ایسے ہیں جو نہر یلے بچھو کی طرح سیٹھ کی ناک میں گھس کر اس کا جینا حرام کر سکتے ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بڑا خبیث بندہ ہے۔ ہر حد تک جاسکتا ہے... اور میری ماں ہے، بہن بھائی ہیں۔ میں ان کے لیے خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"اس کی بھی ماں ہوگی۔ ماں نہیں ہوگی گھر والے تو ہوں گے۔ بیوی بچے، بہن بھائی... کیا وہ اکیلا ہی دنیا میں ٹپکا ہوا ہے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے اپنی ٹھوڑی کی گیلی پٹی اتارتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نہیں ہوسکتا کہ تم کچھ نہ چاہ رہے ہو۔ جو کچھ سیٹھ نے تمہارے اور ثروت وغیرہ کے ساتھ کیا ہے، اس کے بعد تو سیون ایم ایم کی تین چار گولیاں اس کے کھوپڑے میں ٹھوک دی جائیں تو یہ بھی کم ہوگا۔ اگر یہ نہیں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ سزا تو اسے ملنی ہی چاہیے۔ تم نہ بھی دو گے تو میں ضرور دوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"سیٹھ کی تھوڑی سی دھلائی، تھوڑی سی کھینچا کھینچی اور پھینا پھینٹی... لیکن گھبراؤ مت، تم اس میں ملوث نہیں ہوگے۔ تم بس کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر تماشا دیکھنا۔ اس سے تمہیں تھوڑا سا سکون ملے گا اور مجھے بھی۔"

"تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"نہیں، میں تو صاف اور سیدھی بات کر رہا ہوں۔ سیٹھ نے جو کچھ کیا اس کی سزا تو کافی سنگین ہونی چاہیے لیکن چلو، شروع میں چھوٹا سا ٹریلر ہی سہی۔ میرا جی چاہ رہا ہے جانِ من... سیٹھ کی اس جگہ درگت بنائی جائے جہاں اس نے تم سے مارا ماری کی ہے۔ وہی لوگ اس کا تماشا بھی دیکھیں جنہوں نے تمہارا تماشا دیکھا تھا۔"

"اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس سے کیا ہوگا؟"

"بس میرا کلیجا ذرا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بالکل علیحدہ معاملہ ہوگا۔ اس کو تمہارے معاملے سے بالکل بھی نتھی نہیں کیا جاسکے گا... سمجھو کہ ہم راہ چلتے سیٹھ سے جھگڑا مول لیں گے اور آنا فانا اس کی درگت بنا دیں گے۔ تم دیکھنا، بڑی کلاسیکل چھترول بنے گی۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تمہیں کس سے دلچسپی ہے؟ بتاؤ... کس سے دلچسپی ہے؟ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جسے انسان مضبوط ارادے کے ساتھ کرنا چاہے اور وہ نہ ہو سکے۔ اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ہلائے جاسکتے ہیں، دریاؤں کے رخ موڑے جاسکتے ہیں، چاند پر قدم رکھا جاسکتا ہے تو اور کون سا کام مشکل ہوگا۔ اگر ثروت بی بی کی یاد تمہارے دل کو زخمی کر رہی ہے تو اس کا علاج بھی ممکن ہے۔ اسے بھی ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ نہ صرف ڈھونڈا جاسکتا ہے بلکہ اس سے قبول ہے، قبول ہے بھی کرایا جاسکتا ہے۔ دیکھو، یہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ سارے کام ممکن ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ پہلے تم اپنے دل و دماغ پر چھائی ہوئی مایوسی کی دھند صاف کرو۔ زندگی کرکٹ کے کھیل کی طرح ہے پیارے، باؤلنگ کتنی بھی سخت ہو، وکٹ کتنی بھی خراب ہو لیکن وکٹ پر کھڑے رہنا بہرحال، آؤٹ ہونے سے بہتر ہوتا ہے۔ بندہ وکٹ پر کھڑا رہے تو خوشیوں کا تھوڑا تھوڑا اسکور خود ہی بننا شروع ہو جاتا ہے۔ بڑی بڑی اننگز نہ بھی بنیں تو کہیں نہ کہیں بائی کا اسکور ہو گیا، کہیں نو بال یا وائیڈ بال کا رن مل گیا... اور کچھ نہیں تو وکٹ کیپر نے ہی محبت کا ثبوت دیا، بال چھوڑ کر پیچھے سے چوکا کروا دیا اور اگر..."

"یار! میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن فی الحال میں ذرا تنہائی چاہ رہا ہوں۔ کچھ دیر اکیلے میں سوچنا چاہ رہا ہوں۔"

"مگر اکیلے بندے کے ساتھ تو شیطان ہوتا ہے اور تمہارا شیطان تو ہے بھی ذرا خطرناک قسم کا... گندم میں رکھنے والی گولیوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔"

"نہیں، میں اس طرح نہیں سوچوں گا۔" میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"لیکن یار میرے... سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پنجابی میں کہتے ہیں کہ سوچیں پیا تے بندہ گیا۔ سوچنے کے بجائے کرنا چاہیے۔ جو لوگ کرتے ہیں، وہی دنیا بدلتے ہیں اور اپنے حالات بھی..."

وہ دلسوزی کی لیس کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔ مسلسل باتیں کر رہا تھا اور واقعی میرے ذہن کو مایوسی اور پریشانی کی طرف جانے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے جیسے خود ہی طے کر لیا تھا کہ میں نے کم از کم دو تین دن مزید تو یہاں ضرور رہنا ہے۔ اس حوالے سے اس نے اپنے پڑوسی زاہد بھائی کو بھی بتا دیا تھا اور اسے میری خیر خیریت سے بھی آگاہ کیا تھا۔ زاہد کو یہی پتا تھا کہ میں کسی ریلوے اسٹیشن کی نامعقول سیڑھیوں سے پھسل کر گرا ہوں جس کی وجہ سے مجھے چوٹیں آئی ہیں۔ عمران کی طرح اس کے پڑوسی زاہد نے بھی اسٹیشن کی سیڑھیوں اور سیڑھیاں بنانے والوں کو بے نقط سنائی تھیں... بلکہ ریلوے کا محکمہ رکھنے والی موجودہ حکومت اور اس سے آگے امریکا تک بھی شدید مذمت کی لپیٹ میں آگئے تھے۔

میری ٹانگ میں رات بھر شدید درد رہا۔ مگر اگلے روز کچھ افاقہ ہو گیا۔ بہرحال، سہ پہر کے وقت عمران نے بہ اصرار مجھے ایک مہران گاڑی میں سوار کیا اور ڈاکٹر کو دکھانے لے چلا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا کوئی دوست آرتھوپیڈک ڈاکٹر ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ چوٹ ایسی شدید ہے کہ ہڈی کے ڈاکٹر سے معائنہ کرایا جائے مگر عمران بضد رہا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے بہانے سے یہاں لے کر آیا تھا۔ بازار سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی سب سے پیاری ہابی جاگی۔ ایک تھڑے پر بیٹھے ہوئے چاچے نذیر کے قریب گاڑی روک کر عمران نے پوچھا۔ "ہاں چاچا... ختم ہوگئی چائے کہ ہے؟"

بہرے نذیر نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "گائے؟ گائے کا دودھ آج کل کہاں ملتا ہے خالص دودھ؟"

"گائے نہیں... چائے... چائے۔" عمران نے زور سے کہا۔ "چائے ختم ہوگئی کہ ہے؟" اس بار نذیر نے جواب دیا کہ ختم ہوگئی۔ عمران نے پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا اسٹنگ چائے کا بڑا ڈبا اٹھا کر چاچے نذیر کو تھما دیا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ دعائیں دینے لگا۔ گاڑی برق رفتاری سے بازار سے نکل کر بڑی سڑک پر آگئی۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے۔ بغور دیکھنے پر ہی باہر سے کچھ نظر آسکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ اگر کوئی شناسا اندر جھانکنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر؟

اس وقت میری بے چینی بڑھ گئی جب میں نے دیکھا کہ عمران کا رخ میرے علاقے کی طرف ہے۔ "یہ کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"تمہیں، تمہارے گھر والوں سے ملانے نہیں لے جا رہا ہوں یار! مجھے پتا ہے کہ تمہیں اختلاج قلب ہو جائے گا۔ ہمارا راستہ ہی یہ ہے..."

دو تین منٹ بعد میری بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔ وہ بڑی تیزی سے اس پارک کے قریب پہنچ رہا تھا جہاں دو دن پہلے میری زندگی کا اندوہناک ترین واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے کار کے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "گاڑی روکو۔" میرا لہجہ غصیلا تھا۔

وہ گاڑی روکتے روکتے بھی قریباً نصف فرلانگ آگے چلا گیا۔ یہاں سے وہ منحوس پارک صاف دکھائی دے رہا تھا جہاں دو دن پہلے سیٹھ سراج اور اس کے کارندوں سے میری خونریز مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ وہ زیرِ تعمیر عمارت بھی نظر آ رہی تھی جس کی تعمیر غالباً سیٹھ سراج خود کرا رہا تھا۔ یہ عمارت ایک طرح سے پارک کی زمین پر ہی بنائی جا رہی تھی۔ "یہ تم کیا ڈراما کر رہے ہو!" میں نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

"ڈراما نہیں یار... چھوٹا سا پنگا ہے۔"

میں نے اپنی پی کیپ کو چہرے پر تھوڑا اور بھی جھکا لیا اور نیچے کھسک کر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ میرے گھر سے ایک کلومیٹر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس امر کا پورا اندیشہ موجود تھا کہ میرا کوئی شناسا مجھے یہاں دیکھ لیتا۔ میں نے دل ہی دل میں عمران کو صلواتیں سنائیں۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ وہ یہاں کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے۔ "کیا ارادے ہیں تمہارے؟" میں نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہمارے ارادے تو کچھ نہیں۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے، بس تھوڑا سا تماشا دیکھیں گے۔"

"کیسا تماشا؟ کیا تم... سیٹھ سراج کے ساتھ کچھ کرنے لگے ہو؟" میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

"سیٹھ سراج کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے یار! وہ کوئی چھیل چھبیلی لڑکی تو نہیں ہے۔ اور اگر کچھ تھوڑا بہت ہونا بھی ہے تو وہ ہمیں نہیں کرنا۔ ہمارا کوئی تعلق نہیں اس معاملے سے..."

"تم ایک دم حماقت کی باتیں کرتے ہو۔ میں یہاں رکنا نہیں چاہتا۔" میرے لہجے میں شدید جھلاہٹ تھی۔

"تو اتر کر چلے جاؤ۔" وہ مسکرایا۔

وہ جانتا تھا کہ میں یہاں جانے پہچانے لوگوں کے درمیان گاڑی سے اترنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں نے ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھا مگر دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

ہماری اس گفتگو کے درمیان میں ہی میں نے عمران کو ذرا چونکتے دیکھا۔ ہماری گاڑی کے پاس سے ایک سوزوکی پک اپ (ہائی روف) گزر رہی۔ مجھے شک ہوا کہ اس میں سیٹھ سراج تھا۔ ویسے تو وہ اپنی سیاہ چمکیلی ہنڈا میں سفر کرتا تھا تاہم اس کے علاوہ بھی وہ ایک دو گاڑیاں استعمال کرتا تھا۔ سفید پک اپ کے پیچھے ہی پیچھے ایک نیلی اسٹیشن ویگن تھی۔ پک اپ کا رخ پارک کی طرف تھا۔ غالباً سیٹھ سراج شام سے پہلے زیرِ تعمیر عمارت کا کام دیکھنے جا رہا تھا۔ ابھی وہ پارک سے دور ہی تھا کہ زوردار آواز آئی۔ پک اپ نے شاید بریک لگائی تھی۔ عقب میں آتی ہوئی نیلی اسٹیشن ویگن کے ڈرائیور نے دھکے سے گاڑی پک اپ میں ٹھونک دی تھی۔

ایک دم بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دور سے ہی نظر آ رہا تھا کہ سنہ 2010 کی سوزوکی کا پچھلا حصہ پچک کر رہ گیا ہے اور پھر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ سوزوکی ہائی روف میں سیٹھ سراج ہی تھا۔ وہ اپنے چوڑے چکلے جسم کو بمشکل لیے ہوئے سوزوکی کے اگلے بائیں دروازے سے برآمد ہوا۔ نیلی اسٹیشن ویگن میں سے بھی دو تین نوجوان نکل آئے۔ تنازعہ شروع ہو گیا۔ میرا جسم سنسنا رہا تھا۔ عمران نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا تھا۔ جائے حادثہ پر شروع ہونے والا تنازعہ ایک دم ہی لڑائی میں بدل گیا۔ اسٹیشن ویگن میں سے برآمد ہونے والے چار پانچ نوجوان جو یقیناً عمران کے ساتھی ہی تھے، سیٹھ سراج اور اس کے دو کارندوں پر پل پڑے۔ میں نے دیکھا کہ ایک سرخ سپید پٹھان نما شخص کا زوردار گھونسا کھا کر سیٹھ سراج پشت کے بل پختہ سڑک پر گرا۔ اس کے ایک کارندے نے شاید پک اپ کے اندر سے کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنے کی کوشش کی لیکن ایک دوسرے نوجوان نے اسے کمر سے پکڑا اور بے پناہ شدت سے گھما کر ایک الیکٹرک پول سے دے مارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پٹھان اور اس کا ایک ساتھی سیٹھ سے چمٹ گئے۔ انہوں نے اسے دوبارہ سڑک پر گرایا اور چند سیکنڈ میں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس کے دونوں بچے کھچے کارندے بھی اسٹیشن ویگن سے نکلنے والے نوجوانوں کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہے تھے۔ یہ سین ذرا قریب سے دیکھنے کے لیے عمران گاڑی سے اترا اور بھاگتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ وہ چھڑانے والوں میں شامل ہو گیا۔ تاہم میں نے صاف دیکھا کہ وہ بظاہر تو سیٹھ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اصل میں اپنے ساتھیوں کو مار دھاڑ کا مزید موقع دے رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیشن ویگن والے نوجوان واپس گاڑی میں بیٹھے... اور آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دیکھنے والوں کو یہی لگا تھا کہ شاید وہ گاڑی کو سائڈ پر لگانے لگے ہیں مگر وہ چند سیکنڈ میں اڑن چھو ہو گئے۔ جب تک زیرِ تعمیر عمارت میں کام کرنے والوں کو اس "واردات" کی پوری طرح خبر ہوتی اور وہ دوڑتے ہوئے اپنے آقا کی مدد کو پہنچتے، وہاں کچھ نہیں تھا۔ سیٹھ سراج کو سہارا دے کر تباہ حال سوزوکی میں بٹھایا جا رہا تھا۔ اس کا گریبان لہولہان تھا۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر بلند آواز میں گالیاں بک رہا تھا مگر جن کے لیے یہ گالیاں تھیں، وہ کب کے اس کا تھوبڑا خون آلود کر کے ہوا ہو چکے تھے۔ سیٹھ کے ایک کارندے نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مترادف ایک دو ہوائی فائر بھی کیے۔ موٹر سائیکل پر سوار دو ٹریفک پولیس والے بھی وہاں پہنچ گئے مگر اب ان کا آنا بے سود تھا۔

اسی دوران میں عمران ہنستا ہوا واپس کار میں آ گیا۔ "بڑا خراب زمانہ آ گیا ہے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "ذرا سی بات پر لوگ ایک دوسرے کا سر پھاڑنے لگتے ہیں۔ چچ... چچ!"

اس نے گیئر لگا کر کار آگے بڑھائی۔ ہم جائے حادثہ کے پاس سے گزرے۔ وہاں ہجوم کی وجہ سے رفتار خاصی کم تھی۔ میں نے اپنا چہرہ پی کیپ اور ہاتھ کی اوٹ میں چھپایا ہوا تھا۔ میری نظر سیٹھ سراج کی پھٹی ہوئی قمیص اور لہولہان تھوڑی پر پڑی۔ سینے میں نفرت آمیز خوشی کی ایک چھوٹی سی لہر دوڑ گئی۔ سیٹھ کے جرم کے مقابلے میں یہ سزا بہت چھوٹی تھی لیکن سزا تو تھی۔ وہ بھنائے ہوئے انداز میں کسی کو موبائل فون سے کال کر رہا تھا۔

سوزوکی پک اپ کا "تنبھا" بنا ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف سے چادر اندر گھس گئی تھی۔ سوزوکی میں تین چار بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو بوریاں پھٹ گئی تھیں اور بوریوں کے اندر سے چاول وغیرہ باہر نکلے ہوئے تھے۔ کار وہاں سے آگے بڑھی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ "اسٹیشن ویگن کا نمبر نوٹ کر لیا

گیا تو پھر؟"

"نہیں کیا۔ اسٹیشن ویگن والے جانیں اور سوزوکی والے۔" وہ بے پروائی سے بولا مگر میرے چہرے پر غصے کا تاثر دیکھ کر فوراً بولا۔ "اصل میں تم نے غور نہیں کیا۔ اسٹیشن ویگن کی نمبر پلیٹ کیچڑ کے چھینٹوں سے بالکل چھپی ہوئی تھی۔ اپنے پکڑے جانے کے امکانات ہی نہیں چھوڑا گیا تھا..."

"یعنی یہ سب کچھ پوری پلاننگ کے ساتھ ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"پلاننگ کے بغیر تو پاکستان میں بس حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ باقی ہر شے کے لیے تھوڑی بہت پلاننگ تو کرنی پڑتی ہے۔"

ہم ایک ڈیڑھ کلومیٹر آگے گئے تھے کہ عمران کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کا کوئی ساتھی تھا۔ "ونڈرفل... سب ٹھیک رہا۔ ایک دم تم استاد... دشمن کو تو تم لوگ چٹنی بنا رہے تھے..." دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جو عمران نے دھیان سے سنا پھر قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "ہاں... یہ چیز تو میں نے بھی نوٹ کی ہے۔ میں تم سے بات کرنے ہی والا تھا... ہاں... بالکل... دونوں بوریاں اسی طرح تھیں۔ تمہاری نظر ہے بھئی تمہاری بھی... بے شک... بے شک... مجھے بھی کوئی چکر لگتا ہے... ٹھیک ہے... او کے۔" اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے اس کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں نظر آئیں۔ میں کچھ دیر تو چپ رہا پھر میں نے پوچھا۔ "بوریوں کی کیا بات کر رہے تھے؟"

"کچھ شک سا پڑا ہے مجھے اور اقبال کو۔" اس نے اپنے ساتھی کا نام لیا۔

"کیسا شک؟"

"پک اپ میں تین چار بوریاں پھٹی تھیں، ان میں ایک عجیب چیز سامنے آئی ہے۔ بوریوں میں اوپر چاول تھے اور نیچے ساری مٹی بھری ہوئی تھی۔ چاولوں کی یہ مقدار مشکل سے دو تین انچ ہو گی۔ گندم میں مٹی کی ملاوٹ تو سنی تھی لیکن چاولوں میں مٹی اور وہ بھی ننانوے فیصد؟" عمران نے کندھے اچکائے۔

"ہو سکتا ہے کوئی فراڈ ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"دیکھنے میں تو ایسی ہی لگتی تھی یار! ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مٹی کے اندر کچھ اور ہو۔ ویسے یہ سیٹھ سراج جس طرح کا بندہ ہے اس سے کسی بھی قسم کی بُری توقع کی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مٹی کے اندر کچھ اور چھپایا گیا ہو۔ کوئی اسلحہ وغیرہ..."

پھر ہیروئن، شیروئن... میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ سیٹھ کی تھوڑی سی "سی آئی ڈی" کی جا سکے۔ میرے خیال میں تو ایسے بندے کو کسی مصیبت میں گرفتار کرانا بھی عین ثواب ہے۔"

میں خاموش رہا۔ سیٹھ سراج کو زدوکوب کیے جانے کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ میں سیٹھ سراج کو اتنی جلدی اپنی طرح کسی کے ہاتھوں سے پٹتے ہوئے دیکھوں گا۔ اس کی گاڑی کا بھی اچھا خاصا نقصان ہوا تھا اور نقصان کے ساتھ وہ پھٹی ہوئی بوریاں۔ سوچنے کی بات تھی کہ وہ یہ بوریاں کہاں لے کر جا رہا تھا جن میں اوپر تھوڑے سے چاول اور نیچے مٹی بھری ہوئی تھی۔ دو بوریوں میں یہ صورتِ حال تھی تو یقیناً باقی بوریوں میں بھی یہی کچھ ہوگا۔

میں جلد ہی عمران کے ساتھ اس کے گھر واپس پہنچ گیا۔ وہ اپنے اس مشن کی کامیابی پر کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں پتا تھا کہ سیٹھ نے اتنے بجے وہاں پہنچنا ہے؟"

"پتا تھا یار! اس کے لیے ہوم ورک کیا تھا تو بندہ۔"

"اور اگر عمارت میں کام کرنے والی لیبر موقعے پر پہنچ جاتی تو کیا ہوتا؟"

"ہماری اسٹیشن ویگن میں تین چار بندے اور بھی تھے اور ان میں سے ہر ایک، دو تین بندوں پر بھاری ہے۔ اس کے بعد میں خود بھی تو تھا۔ تمہارا یہ یار تمہاری دعا سے پانچ چھ بندوں کو تو باآسانی آگے لگا سکتا ہے۔ بھئی ایسے ہی تو ہیرو کا خطاب نہیں ملا ہوا ہے۔" اس نے بازو کو سویٹ شرٹ کے اندر سے ہی اپنا مسل دکھایا۔

مجھے اس بات کی تسلی تھی کہ سیٹھ کی ٹھکائی والے معاملے کو کوئی شخص بھی میرے والے معاملے سے منسلک نہیں کر سکے گا۔ ایکسیڈنٹ والا کام بڑی چابکدستی اور پلاننگ سے کیا گیا تھا اور یہ سارا واقعہ بالکل حادثاتی لگتا تھا۔

گھر والوں کی پریشانی کا خیال مجھے ہلکان کر رہا تھا۔ ان سے بات کرنے کو دل چاہتا تھا مگر انہیں فون کرنے کی ہمت مجھ میں ہرگز نہیں تھی۔ خاص طور سے والدہ کا سامنا تو میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ عزیزوں، رشتے داروں کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چچی کی ہیرا پھیری سے پوری فیملی میں نہ صرف میری گمشدگی کی اطلاع پھیل چکی ہو گی بلکہ پارک میں میری جو عزت افزائی ہوئی تھی، وہ بھی راز نہیں رہی ہو گی۔ پھر شعلہ بدن آرسہ کا خیال ذہن میں آیا اور سینے میں نفرت کی ایک

بلند لہر محسوس ہوئی۔ یہ اس کی نحوست ہی تھی جو مجھے گھر سے نکال کر پارک میں لائی اور وہاں سیٹھ سراج سے میرا آمنا سامنا ہو گیا۔

میں جب یہ سارے واقعات سوچتا تو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ دم گھٹتا محسوس ہوتا اور میں ایک بار پھر خودکشی کے بارے میں سوچنے لگتا۔ بہرحال، حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا اور حقیقت یہی تھی کہ اب میرے اس خیال میں وہ پہلے دن کی سی شدت نہیں رہی تھی۔ اس تبدیلی میں اہم کردار عمران ہی کا تھا۔ وہ کسی لمحے بھی مجھے تنہا نہیں چھوڑتا تھا۔ یا تو باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا رہتا یا اپنا کوئی دلچسپ قصہ لے کر بیٹھ جاتا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ماہر نفسیات کی طرح اپنی انگلیوں سے میرے ذہن کی سطح کو ٹٹولتا ہے اور اسے ہموار کرتا رہتا ہے۔ اس نے ابھی تک اپنے بارے میں مجھے کچھ خاص نہیں بتایا تھا اور نہ میں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ صرف اتنا پتا چلا تھا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے اور وہ پچھلے کئی سالوں سے لاہور میں مقیم ہے۔ اسے سرکس کی نوکری کرتے بھی تقریباً اتنا ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ اپنے اس سرکس کے ساتھ وہ اکثر پنجاب کے مختلف اضلاع میں سفر کرتا رہتا تھا۔

سرِشام اس نے ایک بار پھر مجھے اپنی مہران کار میں بٹھایا اور سرکس پہنچ گیا۔ آج اس کے ساتھ میں تیسری مرتبہ سرکس آیا تھا۔ پہلے دن کے بعد یہاں کوئی "اسپیشل شو" نہیں ہوا تھا۔ اس بارے میں، میں نے عمران سے کچھ تفصیل معلوم کی تھی۔ ایسے شوز ہر مہینے کے پہلے ہفتے کی رات ہوتے تھے۔ عمران نے یہ بتا کر حیران کیا کہ ان اسپیشل شوز کے علاوہ اس سرکس میں کبھی کبھی دو چار مہینے بعد اسپیشل ترین شو بھی ہوتا ہے۔ اس میں بازی گری کے کچھ انتہائی خطرناک اور خاص الخاص تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریوالور والا کھیل بھی ہوتا ہے۔ اس شو میں کھیل کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ کھلاڑی ریوالور کو پیٹ یا جسم کے کسی اور حصے پر رکھنے کے بجائے سیدھا کنپٹی پر رکھ کر چلاتے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک ترین کھیل بس ایک دو کھلاڑی ہی کھیل پاتے ہیں۔ عمران نے مجھے یہ بتا کر مزید حیران کیا کہ وہ خود بھی ایک بار ریوالور کنپٹی پر رکھ کر "موت" کا کھیل کھیل چکا ہے۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات تھی۔ اس میں اسے ایک لاکھ روپے ملے تھے۔ اس رقم سے اس نے یہ مہران کار خریدی تھی اور اپنے گھر کو ڈیکوریٹ کیا تھا۔

جب ہم سرکس میں پہنچے تو موت کے کنوئیں میں زور و شور سے میوزک بج رہا تھا اور رات کا پہلا تماشا شروع ہو چکا تھا۔

ایک گندمی رنگت والا دراز قد شخص عمران کے قریب آیا اور اس کے کان میں کھسر پھسر کی۔ عمران "ہوں ہاں" میں جواب دیتا رہا۔ پھر وہ رسٹ واچ دیکھتا ہوا میری طرف آیا اور بولا۔ "آج ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہے۔ میں بس کنوئیں والا آئٹم کروں گا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکلیں گے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"تمہاری دل لگی کا کچھ سامان ہے یار... تمہارا دل لگا رہے گا تو الٹی پلٹی باتیں نہیں سوچو گے۔"

"میں پوچھ رہا ہوں، جانا کہاں ہے؟"

"زیادہ دور نہیں... بس ساہیوال کے آس پاس۔ ڈھائی تین گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک خاص بندے سے ملانا ہے تمہیں۔"

وہ ڈھائی تین گھنٹے کی بات یوں کر رہا تھا جیسے ڈھائی تین منٹ کی بات کر رہا ہو۔ ایک دم میرا دھیان پھر سیٹھ سراج کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس بوریوں والے معاملے کی طرف۔ کہیں یہ وہی چکر تو نہیں تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا لیکن وہ گول مول بات کر گیا۔ رات نو بجے کے قریب موت کے کنوئیں میں اپنا آئٹم ختم کرتے ہی وہ میرے ساتھ کار میں آ بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ وہ کار یا موٹر سائیکل چلاتا نہیں تھا بلکہ اڑاتا تھا اور اڑاتا بھی بہت ہائی اسپیڈ سے تھا۔ آج بھی اسپیڈ کے ساتھ وہ تھا بھی کرم بانٹا تھا۔ "فائیو اسٹار" اور "بھونپو کا" کے الفاظ وہ تکیہ کلام کے طور پر استعمال کرتا تھا اور خود بھی اپنے ان الفاظ سے محظوظ ہوتا تھا۔ کرکٹ سے اسے خاصی دلچسپی تھی۔ وہ کافی عرصہ کرکٹ کھیلتا بھی رہا تھا۔ اس کی اکثر باتوں میں کرکٹ کے حوالے ملتے تھے۔ بہرحال، اس نے ابھی تک مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ خاص نہیں بتایا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ اس کے اردگرد کے دیگر لوگ بھی اس کے ماضی کے متعلق زیادہ نہیں جانتے ہیں۔ اس تھوڑے سے اسرار کے باوجود وہ اب کا دوست تھا اور ہر دل عزیز بھی۔

لاہور سے ساہیوال تک کی سڑک اچھی حالت میں تھی۔ تقریباً تین گھنٹے میں ہی ہم ساہیوال پہنچ گئے۔ اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہم نے وہاں سے روسٹ چکن اور روغنی نان لیے اور گاڑی کے اندر ہی بیٹھ کر کھائے۔ ساہیوال کا بھرا پُرا شہر رات کے اس پہر قدرے سنسان نظر آ رہا تھا۔ سڑکوں پر ہر طرف کیلے کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ ان چھلکوں کو دیکھ کر دو باتوں کا پتا چلتا تھا۔ ایک تو یہ کہ ساہیوال کے علاقے میں کیلے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ یہاں کے لوگ چھلکے پھینکنے کے سلسلے میں تھوڑے بے پروا بھی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ صحت مند اور خوش باش لوگوں کا شہر لگتا تھا۔ رات کے اس پہر بھی چائے خانوں اور چھوٹے موٹے ہوٹلوں پر لوگ موجود تھے اور کیبل پر اسٹیج ڈرامے دیکھ رہے تھے۔ میں ساہیوال پہلی بار دیکھ رہا تھا، تاہم ہماری منزل ساہیوال سے ذرا آگے ہڑپہ کا پرانا شہر تھا۔

میں نے نوالہ لیتے ہوئے کہا۔ "یار! ایک تو تم ہر وقت بندے کو تجسس میں ڈالے رکھتے ہو... بتا کیوں نہیں دیتے کہ ہم اتنی رات گئے ہڑپہ کس کی ذات شریف سے ملنے جا رہے ہیں؟"

"یار! اگر ہم کسی مشہور فلمی ایکٹر یا کھلاڑی وغیرہ سے ملنے جا رہے ہوتے تو میں تمہیں بتا دیتا کہ فلاں بندہ ہے۔ جب تم اس بندے کو جانتے ہی نہیں تو میرے بتانے سے کیا فائدہ ہو گا؟ بہرحال، اتنا جان لو کہ بڑا دلچسپ بندہ ہے اور اس سے مل کر تمہیں خوشی ہو گی۔"

"مجھے اب بھی شک ہے کہ یہ سیٹھ سراج والا چکر ہے۔"

"شک کے معاملے میں تم بالکل کسی بیوی کی طرح ہو۔" اس نے مرغی کی ٹانگ پر دانت آزماتے ہوئے کہا۔

ہماری گاڑی ایک بار پھر روانہ ہو گئی۔ گاڑی کا ڈیک زور و شور سے بج رہا تھا۔ نغمہ گونج رہا تھا۔ ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے، مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے...

میرے خیالات دور دور تک بھٹکنے لگے۔ میں اپنے ذہن کو اردگرد کے منظر کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساہیوال سے ہڑپہ جانے والی سڑک بھی شاندار تھی۔ گاڑی بہ آسانی 125 کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

"بڑی فائیو اسٹار سڑک بنا دی ہے یار انہوں نے۔" عمران نے کہا۔

مگر اسی دوران میں ایک فائیو اسٹار کھڈا بھی آ گیا اور عمران نے گاڑی کو بمشکل کنٹرول کیا۔ ہڑپہ تک کا سفر قریباً 30 کلومیٹر تھا جو عمران نے پچیس منٹ میں طے کر لیا۔ جلد ہی ہم ایک دو ذیلی سڑکوں پر مڑے اور ہڑپہ کے قدیم شہر میں پہنچ گئے۔ یہ ویسا ہی قصبہ نما شہر تھا جیسا پنجاب کے نام نہاد قصبوں میں پایا جاتا ہے۔ گلیاں بازار اندھیرا ہے سو رہے تھے۔ ٹھنڈ نے ہڑپے کو جاڑا کر رکھا تھا اور کھلی جگہوں پر ہلکی ہلکی دھند تھی۔ عمران نے موبائل پر اپنے کسی ساتھی سے رابطہ کر کے اپنی منزل کی درست لوکیشن پوچھی اور پھر گاڑی ایک مکان کے سامنے روک لی۔

جلد ہی ہم ایک نیم گرم کمرے میں کچے کوئلوں کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے چائے اور دیگر

لوازمات رکھے تھے۔ میزبان واقعی دلچسپ شخص تھا۔ وہ سانولی رنگت کا تھا اور غیر معمولی حد تک فربہ تھا۔ اس کا پیٹ اس کے آگے جیسے ایک بہت بڑے مٹکے کی صورت میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ہنستا تھا تو اس کا پیٹ بھی اچھل اچھل کر ساتھ دیتا تھا۔ میزبان کی عمر پینتیس سال کے قریب ہو گی۔ اس کا نام امتیاز تھا اور وہ پانچ مرلے کے اس گھر میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ہڑپہ کا پرانا شہری تھا اور یہاں اس کی دو بکریاں تھیں۔ اپنی گفتگو سے وہ کچھ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔

امتیاز نے سب سے پہلے میرا چوٹوں کے بارے میں پوچھا۔

عمران نے وہی جواب دیا جو وہ اس سے پہلے سو ڈیڑھ سو افراد کو دے چکا تھا۔ "یہ میرا پرانا جگری ہے بھئی... مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن کی لکڑی کی سیڑھیوں سے گر گیا۔ شکر ہے کہ ہڈیاں اگر ٹوٹ گئی ہیں۔"

عمران کا ایک ساتھی یہاں پہلے سے موجود تھا۔ یہی وہ "اقبال" تھا جس سے موبائل فون پر دو دن پہلے عمران کی بات ہوئی تھی۔ یہ بھی مضبوط ہاتھ پیر والا پچیس چھبیس سالہ شخص تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی عمران نے اس سے فون پر بات کی تھی۔ اسے یہاں عمران نے ہی کسی کام سے بھیجا ہوا تھا۔ اتفاق سے یہاں اقبال کا یہ دوست امتیاز بھی رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب ہم سب یہاں امتیاز کے نیم گرم کمرے میں موجود تھے۔ دو تین منٹ کی رسمی باتوں کے بعد عمران، اقبال اور امتیاز میں مزید گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ گفتگو میرے لیے کافی حد تک ناقابلِ فہم تھی۔ عمران نے اپنے ساتھی اقبال سے پوچھا۔

"اب کہاں ہے وہ؟"

"گھر کے اندر ہی ہے۔" اقبال نے دبے دبے جوش سے جواب دیا۔ "گاڑی باہر گلی میں کھڑی ہے۔"

"کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟" عمران نے پوچھا۔

"میرا اندازہ تو وہی ہے جو امتیاز بھائی کا ہے... بلکہ یہ تو پکی بات کر رہے ہیں کہ اس میں عورت کا چکر ہے۔ زلیخا نام ہے اس کا۔ خاوند بیمار رہتا ہے بلکہ پاؤں سے لگا ہوا ہے۔ یہ گل چھرّے اڑا رہی ہے۔ سنا ہے کہ ایک دو اور یارانے بھی ہیں۔"

"خاوند کیا کرتا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

اقبال کے بجائے ہمارے میزبان امتیاز نے جواب دیا۔ "بس جی... جو لوگ کچھ نہیں کرتے، وہ کمال کرتے ہیں۔ یہ بھی کمال کرتا ہے۔ پہلے حلوائیوں کا کام کیا کرتا تھا۔

اب تو جو کچھ بھی کرتی ہے اس کی بیوی زلیخا ہی کرتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ ہنسا۔ اس کا پیٹ... پورا جسم بلکہ وہ چارپائی بھی ہنسنے لگی جس پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کی خوش مزاجی اور ہنسنے کی عادت کا اندازہ اس کے چہرے کی لکیروں سے بھی ہوتا تھا۔

عمران، اقبال اور امتیاز کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے میزبان کے نکڑ میں رہنے والی ایک جواں سال عورت زلیخا کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ اس کے گھر کسی مرد کا آنا جانا ہے اور وہ مرد اب بھی زلیخا کے یہاں موجود ہے۔ اس کی گاڑی اب بھی زلیخا کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ باتوں کے دوران میں جب مجھے اس گاڑی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایک سوزوکی ڈبا ہے تو ایک دم ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ میرا شک ایکا ایکی یقین میں بدلنے لگا۔ شاید یہ وہی سوزوکی ڈبا تھا جو دو تین دن پہلے مرراد ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا تھا اور جس میں سے سیٹھ سراج نے نکل کر زبردست خواری کا سامنا کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں ہڑپہ میں بھی یہ ڈبا سیٹھ سراج کو ہی لے کر آیا تھا۔

عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ میں کس رخ پر سوچ رہا ہوں۔ اس کی معاملہ فہمی حیران کن تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "مجھے لگتا ہے بابو! تمہارے اس سیٹھ سراج کے ستارے اور سیارے وغیرہ گردش میں آگئے ہیں۔ دیکھو اب وہ اس کان کی ٹائیاں اسٹار ذلالت کے بعد مزید بے عزت ہونے کے لیے یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔ ایک ایسی عورت کے گھر میں گھسا ہوا ہے جو کچھ زیادہ نیک نام نہیں ہے۔" پھر وہ میزبان امتیاز سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیا یہ عورت کچھ زیادہ خوب صورت ہے؟"

"زیادہ کیا جی... کم خوب صورت بھی نہیں ہے۔ بس سمجھیں کہ رنگ اچھا نمبروں سے پاس ہے لیکن عورت، عورت ہی ہوتی ہے جی۔ جب بندے کی "مت" مارنے پر آجائے تو پھر "مت" کے پاس مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اب ہماری مثال ہی لیں۔ میرے جیسے ہینڈسم نوجوان کے لیے لڑکیوں کی بھلا کوئی کمی تھی لیکن جب دل آیا تو کس پر آگیا۔"

چق کی دوسری طرف سے فربہ اندام امتیاز کی خوبرو بیوی نے شوخی سے کہا۔ "آہو بھائی جی! ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ شادی سے پہلے بارہ بارہ من کی دو تین ہونیں ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں پر ان کی قسمت میرے ساتھ پھوٹ گئی۔"

"شادی سے پہلے میں اتنا موٹا نہیں تھا جی... اگر کچھ تھا بھی تو اس میں خوب صورتی تھی۔ اس پگلی لوک نے میری ہر کیٹ ویلیو ڈاؤن کرنے کے لیے مجھے پراٹھے کھلا کھلا کر تنومند کیا ہے۔ اب بھگتے خود ہی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

چق کے آرپار میاں بیوی کی نوک جھوک کچھ دیر مزید چلتی رہی پھر امتیاز کی بیوی روتے بچے کو چپ کرانے کے لیے کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ خفیہ ہوا تو عمران نے دھیمے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تم سے معافی چاہتا ہوں یار... اگر اس وقت تمہیں بتا دیتا کہ ہم سراج کے لیے یہاں آرہے ہیں تو تم شاید آنے سے انکار کر دیتے۔ تم پریشان نہ ہو۔ ہم سراج کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی تمہیں ایسا کرنا ہے۔ بس یہ دیکھنا ہے کہ یہ بندہ دراصل ہے کس چکر میں۔ اگر یہ کوئی غیر قانونی کام کر رہا ہے تو پھر بھی ہم اس سے کچھ نہیں کہیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ پولیس کو انفارم کر دیں گے... اور وہ بھی سامنے آئے بغیر۔"

میں سٹپٹایا ہوا تھا۔ بہرحال، میں نے عمران سے کوئی بحث نہیں۔ ویسے بھی دیگر لوگوں کے سامنے تلخ کلامی کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

عمران نے میزبان امتیاز سے سوال جواب شروع کر دیے۔ "امتیاز بھائی! تم نے بتایا ہے کہ یہ بندہ سراج جسے تم یہاں خواجہ کے نام سے جانتے ہو، ہفتے میں کم از کم دو تین بار ضرور آتا ہے؟"

"بالکل... اور خاص طور سے ہفتے کی شام کو تو ضرور آتا ہے۔"

"ہر دفعہ سوزوکی ڈبا ہی روف پر آتا ہے؟"

"میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے۔"

"یہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟... تم بتاؤ کہ تم کیا جانتے ہو؟"

امتیاز نے اپنے بے کراں پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "مجھے تو یہی معلوم ہے کہ یہ بندہ لاہور کے قریب رائے ونڈ میں کوئی اسٹور چلاتا ہے جہاں تھوک میں آٹا، دالیں اور چاول وغیرہ ملتے ہیں۔ یہاں بظاہر زلیخا کے خاوند سے اور اصل میں خود زلیخا سے اس کی یاری دوستی ہے۔ یہ یہاں سے آٹا گل چاول وغیرہ بھی لے کر جا رہا ہے۔ شاید اپنے اسٹور پر فروخت کرتا ہے یا پھر کہیں اور بھی دیتا ہے۔"

عمران نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "اب اگر میں یہ کہوں کہ جسے تم خواجہ کہہ رہے ہو یہ لاہور کا سیٹھ سراج الدین ہے اور یہ رائے ونڈ میں کوئی چھوٹا موٹا اسٹور نہیں چلاتا

بلکہ لاہور میں ایک بڑے پلازے کا مالک ہے اور ایک دوسرا پلازا تعمیر کروا رہا ہے... تو؟"

امتیاز بھاڑ جیسا منہ کھول کر حیرت سے عمران کی طرف دیکھنے لگا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" اس نے کہا۔

"بالکل ایسے ہی ہے۔" عمران کا ساتھی اقبال بولا۔

"تم نے امتیاز بھائی کو ابھی وہ بوریوں والی بات تو نہیں بتائی؟" عمران نے اقبال سے دریافت کیا۔ اقبال نے نفی میں سر ہلایا۔ عمران نے اپنی جیکٹ درست کرتے ہوئے خود کو کچھ اور بھی انگیٹھی کے قریب سمیٹا اور رازداری کے لہجے میں بولا۔ "امتیاز بھائی! تمہاری یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ سراج کا اس زلیخا نام کی عورت سے کوئی تعلق ہے لیکن ہمیں لگ رہا ہے کہ بات اس سے کچھ زیادہ بھی ہے... اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس بندے کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

امتیاز نے حیرت اور تجسس سے عمران کی طرف دیکھا۔ پھر اقبال کو دیکھنے لگا۔ "آپ کو کس قسم کا شک ہے؟" امتیاز نے پوچھا۔

"ہمیں لگ رہا ہے کہ یہ سیٹھ سراج یہاں کوئی گڑبڑ گھوٹالا کر رہا ہے۔ صرف زلیخا ہی نہیں ہے جس کی خاطر یہ بندہ خواجہ کے روپ میں یہاں پہنچتا ہے اور راتیں گزارتا ہے۔ اس شک کی ایک بڑی معقول وجہ ہے جو کچھ ہی دن پہلے ہمارے سامنے آئی ہے... بلکہ دو تین دن پہلے سامنے آئی ہے۔"

"یار! تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔" امتیاز موٹے نے ایک بار پھر اپنی بے مثال توند کو سہلایا اور سوالیہ نظروں سے عمران کا چہرہ تکنے لگا۔

عمران نے کہا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ امتیاز بھائی کہ جس جگہ ہم بیٹھے ہوئے ہیں یہ جگہ ہڑپہ شہر میں آتی ہے یا اس کے مضافات میں؟"

"یہ مضافات میں ہی آتی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سرکاری زمین ہے۔ اس پر لوگوں نے اپنے گھر بنا رکھے ہیں۔ اب یہاں کے مکینوں کے ساتھ گورنمنٹ کا تنازعہ چل رہا ہے۔ یہ زمین ہڑپہ کے کھنڈرات سے بہت قریب ہے اور گورنمنٹ اسے واپس لینا چاہتی ہے لیکن گورنمنٹ جو معاوضہ دے رہی ہے وہ یہاں رہنے والوں کو قبول نہیں ہے۔ عدالتی چکر بھی چل رہا ہے۔"

"گورنمنٹ کو اس جگہ میں کیا دلچسپی ہے؟"

"بہت زیادہ دلچسپی ہے جی... اور ہونی بھی چاہیے۔

شاید آپ کو پتا نہ ہو کہ پرانے کھنڈر نکالنے کے لیے ہڑپہ کے جتنے بڑے حصے میں کھدائی ہوئی ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ ابھی تقریباً تقریباً اسّی فیصد علاقہ ایسا ہے جس پر کھدائی وغیرہ شروع ہی نہیں کی گئی۔ ماہر لوگوں کا خیال ہے کہ اس سارے علاقے کے نیچے بھی کھنڈر مندر موجود ہیں۔"

"تو پھر کھدائی کیوں نہیں کی جاتی؟" میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا پتا تو صاحب لوگوں کو ہوگا بھائی صاحب! کہا یہ جاتا ہے کہ صحیح طریقے سے کھدائی کرنے کے لیے بہت زیادہ پیسا اور ٹائم کی ضرورت ہے۔ پھر شاید صاحب لوگ یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ اگر ان زمینوں کے نیچے سے واقعی کھنڈر وغیرہ نکل آئے تو ان کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا۔ پہلے جو کھنڈر نکلے ہیں ان کی حالت بھی روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ بارشیں پڑتی ہیں، آندھیاں آتی ہیں۔ ہر طرح کے موسم اثر ڈالتے ہیں۔ محکمے کے لوگ اور باہر سے آنے والے صاحب لوگ ان کھنڈرات کی حفاظت کے لیے کام شام تو کرتے رہتے ہیں پھر بھی کچھ نہ کچھ تو نقصان ہوتا ہی ہے۔ شاید یہ لوگ سوچتے ہوں کہ جو کچھ ہزاروں سال سے زمین میں دبا ہوا ہے وہ ابھی دبا ہی رہے تو بہتر ہے جی۔"

عمران نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہ کچی پکی آبادیاں ایسی سرکاری زمین کے اوپر ہیں جن پر کھدائی وغیرہ ہونی ہے۔ آج نہیں تو کل... اور کل نہیں تو دس پندرہ سال بعد؟"

امتیاز نے اثبات میں سر ہلایا۔ عمران نے کہا۔ "اچھا، ایک بات بتاؤ امتیاز بھائی! یہاں آبادی میں لوگ غیر قانونی طور پر تو کھدائی وغیرہ نہیں کرتے؟"

"نہیں جی۔ محکمہ اس بارے میں بڑا چوکس ہے اور سختی بھی کرتا ہے۔ محکمے کے چوکیدار اکثر علاقے میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور اردگرد کی سن گن رکھتے ہیں لیکن..."

"لیکن کیا؟"

"کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ ہو بھی جاتا ہے۔ کسی بنیاد یا قبر وغیرہ کی کھدائی کرتے ہوئے کسی کھیت کھلیان میں سے کوئی پرانی شے مل بھی جاتی ہے۔ کسی پرانے برتن کا ٹکڑا یا کسی مورتی کا کوئی حصہ وغیرہ۔"

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ نگاہوں کے سامنے سوزوکی ڈبے کے ایکسیڈنٹ کا منظر آگیا۔ عمران نے بتایا تھا کہ سوزوکی ڈبے کے اندر موجود بوریوں میں چاولوں کے بجائے مٹی بھری ہوئی تھی۔ تو کیا اس مٹی میں کچھ چھپایا گیا

تھا... یا پھر...

ابھی میری سوچ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ عمران نے یہی بات امتیاز سے کہہ دی۔ اس نے کہا۔ "امتیاز بھائی! دو تین دن پہلے سراج کی سوزوکی کے ساتھ ہماری اسٹیشن ویگن کی جو ٹکر ہوئی تھی، اس کے بارے میں تو اقبال نے آپ کو بتا ہی دیا ہے۔ جس وقت ٹکر ہوئی، سراج کی سوزوکی میں چاول کی بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو بوریاں ٹکر کی وجہ سے پھٹ گئیں۔ ان پھٹی ہوئی بوریوں میں جو کچھ تھا، اس نے ہم دونوں کو تھوڑا سا حیرت میں ڈال دیا۔ ان بوریوں کے اوپر تو چاولوں کی دو ڈھائی انچ موٹی تہ بچھی تھی لیکن نیچے ساری مٹی بھری ہوئی تھی... اس بات کا پتا میرے علاوہ اقبال کو بھی چلا۔ ہم دونوں شک میں پڑ گئے۔ اس شک کی وجہ سے ہی میں نے اقبال کو سراج کے پیچھے لگایا اور وہ یہاں ہڑپہ تک آپہنچا۔"

بوری میں چاولوں کے نیچے مٹی والی بات سننے کے بعد امتیاز کا بھاری بھرکم چہرہ متغیر ہوگیا۔ میں نے صاف دیکھا کہ اس نے اس بات میں زبردست دلچسپی محسوس کی ہے۔ اس نے اوپر تلے کئی سوال عمران اور اقبال سے پوچھے اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس کا کھڑا ہونا ویسے ہی تھا جیسے کسی لیٹے یا بیٹھے ہوئے ہاتھی کا کھڑا ہونا۔ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ "مجھے پہلے ہی اس خواجہ کے معاملے میں شک وشبہ لگ رہا تھا۔ اب یہ جو آپ نے بوریوں میں مٹی والی بات بتائی ہے، اس نے میرا شک بڑا پکا کردیا ہے۔"

وہ لکڑی کی الماری میں سے اپنا موبائل فون اٹھا لایا۔

"کیا کر رہے ہو؟" عمران نے پوچھا۔

"سعید کو فون کر رہا ہوں۔"

"یہ سعید کون ہے؟"

"یہاں ہیڈ چوکیدار ہے۔ میرا سالا بھی ہے۔ اس کی ذمے داری ہے کہ اگر یہاں کوئی گڑبڑ ہو تو وہ اسے پکڑے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، کیا گڑبڑ ہو رہی ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"جو کچھ آپ نے بتایا ہے، اسے سن کر مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہاں زلیخا اور چھیدے کے گھر میں ناجائز طور پر کھدائی ہو رہی ہے۔ دراصل یہاں اگر کوئی چوری چھپے کھدائی کرتا ہے تو اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ کھودی ہوئی مٹی کو چھپائے کہاں؟ پچھلے سال بھی یہاں ایک اسی طرح کا واقعہ ہوا تھا۔ وہ ایک عیسائی فیملی تھی۔ انہوں نے گھر کے ایک کمرے میں کھدائی شروع کی اور وہاں سے نکلنے

والی مٹی رات کے اندھیرے میں پاس کے جوہڑ میں پھینکنے لگے۔ ایک رات چوکیداروں نے انہیں دیکھ لیا اور وہ پکڑے گئے... مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی چکر ہے۔"

"جو لوگ پکڑے گئے تھے، ان سے کچھ برآمد بھی ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دو مہریں برآمد ہوئی تھیں۔ باقی چیزیں وہ لوگ آگے نکال چکے تھے۔"

"پھر بہتر ہے کہ تم ابھی فون نہ کرو۔" عمران نے مشورہ دیا۔

"کیا مطلب؟" امتیاز نے پوچھا۔

"جلد بازی میں کام بگڑ جائے گا۔ پہلے ہم دیکھیں کہ یہ لوگ کر کیا رہے ہیں اور ان کے ساتھ اور کون سے کھلاڑی شامل ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بس ایک دو لوگوں کا کام ہو اور ہوسکتا ہے کہ اس میں زیادہ لوگ شامل ہوں۔"

اس سلسلے میں ان تینوں کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی پھر عمران نے ایک دلیرانہ بلکہ حیران کن فیصلہ کیا۔ کم از کم میرے لیے تو یہ حیران کن ہی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اور اقبال ابھی دیوار پھاند کر زلیخا اور چھیدے کے گھر میں داخل ہوں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خطرناک کام تھا۔ اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ کچھ دیر تک اس بارے میں صرف جرح قدح خیال ہوا۔ اس میں، میں نے بھی تھوڑا بہت حصہ لیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ یہ کام کل پر چھوڑ دیا جائے۔ امتیاز کو معلوم تھا کہ سراج بس آج کی رات یہاں ٹھہرے گا اور کل زلیخا کے گھر میں زلیخا اور اس کے بیمار خاوند کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ زلیخا کا ایک بھانجا ہوگا، اس کا کوئی ایسا خاص مسئلہ نہیں تھا۔

ہم نے رات کا باقی حصہ امتیاز کے گھر میں ہی گزارا۔ امتیاز کی بیوی نے ہمارے لیے دو نئے لحاف نکال دیے تھے۔ ہم سوئے تو صبح دس گیارہ بجے سے پہلے آنکھ نہیں کھلی... دھوپ پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ امتیاز کے دونوں بچے صحن میں کھیل کود کر رہے تھے۔ باپ کی طرح وہ بھی خوب خوب فربہ تھے اور ہاتھی کے چھوٹے چھوٹے گول مٹول بچوں کی طرح تھے۔

کچھ دیر بعد ایک گرما گرم دیہاتی ناشتے نے ہمارا استقبال کیا۔ دیسی گھی کے بھاری بھرکم پراٹھے، انڈوں کا آملیٹ، سوجی کا باداموں والا حلوہ اور دودھ پتی چائے۔ ساتھ میں ریڈیو پر پنجابی گانے نشر ہو رہے تھے۔ امتیاز اور اس کی بیوی میں دلچسپ نوک جھونک بھی جاری تھی۔ عمران بھی

گاہے بگاہے اپنی نقب بار بار اپنوں کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہا تھا۔ اس ماحول میں مجھے اپنی ذاتی تلخیاں کسی حد تک بھولی ہوئی تھیں۔ ایسے بھی میں سکون بخش گولیاں باقاعدگی سے لے رہا تھا۔ ان کے سبب دماغ پر ایک غفلت آمیز دھند چھائی رہتی تھی اور اپنے بے نام غم کی دھار مجھے کم محسوس ہوتی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر عمران نے سب سے پہلے موبائل فون پر اپنے سرکس کے اسسٹنٹ منیجر عباس سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں لاہور سے باہر ہے اس لیے آج شو میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ اس اطلاع کے بعد وہ کچھ "ایزی" نظر آنے لگا۔ اقبال، امتیاز اور عمران میں ایک بار پھر یہاں کی پراسرار صورت حال کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔

امتیاز نے بتایا کہ محکمہ آثار قدیمہ کا دفتر یہاں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ جو افسر ہے، خاصا ایماندار اور سخت گیر ہے۔ وہ کسی قسم کی بے قاعدگی برداشت نہیں کرتا۔ اس کی وجہ سے نوادرات کے متلاشی خوف زدہ رہتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو اگر ٹیلوں سے کبھی کبھار کوئی چیز مل بھی جاتی ہے تو وہ خود جا کر دفتر میں جمع کرا دیتے ہیں۔

دوپہر کے وقت اقبال باہر کا جائزہ لینے کے لیے چلا گیا۔ وہ تین بجے کے قریب واپس آیا۔ اس نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ "او جناب! سراج واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ساتھ ایک بندہ بھی ہے۔ گاڑی کو کپڑا وغیرہ مار رہا ہے۔"

"اب بھی کوئی بوری وغیرہ ہے گاڑی میں؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں جی! پانچ بوریاں ہیں۔ میں نے گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے خود دیکھی ہیں۔"

اسی دوران میں گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی دوراندہ آواز آئی۔ اندازہ ہوا کہ سراج روانہ ہو رہا ہے۔ دو تین منٹ بعد سراج کا سوزوکی ڈالا گلی میں سے گزرا۔ عمران کی طرح میں نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ سیٹھ کا ساتھی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ سیٹھ سراج دوسری والی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے صاف پہچانا... تاہم بوریاں وغیرہ نظر نہیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ بوریاں رکھنے کے لیے ڈالے کی پچھلی نشستیں نکال دی گئی ہیں۔ گاڑی کے پچھلے شیشے کے ڈینٹ وغیرہ نکلوائے جا چکے تھے، تاہم ابھی اس کی کافی مرمت ہونا باقی تھی۔ سیٹھ کا چہرہ دیکھتے ہی مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ میں کافی دیر بالکل گم صم رہا۔

وہ رات خاصی سنسنی خیز رہی۔ عمران کی کئی صلاحیتیں کھل کر میرے سامنے آ گئیں... اس کی غیر معمولی بے خوفی تو مجھ پر پہلے ہی ثابت ہو چکی تھی۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ کسی بھی خطرناک کام میں فوری طور پر کود پڑنے اور وقت کے مطابق نہایت تیزی سے فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یقیناً اس کے دوست بھی اس کے مزاج کے مطابق ہی تھے۔

رات قریباً گیارہ بجے کے لگ بھگ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ عمران گاڑی میں ایک پسٹل بھی رکھ کر لایا ہے۔ وہ پسٹل، باہر کھڑی گاڑی میں سے نکال کر اندر لے آیا اور اسے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ آٹھ دس اضافی گولیاں بھی اس نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اس کے بعد وہ اور اقبال... زلیخا کے گھر میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان دونوں نے اپنے چہرے کپڑے کے ڈھاٹوں میں اس طرح چھپا لیے کہ آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران نے اپنے جسم کے گرد ایک گرم چادر بھی لپیٹ لی۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ میرے روکنے سے یہ لوگ رکنے والے نہیں ہیں۔ وہ تھرل اور غیر معمولی سنسنی کے متلاشی تھے اور یہ ان کے لیے ایک اچھا موقع تھا۔ عمران میرا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ "پریشان نہ ہو جگر! یہ پستول کسی کو زخمی کرنے یا مارنے کے لیے نہیں ہے، بس اپنی حفاظت کے لیے ہے۔"

میں نے بجھے دل سے کہا۔ "پستول تو پستول ہی ہوتا ہے۔ بہرحال، ایک بات ذہن میں رکھنا، میں یہاں ہونے والے کسی بھی معاملے کے لیے ذمے دار نہیں ہوں۔ تم مجھے کچھ بھی بتائے بغیر یہاں لائے ہو اور اب ان الٹے سیدھے کاموں میں پڑ گئے ہو۔ مجھے اس میں خطرے کی بو آ رہی ہے۔"

وہ مسکراتی آواز میں بولا۔ "رات کا وقت ہے۔ اسٹامپ پیپر نہیں مل سکتا، ورنہ میں ابھی تمہیں اقرار نامہ لکھ کر دے دیتا کہ تم ہر مسئلے سے بری الذمہ ہو۔"

"ایک اسٹامپ پیپر سے نہیں دو سے کام چلے گا۔ تم مجھے کیوں بھول رہے ہو؟" امتیاز نے کہا اور پھر ہنسنے لگا۔ جب وہ ہنستا تھا تو اس کا پورا جسم ہلتا تھا اور توند کے اندر تو تھرتھلی سی مچ جاتی تھی۔ ویسے ہم اس کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اگر یہاں کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا تو وہ بھی لپیٹ میں آ سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد عمران اور اقبال گھر سے باہر نکل کر تاریکی کا حصہ بن گئے۔ دیہات اور قصبات کی یخ بستہ

راتوں میں سردی سے بچنے کے لیے اکثر لوگ اپنے چہرے گرم مفلروں اور ڈھاٹوں وغیرہ میں چھپا لیتے ہیں۔ اس چیز کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔

عمران اور اقبال کے جانے کے بعد میں بے چینی کا شکار رہا۔ امتیاز بھی کسی حد تک مضطرب تھا... تاہم وہ اپنا دل، مونگ پھلی اور ریڈیو سے بہلا رہا تھا۔ اس کی بیوی بچے دو گھنٹے پہلے ہی سو چکے تھے... چار دیواری سے باہر سرد ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ کھڑکی میں سے دور بڑے بڑے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ ان پر مدھم چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی تو میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ امتیاز ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا اٹھا اور دروازہ کھولا۔ آنے والا عمران ہی تھا۔

وہ تیزی سے اندر آیا۔ اس نے منڈاسا کھولا۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا... لگتا تھا کہ بڑے موڈ میں ہے۔ آتے ساتھ ہی اس نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ "آؤ میرے ساتھ تمہیں تماشا دکھاؤں۔ بڑے مزے کا سین ہے۔ ایک دم ٹیکا اسٹار۔"

"نہیں، مجھے نہیں جانا۔ جو دیکھنا ہے تم خود ہی دیکھو۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"او یار! کیا عورت بنے بیٹھے ہو۔ وہاں کوئی ڈر والی بات نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو میں تمہیں بلانے ہی نہ آتا۔ چل اٹھو... حیران رہ جاؤ گے تم۔"

"میں پہلے ہی بہت حیران ہوں۔ تم امتیاز بھائی کو لے جاؤ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اس نے میری ایک نہ سنی اور کھینچ کر مجھے اٹھا دیا۔ اس وقت وہ بالکل ایک تیز سیلابی ریلے کی طرح ہو رہا تھا۔ اس کے اندر ایک ایسا محبت بھرا دباؤ پیدا ہوتا تھا جس کے سامنے رکے رہنا ممکن ہی نہیں رہتا تھا۔

قریباً پانچ منٹ بعد میں عمران کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔ سرد ہوا سوئیوں کی طرح جسم کے مختلف حصوں پر لگی۔ عمران نے ایک بڑا مفلر مجھے بھی اس طرح لپیٹ دیا تھا کہ چہرے کا بس ایک تہائی حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ گلیوں میں گہری تاریکی تھی۔ آخری راتوں کا چاند کسی بدلی میں چھپا ہوا تھا۔ آوارہ کتوں کی لپیٹ سے بچتے ہم قریباً نصف فرلانگ چلے اور ایک گھر میں داخل ہو گئے۔ یہی چھیدے اور زلیخا کا گھر تھا۔ چھوٹا سا صحن تھا جس میں اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ آگے ایک برآمدہ تھا جس پر سردی سے بچنے کے لیے چقیں ڈال دی گئی تھیں۔ غسل خانے کے ساتھ ایک چھوٹا سا اسٹور نما کمرا تھا جس میں بکری بندھی ہوئی تھی۔ ہم برآمدے میں داخل ہوئے پھر ایک کمرے کا آہنی دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

اندر بلب کی زرد روشنی تھی۔ اس روشنی میں نظر آنے والے منظر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں کوئی ایسی صورت حال دیکھوں گا۔ پچیس ستائیس سال کی ایک صحت مند عورت چارپائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ وو آمن کی رسی نے اسے کافی مضبوطی کے ساتھ چارپائی سے جکڑا ہوا تھا۔ عورت کے جسم پر عنابی رنگ کے شنیل کا نیا لباس تھا۔ کانوں میں سونے کے جھمکے چمک رہے تھے۔ وہ گدرائے ہوئے جسم کی مالک اور رنگ سفید تھا۔ یہ سفید رنگ ہی تھا جس کی وجہ سے اس کے ایک گال پر انگلیوں کے نشان ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ نشان طمانچے کے لگتے تھے۔ اقبال پسٹل ہاتھ میں لیے اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ دوسری چارپائی پر تیس پینتیس سال کا ایک کمزور شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے اور شکل سے ہی نظر آتا تھا کہ وہ عرصے سے بیمار ہے۔ یقیناً یہی چھیدا تھا۔ اسے باندھا نہیں گیا تھا، وہ اتنا سہما ہوا تھا کہ اسے باندھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

عمران نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھنا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے آگے جھک کر بڑی محبت سے عورت کے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ "چاچی! تو ٹھیک ہے بیبا، لیکن شکل سے بدبخت نہیں لگتی۔ میں تجھ سے کسی طرح کی سختی کرنا نہیں چاہتا۔ میں پھر تجھ سے کہتا ہوں کہ کوئی بھی بات چھپا مت۔ اس سے تیرا ہی نقصان ہوتا ہے۔"

"میں سچ کہتی ہوں۔ میں کچھ نہیں چھپا رہی۔ مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ تو سب کچھ نہیں بتا رہی۔ کچھ نہ کچھ مجھ سے چھپا رہی ہے... اور جو کچھ چھپا رہی ہے وہی زیادہ ضروری ہے۔"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟ میں کبھی لاہور نہیں گئی۔ نہ ہی اس نے کبھی مجھے لاہور کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ یہی کہتا تھا کہ رائے ونڈ میں اس کی تھوک کی دکان ہے جہاں سے آلے دوالے کے دکان دار آٹا، چاول وغیرہ لے کر جاتے ہیں۔"

"تیرا بھانجا آج کہاں ہے؟ سنا ہے وہ تیرے ساتھ ہی یہاں رہتا ہے؟"

"وہ آج اپنے پنڈ گیا ہے۔ دو تین دن تک آئے گا۔"

''کیا اس کے دماغ میں بھی کبھی یہ نہیں آیا کہ خولیہ (سراج) جھوٹ بول سکتا ہے... یا اس نے سوچا ہو کہ رائے ونڈ جا کر اس کا پتا کرنا چاہیے؟''

''نہیں، وہ اتنے جوگا نہیں ہے۔ وہ تو بس وہی کرتا رہا ہے جو خولیہ اسے کہتا رہا۔''

''اور تم بھی وہی کرتی رہتی ہو بلکہ رہی... وہی کرتی رہتی ہو۔'' عمران نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

زلیخا کے چہرے پر شرمندگی جھلکی۔ اس کا ہڈیوں کا ڈھانچا خاوند بھی دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اقبال نے کہا۔ ''ابھی تو نے بتایا ہے کہ پچھلے چار مہینوں میں تو نے سراج سے چالیس پچاس ہزار روپیا لیا ہے۔ تیری الماری میں سے یہ ساڑھے تین ہزار نکلا ہے۔ باقی کہاں ہیں؟''

''باقی وہ کل لے گیا ہے نکال کر۔ بائیس ہزار روپیا تھا۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''دو چوڑیاں بھی تھیں سونے کی... وہ بھی کھینچ کر لے گیا ہے۔ یہ دیکھو، مرن جوگے نے میری بانہیں چھیل دی ہیں۔'' اس نے اپنی سرخ کلائیوں کی طرف اشارہ کیا۔

عمران نے غور سے اس کی کلائیاں دیکھیں اور اثبات میں سر ہلایا۔

اس دوران میں زلیخا کا شوہر پھیدا کمزور آواز میں بولا۔ ''اس کا کوئی قصور نہیں ہے... خولیے نے جو کچھ کیا ہے، زبردستی کیا ہے۔ اس نے ہماری کوئی پیش نہیں چلنے دی۔ پتا تھا کہ اگر کسی کو پتا چلا تو سب ہتھکڑیاں لگیں گی۔''

عمران بولا۔ ''یہ جو پچاس ہزار روپیا تیری بیوی نے اس سے لیا ہے، یہ بھی اس نے زبردستی دیا تھا؟ اور یہ سونے کے جھمکے... یہ پازیباں... اور یہ شنیل کا کامدار جوڑا؟ یہ سب زبردستی تھا؟ تیری بیوی کی کوئی مرضی نہیں تھی اس میں؟''

پھیدا جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ بس بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اقبال بولا۔ ''تم دونوں اس میں برابر کے شریک ہو اور جو کچھ ہوگا، وہ تم سب کے ساتھ ہوگا۔''

عمران نے میرا بازو پکڑا اور مجھے ساتھ والے دروازے کے سامنے لے آیا۔ یہ دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو میں چکرا کر رہ گیا۔ کمرے میں فرش کی جگہ ایک بڑا کنواں تھا۔ بلب کی مدھم سی زرد روشنی اس کنوئیں کی گہرائی تک پہنچتے پہنچتے بہت مدھم ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص بے دھیانی میں کمرے کے اندر دو قدم بھی رکھتا تو اس کنوئیں نما گڑھے میں گر جاتا۔

''او خدایا! یہ کیا ہے؟''

''اسی لیے تو کہا تھا جگر... کہ سین دیکھو گے تو مزہ آ جائے گا۔''

میں نے آگے بڑھ کر نظر دوڑائی... اس تقریباً آٹھ فٹ قطر کے کنوئیں کے اندر بانس کی ایک طویل سیڑھی لگی تھی۔ کنواں پچیس فٹ سے زیادہ گہرا تھا۔ ذرا غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ کنوئیں کے اندر دائیں اور بائیں طرف دو اور گڑھے بھی نظر آ رہے تھے... یا یوں کہا جائے کہ یہ کنوئیں کی دیوار میں دو چھوٹی سرنگیں سی تھیں۔

''یہ سب کیا ہے عمران؟'' میں نے تحیر میں ڈوب کر پوچھا۔

''سمجھو کہ یہ بھی موت کا کنواں ہے لیکن اس کی دیوار کچی ہیں اس لیے ان میں موٹر سائیکل نہیں چل سکتی... یا شاید ٹھیکیدار سراج کے پاس کوئی ایسی موٹر سائیکل ہو جو اس میں چل سکتی ہو۔''

''تو یہ سب سیٹھ سراج نے کیا ہے؟''

''تو اور کیا میں نے کیا ہے؟ وہ خبیث پچھلے تین چار مہینے سے صرف زلیخا کے لیے یہاں نہیں آ رہا۔ یہ کنواں بھی کھود رہا تھا مگر اندازہ یہی ہوا ہے کہ اس کے لالچ کی موٹر سائیکل بڑے کے اس کچے کنوئیں میں چل نہیں سکی۔ یعنی اسے یہاں سے کچھ ملا نہیں۔ اسی لیے تو دو بھنایا ہوا یہاں سے رخصت ہو گیا ہے اور جاتے جاتے اپنی زلیخا سے نقدی وغیرہ بھی چھین کر لے گیا ہے۔''

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں اطمینان سے سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے اس کنوئیں کی سیر تو کر لو... نیچے اترو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''اچھا... تو یہ ٹارچ پکڑو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔''

میں نے ٹارچ پکڑ لی اور اس کا رخ کنوئیں نما گڑھے میں کر دیا۔ وہ سیڑھی اتر کر نیچے چلا گیا۔ یہ لمبے دستے والے دو کھرپے اور دو کدالیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کنوئیں کے اندر سے ہی آواز دے کر بولا۔ ''یہ دیکھو... یہ لوگ مٹی کے بجائے ان لمبے کھرپوں سے کھدائی کرتے رہے ہیں۔ مقصد یہی تھا کہ کسی سے کھدائی کریں گے تو آواز پیدا ہوگی۔''

دائیں بائیں نظر آنے والے دونوں خلا افقی رخ پر زیادہ گہرے نہیں تھے۔ یہ مشکل سے دس دس فٹ آگے گئے ہوں گے۔ ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کارآمد چیزوں کی تلاش میں کھدائی کرتے ہوئے دائیں بائیں بھی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد عمران سیڑھی کے سہارے باہر نکل آیا۔

اس کے جوتے نم تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کنوئیں کی تہ میں تھوڑا بہت کیچڑ تھا۔

''یہ تو بڑا عجیب چکر لگ رہا ہے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''عجیب اور دلچسپ!'' عمران بھی ویسی ہی آواز میں بولا۔ ''یہ بڑی غلط کار عورت ثابت ہوئی ہے۔'' اس کا اشارہ زلیخا کی طرف تھا۔

''کیا کرتی رہی ہے؟''

''وہ سب کچھ جو ہم سوچ رہے تھے۔ یہ یہاں سراج کے ساتھ داد عیش بھی دیتی رہی ہے اور ساتھ ساتھ یہ کھدائی والا کام بھی ہوتا رہا ہے۔ اس کے شوہر پھیدے کو بھی سب پتا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔''

''ان لوگوں نے یہاں اسی کمرے میں کھدائی کیوں کی ہے؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ ساری باتیں ابھی تھوڑی دیر میں سامنے آ جائیں گی... تم دیکھتے رہو۔''

''کیا تم نے زلیخا کے ساتھ مار پیٹ کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ بس یہ ذرا اودھم مچا رہی تھی اس لیے اسے چارپائی سے باندھنا پڑا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اقبال نے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا۔ بہرحال، اب یہ کافی حد تک شانت ہو چکی ہے۔''

''لیکن اس کے منہ پر تو نیل سے پڑے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ انگلیوں کے نشان ہیں اور اس کا ہونٹ بھی ایک طرف سے زخمی ہے۔''

''یہ مہربانی ہم نے نہیں، اس کے یار سراج نے کی ہے۔ کل ان لوگوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔ سیٹھ سراج اور اس کا ساتھی شاید اب یہاں نہیں آئیں گے۔ وہ جاتے جاتے یہاں سے بیس پچیس ہزار روپیا لے گئے ہیں... اس کے علاوہ زلیخا کا کچھ زیور بھی۔ کم از کم زلیخا تو یہی کہہ رہی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کھدائی کے کام میں ان لوگوں کو مایوسی کے سوا کوئی خاص چیز نہیں ملی اور یہی وجہ ہے کہ یہاں جھگڑا وغیرہ بھی ہوا ہے۔''

ہم دونوں واپس پہلے والے کمرے میں آ گئے۔ یہاں صورت حال جوں کی توں تھی۔ زلیخا ٹسوے بہا رہی تھی۔ عمران نے ایک بار پھر اس سے سوال جواب شروع کیے۔ ''سراج سے تمہاری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟'' عمران نے پوچھا۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ جس کمرے میں کھدائی ہوئی ہے، وہاں سے فرش بیٹھ گیا تھا۔ یہ پچھلی بارشوں کے بعد ہوا تھا۔ ہم نے دوبارہ فرش ڈالنے کے لیے پہلا فرش توڑا۔ ایک طرف چھوٹا سا گڑھا بن گیا تھا۔ اس گڑھے سے ہمیں ایک پرانا بھانڈا (برتن) ملا۔ یہ مٹی کی گڑوی جیسا تھا اور تین ٹکڑوں میں تھا۔ ہم نے اسے سیمنٹ سے جوڑا۔ میرے بھانجے جہانے نے یہ برتن عاشق مسیح کو دیا۔ عاشق مسیح کبھی کبھار ایسی چیزیں لے لیتا ہے۔ اس نے اس برتن کے جہانے کو ڈھائی ہزار روپے دیے۔ جہانا ڈھائی ہزار روپے لے کر بڑا خوش تھا... پر ہمیں پتا تھا کہ یہ برتن ڈھائی ہزار سے کہیں زیادہ رقم کا ہوگا۔ عاشق مسیح ایسی چیزیں لاہور لے جاتا ہے اور زیادہ پیسوں میں بیچ دیتا ہے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ وہ یہ چیزیں خواجے کو دیتا ہے جسے تم لوگ سراج بتا رہے ہو۔''

''اس کا اصلی نام سراج ہی ہے۔ تم آگے بتاؤ۔'' عمران نے کہا۔

''عاشق مسیح جب سراج کے پاس برتن لے کر گیا تو اسے دیکھ کر سراج وغیرہ کا شوق ایک دم بڑھ گیا۔ دراصل سراج کے ساتھ جو بندہ کل یہاں آیا تھا، وہ ان برتنوں اور مورتیوں وغیرہ کے بارے میں بڑا کچھ جانتا ہے۔ اس کا نام عارف خاں ہے۔ اسے خان خاں کہتے ہیں۔ اسے ان پرانی چیزوں کی اصلی قیمت کا بھی پتا ہوتا ہے... اور اصل میں یہی عارف خاں ہے جس نے خواجے کو لالچ دیا اور بتایا کہ جہاں سے یہ گڑوی ملی ہے، وہاں اور چیزیں بھی ہوں گی۔''

''تو پھر کیا ہوا؟ عارف خود تمہارے پاس آیا یا سراج یہاں پہنچا؟''

''دونوں ہی یہاں آئے تھے۔ ان دنوں پھیدا اسپتال میں تھا۔ گھر میں میرے اور میرے بھانجے جہانے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خواجے نے مجھے بتایا کہ وہ لاہور کے قریب رائے ونڈ میں کاروبار کرتا ہے۔ اس نے عارف خاں کو اپنا ملازم بتایا۔ اب پتا نہیں کہ خواجے کی طرح عارف خاں بھی اصلی نام ہے یا جھوٹا ہے۔ بہرحال، ان دونوں نے کہا کہ جہاں سے گڑوی ملی ہے وہاں اگر اور کھدائی کی جائے تو اور چیزیں مل سکتی ہیں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ غلط کام ہے۔ سرکاری بندے ہر وقت یہاں نظر رکھتے ہیں۔ چوکیدار بھی گھومتے رہتے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ خواجہ اور عارف خاں پہلے لالچ دیتے رہے پھر ڈرانے دھمکانے لگے۔ انہوں نے کہا کہ میرے بھانجے جہانے کو ہتھکڑی لگ سکتی ہے کیونکہ اس نے یہ گڑوی ناجائز طور پر نکالی ہے اور بیچی ہے۔ اس کے

تو وہ بھی بڑا کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں ان کی بات مان لوں۔ میں اکیلی عورت ذات تھی اور یہ بات بھی صحیح تھی کہ جہاں آرا کی گزری بیچ دی گئی تھی۔ عاشق شیخ نے اس سے ڈھائی ہزار روپے کی وصولی پر انگوٹھا بھی لگوایا تھا۔ مجھے ان کی بات ماننی پڑ گئی۔ اس کے بعد نوابجے نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ عارف خاں بھی ہوتا تھا۔ جمید اسپتال سے واپس آ گیا تھا۔ خواجہ نے اس کو بھی ڈرایا دھمکایا اور پھر انہوں نے کھدائی کا کام شروع کر دیا۔"

"کھدائی کون کرتا تھا؟"

"عارف خاں اور جہاں آرا۔ سب سے بڑا مسئلہ مٹی چھپانے کا تھا۔ پہلے تو خواجہ تھوڑی بہت مٹی چھت پر ڈلواتا رہا اور دیہڑے کی بڑی کیاری میں پھنکواتا رہا۔ پھر اس نے رستہ ڈھونڈ لیا۔ وہ کھدائی سے نکلنے والی مٹی، بوریوں میں بھر کر اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اب پتہ نہیں لاہور لے جاتا تھا یا راستے میں کہیں پھینکتا تھا۔ بہرحال، یہاں سے تو اپنی سفید گاڑی میں بھر کر لے جاتا تھا۔"

"محلے میں یا اڑوس پڑوس میں کسی کو پتا نہیں چلا کہ تم لوگ کھدائی کر رہے ہو؟" اقبال نے پوچھا۔

"خواجہ نوکروں سے کھدائی کرواتا تھا۔ یہ کام جب بھی ہوا، رات کو ہوا۔ دن کے وقت ہم اس کمرے کو تالا لگا چھوڑتے تھے۔"

عمران ٹارچ کی روشنی زلیخا کے گورے چٹے چہرے پر ڈال کر بولا۔ "زلیخا بی بی! یہ بات ماننے والی ہرگز نہیں ہے کہ تم لوگوں نے اتنی کھدائی کر لی اور تمہیں یہاں سے ملا کچھ نہیں۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کھدائی کے بعد یہاں سے ایک بھی کام کی شے نہیں ملی۔ خواجہ ہم سے کہتا تھا کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ گزری بھی یہاں سے کہیں نکلی ہوگی۔ ہم نے کسی کو چرائی ہے یا کہیں اور سے نکالی ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کھدائی کرتے ہوئے یہاں سے کچھ نکلا ہو مگر ان لوگوں نے... میرا مطلب ہے کہ سراج اور عارف نے تم سے چھپا لیا ہو؟"

"اللہ کی اللہ ہی جانے... پر میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ جب بھی کھدائی ہوتی تھی، جہاں آرا ساتھ ہوتا تھا۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اسے پتا چل جاتا۔" بات کرتے ہوئے زلیخا کے ایک گال پر چھوٹا سا گڑھا پڑتا تھا اور وہ قدرے خوب صورت نظر آنے لگتی تھی۔

"وہ عاشق شیخ اب کہاں ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"اس پر جھگڑے اور ناجائز اسلحے کا کوئی کیس بنا ہوا ہے۔ آج کل وہ گھر سے غائب ہے۔ تین چار مہینے سے اسے دیکھا نہیں ہے۔"

اگلے ایک گھنٹے تک عمران اور اقبال اس زلیخا نامی عورت سے مسلسل سوال جواب کرتے رہے۔ اس ساری گفتگو سے جو کچھ معلوم ہوا اور جو کچھ ہم نے اخذ کیا وہ کچھ اس طرح تھا۔

زلیخا ہوشیار عورت تھی۔ وہ جو یہ بات کر رہی تھی کہ اس نے خوف زدہ ہو کر سراج وغیرہ کا ساتھ دیا... غلط تھی۔ ممکن ہے کہ اس پر تھوڑا بہت دباؤ بھی ہو مگر اس کے ملوث ہونے کی اصل وجہ اس کا لالچ اور اس کی عیش پسندی تھی۔ سیٹھ سراج نے زلیخا کی فطرت کو سمجھتے ہوئے اسے بڑی ہوشیاری سے شیشے میں اتارا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف یہاں زلیخا کے ساتھ اپنی راتوں کو گرما رہا تھا بلکہ نوادر کی تلاش میں کھدائی بھی کروا رہا تھا۔ زلیخا کو اپنے لاغر خاوند کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔ اس کا گھر میں موجود ہونا یا نہ ہونا زلیخا کے لیے برابر تھا۔ بیٹا جہاں آرا بھی ایک نمبر کا بے غیرت تھا۔ اسے بھی پروا نہیں تھی کہ اس کی ماں کیا کرتی ہے۔ اسے بس نشے پانی سے مطلب تھا اور پیسہ اسے وافر مل رہا تھا۔ اس کی جیب بھی سراج کی مہربانی سے ہمہ وقت گرم رہتی تھی۔ جب سراج اپنے سوزوکی وین پر یہاں آتا تو اکثر عارف خاں بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ عارف اور جہاں آرا دونوں کھدائی میں مصروف رہتے تھے اور سراج سیٹھ، کمرے میں زلیخا کے ساتھ مصروف وقت گزارتا تھا۔ اس نے زلیخا کو تحفے میں پہننے کے لیے سونے کی چوڑیاں دی تھیں اور بہت نقد پیسے بھی دیتا تھا... زلیخا ان عورتوں میں سے تھی جنہیں سونے کی چمک دکھا کر اور نوٹوں کی کڑکڑاہٹ سنا کر کسی بھی کام پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے یہاں سوچنے کی بات یہ تھی کہ سیٹھ جیسا امیر کبیر شخص اگر ہفتے میں دو بار لاہور سے چل کر یہاں پہنچتا تھا اور اس سارے معاملے میں اتنی زیادہ دلچسپی لے رہا تھا تو پھر اسے یہاں سے غیر معمولی فائدے کی بھی توقع رہی ہوگی۔ یہ فائدہ ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہوگا۔

لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے، سراج اور عارف خاں کمرے کے اندر کھدائی سے مایوس ہوتے گئے۔ انہیں کوئی خاص چیز نہیں مل سکی۔ اس کے بعد سراج، زلیخا کے ساتھ بھی سرد مہری سے پیش آنے لگا۔ زلیخا کوئی اتنی حور پری نہیں تھی کہ وہ اس پر فدا ہو جاتا۔ وہ تو فقط اپنے مطلب کے لیے اس کے ناز نخرے اٹھا رہا تھا۔ آٹھ دس روز پہلے سراج نے عارف خاں کے ساتھ مل کر زلیخا اور اس کے خاوند کو بھی

صلواتیں سنائیں اور انہیں کہا کہ انہوں نے اس کا وقت برباد کیا ہے۔ کل یہ جھگڑا مزید بڑھا۔ زلیخا کے بیان کے مطابق اس کے خاوند کے ساہیوال کے اسپتال میں دو تین ٹیسٹ ہونے تھے۔ اسے پھیپھڑوں میں پانی کی شکایت تھی۔ زلیخا نے سراج سے کچھ پیسے مانگے۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے پہلے انکار کیا پھر جھلاہٹ میں زلیخا کو تھپڑ مارے جس کی وجہ سے اس کا ہونٹ بھی پھٹ گیا۔ اس نے زلیخا کی چوڑیاں بھی اتروا لیں اور اس کی الماری کے اندر کے خانے سے بیس بائیس ہزار روپے بھی نکال لیے۔ زلیخا نے بہت واویلا کیا کہ وہ اب کیا کرے گی۔ وہ جو اتنا بڑا گڑھا اس کے گھر میں کھود دیا گیا ہے، وہ کیسے بھرا جائے گا اور اگر گڑھا ایسے ہی رہا تو کب تک چھپا رہے گا... اور اگر گھر کی بنیادوں کو کچھ ہو گیا تو کیا بنے گا... وغیرہ وغیرہ۔

ان ساری معلومات کے بعد اس بات کی تصدیق ہوئی کہ سیٹھ سراج اور عارف خاں وغیرہ نے یہاں جو کچھ کرنا تھا... وہ کر کے جا چکے ہیں اور جاتے جاتے زلیخا وغیرہ کو بھی سخت خفا کر کے گئے ہیں۔ عمران کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ میرے یہاں آنے سے پہلے ہی وہ بڑی "جانفشانی" سے زلیخا اور جمیدے کو یہ باور کرا چکا تھا کہ ان کا تعلق پولیس سے ہے اور وہ ایک خفیہ اطلاع پر یہاں پہنچے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ زلیخا اور خاص طور سے اس کا شوہر جمیدا سہمے ہوئے تھے۔ ممکن تھا کہ شروع میں زلیخا نے کچھ تو تو میں میں دکھائی ہو لیکن اب وہ بھی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بول رہی تھی اور ہر سوال کا جواب فرفر دے رہی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے آنے سے پہلے عمران اور اقبال نے ان میاں بیوی کو اس معاملے میں معافی دینے کا تاثر دیا تھا۔

زلیخا تو کافی دیر سے آنسو بہا رہی تھی۔ اب مجھے جمیدے کی آنکھوں میں بھی نمی نظر آنے لگی تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک سیاہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا اور پھر پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگتا تھا۔ زلیخا نے چنچناتے ہوئے کہا۔ "اگر تم تینوں... واقعی... پولیس والے ہو تو پھر تم عام کپڑوں میں کیوں آئے ہو؟ اور تم نے اپنے منہ بھی چھپائے ہوئے ہیں۔ اب ہمیں کیا پتا کہ تم واقعی پولیس والے ہو یا نہیں... اگر ہم تمہاری وجہ سے... کسی اور چکر میں پھنس گئے تو پھر...؟"

"ہوشیار عورت ہو۔" عمران نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر اس ہوشیاری میں سے کچھ ہوشیاری پہلے دکھائی ہوتی تو سراج کے جال میں نہ آتیں۔ لگتا ہے کہ اس وقت تمہاری ہوشیاری پر تھپا لگ گیا تھا اور آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔" پھر وہ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دکھاؤ بھئی! اس ہوشیار عورت کو اپنا کارڈ۔"

اقبال نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر زلیخا کی طرف بڑھا دیا۔ یہ پتا نہیں کس محکمے کا کارڈ تھا۔ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ زلیخا اور جمیدے کو خاک سمجھ میں آنا تھا... دونوں ہی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ عمران نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بی بی صاحبہ! اگر آپ کی تسلی نہیں ہو رہی تو پھر علاقہ انچارج سے فون پر آپ کی بات کرا دیتے ہیں... یا پھر ایس پی صاحب سے کہتے ہیں کہ وہ خود یہاں آ کر آپ کے پاس حاضری لگوا جائیں۔"

"نن... نہیں... ہم آپ پر شک تو نہیں کر رہے جی... بس... بس اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ ہم پر کوئی اور مصیبت نہ آ جائے۔" زلیخا کا شوہر جمیدا منمنایا۔

زلیخا نے عاجزی سے کہا۔ "ہم بڑے وچارے لوگ ہیں بھرا جی... ہم میں تھانے کچہریوں کی ہمت نہیں ہے۔ آپ جو کہیں گے... ہم ویسا ہی کریں گے۔ بس ہم پر اس معاملے کا بوجھ نہ پڑے۔"

"ہم تو یہی چاہتے تھے... پر اب تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے کہ تم لوگ خوار ہونے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ یہ بڑا سخت کیس ہے بی بی... یہ جو نمبر دار کا گھر ہے نا، یہ بس چار چھ مہینے تک بک جاتا ہے اور یہ جو تیرے بیٹے پر چوری چڑھی ہوئی ہے نا، یہ بھی چھ سال بانی ہے سینٹرل جیل میں..." عمران کا انداز جلالی تھا۔

"ہم... مجھے معافی دے دو صاحب جی... میں نے تو بس سچی بات کی تھی۔ آ... آپ جو کہیں گے، ہم ویسا ہی کریں گے۔ ہم... تو خود چاہتے ہیں کہ خواجہ اور اس کے یار کو ہتھکڑیاں لگیں۔ اللہ کرے... اللہ کرے ان کے جنازے نکلیں جیل کے اندر سے۔ اس خواجے نے میرے ساتھ جو کی ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ کل جہانے اور جمیدے کے سامنے، مجھے ماں بہن کی گندی گالیاں دی ہیں۔ مجھے تھپڑ مارے ہیں۔ میری قمیص پھاڑ دی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں، وہ سامنے الماری میں پڑی ہوئی ہے۔" وہ ایک بار پھر آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے آنسو ہمدردی کے طالب تھے۔

عمران پتھر کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ روایتی تھانے داروں کی طرح اس کے انداز میں کوئی لچک نظر نہیں آ رہی تھی۔ نادانستہ دل ہی دل میں وہ اس صورت حال کو انجوائے بھی کر رہا تھا۔ اسے بے حرکت بیٹھے دیکھ کر جمیدے نے ہاتھ

جوڑ دیے۔ "معاف کر دیں جی۔ اس نے غلط بات کی ہے، اس کے لیے میں معافی مانگتا ہوں۔ ہم آپ سے پورا پورا تعاون کریں گے۔"

اب عمران نے تھوڑی سی نرمی دکھائی اور دوبارہ سوال جواب شروع کیے۔ اس نے زلیخا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "دیکھو زلیخا! میں اس سارے معاملے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ یہاں سراج اور عارف خاں کے علاوہ اور کون کون آیا ہے؟ انہوں نے کیا کیا ہے؟ ان کے درمیان کیا باتیں ہوتی رہی ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اس بارے میں کوئی بھی چھوٹی بڑی بات چھپاؤ مت۔ کون سی بات ہمارے لیے ضروری ہے اور کون سی نہیں، یہ ہم خود طے کریں گے۔"

زلیخا نے ایک بار پھر تھوڑی سی منت سماجت کی کہ ان دونوں کو اور جہانے کو اس معاملے میں سے نکال لیا جائے۔ عمران نے اس بات پر نیم رضامندی ظاہر کی۔ اس کے بعد زلیخا کو چارپائی سے کھول دیا گیا۔ اس کی گردن اور بازوؤں پر گہری خراشیں تھیں۔ یہ خراشیں آج ہی کی کھینچا تانی کا نتیجہ تھیں۔ جہاں جہاں رسی کا بل آیا تھا، وہاں اس کے گورے جسم پر نشان سے پڑ گئے تھے۔ ان نشانوں کو سہلانے لگی۔ پھر اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص الماری میں سے نکال کر ہمیں دکھائی۔ عمران اور اقبال نے قمیص دیکھ کر ایک طرف رکھ دی۔ عمران کے کہنے پر وہ چادر اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر شروع سے اپنی روداد سنانے لگی۔ اس بار وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی بتا رہی تھی۔ شوہر کی موجودگی کی وجہ سے صرف اس روداد کا "رومانی پہلو" مختصر کر رہی تھی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ داراشی نام کا ایک بندہ بھی دوبار سیٹھ سراج کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر زخم کا ایک پرانا نشان تھا۔ اس نے بھی عارف خاں اور جہانے کے ساتھ کھدائی میں حصہ لیا تھا۔ ایک خاص بات جو زلیخا نے بتائی، وہ یہ تھی کہ سراج اور عارف خاں کی باتوں میں اکثر "لال کوٹھیوں" کا ذکر آتا تھا۔ "لال کوٹھیاں" لاہور میں ہی کوئی جگہ تھی۔ وہاں سراج کے علاوہ عارف اور داراشی وغیرہ بھی جاتے رہتے تھے۔ لال کوٹھیوں کے ساتھ کسی میڈم کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ یہ میڈم یا تو لال کوٹھیوں والی جگہ پر رہتی تھی یا پھر اس کا بھی وہاں آنا جانا تھا۔

عمران نے زلیخا سے دریافت کیا۔ "تم دونوں نے کبھی اس سے پوچھا نہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ خاص طور سے تمہارے ساتھ تو وہ ہر طرح کی بات کرتا تھا اور بہت سارا وقت گزارتا تھا۔" عمران کا لہجہ ایک بار پھر معنی خیز تھا۔

زلیخا کی گردن جھک گئی۔ "نہیں جی... میں سچ کہتی ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔"

عمران نے اقبال اور مجھ سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر پوچھا۔ "ہاں بھئی! تم دونوں نے کچھ سنا ہے لال کوٹھیوں کے بارے میں؟"

اقبال بولا۔ "ہری کوٹھیوں کے بارے میں تو سنا ہے۔ اس جگہ کو ہری کوٹھیاں اسٹاپ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ کینٹ کے ساتھ لاہور میں ہے لیکن لال کوٹھیاں تو نہیں سنا۔"

عمران نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "لال کوٹھی، پیلی کوٹھی، سفید کوٹھی... اس طرح کے نام اکثر گلی محلوں میں رکھ لیے جاتے ہیں۔ اس طرح تو رنگوں کے نام سے لاہور میں ہزاروں کوٹھیاں ہوں گی مگر یہاں ہمارے لیے تھوڑی سی آسانی موجود ہے۔ یہ ایک کوٹھی نہیں بلکہ ایک سے زیادہ ہیں۔ یقیناً یہ کوٹھیاں ساتھ ساتھ ہوں گی اس لیے انہیں لال کوٹھیاں کہا جانے لگا ہے۔"

"ہاں ظاہر ہے کہ لال کوٹھیوں کا نام تو کسی بھی بڑے شہر میں بہت سی جگہوں کا ہو سکتا ہے مگر لال کوٹھیاں بہت زیادہ جگہوں کا نہیں ہوگا۔" میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہاری ترقی ضرور ہو جائے گی۔" عمران نے ذرا شوخ لہجے میں کہا۔ "اب تم نے دماغ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔"

وہ فقرہ چست کرنے سے کہیں بھی باز نہیں آتا تھا۔

زلیخا کا خاوند اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے سب کچھ دیکھنے سننے لیکن خاموش رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ذرا سیدھا ہو کر بیٹھا تو عمران نے پوچھا۔ "کیا تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

وہ پُرسوچ انداز میں منمنایا۔ "کیا لاہور میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں کبوتر وغیرہ اڑانے پر پابندی ہے؟"

"کبوتر اڑانے پر؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟" اقبال نے کہا۔ "ہم نے تو کبھی ایسا نہیں سنا... اور اگر کوئی ایسی پابندی ہو بھی تو پورے شہر پر ہوتی ہے، کسی ایک جگہ تو نہیں۔"

"تم یہ بات کیوں کہہ رہے ہو؟" عمران نے چھیدے سے پوچھا۔

"بس جی، ویسے ہی۔ ایک دن عارف خاں یہاں موبائل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ دوسرا بندہ لال کوٹھیوں میں تھا۔ وہ عارف کو بتا رہا تھا کہ یہاں کسی نے

شکایت کر دی ہے کہ ہم نے کوٹھی میں کبوتر رکھے ہوئے ہیں۔ اب ناظم کا بھی فون آ گیا ہے... کچھ اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔"

"یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔" اقبال نے کہا۔ "چھوٹی گلیوں یا کالونیوں میں علاقے کے لوگ خود ہی کبوتر اور پتنگ بازی وغیرہ پر پابندی لگا لیتے ہیں یا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

عمران کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ اس نے بڑے دھیان سے چھیدے کی طرف دیکھا۔ وہ چھیدے کی بات پر گہرائی سے غور کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے انگلی اٹھائی اور بولا۔ "میرے خیال میں کبوتروں کی اطلاع، غور کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" اقبال نے پوچھا۔

"میری معلومات کے مطابق لاہور میں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں ہوا میں پرندوں کی موجودگی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ سول ایوی ایشن والے دھیان رکھتے ہیں کہ اس علاقے کی فضا پرندوں، چیلوں وغیرہ سے خالی رہے۔"

"سول ایوی ایشن اس میں کہاں سے آ گئی؟" اقبال نے استفسار کیا۔

"تم شاید اخبار غور سے نہیں پڑھتے۔ ابھی پچھلے دنوں بھی اس طرح کی ایک خبر آئی تھی۔ انتظامیہ کے کسی اعلیٰ افسر نے کہا تھا کہ ہوائی اڈوں کے اردگرد کی فضا کو صاف رہنا چاہیے۔ دوسری صورت میں جہازوں کو لینڈنگ اور ٹیک آف کے وقت خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس خبر میں علاقے کے اندر صفائی ستھرائی کی ضرورت پر بھی خاص زور دیا گیا تھا... کیونکہ گندگی کی وجہ سے پرندوں کی آمد بڑھ جاتی ہے۔"

"ہاں، اس قسم کی خبریں آتی رہتی ہیں۔" میں نے تائید کی۔

"کبوتر بازی اور پتنگ بازی پر پابندی والی بات بھی میں نے کہیں سنی تھی۔ متعلقہ محکمے کے کسی عہدے دار نے کہا تھا کہ ایئرپورٹ کے اردگرد کے علاقے میں ایسے حفاظتی انتظامات کو یقینی بنایا جائے۔" عمران نے وضاحت کی۔

چھیدے نے ایک بار پھر گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ اس روز عارف خاں نے موبائل پر جو گل بات کی تھی وہ اسی طرح کی تھی۔ اس میں بتانے کی بات بھی ہوئی تھی کہ کہیں کبوتروں کی وجہ سے کوئی پرچہ وغیرہ نہ ہو جائے۔ عارف خاں نے گالی دیتے ہوئے کہا تھا کہ کسی کی شامت نہیں آئی ہے کہ ایسی چھوٹی سی بات پر ہم پر پرچہ کرائے۔"

کچھ دیر تک عمران، اقبال اور چھیدے میں اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ عمران کو لال کوٹھیوں والا "کلیو" اب خاصا اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ کم از کم میں نے تو یہی اندازہ لگایا تھا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں عمران نے زلیخا اور چھیدے کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اگر اس سنگین کیس میں وہ اپنے لیے بچت چاہتے ہیں تو انہیں کیا کرنا ہوگا۔ انہیں اس سارے معاملے میں فی الحال بالکل خاموش رہنا تھا۔ یہاں تک کہ محلے کے چوکیدار سعید سے بھی کوئی بات نہیں کرنی تھی۔ نہ ہی گھر کو تالا لگا کر کہیں غائب ہونا تھا۔ عمران نے ان کو تسلی دی کہ وہ انہیں اس معاملے سے نکالنے کی کوشش کرے گا یا کم از کم سلطانی گواہ بنا دے گا۔ زلیخا اور چھیدے سے بات کرتے ہوئے عمران نے اپنا لب و لہجہ بالکل پولیس انسپکٹروں جیسا بنا لیا تھا۔ وہ اپنا اور ہمارا تعلق خفیہ پولیس سے بتا رہا تھا اور ہم نے جو اپنے چہرے چھپا رکھے تھے، اس کی وجہ بھی یہی بیان کر رہا تھا۔

رات تین بجے کے لگ بھگ ہم اپنے میزبان امتیاز کے گھر واپس آ گئے۔ وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہا تھا اور اس انتظار میں کئی کپ چائے کے علاوہ ڈیڑھ دو پلیٹ مونگ پھلی بھی کھا چکا تھا۔

زلیخا اور چھیدے کے گھر میں جو کچھ نظر آیا تھا، اس نے عمران کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا۔ وہ ایک دم پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا پختہ ارادہ بن گیا تھا کہ وہ سیٹھ سراج سے تعلق رکھنے والے اس معاملے کی تہ تک ضرور پہنچے گا۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ایک بازی گر سے زیادہ ایک جاسوس دکھائی دیا۔ سیٹھ سراج کے کالے کرتوت کو سامنے لانے کا سودا اس کے دماغ میں سما گیا تھا اور اب وہ پیچھے ہٹنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اور پتا نہیں کیوں، مجھے لگ رہا تھا کہ وہ یہ کام کر گزرے گا۔ اس تھوڑے ہی عرصے میں، میں نے اس کے بہت سے گن دیکھ لیے تھے اور مجھے اس پر اعتماد سا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس شخص کے اندر سے ہر وقت ایک توانائی سی پھوٹتی رہتی ہے اور یہ توانائی اس کے اردگرد کے لوگوں کو گرماتی ہے۔ ان میں حیران کن تبدیلیاں لاتی ہے۔ میں خود پر ہی غور کرتا تو ان تبدیلیوں کا ثبوت سامنے آ جاتا تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند دن پہلے میں نے بیسیوں افراد کے سامنے ایک خطرناک کھیل کھیلا تھا۔ ریوالور کے چیمبر میں اصلی گولی رکھ کر اپنے جسم پر فائر کیا تھا۔ یہ

شک اس عمل میں میرے اندر کی سخت اضطرابی کیفیت نے بھی میری مدد کی تھی لیکن اس کے لیے دراصل حوصلہ مجھے عمران سے ہی ملا تھا۔ تالیوں کی وہ آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی جو میرے ٹرک رکوانے کے بعد فضا میں ابھری تھی۔ اور اس واقعے سے صرف تیرہ چودہ گھنٹے پہلے تک میں اس قدر مایوس تھا کہ ریل کی پٹری پر لیٹ کر اپنے جسم کو ٹکڑوں میں بدلنے کو سوچ رہا تھا۔

ہاں... یہ شخص میرے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کر رہا تھا، بڑی نرمی سے اور رعنائی سے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہاں آ کر مجھے اپنے ساتھ زلیخا اور چھیدے کے گھر لے گیا تھا۔ نہ بھی لے کر جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا لیکن وہ شاید میرے اندر دلچسپی اور جوش پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔

ہم علی الصباح بستی کے جاگنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہڑپہ کا قدیم شہر ابھی تاریکی اور دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ہماری گاڑی ان ٹیلوں کے قریب سے گزری جن کے نیچے اور جن کے اردگرد قریباً ساڑھے چار ہزار سال پرانی تہذیب دم سادھے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ان کھنڈرات کے ہیولوں کو اپنے بالکل قریب محسوس کیا... اور سوچا کہ یہ کب سے یہاں موجود ہیں۔ بہت دیر سے... بے شک بہت دیر سے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں آئے اس وقت بھی یہ در و دیوار قریباً 2600 سال پرانے تھے...

ہماری مہران کار اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھاتی ساہیوال کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اقبال اگلی نشست پر عمران کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں پچھلی نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم لاہور کے گردونواح میں تھے۔ عمران ایک ٹریکٹر ٹرالی کو مسلسل ہارن دے رہا تھا مگر وہ راستہ نہیں دے رہی تھی۔ ایک دوبار عمران نے بائیں جانب سے نکلنے کی کوشش کی مگر ادھر سے بھی راستہ نہیں ملا۔ ٹرالی میں چارے کے گٹھے تھے اور چھ سات افراد سوار تھے۔ یہ نوجوان تھے اور مستی میں دکھائی دیتے تھے۔ ٹرالی کے ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز سے گانے بھی بج رہے تھے۔

تھوڑا سا راستہ ملا تو عمران نے کوشش کر کے اوورٹیک کرنا چاہا۔ اسی دوران میں ٹرالی ڈرائیور نے ٹرالی کو تھوڑا سا لہرایا اور ہماری کار کے پچھلے حصے پر ایک لمبی رگڑ آ گئی... "الو کے پٹھے!" عمران نے دانت پیس کر کہا۔

آگے جا کر اس نے گاڑی روک دی اور ہاتھ کے اشارے سے ٹرالی والوں کو بھی رکنے کو کہا۔ کار سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ٹرالی بھی رک گئی۔ اس میں سے لڑکے چھلانگیں لگا کر نیچے اتر آئے۔ کار کے دونوں بائیں دروازوں پر بھی خاصی رگڑ آئی تھی۔ ٹرالی والوں سے تو تکرار ہوئی۔ اگر وہ ذرا سی بھی شرمندگی ظاہر کرتے تو عمران انہیں جانے دیتا لیکن وہ ایک نمبر کے اجڈ ثابت ہوئے۔ غالباً ان کو افرادی قوت بھی قریب ہی تھی۔ جب انہوں نے بڑھ بڑھ کر باتیں کیں تو عمران کو بھی تاؤ آ گیا۔ وہ ایسے معاملات میں پیچھے ہٹنے والا کہاں تھا۔ اس نے چھوٹی مونچھ والے ڈرائیور کا گریبان پکڑا اور ایک طوفانی ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ وہ اچھل کر کنارے کے کھیت میں جا گرا۔ ایک دوسرے شخص نے اسے عقب سے دبوچنا چاہا۔ وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور اپنے عقب والے شخص کو بھرپور طاقت سے ٹرالی کے ساتھ ٹکرا دیا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اسی جگہ کراہ کر ڈھیر ہو گیا... اسی دوران میں اقبال نے بھی ایک شخص پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ عمران کی طرح وہ بھی لڑائی بھڑائی میں ماہر نظر آتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں گھمسان کا رن پڑ گیا۔ عمران اور اقبال کم از کم پانچ بندوں سے الجھ گئے تھے۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عمران کس بلا کا نام ہے۔ اس نے بے حد مہارت اور بڑی بے رحمی سے چند سیکنڈ کے اندر اندر دو افراد کو بے بس کر دیا۔ ایک اپنا چہرہ پکڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا، دوسرا ٹرالی سے ٹکرانے کے بعد بے حال ہو گیا۔ عمران کے ورزشی جسم میں وہی غیر معمولی پھرتی نظر آئی جو سرکس میں زمین سے قریباً چالیس فٹ کی بلندی پر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے نظر آتی تھی۔ اب اس پھرتی میں طیش کا عنصر بھی شامل تھا اس نے اسے اور بھی قاتل و مہلک بنا دیا تھا۔ عمران اور اقبال کو یوں لڑتے اور غالب آتے دیکھ کر میرے اندر کا خوف بھی ماند پڑنے لگا۔ میں ابھی تک الگ کھڑا تھا اور کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کروں۔ اسی دوران میں عمران نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر نشست کے نیچے سے جیک کی آہنی راڈ نکال لی۔ اس نے جیک کا راڈ میری طرف اچھالا اور خود جیک کو ہتھیار کے طور پر سنبھال لیا۔

جیک کا راڈ میری طرف اچھال کر اس نے ایک طرح سے مجھے اس لڑائی میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ حالانکہ میں نے صاف دیکھ لیا تھا کہ میرے شامل ہوئے بغیر بھی عمران اور اقبال آسانی سے نمٹ لیں گے۔ ابھی میں تذبذب میں ہی تھا کہ کیا کروں... اچانک ٹرالی والوں میں سے ایک بندہ مجھ پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی لاٹھی تھی۔ اس نے لاٹھی مجھ پر چلائی۔ میں ایک طرف ہٹا۔ لاٹھی میرے کندھے کو چھوتی ہوئی ٹرالی کو لگی۔ میں نے آہنی راڈ گھما

کر مد مقابل کی گردن پر رسید کیا... اور حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی میں یہ "پہلا وار" تھا جو میں نے حقیقی لڑائی میں کسی پر کیا... ایک لمحے کے لیے میں خود دنگ رہ گیا کہ یہ میں نے کس طرح کر لیا۔ گردن پر راڈ کی ضرب کھا کر میرا مد مقابل بری طرح ڈگمگایا۔ میرا حوصلہ بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، میں نے راڈ کی ایک اور ضرب اس کے سر پر لگائی۔ یہ زیادہ زوردار ضرب نہیں تھی پھر بھی مجھے تسلی ہوئی۔ مد مقابل نے اپنا توازن درست کیا اور مجھ پر جوابی وار کرنے کے لیے تیار ہوا مگر یہی وقت تھا جب عمران عقاب کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ مد مقابل کی لاٹھی اٹھی رہ گئی اور وہ ڈکراتا ہوا گنے کے کھیت میں جا گرا...

لڑائی میں موجود دو راہگیر افراد بیچ بچاؤ کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ چند مزید افراد بھی وہاں جمع ہو گئے۔ ان میں ایک اسٹیشن ویگن سے اترنے والے افراد بھی تھے۔ یہ کسی ادارے کے سیکیورٹی گارڈز تھے۔ ان سب لوگوں نے مل کر بیچ بچاؤ کرایا۔ اقبال کا سر پھٹ گیا تھا اور عمران کے ہاتھ پر معمولی چوٹ آئی تھی۔

اس جھگڑے کو ختم ہونے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ عمران کی گاڑی کا نقصان ہوا تھا، دوسری طرف ٹرالی والوں کو خاصی جسمانی ضربیں آئی تھیں۔ ایک لاچے کرتے والے لڑکے کی تو کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ تھانے کچہری میں جانے کے بجائے معاملے کو وہیں نمٹا لیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک فون نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ یہ فون عمران نے لاہور سے کروایا تھا۔ فون کرنے والا ایک ایس ایس پی تھا۔

ہم دن گیارہ بجے کے لگ بھگ واپس عمران کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ اقبال کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عمران کو بھی ہاتھ پر ہلکی سی بینڈیج کرانا پڑی تھی۔ بہرحال وہ دونوں بالکل ہشاش بشاش تھے۔ ان کے لیے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ آج کا دن میرے لیے بہت... بہت اہم رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا تو نگاہوں میں ایک بار پھر ٹرالی سواروں کے ساتھ ہونے والی لڑائی کے مناظر گھومنے لگے۔ مجھے اب بھی یقین سا نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے اس لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ پتا نہیں وہ کیا کیفیت تھی جس کے تحت میں نے خود پر جھپٹنے والے پر آہنی راڈ کا وار کیا تھا اور یہ اکیلا وار نہیں تھا... دو وار تھے۔ میری زندگی کے پہلے دو وار!

یہ جو کچھ آج میں نے کیا تھا، اس کی مجھے ہمیشہ حسرت رہی تھی۔ اب تک کی زندگی میں بے شمار موقعے ایسے آئے تھے جب مجھے لڑنا چاہیے تھا لیکن میں لڑ نہیں سکا تھا۔ اپنی اس بے بسی کا بدلہ میں نے ہمیشہ خود ہی سے لیا تھا۔ اپنے اندر ہی جل کڑھتا رہا تھا۔ اپنے آپ کو اذیت دی تھی یا پھر اپنا سارا غصہ کسی پنچنگ بیگ پر اتارا تھا۔ مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کرنے کا جنون بھی دراصل میری انہی محرومیوں و ناتوانیوں کا شاخسانہ تھا۔

"کس سوچ میں کھو گئے دلبر؟" عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی لیٹا ہوں۔"

"یار! اب یونہی نہیں لیٹنا چاہیے۔ کچھ کرنا چاہیے۔ قدرت نے ہمیں ایک بڑا اچھا موقع دیا ہے۔ ویسے تو ہم شاید سیٹھ سراج جیسے بندے سے ٹکر نہ لے سکتے لیکن اب حالات خود اس سے ٹکر لے رہے ہیں۔ شاید اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے اپنے کرتوت ہی اس کی سزا کو آواز دے رہے ہیں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ اقبال دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ عمران پھیل کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ "تم کیا چاہ رہے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"جو میں چاہ رہا ہوں، وہ تم بھی اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ تمہاری منگیتر ثروت کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ذمے دار سراج کا اوباش بیٹا واجی تھا۔ اس کے بعد ثروت کی فیملی کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی ذمے داری سراسر اس خبیث سراج پر آتی ہے۔ ان باپ بیٹے نے تمہیں اجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اب یہ دونوں کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ کم از کم میں تو انہیں کسی صورت معاف نہیں کر سکتا۔"

میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو عمران! سیٹھ اور اس کے بیٹے کو سزا ملنے سے مجھے وہ سب کچھ واپس مل جائے گا جو میں کھو رہا ہوں؟"

عمران نے اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہارا اشارہ ثروت کی طرف ہے اور میں تمہارے دکھ کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم اس سلسلے میں بھی آسانی سے ہار نہیں مانیں گے... بلکہ ہار مانیں گے ہی نہیں۔ ہم سرحد کی باڑیں پھلانگیں گے میرے شہزادے۔ کچے گھڑے پر تیر جائیں گے... اور دریا ہی پار نہیں کریں گے بلکہ سمندر پار کریں گے۔ ہم ڈھونڈیں گے اس کو... اور اتنی شدت سے ڈھونڈیں گے کہ اس کو ملنا ہی پڑے گا... لیکن اب جو بات میں کر رہا ہوں، یہ بھی غیر اہم نہیں ہے۔ قدرت ہمیں سیٹھ سے بدلہ لینے کا

ایک سنہری موقع فراہم کر رہی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ آسانی سے گرفت میں آجائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ ہماری توقع سے زیادہ لمبے ہوں۔''

''لیکن ہم بھی تو اس پر نرم ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے۔ نرم ہاتھ ڈالا ہوتا تو وہ آج بھی سلاخوں کے پیچھے نظر آ سکتا تھا۔ کم از کم اس پر ایک عدد ''پرچہ'' تو ہو ہی سکتا تھا۔ اس کے لیے چھیدے اور زینو کے بیان کافی تھے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے شک ہو رہا ہے کہ سیٹھ جو کچھ کر رہا ہے، اس کا دائرہ ہماری توقع سے زیادہ وسیع ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اس سلسلے میں تھوڑی سی چھان بین کریں۔ چھیدے نے جو لال کوٹھیوں والی اطلاع دی ہے، یہ ہمارے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہے... اور مجھے لگ رہا ہے کہ ہمارے لیے یہ لال کوٹھیوں والی جگہ ڈھونڈنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔''

''لال کوٹھیوں والی جگہ مل گئی تو پھر کیا ہوگا؟''

''پھر یہ پتا چلے گا کہ سراج اور عارف کی باتوں میں بار بار ان کوٹھیوں کا ذکر کیوں آ رہا ہے۔ یہ میڈم صاحب کون ذات شریف ہیں اور کیا سیٹھ سراج جو کچھ بزنس میں کر رہا ہے، اس کا تعلق ان لال کوٹھیوں سے بھی ہے؟''

میں ویسے تو اس سارے معاملے سے بیزاری ظاہر کر رہا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب میرے اندر بھی ایک لہر سی جاگی ہوئی تھی۔ سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے کے لیے میرے اندر چند روز پہلے جو بے پناہ نفرت پیدا ہوئی تھی اور جس نے مجھے خودکشی کی طرف مائل کر دیا تھا، اب ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو سزا کے شکنجے میں دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر جو یہ تبدیلی واقع ہوئی تھی، اس کی بڑی وجہ خود عمران تھا۔ اس شخص کا عجیب و غریب کردار اور اس کا بے پایاں حوصلہ مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، کیا یہ لال کوٹھیوں والی جگہ ڈھونڈنا آسان ہوگا؟''

''یہ ہوئی نا فائیو اسٹار بات۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ ''اب تم نے دلچسپی ظاہر کر دی ہے تو یہ کام ایسا مشکل بھی نہیں ہوگا۔ یہ دیکھو، میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کام کیسے ہوگا۔'' اس کے انداز میں شوخی تھی۔

اس نے الماری میں سے ایک اوور کوٹ نکال کر پہنا، سر پر پی کیپ جمائی اور ہاتھ میں پائپ کی جگہ بڑے اسٹائل سے ایک تنکا پکڑ لیا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر وہ شرلاک ہومز کے اسٹائل میں بولا۔ ''دیکھو ڈاکٹر واٹسن... میرا مطلب ہے ڈاکٹر جانی... کہ لاہور میں ایک جگہ ہے جو لال کوٹھیوں کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور کی آبادی ساٹھ ستر لاکھ ہو چکی ہے۔ اتنی بڑی آبادی میں سے یہ جگہ ڈھونڈنی مشکل تھی مگر اب ہمارے لیے کافی آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جگہ ایک ایسے علاقے میں ہے جو لاہور ایئرپورٹ کے اردگرد ہے۔ اس طرح یہ کام کافی ''شارٹ لسٹ'' ہو جاتا ہے۔ ہو جاتا ہے کہ نہیں؟''

''بالکل ہو جاتا ہے۔'' میرے بجائے ساتھ والے کمرے سے اقبال نے جواب دیا۔ وہ ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔ اس کی کنپٹی پر ایک میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔

''ویری گڈ! میرا خیال ہے کہ تم جیلانی اور سرفراز کو لے کر علاقے کا... سروے کرو۔ دو چار ڈاک خانوں میں جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ اس جگہ کا پتا چل جائے گا۔''

''جو حکم والے تھانے والا صیب۔'' اقبال نے اسٹائل سے کہا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

میں بدستور سنجیدہ رہا۔ ہنسنا اور مسکرانا تو میں جیسے بھول ہی چکا تھا۔ عمران نے بغور میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یار! ایک بار گھر فون کر لو۔ تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔''

وہ پچھلے دو تین روز میں کم از کم ایک درجن مرتبہ یہ مشورہ دے چکا تھا۔ شروع میں تو مجھے یہ مشورہ بالکل ناقابل عمل لگ رہا تھا مگر اب میرے ردعمل میں تھوڑی سی تبدیلی آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں ایک بار واقعی گھر میں بات کر لوں تو گھر والوں کی پریشانی بڑی حد تک کم ہو سکتی ہے۔ خاص طور سے مجھے والدہ کی طرف سے فکر لاحق تھی۔ میری گمشدگی کی پریشانی انہیں کسی بڑی مصیبت سے دوچار کر سکتی تھی۔ میں نے دیر تک اس معاملے پر غور کیا اور پھر شدید تذبذب میں سے نکل آیا۔

میں نے عمران سے اس کا سیل فون لیا اور گھر کی چھت پر چلا گیا۔ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے میں نے گھر کا نمبر ملایا۔ فون والدہ نے ہی اٹھایا۔ انہوں نے میری آواز سنی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ اس رونے میں خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔ ''تم کہاں ہو والی! خدا کے لیے بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟ تم ٹھیک تو ہو!... تم ایسا کیوں کر رہے ہو ہمارے ساتھ؟ تمہیں پتا ہے میں چودہ دن اسپتال رہ کر آئی ہوں۔ کیا تم میری جان لینا چاہتے ہو؟ کیا مارنا چاہتے ہو مجھے...'' وہ بغیر رکے بولتی چلی گئیں۔

میں نے انہیں دلاسا دیا۔ بتایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں... اور اپنی مرضی سے یہاں موجود ہوں۔

وہ فریادکناں انداز میں بولیں۔ ''تم کیوں واپس نہیں آ رہے ہو۔ تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟ اگر واجد اور اس کے باپ والا مسئلہ ہے تو ہم یہ گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تمہاری پھوپھی کے گھر سرگودھا چلے جائیں گے۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ بس واپس آ جاؤ۔''

''مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے امی... بس ایک مجبوری ہے۔ میں آ کر آپ کو بتاؤں گا لیکن ابھی کچھ دن میں نہیں آ سکتا۔ میں آپ کو فون کرتا رہوں گا۔''

''کتنے دن نہیں آ سکتے؟ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ اس طرح ہمیں انتظار کی سولی پر مت لٹکاؤ۔''

اسی دوران میں فرح نے والدہ سے ریسیور لے لیا۔ وہ بھی رونے بلکنے لگی۔ ''بھائی! آپ کو میری قسم، آپ واپس آ جائیں۔ ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

میں نے اس کو پچکارا اور تسلی دی۔ چھوٹے بھائی عاطف اور چچا وغیرہ سے بھی میری بات ہوئی... اس گفتگو سے یہ اندیشہ درست ثابت ہوا کہ پارک میں سیٹھ سراج کے کارندوں نے میرے ساتھ جو مار پیٹ کی تھی، اس کی خبر ہر ایک کو ہو چکی ہے۔ شروع میں تو میرے گھر والوں اور عزیزوں کو یہی اندیشہ تھا کہ مجھے پارک میں مارنے پیٹنے کے بعد سراج نے کہیں بے جا میں رکھا ہوا ہے، وہ تھانے بھی جا چکے تھے تاہم بعد میں علاقے کے ناظر نے سیٹھ کی طرف سے اس بات کی گارنٹی دی کہ میں سیٹھ کی تحویل میں نہیں ہوں۔ بعد میں میری طرف سے عمران نے میرے گھر فون بھی کر دیا تھا۔ اس فون کے بعد گھر والوں کو کچھ تسلی ہوئی تھی۔

میں نزان کے گھر کی چھت پر ٹہلتا رہا اور ساتھ ساتھ گھر والوں سے بات بھی کرتا رہا۔ وہ رو رہے تھے اور میری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے۔ فی الحال میں انہیں تسلی تشفی کے سوا کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ والدہ مسلسل فریادکناں تھیں... ''والی! تو تو ناشتا بھی نہیں کر کے گیا تھا۔ بھوکے پیٹ نکل گیا تھا گھر سے۔ تیری جیب میں تو پیسے بھی نہیں تھے۔ بس ایک جوڑا تھا تیرے پاس۔ کیا پہنتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟''

میں نے انہیں بتایا کہ میں لاہور میں ہی ہوں اور اپنے ایک قریبی دوست کے گھر میں ہوں۔ میری ہر ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ روزانہ فون کروں گا اور بات ختم کر دی۔ ہمارے گھر کے فون میں سی ایل آئی نہیں تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ عمران کا سیل نمبر گھر والوں کو معلوم نہیں ہوگا۔

گھر میں بات کر کے مجھے کافی تسلی ہوئی۔ یوں لگا کہ سر پر رکھا ہوا ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ یہ ایک ایسا بوجھ تھا جس نے پچھلے چند روز سے میری گردن توڑ رکھی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا تاہم کچھ نہ کچھ ریلیف مجھے ضرور مل گیا تھا۔

میں جن حالات سے گزر رہا تھا، یہ بڑے تند و تیز تھے۔ عمران کی پارہ صفت طبع نے انہیں مزید تند و تیز بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود ثروت کا دھیان کسی گھڑی بھی میرے ذہن سے نکلتا نہیں تھا۔ وہ کہاں ہوگی... کیا کر رہی ہوگی؟ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟ اس طرح کے بے شمار سوالات ذہن میں کلبلاتے رہتے تھے۔ میرے پاس ثروت یا ناصر بھائی سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ پاکستان سے یوں اوجھل ہوئے تھے کہ اپنے پیچھے کوئی نشان ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ان کا واحد نشان ان کے محلے کے پراپرٹی ڈیلر وہ حاجی صاحب تھے جنہیں وہ اپنے مکان کی فروخت کا ذمے دار بنا گئے تھے۔ بعد ازاں حاجی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ناصر بھائی انہیں مکان کا مختار نامہ بھی دے گئے ہیں۔ سیٹھ سراج کے ساتھ لڑائی والا واقعہ پیش آنے سے پہلے میں دو تین دفعہ حاجی صاحب کے پاس گیا تھا لیکن وہ مجھے ناصر بھائی کا کوئی سراغ فراہم نہیں کر سکے تھے۔ ہر حال، انہوں نے یہ بات ضرور بتائی تھی۔ ایک دو بار مجھے ایسے بھی لگا تھا کہ شاید وہ ناصر بھائی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دانستہ مجھے مکمل معلومات نہیں دے رہے۔

اس روز رات گئے عمران سرکس میں ڈیوٹی دے کر واپس آیا تو میں جاگ رہا تھا جبکہ اقبال سرِشام ہی کھانا کھا کر سو گیا تھا۔ میری سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ اپنے مخصوص والہانہ انداز میں مسکرایا اور میری طرف جھک کر بولا۔ ''کیا بات ہے جگر! رونے دھونے کی پریکٹس تو نہیں کر رہے تھے؟''

''رونے سے کچھ ہو سکتا تو سارے شہر کو ڈبو دیتا۔'' میں نے آہ بھری۔

''ثروت یاد آ رہی ہے نا؟'' وہ قدرے شوخی سے بولا۔ پھر ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ ''چلو اٹھو... ابھی چلو میرے ساتھ۔''

''کہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی ثروت سے ملنے چلتے ہیں اور کیا؟ یہاں سے اسلام آباد پہنچتے ہیں۔ وہاں سے ویزا لگواتے ہیں۔ سیدھا جرمنی لینڈ کرتے ہیں۔ وہاں سجدہ ہال میں... تمہیں نہیں، گرجا

گھروں میں اعلان کرواتے ہیں کہ ایک اجلے اجلے نکھرے والی سوہنی موہنی لڑکی جس نے پاکستانی لباس پہن رکھا ہے اور جس کی آنکھوں میں کسی کا پیار بسا ہے... کچھ عرصہ پہلے پاکستان سے نکلی، ابھی تک واپس نہیں آئی اور نہ اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی ہے.. لہٰذا...''

''یہ مسخری نہ کرو۔ میں ایسے موڈ میں نہیں ہوں۔''

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اب اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کیوں نہ کل ہم انہی حاجی صاحب کے پاس چلیں جن سے تمہارے ناصر بھائی کی بات ہوئی ہے؟''

یہ اس نے میرے دل کی بات کہی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ باقاعدہ میرے دل میں جھانک لیتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''وہاں جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ ناصر بھائی اپنا اتا پتا تو حاجی صاحب کو بھی نہیں بتاتے۔''

وہ مسکرایا۔ ''داڑھیوں میں سے کچھ حاجی بڑے کچے چٹھے ہوتے ہیں۔ دل کی بات زبان پر نہیں لاتے۔ بڑی گہرائی ہوتی ہے ان کے اندر۔ ہوسکتا ہے یہ حاجی صاحب بھی اسی قسم کے ہوں۔ بہرحال، میں ساتھ ہوں گا تو ہم کچھ نہ کچھ کرگزریں گے۔''

ہمارا پروگرام بنا کہ اگلے روز شام کو ہم حاجی صاحب سے ملیں گے مگر شام سے پہلے ہی ایک الٹی بات ہوئی کہ یہ پروگرام ملتوی ہوگیا اور ہم ایک دوسرے گمبھیر چکر میں الجھ گئے۔ تقریباً چار بجنے کا وقت تھا۔ عمران ابھی سو کر اٹھا تھا اور اپنے ہاتھ کی مالش کر رہا تھا۔ یہ ہاتھ ترائی سواروں کے ساتھ لڑائی میں تھوڑا سا متاثر ہوا تھا۔ بہرحال، اب ٹھیک تھا اور عمران کو امید تھی کہ کل تک وہ سرکس میں موٹر سائیکل کے علاوہ جھولوں والے آئٹم بھی پیش کرسکے گا۔ اچانک اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اقبال تھا۔ اس نے عمران کو کوئی بہت اچھی خبر سنائی تھی اور اس خبر کی وجہ سے عمران کے چہرے پر سرخی جھلکنے لگی تھی۔

وہ تین منٹ تک اقبال سے بات کرنے کے بعد عمران نے موبائل جیب میں ڈالا اور میرے کندھے پر تھپکی دے کر بولا۔ ''مبارک ہو شہزادے! ان کوٹھیوں کا پتا چل گیا ہے۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق یہ کوٹھیاں جس علاقے میں ہیں وہ ائرپورٹ سے زیادہ دور نہیں۔ اقبال نے بھی پرانا اور دانش والا کام کیا ہے۔ وہ کل سے اس چکر میں تھا۔''

اس کے بعد اس نے خود ہی اپنا کندھا تھپک کر خود کو

شاباش دی اور مسرور نظر آنے لگا۔

''اور کیا کہہ رہا ہے اقبال؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے بتایا ہے کہ یہ ایک ہی طرز کی دو کوٹھیاں ہیں۔ دس پندرہ سال پہلے تین بھائیوں نے اپنی رہائش کے لیے بنوائی تھیں۔ پھر ان میں ناچاقی ہوئی اور تینوں یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اب یہ دونوں کوٹھیاں کسی اور کی ملکیت ہیں۔ اقبال اس بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں آکر بتائے گا۔''

ہم بے چینی سے اقبال کا انتظار کرنے لگے۔ وہ تھوڑی تاخیر سے آیا۔ بہرحال، اس کا چہرہ دیکھ کر ہی کہا جاسکتا تھا کہ اس کے پاس دلچسپ اور اہم معلومات ہیں۔ اس نے بتایا۔ ''ان دونوں کوٹھیوں میں اب دو بہنیں رہتی ہیں۔ بڑی بہن کا خاوند کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ اسٹیٹ ڈویلپر تھا اور اس کی بنائی ہوئی دو تین ہاؤسنگ اسکیمیں کامیابی سے فروخت ہوئی تھیں۔ اس کی وفات کے بعد اس کا کام اس کی بیوہ نے سنبھال لیا تھا۔ آج کل وہ بھی ایک ہاؤسنگ اسکیم تیار کر رہی ہے۔ اس جواں سال خاتون کو میڈم یا میڈم شیرازی کہا جاتا ہے۔ ساتھ والی کوٹھی میں اس کی چھوٹی بہن رہتی ہے۔ یہ ذرا پراسرار قسم کی شے ہے۔ اسے بہت کم دیکھا گیا ہے۔ زیادہ تر یہ رنگین شیشوں والی گاڑی میں ہوتی ہے۔ یہ اپنے انجینئر خاوند سے طلاق لے چکی ہے۔ اس کا ذریعہ معاش کیا ہے، یہ بھی پتا نہیں چل سکا۔''

''اس کو بھی میڈم کہتے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''کہنے نہ کہنے کا سوال تو تب ہے یار جب یہ کسی سے ملتی ہو۔'' اقبال نے کہا۔ ''کم از کم جن دو چار بندوں سے میری بات ہوئی ہے، وہ میڈم شیرازی کو ہی جانتے ہیں اور اسی کے بارے میں بتاسکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، اگر کوئی دوسرا نہیں بتا سکا تو ہم خود معلوم کرلیتے ہیں۔ ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں؟''

''پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے لیے۔'' اقبال نے ترنت جواب دیا اور پھر ہنسنے لگا۔

''بعض پھڈے تو ہوتے ہی ٹانگ اڑانے کے لیے ہیں۔ ہم نہیں اڑائیں گے تو کوئی اور اڑائے گا... اور اگر کوئی غلط بندہ کسی غلط پھڈے میں ٹانگ اڑائے گا تو اسے اور غلط کردے گا۔''

''غلط پھڈا میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ پھڈا تو ہوتا ہی غلط ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔

''چلو، تم بولے تو سہی... چاہے الفاظ صحیح کرنے کے لیے

بولے۔'' عمران چہکا۔

☆☆☆

اس رات عمران اور اقبال نے دیر تک ان کوٹھیوں کے بارے میں سرگوشیاں کیں۔ اب تک میں نے عمران کے مزاج کو جو سمجھا تھا، اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ ہر وقت کوئی بھی ضروری یا غیر ضروری خطرہ مول لینے کے لیے ایک دم تیار رہتا ہے۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال کو تفریح کے طور پر لیتا تھا اور اس تفریح میں ہر حد تک جانے کے لیے آمادہ ہوتا تھا۔ جہاں وہ سمجھتا تھا کہ کوئی زیادتی ہو رہی ہے یا غلط کام ہو رہا ہے، وہاں وہ خدائی فوجدار بن کر دخل در معقولات اور غیر معقولات کے لیے پر تولنے لگتا تھا۔

اب بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہنچ گئی تھی۔ سیٹھ سراج کو ذرا چھوٹا سا سبق سکھانے کے لیے عمران نے اپنے ساتھیوں کے ذریعے اس کا ایکسیڈنٹ کروایا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ میں اتفاقیہ طور پر چوریوں والا معاملہ سامنے آیا تھا اور اب چوریوں سے بات آگے بڑھ کر ان کوٹھیوں تک جا پہنچی تھی۔ زلیخا کے خاوند جمید نے کوٹھیوں کا ذکر کچھ ایسے بھید بھرے انداز میں کیا تھا کہ عمران کا تجسس پوری طرح جاگ اٹھا تھا اور اب یہی تجسس اسے کوٹھیوں اور ان کے مکینوں کی طرف کشش کر رہا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق اگلے روز بھی عمران اور اقبال ان کوٹھیوں کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا پروگرام بھی ترتیب دیتے رہے۔ یہ پروگرام رات کو گیارہ بجے کے لگ بھگ میرے سامنے آیا۔ سرکس سے واپس آتے ہی عمران اور اقبال نے کہیں جانے کی تیاری شروع کردی۔ عمران نے بڑی اپنائیت سے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

''لیکن پتا تو چلے کہ جانا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ذرا ان کوٹھیوں تک۔'' عمران بولا۔

''اچھا! کوٹھیوں میں سر دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''لیکن ہمیں تو ہے نا یار! تم بس یہ دیکھنا کہ کوٹھیاں کیسے چاٹتی ہیں اور ان میں سر کیسے دے کر تنکا نکالا جاتا ہے۔ تم کچھ نہ کرنا۔ بس ہمارے ساتھ چلو۔ بے شک گاڑی میں بیٹھے رہنا اور اگر دیکھو کہ ہم واقعی اوکھلی میں پھنس گیا ہے تو بلا جھجک واپس چلے آنا۔ ہم اپنے نقصان کے خود ذمے دار ہوں گے۔''

''ویسے اندر کی بات ہے شہزادے بھائی... یہ دو بھولی

سی اوکھلیاں ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔'' اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا کہ عمران کے ساتھ رہ رہ کر وہ بھی اسی جیسا ہوگیا ہے۔

اس معاملے پر دس پندرہ منٹ بحث ہوئی۔ آخر عمران نے مجھے اس حد تک راضی کرلیا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں گا لیکن کوٹھیوں سے تو فاصلے پر کار کے اندر بیٹھا رہوں گا۔

مجھے اس حد تک راضی کرلینا بھی بس عمران ہی کا کام تھا۔ اگر یہ شخص ساتھ نہ ہوتا تو میں اس قسم کے کسی کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ شخص اپنے اندر سے پھوٹنے والی توانائی کے ذریعے مسلسل میری کیمسٹری تبدیل کر رہا تھا۔

ہم رات بارہ بجے کے قریب مہران کار میں بیٹھے اور راولپنڈی روڈ سے ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ تاریک آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ کسی وقت ہلکی پھوار پڑنی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہم پینتالیس منٹ کے اندر ائرپورٹ کے نواح میں پہنچ گئے۔ میرے جسم میں سنسنی کی ایک ہلکی سی لہر چلنی شروع ہوگئی تھی۔ ایسی ہی لہر میں نے اس وقت محسوس کی تھی جب درجنوں تماشائیوں کے سامنے میں نے عمران کے اکسانے پر ''موت... چھڑ'' کا کھیل کھیلنے کا ارادہ کیا تھا۔ گاڑی ہر ایک سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ عمران نے مجھے بتایا نہیں تھا مگر مجھے پتا تھا کہ اس کی ڈیک کے اندر سیاہ رنگ کا ریوالور موجود ہے۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ دونوں سرپھرے ان کوٹھیوں پر جا کر کیا کرنا چاہتے تھے۔ کیا وہ سیدھے طریقے سے ملاقات کے بہانے اندر جائیں گے؟ کیا وہ چوری چھپے اندر گھسیں گے... کیا وہ کسی کو یرغمال وغیرہ بنا کر معلومات حاصل کرنا چاہیں گے؟ ذہن میں کئی سوال ابھر رہے تھے لیکن میں ان سوالات کے جواب حاصل کرکے خود کو اور پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم ایک پوش رہائشی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں درختوں کی بھرمار تھی۔ بس مرلے اور ایک کینال کی بہت سی کوٹھیاں نظر آرہی تھیں۔ عمران نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو، بھئی لال کوٹھیاں... تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔''

یہ دونوں کوٹھیاں دو منزلہ تھیں۔ ایک کوٹھی کی کسی کسی کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی لیکن دوسری مکمل تاریک تھی۔ شیشم، چنار اور توت کے بلند و بالا درختوں نے دونوں کوٹھیوں کو گھیر رکھا تھا۔ عمران نے ایک چھوٹا سا چکر کاٹا اور

کوٹھیوں کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ پچھواڑے کی چھوٹی سڑک بالکل سنسان تھی اور ایک طرف کے پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ انہوں نے گاڑی سڑک سے ہٹا کر کوٹھی کی ایک باڑ کے قریب پارک کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ آج دن کے وقت وہ اس جگہ کا پورا سروے کر چکے ہیں اور اپنا لائحہ عمل ترتیب دے چکے ہیں۔ ان کی ساری حرکات تلی تلی تھیں۔

"شاباش! تم ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاؤ۔" عمران نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

میں حسب پروگرام ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چابی اگنیشن میں لگی تھی۔ وہ میرا کندھا تھپک کر عجیب جوشیلے انداز میں بولا۔ "فکر نہیں کرو جگر... یہ بڑا فائیو اسٹار کھیل ہے۔ جوں جوں کھیلیں گے، مزہ بڑھتا جائے گا۔"

اور واقعی مجھے لگا کہ میرا خوف دب رہا ہے۔ میں نے بے ساختہ سوچا کہ اگر یہ بندہ میرے ساتھ ہے تو پھر مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ان دونوں نے کرکٹ کی اننگ شروع کرنے والے بیٹسمینوں کی طرح ایک دوسرے کے ہاتھ سے ہاتھ ٹکرایا اور محتاط قدموں سے لال کوٹھی کی بیرونی دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ اس عقبی دیوار میں ایک چھوٹے دروازے کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ دیوار کی اونچائی دس فٹ سے کم نہیں تھی۔ یہ وہی کوٹھی تھی جو مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی کے اندر سے دیکھا، عقبی دیوار کے قریب پہنچ کر عمران کا ہیولا دائیں اچھلا۔ یہ ایک ہی جست تھی جیسی وہ ایک جھولے سے دوسرے جھولے تک پہنچنے کے لیے لگاتا تھا۔ اس جست کے ساتھ اس نے باؤنڈری وال کا بالائی کنارہ تھام لیا اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ دیوار میں نظر آنے والا دروازہ دبے آواز کھل گیا ہے۔ اقبال اس دروازے میں داخل ہوا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔

اب میں تھا اور میرے دل کی بے ترتیب دھڑکنیں تھیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک خطرناک مہم جوئی میں شامل ہو چکا تھا۔ اب اس مہم جوئی سے متعلق سارے خطرے میرے لیے بھی تھے۔ میرے کان ہر لحظہ کسی ان چاہی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ یہ آواز کسی کے چلانے کی ہو سکتی تھی، گولی چلنے کی ہو سکتی تھی یا پھر الارم کا شور ہو سکتا تھا۔

اسٹیئرنگ پر بھی میری ہتھیلیوں پر پسینا آنے لگا۔ بارش کی ہلکی پھوار ونڈ اسکرین کو دھندلاتی چلی جا رہی تھی۔ اسی طرح تقریباً پچیس منٹ گزر گئے۔ لال کوٹھی بدستور مسلسل تاریک تھی۔ کہیں کسی حرکت کے آثار نہیں تھے۔ فقط ایک بالکونی میں دو تین سیکنڈ کے لیے روشنی نظر آنے کے بعد بجھ گئی تھی۔ اچانک ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا موبائل فون جاگ گیا۔ یہ فون اقبال میرے لیے ہی یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل اور چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کال ریسیو کی۔ دوسری طرف عمران خود تھا۔ اس نے نارمل لہجے میں کہا۔ "ہاں! گھبرانے کی بات نہیں ہے لیکن... یہاں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا ہے۔"

"کیا ہوا؟"

وہ مدھم آواز میں بولا۔ "تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تمہیں بس دو تین منٹ کے لیے اندر آنا ہوگا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یار! ایک دروازے کو باہر سے کنڈی لگ گئی ہے۔ اب وہ باہر سے ہی کھل سکتا ہے۔ جلدی آؤ ورنہ ہمارا سارا مشن بے ہول ہو کر کوے میں چلا جائے گا۔" وہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔

"دیکھو عمران! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں گاڑی سے باہر نہیں آؤں گا... تم نے..."

"بھئی! بات تو سنو۔" اس نے تیز لہجے سے قطع کلامی کی۔ "میں تمہیں یہاں ڈاکا ڈلوانے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ صرف دو منٹ کے لیے اندر آنا ہے۔ باؤنڈری وال والا دروازہ کھلا ہے۔ لان سے آگے برآمدہ ہے۔ برآمدے میں بائیں طرف والا کمرا ہے۔ بس باہر سے کنڈی کھول کر واپس چلے جاؤ۔ یار! اتنی سی مدد تو کوئی راہ چلتا بھی کر دیتا ہے۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ "لیکن کنڈی لگی کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا لیکن یہ گارنٹی ہے کہ خطرہ کوئی نہیں ہے یہاں۔ ساری کوٹھی سنسان پڑی ہے۔ بس آ جاؤ جلدی سے۔" مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے بالکونی میں روشنی بھی ہوئی تھی۔ وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس میں خوف کا دور دور تک شائبہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کا لب ولہجہ ایسا ہوتا تھا کہ میرے لیے اس کی بات ٹالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

میں نے اپنی ہمت بندھانے کی کوشش کی اور یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہمت بندھ گئی ہے۔ میں اپنے اندر جو غیر معمولی تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا، شاید یہ ان کی ہی ایک کڑی تھی۔ سیفٹی ایکسچینجر! ورنہ پھر اپنی جان لینے کی نہایت بیہودہ کوشش کرتا۔ پھر سرکس میں ریوالور کے کھیل میں خود پر گولی چلاتا... اور اس کے بعد ہائی وے سے واپس آتے ہوئے راستے میں ٹرالی سواروں سے لڑتا اور ایک ٹرالی سوار پر اپنے ہاتھ سے وار کرتا... یہ سب ان تبدیلیوں کی ہی جھلکیاں تھیں۔

میں اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا گاڑی سے اترا اور باؤنڈری وال کا دروازہ کھولتا ہوا اندر چلا گیا۔ یہ عقبی صحن تھا۔ تقریباً تین چار مرلے میں ہوگا۔ ایک طرف گراسی لان تھا جس میں لوہے کی سفید کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایسی جگہوں پر رکھوالی کے کتے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن اگر کتا ہوتا تو آدھ گھنٹا پہلے ہی سامنے آ گیا ہوتا۔ برآمدہ تاریک تھا۔ میں نے موبائل فون مسلسل کان سے لگا رکھا تھا۔ "اندر آ گئے ہو؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"برآمدے میں بائیں طرف دیکھو۔ ایک چھوٹا دروازہ ہے، دوسرا بڑا ہے، گہرے پیلے رنگ کا... نظر آ رہا ہے؟" میں نے پھر ہنکارا بھرا۔

"دروازے کو باہر سے چٹخنی چڑھائی گئی ہے، اسے آرام سے گرا دو۔"

میں نے ہدایت پر عمل کیا اور لرزتے ہاتھوں سے پیلے رنگ کے دروازے کی چٹخنی گرا دی... دونوں سامنے ہی کھڑے تھے۔ عمران نے کندھا تھپک کر مجھے شاباش دی۔ "جیتے رہو۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ تمہاری ہر دلی مراد پوری ہو۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ تھی۔ ایسی ہی ٹارچ اقبال کے ہاتھ میں بھی نظر آ رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمران اور اقبال دونوں نے بڑے سائز کے گرم مفلر وغیرہ کے ذریعے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر پہلے ہی "پی کیپس" تھیں۔ لہٰذا اب ان کی آنکھوں اور تھوڑی سی پیشانی کے علاوہ باقی چہرہ پوشیدہ تھا۔

"لو، یہ ٹوپی پہن لو تم بھی۔" عمران نے جیکٹ کی جیب سے ایک گرم ٹوپی نکال کر میری طرف بڑھائی۔ یہ وہی ٹوپا تھا جس میں سے صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔ سر، چہرہ اور گردن وغیرہ چھپ جاتے ہیں۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ میں اب واپس جانا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ بھانپ کر عمران نے جلدی سے سرگوشی کی۔ "ایک چیز دیکھ لو پھر چلے جانا۔" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے میں کھینچا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ کوٹھی میں چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے پنسل ٹارچ روشن کی۔ ٹارچ کا چھوٹا سا دائرہ فرش کے قالین پر پڑنے لگا۔ عمران محتاط قدموں سے چلتا ہوا ایک بغلی دروازے تک پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ہم ایک مستطیل کمرے میں تھے۔ اس کمرے کی دیواروں پر بہت سی پینٹنگز نظر آ رہی تھیں۔ یہ نہایت قیمتی فریموں والی پرانی تصویریں تھیں۔ زیادہ تر وکٹورین دور کے مناظر کو پیش کر رہی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ ان ساری تصویروں میں عریانی کا عنصر نمایاں تھا۔ چند تصویروں کو تو فحش بھی کہا جا سکتا تھا۔ ان میں عورتوں کے علاوہ مرد بھی تھے۔ انگوریہ دور کے ایک دربار کی پینٹنگ نہایت بولڈ تھی۔ مصور نے دربار میں شراب نوشی، بدمستی اور عیش و عشرت کے مناظر پینٹ کیے تھے۔ بادشاہ اور درباری جام پر جام لنڈھا رہے تھے اور مورتوں کے عریاں جسموں سے کھیل رہے تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

میں ان تصویروں پر نگاہ دوڑا رہا تھا لیکن میرا دھیان چٹخنی کی طرف ہی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں... یا کم از کم میں تو واپس گاڑی میں پہنچ جاؤں۔ بے شک کوٹھی میں مکمل سکوت تھا مگر یہ ضروری تو نہیں تھا کہ سکوت برقرار بھی رہے... اور پھر سوچنے کی بات تھی کہ برآمدے والے دروازے کو باہر سے کنڈی کس نے لگائی تھی؟ آخر کوئی نہ کوئی تو یہاں جاگ رہا تھا۔ شاید اس نے یونہی دروازہ چیک کیا تھا اور اسے کھلا دیکھ کر باہر سے چٹخنی چڑھا دی تھی۔ پھر میری نگاہوں میں سیٹھ سراج کا چہرہ گھوما۔ اس کا حلیہ بھی تو ان کنجوں سے بیان کیا جا رہا تھا۔ اگر سیٹھ سراج یا اس کے کسی کارندے سے یہاں ملاقات ہو جاتی تو میرا بھانڈا بری طرح پھوٹ سکتا تھا۔ ان لمحوں میں، میں نے محسوس کیا کہ مجھے عمران کی "ٹوپی والی بات" مان لینی چاہیے تھی۔ ٹوپی اس کی جیکٹ کی بائیں جیب میں تھی۔ میں نے یہ گرم ٹوپی نکالی اور ذرا سی جھجک کے ساتھ پہن لی۔

عمران کی ٹارچ کا دائرہ اب ایک سائڈ بورڈ پر رینگ رہا تھا۔ اس نہایت دیدہ زیب سائڈ بورڈ پر گندھارا آرٹ کے کچھ نمونے سجائے گئے تھے۔ تین چار منٹ مزید گزر گئے۔

"عمران! اب چلو یہاں سے۔" میں نے تیز سرگوشی کی۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، ایسا کچھ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں تو خیر اس سارے معاملے کی گہرائی سے ویسے ہی بے خبر تھا، عمران اور اقبال کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ صورت حال یوں اچانک پلٹا کھا لے گی۔ یہ

تاریک مستطیلی کمرا اچانک چکا چوند روشنی سے بھر گیا۔ ایک نہایت تنومند شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس نے چنگھاڑنے والے انداز میں کچھ کہا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ عمران سے ایسے فوری اور انتہائی برق رفتار ردعمل کی توقع مجھے نہیں تھی... اور یقیناً اس گرانڈیل شخص کو بھی نہیں تھی جو اندر گھسا تھا... میں نے بس عمران کی لات کو حرکت کرتے دیکھا۔ اس کے بعد دوسرا منظر جو میری آنکھیں پکڑ سکیں، پستول کے ہوا میں اڑنے اور کمرے کی منقش چھت سے ٹکرانے کا تھا۔ عمران ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کسی عقاب کی طرح نووارد پر جھپٹا۔ اس کا گھٹنا مدمقابل کی ناف پر لگا پھر ایک ایسی ٹکر اس کے چہرے پر پڑی جو شاید پتھر میں بھی دراڑ ڈال سکتی تھی۔ گرانڈیل شخص لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے عمران پر مکا چلایا۔ یہ بے جان وار عمران نے آسانی سے جھک کر بچایا اور تب اس کے سر کی دوسری شدید ترین ضرب مدمقابل کے چہرے پر پڑی۔ اس بار وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا اور تیورا کر ایک خوب صورت مرتبان پر گرا۔ مرتبان اور وہ دونوں زمین بوس ہوئے۔ یہی وقت تھا جب دو مزید افراد بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ دونوں صورتوں سے اس عمارت کے پہرے دار ہی نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے کی صورت حال کو دیکھ کر رائفل استعمال کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتا، اقبال دروازے کی اوٹ سے رائفل بردار پر جھپٹا اور ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ رائفل اس سے چھین لی۔ دوسرے شخص نے اپنی سیاہ جیکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ یقیناً وہ بھی ہتھیار نکالنا چاہ رہا تھا۔ ''خبردار!'' عمران دہاڑا اور اپنے بریٹا پستول کی نال اس کے سینے کی طرف کر دی۔ یہ دونوں پہرے دار جہاں کے تہاں سکتہ زدہ کھڑے رہ گئے۔

یہ سارا ایکشن ناقابل یقین حد تک تیز رفتار تھا۔ مجھے اس بے پناہ مہارت کا احساس ہوا جو عمران اور اس کے ساتھی کو ایسے کاموں کے لیے حاصل تھی۔ سب سے زیادہ قابل دید وہ پھرتی تھی جس کی مدد سے عمران نے گرانڈیل شخص کو صرف دو تین سیکنڈ میں چاروں شانے چت کیا تھا۔ یہ اٹھائیس تیس سالہ خطرناک صورت شخص عمران سے قریباً ڈیڑھ گنا وزن تو رکھتا ہوگا۔ اس کے سانولے چہرے پر زخموں کے نشان اس کی جارحانہ طبع کی گواہی بھی دے رہے تھے۔ لیکن فی الوقت وہ اپنے لہولہان چہرے کے ساتھ مرتبان کے ٹکڑوں کے درمیان بے دست و پا پڑا تھا۔

عمران نے بعد میں آنے والے پہرے داروں کو بھی اس گرانڈیل شخص کے پاس کھڑا کر دیا اور ان تینوں کو ایک ساتھ رائفل کے نشانے پر لے لیا۔ یہ وہی آٹھ ایم ایم رائفل تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اقبال نے پہرے دار سے چھینی تھی۔ وحشیانہ پن میں عمران کے چہرے سے مٹ چکا تھا۔

گرانڈیل شخص کے ہاتھ سے نکلنے والا پستول اقبال نے قالین سے اٹھایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد باہر سے کسی عورت کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ اس نے چلانے کی ادھوری کوشش کی تھی۔ پھر قدموں کی چاپ ابھری اور اقبال ایک عورت کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یہ چالیس پینتالیس سال کی ایک فربہ اندام ملازمہ تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور چربی دار جسم تھل تھل کر رہا تھا۔

''اس بھینس نے باہر سے کنڈی لگائی تھی۔'' اقبال نے اس کی پشت پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ سخت حیران بھی تھی۔ میرا یہ اندازہ درست لگتا تھا کہ وہ دروازہ کھلا دیکھ کر بے دھیانی میں کنڈی چڑھا گئی ہے۔

آج میں عمران کا ایک نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خاصا بے رحم نظر آ رہا تھا۔ اس کے تاثرات گواہ تھے کہ اگر ان تین افراد میں سے کسی نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو وہ انہیں زخمی کرنے کے لیے بے دریغ گولی چلا دے گا۔ ظاہر ہے جو شخص ریوالور کے تین خانوں میں گولی رکھ کر دو پر فائر کر سکتا تھا، وہ دوسروں پر بھی کر سکتا تھا۔

''تم چاروں کے علاوہ اور کون ہے یہاں؟'' عمران نے پوچھا۔

''سنگ... کوئی نہیں۔'' لمبے قد والے پہرے دار نے جواب دیا۔

''اگر بات جھوٹ نکلی تو مرنا پڑے گا۔'' اقبال نے دھمکی دی۔

پہرے دار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''اقبال! یہ سامنے والے باتھ روم کا دروازہ کھولو۔''

اقبال نے دروازہ کھولا۔ ''چلو، تم دونوں گھسو باتھ روم میں۔ اگر گرم پانی آ رہا ہے تو نہا لو۔ اگر نہیں آ رہا تو انتظار کرو... چلو شاباش!'' اس کا اشارہ بعد میں آنے والے دونوں گارڈز کی طرف تھا۔

وہ دونوں متحیر نظروں سے عمران کو دیکھتے رہے۔ ''میں

فارسی نہیں بول رہا۔'' وہ چنگھاڑا۔ ''اندر گھس جاؤ اور اگر آواز وغیرہ نکالی تو پھر وہ آخری آواز ہوگی۔'' اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی اتری ہوئی تھی۔

پہرے دار مرعوب تو پہلے ہی دیکھ کر ہو چکے تھے کہ ان کا پہلوان چند سیکنڈ میں لہولہان ہو کر زمین بوس ہو گیا تھا۔ اب رہی سہی کسر عمران کے انداز نے پوری کر دی۔ وہ رائفل کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھے۔ ''ٹھہرو۔'' عمران نے نیا حکم جاری کیا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ عمران نے اقبال سے کہا کہ وہ ان کی تلاشی لے۔ کہیں ان کی جیبوں میں موبائل فون وغیرہ نہ ہو۔ اقبال نے بڑی احتیاط اور مہارت سے دونوں کی تلاشی لی۔ ایک کی جیب سے موبائل نکل آیا۔ اقبال نے دونوں کو باتھ روم میں دھکیل کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد گرانڈیل شخص اور فربہ اندام ملازمہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ عمران اور اقبال نے تلاشی کے بعد ان دونوں کو دوسرے باتھ روم میں لاک کر دیا۔ گرانڈیل شخص میں ابھی تک کچھ دم خم موجود تھا۔ اس کی تلاشی لیتے ہوئے عمران نے یہ احتیاط کی تھی کہ اس کی جیکٹ بھی اتروالی تھی۔

ابھی گرانڈیل شخص اور ملازمہ کو باتھ روم میں بند کیے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ ان پر ایک اور آفت ٹوٹ پڑی۔ یہ آفت ایک لڑکی کی صورت میں تھی۔ بہتر یہی لگا کہ یہ لڑکی اچانک زمین میں سے اگ آئی ہے۔ وہ بغلی دروازے سے برآمد ہوئی اور عجیب انداز میں چلا کر عمران سے لپٹ گئی۔ وہ عقب سے آئی تھی۔ اس نے عمران کو رائفل سمیت اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اس کے بازو گویا کسی شکنجے میں کھینچ لیے۔

عمران نے خود کو تیزی سے گھمایا اور لڑکی کی بانہوں کا گھیرا توڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اس سے پہلے کہ پھر وحشت میں وہ پھر عمران پر جھپٹتی، اقبال نے اسے جھاپ لیا۔ اقبال نے ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اس کے منہ پر جمایا اور ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے تھوڑا سا ہوا میں اٹھا لیا۔ وہ دائیں بائیں چلا کر رہ گئی۔ اس کی آواز اس کے منہ میں ہی دب گئی تھی۔ بس مشکل ''غوں غاں'' سنائی دے رہی تھی۔

یہ تیئس چوبیس سالہ قبول صورت لڑکی تھی۔ سب سے حیران کن چیز لڑکی کا حلیہ تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ بالکل یہی لگا کہ کسی انگریزی یا انڈین فلم کا سین دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی کے جسم پر مختصر ترین لباس تھا۔ چند انچ کپڑا

مال کا مآل

مشہور امریکی میگزین فوربس کے مطابق دنیا کے امیر ترین افراد میں چار افراد کا تعلق بھارت سے ہے۔ مثلاً لکشمی امبانی، انل امبانی اور کشال پال سنگھ بالترتیب چوتھے، پانچویں، چھٹے اور آٹھویں نمبر پر ہیں۔ ان کی دولت اربوں میں ہے۔ دولت مند ہونا کوئی بری بات نہیں ہے لیکن کیا دولت ہی سب کچھ ہو سکتی ہے؟

اس کا جواب جرمنی کے شہر کرنل کے ارب پتی کروڑپتی نے اپنی اور گھر والوں کی اجتماعی خودکشی سے دیا ہے۔ جس کے بیٹوں نے اپنی دولت میں تیزتر اضافے کی دوڑ میں بہت سے لوگوں کو کروڑوں روپے بھاری سود پر ادھار دے ڈالے۔ ان میں سے اکثر نادہندہ افراد نے بھرپور اختلاف اس کے باوجود رقم دینے سے انکار کر دیا۔ سود کے لالچ میں اصل رقم بھی ڈوب گئی۔ وہ معاشی مشکلات سے دوچار ہو گیا۔ اس نے آئی سی آئی سی بینک سے اپنے کریڈٹ کارڈ پر قرض لیا۔ اس کا برا وقت آیا ہوا تھا۔ وہ رقم بھی ڈوب گئی۔ بینک کے قرضے کی واپسی کے تقاضے شدید ہو گئے تو اس کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا۔

اس نے اپنی ماں، بیوی اور بیٹیوں کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور سب کے ساتھ تیز رفتار گاڑی کو ایک خونی نہر میں گرا کر تمام زندگیوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہ اپنی ہوس کے نتائج بھگتنے کے لیے اندرا ہیں۔ یہ ہے ہوس زر کا عبرت انگیز انجام!

بالائی جسم پر اور اتنا ہی زیریں جسم پر۔ اس کا دودھیا جسم نیم تاریکی کی تیز روشنی میں دمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی سوئمنگ پول سے نکل کر سیدھا یہاں آ گئی ہے۔

آدھی رات گئے، ایسی سردی میں، ایسا لباس؟ یہ بات سمجھ سے باہر تھی۔ اگر وہ کسی نیم گرم بیڈروم سے نکل کر آئی تھی تو بھی اس کے قیامت خیز جسم پر سلیپنگ گاؤن وغیرہ تو ہونا چاہیے تھا۔ ''بس بس بی بی، بس!'' اقبال نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں لے کر بری طرح جھنجوڑا تو اس کا ہیجان قدرے کم ہوا۔ تاہم وہ خود کو چھڑانے کی کوشش مسلسل کر رہی تھی۔

عمران نے اپنی جیب سے ایک چوڑی انگلش ٹیپ نکالی اور اس کے دو ٹکڑے بڑی مضبوطی اور صفائی کے ساتھ لڑکی کے ہونٹوں پر چپکا دیے۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ٹیپ چپکانے کے دوران ہی اس نے عمران کی ناف میں اپنے ننگے پاؤں کی ایک زوردار ضرب لگائی۔ عمران نے بمشکل اس

ناگہانی ضرب کو برداشت کیا۔

وفعتاً نہ جانے کس طرح لڑکی نے خود کو اقبال کی گرفت سے چھڑایا اور ساتھ والے کمرے کی طرف دوڑی۔ عمران اور اقبال اس کے پیچھے گئے۔ پہلے اس نے اپنے منہ سے ٹیپ اتارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ پھر وہ بیڈ روم میں گھسی۔ بڑی پھرتی سے اس نے ایک الماری کھولی۔ شاید وہ یہاں سے کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کہ اسے کوئی کامیابی ہوتی، عمران نے اسے دوبارہ دبوچ لیا۔ اس نے پلٹ کر عمران کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا۔ عمران نے گھما کر اسے بستر پر پٹخا اور اس کے دونوں بازو کھول کر دونوں طرف دبا لیے۔ وہ عمران کے نیچے بے بس نظر آنے لگی۔ وحشیانہ کشتی میں اس کی عریانی مزید عریانی میں بدل گئی تھی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور سانس جونکی کی طرح چل رہی تھی۔ اب وہ کراہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ ہتھیار نکالنے کے لیے جو الماری اس نے کھولی تھی، اس میں شراب خانہ خراب کی بہت سی بوتلیں بجی ہوئی تھیں۔ ساتھ میں چمکیلے گلاس تھے۔

”اقبال! تم بیرونی دروازوں کا دھیان رکھو۔“ عمران نے کہا۔

اقبال فوراً رائفل سنبھال کر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ لڑکی کی مزاحمت مزید کم کرنے کے لیے عمران نے اس کے منہ پر دو تھپڑ رسید کیے تو وہ رونے لگی۔ وہ عمارت کے اس بند کمرے میں شاید اپنی بے بسی کو پوری طرح محسوس کر چکی تھی۔ اب اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن کہہ رہا تھا کہ یہی گھر کی مالکہ ہے۔ میڈم کی وہ چھوٹی بہن جو بہت کم گھر سے نکلتی ہے اور جس کے بارے میں اقبال نے پُراسرار اور ناقابل فہم ہونے کی رپورٹ دی تھی۔ اس نے موقع دیکھ کر ایک بار پھر عمران کا منہ نوچنے کی کوشش کی تو عمران نے بے رحمی سے اسے اوندھا کر دیا اور اس کے دونوں بازو پیچھے موڑ دیے۔ ”اس خبیث کو باندھو۔“ عمران نے مجھ سے کہا۔

میں نے عمران کا سرخ مفلر اس کے کندھوں سے اتارا اور لڑکی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دیے۔ یہ کام کرتے ہوئے میں نے اپنے اندر ایک عجیب سا تھرل اور مزہ محسوس کیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس ڈرامے کا حصہ بنا ہوا ہوں اور عمران کے کہنے پر وہ سب کچھ کر رہا ہوں جو اس سے پہلے صرف تصورات میں کر سکتا تھا۔

عمران نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ تکیے پر رگڑتے ہوئے پھنکارا۔ ”اب چپ چاپ بیٹھ جا... ورنہ برف کی طرح پچھتائے گی۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک تیرا حشر نشر شروع ہو گیا ہوتا۔ خدا کا شکر کر کہ تیرا واسطہ شریفوں سے پڑا ہے۔“

میں نے اطمینان کی سانس لی ورنہ چند لمحے پہلے مجھے خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ شاید عمران مشتعل ہو کر کوئی غلط راستہ اختیار کرنے والا ہے... اسی دوران میں، میں نے عمران کے چہرے پر کچھ الجھن دیکھی۔ وہ مسلسل چھت کے ایک کونے کو دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور پھر مجھے بھی شک گزرا کہ یہاں کوئی ویڈیو کیمرا نصب ہے۔

اچانک ایک بندہ لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے پتلون اور جرسی پہن رکھی تھی... عمر کوئی پچیس چھبیس سال رہی ہو گی۔ عمران اسے دیکھ کر چونکا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس شخص کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اس نے عمران کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی چونکہ عمران کے نیچے اوندھی پڑی ہوئی تھی، لہٰذا وہ اس شخص کی آمد کو دیکھ سکی اور نہ اشارے کو۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگا کہ یہ شخص اس کوٹھی کے مکینوں میں سے ہے لیکن وہ عمران کو اشارہ کیوں کر رہا تھا... اور کیا عمران اسے جانتا تھا؟

اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ عمران اس شخص کو جانتا ہے۔ اس شخص کی طرف سے باہر آنے کا اشارہ ملنے کے فوراً بعد عمران نے لڑکی کی عریاں ٹانگوں کو ایک اسکارف نما سوتی کپڑے کے ساتھ نہایت مضبوطی سے باندھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہاتھ اور پاؤں بندھنے کے بعد لڑکی اب پوری طرح بے بس ہو گئی۔ وہ کسی لاچار پرندے کی طرح بس تھوڑا بہت پھڑپھڑا سکتی تھی۔ میں بھی عمران کے پیچھے ہی باہر آ گیا۔

لنگڑانے والا قبول صورت شخص کوریڈور میں عمران کے پاس کھڑا تھا... وہ کہہ رہا تھا۔ ”خدا کا شکر کریں کہ میں یہاں موجود ہوں اور آپ کو خطرے کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ بس آپ یہاں سے نکل جائیں۔“

”لیکن کچھ پتا تو چلے۔“

”یہ دیکھیں ہیرو بھائی! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“ وہ سخت ہیجانی لہجے میں بولا۔ ”آپ کو کچھ اندازہ نہیں، یہاں کیا ہو رہا ہے۔ آپ بری طرح پھنسنے والے ہیں۔ دیکھیں، آپ کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ میں آپ کو کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز ہیرو بھائی!“

”کیا تمہارا مطلب ہے، یہاں اور لوگ بھی موجود ہیں؟“

”بالکل ہیرو بھائی! یہ حرام زادی ڈراما کر رہی ہے۔ میں خود آ کر آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔ ایک ایک بات بتاؤں گا۔ بس ابھی آپ نکل جائیے۔“

عمران کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لگ رہا تھا کہ وہ نووارد کی باتوں پر بھروسا کر رہا ہے۔

”ادھر آئیں، میں دکھاؤں آپ کو۔“ اس نے ہیجانی انداز میں عمران کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کوریڈور میں چلا کر ایک گیلری نما کمرے میں لے گیا۔ یہاں بھی فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر نایاب آویزاں تھے۔ میں بھی عمران کے پیچھے ہی گیلری میں داخل ہو گیا۔ ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ یہاں دیواروں کے ساتھ ایک پینل پر پانچ چھ مانیٹرز نظر آ رہے تھے۔ مانیٹرز کی اسکرینوں پر اس کوٹھی کے مختلف مناظر کلوز سرکٹ پر دکھائی دے رہے تھے۔ ایک اسکرین پر وہ دیوار نظر آ رہی تھی جو ایک گھنٹا پہلے عمران نے پھلانگی تھی اور وہ دروازہ بھی جس سے گزر کر میں یہاں پہنچا تھا۔ پھر ایک نیم روشن داہداری کا منظر تھا۔ ایک اور نہایت روشن منظر میں اقبال آتھری ایم ایم رائفل تھامے باتھ روم کے دروازے پر پہرا دے رہا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں عمران اور گرانڈیل شخص کے درمیان ہوائیلی لیکن مختصر لڑائی ہوئی تھی۔

نووارد نے ایک بار پھر عمران کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ کوریڈور میں پہلے والے مخصوص مقام پر پہنچ کر وہ پھر سرگوشی میں بولا۔ ”یہ چھوٹی میڈم بڑی انوکھی اور خطرناک شے ہے۔ آپ کے اندر آنے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی اس کو پتا چل گیا تھا کہ آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو اس کے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا مگر اس وقت آپ یہاں سے چلے جائیں۔“ نووارد کے لہجے میں التجا، محبت اور ہمدردی بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔

”میرا ایڈریس معلوم ہے تمہیں؟“

”بالکل ہیرو بھائی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

صرف دو تین منٹ بعد ہم تینوں عقبی دروازے سے گزر کر گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ عمران اور اقبال بھی الجھن میں تھے۔ تاہم لگتا تھا کہ عمران نے کسی حد تک صورت حال کا تجزیہ...... کیا ہے۔ ہماری گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ایک ٹیک آف کرتا ہوا جہاز عین ہمارے سروں کے اوپر سے شور

ریل گاڑی

”بھائی خیر دین! ہزار کھ دوا۔ ریل گاڑی نے تمہاری گائے کو کچل دیا... اللہ تمہیں صبر دے۔ تمہاری گائے بہت پیاری تھی۔ بستی میں پھرتی رہتی تھی، وہ ریل گاڑی کے نیچے کیسے آ گئی؟“

”وہ ریل گاڑی کو دیکھ کر بھاگی۔“ خیر دین نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ”اسے دیکھ کر انجن پٹری سے اترا، کھیتوں میں اس کا پیچھا کیا، میدان میں بھی اسے نہیں چھوڑا، پھر ہانک کر پٹری پر لے گیا اور اسے کچل کر سیٹی بجاتا ہوا آگے جا گیا... بھلے آدمی! تم کو یہ بھی پتا نہیں کہ آدمی اور جانور ریل گاڑی کے نیچے کیسے آتے ہیں۔“

مچاتا گزر گیا۔ وہ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا، ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم واپس گھر جا رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے دن میں بے چین رہا۔ مجھے صورت حال.... سے سنگین اندیشوں کی بو آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عمران اور اقبال کی ”خطرات پسندی“ بھی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ کل رات دروازے کو باہر سے کنڈی لگ جانے کے بعد عمران نے مجھے جان بوجھ کر اندر بلایا تھا۔ ورنہ وہ اس جگہ سے نکلنے کے لیے کوئی اور راستہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ پینٹنگز والے کمرے کے پاس سے ایک زینہ بھی تو اوپر جاتا تھا۔ شاید وہ اس طرح سے میرے اندر حوصلہ ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہرحال، یہ سارا معاملہ ہی پُراندیشہ تھا۔

زلیخا اور جمشید کے گھر میں جو کچھ سامنے آیا تھا، وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ وہاں ایک گھر کی چار دیواری کے اندر بڑی رازداری سے ایک کنوئیں جیسا گڑھا کھودا گیا تھا۔ قیمتی اشیا نکالنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ یہ پروگرام کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا یا نہیں۔ اب یہ لال کوٹھیوں والا معاملہ شروع ہوا تھا اور دونوں معاملات کی کڑیاں آپس میں مل رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ عمران اور اقبال ایک سنگین معاملے کو چھیڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف ان دونوں کو جیسے کچھ پروا ہی نہیں تھی۔ انہوں نے ڈٹ کر حلوہ پوری کا ناشتا کیا تھا، دوپہر کو مٹن کڑاہی کھائی تھی۔ پھر عمران کی گرل فرینڈ شاہین کا فون آ گیا تھا۔ دونوں نوک جھوک کرتے رہے تھے۔ اب عمران

اور اقبال آپس میں ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ ان میں کافی بے تکلفی تھی۔ گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ہاتھا پائی بھی کر گزرتے تھے۔ اب بھی میں دیکھ رہا تھا کہ رات والے واقعات کا ان دونوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ ہاں، وہ انتظار ضرور کر رہے تھے اور یہ عمران کے اس شناسا کا انتظار تھا جس نے آج اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ عمران نے اس کا نام سلیم بتایا تھا اور اس کا کچھ غائبانہ تعارف بھی مجھ سے کرایا تھا۔

اس تعارف کے مطابق کچھ عرصہ پہلے تک سلیم اس کے ساتھ ہی سرکس میں کام کرتا تھا۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل سے گر کر اس کی ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ عمران نے اپنے خرچ پر اس کا علاج کرایا اور اس کی بیماری کے دوران میں اس کے بیوی بچے کی بھرپور کفالت بھی کی۔ مگر صحت یاب ہونے کے بعد سلیم نے اس سے کچھ رقم ادھار لی اور اسی ادھار کے حوالے سے عمران کے ساتھ دھوکا کیا۔ اس واقعے کو قریباً ایک برس گزر چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ عمران نے ملاقات کی کوشش کی تھی۔

سلیم نے پانچ بجے تک آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ اس کی آمد رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ سب سے پہلے ذرا لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ کل کی طرح بہت جذباتی نظر آتا تھا اور بار بار عقیدت کے انداز میں عمران کا ہاتھ تھام رہا تھا۔ رسمی گفتگو اور چائے کے دور کے بعد اصل بات شروع ہوئی۔ سلیم نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں ہیرو بھائی! کل رات آپ تینوں ایک بہت بڑے خطرے سے بچے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ وہاں کیوں آئے تھے اور کیا چاہتے تھے؟ مگر وہ جو کچھ بھی تھا، بہت سخت مصیبت میں ڈالنے والا تھا۔ یہ لڑکی نادیہ ایوب جسے ہم چھوٹی میڈم بھی کہتے ہیں، بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ ایک نمبر کی ڈرامے باز، مکار اور وحشی۔ اس کی کئی کہانیاں مشہور ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ دراصل یہ ایک بیمار لڑکی ہے۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال نے اس کے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہنے دیے۔“

”اس کے بیمار ہونے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”میں شاید آپ کو ٹھیک سے سمجھا نہ سکوں۔ یہ نوبل طور پر بے راہ رو لڑکی ہے۔ اپنے انجینئر شوہر سے طلاق کے بعد بالکل ہی آزاد ہو گئی ہے۔ ہر طرح کے مردوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ جنہیں پسند کرتی ہے، ان کے ساتھ کچھ وقت گزارتی ہے۔ پھر انہیں ایک دم لات مار کر نکال دیتی ہے اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔“

”نشہ کیا کرتی ہے؟“

”کوئی ایک نشہ ہو تو بتاؤں۔ شراب سے لے کر ہیروئن اور کوکین تک اس سے کچھ بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ بڑی بیکن مجبور ہے۔ اسے خود اس کے لیے نشہ مہیا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی نشے کی حالت میں اپنے جسم پر کٹ لگا لیتی ہے اور ان میں مرچیں بھر کر سسکتی رہتی ہے۔ کبھی سخت سردی میں یخ بستہ پانی سے نہانا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے سارے شوق عجیب و غریب ہیں۔ شاید آپ نے گھر میں لگی ہوئی پینٹنگز دیکھی ہوں۔ یہ ساری پینٹنگز ننگی اور گندی ہیں۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لائی ہے...“ سلیم نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”مجھے پورا یقین ہے کہ کل جب آپ گھر میں گھسے اور گارڈز سے مار دھاڑ کی تو یہ کوٹھی سرکٹ پر سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر جب آپ نے گارڈز اور ملازمہ آسیہ کو بے بس کر کے باتھ روموں میں بند کر دیا تو یہ اچانک آپ کے سامنے آ گئی۔ آپ نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ جب یہ آپ کے سامنے آئی تو سردی کے باوجود بالکل تھوڑے سے کپڑوں میں تھی... بلکہ نہ ہونے کے برابر کپڑے تھے۔“

”ہاں، یہ بات ذہن میں آئی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”اس نے آپ کے پیٹ میں لات ماری پھر تھپڑ بھی مارا۔ اس کے پیچھے بھی وجہ تھی۔ وہ آپ کو غصہ دلانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد وہ بھاگی اور بیڈ روم میں آ گئی۔ یہاں اس نے الماری کھولی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے پستول وغیرہ نکالنا چاہتی ہو۔ پر مجھے پتا ہے کہ وہاں پستول تھا ہی نہیں۔ وہ دراصل صرف الماری کھولنا چاہ رہی تھی۔ آپ تینوں کو شراب کی بوتلیں دکھانا چاہ رہی تھی۔ آپ کو شاید میری ان باتوں پر یقین نہیں آئے گا لیکن میں جو کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ ایک بیمار عورت ہے۔ یہ چاہ رہی تھی کہ آپ... اس سے زبردستی کریں۔ یہ آپ کو ”ریپ“ کی طرف لا رہی تھی۔ حالانکہ اپنے ہاتھ بندھنے سے پہلے جب چاہتی، بیڈ پر لگا ہوا ایک نیلا بٹن دبا کر ساتھ والی کوٹھی سے ایک درجن چوکیداروں کو مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔“

ہم سب تعجب کے عالم میں سن رہے تھے۔ فضا میں سنسناہٹ سی تیرتی محسوس ہوتی تھی۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

پیشانی کی سلوٹوں کو بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چھوٹی میڈم کی طرح بڑی میڈم کو بھی پرانی چیزوں کا بڑا شوق ہے۔ ان کے گھر میں بہت سی مورتیاں، تصویریں اور برتن وغیرہ سجے ہوئے ہیں۔ کسی اچھی چیز کے بارے میں انہیں جہاں سے بھی خبر ملتی ہے وہ وہاں اپنا آدمی بھیج دیتی ہیں یا خود پہنچ جاتی ہیں۔ اپنے اس شوق پر پیسے خرچ کرنے میں وہ بالکل بھی دریغ نہیں کرتیں۔''

عمران نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو سلیم! ہم ایک دوسرے پر پورا اعتماد کر سکتے ہیں۔ یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی۔ اس بارے میں تم بالکل بے فکر رہو... میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میڈم کو صرف پرانی چیزوں کا شوق ہے یا بات اس سے آگے بھی بڑھتی ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے، ان چیزوں کو ملک سے باہر بھیجنا... اسمگلنگ وغیرہ...''

''سر... میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا ہیرو بھائی! جہاں تک مجھے معلوم ہے، دونوں میڈم نے کچھ چیزیں باہر کے ملکوں تک ہی پہنچائی ہیں۔ اب مجھے نہیں پتا کہ وہ قانونی طریقے سے بھیجی گئی تھیں یا نہیں...''

''آخر تم وہاں ملازمت کرتے ہو سلیم! اس چار دیواری کے اندر رہتے ہو۔ تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو گا؟''

''اصل میں ہیرو بھائی! وہاں کوٹھیوں میں ہر کام بڑی پلاننگ سے ہوتا ہے۔ جس ملازم کا جو کام ہے، وہ اس کے بارے میں جانتا ہے۔ ملازموں کا آپس میں میل جول بھی بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔ تنخواہ تو اچھی دی جاتی ہے مگر ان کے ساتھ سختی بھی بہت ہے۔ مثلاً اب مجھے ہی لیں، میری ڈیوٹی چھوٹی میڈم کی کوٹھی تک ہے۔ پچھلے ایک سال میں، میں ایک بار بھی دوسری کوٹھی میں نہیں گیا۔ چھوٹی میڈم کی طرف میری ڈیوٹی کچن میں ہے۔ میں بازار سے سودا سلف لاتا ہوں، کوئی پارٹی وغیرہ ہو تو اس کا انتظام بھی کرتا ہوں اور کبھی کبھی خانساماں کا ہاتھ بھی بٹاتا ہوں۔ اور کیا ہوتا ہے، مجھے اس کی کچھ زیادہ خبر نہیں۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ بڑی میڈم کو بے شمار جاننے والے لوگ ملنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی رات کے وقت کوئی وائر جیپ یا سبز گاڑی بھی نظر آتی ہے۔ ان میں اکثر پٹھان ٹائپ بندے ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹے قد کا ہیلا سا بندہ اکثر آتا رہتا ہے۔ کافی بڑی پگ پہنتا ہے

اس کے سر پر۔ وہ چادر کی بکل مارتا ہے... مجھے لگتا ہے کہ وہ ٹیکسلا یا حسن ابدال کی طرف کا ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اپنے علاقے سے ''اینٹیکس'' وغیرہ لاتا ہو۔''

''ہاں جی، بالکل ہو سکتا ہے۔ اصل میں بڑی میڈم ایک چیزوں کی منہ مانگی قیمت دیتی ہیں اس لیے بیچنے والے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر کوئی اچھی چیز ہاتھ لگے تو اس کے سودے کی بات سب سے پہلے بڑی میڈم سے کی جائے۔''

ہمارے اور سلیم کے درمیان تقریباً ڈیڑھ گھنٹے گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں کھانے اور چائے سے بھی انصاف ہو گیا۔ سلیم کی باتوں سے پتا چلا کہ کل رات ہمارے چلے آنے کے بعد میڈم نادیہ بڑی بے مزہ ہوئی تھیں۔ اس نے ملازموں کو آوازیں دی تھیں۔ ان آوازوں کے جواب میں سب سے پہلے سلیم ہی وہاں پہنچا تھا۔ اس نے میڈم نادیہ کے ہاتھ کھولے تھے اور اس کے ہونٹوں پر سے ٹیپ اتاری تھی۔

میڈم نادیہ حیران تھی کہ ہم اس طرح اچانک سب کچھ چھوڑ کر نکل کیوں گئے؟ کیا ہمیں کوئی خطرہ محسوس ہوا تھا یا ہم جس مقصد کے لیے گھر میں داخل ہوئے تھے وہ پورا نہیں ہو سکا تھا؟ ہمارا مقصد کیا تھا، یہ بھی میڈم اور اس کے گارڈز کو ٹھیک سے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ بہر حال، آزاد ہونے کے بعد میڈم نادیہ نے اپنے ذاتی گارڈز کو خوب خوب لعنت ملامت کی۔ خاص طور سے انچارج گارڈ شیر خان کو۔ یہ شیر خان ہی سرخ جسم والا وہ گرانڈیل شخص تھا جس کے ساتھ عمران نے ہوائی اسٹنٹ والا سلوک کیا تھا۔ مشہور باکسر محمد علی نے اپنا فائٹ شروع ہونے کے سکنڈ کے پہلے ہی راؤنڈ میں آٹھ ناک آؤٹ کر کے پوری دنیا کے تماشائیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کل رات عمران نے بھی دو تین سیکنڈ کے اندر پہلوان نما شیر خان کو دو ٹکروں میں ناک آؤٹ کر ڈالا تھا۔ اس نشست میں سلیم نے میڈم نادیہ کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں اور بھی کئی باتیں ہمارے گوش گزار کیں۔

رات گیارہ بجے کے قریب سلیم واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے عمران سے وعدہ کیا کہ وہ اس سے رابطہ رکھے گا اور دونوں میڈم بہنوں کے بارے میں اسے جو کچھ بھی مزید معلوم ہو سکا، اس تک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ عمران کے اس سوال کا جواب وہ یقین سے نہیں دے سکا تھا کہ بڑی میڈم صفورا اسمگلنگ کے دھندے سے منسلک ہے یا نہیں۔ وقتِ رخصت سلیم نے عمران سے علیحدگی میں بھی مختصر ملاقات کی۔ اس ملاقات میں اس نے یقیناً

عمران سے اپنے سابقہ رویے پر معافی مانگی ہو گی... اسے ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ عمران کے اتنا بات کے بدلے سلیم نے اپنے رقم کے معاملے میں جو کارنامہ انجام دیا تھا اور تقریباً ایک سال جیل میں رہا تھا۔

سلیم کے جانے کے فوراً بعد عمران کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ اس نے اقبال سے کہا۔ ''اس کے پیچھے جاؤ اقبال۔ پتا کرو یہ کہاں جاتا ہے... لیکن ذرا احتیاط سے۔''

اقبال جیسے پہلے ہی سے کسی ایسے اشارے کا منتظر تھا۔ اس نے جلدی سے بوٹ پہنے اور پرس جیب میں رکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

میں حیران تھا اور سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا۔ اقبال کے باہر جانے کے بعد عمران نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''میں سلیم کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ میرے خیال میں اس نے ہتھیار ڈالے اور چھپایا بھی ہے۔ شاید یہ کچھ ڈر بھی رہا ہے۔''

''اقبال اب کیا کرے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا پیچھا کرے گا۔ یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ یہ اب کہاں جاتا ہے۔ اگر اس کے گھر کے بارے میں پتا چل گیا تو یہ بھی اچھی بات ہو گی۔''

''اور اگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا پیچھا کیا گیا ہے؟''

''اقبال کچے کھلاڑی نہیں ہے۔ ایسے معاملوں کا بڑا تجربہ رکھتا ہے۔ وہ سال تک سیکرٹ ایجنسی کا انفارمر رہ چکا ہے۔ اس سے پہلے ریڈیو پاکستان میں کام کر چکا ہے... اور ہاں، اس میں ایک بڑی حیرت انگیز صلاحیت بھی ہے۔ آوازوں کی نقل بھی کر لیتا ہے۔ بکری اور سیاسی لیڈروں کی آواز نکال لیتا ہے اور...''

''یار! میں دوسری بات کر رہا ہوں۔ اگر سلیم کو پتا چل گیا کہ اقبال اس کے پیچھے آ رہا ہے؟''

''میری جان! اس بارے میں بے فکر رہو۔ ویسے بھی دو دن بعد ہم اس کے پیچھے نہیں رہیں گے۔ اگر معاملے نے طول کھینچا تو ہم اپنے کسی اور دوست کو اس کے پیچھے لگا دیں گے اور یہ ایسا شخص ہو گا جس کے بارے میں سلیم کچھ نہیں جانتا ہو گا۔''

''فرض کرو کہ اگر کسی طرح سلیم کو پتا چل ہی گیا تو پھر؟ اس طرح تو تمہاری گرینڈ سی سیکرٹ چھوٹی اور بڑی میڈم سے ہو جائے گی۔ سیٹھ سراج سمیت ان سارے لوگوں کو تمہارے ان ٹھکانے کا پتا بھی چل جائے گا۔ پھر کیا ہو گا؟''

بچت

ایک کنجوس گھنٹا بھر سے بھائی گیٹ پر رکشے کے انتظار میں کھڑا تھا۔ آخر اس کی مراد پوری ہوئی اور سامنے سے ایک رکشہ آتا نظر آیا۔ کنجوس آدمی نے جلدی سے آگے بڑھ کر رکشے والے سے پوچھا۔ ''ارے بھائی! شالامار باغ کے کتنے پیسے لو گے؟''

رکشے والے نے جواب دیا۔ ''تیس روپے۔''

یہ جواب سن کر کنجوس آدمی خاموشی سے آگے چل دیا۔ رکشے والے نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔ ''آپ ہی بتا دیجیے آپ کتنے پیسے دیں گے؟''

کنجوس نے کہا۔ ''مجھے تمہارے رکشے میں نہیں جانا ہے۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شالامار باغ تک پیدل جا کر میں کتنے روپے کی بچت کر سکتا ہوں۔''

''وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔'' عمران نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''یار تابش! ایک تو پتا نہیں تم دور دراز کے اندیشوں میں کیوں کھو جاتے ہو۔ ایک دانشور نے کہا ہے کہ ہماری زندگی کی اسّی فیصد پریشانیاں جھوٹے اندیشوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔''

... میں رات پچھلے پہر سو گیا۔ اقبال سے میری ملاقات اگلے روز صبح نو دس بجے کے قریب ہوئی۔ وہ بھی ابھی ابھی اپنے ہوٹل سے واپس لوٹا تھا اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ عمران اور وہ دونوں نہاری نان کا ناشتا کر رہے تھے۔ ساتھ میں لسی کے دو بڑے بڑے گلاس تھے۔ ایک گلاس پلیٹ سے ڈھکا ہوا پاس ہی رکھا تھا۔ یقیناً یہ میرے لیے تھا۔ میرا ناشتا بھی پلیٹوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

میں نے منہ ہاتھ دھو کر ناشتے میں شریک ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں بھئی اقبال! تمہاری جاسوسی کا کیا بنا؟''

''سلیم کے گھر کا پتا چل گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ مسلم ٹاؤن کے ایک مکان میں رہتا ہے۔ دو مرلے کی کوٹھی ہے۔ دس بارہ ہزار روپے کرایہ دے رہا ہے۔ موٹر سائیکل بھی رکھی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ چھوٹی میڈم اچھی تنخواہ دے رہی ہے۔''

''اس کے علاوہ دوسری خاص بات یہ پتا چلی ہے کہ سلیم کی ملاقات جوہر ٹاؤن لاہور کے ایک جانے پہچانے ڈان مجید مٹھو سے بھی ہے۔'' عمران نے کہا۔ وہ اس دوسری اطلاع کو زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔

''مجید مٹھو کا نام تو شاید میں نے بھی کہیں سنا ہوا ہے۔

شاید اخبار میں پڑھا تھا۔ لڑائی جھگڑے یا ڈکیتی وغیرہ کی کوئی واردات تھی۔" میں نے بتایا۔

"ظاہر ہے یار! مجید مغلو کا نام کسی مشاعرے یا ادبی کانفرنس کی خبر میں تو آنے سے رہا۔ یہ بیرون لاہور کے چند سکہ بند غنڈوں میں سے ہے۔ کل یہاں سے روانہ ہونے کے بعد میں سیدھا اپنے گھر مسلم ٹاؤن گیا تھا لیکن راستے میں چند منٹ کے لیے دھرمن آباد کے علاقے میں بھی رکا۔ یہ مجید مغلو کا گھر تھا۔"

"تو کیا اب مجید مغلو سے جھگڑا مول لینے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"توبہ توبہ۔" عمران نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "ہم ان کن ٹٹوں سے جھگڑا کر کے اپنی عاقبت کیوں خراب کریں۔ ہم تو اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر بس یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ جن میں خیر سے ہمارے محترم سیٹھ سراج صاحب بھی شامل ہیں، آخر کر کیا رہے ہیں۔ اس گورکھ دھندے کا کوئی سرا ہاتھ آ گیا تو ہم یہ سرا پولیس والوں کو تھما دیں گے اور خود ایک طرف الگ ہو جائیں گے۔ ہمارا کام یہ نہیں پیارے... ہمارا کام کچھ اور ہے۔"

"ہمارا کام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا کام ایک بچھڑے دل کی آواز سننا ہے۔ یہ دکھیارا دل خاموشی کی زبان میں فریاد کر رہا ہے، کسی کو پکار رہا ہے... اور جس کو پکار رہا ہے، وہ پتا نہیں کہاں ہے۔ بس اسی کو ڈھونڈنا ہے۔" عمران کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ میرے حالات کی طرف اور ثروت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ثروت کا خیال ذہن میں آتے ہی ایک تیر سا دل میں پیوست ہو جاتا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک دبیز اندھیرے کی چادر کھلنے لگتی تھی۔ اس اندھیرے کی دوسری جانب سے وہ مجھے پکار رہی تھی... "تم کہاں ہو تابش! دیکھو، وقت ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے تم سے جدا ہو رہی ہوں۔ کیا تم اسی طرح مجھے چلے جانے دو گے؟"

بارہ بجے کے قریب عمران اور اقبال دونوں باہر نکل گئے۔ وہ اقبال کی موٹر سائیکل پر گئے تھے۔ عمران نے مجھے کھل کر نہیں بتایا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ نسیم والے چکر میں ہی نکلے ہیں۔ کل رات انہیں معلوم ہوا تھا کہ نسیم اور مجید مغلو نامی شخص کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ مزید جاننا چاہتے ہوں۔ میں جوں جوں عمران اور اقبال کو جان رہا تھا، میری حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ اپنی طرز کے انوکھے بندے تھے۔ خاص طور سے عمران تو راہ جاتی مصیبت کو اپنے گلے میں ڈال کر دلی مسرت محسوس کرتا تھا۔ اپنی خیریت، سلامتی اور زندگی کے بارے میں وہ اتنا بے پروا ہو جاتا تھا کہ سخت حیرت ہوتی تھی۔ اس کے لیے شدید خطرے میں کودنا ایسے ہی تھا جیسے تفریح کے لیے سوئمنگ پول میں چھلانگ لگانا۔ یہ سلسلہ سیٹھ سراج کی وجہ سے شروع ہوا تھا اور سیٹھ کے بارے میں، میں نے ہی عمران کو سب کچھ بتایا تھا۔ اب یہ سلسلہ خود بخود ہی ایک خاص سمت میں بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے روکنے سے یہ سب کچھ رکنے والا نہیں تھا۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ میں اس ساری صورت حال سے الگ تھلگ ہو جاؤں۔ خاموشی سے کہیں نکل جاؤں۔ یہ نہ ہو کہ عمران جس آگ کو ہوا دے رہا ہے، اس کی تپش براہ راست مجھ تک اور میرے گھر والوں تک پہنچنے لگے۔

عمران اور اقبال کے جانے کے بعد ڈھائی تین گھنٹے تک میں عجیب تذبذب میں رہا۔ اسی دوران میں اقبال کے موبائل پر عمران کی کال آ گئی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ وہ بڑا پرجوش محسوس ہو رہا تھا۔ "ہاں یار! بڑا مزے کا کام ہوا ہے۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "میں یہاں کمن آباد میں ہوں۔ تم بس فوراً یہاں پہنچ جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے ایک بڑے کام کی شے ہے۔"

"کام کی شے؟ میں سمجھا نہیں؟"

"یہاں آ کر سب سمجھ جاؤ گے۔ بس یہ سمجھو کہ اس بندے سے ہمیں ثروت کا کھوج مل سکتا ہے اور یہ بھی پتا چل سکتا ہے کہ اصل میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔"

ثروت کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے عمران سے تفصیل جاننا چاہی لیکن ایسے معاملوں میں وہ یکسر چکنا گھڑا ثابت ہوتا تھا۔ بہرحال، اس کی بات نے میرے اندر بے پناہ تجسس پیدا کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "میری گاڑی کی چابی، سائیڈ ٹیبل کی اوپر والی دراز میں ہے۔ گاڑی لے کر فوراً نکل آؤ۔ کمن آباد کے دوسرے گول چکر سے دائیں طرف مڑنا ہے۔ آگے ایک گراؤنڈ آئے گی۔ اس کے بعد..." وہ مجھے ایڈریس سمجھاتا چلا گیا۔

فون پر بات ختم کرنے کے بعد میں چند سیکنڈ شدید الجھن میں رہا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ عمران ساتھ ہوتا تھا تو مجھے شہر میں گھومتے ہوئے کوئی خاص اندیشہ محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن جب میں اکیلا کہیں نکلنے کا سوچتا تو یوں لگتا تھا کہ باہر نکلتے ہی سیٹھ سراج کے کارندوں سے ملاقات ہو جائے گی اور

میں کسی سخت مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔

بہرطور، عمران جو کچھ بتا رہا تھا اس کے بعد میرا گھر سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے ہر طرح تسلی دی تھی کہ وہاں پہنچنے پر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ ایسی تسلیاں تو وہ خیر پہلے بھی کئی بار دے چکا تھا اور یہ طفل تسلیاں غلط ثابت ہوئی تھیں۔ تاہم اب میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کسی طرح کا کوئی رسک ہو بھی تو عمران اس سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیتیں رکھتا ہے۔

میں نے عمران کی کار نکالی اور اس کے بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف روانہ ہو گیا۔ بازار کے کئی دکان داروں نے مجھے دیکھ کر سلام کیا۔ وہ اب مجھے اپنے ہیرو بھائی کے مہمان دوست کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ آج تین روز کے بعد ڈرائیو کر رہا تھا۔ سڑکیں، ٹریفک اور لوگوں کی بھیڑ بھی سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں مطلوبہ ایڈریس پر موجود تھا۔ یہ عام آبادی سے الگ تھلگ بنا ہوا ایک مکان تھا۔ اس کے پچھلی طرف قبرستان تھا۔ سامنے کسی سرکاری دفتر کی سرخی مائل دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق یہ مغلو نامی غنڈے کی رہائش گاہ تھی۔

میری گاڑی کا ہارن بجاتے ہی عمران گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ بالکل مطمئن نظر آتا تھا جیسے اپنے ہی گھر میں مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود ہو۔ گاڑی لاک کر کے میں باہر آیا اور عمران کے ساتھ اندر چلا گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سات آٹھ مرلے کے اس مکان کا نیم پختہ صحن پار کرتے ہم برآمدے میں پہنچے۔ یہاں ایک کتا بندھا ہوا تھا۔ وہ شکل و صورت سے خاصا خونخوار نظر آتا تھا۔ اس کے دانت پر تھپیڑا، جھنجھنا رہی نہیں۔ قریب ہی اقبال کی موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ ایک کونے میں شراب کی دو خالی بوتلیں اور مرغی کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ مغلو یا پھر جو کوئی بھی اس گھر میں رہتا ہے، عورت کے بغیر رہتا ہے۔ یعنی یہاں کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو مستقل طور پر اس گھر میں رہتی ہو اور صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی ہو۔ عمران نے موٹر سائیکل کی ڈکی میں سے ایک مفلر نما کپڑا نکالا۔ یہ وہی مفلر نما شے تھی جو پہلے اور پھر اول کوٹھی میں اپنے چہرے چھپانے کے لیے عمران اور اقبال نے استعمال کی تھی۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے عمران نے اس مفلر نما کپڑے کو ڈھاٹا میرے چہرے پر باندھنا شروع کر دیا۔

ایک منٹ کے اندر اس نے میرا سر اور چہرہ اس طرح چھپا دیا کہ آنکھوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ "فی الحال تمہیں بالکل خاموش رہنا ہے۔ اگر کوئی بات کرنا ہوئی تو مجھ سے مشورے کے بعد کرنا۔"

"لیکن یار! یہ کر کیا رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"یہاں ایک لڑکا ہے۔ وہ اپنا نام رفیق بتا رہا ہے لیکن اس کے پاس سے جو شناختی کارڈ نکلا ہے اس پر تو دوسرا نام لکھا ہوا ہے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ لڑکا ان لڑکوں میں سے ہے جنہوں نے ثروت کو بس اسٹاپ سے اٹھایا اور بسوں کی فیکٹری میں لے کر گئے۔"

میری دھڑکن میں شدت آ گئی۔ منہ خشک ہوتا محسوس ہوا۔ میں عمران کے ساتھ گھر کے درمیانی کمرے میں پہنچا۔ یہاں ایک چھوٹے دروازے سے دو ڈھائی فٹ چوڑی سیڑھیاں اتر کر نیچے جاتی تھیں۔ یہ ایک تہ خانہ تھا۔ وہاں بلب کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے عین سامنے اقبال نظر آیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور اپنا سیاہ پسٹل اس نے گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے عین سامنے سنگل صوفے پر ایک دوسرا بندہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اپنا سارا خون سر میں چڑھتا محسوس ہوا۔ ایک دم کچھ یوں لگا کہ پورے جسم میں انگارے دہک اٹھے ہیں۔ میں اس لڑکے کو کیوں نہ پہچانتا؟ یہ واجی کا ساتھی قادر لمبا تھا۔ یہ اس چنڈال چوکڑی کا رکن تھا جس نے چند ماہ پہلے ثروت کا جینا حرام کیا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ میرا بھی۔ پھر یہ لوگ اس معاملے کو اس حد تک لے گئے تھے کہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ان کی بدمعاشی نے نہ صرف ثروت کے والدین کی جان لی تھی بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ہرے بھرے امکان کو خاکستر کر دیا تھا۔ قادر لمبے کے چہرے پر ایک نیل نظر آ رہا تھا۔ شاید کچھ دیر پہلے عمران اور اقبال کے ساتھ اس کی ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ قادر لمبے کو دیکھتے ہی میں طیش اور نفرت کے ایک تند و تیز ریلے میں بہہ گیا۔ عمران نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنی شناخت چھپائے رکھوں اور بولنے کی کوشش بھی نہ کروں لیکن قادر لمبے کو دیکھ کر میں یہ باتیں بھول گیا۔ میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ "حرامزادے... کتے... خنزیر کی اولاد..." میرے منہ میں جو آیا، میں بولتا چلا گیا۔ میرے گھونسوں اور ٹھوکروں نے قادر لمبے کو صوفے سے اچھال کر پختہ فرش پر پٹخ دیا۔ میں اسے مار رہا تھا اور چنگھاڑ رہا تھا۔

""تم نے مجھے برباد کر دیا... تم نے میری زندگی تباہ کر دی... ثروت کی زندگی تباہ کر دی۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے! اسی جگہ مار کر گاڑ دوں گا۔"" میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی تھی۔

اقبال آگے بڑھا تاکہ قادر لمبے کو مجھ سے چھڑا سکے مگر عمران نے اسے راستے میں روک لیا۔ شاید وہ چاہ رہا تھا کہ اگر میرے ""ہاتھ پاؤں کھل رہے ہیں"" تو انہیں کھلنے دینا چاہیے۔ چند سیکنڈ میں صورت حال یہ تھی کہ قادر لمبا دہشت کے عالم میں فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی تھا۔ میری ٹھوکریں تواتر سے اس کے جسم پر برس رہی تھیں۔

آخر میں ہانپ کر ذرا رکا تو اقبال مجھے اپنی بانہوں میں لے کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے چہرے کو ڈھانپنے والا مفلر نما کپڑا بھی تیزی کی طور پر کھل گیا تھا۔ اگر اب وہ مکمل طور پر کھل جاتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اب قادر لمبا مجھے پہچان چکا ہے۔ میں نے وہ کپڑا اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔

عمران نے بالوں سے پکڑ کر قادر لمبے کو اٹھایا اور دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا۔ قادر کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کی جرسی پھٹ گئی تھی اور پتلون کی بھی بری حالت تھی۔ اپنے خون چکاں چہرے کے ساتھ وہ ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

""تو میرا یہ اندازہ درست تھا کہ یہ حرامزادہ ان غنڈوں میں شامل تھا۔"" عمران نے اطمینان سے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

""یہ بدذات ان سب سے زیادہ کمینہ تھا۔ اس کی بلاشیری نے ہی اس کتے داجی کے حوصلے بڑھائے تھے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا... مار ڈالوں گا۔"" میں ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا۔

اس مرتبہ عمران نے میرا راستہ روکا اور بولا۔ ""یار! اس گدھے کا گلا مروڑنے سے تمہیں کون روک سکتا ہے... بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ پہلے اس کمرے کے سارے پرزے کھولیں۔ اس کے بعد اس کی گردن مروڑیں۔ لیکن اس کارروائی سے پہلے اس کے منحوس منہ سے کچھ اگلوا تو لیں۔ اگر ہمیں داجی وغیرہ کے بارے میں یہ نہیں بتائے گا تو اور کون بتائے گا؟""

عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ثروت اور اس کے گھر والوں پر قیامت ٹوٹنے کے بعد جب بات تھانے کچہری تک پہنچی تھی تو داجی اور اس کے تینوں دوست اچانک نظر سے اوجھل

ہو گئے تھے۔ بعد ازاں ان تینوں سے صرف ایک سامنے آیا تھا مگر یہ وہ لڑکا تھا جو ثروت کے اغوا میں براہ راست شریک نہیں ہوا تھا۔ مجھے اور دیگر بھائی وغیرہ کو پورا یقین تھا کہ باقی لڑکوں کو سیٹھ سراج نے ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ شاید سیٹھ سراج کے سرپرست ایم این اے مشتاق گورایہ نے انہیں کہیں اپنی زمینوں پر بھجوا دیا ہے لیکن اب یہ قادر لمبا یہاں کس آندھی کے اس تنہا مکان میں میرے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا اور بار بار فرش پر خون تھوک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔ اقبال تو قادر کے سرہانے کھڑا رہا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا اور میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہاں ایک میز پر تاش کے پتے بکھرے تھے۔ سامنے والی دیوار پر پستول کا خالی ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ یہ جگہ واضح طور پر ایک بدمعاش کا ٹھکانا دکھائی دیتی تھی لیکن بدمعاش کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ قادر لمبے پر جھپٹنے اور اسے مارنے کے بعد میرا جسم اب ہولے ہولے لرزنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔ پتا نہیں وہ کیا کیفیت تھی جس کے تحت میں قادر پر پل پڑا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے اندر بتدریج چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ شاید اس کی وجہ میرے تلخ ترین حالات تھے اور شاید اس کی وجہ عمران بھی تھا۔ عمران کی موجودگی میں، میں ایک حد تک اپنی اندرونی کمزوریوں پر قابو پا لیتا تھا۔

عمران نے مدھم آواز میں کہا۔ ""میں نے تم سے گزارش بھی کی تھی کہ یہاں اپنی شناخت چھپانی ہے۔ اس لیے خاموش رہنا۔ تم نے سب چوپٹ کر دیا۔""

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ""یہ خبیث کیسے ہاتھ آیا؟ اس کے ساتھی کہاں ہیں؟""

""تمہارا دوسرا سوال وائیڈ بال کی طرح ہے۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔ تمہارے پہلے سوال کا جواب میں تمہیں دے رہا ہوں۔ میں اور اقبال کل سے اس چکر میں تھے کہ سلیم جیسا مجید مٹھو کے مکان میں کیا کرنے آیا تھا۔ پچھلے چند گھنٹوں میں اقبال نے کافی بھاگ دوڑ کی ہے۔ اقبال کا ایک ساتھی کل سے اس مکان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آج دوپہر ہمیں پتا چلا کہ مجید مٹھو گھر کو تالا لگا کر اپنے ایک دوست کے ساتھ رکشے میں بیٹھا ہے اور بادامی باغ کے بس اڈے پہنچا ہے۔ وہاں سے وہ جہلم جانے والی بس پر سوار ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مٹھو کا گھر اب خالی ہے اور فوری طور پر مٹھو کے آنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ لہٰذا کچھ دیر پہلے ہم

یہاں آن پہنچے۔ پہلے ہم نے ایک ""ماسٹر کی"" سے بیرونی دروازے کا تالا کھولنے کی کوشش کی لیکن گلی میں اکا دکا راہ گیروں کی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہم مکان کے پچھواڑے گئے اور قبرستان کی طرف سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ تم نے دیکھا ہی ہو گا، پچھلی دیوار درختوں میں گھری ہوئی ہے اس لیے ہمیں مشکل پیش نہیں آئی۔ پہلے تو ہمیں یہ گھر بالکل خالی لگا مگر پھر تہ خانے کا دروازہ نظر آ گیا اور یہ بھی پتا چل گیا کہ اندر کوئی ہے۔ تھوڑی سی کوشش سے ہم تمہارے اس بدبخت مجلے مار قادر تک پہنچ گئے۔ یہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔ پہلے اس نے بتایا کہ وہ مٹھو کا ملازم ہے پھر کہا کہ دوست ہے۔ اس نے اپنا نام رفیق بتایا لیکن کچھ دیر بعد اس کا شناختی کارڈ مل گیا۔ اس پر قادر ولد امانت علی لکھا ہوا ہے۔ تم نے ثروت کو اغوا کرنے والے جن لڑکوں کا ذکر کیا تھا، ان میں سے ایک کا نام قادر بھی تھا۔ مجھے شک ہو گیا۔ میں نے پوچھ تاچھ کی لیکن اس خبیث نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ پھر میں نے فون کر کے تمہیں بلا لیا۔""

میں نے کہا۔ ""تم بتا رہے ہو کہ گھر کی دیوار پھاند کر یہاں آئے ہو لیکن اب تو دروازہ کھلا ہوا ہے؟""

""وہ ہم نے بعد میں کھولا ہے یار! اس قادر کے پاس گیٹ کی دوسری چابی ہے۔"" عمران نے وضاحت کی۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ قادر کے سامنے آ کر میں کتنی بڑی غلطی کر چکا ہوں۔ میرے جسم کے مساموں سے پسینا پھوٹ نکلا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں قادر لمبے کے سامنے ہی نہیں آیا، سیٹھ سراج، انسپکٹر اشرف اور ایم این اے مشتاق وغیرہ کے سامنے بھی آ چکا ہوں۔ اب وہ سارے خطرات ایک دم زندہ ہو گئے تھے جن سے مجھے یا میرے گھر والوں کو واسطہ پڑ سکتا تھا۔

عمران نے میرے تاثرات بھانپتے ہوئے مجھے حوصلہ دیا اور میرا شانہ تھپک کر بولا۔ ""چلو جو ہو گیا سو ہو گیا... اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم اس معاملے کو دیکھ لیں گے لیکن پہلے ہمیں اس قادر کو نچوڑنا پڑے گا۔""

""نچوڑنا پڑے گا؟"" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ مسکرایا۔ ""یار! یہ اپنی خاص لینگویج ہے۔ نچوڑنے کا مطلب ہے کہ اس کے اندر سے باتیں اگلوانی پڑیں گی۔""

""تو تم اس سے مار پیٹ کرو گے؟""

""مار پیٹ تو نہیں... بس تھوڑا سا ڈرائیں دھمکائیں

گے۔ وہ جیسے کرکٹ میں بلے باز کو بیک فٹ پر کرنے کے لیے باؤنسر وغیرہ مارے جاتے ہیں۔""

عمران اور اقبال اب بھی بالکل ایزی موڈ میں تھے جبکہ میں خاصا تناؤ محسوس کر رہا تھا۔ جب ہم کمرے میں واپس پہنچے تو اقبال ایک جگ میں سے پانی گرا کر قادر کا منہ دھلوا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور ناک سے مسلسل خون رس رہا تھا۔

عمران نے قادر کے عین سامنے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر کرسی سنبھال لی۔ اس کا چہرا بدستور مسکرا رہا تھا مگر آنکھوں میں عجیب سی سختی عود کر آئی تھی۔ وہ قادر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ""دیکھو قادر لمبا صاحب! بات یہ ہے کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے۔ تم داجی کے لنگوٹیے یار قادر ہو اور تم تین چار دوستوں نے مل کر بٹ کی منگیتر کو اغوا کیا تھا۔ تمہاری اس بدمعاشی کے جو نتیجے نکلے وہ سب کے سامنے ہیں۔ اب تم قانون سے بھاگے پھر رہے ہو اور اپنے خلاف کیس کو سخت سے سخت بنا رہے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا حشر بہت زیادہ خراب نہ ہو تو پھر تمہیں اپنے باقی دونوں یاروں کے بارے میں بتانا پڑے گا اور اگر...""

""میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"" وہ لرزتی آواز میں عمران کی بات کاٹ کر بولا۔

""یہ تم نے کوئی انوکھی بات نہیں کی۔ ہر چور، ڈاکو ذلیل و خوار ہونے سے پہلے ایسے ہی اقوال زریں دہراتا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا، مجھے بے گناہ پھنسایا گیا ہے، میں بے قصور ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر ان سنہری مقولوں پر اعتبار کر لیا جائے تو دنیا میں کوئی بھوتنی کا چور ڈکیت پکڑا نہ جا سکے۔""

""یہ ایسے نہیں مانے گا بادشاہو! اس کو سیب کھلاؤ۔"" اقبال نے کہا۔

""ہاں لگتا ہے کہ سیب ہی کھلانا پڑے گا۔"" عمران نے تائید میں سر ہلایا۔

""سیب... کیا مطلب؟"" میں نے پوچھا۔

""یہ بھی ہماری خاص لینگویج ہے ڈیئر۔"" عمران نے کہا اور پھر اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے ایک سیب نکال لیا۔

گول مٹول سیب کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے اس نے دوسری جیب سے چمک دار چاقو نکال کر کھولا اور بولا۔ ""یہ

سیب میں تمہیں خود کاٹ کر کھلاؤں گا لیکن میرے کاٹنے کا انداز ذرا دوسرا ہے۔"

قادر ہونقوں کی طرح دیدے پھاڑے بیٹھا تھا۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔ عمران نے سیب اقبال کی طرف اچھال دیا۔ اقبال، قادر کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے اچانک سیب قادر کے سر پر رکھا۔ عمران نے تیزی سے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی۔ میری نگاہوں میں جیسے برق سی کوند گئی۔ عمران کے دائیں ہاتھ سے جدا ہونے والا لمبے پھل کا چاقو گولی کی رفتار سے قادر کے سر کی طرف گیا۔ چاقو سیب میں گھسا۔ پھر چاقو اور سیب دونوں عقبی دیوار سے ٹکرانے کے بعد اقبال کے قدموں میں لڑھک گئے۔

یہ سارا عمل بس سیکنڈ کے نصف حصے میں مکمل ہو گیا تھا۔ ایسی رفتار تھی کہ قادر اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کر سکا تھا۔ چاقو سمیت سیب کو زمین پر لڑھکتے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ میں بھی ششدر کھڑا تھا۔ یہ عمل ناقابلِ یقین تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سنگین بھی۔ نشانے کی ذرا سی غلطی قادر کو جان لیوا طور پر زخمی کر سکتی تھی۔

میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ بے رحمی سے مسکرا رہا تھا۔

اقبال نے جز وقتی طور پر کٹا ہوا سیب عمران کو تھما دیا۔ سیب کا جائزہ لینے کے بعد اس نے چاقو سیب میں گھسیڑا اور بولا۔ "اس پر ایک بار اور چاقو چلانا پڑے گا۔ چلو رکھو اسے دوبارہ قادر بیٹے کے سر پر۔"

قادر "بیٹے" کا برا حال تھا۔ جب اس نے دوبارہ اپنے سر پر سیب رکھے جانے کی خوش خبری سنی تو ایک دم اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "خبردار!" اقبال اس پر پستول تان کر گرجا۔ "بیٹھ جاؤ... نیچے بیٹھ جاؤ۔" اقبال کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ قادر لرز کر بیٹھ گیا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اقبال نے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگائی اور پھنکارتے لہجے میں کہا۔ "اس کو خالی خولی دھمکی مت سمجھنا بچے۔ ہم گولی چلانا بھی جانتے ہیں۔ اچھا ایک ٹھک کرو گے تو کنپٹی میں تین انچ کا سوراخ ہو جائے گا... اور اس سوراخ میں سے لال لال چیز بہنے لگے گی۔"

"خدا کے لیے... ایسا مت کرو... میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جو جانتا تھا تمہیں بتا دیا ہے۔"

"ہم بھی جو جانتے ہیں تمہیں بتا دیا ہے۔ جب اس پستول کا ٹریگر دبایا جائے گا تو تمہاری کھوپڑی شریف میں سوراخ ضرور ہو گا۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔" اقبال نے کہا۔

عمران نے پھر چاقو اپنے ہاتھ میں تولا۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ مجھ پر اس شخص کے نئے نئے گن کھل رہے تھے۔ دو منٹ پہلے اس نے جس طرح قادر پر چاقو پھینکا تھا، وہ کوئی ماہر ترین چاقو باز ہی پھینک سکتا تھا۔ سرکس کے کھیل تماشوں میں خنجر زنی کے ایسے کرتب دکھائے جاتے ہیں لیکن یہ کوئی تماشا نہیں تھا۔ یہ ایک جیتا جاگتا واقعہ تھا اور جس پر یہ وار ہو رہا تھا وہ ابھی تک عالمِ وحشت میں لرزاں تھا۔

اقبال نے بڑے اطمینان سے آدھ کٹا سیب دوبارہ قادر کے سر پر رکھا۔ عمران نے چاقو کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہاتھ میں جلایا مگر اس مرتبہ قادر بیٹھے رہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ کنپٹی پر پستول ہونے کے باوجود وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "نہیں... نہیں... ایسا مت کرو۔" وہ گھگھیایا۔

اقبال نے کھٹاک سے اس کے سر پر پستول کا آہنی دستہ رسید کیا۔ ضرب زوردار تھی، وہ کراہتا ہوا سر پکڑ کر ڈھیر ہو گیا۔ اقبال نے اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑی اور وحشیانہ جھٹکا دے کر بولا۔ "زیادہ پھڑکو گے تو پھر سیب کے بجائے تمہارے سر پر خوبانی یا آلو بخارا رکھیں گے۔ بالکل چپکے بیٹھے رہو۔"

"م... میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے پچھلے ایک مہینے سے داجی اور اختر کو دیکھا تک نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا... دو امیر باپوں کے بیٹے ہیں۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ میں پھنس گیا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے اس لڑکی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں اس کے زخمی ہونے کا ذمے دار نہیں ہوں۔ میں تو... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب اس طرح ہو گا۔ میں تو بس داجی کی باتوں میں آ گیا تھا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میرا قصور بس یہ ہے کہ میں داجی کا یار تھا۔" ایک دم اس کی آنکھوں سے آنسو جھڑنے لگے، پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "وہ حرامزادہ داجی بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ ان کے بچاؤ کا راستہ نکل آیا ہے۔ جس کا کوئی قصور نہیں، اس کے گلے میں رسا ڈالا جا رہا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے... کہاں کا قانون ہے؟"

میرا دماغ گھومنے لگا۔ قادر لمبے کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اس کا یہ فقرہ تو بالکل ہی ناقابلِ فہم تھا کہ... میں اس کے زخمی ہونے کا ذمے دار نہیں ہوں۔

وہ ثروت کی بات کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ کسی نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہے۔ کیا ثروت کسی وجہ سے زخمی ہو چکی

تھی؟ یہ خیال ہی مجھے دہلانے کے لیے کافی تھا۔ میں گھبرا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟" میں نے کراہتے ہوئے عمران سے پوچھا۔

عمران نے انگلی سے نفی کا اشارہ کیا اور آنکھوں آنکھوں میں مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ شاید مجھے یہ بتا رہا تھا کہ قادر لمبا اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبر ہے۔

اگلے دو چار منٹ میں عمران کا یہ اندازہ درست محسوس ہونے لگا۔ قادر لمبا گڑگڑا رہا تھا اور بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ پولیس نے واجی کے وارثوں سے پیسے کھا لیے ہیں اور اسے بے وجہ پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ حد سے زیادہ ڈرا ہوا بھی تھا۔ اس کی باتوں سے یہ انداز بھی ہوا کہ وہ ثروت کے حوالے سے بدترین اندیشے رکھتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ثروت نے خود کو آگ لگا کر اپنی جان لینے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہوئی ہے۔

میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ قادر کی معلومات ناقص تھیں۔ اس کے باوجود یہ صورت حال اتنی گمبھیر تھی کہ میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس گورکھ دھندے کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بس لگتا تھا کہ کسی خاص مقصد کے تحت کسی نے جان بوجھ کر قادر سے کو غلط اطلاعات دے رکھی ہیں اور اسے دہشت زدہ کر رکھا ہے۔

عمران نے اس سے مزید سوال جواب کیے۔ وہ بہت ڈر چکا تھا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ اگلنے لگا۔ عمران کا اہم سوال یہ تھا کہ وہ یہاں مجید منشو کے گھر میں کیسے پہنچا اور اس کے دیگر دونوں ساتھی کہاں ہیں؟

قادر نے بتایا۔ "میں پچھلا ہفتہ ڈیرہ غازی کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ میرے ساتھ صرف شکیل تھا۔ ہمیں پولیس سے بچانے کے لیے انکل سراج نے لال کوٹھی بھجوا دیا تھا۔ لال کوٹھی میں ہم دونوں بڑی میڈم صفورا کے پاس تھے۔ انکل سراج کا خیال تھا کہ ہم پانچ چھ ہفتے یہاں رہیں۔ اس دوران میں مخالف پارٹی سے صلح صفائی کی بات ہو جائے گی۔ مگر پھر ایک دن پتا چلا کہ معاملہ زیادہ بگڑ گیا ہے۔ انکل سراج نے مجھے بتایا کہ راناجش کی منگیتر نے اپنے گھر میں خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اس نے خود کو آگ لگائی ہے۔ میو اسپتال میں اپنے بیان میں اس نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی بھی ہوئی ہے اور اسے اس اسٹاپ سے اٹھا کر ویگن میں ڈالنے والوں میں سب سے آگے میں تھا۔ انکل گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔ انکل نے مجھے بتایا کہ اب ہمارا بچنا بہت مشکل ہے۔ ہم پکڑے گئے تو بہت لمبی سزا ہو سکتی ہے اور... اور ہو سکتا ہے کہ..." قادر کی آواز بھرا گئی۔ وہ فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔

"اچھا پھر کیا ہوا؟" عمران نے چوٹ کی جگہ پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"انکل سراج نے کہا کہ اب ہمارا لال کوٹھی میں رہنا ٹھیک نہیں۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔"

"تو انکل سراج نے تجھے یہاں پارسل کر دیا... مجید منشو کے پاس؟"

"ہاں جی... اب میں پچھلے فریاد دن سے یہاں ہوں۔ مجھے اب شکیل کا بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ واجی کی طرح اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے واجی کے گھر والوں نے اسے کسی دور نزدیک کی طرف نکال دیا ہو۔"

قادر کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے۔ انسان جب کسی مصیبت کے شکنجے میں پھنستا ہے تو کتنا مختلف نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ یہی قادر تھا جس نے واجی کے ساتھ مل کر مجھے اور ثروت کو ڈسٹنگ باؤن پارکنگ میں ذلیل کیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی بڑی بڑی موٹر سائیکلیں ثروت کی کار کے پیچھے پارک کر دی تھیں اور ہمیں وہیں پارکنگ سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ تب کتنا چھنے خان نظر آتا تھا یہ قادر۔ اب یہ "بکری" بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی زردی تھی اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

اس سارے معاملے میں کوئی بھید نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی قادر نے میو اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ ثروت اور اس کے گھر والوں کو ابھی تک لاہور میں ہی سمجھ رہا تھا جبکہ وہ ڈھائی تین دن پہلے جرمنی پہنچ چکے تھے۔

ابھی ہم قادر سے بات چیت کر ہی رہے تھے کہ میز پر رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ قادر چونک گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے کہا۔ "کال ریسیو کرو مگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کرنا..."

اقبال بولا۔ "ورنہ ہم سب کی چھ فرلانگی بلکہ پیر رکھیں گے تمہارے سر پر۔"

"اور اسپیکر آن کر دو تاکہ ہمیں تمہاری گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔" عمران نے دوسرا حکم دیا۔

قادر نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کال اٹینڈ کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے ایک نرم لیکن بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو قادر! کیسے ہو؟"

"بس ٹھیک ہوں صدیقی صاحب! آپ نے کہا تھا کہ میں چکر لگاؤں گا جمعرات کو... لیکن آپ آئے ہی نہیں۔"

"بس یار! تمہارے ہی کام میں پھنسا ہوا تھا۔ بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ معاملہ بڑا الجھن ہے۔ لڑکی کی گواہی ہمارے خلاف آئی تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا... اور ابھی تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ بچتی بھی ہے یا نہیں۔"

"آپ... اپنے... کسی ساتھی کا ذکر کر رہے تھے۔"

"ہاں بیرسٹر فیروز خان۔ وہ مجھ سے سینئر ہے اور دوست بھی ہے۔ میں ان سے بھی مشورہ کر رہا ہوں۔ ہم کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ اللہ رب العزت نے چاہا تو ہم تمہیں گرم ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مصیبت فوراً آ جاتی ہے لیکن جاتے ہوئے کچھ وقت تو لگتا ہے نا۔"

"بس... بس... اب آپ ہی کا آسرا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ آسرا بس اوپر والے کا ہوتا ہے۔ بندے کا کام تو کوشش کرنا ہے۔ کون سی کوشش کامیاب ہوگی اور کون سی نہیں، یہ بس اوپر والے کو پتا ہے۔ بہرحال، تم فکرمند نہیں ہو اور نہ ہی والدہ اور کنول کو ہونے دینا ہے۔ فون پر بات ہو تو انہیں پوری تسلی دو... اور ایک بار پھر کہوں گا... والدہ اور کنول کے سوا کسی سے بھول کر بھی رابطہ نہیں کرنا۔ پولیس ہر طرف تمہیں سونگھتی پھر رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے جی۔ جیسے آپ کہتے ہیں۔"

"میں ذرا جلدی میں ہوں۔ تمہارے ہی سلسلے میں جا رہا ہوں۔ ایک بڑے خاص بندے سے ملنا ہے۔ کل پھر رابطہ کروں گا... اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ جی!" قادر نے کہا اور بات ختم کر دی۔

"یہ ذات شریف کون ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ ابرار صدیقی صاحب بہت بڑے وکیل ہیں۔ بڑی میڈم صفورا کے جاننے والے ہیں۔ میڈم صفورا نے ان سے میری سفارش کر رکھی ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جس طرح بھی ہوا وہ مجھے اس کیس میں سے نکال لیں گے۔ فیملی کیسوں کے علاوہ بھی کرتے رہتے ہیں۔"

"اور یہ کنول؟"

"یہ... میری بہن ہے۔"

"یہ صدیقی صاحب ان کا ذکر کیوں فرما رہے تھے؟"

"دراصل والدہ اور کنول ایک دو بار میرے کیس کے لیے صدیقی صاحب سے ملی ہیں۔ وہ میری والدہ کی بڑی عزت کرنے لگے ہیں۔ ویسے وہ خود بھی نیک بندے ہیں۔ وکالت کے علاوہ دینی کاموں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ انہوں نے کوئی فرم بنا رکھی ہے جس میں بے سہارا لوگوں کو مفت قانونی مدد دی جاتی ہے۔"

"مفت قانونی مدد۔" اقبال نے سر ہلایا۔ "اس لفظ 'مفت' میں بڑا جادو ہے بھئی۔ مفت زہر بھی ملے تو ہم لوگ فوراً پھانکنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں... اور جہاں تک صدیقی صاحب کے نیک ہونے کا سوال ہے، اس کے لیے یہ ثبوت ہی کافی ہے کہ وہ تیرے جیسے نیک بندے کا کیس بلا معاوضہ لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

قادر سے کے ساتھ عمران اور اقبال کی تفتیشی گفتگو جاری تھی اور میری پریشانی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جذبات کا شکار ہو کر قادر کے سامنے آ گیا تھا اور اس کا سیدھا مطلب تھا کہ میں سیٹھ سراج اور دیگر لوگوں کے سامنے بھی آ گیا ہوں۔ اب میرے گھر والوں کے لیے کوئی بھی سنگین خطرہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

عمران میرے ساتھ پہلو کے کمرے میں آیا اور صورت حال کے بارے میں مشورہ کیا۔ عمران بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ قادر لمبے کو بے ہوشی کا انجکشن لگا کر انتقال کیا جائے اور پھر گاڑی میں ڈال کر یہاں سے نکال لیا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ بے ہوشی کا انجکشن اور سرنج وغیرہ اس کی گاڑی میں موجود ہیں۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تمہیں پہلے سے پتا تھا کہ کسی کو بے ہوش کیا پڑے گا؟"

"یہ مجھو جگر! ہمارا بازی گری کا سارا کام 'پنج منٹ' پر ہوتا ہے۔ ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگاتے ہوئے، موٹر سائیکل پر کرتب دکھاتے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر خنجر چلاتے ہوئے... سب کچھ پنج منٹ پر 'ڈن پینڈ' کرتا ہے۔ یہاں بھی بس ایک پنج منٹ ہی تھی کہ شاید ایسا کچھ کرنا پڑے۔"

"لیکن یہ تو بہت خطرناک کام ہوگا۔ سیدھا سیدھا اغوا کا معاملہ بن جائے گا۔"

"میرے خیال میں تو یہ اغوا کا معاملہ نہیں ہوگا... بلکہ ہم ایک اغوا شدہ شخص کو بازیاب کرائیں گے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہمارے ساتھ رہو گے جگر تو سمجھنا بھی سیکھ جاؤ گے۔ مجھے شک پڑ رہا ہے کہ سیٹھ سراج وغیرہ اس بدبخت قادرے کے خلاف ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔ کسی خاص مطلب کے لیے اس کو ثروت کے معاملے میں ضرورت سے

زیادہ ڈرایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ صدیقی نام کا بندہ بھی سیٹھ سراج کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو۔ وہ قادرے کو اس کیس سے بچانے کا لالچ دے کر اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو۔"

"نہیں... قادرے کی بہن ہی کا کوئی چکر نہ ہو۔ میرا مطلب ہے صدیقی نے دو تین بار قادرے کی بہن کی بات بھی کی ہے۔"

"ان باتوں کا پتا تو وقت کے ساتھ ہی چل سکتا ہے۔ فی الحال تو فوری طور پر ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم قادرے کو یہاں چھوڑ جائیں یا پھر مہمان بنا لیں، اپنے نائنٹو اسٹار گھر میں۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا... اور... مجھے پتا ہے کہ تم میری بات مانو گے بھی نہیں۔"

"دیکھا!... اب! تم آہستہ آہستہ تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہیں۔" وہ بڑی ادا سے مسکرایا۔ پھر انگلی سے اپنی کنپٹی کھجا کر بولا۔ "اچھا ایک کام کرو... دو منٹ کے لیے مجھے اور اقبال کو اکیلے میں مشورہ کرنے دو۔ اس دوران میں تم ذرا اس مصیبت کے پاس رکو۔" اس نے مجھے پستول دے دیا۔

میں نے روانی میں پستول تھام تو لیا لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بڑی ہوشیاری سے مجھے اپنے نیک کاموں میں شریک کرتا چلا جا رہا ہے۔ آج سے چند روز پہلے میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں اس طرح ایک بھرا ہوا پستول تھام کر وانی کے ایک بدمعاش دوست کو گن پوائنٹ پر رکھوں گا اور وہ نظریں جھکائے میرے سامنے بیٹھا رہے گا۔

میں عمران کی ہدایت کے مطابق پستول بدست قادرے کے پاس رہا اور دوسرے کمرے میں عمران اور اقبال آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔

کچھ ہی دیر بعد عمران اپنے ہاتھ میں ایک سرنج لیے نمودار ہوا۔ اس کے عقب میں اقبال تھا۔ سرنج دیکھ کر قادرے کے زرد چہرے پر بہت سے سوالیہ نشان ابھر آئے۔

"یہ ٹیکا لگوا لو۔ تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ درد ٹھیک ہو جائے گا اور انفیکشن بھی نہیں ہوگا۔" عمران نے قادرے سے کہا۔

"نن... نہیں... میں ٹھیک ہوں۔"

"ٹھیک نہیں ہو بیٹا جی۔ دیکھو تمہارا رنگ بالکل پیلا ہو رہا ہے۔ اس سے تھوڑی سی طاقت بھی آئے گی اور تمہارا دماغ بھی اچھے طریقے سے کام کرنے لگے گا۔ اس ایک ٹیکے میں بہت کچھ ہے۔ تمہارے بہت سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ سمجھو ٹیکا نہیں جادو کی چھڑی ہے... چلو شاباش۔"

پستول بدستور اقبال کے ہاتھ میں تھا۔ قادرے جانتا تھا کہ مزاحمت کرے گا تو سر پر پھر پستول کی تکلیف دہ ضرب سہنی پڑے گی۔ اقبال نے اس کی آستین چڑھائی اور عمران نے انجکشن دے دیا۔ دو چار منٹ میں ہی قادرے کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ کچھ دیر بڑبڑاتا رہا۔ پھر صوفے پر ایک طرف کو ڈھلکتا ڈھلکتا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

سارا پروگرام جیسے عمران اور اقبال نے پہلے ہی طے کر لیا تھا۔ عمران نے مجھ سے گاڑی کی چابی لی اور گھر کا گیٹ کھول کر اسے اندر لے آیا۔ بے ہوش قادرے کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر اس طرح لٹایا گیا کہ اس کا سر میری گود میں آ گیا۔ اس کے اوپر ایک چھوٹا کمبل ڈال دیا گیا۔ اب دیکھنے میں یہی لگ رہا تھا کہ ہم کسی بیمار کو اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ مجید مٹھو کا گھر چھوڑنے سے پہلے عمران اور اقبال نے وہاں اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹا دیے۔ جن چیزوں پر فنگر پرنٹس کا اندیشہ تھا، وہاں کی صفائی کر دی۔ گھر کی ہلکی پھلکی تلاشی میں انڈین شراب کی چند بوتلیں، ہیروئن کی پڑیاں اور دو اسلحے بھی نظر آئیں۔ بہرحال، ان اشیا کو جہاں کا تہاں رہنے دیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم مجید مٹھو کے گھر سے نکل رہے تھے۔ گلی میں اکا دکا افراد نے ہمیں دیکھا لیکن کسی نے بھی خصوصی توجہ نہیں دی۔ تقریباً پینتالیس منٹ بعد ہم راوی روڈ پر عمران کے گھر داخل ہو چکے تھے۔

شام کے بعد ہی قادرا مکمل طور پر ہوش میں آ سکا تھا۔ اس نے خود کو ایک اجنبی جگہ دیکھ کر واویلا کیا۔ وہ یہ بات جان گیا تھا کہ اسے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کر کے ٹمن آباد والے مکان سے نکال لیا گیا ہے۔

جب اس کے ہوش ٹھکانے پر آئے تو عمران نے اسے چائے پلوائی اور اس سے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ عمران اس سے ابرار صدیقی نامی شخص کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہ رہا تھا۔ قادرے نے بھرائی ہوئی مسمسی آواز میں کہا۔ "میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ صدیقی صاحب وکیل ہیں۔ ان کا کافی نام ہے۔ جب میں اور شکیل لالی کوٹھی میں میڈم صفورا کے پاس تھے، یہ وہاں دو تین بار آئے تھے۔ انکل سراج سے بھی ان کی جان پہچان ہے۔ انہوں نے داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوگی۔"

"میڈم صفورا اور سیٹھ سراج سے اس بندے کا کیا تعلق ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں مگر لگتا ہے کہ میڈم صفورا کی طرح صدیقی صاحب کو بھی پرانی چیزوں کا تھوڑا بہت شوق ہے۔ یعنی مورتیاں، پرانے برتن اور زیور وغیرہ۔"

"تمہاری والدہ سے صدیقی کی ملاقات کیسے ہوئی تھی؟" اقبال نے دریافت کیا۔

"میری والدہ اور بہن ایک دو بار لالی کوٹھی آئی تھیں، مجھ سے ملنے کے لیے... شاید وہیں پر صدیقی صاحب نے انہیں دیکھا تھا۔"

"اب تم کہتے ہو کہ تمہاری والدہ سے صدیقی کی اچھی جان پہچان ہو چکی ہے؟"

"جی ہاں... میرے خیال میں انکل سراج نے ہی والدہ کو بتایا تھا کہ صدیقی صاحب مجھے اس کیس سے نکالنے میں مدد کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد والدہ اور کنول، صدیقی صاحب سے ملنے ان کے دفتر بھی گئی تھیں؟"

"وہ خود کیوں گئی تھیں؟ کیا اس کام کے لیے کوئی مرد نہیں تھا؟" اقبال نے پوچھا۔

قادرے نے چونک کر اقبال کو دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ "اور کون جاتا؟ ایک بھائی کے سوا میرا کوئی اور ایسا نہیں ہے جو یہ بھاگ دوڑ کر سکے۔ وہ بھائی بھی مسقط میں بیٹھا ہوا ہے۔"

عمران نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "اس وقت تو یہی لگ رہا ہے کہ تم دنیا کے مظلوم ترین بندوں میں سے ایک ہو۔ تمہاری آمدن اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تم تھانے کچہریوں کے خرچ برداشت کر سکو۔ تمہیں اپنے گناہوں کی سزا سے بچانے کے لیے تمہاری بوڑھی والدہ اور جوان بہن کو بھی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ تمہاری اتنی حیثیت نہیں ہے کہ تم بھی شکیل کی طرح جان بچانے کے لیے پاکستان سے باہر جا سکو، وغیرہ وغیرہ... لیکن یہ ساری باتیں تب تمہارے دماغ میں نہیں آئیں جب تم نے ایک غنڈے کا روپ دھارا ہوا تھا... ایک شریف لڑکی کا جینا حرام کیا ہوا تھا اور اس کے ساتھ مل کر اسے اغوا اور بے آبرو کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اگر اس وقت تم اپنی والدہ اور جوان بہن کا خیال کرتے جو اب تمہیں بچانے کے لیے جگہ جگہ دھکے کھا رہی ہیں۔"

قادرے کی جھکی ہوئی گردن بدستور جھکی رہی۔ آج دوپہر والی چوٹوں کی وجہ سے اس کا چہرہ جگہ جگہ سے سوج گیا تھا اور سوزش کے سبب ایک آنکھ تقریباً بند تھی۔ اپنے حلیے کے سبب وہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

اقبال نے پوچھا۔ "تمہیں پتا ہے کہ یہ صدیقی کہاں رہتا ہے؟"

"نہیں، گھر کا تو پتا نہیں... پر ان کا دفتر پرانی انارکلی کی طرف ہے۔ صدیقی لا ایسوسی ایٹس کے نام سے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، اس وقت وہ اپنے دفتر میں ہوگا؟"

قادرے نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ وہ بولا۔ "ہاں، اگر وہ لاہور سے باہر نہیں گئے تو دفتر میں ہی ہوں گے..."

یہی وقت تھا جب قادرے کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ موبائل فون اب عمران کی جیب میں تھا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین کا جائزہ لیا۔ اس پر "کنول" کا نام چمک رہا تھا۔ یہ قادرے کی بہن کی کال تھی۔

عمران نے سرسراتے لہجے میں قادرے کو حکم دیا۔ "چل، کال ریسیو کر... اور خبردار کوئی ہوشیاری نہیں دکھانی۔ اسی طرح بات کر جس طرح مجید مٹھو کے گھر میں کر رہا تھا... اور اسپیکر آن کر لے۔"

قادرے کے چہرے پر پریشانی بڑھ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ ایک جوان نسوانی آواز کمرے میں گونجی۔ "ہیلو..."

"ہیلو!" قادرے نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

"السلام علیکم قادر بھائی۔" کنول نے کہا۔

"وعلیکم السلام... کیسی ہو؟"

"بس ٹھیک ہوں۔"

"کیا بات ہے، آج آپ کچھ سست لگ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟"

"ہاں ہاں، خیریت ہے۔ بس سر میں ہلکا سا درد تھا۔"

"سر درد پریشانی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے بھائی... لیکن اب اللہ نے چاہا تو ہماری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اوپر والے نے صدیقی صاحب کو ہمارے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ وہ دوپہر کو پھر آئے ہوئے تھے۔ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا ہے۔ عصر کے بعد گئے ہیں۔ بڑی تسلی دے رہے تھے۔"

قادرے خاموش رہا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ڈر کی وجہ سے کہہ نہیں پا رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد کنول کی آواز دوبارہ ابھری۔ "بھائی! آپ میری طرف سے بالکل فکرمند نہ ہوں۔ میں آپ کو یقین

دلائی ہوں... میں... صدیقی صاحب... کے ساتھ... میرا مطلب ہے... میں ان کے ساتھ... خوش رہوں گی۔ میں... ان کو بڑی حد تک جان گئی ہوں۔ وہ دل کے بہت بہت اچھے ہیں۔ امی نے چاچا امین کے ذریعے پتا کروایا ہے۔ صدیقی صاحب نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ آٹھ دس سال پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ دو سال بعد ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اکیلے رہ رہے ہیں۔ بچہ بھی کوئی نہیں ہے۔ خدا ترس اور ہمدرد بندے ہیں۔ محلے تک میں ان کی نیک نامی ہے۔"

قادر اب بھی خاموش رہا۔ اس کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فون بند کر دے مگر ظاہر کی وجہ سے وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا تھا...

"ہیلو قادر بھائی! آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"نن... نہیں۔"

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر کنول نے کہا۔ "بھائی! امی بتا رہی تھیں کہ آپ عمر کی بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ صدیقی صاحب کی عمر تھوڑی زیادہ ہے۔ بھائی! یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے۔ کم از کم میرے لیے تو نہیں ہے۔ میری اور ان کی عمر میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کا فرق ہوگا۔ ہمارے ہی خاندان میں دو تین شادیاں ایسی ہو چکی ہیں جن میں میاں بیوی کی عمر میں آٹھ دس سال کا فرق ہے... اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے بھائی کہ صدیقی صاحب نیک اور ہمدرد ہیں۔ ان کی طبیعت میں جو ہمدردی ہے، وہ ان کو اور... مجھے بہت پسند آئی ہے۔"

"اچھا... اس بارے میں پھر بات کریں گے۔" قادر بولا۔

"کیا... آپ کے پاس کوئی اور بھی ہے؟" کنول نے پوچھا۔

"نہیں تو... بس ذرا درد ہو رہا ہے سر میں۔"

"اگر زیادہ ہو رہا ہے تو پھر ڈاکٹر کو دکھائیں۔" کنول کے لہجے میں ایک بہن کی بے تاب محبت تھی۔ دونوں کے درمیان ایک دو جملوں کا مزید تبادلہ ہوا۔ اسی دوران میں قادرے کے فون کی بیٹری جواب دے گئی اور رابطہ ختم ہو گیا۔

صورت حال ایک دم ہی واضح تر ہو گئی تھی۔ ہمارا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ یہ صدیقی نام کا ایڈووکیٹ قادرے کی ماں بہن کے ساتھ جو والہانہ ہمدردی دکھا رہا تھا، اس کے پیچھے مقصد تھا... اور یہ مقصد تھا قادرے کی بہن۔ قادرے کے نقوش بھی برے نہیں تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی بہن خوب صورت رہی ہوگی۔ اس کی یہی خوب صورتی اس صدیقی کو قادرے اور اس کے گھر والوں کے قریب لے آئی تھی۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔

قادرا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے درم زدہ چہرے پر شرمندگی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ بہن جو کچھ بھی کہہ رہی تھی، وہ اچھی جگہ تھا مگر اندر کی حقیقت قادرا بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کی بہن رہی کچھ کر رہی تھی جو ہوا کی بیٹی ہمیشہ سے کرتی رہی ہے۔ قربانی دیتی رہی ہے۔ کبھی اپنے باپ اور بھائی کی عزت بچانے کے لیے، کبھی شوہر کا ہاتھ سے بچانے کے لیے اور کبھی اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے۔ اس کے جسم اور اس کی روح کو اکثر گناہوں کے کنارے میں ہمیشہ چھیدا گیا ہے۔ بہت اسی بچوں کی سزا دی گئی ہے جو اس نے چھیڑی ہی نہیں تھیں۔ اسے ان بداعمالیوں کے خون کی قربانی بھی دینا پڑی ہے جو اس نے کی ہی نہیں تھیں۔ اسے ایسی ہوسوں کی خاطر آگ میں زندہ جلایا گیا ہے جن کا مقصد صرف مرد کی عظمت کو ثابت کرنا تھا... اور ان سب مظالم کے حوالے سے عورت کا قصور صرف اور صرف اتنا رہا ہے کہ وہ کمزور تھی اور عورت تھی۔

عمران نے قادرے کی تھوڑی کے نیچے انگلی رکھی اور اس کے جھکے ہوئے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "قادر بیٹا! شرمندہ ہونے کی کون سی بات ہے؟ زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز پیاری نہیں۔ تمہاری جان چھوٹ رہی ہے۔ اس کے بدلے تمہاری بہن کو ایک بڑی عمر کے شخص سے شادی کرنی پڑ جائے گی... یہ نقصان کا سودا نہیں۔"

قادرے کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ بے عزتی کا احساس اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش کو اور بھی بگاڑنے لگا۔

"ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو دل سے نہیں لگایا کرتے قادرے صاحب۔" اقبال نے بھی طنز کا زہریلا تیر چھوڑا۔ "یہ ابرار صدیقی تیز طرار بندہ لگتا ہے۔ لمبے چکروں میں نہیں پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ چار مہینے یہیں رکھ کر چھوڑ دے تمہاری بہن کو... اور تم جیسوں کی بہنیں تو ہوتی ہی اس لیے ہیں۔ تمہارے کارناموں کے بدلے سب سے پہلے ان کو ہی گالی دی جاتی ہے اور کارنامہ جتنا بڑا ہوتا ہے، گالی بھی اتنی بڑی ہوتی ہے۔ تم نے ایک شریف لڑکی کو اٹھایا تھا، اب تمہاری بہن کو بھی کوئی اٹھا رہا ہے۔ بس طریقے کا فرق ہے۔"

قریباً ایک گھنٹے بعد قادرے کے موبائل کی گھنٹی پھر بج گئی۔ موبائل اس وقت چارجر پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ اس پر "انکل" کا نام آ رہا تھا۔ دھیان سیدھا سراج کی طرف گیا۔ عمران نے بھی اسکرین دیکھی اور پھر قادرے سے کہا کہ وہ پہلے کی طرح موبائل کا اسپیکر آن کر کے کال ریسیو کرے۔

قادرے نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے سیٹھ سراج کی منحوس آواز ابھری۔ "ہاں بھئی قادر! کیا حال چال ہے؟"

"ٹھیک ہوں جی۔"

"منحو کہاں ہے؟"

"وہ تو آج سویرے چلے گئے تھے۔ کہتے تھے ضروری کام ہے۔ کل شام تک آئیں گے۔"

"تمہارے صدیقی صاحب نے بھی چکر لگایا ہے یا نہیں؟"

"نہیں، آئے تو نہیں۔"

"بس وہ تمہارے ہی غم میں ہلکا ہوا جا رہا ہے۔ بڑی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ کل عدالت والا جج بھی پیش ہو رہا تھا۔ پیش ہوتا تو تم... جج نے اشتہاری بنا دیا تھا۔ بہت چنگا اور بابند ہے صدیقی۔ بغیر لالچ کے کام کرنے والے ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔"

کرسیٹھ سراج نے دو چار منٹ صدیقی کی تعریفیں کرنے میں صرف کیے۔ وہ قادرے کو باور کرا رہا تھا کہ اس وقت اس کا اور اس کے گھر والوں کا نجات دہندہ یہ صدیقی ہی ہے۔ سیٹھ کی آواز اسپیکر سے نکل کر کمرے میں گونج رہی تھی۔ اقبال اپنے موبائل پر اس کی آڈیو ریکارڈنگ کرتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ابرار صدیقی کے ساتھ ہونے والی گفتگو بھی اپنے موبائل میں محفوظ کی تھی۔

سیٹھ سراج کی باتوں سے عیاں تھا کہ ابھی تک کسی کو کانوں کان یہ خبر نہیں ہے کہ قادرے کو جید مٹھرے کے کن آباد والے مکان سے اٹھایا جا چکا ہے۔

سیٹھ سراج سے قادرے کی بات ختم ہوئی تو عمران گہری سوچ میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے قادرے سے پوچھا۔ "وہاں مٹھو کے مکان میں تمہارے پاس کون کون آتا رہا ہے؟"

"دو تین بار صدیقی صاحب آئے ہیں۔ پھر چھوٹی سیلم کا ایک ملازم سیم بھی آتا رہا ہے۔"

"اور یہ تمہارا انکل سراج؟"

"یہ بھی ایک بار آیا تھا سیلم کے ساتھ ہی۔"

عمران کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ اقبال کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابرار صدیقی سے بات ہو گئے؟"

"اگر تم چاہتے ہو تو ضرور کر دوں گا۔" اقبال بولا۔

عمران نے قادرے کے ہاتھ سے اس کا موبائل فون لیا۔ ہم تینوں قادرے کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی گئی۔ گھر کے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اقبال نے اپنا موبائل میز پر رکھا اور اس میں ریکارڈ ہونے والی سیٹھ سراج کی آواز کو بغور سننے لگا۔ اس نے تین چار بار یہ ریکارڈنگ پلے کی۔ اس کے بعد وہ سیٹھ کی آواز کی نقل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ صرف ایک دو بار کی کوشش سے وہ کافی حد تک سیٹھ سراج کی آواز سے ملتی جلتی آواز نکالنے لگا۔ وہ اپنے اب و لہجے کو بھی سیٹھ کے لب و لہجے سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کسی اداکار کی طرح سیٹھ سراج کے بولے ہوئے فقرے چند بار دہرائے اور مجھے ششدر کر دیا۔ اسے اس کام میں ساٹھ ستر فیصد کامیابی ہوئی تھی۔ آڈیو ریکارڈنگ سے تو اس کو مدد مل ہی رہی تھی، وہ ایکسیڈنٹ والی لڑائی میں سیٹھ کی LIVE آواز بھی سن چکا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ عمران کی ہدایت کے مطابق ابرار صدیقی کو فون کر رہا تھا۔ اس کال کے لیے وہ قادرے والا فون ہی استعمال کر رہا تھا۔ اس نے ابرار صدیقی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ابرار کی آواز ابھری۔ "ہیلو!"

"ہیلو! صدیقی صاحب... میں آپ کا خادم بول رہا ہوں جی، سراج احمد۔"

"اوہو سراج بھائی تم؟ یہ تو قادرے کا نمبر ہے۔"

"بس جی، ادھر آیا ہوا تھا قادرے کے پاس۔ میرے پاس بیلنس ختم ہے اس لیے قادرے کے فون سے کر رہا ہوں۔ اور سناؤ جی کیا حال چال ہے؟" اقبال نے کھنکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے سراج بھائی، تمہاری آواز کچھ بدلی ہوئی ہے۔ زکام ونگ لگا ہے؟"

"زکام اور کھانسی دونوں ہی۔ کل رات بس اچار گوشت کھا لیا تھا۔"

"کل؟ کل تو تم رات کو بھٹی صاحب کے بیٹے کے ولیمہ پر تھے... ہاں تو وہاں ہی کھایا تھا۔"

اقبال ذرا گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ "نہیں، بعد میں گھر جا کر تھوڑا سا چکھ لیا تھا۔ اور سناؤ جناب! کب تک انتظار کرواؤ گے۔ کوئی خوش خبری وغیرہ سناؤ جی ہم کو بھی۔" اقبال نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا۔ غالباً اس نے کوشش کی تھی

کہ ابرار صدیقی اپنی نجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائے۔

ابرار صدیقی نے کہا۔ ''یار! کیا بتاؤں تمہیں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہیں فون کروں۔ تمہاری اس خوش خبری کو تو لاہور سے باہر لے جانا پڑا ہے... جہلم میں۔''

''وہ کیوں؟'' اقبال نے پھر اندھیرے کا تیر چلایا۔

''بس یہاں کچھ خطرہ لگ رہا تھا۔ رات کو کوٹھی کے آس پاس کچھ مشکوک بندے گھومتے دیکھے گئے تھے۔ پھر اسی کسٹمر والے عابد شاہ کا فون آگیا۔ اسے کسی نے مخبری کی تھی کہ میرے پاس ایک ''پیس'' آیا ہے... جو کہ اسپیشل چیز ہے۔ میں نے سوچا کہ اب ''مال'' پر گندی نظریں پڑنا شروع ہو گئی ہیں اس لیے اسے یہاں سے نکال لینا چاہیے۔''

''تو اب کہاں رکھا ہے؟'' اقبال نے سیٹھ سراج کے لہجے میں دہرایا۔

''وہیں جہلم میں۔'' ابرار صدیقی نے گول مول جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بولا۔ ''تمہاری آواز صاف نہیں آرہی۔ کچھ گونج رہی ہے...''

اقبال نے ایک بار پھر کھانسنا شروع کیا۔ ''بس طبیعت ذرا خراب ہے۔ اچھا ٹھیک ہے بعد میں پھر بات کریں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔''

''رب راکھا۔'' اقبال نے سراج کے انداز میں کہا اور فون بند کر کے گہری سانس لی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

عمران نے اسے انگوٹھا دکھا کر اشارہ دیا کہ اس نے اچھی ایکٹنگ اور صداکاری کی ہے۔

اقبال نے سراج کی آواز میں بات کرتے ہوئے خوش خبری کا ذکر کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس لفظ کو سن کر شاید صدیقی اپنی ''نادیدہ مصروفیت'' کا کوئی ذکر کرے۔ یہ بات تو اب ثابت ہو چکی تھی کہ وہ قادرے کی بیوی کنول میں دلچسپی لے رہا ہے۔ بہرحال صدیقی نے ''خوش خبری'' کے لفظ سے کوئی اور مطلب لے لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ خوش خبری تو اس نے لاہور سے جہلم پہنچا دی ہے کیونکہ یہاں کچھ لوگ اس کے بارے میں باخبر ہو چکے تھے۔

عمران نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ ''ہاں بھئی! کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟''

''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم دونوں خود کو خواہ مخواہ کی مصیبت میں پھنسانے چلے جا رہے ہو... اور مجھے یہ کوئی چھوٹی مصیبت نہیں لگتی۔''

''مصیبت کوئی بھی چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی یار... بندے کی سوچ اسے چھوٹا بڑا بناتی ہے۔ ذرا غور کرو، وہی بلے باز جو نوے تک آسانی سے اسکور بنا لیتا ہے... بعد کے دس اسکورز کو ایک بڑی مشکل سمجھنے لگتا ہے اور سنچری کا آخری اسکور تو اس کے لیے پہاڑ بن جاتا ہے۔ حالانکہ وہی پچ ہوتی ہے، وہی باؤلرز اور وہی سب کچھ۔ ثابت یہ ہوا کہ ہماری سوچ ہی کسی کام کو مشکل یا آسان بناتی ہے۔''

میں منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہاں بھئی بتاؤ... تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟''

اقبال نے تھوڑی سوچتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ صدیقی نوادر کی بات کر رہا تھا۔ ''پیس'' کا لفظ یہ لوگ عام طور پر نادر چیزوں کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔ شاید صدیقی کے پاس کوئی بہت خاص الخاص شے ہے جسے وہ بہت سنبھال کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے حفاظت کی خاطر اسے لاہور سے جہلم منتقل کر دیا ہے۔''

''ہاں، بات تو سمجھ میں آرہی ہے۔ صدیقی، میڈم صفورا اور سراج سے ملتا ہے۔ یقیناً وہ بھی نوادرات میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تم نے خوش خبری کی بات کی تو اس کا دھیان فوراً اس نادر شے کی طرف کیوں چلا گیا؟''

''ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ اس شے کو کسی بڑی قیمت پر فروخت کرنا چاہ رہے ہوں۔ صدیقی نے خوش خبری والی بات کو اسی بیک گراؤنڈ میں دیکھا ہو یا پھر اس سے ملتی جلتی کوئی اور بات ہو۔'' اقبال نے کہا۔

''یہاں مغز ماری کرنے کے بجائے کیوں نہ قادرے سے پوچھا جائے۔'' عمران نے خیال ظاہر کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم ایک بار پھر قادرے کے پاس پہنچے اور ان نئی معلومات کے حوالے سے اس سے سوال جواب کیے۔ وہ اس بارے میں تو کچھ نہیں بتا سکا تاہم اس سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ جہلم میں فردوس پلازہ نامی بلڈنگ کے اندر صدیقی کا ایک شاندار فلیٹ ہے۔

صدیقی کے بارے میں عمران نے کرید کرید کر قادرے سے کچھ مزید معلومات بھی حاصل کیں۔ ان معلومات کا خلاصہ قادرے کے مطابق یہ تھا کہ ابرار صدیقی صاحب ایک نہایت دین دار، پرہیزگار اور ہمدرد انسان ہیں۔ وہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام کرتے ہیں اور انہوں نے بے سہارا لوگوں کو فی سبیل اللہ قانونی امداد فراہم کرنے کے لیے ایک باقاعدہ فرم بنا رکھی ہے۔

ان ابرار صدیقی کے بارے میں اب تک ہم اتنا ان

بچے تھے کہ اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ اپنی آواز اور لب و لہجے کے اعتبار سے وہ کافی دبنگ قسم کا شخص محسوس ہوتا تھا۔ ایسا شخص جو اپنی قوتِ گفتار سے کسی کو بھی قائل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے دیکھا کہ عمران اور اقبال کہیں جانے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ناشتا کر چکے تھے اور میرا ناشتا حسبِ معمول ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ تھرماس میں چائے موجود تھی۔ ''کہاں کا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جہلم۔'' عمران نے ترت جواب دیا۔ ''آج اور کل کام سے (سرکس سے) چھٹی ہے۔ سوچا کہ ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی۔ تم ناشتا کرلو۔''

''میں بعد میں کرلوں گا۔''

''بعد میں... کیا مطلب؟ گاڑی میں کرو گے؟''

''میں کہیں نہیں جا رہا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تو پھر ہم بھی کہیں نہیں جا رہے۔'' عمران نے دھوپ کا چشمہ اور پی کیپ اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

''کیا کوئی زبردستی ہے؟''

''بس یہی زبردستی ہے کہ ہم بھی نہیں جائیں گے۔ ہمارے نہ جانے سے سیٹھ سراج کا جتنا فائدہ ہوگا، اس کے تم ہی ذمے دار ہو گے۔''

''مجھے سیٹھ کے فائدے نقصان سے کچھ لینا دینا نہیں۔ بھاڑ میں جائے وہ اور اس کے چیلے چانٹے۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں صرف ثروت کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو گے لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ تمہاری بس اپنی دلچسپیاں ہیں۔ میں کسی ایسے کھیل کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔'' میں نے کڑوے کسیلے لہجے میں کہا۔

''یار! ایک تو تم بدگمان بہت ہو۔ اگر تمہارے ساتھ میری تھوڑی سی بے تکلفی اور ہوتی تو آج میں نے تمہاری اس خوب صورت ناک پر گھونسا مار دینا تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بالکل بے خبر بیٹھا ہوا ہوں؟ مجھے تمہارے اندر کی حالت کا کچھ پتا نہیں؟''

''دیکھنے میں تو ایسے ہی لگتا ہے۔'' میرا موڈ بدستور آف تھا۔

وہ فلم اسٹار محمد علی کے انداز میں بولا۔ ''دیکھ لو دنیا والو... یہ صلہ ہے وفاؤں کا صلہ... یہ میرا دوست ہے۔ میری جان ہے... میرا جگر ہے... اور آج... آج اس بھری عدالت میں یہی مجھ پر بے وفائی کا الزام لگا رہا ہے۔ مجھے اپنے دکھ درد سے ناآشنا سمجھ رہا ہے۔ اتنے بڑے الزام کا سامنا کرنے سے بہتر ہے کہ میں خود اپنی جان لے لوں۔ اپنی زندگی دے کر اپنی سچائی ثابت کر دوں۔ لاؤ یار اقبال! کہاں ہے میرا پستول؟''

اقبال نے مسکراتے ہوئے... تکیے کے نیچے سے پستول نکالا اور عمران کی طرف اچھال دیا۔ عمران نے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے کنپٹی سے لگایا... مگر پھر ٹریگر دبانے سے پہلے اس کا چیمبر کھول کر دیکھا اور غصے سے اقبال کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''یار! بڑے بے وقوف ہو تم... اس میں تو پوری گولیاں ہیں۔ کم از کم دو تین گولیاں تو نکال لو۔ کچھ نہ کچھ چانس تو باقی رہے۔ وہ شاہین بے چاری تو بے موت ماری جائے گی۔ پرسوں اس غریب کی سالگرہ ہے۔ ایسی خوشی کے موقعے پر اسے میرے ٹکڑے چننے پڑ گئے تو پھر؟''

''سرکس میں تم سے کہیں اچھے مسخرے موجود ہیں۔ اس فیلڈ میں کوشش نہ ہی کیا کرو تو بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔

''دیکھ لو دنیا والو۔ میری برباد زندگی کا تماشا دیکھ لو۔ اب مجھے مسخرہ بھی کہا جا رہا ہے۔'' عمران نے ادا سے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

اقبال مسکراتا ہوا میرے پاس آ بیٹھا۔ ''بس یار! عمران تمہارے والے کام سے غافل نہیں ہے۔ ساتھ ساتھ تمہارا کام بھی ہو رہا ہے۔''

''کیا ہو رہا ہے میرا کام؟''

''بتاؤ عمران! کیا ہو رہا ہے کام؟'' اقبال نے کہا۔

''نہیں یار! تم ہی بتاؤ۔ میں بولوں گا تو کہے گا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' عمران مصنوعی ناراضی کے ساتھ بولا۔

اقبال نے کہا۔ ''حاجی صاحب سے بات چیت ہو رہی ہے۔ عمران تمہیں بتائے بغیر ہی دو دفعہ ان سے مل چکا ہے۔''

''کون حاجی صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے یار! وہی پراپرٹی ڈیلر... جن کو تمہارے ناصر بھائی اپنا مکان بیچنے کی ذمے داری دے گئے ہیں۔ یہ حاجی صاحب بھی عمران کے جاننے والے نکل آئے ہیں۔ وہ اپنے بازار کا چاچا نذیر ہے نا جو اونچا سنتا ہے... وہ حاجی صاحب کا چچیرا بھائی ہے۔ حاجی صاحب کبھی کبھی اس کے پاس آتے ہیں۔ وہیں عمران سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اب حاجی صاحب نے عمران سے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔''

''کیسا وعدہ؟''

اقبال کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہاں فردوس پلازا پر پہنچتے ہی مجید منصو سے ملاقات ہو جائے گی۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے جہلم کی مختلف سڑکوں سے گزر رہی تھیں۔ یہاں ٹریفک زیادہ تھا اور سڑکوں کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ قریباً دس منٹ بعد منصو کی گاڑی ایک کوٹھی میں داخل ہوئی۔ ہم کوٹھی کی نیم پلیٹ پڑھتے ہوئے سامنے سے گزر گئے۔ کوٹھی کا نمبر 100 تھا اور یہ کسی چوہدری منصب علی کی ملکیت تھی۔ کچھ دور جا کر ہم نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور کوٹھی سے کچھ فاصلے پر چند دکانوں کے سامنے رک گئے... اقبال قریبی شاپ سے الائچی سپاری لے آیا۔ ہم پان چباتے ہوئے صورت حال پر غور کرنے لگے۔ مجید منصو کے یہاں ہونے کا مطلب یہ تھا کہ مدقوق وغیرہ سے اس کا براہ راست تعلق ہے۔ ممکن تھا کہ جو نادر شے لاہور سے یہاں جہلم پہنچائی گئی تھی، مجید منصو اسی کے سلسلے میں یہاں پہنچا ہو۔

اچانک منصو کی نیلی کار پھر کوٹھی سے نکلتی دکھائی دی۔ عمران کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ منصو اتنی جلدی یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ اقبال نے ابھی پان والے سے بقایا پیسے بھی لینے تھے۔ تاہم یہ ستر اسی روپے اس کو گفٹ کرتے ہوئے ہم پھر نیلی کار کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ منصو نے ایک جگہ رک کر گاڑی میں "سی این جی" ڈلوائی۔ ایک ورکشاپ کے اندر جا کر کسی کو ساتھ لیا اور باہر آیا۔ یہ لکڑی کی ورکشاپ تھی۔ جب منصو ورکشاپ سے باہر آیا تو اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان بھی تھا۔ نوجوان کا چہرہ افسردہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ منصو اسے سمجھانے والے انداز میں کچھ بول رہا تھا۔ پھر اس نے نوجوان کا کندھا تھپکا اور اسے واپس ورکشاپ میں بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ شہر کے جنوبی حصے کی طرف چل دیا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے مختلف سڑکوں پر بھاگ رہی تھیں...

اچانک عمران بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اس اندر کو شک ہو گیا ہے۔"

"ہاں لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔" اقبال نے تائید کی۔

ہم کچھ دیر سے دیکھ رہے تھے کہ مجید منصو کی گاڑی بے مقصد ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ وہ بند گلی سڑکوں پر بھی مڑا۔ عمران نے درمیانی فاصلہ کافی زیادہ کر دیا مگر لگتا تو یہ تھا کہ اب فاصلہ بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اقبال بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اس خبیث نے ایک دم ہمیں غائب ہو جانا ہے۔ تم اب اس کے قریب ہی رہو تو بہتر ہے۔"

عمران خود بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔ نیلی کار کی رفتار بھی ایک دم بڑھ گئی۔

دونوں گاڑیاں تیزی سے آگے پیچھے بھاگتی اور مختلف سڑکوں سے گزرتی مضافاتی علاقے میں آگئیں۔

"مجھے لگتا ہے یہ بلاوجہ وقت گزار رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے موبائل پر اپنے مددگار بلا لیے ہوں۔" عمران نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن ابھی تک کوئی نظر تو نہیں آیا۔" اقبال نے عقب نما اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں منصو کی نیلی کار نے ایک شارپ ٹرن لیا اور جی ٹی روڈ کی طرف جانے والی سڑک پر چڑھ گئی۔ یوں محسوس ہوا کہ منصو کے ذہن میں کوئی خاص منزل ہے۔ شاید وہ ہمیں اس طرف لے جا رہا تھا جہاں اسے مدد مل سکتی تھی۔ اس امر کا امکان تھا کہ اس سڑک پر آگے جا کر منصو کے ساتھی موجود ہوں۔

عمران نے کار کی رفتار ایک دم بہت بڑھا دی اور منصو کی کار کے برابر آگیا۔ میرے جسم میں سنسناہٹ پھیل رہی تھی اور دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ وہی ہو رہا تھا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ یہ دونوں سر پھرے ایک بار پھر راہ جاتی مصیبت کو گلے کا ہار بنا رہے تھے اور میری بدقسمتی تھی کہ میں بھی ان کے ساتھ گاڑی میں موجود تھا۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں ہوٹل کی [illegible] اور ٹی وی وغیرہ کو چھوڑ کر ان خدائی فوجداروں کے ساتھ چل پڑا تھا۔ عمران کی ہمیشہ مسکراتی آنکھوں میں اب وہی سرد جارحیت نظر آتی تھی جس کا مشاہدہ میں پہلے [illegible] زلیخا کے ہاں اور پھر لاہور گلشن آباد میں منصو کے مکان میں کر چکا تھا۔

عمران کے اشارے پر اقبال نے مجید منصو کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے رفتار کم کرنے کے بجائے اور تیز کی تو اقبال نے اپنی جیکٹ میں سے پستول نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی عمران نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے منصو کی کار کو سائڈ ماری۔ منصو کی کار بری طرح لہرائی اور سائڈ کے کچے میں جا کر تھوڑا سا گھوم گئی لیکن وہ پھر بھی رکا نہیں۔ جس طرف کو گاڑی کا رخ ہو گیا تھا، وہ اسی طرف کو بھگا لے گیا۔ عمران نے بھی اس کے پیچھے گاڑی ناہموار کھیت میں ڈال دی۔ یہ تقریباً سنسان جگہ تھی۔ گہری ہوتی شام میں بس اکا دکا راہگیر نظر آرہے تھے۔ دونوں گاڑیاں کھیت میں دوڑتی چلی گئیں۔

منصو کھیت میں سے نکل کر دوبارہ ایک کچی سڑک پر آگیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے کھیت سے نکل آئے۔ یہ

سڑک بڑی اندھا دھند ثابت ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیونگ میں عمران کی زبردست مشاقی بھی مجھ پر کھل رہی تھی۔ میں خود بھی بڑی اچھی ڈرائیونگ کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دل ہی دل میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ سڑک کی دونوں طرف تاریک پہاڑیاں تھیں، جہلم شہر کی روشنیاں دور عقب میں دکھائی دے رہی تھیں۔ عمران نے کئی خطرناک موڑ تیز رفتاری سے کاٹے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی یہ خطرہ محسوس نہیں ہوا کہ گاڑی اس کے کنٹرول سے باہر ہو گی۔

جلد ہی اس نے پھر منصو کی گاڑی کو جا لیا۔ "اس کا ٹائر پھاڑ دوں؟" اقبال نے اپنے کولٹ پسٹل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ابھی ویسے ہی کوشش کرتے ہیں۔" عمران نے کہا۔

اب ایک بار پھر دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو دوڑ رہی تھیں۔ عمران نے اوورٹیک کرنے کے بجائے منصو کی گاڑی کو دبانا شروع کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ گاڑی کی رفتار کم کرنے اور اسے روکنے پر آمادہ ہو جائے لیکن منصو بھی شاید آخری حد تک مزاحمت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے بجائے اچانک ہماری گاڑی کو زوردار سائڈ ماری۔ یہ بڑی اندھا دھند حرکت تھی۔ دونوں گاڑیوں کی سائڈوں کے تصادم سے زوردار آواز پیدا ہوئی۔ شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ابھرا۔ عمران تو کسی طرح گاڑی سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا لیکن جس نے ٹکر ماری تھی وہی اپنی گاڑی سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ موڑ پر اس کی گاڑی بری طرح لہرائی۔ کسی پتھر سے ٹکرا کر گھومی اور پھر نشیب کے گھنے درختوں کو توڑتی ہوئی تاریکی میں جا گری۔

یہ سنسنی خیز منظر تھا۔ چھوٹی سی پہاڑی سڑک بالکل تاریک اور سنسان تھی۔ عمران نے گاڑی کو بریک لگائے اور وہیں بیس میٹر آگے جا کر رک گئی۔ ہم تیزی سے باہر نکلے اور نشیب کی طرف لپکے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس شاید ٹوٹ چکی تھیں، صرف عقبی بتیوں کی مدھم سی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ گاڑی تیس چالیس فٹ نیچے الٹی حالت میں پڑی ہے۔

عمران کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ سب سے پہلے نیچے اترا۔ اس کے عقب میں اقبال تھا۔ اس کے ہاتھ میں ابھرا ہوا پسٹل میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ "احتیاط سے عمران! ہو سکتا ہے، وہ باہر نکل آیا ہو۔" اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

میں اقبال کے بالکل پیچھے تھا۔ جس سڑک پر سے منصو کی گاڑی گری تھی، یہ کسی گاؤں کی طرف جانے والی کچی سی سڑک تھی۔ دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم احتیاط سے چلتے آگے بڑھتے رہے اور گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ [illegible] کی پچھلی [illegible] تھی۔ سائڈ کی دونوں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے تاہم اپنی جگہ پر موجود تھے۔ عمران نے ٹارچ روشن کی۔ مجید منصو اندر اوندھی گاڑی میں اوندھا پڑا نظر آیا۔ وہ بے حرکت تھا۔ اقبال نے ایک پتھر کی مدد سے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو کھڑکی سے علیحدہ کیا اور اندر ہاتھ ڈال کر دروازہ کھول دیا۔ منصو کو کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ اس کام میں میں نے بھی مدد کی۔ وہ خاصا وزنی اور ٹھوس جسم والا تھا.... بظاہر اسے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ ہم اسے اٹھا کر گاڑی سے تھوڑا دور لائے اور یہی وقت تھا جب میری نگاہوں کے سامنے برق سی چمک گئی۔ مجید منصو کے دائیں ہاتھ نے بڑی تیزی سے حرکت کی اور جیکٹ کے نیچے گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔ اتفاقاً اس وقت میں ہی مجید منصو کے زیادہ قریب تھا۔ میں نے اضطراری طور پر ٹھوکر چلائی۔ میرے وزنی بوٹ کی ضرب مجید منصو کے ہاتھ پر لگی... یہ بڑی کارگر ضرب تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ مجید منصو نے لیٹے لیٹے مجھے لات ماری۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گیا۔ اسی اثنا میں منصو نے اٹھ کر دوڑ لگا دی۔ یقیناً اس سے پہلے وہ مکر کر رہا تھا۔

"رک جاؤ... گولی مار دوں گا۔" اقبال دہاڑا۔

مگر وہ رکا نہیں۔ عمران نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ وہ پہلوان لمبی لمبی جستیں لگاتا ہوا تیزی سے منصو کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے اس کے سائے کو ہوا میں جست لگا کر منصو کے سائے پر گرتے دیکھا۔ اس نے تقریباً پچاس میٹر نیچے منصو کو چھاپ لیا تھا۔ میں اور اقبال سنبھل سنبھل کر اترے اور ان دونوں کے سر پر پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے مجید منصو اور عمران کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ منصو تکلیف سے بری طرح کراہ رہا تھا اور عمران کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا گریبان تار تار تھا۔

"یہ جو اس کتے کو اس کے مقدر سے۔" عمران نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اقبال نے منصو کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر مضبوطی سے کس دیے۔ اس کے بعد

بعد رابطہ ضرور کرتے۔

"صدیقی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"بس... ٹھیک ٹھاک ہے۔ کسی وقت وہ مجھ سے کوئی کام شام لے لیتے ہیں۔"

"کس طرح کا کام شام؟"

مجید منصو نے دونوں کن اکھیوں سے سلگتے سگار کو دیکھا اور بولا۔ "انہیں پرانی چیزیں اکٹھی کرنے کا شوق ہے۔ اس کے لیے مردان، سوات اور ٹیکسلا وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔"

"اور میڈم صفورا سے کیا ناتا ہے تمہارا!" عمران نے اچانک سوال کیا۔

مجید منصو ایک دم گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ "دراصل... میری جان پہچان میڈم صفورا سے ہی ہے۔ میڈم صفورا کو بھی پرانی چیزوں کا بہت زیادہ شوق ہے۔ میڈم صفورا کا ملنا جلنا صدیقی صاحب سے تھا۔ اس طرح صدیقی صاحب سے بھی ٹھیک ٹھاک ہوگئی۔"

"دیکھو میاں منصو! تجھے ہر بات کھل کر بتانی پڑے گی۔ یہ سگار تجھے زیادہ ٹائم نہیں دے گا۔ یہ گر گیا تو پھر ہم بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

"م... میں... کچھ نہیں چھپا رہا تم سے۔" وہ منمنایا۔

"تو ڈر لیمپ کو اپنے گھر میں کیوں چھپایا ہوا ہے تم نے؟" عمران نے پھر اچانک دھماکا خیز سوال کیا۔

اس مرتبہ منصو گھبرا گیا۔ "ک... کک... کون... ڈ... ڈر لیمپ؟" وہ ہکلایا۔

"وہی جس کو سیٹھ سراج نے پہلے میڈم صفورا کی کوٹھی میں چھپایا تھا پھر تمہارے حوالے کر دیا۔"

مجید منصو ایک دم خاموش ہوگیا۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بڑی اچھی طرح اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کا واسطہ بڑے خطرناک لوگوں سے پڑا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اونٹ خود کو پہاڑ کے نیچے محسوس کر رہا تھا۔

"دیکھو میاں منصو! یہ بات بھول جا کہ جھوٹ بول کر تو اپنی جان بچا لے گا۔ اگر تھوڑی بہت سچ بتانے گا تو پھر تیرے بچنے کی کچھ امید پیدا ہوسکتی ہے... ورنہ... یکی بات ہے کہ کل ٹی وی پر تیری خبر ضرور چلے گی۔ لاہور کے میاں منصو صاحب، تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے جہلم کے پاس ایک کھائی میں گر گئے... اور گاڑی کے ساتھ ہی جل کر بھسم ہو گئے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے فلاں فلاں کو چھوڑا ہے۔"

مجید منصو نے پھر خوف زدہ نظروں سے سگار کو دیکھا۔ وہ اینٹ نما پتھر پر رکھا تھا اور کسی "بارودی فلیتے" کی طرح مسلسل سلگ رہا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی۔ سگار کے ہوا وغیرہ سے گرنے کے امکانات تو نہیں تھے مگر وہ "ان بیلنس" ہوکر کسی بھی وقت گر سکتا تھا۔

مجید منصو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں، پر پہلے اسے یہاں سے ہٹاؤ۔" اس کا اشارہ سگار کی طرف تھا۔

"اسے ہٹائیں گے تو تم بھی پٹری سے ہٹ جاؤ گے۔ ہاں، یہ کر دیتے ہیں کہ اسے تھوڑا سا آگے کھسکا دیتے ہیں۔" اس نے آگے بڑھ کر بڑی احتیاط سے سگار کو حرکت دی اور اسے تھوڑا سا مزید پتھر پر چڑھا دیا۔

میں عمران کی اس "اوٹ پٹانگ ترکیب سازی" پر حیران ہو رہا تھا۔ ایک عام سے سگار کو اس نے "ٹائم بم" کی شکل دے دی تھی اور یہ ٹائم بم مجید منصو جیسے بے رحم غنڈے کا پتا پانی کر رہا تھا۔ مجید منصو کی اس حالت میں کچھ نہ کچھ دخل اس کی جسمانی اذیت کا بھی تھا۔ اس کا دایاں بازو کہنی کے اوپر سے ٹوٹ چکا تھا اور اس کی یہ تکلیف مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "منصو صاحب! بس مختصر لفظوں میں یہ بتاؤ کہ پرانی چیزوں کی یہ اسمگلنگ کس طرح ہو رہی ہے اور اس میں اور کون کون شریک ہے؟"

"اسمگلنگ؟"

"ہاں ہاں، اسمگلنگ... ہمارے پاس اس سارے کالے دھندے کے ثبوت ہیں۔ بس ہم تمہارے منہ سے سننا چاہ رہے ہیں۔"

مجید منصو نے ایک دو پیچ کیے۔ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دوسری طرف سختی ہوئی موت بھی اس کے سامنے تھی۔ سگار کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ بلکی سے ہلکا دھواں جاری تھا... اور مہلک گیس نتھنوں میں گھس کر شدید خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔

آخر مجید منصو نے ہتھیار ڈال دیے... اور عمران جو جو کچھ پوچھتا گیا، وہ بتاتا چلا گیا۔ اس کی تیز رفتار گفتگو سے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

صدیقی جسے منصو نے ایک دو بار مولا بھی کہا، میڈم صفورا ہی کی طرح نوادرات میں دلچسپی رکھتا تھا اور ان کا بیوپار بھی کرتا تھا۔ یہ لوگ نوادرات کو منہ مانگی قیمتوں پر خریدتے تھے۔ اس کے بعد انہیں ملک سے باہر بھیجتے تھے یا پھر مقامی شوقینوں کو فروخت کرتے تھے۔ میڈم صفورا اور اسرار صدیقی کے درمیان دوستی تھی لیکن وہ کاروباری حریف بھی

تھے۔ کچھ دن پہلے ابرار صدیقی نے ٹیکسلا یا تخت بائی کی طرف سے کوئی نایاب نوادر چیز خریدی تھی۔ میڈم صنوبرا بھی اس شے کی خریداری میں دلچسپی رکھتی تھی لیکن اس معاملے میں ابرار صدیقی پہل کر گیا۔ وہ مقامی فروخت کنندہ سے ملا اور اس نے آناً فاناً یہ سودا کر لیا تھا۔ اب وہ شے صدیقی کی تحویل میں تھی۔ پہلے اس نے اسے اپنے ہوٹل میں رکھا تھا لیکن پھر وہاں کسی طرح کا خطرہ محسوس کر کے وہ اسے یہاں جہلم میں لے آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میڈم صنوبرا کے علاوہ کوئی اور پارٹی بھی اس قدیم پیس آف آرٹ کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تاہم یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صدیقی نے صرف اس چیز کی اہمیت بڑھانے کے لیے اور میڈم صنوبرا کو زچ کرنے کے لیے یہ تیسری پارٹی والا شوشا چھوڑا ہو۔ میڈم صنوبرا نے سیٹھ سراج کو یہ کام سونپ رکھا تھا کہ وہ کسی طرح ابرار صدیقی سے اس "پیس آف آرٹ" کا سودا کرے۔ سیٹھ سراج پچھلے ڈھائی تین ہفتے سے صدیقی کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ وہ کسی طرح یہ "پیس" میڈم کو فروخت کر دے۔ اس نے میڈم کی طرف سے "پیس" کی خاصی قیمت بھی لگوائی تھی مگر صدیقی رضامند نہیں ہوا تھا لیکن پھر اس صورت حال میں ایک دلچسپ تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ اس تبدیلی کا ذکر مجید مٹھو نے ان الفاظ میں کیا۔

"ان دنوں قادر لبا اور اس کا یار نبیل میڈم کی کوٹھی میں چھپے ہوئے تھے۔ نبیل کے اغوا والے چکر میں انہیں گرفتاری کا ڈر تھا۔ قادر لبے کی ماں اپنے بیٹے کے لیے بڑی پریشان تھی۔ وہ چوری چھپے دو تین بار بیٹے سے ملنے میڈم کی کوٹھی میں آئی۔ اس کی بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کا نام کنول ہے۔ وہ کافی موہنی ہے۔ ایک دن جب ماں بیٹی کوٹھی میں آئیں تو صدیقی صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی نظر لڑکی پر پڑ گئی۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ لڑکی ایک دم ان کو پسند آ گئی۔ سیٹھ سراج بھی اس وقت وہیں پر تھا۔ سیٹھ کی نظر بھی بڑی تیز ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ لڑکی صدیقی صاحب کے دل کو بھا گئی ہے۔ اس نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کا سوچ لیا۔ وہ ویسے تو صدیقی صاحب کو خرید و فروخت پر راضی نہیں کر سکا تھا، وہ اس لڑکی کو بیچ میں لے آیا۔ اس نے صدیقی صاحب کو آفر دی کہ اگر وہ اپنی شے بیچنے پر تیار ہو جائیں تو وہ اس لڑکی کا معاملہ ان کے ساتھ سیدھا کرا دے گا۔ صدیقی صاحب نے تھوڑا بہت رضامندی دکھائی تو سیٹھ اس کام میں لگ گیا۔ اس کو پتا تھا کہ قادر لبا پولیس کیس سے جتنا زیادہ ڈرے گا، اس کی ماں بہن بھی اتنی ہی زیادہ ڈر جائیں گی اور ان کو اپنے ہاتھ پر کام نکالنا بھی آسان ہو جائے گا۔"

تباہ حال گاڑی کے سامنے، مجید مٹھو سے ہونے والی اس گفتگو کے بعد صورت حال کی بہت سی کڑیاں آپس میں مل گئیں اور حالات کی ایک واضح تصویر ابھرنے لگی۔

مجید مٹھو ابھی تک گاڑی سے بندھا ہوا تھا۔ تاہم اس کے راہ راست پر آنے کے بعد عمران نے سلگتا ہوا سگار پتھر پر رکھ دیا تھا۔ آخری دس پندرہ منٹ کی گفتگو اس سگار کے بغیر ہی ہوئی تھی۔ تکلیف سے مجید مٹھو کا برا حال تھا۔ وہ اب با آواز کراہ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے جلد از جلد اس تباہ حال کار سے علیحدہ کر دیا جائے اور اس کی چوٹ کے لیے کچھ کیا جائے تاکہ اسے تکلیف سے نجات ملے۔

عمران نے کہا۔ "بس پیارے! ایک دو آخری سوال۔ پھر تمہارے بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔"

"میں سب کچھ بتا دوں گا لیکن پہلے مجھے یہاں سے کھولو۔" وہ کراہا۔

"یار! اتنے بے صبرے کیوں ہوتے ہو؟ اب ہم نے کچھ زیادہ پوچھنا نہیں ہے۔ بس ایک دو سوال ہی ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر سیٹھ سراج نے صدیقی کے لیے کنول کو حاصل کرنا ہی تھا تو اس کے لیے اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ ماں بیٹی تو گھڑے کی مچھلی کی طرح تھیں۔ لال کوٹھی میں آئی ہوئی تھیں۔ سیٹھ سراج کسی بھی وقت کنول کو بے بس کر کے صدیقی کے سامنے ڈال دیتا۔ سیٹھ جیسے خبیثوں کے لیے ایسے کام غیر معمولی نہیں ہوتے ہیں۔"

"لیکن صدیقی صاحب اس کام کو اور طرح کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود پابند ہیں۔ وہ کنول سے باقاعدہ نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ سیٹھ سراج بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لیے وہ کنول اور اس کے وارثوں کو پریشر میں لا کر راضی کرنا چاہتا ہے۔"

"قادر لبے کو تو یہ بات کس نے بتائی کہ کنول نے خود کو آگ لگا کر مرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اسپتال میں زخمی پڑی ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"یہ جھوٹ بھی سیٹھ نے ہی بولا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ قادر لبے اور اس کے گھر والوں کو ڈرایا جائے۔ اسے ذلیل کر کے میرے گھر لانے کی وجہ بھی یہی تھی۔"

"کیا تمہارے محترم صدیقی صاحب کو پتا ہے کہ ان کے لیے کنول کو کس طرح راضی کیا جا رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شروع میں پتا نہیں تھا، پر اب لگ گیا ہے۔ شاید

سراج نے ان کی منت کی ہے کہ اب وہ اس معاملے میں خاموش رہیں کیونکہ اب اگر بات کھلی تو وہ سب جھوٹے ثابت ہو جائیں گے۔ سیٹھ نے صدیقی سے کہا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اپنی ذمے داری پر کر رہا ہے اور اس کا کسی پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔"

"یہ تیرا صدیقی بڑی خرانٹ شے ہے میاں مٹھو۔" عمران نے کہا۔ "اس جیسے گھاگ لوگ سب کو موم کی ناک بنا لیتے ہیں۔ جدھر چاہا موڑ لی۔ اس سے تو بڑی اچھی طرح سمجھیں گے ہم۔ شرط یہی ہے کہ بس ایک دفعہ ملاقات ہو جائے حضرت سے۔"

گاڑی سے پٹرول رسنا اب بند ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹینکی خالی ہو چکی ہے۔ جلوالن سے اوپر... پکی سڑک پر سے کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل یا ٹریکٹر ٹرالی روشنی بکھیرتی گزرتی تھی اور پھر گہری خاموشی چھا جاتی تھی۔ پٹرول کی بو ابھی تک خنک ہوا میں موجود تھی۔

ایک دم میرے ذہن میں اس افسردہ صورت لڑکے کا خیال آیا جس سے راستے میں مجید مٹھو کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لکڑی کی ورکشاپ میں سے مجید مٹھو کے ساتھ باہر نکلا تھا اور پھر واپس چلا گیا تھا۔ میں نے مٹھو سے پوچھا۔ "وہ لڑکا کون تھا جس نے رونے والا منہ بنایا ہوا تھا اور تم نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر اسے ورکشاپ میں واپس بھیجا تھا؟"

"وہ... ایک جاننے والا تھا۔ روزگار کے لیے کویت جانا چاہتا ہے۔ وہاں ورکشاپ میں کام وغیرہ سیکھ رہا ہے۔"

"صدیقی اور سیٹھ والے معاملے سے تو اس کا تعلق نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... یہ علیحدہ... معاملہ ہے۔" مجید مٹھو نے کراہتے ہوئے سر ہلایا۔

عمران مٹھو کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ کون تھا وہ لڑکا؟ نام کیا تھا اس کا؟"

"اکمل... اکمل سلطان۔"

"رہتا کہاں ہے؟"

"لاہور میں۔"

"تو کام سیکھنے کے لیے یہاں جہلم میں کیوں آ گیا؟" عمران نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ... وہ... لاہور میں رہنا نہیں چاہتا۔ بھائیوں سے جھگڑا ہے۔"

"کہیں اس کے ساتھ بھی تو کوئی غنڈا گردی نہیں کر رہے ہو تم؟"

مجید مٹھو نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا مگر لگتا تھا کہ عمران کا شک برقرار ہے۔ اس نے مٹھو سے سوال جواب جاری رکھے۔ یہاں تک کہ اس کو پریشر میں لانے کے لیے ایک بار پھر سگار سلگا لیا۔ سگار کی دہشت بڑی کارگر تھی۔ دوسری طرف بازو کی تکلیف بھی مٹھو کو بے حال کر رہی تھی۔ چار پانچ منٹ بعد اس نے ایک دم ہتھیار ڈال دیے۔ اپنے سر پر عمران کے بوٹ کی ایک زوردار ٹھوکر کھا کر مجید مٹھو نے یہ انکشاف کیا کہ اکمل دراصل قادر لبے کا ماموں زاد بھائی ہے اور وہ قادر کی بہن کو پسند کرتا ہے۔

یہ چکرا دینے والا انکشاف تھا۔ عمران کے ایک سوال کے جواب میں مجید مٹھو نے اعتراف کیا کہ اس نے اکمل کا نام غلط بتایا ہے۔ اس کا اصل نام فیاض ہے۔ فیاض اور کنول ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اب فیاض پاکستان سے باہر جا رہا ہے۔

عمران نے کہا۔ "تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ فیاض باہر نہیں جا رہا بلکہ تم اسے بھیج رہے ہو۔ اپنا اور صدیقی کا راستہ صاف کرنے کے لیے۔"

جواب میں مجید مٹھو خاموش رہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے بازو کی تکلیف برداشت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے سفاک لہجے میں اقبال سے کہا۔ "یہ لاتوں کا بھوت ہے... لاتیں پڑتی رہیں گی تو بولتا رہے گا۔ سگار رکھو اس کے سامنے۔"

اس مرتبہ عمران کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجید مٹھو اندر تک ہل گیا۔ اپنے خشک ہونٹ تر کرنے کے لیے اس نے پانی مانگا۔ اقبال نے بوتل سے اسے پانی پلایا۔ اس کے بعد مٹھو نے درخواست کی کہ سگار اس کے سامنے سے اٹھا لیا جائے۔ وہ فیاض کے بارے میں بھی کچھ نہیں چھپائے گا۔ عمران نے سلگتا ہوا سگار جس کی حیثیت اب بم سے کم نہیں تھی، مٹھو کے سامنے سے اٹھوا لیا۔

"ہاں، اب بتاؤ۔ کہاں غائب کرنا چاہ رہے ہو لڑکے کو؟"

"غائب کرنے کی بات نہیں۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں پاکستان سے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں تمہیں باہر بھجوا رہا ہوں۔"

"اب تم یہ بھی بتاؤ کہ وہ کیوں جانا چاہتا ہے؟"

"تم تو خود سمجھتے ہو... کنول کو پسند کرتا ہے،

پر اب کنول اس کی طرف توجہ نہیں دے رہی۔ وہ سمجھتی ہے کہ اگر وہ اپنے بھائی کو بچانا چاہتی ہے تو پھر... اس کو صدیقی صاحب سے شادی کرنی پڑے گی۔ دو تین ہفتے پہلے کنول کے گھر میں فیاض اور کنول کی بات ہوئی تھی۔ دونوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ کنول نے کہا تھا کہ وہ بار بار ان کے گھر کے چکر نہ لگائے۔ اس طرح ان کی بدنامی ہوتی ہے۔ کنول کی ماں نے بھی فیاض کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دراصل کنول اور فیاض قریباً ہم عمر ہی ہیں۔ کنول کی ماں نے فیاض سے کہا کہ کنول کی شادی کی عمر گزری جا رہی ہے اور ایک سال کے اندر اندر وہ اس کی شادی کرنا چاہتی ہے لیکن وہ ابھی بے روزگار ہے۔ دو تین سال سے پہلے کمانے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ کنول کا خیال چھوڑ دے۔ اس کے بعد سے فیاض بڑا بددل تھا۔ الٹی سیدھی باتیں سوچ رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا اور کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ میں اس کام میں اس کی مدد کروں گا۔"

عمران نے کہا۔ "میاں منظو! میرے خیال میں اب بھی تم آدھا سچ بول رہے ہو۔ تم نے اس لڑکے کو سمجھایا نہیں بلکہ بھڑکایا ہے۔ چلو، وقت کے ساتھ یہ پول بھی کھل جائے گا۔"

"تو کیسے لڑکی کے بدلے ہوئے رویے کی اصل وجہ کا پتا چلا ہے یا نہیں؟" اقبال نے سوال کیا۔

"بس اس کا یہی اندازہ ہے کہ کنول کی ماں اپنی بیٹی کی شادی کسی کھاتے پیتے بندے سے کرنا چاہ رہی ہے۔"

منظو سے کوئی سوال جواب ہو چکے تھے۔ عمران نے مجھے اور اقبال کو اشارہ کیا۔ ہم تباہ حال گاڑی سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ "اب اس کا کیا کرنا ہے؟" عمران نے اقبال سے پوچھا۔ اس کا اشارہ مجید منظو کی طرف ہی تھا۔

"اس نے ہماری گاڑی دیکھ لی ہے اور ممکن ہے نمبر وغیرہ بھی پڑھ لیا ہو۔ اب ہم اسے چھوڑیں گے تو مصیبت میں پڑیں گے۔ اس کے علاوہ جمیلہ اور صدیقی وغیرہ بھی ایک دم ہوشیار ہو جائیں گے۔" اقبال نے کہا۔ اس نے بڑے اطمینان سے سگار ہونٹوں میں دبا رکھا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ لگاؤ اس کو بھی انجکشن اور گاڑی میں ڈال لو۔ چار پانچ گھنٹے تو اتنا مقفل رہے گا۔ اتنے میں لاہور پہنچ جائیں گے۔"

"انجکشن ہے گاڑی میں؟" اقبال نے کش لیتے ہوئے پوچھا۔

"میرے خیال میں ایک پڑا ہوا ہے۔ دیکھ لو نہیں تو پھر گولیوں سے کام چلانا پڑے گا۔"

اقبال اوپر گاڑی کی طرف جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا۔ دور نیچے نشیب میں کچھ ٹمٹماتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں ایک دو روشنیاں شاید لالٹینوں کی تھیں، باقی ٹارچوں کی لگتی تھیں۔ یہ روشنیاں ڈھلوان پر قریباً ایک کلومیٹر دور ہوں گی۔ وہ سست روی سے جائے حادثہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"لگتا ہے، کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔" اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

"تو پھر چلتے ہیں۔ راستے میں کیا انجکشن وغیرہ گاڑی میں ہی لگا دیں گے۔" عمران نے سرگوشی کی۔

اقبال نے میرے ساتھ مل کر مجید منظو کی رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ عمران اپنی موجودگی کی دیگر نشانیاں ختم کرنے لگا۔ رسیاں کھل گئیں تو مجید منظو درد سے کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرا بازو ٹوٹ رہا ہے۔ ہاتھ کھول دو۔"

واقعی وہ شدید اذیت میں تھا۔ ٹوٹے ہوئے بازو کو پیچھے موڑ کر باندھا گیا تھا جس کی وجہ سے بازو کی شکل عجیب ہو گئی تھی۔

اقبال نے اس کے ہاتھ کھول دیے... اور یہ غلطی تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ ہاتھ کھولنے سے پہلے ہی پستول اپنے ہاتھ میں کر لیتا۔ لیکن پستول ابھی تک اس کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ یہ مجید منظو والا بریٹا پستول ہی تھا۔ مجید منظو بالکل نڈھال بلکہ نیم جان تھا، موقع دیکھ کر ایک دم حرکت میں آیا۔ اس نے پھرتی سے پستول پر جھپٹا مارا۔ پستول تو اس کے ہاتھ میں آ گیا لیکن اس سے پہلے ایک اور کام ہو گیا اور اس کام کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ مجید منظو کو بھی نہیں تھی۔ اقبال کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگار نیچے اچھلا اور پیٹرول پر جا گرا۔ پستول جھپٹنے کے بعد مجید منظو ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف ہٹا تھا اور گاڑی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اچانک بھک بھک کی زوردار آوازوں سے آگ بھڑکی اور اس نے مجید منظو اور اقبال کو لپیٹ میں لے لیا۔ یہ سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا کہ ہم ہکا بکا رہ گئے۔ منظو گاڑی کے زیادہ قریب تھا اس لیے وہ پورے کا پورا آگ کی زد میں آیا۔ اقبال کا نچلا دھڑ بھی آگ میں تھا۔ اقبال چلاتا ہوا پیچھے ہٹا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ عمران نے اس موقعے پر زبردست حاضر دماغی اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے نیچے بچھا ہوا کمبل نما کپڑا اٹھایا اور اقبال پر پھینک دیا۔ شعلے پوری طرح بھڑکنے سے پہلے ہی

دھوئیں میں تبدیل ہو گئے۔ مگر دوسری طرف کا منظر دیکھنا ہمارے بس میں نہیں تھا...

مجید منظو نے سر تا پا آگ پہن لی تھی اور بھیانک آواز میں چلا رہا تھا۔ وہ چند قدم مخالف سمت میں دوڑا پھر ایک دم ٹھوکر کھا کر گرا اور کھائی میں لڑھک گیا۔ قریباً چالیس فٹ نیچے پتھریلی زمین سے اس کے ٹکرانے کی آواز بڑی لرزہ خیز تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی مجید منظو کی کرب ناک آواز بھی دم توڑ گئی تھی۔ پٹرول، دھوئیں اور جلتے گوشت کی بو نے فضا کو ایک دم مکدر کر دیا تھا۔

فوری طور پر ہم میں سے کوئی بھی ہمت نہ کر سکا کہ کنارے پر جا کر مجید منظو کا حشر دیکھے۔ اقبال کی آگ بجھ گئی تھی تاہم وہ نڈھال سا زمین پر پڑا تھا... اور یہی وقت تھا جب ایک خوفناک دھماکا ہوا اور پوری گاڑی آگ کا گولا بن گئی۔ اس کا گیس سلنڈر پھٹ گیا تھا۔ گاڑی کے کئی جلتے ہوئے ٹکڑے اڑ کر دور تک گئے۔ عمران نے ٹارچ تھامی اور دل کڑا کر کے نشیب میں اترا۔ میں بھی چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پیچھے گیا۔ میں نے دس پندرہ قدم کی دوری سے دیکھا۔ مجید منظو کا سلگتا ہوا جسم پتھروں اور سرخی مائل مٹی کے درمیان بے حرکت پڑا تھا۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں اس کا منہ ایک طرف سے بالکل پچکا ہوا نظر آیا۔ وہ مر چکا تھا۔ ہاں، وہ شخص جو فقط ایک ڈیڑھ منٹ پہلے زندہ تھا اور بول رہا تھا، اب مٹی کا ڈھیر بن چکا اور بہت دور جا چکا تھا۔ یہی حیات کی بے ثباتی ہے۔

ہم دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ عمران نے مجید منظو کا کمبل نما کپڑا اٹھا کر شعلوں میں پھینکا پھر اس کا پستول بھی ٹھوکر مار کر آگ میں پھینک دیا۔ نشیب سے اوپر آتی ہوئی روشنیاں اب نزدیک پہنچ گئی تھیں۔ یقیناً ان کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ آنے والے اب کسی بھی وقت موقعے پر پہنچ سکتے تھے۔ اقبال بغیر سہارے کے چلنے کے قابل تھا۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور دوڑتے ہوئے کار تک پہنچ گئے۔ چند منٹ بعد ہماری گاڑی بل کھاتی پتلی سڑک پر رواں دواں تھی۔ ہمارا رخ واپس جہلم شہر کی طرف تھا۔

اقبال کی پتلون تقریباً جھڑی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ مجھے اس کی ٹانگوں پر جلنے کے سرخی مائل نشان نظر آئے۔ کہیں کہیں جلد چھل بھی گئی تھی۔ تاہم وہ زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔

"بڑی بار جو کچھ ہوا، بالکل اچانک ہوا۔" اقبال بولا۔ "میں اپنی غلطی مانتا ہوں... مجھے سگار منہ میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔"

"مجھے بھی امید نہیں تھی کہ وہ اس حالت میں ایسا کام کرے گا۔ بڑا دلیرانہ پن دکھایا اس نے۔ لگتا ہے کہ وہ ہماری توقع سے زیادہ سخت جان تھا۔" عمران نے کہا۔ میری نگاہوں میں سنگار گرنے اور پھر ایک دم آگ بھڑک اٹھنے کے مناظر گھومنے لگے... مجید منظو کا پچکا ہوا سر اور پھر سرخی مائل مٹی کو مزید سرخ کرتا ہوا اس کا خون... مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خوف دامن گیر ہوا کہ میں، عمران اور اقبال کے ساتھ ایک نہایت سنگین واقعے میں ملوث ہو چکا ہوں۔ اگر پولیس تفتیش میں یہ حادثہ... حادثہ نہ رہتا قتل بن جاتا تو پھر میں بھی ملزمان کی فہرست میں آ جاتا۔

عمران کے اپنے چہرے پر بھی قدرے پریشانی کے آثار تھے لیکن جب اس نے مجھے پریشان دیکھا تو ایک دم اس نے اپنا مخصوص موڈ بحال کر لیا اور مسکرا کر بولا۔ "آج بہت خاص دن ہے۔ بڑے بڑے اہم تاریخی واقعات ہو رہے ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے جل کر پوچھا۔

"اقبال کی پتلون کا دیکھتے ہی دیکھتے نیکر بن جانا کوئی معمولی واقعہ ہے؟ اور پھر دیکھو یہ کیسی انہونی ہوئی ہے کہ تم جیسے ڈرپوک شخص نے بھی آج ببر شیر والا کام کر دیا۔ بروقت ٹانگ چلا کر مجید کے ہاتھ سے پستول چھڑا دیا۔ اس کے بعد جو جھڑا دھڑ انکشاف ہوئے ہیں ہم پر... وہ بھی کوئی معمولی نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اب اگر پولیس پر بھی دھڑا دھڑ کچھ انکشافات ہو گئے تو پھر کیا ہوگا؟ تم نے مجید کو قریباً ایک گھنٹا رسیوں سے باندھے رکھا ہے۔ اگر اس کے جسم پر رسی کے نشان مل گئے تو اس سارے واقعے کا رخ ہی بدل جائے گا اور پھر وہ لوگ جو نیچے بستی سے روشنی کی طرف آ رہے تھے، وہ جانے کون تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بندہ پہلے الٹی ہوئی گاڑی کو دیکھ گیا ہو اور پھر نیچے سے بستی والوں کو لے کر اوپر آ رہا ہو۔ ایسے میں یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ہماری گاڑی اور اس کا نمبر بھی دیکھ لیا ہو..."

عمران نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے دور سے تمہاری تصویریں بھی اتار لی ہوں... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خفیہ پولیس کا کوئی بندہ ہو... اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے پھرتی دکھائی ہو اور ہماری اس مہران کے نیچے سگنل چھوڑنے والی کوئی ڈیوائس بھی لگا دی ہو... یار! ایک تو تم سب سے پہلے وہ بات سوچنے لگتے ہو جو سب سے بعد

تیں اور سب سے بُرے حالات میں سوچنی چاہیے۔ بالکل پُرسکون رہو... کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ سے اور اپنی پولیس کی طرف سے پُرامید رہو۔ ہماری پولیس تفتیش کرتے ہوئے غور و فکر کے بنا وہ اور سب پتہ کرتی ہے... اور غور و فکر کے بغیر موقعے سے کچھ بھی ملنے والا نہیں ہے۔"

"یار! اب کچھ غور و فکر میری باتوں پر بھی کر لو۔ تھوڑی تھوڑی جلن شروع ہوگئی ہے۔"

"اس کا انتظام بھی ابھی ہو جاتا ہے۔" عمران نے اطمینان سے جواب دیا۔

اب شہر کی آبادی شروع ہوگئی تھی۔ عمران نے ایک ٹی شاپ کے سامنے گاڑی روک دی۔

"کیا میری ٹانگیں کو مزید رو سٹ کراتا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"نہیں... وہ سامنے کارمنٹس کی دکان ہے وہاں سے تمہارے لیے پینٹ لیتے ہیں اور ساتھ ہی میڈیکل اسٹور ہے، وہاں سے دوا بھی لے لیں گے۔ ایک دم فائیو اسٹار کام ہو جائے گا۔"

ہم گاڑی میں بیٹھے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد عمران جینز کی ایک پتلون لے کر واپس آگیا۔ ساتھ میں وہ "زیماز بن" مرہم بھی لایا تھا۔ مرہم فوری طور پر اقبال کی ٹانگوں پر لگا یا گیا اور اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی پتلون بھی پہن لی۔ عمران گاڑی کو سیدھا ایک ہوٹل لے گیا۔ یہاں تین بیڈ کا ایک کمرا بک کرانے اور شفٹ ہونے میں ہمیں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہوٹل کی کھڑکی سے اردگرد جہلم سے پہلے کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔

ہم نے ٹی وی کھولا تو نیوز چینل پر تھوڑی ہی دیر بعد کار حادثے کی پٹی چلنی شروع ہوگئی۔ خبر کچھ اس طرح دی جا رہی تھی۔ براؤن روڈ پر کار کھائی میں گر گئی۔ گیس سلنڈر پھٹنے سے آگ لگ گئی۔ جانی نقصان کا اندازہ لگایا جا رہا ہے۔

پندرہ منٹ بعد یہ خبر دی جانے لگی۔ کار سوار شخص موقع پر ہلاک۔ آگ حادثے کے کافی دیر بعد لگی۔ عینی شاہدین کا بیان... موقعے پر گوشت سے بھرے ہوئے تین بڑے شاپر بھی ملے ہیں۔

"بند کرو یار اس کو... خوامخواہ کی ٹینشن ہے۔" عمران نے کہا۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا۔ عمران اقبال کے لیے کھانے والی دوا لایا تھا، اس کے علاوہ ایک انجکشن بھی تھا۔ اس نے اقبال کو انجکشن دیا۔ جلد ہی اسے تکلیف میں افاقہ محسوس ہونے لگا۔ وہ دونوں یوں صورت حال پر تبصرہ

کرنے میں مصروف ہو گئے جیسے کوئی خاص واقعہ رونما ہی نہیں ہوا۔ پالیس... وکس منی کے بنے ہوئے تھے۔

مجھے آج پھر سکون بخش گولیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پانی کے ساتھ دو گولیاں اٹھیں نگل لیں اور اپنا دھیان دو گھنٹے پہلے رونما ہونے والے واقعات سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹی وی کی خبروں سے امید تو پیدا ہوئی تھی کہ شاید اس حادثے کو اتفاقیہ ہی سمجھا جائے گا۔ یہ ایک بالکل ویران سڑک کے کنارے ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ عمران نے بڑی ہوشیاری سے موقعے پر سے سارے شواہد ختم کر دیے تھیں۔ تیسری موصل اطلاعات یہ تھیں کہ اپنے ٹی تپ کے دوران میں مجید منصور کسی ساتھی سے رابطہ قائم نہیں کر سکا تھا۔

جلد ہی میں سوگیا۔ اگلی صبح کافی دیر سے آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی ذہن میں رات والے واقعات کی تشویش نے آگھیرا۔ دل پر ایک دم بہت سارا بوجھ پڑ گیا۔ اب کیا ہوگا؟ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں، عمران اور اقبال کے ساتھ بتدریج ایک دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہوں۔

میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ دن کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ سکون بخش گولیوں کا خمار ابھی تک ذہن پر موجود تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی چوتھا شخص بھی موجود ہے۔ میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حسبِ معمول عمران اور اقبال ناشتا کر چکے تھے بلکہ دو پیالے تو شخص بھی کر چکا تھا جو ان کے ساتھ ہوٹل کے اس کمرے میں موجود تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے ہم نے کل شام لکڑی کی ورکشاپ سے مجید منصور کے ہمراہ نکلتے دیکھا تھا۔

مجھے جاگتے دیکھ کر عمران نے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی لڑکے کا جائزہ لیتے ہوئے، عمران کے پیچھے ہوٹل کی بالکونی میں آگیا۔ نیچے سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ عمران مدھم آواز میں بولا۔ "تم نے پہچان لیا ہوگا۔ یہ وہی فیاض ہے جسے کل رات مجید منصور نے بتایا تھا۔ یہ قادر کی بہن کو پسند کرتا ہے۔"

"تمہیں یہ یہاں کیسے پہنچا؟"

"میں سویرے اسے ورکشاپ سے نکال کر یہاں لایا ہوں۔ اس کے سامنے مجید منصور وغیرہ کی کوئی بات نہیں کرنی۔ میں نے اسے یہی بتایا ہے کہ ہم خفیہ پولیس کے بندے ہیں اور اس کی مدد کرنا چاہ رہے ہیں۔ پہلے تو وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔

پر اب نارمل ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو۔ ہم اس معاملے میں بُری طرح پھنستے جا رہے ہیں۔"

"بس سوچ کا فرق ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ ہم پھنس رہے ہیں لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ ہم پھنس نہیں رہے بلکہ کسی پھنسے ہوئے کو نکال رہے ہیں۔ اس کی مدد کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں سکون محسوس کر رہا ہوں اور تمہارے چہرے پر ساڑھے دس بجے ہی بارہ بج گئے ہیں۔"

"کس پھنسے ہوئے کو نکال رہے ہو؟"

"اس فیاض کو۔ یار! یہ عاشق بندہ ہے۔ اس کو پیار کا روگ لگا ہوا ہے اور تم... تم خواہ مخواہ کشتی کے سوار ہو۔ ایک عاشق کو تو دوسرے عاشق کا درد سمجھنا چاہیے۔ تم اس تکلیف کو محسوس نہیں کرو گے تو کیا ہم جیسے کریں گے جنہوں نے کبھی اس 'گلی' میں قدم ہی نہیں رکھا۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا اور مسکرانے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ فیاض صوفے پر گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے خوبرو چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا قد لمبا تھا۔ وہ شلوار قمیص اور پشاوری چپل پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ہاتھ میں وہی کھردرا پن موجود تھا جو محنت مشقت کرنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

میرے بیٹھنے سے پہلے شاید وہ لوگ کنول کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اب یہ گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوئی۔ عمران نے فیاض سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہاں، کیا کہہ رہے ہو تم؟"

وہ بوجھل آواز میں بولا۔ "مجھے تو لگتا ہے سر جی... وہ بہت بدل گئی ہے۔ شاید وہ اب میرا ساتھ دینا ہی نہیں چاہتی۔"

"وہ بدلی نہیں، اسے بدلا گیا ہے۔ بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ہم نے اس بارے میں کوئی کھوج لگایا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ اس کا بھائی قادر، والد، والدہ، سب کچھ بُرے لوگوں کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں کچھ بتا نہیں سکتی اس لیے بے وفائی کا الزام اپنے سر پر لے رہی ہے۔ آہستہ آہستہ ساری باتیں تم پر کھل جائیں گی۔ تم فی الحال ان باتوں کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ اپنے چھوٹے زاد قادر کے بارے میں تمہیں کیا پتا ہے؟"

وہ کچھ دیر تک مذبذب میں رہا پھر مرعوب لہجے میں

بولا۔ "سر جی! مجھے تو بس یہی پتا ہے کہ قادر بھائی کا اٹھنا بیٹھنا کچھ خراب لڑکوں میں تھا۔ انہوں نے اپنے محلے کی ایک لڑکی کو سڑک سے اٹھایا۔ قادر بھائی بھی اس معاملے میں پھنس گیا۔ جن لڑکوں کا اصل قصور تھا وہ تو امیر گھروں کے تھے۔ ان کے گھر والوں نے انہیں دائیں بائیں کر دیا۔ اب اس واردات کا بہت سارا بوجھ قادر بھائی پر آرہا ہے۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے کہیں چھپا ہوا ہے۔ پولیس اس کے گھر والوں کو تنگ کرتی رہتی ہے۔ کنول بہت پریشان ہے۔"

"اچھا، مجید منصور سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی تھی؟"

"میں ان دنوں بڑا پریشان تھا جی۔ مر جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ بچوں کے ایک پارک میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ مجید صاحب میرے پاس بیٹھے۔ انہوں نے مجھ سے ہمدردی کی باتیں کیں۔ میری کہانی سنی اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے حالات اچھے کرنے کے لیے کویت چلا جاؤں۔ انہوں نے اس سلسلے میں میری مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کوئی ہنر ہے؟ میں نے بتایا کہ ہنر تو کوئی نہیں۔ ایف اے کیا ہوا ہے۔ اب اپنے محلے میں ایک جنرل اسٹور چلاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں تین چار ہفتے لگا کر تھوڑی سی کارپینٹری سیکھ لوں۔ اس کے بعد وہ مجھے ورک ویزے پر باہر بھیج دیں گے۔ تھوڑے سے پیسے میرے پاس تھے وہ میں نے انہیں دے دیے۔ انہوں نے کہا کہ باقی پیسے میں باہر جانے کے بعد بھیج دوں۔ مجھے مجید صاحب کے بارے میں زیادہ پتا نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان کو مجھ سے ہمدردی ہے۔"

فیاض "ہمدردی ہے" کے لفظ استعمال کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی تک مجید منصور کے انجام سے بے خبر ہے۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ کل رات اپنی ہی چالاکی کی آگ میں جل کر بھسم ہو چکا ہے۔

عمران نے فیاض سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں مجید منصور سے کبھی ملا نہیں لیکن جہاں تک مجھے پتا ہے، اس کی شہرت ایک غنڈے کی ہے۔ ایسے لوگ بلاوجہ کسی سے ہمدردی نہیں جتاتے۔ تمہاری بات سننے کے بعد مجھے سو فیصد یقین ہے کہ مجید بھی ان لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہے جنہوں نے قادر اور اس کے گھر والوں کو اپنے چکر میں پھنسایا ہوا ہے۔ یہ لوگ صرف کنول کو شادی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہر ہتھکنڈہ استعمال کر رہے ہیں۔ تمہیں اگر باہر بھیجا جا رہا ہے تو اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ وہ تمہیں کنول اور قادر وغیرہ سے دور کرنا چاہتے ہیں۔"

فیاض کے چہرے سے تک رہا تھا کہ اسے عمران کی باتوں پر یقین آنا شروع ہوگیا ہے۔ اس الجھن کے بعد اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی بے تابی کروٹیں لینے لگی تھی۔

"تم کب جارہے تھے دبئی؟" اقبال نے پوچھا۔

"اگلے ہفتے جی... پاسپورٹ بننے گیا ہوا ہے۔ میڈیکل بھی مجید صاحب نے کروادیا تھا۔ اب تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تھا... لیکن... لیکن..." وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"کہو کہو۔" عمران نے اسے حوصلہ دیا۔ "تم ہم پر پورا اعتماد کر سکتے ہو۔ پورا اعتماد کرو گے تب ہی ہم تمہاری مدد کرسکیں گے۔"

"جو کچھ آپ بتا رہے ہیں جی... اس کے بعد تو میں باہر جانے کا نہیں سوچوں گا۔ میں... ایک بار پھر کنول سے ملنا چاہتا ہوں... اور چھوٹی باجی سے بھی۔"

"تمہیں ضرور ملنا چاہیے... بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس کے علاوہ تمہیں قادرے سے بھی ملاقات کرنی چاہیے۔"

"مگر قادر بھائی کا تو مجھے پتا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟" فیاض نے کہا۔

"گھبراؤ مت، اس کو بھی ڈھونڈ لیں گے۔" عمران نے فیاض کا شانہ تھپکا۔

عمران کے اس انداز نے مجھے اس دن کی یاد دلا دی جب سیٹھ کے کارندوں نے مجھے مارا تھا اور میں بری طرح ٹوٹ پھوٹ کر ریلوے لائن پر سر رکھنے کا سوچ رہا تھا۔ تب بھی عمران ایسے ہی ایک پُرخلوص غم خوار کے روپ میں میرے سامنے آیا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر جو تھپکی دی تھی، اس نے میرے اندر زندگی کی توانائی پیدا کی تھی۔ آج ویسی ہی تھپکی وہ فیاض کو دے رہا تھا۔

☆☆☆

ہم نے اگلے چوبیس گھنٹے جہلم کے اسی ہوٹل میں گزارے۔ مجید سٹھ کا موبائل فون ابھی تک عمران کے پاس تھا لیکن اس نے اسے آف کردیا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے ضائع کردے مگر ابھی تک اس نے میری بات نہیں مانی تھی۔ اقبال کو اپنی بغلی اور ٹانگوں کے سبب چلنے پھرنے میں تکلیف ہو رہی تھی تاہم وہ اسے برداشت کر رہا تھا۔ فیاض ہمارے ساتھ ہی تھا... اس سازش سے کافی حد تک آگاہ ہو چکا تھا جو کنول کے گھر والوں کے اردگرد بُنی جارہی تھی اور جس نے خود فیاض کو بھی بُری طرح متاثر کیا تھا۔ آہستہ آہستہ باتیں اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔

ہم اگلے روز جہلم سے لاہور روانہ ہوئے... اور قریباً چار گھنٹے کے سفر کے بعد راوی روڈ پر عمران کے گھر پہنچ گئے۔ یہاں عمران کا ساتھی آصف موجود تھا۔ وہ تیس پینتیس کے پیٹے میں تھا اور درمیانے قد کا خوش باش سا شخص تھا۔ میں اسے عمران کے ساتھ سرکس میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ہماری غیر موجودگی میں اس نے قادرے کی دیکھ بھال کی تھی۔ اس نے بتایا کہ قادرا رات کو روتا گڑگڑاتا رہتا ہے۔ کل سے اسے تیز بخار بھی ہے۔ بہرحال، گھر واپس پہنچتے ہی عمران نے آصف کو فارغ کردیا اور وہ اپنی موٹرسائیکل پر چلا گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی عمران نے فیاض کو بتا دیا تھا کہ وہ اس کی ملاقات ایک جانے پہچانے شخص سے کرانے والا ہے۔ اسے دیکھ کر فیاض کو خوشی ہوگی۔ فیاض کے چہرے پر تجسس نظر آرہا تھا۔

عمران نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں قادر کو رکھا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی قادرے کی نظر سب سے پہلے اپنے ... بھائی فیاض پر پڑی۔ قادرے کا جسم حیرت سے تن گیا۔ کچھ یہی کیفیت فیاض کی بھی ہوئی۔ وہ بھی قادرے اور عمران کا چہرہ تکتا تھا۔ پھر قادر جاگ کر آگے آیا اور فیاض سے لپٹ گیا۔ وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ فیاض کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جب سے قادرے دلہن کے گھر سے روپوش ہوا ہے، آج پہلی بار فیاض اور وہ مل رہے ہیں۔

قادرا ابھی تک اسی لباس میں تھا جس میں ہم اسے یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔ دو دن پہلے میں نے ٹیرس میں جو کر اس سے جو مار پیٹ کی تھی، اس کے آثار ابھی تک وہ گہرے نیلوں کی صورت میں اس کے سرخ و سپید چہرے پر موجود تھے۔ "قادر بھائی! تم کیسے ہو؟ ہم سب تمہارے لیے بڑے پریشان تھے۔" فیاض نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"یہ سارے سوال جواب بعد میں ہو جائیں گے۔" عمران نے تیزی سے کہا۔ "فی الحال تمہیں اپنے گھر میں ایک فون کرنا ہے اور گھر والوں سے دو چار باتیں کرنی ہیں۔" عمران کے لہجے میں حکم تھا۔

"کیا کہنا ہے؟" قادرا ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔" عمران نے کہا پھر وہ فیاض سے مخاطب ہوکر بولا۔ "چلو یار! تم ذرا دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

فیاض اپنے بھوپھی زاد قادرے پر ایک پریشان نظر ڈالتا ہوا

باہر چلا گیا۔ قادرے کی حالت دیکھ کر یقیناً فیاض جان گیا تھا کہ اسے یہاں زبردستی رکھا گیا ہے اور اس سے مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔

اس کے جانے کے بعد عمران نے جیب سے قادرے والا سیل فون نکالا۔ یہی فون تھا جس پر دو دن پیشتر قادرے کی بہن کنول کا فون آیا تھا اور بعد میں اسی فون سے اقبال نے سیٹھ سراج کی آواز کی کامیاب نقل کرتے ہوئے صدیقی سے بھی بات کی تھی۔ بعد ازاں عمران نے یہ فون آف کرکے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

فون کو آن کرنے کے بعد عمران نے کہا۔ "ہاں قادر بچیا... فون پر کال کرکے تم نے اپنی بہن یا امی جان کو یہ بتانا ہے کہ..." بات کرتے کرتے عمران ایک دم رک گیا اور پُرسوچ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اسے رکتے دیکھ کر پوچھا۔

"ایک منٹ، میرے ساتھ آؤ۔" اس نے کہا۔

ہم دونوں کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کرکے برآمدے میں آگئے۔ "کیا مسئلہ ہے؟" میں نے دریافت کرلیا۔

"یار جی! قادرے کے ساتھ کوئی بھی بھلائی کرنے سے پہلے تم سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اگر تم اسے معاف کردو گے تو میں بھی کرسکوں گا۔ ورنہ پھر بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ۔"

"تو تم اسے چھوڑنا چاہ رہے ہو؟"

"چھوڑیں گے... تو اس کی بہن زبردستی کی شادی سے بچے گی نا... لیکن ہوگا بھی جو آخری فیصلہ تمہارا ہوگا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ قادرے کے سامنے آنے کے بعد سے میں نے اس پر جی بھر کر اپنی بھڑاس نکالی تھی۔ اسے بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ گالیاں دی تھیں، ذلیل کیا تھا۔ وہ معافی تلافی کرتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ دہائی بھی دیتا رہا تھا کہ وہ راجی اور اپنے تیسرے ساتھی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم اس کے موبائل فون کے ذریعے راجی اور شکیل وغیرہ کے نمبروں پر کال ملانے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن وہ دونوں اپنی سم بدل چکے تھے۔ اب اس صورتِ حال میں قادرے کو مزید بند رکھنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں اسے اپنے کیے کی کافی سزا مل چکی تھی۔ وہ ڈیڑیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ اس کے گھر والے شدید معاشی بدحالی کا شکار تھے اور اس سارے چکر میں اس کی بہن کی زندگی بھی برباد ہو رہی تھی۔

اگر بات صرف قادرے کی ہوتی تو شاید میرے دل میں اس کے لیے اتنی جلدی نرم گوشہ پیدا نہ ہوتا مگر یہاں ایک بے گناہ لڑکی کی زندگی اور عزت کا سوال بھی تھا۔ اسے بھائی کے جرم کی بھینٹ چڑھایا جارہا تھا۔ پتا نہیں کیوں جب میں کنول اور فیاض کے بارے میں سوچتا تھا تو مجھے اپنا اور ثروت کا دکھ یاد آجاتا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا تھا عمران نے... اگر ایک دل فگار دوسرے دل فگار کے درد کو نہیں سمجھے گا تو اور کون سمجھے گا۔ وہیں کھڑے کھڑے ایک دم میرا دل آنسوؤں سے بھر گیا۔ میں نے سوچا، میں ایک بے گناہ لڑکی کو برباد ہونے سے بچاؤں... شاید اس کے صلے میں قدرت مجھ پر اور ثروت پر بھی رحم کردے۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور عمران ایک بار پھر کمرے میں قادرے کے پاس تھے۔ وہ سکڑا سمٹا صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ عمران نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔ "تم نے ترس نہیں کھایا تھا لیکن ہم تم پر ترس کھا رہے ہیں۔ تیری بہن کو بچایا جارہا ہے جو تیرے کرتوتوں کی سزا زبردستی کی شادی کی شکل میں بھگتنے والی ہے... تم بھی سب کچھ جانتے ہو مگر بے غیرت بنے ہوئے ہو۔ اپنی جان چھڑانے کے عوض اپنی بے قصور بہن کو دوزخ میں دھکیل رہے ہو... دھکیل رہے ہو یا نہیں؟"

قادرے کے چہرے پر بزدلی اور خوف کی زردی چھائی رہی اور اس کا سر جھکا رہا۔ ندامت کے آنسو اس کی گدلی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

"چل فون لگا اپنی والدہ کو اور ان کو بتا کہ فیاض ان سے ملنے آرہا ہے۔ وہ ان کے لیے اچھی خبر لا رہا ہے۔ وہ ہر صورت اسے ملنے دیں۔"

"فیاض کو کیا کہنا ہے ان سے؟" قادرے نے دبی آواز میں پوچھا۔

"سوال کرے گا تو مجھے تاؤ آجائے گا۔ جس طرح کہہ رہا ہوں اسی طرح کر۔ باقی باتیں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ چل شاباش۔"

قادرے نے عمران کی ہدایت کے مطابق اپنے گھر کال ملائی۔ اس کی بہن کنول نے ہی کال اٹینڈ کی۔ "بھائی! آپ کہاں تھے؟ اتنی کوششیں کی ہیں کیا بتاؤں، کتنی دکھتی کی ہیں۔ آپ نے فون بند کیوں کیا ہوا تھا؟"

"چارجر نہیں مل رہا تھا۔ ابھی ملا ہے۔" قادرے نے بہانہ بنایا۔

"آپ کو پتا چلا ہے مجید صاحب کے بارے میں؟" کنول نے لرزتی آواز میں پوچھا۔
"کیوں... کیا ہوا؟" قادر نے چونک کر پوچھا۔
"آپ کو واقعی اب تک پتا نہیں؟" کنول کی آواز بھرا گئی۔ قادر نے نفی میں جواب دیا۔
وہ کراہ کر بولی۔ "جہلم کے قریب مجید صاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ موقعے پر ہی ختم ہو گئے ہیں۔ ابھی... کچھ دیر پہلے... صدیقی صاحب آئے ہوئے تھے، انہوں نے بتایا ہے۔"
"اوہ گاڈ!" قادر نے سر تھام لیا۔ پھر ادھوری نظروں سے ہماری طرف دیکھا... عمران نے بھلاتے ہوئے انداز میں اشارہ کیا کہ وہ یہ باتیں چھوڑے اور وہ بات کرے جس کے لیے فون کیا ہے۔
اظہارِ حیرت اور اظہارِ افسوس کے چند جملوں کے بعد قادر نے بہن کو بتایا کہ فیاض ایک بہت خاص کام کے لیے ان کے پاس آ رہا ہے اور اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔
"لیکن وہ کیوں آ رہا ہے؟" کنول الجھ گئی۔
"بس ایک اچھی خبر لا رہا ہے ہم سب کے لیے۔ باقی باتیں بعد میں بتاؤں گا۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ رابطہ منقطع کرنے کے بعد وہ متعجب نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔ غالباً وہ عمران کے منہ سے اس بات کی تصدیق چاہتا تھا کہ مجید صاحب واقعی راہیِ ملکِ عدم ہو چکا ہے لیکن عمران نے اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی اور کمرے سے نکل آیا۔ اس گفتگو کے دوران میں قادر نے عمران کی ہدایت پر کنول سے یہ بھی پوچھ لیا تھا کہ صدیقی صاحب تو گھر میں نہیں آ گئے وہیں... آ تو نہیں رہے؟ کنول نے ان دونوں کا جواب نفی میں دیا تھا۔
شام کے سات بج چکے تھے۔ عمران، کنول کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ کافی جلدی میں نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ اس کے ذہن میں کیا تھا مگر جو کچھ بھی تھا وہ وہاں سے بعد سے جلد نمایاں ہوتا جاتا تھا۔ اقبال تو اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے اس کام کے نہیں رہے تھے۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے پر تیار کر لیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی، اب میں اس کی باتوں سے بے دلی تو نہیں ہونے لگا تھا۔ اس کے ساتھ اس بھاگ دوڑ میں مجھے ذاتی دلچسپی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جتنی دیر عمران کے ساتھ مصروف عمل رہتا، میرا دھیان اپنے بابا کی طرف سے ہٹا رہتا تھا۔
قادر سے لے کر رشید پارک کے قاسمی میں تھا یہ پانچ چھ مرلے کا مکان تھا۔ متوسط آبادی تھی۔ قادر نے بتایا تھا، یہ کرائے کا گھر ہے۔ گلی اتنی بڑی نہیں تھی کہ گاڑی پارک کی جا سکتی۔ ہم نے گاڑی گلی سے باہر ہی کھڑی کی۔ فیاض نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی بوڑھی نسوانی آواز میں پوچھا گیا۔ "کون؟"
"میں فیاض ہوں پھوپی جی۔"
چند سیکنڈ بعد ایک پریشان چہرے والی چالیس پینتالیس سالہ عورت نے دروازہ کھول دیا... فیاض نے اسے سلام کیا جس کا جواب سپاٹ لہجے میں دیا گیا۔ فیاض نے کہا۔ "پھوپی جی! ذرا بیٹھک کا دروازہ کھول دیں۔ میرے ساتھ دو مہمان بھی ہیں۔"
ادھیڑ عمر عورت پہلے ہی متذبذب تھی۔ مہمانوں کا سن کر مزید متذبذب ہو گئی۔ اس نے سر تا پا ہمارا جائزہ لیا۔ پھر الجھی الجھی سی اندر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد گلی میں کھلنے والے ایک دوسرے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ یقیناً یہ بیٹھک کا دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا اور ہم اندر چلے گئے۔
اسی دوران میں موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ قادر والا فون تھا۔ عمران نے مجھے تھما یا تھا اور میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ فون اسکرین پر صدیقی صاحب کے الفاظ چمک رہے تھے۔ عمران نے بھی نام پڑھا۔ پھر اشارے سے مجھے کہا کہ میں کال ریسیو کروں مگر خاموش رہوں۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے صدیقی کی پریشان آواز آئی۔ "کیا بات ہے قادر! بیٹا... کہاں ہو تم... ہیلو... میں دس منٹ سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں... تم سن رہے ہو... ہیلو... ہیلو۔" میں نے فون بند کر دیا۔
"کیا کہہ رہا تھا؟" عمران نے سرگوشی میں پوچھا۔
"کہہ رہا ہے کہ وہ مجید مغل کے گھر کے باہر کھڑا ہے۔ اس کا ابھی تک یہی خیال ہے کہ تم وہاں گھر کے تہ خانے میں ہے۔"
عمران نے کہا۔ "ہمیں یہاں زیادہ وقت نہیں لگانا چاہیے... اگر ہو سکے تو..."
عمران کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ ادھیڑ عمر عورت دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینا آ رہا تھا اور سانس تیز چل رہی تھی۔ "پھوپی جان!" فیاض پکارا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ادھیڑ عمر عورت کو سنبھالا۔ پھر اس نے آواز دی۔ "کنول... کنول۔"
ایک لڑکی بھاگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ فیاض کے ساتھ مل کر ادھیڑ عمر عورت کو سنبھالنے لگی۔ ہم نے بھی مدد کی اور عورت کو بیٹھی صوفے سے اٹھا کر بڑے صوفے پر لٹا دیا۔

لڑکی پانی لے آئی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے ماں کو پانی پلایا۔ پھر اسے زبان کے نیچے رکھنے والی گولی دی۔ لڑکی جو یقیناً کنول تھی، اشتہا بر نام حالات میں ہمارے سامنے نہ آتی مگر شدید پریشانی نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ اچھی شکل صورت کی تھی۔ کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور ناک میں چھوٹا سا کوکا چمک رہا تھا۔ ماں کی حالت ذرا سنبھل گئی تو اس نے سر پر دوپٹا لے لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔
فیاض نے صوفے پر ایک طرف دو تکیے رکھ کر کنول کی والدہ کو نیم دراز کر دیا۔ کنول نے اسے مزید دوا دی۔ عورت کراہتے ہوئے بولی۔ "فیاض! ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو... تمہیں خدا رسول کا واسطہ ہے۔ کیوں ہم سب کی جان لینے پر تلے ہوئے ہو؟ چھوڑ دو ہماری جان۔" وہ باقاعدہ رونے لگی۔
عمران نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "خالہ جان! ایسا اب نہیں ہوگا۔ آپ کی مجبوریاں ہم سمجھ رہے ہیں... اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی مجبوریاں ختم ہو جائیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"آ... آپ لوگ کون ہیں؟" کنول نے پوچھا۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔
"ہم تمہارے بھائی کا دوست سمجھ لیں لیکن وہ دوست نہیں جنہوں نے اسے تباہ کرنے کی کوشش کی بلکہ وہ جو اسے تباہی سے بچانا چاہتے ہیں۔ دوبارہ زندگی کی طرف لانا چاہتے ہیں۔" عمران نے کہا۔
"آپ... کچھ نہ کریں بھائی جان!" کنول نے پھر جھکی نظروں کے ساتھ کہا۔ "ہم اپنے طور پر کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آٹھ دس دن تک قادر بھائی گھر پہنچ جائیں گے۔" بات کرتے ہوئے وہ سب جانے کیوں کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس خستہ تھا اور کندھے سے قمیص کی سلائی ادھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کندھے کو بار بار دوپٹے سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گھر کی حالت سے بھی غربت جھلک رہی تھی۔
عمران نے کہا۔ "میری بہن! ٹھیک ہے کہ آپ دونوں قادر کو بچانے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن وہ جس طرح کی کوشش بھی ہے، اس سے ہم اچھی طرح جان چکے ہیں... اور آپ دونوں کے لیے خوش خبری یہ ہے کہ اب کسی فرد کی کوشش کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ وہ مجبوری اب ختم ہو چکی ہے جس کی وجہ سے آپ دونوں کو ریاض اور صدیقی سے ملنا پڑ رہا تھا اور اس کی ہر بات میں ہاں ملانا پڑ رہی تھی۔"
ابرار صدیقی کے نام نے ماں بیٹی کے چہرے متغیر کر دیے۔ "ہیں... پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" کنول ہکلائی۔
"تمہیں پتا ہے میری بہن۔" عمران نے کہا۔ "اور آپ دونوں کے لیے خوش خبری یہ ہے کہ قادر کے لیے اب کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"
قادر کی والدہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر دیکھا جائے تو قادر کے لیے کبھی کوئی بڑا خطرہ تھا ہی نہیں۔ بے شک اس نے جرم کیا ہے مگر کچھ لوگوں نے اپنا الّو سیدھا کرنے کے لیے اس جرم کا سارا بوجھ قادر پر ڈالا ہے۔ قادر کو اور آپ دونوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کچھ سوچے سمجھے جھوٹ بولے گئے ہیں۔"
"جھوٹ بولے گئے ہیں؟" کنول کی والدہ حیران ہوئیں۔
"آپ کو بتایا گیا ہے کہ جس لڑکی کو اٹھایا گیا تھا اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ وہ جل گئی ہے اور اسپتال میں خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ اس نے بیان دیا ہے کہ اس سے زیادتی ہوئی ہے اور اس کا بڑا مجرم قادر ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری باتیں بس ایک ڈرامے کا حصہ ہیں اور ڈراما یہی ہے کہ آپ لوگوں کو اتنا دہشت زدہ کر دیا جائے کہ آپ ہر جائز ناجائز بات ماننے پر مجبور ہو جائیں۔ قادر بالکل خیریت سے ہے اور ہمارے پاس ہے۔ اب آپ لوگوں کو تھوڑی سی ہمت کرنا ہوگی اور ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا ہوگا۔"
"آپ کا مطلب ہے کہ... وہ لڑکی اسپتال میں نہیں ہے... اور اس کا بیان؟" کنول نے حیران لہجے میں پوچھا۔
"کچھ نہیں ہے۔ یہ سب سیٹھ سراج کی چالبازی ہے۔ وہ بس ایڈووکیٹ صدیقی کے لیے راستہ صاف کر رہا ہے۔"
"پھر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟" کنول کے خوبرو چہرے پر الجھن تھی۔
اب عمران اسے کیا بتاتا اور اگر بتاتا بھی تو کنول اور اس کی ماں کی کچھ سمجھ میں کیا آتا تھا۔ درحقیقت تو یہ نیکسٹ یا مردان کے کھنڈرات سے نکلی ہوئی کوئی "دورشے" کا شاخسانہ تھا... نئے جو غالباً کسی گندھارن مورتی کی شکل میں تھی اور ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کے پاس تھی۔ اس گندھارن پیس آف آرٹ کو حاصل کرنے کے لیے سیٹھ سراج وغیرہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اس ایڑی چوٹی کے زور میں کنول کا کومل بدن اور اس کا شباب بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ بے چاری بے خبری میں

ایک ایسے کھیل کا حصہ بن گئی تھی جو نادر اشیا کی نہایت منافع بخش نقل و حمل سے متعلق تھا۔ اسے رشوت کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا اور وہ لاعلم تھی۔

میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع ہو کر کہاں پہنچی ہے۔ سیٹھ سراج کو تھوڑا سا سبق سکھانے کے لیے عمران نے سردار اکرم کی گاڑی کو ٹکر لگوائی تھی۔ اس ٹکر کے نتیجے میں گاڑی کے اندر رکھی ہوئی کچھ بوریاں پھٹ گئی تھیں اور ان میں سے چاولوں کے ساتھ ممنوعہ اشیا برآمد ہوئی تھی۔ اس ہستی کے ڈانڈے بہت دور جا ملے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ عمران کے تیز رفتار ذہن نے رات کو ہی بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ کنول، اس کی والدہ اور قادر کو فوری طور پر لاہور سے ملتان بھجوانے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے لیے وہ کافی حد تک انتظام بھی کر چکا تھا۔ صرف دس پندرہ منٹ کے اندر وہ ماں بیٹی کو پوری طرح قائل کر چکا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے اور وہ حالات کی اس حیران کن تبدیلی پر ششدر نظر آتی تھیں۔ فیاض کی کیفیت بھی اس سے ملتی جلتی تھی۔ اب ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں بھی بڑی اچھی طرح آ رہی تھی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ جبید فوجدار اسے بیرونِ ملک بھجوانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا تو اس کی اصل وجہ کیا تھی۔ اس نے یہ ساری بات اپنی بھابی اور پھوپی زاد کنول کو بتائی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر کنول اور اس کی والدہ گھر کو تالا لگا کر ہمارے ساتھ روانہ ہو رہی تھیں۔ گھر میں کوئی ایسا قیمتی سامان تھا ہی نہیں جسے وہاں سے سمیٹا جاتا۔ بس ایک دو گہنے اور تھوڑی سی نقدی تھی۔ یہ چیزیں انہوں نے ساتھ لے لیں۔ ہم واپس راوی روڈ پر پہنچے۔ وہاں سے قادر کو گاڑی میں بٹھایا گیا۔ قادر نے ماں اور بہن کے گلے لگ کر آنسو بہائے۔ تب اس نے اچانک میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور رو رو کر معافی مانگی۔ میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے دل میں سوچا، میں معافی دینے یا نہ دینے والا کون ہوتا ہوں؟ معافی تو وہ دیں جن کے والد کی جان اس جرم نے لے لی۔ جن کا گھر اجڑا... جو در بدر ہوئے۔ قادر کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ ہونے کے باوجود میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ عمران ان چاروں کو لے کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ ان چاروں میں قادر، کنول، ان کی والدہ اور ماموں زاد فیاض شامل تھے۔ ان کو لاہور اسٹیشن سے ملتان جانے والی ایکسپریس ٹرین میں سوار ہونا تھا۔ ملتان میں انہیں عمران کے دوست نے محفوظ ٹھکانے تک پہنچانا تھا۔

وقتِ رخصت میں نے کنول کی آنکھوں میں امید کی خوب صورت کرنیں دیکھیں۔ کچھ ایسی ہی کرنیں فیاض کی آنکھوں میں بھی تھیں۔

میں بستر پر لیٹا رہا اور اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ آج قادر اور اس کے گھر والوں کا ملاپ دیکھ کر مجھے اپنے بچھڑے ہوئے بھی شدت سے یاد آنے لگے تھے... پتا نہیں کہ کتنا وقت گزر چکا تھا ان سے ملے ہوئے؟ اب تو میں دنوں کی گنتی بھی بھول چکا تھا۔ کھڑکی میں سے جھانکنے والے چاند نے میری اداسی کچھ اور بڑھا دی۔ مجھے لگا کہ ایک زمانہ بیت گیا ہے اپنی والدہ کی گود میں سر رکھے ہوئے... اور اپنی بہن کا ماتھا چومے ہوئے اور اپنے بھائی کو گلے سے لگائے ہوئے۔

میری آنکھوں میں نمی جاگنے لگی۔ میں خود کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کیوں میں اپنے گھر والوں کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا؟ اگر میں اپنے محلے میں نہیں جانا چاہتا تھا، اپنی جان پہچان والوں سے نہیں ملنا چاہتا تھا تو یہ اور بات تھی مگر اپنے گھر والوں سے ملنے کا کوئی راستہ تو مجھے نکالنا چاہیے تھا۔ میں دیر تک اس بارے میں غور کرتا رہا... پھر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو اقبال میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اسی نے ہی مجھے ہلا کر جگایا تھا...

"کیا بات ہے؟" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یار! عمران ابھی تک نہیں آیا... اس کا فون بھی بند ہے۔"

میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ "اتنی دیر کیوں کر دی؟" میں نے کہا۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک اسے آ جانا چاہیے تھا۔ گیارہ بجے ٹرین چلنی تھی۔"

"لیکن ہماری ٹرینیں لیٹ بھی تو گھنٹوں اور دنوں کے حساب سے ہوتی ہیں۔"

"بھئی فون تو کر رہا ہوں۔" اقبال نے کہا اور ایک بار پھر اسے کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔

"جیلانی یا کسی اور یار دوست کو ٹرائی کر کے دیکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"کیا ہے لیکن کسی کو پتا نہیں۔" اقبال بولا اور ایک بار پھر کسی کو کال ملانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اٹھ کر چائے تیار کی اور اقبال کے ساتھ بیٹھ کر عمران کا انتظار کرنے لگا۔ یہ گھر بارونق علاقے میں تھا۔ سارا

دن گلی محلے اور بازار کا شور سنائی دیتا رہتا تھا لیکن اب اس گھر کے اردگرد زندگی سوئی پڑی تھی۔ اذانیں ابھی نہیں ہوئی تھیں۔ "کوئی بات نہیں یار! کہیں رک گیا ہوگا۔" میں نے اقبال کو تسلی دی۔

"میں اس لیے پریشان ہوں کہ وہ ایسی غیر ذمے داری دکھاتا نہیں۔ اسے کہیں رکنا ہوتا تو کسی بھی طرح فون پر اطلاع ضرور دیتا۔"

"ہو سکتا ہے کہ اچانک کوئی کام پڑ گیا ہو۔ وہ خدائی فوجدار تو ہے ہی... کسی کا مسئلہ حل کرنے میں لگ گیا ہوگا... پچھلے ہفتے بھی تو ہم صبح تک اس کا انتظار کرتے رہے تھے اور وہ چاچے نذیر کو لے کر اسپتال پہنچا ہوا تھا۔"

ہم باتیں کرتے رہے اور ساتھ ساتھ کسی ایسی آواز کی آہٹ کے منتظر رہے جو عمران کی آمد کی نوید دیتی۔ بازار سے کوئی گاڑی گزرتی تو ہمارے کان کھڑے ہو جاتے لیکن جلد ہی اندازہ ہو جاتا کہ یہ عمران کی گاڑی کی آواز نہیں ہے۔

دن چڑھ گیا تھا لیکن عمران کی واپسی نہیں ہوئی۔ اقبال کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ ایک تو وہ اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے تکلیف میں تھا، دوسرے عمران کی پریشانی اسے شدید متاثر کر رہی تھی۔ اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بازار کے شیر فروش خادم نبی کا ملازم لڑکا اگلے زینے میں ہم تینوں کا بھاری بھرکم ناشتہ لیے کھڑا تھا۔ روزانہ یہی لڑکا ناشتہ لے کر آتا تھا۔ نہاری، نان، حلوہ اور زبردست قسم کی لسی۔

میں ناشتہ لے کر اندر آگیا اور فرشی میز پر رکھ دیا۔ دس بج گئے مگر ہم دونوں میں سے کسی نے ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ پریشانی بڑھ رہی تھی۔ عمران جس قسم کے روز و شب گزار رہا تھا، وہ میرے سامنے تھے۔ اس کی دوستیاں بہت تھیں تو دشمنیاں بھی بہت تھیں۔

ساڑھے دس بجے کے قریب جیلانی آ گیا۔ اس نے کہا۔ "میں ریلوے اسٹیشن سے ہو کر آ رہا ہوں۔ ملتان جانے والی ٹرین صرف پندرہ بیس منٹ کی تاخیر سے ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوئی تھی۔"

"کہیں اور بھی پتا کیا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"میو اسپتال اور گنگا رام کی ایمرجنسی دیکھ آیا ہوں۔ [illegible] ہے کہ وہ آن ڈیوٹی کے ڈاکٹروں میں پتا کر لے۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا۔ اگر بھائی نے رابطہ کرنا ہوتا تو وہ کہیں سے بھی کر سکتے تھے۔ یا تو وہ کہیں بری طرح پھنس گئے ہیں یا جان بوجھ کر رابطہ نہیں کرنا

چاہ رہے ہیں۔"

"کہیں آزاد ہونے کے بعد اس قادر لمبے نے ہی کوئی چکر نہ چلا دیا ہو؟" جیلانی نے کہا۔

"لگتا تو نہیں ایسے۔" اقبال نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ تو بس اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ سیٹھ سراج وغیرہ کا اصل چہرہ بھی اس نے دیکھ لیا ہے۔ وہ ان سے کہیں دور چلا جانا چاہتا ہے۔"

اگلے تین چار گھنٹے بھی شدید پریشانی میں گزرے۔ کہیں سے عمران کا فون آیا اور نہ اس کی گاڑی کا کوئی سراغ ملا۔ قادر کا موبائل فون بھی عمران ہی کے پاس تھا۔ اس نمبر پر بھی اقبال اور جیلانی نے بہت سی کالیں کیں مگر جواب ندارد۔ اسی دوران میں سرکس سے اسسٹنٹ منیجر عباس کا فون آگیا۔ اسے عمران کی گمشدگی کی اطلاع ہو چکی تھی اور وہ بھی ازحد پریشان تھا۔ اپنے طور پر وہ بھی عمران کو ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔

سرکس سے فون آیا تو میرا دھیان شاہین کی طرف چلا گیا۔ وہ عمران کی گرل فرینڈ تھی، کم از کم عمران کہتا تو یہی تھا۔ وہ اکثر سرکس میں اور پھر فون پر بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ وہ اسے اپنے ہونے والے بچوں کی ماں کہتا تھا۔ اس نے بچوں کے نام اور پیشے وغیرہ بھی منتخب کر رکھے تھے۔ اس حوالے سے شاہین کے ساتھ اس کی دلچسپ نوک جھونک ہوتی تھی۔ میں نے اقبال سے کہا۔ "یار! کہیں وہ شاہین کے پاس ہی نہ چلا گیا ہو۔"

"نہیں یار! اس کے بارے میں وہ اتنا سنجیدہ نہیں کہ رات گزارنے اس کے پاس چلا جائے۔"

"مگر شاہین کو بھی تو کوئی فون نہیں آیا۔ اگر سرکس میں اس کے گم ہونے کا پتا چل گیا ہے تو شاہین کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔"

"لیکن ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عباس نے جان بوجھ کر یہ خبر شاہین سے چھپائی ہو۔ وہ بڑی جلدی رونا دھونا شروع کر دیتی ہے۔"

پتا نہیں کیوں مجھے چند ہی گھنٹوں کے اندر اپنے اردگرد ایک خلا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ عمران کی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ اس کی غیر موجودگی کو نظرانداز کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ حواس پر چھا جاتا تھا۔ دل و دماغ میں سرایت کر جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا، ایک دن وہ تھا کہ ایک بینک اسٹور کے سامنے وہ مجھے سرراہ ملا تھا۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن وہ میرے مردہ جسم کے ساتھ زندگی

بن کر جنت گیا تھا۔ میں دو تین روز اسی کوشش میں رہا تھا کہ موقع ملتے ہی وہاں کے پاس سے کہیں کھسک جاؤں لیکن آج یہ صورت حال تھی کہ اس کی غیر موجودگی مجھے اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپنی تمام تر پریشانیوں کے ساتھ میں ایک بار اکیلا رہ گیا ہوں۔ کسی کی خوب صورت مسکراہٹ، کسی کی چوڑی چھاتی اور مضبوط بازوؤں نے میرے اردگرد حفاظت کا جو حصار سا بنا رکھا تھا، وہ ایک دم ٹوٹ گیا ہے۔ میں اسے دوبارہ دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

شام کے سات بجے تھے۔ جیلانی اور سرفراز، عمران کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے... گھر میں اقبال اور میں تھے... کال بیل ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا اور چونک گیا۔ سامنے سلیم کھڑا تھا۔ یہ عمران کا وہی پرانا دوست تھا جس نے ایک رات ہمیں میڈم کی لال کوٹھی سے بردات نکالا تھا اور ایک بڑی مصیبت سے بچایا تھا۔ بعد میں وہ یہاں عمران سے ملنے بھی آیا تھا۔ آج کافی دنوں بعد میں دوبارہ اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ "السلام علیکم!" اس نے کہا اور لنگڑاتا ہوا تیزی سے اندر آ گیا۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خیریت نہیں ہے۔" اس نے ترت جواب دیا۔

"اقبال کہاں ہے؟" میں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"کوئی اور تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہ اقبال تو نہیں۔"

ہم دونوں کمرے میں اقبال کے پاس آ گئے۔ اقبال نے اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے تکیہ پیچھے رکھی تھی اور کسی کو فون کر رہا تھا۔ سلیم کو اور اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر وہ بھی چونک گیا۔ سلیم نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ "اقبال بھائی! اچھی خبر نہیں ہے۔ ہیرو بھائی کو میڈم کے گارڈز نے پکڑ لیا ہے اور وہیں لے گئے ہیں۔ میڈم کو بہت کچھ پتا چل گیا ہے۔"

یہ دھماکا خیز اطلاع تھی۔ اندیشے تو ہمارے ذہنوں میں بہت سے تھے لیکن یہ بدترین اندیشہ تھا جو حقیقت کا روپ دھار رہا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا؟" اقبال نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔ یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے اقبال بھائی... عمران بھائی کی گاڑی بھی لال کوٹھی میں ہے۔ گاڑی کی رجسٹریشن بک میرے اندازے کے مطابق گاڑی کے اندر ہے کہیں، لیکن رجسٹریشن آفس سے تو ایڈریس کا پتا چل سکتا ہے۔ اگر رجسٹریشن میں یہاں کا ایڈریس ہی لکھا ہے تو میڈم کے بندے کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ہیرو بھائی کے بعد اب آپ دونوں بھی سخت خطرے میں ہیں۔ آپ دونوں کو فوراً یہاں سے نکلنا ہو گا۔" وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

"لیکن... یہ سب ہوا کیسے؟"

"میں نے کہا ہے نا بھائی! یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ آپ بس فوراً یہاں سے نکلیں۔ میں خود بڑے سخت خطرے میں ڈال کر صرف آپ کی خاطر یہاں آیا ہوں۔"

"ہم کہاں جا سکتے ہیں؟"

"کہیں بھی... لیکن یہاں سے تو فوراً نکلنا ہو گا۔"

"کیسے جائیں گے؟" اقبال نے پوچھا۔

"میں ایک دوست کی سوزوکی وین لایا ہوں۔ بازار کے کونے پر کھڑی ہے۔"

سلیم کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ واقعی پریشان ہے اور جو کہہ رہا ہے خلوص سے کہہ رہا ہے۔ ہم دونوں نے آپس میں مختصر مشورہ کیا اور سلیم کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اقبال نے پتلون، پینٹیں اور کچھ ضروری اشیا ایک ٹریولر بیگ میں رکھیں۔ ان اشیا میں کولٹ پسٹل اور اس کی قریباً پچاس راؤنڈ گولیاں بھی تھیں۔

سلیم نے کہا۔ "اپنے باقی ساتھیوں کو بھی اطلاع دے دو کہ ان میں سے کوئی بھی اب یہاں نہیں آئے۔ اچھا طریقہ یہ ہے سارے لوگ اپنے ٹھکانوں سے ادھر ادھر ہو جائیں۔"

اقبال نے جیلانی کو فون کیا اور اسے مختصر الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اسی دوران میں سلیم سوزوکی وین کو بالکل گھر کے دروازے کے پاس لے آیا۔ یہ اقبال کے لیے بہتر تھا۔ اپنی زخمی ٹانگوں کے ساتھ چلنا اس کے لیے کافی دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

چند ہی منٹ بعد ہم گھر کو تالا لگا کے سوزوکی وین میں سوار ہو رہے تھے۔ میں سلیم کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ اقبال پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ بازار کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ دکانوں پر رش تھا۔ ٹی وی چل رہے تھے۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ ایک تھڑے پر بڑے چاچا یعنی میاں اکبر اور ان کے دیگر عمر رسیدہ ہم جولی حقے پیتے ہوئے گپیں لگانے میں مصروف تھے۔ زندگی اپنی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ اس کا موسم ایک سا رہتا ہے۔ تاہم دیکھنے والی آنکھ کے لیے یہ موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کا تعلق انسان کے اپنے اندر کے موسم سے ہوتا ہے۔ ہمارے

اندر دکھ، پریشانی اور کسی حد تک خوف کا موسم تھا اور اس کیفیت کی وجہ سے ہمارے اردگرد موجود زندگی کی کیفیت بھی بدل گئی تھی۔

گاڑی دو تین منٹ سست روی سے چلتی بازار سے گزری اور پھر بڑی سڑک پر آ گئی۔ بڑی سڑک پر آتے ہی جیسے سلیم کی شدید پریشانی ماند پڑنا شروع ہو گئی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اب تم دونوں کم از کم فوری مصیبت سے تو بچ گئے ہو۔ اب کسی بازار کے چائے خانے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر سوچو کہ اب کہاں جانا ہے۔"

"عمران... ٹھیک تو ہے نا...؟" میں نے اندرونی بے تابی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"بابر بھائی! میں آپ لوگوں کو جھوٹی تسلی دینا نہیں چاہتا۔ انھوں نے عمران بھائی سے مار پیٹ کی ہے لیکن... یہ تو شروعات ہے۔ آگے کیا ہو گا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میڈم بہت زیادہ غصے میں نظر آ رہی ہے۔"

گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر رکی۔ یہ مینار پاکستان کا علاقہ تھا۔ منٹو پارک کی طرف جانے والی سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ ایک شخص دائیں طرف سے گاڑی کے قریب آیا۔ میں سمجھا کہ وہ نکلنے والا ہے یا پھر راستہ پوچھنے والا۔ اچانک اس نے گاڑی کا سلائیڈنگ دروازہ کھولا اور اقبال کے برابر میں بیٹھ گیا۔ تین چار لمحے بعد بائیں طرف والے دروازے پر بھی ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے ادھ کھلی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر لاک ہٹایا اور دروازہ کھول کر اقبال کی بائیں طرف بیٹھ گیا۔

یہ اتنی تیزی اور صفائی سے ہوا کہ بھری پری سڑک کے اردگرد کسی کو کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔ دیکھنے والوں کو بالکل یہی لگا ہو گا کہ اندر آنے والے ہمارے شناسا ہیں اور ہم نے شاید انھیں سر راہ لفٹ دی ہے۔ پیچھے داخل ہونے والے شخص نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔ "میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

اس کی آواز میں موجود سنگینی واضح تھی کہ وہ صرف دھمکا نہیں رہا۔ میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے ہاتھ بڑھا کر میری سائیڈ والے دروازے کو لاک کر دیا اور احتیاطاً اپنا ہاتھ لاک کے اوپر ہی رکھا تاکہ میں اچانک باہر نکلنے کی کوشش نہ کر سکوں۔ اس کے پاس سے پسینے اور سگریٹ کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ منطقی طور پر پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اس سے پہلے عمران پر ہاتھ ڈال چکے ہیں۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ سلیم کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ "خبردار سلیمے!" دائیں طرف والا شخص پھنکارا۔ "اب کوئی چالاکی دکھائی تو بھیجا پر ڈھیر کر دوں گا اور پستول پر سائلنسر چڑھا ہے، کسی کو آواز تک نہیں آئے گی... تیرا کھوپڑا ٹوٹے گی۔"

بولنے والے کی آواز میں ایسی درندگی تھی کہ سلیم بے ساختہ اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گیا۔

"چل، اشارہ کھل گیا ہے۔ بس چپ چاپ سیدھا چلتا جا... جہاں مڑنا ہو گا، تمہیں بتا دیں گے۔"

اب اس بات میں شبہ کم ہی رہ گیا تھا کہ یہ میڈم زاہدہ ہنڈرا کے پالتو غنڈے تھے۔ ممکن تھا کہ کسی شک کی بنا پر انھوں نے سلیم کا پیچھا کیا ہو اور یہاں تک پہنچ گئے ہوں... کچھ ہی دیر بعد یہ "پیچھے" والی بات درست معلوم ہونے لگی۔ ایک اوپن جیپ مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ ہماری وین میں گھسنے والے دونوں افراد نے جیپ والوں کو ہاتھ سے چند اشارے بھی کیے۔ ہماری گاڑی میں گھسنے والے دونوں افراد صورتوں سے ہی بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں یقیناً اسی جیپ سے ہی اترے تھے۔ دونوں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں لمبی نال کا پستول تھا جس کی ایک جھلک میں دیکھ چکا تھا۔ یہ لمبی نال دراصل پستول کا سائلنسر تھا۔ دوسرے شخص نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سر پر گرم ٹوپی تھی۔ مجھے شک پڑ رہا تھا کہ اس کی چادر کے نیچے کوئی چھوٹے بیرل والی رائفل ہے۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔

ایک جگہ سلیم نے گاڑی آہستہ کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ گھبراہٹ کی وجہ سے اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا یا اس قسم کا کوئی اور کام ہو جائے گا۔ وہ کانپتی آواز میں گرم چادر والے کو مخاطب کر کے بولا۔ "میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں بختیار صاحب!"

"بکواس بند کرو۔" عقب سے دہاڑتی ہوئی آواز آئی۔ "چپ چاپ گاڑی چلاتے رہو۔ اب جو بات ہو گی، کوٹھی پہنچ کر ہی ہو گی۔"

"لیکن میں نے..."

"چپ ہو جا۔" گرم چادر والا چنگھاڑا۔ "نہیں تو ابھی گردن توڑ دوں گا تیری۔" میں نے بولنے والے کی آواز اور لب و لہجے سے اندازہ لگایا کہ یہ ان گارڈز میں سے ایک ہے

جن سے چھوٹی میڈم کی کوٹھی میں عمران اور اقبال کی ملاقات ہوئی تھی۔ بعد ازاں عمران نے ان بچے کھچے گارڈز کو واش روم میں بند کر دیا تھا۔

عقب میں بیٹھا ہوا خرم ڈرائیونگ کے سلسلے میں سلیم کو ہدایت دیتا رہا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم شاہراہ قائداعظم پر آ گئے ہیں اور ائرپورٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ ائرپورٹ کی طرف جانے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ہمیں لال کوٹھیوں میں لے جایا جا رہا ہے۔

میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ ہمیں کسی پولیس ناکے پر روک لیا جائے اور پولیس والوں کو علم ہو جائے کہ اس گاڑی میں کیا صورت حال ہے۔ لیکن یہ تو تب ہوتا جب پولیس اہلکار سرسری جائزہ لینے کے بجائے غور و فکر کرتے... اور عمران نے صرف تین دن پہلے کہا تھا کہ ہماری پولیس غور و فکر کرنے کے علاوہ اور سب کچھ کرتی ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم دو ناکوں پر سے گزرے اور خیر خیریت سے گزر گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ "خیر خیریت" میڈم کے کارندوں کے نقطۂ نظر سے تھی۔

یہ بڑا کٹھن سفر تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پھانسی کا سزا یافتہ ہوں اور پھانسی پانے کے لیے تختۂ دار کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں کیا ہوگا؟ وہ لوگ کس طرح پیش آئیں گے؟ کیا وہ جان چکے ہیں کہ ہم اس سے پہلے ایک دفعہ لال کوٹھی میں گھسے تھے؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ جنید منصور کی موت میں ہمارا ہاتھ ہے؟ اس طرح کے ان گنت سوالات تھے جو ذہن میں اودھم مچا رہے تھے اور گاڑی بھاگتی جا رہی تھی۔ گاڑی کے اندر تناؤ اور خاموشی کی ایک ایسی کیفیت تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں کل رات اپنے گھر والوں سے ملنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ مجھے آج یا پھر کل اس پروگرام پر عمل کرنا تھا۔ والدہ، فرح اور ناظف کو گھر سے باہر نکلوانا تھا اور ان سے ملاقات کرنی تھی لیکن اب وہ ملاقات ایک دور دراز کا خیال محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بعید از قیاس سوچ۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں جن راستوں پر چل کر لال کوٹھیوں کی طرف جا رہا ہوں، ان راستوں کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ نہ ان در و دیوار کو، نہ ان لوگوں کو، نہ اس شہر کی جھلملاتی روشنیوں کو۔ مجھے شاید گولی مار دی جائے گی اور لال کوٹھی کے اندر ہی کسی باغیچے وغیرہ میں گاڑ دیا جائے گا۔

پھر عمران کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے ایک دن کہا تھا۔ "یار! ایک تو تم وہ بات سب سے پہلے سوچنے لگتے ہو جو سب سے آخر میں سوچنی چاہیے۔ تمہارے ذہن میں ہر طرح کے اندیشے بجلی کی رفتار سے داخل ہوتے ہیں۔"

کیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا؟ میں خوف پیدا کرنے والے خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس طرح تکلیف دہ خیالات سے چھٹکارا کہاں ملتا ہے۔ جلد ہی دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی رہائشی علاقے میں داخل ہوئیں اور پھر لال کوٹھیوں کے اندر پہنچ گئیں۔ اقبال تو شاید پہلے بھی اس طرح کے حالات سے گزر رہا تھا مگر میری حالت بری تھی۔ لگتا تھا کہ دل سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑک رہا ہے اور پورے جسم میں سے خون نچڑ گیا ہے۔

میرے لیے سب سے تکلیف دہ خیال یہ تھا کہ اگر یہاں لال کوٹھیوں میں میری ملاقات سیٹھ سراج یا ان کے کسی ایسے کارندے سے ہوگئی جو مجھے جانتا ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ ایسی صورت میں، میں براہِ راست اس سارے معاملے میں ملوث ہو جاتا۔ میرے ملوث ہونے کے بعد میرے اور میرے گھر والوں کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا... اور یہی وہ خوف تھا جو پہلے دن سے آج تک ہر گھڑی میرا دامن گیر رہا تھا۔

گاڑی چھوٹی میڈم یعنی زیبی کی کوٹھی میں داخل ہوئی اور پورچ میں پہنچ کر رک گئی۔ اس کے پیچھے نویوٹا جیپ رک گئی۔ گاڑی رکتے ہی میڈم کے گارڈز نے سلیم کو کھینچ کر باہر نکال لیا اور بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ منت بھی کر رہا تھا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ہم دم بخود کھڑے تھے۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا... عمران کی موجودگی میں میرے اندر جو خاص قسم کی توانائی پیدا ہو جاتی تھی، اس کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

بہرطور خیریت رہی کہ فوری طور پر ہمارے ساتھ مار پیٹ نہیں کی گئی۔ ہمیں کوٹھی کے مہمان خانے میں لے جایا گیا۔ اس عمارت کے داخلی دروازے پر "ایکسی" کے الفاظ لکھے تھے۔ پہلے ہمیں ایک چوکور کمرے میں بٹھایا گیا۔ گرم چادر والا خطرناک صورت گارڈ مسلسل ہمارے ساتھ رہا۔ اس نے چادر کے نیچے سے روسی ساخت کی چھوٹے بیرل والی کلاشنکوف نکال لی تھی۔ ایک گارڈ کمرے سے باہر بھی چوکس حالت میں موجود تھا۔ عورت کے کسی قریبی کمرے سے رونے چلانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں نالہ و زاری کرتی سی گھٹی گھٹی تھیں۔ بلاشبہ یہ سلیم کی آوازیں

تھیں۔ اسے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

گرم چادر والے گارڈ نے سفاک لہجے میں کہا۔ "ہم انتظار کی تکلیف کے لیے تم دونوں سے معافی چاہتے ہیں۔ تمہارے یار سلیم صاحب کو تھوڑی لگ رہی ہے۔ پانچ دس منٹ میں وہ فارغ ہو جاتے ہیں تو پھر تمہاری باری آتی ہے۔"

میرے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ گارڈ بہ غور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میرے تاثرات نوٹ کرنے کے بعد بولا۔ "اگر سلیم صاحب والی عزت افزائی سے بچنا چاہتے ہو تو کچھ چھپا کر نہ رکھنا۔ بس یہی ایک قیمتی مشورہ ہے جو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔"

میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میری نگاہیں عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی سلامتی اور زندگی کے حوالے سے میری بے قراری انتہا کو پہنچ گئی۔ اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر میں نے دو گارڈز کے ساتھ ایک عورت کو آتے دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں اسے یہاں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یقیناً اقبال کی بھی یہی کیفیت رہی ہوگی۔ یہ وہی کمی عورت زلیخا تھی۔ وہی جس سے ہماری ملاقات نمبر چار کے ایک مکان میں ہوئی تھی۔ اس دھند آلود سرد رات تنہا ہم پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ زلیخا کے گھر کے ایک کمرے میں ایک کنواں نما گڑھا ہے۔ زلیخا کے ساتھ سراج کا ناجائز تعلق بھی ثابت ہوا تھا۔ بعد ازاں زلیخا اور اس کے خاوند چھیندے نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہماری آمد کے بارے میں اپنی زبان بالکل بند رکھیں گے مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے۔

زلیخا نے چادر کی اوٹ سے ہمیں دیکھا۔ وہ آج بھی زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھی اور کانوں میں جگمگاتے جھمکے تھے۔ وہ بولی۔ "ہاں جی، یہی ہیں وہ دونوں۔ یہ اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم خفیہ پولیس کے بندے ہیں۔"

"یہاں ہی خفیہ پولیس ہے بھئی جس کا پتا خفیہ پولیس کو بھی نہیں؟" گارڈ نے اقبال کی ٹانگ پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

اقبال کی ٹانگ پہلے ہی زخمی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔

زلیخا سے ہماری شناخت پریڈ کرانے کے بعد اسے واپس بھیج دیا گیا۔ اس دوران میں کسی قریبی کمرے سے بلند ہونے والی آہ و بکا ختم ہو گئی۔ شاید سلیم کی خلاصی ہوئی تھی یا پھر وہ ویسے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

گرم چادر والے گارڈ نے ایک بار پھر بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ غالباً اسے میرے چہرے پر کوئی ایسی بات نظر آئی جس نے اسے باور کرایا کہ مجھ سے پوچھ گچھ نسبتاً آسان ثابت ہوگی۔ اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اٹھنے میں دیر کی تو دو افراد نے مجھے بازوؤں سے تھام لیا اور دروازے کی طرف لے جانے لگے۔

اقبال نے پکار کر کہا۔ "دیکھو، اسے کچھ پتا نہیں۔ جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔ یہ بس ہمارے ساتھ تھا... ہمارے کسی کام میں شامل نہیں تھا۔"

گارڈ بولا۔ "تم ذرا چھری کے نیچے سانس لو۔ تم سے بھی پورے سوال جواب کریں گے۔"

وہ مجھے پکڑ کر ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں کھڑکیوں پر لوہے کی گرلیں تھیں اور دروازہ شیشم کی مضبوط لکڑی کا تھا۔ میرا رہا سہا خون بھی نچڑ گیا۔ چھت سے نائیلون کی ایک رسی لٹک رہی تھی۔ یہ یقیناً مطلوبہ معلومات کے لیے مطلوبہ شخص کو سیدھا یا الٹا لٹکانے کے لیے تھی۔ ایک تخت نظر آ رہا تھا جس پر کسی شخص کو لٹایا جا سکتا تھا اور اس کی کلائیوں اور ٹخنوں وغیرہ کو "اسٹریپس" سے باندھا بھی جا سکتا تھا۔ پانی کا ایک بڑا ٹب بھی پڑا تھا جس کا مقصد فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران کا دوست سلیم تھوڑی دیر پہلے یہیں موجود تھا۔ فرش پر لہو کے تازہ قطرے تھے۔ سلیم کی گرم جرسی اور اس کی ٹوٹی ہوئی گھڑی بھی وہیں فرش پر پڑی تھی۔ غالباً ان اشیا کو میری اعصاب شکنی کے لیے قصداً وہاں پڑا رہنے دیا گیا تھا اور مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ میرے اعصاب واقعی ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ قریب و جوار میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی بھی وقت بے ہوشی کے اندھیرے میں کھو جاؤں گا... ہاں، میں وہی تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے ہاتھ سے اپنے جسم پر کوئی چاقو چلایا تھا لیکن تب کی اور اب کی کیفیت میں بہت فرق تھا۔

اچانک میری آنکھوں کے سامنے چمک سی لہرا گئی۔ میں نے دیکھا کہ میڈم نادیہ ہوشربا چال چلتی میری طرف آ رہی ہے۔ وہ ایک سیاہ ٹیکر اور دو بڑے بڑے پھولوں والی سفید شرٹ میں تھی۔ شرٹ پر ایک رائل بلیک ٹائیگر کی شبیہ پرنٹ تھی۔ یہ تیر نادیہ کے جسم سے لپٹا نظر آتا تھا۔ نادیہ کی آنکھوں میں نشہ تیر رہا تھا۔ اپنی اونچی ایڑی پر

ٹھیک ٹھاک کرتی... میرے عین سامنے کھڑی ہوئی تو کسی قیمتی پرفیوم کی مہک میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ ترم چادر والے گارڈ کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔ "اوئے بختیار! کیا کرنے لگے ہو اس کے ساتھ۔ اس کو مارنا ہے؟ اس کا چہرہ نہیں دیکھ رہے تم... یہ اور طرح کا ہے۔ پیار سے ہی سب کچھ بتا دے گا۔ کھولو اسے۔"

میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میڈم نے سمجھا کہ مجھے باندھا گیا ہے۔ گارڈ بختیار بولا۔ "ابھی ہم نے اسے باندھا ہی نہیں ہے جی۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے ایک مہمان کی طرح ڈرائنگ روم میں لاؤ۔ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے کر آؤ۔"

"اور یہ دوسرا میڈم؟" بختیار کا اشارہ یقیناً اقبال کی طرف تھا۔

"دیکھو... گدھے گھوڑے کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا کرتے۔ وہ خرانٹ ہے۔ اس سے دوسری طرح نمٹیں گے۔"

چند ہی سیکنڈ بعد میں اس ٹارچر روم سے نکل کر ایک سجے سجائے شاندار ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ میرے پاؤں دبیز قالین میں دھنس رہے تھے۔ دروازوں، کھڑکیوں پر نیلے رنگ کے مخملی پردے لہراتے تھے... اور دیواروں پر نایاب پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ ہم ان پینٹنگز کا رنگ ڈھنگ وہی تھا جو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔ عریانی، بے حیائی اور فحاشی۔ کہنے کو تو یہ آرٹ تھا لیکن ایسی ہی چیزیں آرٹ کے نام پر بدنما دھبا ہوتی ہیں۔

میڈم نادیہ ہاتھ میں شیری کا گلاس لیے آئی اور بے تکلفی سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر مجھ سے تین چار فٹ کی دوری پر بیٹھ گئی۔ آڈیو سسٹم پر بہت مدھم آواز میں انگلش میوزک بج رہا تھا۔ وہ عجیب انداز میں برابر راست میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اچانک بولی۔ "اس رات تم اچانک میرے گھر میں آئے اور پھر اچانک بھاگ بھی گئے... ایسا کیوں کیا تم نے؟"

مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ زبان منہ کے اندر، چھڑے کا ٹکڑا بن گئی تھی۔ میری حالت دیکھ کر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور شیری کے دو بڑے گھونٹ بھر کر بولی۔ "اچھا چھوڑو اس ذکر کو۔ کچھ اور بات کرتے ہیں... تم یہ بتاؤ کہ..." یکایک اسے رکنا پڑا۔ اس کے بیش قیمت موبائل فون کی بیل ہونے لگی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "ہاں ہاں۔ میں نے آواز پہچان لی ہے سراج... کیسے ہو؟... ہاں، میں بھی ٹھیک ہوں۔ کب آ رہے ہو تم؟... نہیں

نہیں... ابھی تو ضرورت نہیں۔ صبح آ جاؤ... دس بجے کے بعد آرام سے آ جانا... اوکے... بائے۔"

اس نے کال منقطع کر دی۔ تو وہی ہونے والا تھا جس کا اندیشہ میری جان مسلسل کھا رہا تھا۔ چند گھنٹے بعد یہاں سیٹھ سراج سے ملاقات ہونے والی تھی۔ دو ملازماؤں نے چائے اور اس کے بہت سے لوازمات لا کر سامنے خوب صورت میز پر سجا دیے۔ میڈم نادیہ بڑی نرمی سے بولی۔

"دیکھو مسٹر تابش! اس ساری اسٹوری میں مجھے کچھ باتیں تو پہلے سے معلوم ہیں۔ یہ باتیں تم سے سن کر میں تمہارا اور اپنا ٹائم ضائع نہیں کروں گی۔ تم مجھے صرف وہ باتیں بتاؤ جو مجھے اب تک معلوم نہیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہاں پہنچنے سے پہلے کیا ہوا؟ اور مثلاً یہ کہ یہاں میرے گھر سے بھاگنے کے بعد کہانی میں کیا ٹرن آئے۔ اور مثلاً یہ کہ... خیر چھوڑو، پہلے یہی بتا دو کہ تم لوگ سراج کے پیچھے گئے کیسے؟ وہ تو بڑا خرانٹ بندہ ہے۔ اس نے کہاں تمہیں گنجائش دی کہ تم اس کہانی میں گھس بیٹھے؟"

"لیکن میڈم! میں سچ کہتا ہوں۔ میرا اس معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں تو..."

"مسٹر تابش!" میڈم نادیہ نے انگلی اٹھا کر مجھے روکا۔ "تمہاری حیثیت میرے گیسٹ کی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تمہارا اسٹیٹس برقرار رہے۔ اس لیے ایک بار پھر بتا دیتی ہوں... مجھے وضاحت نہیں چاہیے۔ بس اپنے سوال کا جواب چاہیے اور سوال یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی سیٹھ سراج جیسے سیانے کوے کے پیچھے کیونکر لگ گئے؟" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کل صبح سیٹھ سراج کے یہاں پہنچنے کے بعد میرے بارے میں بہت سی باتیں میڈم نادیہ کو معلوم ہو جانی ہیں۔ تو کیوں نہ میں خود ہی اپنے بارے میں بتا کر میڈم نادیہ کا اعتماد حاصل کروں۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ سیٹھ سراج نے اقبال کو کافی یقیناً پہچان لیا ہے۔ یہ اقبال ہی تو تھا جس نے میرے، سیٹھ سراج کی اپنے سے گاڑی ٹکرائی تھی اور پھر سیٹھ کی کنپٹی پر گن رکھ کر اس کی پراڈو... پھر کال بھی کروائی تھی۔ تو پھر جب یہ سب کچھ سامنے آنے ہی والا تھا تو پھر بہتر تھا کہ میں اپنی زبان سے بتا دوں۔

میڈم نادیہ کے صوفے پر بیٹھنے کا انداز تو بے تکلف تھا۔ وہ نظر نظروں سے میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

حشروں کے دائروں میں سفر کرنے والوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

کی۔" میں نے وثوق سے کہا اور پھر اپنی روداد کو بالکل شروع سے بیان کرنے لگا۔

میں نے میڈم نادیہ کو بتایا کہ کس طرح تقریباً ڈیڑھ سال پہلے واجی اور اس کے اوباش دوست میری منگیتر ثروت کے پیچھے پڑے۔ کس طرح انہوں نے میرا اور ثروت کا جینا حرام کیا۔ پھر ثروت کے اغوا اور واپسی کی تفصیل بتانے کے بعد میں نے اس حوالے سے واجی کے باپ سیٹھ سراج کے منفی کردار کا ذکر کیا۔ بعدازاں سیٹھ سراج اور اس کے کارندوں نے میرے گھر کے قریب مجھ پر جو بہیمانہ تشدد کیا، اس کی تفصیل بھی بیان کر دی۔

میڈم ادیہ دھیان سے سنتی رہی اور بیچ بیچ میں مجھ سے سوالات بھی کرتی رہی۔ میں نے میڈم سے کہا۔ "میں بیچ کہتا ہوں، میں سخت مایوس تھا۔ اپنی جان لینے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر عمران مجھے نہ ملتا تو شاید میں اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتا... عمران میری کہانی پر بہت دکھی ہوا۔ خاص طور سے سیٹھ نے میرے ساتھ جو مار پیٹ کی تھی، اس کو اسے بہت صدمہ پہنچا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے سیٹھ سراج کو تھوڑا سا سبق سکھانے کا ارادہ کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے سیٹھ صاحب کی گاڑی کو ایک ویگن نے ٹکر ماری تھی اور بعد میں وہاں لڑائی بھی ہوئی تھی۔"

"ویری گڈ... بہت خوب!" میڈم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ "تو وہ طے شدہ ایکسیڈنٹ تھا... ورنہ اسمارٹ!"

"دراصل یہی ایکسیڈنٹ تھا میڈم جس کے بعد ہم سیٹھ سراج کے پیچھے لگے۔ یہ سب کچھ اتفاقاً ہوا۔ سیٹھ سراج کی گاڑی میں کچھ بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند بوریاں ایکسیڈنٹ کی وجہ سے پھٹ گئیں..." اس کے بعد میں نے بوریوں کے بارے میں سارا ماجرا میڈم کے گوش گزار کر دیا اور بتایا کہ صرف ان بوریوں سے پیدا ہونے والا تجسس دور کرنے کے لیے ہم نے سیٹھ سراج کا پیچھا کیا اور یہاں پہنچ گئے۔

آگے کی ساری روداد میڈم کو زلیخا اور اس کے شوہر سے معلوم ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ زلیخا اور اس کے شوہر کی زبان سے ہم نے لال کوٹھیوں کا ذکر سنا اور پھر اپنے "تجسس کے گھوڑے" پر بیٹھ کر دگڑ دگڑ کرتے لال کوٹھیوں تک پہنچ گئے۔

وہ بولی۔ "ٹھیک ہے، یہاں تک تو سب کلیئر ہو گیا۔ تم لوگ اس شوق میں یہاں گھس آئے کہ شاید یہاں سے تمہیں بیش قیمت تحفے تحائف مل سکیں گے۔ کروڑوں کروڑ کی مورتیاں، تین چار کروڑ کی تصویریں اور اسی طرح کی دوسری

چیزیں، برتن، زیورات وغیرہ وغیرہ... مگر پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ تم لوگ اچانک روپوش ہو گئے۔ روپوشی اور خاموشی تو تم لوگ تب ہوتے جب یہاں سے کچھ لے جاتے... مگر تم تو خالی ہاتھ گئے تھے پھر تمہاری غیر حاضری کیوں لگی؟"

"دراصل ہم ڈر گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ابھی کچھ دیر خاموش رہنا چاہیے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات بھی آگئی تھی کہ وی ڈی آر سسٹم میں ہماری تصویریں آگئی ہوں گی اور ہمیں پہچان لیا جائے گا۔"

"تمہاری یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی۔ میں تمہارے بارے میں تو ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن وہ تمہارا ہیرو بھائی بڑی خرانٹ شے ہے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہمارے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے بعد بھی خاموش رہا ہوگا۔ اس کے دماغ میں کھچڑی نہیں پکی ہوگی؟"

میڈم بات تو ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ اتنی خاموشی نہیں بیٹھا رہا۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" میڈم نے بڑی بے تکلفی سے میرے گال پر انگلی چلاتے ہوئے کہا۔

"یہی سوچ رہا ہوں کہ آپ کو اپنی بات کا یقین کس طرح دلاؤں۔"

"اچھا... سلیم لنگڑے نے تم لوگوں سے کیا کہا تھا؟"

"اس نے ہمیں ڈرایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم نے لال کوٹھیوں میں گھس کر سخت غلطی کی ہے۔ ہم بہت بری طرح پھنس سکتے تھے۔ ہمیں آئندہ اس طرح کی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔" جواب دینے کے بعد میں نے میڈم نادیہ کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ میرے جوابات سے سو فیصد مطمئن نہیں تھی پھر بھی اس کا ذہن کچھ نہ کچھ صاف ضرور ہوا تھا۔

حوصلہ پا کر میں نے وہ سوال کیا جو دیر سے میرے اندر مچل رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "کیا میں آپ سے ہیرو بھائی کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟"

"پوچھو۔" اس نے ادا سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی تو اس کے جسمانی خطوط اور بھی ہوش ربا ہونے لگے۔

"ہم... میرا مطلب ہے... وہ خیریت سے تو ہے؟"

"بہت چاہتے ہو ہیرو بھائی کو؟" میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ "ویسے وہ ہے بھی چاہے جانے کے قابل۔ لیکن اکھڑ گھوڑے کی طرح ہے۔ اس پر کاٹھی ڈالنے کے لیے تھوڑی سی محنت کرنا پڑے گی۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"وہ تمہارا دوست ہے۔ تم ہر وقت اکٹھے رہتے ہو۔

تمہیں اس کے مزاج کی ہر سرد گرم کا پتا ہوگا۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں، وہ میرے بیڈروم میں ہو۔ بالکل گرم... جوش سے بھرا ہوا۔ وہ بھڑکے اور میں اسے جھنجوڑ کر رکھ دوں۔" وہ بڑی بے باکی سے بولی۔ اس کی ہلکی بادامی آنکھوں میں عجیب سی تپش کروٹیں لے رہی تھی۔

مجھ سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت دیکھ کر میں نے نگاہ جھکا لی۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "جو میرے دل میں ہوتا ہے، وہ میں صاف صاف کہہ دیتی ہوں... اور سچ یہی ہے کہ تمہارا یہ ہیرو بھائی میرے دل میں کھب کر رہ گیا ہے اور جو چیز میرے دل کو بھا جاتی ہے پھر میں اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہتی۔ تم لوگ اچانک میرے گھر سے نکل گئے۔ ہیرو بھی آنکھ بچا گیا۔ پورا باسٹرڈ! میرے اندر سے کہیں آگ بھڑکا... میں نے پچھلے دنوں اس کے لیے بڑی بے چینی محسوس کی ہے اور اسے اپنے طور پر ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتی رہی ہوں۔ بس اسے ٹیرٹی لک۔ سمجھ لو کہ کل رات میرے ملازموں کو اچانک اس کی گاڑی نظر آگئی۔"

"کیا میں آپ سے..." میں فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی خاموش ہو گیا۔

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ عامیانہ انداز میں بولی۔ "میرے خیال میں تم پوچھنا چاہ رہے ہو کہ تمہارے ہیرو بھائی کو میں نے کیسے پکڑا۔ تو پوچھ لو۔"

"دراصل... میرا ذہن صاف ہو جائے گا تو پھر میں بہتر طور پر سوچ سکوں گا اور آپ کے سوالوں کے جواب دے سکوں گا۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا اور اس کے بدن سے نگاہیں چراتا اس کے وسیع بیڈروم میں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس رات کے سارے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے جب ہم چوری چھپے یہاں گھسے تھے اور نادیہ کو باندھ کر بے بس کیا تھا۔ دائیں طرف وہ خوب صورت اور چینی الماری تھی جو سلیم کے بقول میڈم نے صرف اس لیے کھولی تھی کہ ہمیں شراب کی بوتلیں دکھا سکے۔ سامنے ہی وہ جہازی سائز بیڈ تھا جس پر عمران اور میڈم نادیہ کی دھینگا مشتی ہوئی تھی اور عمران نے مشتعل ہو کر نیم عریاں نادیہ کے ہاتھ پاؤں باندھے تھے۔ سلیم نے بتایا تھا کہ اس بیڈ کی ایک سائڈ پر ایک بٹن ہے جسے دباتے ہی آدھے درجن بھر گارڈز دوسری کوٹھی سے طلب

کر سکتی تھی مگر اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" نادیہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں کسی معمول کی طرح بیش قیمت صوفے کے گداز میں دھنس گیا۔ وہ بیڈ کے سہارے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ سامنے دیوار پر ایک ایل سی ڈی اسکرین نظر آ رہی تھی۔ نادیہ نے ریموٹ کنٹرول سے اسکرین روشن کی پھر کئی ایک بٹن دبائے۔ کچھ دیر بعد اسکرین پر "وی ڈی آر" کی ایک پرانی فوٹیج چلنے لگی۔ یہ اس رات کے مناظر تھے جب میں، عمران اور اقبال یہاں داخل ہوئے تھے۔ ایک منظر میں اقبال بالکل بدست باتھ روم کے بند دروازوں کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک منظر میں ہم پرچھائیوں کی طرح اس نیم تاریک گیلری میں گھوم رہے تھے جہاں نہایت نایاب پینٹنگز دیواروں پر سجی تھیں۔ پھر باؤنڈری وال کا منظر دکھائی دیا۔ باؤنڈری وال سے باہر عمران کی مہران گاڑی کھڑی تھی۔ غالباً میں ہی اس میں موجود تھا مگر صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میڈم نادیہ نے بٹن دبا کر گاڑی کی فوٹیج کو اسکرین پر ساکت کر دیا۔

وہ کہنے لگی۔ "میرے پاس تم لوگوں کا بس یہی سراغ تھا مگر تم دیکھ رہے ہو گاڑی کی پوزیشن ایسی ہے کہ نمبر پلیٹس نظر نہیں آ رہیں۔ اگر گاڑی کا نمبر نظر آ جاتا تو شاید دوسرے تیسرے روز ہی ہماری ملاقات ہو جاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہاں، گاڑی کی ایک دو نشانیاں ضرور اس فوٹیج میں ریکارڈ ہو گئیں۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ گاڑی کی چھت پر "کیریئر" لگا ہوا ہے۔ اب دوسری نشانی دیکھو۔" نادیہ نے کہا۔ اسکرین پر نظر آنے والی گاڑی کی شبیہ کچھ کلوز ہو گئی۔ گاڑی کی سائڈ پر عمران نے یا اقبال نے ایک طویل اسٹیکر چپکا ہوا تھا۔ یہ ایک دلاسا لگتے تیزے چیتے کی شبیہ تھی اور نیچے انگریزی کے چند حروف تھے۔ اسٹیکر جزوی طور پر اتر چکا تھا اور حروف

بھی ملے ملے تھے۔ بہرحال، یہ سب کچھ فوٹیج میں دکھائی ضرور دے رہا تھا۔

نادیہ نے ٹی وی اسکرین کو آف کیا اور بولی۔ "میرے ملازم اس گاڑی کی کھوج میں تھے۔ کل رات اتفاق سے میرے ایک ملازم شوکت کو یہ گاڑی ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑی نظر آئی۔ اس نے ساتھیوں کو فون کیا۔ تمہارے ہیرو بھائی کے آنے سے پہلے ہی گاڑی کو گھیرا جا چکا تھا۔ اب آگے کی بات تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔"

"وہ... خیریت سے ہے نا؟ م... میرا مطلب ہے آپ نے اس سے مار پیٹ تو نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو نہیں کی لیکن میرے گارڈز کو اس رات والے واقعے پر غصہ تھا۔ انہوں نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی دو چار ہاتھ لگا دیے تھے اسے۔ بہرحال، پریشانی کی بات نہیں۔ وہ اب خیریت سے ہے۔"

یہ بات تو ہرگز ماننے والی نہیں تھی کہ گارڈز نے میڈم کی مرضی کے بغیر ہی عمران سے مار پیٹ کی ہو گی۔ وہ یقیناً تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔ میرے تصور میں عمران کا زخمی چہرہ اور اس کا پھٹا ہوا لباس گھومنے لگا۔ میں نے بڑی بے چینی سے سوچا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہو گا؟ بس یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آسانی سے بے بس ہونے والا نہیں ہے۔ یقیناً اس پر پلاننگ سے ہاتھ ڈالا گیا تھا۔

اب میرے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہا تھا کہ سیم کے بارے میں نادیہ کو ٹپ کس نے دی؟ یہ سلیم ہی تھا جس کی وجہ سے ہم بھی پھنس گئے تھے۔ میں نے محتاط لفظوں میں اس بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ "لگتا ہے کہ تم اپنے ذہن کو پورا پورا کلیئر کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ چلو یہ بھی کر لو کلیئر۔"

اس نے ایک بار پھر ٹی وی اسکرین روشن کی... اور وی سی آر میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ جلد ہی مطلوبہ فوٹیج اسے مل گئی۔ یہ بھی اسی رات کی فوٹیج تھی جب ہم پہلی بار دولت کوٹھی میں آئے تھے۔ پوشیدہ کیمرا ایک خالی راہداری کو دکھا رہا تھا۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ راہداری بالکل خالی نہیں ہے۔ راہداری کے نیم روشن فرش پر تین سائے نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک سایہ واضح طور پر سیم کا اور دوسرا سایہ عمران کا تھا۔ نادیہ نے فوٹیج کو ایک جگہ "اسٹل" کر دیا۔ اور بولی۔ "غور کرو... یہ کیا ہے؟"

میں خاموش رہا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "ان میں سے درمیان والا تو سیم لگ رہا ہے۔ بائیں طرف تمہارا ہیرو بھائی ہے اور دائیں طرف شاید تم ہو۔ تم تینوں راہداری سے باہر کھڑے ہو مگر تمہاری پرچھائیاں راہداری کے فرش پر پڑ رہی ہیں۔"

"آپ... کیا بتانا چاہ رہی ہیں؟"

"میں سیم کی 'بیڈ لک' بتانا چاہ رہی ہوں۔ وہ بہت ہوشیار ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کوٹھی میں سی سی ٹی وی کیمرے کس کس جگہ کو فوکس کرتے ہیں اور کون کون سی جگہ ان کی پہنچ سے دور ہے۔ اس لیے جب اس نے تم دونوں سے راز داری کے ساتھ بات کی اور تمہیں کوٹھی سے نکل بھاگنے کا مشورہ دیا تو وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں کیمرا اسے نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی مائیکروفون کوئی آواز کیچ کر سکتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ تم دونوں کے سائے راہداری میں پڑ رہے تھے اور راہداری کو کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اس سایوں والی فوٹیج پر میری نظر اس واقعے سے دو تین دن پہلے ہی پڑی ہے۔ اس کے بعد میری ہدایت پر مختیار نے سلیم پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب تمہیں ہیرو کی شامت کی اطلاع دینے وہ اس روز پہنچا تو تم دونوں بھی نظر میں آ گئے۔"

بات ختم کر کے نادیہ نے شیری کے چند اور گھونٹ بھرے اور اس کا چہرہ شراب کی حدت سے تمتمانے لگا۔ اس کی حرکات و سکنات میں عجیب سی تپش تھی۔ جسم کا ہر حصہ انگڑائی لیتا محسوس ہوتا تھا۔ کہنے لگی۔ "تم بہت سوال کر چکے ہو۔ اب میرے کچھ سوالوں کے جواب دو۔"

"جی کہیں۔"

"ہیرو عمران صاحب کو لڑکیاں پسند ہیں؟" میڈم نادیہ نے اچانک سوال کیا۔

میں پہلے تو گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ "میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ مجھے ان کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزرا۔ سرکس میں کام کرنے والی ایک دو لڑکیوں کے ساتھ ان کا ہنسی مذاق ضرور ہے۔"

"کوئی پکی گرل فرینڈ؟"

"میرے علم میں تو نہیں۔"

"ڈانس وغیرہ کرتے ہیں؟"

"ایک دو بار بیئر پیتے دیکھا ہے۔"

"کوئی خفیہ شادی وغیرہ؟"

میں نے ایک بار پھر لاعلمی میں سر ہلایا۔ "دراصل عمران اپنے بارے میں اپنے دوستوں کو بھی بہت کم بتاتا ہے۔ اس معاملے میں وہ ذرا مختلف ٹائپ کا ہے۔"

"ہو گا مختلف ٹائپ کا۔" میڈم نے ہلکی سی انگڑائی لی۔ "سرکش گھوڑا ہے۔ بس ذرا اس کی لگام کھینچنی ہے تو ایک

دم شانت ہو جائے گا۔ اشاروں پر چلے گا اور سرپٹ بھاگے گا..." اس کی نشیلی آنکھوں میں ایک بار پھر نشہ تیرنے لگا۔ چند لمحے خاموشی رہی جیسے وہ تصور ہی تصور میں اسے اپنے اشاروں پر چلتا دیکھ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی راحت جھلکنے لگی۔ پھر وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ مت سمجھنا کہ ابھی وہ میرے بس میں نہیں ہے۔ میں چاہوں تو وہ اب بھی سرپٹ بھاگ سکتا ہے۔ جیسے بھینسوں کا دودھ دوہنے کے لیے انہیں انجکشن لگائے جاتے ہیں، اسی طرح ریس کے گھوڑوں کو سرپٹ چلانے کے لیے بھی بہت انجکشن ہوتے ہیں۔ اوپر سے چابک کی ضرب... وہ گھوڑا ہواؤں میں اڑنے لگتا ہے۔ لیکن میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔ کم از کم تمہارے ہیرو عمران کے حوالے سے مجھے یہ بناوٹ بالکل پسند نہیں آئے گی۔ ناٹ ایٹ آل۔ میں چاہوں گی کہ وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنی شکست کو تسلیم کرے اور اسے محسوس بھی کرے۔"

شاید سلیم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میڈم نادیہ ایک ایب نارمل لڑکی تھی۔ فی الوقت اس کی تمام توجہ کا مرکز عمران بنا ہوا تھا۔ وہ اسے تسخیر کرنے کے چکر میں تھی۔ شاید ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ ان حالات میں خود بھی بہت کوشش کر بھی چکی تھی۔ پتا نہیں کیوں نادیہ کا رویہ دیکھ کر مجھے ایک طرح کی تسلی بھی ہوئی۔ اس سے پہلے مجھے اور اقبال کو اندیشہ تھا کہ عمران کے پکڑے جانے کے پیچھے جہلم میں مجید منشو کی ہلاکت کا واقعہ ہے اور نوارات والا معاملہ بھی اس ساری صورت حال کو گمبھیر بنا رہا ہے۔ مگر میڈم نادیہ سے بات کر کے پتا چلا کہ صورت حال اتنی نازک نہیں جتنی ہم سمجھ رہے تھے۔ میڈم نادیہ نے صرف اس رات والے واقعے کو ایک مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ وہ عمران کو شکار کرنا چاہ رہی تھی اور اگر اس سارے معاملے میں اسے کسی پر حقیقی غصہ تھا تو وہ سیم پر تھا۔ وہ اسے غداری کا مرتکب سمجھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک سلیم کا قصور ناقابلِ معافی تھا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف پہلی بار ہم تینوں لال کوٹھی سے بچ کر نکل گئے تھے بلکہ دوسری بار بھی اس نے مجھے اور اقبال کو بھگانے کی پوری کوشش کی تھی۔

"مجھے میرے سرکش گھوڑے کے بارے میں کوئی ٹپ دو۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔ "اس پر کاٹھی ڈالنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"ہاں، تم کیا کہہ سکتے ہو۔ تم گھوڑوں کے سائیس تو نہیں ہو... لیکن تم گھوڑے تو ہو۔ ایک گھوڑا اپنے ساتھی گھوڑے کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ شروع میں، میں کافی خوف زدہ تھا مگر اب نادیہ کا رویہ اور اس کا "نصب العین" جاننے کے بعد میں خود کو کافی آزادی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "میڈم! میں کوئی نفسیات دان تو نہیں ہوں، نہ ہی مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں عمران کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں لیکن ایک بات آپ کو بتا سکتا ہوں۔ وہ اپنے دوستوں کے بارے میں بہت پکا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں نے اندازہ لگایا ہے کہ سلیم کے بارے میں آپ کا رویہ بڑا سخت ہے۔ کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ کافی مار پیٹ ہو چکی ہے اور لگتا ہے کہ آپ اسے کوئی کڑی سزا دینے والی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ایسا کر کے غلط کریں گی۔ اپنے نقطۂ نظر سے آپ صحیح ہیں لیکن اگر آپ اسے معاف کر سکیں تو اس کا عمران پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔"

"یعنی کہ تمہارا مطلب ہے کہ عمران کو راہِ راست پر لانے کے لیے سلیم کو استعمال کیا جا سکتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تو پھر کیوں نہ اس کو زیادہ اچھے طریقے سے استعمال کیا جائے۔" نادیہ کا لہجہ بدل گیا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ہو سکتا ہے سلیم کو معافی دینے کا تمہارے ہیرو صاحب پر وہ اثر نہ ہو جو اسے سزا دینے کا ہو۔ سلیم کو سخت سزا سے بچانے کے لیے بھی تو وہ اپنی سرکشی ختم کر سکتا ہے نا اور پھر..." اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کبھی تو اس نے دوستی کی ہو۔ آج کل عمران کے دل میں تمہارے لیے خصوصی ہمدردی جاگی ہوئی ہے۔"

پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنی سیدھی اور آسان نہیں جتنی نظر آتی ہے۔ اس کے لہجے میں میرے لیے ایک خطرناک دھمکی پوشیدہ تھی۔

وہ میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولی۔ "نو... نو... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہتے ہیں انگلش میں... ایک پتھر سے دو پرندے شکار کرنا... میں بھی یہی کروں گی۔ اگر میں نے استعمال کرنا ہوا تو سلیم ہی کو استعمال کروں گی۔ اس کو سزا بھی ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کی سزا سے تمہارے ہیرو صاحب کی دولتیاں بھی ختم ہو جائیں۔"

میں اندر ہی اندر بری طرح سٹپٹایا اور پچھتایا بھی کہ میں نے ایسی بات کیوں کہی۔ اس نے فوراً میری یہ بات پکڑ

تی تھی کہ عمران اپنے دوستوں کے بارے میں بڑا لچی ہے۔

عمران کی مصیبت کے خیال نے مجھے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ بلاد جس کو نا قابلِ شکست سمجھتا ہے اور جس کی صلاحیتوں پر بہت زیادہ اعتماد کرتا ہے وہ اچانک کسی مصیبت سے دست و پا نظر آئے تو دل کو شدید ٹھیس لگتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہو رہا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ عمران یہاں میڈم نادیہ کی گرفت میں آ چکا ہے اور اسے بے بس کر کے رکھا گیا ہے۔ عمران کو پریشانی اور بے بسی کی حالت میں دیکھنے کا تصور ہی مجھے ہلکان کر رہا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے نادیہ سے پوچھا۔ ”کیا میں عمران کو دیکھ سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں۔ ابھی لو۔“

اس نے میز پر پڑے ہوئے بڑے سائز کے ریموٹ کنٹرول پر دو تین بٹن پریس کیے۔ ایک دم اسکرین پر عمران میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ وہ ایک قالین پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ یہ اسی ہال نما کمرے کا کوئی کونا نظر آتا تھا۔ عمران کے چہرے پر خراشیں تھیں۔ دونوں آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا جس پر آہنی گرل تھی۔ گرل کے پاس ایک موٹی ملازمہ کھڑی تھی۔ اس ملازمہ کو ہم پچھلی بار بھی دیکھ چکے تھے۔ یہی تھی جس نے ”رودھن“ میں کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا اور عمران نے مجھے باہر سے بلوا کر دروازہ کھلوایا تھا۔ اس کا نام آسیہ تھا۔ میں نے دیکھا، عمران کے چہرے پر تکلیف کا سایہ ہے اور وہ بے چارگی کے انداز میں ملازمہ آسیہ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ شاید وہ اس سے کسی طرح کی مدد طلب کر رہا تھا۔ عمران کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔

میڈم نادیہ نے کہا۔ ”آواز بھی سننا چاہتے ہو عمران صاحب کی؟“

پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے سائڈ ٹیبل کے پاس سے کوئی بٹن پریس کیا اور اسکرین پر تصویر کے ساتھ آواز بھی ابھرنے لگی۔ آواز زیادہ صاف نہیں تھی لیکن سنی جا سکتی تھی۔

عمران کہہ رہا تھا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں آسیہ جی! عورت کی خوب صورتی مرنے یا پلکے ہونے میں نہیں ہوتی، اس کے چہرے میں ہوتی ہے... اور تمہارا چہرہ ایک سو ایک فیصد میری منگیتر روزینہ سے ملتا ہے۔ آج اگر روزینہ زندہ ہوتی تو بہو بہو تمہاری طرح ہوتی۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں، میں مذاق نہیں کر رہا۔ تمہیں دیکھ کر میرے سارے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔ ہرے بھی اور لال سرخ بھی۔“

”لگتا ہے تمہیں بکواس کرنے کی عادت ہے۔“ قریب کھڑے ایک گارڈ نے بھڑک کر کہا۔

”عادت نہیں ہے یار! میں تو اتنا خاموش طبع ہوں کہ کبھی بولوں تو یار دوست سمجھتے ہیں شاید آج کوئی تہوار ہے۔ یہ تو آپ کی بہن کو دیکھ کر بولنا پڑ رہا ہے۔ یقین کرو، میں تمہیں اپنی روزینہ کی تصویر دکھاؤں تو تم بھی ہکا بکا رہ جاؤ گے اور آسیہ جی تو سمجھیں گی کہ آئینہ دیکھ رہی ہیں۔“

گارڈ دانت پیس کر بولا۔ ”میں ایک بار میڈم سے اجازت لے لوں پھر تمہاری بولتی ایسے بند کروں گا کہ قیامت تک آواز نہیں نکلے گی۔“

”تو اب اور قیامت کیا آئے گی؟ میرے لیے تو قیامت آ چکی ہے میرے برادر۔“ اس نے بلبل فدا ہو جانے والی نظروں سے ملازمہ آسیہ کو دیکھا۔

آسیہ کے ہاتھ میں سفید رومال تھی اور شاید کوئی دوا تھی۔ وہ غالباً عمران کے چہرے کے زخم صاف کرنے کے لیے آئی تھی۔ جھنجلا کر بولی۔ ”تمہیں دوا لگوانی ہے یا نہیں؟“

”تم اپنے ہاتھ سے لگاؤ گی تو کون کافر انکار کرے گا لیکن...“

ملازمہ نے شپٹا کر پلاسٹک کی بوتل اور روئی وغیرہ اپنی گرل کے راستے کمرے میں پھینکی اور اپنے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی چلی گئی۔

میڈم نادیہ نے ریموٹ کے ذریعے اسکرین کو بے رنگ کر دیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ تمہارا ہیرو عجیب شے ہے۔ اتنی مار کھا کر بھی شرمندہ نہیں ہے۔“

میں بس سر ہلا کر رہ گیا۔ دلی طور پر مجھے واقعی مسرت ہوئی تھی۔ بے شک عمران کو مارا پیٹا گیا تھا لیکن بیمار ہیت اس کے چہرے سے اس کی جاودانی مسکراہٹ چھیننے میں ناکام رہی تھی۔ کہیں پڑھی ہوئی یہ بات یاد آنے لگی کہ جو انسان اپنا حوصلہ نہیں ہارتا وہ کچھ بھی نہیں ہارتا۔ پتا نہیں کیوں عمران کو ہشاش بشاش دیکھنے کے بعد میں خود کو بھی ویسا ہی محسوس کرنے لگا۔

اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ فون سننے کے لیے سائڈ روم میں چلی گئی۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ سامنے شیشے کی نہایت نفیس تپائی پر انگریزی اخبار رکھا تھا۔ یہ آج کا ہی تھا۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اندرونی صفحے پر

ایک خبر میرے لیے قابلِ توجہ تھی۔ یہ تین دن پہلے جہلم میں پیش آنے والے واقعے سے ہی متعلق تھی۔ وہ کالمی خبر کی سرخی تھی۔ ”روڈ ایکسیڈنٹ میں مجید مخوکی ہلاکت اتفاقیہ نہیں تھی۔“

ذیلی میں درج تھا... ”پولیس تفتیش میں مجید مخو کی ہلاکت کے بارے میں کچھ نئے حقائق سامنے آئے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کھائی میں گرنے سے پہلے مجید کی کار کسی اور گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ جائے حادثہ سے کچھ فاصلے پر سڑک کے اوپر بھی تباہ ہونے والی گاڑی کے شیشے ملے ہیں اور ٹائروں کے نشان بھی ہیں۔ تفتیشی پولیس افسر کے مطابق دونوں طرح کے امکان موجود ہیں۔ یہ اتفاقی حادثہ ہو سکتا ہے اور کسی عداوت کا شاخسانہ بھی۔“

اسی دوران میں میڈم نادیہ اپنی گوریاں ٹانگوں کو بڑے اسٹائل سے حرکت دیتی ہوئی واپس آ گئی۔ شاید فون پر کسی سے کوئی تلخ بات ہوئی تھی، وہ کچھ برہم نظر آتی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ بستر پر نیم دراز ہو کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کوشش میں اس نے شیری کا ایک اور گلاس پیا۔ اس کے علاوہ اپوروڈ سگریٹ کے چند گہرے کش بھی لیے۔ تب وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ملنا چاہو گے عمران سے؟“

”اگر آپ پسند کریں تو۔“ میں نے کہا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں ایک بار پھر اس کے پیچھے چل دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس عمارت میں ہر جگہ کیمرے موجود ہیں اور ڈکٹا فون بھی لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ دیوار کان نہیں رکھتی تھیں اور دیواریں آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اس عمارت میں جگہ جگہ پینٹنگز اور آرائش کی سجاوٹ نظر آتی تھی۔ راہداریوں میں قیمتی قالین تھے اور یہ ساری بلڈنگ سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھی۔ جلد ہی ہم ایک مستطیل کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں نے ہی دیوار گیر آہنی گرل تھی جس کی دوسری طرف عمران موجود تھا۔ گرل کے ساتھ جالی نہیں تھی اس لیے چھوٹی موٹی اشیاء گرل میں سے کمرے میں ”پاس“ کی جا سکتی تھیں۔

عمران غالباً سیال آیوڈین کے ذریعے اپنے چہرے کے زخم صاف کر رہا تھا۔ اس کے لیے وہ بایاں ہاتھ استعمال کر رہا تھا۔ دایاں ہاتھ پٹی میں جکڑا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ زیادہ چونکا نہیں۔ یقیناً وہ یہاں ہماری آمد سے آگاہ ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے معصوم چہرے کے ساتھ ہلکی سی آہ بھری۔ ”اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”مریں تمہارے دشمن۔“ نادیہ بولی۔

”کیسے سب ہیں، میرا کوئی نہیں۔“ وہ ترت بولا۔

”یعنی میں تمہاری دشمن ہوں؟“

”میں نے یہ کب کہا؟ اپنا سب سے بڑا دشمن تو میں خود ہوں۔ عاشق خود ہی اپنا دشمن ہوتا ہے۔ مجنوں، رانجھا، فرہاد ان میں سے کون ایسا ہے جس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں ماری۔ عاشق کا تو شروع سے انتہائی ہلاک ہونے کا ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اب مجھے بھی مرنا ہے۔ اس موچھیل گارڈ کے ہاتھوں یا پھر اپنے تایا ابا کے ہاتھوں۔“ موچھیل گارڈ وہی تھا جس سے ذرا دیر پہلے عمران کی تکرار ہوئی تھی۔

”موچھیل گارڈ اور تایا ابا... یہ کیا بات ہوئی؟“ نادیہ نے عمران کی گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”گارڈ صاحب کے ہاتھوں مرنے کے امکانات یوں روشن ہیں کہ میں ان کی بہن سے عشق فرمانے سے باز نہیں آتا... اور وہ مجھے شوٹ کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے ہم دونوں میں ایک جھڑپ بھی ہو چکی ہے... اور تایا ابا والی بات یہ ہے کہ وہ ہر فن مولا ہونے کے علاوہ بڑے سخت قسم کے مذہبی ہیں۔ میں جب انہیں بتاؤں گا کہ میری مرحومہ منگیتر روزینہ لال کوٹھی کی نہایت قابل اور چربیلی ملازمہ آسیہ کی صورت میں واپس آ گئی ہے تو انہیں شدید جھٹکا لگے گا۔ وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ میں ”آواگون“ پر یقین کرنے لگا ہوں۔ بس اسی بات پر وہ مجھے قتل فی سبیل اللہ کر دیں گے۔“

”جب تمہیں مرنا ہی ہے تو پھر کسی کے کام کیوں نہیں آ جاتے مسٹر؟“ نادیہ عجیب تیکھے انداز میں بولی۔

”کام تو میں اسی کے آ سکتا ہوں جس سے مجھے یہ تازہ عشق ہوا ہے۔ اپنی اس چربیلی ملازمہ کو میرے حوالے کر دو۔ تین ساڑھے تین سال کے اندر ہی چار بچے نکلے بچے پیدا نہ کر دوں تو مجھے ہیرا نہ کہنا۔“ عمران بڑے یقین کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”تین ساڑھے تین سال میں چار بچے!“ نادیہ نے بھویں اچکائیں۔

”ہیں اور دنوں میں آج کل دوسرا اسکور ہو رہا ہے تو ساڑھے تین سال میں چار بچے کیوں نہیں ہو سکتے؟ میرے خیال میں تو پانچ بھی ہو سکتے ہیں۔ جڑواں بچوں کا چانس بھی تو ہوتا ہے۔“

نادیہ نے عمران کو گھور کر دیکھا۔ پھر اس کی بادامی آنکھوں میں ایک زہریلی چمک ابھر آئی۔ وہ لمبی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”لگتا ہے کہ تمہیں ترکت سے کوئی دلچسپی

ہے۔ چلو ایک اُلٹی ٹوپی ہی تمہیں میں بھی دکھاتی ہوں۔"

اس نے اور بھی گارڈز کو کوئی اشارہ کیا، اچانک میری شریانوں میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ دو تنومند گارڈز تیزی سے میری طرف آئے اور مجھے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہٹا کٹا شیرا برآمد ہو گیا۔ یہ وہی کرخت چہرہ گرانڈیل تھا جس سے پچھلی مرتبہ عمران کی خونی جھڑپ ہوئی تھی۔ عمران نے اس انچارج گارڈ کو دو خوفناک ٹکروں سے "ناک آؤٹ" کر کے سبھی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ شیرے کے ہاتھوں میں نائلون کی رسی نظر آ رہی تھی۔

مجھے پکڑنے والے دونوں گارڈز کی گرفت بڑی سخت تھی۔ انہوں نے مجھے دھکیل کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ ایسے مناظر اس سے پہلے میں نے کہانیوں میں پڑھے تھے یا فلموں اور ڈراموں میں دیکھے تھے۔ چند ماہ پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن خود میرے ساتھ یہ سب کچھ پیش آئے گا۔ جابر لوگوں کی سختی، اسلحے کی نوک اور بے بسی کا لمس میں اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ محسوس کروں گا۔

میں نے خود کو چھڑانے کی اضطراری کوشش کی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس وقت میرا چہرہ زرد ہو چکا ہے اور میری آنکھوں کی دہشت مجھے پکڑنے والوں کا حوصلہ بڑھا رہی ہے... اور یہی وقت تھا جب میں نے عمران کی طرف بھی دیکھا۔ ان لمحوں میں مجھے عمران کا چہرہ بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ بظاہر چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت تھی جو میں نے پہلے بس ایک دو بار ہی دیکھی تھی۔ یہ کیفیت اس کی معصوم صورت سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ اس میں آگ تھی، سفاکی تھی اور ایک پوشیدہ توانائی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ عمران کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر رہا ہے... اور اس کے ساتھ ہی دل نے یہ گواہی بھی دی کہ وہ جو کچھ کرنا چاہ رہا ہے، وہ کر گزرے گا۔ ہاں، اگر میرے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا گیا تو وہ کر گزرے گا۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ وہ کیا کرے گا؟ دروازہ مقفل تھا، کھڑکی پر آہنی گرل تھی۔ ہاں، ایک گارڈ ضرور کھڑکی کے قریب موجود تھا۔ کیا وہ گرل میں سے ہاتھ گزار کر اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کرے گا؟ یا پھر کسی زوردار ضرب سے دروازے کا کھٹکا توڑنا چاہے گا؟ ابھی یہ سب کچھ میرے ذہن میں چل ہی رہا تھا کہ ایک اور واقعہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کھڑے دو گارڈز ایک دم اٹینشن ہو گئے۔ ان میں شیرا بھی شامل تھا۔ مجھے پکڑنے والے دونوں گارڈز بھی بے حرکت ہو گئے۔ شاید انہوں نے کچھ دیکھا تھا۔ وہ تو ابھی اٹینشن ہو جاتے۔ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور میں نے ایک جواں سال عورت کو اندر آتے دیکھا۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ عمر یہی کوئی پچیس سال رہی ہو گی۔ اس نے چست پتلون اور جرسی پہن رکھی تھی۔ جرسی کے دونوں بازو دوہرے ہوئے تھے۔ بال بوائے کٹ تھے۔ وہ گداز جسم ہونے کے باوجود کسی اولمپین کھلاڑی کی طرح چست اور توانا نظر آتی تھی۔

میرے دل نے پکار کر کہا کہ یہی ہو گی میڈم صفورا شیرازی ہے۔ اس کی صورت بھی یہ گواہی دے رہی تھی کہ وہ میڈم نادیہ کی بڑی بہن ہے۔ اس نے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بولی۔ "ہیلو نادو! ابھی کیا چل رہا ہے یہاں؟"

"کچھ نہیں سسٹر! بس اس بندے سے چھوٹا سا انٹرویو کرنا تھا۔" نادیہ نے عمران کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ اسے بڑی بہن کی آمد کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ دوسری طرف بڑی بہن نے بھی اس کی نہایت مختصر جرسی اور کھلے گریبان کو ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔

"اچھا، یہ ہے وہ اسپائڈرمین جو یہاں گھسا تھا؟" صفورا نے عمران کا جائزہ لیا۔

"ہاں سسٹر! یہ بھی... اور یہ بھی۔" اس مرتبہ نادیہ نے میری طرف اشارہ کیا۔ "ان کے علاوہ ایک تیسرا بھی ہے۔"

"اچھا، ان میں سے شیرے کے ساتھ جھڑپ کس کی ہوئی تھی؟" میڈم صفورا کے لہجے میں تجسس ابھرا۔

"اس کی جو اندر بیٹھا ہے۔ عمران نام ہے۔ ہیرا ہیرا بھی کہتے ہیں۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتا ہے اور بازی گری کرتا ہے۔"

"زبردست!" صفورا، عمران کے قریب چلی گئی اور یوں دیکھنے لگی جیسے پنجرے میں بند کسی نامعلوم نسل کے جانور کو دیکھا جاتا ہے۔

نادیہ نے کھنکھار کر بڑی بہن کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بولی۔ "سلیم لنگڑے کے ساتھ اس کا پرانا یارانہ ہے۔ وہ بھی سرکس میں کام کرتا تھا۔ اسی کی وجہ سے یہ لوگ یہاں سے بھاگے تھے۔"

میڈم صفورا بڑی شان سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نادیہ کے اشارے پر مجھے تھامنے والے دونوں گارڈز نے مجھے چھوڑ دیا اور ذرا ہٹ کر اٹینشن کھڑے ہو گئے۔

میڈم صفورا نے مجھے دیکھا۔ اس کی کھوجتی نظریں جیسے میرے سر کے اندر گھسنے لگیں اور دماغ کا ایکسرے کرنے لگیں۔ اور نگاہیں واقعی ویسی ہی تھیں۔ پھر یہ درندہ صفت

نگاہیں عمران کی طرف اٹھ گئیں۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔ "نادو! ہمیں اس سارے معاملے کو ایزی نہیں لینا چاہیے۔ یہ صرف چور اچکے ہو سکتے ہیں اور اس سے بڑھ کر بھی۔ ان سے پوری پوری پوچھ گچھ کرو۔ ان کی تلاشی وغیرہ ہوئی ہے؟"

"ہاں سسٹر! ابھی تک کوئی خاص چیز نہیں ملی سوائے ایک پستول کے۔"

"گاڑی کی تلاشی؟"

"نہیں، وہ ابھی نہیں لی۔"

"جاؤ شیرا! گاڑی کو اچھی طرح دیکھو۔"

شیرا حکم کی تعمیل کے لیے تیزی سے باہر چلا گیا۔ عمران کی گاڑی کی چابی یقیناً اس کے پاس ہی تھی۔

شیرے کی واپسی آٹھ دس منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں میڈم صفورا فون پر کسی سے باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتیں ریئل اسٹیٹ کے کاروبار کے بارے میں تھیں۔ زمینوں کی قیمت، بلڈنگ میٹریل کے خرچے اور ٹیکسز... بس اس طرح کی باتیں تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے شوہر نامدار کی موت کے بعد اس کے کاروبار کو بخوبی سنبھال رہی ہے۔ دوسری طرف شاید کوئی پٹھان تھا۔ میڈم نے اسے خان خان کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ پھر بات کرتے کرتے وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو شیرا بھی تلاشی لے کر واپس آ چکا تھا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے نکلنے والی اشیا اس نے گاڑی کے صفائی والے کپڑے میں باندھ رکھی تھیں۔ اس نے یہ چیزیں میڈم صفورا شیرازی کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھیں اور گرہ کھول دی۔ گاڑی کے کاغذات تھے، چند کیسٹس تھیں، ایک پیچ کش اور کچھ رسیدیں وغیرہ۔

میڈم صفورا ان چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کاغذات کو دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے عمران سے سوال کیا۔ "ہیرو صاحب! تم جمعرات کے دن جہلم گئے تھے، جی ٹی روڈ کے ذریعے؟"

"جی ہاں۔" عمران نے معصوم لہجے میں کہا۔

میڈم صفورا کے ہاتھ میں دریائے چناب اور جہلم کے پلوں پر لیے گئے ٹول ٹیکس کی دو پرچیاں نظر آ رہی تھیں۔

"کیوں گئے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"دراصل میں ایک آرٹیکل لکھ رہا ہوں۔ آرٹیکل کا موضوع یہ ہے کہ سوہنی اصل میں دریائے چناب میں نہیں ڈوبی تھی بلکہ دریائے جہلم میں ڈوب کر فوت ہوئی تھی۔"

"ونڈرفل... زبردست... بڑے اونچے خیالات ہیں۔ لیکن تمہارے یہ خیالات پڑھے گا کون؟" میڈم صفورا نے استفسار کیا۔

"پڑھے گا نہیں تو دیکھے گا ضرور۔ یہ دور ہی دیکھنے کا ہے۔ دراصل میرے تایا صاحب جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، ایک نیوز چینل بھی چلا رہے ہیں۔ میرے اس آرٹیکل کے ٹکڑے نیوز چینل پر چلیں گے اور ہزاروں لاکھوں لوگ پڑھیں گے... دراصل بات یہ ہے میڈم کہ آج کل خبروں کا کام کچھ مندا چل رہا ہے۔ خبروں کی پیاس میں تائی کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے بلکہ سب چینلوں کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ اب ایسے میں یہ سوہنی والی اطلاع بریکنگ نیوز ثابت ہو گی..."

"اس پر یقین کون کرے گا؟"

"نہ کرے یقین۔ بحث تو چھڑ جائے گی نا۔ گجرات والے ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے کہ اتنا بڑا اعزاز دریائے چناب سے چھن جائے۔ وہ ہر صورت یہ ثابت کریں گے کہ سوہنی کو دریائے چناب نے ہی نگلا تھا۔ دوسری طرف جہلم والے اپنے دریا کی مشہوری چاہیں گے۔ ٹاک شو والے اپنے اپنے بھونپو بجائیں گے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ ان میں سے ہر کوئی ارسطو اور افلاطون کے کان کاٹتا ہے۔ یہ لوگ میزوں پر مکے مار مار کر اور چلا چلا کر اپنے اپنے موقف کے حق میں دلیلیں دیں گے۔ چند ہی دنوں میں سوہنی کی غرقابی والا مسئلہ ملک کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ چینلوں پر مشتہر کیا جائے گا، ایس ایم ایس کے ذریعے اپنی رائے دیں۔ آپشن نمبر ایک... سوہنی دریائے چناب میں غرق ہوئی۔ آپشن نمبر دو... سوہنی دریائے جہلم میں غرق ہوئی۔ آپشن نمبر تین... سوہنی غرق ہی نہیں ہوئی۔

"شاہراہوں پر گاڑیاں روک روک کر لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ آپ کے خیال میں سوہنی کا رجحان دریائے چناب کی طرف زیادہ تھا یا دریائے جہلم کی طرف؟ اس کے علاوہ چینلوں پر پٹیاں چل جائیں گی... اگر آپ کے پاس سوہنی کے غرق ہونے کی کوئی تصویر یا فوٹیج ہو تو ہمیں ارسال کریں اور ثواب دارین حاصل کریں۔ جی ہاں میڈم! آپ مسکرا رہی ہیں لیکن حقیقت یہی ہے۔ چند ہی دنوں میں یہ اہم ترین ایشو بن جائے گا اور عین ممکن ہے کہ دونوں صوبوں میں سوہنی کی موت کا کریڈٹ لینے کے لیے کھینچا تانی شروع ہو جائے گی۔"

"دونوں صوبے؟ یہ گجرات اور جہلم تو دونوں ایک ہی صوبے میں ہیں۔" میڈم نے کہا۔

"میں لڑائی چھڑ جانے کے بعد کی بات کر رہا ہوں جی۔" عمران نے روانی سے کہا۔ "زیادہ نہیں تو ڈھائی تین ماہ یہ بحث چلے گی۔ اس کے بعد سوہنی واپس دریائے چناب میں

آ بھی گئی تو ہم انشاء اللہ کوئی اور شوشہ چھوڑ دیں گے۔ مثلاً یہ کہ ہیرز ہر کھانے سے نہیں مری تھی بلکہ اس کی جان ایک اور صدمے نے لی تھی۔ وہ مجھے فون پر نیٹ ورک تبدیل کر لیا تھا اور اپنے نئے نمبر سے ہیر کو بے خبر رکھا تھا...''

''ہیرا اور نیٹ ورک؟ یہ کیا بات ہوئی؟''

''میڈم ابھی بحث ہی چھیڑ رہی ہے نا۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن اطلاع کوئی ایسی ہونی چاہیے جس سے بحث چھڑ بھی سکے۔ میں تمہارے ٹی وی کے نیوز چینل کے لیے تمہیں ایک بریکنگ نیوز دیتی ہوں۔'' میڈم عفورا نے عجیب لہجے میں کہا۔

اس کے بدلے ہوئے لہجے نے مجھ سمیت سارے حاضرین کو چونکا دیا۔ وہ نپے تلے قدموں سے عمران کے قریب پہنچی اور بولی۔ ''میں ابھی پورچ میں تمہاری گاڑی دیکھ کر آ رہی ہوں۔ وہ ایک طرف سے پچکی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ سڑک پر کسی گاڑی کو مار دیا ہے تم نے... یا کسی نے تمہیں ماری ہے۔''

''تو اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہیں آپ؟''

وہ عمران کی بات کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے تیسرے ساتھی کو بھی دیکھ کر آ رہی ہوں۔ اس کی دونوں ٹانگیں جلی ہوئی ہیں اور زخم دو تین دن پرانے ہیں۔ کہتا ہے کہ کیروسین کے چولہے سے آگ لگ گئی تھی، چائے بنا رہا تھا۔''

''وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ حالانکہ یہ شرم کی بات ہے کہ ایک بندہ شادی شدہ ہونے کے باوجود خود چائے بنائے۔''

اس بار بھی میڈم نے عمران کے مزاحیہ جملے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ اور آنکھوں میں عجب سنسنی تھی۔ وہ سب کی موجودگی میں بھی جیسے کہیں بہت دور جا چکی تھی۔ اس کی پُرتفکر نگاہیں عمران پر جمی تھیں۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں چھوٹی بہن نادیہ کی طرف مڑی اور گمبھیر لہجے میں بولی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا... کہ اس معاملے کو اتنی کی نہ لو۔ یہ صرف جیدی چوکیدار کا چکر نہیں ہے۔ جمعرات کے دن جس وقت مجید کو حادثہ پیش آیا یہ لوگ جہلم میں موجود تھے... نہ صرف جہلم میں موجود تھے بلکہ مجھے لگتا ہے کہ موقع پر بھی موجود تھے۔''

''موقع پر؟'' نادیہ نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں، ان کی گاڑی کا جو سائیڈ ایکسیڈنٹ ہے... وہی سائیڈ مجید کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ اس بات کا 95 فیصد امکان ہے کہ مجید کی گاڑی کو اسی گاڑی سے ٹکر مار کر کھائی میں گرایا گیا ہو۔'' عفورا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اس کے جملے نے ہر چہرے پر سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ ان میں نادیہ کا چہرہ بھی تھا۔ عفورا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ان کے تیسرے ساتھی کی ٹانگیں جلی ہوئی ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ ان ٹانگوں کو اسی آگ نے جلایا ہے جس نے مجید کا جسم کیا ہے۔ کہو کیسی نیوز ہے؟''

کمرے میں کتنی ہی دیر تک خاموشی رہی پھر نادیہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھے بھروسا نہیں ہو رہا سسٹر کہ انہوں نے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔''

''لگتا ہے تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا۔ تم اس ایک ہی زاویے پر سوچتی ہو۔'' میڈم عفورا جھنجلا کر بولی۔ ''اٹھو، لینا کچھ ختم کر دو۔''

پھر وہ تیزی سے شہرے کی طرف مڑی۔ ''شیرے! باندھو اس کو رسی سے۔ یہ ابھی بتائیں گے سب کچھ۔''

شیرا تو جیسے حکم کا منتظر تھا۔ وہ میری طرف بڑھا۔ اس کے ساتھی نے نائلون کی رسی اس کی طرف بڑھائی۔ دونوں گارڈز نے مجھے پھر بازوؤں سے دبوچ لیا۔ عمران گرج کر بولا۔ ''ٹھہرو۔''

دونوں بہنوں سمیت سب لوگ عمران کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کچھ دیر پہلے کے عمران سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ ''اگر میں کہوں میڈم عفورا کہ میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا... کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھوں گا تو پھر؟''

''تو پھر اس کو کھول دیں گے۔'' میڈم روانی سے بولی۔ پھر اس نے دوبارہ میرے بارے میں حکم صادر کیا۔ ''باندھو اس کو۔''

''ٹھہرو!'' عمران بھی دوبارہ گرجا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ کسی گرج کے ساتھ میڈم عفورا پر برس پڑے گا۔ تاہم اس نے اپنے لب و لہجے کو چیک کیا، گہری سانس لے کر ہموار انداز میں بولا۔ ''میڈم عفورا! یہ میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہے۔ تم میرے بارے میں جانتی نہیں ہو، اس لیے اعتبار نہیں کر رہی ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ میں اس معاملے کے حوالے سے تم سے ایک لفظ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میری خواہش ہے کہ ہمارے درمیان جو بات ہو، اچھے ماحول میں ہو۔ اگر تم اسے باندھ دو گی یا مار پیٹ کرو گی تو پھر اچھا ماحول باقی نہیں رہے گا۔''

میڈم چند سیکنڈ تک گہری نظروں سے عمران کا جائزہ لیتی رہی، تب اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ رسی بردار شیرا مجھ سے دور چلا گیا۔ مجھے دبوچنے والے دونوں گارڈز بھی پیچھے

ہٹ گئے۔ میڈم کو بھی شاید اندازہ ہو چکا تھا کہ اتنے افراد کی موجودگی میں، میں کسی طرح کی مہم جوئی کا نہیں سوچ سکتا۔

عمران نے مجھے کسی بھی طرح کی سختی سے بچانے کے لیے بڑی تیزی سے فیصلہ کیا تھا۔ اس کی اس تیزی پر میرے دل میں اس کا پیار کچھ اور بھی بڑھ گیا۔ میں نے خود کو اس کے اور نزدیک محسوس کیا۔ میں نے گرل کے پار اس کی چوڑی چھاتی اور روشن آنکھیں دیکھیں اور مجھے فخر سا محسوس ہونے لگا کہ وہ میرا دوست ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے اندر ایک جوش سا ابھر گیا۔ مجھے لگا کہ آئندہ گھڑیوں میں مجھے کہیں اس کے شانے سے شانہ ملا کر لڑنا پڑا تو میں لڑ جاؤں گا۔ اس پر ثابت کر دوں گا کہ میں لڑ سکتا ہوں۔

میڈم نادیہ یکسر خاموش کھڑی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سب کے سامنے اسے بڑی بہن سے جو ڈانٹ پڑی تھی، وہ اسے بدمزہ کر گئی تھی۔ احتجاج کے طور پر اس نے ٹھنڈی شراب کا ایک اور جام چڑھایا اور اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

میڈم صفورا نے بھی ایک صوفہ سنبھال لیا۔ اس کے بعد اس نے اشارے سے سب گارڈز کو باہر بھیج دیا۔ بس ایک گارڈ وہاں رہا، یہ شیرا تھا۔ میڈم صفورا کے ساتھ عمران کی بات چیت شروع ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عمران نے واقعی میڈم صفورا شیرازی کو الف سے بے تک ساری کہانی سنانی شروع کر دی۔ اس نے کچھ بھی میڈم سے نہیں چھپایا۔ اس نے تسلیم کیا کہ سیٹھ سراج کی گاڑی سے انہوں نے جان بوجھ کر گاڑی ٹکرائی تھی... پھر بریف... اور لال کبھیوں کا کھوج۔ اس کے بعد سلیم کا ہمارے پاس آنا اور ہمارا سلیم کا تعاقب کر کے مجید منگو تک پہنچنا۔ پھر مجید منگو کے ساتھ کار ریس لگاتے ہوئے مجید منگو کا کھائی میں گر جانا... سب کچھ عمران نے میڈم کے گوش گزار کر دیا۔ درمیان میں میڈم نے سوالات کیے جن کے جواب عمران نے وضاحت سے دیے۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”میں نے آپ کو سچ اور صرف سچ بتایا ہے۔ میں آپ کو یہ بات بھی پوری سچائی کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا ارادہ مجید منگو کے بارے میں برا نہیں تھا۔ ہم صرف اس سے بات کرنا چاہتے تھے... بس تھوڑی سی پوچھ گچھ لیکن جب وہ بھاگا تو ہمیں اس کا پیچھا کرنا پڑا۔ وہ بڑی بڑی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہم نے اسے سائیڈ نہیں ماری، اس نے ہمیں ماری اور پھر خود ہی اپنی گاڑی پر کنٹرول نہیں رکھ سکا۔ وہ معمولی زخمی ہوا تھا۔ ہم نے وہیں پر اس سے سوال جواب کیے۔ اس پر کسی طرح کا تشدد نہیں کیا۔ مجید کو جو نقصان پہنچا وہ اس کی اپنی غلطی سے پہنچا۔ وہ اقبال پر جھپٹ پڑا۔ اقبال کے منہ میں سگار تھا۔ یہ سگار اچھل کر اس پٹرول پر جا گرا جو گاڑی سے بہہ رہا تھا۔ اقبال اور مجید دونوں آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ مجید چونکہ گاڑی سے زیادہ قریب تھا، اس لیے اس کا زیادہ نقصان ہو گیا۔“

یہ پوری روداد سننے کے بعد میڈم صفورا کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔

دوسری طرف میڈم نادیہ، عمران کے بیان سے کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جو ایک دو سوالات کیے وہ بھی خاصے تیکھے تھے۔

میڈم صفورا نے گہری سانس لی تو تنی شرٹ میں اس کے جسمانی نشیب و فراز اور بھی نمایاں نظر آنے لگے۔ وہ چھوٹی بہن کی طرف دیکھ کر حتمی لہجے میں بولی۔ ”نادیہ! میں ان تینوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ میں نے ابھی تم سے کہا تھا ناں کہ یہ پیچیدہ معاملہ ہے۔ اب دیکھو بات کہاں سے کہاں پہنچی ہے۔ نہ صرف ان کی وجہ سے مجید منگو کی جان گئی ہے بلکہ قادر بھی اب وہاں نہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔“ یہ آخری فقرہ میڈم صفورا نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اس ساری روداد میں اسے جس اطلاع نے سب سے زیادہ پریشان کیا ہے، وہ یہی ہے کہ قادرا اب ان کی دسترس میں نہیں ہے۔ اس پریشانی کی وجہ بھی کافی حد تک ہماری سمجھ میں آ رہی تھی۔ قادرے کے اوجھل ہو جانے کا مطلب تھا کہ قادرے کی نوبیاہتا بہن کنول بھی اب ہاتھ سے نکل چکی ہے اور کنول کے ہاتھ سے نکلنے کا مطلب تھا کہ میڈم صفورا کا صدیقی کے حوالے سے سارا پلان فلاپ ہو گیا ہے۔

میڈم صفورا نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تمہارا دعویٰ ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ تو کیا میں یہ امید رکھوں کہ تم قادرے کے ٹھکانے کے بارے میں بھی سچ کہو گے؟“

عمران نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ہاں میڈم! قادرے کے بارے میں بھی سچ کہوں گا اور قادرے کے بارے میں سچ یہ ہے کہ میں نے اسے اس کی بہن سمیت یہاں سے نکال دیا ہے۔“

”بہت خوب!“ میڈم صفورا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ اس کی دور سے بھی نگاہیں عمران کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد وہ چھوٹی بہن کی طرف گھومی۔ ”دیکھ رہی ہو نادیہ!

سیدھے ہوتے ہیں جلیبی کی طرح سیدھے سارے معاملے۔“

اور یعنی نادیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی صفورا نے گارڈز کو حکم دیا کہ وہ عمران کو کمرے سے نکالیں اور اس کی رہائش گاہ پر پہنچا دیں۔

نادیہ نے کہا۔ ”مسٹر! میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ یہ ایک دم بہت چست ہے۔ اس کے لیے احتیاط کرنی ہوگی۔“

”مجھے یہ اتنا بے وقوف نہیں لگتا کہ دو تین رائفلوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایڈونچر کرے گا۔“ پھر صفورا عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”کیوں مسٹر! ایسی بے وقوفی کا ارادہ ہے تمہارا؟“

”نو میڈم! ناٹ ایٹ آل۔“ عمران نے سعادت مندی سے کہا۔

”لیکن پھر بھی مسٹر! بہتر ہے کہ اس سے پہلے پوچھ گچھ کر لو۔ ہم نے بڑا رسک لے کر اسے یہاں تک پہنچایا ہے۔“

”او نو نادو! اب اسے اتنا بھی ہوا نہ بناؤ۔ اگر زیادہ ڈر رہی ہو تو ہینڈ کف لگا دو دونوں کو۔“ اس کے ساتھ ہی صفورا نے مونچھیل گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ بغلی دروازے میں داخل ہوا اور چند سیکنڈ بعد دو اسٹیل ہینڈ کف لیے واپس آ گیا۔ یہ ہتھکڑی کی جدید اور زیادہ پتلی قسم تھی۔ عمران نے ناک میں چیں نہیں کیا۔

مونچھیل گارڈ نے باہر کمرے سے ہینڈ کف کو گرل کے اندر سے گزارا اور پھر عمران کے ہاتھوں میں پہنا دیا۔ ایک ایسا ہی ہینڈ کف مجھے بھی پہنا دیا گیا۔ میں زندگی میں پہلی بار ہتھکڑی کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ یہ توہین آمیز بے بسی کی عجیب سی کیفیت تھی۔

شیرے نے کمرے کا لاک کھول کر عمران کو باہر نکالا۔ عمران کو باہر نکالتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں عمران پر کوئی فقرہ کسا۔ جواب میں عمران نے بھی کچھ کہا۔ دونوں کے الفاظ مجھ تک نہیں پہنچے۔ آخر میں نے شیرے کا چہرہ سرخ ہوتے دیکھا۔ وہ غضب ناک ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹا پھر ایک زوردار دوہتڑ عمران کی گردن پر مارا۔ عمران اس حملے کے لیے پوری طرح تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اس کے ہاتھ آگے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ پیچھے کی طرف بندھے ہوتے تو شاید چہرہ صوفے سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتا۔ عمران کے گرتے ہی شیرا اور اس کے دو ساتھی چیلوں کی طرح اس پر جھپٹے اور لاتیں چلانے لگے۔ عمران نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے ایک گارڈ کے پیروں پر پیچھے سے ضرب لگائی، وہ اچھل کر میڈم صفورا کے پاس گرا اور ایک قیمتی ڈیکوریشن پیس چکنا چور کر گیا۔ اس کے ساتھی نے جواباً عمران کے سر پر رائفل کا بٹ مارا۔

”رک جاؤ... رک جاؤ۔“ میڈم صفورا گرجی۔

پھر اس نے اپنے ہاتھ سے ایک گارڈ کے سر کے بال پکڑے اور اسے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ گارڈز میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میڈم صفورا کے حکم کو نظرانداز کر سکتے۔ وہ ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ تاہم اب دو گارڈز نے اپنی رائفلیں عمران کی طرف سیدھی کر لی تھیں۔ عمران بھی صوفے کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ میڈم صفورا شیرے پر برسی۔ ”میرے ہوتے ہوئے تم ایسا کر رہے ہو تو آگے پیچھے کیا کرتے ہو گے؟“

”میڈم! اس نے گالی دی ہے۔“ شیرا بھاری آواز میں بولا۔

”کوئی گالی نہیں دی ہے... اور پہل تم نے کی تھی۔“ صفورا نے جواب دیا۔

”اس کے منہ میں کتے کی زبان ہے میڈم!“ شیرا بولا۔

عمران نے کہا۔ ”تم سرتاپا کتے ہو اور وہ بھی گندی نسل کے۔ بندھے ہوئے پر حملہ کرتے ہو۔ آزاد کے سامنے پونچھ ٹانگوں میں دبا کر بھاگتے ہو۔“

”میڈم! اس کو بہت غلط فہمی ہو گئی ہے اپنے بارے میں۔ اس کے ہاتھ کھول دیں اور مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی اکڑفوں نکال سکوں۔“

”اچھا اچھا، ابھی یہ ڈراما بند کرو۔“ میڈم صفورا پھر گرجی۔ ”چلو! اسے لے کر چلو میری طرف۔“

نادیہ کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس صورت حال سے بالکل خوش نہیں ہے۔ بہرطور وہ سب کے سامنے خاموش تھی۔ گارڈز نے ہمیں دھکیل کر کمرے سے باہر نکالا اور ایک طویل راہداری میں لے آئے۔ ہم نے کوٹھی سے نکل کر ایک وسیع گراسی لان طے کیا۔ اس میں فوارے لگے تھے اور پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ اب ہم دوسری کوٹھی کے پورچ میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک شاندار لینڈ کروزر اور ایک ویلز جیپ کھڑی تھی۔ رہائشی عمارت کے مین دروازے کے پاس ایک بہت بڑا السیشن کتا سنہری زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ گارڈز ہمیں لے کر اس دوسری کوٹھی کے اندر داخل ہوئے اور سیڑھیاں اتر کر ایک کشادہ بیسمنٹ میں لے آئے۔ اس بیسمنٹ میں دو کمرے تھے اور ایک لاؤنج نما جگہ تھی جہاں ایک خوب صورت جہازی ٹی وی اور آڈیو سسٹم وغیرہ موجود

تھے۔ کمرے میں دائیں طرف ایک کھڑکی تھی جس میں ڈیزائن دار آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ یہ بالکل ویسی ہی کھڑکی تھی جیسی میں اس سے پہلے ڈیوی کی رہائش گاہ پر دیکھ چکا تھا۔

عمران مجھے دیکھ کر مسکرایا تو اس کی سوجی ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی نظر آنے لگیں۔ چہرہ نیلو نیل تھا۔ بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ وہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو حرکت دے کر بولا۔ ''جگر! یہ ہتھکڑیاں تو مردوں کا زیور ہوتی ہیں اور چوٹیں وغیرہ بناؤ سنگھار۔ ایسی باتوں کو دل سے نہیں لگانا چاہیے۔ بندر ہلدی کی گانٹھ لے تو پھر گندم کی بالیاں ڈھونڈنا شروع کر دیتا ہے۔''

وہ اکثر گندم کی بالیوں کا حوالہ دیتا رہتا تھا اور یہ بات مجھے بہت بری لگتی تھی مگر پہلی مرتبہ اس کی یہ بات مجھے بری نہیں لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس وقت جب میں ڈیوی کی انا کو چھو کر زہریلی گولیاں ڈھونڈ رہا تھا، میں واقعی غلطی پر تھا۔ تب مجھے سر عام زدوکوب کیا گیا تھا اور میں اس صورت حال کو اپنے لیے بے حد ذلت آمیز محسوس کر رہا تھا۔ آج عمران کو بھی زدوکوب کیا گیا تھا۔ اس کے جسم پر مجھ سے زیادہ چوٹیں آئی تھیں لیکن اس نے یہ سب کچھ ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ وہ کل ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ شاید دکھوں سے بھری ہوئی زندگی کا سامنا کرنے کے لیے یہی طریقہ زیادہ مناسب تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے جگر؟'' اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔

''تمہارے ساتھ کافی مار پیٹ ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس خبیث شیرے کا ہی کیا دھرا ہے۔''

''میں نے کہا تھا نا جگر! ہمارے ساتھ رہو گے تو آہستہ آہستہ تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو جائیں گی۔ یہ واقعی شیرے ہی کی والہانہ محبت ہے۔ اس نے مجھ پر بڑا غصہ نکالا ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ اس کی باری آگئی ہے تو ہماری بھی آ جائے گی مگر جب ہماری آئے گی تو ہم اسے باندھ کر نہیں ماریں گے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم بتاؤ تم اس ڈھوب شیراز میں کیسے تشریف لے گئے ہو؟''

''ڈھوب شیراز میں؟''

''او یار! میں ذرا ادبی بات کر رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ تم یہاں کیسے آ پہنچے؟''

''تمہارا یار سلیم، تمہارے یہاں پکڑے جانے کی اطلاع لے کر میرے پاس آیا تھا۔ وہاں رات کو...''

''پھر؟''

''پھر ہم گھر سے نکلے اور نکلتے ہی پکڑے گئے۔ شیرے کی نگرانی ہو رہی تھی...''

میں نے اپنے پھنسنے کی ساری تفصیل عمران کے گوش گزار کر دی۔ وہ پریشانی کے بجائے دلچسپی سے سنتا رہا۔

اسی دوران میں تہ خانے کا دروازہ کھلا اور ہمیں اقبال کی صورت نظر آئی۔ دو گارڈز اسے لے کر سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ اقبال نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ تاہم گارڈز اسے ہمارے کمرے میں لانے کے بجائے ساتھ والے کمرے میں لے گئے اور دروازہ دوبارہ سے مقفل کر دیا۔

''کیا حال ہے شہزادے؟'' عمران نے بلند آواز میں اقبال سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں... اور تم؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں یار! لیکن اب میری بات پر یقین کون کرے گا؟'' عمران نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''پوری رات میڈم صفورا کی لاڈلی بہن کے پاس رہا ہوں۔ بے شک میری عزت بچی رہی ہے مگر لوگوں کی زبانیں تو بند نہیں کی جا سکتیں نا۔ وہ یقین نہیں کریں گے۔ تم ہنسو گے؟ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ پتا نہیں کہ اب شاہین مجھے قبول بھی کرے گی یا نہیں؟''

''چلو قبول نہیں کرے گی تو میں شادی کر لوں گا۔''

''مجھ سے؟''

''نہیں یار! شاہین سے۔''

''لعنت ہے تیری دوستی پر۔ میرے دکھ میں شریک ہونے کے بجائے زخموں پر مرچیں چھڑک رہا ہے۔ کم از کم تجھے تو میرا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں بالکل پاک ہوں۔ میڈم زہرہ نے میرے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ تیرے سر کی قسم، میری عزت محفوظ ہے۔ آج مجھے پتا چلا ہے میرے پیارے سہیلے! اگر میرے ساتھ کچھ ہوا ہوتا تو میں نے اب تک پنکھے سے لٹک کر اپنا خاتمہ کر لیا ہوتا۔''

ایک سینئر گارڈ دہاڑا۔ ''تم اپنی بکواس بند کرو تو اچھا ہے۔''

''دیکھ لو دنیا والو! یہ مارتے بھی ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔ اب اگر ان کی ہمشیرہ کی شکل میری بچپن کی دوست سے ملتی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' عمران نے فریاد بلند کی۔

''تمہاری تو...'' سینئر گارڈ نے نازیبا الفاظ استعمال کیے اور کھڑکی کو زور سے بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اقبال کے کمرے والی کھڑکی بھی بند کر دی۔

یہی وقت تھا جب ایک بار پھر اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ ہم نے کھڑکی کی جھری میں سے جھانکا۔ میڈم صفورا بارعب چال چلتی ہوئی تہ خانے میں آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک گنجا شخص تھا جس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ میڈم صفورا ہماری

طرف آئے گی۔ وہ اقبال والے کمرے کی طرف چلی گئی... میڈیکل باکس والا ڈاکٹر نما شخص بھی ادھر ہی گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ اقبال کی زخمی ٹانگوں کو دیکھنے گئے تھے۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے۔ پھر گنجا شخص تو اپنے باکس سمیت ہمارے کمرے میں آ گیا تاہم میڈم صفورا اقبال کے پاس ہی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پولیس والوں والا جواب سوال کر رہی ہے۔ ہمارے بیانات کی تصدیق کے لیے اقبال کو علیحدہ سے کریدا جا رہا ہے۔ عمران کو پتا تھا کہ اقبال سے میڈم کا اہم ترین سوال یہی ہونا ہے کہ تورا اور اس کی بہن کہاں ہیں۔ اس حوالے سے عمران کو تسلی تھی۔ دراصل اقبال کو بھی صرف اتنا ہی پتا تھا کہ عمران نے تورا اور اس کی نبیل کو ملتان بھیجا ہے۔ کس کے پاس بھیجا ہے... کہاں بھیجا ہے اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

گنجا شخص واقعی ڈاکٹر تھا۔ لگتا تھا کہ وہ گونگا ہے۔ جتنی دیر ہمارے پاس رہا اس نے ''ہوں ہاں'' کے سوا کوئی بات نہیں کی۔ اس نے عمران کے چہرے کی مرہم پٹی کی... ہاتھ کی بینڈیج بھی کھول کر دیکھی۔ ہاتھ پشت کی طرف سے بری طرح سوج گیا تھا۔ ڈاکٹر نے روئی وغیرہ رکھ کر دوبارہ پٹی باندھ دی۔ [illegible] اسی دوران میں میڈم صفورا کی شکل بھی نظر آئی۔ وہ کمرے میں نہیں آئی تھی بلکہ اس نے کھڑکی کھول کر اپنی صورت دکھائی تھی۔

''ہاں ڈاکٹر! ان کا کام مکمل ہو گیا؟'' میڈم نے پوچھا۔

''جی میڈم!'' ڈاکٹر نے کہا تو ہمیں پتا چلا کہ وہ بھی منہ میں زبان رکھتا ہے۔ ہم دونوں کے ہاتھ ابھی تک سامنے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ میڈم صفورا کھڑکی کے عین سامنے کرسی ڈلوا کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کی نسبت زیادہ سنجیدہ اور رعب دار نظر آتی تھی۔ وہ زہرا کی طرح ''اوو ویٹ'' قسم کی [illegible] تاہم خوب صورت دکھائی دیتی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ تک اپنی متقابل نگاہیں عمران کے چہرے پر گاڑے رکھیں پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تو تم تاورا اور اس کی بہن کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں نے انہیں ان کی مرضی سے جانے دیا ہے۔ وہ کہاں گئے، مجھے خود پتا نہیں۔''

''تمہارے نہ بتانے سے ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ یہ ہمارے لیے بڑا نازک معاملہ ہے۔ صدیقی ایک بڑے قبیلے شخص کا نام ہے۔ اس نے ایک بار ''نہ'' کہہ دی تو پھر کوئی طاقت اسے ہاں میں نہیں بدل سکے گی۔ ہم بڑی

مشکل سے اسے اپنے راستے پر لائے تھے۔ سراج کے ساتھ صدیقی کی ''کمٹمنٹ'' ہو چکی ہے۔ اگر وہ لڑکی کنول... ابرار صدیقی سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے تو وہ بھی ہماری بات مان لے گا اور وہ بہت حد تک راضی ہو بھی چکی تھی۔ تم لوگوں نے بیچ میں کود کر سارا معاملہ اپ سیٹ کیا ہے۔''

عمران بولا۔ ''میڈم! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس لڑکی کو کس طرح رضامند کیا جا رہا تھا۔ خیر! آپ یہ باتیں چھوڑیں۔ آپ مجھے صرف ایک بات بتائیں۔ وہ ایسی کیا خاص شے ہے جس کو صدیقی سے حاصل کرنے کے لیے آپ اس قدر ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں؟ آپ کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک اور شے موجود ہے... پھر کسی ایک شے کی خاطر اتنی زیادہ بے قراری؟''

''یہ تم نہیں سمجھ سکتے اور نہ میں سمجھا سکتی ہوں۔ ہاں، کوئی میرا ہم ذوق ہو تو اور بات ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی ''ارج'' ہوتی ہے۔ ایک ان بجھی پیاس جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔'' اس کی اداس آنکھوں میں واقعی ایک عجیب طرح کی پیاس اتر آئی۔ وہ جیسے تصور میں اس نادر پیس آف آرٹ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے کاروباری رقیب ابرار صدیقی کے پاس تھا اور جس کو پانے کے لیے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

''کیا وہ گندھارا آرٹ کا کوئی نمونہ ہے؟''

''تم یہی سمجھ لو۔'' میڈم نے مختصر جواب دیا۔

عمران نے بے تکلفی سے ٹانگیں پھیلائیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ میڈم صفورا کھڑکی کے دوسری طرف تھی اور عمران کو گھور رہی تھی۔ اس بے بسی کی حالت میں بھی عمران کا انداز اور رویہ بڑا اطمینان بخش تھا۔ اسے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا پالا کسی معمولی شخص سے نہیں پڑا اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اب سختی کے بجائے نرمی اور حکمت سے کام لینا چاہ رہی تھی۔ اس کی سرمئی آنکھوں کی خاص ملاحتیں نظر آئی تھیں۔

عمران گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''میڈم! آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو تورا اور اس کی بہن کی ضرورت ہے یا اس پیس آف آرٹ کی؟''

''ظاہر ہے، مجھے اس پیس آف آرٹ کی ضرورت ہے لیکن اب صدیقی سے بھی اپنا تعلق خراب کرنا نہیں چاہتی۔''

''اگر میں کہوں کہ صدیقی سے آپ کا تعلق خراب نہیں ہوگا اور وہ پیس آف آرٹ بھی آپ کو مل جائے گا تو پھر؟''

''تمہارے پاس جادو کی چھڑی ہے؟''

"جادو کا ڈنڈا ہے اور انشاء اللہ آپ خود بھی اس ڈنڈے کی معترف ہو جائیں گی۔ میڈم! گستاخی معاف۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ کے پاس بندے ضرور ہیں اور وہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں لیکن ان کا لیول اتنا نہیں ہے کہ وہ آپ کے لیے کوئی بڑا کام کر سکیں۔ سیٹھ سراج اور عارف خان جیسے لوگ بھی گزارا کر سکتے ہیں، کوئی شاہکار نہیں دکھا سکتے۔ میں ایک مسکین بندہ ہوں لیکن... معافی چاہتا ہوں... آپ کے ان کرائے کے ٹٹوؤں سے بہت بہتر ہوں۔ اس کے علاوہ مار دھاڑ بھی میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک میڈم آپ دیکھ چکی ہیں۔ ان کا ہیڈ گارڈ شیرا میرے ہاتھوں جس طرح ذلیل ہوا تھا، وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"اچھا! اس واقعے کی وجہ سے تم یہ بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو؟ لیکن شیرے کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہوا اتفاق تھا ورنہ وہ تم جیسے دو تین بندوں کو بیک وقت مجھے بتا سکتا ہے... اور سچ پوچھو تو میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ اس روز اتفاقاً ہی شیرے کے ساتھ یہ ہوا تھا۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں اب بھی بلکہ اسی وقت اس سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ لوگوں کی تھوڑی سی تفریح بھی ہو جائے گی۔"

میڈم کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اسے جیسے اب بھی بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ عمران جیسا درمیانے قد کاٹھ کا شخص شیرے جیسے نہایت خطرناک اور پہلوان نما فائٹر کو صرف دو تین سیکنڈ میں زمین چٹوا سکتا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ اگر میں نے بھی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ عمران کا قد بمشکل پانچ فٹ تھا۔ شانے چوڑے لیکن جسم چھریرا تھا۔ خاص طور سے اپنی صورت کے اعتبار سے تو وہ بالکل بھی کرخت اور مار دھاڑ والا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شوخ سی معصومیت چھائی رہتی تھی۔ میڈم نے کھڑکی کے پاس آ کر عمران کو غور سے دیکھا اور بولی۔ "تجربہ تمہارا ٹھیک ہے... لیکن اگر اس کھیل میں تم دونوں میں سے کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تو کیا ہو گا؟"

"اگر آپ چاہتی ہیں تو ہڈی پسلی بھی نہیں ٹوٹے گی اور آپ کو پہلوان جیت بھی ہو جائے گا۔"

"خود پر اتنا بھروسا ہے؟"

"بھروسا تو اللہ پر ہے۔ میرا کام کوشش کرنا ہے۔" اسی دوران میں میڈم کی نظر کا زاویہ تبدیل ہوا۔ غالباً اس کا دھیان عمران کے زخمی ہاتھ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ بولی۔ "لیکن تمہارا ہاتھ تو زخمی ہے۔ کیا اسی طرح لڑنا پسند کرو گے؟"

"میرے دونوں ہاتھ زخمی ہوتے تو بھی میں پسند کرتا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"سوچ لو۔"

"سوچ لیا۔"

میڈم صفورا کی آنکھوں میں دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے موبائل فون نکالا اور ایک نمبر پریس کرنے کے بعد بولی۔ "شیرا! یہاں آ جاؤ میرے پاس۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہاں ہلچل ہو گی۔ میری دھڑکن بڑھ گئی۔ قریباً دو منٹ بعد شیرا تہ خانے میں موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ شاید وہ جان گیا تھا کہ اسے کس لیے بلایا گیا ہے۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے میڈم نادیہ بھی وہاں آ گئی۔ اس کے ساتھ دو باوردی گارڈز بھی تھے۔ گارڈز کی "اے کے 56" رائفلیں خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے نادیہ کی شکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ بالکل ناقابل اعتبار بھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ عمران پر "کتا چھوڑنے" کے لیے میرے ساتھ بدسلوکی نہیں کرے گی لیکن اپنے وعدے کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ مجھے نرمی سے اندھیرے پر قابل گئی تھی۔

دو گارڈز نے عمران کو کمرے سے باہر نکالا اور اس کے ہاتھ کھول دیے۔ شیرے نے اپنی جیکٹ میں سے تمام اسلحہ نکال کر اپنے ایک ساتھی کو پکڑا دیا۔ ان میں ایک ریوالور بھی شامل تھا۔ اس کے بعد اس نے گھڑی اتاری اور وہ بھی ساتھی کے حوالے کر دی۔ عمران کی تلاشی تو پہلے بھی کئی بار ہو چکی تھی۔

"کوئی ہتھیار استعمال نہیں ہو گا۔" میڈم صفورا نے شیرے اور عمران دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کسی بھی چیز سے کوئی ضرب نہیں لگائی جائے گی۔" اس نے آخر میں اضافہ کیا۔

احتیاط کے طور پر میڈم نے وہاں سے ہر وہ شے ہٹوا دی جسے ضرب لگانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سب کے چہرے پر سنسنی نظر آ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید شیرا عمران کے زخمی ہاتھ کو دیکھ کر اس حوالے سے کوئی بات کرے گا لیکن وہ یہ اخلاقی جرأت نہیں کر سکا اور ایک طرح سے یوں اس نے خود کو اخلاقی طور پر گرا ہوا ثابت کیا۔

بلکہ بعض اوقات تو انہی گیمز وغیرہ بھی ہو جاتی ہیں اور بات بڑھ جاتی ہے۔ جب دو مشتعل افراد خالی مکوں سے لڑتے ہیں تو اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ چہرے پر گہرے زخم آئیں۔ میں نے تصور کی نگاہ سے عمران کے زخمی چہرے کو مزید زخمی دیکھا اور میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ یہ دو بدو لڑائی کسی طرح ٹل جائے۔

بہرحال، ایسا نہیں ہوا۔ تہ خانے کے خالی حصے نے "فائٹنگ رنگ" کی شکل اختیار کر لی۔ عمران اور شیرا ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ شیرے کی آنکھوں میں نفرت کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ یقیناً وہ اس رات والی ہزیمت کا پورا پورا بدلہ عمران سے لینا چاہتا تھا۔ دوسری طرف عمران کو بھی ایک مناسب موقع ملا تھا۔ اسے یہاں لا کر باندھا گیا تھا اور شیرے نے اس کے ساتھ "مکا لات" کی تھی۔ اب اس مکا لات کا جواب دیا جا سکتا تھا۔

پہلا وار شیرے نے ہی کیا۔ اس نے عمران پر مکا چلایا۔ یہ مکا عمران کی ٹھوڑی کو چھوتا ہوا گیا۔ شیرے کا دوسرا مکا بھی اینٹ ہوا سا پڑا۔ تاہم وہ اتنے جوش سے آگے آیا تھا کہ عمران اسے سنبھالنے سنبھلتے لڑکھڑا گیا اور گر پڑا۔ شیرا اس کے اوپر گرا اور مکے برسانے لگا۔ عمران نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ وہ اس کی پسلیوں کو نشانہ بنانے لگا۔ عمران نے بھی ایک دو ضربیں اس کے چہرے پر لگا دیں۔

میڈم صفورا کے حکم پر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک بار پھر ایک دوسرے پر جھپٹے۔ اس بار شیرے کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو کچھ عرصہ پہلے میڈم نادیہ کی رہائش گاہ پر ہو چکا تھا۔ وہ غم و غصے اور جوش میں پچھاڑ تک کھا بیٹھا۔ اس نے اپنا چہرہ عمران کے سر کی خوفناک ٹکر کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ مجھے تو یہی لگا جیسے یہ اس پہلے سین کا ری پلے ہے۔ عمران کے سر کی دھواں دھار ضرب شیرے کے چہرے پر لگی۔ دبی دبی چیخنے کی سی آواز آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا، اس کے کھوپڑے کو عمران کے سر کی دوسری ضرب سہنا پڑی۔ اس ضرب نے اسے کئی فٹ پیچھے اچھالا اور وہ میڈم صفورا کے قدموں میں جا گرا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ اس نے بڑی ہمت مجتمع کر کے اٹھنے کی کوشش کی مگر تیوراتے ہوئے پاگلوں کی طرح ڈگمگا کر گھٹنوں کے اوپر گر گیا۔

"اسٹاپ... اسٹاپ اٹ۔" میڈم صفورا چلائی۔

دو گارڈز عمران اور شیرے کے بیچ آ گئے۔ توہین اور تکلیف کے شدید اثر کے تحت شیرا اٹھا اور عمران کی طرف بڑھنا چاہا تاہم اب میڈم صفورا نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سامنے آ کر اسے روک دیا۔

یہ لڑائی بمشکل دو تین منٹ جاری رہ سکی تھی۔ شاید حاضرین میں سے کسی کو بھی ایسے تیز رفتار اختتام کی توقع نہیں تھی۔ شیرا رک گیا مگر بدستور احتجاج کرتا رہا۔ اس کے احتجاج میں کوئی جان نہیں تھی۔ وہاں موجود ہر فرد نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میڈم صفورا نے عقل مندی کا ثبوت دے کر شیرے کو بچا لیا ہے۔ وہ ایک بار پھر... عمران کے سامنے آتا تو شاید بہت زیادہ نقصان اٹھا لیتا۔ شیرے کے علاوہ شیرے کے دو تین قریبی ساتھی بھی عمران کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ تاہم ان نظروں میں خوف کی جھلکیاں بھی تھیں۔

میں کوئی مارشل آرٹ کا ماہر نہیں تھا کہ اس کی باریکیوں پر بہت زیادہ غور کر سکتا۔ تاہم میں نے کافی عرصے تک جوڈو کراٹے کی کلاسیں لی تھیں۔ میں دو بدو لڑائی کے بنیادی اصول جانتا تھا۔ میں نے بہترین لڑاکوں کو رنگ میں لڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن میں نے عمران کے انداز میں جو حیران کن چستی دیکھی وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑائی میں اس کا سب سے خطرناک ہتھیار اس کے سر کی ضرب تھی۔ یہ وار وہ اس قدر اچانک اور اتنے بھرپور طریقے سے کرتا تھا کہ مدمقابل بھونچکا رہ جاتا تھا۔ یہ وار کرتے ہوئے سر سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک عمران کا جسم ایک ایسا زاویہ اختیار کر جاتا تھا جس سے بے پناہ توانائی پیدا ہوتی تھی۔ اس توانائی کو پیدا کرنے میں اس کے پاؤں کی ایڑیاں شاید سب سے اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ پھر یہ توانائی ایک شوریدہ لہر کی طرح اس کے سر تک جاتی تھی اور ایک خوفناک ضرب کی شکل اختیار کرتی تھی۔

ڈیئر! میں نے تمہارا ناشتہ لگا دیا ہے

تھے۔ خانے میں سب بچے بچائے تھے۔ جسمانی لحاظ سے عمران اور شیر سے کا مقابلہ کوز سے اور ہاتھی کا مقابلہ تھا۔ اوجھل کھڑکی میں سے اقبال نے بھی اس تیز رفتار مقابلے کو دیکھا تھا اور اندر سے ہی دو ایک تالیاں بھی بجائی تھیں۔

میڈم صفورا کے اشارے پر شیر سے کو باہر جانا پڑا۔ اس کے بعد دروازہ بھی بند ہو گیا تھا۔ ادھم ختم ہو چکی تھی۔ میڈم صفورا نے اپنے گارڈز کو اشارہ کیا۔ انہوں نے عمران کو واپس کمرے میں چلنے کو کہا۔ عمران، میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اگر آپ کی تفریح ادھوری رہی ہے تو میں مزید تفریح مہیا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔ اگر شیرا صاحب کے ایک دو ''بھیا'' اکٹھے میرے ساتھ کشتی لڑنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔''

''اس بارے میں بھی بات کر لیں گے۔'' میڈم صفورا سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''ابھی تم کمرے میں جاؤ۔''

میں نے شکر کیا کہ عمران کمرے میں واپس آ گیا، ورنہ ایک موقعے پر تو میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ کسی بڑے ایڈونچر کی کوشش نہ کرے۔ آس پاس آٹھ دس گارڈز موجود تھے اور ان میں سے کسی پر جھپٹنے کا سوچ سکتا تھا یا پھر ایسی ہی کوئی اور حرکت۔ کمرے میں واپس آنے سے پہلے عمران کو پھر ہینڈ کف پہنا دیے گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہمارے اردگرد سکون ہو گیا۔ بس تہ خانے کے دروازے پر دو باوردی گارڈز کھڑے رہے۔ ہم اپنے راولپنڈی والے گھر سے شام سات بجے کے قریب نکلے تھے۔ اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا اور جن حالات سے گزر رہے تھے ان کے نتیجے میں بھوک بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

بہرحال تھوڑی دیر بعد کھانے کی خوشبو محسوس ہوئی۔ ایک جواں سال ملازم ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ چکن بریانی، قورمہ، فرائی فش اور نان وغیرہ بہت سے لوازمات ٹرالی میں موجود تھے۔ اس میں سے کچھ کھانا اقبال کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ باقی ہمارے کمرے میں آ گیا... میڈم نے جاتے جاتے ہم پر واضح کر دیا تھا کہ اقبال ابھی دوسرے کمرے میں ہی رہے گا۔ اس نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ فی الحال ہم اس سے بات چیت کی کوشش نہ کریں، ورنہ گارڈز کو مداخلت کرنا پڑے گی۔

''کھاؤ یار!'' عمران نے بائیں ہاتھ سے ایک بڑا لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، بھوک نہیں۔'' میرا لہجہ زرد تھا۔

عمران نے بھی ہاتھ روک لیا۔ ''کیوں بھوک نہیں ہے؟''

''عمران! میں اسی وقت سے ڈر رہا تھا۔ ہم اس معاملے میں بُری طرح پھنس چکے ہیں اور اگر صرف ہماری ہی بات ہوتی تو بھی خیر تھی... مگر اب میرے گھر والے بھی زد میں آ رہے ہیں۔''

''تم نے اپنے بارے میں چھوٹی میڈم کو کچھ بتایا ہے؟''

''سب کچھ بتایا ہے۔''

''کیا ضرورت تھی؟''

''نہ بتاتا تو چند گھنٹے میں اسے خود ہی معلوم ہو جانا تھا۔ وہ میرے سامنے فون پر سیٹھ سراج سے بات کر رہی تھی۔ سیٹھ نے صبح دس بجے یہاں آنا ہے۔''

عمران کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر منرل واٹر کے چند گھونٹ لے کر بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں یار! میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بڑی میڈم میرے ہاتھ پر بیعت ہونے والی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! مرید بننے والی ہے اپنی۔ جو کچھ کہیں گے مانے گی۔ نہ مانے گی تو کہیں دیوار سے چپکا دیں گے۔''

''ہر وقت پہیلیوں میں بات نہ کیا کرو۔'' میں نے کہا۔

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نے چھوٹی میڈم کو اپنی سوانح حیات نہ سنائی ہوتی تو زیادہ آسانی ہوتی۔ ہم بڑی میڈم سے کہہ دیتے کہ وہ تمہیں سیٹھ سراج کے سامنے آنے ہی نہ دے لیکن اب اس سے فائدہ نہیں۔ اب دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ میڈم سے کہنا ہو گا کہ وہ تمہارے گھر والوں کی حفاظت کا انتظام کرے تاکہ نادیہ یا سیٹھ سراج وغیرہ انہیں پریشان نہ کر سکیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ بڑی میڈم انہیں پناہ دے... بالکل بکواس خیال ہے تمہارا۔ یہ لوگ جس طرح کی پناہ دیتے ہیں، وہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ تمہارے کہنے پر تو بڑی میڈم نے پناہ دی تھی... پھر کیا کیا اس کے ساتھ؟''

''کیا تمہیں قادرے اور مجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟''

''مجھے صرف ایک بات کا پتا ہے۔ تم مجھے اس لعنتی معاملے میں پھنساتے چلے جا رہے ہو۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''اس سے بہتر تھا کہ تم مجھے مر جانے دیتے اسی دن۔ قصہ پاک ہوتا۔ میری وجہ سے میرے گھر والوں پر تو آفت نہ آتی... لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی۔ بس اپنے خبط میں لگے رہے ہو۔ تم بس اپنے ہی ڈھنگ سے چلنا جانتے ہو۔ تمہیں کسی کی کوئی پروا نہیں۔'' میں بھنایا ہوا کھانے کے

سامنے سے اٹھا اور دوسری دیوار کے ساتھ جا بیٹھا۔

عمران نے بھی کھانا ایک طرف ہٹایا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دو منٹ بعد وہ میرے پاس بیٹھا۔ اس نے اپنا زخمی ہاتھ بڑی ملائمت سے میرے ہاتھ پر رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جو میں کہہ رہا ہوں، ہونے والا ہے... وہ تم نہیں دیکھ رہے۔ اگر مجھ پر تھوڑا سا بھی بھروسا ہے... تو اس بات پر یقین رکھو کہ تمہارے گھر والوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ میں تمہیں حلف دیتا ہوں۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میری بے قراری اچانک کم ہو گئی۔ جیسے کسی بھڑکتی ہوئی آگ پر بہت سارا ٹھنڈا پانی پھینک دیا گیا ہو۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولا۔ ''بس یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس یاد رکھو اور میرا کام۔''

اور پتا نہیں کیا ہوا، میں واقعی ایک درجے سکون ہو گیا۔

''چلو، اٹھو اب کھانا کھاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں میرے لیے بلاوا آ جائے۔''

''کہاں سے؟''

''کہیں سے بھی آ سکتا ہے یار!'' اس نے کہا اور مجھے اٹھا کر دسترخوان تک لے گیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ بندھے تھے۔ دونوں ہاتھوں کے ساتھ کھانا لینے لگے۔ یہ میری زندگی کا عجیب تجربہ تھا۔ لقمہ ایک ہاتھ سے لیا جاتا ہے لیکن جب ہاتھ بندھے ہوں تو خالی ہاتھ کو بھی ساتھ ساتھ حرکت دینا پڑتی ہے۔ کسی سے ہاتھ ملانا ہو، کہیں کچھ کرنا ہو، کچھ لکھنا ہو تو بھی خالی ہاتھ بڑی بے چارگی سے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہے۔ جیسے وہ کوئی ایسا بچہ ہو جو پیدائشی طور پر اپنے بھائی بہن سے جڑا ہوا ہو۔ کھانے کے دوران ہی میرے ایک سوال کے جواب میں عمران نے سرگوشی میں بتایا کہ ریلوے اسٹیشن پر میڈم کے بندوں کے ہتھے چڑھتے ہی اس نے اپنا موبائل، کچرے کے ایک ڈبے میں پھینک دیا تھا۔ یہ کام بڑی صفائی سے اس وقت ہوا تھا جب میڈم کے بندے اس سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ عمران کے پاس موبائل کی غیر موجودگی نے تو ہمارے اور کنول وغیرہ کو بڑا محفوظ کر دیا تھا۔

اسی دوران میں لمبی ناک اور تیکھے نقوش والا ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب آ کر گارڈ سے بولا۔ ''چودھری! کھولو اسے۔ میڈم نے بلایا ہے۔'' لمبی ناک والے کا اشارہ عمران کی طرف تھا۔

''تمہیں کہا تھا نا... بلاوا آئے گا۔'' عمران نے سرگوشی

> **''تیرھویں منزل''**
>
> ایک چور نے واردات کے دوران گھبراہٹ زدہ لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔ ''پولیس آ رہی ہے... جلدی سے کھڑکی سے کود جاؤ...''
>
> ''لیکن ہم تو تیرھویں منزل پر ہیں۔'' ساتھی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔
>
> ''اس وقت صرف چھلانگ لگانے کی فکر کرو... توہمات میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔'' پہلے نے تیزی سے کہا۔

کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا؟'' میں کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

''مسئلہ ہو گا تو میں مرغا پاپل بن جاؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔'' اس نے کہا اور دو افراد کے ساتھ باہر چلا گیا۔ دو گارڈز بھی اس کے تعاقب میں گئے۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مختلف اندیشے بے پناہ رفتار سے میرے ذہن میں آتے اور جاتے رہے۔ دو بیگل السیشین کتّے کی آواز بیرونی کی طرف سے ابھری اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں اقبال اور عمران کو دیکھنا چاہتا تھا مگر دونوں میری نظر سے دور تھے۔

عمران کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ ایک گارڈ کے ساتھ گپیں لگاتا ہوا واپس آ رہا تھا۔ اس کی ابھرتی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''میری بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ آپ واقعی میری منگیتر کی ہم شکل ہے۔ میرے سارے زخم ہرے ہو گئے ہیں شیر رخ۔''

''شیر رخ نہیں جی، رخ شیر۔'' گارڈ نے اپنے نام کی تصحیح کی۔

''شیر آگے ہو یا پیچھے، شیر ہی رہتا ہے یار۔'' عمران نے کہا۔ ''بلکہ پیچھے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''

اب میں نے غور کیا تو عمران کے ہاتھوں میں ہینڈ کف بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

گارڈ نے میرے کمرے کو ان لاک کیا اور بڑی عزت سے مجھے باہر آنے کے لیے کہا۔ میرے ہینڈ کف بھی ایک کبھی چابی کے ذریعے کھول دیے گئے۔ اس کے بعد اقبال کی باری آئی۔ اسے کمرے سے نکالا گیا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی آزاد تھے۔ بہرحال، زخموں کی تکلیف کے سبب وہ بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ میں نے اس کا قد اندازہ لگایا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے ساتھ مار پیٹ نہ کی گئی ہو مگر ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔

ہمیں ایک راہداری میں لایا گیا۔ میں صاف دیکھ رہا

تھا کہ گارڈز کا رویہ بدل چکا ہے۔ ان کی رائفلیں ایزی پوزیشن میں کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ ''کہاں لے جا رہے ہیں؟'' میں نے مدھم آواز میں عمران سے پوچھا۔

''اس وقت بستر سے اچھی جگہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ بدل بدل کر میری تو ٹانگیں اکڑنے لگی ہیں۔''

''ٹانگیں؟''

''ہاں ٹھیک! یہ مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ بولنے سے ٹانگیں اکڑتی ہیں... زیادہ چلیں تو زبان کو سنبل لگ جاتا ہے۔'' اس نے سب ہی کی اڑائی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے خود بھی ٹھیک سے پتا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اس چھوٹی عمارت میں داخل ہو رہے تھے جو دونوں لال کوٹھیوں کے سنگم پر واقع تھی۔ یہ یہاں کی انیکسی تھی۔ اسے چاروں طرف سے کچنار اور نیم کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اندر سے یہ خوب سجی سنوری تھی۔ ہمیں ایک نہایت آرام دہ بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا۔ اس نمائی کمرے میں تین ڈبل بیڈ تھے۔ باتھ روم بھی بیڈ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر جدید آسائش باتھ روم میں موجود تھی۔

جب ہم یہاں داخل ہو رہے تھے، ہم نے ایک ساتھ والے کمرے سے ایک ملازم کو کچھ سامان وغیرہ نکالتے دیکھا۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ انچارج گارڈ شیرے کا سامان ہے۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ یہاں رہائش رکھے ہوئے تھا۔ اب اسے یہاں سے شفٹ کیا جا رہا تھا۔ جلد ہی ہمیں شیرا بھی نظر آ گیا۔ عمران کی دو جہازی ضربوں کی وجہ سے اس کا چہرہ متورم تھا۔ وہ اپنا بیگ اٹھائے ہوئے باہر آ رہا تھا۔ اس نے عجیب زہریلی نظروں سے ہمیں گھورا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

جلد ہی دو خوبرو ملازمائیں ہماری خدمت کے لیے حاضر ہو گئیں۔ ان کی عمریں بیس بائیس سال کے درمیان رہی ہوں گی۔ ان کی مسکراہٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر ہم چاہیں تو وہ ہر قسم کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ وہ دونوں شلوار قمیص میں تھیں۔ سویٹرز بغیر آستین کے تھے اور قمیصیں آدھی آستین کی تھیں۔ ان کی سڈول باہیں اور صراحی دار گردنیں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ انہوں نے ایک وسیع وارڈ روب کھولی اور قریباً دو درجن مردانہ لباس، سویٹر، کوٹ وغیرہ ہینگرز پر لٹکا دیے۔ ان میں سلیپنگ گاؤن وغیرہ بھی تھے۔ نفیس چپلیں اور جوتے وغیرہ پہلے ہی ڈبوں کے اندر اس وسیع وارڈ روب میں موجود تھے۔

قد آدم ریفریجریٹر میں کھانے پینے کے بہت سے لوازمات رکھے تھے۔ ان میں امپورٹڈ وسکی کی چھلکتی بوتلیں نمایاں تھیں۔ بڑے سائز کے ایل سی ڈی ٹیلی ویژن پر کوئی انگریزی فلم دھیمی آواز میں چل رہی تھی۔ یہ غیر معمولی حد تک شاندار رہائش گاہ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میڈم صفورا ہمیں مرعوب کرنا چاہتی ہے۔

''کوئی خدمت سر؟'' ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''تھینک یو۔ فی الحال ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن ذرا آرام کرنے کے لیے تھکنا ضروری ہوتا ہے۔'' اقبال نے بھی معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ابھی ذرا اپنی ٹانگوں کو سنبھالو۔'' عمران نے سرزنش کی۔

''چلو پھر تھوڑا سا مساج ہی کرا دو۔ ہمیں کچھ تو قدر دو جوان مہربان میزبانوں کا۔'' اقبال چہکا۔

عمران نے ایک لڑکی کو مساج کے لیے کہا۔ وہ تو جیسے اشارے کی منتظر تھی۔ اس نے جھٹ ایک الماری میں سے دو تین امپورٹڈ آئل نکال لیے۔ ''چلو جی چلیں۔'' اقبال اٹھ کر بغلی کمرے کی طرف بڑھا۔

عمران نے اسے گردن سے دبوچ کر دوبارہ بستر پر ڈال دیا۔ ''جو کچھ کہا ہے یہیں پر کراؤ... ہمارے سامنے۔ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

''پھر کیا فائدہ؟'' اقبال نے ٹھنڈی سانس بھری اور غم انگیز لہجے کی آواز میں بولا۔ ''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ٹیلی فون پر منگنی کرنے کے بعد ٹیلی فون پر ہی سہاگ رات منا لو۔ ٹھیک ہے بی بی! جاؤ تم۔ ابھی ہمارے ستارے آپس میں نہیں مل رہے۔'' اس نے آخری فقرہ لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ لڑکی اس کی آواز اور اسٹائل پر ششدر رہ گئی۔

عمران نے بڑی احتیاط سے اس وسیع بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ پھر ایک کاغذی چٹ پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ لکھا تھا۔ ''ہمیں بات کرتے ہوئے بہت احتیاط کرنی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں ہمیں دیکھا اور سنا جا رہا ہو۔''

اس کے بعد یہی چٹ اس نے اقبال کو دکھائی۔

میں عمران سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میڈم صفورا سے اس کی کیا بات چیت ہوئی ہے اور میرے گھر والوں کے بارے میں اس نے میڈم سے کیا تحفظ حاصل کیا ہے۔ عمران نے میرے تاثرات سے میرا ارادہ بھانپ لیا اور میرا ہاتھ دبا کر بولا۔ ''ایک دم بے فکر ہو جاؤ۔ میڈم جی سے ساری بات ہو چکی ہے۔ نو پرابلم ایٹ آل۔''

اس رات میں بہت تھوڑی دیر کے لیے سویا۔ دوسری طرف عمران اور اقبال بے فکری سے پڑے رہے۔ وہ جیسے اپنے ہی گھر میں سو رہے تھے۔ عجب مزاج تھے ان کے۔ چند گھنٹے پہلے پیش آنے والے واقعات کی فلم کئی بار تصور کے پردے پر چلتی رہی اور میں بے قرار ہوتا رہا۔ سب سے اہم سوال میرے ذہن میں یہی ابھر رہا تھا کہ صبح جب سیٹھ سراج کو میری یہاں موجودگی کا علم ہوگا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟

اگلے روز ہم دونوں نے بہترین باتھ روم میں غسل کیا اور وارڈ روب میں سے اپنی پسند اور اپنے ناپ کے کپڑے نکال کر پہنے۔ اقبال اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے ان سہولتوں سے محروم رہا۔ ابھی ہم ایک پُرتعیش ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سیٹھ سراج، شیرا اور ایک دراز قد شخص اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، دراز قد شخص سیٹھ سراج کا ساتھی عارف خان تھا۔

میرے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ آخر میرا اور سیٹھ کا سامنا ہو ہی گیا تھا۔ میرا ابھی ساتھ تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن عمران یہاں موجود تھا اور اس کے ہوتے مجھے کیا فکر ہو سکتی تھی۔ حیرت انگیز طور پر سیٹھ سراج نے آگے بڑھ کر عمران اور اقبال سے ہاتھ ملایا اور پھر میری طرف بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے سراج سے مصافحہ کیا۔ سب ایک صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اسی دوران میں میڈم صفورا بھی تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے بھی سب سے ہاتھ ملایا۔ پھر سیٹھ سراج سے مخاطب ہو کر بولی۔

''سراج! یہ بات اب کلیئر ہے کہ عمران اور اس کے دونوں ساتھی اب ہمارے ساتھ شامل ہیں اور ہمارا ہی ایک حصہ ہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے اپنے ہی ساتھیوں کا ایک دوسرے سے اختلاف رکھنا بالکل پسند نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے، اسے آپ سب ابھی بالکل بھول جائیں اور ایک نئے تعلق کی شروعات کریں۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی میڈم... لیکن...''

''لیکن نہیں سراج... یہ لفظ ''لیکن'' مجھے زہر لگتا ہے۔ جو کچھ میں نے تم سب سے کہہ دیا ہے، اس میں ''لیکن'' کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''ٹھیک ہے میڈم!'' سیٹھ نے مدھم لہجے میں کہا۔

''تمہارے سامنے ٹھن کیسے بولا ہے۔''

''تم نے بھی سن لیا ہے شیرے؟''

''ہاں جی میڈم!''

''چلو اٹھو... پھر ایک دوسرے سے گلے ملو۔''

سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آئندہ کیا ہو گا لیکن رسمی طور پر کشیدگی کم ہوتی نظر آتی تھی۔

سیٹھ سراج جب مجھ سے گلے مل کر پیچھے ہٹا تو ایک لمحے کے لیے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میری آنکھیں ملیں۔ ایک بار پھر وہی چنگاری سی اس کی نگاہوں میں نظر آئی جو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی اور جس کی وجہ نے میرے دل میں انجانا خوف پیدا کیا تھا۔ کیا یہ چنگاری واقعی دوبارہ نظر آئی تھی یا محض میرا وہم تھا؟

کچھ ہی دیر بعد سیٹھ سراج، شیرا اور عارف خان واپس چلے گئے۔ سیٹھ سراج کا بھاری بھرکم ڈولتا ہوا جسم میری نگاہوں سے اوجھل ہوا تو مجھے ایک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔

صلح صفائی کی اس کارروائی سے عمران بھی کچھ زیادہ مطمئن دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس کی وجہ جانی پہچانی تھی۔ چھوٹی میڈم نادیہ اس کارروائی میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ قرین قیاس تھا کہ میڈم صفورا نے اسے بلایا ہو لیکن وہ کسی بہانے سے کترا گئی ہو۔ وہ بر ملا سے میں موجی اور من مانی کرنے والی دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے ہینڈل کرنے میں میڈم صفورا کو بھی دشواری محسوس ہوتی ہے۔

کل رات میں نے نادیہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔ میڈم صفورا کی مداخلت کے بعد وہ عمران کو ایسی نظروں سے گھور رہی تھی جن میں حرص کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی گہری مایوسی بھی شامل تھی۔ جیسے کوئی

خبردار! یہاں سے کچھ نہ خرید ہو ورنہ تم لی پہاڑ میں برف پر پھسل کر اپنی ہڈیاں پسلیاں تڑوا کر آرام سے اسپتال میں مزے کرو گے اور برف سمیٹنے کا کام مجھے کرنا پڑے گا۔

بھوکا شکاری اپنے ہاتھ سے نکلنے والے لذیذ شکار کو دیکھتا ہے۔

رات کو عمران نے مزاحیہ لہجے میں مجھ سے کہا تھا کہ میڈم صفورا منظر سب اس کی سرپرستی میں ہونے والی ہے... اور لگتا تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی گرویدہ نظر آنے لگی تھی اور یہ سب کچھ بہت تھوڑے وقت میں ہوا تھا۔

ہم کوٹھی کے لان میں آبیٹھے۔ یہ بڑی سرسبز جگہ تھی۔ اسے چاروں طرف سے مجھ روزینا کی سات آٹھ فٹ اونچی باڑ نے گھیر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں کسی قسم کے ڈکٹا فون یا ریکارڈنگ ڈیوائس کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ "میرے گھر والوں کے بارے میں میڈم نے کیا کہا ہے؟"

"میڈم نے ہر طرح تسلی بلکہ گارنٹی دی ہے کہ سینیٹر سراج وغیرہ کی طرف سے تمہاری فیملی کو کسی طرح کا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوگا۔ میڈم نے سینیٹر سراج اور عارف خان وغیرہ سے ساری بات کرلی ہے۔ اس کے باوجود میں نے مزید احتیاط کے طور پر انہیں کچھ روز کے لیے ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا ہے۔"

"کہاں؟"

"ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں۔ یہ میرے ایک دوست کی ملکیت ہے۔ میڈم اور اس کے ساتھیوں کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ یہاں دو گارڈز بھی موجود رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے ایک گاڑی بھی ہے۔"

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ یہاں ہمارے عزیز رشتے دار اور جاننے والے ہیں۔ وہ کیا سوچیں گے کہ ہم اچانک دربدر بھائی کی طرح گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں؟"

"اچانک نہیں گئے یار! سب کچھ طریقے سے ہوا ہے۔ میں نے کل فون پر تمہاری والدہ سے کافی دیر بات کی تھی۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ حفاظت کی غرض سے انہیں چند دن گھر سے دور رہنا ہوگا۔ اس دوران میں تمہارے سارے گھر کا رنگ روغن ہوگا اور مرمت وغیرہ ہوں گی۔ کم از کم ایک ڈیڑھ مہینا تو لگ ہی جائے گا ان کاموں میں۔ یہ گھر سے دور رہنے کی ایک معقول وجہ ہوگی۔ اور ویسے بھی یار! عنقریب ثروت بی بی کے ساتھ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ گھر کا حلیہ تو ٹھیک کرنا ہی ہے نا۔" اس نے آنکھ ماری۔

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں... اور میرے خیال میں تمہیں بھی اس معاملے کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔"

"یار! اس میں غیر سنجیدگی والی کون سی بات ہے؟ تمہاری شادی ہونی ہے ثروت سے۔ دونی ہے جتنی جب ہونی ہے... اور میں نے گواہوں کے خانے میں اپنا نام لکھوا لیا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں بھول گیا ہوں... ہر گھڑی تمہارے ماتھے پر سجنے والے سہرے کا خیال میرے ذہن میں رہتا ہے۔"

میں نے اس کی بات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ میری اور میرے گھر والوں کی بھی ساری زندگی تم نہیں ہو رہی ہے۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق وہ لوگ واقعی ڈیفنس چلے گئے ہیں تو پھر بھی انہوں نے وہاں ہمیشہ تو نہیں رہنا۔ ... میری بہن فرح کو کالج جانا ہوتا ہے... وہ کیا گھر میں بیٹھے رہیں گے اور پڑھائی کا حرج کریں گے؟"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عاطف کے امتحان ہو چکے ہیں اور وہ آج کل فارغ ہے۔ مسلم فرح کی کلاس بھی آج کل بند ہے میں بس دو روز ہوئی ہے۔ اگر اسے جانا بھی ہوا تو وہ گاڑی میں پوری حفاظت کے ساتھ جائے گی۔ تمہیں بتایا ہے نا، یہ ساری میری ذمہ داری ہے۔ تمہاری والدہ اور گھر والے پوری طرح مطمئن ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں ان سے فون پر تمہاری بات بھی کرا دیتا ہوں۔"

ابھی ہماری بات جاری تھی کہ میڈم صفورا آگئیں۔ ان کے ساتھ ہی کل والا ڈاکٹر تھا۔ میڈم صفورا نے اپنی نگرانی میں اقبال کی زخمی ٹانگیں چیک کروائیں۔ ڈاکٹر نے موبائل فون پر کسی دوسرے سینیئر ڈاکٹر سے مشورہ بھی کیا۔ اس نے اپنے جدید موبائل کے ساتھ اقبال کی زخمی ٹانگوں کی کچھ تصویریں کھینچیں اور انہیں سینیئر ڈاکٹر ایم ایس کو بھیجا۔ سینیئر ڈاکٹر نے فون پر اقبال سے بات کی اور دوائیں تجویز کیں۔

اندازہ ہوتا تھا کہ میڈم صفورا ہماری دیکھ بھال میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ میڈم صفورا اور ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر گراس لان میں آ کر [illegible] کرنے لگے۔ جاتی سردیوں کی نرم دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ایک خوبرو ملازمہ ہمارے سامنے چھوٹی تپائی پر مالٹے اور سرخ انار کا جوس رکھ گئی۔ میں نے عمران سے پوچھا کہ یہ سارا کیا گورکھ دھندا ہے اور وہ میڈم صفورا جیسی عورت کو کس طرح زیر کرنے میں کامیاب ہوا ہے؟

عمران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں نے میڈم کو قائل کیا کہ اسے ہماری ضرورت ہے۔ جب وہ مان گئی تو اس نے ہمارے بیچارے دل میں زہریلا "ایجاد" کرلیا۔"

"ہم اس کی کیا ضرورت پوری کر سکتے ہیں؟"

"دیکھو جو اس وقت اس کے دل کا روگ بنی ہوئی ہے۔ وہ نوادرات کا کاروبار کرتی ہے۔ اس حوالے سے ہر طرح کے نوادرات میں اس کی بے حد دلچسپی ہے۔ کوئی اچھا پیس آف آرٹ دیکھ کر اس کی ایسی حالت ہوتی ہے جو پانچ روز کے بھوکے کی گرم گرم روٹی اور چکن کڑاہی دیکھ کر ہوتی ہے۔ اب یہ چکن کڑاہی اس سے دور ہے اور اس کی بھوک روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔"

"وہ پیس آف آرٹ کیا ہے جس کے لیے اچھے لوگ دیوانے بنے ہوئے ہیں؟"

"بدھا کا ایک نادر مجسمہ۔ یہ فاقے کی حالت میں ہے۔ اسے 'فاسٹنگ بدھا' کہا جاتا ہے۔ اس کی تخلیق میں بے پناہ فن کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ فاقہ زدہ بدھا کے پنجر اور اس کے رگ پٹھوں اور دھنسی ہوئی آنکھوں کو نمایاں کرنا ایک نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔ اس طرح کے مجسمے جو مختلف عجائب گھروں میں ہیں ان میں بھی کوئی نہ کوئی خامی رہ گئی ہے۔ صدیوں کا سفر طے کرکے جو ہم تک پہنچے ہیں ان میں کچھ نہ کچھ ٹوٹ پھوٹ ضرور ہوتی ہے۔ کہیں انگلیاں نہیں ہوتیں، کہیں ناک نہیں ہوتی اور کہیں سر علیحدہ اور دھڑ علیحدہ پایا جاتا ہے۔ ایسے مجسموں اور چھوٹی مورتیوں کو ماہرین بعد میں جوڑ کر مکمل کرتے ہیں۔ بہت کم پیس آف آرٹ ایسے ہوتے ہیں جو شان دار ہونے کے علاوہ مکمل بھی ہوتے ہیں۔ بدھا کا یہ مجسمہ ان میں سے ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈم اسے حاصل کرنے کے لیے دیوانی ہو رہی ہے اور میڈم کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کی یہی کیفیت ہے۔"

"وہ اس کا کیا کرے گی؟"

"اس کا ایک پرائیویٹ میوزیم بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لیے خرید رہی ہو... یا پھر اس کا خیال ہو کہ وہ اسے زیادہ مہنگے داموں فروخت کر سکتی ہے۔ آج کل جاپان اور تھائی لینڈ وغیرہ میں یہ کام زوروں پر ہے۔"

"تو کیا تم نے اس سے کہا ہے کہ تم وہ مجسمہ اسے لادو گے؟"

"ہاں، کچھ ایسی ہی حماقت کی ہے میں نے۔" وہ مسکرایا۔

"اس حماقت کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اس کی یہ خواہش پوری کر دیں گے اور وہ خوشی سے نہال ہو کر ہم تینوں کی... نہیں نہیں... ہم میں سے کسی ایک کی زوجیت میں آجائے گی۔" وہ پھر چہکنے لگا۔

"یعنی تم وہ پیس آف آرٹ حاصل کرلو گے... لیکن کیسے؟ یہ کام اتنا آسان تھا تو پھر یہ لوگ خود کیوں نہ کر سکے؟"

"یہ لوگ اس لیے نہیں کر سکے کیونکہ یہ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل نہیں چلا سکتے... دس پچاس فٹ کی بلندی پر بغیر جال کے ہوا میں کرتب نہیں دکھا سکتے... اور پستول کے چیمبر میں تین گولیاں ڈال کر خود پر فائر نہیں کر سکتے۔" وہ عجیب انداز میں بولا۔ اس کے اندر کی بے پناہ توانائی اس کی مسکراتی آنکھوں میں جھلک رہی تھی اور معصوم چہرے پر لہریں لے رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ ہم اس معاملے کو خطرناک حد تک خطرناک بناتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم جو بھی کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک بندے کی جان ہماری وجہ سے جا چکی ہے۔ اب یہ نہ ہو کہ کوئی اور جان چلی جائے۔"

فقیر

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ پاکستان کا سب سے صاف ستھرا اور خوب صورت شہر اسلام آباد ہے، وہاں کیوں نہ جایا جائے۔ وہاں منہ بولے بھائی ایک دفعہ اہل و عیال کے ساتھ گئے... ایک عزیز کے بیٹے کی شادی تھی، انہوں نے گردن میں ہار ڈالے اور کہا "میں آیا ہوں"... وہ شہر جو پاکستان کا حصہ لگتا ہی نہیں، وہاں فقیروں کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ سو میں اسلام آباد چلا گیا اور یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ واقعی وہاں کوئی فقیر نہیں تھا۔ عالی شان شاہراہیں تھیں، لمبی لمبی کاریں تھیں، لوگ سوٹوں میں ملبوس "موٹے" تازے پھر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے گھر کا رخ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کیسے آئے؟ میں نے کہا فقیروں سے بھاگ کر آیا ہوں، خدا کا شکر ہے اس شہر میں کوئی فقیر نہیں ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا "یہ آپ سے کس نے کہا، یہ شہر تو فقیروں سے بھرا پڑا ہے۔" میں نے عرض کی، "میں نے پورے شہر کا چکر لگایا ہے مجھے تو کوئی فقیر دکھائی نہیں دیا۔" اس پر ایک بار پھر ڈاکٹر صاحب کا قہقہہ گونجا اور بولے "یہ آپ کی خوش فہمی ہے، دراصل ان دنوں اسلام آباد کے سارے فقیر وزیر خزانہ کی قیادت میں واشنگٹن بھیک مانگنے گئے ہوئے ہیں!"

("ہنسنا منع ہے" عطاء الحق قاسمی کی کتاب سے انتخاب: فیضان بلال)

"میں نے کہا ہے نا...یہ اندیشہ سب سے آخر میں ذہن میں آنا چاہیے۔ سب سے پہلے تمہارے ذہن میں آیا ہے۔"
"مگر کرنے کیا؟"
"بس دیکھتے جاؤ۔ جو کام ان کو پہاڑ نظر آ رہا ہے وہ ہم چٹکی بجاتے کریں گے۔ اس طرح سے..." اس نے باقاعدہ چٹکی بجانے کی کوشش کی مگر ہاتھ زخمی تھا اس لیے کراہ کر رہ گیا۔
اسی دوران میں میڈم صفورا پھر آ گئی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی تھی۔ جینز شرٹ اور اونچی ایڑی والی جوتی کے ساتھ وہ خاصی اسمارٹ نظر آ رہی تھی۔ شولڈر بیگ اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس نے بیگ میں سے پانچ پانچ ہزار کے کرنسی نوٹوں والی چار گڈیاں نکالیں اور عمران کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ خرچے وغیرہ کے لیے رکھو۔ شام تک ایک کریڈٹ کارڈ بھی تمہیں مل جائے گا۔"
"اس کی کیا ضرورت ہے میڈم! جب ضرورت پڑے گی آپ سے خود مانگ لوں گا۔"
"نہیں نہیں، یہ رکھو۔ اس سے مجھے تسلی رہے گی... بلکہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ..." وہ کہتے کہتے ناگہاں رک گئی۔
"جی فرمائیں... آپ رک کیوں گئیں؟"
"میں تو چاہتی ہوں کہ چھوڑو یہ سرکس وغیرہ۔ جو وہاں سے کماتے ہو اس سے چار پانچ گنا تم کہیں بھی کما سکتے ہو۔"
"میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے میڈم کہ سرکس میرا روزگار نہیں بلکہ شوق ہے۔ اور میرے لیے اسے فی الحال چھوڑنا ممکن نہیں ہے۔ ہاں، آپ کے حکم کے مطابق میں وہاں سے پندرہ روز کی چھٹی لے لیتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔ اس بارے میں مزید سوچ بچار کر لو۔ میری طرف سے تمہارے لیے ہر طرح کی آفر موجود ہے۔"
ہمارے پاس کچھ دیر تک مزید بیٹھنے کے بعد اور اپنائیت کا اظہار کرنے کے بعد میڈم صفورا واپس چلی گئی۔ یہ ملاقات تکلف برطرف اور بے تکلفی سے ہوئی تھی اور بات چیت کے دوران میں ہمارے اردگرد کوئی ملازم یا مجبور وغیرہ موجود نہیں تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے مختصر وقت میں میڈم صفورا عمران کو اپنے باقی تنخواہ داروں پر فوقیت دینے لگی ہے۔
اقبال نے کہا۔ "یار ہیرو! میڈم کی یہ "محبت" ہمیں کہیں لے نہ ڈوبے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں سراج اور شیرے جیسے بہت سے رقیب پیدا ہونے والے ہیں۔"
"جو پیدا ہونے والا ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ نیچر کا اصول ہے۔"
"نیچر کے اور بھی بہت سے اصول ہیں۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔ "آگ سے کھیلیں گے تو وہ ہمیں ضرور جلائے گی اور تم آگ سے کھیل رہے ہو۔ نہ صرف کھیل رہے ہو بلکہ آگے بڑھتے جا رہے ہو۔ میں اس معاملے میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اگر تم مجھے معاف رکھو تو بہتر ہے۔"
"ارے... تم تو سنجیدہ ہو گئے ہو۔ بالکل اس بیٹسمین کی طرح لگ رہے ہو جو ڈپریشن میں الٹی سیدھی ہٹ لگا کر آؤٹ ہو جاتا ہے۔ جا بے اپنے آخری میچ میں ہمارے انضمام الحق نے بھی..."
"خدا کے لیے عمران... خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔" میں نے تڑخ کر کہا۔ "میں اب اور تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔"
عمران نے ایک دم میرا ہاتھ دبا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور یاد دلایا کہ یہاں کیمرے اور مائیکروفون وغیرہ موجود ہیں۔
میں اٹھا اور جھنجلایا ہوا باہر لان میں آ گیا۔ گفتگو کے لیے یہ لان ہی مناسب تھا۔ عمران بھی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ ہم زرد گلاب کی کیاریوں کے پاس بیٹھ گئے۔
میں نے عمران سے دوٹوک لہجے میں کہا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اور جو کچھ کرنے جا رہا ہے، وہ بالکل میرے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ مجھے اپنے گھر والوں کی عزت اور سلامتی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے لہٰذا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ سمجھے۔ میں اب ایک قدم بھی اس کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوں اور اگر وہ مجھے چلنے پر مجبور کرے گا تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔
عمران نے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں مجھے سمجھانے بجھانے اور قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر پتا نہیں آج کیا بات تھی کہ میں نے اس کی ہر دلیل کو رد کر دیا اور کہا کہ میں اپنا راستہ ابھی اور اسی وقت اس سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔ میری آنکھوں میں بار بار آنسوؤں کی نمی آ رہی تھی اور اپنے اہل خانہ کی پریشانیوں کا خیال میرا خون جلا رہا تھا۔ میں نے عمران سے بس ایک بات کہی۔ میں نے کہا کہ وہ میڈم سے کہہ کر مجھے اس سارے چکر سے الگ کر دے۔ میں واپس اپنے گھر جانا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ میرے اہل خانہ بھی گھر واپس آ جائیں۔
"مگر تابی! سمجھنے کی کوشش کرو۔" عمران بولا۔ "جو بھی ہوا اور جس طرح بھی ہوا لیکن حقیقت اب یہی ہے کہ تم اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہو۔ یہ لوگ اب کسی صورت تمہیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔"
"نہ رہنے دیں لیکن اگر ہمیں مرنا ہے تو اپنی مرضی سے

مرنا چاہیں گے، تمہاری مرضی سے نہیں۔ تم جس طرح مجھے اس دلدل میں دھنساتے جا رہے ہو، مجھے تو لگ رہا ہے کہ ہماری موت بھی بدترین قسم کی ہو جائے گی۔" میرا لہجہ حتمی تھا۔
کافی دیر بعد عمران نے ایک گہری سانس لی اور ہارے ہوئے انداز میں بولا۔ "تم پر میرا کوئی زور نہیں ہے جگر! میں نے تو اس پہلی رات کو ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ تم موٹر سائیکل سے اتر کر جہاں چاہے جا سکتے ہو۔ تم اس وقت اتر جاتے تو بہتر ہوتا۔ بہرحال، اب بھی میں تمہیں زبردستی نہیں روکوں گا۔ ہاں اتنا ضرور چاہوں گا کہ میری وجہ سے تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو۔ مجھے بس تین چار دن کا وقت دو۔ میں سراج کے حوالے سے میڈم سے بات کروں گا۔ مجھے میڈم سے اس بات کی مکمل گارنٹی چاہیے کہ سراج یا مجید منگو کے چیلے چانٹے تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔"
"لیکن میں دو تین دن سے زیادہ کسی صورت یہاں نہیں رکوں گا۔" میرا لہجہ ایک بار پھر دوٹوک تھا۔
"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔" عمران نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "جہاں تک ثروت والا مسئلہ ہے... اس میں، میں نے تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ میں اس وعدے پر قائم ہوں۔ ابھی پرسوں ہی حاجی صاحب سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مکان کی رقم مل گئی ہے۔ وہ چار دن میں ناصر جرمنی سے وہ اکاؤنٹ نمبر بھیج دے گا جس میں رقم ٹرانسفر ہونا ہے۔ جیسے ہی اس کا سراغ لگا، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔"
"ٹھیک ہے جو میری قسمت میں ہے وہ ہو جائے گا۔ میں اپنے گھر والوں کی سلامتی داؤ پر لگا کر ثروت کو تلاش نہیں کر سکتا۔"
اس طویل گفتگو کے بعد میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ سہ پہر کو عمران مجھے بتائے بغیر ایک سرخ کار میں کہیں چلا گیا اور دو ڈھائی گھنٹے بعد واپس آ گیا۔ وہ کار خود ڈرائیو کر کے گیا تھا۔ رات کو میں لگژری بیڈ پر لیٹا دیر تک سوچ بچار کرتا رہا۔ مجھے عمران اور میڈم کی گارنٹی کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ میرا مستقبل بھی ثروت اور ناصر بھائی کے مستقبل سے ملتا جلتا ہے۔ مجھے بھی اب ہجرت کرنا تھی۔ ہجرت جو صدیوں سے ظلم و جبر کے ردعمل میں کی جاتی ہے۔ اس کے بہت سے درجے تھے۔ کچھ عظیم ہجرتیں عظیم مقاصد کے لیے کی گئیں۔ کچھ معمولی ہجرتیں مجھ جیسے معمولی لوگوں نے معمولی مقاصد کے

گر کی بات

ایک ادھیڑ عمر شخص اپنی بیوی کو گر کی باتیں سکھا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "اپنے ہاتھوں کو گرم پانی سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے پانی کو محسوس کر کے دیکھ لو۔"

دیوانہ

پہلا۔ "وہ اس قدر دیوانہ تھا کہ بالآخر اسے اسپتال جانا پڑا۔"

دوسرا۔ "کیوں، کیا ہوا تھا؟"

پہلا۔ "ہوا کیا تھا اس نے سگریٹ پی کر میز دان میں جھٹک دی اور پھر جوتے سے اسے بجھانے کی کوشش کر ڈالی۔"

لیے کیں۔ اب یہ بات تو طے تھی کہ سیٹھ سراج کے ہاتھوں میرے زدوکوب ہونے والا واقعہ کبھی لوگوں کے ذہنوں سے مٹے گا اور نہ میرے اپنے ذہن سے۔ اس لیے اپنے گھر واپس جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں اپنے ذہن میں جو منصوبہ بندی کر رہا تھا وہ یہی تھی کہ عمران اور اس کی خطرناک مصروفیات سے پیچھا چھڑانے کے بعد میں اپنے گھر والوں کے ساتھ جنوبی پنجاب یا پھر سندھ کے کسی شہر میں منتقل ہو جاؤں گا۔ چار چھ ماہ تک خاموشی سے حالات کا جائزہ لوں گا اور اگر صورت حال سازگار نظر نہیں آئی تو مکان وغیرہ فروخت کر دوں گا۔ کرائے کا مکان کہیں بھی لیا جا سکتا تھا... عاطف اور فریا کی پڑھائی بھی ایسی نہیں تھی کہ انہیں تعلیمی ادارہ تبدیل کرنے میں دشواری ہوتی۔
دو دن میں اسی ڈگر پر سوچتا رہا اور مجھے اپنی منصوبہ بندی میں خاصا وزن محسوس ہوا مگر تیسری صبح ایک بار پھر اندیشے دل میں گھر بنانے لگے۔ عمران نے یہ بات ٹھیک ہی کہی تھی کہ میں اس سارے چکر میں ملوث ہو چکا ہوں۔ تو کیا میں ملوث ہونے کے باوجود خطرناک لوگوں سے دور رہنے میں کامیاب ہو سکوں گا؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ کیا میں عمران کے بغیر تحفظ محسوس کر سکوں گا؟
میں اس شخص پر لاشعوری طور پر بے پناہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ کسی وقت مجھے یوں لگتا کہ یہ شخص ہر وہ کام کر سکتا ہے جسے کرنے کا عزم ارادہ کر لے۔ تو کیا "کن فیکون" جیسی خداداد صلاحیت رکھنے والے شخص کی پرخلوص دوستی سے محروم ہو

نالش رندلی تھی؟

صبح ناشتے پر میں نے عمران کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کی دھندلاہٹ تھی... اس نے ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا اور خلاف معمول چپ سا ہو گیا۔ عجیب جادو تھا اس شخص میں۔ وہ ہر کسی کو اپنے دائرۂ اثر میں لے لیتا تھا۔ شاید میں بھی اس کے دائرۂ اثر میں آ چکا تھا۔ اس کی پُرخلوص محبت سے محروم ہونے کا سوچ کر مجھے اپنے دل کی رگیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کیا تھا؟ کون تھا؟ کہاں سے آ دھمکا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

رات کو میں نے فون پر والدہ، فرح اور عاطف سے بھی بات کی۔ میرے اندیشوں کے برخلاف والدہ اور فرح وغیرہ پریشان نہیں تھے بلکہ میں نے پہلی بار ان کے لب و لہجے میں طمانیت محسوس کی۔ والدہ نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ تین روز پہلے عمران خود انہیں اس نئے گھر میں چھوڑ کر گیا ہے۔ والدہ نے کہا کہ وہ یہاں زیادہ تحفظ اور اطمینان محسوس کر رہی ہیں۔ انہوں نے عمران کی بہت تعریف کی اور کہا۔ ''ایسے دوست قسمت سے ملتے ہیں بیٹا جی! عمران کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ تمہیں تمہاری پریشانیوں سے نکال لے گا۔ بڑا اچھا ہے اس کے اندر۔ تم تو مجھے کچھ بتاتے نہیں ہو لیکن اس نے کچھ باتیں بتائی ہیں۔''

اتنے میں فرح نے والدہ سے فون لے لیا اور بولی۔ ''ہیلو بھائی! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں، عمران بھائی بڑے اچھے ہیں۔ انہوں نے یہاں ہماری ہر سہولت کا خیال رکھا ہے۔ سگے بھائیوں کی طرح میرا ماتھا چوم رہے تھے۔ لگتا ہے کہ ان کے ہاتھ کافی لمبے ہیں۔ ایسے لوگ سیٹھ سراج اور تھانے دار اشرف جیسے لوگوں سے اچھی طرح نمٹ سکتے ہیں۔ ویسے وہ بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق ''خفیہ پولیس'' سے ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ عمران نے خفیہ پولیس والا شوشا یہاں بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی کوئی بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی تھی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری کلاسز کا کیا ہوگا؟''

''میں کل گئی تھی بھائی۔ اب اگلے ہفتے جاؤں گی۔''

''کیسے گئی تھیں؟''

''جانا تو ڈرائیور کے ساتھ تھا مگر اس وقت اتفاق سے عمران بھائی خود آ گئے۔ کہنے لگے، چلو آج میں جاؤں گا اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ۔ راستے میں ''جیب اسٹور'' سے دو ہزار کی چاکلیٹس لے دیں۔ کہنے لگے کہ واپسی پر ڈرائیور لینے آئے گا، ساتھ میں گارڈ بھی ہوگا مگر ان گارڈز کو دیکھ کر پریشان نہیں ہونا۔ یہ صرف تمہاری شان و شوکت بڑھانے کے لیے ہیں۔ تسلی دے رہے تھے کہ چھوٹی موٹی پریشانیاں ہیں، جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر ان گارڈز کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بہت اچھے ہیں۔ ان کے ساتھ ہوتے ہوئے عجیب سی سیکیورٹی محسوس ہوتی ہے۔''

فرح نے عمران کے زخمی ہاتھ کے بارے میں بھی پوچھا کہ انہیں کیسے چوٹ لگی ہے؟ کیا انہوں نے کسی سے مار پٹائی کی ہے؟ میں نے بس کوئی موٹا سا جواب دیا۔ میں اسے کیا بتاتا۔

اس موقعے پر والدہ نے ایک بار پھر میری بہن فرح سے فون لے لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''میں نے تیرے لیے بڑی دعائیں کی ہیں بیٹا جی! رو رو کر اللہ سے کہا ہے کہ وہ تیری مشکلیں آسان کرے... تیری مدد کرے۔ میرا دل کہتا ہے کہ میری دعائیں قبول ہوئی ہیں... تیرے اس دوست کی شکل میں اللہ نے تیرے لیے مدد بھیجی ہے۔ تم اس کی دوستی سے منہ نہ موڑنا۔ وہ تیرے بارے میں کچھ بھی مانگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، تابش مجھ سے کچھ ناراض ہے۔ کیا تمہارے درمیان کوئی بات ہو گئی تھی؟'' والدہ نے بڑے درد سے پوچھا۔

''نن... نہیں امی! بس یونہی کہہ دیا ہوگا اس نے۔''

''دیکھو بیٹا!'' والدہ نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''تیرے بارے میں میرے دل سے جو آواز آتی ہے، وہ کبھی جھوٹی نہیں ہوتی۔ میں نے بہت دفعہ آزمایا ہے۔ اب بھی میرے دل سے آواز آ رہی ہے کہ تیرا یہ دوست تیرے اور ہم سب کے لیے نیک شگون ثابت ہوگا۔ اس کی دوستی پر شک نہ کرنا۔''

میں حیران رہ گیا۔ والدہ نے ایک مختصر سی رفاقت کے بعد عمران کے بارے میں ایسا بیان دے دیا تھا۔ مجھے والدہ کے وجدان پر یقین تھا۔ وہ اس خاص لب و لہجے میں جب بھی کچھ کہا کرتی تھیں، وہ کسی نہ کسی شکل میں پورا ہو جاتا تھا۔

ٹیلی فون پر بات ختم کرنے کے بعد بھی میں دیر تک والدہ کے لفظوں پر غور کرتا رہا۔ میرے اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز بھی والدہ کے خیال کی تائید کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب عمران کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی بے لوث و بے لاگ دوستی ایک تیز اثر نشے کی طرح تھی اور یہ نشہ کچھ ہی عرصے میں میرے رگ و پے میں سرایت کر کے میری ''ناقابلِ مزاحمت ضرورت'' بن گیا تھا۔ بے لوث دوستی کا لفظ ہم ہزاروں بار استعمال کرتے ہیں مگر اس لفظ کو اصل معنی عمران نے دیے تھے۔ مجھے لگا کہ میں اس پہلی رات کی طرح آج بھی اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوں اور اب اس موٹر سائیکل سے کبھی اتر نہیں سکوں گا۔

اگلے روز میڈم نے لال کوٹھی کے شاندار ڈائننگ ہال میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس میں سیٹھ سراج، عارف خان، شیر محمد شیرا اور شیرے کا ساتھی بختیار بھی شامل تھا۔ یہ پارٹی ایک طرح سے اہم ملازمین کے درمیان ''وارڈی نیشن'' قائم کرنے کے لیے تھی۔ غیر متوقع طور پر اس میں چھوٹی میڈم یعنی نادیہ نے بھی شرکت کی۔ اس پارٹی میں میڈم صفورا نے پھر اپنی بات دہرائی۔ اس نے کہا کہ اب عمران اور اس کے دونوں ساتھی ہمارے اسکواڈ کا حصہ ہیں۔ ہمیں اب اپنی ساری پرانی رنجشیں بھلا کر اور مل کر کام کرنا ہے۔ ہمیں اپنے گلے شکوے دور کر کے اپنے دل صاف کر لینے چاہئیں۔

میڈم نے خاص طور سے مجھے اور سیٹھ سراج کو ساتھ ساتھ بٹھایا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو بلی! جب نیا تعلق بنتا ہو تو پرانی باتیں بھلانا پڑتی ہیں۔ مجید، سیٹھ سراج کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ اس کی موت جس طرح ہوئی، وہ ہم سب جانتے ہیں۔ سراج کے لیے یہ ایک بڑا صدمہ ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح تمہارے لیے تمہاری منگیتر کا اغوا تھا۔ بے شک سراج کے صاحب زادے کی یہ ایک سنگین غلطی تھی اور اس غلطی کے اثرات دور تک گئے۔ بہرحال، اب یہ غلطیوں کو کھلے دل سے معاف کر دینے کا وقت ہے...''

میڈم نے اس طرح کی اور بھی کئی باتیں کیں۔ اس نے اس بات کی تصدیق کی کہ سراج کا بیٹا واقعی پاکستان سے باہر جا چکا ہے اور وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ بھی ہے۔ آخر میں میڈم نے مجھے مجبور کیا کہ میں سیٹھ سراج سے ایک بار پھر خلوص دل سے گلے ملوں۔

میں نے ایسا کرنے سے پہلے ایک نگاہ عمران پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر موافق تاثرات تھے۔ میں نے سیٹھ سراج سے معانقہ کیا لیکن ایک بار پھر لگا کہ صرف سینے سے سینہ ملا ہے، دل سے دل نہیں۔

تین چار خوش رو لڑکیاں تتلیوں کی طرح ہمارے اردگرد چکرا رہی تھیں۔ ان میں سے دو تو بھی تھیں جو خاص ہماری خدمت پر مامور تھیں۔ ان میں سے ایک تیکھے چہرے والی لڑکی کا نام سائرہ تھا۔ وہ زیادہ تر عمران کے اردگرد ہی منڈلا رہی تھی۔ اب بھی اس ماہ رخ لڑکی نے جسم کو نمایاں کرنے والا ہوش رُبا لباس پہن رکھا تھا اور ہمارے اطراف میں چکرا رہی تھی۔ ڈیک پر دھیمی دھن بج رہی تھی۔ ایک طرف بار تھا۔ چمکتی بوتلیں اور شفاف گلاس گردش کر رہے تھے۔ بار کے سامنے رقص ہو رہا تھا۔ پس پردہ مدھم آواز میں میوزک چل رہا تھا اور ڈانس فلور پر ایک لڑکی مسلسل اپنے پُرشباب جسم کو تھرکا رہی تھی۔ یوں لگتا ہے وہ تھرکتی تھرکتی نشست گاہ میں بھی آ جاتی تھی اور حاضرین کو گلاس، سوڈا، سگریٹ وغیرہ سرو کرتی تھی۔

یہ سارا فائیو اسٹار سے کہیں اوپر کا ماحول تھا۔ میڈم نادیہ کچھ خاموش سی تھی۔ بہرحال تقریب میں حصہ لے رہی تھی۔ دیگر حاضرین کی طرح وہ بھی مسلسل پیگ لے رہی تھی... بلکہ اس معاملے میں وہ سب سے آگے دکھائی دیتی تھی۔ عمران نے اس خوش گوار ماحول سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس نے میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔''

''بولو... بولو۔ بغیر اجازت کے بول سکتے ہو۔'' صفورا نے بیئر کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''یہ خوشی کا موقع ہے میڈم! ہم نے ایک دوسرے کی تلخیوں کو درگزر کر کے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ کیوں نہ اس موقعے کی مناسبت سے سلیم کو بھی معاف کر دیا جائے۔''

میڈم صفورا نے نادیہ کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا تنک کر بولی۔ ''دشمن اور غدار میں فرق ہوتا ہے... اور سلیم لنگڑا غدار ہے۔''

''مگر میرے خیال میں اس کو کافی سزا مل چکی ہے میڈم نادیہ! ہم پرسوں بھی پورا ایک گھنٹا اس کے چلانے کی آوازیں سنتے رہے ہیں۔''

''تم اپنے طور پر کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کافی سزا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ کچھ بھی نہ ہو۔'' نادیہ کڑوے انداز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا تھا۔

میڈم صفورا نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا اس بارے میں پھر بات کریں گے مگر جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوتا، سلیم سے کوئی مار پیٹ نہیں ہوگی... ٹھیک ہے نا؟'' میڈم نے نادیہ سے تصدیق چاہی۔

وہ جز بز نظر آ رہی تھی تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کھانا شاندار تھا۔ میں نے سیٹھ سراج کو ایک دفعہ پہلے بھی کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جیسے کھانے پر باقاعدہ حملہ کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک نئی حریص سی چمک ابھرتی تھی جیسی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر شراب کا دور چلا۔ اس دور میں عمران نے بھی بیئر کے ایک دو چھوٹے پیگ لیے۔ میڈم نادیہ بدمزاجی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اندرونی اضطراب کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ

اول ڈول بھی بول رہی تھی۔ بڑی بہن میڈم صفورا کسی کام کے لیے باہر گئی تو نادیہ اور بھی کھل گئی۔ وہ تھرکنے لگی اور گاہے بہ گاہے شرابیوں کے انداز میں لڑکھڑا لڑکھڑا کر بات کرنے لگی۔

اس نے میڈونا کے ایک جذبات انگیز انگلش گانے کے چند بول سنائے پھر ایک جوک سنایا جس کا تعلق سرکس کی جوہا مہی سے تھا۔ وہ عمران کے بالکل سامنے بیٹھی تھی اور اپنے سگریٹ کا دھواں جان بوجھ کر اس کی طرف چھوڑ رہی تھی۔ پھر وہ اپنا گلاس بھرنے کے لیے خود ہی اٹھی اور لڑکھڑا کر گر گئی۔ گرتے ہوئے اس کا ہاتھ عمران کے کندھے سے ٹکرایا اور اس کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ عمران کی گردن پر بجھ گیا۔ عمران تڑپ کر پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ عارف خان نے نادیہ کو سنبھال کر اٹھایا۔

نادیہ نشے کی حالت میں افسوس کا اظہار کرنے لگی۔ ''او، سوری... ویری ویری سوری۔ اوہ تمہاری تو گردن جل گئی۔'' وہ اس کی گردن پر پھونکیں مارنے لگی۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے یا اتفاقاً ہو گیا ہے۔

عمران کی گردن پر سرخ داغ نظر آ رہا تھا۔ نادیہ نے بہکے ہوئے انداز میں اپنے ٹشو پیپر سے اس داغ کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ ''میں معافی مانگتی ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا... اوہ نو... نہیں ہونا چاہیے تھا۔ واٹ کین آئی ڈو؟ اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو بھی میں تیار ہوں۔ یہ لو... یہ لو سگریٹ... تم بھی مجھے سگریٹ لگا سکتے ہو... جہاں چاہے لگا سکتے ہو۔'' اس نے اپنی گردن آگے کر دی اور سگریٹ عمران کے ہاتھوں میں تھمانے کی ناکام کوشش کی۔

''او، نو، پکڑو نا... پلیز ڈونٹ مائنڈ۔'' وہ بہکی آواز میں بولی۔ ''اچھا گردن پر نہیں لگانا چاہتے تو جہاں جی چاہے لگا لو... اس نے اپنی ٹی شرٹ کے بٹن تیزی سے کھولنا شروع کیے...'' وہ واقعی بہت بور رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر وہ بجھا سگریٹ زبردستی عمران کے ہاتھ میں تھمانے اور اسے اپنے عریاں جسم سے لگانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ لگتا تھا کہ تقریب کے دیگر حاضرین نادیہ کی ایسی حرکتوں کے عادی تھے۔ ان میں سے اکثر کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔

پتا نہیں کہ یہ قضیہ کیا رنگ اختیار کرتا کہ اسی دوران میں میڈم صفورا لیے ڈگ بھرتی اندر آ گئی۔ اس وقت نادیہ شرابی لہجے میں عمران کو مخاطب کر کے بول رہی تھی۔ ''بڑے مغرور ہو تم۔ کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو۔ کیا میں تمہارا احسان اپنی طرف رکھ لوں گی؟ ہرگز نہیں، ناٹ ایٹ آل... تم بھی مجھے سگریٹ لگاؤ... ابھی لگاؤ... نہیں تو میں تمہیں اس طرح تو ڑ دوں گی۔ ابس طرح... لائیک دیٹ۔'' اس نے شیمپین کی خالی بوتل تڑاخ سے دیوار پر توڑ دی۔

''یہ تو... کیا کر رہی ہو؟ ہوش کرو۔'' میڈم صفورا چلائی۔

نادیہ جواب دوسری بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی، ذرا ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے سرخ آنکھوں سے بڑی بہن کو دیکھا۔ تند و تیز لہجے میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ بولنے سے پہلے ہی بند کر لیا۔ میڈم دہاڑ کر بولی۔ ''ختم کرو یہ تماشا۔ کیوں اتنی شراب انڈیلتی ہو اپنے اندر... کیوں بیڑا غرق کر رہی ہو اپنا؟''

نادیہ نے باغی نظروں سے بڑی بہن کی طرف دیکھا۔ تاہم کچھ کہے بغیر ہی پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی تقریباً پون گھنٹے تک پارٹی چلتی رہی۔ سبھ سراج کی موجودگی مجھے سخت بے چین کر رہی تھی۔ بہرحال، میں نے جیسے تیسے وقت گزار لیا۔ میرا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ رات کو بھی میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ ایک بے نام تذبذب نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ عمران کا ساتھ چھوڑنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا، دوسری طرف اس کی خطرناک معروفیات کا ساتھ دینا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا۔ رات دو ڈھائی بجے کے لگ بھگ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں بستر پر لیٹا تھا۔ عمران اٹھ کر میرے پاس آ گیا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں سے کافی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''جی! لگتا ہے ابھی تک الجھن میں ہو؟''

مجھے لگا جیسے اس نے میرے دل میں جھانک لیا ہے۔ تاہم میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''کیسی الجھن؟''

''یہی الجھن کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ میری جماقتوں کا ساتھ دینا مشکل نظر آ رہا ہے۔ دوسری طرف مجھ پر ترس بھی آ رہا ہے۔ ہے نا یہی بات؟'' وہ اپنے مخصوص انداز میں میری طرف جھک کر بولا۔ لبوں پر وہی لیکن وہی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

اس نے دو لیے کش لے کر کہا۔ ''اچھا ایسے کرتے ہیں کہ فال نکالتے ہیں... دیکھتے ہیں کہ تمہارے چلے جانے کے حق میں فیصلہ آتا ہے یا نہ جانے کے حق میں۔''

''کیسی فال؟''

''بھئی، جس طرح کے ہم ہیں، ہماری فال بھی ویسی ہی ہو گی۔ میں اکثر ریوالور سے ہی فال نکالا کرتا ہوں اور میری فال اکثر ٹھیک نکلتی ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ دس پندرہ دن کی دوری پر اقبال اپنے بیڈ روم کی دو گولیاں کھا کر سویا پڑا تھا۔

''یار! تمہاری پہیلیوں جیسی باتوں سے مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔''

''اس میں پہیلی والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور کھلنڈرے انداز میں تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ یہ عمران کا اپنا ہی ریوالور تھا۔ کل ہی میڈم نے اسے واپس کیا تھا۔ ساتھ میں ایک موبائل بھی دیا تھا۔

عمران نے بڑے اطمینان سے ریوالور کے چیمبر میں ایک گولی ڈالی... اور مسکراتے ہوئے ریوالور کی نال اپنے بائیں ہاتھ کی نیلی پر رکھ لی۔ ایسا کرنے سے پہلے اس نے ریوالور کی چرخی کو دو تین بار گھما دیا تھا۔ ''گولی چل گئی تو چلے جانا۔ نہ چلی تو اپنے ارادے پر نظرثانی کرنا۔'' عمران نے عجیب وجدانی لہجے میں کہا۔

پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبا دیا۔ میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بہرحال، گولی نہیں چلی اور عمران کا ہاتھ جو گولی چلنے کی صورت میں نہایت شدید طور پر زخمی ہو سکتا تھا، محفوظ رہا۔

اس نے مجذوبی نظروں سے میری طرف دیکھا، بولا۔ ''اب کیا خیال ہے؟''

میں خاموش رہا۔ اس نے سگریٹ کے دو تین گہرے کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور ریوالور میری گود میں ڈال دیا۔ ہولے سے بولا۔ ''ویسے... میں نے ریوالور میں جو گولی ڈالی، وہ اصلی نہیں تھی۔''

''کیا مطلب؟''

وہ جواب دینے کے بجائے مسکراتا رہا اور نیا سگریٹ سلگا لیا۔ میں نے ریوالور کا چیمبر کھول کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ چرخی میں چار گولیاں موجود تھیں۔ بس دو خانے خالی تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ تین گولیاں پہلے سے ریوالور میں موجود تھیں۔

''کبھی کبھی مجھے تمہاری ذہنی حالت پر شک ہوتا ہے۔'' میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

''عقل اور عشق دو متضاد چیزیں ہیں جگر... جب عشق اشارے لیتے ہیں تو پھر عقل کے بجائے جنون سے کام لینا پڑتا ہے۔''

میں حیرت سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ رات کے ان خاموش لمحوں میں گلوری بیڈ روم کی کھڑکیوں سے باہر جھینگر چل رہی تھی، کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھا کسی داستانی کردار کی طرح مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وجدان کی روشنی تھی۔ ایسا وجدان جو بے حد پختہ یقین کے بطن سے پھوٹتا ہے۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں میرے لیے فیصلہ کرنا بہت آسان ہو گیا اور میرا فیصلہ تھا کہ میں عمران کے ساتھ رہوں گا اور دیکھوں گا کہ پردہ غیب سے میرے لیے کیا ظہور میں آتا ہے۔ بہرحال، اپنے اس فیصلے کے بارے میں میں نے عمران کو اگلی صبح ہی بتا دیا۔

وہ میرے فیصلے سے بہت خوش تھا... پتا نہیں کیوں؟ اگر معروضی انداز سے دیکھا جاتا تو وہ میرے لیے ہر طرح سودمند تھا جبکہ میں اس کے لیے ہر طرح بے سود۔ پھر بھی وہ مجھے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

''یار عمران! اگر تم چاہتے ہو کہ میرا دماغ ٹھیک کام کرتا رہے اور میں نفسیاتی مریض نہ بن جاؤں تو پھر مجھے پہیلیوں میں نہ الجھایا کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو اور میڈم سے تمہاری کیا باتیں طے ہوئی ہیں؟''

ہم دونوں گراسی لان میں بیٹھے تھے۔ اقبال کو ہلکا بخار تھا اور وہ بیڈ روم میں ہی لیٹا ہوا تھا۔

''تمہیں کس بات کا کنفیوژن ہے؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ بس کنفیوژن ہی کنفیوژن ہے۔ کوئی بات بھی ٹھیک سے میرے پلے نہیں پڑ رہی۔ تم نے معاملات کو بہت الجھا رکھا ہے۔''

''اچھا، ایسے کرتے ہیں کہ تم مجھ سے ایک ایک بات پوچھتے جاؤ، میں بتاتا جاتا ہوں۔''

میں نے کہنیوں کے بل نرم گھاس پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''جید صفورا اگر میڈم صفورا کا بندہ تھا تو وہاں جہلم میں کیا کر رہا تھا؟''

''بے شک وہ میڈم کا بندہ تھا مگر اس نے بتایا تھا کہ ابرار صدیقی سے بھی اس کی ملی بھگت ہو چکی ہے اور ابرار صدیقی اسے کبھی کبھی اپنے ساتھ ٹیکسلا اور مردان وغیرہ بھی لے کر جاتا تھا۔''

''وہاں جہلم میں جید کیا کر رہا تھا؟''

''ابرار صدیقی آج کل جہلم میں ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ وہیں ابرار صدیقی کا کوئی پیر طریقت بھی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو پیر صاحب کے ہاں کوئی محفل ہوتی ہے جو ساری رات جاری رہتی ہے اور کبھی کبھی دوسری رات تک بھی چلتی ہے۔ ابرار صدیقی کو اس محفل میں شریک ہونا تھا۔ اس کا خاص ملازم سلطان غائب کی حفاظت کرتا تھا۔ صدیقی کو اس

رہیں گے۔"

"باقی نگینے کہاں ہیں؟" عنایت نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"وہ تو پاس نہیں ہیں۔ یہ نمونہ آپ کے سامنے ہے۔ باقی بھی بالکل اسی طرح کے ہیں۔ بس چھوٹی بڑی کا فرق ہے سب میں۔"

عنایت علی چند سیکنڈ تک پُرسوچ انداز میں اپنا گنجا سا سر ہلاتا رہا۔ وہ اب اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ "بڑی سرکار" سے رابطہ کرنا ضروری ہے۔

اس نے عمران سے دو تین سوال مزید پوچھے پھر موبائل فون نکالا اور ابرار صدیقی کا نمبر ملایا۔ وہ ابرار سے بات کرنے لگا۔ اس نے ابرار کو ہماری آمد کے بارے میں بتایا۔ ہمارے نام بتائے اور ہمارے مال کی تفصیل بتائی۔ "جی ہاں... جی جی... کہتے ہیں کہ آٹھ ہیں اور ہیں۔ بالکل یہی سائز ہے... ایک ہی "سورس" سے لے ہیں... جی جی... قیمت زیادہ بتا رہے ہیں۔ آپ سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔"

عنایت علی نے پندرہ بیس منٹ تک دوسری طرف سے ملنے والی ہدایات سنیں پھر بولا۔ "ٹھیک ہے جناب! میں لے آتا ہوں ان کو۔ ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ او کے جی!"

فون بند کر کے وہ بولا۔ "صدیقی صاحب عام طور پر اس وقت ملتے نہیں ہیں لیکن آج جلدی گھر آ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ ٹیکسی پکڑنے اور وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹہ تو لگ ہی جاتا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم عنایت علی کے گھر سے روانہ ہو رہے تھے۔ ہماری کو ر لایت علی کے دروازے سے بس پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی مگر ہم اس کے پاس سے بیگانوں کی طرح گزر گئے۔ عمران کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس بارے میں اس نے کچھ تو مجھے بتایا تھا اور کچھ ابھی تک نہیں بتایا تھا۔ میں اس کے یار یا پھر زاد وشراکت کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھا۔ میری بیماری کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اس نے میری ایک کلائی کی وریدوں میں "کینولا" بھی لگوا رکھا تھا۔ اسے ٹیپوں سے میری کلائی کے ساتھ چپکایا گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مجھے اسپتال میں انجکشن وغیرہ لگتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عمران کے پاس ایک تقریباً پانچ انچ لمبا اسٹائلش سا سگریٹ لائٹر بھی تھا۔ مجھے پتا تھا کہ عمران بہت کم سگریٹ پیتا ہے اور وہ مستقل طور پر لائٹر وغیرہ اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ اب اگر یہ لائٹر اس کی جیب میں موجود تھا تو

اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔

ہم نے تقریباً دو فرلانگ تک پیدل ہی چل کر شہر کی اس نواحی بستی سے نکل آئے اور سڑک پر سے ٹیکسی لے لی۔ ٹیکسی نے... آدھے گھنٹے میں ہمیں ہمارے ہونے پہنچانے علاقے میں پہنچا دیا۔ یہ دہلی فردوس پلازا والا علاقہ تھا۔ ابرار صدیقی کا کنٹری فلیٹ اسی پلازا میں تھا۔ یہیں سے ہم نے چند روز پہلے مجید منو کا پیچھا کیا تھا۔ اس وقت ہم نے اس پلازا کو صرف دیکھا تھا، آج ہم اس کے اندر داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔

اب رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ کڑکتی سردی میں سڑکیں سنسان نظر آ رہی تھیں۔ عنایت علی ہمیں لے کر اس شاندار عمارت میں داخل ہوا اور بذریعہ لفٹ پانچویں منزل پر آ گیا۔ ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کا فلیٹ اسی فلور پر تھا۔

اس فلور پر داخل ہوتے ہی ہمیں ایک مسلح پرائیویٹ گارڈ کا سامنا کرنا پڑا... دوسرے گارڈ سے فلیٹ کے آہنی دروازے کے سامنے ملاقات ہوئی۔ عنایت علی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اس کے باوجود "میٹل ڈیٹیکٹر" کے ذریعے ہمیں چیک کیا گیا اور جیبیں وغیرہ ٹٹولی گئیں۔ آخر ہم تین بیڈ رومز والے اس وسیع فلیٹ میں داخل ہو گئے... کھڑی ناک اور عقابی آنکھوں والے ایک خطرناک صورت شخص نے ہمیں نشست گاہ میں بٹھایا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ یہی صدیقی کا خاص کارندہ سلطان ہے۔ وہ بے حد چوکس اور تیز طرار شخص دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کے جسم سے عجیب طرح کی بو آتی محسوس ہوئی، جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی جانور ہو۔ بہرصورت ساتھ اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے ابرار صدیقی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ابرار صدیقی ایک تنومند شخص تھا۔ اس نے ایک طرف مانگ نکال کر بال بنائے ہوئے تھے۔ سیاہ داڑھی خوب رو دکھائی دیتی تھی اور خاصی لمبی تھی۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ عمر بھی کوئی پچپن سال رہی ہوگی۔ اس کے ہاتھ میں نہایت چمکیلے دانوں والی ایک چھوٹی سی تسبیح بھی تھی جو اس نے ہم سے مصافحہ کرنے کے بعد سامنے شیشے کی تپائی پر رکھ دی۔

عنایت علی نے بڑے مؤدب انداز میں ابرار صدیقی سے ہمارا مختصر تعارف کرایا۔ اس دوران میں ابرار صدیقی بس اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ وہ کچھ چپ چپ دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں بھی سرخی مائل تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی یہ کیفیت موجودہ صورت حال کی وجہ سے ہے۔ وہ کنول پر فریفتہ تھا اور اس سے شادی کرنے کی پوری پلاننگ کر چکا تھا مگر اب اس کی یہ

ساری پلاننگ ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا اچانک ہوا تھا۔ کنول اپنی والدہ سمیت روپوش ہو چکی تھی... اور رتو اور کنول کا بھائی تو پہلے ہی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

تعارف ختم ہوا تو ابرار صدیقی نے اپنی گونج دار آواز میں ہم سے دو چار سوال پوچھے۔ عمران ان سوالوں کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ابرار کا اہم سوال یہی تھا کہ مجید منو سے ہمارا رابطہ کب اور کہاں ہوا تھا؟ عمران نے اس کا تسلی بخش جواب دیا۔ ابرار نے "نمونے" کا "نگینہ" دکھانے کے لیے کہا۔

عمران نے ایک بار پھر دبے دبے جوش کے ساتھ گرم چادر کے اندر اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور جڑاؤ شیر کا مجسمہ فلالین کے کپڑے سے نکال کر ابرار صدیقی کے سامنے کر دیا۔

ابرار نے بظاہر عام نظروں سے مجسمے کو دیکھا مگر اس کے چہرے پر شوق کی جو ایک چمک ابھری تھی، وہ پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ وہ ماہرانہ انداز میں "جیم" کے زیر و بم پر اپنی انگلیاں چلا کر دیکھتا رہا اب جیب سے عینک نکالی اور اپنا رخ روشنی کی طرف کر کے مزید باریک بینی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ وہ ہمارے لیے کسی طرح کا تکلف کرے گا... البتہ اب اس نے ملازم کو چائے کا کہا تو مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اس نگینے یا "پیس" کی اصل قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ یقین تھا کہ جس چیز کا سودا ہم سے چالیس پچاس ہزار میں کر رہا تھا وہ آگے چل کر دس پندرہ لاکھ یا اس سے بھی زیادہ کی قیمت پائے۔

اسی دوران میں ابرار صدیقی کے بیش قیمت موبائل فون پر کال آ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور مدھم آواز میں بولا۔ "جی حضرت..." اس کا انداز مؤدبانہ تھا۔ قیافہ لگایا جا سکتا تھا کہ دوسری طرف ابرار صدیقی کا وہی پیر و مرشد ہے جس کا تذکرہ مجید منو نے اپنی موت سے قبل کیا تھا۔

ابرار صدیقی کہہ رہا تھا۔ "جی حضرت... تلاش تو ہو رہی ہے جی... پوری کوشش کر رہے ہیں۔ بس آپ خصوصی دعا کیجیے گا۔ جی ہاں... جی ہاں... بھائی کا بھی کوئی پتا نہیں چلا۔ وہ سب اکٹھے ہی نکلے ہیں کہیں... نہیں حضرت... سراج یا میڈم خود تو ایسا نہیں کر سکتے۔ کم از کم میری عقل تو یہی کہتی ہے... یہ کوئی تیسری پارٹی ہے جی..." پھر ابرار صدیقی بات کرتے کرتے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے بولنے کی بس مدھم آواز ہم تک پہنچتی رہی۔ الفاظ اب سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ایڈووکیٹ مولانا ابرار

صدیقی صاحب اپنی گمشدہ محبوبہ کا تذکرہ فرما رہے تھے اور دوسری طرف ان کے پیر و مرشد صاحب تھے۔ لگتا تھا کہ ان پیر و مرشد صاحب کو ابرار صدیقی کی زندگی میں خاص الخاص اہمیت حاصل ہے۔ نشست گاہ کی دیوار پر نہایت قیمتی فریم میں ایک بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک پچاس پچپن سالہ شخص تھا۔ لمبی داڑھی تھی لیکن سیاہ تھی۔ ابھی لگا رکھی تھی۔ اس کی بھویں غیر معمولی طور پر گھنی تھیں اور ان بھووں کے نیچے لمبوتری آنکھوں میں خاص چمک تھی۔

میں نے نہایت مدھم آواز میں عنایت علی سے پوچھا۔ "یہ کون ہیں؟"

"حضرت صاحب ہیں... بڑے صاحب کے مرشد۔" اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

حضرت صاحب کے ہاتھ میں چاندی کا ایک نفیس سا کڑا نظر آ رہا تھا۔ ایسا ہی کڑا ابھی میں نے ابرار صدیقی کی کلائی میں بھی دیکھا تھا۔

دو چار منٹ بعد ابرار صدیقی واپس آ گیا۔ وہ اب قدرے پُرسکون نظر آتا تھا۔ اس نے پوری توجہ کے ساتھ نو عدد نگینوں کے بارے میں ہم سے بات چیت شروع کی۔ عمران نے یہ کہہ کر ابرار صدیقی کی دلچسپی میں اضافہ کیا کہ اس کے پاس ایک قدیم اسٹوپا کا ٹوٹا ہوا حصہ بھی ہے۔ اس قریباً چار مربع فٹ کے ٹکڑے پر تصویریں کندہ تھیں۔ اور وہ یہ ٹکڑا بھی نہایت مناسب قیمت پر اس کے حوالے کر سکتا ہے۔

چائے کے بعد ابرار صدیقی نے عنایت علی کو تو واپس روانہ کر دیا تاہم عمران کے ساتھ اس کی بے تکلف گفتگو جاری رہی۔ ابرار صدیقی جیسے نہایت گھاگ شخص کو مطمئن کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر عمران یہ کام بہ خوبی کر رہا تھا۔ نو عدد نگینوں کی قیمت کے بارے میں بھی عمران نے تکرار کا انداز اختیار نہیں کیا اور بڑے کھلے دل سے یہ معاملہ ابرار صدیقی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اس نے کہا۔ "صاحب جی! ہم غریب لوگ تو بس عزت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ آپ نے جو عزت دی ہے، اس سے پیسے پورے ہو گئے ہیں۔ باقی سودے میں چالیس پچاس ہزار روپے اوپر نیچے ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

فرق پڑنا بھی کیا تھا؟ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ نو نگینے موجود ہی نہیں ہیں۔ بس یہ ایک ہی نگینہ تھا جو عمران نمونے کے طور پر یہاں لے کر آیا تھا... اور یہ بھی ابرار صدیقی کو شیشے میں اتارنے کا ایک حربہ تھا۔

جو پروگرام ہم طے کر کے نکلے تھے، اس کے مطابق

ہمیں یہاں ابرار صدیقی کے شان دار اپارٹمنٹ میں رات گزارنے کی کوشش کرنا تھی۔ مجھے ایک مریض کی حیثیت سے اپنے ساتھ لانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ میرے لیے عمران کی ہدایت تھی کہ جب ہم یہاں سے جانے والے ہوں گے تو میری طبیعت اچانک خراب ہو جائے گی۔ سر شدت سے چکرانے لگے گا۔ مجھے کچھ دیر آرام کی ضرورت پڑے گی۔ امید تھی کہ اس موقع پر ابرار صدیقی اخلاق کا مظاہرہ کرے گا اور ہمیں اتنی رات گئے جانے سے روک دے گا۔ لیکن بیماری کے بہانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ باتوں میں رات کے دو بج گئے۔ یہ موسم بھی سخت سرد اور ابر آلود تھا۔ گاہے بگاہے چھینٹے پڑنے لگتے تھے۔ ابرار صدیقی کو گوارا نہیں ہوا کہ ہم اتنی خنکی کے ساتھ اتنی رات گئے واپس جائیں۔ اس نے رات کا باقی حصہ یہیں نشست میں ہی گزارنے کی آفر کی جو عمران نے دو بار انکار کرنے کے بعد بڑی انکساری سے قبول کر لی۔

نشست گاہ کے ساتھ ایک بچھا کمرا اس اپارٹمنٹ کے مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں بھی قالین موجود تھا۔ ٹی وی، گیس ہیٹر، اٹیچ باتھ اور دیگر سہولتیں بھی مہیا تھیں۔ اس کمرے کی ایک دیوار پر بھی حضرت جی کی بڑی سی پورٹریٹ آویزاں تھی۔ ایک ملازم نے ہمارے سونے کا انتظام کر دیا۔

ہم ڈبل بیڈ پر ایرانی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے مگر سونا کس کافر کو تھا۔ ہم یہاں جاگنے کے لیے آئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اب اس مشن کا اہم ترین مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ نایاب "فاسٹنگ بدھا" اسی اپارٹمنٹ میں کہیں موجود تھا جس کے لیے بہت سے لوگ دیوانے ہو رہے تھے۔ وہ دو فٹ طویل مجسمہ کسی دیوار میں نہیں چھپایا گیا تھا اور ایسے اچھے طریقے سے چھپایا گیا تھا کہ مجید مفتو دو بار بھرپور کوشش کرنے کے باوجود ناکام رہا تھا۔ مجید مفتو ایسے معاملوں میں نہایت ماہر سمجھا جاتا تھا۔ عمران کو میڈم سے معلوم ہوا تھا کہ مجید ایک خاندانی نقب زن تھا۔ کسی چار دیواری میں گھس کر وہاں سے کسی شے کو نکال لانے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ اس نے اس اپارٹمنٹ میں خوب تگ و دو کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

رات آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر سرد ہوا کا شور تھا۔ اس اپارٹمنٹ کا نہایت خطرناک محافظ سلطان ہمارے کمرے سے باہر موجود تھا اور جاگ رہا تھا۔ اس کی صحت دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بوقت ضرورت بڑے سے بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔ فضا میں سنسنی سی تیرنے لگی۔

میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔ "اب تو بتا دو کہ کیا کرنا ہے؟"

"بس تیار ہو جاؤ۔" وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں مقامی فائر بریگیڈ کو فون کرتا ہے کہ فردوس پلازا کے ٹاپ فلور پر واقع اپارٹمنٹ میں آگ لگ گئی ہے۔"

"یہ جھوٹ بولنے کا مقصد؟"

"یار! جھوٹ کون بول رہا ہے؟ سچی مچی بات کریں گے۔"

"مگر آگ کہاں ہے؟"

"آگ بھی لگ جائے گی یار! اتنے بے تاب کیوں ہو رہے ہو؟ اور یہ بھی کوئی ضروری تو نہیں ہوتا کہ آگ لگنے کے بعد ہی فائر بریگیڈ کو اطلاع دی جائے۔ اکثر فائر بریگیڈ والے لیٹ ہو جاتے ہیں، اس لیے سیانے لوگ پہلے ہی فائر بریگیڈ کو کال کر لیتے ہیں۔"

عمران کی باتوں پر ہنسی تو نہیں آسکتی تھی تاہم مجھے اس بے پناہ اعتماد کا احساس ضرور ہوا جو وہ نہایت پرخطر لمحات میں بھی اپنے اندر موجود رکھتا تھا... اور اس کا یہی غیر معمولی اعتماد تھا جو مجھ جیسے ماٹھے شخص کو بھی اب بتدریج ایک نئے سانچے میں ڈھال رہا تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو سب چھوڑ چکا ہوتا کہ اب مجھے بھی اس سنسنی خیزی میں کچھ لطف آنے لگا تھا۔

اس نے مجھے سرگوشیوں میں کچھ ہدایات دیں۔ یہ ہدایات سن کر میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ بلاشبہ ضرورت سے زیادہ شاطر ہوتا جا رہا تھا۔ اب بھی وہ ایک نہایت بولڈ قدم اٹھانے جا رہا تھا۔ میں نے تشویش سے سرگوشی کی۔ "لیکن عمران! یہاں اور بھی تو اپارٹمنٹ ہیں... اگر کسی دوسرے اپارٹمنٹ کو نقصان پہنچا تو؟"

"یار! فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے کے لیے آتے ہیں کوئی تندی دکھانے تو نہیں آتے۔ پھر بھی اگر تھوڑا بہت نقصان ہو بھی گیا تو کوئی بات نہیں۔ رات بات آئی گئی ہوگی۔ ہاں کوئی جانی نقصان نہیں ہونا چاہیے اور انشاء اللہ ہم ہونے بھی نہیں دیں گے۔"

قریباً تین چار منٹ بعد ہم حرکت میں آگئے۔ سب سے پہلے عمران نے اپنے موبائل پر مقامی فائر بریگیڈ کا نمبر ملایا اور بڑی گھبرائی ہوئی آواز میں اطلاع دی کہ فردوس پلازا کے بالائی اپارٹمنٹ میں آگ لگ گئی ہے۔ تاہم یہ اطلاع دیتے ہوئے عمران نے اپنا لہجہ اتنا بلند نہیں ہونے دیا تھا کہ آواز کمرے سے باہر جائے۔

اس کے فوراً بعد اس نے دوسرا قدم اٹھایا۔ گیس ہیٹر بند کر دیا لیکن گیس دوبارہ کھول دی۔ گیس کی بو تیزی سے

کمرے میں پھیلنے لگی۔ جب کافی گیس پھیل گئی تو ہم دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے نکلتے عمران نے ایک اور کام کیا۔ اس نے اپنے لائٹر سے کھڑکی کے پردوں کو شعلہ دکھا دیا۔ بھک بھک کی آواز سے بیڈ روم نے آگ پکڑ لی... یہ ایک بار دینے والا منظر تھا۔

"آگ... آگ!" ایک ملازم کے چلانے کی آواز سنائی دی۔

پھر میں نے سلطان کا دھواں دھار چہرہ دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے بھڑکتے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ تب وہ عجیب خوف زدہ انداز میں دہاڑا اور اس نے تڑپ کر ایک قریبی دیوار سے آگ بجھانے والا گیس سلنڈر اتار لیا۔

"کیا ہوا سلطان؟" کسی قریبی کمرے سے ابرار صدیقی کی چلاتی ہوئی گونج دار آواز ابھری۔

"آگ صاحب جی!" سلطان بس اتنا ہی کہہ سکا۔

اس نے بڑی دلیری سے آگے بڑھ کر آگ پر گیس پھینکی تاہم آگ کا پھیلاؤ اس سلنڈر کی کارکردگی سے کہیں زیادہ تھا۔

اسی دوران میں، میں نے دیکھا کہ عمران نے اپنے پانچ انچ لمبے لائٹر کو اس خاص انداز سے استعمال کیا جس کے بارے میں وہ مجھے بتا چکا تھا۔ ایک بٹن پش کر کے اس نے لائٹر کو کامن روم میں پھینک دیا۔ کامن روم میں آگ نہیں لگی مگر وہاں اتنی تیزی سے دھواں پھیلا کہ یوں لگا جیسے پورا اپارٹمنٹ آگ کی زد میں آگیا ہے۔ یہ دھواں اسی خاص قسم کے لائٹر سے برآمد ہو رہا تھا جیسا کہ عمران نے مجھے بتایا تھا، ایسے لائٹر سرکس اور شعبدہ بازی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ پورے اپارٹمنٹ میں ایک دم تہلکہ مچ گیا۔

پلاننگ کے مطابق میں اور عمران ابرار صدیقی کی طرف بڑھے۔ وہ یقیناً سوتے میں اٹھا تھا۔ اس کے بدن پر صرف شلوار اور بنیان تھی۔ بنیان میں اس کی موٹی لیکن تھوڑی توند نمایاں نظر آتی تھی۔ افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر بھاگتے ہوئے یہ توند بری طرح ہل رہی تھی۔

"آگ لگ گئی ہے صاحب جی... آگ!" عمران دہشت زدہ آواز میں چلایا۔

عمران کا یہ بے معنی نعرہ صرف دہشت بڑھانے کے لیے تھا ورنہ اندھے کو بھی دکھائی دے رہا تھا کہ اپارٹمنٹ آگ کی لپیٹ میں ہے۔

ابرار صدیقی عالم دہشت میں ناچ کر رہ گیا۔ پہلے اس نے موبائل پر غالباً فائر بریگیڈ کو کال کرنے کی کوشش کی پھر اس کو ادھورا چھوڑ کر اپنے بیڈ روم کی طرف گیا۔ اب شعلے اس بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ابرار صدیقی بری طرح کھانستا ہوا اپنے بیڈ پر چڑھ گیا۔ وہ دو بڑے کشن اوپر نیچے رکھ کر بیڈ پر کھڑا ہوا تو اس کا ہاتھ چھت کی اندرونی سیلنگ تک پہنچنے لگا۔ یہاں خانے دار ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ صدیقی نے ایک دو سیکنڈ تک ان خانوں کا جائزہ لیا جیسے مطلوبہ خانہ گن کر ڈھونڈ رہا ہو۔ تب اس نے ایک خانے کے ایک کونے کو مخصوص جھٹکے سے اوپر کی طرف دبایا۔ یہ تقریباً دو فٹ مربع کا خانہ باقی چھت سے علیحدہ ہو کر اوپر چلا گیا۔ صدیقی نے کھانستے ہوئے اندھا دھند اس خانے میں ہاتھ ڈالا۔ کوئی چیز اس نے زور لگا کر باہر کھینچ لی۔ یہ پوٹلی میں لپٹی ہوئی تھی... یقیناً یہ وہی دو فٹ اونچا فاسٹنگ بدھا تھا۔ میڈم صفورا اور مجید مفتو وغیرہ کے بقول ایک نایاب اور بے داغ پیس آف آرٹ!

ابرار صدیقی نے اس نادر اسٹیچو کو بڑی کامیابی سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دے رہا تھا لیکن آج وہ ہمارے سامنے اس "پیس" کو اس کے خفیہ ٹھکانے سے نکال رہا تھا۔ وہ اور اس کا پیس بری طرح دھوئیں میں لپٹے ہوئے تھے۔ بستر سے اترنے سے پہلے اس نے یہ پیس بدست خود عمران کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

"لائیے... لائیے۔" عمران نے خلوص دل سے کہا۔

صدیقی سے پیس لینے کے بعد عمران نے مجھے تھما دیا۔ وہ وزنی تھا مگر اتنا بھی نہیں جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ بدھا کے اس مجسمے نے شاید آلتی پالتی مار رکھی تھی۔ نیچے سے اس کا پھیلاؤ کافی زیادہ تھا۔

عمران نے صدیقی کو بیڈ سے اترنے میں مدد دی۔ کھانس کھانس کر صدیقی کا برا حال تھا۔ ہم نے اپنے چہرے کپڑے میں لپیٹ رکھے تھے اس کے باوجود ہم بھی کھانس رہے تھے۔ میں نے ابرار صدیقی کو عمران کے سہارے ڈبل بیڈ سے اترتے دیکھا۔ اس کے بعد مجھے پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے۔ بظاہر یہی لگا کہ ابرار صدیقی چکرا کر اوندھے منہ گر گیا ہے یا شاید اسے ٹھوکر وغیرہ لگی ہے۔ تاہم یہ امکان بھی تھا کہ عمران نے اسے ضرب لگائی ہو... اور مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق اسے لمبا لٹا دیا ہو۔ اس بات کا اعتراف عمران نے پانچ چھ دن بعد کیا کہ اس نے ابرار صدیقی کی گردن پر ضرب لگائی تھی۔

"چلو۔" صدیقی کے گرتے ہی عمران نے تیز سرگوشی کی اور پوٹلی میں لپٹا مجسمہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ ایک ملازم کھانستے

ہوئے ہماری طرف لپک رہے تھے۔ "حبیب جی کو دیکھو... وہ گر گئے تھا۔" عمران نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا... آگ اب مہمان خانے سے نکل کر کامن روم تک پہنچ گئی تھی۔ فرنیچر دھڑا دھڑ جلنا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت جی کی تصویر آگ کی زد میں آنے کے بعد اوندھے منہ سلگتے ایرانی قالین پر گری۔ سلطان اب EXTINGUISHER کے ذریعے آگ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کسی قاسم نامی ساتھی کو بھی طلب کر کے دہاڑ رہا تھا۔ "قاسم... قاسم... فون کر فائر بریگیڈ کو..." اس کی آواز خوف سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔

ہم اپارٹمنٹ سے باہر نکلے۔ پورے پلازا میں ہلچل مچ چکی تھی۔ بوکھلائے ہوئے لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ دو چوکیدار EXTINGUISHER لیے متاثرہ اپارٹمنٹ کی طرف لپک رہے تھے۔ ہم ان کے پہلو سے گزر کر سیڑھیوں پر آگئے۔ بکھرے بالوں والی ایک نوجوان لڑکی جو شاید کچھ دیر پہلے اپنے شوہر کے ساتھ بستر میں اچھا وقت گزار رہی تھی، بستر کی چادر میں لپٹی سیڑھیوں پر موجود تھی۔ چادر سیڑھیوں کے جنگلے میں پھنس گئی تھی۔ وہ جھٹکے دے کر چادر کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خوش قسمتی سے چادر پھٹ گئی اور لڑکی آزاد ہو کر قلانچیں بھرتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

اردگرد سے لوگوں کے چلانے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ سیکنڈ فلور پر ہم نے ایک موٹی تازی خاتون کو دیکھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی اور دو چھوٹے بچوں کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر سیڑھیاں اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ آگ سے بہت دور تھی مگر لگتا تھا کہ سب سے زیادہ خطرہ اسی کو ہے۔

"آؤ جی کی مدد کرو یارا!" عمران نے کہا۔

میں نے خاتون کا ایک بچہ اٹھا لیا۔ چند سیکنڈ بعد ہم گراؤنڈ فلور پر تھے۔ یہی وقت تھا جب فائر بریگیڈ والوں کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ گئے تھے... ہم فردوس پلازا سے باہر نکلے۔ بہت سی راہ چلتی گاڑیاں سڑک کے کناروں پر رک گئی تھیں۔ اردگرد کی عمارتوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھل رہے تھے۔ ٹاپ فلور کے اپارٹمنٹ میں لگی ہوئی آگ کی جھلکیاں سڑک سے بھی نظر آرہی تھیں۔

ہم نے ہلکی ہلکی پھوار میں تیز تیز سڑک کراس کی اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ عمران پچھلی نشست پر تھا اور فاسٹنگ بدھا کا نادر مجسمہ اس کی گود میں تھا۔ ایک بھی گولی چلائے بغیر، کسی بھی شخص کو شدید زخمی کیے بغیر، بلا کسی بڑے جھگڑے کے... یہ فاسٹنگ بدھا عمران نے حاصل کر لیا تھا۔ اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ مسائل کو الگ طریقے سے دیکھنے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت اس میں موجود تھی۔ اس صلاحیت کو اس کی غیر معمولی بے خوفی سے مزید تقویت ملتی تھی۔

ٹیکسی نے ہمیں بیس منٹ میں واپس اسی رہائشی کالونی تک پہنچا دیا جہاں عزیت کے گھر کا دروازہ صاف نظر آرہا تھا۔ پتا نہیں کہ اسے ابھی فردوس پلازا کی آتشزدگی کی خبر ملی تھی یا نہیں؟

عمران نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ بدھا کو بڑے احترام سے پچھلی نشست پر بٹھا کر اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ وہ جیسے ساڑھے چار ہزار سال پہلے خاموش تھا، آج بھی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ ابدی خاموشی... جس میں زندگی، زمان اور کائنات کے ہزاروں راز پوشیدہ تھے۔ بدھا آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ آگے کو نہ گرے، عمران نے اس کے آگے دو کشن رکھ دیے تھے۔

"ایک تو تمہاری چوری میں [illegible] نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "گاڑی اس گھر سے اتنا قریب کھڑی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اب تو جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "آئندہ جب بھی مولانا ابرار صدیقی صاحب کے اپارٹمنٹ میں آگ لگانے کا پروگرام بنے گا، میں گاڑی ساتھ والی گلی میں کھڑی کیا کروں گا۔ اب خوش؟"

میں منہ بنا کر رہ گیا۔

ہمارے گوجرانوالہ تک پہنچتے پہنچتے اجالا ہو گیا۔ یہ ایک ابر آلود صبح تھی۔ ہم نے کاموکی قصبے کے پاس ایک چھپر ہوٹل پر رک کر ڈٹ کر چائے پی اور بسکٹ وغیرہ کھائے۔ یہاں رکنے کا ہمیں ایک اور فائدہ ہو گیا۔ فردوس پلازا میں ہونے والی آتشزدگی کی مختصر خبر بھی ایک نیوز چینل پر مل گئی۔ اسکرین پر چلنے والی ایک پٹی کچھ یوں تھی۔

"جہلم شہر کے ایک پلازا میں آتشزدگی... ایک فلیٹ جل گیا۔ دوسرے کو جزوی نقصان پہنچا۔ فائر بریگیڈ نے وقت پر پہنچ کر آگ پر قابو پالیا۔ کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی۔"

عمران نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "یار! ہمارے فائر بریگیڈ والوں کی کارکردگی کچھ اچھی نہیں ہوتی جا رہی؟"

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ قریب بیٹھے ایک پٹھان ٹرک

ڈرائیور نے کہا۔ "خو، ام نے تو یہ دیکھا ہے کہ فائر بریگیڈ کی اپنی گاڑی کو بھی آگ لگ جائے تو گاڑی والے آگ بجھانے میں پانچ دس منٹ کا دیری ضرور کرتا ہے۔ خو، یہ پلازے کا مالک کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہوگا۔"

سب ہنسنے لگے۔ عمران نے بھی اس ہنسی میں شرکت کی۔

ہم صبح نو بجے کے لگ بھگ سیکیورٹی کے دو مرحلوں سے گزر کر لال کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ ہم ابھی تک اسی دیہاتی لباس میں تھے۔ کوٹھی میں میڈم صفورا بہت بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ عمران نے راستے میں ہی موبائل پر اسے اپنی آمد اور اپنی کامیابی کی اطلاع دے دی تھی۔

جب ہماری گاڑی پورچ میں رکی تو میڈم صفورا وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس کی بے تاب نگاہ سب سے پہلے گاڑی کی پچھلی نشست کی طرف گئی جہاں کپڑے میں لپٹا بدھا موجود تھا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ بدھا پر جھپٹے گی اور بے تاب ہو کر اسے اپنی گود میں اٹھا لے گی لیکن پھر اس نے سنبھالا لیا اور اپنا رکھ رکھاؤ برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔

اس نے بے حد جوشیلے انداز میں ہماری خیریت دریافت کی۔ پھر اس کے اشارے پر دو ملازمین نے کمال احتیاط کے ساتھ بدھا کا وزنی مجسمہ کار سے نکالا اور اندرونی کمروں کی طرف بڑھے۔ ہم بھی ساتھ ہی تھے۔ مجسمے کو لال کوٹھی کے ایک خاص کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں دو بڑی بڑی میزیں تھیں، ان پر کچھ طبی آلات پڑے تھے۔ ایک ایکسرے مشین جیسی چیز تھی... دو تین جدید اسٹل کیمرے تھے۔ فرش پر آسٹرو ٹرف جیسی شے بچھی تھی۔ بدھا کے مجسمے کو بے حد احتیاط کے ساتھ ایک میز پر رکھ دیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ملازمین باہر چلے گئے۔ اب وہاں ہمارے اور میڈم کے سوا اور کوئی نہیں تھا... "ویل ڈن عمران!" میڈم نے ایک بار پھر دبے دبے جوش سے کہا۔ "تم نے خوش کر دیا۔"

"تھینک یو میڈم... اور دیکھ لیں، وعدے کے مطابق کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اگر ہوا ہوگا تو تھوڑا بہت مالی نقصان ہوا ہوگا۔"

"ہاں، میں نے ابھی نیوز دیکھی ہے۔ ایک دوست سے بھی بات ہوئی ہے۔ فلیٹ کے دو کمرے ہی زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ صدیقی کو قریبی اسپتال لے جایا گیا تھا مگر طبی امداد کے بعد فارغ کر دیا گیا ہے۔ گرنے سے اس کے چہرے پر تھوڑی بہت چوٹ آئی ہے۔"

"صدیقی وغیرہ کا عام تاثر کیا ہے؟" عمران نے دریافت کیا۔

"ابھی یہ تو معلوم نہیں ہو سکا مگر سنا ہے کہ وہ مقامی تھانے میں نامعلوم افراد کے خلاف ڈکیتی یا چوری وغیرہ کا پرچہ درج کرانے کا سوچ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ صدیقی کا دھیان اسی پارٹی کی طرف جا رہا ہے جن کی وجہ سے اسے اس مجسمے کو لاہور سے جہلم لے جانا پڑا تھا۔ یہ غنڈا ٹائپ لوگ ہیں۔ لاہور میں بھی یہ صدیقی کے گھر کے گرد منڈلاتے رہے ہیں۔" میڈم کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک تھی۔

بات کرتے ہوئے بھی میڈم کی نظریں مسلسل بدھا کا طواف کر رہی تھیں۔ تب اس کے ہاتھ پرشوق انداز میں مجسمے کے کور کی طرف بڑھے۔ کور کو بڑے سلیقے سے پن وغیرہ لگائی گئی تھیں۔ میڈم نے ان پنوں کو خود اتارا۔ نیچے سیلوفین کی کوٹنگ تھی۔ کوٹنگ کو قینچی سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا۔ نیچے بدھا تھا۔ میں فائن آرٹ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ فن سنگ تراشی، مجسمہ سازی سے بھی کوئی خصوصی لگاؤ نہیں ہے مگر پتا نہیں کیا بات تھی، بدھا کے اس زبردست مجسمے نے مجھے بھی غیر معمولی طاقت سے اپنی طرف کشش کیا۔ وہ فاقہ زدہ بدھا کی تصویر کشی کرتا ہوا آرٹ کا ایک نہایت اعلیٰ و نفیس نمونہ تھا۔ جسم کا ہر نشیب و فراز، ہر رگ پٹھا اور ہڈی... ایک ایک تفصیل اپنی جگہ باکمال تھی۔ بے شک وہ ماہر ترین ہاتھوں کا بنا ہوا تھا۔ اس کی اضافی خوبی یہ تھی کہ اس میں کہیں ٹوٹ پھوٹ نہیں تھی۔ یہ ایک دھاتی مجسمہ تھا۔

"ونڈر فل... واٹ اے بیوٹی۔" میڈم نے مسحور کن انداز میں اسے چھوا۔ اس کی آنکھوں میں پراشتیاق چمک تھی۔

پھر اس نے ٹیبل کے گرد موجود چند روشنیاں آن کیں اور جدید کیمرے سے مجسمے کی کئی تصویریں کھٹا کھٹ اتار لیں۔ وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

تب وہ شاہانہ انداز سے ایک لگژری صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک ایک بیش قیمت سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ اس کے بکھرے بکھرے بال پیشانی پر بھی جھول رہے تھے اور خوب صورت نظر آرہے تھے۔ وہ یقیناً ایک بھرپور عورت تھی۔ اپنی جسمانی کشش اور بھرپور انداز کے سبب وہ [illegible] بڑی ہونے کے باوجود کسی بھی مرد کو بہ آسانی اپنی طرف کشش کر سکتی تھی۔ تاہم یہ ایک شور مچاتی پھلجڑی کی طرح تھی... آنکھوں میں چبھنے والے عجیب و غریب رنگ چھوڑتی ہوئی لیکن میڈم صفورا ڈنر ٹیبل پر جلتی ہوئی ایک خاموش شمع کی طرح تھی۔ بہت دیر تک روشن رہنے والی... گہری... اور

ہماری معلومات کے مطابق سلیم کی حالت خاصی پتلی تھی۔ وہ لال کوٹھی کے تہ خانے میں تھا۔ اسے بُری طرح ٹارچر کیا گیا تھا۔ تفصیل کے مطابق چھوٹی میڈم نادیہ نے اسے عریاں کر کے بدست خود ربڑ کے ایک ایسے پائپ کے ذریعے پیٹا تھا جس کے گرد لوہے کا باریک تار لپٹا ہوا تھا۔ اس مار نے سلیم کا گوشت کئی جگہ سے ادھیڑ ڈالا تھا۔ گرنے سے اس کی کنپٹی پر بھی چوٹ لگی تھی جس کے سبب اسے اپنا جسمانی توازن قائم رکھنا مشکل محسوس ہوتا تھا۔ بس ہمیں اتنا ہی معلوم ہوا تھا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ یہ معاملہ کسی حد تک طے ہو گیا۔ میڈم صفورا نے انٹرکام پر عمران کو اطلاع دی کہ صبح سلیم ان کے پاس آجائے گا۔

عمران کی خواہش تھی کہ سلیم ناشتے پر ہمارے ساتھ ہو لیکن نو بجے تک وہ انیکسی میں نہیں آیا۔ عمران نے میڈم صفورا کے فون پر رابطہ کر کے اس سے پوچھا۔ صفورا نے جواب دیا۔ ''میں تو اس وقت ایک پارٹی کے لیے رائے ونڈ روڈ پر آئی ہوئی ہوں۔ بہرحال، سلیم ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔''

ہم نے ناشتا سلیم کے بغیر ہی کیا۔ ہم اس کے فوراً بعد وہ پہنچ گیا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی۔ وہ پہلے ہی لنگڑا کر چلتا تھا، اب کچھ اور بھی ڈگمگا رہا تھا۔ دو گارڈز نے اسے دونوں طرف سے تھاما ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہم تینوں نے اسے بڑی آہستگی کے ساتھ گلے لگایا۔ گرم جوشی سے گلے لگاتے تو وہ یقیناً تکلیف سے کراہنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے۔ ''میں جانتا ہوں کہ مجھے آپ کی کوششوں کی وجہ سے چھوڑا گیا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔'' وہ بولا۔

''کیوں جوتے مارتے ہو یار!'' عمران بولا۔ ''تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہماری وجہ سے ہوا۔ ہم تمہاری طرح آنکھوں میں آنسو لے کر ایک ہزار بار بھی تمہارا شکریہ ادا کریں تو یہ کم ہے... خیر... ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب سب اچھا ہوگا۔''

ابھی عمران کی بات منہ ہی میں تھی کہ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ پھر چھوٹی میڈم نادیہ کسی بگولے کی طرح انیکسی میں داخل ہوئی۔ پانچ گارڈز اس کے ہمراہ تھے۔ وہ غصے میں دہشت نظر آرہی تھی۔

آتے ساتھ ہی اس نے چلّا کر پوچھا۔ ''یہ کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے؟''

جو دو گارڈز سلیم کو لے کر آئے تھے، ان میں سے ایک بولا۔ ''بڑی میڈم نے فون پر بولا تھا جی۔''

''بکواس کرتے ہو۔'' وہ گرجی۔ ''بڑی میڈم نے بولنا ہوتا تو مجھ سے بولتی۔''

''بڑی میڈم کہتی تھیں جی کہ بات ہو گئی ہے۔ اس لیے...''

''کوئی بات نہیں ہوئی ابھی۔'' وہ چیخ و بازی۔ ''کیا سمجھتے ہو تم لوگ... اس باسٹرڈ کو میں ایسے ہی چھوڑ دوں گی؟ اس نے غداری کی ہے۔ ہماری پیٹھ میں چھرا مارا ہے۔'' پھر وہ پلٹ کر اپنے گارڈز سے بولی۔ ''لے چلو اس کتے کو۔''

''ٹھہرو!'' عمران مشتعل گارڈز اور سلیم کے درمیان آگیا۔

''تم پیچھے ہٹ جاؤ، ورنہ تمہیں بھی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ تم۔'' نادیہ چلائی اور اس نے شرابی انداز میں عمران کو پیچھے دھکیلا۔

نادیہ کے گارڈز نے سلیم کو کھینچا۔ عمران نے سلیم کا دوسرا بازو پکڑ لیا۔ وہ بے چارہ عمران اور گارڈز کے درمیان بے بسی کی تصویر نظر آنے لگا۔ گارڈز نے اپنی رائفلیں ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ ان میں انچارج گارڈ شیرا بھی شامل تھا۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

عمران نے جیب سے موبائل نکالا اور بولا۔ ''اس طرح زور آزمائی کرو گے تو سب کا نقصان ہوگا۔ میں میڈم صفورا کو کال ملاتا ہوں۔''

''میڈم سے کال ملا کر بتا دینا اسے سب کچھ۔'' نادیہ زہریلے انداز میں پھنکاری۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ پھر اس نے گارڈز کو اشارہ کیا۔ وہ سلیم کو بے دردی سے کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ اس موقع پر میں نے دیکھا کہ اقبال کا بھی پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ وہ آگے بڑھا مگر عمران نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ غالباً وہ کچھ بھی کرنے سے پہلے میڈم صفورا سے بات کرنا چاہتا تھا اور یہی دانش مندی بھی تھی۔

گارڈز سلیم کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔ سلیم کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور وہ بے چارگی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران نے پکار کر کہا۔ ''گھبراؤ نہیں سلیم! یہ ابھی چھوڑیں گے تمہیں۔'' وہ میڈم صفورا کو کال ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا اور ہم دونوں میں سے بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہم سلیم کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ اب ہم اسے نہیں دیکھ سکیں گے... عمران کال ملا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی... سرخی اسے ایک بالکل مختلف روپ دے رہی تھی۔

خطروں کے دائرے میں سفر کرنے جانبازوں کی داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

نے نہایت خشک لہجے میں کہا۔
سینڈو باہر چلا گیا۔ عمران نہایت گمبیر آواز میں بولا۔ "میڈم! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ ایسا کریں گی۔ میں نے آپ کے قول پر بھروسا کیا اور آپ کے حکم کے مطابق عمل کیا۔ دو بار اس کے کارندے سلیم کو حراست میں لینے سے چھین کر لے گئے۔ ہم صرف اس لیے خاموش رہے کہ آپ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔ کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گی۔"
"مگر عمران... جو کچھ ہوا ہے بالکل حادثاتی ہے۔ یہ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سلیم اس طرح اپنی جان لے لے گا۔ چوکیدار نے خود دیکھا ہے کہ اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہے۔"
"یہ بالکل غلط ہے میڈم!" عمران نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ "گستاخی معاف... سلیم کو آپ کی بڑی بہن نے کھڑکی سے دھکا دے کر مروایا ہے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"
میڈم کے چہرے کا رنگ بدلا تاہم وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ "اس وقت تم غمناک میں ہو عمران! ویسے بھی اتنی جلدی کسی نتیجے پر پہنچنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر تمہارے دماغ میں کسی طرح کا کوئی شک ہے تو ہم اس پر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو اس کو سزا ملے گی۔ وہ زندہ بھی بچ نہیں سکے گا۔"
"کیا آپ اپنی لاڈلی بہن کو وہ سزا دے سکتی ہیں جس کی وہ حق دار ہے؟" عمران نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔
میڈم نے چند لمحے توقف کرکے کہا۔ "ہاں۔ میں دے سکتی ہوں مگر پہلے یہ طے ہو جائے کہ زیادتی کس کی طرف سے ہوئی ہے۔ مجھے تھوڑا سا ٹائم دو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ مجھ سے جو بن پڑا وہ کروں گی۔"
میڈم نے تسلی تشفی کی کچھ اور باتیں کیں۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس معاملے کو ذہنی طور پر ٹالنے کی کوشش کر رہی ہے۔
ہمیں دفتر سے واپس ٹیکسی تک پہنچا دیا گیا۔ تاہم ہم اندازہ لگا سکتے تھے کہ اب ایجنسی کے ادارے وکیل روز جیسا کہ وہ ہوا تھا، ویسا طرح جو کسی بھی ہیں۔ وہ ٹیکسی ایسٹیشن تک ایجنسی کے سامنے تکرار پاتی۔
سلیم کی موت نے اقبال کو بھی بہت دکھی کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تکلیف اس دکھ میں چھپ کر رہ گئی تھی۔
عمران نے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں نے سلیم کی بہت دیکھی ہے یار! وہ مر کے نیچے گرا ہے۔ اوپر سے خود چھلانگ لگانے والا کبھی ایسے نہیں گرتا۔ اس نرا مرادی نے اسے قتل کیا ہے۔"
عمران نے اشارے سے اسے یاد دلایا کہ یہاں ان کی گفتگو سنی جا سکتی ہے۔
میں نے سرگوشی میں کہا۔ "اقبال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے کھڑکی سے نیچے کی طرف آنے والی بہ جہاں کھڑکی تھی، وہ کسی بے جان شے کی طرح نیچے آیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ گرنے کے وقت وہ ہوش میں نہ تھا۔"
"ان باتوں کا پتا تو پوسٹ مارٹم سے ہی چل سکتا ہے۔" عمران نے کہا۔ "لیکن اس کا پوسٹ مارٹم کس نے ہونے دینا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میڈم منورا سلیم کے وارثوں کی طرف ہی گئی ہے۔ وہ ضرور ان کو جتا کر اور رقم دے کر ان کے منہ بند کر دے گی اور ہو سکتا ہے کہ کوشش کرے کہ جلد سے جلد دفنانے کے لیے بھی دباؤ ڈالا جائے۔"
عمران کا اندازہ درست تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد میڈم منورا نیلی رنگ پہنے ہوئے برآمد ہوئی۔ سفید کپڑوں میں ایک دراز قد شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ شکل و صورت سے کوئی پولیس افسر یا ایجنسی کا آدمی لگتا تھا۔ وہ تو برآمدے کی طرف چلا گیا۔ میڈم سیدھی ہماری طرف آگئی۔ اس نے عمران سے کہا۔ "اگر تم سلیم کے جنازے میں شریک ہونا چاہو تو گاڑی اور ڈرائیور موجود ہیں۔ جولوجا۔ شام سات بجے اس کی آخری رسوم ہوں گی۔"
"ٹھیک ہے۔" عمران نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم جائیں گے۔"
"لیکن اقبال کو نہ ہی لے جاؤ تو بہتر ہے۔ اسے چلنے میں دشواری ہو گی۔" میڈم نے منورا کو اپنے بیانوں کے حوالے سے بولی۔ "اس سانحے کو سنبھالنے کے لیے کافی کوشش کرنا پڑی ہے۔ میں خود سلیم کے گھر گئی تھی۔ اس کی بیوی اور بوڑھے باپ کو بھی بتایا ہے کہ چند دن پہلے جو لوگ اسے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ ان سے اس کا کوئی لین دین کا تنازع تھا۔ ہم اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے میں لگے رہے۔ آپ لوگوں کو بھی نہیں بتایا کہ آپ پریشان ہوں گے۔ لیکن اگلے روز خود ہی بھیں اڈے پر چھوڑ گئے۔ انہوں نے سلیم پر تشدد کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے ذہن پر شدید اثر ہوا۔ وہ ٹھیک سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ آج کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے اس کا توازن بگڑ گیا۔"
عمران خاموش رہا۔ میڈم بھی "گڈ لک" دے کر نا معلوم ہوئی۔ وہ جیت خاموشی کی زبان میں بہت کچھ کہہ دیتی تھی کہ ہمیں اپنی زبانیں بند رکھنی ہیں اور سلیم کے وارثوں نے وہی کچھ کہنا ہے جو ان کو بتایا جا رہا ہے۔
ہم سنمبو ٹاؤن میں واقع سلیم کے گھر پہنچے۔ سلیم کی بیوی کی رشتے داری تھی کی گز... اور ایک بھائی کے علاوہ بہن اس کے دو چار عزیز تھے۔ یہی لوگ تھے جنہیں عرف عام میں "موالی" کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی میں اتنی سکت نہیں تھی کہ سلیم کی پراسرار موت کے حوالے سے کسی طرح کا کوئی سوال اٹھاتا۔
اندر سے رونے دھونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سلیم سرکس میں ملازمت کرتا رہا تھا۔ لہٰذا سرکس سے تعلق رکھنے والے دو چار افراد بھی یہاں موجود تھے۔ یہ لوگ تعزیتی انداز میں عمران سے گلے ملے۔ ہم اندر گئے تو سلیم کی بیوی دھاڑیں مارتی ہوئی عمران سے لپٹ گئی۔ "میرا بھائی! اٹھ جاؤ... میرا سب کچھ چھن گیا۔ میں کس کے سہارے زندہ رہوں گی؟"
سلیم کا چھ سات سالہ معصوم صورت بچہ بھی آنکھوں میں آنسو لیے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ "میرا ابو کئی دن گھر نہیں آتا تھا۔ جب بھی آتا تھا تو خوش ہوتا تھا۔ آج وہ چپ چاپ کیوں لیٹا ہوا ہے؟"
عمران نے اس بچے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
وہ عمران کی قمیص اپنی مٹھیوں میں لی اور اسے روتے ہوئے بولی۔ "میرے بھائی! وہ آج کل آپ سے ملتے تھے۔ آپ کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے آپ کو کچھ تو بتایا ہو گا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان کو کس کی طرف سے ڈر تھا؟ وہ بہت پریشان تھے۔ اب ان کے مالک کہہ رہے ہیں کہ ان کا کسی سے لین دین کا جھگڑا تھا۔ کیا یہ بات صحیح ہے... یا کچھ اور ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے؟"
پھر روتے روتے اس پر بے ہوشی کی طاری ہو گئی۔ عمران نے اسے سہارا دے کر نیچے چٹائی پر بٹھا دیا۔ عورتیں اسے پانی پلانے اور ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک فربہ سی عورت جو شاید بڑی بہن تھی، سلیم کا زخمی ماتھا چوم رہی تھی اور بین کر رہی تھی۔ "تیرے ساتھ کیا ہو گیا بھائی! تجھے کس کی نظر کھا گئی؟ تیری تو کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی۔"
میں نے دل میں سوچا "تیرا بھائی دشمنی کی وجہ سے نہیں، دوستی کی وجہ سے مارا گیا ہے۔ ایک سیاہ رات وہ اس کے لال کوٹھی میں اپنے پرانے دوست کو دیکھا اور اس کی

کردار پر۔ وہ ایک دم اچھل پڑی۔ میں نے اپنی پیاری بہن فرح کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "یہ کیا ہوا بھائی؟ آپ قاتل تو نہیں ہو سکتے۔ آپ تو میرے بھائی ہیں۔" اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "نہیں میری بہن! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں ان دونوں کے ساتھ تھا۔"

فرح نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ "میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی لیکن اپنے بھائی پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

تب اچانک میں ہڑپہ کے کھنڈرات پہنچ گیا۔ وہاں گرما کی ایک نہایت گرم و سنسان دوپہر تھی۔ دھول اڑ رہی تھی۔ بگولے چکرا رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں نزہت کا ہاتھ تھا... ہم بھاگ رہے تھے۔ جائے پناہ تلاش کر رہے تھے۔ کچھ سانولے چہروں اور سرخ آنکھوں والے کچھ نیم لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ پیاس سے میرے جسم میں دراڑیں پڑ رہی تھیں... میری زبان خشک چمڑے کا ٹکڑا ہو کر رہ گئی تھی۔ میرے سینے میں زہریلے کانٹے چبھ رہے تھے۔ پھر میرے کانوں سے وہی بھاری آواز ٹکرائی جو اس سب بے ہوشی و نیم بے ہوشی میں گاہے بگاہے میری سماعت میں داخل ہوتی تھی۔ یہ بھاری آواز کرخت لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "منہ کھول۔ منہ کھول۔"

میں نے لبوں کو حرکت دی۔ ٹھنڈا پانی... آب حیات کی طرح میرے ہونٹوں، دانتوں اور زبان سے ٹکرایا۔ پھر گلے کے زہریلے کانٹوں کو اپنی ٹھنڈک سے نرم کرتا چلا گیا۔

"لگتا ہے کہ ہوش میں آ رہا ہے۔" نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ شاید یہ وہی عورت تھی جس کے بیٹے سے میں نے شیر خوار بچے کو ڈھونڈ دیکھا تھا۔

غنودگی اور بیداری کے ریلے سے آتے رہے۔ پھر میری بے ہوشی شاید نیند میں بدل گئی تھی۔ میں اپنے اردگرد دیکھنے کے قابل ہوا تو کمرے میں بلب لائٹ کی روشنی تھی۔ وال کلاک کی سوئیاں نو بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میرے بازو پر گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ بڑی سست رفتاری سے ایک ایک قطرہ گر رہا تھا۔ میرے گرد رسیوں کی مضبوط بندشیں بدستور موجود تھیں۔ صرف دایاں بازو آزاد تھا جس پر انجکشن وغیرہ دینے کے لیے "کینولا" لگایا گیا تھا۔

میں نے کسی کو پکارنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ٹھٹک گیا۔ مجھے ساتھ والے کمرے سے باتوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ یقیناً یہ وہی طوائف نما عورت تھی جس سے پہلے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ شاید اس نے یہی سمجھا تھا کہ میں دوبارہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ہوں۔ لگتا تھا کہ دوسری طرف اس کی کوئی بے تکلف سہیلی ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ "ہائے... ہائے! اب میں تجھ سے بھی چھپاؤں گی۔ اگر جا، پیسے ہتھ آئے ہوتے تو سب سے پہلے تیرا کرجا (قرضہ) اتارتی... نہیں تھی... تیرے سر کی قسم۔ میں تجھ سے بھلا جھوٹ بول سکتی ہوں... نہیں نہیں... یہ ٹھیک ہے کہ آبادی میں سب سے کماؤ پتا گھر وہی تھا پر اندر سے کچھ ملا نہیں سب مال اوپر سے دو گڈی والا مسالہ ہو گیا... ہاں ہاں۔ رشید، ماجھو اور کالا اندر موجود تھے۔ کبھی بارہ اور جیرا باہر پہرا دے رہے تھے... وہ خبیث شاید چھت پر تھا۔ اس نے اوپر سے ہی دیکھ لیا کہ گھر میں لوگ اندر آئے ہیں۔ اس نے ساتھ والی چھت پر چھلانگ ماری اور وہاں سے باہر سڑک پر آ گیا۔ اب دیکھو اللہ کی مرضی... وہ رشید والی گڈی میں ہی وڑ گیا۔ گڈی کی چابی بھی گڈی کے اندر ہی تھی۔ اس نے اسٹارٹ کی اور گڈی تر دی (چلا دی)۔ کالا اور جیرا نے جب دیکھا کہ اپنی ہی گڈی ہتھ سے نکلی ہے تو دوسری گڈی میں بیٹھ کر اس کے پیچھے دوڑے۔ پھر اڈے چوک سے تھوڑا پہلے روڑی پھٹی کے پاس اس خبیث نے گڈی الٹا دی۔ اس کے سر اور موڈھے پر سٹ پوچھیں آئی ہیں۔ کالا اور جیرا کے دماغ نے ٹھیک کام کیا۔ انہوں نے اپنی گڈی روک دی اور دو چار راہگیروں کے ساتھ مل کر اس خبیث کو اپنی گڈی میں ڈال لیا۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ اسے اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ وہ اسے یہاں گھر لے آئے۔"

دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔

جمیلہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "رشید اور ماجھو کا کیا پتا تھا۔ جب انہوں نے اندر سے دیکھا کہ اپنی دونوں گڈیوں نے ایک دم آگے پیچھے دوڑ لگا دی ہے تو وہ ڈر گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ پولیس آ گئی ہے۔ وہ بھی گھر سے نکل کر پچھلی آبادی کی طرف نس (بھاگ) گئے۔"

جمیلہ تو یاں مزید باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ یہ کوئی جرائم پیشہ ٹولا تھا۔ ان میں سے رشید نام کا بندہ اس عورت کا کوئی اصلی خاوند ہے۔ باقی اس کے رکھے ہوئے ہیں۔ اس بے زبان عورت کی ان ہی بے ہودہ باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان باتوں سے مجھ پر ایک حیران کن انکشاف ہوا اور وہ انکشاف یہ تھا کہ میں ایک خطرناک ٹولے کا شکار ہوا ہوں۔

"کون لوگ ہیں؟" عمران کے لہجے میں ایک سخت شدید فکرمندی در آئی۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ان کے نام رشید، بیرا، ربگر ر وغیرہ ہیں۔ ایک بازاری عورت تابندہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ یہ کوئی ویران، اجنبی آبادی سی ہے۔"

"کچھ تھوڑا بہت اندازہ بھی نہیں کہ کون سی جگہ ہے؟"

اچانک میرا دھیان اس فون سیل کی طرف چلا گیا جو زمین سے اٹھایا تھا۔ میں نے جلدی جلدی سیل کھول کر دیکھا اور عمران کو بتایا کہ مجھے ایک فون سیل ملا ہے اس پر مختصر سا ایڈریس بھی لکھا ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ یہاں کا ایڈریس ہے یا کسی اور جگہ کا۔

"تم ایڈریس بتاؤ۔" عمران تیزی سے بولا۔

"مسز کی بشیر۔ مکان نمبر 18۔ الہٰ زار اسکیم۔ روڈ۔" ساتھ ہی میں نے فون نمبر بھی لکھوا دیا۔

"وہاں اس وقت تمہارے آس پاس کتنے لوگ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ اس چار دیواری میں؟"

"ابھی تو صرف ایک عورت اور اس کا بچہ ہیں۔ کچھ دیر بعد کا پتا نہیں۔" میں نے سرگوشی کی۔

"تم بے فکر رہو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔"

"کوئی آ رہا ہے۔ میں بند کر رہا ہوں۔" قدموں کی چاپ سن کر میں نے فون بند کیا اور ہاتھ لمبا کر کے دوبارہ دری پر رکھ دیا۔

تابندہ اپنے جسم کو ہلکورے دیتی تیزی سے اندر آئی۔ میری طرف دیکھے بغیر وہ الماری کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک دراز کھول کر جلدی جلدی کچھ ڈھونڈنے لگی۔ قریبی کمرے میں بچے کے رونے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ تابندہ ایک رومال دراز سے لے کر پھر باہر نکل گئی۔

میں اپنی جگہ پیٹ کے بل لیٹا رہا اور دل کی دھڑکنیں گنتا رہا۔ آنے والے لمحوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ عمران کو یہاں پہنچنے میں دیر ہو سکتی تھی۔ اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی تابندہ کا شوہر اور اس کے ساتھی واپس آ سکتے تھے... وہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جو ایڈریس میں نے عمران کو لکھوایا ہے وہ کسی اور جگہ کا ہو۔

تابندہ بچے کے چکر میں پڑ کر شاید مجھ سے غافل ہو گئی تھی۔ کمرے کے آخری کونے میں لوہے کے ایک اسٹینڈ پر پی ٹی سی ایل کا فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میں دور ہی سے دیکھ سکتا تھا کہ اس سیٹ پر سی ایل آئی نہیں ہے۔ میں نے زور لگا کر اور بازو لمبا کر کے نیچے سے موبائل سیٹ اٹھا لیا۔ فون سیل پر لکھا ہوا فون نمبر مجھے یاد تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل پر وہی نمبر پریس کیا۔ میرا "تجربہ" کامیاب ثابت ہوا۔ کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے پی ٹی سی ایل سے فون پر بیل ہوئی۔ ابھی آدھی بیل ہی ہوئی تھی کہ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے موبائل سیٹ اور فون ہولڈر پھر سے دری پر پھینک دیے۔ اب مجھے اس بات کی تسلی ہو گئی تھی... ہاں کم از کم اس بات کی تسلی ہو گئی تھی کہ میں نے عمران کو جو ایڈریس دیا ہے وہ اسی چار دیواری کا ہے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں نے امید و بیم کی عجیب کیفیت میں گزارے۔ بخار ایک بار پھر بڑھ رہا تھا۔ پورا جسم چٹخنا شروع ہو گیا تھا۔ کیا میں ایک بار پھر بے ہوشی یا نیم بے ہوشی سے دوچار ہو جاؤں گا؟ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ دل پر بہت بوجھ تھا۔ جیسے کسی نے دو بھاری پتھر سینے پر رکھ دیے ہوں۔ اور یہ بوجھ انہی باتوں کا تھا جو کچھ دیر پہلے تابندہ نے مجھے بتائی تھیں۔ تابندہ کے منہ سے جھوٹی اور بے بنیاد کہانی سننے کے بعد اس کی باتوں پر یقین کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ میں اپنے ساتھ ساتھ عمران اور اقبال وغیرہ کے لیے بھی ایک بڑی مصیبت کھڑی کر چکا ہوں۔

عمران کی آمد میری توقع سے پہلے ہوئی۔ گھر کی کال بیل بجی، میرا دل بری طرح اچھلا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ تابندہ کا شوہر وغیرہ آ گئے ہیں مگر پھر مجھے اندازہ ہوا کہ تابندہ کسی کے لیے مرکزی دروازہ کھول رہی ہے۔ پھر دروازے کی طرف سے کھٹاک کی آواز آئی۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ عمران تھا۔ اس نے خود کو تابندہ کا دوست ظاہر کیا تھا۔ بیٹھک میں داخل ہوتے ہی عمران نے تابندہ کو دبوچ لیا۔ جب وہ دونوں میرے سامنے آئے تو یہ ڈرامائی منظر تھا۔ عمران نے تابندہ کا منہ سختی سے جکڑ رکھا تھا۔ اس کی ایک ہتھیلی تابندہ کے ہونٹوں پر جمی تھی اور تابندہ کی آنکھیں خوف سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس کے منہ سے بس غوں غاں کی آوازیں ہی نکل پا رہی تھیں۔ عمران کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ کمرے کے اندر آنے تک تابندہ کی مزاحمت دس پندرہ فیصد ہی رہ گئی تھی۔

عمران اسے باتھ روم میں لے گیا۔ اسے دیوار کے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پر پستول کی نال رکھی اور پھنکارا۔ "اپنی اور بچے کی خیریت چاہتی ہو تو آواز مت نکالنا۔"

اس کا رنگ ہلدی مائل ہو گیا۔ ساری فن کاری ہوا ہو چکی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑے اور گڑگڑائی۔ "مجھے اور بچے کو کچھ نہ کہنا۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔"

"تو چپ چاپ یہاں کھڑی رہو۔" عمران کا لہجہ

سخت تھا۔

"مگر... میرے بچے کو یہاں لا دو... وہ رو رہا ہے۔"

بچہ واقعی اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی سانس کی رگ پھٹ جائے گی۔

باتھ روم کو باہر سے کنڈی لگا کر عمران دوسرے کمرے میں گیا اور روتے چلاتے بچے کو لے آیا۔ اس کا چہرہ زخمی تھا۔ عمران نے باتھ روم کی کنڈی کھول کر بچہ تابندہ کے حوالے کیا۔ وہ اس کے ہاتھوں سے نکلا نکلا جا رہا تھا۔ دہشت زدہ تابندہ نے اسے سینے سے بھینچ لیا اور بچے کو اپنے ساتھ لگا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی... بارہ پندرہ سیکنڈ بعد دودھ اور بچے کا ملاپ ہو گیا اور اس کا رونا تھم گیا۔

عمران نے جیب سے چاقو نکالا اور بڑی پھرتی سے میری بندشیں کاٹ دیں۔ میں کھڑا ہوا تو مجھے چکر سے آنے لگے۔ عمران نے گلوکوز کی ڈرپ میرے جسم سے علیحدہ کی اور میرا جوتا اٹھوا دیا۔

"جمیں، کچھ تمہارا کوئی سامان تو نہیں ہے یہاں؟"

میں نے پتلون کی جیبیں ٹٹولیں۔ جیبیں بالکل خالی تھیں۔ میں نے باتھ روم میں کھڑی تابندہ سے پوچھا۔ "میری چیزیں کہاں ہیں... میرا سوٹ کیس؟"

"تت... تمہاری جیب سے کچھ پیسے... شناختی کارڈ اور ایک چین نکلا تھا۔ وہ ساری چیزیں وہاں دراز میں پڑی ہیں۔" اس نے سامنے الماری کی طرف اشارہ کیا۔

"اور موبائل؟"

"وہ تو نہیں تھا تمہارے پاس۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

مجھے یاد آیا کہ موبائل واقعی میرے پاس نہیں تھا۔ راستے میں جب گلزار وغیرہ نے میرا پیچھا شروع کیا تو میں نے عمران سے رابطہ کرنے کا سوچا تھا مگر پھر پتا چلا تھا کہ موبائل تو میں گھر پر ہی کہیں چھوڑ آیا ہوں۔

میں نے دراز میں سے اپنی باقی چیزیں سمیٹیں۔ عمران نے تابندہ کو دھکا دے کر خاموش رہنے کی تلقین کی اور باتھ روم کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ میں قریباً 72 گھنٹے بستر پر رہا تھا۔ مثانے میں بہت سا پانی جمع ہو چکا تھا۔ میں ایک دوسرے باتھ روم میں گیا۔ دو تین منٹ بعد ہم مکان سے باہر نکلے۔ یہ ایک ویرانے والی زیر تعمیر آبادی تھی۔ اس مکان کے ارد گرد کئی پلاٹ خالی اور ویران پڑے تھے۔ عمران اپنی مہران کار میں آیا تھا۔ ہم کار میں بیٹھے اور تیزی سے روانہ ہو گئے۔ یہ رات کے قریباً ساڑھے دس کا عمل تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کراہتی آواز میں عمران سے پوچھا۔

"گھر۔"

"گھر نہیں... کہیں اور چلو... کسی ریسٹورنٹ میں۔" میرا لہجہ اندیشوں سے لبریز تھا۔

عمران نے گاڑی ایک جانب موڑ دی۔ ہم وحدت روڈ پر سے گزرے اور پھر ایک ٹک شاپ پر جا بیٹھے۔ "کچھ کھاؤ گے؟" عمران نے پوچھا۔

"نہیں... مجھے بس کوئی جوس لا دو۔" میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

"تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے۔ چلو، پہلے کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" عمران نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں... عمران نہیں۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ معاملہ بہت خراب ہو چکا ہے۔" میری آواز بلند ہو گئی۔

"یار! کتنا بھی خراب ہے، ہم اسے ٹھیک کر لیں گے۔ تم پہلے خود کو ٹھیک کرو۔ مجھے تمہاری حالت اچھی نہیں لگ رہی۔"

میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ پھر عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک بات سچ سچ بتاؤ... زیب کی حالت اب کیسی ہے؟"

عمران کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "وہ اسپتال ہی میں ہے۔ اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں۔ اس کا نچلا دھڑ کام نہیں کر رہا۔ بے ہوشی بھی اسی طرح ہے۔"

"اس کی موت کا ذمے دار کون ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"کیا... کیا مطلب؟"

"دیکھو عمران... اگر میری اور اپنی دوستی کا دم بھرتے ہو تو مجھے ایک سوال کا جواب سچ سچ دینا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ کیا میں توقع رکھوں کہ تم ایسا کرو گے؟"

اس نے پھر ایک طویل سانس لی اور تھکے تھکے انداز میں بولا۔ "پوچھو۔"

"وہ پسٹل شوٹ میں زیب کو گولی کیسے لگی تھی؟" میں نے بہت دھیمی آواز میں دریافت کیا۔

اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔ "تو تم نے میری وہ جیکٹ دیکھی ہے جس کی جیب میں سوراخ ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لیے اور گمبھیر آواز میں بولا۔ "تابش! اس سوراخ سے کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ اور اس سوراخ کے علاوہ بھی کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔ بہرحال، تم نے جو اندازہ لگایا ہے... وہ درست ہے۔"

میرے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ میں نے کہا اس

رہی تھیں۔ بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ کسی وقت باریک پھوار پڑنے لگتی تھی۔ سردی محسوس ہو رہی تھی۔ نیکی نالے میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کوئی پہاڑی نالا ہو۔ میں نے بہ غور دیکھا۔ نالے کے قریباً 100 میٹر چوڑے پاٹ کے اوپر ڈیڑھ دو فٹ چوڑی بلند پٹی ایک پل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جیسے ایک لکیری اس کنارے سے دوسرے کنارے تک کھینچ دی گئی ہو۔ اس کے نیچے قریباً بیس فٹ کی گہرائی میں نیکی نالے کا پانی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دھیان سے دیکھا تو یہ پٹی دراصل لوہے کے تین پائپ تھے جو ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کس پانی کی سپلائی ہے یا کوئی اور چیز۔

عمران نے گاڑی میں سے اوزار، گولیاں اور دو چار ضروری اشیا نکالیں پھر کنارے سے اتر کر اس آہنی پٹی پر پاؤں دھرا اور چند قدم چل کر دیکھا۔ اس کے بعد میرے پاس آیا اور بولا۔ ”چلو شہزادے! ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔“

”اس پر چل کر دوسری طرف جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل... لوگ یہاں سے اکثر گزر جاتے ہیں۔ بالکل آسان ہے۔“

”مگر ذرا ٹھیرو یار... ابھی...“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے جگر! بس تھوڑی سی ہمت۔ پہلے میں جاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

اس نے دونوں ہاتھ فضا میں دونوں طرف پھیلا لیے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریباً پانچ فاصلہ طے کر گیا۔ تب وہ میری طرف مڑا اور پکار کر بولا۔ ”چلو آ جاؤ... بس سیدھا دیکھتے رہو۔ نیچے پانی کو نہیں دیکھنا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو بیٹھ جانا۔ چلو شاباش...“

دوسرے کنارے پر کسی گاڑی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عمران کا کوئی ساتھی ہے جو ہمیں ریسیو کرنے کے لیے یہاں موجود ہے۔ عمران نے پھر مجھے پکارا۔ میں نے دل کڑا کر کے پائپوں پر قدم رکھا۔ میرا دل طوفانی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ سردی کے باوجود میں نے اپنی پیشانی پر پسینا محسوس کیا۔ ایک دم میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ شاید یہ پل صراط عبور نہیں کر سکوں گا اور میرے ایمان کی وجہ سے آج یہاں کوئی بڑا سانحہ رونما ہو جائے گا۔ عقب میں متعاقب گاڑیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ عمران نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔ ”کیا کر رہے ہو بھائی! جلدی کرو... وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔“ میں نے ایک بار پھر اپنی روحانی و جسمانی قوتوں کو جمع کیا۔ آگے بڑھنا چاہا مگر پاؤں نہیں اٹھے۔ میرے جسم جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ عمران عجب بے چارگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تب وہ واپس پلٹا۔ یہی وقت تھا جب عقب میں آنے والی ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس نے نیکی نالے کے کنارے کو روشن کر دیا۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ”کیا کر رہے ہو بھائی! وہ آ گئے ہیں۔ ہمت کرو۔ بس آجاؤ۔ کوئی مشکل نہیں ہے۔ بس سیدھا دیکھتے رہو۔“

وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ مشکل نہیں ہے۔“ میں اسے اب کیا کہتا؟ گزرے ہوئے دو سال میں، میں نے کتنی ہی بار خود سے کہا تھا۔ یہ مشکل نہیں ہے... یہ مشکل نہیں ہے۔ بس ہمت کرکے دیکھو۔ تھوڑی سی ہمت کرو۔ قدرت نے تمہیں اچھے بھلے دو ہاتھ دو پاؤں دیے ہیں۔ صحت مند جسم دیا ہے۔ پھر تم وہ کیوں نہیں کر سکتے جو کرنا چاہتے ہو؟ کیوں ہر دشوار گھڑی میں پسپائی تمہارا مقدر بنتی ہے؟ تم اپنا حق کیوں نہیں مانگ سکتے؟ کسی غاصب کا گریبان کیوں نہیں پکڑ سکتے؟ کسی مجبور کو پناہ کیوں نہیں دے سکتے؟ تم آزمائشوں کے سامنے ہتھیار کیوں ڈال دیتے ہو؟ کتنی بار یہ سوال میں نے خود سے پوچھے تھے اور کتنی بار بے چارگی کے شکنجے میں دب گیا تھا۔ آج اس تیرہ و تاریک رات میں، اس منہ زور نالے کے کنارے میں ایک بار پھر اسی بے چارگی اور ناتوانی کا شکار تھا... اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب قدرت کی طرف سے تھا... اور میں اکیلا نہیں تھا۔ شاید مجھ جیسے ہزاروں، لاکھوں اور بے شمار لوگ تھے جو غیر معمولی ذہنی ٹیسٹ اسی کا شکار رہتے تھے۔ جو نام تھے اور شاید نام سے بھی محروم۔ ایسے میں ان سب کا کیا قصور تھا؟ شاید وہ سب میری طرح خود کو بدلنے کی کوشش کرتے تھے مگر بدل نہیں سکتے تھے... وہ اپنی فطرت کے اسیر تھے۔

”عمران! میں یہ نہیں کر سکتا۔“ میں کراہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

گاڑیاں بائیں کنارے پر پہنچ گئی تھیں۔ ان کی ہیڈلائٹس نالے کے ایک طرف کے کنارے کو روشن کر رہی تھیں۔ جہاں تیز ہوا میں لہراتے سرکنڈے بھوتوں کے رقص کا منظر پیش کر رہے تھے۔ تعاقب کرنے والوں کی جوشیلی آوازیں بھی میرے کانوں سے ٹکرانے لگی تھیں۔

عمران ایک جانباز آدمی تھا۔ وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتا تھا... اور اب واپس میری طرف آنا بھی اس کے لیے از حد خطرناک تھا مگر وہ آ رہا تھا۔ اس کے سینے میں ایک فولادی دل دھڑکتا تھا اور اس فولادی دل میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ واپس میری طرف آ رہا تھا۔ اسے نہیں آنا چاہیے تھا... اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔

حادثات، مشکلات کی شکل... بلاؤں کی تلاش میں سرگرداں ماہ رخ کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ..... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ..... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان، محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ..... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے۔ ..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ..... ایک للکار ہے۔

چھٹی قسط

سیٹھ سراج کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”وہ دیکھو... وہ ہے... وہ آرہا ہے۔“ اس نے عمران کو دیکھ لیا تھا۔

میں بھی عمران کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر حتی الامکان تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید اب اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ مجھ تک پہنچے اور مجھے لے کر کنارے کے سرکنڈوں میں اوجھل ہو جائے۔

یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔

میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں صاف دیکھا۔ ایک گولی عمران کے دائیں کندھے پر لگی۔ اس کا جسم ایک جھٹکے سے

پیچھے کی طرف گیا۔ وہ ایک دم لڑکھڑایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ماؤزر سیدھا کیا۔ وہ کمال کا نشانے باز تھا مگر یہاں مدِمقابل ایک یا دو نہیں تھے، بہت سے تھے۔ عمران نے ایک فائر کیا اور اس کے جواب میں طاقتور آٹھ ایم ایم رائفل کا پورا ایک برسٹ اس کے سینے پر لگا... ہاں، اس رائفل کی ایک گولی بھی شاید انسانی جان لینے کے لیے کافی تھی اور یہ پورا برسٹ تھا۔ کم از کم پانچ چھ گولیاں۔ وہ اچھلا اور سر کے بل ڈیک نالے کے تند و تیز پانی میں جا گرا۔ یہ اپنے یار کی آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی۔ اس کے بعد میں جیسے کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس پُرآشوب رات میں، اس ڈیک نالے کے کنارے، ان سرکنڈوں میں عین اس وقت زمین کی گردش تھم گئی ہے اور کائنات ختم ہوگئی ہے۔

وہ ایسے جائے گا؟ اتنی جلدی... اتنا اچانک... ایسا غیر متوقع؟ میں کچھ دیر کے لیے شاید سکتے میں چلا گیا۔ جیسے دل سینے میں پھٹ جائے، نبضیں تھم جائیں اور آنکھیں پتھرا جائیں۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم کی ساری توانائی میری ٹانگوں میں منتقل ہو رہی ہے۔ جسم میں موجود خون کا ہر قطرہ میرے پاؤں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ یہ شاید زندگی بچانے کی وہ فطری خواہش تھی جو قدرت نے ہر جان دار کی جبلت میں نصب کر رکھی ہے۔

ایک قیامت کا جھٹکا سہنے کے بعد میرے اندر بھی یہ خواہش جاگی اور میں اندھا دھند سرکنڈوں میں بھاگ کھڑا ہوا۔

''وہ دیکھو... وہ جا رہا ہے۔'' ایک بار پھر سیٹھ کی منحوس آواز ہوا میں تیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ آواز کم و بیش چالیس میٹر دور سے آئی تھی اور اس کا رخ میری دائیں جانب تھا۔ مجھے لگا کہ کچھ لوگ للکارتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے ہیں۔ تب یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے۔ ایک گولی بالکل میرے پاس سے گزری۔ میں نے اس مہلک سیسے کی قاتل سنسناہٹ اپنے سر کے عین اوپر سنی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگلی گولی میری کمر یا سر کے پچھلے حصے میں کہیں لگے گی۔ گولی لگنے کا احساس کیا ہوگا؟ کیا میں وہ تکلیف سہہ سکوں گا؟ کیا میں فوراً گر پڑوں گا... کیا میری موت آناً فاناً ہو جائے گی؟ ایسے کئی سوال سیکنڈ کے مختصر وقفے میں میرے دماغ کے اندر چمکے اور اوجھل ہوئے۔

مجھے بس اتنا یاد ہے، میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ میرے راستے میں اونچے سرکنڈے تھے، خودرو جھاڑیاں تھیں اور کیچڑ تھا۔ میں گر رہا تھا، اٹھ رہا تھا اور پھسل رہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے اندازاً سو قدم کی دوری پر ہوں گے۔ دفعتاً مجھے لگا کہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شاخیں ٹوٹنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں ایک ساعت کے لیے یا شاید اس سے بھی کم وقت تک ہوا میں معلق رہا اور پھر کسی نیم ٹھوس جگہ پر گرا۔ میں کمر کے بل گرا تھا۔ میرے اوپر کچھ چیزیں گریں۔ جھٹکے کے سبب آنکھوں میں تارے سے ناچے اور ریڑھ کی ہڈی میں درد کی ایک بلند لہر اٹھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں جہاں گرا تھا، وہیں ساکت پڑا رہا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کیا میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے؟ فی الحال کچھ بھی نتیجہ نکالنا مشکل تھا۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد میرے پیچھے آنے والے طوفانی رفتار سے میرے آس پاس سے گزرے۔ میں نے ان کی چنگھاڑتی ہوئی آوازیں سنیں۔ ان میں شاید شیرے کی آواز بھی شامل تھی۔ وہ لوگ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے اور بھاگتے ہوئے ایک دوسرے سے بات بھی کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی گڑھے میں ہوں اور میرے اوپر بہت سا جھاڑ جھنکاڑ گرا ہوا ہے۔ شاید یہی جھاڑ جھنکاڑ تھا جس نے مجھے تعاقب کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد آوازیں مجھ سے دور چلی گئیں۔ رائفل کے تین چار فائر سنائی دیے اور لوگوں کی دور افتادہ چنگھاڑیں کانوں میں پڑیں۔ میں بے حرکت پڑا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے اب عمران کو گولیاں لگنے کا منظر تھا۔ بلندی سے اس کا پانی میں گرتا ہوا جسم۔ میری آنکھوں میں نمی جاگی پھر یہ نمی گرم پانی کے دھاروں میں بدل گئی۔ میرا سینہ ہچکیوں سے دہلنے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیا اور اپنے رونے کی آواز کو اپنے سینے کے اندر ہی روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ کیسے ہو گیا تھا؟ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ... جو تھوڑے ہی عرصے میں میری رگ و جاں سے قریب ہو گیا تھا، میری زندگی کا لازمی جزو بن گیا تھا، اس طرح اچانک مجھ سے منہ موڑے گا، اس طرح آناً فاناً موت کے اندھیروں کی طرف جست لگا جائے گا؟ میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ کہیں یہ جاگتی آنکھوں کا خواب تو نہیں تھا... کہیں میرا تصور مجھے کوئی دہشت ناک دھوکا تو نہیں دے رہا تھا؟

میری کراہیں میرے ہونٹوں کی فصیل توڑنے لگیں۔ میں اوندھا ہو گیا۔ میں نے اپنا منہ گھاس اور کیچڑ میں دھنسا دیا۔ میرا پورا جسم ہچکیوں سے دہلنے لگا۔

''عمران... عمران!'' میرے دل نے پکار کر کہا۔ ''مجھے یوں اکیلے چھوڑ کر نہ جا یار! یہ تو کوئی بات نہیں ہے... یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ تو تو مجھے زندگی کی طرف لا رہا تھا۔ اور ابھی تو میں پوری طرح زندہ بھی نہیں ہوا... اور تو مجھے چھوڑ رہا ہے... اور کیسے حالات میں چھوڑ رہا ہے۔ مجھ پر رحم کر... میری ناتوانیوں کی اتنی کڑی سزا نہ دے یار۔ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دو قدم نہیں چل سکتا۔ تو واپس آ جا یار... نہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا...''

میں رو رہا تھا۔ میرے آتشیں آنسو گھاس میں اور کیچڑ میں جذب ہو رہے تھے۔ عمران کے جاں کاہ دکھ کے سوا ہر طرح کی جسمانی و ذہنی تکلیف جیسے پس منظر میں چلی گئی تھی۔

وہ نہیں مرا... وہ زندہ ہوگا۔ دل کی گہرائیوں سے ایک صدا بلند ہوئی۔ وہ خطروں کا کھلاڑی ہے۔ وہ ہر رات موت کو جُل دیتا ہے، اس نے آج رات بھی جُل دیا ہوگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ گیا ہوگا۔ اس کی جادو کی پٹاری سے کوئی نہ کوئی شعبدہ ایسا ضرور نکلا ہوگا جس نے ''وقت'' کو حیران کر دیا ہوگا اور اب وہ کہیں کھڑا وقت کی حیرانی پر مسکرا رہا ہوگا۔ اس کی مسکراہٹ ناقابلِ شکست تھی۔ آج اتنی جلدی یہ مسکراہٹ شکست کھا کر پانی میں کیسے ڈوب گئی؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں، یہ بعید از قیاس ہے۔ میں اپنے پارہ پارہ دل پر تسلیوں کا مرہم رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

... وہ میری زندگی کی دشوار ترین گھڑیاں تھیں۔ اب میری آنکھیں کسی حد تک اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ یہ جگہ ایک رکھ (درختوں کا ذخیرہ) تھی۔ میں قریباً سات فٹ گہرے ایک مستطیل گڑھے میں تھا۔ اس جنگل میں یہ گڑھا انسانی ہاتھوں نے بنایا تھا اور اس کا مقصد غالباً کسی جانور کا شکار تھا۔ گڑھے کی بالائی سطح کو پتلی شاخوں، پتوں اور مٹی کے ساتھ اس طرح ڈھانپا گیا تھا کہ یہ ایک پھندا بن گیا تھا اور آج اس تاریک بارشی رات میں، ان خوفناک گھڑیوں میں، میں اس پھندے کا شکار ہوا تھا۔ یہ پھندا جو کسی جانور کے لیے موت بننے والا تھا، میرے لیے زندگی بنا تھا۔ گڑھے میں میرے گرنے کے بعد میرے اوپر شاخیں، پتے اور بھربھری مٹی گری تھی اور میں مکمل کیموفلاج ہو گیا تھا۔

ہاں، وہ میری زندگی کی دشوار ترین گھڑیاں تھیں۔ ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ کچی زمین اور پتوں پر اس کے گرنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ مجھے تلاش کرنے والے میرے قریب نہیں تھے تاہم میرے اردگرد موجود تھے۔ گاہے بہ گاہے مجھے فاصلے سے فائر سنائی دے جاتا یا کسی کے بولنے کی دور افتادہ آواز کانوں میں پڑتی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ بارش کے باوجود مجھے سردی محسوس نہیں ہو رہی اور میرا منہ بالکل خشک ہے۔ شاید میرا ٹمپریچر پھر شوٹ اَپ کر چکا تھا مگر ان حالات میں بخار اور جسمانی چوٹوں وغیرہ کی اہمیت میرے نزدیک ختم ہو چکی تھی۔ کسی جانور یا سانپ بچھو وغیرہ کا خوف بھی دور پس منظر میں چلا گیا تھا۔ میں نیم مردہ کیفیت میں اپنی جگہ پڑا رہا اور میری آنکھوں سے آتشیں آنسو رستے رہے۔

مجھے یاد آیا کہ لاہور کی ٹکا شاپ سے ہماری گاڑی کا تعاقب شروع ہونے کے بعد عمران نے اقبال سے کئی بار رابطے کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہیں ہو سکا تھا... تو کیا اب اقبال بھی میڈم کے ہرکاروں کی گرفت میں آ چکا تھا؟ اگر ایسا ہوا تھا تو پھر یہ میرے اہلِ خانہ کے لیے بھی از حد خطرناک تھا۔ اقبال کو معلوم تھا کہ میرے گھر والے کہاں ہیں۔ اس کے موبائل میں آصف کا فون نمبر بھی موجود تھا اور یہ آصف ہی تھا جو ڈیفنس والی کوٹھی کی سیکیورٹی کا ذمے دار تھا۔ کیا سیٹھ سراج اور اس کے مشتعل ساتھی میرے گھر والوں تک بھی پہنچ جائیں گے؟ یہ سوال ایک آتشیں نیزے کی طرح میرے سینے میں دھنس گیا اور مجھے بے حال کرنے لگا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ نادیہ مر چکی ہے اور اس کی موت نے میڈم صفورا اور اس کے ساتھیوں کو شعلہ جوالا بنا دیا ہے۔ وہ سب کچھ خاکستر کر دینا چاہ رہے ہیں۔ خاص طور سے سیٹھ سراج کی آواز میں، میں نے جو درندگی محسوس کی وہ بیان سے باہر تھی۔ یہ ایک ایسے شخص کی آواز تھی جس کے سر پر خون سوار ہو چکا ہو۔

اب بھی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جونہی میں سراج اور شیرے وغیرہ کو نظر آیا، میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ مجھے ایک سیکنڈ کی مہلت دیے بغیر چھلنی کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میری لاش کو بھی چند برسٹ مارے جائیں۔ قبر تو میری

> ایک صاحب ریسٹوران میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک سامنے سے فائر بریگیڈ کی گاڑی گزرتی نظر آئی۔ وہ صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔ ''وہ چلی فائر بریگیڈ کی گاڑی اور یہ چلا میں۔''
> ایک دوست نے کہا۔ ''لیکن تم فائر مین تو نہیں ہو؟''
> وہ صاحب بولے۔ ''میں فائر مین نہیں ہوں... لیکن میری محبوبہ کا شوہر تو فائر مین ہے۔''

پہلے ہی کھدی ہوئی تھی، اس پر بس مٹی ڈالنے کی کسر تھی۔

قریباً دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میری بہن، میرا بھائی اور والدہ شدید خطرے میں تھے۔ میں ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر یہاں سے کیسے نکلتا؟ میرے گرد موت کا پہرا تھا۔ قاتل شکاری ابھی تک مجھے اس ''رکھ'' میں ڈھونڈ رہے تھے۔ میں ان کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا۔ پچھلے قریباً آدھ گھنٹے سے کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ میرے اردگرد موجود نہیں ہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ یہ بھی ان کی چال ہو۔ وہ اپنے نہ ہونے کا تاثر دے کر مجھے میری پناہ گاہ سے نکالنا چاہتے ہوں۔ ڈیک نالا اور نالے کے کنارے کھڑی گاڑیاں یہاں سے بہت دور رہ گئی تھیں۔ اگر انہیں اسٹارٹ کیا جاتا تو شاید آواز مجھ تک نہ پہنچ سکتی۔

جلد ہی اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ بڑھتی چلی گئی۔ میں نے خود کو کچھ اور بھی جھاڑ جھنکاڑ کے اندر چھپا لیا۔ رات ختم ہونے کے ساتھ ہی دل میں یہ خوفناک اندیشہ سر اٹھانے لگا کہ اب مجھے دیکھ لیا جائے گا۔ اردگرد سے آوازیں اب معدوم ہو چکی تھیں مگر کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔ میں وہیں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ دن ہونے کے باوجود وہاں نیم تاریکی ہی رہی۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ رات کو گاہے بہ گاہے ہونے والی تیز بارش نے میرے قدموں کے نشان بہت حد تک ختم کر دیے ہوں گے۔ یہ گڑھا یقیناً کسی جنگلی بلے، گیدڑ یا سور وغیرہ کو پکڑنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ گڑھا تیار کرنے والے یہاں پہنچ جائیں اور ان کی وجہ سے میں اپنا تعاقب کرنے والوں کی نگاہوں میں آ جاؤں۔

دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ میرے اردگرد کوئی موجود نہیں... اور اگر میں اس گڑھے سے نکلنا چاہوں تو نکل سکتا ہوں۔ مگر ایک بار پھر میرا فطری تذبذب مجھے ہلکان کرنے لگا۔ کیا دن کی روشنی میں میرا یہاں سے نکلنا ٹھیک ہوگا؟ کیا یہاں سے نکل کر میں درست سمت میں سفر کر سکوں گا؟ کیا اس رکھ کے چوکیدار وغیرہ تو مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر دیں گے؟

میں نے اس گڑھے میں تقریباً سات گھنٹے مزید گزار دیے۔ پچھلے بیس گھنٹے سے میں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ گلوکوز کی ڈرپ کے ذریعے جو توانائی میرے جسم میں پہنچی تھی، وہ کب تک ساتھ دیتی۔ میرے کندھے اور گردن کے زخم آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ بخار کے سبب پورا جسم پھنک رہا تھا۔ گڑھے میں گرنے سے جو چوٹیں آئی تھیں، وہ اس کے علاوہ تھیں اور سب سے بڑی چوٹ جسمانی نہیں ذہنی تھی۔ کل رات عمران کے شوٹ ہونے کے منظر کو میں ایک لمحے کے لیے... صرف ایک لمحے کے لیے بھی بھلا نہیں سکا تھا۔ شاید میں اس کرب کو لفظوں میں بیان نہ کر سکوں اور اگر کرنا بھی چاہوں تو ہزاروں لاکھوں لفظ لکھ کر بھی یکسر ناکام رہوں۔ میں خود کو بس یہی دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے جو دیکھا، وہ بعین وہ نہیں تھا جو نظر آیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تو میں نے خود کو گڑھے کے گدلے پانی اور کیچڑ سے اوپر اٹھایا، اپنے جسم سے شاخیں اور پتے وغیرہ ہٹائے۔ میں بہ مشکل کھڑا ہو سکا۔ یہ بات تو اب تقریباً طے تھی کہ سیٹھ سراج اور اس کے ہرکارے اس جگہ سے جا چکے ہیں۔ اب مسئلہ یہاں سے باہر نکلنے کا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ اوپر اٹھائے تو وہ بہ آسانی گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے۔ تاہم گڑھے سے نکلنا آسان ثابت نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ میرا زخمی جسم بھی تھا۔ پانچ چھ منٹ کی کوشش اور کئی ایک تازہ خراشوں کے بعد ہی میں باہر نکل سکا۔ یہی وقت تھا جب قریبی درختوں میں تیز آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو جلدی سے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں چھپایا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے گڑھا کھودا ہے۔ میں چند سیکنڈ تک اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ کوئی جنگلی جانور تھا جو بڑی سرعت سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ میں بس اس کی پرچھائیں ہی دیکھ سکا۔ یہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی بڑا جنگلی بلا، گیدڑ یا چھوٹے قد کا سور۔ عام حالات میں شاید یہ منظر مجھے سرتاپا لرزا دیتا مگر جب انسان جنگلی درندوں سے بڑھ کر ہلاکت خیز ہو جائیں تو پھر جانوروں کی دہشت ماند پڑ جاتی ہے۔

پانچ دس منٹ تک جھاڑیوں میں رکنے کے بعد میں نے اندازے سے ایک سمت چلنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں ڈیک نالے کی مخالف سمت میں جا رہا ہوں مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے ڈیک نالے کا منحوس شور سنا اور دل کے زخموں کے منہ پھر کھل گئے۔ تازہ خون رسنے لگا۔

اچانک انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے خود کو کیکر اور شیشم کے تناور درختوں کے پیچھے چھپایا۔ یہ ایک ٹریکٹر ٹرالی تھی۔ اس پر بہت سی خشک ٹہنیاں اور درختوں کے چھوٹے چھوٹے تنے لدے ہوئے تھے۔ غالباً یہ سب کچھ ایندھن کے لیے استعمال ہونا تھا۔ ایک اکیلا دیہاتی اس ٹریکٹر کو چلا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری ہمت بندھی اور میں دل کڑا کر کے اس کے سامنے چلا گیا۔ اس نے ٹریکٹر کی ہیڈ لائٹس میں مجھے دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ میرا حلیہ کسی کو بھی ششدر کر سکتا تھا۔ پورا جسم کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔

''کون ہو؟'' اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

''مسافر ہوں بھائی! میری جیپ پیچھے درخت سے لگ کر الٹ گئی ہے۔ سخت تکلیف میں ہوں۔ مجھے کسی ڈاکٹر تک پہنچا سکتے ہو؟'' میں نے ایک ہی سانس میں سب کہہ دیا۔ وہ ٹریکٹر سے اترا اور میرا جائزہ لینے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اس کے ساتھ ٹریکٹر پر بیٹھا تھا۔ اس کا نام رحمت علی تھا اور وہ ایک قریبی دیہہ روہی پور کا رہنے والا تھا۔ میں اس کے ساتھ گاؤں جانے کا رسک ہرگز نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ مجھے تلاش کرنے والوں نے اردگرد کے دیہات کو بھی کھنگالا ہو اور وہاں کے لوگ کسی ''مفرور'' شخص کے لیے الرٹ ہو چکے ہوں۔

بہرحال، مجھے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ رحمت علی اپنے گاؤں جانے کے بجائے اپنے ڈیرے پر جا رہا ہے۔ اس کے بیوی بچے بھی وہیں تھے۔ اس کا ڈیرا اس رکھ کے پاس ہی ایک بارانی رقبے میں تھا۔

رحمت علی کا رویہ دوستانہ ہی لگ رہا تھا۔ ہم قریباً بیس منٹ میں ڈیرے پر پہنچ گئے۔ گندم ابھی چھوٹی اور ہری تھی۔ اس وسیع و عریض ہریالی کے درمیان رحمت علی کا ڈیرا بس تین چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک چھوٹا ٹیوب ویل بھی لگا ہوا تھا۔ دبلا پتلا رحمت علی اور اس کی فربہ اندام بیوی بالکل سادہ سے لوگ تھے۔ انہوں نے میری بات پر من و عن یقین کیا تھا۔ کسی طرح کے سوال جواب کیے بغیر انہوں نے پوچھا کہ وہ میری کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ ایک رات پہلے پیش آنے والے واقعات کا انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ فائرنگ کی دور افتادہ آواز انہوں نے ہو سکتا ہے کہ سنی ہو مگر یہاں شکاری بھی گھومتے رہتے تھے۔ اس طرح کی آوازیں آتی ہی رہتی ہوں گی۔

رحمت علی نے میرے لیے نہانے کا انتظام کیا اور ایک شلوار قمیص بھی مجھے پہننے کے لیے دی۔ یہ میرے سائز کی تو نہیں تھی مگر شلوار کو ذرا نیچے باندھ کر اور جسم کے گرد گرم چادر لپیٹ کر گزارہ ہو گیا۔ مجھے شدید نقاہت تھی مگر میں ایک گلاس دودھ کے سوا کچھ نہ لے سکا۔ قریباً اٹھارہ گھنٹے کیچڑ اور جھاڑ جھنکاڑ میں رہنے کے بعد میرے زخموں کا برا حال تھا۔ بخار

بھی برقرار تھا۔ بہرطور یہ جسمانی تکلیفیں میرے اندرونی کرب میں ڈوب کر رہ گئی تھیں۔

میں نے رحمت علی کو بتایا۔ ''میں فوری طور پر گھر جانا چاہتا ہوں۔ میرے گھر والے میرے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ واپسی پر میں کچھ بندے بھی لے کر آؤں گا تاکہ اپنی گاڑی کو لاہور واپس لے جاسکوں۔''

میری جیب میں کچھ بھیگے ہوئے، کیچڑ آلود کرنسی نوٹ موجود تھے۔ میں نے یہ نوٹ رحمت علی کو دے کر اس سے دوسرے نوٹ حاصل کرنا چاہے لیکن وہ مجھ سے پیسے لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوا۔ میرے بے حد اصرار کے باوجود اس نے چار پانچ سو روپے میری جیب میں ڈال دیے۔ میں اس کا یہ احسان رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا وقت رخصت چند بھیگے نوٹ خاموشی سے بستر کی چادر کے نیچے رکھ دیے۔ رحمت مجھے اپنے ٹریکٹر پر تقریباً چار کلومیٹر دور پختہ سڑک تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ یہاں اس نے اپنے کسی جاننے والے سے درخواست کی اور وہ مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر جی ٹی روڈ تک لے آیا۔ جی ٹی روڈ سے مجھے بس پکڑنے اور لاہور پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

جب میں یادگار چوک میں اترا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ وہی یادگار چوک تھا جہاں سے میں اور عمران درجنوں بار موٹر سائیکل پر فراٹے بھرتے ہوئے گزرے تھے۔ آج یہ یادگار چوک بلکہ یہ پورا شہر مجھے ایک ویرانہ لگ رہا تھا۔ ایک ایسا ویرانہ جو کسی جوان بیوہ کی طرح بال کھولے آہ و بکا کر رہا ہو۔ آہ... کہاں تھا وہ شہریار... کہاں تھا وہ خندہ جبیں؟ کہاں تھے اس کے قہقہے، اس کی باتیں؟ وہ ایک شخص پورے شہر کو کھنڈر کر گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے حالات کی بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ عمران کو پیش آنے والے سانحے کی اطلاع اس کے دوستوں اور ساتھیوں کو ہو چکی ہے یا نہیں۔ اگر ہو چکی ہے تو ان کا ردِعمل کیا رہا ہے... راوی روڈ والے گھر جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ شاہین کے گھر کا رخ کروں لیکن یہ بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پھر میں نے دل کڑا کیا اور براہِ راست ڈیفنس پہنچنے کا تہیہ کرلیا۔ میں پہلے ہی بہت تاخیر کر چکا تھا۔ اب مجھے جلد از جلد گھر والوں تک پہنچنا چاہیے تھا۔ میں جانتا تھا کہ عمران اور اقبال کے سوا میرے اہلِ خانہ کے ٹھکانے کا کسی کو علم نہیں۔ مجھے زیادہ اندیشہ بھی اقبال ہی کی طرف سے تھا۔ اگر عمران کی طرح وہ بھی سیٹھ سراج اور شیرے کے ہتھے چڑھ چکا تھا تو پھر اس کو بھی بدنصیب سلیم کی طرح تشدد کے شکنجے میں کسا جا سکتا تھا۔ وہ ایسا تشدد تھا کہ پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا... اور اگر اقبال جو پہلے ہی علیل تھا، بول پڑتا تو پھر سیٹھ سراج اور شیرے کی سفاکی میرے گھر والوں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔

میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور اپنی بے پناہ دھڑکنوں پر قابو پاتا ہوا، براستہ جیل روڈ ڈیفنس کی طرف روانہ ہوگیا۔ دیہاتی لباس میں میرا حلیہ کچھ ایسا مناسب نہیں تھا۔ راہ گیروں کی طرح ٹیکسی ڈرائیور نے بھی مجھے سرتاپا گھورا۔ مجھے اس چار دیواری کا پتا ذہن نشین تھا جہاں میں اپنی والدہ، بہن اور بھائی سے مل چکا تھا۔ میں نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکوادی۔ خوب صورت کوٹھی کے برآمدے میں روشنی تھی، تاہم گیٹ پر نیلی وردی والا ریٹائرڈ فوجی گارڈ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ صحن میں تھا۔

میں گیٹ پر پہنچا تو گارڈ فوراً باہر آگیا۔ اس نے مجھے بہ غور دیکھا اور پہچان لیا۔ ''صاحب! آپ اس وقت یہاں؟ آپ خیریت سے تو ہیں؟''

''ہاں، خیریت سے ہوں۔'' میں نے کہا اور اندر چلا گیا۔ اندر عمران کا قریبی ساتھی آصف بھی موجود تھا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی عاطف سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ ابھی تک حالات کی سنگین ترین کروٹ سے بے خبر ہیں۔ میرے دیہاتی حلیے کی وجہ سے عاطف کو بھی مجھے پہچاننے میں تین چار سیکنڈ لگ گئے۔ پھر وہ تیزی سے میری طرف آیا اور بھائی جان کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا۔ ''کیا ہوا بھائی جان؟'' اس نے کہا۔

میرے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میرے جسم پر زخم ہیں اور اس کے پُرجوش معانقے نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ ''اوہ... سوری بھائی جان!'' وہ ہکلایا۔ ''آپ کو شاید چوٹ لگی ہوئی ہے... اوہو... آپ تو زخمی لگتے ہیں۔ کک... کیا ہوا ہے بھائی جان! خیریت تو ہے نا... اور عمران بھائی... وہ کہاں ہیں؟ کل دو تین بار اقبال صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ وہ آپ کا اور عمران بھائی کا پوچھ رہے تھے۔ آپ دونوں کہاں تھے۔ اور... اور آپ کے یہ کپڑے؟''

اس نے حسبِ عادت ایک ساتھ کئی سوال پوچھ لیے۔ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے گہرے ہوتے چلے جارہے تھے۔

اب آصف بھی قریب آگیا۔ اس نے مجھے سرتاپا دھیان سے دیکھا۔ اس کی معاملہ فہم نظر جان چکی تھی کہ کوئی

بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اس نے ہولے سے کہا۔ ''اندر آجائیے تابش صاحب!''

میں لڑکھڑاتے قدموں سے انٹرنس کی طرف بڑھا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں عاطف سے کہا۔ ''امی اور فرح کو میری چوٹوں کے بارے میں نہیں بتانا۔''

ہم اندر پہنچے۔ پہلی منزل پر والدہ سو رہی تھیں تاہم فرح ابھی جاگ رہی تھی۔ وہ ٹی وی آن کیے بیٹھی تھی اور ساتھ ساتھ سلائی مشین پر کچھ بنا رہی تھی۔ اس نے عاطف کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر ایک دم تڑپ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی ''بھائی'' کہہ کر میرے گلے لگی اور مجھے ایک بار پھر درد کی شدید ٹیسیں برداشت کرنا پڑیں۔ کچھ دیر بعد والدہ بھی جاگ گئیں۔ ان کے چہرے پر شدید نقاہت تھی۔ پتا چلا کہ پرسوں سے ان کے کندھوں میں سخت درد ہے۔ وہ کافی عرصے سے ''فریزڈ شولڈرز'' کی تکلیف میں مبتلا تھیں۔ سرد ہوا میں گھومنے پھرنے سے یہ تکلیف فوراً عود کر آتی تھی۔ ان کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پر تین چار دوائیں بھی رکھی تھیں۔ بہرحال، میری آمد کی خوشی میں وہ اپنی تکلیف بھول گئیں اور تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے کئی بار میرا ماتھا چوما۔ پھر میرے حلیے کی وجہ پوچھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کل عمران کے ساتھ ایک دیہاتی علاقے میں تھا۔ وہاں بارش اور کیچڑ کی وجہ سے کپڑے خراب ہوگئے تھے۔ عمران کے ایک مقامی دوست کے کپڑے پہننا پڑے۔ انہوں نے میرے چہرے کی خراشوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھا اور ایک دو سوال پوچھے۔

والدہ کی نگاہیں مسلسل عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ''لیکن وہ ہے کہاں؟''

اس سوال کا جواب دنیا کا مشکل ترین جواب تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور کہا۔ ''وہ ساتھ نہیں ہے امی جی۔''

فرح مسکرا کر بولی۔ ''وہ تو کہتے تھے کہ ہم جب آئیں گے، اکٹھے ہی آئیں گے... کیونکہ ہم ایک دوسرے کی دُم کی طرح ہیں۔ یہ دیکھیں، میں نے تو ان کی شرٹ بھی ٹھیک کر دی ہے۔''

اس نے پرانی شرٹ میرے سامنے پھیلائی۔ فرح نے شاید اس کو نئی سلائیاں لگائی تھیں۔

''یہ کیا ہے؟'' والدہ نے پوچھا۔

''عمران بھائی کی شرٹ۔ پچھلی دفعہ مجھے دے کر گئے تھے۔ کہتے تھے کہ میں اسے ٹھیک ٹھاک کردوں۔''

''ہائے۔'' والدہ نے کہا۔ ''اتنی پرانی قمیص مرمت کرانے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ اللہ کا کرم ہے، اس کے پاس پیسوں کی کوئی کمی ہے؟''

''امی جی! کچھ چیزیں پیسوں سے نہیں خریدی جا سکتیں۔'' فرح مسکراتے لہجے میں بولی۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس قمیص سے عمران بھائی کی کچھ بڑی اچھی اچھی یادیں جڑی ہوئی ہوں۔ ہم نے بھی تو ابھی تک ابو جی کی دو شیروانیاں سنبھالی ہوئی ہیں نا... ہاں، شیروانی سے یاد آیا کہ عمران بھائی بھی شیروانی کی بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بچپن میں ان کی والدہ نے انہیں بھی شیروانی پہنائی تھی۔ وہ اتنی لمبی تھی کہ اس کے نیچے کچھ پہننے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی، بس ٹخنوں تک بٹن بند کرتے چلے جاؤ۔ دراصل عمران بھائی کی والدہ نے چالاکی دکھائی تھی۔ عمران بھائی ایک سیکنڈ بھی نچلے نہیں بیٹھتے تھے۔ ہر وقت بھاگ دوڑ کرتے تھے۔ انہوں نے ایسی شیروانی پہنا دی کہ وہ بھاگ ہی نہ سکیں...'' فرح ہنسنے لگی۔

والدہ بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ''کیا بات ہے تابش! تم... کچھ... چھپا رہے ہو... تمہیں چوٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ کیا... بات... ہے۔ کہیں کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا ہے؟''

میں نے اپنا سر تھام کر جھکا لیا۔ آنسو ایک دم ہی گرم پانی کے آبشار کی طرح آنکھوں سے گرنے لگے۔ ''ہائے میں مرگئی۔'' والدہ نے کہا اور میرا چہرہ اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

''کیا بات ہے بھائی... عمران بھائی تو خیریت سے ہیں؟'' فرح نے بھی روہانسی آواز میں پوچھا۔

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''ہاں، سب خیریت سے ہیں، کوئی ایسی بات نہیں۔ لل... لیکن یہاں اب آپ لوگوں کے لیے بہت خطرہ ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے چلنا ہوگا بلکہ... اسی وقت نکلنا ہوگا۔'' میری آواز بے طرح لرز رہی تھی۔

میرے انداز نے سب کو ایک دم ہراساں کر دیا۔ ''مگر عمران بھائی آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟'' عاطف نے میرا شانہ تھاما۔ ''کل بھی ان کا کچھ پتا نہیں تھا... آج آصف بھی سارا دن فون کرتا رہا ہے، پر ان کی طرف سے یا آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔''

''یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تفصیل آپ لوگوں کو بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔''

''ہم... کہاں جائیں گے تابی... پہلے ایک دم اپنے گھر سے نکلے، اب تم ایک دم یہاں سے نکلنے کے لیے کہہ رہے ہو... کیا ہم اس طرح بھاگتے ہی رہیں گے...؟''

''بس ای جی! حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے ہیں۔ مم... مجھے عمران نے ہی بھیجا ہے... وہ چاہتا ہے کہ... ہم فوراً یہاں سے نکل جائیں۔''

''پر وہ تو کہتا تھا تابی... کہ یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہم دس سال بھی یہاں رہیں تو کوئی ڈر خطرہ نہیں۔''

''غیب کا علم تو کسی کو نہیں ہوتا نا ای! آپ بس چلنے کی تیاری کریں۔'' میری آواز میں لرزش بڑھتی جارہی تھی۔

آصف مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''تابش بھائی! آپ کچھ چھپا تو نہیں رہے؟'' میں نے آنسو چھپا کر ایک بار پھر نفی میں سرہلایا۔

وہ بولا۔ ''لیکن آپ یہاں سے جانے کی بات کیوں کررہے ہیں؟ آپ اس طرح کیسے جاسکتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''ہیرو بھائی نے اس بارے میں ہمیں سختی سے ہدایت کی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس چار دیواری سے باہر ماں جی، عاطف اور فرح بی بی کے لیے خطرہ ہے۔''

''لیکن اب یہاں خطرہ زیادہ ہے آصف۔''

''گستاخی معاف تابش بھائی! اگر ایسی بات ہے تو پھر ہیرو بھائی کو خود بات کرنی چاہیے۔ ان کے پاس میرے اور گارڈ خادم حسین، دونوں کے فون نمبرز ہیں۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے گھر والے یہاں یرغمال ہیں... وہ میری مرضی سے بھی کہیں نہیں جاسکتے؟'' میں نے بھڑک کر کہا۔

''نہیں... نہیں تابش بھائی! آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں؟ ہماری اتنی جرأت ہے کہ ایسا سوچ سکیں۔ ہماری حیثیت تو آپ کے نوکروں کی ہے... مگر...''

''مگر کچھ نہیں آصف!'' میں نے بڑے درد سے اس کا کندھا تھاما۔ ''میں اس وقت تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ عمران اس وقت فون نہیں کرسکتا اور ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہے۔ جتنی دیر ہوگی، خطرہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔''

آصف کے چہرے پر الجھن ہی الجھن تھی۔ وہ پیشانی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تابش صاحب!! اقبال بھائی سے بھی رابطہ نہیں ہو پارہا۔''

''اور یہی زیادہ خطرناک بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ کوٹھی بڑی جلدی سراج وغیرہ کی نظر میں آنے والی ہے۔ اقبال کے سیل فون میں تمہارا نمبر بھی سیو ہے۔ تمہارے نمبر پر کوئی مشکوک کال تو نہیں آئی؟''

اس سے پہلے کہ آصف جواب میں کچھ کہتا، گراؤنڈ فلور سے سابق فوجی گارڈ کی آواز آئی۔ ''آصف بھائی! ذرا نیچے آنا۔'' اس کے لہجے میں عجلت تھی۔

''میں ابھی آیا۔'' آصف نے مجھ سے کہا اور تیزی سے زینے اتر کر نیچے چلا گیا۔

میں ایک بار پھر والدہ اور فرح وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ اب پریشانیوں نے بھی ان کے چہرے پر ڈیرے جمالیے تھے۔ فرح بھی بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سب سمجھ گئے تھے کہ یہ رات ایک بار پھر ان کے لیے خانہ بدوشی کا اذن لے کر آئی ہے۔

اگلے پانچ منٹ میں، میں نے والدہ سمیت سب کو یہاں سے نکلنے کے لیے تیار کرلیا۔ فرح میری ہدایت کے مطابق جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگی۔ سامان تھا ہی کتنا؟ گھر سے نکلتے ہوئے والدہ نے فرح کے لیے بنایا ہوا کچھ زیور ساتھ لیا تھا، اس کے علاوہ تیس چالیس ہزار روپے نقد اور اتنے کے ہی ڈیفنس سرٹیفکیٹ تھے۔ باقی جو سامان تھا، وہ ہمارے ذاتی گھر میں پڑا ہوا تھا۔

ضروری کپڑے اور دیگر چیزیں فرح نے کانپتے ہاتھوں سے ایک اٹیچی میں بند کرلیں۔ عاطف نے اپنی کتابیں، ای کی دوائیاں اور دیگر چھوٹا موٹا سامان ایک بڑے شولڈر بیگ میں رکھنا شروع کیا۔ میں اس کام میں اس کی مدد کررہا تھا۔ یہ اندیشہ ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھا کہ آصف، ہمارے یہاں سے نکلنے میں کہیں رکاوٹ نہ ڈالے۔

اچانک مجھے زیریں منزل سے عجیب سی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی تیزی سے بھاگا ہو پھر کوئی وزنی چیز گری ہو۔ میں چونک کر کامن روم کی طرف آیا۔ یہاں میں نے جنگلے سے نیچے جھانکا تو میرا سر لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے میرا پورا جسم الیکٹرک شاک کی زد میں ہے۔ شاید یہ شب وروز ہی کچھ ایسے تھے۔ میری آنکھوں کی قسمت میں بدترین مناظر کی دید لکھ دی گئی تھی۔

میں نے آصف کو دیکھا۔ وہ ٹی وی ٹرالی کے قریب گرا ہوا تھا۔ دو بندے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ ایک نے پوری طاقت سے اس کا گلا دبایا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے منہ پر اندھا دھند گھونسے رسید کررہا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ پُرہول منظر ایک اور تھا۔ مجھے داخلی دروازے کے بالکل قریب براؤن فرشی ٹائلز پر گارڈ خادم حسین کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ گرا پڑا تھا اور بالکل بے حرکت تھا۔ اس کا بالائی دھڑ میری نظر سے اوجھل تھا، تاہم شواہد بتا رہے تھے کہ وہ شدید زخمی ہے یا مرچکا ہے۔ اس کے بالائی دھڑ کی طرف سے خون بہہ کر ٹانگوں کی طرف آرہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ کامن روم سے گزرنے کے بعد میں نے جو سب سے پہلا کام کیا، وہ یہ تھا کہ درمیانی دروازہ لاک کردیا۔ اب کامن روم اور سیڑھیاں باقی کے پورشن سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر علیحدہ ہوگئے۔

میں چلّایا۔ ''عاطف! بھاگو یہاں سے۔ وہ آگئے ہیں۔'' میری آواز دہشت سے بگڑی ہوئی تھی۔

''کون آگئے ہیں؟'' عاطف نے بھی بلند آواز میں پوچھا۔

''میڈم کے لوگ۔ انہوں نے خادم حسین کو ماردیا ہے... وہ ماردیں گے سب کو... نکلو یہاں سے۔''

والدہ کے چہرے کا جیسے سارا خون نچڑ گیا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اپنی کمر اور کندھوں کی تکلیف کے سبب وہ فوری طور پر اٹھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ عاطف اٹیچی بند کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اٹیچی کو ٹھوکر ماری۔ ''عاطف! لعنت بھیجو اس پر... نکلو... فرح کو لے کر نکلو۔''

عاطف، فرح کی طرف لپکا تو میں والدہ کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب کامن روم میں کھلنے والا دروازہ دھڑا دھڑ بجنا شروع ہوگیا۔ فرح کا چہرہ ہلدی ہوچکا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں پھر چلّایا۔ ''فرح... نکلو یہاں سے۔''

عاطف نے فرح کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں دوڑتے ہوئے ٹیرس کی طرف چلے گئے۔ وہ ٹیرس کی چار فٹ اونچی ''سائڈ وال'' کراس کرکے بہ آسانی ساتھ کی زیرتعمیر کوٹھی میں داخل ہوسکتے تھے۔ میں نے کراہتی ہوئی والدہ کو سہارا دے کر بہ مشکل بیڈ سے اتارا۔ ابھی میں ان کے ساتھ بیڈروم کے دروازے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ باہر سے لگنے والے زوردار دھکوں سے دروازہ ٹوٹ گیا۔ میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، میں والدہ کو لے کر ایک ساتھ والے دروازے میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کہاں گھسا ہوں۔ چند ہی سیکنڈ بعد یہ دروازہ بھی دھڑا دھڑ بجایا جانے لگا اور پھر میرے کانوں میں چھوٹے سر اور موٹے جسم والے سیٹھ سراج کی منحوس آواز داخل ہوئی۔

''دروازہ کھول دے کاکے! اج توں بچ نئیں سکدا۔''

اس کے ساتھ ہی دروازے کو زوردار دھکے مارے گئے۔

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں جس کمرے میں داخل ہوا ہوں، یہ چاروں طرف سے بالکل بند ہے۔ کوئی کھڑکی، کوئی روشن دان موجود نہیں تھا۔ بس بلندی پر ایک چھوٹا ایگزاسٹ فین لگا ہوا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ بھی لکڑی کے بجائے لوہے کی وزنی چادر کا تھا۔ یہاں شفاف لمبوتری میز پر دو تین کمپیوٹر پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کپڑے کی ایک اسکرین تھی اور اس کے سامنے آٹھ دس کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔

میں نے والدہ کو ایک کرسی پر بٹھایا اور خوف زدہ نظروں سے دروازے کو دیکھنے لگا۔ دروازے پر شاید رائفلوں کے بٹ برسائے جارہے تھے۔ ساتھ ساتھ سراج، شیرے اور ان کے ساتھیوں کے گرجنے برسنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ وہی ہوا ہے جس کا خطرہ تھا۔ اقبال پکڑا جاچکا ہے اور اس کے ذریعے میڈم کے لوگ اس کوٹھی تک پہنچ گئے ہیں۔

والدہ نے میرا بازو تھاما اور کراہتی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''اب کیا ہوگا تابی! یہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں تم سے... ان کے سروں پر تو خون سوار ہے۔ ہائے ربا... اب کیا ہوگا؟''

میں والدہ کو کیا تسلی دیتا۔ میں تو خود خوف کے ایک عمیق سمندر میں ڈوبتا چلا جارہا تھا۔

''تمہارے پاس موبائل نہیں ہے تابی! تم ون فائیو پر فون کردو یا پھر عمران کو بتاؤ۔''

''نہیں ای، فون نہیں ہے۔'' میری آواز بہ مشکل ہونٹوں سے نکل پائی۔

یوں لگتا تھا کہ والدہ کو کچھ ہو جائے گا۔ ان کی رنگت نیلی پڑتی جارہی تھی۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ لگالیا۔ ان کا سر چومنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ کسی معجزے کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی ایسا کرشمہ جس سے میری اور والدہ کی جان بچ جائے۔ ان بدترین حالات میں اگر مجھے تھوڑی سی تسلی تھی تو صرف اس بات کی کہ فرح اور عاطف یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے مگر ابھی اس بارے میں بھی پورے یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ ٹیرس سے نکل کر ساتھ والی زیرتعمیر کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔ اگر سیٹھ سراج کے ساتھی

اردگرد نظر رکھے ہوئے تھے تو پھر ان کے پکڑے جانے کا امکان بھی موجود تھا۔

میں کسی پلاننگ کے تحت اس کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ تاہم لگتا تھا کہ اس کوٹھی کے اندر شاید یہ محفوظ ترین کمرا ہے۔ ایک دروازے کے سوا اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ دروازہ بھی آسانی سے کسی کو راہ دینے والا نہیں تھا۔ وہ لوگ دیوانہ وار دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ناکام تھے۔ اب وہ ضربیں نہیں لگا رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ اس طرح کا شور کسی قریبی کوٹھی کے مکینوں کو متوجہ کر سکتا ہے۔ وہ اب دروازے کو دھکیل رہے تھے اور کسی آہنی بار کے زور سے اس کا کھٹکا توڑنے کی سعی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سراج کی غضب ناک وارننگ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ وہ دہاڑ رہا تھا۔ ''دروازہ کھول دو۔ نہیں تو بڑی بھیڑی طرح پچھتاؤ گے۔ بڑا تڑفا کر ماردوں گا تمہیں۔''

''گیس چھوڑ دیں جی کمرے میں۔ مرجائیں گے کتے یا باہر نکل آئیں گے۔''

پتا نہیں کہ وہ کس گیس کی بات کر رہا تھا؟ مگر ایک بات واضح تھی۔ یہ مضبوط دروازہ انہیں راستہ نہیں دے رہا تھا۔

میں نے کمرے میں اندھا دھند ہاتھ چلا کر کوئی فون یا سیل فون ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ یہ دروازہ کتنا بھی مضبوط ہوا، بہت دیر تک ہمیں محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں گے اور اس کے بعد... اس کے بعد ایک وحشت ناک تاریکی کے سوا کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا تھا۔ والدہ نے نڈھال ہو کر کرسی کی لمبی نشست سے ٹیک لگائی۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''یا اللہ! میرے بچوں کو بچالے۔ یا اللہ! تُو ہی ان کا حافظ و ناصر ہے۔'' وہ بار بار یہی فقرہ بول رہی تھیں۔ میں نے ان کا لرزاں سر اپنے ساتھ لگایا۔ وہ کراہیں۔ ''اب اس دنیا میں کوئی کس پر بھروسا کرے۔ اب، وہ تیرا یار کہتا تھا کہ ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دے گا... ہمیں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہ ہو گی۔ اب وہ کہاں ہے؟ اس کے گھر میں ہی ہم پر یہ قیامت ٹوٹ رہی ہے۔'' ان کا اشارہ عمران کی طرف تھا۔

میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''امی جی! اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ میں ہی مجرم ہوں آپ سب کا۔ جو کچھ ہوا ہے، میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں... آپ سب کو لے ڈوبا ہوں۔''

اچانک سوئی گیس کی تیز بو محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی پائپ سے گیس کے خارج ہونے کی تیز آواز بھی سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ آواز چھت کے قریب لگے چھوٹے سے ایگزاسٹ فین سے آرہی تھی۔ ان لوگوں نے سوئی گیس کا کوئی پائپ کاٹ کر وہاں تک پہنچایا تھا اور اب کمرے میں گیس داخل کر رہے تھے۔ والدہ بُری طرح کھانسنے لگیں۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا، میں نے ایگزاسٹ فین کا بٹن ڈھونڈ کر آن کر دیا۔ ایگزاسٹ فین بس ذرا سی حرکت کر کے رہ گیا۔ ان لوگوں نے اس میں کوئی چیز پھنسا کر اسے چلنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فین اتنی بلندی پر تھا کہ وہاں تک پہنچ کر اس کے خلا میں کوئی کپڑا وغیرہ بھی ٹھونسا نہیں جا سکتا تھا۔

دو منٹ کے اندر اندر ہمارے سانس اکھڑنے لگے۔ میں نے بے تاب ہو کر والدہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ان کی کمر سہلانے لگا۔ وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ سراج، شیرا اور ان کے ساتھی بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ ان کے چہرے وحشت سے بگڑے ہوئے تھے۔ سیٹھ سراج نے ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا اور میں لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ شیرے نے رائفل کی نال میرے سر سے لگا دی۔ کم از کم چار مزید افراد اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک دو کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ تھا۔ میرے دروازہ کھولنے کے فوراً بعد ہی کمرے میں سوئی گیس کی آمد بند ہو گئی تھی۔ تاہم تیز بو ابھی موجود تھی۔ والدہ بُری طرح کھانس رہی تھیں۔

ہمیں اس کمرے سے نکال کر ساتھ والے کمرے میں پہنچایا گیا۔ والدہ کو کھڑکی کے پاس ایک صوفے پر پھینک دیا گیا۔ پھر سیٹھ سراج اور شیرے نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور کھینچ کر والدہ کے قریب فرش پر پٹخ دیا۔ شیرے نے رائفل کا بٹ میرے سینے پر مارا۔ مجھے لگا کہ میری ایک آدھ پسلی چٹخ گئی ہے۔ جب اس نے دوسرا وار کرنا چاہا تو والدہ تڑپ کر میرے اوپر گر گئیں۔ ''نہیں... خدا کے لیے نہیں... میرے بچے کو کچھ نہ کہو۔ میری جان لے لو۔''

سیٹھ سراج نے والدہ کو گھسیٹ کر مجھ سے جدا کیا۔ ''تیری جان بھی ضرور لیں گے۔ پہلے تیرے اس بدمعاش پتر اور اس کے یاروں سے تو حساب کتاب برابر کر لیں۔''

''خدا کے لیے نہیں۔'' والدہ سیٹھ کے پاؤں سے چمٹ گئیں۔

اس نے ایک ٹھوکر سے انہیں پیچھے کیا۔ یہ میری

برداشت سے باہر تھا۔ میں نے سیٹھ پر جھپٹنا چاہا لیکن راستے میں ہی شیرے کی رائفل کی زوردار ضرب میری گردن پر لگی اور میں الٹ کر ٹی وی کے اوپر جا گرا۔ ٹی وی نیچے گر کر چکنا چور ہوا اور ہر طرف چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ میری اس جرأت کی سزا دینے کے لیے شیرا اور اس کے کئی ساتھی مجھ پر پل پڑے۔ میرا جسم جیسے ایک دم ہی وزنی ہتھوڑوں کی زد میں آ گیا۔ مجھے کچھ ویسا ہی احساس ہوا جیسا سیٹھ سراج سے پہلی مڈبھیڑ پر ہوا تھا۔ چلڈرن پارک میں، میں سیٹھ سراج پر جھپٹا تھا اور اس کے فوراً بعد سیٹھ کے ہرکاروں نے مجھے بے دردی سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تب والدہ میرے پاس نہیں تھیں۔

آج وہ پاس تھیں... اور ایک ماں کے لیے اس سے بڑا امتحان اور کیا ہو سکتا تھا؟ سفاک لوگ آنکھوں میں قاتلانہ چمک لیے اس کے بیٹے کو اس کے سامنے روئی کی طرح دھنک رہے تھے۔ وہ بیٹا جسے انہوں نے خاص ناز و نعم سے پالا تھا... جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ بچپن سے کمزور ہے اور اسے زیادہ توجہ و محبت کی ضرورت ہے۔ جس کی چھوٹی سی تکلیف پر وہ غیر معمولی بے تابی کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔

یکایک سیٹھ سراج نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے گماشتوں کو روک دیا۔ انہوں نے میرا خون آلود چہرہ فرش کی طرف کیا اور میرے ہاتھ پیچھے موڑ کر کسی رسی سے باندھ دیے۔ تب مجھے گھسیٹ کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا گیا۔

والدہ صوفے پر تھیں اور ایک ہٹے کٹے غنڈے نے انہیں سر کے بالوں سے یوں جکڑ رکھا تھا کہ ان کی گردن ایک طرف مڑ گئی تھی اور وہ حرکت بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

''میری ماں کو چھوڑ دو۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس حرامجادی کا یہ قصور کم ہے کہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔'' سیٹھ سراج پھنکارا، تب اس نے ہم ماں بیٹے پر مشترکہ طور پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اسی دوران میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل آن کیا اور بھاری آواز میں بولا۔ ''ہاں بختیار ے! کیا بنا؟''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر سیٹھ سراج کا طیش بڑھ گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ ''اوئے کیا نامردوں جیسی گل کر رہا ہے؟ وہ تو ملوکڑی سی کڑی ہے اور ملوکڑا سا منڈا ہے۔ وہ تو زیادہ بھج (بھاگ) بھی نہیں سکدے۔ ادھر ہی کہیں آلے دوالے ہوں گے۔ ڈھونڈو ان کو۔''

واضح تھا کہ سیٹھ سراج، فرح اور عاطف کی بات کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے غالباً انہیں کوٹھی سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور ان کے پیچھے لگ گئے تھے مگر شکر کی بات یہ تھی کہ وہ ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں لگے تھے۔

پھر سیٹھ سراج کے فون پر ایک اور کال آگئی۔ وہ بات کرتا ہوا باہر نکل گیا... دو تین منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تیرا موبائل کہاں ہے؟''

''موبائل نہیں ہے میرے پاس۔'' میں کراہا۔

اس کے اشارے پر شیرے نے بڑی سختی سے میری جامہ تلاشی لی۔ موبائل نہیں ملا۔ عمران والی ڈائری ابھی تک میری قمیص کی بغلی جیب میں تھی۔ شیرے نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ سیٹھ سراج نے اپنے ایک ساتھی سے موبائل فون لیا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تیری بھین اور بھائی میں سے کسی کے پاس تو موبائل ہوئے گا۔ چل، کسی اک کا نمبر بتا۔ چل شاباش! جلدی کر۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ فرح یا عاطف کے ساتھ میرے ذریعے رابطہ کر کے ان تک پہنچنا چاہ رہا تھا اور یہ نہایت خطرناک صورتِ حال تھی۔

میں نے خاموشی اختیار کی تو اس نے شیرے کو اشارہ کیا۔ شیرے نے ایک ''بریٹا پسٹل'' اپنی براؤن قمیص کے نیچے سے نکالا اور ماں جی کی گردن پر رکھ دیا۔ اس پسٹل پر آٹھ دس انچ لمبا سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ شاید نیچے خادم حسین کو اسی پسٹل سے گولی ماری گئی تھی۔ سراج پھنکارا۔ ''میں تجھ کو صرف پندرہ سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں۔ ماں کو بچانا چاہندا ہے تو ان دونوں میں سے کسی کا نمبر بتا دے۔ میں پھر کہندا ہوں۔ پندرہ سیکنڈ ہیں تیرے پاس، گھڑی کے مطابق۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی گھڑی دیکھنی شروع کر دی۔ پانچ سیکنڈ پورے ہوئے تو اس نے کہا۔ ''پانچ!''... دس سیکنڈ پورے ہونے پر کہا۔ ''دس۔''

میرے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ محسوس ہوا کہ دل پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سراج بول رہا تھا... ''بارہ... تیرہ... چودہ۔''

''ٹھہرو... ٹھہرو۔'' میں بلکا۔ ''ایسا مت کرو۔ میں قسم کھاتا ہوں...''

''بکواس بند کر۔'' سیٹھ سراج نے بڑی وحشت سے میری بات کاٹی۔

شیرے نے ماں جی کو بازو سے کھینچا اور سیدھا بٹھا دیا۔ وہ چلا اٹھیں۔ ''ہائے میرا مونڈھا۔''

''کیا ہوا ہے تیرے مونڈھے (کندھے) کو؟'' سیٹھ سراج نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''مم... میرے مونڈھے درد کرتے ہیں... ہل نہیں سکتے۔'' ماں جی کرب ناک آواز میں بولیں۔

''ہم بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیندے ہیں تیرے مونڈھے کو۔'' سیٹھ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی شیرے کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

شیرے نے بریٹا پسٹل کا سائیلنسر بے رحمی سے ماں کے ''فروزن شولڈر'' پر رکھ دیا۔ سیٹھ سراج نے مجھ سے مخاطب ہو کر زہر اگلا۔ ''بتا... اپنی بے بے کے مونڈھے پر ٹیکا لگوانا ہے کہ اپنی بھین اور بھائی کا نمبر دینا ہے...؟''

میرا منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کہ بولنے کی سکت ہی نہیں رہ گئی۔ میں نے بے بسی کی انتہا کو چھو کر سیٹھ سراج کی طرف دیکھا۔ اس نے شیرے کو اشارہ کیا۔ بے مثال سفاکی کے ساتھ شیرے نے ٹریگر دبا دیا۔ سائیلنسر لگے پسٹل میں سے ٹھک کی مخصوص آواز برآمد ہوئی اور ماں جی کا کندھا ایک جھٹکے سے پیچھے کو گیا۔ انہوں نے ماں جی کے کندھے میں گولی اتار دی تھی۔

وہ تڑپ کر صوفے پر گریں اور کرب کی انتہا کو چھو کر رونے لگیں... وہ بے حس درندے تھے۔ ایسی ہی سفید بالوں اور نم آنکھوں والی مائیں ان کے گھروں میں بھی ہوں گی... اور یہ ماں تو پہلے ہی بیمار تھی، درد سے بے حال تھی لیکن وہ سنگ دل ذرا پشیمان نہیں ہوئے۔ ماں جی کے زخمی کندھے سے خون بہہ کر نیلے صوفے پر گل کاریاں کرنے لگا۔

سیٹھ سراج کے اشارے پر شیرے نے پسٹل ماں جی کے دوسرے کندھے سے لگا دیا۔ سراج نے اپنی چھوٹی چھوٹی کینہ پرور آنکھوں سے مجھے گھورا اور بولا۔ ''ہاں، اب بتا کا کا... اپنی بے بے کے دوجے مونڈھے پر بھی ٹیکا لگوانا ہے کہ کچھ بکنا ہے؟''

میرے لیے جیسے زمین آسمان کے قلابے مل چکے تھے۔ ایک طرف تڑپتی ہوئی ماں تھی، دوسری طرف بہن اور بھائی... لیکن بہن اور بھائی اوجھل تھے۔ ماں سامنے تھی اور جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، وہ زیادہ عذاب ناک ہوتا ہے۔

میرا منہ اتنا خشک تھا کہ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے پانی مانگا۔ ایک شخص نے گلاس میں پانی دیا۔ میرے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے خود ہی چند گھونٹ پلائے... اور بے رحم مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر چند قدم دور کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ سراج نے اپنے جوتے کی نوک سے میری ٹھوڑی اوپر کی اور اپنی زہریلی نگاہیں میری آنکھوں میں گاڑیں۔ اس کی ریچھ جیسی چمکیلی آنکھیں جیسے بےزبان خاموشی کہہ رہی تھیں... تجھے کہا تھا نا مجھ سے متھا نہ لگانا، نہیں تو بات بہت دور تک جائے گی۔ تو نے میرے منہ پر چپیڑ ماری تھی اور اس چپیڑ کے لیے میں نے تجھے پوری مانی نہیں دی تھی۔ بس تھوڑا سا وقفہ دیا تھا۔ اب وہ وقفہ ختم شد ہو چکا ہے۔ اب تیرے نال نال تیری ماں اور تیری جوان بھین کو بھی تیرے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

میں سیٹھ سراج کی وحشی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا اور نظریں جھکا لیں۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کا کا جی! زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ جلدی بکواس کرو۔ نہیں تو دوجے کندھے میں دوجا ٹیکا لگ جائے گا اور پھر شاید تیسرا ٹیکا گلے لگا اور یہ گلے گا بے بے جی کے سر کی ہانڈی میں۔ ہانڈی کے دو تین ٹوٹے ضرور ہو جائیں گے۔ چلو شاباش! فون نمبر بولو۔''

میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، ماں جی کی سانس پھنس کر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گولی کندھے میں لگ کر پسلیوں کی طرف چلی گئی ہے۔ شیرے کی بے مہر انگلی پھر پسٹل کے ٹریگر پر تھی۔ کسی بھی وقت ''ٹھک'' کی منحوس آواز دوبارہ ابھر سکتی تھی۔ میں ٹوٹ گیا، ریزہ ریزہ ہو گیا۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں چھوٹے بھائی عاطف کا سیل نمبر بتایا اور اس کے ساتھ ہی دل کی گہرائیوں سے دعا کی کہ یہ نمبر اٹینڈ نہ ہو سکے۔

سراج نے فون نمبر موبائل سیٹ پر پریس کیا اور کال ملانے سے پہلے بولا۔ ''دیکھ کاکے! اپنے بھائی سے وہی بولنا پڑے گا جو تجھ کو بتا رہا ہوں۔ اک لفظ بھی دائیں بائیں کرے گا نا تو بے بے کے دوجے مونڈھے میں ٹیکا لگ جائے گا۔ بھائی سے پوچھ کہ وہ کتھے ہے۔ وہ جہاں کا بتائے، اس سے بول کہ وہ اوسے جگہ پر ٹھہر جائے۔ تو وہاں پہنچ رہا ہے۔ گل سمجھ وچ آ گئی نا۔ میں اک وار فیر کہندا ہوں۔ ایک لفظ بھی بچے کھچے کرے گا نا تے گولی چلے گی۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے کال ملائی۔ میرا دل پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ عاطف کے فون پر بیل جا رہی تھی۔ سراج نے ہاتھ آگے بڑھا کر فون میرے کان سے لگا دیا۔ چوتھی، پانچویں بیل پر کال ریسیو ہو گئی۔ دوسری طرف سے عاطف کی سہمی اور ہانپی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''کون؟''

میں خاموش رہا۔
"کون بول رہا ہے؟" عاطف نے پھر پوچھا۔

سراج نے مجھے فون کے ساتھ زور سے ٹھوکا دیا کہ میں بولوں۔ میں تو نہیں بولا لیکن سراج کے ٹھوکا دینے سے موبائل کا بٹن دب گیا اور کال "ڈس کنیکٹ" ہوگئی۔

سراج نے جھلا کر مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ اس کے ساتھ ہی گرانڈیل شیرے کا چہرہ بھی خون کے دباؤ سے سیاہی مائل ہوگیا۔ سراج بولا۔ "یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اس کی بے بے کی ہانڈی پر رکھ نالی اور اگر نہ بتائے تو توڑ دے کتیا کی ہانڈی..."

یہ بے بسی کی انتہا تھی، یہ ذلت کا "عروج" تھا، مجھے موت سہل لگ رہی تھی۔ اپنی سسکتی ہوئی خونچکاں ماں کو لاچاری کے ساتھ دیکھنا آنکھوں کا بدترین عذاب تھا۔ وہ درد کی انتہا سے گزر رہی تھیں لیکن پھر بھی وہ ماں تھیں۔ اس حالت میں بھی انہیں اپنے بچوں کی سلامتی عزیز تھی۔ ان کی ماتا آخری ہچکی تک اپنے بچوں کا تحفظ چاہتی تھی اور اس تحفظ کے لیے وہ اس سے دس گنا اذیت بھی جھیلنے کو تیار تھیں۔

سراج نے ایک بار پھر عاطف سے کال ملائی اور فون میرے کان سے لگا دیا۔

ماں جی نے لڑکھڑاتی آواز میں فریاد کی۔ "نہیں تابی! مجھے مرجانے دینا۔ ان کو کچھ نہ بتانا میرے بچوں کا۔ ان کو کچھ نہ بتانا۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ نہ بتائے تو توڑ دو اس بڈھی کا کھوپڑا۔" سراج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں میری بدقسمتی نے پھر زور مارا۔ عاطف سے کال مل گئی۔ اس مرتبہ عاطف کے فون پر فرح کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ "کون ہے؟ کون بول رہا ہے؟"

فرح کی آواز سن کر سیٹھ سراج کی آنکھوں میں شیطانی چمک نمایاں ہوگئی۔ اس نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ بہ زبانِ خاموشی کہہ رہا تھا... 'بول نہیں تو تیری ماں جا رہی ہے۔'

میرے دل نے گواہی دی کہ وہ اور اس کے ساتھی ماں جی کو مار دیں گے اور اگلے چند سیکنڈ میں، میں اپنی ماں کی بے نور آنکھیں دیکھوں گا۔ ان کے ساکت ہونٹ جو پھر کبھی ہمارے لیے دعا کے لیے نہیں ہلیں گے اور ان کے منجمد ہاتھ جو کبھی ہمارے سر پر نہیں آئیں گے۔ نہیں، میں اپنی ماں کو یوں نہیں جانے دوں گا... کسی قیمت پر نہیں۔ میرے اندر ایک عجیب سی توانائی لہر لینے لگی۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"ہیلو... فرح... میں تابش۔"

"بھائی! کہاں ہیں آپ... آپ نکل آئے ہیں نا؟ امی کہاں ہیں؟ آپ ٹھیک ہیں نا... خدا کے لیے بتائیں آپ ٹھیک ہیں نا؟ خدا کے لیے..." وہ بولتی چلی گئی۔

میرے ہونٹ لرزاں تھے لیکن میں کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ سراج نے فون کے ماؤتھ پورشن کو انگلی سے ڈھانپا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ "اس سے پوچھ، وہ کہاں ہے... کس جگہ پر ہے... جلدی پوچھ... جلدی۔"

میں جانتا تھا کہ سراج اور شیرے کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اب میں نہ بولا تو وہ ماں جی کو مار دیں گے۔ وہ اگلے چند سیکنڈ میں ان کی جان لے لیں گے۔ شیرے نے اب ایک ہاتھ ماں جی کے ہونٹوں پر بڑی مضبوطی سے جما دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی آہ و بکا موبائل فون کے ذریعے فرح اور عاطف تک پہنچ جائے۔ ماں جی کسمسا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے کراہتی آواز میں کہا۔ "ہیلو فرح... میں ٹھیک... ہوں... تم... تم..." میں نے بہت کوشش کی مگر آواز گلے میں رک رہی تھی۔ میں اتنا جگرا کہاں سے لاتا کہ فرح سے پوچھتا، وہ کہاں ہے؟

ماں جی کی سانس بند ہو رہی تھی۔ وہ بے طرح کھانس رہی تھیں پھر انہیں قے ہوئی۔ وہ کھانستے کھانستے اٹھیں اور کھڑکی کی طرف مڑیں۔ دو تین سیکنڈ کے لیے یہی لگا کہ وہ شاید قے کرنا چاہ رہی ہیں مگر انہوں نے وہ کیا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے خود کو قربان کر دیا... ہاں، مرتو انہوں نے شاید ویسے بھی جانا تھا کہ وہ بری طرح زخمی ہو چکی تھیں، انہوں نے اپنی موت کو بروقت بنا دیا۔ اس سے پہلے کہ میں ان کی جان کے خوف سے سیٹھ سراج کی ہدایت پر عمل کر گزرتا، ماں جی نے اپنی جان... جان آفریں کے حوالے کر دی۔ وہ قریباً سترہ فٹ نیچے پختہ فرش پر گری تھیں۔ سراج، شیرا اور ان کے ساتھی حواس باختہ ہو کر کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگے۔ میں نے بھی نیچے دیکھا۔ وہاں ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ میری ماں کا سر چسم کے ایک بڑے گملے سے ٹکرایا تھا۔ شاید سر کی FRONTAL BONE ٹوٹ گئی تھی۔ خون کا ایک ریلا سا سیاہی مائل فرش پر رینگتا ہوا ایک کیاری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ ماں تھی جو ابھی جینا چاہتی تھی۔ جس نے ابھی اپنے کسی بچے کی کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ جو اپنی بیٹی کے بڑے پیار سے بنائے ہوئے زیور ایک اٹیچی میں لیے لیے پھر رہی تھی اور ان زیوروں جیسے سیکڑوں متا بھرے ارمان اس کے دل میں موجود تھے۔ ان ارمانوں سمیت کچھ ہی دیر پہلے تو وہ

زندہ تھی، سانس لے رہی تھی، باتیں کر رہی تھی۔

میں مڑا اور اندھا دھند سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میں نے اپنی ماں کا ٹوٹا ہوا سر دیکھ لیا تھا پھر بھی جیسے دل میں آس تھی کہ ان میں جان باقی ہوگی۔ میں ان کے سر کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر اپنی گود میں رکھوں گا اور ماتھے کو بوسہ دوں گا تو وہ پلکیں جھپکنے لگیں گی۔

"پکڑو... بھاگ رہا ہے۔" شیرا دھاڑا۔

میں زینوں پر پہنچا۔ کچھ لوگ میرے پیچھے لپکے۔ "ماں جی... ماں جی۔" میں دودھ پیتے بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ میں نے چار پانچ زینے طے کیے تھے کہ کسی نے عقب سے میری گردن پر ضرب لگائی۔ میں لڑکھڑایا۔ ابھی میرے سامنے بارہ تیرہ زینے باقی تھے۔ میں ان زینوں پر سے اڑتا ہوا سر کے بل سیاہی مائل فرش کی طرف گیا۔ فرش جس میں سفید مائل دھاریاں تھیں۔ جو بہت سخت تھا اور ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ میں اس فرش سے ٹکرانے والا تھا۔ بری طرح ٹکرانے والا تھا۔ میرے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے پھر میں تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اپنی ساری کم ہمتی، لاچاری اور بدقسمتی سمیت۔ مجھے ہر طرف سے ایک سرد سیاہ بے خبری نے ڈھانپ لیا۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی۔ میں چت لیٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پورا جسم پھوڑا بنا ہوا ہے۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کنپٹی کے قریب چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ یقیناً یہ سر کے زخم سے بہنے والا خون تھا۔

میری دھندلائی ہوئی نگاہیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اپنے سر پر کسی چھت کے بجائے درخت نظر آئے۔ یہ شاید شام کا وقت تھا۔ درختوں سے اوپر آسمان گہرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ پھر زور سے بجلی چمکی۔ گڑگڑاہٹ ہوئی اور بوندیں برسنے لگیں۔ میں یہ سارے مناظر بالکل خالی خالی ذہن کے ساتھ دیکھ رہا تھا... پردۂ تصور خالی تھا۔ پھر جیسے دھیرے دھیرے ٹی وی اسکرین پر کوئی منظر "فیڈ اِن" ہوتا ہے، میرے پردۂ تصور پر بھی دھندلے مناظر کی شبیہ بننے لگی۔ یہ شبیہ بہت آہستہ آہستہ بنی لیکن بنتی چلی گئی۔ ٹیڑھی میڑھی لکیروں اور بے ترتیب رنگوں نے موہوم شکلیں اختیار کرنا شروع کیں۔ ہوا کی سائیں سائیں نے آوازوں کا روپ دھارا۔ یہ آوازیں واضح ہوئیں۔ ان کے آہنگ، ان کے الفاظ باقاعدہ شکل اختیار کرنے لگے۔

"پکڑو... بھاگ رہا ہے۔"

"یہ کس کی آواز تھی؟"

موٹے جسم اور چھوٹے سر والا ایک شخص میری نگاہوں کے سامنے دھیرے دھیرے ایک وجود اختیار کرنے لگا۔ کون تھا یہ؟... سیٹھ سراج۔

ایک دم اپنی والدہ کی صورت دھند کی دبیز چادر کو چاک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آئی۔ "نہیں تابی... مجھے مرجانے دینا... ان کو کچھ نہ بتانا میرے بچوں کا۔"

مجھے لگا کہ میں نے یہ آواز بہت عرصہ پہلے کہیں سنی تھی۔ پھر اس آواز کے بعد کیا ہوا تھا؟ ایکا ایکی میری شریانوں میں تہلکہ مچ گیا۔ پاؤں کے ناخنوں سے سر کے بالوں تک پورے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ماں جی کا سر چسم کے گملے سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی بے نور آنکھیں، ٹیوب لائٹ کی روشنی میں شیشے کی طرح چمک رہی تھیں۔

میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ "ماں جی... ماں جی۔" میں نے سینے کی پوری قوت سے پکارا اور اٹھ بھاگا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ یہ بالکل اجنبی جگہ تھی۔ چاروں طرف بلند و بالا درخت تھے اور ان کے درمیان خودرو جھاڑیوں نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ بارش کی بوچھاڑوں کے سبب زمین پر کیچڑ بننا شروع ہوگیا تھا۔ میں پہلے تو چالیس پچاس قدم تک سیدھا بھاگا، پھر وہاں سے بائیں مڑ گیا پھر بائیں سے دائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بھاگنے کے ساتھ ساتھ میں پکار رہا تھا۔ "میری ماں کو مار دیا تم نے... میری ماں کی جان لے لی۔ تم خونی ہو، قاتل ہو..."

لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں جو میری سنتا اور کسی طرح کا ردعمل ظاہر کرتا۔ چاروں طرف درخت تھے اور بارش کی بوچھاڑیں تھیں۔ میں ہانپ کر رک گیا۔ اردگرد دیکھنے لگا۔ یہ بالکل اجنبی جگہ تھی۔ پھر میری نگاہ اپنے لباس پر پڑی۔ لباس بھی اجنبی تھا۔ یہ ایک پاجامہ کرتا تھا۔ اس کے اوپر سوتی کپڑے کی ہی واسکٹ سی تھی۔ جوتی بھی اجنبی سی تھی۔ یہ مجھے کہاں پھینکا گیا تھا اور کیوں؟ مجھے ہر چیز اجنبی لگ رہی تھی۔ درخت، ہوا، بارش اور خود اپنا آپ بھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ یہ سر سے بہنے والے خون کے سبب داغ دار تھا۔ مجھے یوں لگا کہ غیر ماحول میں یہ ہاتھ بھی اجنبی سا ہوگیا ہے۔

"کوئی ہے... کوئی ہے یہاں؟" میں کرب کی انتہا کو چھو کر چلانے لگا۔

میری آواز بارش کی صدا سے بغل گیر ہو کر دور تک گئی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میرے سینے میں غم کا طوفان تھا۔ لگتا

تھا کہ میں کھل کر نہ رویا تو کلیجا پھٹ جائے گا۔ مجھے پُرسا چاہیے تھا۔ میں ایک درخت سے لپٹ گیا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ”میں یتیم ہو گیا۔ میری ماں مر گئی۔ میرا سب کچھ لٹ گیا۔“ میں رو رہا تھا اور درخت کے تنے سے اپنا چہرہ رگڑ رہا تھا۔ یہ درخت میرا قریبی عزیز بن گیا۔ میرا غم گسار، میرا دوست، بھائی، سب کچھ۔

ایک دم مجھے عاطف کا خیال آیا۔ عاطف... اور فرح کوٹھی سے نکل بھاگے تھے۔ کیا وہ بچنے میں کامیاب ہوئے؟ وہ کہاں تھے؟ کس حال میں؟ ایک دم بہت سے سوالوں نے ذہن پر یلغار کی... مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں۔ ان واقعات کو گزرے کتنا وقت گزر چکا ہے۔ چند گھڑیاں، چند دن یا ہفتے... میری نگاہ کلائی کی گھڑی کی طرف گئی۔ وہاں رسٹ واچ موجود نہیں تھی۔

میں بے دم سا ہو کر اپنے غم گسار درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بارش کا پانی پتوں سے چھن چھن کر میرے سر پر پڑنے لگا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ میں کتنی دیر بے ہوش رہا... اب کہاں تھا میں؟

ماں کا مرا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا اور میں ایک بار پھر بے قرار ہو کر اس بھیگے ہوئے جنگل میں بھاگنے لگا۔ آوازیں دینے لگا۔ کبھی اپنی ماں کو، کبھی چھوٹے بھائی کو... اور فرح کو... کبھی کسی کو مدد کے لیے بلانے لگا۔

میں روتا رہا اور بھاگتا رہا۔ بے دم ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا اور پھر بھاگنا شروع کر دیتا۔ اب اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اردگرد کے مناظر ہیولوں کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ جیسے یہ ساری دنیا ایک ویرانے کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ بس کسی وقت مجھے اپنے اردگرد کسی چھوٹے موٹے جانور، گلہری، بلی، نیولے وغیرہ کی موجودگی کا احساس ہوتا یا گھونسلے میں دبا ہوا کوئی پرندہ مدھم آواز نکالتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں سمتوں کا تعین کرنے سے بالکل قاصر تھا۔ اگر میری آنکھوں کے سامنے اجالا... اندھیرے میں نہ بدلا ہوتا تو شاید میں وقت کا تعین کرنے سے بھی قاصر رہتا۔

نہ جانے میں کب تک اسی طرح بھاگتا رہا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ بول بول کر گلا بیٹھ گیا اور آنسو خشک ہو گئے۔ میرے اردگرد خاموش نباتات اور مسلسل برستی بارش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بالآخر ایک نشیب میں مجھے ایک چھوٹی سی کھوہ نظر آئی، میں اس میں داخل ہو گیا۔ یہ کچی زمین میں ایک پندرہ بیس فٹ لمبا سوراخ سا تھا اور بو بھی آ رہی تھی۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا جانور یہاں مرا تھا۔ بہرحال، اس کھوہ میں داخل ہوتے ہی میں بارش سے محفوظ ہو گیا۔

میں نے ایک دیوار سے ٹیک لگا لی اور اپنے اندرونی ہیجان کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں معروضی انداز میں سوچنا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے لباس پر توجہ دی۔ جیبوں کو ٹٹولا۔ کُرتے کی بغلی جیب میں سے ایک رومال نکلا۔ کپڑے کی ایک چھوٹی سی ملائم تھیلی نکلی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا، اس میں بادام، چھوہارے اور مکھانے وغیرہ تھے۔ شادی بیاہ اور نکاح کے موقع پر ایسی تھیلیاں مہمانوں میں تقسیم کی جاتی ہیں پھر میری جیب سے سگریٹ کا ایک چھوٹا پیکٹ اور لائٹر نکلا۔ یہ دونوں اشیا پتا نہیں کس نے جیب میں رکھی تھیں، ورنہ میں تو سگریٹ پیتا نہیں تھا۔

میں نے لائٹر جلایا تو وہ جل گیا۔ چھوٹے سے زرد شعلے کی روشنی میں، میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کھوہ کی کچی دیواروں سے کئی جگہ جالے لٹک رہے تھے۔ ایک کونے میں کسی پرندے کے پر پڑے تھے۔ ایک طرف خشک ٹہنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے ان ٹہنیوں میں سے کچھ کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور تھوڑی سی کوشش سے آگ سلگانے میں کامیاب ہو گیا۔

آگ سے روشنی کے علاوہ حرارت بھی ملی۔ میں قدرے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں کہاں ہوں اور میرے جسم پر یہ بالکل اجنبی لباس کیوں ہے؟ میں ماں جی کو پکارتا ہوا زینوں کی طرف بھاگا تھا... پھر کیا ہوا تھا؟ پھر وہ لوگ میرے پیچھے لپکے تھے۔ میں نے چند زینے ہی طے کیے تھے کہ عقب سے کسی نے مجھے رائفل کا بٹ رسید کیا تھا۔ میں ہوا میں اڑتا ہوا سیاہی مائل فرش کی طرف گیا تھا۔ اس فرش میں سفید سفید دھاریاں تھیں۔ اس کے بعد کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ سب کچھ ایک دور افتادہ ”سیاہ دھند“ میں چھپ گیا تھا۔ مجھے سیٹھ سراج، شیرے اور بختیار وغیرہ کے سفاک چہرے یاد آئے۔ بختیار تو فرح اور عاطف کے پیچھے تھا۔ باقی لوگ مجھے زندگی میں موت کا مزہ چکھا رہے تھے۔ دلیل تو یہی کہتی تھی کہ انہیں، مجھے چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن اگر میں یہاں اس ویرانے میں موجود تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ انہوں نے مجھے چھوڑا ہے۔ کیا اس کے پیچھے بھی کوئی چال تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اب بھی کچھ لوگ میری بے خبری میں میرے اردگرد موجود

ہوں۔ وہ میرے ذریعے کسی اور تک پہنچنا چاہتے ہوں... مثلاً فرح اور عاطف تک۔

لیکن ایسا ہوتا تو مجھے لاہور ہی میں کہیں چھوڑا جاتا، اس ویرانے میں چھوڑنے کی کیا وجہ تھی؟ میں غور کرنے لگا کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ شیشم کے علاوہ دھریک اور تھوہر وغیرہ کے پودے بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ خودرو جھاڑیاں تھیں۔ لاہور کے اردگرد تو چھانگا مانگا ہی ایسی جگہ تھی جہاں اس قسم کے مناظر دیکھے جا سکتے تھے۔ مگر مجھے یہ چھانگا مانگا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر میرا دھیان اس ڈیک نالے اور اس ”رَکھ“ کی طرف چلا گیا جہاں میں نے اپنی زندگی کا ایک دل دوز ترین منظر دیکھا تھا۔ جہاں میرا یار، سینے پر برسٹ کھا کر میری آنکھوں کے سامنے قاتل پانی میں گرا تھا۔ دل میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھیں اور سر چکرانے لگا۔ کیا یہ وہی گردوپیش تھے جہاں یہ سب کچھ ہوا تھا؟ ذہن نے اس بات کو بھی ماننے سے انکار کیا۔

بارش کچھ ہلکی ہوئی تھی۔ میں کھوہ سے باہر نکلا اور کسی راہ گم کردہ بدحال مسافر کی طرح اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ آنسو خشک ہو چکے تھے مگر سینے میں ناقابلِ بیان دکھ کا الاؤ تو موجود تھا۔ میں پھر دل دوز انداز میں پکارنے لگا۔ ”کوئی ہے... کوئی ہے... میری مدد کرو۔“

جواب میں جنگل کے مہیب سناٹے کے سوا اور کچھ نہیں تھا! پکار پکار کر میرا گلا بیٹھ چکا تھا۔ اب تو آواز بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ میں بے دم ہو کر پھر کھوہ میں آ گیا اور بجھتی ہوئی آگ میں کچھ اور خشک ٹہنیاں ڈال کر قریب ہی لیٹ گیا۔ سر کے زخم سے شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے انگلیوں سے چھو کر دیکھا۔ زخم کی حالت سے لگتا تھا کہ وہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ تو کیا ڈیفنس کی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات کو زیادہ دیر نہیں گزری؟ یہ ایک دو روز پہلے کی بات ہی ہے؟ مگر ایسا لگ نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، چہرے پر چھ سات روز کی شیو تھی۔ مجھے یاد آیا کہ رشیدا اور گلزار وغیرہ کے ہتھے چڑھنے کے بعد میں نے دو تین روز تو لالہ زار اسکیم کے گھر میں ہی گزارے تھے۔ وہاں میری شیو بڑھتی رہی تھی، اس کا مطلب تھا کہ سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہونے کے بعد مجھے چار پانچ دن مزید گزر گئے ہیں۔

دماغ ایک بار پھر بری طرح چکرانے لگا۔ خیالات آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اپنی ماں جی کا مردہ چہرہ دیکھے مجھے بس ایک دو دن ہی ہوئے ہیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اس واقعے کو صدیاں بیت چکی ہیں۔ میں کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ والدہ اور عمران کے لیے آنکھوں سے تازہ آنسو ابلنے لگے۔ میرے رخسار پر رینگنے لگے اور میری ناک کے بانسے سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں دل ہی دل میں پکارا۔ ”میں زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوں... میں اپنے چاہنے والوں کے لیے ایک مجسم بدنصیبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ میرا پیارا دوست، میری بزدلی اور حماقت کی وجہ سے گولیوں سے چھلنی ہوا۔ میری ماں کی جان میری آنکھوں کے سامنے گئی... میں ان کی موت کا ذمے دار ہوں اور جو ابھی زندہ ہیں... ان پر میری وجہ سے ابھی نہ جانے کیا قیامت گزر رہی ہے...“ میں بہ زبانِ خاموشی بلکنے لگا۔ ”اے خدا! تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا؟ اور اگر ایسا بنایا تھا تو پھر اس طرح کے حالات سے کیوں دوچار کیا؟ میرا کیا قصور ہے میرے مالک... میں ہوں ہی ایسا۔ میں نے خود کو بدلنے کی ہزار کوششیں کیں مالک۔ جو کچھ میری سمجھ میں آیا، خلوصِ دل سے کیا اور کرتا رہا۔ خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر مضبوط بنانے کے بے شمار جتن کیے۔ ہر طرح کی بداخلاقیوں سے دور رہا۔ اپنے اندر چھپی ہوئی توانائیوں کو ڈھونڈنے کی سعی کرتا رہا۔ مگر جو کچھ میرے اندر تھا ہی نہیں... جو تو نے میرے اندر رکھا ہی نہیں تھا، میں اسے کیسے ڈھونڈ پاتا...

دکھ کی انتہا کو چھو کر میں اپنے رب سے شکوہ کناں ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آتشیں آنسو، طوفانی دھاروں کی طرح ابلنے لگے... ”اے میرے رب! ہم نے تو یہی سنا تھا تو اپنے بندے کو پیار کرتا ہے... ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ اے مالک! ماں تو اپنے ہر بچے کی کمزوریوں، خامیوں کو سمجھتی ہے۔ جو بچہ زیادہ کمزور ہوتا ہے، وہ اس کا اتنا ہی دھیان رکھتی ہے۔ اس کو کوئی کسر نہ لگ جائے، اس کی کوئی کمزوری اسے نقصان نہ پہنچائے، وہ ہر گھڑی اسی فکر میں رہتی ہے۔ تو اے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے مالک... تو نے مجھے کمزور و ناتواں پیدا کیا اور پھر میری طرف سے دھیان بھی ہٹا لیا۔ میں کہاں جاؤں مالک؟ میں کیا کروں؟ ماں کی ممتا تو اپنے بچوں میں سے کسی کو کوئی کمی نہیں ہونے دیتی۔ اگر کمی ہوئی بھی ہے تو اس کا ازالہ کر دیتی ہے۔ اے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے ربّ العزت! تو نے مجھے کم ہمتی و ناتوانی دی... اور اس کے بدلے میں بھی کچھ نہ دیا۔ کوئی تو صلاحیت رکھی ہوتی میرے اندر... کوئی ہنر... کوئی گُن... جس سے میں اپنی لاچاریوں کا ازالہ کر سکتا۔

”... میں بہت رو چکا مالک... بہت دکھ سہہ چکا۔ اب تو ماں بھی نہیں رہی، اب اور ہمت نہیں ہے... اب یہ کھیل ختم

کر دے۔ اب اپنی زندگی واپس لے لے۔'' میں نے اپنا چہرہ کچھ زمین میں دھنسا دیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ روتے روتے نہ جانے کس وقت جسم و جاں پر نقاہت طاری ہوئی اور میں غنودگی میں جانے کے بعد... سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں بدستور اسی کھوہ میں تھا۔ آگ مدھم ہو چکی تھی مگر مکمل طور پر بجھی نہیں تھی۔ باہر تاریک فضا میں درختوں کے پتوں پر بارش تواتر سے برس رہی تھی۔ یکا یک میں نے محسوس کیا کہ میرا سر کسی نرم گداز چیز پر ہے۔ یہ شاید کسی کے زانو پر تھا۔ پھر مجھے اپنے ہونٹوں پر بھی کسی نرمی اور گرمی کا احساس ہوا۔ کسی کی سانس میرے رخسار سے ٹکرائی۔ کسی کے ہونٹ مجھے بڑی نرمی سے بوسہ دے رہے تھے۔

میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ سر میں شدید ٹیس اٹھی۔ میں نے گھوم کر دیکھا اور سکتے میں رہ گیا۔ میرے بالکل قریب ایک لڑکی موجود تھی۔ آگ کی مدھم سرخ روشنی میں اس کے خدوخال دکھائی دے رہے تھے۔ وہ درمیانی شکل و صورت کی تھی، تاہم اس کے چوڑے رخسار قندھاری اناروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس کے بال بے حد گھنے اور لمبے تھے۔ چوڑی پیشانی پر ایک طرف زخم کا چھوٹا سا نشان تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ دوپٹا بھی موجود تھا مگر وہ اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ دکھی انداز میں بولی۔ ''میں دیوانوں کی طرح ڈھونڈتی رہی ہوں تم کو... دیکھو میرے پاؤں بھی زخمی ہو گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا تھا کہ کہیں...''
اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

''کک... کون ہو تم؟'' میں نے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں نظر آنے والی حیرت اور پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ پھر وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ ''مذاخ (مذاق) کے لیے یہ وخت (وقت) اچھا نہیں ہے مہروج۔''

''مہروز... کون مہروز؟''

اس کی آنکھوں کی پریشانی فزوں تر ہوئی لیکن اس نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا اور ذرا مسکرا کر اور مجھے نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر ادا سے بولی۔ ''مہروج... میرا شوہر، میرا شریک حیات، میری زندگی کا واحد سہارا۔ جو کج ادا ہے۔ ستاتا ہے... رلاتا ہے پھر بھی اچھا لگتا ہے۔'' اس کے لب و لہجے میں حیدر آبادی آہنگ تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس سے بہت دور نظر آتی تھی۔ اس ویران جنگل میں، اس مسلسل برستی بارش میں اس کا یہاں پایا جانا اتنا ہی حیرت ناک و ناقابلِ فہم تھا جتنی وہ خود تھی۔ اس کے لباس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی دنوں سے اس ویرانے میں بھٹک رہی ہے۔ اس کی پھول دار قمیص دو تین جگہ سے پھٹی ہوئی تھی، کپڑوں پر سرخی مائل کیچڑ کے داغ بھی جا بجا تھے۔ سب سے عجیب چیز اس کا لب و لہجہ تھا۔ اس قسم کی زبان میں نے ایک دفعہ انڈین حیدر آباد میں سنی تھی۔ وہاں میں، فرح اور عاطف ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ یہ کئی برس پہلے کی بات تھی۔

وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر لگاوٹ سے بولی۔ ''دیکھو، میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ تم کو نیند آرہی ہے، تم خود کو کسی کپڑے کے ساتھ درخت سے باندھ لو تو اچھا ہوئیں گا... مگر تم نے میری بات اچ نہیں مانی۔ یہ تو شکر ہے درخت زیادہ اونچا نہیں تھا، ورنہ بہت چوٹ آتی۔''

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی اور اسے مجھ پر کس شخص کا شبہ ہو رہا تھا۔ بہر حال، میں خاموش رہا۔ اس نے میری کنپٹی پر بڑی ملائمت سے انگلیاں چلائیں اور بولی۔ ''میں نے پٹی کر دی ہے، خون بھی بند ہو گیا ہے۔ مگر لگتا ہے کہ ٹانکے لگنے کا ضرورت ہوئیں گا۔ اللہ کرے ہم کل کسی طرح اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے خابل (قابل) ہو جائیں۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بول رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ وہ جو کہہ رہی ہے، وہی درست ہے۔ اس کے قریب ہی ایک جھولا سا رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ کپڑے کے اس جھولے میں اس کا سفری سامان ہے۔ اس نے جھولے میں ہاتھ ڈال کر اِدھر اُدھر گھمایا اور کسی پودے کی دو تین شاخیں باہر نکال لیں۔ ان شاخوں کے ساتھ لمبوترے پتے بھی لگے ہوئے تھے۔ اس نے پتے شاخوں سے علیحدہ کیے اور بولی۔ ''یہ ہے وہ بوٹا جسے ڈھونڈنے گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ کہیں آس پاس اچ ہوئیں گا لیکن کافی دور سے ملا۔ سینے کی جلن اور پیٹ درد کے لیے ایک دم اچھی چیز ہے۔ تم دیکھنا کتنی جلدی ٹھیک ہوتے ہو۔''

میں اب بھی خاموش رہا۔ اس نے جھولے کے اندر سے ہی چھوٹی سی سل اور وٹا نکالا۔ ساتھ میں پلاسٹک کی بوتل بھی تھی جس میں پانی تھا۔ اس نے پتوں کو مروڑ کر سل پر رکھا اور وٹے سے انہیں پیسنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا سارا جسم ہلکورے لینے لگا۔ بھیگے ہوئے لمبے بال آگے کو ڈھلک آئے اور زمین کو چھونے لگے۔ اس کی عمر تئیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ مضبوط ہاتھ پیر کی صحت مند لڑکی تھی۔ نقوش ذرا موٹے تھے تاہم ان میں جاذبیت موجود تھی۔ لگتا تھا کہ ذرا سی مشقت سے اس کے عارض، انار کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔

سل پر چند رگڑے لگانے کے بعد وہ ایک دم چونکی۔ اس نے اپنا ہاتھ روک کر ناک سکوڑی اور کچھ سونگھنے لگی۔ یقیناً کھوہ میں سے اٹھنے والی ہلکی بو اسے بھی تنگ کر رہی تھی۔ اس نے آگ میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور اس کی روشنی میں احتیاط سے کھوہ کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی وہ بو کا ماخذ ڈھونڈنے میں کامیاب رہی۔ یہ بلی کا مردہ بچہ تھا جسے شاید کسی نر نے ہی مار ڈالا تھا۔ اس کی انتڑیاں نکلی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے اس منظر پر افسوس کا اظہار کیا۔ بہر حال، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے کسی طرح کی کراہت کھائے بغیر بلونگڑے کی لاش کو دُم سے پکڑا اور کھوہ سے باہر نکال کر جھاڑ جھنکاڑ میں پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے متاثرہ جگہ کو ایک گیلے کپڑے سے صاف کیا اور جھولے میں سے کوئی عطر قسم کی شے نکال کر کھوہ میں تین چار جگہ لگا دی۔ اس سے بھینی سی خوشبو پھیل گئی۔

میں نے اسے پہلی بار چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اس نے پاؤں میں کیچڑ آلود جوگرز ٹائپ جوتے پہن رکھے تھے۔ جب وہ بلونگڑے کو باہر جھاڑ جھنکاڑ میں پھینکنے گئی تو بارش کی بوچھاڑوں سے اس کا لباس پھر بھیگ گیا۔ اس کی پھول دار قمیص اس کے جسمانی خدوخال کو نمایاں کرنے لگی۔ اس کا جسم غیر معمولی طور پر منہ زور تھا... جیسے ہر حرکت پر لباس سے برسرِ پیکار ہو رہا ہو۔ وہ ایک بار پھر دو زانو بیٹھ کر سل پر پتوں کو رگڑنے لگی۔ ''دیکھو، تم نے کیا کیا؟'' وہ اپنی روانی میں بولی۔ ''میں تمہارے پیٹ درد کے لیے پریشان تھی اور تم نے اتنی بڑی چوٹ لگوا لی... اور چلو اگر چوٹ لگ اچ گئی تھی پھر وہیں تو رہتے... وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ تمہاری یہی باتاں پریشان کر دیتی ہیں۔ میرا دل تو رونے کو چاہ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ بس اب گم ہو گئے تم۔ وہ تو شکر ہے کہ جنگل خراب ہوتی یہاں پہنچی تو تھوڑی روشنی نظر آ گئی...''

وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔ یہ جنگل، یہ بارش اور یہ تاریک کھوہ جس میں آگ کی طلسماتی روشنی تھی، کسی داستان کا منظر لگتا تھا۔ دل میں واہمہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ لڑکی واقعی وجود رکھتی ہے یا پھر کوئی بصری دھوکا ہے، آسیب ہے۔

میں جو کچھ بھی ہوں لیکن ٹھوس حقائق پر یقین رکھنے والا شخص ہوں۔ ہر چیز کو سائنسی بنیادوں پر پرکھنے والا اور مافوق الفطرت تصورات سے دور رہنے والا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ گوشت پوست کی لڑکی ہے اور میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، جاگتی آنکھوں سے اور پورے ہوش و حواس میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر کوئی الجھن تھی تو وہ یہی تھی کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں اور یہ کون سی جگہ ہے جہاں میں موجود ہوں۔

لڑکی نے پتوں کو پیس کر بالکل باریک کر دیا پھر اسے ایک پیالے میں ڈالا۔ پلاسٹک کی بوتل سے اس میں تھوڑا سا پانی ملایا اور میری طرف بڑھایا تاکہ میں چند گھونٹ پی لوں۔ اس میں سے عجیب سی نباتاتی بو اٹھ رہی تھی۔ میں نے پینے سے منع کر دیا۔ نہ جانے یہ مخبوط الحواس لڑکی کیا پلا رہی تھی۔

اس نے میرے انکار کا حتمی انداز دیکھا اور گہری سانس لے کر پیالا ایک طرف رکھ دیا۔ ''اچھا، کوئی باتاں نہیں۔ ٹھہر کر پی لینا۔'' وہ بولی۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں بھوک لگی ہوئیں گی، کچھ کھا لو۔''

میں نے ایک بار پھر انکار کیا۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ تب اس نے آگے بڑھ کر میرے سر کی چوٹ کا معائنہ کیا اور قدرے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''میں تو تمہاری یہ چوٹ دیکھ کر ڈر اچ گئی تھی۔'' اس نے کہا اور اچانک میرے گال کا بوسہ لے کر پیچھے ہٹ گئی۔

میں اس کی اس حرکت پر سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ آگ کے پاس ایک چٹائی بچھا کر نیم دراز ہو گئی۔ انداز وہی تھا جو تنہائی میں ایک بیوی کا اپنے شوہر کے سامنے یا پھر محبوبہ کا اپنے چاہنے والے کے سامنے ہوتا ہے۔ بادل مسلسل پانی برسا رہے تھے۔ گاہے بہ گاہے گرج چمک بھی ہوتی تھی۔ یہ عجیب سا رومان انگیز افسانوی ماحول تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید دل میں کھد بد محسوس کرتا لیکن میرے لیے تو اس سے سو گنا زیادہ رومانیت بھی بے معنی تھی۔ میرے سینے میں دکھ کا جو دریا بہہ رہا تھا، اس کی اذیت ناقابلِ بیان تھی۔ لگتا تھا کہ میری شریانیں ٹوٹ جائیں گی اور جسم کا ریشہ ریشہ جدا ہو جائے گا۔

میں نے ایک بار پھر اس لڑکی سے پوچھنا چاہا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ مگر تب مجھے احساس ہوا کہ وہ پھر وہی جواب دے گی جو پہلے دیا تھا۔ میں نے گفتگو کا انداز بدلا اور ٹوہ لینے والے انداز میں پوچھا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم کہاں ہیں؟''

وہ میرے بولنے پر خوش ہوئی اور دیوار کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہم ٹھیک راستے پر آ گئے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا پچھلے برس گرمیوں میں ''کچے'' کے

پاس بہت سے درختوں میں آگ لگ گئی تھی۔ تین دن تک پیڑ جلتے رہے تھے۔ یاد ہے نا؟''

''ہاں ہاں۔'' میں نے کہا۔

''یہ جگہ ''نل پانی'' جانے والے رستے کی بالکل سیدھ میں ہے۔ ابھی شام سے پہلے مجھے نالے کے پار کچھ جلے ہوئے پیڑ نجر آئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اب ہمیں ناک کی سیدھ میں جانا ہے۔''

''کتنی دیر میں پہنچیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''بارش رک گئی تو بالکل سویرے اِچ نکل جائیں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ سات آٹھ میل سے جیادہ کا سفر ہوئیں گا۔'' وہ اِچ کو ''ہی'' کے معنوں میں استعمال کرتی تھی۔

میں نے سر کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ آس پاس کوئی اسپتال ہوتا تو اچھا تھا۔''

میرا خیال تھا کہ شاید اس کے جواب سے علاقے کے محلِ وقوع کا اندازہ ہو سکے لیکن وہ مسکرائی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''حکم جی کا بس چلے تو یہاں کوئی حکیم وید بھی دکھائی نہ دے۔ سب کچھ جنتر منتر سے کیا جائے۔ ہاں، بس ایک ڈاکٹر ہو، اس کو ہمارے حکم جی نے اپنی تجوری میں بند رکھا ہو۔ اس کو بس اس وخت نکالا جائے جب حکم جی صاحب خود بیمار ہوئیں یا ان کے خاندان کے کسی بندے کو جرورت پڑے۔''

پتا نہیں، وہ کہاں کہاں کی باتیں کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس اس کی اوٹ پٹانگ گفتگو سے اتنا پتا چلا کہ وہ میرے ساتھ (یعنی اپنے شوہر کے ساتھ) کسی ''نل پانی'' نامی جگہ پر جانا چاہ رہی ہے اور اس کا خیال ہے کہ وہاں پہنچ کر وہ اور اس کا شوہر محفوظ ہو جائیں گے۔ حکم جی نام کا شخص ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ جہاں سے آئی تھی، اس جگہ کا نام زرگاں تھا اور وہ وہاں سے بھاگ کر آئی تھی۔

اس کی گفتگو کے دوران میں ہی کچھ آہٹیں ہوئیں۔ وہ ایک دم چوکنا ہو گئی۔ اس کے انداز میں خوف کے بجائے ایک عجیب طرح کی حرارت اور چوکسی تھی۔ آہٹیں میں نے بھی سنی تھیں۔ بالکل یہی لگا تھا جیسے کئی افراد ہمارے بالکل آس پاس موجود ہوں۔ کھانسی سے ملتی جلتی صدا بھی کانوں میں پڑی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی نے اپنے جھولے میں سے ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی نکال لی۔ اپنے دستے اور پھل کی بناوٹ کے سبب کلہاڑی خوب صورت نظر آتی تھی۔ اس نے کلہاڑی میری طرف بڑھائی اور پھر ایسی ہی ایک اور کلہاڑی اپنے ہاتھوں میں سونت لی۔ اس کی عقابی نگاہیں کھوہ کے باہر کی تاریکی میں پیوست تھیں اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے پلاسٹک کی بوتل اٹھائی اور اس کا پانی ادھ بجھی آگ پر ڈال کر اسے بالکل بجھا دیا۔ اس دوران میں اس کے کان باہر کی سن گن لیتے رہے۔ باہر اب بارش کی مدھم صدا کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ''کون ہو سکتا ہے؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''کھانسی کی آواز تو آئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''پر ہم یخین (یقین) سے تو نہیں کہہ سکتے نا کہ وہ کھانسی اِچ کی آواج تھی۔ کبھی کبھی جناور کی آواج بھی تو ایسی ہوئے ہے۔''

کافی دیر گزرنے کے بعد بھی جب کوئی مزید آہٹ، آواز سنائی نہیں دی تو وہ ہولے سے باہر نکلی اور کھوہ کے دہانے کے اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ بارش اب بوندا باندی کی شکل میں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ گئی اور اس نے سردی سے بچنے کے لیے خشک لکڑیوں کو ایک جگہ جمع کر کے آگ دوبارہ جلائی۔

وہ میری طرف بڑی محبت سے دیکھ کر بولی۔ ''تم بہت جیادہ تھک گئے ہو۔ چوٹ میں درد بھی ہو رہا ہوئیں گا۔ تم یہاں آگ کے پاس لیٹ کر آرام کر لو۔ میں جاگتی ہوں۔ بعد میں، میں تھوڑی دیر کے لیے سو لوں گی۔''

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

لیکن وہ اصرار کرتی رہی۔ میں آگ کے قریب لیٹ گیا۔ وہ کھوہ کی دوسری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی رہی۔ چھوٹے دستے کی کلہاڑی اس کے قریب رکھی تھی۔ میری والی کلہاڑی وہ واپس جھولے میں ڈال چکی تھی۔ میں لیٹ تو گیا تھا لیکن سو نہیں سکتا تھا۔ یہ مخبوط الحواس لڑکی کلہاڑی بدست میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ یہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور اندیشہ بھی سر اٹھا رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس لڑکی کے پیچھے واقعی کچھ خطرناک لوگ ہوں۔ وہ اس کے پیچھے یہاں تک آ سکتے تھے اور نتیجے میں، میں بھی کسی غیر متعلقہ مصیبت کا شکار ہو سکتا تھا۔ میرے سر پر پہلے ہی مصائب کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے، اگر میں یہ کہوں کہ زندوں میں تھا نہ مردوں میں تو بے جا نہ ہوگا۔

میں آگ کے قریب لیٹا رہا۔ میرے سینے میں آنسوؤں کا آبشار گرتا رہا۔ کھوہ سے باہر بارش ایک بار پھر شدت اختیار کر گئی تھی۔ میں عجیب مخمصے میں تھا۔ مجھے یہ رات... یہ کھوہ... یہ لڑکی... یہاں تک کہ اپنا وجود... سب کچھ

جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ بہت زور سے بجلی کڑکی۔ قرب و جوار لرز کر رہ گئے۔ لڑکی نے کچھ اور لکڑیاں آگ میں جھونک دیں اور میری طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

آگ کی حرارت اور مسلسل خاموشی نے میری آنکھوں میں دھیرے دھیرے غنودگی بھر دی۔ اپنے بے پناہ کرب سے لڑتے لڑتے میری آنکھ لگ گئی۔ اندازاً میں ایک ڈیڑھ گھنٹے تک سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو سینے پر بھاری بوجھ سا محسوس ہوا۔ کھوہ میں گہری تاریکی تھی۔ آگ کی راکھ میں بس چھوٹی موٹی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔ میں نے اپنے سینے کو ٹٹولا تو وہاں لڑکی کا سر رکھا ہوا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے لائٹر جلایا۔ نیلگوں شعلے کی روشنی میں اردگرد کا منظر دکھائی دیا۔ وہ میرے سینے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم میرے جسم سے چھو رہا تھا۔ اس کے نہایت گھنے بال میری گردن اور کندھوں پر بکھرے تھے۔

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ وہ بھی بیدار ہو گئی۔ وہ چند سیکنڈ تک خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ تب اس نے اپنے سینے پر دوپٹا درست کیا اور بال سمیٹنے لگی۔ ''شاید میں بھی سو گئی تھی۔'' وہ ہولے سے بولی۔

اس نے آگ دوبارہ جلائی۔ آگ روشن ہوئی تو وہ بڑے دھیان سے میرے سر کی چوٹ کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے سر کی پٹی کو چھوا اور بولی۔ ''خدا کا شکر ہے، خون رسنا بند ہو گیا ہے۔ کیا پتا کہ ٹانکوں کی جرورت اِچ نہ پڑے۔''

کھوہ سے باہر ابھی گہری تاریکی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ بس کسی وقت بجلی چمک جاتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اچانک وہی آہٹ سنائی دی جو میرے سونے سے پہلے سنائی دی تھی۔ اس مرتبہ یہ آہٹ دہانے کے بالکل پاس سے ابھری تھی اور خاصی واضح تھی۔ یہ انسانی قدموں کی آواز لگتی تھی۔

لڑکی نے اپنی کلہاڑی کی تلاش میں تیزی سے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ تھوڑی دور، اس کے جھولے کے پاس ہی پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کلہاڑی تک جاتی، یکایک ایک شخص کھوہ کے دہانے پر نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ یہ منظر اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند سیکنڈ کے لیے لڑکی بھی سکتہ زدہ رہ گئی۔ رائفل بردار کے سر پر بڑا سا پگڑ تھا... اس نے تہ بند، کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک کڑیل دیہاتی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسلحہ شناس ہے اور غالباً اسے چلانے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ اس نے دانت نکوسے اور لڑکی کو مخاطب کر کے زہریلے لہجے میں بولا۔ ''حکم جی کی حد سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے سلطانہ... اتنی ہمت اور چالاکی دکھانے کے لیے تجھے دوسری، تیسری بار جنم لینا پڑے گا، پھر بھی جروری نہیں کہ تو کامیاب اِچ ہو جائے۔''

لڑکی جسے سلطانہ کہا گیا تھا، اپنی جگہ پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رائفل کا رخ اس کی طرف ہے اور اس کی کوئی بھی غلط حرکت اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ بولی۔

''میں چاہنے والا یا نہ چاہنے والا کون ہوتا ہوں۔ چاہنے والا تو وہی تمہارا عاشخ (عاشق) گورا صاحب ہے اور وہ تم کو اپنی جورو بنا کر اِچ رہے گا۔ چلو شاباش، اٹھو۔ اب تم کو واپس جانا ہوئیں گا۔''

''نہیں... میں ہرگج نہیں جاؤں گی۔'' وہ سینہ تان کر بولی۔ ''ہر کسی کو پتا ہے کہ میں بیاہتا ہوں۔ بیاہتا پر حکم جی کا ادھکار ہے اور نہ ان کے کسی یار دوست کا۔''

''لیکن وہ تمہیں بیاہتا نہیں مانتے۔ پنڈت جی نے فیصلہ دے دیا ہے اور تم بھی اس فیصلے کو اچھی طرح جانتی ہو۔''

''میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتی کہ پنڈت نے اپنے دھرم کو موم کی ناک بنایا ہوا ہے۔ حکم جی کے اشارے پر وہ اس ناک کو جدھر چاہے موڑ لیتا ہے۔''

''بکواس بند کر۔ وہ تیری یہ گوری چمڑی ادھیڑ کر اس میں بھس بھر دیں گے۔ ایسی سجا دیں گے کہ مر کر بھی چین نہ پائے گی۔ اب بھی وخت ہے، جا کر حکم جی کے پاؤں میں گر جا اور گڑگڑا کر مافی مانگ لے۔''

''ہارون! تو جانتا ہے کہ میں کس ماں کی بیٹی ہوں۔ مر جاؤں گی پر عجت کے لٹیروں کے آگے سر نہ جھکاؤں گی۔ مجھے شرم آ رہی ہے تیرے کرتوتوں پر۔ کہنے کو تو مسلمان ہے پر حکم جی کے پھینکے ہوئے، بے غیرتی کے ٹکڑے کھا کھا کر تیرا جمیر مر گیا ہے۔ جو بندوخ تو نے میری طرف اٹھائی ہوئی ہے، یہ ان لوگاں کی طرف اٹھا جو تیری آنکھوں کے سامنے دن رات سکینہ اور اس جیسی دوسری لڑکیوں کی عجت کے جنازے نکال رہے ہیں۔''

''بکواس بند کر حرام جادی... جبان کھینچ لوں گا۔''

یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے برق سی کوند گئی۔ اشتعال میں آ کر بندوق بردار تھوڑا سا آگے آ گیا تھا۔ لڑکی نے اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھایا۔ وہ تیزی سے جھپٹی اور اس پر جا پڑی۔ بندوق بردار جس کا نام لڑکی نے ہارون لیا، اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دونوں اوپر

نیچے گرے۔ لڑکی نے بندوق کی نال پکڑ کر اوپر اٹھا دی تھی۔ ہارون نامی وہ شخص فائر کرتا بھی تو گولی کھوہ کی چھت میں کہیں لگتی۔ بہرحال، اس نے فائر نہیں کیا۔ شاید اسے موقع نہیں ملا یا پھر ہمت ہی نہیں ہوسکی۔ جلد ہی بندوق بردار سنبھل گیا۔ اس نے پلٹا کھا کر لڑکی کو اپنے نیچے کرلیا اور بندوق کو کسی لاٹھی کی طرح لڑکی کی گردن پر آڑھا رکھ کر اس کی گردن دبانے لگا۔ وہ بھرپور مزاحمت کررہی تھی۔ میں مزید اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں رہ سکا۔ میں نے بندوق بردار کے کرتے کا کالر عقب سے پکڑ لیا اور اسے لڑکی پر سے کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خاصا زورآور تھا، ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کا پگڑ کھل گیا تھا اور گلے میں پڑا تھا۔ میں نے ایک لکڑی سے اس کے سر پر چوٹ لگائی اور پھر اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر پوری طاقت سے پیچھے کی طرف کھینچا۔

یک دم اس نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور وحشیانہ انداز میں مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے بندوق کے چوبی دستے سے مجھے ضرب لگائی۔ یہ ضرب میرے چہرے پر لگتی مگر میرے پیچھے ہٹنے سے میرے کندھے پر لگی۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا۔ وہ مجھ پر پل پڑا اور بندوق کے دستے سے مجھے اندھا دھند مارنے لگا۔ میں نے کچھ ضربیں اپنی کلائیوں پر روکیں، کچھ میری پسلیوں اور سر پر لگیں۔ سلطانہ نامی لڑکی نے جب یہ منظر دیکھا تو بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بندوق بردار کی طرف آئی۔ وہ عقب سے اس سے چمٹ گئی۔ چلانے لگی۔ ''چھوڑ دو اس کو۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو۔ میں تمہاری جان لے لوں گی۔ کتے... حرام جادے...'' وہ جیسے دیوانی ہوگئی تھی۔ اس کے لمبے بال دائیں بائیں لہرا رہے تھے، اس کا توانا جسم ایک دم سرکش نظر آرہا تھا۔

بندوق بردار ہارون نے اس کی طرف مڑے بغیر اسے کہنی سے شدید ضرب لگائی۔ وہ اپنا منہ پکڑ کر کئی فٹ پیچھے جا گری۔ جہاں وہ گری، وہیں پر چھوٹے دستے کی کلہاڑی پڑی تھی۔ ایک لمحے میں لڑکی نے کلہاڑی پکڑی اور واپس بندوق بردار پر جھپٹی۔ اس مرتبہ اس نے بے دریغ بندوق بردار کے سر کو نشانہ بنایا۔ کلہاڑی اس کے سر کے پچھلے حصے پر لگی۔ ہڈی اور لوہے کے تصادم کی آواز صاف سنائی دی۔ یکایک بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما اور میرے پہلو میں گرا۔ لڑکی دیوانہ وار اسے کلہاڑی سے ضربیں لگانے لگی۔ تاہم اب وہ کلہاڑی کو الٹی طرف سے استعمال کررہی تھی۔ کند لوہے کی چوٹوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ہارون نامی اس حملہ آور کا چہرہ لہولہان کردیا۔ وہ ایک دم نیم مردہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کا ہاتھ روکا۔ وہ اب بھی بپھری ہوئی تھی۔ میں اسے پیچھے لے گیا... اسے کھوہ کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ وہ شعلہ فشاں نظروں سے بے سدھ پڑے بندوق بردار کو دیکھتی رہی۔ اس کی سانس چل رہی تھی لیکن وہ گہری بے ہوشی میں دکھائی دیتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے کلہاڑی ایک طرف پھینکی اور کھوہ کی دیوار کے ساتھ پھسلتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپایا اور... ہچکیوں سے رونے لگی... ''جو تمہیں نقصان (نقصان) پہنچائے گا، میں اسے نقصان پہنچاؤں گی... میں... اس کی جان لے لوں گی... میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی... کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تمہیں کچھ ہوئیں گا تو اس وخت ہوئیں گا... جب میری لاش گر چکی ہوئیں گی...'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھی اور ہچکیوں سے روتی جارہی تھی۔

میں ہکا بکا کھڑا تھا، میں نے اس کا عجیب روپ دیکھا تھا۔ پھر میں جیسے چونک کر بندوق بردار ہارون کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے ایک دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ کاری زخم کلہاڑی کے بلیڈ سے آیا تھا جو سر کے پچھلے حصے پر تھا۔ وہاں سے کٹی ہوئی چربی کے اندر سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ اس شخص نے دیسی ساخت کی جوتی پہن رکھی تھی۔ اس کا لباس بھی مجھے نامانوس سا لگا۔ لڑکی سلطانہ کی طرح ہارون نے بھی نامانوس حیدرآبادی لہجے میں بات کی تھی۔ ایک دو لفظ ہندی کے بھی بولے تھے۔ پھر کسی پنڈت جی کا ذکر بھی کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سندھ کے اندرونی علاقوں میں ہندو آباد ہیں۔ کئی جگہ ان کی پوری پوری بستیاں ہیں مگر میں سندھ میں تو نہیں تھا، پنجاب میں تھا... بلکہ مجھے لاہور کے گردونواح میں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ شروع میں، میں نے جب اپنے اردگرد گھنے درخت دیکھے تو سوچا تھا کہ شاید میں چھانگا مانگا یا شیخوپورہ کے علاقے میں کہیں ہوں۔ مگر اب یہ خیال باطل محسوس ہورہا تھا۔ یہ ویسا علاقہ ہرگز نہیں تھا۔ تو پھر کیا میں اندرونِ سندھ میں کہیں تھا؟

ہارون نامی شخص بالکل بے سدھ تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے سانس لے رہا ہے۔ اس کی کمر سے گولیوں والی پیٹی بندھی تھی اور چھوٹی نال والی چینی ساخت کی رائفل پاس ہی پڑی تھی۔

سلطانہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے اپنے بکھرے

ہوئے بالوں کو ایک بار پھر سمیٹا۔ ہارون کے ساتھ دھینگا مشتی میں اس کی سوتی قمیص سامنے سے پھٹ گئی تھی اور دودھیا جسم جھانک رہا تھا۔ اس نے اس پھٹے ہوئے حصے کو گرہ لگائی۔ ہارون پر ایک نفرت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''مہرو! ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہوئیں گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس خبیث کے ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں۔''

''یہ ہوش میں بھی آسکتا ہے۔'' میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

سلطانہ نے جلدی جلدی ہارون کی کمر سے گولیوں والی بیلٹ کھولی۔ پھر اس کی چھوٹی نال والی رائفل اٹھائی اور اسے جھولے میں ڈال لیا لیکن یہ پہلے والا جھولا نہیں تھا۔ یہ دوسرا تھا۔ اس پر پہلے میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ یہ کھوہ کی پچھلی دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔

''اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹ ابھری۔ ''نہیں... میرا خیال ہے کہ صرف ہاتھ باندھ دیتے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں پتا ہے نا وہاں چھوٹے گاؤں میں سریتا کے پتی راجندر کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ راجو نے اس کے پاؤں بھی بندھوا دیے تھے، وہ تمہارے دوست مختار کی کوٹھڑی میں بھوکا پیاسا مر گیا تھا۔''

پتا نہیں وہ کن لوگوں کی باتیں کررہی تھی اور مجھے کیوں ان میں شامل کرتی جارہی تھی۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ بالکل مخبوط الحواس دکھائی دیتی تھی۔ شاید اسے کوئی شدید صدمہ پہنچا تھا جس کے سبب اس نے ہوش و حواس کھو دیے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ اس صدمے کا تعلق اس کے مہروز نامی شوہر سے ہی ہو۔ اپنے دیوانے پن میں شوہر کو تلاش کرتی ہوئی وہ دور نکل آئی ہو اور ہارون وغیرہ اسے ڈھونڈ رہے ہوں۔ وہ اپنے خیالات میں اس قدر پختہ دکھائی دیتی تھی کہ اس موقع پر اس کی باتوں کی تردید کرنا یا اس سے بحث میں الجھنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔

اس نے میرے ساتھ مل کر ہارون کے ہاتھ پشت پر موڑے اور انہیں اچھی طرح ایک ازاربند سے باندھا۔ یہ ازاربند اس کے جھولے سے ہی نکلا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہارون کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کے کرتے کی بغلی جیب سے ایک رومال، ایک چھوٹا جیبی چاقو اور تھوڑی سی کرنسی نکلی۔ کرنسی دیکھ کر میں پھر چونکا۔ مجھے لگا کہ ان نوٹوں میں کچھ اجنبی نوٹ بھی شامل تھے۔ غالباً وہ انڈین تھے۔ انڈین کرنسی اس شخص کی جیب میں؟ یہ خاصا اہم سوال تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا کہ میں انڈین بارڈر کے آس پاس کہیں ہوں۔ سرحدی علاقوں میں اس قسم کے جنگلی رقبے بھی عام پائے جاتے ہیں۔ وہاں اسمگلنگ وغیرہ کا دھندا بھی ہوتا ہے۔ ہارون نامی اس شخص کی جیب سے غیر ملکی کرنسی کا نکلنا کئی امکانات کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ان میں اسمگلنگ کا امکان بھی شامل تھا۔ ان لمحوں میں ایک دم عمران کی شبیہ میری نگاہوں میں ابھری اور سینے میں درد کی ایک شدید ٹیس، بے کراں کرب بن کر پھیل گئی... وہ اس وقت یہاں میرے ساتھ ہوتا تو اس کی متجسس فطرت یکایک انگڑائی لے کر بیدار ہوجاتی۔ وہ خدائی فوجدار بن جاتا اور فوراً اس امر کی سراغ رسانی شروع کردیتا کہ اس موچھیل دیہاتی کی جیب میں انڈین کرنسی کیسے آئی ہے۔ عمران کے خیال کے ساتھ ہی میرے سینے میں موجزن دکھ کا سمندر کچھ اور بھی بپھر گیا۔ آنسو، آنکھوں کے بند توڑ کر بہہ نکلنے کو بے تاب ہوگئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم یہ تاریک کھوہ چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ بارش تھمی ہوئی تھی، بس کسی وقت باریک پھوار پڑنے لگتی تھی۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ اجالے کی آمیزش ہورہی تھی۔ سلطانہ نے چھوٹا جھولا میری طرف بڑھایا اور بڑا خود اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔ وہ جلد از جلد یہ جگہ چھوڑنے کی خواہاں تھی۔

ہم کھوہ سے نکلے اور نم زمین پر احتیاط سے پاؤں رکھتے ہوئے درختوں میں آگے بڑھنے لگے۔ ہوا چلتی تو شاخوں سے بہت سا پانی جھڑ کر ہمارے اوپر گرتا اور لگتا کہ بارش پھر شروع ہوگئی ہے۔ بھیگے ہوئے گھونسلوں میں پرندوں نے ہولے ہولے بولنا شروع کردیا تھا۔ میں سلطانہ سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکس نظر آتی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے کے جھولے میں کلہاڑی اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے فوراً باہر نکال سکتی تھی۔ میرے والے جھولے میں بھی کلہاڑی اسی انداز سے رکھی گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد اجالا پھیل گیا۔ بادلوں کے اندر سے کہیں کہیں نیلا آسمان نظر آرہا تھا۔ رات بھر کی بارش سے سب کچھ اجلا اور نکھرا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ دیوانی لڑکی نہ جانے مجھے کہاں لے جارہی تھی؟ ''وہ دیکھو مہرو! وہاں سے جلے ہوئے درخت شروع ہوجاتے ہیں۔'' اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

مجھے جلے ہوئے خشک درختوں کے آثار نظر آئے۔ سلطانہ نے ایک چھوٹے سے کچے ٹیلے پر کھڑے

ہوکر اطراف کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر ایک سمت کا تعین کرکے بااعتماد طریقے سے آگے بڑھنے لگی۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے کچھ کہنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوگا۔ اگر میں اس سے کچھ کہوں گا تو وہ الٹا مجھے مخبوط الحواس سمجھنے لگے گی اور عین ممکن ہے، یہ گمان کرنے لگے کہ سر پر چوٹ آنے کی وجہ سے میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے پاس جانا چاہ رہی ہے، ان تک پہنچ جائے۔ ممکن تھا کہ وہ لوگ دوستانہ رویہ ظاہر کرتے اور میری مدد کو آمادہ ہو جاتے۔ ان کے ذریعے میں کسی معروف راستے یا پختہ سڑک تک پہنچ سکتا تھا۔ ایک بار میں اس ویرانے سے نکل جاتا پھر سوچا جا سکتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ پولیس تک پہنچنا ہے؟ کسی عزیز رشتے دار کی مدد حاصل کرنی ہے یا خاموشی سے فرح اور عاطف کا کھوج لگانا ہے؟

دوسری سوچ یہ تھی کہ میں راستے میں ہی کسی مناسب جگہ پر اس لڑکی سے علیحدہ ہو جاؤں۔ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ اس کے ساتھ ''تل پانی'' نامی بستی میں جا کر میں کسی اور چکر میں پھنس جاتا۔ انہی سوچوں میں غلطاں میں مسلسل چلتا جا رہا تھا۔ اب ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ کچھ کھا لینا چاہیے۔ تمہیں بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔'' لڑکی نے ایک سایہ دار درخت کے نیچے خشک جگہ دیکھ کر کہا۔

وہ بھوک کی بات کر رہی تھی اور میرے اندر صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے دو میتیں تھیں۔ ایک عمران کی دوسری والدہ کی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں شاید ہفتوں تک کوئی نوالہ گلے سے نیچے نہ اتار سکوں۔ سلطانہ نامی وہ لڑکی درخت کے ایک گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا جھولا کھولا۔ پلاسٹک کے ایک سبز برتن کے اندر گوشت کے تلے ہوئے ٹکڑے تھے۔ خشک چنے اور میٹھی پھلیاں وغیرہ بھی تھیں۔ دو بوتلوں میں صاف پانی تھا۔ جھولے کے سامان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جہاں سے بھی نکلی ہے، پوری تیاری سے نکلی ہے۔ اس کے بے حد اصرار پر میں نے تھوڑے سے چنے کھائے اور پانی پیا۔ پانی کا ذائقہ بھی کچھ عجیب لگا۔ سلطانہ بڑی جلدی میں نظر آتی تھی۔ وہ جلدی جلدی لقمے لے رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے اس کی نگاہ بے ساختہ اپنے عقب میں اٹھ جاتی تھی۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آ سکتا ہے۔

دن کی روشنی میں، میں اسے زیادہ وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی رنگت تانبے جیسی تھی۔ رخسار چوڑے تھے اور ان کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی تھیں۔ بالکل سفید دانت ذرا سے اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے اور اس کی سخت جانی کو ظاہر کرتے تھے۔

وہ جلدی جلدی لقمہ چباتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں بالو کہاں ہوئیں گا۔ کیا کر رہا ہوئیں گا؟ اس نے کچھ کھایا بھی ہوئیں گا کہ نہیں...''

اس نے دوسری تیسری دفعہ کسی ''بالو'' کا ذکر کیا تھا۔ رات کو بھی جب ہم کھوہ میں تھے، زوردار بارش ہو رہی تھی اور بجلی کڑک رہی تھی تو اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ ''بڑی ٹھنڈ ہو گئی ہے۔ پتا نہیں بالو کہاں ہوئیں گا؟''

وہ جھولا سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرے سر کی چوٹ کا معائنہ کیا۔ مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ہم پھر چل دیے۔ وہ مجھے گفتگو میں شریک کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، ہاشم، بالو کو لے کر ڈیرے پر پہنچ گیا ہوئیں گا نا؟''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''ویسے وہ جے دار تو بہت ہے۔ اسے پتا ہے کہ میرے بغیر بالو کو سنبھالنا مشکل ہو جائیں گا۔ وہ ایک دم سب کو مصیبت میں ڈال دیں گا۔''

میں نے ایک بار پھر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے کلہاڑی نکال لی تھی۔ جہاں کہیں جھاڑ جھنکاڑ زیادہ ہوتا، وہ اسے کاٹ کر آگے بڑھ جاتی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسی ویرانے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے اور اس جنگل کے نشیب و فراز اس کے لیے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ہیں۔ اس کے انداز میں بلا کی چستی تھی۔ اسے چلتے پھرتے دیکھ کر میں نے ایک اور بات محسوس کی... نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ واقعی شادی شدہ ہے اور اس کا سڈول جسم ''دودھ پلانے والی ماؤں'' جیسا ہے۔ مجھے اس کی سوتی قمیص پر سامنے کی طرف گیلاہٹ نظر آئی۔ ایسی گیلاہٹ کبھی کبھی ان ماؤں کے کپڑوں پر نظر آتی ہے جن کے جسم میں قدرت نے بچے کی ''خوراک'' کی فراوانی رکھی ہوتی ہے۔ ہم جونہی ایک جھنڈ میں سے نکلے، سلطانہ کے چہرے پر خوشی کی چمک نظر آئی۔ اس نے ایک دم اپنی انگلی سے دور کہیں اشارہ کیا اور چہکی۔ ''وہ دیکھو مہرو! وہ ہے ڈیرا۔''

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر قدرے نشیب میں، کسی گھر کی چھت نظر آ رہی تھی۔ اس کچے گھر کو چاروں طرف سے سبز درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھلا احاطہ بھی نظر آتا تھا۔ اس کے گرد مٹی کی ہی چار دیواری تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اکیلی اچ جاتی ہوں۔'' سلطانہ نے کہا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ٹھ ٹھ... ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنا جھولا اتار کر ایک درخت کی موٹی شاخ سے لٹکا دیا... اور تیزی سے درختوں میں اوجھل ہو گئی۔

میں اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے ذہن میں آیا کہ اکیلا ہی آگے بڑھ جاؤں۔ جس طرح اس ویران جنگل میں یہ چھوٹا سا ڈیرا نظر آیا تھا، عین ممکن تھا کہ آگے بھی کوئی گھر یا متنفس نظر آ جاتا اور میں اس کی مدد حاصل کر سکتا۔ لیکن اس میں رسک بھی تھا۔ میں راستہ کھو کر بھٹک سکتا تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے سلطانہ کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کسی ہاشم نام کے بندے کی بات بھی کر رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اسے لینے ہی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ تو سلطانہ کی طرح ذہنی بیمار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے کچھ ٹھکانے کی باتیں بتا سکتا تھا اور یہ بھی بتا سکتا تھا کہ یہ لڑکی اصل میں کون ہے اور اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔

میں وہیں درخت کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنا جھولا کھول کر دیکھا۔ اس میں دو تین مردانہ جوڑے تھے۔ پانی سے بھری ہوئی ایک چھوٹی بوتل تھی۔ دو چار سیب، اچار کا ڈبا اور خشک چنے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک طرف کلہاڑی رکھی تھی۔ جو سب سے عجیب شے دکھائی دی، وہ ایک سرخ عروسی جوڑا تھا۔ گوٹے کناری والے اس جوڑے کو بڑی احتیاط سے تہ کر کے ایک دوسرے کپڑے میں رکھا گیا تھا... اس کے بعد میں اٹھا۔ اردگرد دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے سلطانہ کے شاخ سے لٹکے ہوئے جھولے میں تاکا جھانکی کی۔ زخمی ہارون کی تلاشی میں ملنے والے کرنسی نوٹ واقعی انڈین تھے۔ یہ کُل ملا کر کوئی دو ڈھائی سو روپے بنتے تھے۔ ان میں پاکستانی نوٹ کوئی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ سلطانہ کے جھولے میں کچھ ایسا سامان بھی نظر آیا جو چھوٹے بچوں کے استعمال کے لیے ہوتا ہے۔ دو چار بالکل چھوٹے فراک... جانگیے اور بنیان وغیرہ۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کے ایک دو کھلونے بھی تھے۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ بار بار جس ''بالو'' کا ذکر کر رہی تھی، وہ اس کا شیر خوار بچہ ہی ہے۔

بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح یہ سوال بھی ذہن میں سر اٹھا رہا تھا کہ وہ بچہ سلطانہ کے ساتھ سفر کیوں نہیں کر رہا اور یہاں ڈیرے پر کیوں موجود ہے؟

میں وہیں بیٹھا خیالوں کے تانے بانے بُنتا رہا۔ سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا، ہلکی تمازت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اپنے اردگرد سے چوکس تھا۔ کسی نامعلوم شخص یا اشخاص کے علاوہ مجھے کسی جنگلی جانور کی آمد سے بھی خطرہ تھا۔ یہ کوئی ''رکھ'' نہیں تھی، خالص جنگلی علاقہ تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے دور نشیب میں کچھ حرکت دکھائی دی۔ میں نے سلطانہ کا سرخی مائل لباس پہچان لیا۔ وہ واپس آ رہی تھی۔ غالباً اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی تھا۔ دھیرے دھیرے وہ دونوں قریب آ گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ سلطانہ کے بازوؤں میں ایک بچہ بھی ہے۔

گھنی جھاڑیوں سے نکل کر سلطانہ جب میرے سامنے آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ رخسار بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے چٹاچٹ بچے کے کئی بوسے لیے اور اس کا چہرہ میری طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو، تین چار روج میں ہی کیا حال ہو گیا ہے۔ ایک دم آدھا رہ گیا ہے۔ میں جب وہاں پہنچی، اس وخت بھی رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔''

بچے کی عمر مشکل سے پانچ چھ ماہ ہوگی۔ وہ خوش شکل تھا۔ مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں چیپچیپی ہو رہی تھیں۔

میں نے ساتھ آنے والے شخص کو دیکھا۔ وہ بھی دیہاتی لباس میں تھا۔ اس کے سر پر بڑا سا پگڑ تھا۔ ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس کی عمر پینتیس چالیس سال ہوگی۔ اس نے ہاتھ کو ماتھے پر لے جا کر مجھے سلام کیا اور خاموش کھڑا رہا۔

سلطانہ نے ایک بار پھر گول مٹول بچے کا منہ چوما، اسے سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر اسے میری بانہوں میں دیتے ہوئے بولی۔ ''چلو، اب جاؤ اپنے ابا کے پاس۔''

میں بھنا کر رہ گیا۔ ویسے مجھے اس سے کسی ایسی ہی حماقت کی توقع تھی۔

میں نے سلطانہ کے ساتھ آنے والے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل لاتعلق کھڑا تھا جیسے اس نے کچھ دیکھا، سنا ہی نہ ہو۔ وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

سلطانہ نے بڑا جھولا خود اٹھا لیا اور چھوٹے جھولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہاشو! یہ تم اٹھا لو۔'' زبان سے یہ الفاظ کہنے کے ساتھ ساتھ سلطانہ نے ہاتھوں سے بھی اشارے کیے تھے اور تب مجھے پتا چلا کہ سلطانہ کے ہمراہ آنے والا یہ ہاشم نامی شخص گونگا بہرا ہے۔ اس نے فرماں برداری سے جھولا اٹھایا اور ہمارے ساتھ چل دیا۔

بچہ میری گود میں تھا اور ماں کی طرف دیکھ کر ہمک رہا

تھا۔ میں سٹپٹا گیا... زورازوری کی بیوی کے ساتھ اب یہ زبردستی کا بچہ بھی گلے پڑ رہا تھا۔ میں نے سلطانہ کی نگاہ بچا کر سوالیہ نظروں سے ہاشم عرف ہاشو کو دیکھا اور اشارے سے پوچھا کہ یہ لڑکی کیا شے ہے؟

وہ جیسے کچھ بھی سمجھ نہیں سکا اور بے ڈھنگے طریقے سے مسکرا کر رہ گیا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ہاشو کے آنے کے بعد اب ہاشو کی حیثیت راہبر کی ہو گئی تھی۔ میں اور سلطانہ اس کے عقب میں چل رہے تھے۔ میں اب جلد از جلد ''نل پانی'' نامی آبادی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ فرح، عاطف، والدہ، عمران اور ثروت کے چہرے مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ سب میرے دل سے قریب ترین تھے۔ میرے اپنے تھے لیکن فی الوقت کوئی بھی میرے پاس نہیں تھا۔ کچھ مستقل طور پر بچھڑ گئے تھے، کچھ عارضی طور پر۔ جو عارضی طور پر بچھڑے ہوئے تھے، میں جلد از جلد ان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

بچہ میرے گلے سے لگا ہوا تھا۔ اس کی مستانی ماں میرے پہلو میں چل رہی تھی۔ جھولے میں پڑی کلہاڑی کا رنگین دستہ اس کے ہاتھ سے بہت قریب تھا۔ اس کی تیز نگاہیں اردگرد کا جائزہ لیتی جا رہی تھیں۔ یقیناً کھوہ میں اس ہارون نامی شخص کی اچانک آمد اور وہاں ہونے والی سنگین مارکٹائی کے مناظر سلطانہ کے ذہن میں تازہ تھے۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں پھر کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہو جائے۔

چلتے چلتے بچہ کسمسایا اور اس کا ہاتھ میری گردن کے پچھلے حصے پر لگا۔ مجھے لگا جیسے یہ جگہ سن ہے۔ مجھے یاد آیا کہ لاہور میں جی والے چوک کے قریب گاڑی الٹنے کے بعد میں زخمی ہوا تھا اور میرے سر کے علاوہ گردن پر بھی زخم آئے تھے لیکن اب بچے کا ہاتھ لگنے کے باوجود مجھے گردن کے پچھلے حصے پر تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے گردن کو ٹٹول کر دیکھا۔ محسوس ہوا کہ زخم مندمل ہو چکا ہے یا پھر... اس پر کوئی... ایسی چیز لیپ کر دی گئی ہے جس نے درد کا احساس ختم کر دیا ہے۔ آٹھ دس روز میں زخم کا اس طرح ٹھیک ہونا تو ممکن نہیں تھا، غالباً اس پر کوئی ایسی چیز لگا دی گئی تھی جس نے جلد کی سی شکل اختیار کر کے درد کا احساس ختم کر دیا تھا۔

ایک دم سلطانہ خوشی سے چلا اٹھی۔ اس نے انگلی سے دور درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ گھنے جنگل کے درمیان میں سے نیلے پانی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک خوب صورت قدرتی جھیل کی طرح تھی۔ اس جھیل کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی بستی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ''ہم پہنچ گئے۔ آخر ہم پہنچ اچ گئے۔'' وہ مسرور ہو کر بولی۔

ہم تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ آخر بستی اور جھیل کے خدوخال واضح ہونے لگے... نہایت گھنے جنگل کے درمیان یہ ایک قابلِ دید نظارہ تھا۔ جھیل کا ایک کنارہ پوری طرح آباد تھا اور یہ کوئی چھوٹی بستی نہیں تھی۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ اس قصبے میں کم از کم تین مندروں کے کلس اور دو مسجدوں کے مینار دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی حویلی ٹائپ عمارت تھی۔ اس سے ذرا کم بلند اور بھی کئی حویلیاں تھیں اور اس بستی کے درمیان بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ کل رات کی بارش نے ہر شے کو بڑی اچھی طرح نکھار دیا تھا۔ جھیل کے کنارے سبز ڈھلوانوں پر کہیں کہیں گائے بھینسیں اور بکریاں وغیرہ چرتی نظر آ رہی تھیں۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر بڑی بڑی پگڑیوں والے گھڑسواروں کا ایک دستہ تیزی سے جاتا دکھائی دیا۔

میں اس بستی کے خدوخال دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ ہم کسی دیہاتی بستی یا چھوٹے سے دیہہ میں پہنچیں گے۔ یہاں کا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔

سلطانہ خوش تھی۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولی۔ ''کتنی پیاری جگہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ پہلے اسے ''نیلا پانی'' کہتے تھے لیکن پھر یہ نام بدلتے بدلتے ''نل پانی'' بن گیا۔ یہ پرانے وختوں کی بات ہے۔ شاید حکم جی کے پڑدادا کے وخت کی یا پھر اس سے بھی پہلے کی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ میں بس صورتِ حال کو جوں کا توں رکھ کر اس بستی میں پہنچنا چاہتا تھا اور... سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں آخر ہوں کس جگہ پر؟ کیا یہ واقعی اندرونِ سندھ کا کوئی علاقہ تھا؟ سانگھڑ، دادو وغیرہ... لیکن یہ شان دار جھیل؟

خوشی کے عالم میں سلطانہ نے بچہ میرے ہاتھوں سے لیا اور زیادہ تیزی سے قدم اٹھانے لگی۔ جلد ہی ہم درختوں سے نکل کر جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں مجھے کئی دیہاتی عورتیں اور مرد نظر آئے۔ عورتوں نے گھاگرے چولے پہن رکھے تھے۔ مردوں کا لباس دھوتی کرتے اور بڑے پگڑ پر مشتمل تھا۔ کچھ جوان عورتیں سروں پر مٹکے رکھے ایک قطار میں جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے دو بیل گاڑیوں کے بیل جھومتے اور گھنٹیاں بجاتے چلے جا رہے تھے۔ کسی نے ہماری طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں دی۔

اگر ہم خشکی کے راستے بستی تک پہنچنا چاہتے تو کافی چکر پڑتا۔ اس کام کے لیے جھیل میں چھوٹی چھوٹی تین چار کشتیاں چل رہی تھیں۔ انہیں طویل بانسوں کے ذریعے دھکیلا جا رہا تھا۔ ہم بھی بچے سمیت ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ پندرہ سواریاں پوری ہو گئیں تو کشتی بان نے کشتی کھینی شروع کی۔ ساتھ ساتھ وہ سواریوں سے کرایہ بھی وصول کرتا جا رہا تھا۔ وہ نوجوان لڑکا تھا۔

''کتنے پیسے بھائی؟'' سلطانہ نے کشتی بان سے پوچھا۔

''کتنی سواریاں ہیں دیدی؟''

''تین...''

''تین روپے دے دو جی۔''

سلطانہ نے دوپٹے کی گرہ سے پیسے کھولے اور ایک نوٹ کشتی بان کو دیا۔ یہ پانچ کا نوٹ تھا... اور انڈین تھا۔ کشتی بان نے جو دو روپے بقایا دیے، وہ بھی انڈین تھے۔ کشتی میں تین چار عورتیں ایسی موجود تھیں جن کی مانگوں میں سیندور بھرا تھا۔ ایک دو لڑکیوں کے ماتھے پر بندیا نظر آ رہی تھی۔ مجھے یہ سارا ماحول ہی کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ اس ساری صورتِ حال میں کوئی خلا محسوس ہو رہا تھا... کوئی بہت بڑا خلا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کئی گنا بڑھی کہ باقی سواریوں نے بھی جو کرایہ دیا، وہ بھارتی کرنسی میں تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ یوں لگا کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ تو کیا... تو کیا میں اپنے ملک میں نہیں تھا؟ میں پاکستان میں نہیں تھا؟

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''کیا ہوا مہرو! خیریت تو ہے؟'' سلطانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''ہم... کہاں... ہیں؟'' میں نے ٹوٹی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''نل پانی میں مہرو! اور کہاں؟''

''یہ نل پانی کہاں ہے؟'' میری آواز لرز رہی تھی۔

''نل پانی کہاں ہوئیں گا۔ وہیں ہوئیں گا جہاں پر ہمیشہ سے ہے۔'' سلطانہ نے ایک بار پھر مجھے پُرتشویش نظروں سے دیکھا۔

میرا جی چاہا کہ اسے تھپڑ دے ماروں مگر میں یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنا سر پکڑے خاموش بیٹھا رہا۔

اسی دوران میں کشتی کے اندر بیٹھی سواریوں میں سے ایک بڑھیا کے ہاتھ سے اس کا مرغا چھوٹ گیا اور کشتی میں ادھر ادھر پھدکنے لگا۔ لوگ اسے پکڑنے کی کوشش میں دائیں بائیں ہوئے تو کشتی بری طرح ڈولنے لگی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ الٹ ہی جائے گی۔ پھر کشتی بان اور اس کے معاون کی ڈانٹ ڈپٹ سے لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور یہ خطرہ ٹلا۔

ہم دوسرے کنارے پر پہنچے۔ میرے دماغ میں مسلسل تندوتیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں جس مقام پر ہوں، یہ پاکستان میں نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔ تو کیا میں انڈیا کے کسی سرحدی علاقے میں تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر مجھے بارڈر کیسے کراس کرایا گیا تھا... اور بارڈر کراس کرانے والوں نے مجھے اس نامعلوم علاقے میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ مجھے یہ بھی لگ رہا تھا کہ میں اپنے اندازوں سے زیادہ دیر تک بے ہوش رہا ہوں۔ جلد ہی ہم ایک گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ سلطانہ نے اب اپنا چہرہ چھوٹے سے گھونگھٹ میں چھپا لیا تھا۔ وہ کچھ ہراساں بھی نظر آتی تھی۔ اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد ایک درمیانی عمر کے مقامی شخص نے دروازہ کھولا... وہ بھی دیہاتی لباس میں تھا۔ تاہم اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور ماتھے پر محراب کا نشان ظاہر کرتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔

اس نے دروازہ کھولنے کے بعد سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ سلطانہ جلدی سے بولی۔ ''آپ چاچا غنی ہیں نا؟''

ادھیڑ عمر شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔

سلطانہ نے کہا۔ ''میں سلطانہ ہوں جی۔ زرگاں سے...''

ادھیڑ عمر غنی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر ہم تینوں کا جائزہ لیا اور ہمیں اندر آنے کے لیے کہا۔

یہ ایک درمیانے سائز کا دیہاتی گھر تھا۔ چھت لکڑی کی تھی۔ دیواریں اور فرش کچا تھا۔ تاہم بڑی اچھی طرح لیپا پوتی کی گئی تھی اور نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ غنی نامی اس شخص نے سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں اکیلا ہی ہوں، بچے کل سے اپنے ماموں کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ ویسے میرا خیال تھا کہ تم لوگ ایک دو روج بعد آؤ گے۔ رمجان نے تو مجھ سے یہی کہا تھا۔''

''بس جلدی آنا پڑ گیا جی۔ حالات اچ کچھ ایسے ہو گئے تھے۔'' سلطانہ منمنائی۔ وہ اب بھی گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔

''یہ ہے تمہارا شوہر؟'' ادھیڑ عمر غنی نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' وہ ذرا سا شرمائی۔

''یہ چوٹ کیسے لگی بیٹا؟'' غنی نے مجھ سے پوچھا۔

میرے بولنے سے پہلے ہی سلطانہ بولی۔ ''کل شام

کے وختت پیڑ سے گرے ہیں۔ کافی جیادہ چوٹ آئی ہے۔ میں نے پٹی تو کردی ہے، پر ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی جرورت پڑ جائے۔''

میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''غنی صاحب! آپ میری ایک بات سنیے۔''

ادھیڑ عمر غنی ایک لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آیا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں جی، بس ذرا اکیلے میں آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

سلطانہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی مگر اس سے پہلے ہی ہم کمرے سے باہر آگئے۔ گونگا بہرا ہاشم دروازے کے پاس لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ ایک قریبی کمرے میں جاکر میں نے غنی صاحب سے کہا۔ ''میں سخت پریشان ہوں جی۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ یہ لڑکی کون ہے؟''

غنی صاحب حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگے۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟ یہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟''

''نہیں جی، یہ میری بیوی نہیں ہے اور نہ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ کل شام پہلی بار مجھ سے ملی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی دماغی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ کل سے مسلسل اول فول بک رہی ہے۔''

''اور یہ بچہ جو ساتھ ہے؟''

''وہ بھی میرا نہیں۔ ان دونوں کے پیچھے کچھ لوگ لگے ہوئے ہیں۔ کل رات تیز بارش میں ہم نے ایک جگہ پناہ لی تھی۔ وہاں بھی ایک بندوق والا آپہنچا تھا۔ وہ اسے اور مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ پھر وہاں ہمارے درمیان لڑائی ہوئی اور وہ ہارون نام کا بندہ زخمی ہوکر گر گیا۔ اب وہ بندہ بھی وہیں جنگل میں بندھا پڑا ہے...''

ادھیڑ عمر عبدالغنی کے چہرے پر الجھن آمیز تشویش نظر آنے لگی۔ انہوں نے مجھے سرتاپا گھور کر کہا۔ ''تو... تم کون ہو...؟''

''میں دراصل...'' میں کہتے کہتے رک گیا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں کہاں بے ہوش ہوا تھا اور کہاں ہوش میں آیا ہوں... اور ممکن تھا کہ وہ میری بات پر یقین ہی نہ کرتے۔

میں گہری سانس لیتے ہوئے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا۔ ''غنی صاحب! میں بڑے مشکل حالات سے دوچار ہوں۔ میں ان حالات کے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے آپ مجھے یہ بتایئے کہ میں کہاں ہوں؟ میرا مطلب ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟''

غنی صاحب کی آنکھوں میں حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''بھئی، یہ نل پانی ہے۔ زرگاں کے بعد علاخے (علاقے) کی سب سے بڑی آبادی تو یہی ہے۔ اسے کون نہیں جانتا؟''

''اچھا... یہاں کا سب سے قریبی شہر کون سا ہے؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''بیٹا! تم کیسی باتاں کر رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی کچھ چکرائے ہوئے ہو۔''

''غنی صاحب! آپ بس میرے ایک دو سوالوں کے جواب دے دیں۔ پھر آپ جو پوچھیں گے، میں بتاؤں گا۔'' میرے لہجے میں عاجزی تھی۔

''بھئی، یہاں کا سب سے قریبی شہر تو جھانسی ہے۔ وہاں تک جانے میں بھی چار دن لگ جاتے ہیں۔''

''جھانسی... جھانسی۔'' میں نے اپنے ذہن میں دو تین بار دہرایا۔ یقیناً یہ کوئی انڈین نام تھا... میرے ذہن میں تاریخ کے حوالے سے ''جھانسی کی رانی'' کے الفاظ چمکنے لگے۔ مگر ضروری بھی نہیں تھا کہ یہ وہی جھانسی ہو۔ کہاں لاہور میں ڈیفنس کا علاقہ اور کہاں یہ جھانسی۔ میں نے مزید وضاحت کے لیے پوچھا۔ ''جھانسی کے بعد کون سی جگہ آتی ہے؟''

غنی صاحب کے چہرے پر الجھن بڑھتی جارہی تھی۔ انہوں نے بیزار انداز میں کہا۔ ''جھانسی کے بعد الٰہ آباد ہے پھر لکھنؤ ہے۔''

میرے ذہن میں جیسے کئی دھماکے ہوئے۔ میرا حیرت ناک اندیشہ درست تھا۔ میں پاکستان میں نہیں انڈیا میں تھا... اور انڈیا کا بھی یہ کوئی سرحدی علاقہ نہیں تھا۔ یہ ''ڈیپ'' انڈیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سر تھام لیا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ میرا رنگ ہلدی ہو رہا ہے۔ ''غنی صاحب! مجھے یہ بتائیں، یہ لڑکی کون ہے؟ آپ سے اس کا تعلق کیسے ہوا ہے؟''

میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے غنی صاحب شروع میں تو ہچکچائے پھر انہوں نے جواب دیا لیکن صرف اتنا بتایا کہ سلطانہ اس علاقے کی دوسری بڑی بستی زرگاں کی رہنے والی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ کچھ مسئلہ تھا جس کی وجہ سے یہ فوری طور پر زرگاں سے یہاں نل پانی میں آنا چاہتی تھی۔ زرگاں میں غنی صاحب کا کوئی دوست رمضان علی تھا۔ اس نے ایک پیامبر کے ہاتھ غنی صاحب کو یہ پیغام پہنچایا تھا کہ وہ چند روز تک ایک لڑکی کو ان کے پاس بھیج رہا ہے۔ لڑکی کے ساتھ اس کا شوہر اور بچہ بھی ہیں۔ یہ لوگ صرف دو تین دن ان کے پاس رہیں گے، پھر خود اپنے رہنے کا کوئی انتظام کرلیں گے۔ اس کے سوا عبدالغنی صاحب کو کچھ معلوم نہیں تھا... یا شاید وہ ابھی بتانا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''غنی صاحب! آپ جن رمضان صاحب کا ذکر کر رہے ہیں، اگر وہ واقعی آپ کے دوست ہیں تو پھر انہیں بتانا چاہیے تھا کہ وہ جس لڑکی کو آپ کے پاس بھیج رہے ہیں، وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں خود اس بات پر حیران ہوں۔ اگر لڑکی کا کوئی ایسا مسئلہ ہوتا تو رمجان نے مجھے جرور بتانا تھا۔ پر اس نے تو کوئی بات نہیں کی۔''

''یہ جو اس کے ساتھ گونگا بندہ آیا ہے، یہ کون ہے؟''

''مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکی سلطانہ کا کوئی رشتے دار ہے۔ رمجان نے مجھے بتایا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ لڑکی پہلے اج زرگاں سے نکل پڑے، اس کا بچہ بعد میں کسی دوسرے کے ساتھ نکلے۔ اس طرح لڑکی کو زرگاں سے نکلنے میں آسانی ہوئیں گا۔ بعد میں کہیں راستے میں لڑکی اور بچہ آپس میں مل جائیں گے۔ میرے خیال میں ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ گونگا بچے کے ساتھ نکلا ہوئیں گا...''

''میں آپ کو پھر بتا رہا ہوں، یہ لڑکی اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ جو بندہ پیغام لے کر آیا تھا، وہ کہاں ہے؟''

''وہ تو شاید واپس چلا گیا تھا۔ ویسے زرگاں کے ایک دو بندے ہور یہاں ہیں لیکن سب سے پہلے میں اس گونگے سے بات کرکے دیکھتا ہوں۔''

غنی صاحب اٹھے اور اپنے چہرے پر الجھن لیے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی انہیں بھی سلطانہ کی مخبوط الحواسی کا علم ہوجائے گا۔ میرے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پٹی بدلے جانے کی ضرورت تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا... اور یہ یقین کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں اپنے ملک میں نہیں، غیر ملک میں ہوں۔ فرح، عاطف اور اپنی ماں کی قبر سے سیکڑوں میل دور۔ پتا نہیں کہ میری ماں کو باقاعدہ قبر بھی نصیب ہوئی تھی یا نہیں۔ ان کی موت کو چھپا لینا سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ کے لیے بہت آسان تھا۔ وہ اس چار دیواری میں پوری طرح حاوی ہوگئے تھے۔ انہوں نے گارڈ خادم حسین کو مار دیا تھا۔ عمران کا دوست آصف بھی غالباً ان کے ہاتھوں سے جان گنوا بیٹھا تھا۔ سیٹھ سراج وغیرہ کے لیے عین ممکن تھا کہ وہ ماں جی کی موت کو کوئی اور رنگ دے دیتے یا پھر ان کے جسدِ خاکی کو ویسے ہی کہیں غائب کردیتے۔

میں جب ان سارے خونی مناظر کے بارے میں سوچتا تو مجھے لگتا تھا کہ یہ کوئی سات آٹھ یا دس پندرہ روز پہلے کی باتیں نہیں ہیں بلکہ ان کو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ اچانک مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ غنی صاحب واپس آگئے۔ ان کے چہرے پر پہلے سے زیادہ الجھن تھی۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ ہولے سے بند کیا اور دھیمی آواز میں بولے۔ ''بچے نے پوٹی کی ہے۔ لڑکی اس کی ٹانگیں وغیرہ دھو رہی ہے۔ میں نے گونگے سے علیحدہ میں بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ پتا نہیں کیا کیا اشارے کر رہا ہے۔ صحیح طرح سے میرے پلّے تو کچھ نہیں پڑا۔ کسی وختت تو لگتا ہے کہ وہ لڑکی کی طرف کی بات اج کر رہا ہے۔''

''آپ اسے یہاں لائیں، میرے پاس۔''

''نہیں، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوئیں گا۔ میں چوہان کو لے کر آتا ہوں۔ وہ بھی زرگاں سے آیا ہے۔ رمجان کے محلے میں ہی رہتا تھا۔ پکی بات ہے کہ اس لڑکی کو بھی جانتا ہوئیں گا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، عبدالغنی صاحب تیزی سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے چند سیکنڈ بعد سلطانہ آدھمکی۔ وہ خوش نظر آرہی تھی۔ اس نے میرے قریب بیٹھ کر جوشیلے انداز میں میرا ہاتھ دبایا اور بولی۔ ''مہرو! بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ اب کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گا۔ ہم کل اج چھوٹے سرکار سے ملیں گے۔ وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔ وہ ہم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔'' اس نے بڑی محبت سے اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیا۔

پھر جیسے اسے ایک دم یاد آیا۔ ''ہائے میں مری... میں نے تمہاری چوٹ تو دیکھی اج نہیں۔ اب کیا حال ہے درد کا؟''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ جلدی جلدی پٹی کھولنے لگی۔ وہ اپنے جھولے میں سے صاف روئی اور مرہم لے کر آئی۔ ہاشو سے اس نے نیم گرم پانی منگوایا اور بڑی توجہ سے میرے سر کے زخم کو صاف کرنے میں مصروف ہوگئی۔ اس کی انگلیوں کے لمس میں انتہا درجے کی محبت آمیز ملائمت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خاص قسم کی جرأت بھی اس کے انداز میں موجود تھی جو سنگین چوٹوں کی مرہم پٹی کے لیے درکار ہوتی ہے۔ ایسی جرأت عام طور پر لڑکیوں میں نہیں پائی جاتی... یوں لگ رہا تھا کہ بہروز نام کا کوئی شخص واقعی موجود تھا اور وہ سلطانہ کا شوہر تھا۔ اب اس شخص کے ساتھ پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ وہ یہاں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ موجود نہیں تھا۔ شاید کوئی المناک حادثہ... کوئی سنگین جرم... کوئی خونی واردات۔

عین ممکن تھا کہ جو کچھ پیش آیا، وہ زرگاں سے تل پانی تک کے راستے میں ہی پیش آیا ہو اور اس واقعے کے بعد سلطانہ نے ہوش وحواس کھو دیے ہوں۔ غالب امکان یہی تھا کہ ایسا ہی ہوا ہے کیونکہ غنی صاحب کو سات آٹھ دن پہلے اپنے دوست رمضان کا پیغام ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ لڑکی اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ان کے پاس آرہی ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟'' وہ میری پٹی کرتے کرتے ذرا شرمیلے انداز میں بولی۔

''کچھ نہیں۔''

''جب تم کہتے ہو کہ کچھ نہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کچھ ہے۔'' وہ پٹی کو آخری گرہ لگا کر میرے بازو سے لگ گئی اور میری بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''داڑھی بنا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا؟''

''اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو؟ پہلے کبھی نہیں بنائی میں نے... شاید تم بھول گئے۔ شروع شروع میں تو میں تمہیں نہلا بھی دیا کرتی تھی۔'' وہ کہہ کر شرما گئی۔

یکایک گھر کے بیرونی دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ سلطانہ جلدی سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ غنی صاحب واپس آگئے ہیں۔ ان کے ساتھ بھاری آواز والا کوئی اور شخص بھی تھا۔ یہ وہی چوہان نام کا بندہ تھا جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے ذکر کیا تھا۔ سلطانہ جلدی سے ان دونوں کے پاس باہر چلی گئی۔ میں وہیں نیم تاریک کمرے میں بیٹھا رہا اور ادھ کھلے دروازے سے دوسرے کمرے کا منظر دیکھتا رہا۔ چوہان سفید رنگت اور مسکراتے چہرے والا ایک چوبیس پچیس سالہ نوجوان تھا۔ وہ بھی مقامی لباس میں تھا۔ اس نے سلطانہ کو پہچان لیا۔ سلطانہ نے اسے ''چوہان بھائی'' کہہ کر مخاطب کیا۔ چوہان نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور بچے کے گال گدگدائے۔

ان کو وہیں چھوڑ کر عبدالغنی صاحب میرے پاس کمرے میں آگئے۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ان کے چہرے پر اب پہلے سے زیادہ الجھنیں موجود تھیں۔ سفیدی مائل بالوں کی ایک لٹ ان کی شکن شکن پیشانی پر جھول رہی تھی۔ میں غنی صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جو پہلی ملاقات میں ہی آپ سے اپنا احترام کرانے لگتے ہیں۔ اپنے چہرے مہرے سے وہ ایک دانا بینا اور ہمدرد انسان دکھائی دیتے تھے۔

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے دیکھنے کے انداز نے مجھے گڑبڑا دیا۔ ''کیا بات ہے غنی صاحب! آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور الجھے لہجے میں بولے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم... ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''کک... کیا مطلب... غنی صاحب؟''

''تمہیں غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''غلط بیانی... میں کون سی غلط بیانی کر رہا ہوں؟'' میں ششدر تھا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولے۔

''آپ کھل کر بات کریں۔''

''سلطانہ تمہاری بیوی ہے اور تم اس سے انکار کر رہے ہو۔ بالو بھی تمہارا اپنا بچہ ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔'' غنی صاحب کا لہجہ حتمی تھا۔

میں نے ایک بار پھر ماتھا پکڑ لیا۔ مجھے لگا جیسے میں دیوانوں کے کسی گروہ میں گھر گیا ہوں اور اپنی شناخت کھو بیٹھا ہوں۔

غنی صاحب نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''دیکھو برخوردار! اگر تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں ہر طرح تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس طرح...''

''خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' میں نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا اور اپنے آپ میں سمٹتا چلا گیا۔

''یہ دیکھو... یہ کیا ہے۔ کیا تم اس سے بھی انکار کرو گے؟'' غنی صاحب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں ایک تصویر تھی۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے تصویر دیکھی۔ یہ ایک گروپ فوٹو تھا۔ اس میں کئی مرد و زن تھے۔ دو چار بچے بھی نظر آرہے تھے۔ یہ سب لوگ مقامی دیہاتی لباس میں تھے۔ ایک سات آٹھ سالہ بچہ دُلہے کے لباس میں تھا۔ اس نے سہرے میں سے اپنا چہرہ نکالا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ میرے اردگرد کی ہر شے گھومنے لگی ہو۔ غنی صاحب کا چہرہ... ان کی کالی چھتری، رنگین نقش ونگار والی دیواریں، چٹائی کے پھول بوٹے... سب کچھ میری نظروں میں گھومنے لگا تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں غرق تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اس گروپ فوٹو میں ایک طرف

میں خود بھی موجود تھا۔ میرے ہاتھوں میں ایک نومولود بچہ تھا۔ شاید چند ہفتے کا ہوگا۔ غالباً یہ بالو تھا۔ سلطانہ نے میرا بازو تھام رکھا تھا اور میرے کندھے سے چپکی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔

مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں نے تصویر پھینک دی۔ اپنا سر عقب سے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور اپنے چہرے کو اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں میں دھنساتا چلا گیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ؟ میں کہاں پھنس گیا تھا؟ کیا میں ڈیفنس والی کوٹھی میں بارہ تیرہ زینوں کے اوپر سے پرواز کر کے پختہ فرش پر گرنے کے بعد ابھی تک بے ہوش تھا؟ اور یہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، بے ہوشی کے عالم میں دیکھ رہا تھا؟ میں کیسے یقین کر سکتا تھا... میں ایسی باتوں پر کیسے یقین کر سکتا تھا؟ میں نے زندگی میں ٹھوس حقیقتوں کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں کیا تھا۔ یہ میری فطرت میں ہی نہیں تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میری گردن کے پچھلے حصے پر رکھے ہیں اور وہاں مطلق درد نہیں ہو رہا۔ لگتا تھا کہ وہ زخم بالکل مندمل ہو چکا ہے جو بتی والے چوک میں گاڑی کے الٹنے سے میری گردن پر آیا تھا اور جس نے رشید اور تابندہ کے گھر میں بھی مجھے سخت تکلیف میں رکھا تھا۔ ایک بار پھر میرے جسم میں سرد پھریریاں سی دوڑ گئیں۔ کیا واقعی یہ زخم مندمل ہو چکا تھا؟ میں نے دیوانوں کی طرح اس زخم پر ہاتھ چلایا۔ کوئی تکلیف نہیں تھی، کوئی کھرنڈ نہیں تھا۔ بالکل ملائم جلد تھی۔ پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ اسی ایکسیڈنٹ میں میری داہنی کہنی بھی تو زخمی ہوئی تھی۔ گاڑی کی کوئی نکیلی شے لگنے سے دو تین انچ لمبا زخم بن گیا تھا۔ میں نے تڑپ کر اپنا بازو موڑا اور سر گھما کر کہنی کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے ہیں۔ کہنی پر زخم کا بس بالکل مدھم سا نشان موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چوٹ عرصہ پہلے ٹھیک ہو چکی ہے۔

''اوہ خدا... اوہ خدایا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

غنی صاحب نے ایک بار پھر ملائم لہجے میں کہا۔ ''سنو مہروج! اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ... لیکن اس طرح کی باتاں نہ کرو۔ ان سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں...''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں۔'' میں نے اپنا سر بہ دستور ہاتھوں میں دبائے رکھا۔ ''میرا دماغ درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہو سکے تو مجھے ایک آدھ گھنٹے کے لیے اکیلا چھوڑ دیں۔''

''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ تمہیں آرام کی جرورت ہے۔ چلو، میں درواجا بند کر دیتا ہوں، تم کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔'' غنی صاحب نے کہا۔ ان کا متین چہرہ بہ دستور الجھنوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

وہ مجھے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ شاید وہ اب میری ذہنی صحت پر شک کرنے لگے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کا دھیان میرے سر کی شدید چوٹ کی طرف جا رہا ہو اور وہ خیال کر رہے ہوں کہ اس چوٹ کی وجہ سے میرے حواس وقتی طور پر مختل ہو گئے ہیں۔ دروازہ بند ہوا تو کمرے میں نیم تاریکی چھا گئی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میری نگاہ بار بار اپنی کہنی کی چوٹ پر پڑ رہی تھی۔ ہاں، یہی چوٹ تھی۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور یہ چوٹ بالکل مندمل ہو چکی تھی۔ شاید ایک ڈیڑھ سال پہلے... یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔

اچانک میری نظر کمرے میں لگے ایک چھوٹے سے گول آئینے پر پڑی۔ یہ آئینہ کھڑکی کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ میں نے روشنی کے لیے کھڑکی ذرا سی کھولی اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ یہ ایک اور ذہنی جھٹکا تھا جو مجھے برداشت کرنا پڑا۔ مجھے اپنی شکل اجنبی لگ رہی تھی۔ بے شک یہ میرا ہی چہرہ تھا تاہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس چہرے کو مدتوں بعد دیکھ رہا ہوں... رنگ کچھ سنولایا ہوا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں قدرے ابھری ہوئی، آنکھوں کے نیچے ہلکے سے ابھار... کچھ ضرور ہوا تھا، میرے ساتھ۔ کچھ انوکھا اور غیر معمولی۔ میرا دل و دماغ اب پوری طاقت سے گواہی دے رہا تھا کہ ڈیفنس لاہور میں پیش آنے والے خونی واقعات کو دو تین ہفتے نہیں گزرے، نہ ہی دو تین مہینے گزرے ہیں... انہیں ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ان واقعات میں اور یہاں اس جنگل میں پیش آنے والے واقعات کے درمیان ایک خلا ہے۔ ایک ایسا خلا جس کی طوالت اور گہرائی نامعلوم ہے۔ وہ خلا کیسے پیدا ہوا؟ اس خلا نے مجھے کیسے متاثر کیا؟ متاثر ہونے کے بعد میں کیا کرتا رہا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

ایکا ایکی میرے دل پر ایک زوردار گھونسا لگا۔ اگر... واقعی... یہ خلا موجود تھا تو پھر میرے پیارے کہاں تھے؟ ان پر کیا بیتی تھی؟ فرح، عاطف اور... ثروت۔ ثروت کی شبیہ نگاہوں میں گھومی اور سینے میں دھماکے سے ایک بہت بڑا الاؤ دہک گیا۔ میں تو ثروت کے پاس جانا چاہ رہا تھا۔ اس کو حالات کی زنجیروں سے آزاد کرانا چاہ رہا تھا۔ مجھے... جرمنی جانا تھا۔ میرا پاسپورٹ بن چکا تھا۔ ویزا لگنے والا تھا۔ میں

دن نہیں، گھڑیاں گن رہا تھا، گھنٹے شمار کر رہا تھا۔

اوہ خدایا... یہ کیا ہوگیا؟ کہیں میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا... ایک دم میرے اندر کی بے قراری انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے بے پناہ کرب کے ساتھ سوچا۔ ’کیا واقعی بہت تاخیر ہو چکی ہے؟ کیا واقعی میں اپنی ثروت کو ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں؟‘ میں نے ایک بار پھر دیوانوں کی طرح اپنی کنپٹی پر زخم کے پرانے نشان کو ٹٹولا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں مرنے والا ہوں۔ میری نگاہوں میں ثروت، فرح اور عاطف کی صورتیں گھومنے لگیں۔ میں نے کمرے کا عقبی دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ میں گلی میں کھڑا تھا... میں بھاگنے لگا۔ بھاگتا چلا گیا۔ لوگ مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں جنہوں نے ساڑیوں کے علاوہ چولیاں گھاگرے پہن رکھے تھے اور سانولے رنگ کے مرد بھی... اور ننگ دھڑنگ بچے بھی۔

میں اس مسافر کی طرح بھاگ رہا تھا جو پلیٹ فارم پر اتر کر ذرا دیر کے لیے غافل ہوا ہو اور اس کی گاڑی اس کے سارے مال اسباب سمیت آگے نکل گئی ہو۔

میں یوں تو بے سمت جا رہا تھا مگر اپنے تئیں ثروت کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جیسے وہ ابھی تک کسی اور کی نہ ہوئی ہو... جیسے ابھی تک میری محبت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جانی باقی ہو... وہ سرخ عروسی جوڑا پہنے بیٹھی ہو۔ ابھی قبول و ایجاب کے مراحل طے ہونا باقی ہوں۔ مجھے لگتا تھا کہ میں بھاگتا ہوا اس تک پہنچ جاؤں گا۔ پکار کر کہوں گا... میں آگیا ہوں ثروت... اب اپنے اقرار کو اپنے ہونٹوں کے اندر روک لو۔ یہ اقرار صرف میرے لیے ہے۔ لہٰذا یہ شادی انجام نہیں پا سکتی۔ یہ محفل برخاست کرنا ہوگی۔ ایک نئی محفل سجانا ہوگی... جہاں سچا اقرار ہوگا، جہاں سچی محبت کے سدابہار پھول کھلیں گے۔

میں بھاگ رہا تھا۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اردگرد کے مناظر میری نگاہ میں دھندلائے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے درجنوں سکون بخش گولیاں ایک ساتھ نگل لی ہیں اور اب میں دوڑنے کے بجائے ہوا کے سمندر میں تیر رہا ہوں۔

اب میرے اردگرد سرسبز ڈھلوان تھی۔ یہاں گھنے درخت تھے۔ ان درختوں میں کہیں کہیں بکریاں چرتی نظر آ رہی تھیں۔ میں ایک جگہ بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔

میں ضعیف العقیدہ نہیں تھا۔ مجھ میں بے شمار خامیاں تھیں مگر توہم پرستی اور فطرت سے اغماض کرنے جیسی کمزوریاں نہیں تھیں۔ میں نے ہمیشہ ٹھوس حقائق پر یقین رکھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب میرا دماغ شدید ترین تناؤ کے سبب پھٹ رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ان حالات کے ڈانڈے فوراً ماوراء سے جوڑنے لگ جاتا۔ جادو ٹونا سحر، جن، بھوت، آسیب، ہمزاد اور اس طرح کے نہ جانے کون کون سے تصورات اس کی سوچوں کو جکڑ لیتے۔ اور شاید اس وجہ سے وہ کسی حد تک ’’ریلیکسڈ‘‘ بھی ہو جاتا مگر میں وجہ تلاش کر رہا تھا۔ منطق ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے کوئی ’’واہمہ‘‘ مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی صورتِ حال کے لیے ٹھوس وضاحت چاہیے تھی۔

اچانک مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ بھاگتے قدموں کی چاپ تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سلطانہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے گال قندھاری انار کی طرح سرخ تھے اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔ عیاں تھا کہ وہ بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آئی ہے۔ پھر مجھے اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر غنی صاحب اور وہ دوسرا شخص بھی دکھائی دیے جس کا نام چوہان بتایا گیا تھا۔ سلطانہ نے آتے ساتھ ہی میرے دونوں کندھے تھام کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ سسک کر بولی۔ ’’تمہیں کیا ہوگیا ہے مہرو! ایسا کیوں کر رہے ہو تم... کیا میری جان لینا چاہتے ہو؟ تمہیں پتا ہے، تمہاری تکلیف دیکھ کر مجھ پر کیا گزرتی ہے؟‘‘

اسی دوران میں غنی صاحب اور چوہان بھی میرے پاس آگئے۔ چوہان نے بھی بڑی ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ’’تمہیں کیا ہوگیا ہے مہرو... ہوش کرو یار! نہیں تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔‘‘

’’مجھے اکیلا چھوڑ دو تم لوگ۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔‘‘ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

سلطانہ نے ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ لگایا۔ میں نے اسے جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا۔ غنی صاحب اور چوہان آپس میں کھسر پسر کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں سے کچھ الفاظ میرے کانوں تک پہنچے۔ جیسے سر... چوٹ... پریشانی وغیرہ۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے سر پر لگنے والی چوٹ کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس چوٹ کی وجہ سے میرے حواس گڑبڑا گئے ہیں۔

اسی دوران میں تین گھڑ سوار نظر آئے۔ وہ گہری سبز وردیوں میں تھے۔ ان کے سروں پر ہلکی سبز دھاری دار پگڑیاں تھیں۔ کندھوں پر رائفلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان پر خاکی غلاف چڑھے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے بارعب لہجے میں پوچھا۔ ’’کیا بات ہے... یہاں کیوں بیٹھے ہو؟‘‘

سلطانہ کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا، غنی صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔ ’’کوئی خاص بات نہیں جی۔ یہ گھر کا معاملہ ہے۔‘‘

’’گھر کا معاملہ ہے تو گھر میں بیٹھ کر نمٹاؤ... اور اس بندے کو چوٹ کیسے لگی ہے؟‘‘ میری طرف اشارہ کر کے پوچھا گیا۔

’’پیڑ سے گر گیا ہے جناب! کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔‘‘ غنی صاحب نے کہا۔

’’ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں سے اٹھ جاؤ۔‘‘ اور تینوں گھوڑے آگے بڑھ گئے۔

غنی صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر التجا آمیز لہجے میں بولے۔ ’’چلو اٹھ جاؤ مہرو!‘‘

’’میرا نام مہرو نہیں ہے۔ میں تابش ہوں۔ میں پاکستانی ہوں۔‘‘ میری آواز اتنی بلند تھی کہ آگے جاتے ہوئے گھڑ سواروں تک پہنچ سکتی تھی۔

غنی اور چوہان بُری طرح گھبرا گئے۔ سلطانہ نے مجھے خاموش رکھنے کے لیے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ’’خدا کے لیے مہرو! ہوش کرو۔‘‘ وہ کراہی۔

گھڑ سواروں تک میری آواز نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ آگے نکل گئے تو غنی صاحب نے دوبارہ بھنچی آواز میں کہا۔ ’’ٹھیک ہے، تم جو کہو گے ہم سنیں گے لیکن گھر جا کر۔ یہاں سے اٹھ جاؤ۔ اگر کوئی اور یہاں آگیا تو ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہوئیں گا۔‘‘

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں دوبارہ غنی صاحب کے گھر میں تھا۔ سلطانہ سمیت کوئی بھی مجھ سے کسی طرح کی متنازع بات نہیں کر رہا تھا۔ کسی نے مجھے مہرو کہہ کر بھی نہیں پکارا تھا۔ بہرحال، وہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

میں اون کی چٹائی پر دراز ہوگیا اور کچی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ سامنے والی دیوار پر دو تین جانوروں کی کھالیں آویزاں تھیں۔ میں ان میں سے بس ایک کھال پہچان سکا۔ یہ کسی چھوٹے چیتے کی تھی۔ گھر سے باہر گلی سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ بچے شور مچا رہے تھے۔ کہیں قریب ہی شاید بھجن گایا جا رہا تھا۔ میرے دماغ میں دھند سی بھری ہوئی تھی۔ میں جیسے ہوش اور بے ہوشی کے درمیان بھٹک رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ میں تابش ولد اشفاق سکنہ لاہور، ایک انوکھی و حیران کن صورتِ حال کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری زندگی کے تسلسل میں سے شب و روز کا ایک طویل ٹکڑا غائب ہو چکا ہے۔ یہ بڑی فلمی اور داستانی سی صورتِ حال تھی۔ بچپن سے فلموں، ڈراموں میں اس طرح کے مناظر دیکھے تھے۔ کوئی شخص کسی حادثے کا شکار ہو کر اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔ پھر کسی اور حادثے کے سبب اس کی یادداشت بحال ہوگئی۔ کیا میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے؟ لاہور ڈیفنس کی کوٹھی میں حادثے کا شکار ہونے کے بعد میں ایک نامعلوم وقت تک کسی اور حیثیت سے زندہ رہا ہوں۔ اس نامعلوم عرصۂ حیات میں، میں نے کیا کیا ہے؟ کن لوگوں سے ملا ہوں؟ کن لوگوں سے بچھڑا ہوں؟ کیا ٹھوکریں کھائی ہیں؟ کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

یہ لوگ غالباً سمجھ رہے تھے کہ سر کی چوٹ کی وجہ سے میرے حواس مختل ہو گئے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔ چوٹ کی وجہ سے میرے حواس مختل نہیں، بحال ہوئے تھے۔ میرے زخم نے مجھے مخبوط الحواس نہیں بنایا تھا، صحیح الدماغ کیا تھا۔ مگر حافظے کی یہ واپسی میرے لیے ایک ایسا عذاب بنی تھی جس کی شدت کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ دل و دماغ میں یہ احساس ایک نہایت کربناک لہر کی طرح موجزن تھا کہ... میں نے دیر کر دی ہے۔ میں نے جہاں اور بہت کچھ کھویا ہے، وہاں ثروت کے معاملے میں بھی بہت دیر کر دی ہے۔

اسی دوران میں گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ کسی نے دروازہ کھولا۔ کچھ ملی جلی آوازیں آئیں۔ ان میں ایک بھاری اور پُرتحکم آواز سب سے نمایاں تھی... گاہے بہ گاہے غنی صاحب بھی احتجاجی انداز میں کچھ کہہ رہے تھے۔

میں نے گھر کے صحن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اپنی اس کوشش میں، میں پوری طرح کامیاب تو نہیں ہو سکا تاہم چند افراد کی ٹانگیں نظر آئیں۔ یہ وہی باوردی افراد تھے جو اس سے پہلے بستی سے باہر درختوں میں دکھائی دیے تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے ہیں۔ ان کا رویہ سخت تھا۔ بہرحال، وہ کسی طرح کی بدتمیزی نہیں کر رہے تھے۔ غنی صاحب کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ’’دیکھو جناب! ہم تو خود ابھی تھوڑی دیر میں آپ کے پاس حاجر ہونے والے تھے۔ اس لڑکی نے کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ تو خود سائل بن کر آئی ہے۔‘‘

جواب میں بھاری آواز والے نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے بزرگوار! ہم بھی کسی کو اپرادھی تو نہیں کہہ رہے۔ بس اوپر کے

حکم پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ جو کچھ بولنا چاہتی ہے، وہاں جا کر بول لے۔"

وردی والے ایک دوسرے شخص نے کہا۔ "اور اس کا پتی کدھر ہے؟"

"وہ بیمار ہے جی۔ دوسرے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔" غنی صاحب کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد دو تین افراد میرے والے کمرے میں گھس آئے۔ ان میں سے بھاری آواز والا شخص وہی تھا جس سے کچھ دیر پہلے بستی سے باہر ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سر تا پا دیکھا اور بولا۔ "تم ہی سلطانہ کے پتی ہو؟"

ایک دم ہی میرے اندر کی گھٹن اور بے قراری آواز بن گئی۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ "میں نہیں ہوں اس کا پتی۔ میرا اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"تو کون ہو تم؟" بھاری آواز والے نے کہا۔

"میرا نام تابش ہے۔ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ مجھے زبردستی روک رہے ہیں۔"

سلطانہ تیزی سے اندر آئی۔ بھاری آواز والے سے مخاطب ہو کر بولی۔ "آپ کو بتایا ہے نا یہ بیمار ہیں۔ ان کو چوٹ لگی ہے سر میں... اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ الٹی سیدھی باتاں کر رہے ہیں..."

"یہ جھوٹ بول رہی ہے... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے نہیں پتا، یہ کیا چاہتی ہے... اس کے ساتھی کیا چاہتے ہیں؟" میں نے چلا کر کہا۔

"خدا کے لیے مہروج... ایسی باتاں نہ کرو۔" سلطانہ نے بے قرار ہو کر میرا بازو تھاما۔

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور ایک دم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ لگتا تھا میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ چکر بڑھتے جا رہے تھے۔ دم گھٹ رہا تھا۔ میں گہری سانسیں لینے لگا۔ اردگرد کی آوازیں اب جیسے مجھے فاصلے سے سنائی دے رہی تھیں۔ بھاری آواز والا مقامی لب و لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ سلطانہ اور غنی صاحب بھی بول رہے تھے۔ آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پلیز! چلے جاؤ یہاں سے... میرا سر پھٹ رہا ہے۔"

میں اپنا سر گھٹنوں میں جھکاتا چلا جا رہا تھا۔

وہ لوگ باہر چلے گئے۔ اب ان کی گفتگو کی آواز دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا۔ باوردی افراد سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ سلطانہ نے بچہ گود میں اٹھا لیا تھا اور اوڑھنی سر پر لے لی تھی۔ وہ پریشان اور دکھی ضرور تھی مگر ہراساں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ سلطانہ کے ساتھ بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے۔ گونگا ہاشم بھی ان کے ساتھ ہی گیا تھا۔

تین چار منٹ بعد غنی صاحب اندر آئے۔ میں چٹائی پر لیٹا، گہرے سانس لے رہا تھا۔ غنی صاحب کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "وہ لوگ سلطانہ کو لے گئے ہیں۔ اسے تمہاری مدد کی بہت جیادہ جرورت تھی مگر تم نے سب کچھ الٹ دیا ہے۔"

"میں نے کیا الٹا ہے... اور میں کسی کی مدد کیا کروں گا؟ مجھے خود مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے بتائیں، میرے ساتھ کیا ہوا ہے...؟"

"تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہوا مہروج! تم بالکل ٹھیک ہو۔ تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے جس کی وجہ سے تم وقتی طور پر باتوں کو بھول رہے ہو۔ بہت جلد سب اچھا ہو جائے گا۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ چوٹ لگنے سے میرا حافظہ چلا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل الٹ ہے... بالکل الٹ ہے۔ میں اپنے آپ کو پہچان رہا ہوں۔ اپنے حالات کو پہچان رہا ہوں۔ میرا نام تابش ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔ وہاں کچھ لوگوں کے ساتھ میری دشمنی تھی۔ میرا ان سے جھگڑا ہوا۔ میں سیڑھیوں سے گرا... بس... مجھے یہاں تک یاد ہے۔ اس کے بعد کچھ یاد نہیں۔ سب کچھ کسی گہری دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ اس دھند میں کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا۔"

میں نے ایک بار پھر اپنا سر ہاتھوں میں جکڑ لیا اور کرب کی انتہا سے گزرنے لگا۔ "میری مدد کریں غنی صاحب! مجھے بتائیں میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں کتنی دیر تک اپنے ہوش میں نہیں رہا ہوں... اور مجھے یہ بھی بتائیں کہ میں یہاں سے کیسے نکل سکتا ہوں۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے کہیں جانا تھا۔ کسی سے ملنا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے میرا انتظار کیا ہو گا... وہ شاید آج بھی میری راہ تک رہی ہو۔ اوہ خدا! یہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟"

میں بولتا جا رہا تھا اور غنی صاحب ہمدردانہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میری اس بات نے انہیں چونکایا تھا کہ میرا حافظہ گیا نہیں، واپس آیا ہے۔

میری بڑھتی ہوئی بے قراری دیکھ کر انہوں نے وہ

بات ادھوری چھوڑ دی جو وہ کرنا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے سلطانہ کا ذکر دوبارہ نہیں کیا۔ مجھے روغنی مٹی کے گلاس میں پینے کے لیے پانی دیا۔ پھر بولے۔ "چلو، تم کچھ دیر کے لیے آرام کر لو۔ اتنے میں چوہان بھی آ جاتا ہے پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔"

میں واقعی چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤں۔ شاید میرے دماغ پر چھائی ہوئی دھند کچھ چھٹ جائے۔ ممکن ہے کہ میں اپنے ماضی اور حال میں کوئی رابطہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

گلی میں سے کبھی کبھی کوئی گھوڑا اڑیل چال چلتا گزرتا تھا اور اس کی ٹاپوں کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر کبھی بھینسوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز گونجتی تھی۔ بچے شور مچاتے تھے اور کوئی بھک منگا صدا لگاتا تھا۔ کہیں کسی قریب کے گھر میں کوئی شخص بانسری جیسا ساز پُردرد آواز میں بجا رہا تھا۔ ہوا بلند و بالا درختوں میں سے سائیں سائیں کرتی گزر رہی تھی۔ میں یہ ساری آوازیں کمرے کے اندر سے سن رہا تھا اور اپنے ذہن میں ماحول کی ایک تصویر بنا رہا تھا۔

یہ بستی، یہاں کے لوگ، یہاں کا رہن سہن آہستہ آہستہ مجھ پر واضح ہو رہا تھا۔ پھر بھی بے شمار سوال، جواب طلب تھے۔ غنی صاحب نے کہا تھا کہ اس علاقے کے قریبی شہر جھانسی اور الٰہ آباد وغیرہ ہیں۔ لیکن سلطانہ اور غنی صاحب جو بولی بول رہے تھے، اس میں دکنی رنگ تھا۔ ایسا لب و لہجہ میں نے حیدرآباد میں سنا تھا اور جہاں تک مجھے پتا تھا، الٰہ آباد اور حیدرآباد وغیرہ میں بہت فاصلہ تھا۔ کئی سوال مسلسل ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ باوردی افراد مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے ہیں؟ شاید میری حالت دیکھ کر انہوں نے مجھے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

جلد ہی مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ وہ مجھے چھوڑ ضرور گئے تھے مگر میری طرف سے مکمل غافل نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کھڑکی کی درز سے دیکھا تو باہر گلی میں ایک باوردی شخص ایک خوانچہ فروش کے پاس کھڑا نظر آیا۔ وہ خوانچے پر سے کوئی فالسے کی طرح کا پھل اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ اس کی رائفل غلاف میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ یہ شخص یہاں میری نگرانی کے لیے موجود ہو۔

میں لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد میری غنودگی، نیند میں بدل گئی۔ جب ذہن بہت تھک جائے اور اعصاب نڈھال ہو جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب میں سویا تو میرے اندازے کے مطابق سہ پہر تین چار بجے کا وقت تھا۔ آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کمرے میں ایک بڑی لالٹین روشن تھی۔ میں چٹائی پر لیٹا تھا اور میرے سر کے نیچے غالباً غنی صاحب نے ہی ایک نرم سرہانہ رکھ دیا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ منظر حیران کن تھا۔ جھیل کے خم کھاتے ہوئے کنارے کے ساتھ دور دور تک آبادی کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کا عکس جھیل کے ساکت پانی میں چمکتا تھا اور لگتا تھا کہ ہر طرف ستارے روشن ہیں۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید یہ منظر مجھے کشش کرتا مگر اس وقت تو دل و دماغ میں طوفان برپا تھا۔ جاگتے ساتھ ہی سارے کرب زیادہ شدت کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگے۔ ان میں سے سب سے جان لیوا کرب کا تعلق ثروت کے تصور سے تھا۔ یقینی بات تھی کہ میں اسے کھو چکا ہوں... وقت کا ایک طویل ٹکڑا جو میرے دل و دماغ سے اوجھل ہو گیا تھا، اسی ٹکڑے کے دورانیے میں ثروت کہیں گم ہو چکی تھی... میرا دل غم سے بھر گیا۔ میں کچھ دیر تو برداشت کرتا رہا پھر کھڑکی کے پاس ہی بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میرے یہ آنسو ثروت کے لیے تھے۔ یہ اس جدائی کا ماتم تھا جو میری زندگی کا سب سے بڑا داغ بننے والی تھی۔ میں روتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ میں نے کیا کیا سوچا تھا۔ اپنی اور ثروت کی جدائی کو ختم کرنے کے لیے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔ وہ سارا عزم، سارا جوش و خروش، انہونی کو ہونی کرنے کے وہ سارے حوصلے کیا ہوئے تھے؟ کسی بھی جدوجہد کے بغیر میں کس طرح ہار گیا تھا؟ یہ کیسی شکست تھی جس میں لڑنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے ان آنسوؤں میں فرح اور عاطف کے حصے کے آنسو بھی شامل ہونے لگے۔ میں ان سب کے لیے رویا اور بہت دیر تک رویا۔ ابھی مجھے اپنے حالات کا ٹھیک سے ادراک نہیں تھا مگر میرا دل اندر سے گواہی دے رہا تھا کہ مجھے کچھ کاموں کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے۔

کسی نے بہت ہولے سے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے جاگتے دیکھ کر اندر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ غنی صاحب ہوں گے مگر وہ چوہان تھا۔ چوہان بے شک مقامی لباس میں ہی تھا مگر وہ اپنی بول چال سے پڑھا لکھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے خدوخال بھی ظاہر کرتے تھے کہ وہ کہیں باہر سے یہاں آیا ہے۔ وہ متناسب جسم کا مالک تھا۔ آنکھیں روشن اور ماتھا چوڑا

تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور ملائمت سے بولا۔ ''بھوک لگی ہے تو کچھ تھوڑا بہت کھالو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ''شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ میں ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں۔ کچھ عرصہ الٰہ آباد میں پریکٹس بھی کر چکا ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''میں تم سے جو کچھ کہوں گا، اپنی جانکاری کے مطابق سچ کہوں گا کیونکہ اس میں میرا کوئی مفاد نہیں ہے اور نہ ہی کچھ لینا دینا ہے۔ میں آشا کرتا ہوں کہ تم بھی مجھے اپنا ہمدرد سمجھو گے۔''

''مجھے یہ بتاؤ، میں کس جگہ ہوں... کیسے پہنچا ہوں یہاں؟''

''کیسے پہنچے ہو، اس کے بارے میں تو میں زیادہ نہیں جانتا کیونکہ تم میرے یہاں اس اسٹیٹ میں آنے سے پہلے ہی موجود تھے لیکن...''

''اسٹیٹ؟ کیا یہ کوئی اسٹیٹ ہے؟'' میں نے حیرت سے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں، یہ بھانڈیل اسٹیٹ ہے۔ اتر پردیش کی دور دراز اسٹیٹس میں سے ایک۔ قانونی طور پر تو انڈیا میں راجواڑے، ریاستیں اور جاگیریں ختم ہو چکی ہیں مگر دور افتادہ علاقوں میں کسی نہ کسی طور ان کی حیثیت برقرار ہے۔''

''تم... کب... یہاں پہنچے تھے؟''

''آج سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے۔ بس میری کوئی مجبوری تھی جس کے سبب مجھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آنا پڑا۔''

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ یہ چوہان نامی شخص ڈیڑھ سال پہلے یہاں پہنچا تھا اور تب بھی میں یہاں اس جگہ موجود تھا؟

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں یہاں کن حالات میں آیا؟''

''تم آئے نہیں لائے گئے تھے اور جہاں تک میری جانکاری ہے، تم کو بڑے پنڈت مہاراج جی کی تحویل میں دیا گیا تھا۔ تم سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا جس کی سزا تمہیں یہاں بدھ مندر میں بھگتنا تھی اور مقامی لوگوں کے عقیدے کے مطابق خود کو پوتر کرنا تھا۔''

''بڑا جرم؟ میں نے کیا کیا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا۔''

''میرے خیال میں یہ کوئی چوری کا معاملہ تھا۔ بدھا کی ایک خاص مورتی کی چوری کا... تمہارے علاوہ بھی یہاں دو لوگوں کو سزا بھگتنا تھی۔ ان میں سے ایک عورت تھی۔ اس عورت کا نام کورتی ہے۔ مقامی زبان میں کورتی ونچ عورت کو کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں تم کورتی سے مل بھی چکے ہو۔ تم اسے جانتے ہو۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا۔ ''جب تم لوگ ایسی باتیں کرتے ہو تو میرے سر کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم غلط کہہ رہے ہو مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔''

چوہان نے بڑی نرمی سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے ہولے ہولے سہلانے لگا۔ اس کے لمس میں ایک ہمدرد دوست کا خلوص تھا۔ ''تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری اس کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو۔ میں تمہیں کئی ماہ تک وہاں زرگاں میں دیکھتا رہا ہوں۔ تمہارے مزاج کے اتار چڑھاؤ میری نگاہ میں رہے ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ... پلیز...''

''اچھا... تم میری طرف دیکھو... خوب غور سے۔'' چوہان نے اپنے ہاتھ سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''میں ڈاکٹر چوہان ہوں۔ جب بدھ مندر میں آگ لگی تو دو بھکشو آگ میں گھر گئے تھے۔ تم بھی ان کے ساتھ تھے۔ پھر میں اور سلطانہ اندر گئے تھے۔ ہم نے تمہیں آگ سے نکالا تھا۔ یہ دیکھو، اس وقت میرا بازو تھوڑا سا جل گیا تھا۔'' چوہان نے قمیص کی آستین اٹھا کر کلائی سے اوپر جلنے کا نشان دکھایا۔

میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بولا۔ ''اس بات پر وشواس کرو کہ یہ سب سچ ہے۔ اب یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ادھوری آدھی بات تمہیں یاد آجائے۔''

میں نے چوہان کے کہنے پر کوشش کی مگر ایک سفید دھند کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ محسوس ہوا کہ دم گھٹ رہا ہے۔ میری کیفیت دیکھ کر چوہان نے فوراً موضوع بدل دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں ذرا نارمل ہوا تو وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ ''تم سمجھدار اور روشن خیال ہو۔ اپنی تکلیف کو کوئی آسیبی رنگ نہیں دے رہے۔ اسے معروضی طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ جب بندہ اپنی تکلیف کو سمجھ لیتا ہے تو پھر اس پر غلبہ پانے میں آسانی رہتی ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو... میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

وہ اپنے گھونگریالے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولا۔ ''جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، ڈیڑھ دو سال پہلے تم کہیں سے بری طرح گرے ہو۔ کورتی بھی یہی بتاتی ہے کہ تم گرے ہو۔ تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے۔ اس چوٹ کے بعد ''اے پیس آف ٹائم''... یعنی وقت کا ایک ٹکڑا تمہاری یادداشت سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اسے ہم میڈیکل کی زبان میں RETROGRADE AMNESIA کہتے ہیں۔ یہ AMNESIA کی وہ قسم ہے جس میں کسی حادثے کی وجہ سے حادثے سے پہلے کے واقعات ذہن سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ بیماری جزوی بھی ہوتی ہے اور کلی بھی۔ جزوی بیماری میں کچھ باتیں یاد رہ جاتی ہیں، کچھ بھول جاتی ہیں۔ تمہارا معاملہ جزوی نہیں ہے۔ تمہاری یادداشت مکمل طور پر گئی تھی اور اب واپس آگئی ہے۔ تاہم یہ سو فیصد واپسی نہیں ہے۔ تم غور کرو گے تو اب بھی ماضی کی کچھ باتیں تمہارے ذہن سے محو ہوں گی۔ بہرحال، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا... بلکہ مجھے وشواس ہے کہ اب اس نئی صورتِ حال میں تم جو پچھلے ڈیڑھ دو سال کی باتیں بھول رہے ہو وہ بھی جلد ہی تمہارے ذہن میں تازہ ہونے لگیں گی۔''

اس نے چند لمحے توقف کر کے میری آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں۔ میرے سر کی چوٹوں کا بغور معائنہ کیا پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''کورپس کلوزم...''

غالباً وہ میری تکلیف کا طبی نام لے رہا تھا۔

اس نے میرا کندھا تھپکا اور حوصلہ افزا انداز میں بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں ہے۔ برا وقت گزر چکا ہے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے مہروز۔''

میں جھنجلا گیا۔ ''تم بار بار مجھے اس نام سے کیوں پکار رہے ہو؟ یہ میرا نام نہیں ہے۔''

''سوری... سوری... مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم نے اپنا نام تابش بتایا ہے۔ میں آئندہ تمہیں اسی نام سے مخاطب کروں گا۔ ویری سوری!''

''اوکے!'' میں نے کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر بات جاری رکھی۔ ''یہاں صورتِ حال یہ ہے مہروز... میرا مطلب ہے تابش کہ سلطانہ کو تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے۔ اگر تم نے اس کی مدد نہ کی تو وہ بری طرح پھنس جائے گی۔ اس کی عزت اور جان دونوں شدید خطرے میں پڑ جائیں گی۔''

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''سب سے پہلے تو تمہیں اپنا بیان تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے چھوٹے سرکار کے اہل کاروں کے سامنے جو کچھ کہا ہے، وہ بہت خطرناک ہے۔ تم نے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کیا ہے اور یہی وہ انکار ہے جو جارج اور حکم جی وغیرہ کو ایک دم ''اپر ہینڈ'' دے دے گا۔ وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ حکم جی اور جارج کا تو پہلے ہی یہ کہنا ہے کہ سلطانہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ اس نے بس ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ حکم جی... چھوٹے سرکار... یہ سب لوگ کون ہیں... ان سے میرا کیا تعلق ہے؟''

ایک دم چوہان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ مجھے سلجھانے کے بجائے مزید الجھا رہا تھا۔ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔ مجھے چاہیے کہ تمہیں آغاز سے بتاؤں... ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ باتیں تمہارے ذہن میں بھی تازہ ہو جائیں۔''

میں سوالیہ نظروں سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ''جو کچھ میرے علم میں ہے، میں تم تک پہنچا رہا ہوں۔ میری کسی بات پر شک کرو گے تو اپنی الجھنوں میں اضافہ کرو گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ کہنے لگا۔ ''یہ بھانڈیل اسٹیٹ دو بھائیوں کی ہے۔ دونوں کا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ یہاں ہندو زیادہ ہیں لیکن مسلمانوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ بڑے بھائی کا نام رائے وشوا ناتھ ہے لیکن انہیں یہاں ''حکم جی'' کہا جاتا ہے۔ ان کے حصے میں زرگاں کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں چھ سات بڑے گاؤں ہیں جو اس جنگل میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آباد ہیں۔ چھوٹے بھائی کا نام اجیت رائے ہے اور وہ ''چھوٹے سرکار'' کہلاتے ہیں۔ وہ یہاں نل پانی کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ نل پانی دراصل ''نیلے پانی'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ ایک ہی بڑی بستی ہے جو تم اس جھیل کے کنارے آباد دیکھ رہے ہو۔ اس کے علاوہ جنگل میں کہیں کہیں کسانوں اور خانہ بدوشوں کے چھوٹے چھوٹے ڈیرے ہیں جو ایسے قابلِ ذکر نہیں۔ میں جب اس بھانڈیل اسٹیٹ میں پہنچا تھا تو زرگاں میں اترا تھا۔ مجھے پناہ کی ضرورت تھی اور زرگاں کے حکم جی نے مجھے پناہ دی تھی۔ وہاں پتا ہے میں نے سب سے پہلے تمہیں کہاں دیکھا تھا؟''

''کہاں؟''

''ایک بار پھر کہوں گا کہ وشواس کرنا۔ میں تمہیں حقیقت بتانے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا۔ میں نے تمہیں سب سے پہلے زرگاں کے بودھ مندر میں دیکھا تھا۔ یہاں اسے پگوڈا بھی کہتے ہیں۔ تم نے گیروا رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ تمہارا سر منڈا ہوا تھا اور تم مندر کے صحن میں جھاڑو دے رہے تھے۔ کورتی بھی وہیں تھی۔ وہ بھی اسی حال میں تھی۔ تمہارا ایک تیسرا ساتھی بھی تھا مگر میں نے اسے نہیں دیکھا۔

''پھر ایک روز میں نے تمہیں بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ تم دوپہر کے وقت ایک پیالا لیے گھروں کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ تمہارے گلے میں زرد رنگ کی مالا تھی اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں۔ مجھے لگا کہ تم وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔ شاید تمہیں ایسا بنایا گیا ہے، تمہیں ایک نیا روپ دیا گیا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں اپنے دوست رمضان سے پوچھا تھا۔ رمضان زرگاں کا مقامی ہے۔ اس نے بتایا کہ تم بڑے پنڈت مہاراج کے اپرادھی ہو اور یہاں اس بودھ مندر میں جیون قید کاٹ رہے ہو۔ رمضان نے مجھے وہی چوری والی بات بتائی اور کہا کہ تم نے کوئی مقدس مورتی چوری کی تھی۔ تمہارے ساتھ جو دو اور افراد شریک تھے، وہ بھی اسی بودھ مندر میں سزا بھگت رہے تھے۔ تم سارا دن بے تکان کام کرتے تھے۔ تمہیں فقط ایک وقت کا بھوجن ملتا تھا... اور روزانہ شام کو مخصوص تعداد میں بید مارے جاتے تھے تاکہ تم مرنے سے پہلے پوتّر ہو جاؤ۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو ان بیدوں کے نشان شاید تمہاری کمر پر اب بھی موجود ہیں۔''

چوہان اٹھا اور اس نے میری قمیص ہولے سے اوپر اٹھائی۔ پہلے خود میری پشت پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر میری پشت پر پھیرا۔ مجھے ہلکے ہلکے کئی ابھار محسوس ہوئے۔ بہرحال، ان میں کسی طرح کا درد نہیں تھا اور یہ پرانی بات لگتی تھی۔

''ایک روز میں نے تمہیں اور بھی بُری حالت میں دیکھا۔ میں اس کی تفصیل بیان کر کے خوامخواہ تمہارا من خراب کرنا نہیں چاہتا۔ سمجھو کہ تمہیں مارا پیٹا جا رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکم جی کی ایک بیوی اور اس کی سہیلیوں نے تمہارے ساتھ کوئی شرارت کی تھی۔ تم پر چھیڑ چھاڑ کرنے کا الزام لگایا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی کا نام رتنا تھا۔ تم ذہن پر زور دو، شاید تمہیں کچھ یاد آئے۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ ہی تم بار بار مجھ سے یاد کرنے کو کہو۔ مجھے بس بتاتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے سخت مضطرب لہجے میں کہا۔

''انہی دنوں میں زرگاں سے ہجرت کر کے یہاں نل پانی میں آ گیا۔ مجھے وہاں زرگاں کے حالات کی زیادہ جانکاری نہیں رہی۔ پھر ایک روز اچانک مجھے پتا چلا کہ راجپوت مسلم گھرانے کی لڑکی سلطانہ نے تم سے شادی کر لی ہے اور اب تم اس کے گھر میں اس کے بوڑھے والد کے ساتھ ہی رہتے ہو۔ اس خبر نے جہاں اور لوگوں کو حیران کیا ہوگا، وہاں میں بھی ششدر رہ گیا۔ تم تو پنڈت مہاراج کے قیدی اور معتوب تھے پھر تمہاری شادی سلطانہ سے کیسے ہوئی؟ اس کی ٹھیک جانکاری مجھے آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ ہاں، یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ یہ شادی آناً فاناً ہوئی۔ شاید تم سلطانہ کو پسند آ گئے تھے یا پھر کوئی اور بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا ہو... بہرحال، سلطانہ ایک دلیر لڑکی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی سے دبتی نہیں۔ حتیٰ کہ جارج جیسے شخص کو بھی وہ کبھی خاطر میں نہیں لائی۔ میرا خیال ہے کہ آگے بتانے سے پہلے... میں تمہیں حکم جی، اس کے خاص دوست سر جارج اور سلطانہ کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتا دوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہان بولا۔ ''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، حکم جی اس اسٹیٹ کے ایک بڑے علاقے زرگاں کا مالک و مختار ہے۔ حکم جی اور چھوٹے سرکار دونوں بھائی ہیں لیکن دونوں کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ حکم جی شروع سے رنگین طبیعت کا مالک ہے۔ اس کی محل سرا میں جسے عرفِ عام میں دیوان کہا جاتا ہے، دنیا کی بیشتر خرافات موجود ہیں۔ حکم جی کی پانچ باقاعدہ پتنیاں ہیں جن میں رتنا بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی لونڈیاں، رکھیلیں وغیرہ بھی حکم جی اور ان کے دوستوں کی تفریحِ طبع کے لیے دیوان میں موجود رہتی ہیں۔ جارج جس کو یہاں سر جارج بھی کہا جاتا ہے، حکم جی کا سب سے قریبی دوست ہے۔ دونوں کی مشترکہ دلچسپیوں میں شراب، شکار اور شباب سرِفہرست ہیں۔ جارج درحقیقت آج سے دس بارہ سال پہلے انڈیا آیا تھا اور کوگر شیروں پر ریسرچ کرنے کے لیے ہی ان دشوار گزار جنگلات میں داخل ہوا تھا۔ اس نے یہاں بہت سی دستاویزی فلمیں بنائیں اور ڈیٹا وغیرہ اکٹھا کیا۔ پھر اس کا من ان جنگلوں میں ایسا لگا کہ وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ان دنوں حکم جی اور چھوٹے سرکار کے پتاجی رائے پرتاب بہادر بھی زندہ تھے۔ وہ بھی کوگر نسل کے شیروں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے کوگرز پال رکھے تھے۔ انہی کوگرز کی وجہ سے ہی کچھ عرصے بعد ان کی موت بھی ہوئی۔ بہرحال، رائے پرتاب بہادر کے جیون میں ہی حکم جی اور جارج میں گہری دوستی ہو چکی تھی۔ دونوں کی طبیعت ملتی تھی اور دونوں کے لیے اس دور دراز اسٹیٹ میں ہر طرح کا ''شکار'' بھی موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد جارج کا دل کہیں اور نہیں لگ سکا۔ وہ ایک دو بار چند مہینوں کے لیے انگلینڈ گیا بھی لیکن پھر واپس آ گیا۔ اب وہ یہیں پر ہے۔ اس کے دو تین انگریز دوست بھی یہیں بکے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک برمنگھم کا سرجن ہے... اب میں تمہیں سلطانہ کے بارے میں کچھ بتا دوں؟''

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

پتا نہیں کیوں مجھے کسی وقت لگنے لگتا تھا کہ میں نے اس کہانی کے کچھ حصے کہیں سنے ہوئے ہیں۔ کہاں سنے ہیں؟ کس نے سنائے ہیں؟ واقعات کے یہ ٹکڑے کچھ شناسا سے کیوں لگتے ہیں؟ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس کے گرد ایک ناقابلِ عبور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

چوہان نے حسبِ عادت اپنے گھونگریالے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ زرگاں میں اس کے والد مختار احمد کی تھوڑی سی زمین ہے۔ اس زمین سے ان کی گزر بسر ہوتی ہے۔ سلطانہ کا صرف ایک بھائی ہے۔ وہ کمر میں چوٹ لگنے سے معذور ہو گیا ہے اور کئی سال سے بستر پر ہی ہے۔ سلطانہ کی والدہ بڑی دلیر عورت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تلوار چلانا جانتی تھی اور باقاعدہ مردوں سے مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس کی موت بھی ایک بہادر راجپوت کی طرح ہوئی۔ یہ کوئی پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سلطانہ... بمشکل آٹھ نو سال کی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ جنگل میں لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھی۔ اچانک ماں بیٹی کو درختوں میں ہلچل محسوس ہوئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو دل ہلا دینے والا منظر نظر آیا۔ حکم جی جو اس وقت نوجوان تھا، زمین پر گرا ہوا تھا اور تین بھیڑیے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ حکم جی کا خاص محافظ ایک طرف پڑا تھا۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ سلطانہ کی والدہ اپنی بچی کو لے کر وہاں سے بھاگ جاتی یا شور مچا کر کسی کو مدد کے لیے بلانے کی کوشش کرتی، وہ ایک موٹی لکڑی کے ساتھ خود بھیڑیوں پر حملہ آور ہو گئی۔ اس نے انہیں زوردار چوٹیں لگائیں۔ پھر اس کی نظر محافظ کی رائفل پر پڑ گئی۔ اس نے رائفل کھینچی اور یکے بعد دیگرے کئی فائر کر کے تینوں بھیڑیوں کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ تاہم اس شدید کشمکش میں وہ خود بھی زخمی ہو گئی اور قریباً ایک ماہ بعد ان زخموں کی وجہ سے ہی چل بسی۔ سلطانہ کی والدہ نے بھانڈیل اسٹیٹ کے ولی عہد کا جیون بچایا تھا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا... سورگ باشی رائے پرتاب بہادر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے صلے میں سلطانہ کے والد مختار احمد کو کچھ زمین دینا چاہی جس میں ایک بڑا باغ بھی تھا مگر وہ بھی بہت خوددار تھے۔ انہوں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت رائے پرتاب بہادر نے انہیں اپنی خاص مہر دی تھی اور کہا تھا کہ یہ مہر دکھا کر وہ جب چاہے ان سے یا ان کی اولاد سے کچھ مانگ سکتے ہیں۔ اب پتا نہیں اس میں کتنی حقیقت ہے لیکن بات ایسے ہی بیان کی جاتی ہے۔''

چوہان نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ ''اب میں دوبارہ سر جارج کی طرف آتا ہوں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، جارج مقامی عورتوں کا رسیا ہے۔ چونکہ وہ حکم جی کا گہرا دوست ہے اس لیے حکم جی کسی نہ کسی طریقے سے اس کے لیے تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرتا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق، سر جارج کچھ عرصے سے سلطانہ کے چکر میں ہے۔ سلطانہ کوئی ایسی خوب صورت لڑکی نہیں ہے لیکن تمہیں پتا ہی ہوگا، جارج کی فطرت کے لوگ اس شے کو حاصل کر کے زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں جسے حاصل کرنا زیادہ مشکل ہو۔ ممکن ہے کہ ماضیٔ قریب میں کسی وقت جارج نے سلطانہ کی طرف پیش قدمی کی ہو مگر اسے ناکامی ہوئی ہو اور اس کے بعد اس نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہو۔ بہرحال، اس طرح کی کوئی بھی صورت ہو سکتی ہے۔ حالانکہ سلطانہ کا بیاہ ہو چکا ہے مگر جارج پھر بھی اس کے پیچھے ہے کیونکہ حکم جی پر جارج کا ہولڈ ہے، اس لیے میرے اندازے کے مطابق سلطانہ کے لیے کوئی نہ کوئی مشکل کھڑی ہوتی رہتی ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جارج کے اثر کی وجہ سے حکم جی اور پنڈت مہاراج، سلطانہ کی شادی کو شادی ہی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ صرف نام کی شادی ہے۔ وہ تم کو ایک سنکی شخص سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سلطانہ نے تمہیں صرف دکھاوے کا پتی بنایا ہوا ہے۔ اصل میں اس کے بچے کا باپ کوئی اور ہے وغیرہ وغیرہ۔''

''کیا... تم بھی... یہی کہہ رہے ہو کہ... میں سلطانہ کا شوہر ہوں؟'' میری آواز خوف آمیز حیرت کی شدت سے لرز

رہی تھی۔

''کم از کم اس میں تو کوئی شک نہیں ہے مہروز... مم... میرا مطلب ہے تابش! میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں ایک شوہر کی حیثیت سے سلطانہ کے گھر میں رہتے دیکھا ہے۔''

''لیکن تم تو کہتے ہو کہ تم سلطانہ کی شادی سے پہلے ہی یہاں تل پانی میں آ گئے تھے؟''

''میں کچھ دن کے لیے عارضی طور پر وہاں گیا تھا۔ حکم جی کی ایک پتنی بیمار تھی۔ وہ اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرح سے یہ بھی حکم جی کی منافقت ہی کہلائے گی۔ وہ عام لوگوں کو تو جڑی بوٹیوں اور جھاڑ پھونک سے علاج کی تلقین کرتا ہے مگر جب اپنے گھر کا کوئی فرد بیمار ہوتا ہے تو پھر اسے انگریزی طریقہ علاج کی ضرورت پڑتی ہے۔ بہر طور یہ حکم جی کی مجبوری تھی جس کی وجہ سے میں دوبارہ زرگاں جا سکا۔ یہ گروپ فوٹو جو ابھی چاچے غنی نے تمہیں دکھائی ہے، یہ میری موجودگی میں ہی اتری تھی۔ ٹھاکر برادری کے ایک لڑکے کی شادی تھی۔ میں اور میری منہ بولی بہن بھی اس تصویر میں موجود ہیں۔ یہ دیکھو... یہ اس طرف دُلہے کے پیچھے ہم دونوں کھڑے ہیں۔''

چوہان نے ایک بار پھر مجھے تصویر دکھائی۔ وہ واقعی تصویر میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے گلے میں پھولوں کا ہار تھا۔ چوہان نے کہا۔ ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے تابش! ورنہ میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ ایک بیوی کی حیثیت سے سلطانہ نے تمہاری خاطر کیا کیا مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی ایک باہمت لڑکی ہے تابش! تمہاری شریکِ حیات بننے کے بعد اس نے واقعی شریکِ حیات بن کر دکھایا ہے لیکن اب اس کی مصیبتوں میں ایک دم اضافہ ہو گیا ہے اور یہ اضافہ... میری بات کا بُرا نہ ماننا... یہ اضافہ تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اہل کاروں کے سامنے تم نے جو کچھ اپنے اور سلطانہ کے بارے میں کہا ہے، وہ اس بے چاری کو سخت آفت میں ڈال دے گا۔ میری طرح وہ بھی یہاں چھوٹے سرکار کی پناہ میں آنے کے لیے آئی تھی مگر مجھے نہیں لگتا کہ اب اسے یہ پناہ مل سکے گی۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ...''

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ ایک دو دن میں ہی ہو جائے۔ حکم جی کے لوگ تمہیں اور سلطانہ کو یہاں سے گھسیٹ کر واپس لے جائیں گے۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ سلطانہ کے ساتھ ہو سکتا ہے، اس کا تصور کرنا بھی سخت تکلیف دہ ہے۔ تمہیں کچھ کرنا پڑے گا مہروز... میرا مطلب ہے تابش! ورنہ تمہاری بیوی، تمہارا بچہ بلکہ پورا گھر سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔''

میرا دم پھر گھٹنے لگا۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ''تم اگر میرے دوست ہو تو پھر سمجھ لو کہ مجھے ان لوگوں سے کچھ بھی لینا دینا نہیں۔ میں صرف یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے لوگوں میں جانا چاہتا ہوں۔''

چوہان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ''کیا تم اس لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ دو گے جو تمہاری خاطر زخم پر زخم کھاتی رہی ہے اور جو اب صرف تمہارے کارن ایک بڑی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے؟''

''میں نے کسی کو مصیبت میں نہیں پھنسایا۔ میں خود مصیبت میں ہوں۔ مجھے یہاں سے جانا ہے۔''

''تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے تابش! تمہیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ تمہارے لیے جانا ممکن ہی نہیں ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر میں بتاؤں گا بھی تو تم وشواس نہیں کرو گے۔ یہ جگہ تمہارے لیے ایک... جزیرے کی طرح ہے۔ تم اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ کیا ہم کسی جزیرے میں ہیں؟''

''نہیں، میں صرف ایک مثال دے رہا ہوں۔ میں نے کہا ہے نا کہ تمہیں میری بہت سی باتوں پر وشواس نہیں ہو گا۔ جہاں تک میری جانکاری ہے، تم اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کر چکے ہو لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔''

''میں کوشش کر چکا ہوں؟''

''ہاں، تم... ایک مرتبہ کا تو میں گواہ بھی ہوں۔ جب تمہیں تیواری لال اور ڈیوڈ وغیرہ پکڑ کر لائے تھے۔ تمہیں گھوڑے کے پیچھے باندھا گیا تھا...''

تیواری لال؟ ڈیوڈ؟ وہ پتا نہیں کن لوگوں کے نام لے رہا تھا اور کن واقعات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کی ایسی باتوں سے میری کنپٹیاں پھٹنے لگتی تھیں... اچانک جنگل کی طرف سے آنے والی ایک ہولناک آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ عمران ایک انوکھا کردار تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر لاہور کے گلی کوچوں میں موت کو تلاش کرتا پھرتا تھا۔ اس کی بے خوفی انتہا کو چھوتی تھی۔ اس نے پتا چلایا کہ ثروت کو اغوا کرنے والے واجی کا باپ سیٹھ سراج نوادرات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ بڑی بے باک لڑکی تھی۔ نت نئے مردوں سے جسمانی تعلقات رکھنا اس کا شوق تھا۔ وہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران سرکس کا ایک مقبول فن کار بھی تھا۔ وہ سرکس میں اپنے شوق کی خاطر کچھ نہایت خطرناک کھیل بھی کھیلتا تھا۔ اس نے یہ جان لیوا کھیل مجھے بھی دکھائے۔ وہ میرے اندر بھی زندگی کی امنگ ترنگ اور جوش پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔ ہر خطرناک کام میں وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ رہا تھا۔ میں خود بھی گھر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی دوران میں عمران اور اس کے دوست اقبال نے ایک مجید منٹو نامی غنڈے کا سراغ لگایا۔ مجید منٹو کو پکڑنے کے بعد عمران نے اس سے سوال جواب کیے تو پتا چلا کہ وہ بھی میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ ایک ایڈووکیٹ ابرار صدیقی سے بھی اس کا دوستانہ تھا۔ ابرار صدیقی کے پاس مہاتما بدھ کا کوئی نادر مجسمہ تھا جسے میڈم صفورا ہر صورت خریدنا چاہتی تھی مگر صدیقی بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ اور نامعلوم لوگ بھی اس مجسمے کے پیچھے تھے۔ ان سے بچانے کے لیے صدیقی نے اس مجسمے کو لاہور سے لاکر جہلم میں کہیں چھپا دیا تھا۔ مجید منٹو سے اس پوچھ گچھ کے دوران میں مجید منٹو کی گاڑی کو آگ لگ گئی اور وہ ہلاک ہو گیا... شک کی بنا پر میڈم صفورا نے عمران کو اغوا کرا لیا۔ میں اور اقبال بھی میڈم کی دسترس میں چلے گئے۔ وہاں عمران نے اپنی خوش بیانی سے صفورا کو قائل کر لیا کہ وہ اس کا مطلوبہ مجسمہ ابرار صدیقی کی تحویل سے نکال لائے گا۔ اس نے واقعی یہ کام اپنی خوش اسلوبی سے کیا کہ میڈم اش اش کر اٹھی۔ تاہم میڈم کی چھوٹی بہن نادیہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔ عمران کی توجہ اپنی گرل فرینڈ شاہین کی طرف تھی جس کی وجہ سے رقابت پروان چڑھ رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سرد مہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا مگر ظاہر یہ کیا کہ وہ دوسری منزل سے گرا ہے۔ سلیم کی دردناک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل کے دوران میں حیران کن طریقے سے لیا۔ اس نے نادیہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ ہزاروں تماشائیوں میں سے کسی کو شک تک نہیں ہو سکا۔ نادیہ شدید زخمی ہو گئی۔ میری بے وقوفی، کم ہمتی کی وجہ سے نادیہ کے زخمی ہونے کا پول کھل گیا۔ شدید بخار کی بے ہوشی میں، میں نے دو جرائم پیشہ افراد کے سامنے یہ انکشاف کر دیا کہ نادیہ کو گولی مارنے والا میرا دوست محسن عمران ہے۔ میں ان جرائم پیشہ افراد کی حبسِ بے جا میں تھا۔ میں نے کسی طرح ایک فون کال کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے جواب میں میرا جگری یار عمران آندھی طوفان کی طرح آیا اور مجھے ان افراد کی گرفت سے چھڑا کر لے گیا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ میری وجہ سے میڈم صفورا کو علم ہو چکا ہے کہ اس کی لاڈلی بہن کو موت کے کنارے پہنچانے والے تم ہو۔ میں نے عمران کو پہلی بار تھوڑا پریشان دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میڈم صفورا بہن کا انتقام لینے کے لیے شعلہ جوالا بن جائے گی۔ اور یہی ہوا۔ میڈم کے ہرکاروں سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ نے میرا اور عمران کا پیچھا کیا۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میڈم صفورا اب میری ماں، بہن اور بھائی کے لیے خطرہ بنے گی۔ میں انہیں بچانے کے لیے ذوالنفس کی ایک کوٹھی میں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا کے لوگ دندناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو تو موقع سے بھگا دیا، خود والدہ کے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسدِ خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ میرے دماغ میں عجیب دھند بھری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک طویل عرصے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم ایک کھوہ میں چلے گئے... سلطانہ کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صحیح الدماغ نہیں۔ سلطانہ کا تعاقب کرتا ہوا ایک ہارون نامی شخص کھوہ میں پہنچا اور سلطانہ کی کلہاڑی سے زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ میں نے سلطانہ کے ساتھ مل کر اس شخص کو باندھ دیا۔ ہم اس کھوہ سے نکل گئے۔ راستے میں باشو نام کا ایک گونگا شخص بھی ایک شیر خوار بچے سمیت ہم سے مل گیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اترپردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ حیرت کی شدت سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ سلطانہ مجھے ایک مسلمان بزرگ عبدالغنی صاحب کے پاس لے آئی۔ ہم ان کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اس جگہ کو بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی تل پانی میں آئی ہے۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کار مختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ لیکن یہاں مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں نے چھوٹے سرکار کے اہل کاروں کے سامنے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کر دیا... سلطانہ کو پناہ ملنے کا امکان معدوم ہو گیا۔ چھوٹے سرکار کے اہل کار اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبدالغنی کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سر کی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں پچھلے دو برس کی باتیں بالکل بھلا ہوا ہوں۔ ان دو برسوں میں، میں یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں رہا ہوں۔ مجھے ایک قیدی کی حیثیت سے یہاں لایا گیا تھا کیونکہ میں بدھا کے ایک خاص مجسمے کی چوری اور نقل و حرکت میں ملوث تھا۔ چوہان نے یہ بھی بتایا کہ یہ مسلمان لڑکی سلطانہ بیوی کی حیثیت سے میرے لیے بہت قربانیاں دیتی رہی ہے۔ ابھی میں اور چوہان باتیں کر ہی رہے تھے کہ جنگل کی طرف سے کسی جانور کی آواز آئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ چلاتی ہوئی آواز چار پانچ سو میٹر کی دوری سے آئی ہوگی۔ یقیناً یہ کوئی جنگلی جانور تھا۔ آواز ایک بار پھر سنائی دی، اس کے ساتھ ہی رائفل کے دو تین فائر ہوئے۔ لوگوں کے واویلا کرنے کی دور افتادہ آوازیں بھی کانوں میں پڑیں۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے چوہان سے پوچھا۔

"یہ ہاتھی ہے۔ میرے خیال میں یہ کنور بابو کا پالتو ہاتھی ہے۔ کنور بابو چھوٹے سرکار جی کا چھوٹا بھائی ہے۔"

یقیناً یہ ہاتھی ہی تھا۔ ایک بار پھر اس کی زوردار چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ اب غالباً بستی کی طرف آ رہا تھا۔

چوہان مجھے وہیں چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ شاید یہ پالتو ہاتھی آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ راہ گیروں میں کھلبلی نظر آ رہی تھی۔ وہ آواز کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ دیہاتی کونے کھدروں میں کھڑے ڈری ہوئی نظروں سے ہلچل کے مرکز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب تین چار سبز وردیوں والے گھڑ سوار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے آواز کی سمت چلے گئے۔ ان میں سفید کپڑوں والا ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا بھی تھا۔ اپنے گھوڑے اور لباس کے اعتبار سے وہ ان میں ممتاز دکھائی دیتا تھا۔ اس کے کندھے سے ایک سنہری ہولسٹر جھول رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی کنور بابو ہے۔

دو تین منٹ بعد میں نے کھڑکی میں سے ایک اور چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ پانچ چھ افراد نے ایک چارپائی اٹھا رکھی تھی اور ایک طرف بھاگے جا رہے تھے۔ چارپائی پر سانولی رنگت والا ایک غریب صورت نوجوان تھا۔ وہ دھوتی اور بنیان میں تھا۔ اس کی دھوتی خون سے سرخ نظر آ رہی تھی۔ باقی جسم سے بھی خون رس رہا تھا۔ دو تین مشعل بردار بھی چارپائی کے ساتھ ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد سکون ہو گیا۔ ہاتھی کی آواز کافی فاصلے سے سنائی دینے لگی۔ اسی دوران میں چوہان بھی واپس آ گیا۔ اس نے بس اتنا بتایا کہ کنور بابو کا پالتو ہاتھی "بادل" اپنے مہاوت کی غلطی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کی وجہ سے ایک بندہ زخمی ہو گیا ہے۔ بہرحال، اب "بادل" کو پکڑ لیا گیا ہے۔ جو فائر کیے گئے وہ صرف ہاتھی کو ڈرانے کے لیے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہماری گفتگو پھر وہیں سے شروع ہو گئی جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ چوہان نے مجھے بتایا کہ اس کی معلومات اور عینی مشاہدے کے مطابق میں متعدد بار یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ اس کی ایسی باتوں سے میرا دماغ سنسنا اٹھتا... دل کی دھڑکن بڑھ جاتی... اور میرے اردگرد پھیلی دھند گہری ہوتی چلی جاتی۔ اس کے ساتھ ہی کہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ آواز ابھرتی کہ شاید یہ ڈاکٹر چوہان ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ماضی میں کہیں... کچھ ایسا ہو چکا ہے۔

چوہان میرے تاثرات بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "تل پانی کے چھوٹے سرکار اجیت رائے حالانکہ حکم جی کے سگے بھائی ہیں لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے، دونوں بھائیوں کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ چھوٹے سرکار عیش و عشرت کے اس طرح دلدادہ نہیں جس طرح حکم جی ہیں۔ چھوٹے سرکار انصاف پسند بھی ہیں، خاص طور سے مسلمانوں کے لیے وہ اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے اور ان کے ساتھ اپنی عملداری میں کوئی ناانصافی نہیں ہونے دیتے... بلکہ کئی لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ہندو ہونے کے باوجود ہندووانہ رسم و رواج کو خرافات سمجھتے ہیں اور دھرم کے کٹر پن کو برداشت نہیں کرتے۔

"کبھی کبھی کچھ لوگ حکم جی کی عملداری میں ناانصافی کا شکار ہوتے ہیں تو وہ چھوٹے سرکار کی عملداری کا رخ کرتے ہیں اور تل پانی آ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چھوٹے سرکار بڑی دلیری اور فراخ دلی سے پناہ دیتے ہیں لیکن شرط یہی ہوتی ہے کہ پناہ لینے والا اپرادھی نہ ہو اور اس نے کوئی بڑا جرم نہ کیا ہو۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں خود بھی شروع میں زرگاں ہی آیا تھا مگر پھر یہاں تل پانی آ گیا۔ اسی طرح یہ لڑکی سلطانہ بھی اپنے بچے کو اور تمہیں لے کر یہاں پناہ لینے آئی ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ وہ جارج اور حکم جی کی دستبرد سے بچنا چاہ رہی ہے۔ اسے یہاں بہ آسانی پناہ مل جاتی تھی مگر..." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "اب بے چاری سلطانہ کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ حکم جی کی طرف سے تو اس پر پہلے ہی الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ آوارہ ہے اور اس کی گود میں جو بچہ ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہے۔ اب جبکہ تم نے اہل کاروں کے سامنے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ تمہاری بیوی نہیں ہے تو اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ جو لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں وہ یہاں تل پانی پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ عین ممکن ہے کہ چھوٹے سرکار اسے اور تمہیں گونگے باشو سمیت فوراً ہی حکم جی کے اہل کاروں کے حوالے کر دیں۔"

چوہان جو کچھ بھی بتا رہا تھا، وہ سب کافی حیرت ناک تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس سے پہلے بھی یہاں سے بھاگنے

کی کوشش کر چکا ہوں اور ناکام رہا ہوں۔ تو کیا یہ سارا علاقہ کسی سخت حفاظتی حصار میں تھا جہاں سے میں نکل نہیں پایا تھا؟ اتنے وسیع و عریض علاقے کو کسی سخت حصار میں رکھا جانا کیسے ممکن تھا؟ کیا وہ مجھے صرف ڈرانے کے لیے ایسی باتیں کر رہا تھا تاکہ میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کروں؟

وہ کہہ رہا تھا کہ سلطانہ نامی یہ لڑکی میری محسنہ کی حیثیت رکھتی ہے اور میری خاطر بہت تکلیفیں سہہ چکی ہے۔ ممکن تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ سلطانہ کے رویے کی کچھ جھلکیاں تو میں پچھلے دو تین روز میں دیکھ چکا تھا... لیکن جو کچھ بھی تھا ماضی کا وہ حصہ جس میں، بقول چوہان یہ لڑکی میری محسنہ کی حیثیت رکھتی تھی، میرے حافظے میں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وقت کے اس گمشدہ ٹکڑے میں جو کچھ ہوا تھا... میں کسی بھی طرح اس کا ذمے دار نہیں تھا۔ اپنے جسم کے مندمل زخم دیکھنے کے بعد میں اس حیرت ناک نتیجے پر تو بہرحال پہنچ گیا تھا کہ میرے ساتھ کچھ انوکھا ہو چکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں چوہان کی باتوں کو مکمل طور پر رد نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن کچھ بھی تھا، سلطانہ کے ساتھ میری شناسائی صرف دو دن پرانی تھی۔ میں اس کے ساتھ کسی طرح کی وابستگی محسوس نہیں کر سکتا تھا... اور یہی سبب تھا کہ اس کی مصیبت سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے ذہن میں تو صرف ثروت کا نام گونج رہا تھا اور دل میں اس کے غم کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ میں جلد سے جلد اپنوں تک پہنچنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میرے زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی بچا ہے یا نہیں...

وہ رات بڑی مشکل سے کٹی تھی۔ میں رات آخری پہر تک جاگتا رہا۔ غنودگی کی سی کیفیت تھی۔ ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ یہ بات اب میری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی کہ لاہور ڈیفنس کی کوٹھی میں سیڑھیوں سے گر کر میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا تھا۔ اب میں اپنے ہوش حواس میں واپس آیا ہوں۔ لیکن اس دوران میں ناقابلِ یقین طور پر ڈیڑھ دو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے... اور اب وہ عرصہ میری یادداشت میں موجود نہیں ہے۔

آخری پہر مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ نیلی جھیل کے کنارے اس وسیع و عریض بستی میں زندگی رواں دواں تھی۔ جھیل میں کشتیاں ڈول رہی تھیں... ایک بڑا بجرا جو یقیناً بستی کے کسی متمول شخص کا رہا ہوگا، بادبانوں کی مدد سے ہولے ہولے جنگل کی سمت بہہ رہا تھا۔ اس میں دو تین پالکیاں دھری تھیں جن میں یقیناً پردہ پوش خواتین تھیں۔ کہیں کہیں جھیل کے کنارے سبز وردیوں والے گھڑ سوار بھی گھوڑے دوڑاتے دکھائی دیتے تھے۔ دور فاصلے پر ایک عظیم الشان حویلی کے کلس اور گنبد سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان سے اوپر نیلگوں فلک پر پرندوں کی اڑانیں تھیں۔ بقول چوہان اس عمارت کو دیوان کہا جاتا تھا۔

یہ میں کس داستانی بستی میں آ گیا تھا۔ اسی دوران میں غنی صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کے بیوی بچے تاحال لوٹے نہیں تھے۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر بے دلی سے ناشتا کیا۔ وہ افسردہ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سلطانہ واپس نہیں آ سکی۔ اس کا بچہ اور ہاشو بھی وہیں ہیں۔ میرے سر سے مسلسل ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پٹی بدلے جانے کی ضرورت تھی لیکن فی الوقت ڈاکٹر چوہان یہاں تھا اور نہ سلطانہ موجود تھی۔

ابھی بمشکل ہم فارغ ہوئے ہی تھے کہ وردیوں والے گھڑ سوار غنی صاحب کے دروازے پر نظر آئے۔ ان کی آمد متوقع تھی۔ غنی صاحب نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ ہم کو لینے آئے ہیں۔ شاید آج سلطانہ کا مقدمہ چھوٹے سرکار کے سامنے پیش ہوئیں گے۔''

غنی صاحب کا اندازہ بالکل درست تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک مقامی طرز کی گھوڑا گاڑی پر سوار چھوٹے سرکار کی عظیم الشان حویلی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ دو گھوڑوں والی گاڑی تھی اور اس کے دونوں پائدانوں پر دو مسلح باوردی اہل کار کھڑے تھے۔ چھوٹے سرکار کے اہل کار سلطانہ کے دونوں تھیلے نما جھولے کل ہی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ آج انہوں نے گونگے ہاشو کا مختصر سامان بھی گھوڑا گاڑی میں دھر لیا تھا۔

راستے میں مجھے حیران کن مناظر دیکھنے کو ملے۔ کاروبارِ زندگی جاری تھا۔ ہم ایک سبزی منڈی کے پاس سے گزرے پھر ایک زیرِ تعمیر مسجد میں بہت سے لوگوں کو مچانوں کے اوپر کام کرتے دیکھا۔ گھوڑا گاڑیوں کے علاوہ یہاں بیل گاڑیاں اور کہیں کہیں اونٹ گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ پختہ سڑک کہیں نہیں تھی، ہاں نیم پختہ راستے موجود تھے جن کے کنارے کثرت سے درخت لگائے گئے تھے۔ ایک جگہ درختوں تلے دو خستہ حال جیپیں کھڑی دکھائی دیں۔ یہ جیپیں شاید استعمال کے قابل نہیں تھیں۔ مقامی لوگوں کا لباس زیادہ تر پاجامے اور لنگی پر مشتمل تھا۔ کہیں کہیں انگرکھے بھی نظر آتے تھے۔ عورتوں میں سے کچھ نے گھاگرے چولیاں پہن رکھی تھیں۔ عورتوں کے جسم پر چاندی کے زیور عام دکھائی دیتے تھے، خاص طور سے چوڑیاں۔ ہندو مسلم دونوں طرح کے

لوگ یہاں نظر آ رہے تھے بلکہ مسلمان شاید کچھ زیادہ ہی تھے۔

جلد ہی ہم جھیل کے کنارے اس عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچ گئے جو دور سے تو شان دار نظر آتی ہی تھی، قریب سے اور بھی پُرشکوہ تھی۔ ایک دیوہیکل چمکیلے گیٹ کے اندر سے گزر کر ہم ایک طویل روش پر آ گئے۔ یہ دیوان کا بیرونی حصہ تھا۔ بڑی خوب صورت جگہ تھی۔ دونوں طرف سبز گراسی میدان نظر آتے تھے اور پھول پودے کثرت سے تھے۔ جگہ جگہ مستعد گھڑ سوار بالکل ساکت کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں پر کہنیوں تک سفید دستانے تھے اور ان کی نگاہیں اپنے سامنے غیر مرئی نکتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یہاں ہمیں چند شان دار گاڑیاں اور جیپیں بھی نظر آئیں جن میں ایک قیمتی رولز رائس بھی تھی۔

سفید ہاتھی کے بارے میں، میں نے اس سے پہلے فقط سنا تھا، یہاں دیکھا بھی۔ وہ بڑے اچھے طریقے سے سجا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ہودہ رکھا تھا اور چوکس مہاوت، ہاتھی کے اوپر ہی تھا۔ غالباً یہ کسی ایسے رئیس یا امیر کی سواری تھی جو یہاں چھوٹے سرکار سے ملنے آیا ہوا تھا۔

باوردی افراد نے مجھے اور غنی صاحب کو گاڑی سے اتارا اور ایک جگہ عام لوگوں کے درمیان بٹھا دیا۔ یہاں مجھے دو چار ایسے افراد بھی نظر آئے جن کی مشکیں خاص قسم کی رسیوں سے کسی ہوئی تھیں۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ لوگ مختلف مقدمات میں پیش ہونے کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد اس ہجوم میں سے چھ افراد کی ایک ٹولی کو اٹھنے کا حکم دیا گیا اور دیوان کے اندرونی حصے کی طرف لے جایا گیا۔ اس ٹولی میں میرے اور غنی صاحب کے علاوہ ایک جواں سال عورت بھی شامل تھی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کی گود میں اسی کی طرح کا ایک سانولا سلونا شیر خوار بچہ تھا۔ ہم مختلف راہداریوں سے گزر کر ایک شان دار ہال میں پہنچے۔ یہاں مخمل و زربفت کے طویل پردے تھے۔ فانوس، غالیچے، خوب صورت نقش و نگار والے جھروکے جن میں زرنگار کرسیوں پر اس راجواڑے کے معزز افراد قیمتی پوشاکیں پہنے براجمان تھے۔ ان میں ہندو اور مسلم دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔ یہ جگہ پرانے زمانے کے کسی دربار سے مشابہ نظر آتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ کہیں کہیں انگریزی لباس والے افراد بھی دکھائی دیتے تھے۔ اس مقام پر دکھائی دینے والا اہم ترین شخص وہ جواں سال شخص تھا جو ایک ڈیڑھ ڈھائی فٹ اونچے چبوترے پر موجود تھا۔ اس نے بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ گلے میں قیمتی مالائیں اور سر پر ایک زرنگار پگڑی تھی۔ وہ وکٹورین طرز کی شان دار کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے اردگرد دو درجنوں محافظ پتھروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ چبوترے سے نیچے چھوٹی کرسیوں پر اس عدالت کے اہل کار یعنی کاتب، محرر، وکیل وغیرہ موجود تھے۔

مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ زرنگار وکٹورین کرسی پر بیٹھا ہوا بارعب شخص کون ہے۔ یقیناً یہی ''چھوٹے سرکار'' تھا جو اس تل پانی نامی جگہ کا کرتا دھرتا و مختار کہلاتا تھا۔ غالباً کسی مقدمے کی سماعت اختتام پذیر ہوئی تھی۔ درمیانی عمر کے دو افراد جو اپنی صورتوں اور حلیے سے تاجر پیشہ نظر آتے تھے، جھک کر سلام کرتے ہوئے الٹے قدموں پیچھے ہٹتے گئے اور پھر ایک بغلی دروازے سے باہر نکل گئے۔ ایک اٹھائیس تیس سالہ شخص جس کا آدھا سر، آدھی داڑھی، آدھی مونچھ اور ایک بھوں مونڈ دی گئی تھی، رو گڑگڑا رہا تھا۔ وہ چھوٹے سرکار سے اپنی سزا میں کمی کی درخواست کر رہا تھا۔ باوردی افراد نے اسے دبوچ لیا اور دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔

اس کے بعد چھوٹے سرکار کی عدالت میں جو معاملہ پیش ہوا، وہ اسی روتی دھوتی عورت کا تھا جو ہمارے ساتھ اندر آئی تھی۔ اہل کاروں نے اسے چھوٹے سرکار کے عین سامنے چبوترے کے پاس کھڑا کر دیا۔ وہ اپنی فریاد پیش کرنے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور گڑگڑا رہی تھی۔ ''چھوٹے سرکار! ہمرے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے جی۔ ہم کیا کریں۔ ہمرے بچے بھوکے مر جاویں گے جی، وہی تو کمانے والا تھا۔ وہ مہینوں کے لیے بستر پر پڑ گیا ہے۔ پتا ناہیں کہ اٹھتا بھی ہے یا ناہیں۔ ہمری کھیتی اجڑ جاوے گی۔ جو کچھ بویا ہے وہ بھی برباد ہو جاوے گا...''

''حوصلہ رکھو۔ تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔'' چھوٹے سرکار کی بارعب آواز ہال میں گونجی۔ پھر وہ سرگوشیوں میں اپنے اردگرد کھڑے افراد سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے بلند آواز سے اپنے اہل کاروں کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''کنور بابو کو یہاں لایا جاوے۔''

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی ہاتھی والا معاملہ ہے جس کی کچھ جھلکیاں میں نے کل کمرے کے اندر سے دیکھی تھیں۔ یہ فریاد کناں عورت اس کھیت مزدور کی بیوی تھی جو بپھرے ہوئے ہاتھی کی زد میں آ کر زخمی ہوا تھا۔ وہ ہاتھی چھوٹے سرکار اجیت رائے کے چھوٹے بھائی کنور بابو کا

پالتو تھا۔

چند سنٹ بعد ایک اور چونکا دینے والا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکے کو ہال کمرے میں لایا گیا۔ اس نے بھی بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ تاہم اس کے بال بکھرے بکھرے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کی ناک کا بانسہ بھی چھوٹے سرکار کی طرح کافی اونچا تھا۔ چہرے کے باقی خدوخال بھی گواہی دے رہے تھے کہ وہ چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی کنور بابو ہے۔ اس کی ایک کلائی میں ایک ریشمی رسّی بندھی ہوئی تھی۔ یہ کوئی بہت مضبوط بندش نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بس علامتی طور پر اسے یہ رسّی باندھی گئی ہے۔

چھوٹے سرکار نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''اس عورت کو پہچانو۔ یہ اس بندے کی گھر والی ہے جس کو تمہارے بادل نے روندا ہے۔ یہ ہم سے اور تم سے اپنے پتی کا قصور پوچھت ہے۔ کیا تم اسے بتا سکتے ہو کہ کھیت میں کام کرتا ہوا اس کا پتی جو پورے پریوار کی روٹی چلاوت تھا، کیوں مہینوں کے لیے بستر پر جا گرا ہے؟''

کنور کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

چھوٹے سرکار کی آواز دوبارہ گونجی۔ ''تم ناہیں بتا سکتے لیکن ہم بتاتے ہیں۔ اس کا پتی اس لیے زخمی اور اپاہج ہوا ہے کہ ایک صاحب بہادر اپنے بدمست جانور کو سنبھال نہیں سکے۔ انہوں نے اپنے لاڈلے ہاتھی کو ہوا خوری کے لیے باغ میں نکالا۔ پھر اس کی طرف سے غافل ہو کر اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کی بازی لگانے میں مصروف ہو گئے اور تو اور مہاوت کو بھی کسی کام سے بھیج دیا۔ اور... صاحب بہادر نے اس طرح کی حرکت پہلی دفعہ ناہیں کی ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کی وجہ سے اسی انداز میں عام لوگن کا نقصان ہو چکا ہے۔ صاحب بہادر کا یہ ہاتھی ایک چھوٹے بچے کی جان لے چکا ہے۔ ایک بوڑھی عورت کی ٹانگ توڑ چکا ہے۔ گلاب محلے کی کئی جھونپڑیاں بھی اس کے کارن مسمار ہوئی تھیں۔ ہوئی تھیں نا ناہیں؟'' چھوٹے سرکار کی بارعب آواز گونجی۔

کنور بدستور سر جھکائے کھڑا تھا۔ ایک فربہ اندام شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کنور بابو! آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہت ہیں؟''

''ناہیں۔'' کنور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ ہم مانتے ہیں۔''

''آپ بہت عقل مند ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنی سزا بھی خود ہی تجویز کر لیں۔'' چھوٹے سرکار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ جو سزا دیں گے، مجھے قبول ہے۔''

چھوٹے سرکار اور مصاحبین کے درمیان دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو ہوئی پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ ''گھائل ہونے والے کسان کی پتنی کو اپرادھی کی طرف سے دس ہزار روپیا اور بیلوں کی جوڑی دی جائے گی۔ گھائل کے علاج معالجے کا سارا خرچہ بھی اپرادھی ہی برداشت کرے گا۔ اس کے علاوہ اپرادھی کو تین مہینے جیل کے اندر قیدِ تنہائی میں کاٹنا ہوں گے۔ بالکل عام قیدی کی حیثیت سے۔''

کنور کا چہرہ اتر گیا۔ اس کا فربہ اندام وکیل بھی پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں معافی چاہت ہوں۔ ایک عام اپرادھی کے لیے تو شاید یہ سزا مناسب ہو مگر کنور بابو آسائش میں رہن سہن کے عادی ہیں۔ اس لیے ان کے لیے یہ سزا بہت کڑی ثابت ہووے گی۔ آپ جانت ہیں، وہ کافی دیر بعد میعادی بخار سے صحت یاب ہوئے ہیں۔ ان کے دوبارہ بیمار پڑنے کا خدشہ ہوگا۔''

چھوٹے سرکار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری یہ دلیل بالکل بے کار ہے۔ اپنے رہن سہن کی وجہ سے کنور کو یہ سزا زیادہ کڑی محسوس ہووے گی تو ہونی بھی چاہیے... کیونکہ اسی رہن سہن اور مرتبے کی وجہ سے کنور پر زیادہ ذمے داری بھی لاگو ہوتی تھی۔ ایک عام بندہ چوری کرتا ہے تو اس کے اپرادھ کی حیثیت اور ہے لیکن ایک پنڈت، پادری یا امام مسجد کے اپرادھ کی حیثیت اور ہے۔''

اس موقع پر کسان کی اشک بار بیوی دو قدم آگے آئی۔ اس کے مفلس چہرے پر اب قدرے اطمینان دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''ہم آپ کے چاکر ہیں۔ آپ کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں... ہمری ہر شے پر آپ کا ادھکار ہے۔ کنور بابو نے جان بوجھ کر تو کچھ نہیں کیا۔ جو ہوا وہی اللہ کو منظور تھا۔ میں آپ کے انصاپھ سے بہت کھس (خوش) ہوں جی۔ اس کے ساتھ ہی آپ سے بنتی کرتی ہوں کہ کنور بابو کی جیل والی سجا معاپھ کر دی جاوے۔ میں اور عبداللہ آپ کو دعائیں دیں گے جی۔''

عبداللہ اس عورت کے گھر والے کا نام تھا۔ عورت کی بات سن کر چھوٹے سرکار کے سرخی مائل چہرے پر ناگواری کا سایہ لہرا گیا۔ بہرحال، جب وہ بولا تو اس کی آواز نارمل ہی تھی۔ اس نے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم یہ سمجھت ہو کہ دس ہزار روپیا اور بیلوں کی جوڑی دینا کنور بہادر

کے لیے ایک بڑی سزا ہے تو تم غلطی پر ہو۔ اس سے پانچ دس گنا کا خسارہ بھی وہ آسانی سے برداشت کر سکت ہے۔ اس کی اصل سزا وہی ہے جسے تم معاف کرنے کا کہہ رہی ہو۔ یہ سزا اس کو ہر صورت جھیلنا پڑے گی۔''

عورت نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر اظہارِ خیال کی جرأت نہ کر سکی۔

بہرطور سائلہ عورت کا دل رکھنے کے لیے چھوٹے سرکار نے کنور کی سزا میں دو ہفتے کی تخفیف کر دی۔ کنور کو بادروی اہل کار باہر لے گئے۔ عورت بھی اپنے بچے سمیت باہر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے سلطانہ کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے عقب میں گونگا ہاشو تھا۔ دونوں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ جلد ہی سلطانہ کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں التجا کا رنگ ابھرا۔ وہ جیسے بہ زبانِ خاموشی مجھ سے التجا کر رہی تھی کہ میں اس کے حوالے سے اپنا بیان بدل لوں۔ سلطانہ کے ساتھ ہی تین افراد مزید اندر داخل ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ حکم جی کے لوگ تھے اور زرگاں سے سلطانہ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کی ٹھوڑی غیر معمولی طور پر چوڑی تھی اور وہ کافی غصے میں بھی نظر آتا تھا۔ جب اس کی نظر مجھ سے ملی تو اس نے مجھے گھورا اور بڑبڑانے والے انداز میں کچھ کہا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ باقی دونوں افراد کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے۔ لیکن میرے حافظے میں ان تینوں کے لیے کوئی شناخت موجود نہیں تھی۔

اہل کار میری طرف بڑھے اور انہوں نے مجھے بھی چھوٹے سرکار کے عین سامنے چبوترے کے پاس کھڑا کر دیا۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو موقع پر موجود لوگوں نے زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ چھوٹے سرکار کی گہری سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اس نے بڑے غور سے پہلے میری طرف اور پھر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اپنے سامنے تپائی پر رکھے ہوئے کچھ کاغذات کا مطالعہ کیا۔ یقیناً یہ کاغذات ہمارے اس مقدمے کے حوالے سے ہی تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے کاغذات سے سر اٹھایا اور چوڑی ٹھوڑی والے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''موہن کمار! تم اس معاملے کے بارے میں کیا کہنا چاہت ہو؟''

موہن کمار نے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں کوئی لمبی چوڑی بات کرنا ناہیں چاہت ہوں۔ یہ بالکل صاف سیدھا معاملہ ہے۔ سلطانہ نام کی یہ لڑکی اپرادھن ہے۔ اس نے آپ کے بڑے بھائی حکم جی کی پتنی اور آپ کی بھاوج رتنا دیوی کو گھائل کیا ہے۔ اس نے ان سے سخت بدتمیزی کی پھر جھگڑا کیا اور ہاتھ چلا کر ان کا جبڑا توڑ دیا۔ اب وہ کچھ بول سکت ہیں، نہ کھا پی سکت ہیں۔ شاید یہ ان کو جان سے ہی مار ڈالتی مگر رتنا دیوی کی سکھیوں نے اسے روک لیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد یہ غائب ہو گئی۔ دو دن تک پتا ناہیں کہاں اور کس کے پاس رہی۔ پھر اپنے اس چھوٹے پتی کو لے کر یہاں تل پانی آ گئی ہے۔ اور بات صرف اتنی ہی ناہیں ہے چھوٹے سرکار! وہاں زرگاں میں ہر کوئی جانت ہے کہ سلطانہ کا چال چلن ٹھیک ناہیں ہے۔ یہ مہروز کو اپنا پتی کہتی ہے لیکن سب جانت ہیں کہ مہروز ایک مخبوط الحواس بندہ ہے۔ سلطانہ کے لیے بس یہ نام کا پتی ہے۔ اس نے یارانے پالے ہوئے ہیں۔ اس کے بچے کا پتا بھی نہ جانے کون ہے اور اگر...''

''چھوٹے سرکار! یہ مجھ پر جھوٹے الجام لگا رہے ہیں جی۔'' سلطانہ دلیری سے بات کاٹ کر بولی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا۔ ''یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ جارج گورا صاحب مجھ پر گندی نجر ڈالتا ہے۔ اس کی نیت میرے بارے میں ٹھیک ناہیں ہے۔ شروع سے ٹھیک ناہیں ہے۔ اور حکم جی صاحب، گورا صاحب کی ہر بات مانتا ہے۔ پنڈت مہاراج بھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ان لوگاں نے ہماری جندگی حرام کی ہوئی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جی کہ میں کل گورا صاحب کی بات مان لوں تو کل اِج سب کچھ ٹھیک ہو جائیں گا۔ مجھ پر ہر الجام ختم ہو جائیں گا۔ ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گا۔''

چھوٹے سرکار نے سلطانہ کی آہ و بکا کا کچھ زیادہ اثر نہیں لیا۔ وہ دھیان سے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چوڑے جبڑے والے موہن کمار نامی شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''موہن کمار! ہم جانت ہیں کہ پندرہ سولہ برس پہلے اس لڑکی کی ماتا نے بڑی دلیری دکھاتے ہوئے، جنگل میں بڑے بھائی جی کی جیون رکھشا کی تھی۔ اس طرح سے اس پریوار کا ہمارے اوپر ایک احسان بھی ہے۔ ہمیں بہت نراشا ہو رہی ہے کہ اسی پریوار کی ایک لڑکی کے اوپر اتنے کٹھور الزامات لگ رہے ہیں۔''

موہن کمار بولا۔ ''چھوٹے سرکار! آپ بالکل ٹھیک کہوت ہیں لیکن یہ چھوری اپنی ماتا پر ناہیں گئی، اس کے بالکل الٹ گئی ہے۔ اس کو بہت برداشت کیا گیا، پر اب پانی سر سے گزر گیا ہے۔ یہ اسٹیٹ کی باغی بن چکی ہے۔ خود قانون توڑت ہے اور چاہت ہے کہ دوسرے بھی ایسا کریں۔ اس کو

جو ڈھیل دی جاتی رہی، اس کا اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ حکم جی کی پتنی رتنا دیوی سے بھی ورودھ کرنے لگی بلکہ ان سے یُدھ چھیڑ دیا۔"

چھوٹے سرکار اچانک میری طرف گھوما... اور بارعب آواز میں بولا ... "تمہارے بارے میں کہا جاوت ہے کہ تم سلطانہ کے پتی ہو؟ کیا تم یہ بات مانت ہو؟"

میرا سر چکرا گیا۔ ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے لال پیلی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ میں سیڑھیوں پر سے اڑتا ہوا سیاہی مائل فرش کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے آگے کچھ یاد نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرے ماتھے پر پسینا چمکنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس عدالت میں موجود ہر فرد میری طرف دیکھ رہا ہے۔ ان میں سلطانہ اور غنی صاحب بھی شامل تھے۔ غنی صاحب کی آنکھوں میں بھی وہی ڈری ڈری التجا تھی جو کچھ دیر پہلے سلطانہ کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی اور اس کے بچے کو اپنا بچہ مان لوں۔ میرا گلا خشک ہو گیا اور زبان کو تالا سا لگ گیا۔ میں نے بے بسی سے چھوٹے سرکار کے بارعب چہرے کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں مجھے پھر عمران یاد آ گیا۔ کاش وہ اس وقت یہاں موجود ہوتا۔ وہ میری طرف سے بولتا۔ اس کے پاس تو ہر سوال کا بے مثال جواب موجود رہتا تھا۔ اس کے پاس تو ہر دلیل کا توڑ ہوتا تھا۔ وہ سچ بول کر تو قائل کرتا ہی تھا، جھوٹ بول کر بھی لاجواب کر دیتا تھا۔

موہن کمار نے بلند آواز سے کہا۔ "یہ کچھ ناہیں بولے گا چھوٹے سرکار! یہ کچھ بولنے کے قابل ہوتا تو سلطانہ اس کو پتی ہی کیوں بناتی؟"

کچھ لوگ مسکرائے اور سرگوشیاں ابھریں۔ چھوٹے سرکار نے ایک کاغذ پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میڈم صفورا کون ہے؟ جسے بعدازاں یہاں اسٹیٹ میں کورلی کا نام دیا گیا؟"

"جناب! اس کا جواب میرے یہ ساتھی گرور اکیش اور حافظ خدا بخش صاحب زیادہ اچھے طریقے سے دے سکت ہیں۔" موہن نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

گیروا لباس والے گرور اکیش نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور مؤدب انداز میں بولا۔ "چھوٹے سرکار! یہ صفورا نام کی ناری بھی اسی اپرادھ میں ملوث تھی جس میں یہ مہروز تھا۔ اس کے علاوہ ان کا ایک تیسرا ساتھی ابرار احمد بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ تھوڑا بہت تو جانت ہی ہوں گے۔ یہ... مہاتما بدھ کی مقدس مورتی کی چوری کا معاملہ تھا۔ کچھ لوگن نے بڑی بے دردی سے مورتی کو پرانے پگوڈا کے تہ خانے سے اکھاڑا اور یہاں سے نکال کر جھانسی پہنچایا۔ جھانسی سے یہ مورتی الٰہ آباد پہنچی اور پھر وہاں سے حیرت انگیز طور پر پاکستان پہنچا دی گئی۔ اس مورتی کو واپس لانے کے لیے ہمارے لوگن کو جو جو کچھ کرنا پڑا، وہ ایک لمبی کتھا ہے۔ اس میں ہمارے کئی لوگن کا جیون گیا... ورودھیوں میں سے بھی کئی مارے گئے۔ بڑے گرو کے حکم کے مطابق کچھ اپرادھیوں کو بندی بنا کر یہاں اسٹیٹ میں لایا جانا ضروری تھا۔ سو ہمارے لوگن نے سرتوڑ کوشش کی اور پانچ چھ کو لے آئے۔ یہ صفورا، ابرار احمد اور مہروز بھی ان میں شامل ہیں۔"

"مگر اس لڑکی سلطانہ اور تمہارے اس اپرادھی مہروز کا ملاپ کیسے ہوا؟" چھوٹے سرکار کی طرف سے پوچھا گیا۔

"جناب! دستور کے مطابق مہروز کو بھی دوسرے قیدیوں کی طرح بڑے پگوڈا میں قید کی سزا کاٹنی تھی۔ یہ وہاں سزا کاٹ رہا تھا۔ اس لڑکی سلطانہ کے چوبارے سے پگوڈا کا صحن نظر آوت تھا۔ یہ وہاں سے مہروز کو پگوڈا کا کام کاج کرتے دیکھتی رہوت تھی۔ پھر ایک روز پگوڈا کے ایک حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ یہ مہروز اور دو تین اور بندے اس آگ میں پھنس گئے۔ سلطانہ نے مہروز کو آگ سے نکالا تھا اور بعد میں اس کی مرہم پٹی بھی کرتی رہی تھی۔ پھر ایک دن بالکل اچانک زرگاں کے لوگن کو پتا چلا کہ مختار کی بیٹی سلطانہ نے پگوڈا کے جا کر مہروز سے بیاہ کر لیا ہے اور خود کو اس کی پتنی کہہ رہی ہے۔ میں نے سرکار کو بتایا ہے نا کہ اس چھوری نے ہمیشہ وہ کام کیا ہے جس کی وجہ سے کھلبلی مچی ہے اور لوگن نے دانتوں میں انگلیاں دابی ہیں۔ دراصل یہ اپنی اس حیثیت کا فائدہ اٹھاتی رہی ہے جو سورگ باشی راجے پرتاپ بہادر جی نے اسے اور اس کے خاندان کو دی تھی۔ کچھ لوگن کو عزت راس ناہیں آتی، اس کو بھی ناہیں آئی ہے چھوٹے سرکار۔"

اس موقع پر سلطانہ نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا مگر چھوٹے سرکار نے انگلی اٹھا کر اسے فی الحال خاموش رہنے کا حکم دیا۔ وہ موہن کمار اور گرور اکیش سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر بولا ..... "لیکن ہماری بدھی میں یہ بات ناہیں آئی کہ پگوڈا کے اپرادھی کی شادی کو بڑے بھائی صاحب اور دوسرے لوگن نے مان کیسے لیا؟"

موہن کمار بولا۔ "چھوٹے سرکار! بھگوان ہزاروں ورش آپ کی رکھشا کرے۔ گرور اکیش نے آپ کو بتایا ہے نا

کہ اس چھوری نے ہمیشہ اس حیثیت کا فائدہ اٹھایا ہے جو آپ کے پُرکھوں نے اس پریوار کو دی تھی۔ اس بیاہ کے موقع پر بھی اس چھوری نے ایسا ہی کیا۔ یہ جانت تھی کہ اس کے پاس ایک ترپ کا پتا موجود ہے۔ اس نے وہ پتا پھینکا اور بازی اپنے نام کر لی۔"

"موہن کمار! کھل کر بات کرو۔" چھوٹے سرکار نے کہا۔

"چھوٹے سرکار! سب لوگ جانت ہیں کہ پندرہ سولہ سال پہلے ترائی کے جنگل میں سلطانہ کی ماتا نے حکم جی کا جیون بچایا تھا اور اس کے لیے اپنا بلیدان دے دیا تھا۔ ہمارے سورگ باشی مہاراج پرتاپ بہادر نے اس کے بدلے اس پریوار کو بہت کچھ دیا تھا پھر بھی شاید ان کے من میں تھا کہ ان کی طرف سے کوئی کسر نہ رہ جائے۔ ان جیسا دیالو کسی کے احسان کا بوجھ اپنے سر پر کاہے کو اور کیسے رکھ سکتا تھا۔ شاید آپ بھی جانت ہوں کہ اس سمے مہاراج نے سلطانہ کے پتا مختار کو اپنی خاص مہر دی تھی اور کہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑے تو یہ مہر دکھا کر جو چاہے لے لینا۔"

چھوٹے سرکار نے قدرے چونک کر کہا۔ "ہاں، یہ بات ہم نے بھی سنی ہے۔"

موہن کمار تاسف سے بولا۔ "اس چھوری سلطانہ نے مہاراج کی اس مہر کا استعمال کیا اور حکم جی سے اپنی اور مہروز کی جان بخشی کروانے میں کامیاب رہی۔ اس کے لیے حکم جی کو بہت کٹھنائی بھی اٹھانا پڑی۔ بدھ مت کے ماننے والے بہت سے لوگن حکم جی کے خلاف ہو گئے۔ وہ ہرگز ناہیں چاہت تھے کہ ان کے اپرادھی کو اس طرح معاف کر دیا جاوے اور ایک مسلم لڑکی ڈنکے کی چوٹ پر اس کو اپنا پتی بنا لے۔ ایسے لوگن کو رام کرنے کے لیے حکم جی کو بہت کوشش کرنا پڑی۔ بہرحال، انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے پتا کا دیا ہوا وچن نبھا دیا...."

اس موقع پر سلطانہ نے پھر بولنا چاہا مگر چھوٹے سرکار کی طرف سے اسے خاموش کر دیا گیا۔ میں ہکا بکا کھڑا تھا۔ میرے بارے میں جو تفصیلی بات چیت ہو رہی تھی، اس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ بس کسی کسی وقت ذہن میں جھما کا سا ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ کوئی ٹوٹا پھوٹا منظر یا بکھری ہوئی سی کوئی آواز یاد آ رہی ہے۔ صفورا کے نام نے بھی میرے دماغ میں کھلبلی مچائی تھی اور میرا یہ شک درست ثابت ہوا تھا کہ جس قیدی عورت کا نام کورلی لیا جا رہا ہے، وہ میڈم صفورا ہو سکتی ہے۔

چھوٹے سرکار نے موہن کمار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی بات جاری رکھو۔"

موہن کمار کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ بولا۔ "چھوٹے سرکار! میں پھر وہی بات کہوں گا۔ کچھ لوگن کو عزت راس ناہیں آتی۔ حکم جی اور ہم سب نے بہت کوشش کی کہ یہ لڑکی کسی طرح سنبھل جاوے۔ مگر یہ سنبھلنے کے بجائے اور بھی بگڑتی چلی گئی ہے۔ رتنا دیوی سے اس نے اپنا ورودھ اتنا بڑھا لیا ہے کہ ان کی ہوا پر بھی تلواریں چلاتی ہے۔ حکم جی کے سامنے اب اس کے سوا کوئی چارہ ناہیں کہ وہ اسے قانون کے مطابق سزا دیں۔ ہم آپ سے درخواست کرت ہیں کہ اسے ہمارے حوالے کیا جاوے اور اس کے نمائشی پتی کو بھی تاکہ ہم انہیں حکم جی کے سامنے پیش کر سکیں۔"

میں نے دیکھا کہ سلطانہ کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ تاہم وہ چھوٹے سرکار کے حکم کی وجہ سے چپ تھی۔

چھوٹے سرکار اور ان کے ایک مصاحب نے ایک بار پھر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھا۔ تب چھوٹے سرکار نے گہری سانس لیتے ہوئے سلطانہ کو مخاطب کیا۔ "کیا یہ بات درست ہے کہ تم اپنے گھر کے چوبارے سے پگوڈا کے صحن میں تاکا جھانکی کرتی رہتی تھیں... اور تم نے وہاں سزا کاٹتے ہوئے مہروز سے آنکھ لڑا رکھی تھی؟"

"یہ بالکل غلط ہے چھوٹے سرکار... ان لوگاں نے جو کچھ کہا ہے وہ سب جھوٹ کا پلندا ہے۔ اس میں کچھ بھی سچ ناہیں۔" وہ بے حد جوش سے بولی۔

چھوٹے سرکار نے اسے ٹوکا۔ "ہم جو کچھ تم سے پوچھ رہے ہیں بس اس کا جواب دو... کیا بیاہ سے پہلے مہروز سے تمہارا کوئی ناتا تھا؟"

"ناہیں سرکار! میں بالکل سچ کہتی ہوں۔ میں اس کو اپنے گھر کی چھت پر سے دیکھتی جرور تھی... اور میں کوئی اکیلی اِچ ناہیں دیکھتی تھی اور بھی اڑوس پڑوس کے لوگاں دیکھتے تھے۔ اس کی اور دوسرے دو قیدیوں کی حالت بہت پتلی تھی۔ ان کے پاؤں میں رسّی کی بیڑیاں رہتی تھیں۔ یہ سارا دن پگوڈا کے کام کرتے تھے۔ جھاڑ پونچھ کرتے تھے، فرش دھوتے تھے، نالیاں صاف کرتے تھے۔ بڑے بھکشوؤں کی مٹھی چاپی اور خدمت بھی ان کا اِچ کام تھا۔ ان کو بس دوپہر کے وخت کھانا ملتا تھا اور وہ بھی یہ مانگ کر لاتے تھے۔ شام سے جرا پہلے ان کو پگوڈا کی سیڑھیوں کے سامنے جہاں لوگاں کی کھڑانویں اور جوتیاں پڑی رہتی تھیں، اوندھا لٹایا جاتا اور بید مارے جاتے تھے۔ دونوں مردوں کو دس دس، عورت کو چھ۔ چھوٹے سرکار! دوسروں کی طرح مجھے بھی ان تین لوگاں

پر ترس آتا تھا۔ اس وخت مھوج مجھے اپنے ایک مسلمان بھائی کی طرح لگتا تھا۔ ایک ایسا بھائی جو اپنے وطن سے دور ایک سخت مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔''

''لیکن پھر ایک دن تم نے اچانک اس سے شادی کر لی اور اس شادی کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا؟'' چھوٹے سرکار نے سوال کیا۔

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''چھوٹے سرکار! مجھے آپ کے انصاف پر پورا اعتبار ہے... لیکن سرکار! ابھی تک آپ کے سامنے اس تصویر کا بس ایک اِچ رخ ہے اور یہ بالکل غلط رخ ہے۔ زرگاں میں جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے والد نے اچانک میری شادی مہروج سے کیوں کی؟ اس کے پیچھے کیا وجہ تھی؟ اس کے پیچھے بس ایک اِچ وجہ تھی چھوٹے سرکار... میرے گھر والے میری عجت بچانا چاہتے تھے...''

موہن کمار بھڑک کر بولا۔ ''یہ معاملے کو الجھانے کی کوشش کرت ہے چھوٹے سرکار...''

''دیکھو موہن کمار! تمہاری پوری بات سن گئی ہے۔ اب مجھے اس سے اپنے سوالوں کا جواب لینے دو۔'' چھوٹے سرکار نے موہن کمار کو ٹوکا۔ پھر اس نے اشک بار سلطانہ کو بات جاری رکھنے کا کہا۔

سلطانہ بولی۔ ''یہ بات کوئی ڈھکی چھپی ناہیں ہے جی... جارج گورا اس راجواڑے کی عورتوں پر گندی نجر ڈالتا ہے۔ اس نے تین چار برس پہلے مجھ پر بھی گندی نجر ڈالی اور اس کی یہ نجراب بھی جوں کی توں ہے۔ آپ جانتے ہیں، وہ ہندی بول لیتا ہے۔ ایک بار اس نے مجھ سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر میں اس کی پتنی بننے پر راجی ہو جاؤں تو وہ ہر طرح کے غلط کام ایک دم چھوڑ دے گا۔ میں جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس طرح کی بات اس نے اس سے پہلے بھی کئی عورتوں سے کہی ہوئے گی۔ اور وہ عورتیں میری طرح عام نہیں ہوئیں گی، بڑی بڑی خوب صورت ہوئیں گی۔ یہ عورت باج (عورت باز) بندے تو ایسے اِچ ہوتے ہیں...''

''یہ ہز میجسٹی کی شان میں گستاخی کر رہی ہے چھوٹے سرکار!'' حافظ خدا بخش نے بھڑک کر کہا۔ ''یہ ثبوت کے بغیر الزام لگاوت ہے۔''

چھوٹے سرکار نے سلطانہ کو تنبیہ کی۔ ''تم غلط لفظ استعمال ناہیں کرو... اور اپنے جواب کو صرف اس تک رکھو کہ تمہارا بیاہ اچانک مہروز سے کیوں ہوا؟''

سلطانہ نے اوڑھنی سے آنسو پونچھے اور بچے کو کندھے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''چھوٹے سرکار! میں نے گورا صاحب کو صاف انکار کر دیا تھا، پر اس نے کبھی بھی میرا پیچھا ناہیں چھوڑا۔ وہ حکم جی کو میرے خلاف بھڑکاتا رہا اور مجھے پانے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکم جی بھی اس کی باتوں میں آگئے... بلکہ... پوری طرح اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ ساتویں کا جشن آنے والا تھا۔ آپ جانتے اِچ ہیں، ساتویں کے جشن میں راج بھون کے اندر خاص انتجام کیے جاتے ہیں۔ پرانے رواج کے مطابخ سات رنگوں کے لیے سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ ان کو فیریوں یا پریوں کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ایک وخت تھا جی کہ جب کسی بھی لڑکی کے لیے پری بننا اور راج بھون میں جگہ حاصل کرنا بڑی عجت کی بات ہوتی تھی۔ اس کا جیون سنور جاتا تھا مگر اب وہ پہلے والی بات کہاں رہی ہے جی۔ سب جانتے ہیں کہ وہاں کیا ہونے لگا ہے۔ پھر بھی بے شمار لڑکیاں ہیں جو ''پری'' بن کر راج بھون میں جانے کے سپنے دیکھتی ہیں۔''

''تم اپنی بات کو صرف اپنے جواب کی حد تک رکھو۔'' چھوٹے سرکار نے اسے ٹوکا۔

''معافی چاہتی ہوں سرکار! میں ساتویں کے جشن کی بات کر رہی تھی۔ راج بھون کی کچھ عورتیں مجھے یہ خوش خبری سنانے آئیں کہ میرا نام اس سال چنی جانے والی سات لڑکیوں میں لیا جا رہا ہے۔ بہت آشا ہے کہ میں چن لی جاؤں گی۔ چھوٹے سرکار! میں جان گئی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں دکھ کے سمندر میں ڈوب گئی۔ مجھے پتا تھا کہ مجھے صرف اور صرف گورا صاحب کے لیے راج بھون میں لے جایا جا رہا ہے۔ میں وہاں صرف گورا صاحب کی رکھیل بن کر رہ جاؤں گی۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایسا ناہیں ہونے دیں گے۔ مجھے سات لڑکیوں میں چن لیا گیا۔ میرا رنگ ''لال'' تھا مگر جس رات حکم جی کے آدمیوں نے میرے ماتا پتا سے چناؤ کی رسمی اجاجت لینے کے لیے آنا تھا، دوپہر کے وخت میرے پتا نے مہروج سے میرا بیاہ کر دیا۔ یہ پہلے سے پتا جی کا منصوبہ ناہیں تھا، اس وخت کوئی بھی مسلمان لڑکا مل جاتا اور راجی ہو جاتا تو میرے پتا نے اس سے میرا نکاح پڑھوا دینا تھا۔ آپ جانتے اِچ ہیں کہ بیاہتا لڑکی راج بھون کی پری ناہیں بن سکتی۔ میں بھی پری بننے سے بچ گئی لیکن اس کے بدلے میں حکم جی کا غصہ جھیلنا کوئی آسان کام ناہیں تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ ہمارے ساتھ بہت مشکلیں ہوئیں گی۔ تب پتا جی نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مشکل وخت سے گجرنے کے لیے مہاراج پرتاپ بہادر جی کی دی ہوئی مہر سے کام لیں گے۔''

موہن کمار نے بے حد بے چینی سے اپنی چوڑی ٹھوڑی کو کھجایا اور بولا۔ ''گستاخی معاف چھوٹے سرکار! یہ چھوری اپنی چرب زبانی سے معاملے کو الجھانا چاہت ہے۔ یہ ہماری توجہ اصل صورت حال سے ہٹا رہی ہے۔ کوّے کو سفید کہنے سے وہ سفید ناہیں ہو جاتا۔ سارا زرگاں جانت ہے کہ یہ ٹھیک عورت ناہیں ہے۔ اپنے کالے کرتوت چھپانے کے لیے یہ دوسروں پر گھناؤنے الزام لگاتی ہے اور جب اس کا جواب دیا جادت ہے تو مرنے مارنے پر اتر آتی ہے۔ رتنا دیوی جی کے ساتھ بھی اس کا جھگڑا ایسے ہی شروع ہوا تھا۔ اس نے ان کے رتبے کا خیال کیے بغیر پہلے منہ ماری کی پھر ہاتھا پائی پر اتر آئی...''

''یہ بھی بالکل جھوٹ ہے سرکار! میں بڑی سے بڑی حسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے رتنا دیوی سے کچھ ناہیں کہا۔ میرا اور ان کا بھلا کیا جوڑ؟ میں ایک نصیبوں ماری بے سہارا لڑکی، وہ راج بھون کی رانی۔ میں تو ان سے اپنی جان بچاتی پھرتی تھی۔ پر وہ کسی صورت مجھے شما کرنے کو تیار ناہیں تھیں۔ میں پنگھٹ پر پانی بھر رہی تھی۔ وہ وہاں اپنی سکھیوں کے ساتھ سیر کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک ایسی گندی بات کہی جو ان کی جبان کو ہرگج جیب ناہیں دیتی تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ اتنے بڑے منہ سے اتنی چھوٹی بات مت کہیں۔ بس وہ اسی بات پر بھڑک گئیں اور پالکی چھوڑ مجھ پر کود پڑیں۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھا پائی کی اور پھر اپنے جور میں خود ہی پھسل کر پنگھٹ کی سیڑھیوں سے گریں۔ ان کو جو چوٹ آئی، وہ اپنی وجہ سے آئی۔ وہاں بہت سوں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا لیکن میں جانتی ہوں کہ اب کسی میں اتنی ہمت ناہیں ہوگی کہ وہ اس بات کی گواہی دے۔ آپ جانتے ہیں، یہاں کم جور کا ساتھ کوئی ناہیں دیتا چھوٹے سرکار! وہ سچ بول کر بھی ہارتا ہے۔ جور والا جھوٹ بول کر بھی جیت جاتا ہے...'' آخری الفاظ کہتے کہتے سلطانہ کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنے بچے کو کندھے سے لگا کر سسکنے لگی۔ اس کے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اس کی اوڑھنی سے نکل کر اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔

حافظ خدا بخش نے کہا۔ ''یہ اپنے گناہوں پر پردہ ڈال رہی ہے جی۔ اصل میں اس نے مہروز جیسے دیوانے سے بیاہ کیا ہی اس لیے تھا کہ یہ اپنے کرتوتوں کو چھپانا چاہت تھی۔ ہم سب جانت ہیں کہ یہ ہرجائی ہے۔ اس کے کئی... یارانے ہیں۔ باپ بوڑھا ہو چکا ہے۔ بھائی بہت عرصے سے بیمار پڑا ہے۔ اس کو کسی کا ڈر خوف ناہیں ہے...''

''یہ جھوٹ ہے... الجام ہے۔'' سلطانہ چلّائی۔ ''میں ان سب لوگاں کو جانتی ہوں۔ یہ حکم جی کے خاص بندے ہیں۔ ان کے منہ میں حکم جی کی جبان ہے...''

اس دوران میں غنی صاحب نے بھی دبے لہجے میں سلطانہ کی حمایت میں چند فقرے بولے۔ انہوں نے کہا کہ ایک ایسی لڑکی پر جو ماں بھی ہے، کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر ایسے سنگین الزام نہیں لگائے جانے چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس لڑکی کے گھرانے کو کسی حد تک جانتے ہیں۔ وہ عزت دار، سچے اور عذر لوگ ہیں۔ اگر ان کی لڑکی واقعی بدچلن ہوتی تو وہ کبھی چپکے نہ بیٹھے رہتے۔

چھوٹے سرکار نے دونوں طرف کا مؤقف وضاحت سے سنا اور چند مزید سوالات کیے۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ تب تک میں فیصلہ کر چکا تھا۔ جب چھوٹے سرکار نے مجھ سے پوچھا کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی تسلیم کرتا ہوں یا نہیں تو میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور کہا۔ ''میں اپنی غلط بیانی کی معافی چاہتا ہوں۔ کل میں پوری طرح اپنے حواس میں نہیں تھا۔ سلطانہ کے ساتھ میرا بیاہ ہو چکا ہے۔ اس کی گود میں جو بچہ ہے، وہ میرا ہی ہے...''

''اس بات کا پتا کیسے چلے گا کہ تم کل اپنے حواس میں ناہیں تھے یا آج حواس میں ناہیں ہو؟'' چھوٹے سرکار نے کہا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، درست ہے چھوٹے سرکار! یہ میری بیوی ہے، یہ میرا بچہ ہے۔ میری بب... بیوی پر جھوٹے الزام لگائے جا رہے ہیں۔ یہ گھر گرہستن ہے۔ یہ پوری طرح میری وفادار ہے۔ یہ حکم جی اور ان کے دوست کی بدنیتی ہے۔ وہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ظلم سے بچنے کے لیے ہم نے زرگاں چھوڑا ہے۔ لیکن یہ لوگ یہاں بھی ہمارے پیچھے ہیں۔ اگر... اگر آپ نے ہمیں ان کے حوالے کر دیا تو ہمیں بے عزت کر کے مار دیا جائے گا چھوٹے سرکار...'' میں بولتا چلا گیا۔ حالانکہ میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ زرگاں کہاں ہے؟ حکم جی کون ہے... میری شادی کب ہوئی تھی؟ لیکن میں خود کو ذہنی طور پر باور کرا چکا تھا کہ زرگاں موجود ہے۔ حکم جی، گورا صاحب اور ان کی بدنیتی بھی موجود ہے اور سلطانہ سے میری شادی بھی ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ میری یادداشت کے پردے پر موجود نہیں تھا لیکن اس کے بارے میں اب اتنے ثبوت موجود تھے کہ میں

اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں نے اب اپنی یادداشت کے بجائے ان ثبوتوں پر بھروسا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''یہ صحیح الدماغ بندہ ناہیں ہے سرکار! اس کی کسی بات پر بھروسا ناہیں کیا جاسکتا۔'' موہن کمار نے احتجاج کیا۔

چھوٹے سرکار نے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور مجھے اپنا بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میرے بیان کے مثبت اثرات چھوٹے سرکار کے چہرے پر نظر آنے لگے تھے۔ انہیں کم از کم اتنا یقین تو ہو رہا تھا کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی مان رہا ہوں اور میرے نزدیک وہ وفادار ہے۔ اب تک کی سماعت کے دوران میں مجھے اندازہ ہوا تھا کہ چھوٹے سرکار کے دل میں سلطانہ اور اس کے بچے کے لیے نرم گوشہ موجود ہے اور وہ انہیں پناہ دینا چاہتا ہے۔ تاہم اس کے لیے وہ قانونی تقاضے بھی پورے کرنا چاہتا تھا۔ میرا بیان سننے کے بعد اس نے بڑی ذہانت سے موہن کمار اور گرو راکیش سے چند ایسے سوال کیے جن سے ان کے بیانوں میں تضاد پیدا ہوا۔ جارج گورا کی ناپسندیدہ مصروفیات کے بارے میں بھی چھوٹے سرکار نے موہن کمار سے چند چبھتے ہوئے سوالات کیے۔ اس موقع پر ایسا نظر آنے لگا کہ اس مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا اور ہمیں گونگے ہاشو سمیت نل پانی میں پناہ دے دی جائے گی۔ کم از کم عارضی پناہ تو ضرور مل جائے گی جسے بعد ازاں مستقل کیا جاسکے گا۔

لیکن پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اچانک سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ ایک فربہ اندام شخص جو اپنے حلیے سے چوب دار نظر آتا تھا، اندر داخل ہوا۔ اس نے چھوٹے سرکار کے قریب جھک کر سرگوشیوں میں کوئی بات کی۔ چھوٹے سرکار کا چہرہ متغیر نظر آیا۔ انہوں نے گہری نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ دھیمی آواز میں اپنے مصاحبین کے ساتھ چھوٹے سرکار کا مختصر مکالمہ ہوا۔ اس کے بعد چھوٹے سرکار نے ایک باوردی اہل کار کو کچھ ہدایات دیں۔ وہ باہر چلا گیا۔ وہ کوئی سینئر اہل کار تھا۔ اس کے ساتھ دو تین معزز افراد بھی باہر گئے۔ حاضرین مدھم آوازوں میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ چار پانچ منٹ بعد سینئر اہل کار واپس آیا۔ اس کے عقب میں دو اور افراد بھی تھے۔ ان میں سے ایک بوڑھا تھا، دوسرا نوجوان... یہ دونوں رو رہے تھے۔ ان کی پگڑیاں گلے میں پڑی تھیں۔ سینئر اہل کار نے چھوٹے سرکار کے روبرو تعظیم پیش کرنے کے بعد کہا۔ ''جناب! میں نے خود ملاحظہ کیا ہے۔ لاش تقریباً دو دن پرانی ہے۔ سر کے پچھلے حصے میں کلہاڑی کا گہرا گھاؤ آیا ہے۔ مقتول کے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر ایک پرانے ازار بند سے باندھے گئے ہیں۔''

''لاش کہاں سے ملی ہے؟'' چھوٹے سرکار نے سوال کیا۔

''کچے کی دوسری طرف... جہاں پچھلے سال جنگل میں آگ لگت تھی۔ وہاں ایک کھوہ سے نکلی ہے۔ مرنے والے کا نام ہارون بتایا جارہا ہے۔ یہ حکم جی کے ان سپاہیوں میں شامل تھا جو سلطانہ کی تلاش میں اس کے پیچھے آئے تھے۔''

میرے سر میں دھماکا سا ہوا۔ کھوہ میں ہونے والی لڑائی کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ میں نے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی زرد ہو رہا تھا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہے۔

جب ہم کھوہ میں ہارون نامی اس رائفل بردار کو باندھ رہے تھے تو وہ بے ہوش تھا۔ لیکن اس کی بے ہوشی ایسی گہری نہیں تھی اور نہ ہی اس کا زخم اتنا سنگین تھا کہ فوری طور پر اس کی موت واقع ہو جاتی۔ لیکن یہ ہو گیا تھا اور اب ہارون کے ساتھی اس کی لاش لے کر دہائی دیتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔

ایک باوردی اہل کار نے سلطانہ کے جھولے میں سے وہ رنگین دستے والی کلہاڑی نکال لی جس سے ہارون کے سر پر وار کیا گیا تھا۔ صفاچٹ چہرے والے سینئر اہل کار نے اس کلہاڑی کو بہ غور دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''جی چھوٹے سرکار! میرے خیال میں یہی وہ کلہاڑی ہے جس سے مقتول کو چوٹ لگائی گئی ہے۔''

پھر اس سینئر اہل کار نے جھولے میں سے وہ رائفل بھی نکال لی جو لڑائی سے پہلے مقتول ہارون کے ہاتھ میں تھی۔ رائفل کو دیکھتے ہی بوڑھا شخص پکار اٹھا۔ ''جی ہاں سرکار! یہ میرے بیٹے کی ہی بندوق ہے۔ میں اس کو اچھی طرح پہچانت ہوں۔ یہ قاتلہ ہے۔ یہ ڈائن ہے۔ یہ میرے بیٹے کو کھا گئی ہے۔'' بوڑھا آہ و بکا کرنے لگا۔

سلطانہ نے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں نے کسی کو ناہیں مارا۔ میں نے تو صرف خود کو اور اپنے شوہر کو بچانا چاہا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی سرکار۔ اگر میں اس کو کلہاڑی سے چوٹ نہ لگاتی تو وہ مجھے اور مہرج کو بھون کر رکھ دیتا...''

چھوٹے سرکار نے اس مرتبہ سلطانہ کی سنی ان سنی کر دی۔ اس نے صفاچٹ سر والے اہل کار سے پوچھا۔ ''منوج! اس رائفل کے بارے میں سلطانہ نے اس سے پہلے کیا بیان دیا تھا؟''

اہل کار بولا۔ ''سرکار! یہ کہوت تھی کہ یہ اس کے پتا جی کی رائفل ہے۔ یہ اپنی رکھشا کے لیے ساتھ لائی ہے۔''

موہن کمار پکار کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا سرکار کہ یہ پرلے درجے کی جھوٹی اور مکار ہے۔ یہ اپنی ڈگر پر اتنا آگے چلی گئی ہے کہ اس کے لیے واپس آنا ممکن ناہیں ہے۔ یہ بہت خطرناک ہو چکی ہے سرکار۔'' موہن کمار کے لہجے میں نئی توانائی آگئی تھی اور بات صرف موہن کمار ہی کی نہیں تھی... ان سب لوگوں کے چہرے دمکنے لگے تھے جو سلطانہ کے پیچھے یہاں آئے تھے۔

اس واقعے کے بعد صرف پانچ دس منٹ کے اندر اندر اس کیس کا فیصلہ ہو گیا۔ چھوٹے سرکار نے سلطانہ اور اس کے بچے کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا جو اسے لینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ سلطانہ کے ساتھ ساتھ مجھے اور ہاشو کو بھی ان لوگوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ یہ فیصلہ سناتے ہوئے چھوٹے سرکار اجیت رائے کے لہجے میں افسردگی کی جھلک موجود تھی۔ اس جگہ موجود بیشتر مقامی لوگ بھی اس صورتِ حال سے مایوس تھے۔ اس فیصلے میں غنی صاحب اور ڈاکٹر چوہان کو سرزنش بھی کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ باہر سے آنے والے کسی بھی شخص کو پناہ دینے سے پہلے اس کے بارے میں چھان بین کریں۔

اب ہم واپس جا رہے تھے۔ انہی راستوں پر سفر کرتے ہوئے جن پر سفر کر کے یہاں نیلے پانی کی خوب صورت جھیل پر پہنچے تھے۔ ہمارا قافلہ تقریباً بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں موہن کمار، گرو راکیش مودان اور حافظ خدا بخش بھی شامل تھے۔ سب لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ میں، سلطانہ اور ہاشو بھی گھوڑوں پر تھے۔ ہم تینوں کے گھوڑوں کی لگامیں آپس میں باندھ دی گئی تھیں اور پھر انہیں ایک چوتھے گھوڑے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ یہ موہن کمار کا گھوڑا تھا۔

ہارون کی لاش لکڑی کے ایک سیل بند تابوت میں رکھی گئی تھی۔ اس تابوت کو ایک توانا خچر کے پہلو سے باندھا گیا تھا۔ وزن برابر رکھنے کے لیے خچر کے دوسرے پہلو سے کچھ سامان وغیرہ باندھ دیا گیا تھا۔ ایک اور خچر پر بھی سامان لدا ہوا تھا۔ یہ کینوس کی تین چار چھولداریاں اور ان کے بانس وغیرہ تھے۔ گھنے درختوں میں ہمارا قافلہ سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہمارے ہاتھ وغیرہ نہیں باندھے گئے مگر ہم پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی، خاص طور سے سلطانہ پر۔ ایک رائفل بردار گھڑ سوار مسلسل اس کے پہلو میں چل رہا تھا۔ گاہے بہ گاہے وہ اسے خوں خوار نظروں سے گھور بھی لیتا تھا۔ یہ ہلاک ہونے والے ہارون کا بھائی صادق لاکھی تھا۔

موسم خوش گوار تھا۔ نہ زیادہ گرمی نہ سردی مگر سفر تو پھر سفر ہوتا ہے۔ ہم تھک کر شام تک چُور ہو گئے۔ خاص طور سے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے کبھی گھوڑے پر سفر نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جسم پھوڑا ہو گیا ہے۔ رکابوں میں پاؤں سوج گئے تھے۔ شام سے ذرا پہلے گھنے جنگل میں ایک ہموار جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈالا گیا۔ چار چھولداریاں لگا دی گئیں۔ ان میں ایک کافی بڑی تھی۔ اس میں موہن کمار، گرو راکیش اور خدا بخش نے قیام کرنا تھا۔ ہارون کی لاش والا تابوت بھی اسی چھولداری میں رکھ دیا گیا۔

ابھی چھولداریاں پوری طرح لگی نہیں تھیں، سلطانہ کا بچہ بالو مسلسل رو رہا تھا۔ وہ اسے دودھ پلانا چاہ رہی تھی۔ شاید اتنے مردوں کے سامنے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئی مگر اس کا یوں جھاڑیوں کی طرف جانا موہن کمار وغیرہ کو پسند نہیں آیا۔ متوفی ہارون کا بھائی صادق بھڑک کر اپنی جگہ سے اٹھا اور زور سے بولا۔ ''ادھر کہاں جا رہی ہو؟''

''بچے کو دودھ پلانا ہے۔''

''تو ہم تیری ''دودھ پلائی'' کی وِیڈیو فلم بنا لیویں گے؟ حرام زادی۔ نخرے باز۔ چل واپس آ ادھر۔''

''دیکھو تم فضول میں گالی نکال رہے ہو۔ میں نے تم سے کچھ ناہیں کہا۔''

وہ ایک دم شعلہ جوالا بن گیا۔ ''کتیا... بدمعاش عورت... ابھی تو نے کچھ کہا ہی ناہیں۔ میرے بھائی کی جان لے لی۔ اسے قتل کر دیا اور کچھ کہا ہی ناہیں تو نے۔ میں تو ہے مار ڈالوں گا۔ مار کے یہیں گاڑ دوں گا۔''

وہ دیوانہ وار سلطانہ پر جھپٹا۔ اس نے رائفل کا کندہ اس کے سینے پر مارا۔ وہ بالو سمیت اچھل کر کئی فٹ پیچھے گری۔ وہ اس پر بے دریغ ٹھوکریں برسانے لگا۔ وہ لوٹ پوٹ ہونے لگی مگر اپنے بچے کو اس نے اس طرح بانہوں میں چھپایا کہ اپنے جسم کو ڈھال بنا لیا۔

میں نے بے تاب ہو کر اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر ایک رائفل بردار میرے سر پر کھڑا تھا۔ ''خبردار! اپنی جگہ پہ بیٹھا رہ... ورنہ بھیجا اڑ جاوے گا۔'' وہ پھنکارا۔

اسی دوران میں حافظ خدا بخش آگے بڑھا اور اس نے بپھرے ہوئے صادق لاکھی سے سلطانہ کی جان چھڑائی۔ وہ مٹی میں لتھڑ گئی تھی اور اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔ دو تین دن پہلے کھوہ کے اندر مقتول ہارون سے ہونے والی لڑائی میں سلطانہ کی قمیص پھٹ گئی تھی اور اس نے کندھے پر گرہ لگا رکھی تھی۔ موجودہ مار پیٹ میں یہ قمیص پھر پھٹ گئی۔

سلطانہ بمشکل اپنی برہنگی چھپانے میں کامیاب ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی نظر آتی تھی مگر یہ شیرنی فی الوقت مسلح افراد کے گھیرے میں تھی اور دہاڑنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے صادق کو بے نقط سنائیں۔ اسے شرابی، بدمعاش قرار دیا اور کہا کہ اسے کسی پتھر نے جنم دیا ہے۔ اگر اسے جنم دینے والی گوشت پوست کی ماں ہوتی تو آج وہ ایسی کمینگی کا مظاہرہ نہ کرتا۔

صادق جواب میں گرجا۔ ''کتیا! میں تیری موت کو آسان بنانا نہیں چاہتا ہوں۔ ورنہ ابھی تجھے چیر کر چیل کوؤں کے لیے پھینک دیتا۔''

چھولداریاں لگ چکی تھیں۔ موہن کمار اور مسلح افراد نے سلطانہ کو دھکیل دھکال کر ایک چھولداری میں داخل کر دیا۔ بالو رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رہا تھا۔ چھولداری کے اندر سے بھی ایک دو منٹ تک اس کی پکار سنائی دیتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹوں اور اس کی آہ و بکا کے درمیان اس کی ماں کا جسم حائل ہونے لگا۔ اس کی روتی بلکتی آواز مدھم پڑنے لگی اور پھر معدوم ہوگئی۔

اندھیرا ہوا تو مجھے اور ہاشو کو بھی سلطانہ والے خیمے میں پہنچا دیا گیا اور خیمے کے گرد چار افراد کا کڑا پہرا لگا دیا گیا۔ یہ ایک خالص جنگلی علاقہ تھا۔ جانوروں کا خطرہ بھی ہوسکتا تھا۔ موہن کمار اور اس کے ساتھیوں نے چھولداریوں کے گرد چار پانچ چھوٹے الاؤ روشن کیے۔ یہ ایک طرح سے اس پڑاؤ کا حفاظتی دائرہ تھا۔

چھولداریوں کے اندر موم بتیوں کی مدھم روشنی تھی۔ اس روشنی میں سلطانہ کے چہرے پر دو گہرے نیل نظر آرہے تھے۔ اس کے جسم پر بھی یقیناً ایسے ہی نیل ہوں گے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بُری طرح پھنس چکی ہے۔ زرگاں پہنچنے کے بعد وہ بدترین حالات کا شکار ہوسکتی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی یا عورت ہوتی تو اس کی حالت پتلی ہو جاتی تھی۔ مگر وہ اب بھی حوصلے میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا لیکن یہ طیش آمیز خوف تھا۔

اسے خود چوٹیں لگی ہوئی تھیں لیکن اسے خود سے زیادہ میرے سر کی چوٹ کی فکر تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے اپنی اوڑھنی سے ایک طویل پٹی پھاڑی۔ پانی سے میرے سر کے زخم کو دھویا اور روئی رکھ کر تازہ پٹی باندھ دی۔

ہم گاہے بہ گاہے، چھولداری کے چھوٹے چھوٹے روشن دانوں سے باہر جھانک لیتے تھے۔ درختوں پر مشعلیں روشن تھیں اور پہرے دار گشت لگا رہے تھے۔ مشعلوں کا روغن جلنے کی بُو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہماری چھولداری میں بھی آجاتی تھی۔ وہ لوگ گوشت بھون رہے تھے۔ راستے میں تین بڑے جل مرغ اور چند خرگوش شکار کیے گئے تھے۔ یقیناً یہی شکار پکایا جارہا تھا۔ ایک چھوٹی نسل کا ہرن زندہ پکڑا گیا تھا۔ وہ بھی ایک الاؤ کے قریب بندھا ہوا تھا۔ غالباً اسے کل کسی وقت استعمال کیا جانا تھا۔ یعنی ہماری طرح وہ ہرن بھی بتدریج راحت سے دور اور اذیت سے قریب ہورہا تھا۔ اب یہ اذیت کیسی ہوگی، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ فی الوقت تو ایسا لگتا تھا کہ یہ لوگ مجھے بھی سلطانہ کے ساتھ برابر کا شریکِ جرم سمجھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہارون کے بھائی صادق نے سلطانہ سے کہا تھا کہ میں تیری موت کو آسان بنانا نہیں چاہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے آسانی سے مارا نہیں جائے گا۔ شاید اسے جارج گورا نامی شخص کے حوالے کر دیا جائے یا پھر اسٹیٹ کی جیل میں ڈال دیا جائے۔

ہمیں کھانا دیا گیا لیکن ہم تینوں نے کُل ملا کر دس بارہ نوالے ہی لیے ہوں گے۔ سلطانہ نے خود پر جبر کر کے تھوڑا سا زیادہ کھایا۔ اس کے ساتھ اس کے شیر خوار کی خوراک بھی وابستہ تھی۔ چاند درختوں کی اوٹ سے جھلک دکھا رہا تھا۔ گونگا ہاشو کچھ دیر تک گم صم لیٹا رہا پھر سو گیا۔ اب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مدھم ہوا چھولداری کی دیواروں کو ہولے ہولے ہلاتی تھی اور پاس ہی کہیں چکور کی آواز سنائی دیتی تھی۔ سلطانہ نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہولے سے بولی۔ ''تم پریشان نا ہیں ہو۔ مہروج! ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کسی کا حق ناہیں مارا۔ اللہ ہمارے ساتھ جرورزی والا معاملہ کریں گا۔ تم دیکھنا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئیں گا... اور... اگر اللہ کی مرجی نہ ہوئی اور راستہ نہ بھی نکلا تو تم دل چھوٹا نہ کرنا۔ ہم صبر سے اچھے وخت کا انتجار کریں گے۔''

میں خاموش رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ شمع کی روشنی میں سلطانہ کی جلد شفاف اور چمکیلی نظر آتی تھی۔ اس کے بالوں کی طویل لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک سخت ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ اگر یہی لڑکی کسی بڑے شہر میں ہوتی اور اسے زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتیں تو وہ ''اچھی صورت'' کی قرار دی جاسکتی تھی۔ اب بھی دھیان سے دیکھنے پر اس میں ایک خاص طرح کی کشش محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا اور حیران ہورہا تھا کہ میں ''بے خبری کے دور میں'' اس لڑکی کے

قریب رہا ہوں اور اس کی گود میں میرا بچہ ہے۔ کسی وقت میں سلطانہ کی طرف عجیب طرح کا کھچاؤ محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ وابستگی اسی قربت کا نتیجہ تھی جس کے بارے میں لوگ مجھے بتا رہے تھے اور خود سلطانہ بتا رہی تھی؟

سلطانہ نے ہولے سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں مانگی ہیں مہروج.. اور ماں جی نے بھی۔ مجھے یقین ہے تمہیں کچھ ناہیں ہوئیں گا۔ تم جلد ٹھیک ہوگے اور خوش رہوگے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''مہروج! اگر مجھے کچھ ہوگیا تو مجھے بھول تو نہ جاؤگے.. مجھے یاد رکھوگے نا؟''

''ایسی باتیں مت کرو۔ تم خود ہی تو کہتی ہو کہ قدرت ہمارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گی۔''

''ہاں، امید پر دنیا خائم ہے... لیکن... یہ گورا صاحب بہت کمینہ بندہ ہے۔ پتا ناہیں کیوں اکثر میرا دل کہتا ہے کہ یہ میرے ہاتھوں مرے گا یا میں اس کے ہاتھوں مروں گی۔''

میں نے پوچھنا چاہا کہ گورا صاحب کی عمر کیا ہوگی مگر پھر ایک دم خاموش ہوگیا۔

اب تک صرف ڈاکٹر چوہان کو معلوم تھا کہ میری یادداشت کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ اس نے میری تکلیف کو AMNESIA کا نام دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ میری یادداشت، لاہور میں حادثے کا شکار ہونے کے بعد قریباً دو سال بعد واپس آئی ہے۔ مگر اب میں درمیانی دو سال کے واقعات یاد کرنے میں ناکام ہورہا ہوں۔ یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ شاید عام شخص اس پر یقین نہ کرتا اور ممکن تھا کہ سلطانہ بھی نہ کرتی۔

سلطانہ نے ٹانگیں سمیٹ کر اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ لی تھی اور مبہوت سی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''ایک بات پوچھوں... سچ بتاؤ گے؟''

''پوچھو۔''

''سوال تو وہی پرانا ہے لیکن موقع نیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہوسکتا ہے کہ ہم بچھڑ جائیں۔ پتا ناہیں کتنی دیر بچھڑے رہیں۔ اور کیا پتا مہروج! پھر ملیں بھی یا ناہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ آج تم اس سوال کا صحیح جواب دے دو۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''کوئی ہے نا؟''

''کون؟''

''وہی... جسے میں جانتی ناہیں۔ جو یہاں سے بہت دور ہے۔ جس کو تم یاد کرتے ہو... جس کی طرف کھچتے ہو۔ بولو، ہے نا؟''

''پتا نہیں تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''وہی مہروج وہی۔'' وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''میرے بہت خریب ہوتے ہوئے بھی تم جس کے پاس رہتے ہو۔ جس تک پہنچنے کے لیے... تمہارے... پر پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتے رہتے ہیں۔ تم بار بار اڑتے ہو اور اس راجواڑے کی حدوں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہو۔ پکڑے جاتے ہو... پھر بھاگتے ہو... بتاؤ کوئی ہے نا؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ ناک سرخ تھی۔ وہ عجیب جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو... لیکن... اگر کوئی ایسی بات ہے بھی تو پھر تم کیا کرسکتی ہو؟''

''ہاں، میں کیا کرسکتی ہوں۔ میں تو خود خیدی (قیدی) ہوں۔ لیکن مہروج! تم ایک بار مان تو لو کہ ہاں کوئی ہے۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''ہوسکتا ہے کوئی ہو۔ ہوسکتا ہے نہ ہو۔ مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔''

وہ بدستور میری طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ''تمہیں یاد ہے جب تم پہلی بار بھاگے تھے، تم راجواڑے کی آخری حد تک جا پہنچے تھے۔ تمہیں ڈیوڈ وغیرہ نے پکڑا تھا۔ وہ تمہیں واپس زرگاں لائے تھے۔ تم نے کہا تھا... مجھے چھوڑ دو۔ بڑی سخت آندھی ہے۔ وہ آندھی میں اڑ جائے گی۔ وہ گم ہو جائے گی۔ ڈاکٹر چوہان اور ریحان تم سے بار بار پوچھتے رہے تھے، کون آندھی میں اڑ جائے گی... کون گم ہو جائے گی۔ تم کوئی جواب ناہیں دے سکے تھے۔ بس اپنا ماتھا مسلتے رہے تھے۔ تب ایک بار پھر بے تاب ہو کر اٹھ گئے تھے اور بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ تمہیں پکڑ کر گوڈا کے چھوٹے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔''

سلطانہ نے چند لمحے توقف کیا اور بے حد سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں دو سال کی مدت میں کبھی بھی یاد ناہیں آیا کہ وہ کون تھی؟ تمہارا اس کے ساتھ کیا سمبندھ تھا.. وہ کیسے بچھڑی تھی تم سے؟''

میں سلطانہ کو اس بات کا بڑا واضح جواب دے سکتا تھا۔ دو سال قبل کی ہر بات اب میرے حافظے میں روشن تھی۔

اس روشنی میں روشن ترین چہرہ ثروت کا تھا۔ وہ جو میری رگِ جاں سے بھی قریب تھی۔ وہ جو میری دلہن بنتے بنتے مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ ایک خبیث باپ کے خبیث بیٹے کی شیطانیت نے ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑا تھا اور ملاپ کے انتظار میں ایک ایک گھڑی گننے والے دو بے تاب دل قرنوں کے فاصلے پر چلے گئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں اس لڑکی کو جو میری بیوی ہونے کا دعویٰ کرلی ہے، بتا دوں کہ میں کسی کی لازوال محبت کا اسیر ہوں۔ اسے بتا دوں کہ وہ کون ہے جو لڑکپن سے میری سانسوں میں چلتی ہے، میرے لہو میں دوڑتی ہے اور میرے دل میں دھڑکتی ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ بتانے سے کوئی فائدہ تھا؟ شاید نہیں۔

اسی دوران میں اچانک چھولداری کے دروازے پر کھڑے ہوکر کوئی زور سے بولا۔ ''پردہ ہٹاؤ۔''

میں نے لرزاں ہاتھوں سے ڈوری کھول کر پردہ ہٹایا۔ ایک کرخت چہرے والے شخص نے اندر جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ تھا۔ پتا نہیں، اس نے کہاں سے حاصل کیا تھا یا شاید وہ کسی چھاگل وغیرہ میں اس کے پاس ہی تھا۔ ''یہ تمہارے بچے کے لیے۔ اور موہن جی کا حکم ہے، جرا جلدی سو جاؤ۔ سویرے جلدی نکلنا ہووے گا۔ اور فالتو خرچہ مت کرو۔ یہ موم بتیاں بجھا دو۔''

سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم نے موم بتیاں بجھا دیں اور ایک دوسرے کے قریب لیٹ گئے۔ ہمارے رخ ایک دوسرے کی طرف تھے اور درمیان میں بمشکل چند انچ کا فاصلہ ہوگا۔ بچہ ایک طرف سو رہا تھا۔ سلطانہ کی سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ اس میں جنگلی پھولوں کی سی باس تھی۔ ہم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''سلطانہ! کیا ہم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے؟''

''بھاگنے کے لیے کل کا دن بہت اچھا ہوسکتا ہے۔ مگر بھاگ کر بچ نکلنے کا امکان اتنا ہی ہے جتنا سوئی کے ناکے میں سے ہاتھی کے گجرنے کا۔'' وہ بھی سرگوشی میں بولی۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ کل بھاگنے کا اچھا موقع ہوگا؟''

''ہم اس وقت اسٹیٹ کے بائیں کنارے کی طرف ہیں۔ کل جہاں ہمارا پڑاؤ ہوئیں گا، وہ جگہ کنارے کے اور بھی قریب ہے۔ مشکل سے سات آٹھ میل کا فاصلہ ہوئیں گا۔ ایک بار کوئی اسٹیٹ کی حد سے نکل جائے تو پھر اس کے لیے چھپنا آسان ہوسکتا ہے۔ وہاں جنگل میں کئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں جن کو ''آدیاں'' کہتے ہیں... لیکن مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم اسٹیٹ کی حد سے ناہیں نکل سکتے اور تم تو بالکل ناہیں نکل سکتے۔''

میں چونک گیا۔ یہ بات اس سے پہلے چوہان نے بھی کہی تھی کہ میں اسٹیٹ کی حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔ میں نے سلطانہ سے پوچھا کہ وہ میرے بارے میں ایسا کیوں کہہ رہی ہے؟

وہ بولی۔ ''اتنی بار ناکام ہوکر بھی اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات ناہیں آئی تو پھر کب آئے گی؟ اب تم کو بھی یہ بات مان لینی چاہیے کہ تم بے بس ہو۔ تم کو کیل دیا گیا ہے۔''

''کیل دیا گیا ہے؟ اس کا کیا مطلب؟''

''تم پر جادو ہے مہروج۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولی۔ ''تم اس کے اثر سے باہر ناہیں نکل سکتے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہاں یہ ہوتا ہے مہروج! جن لوگاں کے بارے میں یہاں خطرہ ہوتا ہے کہ وہ راجواڑے سے بھاگ جائیں گے، انہیں یہاں کیل دیا جاتا ہے۔ پھر چاہے وہ آجاد بھی پھر رہے ہوں، وہ راجواڑے سے باہر ناہیں جا سکتے۔ وہ پکڑے جاتے ہیں اور ایسا کوئی ایک بار ناہیں ہوا، بے شمار مرتبہ ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی دو چار بندے اور پکڑ کر یہاں لائے گئے تھے۔ ان میں سے دو کی موت بھی ایسے اِچ ہوئی تھی۔ وہ کچے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ان کی دوسری کوشش تھی۔ جب وہ پکڑے جانے لگے تو ایک کھوہ میں گھس گئے۔ یہاں تیندوے کا ایک جوڑا تھا۔ یہ تیندوے ان دونوں پر پل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تکا بوٹی کر ڈالی۔''

میرے ساتھ پکڑے جانے والے لوگ اور کون ہو سکتے تھے؟ میں ذہن پر زور دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس سے پہلے میں چوہان کی زبان سے میڈم صفورا کا نام سن چکا تھا۔ اس نام نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تو کیا صفورا کے علاوہ کوئی اور بھی میرے ساتھ پکڑ کر یہاں لایا گیا تھا؟ کہیں وہ سیٹھ سراج یا عارف خان وغیرہ تو نہیں تھے یا پھر میرے اور عمران کے دوستوں میں سے کوئی؟ مثلاً اقبال یا جیلانی وغیرہ۔ سوال بے شمار تھے اور جواب نہیں مل رہے تھے۔ اگر کوئی جواب ملتا بھی تھا تو اس کی جگہ دس سوال اور پیدا ہو جاتے تھے۔

میں نے سلطانہ سے پوچھا۔ ''یہ ''کچا'' کیا ہے؟ اس سے پہلے بھی میں دو تین دفعہ یہ لفظ سن چکا ہوں۔ کیا یہ کوئی خاص علاقہ ہے؟''

''تم بھول رہے ہو مہروج! میں تمہیں ایک بار پہلے بھی تفصیل سے بتا چکی ہوں۔ ہمارا یہ راجواڑا تین طرف سے تو ایک بڑی ندی نے گھیر رکھا ہے۔ خشکی کی طرف سے باہر جانے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ اسے ہم کچا کہتے ہیں۔ اس رستے پر کئی جگہ چھوٹی چھوٹی چوکیاں بنی ہوئی ہیں جہاں پہرے دار موجود ہوتے ہیں۔ کوئی اسٹیٹ سے باہر جا سکتا ہے، نہ باہر سے اسٹیٹ میں آسکتا ہے۔ پہلے پہل کبھی کبھار پولیس یا فوج کے لوگ یہاں آتے تھے مگر ان کا یہاں کوئی جور ناہیں چلتا تھا۔ ویسے بھی یہ جنگل اتنے گھنے ہیں کہ یہاں گورنمنٹ کے لوگاں کا آنا اور اپنے کسی اپرادھی وغیرہ کو ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ اب بہت عرصہ ہوگیا، باہر کے لوگاں اس علاقے کو اس کے حال پر چھوڑ چکے ہیں۔''

ہم سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے، پھر بھی باہر کھڑے پہرے دار خبردار ہوگئے۔ ایک پہرے دار نے چھولداری کے پاس آکر زور سے کہا۔ ''اوئے! یہ کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے۔ آرام سے سوتے ہو یا پھر تمہارا کوئی اور علاج کیا جاوے۔''

ہم چپ ہوگئے۔

وہ پھر گرجا۔ ''اب تمہاری آواج ناہیں آنی چاہیے۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کر نکلنا ہے۔''

سلطانہ غصے میں بڑبڑا کر رہ گئی۔ پھر اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور بڑی محبت سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کے پاؤں میرے پاؤں سے چھو رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں پازیب نہیں تھی۔ حالانکہ یہاں کی تمام عورتوں کے پاؤں میں، میں نے پازیبیں وغیرہ دیکھی تھیں۔ اور بات صرف پازیب ہی کی نہیں تھی، یہاں کی معمولی سے معمولی عورت کے جسم پر بھی مختلف طرح کے زیورات نظر آتے تھے۔ سلطانہ شاید واحد عورت تھی جس کے جسم پر کسی طرح کی کوئی آرائش نہیں تھی۔ شاید وہ یہ سب پسند ہی نہیں کرتی تھی۔

وہ لیٹی ہوئی تھی اور اس کی قربت میں ایک عجیب سی یاسیت تھی۔ دور کہیں جنگل میں گیدڑ چلا رہے تھے۔ جلد ہی میں سو گیا۔

اگلے روز سفر پھر شروع ہوا۔ صادق لاکھی مسلسل سلطانہ کو گھور رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ شاید وہ اسے کچا چبا جاتا۔ کل والے واقعے کو مدنظر رکھتے ہوئے قافلہ سالار موہن کمار نے صادق کو سلطانہ سے دور ہٹا دیا تھا۔ اب صادق کا چتکبرا گھوڑا سب سے پیچھے تھا۔ ایک چھوٹی سی ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہم نے سارا دن سفر کیا۔ میں نے سرگوشی میں سلطانہ سے پوچھا کہ کیا یہی وہ ندی ہے جس کا اس نے رات کو ذکر کیا تھا؟ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ تو بہت بڑی ہے۔ بیچ بہاؤ ہے اس کا۔ تم دیکھو گے تو حیران اِچ رہ جاؤ گے۔'' اس نے سرگوشی کی۔

رات کو ہمارا پڑاؤ ایک بار پھر گھنے درختوں میں ہوا۔ ہاشو یکسر خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے موت کی زردی نے مستقل ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ سلطانہ نے ہاشو کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ان کا پرانا گھریلو ملازم ہے۔ پہلے یہ ٹھیک تھا لیکن پھر بیمار ہوا اور ایک روز اچانک اس کی زبان بند ہوگئی۔ وید نے بتایا ہے کہ اس کے سر کی کوئی نس پھٹ گئی ہے جس کی وجہ سے یہ بولنے سننے سے معذور ہوگیا ہے۔ شروع میں سلطانہ کے والد مختار صاحب کی مالی حالت اچھی تھی مگر جب حالت پتلی ہوگئی تو ہاشو نے کسی اور مسلم گھرانے کی ملازمت کرلی۔ بہرحال، سلطانہ اور اس کے گھرانے کے ساتھ اس کی اٹوٹ وفاداری اب بھی برقرار تھی۔ اب یہ شخص سلطانہ ہی کی وجہ سے ایک بدترین مشکل کا شکار ہوگیا تھا۔

رات کو ہاشو پھر جلدی سو گیا۔ میں اور سلطانہ بالکل قریب قریب لیٹے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ ندی پار سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں۔ سلطانہ نے آج بچے کو اپنے اور میرے درمیان لٹایا تھا۔ وہ بار بار میرا ہاتھ بچے کے سینے پر رکھتی تھی... جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی ہو کہ تم اس بچے کے باپ ہو۔ اگر میں نہ ہوں گی تو تمہیں اس کا دھیان رکھنا ہوگا، اس کے بارے میں سوچنا ہوگا۔

ہماری گفتگو کا رخ ایک بار پھر ندی اور اس کے قرب و جوار کے علاقے کی طرف ہوگیا۔ سلطانہ نے بتایا کہ یہاں سے بائیں رخ پر بس سات آٹھ میل کا فاصلہ طے کرلیا جائے تو راجواڑے کی حدود سے نکلا جا سکتا ہے۔ میں نے اس سے دو چار باتیں اور بھی پوچھیں۔

میرے دل کی گہرائی میں کہیں یہ خیال ابھر رہا تھا کہ میں یہاں سے نکلنے کی ایک کوشش کروں... شاید سلطانہ ٹھیک ہی کہتی ہو کہ میں نے پہلے بھی یہاں سے نکلنے کی دو چار کوششیں کی ہوں لیکن مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اب میں اپنے پورے ہوش و حواس میں تھا... میرے سینے میں ایک آگ تھی اور یہ آگ میری کمزوریوں کو دبا کر مجھے توانا اور قدرے دلیر بنا رہی تھی۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ کیا میں کبھی ثروت کو دوبارہ دیکھ سکوں گا؟ کیا

میں کبھی سیٹھ سراج کی منحوس گردن پکڑ سکوں گا؟ بس یہ دو سوال تھے جو پچھلے چار پانچ دن میں سیکڑوں بار میرے ذہن میں ابھرے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر مجھے ان دو سوالوں کے جواب مل جائیں اور میں یہ دونوں کام کر سکوں تو پھر مجھے مرنے کا بھی کوئی دکھ نہ ہوگا۔ بس دو جواب... بس دو خواہشیں۔ ثروت سے ملنا اور اپنی ماں کے قاتل سراج کو گردن سے پکڑنا۔

رات کسی وقت اچانک میری آنکھ کھلی۔ چھولداری کی دیواریں بے طرح ہل رہی تھیں۔ میں نے چھولداری کے روزن میں سے دیکھا۔ چاندنی غائب ہو چکی تھی اور جنگل گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ نہایت تیز ہوا میں درخت دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ سلطانہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آتی تھی۔ ننھا بالو اس کے پہلو میں تھا۔ ہاشو ہمارے پاؤں کی طرف سویا ہوا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چھولداری کے گرد موجود پہرے دار پناہ کے لیے کسی پاس کی چھولداری میں چلے گئے ہیں۔ درختوں پر لگی مشعلیں بھی بجھ چکی تھیں، صرف ایک روشن تھی اور وہ بھی بے طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی بجھ گئی۔

اچانک میرے دل میں یہاں سے بھاگنے کی دبی دبی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ جاگ گئی۔ میں نے فقط چند سیکنڈ کے لیے سوچا پھر قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے تاریکی میں بیٹھے بیٹھے چھولداری کی اندرونی ڈوری کھولی۔ بیرونی پردہ واٹر پروف تھا۔ اس کی ڈوری کو بھی گرہ لگی ہوئی تھی۔ یہ دوسری ڈوری کھولنے کے بعد میں باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ تب اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میرے کُرتے کا دامن کسی شے سے اٹکا ہوا ہے۔ میں نے ہاتھوں سے آنکھوں کا کام لیا اور ٹٹول کر دیکھا۔ مجھے پتا چلا کہ سلطانہ نے میرے کُرتے کا دامن اپنی اوڑھنی سے باندھ رکھا ہے۔ شاید اس کے ذہن میں کہیں یہ اندیشہ موجود تھا کہ میں اپنی ذہنی کیفیت کے زیر اثر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ اس کا اندیشہ درست تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے گرہ کھولی اور اس کی اوڑھنی کو اپنے کُرتے سے جدا کیا، تب ہولے ہولے سرکتا دروازے سے باہر آ گیا۔ مجھے لگا کہ قدرت میری مدد پر آمادہ ہے۔ تیز بارش شروع ہو گئی تھی اور چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ مجھے بارش کی بوچھاڑوں میں بھیگتے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں جھک کر چلتا تیزی سے خودرو جھاڑیوں کی طرف بڑھا اور آگے نکل آیا... میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہاں سے نکلنا میرے لیے اتنا آسان ثابت ہوگا۔ میں نکل آیا تھا مگر اب بھی اس صورت حال پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے پاؤں میں مقامی طرز کے سینڈل تھے۔ جسم پر وہی پاجامہ کُرتا تھا جو پچھلے چار پانچ روز سے میرے ساتھ دربدر ہو رہا تھا۔ واسکٹ کا حال دیگر لباس سے ابتر تھا۔

یہ جنگل کی بارش تھی۔ ہر طرف ایک شور برپا تھا۔ دیوہیکل درخت جھوم رہے تھے۔ پانی سے پتّوں کے ٹکرانے کی آواز ایک مہیب گونج کی طرح تھی۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ حفاظت کی غرض سے سامنے کی طرف پھیلا رکھے تھے اور حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں کئی جگہ گرا اور سنبھلا۔ مجھے چوٹیں اور خراشیں آئیں لیکن میں بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کل رات جنگل میں پکارتا ہوا چکور یاد آیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے خود میں اور اس چکور میں مشابہت محسوس ہوئی۔ وہ بھی تو کہیں پہنچنا چاہتا تھا، اَن گنت زمانوں سے سفر کر رہا تھا۔ اس کے پر پھڑ پھڑاتے تھے اور اس کا بے قرار دل اسے پرواز رکھتا تھا۔ مجھے بھی کہیں پہنچنا تھا۔ کسی کے پاس جانا تھا۔ کچھ آنکھیں تھیں جن کا انتظار مجھے ختم کرنا تھا۔ وہ میرے پیاروں کی آنکھیں تھیں۔ وہ پتا نہیں کب سے میری راہوں میں بچھی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں نے مجھے کہاں کہاں ڈھونڈا تھا۔ میرے لیے کس کس طرح روئی تھیں... اور یہ کوئی دو چار دن کا واقعہ نہیں تھا، نہ ہی دو چار ہفتوں یا مہینوں کا۔ اسے دو سال گزر چکے تھے۔ پتا نہیں کہ پُلوں کے نیچے سے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ خبر نہیں کہ اس بے کراں جنگل سے باہر کیا کچھ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ میں بھاگ رہا تھا۔ میرے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی۔ میں جلد سے جلد ان تاریک درختوں کی حد سے گزر جاؤں۔ کسی ایسی جگہ پہنچ جاؤں جہاں مجھے جانے پہچانے منظر نظر آئیں۔ سڑکیں، گاڑیاں، لوگ، بازار...

بھاگتے ہوئے میں عقب سے آنے والی آوازوں پر بھی دھیان رکھے ہوئے تھا۔ عقب میں کوئی آواز نہیں تھی، کوئی روشنی نہیں تھی۔ بس شور مچاتے پانی کی نادیدہ چادر تھی جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی تھی اور جنگل دہاڑ رہا تھا۔ تاریک پانیوں میں میرے پاؤں چھپا چھپ چلتے تھے اور بھیگی ہوئی بیلیں میرے جسم سے الجھتی تھیں۔ میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی روشنی دینے والی

چیز۔ سلطانہ کی صرف اتنی بات مجھے یاد تھی کہ ندی سے بائیں طرف سفر کیا جائے تو سات آٹھ میل کی دوری پر ''پکا'' ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسٹیٹ کی حد بھی۔ لیکن کیا اس سے آگے بھی ویرانی ہوگی یا کوئی ایسی آبادی نظر آئے گی جہاں مجھے کوئی مددگار مل سکے؟ مجھے لگ رہا تھا کہ آج کی رات شاید میرے فرار کے لیے ہی اس قطعۂ زمین پر اتری ہے۔ کسی حصار سے نکلنے کے لیے اس سے بہتر تاریکی اور کون سی ہو سکتی تھی۔ مجھے بس اپنا رخ درست رکھنا تھا اور رخ درست رکھنے کے لیے میں صرف اپنے وجدان پر بھروسا کر رہا تھا۔

میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ تم ٹھیک رخ پر جا رہے ہو۔ بارش کی بوچھاڑیں اور ہوا اب بھی تمہارے عقب میں ہے اور اس کا عین عقب میں ہونا ہی تمہارے رخ کو درست قرار دے رہا ہے۔ ایک جگہ میں گرا تو میرے ہاتھ میں ایک لٹھ نما لکڑی آ گئی۔ میں نے یہ لکڑی اٹھا لی۔ ہاتھ میں کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ تیز بارش میں جنگلی جانوروں سے آمنا سامنا ہوتا ہے یا نہیں۔ ہاں، یہ احساس ضرور تھا کہ میں عام رات کی نسبت اس طوفانی رات میں زیادہ محفوظ ہوں۔

میں بے دم ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے رک جاتا۔ سانس ذرا بحال ہوتی تو پھر دوڑنا یا تیز تیز چلنا شروع کر دیتا۔ جنگل گنجان تھا اور دوڑنے کا موقع بس کہیں کہیں دو چار سیکنڈ کے لیے ملتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری قمیص پھٹ چکی ہے۔ میرا چہرہ شاخوں کے لگنے سے لہولہان ہو چکا ہے اور پاؤں اور پنڈلیوں میں بہت سے کانٹے چبھے ہوئے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں، اذیت کا احساس کہیں نہیں تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں اب اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ تاریکی، گھنا جنگل، طوفانی بارش۔ یہاں کون کسی کو ڈھونڈ سکتا تھا... کون میرے پیچھے آ سکتا تھا؟ میں تاریکی کے سمندر میں ایک تاریک نکتے کی طرح تھا۔ ناقابلِ شناخت، ناقابلِ گرفت۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اچانک اپنے سامنے ایک شخص کو دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہے اور آسمان لاکھوں ٹن پانی سمیت ٹوٹ کر میرے سر پر آن گرا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ یہی وقت تھا جب زور سے بجلی چمکی۔ چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار روزِ روشن کی طرح نمایاں ہوئے۔ میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ بے شک وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوفناک

چمک... پھر تاریکی چھا گئی۔ بادل زور سے گرجے۔ وہ دوبارہ ہیولا بن گیا۔ پھر اس کے دائیں بائیں سے دو اور ہیولے نمودار ہوئے۔ ٹارچیں روشن ہوئیں۔ ان کی دودھیا روشنی پانی کی چادر کو چیرتی ہوئی میرے چہرے پر پڑی۔ تب رائفل کاک ہونے کی آواز آئی۔ ایک پھنکارتی ہوئی آواز میرے بائیں جانب سے ابھری۔ ''ہاتھ اوپر اٹھاؤ... اور زمین پر بیٹھ جاؤ۔''

میری ٹانگوں سے دم تو پہلے ہی نکل چکا تھا۔ میں جھکا اور دوزانو بیٹھ گیا۔ بارش کا پانی میری ٹانگوں کے اوپر سے چل رہا تھا۔

''اس کا تلاشی لو۔ پاکٹ چیک کرو۔'' ایک اور آواز ابھری۔ یوں لگا جیسے کوئی انگریز گلابی اردو بول رہا ہے۔

ایک کرخت ہاتھ نے میرے بال مٹھی میں جکڑے اور میری واسکٹ اور قمیص کی جیبیں ٹٹولیں۔ ان میں پانی اور مٹی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

''اس کے ہاتھ پیچھے باندھو۔'' گلابی اردو والے نے پھر کہا۔

میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ سلطانہ نے کہا تھا یہ ''سحرکاری'' ہے۔ مجھے جادو کے زور پر پابند کیا گیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے... صرف ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا تاریکی کے اس سمندر میں مجھے یوں اچانک ڈھونڈ لیا جانا کسی سحرکاری کا نتیجہ ہے؟ لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ میں کسی ایسے خیال کو قبول کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں تھا۔

جب ایک شخص نے مجھے اوندھا گرا کر میرے ہاتھ پشت پر موڑنے چاہے تو میرا اضطراب انتہا کو پہنچ گیا۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اٹھی اور مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ پتا نہیں کہ میری کمزوری اتنی شدید تلخی اور حدت میں کیسے بدل گئی؟ میں نے تڑپ کر خود کو چھڑایا اور ایک بار پھر اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ میں اسے جرأت نہیں کہوں گا، اسے میری غفلت کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ کم از کم دو رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ کوئی گولی میرے جسم میں سوراخ کر سکتی ہے۔ میں نے بمشکل دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک گرانڈیل شخص نے مجھے چھاپ لیا۔ میں اس کے نیچے اوندھے منہ گرا اور خود کو چھڑانے کی اندھا دھند کوشش کرنے لگا۔ میں مچھلی کی طرح پھسل کر اس کی گرفت سے نکلا لیکن اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک دوسرے شخص نے

زیادہ سختی سے دبوچ لیا۔ میں آتشیں لہجے میں چلّانے لگا۔ ''چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو کتو... مجھے جانے دو... مجھے میرے گھر والوں کے پاس جانے دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے مار دو ظالمو... یا مجھے جانے دو۔''

میں جسم و جاں کی پوری قوت سے تڑپ رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی سعی کر رہا تھا۔ ان لمحوں میں... ہاں، ان لمحوں میں مجھے لگا کہ شاید سلطانہ اور چوہان وغیرہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں اس سے پہلے بھی اسی طرح یہاں سے نکلنے کی متعدد کوششیں کر چکا ہوں۔ کچھ دھندلے دھندلے سے ہیولے میرے ذہن میں بن رہے تھے۔ یہی تڑپ... یہی بے قراری... یہی پھڑ پھڑا کر پنجرہ توڑ دینے کی خواہش۔ کوئی اور وقت تھا... کوئی اور لوگ تھے لیکن شاید یہی جنگل تھا... اور اسی طرح کا واقعہ ہوا تھا۔

مجھے ایک بار پھر زمین پر گرایا گیا اور باندھ دیا گیا۔ میرے پاؤں میں ایک زنجیر ڈالی گئی تھی جس میں عجیب وضع کا تالا لگا ہوا تھا... اس تاریک گرجتے برستے اور دہاڑتے جنگل میں، میں نے پھر ایک طویل سفر کیا۔ لیکن اس مرتبہ یہ سفر گھوڑے پر تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے کسی بوری کی طرح گھوڑے کی پشت پر اوندھا لٹایا گیا تھا۔ چار گھڑسوار میرے اردگرد تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تیواری لال تھا۔ اسے اس کے ساتھی تیواری بھائی یا تیواری جی کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ایک دوسرے بندے کا نام ڈیوڈ تھا۔ یہ ایک سفید فام تھا اور گلابی اردو بولتا تھا۔ اس نے انگریزی لباس پہنا ہوا تھا اور برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ اس کی رائفل بھی برساتی کے اندر ہی تھی۔ اس کی عمر کوئی تیس پینتیس سال ہوگی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے پکڑ کر واپس اسی پڑاؤ میں لے جایا جا رہا ہے جہاں سے میں بھاگا تھا۔ میرے دل و دماغ میں اودھم سا مچا ہوا تھا۔ تیواری لال اور ڈیوڈ کے نام میں نے پہلے بھی سنے تھے۔ چوہان نے بتایا تھا کہ پہلے بھی ایک دفعہ جب میں بھاگا تھا تو مجھے تیواری اور ڈیوڈ پکڑ کر واپس لائے تھے۔ سزا کے طور پر مجھے ایک گھوڑے کے پیچھے باندھا گیا تھا اور طویل فاصلے تک ننگے پاؤں چلایا گیا تھا۔ آج بھی میں یہی دو نام تواتر سے سن رہا تھا۔ تو کیا مجھے پکڑنے کے لیے خاص طور سے یہی دونوں افراد مامور تھے؟ ڈیوڈ کے علاوہ باقی تینوں افراد مقامی لب و لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ان کی زیادہ تر گفتگو راستے اور موسم کے بارے میں تھی۔ میرا بھاگنا اور پھر انتہائی حیران کن انداز میں پکڑا جانا، ان کے

لیے جیسے کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں تھی۔

قریباً دو گھنٹے بعد ہم واپس پڑاؤ میں پہنچ گئے۔ بارش اب ہلکی ہو چکی تھی مگر بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ تاریک جنگل ہوا کے شور سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مجھے گھوڑے سے اتارا گیا۔ موہن کمار مجھے دیکھ کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے میرے منہ پر دو تھپڑ مارے اور پھنکارا۔

''میں حکم جی سے ضرور تیری سفارش کروں گا۔ بہتر یہی ہے کہ تیری دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ دی جاویں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔''

موہن کمار کی شہ پر مشتعل صادق بھی آگے بڑھا۔ اس نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ سلطانہ فریاد کرتی ہوئی چھولداری سے نکل آئی۔ ''اس کا کوئی قصور نا ہیں۔ یہ اپنے ہوش میں نا ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ تقریباً میرے اوپر گر گئی۔

موہن کمار زہریلے لہجے میں بولا۔ ''بہت پریم ہے تجھے اپنے پتی سے۔ بڑی گھر گرہستن ہے تو۔ تیرے جیسی دو چار اور جنم لے لیں تو سارا سنسار سورگ بن جائے۔''

اس نے سلطانہ کو اس کے لمبے بالوں سے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ ایک گھڑسوار بتیسی نکال کر بولا۔ ''حسن حاجر ہے محبت کی سجا پانے کو۔ کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔''

سلطانہ کو گھسیٹ کر چھولداری میں پہنچایا گیا۔ اس کے بعد مجھے بھی وہاں پھینک دیا گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے موم بتی کی مدھم روشنی میں دیکھا، ہاشو سہما ہوا ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ میں کیچڑ میں لت پت تھا، پورے جسم پر خراشیں تھیں۔ سلطانہ نے خود کو سنبھالا اور اپنی اوڑھنی سے میرے چہرے کا لہو پونچھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔ اسی دوران میں ایک شخص لوہے کا ایک چھوٹا سا ڈبا چھولداری میں پھینک گیا۔ اس میں مرہم پٹی کا مختصر سامان تھا۔ میرے سر کا زخم پھر تازہ ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے بڑی احتیاط سے میری پٹی کھولی۔ دوا ملے پانی سے میرے زخم کو صاف کیا اور بڑی ہمت سے مرہم وغیرہ لگا کر پھر پٹی باندھ دی۔ تب ہاشو کے ساتھ مل کر اس نے میرے پاؤں اور پنڈلیوں سے کانٹے نکالے۔ کچھ پورے نکل آئے۔ دو چار ایسے بھی تھے جو اندر ہی ٹوٹ گئے۔ میری قمیص کی دھجیاں سلطانہ نے میرے جسم سے علیحدہ کیں۔ ان سے میرے لت پت جسم کو صاف کیا اور مجھے ایک صاف چادر میں لپیٹ دیا۔ اس نے مجھے جنگلی شہد اور ستو پانی میں گھول کر پلایا۔ میں نیم جان تھا۔ تکلیف اور دکھ کی شدت سے کراہ رہا

تھا۔ اس نے بڑی محبت سے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور میرے سر کے بالوں کو سہلانے لگی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ بالو کو تھپک رہی تھی۔ شاید سردی کے سبب وہ گاہے بہ گاہے کسمسانے لگتا تھا۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے سلطانہ کو دیکھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اس کے قندھاری رخسار زرد نظر آتے تھے۔ آنکھوں میں وہی دکھ تھا جو کسی لڑکی کی آنکھوں میں اس وقت نظر آتا ہے جب وہ اپنے محبوب یا شوہر سے بہت عرصے کے لیے بچھڑ رہی ہو۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے ہی ہم زرگاں پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے نہایت گھنے درختوں میں گھری ہوئی یہ ایک وسیع بستی تھی۔ یہ ایک ڈھلوان پر واقع تھی۔ اس کے دامن سے ٹیالے پانی والی وہی چھوٹی ندی گزرتی تھی جو ہم نے راستے میں بھی دیکھی تھی۔ یہاں ہریالی اتنی گہری تھی کہ سیاہی مائل محسوس ہوتی تھی۔ زرگاں کا پھیلاؤ کسی طرح بھی تل پانی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بھی بلند کلسوں اور برجیوں والی کئی ایک شان دار عمارتیں نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے ایک پرانی طرز کی پُرشکوہ عمارت راج بھون کہلاتی تھی اور وہ ندی کے عین کنارے پر تھی۔ زرگاں میں مجھے مندروں اور بدھ مندروں کی کثرت نظر آئی۔ مسجدیں شاید دو تین ہی تھیں۔ بارش کے بعد ہلکی دھوپ نکل آئی تھی اور زرگاں میں زندگی رواں دواں تھی۔ بھیڑ، بکریاں اور گائے بھینسیں سرسبز ڈھلوانوں پر منہ مار رہی تھیں۔ ان کے پیچھے رنگ برنگی پگڑیوں والے لڑکے تھے۔ مال برداری والے جانور اپنے راستوں پر گامزن تھے۔ چھوٹے چھوٹے بازاروں میں پھل، سبزی اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی دکانیں تھیں۔ گلیوں میں مرغیاں اور بطخیں دوڑتی تھیں اور سانولے بچے شور مچاتے تھے۔

زرگاں پہنچتے ہی مجھے سلطانہ اور ہاشو سے جدا کر دیا گیا۔ وقتِ رخصت سلطانہ کی بے تابی دیدنی تھی۔ وہ جیسے ساری زنجیریں توڑ کر مجھے اپنی بانہوں میں چھپا لینا چاہتی تھی۔ لگتا تھا کہ ان سنگین ترین لمحوں میں بھی اسے خود سے زیادہ میری فکر ہے۔ وہ مجھے تو نہیں چوم سکتی تھی، لیکن میری طرف دیکھ کر اپنے بچے کو چوم رہی تھی۔ آنسو موتیوں کی طرح اس کی شفاف آنکھوں سے گر رہے تھے۔ مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں ڈال کر وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔

نیم پختہ سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجتی رہیں اور تقریباً دس منٹ بعد میں زرگاں کے سب سے بڑے پگوڈا میں تھا۔ میرے ہاتھ کھول دیے گئے تھے لیکن پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ مجھے سہارا دے کر اتارا گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا۔ یہاں سنگِ مرمر کثرت سے استعمال ہوا تھا۔ سرخ لباسوں والے بھکشو ننگے پاؤں گھومتے نظر آتے تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور گلے میں مالائیں تھیں۔ احاطے کی ایک جانب مخروطی چھت والی ایک دوسری عمارت تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ مٹھ کی عمارت تھی۔ مٹھ میں بدھ مت کی تعلیم دی جاتی تھی اور نوعمر طالبِ علموں کو عبادات کا طریقہ بتایا جاتا تھا۔ احاطے میں موجود اکثر لوگ مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان کے انداز ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔ تاہم میں ان میں سے کسی کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔

ایک سوجی سوجی آنکھوں والے بھکشو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ہم جانتے تھے کہ تم ایک نہ ایک دن واپس جرور آؤ گے۔ ٹھس آمدید (خوش آمدید)۔“

ایک دوسرا شخص بولا۔ ”تم کو عجت راس آہی ناہیں سکتی تھی۔ تم بدھا کے اپرادھی ہو۔ تم پر نحوست کی چھایا ہے۔“

مختلف طنزیہ فقروں کے درمیان چلتا میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک گھڑے، ایک پیالے اور مٹی کے دو برتنوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کچے فرش پر ایک چٹائی بچھی تھی اور تکیے کی جگہ ملائم لکڑی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی میرا بسیرا ہے۔ دو فربہ اندام افراد کوٹھڑی میں آئے۔ یہ اس عبادت گاہ کے ملازم معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے لوہے کا ایک چپٹا کڑا میرے گلے میں ڈال دیا۔ ایک کھٹکے کے ذریعے یہ کڑا لاک ہو گیا۔

وہ رات میں نے اس کوٹھڑی میں تکلیف سے کراہتے ہوئے گزاری۔ اگلی صبح صفاچٹ سر اور چہرے والا ایک جواں سال بھکشو میرے پاس آیا۔ اس کا انداز قدرے دوستانہ تھا۔ اس نے رسمی کلمات ادا کیے... ”کیسے ہو مبروز! یار حوصلہ رکھو۔ جیون میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ سلطانہ کے ہاتھوں ایک بندہ مارا گیا ہے۔ ویسے اسے یہاں سے بھاگنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہاں رہ کر حالات کا سامنا کرتی۔“

میں اسے نہیں پہچان پا رہا تھا تاہم میں نے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ میری چوٹوں پر اظہارِ افسوس کرتا رہا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اس کی باتوں کا جواب دیا۔

جلد ہی مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ وہ ہمیش تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں پگوڈا میں میرے ساتھ کافی وقت گزار چکا ہے۔ اس نے کہا۔ ”تمہاری شکل سے لاگت ہے کہ تم بہت بھوکے ہو۔ ابھی کھانے میں بہت دیر ہے۔ یہ تھوڑے سے بھنے ہوئے چاول ہیں، کھالو۔“ اس نے اپنی گیروا چادر کے پلو میں سے مٹھی بھر چاول نکالے اور چپکے سے میری طرف بڑھا دیے۔ ساتھ ساتھ وہ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بھکشو، دوپہر سے پہلے کچھ نہیں کھاتے اور ابھی دوپہر ہونے میں کافی دیر تھی۔ میں نے بھی نظر بچا کر تھوڑے سے چاول کھائے۔ گلا بند سا ہونے لگا۔ میں نے گھڑے میں سے پانی انڈیل کر پیا۔

ہمیش نے حیرانی سے کہا۔ ”کیا کرت ہو؟ پیالے پر کپڑا کیوں ناہیں رکھا؟“

ایک دم مجھے یاد آیا۔ چوہان نے بتایا تھا کہ بھکشو پانی کو باریک کپڑے سے چھان کر پیتے ہیں۔

”اوہو، بھول گیا۔“ میں نے بات بنائی۔

”لگتا ہے کہ تم بہت کچھ بھول رہے ہو۔ تمہاری دماغی صحت ٹھیک ناہیں لگتی۔“

وہ میرے زخموں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس شخص سے میرے تعلقات کس طرح کے ہیں۔ مجھے کیا بتانا چاہیے اور کیا اس سے چھپانا چاہیے۔ میں گول مول باتیں کرتا رہا۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ مجھے وہ سب کچھ یاد آگیا ہے جو یہاں انڈیا آنے سے پہلے مجھ پر بیتا ہے تو شاید وہ یقین کر لیتا... لیکن اگر میں یہ بتاتا کہ اس نئی صورتِ حال میں پچھلے دو سال کی باتیں بھول گیا ہوں تو شاید وہ اسے ایک مذاق سمجھتا یا میرا مضحکہ اڑانا شروع کر دیتا۔ اپنی اس کیفیت پر میں خود بھی ششدر تھا۔ مجھے بعین یہی لگ رہا تھا کہ میرے دماغ میں ایک بند دروازہ کھل گیا ہے اور اس دروازے کے کھلنے سے ایک دوسرا دروازہ بالکل بند ہو گیا ہے۔

اچانک ہمیش چونکا۔ وہ دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ”اوہ، وہ آرہی ہے۔ کہیں پھر کوئی گڑبڑ نہ کردے۔“ اس نے کہا۔

میں نے دیکھا۔ سامنے مٹھ کی طرف سے ایک عورت پگوڈا کے صحن میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ وہ میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کون تھی؟ اور مجھے اس سے کیا ڈر تھا؟

ہمیش تیز سرگوشی میں بولا۔ ”میں جاتا ہوں۔ اگر وہ تم سے کوئی بدتمیزی کرے تو خود جواب نہ دینا۔ چھوٹے گروجی کے استھان کی طرف چلے جانا۔“

اب مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چھوٹا گرو کون ہے اور اس کا استھان کیا ہے؟

میں نامعلوم حالات میں جکڑا ہوا تھا۔ میرے چاروں طرف شناسا لوگ تھے لیکن وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کے مزاج، ان کے رویے اور میرے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت... سب کچھ میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ یہ عجب صورتِ حال تھی۔

عورت تیزی سے چلتے ہوئے میری طرف آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لٹھ تھی۔ وہ غالباً میری یہاں موجودگی سے آگاہ تھی۔ شاید وہ اس سے پہلے میرے ساتھ کوئی مار پیٹ کر چکی تھی اور ہمیش کو اندیشہ تھا کہ آج پھر اس طرح کا واقعہ ہو گا۔ میرے قریب پہنچ کر اس کی رفتار کچھ سست ہو گئی۔ وہ مجھے بہ غور دیکھنے لگی۔ اس کی گردن میں مالا کی جگہ لوہے کا ایک کڑا تھا۔ یہ ویسا ہی کڑا تھا جو کل مجھے پہنایا گیا تھا۔ وہ جواں سال عورت تھی اور مقامی بھی نہیں لگتی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سکتہ زدہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اگر... میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں تو وہ صفورا تھی... میڈم صفورا۔ وہی جواں سال دبنگ عورت جو لاہور ایئرپورٹ کے قریب واقع لال کوٹھیوں میں مختارِ کل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بوائے کٹ بال اپنی مثال آپ تھے۔ وہ نہایت قیمتی پینٹ شرٹ پہنتی تھی اور اس کی چال میں ایک شاہانہ دبدبہ تھا۔ لیکن آج یہاں پگوڈا کی اس عجیب و غریب عمارت میں وہ ایک بالکل مختلف روپ میں نظر آرہی تھی۔ میں دنگ رہ گیا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں طیش کی ہلکی ہلکی سرخی ابھر آئی تھی۔ میں نے سوچا شاید ہمیش کا اندیشہ ٹھیک ہے۔ یہ مجھ پر حملہ کرنے جا رہی ہے۔ چند سیکنڈ تک صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ پھر بتدریج صفورا کی آنکھوں کی سرخی ماند پڑ گئی۔ اس کی جگہ ایک طرح کی نمی نے لے لی۔

وہ خشک لہجے میں بولی۔ ”تو آخر تم واپس آہی گئے۔“

میں خاموش رہا۔

وہ اندر کوٹھڑی میں چلی آئی اور چٹائی پر بیٹھ کر کھردری دیوار سے ٹیک لگا لی۔ میں کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا پھر میں بھی چٹائی کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھ پر نگاہیں جمائے

ہوئے بولی۔ ”تمہیں دیکھتی ہوں تو سینہ جل اٹھتا ہے، خود پر بس نہیں رہتا... حالانکہ... جانتی ہوں تم... نادیہ کی موت کے براہِ راست قصوروار نہیں ہو۔ اس کا اصل مجرم تو وہی خبیث بازی گر تھا...“

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں، تاہم بالکل ساکت بیٹھا رہا۔ میرا اندیشہ بالآخر درست ثابت ہوا تھا کہ نادیہ جاں بر نہیں ہوسکی۔ وہ اس رات مرگئی تھی اور اس کی موت ہی تھی جس نے سیٹھ سراج، شیرے اور دیگر لوگوں کو شعلہ جوالا بنا کر ہمارے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس خوفناک تعاقب کا انجام بالآخر ڈیک نالے پر ہوا تھا جہاں عمران کو رائفل کا برسٹ لگا تھا اور وہ اپنا ہنستا مسکراتا چہرہ لے کر تاریک پانیوں میں اوجھل ہوگیا تھا۔ کتنی بھیانک تھی وہ رات...

... ہاں نادیہ مرگئی تھی اور اس کی بہن جو اسے بے پناہ پیار کرتی تھی... آج یہاں اس پگوڈے کی کوٹھڑی میں گیروا لباس پہنے میرے سامنے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کا بے پناہ غم کروٹیں لے رہا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟“ میڈم صفورا نے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نگاہیں جھکا لیں۔ وہ بولی۔ ”تمہارے یہاں پگوڈا سے جانے کے بعد کافی کچھ تبدیل ہوا ہے اور سچ پوچھتے ہو تو میں بھی اس ایک ڈیڑھ برس میں بہت بدل گئی ہوں۔ میرے اندر تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں نے اپنے غم اور غصے سے نباہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ پہروں اکیلی بیٹھی گزرے واقعات پر غور کرتی رہتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ مجھ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئی ہیں۔ نادیہ کی موت کے حوالے سے میری بڑی غلطی شاید یہی تھی کہ میں نے سلیم کو نادیہ کے پاس رہنے دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نادیہ خطرناک حد تک ضدی ہے اور سلیم کی جان بھی لے سکتی ہے۔ سلیم کی موت کے بدلے میں نادیہ کو اپنی جان دینا پڑی اور نادیہ کے بدلے میں کچھ اور جانیں گئیں۔ ان میں سے مجھے تمہاری والدہ کی موت کا واقعی افسوس ہے۔ یہ سراسر سراج کا ذاتی فعل تھا۔ مجھے سراج کی طرف سے اندیشہ تھا۔ میں نے اسے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ تمہاری بیمار والدہ کے ساتھ کسی طرح کی سختی نہ کی جائے لیکن سراج اکثر اپنی من مانی کرتا تھا۔ کئی دفعہ وہ نادیہ کو بہکانے کا بھی سبب بنا تھا۔ اس نے وہاں ڈیفنس کی کوٹھی میں بھی اپنی مرضی چلائی... بہرحال، اب اپنے واقعات کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔“ صفورا نے آہ بھر کر چہرہ دروازے کی طرف پھیر لیا۔

کچھ دیر تک ہم دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی طاری رہی۔ پگوڈا کے اندر لوبان سلگایا جارہا تھا۔ اس کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہم تک پہنچنے لگی۔ صفورا نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ”اس شام میں نے تم سے بہت زیادتی کی۔ مجھے شاید ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں لگنے والی ان چوٹوں کے لیے مجھے رنج ہے۔“

میں کیا جواب دیتا۔ اس بارے میں میرے ذہن کی سلیٹ بالکل صاف تھی۔ وہ کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کرتی رہی، تب اس کی آواز ابھری۔ ”تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ کہو۔ شاید میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ تم جانتے ہو، ہم اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہمارے دکھ سانجھے ہیں۔“

”میڈم! آپ کو یہاں اس حالت میں دیکھ کر میرا دماغ سن ہورہا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی اُس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے پچھلے دو سال میں پہلی بار میرا نام لیا ہے... کیا... تم مجھے... ٹھیک سے پہچان رہے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں میڈم! میں آپ کو پہچان رہا ہوں اور ان سارے حالات کو بھی جو یہاں پہنچنے سے پہلے پیش آئے تھے۔“

میڈم صفورا کے چہرے پر خوشی کی مدھم چمک نمودار ہوئی۔ اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ”کیا واقعی ایسا ہے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بہ غور میرے سر پر بندھی پٹی کو دیکھنے لگی۔ ”کیا تم کہیں سے گرے ہو؟ مم... میرا مطلب ہے تمہارے سر پر پھر چوٹ لگی ہے؟“

”ہاں، کچھ دن پہلے ایسا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ پچھلے چند روز میں کچھ عجیب صورتِ حال ہوئی ہے۔ دو سال پہلے کے سارے حالات مجھے بتدریج یاد آرہے ہیں... میں اب پورے وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ میں کن حالات میں یہاں پہنچا...

میڈم نے تصدیق کے لیے مجھ سے کئی ایک سوالات کیے اور اس کی حیرانی میں اضافہ ہوگیا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ اس نئی صورتِ حال میں ماضیِ قریب کی باتیں میرے ذہن سے یکسر نکل گئی ہیں تو وہ مزید حیران ہوئی اور تعجب سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے مناسب الفاظ میں اسے آگاہ کیا کہ مجھے بتایا جارہا ہے کہ میں پچھلے قریباً دو برس سے

یہاں ہوں لیکن اب یوں لگتا ہے کہ ان دو برسوں پر ایک کالے رنگ کا پردہ پڑگیا ہے۔ اس پردے کی دوسری طرف مجھے ایک دھندلی حرکت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

میرا خیال تھا کہ وہ یقین نہیں کرے گی لیکن وہ بڑے دھیان سے میری باتیں سنتی رہی اور میری عجیب ذہنی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”میرے خیال میں تمہیں چند دن آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد تم خود کو بہتر محسوس کروگے۔“

”میں اب بھی خود کو بہتر محسوس کرتا ہوں۔ بس کسی وقت سر میں شدید درد ہوتا ہے اور آنکھوں کے سامنے دھندسی چھانے لگتی ہے۔“

میڈم صفورا کو دیکھ کر میرے ذہن میں بے شمار سوالات کلبلانے لگے تھے۔ ان سوالات میں سے کچھ کا تعلق پاکستان میں پیش آنے والے واقعات سے تھا اور کچھ کا یہاں کے حالات سے۔ مجھے ابھی تک صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ ہمیں کچھ نامعلوم لوگوں نے بدھا کے مجسمے کی چوری کی پاداش میں پکڑا تھا اور یہاں پہنچایا تھا اور یہ سب کچھ بطور سزا کیا گیا تھا مگر اس بارے میں تفصیلاً کچھ بھی میرے علم میں نہیں تھا۔ میں میڈم صفورا سے یہ سب کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ خاص طور سے پاکستان اور لاہور کے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہاں میری بے ہوشی کے فوراً بعد کیا کچھ رونما ہوا تھا۔ میرا بھائی اور بہن کہاں تھے... اقبال اور عارف پر کیا گزری تھی اور میرا دوست عمران، وہ یاروں کا یار، وہ جاں نثار... وہ غم خوار کیا ہوا تھا۔ کس تاریکی میں چھپ گیا تھا؟ پتا نہیں کیوں میں جب بھی عمران کے بارے میں سوچتا، میرے دل کے اندر کہیں گہرائی میں یہ انہونی آس ضرور جاگتی تھی کہ وہ ہر مشکل کو شکست دینے والا، شاید اس رات موت کو بھی شکست دینے میں کامیاب رہا ہو۔

چھ بھکشو ایک جتھے کی صورت میں پگوڈا سے نکلے۔ ان کے آگے ایک تنومند گرو تھا۔ انہیں دیکھ کر میڈم صفورا ٹھٹکی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”تمہیں آرام کی شدید ضرورت ہے۔ میں چھوٹے گرو سے کہوں گی کہ تمہیں کچھ دن تک خدمت سے چھٹی دی جائے۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ میرے پاس بھی تمہارے اور سلطانہ کے لیے بہت سے سوال ہیں لیکن اس بات چیت کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا... اچھا، میں چلتی ہوں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے محتاط نظروں سے بھکشوؤں کے جتھے کی طرف دیکھا پھر پگوڈا کے مرمریں احاطے میں بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی مٹھ کی عمارت کی طرف نکل گئی۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہ گیا۔ نادیہ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ میں کل جب اس کوٹھڑی میں داخل ہوا تھا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں چند گھنٹے بعد میڈم صفورا سے میری ملاقات ہوگی اور اس کی زبانی مجھے نادیہ کی موت کی خبر ملے گی۔ حالات بڑی تیزی سے رونما ہورہے تھے۔

نادیہ کو میں نے آخری بار اسپتال کے آئی سی یو میں دیکھا تھا۔ اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ وہ سفید بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ اس وقت وہ کروڑ پتی میڈم صفورا کی لاڈلی بہن نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے جسم میں بجلیاں کوندتی تھیں، نہ ہی اس کی آنکھوں میں دعوت کے لشکارے تھے۔ وہ صرف ایک مریضہ تھی۔ دھیرے دھیرے موت کی طرف سرکتی ہوئی، اپنے انجام کی طرف بڑھتی ہوئی... اور آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے انجام تک پہنچ گئی ہے۔ وہ مردوں کا شکار کرتی تھی لیکن اس نے جس آخری مرد کو شکار کرنا چاہا تھا، وہ اپنی فطرت میں انوکھا تھا۔ وہ اس کی حریص آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بجھا گیا تھا اور شاید... خود بھی بجھ گیا تھا۔

☆☆☆

بھکشو اور ان کا گرو ننگے پاؤں چلتے ہوئے میرے پاس آئے۔ گرو نے اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے مجھے سرتاپا گھورا پھر بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ”سیڑھیوں پر چلو۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں اپنی جگہ متحیر کھڑا رہا۔ ایک چیلا کرخت لہجے میں بولا۔ ”سنتے ناہیں، گرو جی کیا کہوت ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے ایک طرف دھکیلا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے اس خاص سمت میں جانے کو کہا جارہا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے تیور دیکھے اور چل پڑا۔ پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی۔ مجھے چلنے میں دشواری ہورہی تھی۔ میں بمشکل ڈیڑھ دو فٹ کا قدم ہی اٹھا پارہا تھا... وہ سب میرے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔ جلد ہی ہم پگوڈا کی سفید سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ یہ قریباً چالیس سیڑھیاں تھیں جو پگوڈا کے صحن سے نیچے اترتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر کئی بھک منگے بیٹھے تھے اور آتے جاتے زائرین سے خیرات وصول کررہے تھے۔ مالائیں، پھول اور تبرکات بیچنے والے دیگر افراد بھی یہاں موجود تھے۔

مجھے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے چہروں پر دلچسپی کے

آثار نمودار ہوئے۔ مجھے لگا جیسے میرے ساتھ کوئی تماشا ہونے والا ہے۔ پھر ایک دم مجھے چوہان کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ مجھے اور چوری کے دیگر مجرموں کو سزا کے طور پر بلاناغہ پگوڈا کی سیڑھیوں پر لٹایا جاتا ہے اور انہیں بید مارے جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے گناہوں کو دھونے کا عمل ہے۔ بدھا کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ اس عمل سے چوری کا ارتکاب کرنے والوں کو جو جسمانی تکلیف پہنچے گی، وہ انہیں پوتر ہونے میں مدد دے گی۔

مجھے پگوڈا کی سیڑھیوں پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ میری پشت سے قمیص اٹھا دی گئی۔ درجنوں نگاہیں دیکھ رہی تھیں۔ بے عزتی کے احساس سے مجھے پسینا آ گیا۔ ایک شخص جو بھکشو نہیں تھا، ایک لکڑی تھامے برآمد ہوا۔ یہ بید کی لکڑی نہیں تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ برگد کی شاخ تھی جسے مقدس تیل میں بھگویا جاتا تھا۔

اس لکڑی سے میری کمر پر یکساں وقفوں سے دس ضربیں لگائی گئیں۔ یہ ہلکی ضربیں تھیں اور نہ شدید تھیں۔ ان ضربوں نے مجھے جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی اذیت دی۔ مجھے اٹھا کر پھر سے خستہ حال کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ میری کمر پر جلن تھی اور زخمی پنڈلیوں اور پیروں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ سر کے زخم سے بھی لہو کا تھوڑا تھوڑا رساؤ جاری تھا۔ اپنی حالت پر مجھے خود ترس آنے لگا۔ ایک بھکشو نے مجھے مرہم پٹی کا کچھ سامان دیا اور بے اعتنائی سے منہ موڑ کر واپس چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ہمیش آ گیا۔ اس شخص کا رویّہ قدرے دوستانہ تھا۔ وہ میرے لیے بھی گیروا لباس لے کر آیا تھا۔ یہ دو چادروں پر مشتمل تھا۔ اس نے میرے زخموں کی مرہم پٹی کی اور لباس بدلنے میں بھی میری مدد کی۔ اس نے بتایا کہ بدھ کی دوپہر کو میرا سر بھی مونڈ دیا جائے گا۔

میرا حلیہ عجیب وغریب ہو گیا تھا... لیکن پتا نہیں کہ وہ مجھے زیادہ عجیب نہیں لگ رہا تھا۔ شاید میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی اور مجھے یہاں کے حالات اور واقعات دھیرے دھیرے یاد آنے شروع ہو گئے تھے۔ بہرحال، ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دوپہر کو کھانا کھایا گیا۔ پھر پگوڈا کے وسیع صحن میں مختلف عبادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شام کو بڑے بڑے نقارے بجائے گئے اور سُوتر پڑھے گئے۔ وہ رات بھی جیسے تیسے گزر گئی۔ رات کی تاریکی میں پگوڈا کا اندرونی منظر بڑا عجیب تھا۔ مخروطی دروازوں میں سے شمعوں کی روشنی چھلک چھلک کر باہر آتی تھی اور بھکشو پُراسرار سایوں کی طرح حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ پگوڈا کے اندرونی دروازے کے سامنے میں نے ایک ننگ دھڑنگ سادھو کو چلہ کشی کی حالت میں دیکھا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے آگ جل رہی تھی اور وہ گاہے بگاہے اس میں کچھ پھینکتا تھا جس سے آگ میں سے بہت سی چنگاریاں نکلتی تھیں۔ گیروا لباس والی ایک لڑکی ہولے ہولے اس آگ کے گرد چکر کاٹتی تھی۔ شاید یہ کوئی سحر کاری تھی۔

میرے ذہن میں ایک بار پھر پرسوں رات کے تہلکہ خیز مناظر تازہ ہو گئے۔ نہایت گھنا اور تاریک جنگل، نہایت تیز بارش اور پھر کچھ لوگوں کا اچانک میرے سامنے آ جانا۔ مجھے ڈھونڈ لینا۔ جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کر لی جائے۔ کیا واقعی وہ کوئی جادو تھا؟ میرا ذہن یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔

اگلی صبح پھر صفورا سے ملاقات ہو گئی۔ اس دور دراز مقام پر ان اجنبی در و دیوار میں میڈم صفورا کا مجھ سے ملنا جتنا حیرت ناک تھا، اتنا ہی ناقابلِ فہم بھی تھا۔ وہ کیا تھی اور کیا بن کر یہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ کیا حالات تھے جنہوں نے اس جیسی دبنگ عورت کو اٹھا کر یہاں پٹخا تھا۔ ابرار صدیقی کو یہاں پٹخا تھا اور مجھے بھی؟ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور شاید اس کی کیفیت بھی یہی تھی۔

صبح کی اولین گھڑیوں میں جب بھکشو اور ان کے گرو حضرات صبح کی مناجات کے بعد پھر سے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے تھے، ہمیں وہ تنہائی میسر آ گئی جس کی ضرورت تھی۔ میں اور میڈم صفورا کوٹھڑی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میڈم صفورا کی آنکھوں میں غم و اندوہ کے گہرے نشان جیسے نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی مسکرائی ہی نہیں ہے۔ وہ ایک دم اپنی اصل عمر سے دو تین سال بڑی لگنے لگی تھی۔ جب میں نے اسے لاہور میں دیکھا تھا، وہ قریباً پچیس کی لگتی تھی۔ اگر یہ انہونی ہو چکی تھی کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ دو سال ہو چکے تھے تو پھر صفورا کی عمر چھبیس ستائیس لگنی چاہیے تھی مگر وہ ایک دم تیس کی لگ رہی تھی۔ تاہم اس کا جسمانی دم خم اسی طرح موجود تھا اور گہرے سرخ ہونٹوں کی شادابی بھی مکمل اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

وہ گمبھیر آواز میں بولی۔ ”تابش! میں نے تم سے جو رویّہ روا رکھا ہے اس کے لیے میں ایک بار پھر تم سے معذرت چاہتی ہوں۔ میرا صدمہ بہت گہرا تھا، مجھے اپنے جذبات پر اختیار نہیں تھا۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! اگر میں یہ کہوں کہ مجھے آپ کے رویّے کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تو آپ یقین نہیں کریں گی۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”ہاں، کل تم نے جو کچھ اپنے بارے میں بتایا ہے اس سے مجھے کافی باتوں کی سمجھ آئی ہے۔ میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اگر تمہاری یادداشت واپس آئی ہے تو بہت جلد مکمل طور پر واپس آ جائے گی۔ تم اپنے اردگرد کی چیزوں اور چہروں پر غور کرو۔ انہیں پہچاننے کی کوشش کرتے رہو، بہت جلد تمہیں باتیں یاد آنے لگیں گی۔“

میں نے اپنی پیشانی کو مسلا۔ میں ذہن پر زور دیتا تھا تو کنپٹیوں میں ٹیسیں سی اٹھنے لگتی تھیں۔

میڈم صفورا نے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہیں پتا ہے، تم یہاں کیسے پہنچے تھے؟“

”نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ کچھ معلوم نہیں... پلیز میڈم... مجھے... شروع سے بتائیں... میرے ساتھ کیا ہوا؟ میں لاہور سے یہاں انڈیا کے اس دور دراز علاقے میں کیسے پہنچا؟ کن لوگوں نے پہنچایا؟ اور... اور آپ کیسے پہنچیں یہاں؟ اور ابرار صدیقی؟ اتنا بڑا واقعہ کیسے ہوا میڈم؟“

وہ ساکت بیٹھی رہی۔ اس کی مخروطی انگلیاں بے خیالی میں اپنے گلے کے آہنی کڑے کو سہلا رہی تھیں۔ اس کڑے پر سنسکرت یا اس سے ملتی جلتی زبان کے کچھ لفظ لکھے تھے۔

وہ گہری دکھ بھری سانس لے کر بولی۔ ”نادیہ اپنے دوسرے آپریشن کے دوران میں ہی دم توڑ گئی تھی۔ گولی نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو بُری طرح زخمی کیا تھا۔ تم جانتے ہی ہو، اس کا نچلا دھڑ بالکل بے حس ہو گیا تھا۔ تمہارے اس قاتل دوست نے میری زندگی کو جس طرح برباد کیا ہے، میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔ وہ خبیث بہت زیادہ سازشی دماغ کا مالک تھا۔ اس نے گہری سازش کی۔ سرکس کے اسپیشل شو میں میری بہن کو اپنے ہاتھ سے گولی ماری اور ظاہر یہ کیا کہ وہ خود اپنی گولی کا شکار ہوئی ہے۔ قدرت نے اس کا بھانڈا پھوڑا اور اس کے لیے تم ذریعہ بن گئے۔ تم نے رشید اور تابندہ وغیرہ کے گھر میں بخار کی حالت میں جو کچھ کہا، اس نے پول کھول دیا۔ کاش میرے بس میں ہوتا کہ اس کی بوٹیاں کر کے چیل کوّوں کے آگے ڈال سکتی۔ کاش میرے بس میں ہوتا۔“

میڈم صفورا کی آنکھوں سے جیسے لہو ٹپکنے لگا۔ اس کے ماتھے کی رگیں ابھر آئیں۔ یوں لگا کہ ان لمحوں میں وہ میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہ رہی۔ اس نے میری طرف سے بھی نگاہیں پھیر لیں اور گہرے سانس لینے لگی۔ چند سیکنڈ بعد وہ قدرے نارمل ہوئی تو بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”ہر بُرے سے بُرے کام میں کوئی پہلو اچھائی کا بھی ہوتا ہے۔ میں کچھ لوگوں کے جبر کا شکار ہو کر لاہور سے یہاں پہنچ گئی۔ یہ بہت بُرا ہوا لیکن اس میں شاید ایک نکتہ اچھائی کا بھی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اگر میں نادیہ کی موت کے بعد وہاں لاہور میں رہتی تو پتا نہیں، کیا کچھ کر گزرتی۔ عین ممکن تھا کہ اس خونی (عمران) کے بعد اس کے گھر والے، اس کے بہن بھائی بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ جاتے۔ میری ذہنی کیفیت ان دنوں کچھ ایسی ہی تھی۔ میں ان کو بالکل نہیں چھوڑتی...“ میڈم صفورا کی سرخ آنکھوں میں اشکوں کی نمی چمکنے لگی۔

اس کا طیش دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس عبادت گاہ میں میڈم صفورا کا رویّہ مجھ سے بہت تلخ رہا ہو گا اور عین ممکن ہے کہ شروع شروع میں اس نے میری جان لینے کی کوشش بھی کی ہو۔

وہ چادر کے پلو میں چہرہ چھپا کر خاموش آنسو بہانے لگی۔ میں چپکا بیٹھا رہا۔ سورج دھیرے دھیرے مٹھ (مدرسے) کی مخروطی چھت کے عقب سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنوں میں پگوڈا کے سنہری کلس اور کام دار دروازے چمک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میڈم صفورا کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے گیروا چادر کا پلو چہرے سے ہٹا لیا۔ میں نے اسے مٹی کے پیالے میں پینے کے لیے پانی دیا۔ اس نے پانی پیا اور ایک بار پھر کھردری سفید دیوار سے ٹیک لگا لی۔ اس کے چہرے پر کرب آمیز تردد کی پرچھائیاں موجود تھیں۔

اس نے ہولے ہولے کہنا شروع کیا۔ ”...دراصل ہم ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا سکے کہ بدھا کا وہ مجسمہ کچھ لوگوں کے لیے کتنا اہم ہے اور وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ اندازے کی بہت بڑی غلطی تھی، بہت بڑی غلطی...“

اس نے پھر ایک آہ بھری اور جیسے کسی سوچ میں کھو گئی۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”وہ مجسمہ جو ابرار صدیقی کے پاس تھا اور جسے بعد میں، میں نے تمہارے اس قاتل دوست کے ذریعے صدیقی کے فلیٹ سے نکلوایا تھا... کوئی عام مجسمہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تفصیل میں جاؤں گی تو بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ یہ شان دار مجسمہ برما سے یہاں پہنچا تھا۔ یہ کئی سو سال سے برما کے ایک شاہی خاندان کے پاس تھا۔ اس مجسمے کی شہرت یہ تھی کہ یہ اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ ماضی میں کئی طرح کے حادثات اس پر گزرے لیکن یہ ہمیشہ محفوظ ہی رہا۔ نہ صرف خود محفوظ رہا بلکہ اس نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی محفوظ

رکھا۔ اس کی آخری مثال دوسری جنگِ عظیم میں سامنے آئی۔ برما کا وہ پہاڑی قصبہ بھی شدید جنگ کی زد میں تھا جہاں ایک بدھ مندر کے اندر یہ مجسمہ موجود تھا۔ علاقے کے لوگوں کو اس مجسمے کی کرامات پر اتنا یقین تھا کہ جاپانیوں کے کئی شدید حملوں کے باوجود لوگ قصبہ چھوڑ کر نہیں گئے اور بدھ مندر کے اردگرد پناہ گزیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانیوں نے جب بھی قصبے پر ہلا بولنے کی کوشش کی، شدید طوفانی بارش یا خراب موسم کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ کر سکے اور ناکام واپس لوٹ گئے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ عین حملے کے موقع پر ان پر برطانوی فوجیوں نے کسی اور طرف سے حملہ کر دیا اور قصبے کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلا۔ بعدازاں قصبے کے لوگ خود بھی قصبہ چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ چلے گئے۔ جاپانی فوجیوں نے گولہ باری سے پورا قصبہ کھنڈر کر دیا۔ بدھ مندر بھی تہس نہس ہوگیا۔ اس کے اندر چھوٹی سے چھوٹی شے بھی تباہی سے نہیں بچ سکی لیکن یہ مجسمہ جوں کا توں رہا۔ اسے خراش تک نہیں آئی۔ بعد میں اس قصبے پر برطانوی فوج کا قبضہ ہوگیا۔ ایک انگریز میجر اسٹیفن اس نادرِ روزگار مجسمے کو بڑی احتیاط سے انڈیا لے آیا۔ حکم جی کے دادا رائے سوم آنند بہادر سے مسٹر اسٹیفن کی گہری دوستی تھی۔ لہٰذا اس انوکھے مجسمے کو یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کے سب سے بڑے پگوڈا کی زینت بنا دیا گیا۔''

میڈم صفورا نے محتاط نظروں سے کوٹھڑی سے باہر جھانکا کہ کوئی اردگرد تو موجود نہیں پھر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آج سے تین سال پہلے یہ مجسمہ یہاں زرگاں کے پگوڈا سے چوری ہوا۔ اس چوری نے بدھ مت کے پیروکاروں میں تہلکہ مچا دیا۔ انہوں نے تہیہ کیا کہ وہ مجسمے کو بہرصورت ڈھونڈیں گے اور واپس لائیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ مجسمہ جہاں بھی ہوگا، محفوظ ہوگا کیونکہ وہ بری زبان کے مطابق ''آرا کوئے'' ہے۔ یعنی اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ بدھ مت کے ماننے والوں نے سات ایسے افراد چنے جو اس مجسمے کو واپس لانے کے لیے اپنی جان لٹانے کو تیار تھے۔ ان کے ساتھ بھانڈیل اسٹیٹ کے پانچ نہایت خطرناک اور تربیت یافتہ کمانڈوز بھی شامل ہوئے۔ ان کمانڈوز کا سربراہ انڈین اسپیشل فورسز کا ایک سابقہ افسر رنجیت پانڈے تھا۔ رنجیت پانڈے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے عزرائیل کا دوسرا نام ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس پانڈے کی مطلوبہ رقم موجود ہے تو وہ پانڈے سے دنیا کے کسی بھی محفوظ ترین اور وی وی آئی پی شخص کو قتل کرا سکتا ہے۔ اسے ایک بلا کہا جاتا ہے۔ ایسی بلا جو بہت جلد خود ختم ہو جائے گی یا پھر اس کے ہاتھوں کئی اہم ترین لوگ ختم ہو جائیں گے۔ پانڈے کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ صرف بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔

''ہماری بدقسمتی کہ جو لوگ گندھارا آرٹ کے اس مجسمے کو پاکستان سے واپس لانے کے لیے انڈیا سے پاکستان میں داخل ہوئے ان کا لیڈر بھی رنجیت پانڈے تھا۔ پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے تیزی سے تفتیش کی اور صرف تین چار ہفتے کے اندر مجسمے کے آس پاس پہنچ گئے۔ یہ مجسمہ کم از کم چھ سات ہاتھوں سے ہو کر ابرار صدیقی تک آیا تھا اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ان سات آٹھ افراد میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ پیس یعنی مجسمہ کچھ لوگوں کے لیے کتنا قیمتی ہے اور اسے ڈھونڈنے کے لیے کتنے بڑے پیمانے پر کوششیں کی جا رہی ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا، ابرار صدیقی نے پہلے یہ ''پیس'' لاہور میں رکھا ہوا تھا۔ وہاں اسے شک ہوا کہ کچھ مشکوک لوگ اس کے اردگرد موجود ہیں۔ وہ پیس کو لاہور سے اٹھا کر جہلم لے گیا اور بڑی رازداری سے اسے اپنے فردوس پلازا والے فلیٹ میں چھپا دیا۔ اس فلیٹ سے یہ ''پیس'' تمہارے اس قاتل دوست عمران نے حاصل کر لیا اور میرے پاس لال کوٹھی میں لے آیا۔ ہم اپنی کامیابی پر خوش تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ اس کامیابی کے ساتھ ساتھ کتنی بڑی مصیبت ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے کمانڈوز نے ابرار صدیقی کے فلیٹ تک رسائی حاصل کی۔ انہوں نے ابرار کے ایک محافظ کو قتل اور دوسرے کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ ابرار صدیقی لاپتا ہوگیا تھا۔ دراصل وہ پانڈے کے خوفناک شکنجے میں تھا۔

''نادیہ کی موت کا پانچواں روز تھا... جب رات کے وقت پانڈے اور بھانڈیل اسٹیٹ کے نہایت خطرناک کمانڈوز لال کوٹھی میں گھس آئے۔ ان کے ساتھ بدھ مت کے وہ چند جنونی پیروکار بھی تھے جنہوں نے مقدس مجسمے کے حصول کے لیے اپنی جان واقعی ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔ آگے کے حالات کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ ان لوگوں نے نہ صرف وہ پیس حاصل کیا بلکہ مجھ پر بھی رائفلیں تان لیں۔ اس رات کی شدید خونی کشمکش میں میرے تین باڈی گارڈز میری آنکھوں کے سامنے اپنی جان ہارے۔ عارف خان کو گولی لگی اور تین چار افراد شدید زخمی ہوئے۔ میری چلائی ہوئی ایک گولی ایک کمانڈو کی گردن سے پار ہوگئی لیکن وہ حیران کن طور پر زندہ رہا۔ وہ لوگ مجھے مجسمے سمیت لاہور ہی کی ایک نامعلوم چار دیواری میں لے گئے۔ یہ غالباً ماڈل ٹاؤن کی کوئی بہت پرانی کوٹھی تھی۔ اس میں کسی انگریز میاں بیوی کی قبریں بھی تھیں۔ مجھے ایک تہ خانے میں رکھا گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہاں ایڈووکیٹ ابرار صدیقی پہلے سے موجود تھا۔ اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ اس کے جسم پر ابھی تک کالا کوٹ اور سفید پتلون تھی۔ وہ کوئی معمولی بندہ نہیں لیکن اس وقت بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔

''مجھ پر بھی جسمانی تشدد کیا گیا۔ مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جنہوں نے مقدس مجسمہ جہلم کے فلیٹ سے چرا کر میرے پاس پہنچایا تھا۔ میں نے انہیں سچ بتانے میں ہی بہتری سمجھی۔ نہ بھی بتاتی تو انہیں معلوم ہو ہی جانا تھا۔ میں نے انہیں تمہارا، اقبال اور عمران وغیرہ کا نام بتا دیا...'' میڈم بری طرح کھانسنے لگی۔ مسلسل بولنے سے اس کا گلا خشک ہوگیا تھا۔

''میں ان لوگوں کے ہاتھ کیسے آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''دراصل تم سراج اور شیرے وغیرہ کے پاس تھے۔ تمہیں مجید منھو والے خالی مکان میں رکھا گیا تھا۔ چوٹ لگنے کے بعد تم اپنے حواس میں نہیں تھے۔ نہ کسی کو پہچانتے تھے، نہ بات کرتے تھے۔ پانڈے کے لوگ اسی حالت میں تمہیں مجید منھو کے مکان سے پکڑ لائے اور ہمارے ساتھ ماڈل ٹاؤن کے تہ خانے میں بند کر دیا...''

میں نے ذہن پر زور دیا لیکن ایک دبیز دھند کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کوئی ہلکا سا خیال بھی ذہن میں نہیں ابھرتا۔''

''ہاں، تمہاری چوٹ کافی شدید تھی۔ پورے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سوج کر نیلی ہو چکی تھیں۔ دیکھ کر خوف آتا تھا۔''

میں نے میڈم صفورا کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ میں نے التجائی لہجے میں کہا۔ ''میڈم! آپ نے کہا ہے کہ ہم سب اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ کیا میں آپ سے امید رکھوں کہ آپ مجھے شدید ذہنی اذیت سے بچانے کے لیے میرے ایک سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دیں گی؟''

''ہاں پوچھو۔''

''میڈم! میری بہن اور بھائی کا کیا ہوا؟''

''میں جانتی تھی تم یہی پوچھو گے۔ ان دونوں کے بارے میں میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تو بری بھی نہیں... بلکہ تم اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اچھی خبر بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہاری والدہ والے واقعے کے چار پانچ روز بعد تک وہ دونوں سراج کے ہتھے نہیں چڑھے تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ لاہور میں تھے ہی نہیں۔ شاید کراچی کی طرف نکل گئے تھے۔ پانچویں روز میں خود پانڈے وغیرہ کے ہاتھوں بے بس ہوگئی۔ اس کے بعد مجھے کسی کے حالات کا کچھ پتا نہیں... کچھ بھی نہیں۔''

''اور میری والدہ... میرا مطلب ہے ان کی میت؟'' میں نے آنسو بہاتے ہوئے پوچھا۔

''انہیں کوٹھی کے احاطے میں ہی دفنایا گیا تھا۔''

''دفنایا گیا تھا یا دبایا گیا تھا؟'' میں نے کرب ناک لہجے میں پوچھا۔

''مجھے اس بارے میں تفصیل معلوم نہیں۔'' میڈم نے نظریں چرائیں۔

میرا دل دکھ سے لبریز ہوگیا۔ تو کیا میری ماں کو کفن بھی نہیں مل سکا تھا... کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟

میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ میڈم بھی خاموش رہی۔ گئے وقت کا کرب ایک مہیب لہر کی طرح ہم دونوں کے درمیان موجزن رہا۔ آخر میڈم صفورا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ پانڈے جیسے سفاک شخص نے ہمیں قتل کیوں نہ کیا... یا ہڈیاں وغیرہ توڑ کر وہیں کیوں نہ پھینک آیا؟ ہمیں اپنے ساتھ یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کیوں لایا؟''

یہ سوال واقعی بڑی شدت سے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ میں نے بھیگی ہوئی سوالیہ نظروں سے میڈم کو دیکھا۔ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ایک دم چپ رہ گئی۔ پگوڈا کے مین دروازے سے تین افراد اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان میں بھکشو کوئی نہیں تھا۔ دو مقامی تھے۔ ایک انگریز تھا۔ وہ درمیانی عمر اور اچھے مضبوط جسم کا مالک تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ اس نے بھی مقامی لباس پہنا ہوا تھا۔ یہ پاجامے کرتے اور انگرکھے پر مشتمل تھا۔ پگوڈا کے احترام میں وہ اور اس کے ساتھی ننگے پاؤں چلتے ہوئے آ رہے تھے۔ وہ قریب پہنچے تو مجھے سفید فام شخص کے چہرے پر نقش خباثت اور سفاکی دکھائی دی۔ اس کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں یقیناً ایک جاہ طلب اور حریص شخص کی آنکھیں تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ جارج گورا ہے۔ اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوگیا۔

جارج نے مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا اور بولا۔ ''کورتی کے ساتھ کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی یہاں... کیا ایک بار پھر تم یہاں سے بھاگنا مانگتا ہے؟''

وہ حیران کن طور پر صاف اردو بول رہا تھا۔ بس لہجے کا

فرق تھا۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جارج کا ساتھی، مقامی شخص بولا۔ ''صاحب! موہن کمار جی نے شاید ٹھیک ہی مشورہ دیا ہے۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ دینی چاہئیں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

دوسرا شخص جو سانولی رنگت کا تھا، کرخت آواز میں بولا۔ ''اوئے! دیکھتے ناہیں ہو کہ صاحب بہادر آئے ہیں۔ کیسے گنواروں کی طرح چھسکڑا مارے بیٹھے ہو۔ کھڑے ہو جاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔

میں کھڑا ہو گیا۔ سانولا شخص پھر گرجا۔ ''دیدے کیوں پھاڑت ہو؟ نیچے دیکھو۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ بہت زوردار تو نہیں تھا لیکن شاید ہاتھ بھاری تھا یا کیا وجہ تھی۔ میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور تیزی سے خون کے قطرے گرنے لگے۔ جارج اور اس کے دونوں ساتھی مجھے مسلسل خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے۔

پہلا شخص جارج کو بھڑکانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ اس حرافہ کے کرتوتوں میں برابر کا شریک ہے جی۔ اوپر سے گھنا بنا رہتا ہے۔ اندر سے سب کچھ جانت ہے۔''

جارج نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں مجھے اپنے لیے رقابت کی جھلک نظر آئی۔ غالباً اس رقابت کا سرچشمہ سلطانہ ہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق جارج، سلطانہ کے پیچھے تھا اور سلطانہ نے جارج کی جارحیت سے بچنے کے لیے آناً فاناً مجھے اپنا شوہر بنا لیا تھا۔ اب وہ میری بیوی تھی اور میں اس کے بچے کا باپ تھا۔ کہنے والے تو یہی کہہ رہے تھے... اور یہی صورتِ حال تھی جس نے جارج کی آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ رقابت بھر دی تھی۔

یکایک جارج اور اس کے ساتھی چونکے۔ ایک فربہ اندام گرو اچانک ہی کوٹھڑی کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے صفاچٹ چہرے پر جھریاں اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے گلے میں موٹے دانوں والی بڑی مالائیں اس کے اونچے رتبے کو ظاہر کرتی تھیں۔ وہ ہاتھ میں عصا لیے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دو بھکشو ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔

جارج نے گرو کو مقامی انداز میں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ گرو نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ تاہم گرو کے چہرے پر برہمی کے آثار موجود تھے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' اس نے ضعیف آواز میں دریافت کیا۔

''کچھ ناہیں گرو جی! یہ بدتمیزی کر رہا تھا۔'' گہرے سانولے رنگ والے شخص نے کہا۔

''تم نے اسے کیا مارا ہے؟'' گرو کے لہجے میں بدستور تلخی تھی۔

''کچھ ناہیں گرو جی!'' اس مرتبہ جارج نے جواب دیا۔ ''یہ فضول بول رہا تھا۔ تیواری نے تھپڑ مارا ہے۔''

آج میں دن کی روشنی میں پہلی بار دھیان سے تیواری کی شکل دیکھ رہا تھا۔ گہری رنگت والا یہ شخص کسی شکاری کتے کی طرح چوکنا اور خبردار تھا۔ شاید اس کا کام ہی یہاں سے بھاگنے والوں کو پکڑنا تھا۔

گرو کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ جارج کے جواب سے بالکل مطمئن نہیں ہوا۔ وہ ناراض لہجے میں بولا۔ ''میں ہمیشہ سے یہی کہتا آیا ہوں کہ یہ بدھ مندر ہے۔ یہ پریم اور آشتی کا دوارا ہے۔ یہاں پر خون خرابا ہماری سکھشا کے خلاف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم ہاتھ میں ہتھوڑا لے کر بدھ مندر کی دیواریں گرانا شروع کر دیں۔ چھی چھی... کتنے افسوس کی بات ہے۔ ایک جیتے جاگتے بندے کا خون مندر کے فرش پر گرتا ہے اور ہم کھڑے دیکھت ہیں۔''

گرو نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک نے ایک کپڑے سے فرش پر گرا خون صاف کرنا شروع کیا۔ دوسرے نے اپنا گیروا رومال میرے ہونٹوں پر رکھ دیا تاکہ مزید خون گر کر فرش کو داغ دار نہ کرے۔

گرو نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں آپ لوگوں سے بنتی کرتا ہوں... کہ بدھ مندر کی سندرتا کو اس طرح داغ دار نہ کریں۔ اگر یہاں آپ کا کوئی اپرادھی ہے تو پھر اسے یہاں سے لے جائیں۔ اس کے ساتھ جو بھی خون خرابا کرنا چاہت ہیں، باہر جا کر کریں۔''

جارج ذرا ترش انداز میں بولا۔ ''بڑے گرو جی! آپ بار بار خون خرابے کا ورڈ کیوں استعمال کر رہا ہے۔ یہاں کسی نے کسی پر تلوار ناہیں چلایا۔ ایک تھپڑ کو آپ خون خرابا کیوں کہہ رہا ہے؟''

''کیا یہ پہلی بار ہے کہ یہاں ایسا ہوا ہے؟'' بڑے گرو کی آواز میں دبی دبی آگ تھی۔ ''میں نے بہت برداشت کیا لیکن اب مجھ سے برداشت ناہیں ہوتا۔ ہم یہاں اس دوارے میں پریم، آشتی اور بلیدان کی سکھشا دیوت ہیں۔ اگر ہمارے کہنے اور کرنے میں اتنا فرق ہووے گا تو پھر سب کچھ برباد ہو جاوے گا۔''

''بڑے گرو! آپ خوامخواہ بات کو بڑھا رہا ہے۔ اٹ از ناٹ فیئر۔'' جارج بولا۔

''میں بات ناہیں بڑھا رہا۔ میں صرف یہ کہنا چاہت ہوں کہ اگر کوئی اپرادھی ہے اور آپ اسے سزا دینا چاہت ہیں تو پھر اسے یہاں سے لے جاویں... بس۔''

جارج کا چہرہ سرخ انگارہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں جیسے نیلا زہر بھر گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ ویسا ہی ہوگا جیسا بڑے گرو چاہیں گے۔''

اس کے بعد وہ مڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

بڑے گرو نے مجھے قدرے ترحم کی نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنے ساتھی بھکشوؤں سے کہا کہ وہ میرے ہونٹ کا خون بند کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی اور راکھ کا استعمال کریں۔ کچھ اور بھکشو بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ بڑے گرو کے سامنے ان کے سر تعظیم سے جھکے ہوئے تھے۔ بڑا گرو ان کے جلو میں چلتا ہوا پگوڈے کے اندرونی حصے کی طرف واپس چلا گیا۔

سہ پہر ہوتے ہی ایک بار پھر مجھے عجیب طرح کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ ڈاکٹر چوہان نے مجھے بتایا تھا کہ ہم ''مجسمہ چوری'' کے لیے پگوڈا میں سزا بھگت رہے ہیں۔ ہماری سزاؤں میں فاقہ کشی کے علاوہ مار پیٹ کی سزا بھی شامل ہے۔ ہمیں یعنی مجھے، میڈم صفورا اور ابرار صدیقی کو ہر شام پگوڈا سے باہر نکالا جاتا ہے اور سنگِ مرمر کی سفید سیڑھیوں پر اوندھا لٹایا جاتا ہے۔ پھر ہمیں زائرین کے سامنے مقررہ تعداد میں بید مارے جاتے ہیں۔ دو دن پہلے یہ سزا میں ایک بار تو بھگت چکا تھا، تاہم اس کے بعد ابھی تک کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ بہرحال، میرے ذہن میں اندیشہ موجود تھا اور سہ پہر کے وقت یہ اندیشہ ایک دم بہت بڑھ جاتا تھا۔ میڈم صفورا سے میری ملاقات دو بار ہو چکی تھی لیکن اس سزا کے بارے میں، میں اس سے کچھ پوچھ نہیں سکا تھا۔ بہرحال یہ شام بھی خیریت سے گزر گئی۔ میرے پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی اور مجھے بہت تنگ کر رہی تھی۔ میرے پاؤں آزادی چاہتے تھے۔ میں اپنی مرضی سے اپنے جسم کو حرکت دینا چاہتا تھا اور یہ خواہش کسی وقت اتنی شدید ہو جاتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ نیند کی حالت میں بھی جیسے یہ احساس ذہن کی گہرائی میں موجود رہتا کہ میرے پاؤں کے ساتھ ایک نہایت ناپسندیدہ بوجھ موجود ہے۔

سلطانہ کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں اندیشے موجود تھے۔ وقتِ رخصت اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں میرے تصور میں گھومتی رہتی تھیں۔ اس کا بچے کو چومنا پھر الوداعی انداز سے مجھے دیکھنا۔ غنی صاحب، چوہان اور دیگر لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ میری بیوی کی حیثیت سے سلطانہ نے میرے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ وہ ان گنت موقعوں پر میرے لیے ڈھال بنی ہے اور اپنی زندگی خطرے میں ڈالی ہے۔ پتا نہیں کہ میں اس کا محبوب تھا یا نہیں لیکن اس کا شوہر ضرور تھا اور وہ ہر طرح سے شوہر پرست عورت لگتی تھی۔ وہ اپنا سرخ عروسی جوڑا اپنے جھولے میں ساتھ لیے پھرتی تھی۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے والی تھی کہ بقول چوہان، سلطانہ نے مجھے تحفظ دینے کے لیے اپنا وہ قیمتی اثاثہ یعنی مہاراج بہادر کی دی ہوئی مہر بھی استعمال کر ڈالی تھی۔ حالانکہ وہ مہر سلطانہ اور اس کے گھرانے کو بڑے سے بڑا فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

اب سلطانہ خود خطرے میں تھی۔ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا تھا۔ جارج گورا کو تو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ میں نے اس کے کردار کے بارے میں جو سنا تھا، وہ اس کے عین مطابق تھا۔ چہرے پر خباثت اور عورت کی بھوک اس کی آنکھوں میں نقش تھی... پھر میں بالو کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ واقعی میرا بچہ تھا... میرا خون؟

اچانک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور صفورا اندر آ گئی۔ پچھلے دو برس میں وہ کافی کمزور ہو چکی تھی اور شاید یہی حال میرا تھا۔ یہ اس مسلسل فاقہ کشی کا نتیجہ تھا جو یہاں ہم سے زبردستی کرائی جاتی تھی۔ اب بھی کل دوپہر سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بھکشو ہمیش آیا تھا اور اس نے خاموشی سے تھوڑے سے بھنے ہوئے چاول مجھے دیے تھے، یہ چاول وہ حسبِ سابق اپنی چادر کے پلو میں باندھ کر لایا تھا۔

اندر آتے ہی میڈم صفورا نے پوچھا۔ ''کل جارج اور بڑے گرو جی میں کوئی جھگڑا ہوا تھا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا اور صفورا کو اپنا زخمی ہونٹ دکھایا۔

وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ بہت بُرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب جارج تمہیں پگوڈا سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں جیل میں لے جایا جائے۔ ابھی حکم جی زرگاں سے باہر ہے۔ ایک دو روز میں وہ آ جائے گا۔ پھر تمہارا یہاں پگوڈا میں رہنا مشکل ہوگا۔''

''تو یہ جگہ بھی جیل سے کون سی کم ہے۔ جیل میں شاید کھانا تو ملے گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں... ایسی بات نہیں... جو کچھ بھی ہے لیکن یہ ایک عبادت گاہ ہے۔ یہاں کچھ اصول اور قاعدے ہیں۔''

"سیڑھیوں پر لٹا کر لوگوں کے سامنے پیٹھ پر بید مارنا کون سا سنہری اصول ہے؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"بید ہی مارے جاتے ہیں نا... الٹا لٹکا کر چمڑی تو نہیں ادھیڑی جاتی۔ عورتوں کو بے عزت تو نہیں کیا جاتا... اور اب یہ بید مارنے والی سزا بھی تو ختم ہو چکی ہے۔ سات آٹھ مہینے پہلے ہی میرے اور ابرار کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب کم از کم ہمیں تو بید نہیں مارے جاتے۔"

"لیکن مجھے تو منگل کو بھی بید مارے گئے ہیں۔" میں نے کہا اور وہ ساری تکلیف و توہین ذہن میں تازہ ہو گئی جو مجھے جھیلنا پڑی تھی۔

"لیکن منگل کے بعد تو ایسا کچھ نہیں ہوا نا۔ اور میرا خیال ہے کہ آئندہ بھی نہیں ہوگا لیکن... اب یہ جو جارج اور بڑے گرو کی تکرار والا معاملہ ہے، یہ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ صدیقی کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔"

"ہاں، مجھے صدیقی کے بارے میں پوچھنا تھا۔ وہ کہاں ہے؟"

"اسے بھی بڑے گرو اور موہن کمار کی تکرار کے بعد جیل جانا پڑا تھا۔ سات آٹھ مہینے تک اسے جیل میں بہت "ٹف ٹائم" گزارنا پڑا ہے۔ بہرحال، اب وہ دوسرے پگوڈا میں ہے اور کسی حد تک سکون میں ہے۔"

کچھ بھکشو لڑکیاں کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لے کر اندر جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے کچھ نوجوان بھکشو چاندی کے گول طشت اٹھائے ہوئے جا رہے تھے۔ میری کوٹھڑی کے اردگرد مکمل سکوت تھا۔ میں نے میڈم صفورا سے کہا۔ "کل ہماری گفتگو کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا تھا۔ آپ مجھے یہ بتانے لگی تھیں کہ پانڈے جیسے بے رحم شخص نے ہمیں لاہور ہی میں قتل کیوں نہ کر دیا یا ہڈیاں وغیرہ توڑ کر ویں کیوں نہ پھینک دیا... چوری کے جرم میں ہمیں یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کیوں لے آیا؟"

میڈم صفورا نے کوٹھڑی کی کھردری دیوار سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "یہ صرف چوری کا معاملہ نہیں تھا۔ ایک "خاص" مجسمہ چوری ہوا تھا جو "مت" کو ماننے والوں کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مت کی تعلیمات کے مطابق اپرادھیوں کے لیے ایک کڑی سزا مقرر تھی۔ اگر اپرادھی یعنی ہم اس سزا سے بچ جاتے تو اس کا وبال گرو حضرات پر اور پورے مٹھ پر آتا۔ لہٰذا ہمیں سزا کے لیے یہاں زندہ لایا جانا ضروری تھا۔ کم از کم دو چار افراد کو تو یہاں ضرور پہنچنا چاہیے تھا اور اگر زیادہ لوگ پہنچ جاتے تو یہ پانڈے اور اس کے ساتھیوں کی "ایکسٹرا پرفارمنس" تھی۔ اب ہم اسے اپنی خوش قسمتی کہہ لیں یا بدقسمتی... کہ ہم پاکستان میں پانڈے کی یورش سے تو بچ گئے لیکن عمر قید بھگتنے کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ ہم کُل پانچ افراد یہاں آئے تھے۔ تم، میں، ابرار صدیقی، عنایت علی اور کرامت سندھو۔ عنایت اور کرامت سندھو کو تم نہیں جانتے بلکہ میں بھی نہیں جانتی۔ بہرحال، یہ بھی اس سلسلے میں شامل تھے اور مجسمہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہو کر صدیقی تک پہنچا تھا۔ ان دونوں بندوں کو پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے بہاولپور سے پکڑا تھا۔ بہرحال، یہ لوگ بعد میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش میں مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگل میں انہیں تیندووں نے مار دیا تھا... اب ہم تین یہاں باقی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ہمارا "اینڈ" کیا ہوتا ہے۔"

میرے اور صفورا کے درمیان تادیر گفتگو ہوتی رہی۔ میڈم صفورا نے تصدیق کی کہ میں نے سات آٹھ ماہ یہاں پگوڈا میں سزا کاٹی ہے۔ ہم سے جبری فاقے کرائے گئے ہیں، ہم نے ماریں کھائی ہیں، صفائیاں کی ہیں، غلاظت خانے دھوئے ہیں اور پتا نہیں کیا کچھ... میڈم جب یہ باتیں کر رہی تھی، میرے ذہن میں دھندلے سے نقش بنتے اور بگڑتے تھے مگر کچھ بھی یاد نہیں آتا تھا۔ میڈم نے اس بات کی تصدیق بھی کی کہ میں یہاں سے فرار ہونے کی کئی کوششیں کر چکا ہوں۔

میں نے کہا۔ "میڈم! مجھے یہ بات غنی صاحب اور پھر چوہان نے بھی بتائی تھی مگر مجھے اس پر یقین نہیں ہوا تھا لیکن اب ہوش میں آنے کے بعد میں خود اس تجربے سے گزرا ہوں۔ یہاں زرگاں پہنچنے سے ایک رات پہلے میں پڑاؤ سے بھاگ گیا تھا..."

میں نے طوفانی بارش میں اپنے ناکام فرار کی ساری روداد میڈم صفورا کے گوش گزار کی اور یہ بھی بتایا کہ آخر میں مجھے کس طرح بالکل غیر متوقع طور پر پکڑ لیا گیا۔ بالکل جیسے تاریک زمین نے تیواری اور ڈیوڈ وغیرہ کو اگل دیا ہو اور وہ اچانک میرے سامنے آن کھڑے ہوئے ہوں۔

میں نے کہا۔ "میڈم! میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ یہ لوگ وہاں اچانک کیسے نمودار ہو گئے۔ یہ سخت حیران کرنے والی بات ہے... میری جگہ کوئی اور بندہ ہوتا جسے جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر یقین ہوتا تو فوراً اس کا دھیان ان چیزوں کی طرف چلا جاتا۔ مگر یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

صفورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں... کچھ ایسی باتیں تو میں نے بھی سنی ہیں کہ پنڈت مہاراج کی آشیرباد سے حکم جی کو روحانی طاقت حاصل ہے اور اس طاقت کی وجہ سے حکم جی کا کوئی قیدی ان کی مرضی کے بغیر اس رجواڑے کی حد سے نہیں نکل سکتا۔ اگر کوشش کرے تو پکڑا جاتا ہے یا مارا جاتا ہے... اور پچھلے کئی برس سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔"

"کیا آپ کو اس بات پر یقین ہے؟"

"نہیں، یقین تو نہیں... لیکن... جب بہت سے لوگ ایک ہی بات کہیں اور بار بار کہیں تو دماغ الجھ ضرور جاتا ہے۔ اب تم بھی ایک تجربہ بیان کر رہے ہو اور یہ تمہارا ذاتی تجربہ ہے۔ ایسی باتوں سے لگتا ہے کہ اس معاملے میں کوئی نہ کوئی بھید ضرور ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ روحانی طاقت والی بات صرف قیدیوں کی حد تک ہی نہیں ہے، مقامی لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "حکم جی" کئی ایسے کام کر سکتے ہیں جو عام لوگوں کے لیے ممکن نہیں۔"

بات کرتے کرتے اچانک صفورا کا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ سب سے پہلے میری نظر تیواری لال کے گہرے سانولے چہرے پر ہی پڑی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا پگوڈا کے صحن میں داخل ہوا تھا اور اب میری کوٹھڑی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ سبز وردیوں والے تین چار مسلح اہلکار بھی تھے۔ ان کی رائفلیں کینوس کے غلافوں میں بند تھیں اور وہ پگوڈا کے احترام میں ننگے پاؤں تھے۔

صفورا نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے لیے ہی آئے ہیں..."

دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ سر پر پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے ایک بوڑھا بھکشو لاٹھی ٹیکتا چلا آ رہا تھا۔ تیواری کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے صاف طور پر طیش اور حسد دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھے بھکشو کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا تھا۔ اس نے صفورا کو مخاطب کر کے کہا۔ "کورتی! تم مٹھ میں واپس جاؤ۔ یہاں کیا کرت ہو؟ یہاں تمہارا کوئی کام نا ہیں۔"

صفورا اٹھی اور مایوس نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کوٹھڑی سے نکل گئی۔ بوڑھے بھکشو نے ایک چھوٹی چابی کی مدد سے میرے گلے کا آہنی کڑا کھول دیا۔ ایک دوسرا بھکشو آگے بڑھا اور اس نے پاؤں سے زنجیر علیحدہ کر دی۔

"چلو۔" تیواری لال نے تحکم سے کہا۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔" اس کے ساتھ ہی ایک باوردی شخص نے مجھے دروازے کی طرف دھکا دیا۔

میں نے دیکھا، بوڑھے بھکشو کی آنکھوں میں میرے لیے ترحم تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی تھی۔ وہ میرے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

باوردی اہل کار مجھے پگوڈا سے باہر لے کر آئے۔ یہاں سیڑھیوں پر ایک کوڑھی شخص کو بیدوں کی سزا دی جا رہی تھی۔ اور گرد کئی افراد کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں بٹھایا گیا۔ جونہی گاڑی کا دروازہ بند ہوا، تیواری لال نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر کئی زوردار جھٹکے دیے... اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ باوردی افراد بھی مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد گاڑی ایک بہت بڑی پختہ عمارت میں داخل ہوئی۔ لگتا تھا کہ یہ انگریزی دورِ حکومت کا کوئی بہت بڑا دفتر ہے لیکن کچھ دیر بعد پتا چلا کہ یہ قدیم عمارت زرگاں کی جیل ہے... میں نے قیدیوں کو خاکی وردی میں ملبوس ادھر سے ادھر جاتے اور مشقت وغیرہ کرتے دیکھا۔ ان کی قمیصوں پر ہندی میں کچھ لکھا تھا اور نمبر لگے ہوئے تھے۔

مجھے گاڑی سے اتار کر ایک دفتر میں پہنچایا گیا۔ یہاں نہایت کرخت شکل والا ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ اس نے میرے کوائف لکھے پھر ایک رجسٹر پر دو تین جگہ میرا انگوٹھا لگوایا۔ مجھے نمبر الاٹ کیا گیا 412۔ اس کے بعد مجھے پاجامے کُرتے پر مشتمل خاکی وردی دی گئی۔ مجھے ایک غلیظ کمرے میں دھکیل دیا گیا تاکہ میں وردی پہن سکوں۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان احکامات پر عمل کروں۔ میرا اندازہ تھا کہ اب مجھے کسی بیرک میں دھکیل دیا جائے گا جہاں نہایت واہیات قسم کے بدبودار لوگ بند ہوں گے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مجھے ایک چھوٹے احاطے میں لے جا کر ایک دوسری گھوڑا گاڑی میں بٹھایا گیا۔ اس گاڑی میں صرف ایک گھوڑا تھا۔ باوردی افراد بدستور میرے ساتھ موجود تھے لیکن اب "سیاہ چہرہ" تیواری لال نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھوڑا گاڑی ایک چھوٹے دروازے سے باہر نکلی۔ غالباً یہ جیل کا کوئی عقبی دروازہ تھا۔ دس پندرہ منٹ تک سفر کرنے کے بعد ہم ایک اور عمارت میں داخل ہوئے۔ میں گھوڑا گاڑی سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ راج بھون کی پُرشکوہ عمارت یہاں سے بس نصف فرلانگ کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ میں جس عمارت میں کھڑا تھا، یہ بھی کافی شان دار تھی۔ اس کے ادھ کھلے مین گیٹ میں سے ندی کا شفاف پانی جھلک دکھا رہا تھا۔ عمارت کے سرسبز لانوں

میں سفید کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور کچھ لوگ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

...تب ہی میری نظر جارج گورا پر پڑی۔ وہ عمارت کے اندرونی دروازے سے نکل کر آیا تھا۔ اس کی بغل میں ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ ایک باوردی اہل کار نے سیلیوٹ مارنے کے بعد کہا۔ ”بندہ حاضر ہے سر!“

جارج گورا نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ”ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ ابھی اسے سرونٹ کوارٹر میں لے جاؤ۔ باتھ وغیرہ کرواؤ۔ دوسرے کپڑے دو۔ پھر ہم اس کے بارے میں بتائیں گا۔“

مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہوں۔ مجھے دھکیل کر سرونٹ کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں دیگر ملازمین بھی موجود تھے۔ وہ میرے ابتر حلیے اور زخم زخم جسم کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دو نے مجھ پر فقرے بھی کسے۔ مجھے ایک کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بٹے کٹے جسم اور عقابی آنکھوں والا ایک ملہوترا نامی ملازم میرا روم میٹ تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، ملہوترا یہاں گھوڑوں کا ٹرینر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سرکش سے سرکش گھوڑا بھی جب پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے تو اس کی آدھی سرکشی ختم ہو جاتی ہے۔

رات کو سونے سے پہلے ملہوترا نے مجھ سے کہا۔ ”سنا ہے کہ تمہیں بھاگنے کی بیماری ہے۔ یہاں اس بیماری سے دور ہی رہو گے تو اچھا ہووے گا۔ رات کو احاطے میں تین کتے کھلے چھوڑے جاوت ہیں اور ان میں سے ہر کتا تیندوے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ بندے کو پھاڑتے پہلے ہیں، اس کا نام بعد میں پوچھتے ہیں...“

رات کو واقعی کوٹھی کے احاطے کی طرف سے دیوہیکل کتوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ یقیناً یہاں کافی تعداد میں پہرے دار بھی موجود تھے۔ کوٹھی کے اندر کہیں مدھم آواز میں پیانو بج رہا تھا اور رقص کی دھن فضا میں بکھر رہی تھی۔ میں جب تک سو نہیں گیا، ملہوترا بھی جاگتا رہا اور بیڑی کے کش لیتا رہا۔ یقیناً وہ میرا روم میٹ ہونے کے ساتھ ساتھ میرا نگراں بھی تھا۔

صبح جاگنے کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پھر ان گنت اندیشے سر اٹھانے لگے۔ مجھے پکوڑا سے جیل لے جایا گیا تھا مگر وہاں بھی ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رکھا گیا تھا۔ اب یہاں میرے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہونے والا تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد ملہوترا مجھے لے کر عمارت کے عقب میں گیا۔ یہاں ایک بہت بڑا اصطبل تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ سو چھوٹے بڑے گھوڑے تو یہاں ہوں گے۔ خچروں کے لیے ایک بہت بڑا اواڑا علیحدہ سے بنایا گیا تھا۔

ملہوترا نے مجھ سے کہا۔ ”تمہیں یہیں پر کام کرنا ہے۔ کچھ کام تو تمہیں آتے ہوں گے، کچھ کام تھوڑے سے تجربے کے بعد سیکھ جاؤ گے۔ گھوڑوں کی لید وغیرہ ڈھونے کے لیے کسی خاص ٹریننگ کی ضرورت ناہیں ہووے ہے۔ ہاں، ان کا کھریرا کرنا، ان کو دوا وغیرہ کھلانا یہ کام ذرا مشکل ہووےیں ہیں۔ یہ آٹھ دس دن میں سیکھ جاؤ گے۔ ناہیں سیکھو گے تو پھر میں سکھا دوں گا۔“ آخر میں اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔“

”دیکھو، یہاں اس سے گندے گندے کام بھی موجود ہیں۔ اسے گورا صاحب کی مہربانی جانو کہ تمہیں اصطبل تک رکھا ہے۔ وہ دیکھو، وہاں کتوں کا واڑا ہے۔ اس سے آگے پالتو سور ہیں۔ سوروں کے گند میں رہ لو گے؟“ اس نے آخری الفاظ بڑی ”محبت“ سے کہے۔

اگلے تین چار دن میری مصروفیت بے حد کڑی اور ناپسندیدہ رہی۔ مجھے علی الصباح منہ اندھیرے اٹھنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے ایک الارم تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین بار بجایا جاتا تھا۔ ایک رات میں نے ایک بہت تیز اور کریہہ آواز والا سائرن بھی سنا۔ پتا چلا کہ یہ خطرے کا سائرن ہے اور عموماً عمارت کے قریب کسی جنگلی جانور کی موجودگی کے وقت بجایا جاتا ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی اصطبل میں میرا کام شروع ہو جاتا تھا۔ اصطبل کے دروازے ساری رات بند رہتے تھے لہٰذا علی الصباح جانوروں کی جو بُو اندر سے اٹھتی تھی وہ ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ اصطبل میں کم و بیش تیس ملازم تھے۔ ملہوترا ان کا سیکنڈ انچارج تھا۔ وہ سارا دن اصطبل کے طول و عرض میں دندناتا اور ملازموں کو ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا۔ مجھ پر وہ خاص شفقت فرماتا تھا۔ کسی چھوٹی سی غلطی کے لیے بالوں سے پکڑ کر بُری طرح جھنجوڑ دیتا تھا اور مقامی لہجے میں گالیاں دیتا تھا۔ وہ مجھے کسی ایک کام پر ٹکنے بھی نہیں دیتا تھا۔ کبھی مالشیوں میں شامل کر دیتا تھا، کبھی گھوڑوں کو کھریاں لگانے والوں میں۔ کبھی چارے کا انتظام کرنے والوں میں۔ گاہے بگاہے وہ مجھے سخت طنز کا نشانہ بھی بناتا تھا۔

ایک دن میرے قریب سے گزرا تو ایک سینئر ملازم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اوئے نادر! لید کی ٹوکری اس کے کندھے پر کیوں رکھوائی ہوئی ہے۔ تمہیں پتا ناہیں یہ سلطانہ راجپوت کا شوہر نامدار ہے۔ آخر کوئی عزت ہووے ہے شوہر نامدار کی۔“

سینئر ملازم نے فوراً ٹوکری میرے کندھے سے اٹھا لی۔ ملہوترا بڑی محبت سے بولا۔ ”مہروز جی! آپ ان چار سفید گھوڑیوں کا کھر کھرا کر لیں۔ دوپہر کے بھوجن تک کے لیے یہ کام کافی ہے۔“

کھر کھرا یعنی کھریرا میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔ میں اس میں صرف پندرہ بیس فیصد مہارت ہی حاصل کر پایا تھا۔ ایک ملازم نے کھریرے والا برش مجھے پکڑا دیا۔ میں ڈرتے ڈرتے پہلی گھوڑی کے پاس گیا۔ وہ اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ میں نے دوسری کوشش کی تو اس نے ایک دم گھوم کر لات چلائی۔ میں الرٹ تھا اس لیے سنگین ضرب سے بچ گیا۔ اس کے باوجود لات میرے کندھے پر لگی اور میں الٹ کر کچی زمین پر جا گرا۔ یہ جگہ پیشاب اور لید سے لتھڑی ہوئی تھی۔ میرا ایک پہلو اور چہرے کی سائڈ بُری طرح لتھڑ گئی۔ اردگرد موجود افراد ہنسنے لگے۔ جی چاہا کہ ان میں سے کسی ایک پر جھپٹ پڑوں اور دو چار گھونسے تو ضرور جڑ دوں لیکن پھر اس کے بعد کی صورتِ حال ذہن میں آئی اور دل مسوس کر رہ گیا۔

ملہوترا کے اشارے پر سینئر ملازم نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور بولا۔ ”تم سے پرسوں بھی کہا تھا۔ پیچھے سے ناہیں سائڈ کی طرف سے آوت ہیں۔“

”اصل میں مہروز صاحب کے ساتھ یادداشت کا مسئلہ ہے بھئی۔“ ملہوترا نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ ”ان کی یادداشت کے ساتھ عجیب گڑبڑ گھوٹالا ہے۔ ان کو دس دن کی باتیں یاد آتی ہیں تو پچھلے دس دن کی بھول جاوت ہیں۔ اور جب وہ یاد آتی ہیں تو اگلے دس دن کا دروازہ بند ہو جاوت ہے۔ یہ اپنے ٹائپ کے بڑے انوکھے مریض ہیں... ان کو تو کسی میوزیم میں ہونا چاہیے جہاں لوگ ان کو دیکھنے آویں اور بھگوان کے چمتکار کا نظارہ کریں۔“ اس قسم کے مذاق میرے ساتھ اکثر کیے جاتے تھے۔

ایک دوپہر عجیب تماشا ہوا۔ میرے علاوہ چھ سات ملازمین اصطبل میں موجود تھے۔ ہم گھوڑوں کے لیے چارا بنا رہے تھے۔ خشک اور تر چارے کو علیحدہ علیحدہ کاٹنا اور پھر اسے مکس کر کے کھرلیوں میں ڈالنا ایک نہایت مشقت طلب کام تھا۔ ہم پسینے سے شرابور ہو رہے تھے... اچانک ایک خوب صورت لڑکی بھاگتی ہوئی آئی۔ غالباً وہ یہ سمجھی تھی کہ اصطبل کے اس حصے میں کوئی موجود نہیں۔ اس نے اندر آ کر دروازہ تیزی سے بند کرنا چاہا مگر ایک شخص دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔

لڑکی ہنستی اور بل کھاتی ہوئی اصطبل کے اندرونی حصے کی طرف بھاگی۔ اس کے پیچھے آنے والا مرد اسے پکڑنے کے لیے دوڑا۔ ہم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ کوئی اور نہیں، یہاں کا کرتا دھرتا جارج گورا تھا۔ وہ نشے میں تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر بس ایک پتلون تھی۔ وہ بڑے رومانی موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے جلد ہی لڑکی کو پکڑ لیا اور گھاس کے ایک بڑے ڈھیر پر گرا لیا۔ لڑکی کے جسم سے ہنسی فوارے کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہونے لگے۔

ملہوترا تیز سرگوشی میں بولا۔ ”چلو چلو... باہر چلو۔“ وہ ملازمین سے مخاطب تھا۔

ملازمین نے شوخ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموشی سے باہر کھسک گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ جارج گورا اور لڑکی گھاس کی حرکت میں گم ہو چکے تھے...

میں دنگ رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ عمارت جارج کی شکارگاہ ہے۔ وہ جہاں اور جب چاہتا ہے، شکار کرتا ہے۔ اپنی طلب کی شدت میں وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس کے اردگرد کا ماحول کیا ہے۔ یہاں کے لوگ غالباً اس کے مزاج کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ موقع کے لحاظ سے اپنا ردِعمل ظاہر کرتے تھے۔ جیسے انہوں نے اب کیا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ ابھی تو مالک نشے میں تھا۔ کل وہ ہوش میں ہوتا تو جواب طلبی کرتا کہ جب وہ اتنے شدید رومانی موڈ میں تھا تو وہ لوگ موقع سے دفعان کیوں نہیں ہوئے تھے۔

ابھی تک میرے ساتھ سختی کا سلوک نہیں ہوا تھا۔ مطلب جسمانی تشدد سے ہے۔ ہاں، اگر بارہ گھنٹے کی شدید مشقت کو دیکھا جائے تو اسے جسمانی تشدد بھی کہا جا سکتا تھا۔ ذہنی تشدد اس کے علاوہ تھا۔ یعنی طنزیہ انداز اور بعض اوقات گالم گلوچ۔ ذہن میں وہ جو ایک اندیشہ سا تھا کہ شاید مجھے الٹا لٹکایا جائے گا یا اس نوع کی کوئی اور کارروائی ہوگی، ابھی تک غلط نکلا تھا۔ لیکن پھر ایک روز ایسا کچھ ہوا جس نے ساری کسر نکال دی۔ وہ میری زندگی کا ایک ایسا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے کہ جسے اپنے خونی آنسوؤں سے تحریر کروں تو بھی حق ادا نہ ہو۔ اور یہ ایسا واقعہ تھا جس نے مجھے بدلا، میری سوچ کو بدلا اور شاید زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ میں وہ نہ رہا جو تھا اور وہ ہو گیا جو نہیں تھا... جو ہزار کوشش کے باوجود نہیں بن سکتا تھا۔

ہاں، وہ ایسے ہی کایا پلٹ لمحے تھے۔

شام کے بعد کا وقت تھا۔ میں اصطبل کے کام سے تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کہ بستر پر گرتے ہی سو جاؤں گا۔ میں نے سارے دن کی بدبو اور پسینے کی چپچپاہٹ کو صاف کرنے کے لیے غسل خانے کا رخ کیا۔ شیو کئی دن سے بڑھی ہوئی تھی لیکن شیو کرنے کا سامان نہیں تھا۔ میں نے نیم ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد کپڑے بدلے اور کھانا کھایا۔ ابھی بستر پر لیٹنے ہی لگا تھا کہ ایک شخص کوارٹر میں داخل ہوا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں بڑے صاحب بہادر نے بلایا ہے۔''

''کیوں خیریت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خیریت کا پتا تو تمہیں وہاں جا کر ہی لگے گا۔ ویسے ڈرنے کی بات ناہیں۔ صاحب بہادر کا ذاتی ملازم اچانک چھٹی پر چلا گیا ہے۔ تمہیں ایک دن کے لیے اس کی جگہ لینی ہے۔''

''ابھی جانا ہوگا؟''

''ناہیں۔ جانا تو دو تین روز بعد ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو پہلے ہی بتا دوں تاکہ آپ اپنے مصروف وقت میں سے تھوڑا سا وقت نکال سکیں۔'' سخت طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

میں اٹھ کر اس شخص کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے وسیع گراسی لان میں سے گزار کر عمارت کے رہائشی حصے میں لے گیا۔ یہ قدیم طرز کی عمارت شاہانہ ٹھاٹ باٹ رکھتی تھی۔ بلند چھتیں، محرابی دروازے، پتھر کے چکنے فرش، دبیز پردے، غالیچے اور نادر قالین۔ غرض وہ ہر شے یہاں دکھائی دیتی تھی جس کا تصور کسی بہترین رہائشی عمارت میں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں جنریٹرز کے ذریعے بجلی مہیا کی گئی تھی اور وہ ساری آسائشیں بھی موجود تھیں جن کے لیے بجلی ضروری ہوتی ہے۔ باوردی ملازمین بے آواز چلتے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ ان میں مرد و زن دونوں شامل تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ملازموں کی اس فوج ظفر موج کے ہوتے ہوئے میری خدمت کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ اس میں کوئی چکر لگتا تھا۔ میں ایک طویل راہداری سے گزر کر ایک شان دار بیڈ روم میں پہنچا۔ یہاں خوشبوؤں کا بسیرا تھا۔ کھڑکیوں پر مخملی پردے تھے۔ سجاوٹ کی امپورٹڈ اشیا اور دیواروں پر سجی ہوئی ان جانوروں کی ٹرافیاں جو جارج گورا کے دستِ ستم کا شکار ہوئے تھے۔ بکال رائفلوں کے ایک نہایت قیمتی جوڑے کے نیچے دیوار پر ایک رائل بنگال ٹائیگر کی کھال آویزاں تھی۔

میرے ساتھ آنے والے شخص نے مجھے بیڈ روم کی جھاڑ پونچھ کا حکم دیا۔ کھڑکیوں کے پردے تبدیل کیے جانے تھے اور پھر بیڈ شیٹ بدلنی تھی۔ ایک طرف بہت سے تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔ ان پھولوں کو گل دانوں میں سجانا تھا اور واش روم پر بھی ایک نظر ڈالنی تھی۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں، میں نے یہ کام کر دیے اور ایک طرف قالین پر بیٹھ گیا۔ مجھے یہاں لانے والا شخص اندر آیا۔ اس نے ناقدانہ نظروں سے بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ ایک دو نقص نکالے، میں نے وہ نقص دور کیے۔ وہ مجھے لے کر ایک اور کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرا عجیب وضع کا تھا... بالکل جیسے کوئی لفٹ ہو۔ لگتا تھا کہ یہ چھوٹا سا چوکور کمرا سارے کا سارا دھات کا بنا ہوا ہے۔ اس کی پیمائش آٹھ فٹ ضرب دس فٹ ہوگی... یا شاید اس سے تھوڑی سی زیادہ۔ یہاں ایک طرف کی دیوار میں آہنی سلاخیں تھیں لیکن سلاخوں کی دوسری طرف بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ سلاخوں سے آگے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر ایک بلائنڈ شیشہ تھا۔

ملازم نے مجھے اس کمرے میں دھکیل دیا۔ ''مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''قوالی۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور دروازہ لاک کر کے باہر چلا گیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سلطانہ اس وقت میرے آس پاس موجود ہے اور جلد ہی میری اس سے ملاقات ہونے والی ہے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ طبیعت میں عجیب سی بے چینی تھی۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ کیا جارج مجھ سے کسی طرح کی پوچھ گچھ کرنے والا تھا یا اس کی رقابت مجھے کسی اذیت سے دوچار کرنے والی تھی۔

اچانک مجھے یوں لگا کہ میرے دونوں پاؤں پر کسی نے بڑے زور سے لٹھ رسید کی ہو۔ ٹانگیں جھنجنا اٹھیں بلکہ پورا جسم جھنجھنا گیا۔ میں تڑپ کر کرسی سے نیچے گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میرے پورے جسم پر جیسے ہتھوڑے برس گئے تھے اور پھر ایک دم سب کچھ تھم گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے کرنٹ لگایا گیا ہے۔ میرے جسم میں غالباً صرف تین چار سیکنڈ کے لیے برقی لہر دوڑی تھی لیکن اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں کچھ دیر تک سکتہ زدہ وہیں پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا... پھر دوسرا حملہ ہوا اور یہ پہلے سے کچھ شدید تھا۔ میرا پورا جسم پھر برقی رو کی زد میں آیا۔ اس دفعہ میں اوندھے منہ آہنی فرش پر گرا اور ایک بار پھر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس مرتبہ میرے منہ سے بے ساختہ دردناک آوازیں نکلیں۔ میں چلّا رہا تھا اور چلّاتا جا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ آخری وقت آ گیا ہے... بس وہ ایک قیامت تھی جس کی شدت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور تب ایک بار پھر اچانک سب کچھ تھم گیا۔ جیسے کسی عفریت نے مجھے نگلنے کے بعد دوبارہ اگل دیا ہو۔

میں کراہنے لگا۔ میرا سارا جسم لرز رہا تھا اور درد کی ٹیسیں بے حال کر رہی تھیں۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟ میرا جرم کیا ہے؟'' میں خوف زدہ ہو کر چلّایا۔

یہ خوف بے پناہ شدت کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا کہ ابھی اس دھاتی کمرے میں پھر کرنٹ چھوڑا جائے گا اور میں موت اور زندگی کے درمیان جھول جاؤں گا۔ سزا دینے والا سامنے ہو تو اور بات ہوتی ہے۔ یہاں سزا دینے والے کا پتا تھا، نہ سزا کی وجہ معلوم تھی۔ نہ یہ پتا تھا کہ اس سزا سے بچنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ یہ زیادہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ مجھے لگا کہ دہشت سے میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ میں اس چوکور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسٹیل کا یہ سلائیڈنگ ڈور لاک تھا۔ میں نے اس پر بے دریغ مکے برسائے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی نے میری آواز سنی۔ میں ننگے پاؤں تھا اور برقی رو کسی بھی وقت دوبارہ فرش میں اور دیواروں میں دوڑ سکتی تھی۔ ایک اضطراری حرکت کے تحت میں کرسی پر چڑھ گیا۔ اپنے دونوں پاؤں سمیٹ کر اوپر رکھ لیے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ بظاہر عام نظر آنے والی یہ کرسی بھی دھات کی ہے۔ اس مرتبہ کرنٹ لگا تو میں جیسے کرسی کے ساتھ ہی چپکا رہ گیا۔ پورا جسم شدید ارتعاش کی زد میں آیا اور میرے حواس مختل ہونے لگے۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں، پھر شاید کبھی ہوش میں نہ آنے کے لیے۔ میری نگاہوں میں اپنے پیاروں کی شکلیں گھومیں۔ فرح، عاطف اور ثروت... کیا انہیں کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ مجھ پر کیا گزری؟ میں کہاں اور کس حال میں شکار ہوا؟

میں مر رہا تھا... جب اچانک ایک بار پھر سب کچھ تھم گیا۔ مجھے لگا کہ میرے منہ سے رال گر رہی ہے اور ناک سے پانی بہہ رہا ہے۔ پورا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اپنی ناک صاف کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو لگا کہ وہ منوں وزنی ہو گیا ہے۔ ان آخری برقی جھٹکوں کے دوران بھی میں بُری طرح چلّایا تھا اور میرے گلے کے اندر خراشوں کی جلن تھی۔

میں نے بولنا چاہا تو بولا نہیں گیا۔ میری یہ حالت بس آٹھ دس منٹ کے اندر ہوگئی تھی۔

کیوں ہو رہا تھا میرے ساتھ یہ سب کچھ؟ کیا یہ صرف رقابت کی کارستانی تھی؟ مجھے جسمانی اذیت دے کر لطف لیا گیا تھا؟ لیکن یہاں تو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تھا تو کیا کسی ویڈیو کیمرے وغیرہ کے ذریعے مجھے دیکھا جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہی منحوس شخص مسکراتے چہرے کے ساتھ اندر آیا جو مجھے اس عقوبت خانے تک پہنچا کر گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک تولیا دیا جس سے میں نے اپنا پسینا پسینا چہرہ پونچھا۔ اس کے ہاتھ میں ملک شیک کا گلاس تھا۔ اس نے مجھے ملک شیک پلایا۔ اس کے بعد مجھے تسلی دی کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ میں یہاں آرام کر سکتا ہوں۔ میں ایک سیکنڈ سے پہلے یہاں سے نکلنے کا آرزومند تھا لیکن وہ مجھے یہاں رکھنے پر مصر تھا۔ اس نے ایک کرسی کو اسٹریچ کر دیا۔ وہ آرام دہ کرسی بن گئی۔ وہ خود باہر چلا گیا۔

اگلے قریباً دو گھنٹے میں نے اسی لفٹ نما کمرے میں گزارے۔ میری حالت اب بہتر تھی لیکن وہ جو برقی رو کا خوف سا دل میں جاگزیں ہو گیا تھا، وہ کسی طور نکل نہیں رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اچانک آہنی کمرے کا دروازہ پھر کھلا اور ملازم نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ ہم ایک خم کھاتے ہوئے کوریڈور سے گزر کر پھر اسی بیڈ روم میں آ گئے جسے ڈھائی تین گھنٹے پہلے میں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا تھا۔ مگر اب یہ بیڈ روم خالی نہیں تھا۔ یہاں جارج گورا کے علاوہ جو چہرہ مجھے نظر آیا، اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ سلطانہ تھی جسے میری بیوی بتایا جاتا تھا۔ سلطانہ کی نظر مجھ سے ملی اور ایک دم جھک گئی۔ مجھے اس میں وہ دم خم نظر نہیں آیا جو اب تک آتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی اور خاموشی سے ایک ٹی ٹرالی پر جھکی، چائے بنا رہی تھی... اس کا لباس بھی آج مختلف تھا۔ اس نے بروکیڈ کا چمکیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آدھی آستینوں میں سے اس کے سڈول بازو جھلک دکھا رہے تھے۔ اس کے لمبے بال ایک موٹی چوٹی کی صورت اس کی گود تک پہنچ رہے تھے۔ ہاں، زیور نام کی کوئی شے آج بھی اس کے جسم پر نہیں تھی۔

''تم بھی چائے پیئں گا؟'' جارج نے گلابی اردو میں پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ''شاید تم بھی ان لوگوں میں سے ہے جن کو دوسروں کی وائف کا بنایا ہوا چائے اچھا لگتا ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ اگر تم کسی دوسرے کی وائف کے ہاتھ کا چائے پینا مانگتا ہے تو اس کا انتظام بھی ہو جائیں گا آج کی

رات۔ ویسے ہم تو آج کی رات تمہاری وائف کے ہاتھ کا چائے ہی پئیں گا۔"

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جارج کی ذومعنی گفتگو اس کے خطرناک ارادوں کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ چوہان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جیل کا انچارج بھی ہے۔ اس کے لیے سلطانہ کو جیل سے نکال کر یہاں اپنے عشرت کدے میں لے آنا کون سا مشکل کام تھا؟ لیکن مجھے حیرانی سلطانہ کا غیر مزاحمتی رویہ دیکھ کر ہو رہی تھی۔ اس نے جارج کی ذومعنی گفتگو ان سنی کر دی تھی اور خاموشی سے چائے بنا رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اس کی سمجھ بھی آ گئی۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ میری نگاہ واش روم کے دروازے کے ساتھ ہی ایک سنہری چوکور شیشے پر پڑی۔ اس سے پہلے جب میں نے اس کمرے کی صفائی کی تھی تو اس شیشے پر مخملی پردہ پڑا ہوا تھا۔ یہ وہی بلائنڈ شیشہ تھا جسے میں نے اپنے آہنی عقوبت خانے میں سے دیکھا تھا۔ بیڈروم کی طرف سے یہ بلائنڈ نہیں تھا۔ یہاں سے عقوبت خانے کی آہنی سلاخیں اور سلاخوں کے پیچھے کا سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں کرسیاں جن پر میں بیٹھا تھا اور وہ خالی گلاس بھی جس میں سے میں نے ملک شیک پیا تھا۔

میں چکرا گیا۔ تو کیا اس بیڈروم کے اندر سے کوئی میری اذیت کا تماشا دیکھتا رہا ہے... وہ کون ہو سکتا تھا؟

جارج اور... سلطانہ ہی ہو سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سلطانہ کی آنکھوں کی غم زدہ سرخی بھی سمجھ میں آ گئی۔ "اوہ گاڈ..." تو یہاں یہ تماشا ہوا تھا۔ عقوبت خانے کا آہنی کمرا ساؤنڈ پروف تھا، لہٰذا باہر کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ممکن تھا کہ میرے تڑپنے پھڑکنے کا منظر دیکھ کر سلطانہ نے واویلا مچایا ہو۔ داد فریاد کی ہو لیکن باہر کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ اندھے شیشے کی وجہ سے میں باہر کا منظر دیکھنے سے بھی قاصر رہا تھا۔

میرا جی چاہا کہ نتائج سے بے پروا ہو کر اس سفید سور پر جھپٹ پڑوں۔ وہ سب کچھ کر گزروں جو کر سکتا ہوں لیکن دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ سفید ہوتا جا رہا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" جارج نے میری آنکھوں میں اپنی نیلی آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں گڑبڑا گیا۔

"میں بتاتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ سلطانہ تمہارا وائف ہے اور تم اپنی وائف کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ شاید تمہارا دل چاہ رہا ہے کہ مجھ پر جھپٹ پڑو۔ میرے ساتھ فائٹ کرو۔ ایک زبردست فائٹ جسے دیکھ کر تمہاری وائف کا ہارٹ خوش ہو جائے۔ پھر تم میرے ہی پسٹل سے مجھ کو شوٹ کر دو اور اپنی وائف کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤ۔"

میں خاموش رہا۔ وہ بڑے زہریلے انداز میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں سب جانتا ہوں تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ تم مجھے ایک بہت بڑا ولن سمجھ رہے ہو جس نے اپنے گارڈز کے زور سے تمہیں بے بس کیا ہے اور اب ایک کمزور عورت کو اپنی طاقت دکھانا چاہ رہا ہو۔ ایسا نہیں ہے مائی ڈیئر... بالکل بھی نہیں ہے۔ مجھے ولن بننا کبھی اچھا نہیں لگتا اور نہ ہی یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی مجھے ولن سمجھے... چلو، میں تمہیں ایک HEROIC پیش کش کرتا ہوں۔ تم سمجھو کہ تم قید نہیں، آزاد ہو۔ تمہارے اردگرد کوئی گارڈ نہیں۔ بس میں اور تم اکیلے ہیں۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور مجھے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ "اور دیکھا جائے تو تم مجھ سے کمزور نہیں ہو۔ قد بھی مجھ سے تھوڑا سا زیادہ ہی ہو گیں گا۔ تم اپنی وائف کو یہاں سے لے جانے کے لیے مجھ سے دوبدو مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیس' مین ٹو مین۔ اور میں پرامس کرتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے زیر کر لیا تو تم سے کوئی بازپرس نہیں ہو گی۔ تم پوری آزادی کے ساتھ اپنی وائف کو لے کر یہاں سے جا سکے گا۔ آئی پرامس یو۔"

میں سکتہ زدہ کھڑا تھا۔ اس نے گلاس میں سے شراب کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور اپنی قمیص کے نیچے سے کولٹ پسٹل نکال کر سامنے قالین پر پھینک دیا۔ پسٹل کا فاصلہ جارج سے قریباً پندرہ فٹ اور مجھ سے صرف سات آٹھ فٹ کے قریب تھا۔ وہ کھلنڈرے انداز میں بولا۔ "پسٹل اٹھاؤ اور کوشش کرو میری باڈی میں ایک ہول کرنے کی۔ چلو شاباش۔"

میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ وہ دعوت دے رہا تھا۔ پستول کا فاصلہ مجھ سے بہت کم تھا۔ اگر میں تیزی سے لپکتا تو پستول اٹھا سکتا تھا۔

لیکن پھر وہی تذبذب... وہی کم ہمتی... وہی ناتوانی۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ جونہی میں پستول کی طرف جھپٹوں گا، جارج بھی جھپٹے گا۔ وہ ایک گھاگ شکاری تھا۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس اعتماد نے مجھے لرزہ براندام کر دیا۔ سلطانہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اسے شاید اس ڈرامائی صورت حال کی توقع نہیں تھی۔

قریباً ایک منٹ گزر گیا۔ میری پیشانی سے پسینا ٹپکنے لگا۔ میں پستول کی طرف نہیں بڑھ سکا۔ جارج کی آنکھوں میں استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے پاؤں کی حرکت سے پسٹل کو کچھ اور بھی میری طرف کھسکا دیا۔ تب وہ دوبارہ پہلے والی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ "اب کیا خیال ہے شوہر صاحب؟" اس نے پوچھا۔

پسٹل اب مجھ سے فقط چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ لوڈڈ ہے۔ اس کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا ہوا تھا۔ بس اس تک ہاتھ پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ میں اب بھی ہمت نہیں کر پایا۔ میرے ہونٹ بالکل خشک ہو چکے تھے۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر میں پسٹل پکڑ کر گولی نہ چلا پایا تو کیا ہو گا۔ کیا جارج مجھے گولی مار دے گا؟ تب جارج آگے بڑھا اور اس نے پسٹل تقریباً میرے پاؤں میں رکھ دیا۔ "شیر بنو یار! تھوڑی سی تو ہمت کرو۔" وہ بولا اور مجھ سے دس پندرہ فٹ کی دوری پر جا کھڑا ہوا۔

میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ پسٹل میرے پاؤں میں تھا۔ ایک دم میرے دماغ میں دھندی بھر گئی۔ میں جھکا۔ میں نے کولٹ پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہی لمحے تھے جب میں نے کسرتی جسم والے جارج کو بجلی کی طرح اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی۔ شاید اس پھرتی کے پیچھے وہ گہرا اعتماد بھی تھا جو مجھ میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پسٹل پکڑ کر پوری طرح سیدھا ہو پاتا، وہ مجھ پر آن پڑا۔

اس کا طوفانی مکا میرے جبڑے پر لگا، میں الٹ کر پیچھے گرا۔ جارج کا دوسرا ہاتھ میرے دائیں ہاتھ پر آیا تھا۔ اس ہاتھ میں پسٹل تھا۔ اس نے میری اس کلائی کو اتنی زور سے مروڑا کہ پسٹل، پکے ہوئے پھل کی طرح میرے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہو گیا۔ اس نے میری ٹھوڑی پر اپنا گھٹنا رسید کیا۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گرانا چاہا لیکن وہ خاصا زورآور تھا۔ پُرتعیش زندگی گزارنے والے عام لوگوں کے برعکس اس کا جسم سڈول اور کافی حد تک پھرتیلا تھا۔ وہ گرنے سے بچ گیا اور میری گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے کر مجھے بے بس کر دیا۔

سلطانہ اس دوران میں سکتہ زدہ بیٹھی رہی تھی۔ اس کا رنگ جو قندھاری اناروں کی طرح دہکتا تھا، زرد ہو چکا تھا۔ جارج نے میری گردن چھوڑی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر بڑے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے ہونٹوں سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا اور میں اس کا نمکین ذائقہ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے پسٹل اٹھایا اور اس مرتبہ اسے میرے نیفے میں اڑس دیا۔ تب وہ ایک بار پھر دس بارہ فٹ دور جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں نیلا زہر تھا اور چہرے پر اعتماد کی بے پناہ چمک۔ ہم دونوں آمنے سامنے اس کشادہ بیڈروم میں کھڑے تھے جس میں دنیا کی بہترین آرائشی چیزیں موجود تھیں اور یہ جارج کی شکارگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاید آج وہ یہاں پھر ایک شکار کھیلنے والا تھا اور اس کے نشانے پر وہ راجپوت مسلم لڑکی تھی جسے میری بیوی کہا جاتا تھا۔ اپنے عالی شان بیڈروم کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا جارج گورا بڑے خباثت بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ یقیناً یہ بات اس کی انا کی تسکین کا باعث تھی کہ میں نے ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے آج اس کمرے کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ اسے چمکایا ہے اور پھولوں سے سجایا ہے۔ یہ بھی اذیت رسانی کی ایک قسم ہی تھی۔

وہ دونوں بازو اپنی دونوں جانب لٹکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ کاٹرائے کی پتلون اور "ڈینم" کی ہاف سلیو شرٹ میں سے اس کا ٹھوس جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "چلو برادر! ایک اور کوشش کرو۔ اب تو یہ اور بھی ایزی ہے۔ پسٹل تمہارے پاس ہے۔ چلو شاباش! مجھے وشواس ہے کہ تم کامیاب ہو جائیں گا۔"

میں ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اس کی عقابی آنکھیں میری ہر حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔ اپنے پچھلے پاؤں پر جھکے ہوئے کسی خطرناک تیندوے کی طرح ہی وہ مجھ پر جست لگانے کو بالکل تیار تھا۔ کہتے ہیں، خطرناک درندوں کی نظر ان کے شکار کو ہپناٹائز کر دیتی ہے۔ وہ حرکت نہیں کر سکتے۔ اپنا دفاع نہیں کر سکتے... بھاگ بھی نہیں پاتے۔ میں بھی شاید ہپناٹائز ہو چکا تھا۔ جارج کے بے پناہ اعتماد نے مجھے مبہوت کر دیا تھا... میں نے ایک اضطراری نگاہ سلطانہ پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں بے چارگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ جیسے بڑی اچھی طرح جان چکی تھی کہ جارج کا سامنا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

میں نے ایک بار پھر اپنی بچی کھچی طاقت جمع کی۔ اپنے دل و دماغ پر لعنت ملامت کے تازیانے رسید کیے۔ خود کو سمجھایا کہ پسٹل تمہارے پاس ہے، تمہارے ہاتھ سے بمشکل ایک فٹ کی دوری پر ہے۔ تم اسے پلک جھپکتے نکال سکتے ہو۔ جارج کے جست لگانے سے پہلے بہ آسانی اس پر فائر کر سکتے ہو۔

میرے جسم کے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ سینے کے

اندر جیسے ایک مشعل زور سے پھڑپھڑانے کے بعد ایک دم بجھ گئی۔ میرے دل نے کہا۔ ”تم یہ نہیں کر سکتے تابی... یہ تمہارے بس میں نہیں۔“

یہ کچھ ویسی ہی کیفیت تھی جو لاہور کے نواح میں ڈیک نالے کے کنارے تاریکی میں لہلہاتے سرکنڈوں کے پاس، مجھ پر اس وقت طاری ہوئی تھی جب عمران نے نالا پار کرنے کے لیے مجھے اپنی طرف بلایا تھا اور میں صد کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکا تھا۔ اور یہ کوئی ایک موقع تو نہیں تھا۔ ایسے نہ جانے کتنے مواقع میری زندگی میں آچکے تھے۔

میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جارج کے سرخ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ زیادہ گہری اور زہریلی ہوگئی۔ وہ نپے تلے قدموں سے میری طرف آیا۔ اس نے میری قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا پسٹل واپس لے لیا اور گمبھیر انداز میں بولا۔ ”لگتا ہے کہ تم انڈین فلمیں نہیں دیکھتا۔ ان فلموں میں تو ایسے موقعوں پر ہیرو ایک دم شیر ببر بن جاتا ہے۔“

میں خاموش رہا۔ وہ سلطانہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”سلطانہ ڈیئر! یہ شاید ہیرو ہے ہی نہیں۔ تم نے اسے خوامخواہ ہیرو بنایا ہوا تھا۔ اس کا جگہ تو تمہارے پاؤں میں بھی نہیں بنتا اور تم نے پتا نہیں اسے کہاں تک اجازت دے رکھا تھا۔“

سلطانہ بھی خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کے جسم سے پھوٹنے والی جنگلی پھولوں کی خوشبو نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔

جارج نے وسکی کا ایک گھونٹ لیا اور میری طرف گھوم کر بولا۔ ”چلو باسٹرڈ! اب نکلو یہاں سے۔ اب یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔“

باسٹرڈ کی گالی میرے سینے پر گھونسے کی طرح لگی۔ لیکن پچھلے تین چار گھنٹوں میں ایسے نہ جانے کتنے گھونسے میں سہہ چکا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”سلطانہ کا اگر کوئی قصور ہے تو اسے قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے... تم... اسے جیل سے یہاں کیوں لائے ہو؟“

”یہاں اسے سزا دینے کے لیے نہیں محبت کرنے کے لیے لائے ہیں... مائی ڈیئر چوہے!“ جارج نے دانت پیس کر گلابی اردو میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے گریبان سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکا دیا۔

میں چاندی کے ایک قیمتی گل دان پر گرا۔ گل دان نیچے لڑھک گیا۔ میں نے مزاحمتی نظروں سے جارج کو دیکھا۔ وہ ایک دم پھر آگ بگولا ہو گیا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو باسٹرڈ! ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

اس نے زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا۔ پھر مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور دیوار پر دے مارا۔ وہ ایک بار پھر مجھ پر پل پڑا تھا۔ سلطانہ چلاتی ہوئی ہم دونوں کے درمیان آگئی۔ اس نے میرا گریبان جارج کے ہاتھوں سے چھڑایا۔ پھر مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ ”تم چلے جاؤ یہاں سے۔ میری خسمت (قسمت) میں یہی ہے۔ تم جاؤ۔“

اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے مجھے دروازے سے باہر دھکیلا۔ پھر دروازے کو ہولے سے بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کے چہرے کی بے چارگی کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ میرا پورا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ہٹا کٹا ملازم آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ ایک گارڈ بھی تھا۔ عقب میں دو باوردی گارڈز مزید کھڑے تھے۔ ہٹے کٹے ملازم کی آنکھوں میں چھپا چھپا تمسخر تھا۔ ”چلو جی پتی ویو صاحب۔“ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے چلا۔

جلد ہی مجھے واپس میرے کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ کوارٹر میں آج اتفاقاً میں اکیلا تھا۔ اصطبل کا سیکنڈ انچارج اور میرا روم میٹ ملہوترا آج اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور چارپائی پر چت لیٹ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ سینے میں انگارے دہک رہے تھے۔ میں تصور کی نگاہ سے کچھ دل دوز منظر دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ، جارج کے پنجۂ ستم میں تھی۔ اسی چار دیواری میں... اسی چھت کے نیچے۔ پھر مجھے بالو کا خیال آیا، وہ پتا نہیں کہاں تھا؟ وہ بھی تو اپنی ماں کے ساتھ ہی جیل گیا تھا۔ شاید وہ بھی اسی چار دیواری میں کہیں تھا۔

مجھے لگا کہ میرے سر کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہچکیوں سے رونے لگا۔ میں اتنا رویا کہ میرا بازو آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ پر طیش آرہا تھا۔ خود کو مار لینے کو دل چاہتا تھا... میں نے بلک کر فریاد کی... ”اے خدا! میری اس بے کار زندگی کو ختم کر دے۔ میں اور جینا نہیں چاہتا اور دکھ سہنے کی ہمت نہیں۔ میں وہی رہوں گا جو ہوں۔ ایک بے کار، بزدل کمزور اور نحوستوں کا مارا انسان... میرے بخت میں تاریکیوں اور ذلتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں ہار گیا ہوں یارب...“

آج میں اس قدر ٹوٹا ہوا تھا کہ خدائے بزرگ و برتر کو پکارتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تپش تھی۔ شاید یہ دعا نہیں تھی، شکوہ تھا۔ ایک ایک کر کے مجھے اپنے سارے کرتوت یاد

آرہے تھے۔ میں نے ثروت کو اپنی آنکھوں سے بربادی کی طرف جاتے دیکھا اور کچھ نہ کر سکا۔ میری ماں میرے سامنے اذیتیں سہہ کر مر گئی۔ میرا یار، میرا غم گسار سراسر میری بزدلی کا شکار ہو کر تاریکیوں کا رزق ہو گیا۔ اور آج... ایک غیر ملکی بدکار نے میری مبینہ بیوی کی آنکھوں کے سامنے میری بے مثال ذلت کا انتظام کیا۔ اس نے مجھے مزاحمت کرنے کے دلیرانہ موقع دیے اور بار بار مجھے شرمناک پسپائی سے دوچار کیا...

میں روتا رہا۔ میری آنکھوں سے آتشیں آنسو بہہ کر میرے رخساروں پر چلتے رہے اور میری بے بسی کا نوحہ پڑھتے رہے۔

نہ جانے کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر کمرے میں روشن موم بتی پگھل پگھل کر ختم ہو گئی اور کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ کمرے سے باہر دیوہیکل کتے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے اور گاہے بگاہے مسلح پہرے داروں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان پہرے داروں میں دو گھڑسوار بھی شامل تھے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے عمارت کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چکر مکمل کرتے تھے۔

میں اس رات بہت رویا لیکن جتنا رویا، آنکھوں کی آگ اتنی ہی بھڑکتی گئی۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے سوچا کہ خود کو ختم کر لوں۔ کوارٹر کے باورچی خانے میں سبزی اور گوشت کاٹنے والی تیز چھری موجود تھی۔ میں اس سے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ سکتا تھا اور موت کی آغوش میں پہنچنے کے لیے چارپائی پر چت لیٹ سکتا تھا... یا پھر الماری میں سے شراب کی وہ بوتلیں نکالتا جو ملہوترا نے اپنے استعمال کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ اتنی زیادہ شراب اپنے معدے میں انڈیل لیتا کہ میری موت واقع ہو جاتی۔ اس طرح کے کچھ مزید جان لیوا خیال بھی ذہن میں آئے لیکن ان سب میں سے، چھری سے رگیں کاٹنے والا خیال غالب رہا۔

اس رات دل و دماغ کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی کہ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ شاید یہ وہی کیفیت تھی جو دو ڈھائی سال پہلے مجھ پر لاہور میں طاری ہوئی تھی۔ میں گندم کی گولیاں نگلنے کے لیے سو فیصد تیار ہو گیا تھا۔ اس وقت تو عمران کی صورت میں ایک ”روشن چہرہ“ فرشتہ آیا تھا اور مجھے میرے ارادے سے روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن آج یہاں کس نے آنا تھا؟ آج کسی نے نہیں آنا تھا۔

میں نہایت گہری تاریکی میں ٹٹولتا ہوا اٹھا اور باورچی خانے میں سے نہایت تیز پھل والی چھری لے آیا۔ اندوہ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ مجھے یہ سب کچھ آسان لگنے لگا تھا۔

میں بستر پر لیٹ گیا۔ گہری تاریکی میں آنکھیں بند کر لیں۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنے قریب سے کہیں عمران کی آواز سنائی دی۔ ”کیا کر رہے ہو تابی؟“

میں چونک کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کوئی نہیں تھا مگر آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں ششدر رہ گیا۔ یہ صرف میرے تصور کا کرشمہ تھا۔

میں نے آنکھیں پھر بند کر لیں، عمران کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اس نے بڑی ادا سے میری طرف دیکھا۔ ”جگر! بھول گئے جو میں نے کہا تھا؟“

”کیا کہا تھا؟“ میں نے اشک بار لہجے میں بہ زبانِ خاموشی پوچھا۔

اس کے تصوراتی ہاتھ نے آگے بڑھ کر میری ناک کو چٹکی میں پکڑا اور بولا۔ ”لکڑی کے باندر! تیرا بھیجا بھی ایک دم فائیو اسٹار ہے۔ میں نے ایک مرتبہ خودکشی کے بارے میں کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے یاد رکھنا...“

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس جھماکے کے ساتھ ہی عمران کا تصور اوجھل ہو گیا۔ تاہم یہ تصور اوجھل ہوتے ہوتے ایک ایسا جملہ میرے دماغ کو تھما گیا جس نے مجھے سرتاپا ہلایا اور میرے مُردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑائی۔

مجھے ان نہایت سنگین گھڑیوں میں عمران کا وہ بے مثال چمکیلا فقرہ یاد آیا جو اس نے مجھ سے ملنے کے بعد لاہور میں کہا تھا۔ اس نے کہا تھا... ”اگر تمہیں خودکشی کرنی ہی ہے تو پھر اس کی ذمے داری خود پر نہ لو... بس اپنے آپ کو جان لیوا حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ جو قدرت کو منظور ہوگا، وہ ہو جائے گا۔“

اس کا یہ بھولا بسرا فقرہ اتنی شدت سے میرے دماغ میں آیا کہ سوچ کے بے شمار بند کواڑوں کو ایک دھماکے سے کھول گیا۔ شاید کچھ لمحے ایسے ہی انقلاب آفریں ہوتے ہیں اور کچھ لفظ ایسا ہی ”کایا پلٹ“ اثر رکھتے ہیں۔ میں مبہوت رہ گیا۔ وہ منوں وزنی بوجھ جو میرے سینے کو کچل رہا تھا، اچانک میرے سینے سے ہٹ گیا۔ مجھے لگا کہ مجھے اپنی نجات کی راہ نظر آگئی ہے۔ یہ کیا ہوا تھا؟ یکایک تبدیلی کی یہ کیسی ہوا چلی تھی میرے اندر؟ شاید یہ سب اس گریہ زاری کا صلہ تھا جو آج شب میں نے اپنے خدا کے حضور کی تھی اور ان بے شمار آنسوؤں کا اجر جو آج اس کمرے کی تیرگی میں، میں نے بہائے تھے۔ تو کیا قدرت نے بالآخر میری سن لی تھی؟ میں مرنا چاہتا تھا لیکن حرام موت مرنا نہیں چاہتا تھا اور مجھے راستہ نظر آرہا تھا۔ وہی راستہ جو میرے یار نے مجھے ایک روز دکھایا

تھا۔ آگے بڑھنے کا... سنگین ترین خطرات سے ٹکرانے کا۔ موت کے پیچھے بھاگنے کا... اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا لیکن یہ خوف کا لرزہ نہیں تھا۔ یہ کچھ اور تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ باہر عمارت کے وسیع احاطے میں گیس لیمپس کی مدھم روشنی موجود تھی۔ اندرونی کمروں میں برقی روشنی تھی جو جنریٹرز سے مہیا ہوتی تھی۔ میرے کوارٹر سے چند گز کے فاصلے پر وہی ہٹا کٹا مسلح ملازم کھڑا تھا جو پانچ چھ گھنٹے پہلے مجھے کسی گائے بکری کی طرح ہانک کر عمارت کے اندرونی حصے میں لے گیا تھا اور ''عقوبت خانے'' کے حوالے کیا تھا۔ چھوٹی نال کی ایک رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ وہ ٹہلنے کے ساتھ ساتھ ٹرانزسٹر ریڈیو پر بھی کچھ سن رہا تھا۔

وہ قطعی بے پروا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں عجیب ذہنی کیفیت میں کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ میں نے جوتی بھی پہنی ہوئی ہے یا نہیں۔ مجھے اردگرد موجود کوئی اور شخص دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ رکھوالی کے خوفناک کتے کہاں ہیں؟ چھت پر موجود مسلح پہرے دار کی پوزیشن کیا ہے؟ اور میں ان باتوں کے بارے میں سوچتا بھی کیوں؟ میں تو موت کا راہی تھا۔ مجھے مرنا تھا یا مار دینا تھا اور جتنی جلدی یہ مرحلے طے ہو جاتے، اتنا ہی بہتر تھا۔ میں اپنی دلی کیفیت بالکل کھول کر بیان کر رہا ہوں اور حقیقت یہی ہے کہ ان لمحوں میں مجھے اپنے اردگرد موجود تمام رکاوٹیں اور دیواریں یکسر حقیر نظر آئیں۔

میں اندھا دھند مسلح شخص کی طرف بھاگا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ میری طرف مڑا اور اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی ہے... اور یہ وہی تیز پھل والی چھری تھی۔ مجھے یوں اپنی طرف آتے دیکھ کر گوبندر نامی یہ ملازم گھبرایا۔

''اوئے... اوئے...'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ میں اس پر جا پڑا۔ میں نے بایاں ہاتھ اس کے گریبان پر ڈالا۔ میرے دائیں ہاتھ کی ''مہلک حرکت'' میں میری عمر رفتہ کی ساری بے بسی، بے چارگی اور اذیت ایک عجب لہر بن کر دوڑ رہی تھی۔ تیز دھار چھری قریباً آٹھ انچ تک گوبندر کے چربی دار پیٹ میں گھسی۔ گوشت اور لوہے کا تصادم... گوشت کٹنے کی آواز، گوبندر کی کربناک آہ... اور اپنے ہاتھ پر گرم خون کے چند چھینٹے... یہ سب کچھ میں نے پورے ہوش وحواس کے ساتھ محسوس کیا۔

میں نے چھری کھینچی لیکن وہ نہیں نکلی۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ کسی کو چھری ماری جائے تو وہ اس طرح پھنس بھی جاتی ہے۔ گوبندر پشت کے بل گرا۔ اس کی رائفل اس کے جسم سے علیحدہ ہو گئی۔ میں نے رائفل اٹھائی۔ میری نگاہیں ایک لمحے کے لیے گوبندر کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی تھی... اب رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ مجھے ایک دفعہ عمران نے بتایا تھا کہ سیفٹی کیچ کہاں ہوتا ہے اور کیسے ہٹایا جاتا ہے۔ میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا... اور مین گیٹ کی طرف دوڑا۔ ابھی مین گیٹ سے پندرہ بیس قدم دور تھا کہ دو دیوہیکل کتے میری طرف جھپٹے۔ یہ خوفناک منظر تھا لیکن موت سے بڑھ کر خوف اور کس چیز کا ہو سکتا ہے... اور میں ان لمحوں میں اس خوف پر غلبہ پا چکا تھا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ دھماکوں کے ساتھ رائفل نے شعلے اگلے۔ میں نے کم وبیش چھ فائر کیے۔ عمارت کے سناٹے تہلکہ خیز آوازوں سے گونج اٹھے۔ دونوں کتے مجھ سے دس پندرہ قدم کی دوری پر گر گئے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

اب میرا رخ گیٹ کی طرف تھا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ عمارت کے بیرونی گیٹ سے نکلنا میرے لیے اس قدر آسان ثابت ہوگا۔ یہاں تو خوفناک سرخ آنکھوں والے ڈشکرے چکراتے تھے اور ان کی رائفلوں پر چڑھی ہوئی سنگینیں لشکارے مارتی تھیں۔ رات کے اس پہر گیٹ پر صرف دو افراد موجود تھے۔ وہ سگریٹ پھونک رہے تھے اور ان کی رائفلیں چوبی کیبن کی دیوار کے ساتھ رکھی تھیں۔ انہوں نے دو تین سیکنڈ تو صورتِ حال کو سمجھنے میں لگا دیے۔ پھر وہ رائفلوں کی طرف لپکے۔ ایک پہرے دار ٹانگ پر گولی کھا کر راستے میں ہی گرا، دوسرا رخ بدل کر باہر کی طرف بھاگا۔

میں دندناتا ہوا مین گیٹ سے باہر تھا۔ میرے دونوں ہاتھ بڑی مضبوطی سے رائفل پر جمے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں میں لہو تھا۔ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھے دور درختوں میں ایک گھوڑا گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں اس کی طرف دوڑا۔ ''رک جاؤ... رک جاؤ... گولی مار دوں گا...'' عقب سے ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ میں نہیں رکا... اب مجھے نہیں رکنا تھا... مجھے اندازہ ہوا کہ عمارت میں بے شمار روشنیاں جل اٹھی ہیں۔ ہر طرف خطرے کے مخصوص الارم بجنا شروع ہو گئے تھے۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

للکار

طاہر جاوید مغل

زمانہ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں
اڑتا پھرتا ہے۔ خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے
یار کے طواف میں محو رہتا ہے..... مگر آج عشق کی اقدار میں
تبدیلی وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے..... جس نے
عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے..... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی
ہے..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے
جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ
دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے..... ایسے ہی
عاشقوں کے گرد گھومتی داستان۔ محبت جہاں ایک عاشق عشق
پیشہ ہے..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی
اور قدر ہے..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمع نظر مختلف ہے۔
زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر..... عقل و
شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے.....
کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر..... ایک للکار ہے۔

آٹھویں قسط

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے۔ لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آ گئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ میں جدائی کی آگ میں تڑپ تڑپ گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ ثروت کہاں ہے۔ اسی دوران میں اپنے گھر کے قریب سیٹھ سراج اور اس کے غنڈوں سے میرا سامنا ہو گیا اور

انہوں نے درجنوں لوگوں کے سامنے مجھے بری طرح زدوکوب کیا۔ میری حساس طبع کے لیے یہ سب کچھ نہایت تباہ کن تھا۔ میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ عمران ایک انوکھا کردار تھا۔ اس نے پتا چلایا کہ ثروت کو اغوا کرنے والے واجی کا باپ سیٹھ سراج نوادرات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ بڑی بے باک لڑکی تھی۔ وہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران سرکس کا ایک مقبول فن کار بھی تھا۔ وہ سرکس میں اپنے شوق کی خاطر کچھ نہایت خطرناک کھیل بھی کھیلتا تھا۔ اس نے یہ جان لیوا کھیل مجھے بھی دکھائے۔ وہ میرے اندر بھی زندگی کی امنگ ترنگ اور جوش پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔ اسی دوران میں عمران اور اس کے دوست اقبال نے ایک مجید منھو نامی غنڈے کا سراغ لگایا۔ مجید منھو کو پکڑنے کے بعد عمران نے اس سے سوال جواب کیے تو پتا چلا کہ وہ بھی میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ ایک ایڈووکیٹ ابرار صدیقی سے بھی اس کا دوستانہ تھا۔ ابرار صدیقی کے پاس بہا تما بدھ کا کوئی نادر مجسمہ تھا جسے میڈم صفورا ہر صورت خریدنا چاہتی تھی مگر صدیقی بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ اور نامعلوم لوگ بھی اس مجسمے کے پیچھے تھے۔ مجید منھو نامی شخص کی ہلاکت پر... شک کی بنا پر میڈم صفورا نے عمران کو اغوا کرا لیا۔ میں اور اقبال بھی میڈم کی دسترس میں چلے گئے۔ وہاں عمران نے اپنی خوش بیانی سے صفورا کو قائل کر لیا کہ وہ اس کا مطلوبہ مجسمہ ابرار صدیقی کی تحویل سے نکال لائے گا۔ اس نے واقعی یہ کام اتنی خوش اسلوبی سے کیا کہ میڈم اش اش کر اٹھی۔ تاہم میڈم کی چھوٹی بہن نادیہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔ عمران کی توجہ اپنی گرل فرینڈ شاہین کی طرف تھی جس کی وجہ سے رقابت پروان چڑھ رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سردمہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی دردناک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل کے دوران میں حیران کن طریقے سے لیا۔ اس نے نادیہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ درجنوں تماشائیوں میں سے کسی کو شک تک نہیں ہو سکا۔ نادیہ شدید زخمی ہو گئی۔ میری بے وقوفی، کم ہمتی کی وجہ سے نادیہ کے زخمی ہونے کا پول کھل گیا۔ عمران نے مجھے ان افراد کی گرفت سے چھڑایا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ میں نے عمران کو پہلی بار تھوڑا پریشان دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میڈم صفورا بہن کا انتقام لینے کے لیے شعلہ جوالا بن جائے گی۔ اور یہی ہوا۔ میڈم کے ہرکاروں سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ نے میرا اور عمران کا پیچھا کیا۔ اس خونی تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میڈم صفورا اب میری ماں، بہن اور بھائی کے لیے خطرہ بنے گی۔ میں انہیں بچانے کے لیے ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا کے لوگ دندناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو تو موقع سے بھگا دیا، خود والدہ کے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسد خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ میرے دماغ میں عجیب دھند بھری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک طویل عرصے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم ایک کھوہ میں چلے گئے... سلطانہ کا تعاقب کرتا ہوا ایک ہارون نامی شخص کھوہ میں پہنچا اور سلطانہ کی کلہاڑی سے زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ میں نے سلطانہ کے ساتھ مل کر اس شخص کو باندھ دیا۔ ہم اس کھوہ سے نکل گئے۔ راستے میں ہاشو نام کا ایک گونگا شخص بھی ایک شیر خوار بچے سمیت ہم سے مل گیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اترپردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ حیرت کی شدت سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ سلطانہ مجھے ایک مسلمان بزرگ عبدالغنی صاحب کے پاس لے آئی۔ ہم ان کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اس جگہ کو بھاٹڑیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی تل پانی میں آئی ہے۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارمختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ لیکن یہاں مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں نے چھوٹے سرکار کے اہل کاروں کے سامنے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کر دیا... سلطانہ کو پناہ ملنے کا امکان معدوم ہو گیا۔ چھوٹے سرکار کے اہل کار اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبدالغنی کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سر کی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں پچھلے دو برس کی باتیں بالکل بھولا ہوا ہوں۔ ابھی میں اور چوہان باتیں کر ہی رہے تھے کہ جنگل کی طرف سے کسی جانور کی آواز آئی۔ یہ آواز دراصل چھوٹے سرکار کے چھوٹے بھائی کنور بابو کے ہاتھی کی تھی جو بستی میں گھس آیا تھا اور اس نے ایک نوجوان کو زخمی کر دیا تھا۔ بعد میں چھوٹے سرکار نے اپنے بھائی کو سزا دی۔ بہرحال مجھے چھوٹے سرکار کی عدالت میں پیش کیا گیا اور بعد ازاں مجھے اور سلطانہ کو حکم جی کے لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی مگر حیرت انگیز طور پر پکڑا گیا۔ زرگاں میں مجھے پگوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ وہاں مجھ سے اصطبل میں کام لیا جانے لگا۔ ایک روز مجھے جارج کی رہائشی عمارت میں موجود لفٹ نما کمرے میں بند کر دیا گیا اور مجھے کرنٹ لگایا گیا۔ یہ منظر ایک کھڑکی کے ذریعے سلطانہ نے بھی دیکھا۔ پھر جارج نے مجھے لڑائی کی پیشکش کی اور مجھے بہت موقع دیے۔ مگر میں اپنی کم ہمتی کی وجہ سے کچھ نہ کر سکا۔ سلطانہ نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس نے مجھے وہاں سے بھیج دیا اور خود وہیں رک گئی۔ میرا یہ دوچ زبراحال ہونے لگا۔ میں بہت رویا اور پھر عمران کے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے۔ میں مار دو یا مر جاؤ کا عہد کرتے ہوئے اٹھا اور باہر نکل کھڑا ہوا۔ میں نے دو گارڈز کو زخمی کیا۔ دو کتوں کو ہلاک کر ڈالا۔ میرے سینے میں آتش آگ تھی۔ ہاتھ میں رائفل تھی۔ میں نتائج سے بے پروا باہر کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا اور پھر ہر طرف خطرے کے مخصوص الارم بجنا شروع ہو گئے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

الارموں کی آواز بڑی تیز اور کریہہ تھی۔ جیسے کوئی بدبودار مکروہ جانور اپنے گروہ کو اکٹھا کرنے کے لیے چلا رہا ہو۔ یہ ڈوبتی ابھرتی آواز عمارت کے مین گیٹ اور جنوب کی باؤنڈری وال کی طرف سے ابھر رہی تھی۔ میری نگاہ گھوڑا گاڑی پر تھی۔ میں سیدھا گھوڑا گاڑی کی طرف گیا۔ گیس لیمپ کی مدھم روشنی میں گاڑی بان نے میرا حلیہ اور میرے تاثرات دیکھے تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ مجھے لگا کہ وہ گاڑی سے چھلانگ لگا کر بھاگ نکلے گا۔ اگر وہ بھاگ نکلتا تو یہ گاڑی میرے لیے بے کار تھی۔ میں گھوڑوں کو ہانک نہیں سکتا تھا۔

میں نے رائفل گاڑی بان کی طرف سیدھی کی اور پھنکار کر کہا۔ ”خبردار! نیچے نہ اترنا... گولی مار دوں گا۔“

زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ میں نے اس انداز میں کسی کو دھمکایا تھا اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس شخص نے میری بات نہ مانی تو میں اسے گولی مار دوں گا اور یہی بات شاید درمیانی عمر کے اس گاڑی بان کو بھی معلوم ہو گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میں جست لگا کر گاڑی کے اگلے حصے پر سوار ہوا اور بے دریغ رائفل کی نال گاڑی بان کی فربہ گردن پر رکھ دی۔

”گاڑی بھگاؤ۔“ میں نے نال اس کی گردن میں دھنساتے ہوئے کہا۔ غیظ و غضب کی شدت سے میری آواز اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ خود مجھ سے بھی پہچانی نہیں گئی۔

گاڑی بان نے ایک لحظے کے لیے تذبذب دکھایا۔ میں نے رائفل اس کے سر پر ماری... اس کی پگڑی اچھل کر دور جا گری۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باگیں تھام کر چابک دکھایا۔ گاڑی کے دونوں گھوڑے ایک جھٹکے سے آگے بڑھے۔ یہی وقت تھا جب میں نے عمارت کے آہنی گیٹ پر ہلچل دیکھی۔ گارڈز افراتفری میں باہر آ رہے تھے۔ بوکھلاہٹ اور تاریکی کے سبب انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ پہلے انہوں نے اندھا دھند ہوائی فائرنگ کی۔ پھر کسی نے تیزی سے درختوں میں اوجھل ہوتی ہوئی گھوڑا گاڑی کو دیکھا۔

”وہ دیکھو۔“ ایک پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

اسی دوران میں گھوڑا گاڑی نے درختوں کے درمیان ایک موڑ مڑا اور بل کھاتے راستے پر سرپٹ بھاگتی چلی گئی۔

مجھے پتا تھا کہ تعاقب کیا جائے گا۔ جلد ہی تعاقب کے آثار نظر آنے لگے۔ دور عقب میں تیزی سے حرکت کرتی مشعلیں دکھائی دیں۔ یقیناً یہ وہ مسلح گھڑ سوار تھے جو جارج کی رہائش گاہ سے نکلے تھے اور تیزی سے میری طرف آ رہے تھے۔

”تیز چلاؤ۔“ میں نے گاڑی بان کے ننگے سر پر رائفل کے آہنی بیرل کی ٹھوکر لگائی۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باگوں کو جھٹکے دیے اور چابک لہرایا... گھوڑوں کی گردنیں اوپر اٹھیں اور رفتار ایک دم بڑھ گئی۔

گھوڑوں اور گھوڑا گاڑی کی رفتار میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ ایک دو منٹ میں ہی گھڑ سوار نزدیک آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے گولیاں چلائیں۔ دھماکوں سے شعلے لپکے۔ گولیوں کی شائیں شائیں ہمارے سروں سے کافی اوپر سنائی دی۔

یقیناً یہ فائرنگ مارنے کے لیے نہیں ڈرانے کے لیے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم گھوڑا گاڑی روک لیں۔ میں نے ایک بار پھر رائفل، گاڑی بان کی گردن میں دھنسائی اور سرسراتی آواز میں کہا۔ ”گاڑی روکو گے تو اسی جگہ گولی مار دوں گا۔“

گاڑی بان بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

یہ گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتا ہوا تاریک اور نیم پختہ راستہ تھا۔ ہر گھڑی یہی لگتا تھا کہ گھوڑا گاڑی کسی تناور درخت سے ٹکرا جائے گی مگر گھوڑے ان نشیب و فراز کے شناور تھے۔ وہ اپنے مالک کے اشاروں پر سرپٹ بھاگے چلے جا رہے تھے اور پھر گھڑ سوار بالکل قریب پہنچ گئے۔ ایک گھڑ سوار نے للکار کر کہا۔ ”اوئے! گاڑی روکو۔ نہیں تو مارے جاؤ گے رے۔“

گاڑی بان کی صورت دیدنی تھی۔ وہ دونوں طرف سے موت کی دھمکی سن رہا تھا۔ گہری تاریکی کے سبب اس کے تاثرات ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہے تھے تاہم اتنا پتا چلتا تھا کہ وہ دہشت زدہ ہے۔ اچانک سرپٹ بھاگتے گھوڑوں میں سے ایک کو ٹھوکر لگی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا گرا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا گھوڑا بھی گرا۔ گاڑی جیسے ہوا میں معلق ہوئی۔ مجھے لگا کہ میں پہلے اوپر اٹھنے کے بعد اب تیزی سے نشیب کی طرف جا رہا ہوں۔ میں گھنی جھاڑیوں میں گرا اور پتلی پتلی شاخوں کو توڑتا ہوا کچی زمین پر آیا۔ میں نے اپنے عقب میں گھوڑوں کی دردناک ہنہناہٹ سنی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ میں حیرت انگیز طور پر شدید چوٹوں سے محفوظ رہا تھا۔

میں اٹھتے ساتھ ہی پھر دوڑا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرا رخ کس طرف ہے، میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں بس جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ تاروں کی مدھم روشنی میں مجھے راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اردگرد گھیرا

ناگ پھنی اور جنتر کے درخت تھے اور وہ ساری نباتات تھیں جو جنگلی علاقے میں نظر آتی ہیں۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔ رائفل کے لمس نے میرے اعتماد میں اضافہ کیا۔ زندگی میں شاید پہلی بار مجھے ہتھیار کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا تھا۔

ہوا بہت تیز تھی اور میرے عقب سے چل رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ ہوا مجھے دھکیل رہی ہے اور میں بھاگنے کے بجائے اڑتا چلا جا رہا ہوں۔ یہ سب جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔ میں بہت سے خطروں سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ درختوں سے ٹکرا کر زخمی ہونے کا خطرہ، کسی گڑھے میں گرنے کا خطرہ، عقب سے گولی چلنے کا خطرہ، کسی جنگلی جانور کا ڈر... کچھ بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میں بس نکلنا چاہتا تھا۔ نکل جانا چاہتا تھا اس سیاہی مائل جنگل کے حصار سے۔ میں اس منحوس نرغے کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ مجھے آزادی درکار تھی۔ بس آزادی... اور میں بھاگ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے عقب میں دور افتادہ آوازیں سنیں۔ ان میں کتوں کی آواز بھی شامل تھی۔ میں یقینا سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ آوارہ کتے تھے یا خاص کھوجی کتے جو گھڑ سواروں کے ساتھ میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میں دو کتوں کو عمارت کے احاطے میں مار چکا تھا۔ میں مزید کو بھی مار سکتا تھا۔ اگر میرا راستہ روکا جاتا تو میں نے اس رائفل میں موجود ایک گولی بھی بچا کر نہیں رکھنا تھی۔ اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس رائفل میں کتنی گولیاں ہیں۔ یہ برسٹ مارنے والی رائفل تھی اور ایک بار عمران یا شاید اقبال نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی رائفلوں میں عموماً بیس پچیس تک گولیاں موجود ہوتی ہیں۔ میں نے اب تک بمشکل سات آٹھ گولیاں ہی استعمال کی تھیں۔

... میں اندھا دھند بھاگتا رہا۔ پتا نہیں کہ میں کتنی دیر بھاگا۔ آٹھ دس منٹ یا بیس پچیس منٹ۔ بس مجھے یہ احساس تھا کہ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی ہے اور میری ٹانگیں شل ہوتی جا رہی ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ میں بھاگتے بھاگتے اچانک گر پڑوں گا اور تادیر اٹھ نہیں سکوں گا۔ مگر میں پھر بھی ٹانگوں کو حرکت دیتا رہا۔ تسلی کی صرف ایک بات تھی۔ اب مجھے اپنے عقب میں تعاقب کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کتوں کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تو کیا میں متعاقب افراد کو جل دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں؟ اس سوال کا یقینی جواب دینا تو ابھی مشکل تھا... بھاگتے بھاگتے میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہوا میرے عقب سے چل رہی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ اگر تیز ہوا اسی سمت میں چل رہی ہو جس سمت میں کتوں کا ''شکار'' جا رہا ہو تو پھر کتوں کی حس شامہ کند ہو جاتی ہے۔ شاید یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے گھڑ سوار کسی اور جانب نکل گئے تھے۔

میری ٹانگیں اب کسی بھی وقت جواب دینے والی تھیں... میں ایک جگہ برگد کے بڑے بڑے درختوں تلے بیٹھ گیا۔ درختوں کی جڑیں اوپر سے نیچے کی طرف آ رہی تھیں اور اندھیرے میں یوں لگتا تھا کہ درجنوں سانپ ہوا میں جھول رہے ہیں۔ موسم میں خنکی تھی پھر بھی مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پنڈلیوں میں نئے کانٹے چبھ گئے تھے اور جسم پر تازہ خراشوں کی جلن تھی۔

میں نے آٹومیٹک رائفل گود میں رکھ لی اور درخت سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ سلطانہ کی بے بسی کا خیال ذہن میں یوں آیا جیسے اندھیرے میں اچانک بجلی چمکتی ہے۔ اس کا مجھے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر دینے کا انداز دل کو لہولہو کرنے والا تھا۔ پتا نہیں آج رات اس پر کیا بیتی تھی اور اب وہ کہاں تھی؟ اور وہ چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں والا معصوم صورت بالو... جسے وہ میرا بچہ کہتی تھی۔ وہ سلطانہ کے ساتھ ہی جیل میں گیا تھا لیکن جارج کی چار دیواری میں وہ سلطانہ کے ساتھ نہیں تھا۔ خبر نہیں وہ کہاں تھا؟ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سلطانہ جیسی نڈر لڑکی اگر جارج کے جال میں آئی تھی تو اس کی وجہ میں تھا۔ مجھے اذیت کے ناقابلِ برداشت شکنجے میں دیکھ کر سلطانہ نے جارج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس نے مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنے سے بہتر سمجھا تھا کہ وہ اپنی شوہر پرستی کو ایک نیا رخ دے دے اور اپنا آپ مجھ پر لٹا دے۔

اس منحوس بہائی کمرے میں برقی رو کی ''اذیت رسانی'' میرے ذہن میں آئی تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے تین بار چند سیکنڈ کے لیے کرنٹ دیا گیا تھا اور اب مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں تین بار جان کنی کا عذاب سہہ کر اور موت کے منہ میں جا کر واپس آیا ہوں۔ جہاں جہاں سے کرنٹ میرے جسم میں داخل ہوا تھا، وہاں وہاں سے ابھی تک رگ پٹھے پھوڑے کی طرح دکھتے تھے... اور سیاہی مائل داغ نظر آتے تھے۔

میں چار پانچ منٹ تک تاریکی میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ ٹانگوں میں قدرے جان آ گئی۔ میں پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ برگد کی لٹکی ہوئی جڑوں میں سے ایک جڑ میرے کندھے پر آئی اور سینے کی طرف رینگ گئی۔ یک لخت مجھے

محسوس ہوا کہ جڑ واپس میرے کندھے کی طرف آ رہی ہے۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن نے کہا کہ یہ برگد کی جڑ نہیں ہے۔ ایک تیز اضطراری حرکت کے تحت میں نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور پیچھے ہٹا۔ کئی فٹ لمبا سانپ میرے جسم سے جدا ہو کر دھپ سے پکی زمین پر گرا۔ میں نے اس کی پھنکار سنی۔ تاریکی میں اس کا ہیولا دیکھا۔ وہ پھن پھیلائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ انگلی ٹریگر پر رکھی لیکن پھر ایک دم دماغ نے کام کیا۔ اس سانپ سے زیادہ اس رائفل کا فائر میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ گولی چلنے کی آواز میرے دشمنوں کو میری طرف کھینچ سکتی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سانپ اپنے شکار کا پیچھا بھی کرتا ہے۔ دادی کہا کرتی تھیں کہ بپھرا ہوا سانپ کبھی کبھی گھڑ سوار کو بھی جا لیتا ہے۔ میں الٹے پاؤں پیچھے ہٹتا رہا اور میری نظریں سانپ کے ہیولے پر مرکوز رہیں۔ وہ پیچھے نہیں آیا... میں نے رخ پھیرا اور... پھر ہوا کے رخ پر بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ میں کچھ دن پہلے بھی اسی طرح ایک تاریک جنگل میں بھاگا تھا اور خود کو ہائنڈیل اسٹیٹ کے جنگل سے نکالنا چاہا تھا لیکن تب اور آج کی صورتِ حال میں بہت فرق تھا۔ آج میرے ہاتھوں میں ایک مہلک ہتھیار تھا اور سینے میں... اس ہتھیار کو چلانے کی ہمت بھی تھی۔ آج میں بلاتردد کسی کو مار سکتا تھا اور مر بھی سکتا تھا۔ ہاں، بعض اوقات ایسے ہی کایا پلٹ ہوتے ہیں اور کچھ تقریروں کی بازگشت اور کچھ مناظر کی یاد ایسے ہی زندگیوں کے رخ بدلتی ہے۔ عمران کا مسکراتا چہرہ ایک بار پھر میری نگاہوں میں آیا۔ بے شک اس نے کہا تھا۔ ''مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن میں اپنی موت کی ذمے داری خود پر لینا نہیں چاہتا۔ اس لیے خطرات سے ٹکراتا ہوں اور بدترین حالات کا پیچھا کرتا ہوں۔''

میں بھاگتا رہا... اور چلتا رہا... اور دم لیتا رہا اور پھر بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ رات بھر گھونسلوں میں دبکے رہنے والے پرندے بیدار ہوئے اور چہچہانے لگے۔ پہلے ان کی آوازیں مدھم تھیں پھر بلند ہوتی چلی گئیں۔ اندھیرے میں سفیدی گھلی اور پھر غالب ہوتی چلی گئی۔ ہوا کا رخ بھی بدل چکا تھا۔ اردگرد کے مناظر واضح ہونے لگے۔ پتوں سے اٹی ہوئی زمین، جھاڑیاں، درخت اور درختوں کی بلند شاخوں کے پیچھے سے جھلک دکھاتا ہوا نیلگوں آسمان۔ میں ایک یکسر ویران جنگل میں تھا۔ آثار سے تو یہی لگتا تھا کہ دور تک کسی آدم زاد یا متنفس کا نشان نہیں۔ روشنی ذرا

زیادہ ہوئی تو مجھے کہیں کہیں کچی زمین پر پنجوں اور کھروں کے نشان دکھائی دیے۔ میں جنگلی زندگی سے قطعی ناآشنا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کن جانوروں کے قدموں کے نشانات ہو سکتے ہیں... اور کہیں کہیں جو فضلہ بکھرا دکھائی دیتا ہے، وہ کن جانوروں کا ہے۔ رات گاہے بگاہے مجھے جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی رہی تھیں لیکن میں ان کے بارے میں بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہا تھا۔

ایک جگہ بارشی پانی کا چھوٹا سا تالاب نظر آیا۔ اس کے گرد بھی پنجوں کے نشانات کثرت سے تھے۔ ایک طرف کسی ہرن سائز کے جانور کا ڈھانچا پڑا تھا۔ پانی نتھرا ہوا تھا۔ پیاس کی شدت زیادہ تھی اور دھوپ نکلنے کے بعد مزید بڑھ گئی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے تھوڑا سا پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ اپنے کُرتے کے گیلے دامن سے رائفل پر لگا ہوا کیچڑ صاف کیا۔ یہ روسی ساخت کی رائفل تھی۔ خم دار میگزین کافی لمبا تھا۔ میں میگزین علیحدہ کر کے گولیوں کی تعداد دیکھ سکتا تھا لیکن یہ تجسس مہنگا پڑ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں میگزین دوبارہ رائفل سے اٹیچ نہ کر پاتا۔

دس پندرہ منٹ وہاں ستانے اور اپنی چوٹوں کو سہلانے کے بعد میں پھر چل پڑا... گھوڑا گاڑی کے الٹنے سے کوئی زخم تو نہیں لگا تھا مگر جسم پر کئی جگہ نیل موجود تھے۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ان چوٹوں کا احساس ہو رہا تھا۔ خاص طور سے بائیں بازو کو حرکت دینا دشوار لگ رہا تھا۔

اگلے تین چار گھنٹے میں مسلسل چلتا رہا۔ کبھی کبھی بھاگنا بھی شروع کر دیتا تھا۔ اس عرصے میں مجھے صرف ایک بھینس نما سیاہ جانور کی جھلک دکھائی دی یا پھر دو چیتل (نیل گاؤ) تھے جو تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک طرف اوجھل ہو گئے۔ چاروں طرف درختوں کے لامتناہی سلسلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان درختوں میں سرکنڈوں اور جھاڑیوں کے درمیان کہیں کہیں بارشی پانی کے گڑھے تھے یا کسی تیز آندھی سے اکھڑے ہوئے درختوں کے تنے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس روئے زمین پر اس گھنے جنگل کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

مجھے یہاں سے نکلنا ہے... مجھے اپنوں کے پاس واپس جانا ہے... مجھے ہر صورت اس پنجرے کو توڑنا ہے... میں دل ہی دل میں دہرا رہا تھا اور چلتا جا رہا تھا۔

شاید سلطانہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں ایک پر پھڑپھڑاتا ہوا پنچھی ہی تھا۔ یہ پنچھی ایک مدت سے اپنا پنجرہ توڑنا چاہ رہا تھا۔ کسی کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کسی کی خوب صورت آنکھیں اسے شب و روز بے کل رکھتی تھیں۔ وہ پنجرے کی سلاخوں سے ٹکراتا تھا، لہولہو ہو جاتا تھا... زخم مندمل ہوتے تھے تو وہ پھر پھڑپھڑاتا اور ٹکرانا شروع کر دیتا تھا۔ ایک عرصے سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ دھوپ اب جسم میں چبھنے لگی تھی۔ مجھے درختوں کے درمیان ایک آبی گزرگاہ نظر آئی۔ اس کا پاٹ دس بارہ میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ کنارے کٹے پھٹے تھے اور ان پر کثرت سے داب اگی ہوئی تھی۔ میں اس آبی گزرگاہ کے کنارے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے ارد گرد سیکڑوں میل تک کوئی انسان موجود نہیں ہے۔ جنگل سائیں سائیں کرتا تھا اور تیز دھوپ کے سبب نباتات کی مہک فضا میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس وقت یہاں کوئی سیاہ فام حبشی نظر آ جائے تو اس جگہ کو کانگو یا تنزانیہ وغیرہ کا جنگل تصور کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

میں وہاں بیٹھا رہا اور دوپہر ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ کسی نکیلی شاخ کے لگنے سے میری کلائی پر گہرا زخم آیا تھا۔ قریباً دو انچ جگہ سے کھال اتر گئی تھی۔ اس تازہ زخم کی وجہ سے کلائی کے ایک بہت پرانے زخم کا نشان بھی معدوم ہو گیا تھا۔ میرے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں ثروت اس طرح ٹوٹ کر یاد آ رہی تھی کہ دل کسی آہنی مٹھی میں آ گیا تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آنے لگا۔ ہمارے والدین نے ہماری شادی کے وقت کا باقاعدہ اعلان تو نہیں کیا تھا تاہم بین السطور یہ بات طے تھی کہ شادی کب اور کس موسم میں ہونی ہے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ ثروت نے اپنی فائل میں انتظار کے ماہ و سال کو دنوں میں تبدیل کر رکھا ہے اور ان دنوں کی تعداد کے مطابق کاغذ پر لکیریں لگا رکھی ہیں۔ وہ ہر صبح اٹھ کر ان لکیروں میں سے ایک لکیر کاٹ دیتی تھی۔ اس روز ہم ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ میری نظر ثروت کی فائل پر پڑی۔ وہاں لکیریں نظر آئیں تو میرا تجسس جاگ گیا۔ میں فائل دیکھنے کے لیے فائل پر جھپٹا تو ثروت نے فائل ایک دم اپنے پیچھے چھپا لی۔ میں نے اس سے فائل لینا چاہی۔ اسی دوران میں ثروت کے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم، نب کی طرف سے میرے بازو میں چبھ گیا۔ کلائی اور کہنی کے درمیان سے خون نکل آیا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے قلم اور فائل دونوں پھینک دیے اور میرا بازو دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔

زخم کا وہ نشان انگریزی کے حرف ''ایس'' سے ملتا جلتا تھا۔ میں یہ زخم دکھا کر اسے اکثر ستایا کرتا تھا۔ کہتا تھا، دیکھو کتنی سنگ دل ہو تم۔ لوگ درختوں کے تنوں کو چھیدتے ہیں، تم نے اپنے نام کے لیے میرے بازو کو چھیدا ہے۔ وہ شرمندہ ہو جاتی تھی اور پھر کئی دفعہ تلافی کے لیے میرے بازو کے نشان کو چوم لیتی تھی۔ ایک دن جب اس نے ایسا کیا تو میں نے شرارت سے کہا تھا... اچھا ہوتا اگر اس دن تمہارا قلم کلائی کے بجائے میرے ہونٹوں پر لگا ہوتا۔ اس نے شولڈر بیگ میرے سر پر دے مارا تھا... وہ ذرا سا چوک کر میری ناک پر لگا۔ ''ٹھہر جا... تیری تو...'' میں اس کے پیچھے لپکا۔

وہ اٹھلاتی اور بل کھاتی ہوئی بھاگی اور اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر سیدھی چھت پر چلی گئی جہاں خالہ صفیہ اور پھوپھو سکینہ وغیرہ بیٹھی تھیں۔

وہ دن ایسی ہی خوب صورت یادوں اور شرارتوں سے عبارت تھے۔ آج کلائی کے اس تازہ زخم کے ساتھ اس پرانے زخم کا نشان معدوم ہو گیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری کوئی نہایت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔

میں تھک گیا تھا۔ میرے چاروں طرف گنجان جنگل تھا۔ مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا... اب تو مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ میں کئی ہفتے بھی یہاں بھٹکتا رہوں تو باہر نکلنے کی راہ نہ پاؤں گا۔ میں اس چھوٹی ندی کے ساتھ ساتھ پھر چل پڑا۔ اندھیرا ہونے تک چلتا رہا۔ ہریالی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ بھوک سے بُرا حال تھا۔ شام ہوتے ہی پرندے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ گئے۔ جوں جوں تاریکی پھیلتی گئی، جنگل جاگتا گیا۔ گاہے بگاہے مختلف جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کے وقت مجھے کسی درخت پر ہونا چاہیے مگر درخت پر بھی کیڑوں مکوڑوں اور دیگر حشرات کے خطرات موجود تھے۔ پھر مجھے معلوم تھا کہ تیندوے اور جنگلی بلے وغیرہ بھی جو ازحد خطرناک ہوتے ہیں، درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی کہ میں زیادہ خوف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ وہ طاقتور رائفل تھی جو میرے ہاتھ میں تھی اور ایک وجہ وہ انقلابی کیفیت بھی تھی جو کل نیم شب سے میرے سینے میں موجزن ہو چکی تھی۔

وہ رات جیسے تیسے میں نے شاہ بلوط کے ایک بلند درخت پر گزاری۔ میں ساری رات نیم غنودگی کی کیفیت میں رہا۔ چھوٹی نال والی روسی ساخت رائفل ایک قیمتی اثاثے کی طرح میرے کندھے سے لگی رہی۔ جنگلی حیات کی موجودگی صرف آوازوں تک محدود تھی اور یہ آوازیں مجھ تک پہنچتی رہیں۔

صبح میں ایک بار پھر اپنے خستہ جاں بدن کو سمیٹ کر چل پڑا۔ بھوک اب نقاہت بن کر جسم کے ہر ہر ریشے میں اترنے لگی تھی۔ میں اس کٹی پھٹی گم راہ ندی کے ساتھ ساتھ چلتا رہا... ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں اور سر چکرا رہا تھا۔ دوپہر کے وقت میں نیم جان ہو کر پھر اس مدام چلنے والے پانی کے کنارے شیشم اور جنتر کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں ڈھونڈتا تو مجھے ان رنگ رنگ کے درختوں، پودوں اور جھاڑیوں میں کہیں نہ کہیں نباتاتی خوراک مل سکتی تھی لیکن میں ابھی تک تذبذب میں تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کیا کھا سکتا ہوں اور کیا نہیں۔

عجیب سی مایوسی مجھ پر طاری ہونے لگی۔
کیا میں کبھی یہاں سے نکل نہ سکوں گا؟
کیا میں پھر پکڑا جاؤں گا؟
کیا بھاگنے کے جرم میں اس بار میری گردن اتار دی جائے گی؟

ذہن میں ایک بار پھر سوال ہجوم کرنے لگے۔

دفعتاً میری نگاہ داب اور کیچڑ میں پھنسی ہوئی ایک شے پر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ براؤن شیشے کی ایک بوتل تھی۔ نہ جانے یہ کہاں سے بہتی ہوئی آئی تھی اور کب سے یہاں دو پتھروں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اس پر کائی جم چکی تھی۔ میں نے یہ بوتل نکال لی۔ یہ اندر سے خالی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف پھینک دیا اور ایک بار پھر درخت سے ٹیک لگا لی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں اسی گنجان جنگل میں ہمیشہ چکراتا رہوں گا۔ کبھی یہاں سے نکل نہیں پاؤں گا۔ یاسیت کے سبب دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ اپنے بچھڑے ہوئے شدت سے یاد آنے لگے۔ بیٹھے بیٹھے دل میں پتا نہیں کیا آئی، میں نے بوتل پھر اٹھا لی۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ میرے بازو کے زخم سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب سے ایک کرنسی نوٹ مل گیا۔ میں نے ایک پتلی سی شاخ ڈھونڈی جسے قلم کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اپنے بازو کے زخم کو کرید کر میں نے اسے کچھ مزید خونچکاں کیا۔ شاخ کے قلم کو اس خون میں ڈبو کر کرنسی نوٹ پر لکھا۔

''میرے پیارو! میں زندہ ہوں۔ میرا انتظار کرنا... میں ایک دن ضرور آؤں گا... تابش۔'' اس سے آگے اپنا لاہور کا مختصر پتا لکھا۔

نوٹ کی دوسری طرف میں نے اپنے لہو سے تین نام لکھے۔ فرح... عاطف... ثروت۔ پھر میں نے اس نوٹ کو کائی زدہ بوتل کے اندر رکھا۔ بوتل کا ڈھکن بند کیا اور اشک

بار آنکھوں کے ساتھ اسے پانی میں بہا دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس بوتل کو کہیں نہیں پہنچنا... شاید وہ کچھ ہی آگے جا کر کہیں گھاس وغیرہ میں اٹک جائے گی یا پھر اس بے کراں جنگل کے اندر ہی کہیں کسی بارشی جھیل میں جا ٹھہرے گی... لیکن بوتل کو اس طرح بہتے پانی میں ڈالنا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے خود کو کسی قدیم کہانی کے کردار کی طرح محسوس کیا۔ وہ کہانیاں جن میں انہونیوں کی امیدیں پالی جاتی ہیں۔ جن میں گہری تاریک راہوں پر آس اور انتظار کے دیپ جلائے جاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں اپنوں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والے اور دور دراز کے جزیروں میں سدا کے لیے محصور ہو جانے والے لوگ، ساحلوں پر بیٹھتے ہیں اور افق کے پار دیکھتے ہیں۔ وہ پانیوں کو پار کرنے کے لیے کبھی تنوں سے کشتیاں بناتے ہیں، کبھی درختوں کو آگ لگا کر دور دراز کے جہازوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں... اور کبھی نامے لکھ کر اور انہیں بوتلوں میں بند کر کے لہروں کے سپرد کرتے ہیں...

میں نے بھی بوتل کو ندی کے بہاؤ میں بہا دیا۔ وہ تیرتی گئی اور مجھ سے دور ہوتی گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا... اور سوچتا رہا... یہ دور دراز کے کسی ایسے پانی میں پہنچے گی جہاں کوئی کشتی ران، کوئی مچھیرا اسے نکالے گا اور میرے پیاروں تک پہنچا دے گا۔ میری نگاہیں بوتل پر جمی رہیں... وہ دور ہوتی گئی۔ دھیرے دھیرے ایک نکتہ بنی اور پھر معدوم ہوگئی۔

میں نے رخ پھیر کر دیکھا۔ میرے سامنے چار افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں رائفلیں اور تیسرے کے ہاتھ میں خوفناک پھل کی کلہاڑی تھی۔ بالکل یہی لگا کہ وہ اچانک زمین کے اندر سے نمودار ہو گئے ہیں یا درختوں کے تنے چیر کر باہر نکل آئے ہیں۔ میں اپنی جگہ پتھرا کر رہ گیا۔ میری نگاہیں گہرے سانولے چہرے والے تیواری لال پر جمی تھیں... اس کی آنکھوں میں قہر کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ مجھے اپنی بصارت پر بھروسا نہیں ہوا... دل و دماغ کی کچھ وہی کیفیت ہوئی جو چند روز پہلے اس وقت ہوئی تھی جب بادوباراں کی رات میں ایک سنسان جنگل کے اندر اچانک ہی ان لوگوں نے مجھے آدبوچا تھا۔ لیکن تب میں اور آج میں ایک فرق تھا... ایک سنگین اور مہلک فرق... اور یہ "فرق" آگ کی ایک دیوقامت لہر کی طرح میرے سینے میں موجزن تھا اور میرے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ میری رائفل مجھ سے تین چار فٹ دور گہری سبز گھاس پر پڑی تھی۔

تیواری لال کی زہریلی پھنکار میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "بڑا شوق ہے تجھے بھاگنے کا... میرا خیال ہے کہ اگر بھگوڑوں کا عالمی مقابلہ کرایا جاوے تو... تو حرام جادہ پہلے نمبر پر تو آ ہی جاوے گا۔"

میں خاموش کھڑا تھا لیکن میرے جسم میں آج جو جذبات کی ہلچل تھی، اس سے تیواری اور اس کے ساتھی بے خبر تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اذیت کی انتہا بالآخر بے خوفی میں بدل چکی ہے۔ درد کی بھٹی میں تپ تپ کر اور جل جل کر ایک خام دھات نے آخرکار اپنی شکل تبدیل کر لی ہے۔

"ہاتھ اوپر اٹھا۔" تیواری کے پہلو میں کھڑے شخص نے میرے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے کرخت آواز میں کہا۔

لڑائی ایک فن بھی ہے... لیکن لڑائی ایک دیوانگی بھی ہے... یہ ایک آرٹ بھی ہے اور ایک ایسی سرکش لہر بھی ہے جو کسی ضابطے، قاعدے کو نہیں مانتی۔ ایسی سرکش لہر کو تجربہ درکار ہوتا ہے، نہ ماحول اور نہ حکمتِ عملی... اور میں ایک ایسی ہی لہر کے زیرِاثر تھا۔

مجھے ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دیا گیا تھا لیکن میں اپنی رائفل کی طرف گیا۔ رائفل اٹھانے کے لیے میرا تیزی سے جھکنا میری زندگی کا جواز بن گیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک گولی میرے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں رائفل پر گرا۔ تب رائفل بردار نے دوسری گولی چلائی۔ یہ گولی میرے پہلو کے پاس کچی زمین میں لگی۔ تب تک میں بھی ٹریگر دبا چکا تھا۔ میں نے دو فائر کیے۔ ان میں سے ایک گولی سیدھی رائفل بردار کی گردن میں جا گھسی۔ وہ جھاڑیوں میں گرا۔ کلہاڑی بردار اور تیواری لال دونوں بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ تیواری لال کا پاؤں پھسلا اور وہ الٹ کر نشیب میں چلا گیا۔ اس کی دھوتی کے اندر سے اس کی کالی سیاہ ٹانگیں دور تک نظر آئیں۔ دوسرا رائفل بردار ڈیوڈ تھا۔ اس نے رائفل میری طرف سیدھی کر رکھی تھی مگر اس کے چہرے پر شدید گھبراہٹ کے آثار تھے۔ وہ پیچھے ہٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ رائفل کو جھٹک رہا تھا۔ اس وقت تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن کئی دن بعد معلوم ہوا کہ ڈیوڈ نے مجھ پر گولی چلائی تھی مگر گولی چیمبر میں پھنس گئی تھی۔

ڈیوڈ برف کی طرح سفید چہرے کے ساتھ کئی قدم پیچھے ہٹا پھر اچانک رخ پھیر کر بھاگ نکلا۔ کلہاڑی بردار اس سے دس قدم آگے تھا۔ میں نے بے دریغ، ڈیوڈ نامی اس بندے پر دو فائر کیے۔ ایک گولی تو ضائع ہوگئی، دوسری اس کی ٹانگ میں کہیں لگی لیکن وہ رکا نہیں، لنگڑاتا ہوا بھاگتا رہا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں جنونی لہجے میں چلایا... "مجھے مارو... مجھے مارو۔ بھاگتے کیوں ہو حرامزادو... مجھے جان سے مار دو..." اس کے ساتھ ہی میں نے کئی گولیاں چلائیں اور ان کے پیچھے لپکا... وہ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں میں اوجھل ہو گئے۔

میں جنونی انداز میں ان کے پیچھے دوڑتا رہا۔ میری آواز جنگل میں دور تک گونجتی رہی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں افراد گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ نکلے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ کہیں پاس سے کمک لینے گئے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بدحواس ہو گئے ہوں۔

اچانک مجھے تیواری لال کا خیال آیا۔ وہ بوکھلاہٹ میں پیچھے ہٹا تھا اور نشیب کی جھاڑیوں میں گرا تھا۔ میں رائفل سونت کر اس نشیب کی طرف بھاگا۔ مگر بیس پچیس میٹر آگے ہی گیا تھا کہ دائیں طرف سے مجھ پر دو فائر ہوئے۔ یہ پستول کے فائر تھے۔ ایک گولی میرے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ میں تلملا کر پلٹا۔ جھاڑیوں میں تیواری لال کی سفید دھوتی کی جھلک نظر آئی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ جنگل دھماکوں سے گونج اٹھا۔ دھوتی جیسے زمین پر بچھ گئی۔ طیش کے سبب میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ یہ خیال کیے بغیر کہ تیواری کے پاس پستول ہے اور وہ اب بھی مجھ پر جوابی فائر کر سکتا ہے، میں بھاگتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسے صرف ایک گولی لگی تھی لیکن یہی کام دکھا گئی تھی۔ یہ گولی اس کے پیٹ میں داخل ہو کر پسلیوں کی طرف سے نکل گئی تھی۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ سر پر خون کیسے سوار ہو جاتا ہے۔ کس طرح ایک قتل کے بعد دوسرے قتل بائیں ہاتھ کا کھیل نظر آنے لگتے ہیں۔ میری آنکھوں میں جنون دیکھ کر تیواری لال کا سانولا چہرہ کالا سیاہ ہو گیا۔

وہ گھگھیایا۔ "گولی مت چلانا... مم... میرا کوئی دوش ناہیں... یہ گورا صاحب کا حکم تھا۔"

میں پھنکارا۔ "گورا صاحب کے حکم پر ہی تو سلطانہ کو زرگاں لایا تھا۔ اسی کے حکم پر تو نے اسے جیل سے نکال کر اس کی کوٹھی میں پہنچایا ہوگا... اور اسی کے حکم پر تو نے کوٹھی کے باہر پہرا دیا ہوگا تاکہ وہ آسانی سے اس کی آبرو خراب کر سکے..."

"ناہیں... ناہیں۔" تیواری نے کرب کے عالم میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔ "سلطانہ کو زرگاں لانے والا میں ناہیں، موہن کمار ہے۔ میں سوگند کھاوت ہوں..."

میں نے صرف تین انچ کے فاصلے سے اس کے سر پر فائر کیا۔ اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی۔ شاید میں مزید فائر بھی کر گزرتا لیکن ذہن میں یہ احساس موجود تھا کہ میرے پاس ایمونیشن کم ہے۔

تیواری کی منحوس، متلاشی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بجھانے کے بعد میں نڈھال سا ہو گیا۔ ہانپتا ہوا سا میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا لی۔ چالیس پچاس فٹ آگے ندی کا کنارہ تھا اور وہاں دوسری لاش پڑی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ کیا ان دونوں جیتے جاگتے انسانوں کو میں نے مارا ہے؟ اپنے ہاتھوں سے مارا ہے؟

بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن حقیقت سامنے تھی... اور ابھی سینے میں آگ کی وہ دیوقامت لہر تھی، بلندی میں کم نہیں ہوئی تھی...

میں نے ندی کے کنارے مرنے والے محافظ کی لاش چیک کی۔ گولی اس کی فربہ گردن کی ہڈی توڑ کر دوسری طرف نکل گئی تھی۔ اس شخص کی رائفل اس کے پاس ہی پڑی تھی، اس رائفل میں بڑا میگزین لگا ہوا تھا اور یہ نسبتاً بڑی بھی تھی۔ میں نے یہ رائفل اٹھالی اور دوسری رکھ دی کیونکہ دونوں رائفلوں کو لے کر چلنا آسان نہیں تھا۔ یہ دوسری رائفل حاصل کرنے کا ایک فائدہ مجھے یہ بھی ہوا کہ گولیوں کی ایک بیلٹ بھی مل گئی۔ یہ بیلٹ مرنے والے کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے بیلٹ کھول کر جیسے تیسے اپنی کمر سے باندھ لی۔ اپنی والی چھوٹی نال کی رائفل پانی میں پھینک دی۔ تیواری لال کے پاس پڑا ہوا پستول بھی میرے کام آ سکتا تھا۔ یہ پستول بھی میں نے اٹھا لیا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ڈیوڈ اور اس کا کلہاڑی بردار ساتھی کمک لے کر واپس آ سکتے تھے۔ تیواری لال کی جامہ تلاشی میں کچھ کرنسی، سگریٹ اور دیگر اشیا بھی ملیں جو میں نے اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کے بعد میں وہاں سے چل دیا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر ڈیوڈ اور کلہاڑی بردار شخص گھوڑوں پر یہاں آئے تھے تو تیواری اور اس کا مرنے والا ساتھی بھی یقیناً گھوڑوں پر ہوں گے۔ ان کے گھوڑے بھی یہیں کہیں ہو سکتے تھے۔ میں تھوڑا آگے گیا اور دو گھوڑے درختوں میں بندھے ہوئے مل گئے۔ وہ بڑے انہماک سے ہری بھری گھاس پر منہ مار رہے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک گھوڑا منتخب کیا۔ میری گھڑ سواری صرف مری اور ایبٹ آباد وغیرہ تک محدود تھی۔ ہم اپنے والدین کے ساتھ ان "ہل اسٹیشنز" پر جاتے تھے اور کرائے کے گھوڑوں پر تھوڑی بہت سواری کر لیتے تھے۔ کچھ تجربہ یہاں جارج گورا کے وسیع وعریض اصطبل میں آکر حاصل ہوا تھا۔ گھوڑوں کی عادات کا تھوڑا بہت پتا چلا تھا۔

میں نے ایک گھوڑا کھولا۔ اسے تھپکیاں دے کر ذرا شانت کیا اور پھر سوار ہو گیا۔ حقیقی معنوں میں یہ میری زندگی کی پہلی گھڑ سواری تھی۔ میں گھوڑے کو پہلے آہستہ چلاتا رہا پھر تھوڑی تھوڑی ایڑ لگانی شروع کی۔ میں نے ڈیوڈ اور اس کے ساتھی کو شمال کے رخ پر بھاگتے دیکھا تھا، میں نے جنوب کا رخ کیا۔

تجربے کے بغیر گھوڑے پر بیٹھنا اور گھنے درختوں میں ایک طویل سفر کرنا نہایت دشوار کام تھا مگر میری ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ جب مرنا تھا تو پھر ڈرنا کیا۔ بازو پر لگنے والی گولی نے مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ یہ ایک قابلِ برداشت زخم تھا۔

میں نے قریباً ایک گھنٹے تک گھوڑے پر سفر کیا۔ اس دوران میں کوئی خاص واقعہ تو نہیں ہوا مگر میرا ذہن مسلسل سوچتا رہا اور تحیر کی لہریں مجھے اتھل پتھل کرتی رہیں۔ غنی صاحب نے، سلطانہ نے اور پھر بھکشو ہمیش نے ملتی جلتی بات ہی کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے کسی سفلی عمل کے ذریعے اس راجواڑے کی حدود میں پابند کر دیا گیا ہے۔ میں ان گنجان جنگلوں کو پار نہیں کر سکتا اور جب بھی کوشش کروں گا، پکڑا جاؤں گا... اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ میں ایسی کئی ایک ناکام کوششیں کر چکا ہوں۔ شروع میں مجھے ان باتوں پر یقین نہیں آیا تھا مگر اب ذہن میں عجیب سی بے کلی تھی۔ چند دنوں کے اندر یہ دوسرا واقعہ ہوا تھا۔ اس گھنے ویران جنگل میں جہاں بیسیوں میل تک کسی آدم زاد کے آثار نظر نہیں آتے تھے... تیواری، ڈیوڈ اور ان کے ساتھی یوں وارد ہوئے تھے جیسے زمین سے نکل آئے ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ کیونکر کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح مجھ تک آ پہنچے تھے... اور سلطانہ نے بتایا تھا کہ یہ کچھ میرے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اسٹیٹ کے وہ خاص قیدی جنہیں بہرصورت یہاں رکھنا مقصود ہوتا ہے، اس ''سحر'' کے اثر میں لائے جاتے ہیں اور پھر وہ کبھی اس اسٹیٹ کو چھوڑ نہیں سکتے۔

میں اپنے ذہن کا کیا کرتا؟ میرا ذہن ایسی کسی بھی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں گھوڑے پر محوِ سفر رہا۔ میرے لیے جو چیز سب سے زیادہ اطمینان کا باعث تھی، وہ یہ تھی کہ گھوڑے کے ساتھ ثنا کی کینوس کا ایک بڑا تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس میں کھانے پینے کا کافی سامان موجود تھا۔ خشک گوشت، بھنے ہوئے چنے، چاولوں کی پنجیری، کوئی ایک درجن سیب اور صاف پانی۔ یہ سامان میرے لیے کئی دن تک کافی تھا۔ میں نے دلکی چال چلتے گھوڑے پر ہی تھوڑی سی پیٹ پوجا کی اور سفر جاری رکھا۔

نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں جہاں بھی چلا جاؤں گا، جتنی دور بھی نکل جاؤں گا... میرا تعاقب کرنے والے وہاں پہنچ جائیں گے۔ اور قریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد یہی کچھ ہوا۔ ہانپتا ہوا گھوڑا، ایک ڈھلوان چڑھنے کے بعد بلندی پر آیا تو میری نگاہ اپنے عقب میں نشیب کی طرف اٹھ گئی۔ یکایک میں چونک گیا۔ مجھے دور نیچے اندازاً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر درختوں کے درمیان متحرک چیزیں دکھائی دیں۔ یہ کچھ اور نہیں گھوڑے تھے۔ فاصلے سے ان کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا مگر وہ آٹھ دس سے کم ہرگز نہیں تھے۔ میں نے بلندی پر ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ لیا تھا، اب معلوم نہیں کہ انہوں نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں۔ میری رگوں میں لہو کی گردش پھر بڑھ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ گنجان درختوں اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دو گھنٹے کا مسلسل سفر بھی مجھے میرے دشمنوں سے دور نہیں لے جا سکا تھا۔

ایک عجیب سی جھنجلاہٹ مجھ پر طاری ہو گئی۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ ان سارے حالات سے چھٹکارا پانے کے لیے خود کو گولی مار لوں۔ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رائفل کی نال رکھ کر ٹریگر دبانا مجھے کوئی بہت زیادہ مشکل نظر نہیں آتا تھا لیکن تب ہی وہ ہمیشہ مسکراتا چہرہ پھر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ غیر مرئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''جگر! مرنا تو ہے لیکن اس کی ذمے داری خود پر نہیں لینی۔''

میں نے درختوں کی اوٹ سے دیکھا، گھڑ سوار تیزی سے قریب آتے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ سیدھے میرے رخ پر آ رہے تھے۔ حالانکہ میں نے راستے میں کئی بار اپنا رخ تبدیل کیا تھا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور گھوڑے سے اتر آیا۔ خوراک اور پانی والا تھیلا میں نے گھوڑے کی زین سے علیحدہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے گھوڑے کی پشت پر چند چھڑیاں رسید کیں۔ وہ گردن اٹھا کر ہنہنایا اور دوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں جھاڑیوں سے اٹی ہوئی ایک دشوار ڈھلوان پر پاؤں جما جما کر اترا اور بائیں رخ پر بھاگنا شروع کر دیا۔ اب رائفل کے علاوہ وزنی تھیلا بھی میرے پاس تھا۔ میں اپنی رفتار تیز نہیں رکھ سکتا تھا۔

قریباً ایک کلومیٹر آگے جانے کے بعد راستہ مسدود نظر آیا۔ وہی آبی گزرگاہ میرا راستہ روکے کھڑی تھی جس کے ساتھ ساتھ میں نے پچھلے دو گھنٹے تک سفر کیا تھا۔ اب وہ خم کھاتی ہوئی بہہ رہی تھی اور اس کے کنارے کافی بلند تھے۔ اگر اب پھر میں اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتا تو گھڑ سواروں سے زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ ضروری تھا کہ میں اسے پار کر جاؤں۔ اسے پار کرنے کے لیے نہ جانے کب کسی نے ''لونگ پیپر'' کے درخت کا کٹا ہوا تنا اس کے پاٹ کے اوپر پھینک دیا تھا۔ ندی اس کے نیچے قریباً پندرہ بیس فٹ کی گہرائی میں بہہ رہی تھی۔ میں تین چار فٹ قطر کے اس تنے کے اوپر سے گزر کر ہی ندی پار کر سکتا تھا۔

میرے ذہن میں وہی ڈیک نالے والا منظر پھر تازہ ہو گیا۔ درد کی ایک لہر سی پورے جسم میں چل گئی۔ دو ڈھائی سال پہلے ایک ایسی ہی صورتِ حال میں تو عمران مجھ سے جدا ہوا تھا۔ کچھ ایسا ہی پانی تھا، کچھ ایسا ہی رستہ تھا اور عقب میں چلتے ہوئے کچھ ایسے ہی خطرات تھے۔ ''ہمت کر دتابی... تم یہ کر سکتے ہو۔ یہ زیادہ مشکل نہیں...'' عمران کی بے چین آواز تاریکی کا سینہ چیر کر مجھ تک پہنچی تھی۔

میں نہیں کر سکا تھا... لیکن آج میں کر سکتا تھا۔ آج دل و دماغ کی کیفیت کچھ اور تھی۔ بے رحم خزاؤں کے تھپیڑے سہہ سہہ کر اندر کے موسم بدل چکے تھے... اب کھونے کو کچھ باقی نہیں تھا اور جب کچھ نہ ہو تو ڈر بھی باقی نہیں رہتا۔ میں نے ایک ہاتھ میں رائفل، دوسرے میں بیگ تھاما۔ دونوں چیزوں کو دونوں کندھوں سے لٹکایا اور تنے پر پاؤں رکھ دیے۔ میرے پاؤں مستحکم تھے۔ جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور نگاہیں دوسرے کنارے پر مرکوز تھیں۔ میں نیچے نہیں دیکھ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ گزر جاؤں گا۔ میں اگلے کنارے سے دس بارہ فٹ دور تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے ڈانواں ڈول کیا۔ میں نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن توازن بگڑ چکا تھا۔ کوشش کے باوجود میں سنبھل نہیں پایا۔ میں پھسلا... دایاں کندھا بری طرح تنے سے ٹکرایا اور میں سر کے بل ندی کے پانی میں آیا... یہ سب کچھ میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اور بے خوفی کے عالم میں محسوس کیا۔ ڈر کے بجائے ایک عجیب سی جھنجلاہٹ مجھ پر طاری ہوئی۔ میں نے سرد پانی میں چند غوطے کھائے اور پھر سطحِ آب پر رہنے کے لیے ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ تیز بہاؤ مجھے اپنے ساتھ لیے چلا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اپنی رائفل کا خیال آیا وہ ابھی تک میرے کندھے پر تھی تاہم میرے ساتھ ہی پانی میں ڈبکیاں لے رہی تھی... کینوس کا بیگ کندھے سے اتر کر ناپید ہو چکا تھا۔

میں بہت اچھا تیراک تو نہیں تھا تاہم ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو سطحِ آب پر رکھ سکتا تھا۔ اگلے دس منٹ تک ٹھیائے سرد پانی نے مجھے تیزی سے اپنے ساتھ بہایا۔ اس پانی میں درختوں کی پتلی شاخیں، زرد پتے، جنگلی پھولوں کے آثار اور پتا نہیں کیا کچھ میرے ساتھ بہہ رہا تھا۔ دس منٹ بعد پانی کی رفتار قدرے کم ہو گئی۔ میں نے کوشش کی اور خود کو کنارے کی طرف لے آیا۔ یہاں کناروں کی بلندی بھی دو تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں شرابور کپڑوں کے ساتھ باہر نکلا۔ عقب میں دیکھا، ایک بار پھر دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میں خطرے سے باہر نہیں ہوں۔ میں نے ایک بار پھر تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ گاہے بگاہے دوڑنے لگتا تھا۔ میرا سامان کھو گیا تھا لیکن اس سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ رائفل بری طرح بھیگ چکی تھی۔ اب مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس طرح بھیگی ہوئی رائفل بوقتِ ضرورت کام کر سکتی ہے یا نہیں۔ میں ٹریگر دبا کر ہی اسے ٹیسٹ کر سکتا تھا لیکن اگر گولی چل جاتی تو اس کی آواز بھی خطرناک تھی۔ میرا تعاقب کرنے والے تو پہلے ہی مقناطیس کی طرح میری طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

میں اپنے زخم زخم جسم کو سمیٹے اسی طرح چلتا رہا۔ ایک جگہ گھنی جھاڑیوں میں دو تین جانور دکھائی دیے۔ ان کی جسامت کتے کی طرح تھی۔ اس معاملے میں میری شناخت کی قابلیت صفر تھی۔ وہ بھیڑیے ہو سکتے تھے، لومڑ یا پھر جنگلی کتے جو اپنی جبلت میں بڑے خطرناک تصور کیے جاتے ہیں۔ بہرحال، انہوں نے مجھے نظرانداز کیا اور میں نے انہیں... میں تھوڑا آگے گیا تھا کہ جھاڑ جھنکاڑ میں کوئی سیاہی مائل چیز نظر آئی... جیسے کوئی بڑا ریچھ یا سیاہ بھینسا چھپا بیٹھا ہو مگر دھیان سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوئی ذی روح نہیں۔ یہ دراصل کسی کھوہ کا دہانہ تھا۔ کچی زمین کے اندر ایک دراڑ کی سی شکل تھی جو نیچے سے پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اس دراڑ میں گھس گیا۔ خطرہ کہاں نہیں تھا؟ خطرہ یہاں بھی تھا۔ سانپ، بچھو یا کوئی جانور۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا یہاں اور میری رائفل بھیگ چکی تھی۔ کہیں سنا تھا کہ کبھی کبھی انسان خوں خوار درندوں سے بڑھ کر خطرناک ہو جاتا ہے۔ آج یہ بات درست محسوس ہو رہی تھی۔ درندہ تو صرف شدید بھوک میں ہی حملہ آور ہوتا ہے اور اس میں حکمتِ عملی کا بھی فقدان ہوتا ہے... لیکن یہ جان دار جس کا نام انسان ہے، جب درندگی پر اترتا ہے تو اس کے لیے سارے اوقات برابر ہو جاتے ہیں... اپنی خداداد صلاحیت سے وہ ایسی ایسی بھیانک چالیں سوچتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ یہ نیم تاریک دراڑ اتنی گہرائی تک جائے گی۔ میں چلتا گیا اور وہ مجھے راستہ دیتی گئی۔ میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ذرا گہرائی میں بھی اتر رہا تھا۔ کہیں کہیں جالے لگے ہوئے تھے۔ جانوروں کی مینگنیاں اور گوبر وغیرہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ دراڑ کی دیواریں کچی لیکن سخت مٹی کی تھیں۔ کافی آگے جا کر مجھے ایک جگہ تھوڑی سی راکھ اور کوئلے نظر آنے۔ یہاں آگ جلائی گئی تھی۔ اس واقعے کو کتنا عرصہ ہوا تھا، اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ فی الحال یہ دراڑ بالکل سنسان نظر آتی تھی۔ کسی جگہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا لیکن کسی جگہ ہوا کی سی حرکت بھی محسوس ہوتی تھی۔ بھیگی ہوئی رائفل میں دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی۔ آگے دراڑ دو شاخوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ میں دائیں شاخ داخل ہو گیا۔

”رک جاؤ ناہیں تو گولی مار دوں گا۔“ ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز مجھے عقب سے سنائی دی۔

میں ایک بار پھر سکتہ زدہ رہ گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نیم تاریکی میں بہ ظاہر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ”بندوق پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ ایک بار پھر کرخت لہجے میں کہا گیا مگر اس بار آواز دوسری تھی۔ مطلب یہ تھا کہ یہاں ایک سے زیادہ افراد ہیں۔

”کون ہو تم؟“ میں نے رائفل پھینکے بغیر کہا۔

”سب کچھ بتا دیں گے۔ پہلے اپنی اس ماں کو نیچے پھینکو۔“ پہلے شخص نے گرج کر حکم دیا۔

میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ یہ لوگ کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔

میں نے رائفل نیچے پھینک دی لیکن کسی بھی کارروائی کے لیے تیار رہا۔ کرتے پاجامے اور ٹوپی والا ایک مقامی شخص میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کا رخ میری طرف رکھا اور رائفل اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے عقب میں دو تین اور ہیولے سے دکھائی دے رہے تھے۔ جونہی اس نے رائفل اٹھانی چاہی، میں نتائج سے بے پروا اس پر جا پڑا۔ میری ٹانگ بڑے زور سے اس کے چہرے پر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر اس سرنگ نما دراڑ کی دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی انگلی بے ساختہ ریوالور کے ٹریگر پر دب گئی تھی۔ دھماکے کے ساتھ شعلہ نکلا اور ایک دیوار کی طرف چلا گیا۔ رائفل کی نال میرے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ میں نے اسے لاٹھی کی طرح گھما کر ریوالور بردار کے ہاتھ پر مارا۔

نشانہ درست لگا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ڈکراتا ہوا پشت کے بل گرا۔

یہی وقت تھا جب دو تین سائے مجھ پر جھپٹے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں پرانی طرز کی تلواریں اور ایک کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے مجھ پر آئے۔ میں نے پیچھے ہٹ کر ایک برفائر کرنا چاہا لیکن وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ بری طرح بھیگی ہوئی کیچڑ آلود رائفل نے کام نہیں کیا۔ تلوار کا پہلا وار میں نے رائفل پر ہی روکا۔ پھر رائفل کو کسی لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میں حملہ آوروں سے بھڑ گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا، میں کیا کر رہا ہوں؟ کیوں کر رہا ہوں؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ بس میرے سینے میں آگ کی دیوتا مت لہر تھی اور دماغ میں چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ لڑنے کے ساتھ ساتھ میں جنونی انداز میں دہاڑ رہا تھا... ”مار دو مجھے... جان سے مار دو۔ میرے ٹکڑے کر دو...“

اور جن کو میں یہ دعوت دے رہا تھا، وہ سخت بدحواس نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو سر پر شدید چوٹ کھانے کے بعد زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ سے تلوار نکل گئی تھی اور وہ چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جگہ پر کہرام سا مچ گیا تھا۔ پھر بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک گرج دار آواز ابھری۔ ”ٹھہرو... یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ سلطانہ کا شوہر ہے...“

میرے اردگرد ایک دم سکوت سا ہو گیا۔ تلوار بردار اور اس کے ساتھی پیچھے ہٹ گئے۔ وہ اب آواز کے ماخذ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب میں نے ڈاکٹر چوہان کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو تسلی دینے کے انداز میں ہلا رہا تھا اور میری طرف آ رہا تھا۔ ”رک جاؤ تابش! یہ دوست ہیں۔“ اس نے پکار کر کہا۔

میں حیرت زدہ کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ اب بھی رائفل پر تھے۔ میں نے اسے نال کی طرف سے بڑی مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ میں لڑنے مرنے کو بالکل تیار تھا۔

چوہان نے آگے بڑھ کر رائفل میرے ہاتھ سے لے لی اور مجھے کھینچ کر ایک طرف لے گیا۔ میرے شدید حملے سے زخمی ہونے والے دو افراد کو بھی دوسرے لوگوں نے سہارا دے کر اٹھا لیا اور ایک طرف لے گئے۔ چوہان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور بولا۔ ”ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ تمہیں یہاں دیکھیں گے۔ یہ تو

ایک کرشمہ ہے۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔ مجھے مارنے کی کوشش کی ہے۔"

"یہ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر ان کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو سب سے زیادہ دکھ بھی ان لوگوں کو ہی ہوتا۔ یہ دشمن نہیں، دوست ہیں۔ تمہاری اور سلطانہ کی خاطر ہی یہاں اس جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ شاید تمہیں پتا نہیں، وہاں زرگاں میں اس رات کیا کچھ ہوا ہے۔"

"تم کس رات کی بات کر رہے ہو؟"

"جب سلطانہ کو جیل سے نکال کر جارج گورے کی رہائش گاہ پہنچایا گیا اور تم جارج کے دو ملازموں کو زخمی کر کے وہاں سے بھاگے۔"

میں سوالیہ نظروں سے چوہان کا چہرہ تک رہا تھا۔

وہ بولا۔ "تمہیں پتا ہے، تم اب کس جگہ ہو؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ "تم ایک بار پھر تل پانی کے آس پاس پہنچ چکے ہو۔ اور یہ ایک بڑی اچھی پناہ گاہ ہے جہاں تم آ گئے۔ یہ ایک زبردست اتفاق ہے۔ یہاں موجود لوگوں میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم از خود یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"تم اس رات کی بات کر رہے ہو... کیا ہوا تھا اس رات؟"

"میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے تم اپنا لباس درست کر لو۔ تمہیں مرہم پٹی کی ضرورت بھی ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے تم نہا لو۔"

میں ایک بار پھر شدید حیرت کی زد میں تھا۔ میں نے خود کو ایک تنکے کی طرح محسوس کیا جسے حالات کی ہوا اپنے ساتھ اڑائے لیے پھر رہی تھی۔

یہاں نہانے کا انتظام موجود تھا۔ میرے لیے ایک مقامی لباس بھی فراہم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر چوہان نے اپنے ہاتھ سے میرے مختلف زخموں اور خراشوں وغیرہ کی مرہم پٹی کی۔ اس دوران میں، میں دیکھتا رہا کہ میرے اردگرد موجود لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے ہمدردی اور دوستی کی جھلک ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کم و بیش چالیس افراد تھے۔ ان میں عورت کوئی نہیں تھی۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ سب مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس آتشیں اسلحے کے علاوہ تلواریں اور لاٹھیاں وغیرہ بھی تھیں۔ مجھے ان میں سے چند ایک کے چہرے اور جسم پر چوٹوں کے تازہ نشان بھی نظر آئے۔

یہ دراز یہاں آ کر کئی شاخوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ کئی جگہ گہری تاریکی تھی جہاں مشعلیں وغیرہ جل رہی تھیں۔ کئی حصوں میں ہلکا اجالا موجود تھا۔ ویسے بھی اب مجھے یہاں داخل ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ میری آنکھیں بتدریج نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ یہ جگہ زیرزمین ایک وسیع و عریض قدرتی غار کی طرح تھی۔ ایک تنہا گوشے میں چٹائی بچھی تھی اور دو موم بتیاں روشن تھیں۔

چوہان مجھے وہاں لے آیا۔ اس نے مجھے زبردستی تھوڑا سا پنیر کھلایا۔ ساتھ میں خشک گوشت کے ٹکڑے اور بھنے ہوئے بھٹے تھے۔ پانی پی کر قدرے میری جان میں جان آئی۔ میری نگاہوں میں وہ دو عدد لاشیں گھومنے لگیں جنہیں میں اپنے پیچھے آبی گزرگاہ کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔ ناقابلِ یقین بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو میں نے مارا تھا اور اپنے ہاتھوں سے مارا تھا۔

چوہان نے مجھ سے پوچھا۔ "جہاں تک میں جانتا ہوں جو رائفل تمہارے پاس ہے، وہ حکم جی کے ذاتی گارڈز کے استعمال میں ہوتی ہے۔ یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟"

"میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اس رات زرگاں میں کیا ہوا ہے؟"

"وہ کچھ جو بہت کم لوگوں نے سوچا تھا۔ دراصل جب عام لوگوں کے دلوں کے اندر لاوا پکتا رہتا ہے تو پھر ایک روز اسے باہر تو نکلنا ہی ہوتا ہے۔ جبر، طاقت اور چالبازی سے ان جذبوں کو دبایا نہیں جا سکتا جو انسانوں کے اندر پلتے ہیں اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ پھلتے پھولتے ہیں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ حد ختم ہو جائے تو پانی جیسی نرم رقیق شے بھی بڑے بڑے مضبوط بند بہا کر لے جاتی ہے۔ زرگاں میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہوتی جا رہی ہے۔ اس تازہ واقعے نے لوگوں کو اور زیادہ بدظن کر دیا ہے۔ جارج گورا نے جو کچھ کیا، بڑی رازداری سے کیا۔ تمہیں پتا ہی ہوگا کہ جارج گورا زرگاں کی جیل کا انچارج بھی ہے۔ وہ بڑی رازداری سے سلطانہ کو رات کے وقت جیل سے نکلوا کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ لیکن یہ بات راز نہیں رہ سکی۔ جیل کا ایک ملازم مظفر جو یوں تو جارج کا وفادار ہے لیکن اس زیادتی کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بڑی مسجد کے امام صاحب کو جا کر سارا واقعہ بتا دیا۔ اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے۔ پورا زرگاں سویا پڑا تھا لیکن یہ ایسی خبر تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان آبادی میں پھیل گئی۔ اگلے روز صبح منہ اندھیرے سیکڑوں لوگ جارج کے گھر کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ جوں

جوں دن چڑھتا گیا، یہ ہجوم بڑھتا گیا۔ لوگوں کے تیور دیکھ کر جارج نے بہت سے مسلح گارڈز بلا لیے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی لوگوں نے جارج کے گھر پر ہلا بول دیا۔ گارڈز نے پہلے تو لاٹھی چارج اور ہوائی فائرنگ کے ذریعے لوگوں کو ڈرانا چاہا۔ جب بس نہیں چلا تو سیدھی فائرنگ شروع کر دی۔ وہاں بہت ہنگامہ ہوا مہروز... مم... میرا مطلب ہے تابش! کیا تمہیں اس کی کچھ خبر نہیں؟" چوہان نے پوچھا۔

"نہیں... مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں اسی رات زرگاں سے نکل گیا تھا۔ میں نے یہ دو دن بالکل ویرانے میں گزارے ہیں۔" میں نے کہا۔

چوہان نے بتایا۔ "اس ہنگامے میں کم از کم آٹھ لوگوں کی جان گئی ہے۔ چھ بندے مظاہرہ کرنے والوں میں سے مرے ہیں۔ دو گارڈز بھی جان سے گئے ہیں۔ انہیں کلہاڑیوں اور چھریوں کے زخم لگے تھے۔ اسی دوران میں جارج اور اس کے دو قریبی ساتھی موقع دیکھ کر عقبی راستے سے کوٹھی سے نکل گئے۔ حکم جی تو زرگاں سے باہر ہے۔ اس کے قائم مقام نے گارڈز کی مزید نفری منگوائی اور بڑی مشکل سے اس ہنگامے پر کنٹرول کیا۔"

"سلطانہ کا کیا بنا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"لوگوں نے اسے اور تمہارے بچے بالو کو بھی کوٹھی سے نکال لیا۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

چوہان نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، اسے کہاں ہونا چاہیے؟"

"کیا... وہ یہیں پر ہے؟" میں نے پوچھا۔

چوہان نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "لیکن اس کی حالت ایسی نہیں کہ تم فوری طور پر اس سے مل سکو۔ اس نے ان سارے حالات کا بہت زیادہ اثر لیا ہے۔ یہاں ایک بندے کے پاس افیون تھی۔ میں نے وہ اسے دی ہے تاکہ وہ کچھ دیر سکون سے رہ سکے۔" چوہان کے چہرے پر دکھ کے تاثرات تھے۔

میری نگاہوں میں ایک بار پھر وہی دل دوز منظر گھوم گیا جب میں بے بسی کی حالت میں جارج کے کمرے سے باہر آ رہا تھا اور سلطانہ دروازہ بند کر رہی تھی۔ یہ منظر جیسے میرے حافظے سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میری سانس تیزی سے چلنے لگی اور رگ پٹھوں میں تناؤ محسوس ہوا۔

"کیا بات ہے؟" چوہان نے میرا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، کہیں دور سے بچے کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ بالو ہی تھا۔

"میں سلطانہ اور بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

"لیکن اس سے سلطانہ اور ڈسٹرب ہو سکتی ہے۔"

"اس نے جتنا ڈسٹرب ہونا تھا، ہو چکی ہے۔" میں نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو... ٹھہرو... ایسے نہیں۔" چوہان نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک لیا۔ "پہلے مجھے سلطانہ کے پاس جا کر وہاں کی صورتِ حال دیکھنے دو۔"

وہ مجھے وہیں بٹھا کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ ایک شخص دوستانہ انداز میں میرے پاس آ بیٹھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سلطانہ کا باپ اور بھائی زرگاں سے نکل نہیں سکے۔ اس بات کا سب کو بہت افسوس ہے۔ چند افراد ایک طرف چادریں بچھا کر نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ بھی لیتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے ہمدردی تھی۔ لیکن اب پتا نہیں کیوں یہ ہمدردی مجھے ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ہمدردی کے ساتھ ساتھ مجھ پر ترس بھی کھا رہے ہیں اور مجھے اب ترس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اب میں جتنے ہفتے، دن یا گھنٹے زندہ رہوں، سر اٹھا کر رہوں اور کوئی مجھے قابلِ رحم نہ سمجھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان چند دنوں کے اندر میری پوری کیمسٹری ہی بدل گئی ہے۔ ایک شخص دائیں طرف دیوار کے ساتھ بیٹھا کراہ رہا تھا۔ اس کا بازو ٹوٹ گیا تھا اور اب ایک پٹی میں بندھا ہوا گلے میں جھول رہا تھا۔ یقیناً یہ بھی اس خونی ہنگامے کا زخمی تھا جو تین دن پہلے جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ ہمیش تھا۔ وہی جواں سال بھکشو جس سے پگوڈا میں پہلے ہی روز میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ محبت سے پیش آیا تھا۔ اس نے بھنے ہوئے چاولوں سے میری تواضع کی تھی... آج وہ یہاں اس مسلمان جتھے کے ساتھ موجود تھا جس نے حکم جی اور جارج وغیرہ کے خلاف بغاوت کا علم اٹھایا تھا اور اب یہاں اس زیرزمین پناہ گاہ میں موجود تھا۔

میری آنکھیں ہمیش کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ہمیش کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی... میں اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ "تم یہاں کیسے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "میں کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"میرا مطلب ہے تم تو بودھی بھکشو ہو۔"

"بھکشو بھی تو انسان ہی ہوتا ہے۔ ظلم زیادتی دیکھ کر

اس کا سینہ بھی جلتا ہے اور پھر جس طرح کے ظلم حکم جی اور جارج وغیرہ کر رہے ہیں، یہ تو پتھر کو بھی رونے پر مجبور کر دیوت ہیں۔'' نوجوان بھکشو کی شفاف آنکھوں میں گہرا دکھ پھیل گیا۔

''تو تم بھی جارج کے گھر گھسنے والوں میں شامل تھے؟''

''ہاں... اور میرے دو اور دوست بھی تھے۔ جب ہمیں جانکاری ہوئی کہ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کو رات کے وقت جیل سے نکال کر جارج گورا کے گھر پہنچایا گیا ہے اور اب بہت سے لوگن جارج کے گھر کے سامنے جمع ہیں تو میں بھی نہ رہ سکا۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں لوگن کے اندر آگ بھڑکت تھی اور وہ غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اچانک جارج کے غنڈوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ ہوا، وہ ڈاکٹر چوہان نے تمہیں بتایا ہی ہووے گا۔''

میں خاموش رہا۔ ہیمش بھی خاموشی سے اپنے ٹوٹے بازو کو سہلاتا رہا۔ آخر اس نے ہولے سے کہا۔ ''تم وہاں سے کب نکلے تھے؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرا وچار ہے کہ وہ رات دو ڈھائی بجے کا وقت ہووے گا۔ اس وقت ہم نے جارج کی کوٹھی کی طرف سے خطرے کے سائرن سنے تھے۔ پر اس وقت ہم کو بالکل پتا نا ہیں تھا کہ یہ سائرن تمہارے کارن بجائے جا رہے ہیں۔ یہ تو اگلے روز پتا چلا کہ تم ابھی جیل کے بجائے جارج کی کوٹھی پر ہی تھے اور رات کو جارج کے دو بندے زخمی کر کے وہاں سے بھاگ نکلے ہو۔ جس گھوڑا گاڑی پر تم بھاگے تھے، وہ آگے جنگل سے ملی تھی۔ بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ ایک گھوڑے کی ریڑھ ٹوٹی تھی اور وہ مر گیا تھا۔''

میں اب بھی خاموش رہا۔ اس رات کے تہلکہ خیز مناظر ذہن میں تازہ ہونے لگے۔ ہیمش میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ تعریف کا مدھم سا عکس بھی تھا۔ جیسے بزبانِ خاموشی کہہ رہا ہو۔ تم نے دلیری دکھائی ہے۔ تمہیں ایسے ہی کرنا چاہیے تھا بلکہ بہت پہلے سے ایسے کرنا چاہیے تھا۔

اسی دوران میں چوہان واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ میں اور چوہان کھوہ کے کونے میں بچھی چٹائی پر جا بیٹھے۔ چوہان نے کہا۔ ''تابش! ابھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ذہنی طور پر بھی بری طرح اپ سیٹ ہے۔ تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ کم از کم کل تک۔''

''ہم یہاں کب تک رہیں گے؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''ابھی کچھ پتا نہیں۔ ویسے تل پانی میں چھوٹے سرکار کو ساری بات معلوم ہو چکی ہے۔ وہ جلد ہی کوئی فیصلہ لیں گے۔ اگر انہوں نے اس بار تمہیں اور سلطانہ کو پناہ دے دی تو یہ بہت اچھا ہوگا... اور میرا خیال ہے کہ اگر تمہیں پناہ ملی تو ان چالیس پینتالیس لوگوں کو بھی مل جائے گی جو تمہارے ساتھ یہاں موجود ہیں۔''

''اور اگر پناہ نہ ملی تو؟''

''پھر کافی مشکل ہوگی۔ یہ لوگ اس پناہ گاہ میں بہت دیر تک چھپے نہیں رہ سکیں گے۔ پھر ان سب کو...'' وہ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گیا۔

بہر طور اس کا ادھورا فقرہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پھر ان سب کو مرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان سب میں سلطانہ اور میں بھی شامل تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے... چھوٹے سرکار کب تک فیصلہ کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چھوٹے سرکار کے لیے یہ بہت کٹھن فیصلہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ان کی پوری طرح ٹھن جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ یہ جھگڑا سنگین شکل اختیار کر جائے۔''

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ چھوٹے سرکار ہم لوگوں کی خیر خواہی میں اس حد تک چلے جائیں گے؟''

چوہان نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرائیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''بے شک دونوں بھائی ہیں اور کئی معاملوں میں ان کا مفاد ایک ہے۔ مثلاً دونوں یہ چاہتے ہیں کہ اس راجواڑے میں باہر سے کوئی مداخلت نہ ہو۔ راجواڑے میں ایسے لوگوں کو سر نہ اٹھانے دیا جائے جو کل کو راج پاٹ کے لیے خطرہ بن جائیں یا اس قسم کی دوسری باتیں۔ مگر یہ بات سب جانتے ہیں کہ چھوٹے سرکار میں حکم جی سے کہیں زیادہ رواداری اور انصاف پسندی ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی حکم جی کا جبر پسند نہیں کرتے اور جو لوگ اس جبر، ناانصافی کے ہاتھوں تنگ ہو کر تل پانی کا رخ کرتے ہیں، انہیں پناہ دیتے ہیں۔ اب تمہارے اور سلطانہ کے معاملے میں بھی جو کچھ زرگاں میں ہوا ہے، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ سلطانہ کا وہ خدشہ بالکل درست ثابت ہوا ہے جو اس نے مقدمے کی کارروائی میں چھوٹے سرکار کے سامنے بیان کیا تھا۔ اس نے

کہا تھا کہ اگر اسے موہن کمار وغیرہ کے حوالے کر دیا گیا تو زرگاں میں اس کی آبرو اور جان دونوں خطرے میں پڑ جائیں گی اور یہی کچھ ہوا ہے۔ اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بیسیوں لوگ گواہ ہیں۔ سلطانہ اور اس کا بچہ جارج کی رہائش گاہ سے برآمد ہوئے ہیں۔''

گہرے تاسف کے ساتھ چوہان خاموش ہو گیا۔

جلد ہی شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ اس زیرِ زمین پناہ گاہ کے اندر گہری تاریکی پھیل گئی۔ اس تاریکی میں کہیں کہیں مشعلوں اور لالٹینوں کی روشنی تھی۔ جب دھوئیں سے گھٹن محسوس ہونے لگی تو مشعلیں بجھا دی گئیں اور لالٹینیں جلتی رہنے دی گئیں۔ ایک طرف سے شور اٹھا۔ پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے کسی تاریک گوشے میں چھپے ہوئے ایک خطرناک جنگلی بلے کو مارا ہے۔ رات کو بھی اس پناہ گاہ میں موجود لوگوں نے خشک راشن ہی استعمال کیا۔ چوہان نے میری کیچڑ آلود رائفل کو ایک انور خاں نامی شخص کے حوالے کیا تھا۔ اس نے رائفل کے حصے بخرے کر کے اسے صاف کیا، پھر جوڑا اور تیل وغیرہ لگا کر چمکا دیا۔ گولیاں بھی بھیگی تھیں تاہم انور خاں کا خیال تھا کہ یہ قابلِ استعمال ہیں۔

رات کو لوگ، کھوہ کے مختلف حصوں میں چادریں وغیرہ بچھا کر سو گئے۔ کھوہ کے دہانے کی طرف انور خاں نے دو تین افراد کو مقرر کر دیا تھا۔ میں اور چوہان ساتھ ساتھ ہی لیٹے۔ چوہان کچھ دیر بعد سو گیا لیکن میں جاگتا رہا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ سینے میں مسلسل آگ سی روشن تھی۔ آدھی رات کے وقت مجھے پھر بچے کے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی کراہا اور کچھ بولا۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ یہ سلطانہ کے سوا کس کی آواز ہو سکتی تھی۔

میں آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نیم تاریکی میں احتیاط سے پاؤں رکھتا اور سوئے ہوئے لوگوں کو پھلانگتا ہوا میں کھوہ کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں سلطانہ اور اس کا بچہ موجود تھے۔ یہاں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی مدھم روشنی میں چٹائی پر ایک لڑکی نظر آئی۔ یہ سلطانہ ہی تھی مگر یہ وہ سلطانہ تو نہیں تھی جسے چند روز پہلے میں نے دیکھا تھا... وہ دنوں میں ہی مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا رنگ زرد تر نظر آ رہا تھا۔ رخساروں کے نکھار اور اس پژمردہ زردی میں دفن ہو چکے تھے۔ وہ بال کھولے ایک گٹھڑی پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور بالو اس کے پہلو میں کسمسا رہا تھا۔

میری طرف دیکھنے کے بعد بھی اس نے جیسے مجھے پہچانا نہیں۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات ابھرے۔ کچھ دیر کے لیے تو ایسے لگا کہ وہ ایک دم کروٹ بدل کر اپنا چہرہ چھپا لے گی یا پھر ویسے ہی اٹھ کر کسی طرف بھاگ جائے گی... مگر بتدریج اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ یہ آنسو موٹی موٹی بوندوں کی صورت اس کے زرد رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اوڑھنی اپنے سر پر پھیلا لی اور کسی شرمسار مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ میرا دل جیسے سینے میں کٹ کر سو ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ مجرم کون تھا؟ وہ تو نہیں تھی۔ اگر کوئی تھا تو پھر شاید میں تھا... اور میرے حالات تھے...

نہ جانے دل کی کیا کیفیت تھی کہ میں اس کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ روتا ہوا بالو اب چپ ہو گیا تھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں سے پُرحیرت انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آنسو ابھی تک اس کی معصوم آنکھوں میں موجود تھے لیکن وہ انہیں یکسر بھول چکا تھا۔ میں نے اس کا گال سہلایا۔ وہ مسکرانے لگا۔ وہ اس درد و کرب سے یکسر بے خبر تھا جو اس کی ماں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔

''مہرو! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔'' سلطانہ کربناک انداز میں منمنائی اور اپنا سر اپنے گھٹنوں پر جھکا لیا۔

''کیوں چھوڑ دوں؟'' میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

اسے جیسے برقی رو چھو گئی۔ اس نے ایک دم ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ''مجھے مت چھوؤ مہرو! میں تمہارے قابل نا ہیں ہوں۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔ خدا کے لیے۔''

''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے سلطانہ! تم خود کو گناہ گار کیوں سمجھ رہی ہو؟'' میں نے بڑے کرب سے کہا۔

وہ رونے لگی۔ اس کی سسکیاں جلد ہی ہچکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ ایک دم پلٹی اور اس نے اپنا سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ ''مجھے معاف کر دینا مہرو! میں بے بس ہو گئی تھی۔ وہ تمہیں مار دیتا، وہ بالو کو مار دیتا اور تم دونوں اج دنیا میں نا ہیں رہتے تو میرے جندہ رہنے کا کیا فائدہ تھا؟''

''سلطانہ... سلطانہ!'' میں نے اسے اپنے پاؤں سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ چمٹی رہی۔

''تم میرے سرتاج ہو مہرو۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں لیکن اب مجھ میں اتنی ہمت نا ہیں کہ اپنی نحوست کو تمہاری جندگی کا روگ بنا کر رکھوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو مہرو... کہیں چلے جاؤ... اور ہو سکے تو بالو کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔'' وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کے بال میرے

پاؤں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ کچھ فاصلے پر سوئے ہوئے دو تین افراد اٹھ بیٹھے اور تعجب سے دیکھنے لگے... میں نے پھونک مار کر لالٹین بجھا دی۔ کھوہ کے اس حصے میں تاریکی پھیل گئی۔

میں نے سلطانہ کے بالوں کو سہلاتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ ''تمہارا کوئی قصور نہیں سلطانہ... تم بالکل پاک صاف ہو۔ اسی طرح ہو جس طرح پہلے تھیں۔ تم خود کو...''

''ناہیں ناہیں مہرو۔'' سلطانہ نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''تم ناہیں جانتے، عورت کی عجت آبرو کا ماملہ کتنا نازک ہوتا ہے۔ میرے منہ پر جو کالک مل گئی ہے، وہ اب مجھے کبھی چین سے ناہیں رہنے دے گی۔'' وہ رو رہی تھی اور مسلسل میرے پاؤں سے چمٹی ہوئی تھی۔

اس کا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ تم ناہیں جانتے عورت کی عجت آبرو کا ماملہ کتنا نازک ہوتا ہے...

وہ غلط کہہ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ معاملہ کتنا نازک ہوتا ہے۔ میں نے اس نزاکت اور اس نزاکت کی بے مہر سنگینی کو بھگتا ہوا تھا۔ ثروت کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ حالانکہ غنڈوں کے چنگل سے نکل کر بخیریت گھر آگئی تھی لیکن ایک رات گھر سے باہر رہنے کی پاداش میں اس کے ساتھ اور اس کے اہلِ خانہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ درد کا ناقابلِ فراموش ماجرا تھا۔ اور سلطانہ؟ سلطانہ تو ''بخیریت'' بھی واپس نہیں آسکی تھی۔ ہر جگہ اندوہ کی وہی کہانی تھی۔ شکاریوں کے وہی جال اور شکار ہونے والوں کی وہی بے چارگیاں۔ آسمانی کتابوں کے مطابق عورت نے غلطی کی۔ اس نے آدم کو بہکایا اور جنت سے نکلوایا۔ شاید اس غلطی کی سزا ہر بنتِ حوا آج تک بھگت رہی ہے۔

میں نے بمشکل سلطانہ کو اپنے پاؤں سے جدا کیا اور دیوار کے سہارے بٹھایا۔ تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تربتر ہے۔

تاریکی کی وجہ سے بالو نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا تھا۔ سلطانہ اس سے قطعی بے پروا نظر آرہی تھی۔ وہ اسے ہاتھ لگاتے ہوئے بھی کتراتی تھی۔ میں ان دونوں کے پاس سے اٹھ کر باہر آگیا۔ دماغ میں آندھی چل رہی تھی۔ ایسی بےکار زندگی کا کیا فائدہ تھا؟ اسے ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جلد سے جلد ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ مجھے پچھلے دو برس کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا لیکن لوگ جو کچھ بتا رہے تھے، ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ سلطانہ نے میرے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ جب میں ایک بار اس کا شوہر بن گیا تو پھر اس نے مجھے واقعی اپنا شوہر سمجھا اور ایک جاں نثار شریکِ حیات کی حیثیت سے میری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن گئی۔ ایک مرتبہ اس نے میری حفاظت کی خاطر اپنے گھرانے کی سب سے قیمتی متاع، راجا پرتاپ بہادر کی بخشی ہوئی مہر داؤ پر لگائی اور اب اس نے میری زندگی کے لیے اپنا آپ ہی داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کے بدلے میں نے کیا کیا؟

یہ سوال دہکی ہوئی آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑ گیا۔ دماغ میں چلتی ہوئی آندھی مزید تند و تیز ہوگئی... عمران نے ہی تو کہا تھا ایک بار... جب مرنے کا ارادہ کر لو تو پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔ پیچھے دیکھنے سے زندگی کا کالا جادو چل جاتا ہے... ڈاکٹر چوہان، ہمیش اور انور خاں وغیرہ سب اپنی اپنی جگہوں پر سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک نظر ان سب پر ڈالی۔ پھر انور خاں کے پاس سے اس کی رائفل اٹھائی... اور ایک عجیب کیفیت کے زیرِ اثر وہاں سے چل پڑا۔ میرا رخ اس طویل کھوہ کے دہانے کی طرف تھا۔

میں کیا کرنا چاہتا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ فی الوقت بس ایک ہی خواہش تھی۔ سرخ و سپید چہرے والا جارج میرے سامنے ہو۔ میں رائفل اپنے اور اس کے درمیان پھینک دوں پھر چلا کر کہوں... ''چل کتے آ... تو مجھے مار دے یا میں تجھے مار دوں۔'' ایسی درندگی کے ساتھ اس پر جھپٹوں کہ بس چند سیکنڈ میں میری یا اس کی موت کا فیصلہ ہو جائے۔

جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، کھوہ تاریک تر ہوتی گئی۔ مجھے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنا پڑا۔ بالآخر میں دہانے تک پہنچ گیا۔ یہاں تاریکی میں دو ہیولے نظر آئے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہیں انور خاں نے پہرے پر مقرر کیا تھا۔

میں پاس پہنچا تو ان میں سے ایک بولا۔ ''کون؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکی۔

''کیا بات ہے۔ تم کہاں جادت ہو؟'' ایک شخص نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے کوئی کام ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا اور آگے بڑھنا چاہا۔

اس شخص نے میرا راستہ روکا۔ میں نے دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔

''دیکھو! تم ایسے ناہیں جا سکت ہو۔'' اس نے کہا اور دوبارہ میرے راستے میں آگیا۔ اس مرتبہ دوسرا شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔

''بکواس بند کرو۔'' میں نے وحشت کے عالم میں اسے پھر دھکا دیا۔ اس مرتبہ وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ وہ دوبارہ میرے سامنے آتا تو میں اس پر رائفل تان لیتا مگر اس سے پہلے کہ نوبت یہاں تک پہنچتی، کسی نے عقب سے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔ ''نہیں تابش! ایسے نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک نہیں۔''

یہ چوہان کی آواز تھی۔ پتا نہیں وہ کب میرے پیچھے آن موجود ہوا تھا۔ میں نے زور مارا۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے مار ڈالوں گا...'' میں چنگھاڑا۔ میری آواز فرطِ طیش سے بگڑی ہوئی تھی۔ میرا اشارہ جارج کی طرف تھا۔

اسی دوران میں دو اور افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ ان میں سے ایک انور خاں تھا۔

''میں قتل کر دوں گا یا قتل ہو جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے مرنے دو۔'' میں دہاڑ رہا تھا اور خود کو چھڑانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ وہی آنسو جو بےبسی کی انتہا کو چھونے کے بعد بجنگ آمد کی کیفیت میں آنکھوں میں آتے ہیں۔

کچھ دیر بعد میرے ہیجان میں کچھ کمی آئی تو چوہان نے نرمی کے ساتھ رائفل میرے ہاتھ سے لے لی اور انور خاں کو واپس کر دی۔ وہ لوگ مجھے دلاسا دیتے ہوئے کھوہ کے اندرونی حصے میں واپس لے آئے...

چوہان نے مجھے سمجھانا شروع کیا۔ اس نے کہا کہ اس موقع پر ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ ہماری کسی بھی جلد بازی سے حکم جی اور جارج وغیرہ کو فائدہ پہنچے گا اور وہ پہلے ہی کچھ کم طاقتور نہیں ہیں۔ اس نے مجھے انور خاں کے بارے میں بھی بتایا۔ اس نے کہا۔ ''انور خاں بڑا باکمال آدمی ہے۔ علاقے کے مسلمان باشندے اسے ایک ہیرو کی طرح مانتے ہیں۔ حکم جی وغیرہ کو بھی انور خاں کے ساتھ بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ انور خاں کسی بھی وقت مسلمان باشندوں کو بھڑکا بھی سکتا ہے اور ان کے جذبات کو ٹھنڈا بھی کر سکتا ہے۔ چند دن پہلے تک انور خاں کے تعلقات حکم جی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ٹھیک ہی تھے مگر اب سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ انور خاں نے سلطانہ کو جارج کے شکنجے سے چھڑانے میں باقاعدہ کردار ادا کیا ہے... بلکہ لوگوں کو جارج کے گھر کے سامنے جمع ہونے اور پھر ہلا بولنے کی ہمت انور خاں کی وجہ سے ہی ہو پائی تھی...''

چوہان نے مجھے انور خاں کے بارے میں کئی ایک باتیں بتائیں۔ میں سن تو رہا تھا مگر میرا دماغ کئی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جو سب سے پریشان کن خیال بار بار میرے ذہن سے ٹکرا رہا تھا، وہ یہی تھا کہ آخر میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں جہاں جاتا ہوں، میرا پیچھا کرنے والے وہاں کیسے پہنچ جاتے ہیں؟ اگر وہ ہر جگہ پہنچ گئے تھے تو پھر یہاں بھی پہنچ سکتے تھے۔ میں نے اب تک پیش آنے والے سارے واقعات سے چوہان کو آگاہ کرنا بہتر سمجھا۔ میں نے جب چوہان کو بتایا کہ حکم جی کا خاص ہرکارہ اپنے ایک ساتھی سمیت میرے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے تو چوہان ششدر رہ گیا۔

اس نے مجھ سے تفصیل پوچھی۔ میں نے اسے بتایا۔ ''وہ میرے پیچھے آرہے تھے۔ میں جنگل میں بہت آگے نکل گیا تھا مگر وہ پھر بھی مجھ تک پہنچ گئے۔ وہ گھوڑوں پر آئے تھے... ان کے ساتھ وہ غیر ملکی ڈیوڈ بھی تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑنا چاہا تو میں نے گولی چلا دی۔ ڈیوڈ اور اس کا ایک ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیواری اور ایک دوسرا بندہ وہیں مارے گئے۔ میں ان کی لاشیں ندی کے کنارے چھوڑ آیا ہوں۔''

''یہ بات اب بہت آگے تک جائے گی۔'' چوہان نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تیواری اور ڈیوڈ وغیرہ حکم جی کے لیے بڑے خاص لوگ ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بہت سی تبدیلیوں کا وقت ہے۔ یہاں کافی ہلچل مچنے والی ہے۔'' چوہان کی آنکھوں میں بدستور حیرت ناچ رہی تھی۔

اچانک ایک طرف سے پھر شور ابھرا۔ ہم نے خیال کیا کہ شاید پھر کہیں سے کوئی جانور نکل آیا ہے۔ لیکن اس مرتبہ صورتِ حال مختلف تھی۔ دو افراد آپس میں لڑ پڑے تھے۔ وہ گتھم گتھا تھے۔ دوسرے افراد انہیں چھڑانے میں لگے ہوئے تھے۔ چند سیکنڈ تک یہ ہنگامہ رہا پھر دونوں متصادم افراد کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نوجوان کا نام فیروزا اور دوسرے کا نام اکبر ہے۔ اکبر درمیانی عمر کا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی بلند آواز سے بول رہا تھا۔ ''میں پھر کہتا ہوں، یہ فیروزا ہم کو نقصان پہنچا دے گا۔ اس نے روپ بدلا ہوا ہے۔ اس کا دل اب بھی ان لوگوں کے ساتھ دھڑکت ہے جن کا یہ نمک کھادت ہے۔''

''بکواس بند کرو۔'' انور خاں زور سے دہاڑا۔ ''ثبوت کے بغیر کوئی بھی بات نہ کرے۔ جو بھی ثبوت کے بغیر بات کرے گا، میں اس کا گریبان پکڑ لوں گا۔''

اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر زیادہ بولنے والے شخص اکبر کو

چپ کرا دیا۔ دونوں طرف سے لوگ بول رہے تھے۔ انور خاں پانچ چھ افراد کو لے کر ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دیر تک وہاں میٹنگ ہوتی رہی۔ پھر لگا کہ معاملہ ٹھنڈا پڑ رہا ہے۔ صرف دس پندرہ منٹ بعد میں دیکھ رہا تھا کہ فیروز اور اکبر نامی دونوں افراد آپس میں گلے مل رہے ہیں۔ انہیں گلے ملانے والا انور خاں ہی تھا۔

''یہ کیا معاملہ تھا؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''بس غلط فہمی تھی جس کی وجہ سے جھگڑا ہو گیا لیکن اس جھگڑے کی وجہ سے ایک اہم انکشاف بھی ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

چوہان نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔ ''دراصل فیروز نام کا یہ لڑکا جس سے اکبر علی نے جھگڑا کیا ہے، حکم جی کے ملازموں میں سے ہے۔ فیروز کی والدہ ہندو تھی مگر شادی کے وقت مسلمان ہو گئی۔ پر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پھر بھی ہندو ہی رہی تھی۔ اس وجہ سے وہ فیروز سے بھی عناد رکھتے ہیں جبکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اب بھی اسی بات پر جھگڑا ہوا ہے۔ اکبر نے فیروز پر الزام لگایا ہے کہ وہ جاسوسی کے لیے ان کے ساتھ موجود ہے ورنہ وہ اب بھی حکم جی کے گھر میں اس کے پودوں کو پانی دے رہا ہوتا یا اس کی گاڑیاں صاف کر رہا ہوتا۔ جواب میں فیروز نے جو کچھ کہا ہے، اس نے سب کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ فیروز نے کہا ہے کہ وہ اس بندے کی موت کی وجہ سے حکم جی کا باغی ہوا ہے جو کچھ دن پہلے سلطانہ کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔''

''تم ہارون کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

چوہان نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ''فیروز نے انکشاف کیا ہے کہ ہارون اس وجہ سے نہیں مرا تھا کہ اسے سلطانہ نے کلہاڑی ماری اور پھر کھوہ میں اسے باندھ کر نل پانی چلی گئی۔ اس کی موت حکم جی کے اپنے بندوں کی وجہ سے ہوئی۔ اسے موہن کمار اور اس کے ساتھیوں نے مارا۔ اور اس وجہ سے مارا تا کہ ہارون کی موت کو سلطانہ کے سر تھوپ کر اسے نل پانی سے واپس لایا جا سکے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ واقعی یہ سنسنی خیز انکشاف تھا۔ میں خود بھی کئی دن تک الجھن میں رہا تھا۔ بے شک سلطانہ کی کلہاڑی سے ہارون کے سر کے پچھلے حصے پر گہرا زخم آیا تھا لیکن یہ ایسا زخم نہیں تھا کہ اس کی فوری موت کا باعث بن جاتا۔ یقیناً یہ سازش ہی تھی۔ بندھے ہوئے ہارون کو کھوہ کے اندر موہن کمار نے مارا تھا پھر اس کی لاش لے کر دہائی دیتا ہوا نل پانی جا پہنچا تھا۔ اس کی دہائی کارگر رہی تھی اور چھوٹے سرکار نے مجھے اور سلطانہ کو پناہ دینے کے بجائے موہن کمار اور گردمووان وغیرہ کے سپرد کر دیا تھا۔

چوہان نے مدھم لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اصل میں یہ نوجوان فیروز اور ہارون ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ فیروز کو معلوم تھا کہ ہارون کی موت حقیقت میں کس طرح ہوئی ہے۔ وہ اپنے دل میں غم چھپائے پھر رہا تھا۔ اس دوران میں یہ دوسرا واقعہ ہو گیا۔ پتا چلا کہ جارج نے سلطانہ کو جیل سے نکال کر اپنے گھر پہنچایا ہے۔ دیگر لوگوں کی طرح فیروز بھی اپنے غم و غصے کو دبا نہیں سکا۔''

''یہ تو بالکل نئی صورتِ حال سامنے آگئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اور اس نئی صورتِ حال میں ہمارا کافی فائدہ ہو سکتا ہے۔ اب جب یہ ساری بات چھوٹے سرکار کے سامنے آئے گی تو مجھے پوری آشا ہے کہ ان کا رویہ بہت نرم ہو جائے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ موہن کمار وغیرہ کی یہ سازش بڑے اچھے وقت پر سامنے آئی ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد انور خاں اپنے ساتھ فیروز نامی اس لڑکے کو لے آیا۔ اس کی عمر بائیس تیئس سال تھی۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ ابھی تک یہاں ہونے والے جھگڑے کے اثرات سے نکلا نہیں تھا۔ انور خاں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بہت دلیری والا کام کیا ہے۔ اکبر علی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ تمہارا قد ہم سب سے اونچا ہو گیا ہے۔''

چوہان نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں فیروز کہ تم کل میرے ساتھ چھوٹے سرکار کے پاس چلو۔ تمہاری گواہی ہمارے لیے بڑی فائدے مند ثابت ہو گی۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ اس بار چھوٹے سرکار کا فیصلہ تم لوگوں کے حق میں ہو گا۔''

فیروز نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ دھیمی نہیں ہوئی۔ وہ انور خاں اور چوہان کی باتیں سن تو ضرور رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں شاید کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ غالباً اس کو ہندو ماں کا بیٹا ہونے کا جو طعنہ دیا گیا تھا وہ اسے آگ بگولا کیے ہوئے تھا... اور وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

اگلے ستر، اٹھارہ گھنٹے بھی کھوہ کے اندر ہی گزرے۔ کھوہ میں میرے اور سلطانہ سمیت تقریباً پینتالیس افراد موجود تھے۔ انور خاں ان کا لیڈر تھا۔ ڈاکٹر چوہان ایک خیر خواہ اور مددگار کی حیثیت سے یہاں موجود تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ان پینتالیس لوگوں کو نل پانی میں چھوٹے سرکار کے پاس پناہ مل جائے۔ اس سلسلے میں گفتگو اور پیغام رسانی کا سلسلہ جاری تھا۔ ابھی تک چوہان اور انور خاں وغیرہ خود اس کھوہ سے باہر نہیں نکلے تھے۔ یقینی بات تھی کہ کھوہ سے باہر سب کے لیے خطرات موجود ہیں۔ سلطانہ بدستور نیم غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ چوہان اسے محفوظ مقدار میں افیون دے رہا تھا تا کہ وہ زیادہ دیر سوئی رہے اور اس کے ذہن کو نارمل ہونے کے لیے وقت ملے۔

آدھی رات کو جب سارے سوئے ہوئے تھے، ایک سایہ سا مجھ پر جھکا اور میرے شانے کو ہولے سے ہلایا۔ میں غنودگی میں تھا، جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے پہچان لیا۔ وہ کل اکبر نامی شخص کے ساتھ جھگڑنے والا فیروز ہی تھا۔ اس نے دوستانہ انداز میں مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں چند لمحے تک تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے کھوہ کی دو تین تنگ و تاریک شاخوں سے گزارنے کے بعد ایک حجرہ نما جگہ پر لے آیا۔ اس قدرتی حجرے میں ایک چھوٹی سی میلی کچیلی لالٹین روشن تھی۔ یقیناً یہ لالٹینیں اور اس طرح کا دیگر سامان چوہان اور اس کے ساتھی ہی یہاں لے کر آئے تھے ورنہ باقی لوگ تو افراتفری میں زرگاں سے بھاگے تھے۔ اس حجرہ نما جگہ پر پہلے سے دو نوجوان موجود تھے۔ ان کی عمریں بائیس چوبیس سال کے قریب رہی ہوں گی۔ ان دونوں کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ ان کا لباس اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں غصے کی سرخی نظر آتی تھی۔

انہوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''میرا نام اسحاق ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''اور میرا نام ماجد ہے۔ میں فیروز کا ماموں زاد بھی ہوں۔'' دوسرے نے بھی دھیمے لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔

''اور مجھے تو تم جانتے ہی ہو۔ میں فیروز ہوں۔ حکم جی کے غنڈوں کے ہاتھوں بے موت مارے جانے والے ہارون کا دوست۔'' فیروز بولا۔

''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آہستہ بولو۔'' فیروز نے سرگوشی کی۔ ''ہم نہیں چاہتے کہ یہاں ہونے والی بات چیت کسی کے کانوں تک پہنچے۔''

اسحاق بولا۔ ''کل رات تمہارا جوش جذبہ دیکھا۔ تمہیں چوہان صاحب اور انور بھائی وغیرہ نے زور مار کر روک لیا ورنہ تم نے یہاں سے نکل جانا تھا۔ لگتا ہے کہ تم بھی اسی طرح سوچ رہے ہو جس طرح ہم سوچ رہے ہیں۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ حد گزر چکی ہے... ہم تینوں نے آج رات ایک فیصلہ کیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی اس فیصلے میں شامل ہو جاؤ۔''

''لیکن یہ تمہاری اپنی مرضی کی بات ہے، کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔'' فیروز بولا۔

''تم کس فیصلے کی بات کر رہے ہو؟''

اسحاق نے میری آنکھوں میں دیکھا اور ڈرامائی سرگوشی کی۔ ''ہم جارج گورا کو قتل کر دیں گے۔''

میری رگوں میں لہو اچھل گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے فیروز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چنگاریاں تھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، اب صبر کی حد گزر چکی ہے۔ یہ سفید بھیڑیا ہماری عورتوں کو کھاوت ہے۔ ان کے جسم نوچت ہے۔ اس نے ہر طرف جال پھیلا رکھے ہیں۔ کہیں زور زبردستی کا جال، کہیں پیار محبت کا جال۔ اس کے پاس سو حیلے بہانے ہیں اور یہ اپنے شکار کو چھوڑتا نہیں ہے۔ اب اس بدنصیب سلطانہ کو ہی دیکھو۔ وہ کوئی ایسی خوب صورت نہیں۔ ایک بچے کی ماں بھی ہے لیکن اس سفید سور نے اس کو بھی معاف نہیں کیا۔ دو تین سال سے اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا اور کوشش میں لگا ہوا تھا۔ آخر کامیاب ہوا۔ اب ہم اس کی کامیابی کو آخری ناکامی میں بدل دیویں گے۔ اس کے ناپاک بستر کے اوپر ہی اس کے ٹکڑے کر دیویں گے۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے فیروز کے لہجے میں عجیب سی گرج آگئی۔ پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔

''ہاں... ہم جارج کو مار دیں گے یا خود مر جائیں گے۔'' ماجد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

فیروز بولا۔ ''ہم تینوں کل رات اس عہد کے ساتھ یہاں سے نکلیں گے کہ جارج گورے کو مار کر واپس آئیں گے یا کبھی واپس نہیں آئیں گے۔'' اس نے کچھ لمحے توقف کیا، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم اس کام میں ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہت ہو؟''

بے بسی کا منظر ایک بار پھر نگاہوں میں چمکا۔ بڑی آن بان والی سلطانہ لاچاری کی تصویر تھی۔ وہ مجھے جارج کے بیڈ روم سے باہر نکال کر دروازہ بند کر رہی تھی۔

رائفل پر میری گرفت مضبوط تر ہو گئی۔ سینے میں آگ کی دیو قامت لہر پھر حرکت میں آنے لگی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس سیکیورٹی کا کیا کرو گے جس نے جارج

کے گھر کو گھیرا ہوا ہے؟ اب تو یہ سیکیورٹی اور بھی سخت ہوگی۔''

''مہروز بھائی! جب جان ہتھیلی پر رکھ لی جاوے تو پھر کوئی رکاوٹ بھی آگے بڑھنے والے کا راستہ ناہیں روک سکتی۔ اب تم خود کو ہی دیکھو۔ جب تم نے جان ہتھیلی پر رکھ لی تو تم جارج کے کتوں اور اس کے رکھوالوں کو لہولہان کر کے اس کے گھر سے نکل آئے۔ نکل آئے یا ناہیں؟'' فیروز نے کہا۔

''کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، منصوبہ بھی ہے لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو بات یہاں ہم چاروں کے درمیان ہوگی، اس کا پتا انور بھائی اور چوہان صاحب وغیرہ سمیت کسی کو ناہیں چلنے گا۔'' فیروز نے کہا۔

میں خاموش رہا۔ اسحاق بولا۔ ''ایسی بات ناہیں کہ ہم انور بھائی اور چوہان صاحب وغیرہ سے علیحدہ سوچت ہیں۔ سوچ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس راجواڑے میں سے جارج گورا جیسے کتوں کا خاتمہ کر دینا ہے۔ وہ یہ کام اور ڈھنگ سے کرنا چاہت ہیں لیکن ہم اور ڈھنگ سے کریں گے اور یہ حرامی جارج والا کام تو بس چند پہروں کے اندر ہی ہوگا... اور اگر ناہیں ہوگا تو پھر ہم ناہیں ہوں گے۔''

''لیکن ایک بات سوچنے کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چوہان اور انور خان وغیرہ کا خیال ہے کہ اس بار سلطانہ کو اور ہم سب کو نل پانی میں پناہ مل جائے گی۔ سب کو پتا ہے کہ جارج اور اس کے پشت پناہ حکم جی نے ظلم کیا ہے لیکن اگر ہماری طرف سے بھی کوئی بڑی کارروائی ہوگئی تو پھر کچھ لوگ اسے بھی ظلم قرار دیں گے۔ یوں، یہ پناہ والا معاملہ خطرے میں پڑ جائے گا۔''

اسحاق نے کہا۔ ''تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے مگر جارج کی موت ایک ایسا واقعہ ہووے گی جس پر شاید حکم جی اور اس کے قریبی ساتھیوں کے سوا ہر کوئی خوش ہوگا۔ جارج جو کچھ کرتا ہے اس سے صرف مسلمان ہی متاثر ناہیں، ہر کوئی متاثر ہے.. اور ہم تو سمجھتے ہیں کہ جارج مارا گیا تو حکم جی اور اس کے حواریوں کی کمر بھی ٹوٹ کر رہ جاوے گی۔ ایک دم سب کچھ اچھا ہو جاوے گا۔''

''مگر ایک دم سب بُرا بھی تو ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

فیروز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''اب اس سے بُرا اور کیا ہووے گا۔ ہم جیتے جی قبن ہو رہے ہیں۔ اب اور برداشت کریں گے تو پھر ہم بھی مجرم ہوں گے۔ ناہیں... اب ناہیں۔'' اس کا جوش اس کے لہجے سے عیاں تھا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے یہاں کے حالات کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں، لہٰذا اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ جارج کو مارنے کے لیے یہ ٹھیک موقع ہے تو پھر میں تمہارے ساتھ ہوں... بلکہ میں ابھی اور اسی وقت تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

''بہت اچھے۔'' اسحاق نے پُرجوش انداز میں کہا۔ پھر وہ اٹھا اور فیروز کو آنکھوں آنکھوں میں کچھ سمجھا کر ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ ہم وہاں لالٹین کی مدھم روشنی میں بیٹھے رہ گئے۔ رات خاموش اور بھیدوں بھری تھی۔

میرے اندازے کے مطابق ہم زمین کے نیچے کم از کم سو فٹ کی گہرائی میں موجود تھے۔ سرنگوں کا ایک شاخ در شاخ سلسلہ تھا۔ میرے قیاس کے مطابق اس کی طوالت ڈیڑھ دو میل کے قریب تو ہوگی۔ حکم جی اور جارج گورا کے کم از کم پینتالیس باغی اس وقت اس زیرزمین پناہ گاہ میں موجود تھے اور ایک خونچکاں منصوبے کے تانے بانے بُن رہے تھے۔

میں نے فیروز سے پوچھا۔ ''اسحاق کہاں گیا ہے؟''

وہ سرگوشی میں بولا۔ ''اسحاق کے ذمے اسلحے کا انتظام ہے۔ وہ اسی کام کے لیے گیا ہے۔''

''رائفلیں تو تم سب کے پاس موجود ہیں اور میرے پاس بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ہمیں کچھ اور کی ضرورت بھی پڑے گی۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''یہ اسحاق بھی زرگاں کا رہائشی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں... اس کی سگی بہن بھی جارج گورا کا شکار ہوئی ہے۔ کوئی چار مہینے پہلے وہ بیمار ہو کر مرگئی تھی لیکن جاننے والے جانت ہیں کہ وہ مری ناہیں تھی، اس نے خود کو مارا تھا۔ کوئی زہریلی چیز کھالی تھی اس بدنصیب نے۔''

''کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟''

''اس کا معاملہ سلطانہ سے مختلف تھا۔ دراصل جارج جیسے شکاریوں کے پاس ہزار طرح کے جال ہوتے ہیں۔ جس رنگ کی زمین ہو، وہ اسی طرح کا جال بچھاوت ہیں۔ وہ لڑکی بڑی پیاری تھی، بالکل گڑیا کی طرح اور بہت ہنس مکھ بھی۔ روبینہ نام تھا۔ اس کی شادی اپنے ماموں زاد سے ہوئی تھی۔ یہ لڑکا بے روزگار تھا۔ پھر ہیروئن اور گانجا وغیرہ بھی پینے لگا۔ اسی دوران میں کچی آبادی میں کہیں جارج کی نگاہ روبینہ پر پڑ گئی۔ اس نے اسے اپنے شکار کے طور پر منتخب کر لیا۔ اس نے روبینہ کے شوہر باسط کو اپنے پاس ملازمت دی اور اس کے ساتھ ہی دعویٰ کیا کہ وہ اس کی ہیروئن چھڑا کر اسے ایک کارآمد شخص بنا دیوے گا... لیکن جو کچھ ہوا، وہ اس کے الٹ تھا۔ اس نے باسط کی ہیروئن تو چھڑا دی لیکن شراب کی پکی پکی لت لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکا جارج کی مہربانی کا غلام ہو کر رہ گیا۔ اسے قیمتی شراب درکار تھی اور عیاشی کا دیگر سامان بھی۔ یہ چیز کیا اسے صرف اور صرف جارج کی جی حضوری سے ہی مل سکت تھیں۔ جارج نے باسط کو رہنے کے لیے ایک سرونٹ کوارٹر بھی دے دیا تھا۔ اس کے بعد باسط کے ساتھ ساتھ روبینہ بھی جارج کی چار دیواری میں آگئی۔ اسے چار دیواری کے بجائے شکارگاہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ باسط نے خود نوبیاہتا بیوی کو مجبور کیا کہ وہ جارج گورا کی خواہش کے سامنے اپنا سر جھکائے۔ وہ بے آسرا لڑکی تھی۔ ایک بھائی کے سوا اس کا آگے پیچھے کوئی ناہیں تھا اور بھائی بھی مزدوری کے لیے زرگاں سے بہت دور تھا۔ وہ جنگل کی کٹائی کرنے والے ایک ٹھیکے دار کے پاس بھرتی تھا۔ وہ کیا کرتی؟ اس نے ہچکچاہٹ دکھائی تو شوہر نے اسے مارا پیٹا۔ بالآخر وہ بےچاری اس غلاظت میں گر گئی جس میں اس کا شوہر اسے گرانا چاہت تھا۔ مگر اس کا دل اس کے ساتھ ناہیں تھا۔ وہ روز روز خود کو جارج کے بستر پر تاراج ہوتے ناہیں دیکھ سکت تھی۔ اس نے ایسے جیون سے موت بہتر سمجھی... ایک رات اس نے کچھ کھالیا۔ اس کا دم الٹ گیا۔ اس کے گلے میں ایک پھندا سا لگ گیا۔ وہ تین روز تک اس طرح سانس لیتی رہی کہ اس کے سانس کی آواز پورے گھر میں گونجت تھی۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے اور وہ بار بار بےہوش ہو وت تھی۔ آخر وہ مرگئی۔ اس کی عمر صرف اٹھارہ بیس سال تھی۔ یہ اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے۔ سکھیوں کے ساتھ مل کر گیت گانے، میلوں ٹھیلوں میں جانے اور تہوار منانے کا وقت تھا اور وہ بیماری کا بہانہ کر کے منوں مٹی کے نیچے جا سوئی۔ اسے کس جرم میں موت کی سزا ملی؟ اس کا کیا دوش تھا؟ شاید صرف یہی دوش تھا کہ بےسہارا عورت تھی اور ایک چالباز ہوس کار کی نگاہ میں آگئی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی ایک رازداں سہیلی سے معلوم ہوا کہ روبینہ نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لی ہے۔ پھر اس حکیم نے بھی اس بات کی تصدیق کی جس نے روبینہ کا علاج کیا تھا۔ بعد میں اس حکیم کی بھی جارج کے ہاتھوں بہت شامت آئی۔ اسے جان کے لالے پڑ گئے اور اسے زرگاں چھوڑنا پڑا۔ زورآور کے خلاف آواز اٹھانا بہت مشکل ہووت ہے۔ جو چند ایک آوازیں اٹھیں بھی، وہ جلد ہی دم توڑ گئیں...''

اسی دوران [illegible] واپس آگیا اور اس کے آنے سے فیروز خاموش ہوگیا۔ اسحاق کے پاس ترپال کا بنا ہوا ایک سیاہ تھیلا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اس تھیلے میں رائفلوں کا ایمونیشن اور ہینڈ گرینیڈ وغیرہ تھے۔ اسحاق، ماجد اور فیروز نے ایک بار پھر سرگوشیوں میں بات چیت شروع کر دی۔ اس بات چیت سے اندازہ ہوا کہ کل کا دن جارج گورا پر ایک کارگر حملہ کرنے کے لیے بہت موزوں ہے۔ جارج گورا ہفتے کے دن شام کے وقت سورج ڈھلنے سے کچھ پہلے اپنی رہائش گاہ سے باہر نکلتا تھا اور زرگاں کی پرانی آبادی میں پرانے پگوڈا کے سامنے لوگوں میں خوراک تقسیم کرتا تھا... بظاہر جارج اور خیرات دو متضاد چیزوں کی طرح نظر آتے تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جارج اور حکم جی جیسے دنیاپرست لوگ اکثر عوام الناس کو دھوکا دینے کے لیے ایسے ڈھونگ رچاتے ہیں۔ شاید وہ اپنے طور پر اپنی زندگی کے کھاتے میں اپنے گناہوں کو ''بیلنس'' کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر جیسے ان گنت جابر لوگوں کی زندگیوں میں کہیں نہ کہیں اس قسم کی ڈراما بازی موجود رہی ہے۔ غالباً یہ بھی ایسے ہی منافق رویے کا عکس تھا۔ جارج جیسا ظالم شخص ہر ہفتے ایک خاص دن میں غربا کی بستی میں پہنچتا تھا اور ان کے دکھوں میں شریک ہونے کی نمائش کرتا تھا۔ وہ جس راستے سے گزر کر جاتا تھا، وہیں پر ایک خاص جگہ ایسی تھی جہاں اس کے مختصر قافلے پر گھات لگا کر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ اسحاق، ماجد اور فیروز وغیرہ اس حملے کے بارے میں ساری تفصیلات پہلے ہی طے کر چکے تھے۔

☆☆☆

ابھی شام ہوئی نہیں تھی مگر گھنے درختوں کی وجہ سے نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ شام ہوتے ہی یہ جگہ گھٹاٹوپ تاریکی میں ڈوب جائے گی۔ ہم اپنی زیرزمین پناہ گاہ سے کل رات کو ہی نکل آئے تھے۔ ہم نے ساری رات اور تقریباً سارا دن سفر کیا تھا۔ اس سفر کے لیے فیروز اور اسحاق وغیرہ نے گھنے جنگل میں شارٹ کٹ راستے استعمال کیے تھے۔ یوں وہ اندازاً دس پندرہ میل کا سفر کم کرنے میں کامیاب رہے تھے اور اب ہم اس خاص مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں ہمیں گھات لگانا تھی۔

یہاں اسحاق وغیرہ کو درختوں میں ایک ٹوٹی پھوٹی گھوڑا گاڑی بھی مل گئی۔ یہ چار پہیوں والی گاڑی تھی۔ اس کے اگلے بانس ٹوٹ چکے تھے۔ ایک پہیہ بھی علیحدہ پڑا تھا۔ اسحاق، ماجد اور فیروز نے مشورہ کیا اور اس گاڑی کو حملے میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسحاق اور فیروز تیزی سے گاڑی

کا پہیہ جوڑنے میں مصروف ہوگئے۔
''اس گاڑی کا کیا کرو گے؟''میں نے فیروز سے پوچھا۔
''اس کو راستہ روکنے کے لیے استعمال کریں گے۔''
فیروز نے جواب دیا اور مجھے لے کر ان گھنے درختوں میں آ گیا جہاں سے راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ایک کچا لیکن بالکل ہموار راستہ تھا۔ دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ زرگاں کی نئی آبادی بائیں طرف تھی اور بلند درختوں کے اندر سے کہیں کہیں اس کے آثار نظر آتے تھے۔ عمارتوں کے سنہری اور سفید کلس اور مندروں کی چوٹیاں ڈوبتے سورج کی روشنی میں جھلک دکھا رہی تھیں۔ راستے تک ایک چھوٹی سی ڈھلوان جاتی تھی۔ فیروز نے ڈھلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''جب جارج کا قافلہ قریب آ رہے گا تو ہم اس چار پہیوں والی گاڑی کو ڈھلوان کی طرف دھکیل دیویں گے۔ وہ گاڑی دوسرے کنارے کے درختوں سے ٹکرائے گی اور راستے کے عین اوپر رک جاوے گی۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''
''اس کے بعد کیا ہوگا؟''میں نے پوچھا۔
''ہم دو طرف سے جارج کی گاڑی پر حملہ کریں گے۔ چھلنی کر دیویں گے حرامزادے کو اور اس کے ساتھیوں کو۔''
''اس کی گاڑی کی پہچان کیا ہے؟''
''سفید گھوڑوں والی لال گاڑی۔ وہ چار گاڑیوں کے قافلے میں سب سے الگ نظر آوے گی۔ اس کے آگے مسلح گارڈز کی گاڑی ہوگی۔ اس کے پیچھے والی گاڑی میں دو چار مصاحب بیٹھے ہویں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خبیث موہن کمار بھی موجود ہو۔ آخری گاڑی میں بھی گارڈز کا دستہ ہوگا۔ ان لوگوں کے پاس بی تھری گن موجود ہوتی ہے۔ اس آخری گاڑی کے عقب میں دو گھڑ سوار ہوں گے۔ ان کے پاس بھی اسلحہ ہوگا۔ تاہم یہ اسلحہ صرف نمائشی ہوتا ہے۔ یعنی تلوار، آرائشی رائفل اور خنجر وغیرہ۔''
مجھے موقع دکھانے کے بعد فیروز واپس گھنے درختوں کے تاریک جھنڈ میں لے آیا۔ وہاں ماجد اور اسحاق بھی بالکل تیار تھے۔ ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ رگ پٹھے تنے ہوئے تھے۔ ہم چاروں نے اپنی پوری پلاننگ پر ایک بار پھر غور کیا۔ یہ طے ہوا کہ پکڑے جانے کے بجائے ہم لڑتے ہوئے جان دینا بہتر سمجھیں گے اور اگر خدانخواستہ کسی شخص کی گرفتاری یقینی ہو جائے تو وہ خود اپنی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ یہ سب بے حد جذباتی صورتِ حال تھی اور جو باتیں ہم ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے، انہیں کہنے کے لیے لوہے کا جگر اور فولاد کا دل درکار تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ میں اس جانباز ٹولی کا حصہ ہوں اور آج میں نے اپنی جان محاورتاً نہیں حقیقتاً ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ ہاں، آج میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو جھوٹ ہوگا کہ میرے دل میں زندگی کی خواہش نہیں تھی لیکن جس طرح کی ذلت آمیز زندگی میں گزار رہا تھا، اس سے موت بہتر نظر آتی تھی۔
میں نے دل ہی دل میں عمران کو یاد کیا اور کہا۔''دیکھو عمران! میں نے اب تمہارے بغیر زندہ رہنے اور مرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ میں اب وہی بنتا جا رہا ہوں جو تم چاہتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے تمہاری کمی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کیا جانو، ان گزرے ماہ و سال میں، میں نے کس کس طرح تمہیں یاد کیا ہے۔ تم میری زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکے ہو میرے یار۔ میں ایک پل کے لیے بھی تمہیں بھول نہیں سکتا۔ اور آج اس گھنے جنگل کی اس دھواں دھواں شام میں جب میں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہوں اور آنے والے لمحوں میں میرے قدم کسی بھی سمت میں اٹھ سکتے ہیں، میں ایک بار پھر تمہیں بڑی شدت سے یاد کر رہا ہوں۔ دل پکار پکار کر کہہ رہا ہے... کاش! اس وقت تم میرے ساتھ ہوتے۔ میرا کندھا تمہارے کندھے سے ملا ہوتا۔ ہم اس دھواں دھواں شام میں ایک ساتھ للکار بلند کرتے اور اپنے دشمن پر جا پڑتے۔''
میری آنکھوں میں آتشیں نمی تھی۔ میں ہر دلعزیز عمران کو یاد کر رہا تھا کہ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ میں فرح اور عاطف کو یاد کر رہا تھا کہ ان کے ساتھ میرا بچپن گزرا تھا اور میں ثروت کو یاد کر رہا تھا کہ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی... اپنے ملک سے، اپنے شہر سے ہزاروں میل دور اس دور دراز خطے میں اس دھواں دھواں شام میں، میں زندگی اور موت کی بازی لگانے جا رہا تھا۔ حالات کی ستم ظریفیوں نے میرے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔
ہم چاروں نے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر ''مارو یا مار دو'' والے عہد کو دہرایا اور اپنے اپنے کام کے لیے بالکل تیار ہوگئے۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے چہرے صافہ کپڑوں میں چھپائے پھر اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ فیروز اور میں راستے کے دائیں کنارے پر تھے جبکہ ماجد اور اسحاق بائیں کنارے پر۔ جارج کی آمد کے آثار دیکھ کر فیروز نے چار پہیوں والی گاڑی کو ڈھلوان پر دھکیلنا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھیل شروع ہو جانا تھا۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا، ہماری دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں بار بار جارج کا مکروہ

چہرہ نگاہوں کے سامنے لا رہا تھا تاکہ میرے اندر غیظ و غضب کی وہ بلند لہر رواں دواں رہے جس نے چند دن پہلے میرے سینے میں جنم لیا تھا اور مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس لہر کو رواں دواں رکھنے کے لیے مجھے کوئی خاص کوشش کرنا نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ لہر ایک عجیب سی زہرناک تلخی کے ساتھ گھل مل کر میرے لہو میں شامل ہو چکی تھی اور میری شریانوں میں مستقل بسیرا کر چکی تھی۔
شام کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ درختوں پر پرندوں کی چہکاریں تھیں۔ پچھلے ایک گھنٹے میں اس راستے پر سے چند گھوڑا گاڑیوں، چند گھڑ سواروں اور ایک عدد سیاہ جیپ کے سوا کوئی سواری نہیں گزری تھی۔ ہماری نگاہیں مغرب کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں سے کسی بھی وقت گرد و غبار اٹھ سکتا تھا۔ یہ گرد و غبار جارج کے قافلے کی آمد کا اعلان ہوتا۔
شام گہری ہوتی گئی لیکن قافلے کے آثار نظر نہیں آئے۔ فیروز کے لیے یہ تاخیر بڑی تعجب خیز تھی۔ فیروز کو اور اس کے دونوں ساتھیوں کو معلوم تھا کہ جارج کے معمول میں کبھی فرق نہیں آتا۔ پچھلے دو تین برسوں میں شاید ہی ایک آدھ بار ایسا ہوا ہو کہ وہ مقررہ وقت پر پرانے گوڑا پر نہ پہنچا ہو۔ جب شام کا ملگجا تاریکی میں بدل گیا تو فیروز اور اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ فیروز مایوسی کے عالم میں بڑبڑایا۔''اتنی دیر تو پہلے کبھی نا ہیں ہوئی۔''
اسی دوران میں اسحاق بھی راستہ پار کر کے ہماری طرف آ گیا۔ وہ بھی مایوس تھا۔ اس نے فیروز سے مخاطب ہو کر کہا۔''غور سے سنو... ڈھول کی آواز آ رہی ہے۔''
فیروز نے بھی ہمہ تن متوجہ ہو کر سنا۔ چند لمحے بعد ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی مدھم آواز ہماری سماعتوں تک پہنچی۔ یہ ڈھول نہیں تھا، غالباً کوئی بہت بڑا نقارہ تھا۔ اسے ایک خاص ردھم سے بجایا جا رہا تھا۔
اس آواز کو سننے کے بعد فیروز اور اس کے دونوں ساتھی بے دم سے ہو کر زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے بھی ان کی تقلید کی۔''کیا ہوا؟''میں نے فیروز سے پوچھا۔
''وہ حرامی کسی دوسرے راستے سے ہو کر گوڑا پہنچ گیا ہے۔ یہ ڈھول کی آواز سنائی دے رہی ہے؟ یہ اس کی گوڑا میں آمد کا اعلان ہے۔''
نقارے کی دور افتادہ تھرتھراہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اندازاً یہ کوئی دو ڈھائی میل کے فاصلے سے آ رہی تھی۔ فیروز اور ماجد آپس میں جھگڑنا شروع ہو گئے۔ ماجد کا خیال تھا کہ انہوں نے یہاں گھات لگا کر غلطی کی تھی۔ انہیں قریباً ایک میل پیچھے گھات لگانی چاہیے تھی جہاں سے دوراہا پھوٹتا تھا۔
فیروز ترخ کر بولا۔''مگر وہاں کون سی جگہ تھی چھپنے والی؟ کھلے میدان میں بیٹھتے تو اب تک دھر لیے گئے ہوتے۔''
اس سے پہلے کہ فیروز اور ماجد کا یہ تنازع شدت اختیار کرتا، ایک آواز نے سب کو چونکایا۔ یہ گھوڑے کی ہنہناہٹ تھی اور ہمارے عقب سے ابھری تھی۔ پھر ایک ساتھ ایسی کئی اور آوازیں ابھریں۔
''میرا خیال ہے یہ حکم جی کے گارڈز ہیں۔''فیروز نے سرسراتی آواز میں کہا۔
''رائفلیں چھپا دو۔''اسحاق نے فوراً تجویز پیش کی اور اپنی رائفل خشک پتوں کے ایک ڈھیر میں گھسیڑ دی۔ فیروز اور میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ماجد کی رائفل پہلے ہی جنگلی گھاس میں پڑی تھی اور تاریکی کے سبب نگاہوں سے مکمل طور پر اوجھل تھی۔ ہینڈ گرینیڈز اور گولیوں والا تھیلا بھی وہیں تھا۔ ہم چار پہیوں والی خستہ حال گھوڑا گاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے گھوڑا گاڑی کو قابلِ استعمال بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد چودہ پندرہ گھڑ سوار محافظ موقع پر آن موجود ہوئے۔ یہ سب باوردی اور مسلح تھے۔''کون ہو تم؟''ایک فربہ جسم کے شرابی گھڑ سوار نے بارعب لہجے میں پوچھا۔
''ٹھاکر کیدار ناتھ کے ملازم ہیں جی۔ اس گاڑی کو ٹھیک کر رہے تھے۔''فیروز نے پتا نہیں کس ٹھاکر کا نام لیا تھا کہ گارڈز کے کڑے تیور ذرا نرمی اختیار کر گئے۔
''یہ کس کی گاڑی ہے؟''انچارج گارڈ نے شرابی لہجے میں پوچھا۔
''ٹھاکر صاحب کے ایک دوست کشوری لال جی کی تھی۔ عرصے سے یہاں خراب پڑی ہے جی۔ ہم نے ان سے مانگ لی ہے۔ صبح سے اسے ٹھیک کر رہے تھے۔ اب اندھیرا ہو گیا ہے۔ اب کل آویں گے۔''فیروز نے مسکین نب و لہجے میں کہا۔
اندازہ ہوا کہ فربہ اندام شرابی انچارج فیروز کے جواب سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا ہے۔ وہ اپنے سات آٹھ ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔ باقی پانچ چھ محافظ وہیں موجود رہے۔ وہ اپنے گھوڑوں کو ایک بارشی گڑھے میں سے پانی پلانے لگے۔ ایک دراز قد گارڈ یونہی گھوم پھر کر چار پہیوں والی مرمت طلب گھوڑا گاڑی کا جائزہ لینے لگا۔ اس

کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کی روشنی وہ بے پروائی سے گاڑی کے مختلف حصوں پر ڈال رہا تھا۔ گاڑی پر لگی ہوئی ایک زنگ آلود پلیٹ دیکھ کر وہ چونکا۔ اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ پلیٹ پر مرکوز کیا۔ پھر فیروز سے مخاطب ہوکر بولا۔ ”تم کیسے کھوت ہو کہ یہ ٹھاکر کیدار ناتھ کے دوست کی گاڑی ہے؟“

یہی وقت تھا جب ایک گارڈ نے چلّا کر کہا۔ ”یہاں گڑبڑ ہے جی۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ فیروز ہے جی، حکیم جی کا ملازم۔“ اس کے ساتھ ہی چلّانے والے نے اپنی ٹارچ کا روشن دائرہ فیروز کے چہرے پر مرکوز کیا۔

دراز قد گارڈ بھی ٹھٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی تین چار رائفلیں ہماری طرف اٹھ گئیں۔ ان میں دراز قد گارڈ کی اپنی رائفل بھی شامل تھی۔ وہ باقی گارڈز میں سے سینئر لگتا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنی جدید رائفل کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ”خبردار... اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ جلدی کرو۔“

فیروز اور ماجد نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ چند لمحے بعد میں نے اور اسحاق نے بھی تقلید کی۔ کم از کم تین ٹارچوں کے روشن دائرے ہمارے چہروں پر پڑ رہے تھے۔ گارڈز کی انگلیاں رائفلوں کے ٹریگرز پر تھیں۔ اس شدید تناؤ کی کیفیت میں کسی لمحے بھی کچھ ہو سکتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ ہمارے درمیان طے تھا کہ پھنس جانے کی صورت میں ہم گرفتاری نہیں دیں گے اور فی الحال ہم پھنس گئے تھے۔

”زمین پر لیٹ جاؤ اوندھے... جلدی کرو۔“ دراز قد گارڈ دہاڑا۔

پہلے ماجد لیٹا، پھر فیروز اور آخر میں، میں اور اسحاق۔ ہم نے اپنے ہاتھ دونوں طرف پھیلا لیے تھے۔ لیٹتے ہوئے میں تھوڑا سا بائیں طرف ہو گیا تھا۔ ایسا کرنے سے میں اپنی اس رائفل کے قریب تر ہو گیا جو خشک پتوں کے ڈھیر کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میرے ہاتھ رائفل کے تقریباً اوپر تھے۔ میرے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا کہ میں رائفل اٹھاؤں اور کچھ کر گزروں۔ ایسا کام کرنے کے لیے جس قسم کی ہمت درکار تھی، وہ آج میں اپنے اندر موجود پا رہا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں یہ کر گزروں گا اور اگر نہ کر سکا تو کیا ہوگا؟ وہی کچھ ہوگا جس کے لیے میں پہلے سے تیار تھا۔ تخت یا تختہ۔

میں نے زرد نرم پتوں کے نیچے رائفل کی سختی کو محسوس کیا۔ دراز قد گارڈ گالیاں بک رہا تھا۔ وہ رائفل سونتے ہوئے آگے بڑھا۔ غالباً وہ ہماری جامہ تلاشی لینا چاہ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ ہمارے لباس میں کوئی ہتھیار وغیرہ ہوگا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ مجھے اوندھا لیٹنے کا حکم دے کر وہ خود مجھے میرے ہتھیار کے قریب پہنچا چکا ہے۔ وہ سامنے کی طرف سے آ رہا تھا۔ ابھی وہ مجھ سے پانچ چھ قدم دور تھا کہ میں نے پتوں کے ڈھیر میں چھپی ہوئی رائفل نکال لی۔ اس کا سیفٹی کیچ پہلے سے ہٹا ہوا تھا۔ وہ برسٹ مار سکتی تھی لیکن فی الوقت سنگل شاٹ پر سیٹ تھی۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ایک لمحے کے لیے دراز قد گارڈ پتھر کا بت بنا کھڑا رہ گیا۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ گولی دراز قد گارڈ کے سینے پر کہیں لگی۔ وہ اچھل کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا۔ میں نے دوسرا فائر اس شخص پر کیا جو پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی ”بکال“ رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ میرا پہلا فائر خالی گیا۔ مدمقابل نے گولی چلائی جو میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی عقب میں درخت کے تنے پر لگی۔ میں نے تیسری بار ٹریگر دبایا۔ اس مرتبہ گولی نے مدمقابل کو زخمی کیا۔ وہ پیٹ پکڑ کر جھکتا چلا گیا۔ اس کی کراہ دردناک تھی۔

اسی اثنا میں اسحاق، ماجد اور فیروز بھی پتوں میں سے رائفلیں برآمد کر چکے تھے۔ ماجد کو تو فائر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس سے پہلے کہ وہ رائفل کو پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لے سکتا، بارہ بور کی ایک گولی اس کے جبڑے اور سر کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تاہم میں، اسحاق اور فیروز درختوں کے پیچھے پناہ لینے میں کامیاب ہوئے۔ گارڈز بھی مختلف درختوں کے عقب میں پناہ لے چکے تھے۔ ان میں سے دو نے خستہ حال گھوڑا گاڑی کے پیچھے پوزیشن لی تھی۔ قریباً ایک منٹ تک اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ دھماکوں سے جنگل گونج اٹھا۔ تاریکی میں ہر طرف شعلے لپکتے نظر آئے۔ یہ شعلے مخصوص آوازوں کے ساتھ درختوں کے تنوں میں پیوست ہو رہے تھے اور شاخوں سے ٹکرا رہے تھے۔ میں ایک تناور درخت کی اوٹ میں تھا... میں لڑائی کے داؤ پیچ سے زیادہ واقف نہیں تھا لیکن میرے اندر کی ہیجانی کیفیت مجھے راستہ دکھا رہی تھی۔ میں نے تناور درخت کی اوٹ چھوڑی اور تیزی سے بھاگ کر بارشی گڑھے میں کود گیا۔ ایسا کرنے سے میں ان دو افراد کو ٹارگٹ بنانے میں کامیاب ہو گیا جو گھوڑا گاڑی کے عقب سے گولی چلا رہے تھے۔ میری فائرنگ سے ان میں سے ایک شدید زخمی ہو کر گرا اور دوسرا پسپا ہو کر تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔

”شاباش مہرورا!“ فیروز کی پرجوش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

اسی دوران میں اسحاق بھی اپنی پوزیشن تبدیل کر کے کچھ آگے جا چکا تھا۔ اس کی رائفل برسٹ پر سیٹ تھی۔ اس کے چلاتے ہوئے دو تین برسٹس نے گارڈز میں کھلبلی مچا دی۔ ہم نے انہیں تاریکی میں بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ان کو بھاگتے دیکھ کر ہمارے حوصلے سوا ہوئے۔ ”مارو حرامزادوں کو۔“ اسحاق کی للکارتی ہوئی آواز تاریکی میں گونجی۔

ہم نے اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر جارج گورا کے رکھوالوں پر گولیاں چلائیں۔ اس فائرنگ سے ایک اور گارڈ نشانہ بنا، باقی تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔

بارشی گڑھے میں کودنے سے میں سینے تک بھیگ چکا تھا۔ مجھے گڑھے کے پاس ہی ایک گارڈ کی ٹارچ پڑی نظر آئی۔ میں نے ٹارچ اٹھا کر روشن کی۔ ہمارا ساتھی ماجد اپنا عہد نبھا چکا تھا۔ وہ پہلو کے بل گیلی زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سر کے آس پاس خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ اسحاق نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے ساتھی کا ماتھا چوما اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ”گھبرا مت! آج ہم جارج کو مار دیویں گے یا خود بھی تیرے پاس پہنچ جاویں گے۔“

سوگ منانے کا وقت نہیں تھا۔ یہاں تقریباً دو منٹ تک لگاتار فائرنگ ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آوازیں ان گارڈز کے باقی ساتھیوں کو کسی بھی وقت یہاں کھینچ سکتی تھیں۔ یقیناً وہ بھی یہیں کہیں درختوں میں گشت کر رہے تھے۔ جس گارڈ پر میں نے پہلی گولی چلائی تھی، وہ جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اس کا لمبا جسم کسی گھڑیال کی طرح جھاڑیوں میں مردہ پڑا تھا۔ جس گارڈ کے پیٹ میں گولی لگی تھی، وہ شدید زخمی حالت میں تھا اور بے ہوش ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے گارڈ کی لاش بھی جھاڑیوں میں پڑی تھی۔ اس گارڈ کی رائفل اور گولیوں والی بیلٹ فیروز نے اٹھا لی۔ ”ہمیں یہاں زیادہ دیر ناہیں ٹھہرنا چاہیے۔“ وہ تیزی سے بولا۔

اسحاق نے ہینڈ گرینیڈز والا تھیلا اٹھایا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ گارڈز کے تین چار گھوڑے جھاڑیوں میں ادھر ادھر چکرا رہے تھے۔ ہم انہیں نظرانداز کرتے ہوئے تاریکی میں لپکتے چلے گئے۔ ماجد کی موت نے اسحاق کو کچھ زیادہ ہی ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بے قراری سے رائفل کو اپنے ہاتھوں میں حرکت دے رہا تھا... جیسے اپنے سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو مار دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ فیروز نے تیز تیز چلتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو کہوت ہوں، آج جارج کو ڈھونڈ نکالیں۔ اسے مار ڈالیں یا خود مر جاویں۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب اس تک پہنچنا بڑا مشکل ہووے گا۔ وہ بہت چوکس ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس حرامی نے پگوڑا تک جانے کے لیے بھی دوسرا راستہ استعمال کیا ہے۔ اور اب یہاں ہونے والی فائرنگ کے بعد تو وہ اور بھی چوکنا ہو گیا ہووے گا۔“

”مگر ہم نے اسے مارنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“ اسحاق بولا۔

”قسم تو کھا رکھی ہے اور اللہ کو منظور ہوا تو ہم اس کا قصہ تمام بھی کریں گے... لیکن اگر ہم نے جلد بازی کی تو ہماری جان ضائع چلی جاوے گی اور یہ ہم کو منظور ناہیں ہے۔“ فیروز نے کہا۔

”تو کیا ہم ماجد کو گنوا کر یہاں سے خالی ہاتھ واپس چلے جاویں گے؟“

چلتے چلتے فیروز چند لمحے کے لیے رک گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”ناہیں... ہم بالکل خالی ہاتھ واپس ناہیں جاویں گے۔ آج ہم جارج تک نہیں پہنچ سکے لیکن اپنے دوسرے ”بہترین نشانے“ پر ضرور پہنچیں گے۔“

”دوسرا بہترین نشانہ... کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم ماریا تک پہنچیں گے۔ ماریا جارج کی سوتیلی بہن ہے لیکن ماں کی طرف سے سگی ہے اور وہ اس سے بہت محبت بھی کرتا ہے۔ ہم جارج کو ایسا زخم دیں گے جو اسے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیوے گا۔ مر سکے گا نہ جی سکے گا۔“

”وہ بدذات ہمیں کہاں ملے گی؟“ اسحاق نے دانت پیس کر پوچھا۔

”میں اچھی طرح جانت ہوں، وہ اس وقت کہاں ہووے گی۔ وہ اپنی ایک دوست کے گھر آئی ہوئی ہے۔ ٹھاکر کیدار ناتھ کی بیٹی کامنی دیوی کی سگائی کی رسم ہے۔ مجھے پتا ہے کہ وہاں بہت زیادہ لوگ ناہیں ہوں گے۔ حفاظت کا بھی کوئی خاص انتظام ناہیں ہووے گا۔ ہم اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ماریا کو عدم آباد روانہ کر سکت ہیں... بالکل کر سکت ہیں۔“

”اگر ایسا ہو جائے تو واقعی یہ بہت بڑی بات ہووے گی۔“

”یہ بات ہووے گی اور ابھی ہووے گی۔“ فیروز کے لہجے میں سخت ہیجان تھا۔

ہم نے درختوں کے درمیان تیزی سے سفر کیا۔ ہمارے پاس ٹارچیں موجود تھیں لیکن ہم انہیں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اسحاق اور فیروز یہاں کے راستوں کے شناور تھے۔ وہ بڑی مہارت سے محفوظ اور شارٹ کٹ راستے استعمال کر رہے تھے۔ ایک جگہ وہ ایک برساتی نالے کے

اندر سے بھی گزرے۔ جب اس نالے سے باہر نکلے تو میں نے بالکل غیر متوقع طور پر خود کو اس خوشبودار نہر کے کنارے پایا جو زرگاں کے راج بھون کو تقریباً چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔ لیکن ہم راج بھون کے پاس نہیں تھے بلکہ بارونق آبادی کے پاس بھی نہیں تھے۔ یہ زرگاں کا مضافاتی علاقہ نظر آتا تھا۔ ہم تینوں نے اپنے چہرے ڈھاٹوں میں چھپا لیے۔ فیروز نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز سرگوشی کی۔ ''وہ دیکھو، ان پیڑوں کے پیچھے جو نیلی روشنیاں نظر آرہی ہیں، یہ ٹھاکر کیدار ناتھ کی حویلی ہے۔ ٹھاکر ذرا عام لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کا عادی ہے۔ آج یہیں پر اس کی بیٹی کی رسم ہورہی ہے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں جو کرنا ہے فوراً کرنا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ سیدھے اندر گھس جاتے ہیں۔ جو بھی راستہ روکے گا، بھون ڈالیں گے اس حرامی کو۔''

کچھ دیر بعد اسحاق نے عجیب جذباتی انداز میں فیروز کا کندھا تھاما۔ ''میں نے تمہاری بات مانی ہے فیروز! اب تم میری بھی ایک بات مانو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر وہ حرام کی جنی ماریہ ہمارے ہاتھ آگئی تو ہم اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کریں گے۔''

''زندہ کیوں؟''

''اس بارے میں، میں تمہیں پھر بتاؤں گا... لیکن مجھ سے وعدہ کرو۔''

تاریکی میں فیروز نے چند لمحوں کے لیے اسحاق کو بغور دیکھا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

ہم شیشم، نیم اور کیکر کے پیڑوں میں سے نکل کر نیلی روشنیوں والی حویلی پر یوں حملہ آور ہوئے جیسے شکاری جانور اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ حویلی سے باہر سات آٹھ خوب صورت گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دو تین موٹریں بھی نظر آرہی تھیں۔ گاڑی بان... ڈرائیور اور چوکیدار وغیرہ یہاں وہاں ٹہل رہے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک اس طرح کی افتاد ان کے سر پر ٹوٹ پڑے گی۔ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکے۔ ہم تینوں دندناتے ہوئے حویلی میں گھس گئے۔ صرف ایک ملازم نے برآمدے میں ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ فیروز نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری، وہ ڈکراتا ہوا نہانے والے تالاب میں جاگرا۔ اس حویلی کو جنریٹر کی مدد سے جگمگایا گیا تھا۔ اندرونی حصے میں مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ گونج رہی تھی۔ پکوانوں کی خوشبو تھی۔ پہلے تو فائر کی آواز نے لوگوں کو چونکایا پھر جب ہم اسلحہ لہراتے ہوئے اچانک اندر گھس آئے تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔ مرد و زن چلاتے شور مچاتے چاروں طرف بھاگے۔ کرسیاں الٹ گئیں۔ کھانوں کی بیش قیمت رکابیں فرش پر بکھرتی نظر آئیں۔ جس لڑکی کی سگائی تھی، وہ سرخ ساڑی پہنے سولہ سنگھار کیے اسٹیج پر بیٹھی تھی۔ اس کے گرد بھی خوش رنگ لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ یہ سب بھی حواس باختہ ہوکر اٹھیں، ان میں دو تین سفید فام بھی تھیں۔

فیروز اور اسحاق نے ان میں سے اپنا شکار پہچان لیا تھا۔ یہ سرخی مائل بالوں والی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سفید فام ہونے کے باوجود اس نے مقامی لباس ہی پہن رکھا تھا۔ یہ چمکیلی کام دار ساڑی پر مشتمل تھا۔ لڑکی مضبوط جسم اور قوی اعصاب کی مالک نظر آتی تھی۔ اسٹیج پر سے اترنے والیوں میں وہ سب سے آخر میں تھی اور وہ منہ پھیر کر بھاگی بھی نہیں تھی، الٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہی تھی۔ تاہم دیگر لوگوں کی طرح اس کے چہرے کا سارا خون بھی نچڑ چکا تھا۔

فیروز اور اسحاق عقابوں کی طرح اس پر جھپٹے اور پکڑ لیا۔ ''ہیلپ... ہیلپ۔'' وہ دہشت زدہ ہوکر چلائی لیکن فی الحال یہاں اس کی پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔

شاید لوگوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہمارے سروں پر خون سوار ہے اور ان لمحوں میں ہم کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ اسحاق نے انگریز لڑکی کی پشت سے رائفل کی نال لگادی تھی اور فیروز اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لا رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب دو تنومند افراد جو یقیناً گارڈز تھے، ہمارے سامنے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ حق نمک ادا کرنا چاہتے تھے مگر یہ کوشش انہیں مہنگی پڑی۔ اسحاق نے بے دریغ برسٹ چلایا۔ دونوں افراد کے چہرے اور سینے پر گولیاں لگیں۔ وہ ٹریگر دبانے کی حسرت دل میں لیے مردہ چھپکلیوں کی طرح دہلیز پر جاگرے۔ ایک گولی ایک بھاگتی ہوئی فربہ اندام خاتون کی ٹانگ میں لگی۔ میں نے اسے برآمدے کے بڑے بڑے گول ستونوں کے پاس گرتے ہوئے دیکھا۔

ہم ماریا کو کھینچتے ہوئے حویلی کے لان میں پہنچے۔ ہر طرف دہشت کا عالم تھا۔ لوگ کونے کھدروں میں چھپ گئے تھے اور وہیں سے واویلا کررہے تھے۔ ''ہوائی فائرنگ کرو۔'' فیروز نے مجھے مشورہ دیا اور خود بھی رائفل کی نال اوپر اٹھا کر ٹریگر دبادیا۔

تڑتڑ کی لرزہ خیز آوازوں نے ماحول کو مزید دہشت ناک کردیا۔ میں نے بھی فیروز کی تقلید کی اور اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ''دہل'' کرنے کے فائدے کیا ہوتے ہیں اور کسی ماحول پر اچانک چھا جانے اور اسے تسخیر کرلینے کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ ہمارے اردگرد کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ وہ ٹھاکر تھے، رائے اور کنور تھے اور پتا نہیں کیا کچھ تھے لیکن اس وقت وہ جان بچانے کے لیے معمولی کیچوؤں کی طرح کونے کھدروں میں رینگ رہے تھے اور چھپ رہے تھے۔ ان کی بھاری پگڑیاں، قیمتی جوتیاں اور ان کے بلوری جام ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔

جس وقت ہم ماریا کے ساتھ بیرونی گیٹ پر تھے، حویلی کی چھت سے ہم پر پھر ایک فائر ہوا لیکن اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس فائر کے جواب میں، میں نے چھت کے بائیں کنارے کی طرف تین چار فائر کیے... اور فیروز وغیرہ کے ساتھ بھاگتا ہوا حویلی سے نکل آیا۔

حویلی سے باہر ایک لینڈروور جیپ موجود تھی۔ ڈرائیور بھی پاس ہی موجود تھا اور ہمیں سکتہ زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم انگریز لڑکی کو کھینچتے ہوئے جیپ میں لے آئے۔ فیروز نے رائفل کی نال ڈرائیور کی طرف اٹھائی اور پھنکارا۔ ''گاڑی اسٹارٹ کر۔''

ڈرائیور کسی معمول کی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور جیب سے چابی نکال کر گاڑی اسٹارٹ کردی۔ فیروز نے اسے بھاگ جانے کا حکم دیا۔ وہ اس حکم کو ماننے کے لیے ایک سو ایک فیصد تیار تھا۔ وہ گاڑی سے نکل کر درختوں کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ فیروز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پلک جھپکتے میں جیپ کو نیلی روشنیوں والی حویلی سے دور لے آیا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں فیروز نے درختوں کے درمیان کچے راستوں پر طوفانی ڈرائیونگ کی۔ لڑکی کو اسحاق نے دبوچ رکھا تھا اور ٹریل ٹور رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا رکھی تھی۔ ہم جیپ کے ساتھ ہی فٹ فٹ بھر اوپر اچھل رہے تھے اور ہمارے سر بار بار جیپ کی چھت سے ٹکراتے تھے۔ لڑکی سمجھ چکی تھی کہ اب شور مچانے اور مزاحمت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ الٹا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ فیروز کی ڈرائیونگ بھی اس کے لب و لہجے کی طرح سخت ہیجانی تھی۔ اس نے جیپ کو طوفانی انداز سے ایک برساتی نالے میں سے گزار دیا اور پھر ایک نہایت خطرناک ڈھلوان پر اندھا دھند دوڑاتا چلا گیا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ جنگل نہایت دشوار ہوگیا اور جیپ نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس کا فرنٹ برباد ہوچکا تھا اور ایک طرف کے شیشے میں دراڑیں آگئی تھیں۔

جب جیپ رک گئی تو ہم اس میں سے نکلے اور لڑکی کو لے کر نہایت گھنے تاریک درختوں میں گھس گئے۔ ایک ٹارچ کی مدد سے راستہ دیکھتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ لڑکی کی ساڑی اس کے بالائی جسم پر سے کھل گئی تھی اور اس کے پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ اسحاق نے اسے تیز دھار چاقو سے کاٹا اور پھر پھاڑ کر علیحدہ کردیا۔ اب لڑکی کی ساڑی کا بالائی حصہ اس کے جسم پر موجود نہیں رہا۔ اسحاق نے اسے اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ کچھ آگے جاکر لڑکی پھسلی اور گرگئی۔ اسحاق نے اسے اٹھانا چاہا لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی اور ہانپتی رہی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ ''ہام کا تمہارا کوئی دشمنی نہیں، تم ہام کے ساتھ ایسا کیوں کرتا؟ اگر تم کو منی چاہیے تو ہام تم کو دینے کو تیار ہے۔ آئی ایم شیور۔ مائیکل تمہارا ہر مطالبہ پورا کردے گا۔''

''ہمیں تمہاری دولت نہیں چاہیے۔ کچھ اور چاہیے۔'' اسحاق سفاک لہجے میں بولا۔

''بتاؤ کیا چاہیے... میں مرنا نہیں چاہتی۔''

''بس یہی ہماری مجبوری ہے۔ ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتے۔'' اسحاق نے اس کے سرخی مائل بالوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکے دیے اور پھر طیش کے عالم میں اس کا چہرہ گیلی زمین میں دھنسا دیا۔

وہ کچھ بول رہی تھی مگر اس کی آواز ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یقیناً وہ منت سماجت ہی کررہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مائیکل کا نام بھی لیا۔

''یہ مائیکل کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کتیا کا شوہر... اور جارج حرامی کا یار... وہ بھی ڈاکٹر ہے۔''

چہرہ کیچڑ میں دھنس جانے کی وجہ سے ماریا کا سانس بند ہورہا تھا۔ جب وہ ہاتھ پاؤں پھینکنے لگی تو اسحاق نے اس کی گردن پر سے دباؤ ہٹا دیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ماریا کا چہرہ دہشت کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے کا کیچڑ صاف کیا اور ڈری ڈری آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ یہ وہی خوف تھا جو ہر اس جوان لڑکی کی آنکھوں میں نظر آسکتا ہے جسے مسلح افراد نے اغوا کرلیا ہو اور کسی تنہا جگہ پر لے آئے ہوں۔ یہ اپنی آبرو کا خوف ہوتا ہے۔

ماریا بھی غالباً یہی سمجھ رہی تھی کہ آنے والے منٹوں یا گھنٹوں میں اس کے ساتھ کچھ برا ہونے والا ہے۔

ہم نے جنگل میں تقریباً ایک گھنٹا مزید سفر کیا اور ایک ایسی جگہ پر آگئے جو فیروز اور اسحاق کے خیال کے مطابق

رکھنے کے لیے محفوظ تھی۔ یہ جگہ نباتات سے اٹی ہوئی تھی۔ یہ تو رات تھی، غالباً دن میں بھی یہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ یہاں گنجان درختوں کے درمیان تھوڑی سی خالی جگہ تھی۔ رات کے وقت ایسی جگہوں پر جنگلی جانوروں کا بہت ڈر ہوتا ہے اور آگ جلانا پڑتی ہے لیکن ہم آگ جلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یقینی بات تھی کہ اب تک ہماری تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ ہمیں صرف ٹارچ کی روشنی پر ہی اکتفا کرنا تھا۔

اسحاق کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ یہاں پہنچتے ہی وہ جیسے انگریز لڑکی ماریا پر پل پڑا۔ اس نے ماریا کی ساڑی کا وہ حصہ اپنی کمر سے کھولا جو پھاڑ کر علیحدہ کیا تھا۔ اس کی لمبائی دو ڈھائی میٹر رہی ہوگی۔ اس نے یہ کپڑا ایک رسی کی طرح ماریا کے گلے میں ڈالا اور اسے گرہ دے دی۔ ماریا خوف سے چلانے لگی۔ ''ہیلپ، ہیلپ! کوئی ہے؟''

یہاں کس نے ہونا تھا؟ کپڑے کا دوسرا سرا اسحاق کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں کوئی ایسی مناسب شاخ ڈھونڈ رہا تھا جس پر لٹکا کر سفید فام ماریا کو پھانسی دے سکے اور وہ یہ کام کرنے کے لیے سو فیصد تیار تھا۔ اس پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ پھنکارنے لگا۔ ''میری بہن جس طرح مری تھی، تجھے بھی اسی طرح مرنا ہوگا۔ بس اتنی رعایت تجھ سے ضرور کریں گے کہ تیری عزت خراب نہیں کریں گے۔''

اس نے ساڑی کے کپڑے کو زوردار جھٹکا دیا۔ سانس ماریا کے گلے میں اٹکنے لگی۔ وہ ہوا کے لیے تڑپنا شروع ہو گئی۔ ''ہاں، اسی طرح... اسی طرح۔'' اسحاق نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی ایسے ہی سانس کے لیے تڑپ تڑپ کر مری تھی۔ زہر کے سبب اس کا گلا اندر سے سوج گیا تھا۔ وہ ہوا کھینچ نہیں سکتی تھی، آج تو بھی نہیں کھینچ سکے گی۔''

اس نے شیشم کی ایک موٹی شاخ پکڑ کر نیچے جھکائی اور ساڑی کے کپڑے کا دوسرا سرا شاخ کے اوپر سے گزار دیا۔ اب وہ زور لگا کر کسی بھی وقت ماریا کو ہوا میں لٹکا سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے اسحاق نے فیروز سے یہ وعدہ کیوں لیا تھا کہ جارج کی بہن کو زندہ پکڑنا ہے۔ وہ اسے اپنے طریقے سے قتل کرنا چاہتا تھا اور وہ آگ ٹھنڈی کرنے کا خواہاں تھا جو کئی ماہ سے اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔

میں نے فیروز کی طرف دیکھا۔ فیروز تذبذب میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ لڑکی کو مار دینا چاہیے یا نہیں۔

میں نے فیروز کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اپنا دل دماغ ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ یہ لڑکی ہمارے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ ایک طرح سے یہ جارج کی دکھتی رگ ہے۔ وہ اس لڑکی کو چھڑانے کے لیے ہماری کئی باتیں مان سکتا ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

فیروز چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ ہووے گی تو ہمیں یہاں سے نکلنے میں آسانی ہووے گی اور اس کے بعد بھی ہم جارج کی ناک میں نتھ ڈال سکیں گے۔''

''تو پھر اسے روکو۔'' میں نے کہا۔

فیروز نے مجھے رائفل بدست لڑکی کے پاس کھڑا کیا اور خود اسحاق کو لے کر ایک طرف درختوں میں چلا گیا۔

میں لڑکی سے دو تین فٹ کے فاصلے پر کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور اس کا روشن دائرہ لڑکی پر مرکوز تھا۔ وہ قابلِ رحم حالت میں تھی۔ چہرہ ایک طرف سے سیاہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ گلے میں مضبوطی سے بندھے ہوئے کپڑے کی وجہ سے اس کے ماتھے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ پاؤں سے ایک سینڈل غائب تھا۔ بالائی جسم پر فقط چولی رہ گئی تھی۔ ہاں وہ قابلِ رحم نظر آ رہی تھی مگر قابلِ رحم نہیں تھی۔ مجھے اس کی شکل میں جارج کی شکل کی جھلکیاں نظر آئیں۔ وہی جارج جو اس بھانڈیل اسٹیٹ کی عورتوں کا دشمن تھا۔ نہ جانے مختلف حیلے بہانوں سے کتنی زندگیاں تباہ کر چکا تھا۔ یہ اسی کی بہن تھی۔ عورت ہونے کے باوجود وہ اپنے جیسی عورتوں کو برباد ہوتے دیکھتی تھی اور اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی تھی۔ شاید وہ بھی ان سفید فاموں میں سے تھی جو دیگر رنگ و نسل کے لوگوں کو انسان کا درجہ ہی نہیں دیتے۔ آج وہ اپنے بھائی کے کرتوتوں کے سبب خود ایک سخت مصیبت میں تھی۔

جھاڑیوں کی دوسری طرف فیروز اور اسحاق کا مکالمہ جاری تھا۔ کبھی ان کی آواز مدھم پڑ جاتی تھی، کبھی بلند ہو جاتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسحاق فوری طور پر بدلہ لینے پر تلا ہوا ہے، وہ ماریا کی جان بخشی کے لیے تیار نہیں۔ یہ گفتگو قریباً دس منٹ جاری رہی پھر دونوں واپس آ گئے۔ ماریا نے ڈری ڈری نظروں سے اسحاق کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کی دہشت جوں کی توں تھی... بہرحال اس کی آنکھوں کی ہیجانی کیفیت کچھ ماند پڑی ہوئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور ماریا کی گردن سے کپڑے کا پھندا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ بری طرح کھانس رہی تھی۔ فیروز نے پھندا کھولنے میں اسحاق کی مدد کی۔

پھندا کھل گیا تو اسحاق نے اسی کپڑے سے ماریا کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیے۔ ماریا اب بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ جب اسحاق اس کے ہاتھ باندھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس پر لعن طعن کر رہا تھا، میں نے سرگوشی میں فیروز سے پوچھا۔ ''کیا فیصلہ ہوا؟''

فیروز بولا۔ ''بس وہ یہاں تک راضی ہوا ہے کہ راستے میں لڑکی کو کچھ نہیں کہے گا۔''

''مطلب ہے کہ وہاں سرنگ میں جا کر مار دے گا؟''

فیروز نے اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پھر اپنے راستے پر رواں تھے۔ مجھے فیروز اور اسحاق کی مہارت کی داد دینا پڑ رہی تھی۔ وہ اس تاریک گھنے جنگل میں بڑے اعتماد سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ٹارچ بھی بس وہ کہیں کہیں خاص ضرورت کے وقت ہی روشن کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ اس دشوار گزار راستے کے نشیب و فراز کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح جانتے ہیں۔ فیروز سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے ماریا، اس کے پیچھے اسحاق اور آخر میں، میں تھا۔ ماریا جہاں کہیں سست پڑتی، اسحاق بے رحمی سے اسے رائفل کے بیرل سے ٹھوکا دیتا اور لعن طعن کرنے لگتا... اچانک ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ دور افتادہ آوازیں ہمارے کانوں میں پڑیں۔ یہ آوازیں چونکا دینے والی تھیں۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا خطرہ تھا۔ جارج کی بہن اغوا ہوئی تھی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کی بازیابی کے لیے جارج اور حکم جی نے اپنے ہرکارے جنگل میں پھیلا دیے تھے۔ یہ لوگ ابھی کافی فاصلے پر تھے لیکن یقینی بات تھی کہ یہ زیادہ دیر فاصلے پر نہیں رہیں گے۔

''امید نہیں تھی کہ یہ لوگن اتنی جلدی ہماری راہ پر لگ جاویں گے۔'' اسحاق نے دانت پیسے۔

''اب اس حرامزادی کے زندہ ہونے کا فائدہ ہووے گا ہمیں۔'' فیروز نے بھی جلتی ہوئی سرگوشی کی۔

واقعی یہ لڑکی اب ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثے کی طرح ہو گئی تھی۔ فیروز کو یقین تھا کہ جارج اور اس کے ہرکارے کسی صورت بھی ماریا کی زندگی کا رسک نہیں لیں گے۔ اب ہم نے ٹارچ مستقل طور پر بجھا دی اور بہت احتیاط مگر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں فیروز اور اسحاق نے کئی موڑ مڑے اور شارٹ کٹ راستے استعمال کیے... لیکن جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم تعاقب کرنے والوں سے اپنا فاصلہ بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ مسلسل ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔

اچانک فیروز رک گیا۔ اس نے دھیان سے میری طرف دیکھا۔ پھر وہ ایک دم بیٹھ گیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بظاہر یہی لگا کہ وہ ہانپ کر بیٹھا ہے لیکن میں اس کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ چکا تھا اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔

''کیا ہوا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کچھ نا ہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کچھ تو ہے۔ شاید تم چھپا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا۔ تاریکی میں اس کے تاثرات پوری طرح تو دکھائی نہیں دیتے تھے، تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم سخت پریشان ہو گیا ہے۔ اس نے ایک نظر اسحاق پر ڈالی۔ وہ رائفل ماریا کی پشت سے لگائے چوکس کھڑا تھا۔ اس نے ٹریل ٹو رائفل ایک ہاتھ سے تھام رکھی تھی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ ماریا کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی گرہ ٹٹول رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بجا طور پر یہ خطرہ موجود تھا کہ ماریا کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے۔ اس حوالے سے میرا اپنا تجربہ بھی یہی کہتا تھا کہ ماریا ٹائپ کے سفید فام غیر ملکی زیر ہونے کے باوجود بھی زیر نہیں ہوتے اور اپنی ذہنی برتری کے زعم میں چالاکی دکھانے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔

فیروز مجھے ایک طرف لے گیا اور ہولے سے بولا۔ ''کیا تمہیں اس بات پر وشواس ہے جو عام طور پر تمہارے بارے میں اور کچھ دوسرے بندوں کے بارے میں کہی جاوت ہے؟''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ... تم لوگن کہیں بھی اپنی مرضی سے نا ہیں جا سکت ہو اور نہ ہی اس اسٹیٹ سے باہر نکل سکت ہو...''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایک سرد لہر سی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی محسوس ہوئی۔

''تمہارا مطلب ہے... کہ یہ لوگ... میری وجہ سے... ہمارے پیچھے آ رہے ہیں؟'' میں نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ بس اسی طرح بے حرکت بیٹھا رہا اور ان دور افتادہ آوازوں کو سنتا رہا جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بہت مدھم صورت میں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ اسحاق کو شاید ماریا کے ہاتھوں کی کمزور بندش کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ دوبارہ سے باندھنے میں مصروف تھا۔ فیروز نے کھوئی

کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بدستور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ''کیا تم جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر وشواس رکھتے ہو؟''

''کیا تم رکھتے ہو؟'' میں نے جوابی سوال کیا۔

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''رکھتا بھی ہوں اور ناہیں بھی... لیکن ایک بات سچ ہے۔ جو بات ہماری سمجھ میں ناہیں آتی، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی انہونی وجہ تو ضرور ہووت ہے۔''

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ روحانیت اور مادیت وغیرہ پر بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے پیچھے آتے ہوئے دشمن سے خطرہ تھا اور یہ خطرہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ لوگ پھیل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی آوازیں دو مختلف اطراف سے آرہی تھیں۔

فیروز خاموش تھا اور اس کی خاموشی گمبھیر تھی۔ آخر میں نے پوچھا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟ اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو میں تم لوگوں سے علیحدہ ہو جاتا ہوں۔''

''ناہیں ناہیں... ایسی بات دماغ میں بھی نہ لانا۔ ہم ساتھ چلے تھے۔ ہم نے اکٹھے جینے مرنے کا عہد کیا ہے اور یہ عہد پورا ہووے گا۔''

''لیکن یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ یہ عہد پورا کرتے کرتے ہم سارے ہی ڈھیر ہو جائیں۔''

''ناہیں، اس کا کوئی حل نکالتے ہیں۔'' وہ بے تابی سے بولا اور پھر اٹھ کر اسحاق کے پاس چلا گیا۔

اسحاق اور وہ ایک طرف جا کر مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میں ماریا کی نگرانی کے لیے اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور بار بار میری رائفل کی طرف متوحش نظروں سے دیکھ لیتی تھی۔

اسحاق اور فیروز کا مکالمہ دو تین منٹ میں ختم ہو گیا۔ وہ دونوں جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ اگر وہ اپنے اندیشوں کے پیش نظر مجھے خود سے علیحدہ ہونے کا کہتے تو میں فوراً ہو جاتا لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

فیروز بولا۔ ''ہم کالی مٹی والے راستے کی طرف سے جاویں گے۔ یہاں ندی بہت تیز چلت ہے۔ اگر ہم کسی طرح اسے پار کر گئے تو ہمارے بچنے کی آشا پیدا ہو جاوے گی۔''

''وہاں ندی پار کرنے کا کوئی انتظام ہے؟''

''ہاں، انتظام تو ہے۔ اب اللہ کرے یہ انتظام ہمارے کسی کام آسکے۔'' اسحاق نے کہا۔

ایک بار پھر بھیگی بھیگی سی تاریکی میں ہمارا سفر شروع ہوا۔ اب سمت بدل گئی تھی۔ ہم قدرے ڈھلوان راستے پر بائیں طرف جا رہے تھے۔ یہاں درختوں اور خودرو جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے بار بار ہمارا راستہ مسدود ہو رہا تھا۔ کئی جگہ ہمیں درختوں کے درمیان سے بیٹھ کر اور رینگ کر گزرنا پڑا۔ کپڑے الجھ رہے تھے اور جسم کے عریاں حصوں پر گہری خراشیں آرہی تھیں۔ ماریا کے لیے سفر زیادہ مشکل تھا کیونکہ اس کے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ اب اسحاق نے اس پر سے رائفل ہٹالی تھی اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ سہارا دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم عقب سے آنے والی آوازوں پر بھی دھیان رکھے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے آوازوں کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے تک ہم نے یہ نہایت دشوار سفر ایک ڈھلوان پر طے کیا۔ یہ ڈھلوان غیر محسوس لیکن مسلسل تھی۔ ہم بوقتِ ضرورت صرف چند سیکنڈ کے لیے ٹارچ روشن کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ایسے ہی اسحاق نے ٹارچ روشن کی تو ہمیں خود سے صرف آٹھ دس قدم کے فاصلے پر دو نہایت چمکیلی آنکھیں نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی خطرے کا شدید احساس ہوا... یہ جھاڑیوں میں دبکا ہوا کوئی جانور تھا۔

ہم اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ ''تیندوا...'' فیروز کے منہ سے بے ساختہ سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

ہم اپنی جگہ پتھر بنے کھڑے تھے۔ تب فیروز نے پھرتی دکھائی۔ اس نے تیزی کے ساتھ رائفل پوزیشن کی اور فائر کر دیا۔ رائفل سے شعلہ نکلا اور جنگل دھماکے سے گونج اٹھا۔ وہ تیندوا یا جو کچھ بھی تھا، جھٹکے سے پیچھے گیا۔ یقیناً اسے گولی لگی تھی۔ ایک کربناک آواز بلند ہوئی اور روشن آنکھیں... جو چھوٹے چھوٹے سرخ بلبوں کی طرح نظر آئی تھیں، تیزی سے تاریکی میں اوجھل ہو گئیں۔ کسی درندے کو اس قدر قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔

درست کہتے ہیں کہ بڑے خطرے کے وقت نسبتاً چھوٹے خطرے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ فیروز کو بھی معلوم تھا کہ فائر کی آواز ہمارے دشمنوں کو ہمارے مزید قریب لے آئے گی لیکن خوں خوار جانور کو اپنے روبرو دیکھ کر وہ پیچھے آنے والے خطرے کو بھول گیا تھا۔ اور اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ اب جانور تو زخمی ہو کر راہِ فرار اختیار کر گیا تھا لیکن جو ''جانور'' ہمارے پیچھے آرہے تھے ان کو واضح راہنمائی مل گئی تھی۔

''ندی کتنی دور ہے؟'' میں نے فیروز سے پوچھا۔

''بس اب پہنچنے ہی والے ہیں۔'' فیروز نے ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

واقعی لگ رہا تھا کہ ہم نباتات کے اس گھنے جال سے نکل کر کسی کھلی جگہ پر پہنچنے والے ہیں۔ ڈھلوان قدرے بڑھ گئی تھی۔ سامنے سے ہوا کی آمد بھی محسوس ہو رہی تھی... ذرا آگے گئے تو پانی کا مدھم شور بھی سنائی دینے لگا۔ یقیناً یہ چوڑی پاٹ والی ایک تیز رفتار ندی تھی۔ ہمارے تھکے ہارے جسموں میں نئی توانائی آگئی۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے، پانی کا شور بلند ہوتا گیا۔ آخر ہم لمبے سرکنڈوں میں سے گزر کر ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس تیز رفتار آبی گزرگاہ کا پاٹ خاصا وسیع نظر آتا تھا۔ کنارے دلدلی تھے اور یہاں بہت سنبھل کر پاؤں رکھنا پڑ رہا تھا۔ قریب ہی گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی نظر آئی۔ یہاں دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور رکھوالی کا کتا تھا۔ کتے نے ہماری آمد محسوس کرتے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا... اور بے چینی سے اپنے کھونٹے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر ساتھ ساتھ تین کشتیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک ذرا بڑی تھی اور اس پر ترپال تنی ہوئی تھی۔ یہ غالباً مچھلیاں پکڑنے کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ دو کشتیاں عام سائز کی تھیں۔

جلد ہی کتے کا شور شرابا رنگ لے آیا۔ جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور ایک سایہ متحرک دکھائی دیا۔ فیروز نے ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی۔ یہ بڑھی ہوئی سفید شیو والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بدحال سی دیسی بندوق تھی۔ وہ فی الوقت صرف ایک لنگی میں دکھائی دے رہا تھا۔

''کون ہو بھئی؟'' وہ دہاڑ کر بولا۔

''بندوق نیچے کر لو۔ ناہیں تو اتنی گولیاں لگیں گی کہ شکل پہچاننا مشکل ہو جاوے گی۔'' فیروز بھی جواباً گرجا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دے کر میرے اور اسحاق کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی جدید رائفلوں کو ہائی لائٹ کیا۔

بات ادھیڑ عمر شخص کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے بندوق کی نال نیچے جھکالی۔ اس کا کتا مسلسل اچھل اچھل کر شور مچا رہا تھا۔ اچانک اس نے کھونٹا اکھاڑ لیا اور تیر کی طرح ہماری طرف لپکا۔ یہ نمک حلالی اسے مہنگی پڑی۔ اسحاق نے اپنی رائفل ٹو کا ٹریگر دبایا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا نشانہ کافی اچھا ہے۔ پہلی گولی نے ہی کتے کو ڈھیر کر دیا۔ وہ ہم سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر دو تین قلابازیاں کھا کر بے سدھ ہو گیا... دھماکے سے جہاں قرب و جوار گونجے، وہیں جھونپڑی کے اندر سے چلانے کی آواز بھی سنائی دی۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ جھونپڑی میں ایک یا ایک سے زائد عورتیں موجود ہیں۔

کتے کو گولی لگنے کا منظر ادھیڑ عمر شخص کو سکتہ زدہ کر گیا۔ فیروز پھر گرجا۔ ''بندوق نیچے پھینک، ناہیں تو آوت ہے گولی تیرے کھوپڑے میں...'' فقرے کے آخر میں ایک زوردار گالی بھی تھی۔

اس مرتبہ ادھیڑ عمر شخص نے بندوق پھینک دی۔ فیروز نے اسے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ جب وہ چار پانچ قدم پیچھے ہٹ گیا تو فیروز نے اس کی بندوق اٹھالی۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ ہم جھونپڑی کے پیچھے سیاہ جنگل میں چند جگنو سے چمکتے دیکھ سکتے تھے۔ یقیناً یہ ہمارے عقب میں آنے والوں کی ٹارچیں تھیں۔

فیروز مجھ سے مخاطب ہو کر تیزی سے بولا۔ ''مہروز! تم دیکھو جھونپڑی میں اور کون ہے۔ ہم کشتیوں کو دیکھت ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فیروز اور اسحاق تیز قدموں سے کشتیوں کی طرف بڑھ گئے۔ ماریا ان کے ساتھ تھی۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ عقل مندی دکھا رہی تھی کہ بالکل مزاحمت نہیں کر رہی تھی، ورنہ اسے اب تک اسحاق کی طرف سے کئی چوٹیں سہنا پڑ چکی ہوتیں۔

میں نے رائفل کے زور پر ادھیڑ عمر شخص کو اپنی کی جھونپڑی سے کچھ مزید پیچھے ہٹا دیا پھر جھونپڑی کے دروازے کو لات مار کر کھولا۔ یہ چوبی دروازہ تھا اور اس پر ٹین کا پتر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ جھونپڑی میں پھینکا تو اندر ایک سکڑی سمٹی مقامی لڑکی نظر آئی۔ اس نے اپنے جسم کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی اور ایک گوشے میں دبکی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر واویلا کرنے لگی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور رات کے اس پہر رومانی موڈ میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا لیکن اس فرق کی وجہ جاننے اور تفصیل میں جانے کا وقت ہرگز نہیں تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے جھونپڑی کی تلاشی لی۔ وہاں اب ایک کلہاڑی کے سوا کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ یہ عجیب سے پھل والی تیز دھار کلہاڑی تھی۔ میں نے یہ کلہاڑی بھی قبضے میں لے لی اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

ادھیڑ عمر شخص جو یقیناً کنارے پر کھڑی تینوں کشتیوں کا مالک تھا... حکم کا منتظر کھڑا تھا... ہمارے لب و لہجے اور انداز نے اسے تقریباً دہشت زدہ کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس میں

مزاحمت کی قوت بالکل ختم ہوچکی ہے۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو یہ شخص کمزور اعصاب کا مالک نہیں ہوسکتا تھا۔ اس تیز رفتار ندی اور گھنے جنگل کے خطرناک سنگم پر ایک جھونپڑی میں اپنے کتے اور بندوق کے ساتھ تنہا رہنے والا شخص کمزور اعصاب کا مالک تو نہیں ہوسکتا تھا۔ پہلی بار مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ طاقت کیا ہوتی ہے اور منہ زور رونوں کے سامنے اچھے بھلے لوگ کیسے مغلوب ہوجاتے ہیں۔

ادھیڑ عمر شخص ڈگمگاتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا تو میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اپنی بیوی کے ساتھ لیٹ جاؤ اور اوپر چادر لے لو۔ خبردار! جو تم دونوں میں سے کسی نے چادر سے منہ باہر نکالنے کی کوشش کی۔ اگر ایسا ہوا تو تم دونوں کی لاشیں بھی کتے کے پاس پڑی نظر آئیں گی۔''

ان دونوں نے لیٹ کر چادر اپنے اوپر تان لی۔ میں جھونپڑی کا دروازہ باہر سے بند کرکے کنارے کی طرف آگیا۔ میرے پہنچنے تک فیروز اور اسحاق نے دو چھوٹی کشتیوں کی رسیاں کاٹ کر انہیں پانی کے تیز بہاؤ میں بہا دیا تھا۔ تیسری کشتی میں ہم خود سوار ہوگئے۔ اب دور دور تک اور کوئی کشتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ فیروز نے لمبے بانس نما چپو کی مدد سے کشتی کو تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف کھینا شروع کردیا۔

پانی کے زوردار بہاؤ کی وجہ سے ہم پلک جھپکتے میں جھونپڑی سے بہت دور نکل آئے۔ جھونپڑی کے ساتھ ساتھ... درختوں میں چمکتے ہوئے جگنو بھی ہم سے بہت دور رہ گئے۔ ہمیں ایسے تیز رفتار اور کامیاب فرار کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق صرف پانچ چھ منٹ میں ہم ملاح کی جھونپڑی اور اس کے گھاٹ سے قریباً دو میل آگے نکل آئے۔ کشتی بتدریج دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی، تاہم کنارہ ہنوز بیس تیس میٹر دور تھا۔ کشتی کے اندر سے مچھلیوں کی بو اٹھ رہی تھی۔ مچھلیاں پکڑنے کے جال اور دیگر لوازمات بھی کشتی میں نظر آرہے تھے۔ کشتی کے پیندے کو مچھلیاں اسٹور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس پیندے کو ایک چھوٹے سے تہ خانے کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک گول سوراخ کے ذریعے اس چار پانچ فٹ گہرے تہ خانے میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ اسٹور نما تہ خانہ فی الحال خالی تھا۔ اس میں مچھلیاں صاف کرنے اور انہیں نمک وغیرہ لگا کر محفوظ کرنے کا انتظام موجود تھا۔

فیروز نے بہت کوشش کرکے ندی کا دوسرا کنارہ پکڑا۔ ورنہ ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ تاریک پانی کا سرکش بہاؤ ہمیں مزید کئی میل آگے لے جائے گا۔ اب کشتی کو روکنے کا مسئلہ تھا۔ وہ کافی وزن دار تھی اور اس کا مومینٹم تھا۔ ایک مناسب جگہ پر فیروز اور اسحاق چھلانگیں لگا کر کنارے پر پہنچے اور انہوں نے رسّوں کی مدد سے کشتی کو سنبھالا۔ اس دوران میں، میں رائفل بدست ماریا کے پاس موجود رہا۔

کشتی رک گئی تو میں نے اور اسحاق نے ماریا کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے وہ اوندھے منہ ریت پر گرگئی۔ اس سے پہلے کہ میں بھی ماریا کے پیچھے کنارے پر اتر جاتا، ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے یوں لگا کہ کشتی کے چھوٹے سے تہ خانے میں کوئی موجود ہے۔

''کیا بات ہے... تم نیچے کیوں نہیں آرہے؟'' فیروز نے پوچھا۔

''ایک منٹ... مجھے شک سا ہو رہا ہے۔'' میں نے سرگوشی کی اور پلٹ کر تہ خانے کے سوراخ کی طرف آیا۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔

تب دوسری مرتبہ آہٹ ہوئی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ تہ خانے کے اندر اتارا۔ بظاہر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں ہمت کرکے نیچے چلا گیا۔ یہاں بدبو تھی۔ لکڑی کا فرش گیلا ہو رہا تھا۔ اس تہ خانے کی چھت اتنی نیچی تھی کہ میں کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ہی ٹارچ کو دائیں بائیں گھمایا... اور اچانک سکتہ زدہ رہ گیا۔

لکڑی کے اس غلیظ تہ خانے میں، مچھلیاں پکڑنے والے جالوں، رسّیوں اور مختلف اوزاروں کے درمیان ایک جیتا جاگتا شخص موجود تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے جسم پر فقط ایک لنگوٹ تھا۔ اس کے عریاں جسم پر چند چھوٹے بڑے زخم موجود تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس جواں سال شخص کی ایک ٹانگ اور ایک بازو ندارد تھا۔ وہ چلنے کے لیے جس لکڑی کو بیساکھی کے طور پر استعمال کرتا تھا، وہ بھی پاس ہی رکھی ہوئی تھی۔

تہ خانے میں مچھلی کی ناگوار بو کے علاوہ ایک اور بو بھی موجود تھی۔ یہ شراب کی تھی۔ لکڑی کے فرش پر دو تین خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ میں نے رائفل سیدھی کی۔ ''کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

جواب نہیں ملا۔ کیچوے کی طرح لیٹا ہوا شخص بالکل بے حرکت رہا۔ بس اس کی سوجی سوجی پلکوں میں تھوڑی سی حرکت ہوئی۔ وہ شکل و صورت سے نیپال کی طرف کا لگتا تھا۔

جسم کمزور اور میلا کچیلا تھا۔ اسی دوران میں اسحاق بھی چھلانگ لگا کر واپس کشتی پر آگیا۔ اس نے کشتی کے تہ خانے میں جھانکا اور پھر ٹارچ کی روشنی میں میرے تاثرات دیکھ کر اندر آگیا۔

وہ بھی اس عجیب الخلقت ننگ دھڑنگ شخص کو دیکھ کر حیران ہوا۔ ''کون ہے یہ؟'' اسحاق نے پوچھا۔

''میں بھی دو تین بار پوچھ چکا ہوں۔ کچھ بتا نہیں رہا۔ ڈھیٹ بنا لیٹا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اسحاق نے آگے بڑھ کر ٹارچ کا روشن دائرہ اس کے چہرے پر پھینکا اور پھر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''اوئے، کون ہو تم؟ بولتے کاہے نا ہیں؟''

اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھول کر بے نیازی سے اسحاق کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اسحاق نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں لگائی۔ پھر دوسری ٹھوکر پھر تیسری۔

مجھے یوں لگا جیسے یہ شخص بلبلا اٹھے گا مگر حیرت انگیز طور پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شاید اس نے کچھ زیادہ تکلیف ہی محسوس نہیں کی تھی۔ کیا یہ نشے کی وجہ سے تھا یا کوئی اور بات تھی۔ ''اٹھ جاؤ۔'' اسحاق دہاڑا۔

اس مرتبہ عجیب الخلقت شخص نے اپنے سیاہی مائل ہونٹ ہلائے اور انگریزی میں بولا۔ ''دفع ہوجاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' اس کی آواز بھی اس کی طرح عجیب تھی۔

''تمہاری تو ایسی کم تیسی۔'' اسحاق نے دانت پیس کر رائفل سیدھی کرلی۔ ''اٹھ جا حرامی! نا ہیں تو میں گولی چلاوت ہوں۔''

حیرت انگیز طور پر اس بار بھی اجنبی شخص کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اسحاق دہاڑا۔ ''میں پانچ تک گنوں گا پھر گولی مار دوں گا۔''

اس نے گنتی شروع کی... اور پھر ختم بھی کردی۔ مدقوق شخص اسی طرح پڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا اکلوتا بازو پکڑا اور اسے سیدھا کرکے بٹھانے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار تو بیٹھا لیکن پھر مٹی کے ڈھیر کی طرح ڈھے کر لیٹ گیا۔ اسحاق کا پیمانۂ صبر اب لبریز ہوچکا تھا۔ اس پر جنونی کیفیت تو پہلے ہی طاری تھی۔ اجنبی شخص کے اڑیل پن نے اسے مزید مشتعل کر دیا۔ اس نے اسے اکلوتے بازو سے پکڑا اور بے دردی سے کشتی کے ڈیک کی طرف کھینچنے لگا۔ اب اس ننگ دھڑنگ شخص نے مزاحمت کی اور تہ خانہ چھوڑنے سے انکار کردیا۔ وہ اب اسحاق کی مخالف سمت میں زور لگا رہا تھا۔ مدقوق ہونے کے باوجود اس کے جسم میں مناسب طاقت موجود تھی۔

اسحاق اسے کھینچنے کے ساتھ ساتھ ٹھوکریں بھی رسید کر رہا تھا۔ اچانک ننگ دھڑنگ شخص نے بھنا کر اسحاق کو لات ماری۔ یہ لات اسحاق کی ناف میں لگی اور وہ تکلیف سے دہرا ہوگیا۔ بہرحال، یہ جرأت ننگ دھڑنگ شخص کو کافی مہنگی پڑی... اسحاق نے اس کی جسمانی حالت کی پروا کیے بغیر اسے روئی کی طرح دھنک دیا۔ دو چار ٹھوکریں میں نے بھی رسید کیں۔ اتنا کچھ کسی صحت مند و توانا شخص کے ساتھ ہوا ہوتا تو وہ بھی تکلیف کے سبب دہائی دینے لگتا، مگر اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا جسم گوشت پوست کے بجائے ربڑ یا پلاسٹک کا بنا ہوا ہے یا پھر وہ اس قدر نشے میں ہے کہ درد کا احساس ہی ختم ہوچکا ہے۔

کشتی بری طرح ڈگمگا رہی تھی۔ باہر سے فیروز چلّا چلّا کر پوچھ رہا تھا۔ ''کیا ہو رہا ہے... کون ہے یہ؟''

وہ ماریا کو اکیلا چھوڑ کر کشتی پر بھی نہیں آسکتا تھا۔ میں نے تہ خانے میں سے سر باہر نکال کر فیروز کو تسلی دی اور بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

میں نے دوبارہ تہ خانے میں دیکھا تو ننگ دھڑنگ شخص بالکل بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اسحاق نے رائفل کے وزنی کندے سے اس کے سر پر کاری ضرب لگائی تھی اور اسے نیم جان کر ڈالا تھا۔

''مرگیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نا ہیں۔'' اسحاق نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ وہ باہر نکل گیا۔ میں تذبذب میں کھڑا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ کون تھا؟ اس کے ساتھ کیا گزری تھی اور یہ کشتی چھوڑنے سے کیوں انکار کر رہا تھا؟ اگر ہم اسے اس حالت میں یہاں چھوڑ کر چلے جاتے تو یہ مر بھی سکتا تھا۔ میری ٹارچ کا روشن دائرہ اجنبی کے چہرے پر تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس شخص کے چہرے میں کہیں اپنے یار عمران کے چہرے کی جھلک نظر آرہی تھی۔ خاص طور سے اس کی پیشانی، بھویں اور رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں... بے شک یہ عمران نہیں تھا۔ اس کے بال گھنگرالے تھے، قد بھی ذرا چھوٹا تھا... لیکن اپنے پیارے دوست کی ایک ہلکی سی جھلک بھی میرے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اس شخص کے لیے میرے دل میں جو نرم گوشہ شروع سے موجود تھا، کچھ اور وسیع ہوگیا۔ میرا دل نہیں چاہا کہ ہم اسے یہاں اس حال میں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں۔

میں نے دیکھا، اس کے اکلوتے بازو پر انمٹ روشنائی سے اس کا نام لکھا ہوا تھا... یہ کچھ عجیب سا نام تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا۔

اسی دوران میں فیروز بھی کشتی میں آ گیا۔ وہ باہر اسحاق کو ماریا کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ اس نے بھی دلچسپی سے اس منک دھڑنگ شخص کو دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''فیروز! یہ زخمی ہے۔ ہمیں اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔''

''لیکن ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ ہم گھاٹ سے بہت زیادہ دور نہیں آئے۔ وہ لوگ کسی بھی سے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ عمران نہیں تھا... بالکل نہیں تھا... لیکن اس میں عمران کی ہلکی سی جھلک تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ میں نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''فیروز! شاید یہ مسلمان ہے۔ لگتا ہے کہ ہماری ہی طرح کسی مصیبت میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی یہ حالت بھی حکم جی یا جارج وغیرہ کی وجہ سے ہوئی ہو۔ ہمیں اسے اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

فیروز جز بز ہو گیا۔ ''لیکن ہم اسے لے جائیں گے کیسے؟''

''چلو، یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسے اٹھا لیتا ہوں۔ اس کا وزن ہی کتنا ہے۔''

فیروز نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ غالباً میرے تاثرات نے اسے سمجھا دیا کہ میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر تم اسے لے جاسکتے ہو تو لے جاؤ...''

میں نے اپنی رائفل اور ٹارچ فیروز کو تھمائی۔ ایک کپڑا جلدی سے مدقوق شخص کے سر کے زخم پر باندھا اور اسے اٹھا کر باہر لے آیا۔ کشتی سے اتر کر میں نے اسے کندھے پر لادا تو وہ بالکل ہلکا محسوس ہوا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کے جسم میں ایک ٹانگ اور ایک بازو کا بوجھ شامل نہیں تھا۔

اسحاق کو بہت ناگوار گزرا کہ میں نے اس شخص کو کندھے پر لاد لیا ہے۔ وہ شاید مجھ سے بحث کرنا چاہ رہا تھا تاہم فیروز اسے ایک طرف لے گیا اور دانائی کے ساتھ سمجھا بجھا لیا۔ تاریک جنگل میں رات کا بسیرا تھا اور جنگلی جانوروں کی آوازیں تھیں۔ ہم ٹارچوں کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھتے گئے۔ اب ہمیں اپنے عقب سے زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر فیروز نے اصرار کے ساتھ مدقوق شخص کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ میں نے اپنی رائفل کے ساتھ ساتھ اس کی رائفل بھی تھام لی۔ جھونپڑی سے ملنے والی دیسی ساخت کی رائفل ہم نے راستے میں ایک بارشی جوہڑ کے اندر پھینک دی تھی۔ وہاں سے ملنے والی کلہاڑی جو بالکل چھوٹے دستے کی تھی، اسحاق کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس کے عجیب وضع کے پھل سے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے جھاڑ جھنکاڑ کو کاٹ رہا تھا۔ ہمارے قدموں میں ایک طرح کی تیزی تو اب بھی موجود تھی لیکن تعاقب کا شدید خطرہ معدوم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر تھا جب ہم ایک جگہ رک گئے۔ یہ درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے عین درمیان ایک ابھری ہوئی جگہ تھی جیسے کوئی ٹیلا ہو۔ ہم اس چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ اسحاق وغیرہ نے ذرا سستانے کے لیے اس ٹیلے کو منتخب کیا ہے لیکن معاملہ کچھ اور تھا۔ فیروز اور اسحاق میں ایک بار پھر کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ ماریا ایک لاچار قیدی کی طرح درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی اکلوتی جوتی اتار چکی تھی۔ اس کے پاؤں بری طرح زخمی تھے۔ دشوار گزار سفر نے ہماری طرح اس کے چہرے پر بھی کئی خراشیں ڈال دی تھیں۔ اس کے کانوں میں ڈائمنڈ کے بڑے بڑے آویزے تھے۔ یہ راستے میں شاخوں سے الجھتے رہے تھے اور اس کے ایک کان سے خون رسنے لگا تھا۔

وہ منمنائی۔ ''ہام کو سخت پیاس لگا۔''

میں نے کہا۔ ''پیاس تو ہم کو بھی لگی ہے لیکن یہاں کہیں پانی نظر نہیں آتا۔''

''ڈھونڈو۔ شاید کہیں مل جائے۔'' وہ انگلش لہجے میں بولی۔ اس کی آواز میں التجا تھی۔

''کیا بکتی ہے یہ؟'' اسحاق نے دور سے پھنکار کر پوچھا۔

''پانی مانگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''پلاتے ہیں۔ ابھی پلاتے ہیں تجھے پانی۔ ہم بکری کو پانی پلائے بغیر ذبح نہیں کرتے۔'' اسحاق کی آواز میں زہر تھا۔

''یہ کیا کہتا؟'' ماریا نے مجھ سے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

وہ ڈرے ڈرے انداز میں بولی۔ ''ہام کو لگتا کہ یہ ہام کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ ہام کو مارنے کا پروگرام بنا رہا۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اسحاق اور فیروز کی سرگوشیاں دھیرے دھیرے بلند ہوتی چلی گئیں۔ اسحاق پھنکارا۔ ''مجھے سب پتا ہے فیروز! ہم وہاں انور بھائی کے پاس سرنگ میں چلے گئے تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اس حرامزادی سے ابھی حساب برابر کرنا ہوگا۔ ابھی اور اسی وقت۔''

فیروز بولا۔ ''دیکھو، میرے دماغ میں تو جو آنا تھا، میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ مشورے سے جو کام ہو، وہ اچھا ہوتا ہے۔''

''ہم مشورے سے ہی چلے تھے۔'' اسحاق ترخ کر بولا۔ ''اور مشورہ یہ تھا کہ اس کتے جارج کو مار کر آویں گے یا خود بھی وہیں رہ جاویں گے۔ وہ حرامی تو بچ گیا۔ اب کم از کم اس سفید سورنی کی گردن تو توڑیں۔ کچھ نہ کچھ تو ٹھنڈک پڑے ہمارے کلیجے میں۔'' اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ فیروز ٹھیک کہتا تھا۔ اسحاق نے وقتی طور پر ماریا کی جان بخشی کی تھی۔ اب چونکہ ہم خطرناک حدود سے نکل آئے تھے اور اس زمین دوز دراڑ کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے جہاں انور خان، چوہان اور دیگر پینتیس چالیس افراد موجود تھے۔ لہٰذا اسحاق چاہتا تھا کہ یہیں اسی جگہ پر ماریا کا کام تمام کر دیا جائے۔ ساڑی کا وہ کپڑا اس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ اس سے پہلے رسی کے طور پر استعمال کر چکا تھا۔ اب وہ پھر اسے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ماریا پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ اسے اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اس کے لیے میرے دل میں بھی کسی طرح کا رحم یا ترس موجود نہیں تھا۔ اس کی رگوں میں وہی زہریلا خون دوڑ رہا تھا جو جارج کی رگوں میں تھا اور جارج کی درندگی میں اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس خبیث نے اپنے بیڈ روم میں سلطانہ کے سامنے مجھے دوبدو مقابلے کا موقع دیا تھا۔ اس نے بھرا ہوا پسٹل میرے پاؤں میں پھینک دیا تھا اور مجھے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں ان لمحوں کو یاد کرتا تھا تو پسینے میں ڈوب جاتا تھا۔ شاید وہی لمحے تھے... وہی وقت تھا جب میرے اندر تبدیلی کی داغ بیل پڑی تھی۔ میں پستی اور ہزیمت کی انتہا کو چھونے کے بعد ابھرنا شروع ہو گیا تھا اور اب میں تہِ دل سے محسوس کرتا تھا کہ میں ابھر چکا ہوں... بدل چکا ہوں... اور یہ کوئی عارضی تبدیلی نہیں تھی۔ میری کیمسٹری میں مستقل طور پر کوئی ردوبدل ہو چکا تھا۔ میں نے حسرت سے سوچا... کاش ایک بار پھر ''وقت'' اسی طرح مجھے جارج کے روبرو کر دے۔ وہ پسٹل میرے سامنے پھینکے اور میری مزاحمت کو للکارے۔

میں سوچ رہا تھا اور اس چھوٹے سے ٹیلے پر وقت کا قلم، رات کے اس آخری صفحے پر کچھ انوکھا لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے مدقوق شخص کو بڑی احتیاط کے ساتھ گھاس پر دراز کر دیا تھا۔ اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل چکی تھی۔ اس کے منہ سے شراب کی بو اٹھ رہی تھی۔ راستے میں فیروز نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے گڑ کی شراب پی رکھی ہے جسے ''رم'' کہا جاتا ہے۔ بے خبری کی حالت میں وہ گاہے بگاہے کراہ اٹھتا تھا۔ اس طویل ہنگامہ خیز رات کے بطن سے نمودار ہونے والا یہ انوکھا کردار تھا۔ وہ اس بدبودار کشتی سے کسی جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ پھر مجھے اس کی سخت جانی یاد آئی۔ اس نے اسحاق کے تندوتیز حملے یوں جھیلے تھے جیسے نشانہ اس کا اپنا جسم نہ ہو کسی اور کا جسم ہو۔ اس کی شباہت میں کہیں عمران کی ہلکی سی جھلک موجود تھی اور یہ جھلک سیدھی میرے دل پر اثر انداز ہوئی تھی۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، محبوب چیزوں کی طرف تو انسان کا دل کھنچتا ہی ہے، ان سے ملتی جلتی چیزوں پر بھی پیار آ جاتا ہے۔ یہ دل کے معاملے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔

یکایک اسحاق اور فیروز کے درمیان ہونے والا مکالمہ ختم ہو گیا اور اسحاق ایک بار پھر غصے سے بپھرا ہوا ماریا کی طرف بڑھا۔ ''پلیز! ایسا مت کرو... پلیز!'' ماریا نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''تیری تو...'' اسحاق پھنکارا اور ماریا کو بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ گر گئی۔

اسحاق جیسے دیوانگی کے عالم میں اس کے اوپر چڑھ بیٹھا اور ساڑی کے کپڑے کو اس کی لمبی گردن کے گرد ایک بل دینے کے بعد بھینچنے لگا۔ ماریا کی آواز گلے میں دب کر رہ گئی... وہ بری طرح مچل رہی تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے وہ مزاحمت کے قابل بھی نہیں تھی۔ فیروز نے مجھے اشارہ کیا کہ میں آگے بڑھ کر اسحاق کو روکوں۔

میں نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ اسحاق میری بات پر اتنا مشتعل نہیں ہوتا۔ میں نے آگے بڑھ کر ماریا کی گردن اسحاق کے ہاتھوں سے چھڑائی اور اسے ماریا سے پیچھے ہٹایا۔ وہ اوندھی ہو گئی۔ بری طرح کھانسنے اور ابکائیاں لینے لگی۔

اسحاق نے خونی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ دہاڑا۔

''میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تمہارا جو جی چاہے کرنا۔''

''کیا کہتے ہو؟''

میں اسے ایک طرف لے گیا۔ ماریا نے اب بلند آواز سے رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ہمت اب جواب دیتی جا رہی تھی۔ میں نے اسحاق سے کہا۔ ''مجھے صرف ایک بات بتا دو۔ ہم جارج کو مارنے کے لیے کیوں نکلے تھے... اور یہ سب لوگ جو حکم جی کے مجرم بن کر اب سرنگ میں چھپے ہوئے

ہیں، کیوں مجرم بنے ہیں؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہ سامنے کی بات ہے۔ سلطانہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد ہمارا صبر ختم ہو گیا ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ ہماری بہن ہے۔ ہم اس کے آنسو نا ہیں دیکھ سکتے۔ ہم ان سارے سفید کتوں کو رونے چلّانے پر مجبور کر دیویں گے۔"

"تم نے بڑی اچھی بات کہی ہے... ہم سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ اب ذرا غور کرو۔ کیا سلطانہ کی آنکھوں میں اس وقت آنسو نہیں آئیں گے جب اسے پتا چلے گا کہ اس کے بوڑھے باپ اور بیمار بھائی کو جارج نے زندہ درگور کر دیا ہے... یا تکلیفیں دے دے کر جان سے مار دیا ہے..."

اسحاق ذرا ٹھٹکا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"بالکل سامنے کی بات ہے۔ تم لوگ سلطانہ اور اس کے بچے کو تو زرگاں سے نکال لائے ہو لیکن اس کے گھر والے وہ ہیں ہیں۔ پکی بات ہے کہ وہ جارج اور حکم جی کے شکنجے میں آ چکے ہوں گے یا آنے والے ہوں گے۔ ہم انہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ ہم سب تو وہاں سے نکل آئے ہیں۔ لیکن اب ہم کر سکتے ہیں... اگر چاہیں تو ہم کر سکتے ہیں۔ اس لڑکی کی شکل میں ہمارے ہاتھ ایک بہت خاص پتا آ گیا ہے۔"

اسحاق کی آنکھوں کے شعلے کچھ مدھم پڑ گئے تاہم چہرے کی سختی برقرار رہی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اسحاق... اور بات صرف سلطانہ کے گھر والوں ہی کی نہیں ہے۔ ہم اس لڑکی کے زور پر اور بھی کئی باتیں جارج اور حکم جی سے منوا سکتے ہیں۔ اس لڑکی کو فوری طور پر مار کر ہم بہت کچھ گنوا دیں گے۔"

ایسا لگا کہ میری بات اسحاق کی سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہے۔ اس کا تنا ہوا جسم ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔ یہ بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر فیروز بھی ہمارے پاس چلا آیا اور اس گفتگو میں شریک ہو گیا۔

☆☆☆

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم زمین دوز دراڑ میں واپس پہنچ گئے۔ اس دراڑ کا دہانہ حیران کن حد تک پوشیدہ تھا۔ رات تو رات، دن کی روشنی میں بھی اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ دہانے کی سیاہی دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی ریچھ جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہو۔ ہم جس وقت دہانے پر پہنچے، سپیدۂ سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جنگل سے جانوروں کی آوازیں معدوم ہو گئی تھیں اور اس کی جگہ پرندوں کی چہچہاہٹ لے رہی تھی۔

غیر متوقع طور پر دراڑ کے دہانے پر کوئی پہرے دار موجود نہیں تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ کچھ عجیب سا لگا، کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے اور تب یہ انکشاف ہوا کہ سرنگ خالی ہے۔ ہم جن چالیس بیالیس ساتھیوں کو یہاں چھوڑ کر گئے تھے، وہ اب یہاں موجود نہیں تھے۔ ان کا سامان وغیرہ بھی ناپید تھا۔ شواہد سے پتا چلتا تھا کہ وہ شاید چند گھنٹے پہلے یہاں سے جا چکے ہیں۔ ایک طرف ٹوٹے ہوئے دستوں والی دو زنگ آلود تلواریں پڑی تھیں۔ ان کے پاس ہی زخموں سے اتاری جانے والی کچھ خون آلود پٹیاں اور خوراک کے بچے کھچے حصے تھے۔ ہاں... یہاں کے مکین یہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ یہ صورتِ حال خاص طور سے فیروز کے لیے مایوس کن تھی۔ اسے ہندو ماں کا طعنہ دینے والا اکبر بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ شاید فیروز، اکبر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہونا چاہتا تھا اور اسے بتانا چاہتا تھا کہ دیکھو، میں نے جان کی بازی لگائی ہے اور دشمن کے گھر میں گھس کر اسے گھاؤ لگایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔

ابھی ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ایک طرف سے آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے گرج دار آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

فیروز نے یہ آواز پہچان لی۔ وہ زور سے بولا۔ "یہ ہم ہیں انور بھائی... کہیں گولی شولی نا ہیں چلا دینا۔"

چند سیکنڈ بعد انور خاں ہمارے سامنے آ گیا۔ فیروز نے ٹارچ کا روشن دائرہ انور خاں کی طرف کیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس کے پیچھے ہمیش بھی باہر آ گیا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ بھکشو ہمیش کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا۔ یہ تیکس چوبیس سال کا نوجوان تھا اور ان پہرے داروں میں سے تھا جنہوں نے پرسوں مجھے دراڑ سے باہر نکلنے سے روکا تھا۔

"یہ سب کیا ہے انور بھائی! باقی سب لوگ کہاں گئے؟" فیروز نے پوچھا۔

"میں سب بتاتا ہوں لیکن پہلے میری حیرت دور کرو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ کہیں میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہیں؟ یہ جارج گورے کی بہن ماریا ہی ہے نا؟"

"بالکل انور بھائی! یہ وہی ہے۔ اس حرامی نے ہماری مسلمان بہن سلطانہ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد وہ

کسی رو رعایت کا حق دار نا ہیں ہے اور نہ یہ سفید کتیا ہے۔" اسحاق نے کہا اور ماریا کو بالوں سے پکڑ کر بری طرح جھنجوڑا۔

"لل... لیکن... یہ تم نے کیا کس طرح؟ اور... یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟"

"نتیجہ کچھ نا ہیں نکلے گا انور بھائی۔" اسحاق بولا۔ "ہم نے یہ سب کچھ سامنے آئے بغیر کیا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نا ہیں کہ اس میم کو اٹھا کر لے جانے والے کون ہیں؟"

انور خاں کی حیرت برقرار تھی۔ وہ اسحاق کے جواب سے پوری طرح مطمئن بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ ایک ٹانگ اور ایک بازو والے مدقوق شخص پر پڑی۔ اس نے پوچھا۔ "اور یہ کون ہے؟ اسے کہاں سے اٹھا لائے ہو؟"

"یہ بھی ایک عجوبہ سا ہے جی۔ یہ راستے میں ملا ہے۔" فیروز نے جواب دیا اور مدقوق شخص کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائی۔

انور خاں اور ہمیش حیرت آمیز دلچسپی سے سن رہے تھے۔ انور خاں نے میرے ہاتھ سے ٹارچ لے لی تھی اور اس کی روشنی میں مدقوق شخص کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

مدقوق شخص اب مکمل ہوش میں آ رہا تھا۔ فیروز نے احتیاط کے طور پر اسے ایک گوشے میں لٹایا اور اس کی اکلوتی ٹانگ کو ایک زنجیر سے باندھ کر اس طرح موڑ دیا کہ وہ گھٹنے پر سے مکمل طور پر مڑ گئی اور سیدھی ہونے سے قاصر ہو گئی۔ ہمارے اور انور خاں کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انور خاں اس بات پر ناراض تھا کہ ہم اسے بتائے بغیر یہاں سے نکل گئے۔ تاہم ماریا کی شکل میں جو ایک ہتھیار ہمارے ہاتھ میں آ گیا تھا، وہ اس پر خوش بھی تھا۔ اس موقع پر فیروز نے انور خاں کو یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ ماجد بھی ہمارے ساتھ تھا اور وہ زندہ واپس نہیں آ سکا۔ انور خاں، ماجد کو لاپتا سمجھ رہا تھا۔

انور خاں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "آخر کار چھوٹے سرکار نے ایک دلیری کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ انہوں نے سلطانہ، بالا اور مہروز سمیت سب لوگوں کو تل پانی میں پناہ دے دی ہے۔ آج وقت دوسرے پہر وہ سب لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تمہیں بھی مبارک ہو مہروز! چھوٹے سرکار کسی کو پناہ دیتے ہیں تو پھر اس پناہ کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ اب تم ہر طرح محفوظ ہو اور جس وقت چاہو تل پانی پہنچ جا سکتے ہو۔"

"لیکن... تم کیوں نہیں گئے؟ اور ہمیش بھی یہیں ہے... اور اس کے ساتھ یہ تیسرا بندہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں پناہ نہیں ملی۔" انور خاں نے جواب دیا۔ "اور میرے خیال میں چھوٹے سرکار کا فیصلہ صحیح ہے۔ اگر وہ ہمیں بھی رکھ لیتے تو پھر معاملہ بہت زیادہ بگڑ جاتا تھا۔"

ہمیش بولا۔ "لوگ تو انور بھائی کے بغیر جانا ہی نا ہیں چاہتے تھے۔ انور بھائی نے بڑی مشکلوں سے انہیں رضامند کیا۔ یہ انور بھائی کی بڑائی ہے۔"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم تین بندوں کی وجہ سے باقی لوگوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے۔ میں نے ہمیش اور احمد سے مشورہ کیا اور انہوں نے بھی میری رائے سے رائے ملائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا، بہت اچھا ہوا ہے۔" انور خاں نے کہا۔

میں سوالیہ نظروں سے احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انور خاں نے میرے تجسس کو دور کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام احمد ہے۔ یہ مارشل آرٹ کا زبردست کھلاڑی ہے۔ پہلے الٰہ آباد کا چیمپئن تھا، اب الٰہ آباد سے باہر بھی اس کو مانا جاتا ہے۔"

"اس کے یہاں رہنے کی وجہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس سمجھ لو کہ یہ بھی ہم دونوں کی طرح حکم جی کا خاص مجرم ہے۔ اس کا ناقابلِ معافی قصور میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔" انور خاں نے جواب دیا۔

ہمارے درمیان آدھ پون گھنٹا بات چیت ہوئی۔ اس میں آئندہ کا لائحہ عمل طے ہوا۔ اس لائحہ عمل میں میرے لیے یہ تجویز تھی کہ میں خود کو ملنے والے موقع کو ضائع نہ کروں اور فوراً تل پانی کا رخ کروں۔ انور خاں کا کہنا تھا کہ مجھے پناہ مل چکی ہے اور مجھے اپنی بیوی بچے کے پاس ہونا چاہیے۔

میرے اندر کچھ اور طرح کی آندھی چل رہی تھی۔ مجھے پناہ نہیں چاہیے تھی۔ مجھے راستے چاہیے تھا۔ وہ راستہ جو مجھے اس راجواڑے کی حدوں سے نکال سکتا۔ میرے اندر اس قیدی پرندے کی روح تھی جو سدا پر پھڑپھڑاتا ہے اور اپنے دیس میں اپنے پیاروں میں واپس پہنچنا چاہتا ہے۔ مجھے سلطانہ کی حالت پر ترس تو آتا تھا اور میں اسے خطروں سے باہر دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس سے یا اس کے بچے سے میری کوئی دلی وابستگی نہیں تھی۔ میری وابستگی تو میری زمین سے تھی۔ میرے گلی کوچوں سے۔ انہی گلی کوچوں میں میرا پیار بھی تھا اور میری نفرت بھی۔ ہاں، میری نفرت بھی۔ انہی گلی کوچوں میں وہ بدذات شخص موجود تھا۔

"کس سوچ میں کھو گئے؟" ہمیش نے اپنے صفاچٹ سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ وہ ابھی تک بھکشوؤں کے سرخی مائل لباس میں تھا۔

''میں نل پانی نہیں جاؤں گا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ ہم ہر مشکل کا مقابلہ اکٹھے کریں گے۔''

''یہ کیا بات کر رہے ہو؟'' انور خاں نے مجھے سرزنش کی۔ ''ہم تمہیں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ ہم نے تم میاں بیوی کو خطرے سے نکالنے کے لیے تو یہ سب کچھ کیا ہے۔''

''اگر تم میرے لیے خود کو خطرے میں ڈال سکتے ہو تو میرا بھی یہ فرض ہے کہ تمہارے خطروں میں حصے دار بنوں۔''

ہمارے درمیان چند منٹ تک بحث ہوئی۔ بہر حال، میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ مجھے لگتا تھا کہ میری خوداعتمادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور اب میں جو بات کرتا ہوں اس پر مستحکم رہنا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔ انور خاں نے مجھے کچھ مزید سوچنے کا مشورہ دیا۔

اسحاق نے ماریا کے پاؤں میں زنجیر ڈالی اور اسے سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں اس طرح مقید کر دیا کہ وہ کوئی چالاکی، ہوشیاری نہ دکھا سکے۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ انور خاں کا کہنا بھی یہی تھا کہ یہ بہت ہوشیار و شاطر لڑکی ہے۔ اس کی طرف سے بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہوگی۔ ہم تھکے ہوئے تھے لیکن سونا [illegible] چاہتے تھے۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ جب ہم دوپہر کا کھانا [illegible] کھا رہے تھے، دہانے کی طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ہم چوکس ہو گئے۔ امکان یہی تھا کہ یہ کوئی اپنا بندہ ہی ہوگا۔ یہ خیال درست نکلا۔ یہ چوہان تھا... اس کے ہاتھ میں تھیلے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، ان میں خوراک تھی اور ضرورت کی دیگر اشیا تھیں۔

ہم ایک دوسرے سے گلے ملے۔ فیروز کو دیکھ کر چوہان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ بولا۔ ''میں راستے میں مانگتا آ رہا تھا کہ میں یہاں پہنچوں تو تم واپس آ چکے ہو۔ میری دعا قبول ہوئی ہے۔ وہاں نل پانی میں تمہاری بہت زیادہ ضرورت ہے... لیکن تم لوگ چلے کہاں گئے تھے؟''

فیروز بولا۔ ''اس بارے میں بھی آپ کو سب کچھ بتاتے ہیں لیکن نل پانی میں میری کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟''

ڈاکٹر چوہان نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن گئی ہے۔ دونوں طرف سے بڑے سخت بیان آ رہے ہیں۔ پچھلی بار سلطانہ کو پناہ اس لیے نہیں مل سکی تھی کہ اس پر گارڈ ہارون کی موت کا الزام آ گیا تھا۔ اب یہ بات سامنے آ گئی ہے کہ ہارون کو خود حکم جی کے بندوں نے ہی قتل کیا تھا اور اس قتل کے اہم ترین گواہ تم ہو۔ تمہاری گواہی حکم جی اور ان کے ساتھیوں کے منہ بند کر کے رکھ دے گی۔''

[illegible] فیروز نے سینہ تان کر کہا۔ ''میں ابھی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

''لیکن تم لوگ چلے کہاں گئے تھے؟'' ڈاکٹر چوہان نے ایک بار پھر اپنا پرتجسس سوال دہرایا۔

فیروز نے مختصر الفاظ میں چوہان کو اپنی مہم جوئی سے آگاہ کیا اور بتایا کہ جارج گورا کس طرح اپنے انجام تک پہنچنے سے بال بال بچا ہے۔

چوہان یہ جان کر ششدر رہ گیا کہ جارج کی عالی مرتبت بہن ماریا فرگوسن اس وقت یہاں اس سرنگ میں موجود ہے۔ اس کی حیرت میں اندیشوں کی آمیزش بھی تھی۔ وہ سنسنی آمیز لہجے میں بولا۔ ''یہ خبر ابھی کچھ دیر پہلے ہی نل پانی پہنچی ہے کہ زرگاں میں کچھ نامعلوم لوگوں نے جارج گورا کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا ہے۔ اس واقعے میں دو تین بندوں کی ہلاکت کے بارے میں بھی بتایا جا رہا ہے۔ بہت سے لوگ اسے سلطانہ والے واقعے کی کڑی ہی قرار دے رہے ہیں۔ اب تم نے یہ بتا کر حیران کر دیا ہے کہ یہ کارروائی تم لوگوں نے ہی کی ہے۔'' چوہان واقعی ہکا بکا تھا۔

چوہان، ماریا کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اسحاق اور فیروز اسے لے کر ماریا کی طرف گئے۔ میں اور انور خان بھی ان کے پیچھے گئے۔ ہم اس نیم تاریک گوشے میں پہنچے جہاں اسحاق نے ماریا کو باندھا تھا۔ وہاں ایک شدید حیرت ہماری منتظر تھی۔ ماریا اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ ساڑی کا وہ کپڑا جس سے ماریا کے ہاتھ باندھے گئے تھے، ایک طرف پڑا تھا۔ وہ زنجیر کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی جو اسحاق نے اس کی ٹانگ سے منسلک کی تھی۔ ''کہاں گئی وہ؟'' اسحاق نے ٹھٹک کر کہا۔

''اوہ خدایا!'' انور خاں بھی سرسراتی آواز میں بولا۔ ''میں نے کہا تھا نا، یہ بڑی تیز طرار عورت ہے۔''

''وہ یہیں کہیں ہوگی۔'' فیروز بولا۔ ''اگر وہ دہانے کی طرف جاتی تو ہماری نظروں میں ضرور آتی۔''

فیروز اور اسحاق بھاگ کر گئے اور اپنی رائفلیں اٹھا لائے۔ میری رائفل پہلے ہی میرے پاس تھی۔ ہم نے ٹارچیں روشن کیں اور چاروں طرف پھیل گئے۔ اچانک تاریکی میں سے فائر ہوا۔ دھماکے کے ساتھ ہی میں نے فیروز کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ کوئی تاریکی میں سے نکل کر دہانے کی طرف بھاگا۔ میرے سینے میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ یہ جارج کی بہن ماریا تھی۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

جانے حکم جی کے اہلکاروں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہاں فائرنگ ہوئی اور ہمارا ایک ساتھی اور حکم جی کے اہلکار مارے گئے۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا جو ایک شادی میں شرکت کے لیے اپنی سہیلی کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا اس کی حالت خراب تھی۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارا ساتھی اسحاق ماریا کو مار کر اپنا بدلہ لینا چاہتا تھا مگر ہم لوگوں نے سمجھا بجھا کر اسے اس عمل سے روکا۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے جہاں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ماریا کو جہاں باندھ کر رکھا گیا تھا وہ وہاں سے غائب تھی۔ پھر اچانک فائر ہوا اور فیروز کراہ کر گرا۔ کوئی تاریکی میں سے نکل کر بھاگا۔ وہ ماریا تھی۔ میرے سینے میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں اس کے پیچھے لپکا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی بڑا ہتھیار نہیں۔ شاید پستول یا ماؤزر ہے۔ وہ پلٹ کر مجھ پر گولی چلا سکتی تھی لیکن میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ ابھی میں اس سے دس پندرہ قدم دور تھا کہ وہ حسب اندیشہ پلٹی۔ اس نے فائر کیا لیکن نشانہ چوک گیا۔ اسی دوران میں وہ کسی شے سے ٹکرا کر گرتی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے چھاپ لیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جو ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ پوری طرح میرے بوجھ کے نیچے دب گئی۔ انور خاں اور احمد وغیرہ بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے عقب میں ڈاکٹر چوہان تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کی ٹارچ تھی۔

ماریا کو بے بس کر دیا گیا۔ وہ بری طرح ہانپی ہوئی تھی اور ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ ”یو باسٹرڈ! تم کو پتا نہیں کہ تم کیا کر رہا ہے۔ تم کو بہت برا نتیجہ بھگتنا پڑیں گا۔ تم الف اور ڈیتھ کے درمیان لٹک جائے گا...“

اسحاق نے اسے چند تھپڑ مارے تو اس کا ہیجان قدرے کم ہوا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے ایک پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی اور جب وہ بھاگ رہی تھی تو وہ اس کے ساتھ ہی گھسٹ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھاگتے ہوئے لنگڑا رہی تھی۔

اسحاق اور احمد اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے واپس مرکزی جگہ پر لائے۔ فیروز دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی بائیں ٹانگ ران پر سے دبا رکھی تھی۔ گولی ران میں لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر اسحاق کا غصہ سوا ہو گیا۔ وہ گالیاں دیتا ہوا ماریا پر پل پڑا۔ اس نے اسے نیچے گرا دیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس کا بالائی جسم بالکل عریاں ہو گیا۔ وہ چلا رہی تھی اور ”ہیلپ ہیلپ“ پکار رہی تھی۔ اسحاق اپنی ہیجانی کیفیت میں شاید اسے بالکل ہی برہنہ کر ڈالتا لیکن میں اور ڈاکٹر چوہان آڑے آئے۔ میں نے اسحاق کو تقریباً گھسیٹ کر ماریا سے پیچھے ہٹایا۔ چوہان نے اسے جسم ڈھانپنے کے لیے چادر دی۔

میں نے کہا۔ ”اسحاق! اگر ہم بھی ایسا ہی کریں گے تو پھر ان میں اور ہم میں فرق کیا رہ جائے گا؟“

وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔ ”آنکھ کا بدلہ آنکھ اور کان کا بدلہ کان ہے۔ یہ سفید نا گن کسی رعایت کی حق دار نہیں ہے۔ اس کا سر نہیں کچل دینا چاہیے۔“

”دیکھو، تم یہ بھول رہے ہو کہ ہم اس سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، ہم اسے زندہ رکھ کر جارج کو کہیں زیادہ تکلیف دے سکتے ہیں۔“

میں نے اسحاق کو بمشکل سنبھالا۔ اس سلسلے میں انور خاں اور احمد نے بھی میری مدد کی۔ ہم اسحاق کو ماریا سے دور لے گئے۔ چوہان، زخمی فیروز کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

اسحاق ذرا ٹھنڈا ہوا تو ہم ماریا کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے اس کے لیے لباس کا انتظام کیا گیا۔ زنانہ لباس ملنا تو یہاں مشکل تھا، مجبوراً مردانہ لباس سے ہی کام چلایا گیا۔ پاجامے کرتے پر مشتمل یہ لباس اس سامان میں موجود تھا جو چوہان اپنے ساتھ لایا تھا۔ ماریا چونکہ لمبی تڑنگی تھی، یہ لباس اس کے جسم پر پورا آ گیا۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اس کے ہاتھ پاؤں دوبارہ باندھ دیے۔

ہاتھ پاؤں تو پہلے بھی باندھے گئے تھے لیکن ماریا نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی۔ اس کے ہاتھ ساڑی کے کپڑے سے باندھے گئے تھے۔ ماریا نے موم بتی کے شعلے سے اس کپڑے کو جلایا تھا اور ہاتھ آزاد کر لیے تھے۔ اس کوشش میں اس کی کلائیوں پر چند زخم بھی آئے تھے۔ بعدازاں اس نے پاؤں کی زنجیر ایک طرف سے کھول لی تھی۔ دراصل اس زنجیر کو لاک کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اسے رسی کی طرح دو گرہیں دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ گرہیں ماریا نے کھول لیں۔ چھوٹے سائز کا پستول حیرت انگیز طور پر ماریا کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ یہ لیڈی پستول اس کے لباس میں ہی چھپا ہوا تھا۔ جب ہم نے ماریا کو پکڑا تھا تو اس خیال سے اس کی تلاشی نہیں لی تھی کہ وہ منگنی میں ایک تقریب میں شرکت

کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہاں اسلحے کا کیا کام تھا۔ ویسے بھی اس کے عورت ہونے کی وجہ سے ہم نے جامہ تلاشی لینا ضروری نہیں سمجھا تھا مگر اب پتا چل رہا تھا کہ یہ غلطی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ اسحاق نے راستے میں ماریا سے کسی طرح کی رعایت نہیں کی تھی اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھے رکھے تھے، ورنہ کئی موقعے ایسے آئے تھے جب وہ بہ آسانی ہمیں اپنے اس ننھے منے لیکن طاقتور پسٹل سے شوٹ کرسکتی تھی۔

اب ہماری سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ یہ لڑکی ہماری توقع سے زیادہ خطرناک ہے۔ احمد نے زنجیر کے لیے ایک چھوٹے سے تالے کا انتظام کرلیا۔ اس کے علاوہ طے ہوا کہ ہم اس لڑکی کو ہر وقت اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں گے۔

چوہان نے بڑی مہارت سے ایک تیز دھار خنجر سے نشتر کا کام لیا۔ فیروز نے بھی بہت برداشت اور حوصلے کا ثبوت دیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کی ران میں سے پسٹل کی گولی نکال لی گئی۔ کچھ اینٹی بائیوٹک دوائیں چوہان کے چھوٹے سے بیگ میں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ان کی مدد سے فیروز کی مرہم پٹی کردی گئی۔

احمد نے کہا۔ ''فیروز بھائی! آپ کے بچنے سے دہری مسرت ہورہی ہے۔ آپ بچ گئے اور آپ کی قیمتی گواہی بھی بچ گئی۔''

''اسی لیے کہتا ہوں کہ اس گواہی سے جتنی جلدی فائدہ اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ اگر کوئی انتظام ہو جاوے تو میں ابھی چھوٹے سرکار کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔''

''خیر، اب ایسی جلدی بھی نہیں۔ رات ہو لینے دو۔ اندھیرا ہوتے ہی نکل چلیں گے۔'' چوہان نے کہا۔

''اور اگر اندھیرا ہونے سے پہلے میرے ساتھ کچھ اور ہوگیا تو؟'' فیروز نے کہا۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' چوہان نے اثبات میں سر ہلا کر فیروز کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ''تمہیں اپنی جان کی نہیں اپنی گواہی کی فکر ہے۔ گھبراؤ مت۔ تمہاری جان اور گواہی دونوں اب سلامت رہیں گی۔''

''میں موہن کمار کو پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہارون کے قتل میں سب سے بڑا مجرم وہی بدذات ہے۔ اس نے بے رحمی کی انتہا کی ہے۔ ہارون حکم جی کا وفادار تھا۔ ان کے لیے درجنوں بار اپنا جیون خطرے میں ڈال چکا تھا۔ اس کی قربانیوں کا موہن کمار کی طرف سے یہ صلہ ملا۔ جب وہ زخمی تھا، مرہم اور دوا کے لیے ترس رہا تھا اور اس کھوہ میں اپنے کسی ساتھی کا انتظار کررہا تھا، موہن کمار نے اپنا رستہ سیدھا کرنے کے لیے اسے بے دردی سے قتل کردیا۔ اور یہ قاتل موہن کمار اب بھی حکم جی کی ناک کا بال ہے۔ اگر ہارون کے ساتھ یہ سب کچھ ہوسکت ہے تو حکم جی کے کسی وفادار کا جیون محفوظ ناہیں ہے...'' فیروز بولتا چلا جارہا تھا۔ اس کے سینے میں جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب اسے اپنی گواہی کی اہمیت کا احساس ہوا ہے اور وہ جلد از جلد یہ گواہی چھوٹے سرکار کے کانوں تک پہنچا دینا چاہتا ہے۔ میرا اپنا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اگر یہ اہم گواہی چھوٹے سرکار تک پہنچ گئی تو وہ ضرور اسے متاثر کرے گی۔ وہ ایک انصاف پسند شخص تھا اور یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عدالت میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اس کا بے لاگ رویہ مجھے یاد تھا...

سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں اسحاق اور انور خاں میں کسی بات پر بحث ہورہی تھی۔ گاہے بہ گاہے ان کی آواز قدرے بلند بھی ہو جاتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس بحث میں میرا نام بھی بار بار آرہا ہے۔ کچھ دیر بعد فیروز اور چوہان بھی اس بحث میں شریک ہوگئے۔ اس خیال سے کہ الفاظ مجھ تک نہ پہنچیں، ان چاروں نے اپنی آوازوں کو دبا رکھا تھا۔ صرف اسحاق ہی تھا جو کسی وقت بھڑک کر بولتا تھا اور اس کے الفاظ مجھے سنائی دے جاتے تھے۔ اس نے فیروز کی کسی بات کے جواب میں تیز لہجے میں کہا۔ ''ہم کو چاہیے کہ سچ کو سچ مان لیں اور اس کے ساتھ یہ بھی مان لیں کہ اس وجہ سے ہم سب خطرے میں ہیں۔''

جواب میں چوہان نے کچھ کہا۔ اسحاق کی بھڑکیلی آواز پھر سنائی دی۔ ''آپ پڑھے لکھے لوگ ہو۔ ظاہر ہے آپ نے پڑھے لکھوں والی بات ہی کرنی ہے مگر جو کچھ سامنے نظر آرہا ہے اس کو ہم کیسے جھٹلا دیں گے اور اگر جھٹلا دیں گے تو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی چلا دیں گے...''

کچھ دیر تک یہ تکرار جاری رہی، اسی دوران میں عجیب الخلقت شخص اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر میں باندھ دی گئی تھی اس لیے وہ کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے سرنگ کی ناہموار دیوار سے ٹیک لگائی اور سوئی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں عجیب سی لاتعلقی اور ناراضی تھی۔ اس کے بازو پر انمٹ روشنائی سے لکھا ہوا نام ہمارے لیے اب بھی ناقابلِ فہم تھا۔ یہ بارنیڈے یا باروندے پڑھا جاتا تھا۔ اس کے آگے انگریزی کا حرف جی یا پھر جے لکھا ہوا تھا۔

وہ انگریزی میں بولا۔ ''مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ مجھے میرے گھر سے کیوں نکالا ہے؟ مجھے واپس لے جاؤ۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے واپس لے جاؤ۔''

چوہان بولا۔ ''ہم تمہیں کسی گھر سے نہیں لائے، کشتی میں سے لائے ہیں۔ تم اس بدبودار کشتی کو اپنا گھر کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، وہی میرا گھر ہے۔ مجھے وہاں لے جاؤ...'' وہ کراہا پھر بری طرح کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے بولا۔ ''میرا گلا خشک ہوگیا ہے۔ مجھے تھوڑی سی شراب دو۔'' اس کی آواز گلے میں اٹک رہی تھی۔

چوہان نے احمد کو اشارہ کیا۔ وہ ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ عجیب الخلقت شخص نے ایک گھونٹ بھرا پھر کلی کردی اور گلاس ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا بدبودار چیز لے آئے ہو۔ مجھے شراب دو... میری سانس رک رہی ہے۔ جلدی کرو۔''

مجھے یاد آیا کہ کشتی میں جہاں ہم نے اس شخص کو پایا تھا، وہیں پر ''رم'' کی بہت سی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ شخص شراب خانہ خراب کا زبردست رسیا ہے۔ نشہ ٹوٹنے کے سبب اب اس کی بُری حالت ہورہی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہاں شراب موجود نہیں تھی۔ یہاں پناہ لینے والے تقریباً سب ہی مسلمان تھے اور اس لت سے دور تھے۔ چند منٹ کے اندر ہی اس شخص کی بُری حالت ہوگئی۔ اس کا مدقوق جسم لرزنے لگا اور سانس جیسے اس کی ہڈیوں بھرے سینے میں الجھنے لگی۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ''میں اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں کہیں اور مرنا نہیں چاہتا۔''

چوہان کے متعدد بار پوچھنے کے بعد اس نے فقط اتنا بتایا کہ اس کا نام یاروندا ہے اور وہ طویل عرصے سے اس مچھلیاں پکڑنے والی کشتی کے اندر رہ رہا ہے۔ اس رہائش کے لیے اور شراب، خوراک وغیرہ کے لیے اس نے ادھیڑ عمر ملاح سیوک رام کو معقول معاوضہ دیا ہوا ہے۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس حرامی سیوک نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ اس نے مجھے کشتی سے نکالنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا ہے۔ تم سارے کرائے کے ٹٹو ہو۔ تم نے اس حرامی سیوک سے پیسے لیے ہیں...''

اس کے منہ میں جو آرہا تھا، وہ بول رہا تھا اور بار بار اٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ کوشش اس کی بندھی ہوئی ٹانگ کی وجہ سے ناکام ہو جاتی تھی۔

وہ اپنی ''گھر بدری'' کے لیے ملاح سیوک رام کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ سیوک رام تو خود گن پوائنٹ پر رہا ہے اور اسے اپنی تین کشتیوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں۔ انور خاں ابھی تک اس باروندا نامی شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہے۔ انور خاں انگریزی نہیں جانتا تھا۔ اس نے چوہان کے توسط سے باروندا سے چند سوال پوچھے تاہم ان سے بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہوا۔ انور خاں نے فیروز سے مخاطب ہوکر بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے میں نے اس بندے کو زرگاں میں کہیں دیکھا ہے۔ شاید راج بھون میں ہی دیکھا ہے۔ کوئی خاص موقع تھا شاید۔ ہوسکتا ہے کہ ساتویں کے جشن کا ہی ہلا گلا ہو۔''

باروندا نامی اس شخص کا شور شرابا جب زیادہ بڑھ گیا تو ڈاکٹر چوہان نے سلطانہ کی طرح اسے بھی معقول مقدار میں افیون کھلا دی اور لمبا لیٹنے پر مجبور کردیا۔ باروندا کو زبردستی افیون کی خوراک دینے کے لیے ڈاکٹر چوہان، اسحاق اور انور خاں کو کافی زور آزمائی کرنا پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مخفوظ ٹنگی

زمین پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ زور آزمائی کی وجہ سے اس کا لنگوٹ عریانی کی حد تک کھسک گیا تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے یہ لنگوٹ پوری طرح کھول کر دوبارہ سے اس کے مدقوق جسم پر باندھ دیا۔

بارونڈا والا یہ ہنگامہ ختم ہوا تو توجہ پھر اس بحث و مباحثے کی طرف چلی گئی جو کچھ دیر پہلے انور خان اور اسحاق کی گفتگو سے شروع ہوا تھا۔ چوہان کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ ہم سرنگ کی اسی حجرہ نما جگہ پر جا بیٹھے جہاں تین دن پہلے فیروزا اور اس کے دونوں ساتھیوں نے جارج گورا کو جان سے مار دینے کا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ کسی بھی طرح کی اہم گفتگو کے لیے یہ بڑی محفوظ جگہ تھی۔ یہاں چھوٹی سی لالٹین روشن تھی اور زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس چٹائی پر میل کی ہلکی سی تہہ تھی۔

ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے چوہان سے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ میرے بارے میں کوئی خاص بات چیت ہوئی ہے۔“

”کچھ ایسا ہی ہے۔“ چوہان نے کہا۔

”شاید اسحاق نے مجھ پر کچھ اعتراضات کیے ہیں؟“

چوہان نے میری سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ شہروز... میرا مطلب ہے تابش! اس بارے میں تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟ یہ جو حکم جی کے لوگ سائے کی طرح تمہارے پیچھے رہتے ہیں اور تم کسی جگہ بھی ان سے محفوظ نہیں ہو... اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟“

کچھ دیر پہلے ہونے والی بحث کے موضوع کے بارے میں میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر چوہان! کیا میں یہ سمجھوں کہ اب تمہارے ذہن میں بھی جارونوے والی باتیں آنا شروع ہو گئی ہیں؟“

”نہیں تابش! میں چاہوں بھی تو اس انداز سے نہیں سوچ سکتا۔ لیکن... کچھ لوگ ایسا سوچ رہے ہیں اور اپنی جگہ شاید وہ بھی ٹھیک ہیں۔ اب تک جو کچھ ہوتا آیا ہے اس کی وجہ سے اچھے بھلے بندے کا ذہن چکرا سکتا ہے۔ پھر جن لوگوں کے ذہنوں نے ایسی باتوں کو پہلے سے قبول کر رکھا ہو وہ تو اور زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اب اس اسحاق ہی کو لو۔ یہ بندہ پہلے سے تعویذ گنڈے اور عملیات وغیرہ پر اعتقاد رکھتا ہے۔ اب جب یہ تمہارے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے دل میں عجیب سے اندیشے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ تمہاری وجہ سے ہم یہاں اس سرنگ میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے ہرکارے کسی بھی وقت تمہارا سراغ لگاتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”میں نے تو پہلے ہی یہ کہا تھا کہ مجھے یہاں سے جانے دیں۔ آپ سب لوگوں نے مجھے زبردستی روکا تھا۔“

”ہم اب بھی تمہیں زبردستی روکیں گے۔ یہ بات دل سے نکال دو کہ میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا... لیکن بات یہ ہے تابش کہ ہمیں حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہیے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

چوہان خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ذہن جیسے کسی دور دراز کے سفر پر روانہ تھا۔ چھوٹی لالٹین کی مدھم روشنی اس حجرہ نما جگہ کو نیم روشن کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر فیروزا اور احمد وغیرہ باتوں میں مصروف تھے۔ ان کی آوازاس شاخ در شاخ سرنگ میں ہولے ہولے گونج رہی تھی۔ اس سرنگ سے باہر دھیرے دھیرے شام اتر رہی تھی اور شام کی سیاہی میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ سرنگ کو بھی ملنا شروع ہو گیا تھا۔

چوہان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا تم دو منٹ کے لیے اپنی قمیص اتارو گے؟“

”کیا دیکھنا چاہتے ہو؟“

”کچھ نہیں، تم قمیص تو اتارو۔“ چوہان لالٹین کو میرے بالکل پاس لاتے ہوئے بولا۔

میں نے قمیص اتار دی۔ وہ اپنا چہرہ میرے سینے کے بالکل نزدیک لے آیا اور بہت غور سے کچھ دیکھنے لگا۔ وہ میری جلد پر ہاتھ پھیر رہا تھا، بڑے دھیان سے وہاں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ پھر اس نے پنڈلیوں پر سے میرے پاجامے کو اونچا کیا اور گھٹنوں سے اوپر تک معائنہ شروع کر دیا۔

”کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔“ آخر میں نے زچ ہو کر کہا۔

وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”تابش! مجھے کئی دنوں سے ایک شک ہے۔ حکم جی اور جارج جیسے لوگوں سے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان لوگوں نے تمہارے جسم کے اندر کچھ چھپا دیا ہو۔ جس کی وجہ سے انہیں ہر جگہ تمہاری موجودگی کا پتا چل جاتا ہو۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”تمہیں پتا ہی ہو گا، جدید ٹیکنالوجی آج کل کیا کیا کرشمے دکھا رہی ہے۔ جنگلی اور سمندری حیات پر ریسرچ کرنے والے لوگ جانوروں کے جسم میں چھوٹی چھوٹی چپس رکھ دیتے ہیں۔ یہ چپس سگنل دیتی ہیں اور ان سگنلز کے ذریعے جانوروں کو گھنے جنگل اور گہرے سمندر میں بھی دوبارہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔“

میرے پورے جسم میں سنسناہٹ کی لہریں دوڑ گئیں۔ چوہان نے ایک انوکھا نکتہ بیان کیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے سوچا... تو کیا واقعی میں اپنے جسم میں کوئی ”CHIP“ لیے پھرتا ہوں جو حکم جی کے اہل کاروں کو میری لوکیشن کی خبر دیتی رہتی ہے؟

چوہان بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ چپ چھوٹے سے آپریشن کے ذریعے جانور کے جسم میں رکھی جاتی ہے یا پھر اسے ایک ایسا کالر پہنا دیا جاتا ہے جس میں چپ موجود ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ حکم جی اور جارج وغیرہ یہ طریقہ ان قیدیوں پر استعمال کرتے ہوں جنہیں وہ ہر صورت اس اسٹیٹ کی حدود میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں نے سنا ہے کہ ماریا کا شوہر سرجن ہے اور جارج کا گہرا دوست بھی ہے۔“ اپنے لہجے میں حیرت کی لہر خود مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

”ہاں، میرا اپنا ذہن بھی اسی رخ پر سوچ رہا ہے۔“ چوہان نے فوراً کہا۔ ”یہ بات عین ممکن ہے کہ قیدیوں کے اندر چپ رکھی جاتی ہو اور یہ کام ماریا کا شوہر اسٹیل انجام دیتا ہو۔ میں نے اس سے پہلے بھی اندازہ لگایا ہے کہ یہ لوگ یہاں اسٹیٹ میں بڑی رازداری سے مختلف کاموں کے لیے جدید ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کام جارج اور اس کے دو چار ساتھیوں کے ذمے ہے لیکن مقامی لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اور ان کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسے کاموں کا سہرا حکم جی کے سر باندھ دیا جاتا ہے۔ مقامی لوگ چونکہ حکم جی کو روحانی پیشوا بھی مانتے ہیں اس لیے انہیں فوراً یقین ہو جاتا ہے کہ فلاں کام حکم جی نے اپنی اندرونی شکتی کی مدد سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ قیدیوں والا معاملہ ہی دیکھ لو۔ یہاں کے سادہ لوح لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان قیدیوں کو جادو کے ذریعے ”کیل“ دیا گیا ہے اور وہ یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“

میں نے پہلی بار اپنے جسم کو تحقیقی نظروں سے دیکھا۔ اگر واقعی میرے اندر کوئی ”چپ“ وغیرہ رکھی گئی تھی تو پھر اس کا کوئی نشان ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ چپ گہرائی میں نہیں تھی، بالائی جلد کے نیچے تھی تو پھر ٹٹولنے سے اسے محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ میں چکر میں پڑ گیا۔

چوہان بولا۔ ”ایسا کرتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ وہاں موڑ پر کھڑا ہو کر میں یہ دھیان رکھوں گا کہ کوئی اس طرف نہ آنے پائے۔ تم اپنے سارے کپڑے اتارو اور بڑے دھیان سے دیکھو کہ کہیں کوئی کٹ وغیرہ کا نشان تو نہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چوہان اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے خود کو بے لباس کیا اور جہاں جہاں تک میری نگاہ جاتی تھی، خوب اچھی طرح اپنی جلد کا جائزہ لیا۔ جسم کو ٹٹول کر اور دبا کر بھی کسی چیز کی موجودگی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جسم پر جو چند ایک زخم مندمل ہو چکے تھے ان کے نیچے بھی کچھ چھپایا جا سکتا تھا... لیکن اگر ایسا ہوتا تو پھر ٹٹولنے اور دبانے سے کچھ نہ کچھ محسوس ہونا لازمی تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد چوہان واپس آ گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کٹ کا نشان تو کہیں نہیں۔ نہ ہی کہیں کوئی اسٹچنگ وغیرہ ہے۔“

میں نے پاجامہ پہن لیا تھا لیکن بالائی جسم ابھی تک عریاں تھا۔ وہ باریک بینی سے ایک بار پھر میری کمر اور کندھوں وغیرہ کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ بات بالکل سامنے کی تھی کہ اگر چوہان کی تھیوری درست ہے اور میرے جسم میں واقعی کوئی چیز رکھی گئی ہے تو پھر جسم پر سرجری کا نشان ہونا چاہیے تھا۔ دو ڈھائی سال میں تو اس طرح کا نشان معدوم نہیں ہو سکتا۔

شام سے ذرا پہلے جب میں چٹائی پر لیٹا تھا اور اسی معاملے پر غور کر رہا تھا، اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ جسم میں ایک جگہ ایسی بھی ہوتی ہے جہاں سرجری کے نشان چھپ سکتے ہیں۔ اگر سر میں کسی جگہ کٹ لگایا جائے یا اسٹچنگ کی جائے تو بعد ازاں بال اسے مکمل طور پر ڈھانپ لیتے ہیں۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے اپنے سر کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

”کیا بات ہے، سر درد کر رہا ہے؟“ میرے قریب لیٹے چوہان نے پوچھا۔

”نہیں، میں ایک شک نکالنا چاہتا ہوں۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پھر اسی حجرے کی طرف چل دیے۔ عجیب اتفاق تھا، بارونڈا ایک طرف پڑا سو رہا تھا۔ ماریا سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں اپنے ساتھ ایک ٹارچ

لے آیا تھا۔ حجرہ نما جگہ پر پہنچ کر میں نے ٹارچ چوہان کے ہاتھ میں تھمائی اور اس سے کہا کہ وہ میرے سر کا معائنہ کرے۔

چوہان نے ٹارچ کی تیز روشنی میں میرے سر کو دیکھنا شروع کیا۔ جب وہ گدی کی طرف آیا تو اس کی انگلیاں ایک دم ٹھٹک گئیں۔ گدی پر نیچے کی طرف جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے ہیں، اسے کچھ نظر آیا تھا۔ ''اوہ گاڈ!'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''یہاں کچھ ہے۔ ایک، دو، تین... ہاں، تین ٹانکے ہیں۔''

اس نے سر کے پیچھے اس نرم جگہ کو چند بار زور سے دبایا اور پھر لرزتے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے تابش... ہم نے ڈھونڈ لیا ہے۔ یہاں گوشت کے نیچے کچھ ہے... کیا تمہیں محسوس ہو رہا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گدی کے پُرگوشت حصے پر رکھا اور میری انگلیوں کی پوروں کو کچھ محسوس کرانے کی کوشش کی۔ میں فوری طور پر تو کوئی اندازہ نہیں لگا سکا لیکن اتنا احساس ضرور ہوا کہ یہاں کچھ ہے۔

ٹارچ کی روشنی میں چار پانچ منٹ کے بغور معائنے کے بعد چوہان نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہمارا اندازہ درست نکلا ہے تابش! یہاں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ یہ چیز تھوڑی سی گہرائی میں پلانٹ کی گئی ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''چپ کیوں ہو گئے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے آسانی سے نکالا نہ جا سکے۔''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اندیشے جھلک دکھانے لگے۔ اس جھلک نے مجھے بھی متاثر کیا۔ واقعی اگر کوئی شے یہاں موجود تھی اور ہم اسے آسانی سے نکال بھی نہیں سکتے تھے تو پھر مسئلہ گمبھیر تھا۔

''اب کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' چوہان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ ''اگر یہ چیز یہاں تمہارے جسم کے اندر موجود ہے تو پھر... ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ حکم جی کے اہل کار اس چپ کے سگنل پکڑ کر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا، میں نے کہا۔ ''ایک بات غور کرنے کی ہے ڈاکٹر چوہان... میں اس سرنگ میں کئی راتیں گزار چکا ہوں اور اب تک کا یہ سارا وقت بخیریت ہی گزرا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس زمین دوز سرنگ میں میرا پتا چلانا مشکل ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اگر میرے جسم میں واقعی کوئی چپ موجود ہے تو پھر زیرِ زمین اس کے سگنل کمزور بھی تو پڑ سکتے ہیں یا ویسے ہی ختم ہو سکتے ہیں۔''

چوہان کی آنکھیں چمک اٹھیں، وہ بولا۔ ''تم نے سچے کی بات کی ہے۔ یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں، زمین کی سطح سے کم از کم سو فٹ نیچے ہے۔ اور شاید... یہی وجہ ہے کہ یہاں تمہارا کھوج نہیں لگایا جا سکا۔''

اس نے ایک بار پھر ٹارچ پکڑی اور مزید توجہ کے ساتھ میری گردن کے پچھلے حصے کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تین چار منٹ کے بعد اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ننانوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ہم معاملے کی تہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں تمہارے اندر کوئی سگنل دینے والا ڈیوائس رکھا گیا ہے اور یہ ایک چپ ہی ہے۔''

''کیا ہم کسی طرح اسے نکال سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا یہ سوال غور طلب ہے۔ چھوٹا موٹا آپریشن تو میں خود کر سکتا ہوں لیکن اگر یہ چیز زیادہ گہرائی میں ہے اور ریڑھ کی ہڈی کو چھو رہی ہے تو پھر مشکلات ہو سکتی ہیں۔''

''میرا تو خیال ہے کہ تم ابھی کوشش کرو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، اتنی جلدی نہیں۔ اور نہ ہی اتنی جلدی کی ہمیں کوئی ضرورت ہے۔ یہ بات تو تقریباً کنفرم ہے کہ اس سرنگ میں تم محفوظ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکم جی کے گارڈز بہت پہلے یہاں ہلا بول چکے ہوتے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی فیروز بھی لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔ اس نے کہا۔ ''اسحاق وہ احمد اور انور بھائی کو بھی اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تابش کی وجہ سے ہم سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تابش کو چھوٹے سرکار نے نل پانی میں پناہ دے دی ہے تو پھر اسے فوراً وہاں چلے جانا چاہیے۔''

چوہان نے کہا۔ ''یہاں کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں فیروز! اور یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہے کہ اس سرنگ میں ہم تابش کے ساتھ بھی بالکل محفوظ ہیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' فیروز نے پوچھا۔

جواب میں چوہان نے فیروز کو سب کچھ بتا دیا۔ میرے جسم کے اندر کسی چپ کے بارے میں جان کر فیروز ششدر رہ گیا۔ پہلے تو اسے اس بات پر یقین نہیں آیا لیکن جب ساری تفصیل اس کے سامنے آئی تو وہ ہماری باتوں کو اہمیت دینے پر آمادہ ہو گیا...

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ باقی قیدی بھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حکم جی کے سحر کے اثر میں ہیں، دراصل اسی طرح سے جکڑے گئے ہیں؟''

''اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' چوہان نے کہا۔ ''ان قیدیوں میں سے کوئی اگر فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو سگنل پکڑنے والے آلے کے ذریعے اس کا پیچھا کیا جاتا ہے اور وہ جہاں کہیں بھی ہو، دھر لیا جاتا ہے۔ تابش کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ یہ جب بھی زرگاں کی حدود سے نکلا ہے، فوراً اس کا پیچھا کیا گیا ہے اور یہ جہاں کہیں بھی گیا ہے اس کو گھیر لیا گیا ہے۔''

''ایک بات اور بھی سمجھ میں آ رہی ہے۔'' فیروز نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''کسی بھاگنے والے کو جب بھی پکڑا جاتا تھا، پکڑنے والے تیواری لال اور ڈیوڈ ہی ہوتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو اس کام کی خاص طور پر تربیت دی گئی ہو۔ ڈیوڈ تو جارج گورا کا قریبی ساتھی ہے اور بہت ہنرمند بھی سمجھا جاتا ہے۔''

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔'' چوہان نے تائید کی۔ ''عین ممکن ہے کہ ان لوگوں کے پاس سگنل ریسیو کرنے والا ڈیوائس اور انٹینا وغیرہ ہوتا ہو۔ اس کی مدد سے وہ کسی بھی جگہ پر اپنے شکار کو ڈھونڈ لیتے ہوں۔''

''لیکن کیا دوسرے لوگ ان باتوں پر وشواس کر لیں گے؟ جیسے یہ اسحاق ہے۔ اس کو پورا پورا یقین ہے کہ حکم جی جادو ٹونے اور عملیات کا ماہر ہے۔ وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو عام لوگ نہیں کر سکتے۔ اس کے دل میں عجیب طرح کا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم آسانی سے اس خوف کو نکال سکیں گے۔''

''سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خود کو منوا لیتا ہے۔ اگر ہم کوشش کریں گے اور حکم جی کی سازشوں کے مناسب ثبوت دیں گے تو لوگ بھی حقیقت کو تسلیم کرنا شروع کر دیں گے۔'' چوہان نے وثوق سے کہا۔

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ سرنگ کے دہانے کی طرف کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر گھنٹیاں سی بجنا شروع ہو گئیں۔ ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں اور دہانے کی طرف لپکے۔ خطرے کا احساس میرے دل کو طوفانی رفتار سے دھڑکایا کرتا تھا لیکن آج کل ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ آج کل اس طوفانی دھڑکن کے بجائے سنسنی کی ایک لہری سراپا میں دوڑتی تھی اور دل میں مرنے یا مار دینے کی امنگ پیدا ہوتی تھی... ہاں، موسم بدل چکے تھے۔ حبس اور گھٹن کی ایک طویل مدت نے بالآخر دل و دماغ کو ایک آشوب سے آشنا کر دیا تھا۔

ہم تقریباً دوڑتے ہوئے دہانے پر پہنچے۔ یہاں چند بکریاں نظر آئیں۔ وہ جیسے زبردستی اس قدرتی سرنگ میں گھس آئی تھیں۔ سانولے رنگ کا ایک ادھیڑ عمر چرواہا انہیں واپس لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ بکریوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیوں کی آواز پوری سرنگ میں گونج رہی تھی۔

چرواہے کو دیکھ کر چوہان ٹھٹک گیا اور بولا۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اتفاق سے یہاں نہیں آیا۔ یہ کوئی چکر ہے۔''

احمد دہانے کی نگرانی پر موجود تھا۔ وہ چرواہے سے الجھ رہا تھا۔ چوہان تیزی سے ان دونوں کے پاس پہنچا۔ ادھیڑ عمر چرواہے نے چوہان کو دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ بھی اسے پہچانتا ہے لیکن اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ چوہان اور چرواہے میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہ دونوں ایک گوشے میں چلے گئے۔ کم عمر لڑکا بکریوں کو سمیٹ کر دہانے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ شکل سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ چرواہے کا بیٹا ہے۔ دونوں کا لباس دھوتی، کرتے اور پگڑی پر مشتمل تھا۔ چوہان اور چرواہے کے درمیان پانچ دس منٹ بات ہوئی پھر چوہان، چرواہے کو لے کر ہمارے پاس آ گیا۔ چرواہے نے اپنے کندھے سے ایک گٹھڑی سی لٹکا رکھی تھی۔

چوہان نے سنسنی آمیز لہجے میں چرواہے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام نریندر سنگھ ہے۔ یہ دراصل چھوٹے سرکار کے مصاحب خاص مراد شاہ صاحب کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر آیا ہے۔'' پھر چوہان نے اس چرواہے نریندر سنگھ سے کہا کہ وہ اپنی زبان سے سب کچھ بتائے۔

نریندر سنگھ کا رنگ سانولا تھا۔ اس نے سرمہ لگا رکھا تھا۔ اس کی مہندی لگی داڑھی دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایسی مقامی زبان میں بولنا شروع کیا جس کے بہت کم الفاظ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ بہرحال فیروز، اسحاق اور انور خاں وغیرہ اس کی بات خوب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران میں انہوں نے دو چار سوال بھی نریندر سے کیے۔ آخر میں فیروز نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''مراد شاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہم جارج کی بہن ماریا کو اٹھا کر یہاں سرنگ میں لے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارا یہ فعل کافی سخت ہے اور ہم اس کی مذمت کرنے پر مجبور ہیں... لیکن وقت اور موقع محل کے لحاظ سے یہ فعل ٹھیک بھی ہے کیونکہ ماریا کی وجہ سے کسی حد

تک جارج وغیرہ کو لگام ڈالی جا سکتی ہے۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ہم ماریا کو اپنے پاس رکھیں اور اس کے ذریعے جارج وغیرہ سے کچھ باتیں منوانے کی کوشش کریں۔ لیکن ہماری یہ کارروائی اس طرح ہونی چاہیے کہ یہ ہمارا اپنا ہی کام نظر آوے... اور اس کا الزام نل پانی والوں پر بالکل دھرا نہ جا سکے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اس کام میں بے آسرا ہو جائیں گے۔ ہمیں اندر خانے چھوٹے سرکار کی حمایت و ہمدردی حاصل رہے گی اور جس طرح ہو سکا، وہ ہماری مدد بھی کریں گے۔''

یہ بڑی غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ بہرطور اس سے چھوٹے سرکار کی فہم و فراست بھی سامنے آ رہی تھی۔ وہ اپنے بڑے بھائی سے کھلم کھلا ٹکر لیے بغیر اس کی ناانصافی و من مانی کا زور توڑنا چاہ رہا تھا۔

چوہان نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ چھوٹے سرکار حکم جی کی چالبازیوں کا مقابلہ حکمتِ عملی سے کرنا چاہ رہے ہیں اور اب بھی ان کی خواہش ہے کہ کھلم کھلا تصادم سے بچا جائے۔ انہوں نے کہا ہے ممکن ہے کہ کسی وقت انہیں ہمارے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا پڑے لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ صرف دکھاوے کے لیے ہوگا اور ہمیں اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' احمد نے پوچھا۔ ''کیا چھوٹے سرکار بھی ماریا کو چھڑوانے کے لیے ہم پر کسی طرح کا دباؤ ڈالیں گے؟''

''ہاں، کوئی اس قسم کی صورتِ حال ہو بھی سکتی ہے۔'' چوہان نے کہا۔

پھر اب نریندر نے رازداری کے انداز میں دائیں بائیں دیکھا پھر اپنے کندھے سے لٹکی ہوئی گٹھڑی ہمارے سامنے رکھ دی۔ اس نے گٹھڑی کی گرہ کھولی۔ گٹھڑی کے اوپر جامن کے پتے، چوکر اور گڑ وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں تھیں۔ ان پوٹلیوں کے نیچے دو تین بڑی خاص چیزیں تھیں۔ ایک فوجی طرز کی طاقتور دوربین تھی۔ ایک اسنائپر گن تھی جس کو کھول کر تین چار ٹکڑوں میں رکھا گیا تھا۔ اس پر بھی چھوٹی ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس تھا۔ اس میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ کچھ اینٹی سیپٹک اور دیسی دوائیں بھی بکس میں موجود تھیں۔

نریندر سنگھ نے مقامی زبان میں چوہان سے کچھ کہا۔ چوہان نے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''نریندر بتا رہا ہے کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ہم اب ماریا کے اغوا کو راز میں نہ رکھیں اور اس کی ذمے داری قبول کر لیں۔''

''اس کی وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وجہ وہی ہے جو ہمارے ذہن میں بھی آئی تھی۔ زرگاں میں حکم جی نے سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو پکڑ لیا ہے۔ وہ اس وقت جارج کی جیل میں ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی زرگاں کے مختلف علاقوں سے پچاس ساٹھ لوگ پکڑے گئے ہیں۔ ان پر جارج کے گھر کے سامنے مظاہرہ کرنے، گولی چلانے اور توڑ پھوڑ مچانے کا الزام ہے۔ یہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ ان میں انور خاں کے تین چار رشتے دار بھی شامل ہیں۔ اگر ہم ان سب لوگوں کی جان بچانا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ ایک ہی ہے۔ ہم اعلان کر دیں کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کی زندگی تب ہی محفوظ رہ سکتی ہے جب حراست میں لیے گئے لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں حکم جی تک یہ پیغام پہنچانا ہوگا کہ لڑکی ہمارے پاس ہے اور اس کا کوئی ثبوت بھی دینا ہوگا؟'' احمد نے کہا۔

''بالکل، اب یہ ضروری ہو گیا ہے۔'' انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''پیغام کس طرح پہنچایا جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے لیے کوئی بندہ ڈھونڈنا ہوگا جو پیغام رسانی کر سکے اور اس کی جان کو بھی کوئی خطرہ نہ ہو۔'' انور خاں نے کہا۔

''کیا ہم اپنے اس ٹھکانے کو اب بھی خفیہ رکھیں گے؟'' اسحاق نے پوچھا۔

''ہمیں ایسا کرنا تو چاہیے لیکن میرے خیال میں اب ہم کر نہیں سکیں گے۔'' چوہان بولا۔ ''جب پیغام رسانی شروع ہوگی تو پھر اس ٹھکانے کو چھپایا نہیں جا سکے گا۔ ویسے بھی چھوٹے سرکار اور مراد صاحب کی طرف سے اطلاع ہے کہ حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے آس پاس پہنچ چکے ہیں اور چپے چپے پر ہماری تلاش ہو رہی ہے۔ وہ لوگ کسی بھی وقت سرنگ کا کھوج لگا سکتے ہیں۔''

نریندر سنگھ اب جلدی جانے کی فکر میں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بارشی جھیل ڈل کے کنارے پر رہتا ہے اور ان علاقوں میں بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے جیسے جیسے موقع ملے گا، وہ چھوٹے سرکار کا پیغام ان تک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

وہ کافی تناؤ بھری اور پرجوش رات تھی۔ ماریا کی صورت میں ہمارے پاس ایک ایسا ترپ کا پتا آیا تھا جس سے ہم حکم جی جیسے شخص کے پسینے چھڑا سکتے تھے۔ چھوٹے سرکار اور مراد صاحب نے برملا انہیں یقین دلایا تھا کہ زرگاں والے ماریا کی جان کا خطرہ کسی بھی صورت مول نہیں لیں گے۔ اب اسحاق کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ماریا کو مار ڈالتا تو یہ کتنا بڑا نقصان ہوتا۔ آدھی شب کے وقت لالٹینوں کی مدھم روشنی میں ہم ساتوں کے درمیان پھر طویل گفتگو ہوئی۔ اس میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ حکم جی تک یہ پیغام کس طرح پہنچایا جائے کہ ماریا ہمارے پاس ہے اور اس کے بدلے میں ہمارے مطالبے یہ ہیں۔ احمد نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کام میں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حکم جی اور جارج مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ میرے پیچھے میری برادری کا ہاتھ ہے اور سب جانتے ہیں کہ حکم جی کے سپاہیوں میں میری برادری کے لوگن خاص عہدوں پر ہیں۔''

''لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس پیغام رسانی کے لیے کوئی غیر جانب دار بندہ استعمال کیا جائے اور تم غیر جانب دار نہیں ہو۔'' چوہان نے کہا۔

''اس جنگل میں آپ کو ایسا غیر جانب دار کون ملے گا جو اچھی طرح سے ہمارا پیغام بھی پہنچا سکے؟''

اس سے پہلے کہ احمد اور چوہان میں تکرار شروع ہو جاتی، انور خاں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''پیغام بر چننے سے زیادہ ضروری یہ بات ہے کہ پہلے ہم اپنا مورچا مضبوط کر لیں۔ ہمارے پاس اتنا انتظام ہونا چاہیے کہ ہم اس لڑکی کے ساتھ آٹھ دس یا پندرہ بیس روز بھی اس سرنگ میں گزار سکیں۔''

''ہمارے پاس پانی اور خشک لکڑیوں کی کمی ہے۔ باقی چیزیں تو گزارے لائق موجود ہیں۔'' چوہان نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ پانی اور لکڑی کا انتظام کیا جائے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ہم دہانے کا اچھی طرح جائزہ لیں اور اس جگہ کو ایک اچھے مورچے کی شکل دے دیں۔'' انور خاں نے کہا۔

کسی کو انور خاں کی بات سے اختلاف نہیں تھا۔ اگلے دو تین گھنٹے اسی انتظام و انصرام میں گزارے گئے۔ کچھ برتنوں اور چند بڑے شاپرز میں کچھ پانی جمع کیا گیا۔ اس کے علاوہ سرنگ کے دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے چند بڑے تنے رکھ کر ایک محفوظ آڑ بنائی گئی۔ اس آڑ میں کم از کم تین رائفل بردار پوزیشن لے سکتے تھے۔ یہاں سے نشیب میں بھی کافی آگے تک نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ اس سے پیچھے قریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ایک اور مورچا بنایا گیا۔ ہنگامی حالت میں اسے دوسری دفاعی لائن کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ دوربین کے بہتر استعمال کے لیے دہانے سے باہر ایک آڑ تلاش کر لی گئی۔ اس مورچا بندی میں انور خاں نے اہم کردار ادا کیا۔ لڑائی بھڑائی کے معاملات میں اس کا تجربہ کافی وسیع لگتا تھا۔

رات آخری پہر ہم نے کچھ دیر کے لیے آرام کیا۔ ہم اپنے ساز و سامان سمیت اب دہانے کے قریب ہی قیام پذیر ہو گئے تھے۔ میں، چوہان اور اسحاق سرنگ کی گہرائی میں تھے۔ میرے گہرائی میں رہنے کی وجہ وہی چپ والا معاملہ تھا۔ میری آنکھ ایک شور کی وجہ سے کھلی۔ یہ شور دہانے کی طرف سے سنائی دے رہا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں تھیں اور گھڑسواروں کی بلند آوازیں تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ دہانے سے باہر چاروں طرف چکرا رہے ہیں۔ انور خاں دہانے کی طرف سے بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس نے آتے ساتھ ہی لالٹین بجھا دی اور ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''یہ حکم جی کے لوگ ہی ہیں۔ میں نے آوازوں سے پہچان لیا ہے۔ ان کی تعداد چالیس پچاس سے کم نہیں ہے۔ یہ سب مسلح ہیں اور ان کے پاس بڑی ٹارچیں ہیں۔ نریندر سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ لوگ جنگل کا چپا چپا چھان رہے ہیں۔''

اسحاق بھڑک کر بولا۔ ''میں نے جو بات کہی تھی وہ آپ لوگن کی سمجھ میں نہیں آئی تھی... اب آپ نے دیکھ لیا نا کہ یہ لوگن یہاں پہنچ گئے ہیں۔''

''تم نے غلط کہا تھا اسحاق... اور تم اب بھی غلط کہہ رہے ہو۔'' چوہان نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''ان لوگوں کے یہاں پہنچنے کا تابش سے کوئی تعلق نہیں۔ خود کو خوامخواہ وہموں کا شکار نہ کرو۔ حکم جی کے کارندوں کی ٹولیاں ہر جگہ بھٹک رہی ہیں اس لیے یہاں بھی پہنچ گئی ہیں۔''

اسحاق نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر منہ بنا کر رہ گیا۔

دس پندرہ منٹ اسی طرح شدید تناؤ میں گزر گئے۔ حکم جی کے کارندے اس سرنگ کے دہانے تک نہیں پہنچ سکے لیکن وہ یہاں سے گئے بھی نہیں۔ وہ اس علاقے کے بارے میں اپنی پوری تسلی کر رہے تھے۔ آخر گھوڑوں کی بکھری بکھری ٹاپیں اور گھڑسواروں کی آوازیں ایک جگہ جمع ہوئیں۔ آثار سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ اب آگے روانہ ہو رہے ہیں۔ کچھ

ہی دیر بعد وہ وہاں سے چل پڑے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگیں۔ چوبان نے سوالیہ انداز میں اسحاق کی طرف دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہا ہو... اب کیا خیال ہے؟ حکم جی کے جادو کا زور ان گھڑسواروں کو سرنگ کے اندر کیوں نہیں لایا؟

ظاہر ہے کہ اگر چوبان یہ سوال پوچھتا بھی تو اسحاق کے پاس اس کا جواب موجود نہیں تھا... انور خاں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اب ہم کو فیصلہ کرنا ہے۔ ہم ان کو اپنے بارے میں بتانا چاہتے ہیں یا نہیں؟''

سب خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ نازک فیصلہ تھا۔ خود کو عافیت سے نکال کر شدید خطرے میں ڈالنے والی بات تھی لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا... بلکہ ہم اس حوالے سے پیغام ریجنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ جب تک ہم اپنے پاس ماریا کی موجودگی کا اعلان نہ کرتے حکم جی اور جارج سے کوئی مطالبہ کیسے منوا سکتے تھے؟ انور خاں بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم سب کے لیے یہ فیصلہ کافی مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ چلو اگر تم چاہتے ہو تو سب کی طرف سے میں ہی فیصلہ کیے دیتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی انور خاں نے اپنی رائفل کا رخ دہانے کی طرف کیا اور اوپر تلے تین چار فائر کر دیے۔ رات کے سناٹے میں دھماکوں کی آواز جنگل میں دور تک گونجی۔ اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ یہ آواز گھڑسواروں کے جتھے تک بھی پہنچی ہوگی۔ ''چلو، اب اپنی اپنی پوزیشن سنبھالو۔'' انور خاں نے پکار کر کہا۔

ہم سب دہانے کی طرف دوڑے اور اپنی اپنی طے شدہ جگہ پر بیٹھ گئے۔ فیروز چونکہ زخمی تھا اس لیے وہ اپنی رائفل کے ساتھ ماریا اور بارو نندا کے قریب موجود رہا۔ ماریا کے ہاتھ پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے اور وہ کسی شکار کیے ہوئے پرندے کی طرح کچی زمین پر پڑی تھی۔ پچھلے بیالیس گھنٹوں میں وہ اپنی تمام شان و شوکت، نفاست اور نخوت سمیت عرش سے فرش پر آ گئی تھی۔ اس کے دمکتے چہرے پر کیچڑ سوکھ کر سفیدی مائل ہو چکا تھا اور اس کے نازک پاؤں زخم زخم تھے۔ وہ یہ پاؤں ہلاتی بھی تھی تو سسک اٹھتی تھی۔ احمد نے اس کے نیچے چٹائی بچھانا چاہی تھی مگر اسحاق نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ جارج کی اس خودسر بہن کو تھوڑی سی رعایت یا عزت دینے کو بھی تیار نہیں تھا۔

ہم دہانے پر پہنچے اور رائفلیں سونت کر تیار ہو گئے۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق گھڑسوار رک گئے تھے اور اب واپس آ رہے تھے۔ جلد ہی ان کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور ان کی اپنی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ ''کون ہے یہاں... کون ہے؟'' ایک کڑک دار آواز گونجی۔

مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ موہن کمار ہی کی آواز تھی۔ وہ لوگ سرنگ کے ارد گرد گھوم رہے تھے لیکن ابھی تک دہانہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ انور خاں نے دلیرانہ قدم اٹھاتے ہوئے اپنی ٹارچ روشن کی اور اس کی روشنی دہانے کی طرف پھینکی۔ اب موہن کمار اور اس کے گھڑسواروں کے لیے دہانے کا کھوج لگانا مشکل نہیں رہا۔ وہ چاروں طرف سے سمٹ کر یوں دہانے کی طرف آئے جیسے مقناطیس کی طرف لوہا چون آتا ہے۔ ان گنت ٹارچیں سرنگ کے دہانے کے ارد گرد چمکنے لگیں۔

موہن کمار گرجا۔ ''کون ہو تم لوگ؟''

انور خاں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''کہنے کو تو ہم تمہارے باپ ہوتے ہیں لیکن لوگ ہمیں شہنشاہ کہتے ہیں۔''

تاریکی میں سے موہن کمار کی آواز ابھری۔ ''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم انور خاں ہو۔ میں یہاں اس کھوہ میں تمہاری آواز سن کر حیران ہوں۔''

''ابھی تمہیں اور حیران ہونا ہے موہن کمار... اتنی حیرت داخل ہونے والی ہے تمہارے دماغ کے اندر کہ تمہاری حیرت دانی ایک دم چوڑی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ پھٹ بھی جائے۔'' انور خاں ہر قسم کے تناؤ سے بالکل آزاد نظر آتا تھا۔ وہ دہانے پر اندر کی طرف لکڑی کے تنوں کے عقب میں کھڑا تھا جبکہ موہن کمار دہانے کے سامنے بیس تیس میٹر کی دوری پر تھا۔

''تم سامنے آؤ انور خاں اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟''

''میرے ساتھ بڑے خاص لوگ ہیں موہن کمار... وہ سامنے آ گئیں گے تو تمہاری سٹی گم ہو جائے گی۔''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ انور خاں۔ تم جانتے نہیں ہو کہ تم لوگوں کے لیے حالات کتنے سنگین ہو چکے ہیں۔ تم نے غداری کی ہے، جس تھالی میں کھایا ہے اسی میں چھید کیا ہے۔ وہاں زرگاں میں جارج صاحب کی کوٹھی پر جو کچھ ہوا ہے، اس کے سب سے بڑے ذمے دار تم ہو... لیکن... لیکن... اگر تم خود کو قانون کے حوالے کر دو... تو اب بھی تم سے رعایت ہو سکتی ہے۔ حکم جی اب بھی تمہارے ساتھ نرمی کا معاملہ کر سکتے ہیں۔''

''نرمی کا معاملہ تو تمہارے حکم جی کو کرنا ہی پڑے گا اور رعایتیں بھی دینی پڑیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تمہارے

حکم جی اور جارج گورا کے ٹیٹوے ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ زیادہ زور لگائیں گے تو ان کی گردنیں کڑک ہو جائیں گی۔''

''تم کیا بک رہے ہو... ہوش میں تو ہو؟'' موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''تمہارے گورا صاحب کی بہن ماریا اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔ اس کا جیون بس اسی صورت میں محفوظ رہے گا جب گورا اور حکم ہمارے حکم کے مطابق چلیں گے۔ اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں ہے موہن کمار! ہم ماریا کو مارنے کے لیے اتنے ہی تیار ہیں جتنے تم اپنی اگلی سانس لینے کے لیے تیار ہو۔ اور میں تمہیں بتا دوں، اس سلسلے میں ہمیں آزمانے کی کوشش نہ کرنا۔ ماریا کی لاش کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا... کچھ بھی نہیں۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے انور خاں کی آواز میں عجیب درندگی در آئی۔ دہانے سے باہر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ تاریکی میں ٹارچوں کی روشنیاں تو چمکتی رہیں لیکن کہیں کوئی حرکت نظر آئی اور نہ آواز سنائی دی۔

''کیا ہوا موہن کمار! سکتے میں چلے گئے ہو یا دل کا دورہ پڑ گیا ہے؟''

موہن کمار کی لرزاں آواز ابھری۔ ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ ماریا صاحبہ تمہارے پاس ہیں؟''

''کیا ثبوت چاہتے ہو؟ اس کا ہاتھ کاٹ کر بھیجوں، ناک کاٹوں یا کچھ اور؟''

''تم... تم اپنے لہجے کو بدلو انور خاں۔'' موہن کمار نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں کہا۔

''اب لہجے نہیں بدل سکتے موہن کمار! اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب حکم جی سے اور اس کے پالتو کتوں سے ہماری کھلی جنگ ہے۔''

ایک بار پھر دہانے سے باہر سناٹا چھا گیا۔ اسحاق آگے آیا اور گرجا۔ ''موہن کمار! جا کر اپنے آقا کو بتا دے کہ اس کے پاپوں کا گھڑا بھر چکا ہے۔ اب یہ گھڑا بیچ چوراہے پر ٹوٹے گا اور سارا سنسار دیکھے گا۔ اب اسے اور اس کے ٹولے کو بھاگنے کے لیے راستہ نہیں ملے گا۔ ہم انہیں چن چن کر ماریں گے اور اس راجواڑے کو ان کے گندے وجود سے پاک کر دیں گے۔''

''لگتا ہے کہ تم سب نشے میں ہو اور اسی نشے کی حالت میں مارے جاؤ گے۔''

''ہم ہوش میں ہیں... اور اب تم لوگوں کے ہوش میں آنے کا وقت ہے۔'' انور خاں گرجا۔ ''جو کچھ تم نے سلطانہ کے ساتھ کیا ہے، وہ ہم بھی جارج گورے کی بہن کے ساتھ کر سکتے تھے... اور ایک بار نہیں بیسیوں بار کر سکتے تھے لیکن وہ بچی ہوئی ہے... ہاں، اس کی جان شدید خطرے میں ہے اور یہ خطرہ تب ہی ٹل سکتا ہے جب حکم اور جارج غیر مشروط طور پر ہماری کچھ باتیں مانیں گے۔''

''تم بکواس کر رہے ہو۔ کہاں ہیں ماریا صاحبہ؟'' موہن کی آواز تاریکی میں ابھری۔

انور خاں نے اسحاق کو اشارہ کیا۔ وہ بپھرا ہوا گیا اور ماریا کو گھسیٹ کر دہانے کے قریب لے آیا۔ دہانے کے بالکل پاس پہنچ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک خم دار خنجر کی تیز نوک اچانک ماریا کے بازو میں اتار دی۔ اس کے عریاں بازو میں خنجر کا یہ انجکشن کارگر رہا۔ وہ بری طرح چلائی اور ''ہیلپ ہیلپ'' پکارنے لگی۔ اس کی یہ آوازیں یقیناً باہر کھڑے گھڑ سواروں تک بھی پہنچیں۔

انور خاں نے پکار کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اپنی میم صاحبہ کے پُرجوش نعرے تم نے اچھی طرح سن لیے ہوں گے۔ وہ یہاں بہت خوش ہیں اور اس طرح کے نعرے اکثر لگاتی رہتی ہیں۔ اگر تم چاہو تو اس طرح کے مزید نعرے بازی بھی تمہیں سنائی جا سکتی ہے۔''

چند لمحے تک گہرا سناٹا رہا پھر موہن کمار کے کسی ساتھی کی نہایت بوجھل آواز سنائی دی۔ ''اگر یہ واقعی ماریا صاحبہ ہیں تو تم لوگ نہیں جانتے ہو کہ اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت کو دعوت دے چکے ہو۔ تم لوگوں کی بدنصیبی پر ترس آ رہا ہے۔''

''یہ واقعی تمہاری میم صاحبہ ہی ہے۔'' انور خاں نے تاؤ دلانے والے لہجے میں کہا۔ ''اور عنقریب ہم اسے زمین پر بکری کی طرح لٹا کر کند چھری سے ذبح کرنے والے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے تم ایک دفعہ اپنے والد صاحبان یعنی حکم جی اور جارج سے بات کر لو۔''

اسحاق نے ایک اور چرکہ ماریا کے بازو پر لگایا۔ وہ پھر دردناک انداز میں چلائی... ''پلیز ہیلپ... پلیز... یہ مجھے مار ڈالیں گے۔''

یہی وقت تھا جب دو افراد اپنی میم صاحبہ کے لیے بے تاب ہو کر دہانے کی طرف بڑھے۔ انور خاں نے بے دریغ برسٹ چلایا۔ ان دونوں افراد کے قدموں کے آس پاس چنگاریاں بکھر گئیں۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ انور خاں بے رحم لہجے میں دہاڑا۔ ''کسی دھوکے میں نہ رہنا موہن! ہم مرنے اور مارنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ اگر کوئی حماقت فرماؤ گے تو کل شام تک تمہاری چتا کے پھول تیار ہو چکے ہوں گے۔''

''کک... کیا چاہتے ہو تم؟'' موہن کمار کی مری مری آواز سنائی دی۔

''چاہتے تو بہت کچھ ہیں۔ ہر انسان کی چاہتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں، لیکن فی الحال ہماری دو چار معصوم معصوم سی خواہشیں تمہارے حکم جی اور اس کے لعنتی بچے جارج کو پوری کرنی ہوں گی۔''

''تم نے جو کچھ کہنا ہے سامنے آ کر کہو۔'' موہن کمار کا نامعلوم ساتھی غصیلی آواز میں بولا۔

''سامنے بھی آ جائیں گے۔ فی الحال ہمارے سروں پر خون سوار ہے۔ ہمارے متھے نہ ہی لگو تو اچھا ہے۔ اچھے بچوں کی طرح جو کہتے ہیں، وہ سنو اور اپنے دونوں والد صاحبان کو جا کر بتاؤ۔''

''جو بکواس کرنا چاہتے ہو جلدی کرو۔'' موہن کمار نے کہا۔

''ہم تمہیں صرف دو دن دیتے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بھائی کو پوری حفاظت کے ساتھ تل پانی پہنچا دو۔ ہمارے پاس پچاس ناموں کی ایک فہرست ہے۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر جارج گورا کی جیل میں ہیں۔ ان کو فوراً رہا کر کے یہاں ہمارے پاس پہنچایا جائے۔ زرگاں کے راج بھون میں ہونے والی ساری شرمناک رسمیں، خاص طور سے جشنِ بہار اور ساتویں کا جشن ختم کرنے کا فی الفور اعلان کیا جائے۔ جارج گورا کو فوری طور پر جیلر کے عہدے سے ہٹایا جائے۔''

''مجھے پھر شک ہو رہا ہے کہ تم نشے میں ہو۔ تم اپنی اوقات میں رہ کر بات نہیں کر رہے ہو۔'' ایک بار پھر موہن کمار کی آواز ابھری۔

''اپنی اپنی اوقات کا پتا ہم سب کو بہت جلد چلنے والا ہے۔ فی الحال تم لی بے بچے بنو اور جو کچھ تمہیں کہا گیا ہے اپنے بزرگوں تک پہنچاؤ۔ بڑوں کے معاملے میں چھوٹے بچے بولیں تو ان کو مرغا بنا دیا جاتا ہے۔''

''ناموں کی فہرست کہاں ہے؟'' موہن کمار نے پوچھا۔

انور خاں نے فہرست نکال کر ہماری طرف دیکھا۔

''کون جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں جاؤں گا۔'' سب سے پہلے میں نے جواب دیا۔

اسحاق اور چوہان نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں اپنا حوصلہ آزمانے پر تلا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے مجھے کوئی نیا اختیار ملا ہے اور میں اس اختیار کو عمل میں لا کر اپنی بے جگری کو پرکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے انور خاں کے ہاتھوں سے ناموں والی فہرست لی اور سرنگ کے دہانے سے باہر نکل آیا۔ ایک عجب سنسنی کا احساس ہوا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرف درجنوں رائفلیں اٹھی ہوئی ہیں، بہت سی خوں خوار نگاہیں مجھ پر مرکوز ہیں اور میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ اس ہو سکنے اور نہ ہو سکنے کے درمیان کی کیفیت بڑی مزے دار تھی۔ میری نگاہوں میں عمران کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ بھی جب کوئی پُرخطر کام کرتا تھا، اس کے چہرے پر بھی ایسی ہی لذت آمیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ میں سینہ تان کر آگے بڑھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی۔ تاریکی میں سے ایک سایہ نکل کر میرے روبرو آیا۔ اپنے ڈیل ڈول اور شکل سے یہ کافی خطرناک شخص لگتا تھا۔ اس نے بھی اپنی رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ میں نے ناموں کی فہرست والا کاغذ اسے تھمایا اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق کہا۔ ''ہمارے چاروں مطالبے اس کاغذ کی پشت پر لکھے ہوئے ہیں۔''

اس شخص نے چھیننے والے انداز میں کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے انور خاں کی دی ہوئی ایک طلائی چوڑی اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ تمہاری میم صاحبہ کی نشانی ہے۔ جا کر اپنے بڑوں کو دکھا دینا۔''

اس شخص نے چوڑی مجھ سے لی اور ایک شعلہ فشاں نگاہ مجھ پر ڈال کر واپس چلا گیا۔

اس کی آنکھوں میں، مجھے دیکھنے کے بعد بے پناہ حیرت اُمڈ آئی تھی۔ یقیناً وہ مجھے پہچانتا تھا اور اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں بھی انور خاں اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ اسی سرنگ میں پایا جاؤں گا۔

موہن کمار نے تاریکی میں سے پکار کر کہا۔ ''انور خاں! تو آگ سے کھیل رہا ہے۔ اس سے تجھے ایک بُری موت کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔''

''ہم موت کے لیے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں موہن... سمجھ لے کہ اپنے کفن اپنے سروں سے باندھے ہوئے ہیں اور اپنا کہا سنا معاف کرایا ہوا ہے۔ اگر قبریں نصیب ہو گئیں تو ٹھیک ہے، نہ بھی ملیں تو کوئی پروا نہیں۔ لیکن ایک بات پتھر پر لکیر ہے موہنے! مرنے سے پہلے ہم تمہاری اس میم صاحبہ کو ذبح ضرور کریں گے۔''

اسحاق نے کہا۔ ''اور یہ مت سمجھنا موہنے کہ ہم سودے بازی کر رہے ہیں۔ ہم تو اس میم کا سر اتارنے سے پہلے صرف حجت پوری کر رہے ہیں... یاد رکھ اگر ہمارے ان

مطالبوں میں سے کسی مطالبے کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی تیرے حکم جی کو قبول ناہیں ہوا تو پھر یہ میم مرے گی اور یہ کوئی اچھی موت ناہیں ہووے گی۔''

اسحاق کے لہجے کی درندگی محسوس کر کے موہن کمار کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ انور خاں بولا۔ ''چلو اب پھوٹ جاؤ یہاں سے۔ اس میم کو بچانے کے لیے تم لوگوں کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اور جاتے جاتے آخری بار سن لو۔ اگر زرگاں کی طرف سے یا ٹل پالی کی طرف سے ہمارے خلاف کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی گئی تو ہم دوسرا موقع نہیں دیں گے۔ اس معاملے کو فوراً انجام تک پہنچا دیں گے۔''

انور خاں نے ٹل پالی کا نام جان بوجھ کر لیا تھا۔ اس طرح وہ حکم جی وغیرہ کو باور کرانا چاہتا تھا کہ ماریا فرگوسن کے اغوا والے معاملے سے چھوٹے سرکار یا اس کے ساتھیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ انگلش اور بنگالی اردو میں پتا نہیں کیا کچھ بول رہی تھی۔ اس کی آواز میں جھلاہٹ آمیز بے چارگی تھی اور کرب تھا۔ ڈاکٹر چوہان نے قریب جا کر اس کی بات سنی اور واپس آ کر انور خاں کو بتایا کہ ''وہ کہہ رہی ہے، میری ماں ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ موہن کمار وغیرہ میری ماں کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لیے ٹوتھ پیسٹ، برش، صابن اور کپڑوں کا ایک جوڑا منگوانا چاہتی ہے۔''

اسحاق پھنکارا۔ ''کوئی ضرورت ناہیں حرامزادی کے لیے یہ چیزیں منگوانے کی۔ یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ ہاں، ایک جوڑا منگوا سکتی ہے یہ۔''

انور خاں نے اسحاق کو نرمی سے سمجھایا۔ وہ نیم رضامند ہو گیا اور منہ بنا کر دوسری طرف چلا گیا۔ انور خاں نے ماریا کا پیغام بلند آواز میں موہن کمار اور اس کے ساتھیوں تک پہنچا دیا۔

تاریکی میں موہن کمار اور اس کے تقریباً چار درجن ساتھیوں کا واضح ردعمل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تاہم اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم پوری طرح چوکس تھے۔ لکڑی کے تنوں کے پیچھے ہم نے پوزیشنیں لی ہوئی تھیں۔ انگلیاں رائفلوں کے ٹریگرز پر تھیں۔ اسحاق نے ہینڈ گرینیڈز والا تھیلا بھی ہمارے پاس رکھ دیا تھا۔ اس نے پانچ دس منٹ صرف کر کے مجھے بڑی اچھی طرح سمجھایا تھا کہ ہینڈ گرینیڈ کو کس طرح اور کس سچویشن میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال، ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ میں بوقتِ ضرورت اچھے طریقے سے اس بارودی گولے کو پھینک سکتا ہوں۔ اسحاق خود رائفل بدست ماریا کے سر پر موجود تھا۔ مجھے پتا تھا کہ خطرے کے وقت وہ ماریا کو شوٹ کرنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگائے گا... بلکہ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ خطرے کے پوری طرح سامنے آنے سے پہلے ہی ماریا کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔

وہ بڑے تناؤ کے لمحے تھے لیکن آخر وہ گزر گئے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ ان چار درجن گھڑسواروں میں سے دس پندرہ گھڑسوار یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ امکان تھا کہ موہن کمار بھی روانہ ہونے والوں میں شامل ہو گا۔ باقی افراد دہانے کے اردگرد پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے چاروں طرف حرکت کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ جنگل میں شب بیدار جانوروں کی آوازیں معدوم ہونے لگیں۔ دہانے کے اردگرد کے نشیب و فراز دھیرے دھیرے نمایاں ہو گئے۔ بظاہر دہانے کے اردگرد کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ہم جانتے تھے، دو تین درجن مسلح افراد یہاں موجود ہیں اور ان کی رائفلوں کے رخ اس دہانے کی طرف ہیں۔ بہرحال، اب ان مسلح افراد کی جانب سے اچانک ہلا بولے جانے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اگر انہوں نے ایسا کچھ کرنا ہوتا تو اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے کرتے۔

ماریا کراہنے لگی۔ ''ہام کو بہت تکلیف ہوتا۔ ہام کا ہاتھ کھول دو۔''

''تاکہ تمہارے شیطانی دماغ کو پھر کوئی چالاکی دکھانے کا موقع مل سکے۔'' اسحاق نے اس کی پشت پر ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ رونے لگی۔ انور خاں نے کہا۔ ''چلو اس کے ہاتھ آگے کی طرف باندھ دو۔ اس نے کھانا وانا بھی تو کھانا ہو گا۔''

اسحاق پہلے تو جز بز نظر آیا پھر اس نے ماریا کے ہاتھ پشت کی جانب سے کھول کر سامنے کی طرف باندھ دیے۔

''ہام کا منہ بہت کڑوا ہوتا۔ ہام پیسٹ کرنا مانگتا۔'' وہ منمنائی۔

اسحاق پھنکارا۔ ''یہ تیرے پیو کا ہاتھ روم ناہیں ہے۔ جنگل ہے۔ یہاں اگر تو نے پیسٹ کرنی ہے تو پھر وہی کرنی ہو گی جو زرگاں کی ساری غریب آبادی کرتی ہے۔''

پاس ہی چولہے کی راکھ پڑی تھی۔ اسحاق نے اس میں سے چند کوئلے نکالے۔ انہیں ماریا کے سامنے رکھا پھر انہیں رائفل کے دستے سے پیس کر باریک کیا اور بولا۔ ''یہ ہے وہ پیسٹ جو ہم لوگن کرت ہیں۔ آج تو بھی یہی کر۔''

وہ تعجب سے اسحاق کو دیکھنے لگی۔

''ایسے دیدے کیا پھاڑت ہے... چل انگلی پر لگا اس کوئلے کو اور دانت صاف کر۔'' ماریا اپنی جگہ بے حرکت بیٹھی رہی۔ اسحاق نے بھنا کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔ اس کی ایک انگلی کو پسے ہوئے کوئلے میں لتھڑا اور یہ انگلی زبردستی اس کے منہ میں گھسا دی۔ ''چل کر یہ پیسٹ... چل کر... ناہیں تو منہ پھاڑ ڈالوں گا تیرا۔''

ماریا چلّانے لگی۔ انور خاں نے مداخلت کر کے اسحاق کو پیچھے ہٹایا اور اسے گھور کر بولا۔ ''تم ایک ٹھیک کام بھی غلط طریقے سے کرتے ہو اور وہ غلط لگنے لگتا ہے۔'' پھر وہ ماریا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میم صاحب! یہ کوئلہ بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کا رنگ کالا ہے تو کیا ہوا۔ ہر کالی چیز بری نہیں ہوتی اور نہ ہر سفید چیز اچھی ہوتی ہے۔ آپ اس کو دانتوں پر مل کر دیکھیں۔ یہ آپ کی ولایتی ٹوتھ پیسٹ کی کمی کو بڑی حد تک پورا کرے گا۔''

''دی کول؟ واٹ نان سینس۔'' ماریا نے تیوری چڑھائی۔

''یہ نان سینس نہیں ہے میم صاحب! اس سے تو ہم لوگ بڑے کام لیتے ہیں۔ اس سے ہماری عورتیں برتن مانجھتی ہیں۔ کہیں زخم لگ جائے تو اس کو پیس کر خون بند کیا جاتا ہے۔ اس سے دانت چمکائے جاتے ہیں۔ کئی طرح کی دواؤں میں ڈالا جاتا ہے۔''

انور خاں نے اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں کافی کوشش کی لیکن ماریا دانت صاف کرنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے پانی سے بس چند کلیاں کرنے پر اکتفا کیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ پچھلے تقریباً بارہ پہر سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ لیکن فی الوقت ہمارے پاس کھانے کے لیے خشک چنوں، مکئی کے بھٹوں اور گڑ وغیرہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

جب کھانے کے نام پر یہ چیزیں ماریا کے سامنے رکھی گئیں تو اس نے ایک بار پھر ناک بھوں چڑھائی۔ وہ انگلش اور چائنیز کھانے کھانے والی لڑکی اس خشک راشن پر کیسے منہ مار سکتی تھی۔ ''اب کھائی کا ہے ناہیں ہو؟'' اسحاق نے پھر آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''یہ ہام ناہیں کھا سکتا۔''

''تمہارا تو باپ بھی کھائے گا۔'' اسحاق نے کہا اور زبردستی مکئی کا بھٹا اس کے ہاتھ میں دیا۔

اس نے بھٹا دور پھینک دیا اور چلّائی۔ ''ناہیں کھائے گا... ناہیں کھائے گا۔ ہام کو اکیلا چھوڑ دو۔'' اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔

چند لمحے کے لیے لگا کہ اسحاق اس سے پھر مار پیٹ شروع کر دے گا مگر اسی دوران میں انور خاں نے معاملہ سنبھال لیا۔ اس نے کھانے پینے کی اشیا ماریا کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیں۔ ''میم صاحب! جب تم کو زیادہ بھوک لگے گی تو یہی چیزیں ڈبل روٹی، کیک، پیسٹری اور فرائی انڈے سے زیادہ مزے دار لگیں گی... اگر یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لینا۔'' پھر انور خاں نے اسحاق کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ شانت رہے۔ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

عجیب الوضع بارونڈا ابھی تک سرنگ کے اندرونی حصے میں موجود تھا۔ میں نے اندر جا کر اسے ناشتا کرایا۔ اس کا نشہ ٹوٹا ہوا تھا اور وہ مسلسل شراب کی ڈیمانڈ کر رہا تھا... اس کے علاوہ وہ جلد از جلد اس کہنہ سال کشتی میں بھی واپس جانا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جس طرح شراب کے لیے تڑپ رہا ہے، اسی طرح اس کشتی کے لیے بھی تڑپ رہا ہے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس کشتی سے اس کا کیا ناتا ہے۔ اس کے ساتھ میری ہمدردی صرف اتنی تھی کہ مجھے اس میں اپنے بچھڑے یار عمران کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے اسے یہاں لا کر غلطی تو نہیں کی؟ وہ ان شرابیوں میں سے لگتا تھا جو نشے کے بغیر جاں بلب ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو اس کا ذمے دار میں ہوتا۔ وہ لاغر اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس کی جلد سیاہی مائل ہو چکی تھی۔

بارونڈا کو ناشتا کرانے کے بعد میں سرنگ کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھ گیا۔ میری بے چین روح پھر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ مجھے میرے اپنے یاد آ رہے تھے۔ میرے گلی کوچے... میری دھوپ چھاؤں... میرے موسم... اور وہ چہرہ جو شاید میرے اب تک زندہ رہنے کا جواز تھا۔ میں اپنے ہاتھ سے ہولے ہولے اپنی گردن کے عقبی حصے کو سہلا رہا تھا۔ چوہان کو یقین تھا کہ مجھے قید کرنے والوں نے یہاں میرے جسم میں کچھ رکھا ہوا ہے۔ کچھ ایسا جو فوراً میری نشان دہی کرتا ہے اور میرے نگراں آندھی طوفان کی طرح مجھ تک آن پہنچتے ہیں۔ میرا اپنا دل بھی اب گواہی دینے لگا تھا۔ چوہان کے خیال کی تائید کرنے لگا تھا۔ ورنہ وہ سب کچھ کیسے ہو سکتا تھا جو اب تک ہوا۔ میرا دل چاہا کہ میرے پاس کوئی تیز دھار چاقو ہو۔ میں ابھی اپنی گردن کے عقبی حصے کو چیر ڈالوں۔ وہ شے باہر نکال پھینکوں جو میرے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ آزاد

زمیوں تک پہنچنے کے لیے میری ہر کوشش کو ناکام کر دیتی تھی۔

ایک عجیب سی بے چینی کسی گاڑھے دھوئیں کی طرح میرے سینے میں بھرنے لگی اور میرا دم گھٹنے لگا۔ یہی وقت تھا جب میں نے جواں سال بھکشو ہمیش کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا بازو گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کی مٹھی میں کوئی شے دبی ہوئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے مٹھی کھولی۔ اس میں چاندی کی ایک باریک سی زنجیر تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ جاتے جاتے تمہاری بیوی سلطانہ نے دی تھی۔ کہتی تھی کہ میں تم تک پہنچا دوں۔''

ایک دم مجھے یاد آیا کہ چاندی کی یہ مہین سی زنجیر میں نے سلطانہ کے پاس دیکھی تھی۔ میں نے ہمیش سے پوچھا۔ ''وہ یہ مجھے کیوں دے گئی ہے؟''

''اس کا پتا تو تمہیں ہوگا۔'' ہمیش بولا۔ وہ کچھ دیر تک جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''وہ یہاں سے جاتے وقت بہت پریشان تھی۔ مسلسل رو رہی تھی اور دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ یقینی بات ہے کہ وہ تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے بھی پوچھا لیکن میں کیا بتاتا۔ مجھے خود پتا ناہیں تھا کہ تم، فیروز اور اسحاق وغیرہ اچانک کہاں نکل گئے ہو۔ اس نے مجھے یہ زنجیر دی اور کہا کہ میں تمہیں دے دوں۔''

میں نے خاموشی سے زنجیر کُرتے کی جیب میں ڈال لی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس زنجیر سے میرے اور سلطانہ کے تعلق کی کوئی یاد وابستہ ہے لیکن کیا ''یاد'' ہے؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ہمیش کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''وہ تمہیں بہت چاہت ہے مہروز! وہ ان عورتوں میں سے ہے جو جب شادی شدہ ہو جادت ہیں تو پھر ان کا شوہر ہی ان کے لیے سب کچھ ہووت ہے۔ اس نے تمہاری رکھشا کے لیے بہت دکھ جھیلے ہیں مہروز! اور اب بھی اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ تمہارے جیون کی رکھشا کرتے ہوئے ہی ہوا ہے۔ اب اسے تمہارے سہارے اور پریم کی سخت ضرورت تھی لیکن افسوس کہ اب تم اس کے ساتھ ناہیں ہو۔''

''لیکن... میں کیا کروں ہمیش! میں اس کے لیے ہمدردی تو رکھتا ہوں لیکن اسے اپنی بیوی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔''

''مگر مہروز! اگر تم...''

''ایک منٹ ہمیش۔'' میں نے ہمیش کی بات کاٹی۔

''مجھے میرے نام سے پکارو۔ میں مہروز نہیں تابش ہوں۔ اگر کوئی مہروز تھا بھی تو وہ بس ایک دھوکا تھا اور وہ دھوکا ختم ہو چکا ہے۔''

میرے حتمی لہجے کو محسوس کر کے ہمیش بجھ سا گیا۔ ''ٹھیک ہے مہروز... مم، میرا مطلب ہے تابش! تم اپنے اندر کے حالات کو بہتر سمجھتے ہو۔ اپنے بارے میں جو فیصلہ تم خود کرو گے، وہی اچھا ہوگا۔ میں نے تو بس ایک امانت تمہارے حوالے کرنی تھی۔''

اسی دوران میں دہانے کی طرف سے ماریا فرگوسن کے چلانے چنگھاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید کسی بات پر اسحاق سے پھر اس کی تکرار ہو گئی تھی۔ وہ بڑے غصیلے لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں اسحاق یا انور خاں کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ہمیش بولا۔ ''میرا خیال ہے، اب یہ جان گئی ہے کہ اس کی جان ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ ہم اس کے ذریعے اپنی شرطیں منوانا چاہت ہیں۔ اس لیے فوری طور پر اس کی جان ناہیں لیں گے۔ اسی لیے اب یہ ہر بات پر اَڑ رہی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، حکم جی اور جارج وغیرہ اس کی رہائی کے لیے ہماری شرطیں ماننے پر آمادہ ہو جائیں گے؟''

''آشا تو ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ایک بہت بڑا کام ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ماریا کا یہاں پہنچ جانا۔ شاید تم لوگ جارج گورا کو مار بھی دیتے تو اسٹیٹ میں اتنا تہلکہ ناہیں مچا جتنا اب مچے گا۔ بہت کھلبلی مچی ہوگی اور ابھی اور مچے گی۔ یہ نہ صرف جارج کی بہن ہے بلکہ اسٹیل کی چہیتی بیوی بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ماریا کی ماں لندن میں ایک بہت بڑی جائداد کی مالک ہے۔ اس جائداد کی وجہ سے بھی اسٹیل صاحب نے اپنی بیوی کو آنکھ کا تارا بنا رکھا ہے۔ اپنوں کی بہت زیادہ محبت اور توجہ نے اس لڑکی کو بہت خودسر بنا رکھا ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہ خود کو زمین کی شے ہی ناہیں سمجھتی... تمہیں وہ پگوڈا میں آگ لگنے والا واقعہ یاد ہے؟'' ہمیش نے کہا۔

''نہیں... مجھ کو کچھ یاد نہیں۔''

''تم بہت خاص باتیں بھی بھول چکے ہو۔ اس واقعے میں تمہاری جان بڑی مشکل سے بچی تھی۔ سب لوگن جانت ہیں کہ وہ آگ ماریا کی وجہ سے ہی لگی تھی۔''

''ماریا کی وجہ سے؟''

''ہاں، یہ میم صاحبہ ایک روز پگوڈا کی سیر کے لیے گئی تھیں۔ ان کے گارڈز نے ان کی آمد کے وقت پگوڈا کو

زبردستی عام لوگن سے خالی کرایا۔ عبادت کرنے والے کئی گھنٹے تک پگوڈا سے باہر دھوپ میں کھڑے رہے۔ وہ عبادت کا خاص دن تھا۔ تمام بڑے گرو حضرات عبادت میں مصروف تھے۔ اس لیے جب ماریا پگوڈا میں آئی تو وہ اس کے استقبال کے لیے نہ آسکے۔ پگوڈا کے خادموں نے ماریا کی موجودگی میں ایک دو تلخ باتیں بھی کہہ دیں۔ ماریا نے ان سب کا بہت بُرا منایا اور پانچ دس منٹ کے اندر پگوڈا سے واپس چلی گئی۔ اس واقعے کے صرف دو دن بعد رات کے وقت اچانک پگوڈا کے سیڑھیوں والے حصے کی طرف زبردست آگ بھڑک اٹھی۔ بہت سے لوگوں کو پورا وشواس ہے کہ یہ آگ ماریا نے ہی لگوائی تھی۔ اس کا کوئی کارندہ پجاری کے روپ میں اندر آیا تھا اور چراغوں کے تیل والے پیپے الٹ کر انہیں آگ دکھا دی تھی۔ اس آگ میں ہمارے ایک بہت پیارے گرو نروانی جل کر بھسم ہو گئے تھے۔ تم دو بھکشوؤں سمیت آگ میں بُری طرح گھر گئے تھے۔ ان دنوں تمہارے دونوں پاؤں رسی کی ایک بیڑی میں رہتے تھے۔ تم چل تو سکتے تھے لیکن بھاگ ناہیں سکتے تھے... تمہیں یاد ہے جب میں نے تمہیں آوازیں دی تھیں اور کہا تھا کہ تم اپنا کمبل لپیٹو اور دوڑ کر آگ میں سے گزر جاؤ۔ اس وقت میں بھول گیا تھا کہ تم دوڑ ناہیں سکو گے۔ تمہیں یاد ہے؟''

''نہیں... مجھے کچھ یاد نہیں۔ اور تم مجھے یاد بھی نہ کراؤ۔ ایسی باتیں سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ناہیں یاد کراتا لیکن میں تمہیں ماریا کی ہٹ دھرمی اور بے رحمی کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ اس لڑکی نے ایک چھوٹی سی غلطی کی سزا میں پگوڈا کے ایک حصے کو جلا کر خاکستر کروا ڈالا تھا۔ کئی قیمتی نوادرات ضائع ہوئے۔ ایک بزرگ پجاری کے پران چلے گئے اور تم سمیت تین بندوں کی جان شدید خطرے میں پڑ گئی۔ یہاں ایک بار پھر سلطانہ کی بات کرنی پڑ جاوت ہے۔ جب آگ لگنے کے بعد سب لوگن پگوڈا سے بھاگ گئے تھے اور میں بھی وہاں ناہیں ٹھہر سکا تھا، سلطانہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی۔ مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے ایک کمبل بھگو کر اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ وہ آگ کے درمیان میں کھڑی تھی اور پکار رہی تھی... ''اندر لوگ ہیں۔ ان کی مدد کرو۔ ان کو بچاؤ۔'' پھر میں نے ڈاکٹر چوہان کو دیکھا تھا۔ اس نے بھی ایسے ہی ایک بھیگا ہوا کمبل اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ سامنے والے دروازے کی طرف سے نکلنے والا راستہ آگ نے بالکل بند کر دیا تھا۔ وہ دونوں آگ میں سے گزر کر پہلو والے دروازے تک پہنچے۔

اس دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ کنڈی کھولی۔ دونوں بھکشو تو دوڑتے ہوئے آگ میں سے گزر گئے لیکن تم دوڑ ناہیں سکتے تھے۔ تمہیں سلطانہ اور چوہان نے اپنے درمیان رکھا اور کمبلوں میں چھپا لیا۔ چوہان کے کمبل کو آگ لگ گئی تھی۔ وہ تمہیں چھوڑنے پر مجبور ہو گیا لیکن سلطانہ تمہارے ساتھ چمٹی رہی اور تمہیں باہر نکال لائی۔ وہ ایک بہادر ماں کی بہادر بیٹی ہے تابش! اس روز اس نے ثابت کیا تھا کہ حوصلہ مندی اور جی داری صرف مرد کا ورثہ ہی ناہیں ہووت ہے۔ اس روز لوگن سلطانہ کی ہمت پر اش اش کر اٹھے تھے۔''

ایک بار پھر سلطانہ کا اجڑا اجڑا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے آنسو پونچھنا چاہتا ہوں لیکن وہ جا چکی تھی اور جاتے جاتے اپنے گلے کی چین مجھے دے گئی تھی۔ خبر نہیں کہ ایسا کرنے سے اس کا کیا مطلب تھا۔ شاید یہ چین میں نے ہی اسے دی ہوا اور اس کے ساتھ کوئی وعدہ منسلک ہو اور وہ جاتے جاتے یہ وعدہ ختم کر گئی ہو۔

بھکشو ہمیش نے ماریا کی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ پورے زرگاں میں سب سے زیادہ نخرے والی میم مشہور ہے۔ چھوٹی چھوٹی غلطی پر اپنے ملازموں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آوت ہے۔ پچھلے سال اس نے اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ اس قدر مار پیٹ کروائی تھی کہ اس کی آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ملازمہ کا دوش صرف اتنا تھا کہ اس نے غلطی سے میم صاحبہ کے بستر پر ان دھلی چادر بچھا دی تھی۔ اور اسی سال عید سے پہلے اس نے ایک ملازم لڑکے کو چھ دن بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند رکھا تھا۔ لڑکے کا دوش یہ تھا کہ اس نے ماریا کے پالتو افریقن طوطوں کو تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے ان کے پنجروں میں خوراک ڈالنا بھول گیا تھا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ لڑکا بعد میں کبھی کچھ کھا پی ناہیں سکا اور چند ہفتے بیمار رہ کر مر گیا۔''

''اس کے خلاف کسی نے آواز نہیں اٹھائی؟''

''اسحاق کی بہن بھی تو زہر کھا کر مر گئی تھی۔ سب کو پتا تھا کہ وہ کیوں مری ہے۔ اس کی موت پر بھی تو کسی نے آواز ناہیں اٹھائی تھی لیکن جب آواز ناہیں اٹھائی جاتی تو اس کا مطلب یہ تو ناہیں ہوتا نا کہ لوگن کے دلوں میں غم اور غصہ بھی ناہیں ہے۔ یہ اندر ہی اندر پلتا رہتا ہے، بڑھتا رہتا ہے اور پھر ایک روز اس کی طاقت اتنی زیادہ ہو جاوت ہے کہ کوئی

سے اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔"

یہ ان پڑھ شخص اپنے سیدھے سادے انداز میں بڑی فلسفیانہ بات کر رہا تھا... اس کی بات میں بہت وزن تھا۔ میں اپنا تجزیہ کرتا تو میری صورتِ حال بھی تو اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ میں نے ایک عرصے تک بے پناہ دباؤ جھیلا تھا، بے شمار جسمانی و ذہنی اذیت برداشت کی تھی۔ مجھے ذلت و شرمندگی کے پانی میں غرق کر دیا گیا تھا۔ میں اس پانی میں نیچے اور نیچے جاتا گیا لیکن آخرکار میرے پاؤں زمین سے چھو گئے اور میں اوپر ابھرنا شروع ہو گیا۔ اس بھانڈیل اسٹیٹ کے کمزور لوگوں کے پاؤں بھی اب شاید زمین سے لگ گئے تھے۔ ان کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ اب وہ کہنہ قدروں کی دیواریں توڑ دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ایسی دیواریں توڑنے کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور شاید یہ قربانیاں دینے اور تکلیفیں برداشت کرنے کا موسم ہی تھا۔

میرا دھیان ایک بار پھر سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا۔ اس کی نقرئی چین میری مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ چین تپ گئی ہے اور میرے ہاتھ کو جلانے لگی ہے۔ میں نے چین پھر جیب میں ڈال لی۔

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ انور خان اور ڈاکٹر چوہان تھے۔ انور خان نے بتایا۔ "دہانے کے آس پاس چالیس سے زیادہ مسلح بندے نہیں ہیں۔ انہوں نے پوزیشنیں لے رکھی ہیں اور پوری طرح چوکس ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" ہمیش نے پوچھا۔

"پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہم فیروز کو جلد از جلد نیپال پہنچانا چاہتے تھے تاکہ وہ چھوٹے سرکار کے سامنے موہن کمار وغیرہ کے خلاف گواہی دے سکے لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ یہ لوگ کسی کو باہر نہیں جانے دیں گے۔ [illegible] جائے گا بھی تو اسے یرغمال بنائیں گے۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

"وقت کا انتظار۔" انور خان نے جواب دیا۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اس سلسلے میں کسی طرح کی مدد کر سکتا ہوں تو میں تیار ہوں۔" میں نے دل کی گہرائی سے پیشکش کی۔

انور خان کا چہرہ چمک گیا۔ "تمہارے اتنا کہنے سے ہی میرا حوصلہ دگنا ہو گیا ہے لیکن ابھی کسی طرح کا رسک لینے کی ضرورت ہمیں نہیں ہے۔"

اچانک دہانے کی طرف سے ایک بار پھر ماریا کے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ چوہان نے کہا۔ "وہ بیچاری بے زوروں کی وجہ سے پریشان ہے۔ اب اس کے لیے یہاں کیڑے مار دوا کا انتظام کون کرے؟"

انور خان یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ "میں جا کر دیکھوں، کہیں اسحاق اس سے پھر مار پیٹ شروع نہ کر دے۔"

رات کو ہم نے باری ٹھہرالی۔ آدھی رات تک فیروز، اسحاق اور ہمیش نے دہانے کی پہرے داری کرنا تھی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ شامل ہونا تھا۔ آدھی رات کے بعد ہم نے سو جانا تھا اور انور خان، چوہان اور احمد نے پوزیشن سنبھال لینی تھی۔

پروگرام کے مطابق ہم آدھی رات تک جاگتے رہے۔ جنگل جانوروں کی آوازوں سے گونجتا رہا۔ ان آوازوں میں گاہے بگاہے لیپارڈ یعنی تیندوے کی دور افتادہ آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ تاہم ہمیں ان آوازوں سے زیادہ انسانی آہٹوں سے خطرہ تھا۔ ہم پر شب خون مارا جانا خارج از امکان نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ٹھکم جی کے پاس خطرناک لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی شامل تھا۔ بڑے پٹوڈا میں میڈم عفورا نے مجھے اس شخص کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے جو پانچ نہایت خطرناک کمانڈوز بدھا کے نادر مجسمے کو پاکستان سے انڈیا واپس لانے کے لیے گئے تھے، ان کا سربراہ یہی رنجیت پانڈے تھا۔ وہ انڈین اسپیشل فورسز کا ایک سابقہ افسر تھا اور کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے موت کا دوسرا نام ہے۔

گاہے بگاہے دہانے کا گھیراؤ کرنے والوں کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی کوئی چاپ ابھرتی تھی۔ کبھی کوئی رائفل کاک ہونے کی آواز کانوں میں پڑتی تھی۔ رات قریباً ایک بجے ہم نے انور، چوہان اور احمد کو جگا دیا۔ ان کی چٹائیوں پر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ماریا بھی ایک طرف بندھی پڑی تھی۔ خبر نہیں کہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ وہ ہٹ کی پلی نکلی تھی۔ ابھی تک اس نے کچھ بھی کھایا نہیں تھا۔ وہ شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔ میں تھکا ہوا تھا، کچھ ہی دیر بعد سو گیا۔ میں کسی کے ہلانے سے جاگا۔ مجھے ہمیش نے جگایا تھا۔ وہ میرے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ لالٹین بجھ چکی تھی اور اس حصے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ "کیا ہے؟" میں نے ہمیش سے پوچھا۔

"وہ دیکھو، میم صاحب کیا کر رہی ہے؟" ہمیش نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا اور چونک گیا۔ ماریا کا ہیولا صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ تاریکی میں رینگتی ہوئی اس تھیلے تک پہنچی تھی جس میں بھنے ہوئے چنے، گڑ اور بھٹے وغیرہ رکھے تھے۔ وہ تھیلے کو ٹٹول رہی تھی۔ ساتھ ساتھ چور نظروں سے دہانے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر ہم نے آوازیں سنیں جن سے اندازہ ہوا کہ وہ چنے چبا رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ بھوک انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اگلی صبح انور خان نے کھانا پکانے کے لیے ایک چولھا تیار کر لیا تھا۔ روٹی پکانے والا ایک توا بھی چوہان دیگر سامان کے ساتھ لے کر آیا تھا۔ انور خان ایک ہرفن مولا شخص کی طرح تھا۔ وہ زبردست اسلحہ شناس تھا۔ اس نے میری کیچڑ زدہ بھیگی ہوئی رائفل کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا۔ چرواہا نریندر سنگھ جو دور مار رائفل لے کر آیا تھا، وہ ٹکڑوں میں تھی۔ انور نے اسے بھی منٹوں میں جوڑ کر تیار کر لیا تھا۔ اس میں لیڈرشپ کی خصوصیات موجود تھیں۔ وہ لوگوں کو اکٹھا کرنا اور ان کے جھگڑے نمٹانا جانتا تھا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ اسے کھانا پکانے میں بھی زبردست مہارت حاصل ہے۔ ہمیش نے آٹا گوندھا۔ انور خان نے آلو کا سالن تیار کیا اور ساتھ زبردست پراٹھے بنائے۔

یہ معقول کھانا ہمیں کئی دنوں بعد نصیب ہوا اور یہ انور خان ہی کے مرہونِ منت تھا۔ انور خان نے ایک پراٹھا، کچھ سالن اور دہی ماریا کے سامنے بھی رکھا۔ ماریا کی آنکھوں میں بھوک چمک رہی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتی، اسحاق اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے کھانا ماریا کے سامنے سے اٹھا لیا۔ "ہم اس کی سیوا کرنے اور اس کے سامنے کھانے کی ٹرے سجانے کے لیے اسے یہاں نہیں لائے۔ یہ اپنا کھانا خود پکائے گی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ یہ پکائے اور ہمیں بھی کھلائے۔"

"چلو چھوڑو یار! ابھی تو کھانے دو اسے۔" انور خان نے پھر مداخلت کی۔

اسحاق جھنجلا گیا۔ "انور بھائی! اگر تم نے اس طرح اس کتیا کے نازنخرے دیکھنے ہیں تو پھر مجھ کو بولنا پڑے گا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس نے آج تک ہم کو اور ہماری عورتوں کو ذلیل و خوار کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اب تک اس کو لٹکا کر اس کی گردن کو دو فٹ لمبا کر چکے ہوتے لیکن اگر ہم نے یہ نہیں کیا تو پھر ہم اس کی مہمان نوازیاں بھی نہیں کریں گے۔"

"لیکن اسحاق..."

"نہیں انور بھائی۔" اسحاق نے تیزی سے انور کی بات کاٹی۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ میرے دل پر آرے چل جاتے ہیں۔ مجھے اپنی بہن کا مرنا یاد آ جاتا ہے۔ میں اس کو گولی مار دوں گا اور خود کو بھی مار لوں گا۔" اسحاق کے لہجے میں تپش بڑھتی جا رہی تھی۔

اس تپش کو محسوس کر کے انور خان ایک دم مسکرا دیا۔ شاید یہ اس کی عادت تھی اور یہ بہت اچھی عادت تھی۔ جب صورتِ حال گمبھیر ہوتی تھی اور تناؤ بڑھ جاتا تھا تو وہ ایک دم مسکراتا تھا اور اپنا لب و لہجہ تبدیل کر لیتا تھا۔ اس کے ایسا کرنے سے لگتا تھا کہ پوری صورتِ حال اور صورتِ حال کے سارے اسباب اچانک بدل گئے ہیں۔

انور خان نے اپنی رائفل ایک طرف رکھی اور ماریا کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اپنے سامنے سے کھانا اٹھائے جانے پر سخت بھنائی ہوئی تھی۔ انور خان نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور بولا۔ "چلو، اس میں برائی ہی کیا ہے؟ اپنا کھانا تم خود بنا لو۔ کسی کا احسان لینا کون سی اچھی بات ہے۔"

احسان والی بات شاید ماریا کے دل کو لگی۔ ویسے بھی وہ پچھلے قریباً ساٹھ گھنٹے سے بھوکی تھی۔ رات کو اس نے تھوڑے سے چنے ضرور کھائے تھے لیکن یہ خشک چنے اس کے گلے میں پھنس گئے تھے اور وہ دیر تک کھانسنے کے بعد الٹے سیدھے ہو کر لیٹ گئی تھی۔ اب نقاہت کے سبب اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا اور ہاتھ پاؤں میں لرزش نظر آتی تھی۔ انور خان نے اسے سہارا دے کر چولھے کے نزدیک پہنچایا اور گندھا ہوا آٹا اس کے قریب رکھ دیا۔ وہ سخت جھنجلائی ہوئی نظر آتی تھی... جیسے یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ وہ اتنی ناکارہ نہیں کہ اپنا کام خود کر سکتی ہے۔ انور خان نے چولھے میں آگ جلا دی۔ توا پہلے ہی اوپر رکھا ہوا تھا... ماریا اپنے لیے روٹی بنانے لگی۔ یہ عمل اس کی توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ چار پانچ منٹ کی کوشش میں وہ پہلی روٹی بھی توے پر نہیں ڈال سکی۔ اس کے ہاتھ لتھڑ گئے اور بہت سا آٹا ضائع ہوا۔ بالآخر جو ایک روٹی اس نے توے پر ڈالی بھی وہ عجیب نقشے کی تھی اور وہ بھی توے سے چپک کر رہ گئی۔ ایک دم ماریا جھلا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے خشکے والی تھالی دور پھینک دی اور انگریزی میں سب کو صلواتیں سنانے لگی۔

اسحاق نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ "حرامزادی! آج تک تو پکی پکائی کھاتی رہی ہے۔ نوکروں کی فوج تیرے نخرے، چونچلے اٹھانے کے لیے تیرے آگے پیچھے گھومتی رہی ہے۔ آج تجھے پتا چلا ہوگا کہ تو اس قابل

نا ہیں کہ اپنے بل بوتے پر اپنا پیٹ بھی بھر سکے۔ لعنت ہے تیرے مال و دولت پر۔"

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ شاید چیزیں اٹھا اٹھا کر بھی پھینکنا شروع کر دیتی لیکن اب وہ اسحاق کی شعلہ مزاجی سے ڈرتی بھی تھی۔ انور خاں نے اسحاق کو سمجھا بجھا کر پیچھے ہٹایا اور خود ایک روٹی پکا کر ماریا کو دی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ نہیں کھائے گی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ کھا رہی ہے۔ اس کے پاؤں بدستور زنجیر میں تھے۔

اسحاق تڑخ کر بولا۔ "انور بھائی! آج تم نے اپنی من مانی کرلی ہے لیکن اس کے بعد نا ہیں۔ یہ جب تک مرنے سے بچی ہوئی ہے اپنا کام خود کرے گی... بلکہ اس کو ہمارے کام بھی کرنے پڑیں گے۔ میں نے اس کی گردن کو ہمیشہ اکڑا ہوا دیکھا ہے۔ اگر یہ اب بھی اکڑی رہی تو پھر میں اس کو توڑ دوں گا۔ میں سچ کہتا ہوں، توڑ دوں گا۔"

اگلے روز دوپہر سے کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ زرگاں سے کچھ لوگ یہاں پہنچے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں حکم جی کا خاص مشیر گرد موداں اور جارج گورا کا بہنوئی یعنی ماریا کا شوہر اسٹیل بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بھاری مقدار میں اسلحہ اور تازہ دم سپاہی بھی موقع پر پہنچائے گئے تھے۔ انہیں دہانے کے اردگرد تازی گھوڑے، بوگیر کتے اور ایک عدد جیپ بھی نظر آئی۔ یہ جیپ نہایت دشوار راستوں سے گزار کر یہاں تک یہاں پہنچائی گئی تھی۔

ایک شخص نے دہانے کے سامنے آکر اعلان کیا کہ گرد موداں اور اسٹیل صاحب بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری طرف سے جو لوگ بات کرنا چاہتے ہیں، وہ باہر آجائیں یا پھر ہمیں اندر آنے کی اجازت دی جائے۔

انور خاں اور چوہان وغیرہ نے مشورہ کیا۔ دونوں صورتوں میں خطرہ موجود تھا۔ بہتر تھا کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے۔ فیصلہ ہوا کہ سرنگ کے دہانے سے پندرہ بیس گز آگے درختوں کے درمیان بات چیت ہو اور اس گفتگو کے دوران میں دونوں طرف سے کسی طرح کی کوئی کارروائی نہ کرنے کا عہد کیا جائے۔ دس پندرہ منٹ کے اندر شرائط طے ہوگئیں۔ فیصلہ ہوا کہ انور خاں یہیں سرنگ میں رہے گا جبکہ چوہان اور فیروز آگے جا کر بات کریں گے۔ فیروز زخمی تھا، اس کے باوجود وہ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس کے اندر جو آگ جل رہی تھی، اس نے اسے اضافی توانائی دے دی تھی۔

سہ پہر ہونے والی تھی۔ درختوں کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ چوہان اور فیروز اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے باہر نکلے۔ دوسری طرف سے سرخ لباس میں گرد موداں اور اسٹیل نمودار ہوئے۔ گرد موداں چھوٹے قد کا فربہ اندام شخص تھا جبکہ اسٹیل چھریرے جسم اور نہایت اونچی ناک والا دراز قد انگریز تھا۔ سنگین صورت حال کے باوجود اسٹیل کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا... وہ ان انگریزوں میں سے تھا جو جب تیسری دنیا کے ملکوں میں آتے ہیں تو نسلی برتری اور اپنی شان و شوکت کا احساس مستقل طور پر ان کے چہروں سے چپک جاتا ہے۔

وہ لوگ چند بلند قامت درختوں کے درمیان بیٹھ گئے اور بات چیت شروع ہوئی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ دونوں طرف کے رائفل بردار گفتگو کرنے والوں پر نظر رکھ سکتے تھے... انور خاں اپنی پوزیشن پر بالکل چوکس تھا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور اسنائپر گن بھی اور انگلی لبلبی پر تھی۔ وہ کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں ایک ثانیے کے اندر ایکشن لے سکتا تھا۔ اسحاق مسلسل ماریا کے سر پر موجود تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ اگر حکم جی کے کارندوں کی طرف سے کسی طرح کی کارروائی کی گئی تو ہم ماریا کو شوٹ کر دیں گے۔ انور خاں، احمد اور میں دہانے پر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ہم نے صورت حال پر عقابی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔

درختوں کے نیچے ہونے والی گفتگو دس پندرہ منٹ ہی جاری رہ سکی۔ دونوں طرف برہمی نظر آرہی تھی۔ اسٹیل بار بار ایک کاغذ چوہان کے سامنے لہرا رہا تھا اور بلند آواز میں بول رہا تھا۔ دوسری طرف چوہان بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ یہ گفتگو تلخ کلامی پر ہی ختم ہوئی۔ جب چوہان اور فیروز واپس آنے لگے تو گرد موداں نے ایک تھیلا چوہان کو دیا۔ اس تھیلے میں ماریا کی ضروریات کا سامان تھا۔

"کیا ہوا؟" انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔

"ابھی ان میں بہت اکڑفوں ہے۔ دماغ درست ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔"

"کیا کہتے ہیں؟" انور خاں نے پوچھا۔

"وہ صرف ایک مطالبہ مان رہے ہیں۔ سلطانہ کے والد اور بیمار بھائی کو حفاظت کے ساتھ تل پانی پہنچانے پر تیار ہیں۔"

"اور جو پچاس بندوں کی فہرست دی تھی؟"

"ان کا کہنا ہے کہ ان میں سے بس پندرہ بیس ہمارے پاس موجود ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں جن پر سنگین قسم کے کیس ہیں۔ انہیں اس طرح چھوڑا نہیں جا سکتا۔"

"بکواس کرتے ہیں۔" انور خاں پھنکارا۔ "میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ پچاس کے پچاس لوگ حکم جی کے قبضے میں ہیں۔ ان کو اس وقت بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہوگا۔" انور خاں نے چوہان سے پوچھا۔ "جارج گورا کو سزا دینے کے بارے میں کیا کہا گیا ہے؟"

"گرد موداں کا کہنا ہے کہ جارج کے خلاف اگر ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت اور گواہی ہے تو پیش کی جائے۔ اس کے خلاف اسی طرح کارروائی ہوگی جس طرح اسٹیٹ کے کسی عام بندے کے خلاف ہوسکتی ہے... اور اگر الزام ثابت ہوئے تو پھر سزا بھی ملے گی۔"

انور خاں نے دانت پیس کر حکم جی اور اس کے مشیروں کو ایک غائبانہ گالی دی اور بولا۔ "جس عورت کی عزت خراب کی جاتی ہے اس کی گواہی سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے... اور پھر ایک دو نہیں، سیکڑوں لوگوں نے سلطانہ کو جارج کے گھر سے اجڑی بجڑی حالت میں برآمد کیا ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی؟ لیکن یہ لوگ جانتے ہیں کہ قانون کے محافظ بھی اپنے ہیں، عدالت بھی اپنی اور قاضی بھی اپنے۔ یہ دن دہاڑے ہزاروں لوگوں کے سامنے بھی کسی کو ناحق قتل کریں گے تو پھر بھی کسی نہ کسی شق کی وجہ سے بچ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سینہ تان کر قانون کی بات کرتے ہیں۔ انہیں خبر نہیں کہ جب قانون، انصاف نہیں کرتا تو پھر کچھ اور راستے کھلتے ہیں، کچھ اور طرح کی عدالتیں لگتی ہیں... اور شاید اب ایسی ہی عدالتیں لگیں گی۔" انور خاں کی آواز طیش سے پھٹ رہی تھی۔

"تم نے آخر میں کیا کہا ہے؟" اسحاق نے چوہان سے پوچھا۔

"میں نے انہیں چوبیس گھنٹے کی مہلت اور دی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس کے بعد ہم ماریا کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکیں گے۔"

"اس بیگ میں کیا ہے؟" انور خاں نے پوچھا۔

چوہان نے کینوس کے بیگ کی زپ کھولی۔ یہ کافی بڑا بیگ تھا۔ اس میں ماریا کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ ایک شال، کپڑوں کا ایک جوڑا، ٹوتھ پیسٹ، صابن، تولیا، پرفیوم، شراب، بسکٹ، نیچے بچھانے کے لیے ایک خاص قسم کی میٹ اور اس طرح کی دیگر اشیا۔

اسحاق نے بھی یہ چیزیں دیکھیں اور اس کا چہرہ سرخی مائل ہوگیا۔ "میں اسے یہ سب کچھ استعمال نہیں کرنے دوں گا۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "یہ اسی طرح رہے گی جس طرح ہم رہیں گے۔ وہی کھائے گی جو ہم کھائیں گے۔ یہ آسمان سے نہیں اتری ہوئی... ہماری ہی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ میں یہ سب کچھ جلا دوں گا۔ اس کے سامنے جلا کر راکھ کر دوں گا۔" وہ ایک دم بپھر گیا۔

اس نے تھیلا پکڑا اور جلتے ہوئے چولھے کی طرف بڑھا۔ انور خاں لپک کر گیا۔ "کیا کرتے ہو اسحاق! کچھ ہوش کی بات کرو۔ یہ چیزیں کل ہمارے کام آسکتی ہیں اور ان میں دوائیاں بھی ہیں۔ کیا پتا ہمیں اس لڑکی کے لیے ان دوائیوں کی ضرورت ہی پڑ جائے..."

اس نے اسحاق کے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا لیکن اسحاق نے نہیں چھوڑا۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ "پہلے تم کو وعدہ کرنا ہوگا انور بھائی... دواؤں کے علاوہ ان میں سے کوئی شے اس حرامزادی کے لیے استعمال نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں۔" انور خاں نے کہا اور تھیلا اسحاق سے لے لیا۔

ماریا ایک گوشے میں بیٹھی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ ماحول میں سخت تناؤ پایا جا رہا تھا۔ دہانے سے باہر حکم جی کے اہل کاروں کی نفری بہت بڑھ گئی تھی کہ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم بھی زیادہ چوکسی کا مظاہرہ کریں۔

اچانک شور سنائی دیا لیکن یہ شور دہانے کی طرف سے نہیں اندرونی حصے کی طرف سے تھا۔ وہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں بارونda کے زخموں پر مرہم وغیرہ لگا کر آیا تھا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ کو انور نے دہرا کر کے زنجیر سے باندھ دیا تھا۔ اب یہ ٹانگ کھل نہیں سکتی تھی۔ میں نے اس کی دبلی پتلی پنڈلی کے زخم پر دوا لگانے کے لیے اس کی زنجیر کو تھوڑا سا ڈھیلا کیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تھوڑی سی ڈھیل اس شخص کے لیے کافی زیادہ ثابت ہوگی اور وہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔

ہم آوازوں کی سمت دوڑے۔ عجیب الخلقت بارونda ایک لکڑی کے سہارے تیزی سے ایک سمت دوڑا جا رہا تھا۔ احمد اس کے پیچھے تھا اور انگریزی میں پکار رہا تھا۔ "رک جاؤ... میں کہتا ہوں رک جاؤ۔"

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے احمد نے بارونda کو دبوچ لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب بارونda احمد کی گرفت میں بے بس ہوگیا ہے۔ احمد اسے آسانی سے سنبھال لے گا مگر ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بارونda نے جنونی انداز میں چلاتے ہوئے زور مارا اور خود کو احمد کی گرفت سے چھڑا لیا۔ احمد لڑکھڑا کر پیچھے گیا اور دوبارہ بارونda کی طرف بڑھا۔ تب بارونda نے

اپنی بیساکھی کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور اس کی دھکیل سے ایک بار پھر احمد کو لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ احمد سے مقابلے پر آمادہ ہے۔ احمد کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک پروفیشنل لڑاکا تھا۔ وہ کراٹے میں الٰہ آباد کا چیمپئن تھا اور کئی اہم مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا۔ اس کے لیے بارونڈا جیسے معذور و مدقوق شخص پر غالب آنا قطعی مشکل نہیں تھا۔ اس نے بھنا کر کھڑے کھڑے ایک زوردار لات بارونڈا کے منہ پر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ یوں لگا کہ اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی، مگر کچھ بھی تھا اس شخص کی سخت جانی ہم بدبودار کشتی میں دیکھ چکے تھے۔ میری اور اسحاق کی کئی سخت ضربات وہ بہ آسانی جھیل گیا تھا۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ چوٹ کھا کر مردہ چھپکلی کی طرح گرا ضرور لیکن پھر اپنے اکلوتے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں احمد سے اندازے کی غلطی ہوئی یا شاید اسے غلطی نہیں کہنا چاہیے۔ احمد کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو بارونڈا جیسے لاغر و مدقوق شخص کے سامنے اسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا۔ احمد نے تیزی سے آگے بڑھ کر بارونڈا کو گردن سے دبوچنا چاہا۔ بارونڈا نے اس کی ناف پر گھٹنے کی ضرب لگائی پھر اس کے جبڑے پر ایک کارگر مکا رسید کر کے دوبارہ بھاگ کھڑا ہوا۔

احمد کے لیے یقیناً یہ صورتِ حال سبکی اور طیش کا باعث تھی۔ وہ ایک مانا ہوا فائٹر تھا۔ وہ اپنی طرف سے اب تک اس لاغر شخص کو رعایت دیتا رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر بارونڈا کو ایک بار پھر دبوچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں میں زبردست جدوجہد شروع ہو گئی۔ آنے والے دو تین منٹ بے حد حیرت ناک تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ لاغر بارونڈا نے نہ صرف احمد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ آخر میں اچانک اس کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے احمد کے دو تین وار بچانے، پھر ونجا کراٹے کے ہی انداز میں گھوم کر لات چلائی۔ اس کی ایڑی احمد کی کنپٹی کے آس پاس کہیں لگی۔ اس سے پہلے کہ احمد اس ضرب سے سنبھل سکتا، اس کی بیساکھی نے ایک بار پھر لاٹھی کا کام کیا۔ اس کی بھرپور ضرب احمد کی پیشانی پر لگی، احمد پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔

اسحاق نے اپنی ٹریل نو رائفل سیدھی کی اور صرف آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے بارونڈا کو نشانے پر لے لیا۔ ”خبردار... شوٹ کر دوں گا۔“ وہ چلایا۔

میں نے بھی رائفل بارونڈا کی طرف سیدھی کر لی۔ اس موقع پر وہ مزید ”ایفی شینسی“ دکھانے کی کوشش کرتا تو ہم یقیناً اس پر گولی چلا دیتے۔ جان سے نہ بھی مارتے تو زخمی ضرور کر دیتے۔ وہ ایک دم بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر انگریزی میں دہائی دینے لگا۔

”مجھے شراب دو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔ میری موت کی ذمے داری تم پر ہوگی۔“ پھر وہ سب کو مشترکہ گالیاں دینے لگا اور اس بات پر صلواتیں سنانے لگا کہ ہم اسے اس کے گھر سے نکال کر کیوں لائے ہیں۔

وہ اس خستہ حال سڑی ہوئی کشتی کو اپنا گھر قرار دے رہا تھا۔ انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی بارونڈا اور احمد کی لڑائی کے آخری مناظر دیکھ چکا تھا۔ ہم سب کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی تعجب تھا۔ انور اردو میں بولا۔ ”یارو! اس کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہوئی ہیں پھر بھی اس نے احمد کو لمبا لٹا دیا ہے۔ اگر یہ خدائی خوار صحت مند ہوتا تو کیا کرتا؟“

انور خاں اس بات پر مجھ سے تھوڑا سا خفا بھی ہوا کہ میں نے مرہم پٹی کے وقت اس کی زنجیر تھوڑی سی ڈھیلی کر دی تھی۔ میں نے اپنی اس غلطی کو تسلیم کیا۔ بارونڈا کو دبوچ کر ہم نے ایک بار پھر اس کی اکلوتی ٹانگ کو دہرا کیا اور اسے زنجیر میں کسا۔ چونکہ ہم زیادہ تھے اس لیے بارونڈا کوئی خاص مزاحمت نہیں دکھا سکا۔ اسے دبوچتے وقت میں نے اس کے ہڈیوں بھرے جسم کی عجیب سی سختی کو محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ اس کی ہڈیوں پر کسی انسان کی نہیں کسی بھینسے کی کھال منڈھی ہوئی ہے۔ سوکھی سڑی ہونے کے باوجود وہ جلد اپنے اندر عجیب سا کھردرا پن رکھتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ بظاہر مدقوق دکھائی دینے والا شخص کئی ایک سخت ضربات آسانی سے سہہ گیا تھا۔

احمد کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ایک ہاتھ کے پنجے پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ، میں تمہاری بینڈیج کر دوں۔“

احمد لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ بھی واضح طور پر حیران نظر آ رہا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ چل دیا۔

”یار! یہ کیا بلا ہے؟“ چوہان نے پوچھا۔

”مجھے امید نہیں تھی کہ یہ اتنا سخت جان نکلے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کسی وقت مارشل آرٹ کا ٹھیک ٹھاک کھلاڑی رہا ہے۔ دفاع اور حملے کی ہر باریکی کو سمجھتا ہے یہ۔“ احمد کے لہجے میں بدستور حیرت موجزن تھی۔

”وہاں کشتی میں بھی اسحاق نے اسے بری طرح مارا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”دو چار ٹھوکریں میں نے بھی لگائی تھیں۔ لگتا تھا کہ ہم کسی جیتے جاگتے بندے کو نہیں، لکڑی کے پتلے کو مار رہے ہیں۔ اس وقت یہ سخت نشے میں تھا۔ ہم نے سمجھا تھا، شاید نشے کی وجہ سے یہ ساری چوٹیں جھیل گیا ہے۔“

”اس کا کوئی اتا پتا معلوم ہونا چاہیے۔ پھر ہی کوئی جانکاری ہو سکتی ہے اس کے بارے میں۔“ انور خاں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

انور خاں جب بھی بارونڈا کے بارے میں کوئی بات کرتا تھا یا اس کی طرف دیکھتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید وہ اس سے پہلے بھی بارونڈا کو کہیں دیکھ چکا تھا۔

ڈاکٹر چوہان نے احمد کی مرہم پٹی کر دی۔ احمد عجیب گومگو کی کیفیت میں تھا۔ ایک طرح کی شرمندگی بھی اسے محسوس ہو رہی تھی تاہم اس شرمندگی پر حیرت اور الجھن کے تاثرات غالب تھے۔

چوہان نے کہا۔ ”اپنی شکل و صورت اور لہجے سے یہ شخص نیپالی کا لگتا ہے لیکن جہاں تک میری جانکاری ہے، نیپالی تو مارشل آرٹس کے کوئی ایسے شوقین نہیں ہوتے...“

”ڈاکٹر چوہان! مجھے آپ کی بات سے اتفاق نہیں۔“ احمد نے کہا۔ ”کھٹمنڈو وغیرہ میں، میں نے خود کِک باکسنگ اور کراٹے وغیرہ کے بڑے بڑے کلب دیکھے ہیں۔ اور پھر آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ جیلی جیسا خوفناک فائٹر جس نے یورپ تک تہلکہ مچایا تھا اور اسٹریٹ فائٹنگ میں ایشیائی چیمپئن مانا جاتا تھا، نیپال سے ہی تعلق رکھتا تھا۔“

مارشل آرٹس میں جیلی کا نام تو میں نے بھی سن رکھا تھا۔ لاہور میں جب گاہے بگاہے مجھ پر مارشل آرٹ کا جنون سوار ہوتا تھا اور میں نئے سرے سے اپنے پرانے کلب میں جانا شروع کرتا تھا تو پھر مارشل آرٹ کی سرگرمیوں کے حوالے سے بہت سی خبریں میرے کانوں تک بھی پہنچا کرتی تھیں۔ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے، بین الاقوامی مقابلے کہاں کہاں منعقد ہو رہے ہیں، کون کون سے بڑے کھلاڑی ابھر کر سامنے آ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مارشل آرٹس سے متعلق رسائل و جرائد بھی کلب میں آتے تھے جو معلومات میں اضافے کا سبب بنتے تھے۔

ہمارے درمیان کچھ دیر تک عجیب الخلقت بارونڈا کے بارے میں بات ہوتی رہی... پھر انور خاں نے ہمیں دہانے کی طرف بلا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اپنے مورچے سے زیادہ دور نہ جائیں۔ اور وہ ٹھیک ہی کہتا تھا، حالات ہمیں اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ احمد بھی اپنی پوزیشن پر میرے برابر آ کر بیٹھ گیا لیکن وہ چپ چپ تھا۔ وہ واضح طور پر ہزیمت محسوس کر رہا تھا۔ فنِ حرب اس کی شناخت تھا اور آج ایک لاغر شخص نے اس فن میں اسے نیچا دکھایا تھا۔

شام کے وقت میں سرنگ کے عقبی حصے میں گیا تو یہاں دھپ دھپ کی آوازیں آئیں۔ آگے جا کر دیکھا تو احمد پسینے میں شرابور مشق میں مصروف تھا۔ دو دن پہلے اس نے ایک بیگ میں ریتیلی مٹی بھر کر اسے سرنگ کی چھت سے لٹکا دیا تھا اور صبح کے وقت اس پر طبع آزمائی کرتا تھا لیکن آج وہ چونکہ تناؤ میں تھا اس لیے شام کے وقت بھی لگا ہوا تھا۔ میں اس کو نیڈ بیگ پر گھونسے برساتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی گھونسوں میں جان تھی۔ جو ضربات وہ نیڈ بیگ کو لگا رہا تھا، وہ واقعی ایک چیمپئن کی ضربات نظر آتی تھیں۔ اس کا اسٹیمنا بھی قابلِ تعریف تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں بھی کراٹے میں دلچسپی رکھتا ہوں اور لاہور میں کئی سال تک ایک کلب سے منسلک رہا ہوں۔ ہم جب باتیں کر رہے تھے، تھوڑے ہی فاصلے پر موجود بارونڈا نے ایک بار پھر واویلا شروع کر دیا۔ وہ شکستہ آواز میں سب کو گالیاں دے رہا تھا اور اپنے لیے شراب طلب کر رہا تھا۔ انگریزی کے علاوہ وہ گاہے بگاہے نیپالی میں بھی بولنے لگتا تھا۔ اس کی نیپالی سننے کے بعد اب اس میں شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ نیپال سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ”اپنی یہ رائفل یہاں... یہاں میرے دل پر رکھو اور گولی چلا دو۔ میں اب جلدی مرنا چاہتا ہوں۔ شراب کے بغیر میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ تم سب کے سب اپنے بال بچوں سمیت جہنم میں جاؤ گے... کیونکہ تم نے ایک بندے کو جیتے جی جہنم میں ڈال دیا ہے۔“

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ”تم تسلی رکھو۔ میں رات کو تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا۔ لیکن شور شرابا کرتے رہو گے تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم شراب کی بات کر رہے ہو؟“

”کہا ہے نا آہستہ بولو۔“ میں نے اسے سرگوشی میں ڈانٹا۔

وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

رات کو پھر دوسرے پہر تک ہماری ڈیوٹی تھی۔ یعنی میں، فیروز، اسحاق اور ہینش۔ ایک بجے کے قریب ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میرے پہلو میں ہینش جلد ہی سو گیا لیکن میں جاگتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں اٹھا اور اس تاریک گوشے میں پہنچ گیا جہاں کیموس کا بڑا بیگ رکھا تھا۔ اس بیگ میں آج

ماریا فر گوہن کے لیے ضروری اشیا آئی تھیں۔ ان ضروری اشیا میں، میں نے اعلیٰ درجے کی شراب کی دو بوتلیں بھی دیکھی تھیں۔ میں نے بغیر کوئی آواز پیدا کیے ایک بوتل نکالی اور سرنگ کے اس عقبی حصے میں پہنچ گیا جہاں ایک چٹائی پر ایک بازو اور ایک ٹانگ والا باروندا دراز تھا۔ میرے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس لالٹین کی روشنی میں باروندا کسی کیچوے کی طرح حقیر اور بے جان نظر آرہا تھا لیکن اس کیچوے کے اندر جو بجلی چمکتی تھی، اس کا مشاہدہ آج سہ پہر ہم نے کیا تھا۔

مجھے دیکھ کر باروندا کی نقاہت بھری آنکھیں چمک اٹھیں۔ پھر جب اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں پکڑی بوتل پر پڑی تو وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اسے کسی طاقتور اسپرنگ نے دھکیلا ہو۔ میں جانتا تھا کہ وہ بلانوش ہے اور اگر میں نے بوتل اسے تھمائی تو ہوسکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں ہی اسے ختم کر ڈالے۔ "مجھے دو۔ میرا گلا بالکل خشک ہورہا ہے۔" وہ تڑپ کر بولا۔

"لیکن تمہیں صرف اتنی ہی پینی ہوگی جس سے تمہارا کام چل جائے۔ میرے پاس صرف ایک ہی بوتل ہے۔"

وہ بنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے دو... میں مر رہا ہوں۔" اس کی بے تابی دیدنی تھی۔

میں نے اسے گلاس میں ڈال کر دی۔ وہ اپنے اکلوتے ہاتھ سے غٹاغٹ چڑھا گیا اور ایک بار پھر کسی بھک منگے کی طرح میلا کچیلا گلاس میرے سامنے کر دیا۔ میں نے دوبارہ اس کا گلاس بھرا۔ وہ یہ بھی سانس لیے بغیر پی گیا۔ وہ بالکل "نیٹ" پی رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ پانی پی رہا ہو۔ تیسرے پیگ کے بعد اس کی طبیعت کچھ بحال ہوگئی۔ اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف پھینک دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اسے نشہ چڑھنا شروع ہوگیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے کا دایاں رخ نظر آرہا تھا۔ اسی رخ میں عمران کے چہرے کی جھلک تھی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ مجھے عمران کی مسکراہٹ یاد آئی۔ اس کی آواز، اس کے باتوں کا اسٹائل... میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ جا چکا تھا... اس خونی رات میں ذیک نالے کے قاتل پانی نے اسے نگل لیا تھا۔

کچھ دن پہلے پوکھرا میں میڈم عفیرا نے بھی یہی بتایا تھا کہ وہ عمران کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ یعنی وہ مجھے عمران کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں... کسی وقت میرا دل پکار پکار کر یہ کہنے لگتا تھا کہ میں اسے ضرور دیکھوں گا۔ کم از کم ایک بار ضرور دیکھوں گا۔ کہیں نہ کہیں... کسی نہ کسی جگہ، کسی چمکیلی صبح کو، کسی سرمئی شام کو یا کسی ایسی ہی تاریک رات کو جب اسے آخری بار دیکھا تھا۔ اس خیال کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں تھی لیکن یہ ایک دیوانی آس بن کر میرے دل میں پیوست رہتا تھا۔ رات کے اس پہر جب چار سو خاموشی تھی، اس سرنگ سے باہر جنگل میں جانوروں کی آوازیں گونج رہی تھیں اور کبھی کبھی دہانے کی طرف آسمانی بجلی کی چمک دکھائی دیتی تھی... وہاں بیٹھے بیٹھے میرے دل کی کیفیت عجیب ہوگئی اور یہ کیفیت اکثر طاری ہو جاتی تھی۔ بچھڑنے والے اتنی شدت سے یاد آتے تھے کہ دل کی رگیں ٹوٹنے لگتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ جانکاہ خیال دل میں پیدا ہوتا تھا کہ میں واپس لوٹنے میں بہت دیر کر چکا ہوں۔ دو ڈھائی سال کا عرصہ میں نے مکمل بے خبری میں گزار دیا ہے، حالانکہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ میرے لیے بے حد قیمتی تھا۔

میں جاگتا رہا۔ میری بے تابی بڑھتی رہی۔ میں اٹھ کر سرنگ میں ٹہلنے لگا۔ جسم جیسے بخار میں پھنک رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ساری دیواریں توڑ کر سارے تالوں سے منہ موڑ کر آندھی طوفان کی طرح یہاں سے نکل جاؤں۔ سامنے ہی وہ نیڈ بیگ جھول رہا تھا جس پر احمد ایکسر سائز کرتا تھا۔ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے میں اس نیڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ مارشل آرٹس کے حوالے سے میں نے جو کچھ سیکھ رکھا تھا، وہ میرے اندر موجود تھا۔ بس اس پر وقت کی گرد پڑی ہوئی تھی۔ میں نے نیڈ بیگ پر طبع آزمائی شروع کی تو جیسے وقت کی پڑی ہوئی گرد صاف ہونے لگی۔ سب کچھ تازہ ہوگیا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ تازگی کچھ اور طرح کی ہے۔ گئے برسوں میں بھی میں نیڈ بیگ کے ساتھ بہت وقت گزار چکا تھا لیکن آج کی ملاقات کچھ اور طرح کی تھی۔ اس ملاقات میں وہ بے پناہ حرارت بھی شامل تھی جو پچھلے چند ہفتوں میں میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ اس حرارت کے کچھ ماخذ تھے۔ اپنی ماں کا مرا ہوا چہرہ... عمران کے سینے پر لگتا ہوا رائفل کا برسٹ... سیٹھ سراج کا منحوس چہرہ... اور پھر آخری منظر... جو شاید اپنی تازگی کی وجہ سے سب سے زیادہ تکلیف دیتا تھا... جارج گورا کے بیڈ روم کا بند ہوتا دروازہ اور اس کے پیچھے اوجھل ہوتا سلطانہ کا زرد چہرہ۔

میں نیڈ بیگ پر اندھا دھند مکے اور ٹھوکریں برساتا چلا گیا۔ میری لگائی ہوئی ضربات کی آواز سرنگ میں دور تک جارہی تھی لیکن میرے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ کچھ تو سو رہے تھے اور جو جاگ کر پہرا دے رہے تھے، انہوں نے یہی سمجھا کہ شاید احمد ذہنی ورزش میں مصروف ہے۔ میں جب ہانپ جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے رک جاتا۔ سانس بحال ہوتی تو پھر زور آزمائی شروع کر دیتا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے قریب اندھیرے میں موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ باروندا تھا۔ وہ گھسٹتا ہوا یہاں پہنچا تھا اور نہ جانے کب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "تم یہاں؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ہاں... اگر تم مجھے اپنی بوتل میں سے ایک بڑا پیگ اور پلا دو تو میں تمہیں تمہارے اس مارشل آرٹ کے بارے میں ایک بڑے کام کی بات بتاؤں گا۔" وہ انگریزی میں بولا۔

"پہلے بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟" میں نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر اس کا ننگ دھڑنگ جسم دیکھا۔ اس کی ٹانگ بدستور زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی۔

"اس بات کو چھوڑو۔ پیاسا کنوئیں کے پاس پہنچ ہی جاتا ہے۔" شراب پینے کے بعد اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ کافی کم ہوگئی تھی اور وہ قدرے توانا بھی نظر آتا تھا...

"تم مجھے کام کی بات کیا بتاؤ گے؟ کیا تمہارا تعلق فائٹنگ آرٹ سے رہا ہے؟"

"بس تھوڑا بہت۔ کھٹمنڈو میں استاد کھلاڑیوں کو دیکھتا رہا ہوں۔ تم مجھے چند گھونٹ دو، میں تمہیں کچھ شاندار ٹپس دوں گا۔" وہ للچانے والے انداز میں بولا۔

پتا نہیں کیوں میں اس سے ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ عمران کی شباہت کی جھلک بھی ایک وجہ ہوسکتی تھی لیکن شاید اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔

میں نے اسے ایک درمیانے سائز کا پیگ اور دیا۔ یہ پیگ اس نے ذرا تحمل سے پیا اور خاصا مسرور نظر آنے لگا۔ اس کے اندر کی بے پناہ تلخی اور جھلاہٹ بھی قدرے کم نظر آنے لگی۔ وہ اپنے لنگوٹ کے اندر اپنی دبلی پتلی رانوں کو کھجاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو... تم جب مکا چلاتے ہو تو اس میں صرف اپنے بازو اور کندھے کی طاقت استعمال کرتے ہو۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تم اپنی طاقت کا صرف چوتھا پانچواں حصہ استعمال کرتے ہو۔ تمہارے مکے میں تمہارے پورے جسم کی طاقت استعمال ہونی چاہیے۔ پاؤں سے لے کر سر تک پورے جسم کی۔"

وہ خود کو زمین پر کھسکاتا ہوا نیڈ بیگ کے پاس پہنچ گیا پھر اس نے مجھے نیڈ بیگ پر مکا چلا کر دکھایا۔ "اس طرح۔" وہ بولا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا تھا لیکن واقعی میں نے محسوس کیا کہ اس کے مکے میں کوئی بات ہے۔

اس نے جیسے ہانپ کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ ذرا دیر کھانستا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ماہرانہ انداز میں بولا۔ "توازن... فائٹنگ آرٹ میں توازن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔ جب تم ضرب لگاتے ہو تو یہ تصور کرلیتے ہو کہ یہ ضرب تمہارے مقابل کو ضرور لگے گی۔ نیڈ بیگ کی حد تک تو یہ سوچ درست ہے لیکن جب تمہارا مدمقابل متحرک ہوتا ہے تو پھر کوئی ضرب اس کو لگتی ہے، کوئی نہیں لگتی۔ تم جس انداز میں ضرب لگاتے ہو، وہ خطا ہونے کی صورت میں تمہارے توازن کو بری طرح بگاڑ دے گی اور ہوشیار مدمقابل اس سے فوراً فائدہ اٹھائے گا۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شراب پینے کے بعد وہ بالکل بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ بُری شے اس کے جسم میں پہنچ کر اثر دکھا رہی تھی۔ وہ بڑے یقین سے بولا۔ "اگر تم مقابلوں میں حصہ لیتے رہے ہو تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے سر کے پچھلے حصے اور دائیں کندھے پر ضرور سخت چوٹیں آئی ہوں گی اور اس کی وجہ یہی توازن کی کمی ہے۔"

میں ایک دم سناٹے میں رہ گیا۔ باروندا نے یہ بات سو فیصد درست کہی تھی۔ کلب اور انٹر کلب مقابلوں میں اکثر میرے دائیں کندھے پر چوٹ لگ جاتی تھی۔ ایک ایسی ہی چوٹ کی وجہ سے ایک مرتبہ میں ایک فائنل مقابلے میں پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ یہ کئی برس پرانی بات تھی۔

میں تعجب سے اس عجیب وضع مدقوق شخص کی طرف دیکھنے لگا... میں نے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ تم کھٹمنڈو میں استاد کھلاڑیوں کے مقابلے دیکھتے رہے ہو... انہیں دیکھ دیکھ کر تمہیں خود بھی تو کھیلنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا؟"

"ہاں، کسی وقت میں خود بھی کھیلتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "نیپال کے ایک کھلاڑی جیکی کا نام بہت مشہور ہوا تھا۔ ہمارے کلب میں "انٹرنیشنل کراٹے پلیئرز" کے ساتھ جیکی کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔ کیا تم نے کبھی اس کو بھی دیکھا؟"

"ہاں ہاں جیکی... وہ تو نیپال کا چمکتا ستارہ تھا۔ اس نے تھائی اور جاپانی فائٹرز کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ زبردست کھلاڑی... زبردست کھلاڑی تھا۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

"اب وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب وہ نیپال چھوڑ چکا ہے۔ ویسے بھی اب وہ اس فیلڈ میں نہیں ہے۔"

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ مارشل آرٹ کو خیرباد کہہ چکا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ اس کے لمبے بال اس کے چہرے پر جھولنے لگے۔ ''جو شخص ایک بار سچے دل کے ساتھ مارشل آرٹ سے منسلک ہو جاتا ہے، وہ پھر کبھی بھی اسے مکمل طور پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ناٹ ایٹ آل۔ اور جیکی تو ایسا شخص ہے جس کے خون میں یہ آرٹ رچ بس چکا ہے... وہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ وہ بڑا انوکھا شخص ہے۔''

''اگر کوئی شخص اس سے ملنا چاہے تو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں... میں تمہیں اس کا مکمل پتا بتا سکتا ہوں۔ یہ پتا... یہ پتا شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ لیکن اس کے لیے... اس کے لیے... تمہیں تھوڑی سی اور مہربانی کرنا پڑے گی۔'' اس نے دور کونے میں رکھی ہوئی واٹ 69 کی بوتل کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''تم حد سے بڑھ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنسا اور چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں سے اس کے میلے دانت جھلک دکھانے لگے۔ میں نے اسے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ ''تم حد کی بات کر رہے ہو... اور حد تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی۔ لیکن مجبوری ہے، تم دو ڈبل پیگ اور دے دو تو میرا گزارہ ہو جائے گا۔''

''اسپرٹ نے تمہارا بیڑا غرق کر دیا ہے... اور پیو گے تو تمہاری ہڈیاں بھی کھوکھلی ہو کر ٹوٹنے لگیں گی۔''

''یہی تو میں چاہتا ہوں کہ یہ ہڈیاں جلد ٹوٹنا شروع ہو جائیں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا پھر بری طرح کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے دہرا ہو گیا۔ ''دیکھو... میرا پہلا نشہ بھی غارت ہو رہا ہے۔ اگر میں دو پیگ اور لگا لوں گا تو میرا پہلا نشہ بھی بچ جائے گا اور میری آخری راتوں کی یہ رات بھی تھوڑی سی خوب صورت ہو جائے گی۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بدلے میں تمہیں نیپال کے اکلوتے ''سپر اسٹار نارشل'' کا پتا بھی بتاؤں گا۔'' وہ شستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا، پھر میں نے بوتل اٹھائی اور قریباً نصف گلاس بھر کر اس کے سوکھے سڑے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ گلاس اس نے غٹاغٹ چڑھانے کے بجائے گھونٹ گھونٹ کر کے پیا۔ اس کے نیم مردہ چہرے پر عجیب سی تمتماہٹ آتی جا رہی تھی۔ حسبِ وعدہ مجھے دوسرا گلاس بھی دینا پڑا۔ اب بوتل میں فقط تین چار انچ شراب ہی باقی رہ گئی تھی... بوتل میں نے ایک طرف چھپا دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ عام شرابیوں کی طرح ساتھ میں کچھ کھانے کے لیے بھی مانگے گا لیکن اس نے کچھ نہیں مانگا۔ شاید اس کی سانسوں کی ڈور بس شراب کے ساتھ ہی بندھی ہوئی تھی۔

وہ دوسرے گلاس میں سے نصف ''آگ'' اپنے اندر انڈیل چکا تو میں نے کہا۔ ''تم مجھے جیکی کے بارے میں کچھ بتانے جا رہے تھے۔''

''تم... اس سے ملنا... چاہتے ہو؟'' وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ایسا موقع آ ہی جائے۔''

وہ عجیب ترنگ آمیز آواز میں بولا۔ ''تم کہتے ہو کہ تمہارے کلب میں جیکی کی تصویر لگی ہوئی تھی، کیا تم اس تصویر کو غور سے دیکھا کرتے تھے؟''

''ہاں... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میرا مطلب ہے کہ اگر کبھی جیکی تمہارے سامنے آئے تو تم اسے پہچان سکتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ پہچان سکتا ہوں۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ وقت کے ساتھ چہرے بہت بدل جاتے ہیں۔''

''تم... کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے بری طرح چونک کر پوچھا۔

''میں کہتا ہوں کہ تم دھوکا کھا جاؤ گے۔ جیسے دوسرے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جیکی ان کے سامنے ہوتا ہے لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکتے۔'' لالٹین کی زرد روشنی میں وہ عجیب ڈرامائی انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ میرے بدن کا سارا خون تیز رفتاری سے میرے سر کی طرف دوڑ پڑا ہے۔ پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میں ساکت نظروں سے بارونڈا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اس کے لمبے بالوں اور چہرے کے جھاڑ جھنکاڑ میں مجھے کچھ جانے پہچانے خدوخال نظر آئے۔

وہ اپنے بدنما دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پُروقار انداز میں مسکرایا۔ ''ہاں... تم میرے بتائے بغیر ہی ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہو۔ میں تمہارے سامنے ہے۔ نیپال کا درخشندہ ستارہ، ایشیائی چیمپئن، انٹرنیشنل کراٹے سپر اسٹار، اسٹریٹ فائٹنگ کا بادشاہ۔ ہاں ہاں، وہ سب کچھ میں ہی ہوں۔''

''لیکن... یہ... کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ دنیا ہے۔ یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ جہاں تم جیسے شیطان ہوں، جہاں جارج اور اسٹیل جیسے بھیڑیے ہوں، وہاں سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن تمہیں ان چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں... بالکل ضرورت نہیں۔''

میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے وہ مناظر یاد آئے جب اسحاق اور میں اسے بدبودار کشتی میں بری طرح پیٹ رہے تھے اور وہ ہماری ضربوں کو حیران کن آسانی سے جھیل رہا تھا اور پھر یہاں اس سرنگ میں آج صبح کا واقعہ نگاہوں میں تازہ ہوا۔ جواں سال صحت مند احمد اس لاغر معذور کو دست بدست لڑائی میں زیر کرنے میں ناکام رہا تھا۔

وہ نشے کی ترنگ میں بولا۔ ''اگر تم مجھ سے آٹوگراف لینا چاہتے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی۔ دراصل میں بائیں ہاتھ سے لکھتا تھا اور میرا بایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے۔ ہاں، اگر تم میرا انٹرویو لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ تم یہ انٹرویو کسی اخبار یا ٹی وی چینل کو دے کر بہت پیسے بنا سکتے ہو۔ جیکی کے آخری انٹرویو کے طور پر یہ بڑی شہرت پائے گا۔ ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ ایک بار پھر کھانسنے لگا۔

میں نے اس کے برہنہ بازو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تمہارے بازو پر تو تمہارا نام بارونڈا لکھا ہوا ہے۔''

''لیکن بارونڈا کے آگے ''جے'' بھی تو لکھا ہوا ہے۔ یہ جیکی کے لیے ہے۔ میرا پیدائشی نام بارونڈا ہے لیکن جس نام نے شہرت پائی وہ جیکی ہے۔''

میں حیرت آمیز تجسس سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس مشہور و معروف شخص سے میری ملاقات بھانڈیل اسٹیٹ کے اس جنگل کی اس زیرِ زمین سرنگ میں ہوگی اور اس حال میں ہوگی... یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہارا بازو... اور ٹانگ کاٹے گئے تھے؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، میں نے شوقیہ انہیں اپنے جسم سے علیحدہ کر دیا تھا؟''

''نن... نہیں... میرا مطلب ہے کہ تم حکم اور جارج کا نام لے رہے ہو... کیا یہ کام انہوں نے کیا ہے؟''

''دیکھو دوست! میں نے دو پیگ کے بدلے میں تمہیں جو کچھ بتانے کا وعدہ کیا تھا، وہ میں نے بتا دیا ہے۔ اگر تم کچھ اور پوچھنا چاہو گے تو پھر اس کے لیے تمہیں کچھ اور مہیا کرنی پڑے گی۔ ویسے بہتر تو یہی ہے کہ اس موضوع کو نہ چھیڑو۔ تمہارا دل دکھے گا اور میرا تو بہت زیادہ دکھے گا۔ دیکھو، کتنی پیاری رات ہے، ہوا ٹھنڈی ہے۔ باہر سے جنگلی

پھولوں کی خوشبو بھی آرہی ہے۔ یہ سنو... یہ سنو۔ کہیں دور شاید کوئی چیتا چہک رہا ہے۔''

میں خاموش رہا۔ وہ خود ہی بولا۔ ''تم کہو گے، چیتا چہکتا نہیں، چلاتا اور چنگھاڑتا ہے لیکن مجھے تو اس وقت چہکتا ہی لگ رہا ہے۔ ہر شے خوب صورت ہے۔ یہ سرنگ بھی اب اتنی بری نہیں لگ رہی۔ میرا خیال ہے کہ باہر چاند بدلیوں میں سے جھانک رہا ہوگا۔ کاش! میں اس وقت اپنے گھر میں ہوتا، اپنی کشتی میں... کیا تم کسی طرح اپنی کشتی تک جانے میں میری مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے اپنے سارے ساتھیوں میں سے بہتر لگے ہو۔ تم میری زبان بھی سمجھتے ہو۔ شاید میرے دل کی زبان بھی کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آرہی ہو۔ میں اپنی کشتی میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کسی بھی وقت کام ختم ہو سکتا ہے۔ میں اپنی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے میری کشتی اور میری شراب تک پہنچا دو تو میں... تو میں...'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا لیکن پھر اسے خیال آیا ہوگا کہ ابھی وہ اپنی زندگی کے مختصر ترین ہونے کا ذکر کر چکا ہے۔

اچانک دہانے کی طرف سے بلند آوازیں سنائی دیں۔ ان میں نمایاں آواز انور خاں کی تھی۔ وہ چلانے والے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ میں نے باروندا کو وہیں نیڈا بیک کے قریب چھوڑا۔ بوتل اور رائفل تھامی۔ قریباً پچاس ساٹھ میٹر کا فاصلہ طے کر کے میں تیزی سے دہانے پر پہنچ گیا۔ یہاں صورت حال واقعی تشویش ناک تھی۔ انور خاں ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ سرتاپا ایک جنگجو پٹھان تھا۔ اس نے ماریا کو سر کے بالوں سے بری طرح جکڑ رکھا تھا اور اپنی رائفل کی نال اس کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ ماریا کو بالکل سرنگ کے دہانے پر لے آیا تھا۔ انور خاں اور ماریا دونوں کا رخ باہر کی طرف تھا۔

انور خاں دہاڑ رہا تھا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ... میں کہتا ہوں پیچھے ہٹ جاؤ... نہیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ابھی ختم ہو جائے گا۔''

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دہانے سے باہر حکم جی کے مسلح گارڈز نے پیش قدمی کی کوشش کی ہے۔ وہ دہانے کے عین سامنے قریباً پندرہ میٹر کی دوری پر دو بڑے پتھروں کے پیچھے پوزیشن لینے کی کوشش میں تھے۔

انور خاں نے ہوائی فائر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ماریا کو دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ فائر کی آواز سے ماریا چلا کر رہ گئی۔ انور خاں گرجا۔ ''میں صرف پانچ تک گنوں گا... تم لوگ واپس نہیں گئے تو میں اسے گولی مار دوں گا۔''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''بات کرنا چاہتے ہو تو پہلے پیچھے جاؤ۔ ہم کوئی ہوشیاری نہیں چلنے دیں گے... میں پھر کہتا ہوں، ابھی تمہارے سامنے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔'' انور خاں کی آواز میں ایسی دہاڑ تھی کہ اردگرد کی ہر شے لرزتی محسوس ہوئی۔

ماریا دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ وہ دہشت زدہ آواز میں پکاری۔ ''خدا کے لیے پیچھے چلے جاؤ۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا مگر انور خاں نے سنی ان سنی کر دی۔ وہ بلند آواز میں وقفے وقفے سے بولا۔ ''ایک... دو... تین...''

ماریا پھر چلائی۔ ''چلے جاؤ... واپس چلے جاؤ۔''

ہم نے صاف دیکھا کہ پتھروں کے پیچھے سے مسلح گارڈز اٹھے اور الٹے قدموں چلتے پیچھے ہٹنے لگے۔ مدھم چاندنی میں ان کی موومنٹ اور ان کے ہاتھوں کا جدید اسلحہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

وہ جب تک نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے انور خاں، ماریا کو دبوچے اپنی جگہ بالکل الرٹ کھڑا رہا۔ اس کے عقب میں احمد تھا۔ شور سن کر اسحاق اور فیروز بھی اٹھ کر آگئے تھے۔ ان سب کی رائفلوں کا رخ باہر کی طرف تھا۔

دو چار منٹ بعد یہ ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ انور خاں نے سب کو تفصیل بتائی کہ کس طرح اسے اور چوہان کو درختوں کے پیچھے حرکت محسوس ہوئی اور کس طرح وہ الرٹ ہوئے... ماریا کو دہانے سے ہٹا کر دوبارہ اس کی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ احمد پوری طرح چوکس اس کے سر پر کھڑا رہا۔

اس واقعے کے بعد کوئی بھی سونے کے لیے نہیں گیا۔ ڈاکٹر چوہان مسلسل ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے اپنی پوزیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہیش نے خشک دودھ سے چائے بنائی۔ چائے پیتے ہوئے ہم باتوں میں مصروف رہے۔ ایک زبردست تناؤ کے بعد سب کے اعصاب قدرے پُرسکون تھے۔ میں نے انور خاں اور چوہان کو بتایا کہ مدقوق نیپالی باروندا دراصل کون ہے۔

میرے انکشاف نے سب کو حیران کیا پھر ایک دم انور خاں کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ اس نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھی اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے لرزاں آواز میں بولا۔ ''اوہ خدایا... اسی لیے میں بار بار سوچ رہا تھا کہ اس بندے کی شکل اور آواز کی وجہ سے مجھے یاد کیوں آرہا ہے۔ اب میں سب کچھ جان گیا ہوں... سب کچھ جان گیا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' چوہان نے پوچھا۔

''میں نے اس بندے کو دو سال... تقریباً دو سال پہلے راج بھون میں دیکھا تھا۔ اس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بڑی چمک دار سیاہ جوتی تھی اور شاید ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ ہاں، بہت اسمارٹ اور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ راج بھون کے بڑے ہال میں شاید کوئی پارٹی تھی۔ کافی لوگ جمع تھے۔ میں نے وہاں اس بندے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میں نے موہن کمار سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک چیمپئن فائٹر ہے۔ جوڈو کراٹے کا بہت بڑا کھلاڑی ہے۔ ہاں، مجھے سب کچھ یاد آرہا ہے۔''

''اس کی راج بھون میں آمد کا مقصد کیا تھا؟'' چوہان نے ٹیلی اسکوپ سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے موہن کمار سے یہی سوال کیا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا۔ بعد میں موہن کمار کے بھائی نے بتایا تھا کہ جارج گورا صاحب کی بہن کو مارشل آرٹ وغیرہ سیکھنے کا شوق ہے۔ اس بندے کو بھاری معاوضہ دے کر اسی کام کے لیے یہاں بلایا گیا ہے۔ یہ جارج گورا صاحب کی بہن کو ٹریننگ دینے کے علاوہ حکم جی کے ذاتی گارڈز کے دستے کو بھی ٹریننگ دے گا۔ اس ٹریننگ کے لیے حکم جی اپنے گارڈز کے دستے میں سے ایک سو بندے چنیں گے۔ مجھے وہ ساری باتیں اب اچھی طرح یاد آرہی ہیں۔''

چوہان نے ٹیلی اسکوپ ایک طرف رکھتے ہوئے بے حد حیران لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ یہ بندہ ماریا فرگوسن کو سکھشا دینے کے لیے یہاں آیا تھا؟''

''صرف ماریا کو سکھشا دینے کے لیے نہیں... حکم جی کے ذاتی گارڈز کو ٹرینڈ کرنے کے لیے بھی۔ اس بندے سے ان دونوں کاموں کا معاوضہ طے ہوا تھا... مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں لیکن اندازہ ہے کہ یہ بہت بھاری معاوضہ رہا ہوگا... لیکن پھر...''

''پھر کیا؟'' چوہان نے پوچھا۔

''کچھ دن تو یہ بندہ راج بھون میں نظر آیا تھا پھر اچانک ہی اوجھل ہو گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب زوردار بارشوں کی وجہ سے بڑی ندی کے دو بند ٹوٹ گئے تھے اور اسٹیٹ میں زبردست سیلاب آگیا تھا۔ نل پانی میں بھی کافی

نقصان ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں نے وقتی طور پر رنجشیں بھلا دی تھیں اور ایک دوسرے کے علاقے میں امدادی کاموں کے لیے رضاکار بھیجے تھے۔ میں بھی ڈیڑھ دو ماہ تک دن رات مصروف رہا تھا۔ انہی دنوں میں یہ بندہ کہیں اوجھل ہوا تھا۔ بعد میں جب حالات ٹھیک ہو گئے تو میں نے ایک دو دفعہ موہن کمار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ واپس چلا گیا ہے۔"

چوہان نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لیکن وہ واپس نہیں گیا تھا۔ وہ یہیں پر تھا... اور بری حالت میں تھا..."

"ہاں، یہ گہرا چکر معلوم ہوتا ہے۔" انور خاں نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔ انور کسی داستان گو کی طرح ہمارے درمیان بیٹھا تھا اور ہم ہمہ تن اس کی طرف متوجہ تھے۔ پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ یہ وہی ہے۔"

انور خاں نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک کھردری چٹائی پر ماریا پہلو کے بل پڑی تھی۔ رات کے وقت اسحاق اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر نائیلون کی رسی سے باندھ دیتا تھا۔ وہ اسے کسی طرح کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا اور اب ہم بھی سمجھ گئے تھے کہ ماریا رعایت کی مستحق نہیں ہے۔ فیروز کی ٹانگ پر گولی کا زخم اس کا ثبوت تھا... انور خاں میرے پہلو میں چلتے ہوئے بولا۔ "اس بندے کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اسے پہلے سے جانتے ہیں۔"

"آپ بے فکر رہو۔" میں نے کہا۔

ہم اس جگہ پر پہنچے جہاں باروندا کسی کیچوے کی طرح سمٹ سمٹا کر لیٹا ہوا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

"اسے شراب کہاں سے ملی؟" انور خاں نے پُرحیرت سرگوشی کی۔

"یہ وہ شراب ہے جو ماریا کے لیے آئی تھی۔" میں نے بھی مدھم لہجے میں جواب دیا۔

لالٹین کی روشنی میں انور خاں نے قریب سے بغور باروندا کا چہرہ دیکھا اور پھر پیچھے ہٹ آیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ انور کا مطلب تھا کہ یہ وہی ہے۔

ہم بغور اس کے کٹے ہوئے بازو اور ٹانگ کا جائزہ لیتے رہے۔ ٹانگ کو ران پر سے کاٹا گیا تھا۔ بمشکل چھ سات انچ ران، جسم کے ساتھ موجود تھی۔ بازو کہنی کے اوپر سے کٹا ہوا تھا۔ یہ دونوں زخم یقیناً ڈیڑھ دو سال پرانے تھے۔ ٹانگ کا زخم تو بالکل مندمل ہو چکا تھا لیکن کہنی کے زخم کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔ یہاں میلی کچیلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور کسی دوا کی بو بھی آتی تھی۔

ہم خاموشی سے واپس لوٹ آئے۔ راستے میں انور خاں نے کہا۔ "پتا چل رہا ہے کہ یہ حکم جی کے ظلم کا ایک اور شاہکار ہے۔ لیکن یہ اس حال تک پہنچا کیسے... اور پچھلے دو سال میں رہا کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ تھوڑا تھوڑا مجھ سے کھل رہا ہے۔ اگر کہیں سے شراب مل جائے تو میں اس سے سب کچھ اگلوا سکتا ہوں۔"

"شراب کی ایک اور بوتل ماریا والے بیگ میں موجود ہوگی۔"

"ہو سکتا ہے کہ اتنی سے کام نہ چلے۔ یہ بلانوش ہے۔ پانی کی طرح پی جاتا ہے۔"

"یہ تو اس کی حالت سے ہی ظاہر ہے... بہرحال اگر اور کی ضرورت پڑے تو ہم باہر سے بھی منگوا سکتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ماریا کو چاہیے۔"

شام سے ذرا پہلے میں ایک بار پھر باروندا کے پاس جا بیٹھا۔ اس بار جانی واکر کی چم چم کرتی بوتل اور گلاس میرے پاس تھے۔ باروندا کا نشہ ٹوٹے اب کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ بوتل دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں اس کے لیے تھوڑا سا ہنٹر بیف بھی لایا تھا۔ یہ بیف بھی ماریا کے سامان میں ہی آیا تھا۔

کل والا عمل پھر شروع ہوا اور تین چار گلاس "سیالِ آتش" اپنے اندر انڈیلنے کے بعد باروندا جیکی پھر ترنگ میں آ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک مُردہ مرتے مرتے پھر زندہ ہو گیا ہے۔ وہ پھر اپنی کشتی کو یاد کرنے لگا اور میری منت کرنے لگا کہ میں اس کی مدد کروں اور اسے واپس کشتی میں پہنچا دوں۔ اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہم اسے پکڑ کر یہاں کیوں لے آئے ہیں اور اس سے کیا چاہتے ہیں۔

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اسے یہاں پکڑ کر لانے والا میں ہوں کیونکہ اس کی صورت میں مجھے اپنے ایک بہت "پیارے" کی جھلک نظر آئی تھی۔ لیکن اگر میں اسے یہ بتاتا تو وہ مجھے اپنی مصیبت کا ذمے دار قرار دے سکتا تھا۔ لہٰذا میں اس حوالے سے خاموش رہا۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ حکم کے غیر ملکی دوست جارج گورا نے ایک مسلمان لڑکی پر ظلم کیا ہے۔ اس ظلم کے نتیجے میں زرگاں کے بہت سے لوگوں نے بغاوت کر دی ہے۔ ہم بھی ان باغیوں میں شامل ہیں اور پناہ کے لیے یہاں کن پالی کے نواح میں چھپے ہوئے ہیں۔

میری اس گفتگو کا باروندا پر اچھا اثر ہوا لیکن اگر میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ بھی اس حوالے سے کچھ بولے گا تو یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ لگتا تھا کہ اسے اپنی کشتی اور کشتی میں رکھی ہوئی شراب کے علاوہ کسی شے سے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ اس کو ابھی تک اس سوال کا جواب بھی نہیں ملا تھا کہ ہم اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟

میں نے اسے بتایا۔ "تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہمیں ڈر لگا تھا کہ کہیں اسی بے ہوشی میں تمہاری جان نہ چلی جائے۔ ہم وہاں رک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہمارے لیڈر انور خاں کو یہ مناسب محسوس ہوا کہ تمہیں ساتھ لے لیا جائے۔"

"بہت بُرا کیا۔ میں جتنی جلدی فارغ ہو جاتا اتنا ہی اچھا تھا۔" وہ فارغ کو مرنے کے معنی میں استعمال کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

"لگتا ہے تمہیں بھی حکم اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے بہت اذیت اٹھانی پڑی ہے۔" میں نے اسے اکسایا۔

"نہیں، کوئی اذیت نہیں۔" وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ "تم نے وہ مقولہ نہیں سنا... محبت میں گزاری ہوئی چند گھڑیاں، بے محبت زندگی کے سو برسوں سے بہتر ہوتی ہیں... نہیں، کوئی اذیت نہیں۔" اس نے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا تو اس کے بال چہرے پر جھولنے لگے۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ باتیں کرتا رہا۔ وہ پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ در تہ تھا۔ اس کے اندر جھانکنا آسان نہیں لگتا تھا۔ میں اسے گھیر گھار کر ایک پوائنٹ پر لایا لیکن وہ ایک دم پلٹا کھا گیا۔ شراب کے نشے میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ "چھوڑو ان باتوں کو۔ ایسی باتیں تو تم کسی کے ساتھ بھی کر سکتے ہو۔ دیکھو تمہارے سامنے ایک چیمپئن بیٹھا ہوا ہے۔ ایک سپر اسٹار انٹرنیشنل فائٹر۔ تم مارشل آرٹ میں دلچسپی رکھتے ہو... اور میں تمہیں جو کچھ بتا سکتا ہوں، روئے زمین پر اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ ہرگز نہیں بتا سکتا۔ مجھ سے فائدہ اٹھالو... میں اب زیادہ دیر رہنے والا نہیں ہوں۔"

وہ اپنے مرنے کی بات بڑے تواتر اور یقین سے کر رہا تھا۔

"تم اتنے مایوس کیوں ہو؟ تم اس قدر بیمار نہیں کہ زندگی کی طرف پلٹ ہی نہ سکو۔"

اس نے میری بات کو یکسر نظر انداز کر دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ سامنے ہیڈ بیگ کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "مجھے کھڑا ہونے میں مدد دو۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی ٹانگ انور خاں کی ہدایت کے مطابق بدستور زنجیر میں تھی اور گھٹنے سے مڑی ہوئی تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ "میری یہ ٹانگ کھول دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جس سے کسی کو نقصان پہنچے یا تمہیں شرمندگی ہو۔"

میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اگر یہ چند روز پہلے کی بات ہوتی تو شاید میں ایسا رسک کبھی نہ لیتا۔ لیکن اب دل و دماغ کی کیفیت کچھ اور تھی۔ مجھے خطرات ہیچ محسوس ہونے لگے تھے۔ اگر دل میں کوئی اندیشہ ابھرتا بھی تھا تو میں خود کو سمجھاتا تھا۔ موت سے بڑھ کر تمہارے لیے کیا بُرا ہوگا... اور یاد رکھو کہ تم خود کو موت کے لیے آمادہ کر چکے ہو۔

میں نے جیکی کی زنجیر کھول دی۔ اس نے میرا سہارا چھوڑ دیا اور اپنی اکلوتی ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بیساکھی نما لکڑی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی بھینچی اور عجیب انداز میں بولا۔ "طاقت اس مٹھی میں نہیں ہے۔ یہاں ہوتی ہے یہاں... دماغ کے اندر... اگر دماغ میں طاقت نہیں تو پھر یہ مٹھی چاہے ایک پہلوان کے جسم کا حصہ ہو، وہ کمزور ہی رہتی ہے۔ دوسری صورت میں مجھ جیسا لاغر آدمی بھی ہیڈ بیگ مار کر مکا پھاڑ سکتا ہے... سس سوری۔ مکا مار کر ہیڈ بیگ پھاڑ سکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔"

"دکھاؤ۔" میں نے کہا۔

اس نے آہستہ آہستہ مٹھی بھینچی جیسے انگلی کے ایک ایک جوڑ کو علیحدہ علیحدہ موڑ رہا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں۔ کچھ دیر تک اپنے خیالات کو مرتکز کرتا رہا۔ تب اس نے اپنی بیساکھی اور ٹانگ پر اچھلتے ہوئے ہیڈ بیگ کو مکا رسید کیا۔ ہیڈ بیگ پھٹا تو نہیں لیکن ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ دور تک گیا اور واپس آیا۔

"ونڈر فل۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "تمہاری جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ ضرب کافی زوردار ہے۔"

"یہ ضرب میں نے اپنے جسم کی طاقت سے نہیں، دماغ کی طاقت سے لگائی ہے۔ میری ساری ذہنی توانائی اس ضرب میں لگی ہے اور جب ذہنی توانائی لگتی ہے تو جسمانی توانائی خود بخود لگتی ہے۔ چلو اب تم خود کوشش کرو۔"

اگلے چار پانچ منٹ تک میں نے باروندا جیکی کی ہدایات کے مطابق چھ ضربیں لگائیں اور مجھے لگا کہ اس شخص

کی باتوں میں وزن ہے۔

وہ بولا۔ ''آج میں تمہیں دو کام کی باتیں بتاتا ہوں۔ اگر تم ان کو یاد رکھو گے تو یہ عمر بھر تمہارے کام آئیں گی... بولو یاد رکھو گے؟''

''بالکل رکھوں گا۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس شخص سے اب واقعی عقیدت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ چند دن میں مرنے والا ہے اور میں نے ان آخری دنوں میں اسے ایک ویرانے میں بہترین شراب فراہم کر کے اس کو مسرور کیا تھا۔

وہ بولا۔ ''انسان کے بنیادی خوف دو ہی ہوتے ہیں۔ ذہنی تکلیف اور جسمانی تکلیف۔ تم کسی خطرناک غنڈے سے دو بدو لڑتے کیوں نہیں ہو؟ تمہیں ڈر ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مارے گا۔ تم پر کوئی ہتھیار استعمال کرے گا جس سے تمہیں تکلیف ہوگی۔ دوسرا خوف ذہنی تکلیف کا ہے۔ اگر وہ تمہیں مارے گا یا تم سے گالم گلوچ کرے گا یا تمہیں تھرتھر کانپنے پر مجبور کر دے گا تو لوگ یہ منظر دیکھیں گے اور تم شدید شرمساری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اگر ہم ان دو بنیادی خوفوں پر کنٹرول کر لیں تو ہم کسی بھی بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔ بس ہم یہ طے کر لیں کہ ہم جسمانی تکلیف کو جھیلیں گے... اور اگر ہمیں شرمندگی اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا تو بھی جھیلیں گے...''

''تمہاری باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اگر نہ لگیں گی تو یہ تمہارا ہی نقصان ہوگا۔'' وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔ ذرا توقف کر کے اس نے گلاس میں بچی کھچی شراب اپنے اندر انڈیلی اور بولا۔ ''اب میں تمہیں جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کا ایک خاص الخاص گر بتاتا ہوں۔ اس گر کو سمجھ لو گے تو ڈھیر سے ڈھیرے جسمانی تکلیف تمہارے جسم سے دور ہو جائے گی۔ تمہیں درد نہیں ہوگا یا ہوگا تو بہت کم ہوگا۔ تم ایک نئے انسان بن جاؤ گے۔ ذرا سوچو اگر انسان کو درد نہ ہو تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔''

ایک دم مجھے پھر وہ کشتی والا منظر یاد آ گیا۔ اسحاق نے جیکی کو دیوانہ وار مارا تھا اور اس نے بس ایک دو بار کراہنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ کیا واقعی... اسے بھی درد نہیں ہوتا؟ جیکی میں میری دلچسپی ایک دم بڑھ گئی۔ جیکی نے جو دونوں باتیں کی تھیں، وہ میرے دل کو لگی تھیں... اور اب اس کی یہ تیسری بات بھی جیسے دل میں کھب گئی تھی۔

وہ ابھی تک لنگوٹ میں تھا۔ مجھے اس کا سارا جسم لالٹین کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے رگ پٹھوں اور سوکھی سڑی جلد میں عجیب سی سختی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ''اگر میں نے تمہیں سب کچھ آج ہی بتا دیا تو تم کل کس تشریف میں شوق لاؤ گے۔''

''شاید تم کہنا چاہتے ہو کہ کس شوق میں تشریف لاؤ گے؟''

''ہاں ہاں۔ یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی میں فقرے میں لفظ الٹے بول جاتا ہوں۔ تم خود ہی ٹھیک کر لیا کرو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ باقی بات کل ہوگی اور اگر تم "69" ہی کی ایک بوتل لا سکو تو کیا بات ہے۔''

''چلو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل تمہارے لیے وہی لاؤں گا جو کہا ہے لیکن اپنی بات ادھوری نہ چھوڑو۔ مجھے الجھن رہے گی۔''

''آہ ادھوری بات۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''باتیں تو کبھی مکمل نہیں ہوتیں اور نہ کام مکمل ہوتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری خواہش پھر تیسری۔ انسان کو کہیں نہ کہیں رکنے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور جہاں سے آگے نہ جا سکے وہاں خوشی سے رک جائے۔ باقی کی خواہشوں کو دل سے نکال دے۔''

میں نے کہا۔ ''تم ایک چیمپئن فائٹر ہو لیکن تمہاری باتیں فلاسفروں جیسی ہیں۔ لگتا ہے کہیں گہری چوٹ کھائی ہے تم نے۔''

''تم مجھے کریدنے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں اور... شراب کے بغیر تو بالکل بھی پسند نہیں۔'' وہ مسکرایا تو اس کے میلے دانت نمایاں ہو گئے۔

اس کا مطمعِ نظر سمجھتے ہوئے میں نے بوتل کی باقی شراب بھی اس کے حوالے کر دی۔ اس نے بوتل کو ندیدوں کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں نے اس کی اکلوتی ٹانگ پھر سے زنجیر میں باندھ دی تھی۔ مجھے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا تاہم میں انور خاں کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

تھوڑی سی اور پی کر وہ پوری ترنگ میں آ گیا۔ میرے پوچھے بغیر ہی بولا۔ ''مجھے اسی جرم کی سزا ملی ہے جو بہت عام ہے۔ جو ہمیشہ سے بہت عام رہا ہے۔ جس کو کوئی روک سکا ہے نہ روک سکے گا۔ مجھے پیار ہو گیا تھا۔ ایک دم... بہت تیزی سے... بالکل طوفانی پیار...''

''کس سے؟''

''جس سے نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''یہی تو بات ہے۔ پیار وہیں ہوتا ہے جہاں نہیں ہونا چاہیے۔''

''کون لڑکی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ وہ سوال ہے جس کا جواب کوئی بھی سچا عاشق نہیں دیتا۔''

''حکم جی کے خانوادے سے تھی؟''

''یہی سمجھ لو۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''وہی جو ہوتا آیا ہے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن سنبھال نہیں سکا۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ تم ایک ٹیچر کی حیثیت سے اس اسٹیٹ میں آئے ہو، تمہیں اس کے لیے بہت معاوضہ دیا گیا ہے۔ عزت اور آسائش دی گئی ہے۔ یہ کام نہ کرو۔ یہ لوگ جتنے مہربان ہیں، اتنے ہی سخت بھی ہیں۔ بہت ظالم بن جائیں گے۔ لیکن تمہیں پتا ہے ہونی ہو کر رہتی ہے۔''

''میرے دماغ میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے اگر تم برا نہ مناؤ تو پوچھوں؟''

''تم نے شراب پلا کر میری رات کو رنگین کیا ہے... پوچھو۔''

''کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جسے تم سکھشا دینے کے لیے یہاں اسٹیٹ میں آئے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ جارج کی بہن ماریا فرگوسن؟''

''تم فاؤل پلے کر رہے ہو۔ میں نے کہا ہے نا، کوئی بھی سچا پیار کرنے والا اپنے محبوب کا نام زبان پر نہیں لاتا۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں نہیں پوچھتا۔ لیکن تمہارا پیار کس قسم کا تھا؟''

''یہ وہ پیار تھا جو آندھی کی طرح اٹھتا ہے اور طوفان کی طرح دماغ پر اور دل پر چھا جاتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی طلب اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ یہ پیار کرنے والوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ کہیں پاؤں نہیں جمنے دیتا... کچھ سمجھنے میں نہیں آنے دیتا۔ ہم بھی راج بھون میں بس دو چار ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ لگتا تھا برسوں کے شناسا ہیں۔ چند گھڑیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔''

''وہ بہت خوب صورت تھی؟''

''مجھے اس کا پتا نہیں لیکن وہ میرے لیے دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی تھی اور میں اس کے لیے محبوب ترین شخص۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کا ہونے والا شوہر اسے چاہتا تھا اور شاید وہ بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی لیکن میں نے تمہیں بتایا ہے نا، یہ وہ تیز بہاؤ والا پیار تھا جو کہیں پاؤں نہیں جمنے دیتا۔ میں بھی راج بھون میں ہی رہ رہا تھا۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کو دیکھنے اور ملنے کے بہت سے مواقع تھے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔ 'ہمارا راز بہت جلدی کھل جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ بہت برا ہوگا۔' مگر اس نے ہنس کر ٹال دیا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک دن اس کے پتا نے ہمیں دیکھ لیا... اور پھر پتا نہیں کس طرح یہ بات اور بھی کئی لوگوں تک پہنچ گئی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ ہندو تھی اور جہاں تک میری جانکاری ہے ابھی دو چار لوگوں کی فیملیاں راج بھون میں رہتی ہیں جو حکم کے قریبی مشیروں اور مصاحبوں میں شامل ہیں۔''

''تم مجھے شرلاک ہومز کا دیسی ایڈیشن لگ رہے ہو۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتیجے نکالتے ہو۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھے تھوڑا بہت بتا دو تاکہ مجھے نتیجے نکالنے کے لیے مغز ماری نہ کرنی پڑے۔''

''بتا تو رہا ہوں۔''

''میرا مطلب ہے کہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتاؤ، وہ کون تھی؟''

''اب وہ کسی اور کی ہے، اس کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔''

''تم نے خود ہی کہا ہے کہ پھر یہ بات پھیل گئی تھی اور کئی لوگوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ کوئی ایسا راز نہیں رہا۔''

''تم ہوشیار واقع ہوئے ہو۔ وکیلوں کی طرح بحث کر لیتے ہو۔ لیکن تم یہاں اس منحوس اسٹیٹ میں کیسے آ پھنسے ہو۔ اور... مجھے لگتا ہے کہ تم انڈین بھی نہیں ہو... کیا تم انڈین ہو؟''

''نہیں... پاکستانی... بس کچھ حادثات نے یہاں پہنچا دیا ہے۔''

''اوہ، ونڈرفل... پاکستانی۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔

''نیپال اور پاکستان میں بہت کچھ مشترک ہے۔ ہم دنیا کی بلند ترین چوٹیوں کے ''مالک'' ہیں۔ ایورسٹ، کے ٹو، نانگا پربت، ملکہ پربت اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ ہمارے ہاں دنیا کے بہترین قدرتی مناظر اور پہاڑی سلسلے ہیں۔ ہم نے بہت اچھے کھلاڑی پیدا کیے ہیں... اور پھر ایک اور بات... ہم دونوں ملکوں کو ایک بڑا زبردست ہمسایہ بھی ملا ہے۔ بہت محبت کرنے والا، بہت ہمدرد... اور امن پسند...

ڈیبا ہمسایہ ہو تو پھر جنت میں جانے کے لیے مرنے کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ دنیا ہی بہشت بن جاتی ہے۔'' وہ حسبِ عادت طنزیہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

کچھ دیر وہ اس موضوع پر بات کرتا رہا۔ پھر میں نے اسے یاد دلایا کہ ہم موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔ وہ مجھے اپنی محبوبہ کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی تو اس کے سینے کی پسلیاں نمایاں تر ہو گئیں۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا سایہ سرنگ کی کھردری دیوار پر جھول رہا تھا، جیسے سائے نے جیکی سے بھی زیادہ پی رکھی ہو اور اسے بیٹھنا مشکل ہو رہا ہو۔ جیکی نے کہا۔ ''تم وعدہ کرو کہ کم از کم میرے مرنے تک یہ بات اپنے تک ہی رکھو گے۔''

میں نے کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی بھی یہ بات کسی تک نہیں پہنچاؤں گا۔''

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ''وہ جارج کی بہن ماریا کی گہری سہیلی شگفتلا ہے۔ میری شاگرد تو ماریا تھی لیکن دھیرے دھیرے شگفتلا بھی مجھ سے سکھشا لینے لگی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے تھے، وہ ہمیشہ ساڑی پہنتی تھی۔ میں نے ایک دن اس سے کہا... جوڈو کراٹے سیکھنے کے لیے ساڑی سے اچھا لباس اور کوئی نہیں ہے۔ بس اس میں ایک خرابی ہے کہ ساڑی والی پلیئر کراٹے کھیلتے ہوئے کسی کو کک نہیں مار سکتی، صرف فلائنگ کک مار سکتی ہے کیونکہ فلائنگ کک میں دونوں ٹانگیں اکٹھی ماری جاتی ہیں... میری بات سمجھ کر وہ بہت ہنسی... ہنستے ہوئے اس کے دانت یمن کے موتی دکھائی دیتے تھے۔ اگلے روز وہ ماریا کی طرح ٹراؤزر پہن کر آ گئی۔ وہ ماریا کی طرح سنجیدہ نہیں تھی۔ بس شغل کے لیے آ جاتی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہم دونوں کے درمیان ایک ایسا ''لنک'' بنا کہ باقی ساری باتیں، سارے لوگ پس منظر میں چلے گئے۔ بس ہم دونوں رہ گئے اور ہماری پیاسی نظریں جو ہر پل ایک دوسرے کو تلاش کرتی تھیں۔ شگفتلا کے پتا اشوک ساہنی حکم جی کے خاص مشیر تھے۔ ایک دوسرے اہم مشیر رام گوپال کے ساتھ عرصے سے ان کی خاموش جنگ چل رہی تھی۔ اشوک ساہنی اس جنگ میں اپنے حریف کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں مل سکتا تھا کہ وہ شگفتلا کو حکم جی سے بیاہ کر اس کے سسر بن جائیں۔ اشوک ساہنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ شگفتلا اپنے الھڑپن اور خوب صورتی کی وجہ سے حکم جی کو پسند تھی۔ درحقیقت اشوک ساہنی نے اپنے منصب اور رتبے کو بڑھانے کے لیے ہی یہ فیصلہ کیا تھا ورنہ شگفتلا اپنے ہونے والے شوہر سے تقریباً دس بارہ برس چھوٹی تھی... اور اس سے پہلے بھی شوہر صاحب کی کئی بیویاں اور رکھیلیں وغیرہ تھیں جن میں اس کی چہیتی اور منہ چڑھی بیوی رتنا دیوی بھی شامل تھی۔''

بات کرتے کرتے جیکی کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کا پورا ڈھانچا دہل کر رہ گیا۔ میں نے اسے پانی پلانا چاہا لیکن اس نے شراب کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دو گھونٹ لے کر قدرے شانت ہو گیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا اور بولا۔ ''مجھے یہ ماننا چاہیے کہ اس معاملے میں زیادہ پیش قدمی میری طرف سے ہی ہو رہی تھی... شگفتلا پہلے تو بچنے کی کوشش کرتی رہی لیکن پھر وہ بھی بے بس ہو گئی۔ یہ بڑی حیران کن کروٹ تھی۔ بے شک اس کی ''بے جوڑ شادی'' ہو رہی تھی اس کے باوجود وہ حکم جی کو ناپسند نہیں کرتی تھی۔ اپنے ماتا پتا کی پسند کو وہ اپنی پسند سمجھتی تھی۔ اس کے نزدیک حکم جی ایک روحانی شخصیت بھی تھے جن کی عزت تکریم اور خوشی کا خیال رکھنا سب کا فرض تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ بے پناہ طاقت سے میری محبت کے مقناطیس کی طرف بھی کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ ڈیڑھ دو ماہ کے اندر اندر ہی ہوا تھا۔''

جیکی نے چند لمحے توقف کیا اور اپنی نشیلی آنکھوں سے ماضی میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''وہ چاندنی رات تھی۔ بڑی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ میں نے شگفتلا کو راج بھون کی چھت پر بلایا تھا۔ ہم سنگِ مرمر کی جالیوں والی ایک برساتی میں ایک دوسرے کی بانہوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے میں اس مہ جبیں پر جھکا ہوا تھا، اس کے لمبے بال سنگِ مرمر کے چبوترے پر دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں کسی کی آمد کا امکان نہیں تھا لیکن اچانک ہم پر بجلی سی گر پڑی۔ ہم نے اشوک ساہنی صاحب کو دیکھا۔ اپنی بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر وہ سکتے میں رہ گئے پھر ایک دم گھومے اور خاموشی سے نیچے چلے گئے۔ شگفتلا کی بری حالت تھی۔ وہ اپنی اوڑھنی درست کرتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس بات کا پتا ہمیں کئی دن بعد چلا کہ اشوک ساہنی صاحب کو آگاہ کرنے والی شگفتلا کی انگریز سہیلی ماریا ہی تھی۔ اس نے یار مار کا کردار ادا کیا تھا۔

''شگفتلا پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ ہمارے ملنے کے راستے بند ہو گئے۔ ہم جو چند گھڑیاں بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزار سکتے تھے، ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارا ملنا ممکن نہیں اور اگر میں ایک ٹیچر اور ٹرینر کی حیثیت سے یہیں اسٹیٹ میں رہا تو میری جان کے ساتھ ساتھ شگفتلا کی زندگی کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا اور یہ مجھے ہرگز منظور نہیں تھا۔ میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جلد ہی کسی طرح شگفتلا کو بھی اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ وہ بہت روئی تھی۔ ان دنوں اس کا دودھیا گلابی رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ میں اس سے آخری بار ملنا چاہتا تھا اور شاید وہ بھی آخری بار ملنا چاہتی تھی۔ ہمارے درمیان ایک آخری ملاقات طے ہوئی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ وہی کپڑے پہن کر آئے جن کپڑوں میں، میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا... وہ اپنی ایک سہیلی کی بیمار والدہ کی عیادت کے بہانے کوٹھی چلی گئی... شاید تمہیں پتا ہی ہو کوٹھی، زرگاں کی ایک نواحی آبادی ہے۔ یہاں سے جنگلی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔''

''نہیں، میں اس بارے میں نہیں جانتا۔''

''شگفتلا وہاں پہنچی اور میں بھی حکم جی کے 'نائٹ واچرز' سے بچ بچا کر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے یاد ہے، وہ پورے چاند کی رات تھی۔ چاند کبھی نکل آتا، کبھی بدلیوں میں چھپ جاتا تھا۔ ہم ایک باغیچے میں ملے تھے۔ وہاں مولسری اور رات کی رانی کے پھول تھے۔ کچنار اور نیم کے گھنے پیڑوں میں ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے۔ وہ ٹوٹ کر روئی اور میری آنکھیں بھی تربتر ہو گئیں۔ اس نے کہا مجھے بھولنا نہیں۔ میں بھی جہاں ہوں گی، تمہیں یاد کروں گی۔ تمہارے لیے پرارتھنا کروں گی۔ صبح شام کے بدلتے رنگوں میں، نئے موسموں میں اور تہواروں میں تمہاری صورت میری نگاہوں کے سامنے رہے گی۔ میں نے کہا... میں دل میں ایک کانٹا لے کر یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ زخم ہمیشہ رستا رہے گا۔ مجھے بہت خون رلائے گا۔ بس یہ دعا کرنا کہ یہ ناسور بن کر مجھے زندہ درگور نہ کر دے...

''ہم نے وہ سب باتیں کیں جو جدا ہو جانے والے پریمی کسی آخری ملاقات میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ وہاں کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا۔ جب شگفتلا آخری بار میرے گلے لگ کر چلی گئی اور میں بھی رُخ موڑ کر دوسری طرف روانہ ہو گیا، مجھے لگا کہ وہ رک گئی ہے اور مڑ کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن شک اتنا شدید تھا کہ مجھے دیکھنا پڑا... ہاں وہ واقعی رک گئی تھی اور دیکھ رہی تھی۔ کچنار، نیم اور مولسری کے پیڑوں کے درمیان وہ چاندنی میں نہائی ہوئی کھڑی تھی اور کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ کوئی اپسرا یا پھر کوئی داستانی شہزادی... جس نے مڑ کر دیکھا تھا اور پتھرا گئی تھی۔ اور وہی نہیں میں بھی پتھرا گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کی طرف لپکے اور دوبارہ لپٹ گئے۔ وہ جیسے میرے جسم کا حصہ بن گئی، میرے اندر پیوست ہو گئی۔ میں نے ٹوٹے ہوئے دل فگار لہجے میں کہا... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا شاکن۔ وہ ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بولی... تو پھر مجھے یہاں سے لے چلو... کہیں بہت دور... جہاں کوئی میری خبر نہ پا سکے...

''اور پھر وہ ہوا جو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا، جو ہمارے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔ ہم جو، ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے منہ موڑنے کے لیے آئے تھے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اس باغیچے سے نکل گئے۔ اسی حالت میں جس حالت میں تھے۔ ہم گھنے جنگل میں گھس گئے... اندھا دھند بھاگتے رہے اور چلتے رہے۔ ہمیں لگ رہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اسی طرح دنیا کے دوسرے کنارے تک جا سکتے ہیں۔ میں جب شگفتلا سے ملنے کوٹھی میں آیا تھا تو میں نے احتیاط کے طور پر ایک پسٹل اپنے کپڑوں میں رکھ لیا تھا۔ اب اس خطرناک جنگل میں یہی پسٹل ہمارے پاس واحد ہتھیار تھا۔ مگر عجیب بات تھی، کوئی خوف نہیں تھا... ہم ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہ آسانی موت کو گلے لگا سکتے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ پیار دیوانہ ہوتا ہے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی ماضی میں جھانکتی ہوئی آنکھیں جیسے پیار کی دیوانگی کو دیکھنے لگیں۔ میلے چیکٹ لنگوٹ میں وہ ننگ دھڑنگ بیٹھا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے جھاڑ جھنکاڑ بال اسے کسی تارک الدنیا سادھو کے روپ میں پیش کر رہے تھے۔ اب وہ شراب کے لیے زیادہ بے تابی بھی نہیں دکھا رہا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ پورے سرور میں ہے۔ دہانے کی طرف سے ماریا کے کھانسنے کی مدھم آواز سنائی دی... وہ شاید سو رہی تھی۔ بار وندا جیکی کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس کی کہانی کا ایک اہم کردار ماریا اسی سرنگ میں اس کے ساتھ موجود ہے۔

''کیا تمہارا پیچھا نہیں کیا گیا؟'' میں نے لالٹین کی لو ذرا اونچی کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ ''نہیں کیا گیا اور اگر کیا بھی جاتا تو دو چار آدمی تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میرے پاس پسٹل تھا اور اس کی کوئی تین درجن گولیاں تھیں۔ میں نے بہت سا مارشل آرٹ گھول کر پیا ہوا تھا اور میرے بدن میں بجلیاں کوندتی تھیں۔ میں دو چار بندوں کی ہڈیاں تو خالی ہاتھ بھی توڑ

سکتا تھا۔ ہم آدھی رات تک جنگل میں بھاگتے رہے اور پھر اس ندی پر پہنچ گئے جو "کیچے" کے پاس سے گزرتی ہے۔ وہاں گھاٹ پر بہت سی چھوٹی بڑی کشتیاں موجود تھیں۔ ایک نئی نکور کشتی مجھے اچھی لگی۔ اس کے اوپر سائبان تھا اور اس کا نیلا رنگ چمکیلا تھا۔ ملاح اور مچھیرے اپنی جھونپڑیوں میں سو رہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا، اس خاموشی میں بس کبھی کبھی لہریں کشتیوں سے ٹکراتی تھیں اور مدھم آواز پیدا ہوتی تھی۔ کشتی کے اندر بہت سے پھل اور کھانے پینے کی اشیا لدی ہوئی تھیں۔ کشتی کا مالک ایک اشرف نامی نوجوان تھا۔ وہ علی الصباح یہ سامان لے کر یہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اسے اسٹیٹ ہی کی ایک جاگیر زہرہ آباد تک جانا تھا۔ ہم نے نوجوان سے معقول کرایہ طے کیا اور اسے کہا کہ وہ ہمیں بھی زہرہ آباد لے جائے لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ابھی رات کے اندھیرے میں روانہ ہوگا۔ وہ مان گیا۔ ہم اس کے ساتھ ندی کے بہاؤ پر چل دیے۔ نوجوان سمجھ گیا تھا کہ ہم پریمی جوڑا ہیں اور کہیں پناہ کے لیے گھوم رہے ہیں۔ اس نے ہمیں آفر کی کہ اگر ہم کچھ دن کے لیے اس کی اس کشتی میں رہنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہم اسے معقول کرایہ دے دیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر ہم ابھی اور اسی وقت اس سے یہ کشتی خریدنا چاہیں تو پھر؟ پہلے تو وہ نہیں مانا لیکن جب میں نے اسے کشتی کی قیمت سے قریباً ڈھائی گنا زیادہ رقم آفر کی تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس نے کرنسی نوٹوں کو لالٹین کی روشنی میں ایک ایک کر کے بڑے دھیان سے دیکھا اور پھر ایک جگہ کشتی کے تالوں کی چابیاں ہمارے حوالے کر کے نیچے اتر گیا۔ اس کا سارا سامان بھی کشتی کے اندر ہی رہا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ صبح کے ملگجے اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

"اب یہ خوب صورت کشتی ہماری تھی۔ ہم ایک بانس نما چپو کی مدد سے اسے جس طرف چاہے لے جا سکتے تھے... اور ہم تاریک جنگل میں اسے بہت دور تک لے گئے۔ پھر ندی میں سے ایک اور شاخ پھوٹی۔ یہ شاخ ہمیں تیزی سے اپنے ساتھ بہاتی ہوئی ایک نامعلوم مقام پر لے گئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں ہمارے اور جنگلی حیات کے سوا اور کوئی نہیں... اور نہ ہی کوئی کبھی یہاں پہنچا ہے۔ یہاں پانی پر ہزارہا کنول تیرتے تھے۔ ان پھولوں کے درمیان آبی پرندوں کی مستیاں تھیں۔ جنگل سے موروں کی 'میں آؤں... میں آؤں' سنائی دیتی تھی اور شاخوں پر رنگ برنگے طوطے چہکتے تھے۔ ہم نے کشتی کو ایک خاموش کنارے پر ٹھہرا دیا۔"

ذرا توقف کر کے بارونڈا جیکی نے دو گھونٹ لیے۔

اس کی آنکھوں میں یادوں کے خوش رنگ جگنو چمک رہے تھے۔ وہ بولا۔ "میں ان دنوں شراب نہیں پیتا تھا۔ ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا لیکن مجھے اتنا نشہ تھا جو اس واٹ 69 کی دس بوتلیں ایک ساتھ پی لینے سے بھی نہیں ہو سکتا... نہیں ہو سکتا۔ اور اس نشے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس میں خوشبو تھی، آنسو تھے اور ان آنسوؤں کی نمی سے خوشیوں کی کلیاں چٹکتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جگہ قدرت نے روزِ ازل سے ہمارے لیے ریزرو کر رکھی تھی۔ ہماری محبت کے لیے... ہمارے ملن کے لیے۔ ہم زمان و مکاں... کے احساس سے بالکل بے نیاز ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ہجر کی بے رحم سختیوں نے طلب کی شدت کو انتہا پر پہنچایا تھا اور اب طلب کی اس انتہا نے سرشاری اور کیف کا ایک جہاں آباد کر دیا۔ ہم یوں ملے کہ پیار کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ ہاں میرے دوست! کبھی زمین اس طرح دیوانہ وار آسمان سے نہ ملی ہوگی، کبھی بہاروں نے اس طرح ویران باغوں پر یلغار نہ کی ہوگی... اور نہ کبھی تابڑتوڑ بارش نے اس طرح صحراؤں کو جل تھل کیا ہوگا۔ میں شاعر نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ ان روز و شب کے بارے میں شاعری کروں... اگر میں ایسا کر سکتا تو وہ شاعری بے مثال ہوتی۔ وقت اسے مٹا سکتا اور نہ بھلا سکتا۔"

بارونڈا جیکی کی گدلی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ کچھ دیر کے لیے جیسے ان روز و شب میں کھو گیا۔ ان لمحوں میں وہ واقعی ایک چیمپئن فائٹر کم اور ایک شاعر زیادہ نظر آیا...

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ میں چاہتا تھا کہ نشہ اترنے سے پہلے پہلے وہ اپنی کہانی ختم کر لے۔

اس نے گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "ہم اس کشتی میں پورے سات روز رہے۔ شگفتا کے شباب نے مجھے سیراب کر دیا اور میری اندھی محبت کی شدت نے اسے ہر فکر بھلا دی... ہم نے کشتی کا کچھ سامان تو چرندوں پرندوں کو تحفے کے طور پر پیش کر دیا تھا اور کچھ کشتی کے ایک گوشے میں سمیٹ دیا تھا۔ ہم کشتی کے چھوٹے سے ڈیک کو سونے کے لیے استعمال کرتے تھے اور تیز بارش کے وقت بیسمینٹ میں چلے جاتے تھے۔ وہاں نیچر کے سوا ہمیں دیکھنے والا اور کوئی نہیں تھا... اور کبھی کبھی لگتا تھا کہ نیچر بھی ہماری ہم مزاج ہو گئی ہے۔ ایک دن سرخ بالوں والا ایک بہت بڑا ریچھ ندی میں اتر آیا اور کشتی کی طرف بڑھا۔ میں نے پستول نکال لیا لیکن وہ کچھ دیر تک ہمارا جائزہ لینے کے بعد واپس چلا گیا۔ ایک رات پانی میں تیرنے والا ایک سانپ ہمارے ساتھ کشتی پر موجود رہا لیکن اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ خوراک کی خوشبو مختلف چرندوں کو ہمارے قریب لے آتی تھی اور ہم انہیں مایوس نہیں کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ہم تادیر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں تلاش کرنے والے اس جنگل میں ہر طرف پھیلے ہوں گے اور وہ بہت جلد اس دور افتادہ گوشے تک بھی پہنچ جائیں گے۔ شگفتا بھی یہ جانتی تھی لیکن ہم ان باتوں کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ جب وقت آئے گا، دیکھا جائے گا۔ شگفتا چاہتی تھی کہ اگر ایسا وقت آ گیا تو میں اپنے ہاتھ سے اسے گولی مار دوں۔ لیکن میں اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا، زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر ایک پلان بنا رکھا تھا اور میں نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر برا وقت آ گیا تو وہ میری ایک بات ضرور مانے گی۔

"اور پھر ایک رات وہ برا وقت آ گیا تھا۔ ہم دونوں کشتی میں لیٹے تھے۔ تاریک آسمان پر تاروں کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کیا اس کشتی کو چھوڑ کر جنگل میں راستہ بنانے کی کوشش کرنا ٹھیک رہے گا؟ اچانک کچھ آوازیں ہوا پر تیر کر ہم تک پہنچیں۔ یہ پانی پر چپو پڑنے کی آوازیں تھیں، کچھ لوگ بلند آواز میں بول رہے تھے۔ پھر میں نے دور نیم تاریکی میں تین کشتیوں کو دیکھا۔ یہ لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کشتیوں کی بناوٹ دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ حکم جی کے لوگ ہیں اور ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ پہنچے ہیں۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر تھے، میرے ذہن میں جو پلان تھا میں اس پر عمل کر سکتا تھا۔ اب شاید تمہیں میری بات سن کر حیرانی ہو لیکن میں تمہیں جو بتا رہا ہوں سچ بتا رہا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ "میں ایک دم شگفتا پر پل پڑا۔ میں نے اس کے کپڑے پھاڑ دیے، اس کے منہ پر زوردار طمانچے مارے، اس کے جسم کو نوچ لیا۔ وہ گر پڑی۔ وہ حیرت اور صدمے سے گنگ تھی۔ بس وہ اتنا ہی کہہ پا رہی تھی جیکی... جیکی۔ میں نے اسے اوندھا کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ چند دن پہلے جنگل میں بھاگنے کے دوران میں اس کے بازوؤں پر زخم آئے تھے، یہ زخم پھر رسنے لگے۔ میں نے اس کا منہ چومتے ہوئے کہا۔ "شگفتا! مجھے معاف کر دینا۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ مجھے انکار نہ کرنا اور تم نے وعدہ بھی کر رکھا ہے کہ انکار نہیں کرو گی۔"

"اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ روتے ہوئے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔ ہم کو پکڑ لیا جائے گا۔ دونوں کو سزا ملنے سے بہتر ہے کہ کوئی ایک بچ جائے۔ میرا بچنا تو بہت مشکل ہے لیکن تم بچ سکتی ہو۔ میری خاطر شاگن... صرف میری خاطر... تم نے ان لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ تم اپنی مرضی کے ساتھ نہیں آئی ہو۔ میں تمہیں زبردستی لایا ہوں... پلیز شاگن... انکار نہ کرنا۔"

"وہ سراپا احتجاج بن گئی۔ وہ دلدوز انداز میں کراہی۔ "میں ایسا نہیں کر سکتی... کبھی نہیں کر سکتی۔"

"میں نے اس کے خون آلود ہونٹوں کو اپنی ہتھیلی کے ساتھ سختی سے ڈھانپ دیا۔ میں نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ میں نے اسے اپنے سر کی قسم دی اور اسے لاچار کر دیا، ہاں میرے دوست اسے لاچار کر دیا۔"

جیکی کی آنکھوں میں اب مسرت کے جگنو بجھ چکے تھے، واقعے کی مناسبت سے اب اس کے چہرے سے گہرا اندوہ جھلک رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمیں پکڑ لیا گیا۔ مجھے کشتی پر ہی گرا لیا گیا۔ وہ درجنوں لوگ تھے۔ میں جانتا تھا کہ مزاحمت بے کار ہے۔ انہوں نے میرا پستول چھین لیا۔ مجھے اس بری طرح زدوکوب کیا کہ میری ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی اور ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ میں وہیں کشتی پر ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

"ہوش آیا تو خود کو زرگاں کی بدنام جیل میں پایا۔ اس جیل کا انچارج جارج گورا جیسا سفاک شخص تھا۔ مجھے ایک زمین دوز کال کوٹھری میں رکھا گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا رابطہ فقط ایک شخص سے ہوتا تھا۔ یہ مجھے کھانا پہنچاتا تھا اور پھر خالی برتن لے جاتا تھا۔ میرے جسمانی زخم مجھے دن رات تڑپاتے رہتے تھے۔ پھر ایک دن مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ جارج گورا بہ نفسِ نفیس میری کوٹھری میں آیا۔ اس نے کہا۔ "موت کی سزا تیرے جرم کے مقابلے میں بہت معمولی ہے۔ تجھے مر مر کر جینا ہوگا۔" جارج کے ساتھ وہ شخص بھی تھا جو آج کل ماریا کا شوہر ہے... سرجن اسٹیل بریرے۔ وہ کہنے کو سرجن ہے لیکن فطرت میں بے رحم قصاب ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا میڈیکل باکس بھی تھا۔ مجھے ایک انجکشن دیا گیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میرا بایاں بازو اور دائیں ٹانگ جسم کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ واقعی یہ مر مر کر جینے جیسا تھا۔ میرا فن میری زندگی تھا اور مجھے اس فن سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں اس کال کوٹھری میں چھ مہینے تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا

رہا۔ مجھے اَن گنت جسمانی و ذہنی اذیتیں جھیلنا پڑیں... یہاں تک کہ میں جاں بلب ہوگیا۔ مجھے رات کے وقت انتہائی تیز بخار ہونے لگا، اس کے علاوہ میرے بازو کا زخم بھی ٹھیک ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ ایک رات سخت بے ہوشی کی حالت میں مجھے جیل کے شفاخانے میں پہنچایا گیا۔ میں اس شفاخانے میں قریباً ایک ماہ رہا۔ یہاں سیکیورٹی کا وہ انتظام نہیں تھا جو جیل میں تھا۔ میرے پہرے پر صرف دو افراد ہوتے تھے۔ وہ دونوں ہندو تھے۔ وہ دیوالی کی رات تھی۔ زبردست آتش بازی کی وجہ سے کچھ ہوائیاں شفاخانے کے اندر آگریں اور شفاخانے کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ میرے دونوں پہرے دار تہوار کی وجہ سے اندھا دھند پیے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی مدہوشی اور آتشزدگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک خطرناک کوشش کر کے شفاخانے سے نکل گیا۔''

اس نے ایک بار پھر توقف کر کے میری طرف دیکھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ ''اگر تفصیل میں جاؤں گا تو یہ روداد طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ فرار کے بعد میں تین ماہ تک ایک مہربان پارسی عورت کے گھر میں چھپا رہا۔ وہ گھر میں شراب تیار کرنے کا کام کرتی تھی۔ وہیں پر مجھے شراب کی لت بھی لگی۔ وہیں پر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شگفتلا اب کس حال میں رہے ہے۔ کیا تم جاننا چاہو گے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟''

''کیوں نہیں!''

''وہ حکم کی پتنی نہیں بن سکی... لیکن پھر بھی حکم نے اسے چھوڑا نہیں۔ وہ حکم کی پسند تھی اور وہ اس کے ساتھ ''سونے'' کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔''

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔''

جیکی کے چہرے پر عجیب طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''حکم جیسے لوگ ارادے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ وفاداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور یہ وفاداری ہوتی ہے اپنی حرص اور خواہش کے ساتھ۔ اپنے اعلیٰ مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسے لوگ وہ ہر نیک کام کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہوتا ہے... جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد حکم، شگفتلا کو اپنی پتنی کا درجہ تو نہیں دے سکتا تھا لیکن وہ اس کے پرکشش جسم سے یکسر محروم ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی خوب صورتی اور اس کی بے مثال زلفوں کا اسیر تھا۔ اس نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ شگفتلا کے ادھیڑ عمر پتا اشوک ساہنی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو ''فیری'' بنا دے۔ فیری بننے کا مطلب سمجھتے ہو تم؟''

''نہیں، مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں۔''

''حکم اور اس کے حواریوں نے اپنے عوام کی دنیا اور عاقبت سنوارنے کے لیے بڑا اعلیٰ انتظام کیا ہوا ہے... شاید تم نے ساتویں کے جشن کے بارے میں سنا ہو؟ اس عالی شان جشن کے موقع پر راج بھون میں بڑے ''پاکیزہ'' قسم کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ یہ انتظامات درحقیقت حکم اور اس کے درویش صفت دوستوں کی خوشی کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ درویش صفت لوگ اسٹیٹ کی بہتری کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں، اپنا خون جلاتے ہیں۔ اگر یہ ساتویں کے جشن کے موقع پر آٹھ نو روز شراب وغیرہ پیتے ہیں اور لڑکیوں کے ساتھ تفریح وغیرہ کر لیتے ہیں تو ایسا کیا بُرا کرتے ہیں؟ اور یہ سب کچھ بڑے شفاف طریقے سے ہوتا ہے بھئی۔ پرانے زمانے سے یہ ریت چلی آرہی ہے۔ جشن کے موقع پر راجواڑے میں سے سات رنگوں کے مطابق سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ انہیں فیریاں یا اردو میں پریاں کہا جاتا ہے۔ یہ فیریاں پھر راج بھون کے اندر ہی رہتی ہیں۔ انہیں اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے جاتے ہیں۔ فنون کی تعلیم دی جاتی ہے جن میں ظاہر ہے کہ ناچ گانے اور موسیقی وغیرہ کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ پرانے زمانے کا تو پتا نہیں لیکن آج کل یہ فیریاں حکم کی رکھیلیں ہی سمجھی جاتی ہیں۔ وہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے یا اپنے قریبی دوستوں کے تصرف میں لاسکتا ہے۔ اب شگفتلا بھی ایک فیری کی حیثیت سے حکم کے حرم میں داخل ہو چکی ہے۔ اب اس کی زندگی راج بھون کی اونچی دیواروں کے پیچھے ہمیشہ کے لیے گم ہے۔''

اپنی اندرونی تلخی کو کم کرنے کے لیے اس نے تھوڑی سی مزید ''سیال آگ'' اپنے معدے میں اتاری اور اپنا سر سرنگ کی کھردری دیوار سے ٹکا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم اس مچھیرے کی کشتی تک کیسے پہنچے؟ کہیں یہ وہی کشتی تو نہیں...''

''ہاں، یہ وہی کشتی ہے۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''اسی کشتی میں، میں نے اپنی زندگی کے بہترین سات آٹھ روز گزارے تھے۔ یہ کشتی اب پرانی ہو چکی ہے لیکن اس کے ایک ایک نشیب و فراز پر، ہر ہر انچ پر میری محبت کی یادگاریں ہیں۔ اس کشتی کے اندر اب بھی میری شگفتلا کی ہنسی جذب ہے۔ اس کی حسین سرگوشیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دن گزارنے کے لیے میں نے یہ کشتی ڈھونڈ لی ہے۔ میں اسی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوسکا... ایسا نہ ہو سکا دوست تو میں اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی

راحت سے محروم ہو جاؤں گا... اور یہ محرومی مجھے مر کر بھی چین سے نہیں رہنے دے گی... اسی لیے تو کہتا ہوں، میری مدد کرو... مجھے واپس پہنچا دو۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز میں التجا کا رنگ آگیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے کبھی اس اسٹیٹ سے بھاگ جانے کی کوشش نہیں کی؟''

''مجھے لگتا ہے کہ تم یہاں کے جغرافیے اور حالات سے زیادہ واقف نہیں ہو۔ اس اسٹیٹ کو تین طرف سے ایک چوڑے پاٹ والی بہت تیز رفتار ندی نے گھیر رکھا ہے۔ اس ندی کے ساتھ ساتھ نگرانی کا سخت انتظام ہے۔ چوتھی طرف یہ جنگل ہے۔ اس طرف سے بھی اسٹیٹ کے بارڈر کو تقریباً ''سیل'' کر دیا گیا ہے۔ ویسے بھی میرے جسم کی حالت تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اس آدھے جسم کے ساتھ میں کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔ جب میں پارسی عورت ہوشن کے پاس تھا، میرے دل میں کئی بار آئی کہ ہوشن کی پناہ چھوڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔ ہوشن نے بڑا حوصلہ کر کے مجھے پناہ تو دے دی تھی لیکن وہ ڈرتی بھی رہتی تھی۔ اس کے ڈر کی وجہ یہ وہم ہی تھا کہ حکم جی کے خاص قیدی اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتے اور وہ جہاں بھی چلے جائیں، ان کو کھوج لیا جاتا ہے۔ شاید تم نے بھی یہ بات سنی ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرے سینے میں سرد لہر سی دوڑ گئی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں بھی ان خاص قیدیوں میں سے ایک ہوں اور مجھے بھی ایک جدید ''جادو'' کے ذریعے اس اسٹیٹ کے اندر جکڑ لیا گیا ہے۔

بار وندا جیکی نے کہا۔ ''اسے حکم کے روحانی کرشموں میں سے ایک کرشمہ کہا جاتا ہے لیکن اس کی اصل حقیقت سے کوئی بھی واقف نہیں۔ کیا تم جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر یقین رکھتے ہو؟''

''رکھتا بھی ہوں... اور نہیں بھی... اس معاملے میں بہت سے لوگوں کی طرح درمیان درمیان میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''بہرحال، میں تمہیں اپنی محسنہ ہوشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ ہر وقت خوفزدہ رہتی تھی کہ کسی دن اس کے گھر کے دروازے پر حکم کے بے رحم ہرکاروں کی دستک ہو جائے گی۔ وہ بے چاری بیمار رہنے لگی تھی۔ پھر ایک روز میں نے بڑی خاموشی سے اس کا گھر چھوڑ دیا۔ میرے پاس دو تین ہفتوں کی خوراک موجود تھی اور ایک دیسی ساخت کا پستول بھی تھا۔ میں کئی روز تک جنگل میں چھپا رہا۔ پھر میری ملاقات چند مچھیروں سے ہوئی۔ میں ان کے پاس رہنے لگا۔ سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ میں نیپالی اور انگریزی کے سوا کچھ بول نہیں سکتا۔ وہ یہ زبان نہیں سمجھتے تھے۔ بس اشاروں سے گزارہ ہوتا تھا۔ میں بیمار رہتا تھا۔ بازو کا زخم مسلسل رستا رہتا تھا۔ شراب میری سخت ضرورت بن چکی تھی۔ بہرحال، مجھے زندگی سے کوئی گلہ نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ میں سو سال زندہ رہ کر بھی شاید وہ کچھ حاصل نہ کر پاتا جو میں نے اس ستائیس اٹھائیس سال کی زندگی میں حاصل کر لیا ہے۔ شگفتلا کے ساتھ گزارے ہوئے دن میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان دنوں کی خوب صورت یادوں کے سہارے میں جیتا رہا ہوں اور ان یادوں کے سہارے ہی اب مرنا بھی آسان لگ رہا ہے۔ ان مچھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میرے دل میں یہ خواہش جاگی تھی کہ میں اس نیلی کشتی کو ڈھونڈوں جس میں، میں نے شگفتلا کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مقامی شخص نے بھی میری مدد کی۔ آخر میں کامیاب ہوا۔ مجھے وہ کشتی مل گئی۔ مچھیروں کے ساتھ رہتے ہوئے میں کام بھی کیا کرتا تھا۔ میرے پاس کچھ رقم جمع تھی اور پستول بھی تھا۔ میں نے یہ سب کچھ کشتی کے موجودہ مالک ملاح بیوک رام کو دے دیا اور اس سے اجازت لے لی کہ میں جب تک زندہ ہوں، اس کشتی میں رہوں گا اور وہ مجھے کھانا اور شراب دیتا رہے گا۔ وہ میری حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اس نے اقرار کر لیا۔ تو یہ ہے میری کہانی...''

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے جیکی کی سانس پھول گئی اور آواز پھر سے لڑکھڑانا شروع ہو گئی۔ دراصل اب اس کا نشہ ذرا دھیما پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ نشے کے بغیر اس کی وہی حالت ہو جاتی تھی جو کسی نارمل شخص کی نشے میں دھت ہو کر ہو سکتی ہے۔ وہ کسی لاغر کیچوے کی طرح بے ہنر مین ہو جاتا تھا اور اس کی آواز ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔

اس کی کہانی متاثر کن تھی۔ مجھے اس کہانی نے شاید اس لیے بھی زیادہ متاثر کیا کہ میں خود بھی دل کا روگی بن چکا تھا۔ ثروت میری محبت تھی اور وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی... پچھلے دو ڈھائی سالوں میں پلوں کے نیچے سے نہ جانے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ یہاں سلطانہ مجھے اپنی بیوی بتاتی تھی۔ وہ ایک دلیر لڑکی تھی۔ اس میں کچھ انوکھی باتیں موجود تھیں۔ جیسے یہ کہ وہ کبھی زیور نہیں پہنتی تھی۔ شاید وہ زیور کو عورت کے لیے غلامی و محکومی کی علامت سمجھتی تھی۔ وہ میری زندگی کی خاطر عارضی طور پر سر جارج گورا کے ہاتھوں بے بس تو ہوئی تھی لیکن جہاں تک میں اسے سمجھا تھا، وہ ظلم سہہ کر بھول جانے

ملے گا، وہ کچھ کرچکے ہوں گے۔

چند منٹ تک میرے اور بار بندا جیکی کے درمیان اس کی روداد کے بارے میں سوال جواب ہوئے۔ تب میں نے ایک بار پھر اسے سابقہ موضوع کی طرف لانا چاہا۔ میں نے اس کی جلد کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''جیکی! تم ایک مختلف شخص ہو۔ تمہارے جیسے چیمپئن فائٹر کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔''

''تم... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تمہارے اندر جسمانی تکلیف سہنے کی بے پناہ گنجائش ہے۔ اس بیمار حالت میں بھی تم برداشت کے معاملے بے مثال ہو۔ تم اس بارے میں مجھے بھی کچھ بتانے جارہے تھے لیکن پھر درمیان میں تمہاری یہ دلچسپ روداد آگئی۔''

اس نے نفی میں انگلی ہلائی۔ ''میں مرنے والا ضرور ہوں لیکن میری یادداشت زیادہ کمزور نہیں ہوئی۔ میں اب تمہیں بتا سکتا ہوں کہ الزبتھ ٹیلر کے چوتھے شوہر کا نام کیا تھا اور پرل ہاربر کی بندرگاہ پر کس تاریخ کو حملہ ہوا تھا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں بتانے کا وعدہ ضرور کیا تھا لیکن آج نہیں کل... کل تم میرے لیے شراب اور بنٹر بیف کا ایک ''پیس'' لاؤ گے۔ یہاں اس بینڈ بیگ کے قریب اطمینان سے بیٹھیں گے اور مارشل آرٹ کے بارے میں بات کریں گے۔''

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز میری آنکھ دن گیارہ بجے کے قریب کھلی۔ سرنگ کے دہانے پر ایک بار پھر ہنگامہ برپا تھا۔ انور خاں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ دوسری طرف دہانے کے پار سے کسی اور شخص کے بولنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ یہ شخص حکم کے اہل کاروں میں سے تھا اور انور خاں سے زور دار مکالمہ کررہا تھا۔

اس مکالمے سے پتا چلا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ نے ماریا کے وارثوں کو اٹھارہ گھنٹے کی جو دوسری مہلت دی تھی، وہ بھی اب ختم ہوگئی ہے۔ انور خاں چنگھاڑ رہا تھا۔ ''ہم سمجھ گئے ہیں۔ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں۔ ہمارے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں چھوڑ رہے کہ اس حرامزادی کو زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیں اور یہ بس اب ہونے ہی والا ہے۔''

دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''میں تمہیں پھر پیشکش کرتا ہوں۔ تم مسٹر اسٹیل اور گرومودان کو اپنے پاس ضمانت کے طور پر رکھ لو۔ لیکن میم صاحبہ کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد ہم سارا معاملہ بات چیت کے ذریعے طے کر سکتے ہیں۔ ہم تمہارے کہنے سے پہلے ہی میم صاحبہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کرچکے ہیں لیکن یہ ایک ٹکڑے میں تمہارے پاس نہیں آئے گی۔ تھوڑی تھوڑی کر کے آئے گی۔'' انور خاں نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ''پہلے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں آئیں گی۔ پھر پاؤں کی... پھر کوئی اور ٹکڑا۔''

''تم خود کو مسلمان کہتے ہو؟'' بھاری بھرکم آواز والے نے کہا۔

''ہاں... ہم مسلمان ہیں... اور اسی لیے اس کی عزت بچی رہی ہے۔ ورنہ یہ بھی مختار راجپوت کی بیٹی کی طرح تاراج ہوچکی ہوتی۔ باقی رہی اس کے ٹکڑوں کی بات... تو انصاف تو یہی کہتا ہے۔ کان کے بدلے کان... آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اس کتے جارج نے اپنی جیل میں کتنے لوگوں کو اعضا کاٹ کاٹ کر بے کار کیا ہے؟ آج اس کی بہن کو تھوڑا سا بدلہ چکانا ہوگا۔''

ماریا کے شوہر سرجن اسٹیل کی لڑکھڑاتی آواز ابھری۔ ''دیکھو، تم لوگ اپنے لیے بدترین انجام کو CHOOSE کررہا ہے۔ ہام تمہارا ڈیمانڈ مان رہا ہے۔ سلطانہ کے بھائی اور فادر کو چھوڑا جارہا ہے۔ ہام نے آج تمہارا یہ ڈیمانڈ بھی مانا کہ جن 50 لوگوں کا لسٹ تم نے دیا، اس میں سے 25 لوگوں کو ریلیز کردیا جائیں گا لیکن باقی لوگوں میں ایسے کچھ تو ایسا ہے جو ہماری کسٹڈی میں نا ہیں... اور دو چار ایسا ہے جن پر بہت سخت کیس ہے۔''

''کیس تو تم پر بھی بہت سخت ہے اسٹیل صاحب۔'' اسحاق پھر گرجدار ہوا۔ ''ایسے کیسوں کے بدلے تمہاری اپنی چتی کو دس بار بھی پھانسی دی جاوے تو کم ہے۔ اور مجھے لگ رہا ہے کہ یہ زیادہ دیر زندہ رہنے والی ناہیں ہے۔ بس اب گھنٹوں کی ناہیں منٹوں کی بات ہے۔''

''پانڈے! میری بات سنو۔'' گرومودان نے اپنے کسی ساتھی کو پکارا۔

''آرہا ہوں سر۔'' پانڈے نے جواب دیا۔ یہ بھاری آواز والا وہی تھا جو انور سے مکالمہ کررہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آگیا کہ مجھے یہ نام میڈم صفورہ نے بتایا تھا۔ ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ رنجیت پانڈے، غالباً حکم کا وہی اہل کار تھا جسے... دشمنوں کے لیے عزرائیل کہا جاتا تھا... اور وہ یہاں پہنچ چکا تھا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

میں نے پانڈے کی بس ایک ہی جھلک دیکھی اور وہ بھی عقب سے۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ سے نکلا اور چھلانگ لگا کر ایک نشیب میں اوجھل ہوگیا۔ وہ خاصا تنومند تھا۔ اس نے پینٹ اور چیک دار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ غالباً گرومودان سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے نشیب میں اترا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کا شوہر سرجن اسٹیل بھی وہیں موجود ہو...

اس تبادلۂ خیال کا نتیجہ پانچ دس منٹ بعد سامنے آگیا۔ پانڈے کی بھاری بھرکم کرخت آواز ایک بار پھر درختوں کے عقب سے ابھری۔ وہ بلند آواز میں بولا۔ ''انور خاں! ہم ناہیں چاہت کہ تم کسی طرح کی حماقت کرو اور اس کے نتیجے میں سب کچھ برباد ہو جائے۔ گرومودان خون خرابے سے بچنے کے لیے ہر حد تک جانا چاہت ہیں۔ تم نے پچاس لوگن کی جو لسٹ دی ہے، ان میں سے آدھے تو ہمارے پاس آگئے ہیں لیکن باقیوں کا کچھ پتا ناہیں۔ ہم اس سلسلے میں تھوڑی سی مزید کوشش کرتے ہیں، تم بھی اپنے اندر کچھ لچک پیدا کرو۔ میرا خیال ہے کہ ہم کل دوپہر تک تم لوگن کو کوئی حتمی جواب دے سکیں گے۔''

''اور میرا خیال ہے کہ تم صرف وقت گزاری کر رہے ہو۔'' انور خاں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ''تمہاری فطرت دھوکا ہے پانڈے... اور تم اس کے خلاف نہیں چل سکتے ہو۔ مگر میں تمہیں ایک بات صاف صاف بتا دوں۔ ہمیں تو مرنا ہی ہے لیکن یہ میم صاحب بھی زندہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ میرا تم سے اور اسٹیل... مودان وغیرہ سے وعدہ ہے۔'' انور کی آواز میں حد درجے کی تپش تھی۔

سرجن اسٹیل کی لڑکھڑاتی آواز ابھری۔ ''ہام ماریا کا لائف بچانا چاہتا اور اس کے ساتھ تمہارا سب کا لائف بھی بچانا چاہتا۔ ہام ہوپ کرتا ہے کہ کچھ طے ہو جائے گا۔ ہام کی طرف سے پرامس ہے کہ کل دوپہر تک کسی طرح کا کوئی کارروائی ناہیں ہوگا۔ تم لوگ بھی خود کو COOL رکھو۔''

انور خاں... سرجن اسٹیل اور پانڈے کے درمیان اس حوالے سے دو چار منٹ بات ہوئی پھر انور خاں کل دوپہر کا مزید وقت دینے کو تیار ہوگیا۔

یہ بڑی سخت قسم کی اعصابی جنگ تھی۔ ہر ہر پل جیسے سولی پر گزر رہا تھا۔ دونوں طرف سخت تناؤ موجود تھا۔ ایسی صورتِ حال میں کامیاب فریق وہی ہوتا ہے جو اعصاب کو ٹوٹنے سے بچائے رکھتا ہے اور اندازہ ہوتا تھا کہ انور خاں اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں جو کچھ بھی چل رہا تھا مگر اس نے اپنے چہرے کی بشاشت قائم رکھی ہوئی تھی۔ گفتگو کے آخر میں انور خاں نے ماریا کے لیے تین بوتل شراب کا مطالبہ بھی کیا۔ یہ مطالبہ میرے کہنے پر ہی کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسی وقت شراب کی سربمہر بوتلیں اندر سرنگ میں بھجوا دیں۔

گفتگو ختم ہوئی تو میں نے انور خاں سے پوچھا۔ ''یہ پانڈے وہی ہے جو انڈین سیکیورٹی فورس میں افسر تھا اور اب یہاں حکم کے لیے کام کرتا ہے؟''

''وہی ہے حرامی...'' انور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اس کے یہاں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حکم اور جارج وغیرہ دونوں راستے کھلے رکھنا چاہتے ہیں۔ بات چیت کا... اور کسی اچانک کارروائی کا بھی۔ پانڈے اور اس کے ساتھی ایسی اچانک کارروائی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ خاص طور سے یہ پانڈے کسی لومڑی کی طرح چالاک اور بھیڑیے کی طرح خطرناک ہے۔ ہمیں اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار رہنا ہوگا۔''

اسحاق نے کہا۔ ''میری تو رائے ہے کہ دستی بموں میں سے دو چار ہم اس خبیث ماریا کی کمر سے بھی باندھ دیئے جائیں اور پانڈے وغیرہ کو بھی بتا دیا جائے کہ ماریا کس حال میں ہے۔''

''چلو اس بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔'' انور خاں نے کہا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ''لیکن ماریا ہے کہاں؟''

اسحاق بولا۔ ''وہ اُدھر بیٹھی اپنی روٹی پکا رہی ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ یہاں ڈبل روٹی اور کیک پیسٹری ناہیں ملیں گی... روٹی ہی ملے گی اور یہ روٹی بھی اسے خود پکانا ہووے گی۔''

میں نے دیکھا کہ سرنگ کے خم پر جہاں عارضی باورچی خانہ بنایا گیا تھا، وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے جا کر دیکھا اور یقین ہوگیا کہ بھوک انسان سے سب کچھ کروا سکتی ہے۔ سفید فام ماریا کے پاؤں زنجیر میں بندھے ہوئے تھے لیکن ہاتھ آزاد تھے۔ چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور اوپر توا رکھا تھا۔ ماریا جس نے شاید کبھی تنکا پکڑ کر بھی دوہرا نہیں کیا ہوگا، اپنے لیے روٹی پکا رہی تھی۔ پچھلے دو تین دن میں اسے کافی مشق ہوگئی تھی۔ توے پر ایک گول روٹی نظر آرہی تھی۔

اسحاق میرے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میم جی کو کافی تجربہ ہوگیا ہے۔ اب ان پر کچھ اور ذمے داری ڈال دینی چاہیے۔''

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی، یہ سارا دن بیٹھ کر ہمیں گھورنے کے سوا اور تو کچھ کرتی نا ہیں۔ ہم چھ سات بندوں کے لیے اگر چودہ پندرہ روٹیاں اتار دیا کرے گی تو کون سی قیامت آجاوے گی؟ اس کی اپنی روٹی بھی ہضم ہو جایا کرے گی۔"

ماریا، اسحاق کی بات مکمل سمجھ گئی تھی لیکن سنی ان سنی کر گئی۔ اس کے چہرے کی سرخی سے ظاہر تھا کہ اس کا پارا چڑھ رہا ہے لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ ایک اسمارٹ اور صحت مند جسم رکھتی تھی۔ کل باروندا جیکی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک وقت میں جوڈو کراٹے بھی سیکھتی رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ جوڈو کراٹے میں اسے مہارت تھی یا نہیں مگر اس کے ڈیل ڈول اور تاثرات سے دکھائی دیتا تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت سخت قسم کی جدوجہد کر سکتی ہے۔ بہرحال، ابھی تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہوا تھا اور وہ خود کو قطعی بے بس محسوس کر رہی تھی۔

ہمیں اپنے قریب دیکھ کر وہ جھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے روٹی اتار کر ایک طرف رکھی اور سالن گرم کرنے کے لیے توا اتارنا چاہا۔ جب وہ توا اتار رہی تھی، وہ ایک دم کھسک گیا اور گھوم کر اس کے پاؤں پر آیا۔ وہ چلا اٹھی۔ اور پھر "او گاڈ... او گاڈ" کی گردان کرنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ توے نے اس کے سفید گلابی پاؤں کو متاثر کیا تھا اور انگلیوں سے اوپر کی ساری جگہ سرخ نظر آرہی تھی۔ ماریا کی آوازیں سن کر چوہان اور ہمیش بھی وہاں آگئے۔

چوہان نے اس کا متاثرہ پاؤں دیکھ کر کہا۔ "ماریا کے بیگ میں ایک دواؤں والا شاپر پڑا ہے، وہ لے کر آؤ۔"

ہمیش بیگ کی طرف بڑھا۔ ماریا ایک دم بھڑک کر انگریزی میں بولی۔ "مجھے نہیں چاہیے دوا۔ مجھے نہیں چاہیے تمہاری ہمدردی۔ مجھے مرجانے دو۔ مجھے زہر کا کوئی انجکشن لگا دو تاکہ میری جان چھوٹ جائے۔"

اسحاق پھنکارا۔ "تم ابھی سے گھبرا گئی ہو میم جی!! ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟ ابھی پورا پورا حساب کتاب ہونا ہے اور جو کچھ ہوا ہے یہ تو "حساب" کا عشرِ عشیر بھی نا ہیں۔ بس ایک چھوٹی سی مثال سن لو۔ جس ملازم لڑکے کو تم نے طوطوں کو خوراک نہ دینے کی پاداش میں بھوکا مار دیا تھا، یہ اس کی ایک گھنٹے کی بھوک پیاس کا بدلہ بھی نا ہیں ہے۔"

اس مرتبہ وہ گلابی اردو میں بولی۔ "اسی لیے تو ہام تو م سے کہتا ہے کہ ہام کو مار ڈالو۔ تمہارا سارا ہی بدلہ ایک بار میں پورا ہو جائے۔"

"موت اتنی آسان نا ہیں ہے میم جی۔" اسحاق پھنکارا۔ "میں نے اپنی بہن کو ایک ایک سانس کے لیے تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے، اس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ کیا تم نے کبھی ہانپتی ہوئی پیاسی چڑیا کو دیکھا ہے؟ وہ اسی طرح سانس لیوت تھی۔ اور وہ تھی بھی تو ایک چھوٹی سی چڑیا کی طرح... تمہارے بھائی کی شکرہ آنکھوں نے اسے شکار کے لیے چنا... اور پھر اس کے بے رحم پنجوں نے اس کے جسم کو لہولہو کر ڈالا۔ وہ اس کے پنجوں سے نکلنے کی کوشش کرتے کرتے جیون کی ریکھا ہی پار کر گئی۔ ہاں، میں نے اسے مرتے دیکھا ہے اور میں جانت ہوں کہ جان دینا آسان نا ہیں۔"

اسحاق کے لہجے میں اتنی آگ تھی کہ چاروں طرف انگارے برستے محسوس ہوئے... ماریا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اسحاق پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ وہاں ٹھہرا رہا تو طیش کے دریا میں بہہ جائے گا اور وہ اس طیش کی وجہ سے پٹ جائے گی۔

انور خاں آگے بڑھا اور اس نے ماریا کو بہ مشکل آمادہ کیا کہ وہ اپنے پاؤں پر دوا لگوا لے۔ وہ بُرے بُرے منہ بنا رہی تھی۔ میں اس کے قریب چوکس کھڑا تھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی اور میری انگلی ٹریگر کے آس پاس تھی۔ ماریا کے ہاتھ فی الحال کھلے ہوئے تھے اور یہ امر خارج از امکان نہیں تھا کہ وہ غیظ کے عالم میں کسی پر جھپٹ پڑتی۔ پچھلے چند دن میں ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کی طرف سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

سرنگ کے دور افتادہ کونے سے باروندا جیکی کا واویلا سنائی دے رہا تھا۔ وہ نشے کے بغیر تڑپ رہا تھا اور اس کی وہی تلخی اور جھلاہٹ واپس آچکی تھی جس کا مشاہدہ ہم نے کشتی میں کیا تھا۔

احمر نے آکر مجھ سے کہا۔ "تابش بھائی! تمہارا یار بہت بے چین ہووت ہے۔ وہ کہوت ہے، میں مرنے والا ہوں۔ اگر میں پیاسا مر گیا تو تم سب جہنم میں جاؤ گے۔"

"وہ جس طرح کا پانی مانگ رہا ہے، وہ دے کر بھی تو ہم جہنم میں ہی جائیں گے۔" چوہان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

انور خاں بولا۔ "اس کی پیاس ذرا بڑھنے دو، پھر وہ اندر کی باتیں بتانے پر مجبور ہوگا۔"

میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ شام تک اس کی تڑپ ذرا بڑھ جائے تو پھر اسے "مہیا" کی جائے۔ اندر جیکی کا واویلا تھا

اور باہر ان کتوں کی آوازیں تھیں جو پانڈے اور اسٹیل کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔

شام ہونے سے پہلے ہی میں ایک بار پھر باروندا جیکی کے پاس تھا۔ آج وہ خلافِ معمول دراز ہونے کے بجائے ٹیک لگا کر دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دیتا تھا۔ "جیکی!" میں نے کہا۔ اس نے میری آواز نہیں سنی اور بے حرکت بیٹھا رہا۔

"جیکی... جیکی!" میں نے دہرایا لیکن صورتِ حال جوں کی توں رہی۔

یکایک مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ عدم آباد ہی روانہ نہ ہو گیا ہو۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ وہ جیسے اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کے چہرے پر گہری جھلاہٹ ابھری۔ وہ نہایت تلخ لہجے میں بولا۔ "تم کہاں سے آگئے ہو؟ کیوں ڈسٹرب کیا ہے مجھے؟ دفع ہو جاؤ... دفع ہو جاؤ۔"

"تم مجھے پہچان نہیں رہے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ میں تابش ہوں۔"

"تابش ہو تو میں کیا کروں؟" اس پر بدستور جھلاہٹ سوار تھی۔

"دیکھو، میں یہ کیا لایا ہوں۔" میں نے وہسکی کی چم چم کرتی بوتل لالٹین کے رخ پر رکھ کر اسے دکھائی۔ اس کی تلخی ایک دم گم ہو گئی۔

اس نے آنکھیں موند کر دو تین گہری سانسیں لیں پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں بہت دور گیا ہوا تھا... وہ میرے بہت پاس تھی۔ ہم اس خاموش پانی کے کنارے پر تھے اور وہاں سیکڑوں کنول کھلے ہوئے تھے۔ تم نے... سارا طلسم توڑ دیا..." شاید وہ مایوس لہجے میں کچھ اور بھی کہتا مگر پھر اس کی نظر بوتل پر پڑ گئی۔ اس کے خشک ہونٹوں پر پیاس نمایاں ہونے لگی۔

"تم کس طلسم کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"محبت کے طلسم کی!" اس نے رواں انگریزی میں کہا۔ "جب میں بہت تنہا ہوتا ہوں... دکھ کی آخری حدوں کو چھو رہا ہوتا ہوں، وہ میرے پاس چلی آتی ہے۔ اسی لباس میں جس میں، میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا... اور اسی لباس میں جس میں وہ سات آٹھ روز میرے ساتھ کشتی پر رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور سرسبز جنگل میں پانی کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیتی ہے۔ ہنستی ہے اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ پھر وہ اپنا وزن میری بانہوں پر ڈال کر لہراتی ہے۔ اس کے بال بہت لمبے ہیں... وہ کسی سیاہ آنچل کی طرح ہوا میں جھومتے ہیں اور مچلتے ہیں۔ اس کے رخساروں پر کرنیں موتی بکھیرتی ہیں اور اس کی شربتی آنکھوں میں پھولوں اور تتلیوں کے سارے رنگ اتر آتے ہیں۔ وہاں فطرت کے سوا ہمیں کوئی نہیں دیکھتا اور فطرت بھی ہماری ہم مزاج ہو جاتی ہے۔ رات کی پھیلتی ہوئی چادر میں ہم اپنی کشتی کے اندر چلے جاتے ہیں اور اتنا قریب ہو جاتے ہیں کہ... محبت کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا..."

"مجھے افسوس ہے دوست کہ میں نے تمہیں تمہارے تصور سے دور کر دیا۔" میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں۔ اس کو تصور مت کہو۔ یہ تو حقیقت سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ میں اس کے جسم اور لباس کی خوشبو اپنے آس پاس محسوس کرتا ہوں... جیسے اب۔ میں اسے سونگھ سکتا ہوں۔ میں اس کو سونگھ رہا ہوں۔" اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے اپنی سانس اندر کی طرف کھینچی۔

شاید وہ اس بارے میں کچھ دیر مزید بات کرتا لیکن اب شراب کو اپنے سامنے دیکھ کر اس سے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہی روز والا عمل پھر شروع ہوا۔ میں وہ سیال آتش گلاس میں بھر بھر کر اسے دیتا رہا اور وہ یہ تلخ بدلو اپنے گلے میں اتارتا رہا۔ آخر اس کا نشہ پختہ ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ اور ناتوانی ختم ہونے لگی۔ مدقوق چہرے پر برسنے والی ازلی جھلاہٹ کی جگہ ایک طرح کے سکون نے لے لی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، ایک بار پھر اپنی کشتی کو یاد کرنے لگا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا، تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اب یہاں کی صورتِ حال کو بھی کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم حکم اور جارج کے باغیوں کی حیثیت سے یہاں اس سرنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

جلد ہی میں گفتگو کا رخ کل والے موضوع کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ حقیقت ہے کہ مارشل آرٹ کے حوالے سے اس نامور کھلاڑی کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ "ماسٹر کھلاڑی" عام لوگوں کی طرح جسمانی تکنیک اور داؤ پیچ کے بجائے ذہنی کیفیت اور دماغی توانائی پر زور دیتا نظر آتا تھا۔

وہ بیساکھی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ ہیڈ بیگ ہمارے سامنے تھا۔ وہ ایک بار پھر مجھے مختلف ٹپس دینے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے عملی مشق بھی کرا رہا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ مجھے

سے ماضی کی برف پگھل رہی ہو اور یادوں کے جھرنے بہہ رہے ہوں۔

وہ گنگناتا رہا... پھر اس کی آواز دوبارہ مدھم ہو گئی اور وہ دھیرے دھیرے سو گیا۔

اگلی صبح ایک بالکل غیر متوقع بات ہوئی۔ انور خاں کی دی ہوئی ڈیڈ لائن ختم ہونے سے پہلے ہی رنجیت پانڈے درختوں کے جھنڈ میں پہنچا اور اس نے بہ آوازِ بلند پکار کر انور خاں سے کہا کہ وہ بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔

انور خاں نے کہا۔ ''بات چیت بہت ہو چکی ہے۔ اب ہمیں صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں مطالبات منظور ہیں یا نہیں؟''

''یہی بتانے کے لیے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں۔'' پانڈے کی پاٹ دار آواز آئی۔

''کون آیا ہے؟'' انور خاں نے پوچھا۔

''میں ہوں مراد شاہ... تل پانی سے۔'' ایک گونجتی ہوئی آواز ابھری۔

ایک دم میرے ذہن میں روشنی سی چمکی۔ مجھے یاد آیا کہ یہ نام میں نے چرواہے نریندر سنگھ اور انور وغیرہ کی گفتگو میں سنا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ تل پانی میں مراد شاہ کی حیثیت چھوٹے سرکار کے مشیرِ خاص اور دستِ راست کی ہے اور اب یہی مراد شاہ یہاں بات چیت کے لیے موجود تھا۔

''السلام علیکم شاہ صاحب! ہمیں امید نہیں تھی کہ ہم یہاں آپ کی آواز سنیں گے۔'' انور خاں نے بلند آواز میں کہا۔

''اور مجھے بھی امید نہیں تھی کہ مجھے یہاں آکر اس طرح تم سے بات کرنی پڑے گی۔''

''دیکھیں شاہ صاحب! یہاں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی بھی راج بھون کے ستم سے محفوظ نہیں رہا۔ وہاں تل پانی میں سلطانہ نے آپ کے سامنے دہائی دی تھی کہ اگر اسے واپس زرگاں بھیجا گیا تو اس کی جان اور عزت کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اور دیکھ لیں شاہ صاحب... ویسا ہی ہوا ہے۔''

''یہ تو تمہارا بیان ہے انور خاں! اصل حقیقت تو تحقیق کے بعد ہی سامنے آئے گی... اگر واقعی کسی نے قانون توڑا ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے لیکن تم اور تمہارے ساتھی جو کچھ کر رہے ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ تم ایک بے گناہ لڑکی کو پکڑ کر یہاں لے آئے ہو۔ اس کو اذیت دے رہے ہو۔ یہ صورتِ حال کسی کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس طریقے سے انصاف کرنے کی ریت چل پڑی تو پھر یاد رکھو کہ کسی کی جان اور عزت محفوظ نہیں رہے گی۔'' مراد شاہ کا لہجہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے چرواہے نریندر کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ چھوٹے سرکار کو ہمارے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا پڑے گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ انہوں نے واقعی سخت رویہ اپنا لیا ہے۔

انور خاں نے کہا۔ ''شاہ صاحب! ہم نے انصاف اور قانون کا دروازہ بہت کھٹکھٹا لیا۔ اب ہم اور برداشت نہیں کر سکتے۔ اب پانی سر سے گزر گیا ہے جی۔ اب اینٹ کا جواب پتھر سے اور پتھر کا گولی سے ملے گا۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔''

''اگر تمہارا یہ فیصلہ ہے تو پھر ہمارا فیصلہ بھی سن لو۔'' مراد شاہ کی غصیلی آواز ابھری۔ ''ہم کو اس معاملے میں حکم کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونا پڑے گا اور اگر تم لوگ اپنی ہٹ پر قائم رہے تو ہم نے جن لوگوں کو تل پانی میں پناہ دی ہے، وہ بھی ہماری پناہ میں نہیں رہیں گے۔''

''تو آپ بھی ظلم کے آگے جھکنا شروع ہو گئے ہیں۔ میں اسے موقع پرستی کہوں یا کچھ اور؟''

''تم ہر حد توڑ رہے ہو انور خاں! تمہیں اس کے لیے پچھتانا پڑے گا۔''

''ہم تو یہ سمجھے تھے شاہ صاحب کہ آپ حق کا ساتھ دینے کے لیے آئے ہیں۔ آپ ہماری بات سنیں گے اور دوسروں کو بھی سمجھائیں گے۔''

''میں اب بھی تمہاری بات سننے کو تیار ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں پہلے مسز اسٹیل کو چھوڑنا ہوگا۔''

''آپ پہلے ہماری پوری بات سن لیں۔ اس کے بعد بھی اگر آپ نے ہمیں قائل کر لیا تو میں خود اور اپنے سارے ساتھیوں کی طرف سے بھی عہد کرتا ہوں کہ ہم اس لڑکی کو چھوڑ دیں گے۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی، پھر طے ہوا کہ مراد شاہ ہم سے بات کرنے کے لیے اور ماریا کو صحیح سلامت دیکھنے کے لیے سرنگ کے اندر آئے گا۔ رنجیت پانڈے، شاہ صاحب کے ساتھ ایک اور شخص کو بھی بھیجنا چاہتا تھا لیکن انور خاں اور اسحاق نے سختی سے منع کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد مراد شاہ اندر آ گیا۔ مراد شاہ درمیانے قد اور درمیانی عمر کا بارعب... شخص تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں کچھ بال سفید بھی نظر آتے تھے۔ اس نے سفید شلوار قمیص اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر انور خاں کی آنکھوں میں معنی خیز چمک آ گئی۔ مراد شاہ کی آنکھوں میں بھی دوستانہ چمک تھی۔ بہر حال، ماریا بھی یہاں موجود تھی، اس کے سامنے

شاید مراد شاہ محتاط رہنا چاہتا تھا۔

سرنگ کے ایک علیحدہ گوشے میں انور خاں، فیروز، چوہان اور مراد شاہ کے درمیان بات چیت ہوئی۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ مراد شاہ نے کہا۔ ''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ سب سے پہلے وہ کام کرو جو سب سے ضروری ہے۔ اس گواہ کو یہاں لاؤ جو ہارون کے قتل کے سلسلے میں گواہی دینا چاہتا ہے۔''

انور خاں نے فیروز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہ ہے... آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔''

مراد شاہ نے اپنی بھاری پلکیں اٹھائیں اور غور سے فیروز کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی سفید قمیص کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال لیا۔ یقیناً یہ ٹیپ ریکارڈر، بیٹری سیل سے چلتا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ اب ساری پلاننگ سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں آکر مراد شاہ نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ ایک تو سرجن اسٹیل وغیرہ کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ ماریا کے اغوا کو قابلِ مذمت سمجھتے ہیں اور اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ فیروز کا وہ بیان بھی لینا چاہ رہے تھے جو چھوٹے سرکار کے سامنے سلطانہ کو بے گناہ ثابت کر کے موہن کمار کو اپنے ہی دیرینہ ساتھی کا قاتل ثابت کر سکتا تھا۔

مراد شاہ نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور فیروز سے پوچھا۔ ''تم مقتول ہارون کو کیسے جانتے ہو؟''

''میں اس کو نہ جانوں گا تو اور کس کو جانوں گا؟ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہم اکٹھے جوان ہوئے، ہم نے اکٹھے ''حکم'' کی ملازمت کی۔ وہ گھڑ سوار محافظوں میں شامل تھا، میں راج بھون میں کام کرتا تھا لیکن ہم ہر دکھ سکھ میں شریک تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن ہارون کو اس کے اپنے ہی ساتھی ''حکم'' کے کہنے پر جان سے مار ڈالیں گے۔ انہوں نے صرف سلطانہ کو پھنسانے کے لیے اتنا بڑا اپرادھ کیا۔ میں ہر جگہ اور ہر وقت اس حرامزادے موہن کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔''

''تم نے ہارون کو قتل ہوتے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا؟''

''لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ تب تک میں حکم کا باغی نہیں بنا تھا بلکہ حکم کے خاص ملازموں میں شامل تھا۔ جو لوگ ہارون کے قتل میں موہن کے ساتھ شامل تھے، میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی ہیں اور اس قتل کی ساری تفصیل جانی ہے۔''

زخمی فیروز اور مراد شاہ کے درمیان چار پانچ منٹ تک سوال جواب ہوئے اور فیروز کا مکمل بیان ریکارڈ ہو گیا۔

مراد شاہ کے چہرے پر اطمینان کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''یہ بیان بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔''

انور خاں نے کہا۔ ''آپ ہمیں اس صورتِ حال کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ ہم نے ان لوگوں کو آج دوپہر ایک بجے تک کا الٹی میٹم دیا ہے۔''

مراد شاہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر بات بنتی ہے تو بنا لینی چاہیے۔ صورتِ حال ایسی ہے کہ کسی بھی وقت معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہے، ماریا عورت ذات ہے۔ اس کے یرغمال بنائے جانے کی وجہ سے تل پانی میں بھی کچھ لوگ تشویش ظاہر کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکم جی اور جارج کی حمایت بڑھ بھی سکتی ہے۔''

''لیکن لوگوں کو سلطانہ والا معاملہ بھی تو نظر آنا چاہیے... اور اب تو فیروز کے بیان کے بعد بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ سلطانہ کے معاملے میں سراسر ظلم ہوا ہے۔''

''وہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔'' مراد شاہ نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ ''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں نے بھی ایک عورت کو ہی یرغمال بنایا ہے اور یہ عورت... سلطانہ والے معاملے میں بے قصور ہے۔''

''مگر وہ بہت سے دوسرے معاملوں میں نردوش نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔'' اسحاق بھڑک کر بولا۔ ''یہ ظالم عورت ہے اور اس کا بھائی اس سے بڑھ کر ظالم ہے۔ وہ میری بہن کا قاتل ہے اور اس طرح کے کئی ظلم اس گھرانے کے کھاتے میں ہیں۔ ہم اپنے کسی مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اگر یہ لوگ نہیں مانیں گے تو پھر یہ میم قتل ہو گی اور بہت برے طریقے سے ہو گی۔''

''لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟'' مراد شاہ نے قدرے برہم انداز میں کہا۔ ''تم سب لوگوں کو تو مار ہی دیا جائے گا۔ اس کے بعد تم سے رشتہ ناتا رکھنے والوں پر بھی بڑا سخت وقت آئے گا۔ بہت خون بہے گا۔''

انور خاں نے گہری سانس لی اور اس کے چہرے پر وہی ہلکی سی آسودگی پھیل گئی جو ایک دم کشیدہ ماحول کو تبدیل کر دیتی تھی۔ وہ ہولے سے بولا۔ ''لیکن میرا خیال ہے شاہ صاحب... یہ لوگ ماریا کی موت کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لیں گے۔ انہیں مطالبات ماننے ہی پڑیں گے۔''

''اپنی جگہ تم بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔'' مراد شاہ

بولا۔ ”جارج اور اس کے بہنوئی اسٹیل اور ان کے ساتھیوں کو ماریا کی موت کسی طور بھی قبول نہیں ہوگی لیکن زرگاں میں ہی کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک ماریا اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی وہ پچاس بندے رکھتے ہیں جن کو تم رہا کرانا چاہتے ہو۔ یہ لوگ کوئی بھی ایسی چال چل سکتے ہیں جس سے سب کچھ ختم ہو جائے۔“

انور خاں کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ بہرحال، وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں؟“

”میں گرد موداں وغیرہ کی بات کر رہا ہوں۔“ مراد شاہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”گرد موداں اور دیگر گرد اندر خانے جارج گورا سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ خاص طور سے جب سے پگوڈا میں آگ والا واقعہ ہوا ہے۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ زرگاں میں پگوڈا کے بڑے پجاریوں اور جارج کے کارندوں میں چپقلش چلتی رہتی ہے۔“

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ انور خاں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میرے نزدیک گرد موداں اور رنجیت پانڈے کی یہاں موجودگی ایک خاص مطلب رکھتی ہے۔ جہاں تک گرد موداں کو میں جانتا ہوں، وہ ایک بہت ہی گہرا بندہ ہے۔ اس کے اندر جھانکنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ وہ بندے کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتا ہے۔ رنجیت پانڈے سے بھی اس کی دوستی ہے اور رنجیت پانڈے تو ویسے بھی بکاؤ شخص ہے۔ جو اس کی مطلوبہ قیمت دے دے، وہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو سکتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ گرد موداں اور پانڈے یہاں کوئی اپنا کھیل کھیل سکتے ہیں؟“ فیروز نے پوچھا۔

”یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ یہاں اسٹیٹ کی سیاست میں سب کچھ چلتا رہا ہے اور اب بھی چل رہا ہے۔“

”لیکن... شاہ صاحب... ماریا کا شوہر اسٹیل یہاں خود موجود ہے۔ موہن کمار جیسے لوگ بھی ہیں۔ کیا وہ گرد موداں کو کوئی چال چلنے دیں گے؟“

”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ضرور ہی کوئی چال کھیلی جائے گی، میں صرف ایک امکان بتا رہا ہوں۔ فرض کرو اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بھی رنجیت پانڈے تو یہاں موجود ہے نا... اور جہاں یہ خبیث موجود ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی مار دھاڑ تو ضرور ہوتی ہے۔ اس بندے کے تو خمیر میں ہی خون اور بارود شامل ہے۔ اس کی عیاری بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔“

مراد شاہ نے اپنی آواز مزید دھیمی کی اور بولا۔ ”میری یہ بات ذہن میں رکھ لو... جب تک پانڈے یہاں موجود ہے، تم کسی معاملے کو بھی آسان نہیں لے سکتے۔ تمہیں ہر سیکنڈ اپنے کان اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنا پڑیں گی۔ یہ کوئی نہ کوئی کارستانی ضرور کرے گا۔“

”تو کر لے کارستانی۔ اس کی جو کارستانی بھی ہوگی، وہ میم کے جیون کی قیمت پر ہووے گی۔“ اسحاق آتش بار لہجے میں بولا۔

دو چار منٹ تک مراد شاہ سے ہماری بات چیت مزید جاری رہی۔ پھر وہ باہر چلا گیا۔ اس گفتگو کا اختتام اس امر پر ہوا کہ انور خاں نے اپنی دی ہوئی ڈیڈلائن کل رات آٹھ بجے تک بڑھا دی۔

☆☆☆

مراد شاہ نے جو کچھ کہا تھا، اس نے ہمیں مزید چوکس کر دیا۔ رنجیت پانڈے کی عیاری اور سفاکی کی جو کہانیاں میں سن چکا تھا، اس کے بعد اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ عمران مجھے ہر بات پر یاد آتا تھا۔ پانڈے کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی بار بار یاد آیا۔ پانڈے جیسے خطرناک ترین لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا عمران کا شوق تھا۔ اگر عمران یہاں ہوتا تو شاید وہ پانڈے کا بہترین حریف ثابت ہوتا۔ وہ رات میں نے پھر باروندا جیکی کے ساتھ گزاری۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا اب مجھے اچھا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرا روحانی استاد ہے۔ وہ مجھے مارشل آرٹ کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں بتا رہا تھا جو مجھے کسی کتاب میں نہیں مل سکتی تھیں، نہ کوئی شخص انہیں اپنے تجربے کا حصہ بنا سکتا تھا۔ خاص طور سے وہ مجھے جسمانی درد برداشت کرنے کے حوالے سے جو کچھ بتا رہا تھا، وہ نایاب تھا۔

یہ اس رات دو ڈھائی بجے کی بات ہے۔ جیکی سے ملاقات کے بعد میں دہانے کے قریب واپس آ گیا تھا اور ہیمش کے برابر لیٹ گیا تھا۔ میں غنودگی کی حالت میں تھا، جب اچانک مجھے ایک نامانوس بو محسوس ہوئی۔ یہ اسپرٹ... جیسی... کوئی تیز اثر بو تھی۔ دفعتاً میرے ذہن میں کھٹکی سی بج گئی۔ ایک اندیشہ خوفناک انداز میں چنگھاڑتا ہوا میرے دماغ میں گھس آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ الفاظ ذہن میں گونجے جو آج صبح مراد شاہ نے یہاں سرنگ میں ہمارے سامنے کہے تھے۔ اس نے رنجیت پانڈے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پانڈے یہاں موجود ہو اور وہ نچلا بیٹھا رہے۔ مراد شاہ نے وارننگ دی تھی کہ ہمیں اس کی طرف سے بہت زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔

میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور لالٹین کی لو اونچی کی۔ ہیمش بھی اٹھ بیٹھا تھا اور نتھنے پھیلا کر بو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”یہ کیسی بو ہے؟ کہیں کوئی گیس وغیرہ تو ناہیں؟“ وہ پریشان لہجے میں بولا۔

”ماریا کہاں ہے؟“ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

ماریا اپنی جگہ پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے رائفل اٹھائی اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔ ذہن میں یہ خیال برق کی طرح کوندا تھا کہ کہیں سرنگ کے اندر کوئی گیس وغیرہ تو نہیں چھوڑی گئی۔ دہانے کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی پھر چوہان بھی رائفل بدست وہاں آن موجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی ٹارچ تھی۔

”یہ بو کیسی ہے؟“ اس نے بھی وہی سوال کیا۔

اسی دوران میں سرنگ کے ایک گوشے سے شاں شوں کی مدھم آواز آئی۔ اسحاق بھی جاگ گیا تھا۔ وہ اس تاریک گوشے کی طرف لپکا اور چند سیکنڈ بعد ماریا کو کھینچتا ہوا روشنی میں لے آیا۔ ”حرامزادی... الو کی پٹھی... تو خود چین سے بہوت ہے نہ ہمیں رہنے دیوت ہے۔“ اس نے اسے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔

ماریا کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں میں ایک ٹن اسپرے تھا۔ اسپرے کی اسی بوتل سے نکلنے والے کیمیکل کی بو نے ہم سب کو بری طرح چونکایا تھا۔ یہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی صورت حال تھی۔ یہ ایک مچھر مار ٹائپ کا اسپرے تھا جو ماریا کے سامان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

”یہ کیا کر رہی تھی؟“ اسحاق نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

”ہام یہاں ناہیں رہ سکتا۔ یہاں بہت زیادہ کیڑا ہے۔ ہر طرح کا INSECTS ہے۔ ہام کا ہاتھ پاؤں سوج گیا۔“ وہ طیش میں بولی۔

”تم یہیں رہوگی جہاں ہم سب رہتے ہیں۔ تم آسمان سے ناہیں اتریں۔ ہماری ہی طرح گوشت پوست سے بنی ہوئی ہو۔“ اسحاق پھنکارا۔

”ہام سے ناہیں رہا جاتا۔“ وہ کراہی۔

”تم سے رہا جاوے گا۔ جس طرح تم کو روٹی پکانا آ گئی ہے، مٹی کے پیالے میں پانی پینا آ گیا ہے اور کوئلے سے دانت صاف کرنا آ گئے ہیں، اسی طرح تم کو رہنا بھی آ جاوے گا۔“ اسحاق نے مچھر مار اسپرے اس کے ہاتھوں سے چھین کر دور پھینک دیا۔

”ہام یہاں ناہیں رہے گا۔ چاہے تو ہام کو شوٹ کر دے۔“ وہ دہاڑی اور اس نے سرنگ کے عقبی حصے میں جانے کی کوشش کی۔

اسحاق اور احمد نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اسحاق نے اسے دو طمانچے مارے اور گھسیٹتا ہوا واپس لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب میں سے کراری دار چاقو نکال کر کھول لیا تھا۔ وہ پھنکارا۔ ”اگر اپنے باپ کی ہے تو اب قدم اٹھا کر دکھا۔ سیدھا تیرے جگر میں یہ چاقو نہ ڈال دیا تو میرا نام اسحاق ناہیں۔“

اسحاق کے لہجے میں کچھ ایسی آتش تھی کہ ماریا کا جوش و خروش ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔

احمد بولا۔ ”بہتر تو یہ ہے کہ اس کے پاؤں میں ڈھیل نہ چھوڑی جاوے۔ رات کے وقت پاؤں کس کر باندھ دیے جاویں تاکہ یہ چل ناہیں سکے۔“

”اب کوئی حرکت کرے گی تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“ اسحاق نے کہا۔

اسی دوران میں ماریا نے پھر چلانا شروع کر دیا۔ وہ اچھل رہی تھی۔ کبھی دائیں ہو رہی تھی، کبھی بائیں۔ اس کے پاؤں پر سے کوئی چھپکلی گزر گئی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ ڈانس کرنے والی کیفیت میں نظر آئی۔ پھر وہ جیسے اچھل کر ایک پتھر پر چڑھ گئی۔ اس پتھر کے اردگرد تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے گی لیکن یہ پتھر چھوٹا سا تھا۔ اس پر بس کھڑا ہی ہوا جا سکتا تھا اور وہ کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں طیش آمیز بے بسی تھی۔

”بالکل ٹھیک ہے۔ اسی طرح کھڑی رہو اور کھڑی کھڑی اکڑ جاؤ۔“ اسحاق نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا دہانے کی طرف چلا گیا۔

وہ کھڑی رہی اور غصے میں بڑبڑاتی رہی۔ وہ نہایت قیمتی جینز اور شرٹ میں تھی۔ یہ لباس اس کے سامان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اب یہ کپڑے مٹی اور کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جارج گورا کی بہن نے ڈیڑھ دو ہزار ڈالرز کا لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے بال جو اغوا کی رات ریشم کی طرح ملائم اور سلک کی طرح چمک رہے تھے، اب گھونسلے کی شکل اختیار کر چکے تھے اور اس گھونسلے کے نیچے اس کی صورت بھی اجڑی بجڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بالکل عام لڑکی نظر آنے لگی تھی۔ مجھے عمران کی کہی ہوئی ایک بات یاد

آ گئی۔ ایک روز میڈم صفورا کی چھوٹی بہن میڈم نادیہ کے ناز نخرے دیکھ کر اس نے کہا تھا... اس لڑکی کی چمک دمک میں پچھتر فیصد حصہ اس کی دولت اور حیثیت کا ہے۔ اگر یہی نادیہ کسی کھولی ریڑھی پر بیٹھ کر جھگیوں میں سے نکلے تو اس کے مقابلے میں اس کی کھولی زیادہ خوب صورت نظر آئے۔ اور یہ کوئی نادیہ کی بات ہی نہیں ہے، اکثر امیر کبیر لڑکیاں خوب صورتی میں بس کھولی کے آس پاس ہی ہوتی ہیں۔ میں نے کہا تھا... بھئی، یہ تو امیر کبیر لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہ جھٹ بولا تھا... اور میں سمجھتا ہوں یہ کھوتیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ گدھا برادری اس کا بُرا مان سکتی ہے لیکن میں سب امیر لڑکیوں کی بات تو نہیں کر رہا۔ بس ایکسٹرا ماڈرن اور فیشن زدہ بیبیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

عمران کی کہی ہوئی باتیں ایسے ہی میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔ وہ جب بھی یاد آتا تھا، اپنے ساتھ میرے لیے ندامت و پشیمانی کا ایک بہت بڑا ریلا لاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اس کا قاتل ہوں اور ہزار ہا ملامتی نگاہیں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔

صبح جب ہم ناشتا کر رہے تھے، ایک عجیب واقعہ ہوا۔ دہانے سے کچھ فاصلے پر کتوں کا شور سنائی دیا۔ یہ وہی کتے تھے جو حکم کے اہل کاروں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ان کی آوازیں اکثر و بیشتر سنائی دیتی رہتی تھیں۔ لیکن آج یہ آوازیں دہانے کے عین سامنے قریباً ساٹھ ستر میٹر کی دوری سے آ رہی تھیں۔ انور خاں، احمد اور میں اپنی اپنی پوزیشن پر بیٹھے تھے۔ اچانک میں نے انور خاں کو چونکتے دیکھا۔ اس کی نگاہ دور جنتر اور کیکر کے درختوں پر مرکوز تھی۔ ہم نے دیکھا، دیو ہیکل بُو گیر کتے تیزی سے کسی چیز کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ان کا رخ دہانے کی طرف ہی تھا۔ وہ جس چیز کا پیچھا کر رہے تھے، وہ کوئی چھوٹا جانور تھا جو تیزی سے بار بار سمت بدل رہا تھا۔

دفعتاً ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کتے سیدھے سرنگ کی طرف ہی آ رہے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔

''اوہو... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' انور خاں کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اس کی انگلی ٹریگر پر تھی لیکن وہ فیصلہ ہی نہیں کر سکا کہ گولی چلائے یا نہیں۔ اور جب انور خاں خود فیصلہ نہ کر سکا تو ہم کیسے کرتے؟ قریباً نصف درجن خوں خوار کتے سماعت شکن شور برپا کرتے سیدھے سرنگ میں گھس آئے۔ وہ جس چیز کا تعاقب کر رہے تھے، اس کی ہلکی سی جھلک ہم نے دیکھی۔ وہ جنگلی ہرن کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ سیدھا سرنگ کے اس قدرتی چیمبر میں گھسا جہاں ہم نے بستر بچھا رکھے تھے۔ شکاری کتے اس پر جا پڑے، وہ بُری طرح زخمی ہوا۔ ہمیں اس کا پھٹا ہوا پیٹ نظر آیا۔ اسی حالت میں وہ گھوما اور ہماری پوزیشنوں کی طرف آیا۔ اب ہمارے لیے بے حرکت رہنا مشکل تھا۔ میری اور انور خاں کی رائفلوں سے ایک ساتھ شعلے نکلے۔ دو کتے قلابازیاں کھا کر گرے۔ باقی کتوں نے ننھے سے جانور کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ ماریا چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور دیوانہ وار چلا رہی تھی۔ سرنگ میں ایک ادھم کہرام سا مچ گیا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب دہانے کے عین سامنے فائرنگ شروع ہو گئی۔ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر حکم کے مسلح اہل کاروں نے ہلا بول دیا تھا۔

''گولی چلاؤ۔'' انور دہانے کی طرف رخ کر کے دہاڑا۔

میں نے دیکھا، دو افراد جھک کر بھاگتے ہوئے دہانے کے عین سامنے پہنچ گئے تھے۔ وہ جدید رائفلوں سے فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ میں نے احمد کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ ایک دوسری گولی چوہان کے کندھے میں لگی اور رائفل اس کی گرفت سے چھوٹ کر دور جا گری۔ یہاں انور خاں کی مہارت اور اس کے اعتماد کی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس دوسرا موقع نہیں ہے۔ اگر اس کا نشانہ خطا گیا تو حملہ آور بھاگتے ہوئے سرنگ میں گھس آئیں گے۔ اس نے اپنی اسنائپر گن سے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ قریباً بیس میٹر کی دوری پر دونوں حملہ آوروں کے سروں میں گولیاں لگیں اور وہ اپنے بلاوے میں دور تک لڑھک گئے۔ یہ واقعی بڑے خطرناک لمحے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، دونوں حملہ آوروں نے جدید بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ اگر ان کے سروں میں گولی نہ لگتی تو وہ اندر آنے میں کامیاب ہو جاتے۔

دو افراد کے گر جانے سے پیچھے آنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ انہوں نے سیدھا دہانے کی طرف آنے کے بجائے دائیں بائیں پوزیشن لے لی۔ فیروز زخمی ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ مل کر فائرنگ کر رہا تھا۔ چند گولیاں اس کے سر کو چھوتی ہوئی گزریں تو اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کرنی چاہی۔ یہ فیصلہ غلط نکلا۔ دہانے کے عین سامنے سے وہ ''ہٹ'' ہو گیا۔ میں نے اسے سینے پر گولی کھا کر مردہ ہرن کے اوپر گرتے دیکھا۔ دو شکاری کتے تو سرنگ سے باہر نکل گئے تھے۔ دو تین سرنگ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے تھے اور ان کی آوازوں سے ایک پُرہول گونج پیدا ہو رہی تھی۔

اسحاق نے ماریا کو زمین پر گرا کر رائفل کی نال اس کی پیشانی [illegible] کبھی بھی اسے شوٹ کر سکتا تھا لیکن پھر یہ ہنگامہ جس طرح اچانک شروع ہوا تھا، اسی طرح آناً فاناً ختم ہو گیا۔ فائرنگ تھم گئی۔ کتوں کی دور افتادہ آوازوں کے سوا کوئی آواز باقی نہ رہی۔

ہم اپنی پوزیشنوں پر پوری طرح چوکس تھے۔ ہم نے انگلیاں ٹریگر پر رکھی ہوئی تھیں اور دہانے کے سامنے ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی حرکت کا نوٹس لے رہے تھے۔

اسحاق دہاڑا۔ ''یہ اس طرح نہیں مانیں گے۔ اس حرامزادی کے ٹکڑے کر کے باہر بھیجنا شروع کرو۔ اور پہلا ٹکڑا میں کرتا ہوں، ابھی کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا خوفناک پھل کا کراری دار چاقو نکال لیا۔

انور خاں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن دو منٹ ٹھہر جاؤ۔

فائرنگ تھم گئی تھی پھر بھی خطرہ موجود تھا۔ میں اور ہمیش نیچے جھک کر دوڑتے ہوئے فیروز کے پاس پہنچے۔ گولی اس کی چھاتی پر بائیں طرف لگی تھی۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ہم نے اسے اٹھا کر فائرنگ کی رینج سے ہٹایا اور ایک چٹائی پر لٹا دیا۔ چوہان حالانکہ خود بھی زخمی تھا تاہم وہ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ ہم نے فیروز کو پانی پلایا جو اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔

''کچھ ہو سکتا ہے؟'' میں نے لرزاں آواز میں چوہان سے پوچھا۔

اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر شدید کرب تھا۔

فیروز کی نگاہیں ہم پر جمی تھیں۔ یہ نگاہیں زندہ تھیں لیکن بتدریج بے جان ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ احمد کی طرف دیکھ کر بہت نحیف اور شکستہ آواز میں بولا۔ ''اگر... کبھی... اکبر سے ملاقات ہو تو... اسے بتا دینا... میری ماں مسلمان تھی... میں مسلمان ماں کا بیٹا ہوں۔''

احمد نے اشک بہاتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فیروز کی آنکھیں تارا ہو گئیں۔ ہم نے اس کے چہرے پر کپڑا ڈال دیا...

اسحاق قریباً تیس فٹ کے فاصلے سے فیروز کی موت کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا غیظ و غضب انتہا کو پہنچ گیا۔ وہ چنگھاڑنے لگا اور ماریا کو زدوکوب کرنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسحاق کا ہاتھ کسی نے نہیں روکا۔ صدمے نے سب کو جکڑ رکھا تھا... اگر ذرا گہرائی سے دیکھا جاتا تو فیروز کی موت میں ماریا بھی حصے دار تھی۔ چند دن پہلے اس نے فیروز پر گولی چلائی تھی جو اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ آج لڑائی کے دوران میں اسی زخمی ٹانگ کی وجہ سے فیروز تیزی سے حرکت نہیں کر پایا تھا۔ بہرحال، یہ بات تو اٹل حقیقت تھی کہ آج اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے جو ناشتا اس نے کیا تھا، وہ آخری تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں جو کچھ ہوا، وہ اتنا اچانک اور تیز رفتار تھا کہ کوئی اس کا راستہ نہ روک سکا... اور شاید ڈاکٹر چوہان کے علاوہ کوئی اس کا راستہ روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ ماریا کے لیے اب کسی کے دل میں ہمدردی کی رمق موجود نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اسحاق نے بے رحمی سے اس کے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت جڑ سے کاٹ ڈالی تھی۔ اب ماریا چلا رہی تھی اور اس کے ہاتھ کا زخم تیزی سے خون اگل رہا تھا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔

اسحاق نے جنونی انداز میں کٹی ہوئی انگلی ماریا کی آنکھوں کے سامنے لہرائی اور پھنکارا۔ ''... ہاں یہی انگلی تھی نا جس سے تو نے فیروز پر گولی چلائی تھی۔ یہی تھی نا؟ یہ انگلی ہے ہی کاٹنے جانے کے قابل... یہی ہم جیسے غریبوں پر گولی چلاوت ہے... ہمیں اپنے اشاروں پر نچاوت ہے... ہم... ہم اب ایسی ساری انگلیوں کو کاٹ دیویں گے۔''

چلا چلا کر ماریا کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اس پر غشی طاری ہو گئی۔ پتا نہیں کہ ایسا تکلیف کے سبب ہوا تھا یا کٹی ہوئی انگلی دیکھنے کے بعد اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑا تھا۔

اسحاق نے کٹی ہوئی خون آلود انگلی انور خاں کے سامنے پھینکی۔ ''انور بھائی! یہ پہلا چھوٹا سا نذرانہ بھیجو اس حرامزادی کے پتی کو... اور ساتھ ہی بتاؤ اس کو کہ یہ ایک چھوٹی سی جھلک ہے اس ظلم کی جو ابھی ان کو دیکھنی ہے۔'' اسحاق کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

میں نے انگلی کو دیکھا۔ جب یہ جسم کے ساتھ تھی تو خوب صورت لگتی ہوگی، اب علیحدہ ہو کر کریہہ المنظر ہو گئی تھی۔ جڑ کی طرف سے اس کے ساتھ تھوڑی سی کھال لٹک رہی تھی۔ ناخن لمبا تھا اور اس پر گلابی پالش لگی ہوئی تھی۔ اس کے گرد ایک مکھی چکرا رہی تھی، شاید بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اسحاق نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ بااختیار اور طاقتور طبقے کی اسی انگلی نے اس کرۂ ارض پر زندگی کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ یہ انگلی ٹریگر دباتی ہے... پورے پورے

ملک... اور پورے پورے خطے خاک وخون میں لتھڑ جاتے ہیں۔ حالتِ امن میں بھی یہ انگلی ایک خوفناک دھمکی کی صورت ٹریگر پر دھری رہتی ہے اور خلقِ خدا کی ناتوانی سے خراج وصول کرتی رہتی ہے۔

ڈاکٹر چوہان کے کندھے پر گولی لگی تھی۔ تاہم اطمینان کی بات یہ تھی کہ گولی کندھے کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی۔ چوہان نے اپنے زخم کو دوسرے ہاتھ سے دبایا ہوا تھا تاکہ خون کا زیادہ اخراج نہ ہو۔ احمد کو گولی کے بجائے کارتوس کا موٹا چھرّا لگا تھا۔ یہ چھرّا اس کے بازو کے اندر ہی تھا۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر صاف نظر آتے تھے۔ اگلے پانچ دس منٹ میں دونوں زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی۔ اگر ان میں ماریا کو بھی شامل کرلیا جاتا تو زخمیوں کی تعداد تین تھی۔ فیروز کی چادر سے ڈھکی ہوئی لاش ہمارے سامنے تھی اور یہ لاش ہم سب کے ذہنوں میں چنگاریاں بکھیر رہی تھی۔ اب واقعی کچھ کرگزرنے کو دل چاہتا تھا۔

حکم کے جن دوگارڈز کو انور خاں نے دہانے کے عین سامنے اپنے باکمال نشانے سے ٹھنڈا کیا تھا، وہ وہیں ساکت پڑے تھے۔ انہیں انور نے تقریباً بیس میٹر کی دوری سے نشانہ بنایا تھا لیکن وہ چونکہ برق رفتاری سے دہانے کی طرف آرہے تھے، اس لیے گولی کھانے کے بعد بھی وہ لڑھکے تھے اور دہانے کے مزید قریب ہوگئے تھے۔ ان کی عمریں پچیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ ان کے پاس چھوٹے بیرل والی جدید رائفلیں تھیں۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ دونوں نے بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی ہیں۔

اسحاق اور ہمیش نے دونوں مُردہ کتوں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر سرنگ کے عقبی حصے میں پھینک دیا۔ یہ ہاؤنڈ نسل کے قدآور کتے تھے اور میں انہیں زرگاں میں دیکھ چکا تھا... ایسے ہی خوں خوار کتوں نے مجھ پر جارج گورا کی کوٹھی میں حملہ کیا تھا۔ کتوں کے ساتھ ساتھ ہرن کے بچے کا کٹا پھٹا جسم بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا، یہ سارا واقعہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا اور حقیقت یہی ہے کہ اگر انور خاں اپنی دور مار رائفل سے بروقت و ٹھیک نشانے نہ لگاتا تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اس سارے واقعے کے دوران میں عجیب الخلقت باروندا جیکی ہم سے تقریباً سو میٹر دور سرنگ کے عقبی حصے میں موجود رہا تھا اور اس کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا... وہ اس دوران میں سو رہا تھا۔

انور خاں کے کہنے پر اسحاق نے فوری طور پر ایک پرچہ لکھا۔ اس پرچے کا مختصر مضمون کچھ اس طرح تھا۔ ''لگتا ہے کہ یہ کھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ یہ پہلا تحفہ ہم ارسال کررہے ہیں۔ یہ تمہاری میم صاحبہ کی انگلی ہے۔ یہ سب سے چھوٹا ٹکڑا ہے جو تم وصول کررہے ہو۔ اس کے بعد جو ٹکڑا بھی آئے گا، وہ اس سے بڑا ہوگا۔ تمہارے پاس ہمارے مطالبوں کی منظوری کے لیے فقط ایک گھنٹے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد میم صاحبہ کی باقی چار انگلیاں تمہارے پاس پہنچیں گی اور پھر پورا پنجہ پیشِ خدمت کیا جائے گا۔ تم لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ تم کسی رعایت کے حق دار نہیں ہو۔ اگر تم گولی کی زبان میں فیصلہ چاہتے ہو تو پھر ایسے ہی سہی۔ اب ہمارے مطالبوں میں ایک مطالبہ اور شامل کرلو۔ ہم اب نل پانی جانا نہیں چاہتے۔ ہمیں راجواڑے سے نکلنے کے لیے محفوظ راستہ چاہیے اور تمہاری یہ میم تب تک ہمارے ساتھ رہے گی جب تک ہم راجواڑے سے نکل نہیں جاتے۔''

انور خاں نے ماریا کی انگلی ایک موٹی کاغذ میں لپیٹی پھر اس کے ساتھ اسحاق کا لکھا ہوا پرچہ رکھا۔ ان دونوں چیزوں کے ساتھ ایک پتھر رکھنے کے بعد انہیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر اوپر سے باریک ڈوری باندھ دی۔

انور خاں نے اپنی پوزیشن کے عقب سے پانڈے کو بلند آواز میں پکارا اور کہا۔ ''پانڈے! تیری منحوس صورت یہاں دیکھ کر ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ اب میم زندہ نہیں بچے گی۔ تیری بدمعاشی کا تیرے انگریز دوستوں کو بڑا اچھا صلہ ملنے والا ہے۔ اپنی حماقت کا یہ پہلا انعام قبول کرو۔'' اس کے ساتھ ہی انور خاں نے پورے زور سے بازو گھما کر ڈوری میں بندھا ہوا پارسل درختوں کے جھنڈ کی طرف پھینک دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' جھنڈ کے عقب سے پانڈے کی گرج دار آواز ابھری۔

''کھول کر دیکھ لے۔ امید ہے، جو کچھ بھی ہے تجھے پسند آئے گا۔'' انور خاں نے کہا۔

کچھ دیر بعد درختوں کے عقب سے پانڈے کا ایک ساتھی برآمد ہوا۔ اس نے پہلے ہمیں اپنے خالی ہاتھ دکھائے اور پھر محتاط قدموں سے پارسل کی طرف بڑھا۔ پارسل اٹھا کر وہ واپس گھنے درختوں میں اوجھل ہوگیا۔

اگلا ایک گھنٹا بے حد تناؤ بھرا تھا۔ بہرحال، اب ہم مخالف فریق کو مزید رعایت دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ اسحاق بھی بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جو الٹی میٹم ہم نے دیا ہے، اس سے ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں بڑھنا چاہیے اور حقیقت یہی تھی کہ فیروز کی لاش اٹھانے کے بعد اب ہمارے دلوں میں رحم کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ چوہان اور احمد زخمی ہو چکے تھے۔ اپنے ساتھی ماجد کی موت کا صدمہ ہم چند دن پہلے جھیل چکے تھے۔ اب اگر ہمارے ساتھ یہی سب کچھ ہوتا تھا تو پھر جارج گورے کی اس گوری بہن کو بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

وہ اب ہوش میں آچکی تھی اور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی انگلی کے زخم سے خون کا اخراج روکنے کے لیے چوہان نے وہاں خاص طریقے سے پٹی باندھ دی تھی... پھر بھی خون کے قطرے مسلسل گر رہے تھے۔ ماریا نے بھی شاید اب محسوس کرلیا تھا کہ اس کے بچنے کا امکان کم ہوتا جارہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف منجمد ہوگیا تھا اور اس کی ساری تن فن ایک خوف آمیز مایوسی کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

الٹی میٹم کا ایک گھنٹا مکمل ہونے میں آٹھ دس منٹ باقی تھے جب جھنڈ کے عقب سے پھر پانڈے کی آواز ابھری۔ وہ بیٹری سے چلنے والے میگافون کے ذریعے بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اسٹیل اور موہن کمار تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''اب بات چیت کا وقت گزر چکا ہے۔ ہمیں ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔'' انور خاں گرجا۔ ''اور ایک بات اچھی طرح دماغ میں بٹھالو پانڈے! ہم یہاں مرنے کے لیے بالکل تیار ہو کر آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی چالاکی کروگے تو اس کا انجام بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا... ہم نے جو کہہ دیا ہے، وہ کہہ دیا ہے۔ اب ہم ایک سیکنڈ اور نہیں دیں گے۔ ٹھیک دس منٹ بعد اسٹیل کی بچی کا دوسرا ٹکڑا اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد...''

اسحاق ایک تیز دھار تلوار نکال لایا تھا۔ اس نے صاف سیدھے لہجے میں ماریا فرگوسن کو بتا دیا کہ وہ اس کا ہاتھ لینا چاہتا ہے اور وہ خود کو اس کے لیے تیار کرلے۔

''تم ہام کو ایک ہی دفعہ مار کیوں نائیں دیتے؟ ہام کو گولی مار دو۔'' وہ کربناک انداز میں چلائی۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ موت اتنی آسانی سے نائیں آوت ہے۔ ایک ایک سانس کے لیے تڑپنا پڑت ہے۔ جس طرح مَلمل کے مہین کپڑے کو کانٹے دار جھاڑیوں پر ڈال کر کھینچا جائے تو وہ تار تار ہووت ہے... اسی طرح نکلتی ہے جان۔ میں نے سب کچھ دیکھا ہوا ہے اپنی آنکھوں سے...'' وہ ہیجانی لہجے میں بولتا چلا گیا۔

''اچھا... ہام کو دہانے پر لے جاؤ... ہام ایک آخری بار... اپنے اسٹیڈ سے بات کرنا مانگتا۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

اس نے اسحاق کی انگارہ آنکھوں میں سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اگلے دو تین منٹ میں اس کا ہاتھ کلائی پر سے الگ ہونے والا ہے۔

اسحاق نے سوالیہ نظروں سے انور خاں کی طرف دیکھا۔ انور خاں نے سر کے اشارے سے اسحاق کو مشورہ دیا کہ وہ ماریا کی بات مان لے۔

چند منٹ بعد ماریا ایک بار پھر دہانے پر تھی۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ دونوں پاؤں میں بھی زنجیر تھی۔ اس زنجیر میں بس اتنی گنجائش تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا سکتی تھی۔ اس کے عین عقب میں اسحاق موجود تھا۔ اس کی ٹریل ٹو رائفل کی نال ماریا کی کمر سے بس ڈیڑھ دو فٹ کی دوری پر تھی۔

دہانے پر پہنچ کر ماریا نے دل فگار لہجے میں پکار بلند کی۔ وہ اب انگریزی میں بول رہی تھی۔ اس نے اسٹیل کو مخاطب کرکے کہا۔ ''یہ لوگ میرا ہاتھ کاٹ رہے ہیں۔ اب تم کس بات کا انتظار کررہے ہو؟ کیا تم اس بات کے لیے تیار ہوگئے ہو کہ میں ٹکڑوں میں یہاں سے باہر نکلوں؟''

''ایسا ہرگز نہیں ہے ماریا... لیکن جو کچھ ہمارے بس میں نہیں، وہ ہم کیسے کرسکتے ہیں؟ جو بندے یہ مانگ رہے ہیں، ان میں سے کچھ ہمارے پاس موجود ہی نہیں ہیں۔ اگر یہ ان بندوں کی جگہ کوئی تاوان وغیرہ لینا چاہیں تو ہم تیار ہیں... لیکن وہ بندے کیسے پیدا کرسکتے ہیں؟''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' ہماری طرف سے چوہان نے گرج کر انگریزی میں کہا۔ ''یہ سب تمہاری سیاست ہے لیکن یہ سیاست تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔ ہمارا موڈ تاوان وغیرہ کا تو کچھ نہیں جائے گا لیکن تم اپنی بیوی کو بچا نہیں سکو گے۔''

ماریا ایک بار پھر چلائی۔ ''اسٹیل! ان لوگوں کا ایک ساتھی مرگیا ہے۔ یہ اب کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ اگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تو بھائی جارج کو یہاں بلا لو۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو شاید اب تک کوئی حل نکل آتا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ماریا کی آواز شدتِ جذبات سے بیٹھ گئی۔ وہ دل دوز انداز میں رونے لگی۔

اسحاق اور ہمیش اسے کھینچتے ہوئے سرنگ میں واپس لے آئے۔ اس کے رونے کی آواز آخر تک سنائی دیتی رہی۔ اس واقعے کے فقط پانچ چھ منٹ بعد حالات نے ایک حیران کن پلٹا کھایا۔ اسحاق، ماریا کا ہاتھ کاٹنے کے لیے بالکل تیار ہوچکا تھا اور ہم میں سے بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے بظاہر اس سفاک عمل سے روکنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ فیروز کی بے گور وکفن لاش ہمارے سامنے تھی اور اس کی دید نے ہمارے

سینوں میں انگارے بھر رکھے تھے۔ یہ کھلی جنگ تھی اور جنگ میں سب کچھ روا ہوتا ہے اور ماریا تو ویسے بھی فیروز کی موت میں حصے دار تھی۔

اچانک میگافون پر سرجن اسٹیل کی آواز ابھری۔ ''انور خاں! توم کہاں ہے؟''

انور اطمینان سے بولا۔ ''میں اپنی جگہ پر موجود ہوں اور اپنے فیصلے پر بھی قائم ہوں۔''

''ٹھیک ہے انور خاں... ہام تمہارے مطالبوں کو مان رہے ہیں۔ توم اب کسی طرح کا کارروائی ناہیں کرے گا۔'' اسٹیل کی آواز میں شکست خوردگی اور پسپائی نمایاں تھی۔

''اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ بھی کوئی چال ناہیں ہے؟'' اسحاق کی آواز میں دہاڑ تھی۔ ''تم پھر کسی حیلے سے اپنے شکاری کتے ہماری طرف روانہ کرسکت ہو... یا وہ تمہارا پالتو پانڈے کوئی اور حرکت کرسکت ہے۔''

''اب ایسا کچھ ناہیں ہوگا... توم لوگوں کی تسلی کے لیے ہام اپنے گارڈز کو سو میٹر پیچھے لے جا رہے ہیں۔ ہام ہوپ کرتا کہ توم کی طرف سے بھی کوئی ایسا ویسا موومنٹ ناہیں ہوگا۔''

اگلے ایک گھنٹے میں واقعی اس امر کے واضح ثبوت نظر آئے کہ مخالف فریق نے ہمت ہار دی ہے اور اب وہ ماریا فرگوسن کی بخیریت رہائی چاہتے ہیں۔ درحقیقت ہم اس ساری کارروائی کے مشکل ترین مرحلے سے گزر چکے تھے اور مشکل ترین مرحلہ وہی تھا جب پانڈے نے شکاری کتوں والی خوفناک چال چلی تھی۔ یقیناً ہرن کے بچے کو پلاننگ کے تحت دہانے کے سامنے چھوڑا گیا تھا۔ کتے ہرن کے پیچھے لپکے تھے۔ یہ بات سامنے کی تھی کہ ہرن جان بچانے کے لیے بھاگے گا تو سرنگ کے دہانے کی طرف آئے گا۔ اگر وہ دائیں بائیں ہونے کی کوشش کرتا تو بھی ''حکم'' کے اہل کار اسے ذرا گرا کر اس کا رخ دہانے کی طرف کرسکتے تھے۔ بہرحال جو ہوا، وہ منصوبہ ساز کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔

پانڈے اور اس کے مسلح ساتھیوں نے دہانے کے ارد گرد سے اپنی پوزیشنیں ہٹالی تھیں۔ باقی لوگ بھی کافی فاصلے پر چلے گئے تھے۔ ان کے گھوڑے اور کتے وغیرہ بھی اب دہانے کے قریب دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ دہانے کی طرف سے غافل ہوگئے ہوں۔ انہوں نے ہماری حرکات و سکنات پر مکمل نظر رکھی ہوئی تھی۔ کم از کم دو ٹیلی اسکوپس کے چمکتے ہوئے شیشے مجھے اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ماریا کا درد سے بُرا حال تھا۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں کانٹا چبھنے کو بھی باقاعدہ ایک تکلیف کا نام دیا جاتا ہے اور اس کانٹے کو نکالنے کے لیے آپریشن تھیٹر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ یہاں اس کی پوری انگلی جڑ سے کاٹ دی گئی تھی۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہوچکا تھا۔ ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر چوہان نے اسے ایک پین کلر انجکشن دیا اور انفیکشن سے بچانے والا ایک کیپسول بھی کھلایا... وہ پھر بھی مسلسل ہائے وائے کرتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب ہمیں اپنا دوست چرواہا نریندر سنگھ دہانے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے سر کا صافہ کھول رکھا تھا تاکہ ہم اسے دور ہی سے اچھی طرح پہچان لیں۔

دہانے کے عین سامنے آکر وہ زور سے بولا۔ ''آپ لوگوں کے لیے میرے پاس ایک چٹھی ہے، کیا میں آگے آکر دے سکت ہوں؟''

اس نے یہ الفاظ مقامی زبان میں ادا کیے تھے۔ انور خاں نے اس سے کہا۔ ''اگر تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے تو آجاؤ۔ اگر ہتھیار ہے تو اسے وہیں رکھ دو...''

انور خاں نے بھی یہ الفاظ اسی علاقائی زبان میں کہے تھے۔ یہ زبان میری اور چوہان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اس نے اپنی چھوٹی سی کلہاڑی کمر سے نکال کر وہیں ایک درخت کی جڑ میں رکھ دی اور آگے بڑھ آیا۔ وہ ہم سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کررہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے مخالف فریق کی طرف سے ہماری جانب روانہ کیا گیا ہے۔

اس نے ایک چٹھی نکال کر انور خاں کے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ سرجن اسٹیل کی طرف سے تھی اور انگلش میں لکھی گئی تھی۔ چوہان نے چٹھی پڑھی۔ اس کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

''... ہم تمہارے مطالبات کو من و عن تسلیم کررہے ہیں۔ امید ہے کہ اب تمہاری طرف سے ماریا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ تمہارے مطلوبہ لوگوں کو لانے کے لیے آدمی زرگاں روانہ کیے جاچکے ہیں۔ وہ کل شام تک واپس آجائیں گے۔ سلطانہ کا والد اور بھائی بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اگر تم لوگ انہیں یہاں بلوانا چاہتے ہو تو بتادو... لیکن اگر براہِ راست نل پانی پہنچانا چاہتے ہو تو یہ بھی ہوسکتا ہے۔ تمہارا کوئی بندہ خود نل پانی جاکر اس بات کی تصدیق کرسکتا ہے کہ وہ لوگ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ اگر تم لوگ اسٹیٹ سے نکلنا چاہتے ہو تو بھی ہم تمہیں محفوظ راستہ دینے کے لیے تیار ہیں۔

اب ہمارے درمیان معاملات طے ہیں۔ اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ تم ماریا کی صحت اور آرام کا پورا خیال رکھو گے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو ہماری طرف سے ایک ڈاکٹر آکر ماریا کی مرہم پٹی کردے۔ اگر تم لوگوں کو خوراک یا کوئی اور ضروری چیز درکار ہے تو ہمیں بتاؤ، ہم مہیا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

.... حالات میں بہتری کا خواہاں اسٹیل بریرے۔''

یہ خط خوش آئند تھا۔ سب کے چہرے چمک گئے۔ درحقیقت اب اس سارے معاملے کو سات آٹھ روز گزر چکے تھے۔ مسلسل تناؤ نے سبھی کے اعصاب کو متاثر کیا تھا۔ ایسے حالات میں اتنا زیادہ وقت گزارنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص کہے کہ وہ تھکا نہیں اور اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تو وہ غلط کہے گا۔ دلیری سے موت کا سامنا کرنا اور بات ہے... مسلسل موت اور زندگی کے درمیان معلق رہنا اور بات۔

انور نے نریندر سے پوچھا کہ چٹھی بھیجنے والوں سے اس کا رابطہ کیسے ہوا؟

اس نے بتایا کہ اس کے پاس ہمارے لیے ایک اور پیغام بھی ہے اور یہ مراد شاہ وغیرہ کی طرف سے ہے۔ وہ اس امید پر دہانے کے آس پاس موجود تھا کہ شاید اسے کوئی ایسا موقع مل جائے کہ وہ یہ پیغام ہم تک پہنچا سکے۔ یہ امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی... لیکن پھر واہگرو کی طرف سے کرپا ہوگئی اور جو کام ناممکن نظر آتا تھا، ممکن ہوگیا۔ اسے درختوں میں بکریاں چراتے دیکھ کر خود صاحب لوگوں نے اپنے پاس بلایا اور یہ چٹھی دے کر ہماری طرف روانہ کردیا۔

نریندر سنگھ کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ پانڈے وغیرہ نریندر کو اندر بھیج کر شاید یہ بھی جاننا چاہ رہے تھے کہ اندر کا نقشہ کیا ہے اور دہانے کے آس پاس کتنے لوگ موجود ہیں۔

انور خاں نے نریندر سے پوچھا کہ مراد شاہ کا پیغام کیا ہے؟

نریندر کے تاثرات بدل گئے۔ محسوس ہوا کہ اس کے پاس ہمیں بتانے کے لیے کچھ خاص باتیں ہیں۔ اس نے دھیمے لہجے میں جلدی جلدی انور خاں کو مقامی زبان میں جو کچھ بتایا، اس کا مطلب کچھ یوں تھا۔

... ماریا کے اغوا نے پوری اسٹیٹ میں کھلبلی مچادی ہے۔ ہر طرف بس اسی بارے میں بات ہورہی ہے۔ زرگاں میں اونچے طبقے کے لوگوں میں سخت خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ خاص طور سے جو انگریز یہاں موجود ہیں، وہ سخت خوف زدہ ہیں۔ ان کی عورتیں گارڈز کے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ گھروں پر بھی سخت پہرے بٹھادیے گئے ہیں۔ عام لوگ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جارج گورا صاحب کی بہن اغوا ہوسکتی ہے تو اور کون محفوظ ہے۔

نریندر سنگھ نے بتایا کہ اس کے علاوہ زرگاں میں ایک اور طرح کی چپقلش بھی پیدا ہوگئی ہے۔ وہاں جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار ہے، وہ اندر خانے دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ کا تو خیال ہے کہ ماریا کی جان بچانے کے لیے انور خاں اور اس کے ساتھیوں کے سارے مطالبے مان لیے جائیں اور کسی طرح کا خطرہ مول نہ لیا جائے... لیکن کچھ لوگ اسے بہت بڑی شکست سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح باغی ذہن رکھنے والے لوگوں کے حوصلے بڑھیں گے۔ ویسے بھی چالیس پچاس خطرناک ترین لوگوں کو یوں چھوڑ دینا بہت نقصان کا کام ہوگا اور بعد میں اس کے نتائج بہت بُرے نکلیں گے۔

''حکم کا اپنا رویّہ کیا ہے؟'' انور نے نریندر سے پوچھا۔

نریندر نے مقامی زبان میں کہا۔ ''مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ حکم جی خود بھی بندوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔'' پھر وہ انکشاف کرنے والے لہجے میں بولا۔ ''مراد شاہ نے مجھے آپ لوگوں کے لیے یہ پیغام دیا ہے کہ حالات اتنے اچھے نہیں جتنے نظر آرہے ہیں بلکہ بہت زیادہ خراب ہیں۔ ظاہری طور پر شاید یہ لوگ کچھ نرمی دکھا رہے ہوں مگر اندرون خانہ ایک زبردست حملے کا پورا پروگرام بن چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس حملے میں ماریا کے ساتھ ساتھ آپ سب لوگوں کو بھی ختم کردیا جائے... اس حملے کی تیاری کے لیے رنجیت پانڈے اور اس کے تین درجن ساتھی یہاں موجود ہیں۔ انہیں تیاری کے لیے کچھ وقت چاہیے، اسی لیے وہ نرمی دکھا رہے ہیں اور یہ چٹھیاں وغیرہ بھیج رہے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ کے چہروں پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ واقعی یہ ایک تشویشناک اطلاع تھی۔

چوہان نے نریندر سنگھ سے پوچھا۔ ''مراد شاہ صاحب اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟''

جواب میں نریندر سنگھ بولا۔ ''شاہ صاحب اور چھوٹے سرکار کے بندوں نے زرگاں میں خفیہ طور پر جو جانکاریاں اکٹھی کی ہیں، ان سے پتا چلا ہے کہ پچاس بندوں کی لسٹ میں سے قریباً چالیس پینتالیس بندے ایسے ہیں جنہیں ''حکم جی'' کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس بارے میں آپ لوگوں کو جو کچھ بھی بتایا جارہا ہے وہ صرف اور صرف وقت گزارنے کے لیے ہے۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ آپ لوگوں کے جو زیادہ سے زیادہ مطالبے مانے جاسکتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ سلطانہ بی بی کے والد اور بیمار بھائی کو چھوڑ دیا جائے... اور آپ لوگوں کو نل پانی جانے یا پھر اسٹیٹ سے نکلنے کے لیے راستہ دے دیا جائے۔ شاہ صاحب نے آپ لوگوں کو مشورہ

دیا ہے کہ سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی کو نل پانی بھجوا دیں اور خود اسٹیٹ سے نکلنے کا راستہ لے لیں۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں نے اور کچھ نہیں دینا... چاہے اس کے لیے کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔''

انور خاں نے نریندر سنگھ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم اس بارے میں مشورہ کرتے ہیں اور کوئی فیصلہ لیتے ہیں۔''

''اور اس چٹھی کا جواب؟'' نریندر نے پوچھا۔

''اس کا جواب بھی ہم کچھ دیر بعد دیں گے۔''

نریندر نے مقامی زبان میں انور خاں سے گفتگو جاری رکھی اور کہا۔ ''انہوں نے ڈاکٹر کے بارے میں خاص طور سے پوچھا ہے کہ کیا وہ میم جی کے لیے کوئی ڈاکٹر بھیج دیں؟''

اسحاق چمک کر بولا۔ ''کوئی ضرورت نا ہیں۔ ان کو بتاؤ کہ ڈاکٹر ہمارے پاس موجود ہے... بلکہ ہم سب ڈاکٹر ہیں اور اس کا بہت اچھا علاج کر سکت ہیں۔''

نریندر سنگھ ہم سے اجازت لے کر واپس چلا گیا۔

یہ ایک بدلی ہوئی صورتِ حال تھی۔ ہمیں اندر کی رپورٹ مل گئی تھی اور یہ خاصی تشویشناک تھی۔ زرگاں کی محلاتی سازشوں کی وجہ سے ایک نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ ایک گروہ ماریا کی زندگی کی پروا کیے بغیر مہم جوئی کر سکتا تھا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ آدھ پون گھنٹے تک بحث ہوئی۔ اسحاق اور احمد وغیرہ تو اس پر تیار نہیں تھے کہ اپنے دوستوں کی رہائی کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائیں مگر ڈاکٹر چوہان اور انور خاں کا خیال تھا کہ بدلی ہوئی صورتِ حال میں حکمتِ عملی سے کام لینا پڑے گا۔ انور خاں موت سے ڈرنے والا شخص نہیں تھا لیکن وہ مستقبلِ قریب کے حالات کو بھی ذہن میں رکھ رہا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اگر یہ معاملہ خون خرابے پر ختم ہوتا اور ماریا بھی ماری جاتی تو پھر زرگاں کے مسلمان رہائشیوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی تھی۔ حکم جی وغیرہ اس واقعے کو بہانہ بنا کر بہت ظلم کر سکتے تھے۔

آخر میں انور خاں نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''یارو! ہم اس وقت جنگ جیسی حالت میں ہیں اور جنگ میں کبھی وقت کے مطابق تھوڑا سا پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ شکست ہو گئی۔ میری رائے میں مراد شاہ صاحب نے جو اندر کی رپورٹ ہم تک پہنچائی ہے، وہ بڑی اہم اور قیمتی ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

''لیکن اگر ہم اپنے دوسرے مطالبوں سے پیچھے ہٹیں گے تو وہ لوگن اور بھی شیر ہو جاویں گے۔'' اسحاق نے کہا۔

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوگا۔'' چوہان نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''اصل مسئلہ تو ان بچارے بندوں کا ہی ہے جن کو ہم چھڑانا چاہتے ہیں۔ جب یہ مسئلہ نہیں ہوگا تو پھر حکم جی ''ایکشن والا خطرہ'' کسی صورت مول نہیں لے گا۔ اس پر جارج گورا وغیرہ کی طرف سے بھی زبردست دباؤ پڑ جائے گا کہ اس معاملے کو خون خرابے کے بغیر حل کیا جائے۔''

''ہاں، یہ بات تو سمجھ میں آوت ہے۔'' احمد نے کہا۔ ''اگر ہم اپنے اس مطالبے سے پیچھے ہٹ جاوت ہیں... اور پھر بھی حکم اور پانڈے وغیرہ کھون کھرابے کا سوچتے ہیں تو جارج اور اس کے سیکڑوں ساتھی ایک دم قیامت برپا کر دیویں گے۔''

اس موضوع پر پانچ دس منٹ مزید بات ہوئی۔ آخر ایک حتمی فیصلہ کر لیا گیا... طے ہوا کہ اسٹیل وغیرہ کو ان کی چٹھی کا جواب دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ سب سے پہلے سلطانہ کے والد اور بھائی کو نل پانی پہنچائیں، اس کے بعد ہم بھی اپنی مانگوں پر نظرِ ثانی کریں گے۔ ان کو شروع میں یہ عندیہ دیا جائے کہ اگر پچاس کے پچاس لوگ رہا نہیں کیے جا سکتے تو ان میں سے جتنے لوگ جارج کی جیل میں موجود ہیں، ان کو چھوڑ دیا جائے اور یہاں پہنچایا جائے۔ اس فیصلے پر اسحاق سمیت سب نے اتفاق کیا۔ تاہم اسحاق کی رائے تھی کہ اسٹیل اور اس کے ساتھیوں نے کل شام تک سارے مطالبے ماننے کا جو وعدہ کیا ہے، اس کے پورا ہونے کا انتظار کر لیا جائے۔

کچھ بحث و تمحیص کے بعد اسحاق کی یہ بات مان لی گئی۔ حالانکہ اس وعدے کے پورا ہونے کے امکانات کم ہی تھے۔ فیروز کو نہلائے بغیر ایک چادر میں لپیٹا گیا۔ انور خاں نے باقاعدہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر سرنگ کے اندر ہی اسے ایک نیم پتھریلی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ سب کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ دونوں کتوں کی لاشوں کو سرنگ کے عقبی حصے میں پہلے سے موجود ایک گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی گئی۔ پانڈے کے ساتھی اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں اٹھا کر لے گئے۔

...رات کو دہانے پر اپنی ڈیوٹی دینے کے بعد میں پھر باروندا جیکی کے پاس پہنچا اور وہاں اس کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے گزارے۔ شراب پینے کے بعد اس کی توانائیاں عود کر آتی تھیں اور وہ کافی حد تک صحت مند دکھائی دینے لگتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میرا بے حد مشکور بھی ہو جاتا تھا۔ وہ بڑی دل جمعی سے مجھے مارشل آرٹ کے داؤ پیچ سے آگاہ کر رہا تھا۔ میری دلچسپی دیکھ کر اس کے اندر جیسے یہ شدید خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ بتائے اور میں اس کے بتائے ہوئے کو ''فالو'' بھی کروں۔ اس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ میرے اندر ایک آگ دیکھ رہا ہے اور اگر یہ آگ جلتی رہی تو میں کافی کچھ حاصل کر لوں گا۔ اور وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا... میں خود محسوس کرتا تھا کہ میرے اندر کچھ روشن ہو چکا ہے اور اس روشنی کی ابتدا اسی رات ہوئی تھی جس رات سلطانہ نے میرے لیے بہت کچھ کھو دیا تھا۔

مجھے سکھلانے کے دوران میں جیکی چھوٹے چھوٹے وقفے بھی لیتا تھا۔ ان وقفوں میں وہ وسکی کے گھونٹ لیتا، کھانستا اور ہنٹر بیف چبانے کی کوشش کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پرانی یادیں بھی تازہ کرنے لگتا۔

جس رات کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس رات جنگل میں خوب بارش بھی ہوئی۔ بجلی چمکتی رہی، بادل گرجتے رہے۔ بھیگی ہوئی نباتات کی خوشبو ہوا کے ساتھ سرنگ میں چکراتی رہی۔ اس ماحول نے جیکی کا نشہ دوآتشہ کر دیا۔ وہ اپنا من پسند نیپالی گیت گنگنانے لگا۔

...ہم نے اگلے روز شام تک سرجن اسٹیل اور پانڈے وغیرہ کا وعدہ ایفا ہونے کا انتظار کیا۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق ان لوگوں نے ایک بار پھر عذر لنگ کا سہارا لیا۔ پانڈے نے میگافون کے ذریعے ہمیں بتایا کہ بارش کی وجہ سے رات کو کافی راستے بند ہو گئے ہیں۔ جنگل میں سات آٹھ میل کا علاقہ ایسا ہے جہاں سفر ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا جیل سے یہاں پہنچنے والوں کی آمد میں ایک دو روز کی تاخیر ہو سکتی ہے۔

بات کی تہ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مراد شاہ اور چھوٹے سرکار کی طرف سے جو اطلاعات ہم تک پہنچی تھیں، وہ بالکل درست ثابت ہو رہی تھیں۔ ہم سے وعدے کیے جا رہے تھے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کیا جا رہا تھا۔

اسحاق اور احمد بہت برہم تھے۔ وہ ذہنی طور پر مرنے مارنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ خاص طور سے اسحاق تو یہی چاہتا تھا کہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا جائے۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

بہرحال، طے شدہ پروگرام کے مطابق اسحاق کو بھی ہماری بات ماننا پڑی۔ چوہان نے انگریزی میں خط لکھا... اور اس میں اسٹیل وغیرہ کو یہ عندیہ دیا گیا کہ اگر وہ لوگ فوری طور پر سلطانہ کے والد اور بھائی کو گونگے ہاشم سمیت نل پانی پہنچا دیں... تو ہم باقی کے مطالبات میں کچھ لچک پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ خط ایک بار پھر میں ہی لے کر گیا۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں انڈین سیکیورٹی فورسز کے سابقہ افسر رنجیت پانڈے کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس مرتبہ بھی مجھے ناکامی ہوئی۔ رنجیت پانڈے کی جگہ ایک سانولا سا فربہ اندام شخص خط لینے کے لیے آگے آیا۔ اس کی آنکھیں نشے سے سرخ تھیں اور وہ حکم کے سپاہیوں کی مخصوص وردی میں تھا۔ میں نے نل پانی میں چھوٹے سرکار یعنی اجیت رائے کے محافظ بھی دیکھے تھے۔ ان کی وردیاں سبز رنگ کی تھیں۔ جنگل میں یہ وردیاں جیسے سبز گرد و پیش کا حصہ ہی بن جاتی تھیں۔ حکم کے سپاہیوں کی وردیوں میں سبز اور خاکی رنگ تھا۔

خط دینے کے بعد میں واپس آ گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹے پھر انتظار اور تناؤ کے تھے۔ دونوں طرف خاموشی تھی لیکن یہ ایسی خاموشی تھی جسے کسی بھی لمحے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس خاموشی کی دھند میں رنجیت پانڈے جیسا شخص بھی موجود تھا۔

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب پانڈے نے ہی ہمیں میگافون کے ذریعے اطلاع دی کہ ہمارا مطالبہ پورا کر دیا گیا ہے۔ سلطانہ کے والد، بھائی اور ملازم ہاشو بخیریت نل پانی میں چھوٹے سرکار کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اگر ہم اس کی تصدیق کرنا چاہیں تو ہم میں سے کوئی ایک شخص نل پانی جا کر واپس آ سکتا ہے۔

انور خاں تصدیق کیے بغیر کیسے مان سکتا تھا؟ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اطلاع دینے والا پانڈے تھا۔

مشورے کے بعد طے ہوا کہ ہم میں سے احمد سرنگ سے باہر جائے گا اور تصدیق کر کے ہمیں اطلاع دے گا۔ نل پانی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ احمد ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر بہ آسانی واپس آ سکتا تھا۔ میرے دل میں آئی کہ میں بھی رضا کارانہ طور پر احمد کے ساتھ چلا جاؤں۔ اس طرح میں نل پانی میں سلطانہ سے مل سکتا تھا اور اس بچے سے بھی جسے میرا خون کہا جا رہا تھا۔ میں سلطانہ کو تسلی تشفی بھی دے سکتا تھا مگر پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ میں جس منزل کا راہی نہیں تھا، اس منزل کی طرف جانے سے کیا حاصل تھا؟ مجھے سلطانہ کی طرف نہیں کسی اور کی طرف جانا تھا۔ وہ جو ایک روز، بغیر کچھ بتائے، بغیر کچھ کہے، خاموشی سے منہ موڑ کر چلی گئی تھی... سمندر پار جا بیٹھی تھی... ان گلی کوچوں کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ گئی تھی... جہاں ایک چپے پر ہماری یادوں کے گلشن کھلے ہوئے تھے۔ ہاں، میری منزل وہی تھی۔ اس کے سوا کوئی بنتِ حوا میری زندگی میں نہیں آ سکتی تھی۔ اگر سلطانہ آئی تھی تو وہ میرے ہوش و

حواس میں نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ بیتا ہوا وقت میرے ذہن کی سلیٹ پر سے بالکل صاف ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی قربانیوں کے بارے میں سنا تھا۔ ان جانکاریوں کی وجہ سے میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی تو موجود تھی لیکن کسی بھی درجے کی محبت نہیں تھی۔

احمد، انور خاں کی ضروری ہدایات کے ساتھ سرنگ سے روانہ ہو گیا۔ اس کے لیے پانڈے نے گھوڑا فراہم کیا اور ایک محافظ بھی ساتھ بھیجا۔ احمد کی واپسی دو گھنٹے سے پہلے ہی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ مثبت خبر لایا ہے۔ اس نے آ کر بتایا۔

''سب ٹھیک ہے انور بھائی! میں سلطانہ بی بی کے والد اور بھائی سے مل کر آیا ہوں۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں۔ سلطانہ بی بی کے بیمار بھائی کو چارپائی اور گھوڑا گاڑی پر سفر کرا کے تل پانی پہنچایا گیا ہے۔''

''تل پانی میں کیا حالات ہیں؟'' چوہان نے پوچھا۔

''سلطانہ بی بی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجرموں کو ہر صورت سزا ملنی چاہیے۔ اگر حکم اور اس کے لوگ نا ہیں دیتے تو پھر اس سزا کی ذمے داری چھوٹے سرکار کو لینی چاہیے۔''

انور خاں نے احمد سے سرنگ کے اردگرد کے حالات دریافت کیے۔

احمد اپنے زخمی بازو کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''باہر ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ لوگن موجود ہیں۔ میرے کھیال میں تو ان کی تعداد ڈھائی تین سو سے کم نا ہیں ہووے گی۔ وہ دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دوربینیں لے کر درختوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ان کے گھوڑے گھاس پر منہ مارتے نظر آوت ہیں۔ ان کے پاس ہر طرح کا اسلحہ ہے۔ ٹیلوں کے ساتھ ساتھ ان کی چھولداریاں ہیں اور خچر وغیرہ بندھے ہوئے ہیں۔''

''ظاہر ہے کہ میم صاحب کا معاملہ ہے۔ اگر ساری فوج بھی یہاں بھیج دی جاتی تو حیرانی کی بات نہیں تھی۔'' چوہان نے کہا۔

انور خاں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''چلو، پہلا مرحلہ تو طے ہوا۔''

''اب کیا کرنا ہے؟'' احمد نے پوچھا۔

''اب ان کو دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مزید یہاں نہیں رک سکتے۔ وہ ہمارے مطلوبہ بندے یہاں پہنچا دیں۔ اگر سارے نہیں آ سکتے تو اتنے پہنچا دیں جتنے کا انہوں نے اقرار کیا ہے... یعنی پچیس افراد!''

''لیکن وہ اتنے بھی نہیں پہنچائیں گے۔'' بھکشو ہمیش نے کہا۔

''نہیں پہنچائیں گے لیکن کچھ نہ کچھ تو بتائیں گے نا۔ فی الوقت وہ جو بھی دیں، ہمیں مان لینا چاہیے... کیا خیال ہے؟'' آخری الفاظ کہتے ہوئے انور خاں نے چوہان کی طرف دیکھا۔

چوہان نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

اس بار خط لکھنے کے بجائے چوہان اور انور خاں نے براہِ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری طرف سے چوہان اور احمد باہر نکلے۔ ان کی طرف سے سرجن اسٹِل اور گردموداں آئے۔ درختوں کے جھنڈ میں قریباً آدھ گھنٹا بات چیت ہوئی۔ ہماری توقع اور اندیشے کے عین مطابق وہ لوگ فوری طور پر صرف سات بندے دینے کے لیے آمادہ ہوئے۔ یہ زیادہ اہم بندے نہیں تھے۔ یہاں بھاگتے چور کی لنگوٹی والا محاورہ صادق آ رہا تھا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ معاملہ طے ہو گیا۔ چوہان اور احمد واپس آ گئے۔

چوہان نے بتایا۔ ''کل دوپہر تک سات بندے یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ہم ماریا سمیت یہاں سے نکل سکیں گے اور تل پانی کی طرف روانہ ہوں گے۔''

''ماریا آخر تک ہمارے ساتھ رہے گی؟'' ہمیش نے پوچھا۔

''نہیں... اسٹیٹ کی حدود سے دو میل پیچھے ماتی پور کے قریب ہمیں ماریا کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس کے بدلے سرجن اسٹِل یا گردموداں میں سے کوئی ایک ہماری تحویل میں آ جائے گا۔ وہ تب تک ہمارے ساتھ رہے گا، جب تک ہم کسی محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتے۔''

''یہ دھوکا ہے۔ کوئی چال ہے۔'' اسحاق نے چیخ کر کہا۔ ''میں آپ سب کو بتا دیوت ہوں، ہم تب تک ہی بچے ہوئے ہیں جب تک یہ چھوکری ہمارے ساتھ ہے۔ جس وقت یہ ہمارے ہاتھ سے نکلی، ہم مارے جاویں گے۔ میں کسی صورت ایسا نا ہیں ہونے دوں گا۔ یہ تب ہی رہا ہووے گی جب ہم یہاں سے نکلیں گے۔'' اسحاق کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

انور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دیکھو، ہم ماریا کے بدلے جو کچھ لے رہے ہیں، وہ بھی کچھ کم خاص نہیں ہے۔ سرجن اسٹِل یا پھر گردموداں۔ ماریا کی طرح ان دونوں کے جیون کا رسک لینا بھی ان لوگوں کے لیے آسان نہیں ہو گا... اور پھر تب تک ہم ویسے بھی اسٹیٹ سے تقریباً نکل چکے ہوں گے۔''

اسحاق بدستور نفی میں سر ہلاتا رہا۔ بہرحال، انور خاں اور چوہان اسے سمجھانے میں لگے رہے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ اسے بمشکل راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

☆☆☆

سہ پہر کے دو بج چکے تھے۔ اب ہمیں کل دوپہر تک زرگاں سے رہا ہونے والے سات بندوں کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں سے نکلنے کی تیاری بھی کرنا تھی۔

احمد تل پانی سے ہو کر آیا تھا۔ میں اس سے سلطانہ اور بالو وغیرہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ احمد خود بھی بھانپ گیا کہ میں اس سے سلطانہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ کھانے کے بعد ہم ایک الگ جگہ جا بیٹھے۔ احمد نے بتایا۔ ''وہ ابھی تک سخت صدمے میں ہے۔ کچھ کھاتی پیتی نا ہیں۔ نہ ہی بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ بس گم صم بیٹھی رہوت ہے یا پھر رونا شروع کر دیوت ہے۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر ایک ڈاکٹر اس کا علاج کر رہا ہے۔ میں اس سے ملا ہوں۔ وہ بتا رہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بہتر ہو جاوے گی۔''

''تم خود بھی اس سے ملے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، میں گیا تھا۔ وہ عبدالغنی کے گھر میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ میاں بیوی اس کا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر رونے لگ گئی۔ اس نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا۔ تمہاری چوٹوں کے بارے میں پوچھا۔ مجھے بہت تاکید کی کہ میں تمہارا بہت کھیال رکھوں... اس کے دل میں تمہارے لیے وہی پریشانی ہے جو ایک بہت پیار کرنے والی بیوی کے دل میں ہو سکت ہے۔''

''اس نے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کی؟''

''نا ہیں تابش بھائی! میرا کھیال ہے کہ وہ اپنا سارا دکھ درد اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہے۔ جیسے ساگر اوپر سے شانت ہووے ہے، پر اندر طوفان پلے ہے۔ سلطانہ بی بی کے اندر بھی بہت کچھ چل رہا ہے۔ اب پتا نا ہیں، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔''

''تم نے اسے بتایا کہ ہم یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں؟''

''نا ہیں، میں یہ بتاتا تو وہ زیادہ غمگین ہو جاتی۔ وہ اوپر اوپر سے کچھ بھی کہے لیکن کوئی بھی بیوی اس طرح اپنے شوہر کو ہمیشہ کے لیے کھونا نا ہیں چاہتی۔ اور سلطانہ تو ایسی شوہر پرست بیوی ہے جس نے...''

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ شاید اس کے ذہن میں آیا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلے بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہے۔

میں نے احمد سے مشورہ مانگتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے... ایسا کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ وہ جلد سے جلد نارمل ہو جائے؟ اس بات کو سمجھ لے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں؟''

اس سے پہلے کہ احمد جواب میں کچھ کہتا، اسحاق نے اشارے سے ہمیں اپنی طرف بلایا۔ وہ ہمیں کوئی خاص چیز دکھانا چاہ رہا تھا۔

ہم اٹھ کر اس کی طرف گئے۔ وہ ہمیں دہانے سے کچھ فاصلے پر اس جگہ لے آیا جہاں ہم سوتے تھے۔ ''یہ دیکھو۔'' اسحاق نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ماریا جو پچھلے تقریباً اٹھارہ گھنٹے سے پتھر پر چڑھی بیٹھی تھی تاکہ کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہے... اب تھک ہار کر زمین پر لیٹ گئی تھی اور سو رہی تھی۔

اسحاق زہریلے لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''حرامزادی کہوت تھی مجھے بیڈ چاہیے، گدا چاہیے۔ اب دیکھو، پتھروں پر سو رہی ہے۔''

''سیانے ٹھیک ہی کہوت ہیں کہ وقت سب کچھ سکھا دیوت ہے۔'' احمد نے تائید کی۔

''ایک دو ہفتے اور ہمارے ساتھ رہی تو اسے کانٹوں پر بھی سونا آ جاوے گا۔'' اسحاق نے کہا۔

واقعی یہ دیکھنے والا نظارہ تھا۔ خوشبودار کمروں میں مچھر دانیاں لگا کر آرام دہ بستروں کا لطف لینے والی، سخت ناہموار زمین پر پڑی تھی۔ اس کا قیمتی لباس سرنگ کی مٹی سے لتھڑا ہوا تھا۔ اپنے لباس کی طرح وہ خود بھی بے ترتیب تھی۔ ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں تھا۔ میں نے دہانے کی طرف سے آنے والی مدھم روشنی میں دیکھا، اس کی گوری چٹی پنڈلی پر ایک چھوٹا لال بیگ رینگ رہا تھا۔ یہی زندگی اور زندگی کی بوالعجبی ہے۔

اگلے روز سہ پہر ڈھائی تین بجے کے قریب وہ ساتوں افراد زرگاں سے آ گئے جن کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ ان کی عمریں بیس اور ستائیس، اٹھائیس سال کے درمیان تھیں۔ داڑھیاں بڑھی ہوئیں، سر اور چہرے کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی صورت میں تھے۔ ان کی شکلوں سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بامشقت قید گزار کر آ رہے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے جسم اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ وہ انور خاں، احمد اور اسحاق وغیرہ کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ کئی ایک کی آنکھوں میں آنسو بھی چمک گئے۔

ایک پارسی کے سوا یہ سب کے سب مسلمان تھے۔ ان

میں سے صرف ایک شخص قتل کا مجرم تھا، باقی سب جرمِ بے گناہی کا شکار تھے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے حکم یا جارج کی کسی زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ کسی سرکاری اہل کار کے دستِ ستم کو روکنے کی کوشش کی تھی یا ایسا ہی کوئی اور گناہ کیا تھا۔ انور خاں نے مجھ سے اور چوہان سے ان سب کا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک حجام تھا، دوسرا ایک ماہر قفل گر تھا۔ یہ سب افراد اپنی اس آزادی کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ رہے تھے اور قدرت کی نیرنگی پر حیران تھے۔

سب سے پہلے انہیں کھانا کھلایا گیا۔ ہمارے پاس بس گزارے لائق خوراک تھی۔ زیادہ تر خشک راشن یعنی چنے، بھنے، بِنسر بیف اور بسکٹ وغیرہ ہی تھے۔ قیدیوں نے یہ چیزیں ندیدوں کی طرح کھائیں۔ اندازہ ہوا کہ اپنی طویل قید کے دوران میں وہ معقول خوراک سے یکسر محروم رہے ہیں۔

ان میں سے جو شخص حجام تھا، وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زرگاں میں وہ میرے بال تراشتا رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا حمام اسی محلے میں ہے جہاں مختار راجپوت اور ان کی بیٹی سلطانہ رہتے ہیں۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اکثر سلطانہ خود مجھے اپنے ساتھ لے کر آتی تھی اور جب تک میرے بال تراشے جاتے تھے، وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہتی تھی۔ میں چونکہ پوری طرح صحت مند اور چوکس نہیں تھا، وہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی تھی۔ عبدالرحیم نامی یہ حجام اس بات پر ششدر بھی تھا کہ میں اسے کیوں پہچان نہیں پا رہا ہوں۔ چوہان اسے ایک طرف لے گیا، غالباً صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا...

ان قیدیوں سے ہمیں اپنے اردگرد کے حالات کے بارے میں بھی کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ہم رات تک تیاری میں لگے رہے۔ خشک راشن تھیلوں میں رکھا گیا۔ فالتو ایمونیشن کو پولیتھین میں لپیٹ کر کینوس کے دو بڑے بیگوں میں اس طرح سنبھالا گیا کہ وہ بارش وغیرہ سے محفوظ رہے۔ رائفلوں کو صاف کر کے بالکل تیار کر لیا گیا۔ مکمل ترتیب بنائی گئی کہ ہمیں کس فارمیشن میں یہاں سے نکلنا ہے۔ ہنگامی صورتِ حال سے کس طرح نمٹنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انور خاں میں یقیناً قائدانہ صلاحیتیں تھیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل وقت سے پہلے ہی طے کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر خوشی بھی ہو رہی تھی کہ اس تنگ و تاریک سرنگ میں یہ ہماری آخری رات ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرح کی سنسنی بھی رگ و پے میں جاگی ہوئی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد حالات ہمارے لیے ایک دم خطرناک ہو جائیں گے۔ آنے والے ایک دو روز میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ماضیِ قریب میں ایسے حالات مجھے اعصاب زدہ کر دیا کرتے تھے۔ میں خطرے کی آمد سے پہلے ہی اس کے بارے میں اتنا سوچتا تھا کہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی۔ حالات کی سنگینی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ میں خود کو اس پُرجوش گروپ کا حصہ محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح میں بھی لڑنے مرنے کے لیے تیار تھا۔ میرا جوش یوں اور بھی بڑھ گیا تھا کہ ہم جو کچھ کرنے جا رہے تھے، وہ میری خواہش کے عین مطابق تھا۔ میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ میں کسی طرح اس ''جادونگری'' سے نکل جاؤں۔ بے شک اس راجواڑے نے ایک جادونگری ہی کی طرح مجھے کئی برس سے اپنے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ اب میرے لیے ایک سبب پیدا ہو گیا تھا۔ میں ایک ایسی جماعت کا حصہ بن گیا تھا جو یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس جماعت کے پاس یہاں سے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوسری طرف ہمیں روکنے والوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکل جانے دیں۔

یہ بات اب ہر شک و شبے سے بالاتر ہو چکی تھی کہ میرے جسم میں ایک الیکٹرانک چِپ موجود ہے جو مجھے اس راجواڑے کی حدود میں پابند رکھے ہوئے ہے۔ یہ چِپ اب بھی میرے جسم میں موجود تھی۔ میرے صیادوں کو اب بھی فوراً معلوم ہو سکتا تھا کہ میں اس اسٹیٹ میں کہاں ہوں اور کس طرف جا رہا ہوں۔ لیکن اب میں جس جماعت کا حصہ تھا، وہ اسے روک نہیں سکتے تھے۔ اگر وہ روکتے تو پھر زبردست خون خرابے کے حالات پیدا ہو سکتے تھے۔

جو بات چیت ہوئی تھی، اس میں چوہان نے پانڈے وغیرہ سے تین خچر بھی طلب کیے تھے۔ ہمیں دو خچر اور ایک گھوڑا دیا گیا۔ یہ تینوں جانور رات آٹھ نو بجے ہی سرنگ میں پہنچ گئے۔ ہمیں ان کو سامان برداری کے لیے استعمال کرنا تھا۔ حسبِ معمول رات کے پہلے حصے میں جن افراد کی ڈیوٹی تھی... ان میں، میں بھی شامل تھا۔ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں نے دس پندرہ منٹ تک چٹائی پر لیٹ کر کمر سیدھی کی اور پھر شراب کی نصف بوتل لے کر باروندا جیکی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں اس کے لیے ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی اور لالٹین رکھ دی گئی تھی۔ وہ تنہائی میں خوش رہتا تھا اور ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ علیحدہ رہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ نیند سے بیدار ہوتے ہی اس میں شراب کی طلب بیدار ہو جاتی تھی اور

یہ طلب شام تک بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شام کے بعد یہ طلب عروج پر پہنچ جاتی تھی اور وہ واویلا شروع کر دیتا تھا۔ ہمیں جہنمی ہونے کی بشارتیں سناتا... خود کو کوستا اور ان حالات کو بھی جو اسے پیاسا مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہم باروندا کو اس کی طلب کے مطابق شراب فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لیے تو اس سرنگ کے اندر ہی ایک چھوٹی سی فیکٹری لگائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں باروندا جیکی کے ٹھکانے پر پہنچا تو چونک گیا۔ وہ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا اور نہ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے نیڈ بیگ کی طرف دیکھا، وہ بھی اکیلا ہی جھول رہا تھا۔ لالٹین کی لو اونچی کر کے میں دائیں بائیں دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن میں آیا تھا کہ شاید وہ کسی حاجت کے لیے کسی کونے کھدرے کی طرف رینگ گیا ہے۔

اگلے دو چار منٹ کے اندر میری پیشانی پر پسینا آ گیا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اس کی اکلوتی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر زنجیر سے باندھ دی جاتی تھی اور صبح کے وقت ہی بس ایک دو گھنٹے کے لیے کھولی جاتی تھی... یا پھر کسی وقت رات کو جب وہ مجھے فائٹنگ آرٹ کے داؤ پیچ سکھاتا تھا، میں کچھ دیر کے لیے اس کی ٹانگ کھول دیتا تھا۔ رات آٹھ نو بجے میں خود ہی اسے کھانا دینے کے لیے یہاں آیا تھا، تب بھی اس کی ٹانگ بندھی ہوئی تھی۔ اگر وہ اسی بندھی ہوئی ٹانگ کے ساتھ رینگ کر کہیں جاتا تو زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اسے دو چار آوازیں دیں پھر اسے سرنگ کی ذیلی شاخوں میں ڈھونڈنا شروع کیا۔

میری آوازیں سن کر ہمیش اور احمد بھی ٹارچ کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔

''کیا ہوا تابش؟'' احمد نے پوچھا۔

''جیکی نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

وہ دونوں بھی میرے ساتھ تلاش میں شریک ہو گئے۔ ہم نے زمینی شہادت ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی۔ ایک دو جگہ ننگے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ یہ زیادہ پرانے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ بیساکھی نما لکڑی کا نشان بھی موجود تھا۔ تو کیا باروندا جیکی کسی طرح اپنی زنجیر کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ اپنے اکلوتے ہاتھ سے وہ کس طرح ایسا کر پایا تھا؟ جلد ہی دیگر ساتھیوں تک بھی یہ خبر پھیل گئی کہ جیکی غائب ہے۔

سب دہانے کے قریب اکٹھے ہو گئے۔ چوہان نے کہا۔ ''یہ تو سوچا نہیں جا سکتا کہ وہ باہر نکل گیا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ وہ دہانے کی طرف سے ہی نکل سکتا تھا۔''

''مطلب ہے کہ وہ سرنگ کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔'' اسحاق نے کہا۔

''ایک اور بات بھی تو ہو سکتی ہے۔'' انور خاں نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''وہ کیا؟'' چوہان نے پوچھا۔

''سرنگ سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ... جو اب تک ہماری نظر سے اوجھل رہا ہو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے انور بھائی۔'' اسحاق الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''تم جانتے ہی ہو، یہاں پہنچنے کے دوسرے ہی روز ہم نے چپا چپا دیکھ لیا تھا۔''

''لیکن ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہر جگہ پہنچے تھے اور سو فیصد تسلی کر لی تھی۔''

کسی نے انور کی اس بات کا جواب نہیں دیا۔ ہاں ایک طرح کی سنسنی سب نے محسوس کی۔ اگر واقعی سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ موجود تھا تو پھر اس راستے سے سرنگ میں داخل بھی ہوا جا سکتا تھا اور یہاں ہمارے دشمنوں میں پانڈے جیسا نہایت عیار اور گھاگ شخص بھی موجود تھا۔

انور خاں، چوہان اور اسحاق تو اپنی پوزیشنوں پر موجود رہے اور باقی ایک بار پھر جیکی کو ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ میں اپنی جگہ کچھ ندامت بھی محسوس کر رہا تھا۔ جیکی سے زیادہ تر میرا ہی رابطہ رہتا تھا۔ اس کی بندش کو چیک کرنا بھی میری ہی ذمے داری تھی۔ اسحاق اور انور خاں وغیرہ کا خیال تو شروع میں یہ تھا کہ مجھے اسے یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لیکن بعد میں جب انہیں جیکی کی مکمل کہانی معلوم ہوئی تھی، وہ بھی اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگے تھے۔

رات آخری پہر تک سرنگ کی بھول بھلیوں میں اس کی تلاش جاری رہی پھر ہم تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اب ہماری روانگی کا وقت بھی قریب آ رہا تھا۔ انور خاں کا خیال تھا کہ ہم اجالا ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں۔ جانوروں پر سامان رات کو ہی باندھ لیا گیا تھا۔ باقی تیاری بھی مکمل تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب ہم جیکی کی مزید تلاش جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

☆☆☆

چھ بجے کے لگ بھگ ہم سرنگ سے نکل آئے۔ مطلع صاف تھا۔ گردوپیش اوس میں نہائے ہوئے تھے۔ سرنگ چھوڑتے ہوئے میں نے الوداعی نظروں سے اس کے اندر جھانکا۔ یہاں گزارے ہوئے دن بڑے سنسنی خیز تھے... تناؤ سے پُر اعصاب شکن۔ یہاں کئی ایک انوکھے واقعات ہوئے تھے

جن میں شکاری کتوں کا اچانک سرنگ میں گھس آنا اور پھر اندھا دھند فائرنگ کا شروع ہوجانا بھی شامل تھا۔ ہم اپنے قریبی ساتھی فیروز کی قبر بھی اسی سرنگ کی ویران تاریکی میں چھوڑے جارہے تھے... اور پھر سب سے بڑھ کر بارونداجیکی تھا۔ وہ ایک معمے کی طرح ہمارے سامنے آیا تھا اور ایک معمے کی طرح اوجھل ہوگیا تھا۔ اس کا یوں اچانک اوجھل ہوجانا میرے دل ودماغ کو تہ وبالا کررہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس اب یہاں رکنے کا وقت نہیں تھا۔ ورنہ جیکی کو ہم کسی صورت چھوڑ کر نہ جاتے۔ انور خاں کے نزدیک اب بھی نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ جیکی کہیں سرنگ کی بھول بھلیوں میں ہی موجود ہوگا۔ جونہی وہ اپنے اردگرد کے حالات بہتر دیکھے گا، یہاں سے نکل جائے گا۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل اس بات کو نہیں مان رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل چکا ہے لیکن اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو کیا وہ اس خطرناک جنگل کو پار کرکے واپس اس ندی تک پہنچ سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ نہتا تھا، معذور تھا اور نشے کے بغیر اتنا کمزور تھا کہ کسی بھی وقت، کسی حادثے کا شکار ہوسکتا تھا۔

میرا دل اس کے لیے غم سے بھر گیا۔ عمران مجھ سے جدا ہوا تھا تو کیا وہ شخص بھی جدا ہوگیا تھا جس میں عمران کی ہلکی سی جھلک نظر آتی تھی؟

ایک ٹھنڈی سانس لے کر میں اس قافلے کا حصہ بن گیا جو اس سرنگ سے نکل کر گھنے درختوں میں داخل ہورہا تھا۔ اس مختصر قافلے میں موجود افراد ایک خاص ترتیب سے باہر نکلے تھے اور انور خاں کی ہدایت کے مطابق یہ ترتیب ہر صورت میں برقرار رکھی جانی تھی۔

سب سے آگے وہ گھوڑا تھا جس پر خوراک کا سامان لدا تھا۔ اس کے عقب میں چوہان، ہمیش اور احمد تھے۔ ان کے پیچھے ماریا تھی جس کے عین عقب میں اسحاق تھا۔ ماریا کے دائیں بائیں بھی دو افراد موجود تھے۔ اس کے پیچھے وہ باقی پانچواں افراد ایک نیم دائرے کی شکل میں تھے جنہیں زرگاں سے رہا کرایا گیا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس آتشیں ہتھیار تو نہیں تھا تاہم انور خاں نے ان میں سے چار بندوں کو تلواروں سے مسلح کردیا تھا۔ ان لوگوں کے عقب میں انور خاں اور میں تھے۔ ہم دونوں نے دو سامان بردار خچروں کی رسیاں بھی تھام رکھی تھیں۔ ان خچروں پر چٹائیاں، برتن اور اضافی ایمونیشن وغیرہ بار کیا گیا تھا۔ ہر بندے کو اپنی ڈیوٹی معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہنگامی صورتِ حال میں انہیں کیا کرنا ہے۔ جیسا کہ ترتیب سے ظاہر ہے، ماریا اس مختصر قافلے کے عین درمیان میں تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر باندھے جانے چاہیے تھے مگر انگلی کٹنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی تھا اس لیے انور نے تھوڑی سی رعایت کی تھی اور ہاتھ سامنے کی طرف بندھوائے تھے۔ اسحاق نے ایک بڑے سائز کی چادر اس کے جسم کے گرد لپیٹ دی تھی۔ وہ اس چادر کے اندر ڈگمگاتی ہوئی سی چل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تلخی اور جھلاہٹ کے آثار صاف محسوس کیے جاسکتے تھے۔

ہم روانہ ہوئے تو حسبِ پروگرام اسٹیل، پانڈے اور ان کے دیگر ساتھی ہمارے پیچھے چل دیے۔ اپنی ''کمٹمنٹ'' کے مطابق انہوں نے ہم سے کافی فاصلہ رکھا تھا۔ یہ ایک محفوظ فاصلہ تھا۔ یہ لوگ ہمارے پیچھے اور دائیں بائیں موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر گھڑسوار تھے۔ ان کی سبز اور براؤن وردیوں کی جھلک ہمیں چاروں طرف دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی سو سے کم نہیں تھی۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ بھی موجود تھا۔ یہ لوگ چاہتے تو سیکنڈوں میں ہمیں بھون کر رکھ سکتے تھے۔ لیکن ہمارے پاس ماریا ایک اہم مہرے کے طور پر موجود تھی۔ وہ اس اسٹیٹ میں ایک اہم ترین شخصیت تھی اور اس کی زندگی کے لیے رسک لینا آسان نہیں تھا۔

''ہمیں کتنا فاصلہ طے کرنا ہوگا؟'' میں نے اپنے پہلو میں چلتے انور خاں سے پوچھا۔

''میلوں میں تو ٹھیک سے نہیں بتا سکوں گا لیکن اندازہ ہے کہ یہ دو دن کا سفر ہوگا۔ ہم پرسوں دوپہر تک اسٹیٹ کی حد سے نکل جائیں گے۔''

''اسٹیٹ کی حد سے نکلنے کے بعد ہماری پناہ گاہ کہاں ہوگی؟''

''اسٹیٹ سے باہر جو مقامی لوگ آباد ہیں، وہ حکم وغیرہ کے سخت خلاف ہیں۔ یہ زیادہ تر جاٹ اور راجپوت برادریاں ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو نیپالی علاقے سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ حکم اور چھوٹے سرکار کے گارڈز کے ساتھ اکثر ان کی جھڑپیں چلتی رہتی ہیں۔ یہ لوگ ہمیں فوراً پناہ دے دیں گے۔''

''کیا ہم انہیں مطمئن کرسکیں گے کہ ہم واقعی حکم کے باغی ہیں اور ہمیں پناہ دی جانی چاہیے؟''

''یہ سب کچھ ڈاکٹر چوہان کرے گا۔ وہ انہی لوگوں میں سے ہے۔ شاید تمہیں چوہان کی روداد کا پورا پتا نہیں ہے۔''

''پورا کیا، مجھے تھوڑا پتا بھی نہیں ہے۔ اس نے صرف اتنا بتا رکھا ہے کہ وہ الٰہ آباد میں رہتا ہے۔ وہاں حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ اسے بھاگ کر اسٹیٹ میں آنا پڑا اور یہاں پناہ لینا پڑی۔''

انور بولا۔ ''حقیقت میں چوہان ایک دیہاتی کاشت کار کا بیٹا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر محنت مزدوری تک ہی محدود رہتے ہیں مگر چوہان قابل نکلا۔ نہ صرف یہ گاؤں سے شہر گیا بلکہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بھی بن گیا۔ الٰہ آباد میں اس کا کلینک تھا اور مریضوں کی لائن لگی رہتی تھی۔ انہی مریضوں میں چوالیس پینتالیس سال کی ایک ہندو عورت ہیما بھی تھی۔ یہ بیوہ تھی اور کافی پراپرٹی کی مالک تھی۔ اس کے بیٹے نافرمان تھے اور اس کوشش میں تھے کہ ماں سے پراپرٹی اپنے نام کروالیں۔ ہیما اپنے علاج کے دوران میں چوہان پر بے پناہ اعتماد کرنے لگی۔ یہاں تک کہ اس نے بیٹوں اور بہوؤں کے خوف سے اپنی پراپرٹی کے کاغذات چوہان کے پاس رکھوا دیے۔ یہ صورتِ حال ہیما کے بیٹوں کو کسی طور قبول نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹر چوہان کی جان کے دشمن ہوگئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہیما کی ایک بہو نے اپنی ساس پر بدچلنی کا الزام لگا دیا... اور کہا کہ اس کی ساس اپنا دھرم بدل کر نوجوان ڈاکٹر سے بیاہ رچالے گی۔ ہیما کے بیٹوں نے چوہان کو قتل کرنے کی کوشش کی اور اس معاملے میں پولیس کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا۔ چوہان کے خاندان برادری والے بھی بھڑک گئے۔ خدشہ پیدا ہوگیا کہ لڑائی ہوجائے گی۔ چوہان نے سمجھ داری دکھائی اور لوگوں کو خون خرابے سے بچانے کے لیے چپ چاپ اسٹیٹ میں آگیا۔ اب یہ قریباً ڈھائی برس سے یہیں پر ہے۔''

چوہان کے بارے میں جاننے کی خواہش کافی دیر سے میرے دل میں تھی۔ آج انور خاں کے ذریعے یہ خواہش پوری ہوگئی تھی۔ میں نے اس روداد کے حوالے سے انور خاں سے کئی سوالات پوچھے۔ جو کچھ انور کو معلوم تھا، اس نے بتایا۔ ساتھ ساتھ ہمارا سفر بھی جاری رہا۔ میں نے انور سے پوچھا۔ ''اب چوہان اسٹیٹ سے باہر جارہا ہے اور اپنے لوگوں میں واپس پہنچ رہا ہے۔ کیا اب اس کے لیے خطرہ نہیں ہوگا؟''

''اسٹیٹ سے باہر حالات کافی بدل گئے ہیں۔'' انور خاں نے جواب دیا۔ ''ہیما کے لالچی بیٹے ایک دوسرے سے ہی لڑ پڑے ہیں۔ ایک قتل ہوگیا ہے اور دوسرا جیل میں سڑ رہا ہے۔ ایک بہو اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے... اور یہ وہی ہے جس نے اپنی ساس پر الزام لگایا تھا۔ سارا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ ہیما نے اپنی زیادہ تر پراپرٹی بیچ دی ہے اور گورکھ پور چلی گئی ہے۔''

ہم بظاہر تو باتیں کرتے ہوئے جارہے تھے مگر اطراف پر ہماری گہری نظر تھی۔ ایک عجیب سی سنسنی بھی رگ وپے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اور انور خاں سب سے پیچھے تھے۔ اگر خدانخواستہ کسی طرح کی کوئی کارروائی ہوتی تو سب سے پہلے ہم ہی نشانہ بنتے۔ عقب سے قافلے کے تحفظ کی ذمے داری بھی ہم پر ہی تھی۔

دوپہر ایک بجے کے قریب ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ہمارے رکتے ہی ساتھ چلنے والے حکم کے دو ڈھائی سو اہل کار بھی رک گئے۔ ہم نے کھانا وغیرہ کھایا۔ چوہان نے اپنی اور احمد کی مرہم پٹی کی۔ ہمیش کے ٹوٹے ہوئے بازو کی دیکھ بھال بھی چوہان باقاعدگی سے کررہا تھا۔ دیکھا جاتا تو ہم میں سے زیادہ تر زخمی تھے۔ اگر ڈاکٹر چوہان ساتھ نہ ہوتا تو ہماری حالت کافی ابتر ہوتی۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتا تو ڈاکٹر چوہان اس قافلے کا اہم ترین بندہ تھا۔

ہمارا سفر گھنے جنگل کا تھا۔ کہیں کہیں راستہ زیادہ دشوار ہوجاتا تھا۔ ایسے میں تلوار بردار افراد آگے چلے جاتے تھے اور کہیں کہیں سے شاخوں کو کاٹ کر راستہ بناتے تھے۔ تلواریں ایک سرسراہٹ کے ساتھ شاخوں سے ٹکراتیں۔ ایسے ہی سرسراہٹ ہمارے اردگرد بھی سنائی دیتے۔ یہ پانڈے اور اس کے ساتھی ہوتے تھے جو ہماری ہی طرح راستہ بنانے کی کوشش کررہے ہوتے تھے۔ جنگل میں شیشم، کیکر، جنتر اور کچنار کے درختوں کی بھرمار تھی اور جنگلی جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ایک دو جگہ ایسے نشان بھی نظر آئے جن کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تیندوے کے ہیں۔ ان نشانوں کی وجہ سے قافلے میں سنسنی کی لہر محسوس کی گئی۔

چلتے چلتے ایک جگہ ماریا کو اچانک ٹھوکر لگی۔ اس کی بائیں جانب چلنے والے شخص نے بے ساختہ اسے تھاما اور گرنے سے بچایا۔ یہ وہی پارس تھا جو سات افراد کے ہمراہ جارج کی جیل سے رہا ہوکر آیا تھا۔ حالانکہ اس نے ماریا کی مدد کی تھی مگر ماریا نے اس پر ناک بھوں چڑھائی۔ شاید اسے کوفت ہوئی تھی کہ ایک نیچ کالے نے اسے چھوا ہے۔

''ہام سے دور رہو۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''معافی چاہت ہوں میم جی۔'' پارس گڑبڑا کر رہ گیا۔

''اب اس کو ہاتھ مت لگانا۔ چاہے گر کر اس کے تھوبڑے کا بھرتا بن جاوے۔'' اسحاق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ماریا اس رسی کی طرح تھی جو جل جاتی ہے لیکن اس کے بل نہیں جاتے۔ پچھلے چند دن میں وہ بہت خوار ہوئی تھی... اس کے باوجود اس کی اکڑفوں برقرار تھی۔ اس کی نظروں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو حقارت سے دیکھ رہی ہے... غالباً نسلی تعصب بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہمارا سفر جاری رہا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ درختوں کی گھنی شاخوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آتی تھیں۔ کسی وقت ہلکی سی تمازت بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ایک جگہ عجیب سا واقعہ ہوا۔ ہمیں اپنے اردگرد مختلف جنگلی جانوروں کی موجودگی کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کم کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ بس کسی وقت ہلکی سی جھلک نظر آ جاتی تھی۔ اردگرد کے درختوں پر بندر اور ان کے بچے بھی اچھلتے کودتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی باریک آوازیں جنگل میں دور تک گونجتی تھیں۔ ایک بڑے چھتاور درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے دفعتاً ایک جسیم بندر ماریا پر آن گرا۔ بالکل جیسے بجلی سی چمک جاتی ہے۔ بس اتنا ہی دکھائی دیا کہ اس نے ماریا کے ہاتھوں سے کوئی شے چھینی ہے... پھر وہ جتنی تیزی سے آیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس شاخوں پر چلا گیا۔ ماریا چلاتی ہوئی بائیں طرف ایک شخص پر گری۔ دونوں لڑھک کر ایک بارشی گڑھے میں چلے گئے۔ دو تین راکفلیں بندر کی طرف سیدھی ہوئیں مگر وہ زقند لگا کر شاخوں میں اوجھل ہو گیا۔ ماریا بدحواسی میں جس شخص سے ٹکرائی یہ وہی پارسی تھا جسے اس نے سہ پہر کے وقت برا بھلا کہا تھا۔ اب پارسی اوپر اور وہ اس کے نیچے تھی۔ پارسی تڑپ کر اٹھا لیکن کیچڑ کی وجہ سے پھر پھسل کر میم صاحبہ کے اوپر جا گرا۔ اسحاق اور احمد نے اسے کھینچ کر اٹھایا، پھر ماریا کو گڑھے سے باہر نکلنے میں مدد دی۔ پارسی ریان اور ماریا دونوں کیچڑ میں لت پت تھے۔

قافلہ رک گیا تھا۔ قافلے کے ساتھ ہی وہ دو ڈھائی سو افراد بھی رک گئے جن کی کمان پانڈے اور اسٹیل وغیرہ کے پاس تھی۔ پانڈے کے ایک ساتھی نے آگے آ کر استفسار کیا کہ کیا ہوا ہے۔ انور خاں نے اسے واقعے سے آگاہ کیا۔ ماریا کے چہرے اور لباس سے کیچڑ وغیرہ صاف کیا گیا۔ وہ اپنے گھر میں ہوتی تو شاید اس طرح سڑے ہوئے کیچڑ میں لتھڑ جانے کے بعد کئی گھنٹے واش روم کے اندر ہی گزارتی لیکن یہاں اسے بس ایک بالٹی پانی ہی میسر آ سکا۔ پارسی ریان کو اتنا بھی نہیں ملا۔ کچھ دیر بعد جب قافلہ پھر روانہ ہوا تو ہم نے اس شریر بندر کو دوبارہ دیکھا۔ وہ ایک شاہ بلوط کی بلند شاخوں پر بیٹھا بسکٹ کھا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بسکٹ کا [illegible] تھا۔ وہ ماریا سے یہی چھین کر لے گیا تھا۔ ماریا اب کچھ شرمندہ شرمندہ سی نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے بھی احساس تھا کہ جس شخص کے صرف ہاتھ لگانے پر وہ برہم ہو گئی تھی، اس کے ساتھ اسے باقاعدہ بغل گیر ہونا پڑا تھا۔

میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے میم جی اب کچھ شرما رہی ہے۔''

انور خاں گہری سانس لے کر بولا۔ ''ان گوری چمڑی والوں میں شرم کم ہی ہوتی ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتے ہو کہ شرمندہ ہو رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے یا غیرت شیرت جاگتی ہے۔''

ہم مدھم آواز میں باتیں کرتے چلتے رہے۔ باتیں کرتے ہوئے بھی انور خاں عقابی نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی حیثیت ٹیم کے اس کپتان کی سی تھی جو ہمہ وقت فیلڈ پر گہری نظر رکھتا ہے اور ہر نقل و حرکت کو نوٹ کرتا ہے۔

رات کو درختوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ پر ڈیرا ڈالا گیا۔ درختوں کی شاخوں سے لالٹینیں لٹکا دی گئیں۔ دو عارضی چولہے بنائے گئے۔ راستے میں شکار کیے گئے گوشت کو بھونا گیا۔ نہایت سنگین صورتِ حال کے باوجود اس قیام نے لطف دیا۔ جنگلی جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی مداخلت سے محفوظ رہنے کے لیے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے الاؤ روشن کر دیے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا تو سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ ایک دم مجھے بارونداجیکی پھر یاد آ گیا۔ وہ کہاں چلا گیا تھا؟ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ بھی اتنی جلدی کھو جائے گا۔ اس خطرناک جنگل میں وہ اکیلا کس طرح ''سروائیو'' کرے گا؟ یہ سوال ایک تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست تھا۔

چند دنوں کے ساتھ میں جیکی نے مجھے بہت کچھ دیا تھا اور اس میں سب سے اہم، درد کے حوالے سے وہ فلسفہ تھا جس نے میرے دل کی گہرائی کو چھوا تھا۔ وہ درد کے ساتھ انوکھے طریقے سے نمٹنا جانتا تھا اور اس نے یہ جانکاری بڑی تفصیلی انداز میں مجھ تک پہنچائی تھی۔ مجھے لگا جیسے اس معاملے میں بھی عمران نے ہی میری مدد کی ہے۔ اگر مجھے جیکی میں اپنے بچھڑے یار کی جھلک نظر نہ آتی تو میں اسے کشتی سے اٹھا کر کہاں لاتا... اور اگر وہ نہ آتا تو پھر... اس کی باتیں بھی وہیں کشتی میں اس کے ساتھ رہ جاتیں...

مجھے لگا کہ مجھ سے بچھڑنے کے باوجود عمران قدم قدم پر میری مدد کر رہا ہے۔ کبھی کسی ڈھنگ سے، کبھی کسی روپ میں... وہ ہمہ وقت میرے ساتھ تھا۔ اس کی معنی خیز باتیں، اس کی جاں بخش مسکراہٹ، اس کی جادوئی چٹکی... سب کچھ میرے ساتھ تھا۔ اور پھر اس کی آواز، اس کا وہ انقلاب آفریں جملہ جس نے میری ناتوانیوں و نامرادیوں کی راکھ میں سے ایک نئے انسان کو وجود دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''مرنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن میں اپنی موت کی ذمے داری خود پر لینا نہیں چاہتا۔ اس لیے خطرات سے ٹکراتا ہوں اور بدترین حالات کا پیچھا کرتا ہوں۔'' اور پھر اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا تھا۔ ''جو ڈرتا ہے تو مرتا ہے اور مرتا ہے تو ڈرتا کیا۔''

وہ رات خیریت سے گزری۔ ہم نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے باری باری پہرا دیا اور آرام بھی کیا۔ اگلی صبح اجالا ہونے کے ساتھ ہی ہم پھر روانہ ہو گئے۔ ہمارے روانہ ہوتے ہی ہمارے اردگرد موجود دو ڈھائی سو افراد بھی حرکت میں آ گئے۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ گرو مودوان ان لوگوں میں موجود نہیں، تاہم پانڈے، اسٹیل اور موہن کمار وغیرہ ساتھ ہی ہیں۔ جارج کی جیل سے رہا ہونے والے قیدیوں میں حجام عبدالرحیم بھی تھا۔ آج وہ میرے اور انور خاں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ہمیں زرگاں کی اس بدنام جیل کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا۔ ''میں حکم کے ایک سپاہی کو استرا مارنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ میرے استرے سے وہ بری طرح گھائل ہوا تھا۔ وہ میرے پاس ایک مسلمان بوڑھے کو لایا تھا۔ اس بوڑھے پر حکم کا کوئی افسر ناراض تھا۔ سپاہی نے مجھ سے کہا کہ میں بوڑھے کی داڑھی اور سر کے بال مونڈ دوں۔ میں نے انکار کیا۔ وہ سخت غصے میں آ گیا۔ اس نے مجھے گالی دی۔ میں نے اس کی گردن پر استرا مارا اور بھاگ گیا۔ دو دن بعد مجھے ٹل پانی کے راستے میں پکڑ لیا گیا۔''

''کب سے جیل میں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تین سال سے اوپر ہو گئے ہیں جی۔ مگر ایسے لگتا ہے کہ تین صدیاں بیت گئی ہیں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ پھانسی ہی دے دیتے۔ وہاں جیل میں بڑی کڑی مشقت لی جاتی ہے۔ بات بے بات ذلیل کیا جاتا ہے۔ جارج صاحب کے ہرکارے مار مار کر ادھیڑ دیتے ہیں... یہ ہرکارے قیدی عورتوں پر بھی ہر طرح کا ظلم ڈھاتے ہیں۔ وہاں کوئی کسی کی فریاد سننے والا نہیں۔'' عبدالرحیم نے اپنی قمیص اٹھا کر پشت دکھائی۔ یہاں ہنٹر کی مار کے انمٹ نشان موجود تھے۔ جس طرح گھوڑوں کی پیٹھ کو داغا جاتا ہے اسی طرح عبدالرحیم کی پیٹھ کو بھی داغا گیا تھا... یہ عبدالرحیم کا نمبر تھا... R88۔

عبدالرحیم، جارج کی جیل کے لرزہ خیز واقعات سناتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ اس جیل کے قیدیوں کی زندگی و موت کلی طور پر جارج اور اس کے اہل کاروں کے ہاتھ میں تھی۔ اگر زرگاں میں کہیں قانون کا تھوڑا بہت گزر ہے بھی... تو اس جیل میں نہیں۔

سہ پہر تک حبس رہا لیکن پھر ایک دم بادل گھر کر آ گئے۔ شمالی افق پر ایک کالی سیاہ گھٹا نظر آئی۔ آثار سے ظاہر تھا کہ زبردست بارش شروع ہونے والی ہے۔ ہمیں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پرانی چوکی نظر آ رہی تھی۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی چوکیاں ہمیں جنگل میں کئی جگہ ملی تھیں۔ یہ دو تین کمروں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ان کی دیواریں موٹی اور کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ ان چوکیوں کی چھتیں لکڑی کی تھیں۔ وزنی شہتیر اور بالے وغیرہ کی۔ شہر میں اتنی مہنگی چھتیں ڈالنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن یہ جنگل تھا، یہاں لکڑی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو دیواریں بھی اسی قیمتی لکڑی کی بنا سکتے تھے۔ ان چوکیوں میں سے اکثر کی چھتیں گر چکی تھیں اور اندر خودرو گھاس اگی ہوئی تھی، تاہم دو چار چوکیاں سلامت بھی نظر آئی تھیں۔

انور خاں نے بتایا تھا کہ دس پندرہ سال پہلے تک بھانڈیل اسٹیٹ کی حد ان چوکیوں تک ہی تھی لیکن بعد میں اسٹیٹ کی حد بڑھا لی گئی اور نئے بارڈر پر نئی چوکیاں بنا لی گئیں۔ یہ پرانی چوکیاں بے کار ہو گئیں یا ان کو گودام وغیرہ کی شکل دے دی گئی۔

ہمیں کچھ فاصلے پر ایسی ہی ایک بوسیدہ چوکی نظر آ رہی تھی۔ انور خاں رک گیا۔ اس نے ساتھیوں کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''ابھی پڑاؤ کا وقت تو نہیں ہے لیکن لگتا ہے کہ موسم خراب ہونے والا ہے۔ اگر ہمیں کھلے میں بارش نے گھیر لیا تو مصیبت ہو جائے گی۔ پانڈے اور اس کے ہرکاروں کے پاس تو چھولداریاں وغیرہ ہیں، ہم کیا کریں گے؟''

چوہان نے بھی افق پر پھیلتی ہوئی تاریکی کو دیکھا اور بولا۔ ''اس چوکی کو اندر سے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر یہ رات گزارنے کے قابل ہے تو یہاں رک جاتے ہیں۔''

دیگر ساتھیوں نے بھی تائید کی۔ ہم نے چوکی کا اندر سے جائزہ لیا، چھتیں سلامت تھیں۔ جھاڑ جھنکاڑ موجود تھا لیکن اسے معمولی کوشش سے صاف کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے رکنے کا

فیصلہ کرلیا۔

... ہمارا یہ فیصلہ درست ہی ثابت ہوا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر بارش شروع ہوگئی۔ سہ پہر چار بجے کا وقت تھا لیکن اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چمکنے لگی اور بادل دہاڑنے لگے۔ ہمارے ساتھ اسٹیل... پانڈے اور ان کے ساتھیوں کو بھی رکنا پڑا تھا۔ موسم کے تیور دیکھتے ہوئے انہوں نے بڑی تیزی سے چھولداریاں اور خیمے وغیرہ لگائے تھے۔

جنگل کی بارش کا آہنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ گردوپیش ایک تاریک دھند لکے میں چھپ جاتے ہیں اور آواز سے لگتا ہے کہ کہیں ایک بہت بڑا آبشار گر رہا ہے۔ چوکی کی چھت کہیں کہیں سے ٹپک رہی تھی، وہاں برتن رکھ دیے گئے تاکہ زمین گیلی نہ ہو۔ کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر دی گئیں۔ خنکی ایک دم ہی بڑھ گئی تھی۔ چوکی کے اندر سے ہی کاٹھ کباڑ جمع کرکے آگ روشن کرلی گئی۔ جانوروں کو چھت مہیا نہیں کی جا سکتی تھی لہٰذا ان پر سے سامان اتار لیا گیا۔ پانڈے اور اس کے دو ڈھائی سو اہل کاروں نے چوکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

چوہان نے دونوں خچروں اور گھوڑے پر سے سامان اتروایا۔ اس کی آواز آئی۔ ''انور خاں! صرف دو لالٹینیں ہیں۔ باقی دو لگتا ہے کہ راستے میں کہیں گر گئی ہیں۔''

''چلو جو ہیں انہیں تو روشن کراؤ۔'' انور خاں نے کہا۔

''ان میں سے ابھی ایک میں بس تھوڑا سا تیل ہے۔ ایک دو گھنٹے ہی چلے گی!''

''ٹارچ وغیرہ سے کام چلا لیں گے۔'' انور نے تسلی دی۔

ماریا تھک کر چور ہوگئی تھی... اور سونا چاہتی تھی۔ چوہان نے اس کے زخمی ہاتھ کی پٹی بدلی اور ایک چھوٹے کمرے میں اس کے لیے چٹائی بچھا دی۔ حسب معمول اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر تالا لگا دیا گیا۔ مزید احتیاط کے طور پر کمرے کو بھی باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ چوکی میں داخل ہونے کا واحد راستہ سامنے کی طرف سے تھا۔ برآمدے میں چوکور ستونوں کی اوٹ میں دو رائفل برداروں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔ ستونوں کے اندر باقاعدہ سوراخ تھے جن میں رائفل کو ''پوزیشن'' کیا جا سکتا تھا اور اردگرد نگاہ بھی رکھی جا سکتی تھی۔ ایک مورچا انور نے اور دوسرا اسحاق نے سنبھال لیا۔ اپنے سفر کے اس آخری مرحلے میں ہم کسی طرح کی کوتاہی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بارش مسلسل جاری تھی۔ چوکی کے سامنے ایک چھوٹی سی آبی گزرگاہ بن گئی تھی جس میں تیز رفتار پانی بہہ رہا تھا۔ میرے اندر کی کیفیت پھر عجیب ہو رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ جنگی ہو، نیڈ بیگ ہو اور رات کا وہ آخری پہر ہو۔ میں جنگی کی ہدایت کے مطابق نیڈ بیگ پر ننگے ہاتھوں سے حملہ کردوں اور اس وقت تک مکے برساتا رہوں جب تک میرے ہاتھوں کی کھال چھل نہ جائے اور خون میری کہنیوں تک نہ پہنچنے لگے۔ پتا نہیں کیوں اب دھیرے دھیرے جسمانی چوٹیں مجھے تکلیف کے ساتھ ساتھ مزہ بھی دینے لگی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد تھکاوٹ نے اثر دکھایا اور جلد ہی سب سو گئے۔ صرف وہ جاگتے رہے جنہیں شروع رات میں ڈیوٹی دینی تھی۔ یعنی انور خاں اور اسحاق۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ ایک لالٹین بجھ چکی تھی۔ صرف ایک لالٹین کی مدھم روشنی جھلک دکھا رہی تھی۔ میں نے کسی کو اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔ ''کون؟'' میں نے پوچھا۔

پارسی ریان کی مدھم آواز آئی۔ ''میں ہوں۔ پیشاب کرنے جاوت ہوں۔''

میں نے پھر سر تکیے سے ٹکا دیا... اور سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلنے کی وجہ، پاؤں میں اٹھنے والی ٹیس تھی۔ شاید کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹا تھا۔ میں نے اٹھ کر پاؤں کو جھاڑا اور پھر لیٹ گیا۔ تب مجھے دوبارہ ایک سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ ''کون؟'' میں نے پھر استفسار کیا۔

یہ پارسی ریان ہی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گرم چادر لینے گیا تھا۔

بارش کے ساتھ اب تیز ہوا بھی چلنا شروع ہوگئی تھی۔ پانی کی بوچھاڑیں کھڑکیوں کے چوبی تختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ موسم نے ایک دم کروٹ لے لی ہے اور ٹھنڈ شروع ہوگئی ہے۔ میں نے قریب لیٹے ڈاکٹر چوہان سے وقت پوچھا اور پھر سو گیا۔ ابھی ہماری ڈیوٹی شروع ہونے میں قریباً دو گھنٹے باقی تھے۔

پتا نہیں کہ اس بار میں کتنی دیر سویا رہا۔ یکایک مجھے لگا کہ چھت ایک دھماکے سے مجھ پر آن گری ہے اور ہر طرف قیامت برپا ہوگئی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چھت تو اپنی جگہ موجود تھی لیکن اس کے علاوہ کچھ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ میں نے چوہان، احمد، اور ہمیش کو چلاتے ہوئے سنا۔ وہ بدحواسی میں برآمدے کی طرف لپک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ ایک سیکنڈ کے لیے تاریک جنگل روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا۔

برستی بارش میں میری نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑی، وہ ماریا تھی۔ وہ اندھا دھند چھولداریوں کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ اس کے جسم پر صرف شرٹ اور انڈرویئر تھا۔ اس کی لمبی ٹانگیں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ میں نے یہ سارا منظر ایک سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھا۔

ایک سیکنڈ بعد سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا مگر تب تک میں اپنی انگلی رائفل کے ٹریگر تک پہنچا چکا تھا۔ میں نے ماریا کے رخ پر یکے بعد دیگرے چار فائر کیے۔ ان میں سے کم ازکم ایک گولی ضرور ماریا کو لگی۔ چالیس پچاس فٹ کی دوری سے مجھے اس کے چلانے کی آواز آئی۔ چوکی کے دروازے کی طرف بھی زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ سارا جنگل دھماکوں اور للکاروں سے گونج رہا تھا۔ احمد پکار رہا تھا۔ ''انور بھائی! میں چھت پر جا رہا ہوں۔''

انور خاں نے اسحاق کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ ''اسحاق! کھڑکی کے پاس۔''

اسی دوران میں بجلی نے چمک کر پھر نشیب و فراز کو روشن کیا۔ مجھے ماریا کی فقط ایک جھلک نظر آئی۔ اسے کسی نے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ تناور درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ میں نے رائفل کو کھڑکی میں رکھ کر پھر دو تین فائر کیے۔ ایک برسٹ سلاخ دار کھڑکی کے بالکل پاس دیوار سے ٹکرایا۔ چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ مجھے ایک دم نیچے جھکنا پڑا۔

صورتِ حال بڑی نازک ہوگئی تھی۔ وہ کام ہوگیا تھا جسے بدترین کہا جا سکتا تھا۔ ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ کیسے نکلی تھی؟ کس وجہ سے نکلی تھی؟ یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا... فی الحال تو ہم مسلح افراد کے گھیرے میں تھے اور اگلے چند منٹ میں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں جھک کر چلتا ہوا دوسری کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں انور خاں کی ہدایت کے مطابق اسحاق موجود تھا اور مسلسل فائر کر رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہوگیا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں اس طرح مورچا بند ہو کر کسی لڑائی میں حصہ لے رہا تھا... ٹریگر پر انگلی کو حرکت دینا، رائفل کے جھٹکے کو برداشت کرنا، مخالف سمت سے آنے والی گولی کے خطرے کو محسوس کرنا... یہ سب کچھ میرے لیے نیا تھا۔

قریباً سات آٹھ منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ پھر ایک دم یہ سلسلہ ٹھہر گیا۔ غالباً ہمارے مخالفین کوئی حکمت عملی سوچ رہے تھے۔ وہ ہمیں مارنے یا زندہ پکڑنے کی بہترین پوزیشن میں تھے اور... غالباً... انہیں کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ وہ کس طرح کم سے کم جانی نقصان کرا کے ہمیں بے بس کر سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہمیں بس ایک معمولی سا فائدہ حاصل تھا اور وہ یہ کہ ہمارے مخالفین کھلی جگہ پر تھے جبکہ ہم اس چوکی میں مورچا بند تھے لیکن یہ مورچا بندی ایک طرح سے نقصان دہ بھی تھی۔ یہ عمارت ہمارے لیے چوہے دان بن سکتی تھی۔ اگر یہ دو ڈھائی سو افراد ہم تیرہ چودہ بندوں کو مارنے پر ہی تل جاتے تو پھر وہ اس چوکی کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتے تھے۔

''یہ ہوا کیسے؟'' میں نے لرزتی آواز میں اسحاق سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ... اس حرامی کتے کی وجہ سے۔'' اسحاق نے کہا اور بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ سلاخ دار کھڑکی سے باہر پھینکا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ کھڑکی سے تیس چالیس فٹ کی دوری پر ایک لاش اوندھی پڑی نظر آئی۔ یقیناً یہ پارسی ریان کی لاش تھی۔ میں نے اسے اس کے کپڑوں سے پہچانا۔

''یہ کیا ہوا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ اس حرامزادی کے ساتھ ہی بھاگ رہا تھا۔ انور بھائی نے اسے گولی ماری ہے۔''

''لیکن... لیکن وہ تو دوسری طرف بھاگی ہے...؟''

''ہاں، یہ اس طرف آیا تھا... وہ چھولداریوں کی طرف گئی تھی...''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا یار... وہ تو تالے میں تھی۔ اس کے پاؤں میں بھی زنجیر تھی...؟''

''تالے کھولنے والا یہ کتا بھی تو ہمارے ساتھ ہی تھا۔'' اسحاق نے نفرت سے کہا اور ٹارچ کی روشنی ایک بار پھر ریان کی لاش کی طرف پھینکی۔

میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ جب یہ ساتوں قیدی جارج کی جیل سے رہا ہو کر سرنگ میں آئے تھے تو انور خاں نے ان سب کا تعارف کرایا تھا۔ پارسی ریان کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک ماہر قفل ساز ہے۔ اب صورتِ حال کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ سانحہ اس پارسی ریان کی وجہ سے ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج رات میں نے دوبار اس کی مشکوک نقل و حرکت بھی دیکھی تھی لیکن سوال یہ تھا کہ ریان نے ایسا کیا کیوں؟

میں نے یہی بات اسحاق سے پوچھی تو وہ ایک طرف تھوک کر بولا۔ ''ابھی ٹھیک سے تو پتا نا ہیں... لیکن لگت ہے کہ اس کو روٹی گوشت کی خماری چڑھی ہے۔''

”روٹی گوشت کی خماری؟“

”ہاں، تین سال سے کنجر جیل میں پڑا ہوا تھا۔ اب پیٹ بھر کر کھانا ملا... عورت دیکھی تو حرامی کے اندر کا جنگلی سور جاگ پڑا۔“

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ اب بات پوری طرح میری سمجھ میں آرہی تھی۔ اگلے دو چار منٹ میں سب کچھ کھل گیا کہ کیا ہوا ہے۔

اسحاق کے کہنے پر میں اس چھوٹے کمرے کی طرف گیا جہاں ماریا کو حفاظت کی غرض سے بند کیا گیا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، کمرے کے دروازے کا آہنی قفل کھلا ہوا تھا۔ اندر وہ زنجیر بھی کھلی پڑی تھی جو رات کے وقت ماریا کے پاؤں میں ڈالی جاتی تھی۔ زنجیر کے چھوٹے لاک کو بھی ایک آہنی تار کے ذریعے کھولا گیا تھا۔ چٹائی پر ماریا کی نیلی جینز پڑی تھی اور بالائی جسم کا زیر جامہ پڑا تھا۔ کمرے کا یہ نقشہ وہ ساری کہانی سنا رہا تھا جو یہاں گہری تاریکی میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔

اسی دوران میں انور خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے تیزی سے موقع کا جائزہ لیا اور یقیناً اسے بھی وہ سب کچھ سمجھ میں آگیا جو مجھے آیا تھا۔ اس نے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کو ٹھوکر ماری اور ریان کو غائبانہ صلواتیں سنائیں۔ میں نے انور خاں کو بتایا کہ رات پہلے پہر کس طرح ریان پیشاب کرنے اور چادر لینے کے بہانے حرکت کرتا نظر آیا تھا۔

انور خاں بولا۔ ”خبیث نے سب کچھ پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل شام جو دو لالٹینیں گم ہوئی تھیں، وہ بھی اسی نے کہیں گرائی ہوں گی... یا آس پاس کہیں چھپا دی ہوں گی۔“

یقیناً یہاں جو کچھ ہوا تھا، ماریا اور ریان کی باہمی انڈر اسٹینڈنگ سے ہوا تھا۔ انور خاں نے پرسوں جو الفاظ کہے تھے وہ میرے کانوں میں گونج گئے۔ اس نے کہا تھا... ان گوری چمڑی والوں میں شرم کم ہی ہوتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی مشینری میں وہ پرزے ہی نہیں ہوتے جن سے شرم آتی ہے...

تو کیا یہاں بھی اسی انتہا درجے کی ”بے شرمی“ نے کام دکھایا تھا؟ آزادی حاصل کرنے کے لیے ماریا نے اپنا آپ اس شخص کے حوالے کر دیا تھا جس کے ساتھ چھو جانا بھی اسے کل تک گوارا نہیں تھا۔ یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔ پارسی ریان نے یہاں سے نکلنے میں ماریا فرگوسن کی مدد کی تھی، تاہم اس مدد کی بھرپور قیمت بھی وصول کی تھی۔ عین ممکن تھا کہ ماریا کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے اس وقت تک ماریا کے پاؤں ہی نہ کھولے ہوں جب تک اپنا مطلب پورا نہ کرلیا ہو۔ وہ ماسٹر قفل ساز و قفل شکن تھا اور اس نے جو دو ”آخری قفل“ کھولے تھے، انہوں نے اس پر مسرت کا در وا کیا تھا اور موت کا بھی۔

انور خاں کے ایک کان سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی پوری سائڈ نیلی ہو رہی تھی۔ ”یہ کیا ہوا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جس وقت ماریا یہاں سے بھاگی، اس کے ہاتھ میں پختہ اینٹ تھی۔ اسحاق سو گیا تھا لیکن میں جاگ رہا تھا لیکن میری ساری توجہ بھی باہر کی طرف تھی۔ یہ گمان ہی نہیں تھا کہ اندر سے بھی کوئی خطرہ ہوسکتا ہے۔“ انور نے کان کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔

یہی وقت تھا جب اوپر تلے دو فائر ہوئے اور پھر ایک برسٹ چلا۔ قریبی سیڑھیوں سے کوئی لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور عین انور خاں کے قدموں میں گرا۔ یہ احمد تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے چھت پر پوزیشن سنبھالی تھی۔ اس کا کندھا خون سے سرخ نظر آرہا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس پر پانچ دن پہلے دوطرفہ فائرنگ میں لمبے کارتوس کا موٹا چھرا لگا تھا۔

میں نے احمد کو سنبھالا، انور خاں دوڑتا ہوا اپنی پوزیشن پر واپس پہنچ گیا اور جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ ایک بار پھر اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ دھماکوں سے قرب و جوار گونج رہے تھے، ہر طرف شعلوں کا رقص تھا۔ میں، چوہان اور اسحاق بھی پوری توانائی سے اس جوابی فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ مخالف فریق کا پلڑا واضح طور پر بھاری تھا۔ ہماری ایک گولی کے جواب میں درجنوں گولیاں آرہی تھیں۔

انور خاں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ورنہ مارے جائیں گے۔“

”لیکن انہوں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے۔“ چوہان کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گھیرا توڑ کر نکلنا ہوگا۔ ورنہ کچھ نہیں ہوسکے گا۔“ انور خاں کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”ہاں، تخت یا تختہ... اگر کچھ نا ہیں کریں گے تو بے موت مارے جاویں گے۔“ اسحاق نے اپنی رائفل سے ایک طویل برسٹ چلاتے ہوئے کہا۔

میں نے دھیان سے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ اسحاق کے قدموں میں ایک بندے کی لاش پڑی تھی۔ یہ ان ساتوں افراد میں سے ایک تھا جو [illegible] رہا ہوئے تھے۔ یقیناً اسے دوطرفہ فائرنگ میں گولی لگی تھی۔ یہ واقعی نازک ترین گھڑیاں تھیں۔ ماریا کو اپنے ہاتھ سے کھونے کے بعد ہم ایک دم موت کے منہ میں آگئے تھے۔ یہاں رہتے تو موت تھی، باہر نکلتے تو بھی موت تھی۔ بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔

تو کیا آخری وقت آگیا ہے؟ میں نے بے حد درد سے سوچا۔ اس بارشی رات، میں اس گھنے جنگل کے کسی نامعلوم حصے میں... ان تابڑ توڑ برستی گولیوں کے درمیان میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے؟ کیا کبھی میرے پیاروں کو معلوم ہو سکے گا کہ میں کہاں اور کس حالت میں موت کے سفر پر روانہ ہوا تھا؟ کیا کبھی کوئی میرے آخری لمحوں کے بارے میں جان سکے گا؟ چند لمحوں کے لیے... صرف چند لمحوں کے لیے میرے اندر مایوسی اور ناتوانی ابھری لیکن پھر فوراً ہی عمران کا تصور اندھیرے سے برآمد ہوا اور مسکراتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی شبیہہ ان لمحوں میں بالکل واضح اور روشن تھی۔ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی دلکش ہڈیاں، اس کی تھوڑی کا گڑھا، اس کے چمکتے ہوئے ہموار دانت۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مخمور لہجے میں بولا۔ ”آنکھیں بند کر کے کود جاؤ جگر... زیادہ سے زیادہ موت ہی ملے گی نا۔ اور موت تو ہماری محبوبہ ہے۔ وہ ہمارے آگے آگے بھاگتی ہے۔ ہم نے اس کے پیچھے بھاگنا سیکھ لیا ہے...“

میرے رگ و پے میں نئی توانائی سی بھر گئی۔ میں نے وہ سارے لمحے یاد کیے جن میں، میں نے دل کی گہرائی سے خودکشی کا سوچا تھا... یہاں جو کچھ بھی ہونے والا تھا، خودکشی سے تو بہتر ہی تھا۔

انور خاں اپنے ساتھیوں کو آخری ہدایات دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف آمیز دلیری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کرنے جا رہا ہے، اس میں زندگی کے امکانات بہت کم ہیں... لیکن اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسحاق نے ایک جھٹکے سے دستی بموں والا وہ تھیلا کھول دیا جو اب تک ہمارے سامان کا حصہ رہا تھا۔ انور خاں نے دو دستی بم اپنی واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیے، ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دیگر ساتھیوں نے بھی ایک ایک، دو دو بم لے لیے۔ یہ عام دستی بموں کی طرح گول بم نہیں تھے، ان کی شکل لمبوتری تھی۔ یہ پرانی طرز کے لیکن بڑے طاقتور بم تھے۔ ان کی شکل ”آئس کریم کون“ سے ملتی جلتی تھی۔ انور خاں نے بتایا تھا کہ انہیں ”اسٹک بم“ کہا جاتا ہے... چند روز پہلے انور خاں مجھے یہ بم استعمال کرنے کا طریقہ تفصیل سے بتا چکا تھا۔ لیکن اس حوالے سے میری عملی مشق صفر تھی۔ بہرطور ایک دستی بم میں نے بھی لے لیا۔

انور خاں نے آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے تم سب کے سامنے ہے۔ ہم بری طرح گھر چکے ہیں، جتنی دیر کریں گے اتنا ہی مزید پھنستے جائیں گے۔ ہم خود کو بچانے کی آخری کوشش کرتے ہیں۔ ہم چوکی کے عقبی دروازے کو ایک دم کھول کر نکلیں گے۔ میں سب سے آگے رہوں گا۔ ہم پوری رفتار سے دوڑیں گے اور گھنے درختوں میں روپوش ہونے کی کوشش کریں گے۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے کہ اس وقت ان لوگوں کے پاس بوگیر کتے نہیں ہیں۔“

اسحاق بولا۔ ”ہوسکتا ہے کہ ہم ایک دوجے سے بچھڑ جاویں۔ کوئی ایسی جگہ ٹھہرالو، جہاں ہم اکٹھے ہوسکیں۔“

”میرے ذہن میں ایسی کوئی جگہ نہیں۔“ انور نے فوراً جواب دیا۔ ”جو ساتھیوں سے علیحدہ ہو جائے، وہ اپنے طور پر جان بچانے کی کوشش کرے...“

ابھی انور خاں کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور فرش پر رکھے ہوئے کھانے پینے کے برتن بھنے ہوئے چنوں کی طرح اچھل اچھل کر چاروں طرف بکھر گئے... ہمارا گھوڑا اندھا دھند بھاگتا ہوا برآمدے میں گھسا اور پورے زور سے کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر گر کر تڑپنے لگا۔ اسے گولی لگ چکی تھی۔

”لگتا ہے کہ وہ لوگ قریب آرہے ہیں۔“ ہمیش نے کہا۔

انور خاں نے کھڑکی کے ساتھ لگ کر اسنا ئپر گن سے دو فائر کیے اور بولا۔ ”اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

ہم سب جھک کر دوڑتے ہوئے چوکی کے عقبی حصے میں پہنچے۔ یہاں ایک چھپر سا تھا جسے گولیوں کی بوچھاڑ سے آگ لگ گئی تھی۔ بارش کے سبب یہ آگ زیادہ پھیل نہیں پائی تھی۔ ہم عقبی دروازے کے ساتھ لگ گئے۔ انور خاں سب سے آگے تھا۔ موت کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کا سینہ تنا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں اسحاق تھا۔ پھر چوہان، پھر زخمی احمد پھر میں اور آخر میں ہمیش۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے فقط چار ہمارے ساتھ آسکے تھے۔ وہ چاروں ہماری قطار کے دائیں جانب تھے۔ یہ سائڈ قدرے محفوظ تھی۔ عبدالرحیم بھی ان چاروں میں شامل تھا۔

”بس دوڑنا ہے۔ رکنے کا مطلب موت کے سوا اور

کچھ نہیں۔'' انور نے آخری ہدایت دی اور دروازے کی کنڈی پر ہاتھ رکھ دیا۔

گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ خصوصاً سامنے والے حصے کی طرف فائرنگ کا زیادہ زور تھا۔ ہم نے الوداعی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انور خاں نے اپنے ہاتھ والے دستی بم کی پن دانتوں سے کھینچ کر نکالی اور ٹانگ مار کر دروازہ کھول دیا۔

''بھاگو'' انور خاں کی آخری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

ہم اندھا دھند نکلے۔ بارش کی بوچھاڑیں اور درختوں کی شاخیں ہمارے چہروں سے ٹکرائیں۔ ہم نے اپنی رائفلوں کے منہ کھول دیے اور جھک کر بھاگتے چلے گئے۔ سب سے پہلے انور خاں کے پھینکے ہوئے دستی بم کا دھماکا ہی سنائی دیا تھا۔ چکا چوند پیدا کرنے والے اس زوردار دھماکے نے ہر طرف سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ پھر کئی اور دھماکے ہوئے۔ ہم ان دھماکوں کا نتیجہ دیکھنے کے لیے رکے نہیں، بس شاخوں سے ٹکراتے دوڑتے چلے گئے۔ احمد میرے آگے دوڑ رہا تھا۔ بائیں جانب سے ایک برسٹ آیا... جو اسے چھلنی کر گیا۔ وہ اچھل کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا اور ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اتنی مہلت نہیں تھی کہ اسے مڑ کر دیکھا بھی جا سکتا۔ اس برستی موت کا دوسرا شکار ہمیش تھا۔ وہ میرے عین پیچھے تھا۔ مجھے تو یہی لگا کہ اس نے میری طرف آنے والی موت اپنے جسم پر روک لی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جب گولی جسم سے ٹکراتی ہے اور گوشت میں گھستی ہے تو اس سے ایک خاص آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس رات پہلی بار میں نے اپنے عین عقب میں یہ آواز سنی۔ یہ ہمیش کے جسم سے پگھلا ہوا سیسہ ٹکرانے کی آواز تھی۔ ایک کراہ کے ساتھ وہ اوندھے منہ گرا۔ غالباً گرنے سے پہلے وہ اپنے دستی بم کی سیفٹی پن ہٹا چکا تھا۔ اس کے گرنے کے تین چار سیکنڈ بعد ہی عین اس جگہ پر سماعت شکن دھماکا ہوا۔ اس دھماکے سے پیدا ہونے والا ایئر پریشر مجھے اپنے پورے جسم پر محسوس ہوا تھا۔ میری خوش بختی کہ بم کا کوئی ٹکڑا مجھے نہیں لگا اور میں بالکل محفوظ رہا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزریں۔ ایک جگہ میں اوندھے منہ گرا۔ ایک جگہ بری طرح ایک درخت سے ٹکرایا... لیکن رکا نہیں، بھاگتا چلا گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے ٹریل ٹو رائفل پر جمار کھے تھے۔ بھاگتے بھاگتے ہی میں نے رائفل سے دوسرا میگزین اٹیچ کر لیا اور اطراف میں فائر کرتا رہا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے پاس دستی بم بھی تھا لیکن بھاگ دوڑ میں وہ دستی بم کہیں گر گیا تھا۔ کہاں گرا تھا، یہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔

بھاگتے ہوئے مجھے اپنے سامنے صرف چوہان نظر آ رہا تھا۔ اور پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ چوہان اور انور خاں کے سوا کوئی زندہ نہیں بچا۔

فائرنگ کا زور اب ہماری بائیں جانب قریباً دو سو میٹر کی دوری پر تھا... مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہم موت کی زد سے اگر نکلے نہیں... تو کم از کم دور ضرور چلے گئے ہیں۔

''گھاٹی کے ساتھ ساتھ بھاگو۔'' انور خاں نے پکار کر کہا اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے دائیں طرف مڑ گیا۔

اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس کی یہ واقفیت ہمیں ایک یقینی موت کے چنگل سے نکال سکتی ہے۔

''تم ٹھیک ہو تابش!'' چوہان نے بھاگتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے بھی ہانپی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''اور ہمیش؟''

میں چپ رہا۔ چوہان سمجھ گیا کہ میرا جواب کیا ہے۔

پھر مجھے عبدالرحیم اور اس کا ایک ساتھی نظر آیا۔ وہ دونوں دائیں طرف تھے اور ہمارے متوازی ہی بھاگ رہے تھے۔

ہم قریباً بیس منٹ تک انور خاں کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ ہماری ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں لیکن زندہ رہنے کی فطری خواہش ہمیں بھگائے چلی جا رہی تھی۔ یہ گھنا جنگل تھا، تاریکی تھی اور ہلکی بارش بھی... اس لیے ہماری یہ میراتھن دوڑ عجیب طرح کی تھی۔ درختوں سے ٹکرانا، پھسل کر گرنا اور گر کر اٹھنا... یہ سب کچھ ہماری دوڑ میں شامل تھا۔ ایک بڑی ٹارچ ہمارے پاس موجود تھی لیکن ہم اسے روشن نہیں کر سکتے تھے۔ قریباً بیس منٹ بعد ہم نے ایک آبی گزرگاہ کو پار کیا۔ پانی ہمارے سینے تک پہنچ رہا تھا۔ ہم نے اپنی گولیوں والی بیلٹس گردنوں سے لپیٹ لیں اور رائفلیں سروں سے بلند کر لیں۔ آبی گزرگاہ کو پار کرتے ہوئے مجھے پتا چلا کہ اسحاق بھی زخمی حالت میں ہمارے ساتھ ہے۔ چوکی سے نکلتے وقت ہم کل دس افراد تھے... لیکن اب صرف چھ نظر آ رہے تھے۔ چار مزید ساتھی گھیرا توڑنے کی کوشش میں لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ان میں سے احمد... ہمیش اور عبدالرحیم کے ایک ساتھی کی موت تو یقینی تھی۔ عبدالرحیم کا ایک ساتھی بری طرح گھائل ہو کر گرا تھا اور شاید اسی حالت میں پکڑا گیا تھا۔ رہا ہونے والے قیدیوں میں سے ایک کی لاش تو ہم نے خود چوکی میں دیکھی تھی، دوسرے کے بارے میں بھی غالب امکان یہی تھا کہ وہ چوکی میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کا شکار ہوا۔

آبی گزرگاہ کو پار کرنے کے بعد ہم نے قدرے ''ریلیف'' محسوس کیا۔ ہم اس قدر ہانپ گئے تھے کہ چند منٹ کے لیے ستانا ضروری ہو گیا تھا۔ ہم ایک جگہ، گیلی زمین پر درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ''ہمیش کا کیا بنا؟'' اسحاق نے پوچھا۔

''اسے گولی لگ گئی تھی۔'' میں نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔

عبدالرحیم روتے ہوئے بولا۔ ''آپ لوگن نے ہمارے ساتھ کیا کیا... اور ہم لوگن نے آپ کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ سب کچھ اس بدبخت ریان کی وجہ سے ہوا۔ کاش! ہم اسے اپنے ہاتھ سے مار دیتے۔''

انور اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔ ''جو ہو چکا اس کا ماتم کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب اپنا سارا دھیان یہاں سے نکلنے کی طرف لگا دو۔ ہم خطرے سے باہر نہیں۔ وہ لوگ بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ کسی بھی وقت ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔''

ہم ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور گرتے پڑتے آگے بڑھنے لگے۔ اپنے بچھڑ جانے والے ساتھیوں کا غم تازہ تازہ تھا اور دل میں ٹیسیں ابھار رہا تھا۔ جیسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ صرف بیس پچیس منٹ پہلے ہمارے ساتھ چوکی سے نکلنے والے لوگ اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ کل رات تک ہم چوکی میں ماریا کے علاوہ کل تیرہ افراد تھے... اب صرف چھ بچے تھے۔

ہم صبح سات آٹھ بجے تک مسلسل چلتے رہے۔ آخر تھک کر چور ہو گئے۔ یوں لگا کہ اب چند قدم اٹھانا بھی ممکن نہیں ہے۔ خاص طور سے زخمی چوہان سخت تکلیف میں تھا۔ اس کی رائفل انور خاں نے اور گولیوں والا تھیلا میں نے اٹھا رکھا تھا۔ نہایت گھنے اور لمبے سرکنڈوں کے درمیان یہ عارضی طور پر چھپنے کے لیے ایک مناسب جگہ تھی۔ حشرات الارض بشمول سانپوں وغیرہ کا ڈر تو تھا مگر جو حالات ہمارا تعاقب کر رہے تھے، وہ ان سے زیادہ خطرناک تھے۔

یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ ایک طرف ایک بہت بڑا بارشی جوہڑ تھا جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ جوں جوں دھوپ تیز ہوتی گئی، اس جوہڑ سے اٹھنے والی بو باس بڑھتی گئی۔ جونکیں... بچھو... کیڑے مکوڑے بہت کچھ پودوں میں رینگ رہا تھا اور ہمارے جسموں پر بھی۔ دوپہر تک ہمیں محسوس ہونے لگا جیسے ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے اردگرد دور تک کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

اسحاق نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''یوں لگت ہے کہ وہ لوگن پانی کی دوجی طرف رہ گئے ہیں... نا ہیں تو اب تلک کوئی ہلچل ضرور نظر آتی۔''

چوہان بولا۔ ''شاید انور بھائی نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ان لوگوں کے پاس بوگیر کتے نہیں ہیں اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔''

''پھر بھی ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا... اگلے ایک دو گھنٹے میں ہی کچھ اندازہ ہو سکے گا۔'' انور خاں نے کہا۔

وقت گزرتا رہا اور شام تک ہم خود کو کافی مطمئن محسوس کرنے لگے۔ لیکن جلد ہی یہ اطمینان ایک بار پھر تشویش میں ڈھل گیا۔ ہمیں کچھ فاصلے سے فائر کی آواز سنائی دی۔ اس فائر سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو گیا کہ ہمارے آس پاس کوئی موجود ہے۔ ''وہ لوگن اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نا ہیں۔'' اسحاق نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور اپنی رائفل کے ساتھ نیا میگزین اٹیچ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

چوہان نے بھی اپنی رائفل انور خاں سے لے لی اور ٹیلی اسکوپ گلے میں لٹکا لی۔ چند گھنٹے کے وقفے کے بعد ایک بار پھر تناؤ پیدا ہو گیا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے تاریکی میں بدل گئے اور سرکنڈوں میں لاتعداد جھینگروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مجھے دیر سے پیشاب کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ تاریکی پھیلنے کے بعد میں جوہڑ کے کنارے کی طرف گیا۔ اچانک مدھم آوازوں نے میرے قدم پکڑ لیے۔ یہ اسحاق کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ڈاکٹر چوہان تھا۔ اسحاق کہہ رہا تھا۔ ''...یہ بات نا ہیں کہ اس کے ساتھ ہمدردی نا ہیں ہے۔ وہ ہمارا ساتھی ہے... لیکن اس کا ساتھ ہمارے لیے مصیبت کھڑی کرے گا... اور بہت بڑی مصیبت کھڑی کرے گا...'' آخری الفاظ کہتے کہتے اسحاق کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔

''آہستہ بولو۔'' چوہان نے اسے تنبیہ کی۔

اسحاق نے اپنی آواز تھوڑی سی مدھم کر لی لیکن لہجہ ویسا ہی تشویشناک رہا۔ ''چوہان بھائی! میں تم سے اس بحث میں نا ہیں پڑتا کہ تابش پر کوئی جادو ٹونے کا معاملہ ہے یا اس کے

شریر (جسم) میں کوئی پرزہ وغیرہ لگایا گیا ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے، ہمارے لیے ہے خطرناک۔ یہ جہاں بھی جائے گا، وہ لوگ اس کا پیچھا کریں گے... اور اس کے ساتھ... ہم بھی...'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تو کیا تم وشواس سے کہہ سکتے ہو کہ یہ ہمارے ساتھ نہیں ہوگا تو ہم بچ جائیں گے؟'' چوہان کی سرگوشی ابھری۔

''چلو نا ہیں بچیں گے... لیکن کچھ ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع تو ملے گا نا۔''

میں بغیر آواز پیدا کیے آگے بڑھ گیا اور جوہڑ کی طرف چلا گیا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔

بے شک اسحاق جذباتی اور شعلہ مزاج تھا... لیکن جو بات وہ کئی دن سے مسلسل کہہ رہا تھا، وہ ٹھیک تھی... اور یقیناً یہ بات اسحاق کے علاوہ اور کئی ساتھیوں کے دل میں موجود رہی تھی۔ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں تھا۔ ایک نادیدہ بندش نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بندش کسی جادو ٹونے کی شکل میں ہے لیکن اب یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ اسٹیٹ کے کچھ اہم قیدیوں کی طرح میرے جسم میں بھی کوئی ایسی چیز رکھی گئی ہے جو میری WHERE ABOUTS کے بارے میں میرے دشمنوں کو آگاہ رکھتی ہے۔

اسحاق کی یہ بات بالکل درست تھی کہ یہاں سے راہ فرار اختیار کرنے کے معاملے میں، میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ میری موجودگی میرے ساتھیوں کے لیے ہر راستہ بند کر سکتی تھی۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے بڑی تیزی سے سوچا۔

اب میرے دل سے اس بات کی گواہی آنا شروع ہو گئی تھی کہ شاید میں اس منحوس جنگل کے حصار سے کبھی نکل نہیں سکوں گا... اور اگر... مجھے یہیں پر مرنا تھا تو پھر میں اپنے ساتھ دوسروں کی زندگیوں کے لیے خطرہ کیوں بنوں؟

کیوں نا میں اپنا اخلاقی فرض ادا کروں۔ اپنے ساتھیوں کو کسی امتحان میں ڈالے بغیر خاموشی سے اکیلا ہی کسی طرف نکل جاؤں۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اکیلا مرا جائے یا باجماعت...!

میں مردار کی بُو والے کائی زدہ جوہڑ کے کنارے کھڑا تھا۔ میری رائفل، ایک چھوٹی ٹارچ، گولیوں والا بیگ اور ایک شکاری چاقو میرے پاس موجود تھے۔ اس کے علاوہ اور کیا چیز مجھے درکار تھی... اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ اور تھا ہی نہیں۔

میں نے چند لمحے تک سوچا، پھر وہیں سے گہری تاریکی

مجھے کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ کچھ بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ بس ایک یہی سوچ تھی کہ میں یہاں سے آگے بڑھ جاؤں۔ اپنے ساتھیوں اور اپنے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کرلوں۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ موت ملی تو اسے گلے سے لگالوں گا... زندگی ملی تو اس سے بھی نمٹ لوں گا۔ عمران نے یہی تو سکھایا تھا مجھے۔

میں گہری تاریکی اور جھاڑ جھنکاڑ میں آگے بڑھتا چلا گیا اور قریباً ایک گھنٹے میں دو تین کلومیٹر آگے نکل گیا۔ قدرتی طور پر میرا رخ اس آواز کی مخالف سمت میں تھا جو کچھ دیر پہلے ہمارے کانوں میں پڑی تھی۔ میرا مطلب فائر کی آواز سے ہے۔

چلتے چلتے میں سوچ رہا تھا کہ میری اچانک گمشدگی کے حوالے سے میرے ساتھیوں کا ردعمل کیا رہا ہوگا؟ انہوں نے مجھے اردگرد تلاش کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ محتاط انداز میں آوازیں بھی دی ہوں۔ وہ ٹارچیں روشن کرنے کا رسک تو نہیں لے سکتے تھے، تاریکی میں ہی مجھے اور میرے قدموں کے نشان ڈھونڈتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے ذہن میں یہ شدید خدشہ پیدا ہوا ہوگا کہ کہیں میں کسی جنگلی جانور کا نشانہ تو نہیں بن گیا... یا پھر ایسا تو نہیں کہ حکم کے اہل کار گھات لگا کر جوہڑ کے بالکل قریب پہنچ چکے ہوں۔

انہی سوچوں میں غلطاں میں آگے بڑھتا رہا۔ ایک دو جگہ گھنی جھاڑیوں میں کسی جنگلی جانور کی موجودگی کا متحرک احساس بھی ہوا لیکن ایسا کوئی خطرہ عملی طور پر میرے سامنے نہیں آیا۔ میں چل رہا تھا لیکن حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اسٹیٹ کی بیرونی حد کی طرف بڑھ رہا ہوں یا پھر بیرونی حد کے متوازی ہی چلتا جا رہا ہوں۔

رات کا آخری پہر تھا جب میں بے حد تھک گیا۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا لیکن خطرات سے بھرے ہوئے اس سیاہ جنگل میں آرام کیسے کرتا؟ سب سے پہلے یہی بات ذہن میں آئی کہ اگر میں کچھ دیر رکنا چاہتا ہوں تو مجھے زمین کے بجائے کسی درخت پر ہونا چاہیے۔ اس سے پہلے جب میں سلطانہ والی چوٹ کھا کر جارج کی رہائش گاہ سے بھاگا تھا تو دو روز جنگل میں بھٹکتا رہا تھا۔ تب بھی میں نے ایک شب ایک بلند درخت پر کاٹی تھی۔ آج کی شب میں نے پھر یہی کلیہ آزمایا۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک ایسا درخت منتخب کرلیا جس پر چڑھا جا سکتا تھا۔ تھوڑی سی کوشش اور چند تازہ خراشوں کے بعد میں درخت کے ایک مضبوط

دوشاخے پر نشست جمانے میں کامیاب ہوگیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اردگرد کی شاخوں کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کچھ شکاری جانور درختوں پر بھی چڑھ جاتے ہیں جن میں خطرناک جنگلی بلے، تیندوے اور چیتے وغیرہ شامل ہیں۔

ان خطرات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اونگھنے لگا۔ آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ قرب و جوار روشن ہو چکے تھے۔ سبزے پر سے شبنم آہستہ آہستہ اوجھل ہو رہی تھی۔ میری انتڑیوں میں بھوک کی وجہ سے کہرام مچا ہوا تھا لیکن اس کہرام کے مداوے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ایک قریبی درخت پر خوبانی کے سائز کا ایک سبزی مائل پھل نظر آ رہا تھا مگر مجھے انور خان کی بتائی ہوئی باتیں یاد تھیں۔ اس نے کہا تھا... جنگل سے خوراک صرف وہی بندہ حاصل کر سکتا ہے جو ''جنگل شناس'' ہو۔ دوسری صورت میں بندہ بھوک مٹانے کی کوشش میں خود بھی مٹ سکتا ہے۔ بہت سے پھل اور بیج وغیرہ زہریلے ہوتے ہیں اور ان کی ظاہری شکل یا ذائقے وغیرہ سے ان کے زہریلے ہونے کا بالکل پتا نہیں چلتا۔

میں درخت سے اترا اور ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ ابھی بیس تیس قدم ہی چلا تھا کہ بُری طرح چونک گیا۔ میں تیندوے کے پاؤں کے نشانات اب بڑی اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ اب پھر مجھے وہی نشان نظر آئے۔ گیلی زمین پر یہ بالکل واضح تھے۔ ان نشانات کو بغور دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ یہ زیادہ پرانے نہیں۔ غالباً رات کے وقت تیندوا میرے آس پاس موجود تھا۔ ٹرپل ٹو رائفل پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ میں مزید احتیاط سے چلنے لگا۔ میں اردگرد کے درختوں پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خطرناک جانور ''آسانی درختوں'' پر چڑھ سکتا ہے اور پھر درخت کے اوپر سے ہی بے آواز، اپنے شکار پر چھلانگ لگا دیتا ہے... اچانک مجھے اپنی رگوں میں لہو رکتا ہوا محسوس ہوا... وہ میرے سامنے تھا۔ فقط پندرہ بیس فٹ کی دوری پر۔ زردی مائل جھاڑیوں میں چھپا ہوا وہ جھاڑیوں کا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر میں غفلت میں آٹھ دس قدم مزید اٹھا لیتا تو سیدھا اس کی زد میں آ جاتا۔ اس کی قاتل آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ شاخوں کی اوٹ میں تیزی سے حرکت کرتی ہوئی دُم دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دراز قد جوان جانور تھا۔ اس کے جسم پر چیتے کی طرح داغ تھے۔ اس کا وزن اس کے پچھلے پاؤں پر تھا اور اس کی یہ کیفیت اشارہ دے رہی تھی کہ اگر میں نے دو قدم بھی اور بڑھائے تو وہ مجھ پر جست لگا سکتا ہے۔

میں پتھر کی طرح ساکت کھڑا ہو گیا۔ میں نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی۔ رائفل کا بٹ میرے کندھے سے پیوست تھا اور میں نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی تھی۔ مجھے اپنے نشانے پر بھروسا نہیں تھا لیکن میرے گولی نہ چلانے کی وجہ، اپنے نشانے پر ''میرا عدم اعتماد'' ہی نہیں تھا... اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ گولی کی آواز میری نشاندہی کر سکتی تھی اور اگر دشمن آس پاس موجود تھا تو اس کے لیے بہت آسانی فراہم ہو سکتی تھی۔

قریباً نصف منٹ تک میں اور درندہ آمنے سامنے کھڑے رہے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ ایک دوسرے کے عمل اور ردِعمل کو دیکھتے ہوئے۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا اور حقیقت یہی ہے کہ میں اس جانور کے مزاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں کسی درندے کو اس طرح کھلی جگہ پر اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس فٹ کے بے رکاوٹ فاصلے کے سوا اور کچھ نہیں تھا... یہ ایک ناقابلِ بیان احساس تھا۔

وہ تیس چالیس سیکنڈ تیس چالیس گھنٹوں کی طرح گزرے۔ پھر اس نے بڑی بے اعتنائی سے منہ موڑا۔ مجھے اور میری ''ٹرپل ٹو'' کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ بے پروائی سے چلتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ جیسے میرا اور اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو... کوئی واسطہ کوئی بھی اچھا یا بُرا ناتا۔ اور ان لمحوں میں مجھے لگا کہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ انسان جنگلی درندوں سے بڑھ کر خطرناک ہے... درست ہی کہتے ہیں۔ درندے اس وقت تک نقصان نہیں پہنچاتے جب تک وہ بھوکے نہ ہوں یا پھر جب تک ان کی زندگی میں جارحانہ مداخلت نہ کی جائے... لیکن حضرتِ انسان جب شر پر اترتا ہے تو کلی دقتی اور سرتاپا مہلک ہو جاتا ہے۔ اپنی ہلاکت آفرینی کو عملی شکل دینے کے لیے وہ ہزار ہا بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔

میں کچھ دیر وہیں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے تیندوے سے اپنی روبرو ملاقات کا اثر اپنے دل و دماغ پر محسوس کرتا رہا... تب ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ تیندوے کے پاؤں کے نشانات بدستور میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر اب یہ کچھ مدھم محسوس ہو رہے تھے۔ کئی جگہ یہ نشان چھوٹے بڑے دیگر جانوروں کے نقوشِ پا میں گڈمڈ ہو جاتے تھے... ایک جگہ میں بے طرح چونک گیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دھیان سے دیکھا اور پھر مجھے پاؤں کے بل بیٹھنا پڑا۔ بیٹھے بیٹھے ہی میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی اور رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ مجھے کچی زمین پر انسانی پاؤں کے نشان دکھائی دیے تھے۔ یہ ننگا پاؤں تھا اور کئی جگہ اس کا نقش بہت واضح تھا۔ یہ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن میرے لیے حد درجہ حیران ہونے کی وجہ کچھ اور تھی۔ یہ صرف ایک پاؤں کا نشان تھا۔ دوسرا پاؤں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دوسرے پاؤں کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آتا تھا۔ جگہ جگہ نظر آنے والا یہ چھوٹا سا سوراخ کسی بیساکھی نما لکڑی کا تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس جگہ اس قسم کی زمینی شہادت دیکھوں گا۔ میری نگاہوں میں بارو ندا جیکی کا دق زدہ چہرہ گھوم گیا۔ میں نے بے تابی سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ یہاں سے گزرا تھا... یقیناً گزرا تھا۔ وہ زیادہ تیزی سے نہیں چل سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں آس پاس موجود ہے۔

میں تیزی سے ان نشانات کا تعاقب کرنے لگا۔ تیندوے اور دیگر جانوروں سے وابستہ خیالات ایک دم میرے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ میں ان نشانات کو ٹریس کرتا ہوا بے تابی سے آگے بڑھتا رہا۔ صرف دس پندرہ منٹ بعد مجھے گھنے درختوں میں چھپی ہوئی ایک چار دیواری کے آثار نظر آ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کھنڈر تھا۔ اس پر نباتات اور خودرو بیلوں کی یورش تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ جگہ گھاس پات کا ہی حصہ ہے۔ یہ دراصل ویسی ہی بے آباد چوکیوں میں سے ایک تھی جو اس ویرانے میں کہیں کہیں دکھائی پڑتی تھیں لیکن یہ چوکی تقریباً مسمار ہو چکی تھی۔ بس ایک کمرا اور برآمدے کا ایک حصہ موجود تھے۔ تاہم ان کی چوبی چھتیں بھی گری ہوئی تھیں۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ بارو ندا جیکی اس کھنڈر میں ہی موجود ہے۔ یہ دوسرا سوال تھا کہ وہ زندہ حالت میں ہے یا مردہ... اور اکیلا ہے یا اس کے ساتھ بھی کوئی موجود ہے؟ میں پاؤں اور بیساکھی کے نشان دیکھتا ہوا احتیاط سے آگے بڑھا۔ نشان کھنڈر کی تاریکی میں داخل ہو رہے تھے۔ میں کچھ دیر تک ایک دیوار کے ساتھ لگ کر سن گن لیتا رہا پھر میں نے محتاط انداز میں آواز دی۔ ''جیکی... جیکی!''

جواب ندارد... میں نے دو مرتبہ مزید پکارا پھر ٹارچ روشن کر کے اندر چلا گیا۔ کمرے کی چھت نے گر کر جھونپڑی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس جھونپڑی میں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔ اس جھونپڑی کے سامنے ہی ایک چھوٹے چیتل کی کٹی پھٹی لاش پڑی تھی۔ غالباً چند گھنٹے پہلے یہ چیتل کسی تیندوے یا بھیڑیے وغیرہ کا شکار ہوا ہوگا۔ اس کے جسم پر بہت کم گوشت باقی بچا تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے ٹارچ کی روشنی کو حرکت دی۔ بارو ندا جیکی مجھے سامنے ہی بے حرکت پڑا نظر آ گیا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن پھر میری نگاہ اس کے سینے کے مدھم زیر و بم پر پڑی۔ وہ زندہ تھا۔ تب مجھے ایک شے نظر آئی۔ یہ شراب کی بوتلیں تھیں۔ مٹی میں لتھڑی ہوئی۔ یہ پانچ عدد بوتلیں جیکی کے قریب ہی پڑی تھیں۔ یہ مقامی طور پر تیار کی گئی شراب لگتی تھی۔ ان بوتلوں میں سے دو خالی ہو چکی تھیں۔ ایک میں سے تھوڑی سی پی گئی تھی، باقی دو بھری ہوئی تھیں۔ بوتلوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی عرصہ مٹی میں دبی رہی ہیں۔ انہیں جیکی نے کھود کر نکالا تھا۔ اس کے سرہانے کی طرف کچی زمین میں ایک ڈیڑھ دو فٹ گہرا گڑھا موجود تھا۔ جیکی نشے کی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے اکلوتے ہاتھ پر خون جم کر سوکھ گیا تھا تاہم مجھے لگا کہ یہ جیکی کا اپنا خون نہیں ہے۔ اس کے اپنے جسم میں خون تھا ہی کہاں۔ اگر کوئی تھوڑی بہت چیز رگوں میں حرکت کرتی بھی ہوگی تو وہ شراب ہی ہوگی... یہ شاید چیتل ہی کا خون تھا۔

میں نے کچھ دیر تک اردگرد کا جائزہ لیا پھر جھنجوڑ جھنجوڑ کر جیکی کو جگا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور مجھے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ تب شاید اس نے مجھے پہچان لیا مگر اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ اس نے کسمسا کر انگڑائی لی اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں پھر بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے ساتھ ہی بولا۔ ''میں سمجھا تھا کہ میں جب مر کر اٹھوں گا تو خود کو جنت میں پاؤں گا لیکن... تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ دوزخ ہی ہے... اور سناؤ۔ تمہارے ساتھ اور کون کون ہے یہاں؟''

''خوش قسمتی سے آپ مرے نہیں، ابھی زندہ ہو۔''

اس نے پھر ایک مخمور انگڑائی لی۔ ''تم اسے خوش قسمتی کہتے ہو۔ تم سے بڑا بھانڈ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کچی کلیجی کھانے سے میرے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہے ورنہ میں تمہاری اس بات پر خوب ہنستا... بلکہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتا۔''

''کچی کلیجی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تو اور کیا۔ یہاں میری نانی بیٹھی ہے جو پکا کر کھلاتی۔ بھوک کی وجہ سے میری آنتیں بریک ڈانس کر رہی

تھیں...اس لیے، چبا چبا کر ویسے ہی کھالی۔''

''کس کی کلیجی تھی؟''

''حکم جی کی۔'' وہ مسکرایا۔ ''وہ دیکھو، وہ سامنے پڑا ہے۔'' جیکی نے کٹے پھٹے چیتل کی طرف اشارہ کیا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ جیکی کے ہاتھ پر خشک خون کیوں لگا تھا۔ وہ چیتل کے سینے میں سے کلیجی نکال لایا تھا اور اسے شراب کے آتشیں گھونٹوں کے ساتھ گلے سے نیچے اتارا تھا۔ سچ ہے کہ بھوک انسان سے سب کچھ کراتی ہے...

''اس چیتل کو مارا کس نے؟''

''چیتل نہیں یار... حکم جی... اور حکم جی کو عوام کے سوا اور کون مارے گا؟ یہ عوام ہی ہیں جو بھوک سے بے بس ہو کر تیندوے کا روپ دھار لیتے ہیں اور حکم جی جیسے زور آور لوگ ان کے لیے چیتل اور ہرن بن جاتے ہیں۔ کل رات یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ایک عوام نے ایک حکم جی پر حملہ کیا۔ بڑی محبت سے اس پر جھپٹا مارا اور بڑی عقیدت سے اس کا پیٹ پھاڑ کر رکھ دیا۔ حکم جی ڈری ڈری آوازیں نکالتا رہا، اس کی دُم پھڑکتی رہی اور وہ عوام کے پنجے سے نکلنے کے لیے زور لگاتا رہا۔ لیکن عوام کی جھپٹی میں اتنی گرم جوشی تھی کہ وہ نکل نہیں سکا۔ ہاں دوست! ہر حکم جی ایک دن چیتل ضرور بنتا ہے... اور ہر مظلوم ایک دن تیندوے کا روپ ضرور دھارتا ہے۔''

میں نے گہری سانس لے کر ٹارچ بجھا دی۔ صورتِ حال واضح تھی۔ رات کسی وقت تیندوے نے چیتل مارا تھا اور اس کھنڈر کے سامنے بیٹھ کر اس کا گوشت کھایا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھوکا جیکی گھسٹتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور اس نے بھی اس شکار میں سے اپنا حصہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے کچھ کلیجی نکالی تھی اور اس کا نرم گوشت چبایا تھا۔ یقیناً یہ وہی تیندوا تھا جو اس علاقے میں گھوم رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرا اس سے سامنا بھی ہوا تھا۔ وہ تازہ شکار کی وجہ سے بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ تھا لہٰذا اس نے مجھ سے بھی کوئی خاص تعرض نہیں کیا تھا۔

''یہ سب کیا ہے جیکی! آپ مجھے بتاؤ کہ آپ کس طرح یہاں پہنچے؟ کیا وہاں سرنگ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی تھا؟''

''بالکل تھا... لیکن وہاں سے شاید میں ہی نکل سکتا تھا... کوئی اور نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

جیکی نے ٹارچ میرے ہاتھ سے لے کر روشن کی اور اس کا رخ اپنے جسم کی طرف کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ننگ دھڑنگ تھا۔ ایک تہ در تہ لنگوٹ کے سوا اس کے جسم پر اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنے جسم کی گہری خراشیں دکھائیں۔ یہ خراشیں اس کے کانوں، اس کے سینے اور کمر پر خاصی گہری تھیں اور سیاہ نشان سے بن چکے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بہت سخت شے کے ساتھ بہت زیادہ رگڑ کھا کر گزرا ہے۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے اس کی نہایت سخت جلد پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہاں اس سرنگ میں آگے جا کر نکلنے کا ایک راستہ موجود تھا لیکن وہ اتنا تنگ تھا کہ مجھ جیسے پہلوان کو بھی بہت زور لگا کر اس میں سے گزرنا پڑا۔ بس اس وقت مجھے یہ کلیہ یاد رہا کہ جہاں سے بندے کا سر گزر سکتا ہے، وہاں سے پورا جسم بھی گزر سکتا ہے۔''

وہ جو کچھ بتا رہا تھا، وہ حیران کن تھا لیکن یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا کیونکہ بارونڈا جیکی میرے سامنے موجود تھا... اور وہ جس قسم کے ڈھیٹ جسم کا مالک تھا، وہ اس طرح کی مہم جوئی کر بھی سکتا تھا۔

''تم نے زنجیر کیسے کھولی؟''

''جیسے ہمیشہ سے کھولی جاتی ہے۔ زنجیر کھولنے، توڑنے اور پگھلانے کے لیے ہمیشہ سے حوصلے کی ضرورت رہی ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''جیکی! آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح نکل جاؤ گے تو مجھ پر الزام آئے گا... اسے میری غفلت سمجھا جائے گا۔''

وہ ہنسا۔ ''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں بلکہ کسی کا بھی کوئی قصور نہیں۔ میں سرنگ کی جس دراڑ میں سے نکلا ہوں، وہاں سے کوئی اور نکل کے دکھا دے تو میں مانوں۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ تم یہاں کیسے نازل ہوئے ہو؟ مجھے تو اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔''

''مجھے بھی نہیں ہو رہا۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں آپ کو اتنی جلدی دوبارہ دیکھ سکوں گا۔''

میں نے بارونڈا جیکی کو مختصراً وہ سارے واقعات بتا دیے جو اس کے جانے کے بعد پیش آئے تھے۔ میں نے اسے ماریا فرگوسن کے بارے میں بھی بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ہم نے اپنے تحفظ کے لیے اسے یرغمال بنا رکھا تھا۔ سرنگ سے نکلنے کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، وہ بھی میں نے جیکی کے گوش گزار کر دیا۔ جب میں روداد کے اس حصے پر پہنچا جہاں چالباز ماریا پارسی ریان کو اپنا جسم رشوت کے طور پر پیش کر کے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئی تھی... جیکی کے چہرے پر عجب زہرناک تاثرات پھیل گئے۔ وہ اپنے

مخصوص طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم لوگوں کے چنگل سے رہائی تو ماریا کے لیے بہت بڑی بات تھی، اس طرح کی یورپین لڑکیاں تو کبھی کبھی ایک وقت کے کھانے کے لیے بھی خوشی خوشی کسی کے بستر پر لیٹ جاتی ہیں۔ ان کا جسم ان کے لیے ایک فائدہ بخش پراپرٹی کی طرح ہوتا ہے جسے یہ کسی بھی وقت رینٹ پر دے سکتی ہیں... خیر، چھوڑو اس بات کو... اس کے بعد کیا ہوا؟''

میں نے جیکی کو اس خونی ہنگامے کی پوری تفصیل بتائی جو چوکی کے آس پاس برپا ہوا تھا اور جس میں پارسی ریان کے علاوہ ماریا کو بھی گولی لگی تھی۔

ماریا کو گولی لگنے کا سن کر جیکی کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آگئی۔ وہ بولا۔ ''زندہ ہے یا مرگئی؟''

میں نے کہا۔ ''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال، زخمی ضرور ہوئی ہے۔''

''چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ اگر وہ صاف بچ جاتی تو یہ میرے لیے ایک بُری خبر ہوتی... اور اپنی زندگی کے ان آخری دنوں میں، میں بُری خبریں سننا نہیں چاہتا۔''

''اس ماریا کے لیے آپ کے دل میں بہت رنج ہے؟''

''ہاں، اس نے صرف مجھے دکھ دیا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے شگفتا کو دکھ دیا۔ اس کی گہری سہیلی ہو کر بھی اس نے دغا بازی کی اور ہماری ملاقاتوں کے بارے میں شگفتا کے پپا کو بتایا۔ پتا نہیں کہ تم نے اچھا کیا ہے یا بُرا کہ مجھے سرنگ میں ماریا کی موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا... ورنہ اس کے لیے میری ''بے پایاں محبت'' نے جوش ضرور مارنا تھا۔ میں اس کی جتنی بھی عزت افزائی کر سکتا، ضرور کرنی تھی۔ اگر اس عزت افزائی سے اس کی ایک دو ہڈیاں ٹوٹ جاتیں تو مجھے دلی راحت ہوتی... بہرحال جو ہوا ٹھیک ہوا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اسے زندگی دے اور مصیبت والی زندگی دے۔ اسے کچھ تو دوسروں کے درد کا احساس ہو۔''

جیکی اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتا رہا اور اپنا نشہ بحال رکھنے کے لیے شراب کے چھوٹے گھونٹ بھرتا رہا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں اس کھنڈر میں سے اس نے یہ سیال آگ کیسے ڈھونڈ نکالی ہے؟

وہ بولا۔ ''شراب جہاں بھی ہوتی ہے، مجھے بلا لیتی ہے۔ کسی مستانی محبوبہ کی طرح مجھے دیکھ کر آنکھ مارتی ہے، سیٹی بجاتی ہے... اور جب لڑکی خود سیٹی مارے تو پھر عاشق کا تو فرض بن جاتا ہے کہ وہ اس کو گود میں بھرنے کے لیے سر دھڑ کی

بازی لگا دے۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہاں شراب موجود ہے؟''

''شاید تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ اس کھنڈر میں گھستے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کہیں شراب موجود ہے۔ یہ معرفت کی باتیں ہیں۔ تمہاری کھوپڑی میں نہیں آئیں گی۔ اس کے لیے ریاضت کی ضرورت ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ورنہ میں اس حوالے سے بھی تمہیں کئی گُر بتا جاتا۔''

''میں ایسے گُر نہ سیکھنے کے لیے پیشگی معذرت چاہتا ہوں...''

''دیکھو کچھ اور نہ کہنا میری دوسری محبوبہ (شراب) کے بارے میں۔ ورنہ یہ توہینِ محبت ہو جائے گی اور یہ توہینِ عدالت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ میں تمہیں اپنی شاگردی سے عاق بھی کر سکتا ہوں...''

وہ گول مول باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بوتلیں شاید کسی جرائم پیشہ شخص یا اشخاص نے یہاں دبائی تھیں لیکن ان بوتلوں میں سے کچھ شراب رستی تھی۔ اس کی مخصوص بدبو دار نمی مٹی میں جذب ہوتی رہتی تھی اور اسی مخصوص بدبو یا ہلکی سی باس نے جیکی کو اس شراب کا سراغ دیا تھا۔

شام ہونے کے بعد میری بھوک انتہا کو پہنچ گئی۔ شاید اس وقت مجھے بھی کوئی کچی قسم کی چیز ملتی تو میں بھی اسے کچا چبانے کے بارے میں سوچنے لگتا۔ کل رات کی تیز بارش کی وجہ سے ہوا میں خنکی کچھ بڑھ گئی تھی۔ پیٹ خالی ہو تو سردی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا لیکن یہ مدقوق جسم والا جیکی تو جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اسے سردی گرمی کی مطلق پروا نہیں تھی۔ لیکن کچھ بھی تھا، شراب نے اس بے مثال بندے کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ اس کا ایک ثبوت شام کے فوراً بعد اس وقت ملا جب جیکی کو شدید کھانسی شروع ہوئی اور اس کھانسی کے دوران میں ہی اس کے منہ سے خون رسنے لگا... اس نے کئی بار خون تھوکا اور اسے ڈھانپنے کے لیے اس پر مٹی ڈالی۔ وہ ایک دم گم صم نظر آنے لگا۔

وہ آزردہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ تم میری مدد کر سکو۔''

''دل چھوٹا مت کرو... آپ ٹھیک ہو جاؤ گے... اور مدد کی بات آپ کس حوالے سے کر رہے ہو؟''

''میری آخری خواہش پوری کر دو۔ مجھے کسی طرح میری کشتی پر لے جاؤ۔ ہم وہاں سے بہت دور نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دن کا سفر ہمیں واپس وہاں پہنچا دے گا۔ تمہارے پاس رائفل ہے... دو ٹانگیں ہیں... تم صحت مند ہو... مجھے میری منزل تک پہنچا سکتے ہو۔''

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی یاسیت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں نے اس کا گرم ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے جیکی... آپ اپنی یادوں میں گم ہو کر رہ گئے ہو۔ آپ آگے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ راستہ یہاں ختم نہیں ہوا... ابھی آگے بہت کچھ ہے۔''

''میرے لیے کچھ نہیں ہے... میرے لیے سب کچھ وہیں ختم ہو گیا تھا جب اس رات کشتی پر میرا ہاتھ شگنتلا کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ حکم کے محافظوں نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے... اس سے جدا ہونا میرے لیے کیا تھا۔ تم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ تم نے تو اسے دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ بے مثال ہے دوست... میری جگہ کوئی بھی ہوتا، اس کی مسکراہٹ میں کھونے کے بعد دوبارہ ابھر نہ سکتا... اس کی زلفوں میں الجھنے کے بعد پھر رہائی نہ پا سکتا۔ کاش! میں شاعر ہوتا، میں کھل کر بتا سکتا کہ وہ کیا تھی اور...''

وہ بات کرتے کرتے ایک دم رک گیا جیسے کوئی نیا خیال اس کے ذہن سے ٹکرایا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس خیال کو مجھ پر ظاہر کرے یا نہیں۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ توقف سے بولا۔ ''کہنا تو نہیں، کچھ دکھانا چاہ رہا ہوں تمہیں... لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ غلط نہ ہو... وہ اس پر ناراض نہ ہو جائے... جب وہ ناراض ہو جاتی ہے تو کئی کئی دن تک میرے تصور میں نہیں آتی۔ مجھے تڑپاتی ہے اور خود بھی تڑپتی رہتی ہے۔''

''کیا آپ مجھے اس کی کوئی چیز دکھانا چاہ رہے ہو؟''

''ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے کہا... پھر ذرا سوچ کر بولا۔ ''لیکن تم وعدہ کرو کہ اس کو پاک صاف نظروں سے دیکھو گے۔ اس کے بارے میں اپنے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں لاؤ گے۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا... اور میں خود کو بہت گناہ گار محسوس کروں گا۔''

''کیا آپ مجھے اس کی کوئی تصویر دکھانا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ویسا ہی ہوگا جیسا وہ چاہتا ہے۔ ساتھ ساتھ میں حیران بھی ہو رہا تھا کہ یہ تصویر اگر واقعی موجود ہے تو اس نے کہاں رکھی ہوئی ہے۔ میں نے تو اسے اب تک اس میلے کچیلے لنگوٹ میں ہی دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ جیکی نے اپنے تہ در تہ لنگوٹ کی گرہ کھولی اور اس کی ایک بالائی تہ میں بڑی احتیاط سے لپیٹی گئی کارڈ سائز کی تصویر نکال لی۔ اسے پہلے پولیتھین میں پھر ایک رومال میں لپیٹا گیا تھا۔ جیکی نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے رومال کی گرہ کھولی پھر پولیتھین کو ہٹایا۔ وہ تصویر کو یوں برآمد کر رہا تھا جیسے کسی عبادت گاہ میں ہو اور کسی مقدس شے کو منظرِ عام پر لا رہا ہو۔

یہ ایک نہیں تین تصویریں تھیں۔ مسلسل جیکی کے پاس رہنے سے ان پر تھوڑی بہت سلوٹیں بھی آ چکی تھیں۔ جیکی نے پہلی تصویر مجھے دکھائی۔ یہ راج بھون کے کسی عالی شان ہال کمرے میں اتاری گئی تھی۔ اس میں سات لڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان ساتوں نے مختلف رنگ کے لباس پہن رکھے تھے۔ یہ سارے لباس گھاگرے چولی پر مشتمل تھے۔ لڑکیوں کے کندھوں پر خوب صورت آرائشی پَر لگے ہوئے تھے۔ یہ پَر بھی لباس کے رنگ کے ہی تھے۔ ایک لڑکی پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ اس نے سبز لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ یہی شگنتلا ہے۔ میں نے اس سے پہلے جیکی سے سنا تھا کہ شگنتلا جب ساتویں کے جشن کی پری بنی تو اس کو سبز رنگ ملا تھا۔ وہ واقعی حسین و جمیل تھی۔ اس کی صورت میں موجود ایک خاص قسم کی دلکشی نگاہ کو گرفت کرتی تھی۔

''پہچانا کہ وہ کون ہے؟'' جیکی نے معصوم لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے سبز لباس والی پر انگلی رکھی۔

جیکی کا چہرہ چمک اٹھا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم پہچان لو گے... ستاروں میں سے چاند کو پہچاننا کون سا مشکل ہوتا ہے۔''

میں نے تصویر کو بغور دیکھا۔ ساتوں لڑکیاں ایک کرسی کے پیچھے قطار میں کھڑی تھیں۔ زرنگار کرسی پر کوئی شخص تمکنت سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا قدرے فربہ اندام شخص لگتا تھا۔ اس نے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ نہایت قیمتی شیروانی پہن رکھی تھی۔ گلے میں موتیوں کی مالائیں تھیں مگر اس کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ چہرے پر کسی نے سیاہ روشنائی والے قلم سے اتنی لکیریں لگائی تھیں کہ چہرہ مکمل طور پر چھپ گیا تھا۔

''کیا کرسی پر حکم جی بیٹھا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، تم اسے حکم جی بھی کہہ سکتے ہو لیکن یہ زیادہ دیر حکم جی نہیں رہے گا۔ بہت جلد چیتکی بن جائے گا۔'' وہ عنی

خیز انداز میں بولا۔

''حکم جی'' کو دیکھنے کی آرزو میرے دل میں تھی لیکن یہ آرزو اس کی تصویر دیکھنے کے بعد بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

جیکی نے دوسری تصویر دکھائی۔ اس میں سبز لباس والی شکنتلا پنجوں کے بل قالین پر بیٹھی تھی اور اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا ہوا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے چرن چھو رہی ہے۔ یقیناً یہ حکم جی کے پاؤں ہی تھے لیکن یہاں بھی اس کے پاؤں اور پنڈلیوں پر بے تحاشا سیاہ لکیریں لگا دی گئی تھیں اور پاؤں نظر نہیں آتے تھے۔ شکنتلا کی زلفیں واقعی بہت دراز تھیں۔ اس کی بھاری چوٹی، جیسے قالین پر کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے جسم کی ساری غیر معمولی رعنائی اور کشش اس پوز میں نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہ ایک دل آویز جسم کی مالک تھی۔ اس تصویر میں ایک دیوار پر بدھا کے اس نادر روزگار مجسمے کی پینٹنگ بھی نظر آ رہی تھی جو مقامی لوگوں کے نزدیک ناقابلِ شکست تھا اور جسے چوری کرنے کی پاداش میں، میں اور میرے صفورا وغیرہ اس راجواڑے میں موجود تھے۔

تیسری تصویر کلاسیکل رقص کی تھی۔ یہ بھی گروپ فوٹو تھا۔ اس میں ساتوں ''پریاں'' پاؤں میں گھنگرو باندھے رقص کر رہی تھیں۔ ان کے پس منظر میں پگڑیوں والے سازندے نظر آ رہے تھے۔ یہاں بھی شکنتلا نمایاں تھی۔ اس کا سر اپا ایک تصویر تھا اور اس تصویر نے جیکی کے ساتھ ایک کشتی میں کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی جھیل کے اندر سات روز گزارے تھے۔ اگر بارونا جیکی اس حوالے سے خود کو خوش نصیب سمجھتا تھا تو شاید ٹھیک ہی سمجھتا تھا۔

''یہ تصویریں آپ کو کہاں سے ملیں؟'' میں نے جیکی سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر کھانستے رہنے کے بعد بولا۔ ''بس، یہ میری خوش قسمتیوں میں سے ایک خوش قسمتی ہے۔ میں ان دنوں جیل سے بھاگ آیا تھا اور اپنی محسنہ ہوشن کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے ہوشن سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح مجھے ساتویں کے جشن کی کچھ تصویریں لا دے۔ ساتویں کے جشن کی تصویریں اتاری جاتی ہیں اور یہ جشن کے میلے میں فروخت بھی ہوتی ہیں۔ لیکن میلا چونکہ ختم ہو چکا تھا، اس لیے جشن کے پکچر کارڈز کا ملنا بڑا مشکل تھا۔ پھر بھی ہوشن نے کسی طرح جشن کے آٹھ دس پکچر کارڈز حاصل کر لیے۔ ان میں سے ان تین کارڈز میں شکنتلا نظر آ رہی تھی... اور یہ تین کارڈز میرے لیے ایک بہت بڑے سرمائے کی طرح تھے۔''

''تصویروں پر یہ لکیریں... آپ نے لگائی ہیں؟''

''ہاں... حکم جی کے چہرے پر خوب صورتی اور نیکی کی چمک ہی اتنی ہے کہ برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ پھر کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد کہنے لگا۔ ''دیکھو، بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں تم سے التجا کر رہا تھا کہ تم مجھے کسی طرح میری کشتی تک پہنچا دو۔ تم مجھے استاد کہتے ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اپنے استاد پر تمہارا یہ ایک بہت عظیم احسان ہوگا۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، مجھے ایک نامانوس آہٹ سنائی دی۔ پتا نہیں کیوں مجھے شک گزرا کہ یہ کسی ''پمپ ایکشن رائفل'' کے کاک ہونے کی آواز ہے۔ میں نے ٹارچ فوراً بجھا دی اور رائفل پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ لگتا تھا کہ جیکی نے بھی یہ آواز سنی ہے اور وہ تھوڑا سا چونکا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ تاہم میرے لیے یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ دھڑکن کی اس تیزی میں خوف کا عنصر شامل نہیں ہے۔ میں جھک کر چلتا ہوا محتاط قدموں سے دروازے کی طرف آیا۔ چیتل کے ڈھانچے کے قریب پہنچ کر میں نے آنکھیں سکیڑیں اور ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔

یہاں دشمن موجود تھا... اور وہ ایک نہیں تھا۔ کم از کم تین یا چار کی تعداد میں تھا۔ وہ درختوں میں تھا۔ شاید ہر جھاڑی کے پیچھے... ہر درخت کی اوٹ میں تھا۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ نہایت خاموشی... نہایت ہوشیاری سے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں رنجیت پانڈے کا نام گونجا۔

تو کیا وہ وقت پہنچ گیا تھا جس کا انتظار تھا؟

کیا آج یہاں مجھے اپنا حوصلہ آزمانا تھا؟ آگے بڑھنا تھا، لڑنا تھا... اور مرنا تھا؟

مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ صرف چند سیکنڈ میں ہی میں ذہنی طور پر ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے تقریباً تیار ہو گیا۔ میں نے دائیں طرف دیکھا... وہاں عمران کھڑا تھا۔ یہ اس کا تصور تھا لیکن حقیقت کی طرح واضح اور روشن لگا۔ اس نے میرے کندھے سے کندھا ملایا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جادوئی مسکراہٹ تھی۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا... جگر! جو ڈرنا ہے تو مرنا ہے... اور جو مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ کاش! وہ جیتی جاگتی حالت میں میرے ساتھ ہوتا... بہرحال... اس کا تصور بھی کچھ کم حوصلہ افزا نہیں تھا۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

تھے نہایت خطرناک کھیل بھی کھیلتا تھا۔ اس نے یہ جان لیوا کھیل مجھے بھی دکھائے۔ ابرار صدیقی کے پاس مہاتما بدھ کا کوئی ایسا مجسمہ تھا جسے میڈم صفورا ہر صورت میں چاہتی تھی مگر صدیقی بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ اور نامعلوم لوگ بھی اس مجسمے کے پیچھے تھے۔ مجید مغوی نامی شخص کی ہلاکت پر... شک کی بنا پر میڈم صفورا نے عمران کو اغوا کیا۔ میں اور اقبال بھی میڈم کی دسترس میں چلے گئے۔ وہاں عمران نے اپنی خوش بیانی سے صفورا کو قائل کر لیا کہ وہ اس کا مطلوبہ مجسمہ ابرار صدیقی کی تحویل سے نکال لائے گا۔ اس نے واقعی یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا کہ میڈم اش اش کر اٹھی۔ تاہم میڈم کی چھوٹی بہن نادیہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔ عمران کی توجہ اپنی گرل فرینڈ شاہین کی طرف تھی جس کی وجہ سے رقابت پروان چڑھ رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سرد مہری کا انتقام لینے کے لیے اس کے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی دردناک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل کے دوران میں حیران کن طریقے سے لیا۔ اس نے نادیہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ درجنوں تماشائیوں میں سے کسی کو شک تک نہیں ہوسکا۔ میری بے وقوفی اور کم ہمتی کی وجہ سے نادیہ کے زخمی ہونے کا پول کھل گیا۔ میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران نے سینے پر رائفل کا برسٹ کھایا اور وہ ایک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہوگیا۔ اس کے بعد میرے دلِ خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو تو موقع سے ہٹا دیا۔ خود والدہ کے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگالیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسدِ خاکی تک پہنچنے کے لیے چلتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں والد کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ میری بیوی ہے۔ راستے میں پاشو نام کا ایک گونگا شخص بھی ایک شیر خوار بچے سمیت ہم سے مل گیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ سلطانہ مجھے ایک مسلمان بزرگ عبدالغنی صاحب کے پاس لے آئی۔ ہم ان کے گھر میں پناہ گزین ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اس جگہ کو بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دست برد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی تل پانی میں آ گئی تھی۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کار مختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ میری غلط بیانی کی وجہ سے چھوٹے سرکار کے اہل کار سلطانہ کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبدالغنی کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سر کی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں پچھلے دو برس کی باتیں بالکل بھولا ہوا ہوں۔ مجھے چھوٹے سرکار کی عدالت میں پیش کیا گیا اور بعد ازاں مجھے اور سلطانہ کو حکم جی کے لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے راستے میں بھاگنے کی کوشش کی مگر حیرت انگیز طور پر پکڑا گیا۔ زرگاں میں مجھے پکوڑا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے وہاں سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ وہاں مجھ سے اصطبل میں کام لیا جانے لگا۔ مجھ پر تشدد کر کے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے مجھے وہاں سے بھیج دیا اور خود وہیں رک گئی۔ پھر عمران کے کہے ہوئے الفاظ نے مجھے ہمت بخشی اور میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے دو گارڈز کو زخمی کیا۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی۔ میں گارڈز سے بے پروا باہر کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ مسلح گھڑ سوار میرے تعاقب میں تھے اور میں جنگل میں بھٹکتا رہا۔ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن صبح اچانک میرا تعاقب کرنے والے آ پہنچے۔ یہ چار افراد تھے۔ میں نے اچانک فائرنگ کر دی۔ دو افراد فرار ہو گئے جبکہ دو موت کے گھاٹ اتر گئے۔ میں انہی افراد کے ایک گھوڑے پر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مگر مجھے پھر اپنے تعاقب میں کچھ لوگ نظر آئے۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ اس کی حالت خراب تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا۔ مگر جارج نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اس کے بجائے حکم جی کے اہلکاروں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہاں فائرنگ ہوئی اور ہمارا ایک ساتھی اور حکم جی کے اہلکار مارے گئے۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا جو ایک شادی میں شرکت کے لیے اپنی سہیلی کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ماریا کے اغوا کا مقصد اپنی بہت ساری باتیں منوانا تھا۔ پھر چوہان اور میں نے یہ پتا لگا لیا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے کہیں بھی ٹریس کر لیا جاتا ہے۔ ماریا کے اغوا کی خبر ہم نے حکم جی کے اہلکاروں تک پہنچا دی۔ غار کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا اور ہم ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ ادھر باروند نامی عجیب الخلقت شخص نے مجھ پر کچھ باتیں عیاں کیں۔ وہ جوڈو کراٹے کا ماہر سکھ تھا اور یہاں ماریا اور حکم جی کے گارڈز کو تربیت دینے آیا تھا مگر ایک ہندو لڑکی کے عشق نے اسے حکم جی کے عتاب کا شکار بنا دیا اور وہ اپنی ٹانگ اور ایک ہاتھ گنوا بیٹھا۔ باروند نے مجھے جوڈو کراٹے کے حوالے سے اہم باتیں بھی سکھائیں۔ دوسرے دن سرنگ کے دہانے پر ہنگامہ برپا تھا۔ ماریا کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہو چکی تھی اور انور خاں اور حکم جی کے اہلکاروں میں بات چیت کے دوران مجھے ایک نام سنائی دیا۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ انڈین انٹیلی جنس فورسز کا سابقہ افسر جس نے مجسمے کی چوری پر ہمیں پاکستان سے پکڑ کر یہاں انڈیا میں قیدی بنا لیا تھا۔ ادھر باروند اجیلی مجھے جوڈو کراٹے کے حوالے سے اہم گر سکھا رہا تھا۔ انور خاں کے رنجیت پانڈے وغیرہ سے مذاکرات ہو رہے تھے تاہم وہ لوگ وقت گزاری کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے دھوکے سے غار پر ہلا بول دیا تاہم انہیں ناکامی ہوئی لیکن ہمارا ایک ساتھی فیروز اس حملے میں مارا گیا۔ اس کے ردِعمل کے طور پر اسحاق نے ماریا کی ایک انگلی کاٹ کر پانڈے کو بھیج دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے سات افراد کو رہا بھی کر دیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے جیکی وہاں سے غائب ہو گیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہمیں گھیر لیا گیا اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور مہیش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے اور ایک جگہ گھنے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ وہاں چوہان اور اسحاق میں بحث چلی کہ میری وجہ سے دشمن ان تک پہنچ جائیں گے۔ یہ سن کر میں خاموشی سے وہاں سے نکل پڑا۔ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن میں دوبارہ چل پڑا۔ چلتے چلتے اچانک مجھے زمین پر بیساکھی کے نشانات نظر آئے اور میں اسے کھوجتا ہوا باروند اجیلی تک جا پہنچا۔ اس کا اس طرح ملنا میرے لیے حیرت ناک تھا۔ یہ ایک کھنڈر نما چوکی تھی۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ کچھ آہٹ ہوئی۔ یہ رائفل کے کاک ہونے کی آواز تھی۔ یہاں دشمن درجنوں کی تعداد میں موجود تھا۔ ہمیں گھیر لیا گیا تھا۔ میں ذہنی طور پر ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ پھر میرے تصور نے مجھے اپنے ساتھ عمران کو دکھایا۔ اس کا تصور بھی میرے لیے کچھ کم حوصلہ افزا نہیں تھا۔

(اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں)

یکا یک فائرنگ شروع ہوگئی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی... سیٹیاں بجاتی ہوئی چوکی کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ میں اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ میں نے اپنی رائفل سے چند جوابی فائر کیے۔ میرا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا، نہ ہی مجھے ایسی شوٹنگ کے داؤ پیچ آتے تھے... میرے لیے اطمینان اور راحت کی بس ایک بات تھی۔ اس طرح درجنوں دشمنوں میں گھر کر اور موت کو اپنے روبرو دیکھ کر بھی میرے جسم اور دل و دماغ پر لرزہ طاری نہیں ہوا تھا۔ آج میں اس شخص سے بہت... بہت زیادہ مختلف تھا جس نے اپنے گھر کے سامنے چلڈرن پارک میں سیٹھ سراج کے غنڈوں سے مار کھائی تھی اور پھر اپنے ہر جاننے والے سے منہ چھپاتا پھرا تھا۔ آج میں اپنے اندر مرنے کا حوصلہ پا رہا تھا اور یہ حوصلہ بھی پا رہا تھا کہ مرنے سے پہلے اپنے دس بیس دشمنوں کو موت کا مزہ چکھا دوں۔

ایک بار پھر فائرنگ ہوئی۔ تڑتڑ کی زبردست آوازوں کے ساتھ چند برسٹ بھی چلے۔ گولیاں کھنڈر کی دیواروں سے ٹکرائیں اور ہر طرف چنگاریاں بکھر گئیں۔ کسی درخت پر گھونسلے میں دبکا ہوا کوئی پرندہ گولی کھا کر "دھپ" سے میرے سامنے تاریکی میں گرا اور پھڑ پھڑا کر ساکت ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی میگافون پر ایک جانی پہچانی آواز ابھری۔ اس آواز کو سن کر میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ ہمیں گھیرنے والوں میں رنجیت پانڈے بھی شامل ہے۔ اس نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پکار کر کہا۔ "تم لوگوں کے بچنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ باہر آ کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمہیں وچن دیتے ہیں کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی اور قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔"

میں خاموش رہا۔ قریباً ایک منٹ بعد میگافون پر پانڈے کی آواز دوبارہ ابھری۔ "تم جواب کیوں نہیں دیتے ہو؟ اگر تم جواب نہیں دو گے تو ہم سمجھیں گے کہ تمہیں یہ آفر منظور نہیں ہے۔ ہم حملہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے..."

پانڈے کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ چوکی کی اندرونی صورتِ حال سے باخبر نہیں ہے، صرف اندازے سے کام لے رہا ہے۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اندر زیادہ تعداد میں افراد موجود ہیں۔ اگر میں خود اس سے مکالمہ کرتا تو وہ فوراً سمجھ جاتا کہ انور خاں اور چوہان وغیرہ میں سے کوئی یہاں نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں پانڈے اور اس کے درجنوں ساتھیوں کا حوصلہ مزید بڑھ جاتا۔

میری خاموشی طویل ہوئی تو درختوں میں کیے بعد دیگرے کئی ٹارچیں روشن ہوگئیں۔ ان ٹارچوں کی روشنی سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوگئی کہ پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے اس کھنڈر چوکی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے اور ان کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ ایک ساتھ درجنوں ٹارچیں روشن ہونے کی وجہ سے کھنڈر کی اطراف روشن ہوگئی تھیں۔ کوئی اس کھنڈر میں سے نکلنے کی کوشش کرتا تو فوراً نظر میں آجاتا۔

شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ انسان حالات سے سبق سیکھتا ہے۔ اس سے پہلے ہونے والے معرکے میں ماریا کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہم تاریکی کا فائدہ اٹھا کر ہی اپنی پناہ گاہ سے بھاگ نکلے تھے۔ پانڈے جیسا شخص یہ غلطی دوسری بار نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس کھنڈر کے قرب و جوار کو حتی المقدور روشن کر دیا تھا۔

میگافون پر پانڈے کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ "ہم تمہیں دس منٹ کا وقت دیتے ہیں۔ اگر تم لوگ اس کے اندر سے باہر نہیں نکلے تو ہم فائر کھول دیں گے۔ یاد رکھو تم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔" اس بار پانڈے کے لہجے میں مخصوص تپش موجود تھی۔ یہ تپش اس کے اندر کی بے پناہ سفاکی کو ظاہر کر رہی تھی۔

میں بے آواز کھسکتا ہوا پیچھے آیا۔ جیکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی واحد ٹانگ سامنے کی طرف پھیلا رکھی تھی۔ بوتل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس میں سے مزید کافی ساری شراب اپنے اندر انڈیل چکا تھا۔ صورتِ حال اس کی سمجھ میں بھی بہت اچھی طرح آ چکی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ حکم اور جارج کے لوگوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اب بچنے کا کوئی امکان نہیں۔

میں نے دل گرفتہ انداز میں کہا۔ "جیکی! میں آپ کے لیے مصیبتوں کی وجہ بنا ہوں۔ میں آپ کا کھوج لگاتا ہوا اس کھنڈر میں نہ آتا تو شاید آپ بچ جاتے۔"

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "یہ شاید بُری چیز ہے۔ اس لفظ کو اپنی باتوں میں آنے ہی نہیں دینا چاہیے۔ اگر اس لفظ کا ہی سہارا لینا ہے تو پھر تو اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ شاید تم میری وجہ سے پھنسے ہو۔ شاید تم اس کھنڈر میں نہ آتے تو بچ بچا کر کسی طرف نکل جاتے اور شاید میں جارج کی بہن کو مارشل آرٹ سکھانے اس اسٹیٹ میں نہ آتا تو اب تک بھلا چنگا ہوتا... اور شاید میں اور شکنتلا ایک دوسرے کی نظر کا شکار نہ ہوتے اور جارج کی بہن ہماری مخبری نہ کرتی تو میں اس وقت اسٹیٹ کی فوج کا کمانڈر انچیف ہوتا وغیرہ وغیرہ۔"

اس طرح تو بہت کچھ سوچا جاسکتا ہے دوست... لیکن تم یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ تم میرے لیے مصیبتوں کی وجہ بنے ہو؟ کیا اس سے پہلے بھی تم نے میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی کی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''... میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا جیکی... آپ کو آپ کی کشتی سے نکال کر اس جنگل میں لانے کا ذمے دار کوئی اور نہیں صرف میں ہوں۔ یہ میں ہی ہوں جس کی وجہ سے آپ یہاں موجود ہو۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ شستہ انگریزی میں بولا۔

''میرے ساتھی تو آپ کو اس کشتی میں چھوڑ کر آگئے تھے لیکن میں آپ کو وہاں نہ چھوڑ سکا... اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو آپ بے ہوش تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ اسی طرح دم نہ توڑ جاؤ... لیکن زیادہ اہم وجہ دوسری تھی۔ مجھے آپ کی شکل وصورت میں اپنے بہت پیارے دوست کی تھوڑی سی جھلک نظر آئی تھی۔ یہ وہی دوست ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ اس کا نام عمران تھا۔ اس نے مجھے نئی زندگی دی اور تھوڑے سے ہی وقت میں مجھے اتنا عزیز ہوگیا کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ اور اگر بیان کروں گا تو شاید حق ادا نہ کر پاؤں گا۔''

میں نے اس بارے میں اسے تھوڑی سی تفصیل مزید بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔ ''جو بھی ہوا اسے اب دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں... اور نہ ہی اسے دہرانے کے لیے ہمارے پاس وقت ہے۔ بہرحال، میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر تم لوگ مجھے وہاں مرنے کے لیے چھوڑ دیتے تو یہ میرے حق میں بہت اچھا ہوتا۔''

''میں اس کے لیے شرمندہ ہوں جیکی!''

''چلو... تم نے سچ تو بولا... اور مجھے اس کی خوشی ہے۔ نیپالی میں ایک کہاوت ہے کہ سچ بولنے والے کی زندگی کا آخری مرحلہ آسان ہو جاتا ہے...''

میں نے دیکھا کھنڈر سے باہر ٹارچوں کے روشن دائرے اب پہلے سے بڑھ گئے تھے۔ موت کا گھیرا مکمل تھا۔ میں نے کہا۔ ''جیکی! ابھی میگافون پر ان لوگوں نے جو اعلان کیا ہے، آپ نے سنا ہے؟''

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔ ''شاید تم بھول رہے ہو کہ میں اردو اور ہندی نہیں سمجھتا۔''

''اوہ سوری۔'' میں نے کہا۔ ''یہ حکم اور جارج کا سب سے خطرناک ہرکارہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ ہمیں پیشکش کر رہا تھا کہ اگر ہم ہتھیار ڈال کر باہر آجائیں تو ہمیں شوٹ نہیں کیا جائے گا اور ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔''

جیکی نے بوتل میں سے دو بڑے گھونٹ لیے اور ایک بار پھر زخمی انداز میں مسکرایا۔ ''اس پانڈے کو میں بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ کسی بہت نیک ماں کا بچہ ہے۔ وہ خدا کی بندی ایسے تین چار پانڈے اور پیدا کردیتی تو پورا انڈیا شاید اس دنیا میں ہی سورگ بن جاتا۔ وہ میگافون پر جو کچھ کہہ رہا ہے، بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیں بالکل شوٹ نہیں کریں گے اور ہمارے ساتھ سلوک بھی قانون کے عین مطابق ہوگا... لیکن یہاں کا قانون کیا ہے؟ یہ شاید تم نہیں جانتے۔''

''کیا قانون ہے؟''

''یہ تو طے ہے کہ میری اور تمہاری کم سے کم سزا موت ہوگی اور موت یہاں بڑے بُرے طریقے سے دی جاتی ہے۔ تمہیں پھانسی چڑھنے... اور سولی چڑھنے کا فرق معلوم ہے؟''

میں خاموش رہا۔

وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''پھانسی میں گلے میں رسا ڈال کر لٹکایا جاتا ہے اور سولی میں مجرم کو لکڑی کے کراس پر کیل ٹھونک کر ٹانک دیا جاتا ہے... یوں کر کے۔'' اس نے اپنا اکلوتا بازو پھیلا کر کراس کی شکل بنانے کی ادھوری کوشش کی۔ پھر شراب کا ایک طویل گھونٹ بھر کر بولا۔ ''میں نے جارج کی جیل میں لوگوں کو سولی چڑھتے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں بھی وہیں پر سولی چڑھایا جائے گا۔ وہ مرنے کے لیے بہت بُری جگہ ہے اور وہ طریقہ بھی بہت بُرا ہے... بہت ہی بُرا ہے۔''

اس نے ذرا توقف کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''پرانے طریقے کے مطابق جلاد پہلے مجرم کے جسم کے جوڑ توڑتا ہے۔ یہاں سے... یہاں سے... اور یہاں سے...'' اس نے اپنے ٹخنے، گھٹنے، کولھے اور کہنی وغیرہ کے جوڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھر اس بدنصیب کی آنکھیں نکالی جاتی ہیں اور بعض اوقات کان بھی کاٹ لیے جاتے ہیں۔ تب اسے لکڑی کے کراس پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور کندھوں میں چھ لمبی میخیں گاڑی جاتی ہیں... اور اسے کھلی جگہ پر آخری سانسیں لینے کے لیے لٹکا دیا جاتا ہے۔''

جیکی جو کچھ کہہ رہا تھا، اس قسم کی بات میں نے دورانِ سفر حجام عبدالرحیم سے بھی سنی تھی۔ اس نے جارج کی جیل کا احوال سناتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں مجرموں کو بہت بُرے طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ دوسرے قیدیوں کے لیے عبرت کا سامان مہیا کرنے کے لیے ایسی تمام سنگا کانہ سزائیں سرعام دی جاتی ہیں۔

''تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟'' میں نے باروندا جیکی سے پوچھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میری رائے تو وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بھی کئی بار بتا چکا ہوں۔ میں اپنی کشتی میں مرنا چاہتا ہوں لیکن لگتا ہے کہ اب حالات ہمیں اس کی اجازت نہیں دیں گے... اور جب موت کشتی میں نہیں آئی تو پھر کہیں بھی آجائے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''تو آپ گرفتاری دینا نہیں چاہتے؟''

''ہرگز نہیں، اگر تم ایسا کرنا چاہتے ہو تو کرلو لیکن اس سے پہلے اپنی یہ رائفل مجھے دے دینا... تاکہ میں ان حرامیوں میں سے دو چار کو شوٹ کر کے خود کو گولی مار سکوں۔''

''میرے خیال میں، میں بھی لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ پسند کروں گا۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔

اسی دوران میں میگافون پر منحوس آواز پھر سنائی دینے لگی۔ اس مرتبہ آواز میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔ پانڈے نے کہا۔ ''دس منٹ پورے ہو چکے ہیں۔ ہم تمہیں آخری بار باہر آنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔''

میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''پانڈے! تم سامنے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میرا ارادہ تھا کہ پانڈے کے سامنے آتے ہی دو چار گولیاں اس کے سینے میں ٹھونک دوں پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہونا ہے، ہو جائے۔

''تم کون ہو؟'' پانڈے نے پوچھا۔

''تم مجھے مہروز کے نام سے جانتے ہو۔ میں مختار راجپوت کا داماد ہوں۔''

چند لمحے سناٹا رہا۔ پھر ایک بڑی ٹارچ کا روشن دائرہ میری سمت حرکت کر آیا۔ پانڈے کی آواز گونجی۔ ''تم اپنی رائفل پھینک کر سامنے آجاؤ۔ پھر تم سے بات ہوسکتی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ پانڈے جیسا گھاگ شخص اتنی آسانی سے خود پر حملے کا موقع نہیں دے گا۔ عین ممکن تھا کہ میرے سامنے آتے ہی مجھے شوٹ کر دیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی کھنڈر پر ہلا بول دیا جاتا۔

میں نے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جو کرسکتا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے آواز کے رخ پر گولی چلائی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے اور اس کے ساتھ ہی یہ امید کی کہ ایک آدھ گولی رنجیت پانڈے کو لگ گئی ہوگی۔

میری فائرنگ کے ساتھ ہی جیسے کسی طوفان کا بند ٹوٹ گیا۔ گولیاں مینہ کی طرح کھنڈر کے در و دیوار پر برسنے لگیں۔ میں ایک محفوظ آڑ میں تھا، جم کر جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ سچ کہتے ہیں کہ لڑائی کا انتظار لڑائی سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ ایک بار جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو پھر وہ اتنی خوفناک اور تکلیف دہ نہیں رہتی۔ میں نے اپنی فائرنگ کے جواب میں ایک کربناک آواز سنی۔ یہ میرے مدمقابلوں میں سے کسی ایک کی آواز تھی، جسے گولی لگی تھی۔ اس آواز نے میرے اندر چنگاریاں سی بھر دیں۔ میرا دل چاہا کہ میں اس طرح کی مزید آوازیں سنوں۔

اگلے تین چار منٹ میں، میں نے بھرپور مزاحمت کی۔ میرے حریفوں نے جتنی بار پیش قدمی کرنی چاہی، میں نے انہیں روک دیا۔ میرا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا۔ اس کے باوجود دو تین افراد میری فائرنگ سے ''ہٹ'' ہوئے۔ اس دوران میں، میں نے تیزی سے پوزیشنیں بدلیں، رائفل کے میگزین تبدیل کیے اور جیکی سے گفتگو بھی جاری رکھی۔ وہ میرے لیے میگزین بھر رہا تھا۔ میگزین کو اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر وہ اس میں اپنے اکلوتے ہاتھ سے گولیاں ٹھونس سکتا تھا۔ وہ خوف زدہ نہیں تھا اور اس کا اندازہ اس کی باتوں سے ہو رہا تھا۔ فائرنگ کے سماعت شکن شور میں وہ پکار کر بولا۔ ''شاباش... لڑتے ہوئے مرنا ہے، ڈرتے ہوئے نہیں مرنا۔''

''آپ بے فکر رہو۔ آخری گولی تک لڑوں گا۔'' میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں... نہیں۔ آخری گولی تک نہیں لڑنا۔'' جیکی کی آواز ابھری۔

''کیا مطلب؟''

''آخری دو گولیاں بچا کر رکھنی ہیں۔ ایک میرے لیے... اور ایک، چاہو تو اپنے لیے۔''

یکایک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ مجھے جیسے کسی مست ہاتھی نے ٹکر دے ماری تھی۔ میں اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ ٹرپل تو رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میرا سر بڑے زور سے پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ آنکھوں میں نیلے پیلے تارے ناچ گئے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا، مجھے دستی بم سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ اضطراری عمل کے تحت میں نے اپنے جسم کو ٹٹول کر دیکھا۔ ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔ صرف ایک ران میں سے خون رس رہا تھا۔ بارود کی تیز بو نتھنوں میں گھسی۔

''جیکی! آپ ٹھیک ہو؟'' میں نے پکار کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بُری طرح کھانسنے لگا۔ لگتا تھا کہ اس کی سانس رک رہی ہے۔

میں نے گہرے اندھیرے میں رائفل کے لیے دیوانہ وار ہاتھ چلائے۔ وہ مجھے جیتل کی لاش سے پانچ چھ فٹ کی

دوری پر ملی۔ میں لیٹے لیٹے پیچھے کی طرف کھسک آیا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی دیواروں اور درختوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ گولیاں میرا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتیں یا شاید کسی بھی شخص کی موت ان گولیوں سے واقع نہیں ہو سکتی۔ ان گولیوں کا خوف دل و دماغ سے بالکل نکل گیا تھا۔ ہاں... اس کی جگہ دستی بم کے خوف نے لے لی تھی۔ مجھے پتا تھا، دستی بم ہوا میں قوس بناتا ہوا آئے گا اور کھنڈر کے اندر تک نقصان پہنچائے گا۔ میں اپنی رائفل کے ساتھ کچھ اور پیچھے ہٹ آیا اور تب مجھے دوسرا شدید ذہنی دھچکا لگا۔ میری نرنگل تو رائفل استعمال کے قابل نہیں رہی تھی اور ایسا دستی بم کے زوردار دھماکے کے بعد ہوا تھا۔ دھماکے کے بعد رائفل کی لبلبی ٹیڑھی ہو گئی تھی اور اپنی جگہ سے ایک "رتی" بھی حرکت نہیں کر رہی تھی۔

"فائر کیوں نہیں کر رہے ہو؟" جیکی نے چلّا کر پوچھا اور ایک بھرا ہوا میگزین میری طرف اچھالا۔

میں اسے کیا جواب دیتا؟ میں سمجھ گیا تھا کہ اب یہ سارا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ میں نے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے اوپر سے جھانکا۔ ٹارچوں کی چند ایک روشنیاں کھنڈر کے عین سامنے پہنچ گئی تھیں۔ وہ لوگ گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ پانڈے کے کچھ کمانڈوز نے بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی ہیں اور یہ خطرناک کمانڈوز کسی بھی لمحے "چارج" کر کے اندر گھس سکتے تھے۔

کچھ دیر پہلے جیکی نے مجھ سے کہا تھا کہ دو گولیاں بچا کر رکھنا۔ گولیاں تو بہت سی بچی ہوئی تھیں لیکن انہیں چلانے والا ہتھیار بیکار ہو چکا تھا۔

تو پھر اب کیا کرنا ہو گا؟ میں نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔

میرا دھیان اپنے شکاری چاقو کی طرف چلا گیا۔ تو کیا اس چاقو کو مضبوطی سے پکڑ کر دیوانہ وار اس کھنڈر سے نکلوں اور رائفل برداروں پر جا پڑوں۔ کسی کو مار تو شاید نہ سکوں لیکن اپنے مرنے کا حق تو ادا کر دوں؟ پھر ذہن جیکی کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کا کیا بنے گا؟ کیا وہ زندہ پانڈے کے ہتھے چڑھ جائے گا؟ کیا اسے اس انجام سے بچانے کے لیے میں اسے اپنے اس چاقو سے قتل کر سکتا ہوں؟

بے شک... بے شک میں بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن ابھی اتنا تبدیل بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک ایسے شخص کو جان سے مار سکوں جس کی میں دل سے عزت کرنے لگا تھا... اور جان سے مارنے کا کام مجھے کرنا بھی چاقو سے تھا۔

مجھے اپنی ہمت ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیکی بھی بھانپ چکا تھا کہ میرے فائرنگ نہ کرنے کا سبب کوئی گڑبڑ ہے۔

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو؟ وہ لوگ... وہ لوگ اندر گھسنے والے ہیں۔"

جیکی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ اب بہت قریب آ گئے تھے۔ ان کی سفاک آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے رائفل پھینک کر چاقو نکال لیا اور آخری لمحات کے لیے تیار ہو گیا۔ میری ران سے رستا ہوا خون میرے پاؤں تک پہنچ رہا تھا اور اس کی نمی مجھے اپنی جوتی میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔

یکایک فائرنگ دھیمی ہوئی اور پھر تھم گئی۔ مجھے کچھ دور افتادہ آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا کہ شیشم، سفیدے اور بلوط کے دیوقامت گھنے درختوں میں چند افراد چلّا چلّا کر باتیں کر رہے ہیں۔

تب ایک بار پھر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ کھنڈر سے باہر ہر طرف شعلے رقص کرنے لگے۔ در و دیوار سے کرچیاں اڑنے لگیں اور شاخیں کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔ اور پھر یہ انکشاف ہوا کہ اب فائرنگ کا آہنگ اور ہے۔ اب فائرنگ کا سارا زور ہماری دائیں جانب تھا... اور یوں لگ رہا تھا کہ دائیں جانب سے جوابی فائرنگ بھی ہو رہی ہے۔ چاروں طرف ایک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" جیکی کی آواز سنائی دی۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"لگتا ہے کہ کچھ اور لوگ یہاں پہنچ گئے ہیں۔" دھماکوں کے بے پناہ شور میں جیکی کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔ اس کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔

میرے دل میں ایک دم نقارہ سا بجا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ہمارے ساتھی یہاں موقع پر پہنچ گئے ہوں؟ مگر پھر فوراً میں نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔ ہمارے ساتھی باقی ہی کتنے بچے تھے۔ انور خاں، چوہان، اسحاق اور جیل سے رہائی والے دو ہندو... یعنی کُل پانچ افراد! مگر یہاں جس طرح کی فائرنگ ہو رہی تھی، لگتا تھا کہ یکایک دو ڈھائی سو افراد پوری طاقت کے ساتھ ایک دوسرے سے بھڑ گئے ہیں۔ ہر طرف للکارے گونج رہے تھے اور ہتھیاروں کی کھناکھٹ سنائی دیتی تھی۔ زخمیوں کی پکار، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، گولیوں کے سرسرانے اور دستی بموں کے دھماکے... میدان جنگ کا سا منظر تھا۔ دستی بم کے ایک سماعت شکن دھماکے کے بعد ایک جسم اڑتا ہوا سا ہمارے جھونپڑے نما کمرے کے سامنے آن گرا۔

میں نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور ششدر رہ گیا۔ یہ شخص سبز وردی میں تھا۔ اس کا ایک بازو کندھے پر سے صاف اڑ گیا تھا اور گردن پر سے بھی کچھ گوشت غائب تھا۔ غالباً وہ یہاں گرنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

جیکی نے بھی سبز وردی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ پکار کر بولا۔ "یہ تو نل پانی کے لوگ ہیں۔"

"اور کافی تعداد میں ہیں۔" میں نے اس کے فقرے میں اضافہ کیا۔

میرے لیے سب سے خوش آئند چیز وہ رائفل تھی جو سبز وردی والے کے ساتھ ہی چیتل کی لاش کے پاس گری تھی۔ میں نے رائفل پکڑی اور سرکتا ہوا پیچھے آ گیا۔ یہ رائفل میرے لیے بالکل اجنبی تھی لیکن تیار حالت میں تھی۔ میں نے ٹریگر دبایا تو زبردست تڑتڑاہٹ سے ایک برسٹ، لکڑی کی بوسیدہ چھت میں جا لگا اور بہت سی مٹی ہمارے اوپر گری۔

میرے رگ و پے میں اعتماد اور جوش کی نئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے رائفل پر گرفت مضبوط کر دی اور ایک دیوار کی اوٹ لے کر چوکس بیٹھ گیا۔

دو تین پکارتی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ ان میں سے ایک منحوس آواز پانڈے کی بھی تھی۔ وہ سخت طیش کے عالم میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ غالباً میری فائرنگ اسے شدید نقصان پہنچانے سے قاصر رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں دو تین مختصر وقفوں کے سوا زبردست فائرنگ جاری رہی۔ اس فائرنگ میں چھوٹے پستول سے لے کر برسٹ مارنے والی بڑی رائفلوں تک ہر طرح کا ہتھیار استعمال ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ چوٹ برابر کی ہے بلکہ نل پانی سے آنے والوں کو کچھ برتری حاصل ہے... مگر ایک جگہ ایسی تھی جہاں سے پانڈے کے دو تین ساتھی بڑی مؤثر فائرنگ کر رہے تھے اور مخالف فریق میں سے کسی کو آگے بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔ یہ جگہ ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھی اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہاں تین افراد جی تھری گن کے ساتھ موجود تھے۔

جیکی کا خیال بھی یہی تھا کہ جب تک پانڈے کے بندے ٹیلے والی جگہ پر موجود ہیں، ان کا پلڑا بھاری رہے گا۔ جانے کیوں میرے دل میں آئی کہ میں یہاں اس کھنڈر کی پناہ گاہ کو چھوڑ کر نکلوں اور بھاگتا ہوا اس ٹیلے پر پہنچ جاؤں۔ اندھا دھند گولیاں برساؤں اور اپنے سامنے آنے والے ہر ذی روح کو چھلنی کر دوں۔ پھر نل پانی والوں کو میری لاش ٹیلے کی بلندی پر سے ملے۔ میرے جسم پر گولیوں کے ان گنت زخم ہوں۔ وہ لوگ میری لاش کو نل پانی لے جائیں... اور... میرے کردار پر لگے ہوئے بزدلی و کم ہمتی کے سارے داغ میرے لہو سے دھل جائیں۔

سوچنے اور عمل کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ میں بھی سوچ رہا تھا لیکن عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے اندر انقلاب ضرور آیا تھا مگر ابھی یہ انقلاب اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ میں ایسا بڑا اقدام اٹھا سکتا۔

اچانک فائرنگ دھیمی پڑ گئی اور یوں لگا کہ فائرنگ کا آہنگ بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ درختوں میں حرکت کرتی ہوئی روشنیاں تیزی سے بائیں طرف ہٹنے لگیں۔ جیکی نے پکار کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ پانڈے کے لوگ بھاگ رہے ہیں۔"

کچھ دیر بعد مجھے بھی لگا کہ جیکی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے دو گھوڑوں کو برق رفتاری کے ساتھ اپنے سامنے سے گزرتے دیکھا۔ ان پر سبز اور خاکی وردیوں کی جھلک نظر آئی۔ دائیں طرف سے ہونے والی فائرنگ ایک دم زور پکڑ گئی تھی۔ جو فائرنگ بائیں جانب سے ہو رہی تھی، وہ کم ہونے کے ساتھ ساتھ دور بھی چلی گئی تھی۔

یکایک کھنڈر کے بالکل سامنے سے ایک گرجتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "تابش! او تابش! تم کہاں ہو؟"

میری رگوں میں لہو اچھل کر رہ گیا۔ سر سے پاؤں تک جوش کی ایک لہر چلی اور پھیل گئی۔ یہ ہمارے یارِ غار... شیر دل انور خاں کی آواز تھی۔

میں نے پکارا۔ "میں یہاں ہوں انور بھائی۔" اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دی۔

انور خاں اور اسحاق عقابوں کی طرح جھپٹتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ سبز وردیوں والے چار پانچ مسلح افراد بھی تھے۔ انور خاں کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ سرتاپا ایک جنگجو پٹھان نظر آتا تھا۔ ہم بغل گیر ہو گئے۔ وہ میرا ماتھا چوم کر بولا۔ "یار! ایک دم کہاں چلے گئے تھے تم؟ بڑا پریشان کیا تم نے۔"

اسحاق بھی مجھ سے بغل گیر ہوا۔

یہ تفصیلی بات کا وقت نہیں تھا۔ اِکا دُکا فائر ابھی تک ہو رہے تھے۔

دو مسلح افراد جیکی کے پاس رک گئے۔ ہم کھنڈر سے باہر نکل آئے۔ مجھے سامنے ہی درختوں کے نیچے پانچ چھ افراد کی لاشیں نظر آئیں۔ ان میں سے زیادہ تر زرگاں کے تھے۔ ایک بارشی گڑھے میں ایک گھوڑا بھی مرا پڑا تھا۔ ٹیلے کے ارد گرد بھی جانی نقصان ہوا تھا... دو تین لاشیں میں نے اپنی

آنکھوں سے دیکھیں۔ سبز وردیوں والے افراد زخمیوں کو اٹھا رہے تھے اور یہاں وہاں بکھرے ہتھیار اور پگڑیاں وغیرہ اکٹھی کر رہے تھے۔ ایک شخص جھکا اور اس نے خود رو گھاس میں سے دھات کی بنی ہوئی کوئی چیز اٹھائی۔ انور خاں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ ایک آہنی راڈ تھا۔ اس پر افقی رخ پر تین چار چھوٹے راڈ لگے ہوئے تھے۔ عقب میں ایک گول جالی سی تھی۔ دیکھنے میں یہ ٹی وی انٹینا جیسا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بھاگنے والے دیگر کئی چیزوں کی طرح یہ آلہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔

اسی دوران میں کسی نے عقب سے مجھے دبوچ لیا۔ یہ زبردست دوستانہ گرفت تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ ڈاکٹر چوہان تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ اس کا زخمی کندھا پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ فائرنگ ختم چکی تھی لیکن ایک گرم ماؤزر ابھی تک چوہان کے ہاتھ میں تھا۔

''یہ سب کیا ہے چوہان؟ اتنے سارے لوگ تمہارے ساتھ؟ ہم تو صرف چھ بندے باقی بچے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''تم غلط کہہ رہے ہو۔ ہم چھ نہیں، صرف پانچ بچے تھے۔ تم تو جوہڑ کے کنارے پیشاب کرنے کے بہانے نکل گئے تھے اور جس وجہ سے نکلے تھے، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں... بہرحال... یہ جو کچھ ہوا ہے، تم اسے اللہ کی مدد کہہ سکتے ہو۔ حالات ایک دم بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم ابھی تمہیں تفصیل بتاتے ہیں۔'' چوہان نے کہا۔ اس کی آواز میں ایک جوشیلی لرزش تھی۔

انور خاں اور دیگر افراد ٹیلے پر چڑھ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ یہاں اب تل پانی کے مسلح سپاہیوں نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ ٹیلے پر دو تناور درختوں کی اوٹ میں گولیوں کے بے شمار خول پڑے تھے اور ایک بڑی گن تھی۔ انور خاں نے بتایا کہ یہ جی تھری ہے۔ یہاں اس منظر میں موجود سب سے اہم چیز دو انسانی لاشیں تھیں۔ یہ دونوں پانڈے کے ساتھی تھے۔ ان کی سبز اور خاکی وردیاں لہو رنگ تھیں۔ تاہم غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ ان کے جسم پر گولیاں نہیں لگیں بلکہ کسی تیز دھار آلے سے وار کیے گئے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جی تھری گن چلانے والے ان دو افراد کی ہلاکت کے بعد ہی لڑائی ختم ہو سکی ہے۔ انور خاں نے یہ شاندار گن اور اس کا سارا فالتو ایمونیشن اپنے قبضے میں لے لیا۔ دونوں افراد کی خونچکاں لاشیں وہاں سے اٹھوا دی گئیں۔

جلد ہی ہم بارود اجیکی کے پاس چوکی کے کھنڈر میں واپس آ گئے۔ یہاں اب بہت سے افراد جمع ہو چکے تھے۔ وہ سب تل پانی کے سپاہی تھے۔ ان کے چہروں پر فاتحانہ رنگ تھا۔ وہ جیکی میں بہت دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ جیکی نشے میں اوٹ پٹانگ بولتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے چوہان سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ تل پانی کے سپاہی تو اس معاملے میں غیر جانب دار تھے۔ وہ اس لڑائی میں کیسے آ گئے؟''

''بس آ گئے... بلکہ کود پڑے... اور علی الاعلان کود پڑے۔'' چوہان کی آواز میں چھپا ہوا جوش نمایاں ہو گیا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

اس نے میرا کندھا دبایا۔ گرفت میں جذباتی کیفیت تھی۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''تل پانی والے میدان میں آ گئے ہیں۔ چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن گئی ہے۔ پچھلے چوبیس گھنٹے میں تین جگہ زبردست ٹاکرا ہوا ہے۔''

اسی دوران میں انور خاں نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ ''تابش! آؤ تمہیں اپنے اس ساتھی سے ملواؤں جس کی وجہ سے ہم حکم کے کتوں کو یہاں سے بھگانے میں کامیاب ہوئے۔''

''کون ہے یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو اپنی جان سخت خطرے میں ڈال کر ٹیلے پر چڑھا۔ اس نے جی تھری چلانے والے دو سپاہیوں پر تلوار سے وار کیے اور ان کا قصہ پاک کیا۔''

انور خاں اور چوہان مجھے لے کر گھنے درختوں میں گھسے۔ یہاں ابھی تک دھواں اور بارود کی بو تھی۔ ایک جگہ خشک جھاڑیوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یقیناً ایسا کسی دستی بم کے دھماکے کی وجہ سے ہوا تھا۔ جھاڑیوں کے قریب ہی زمین پر دو تین زخمی پڑے ہوئے تھے۔ انور خاں نے مجھے بازو میں لیتے ہوئے ایک زخمی کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ایک نوجوان لڑکا اس زخمی کے پاؤں پر پٹی باندھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ زخمی کوئی عورت ہے۔ اچانک وہ عورت حرکت میں آئی... اور میرے قدموں میں گر پڑی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کی آواز نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ وہ کوئی اور نہیں سلطانہ تھی۔

میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا لیکن وہ میرے پاؤں سے لپٹی رہی۔

''مجھے معاف کر دو مہروج... مجھے معاف کر دو۔'' وہ بس یہی کہتی جا رہی تھی۔

اس نے اپنا منہ سر لپیٹ لیا تھا۔ وہ جیسے مجھے اپنی شکل بھی دکھانا نہیں چاہ رہی تھی۔ چوہان نے نوعمر لڑکے کے ساتھ مل کر اسے بہ مشکل میرے قدموں سے علیحدہ کیا۔ وہ پہلو کے بل ایک طرف جا پڑی۔ اس کا چہرہ بدستور چادر میں پوشیدہ تھا۔

انور خاں مجھے دلاسا دیتے ہوئے ایک طرف لے گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ سب کیا ہے؟''

انور خاں نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''تابش! ہمارے بعد تل پانی اور زرگاں میں حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ اس حرام زادی اریا کے ہمارے ہاتھ سے نکلنے کے بعد حکم اور جارج ایک دم شیر ہو گئے ہیں۔ وہ بڑے جوش میں ہیں اور جوش میں بندے سے بے وقوفیاں بھی ہوتی ہیں۔ حکم جی نے کل دوپہر پورے تیس بندوں کو زرگاں کی جیل سے نکال کر سرِعام سولی چڑھا دیا ہے۔ ان پر بغاوت اور غداری کے الزام لگائے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے اور ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے پچھلے بدھ کی صبح جارج کی رہائش گاہ پر حملہ کیا اور وہاں سے سلطانہ اور اس کے بچے کو نکالا۔''

''یہ تو واقعی ظلم ہے۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''اس ظلم نے پوری اسٹیٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ نے اب تک بہت تحمل سے کام لیا ہے... لیکن اب حالات کو سنبھالنا ان کے بس میں بھی نہیں رہا۔ کل سہ پہر حکم جی کے کچھ سپاہی تل پانی کی ایک قریبی بستی میں گھس گئے۔ وہ وہاں اپنے دو مزدور قیدیوں کو پکڑنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک مراد شاہ کا ہم زلف بھی ہے۔ اس واقعے کے بعد حکم جی اور چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں جھڑپ ہوئی۔ یہ پہلی براہِ راست جھڑپ تھی اور یہ دیکھتے ہی دیکھتے زوردار لڑائی میں بدل گئی۔ وہاں دونوں طرف کے کم از کم چالیس بندے مارے گئے ہیں۔ اس کے بعد دو زبردست جھڑپیں اور ہوئی ہیں جن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے والی جھڑپ بھی شامل ہے۔''

یہ اطلاعات سنسنی خیز تھیں۔ میں نے انور خاں سے پوچھا۔ ''یہ سلطانہ آپ کو کہاں ملی؟''

''مراد شاہ کے حکم پر کچھ لوگ تل پانی سے تمہیں تلاش کرنے کے لیے نکلے تھے۔ سلطانہ بھی اصرار کر کے ان میں شامل ہو گئی۔ ساتھ میں جو نوعمر لڑکا ہے، وہ اس کا بھتیجا طلال ہے۔ ان لوگوں سے ہماری ملاقات وہیں جوہڑ کے کنارے ہو گئی جہاں سے تم پرسوں رات رفو چکر ہوئے تھے۔ سلطانہ کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ تم ہمارے ساتھ موجود نہیں ہو۔ ہم بھی تمہارے لیے پریشان تھے۔ ہم کل رات تمہیں ڈھونڈتے رہے۔ پھر ہمیں خبر ملی کہ پانڈے اور اس کے ساتھ ستر ساتھی پرانی چوکی پر موجود ہیں۔ انہوں نے چوکی کے گرد گھیرا ڈالا ہوا ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ پانڈے نے جس شخص کو گھیر رکھا ہے، وہ تم ہی ہو۔ جیکی کے بارے میں مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ہم پوری تیاری کے ساتھ یہاں پہنچ گئے اور پھر جو کچھ ہوا وہ تم نے دیکھا ہی ہے۔''

''بہت وقت پر پہنچے تم لوگ۔ میں تقریباً بے بس ہو چکا تھا۔ تم نے میری رائفل دیکھی ہی ہے، اس کا بیرل ہی بیکار ہو گیا تھا۔''

''شاید ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر لگتی لیکن یہاں پہلے سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس فائرنگ نے ہمیں راستہ دکھایا۔''

''سلطانہ کیسے زخمی ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ہمیشہ کے لیے

ایک جگہ دعوت تھی۔ بہت سے مہمان جمع تھے۔ ان مہمانوں میں مارک ٹوئین اور ایک نوجوان مصنف بھی شامل تھے۔ جب سارے مہمان کھانا کھا چکے تو وہ گھر کی آرائش و زیبائش دیکھنے میں محو ہو گئے۔ نوجوان مصنف کی نظر کتابوں کی ایک خوب صورت الماری پر پڑی۔ وہ کتابیں دیکھنے لگا، اس کو چند کتابیں بہت پسند آئیں۔ اس نے میزبان سے کہا۔ ''جنابِ والا! کیا یہ چند کتابیں آپ کچھ دنوں کے لیے عاریتاً دے سکتے ہیں؟''

میزبان نے صاف انکار کر دیا۔ ''نہیں... ہرگز نہیں۔''

نوجوان مصنف کو بڑی تکلیف پہنچی۔ مارک ٹوئین نے اس کی یہ حالت جو دیکھی تو کہا۔ ''دوست! تمہیں میزبان کے انکار سے آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔ لوگ کتابیں عاریتاً لے جاتے ہیں اور پھر واپس نہیں کرتے، ذرا خیال تو کرو یہ ساری کتابیں ایسی ہی تو ہیں جنہیں ہمارے میزبان نے وقتاً فوقتاً عاریتاً حاصل کیا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے اس الماری میں جگہ پا گئیں۔''

نائلہ علی کی کراچی سے کاوش

''جیسے ایک بہادر سپاہی ہوتا ہے۔'' انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بڑی انوکھی لڑکی ہے تابش! اور اس کا انوکھا پن پچھلے دو تین سالوں میں بہت دفعہ ثابت ہوا ہے۔ تم تو بہت سی باتیں بھول چکے ہو لیکن حقیقت تو اپنی جگہ موجود ہے نا۔''

''سلطانہ نے لڑائی میں حصہ لیا ہے؟''

''حصہ ہی نہیں لیا، لڑائی جیتی بھی ہے۔'' وہ بہت جذباتی انداز میں بولا۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ ''یقیناً تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ جی تھری اور اس کو چلانے والوں کو سلطانہ نے ہی ٹھنڈا کیا ہے۔ لڑائی کے دوران میں پتا نہیں وہ کس وقت پیچھے سے آئی اور اپنے بھتیجے طلال راجپوت کے ساتھ ٹیلے پر چڑھ گئی۔ دونوں کے پاس خاندانی تلواریں تھیں۔ انہوں نے جی تھری چلانے والوں کو چیر کر رکھ دیا۔ پھر ہمیں آوازیں دیں کہ ہم ٹیلے پر آجائیں۔''

میں سناٹے میں تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''وہ زیادہ زخمی تو نہیں؟''

''نہیں، پاؤں اور ٹانگ پر ایک دو زخم آئے ہیں۔ چوہان اسے سنبھال لے گا۔''

''اور بچہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ وہیں تل پانی میں... چاچا عبدالغنی کے پاس۔ سنا ہے کہ وہ اسے اپنا دودھ نہیں پلاتی۔ وہ بہت بیمار ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اب ایک اور عورت اسے دودھ پلا رہی ہے۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ انور خاں بھی خاموش رہا۔ کوئی زخمی بلند آواز سے چلّا رہا تھا۔ پس منظر میں گھوڑوں کی مضطرب ہنہناہٹ سنائی دیتی تھی۔ تل پانی کے باوردی سپاہی پوری طرح چوکس تھے۔ ان میں سے بیشتر کی رائفلیں ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھیں۔

انور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اسے تمہاری بہت زیادہ ہمدردی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ جو زخم اسے لگا ہے اسے صرف تم ہی بھر سکتے ہو۔''

''میں کیا کروں؟''

''میں اس بارے میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں لیکن ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ سلطانہ ان عورتوں میں سے ہے جو اپنے شوہر کو زبانی کلامی نہیں، واقعی مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ تم اگر ٹھان لو کہ تم نے اسے نارمل کرنا ہے تو یہ ناممکن نہیں ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، سیٹی کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بار بار ابھر رہی تھی۔ پھر یہ آواز قریب آتی چلی گئی۔ ایک باوردی شخص نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی پر ہلکے پیلے رنگ کی تین پٹیاں تھیں۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ وہ چھوٹے سرکار کے سپاہیوں میں اعلیٰ عہدہ رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہی انٹینا نما شے تھی جو ٹیلے کے پاس جھاڑیوں سے ملی تھی۔ سیٹی یا بیپ کی آواز اسی میں سے آرہی تھی۔ اس باوردی شخص نے انور خاں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بھائی! اس میں سے یہ آواز آرہی ہے۔ شاید اس کا کوئی کھٹکا دب گیا ہے۔''

آواز کے ساتھ ساتھ انٹینا پر ایک ننھا سا بلب بھی اسپارک کر رہا تھا۔ اسی دوران میں چوہان بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے انٹینے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ چوہان نے باوردی شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اسجے! انٹینے کو لے کر ٹیلے کی طرف جاؤ۔''

اسجے نامی وہ شخص انٹینے کے ساتھ ٹیلے کی طرف بڑھا۔ جب وہ پچاس ساٹھ قدم چلا گیا تو چوہان نے پکار کر پوچھا۔ ''سیٹی کی آواز کم ہوئی؟''

''ہاں... لگتا ہے کہ ذرا کم ہو گئی ہے۔'' اسجے نے بھی پکار کر کہا۔

''اب اور آگے جاؤ۔''

اسجے پھر چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد چوہان نے پھر بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ اس بار بھی اسجے کا جواب اثبات میں تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں... کچھ اور کم ہوئی ہے۔''

چوہان نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''کچھ سمجھ میں آیا؟''

میرے دماغ میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ ایک دم میرا ذہن اصل صورتِ حال کی طرف منتقل ہو گیا۔ تو یہی وہ ریسیور تھا جس کے ذریعے میرا کھوج لگایا جاتا تھا... اور یہی ریسیور پانڈے اور اس کے ساتھیوں کو مقناطیس کی طرح یہاں اس کھنڈر چوکی تک کھینچ لایا تھا۔

اردگرد اور لوگ موجود تھے۔ اس موقع پر اس بارے میں تبصرہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں اور چوہان ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر رہ گئے۔

میرا بھوک سے برا حال تھا۔ دیکھا جاتا تو پچھلے تقریباً 48 گھنٹے سے میرے منہ میں اناج کا ایک دانہ تک نہیں گیا تھا... انور خاں نے میری صورت سے ہی میری کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے فوری طور پر میرے لیے خشک گوشت اور پانی کا انتظام کیا۔ نمکین گوشت کے چند ٹکڑے کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر میرے جسم میں جیسے جان آگئی۔ اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ بھوک اور ذائقے کا آپس میں کتنا گہرا اور حیرت انگیز تعلق ہے۔ بھوک نہ ہو تو فائیو اسٹار ہوٹل کا بوفے بھی بیکار اور بھوک ہو تو روٹی کے سوکھے ٹکڑے بھی ہفت رنگ دسترخوان کی طرح۔

اجالا ہونے سے پہلے ہی ہم تل پانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیکی بھی ایک گھوڑے پر سوار ہمارے ساتھ تھا۔ پانڈے کے ساتھیوں میں سے تین افراد زخمی حالت میں ہمارے ساتھ تھے۔ ان کی مشکیں کس کے انہیں اوندھے منہ گھوڑوں پر لاد دیا گیا تھا۔ اس خوں ریز لڑائی میں پانڈے اور اسٹیل وغیرہ کے چودہ ساتھی ہلاک ہوئے تھے۔ اسجے اور انور خاں کے ساتھیوں میں سے آٹھ نو بندوں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ مرنے والوں کی لاشوں کو بعد ازاں چھکڑوں کے ذریعے وہاں سے ہٹایا جانا تھا۔ نو دس بجے کے قریب ہم تل پانی میں داخل ہو گئے۔ پہلی بار میں چند ہفتے پہلے سلطانہ اور رستم کے ساتھ اس خوب صورت بستی میں داخل ہوا تھا۔ اس بار بھی سلطانہ میرے ساتھ تھی لیکن کسی اجنبی کی طرح۔ راستے میں بھی وہ بالکل الگ تھلگ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور منہ سر لپیٹے گھوڑے پر بیٹھی رہی۔ وہ بس اپنے بھتیجے طلال سے تھوڑی بہت بات کرتی تھی۔ اس کے مزاج میں عجیب سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔

نیلی جھیل کے کنارے تل پانی کی بستی میں زندگی رواں دواں تھی۔ نیم پختہ راستوں پر گھوڑا گاڑیاں حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ گھاگرے چولی والی عورتیں اور رنگ برنگی پگڑیوں والے مرد روزمرّہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ سرسبز ڈھلوانوں پر بکریوں اور گائے بھینسوں کے ریوڑ چر رہے تھے۔ جھیل پر تیرتی کشتیوں کے پس منظر میں پُرشکوہ عمارتوں کے کلس سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ گھنے جنگلوں کے بیچوں بیچ یہ واقعی ایک دلکش بستی تھی۔

تل پانی میں مجھے دو نئی چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو ہر چہرے پر ایک جوش سا تھا۔ دوسرے میں نے کئی نوجوانوں کے کندھوں پر رائفلیں دیکھیں۔ مجھے لگا ایسا موجودہ صورتِ حال کی وجہ سے ہے۔ ہم بستی کے بارونق علاقے میں داخل ہوئے تو جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں موجود تھیں۔ کچھ گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں میں بھی لوگ نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور نعرے لگائے۔ ایک چوک میں کچھ جوشیلے نوجوانوں نے اسجے کو گھیر لیا اور اس کے ساتھ انور خاں کو بھی۔ پھر ان دونوں کو کندھوں پر اٹھا لیا گیا۔ صورتِ حال سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج رات کھنڈر کے سامنے والی جھڑپ اور جیت کی خبر عام لوگوں تک پہنچ چکی ہے۔

ہمیں سیدھا دیوان میں لے جایا گیا۔ دیوان کے صدر دروازے پر ہم نے جھومتے ہوئے ہاتھی دیکھے۔ دیوان، وہی وسیع و عریض عمارت تھی جس کے اندرونی حصے میں چھوٹے سرکار اور مراد شاد وغیرہ کی رہائش گاہیں تھیں۔ اسی عمارت کے ایک حصے میں، میں نے چھوٹے سرکار کی عدالتی کارروائی بھی دیکھی تھی۔ چوہان مجھے لے کر تین چار کمروں کی ایک خوب صورت رہائش گاہ میں آگیا۔

''سلطانہ کہاں ہے؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''یہیں پر ہے۔ تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''لیکن مجھے تو پتا چلا تھا کہ وہ چاچا عبدالغنی کے گھر میں ہے؟''

''حالات خراب ہو گئے ہیں۔ عبدالغنی کے گھر میں اسے خطرہ ہو سکتا تھا۔ چھوٹے سرکار کی ہدایت پر اسے یہاں لایا گیا ہے۔''

''اور بچہ؟''

اس سے پہلے کہ چوہان جواب میں کچھ کہتا، بچے نے خود ہی جواب دے دیا۔ اس کے رونے کی آواز آئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک ملازمہ بچے کو گلے سے لگائے اس کی پیٹھ تھپکتی ہوئی برآمدے میں سے گزری۔

''یہی مسلمان عورت ہے جو تمہارے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ میرے خیال میں صفیہ نام ہے اس کا۔ اس کا اپنا بچہ بھی یہیں پر ہے۔''

اسی دوران میں عقبی کمرے سے سلطانہ کے کراہنے کی آواز آئی۔ چوہان مدھم آواز میں بولا۔ ''سلطانہ کو معمول پر لانے کے لیے تمہارے پاس یہ بہترین موقع ہے۔ وہ زخمی ہے۔ اسے تیمارداری کی ضرورت ہے۔ تمہاری ہمدردی اس کے لیے مرہم کا کام دے گی۔ تمہاری خاطر اس نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں تابش! اب وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ سمجھو کہ نیم مردہ ہو گئی ہے۔ تم اسے سہارا دو گے تو پھر سے جی اٹھے گی۔''

چوہان نے اپنے بیگ میں سے چند دوائیں نکال کر مجھے دے دیں۔

بارونداجیکی کو بھی دیوان کے اندر ہی ایک دوسری جگہ رکھا گیا تھا۔ چوہان نے مجھے اس کے بارے میں تسلی دی کہ وہ بالکل خیریت سے اور محفوظ جگہ پر ہے۔ اس کے علاوہ اسے وافر مقدار میں شراب بھی مہیا کر دی گئی ہے۔ چوکی کے کھنڈر

میں جیکی کے ساتھ اپنی ڈرامائی ملاقات کی تفصیل میں انور خاں اور چوہان کو پہلے ہی بتا چکا تھا۔

اس گھر میں میرے، سلطانہ اور بالو کے علاوہ تین افراد اور موجود تھے۔ ایک تو وہی صفیہ نامی عورت جو بالو کو دودھ پلا رہی تھی۔ دوسرا گونگا ملازم ہاشم اور تیسرا سلطانہ کا جواں سال بھتیجا طلال۔ طلال کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ تاہم کھلے ہاتھ پاؤں کی وجہ سے وہ دو چار سال بڑا نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ اجلا اور آنکھوں میں دلیرانہ چمک تھی۔ وہ سلطانہ کو بڑی محبت سے چچی جی کہتا تھا۔ میں نے اسے بس دو چار دفعہ ہی بولتے سنا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں خاموشی سے سلطانہ کے کمرے میں چلا گیا۔ میرے پاس چوہان کا دیا ہوا مرہم اور پٹی وغیرہ تھی۔ وہ ایک آرام دہ بستر پر کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ فرش پر کپاس کی پھول دار چٹائی بچھی تھی اور اس کے پھول لالٹین کی زرد روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کے سرہانے دودھ کا گلاس ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ جاگ رہی تھی۔ اس کا زخمی پاؤں جس پر پٹی بندھی تھی، کمبل سے باہر تھا۔ میں نے پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے زخمی پاؤں کو چھوا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں خوف، گریز، شرمندگی، بہت کچھ یکجا ہو گیا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''مہروج... یہ... کیا کر رہے ہو؟''

''تمہارے پاؤں پر دوا لگانے لگا ہوں۔''

''خدا کے لیے نا ہیں... ایسا مت کرو... مجھے گناہ گار نہ کرو۔'' اس نے اپنا پاؤں سمیٹ کر کمبل میں کر لیا۔

''اس میں گناہ والی کیا بات ہے؟''

''نا ہیں... تم میرے پاؤں کو ہاتھ مت لگاؤ۔ اس سے مجھے گناہ لگے گا۔''

''کیوں؟ کیا اس لیے کہ میں تمہارا شوہر ہوں؟''

اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

''تو اگر میں تمہارا شوہر ہوں تو تم مجھ سے دور کیوں ہو... میری بات کیوں نہیں مان رہیں؟''

''میں نے تمہیں کہا ہے نا، میں تمہارے قابل نا ہیں۔ میری ناپاکی تمہیں بھی ناپاک کر دے گی۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں مہروج! میرے بچے کو لے کر مجھ سے کہیں دور چلے جاؤ۔ میں نا ہیں چاہتی کہ میری چھایا بھی تم دونوں پر پڑے۔''

''دیکھو سلطانہ! جو کچھ ہوا، وہ برا تھا لیکن جو کچھ تم اب کر رہی ہو یہ بہت ہی برا ہے۔ ایک طرف تم مجھے اپنا شوہر کہتی ہو، دوسری طرف تمہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ میں دوا لگانے کے لیے ہی تمہارے جسم کو ہاتھ لگاؤں۔ تم اس معصوم بچے کو بھی بھوکا مار رہی ہو جس کی خوراک اللہ نے تمہارے جسم کے اندر رکھی ہے۔ تم دنیا میں کوئی پہلی عورت نہیں ہو جس کے ساتھ اس طرح کا ظلم ہوا ہے۔ بے شک وہ تکلیف دہ حادثہ تھا لیکن ایسے حادثوں کے بعد بھی لوگ سنبھلتے ہیں۔ اپنے اندر ہمت پیدا کرتے ہیں اور نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں اب تک قصوروار نہیں سمجھا لیکن اگر تم اپنا رویہ نہیں بدلوگی تو میں ایسا سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

اس نے سر جھکا لیا اور سسکیاں لے کر روتی رہی۔ کتنا فرق تھا اس سلطانہ میں اور اس سلطانہ میں جو کل رات کھنڈر کے سامنے اچانک اپنی خاندانی تلوار سونت کر نکلی تھی اور ٹیلے پر چڑھ گئی تھی۔ اس نے وہ کیا تھا جو کوئی دوسرا نہیں کر سکا تھا۔ وہ واقعی انوکھی تھی۔

میں نے ذرا تحکم سے کہا۔ ''اپنا پاؤں باہر نکالو۔'' وہ ساکت بیٹھی رہی۔ ''میں نے کہا ہے، پاؤں باہر نکالو۔'' میں نے دوبارہ کہا۔

اس مرتبہ اس نے پاؤں سرکا کر کمبل سے باہر نکال دیا۔ میں نے اس کی وہ پٹی کھولی جو علی الصباح جنگل میں باندھی گئی تھی۔ اس کے پاؤں پر اوپر کی طرف زخم آیا تھا۔ غالباً دستی بم کا کوئی ٹکڑا لگا تھا یہاں۔ میں نے چوہان کی ہدایت کے مطابق زخم کو روئی سے صاف کر کے مرہم لگایا اور تازہ پٹی باندھ دی۔ اس کی پیشانی اور رخساروں پر بھی نیل موجود تھے۔ دوسرا زخم اس کی کہنی پر تھا۔ میں نے یہاں بھی دوا لگائی اور پٹی باندھی۔ اس دوران میں وہ مسلسل آنسو بہاتی رہی۔ میں نے کچھ عرصے پہلے جب اسے پہلی بار ایک نیم تاریک کھوہ میں دیکھا تھا تو وہ مجھے ایک نہایت مضبوط اور باہمت لڑکی نظر آئی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ شاید اس لڑکی کی آنکھ میں کبھی آنسو نہیں آیا ہوگا اور شاید اس نے کبھی آہ بھی نہ بھری ہوگی... اور آنے والے دنوں میں وہ واقعی ایسی ہی نکلی تھی۔ میں نے اسے کئی مشکلوں کا سامنا مردانہ وار کرتے دیکھا تھا لیکن یہ جو آخری آفت اس پر ٹوٹی تھی، اس نے اسے واقعی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے حصے میں آنے والے تمام آنسو انہی دو چار دنوں میں بہا دینا چاہتی ہے۔ کچھ احساسات پر انسان کا بس نہیں ہوتا، شاید سلطانہ بھی ایسے ہی احساسات کی زد میں تھی۔

میں اس کے قریب بیٹھا رہا اور اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اس حوالے سے اس پر اپنی احسان مندی ظاہر کی کہ وہ کل رات میرے لیے بہت نیک شگون ثابت ہوئی ہے... اور حقیقت بھی یہی تھی کہ کل رات کھنڈر کے سامنے ہونے والی خونی لڑائی میں سلطانہ کا انوکھا کردار پوری طرح کھل کر سامنے آیا تھا۔ وہ اگر اپنے بھتیجے طلال کے ہمراہ دیوانہ وار ٹیلے پر نہ پہنچتی اور جی بھر کر گولیاں چلانے والوں پر ٹوٹ نہ پڑتی تو شاید... صورتِ حال کیا سے کیا ہو جاتی... اور شاید میں بھی اس وقت یہاں اس آرام دہ کمرے میں زندہ سلامت موجود نہ ہوتا۔

وہ سب کچھ سنتی رہی لیکن یوں لگ رہا تھا کہ بس اس کے کان سن رہے ہیں۔ اس کا باقی سارا جسم میرے الفاظ کی نرمی، شیرینی اور محبت سے لاتعلق ہے۔ وہ بس میری فرماں برداری کر رہی تھی کہ میرے سامنے خاموش بیٹھی تھی۔ اسی دوران میں چھ سات ماہ کے بالو نے رونا شروع کر دیا۔ اس کا رونا بلند ہوتا گیا۔ اس کی آواز میں اتنا درد تھا کہ ترس آنے لگا۔ جواں سال عورت صفیہ اسے شاید دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی... وہ چند سیکنڈ کے لیے چپ ہوتا تھا پھر آہ و پکار شروع کر دیتا تھا۔

''یہ آواز سن کر تمہارا دل نہیں کانپتا سلطانہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے اچ تو تمہاری منت کرتی ہوں کہ اسے مجھ سے کہیں دور لے جاؤ۔ جن بچوں کی مائیں ان کے جنم کے وخت اچ مر جاتی ہیں، وہ بھی تو جندہ رہتے ہیں اور پل جاتے ہیں۔ یہ تو پھر چھ سات ماہ کا ہے۔''

''تم اتنی پتھر کیوں ہو گئی ہو سلطانہ! میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔''

''میں کیا کروں مہروج! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے اپنے جسم سے گھن آتی ہے۔ میں اس قابل ناہیں ہوں مہروج کہ اپنے بچے کو اپنی گود میں لے کر پیار کروں۔''

''تم ہو... تم ہو اس قابل۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''اور تمہیں ایسا کرنا پڑے گا... اگر نہیں کرو گی تو اس کا مطلب ہے کہ تم میری بیوی نہیں ہو اور نہ میں تمہارا شوہر ہوں۔''

میرے لب و لہجے نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ اس نے پہلی بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے عقب میں سرخ انگارہ تھیں۔

میں تیزی سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے میں جا کر بالو کو لے آیا۔ اس کا رونا تو بند ہو چکا تھا لیکن ننھا سا سینہ مسلسل ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔

میں نے اسے زبردستی سلطانہ کی گود میں ڈال دیا۔ ایک لمحے کے لیے تو لگا کہ وہ اٹھ کر بھاگ جانے کی لیکن پھر اس نے پتا نہیں کس طرح ضبط کیا۔ میری نافرمانی کے خوف سے اس نے اسے بانہوں میں لے لیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا سارا وجود لرز رہا ہے۔ اس کے اناروں جیسے رخسار زرد ہو چکے تھے۔ ہونٹ سفید تھے اور جسم کی لرزش کچھ اس طرح تھی جیسے اسے تپ لرزہ ہو گیا ہو۔

بالو اس کی گود میں آتے ہی پُرسکون ہو گیا تھا۔ وہ اپنی گول گول پیاری آنکھوں سے اسے دیکھتا پایا گیا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ماں کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔ جیسے کہہ رہا ہو... مجھ سے دور کیوں ہو گئی ہو؟ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بالو کو دودھ پلائے لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کر سکے گی یا نہیں۔ میں اس پر ایک دم زیادہ دباؤ بھی ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں اور بچے کو ایک ساتھ چھوڑ کر میں باہر آ گیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو بالو ایک بار پھر زور و شور سے رو رہا تھا۔ اس وقت اس کے رونے میں ایک طرح کا درد بھی لہریں لے رہا تھا۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر اٹھ کر سلطانہ کے کمرے کی طرف گیا۔ بالو اور سلطانہ دونوں بستر پر موجود نہیں تھے۔ جواں سال ملازمہ صفیہ کمرے کے وسط میں پریشان کھڑی تھی۔

بالو کے رونے کی آواز غسل خانے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں غسل خانے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ بند تھا لیکن کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سلطانہ بالو کو نیم گرم پانی سے نہلا رہی تھی۔ وہ بالکل عریاں تھا اور اس کا سارا جسم سرخ ہو رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سلطانہ ایک پتھر سے جسے جھانواں بھی کہا جاتا ہے، بالو کے نازک جسم کو رگڑ رہی تھی۔ وہ درد سے بلبلا رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' میں گرجا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے بالو کو اس کے صابن لگے ہاتھوں سے چھین لیا۔ وہ بیٹھ گئی اور دیوار سے سر لگا کر پھر رونے لگی۔

اس نے بالو کو اتنے زور سے رگڑا تھا کہ کئی جگہ خراشیں آ گئی تھیں۔ ''تم اپنے ہوش میں تو ہو... یہ کیا کیا ہے تم نے؟''

''مہروج! تم نے بہت غلط کیا۔ اس کو میری گود میں ڈال دیا... تم کیوں اسے بھی میری طرح گلیج کر دینا چاہتے ہو؟''

میں نے سلطانہ کو چند جھڑکیاں دیں اور بالو کو تولیے میں لپیٹ کر کمرے میں لے آیا۔ سلطانہ نے غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ملازمہ صفیہ نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر

اس نے نہیں کھولا۔ پہلے تو مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کچھ کر ہی نہ بیٹھے مگر پھر پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی نہا رہی ہے۔

ملازمہ صفیہ نے بچے کو اپنا دودھ پلایا اور میں نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ میری نگاہ بار بار اس کے معصوم چہرے پر ٹک جاتی تھی اور میں سوچنے لگتا تھا کہ کیا یہ واقعی میرا بچہ ہے... میرا خون؟

سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے کوئی خاص لگاوٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ جس طرح معصوم بچے نگاہوں کو پیارے لگتے ہیں، یہ بھی مجھے پیارا لگتا تھا۔ بس... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

سلطانہ کا غسل طویل ہوتا جا رہا تھا۔ شاید وہ خود بھی کھرچ کھرچ کر نہا رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ صفیہ کے آوازیں دینے پر ہی باہر نکلی۔ اس نے اپنا منہ سر اوڑھنی میں لپیٹ رکھا تھا۔ گیلے بال کمر پر جھول رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھے بغیر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ جب وہ کمبل اوڑھ رہی تھی، میں نے اس کے دونوں ہاتھ دیکھے۔ اس نے اپنے بدن کے ساتھ بھی بالو والی سختی روا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ اور بازو جھانوے کی رگڑوں سے سرخ ہو رہے تھے۔ یقیناً یہی صورتِ حال اس کے پورے جسم کی رہی ہوگی۔ میرے ذہن میں پھر چنگاریاں سی بھر گئیں۔ جارج گورا کی منحوس صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ پتا نہیں اس رات اس خبیث نے سلطانہ کے جسم اور روح پر کتنے زخم لگائے تھے۔ یقیناً یہ اس رات کی تلخ یادیں ہی تھیں جنہوں نے اسے نیم دیوانہ کیا ہوا تھا۔

وہ لیٹ گئی تو میں نے بالو کو پھر اس کے پہلو میں لٹا دیا۔ اس مرتبہ اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ بس کسمسا کر رہ گئی۔ میں نے دونوں ماں بیٹے پر کمبل اچھی طرح ڈال دیا۔ سلطانہ کے پاؤں کی پٹی بھیگ کر اتر چکی تھی۔ میں نے سلطانہ کے منع کرنے کے باوجود تازہ پٹی باندھی اور کہنی کی پٹی بھی بدل دی۔

اب صبح ہونے والی تھی۔ میں بستر پر چت لیٹا رہا اور سلطانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے رویّے میں تھوڑی سی نرمی دکھائی دے رہی تھی۔ اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ اگلے دو چار دن میں وہ خود کو مزید سنبھال لے۔ تاہم ڈاکٹر چوہان نے کہا تھا کہ سلطانہ کو مکمل طور پر نارمل کرنے کے لیے مجھے بہت تعاون کرنا ہوگا۔

ہماری میزبانی میں یہاں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جا رہی تھی۔ بہترین رہائش اور کھانا مہیا کیا جا رہا تھا۔ شام کو میری ملاقات اپنے سابقہ میزبان چاچا عبدالغنی سے بھی ہوئی۔ ان سے اسٹیٹ کے ہنگامہ خیز حالات کے بارے میں کچھ مزید معلومات ملیں۔ کئی جگہ تل پانی اور زرگاں کے سپاہیوں میں جھڑپیں ہوئی تھیں اور اب کسی بڑی لڑائی کی توقع کی جا رہی تھی۔ عبدالغنی نے یہ بھی بتایا کہ زرگاں میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے لوگوں کو موقع ملتا ہے، وہ زرگاں کو اور حکم جی کو چھوڑ کر تل پانی کی طرف آ جاتے ہیں۔

عبدالغنی صاحب سلطانہ کے بارے میں بھی بہت پریشان تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''وہ ایک خوددار اور غیور خاندان سے ہے۔ جارج گورا اس کی انا اور پندار کا دشمن تھا۔ آخرکار وہ اس کو رسوا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس واقعے (واقعہ) نے سلطانہ کے دل پر ایک بہت گہرا گھاؤ لگایا ہے۔ مجھے ناہیں لگتا کہ یہ گھاؤ کبھی بھر سکیں گا۔''

میں سلطانہ کے والد اور بھائی سے ملنا چاہتا تھا۔ ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح اس کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ ان دونوں سے تو فوری طور پر ملاقات نہیں ہو سکی تاہم رات کے کھانے کے فوراً بعد حجام عبدالرحیم ملنے کے لیے آ گیا۔ یاریا کے بدلے کل سات افراد کو جارج کی جیل سے رہائی ملی تھی۔ ان سات میں سے صرف دو افراد جان بچا کر تل پانی پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے اور عبدالرحیم ان دو خوش قسمتوں میں سے ایک تھا۔

چوہان نے عبدالرحیم کو وہ سب بتا دیا تھا جو میری یادداشت کے ساتھ ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں، میں پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں فراموش کر چکا تھا۔ عبدالرحیم کو اس کے باوجود یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بار بار پوچھتا تھا... کیا میں یہ بات بھی بھولا ہوا ہوں؟ کیا مجھے یہ واقعہ بھی یاد نہیں ہے؟ وہ مجھے میرے پرانے نام ''مہروز'' سے ہی مخاطب کرتا تھا۔

وہ کہنے لگا۔ ''مہروز بھائی! وہ دن مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ آپ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ سلطانہ بی بی بہت خوش نظر آوت تھی۔ وہ ہر وقت سائے کی طرح تمہارے ساتھ لگی رہت تھی۔ اسے ڈر رہت تھا کہ تم کہیں گم نہ ہو جاؤ... یا پھر جارج گورا صاحب کے کارندوں میں سے کوئی تم کو نقصان نہ پہنچا دے۔ تم بولتے بھی تو بہت کم تھے۔ ہر وقت بس کھوئے کھوئے رہت تھے۔ یوں لگت تھا کہ ہر بات ان سنی کر دیتے ہو۔ ایک دن سلطانہ بڑی گھبرائی ہوئی میری دکان میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ رحیم بھائی! آپ نے مہروز کو تو ناہیں دیکھا؟ میں نے انکار میں جواب دیا۔ وہ اور بھی گھبرا گئی۔ بالکل جیسے تم کوئی چھوٹے سے بچے ہو اور

اس سے اپنی انگلی چھڑا کر بھاگ گئے ہو۔ وہ اس روز دیوانوں کی طرح تم کو ڈھونڈتی رہی۔ میں، طلال، ہاشم اور مختار صاحب بھی اس کے ساتھ شامل تھے۔ آخر تم دوپہر کے وقت ایک باغ سے ملے۔ تمہاری جھولی میں گیندے اور موتیے کے بہت سارے پھول تھے۔ تم نے یہ پھول سلطانہ کو دیے اور محبت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سلطانہ تمہیں دیکھ کر رونے لگت تھی۔ بعد میں پتا ہے اس نے کیا کیا تھا؟''

''کیا کیا تھا؟''

''اس نے ان سارے پھولوں کو دھاگے میں پرو دیا تھا۔ اس کے گجرے، بُندے اور ہار وغیرہ بنائے تھے اور بڑے چاؤ سے یہ زیور پہنا تھا۔ اس نے کبھی کوئی زیور ناہیں پہنا۔ وہ پہلا زیور تھا جو اس نے تمہاری وجہ سے پہنا... اور بعد میں بھی وہ کبھی کبھی گیندے اور موتیے کا زیور پہنتی رہی۔''

مجھے یاد آیا کہ جب میں سلطانہ سے پہلی بار نیم تاریک کھوہ میں ملا تھا، تب بھی مجھے اس کے بالوں کے جوڑے میں موتیے اور گیندے کے پھول نظر آئے تھے۔

عبدالرحیم جذباتی انداز میں اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ وہ تمہیں پوجنے کی حد تک پیار کرنے لگت تھی۔ اس کو تمہارے علاوہ جیسے کوئی کام ہی ناہیں تھا۔ تمہارے آرام کا خیال رکھنا، تمہیں وقت پر دوا دینا بلکہ تمہیں نہلانا دھلانا تک اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جو کچھ تمہیں پسند ہووت تھا وہ خود بھی آنکھیں بند کر کے اسے پسند کرنے لگت تھی۔ لوگن کہوت ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد عورت کا پریم دو خانوں میں بٹ جاوت ہے۔ لیکن ہم سب جانت ہیں کہ کم از کم سلطانہ بی بی کے معاملے میں تو ایسا ناہیں ہوا۔ ایسا لگت تھا اور اب بھی لگت ہے کہ اس کا جینا مرنا صرف اور صرف تمہارے لیے ہے...''

عبدالرحیم باتیں کر رہا تھا مگر میں ابھی تک گیندے اور موتیے کے پھولوں میں کھویا ہوا تھا۔ مجھے کچھ بہت پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ لاہور یاد آ رہا تھا، باغِ جناح یاد آ رہا تھا اور ثروت یاد آ رہی تھی۔ گیندے اور موتیے کے پھول تو ثروت کو بھی پسند تھے۔ وہ ان کی مشترکہ خوشبو سے مدہوش ہو جایا کرتی تھی۔ یہ دونوں پھول اس پر علیحدہ علیحدہ تو کچھ خاص اثر نہیں کرتے تھے لیکن ان کی ''اشتراکی'' باس اس کے دل کی گہرائی میں اتر جاتی تھی۔ میں اس کے لیے جب بھی پھول لیتا تھا، وہ یہی دونوں ہوتے تھے... تو کیا میں دو ڈھائی سال کے عالمِ بے خبری میں بھی کچھ ایسے کام کرتا رہا ہوں جن کا تعلق ثروت اور اس کی محبت سے تھا؟

رات بھیگ رہی تھی۔ عبدالرحیم واپس اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ تل پانی کی گلیوں میں گاہے بگاہے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں آتی تھیں اور کچھ ایسے نعرے گونجتے تھے جن پر جنگی للکاروں کا گمان ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ اسٹیٹ کی موجودہ کشیدہ صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ میں جیکی سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ بے شک یہاں پہنچتے ہی اسے وافر مقدار میں شراب مل گئی تھی اور اس حوالے سے وہ میرا محتاج نہیں رہا تھا... پھر بھی ہم دونوں کے درمیان ایک تعلق سا پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے جانے سے پہلے سلطانہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ حسبِ معمول منہ سر لپیٹے لیٹی ہوئی تھی، تاہم یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ بالو اس کے پہلو میں تھا۔ میں باروندا جیکی کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا محلِ وقوع مجھے ڈاکٹر چوہان نے بتا دیا تھا۔ وہ دیوان خانے کے اندر ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ میں ایک باغیچے کی روش پر سے گزرا۔ یہاں چاندنی رات میں فواروں کا پانی چمک رہا تھا اور مصنوعی جھرنوں کی قلقل تھی۔ پھولوں کے تختوں کے آس پاس پتھریلی کرسیوں پر خوش لباس مرد و زن بیٹھے تھے۔ تاہم ہر چہرے پر سنجیدگی نظر آتی تھی۔ ایک دم میں چونکا۔ مجھے موتیے کی مسحور کن مہک محسوس ہوئی۔ میں نے ایک کیاری میں سے کچھ پھول توڑ لیے۔ ایک باوردی ملازم نے ادب سے پوچھا۔ ''میں جناب کی کچھ خدمت کر سکت ہوں؟''

''یہاں کہیں گیندے کے پھول بھی ہوں گے؟''

''یہاں تو ناہیں سرکار۔ ساتھ والی بڑی باغیچی میں ہوں گے۔ میں ابھی لا دیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ دو منٹ بعد وہ ایک گول طشت میں تازہ پھول لے آیا۔ میں نے اس طشت میں موتیے کے پھول بھی رکھے اور واپس جا کر خاموشی سے انہیں سلطانہ کے سرہانے رکھ دیا۔ وہ بے حرکت لیٹی رہی۔ تاہم چند سیکنڈ بعد اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے مڑ کر پھولوں کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوئی لیکن پھر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ تب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ گڑبڑا گئی اور اضطراری انداز میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں اور بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔

''نہیں... نہیں... تم لیٹی رہو۔ میں ویسے ہی آ گیا تھا۔'' میں نے کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ مجھے چلنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو رہی تھی۔ ران کے زخم میں غالباً ٹھنڈ کی وجہ سے درد

ہو رہا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد میں باروندا جیکی کے روبرو اس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ جیکی بدستور اپنے تدرتی لنگوٹ میں تھا۔ حالانکہ میزبانوں نے اس کے پاس ہی ایک صاف ستھرا لباس بھی رکھ دیا تھا۔ رات کا جو شان دار کھانا اسے پہنچایا گیا تھا، وہ بھی تقریباً جوں کا توں ایک طرف رکھا تھا۔ اس میں سے غالباً دو چار کباب لیے گئے تھے۔ جیکی شراب کی بوتلوں کے درمیان یوں بیٹھا تھا جیسے راجا اِندر حسین و جمیل عورتوں کے درمیان بیٹھتا ہوگا۔

مجھے دیکھ کر ایک دم اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”تو آخر تم آگئے؟“ وہ شستہ انگریزی میں گویا ہوا۔

”مجھے تو کل ہی آجانا چاہیے تھا مگر پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کو کہاں ٹھہرایا گیا ہے۔“

”یہ لوگ مجھے یوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں چڑیا گھر میں بند کوئی جانور ہوں... چھوٹے سرکار کے افسروں نے سوال پوچھ پوچھ کر میرا دماغ پلپلا کر دیا ہے... تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ تم نے کتنے دن جارج کی بہن کو شکھشا دی تھی؟ تمہیں کیسے غائب کیا گیا؟ تم کیسے رہا ہوئے؟ وغیرہ وغیرہ۔“ بات کرتے کرتے وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”کوئی دوا وغیرہ بھی دی گئی ہے آپ کو یا نہیں؟“

وہ بولا۔ ”دوا کیا یہاں تو معالجوں کی پوری ٹیم آئی تھی۔ وہ میرا علاج کرنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے پھر سے بھلا چنگا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاید انہیں پتا نہیں کہ مرض الموت کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دوا مجھے تھوڑا بہت افاقہ دے سکتی ہے تو وہ یہی ہے۔“ اس نے شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ”یہ دوا نہیں زہر ہے اور اسی نے آپ جناب کو اس حال تک پہنچایا ہے... اور دوسری بات میری سمجھ میں یہ نہیں آتی کہ آپ ہر وقت مرنے کی بات کیوں کرتے ہو؟ آپ زندگی کی بات کیوں نہیں کرتے؟ آپ اپنے اندر جینے کی خواہش پیدا کر لو گے تو پھر حالات بھی بدلنا شروع ہو جائیں گے۔ حالات بدل سکتے ہیں۔“

اس نے ایک بار پھر سنی ان سنی کر دی جیسے میری بات اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہ ہو۔ اس نے آتشیں سیال کا ایک طویل گھونٹ لیا اور اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ تب میری نظر پہلی بار ایک ہیڈ بیگ پر پڑی۔ یہ ہیڈ بیگ اس آرام دہ کمرے کے ایک گوشے میں جھول رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں حیران رہ گیا۔

”ہیڈ بیگ کو تم ہیڈ بیگ ہی کہو گے۔ پیراشوٹ یا نیکی کا پیڑ تو نہیں کہو گے۔“

”لیکن یہ یہاں کیسے آیا؟“

”میں نے منگوایا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ تم آج نہیں تو کل ضرور آؤ گے اور ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔“

میں تعجب سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والا معما تھا۔

یوں لگتا تھا کہ جس طرح میرے اندر یہ طلب پیدا ہو چکی ہے کہ میں جیکی سے زیادہ سے زیادہ سیکھوں، اس میں بھی یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ وہ تھوڑے سے وقت میں مجھے بہت کچھ سکھا دے۔

میں نے کہا۔ ”کیا آپ میرا انتظار کر رہے تھے؟“

”بالکل... ادھورے کام سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کام میں نے اور تم نے شروع کیا ہے وہ پورا ہو۔“

”میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کا شاگرد کہلاؤں۔ کیا آپ ایسا سمجھتے ہو؟“

”سچی بات یہ ہے کہ میں بھی ایسا نہیں سمجھتا... لیکن تمہارے اندر ایک تڑپ ضرور ہے اور اسی تڑپ نے مجھے آمادہ کیا ہے۔ تمہاری یہ تڑپ آنے والے دنوں میں تمہارے بہت کام آسکتی ہے۔ اس کو اپنے اندر مرنے نہ دینا۔“

”آپ کس تڑپ کی بات کر رہے ہو؟ میری سب سے بڑی تڑپ تو یہی ہے کہ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔“

”میں اسی کی بات کر رہا ہوں لیکن اس تڑپ کے پیچھے بھی تو کوئی وجہ ہے۔ وہی لڑکی جو تمہارے قریب آتے آتے تم سے بہت دور چلی گئی ہے۔ جس کو تم کھو چکے ہو لیکن بھولے نہیں ہو۔ شاید کبھی بھول بھی نہیں سکو گے۔“

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ ثروت اپنی تمام تر محبوبیت کے ساتھ میرے تصور میں آگئی۔ میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں... یہ تو ہے لیکن... ڈھائی برس بیت چکے ہیں کہ اس کا کچھ پتا نہیں۔ اپنے آخری خط میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں جرمنی میں ایک یوسف نامی لڑکے سے اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے... اب تک تو شاید... اب تک تو شاید...“

میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک گولا سا میرے گلے میں اٹک گیا۔ ثروت کے لیے اس طرح کی بات سوچنا بھی میرے لیے مشکل تھا۔

”میں تمہارے احساس کو سمجھتا ہوں۔ ان مرحلوں سے میں بھی گزرا ہوں۔ میری اور تمہاری کہانی میں فرق یہ ہے کہ... تمہاری کہانی میں، کنول جھیل میں گزرے ہوئے وہ سات دن نہیں ہیں۔ ہاں... وہ سات دن جن پر سات زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔“

”لیکن میں نے...“

”اچھا، یہ باتیں چھوڑو۔“ اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ”اس وقت میں بہت سرور میں ہوں پھر یہ سرور غنودگی میں بدلنے لگے گا۔“

وہ میرا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے لے کر ہیڈ بیگ کی طرف بڑھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ریت سے بھرا ہوا تھیلا ہمارے درمیان تھا۔ بلب کی روشنی میں شفاف دیوار پر اس سارے منظر کا سایہ بن رہا تھا۔ اس ”دیوان“ نامی پوری عمارت میں جنریٹرز کی برقی روشنی موجود تھی۔

”درد کیا ہے؟“ جیکی نے مسرور آواز میں کہا۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے... یہاں۔“ اس نے انگلی سے اپنے سر کو ٹھوکا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے الفاظ کو دہراؤ۔ پوری توجہ اور پورے یقین کے ساتھ۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ”درد ایک احساس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ احساس چوٹ کی جگہ پر نہیں ہوتا۔ یہ دماغ میں ہوتا ہے۔“

وہ آنکھیں بند کیے بولا۔ ”درد کے ساتھ اندیشے اور واہمے شامل کر لیے جائیں تو درد بڑھ جاتا ہے... خالص درد کی حیثیت زیادہ نہیں ہوتی اور اگر خالص درد کی گہرائی میں ڈوب کر اس کی اصلیت محسوس کی جائے تو یہ اور بھی کم ہونے لگتا ہے۔“

”جی۔“ میں نے کہا۔

”صرف ”جی“ نہیں۔ ان الفاظ کو دہراؤ۔ میری طرح آنکھیں بند کر لو۔“ اس نے حکم دیا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے الفاظ دہرائے۔ وہ جب اس انداز میں سکھاتا تھا تو عجیب موڈ میں آجاتا تھا۔ وہ ایک باکسر فائٹر سے زیادہ ایک سائیکاٹرسٹ دکھائی دینے لگتا تھا۔

اس روز باروندا جیکی نے مجھے ہیڈ بیگ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سخت مشق کرائی۔ اتنی مشق جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی کھال چھل گئی۔ خون رسنے لگا اور قطرے سنگِ مرمر کے فرش پر گرنے لگے۔ میں ذرا سست

سگریٹ کا دھواں
تین سو اجزا کا مجموعہ

سگریٹ دیکھنے میں چھوٹی، نازک اور دلکش ہوتی ہے مگر جب سائنس دانوں نے اس کی چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس کے دھوئیں میں تین سو اجزا شامل ہیں۔ یہ اجزا مختلف گیسوں اور رقیق مادوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو پھیپھڑوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوتے ہیں۔ یہ گیسیں چھوٹے چھوٹے قطرات سے مل کر بنتی ہیں جو انچ کے چالیس لاکھویں حصے کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ قطرات پھیپھڑوں کی دیواروں کی جھلی اور گلے کی نالیوں پر جم جاتے ہیں اور ان کے لیے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ تمباکو میں بعض نشہ آور گیسیں بھی ہوتی ہیں، یہی سگریٹ نوشی کو عادت بنانے کا باعث ہوتی ہیں۔

کراچی سے امتیاز احمد کی گل پاشیاں

پڑتا تو وہ مجھے جھڑکتا اور بیساکھی سے میرے سر یا پیٹھ پر ضرب لگاتا۔ وہ جنونی موڈ میں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کا جنون برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ جنون جیسے میرے جنون سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ یہ ایک تند و تیز لہر کی طرح مجھے اپنے ساتھ بہائے لیے چلا جا رہا تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تکلیف میرے لیے مزہ بنتی جا رہی تھی... نشہ بنتی جا رہی تھی۔ میں جیکی کی ہدایات پر عمل کرتا رہا، یہاں تک کہ بالکل بے جان ہو کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔

اگلی صبح سلطانہ کے بھائی اور والد سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ صبح سویرے سلطانہ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ اس وقت میں سو رہا تھا۔ میں جاگا تو وہ جانے کے لیے تیار تھے لیکن جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ہماری ملاقات میرے کمرے میں ہوئی۔ سلطانہ کے والد مختار راجپوت کی عمر پچپن ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ کسی وقت وہ خاصے صحت مند رہے ہوں گے لیکن اب جیسے زندگی کے بوجھ نے انہیں نڈھال سا کر رکھا تھا۔ سلطانہ کا بھائی کافی کمزور تھا۔ جواں سالی میں ہی اس کے ہاتھ میں بیساکھی آگئی تھی۔ کمر کی تکلیف کے سبب وہ بہ مشکل چلتا پھرتا تھا۔

سلطانہ کے والد نے میرے سر پر پیار دیا۔ پھر دونوں نے مجھ سے معانقہ کیا اور اسی گرم جوشی سے ملے جس سے کسی قریبی عزیز کو ملا جاتا ہے... جبکہ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ میں

انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

مختار صاحب نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''مہروج! مجھے پورا یکھین (یقین) ہے۔ اگر کوئی سلطانہ کو پھر سے سلطانہ بنا سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ وہ تمہاری بڑی سے بڑی بات مان سکتی ہے...اور مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ کچھ مان بھی رہی ہے۔ اب وہ پہلے سے کچھ اچھی نجر آرہی ہے۔ خدا کے بعد اب تم اِج ہمارا سہارا ہو مہروج!''

''میں اپنی کوشش کر رہا ہوں۔''

''لیکن...لیکن تم الگ کمرے میں کیوں سو رہے ہو؟ تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اسے تمہاری جرورت ہے مہروج...بہت جیادہ جرورت ہے۔''

میں اب اس بات کا کیا جواب دیتا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں اس کا شوہر ہونے کے باوجود شوہر نہیں ہوں۔ میں نے اسے اپنے ہوش و حواس میں قبول نہیں کیا اور نہ ہی اپنی مرضی سے اس کے ساتھ کوئی ازدواجی تعلق رکھا ہے۔ وہ جو کچھ تھا، ایک عالمِ بے خبری کا ورانیہ تھا۔

دونوں باپ بیٹا بہت دکھی تھے۔ میں اس موقع پر کوئی ایسی ویسی بات کر کے انہیں مزید دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکے نبیل نے میرے ہاتھوں کی چھلی ہوئی کھال دیکھی اور بے تکلفی سے بولا۔ ''مہروج بھائی! یہ کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں، گر گیا تھا۔'' میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''آپ...آپ بہت بدلے ہوئے نظر آتے ہیں مہروج بھائی! چاچا غنی بتا رہے تھے کہ آپ پچھلے دو ڈھائی سال کی باتیں بھول چکے ہیں۔ یکھین نہیں آتا۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟''

مجھے ایسی باتوں سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ میرے چہرے پر الجھن دیکھ کر ہی شاید مختار صاحب نے جلدی سے مداخلت کی اور بولے۔ ''کوئی بات ناہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائیں گا۔ بس تم سے ایک ہی درخواست کرنی ہے...بلکہ ہاتھ جوڑ کر کرنی ہے۔'' انہوں نے واقعی میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''تم سلطانہ کا خیال رکھنا۔ اسے تمہاری بہت سخت جرورت ہے۔''

ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا کہ سلطانہ کو میری ضرورت ہے اور میں خود بھی یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے سنبھالنے میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہوں...لیکن میں کیا کرتا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا میں ایک شوہر کی طرح اس کے قریب جا سکتا تھا؟ اسے پیار دے سکتا تھا؟

جب میں اس طرح سوچتا تھا تو ایک دم شروت ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے آ جاتی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہتی تھی۔ ''بس تابی! اتنی ہی طاقت تھی میرے پیار میں؟ یہی تھا ہمارا اٹوٹ بندھن؟ یہی تھا تمہارا ختم نہ ہونے والا انتظار؟''

میں ایک دوراہے پر تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ میں جسمانی طور پر سلطانہ کے قریب جائے بغیر بھی تو اسے سہارا دے سکتا تھا۔ جسمانی قربت تو میاں بیوی کی محبت کا آخری درجہ ہوتی ہے۔ اس سے پہلے بھی تو کئی مدارج ہوتے ہیں۔ محبت سے بات چیت کرنا، اکٹھے کھانا پینا، دکھ سکھ بانٹنا۔

اس شام میں پھر سلطانہ کے لیے باغیچے سے گیندے اور موتیے کے تازہ پھول لے کر آیا...میں نے ایک باوردی باغبان سے کہا اور اس نے وہیں پر مجھے ایک گجرا بنا دیا۔ میں سلطانہ کے پاس واپس آ رہا تھا جب میری ملاقات اسحاق اور عبدالرحیم سے ہوگئی۔ اسحاق ہمیشہ کی طرح بہت سنجیدہ بلکہ مشتعل نظر آتا تھا۔ اس کے اشتعال کی وجہ ماریا فرگوسن ہی تھی۔ اس نے غم زدہ لہجے میں مجھے بتایا۔ ''وہ حرام زادی بچ گئی ہے۔ تمہاری چلائی ہوئی گولی سے اس کی پنڈلی پر معمولی زخم آیا تھا۔ ابھی زرگاں سے آنے والے ایک بندے نے بتایا ہے کہ جارج گورا نے ماریا کے باڈی گارڈ کو گولی سے اڑا دیا ہے۔ یہ باڈی گارڈ اس گھر میں موجود تھا جہاں سے ہم نے ماریا کو اٹھایا تھا۔''

''زرگاں کی عام صورتِ حال کیا ہے؟'' میں نے اسحاق سے پوچھا۔

''دھکم اور جارج گورا غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔ تمہیں پتا چلا ہی ہووے گا کہ دھکم نے بیس بے گناہ لوگن کو سرِ عام سولی پر چڑھایا ہے۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے جارج کی وہ خبیث بہن خود بھی موقع پر موجود تھی۔ جارج نے سب لوگن کے سامنے اپنی بہن سے وعدہ کیا ہے کہ اس کی ایک انگلی کے بدلے جب تک وہ انگلی کاٹنے والوں کے سر نا ہیں کاٹے گا، چین سے ناہیں بیٹھے گا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا کوئی بڑی لڑائی ہوگی؟''

''ضرور ہوگی۔'' اسحاق نے یقین سے کہا۔ ''دونوں بھائی اب کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے ہیں۔ پتا چلا ہے کہ زرگاں میں عام لوگن کو بھی اسلحہ دے کر لڑنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ چھوٹے سرکار نے آج دوپہر کو اعلان کیا ہے کہ اگر ہم پر حملہ ہوا تو پوری طاقت سے جواب دیویں گے۔ مراد شاہ صاحب نے بھی کہا ہے کہ جن لوگن کو ہم نے پناہ دی ہے، ان کی حفاظت جان پر کھیل کر بھی کی جاوے گی۔''

گھڑ سوار سپاہیوں کا ایک بڑا دستہ دیوان خانے کے سامنے سے گزرا۔ ان کے علم بیرونی دیوار کے اوپر سے دکھائی دیے۔

میں نے اسحاق سے کہا کہ وہ ذرا جا کر باروندا جیکی کی خبر لے لے۔ میں ابھی کچھ دیر میں اس کے پاس آؤں گا۔

عبدالرحیم نے کہا۔ ''وہ سہ پہر کے وقت بہت شور مچاوت تھا۔ اسے پھر اپنی کشتی میں واپس جانے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ بلند آواز میں چلا رہا تھا...پھر چلاتے چلاتے ہی سو گیا۔''

''میں نے تو ایک اور بات سنی ہے۔'' اسحاق نے قدرے مدھم آواز میں کہا۔

''کیا؟''

''زرگاں سے بھاگ کر یہاں آنے والے لوگن میں راج بھون کی کچھ کنیزیں بھی شامل ہیں اور ان میں اشوک ساہنی کی بیٹی بھی ہے۔''

''کون اشوک ساہنی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی شکنتلا کا پتا...مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں پہنچنے والی عورتوں میں شکنتلا بھی ہے۔''

میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ شکنتلا کے بارے میں، میں نے جیکی سے اتنا کچھ سنا تھا کہ اسے دیکھے بغیر بھی میں اسے جاننے پہچاننے لگا تھا۔

''کیا...تم یقین سے...کہہ سکتے ہو کہ ان میں شکنتلا بھی ہے؟''

''پورے یقین سے تو ناہیں...لیکن سنا یہی ہے۔''

میں نے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ ''ایک کام کرو اسحاق...پتا کرو کہ واقعی ایسا ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ یہاں آ گئی ہے؟''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہ ہو لیکن میں جاننا چاہتا ہوں۔''

اسحاق نے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کرے گا۔

جیکی کی ساری کہانی اور اس کی ساری ذہنی کیفیت مجھے معلوم تھی۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اب شکنتلا سے اس کی ملاقات دوبارہ ہوگی...لیکن اگر وہ واقعی یہاں آ گئی تھی تو پھر ایسا ہو بھی سکتا تھا...اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ باروندا جیکی کے لیے انتہائی سنسنی خیز واقعہ ہوتا۔ شکنتلا اور جیکی کے بارے میں سوچتا ہوا میں واپس اپنی آرام دہ قیام گاہ میں پہنچ گیا۔

سلطانہ پھر غسل خانے میں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ روزانہ نہا رہی تھی اور اس کا غسل طویل تر ہوتا تھا۔ آج بھی اس نے باہر آنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور بازو پتھر کی رگڑ سے سرخ نظر آ رہے تھے۔

بالو رو رہا تھا۔ سلطانہ نے اسے گود میں تو نہیں اٹھایا تاہم اتنی مہربانی کی کہ اسے دیکھنے لگی۔

''دودھ پلایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے مزید تفصیل نہیں پوچھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ میری معلومات کے مطابق اس نے دودھ نہیں پلایا تھا۔ وہ ابھی صفیہ کا دودھ ہی پی رہا تھا۔ میں ابھی اس صورتِ حال کو نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔

''ہاتھ آگے کرو سلطانہ۔'' میں نے کہا۔

وہ ہاتھ کو بس تھوڑی سی حرکت دے کر رہ گئی۔

میں نے اس کا بھیگا ہوا سرخ ہاتھ پکڑا اور گجرا اس کی کلائی میں باندھ دیا۔ اس کا جسم پھر لرزنے شروع ہو گیا۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہوتی تھی یہ۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے سر پر لاد دیا گیا ہو...اور اس بوجھ کے ساتھ اسے اونچے نیچے راستے پر چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ اس کی ''سوچ کی کمر'' کانپ رہی ہو، بل کھا رہی ہو۔

''کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے اثبات میں سر ہلانے سے اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو گرے مگر ان آنسوؤں کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی بھوری چٹان کی سی سختی اور خاموشی تھی۔ اس سختی اور خاموشی کے پیچھے کیا پوشیدہ تھا، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے باتیں کرتا رہا۔ بالو بھی اٹھ گیا اور اس کی گود میں بیٹھ کر ہمکنے لگا۔ سلطانہ کا چہرہ زرد ہونے لگا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کہیں اسے دھکیل کر پیچھے نہ ہٹا دے۔ میں نے بالو کو اپنی گود میں لے لیا۔

سامنے ایک منقش پلیٹ میں پھل رکھے تھے۔ چھری بھی پڑی تھی۔ میں نے سلطانہ سے کہا۔ ''ایک سیب کاٹو۔''

وہ شدید تذبذب میں نظر آئی لیکن جب میں نے دوبارہ کہا تو وہ لرزاں ہاتھوں سے سیب چھیلنے لگی۔ ایک دم تیز دھار چھری اس کی انگلی میں لگ گئی۔ خون بہنے لگا۔ میں نے اس کی انگلی کو اپنے انگوٹھے سے دبا دیا۔ خون کا اخراج ذرا کم ہوا تو میں نے پٹی باندھ دی۔

''مہروج! مجھ کو معاف کرنا۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

رات کو میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک پھر باروندا جیکی کے پاس رہا۔ ہم نے مارشل آرٹ پر بہت سی باتیں کیں اور عملی مشق بھی کی۔ میرے کل کے زخموں کی وجہ سے جیکی نے آج مجھ پر زیادہ سختی نہیں کی تھی۔ وہ ایسے ہی کرتا تھا۔ اگر ایک دن بہت سخت مشق ہو جاتی تھی تو اگلے روز ہاتھ تھوڑا سا ہلکا رکھتا تھا۔ آج وہ اپنی کشتی کے بارے میں واقعی بہت دکھی نظر آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے، آج کشتی بہت یاد آرہی ہے؟''

''ہاں، جب کسی چیز کے دوبارہ ملنے کی امید کم ہونے لگتی ہے تو پھر اس کی یاد زیادہ کھور ہونے لگتی ہے۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہو جیکی؟''

''زرگاں اور نل پانی میں ٹھن گئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب میں پھر زرگاں کی طرف جا سکوں گا اور کشتی تک پہنچ سکوں گا۔''

''کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ اس کشتی سے بڑھ کر آپ کو کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔''

''ہاں، کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''کشتی والی بھی نہیں؟'' میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

اس کے ہڈیوں بھرے چہرے پر کرب اور اداسی کے گہرے سائے پھیل گئے۔ وہ لمبی آہ بھر کر بولا۔ ''اس کی بات کیوں کرتے ہو؟ اس کی چاہت تو ہر پیمانے اور موازنے سے جدا چیز ہے۔ وہ تو ایک ایسی ہستی ہے جس نے مجھے تھوڑے سے وقت میں ہزار ہا برس کی پُر بہار زندگی کی راحتیں دیں اور جواب مجھے مرنے کا حوصلہ بھی بخش رہی ہے۔ اس کی بات مت کرو۔''

''آپ اسے ایک بار دوبارہ دیکھنے کی چاہت تو رکھتے ہوں گے؟''

''آج تم بے معنی سوال کر رہے ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہوا سے پوچھے کہ کیا تم چلنے کی چاہت رکھتی ہو۔ پانی سے پوچھے تم بہنے کی چاہت رکھتے ہو اور سرما کی طویل رات، گھونسلے میں گزارنے والے پرندے سے پوچھے... کیا تمہیں صبح کا انتظار ہے؟''

''ہاں، کبھی کبھی لگتا ہے کہ آپ واقعی شاعری کر سکتے ہو۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنی یادوں کو کچھ یادگار نغموں میں ڈھال دو۔''

''یہ ایک اور بے معنی بات۔'' وہ زچ ہو کر بولا۔ ''میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب تو کشتی پر واپس پہنچنے کی آس بھی ختم ہو گئی ہے۔ اب تو میں کسی بھی وقت... کہیں سے بھی عالمِ بالا کی طرف رخصت ہو سکتا ہوں... یوں کر کے۔'' اس نے اپنے ہاتھ سے ہوائی جہاز کی طرح اڑنے کا اشارہ دیا۔

میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مارشل آرٹ کے آسمان کا تابندہ ستارہ تھا... اب آہستہ آہستہ مجھے اس کے بارے میں اور بھی کئی باتیں یاد آرہی تھیں۔ تین چار سال پہلے اس نے ہانگ کانگ میں بنی ہوئی کسی فلم میں کام بھی کیا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ عنقریب ہالی وڈ کی کسی بڑی فلم میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے ابھر رہا تھا۔ غالباً کسی انگلش آرٹیکل میں، میں نے اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ فائٹ کے وقت جیکی کا جسم ہی نہیں، اس کی اسپرٹ بھی مقابلے میں حصہ لیتی ہے۔ وہ اپنے مدِ مقابل کو مسمرائز کر دیتا ہے۔ اس کے ایک معروف برطانوی حریف نے اعتراف کیا تھا کہ وہ جب بھی جیکی سے مقابلہ کرتا ہے، اسے اپنی توانائی میں غیر معمولی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پھر ایک جاپانی فائٹر نے لکھا تھا... حریف کو چوٹ لگا کر بھی اگر آپ اسے درد میں مبتلا نہیں کر پاتے تو آپ کا حوصلہ ٹوٹنے لگتا ہے اور جیکی کے ساتھ لڑتے ہوئے یہی حوصلہ شکنی اعصاب کو جکڑ لیتی ہے۔ وہ چوٹ کو حیران کن صلاحیت سے جھیل لیتا ہے اور اگر اس نے اپنی یہ صلاحیت مزید پروان چڑھا لی تو بہت جلد... کوئی اس کے سامنے ٹک نہیں سکے گا...

یہ... اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں کہی جا رہی تھیں لیکن پھر اچانک یہ ابھرتا ہوا ستارہ مارشل آرٹ کے افق سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس تیز رفتار دور میں کسی کو تا دیر کہاں یاد رکھا جاتا ہے۔ یقیناً جیکی کے بارے میں بھی چند ماہ تک مختلف خبریں گردش کرتی رہی ہوں گی۔ ایسی دو چار اڑتی اڑتی خبریں ہم نے بھی سنی تھیں۔ کسی نے کہا کہ جیکی کو اس کے مخالفوں نے ہنگری کے کسی نائٹ کلب میں قتل کر ڈالا ہے۔ ایک دفعہ یہ سنا کہ وہ شوبز اور فائٹنگ آرٹ سے بالکل کنارہ کش ہو کر بدھ مت کا پیروکار بن گیا ہے اور کسی اسٹوپا میں رہتا ہے... وغیرہ... وغیرہ...

آج... ماضی کا وہ معروف کردار یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کے اس دیوان خانے میں میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے ساتھ طوفانی عشق کی ایک حیران کن داستان نتھی تھی۔ پچھلے دو ڈھائی سال میں وقت کی مہیب لہریں اس سے یوں ٹکراتی ہوئی گزری تھیں کہ وہ جسمانی اور روحانی طور پر تہ و بالا ہو کر ناقابلِ شناخت ہو گیا تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' جیکی نے مجھے چونکایا۔

''آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''ماضی کے بارے میں سوچنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مستقبل کے بارے میں سوچو۔ میں اتنی بری حالت میں بھی تم پر محنت کر رہا ہوں۔ اس محنت کا چالیس پچاس فیصد تو تم میں ظاہر ہونا چاہیے۔ اگر نہیں ہوگا تو میری روح بے چین رہے گی۔''

میں ابھی جیکی کو شکنتلا کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس بات کا انتظار کرنا تھا کہ اسحاق، شکنتلا کے بارے میں اصل صورتِ حال معلوم کر لے۔

اس رات جیکی پھر نشے کی حالت میں اپنا پسندیدہ نیپالی نغمہ گاتا رہا۔ اسے آج کافی تیز بخار بھی تھا۔ بخار کی مدہوشی، شراب کے نشے سے مل کر دو آتشہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے لنگوٹ کی تہوں میں سے، کاغذ میں لپٹی ہوئی شکنتلا کی تصویریں نکال لیں۔ انہیں ان گنت بوسے دیے اور پھر انہیں دوبارہ لنگوٹ کی تہوں میں محفوظ کر کے سو گیا۔

دوسرے روز دوپہر کو ڈاکٹر چوہان آیا۔ اس نے بتایا کہ چھوٹے سرکار مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے دیوان کے مہمان خانے میں طلب کیا ہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد میں اس محل نما عمارت کے وسیع احاطے سے گزرا۔ یہاں مجھے شان دار ہاتھی ''بادل'' بھی نظر آیا۔ یہی بادل نامی ہاتھی تھا جس نے ایک مسلمان مزدور کو زخمی کیا تھا اور جس کی پاداش میں ہاتھی کا مالک یعنی چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی آج کل باقاعدہ عمر قید کاٹ رہا تھا۔ میں عمارت کے عالی شان مہمان خانے میں پہنچا۔ ایک بلند و بالا محرابی دروازے سے گزر کر اور مخملی قالینوں پر پاؤں دھرتا ہوا میں ایک خوب صورت ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں وکٹوریہ طرز کی ایک شان دار کرسی پر چھوٹے سرکار اجیت رائے موجود تھا۔ وہ حسبِ سابق بند گلے کے کوٹ اور سفید پتلون میں تھا۔ سر پر ایک زرنگار پگڑی تھی اور گلے میں بیش قیمت مالا تھی۔ اس کی بارعب شخصیت نے جیسے اس سارے کمرے کو چکاچوند سے بھر دیا تھا۔ اس کے دائیں بائیں چند اور کرسیاں موجود تھیں۔ ان میں سے دو کرسیوں پر انور خاں اور کپتان اجے بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں داخل ہونا کسی مہاراجا کے دربار میں داخل ہونے کی طرح سنسنی خیز تھا۔ ایک طرف شیشے کی دلنشین تپائی پر چند جدید رائفلیں اور ان کے لوازمات رکھے تھے۔ شاید میرے یہاں آنے سے پہلے اس اسلحے پر ڈسکشن ہو رہی تھی۔

میں نے ادب سے سلام کیا۔ چھوٹے سرکار نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں قدرے جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد چھوٹے سرکار نے اپنی بارعب آواز میں کہا۔ ''ہمیں مراد شاہ اور ڈاکٹر چوہان سے تمہارے بارے میں کافی جان کاری مل چکی ہے۔ تمہاری روداد کافی انوکھی ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ مختار راجپوت کی بیٹی نے زرگاں میں تمہارا جیون بچانے کے لیے وہ انگوٹھی استعمال کی تھی جو ہمارے سورگ باشی پتا نے اس کے پریوار کو بخشی تھی۔ یہ ایک بڑا بلیدان ہے۔ اس لڑکی نے دوسرا بلیدان کچھ ہی دن پہلے دیا ہے۔ اسے جارج کے ستم کا شکار ہونا پڑا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس صورتِ حال کے لیے ہم بھی ذمے دار ہیں۔ ہمارا دوش یہ ہے کہ ہم نے اس لڑکی کی فریاد کے باوجود اسے اور تمہیں زرگاں واپس بھیج دیا... ہم اس کے لیے شرمندہ ہیں۔''

میں چونک کر چھوٹے سرکار کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہاں واقعی شرمساری نظر آرہی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ اس دور میں کوئی چھوٹا موٹا افسر یا زمیندار وغیرہ بھی اپنی انا کے خول سے باہر نہیں نکلتا۔ اپنا قصور تسلیم کرنا تو دور کی بات ہے۔ چھوٹے سرکار ایک وسیع اسٹیٹ کا مختارِ کل تھا اور وہ مجھ جیسے ادنیٰ شخص کے سامنے شرمسار دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے خلوصِ دل سے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! یہ آپ کی بڑائی ہے کہ آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو دوشی کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس وقت آپ نے وہی کیا جو آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت تو موہن کمار وغیرہ نے آپ کے سامنے ثابت کر دیا تھا کہ سلطانہ ہی ہارون کی قاتلہ ہے۔''

''پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم سے جلد بازی ہوئی۔ اس کے لیے ہمیں بہت افسوس ہے۔ ہم بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ تمہاری پتنی کو صحت دیوے اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں سپھل ہو جاوے۔ ہم نے یہاں اجے کو ہدایت

نام

ایک نوجوان نے جھجکتے ہوئے اپنی محبوبہ کے باپ کو ٹیلی فون کیا۔

''کیا میں آپ کی صاحبزادی سے شادی کر سکتا ہوں؟''

باپ نے جواب دیا: ''ضرور، ضرور۔ نام کیا ہے تمہارا؟''

ناصر علی کی جرأت مندی ضلع صوابی سے

دے دی ہے کہ تمہارے سمیت مختار راجپوت کی فیملی کی سکیورٹی کا پورا انتظام کیا جاوے۔ ہم نے مختار کے بیٹے کے علاج کے لیے بھی خاص ہدایات دی ہیں۔''

''بہت شکریہ، چھوٹے سرکار۔'' میں نے کہا۔

اجیت رائے کچھ دیر تک بغور میری طرف دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت دچمک تھی۔ اس کے تیکھے خدوخال والے چہرے پر ناک کا اونچا بانسہ بے حد نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ وہ بولا۔ ''مجھے انور خاں اور چوہان نے بتایا ہے کہ پچھلے کچھ عرصے میں تم بہت زیادہ بدل گئے ہو۔ تم نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالا ہے اور رائفل اٹھانا سیکھ لیا ہے۔'' میں جواب میں خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ بہت اچھی بات ہے۔ یہ سنسار کمزور کو دباتا چلا جاوت ہے۔ یہاں تک کہ زمین کے ساتھ زمین کر دیوت ہے۔ سر اٹھا کر جینا ہی جینا ہے اور اس کے لیے بلیدان دینے پڑتے ہیں۔''

انور خاں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''چھوٹے سرکار! تابش کے لیے جارج گورا کی قید کا پلیٹ ثابت ہوئی ہے۔ یہ بڑی دلیری کے ساتھ جارج کے گھر سے نکلا ہے۔ کئی لوگوں کو اب بھی یقین نہیں کہ یہ کسی کی مدد کے بغیر جارج کا کڑا پہرا توڑ کر آیا تھا۔ بعد میں یہ ان تین لڑکوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے جارج کو قتل کرنے کا عہد کیا تھا۔ یہ بھی بڑی جرأت والی کارروائی تھی۔ ان چار لڑکوں میں سے صرف دو زندہ بچے ہیں۔ بے شک یہ لڑکے ناکام ہوئے سرکار! مگر یہ جارج کی خودسر بہن کو سخت حفاظت کے باوجود اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔''

چھوٹے سرکار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''پتا چلا ہے کہ تم ایک ایسے نیپالی کو اپنے ساتھ لائے ہو جس کا ایک بازو اور پاؤں کٹا ہوا ہے۔ اور یہ وہی ہے جو کچھ برس پہلے زرگاں میں جارج کی بہن کا ٹیچر بن کر آیا تھا؟''

''جی سرکار! یہ وہی ہے... بارونداجیکی... زرگاں میں لوگ سمجھتے تھے کہ وہ تین ماہ اسٹیٹ میں رہ کر واپس چلا گیا تھا لیکن وہ جارج گورا کی حبسِ بے جا میں تھا۔ پھر وہاں سے فرار ہوا اور گارڈز سے بچ کر چھوٹی ندی کے کنارے ایک جنگل میں چھپا رہا۔''

''وہاں اس نے بہت سا عرصہ ایک فش بوٹ میں گزارا ہے سرکار! تابش وغیرہ نے اس فش بوٹ میں ہی اسے دیکھا تھا۔'' انور خاں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

چھوٹے سرکار نے زرنگار کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی شفاف ٹھوڑی کھجائی اور بولا۔ ''کیا واقعی... یہ شخص اشوک ساہنی کی بیٹی کے عشق میں گرفتار تھا؟''

''بے شک چھوٹے سرکار! ایسا ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ وہ اب بھی گرفتار ہے اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔ وہ بہت بیمار ہے۔ کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے لیکن اسے اپنی موت کا بھی کوئی غم نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے عشق نے اس کے لیے مرنا بھی آسان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ...''

ایک دم مجھے شکنتلا والی بات یاد آئی اور میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''چھوٹے سرکار! اگر آپ اجازت دیں تو ایک سوال پوچھنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ''پوچھو۔''

مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بولنے کا پڑھا لکھا انداز اسے متاثر کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ''سرکار! مجھے پتا چلا ہے کہ زرگاں کے راج بھون سے کچھ لوگ بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ ان میں ساہنی صاحب کی بیٹی شکنتلا بھی ہے؟''

چھوٹے سرکار نے کہا۔ ''ہاں، کسی نے مجھے یہ بات بتائی تو تھی۔ بعد میں ہم نے اس لڑکی کو پیش کرنے کا حکم دیا لیکن وہ ملی ناہیں۔ اس کے ساتھ راج بھون سے آنے والی تین چار اور عورتیں بھی ناہیں تھیں۔ دراصل زرگاں سے آنے والے لوگن جانت ہیں کہ تل پانی میں زرگاں کے جاسوس موجود ہیں۔ اس لیے وہ یہاں آ کر اِدھر اُدھر روپوش ہو جانا بہتر سمجھت ہیں۔''

بادردی اسبج نے چھوٹے سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب! اگر آپ حکم دیویں تو میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرت ہوں؟''

''ہاں ضرور کرو... بلکہ ہم تو چاہت ہیں کہ اگر وہ مل جاوے تو اسے خاص حفاظت میں رکھا جاوے۔ وہ راج بھون کی فیریز (پریوں) میں سے ہے... اور بھائی صاحب (حکم جی) کے جاسوس اس کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کریں گے۔''

ہماری بات چیت کے دوران میں ہی فوجی افسروں اور انتظامی عہدے داروں کا ایک وفد چھوٹے سرکار سے ملنے پہنچ گیا۔ میں اور انور خاں چھوٹے سرکار سے رخصت ہو کر واپس آ گئے۔

☆☆☆

آٹھ دس روز مزید گزر گئے۔ حالات میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ دونوں طرف جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میری اور باروندا جیکی کی ملاقات روز ہو رہی تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ مجھ پر فائٹنگ آرٹ کے نئے عقدے کھل رہے تھے۔ حقیقت ہے کہ میں خود کو ایک بدلا ہوا شخص محسوس کر رہا تھا... میں اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو بھی شاید نہ کر سکوں۔

سلطانہ کی کیفیت میں بھی معمولی تبدیلی آئی تھی۔ تاہم وہ اب بھی بالکل الگ تھلگ اور گم صم رہتی تھی۔ کوئی اس سے اظہارِ ہمدردی کی کوشش کرتا تو وہ غصے سے پھٹ پڑتی لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ بہت نرم اور اطاعت گزاری والا ہوتا تھا۔ وہ الگ کمرے میں ہی سو رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس نے ابھی بالو کو اپنا دودھ پلانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

ایک رات میں اسے دیکھنے اس کے کمرے میں گیا تو وہ ریشمی تکیے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کے گھنے بالوں کی چند لٹیں اس کے چہرے پر تھیں۔ بالو اس کے پہلو میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ خوب صورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر ایک صحت مند دلوانا کشش تھی۔ جیسے کوئی خودرو پودا یا جنگلی پھول۔ اور وہ میری بیوی تھی۔ میں قریباً ڈیڑھ سال تک اس کے قریب رہا تھا اور ہماری قربت کی نشانی یہ بچہ تھا۔

مجھے سلطانہ کے ریشمی تکیے کے نیچے ایک ابھار سا محسوس ہوا۔ میں نے آگے جا کر دھیان سے دیکھا تو یہ ایک چھوٹی تلوار کا دستہ تھا۔ یہی وہ تلوار تھی جس سے سلطانہ نے چند دن پہلے مردانہ وار کام کیا تھا۔ اس نے ٹیلے پر ''جی تھری'' چلانے والوں کے پیٹ پھاڑ ڈالے تھے اور یہ تلوار وہ اب بھی تکیے کے نیچے رکھ کر سوئی ہوئی تھی۔

میں نے بہت آہستگی کے ساتھ یہ چھوٹی تلوار اس کے تکیے کے نیچے سے نکال لی... میری احتیاط کے باوجود وہ جاگ گئی۔ مجھے دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اوڑھنی اپنے سر پر رکھ لی۔

''یہ تلوار نیچے کیوں رکھی ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس... بس یونہی۔'' وہ ہکلائی۔

''تمہیں اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں اب تمہارے ساتھ ہوں۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے... شاید صرف ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نگاہوں میں وہ ناقابلِ فراموش منظر گھوم گیا جب جارج گورا نے میرے گلے میں ذلت کا ہار پہنایا تھا اور سلطانہ نے میری بے مثال بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔

پھر سلطانہ نے نگاہ جھکا لی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! میں جانتا ہوں کہ میرے اوپر تمہارے کچھ قرض ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انہیں اتارنا آسان نہیں ہے... لیکن اتنا ضرور کہوں گا، اس رات کے بعد میں بتدریج تبدیل ہوا ہوں۔ میرے اندر بہت کچھ بدلا ہے سلطانہ... جس طرح جارج کا نام تمہارے ذہن میں گڑا ہوا ہے، میرے ذہن میں بھی گڑا ہے۔''

وہ دل دوز انداز میں سر جھکا کر رہ گئی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ سوئے ہوئے بالو کا ماتھا چوما اور تلوار سمیت باہر آ گیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ریشمی پردے والے جھروکے میں سے آتش بازی کے مناظر دکھائی دیے۔ رنگ برنگی ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں اور چھوٹے بڑے پٹاخے چل رہے تھے۔ اسی دوران میں حجام عبدالرحیم بھی آ گیا۔ میں نے اس سے آتش بازی کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''اس کی ایک ناہیں دو وجہ ہیں مہروزا بھائی... مم... میرا مطلب ہے تابش بھائی۔''

''وہ کون سی؟''

''پہلی وجہ تو شب برات کا تہوار ہے۔ کل یہاں اسٹیٹ کے مسلمان شب برات منائیں گے۔ دوسری وجہ کا پتا ابھی تھوڑی دیر پہلے چلا ہے۔ تل پانی اور زرگاں کے درمیان لڑائی وقتی طور پر ٹل گئی ہے۔ ہمری جان کاری کے مطابق کل تل پانی اور زرگاں کے خاص خاص لوگن میں بات چیت ہوئی ہے جس میں دونوں طرف سے تھوڑی اور سوچ بچار کا فیصلہ کیا گیا ہے۔''

میں اور عبدالرحیم جھروکے کے سامنے کھڑے ہو کر آتش بازی کا نظارہ کرتے رہے... تل پانی کا کافی بڑا حصہ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ جھیل کا ایک حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ جھیل کے کنارے کی آبادی میں سے گاہے بگاہے ہوائیاں چھوٹتی تھیں اور ان کے رنگ آسمان پر بکھرنے کے ساتھ ساتھ جھیل میں بھی منعکس ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ خوب صورت لگتا تھا۔

عبدالرحیم نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''تابش بھائی! کیا واقعی... تم کو... کچھ یاد ناہیں؟ پچھلی شب برات کی کوئی بات بھی تمہارے دماغ میں ناہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''میں نے تمہارے گھر میں کھانا کھایا تھا۔ سلطانہ بی بی نے بڑے پیارے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پر

مہندی لگائی ہوئی تھی۔ اسے یہ مہندی تم نے ہی لگائی تھی۔ وہ ہر ایک کو بتاتی پھرتی تھی کہ تم نے اسے مہندی لگائی ہے۔ بے ڈھنگی سی مہندی تھی، پر وہ اتنی خوش تھی کہ کچھ نا ہیں پوچھو... اور پھر ہم اوپر چھت پر چلے گئے تھے۔ آتش بازی دیکھتے رہے تھے... اور تم نے سلطانہ بی بی کے ساتھ مل کر درجنوں موم بتیاں روشن کی تھیں... کچھ تو یاد ہوگا تمہیں؟"

مجھے الجھن ہونے لگی۔ "نہیں... مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ میں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے رحیم نے بھی گفتگو کا رخ بدل دیا۔

تاہم اس کے جانے کے بعد میں اس کی بات پر غور کرتا رہا۔ کل شب برات کا تہوار تھا۔ اس موقع کو سلطانہ کو نارمل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اگلے روز سلطانہ کو مجبور کیا کہ وہ نیا لباس پہنے۔ میں اس کے لیے گیندے اور موتیے کے بہت سے پھول اور گجرے لایا۔ میں نے اس سے فرمائش کی کہ وہ آج مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ پکا کر کھلائے۔ میری اس فرمائش نے اس کا چہرہ زرد کر دیا۔ بہرحال، میرے اصرار کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔ وہ جھلمل کپڑوں میں ملبوس پہلی بار گھر کے باورچی خانے میں گئی تو ملازمائیں اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ خوش گوار ٹھنڈک والی ایک خوشبودار شام تھی۔ سلطانہ نے لکھنوی طرز کے چاول بنائے اور بادام کشمش والا زعفرانی حلوہ پکایا۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر پہلی بار ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ جھروکوں سے باہر تاروں بھرا آسمان تھا اور آتش بازی کے رنگ تھے۔ کہتے ہیں کہ ننھے بچے اور اس کے والدین کے درمیان ایک نادیدہ رابطہ ہوتا ہے۔ جب والدین خوش ہوں تو وہ بھی سکون اور راحت محسوس کرتا ہے۔ بالو کی آنکھوں میں بھی آج مسکراہٹ تھی۔ اس شام مجھے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ ایک بڑے حادثے کے بعد سلطانہ نارمل زندگی کی طرف آسکتی ہے۔ اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے زہرناک مایوسی کے بادل چھٹ سکتے ہیں۔

لیکن میں غلط تھا۔ جو کچھ میں سوچ رہا تھا، وہ ہونے والا نہیں تھا... اور وہ ہونے والا تھا جو اس شام میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے قریب میں نے سلطانہ اور بالو کو کمرے میں چھوڑا اور اپنے کمرے میں واپس آکر سو گیا۔

میری آنکھ صبح سویرے ایک تیز آواز سے کھلی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ملازمہ صفیہ برآمدے میں کھڑی چلا رہی تھی۔ "سلطانہ بی بی... سلطانہ بی بی...!"

پھر وہ میری طرف مڑی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مالک! سلطانہ بی بی کمرے میں نا ہیں ہیں۔ وہ کہیں بھی نا ہیں ہیں۔"

"غسل خانے میں دیکھا؟"

"جی مالک..."

میں صفیہ کے ساتھ دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا تھا۔ کل رات میرے اصرار پر جو لباس سلطانہ نے پہنا تھا، وہ ایک طرف فرش پر پڑا تھا۔ پھولوں کے سارے گہنے بھی ٹوٹے پھوٹے ایک طرف دھرے تھے۔ بالو بستر کے ایک گوشے میں سو رہا تھا۔ باقی بستر پر بہت کم سلوٹیں تھیں اور یوں لگتا تھا کہ سلطانہ اس پر تھوڑی دیر کے لیے ہی لیٹی ہے۔

"کہاں جا سکتی ہے وہ؟" میں نے اضطراب کے عالم میں کہا۔

"کچھ پتا نا ہیں جی! بی بی کا بھتیجا طلال بھی نا ہیں ہے۔ لگت ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی لے گئی ہیں۔"

ایک دم میرا دھیان اس چھوٹی تلوار کی طرف گیا جو میں نے ایک دن پہلے سلطانہ کے تکیے کے نیچے سے نکالی تھی۔ میں نے وہ ساتھ والے اسٹور نما کمرے کی الماری میں رکھی تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ تلوار اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

میں تیزی کے ساتھ اپنی قیام گاہ سے باہر آیا۔ میں نے باوردی پہرے داروں سے پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان سلطانہ بی بی اپنے نوعمر بھتیجے طلال کے ساتھ یہاں سے گزری تھی۔ اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی اور چہرہ بھی نصف چھپا ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شدید بخار میں ہے اور چھوٹے سرکار نے اس سے کہہ رکھا ہے کہ وہ جب چاہے، ان کے ذاتی معالج کو دکھا سکتی ہے۔

میں پہرے داروں سے بات کر ہی رہا تھا جب چوہان اور رحیم بھی وہاں آگئے۔ ہم فوراً چھوٹے سرکار کے ذاتی معالج حکیم خدا بخش کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ حکیم صاحب دیوان کے اندر ہی ایک رہائشی حصے میں رہتے تھے۔ ہم ان کے پاس پہنچے تو میرے دل میں چھپا ہوا اندیشہ درست نکلا۔ سلطانہ اور طلال رات کو یہاں آئے ہی نہیں تھے...

چوہان نے کہا۔ "وہ دیوان کے شمالی گیٹ کی طرف گئے ہوں گے۔"

ہم شمالی گیٹ پر پہنچے۔ ابھی رات کی ڈیوٹی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ یہاں وہی پہرے دار موجود تھے جنہوں نے رات بھر اس گیٹ کی نگہبانی کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اس راستے

سے کوئی باہر نہیں گیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ابھی دیوان کی چار دیواری میں ہی ہیں۔" رحیم نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔" چوہان پُرسوچ لہجے میں بولا۔ "اس کی نگاہیں دور ایک سرخ رنگ کے بند پھاٹک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ ٹل پانی کے سرکاری اصطبل کا پھاٹک تھا اور یہ اصطبل دیوان خانے کے اندر ہی تھا۔ پھاٹک کے سامنے ایک دو گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے چوہان سے پوچھا۔

"اگر وہ دونوں، رات کو حکیم خدا بخش صاحب کی طرف نہیں گئے اور نہ ہی اس گیٹ سے باہر نکلے ہیں تو پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اصطبل کی طرف گئے ہوں۔"

"مطلب؟"

چوہان نے میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے انچارج پہرے دار سے پوچھا۔ "رات کو یہاں سے گھوڑا گاڑیاں گزرتی رہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔" پہرے دار نے جواب دیا۔ "تین چار گزری ہیں۔ چھوٹے سرکار کے کچھ مہمان تھے جو آدھی رات کے بعد واپس گئے۔ ایک دودھ لانے والی گاڑی تھی... ایک شاید اور تھی۔"

"تم اندر آنے والی گاڑیوں کو ہی چیک کرتے ہو یا باہر جانے والی گاڑیوں کو بھی؟"

"اندر آنے والیوں کو ہی چیک کیا جاتا ہے جی... یا پھر کوئی خاص آرڈر ہو تو..."

چوہان نے ایک گہری سانس لی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے تابش... سلطانہ اب ہمیں یہاں نہیں ملے گی۔ پھر بھی ہم تسلی کے لیے چیک کر لیتے ہیں۔"

... چوہان نے بالکل درست کہا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہم نے ہر جگہ دیکھ لیا... سلطانہ کے غائب ہونے کی خبر پورے دیوان میں پھیل چکی تھی۔ ہر جگہ ہلچل نظر آرہی تھی۔ سلطانہ دیوان کی عمارت میں کہیں نہیں تھی۔

اب اس کی تلاش کا سلسلہ دیوان کی عالی شان عمارت سے باہر شروع ہوا۔ مراد شاہ کے فوری حکم کے تحت گھڑسواروں کی ٹولیاں اردگرد کے علاقے میں پھیل گئیں اور خاص و عام سے پوچھ گچھ ہونے لگی۔

میں شدید شاک کی کیفیت میں تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ کل رات تک وہ بہت نارمل نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بہتری کی طرف اس کا سفر شروع ہو جائے گا لیکن اب وہ منظر سے اوجھل تھی۔ اس کے اوجھل ہونے کا انداز ذہن میں مزید اندیشے ابھارتا تھا۔

چوہان کے ذہن میں بھی ایسے ہی اندیشے تھے۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ "تابش! مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے خطرے پیدا کرے گی۔"

"دوسروں سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"جارج گورا اور اس کے قریبی ساتھی... وہ جارج گورا کو معاف نہیں کر سکی۔ وہ جس خانوادے سے تعلق رکھتی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ آن پر مر مٹنے والے لوگ ہیں۔ حاکم لوگ پیار سے ان کی جان بھی لے لیں تو دے دیتے ہیں مگر ان کو سر جھکا کر جینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ راجپوت برادری کی وہ لڑکی ہے جو انگریزوں کے دور میں حیدرآباد دکن سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی۔ یہ لوگ فنِ سپاہ گری میں ہمیشہ سے تاک ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی عورتیں بھی تلوار کی دھنی ہوتی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اور طلال یہاں سے نکل کر زرگاں کی طرف گئے ہوں گے؟"

"یہ ایسی ناممکن بات نہیں ہے۔ وہ اپنی عزت کے لٹیرے کے لیے سراپا قہر ہے۔ ایسے میں وہ راستے کی مشکلوں کے بارے میں زیادہ نہیں سوچے گی۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہیے۔ اسے پتا ہوگا کہ عام حالات میں بھی جارج گورا کے

زبان کے ذریعے مصوری

ہانگ ارنان دنیا کا وہ واحد مصور تھا جو زبان سے تصویریں بناتا تھا۔ وہ اپنے منہ کو ٹیوب اور زبان کو برش کی طرح استعمال کرتا تھا۔ ہانگ ارنان ایک میز پر جھک کر ریشم کے بڑے سے ٹکڑے پر خوب صورت پھول، مناظر اور تتلیاں بناتا تھا۔ اس نے اسی طرح شاہکار چینی تصاویر بنائی ہیں، دنیا کا یہ منفرد اور عجوبۂ روزگار آرٹسٹ منہ میں باری باری مختلف رنگ بھر لیتا تھا اور انہیں زبان کے ذریعے تصویر میں منتقل کر دیتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ طریقہ بہت ہی فرحت بخش اور دلچسپ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں رنگوں کا ذائقہ محسوس کر کے مصوری کرتا ہوں۔

عادل نذیر کا انتخاب، واہ کینٹ سے

گرد سخت حفاظتی حصار ہوتا ہے۔ ان حالات میں تو اس کے قریب چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہوگی۔ وہ اپنی جان گنوانے کے سوا اور کچھ نہیں کر پائے گی۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ فوری طور پر زرگاں کی طرف نہ جائے۔ ابھی کہیں کہیں تل پانی میں چھپ کر لائحہ عمل بنائے... طلال اس کے ساتھ ہے۔ وہ اپنی برادری کے کچھ اور افراد کی مدد لینے کے بارے میں بھی سوچ سکتی ہے۔"

"ایسی سوچ بچار تو ٹھنڈے دل و دماغ سے کی جاسکتی ہے تابش! وہ جس طرح یہاں سے گئی ہے، لگتا ہے کہ اس کے اندر ایک آگ ہے۔ یہ آگ اسے شاید ہی کہیں رکنے دے۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق مراد شاہ صاحب نے راستے کی چوکیوں کو خبردار کر دیا ہے۔ اگر وہ زرگاں کے رخ پر گئی ہے تو ہوسکتا ہے کہ اسے راستے میں کہیں اریسٹ کرلیا جائے۔"

"یہ بات وہ بھی تو سوچ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے وہ فوری طور پر زرگاں کا رخ نہ کرے..."

اسی دوران میں اجے تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے اس کے دو باوردی ماتحت تھے۔ ماتحت دروازے پر ہی ٹھہر سے رہے۔ اجے نے اندر آکر ہمیں بتایا۔ "اندرونِ شہر سے اطلاع ملی ہے کہ اسلحے کی ایک دکان پر ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔ ڈاکو ایک اکیلا لڑکا تھا۔ وہ ایک رائفل، ایک پستول اور کچھ ایمونیشن لوٹ کر لے گیا ہے... دکان دار کے بازو پر تلوار کا زخم آیا ہے۔ تفتیش کرنے والے تھانے دار نے شک ظاہر کیا ہے کہ یہ لڑکا، سلطانہ بی بی کا ساتھی ہوسکتا ہے۔ بہرحال، اس حوالے سے وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

یہ اہم اطلاع تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور فوراً اجے کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی میں ہم دیوان کی عالی شان عمارت سے نکلے اور اندرونِ شہر کی طرف چل دیے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ تل پانی کے گلی کوچوں میں زندگی معمول کے مطابق رواں تھی۔ جنگی تناؤ وقتی طور پر ختم ہوگیا تھا اور اس تبدیلی کے آثار لوگوں کے چہروں پر بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ بازاروں میں خریداروں کا رش تھا۔ باغوں اور دیگر تفریح گاہوں میں بھی رونق تھی۔ بہرحال، لوگوں کے ذہنوں میں یہ شک بھی موجود تھا کہ اس صورتِ حال کے پیچھے زرگاں والوں کی کوئی سازش نہ ہو۔

گھوڑا گاڑی ایک ایسی آبادی میں پہنچی جہاں پرانی طرز کی دو تین منزلہ گنجان عمارتیں تھیں۔ یہاں گلیاں تنگ اور راستے پیچ دار تھے۔ ایک جگہ گاڑی سے اترنے کے بعد ہم پیدل ہی ایک بازار میں داخل ہوئے۔ ایک دکان کے سامنے پولیس کے باوردی سپاہی موجود تھے۔ پولیس کی وردی یہاں، انڈیا کی عام پولیس سے ملتی جلتی تھی۔ بس پگڑی کا اضافہ تھا۔

پولیس والوں نے اجے کو فوجی افسر کا پروٹوکول دیا۔ اسے سیلوٹ کیا گیا اور بڑے احترام سے موقع واردات پر پہنچایا گیا۔ زخمی دکان دار مدن لال دکان میں ہی موجود تھا۔ اس کے بازو پر بڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور فربہ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

تھانے دار کے اشارے پر اس نے کراہتے ہوئے بتایا۔ "جناب! دوپہر کے سمے گاہک وغیرہ کی آشا کم ہی ہووت ہے۔ بھوجن کے بعد میں ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا... ملازم لڑکا سامنے کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے ہی سویا تھا کہ ایک دم آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ پر کالا نقاب اور ہاتھ میں دو فٹ لمبی تلوار تھی۔ اس نے تلوار یہاں... میری گردن پر رکھ دی اور کہا کہ میں بولا تو وہ گلا کاٹ دیوے گا۔ اس نے مجھ سے شوکیس کی چابی مانگی۔ میں چابی لینے کے بہانے تھوڑا سا آگے گیا اور پھر میں نے جلدی سے باہر نکلنا چاہا۔ وہ میرے وچار سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے تلوار چلا کر میرا بازو گھائل کر دیا... میں یہاں گر پڑا، اس کرسی کے پاس۔ یہ دکان کا پچھلا کمرا ہے۔ بازار سے گزرنے والے کسی بندے کو پتا بھی ناہیں چلا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ اس نے شوکیس کی چابی مجھ سے لی۔ بڑے سکون کے ساتھ شوکیس کھولا۔ اس میں سے ایک سات ایم ایم رائفل اور ایک کولٹ پستل نکال لیا۔ رائفل کے کوئی دو سیکڑے راؤنڈ بھی وہ خبیث اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اس نے جاتے جاتے ہم کو دھمکی دی کہ اگر ہم نے زبان کھولی تو وہ پھر آوے گا اور تب ہماری ہتھیا کیسے بتانا ہیں جاوے گا..."

دکان دار نے اپنی ساری بپتا ایک ہی سانس میں کہہ ڈالی۔

"جس وقت یہ سب ہورہا تھا تمہارا ملازم کہاں تھا؟" اجے نے پوچھا۔

"اس غریب کو اس نے یہ سامنے والے غسل خانے میں بند کر چھوڑا تھا جی۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے آواز تک ناہیں نکالی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"وہ ذرا کمزور دل کا ہے جی۔" تھانے دار نے کہا۔ "اس کو بے ہوشی ہورہی تھی۔ اسے ساتھ والے اسپتال میں بھرتی کرایا ہے۔"

ہمارے یہاں آنے سے پہلے تھانے دار محمود نے تفتیش کا کچھ کام کیا تھا۔ اس نے فوجی افسر اجے کو اس تفتیش سے آگاہ کیا۔ اجے اور تھانے دار محمود کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ یہاں گھوڑوں کے بھی نمبر ہوتے ہیں اور یہ نمبر ان کی پیٹھ پر بڑے اہتمام سے داغے جاتے ہیں۔ ان نمبروں کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو عام جگہوں پر گاڑیوں کے نمبروں وغیرہ کی ہوتی ہے۔ ایک قریبی دکان دار نے بتایا تھا کہ واردات کرنے والا گھوڑے پر آیا تھا۔ اس گھوڑے کی پیٹھ پر داغا ہوا نمبر بھی اس دکان دار کو کسی حد تک یاد تھا۔ اجے نے اس دکان دار کو طلب کیا۔ وہ مزید گواہوں کے بیان بھی سننا چاہتا تھا۔ میں اس طویل تفتیشی کارروائی سے اُکتا کر گھوڑا گاڑی میں آبیٹھا۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی تھی۔ سلطانہ اور اس کا بھتیجا کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہ سوال ایک آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑا ہوا تھا۔

فوجی گاڑی اندر سے بہت آرام دہ تھی۔ اس کی کھڑکیوں پر مخملی پردے پڑے ہوئے تھے۔ تاہم ان پردوں کی جھریوں میں سے باہر کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔ بازار کی گہما گہمی کی جھلکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک ایک منظر نے مجھے بری طرح چونکایا۔ یہ ایک تئیس چوبیس سالہ نوجوان تھا۔ اس نے ایک ڈبی دار چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ ایک ٹھیلے والے کے عقب میں کھڑا وہ کھوجی نظروں سے فوجی گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز مشکوک تھا لیکن جس چیز نے مجھے چونکایا، وہ اس کی صورت تھی۔ میری نگاہوں میں وہ مناظر گھوم گئے جب اپنے ہوش و حواس میں واپس آنے کے بعد میں نے پہلی بار اسٹیٹ سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور تیواری لال اور ڈیوا وغیرہ مجھے جنگل سے پکڑ کر واپس لائے تھے۔ ان واقعات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ مجھے ان سب لوگوں کے چہرے یاد تھے۔ یہ شخص بھی ان میں سے تھا... میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ لیکن یہ شخص زرگاں سے کوسوں دور یہاں تل پانی کے اس بازار میں کیسے موجود تھا؟ میں نے کھڑکی کے قریب جا کر دیکھا۔ وہ مضطرب نظر آتا تھا۔

میں گھوڑا گاڑی سے باہر آگیا۔ میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ مجھے دیکھ کر وہ گہرا سانولا شخص بُری طرح بدکا اور ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے جسم میں لہری دوڑ گئی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مڑا اور مخالف سمت میں چل دیا۔ میں نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ واضح طور پر بوکھلا گیا۔ اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ میں نے بھی رفتار تیز کر دی۔ یہ گنجان بازار تھا۔ وہ کسی بھی وقت نگاہوں سے اوجھل ہوسکتا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میں مسلسل اس کے پیچھے ہوں تو وہ ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس بازار میں زیادہ تر خواتین ہی خریداری کر رہی تھیں۔ کپڑوں، چوڑیوں اور گہنوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ہر طرف برقعے یا رنگ دار چادریں دکھائی دیتی تھیں۔ میں دوڑا تو مرد و زن سے میرا تصادم شروع ہوگیا۔ کئی خواتین میرا دھکا لگنے سے گریں اور چلائیں۔ ایک فربہ اندام قلفی فروش میری ٹکر لگنے سے آرائشی سامان کی ایک دکان میں جا گرا اور وہاں کھلبلی مچ گئی۔ مجھے اردگرد کا ہوش نہیں تھا۔ میری نگاہ بس بھاگنے والے شخص پر تھی اور میں کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک جگہ وہ ایک گھوڑا گاڑی سے ٹکرا کر گرا اور پھر فوراً اٹھ کر ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گلی میں گیا۔ یہ کوئی مرچ مسالے کا بازار تھا۔ ہر طرف مسالوں کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

"پکڑو... پکڑو۔" میں نے پکارنا شروع کیا۔

میری پکار پر کسی نے فوری عمل تو نہیں کیا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ مجھے ہجوم میں سے بھاگنے کے لیے نسبتاً آسانی سے راستہ ملنے لگا۔

...اگلے دو منٹ میں اندرونِ شہر کی ان بھری پُری گلیوں میں یہ اندھا دھند تعاقب جاری رہا۔ اسی دوران میں کئی خوانچے الٹے اور کئی مرد و زن کو چوٹیں وغیرہ بھی آئیں۔ وہ شخص بھاگتا بھاگتا ایک سہ منزلہ پرانی عمارت میں داخل ہوگیا۔ دو تین سیکنڈ بعد میں بھی عمارت کے اندر تھا۔ ایک عجیب سی تلخی، جھلاہٹ مجھ پر سوار تھی۔ اس کے علاوہ ایک ترنگ سی بھی تھی۔ یہ ترنگ کیا تھی؟ شاید خود کے اندر ہونے والی اہم تبدیلیوں کے بعد میں لاشعوری طور پر کہیں اپنا حوصلہ آزمانا چاہتا تھا۔ کسی سے ٹکرانا چاہتا تھا، نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

...اور اس عمارت میں گھسنے کے بعد یہ موقع مجھے مل گیا بلکہ اتنی شدت سے ملا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔

دو ہٹے کٹے افراد تیزی سے میرے سامنے آئے۔ وہ بھی سانولے تھے اور صورتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہندو ہیں۔

"او سنے... کون ہو؟" ان میں سے ایک نے ہراساں آواز میں کہا پھر وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔

میں نے ایک کے چہرے پر کہنی کی بھرپور ضرب لگائی۔ وہ ڈکراتا ہوا لکڑی کے ایک تخت پر گرا اور وہاں رکھے تاش کے پتے چاروں طرف بکھر گئے۔

میں نے دوسرے شخص کی ناف میں گھٹنا مارا اور پھر سر کی ٹکر سے اسے دور پھینک دیا۔ اسی دوران میں دو افراد

سیڑھیوں سے چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے آگئے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس کا پیچھا کرکے میں یہاں پہنچا تھا۔ اب اس شخص کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ کلہاڑی کا خوفناک پھل چمک رہا تھا مگر وہ مجھے کسی کھلونے کی طرح لگی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کلہاڑی مجھے خراش تک نہیں پہنچا سکتی۔ شاید یہی وہ اعتماد تھا جسے میں آج تک تلاش کرتا رہا تھا... اور یہی وہ اعتماد تھا جس کے بارے میں بارونداجنگلی کہتا تھا کہ جب یہ بندے کے پاس ہو تو پھر اسے لڑنے اور جیتنے کے لیے کسی ہتھیار کی ضرورت نہیں رہتی۔

کلہاڑی کا اندھا دھند وار جو میرے سر پر کیا گیا تھا میں نے آسانی سے بچایا اور کلہاڑی بردار کے جبڑے پر ٹانگ رسید کی۔ جبڑا ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح اور شفاف تھی۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ یہی وقت تھا جب اس گھر کا بیرونی دروازہ ایک بار پھر دھماکے سے کھلا۔ اس مرتبہ اندر داخل ہونے والے میرے ہی ساتھی تھے... چوہان اور کپتان اجے وغیرہ...

اجے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے عقب میں اس کے باوردی سپاہی تھے۔ ''خبردار... خبردار!'' اجے گرجا۔ ''گولی مار دوں گا۔''

یکایک ایک فائر ہوا اور گولی میرے کان کے پاس سے سرگوشی کرتی گزر گئی۔ یہ فائر زمین پر گرے ہوئے اسی بندے نے کیا تھا جس کا اندھا دھند تعاقب مجھے یہاں تک لایا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں کلہاڑی کی جگہ پستول نظر آرہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری مرتبہ مجھے نشانہ بناتا، اجے کی چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں اتر گئی۔

گولی لگنے سے اس کے جسم نے جھٹکا کھایا مگر اس نے پستول پر اپنی گرفت قائم رکھی۔ تڑپ کر اس نے پستول کا رخ اجے کی طرف کیا۔ تب اجے نے پھر ٹریگر دبایا۔ پستول نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور یہ دوسری گولی اس شخص کے جسم کے اسی حصے میں لگی جو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ یعنی اس کا جبڑا۔ ایک کربناک کراہ کے ساتھ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔

اجے کے سپاہیوں نے رائفلیں سونت لی تھیں۔ ان کے خطرناک تیور دیکھ کر باقی افراد ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ ان کے رنگ اڑ گئے اور جانیں بچانے کے لیے انہوں نے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر دیے۔ شوٹ ہونے والے شخص کا خون تیزی سے اس کی ڈبی دار جادر کو بھگوتا چلا جا رہا تھا۔

عمارت سے باہر گلی میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ یہ ہجوم ہر لمحے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین گولیوں کی آواز نے اس گنجان علاقے میں ہر طرف سنسنی پھیلا دی تھی۔

چوہان نے مجھے ٹٹولا اور ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا تابش؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہان اور اجے وغیرہ کی چڑھی ہوئی سانسیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ میرے پیچھے ہی پیچھے بھاگتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔

اجے کے سپاہیوں نے مرنے والے کے ساتھیوں کو ایک قطار میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ کچھ سپاہی عمارت میں پھیل گئے اور دیگر افراد کو تلاش کرنے لگے۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' اجے نے دھیمی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''باقیوں کا تو پتا نہیں... مگر اس بندے کو میں کسی حد تک جانتا ہوں۔'' میں نے ٹائل دار فرش پر مردہ پڑے گہرے سانولے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

''کون ہے یہ؟'' اس مرتبہ چوہان نے پوچھا۔

''ہشم کا ایک قریبی ساتھی۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو گا لیکن تمہارے ذہن سے نکل گیا ہے۔ جب مجھے اور سلطانہ کو یہاں ٹل پالی سے واپس نرگان بھجوایا گیا تو یہ شخص موہن کمار کے ساتھیوں میں شامل تھا۔''

چوہان نے چونک کر مردہ شخص کا خونچکاں چہرہ دیکھا۔ پھر شاید اس نے بھی کسی حد تک اسے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔

''تم نے اسے کہاں دیکھا؟'' چوہان نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل بتا دی۔ اس دوران میں اجے کے ماتحت افراد عمارت کے مختلف حصوں سے قریباً پانچ مزید افراد کو ہانک کر گراؤنڈ فلور پر لے آئے تھے۔ یہ سارے افراد کٹر ہندو لگتے تھے۔ یہ سب کے سب جواں سال تھے۔ اس عمارت کی مختلف دیواروں پر تلواریں، کلہاڑیاں اور رائفلیں آویزاں تھیں۔ بجرنگ بلی، ہنومان اور کالی ماتا کی مورتیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک دو جگہ ہندی کے کچھ پوسٹر بھی نظر آئے۔ پوسٹروں کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ یہ عسکری نوعیت کے ہیں۔

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ جگہ جوشیلے ہندو نوجوانوں کی ایک بیٹھک ہے۔ اس عمارت کی دوسری منزل پر ایک بڑا جمنازیم تھا۔ وہاں جسمانی کسرت کی جاتی تھی اور لڑائی بھڑائی کے گر بھی سیکھے جاتے تھے۔ عمارت میں موجود پوسٹرز سے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ مسلمان مخالف پروپیگنڈے کا اڈا بھی ہوئی ہے۔

کپتان اسجے کی ہدایت پر تھانے دار محمود نے مرنے والے شخص کی لاش کو قبضے میں لے لیا اور عمارت میں موجود افراد کو گرفتار کرلیا۔ امید تھی کہ گرفتار ہونے والوں کے ذریعے مزید انکشافات ہوں گے۔

''تمہاری پنڈلی پر چوٹ آئی ہے۔'' چوہان کی آواز نے مجھے چونکایا۔

میں نے دیکھا، واقعی پنڈلی پر ایک گہرا کٹ آیا تھا۔ لڑائی کے دوران میں کوئی آہنی شے لگی تھی۔ خون بہہ کر ٹخنے تک جارہا تھا مگر یہ جان کر مجھے تعجب ہوا کہ اس چوٹ نے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں دی تھی۔ اپنا بہتا ہوا خون دیکھ کر مجھے پریشانی کے بجائے عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔ شاید جیکی کی تربیت نے مجھ پر اپنا رنگ چڑھانا شروع کردیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم دیوان میں واپس پہنچ گئے۔ یہاں سلطانہ اور اس کے بھتیجے کی گمشدگی سب سے اہم موضوع تھی۔ ہر کوئی اس بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اسجے کو امید تھی کہ اگلے چوبیس گھنٹے میں کوئی نہ کوئی کھوج ہاتھ آجائے گا۔ یہ بات تو اب تقریباً ثابت ہوچکی تھی کہ آج سہ پہر اسلحے کی دکان پر واردات کرنے والا سلطانہ کا بھتیجا طلال ہی تھا۔ یہاں گھوڑے کی پیٹھ پر داغا ہوا نمبر سامنے آیا تھا۔ اسجے کو یقین تھا کہ اس نمبر کے ذریعے پیش رفت ہوگی۔

رات کو باروندا جیکی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کمزور تر ہوتا جارہا تھا۔ لگتا ہے اسے تیز بخار بھی ہوجاتا تھا لیکن وہ اپنا ہر دکھ درد شراب میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ نشے کی وجہ سے اس کی خوش طبعی بھی برقرار رہتی تھی۔

میں نے اسے سہ پہر والی کارکردگی بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ''میں سمجھ گیا۔ یہ ہندو اکھاڑے کے لوگ تھے۔ یہ تو کافی سخت جان ہوتے ہیں۔ نئے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ پرانے ہتھیار چلانے کی بھی انہیں مہارت ہوتی ہے۔ اگر تم نے انہیں نیچا دکھایا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ میری محنت بالکل ہی بیکار نہیں جارہی۔''

''بالکل ہی بیکار نہیں جارہی... سے کیا مطلب؟ کیا آپ میری کارکردگی سے مطمئن نہیں ہو؟''

''مطمئن تو ہوں لیکن پوری طرح نہیں۔'' اس نے کہا پھر میری پنڈلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا باندھ رکھا ہے؟''

''میں نے بتایا ہے نا، یہاں چوٹ لگی ہے۔ کافی خون بہا ہے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔ تم چوٹ کو چوٹ سمجھ رہے ہو۔ تم اس سے خوف زدہ ہو۔ تم نے اسے چھپا دیا ہے، باندھ دیا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی جنگلی جانور شیر، چیتے، ٹائیگر وغیرہ کے بارے میں بھی سنا ہے کہ اس نے زخم پر پٹی باندھی، دوا لگائی؟ حالانکہ انہیں زخم لگتے ہی رہتے ہیں اور ہم سے زیادہ تیزی کے ساتھ ٹھیک بھی ہوتے رہتے ہیں۔ فطرت خود سب سے بڑا مرہم ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''اگر سمجھنا چاہتے ہو تو آہستہ آہستہ سمجھ میں بھی آنے لگے گا۔'' اس نے کہا اور میری پنڈلی کی پٹی اپنے ہاتھ سے کھول دی۔

اس دن مجھے ایک نیا تجربہ ہوا۔ زخمی پنڈلی کے ساتھ ہی میں نے اور جیکی نے سخت ترین مشق کی۔ میرے زخم سے پھر خون رسنے لگا۔ میرا پاؤں لہو رنگ ہوگیا۔ زخم پر لگنے والی پہلی ایک دو ضربوں نے مجھے تکلیف دی لیکن پھر یہ تکلیف ایک طرح کی توانائی میں بدلنے لگی۔ ہر بار جب زخم پر چوٹ لگتی تو میرے اندر ایک ہیجان سا پیدا ہوتا۔ ایک تند لہر ابھرتی اور آتش بن کر میرے رگ و پے میں دوڑ جاتی۔ میں درد اور برداشت کے نئے پہلوؤں سے آشنا ہورہا تھا۔

اس رات باروندا جیکی کو ایک بار پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ یوں لگا کہ اس کی سانس رک جائے گی۔ اس کا ہڈیوں بھرا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔ میرا دل چاہا کہ جیکی تک وہ اطلاع پہنچا دوں جو میں نے کئی دن سے خود تک محدود رکھی ہوئی ہے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی تو جیکی کو اضافی دکھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ابھی تک کپتان اسجے کوٹل پانی میں شگفتا کی موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ بہرحال، وہ تن دہی سے اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

...اگلے تین دن تک سلطانہ اور طلال راجپوت کی تلاش شدومد سے جاری رہی مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ گھوڑے پر داغے ہوئے نمبر سے بھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔ اس سلسلے میں تین مختلف افراد مشکوک قرار دیے گئے تھے اور ان سے پوچھ گچھ ہورہی تھی۔

اکھاڑے سے جو نوجوان پکڑے گئے، انہوں نے کئی انکشافات کیے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حکم اور جارج وغیرہ کوٹل پانی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ہم آہنگی ایک آنکھ نہیں بھا رہی۔ ٹل پانی میں مسلمان اکثریت میں تھے، اس کے باوجود وہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری سے رہ رہے تھے۔ اس رواداری اور ہم آہنگی کو ختم کرنے کے لیے حکم نے اپنے سازشی عناصر یہاں چھوڑے ہوئے تھے۔ اس کی ایک مثال چار دن پہلے اکھاڑے میں ہلاک ہونے والا شخص متیش

آنند تھا۔ یہ شخص ہندو نوجوانوں میں مراد شاہ وغیرہ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کررہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مراد شاہ اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار پر حاوی ہوچکے ہیں اور وہ عنقریب اپنا مذہب بدل کر مسلمان ہونے والا ہے۔ وہ مسلمان عالموں کے پاس بیٹھتا ہے۔ ان کی باتیں سنتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں دن بہ دن مسلمانوں کے ساتھ بڑھتی جارہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سلطانہ کی گمشدگی نے مجھے از حد مضطرب کر رکھا تھا۔ مجھے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اچانک اس کے بارے میں کوئی اندوہناک خبر آجائے گی۔ اس کی تلاش میں چھوٹے سرکار کے ہرکارے دور دور کی خاک چھان رہے تھے۔ میں خود بھی دیوان سے باہر نکل کر اس تلاش میں شریک ہونا چاہتا تھا لیکن چوہان نے مجھے سختی سے منع کردیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''تم ایک بات بھول رہے ہو تابش! تم آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہو۔ تمہارے اندر ''چپ'' موجود ہے اور یہاں ٹل پانی میں حکم کے بہت سے جاسوس موجود ہیں۔ وہ تمہیں کسی بھی وقت ٹریس کرسکتے ہیں۔'' اس نے مجھے انیتا والی بات بھی یاد دلائی اور کہا کہ اب مجھے اس بارے میں کوئی شک شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

وہ تو اس بات پر بھی ناخوش تھا کہ میں نے تین چار دن پہلے بازار میں اچانک متیش کو دیکھ کر اس کا اندھا دھند تعاقب شروع کردیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں سیکیورٹی کے بغیر بالکل دیوان کی عمارت سے باہر نہ نکلوں۔

ننھا بالو بھی آج کل بہت مضطرب تھا۔ ماں کی دوری اکثر اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز رکھتی تھی۔ وہ اسے بانہوں میں نہیں لیتی تھی، اسے اپنا دودھ نہیں پلاتی تھی لیکن اس کے قریب تو رہتی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں لیٹنے کی اجازت تو دیتی تھی مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کی گود میں بلکتا رہتا تھا۔ اب بھی وہ یہی کچھ کررہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز سن کر میں اس کے پاس چلا گیا۔ صفیہ اسے بانہوں میں لیے برآمدے میں چکرا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ لاڈ بھرے انداز میں اسے پچکار رہی تھی۔ ''کاکے کی امی جان آئے گی... کاکے کو گانا سنائے گی... کاکے کو جھولا جھلائے گی... کاکے کو دودھ پلائے گی... کاکے کی امی آئے گی۔''

وہ واقعی چپ ہوگیا۔ اپنی اشک بار معصوم آنکھوں سے صفیہ کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس کی ساری بات سمجھ رہا ہو۔ اس دوران میں صفیہ نے بھی مجھے دیکھ لیا اور جلدی سے اپنی اوڑھنی درست کرنے لگی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر بالو کو اٹھالیا۔ مجھے اس سے انس محسوس ہوا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے، اس کا نم گال چوما۔ اس کا ننھا سینہ اب بھی چھوٹی چھوٹی ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ اس کی ہر ہچکی میں ممتا کی تلاش تھی۔

اسی اثنا میں مجھے چوہان تیز قدموں سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ''خیریت ہے چوہان؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچا کر بولا۔ ''پرانے شہر سے ایک لاش ملی ہے۔''

''کس کی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ایک جواں سال عورت ہے۔ چہرہ بری طرح مسخ ہے... پہچانا نہیں جارہا۔ اسجے کو شک ہے کہ...'' چوہان کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کے ادھورے فقرے کا اشارہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے دہل کر کہا۔ ''وہ کوئی اور ہوگی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ چلو میرے ساتھ آؤ۔ تم شناخت میں مدد دے سکتے ہو۔''

میں نے لرزاں ہاتھوں سے بچہ واپس صفیہ کی گود میں دیا اور ڈاکٹر چوہان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جب میں نے سلطانہ کو آخری بار دیکھا تو اس نے کون سے کپڑے پہن رکھے تھے... اس کی جوتی کون سی تھی؟ وہ زیور تو سرے سے پہنتی ہی نہیں تھی۔ اسے لباس وغیرہ سے ہی شناخت کیا جاسکتا تھا۔

ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھے اور شہر کے بارونق راستوں سے گزرتے ہوئے پرانی آبادی میں پہنچ گئے۔ اب شام ہوچکی تھی۔ گھروں میں چراغ، لالٹینیں اور گیس لیمپ وغیرہ روشن ہوچکے تھے۔ کہیں کہیں کسی خوش حال فیملی کی چار دیواری میں جنریٹر کی برقی روشنی بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں بائیسکلوں پر لیمپ روشن کرنے کا رواج تھا۔ گھوڑا گاڑیوں اور چھکڑوں وغیرہ کی دونوں سائڈز پر بھی کیروسین آئل کے لیمپ روشن کیے جاتے تھے۔

ہم ایک تین چار منزلہ عمارت کے سامنے پہنچے۔ بالکونیوں اور محرابی دروازوں والی اس عمارت کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کے سپاہی اس ہجوم کو موقع واردات سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کررہے تھے۔ ایک فوجی گھوڑا گاڑی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اسجے بھی یہیں موجود ہے۔

میں چوہان کے ساتھ عمارت کے ایک اندرونی حصے میں پہنچا۔ یہاں لکڑی کے ایک بوسیدہ تخت پر ایک لاش سفید چادر سے ڈھکی رکھی تھی۔ چادر پر سر کی طرف خون کے بڑے

بڑے داغ نظر آرہے تھے۔ میری رگوں میں خون کی گردش عروج پر پہنچ گئی۔ کیا اس چادر کے نیچے سلطانہ تھی؟

اسجے کے حکم پر باقی افراد کمرے سے باہر نکل گئے... تھانے دار محمود بھی چلا گیا۔ اب صرف ڈاکٹر چوہان، اسجے اور میں کمرے میں تھے۔ اسجے کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ ہولے سے بولا۔ ''چہرہ بالکل خراب ہو چکا ہے۔ شاید کلہاڑی کے وار کیے گئے ہیں... دل کڑا کر کے دیکھنا پڑے گا۔''

چوہان نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اسجے نے لاش کے چہرے پر سے خون آلود چادر ہٹائی اور اسے کندھوں تک کھسکا دیا۔ واقعی کچھ نظارے آنکھوں کے لیے سخت اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ میں اندر تک لرز گیا۔ قاتل نے بڑی بے رحمی سے چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ اس نے کلہاڑی وغیرہ سے پے در پے وار کر کے سر اور چہرے کی ہڈیاں چور چور کر ڈالی تھیں۔

کپتان اسجے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''نہیں۔ چہرے سے تو کوئی اندازہ نہیں ہو رہا۔'' میں نے رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

چوہان نے بھی میری تائید کی۔

''کپڑوں سے کچھ پتا چل رہا ہے؟'' اسجے نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں کپڑوں سے بھی نہیں۔''

''لیکن یہ اسی طرح کے کپڑے ہیں جیسے سلطانہ بی بی پہنتی تھی۔'' اسجے بولا۔ اس نے لاش کا چہرہ تو ڈھکا رہنے دیا لیکن پہلو سے چادر ہٹا کر ایک بار پھر مقتولہ کے خون آلود کپڑے ہمیں دکھائے۔

میں نے کپڑوں کو دھیان سے دیکھا۔ یہ اسی طرح کی چیک دار... فراک نما قمیص تھی جو سلطانہ پہنتی تھی۔ زیریں جسم پر تنگ موری کا پاجامہ تھا۔ میں نے ہاتھوں اور بازوؤں کی ساخت دیکھی لیکن ایک بار پھر کوئی اندازہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اسجے بولا۔ ''ابھی تھوڑے سے پہلے سلطانہ بی بی کے پتا مختار صاحب بھی یہاں سے ہو کر گئے ہیں۔''

''وہ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو چند سیکنڈ سے زیادہ دیکھ نہیں سکے۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہیں یہاں سے لے گئے ہیں۔ ویسے انہوں نے بھی پہچانا نہیں ہے۔''

چوہان میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے تابش... کہ سلطانہ تمہاری بیوی ہے۔ بیوی اور شوہر کا رشتہ سب سے نزدیکی ہوتا ہے۔ ایک شوہر کی حیثیت سے تم اسے اس کی کسی جسمانی نشانی کی وجہ سے بھی پہچان سکتے ہو۔'' چوہان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

وہ یوں تو ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اسے بھی معلوم تھا کہ میرا کیس کتنا مختلف ہے۔ پچھلے دو ڈھائی سال کا عرصہ میرے ذہن میں ایک بالکل صاف سلیٹ کی طرح تھا۔ اس پر کوئی نقش کوئی یاد موجود نہیں تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں بے طرح چونک گیا۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن اسجے یا چوہان کے ذہن میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی شاید سلطانہ کے والد کے ذہن میں۔ کبھی کبھی یوں ہو جاتا ہے۔ کسی واقعے پر غور کرتے ہوئے نہایت دانا بینا لوگ بھی بالکل سامنے کے نکتے کو فراموش کر جاتے ہیں۔

میں نے چوہان سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں اس سلسلے میں مدد کر سکتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔''

ہم واپس کمرے میں پہنچے جہاں مسخ لاش رکھی تھی۔ دراصل مجھے کچھ روز پہلے کا وہ خون ریز واقعہ یاد آ گیا تھا جب تل پانی کے نواحی جنگل میں ''کھنڈر چوکی'' پر پانڈے اور اسجے کے بندوں میں زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ سلطانہ نے بھی اس لڑائی میں مردانہ وار حصہ لیا تھا اور ٹیلے پر چڑھائی کرتے ہوئے اس کا ایک پاؤں زخمی بھی ہو چکا تھا۔ یہاں دستی بم کا کوئی چھوٹا ٹکڑا لگا تھا۔

اب یہی زخم سلطانہ کی شناخت بن سکتا تھا۔ میں لکڑی کے بوسیدہ تخت پر پڑی لاش کی طرف بڑھا تو میرے اعصاب چٹخنے لگے۔ یہ بڑا جگر پاش مرحلہ ہوتا ہے۔ چادر اٹھا کر لاش شناخت کرتے ہوئے دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں اور سینے پھٹ جاتے ہیں۔ کیا اگلے چند سیکنڈ میں، میں اس اندوہناک خبر سے آگاہ ہونے والا تھا کہ میری مبینہ بیوی اور بالو کی ماں بھی ہمارے درمیان واپس نہ آنے کے لیے جا چکی ہے۔

میں نے لاش کے خون آلود پاؤں پر سے چادر ہٹائی۔ میری نگاہ دھندلا گئی۔ اس دھندلائی ہوئی نگاہ نے دیکھا کہ لاش کے پاؤں پر زخم نہیں تھا۔ یہ سلطانہ کی لاش نہیں تھی۔

''نہیں چوہان۔'' میں نے بدنصیب مقتولہ کے پاؤں دوبارہ چادر سے ڈھک دیے۔ ''یہ سلطانہ نہیں ہے۔''

چوہان اطمینان کی طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی تو وہ خود بھی اس بات پر بھونچکا رہ گیا کہ یہ بنیادی بات اس کے اور اسجے کے ذہن میں کیوں نہیں آ سکی۔

''شدید ٹینشن میں اس طرح کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔'' اسجے نے کہا۔

میں نے تائید کی اور پوچھا۔ ''یہ لاش ملی کیسے؟''

اسجے نے بتایا۔ ''یہ مکان کافی عرصے سے خالی پڑا ہے۔ مالک مکان نئے شہر میں جا چکا ہے۔ آج دوپہر کو بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ ان کی گیند ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے اندر چلی گئی۔ دو بچے گیند لینے کے لیے اندر گئے تو انہیں یہ تازہ لاش نظر آئی۔ انہوں نے شور مچا دیا۔''

''یہ کسی مسلمان لڑکی کی لاش ہے۔'' چوہان نے کہا۔ ''اور خاص بات یہ ہے کہ یہ جگہ اس گلی سے زیادہ دور نہیں جہاں تین چار دن پہلے بندوا کھاڑے میں ستیش آنند کو گولی لگی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اس قتل کا تعلق اکھاڑے والے واقعے سے ہو سکتا ہے؟''

''یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔'' چوہان نے کہا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میں لاش والے کمرے سے باہر نکل آیا۔ دل کی دھڑکنیں ابھی تک زیروزبر تھیں۔ اگر یہ سلطانہ کی لاش ہوتی تو کیا ہوتا؟ اس کا جواب کافی تکلیف دہ تھا... تو کیا میں لاشعوری طور پر سلطانہ سے وابستگی محسوس کرنے لگا تھا؟ اس کی زندگی اور موت میرے لیے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی؟

لاش میں سے اب ہلکی ہلکی بو اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ میں اس بو سے گھبرا کر باہر گلی میں نکل آیا۔

ایک گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اس کے جسم پر فوجی وردی تھی اور وہ اسجے کے ماتحتوں میں سے تھا۔ یقیناً اس کے پاس اسجے کے لیے کوئی خاص خبر تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اسجے کے پاس پہنچ گیا۔ اس ماتحت نے سیلیوٹ کرنے کے بعد کپتان اسجے کو اطلاع دی۔ ''جناب! شہر کے شمالی برج کے پاس ایک لڑکی کا کھوج لگا ہے۔ وہ ایک چھوٹی بگھی پر سوار تھی اور اسے خود ہی چلا رہی تھی۔ اسے ایک ناکے پر روکا گیا لیکن وہ رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ گنجان علاقے میں چلی گئی اور پھر بگھی چھوڑ کر ایک گودام میں گھس گئی۔ وہ اب بھی اسی تین منزلہ گودام میں ہے۔ ہمارے ساتھیوں نے گودام کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

''تو اس کو پکڑا کیوں نہیں؟'' کپتان اسجے نے چیخ کر پوچھا۔

''اس گودام میں بہت سا آتش گیر مادہ پڑا ہے جی۔ گندھک اور سلفر وغیرہ۔ اگر لڑکی کے پاس کوئی ہتھیار ہے اور اس نے گولی وغیرہ چلا دی تو بڑا مسئلہ ہو جاوے گا۔''

''وہ اکیلی ہے؟'' اسجے نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ہمارے سامنے تو اکیلی ہی اندر گھسی ہے۔ اگر اندر پہلے سے اس کا کوئی ساتھی وغیرہ ہو تو کہا نہیں جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں۔'' اسجے نے کہا۔

تھانے دار محمود کو لاش کے حوالے سے [illegible] ہدایات اور مشورے دینے کے بعد اسجے میرے اور چوہان کے ساتھ فوجی گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھا۔ ہم تیز رفتاری [illegible] پانی کے شمالی علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب [illegible] کے نو بجنے والے تھے۔ زیادہ تر گلیاں اور سڑکیں نیم تاریک دکھائی دے رہی تھیں۔

کہاں تو سلطانہ کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی اور کہاں اب اوپر نیچے اطلاعات مل رہی تھیں۔ راستے میں اسجے نے اپنے ماتحت سے پوچھا۔ ''تم نے لڑکی دیکھی ہے؟''

''جی جناب! لیکن بس ایک جھلک ہی دکھائی پڑی تھی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔ نقاب میں سے بس آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ وہ کافی ہوشیار اور دلیر لگتی ہے جی۔ اس نے سپاہیوں کو اپنے پیچھے کوئی تین میل تک دوڑایا ہے...''

اسی گفتگو کے دوران میں ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ نسبتاً کشادہ علاقہ تھا۔ یہاں درخت وغیرہ بھی تھے۔ دائیں طرف سے تازہ ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ یقیناً اس طرف تل پانی کی بڑی جھیل تھی۔ یہاں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایک سراسیمگی سی پائی جا رہی تھی۔ پولیس اور فوج کے جوانوں نے گودام کی عمارت کو گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ تماشائی دور گھروں کی چھتوں اور بالکونیوں پر موجود تھے۔

اسجے نے بڑی بڑی مونچھوں والے اس پولیس افسر سے بات کی جس نے لڑکی کا تعاقب شروع کیا تھا۔ اس نے دور کونے میں کھڑی ایک چھوٹی بگھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس پر آئی تھی جی۔ ہم نے روکا تو یہ سیدھی نکلتی چلی گئی۔ اس نے کالے رنگ کا برقع پہنا ہوا ہے... اور بالکل نڈر لگتی ہے۔''

''تمہیں یہ کیسے شبہ ہوا کہ یہ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ ہو سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سلطانہ بی بی کے ساتھ اس کا نوعمر بھتیجا بھی ہے۔ ہمارے خیال میں اس بگھی میں بھی ایک لڑکا موجود تھا لیکن وہ راستے میں کہیں اترا اور تنگ گلیوں میں غائب ہو گیا۔''

''کسی نے اس لڑکے کو دیکھا؟'' کپتان اسجے نے

پوچھا۔

''ناہیں، صاف تو ناہیں دیکھ سکے... بس کشمیری دروازے کے پاس اس کی ایک جھلک دیکھی گئی ہے...''

کچھ دیر صلاح مشورہ ہوا۔ میں نے اجے سے کہا۔ ''اگر اندر سلطانہ ہی ہے تو پھر اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ میں اندر جاؤں... اور اکیلا ہی جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے اپنی بات سننے پر مجبور کرلوں گا۔''

''اس کام میں بہت احتیاط کرنا پڑے گی جی۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''وہ کسی کی بات ناہیں سن رہی۔ آتما ہتھیا کی دھمکیاں بھی دے رہی ہے۔''

''کیا کوئی اس سے پہلے گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

موچھیل پولیس افسر نے ایک پٹھان چوکیدار کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ درمیانی عمر کے اس شخص کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ وہ قدرے شرمندہ بھی نظر آتا تھا کہ اس کی موجودگی میں ہی لڑکی گودام کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''بی بی اوپر کی منزل پر دائیں طرف والے کمرے میں ہے جی۔ اس کمرے کا ایک کھڑکی باہر گلی میں کھلتا ہے۔ ام اوپر گیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے ام سے کہا کہ اگر ام آگے آیا تو وہ کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دے گا۔ ام ذرا سا اور آگے گیا تو اس نے اپنا پاؤں کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور کودنے کے لیے ایک دم تیار ہوگیا... وہ بہت خطرناک نظر آرہا ہے جی۔''

''کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ہے اس کے پاس؟'' میں نے پوچھا۔

''ام کھڑے سے کچھ نہیں کہہ سکتا جی۔ اس نے برقع پہنا ہوا ہے۔''

میں نے اجے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں اندر جاتا ہوں۔''

اس معاملے پر تھوڑی سی بحث ہوئی پھر اجے اور چوہان نیم رضامند ہوگئے۔ چوہان نے کہا۔ ''وہ جو کوئی بھی ہے، اسے سب سے پہلے یہ بتا دو کہ یہاں بہت سا آتش گیر سامان پڑا ہے۔ اگر اس کے پاس ہتھیار ہے اور اس نے گولی وغیرہ چلانے کی غلطی کی تو سب کچھ دھماکے سے اڑ جائے گا...''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

جسم میں سنسنی دوڑنے لگی تھی۔ وہی میٹھی میٹھی لہر جو خطرے سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ دیتی تھی۔ گودام میں گہری تاریکی تھی۔ بس ایک دو کمروں میں لالٹین یا گیس لیمپ کی روشنی موجود تھی۔ میں صرف ایک ٹارچ لے کر گودام کے اندر داخل ہوا۔ ایک پستول بھی میرے لباس میں موجود تھا لیکن یہ پستول مجھے صرف اسی وقت استعمال کرنا تھا جب کوئی اور چارۂ کار باقی نہ رہتا۔

گودام کے اندر گھستے ہی مجھے ایک ہال کمرے میں لکڑی کی بہت سی پیٹیاں نظر آئیں... یہاں گندھک کی بو صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں تاریک سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی اور پھر دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے آواز دی۔ ''سلطانہ... سلطانہ... کہاں ہو تم؟''

جواب ندارد۔ میں کچھ اور آگے بڑھا۔ چند آخری سیڑھیوں پر رک کر میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ دائیں بائیں پھینکا۔ کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔ مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں یہاں سے کسی طرح نکلنے میں تو کامیاب نہیں ہوگئی۔ میں نے پھر آواز دی۔ ''تم کہاں ہو؟ میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔ جو تم کہوگی ویسا ہی ہوگا لیکن پتا تو چلے کہ تم چاہتی کیا ہو؟ میری بات کا جواب دو۔ تم کہاں ہو؟''

اس بار بھی جواب میں مکمل خاموشی رہی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ سیڑھیوں پر اور گرد آلود فرش پر پھینکا۔ زنانہ قدموں کے نشان واضح طور پر نظر آئے۔ ان نشانات کا رخ اسی کمرے کی طرف تھا جس کا ذکر پٹھان چوکیدار نے کیا تھا۔ مجھے چوہان والی بات یاد آئی اور میں نے بہ آواز بلند پکار کر کہا۔ ''دیکھو... تم کوئی بھی ہو... ایک بات ذہن میں رکھنا۔ یہاں ان کمروں میں بہت سا بارود پڑا ہے۔ اگر یہاں کوئی گولی وغیرہ چلی یا اس طرح کی کوئی اور بے احتیاطی ہوئی تو سب کچھ ختم ہوسکتا ہے۔ میں بھی بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ تم میرے سامنے آؤ اور بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟''

نیم روشن کمرے میں ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے کسی سے کچھ لینا دینا ناہیں... بس مجھے یہاں سے چلے جانے دو۔ خدا کے لیے...'' اس کی آواز بھرّا گئی۔

مجھے جھٹکا سا لگا۔ یہ سلطانہ کی آواز نہیں تھی۔ یہ کوئی اور تھی لیکن ابھی میرے ذہن میں شک موجود تھا۔ میں آواز دوبارہ سننا چاہتا تھا۔

میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ''ٹھیک ہے لیکن تم سامنے تو آؤ۔''

''مم... میں... سامنے آنا ناہیں چاہتی۔ کچھ لوگوں کی طرف سے... میرے جیون کو خطرہ ہے... وہ مجھے مار دیویں گے۔'' وہ روہانسی ہوکر بولی۔ وہ سلطانہ نہیں تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھ کو جانے دو۔ میں بالکل نردوش ہوں۔ میں بھگوان کی سوگند کھاوت ہوں...''

میں نے سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ کمرے میں اس کا ہیولا نظر آیا۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ وہ ادھ کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور کسی سہمے ہوئے جانور کی طرح لگتی تھی۔ اسے دیکھنے اور اس سے بات کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا رویہ جارحانہ نہیں ہے۔ غالباً اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس خوف زدہ تھی اور اس خوف کی وجہ سے خودکشی کی دھمکی دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز سن کر مجھے لگا کہ وہ خوب صورت رہی ہوگی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا جو وہ خود کو سپاہیوں کے حوالے کرنے کے بجائے اپنی جان دینا زیادہ آسان محسوس کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو، میں تمہیں ہر طرح کی تسلی دیتا ہوں۔ اگر تم بغیر کچھ بتائے یہاں سے جانا چاہتی ہو تو بھی جاسکتی ہو لیکن اگر تم اپنا کوئی مسئلہ بتانا چاہتی ہو تو ہم اس کے لیے بھی حاضر ہیں۔ میں تمہاری مدد کے لیے کسی زنانہ پولیس افسر کو بلالیتا ہوں...''

''ناہیں، میں کسی سے کچھ کہنا ناہیں چاہتی۔ میں بس یہاں سے جانا چاہت ہوں۔''

میں ذرا آگے بڑھا تو وہ ایک دم کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ وہ اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کا سراپا یکسر دھمکی آمیز دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک لڑکی کے عقب میں واقع ایک کھڑکی کے شیشے زوردار چھناکے سے ٹوٹے اور ایک پرچھائیں برق رفتاری سے لڑکی پر جھپٹی۔ لڑکی بلند آواز سے چلائی۔ دونوں اوپر نیچے فرش پر گرے۔ شومئی قسمت، گرتے وقت لڑکی پر جھپٹنے والے شخص کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی گرفت ایک سیکنڈ کے لیے لڑکی پر کمزور پڑی۔ وہ چکنی مچھلی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گئی۔ وہ اندھا دھند کھڑکی کی طرف بڑھی۔ انداز سے عیاں تھا کہ وہ نیچے سے بے پروا ہو کر چھلانگ لگا دے گی۔ میں اس سے تقریباً پانچ میٹر کی دوری پر تھا۔ یہ حتی الامکان تیزی سے حرکت میں آنے کا وقت تھا... اور میں نے حرکت کی۔ اپنی ٹانگوں کی پوری طاقت سے میں نے لڑکی کی طرف ''رش'' کیا۔ یہ سیکنڈ کے ایک مختصر ترین حصے کا کھیل تھا۔ وہ جب کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ چکی تھی، میں نے اسے کمر سے دبوچ لیا اور پھر پلٹ کر کمرے میں پھینک دیا۔ اس کے برقعے کا بالائی حصہ اتر کر دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار سے لٹکی ہوئی لالٹین بھی فرش پر لڑھک گئی۔ لالٹین سے اچھلنے والے تیل نے فوراً آگ پکڑ لی۔ دو کرسیاں دھڑا دھڑ جلنا شروع ہوگئیں۔ یہ سنگین ترین صورت حال تھی۔ ہم بارود کے ڈھیر پر تھے اور چنگاری کے بجائے پورا الاؤ روشن ہوگیا تھا۔ اس الاؤ کی روشنی میں مجھے دو چہرے نظر آئے۔ ایک تو اس شخص کا چہرہ جو کھڑکی توڑ کر لڑکی پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ کپتان اجے تھا۔ دوسرا لڑکی کا چہرہ۔ وہ میری گرفت میں تھی۔ بالائی برقع اترنے سے اس کے بال کھل چکے تھے۔ یہ بہت لمبے بال تھے... غیر معمولی حد تک لمبے۔ میں نے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی... ہرگز نہیں تھی۔ میرے ذہن میں چھماکا سا ہوا۔ میں نے اس حسین لڑکی کی تصویر دیکھی ہوئی تھی۔ اگر میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو یہ شکنتلا تھی۔ باروندا جیکی کی گمشدہ محبوبہ۔ وہ بہت حد تک میری دیکھی ہوئی تصویر سے مل رہی تھی۔

اس بارے میں زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔

''دروازہ بند کردو اجے۔'' میں نے پکار کر کہا۔

اجے خود بھی محسوس کرچکا تھا کہ آگ کو محدود رکھنے کے لیے دروازہ بند کرنا ضروری ہے۔ اس نے لپک کر دروازہ بند کردیا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور دونوں جلتی ہوئی کرسیاں یکے بعد دیگرے کھڑکی سے باہر گلی میں پھینک دیں۔ اجے کا یہ اقدام اس کی حاضر دماغی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ آگ ایک دم سمٹ گئی۔ اگلے چند سیکنڈ میں اجے نے اسے مکمل طور پر بجھا دیا۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی بم کا سلگتا ہوا فیتہ کاٹ کر اسے پھٹنے سے روک دیا جائے۔ اجے کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

لڑکی ابھی تک میرے بازوؤں میں دبکی ہوئی تھی اور خود کو چھڑانے کے لیے اندھا دھند زور لگا رہی تھی۔ اجے کے جوان دندناتے ہوئے سیڑھیوں پر نمودار ہوئے اور انہوں نے مجھ سے برسرپیکار ماہ جبیں کو سنبھال لیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ لمبے ریشمی بال بار بار چہرے کو چھپا رہے تھے۔ وہ چلّا رہی تھی۔ ''چھوڑ دو مجھے... مر جانے دو مجھے...''

میں حالات کی دھماچوکڑی پر حیران ہو رہا تھا۔ ہم یہاں سلطانہ کے شبے میں پہنچے تھے۔ یہ خیال تو ذہن میں موجود تھا کہ جو لڑکی یہاں موجود ہے، شاید وہ سلطانہ نہ ہو... لیکن یہ خیال ہرگز ذہن میں نہیں تھا کہ سلطانہ کی تلاش تو ناکام رہے گی لیکن ایک اور تلاش کامیاب ہوجائے گی۔ اجے اور اس کے ساتھی چھوٹے سرکار کے حکم پر کئی روز سے شکنتلا کو ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے اور اب وہ کسی حد تک مایوس

بھی ہو چکے تھے... لیکن آج سب اس گودام میں بالکل اتفاقیہ طور پر ایک ایسی لڑکی کی سامنے آگئی تھی جو میرے اندازے کے مطابق شگفتلا ہی تھی۔ اس کے غیر معمولی لمبے بال اس کی شناخت کو معتبر کر رہے تھے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں میرا یہ اہم ترین اندازہ درست ثابت ہو گیا کہ آج رات اس گودام میں ہم اتفاقیہ طور پر شگفتلا کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ شگفتلا ساہنی ہے۔

وہ واقعی حسین تھی۔ اس کی خوبرو پیشانی پر پسینا موتیو کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ بند کمرے میں میرے، اجے اور چوہان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ ''میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں جانتی ہوں چھوٹے سرکار اگر مجھ سے ملنا چاہت ہیں تو میری بھلائی کے لیے ہی چاہت ہوں گے... لیکن میں یہ بھی جانت ہوں کہ ان کی یہ کرپا مجھ کو مہنگی پڑے گی۔''

''کیوں مہنگی پڑے گی؟ کیا آپ کو چھوٹے سرکار پر اور ہم سب پر وشواس نا ہیں ہے؟'' اجے نے تنک کر پوچھا۔

''میں وشواس کی بات نا ہیں کرتی... لیکن میں یہ بھی نا ہیں چاہتی کہ آپ لوگن کو میرے کارن کسی آزمائش سے گزرنا پڑے۔ سب جانت ہیں کہ تل پانی میں بھی حکم جی اور جارج کے مخبر سو موجود ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکت ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' اجے نے رعب سے کہا۔ ''آپ کو چھوٹے سرکار کی خاص حفاظت میں دیوان کے اندر رکھا جاوے گا۔''

''کچھ لوگن تو یہ کہت ہیں کہ دیوان کے اندر بھی حکم جی کے بندے موجود ہیں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔ وہ واضح طور پر بہت خوف زدہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ تل پانی میں گمنام رہے۔

''آپ کو ضرورت سے زیادہ ڈرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے افسوس ہے کہ آپ دیوان کی طاقت کا غلط اندازہ لگا رہی ہیں۔'' اجے نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم شگفتلا کو خاص فوجی گھوڑا گاڑی میں سوار کر کے دیوان کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ میری نگاہیں اس کے سراپا پر اور اس کے سیاہ آبشار جیسے طویل بالوں پر بھی تھیں... تو یہ زرگاں کے شاہی محل کا وہ نودمیدہ پھول تھا جس نے بارونداجیکی جیسے مضبوط شخص کو عشق میں دیوانہ کیا تھا... اور کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ میری نگاہوں میں بارونداجیکی کا چہرہ گھومنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ جب میں اسے شگفتلا کی موجودگی کے بارے میں اطلاع دوں گا تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ کہیں وہ شادی مرگ کا شکار تو نہیں ہو جائے گا؟

راستے میں شگفتلا نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ تل پانی میں آنے کے بعد وہ جان بوجھ کر اوجھل ہوئی ہے۔ وہ یہاں ایک متوسط آبادی میں اپنی ایک پرانی سہیلی کی ملازمہ کے پاس قیام پذیر تھی۔ نوراں نامی یہ لڑکی اور اس کا خاوند چینی کے برتنوں پر نقش نگاری کا کام کرتے تھے۔ آج وہ دونوں میاں بیوی شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہوں نے کچھ کام کر رکھا تھا جو بازار میں دے کر آنا ضروری تھا۔ مجبوراً شگفتلا نے نوراں کے ملازم کو ساتھ لیا اور بازار میں برتن دے کر آئی۔ واپسی پر پولیس والے پیچھے لگ گئے۔ شگفتلا ہرگز ان پر اپنی شناخت ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے بگھی دوڑا دی۔ راستے میں جو بندہ خوف زدہ ہو کر بگھی سے اترا، وہ نوراں کا ملازم ہی تھا۔ وہ بھی چینی کے برتنوں پر پھول بوٹے بنانے کا کام کرتا تھا۔ میں نے شگفتلا کی باتوں میں حکم کے خطرناک ہرکارے رنجیت یا غڑے کا نام بھی سنا۔ وہ اس شخص سے خاص طور پر خوف زدہ نظر آتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ میں بارونداجیکی کے پاس اس کے کمرے میں موجود تھا۔ جھروکوں سے باہر چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور پھول مہک رہے تھے۔ دیوان کے کسی اندرونی حصے میں کوئی ستار نواز بڑے بیٹھے سروں میں ستار بجا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی سنگت میں ہارمونیم کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔

جیکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ پہلے سے کمزور نظر آ رہا تھا۔ ''کیا خیال ہے، آج آرام نہ کریں؟'' جیکی نے کہا۔

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے اس طرح کی بات کی تھی۔ ورنہ وہ تو چھٹی کی بات پر آگ بگولا ہو جاتا تھا اور اپنا پسندیدہ فقرہ دہراتا تھا... وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ تم ہڈحرامی دکھاؤ گے تو کچھ بھی حاصل نہ کر سکو گے۔

''کیا بات ہے جیکی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں، ایک دم فرسٹ کلاس ہوں۔ بس دوپہر کو بخار نے چھوٹی سی چھلانگ لگائی تھی اور ایک سو دو سے ایک سو چار پر چلا گیا تھا۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی شرارتیں تو یہ میرے ساتھ کرتا ہی رہتا ہے۔ شام کو کھانے کے بعد کھانسی کا دورہ پڑا اور ناک سے تھوڑا سا خون بھی آیا۔ لگتا ہے کہ خون کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے میرے اندر۔'' وہ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں

بولا۔

”آپ دوا بھی تو نہیں کھاتے ہو۔ حالانکہ...“

”چھوڑو دوست!“ اس نے میری بات کاٹی۔ ”جب دوا کھا کر بھی مرنا ہے تو پھر کیوں نہ دوا کے بغیر ہی یہ گھاٹی پار کرلی جائے۔“

آج وہ واقعی تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت سے کہا۔ ”آپ مرنے کی باتیں نہیں چھوڑو گے اور ہم آپ کو مرنے کے لیے نہیں چھوڑیں گے... آپ جو مرضی کرلو، ہم آپ کو کھینچ کر واپس زندگی کی طرف لے آئیں گے۔“

”بہت مشکل ہے۔“

”آپ خود ہی تو کہتے ہو، مشکل کو آسان کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ میں نے کل ہی انور خاں اور مراد شاہ صاحب سے بات کی ہے۔ ہم آپ کے لیے ایک بہت اچھے ڈاکٹر کا انتظام کررہے ہیں۔ اس جاپانی ڈاکٹر کو مقامی لوگ بہت مان رہے ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم آپ کو اسٹیٹ سے باہر بھی بھجوائیں گے۔“

”اسٹیٹ سے باہر جا کر کیا کرنا ہے؟ میری روح اسٹیٹ کے اندر ہے۔ میں یہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔“

اس نے آتشیں سیال کے کئی تلخ گھونٹ بھرے اور ترنگ میں آگیا۔ تکیہ اپنی کمر کے ساتھ رکھ کر وہ نیم دراز ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنا پسندیدہ نیپالی گیت گانے لگا۔

اس کی آواز دل سوز تھی۔ اس میں درد لہریں لیتا تھا اور ”سوچ کی گہری نیلی جھیلوں“ میں سنہری دھوپ کے اندر یادوں کی کشتیاں ڈولتی تھیں۔

وہ گاتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے رہے۔ وہ چپ ہوا تو میں نے اس کا استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”جیکی! آپ جس کو دن رات یاد کرتے ہو... وہ آپ کے سامنے آجائے تو پھر؟“

”کس طرح؟“ اس نے آنکھیں بند کیے کیے پوچھا۔

”جس طرح کوئی انہونی ہوتی ہے... جس طرح کالی سیاہ رات کے اندر سے سورج نکلتا ہے... جس طرح دم گھونٹنے والا حبس، بارشوں کو کھینچ کر لاتا ہے... جیسے تپتی ریت کے اندر سے چشمہ پھوٹتا ہے۔“

اس نے آنکھیں تھوڑی سی کھولیں اور مجھے قدرے حیرت سے دیکھ کر بولا۔ ”آج تو تم بھی شاعری کررہے ہو۔“

”آپ کی صحبت کا اثر ہے جیکی... لیکن... آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اگر آپ کی شگفتہ ایک بار پھر آپ کے سامنے آجائے تو...“

”ایسی باتیں کیوں کرتے ہو جن سے میرا درد بڑھ کر ناقابلِ برداشت ہوجائے۔“

”میں صرف بات نہیں کررہا۔ میں آپ سے ایک سنجیدہ سوال پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم بُری طرح چونک گیا۔ اس کے میلے کچیلے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ وہ چند سیکنڈ تک تحیر کے عالم میں مجھے دیکھتا رہا پھر لرزاں ہونٹوں کے ساتھ بولا۔ ”کیا... تم نے... اسے کہیں دیکھا ہے؟“

میں نے اس کا اکلوتا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور دبے دبے جوش سے کہا۔ ”ہاں، میرے محترم استاد! میں نے اسے دیکھا ہے... اور دیکھا ہی نہیں... وہ میرے ساتھ ہے... اسی چار دیواری میں... اسی چھت کے نیچے۔“

فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں... وہ ہکلایا۔ ”دیکھو... ایسا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔“

”میں آپ سے مذاق کی جرأت نہیں کرسکتا...“

”تو پھر... یہ کیا ہے؟“

”آپ کی طلب کا صلہ۔ آپ کے دکھ درد کا مداوا۔ آپ کے انتظار میں اتنی شدت تھی کہ کوئی کھنچ کر آپ کی طرف آگیا۔ ہاں جیکی... وہ یہاں ہے۔ ہم نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ آپ کی شگفتہ ہی ہے۔ وہ کئی دوسری عورتوں کے ساتھ زرگاں کے راج بھون سے بھاگ نکلی ہے...“

جیکی پر واقعی شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے راکھ کے ڈھیر تھے۔ اب وہاں عجب سی چمک نظر آنے لگی۔ وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے بیساکھی اپنی بغل کے نیچے رکھ لی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ انتہائی اضطراب سے بولا۔ ”وہ کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ... وہ کہاں ہے؟“

”یہیں پر ہے۔ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی ہے۔“

”تم نے اسے میرے بارے میں بتایا ہے؟“ وہ لرزاں آواز میں بولا۔

”نہیں، ابھی کچھ نہیں۔“

”وہ شگفتہ ہی ہے نا؟ میرا مطلب ہے، تم نے اسے اچھی طرح پہچان لیا ہے نا؟“

”ایک سو ایک فیصد۔“

”مم... مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں... میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ بے تابی کی انتہا کو

چھونے لگا۔

اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ دروازے تک پہنچ کر وہ یک لخت رک گیا۔ اس کے اندر کی چکا چوند جیسے ایک دم تاریکی میں بدل گئی۔ کوئی چیز بجھ گئی اس کے اندر۔ میں نے محسوس کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا ہے۔

وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا تب بے دم سا ہو کر وہیں دہلیز کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ایک کندھا آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ٹیک دیا۔ ”کیا ہوا جیکی؟“ میں نے اس کا دوسرا کندھا تھام کر پوچھا۔

اس کا سر گھٹنوں کی طرف جھکتا چلا جارہا تھا۔ اس نے یہ جھکا ہوا سر نفی میں ہلا دیا۔ تب وہ نقاہت بھری دل دوز آواز میں بولا۔ ”نہیں... تابش... اگر وہ واقعی یہاں ہے تو بھی... میں اس سے مل نہیں سکتا۔ میں ایسی بُری حالت میں اس کا سامنا نہیں کرسکتا۔ ہم نے بہت اچھے دن دیکھے ہیں... جب دونوں خوب صورت تھے۔ دونوں کے چہرے گلاب تھے۔ اب نہیں... اب نہیں... میں اسے اپنی بدبودار... برباد زندگی کا تماشا نہیں دکھا سکتا۔“ اس کی آواز بھیگتی چلی جارہی تھی۔

”آپ ایسا کیوں کہتے ہو جیکی... جو کچھ بھی ہے لیکن آپ جیکی ہو۔ جس طرح آپ نے اسے چاہا ہے، اس نے بھی چاہا ہے۔ اور جو چاہتے ہیں وہ ظاہری حالتوں پر نہیں جاتے۔ وہ جا ہی نہیں سکتے۔“

”نہیں تابش، نہیں۔“ اس نے سر جھکائے رکھا اور اسے مسلسل نفی میں ہلاتا رہا۔ اس کے لمبے جھاڑ جھنکاڑ بال اس کے چہرے پر جھولتے رہے۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ بلب کی روشنی میں جیسے ہر جاندار و بے جان شے محوِ حیرت دکھائی دیتی تھی۔ جھروکوں سے باہر سرو اور سفیدے کے بلند درختوں پر چاندنی اٹکھیلیاں کرتی تھی۔ دیوان کی بلند و بالا بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ رکھوالی کے کتے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جیکی کے سراپا میں ایک نئی طرح کی ترنگ پیدا ہوئی۔ اس نے اپنا گرد آلود سر اٹھایا اور میرا بازو تھام کر بولا۔ ”تابش! میں نے تمہیں آج تک جو کچھ دیا ہے اس کے بدلے میں تم سے ایک چیز... صرف ایک چیز مانگتا ہوں۔ کیا تم... دو گے؟“

”آپ نے جو کچھ دیا ہے جیکی... وہ اَن مول ہے۔ پلیز! آپ اس کو بیچ میں نہ لاؤ۔ آپ صرف یہ کہو کہ آپ کیا چاہتے ہو؟“ میں نے کہا۔

اس نے کانپتے ہاتھ اور ہانپتی سانسوں کے ساتھ وسکی کے دو بڑے گھونٹ لیے۔ وسکی کے قطرے اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں چمکنے لگے۔ وہ نم ناک لہجے میں بولا۔ ”تابش! میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں... لیکن... لیکن اس طرح کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔“

”مگر جیکی آپ...“

”نہیں تابش! اب کچھ نہیں کہنا۔ میں نے یہی چیز تم سے مانگی ہے، یہ مجھے ویسے ہی دے دو، جیسے میں چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔ نہ کوئی دلیل دینا۔ اگر ایسا کرو گے تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میری پہلی اور آخری خواہش پوری نہیں کی۔“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں خاموش رہنے کے سوا اور کچھ نہ کرسکا۔ وہ عجیب موڈ میں تھا۔ اس کے پورے جسم میں ہلکی سی لرزش طاری تھی۔ وہ ہیجانی انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ساری تفصیل پوچھی کہ شگفتہ سے میری ملاقات کیسے اور کیونکر ہوئی۔ میں نے اسے کافی کچھ بتا دیا... پھر ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ وہ شگفتہ کو کہاں اور کیسے دیکھے گا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات کو تفصیل میں جا کر سوچ رہا تھا اور اپنی سوچ میں مجھے بھی شریک کررہا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے میں سب کچھ طے ہوگیا۔ وہ انوکھا تھا اور اس کی سوچ بھی انوکھی تھی۔

پروگرام کے مطابق مجھے کل شام کے وقت جیکی کو اس کمرے میں لے جانا تھا جہاں میں سوتا تھا۔ یہ کمرا سلطانہ کے کمرے کے ساتھ واقع تھا۔ شگفتہ چونکہ سلطانہ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی، لہٰذا جیکی کے لیے ممکن تھا کہ وہ میرے کمرے سے اسے تسلی کے ساتھ دیکھ سکے۔ پروگرام کے مطابق میرے کمرے میں بالکل تاریکی رہنی تھی اور دونوں کمروں کی ایک درمیانی جالی دار کھڑکی کو میں نے تھوڑا سا کھول دینا تھا۔ جیکی کو گاہے بگاہے کھانسی بھی ہونے لگتی تھی۔ اگر کہیں ایسا کچھ ہو جاتا تو وہ کمرے کے ملحقہ غسل خانے میں گھس سکتا تھا۔

اگلی صبح شگفتہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب کافی حد تک نارمل تھی۔ ایک وحشت زدہ ہرنی کی سی کیفیت جو اس کی آنکھوں میں نظر آتی تھی، اب معدوم ہوچکی تھی۔ چھوٹے سرکار سے اس کی ملاقات ہوچکی تھی اور اس نے اپنی گفتگو سے شگفتہ کی تشویش کافی حد تک دور کردی تھی۔ صفیہ سمیت تین ملازمائیں ہمہ وقت شگفتہ کی خدمت پر مامور کردی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ شگفتہ کی اضافی تسلی کے لیے قیام گاہ کے باہر گارڈ بھی بٹھا دیا گیا تھا۔

شگفتہ نہایت نفیس مزاج کی مالک تھی۔ لباس اور خوشبو

وغیرہ کے معاملے میں اس کا انتخاب بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس کی نشست و برخاست میں وہ شاہانہ رکھ رکھاؤ تھا جس کا تعلق یقیناً راج بھون کے ماحول سے تھا۔

شگفتلا میرے بارے میں فقط اتنا جانتی تھی کہ میں ان افراد میں سے ہوں جو ماضی میں بدھا کا مقدس مجسمہ چوری کرنے کے الزام میں پاکستان سے پکڑ کر یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں لائے گئے تھے... اور بعد میں مختار راجپوت کی بیٹی نے خود کو ”راج بھون کی فیری“ بننے سے بچانے کے لیے مجھ سے شادی کرلی تھی۔

وہ پاکستان کے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی۔ خاص طور سے کھلاڑیوں اور اداکاروں کے بارے میں۔ اس نے مجھ سے لاہور، انارکلی، کلفٹن اور موہنجودڑو جیسی جگہوں کے متعلق دلچسپی سے سوالات کیے۔ اپنی ہندی میں وہ انگریزی کے الفاظ بھی روانی سے استعمال کرجاتی تھی۔

وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئی تھی۔ اس کی سفید رنگت میں گلابی پن کی آمیزش تھی اور خدوخال سے خاندانی نجابت جھلکتی تھی۔ راج بھون میں یقیناً اسے حکم جی کی دراز دستیوں اور من مانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اس اکھاڑ پچھاڑ نے اس کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو کچھ زیادہ گہنایا نہیں تھا۔

وہ ذرا کھوئے کھوئے انداز میں میری طرف دیکھنے کے بعد بولی۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ تابش! کیا رات کو یہاں کوئی گا رہا تھا؟“

میں چونک گیا۔ تاہم اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”مہمان خانے کی طرف ہارمونیم بج رہا تھا لیکن گانے کا تو پتا نہیں۔“

”ہارمونیم تو میں نے بھی سنا تھا لیکن... یہ اور آواز تھی۔ اور یہ زیادہ دور سے بھی نہیں آرہی تھی۔“

”کس طرح کی آواز تھی؟“ میں نے تفصیل چاہی۔

اس کے چہرے پر شدید الجھن نظر آئی۔ وہ درودیوار کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کوئی بہت مدھم آواز میں گا رہا تھا۔ پتا نہیں کون سی زبان تھی لیکن... طرز... کچھ سنی ہوئی سی لگتی تھی۔“

”یہاں بہت سے گانے والے ہیں۔ چھوٹے سرکار خود بھی اچھی موسیقی کو پسند کرتے ہیں۔ شام کے بعد اکثر راگ رنگ کی محفل جمتی ہے۔“

”نا ہیں، یہ محفل والا میوزک نا ہیں تھا۔“ وہ بدستور الجھن زدہ تھی۔

میں کچھ دیر تک شگفتلا کے ساتھ موجود رہا۔ ملازمہ صفیہ بھی بالو کو لے کر وہاں آگئی۔ شگفتلا نے بالو کو اٹھا کر پیار کیا۔ وہ سلطانہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے سلطانہ کی ساری روداد معلوم ہوچکی تھی۔ وہ بھی اس خبر پر پریشان تھی کہ سلطانہ کی خطرناک ارادے کے ساتھ دیوان کو چھوڑ چکی ہے۔ شگفتلا کا دھیان بھی سیدھا جارج کی ستم ظریفیوں کی طرف ہی جا رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ سلطانہ، جارج سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گی اور یہ کوشش خود سلطانہ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔

وہ بالو کو پیار کرتی رہی۔ مجھ سے سلطانہ کی تلاش کے بارے میں باتیں بھی کرتی رہی اور صفیہ کو چھوٹی موٹی ہدایات بھی دیتی رہی لیکن اس کے چہرے پر الجھن کی لکیریں موجود رہیں۔

اس کی الجھن کی تہ تک پہنچنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ اس نے کل رات جیکی کو گاتے سنا تھا۔ یقیناً وہ نیپالی گیت پہلے بھی کبھی اس کے کانوں میں پڑ چکا تھا۔ اب وہ آواز اس کے دل و دماغ میں ماضی کا کوئی نقشہ کھینچ رہی تھی۔ یہ تو وہ تصور بھی نہ کرسکتی تھی کہ جیکی زندہ حالت میں یہاں اس چار دیواری میں موجود ہوگا... مگر بھولی بسری آواز نے اسے پریشان ضرور کیا تھا۔

شام کو میں نے ایک بار پھر شگفتلا کو الجھن زدہ حالت میں دیکھا۔ وہ ملازمہ صفیہ کے ساتھ ایک اندرونی روش پر ٹہل رہی تھی۔ وہ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی۔ ایک دو جملے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ صفیہ سے پوچھ رہی تھی۔ ”دیوان کے اس رہائشی حصے میں کتنے گھر ہیں؟“

”دس بارہ تو ہوں گے جی۔ ایک دو بڑی کوٹھیاں بھی ہیں۔“

”یہاں کون کون رہتا ہے؟“

”زیادہ تر تو چھوٹے سرکار اور مراد شاہ جی کے مہمان ہی ہووت ہیں۔ ان میں سے دو چار ایسے بھی ہیں جو زرگاں سے آپ کی طرح جیون بچا کر یہاں پہنچے ہیں۔“ وہ دونوں باتیں کرتے کرتے آگے نکل گئیں۔

صفیہ اور دیگر ملازموں کو جیکی کے بارے میں کچھ خاص معلوم نہیں تھا۔ انہیں بس یہ پتا تھا کہ کوئی سخت بیمار، شرابی شخص یہاں آیا ہے۔ کسی لڑائی میں اس کی ایک ٹانگ اور بازو جسم سے علیحدہ ہوچکے ہیں۔

...وہ شام میرے لیے ایفائے وعدہ کی شام تھی۔ آج میں نے اپنے محسن بار دندا جیکی کے لیے کچھ ایسا انتظام کرنا تھا کہ وہ اپنی گمشدہ محبت کو جی بھر کر دیکھ سکے... پوری تسلی کے ساتھ اس چہرے کا دیدار کرسکے جس کی یاد وہ کئی موسموں سے اپنے فگار سینے میں چھپائے پھرتا ہے۔ شگفتلا مجھ سے وہ ساری روداد پوچھنا چاہتی تھی جب میں جارج گورا کے محل نما گھر سے نکلا تھا اور چھپتا چھپاتا انور خاں وغیرہ تک پہنچا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں شام کو اس کے پاس آؤں گا اور سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔ میرے اس وعدے کے پیچھے دراصل بار دندا جیکی سے کیا ہوا وعدہ ہی تھا۔

شام کے بعد میں تھوڑے سے تناؤ میں تھا لیکن سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہی ہوا۔ میں جیکی کو پہلے ہی ساتھ والے کمرے میں پہنچا چکا تھا۔ شگفتلا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ باتیں تو میرے ساتھ کررہی ہے لیکن اسے دیکھ کوئی اور رہا ہے۔ اس کی آواز، اس کی مسکراہٹ، اس کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز سب کچھ کسی کی بے حد مشتاق نگاہوں کے گھیرے میں تھا۔ آج وہ کچھ زیادہ خوب صورت نظر آرہی تھی۔ شاید یہ شام کچھ زیادہ حسین تھی یا پھر اس کی اپنی ذات کی وجہ سے شام کا حسن بڑھ گیا تھا۔ وہ خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے گلابی آنچل کے نیچے اس کے طلائی جھمکے دمکتے تھے اور اس کی صراحی دار گردن کے پس منظر میں اس کے بے مثال بالوں کا آبشار نظر آتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ دو آنکھیں اس کے سراپا کو پلکوں سے چوم رہی ہیں۔

ہاں... وہ بڑی رومانی شام تھی۔ لیکن اس شام میں جس طرح کا رومان ہو رہا تھا، وہ عام ڈگر سے بہت مختلف تھا۔ کوئی سراپا شوق تھا اور دیکھ رہا تھا۔ کوئی سراپا غفلت تھا اور اسے دیکھا جا رہا تھا۔

ہماری نشست ختم ہونے کے قریب تھی جب قریبی کمرے سے کھانسی کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ یہ جیکی کی آواز ہی تھی۔ کھانسی شروع ہونے کے فوراً بعد اس نے شاید اپنا منہ ڈھانپ لیا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ شگفتلا نے قدرے چونک کر پوچھا۔ اس کے انداز میں بیزاری تھی۔

”کوئی ملازم ہے شاید۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر جالی دار کھڑکی کا آدھ کھلا پٹ بند کردیا۔

کچھ دیر بعد میں شگفتلا سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

☆☆☆

جیکی اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یہ جیکی ہی کا کمرا تھا۔ جیکی کے بیمار جسم کی ہلکی سی باس کمرے میں رچی بسی تھی۔ جیکی کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ ان آنکھوں میں تشکر، خوشی، حسرت اور ممنونیت کے جذبات گڈمڈ تھے۔

”مجھے لگتا ہے کہ اب میرے لیے مرنا اور آسان ہو گیا۔“ وہ شستہ انگریزی میں بولا۔

”آپ پھر وہی بات کررہے ہو... اب تو آپ کو جینے

کی بات کرنی چاہیے اور آپ کو کرنی پڑے گی۔ بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے، اب آپ کو بھی تبدیل ہونا پڑے گا۔ ہم نے اب آپ کو بھلا چنگا کر کے چھوڑنا ہے۔ کل بہت اچھے ڈاکٹر صاحب آپ کو دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔''

اس نے اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کو چھت کی طرف اٹھایا اور کھانستے ہوئے بولا۔ ''میں بہت سا سفر طے کر چکا ہوں۔ اب مجھے واپس بلانے کی باتیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔''

''اب آپ کو واپس آنا پڑے گا جناب... کیونکہ واپسی کی نہایت خوب صورت اور شان دار وجوہات موجود ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اب ایسا نہیں ہو سکے گا تابش! اب تو زندگی کی شام گہری ہو چکی ہے۔''

''یہ شام نہیں تھی جناب! بس بادل تھے جن کی وجہ سے آپ نے دوپہر کو شام سمجھ لیا تھا۔ بہت جلد آپ کی زندگی کا سورج نصف النہار پر چمکے گا۔''

وہ نفی میں سر ہلاتا رہا پھر بولا۔ ''میں ایک بار پھر تمہیں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں غلطی سے بھی شاکن (شگفتہ) کو میرے سامنے مت لانا۔ یہ میرے لیے اتنا ہی سخت ہوگا جیسے ایک ہزار بار جان کنی کے عذاب میں سے گزرنا۔''

میں نے اسے یقین دلایا کہ میری اپنی سوچ جو بھی ہو، میں وعدے کی پابندی کروں گا۔ اس کی مرضی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس رات جیکی نے معمول سے زیادہ پی۔ اس کی کھچڑی خودرو داڑھی تربتر ہو گئی۔ وہ اپنی آنکھیں بہت کم کھول رہا تھا، جیسے وہ شگفتہ کے دیدار کی راحت کو اپنی پلکوں میں محفوظ رکھنا چاہتا ہو۔ مجھے اس کی باتوں سے شک ہو رہا تھا کہ وہ اب کسی طرح یہاں سے نکل جانے کا سوچ رہا ہے... اس کے سونے کے بعد میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ موسم میں اب کافی خنکی آ چکی تھی۔ غالباً ٹھنڈ کی وجہ سے ہی میں بیدار ہوا تھا۔ میں کمبل لینے کے لیے الماری کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب میری نظر کھڑکی سے گزر کر اس رہائشی پورشن کی طرف گئی جہاں جیکی قیام پذیر تھا۔ یہ پورشن باقی حصے سے علیحدہ تھا اور وہاں تک جانے کے لیے ایک خم دار گلی سے گزرنا پڑتا تھا۔ مجھے جیکی کے کمرے کی طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ یہ خلافِ معمول تھا۔ وہ تاریکی میں سونا پسند کرتا تھا۔ میں کمرے سے نکلا۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ بس کہیں کہیں بوجھل آنکھوں والے پہرے دار منڈلا رہے تھے۔ میں خم دار گلی سے گزر کر جیکی کے کمرے تک پہنچا۔ یہ دیکھ کر مجھے شاک پہنچا کہ جیکی کے کمرے کا تالا کھلا ہوا ہے۔ اندر نیلگوں بلب کی ہلکی سی روشنی تھی۔ میں دروازہ کھولنے کے بجائے کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف گیا۔ کھڑکی کے ایک نیم وا پٹ میں سے میں کمرے کا وسطی منظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔ اس منظر نے میرے پاؤں زمین میں گاڑ دیے اور میں جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ میں نے کمرے کی خاموش نیلی روشنی میں شگفتہ کو دیکھا۔ وہ فرش پر دوزانو بیٹھی تھی۔ اس کے بال اس کی گود میں کنڈلی مارے ہوئے تھے۔ شگفتہ کے سامنے جیکی تھا۔ وہ گہرے نشے میں بے سدھ پڑا تھا۔ بس اس کی سانس کی آمدورفت سے پتا چلتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے سنولائے ہوئے جسم پر بس وہی ایک لنگوٹ تھا۔ اس کی ایک ایک پسلی اور ہڈی علیحدہ سے گنی جا سکتی تھی۔ اس کا چہرہ خستہ جانی کی بدترین مثال تھا۔

شگفتہ یک ٹک اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں سے تواتر کے ساتھ پانی کے موتی گر رہے تھے۔ میں تحیر کے عالم میں دیکھتا چلا گیا۔ شگفتہ کے چہرے پر محبت کسی پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ اس کے نازک ننھے جذبات کی شدت سے بے ساختہ پھڑک رہے تھے۔ پھر میں نے ایک اور منظر دیکھا۔ جیکی کی حالت اور بدبو کی پروا کیے بغیر وہ آگے بڑھی۔ جیکی کے سرہانے کی طرف بیٹھ کر اس نے جیکی کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ ''جیکی... جیکی...!'' شب کے جادوئی سناٹے میں اس کی جذباتی سرگوشی گونجی۔ یہ سرگوشی محبت کے اس عظیم رشتے کی گواہ تھی جو بظاہر کچے دھاگے سے بھی کمزور ہوتا ہے لیکن جس کی طاقت دو انسانوں کو اس طرح باندھتی ہے کہ جبر و ستم کی سخت ترین آندھیاں بھی انہیں علیحدہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ حکم اور جارج گورا جیسے ہزار ہا لوگ اس نازک دھاگے کو توڑنے کے لیے ہر زمینی حربہ آزماتے رہے ہیں لیکن ہر بار انہیں منہ کی کھانی پڑی ہے۔ بے شک وہ پیار کرنے والوں کو مارنے میں کامیاب ہوئے لیکن پیار کو نہ مار سکے۔ ہاں... یہ وہی پیار بھری سرگوشی تھی۔

اس نے اپنی حنائی انگلیوں سے اس کے گرد آلود بال سہلائے، اس کے گال تھپتھپائے۔ اسے کئی بار ہولے ہولے جھنجوڑا۔ ''جیکی... جیکی... آنکھیں کھولو۔'' اس نے اس کا سر اپنی بانہوں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کی گھنی زلفوں نے بکھر کر جیکی کا سر اور کندھے ڈھانپ لیے۔ وہ اسے چومنے لگی، ہولے ہولے پکارنے لگی۔ پھر میں نے جیکی کے جسم میں حرکت دیکھی۔ ہڈیوں کا وہ قریب المرگ ڈھانچا بیدار ہو رہا تھا...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

انڈین اسپیشل فورسز کا سابقہ افسر جس نے مجھے کئی چوری پر ... پاکستان سے پکڑ کر یہاں انڈیا میں قیدی بنا لیا تھا۔ انور خان کے رنجیت پانڈے وغیرہ سے مذاکرات ہو رہے تھے تاہم وہ لوگ وقت گزاری کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے دھوکے سے غار پر ہلا بول دیا تاہم انہیں ناکامی ہوئی لیکن ہمارا ایک ساتھی فیروز اس حملے میں مارا گیا۔ اس کے ردعمل کے طور پر اسحاق نے ماریا کی ایک انگلی کاٹ کر پانڈے کو بھیج دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے سات افراد کو رہا بھی کیا گیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے جیکی وہاں سے غائب ہو گیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہمیں گھیر لیا گیا اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور مکیش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے اور ایک جگہ گھنے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ وہاں چوہان اور اسحاق میں بحث چلی کہ میری وجہ سے دشمن ان تک پہنچ جائیں گے۔ یہ سن کر میں خاموشی سے وہاں سے نکل پڑا۔ رات میں نے ایک درخت پر گزاری۔ دوسرے دن چلتے چلتے اچانک مجھے زمین پر بیساکھی کے نشانات ملے اور میں انہیں کھوجتا ہوا بارونده جیکی تک جا پہنچا۔ اس کا اس طرح ملنا میرے لیے حیرت ناک تھا۔ یہ ایک کھنڈر نما چوکی تھی مگر پھر دشمن یہاں بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہاں مقابلہ شروع ہو گیا۔ میں نے بھرپور مزاحمت کی۔ ایک موقع پر میں بے بس ہونے والا تھا مگر پھر چوہان، انور خان اور چھوٹے سرکار کے لشکر وہاں پہنچ گئے اور دشمن کو وہاں سے مار بھگایا۔ اس کامیابی میں سلطانہ نے اہم کردار ادا کیا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے اور جیکی کو تل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ کی ذہنی حالت خراب تھی۔ وہ ننھے بالو سے بھی بے اعتنائی برت رہی تھی۔ پھر مجھے لگا کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ رہی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ ایک دن وہ خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تل پانی پہنچنے والوں میں شگفتہ بھی شامل ہے۔ سلطانہ کے غیاب کے بعد اس کی تلاش جاری تھی۔ تلاش کے دوران ہم سلطانہ کے دھوکے میں شگفتہ تک پہنچ گئے۔ شگفتہ کو دیوان لے آیا گیا۔ میں نے شگفتہ کو جیکی کے بارے میں نہیں بتایا۔ جیکی نے شگفتہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر وہ اسے چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا، سامنے نہیں آنا چاہتا تھا اور اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ شگفتہ کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ مگر ایک رات میں نے وہ منظر دیکھا جسے دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ شگفتہ جیکی کے کمرے میں تھی۔ اس کا سر شگفتہ کی گود میں تھا۔ وہ جیکی کو آوازیں دے رہی تھی۔ وہ گہرے نشے میں تھا۔ پھر میں نے جیکی میں حرکت دیکھی۔ ہڈیوں کا وہ قریب المرگ ڈھانچا بیدار ہو رہا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

شگفتہ نے اسے خود سے جدا کیا۔ تر بتر آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھی دیکھنے لگا۔ بالکل خالی خالی نگاہوں سے ..... جیسے اس منظر کو اپنے کسی حسین سپنے کا حصہ سمجھ رہا ہو۔ پھر ہولے ہولے جیکی کے ہڈیوں بھرے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے اور پھیلتے چلے گئے۔ شگفتہ نے ایک بار پھر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ سسکنے لگی۔ "جیکی! یہ کیا ہو گیا؟ تم کیسے کیا بن گئے ..... جیکی! یہ سب میرے کارن ہوا ہے نا؟ میں ہی تمہاری دوشی ہوں نا؟ جیکی! مجھے بتاؤ، میں ہی دوشی ہوں نا؟"

جیکی خاموش تھا۔ بس کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اُسے جیسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک حقیقی منظر دیکھ رہا ہے۔ میں کھڑکی میں سے ہٹ گیا۔ میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔ حسن و عشق کی جو ملاقات آج میں نے دیکھی تھی، وہ کبھی میرے تصور میں بھی نہ آئی تھی۔ یہ بات سمجھنا اب میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا کہ مضطرب شگفتہ رات کو اِن در و دیوار میں چکراتی رہی تھی اور آخر جیکی کے کمرے تک جا پہنچی تھی۔

..... قریباً ایک گھنٹے بعد میں نے دوبارہ جا کر کھڑکی سے آنکھ لگائی۔ وہ اسی طرح اس کے بدبودار جسم کو اپنی خوشبودار ریشمی آغوش میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ اس کے لیے وقت کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ جیکی کا اکلوتا ہاتھ شگفتہ کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ منظر دیگر لوگ بھی دیکھیں۔ میں نے اس پورشن کی طرف آنے والے تمام دروازے مقفل کرا دیے۔

صبح کے وقت میں نے محسوس کیا کہ جیکی کی سانس رک رک کر آ رہی ہے۔ درحقیقت اس کی طبیعت کل رات سے ہی مسلسل بگڑ رہی تھی۔ اسے فوری طور پر ڈاکٹر کی ضرورت تھی اور جاپانی ڈاکٹر کو دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں پہنچنا تھا۔

میں ڈاکٹر چوہان کے پاس پہنچا۔ اسے ساری صورت حال بتائی۔ وہ بھی تفصیل جان کر حیران رہ گیا۔ وہ اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ آیا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے اور جیکی کو بہ مشکل شگفتہ سے علیحدہ کیا۔ پھر بھی وہ مکمل طور پر علیحدہ نہیں ہوئی۔ اس نے جیکی کا ہاتھ مسلسل اپنے ہاتھ میں رکھا۔ چوہان نے جیکی کے وائٹل سائنز چیک کیے۔ اس کا بلڈ پریشر بہت کم ہو چکا تھا اور نبض ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔

جیکی کی حالت کے پیشِ نظر جاپانی ڈاکٹر لی وان نو بجے ہی دیوان میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک اسسٹنٹ اور ایک بڑا میڈیکل باکس بھی لایا تھا۔

قریباً دو گھنٹے تک جاپانی ڈاکٹر لی وان، جیکی کی حالت کے ساتھ نبرد آزما رہا ..... اس کی مسیحائی سے جیکی

کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ اس کی سانس میں بھی قدرے روانی آ گئی لیکن ڈاکٹر لی وان ابھی پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ مریض ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ خاص طور سے اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔

رات بارہ ایک بجے کے قریب جیکی کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔ شکنتلا نے اسے مسلسل اپنی بانہوں میں لے رکھا تھا۔ اس کا سر شکنتلا کی گود میں تھا۔ وہی اسے دوا وغیرہ بھی کھلا رہی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ جیکی شراب کے سوا کسی اور شے کے لیے منہ کھول ہی نہیں سکتا اور دوا کے لیے منہ کھولنا تو اچھے بھلے لوگوں کے لیے کافی مشکل ہوتا ہے۔ شکنتلا کے کہنے پر جیکی نہ صرف دوا کے لیے منہ کھول رہا تھا بلکہ دوا کو نگل بھی رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر شکنتلا اس کے منہ میں جلتا ہوا انگارہ بھی رکھ دے گی تو وہ بغیر آہ کیے اسے گلے میں اتار لے گا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی مگر جیکی کی حالت میں کوئی خاص بہتری نظر نہیں آئی۔ چوہان ہی کی ہدایت پر دو تین بار شکنتلا نے تھوڑی تھوڑی شراب بھی جیکی کو پلائی مگر لگتا تھا کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ یا تو وہ اتنی کم مقدار میں تھی کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ یا پھر اس کی طبیعت ابتر تھی۔

دوپہر کو چوہان اور میں نے شکنتلا کی بہت منت سماجت کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لے اور کچھ کھا پی لے لیکن وہ تو اپنی جگہ سے ایک انچ سرکنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ شام کو جاپانی ڈاکٹر لی وان نے جیکی کو گلوکوز کی ڈرپ لگائی اور ڈرپ میں کچھ دوائیں بھی انجیکٹ کیں۔ اس سے یہ ہوا کہ جیکی غنودگی میں چلا گیا۔ اس کی سانس بھی کچھ ہموار ہو گئی۔ رات کو ہم نے پھر زور لگایا اور شکنتلا کو ایک دو گھنٹے آرام کے لیے آمادہ کر لیا لیکن وہ کہیں گئی نہیں۔ وہیں جیکی کے کمرے میں ایک گوشے میں سمٹ کر لیٹی رہی۔

میں نے جیکی کا سر اپنے زانو پر لے لیا۔ آج سردی خاصی زیادہ تھی۔ کھڑکیوں کی درزوں میں سے سرد ہوا سرسراتی ہوئی اندر داخل ہوتی تھی۔ جیکی حسب معمول ایک لنگوٹ میں تھا۔ میں نے اس پر ایک کمبل ڈالنا چاہا۔ اس نے اضطراب کا اظہار کیا اور کمبل پیچھے ہٹا دیا۔

پھر اس نے سر کے اشارے سے کہا کہ میں اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی سرگوشی میں بولا۔ ''تم ..... بھی ..... اپنا کمبل اتار پھینکو۔''

میں نے کمبل نہیں لیا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جیکی علامتی یا رمزیہ بات کر رہا ہے۔ مجھے بتا رہا ہے کہ میں بھی جسمانی راحتوں کے حوالے سے اپنا وطیرہ بدلوں۔ وہ پہلے بھی مجھ سے اس موضوع پر بات کرتا رہا تھا۔ آج پھر اس نے اسی موضوع پر چند سرگوشیاں کیں۔ اس نے اٹک اٹک کر بے حد لڑکھڑاتی آواز میں جو کچھ کہا، وہ اس طرح تھا۔ ''...... تن آسانی ہمیں کمزور کرتی ہے۔ ہم جتنی زیادہ جسمانی سختیاں جھیلتے ہیں، اتنے ہی مضبوط اور زور آور ہوتے ہیں۔ افریقا کے ریگستانوں میں جہاں دوپہر کے وقت ریت انگاروں کی طرح دہکتی ہے، جان دار زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح جمی ہوئی برف کے اندر بھی آبی مخلوق سانس لیتی ہے ..... تو پھر ہم کیوں موسموں کا جبر نہیں جھیل سکتے؟ ہم کیوں ..... بھوک پیاس ..... تھکن اور درد سے نہیں لڑ سکتے ..... ایسا ہو سکتا ہے ..... اور جو لوگ ایسا کرنا سیکھ جاتے ہیں ..... کوئی ان سے جیت نہیں سکتا۔''

بات کرتے کرتے اس نے میری طرف دیکھا۔ جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے اس کی پیشانی سہلائی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی سرگوشی جاری رہی۔ ''جو درد، تکلیف اور سختی کا سامنا کرتے ہیں، وہی راحت، خوشی اور فتح کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔ بڑا ہی سادہ فارمولا ہے..... جتنا زیادہ دکھ، اتنی زیادہ خوشی..... جتنی زیادہ تکلیف، اتنی زیادہ کامیابی .....''

وہ دھیرے دھیرے بولتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس کی باتیں میرے دل کے اندرونی تاروں کو چھیڑتی تھیں۔

''کچھ'' تھا اس میں جو وہ مجھے دینا چاہتا تھا..... اور جو کچھ وہ دینا چاہتا تھا اس کے لیے میرے اندر ایک خلا موجود تھا۔

صبح سے کچھ دیر پہلے اس کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ شکنتلا پھر بے چین ہو کر اس کے سرہانے آن بیٹھی۔ اس نے اس کا سر پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔ شکنتلا کا لمس پاتے ہی جیکی جیسے پھر سے جی اٹھتا تھا۔ امید پیدا ہونے لگی تھی کہ وہ بے شمار دیگر مقابلوں کی طرح موت سے یہ مقابلہ بھی جیت جائے گا۔

صبح سویرے ڈاکٹر لی وان بھی آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ

کچھ خاص انجکشن لایا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ یہ انجکشن جیکی کی طبیعت سنبھالنے میں بہت مدد دیں گے۔ اپنی دواؤں میں سے ان انجکشنز کا لی جانا لی وان ایک کرشمہ سمجھ رہا تھا۔

یہ انجکشنز بھی گلوکوز کی ڈرپ کے ذریعے ہی جیکی کی ورید میں انجیکٹ کیے جانے تھے۔ ڈاکٹر لی وان ڈرپ لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ شکنتلا کو موقع سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن وہ تو جیسے جیکی کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ کسی صورت جدا ہونے کو تیار نہیں تھی۔ ابھی ڈاکٹر نے جیکی کو ڈرپ لگائی نہیں تھی کہ اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا مدقوق چہرہ بالکل زرد پڑ گیا اور سانس رک رک کر آنے لگی۔ ڈاکٹر لی وان نے جیکی کے وائٹل سائنز چیک کیے اور وہ بھی پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس نے کہا۔ ''ٹمپریچر بہت شوٹ کر گیا ہے۔ فی الحال ڈرپ نہیں لگائی جا سکتی۔''

''بلڈ پریشر کیا ہے؟'' ڈاکٹر چوہان نے پوچھا۔

''وہ بھی بڑھا ہوا ہے۔'' ڈاکٹر لی وان کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''اسے اسپتال لے جانا پڑے گا۔ یہاں مشکل ہو جائے گی۔ آپ لوگ گاڑی کا انتظام کریں۔ اگر کار وغیرہ ہو جائے تو بہتر ہے۔''

چوہان بھاگتا ہوا باہر گیا اور دو چار منٹ بعد واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کار تو نہیں ملی لیکن گھوڑا گاڑی آ گئی ہے۔

ہم نے ہلکے پھلکے باردندا جیکی کو احتیاط سے اٹھایا اور گاڑی میں پہنچا دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ادھورے جسم کا وزن بیس پچیس کلو سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ ایک آرام دہ قوجی گاڑی تھی۔ چار نہایت توانا گھوڑے اسے کھینچ رہے تھے۔ ہم برق رفتاری سے ڈاکٹر لی وان کے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ اب سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں نشیب و فراز کو روشن کر رہی تھیں۔ بلند عمارتوں کے خوب صورت چوبارے اور عبادت گاہوں کے گنبد و کلس اس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ آرام دہ گاڑی حتی الامکان رفتار سے جا رہی تھی۔ جیکی کا سر شکنتلا کے زانو پر تھا۔ اس نے خود کو پوری طرح جیکی پر جھکا رکھا تھا۔ یکایک جیکی کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ وہ بل کھا کر رہ گیا۔ ڈاکٹر چوہان اور شکنتلا نے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا۔ شکنتلا نے بہ مشکل

باؤلر کے سامنے ایک ایسا بیٹس مین تھا جو بیٹ ہلانے کا قائل ہی نہیں تھا۔ اس کی ہر بال یا تو ساکٹ بیٹ سے ٹکراتی، یا دائیں بائیں سے بغیر کوئی نقصان پہنچائے گزر جاتی۔ تنگ آکر وہ امپائر کی طرف مڑا۔ ”جناب! یہ تو بیٹ استعمال ہی نہیں کر رہا ہے، اس صورت میں کیا یہ آؤٹ نہیں؟“

”نہیں“ امپائر نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اگر یہ بیٹ استعمال کرے گا تو آؤٹ ہو جائے گا۔“

■■■■■■■■■■■■■■

نوجوان بیٹس مین بہت زیادہ نروس تھا۔ یہ محض اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اب بھی کریز پر موجود تھا۔ وہ خفت بھی محسوس کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے پلٹ کر وکٹ کیپر کو دیکھا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھ سے زیادہ خراب کھیلنے والے بھی دیکھے ہوں گے۔“

وکٹ کیپر خاموش رہا۔

بیٹس مین نے اپنی بات دہرائی۔

”میں نے تمہاری بات سن لی تھی۔“ وکٹ کیپر نے جواب دیا۔ ”لیکن میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

اسے ایک گھونٹ پانی پلایا۔ اس نے جیکی کو اپنے سہارے بٹھایا ہوا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور خالی خالی نظروں سے گھوڑا گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر نل پانی کے باغات نظر آ رہے تھے۔ ہم اب آبادی کے مضافات میں تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ جیکی کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹ نیلے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے پہلے میری طرف دیکھا پھر شکنتلا کو اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر شکنتلا نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بہت مدھم آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ شکنتلا بھیگی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کھڑکیوں سے باہر بھی دیکھ رہی تھی۔ پھر شکنتلا نے ڈاکٹر چوہان سے مخاطب ہو کر دل فگار آواز میں کہا۔ ''ڈاکٹر! گاڑی رکوائیے۔''

چوہان چند لمحے تذبذب میں رہا پھر اس نے شاہی کوچبان سے کہا کہ وہ گاڑی روک دے۔ گاڑی رک گئی۔ جہاں گاڑی رکی، وہاں سرسبز کھیتوں کے درمیان دور تک شفاف پانی پھیلا ہوا تھا۔ اس پانی پر عجیب سی نیلاہٹ تھی۔ یہ نیلاہٹ دراصل کنول کے بے شمار

پھولوں کی تھی۔ جیکی نے شاید اس خوب صورت منظر کو دیکھ کر ہی گاڑی رکوائی تھی۔ شگفتا اب سسکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے کوچبان کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا گاڑی اس پانی میں جا سکتی ہے؟

کوچبان نے آگے جا کر پانی کا جائزہ لیا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب وہ روتے ہوئے بولی۔ ''گاڑی کو پانی میں لے جاؤ۔''

ہم سب جان گئے تھے کہ یہ جیکی کی خواہش ہے اور شاید یہ خواہش آخری خواہش کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ بس تھوڑی دیر کا مہمان تھا اور لگتا تھا کہ جاپانی دوشیزہ کنول دان نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے جیکی کی اس انوکھی خواہش کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔

ہم گھوڑا گاڑی سے اتر گئے۔ صرف جیکی اور شگفتا موجود رہے۔ وہاں زمین پر پانی دو تین فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ کوچبان گھوڑوں کو آہستہ آہستہ ہانکتا ہوا آگے تک لے گیا۔ وہاں چاروں طرف سنہری دھوپ تھی اور کنول کے ہزارہا پھول سرما کے اولین جھونکوں میں ہولے ہولے رقص کر رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی سفید بطخ یا مرغابی کی جھلک بھی نظر آجاتی تھی۔ گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ کوچبان گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتا ہوا واپس آ گیا۔

سب کی آنکھیں نم تھیں۔ چمکیلی منقش گاڑی کنول کے ان گنت پھولوں کے درمیان ساکت کھڑی تھی اور اس گاڑی میں شگفتا اور جیکی کے ہیولے نظر آرہے تھے..... جیکی کو وہ کشتی اور وہ جھیل تو نہیں مل سکی تھی جو اس کی سنہری یادوں کا حصہ تھی لیکن اس سے ملتا جلتا منظر ضرور مل گیا تھا..... اور پھر اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ شگفتا کی بانہوں میں تھا۔ ایسا تو شاید کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ ایک عظیم نیپالی فائٹر تھا لیکن اس کے چٹانی جسم کے اندر ایک شاعر کا سا گداز بھی موجود تھا اور یہ شاعر ایک آئیڈیل موت چاہتا تھا۔ ایک خوب صورت الوداعی منظر..... اور یہ سب کچھ اسے مل گیا۔

ہونی ہو کر رہتی ہے اور قدرت کے اصول آسانی سے نہیں بدلتے۔ سورج نصف النہار کے قریب تھا جب جیکی مر گیا۔ چمکیلے پانی کے درمیان اور ہزارہا پھولوں کے بیچ۔ اس کی آخری ہچکی شگفتا کی ریشمی گود میں جذب ہوئی۔ شگفتا کے رونے کی آوازوں سے ہمیں پتا چلا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ہم کنارے سے پانی میں چلے گئے۔

وہ گھوڑا گاڑی کی ایک آرام دہ نشست پر ساکت لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر آسودگی تھی اور نقوش گواہی دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہموار طریقے سے زندگی کی سرحد پار کر گیا ہے۔ چوہان نے اس کا جسم ایک کمبل سے ڈھانپ دیا۔ گاڑی کے اندر سے یہی لگ رہا تھا کہ یہ کوئی جھیل ہے اور ہم کشتی میں بیٹھے ہیں۔

ہم گھوڑا گاڑی کو اس پانی سے باہر لائے۔ شگفتا اب بھی جیکی کے ساتھ پیوست تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ اس نے اپنے جھمکے اتار دیے۔ قیمتی ہار بھی اتار پھینکا۔ اس کے بعد اس نے کسی بیوہ کی طرح اپنی چوڑیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر مار کر توڑ ڈالیں اور ایک سفید چادر سے اپنا سراپا ڈھانپ لیا۔

دل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے ہو

☆☆☆

جیکی کی موت نے مجھے گہری افسردگی کا شکار کر دیا۔ میں اس کمرے میں تنہا بیٹھا رہتا جہاں میں اور جیکی مشق کیا کرتے تھے..... میں چھت سے جھولتے ہوئے سینڈ بیگ کو دیکھتا رہتا اور وہ سارے مناظر میری نگاہوں کے سامنے آتے جن میں جیکی میرے ساتھ تھا..... شگفتا بھی بے پناہ غم کے گھیرے میں تھی۔ وہ ایک کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ صفیہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار بہ مشکل اس کو تھوڑا بہت کھلا دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر یقین یہی لگتا تھا کہ وہ ایک جوان بیوہ ہے۔

ایک دن چوہان میرے پاس آن بیٹھا۔ وہ واسع کے ساتھ مل کر سلطانہ کی تلاش سرگرمی سے جاری رکھے ہوئے تھا۔ تاہم اس سلسلے میں ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ ہم کچھ دیر تک سلطانہ کے بارے میں بات کرتے رہے پھر گفتگو کا رخ حسب معمول جیکی اور شگفتا کی طرف مڑ گیا۔

میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''کاش، ہم کسی طرح جیکی کو بچا سکتے۔''

چوہان بولا۔ ''ہم نے اپنی سی کوشش تو کی ہے تابش! اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو بڑی تیزی سے خرچ کیا..... شاید وہ خود بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔''

''لیکن اگر اسے پتا ہوتا کہ وقت ایک بار پھر اسے شگفتا کے روبرو لانے گا تو وہ موت کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتا۔'' میں نے کہا۔

''مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم آنے والے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں اور یہی نظامِ قدرت ہے۔ بہرحال..... اس بات کا تو اطمینان ہے کہ جیکی کا آخری وقت نسبتاً آسان ہو گیا۔ اس نے اس ہستی کی بانہوں میں جان دی جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھی۔''

میں تصور کی نگاہ سے جیکی کا وقتِ رخصت دیکھنے لگا۔ آخری لمحوں میں جیکی کی خواہش پر ہم نے گھوڑا گاڑی کنول کے پھولوں کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔ وہ دونوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیسے جان دی۔ مگر میرا خیال تھا کہ شگفتا آخری وقت تک اسے چومتی رہی ہو گی۔ اسے اپنی بانہوں کا گداز دیتی رہی ہو گی۔

چوہان بولا۔ ''چلو آؤ، باہر چلتے ہیں۔ آج کئی دن بعد دھوپ نکلی ہے۔ ذرا گھومیں پھریں گے۔''

''اس سے کیا ہو گا؟''

''تمہارا غم ذرا ہلکا ہو گا۔ جیکی کی طرف سے دھیان ہٹے گا۔''

''لیکن میں دھیان ہٹانا نہیں چاہتا۔ میں اسے یاد رکھنا چاہتا ہوں اور وہ سب کچھ یاد رکھنا چاہتا ہوں جو وہ مجھ سے کہہ گیا ہے..... اور وہ بھی جو وہ کہہ نہیں سکا۔''

''کیا کہہ نہیں سکا؟''

''وہ جو اس کی جسمانی حالت کہتی تھی۔ اس کی اجاڑ آنکھیں کہتی تھیں..... وہ بھی ہماری طرح حکم جی اور جارج کا ڈسا ہوا تھا۔ وہ زبان سے نہیں کہتا تھا لیکن جارج کی بے رحمی کے لگائے ہوئے چرکے اس کے سینے میں تو تھے نا۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' چوہان نے سرد آہ بھری۔

''میں اپنا حوصلہ آزمانا چاہتا ہوں چوہان۔'' میں نے گمشدہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میں جارج گورا سے روبرو ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بہت سارے قرض ہیں مجھ پر۔''

''تم جذباتی باتیں کر رہے ہو تابش! جارج کوئی پہلوان نہیں ہے جسے تم للکارو گے تو وہ کشتی لڑنے کے لیے تمہارے سامنے آجائے گا۔''

''وہ ہے پہلوان..... چوہان! ہمیں ماننا پڑے گا کہ وہ فلموں کا کوئی روایتی ولن نہیں ہے جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور صرف اپنے چمچوں کے زور پر دادا گیری کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر یورپین کی طرح خود کو بہت اسمارٹ سمجھتا ہے اور اسے اپنی طاقت کا گھمنڈ بھی ہے۔ میں اس کے اس گھمنڈ کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے میرے سامنے پستول پھینکا تھا اور مجھے دعوت دی تھی کہ میں یہ پستول اٹھا کر اس پر چلاؤں..... تب میں ایسا نہیں کر سکا تھا لیکن اب میرا دل کہتا ہے کہ میں ایسا کر سکوں گا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرا دل سچ کہہ رہا ہے یا پھر اب بھی مجھے دھوکا دے رہا ہے۔''

''جلد بازی نہ کرو تابش! تمہیں خود کو آزمانے کے بڑے موقع ملنے والے ہیں۔'' چوہان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''لڑائی ختم نہیں ہوئی، صرف ٹلی ہے۔ کوئی بھی نیا واقعہ کسی بھی وقت اس آگ کو بھڑکا سکتا ہے۔ تمہیں پرسوں رات والی خبر ملی ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''ابھی یہ خبر پوری طرح پھیلی نہیں لیکن چند گھنٹوں میں ہر ایک کی زبان پر ہو گی۔ کل تزاتت زرگاں میں تین بندے قتل ہوئے ہیں۔ یہ تینوں زرگاں کی جیل کے افسر ہیں اور جارج کے ماتحت۔ ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ جگہوں پر قتل کیا گیا ہے۔ دو کو گھر میں اور ایک کو عیاشی کے اڈے پر۔ ان تینوں بندوں کو بڑی بے دردی سے تیز دھار آلے کے وار کر کے مارا گیا ہے۔ شہر میں سخت خوف و ہراس پایا جا رہا ہے۔''

''کس کا کام ہو سکتا ہے؟''

''زرگاں میں تو عام خیال یہ ہے کہ قاتل وہی ہیں جنہوں نے کچھ دن پہلے جارج کی بہن ماریا کو اغوا کیا اور پھر اپنے مطالبے منوانے کی کوشش کی..... لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ماریا کو اغوا کرنے والوں میں تمہارے اور اسحاق کے علاوہ فیروز اور احمد تھے۔ وہ دونوں تو ختم ہو چکے ہیں اور تم دونوں یہاں تل پانی میں ہو۔''

''تو پھر کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

چوہان خاموش نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں برق سی کوند گئی۔ دھیان سیدھا سلطانہ اور اس کی دو فٹ لمبی تلوار کی طرف گیا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اس کی آنکھیں یاد آئیں..... اور ان آنکھوں میں خاموشی سے کوندتی ہوئی وہ بجلی جو خون کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی تھی۔

میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ”تم صاف کیوں نہیں بتاتے..... یہ کس نے کیا ہے؟“

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”ابھی وشواس سے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جو شک تمہارے ذہن میں آیا ہے، وہ میرے ذہن میں بھی ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کے ذہن میں بھی آئے گا۔ ابھی تک جو اطلاع پہنچی ہے، اس کے مطابق ان تینوں وارداتوں کا کوئی چشم دید گواہ تو نہیں لیکن شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دو افراد کا کام ہے..... اور انہوں نے خاص قسم کی تلواریں استعمال کی ہیں۔“

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سلطانہ واقعی وہاں پہنچ چکی ہو؟“

”ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔“ چوہان نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہو چکا ہے.....“

ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح چوہان کا دماغ بھی گھڑدوڑ کا میدان بن چکا ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔ ”اب کیا ہوگا چوہان؟ اگر وہ واقعی زرگاں میں ہے تو پھر وہ لوگ اسے اور طلال کو وہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔“

”ابھی اس بارے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہے تابش! ابھی تو ان لوگوں کو اپنی پڑی ہوگی..... تین اہم ترین بندے قتل ہوئے ہیں۔ وشواناتھ نام کا جو اسسٹنٹ اپنے گھر کے کمرے میں مارا گیا ہے، وہ پرلے درجے کا عیاش مشہور تھا۔ زرگاں کے بازار حسن میں جو بھی خوب صورت طوائف پیشہ شروع کرتی تھی، اسے پہلے وشواناتھ کے پاس حاضری لگوانی پڑتی تھی۔ اس اصول کی خلاف ورزی کرنے والی طوائف اور اس کے وارثوں پر سخت مصیبت نازل ہوتی تھی۔ کل رات بھی وشواناتھ اپنے بیڈ روم میں ایک نئی لڑکی کو پیشے کا ”اجازت نامہ“ دے رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اتفاقاً اس کے دونوں ملازم نشے میں مدہوش پڑے تھے، اٹھ نہیں سکے۔ وشواناتھ نے پہلے ملازموں کو گالیاں دیں پھر دستک دینے والے کی ایسی کی تیسی کرتا ہوا باہر نکلا۔ نوجوان طوائف زادی کمرے میں انتظار کرتی رہی۔

جب کافی دیر گزر گئی تو وہ ڈرتی ڈرتی باہر نکلی۔ اسے گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے ہی وشواناتھ منہ کے بل پڑا نظر آ گیا۔ اس کے فربہ جسم پر درجنوں زخم تھے۔ لگتا تھا کہ اس کی لاش پر بھی تیز دھار آلے کے وار کیے گئے ہیں۔ اس کا پستول بھی قریب ہی پڑا ہوا ملا ہے۔ شاید آخری وقت میں اس نے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لڑکی روتی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی اور لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دوسری واردات جارج گورا کے گھر کے بالکل پاس ہوئی ہے۔ یہاں بھی جیل کے ایک بڑے افسر اروِن لال کو قتل کیا گیا ہے۔ وہ غسل خانے میں قتل ہوا ہے۔ اس کا گلا پہلے اس کے ازار بند سے گھونٹا گیا۔ پھر تیز دھار آلے کے پے در پے وار کیے گئے۔ اروِن کی بیٹی ساتھ والے کمرے میں بے خبر سوتی رہی۔ تیسرے قتل کے بارے میں ابھی تفصیل سامنے نہیں آئی ہے۔“

ہم کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اگر ہمارا شک درست تھا اور ان واقعات کے پیچھے واقعی سلطانہ اور طلال تھے تو پھر آنے والے دنوں میں حالات کوئی بھی سنگین رخ اختیار کر سکتے تھے۔

میں نے چوہان سے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی کسی طرح زرگاں چلا جاؤں؟“

”لگتا ہے کہ تمہاری سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہے۔ تم جارج تک پہنچنا چاہتے ہو۔“

”اب یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے چوہان..... سلطانہ زرگاں میں ہے۔ وہ جارج کو نشانہ بنانا چاہ رہی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ اس کوشش میں اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔ تو کیا مجھے اس کی مدد نہیں کرنی چاہیے؟ یہاں بیٹھ کر اس بات کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ اپنی جان گنوا لے یا کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو جائے؟“

چوہان مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”ابھی تو یہ سب مفروضے ہی ہیں تابش! ہم ابھی وشواس سے نہیں کہہ سکتے کہ زرگاں میں درحقیقت کیا ہوا ہے..... اور جو کچھ ہوا ہے، اس میں سچ مچ سلطانہ اور طلال ملوث ہیں بھی یا نہیں۔“ اس نے دو لمحے توقف کرکے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ”تابش! میرے خیال میں فی الوقت سوچنے والی جو سب سے اہم بات ہے، وہ کچھ اور ہے۔“

”کھل کر بات کرو۔“

”ہمیں سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اس نظر نہ آنے والی زنجیر کو کیسے کھول سکتے ہیں جو حکم اور جارج نے تمہارے پاؤں میں ڈال رکھی ہے..... میرا مطلب اس مائیکرو چپ سے ہے جو تمہارے جسم میں رکھی گئی ہے۔“

میرے اندر ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ کسی وقت میں واقعی اس اہم ترین نکتے کو بھول جاتا تھا کہ میں آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہو چکا ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں گا، کچھ نادیدہ نگاہیں میرے تعاقب میں رہیں گی اور میری ہر جدوجہد کو ناکام کر دیں گی۔

”تم چاہتے ہو کہ میں آپریشن کے ذریعے وہ چپ اپنے جسم سے نکلواؤں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، یہ بے حد ضروری ہے۔ آئندہ تم نے جو کچھ بھی کرنا ہے تابش، اس کی بنیاد اس بات پر ہوگی کہ تم واقعی آزاد ہو یا نہیں۔ مثال کے طور پر اگر تم اس اسٹیٹ سے نکلنا ہی چاہو تو بھی تمہارے اندر کی یہی چپ تمہارے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بنے گی..... تم ہمیشہ کی طرح لاچار ہو کر رہ جاؤ گے۔“

”لیکن اب تو صورتِ حال بدل چکی ہے، میں یہاں ٹل پانی میں ہوں۔ چھوٹے سرکار اور حکم جی میں پوری طرح ٹھن چکی ہے۔ اگر میں چھوٹے سرکار سے یہ درخواست کروں کہ وہ مجھے یہاں سے نکلنے دیں تو کیا وہ میری درخواست کو رد کر دیں گے؟“

”بات درخواست کی نہیں ہے تابش! شاید تمہیں اس بات کی جانکاری نہیں کہ اسٹیٹ سے باہر جانے والے راستوں پر چھوٹے سرکار اور حکم کی مشترکہ نگرانی ہے اور یہ بڑی سخت نگرانی ہے۔ نکاسی کے راستوں پر موجود ان ساری چوکیوں پر ٹل پانی کے ساتھ ساتھ زرگاں کی سیکیورٹی فورس بھی موجود رہتی ہے۔ دونوں طرف کے اہل کاروں کی مکمل اجازت اور تسلی کے بغیر کوئی شخص سرحد پار نہیں کر سکتا.....“

چوہان نے اس حوالے سے مجھے مزید تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ جنگل میں اپنی بھاگ دوڑ کے دوران میں، میں جابجا پرانی حفاظتی چوکیاں اور مچانیں وغیرہ دیکھ چکا تھا۔ انور خان نے بھی مجھے اس راجواڑے کی سرحدی نگرانی کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر چوہان نے کہا۔ ”میری رائے تو یہ ہے کہ ہم فوری طور پر ڈاکٹر لی وان سے رابطہ کریں اور انہیں اس بارے میں پوری تفصیل بتائیں۔ وہ ایک اچھے سرجن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر وہ تمہارا آپریشن کریں تو وہ کامیاب رہے گا۔“

..... ہم اسی روز رات کو ڈاکٹر لی وان سے ملے۔ اس کا چھوٹا سا اسپتال ٹل پانی کے مضافات میں ایک خوش گوار آب و ہوا والی جگہ پر تھا۔ لی وان کو چھوٹے سرکار اور دیوان کے خصوصی معالج کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ وہ بہت کم لیکن کار آمد بات کرتا تھا۔ اس نے انگریزی میں کہا۔ ”مجھے بارونداجیکی کی موت کا بہت دکھ ہے۔ درحقیقت اس میں کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا۔ ہاں..... اگر وہ چار چھ مہینے پہلے ہمارے پاس آجاتا تو شاید ہم کچھ کر سکتے۔“

”آپ کو پتا ہے کہ وہ اصل میں کون تھا؟“ چوہان نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے چھوٹے سرکار اجیت رائے نے بتایا ہے۔ اور یہ سب جان کر میرے دکھ میں اضافہ ہوا ہے۔ جاپان میں مارشل آرٹ کی قدر دیگر ملکوں سے زیادہ ہے۔ نیپالی فائٹر جیکی کا نام وہاں بھی بہت سنا جاتا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ نامور ہیرو کبھی ایک لاغر مریض کی شکل میں میرے سامنے آئے گا اور لاغر بھی ایسا کہ اس پر حسرت کی نظریں ڈالنے کے سوا اور کچھ بھی نہ کیا جا سکے گا۔“

ہم نے کچھ دیر تک جیکی کو یاد کیا..... پھر چوہان اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے ڈاکٹر لی وان کو میرے انوکھے مسئلے کے بارے میں بتایا۔ حسبِ توقع ڈاکٹر لی وان بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ چوہان کے کہنے پر اس نے میرے سر کے عقبی حصے کو ٹٹول کر دیکھا اور ان اسٹچز کا معائنہ بھی کیا جو میری گدی پر موجود تھے۔ ڈاکٹر چوہان اور ڈاکٹر لی وان انگریزی میں بات کرتے رہے۔ ان کی گفتگو میں میڈیکل کی مشکل اصطلاحات بھی آ رہی تھیں۔

ابتدائی معائنے کے بعد ڈاکٹر لی وان مجھے اپنی لیبارٹری میں لے گیا۔ یہاں ایک چھوٹی ایکسرے مشین اور الٹرا ساؤنڈ کی سہولت بھی موجود تھی۔ ڈاکٹر نے میرے دو تین ٹیسٹ لیے..... اس نے فوری طور پر تو کچھ نہیں بتایا تاہم ہمیں ایک دن بعد دوبارہ آنے کے لیے کہا۔

..... میں اور چوہان تیسرے روز دوپہر کے وقت

پھر لی وان کے شفاخانے پہنچے۔ وہ کچھ خاموش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر چوہان کو الٹرا ساؤنڈ کے پرنٹس دکھائے۔ ایکسرے پر غور و خوض ہوا۔ ایکسرے میں چمکتی ہوئی مائیکرو چپ بالکل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مجھ سے دو چار سوال پوچھنے کے بعد چوہان اور لی وان دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے دس پندرہ منٹ مشورہ کیا۔ مشورے کے بعد وہ باہر آئے اور ڈاکٹر چوہان نے مجھے چلنے کے لیے کہا۔

ڈاکٹر لی وان نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب اچھا ہو جائے گا۔''

راستے میں گھوڑا گاڑی کے اندر چوہان نے مجھے بتایا۔ ''لی وان کا خیال ہے کہ یہ آپریشن یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بہتر سہولتوں کی ضرورت ہے۔''

''کیوں؟''

''وہی بات جس کا ہمیں بھی ڈر تھا۔ تم نے بھی ایکسرے وغیرہ دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر اسٹیل وغیرہ نے چپ پلانٹ کرتے ہوئے پوری پوری خباثت دکھائی ہے۔ یہ چپ تمہاری ریڑھ کے بالائی حصے سے بالکل اٹیچ ہے...... اور تمہیں پتا ہی ہو گا کہ ریڑھ میں ''اسپائنل میرو'' ہوتا ہے جو جسم کا بہت نازک حصہ ہے۔''

''تو پھر؟''

''لی وان کا کہنا ہے کہ چپ کو نکالنا ناممکن نہیں ہے مگر اس کے لیے ایک اچھے نیورو سرجن اور جدید آپریشن تھیٹر کی ضرورت ہے۔''

میں نے لمبی سانس لی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ چپ نکلوانے کے لیے ضروری ہے کہ میں اسٹیٹ سے باہر جاؤں اور باہر جانے کے لیے ضروری ہے کہ میں چپ نکلواؤں۔''

''فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر لی وان رسک لینا نہیں چاہ رہا۔ ورنہ وہ خود بھی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ ایک اچھا سرجن ہے۔ اگر اس کام میں خطرہ محسوس کر رہا ہے تو پھر یقیناً خطرہ ہو گا۔''

''لیکن اگر میں خطرہ مول لینا چاہوں تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ میں لی وان سے ہی آپریشن کرانا چاہوں تو؟''

''میں نہیں سمجھتا کہ لی وان مانے گا۔ ایسے لوگ اپنے پروفیشن سے بڑے کمٹڈ ہوتے ہیں۔ انہیں ایسے معاملوں میں گائیڈ نہیں کیا جا سکتا۔''

گھوڑا گاڑی اب شہر کی گنجان آبادی میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ نیلگوں جھیل پر کشتیاں تیر رہی تھیں۔ کنارے کے لاتعداد مکانوں میں روشنیاں جگمگانے لگی تھیں اور ان روشنیوں کے عکس پانی میں جھلملا رہے تھے۔ کنارے کے سبزہ زاروں میں بچے چہک رہے تھے اور خوش پوش لوگ ہنس کھیل رہے تھے...... یہ دلکش مناظر تھے لیکن میرے سینے میں عجیب سی یاسیت بھرتی جا رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ اترپردیش کے جنگلات میں واقع بھانڈیل اسٹیٹ نہیں ہے، یہ ایک بہت بڑی جیل ہے اور میں اس جیل کی بلند و بالا دیواروں کو کبھی پار نہیں کر سکوں گا۔

یہ بڑے عجیب دن تھے۔ مجھ پر عجیب سی بے حسی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی شروع ہو چکی تھی لیکن میرے جسم پر اب بھی گرمیوں والا لباس ہی رہتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ میں رات کو کمبل یا لحاف بھی نہ لیتا۔ اسی طرح پڑا رہتا۔ یوں لگتا کہ میں جان بوجھ کر اپنے جسم کو اذیت دینا چاہتا ہوں۔ اذیت کا حصول میرے لیے ایک مشغلہ بنتا جا رہا تھا۔ میں بند کمرے میں گھنٹوں سینڈ بیگ سے مصروف رہتا اور خود کو سخت ترین ورزشوں میں غرق کر دیتا۔ میرے پاؤں سوج جاتے، ناخنوں سے خون رسنے لگتا۔ مجھے لگتا کہ میں بے ہوش ہونے والا ہوں لیکن میں رکتا نہیں۔ میرے کانوں میں جیکی کی سرگوشیاں گونجتیں۔ اس نے کہا تھا۔ ''...... جہاں برداشت کی حد ختم ہو جاتی ہے، وہاں سے کچھ حاصل کرنے کی حد شروع ہوتی ہے۔'' میں دیوانوں کی طرح اپنا کام جاری رکھتا پھر نیم جان ہو کر یا چکرا کر گر جاتا۔

میرے جسم پر کوئی زخم لگ جاتا تو میں دوا لگانے کی کوشش بھی نہ کرتا۔ اگر چوہان زبردستی اس پر کچھ باندھ دیتا تو میں موقع ملتے ہی اتار پھینکتا۔ اپنے زخم کو مزید زخمی کرنا بھی مجھے اب اچھا لگتا تھا۔ میرے اندر کچھ زبردست تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ میرا جسم بتدریج تکلیف سہنے کا عادی ہو رہا تھا۔ اب چوٹ میری ہمت کو توڑتی نہیں تھی، میرے اندر کی آگ کو کچھ اور بھڑکاتی تھی۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنے کسی دشمن کا سامنا کروں۔ کوئی ہو جو اپنی تمام تر نفرت کے ساتھ میرے سامنے آئے۔ میں اسے ماروں اور وہ مجھے مار دے۔ کوئی بھی ہو۔ انگلینڈ کا جارج گورا ہو جس نے مجھے خود میری نظروں میں گرایا تھا، زرگاں کا حکم جی ہو جو ایک آسیب کی طرح اسٹیٹ کے باشندوں کے ذہنوں پر سوار تھا یا پاکستان کا سیٹھ سراج ہو جس کے ہاتھوں پر میری مقتول ماں کا خون تھا...... ہاں، کوئی بھی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر جھپٹے اور میں پوری وحشت سے اس کو جواب دوں۔ اسے پتا چلے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور مجھے پتا چلے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

سلطانہ کا ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا۔ ایک ہی رات میں قتل کی تین وارداتوں کے بعد کوئی نیا واقعہ بھی نہیں ہوا تھا۔ حالات میں ایک پُراسرار سی خاموشی تھی۔

ایک دن سردی زیادہ تھی۔ بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ کمروں میں انگیٹھیاں روشن تھیں اور مرد و زن گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں اپنے اندر کی آگ کو بجھانے کے لیے کھلی جگہ پر چلا آیا۔ بارش کی سرد بوچھاڑوں نے مجھے لمحوں میں شرابور کر دیا۔ میں نے بالائی جسم پر فقط ایک پتلی سی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ میرے جسم سے چپک گئی۔ میں چلتا ہوا دیوان کی عمارت سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر بھی میں رکا نہیں اور جھیل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ سخت سردی اور بارش کے سبب ہر طرف سناٹا تھا۔ میں کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ یوں، پانی کی یخ بستہ بوچھاڑوں میں بھاگنا مجھے اچھا لگا۔ شاید میں لاشعوری طور پر اپنی برداشت کو آزمانا چاہتا تھا، اپنا دم خم پرکھنا چاہتا تھا۔ اکثر شام کے وقت میں جھیل کے کنارے کنارے تین چار میل تک بھاگتا تھا لیکن آج کا بھاگنا مجھے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ جس نے مجھے دیکھا، حیرت سے دیکھا۔ میں بھاگتا بھاگتا درختوں کی طرف نکل آیا۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں اور سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی اور یہی کیفیت میرے دل کو بھا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ چند گھڑ سوار میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ جلد ہی میں جان گیا کہ یہ کوئی اور نہیں دیوان کے ہی محافظ تھے۔ جب میں باہر نکلتا تھا، یہ حفاظت کی غرض سے اکثر میرے آس پاس رہتے تھے اور آج تو میں کچھ زیادہ آگے نکل آیا تھا۔

میں گھنے درختوں میں داخل ہوا تو گھڑ سوار میرے قریب پہنچ گئے۔ یہ کپتان اجے کے ہی ماتحت تھے۔ ایک حوالدار نے آگے آ کر کہا۔ ''جناب! آپ زیادہ آگے نہ جائیں۔ موسم بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں تمہارا قیدی نہیں ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم اپنی یہ لعنتی ذمے داری پوری کرتے رہو۔'' میں نے کہا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ گیلا جوتا میرے پاؤں سے نکل گیا۔ میں نے دوسرا بھی اتار پھینکا۔ اب میں ننگے پاؤں تھا۔ میرے تلوے راہوں کی سختی سے آشنا ہو رہے تھے۔ میں انہیں مزید آشنا کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندر خواہش جاگتی تھی کہ میرے پاؤں میں کانٹے ٹوٹیں اور میں دوڑتا رہوں۔

دوڑتے دوڑتے میری سانس ٹوٹ گئی اور ٹانگیں یکسر جواب دے گئیں۔ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ جہاں گرا تھا، وہیں پڑا رہا۔ میں نے اپنا رخ تابڑ توڑ پانی برساتے آسمان کی طرف کر لیا۔ اپنی ٹانگیں اور بازو پھیلا دیے۔ کڑکتی سردی میں برفیلے پانی کی ساری سختی اپنے سراپا پر جھیلنے لگا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میرے نگراں گھڑ سوار مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گئے ہوں گے اور وہیں میرے اٹھنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

لیکن مجھے اٹھنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں وہیں لیٹا رہا۔ بارودندا جیکی کے فلسفے کے مطابق درد میں ڈوب کر درد کی حقیقت معلوم کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے درد، اذیت اور بے سکونی کا احساس کم ہوتا گیا...... یخ بستہ پانی میرے جسم پر اپنا اثر کھونے لگا۔ مجھے غنودگی سی ہونے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں گزری۔ تب اچانک مجھے لگا کہ کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔ میں نے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔ یہ ڈاکٹر چوہان تھا۔ شام کے جھٹپٹے میں وہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اجے کے باوردی حوالدار رب نواز نے اس کے اوپر ایک بڑی چھتری تان رکھی تھی۔ چوہان بولا۔ ''شاباش! یہ کیا حماقتیں کر رہے ہو؟ تم اپنے دشمن آپ بنے ہوئے ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے، ایسے موسم میں اس طرح باہر نکلنے کا؟''

''کیا ہو گا؟ مر ہی جاؤں گا نا؟'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''اپنا نہیں تو ان لوگوں کا خیال ہی کرو جو تم سے وابستہ ہیں۔''

''کون لوگ؟''

''سلطانہ.... تمہارا بچہ....''

''سلطانہ جا چکی ہے.... اور جن بچوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ بھی تو پل جاتے ہیں۔''

''سلطانہ جا تو چکی ہے.... لیکن زندہ ہے۔ اسے کسی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کے بارے میں تازہ اطلاع شاید تم نے نہیں سنی۔''

''کیسی اطلاع؟'' میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند ذرا کم ہوئی۔

''زرگاں والوں نے کھوج لگا لیا ہے کہ جارج کے تین ماتحتوں کو قتل کرنے والی سلطانہ ہی ہے۔''

''کیسا کھوج؟''

''ایک مقتول کی ہاتھوں کی انگلیوں سے کچھ لمبے بال ملے ہیں۔ اس کے علاوہ زرگاں کے ایک بیل گاڑی والے نے گواہی دی ہے کہ واردات کی شام ایک عورت اور ایک لڑکے نے اس کی گاڑی میں سفر کیا ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ عورت، مختار راجپوت کی بیٹی ہی تھی۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''اس سے یہ فرق پڑے گا کہ سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس کی رکھشا کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''اب تک سوچ ہی تو رہے ہیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

چوہان نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور واپس دیوان میں آ گیا۔ راستے میں وہ مجھے مسلسل سمجھاتا رہا۔ میرے طرزِ زندگی کو حماقت قرار دیتا رہا اور میانہ روی کے مشوروں سے نوازتا رہا۔ اس کی باتیں مجھ پر بے اثر تھیں۔ میں کسی اور ہی رنگ میں رنگتا چلا جا رہا تھا۔ قریب المرگ باروندا جیکی کچھ بیج بو گیا تھا میرے اندر اور یہ بیج اب لہلہاتے پودے بن رہے تھے۔

قیام گاہ پر واپس پہنچ کر میں نے چوہان کے بے حد اصرار پر کپڑے بدلے۔ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر ہم دونوں نے چائے پی اور لکھنوی طرز کے کباب کھائے۔ رات نو دس بجے کے قریب چوہان واپس چلا گیا۔ میں نے آتش دان بجھا دیا۔ مجھے ہر طرح کی آسائش سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر تک کھڑکی میں بیٹھ کر رم جھم برستی بارش کا نظارہ کرنے کے بعد میں اپنے بیڈ روم میں پہنچا تو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ میں بے چینی کے اس احساس کو کوئی نام تو نہیں دے سکا تاہم بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے ساتھ والے کمرے میں ایک چھوٹا بلب روشن رہنے دیا تھا۔ اس کی ہلکی نیلی روشنی آنکھوں کو تکلیف نہیں دیتی تھی۔

اچانک وہ بندہ اسٹور روم کے دروازے سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کا سیاہی مائل چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے سگریٹ سلگایا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ میرا پستول ہولسٹر میں تھا اور یہ ہولسٹر دیوار سے لٹک رہا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر اس کی سرسراتی سرگوشی نے میرے قدم روک دیے۔ ''ناہیں، میرے بپو صاحب! جیادہ پھرتی دکھانے کی جرورت ناہیں۔ پستول بہت دور ہے۔ اس سے بہت پہلے آپ کی کھوپڑیا اڑ جائے گی۔'' وہ پھنکارا۔

میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ وہ رنجیت پانڈے تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ رنجیت پانڈے ہے۔ اس سے پہلے سرنگ کے دہانے پر میں نے اس کی ادھوری سی جھلک دیکھی تھی۔ آج وہ پورے کا پورا میرے سامنے تھا۔ وہ کسی گینڈے کی طرح ٹھوس تھا۔ گہری سانولی رنگت کے ساتھ براؤن آنکھیں بہت کم دیکھی جاتی ہیں لیکن اس کی آنکھیں براؤن تھیں اور ان میں دنیا بھر کی خباثت جمع تھی۔ یہ ایک نہایت عیار و سفاک شخص کی آنکھیں تھیں۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ''تو تم ہو پانڈے؟''

''جی بپو صاحب! ہم کھاکسار (خاکسار) کو ہی پانڈے کہوت ہیں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر زہریلے انداز میں کہا۔

''تم یہاں کیسے آئے؟''

اس نے ٹانگیں پھیلا کر اطمینان سے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑا۔ ''آپ جناب نے بڑا پیچ دار سوال پوچھا ہے۔ اس کا جواب تو کئی میٹر لمبا ہے.... مختصر یہ کہوں گا کہ ایسا کبھی ہوا ناہیں ہے کہ آپ کے اس کھاکسار نے کہیں پہنچنا ہو.... اور پہنچ نہ سکا ہو۔ بس یہ دروازے اور دیواریں اسے کھد بکھد رستہ دیتے چلے جاتے ہیں۔''

اس کے کالے ماتھے پر ایک چھوٹا قشقہ تھا جو اس کے کٹر ہندو ہونے کی نشانی تھا۔ میں نے ایک بار پھر کچھ

کرنے کا سوچا لیکن اس کی سانپ جیسی نظریں ایک ساتھ اس پورے کمرے اور کمرے کی ہر شے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ پھر پھنکارا۔ ''ناہیں پپو صاحب! آپ حرکت کریں گے تو گولی چلانا پڑے گی اور آپ کی بدقسمتی یہ ہووے گی کہ میرا نشانہ کبھی کھتا (خطا) ناہیں جاتا۔''

میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے موت ہے اور وہ مجھے ویسا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے پستول اپنی پتلون میں سامنے کی طرف اڑسا ہوا تھا۔ یہ اس کا بے پناہ اعتماد تھا کہ اس نے پستول اپنے ہاتھ میں رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ درجنوں پہرے داروں کی موجودگی میں نہ صرف دیوان کی عمارت کے اندر پہنچا بلکہ میرے کمرے تک بھی پہنچ گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

میں نے اسے نگاہوں نگاہوں میں تولا۔ میرے جسم میں عجیب میٹھا میٹھا سا درد ہونے لگا۔ ایک لہر سی سر کی طرف سے چلی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔ میرا سینہ ہلکے ہلکے جوش سے دھڑکنے لگا۔ رگ پٹھوں میں ایک بے نام حرارت جاگ اٹھی۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ''آپ کے گھر مہمان آیا ہے یہ کمی کمین بندہ۔ کوئی کھاطر تواضع ناہیں کریں گے؟''

''کس قسم کی خاطر تواضع چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''اجی کوئی شراب یا لونڈیا تو ناہیں مانگ رہا۔ بس ہنس کر بات کر دیجیے۔ یہی ہمری کھاطر ہو جاوے گی۔''

''سیدھی بات کرو۔ چاہتے کیا ہو؟'' میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

اس نے میری سنجیدگی محسوس کر کے سگریٹ کے دو طویل کش لیے اور دھوئیں کے گاڑھے مرغولے چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''پپو صاحب! یہ کھاکسار آپ کو لینے آیا ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہووے گا۔''

''کہاں؟''

''زرگاں۔ حکم جی کے پاس۔''

''کیوں؟''

''اس کیوں کے دو تین جواب ہیں پپو جی..... لیکن سب سے کھاص جواب یہ ہے کہ آپ کی پتنی کی ناک میں کوئی بہت زہریلا مچھر گھس گیا ہے۔ اس نے ڈنک بار بار مار کر اس کے بھیجے میں آگ لگا دی ہے۔ اب وہ ہر ایک پر جھپٹے مارتی پھرتی ہے۔ اس جھانسی کی رانی کے گلے میں پتا ڈالنے کا بس ایک ہی طریقہ سمجھ میں آدت ہے۔ آپ جناب کو اپنا مہمان بنا لیا جاوے اور ہم جیسے کمینے دن رات آپ کی سیوا میں مصروف ہو جاویں۔ جب اسے آپ کی سیوا کی ساچار ملے گی تو یقیناً وہ سوچنے پر مجبور ہو جاوے گی۔''

اس کی بک بک اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ جو شیلی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ''اگر میں تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا پپو صاحب..... کہ میں بہت کھاص قسم کا حرامی ہوں۔ بھگوان نے میری آنکھ میں ایک بہت پلید جانور کا بال رکھا ہوا ہے۔ یہ کبھی ہوا ناہیں کہ میں نے آپ جیسے کسی پپو کو مہمان بنانا چاہا ہو اور وہ بن نہ سکا ہو۔ ہاں جی، یہ کبھی ہوا ناہیں۔''

اس نے حیرت انگیز سکون سے دونوں ٹانگیں میز پر رکھیں اور بے پروائی سے رانیں کھجانے لگا۔

''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی ایک مسئلہ ہو تو آپ جناب کو بتاؤں بھی۔ یہاں تو اب مسئلوں کا ڈھیر لگ گیا ہے اور سب سے منحوس مسئلہ تو تمہارا یہ مراد شاہ صاحب ہی ہے۔ خبر ناہیں یہ کس لاپتا بندے کا نطفہ ہے۔ میں تو اس کی حرام کاریوں کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہووت ہوں۔ یہ کچھ برس پہلے اسٹیٹ کی فوج میں ایک معمولی کپتان تھا۔ آج سیاہ سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ اس کی ہوس کسی طرح ختم ہونے میں ناہیں آتی۔ آج یہ راج گدی پر بیٹھنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ اس کے یہ سپنے بس اسی صورت میں پورے ہو سکت ہیں کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے کھون کے پیاسے بن جاویں اور پھر لڑ لڑ کر سورگ باشی ہو جاویں..... اور وہ حرامی جو کچھ کر رہا ہے اسی کارن کر رہا ہے۔''

''تم اپنی زبان کو لگام دو۔ میں مراد شاہ صاحب کے خلاف اب ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔''

''اوہو، غلطی ہو گئی پپو صاحب! مجھے شما کر دیجیے۔ مجھے ایسا ناہیں کہنا چاہیے تھا۔ بے شک میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ مراد شاہ کی شان بیان کرنے کے لیے بالکل بھی کافی ناہیں ہے۔ لیکن کچھ بھی ہے، وہ آپ کا میج بان ہے۔ آپ کی دُم پر تو پاؤں آئے گا ہی۔'' آخری الفاظ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہے تھے تاہم میرے کانوں تک پہنچ گئے۔

''کیا کہا تم نے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ ناہیں۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ شاہ صاحب نے تل پانی کی راج گدی حاصل کرنے کے لیے جو راستہ چنا ہے، وہ کچھ جیادہ ٹھیک ناہیں۔ شاید وہ اپنا دھیرج کھو بیٹھے ہیں اور دونوں بھائیوں کو لڑانے پر تل گئے ہیں۔ لڑائی ہوئی تو بہت جیادہ کھون بہے گا۔ بہت سارے لوگن مریں گے۔ بس چند ایک ہی جندہ بچیں گے۔ چند ایک پر حکومت کرنے کا کیا کھاک مجا آوے گا اپنے شاہ صاحب کو..... وہ جس راستے پر پہلے چل رہے تھے، وہ جیادہ اچھا تھا۔''

''تم کس راستے کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''شاہ صاحب کا راستہ آپ کو ناہیں پتا پپو صاحب! یہ تو بڑا سیدھا سادہ راستہ ہے۔ ایک دم فنٹاسٹک..... جو بھی نجر آوے اس کو پکڑ کر مسلمان بنا دو..... نہ بنے تو لالچ اور دھونس سے کام لو..... پھر بھی نہ مانے تو اس کا جینا حرام کر دو۔ یہاں تل پانی میں یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔ لوگن کو پکڑ پکڑ کر مسلا بنایا جا رہا ہے۔ اور تو اور سنا ہے کہ اپنے چھوٹے سرکار بھی اپنے دھرم کو دغا دینے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ ہو سکت ہے کہ ان سے یہ راج گدی چھن جاوے۔ پھر اس گدی پر اپنی تشریف کا ٹوکرا رکھیں گے اپنے یہی شاہ صاحب..... اور پھر اس کے بعد پتا ہے کیا ہو گا.....؟''

میں سوالیہ نظروں سے پانڈے کا سانولا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

وہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''اس کے بعد شاہ صاحب کی نجریں جمیں گی زرگاں پر۔ وہ زرگاں کو سومنات سمجھ لیوے گا اور محمود گجنوی بن کر بار بار اس کو ڈھانے کی کوشش فرماوے گا۔ بڑا فتور ہے سالے کی نیت میں..... بڑا فتور ہے.....''

میں پانڈے کی صورت دیکھ رہا تھا اور میرے سینے میں انگارے سلگ رہے تھے۔ وہ کش لے کر بولا۔ ''باہر برف کھا ہو رہی ہے۔ کھاصی سردی ہے۔ تم کوئی چادر وغیرہ لے لو۔ ہم کو کافی لمبا سفر کرنا ہے۔''

میرے اندر کی گھٹن میں گھلا ہوا میٹھا میٹھا درد فزوں تر ہو گیا۔ کہیں گہرائی میں ایک انگڑائی سی بیدار ہونے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پانڈے! میں جانتا ہوں کہ تو کمزور شخص نہیں ہے..... اور نا کام بھی نہیں ہے لیکن آج کی رات تو بڑا بدقسمت ثابت ہوا ہے۔''

''کیا مطلب پپو صاحب؟''

''آج تو ایک غلط وقت پر، غلط جگہ پر، غلط شخص کے سامنے ہے۔ کاش! تیرے ساتھ ایسا نہ ہوا ہوتا۔''

اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے اسے توقع نہیں تھی کہ میرے منہ سے ایسی بات سنے گا۔

سگریٹ کی راکھ کباب والی پلیٹ میں جھاڑ کر اس نے طویل کش لیا۔ ''پپو صاحب! آپ بڑی بڑی باتیں کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی نشہ وشہ تو ناہیں کیا ہوا..... یا پھر آپ اس کھاکسار کے بارے میں جیادہ جانت ناہیں ہیں۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کے لہجے میں نیلا زہر اتر آیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے پتلون کی بیلٹ میں سے اپنا کولٹ پسٹل نکال لیا۔ نال کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ وہ کسی ششیش ناگ کی طرح پھنکارا۔ ''میں صرف دھمکاتا ناہیں ہوں پپو..... گولی مارتا ہوں اور میرا نشانہ کھتا ناہیں جاتا۔''

ابھی اس کے الفاظ منہ میں تھے کہ میرے اندر کا سرکش ریلا اچھل گیا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی۔ میرے پاؤں کی ضرب بالکل نشانے پر گئی۔ میرے پاؤں کی ''اپر پام'' نے پانڈے کے پسٹل اور پسٹل والے ہاتھ کو ایک ساتھ نشانہ بنایا۔ کولٹ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر چھت سے ٹکرایا اور ایک الماری کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ میں اندھا دھند پانڈے پر جا پڑا۔ میرا سر پوری شدت کے ساتھ اس کے سینے پر لگا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میرا مد مقابل کوئی عام شخص نہیں ہے۔ اس کے سیاہ جسم میں گوشت پوست کے بجائے جیسے فولاد بھرا ہوا تھا۔ میرے سر کی ضرب سے وہ اچھل کر پیچھے کی طرف گیا اور اس کی پشت دیوار سے ٹکرائی۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ دیوار میں طاقتور اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ وہ جتنی تیزی سے ٹکرایا تھا، اس سے کئی گنا تیزی سے واپس میری طرف آیا۔ اس کا فولادی ہاتھ میرے جبڑے پر پڑا اور آنکھوں میں ستارے سے رقص کر گئے۔ یکا یک وہ کسی مشتعل جانور

کی طرح مجھ پر پل پڑا۔ وہ خالی ہاتھ تھا مگر لگتا تھا کہ اس نے ہتھوڑے پکڑے ہوئے ہیں۔ چند سیکنڈ میں مجھے درجنوں تہلکہ خیز ضربیں اپنے جسم پر سہنا پڑیں۔ میں کئی بار سنگ سرخ کی دیواروں سے ٹکرایا، گرا اور اٹھا.....

اور پھر میرا داؤ چل گیا۔ میں نے اسے ایک ایسی چوٹ لگائی جو کسی فائٹنگ مقابلے میں تو سراسر فاؤل ہوتی لیکن اس دوبدو لڑائی میں بالکل برمحل تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اس کی رانوں کے عین درمیان ٹھوکر ماری۔ وہ تڑپ کر پیچھے کی طرف گیا۔ مجھے اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اگلے تین چار منٹ تک ہم دونوں کے درمیان ایک خطرناک معرکہ ہوا۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے، فرنیچر ٹوٹ گیا اور قیمتی ڈیکوریشن پیسز کمروں کے فرش پر بکھرے دکھائی دیے۔

یہ ایسا پُرزور ہنگامہ تھا کہ ارد گرد موجود ہر شخص ہڑبڑا کر اٹھا اور موقع کی طرف لپکا۔ ان میں کئی مسلح پہرے دار بھی تھے۔ وہ رنجیت پانڈے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے مگر میں نے دہاڑتے ہوئے انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ میں پانڈے سے دوبدو لڑنا چاہتا تھا۔ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ میری وحشت نے پانڈے جیسے خطرناک مدمقابل کو بھی ٹھٹکا دیا ہے۔ وہ جو مجھے ”چوچو“ کہہ کر اپنے اندر کے گھمنڈ کا اظہار کر رہا تھا، اب چونکا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی گرے پتلون کی جیب میں سے چمک دار پھل کا چاقو نکال لیا۔ اس کے چاقو کے دو جان لیوا وار میں نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر روکے۔ اس کے بعد اس کرسی سے اسے اندھا دھند دھکیلتا ہوا برآمدے میں جا گرا۔ میں دہاڑ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے خالی ہاتھوں سے پانڈے کو پھاڑ کر رکھ دوں۔ لیکن فولاد کو ہاتھوں سے پھاڑنا بھی تو ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ایک سخت جان فائٹر تھا۔ میری ضربیں سہہ رہا تھا اور ان سے بچنے کی کامیاب کوشش بھی کر رہا تھا۔ اچانک پانڈے کا داؤ چل گیا۔ اپنے سینے پر میری ٹانگ کھا کر وہ برآمدے کی ایک دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہاں دیوار پر بجلی کا ”ڈی پی“ لگا ہوا تھا۔ مین سوئچ بھی موجود تھا۔ اس نے پھرتی سے مین سوئچ آف کر دیا۔ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔

”دیکھو..... پکڑو۔“ ایک دم بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔

پھر کوئی پہرے دار کربناک انداز میں چلّایا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کسی نے ہوائی فائر کیے۔ کوئی ٹارچ لینے کے لیے بھاگا۔ ”تم کہاں ہو تابش؟“ چوہان کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں ٹٹولتا ہوا مین سوئچ کی طرف گیا اور اسے آن کر دیا۔ ایک دم قرب و جوار روشن ہو گئے۔ بیرونی دروازے کے پاس ایک پہرے دار تڑپ رہا تھا۔ چاقو کے وار نے اس کے پیٹ کو اس طرح چاک کیا تھا کہ انتڑیاں باہر آ گئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس شخص نے بے جگری کا مظاہرہ کیا تھا اور تاریکی میں اندازے سے پانڈے پر جھپٹا مارنے کی کوشش کی تھی۔

دیوان میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ زبردست سرگرمی نظر آ رہی تھی۔ پانڈے کی تلاش میں پہرے دار ہر طرف دوڑے پھر رہے تھے۔ دیوان کے بیرونی گیٹ کے پاس ہوائی فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ رکھوالی کے کتوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔

اجے کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنے ماتحتوں سے مخاطب تھا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی اندر ہی ہو۔ باہر نکلنے کے رستے ”سیل“ کر دو۔“

انور خاں بولا۔ ”بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ کچھ بھی کر جائے گا۔“

اجے کی ہدایت پر دو بڑے گھڑ سوار دستے تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف گئے۔ انہیں آس پاس کی آبادی کا محاصرہ کرنا تھا۔ یہ احساس ہر چہرے کو دہشت زدہ کر رہا تھا کہ پانڈے جیسا خطرناک بندہ اس وقت دیوان کے آس پاس یا دیوان کے اندر موجود ہے۔

میرے منہ سے خون رس رہا تھا۔ ایک پاؤں پر بھی شدید چوٹ آئی تھی۔ چوہان نے مجھے ٹٹول کر دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور الماری کے پیچھے گرا ہوا رنجیت پانڈے کا سرکاری پستول نکال لیا۔ اور پھر وہ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ پانڈے موقع سے غائب ہو گیا تھا مگر جاتے جاتے اپنی سفاکی کا انمٹ ثبوت دے گیا تھا۔ ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ چوہان اور میں لڑکھڑا کر رہ گئے۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ میں نے ایک کمرے کے دروازے کو اڑ کر برآمدے میں گرتے دیکھا۔ بارود کی بُو ناقابلِ برداشت تھی۔ ہر طرف سے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں نسوانی آوازیں بھی تھیں اور یقیناً شگفتہ اور ملازمہ صفیہ کی آوازیں بھی ان میں شامل تھیں۔

”یہ کیا ہوا چوہان؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے خیال میں بم بلاسٹ ہے۔“ چوہان کی آواز جیسے کہیں دور سے میرے سیٹیاں بجاتے کانوں میں پڑی۔

ہم دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ یہاں دل دوز مناظر تھے۔ اجے کے کم از کم پانچ ماتحت لاشوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ کسی کا بازو غائب تھا، کسی کی ٹانگ۔ کئی افراد شدید زخمی تھے۔ ان میں سے کچھ آہ و بکا کر رہے تھے۔ لاشوں میں مجھے اجے کا ماتحت حوالدار رب نواز بھی نظر آیا۔ اس کے سر کا ایک حصہ صاف اڑ چکا تھا۔

”اوہ خدایا..... یہ کیا ہو گیا؟“ چوہان نے لرزاں آواز میں کہا۔

”یہ اسی حرامزادے کا کارنامہ ہے۔ وہ جاتے جاتے یہاں کوئی ٹائم ڈیوائس رکھ گیا ہے۔“ اجے پھنکارا۔

”اگر یہاں ایک ڈیوائس ہے تو اور بھی ہو سکتی ہے۔“ چوہان نے کہا۔

چوہان کے اس فقرے نے سراسیمگی میں اضافہ کر دیا۔ اہل کار خوف زدہ نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگے۔ زخمیوں کو نکال کر سب اس جگہ سے دور ہٹ گئے۔ میرے جسم میں آگ روشن تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ حکم اور جارج کے سفاک اہل کار پانڈے نے ان تین عہدے داروں کی موت کا انتقام لیا ہے جنہیں چند روز قبل زر گاں میں قتل کیا گیا تھا..... تو کیا آگ، خون اور بدلے کا کھیل شروع ہو چکا تھا؟

☆☆☆

اگلے تین چار گھنٹے میں سب کچھ واضح ہو گیا۔ اس بات کا شبہ تو ہر ذہن میں موجود تھا کہ تل پانی میں اور دیوان کی عمارت کے اندر بھی زر گاں کے جاسوس موجود ہیں۔ آج یہ بات پوری طرح ثابت ہوئی تھی۔ رنجیت پانڈے نہ صرف دیوان میں داخل ہوا تھا بلکہ ایک سنگین واردات کے بعد صاف نکلنے میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ پانڈے کے ساتھ ہی دیوان کے دو اہم ترین پہرے دار بھی غائب تھے۔ ان میں سے ایک ہندو اور دوسرا مسلمان تھا۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ پانڈے انہی دو افراد کی مدد سے دیوان میں داخل ہوا اور بعد ازاں صاف بچنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

میرے رہائشی پورشن کے اسٹور میں سے ایک دراز قد عورت کا سیاہ برقع بھی ملا۔ معلوم ہوا کہ دیوان میں داخل ہوتے وقت پانڈے اسی برقعے میں تھا۔ اس کے علاوہ اسٹور میں ہی پلاسٹک کی ایک دستی ٹوکری بھی ملی جس میں چند کیلے اور سیب وغیرہ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پانڈے، دھماکا خیز مواد اس ٹوکری میں رکھ کر اندر لایا تھا۔ صورتِ حال واضح ہونے کے بعد دیوان میں فوری طور پر کئی گرفتاریاں ہوئیں اور بہت سے لوگوں کو شاملِ تفتیش کیا گیا۔ عام لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جا رہا تھا۔ اکثر کا تاثر یہی تھا کہ جارج گورا اور حکم نے ان تین ہلاکتوں کا جواب دیا ہے جو زر گاں میں ہوئی ہیں۔ انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھی سیکیورٹی انتظامات کو ناکام بنا کر دیوان میں گھس سکتے ہیں اور لوگوں کو مار سکتے ہیں۔

میری اور پانڈے کی لڑائی کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں نے ٹانگ چلا کر اس کے ہاتھ سے کولٹ پسٹل چھڑایا تھا۔ یہ بڑا زوردار وار تھا اور اس وار کا بہت سا صدمہ میرے پاؤں کو جھیلنا پڑا تھا۔ پسٹل اور پاؤں کے تصادم سے پاؤں کا بالائی حصہ سوج گیا تھا اور نیلا پڑ گیا تھا۔

اگلے روز صبح تک پورا پاؤں سوج گیا اور چلنا مشکل ہو گیا۔ صبح سویرے چوہان اور انور خاں میرے پاس آئے۔ انور خاں نے جوشیلے انداز میں کہا۔ ”برادر! تم تو راتوں رات مشہور ہو گئے ہو۔ ہر زبان پر تمہارا نام ہے۔ پانڈے اس اسٹیٹ میں دہشت کی علامت ہے۔ تم نے نہ صرف اس سے دوبدو مقابلہ کیا ہے بلکہ اسے بھگانے میں بھی کامیاب رہے ہو۔“

”لیکن وہ جاتے جاتے ایک زبردست چوٹ تو ہمیں دے گیا نا۔ چھ بے گناہ لوگوں کی موت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

انور بولا۔ ”اس کا صدمہ تو ہر ایک کو ہے لیکن اس بات کی خوشی بھی ہے کہ پانڈے جیسا شخص جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، یہاں سے چوٹیں کھا کر گیا ہے اور یہ چوٹیں ایسے بندے نے لگائی ہیں جو چند مہینے پہلے تک کسی شمار قطار میں ہی نہیں تھا۔ پانڈے کو لگنے والی ان چوٹوں کا اثر آئندہ حالات پر پڑے گا۔ چھوٹے سرکار بھی تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے کل رات مجھے بلایا تھا اور تمہارے سارے کوائف معلوم کیے تھے.....“

مجھ پر عجیب سی بیزاری طاری تھی۔ میں انور خاں اور چوہان کی باتیں سن تو رہا تھا لیکن مجھے ان میں کسی طرح کی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ دونوں جلد یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ مجھے اکیلا رہنا اچھا لگتا تھا۔ شاید میں آدم بیزار ہوتا جا رہا تھا۔

چوہان میرے پاؤں کی چوٹ کے بارے میں فکر مند تھا۔ اس نے کوئی دینو جیسی قسم کی دوا میرے پاؤں پر لگائی اور بڑی احتیاط سے پٹی باندھ دی۔ اس نے مجھے گرم پانی کی ٹکور کا مشورہ دیا اور یہ ہدایت بھی کی کہ میں پاؤں لٹکا کر نہ بیٹھوں۔ اس نے مجھے کھانے کے لیے چند گولیاں دیں اور بتایا کہ یہ پین کلر ہیں۔

چوہان کے جانے کے بعد میں نے پین کلر گولیوں کو ہتھیلی پر رکھا..... یہ گولیاں درد کو افاقہ دیتی تھیں لیکن "بتانے والا" مجھے بتا گیا تھا کہ درد سے افاقہ گولیاں کھانے سے نہیں ملتا، درد کا سامنا کرنے سے ملتا ہے۔ میں نے وہی کیا جو کرنا تھا۔ میں نے گولیاں پھینک دیں اور تھوڑی دیر بعد وہ پٹی بھی اتار پھینکی جو چوہان باندھ کر گیا تھا۔ میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں میرا سینڈ بیگ جھول رہا تھا۔ مضروب پاؤں جیسے منوں بھاری ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے درد کا علاج درد سے ہی کرنا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ دانتوں پر دانت جمائے۔ پھر مضروب پاؤں سے ایک ضرب سینڈ بیگ پر لگائی۔ بے ساختہ ایک دردناک کراہ ہونٹوں سے نکل گئی۔ پورا جسم اذیت سے جھنجھنا اٹھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ میں دیوانہ وار، زخمی پاؤں سے سینڈ بیگ پر ضربیں لگاتا چلا گیا۔

..... رات کو چوہان میرے پاؤں پر پھر پٹی باندھ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ "اپنے دیوانے پن میں تم خود کو تباہ کر لو گے۔"

"تباہ تو ہونا ہی ہے۔ کیا تم مجھے اپنی مرضی سے تباہ بھی نہیں ہونے دو گے؟" میں نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں۔"

"کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ پہلے بھی مرنے کے لیے جگہ ڈھونڈ رہا تھا، اب بھی ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"بہر حال، ایک بات میں تمہیں پھر بتا دینا چاہتا ہوں۔ دوبارہ اس قسم کی حماقت کرو گے تو پاؤں کی ہڈی میں کوئی فریکچر بھی ہو سکتا ہے..... اور ممکن ہے کہ پہلے سے کوئی ہیئر لائن فریکچر موجود ہو جو مزید خراب ہو جائے۔"

اس دفعہ اس نے پٹی باندھتے ہوئے بہت ساری کاٹن بھی پاؤں پر رکھی تھی۔ پٹی کرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ بلاسٹ میں مرنے والے ایک اور شخص کی آخری رسوم آج ادا کی گئی ہیں۔ لوگوں میں بہت طیش پایا جا رہا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں میں..... کیونکہ مرنے والے زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ اس نے کہا کہ نئی آبادی میں لوگوں نے آج ایک ٹھاکر کی حویلی کو آگ لگا دی ہے۔ ٹھاکر اور اس کے گھر والے غائب ہیں۔ لوگوں کو شبہ ہے کہ دیوان میں گھسنے سے پہلے رنجیت پانڈے نے اس ٹھاکر کی حویلی میں چند گھنٹے گزارے تھے۔

چوہان پٹی کو آخری گرہ دے رہا تھا جب انور خاں اور اسحاق تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی خاص خبر لائے ہیں۔

انور خاں نے آتے ہی کہا۔ "حکم کا دستِ راست موہن کمار قتل ہو گیا۔ رات کو کسی نے اسے سوتے میں ذبح کر دیا۔"

"کب..... کیسے؟" چوہان نے پوچھا۔

"پرسوں رات..... لیکن یہاں آج خبر پہنچی ہے۔ قتل کرنے والے نے اس کا سر دھڑ سے علیحدہ کر دیا اور اس کے پاؤں کی طرف رکھ دیا۔ زرگاں میں سخت خوف پایا جاتا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ بھی سلطانہ اور اس کے بھتیجے کا کام ہے۔ اس بار واردات کی جگہ پر لوگوں نے انہیں پکڑنے کی کوشش بھی کی۔ اس کوشش میں تین چار بندے سخت زخمی بھی ہوئے ہیں۔ ایک کی حالت نازک بتائی جاتی ہے۔ اسے گولی کا زخم آیا ہے۔"

"اوہ خدایا! اب کیا ہو گا؟" چوہان نے کہا۔

"حالات تیزی سے خراب ہو رہے ہیں۔ کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی ہے۔ دوسری طرف سلطانہ کے پکڑے جانے کا امکان بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کہا جا رہا ہے کہ وہ اس خونی واردات کے بعد قریبی جنگل میں گھسی ہے۔ حکم کے سیکڑوں سپاہی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا اندیشہ ہمارے ذہنوں میں بہت پہلے سے موجود تھا۔ سلطانہ جس انداز میں یہاں سے غائب ہوئی تھی، اس سے کوئی اور مطلب لیا ہی نہیں جا سکتا تھا اور اب نتیجہ سامنے آ رہا تھا۔ موہن کمار کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ شخص حکم کے نہایت قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ یہی شخص تھا جو مجھے اور سلطانہ کو چھوٹے سرکار کی پناہ سے نکال کر واپس زرگاں کی نحوست میں لے گیا تھا۔

اسحاق نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آج ہمارے ساتھی فیروز کی روح کو سکون ملا ہو وے گا۔ وہ زندہ ہوتا تو آج اپنے دوست ہارون کے قاتل کا انجام جان کر ضرور جشن مناتا۔"

یہ مکافاتِ عمل کی ایک جھلک تھی۔ چند ماہ پہلے چوڑے جبڑوں والے کرخت چہرہ موہن کمار نے اپنے ایک وفادار ماتحت کو قتل کر کے ڈراما رچایا تھا۔ مقتول ہارون کی موت کا الزام سلطانہ پر دھر کر وہ اسے زرگاں واپس لے گیا تھا اور سمجھا تھا کہ اس کارنامے کے بدلے حکم جی اس پر ترقی اور منزلت کے نئے دروازے کھول دے گا لیکن اس سے پہلے ہی اس پر موت کا دروازہ کھل گیا تھا اور وہ اپنے ادھورے ایجنڈے سمیت اس میں داخل ہو گیا تھا۔

..... اسی دوران میں ایک باوردی سپاہی اندر آ گیا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد انور خاں کو بتایا کہ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ اسے یاد کر رہے ہیں۔ انور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ کوئی خاص قسم کی گفتگو ہونے والی ہے۔"

یہ واقعی خاص گفتگو تھی۔ اس کے موضوع کا پتا مجھے شام کے بعد چلا۔ شگفتہ کو ہلکا بخار تھا۔ میں اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے رہائشی پورشن میں آیا ہوا تھا۔ وہ ایک سفید ساڑی میں غم اور الم کی تصویر بنی لیٹی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے آنسو تو خشک ہو گئے تھے، وہ کسی وقت ہنس بول بھی لیتی تھی لیکن اس کے اندر جو چوٹ آئی تھی، وہ دکھ بن کر اس کی آنکھوں سے چھلکتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر ہلکان ہو جاتی تھی کہ جیکی اس کی وجہ سے برباد ہوا۔ چند دن کی خوشیوں کے عوض وہ مسلسل مصائب کا شکار ہوا اور پھر جواں عمری میں ہی خاک کے نیچے جا سویا۔

میں شگفتہ کا دل بہلانے کے لیے اس سے باتیں کر رہا تھا جب چوہان اندر داخل ہوا۔ اس نے نئی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ "وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ حکم اور جارج کے لوگوں نے سلطانہ کو ایک ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا ہے۔ طلال بھی سلطانہ کے ساتھ ہے۔ وہ کسی بھی وقت پکڑے جا سکتے ہیں۔"

یہ پریشان کن خبر تھی۔ میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ چوہان کو جو کچھ پتا تھا، اس نے بتا دیا۔ وہ بولا۔ "موہن کمار کے قتل کے بعد جب سلطانہ اور طلال نے بھاگنا چاہا تو پہرے داروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ طلال نے فائرنگ کی۔ اس میں دو بندے زخمی ہوئے۔ ایک کو معمولی اور دوسرے کو شدید زخم آیا۔ پھر طلال کے پستول میں گولی پھنس گئی۔ سلطانہ اور طلال نے اپنی چھوٹی تلواریں نکال لیں اور خود کو گھیرنے والوں کو بے دریغ زخم لگائے۔ اس افراتفری میں وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے پاس گھوڑے تھے۔ موہن کمار کے پہرے داروں اور عام لوگوں نے گھوڑوں پر ان کا پیچھا کیا۔ ایک رات پہلے بارش ہوئی تھی اس لیے جنگل میں سلطانہ اور طلال کا کھرا ڈھونڈنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ قریباً آٹھ گھنٹے کے تعاقب کے بعد ان دونوں کو انگریزوں کے زمانے کے ایک ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا گیا ہے....."

چوہان کی گفتگو سے پتا چل رہا تھا کہ سلطانہ اور طلال سخت مصیبت میں ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمارے درمیان اس معاملے میں طویل تبادلہ خیال ہوا۔ اسی دوران میں اسحاق، انور خاں اور اسج بھی آ گئے۔ یہ کمرا ایک کانفرنس روم کی شکل اختیار کر گیا۔

اسج نے بتایا۔ "چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب پل پل کی صورتِ حال پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سلطانہ اور طلال کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ایک بڑا قدم ہو وے گا۔ یہ قدم اٹھانے سے پہلے وہ اپنے مشیروں اور ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہیں گے۔ ہو سکت ہے کہ کل چھوٹے سرکار ایک بڑی میٹنگ بلائیں جس میں طریقہ طے کیا جاوے۔"

"لیکن اندازہ ہو رہا ہے کہ سلطانہ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ کل یا پرسوں تک حکم کے درجنوں لوگوں کو خود سے دور رکھ سکے گی؟"

"ہاں، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔" اسج نے کہا۔ "لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ یہ ایک بڑا قدم ہو وے گا۔

اس کے بعد یقیناً تل پانی اور زرگاں میں لڑائی چھڑ سکت ہے۔ یہ چھوٹے سرکار کی مجبوری ہے کہ وہ ایسی کسی کارروائی سے پہلے ذمے دار لوگن کو اعتماد میں لیں۔''

انور خاں نے اسج سے پوچھا۔ ''برادر! تمہارے خیال میں چھوٹے سرکار کے ذہن میں کیا چل رہا ہے ... وہ کیا کارروائی کر سکتے ہیں؟''

''ان کے ذہن میں دو تین تجویزیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بڑے دستے کے ساتھ ان لوگن پر حملہ کیا جاوے جنہوں نے ریسٹ ہاؤس کو گھیر رکھا ہے۔ انہیں تتر بتر کر دیا جاوے اور یوں سلطانہ اور طلال کو وہاں سے نکلنے کا موقع مل جاوے۔ سلطانہ اور طلال کے پاس وہی سات ایم ایم کی طاقتور رائفل ہے جو طلال نے مدن لال کے اسلحہ اسٹور سے لوٹی تھی۔ یہ رائفل ان کے بہت کام آسکت ہے......''

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں، میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ میرا دل اور دماغ گواہی دے رہے تھے کہ سلطانہ کو فوری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر قاعدے ضابطے کی کارروائیوں میں وقت ضائع کر دیا جاتا تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

جب میٹنگ برخاست ہوئی تو میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ رات کے آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ ٹھنڈ پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ بلندی پر سے تل پانی کی روشنیاں دور تک دکھائی دیتی تھیں۔ جھیل میں ان روشنیوں کا جھلملاتا ہوا عکس یوں دکھائی دیتا تھا جیسے چمکیلے پیراہن والی جل پریاں رقص کر رہی ہوں۔ جھیل کی تاریک سطح پر کہیں کہیں روشنی کے ہنڈولے سے متحرک تھے۔ یہ کشتیاں اور بجرے وغیرہ تھے۔ سرِشام تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، اب بھی یہ کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔

میں دیوان سے نکل آیا۔ اپنے اندر کی بے قراری کو کم کرنے کے لیے میں حسبِ معمول جھیل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ شروع میں ہوا سرد لگی لیکن پھر جسم گرم ہوتا چلا گیا اور پسینا آنے لگا۔ سانس تیزی سے چلنے لگی۔ یہ مشقت مجھے لطف دینے لگی۔ دیوان سے نکلتے ہی کچھ لوگ میرے پیچھے ہو لیے تھے۔ یہ چھ عدد گھڑ سواروں کا وہی نگران دستہ تھا جو دیوان خانے سے باہر میرے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ پہلے اس دستے کا سالار حوالدار رب نواز ہوتا تھا۔ اب وہ تو دیوان میں ہونے والے بم دھماکے کا شکار ہو چکا تھا۔ لمبے قد کے ایک اور حوالدار نے اس کی جگہ لے لی تھی۔

یہ نگرانی مجھے ہمیشہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتی تھی اور آج یہ جھنجلاہٹ ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ میرے دماغ میں کچھ اور طرح کی ہلچل تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں تل پانی سے نکلنا چاہتا ہوں اور کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچنا چاہتا ہوں تو اس کے لیے مجھے سب سے پہلے ایک صحت مند و توانا گھوڑے کی ضرورت ہے۔ دیوان کے اندر بے شمار گھوڑے تھے۔ اصطبل ہر قسم کے جانوروں سے بھرا پڑا تھا مگر میں دیوان کے اندر سے گھوڑا لے کر نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر میں ایسا کرنا چاہتا تو فوراً چھوٹے سرکار یا مراد شاہ صاحب کو خبر کر دی جاتی۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ میں دیوان سے باہر آنے کے بعد کسی گھڑ سوار کا گھوڑا چھینوں..... یا پھر کسی گھوڑا فروش یا سائیس سے گھوڑا خریدوں۔ یہاں اسٹیٹ میں انڈین کرنسی ہی چلتی تھی۔ میرے پاس معقول رقم موجود تھی۔ یہ چھوٹے سرکار نے بذریعہ اسج مجھے جیب خرچ کے طور پر بھجوائی تھی۔ یہ رقم میرے لیے کوئی بھی اچھا جانور فوری طور پر خریدنے کے کام آسکتی تھی۔

مجھے اسحاق سے معلوم ہوا تھا کہ پرانے اور نئے شہر کے سنگم پر ''فیروزہ دروازے'' کے سامنے ایک بڑا مویشی خانہ ہے جو دن رات کھلا رہتا ہے۔ وہاں سے کوئی شخص کسی بھی وقت رقم دے کر جانور حاصل کر سکتا ہے۔

میں فیروزہ دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن نگران دستہ کراماً کاتبین کی طرح میرے ساتھ تھا۔ یہ لوگ مجھ سے قریباً 100 میٹر کا فاصلہ رکھتے تھے۔ تاہم ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی وقت مجھے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ آج میں ان کی یہ کوشش ناکام بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے فیروزہ دروازے کی طرف جانا تھا اور کسی بھی نگران کے بغیر جانا تھا۔

جھیل کے ایک نواحی راستے پر بھاگتا بھاگتا میں دفعتاً گنجان آبادی کی طرف مڑ گیا۔ بازار ابھی کھلے تھے۔ بیشتر دکانیں گیس لیمپس اور جنریٹرز کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں..... آج ہندو برادری کا کوئی تہوار بھی تھا۔ اکثر جگہوں پر دیے روشن تھے اور پرشاد وغیرہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ کہیں کہیں بھجن گانے والوں کی ٹولیاں بھی نظر آتی تھیں۔ مختلف پکوانوں کی خوشبو اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ گھڑ سوار دستے نے مجھ سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کر دیا تھا۔ جب میں زیادہ بارونق علاقے میں داخل ہوا تو حوالدار اور اس کے دو ساتھی گھوڑوں سے اتر آئے اور پیدل ہی میرے پیچھے چل دیے۔ مجھے ان کے اس طرح پیچھے آنے سے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ ایک بار تو جی چاہا کہ واپس پلٹوں اور ان کے منہ توڑ دوں۔ انہیں اس قابل ہی نہ چھوڑوں کہ وہ اپنی منحوس نظریں مجھ پر جمائے رکھیں۔ مگر یہ اضطراری سوچ تھی۔ وہ حکم کے بندے تھے اور انہیں وہی کرنا تھا جو انہیں کہا گیا تھا۔

سیدھا چلتے چلتے میں تیزی سے ایک چھوٹی گلی میں داخل ہوا اور اپنے نگرانوں کو چکمہ دینے میں کامیاب رہا۔ یہ کپڑے کی دکانوں کا ایک تنگ سا بازار تھا۔ کچھ دکانیں بند ہو رہی تھیں، کچھ ہنوز جگمگا رہی تھیں۔ خوش لباس مرد و زن خریداری میں مصروف تھے۔ میں اس تنگ بازار سے گزر کر دوسری طرف نکل آیا۔ یہاں مٹھائی اور کھلونوں وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ایک طرف گھوڑا گاڑیاں کھڑی کرنے کا بہت بڑا احاطہ تھا۔ سو دو سو قدم چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اپنی ''نگرانی'' سے واقعی پیچھا چھڑا لیا ہے۔

میں نے ایک ادھیڑ عمر عطر فروش سے مقامی لب و لہجے میں پوچھا۔ ''جناب! آپ مجھے فیروزہ دروازے جانے کا راستہ بتا سکت ہیں؟''

عطر فروش نے جو اپنے لباس سے مسلمان نظر آتا تھا، اگال دان میں پان کی پیک تھوکی اور رومال سے ہونٹ صاف کر کے بولا۔ ''جی سیدھا چلتے جایئے۔ پہلے چوراہے سے دائیں طرف مڑ جایئے۔ آگے دو مینار والی مسجد آوے گی۔ وہاں کسی سے پوچھ لینا، وہ بتا دیوے گا۔''

میں شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ بازار بارونق تھا۔ کہیں پاس سے کبابوں کی زبردست خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ انڈیا کے کئی علاقوں کی طرح اس راجواڑے کے لوگ بھی چٹ پٹے پکوانوں اور تہواروں میلوں کے شوقین ہیں۔ میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اچانک ٹھٹک گیا۔ میں نے اپنے سامنے صرف بیس پچیس قدم کے فاصلے پر اپنے نگران حوالدار کو دیکھا۔ اپنے دراز قد کی وجہ سے وہ مجھے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یقیناً مجھے ہی تلاش کر رہا تھا۔ اس کی نظر سے بچنے کے لیے میں تیزی سے ایک مندر کے ادھ کھلے دروازے میں گھس گیا۔

یہ ایک بڑا مندر تھا۔ تہوار کی وجہ سے اندر کافی لوگ نظر آرہے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے وغیرہ بھی تھے۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں، خوشبوئیں سلگ رہی تھیں اور پرشاد تقسیم ہو رہا تھا۔ میں ہجوم میں چلا گیا۔

''یہ تم کیا کرت ہو بھائی؟'' ایک خشک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ مندر کا ایک چاکر خشمگیں نظروں سے میرے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بے دھیانی میں، میں جوتوں سمیت اندر آگیا تھا۔

''اوہو..... شما چاہتا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا اور احاطے کے کنارے پر جوتے اتار دیے۔

چاکر بدستور الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ سر پر رومال رکھا اور پرارتھنا کرنے والے انداز میں دُرگا دیوی کی مورتی کے سامنے جا بیٹھا۔ جونہی میں نے پرارتھنا کا انداز اختیار کیا، میری دائیں جانب بیٹھا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص بُری طرح چونک گیا۔ وہ اپنے حلیے سے سکہ بند کٹر ہندو نظر آتا تھا۔ ماتھے پر قشقہ تھا اور سر پر بالوں کی ایک بڑھی ہوئی لٹ بھی تھی جسے بودی کہا جاتا ہے۔ وہ سفید دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ اس کے چونکنے اور دیکھنے کے انداز نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ شاید وہ مجھے پہچانتا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ چالیس پینتالیس سال کی ایک عورت، ایک بڑھیا اور ایک جوان سال عورت بھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ بھی مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔

مجھے پرارتھنا کا صحیح طور طریقہ تو معلوم نہیں تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک دو بار ماتھا ٹیکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اٹھتے ہی ادھیڑ عمر شخص اور اس کے گھر والے بھی اٹھ گئے۔ بس بڑھیا اپنی ناتوانی کی وجہ سے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ادھیڑ عمر شخص میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں اندیشے کلبلانے لگے۔ اگر وہ مجھے ایک مسلمان کی حیثیت سے پہچانتا تھا تو اس بھرے پُرے مندر میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

ادھیڑ عمر شخص نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بیٹھی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''تمہارا شبھ نام بیٹا؟''

''گو..... گوپال۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

ادھیڑ عمر شخص کا ہاتھ بدستور میرے کندھے پر دھرا رہا۔ وہ بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہمری ماتا جی ہیں اور یہ ہمری دھرم پتنی ہیں شانتی اور

یہ بہو ہے مالا۔"

دونوں عورتوں نے بڑی عقیدت سے مجھے پرنام کیا۔ میں نے بھی جواب دیا۔

ادھیڑ عمر شخص بولا۔ "میرا نام رام پرشاد ہے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ "کیا ہم کہیں دو گھڑی بیٹھ کر بات کر سکت ہیں؟"

"در.... دراصل میں ذرا جلدی میں ہوں۔ آپ.... کیا کہنا چاہت ہیں۔"

اس نے دبے دبے جوش کے ساتھ میرا کندھا دبایا اور بولا۔ "اگر بھگوان نے ہمیں یہاں، اس پوجا کے کمرے میں ملایا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے.... بہت خاص وجہ ہے۔"

رام پرشاد کی پتنی بولی۔ "ہاں بیٹا! یہ بڑی شبھ گھڑی ہے کہ تم ہمیں یہاں ملے ہو۔ بھگوان نے چاہا تو اس میل کے کارن بہت بھلائی کا کام ہووے گا۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ فرش پر بیٹھی بوڑھی عورت بھی اپنی عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے مجھے مسلسل دیکھے چلی جارہی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اس کے پاس جھکا تو اس نے میرا سر چوما اور کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ تشکر کے انداز میں کچھ بڑبڑانے لگی۔

"تمرے ساتھ کوئی اور تو ناہیں ہے؟" رام پرشاد نے پوچھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بولا۔ "چلو پھر آؤ ہمرے ساتھ۔ گھر جا کر سکون سے بات کرت ہیں۔"

وہ مجھے لے کر مندر کے بغلی دروازے کی طرف آگیا۔ اس کے گھر والے بھی ساتھ تھے۔ اسی بچاسی سال کی بڑھیا کو رام پرشاد کی بہو سہارا دے کر لارہی تھی۔ بغلی دروازے کے سامنے ہی ایک بڑی شان دار گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ سفید وردی والا کوچبان گاڑی کے پاس ہی موجود تھا۔ رام پرشاد اور اس کی فیملی کو دیکھ کر وہ ایک دم مؤدب ہو گیا۔

میں نے سوچا، یہاں آس پاس حوالدار اور اس کے ساتھی موجود ہیں۔ مجھے کم از کم یہاں سے تو نکلنا چاہیے۔ میں رام پرشاد اور اس کی فیملی کے ساتھ اس شان دار گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کھڑکیوں پر مخملی پردے تھے اور نشستیں کسی مرسیڈیز کی طرح آرام دہ تھیں۔

"پریشان ہونے کی ضرورت ناہیں۔" رام پرشاد نے کہا۔ "واپسی پر تم جہاں کہو گے، یہ گاڑی بان تم کو چھوڑ آوے گا۔"

گاڑی کے اندر بھی ایک سنہری طاق میں لکشمی دیوی، درگا دیوی اور رام کرشن وغیرہ کی مورتیاں موجود تھیں۔ رام پرشاد کی پتنی نے پرارتھنا کے انداز میں کئی بار مورتیوں کے سامنے ہاتھ جوڑے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "بیٹا! ہم کو پوری آشا تھی کہ تم آؤ گے۔ جو کام صرف تم کر سکت ہو، وہ کوئی اور بھلا کیسے کرتا۔ بھگوان کے ہر کام میں کوئی بھید ہووت ہے۔"

اب مجھے اس معاملے میں کچھ دلچسپی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے خود کو پرانی کہانیوں کے اس کردار کی طرح محسوس کیا جو اتفاقاً صبح سویرے سب سے پہلے کسی شہر کے دروازے میں داخل ہو جاتا ہے اور شہر کے لوگ اسے پکڑ کر کوئی خاص ذمے داری سونپ دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے یہی طے کر رکھا ہوتا ہے۔

گاڑی دھیمی رفتار سے شہر کے بازاروں سے گزر رہی تھی۔ مجھے ایک جگہ ایک گھڑ سوار فوجی نظر آیا۔ میں نے پہچان لیا، یہ حوالدار کے ساتھیوں میں سے تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے بالکل سامنے سے گزرنے والی شان دار گاڑی کے اندر اس کا "مطلوب" موجود ہے۔ جلد ہی گاڑی کھلے راستوں پر آگئی اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" میں نے رام پرشاد سے پوچھا۔

"زیادہ دور ناہیں۔ ہمرا گھر پاس ہی ہے۔"

"لیکن.... میں آپ کے کیا کام آسکت ہوں؟" میں نے مقامی لہجے میں پوچھا۔

رام پرشاد کے بجائے اس کی پتنی شانتی بولی۔ "تم ہمرا ناہیں بھگوان کا کام کرو گے۔ اس کام کے لیے بھگوان نے ہی تمہیں چنا ہے۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور سیاہ آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے لہجے میں مذہبی جوش و خروش تھا۔ اور بات صرف شانتی ہی کی نہیں تھی، لگتا تھا کہ یہ پوری فیملی ہی کٹر قسم کے خیالات رکھتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد گھوڑا گاڑی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئی اور پھر ایک حویلی کے اندر چلی گئی۔ کوچبان نے جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ میں نیچے اتر آیا۔ رام پرشاد کی والدہ کو سہارا دے کر نیچے اتارا گیا۔ وہ اپنی بہو اور پوتے کی بیوی کے ساتھ اندر چلی گئی۔ میں اور رام پرشاد حویلی کی نشست گاہ میں آبیٹھے۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اندر کا ماحول وہی تھا جو ہندی فلموں میں ہوتا ہے اور خالص ہندوانہ رہن سہن کی عکاسی کرتا ہے۔ طاقوں میں جابجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں سجی ہوئی تھیں اور دیے روشن تھے۔ دیواروں پر آویزاں پینٹنگز میں بھی یہی رنگ ڈھنگ تھا۔ ہندومت میں لاتعداد دیوی دیوتا ہیں۔ کسی وقت تو ایسا لگتا ہے کہ ہر جان دار و بے جان چیز کو دیوی دیوتا کا روپ دے دیا گیا ہے۔

ہم نشست گاہ میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک پنڈت جی آموجود ہوئے۔ ان کی عمر ساٹھ ستر کے قریب تھی۔ ایک چرمی بیگ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے بھی مجھے توجہ اور دلچسپی سے دیکھا۔ میرا شانہ تھپکا۔ میرا نام، تاریخ پیدائش اور وقت وغیرہ پوچھا۔ یہ سب کچھ ایک کاغذ پر لکھا اور باہر چلے گئے۔

میری الجھن بڑھتی جارہی تھی۔ میں جلد از جلد اس صورت حال کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر رام پرشاد صورت حال پر کوئی بات کرنے کے بجائے میری خاطر تواضع میں لگ گیا۔ پہلے پھلوں اور مربہ جات سے تواضع کی گئی پھر بھوجن پر اصرار کیا جانے لگا۔ میں بہ مشکل انہیں روک پایا۔ میں نے کہا۔ "انکل....! سب سے پہلے میری الجھن دور کیجیے۔ آپ مجھے اس طرح یہاں کیوں لائے ہیں؟"

رام پرشاد نے کہا۔ "میں تمہیں سب کچھ بتاوت ہوں لیکن اس سے پہلے ایک دو میرے سوال بھی ہیں۔"

"جی پوچھیے۔"

اس نے میرے کوائف دریافت کیے۔ یعنی میں کہاں رہتا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ بیاہتا ہوں یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں ان سوالوں کے جواب ذہن میں پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ میں نے اپنی رہائش چاچا عبدالغنی والے محلے میں بتائی۔ میں نے اسے بتایا کہ فیروزہ دروازے کے پاس میری کپڑے کی دکان ہے۔ میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ رہتا ہوں اور غیر شادی شدہ ہوں۔

وہ میرے جوابات سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آگیا۔ اس نے کہا۔ "گوپال پتر! اس سنسار میں دھرم سے بڑی کوئی شے ناہیں اور دھرم کا پالن ہم سب کا فرض ہے۔ جب دھرم دروہی لوگن کوئی غلط کام کرت ہیں تو پھر یہ دھرم پریمیوں کا ہی کام ہوتا ہے کہ وہ ان کا سامنا کریں اور دھرم کی رکھشا کریں۔ میں لمبی چوڑی تمہید باندھنا ناہیں چاہت ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ہمرے راجواڑے میں کچھ لوگن دھرم کو نشٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل بھگوان سے یدھ چھیڑنے جیسا ہے۔ یہ لوگن ایک ایسے اپرادھی کو جیون دے رہے ہیں جس کی کم از کم سزا موت ہے۔ ہم تو دھرم کے ادنیٰ چاکر ہیں۔ ہمری سمجھ بوجھ معمولی ہے لیکن بڑے پنڈت مہاراج تو جوتش دیکھتے ہیں، ٹھیک ہی دیکھتے ہیں نا.... انہوں نے جو کنڈلیاں نکالی ہیں، اس کے مطابق اگر اس اپرادھی کو شما کر کے اسے جیون دیا گیا تو یہ پوری ہندو جاتی پر ایک بڑا ظلم ہووے گا۔ اور اس کی سزا ہر اس منش کو بھگتنا ہووے گی جو اس ظلم کو روکنے کی شکتی رکھتا تھا۔"

"آپ کس اپرادھ کی بات کر رہے ہیں، انکل پرشاد؟" میں نے اپنایت سے پوچھا۔

"ایک ناری نے ایک برہمن کی ہتھیا کی ہے۔ اس کو بے دردی سے مارا ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ پرارتھنا میں مصروف تھا۔ یہ برہمن اس راجواڑے کے سب سے پوتر پریوار کا فرد تھا۔ اوتاروں کی لڑی میں سے تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس پلید ناری کو دو ہیں ٹکڑے کر دیا جاتا اور اس کا ماس کتوں کو کھلا دیا جاتا لیکن اب کچھ لوگن اسے جیون دینے کا سوچ رہے ہیں۔ اسے زندہ رکھنا چاہت ہیں تا کہ وہ اس دھرتی پر چلے، اس ہوا میں سانس لے اور کھائے پیئے۔"

میرے ذہن میں کھدبد شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "انکل! آپ کس ناری کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہے ایک نیچ ذات کی ہتھیارن۔" وہ مبہم انداز میں بولا۔

"وہ مسلمان تو ناہیں؟"

"ہاں.... مسلمان ہی ہے۔" رام پرشاد کے چہرے پر بہت سی نفرت یلغار کر آئی۔

ایک دم میرے ذہن میں دروازہ سا کھل گیا۔ لہو کی گردش رگوں میں تیز ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "انکل پرشاد! مجھے لگ رہا ہے کہ آپ مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کی بات کر رہے ہیں۔"

رام پرشاد کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ پھر وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ”ہاں گوپال! تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے...... یہ وہی ہے جس نے کچھ دن پہلے موہن کمار جی کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کیا تھا۔ اس کتیا نے ان کا سر کاٹ کر شریر سے علیحدہ کر دیا اور ان کے چرنوں میں رکھ دیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ یہ سب کس کے ساتھ کر رہی ہے۔ تم جانت ہو کہ موہن کمار کون تھے؟“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ناہیں، مجھے ٹھیک سے پتا ناہیں۔“

رام پرشاد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”موہن کمار اوتاروں کی لڑی میں سے ہیں۔ یہ زرگاں کے بڑے پنڈت مہاراج کے داماد بھی تھے۔ کہا جاوت ہے کہ دو ہزار سالوں سے اس لڑی (نسل) کے لوگن کا سر بھگوان کے سوا کسی کے سامنے ناہیں جھکا لیکن اس پلید عورت نے یہ سر موہن کمار کے شریر سے کاٹ کر علیحدہ کر لیا اور پھر انہی کے چرنوں میں رکھ دیا۔ ایک طرح سے اس خبیث ناری نے یہ بتایا کہ جو سر جھکتا ناہیں تھا، وہ اپنے ہی چرنوں میں گرا پڑا ہے۔“ بولتے ہوئے رام پرشاد کی آنکھوں سے چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

میں اس عجیب اتفاق پر حیران ہو رہا تھا۔ میں جو آج دیوان کی عمارت سے اس لیے نکلا تھا کہ کسی طرح سلطانہ کی مدد کو پہنچ سکوں، ایک ایسے کٹر ہندو سے آن ملا تھا جس کا دماغ ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا اور جو پچھلے آدھ گھنٹے سے مجھ سے مسلسل سلطانہ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”انکل! میں نے تو سنا ہے کہ موہن کمار جی کی ہتھیا کے بعد سلطانہ کو جنگل میں گھیر لیا گیا ہے اور اب وہ اور اس کا بھتیجا بچ ناہیں سکیں گے۔“

رام پرشاد کے چہرے پر پھر عجیب سا رنگ لہرا گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کوئی اشلوک پڑھنے کے بعد بولا۔ ”پرنتو! یہی تو بھید ہے اس میں۔ وہ حرامزادی مرے گی ناہیں۔ بالکل ناہیں مرے گی۔ اسے زندہ پکڑا جاوے گا۔“

”آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟“

”اس لیے کہ ہم کو اندر خانے کی جانکاری ہے۔ ہم سب جانت ہیں۔ کچھ لوگن ہیں جو سلطانہ کو زندہ حالت میں زرگاں لے جانا چاہت ہیں۔ ان لوگن کا دھرم سے کوئی واسطہ ناہیں اور نہ ہی ان کو بھگوان کا کوئی خوف ہے۔ ان کو جانکاری ناہیں کہ ان کی یہ من مرضی راجواڑے کے باشندوں پر کتنی بھاری پڑے گی۔ کنڈلیاں سب کچھ بتا رہی ہیں مگر یہ گوری چمڑی والے کنڈلیوں وغیرہ کو مانتے ہی کب ہیں۔۔۔“

ایک دم میرا دھیان جارج گورا اور سرجن اسٹیل وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے رام پرشاد کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انکل! کہیں آپ جارج گورا صاحب کی بات تو ناہیں کر رہے؟“

”اس کا نام اتنی عزت سے مت لو۔ وہ اس قابل ناہیں ہے۔ وہ اپنے مطلب کا بندہ ہے۔ وہ بدلے کی آگ میں جل رہا ہے اور اسے بس اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی فکر ہے۔ اگر وہ حکم جی کا سچا دوست ہوتا تو کبھی ایسا سوچتا بھی ناہیں۔“

”کیا آپ یہ کہنا چاہت ہیں کہ جارج گورا، سلطانہ اور اس کے پریوار سے بدلہ لینے کے لیے اسے زندہ اپنے پاس منگوانا چاہت ہے؟“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سلطانہ کو اپنی رکھیل بنا کر رکھے...... وہ کوئی ایسا چکر چلائے گا کہ عام لوگن یہی سمجھیں گے کہ وہ مر گئی یا جیل سے بھاگ نکلی مگر وہ رہے گی جارج گورے کے پاس ہی... جارج گورا کی طرح کے بندے کسی کو آسانی سے شما ناہیں کرتے ہیں۔“

”کنڈلیاں کیا کہتی ہیں؟“ میں نے رام پرشاد سے پوچھا۔

”اس ناری کا مرنا بہت ضروری ہے، ورنہ کوئی بہت سخت آفت آوے گی۔ کوئی ایسی بیماری جس میں راجواڑے کے بہت زیادہ لوگن مر جاویں یا پھر کوئی باڑھ..... یا آپس کی لڑائی جس میں بے شمار بے گناہوں کی ہتھیا ہو جاوے۔ لیکن کچھ نہ کچھ ہووے گا ضرور۔ یہی پنڈت مہاراج کا وچار ہے اور ان کا وچار کبھی غلط ناہیں ہوتا۔“

”پنڈت مہاراج کیا چاہت ہیں؟“

”ان کی خواہش ہے کہ اس ناری کو زندہ ناہیں رہنا چاہیے۔ اور اگر اسے ایک خاص منش (بندہ) خاص ڈھنگ سے مارے گا تو ٹھیک پرائشچت ہووے گا اور بلا ٹل جاوے گی۔“

”میں سمجھا ناہیں، خاص منش کون؟“

رام پرشاد نے پھر منہ میں کوئی اشلوک پڑھا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔ ”ہمرا اندازہ ہے کہ وہ منش تم ہو۔ بہر حال، ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ کھل کر سامنے آجاوے گا۔ پنڈت بھگوان داس تمہاری کنڈلی بنا رہے ہیں۔“

”کنڈلی بنا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کنڈلی سے پتا چل جاوے گا کہ وہ منش تم ہی ہو جس کی طرف ایشور نے پنڈت مہاراج کو اشارہ دیا ہے، یا کوئی اور ہے۔“

”کیا پنڈت مہاراج نے آپ کو میرے بارے میں کچھ بتایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ناہیں، انہوں نے بس نشانی بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم چوتھی تاریخ کو چاند ڈوبنے کے فوراً بعد کالی کے مندر میں پوجا شروع کر دیں۔ پوجا کے دوران میں جو پجاری ہمارے پریوار کے دائیں طرف آ کر بیٹھے گا، وہی اصل منش ہووے گا۔ اسی کے ہاتھوں وہ اپرادھن قتل ہووے گی تو ایشور خوش ہوں گے اور ٹھیک پرائشچت بھی ہو جاوے گا۔“

”میں..... میرا مطلب ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے کسی کے پران لوں گا؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

رام پرشاد نے تسلی بخش انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بلغم زدہ کھانسی کی آواز سنائی دی اور پنڈت بھگوان داس ایک لمبا چوڑا زائچہ لے کر آ گیا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”گوپال سنہا! تمہاری کنڈلی میں کچھ گڑبڑ نظر آوت ہے۔ کیا تمہارا پورا نام یہی ہے؟“

میں نے تصدیق کی۔ وہ کچھ دیر لفظوں اور ہندسوں میں الجھتا رہا۔ آخر بولا۔ ”پھر ہو سکتا ہے کہ تم نے اپنا جنم دن ٹھیک نہ بتایا ہو کیونکہ اس کنڈلی میں بہت سے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی نفی کر رہے تھا..... بلکہ ایک دو لوگ تو ایسے ہیں جو تمہاری کنڈلی میں ہو ہی ناہیں سکتے۔ اس کے علاوہ.....“

وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس پنڈت کو نہیں مانتا تھا اور نہ اس کی کنڈلی کو..... لیکن اس کا یوں مخمصے میں پڑ جانا مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ”اپنے جنم دن کے بارے میں مجھے پورا وشواس ناہیں ہے۔ میری ماتا ایک تاریخ بتاوت ہیں اور پتا کو دوسری تاریخ پر بھروسا ہے۔“

پنڈت کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ اپنی چندیا کھجا کر بولا۔ ”یہ ہوئی نا بات۔ میری کنڈلی کے حساب سے بھی تمہارا جنم دن منگل وار کے بجائے بدھ وار بنتا ہے اور چاند کی اٹھائیس تاریخ۔“

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ پنڈت بھگوان داس نے جلدی جلدی کنڈلی میں کچھ تبدیلیاں کیں اور مطمئن لہجے میں رام پرشاد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”دیکھیں، سب کچھ ٹھیک بیٹھ گیا جی..... یہی وہ منش ہے جس کی طرف پنڈت مہاراج نے اشارہ کیا تھا۔ بھگوان نے چاہا تو وہ اپرادھن مرے گی اور اسی کے ہاتھوں مرے گی۔“ پھر وہ میری طرف گھوم کر بولا۔ ”تم خوش قسمت ہو۔ تمہیں ایشور نے ایک بڑے کام کے لیے چنا ہے۔“

”میں کچھ سمجھ ناہیں رہا۔“ میں نے پھر گھبراہٹ ظاہر کی۔

سوکھے سڑے پنڈت نے کچھ بولنا چاہا مگر رام پرشاد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور مجھ سے کہا۔ ”گوپال پتر! گھبرانے کی کوئی بات ناہیں ہے۔ ہم تمہیں کسی مصیبت میں ناہیں ڈالیں گے۔ میں تمہیں سب سمجھا دوں گا۔“

پنڈت اٹھ کر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گھرانے کے باقی افراد کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے گیا ہے کہ وہ کالی کے مندر سے مطلوبہ بندے کو ہی لے کر آئے ہیں۔ کچھ دیر بعد مجھے رونے گڑگڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ رام پرشاد کی بوڑھی والدہ ہی تھی۔ وہ شاید کسی مورتی کے سامنے پرارتھنا کر رہی تھی۔ پھر وہ اپنی بہو اور بہو کی بہو کے سہارے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کی بوڑھی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے میرا سر چوما اور کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔

اتنے میں ایک گھوڑا گاڑی حویلی کے پورچ میں آ کر رکی۔ رام پرشاد نے کھڑکی سے جھانکا اور مجھ سے مخاطب ہو کر مسرور لہجے میں بولا۔ ”ستیش آیا ہے میرا بیٹا۔ تم سے مل کر بہت خوش ہووے گا۔“

ایک دو منٹ بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ جسم نہایت ورزشی اور چہرے سے سختی ٹپکتی تھی۔ عام برہمن زادوں کی طرح اس کے ماتھے پر بھی سفید قشقہ تھا۔ وہ بگولے کی طرح

اندر آیا۔ سب کو پرنام کیا۔ اس نے اپنی دادی کے چرن چھوئے اور ذرا تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اسے پرنام کیا اور مؤدب کھڑا رہا۔ رام پرشاد اپنے بیٹے کو ایک طرف لے گیا اور چند باتیں کیں۔ یقیناً یہ سب کچھ میرے تعارف کے سلسلے میں ہی تھیں۔ نوجوان واپس پلٹا اور دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ جیسے نظروں نظروں میں مجھے اور میرے قد کاٹھ کو تول رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا۔ اس نے میرے دونوں کندھے تھامے اور انہیں ہلکے ہلکے جوش سے ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی تڑپ رہی تھیں۔ وہ بولا۔ ''اب تم نے یہیں رہنا ہے۔ ہاں، جب تک کام ناہیں ہو جاتا، تم یہیں رہو گے ہمارے مہمان بن کر۔ تم چاہو تو اپنے گھر والوں کو اطلاع دے سکت ہو بلکہ چاہو تو انہیں بھی یہیں بلا سکت ہو۔''

''ناہیں جی! مجھے ان کی طرف سے کوئی ایسی خاص پریشانی ناہیں۔ میں کام کے سلسلے میں نکلا تھا اور مجھے ایک دو دن گھر سے باہر ہی رہنا تھا۔''

''بہت خوب۔'' ستیش نے اپنا بڑا سر اوپر نیچے ہلایا۔

...... میرے اگلے چوبیس گھنٹے اس حویلی کے شاندار مہمان خانے میں گزرے۔ میری ہر طرح خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ ایک ملازم نندلال ہر وقت میری خدمت کے لیے موجود تھا۔ نندلال سے میری تھوڑی بہت بات چیت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ حویلی کی ساری صورتِ حال بھی میرے سامنے تھی۔ میں نے جو نتیجے اخذ کیے، وہ اس طرح تھے۔

یہ تل پانی کے کٹر ہندو گھرانوں میں سے ایک تھا۔ اس گھرانے کا سربراہ رام پرشاد تھا تاہم اس کی بوڑھی ماتا کی بھی بہت مانی جاتی تھی۔ وہ اپنی بوڑھی ماتا، پتنی، بیٹے اور بہو کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ تل پانی میں ان لوگوں کا ایک کارخانہ تھا جہاں کشتیاں اور تفریحی بجرے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ یہ چیزیں پورے راجواڑے میں سپلائی ہوتی تھیں لیکن دس بارہ سال پہلے رام پرشاد کی فیملی نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی ان کی توہم پرستی اور مذہبی جنونیت کی وجہ سے تھا۔ رام پرشاد کی فیملی میں ایک موت ہو گئی جس کے بعد رام پرشاد کی بوڑھی ماتا نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایسا ہمارے کاروبار کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ منحوس کاروبار ہے۔

دراصل پرانے خیال کے ہندوؤں میں یہ عقیدہ بہت پختہ تھا کہ پانی کا سفر پاپ ہے۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ کشتیاں وغیرہ بنانے کا کام دراصل پانی کے سفر سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے گھریلو فرنیچر بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ کاروبار رام پرشاد ہی سنبھالتا تھا۔ اس کے بیٹے ستیش کی مصروفیات کچھ اور طرح کی تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ اب بھی وہ دس پندرہ روز بعد گھر لوٹا تھا۔ پرسوں اسے پھر چلے جانا تھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ستیش کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ وہ شاید کسی تشدد پسند ہندو تنظیم کا رکن تھا۔ اس کے جو ایک دو دوست اس سے ملنے گھر آئے، وہ بھی خطرناک صورتوں والے ہی تھے۔ یہ کچھ اس قسم کے لوگ تھے جن سے چند دن پہلے میری اندرون شہر کے ایک ڈیرے پر مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ ورزشی جسم، کڑے تیور اور سانولی پیشانیوں پر سفید قشقے۔ ان میں سے ایک کے پاؤں میں کوئی نقص تھا اور آواز بہت بھدی تھی۔

دوسری رات نو بجے کے قریب میں نے گھر کے ایک کمرے میں ستیش اور اس کے دو دوستوں کی تھوڑی سی بات چیت سنی۔ وہ بڑے پُرجوش تھے اس لیے بلند آوازوں میں بول رہے تھے۔ شاید انہوں نے کسی طرح کا نشہ بھی کیا ہوا تھا۔ ان کی یہ گفتگو سلطانہ کے بارے میں تھی۔

میں نے ایک مالا توڑی اور پھر اس کے باریک دانے اکٹھے کرنے کے بہانے دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ دروازے کی دوسری جانب ستیش کہہ رہا تھا۔ ''آج چوتھا دن ہے۔ میرا وشواس ہے کہ وہ دونوں بس ایک دو دن اور نکالیں گے۔ وہاں ریسٹ ہاؤس میں کھانے کو اناج کا ایک دانہ ناہیں۔ پانی بھی بند ہے۔ مٹی کھا کر تو گزارہ ناہیں کیا جا سکتا۔''

''ہاں، میرا وچار بھی یہی ہے۔'' ایک دوسری آواز آئی۔ ''حکم جی کے اہل کار کچھ نہ بھی کریں، صرف اپنا گھیرا ہی قائم رکھیں تو ایک دو دن کے اندر اس حرامزادی کو زندہ پکڑا جا سکت ہے۔ جب بھوجن ہی ناہیں ہووے گا تو کتنے روز اکڑے رہیں گے چچی بھتیجا؟''

''مگر بلرام رائے کی اپنی سوچ ہے۔ آخر وہ اس آپریشن کا انچارج ہے۔ وہ اپنی کارکردگی دکھانا چاہت ہے۔ ہو سکت ہے کہ اسے یہ ڈر بھی ہو کہ لاچار ہو کر سلطانہ اور اس کا بھتیجا آتما ہتھیا کی کوشش نہ کریں۔

''تو پھر کیا..... وہ اندر گھسنے کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''ناہیں۔ مجھے ایک اور طرح کی جانکاری ملی ہے اور میرا وچار ہے کہ یہ بہت حد تک ٹھیک ہے۔ تل پانی کا ایک مُسلا ہے چاچا عبدالغنی۔ سلطانہ اس کے گھر میں بھی رہتی رہی ہے اور اس پر بڑا وشواس کرت ہے۔ وہ اس کے لیے بھوجن لے کر اندر ریسٹ ہاؤس میں جاوے گا۔ اس بھوجن میں بے ہوشی کی دوائی ہووے گی۔''

''لیکن وہ غنی ہو گا تو مُسلا۔ اندر جا کر اس نے بھوجن کا بھید کھول دیا تو؟'' ستیش نے پوچھا۔

''وہ ناہیں کھولے گا یار۔'' اس کے دوست کی آواز آئی۔ ''وہ خود بھی یہ چاہے گا کہ کہیں سلطانہ بالکل نراش ہو کر آتما ہتھیا وغیرہ کی کوشش نہ کرے۔ پرنتو عارضی طور پر ہی سہی لیکن اس کا جیون بچ جائے..... مجھے وشواس ہے کہ عبدالغنی وہی کرے گا جو بلرام وغیرہ اس سے کہہ رہے ہیں۔''

ستیش کے ایک دوست نے دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''یار! ویسے ایک بات ہے۔ یہ جارج گورا صاحب ہے بڑی اونچی شے۔ سچویشن جو بھی ہو، یہ اپنی دل پشوری کا کوئی نہ کوئی ڈھنگ ڈھونڈ ہی لیوت ہے۔ اب دیکھو، کیسے ہاتھ دھو کر اس سلطانہ راجپوت کے پیچھے پڑا ہے۔''

''ناری بھی تو زوردار ہے۔'' دوسرے دوست نے لوفر لہجے میں کہا۔

پہلا بولا۔ ''ہاں، ناری گورا صاحب کی کمزوری ہے۔ خاص طور سے مسلمان ناریاں۔''

''میں تمہاری اس بات سے اتفاق ناہیں کرتا۔'' ستیش نے کہا۔ ''ناری اس کے لیے ناری ہی ہے۔ ہندو ہو، چاہے مسلم ہو..... یا کوئی اور..... تم یہ کہہ سکت ہو کہ وہ مقامی عورتوں کا رسیا ہے۔ اگر وہ ایک حد تک رہا تو ٹھیک ہے، اگر اس نے حد پار کی تو پھر اس کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔ حکم جی کو بھی اپنی آشیرباد بس اس سے تک اس کے ساتھ رکھنی چاہیے جب تک وہ اپنی سیما (حد) کو پار ناہیں کرتا۔''

آہٹ ہوئی اور میں دروازے کے سامنے سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ کمرے میں آ کر میں دیر تک سوچتا رہا۔ سلطانہ مصیبت میں تھی..... تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی کو فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ریسٹ ہاؤس کو پوری طرح گھیر لیا گیا تھا مگر فوجی افسر بلرام چاہتا تھا کہ سلطانہ اور طلال کو زندہ پکڑ کر جارج کے پاس لے جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگ ہر حربہ آزما رہے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ سلطانہ اپنے سابقہ میزبان عبدالغنی پر بھروسا کرے گی۔ وہ اس کے ذریعے اسے بے بس کرنے کا پلان بنا رہے تھے۔

صبح سویرے ہی بھجن کی آواز حویلی میں گونجنا شروع کر دیتی تھی اور پوجا کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ مہمان خانے کے اندر بھی پوجا کا کمرا موجود تھا۔ میں اکیلے پوجا پاٹ کا ڈھونگ رچا لیتا تھا۔ اگر مجھے یہ ڈھونگ سب کے سامنے رچانا پڑتا تو بہت دشواری ہوتی۔ مجھے پوجا کے ابتدائی طور طریقے بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھے۔ میں نے ہندوانہ رہن سہن میں ایک دو غلطیاں بھی کیں تاہم وہ خوش قسمتی سے کسی کی نظر میں نہیں آ سکیں۔

اگلے روز رات کو ستیش واپس چلا گیا۔ تاہم جانے سے پہلے اس نے مجھ سے اپنے کمرے میں ملاقات کی۔ اس وقت اس کے ساتھ ایک لمبی ناک والا درمیانی عمر کا شخص بھی تھا۔ وہ بالکل کلین شیو تھا۔ سر بھی منڈا ہوا تھا۔ ستیش نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کچھ باتیں بتائیں۔ یہ باتیں سلطانہ سے ہی متعلق تھیں۔ وہ رازداری کے لہجے میں بولا۔ ''ہم اس اپرادھن کو زندہ سلامت زرگاں میں ناہیں جانے دیں گے۔ اس سلسلے میں پوری پلاننگ ہو چکی ہے۔ جب بلرام اور اس کے ساتھی سلطانہ کو ریسٹ ہاؤس سے پکڑ لیں گے اور واپس زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے تو ہم ان کو راستے میں روکیں گے اور بھگوان نے چاہا تو کامیابی سے روکیں گے۔''

''کیا ان کے قافلے پر ہلا بولا جاوے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ ایسا ہی سمجھ لو.....'' اس نے گول مول بات کی۔

شاید وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی دیکھ کر ستیش سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ایسا حساس تو نہیں تھا کہ میری خاموشی اسے پریشان کرتی لیکن شاید جو کچھ وہ مجھ سے کرانا چاہتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ میری باخبری اور پوری رضامندی اس میں شامل ہو۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور جیب

سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دکھایا۔ اس پر کچھ لکیریں سی کھچی ہوئی تھیں۔ وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ”یہ دیکھو گوپال! یہ ہے وہ ریسٹ ہاؤس جہاں سلطانہ اور اس کا بھتیجا سپاہیوں کے گھیرے میں ہیں۔ پکڑے جانے کے بعد وہ اس راستے سے زرگاں کی طرف روانہ ہوں گے .... یہ دیکھو.... یہ ریکھا جو نیچے کی طرف جارہی ہے، اس راستے کو ظاہر کرت ہے..... یہاں دیکھو، یہ ریکھا اس بیلے کے درختوں میں سے گزرتی ہے۔ یہ ٹیلے کے ساتھ ساتھ ایک موڑ ہے.....“ اس نے ایک قوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ایک دبی دبی سی زہریلی ہنسی اس کے سانولے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

اس نے معنی خیز انداز میں لمبی ناک والے کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس موڑ پر ہم سلطانہ اور اس کے بھتیجے کو باقی قافلے سے علیحدہ کر لیویں گے اور بھگوان نے چاہا تو یہ کام بڑی صفائی سے ہووے گا۔“

”الگ کر لیویں گے؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔“ میں نے کہا۔

ایک دفعہ پھر ایک غیر محسوس لیکن زہریلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی۔ وہ بولا۔ ”جب گاڑیوں اور گھوڑوں کا قافلہ اس موڑ پر سے تیزی سے مڑ رہا ہوگا..... سلطانہ والی گاڑی سیدھی نکلتی چلی جاوے گی..... قریباً سو گز دور ٹیلوں کے اندر یہ تنگ درّہ سا ہے۔ گاڑی اس میں سے گزر کر دوسری طرف چلی جاوے گی ..... اور پھر یہ درّہ بند کر دیا جاوے گا۔“

”یہ کیسے ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے بندے اس درّے کا راستہ روک لیویں گے۔ جو اس راستے کو کھولنے کی کوشش کرے گا، چھلنی ہو جاوے گا۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے ستیش کی آنکھوں میں پھر چنگاریاں دکھائی دینے لگیں۔

”بات سمجھ میں آرہی ہے جی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن جناب! سلطانہ والی گھوڑا گاڑی باقی قافلے سے الگ کیسے ہووے گی؟“

”پر نتو! یہ بڑا اہم سوال ہے لیکن اس سوال کا جواب تمہارے سامنے ہی بیٹھا ہے۔“ ستیش نے معنی خیز انداز میں کہا اور لمبی ناک والے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اپنی بھید بھری آنکھوں کے ساتھ بالکل خاموش تھا۔

”میں اب بھی سمجھ نہیں سکا۔“ میں نے کہا۔

ستیش اپنی آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”یہ اس سرکاری گاڑی کا گاڑی بان ہے جس میں سلطانہ اور طلال کو لے جایا جائے گا۔ یہ وہی کرے گا جو ہم کہیں گے کیونکہ یہ دھرم کی رکھشا کا مطلب سمجھت ہے۔ اسے پتا ہے کہ اس شبھ کام میں اگر اس کے پران بھی چلے گئے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔“

لمبی ناک والے کی لمبوتری آنکھوں میں وہی جنونیت نظر آئی جو ستیش کی آنکھوں کا جزوِ خاص تھی۔ ستیش نے بتایا کہ لمبی ناک والے کا نام بھولا ناتھ ہے۔ جو نقشہ ستیش دکھا رہا تھا اور جس طرح کی پلاننگ کی بات کر رہا تھا، وہ سب کچھ واقعی متاثر کن تھا۔ ٹیلوں کے درمیان وہ ایک چھوٹا درّہ نما تھا۔ اس کی دونوں جانب چھپنے اور گھات لگانے کے لیے بہت سی جگہیں تھیں۔ اگر کوئی اس درّے میں سے گزرنے کی کوشش کرتا تو اسے بہ آسانی روکا جاسکتا تھا اور نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ ستیش اس ساری صورتِ حال کے بارے میں بہت پُرامید اور پُرجوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ مختار راجپوت کی اپرادھن بیٹی مرے گی اور اسی طرح مرے گی جس طرح بڑے پنڈت مہاراج کی خواہش ہے۔

ستیش کے جانے کے بعد میری پریشانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں اس حویلی میں مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ رام پرشاد ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کام مکمل ہونے تک میں حویلی سے باہر قدم نکالوں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس حوالے سے ہر گھڑی میری نگرانی بھی کی جارہی ہے۔ مجھے باہر کے حالات کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میں کسی کو بتائے بغیر اچانک ہی دیوان کی عمارت سے نکلا تھا اور اب مجھے دیوان سے لاپتا ہوئے کم و بیش تین روز ہو چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری گمشدگی نے وہاں کھلبلی مچائی ہوگی۔ خاص طور سے چوہان اور انور خاں تو بہت پریشان ہوں گے۔ چند دن پہلے رنجیت پانڈے سے میری زبردست ٹکر ہوئی تھی۔ رنجیت پانڈے کی خطرناکی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ انور خاں اور چوہان یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ شاید میری گمشدگی کی وجہ رنجیت پانڈے ہی ہو۔ اس غلط فہمی سے دیگر مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔

سلطانہ اور طلال کے موجودہ حالات کا علم بھی مجھے

نہیں ہو رہا تھا..... میرے ایک دو بار پوچھنے پر رام پرشاد نے بس یہی کہا تھا کہ بڑی جلدی اچھی سماچار سننے کو ملے گی۔ وہ جس اچھی سماچار یعنی خبر کی بات کر رہا تھا، اس کی تفصیل مجھے ستیش بتا ہی چکا تھا۔ وہ لوگ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں کے چنگل سے نکالنا چاہتے تھے لیکن کسی اچھی نیت سے نہیں بلکہ بدترین انجام سے دوچار کرنے کے لیے۔ خطرہ اس بات کا بھی تھا کہ سلطانہ کو زرگاں کے سپاہیوں سے چھیننے کی کوشش میں ہی کوئی المیہ نہ ہو جائے۔ اس کوشش میں سلطانہ اور طلال کو شدید نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت میں حویلی کے گراسی لان میں بیٹھا تھا جب برآمدے کی طرف سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا، پندرہ سولہ سال کی ایک بالکل دبلی پتلی لڑکی دو موٹی تازی ملازماؤں کی گرفت میں تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس کے بال کاٹنا چاہ رہی ہیں۔ ایک ملازمہ کے ہاتھ میں قینچی تھی۔ لڑکی کے شہد رنگ بال گھنے اور خوب صورت تھے۔

لڑکی رو رہی تھی۔ اس کے تاثرات برملا کہہ رہے تھے کہ وہ بال کٹوانا نہیں چاہتی۔ رام پرشاد کی بوڑھی والدہ کرسی پر بیٹھی تھی اور زور زور سے بول رہی تھی۔ ”کلموہی! ہم تیرے فائدے کی بات ہی کرت ہیں۔ تجھے پاپ سے بچانا چاہت ہیں۔ نرگ کی اگنی بڑی سخت ہے۔ تجھے اس پر وشواس ہو تو کبھی اس طرح کی بات نہ کرے۔“

رام پرشاد کی نوجوان بہو بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ وہ بولی۔ ”بڑی ماتا! آپ زبردستی نہ کریں۔ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جاوے گا۔ آپ اس بے چاری کو تھوڑا سا سمے دیں۔“

”تو بیچ میں مت بول۔“ بوڑھی عورت چلا کر بولی۔ ”تو ہمیشہ دھرم برودھی بات کرت ہے۔ یہ میرا گھر ہے..... میرا پریوار ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں، یہاں میرا ادھیکار رہے گا اور میرا حکم چلے گا۔“

”لیکن ماتا جی! یہ ہماری زرخرید داسی نہیں ہے۔ یہ ملازمہ ہے۔ اس کی بھی اپنی مرضی ہے۔ اور دھرم ”مرضی“ کا نام ہے، جور زبردستی کا نام نہیں ..... بھگوان کے لیے ماتا جی ..... آپ دھرم کے نام پر اپنی مرضی نہ چلائیں۔“

کتب فروش: یہ بہترین انگریزی کتاب تمہارا آدھا ہوم ورک کرے گی۔

آج کا طالب علم: دو کتابیں دے دو۔

★

”محترمہ آپ کی گود کا بچہ اتنا چھوٹا سا ہے کہ میں نے پہلے کبھی اتنا چھوٹا بچہ نہیں دیکھا۔“

”ہماری شادی کو ابھی دو ہی ہفتے ہوئے ہیں۔“

★

امریکی اور روسی ٹیلی ویژن میں صرف اتنا فرق ہے کہ امریکی ہم ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں اور روس میں ٹیلی ویژن ہمیں دیکھتا ہے۔

★

”مجھے واپسی کا ٹکٹ چاہیے۔“

”کہاں کے لیے؟“

”یہیں واپس آنے کے لیے۔“

”تو اپنی زبان کو لگام دے مالا۔“ بڑھیا کانپتی آواز میں بولی۔ ”بھگوان کا خوف کر۔ یہ بڑا جھگڑا ہے ..... اگر یہ بیاہتا بن کر پھرتی رہے گی تو یہ کلجگ ہو دے گا۔ اس کی نحوست ہم سب کو لے ڈوبے گی ..... اور سب سے پہلے یہ نحوست پڑے گی تجھ پر ..... دفع ہو جا یہاں سے ..... میں جو کرتی ہوں، مجھے کرنے دے۔“ آخری الفاظ بڑھیا نے بہت زور دے کر کہے۔

نوجوان لڑکی مالا نے ایک دم رخ بدلا اور پاؤں پٹختی ہوئی لان کی طرف آگئی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور طیش بھرے انداز میں کسی بچے کا سویٹر بننے لگی۔ وہ اچھی صورت کی تھی اور اپنی بول چال سے پڑھی لکھی نظر آتی تھی۔ ایک امیر کبیر گھرانے کی برہمن بہو ہونے کے باوجود اس میں تکلف اور بناوٹ نہیں تھی۔ ایک دوبار وہ مجھ سے بات بھی کر چکی تھی۔

برآمدے میں، دیکھتے ہی دیکھتے ملازماؤں نے نوعمر لڑکی کے بال قینچی سے کاٹ دیے۔ وہ اتنے بے ڈھنگے طریقے سے کاٹے گئے تھے کہ ترس آنے لگا۔ وہ خاموش بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اس کے کمزور چہرے کا

رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ بعد ازاں وہ اندرونی کمروں کی طرف چلی گئی۔ لڑکی کے کٹے ہوئے بالوں کو غالباً جلانے کے لیے یا کسی اور رسم کی ادائیگی کے لیے ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ لیا گیا۔

مالا چپ بیٹھی رہی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے سلائیوں پر حرکت کرتی رہیں۔ ارد گرد کوئی نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”مالا بہن! یہ کیا جھگڑا تھا؟“

وہ جیسے ایک دم بھڑک اٹھی۔ ”تم لوگوں کو کبھی سمجھ نہیں آئے گی کہ یہ کیا جھگڑا ہے۔ دھرم تو شانتی اور پریم کا نام ہے، تم لوگوں نے اسے یدھ بنا رکھا ہے۔ ایک ڈراؤنا تماشا بنا رکھا ہے۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی، ہم اب بھی پتھر کے زمانے میں جی رہے ہیں .... شوہروں کے ساتھ ان کی پتنیوں کو زندہ جلانا چاہتے ہیں۔ ذات پات پر مر رہے ہیں۔ کالی رسموں کی آڑ میں ایک دوجے کا جیون تباہ کر رہے ہیں ....“ وہ طیش میں بولتی چلی گئی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے بھی رام پرشاد اور ستیش وغیرہ کے مذہبی جنون کا ایک حصہ سمجھ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ذرا ٹھنڈی ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ”بہن! لیکن یہاں ہوا کیا ہے؟“

”ہونا کیا ہے.... ماتاجی اپنے لیے سورگ کا ٹکٹ پکا کر رہی ہیں۔ یہ لڑکی تم نے دیکھی ہی ہو گی۔ مشکل سے سترہ سال عمر ہے اس کی۔ یہ حویلی کی پکی ملازمہ ہے۔ دو مہینے پہلے اس کا بیاہ ہوا تھا لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا پتی چھوٹے سرکار کی سینا میں سپاہی تھا۔ پچھلے دنوں زرگاں والوں کے ساتھ جو جھڑپیں ہوئی ہیں، ان میں وہ گھائل ہوا اور تین دن بعد اس کا دیہانت ہو گیا۔ اب یہ لڑکی ودھوا ہے اور اسے زندہ درگور کرنے کی پوری پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ماتاجی نے اسے ایک علیحدہ کوٹھڑی میں بند کر چھوڑا ہے۔ اسے دن میں بس ایک بار روکھا سوکھا بھوجن دیا جاتا ہے۔ یہ کھدر کے سفید کپڑے پہنتی ہے اور زمین پر سوتی ہے۔ اس کا جیون شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ جتنا عرصہ جیے گی، اسی طرح جیے گی۔ یہ ہے ہمارے ”دھرم پریمیوں“ کی بدھی (سمجھ بوجھ) اور ان کا چلن۔ اور یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ تم بھی سب جانتے ہو جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔“

ابھی ہم بات کر ہی رہے تھے کہ مالا ٹھٹک گئی۔ کوئی پچاس قدم دور حویلی کے مین گیٹ سے ایک گھوڑا گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کالے رنگ کی یہ وہی گھوڑا گاڑی تھی جس پر کچھ دن پہلے تند مزاج ستیش حویلی میں آیا تھا۔ گھوڑا گاڑی دیکھتے ہی مالا مجھ سے بے تعلق ہو گئی اور اپنی ساری توجہ سویٹر بننے پر مرکوز کر دی۔ گھوڑا گاڑی سے ستیش برآمد ہوا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس کے چہرے پر جوش کی سرخی نظر آنے لگی تھی۔ ان لمحوں میں اس نے اپنی بہن کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے نمستے کیا۔ مالا نے آگے بڑھ کر اس کے چرن چھوئے۔ ستیش نے مالا کی طرف توجہ دیے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ لیتا ہوا مہمان خانے کی طرف آ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ستیش کی بائیں کلائی پر چھوٹا سا تازہ زخم نظر آ رہا ہے۔ میری رگوں میں خون کی گردش بڑھ گئی۔

کمرے میں پہنچ کر ستیش نے جوش سے میرے کندھے دبائے اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ”گوپال! ہم سپھل (کامیاب) رہے۔ ہم نے وہ حاصل کر لیا جو چاہتے تھے۔ مختار راجپوت کی بیٹی اب ہمارے پاس ہے....“

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر محسوس ہوئی۔ تاہم اپنے اندرونی تاثرات چھپاتے ہوئے میں نے بھی ستیش کے سامنے مسرت کا اظہار کیا اور اس سے پوچھا کہ سلطانہ کہاں ہے؟

وہ بولا۔ ”میں تمہیں اس کے پاس لے جانے کے لیے ہی تو آیا ہوں۔“

”اور اس کا بھتیجا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ حرامی بھی ساتھ ہے۔“

”کیا سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہوا؟“

”ایک سو ایک فیصد۔“ وہ دبے دبے جوش سے بولا۔ ”اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ حکم جی کے بندے زیادہ زور نہیں مار سکے۔ انہوں نے سلطانہ والی گاڑی کے پیچھے آنے کی کوشش کی مگر ہم نے ورے پر روک لیا۔ بس تین چار منٹ کی فائرنگ کے بعد ہی وہ لوگ بھاگ گئے۔ کچھ ایسا جانی نقصان بھی نہیں ہوا۔ دو بندے ان کی طرف سے مرے، تین چار گھائل ہوئے۔ ہماری طرف سے صرف دو بندے گھائل ہوئے ہیں....“ اس نے جلدی جلدی مجھے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ کا ہاتھ کیسے گھائل ہوا؟“

وہ بے پروائی سے بولا۔ ”جتنی بڑی سپھلتا (کامیابی) ملی ہے اس کے سامنے ایسے چھوٹے زخم کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ کسی شاٹ گن کا چھرا لگا ہے۔ گاڑی بان بھولا ناتھ بھی تھوڑا سا گھائل ہوا ہے۔“

اسی دوران میں رام پرشاد بھی آتا دکھائی دیا۔ اس کی سفید دھوتی بھی جیسے شادمانی سے پھڑپھڑا رہی تھی۔ سینہ پہلے سے زیادہ چوڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیٹے کو گلے سے لگایا اور ماتھا چوما۔ ”شاباش! تم لوگوں نے وہ کر دکھایا جس کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ میں بھاگیہ وان ہوں کہ تم میرے پُتر ہو۔“

بڑھیا بھی ادھر نکلتی ہوئی آ گئی اور پوتے کی بلائیں لینے لگی۔ پھر یہ سارا گھرانا پوجا کے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک پرارتھنا کرنے اور آرتی اتارنے کے بعد یہ لوگ باہر نکلے تو فخر سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ رام پرشاد نے چاکروں کو آوازیں دیں۔ ”ساجن، مہندر، امری.... جلدی آؤ یہاں۔“

کئی نوکر دوڑتے ہوئے پہنچ گئے اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔ ”بہت سا پرشاد بنواؤ اور تقسیم کرو.... نل پانی کے سارے بڑے بڑے مندروں اور استھانوں کے لیے چڑھاوے تیار کرو۔“

بڑھیا نے گنگا جل منگوایا۔ پوتے کو پلوایا اور بیٹے کو بھی۔ پھر وہ ایک لمبی مالا لے کر بھگوان کرشن کی مورتی کے سامنے بیٹھ گئی اور کوئی جاپ کرنے لگی۔ اس نے حکم دیا کہ پچھلا دروازہ بند کر دیا جائے اور کوئی فرد بھی اس دروازے سے پوجا کے کمرے میں داخل نہ ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اس شبھ گھڑی میں پچھلے دروازے سے پوجا کے کمرے میں آنا اچھا شگون نہیں ہے۔ یہ سال خوردہ بوڑھی عورت پتا نہیں کون کون سے توہمات اپنے دماغ میں بسائے بیٹھی تھی اور دوسروں کو بھی ان توہمات میں شریک دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی بہو مالا کو مخاطب کر کے بولی۔ ”دیکھ رہی ہے مورکھا! ہم پاپ کے ایک کام سے بچے ہیں تو ایشور نے کتنی کامیابی دی ہے تیرے پتی کو۔ وہ کلموہی اب اپنے کرموں کا پھل پا لے گی۔ اس نے ایک دھرم اوتار کی ہتھیا کی تھی۔ دھرم اوتار کی آتما کو شانتی دینے کے لیے اس کلموہی کا مرنا ضروری تھا۔“

بہو مالا برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی دادی ساس کس پاپ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ بیوہ ملازمہ کا سر مونڈ کر اور اسے بے چارگی کی تصویر بنا کر انہوں نے دھرم کا پالن کیا ہے اس لیے ایشور نے انہیں فوری طور پر ایک اچھی خبر سنائی ہے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ستیش مجھے حویلی سے لے کر جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک بیگ اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وقتِ رخصت رام پرشاد کی توہم پرست والدہ ایک چودہ پندرہ سال کے خوبرو لڑکے کے ساتھ آئی۔ لڑکے نے بیچ میں سے مانگ نکال رکھی تھی۔ ماتھے پر قشقہ تھا۔ حلیہ سادھو سنتوں جیسا تھا۔ بڑھیا کی ہدایت پر لڑکے نے میرے سر پر ایک نامعلوم خوشبو والا تیل ڈالا اور مجھے گنگا جل کے چند گھونٹ پلائے۔ اس کے بعد نیلگوں پتھروں کی ایک مالا سی میرے گلے میں ڈال دی۔ بڑھیا نے میرے اور ستیش کے ماتھوں پر تلک لگائے۔

کچھ ہی دیر بعد میں ستیش کے ساتھ اس کی شاندار گھوڑا گاڑی میں حویلی سے روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے اب تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں اور کہاں لے جا رہے ہیں۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی تیزی کے ساتھ نل پانی کے مختلف بازاروں سے گزرتی رہی اور مضافات میں آ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ میں سلطانہ کے پاس ہی جا رہا ہوں لیکن سلطانہ کو میں کس حال میں دیکھوں گا اور مجھے سلطانہ کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا اس کا مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں اتنی بات ضرور سمجھ میں آ رہی تھی کہ کچھ انوکھا اور خطرناک ہونے والا ہے۔

کچھ آگے جا کر ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ ستیش کے ہاتھ میں ایک سیاہ پٹی نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ”گوپال! میں تم سے شما چاہتا ہوں لیکن یہ میری مجبوری ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ پٹی تمہاری آنکھوں پر باندھنا پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے کہا۔

ستیش نے پٹی باندھ دی.... گاڑی قریباً ایک گھنٹے تک مزید ہچکولے کھاتی رہی۔ وہ ایک نیم پختہ

راستے پر چلنے کے بعد کچے راستے پر آ گئی۔ اس کی رفتار کم ہو گئی۔ جنگلی گلاب اور دیگر نباتات کی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ایک طویل چڑھائی چڑھنے کے بعد گھوڑا گاڑی رک گئی۔ ستیش نے مجھے اسی حالت میں گاڑی سے اتارا اور سہارا دے کر کسی چار دیواری میں لے گیا۔ میری پٹی کھول دی گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ میں جس جگہ پر موجود تھا وہ کسی کھنڈر سے مشابہ تھی۔ لگتا تھا کہ یہ کسی پرانے استھان کی باقیات ہیں۔ ایک طرف کسی قدیم تالاب کے آثار تھے، دوسری طرف چند پختہ روشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس جگہ خوشبو بہت زیادہ تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہی تھی اس لیے ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ گھوڑا گاڑی خوشبو کے ایک بڑے ڈھیر میں سے گزر کر یہاں پہنچی ہے اور وہ جس خوشبودار جگہ سے گزری تھی، وہاں شاید بہت سے لوگ بھی کام کر رہے تھے۔ غالباً یہ کوئی بڑی پھلواری تھی۔

ستیش اور گاڑی کا کوچبان مجھے لے کر آگے بڑھے۔ ہم ایک تنگ سے سرنگ نما راستے میں داخل ہوئے۔ یہ سرنگ قدرتی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں کی بنی ہوئی تھی۔ دیواروں کا پلاستر جھڑ چکا تھا، جابجا اینٹیں بھی اکھڑی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ جا کر یوں لگا کہ سرنگ ختم ہو گئی ہے۔ یہاں بہت سا جھاڑ جھنکاڑ پڑا تھا۔ سرخ پتھر کی چند ٹوٹی پھوٹی سلیں بھی یہاں پڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سلیں استھان کے کھنڈر کا حصہ ہی ہیں۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ ایسی ہی دو سلوں کے درمیان چھوٹا سا راستہ موجود ہے جسے جھاڑ جھنکاڑ سے چھپا دیا گیا ہے۔ کوچبان نے اس جھاڑ جھنکاڑ کو ہٹایا اور ہم چارپائی کے سائز کی سلوں کے درمیان سے گزر کر اندر داخل ہو گئے۔ جھاڑ جھنکاڑ کو پھر اسی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ ستیش اور کوچبان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ستیش نے بیگ میں سے ایک ٹارچ نکال کر روشن کر لی۔ دائیں طرف اس سرنگ کی نیم پختہ دیواروں میں کہیں کہیں سوراخ سے تھے جن سے مدھم ہوا اور روشنی اندر آتی تھی۔

مجھے اپنے سامنے لاتعداد سیڑھیوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ یہ سیڑھیاں سرنگ کے پتھریلے فرش کو کھود کر بنائی گئی تھیں۔ ہم آگے بڑھنے لگے۔

''ابھی ہمیں کتنا جانا ہے؟'' میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''بس پانچ دس منٹ۔'' ستیش نے جواب دیا۔

اتنے میں سامنے سے بھی ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ تین بندے نظر آئے۔ انہوں نے قریب پہنچ کر ستیش کو پرنام کیا۔ ستیش نے جواب دیا۔ آنے والے دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کو میں نے پہچان لیا۔ حویلی میں جو دوست ستیش سے ملنے آئے تھے، ان میں یہ بھی شامل تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور ہونٹ بہت موٹے تھے۔ یہ چیک دار شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔

ستیش نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں مہندر! کدھر جا رہے ہو؟''

''بس ذرا نالے تک ..... ابھی آجات ہیں۔''

اس کے ہاتھ میں ایک جال تھا۔ لگتا تھا کہ شاید یہ افراد کہیں مچھلی وغیرہ پکڑنے جا رہے ہیں۔

''حالات ٹھیک ناہیں ..... ذرا خیال رکھنا۔'' ستیش نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔

ستیش اور مہندر کے درمیان دو تین فقروں کا تبادلہ ہوا پھر ہم ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھ گئے۔

کہیں قریب ہی پانی کا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پانی کسی اونچی جگہ سے نشیب میں پتھریلی جگہ پر گر رہا ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے، یہ شور نمایاں ہوتا گیا۔ پھر ایک جگہ ہمیں اس پانی کی جھلک نظر آ گئی۔ یہ پانی کسی نامعلوم سمت سے آ کر ایک چھوٹے آبشار کی صورت میں پتھروں پر گرتا تھا اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر ایک تالاب کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ سفید جھاگ اڑاتے اس پانی کے اندر ایک بہت بڑا مجسمہ ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ وہ اوندھی حالت میں تھا۔ اس کی لمبائی تیس چالیس فٹ سے کم نہیں تھی۔ اس کا ایک بازو غائب تھا۔ چونکہ وہ اوندھی حالت میں تھا اس لیے صورت نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک بات واضح تھی کہ وہ ہندو دھرم کے کسی دیوی دیوتا کا بت ہے جو استبدادِ زمانہ کے سبب بلندی سے اس پانی میں گرا ہے اور نامعلوم عرصے سے یہیں پڑا ہوا ہے۔ جس جگہ سے یہ بت گرا تھا وہ آبشار کے قریب تھی اور مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ہم پتھر میں کھدی ہوئی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آگے نکل گئے۔ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی یہ سرنگ پھر تنگ ہونے لگی۔ اب دائیں دیوار پر نظر آنے والے

[illegible] تھے اس لیے قدرے گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ سو ڈیڑھ سو قدم آگے جا کر مجھے ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا۔ میں اس شور کو کوئی واضح معنی نہیں دے سکا۔ بس یہ احساس ہو رہا تھا کہ آس پاس کچھ لوگ موجود ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں..... چل پھر رہے ہیں۔

ایک جگہ پہنچ کر کوچبان نے ہاتھ بڑھایا اور ایک زنگ آلود آہنی دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی میں چکرا سا گیا۔ میں جیسے ایک دم ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی سے نکل کر ایک وسیع و عریض اسٹیڈیم میں آ گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا زمین دوز ہال تھا۔ یہاں ستونوں کی دو قطاریں تھیں جنہوں نے بہت بڑی چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور نانک شاہی اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ ستون اور ستونوں کے نیچے پتھریلا فرش بھی خستہ حال تھے۔ دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی رنگین شبیہیں دھندلی پڑ چکی تھیں یا یکسر مٹ چکی تھیں۔ چند ایک ..... شکستہ مورتیاں بھی نظر آتی تھیں۔ شاید کسی وقت یہ وسیع ہال اس استھان کا ایک اہم حصہ رہا ہوگا لیکن اب یہ ایک کھنڈر تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ یہ کھنڈر بالکل صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ یہاں رہنے والوں نے اسے ایک آباد جگہ کی شکل دے رکھی تھی۔ مجھے ایک ادھیڑ عمر کا فربہ اندام شخص نظر آیا۔ عام ہندوؤں کے برعکس اس کی داڑھی تھی اور سر پر لمبی جٹائیں تھیں۔ وہ پنڈت کے بجائے کوئی سادھو سنت نظر آتا تھا۔ اس کی صورت میں عجیب سی کرختگی تھی۔ اس شخص کے علاوہ یہاں پندرہ بیس جوان لڑکے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ سب بنے کٹے اور ورزشی جسموں والے تھے۔ ان میں سے دو چار کے کندھوں پر رائفلیں بھی جھول رہی تھیں۔ ایک طرف سات آٹھ لڑکے اوندھے لیٹے تھے اور ایک شخص سے رائفل چلانے اور نشانہ باندھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ دیواروں پر کلہاڑیاں، لاٹھیاں اور خنجر وغیرہ آویزاں تھے۔ ایک نظر دیکھنے سے ہی سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ جگہ ایک تربیتی اکھاڑے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ستیش کو دیکھ کر سب نے اپنی مصروفیات روک دیں اور ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے خاص دلچسپی سے دیکھا جا رہا تھا۔ ستیش ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ چند نوجوان بھی ان دونوں کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ یقیناً یہ گفتگو میرے بارے میں ہی ہو رہی تھی۔ گاہے بگاہے مجھ پر طائرانہ نظر بھی ڈال لی جاتی تھی۔

میں گاڑی کے کوچبان کے ساتھ ایک ہموار پتھریلے فرش پر کھڑا تھا اور آٹھ دس فٹ نیچے ہال کی گہما گہمی کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے ذہن میں کئی اندیشے کلبلانے لگے۔ یہ کسی تشدد پسند گروہ کا ٹھکانا تھا۔ ایک ایسا ہی ٹھکانا (جو کافی چھوٹا تھا) میں نے نئی دہلی کی اندرونی آبادی میں بھی دیکھا تھا۔ وہاں فائرنگ میں کپتان اجے کے ہاتھوں سے آنند نامی ہندو ہلاک ہوا تھا اور کئی لڑکے پکڑے گئے تھے۔ اگر ان لڑکوں میں سے کوئی ایک اس جگہ موجود ہوتا تو کیا ہوتا؟ مجھے فوراً پہچان لیا جاتا اور ستیش کو بھی پتا چل جاتا کہ میں گوپال نہیں ہوں...... ایک مُسلا ہوں اور اس سے پہلے آنند جیسے شخص کے قتل میں ملوث رہا ہوں۔

کچھ دیر بعد ستیش میری طرف مڑا اور مجھے لے کر ہال کمرے میں آ گیا۔ یہاں خستہ حال دیواروں میں پرانی لکڑی کے تین چار دروازے موجود تھے۔ ہم ایک دروازے میں داخل ہوئے اور ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر کر ایک کوٹھڑی نما کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک بستر موجود تھا۔ لکڑی کی ایک الماری اور دو کرسیاں بھی تھیں جن کے آگے تین ٹانگوں والی گول میز رکھی تھی۔ یہاں بھی رادھا، کرشن، لکشمی اور کالی ماتا وغیرہ کی چھوٹی بڑی مورتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک طرف ایک بڑا ترشول پڑا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں ہندو دیومالا کے کسی قدیم منظر میں داخل ہو گیا ہوں۔

میں نے ستیش سے پوچھا۔ ''مختار راجپوت کی بیٹی یہیں پر ہے؟''

''ہاں..... بہت جلد تم اسے دیکھ سکو گے۔''

''کب تک؟''

''اس کا اصل تو مہا گرو ہی بتا دیں گے۔ لیکن میرا وچار ہے کہ یہ ملاقات آج رات یا کل شام تک ہو جاوے گی۔''

''یہ مہا گرو کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے ابھی ان کو دیکھا تو ہے۔ وہ داڑھی والے جٹادھاری، جنہوں نے اپنے چہرے پر بھبوت مل رکھا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ اسی سادھو نما شخص کی بات کر رہا ہے جس نے یہاں آتے ہی ستیش سے سوال جواب کیے تھے۔

میں نے ذرا جھجکتے ہوئے ستیش سے کہا۔ ''میں بہت

الجھن میں ہوں جی۔ پتا نا ہیں کہ آپ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرنا چاہت ہیں..... اور اس میں میرا کیا پارٹ ہووے گا؟''

''شاید تم ڈر رہے ہو کہ تمہیں اس اپرادھن کا خون کرنا پڑے گا۔ ایسی کوئی بات نا ہیں ہے۔ ماتا جی نے کہا تھا کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے کچھ نا ہیں کرنا۔ اگر کچھ کرنا ہوا تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہووے گا کہ تمہیں ایک اگنی جلانا ہووے گی..... بس۔''

''میں چاہت ہوں کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جاوے تاکہ میں واپس جا سکوں۔'' میں نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔

''بالکل ایسا ہی ہووے گا۔ اب تم کچھ کھا پی کر سفر کی تھکاوٹ اتار لو۔ جب سمے آوے گا، میں تمہیں خود بلا لوں گا۔''

''نہیں، مجھے کوئی ایسی تھکاوٹ نا ہیں اور نہ ہی بھوک ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ عجیب انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''میں تم میں کئی انوکھی چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ اتنی سردی میں بھی تم نے عام سے کپڑے پہن رکھے ہیں اور تم سردی کو کچھ زیادہ محسوس بھی نا ہیں کر رہے ہو۔ تم باقاعدگی سے بھوجن بھی نا ہیں لیتے ہو۔ شاید کبھی کبھی سارا دن فاقے سے بھی گزار دیوت ہو۔ میں نے ایک دن تمہیں ٹھنڈے یخ پانی سے اشنان کرتے دیکھا ہے۔ کسی وقت تو لگت ہے کہ تم نے اپنے شریر کو تکلیف اور دکھ میں رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے.....''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نا ہیں۔ بس میرا رہن سہن ہی کچھ اس طرح کا ہے۔''

''ایسا کب سے ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں سمجھا نا ہیں سنتیش صاحب!''

''کسی وقت تو لگتا ہے جیسے تم کوئی چلہ کاٹ رہے ہو۔'' وہ ہولے سے مسکرایا اور خاموش ہو گیا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ میں چلہ ہی کاٹ رہا ہوں۔ ایک ایسا چلہ جو اب شاید میری زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گا۔ مجھے کوئی ایسا ملا تھا جو درد کو میرا اوڑھنا بچھونا بنا گیا تھا۔ وہ مجھے بتا گیا تھا کہ درد کے ساتھ زندہ رہنا کیا ہوتا ہے اور درد کے پانیوں میں ڈوب کر راحت کے موتی کیسے نکالے جاتے ہیں۔ میں اس کی بتائی ہوئی راہ پر چل رہا تھا۔ اس راہ پر کانٹے تھے جو میرے پاؤں میں ٹوٹتے

تھے لیکن اب ان کانٹوں کا ٹوٹنا بھی مجھے عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں بدل رہا تھا۔ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔

وہ چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک شخص بڑا سا طشت لے آیا۔ اس میں مٹھائی، خشک میوہ جات اور گرم دودھ وغیرہ تھے۔ موسم اب سرد ہو چلا تھا۔ میں نے تھوڑی سی پیٹ پوجا کی۔ ساتھ ساتھ میں خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کرتا جا رہا تھا..... میں جانتا تھا کہ میں ایک نہایت سنگین صورتِ حال میں داخل ہو چکا ہوں۔ یہاں سلطانہ راجپوت موجود تھی..... اور وہ میری بیوی تھی۔ وہ بے رحم حالات کی زد میں تھی اور خود بھی بے رحم ہو چکی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک لڑکی جو ایک بچے کی ماں بھی ہے، یکایک زندگی اور زندگی کے سارے تقاضوں سے اتنی دور جا سکتی ہے۔ وہ زرگاں میں تھی۔ اس نے پے در پے قتل کیے تھے اور آسیب بن کر لوگوں کے حواس پر چھا گئی تھی۔ صرف چند ہفتوں میں ہی اس کا نام راجواڑے کے ہر باشندے کی زبان پر آ گیا تھا..... خاص طور پر موہن کمار کے قتل کے بعد تو اس کے نام کے حوالے سے تہلکہ مچ گیا تھا..... لیکن وہ حملے اور سنسنی کا یہ سلسلہ تادیر برقرار نہیں رکھ سکی تھی۔ بے شک کچھ لوگ توقع کرنے لگے تھے کہ وہ کسی روز کسی آسیب کی طرح جارج گورا یا سرجن اسکیل وغیرہ کو بھی جا دبوچے گی مگر یہ ہو نہیں پایا تھا۔ موہن کمار کے قتل کے بعد وہ گھیرے میں آ گئی تھی اور اب اپنے نوعمر بھتیجے طلال راجپوت سمیت ان انتہا پسند کٹر لوگوں کے قبضے میں تھی۔ وہ اسے اپنے کسی نامعلوم عقیدے کے مطابق قرار واقعی سزا دینے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک حیرت ناک اتفاق یہ تھا کہ اس قرار واقعی سزا میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے میں خود بھی گوپال کے روپ میں یہاں موجود تھا۔

میں پچھلے تین چار روز سے یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے سلطانہ کے لیے کیا کرنا ہے؟ اسے کس طرح بچانا ہے؟ کیسے اس کی اور طلال کی زندگی کو محفوظ کرنا ہے اور پھر کسی سلامتی والی جگہ تک رسائی حاصل کرنی ہے؟ لیکن یہ سب کچھ تو تب ہی طے کیا جا سکتا تھا جب مجھے اصل حالات کا علم ہوتا۔ مجھے ابھی تک تاریکی میں رکھا گیا تھا۔ کچھ بھی کھل کر نہیں بتایا گیا تھا۔ اور اب جبکہ ڈراپ سین ہونے میں زیادہ وقت باقی نہیں تھا، میں بدستور اندھیرے میں تھا۔

تو کیا اس اندھیرے کا مطلب یہ تھا کہ میں کچھ نہ کر پاؤں گا اور سلطانہ و طلال کو کسی بدترین انجام سے دوچار ہوتے دیکھوں گا؟ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ کم از کم آسانی سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں یہاں موجود تھا اور اب اتنا لاچار بھی نہیں تھا کہ بھرپور تگ و دو نہ کر سکتا۔ میں اب اپنے اندر مرنے اور مار دینے کی ہمت رکھتا تھا اور اس ہمت کے ساتھ ساتھ میرے اندر کچھ اور بھی موجود تھا۔ یہ جو کچھ بھی تھا، مجھے بارو ندا بیگی نے دیا تھا..... اس کی باتوں نے، اس کے فن نے، اس کے فلسفے نے۔ وہ راہِ عشق کا نیپالی مسافر، وہ صبح کا تارا، وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ..... وہ اپنی بجھتی ہوئی لو سے میرے سینے میں ایک دیا روشن کر چکا تھا۔ اس دیے کی روشنی دھیرے دھیرے میرے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ ہاں، ان لوگوں کے لیے اب سلطانہ راجپوت کو مارنا آسان نہیں تھا۔ اگر یہاں سلطانہ کی لاش گرتی تو پھر اور بھی بہت سی لاشیں گرتیں۔

شام کا وقت تھا جب سنکھ بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر بھجن کی گونج سنائی دینے لگی۔ کچھ دیر بعد میرے کوٹھڑی نما کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی فربہ اندام سادھو اندر آ گیا جسے میں نے باہر اکھاڑے میں دیکھا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوتی اور بنیان تھی۔ چہرے پر بھبوت اور گلے میں مالائیں تھیں۔ یہ یہاں کا مہا گرو تھا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور پرنام کیا۔ وہ جواب دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کی آگیا دی۔ وہ بولا۔ ''تم خوش قسمت ہو..... تمہیں ایشور نے ایک پوتر کام کے لیے چنا ہے۔ تم نے ضرور پچھلے جنم میں کوئی بڑا پُن کیا ہووے گا۔''

میں نے مؤدب انداز میں سر جھکائے رکھا۔

وہ اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا دھرم آشتی اور پریم کا دھرم ہے..... لیکن کبھی کبھی کچھ مور کھ اس آشتی کو تباہ کر دینے پر کمر باندھ لیوت ہیں۔ ایسے میں یہ ممکن نا ہیں رہتا کہ آشتی اور پریم کا دامن تھام کر رکھا جاوے۔ پھر کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ لڑکی سلطانہ ہے۔ ناری ذات کمزور ہووت ہے۔ اس کے خلاف کوئی کٹھور فیصلہ کرتے ہوئے دکھ بھی ہووت ہے۔ لیکن اب یہ ہمری مجبوری ہے کہ اسے اس کے کیے کی سزا دیویں اور فوراً دیویں۔ ایسا نہ ہوا تو ہم سب پر سختی آوے گی۔''

''کیا ایسا ہو سکت ہے گرو جی کہ اس لڑکی کو موت کے علاوہ کوئی اور کڑی سزا دے دی جاوے؟''

کرکٹ کا ایک شوقین بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔
''کیا بات ہے؟'' اس کے دوست نے پوچھا۔
''بیوی نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے کرکٹ نہ چھوڑی تو وہ مجھے چھوڑ جائے گی۔''
''اوہ، واقعی بُری خبر ہے۔''
''ہاں..... یقین کرو، میں اپنی بیوی کو بہت مِس کروں گا۔''
□□□□□□□□□□□□□
جارج ہر وقت کرکٹ کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے عاجز آ کر کہا۔ ''تم ہر وقت صرف کرکٹ کے بارے میں سوچتے ہو، مجھے یقین ہے، تمہیں وہ دن بھی یاد نہیں ہوگا، جب ہماری شادی ہوئی تھی۔''
''مجھے خوب یاد ہے۔'' جارج نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''اس روز کاؤڈرے نے سرے کے خلاف ایک سو دس ناٹ آؤٹ رنز بنائے تھے۔''

''نا ہیں۔'' گرو نے فوراً اپنا سر نفی میں ہلایا اور اس کی آنکھوں سے نفرت چھلکنے لگی۔ وہ بولا۔ ''یہ لڑکی ابھاگیہ ہے۔ اس سے پے در پے اپرادھ ہوئے ہیں اور ہر اپرادھ ایسا تھا جس پر اسے موت کی سزا دی جا سکت تھی۔ اس کا سب سے پہلا اپرادھ یہ تھا کہ اس نے مقامی رواج کے مطابق حکم جی کی پری بننے سے انکار کیا۔ اس کے باپو نے چالاکی دکھائی اور اس کا بیاہ راتوں رات ایک ایسے مُسلے سے کر دیا جو اپنے ہوش حواس میں ہی نا ہیں تھا..... بیاہتا ہونے کی وجہ سے یہ پری بننے سے رہ گئی۔ اس کا دوسرا بڑا اپرادھ یہ تھا کہ اس نے ہاتھا پائی کر کے حکم جی کی چھوٹی پتنی رتنا دیوی کا جبڑا توڑا اور پناہ کے لیے بھاگ کر یہاں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کے پاس آ گئی۔ اس کی اس حرکت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دھیرے دھیرے حالات خراب تر ہو گئے ہیں اور اب زرگاں اور نیل پانی میں یدھ کی نوبت آ گئی ہے۔ اس یدھ میں پتا نا ہیں کتنی اتمائیں مریں گی۔ اس لڑکی کا آخری اپرادھ تو کسی صورت معافی کے قابل نا ہیں ہے۔ اس نے مہاتما جی کی

Uploaded By Muhammad Nadeem

کے ایک دھرم ادتار کو بیدردی سے قتل کیا ہے اور ان کا سر کاٹا ہے..... ززگاں کے بڑے پنڈت مہاراج نے اس کے لیے جو سزا تجویز کی ہے، وہ دھرم کا پالن تو کرے گی ہی..... اس اپرادھن کے لیے بھی وہ سزا چھٹکارے کا سبب بنے گی۔ اس کے سارے پاپ اس سزا سے دُھل جائیں گے۔ اس کی آتما کو شانتی ملے گی.....''

''یہ سزا کیا ہے مہا گرو؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ناگ پھنی کی خشک لکڑی سے چِتا تیار کی جاوے گی اور اس میں اسے جلایا جاوے گا۔''

''زندہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو گی تو زندہ ہی لیکن اپنے ہوش حواس میں ناہیں ہو گی۔ اسے افیم کا ست پلایا جاوے گا پھر اگنی میں رکھا جاوے گا۔''

میں اندر سے لرز گیا۔ اندھے عقیدے انسان کو کیسے کیسے کاموں پر مجبور کر دیتے ہیں۔ توہم پرستی دھرم کا لبادہ اوڑھ کر کسی آسیب کی طرح انسان سے چمٹتی ہے اور اسے کائنات کی سب سے ناقص العقل شے بنا دیتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''مہا گرو! اس سارے عمل میں میرا کردار کیا ہووے گا؟''

''وہی جو بڑے پنڈت مہاراج نے تمہارے لیے چنا ہے۔ چاند کی چودھویں رات کو تم کالی کے مندر میں داخل ہوئے اور وہ پہلے منش بنے جو رام پرشاد کے پریوار کے ساتھ پوجا کے لیے بیٹھا۔ تم اب اگارتی بنو گے۔''

''یہ اگارتی کیا ہووت ہے مہا گرو؟''

''جو کسی بُری آتما کو پاپوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے اس کی مدد کرت ہے۔ تم سلطانہ کی چِتا کو اگنی دکھاؤ گے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہاں سلطانہ کو زندہ جلایا جانے والا تھا۔ یہ کام ایک خاص شخص کے ہاتھوں ہونا ضروری تھا..... اور پتا نہیں کیسے وہ خاص آدمی میں بن گیا تھا۔ جب کالی کے مندر کے پاس بھرے بازار میں اے جے کے حوالدار کی نظر سے بچنے کے لیے میں مندر میں گھسا تھا، مجھے ہرگز پتا نہیں تھا کہ میرا یہ اقدام مجھے لے کر کس راستے پر چل نکلے گا۔

مہا گرو نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پرنتو! کیا تم اس کام کے لیے تیار ناہیں ہو؟''

''اگر یہ بڑے پنڈت مہاراج کا حکم ہے تو پھر انکار کی کوئی گنجائش ہی ناہیں ہے گرو جی لیکن.....''

''لیکن ..... کیا؟'' گرو نے پوچھا۔

''میں سلطانہ کے بھتیجے کے بارے میں جاننا چاہت ہوں۔ اس کا کیا کیا جاوے گا؟''

''وہ ابھی یہاں ہمرے پاس ہی رہے گا۔ اس کے بارے میں پنڈت مہاراج بعد میں فیصلہ کریں گے۔''

میرے اور مہا گرو کے درمیان چند منٹ مزید بات چیت ہوئی۔ پھر وہ مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر واپس چلا گیا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنے لگی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہاں ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو زندہ جلانے کی بات کرنا اور چیز ہے لیکن سچ مچ ایک جیتے جاگتے سانس لیتے وجود کو رسیوں سے باندھ کر آگ میں بھسم کر دینا اور بات۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس زمین دوز ہال میں اور اس سے ملحقہ کوٹھڑیوں اور راہداریوں میں کم و بیش ایک سو افراد موجود ہیں۔ مجھے ابھی تک ان میں کوئی عورت نظر نہیں آئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر کی عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ یہ اپنے چہروں مہروں سے ہی شدت پسند لوگ نظر آتے تھے۔ ان میں سے کچھ نے اپنے چہروں پر بھبوت مل رکھا تھا اور گیروا کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہاں کا کرتا دھرتا تو ایک جگ جیت نامی شخص تھا جو مجھے ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا تاہم ستیش کو بھی یہاں ایک اہم حیثیت حاصل تھی۔

میں سلطانہ اور طلال کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہچان لیتے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی یہ پہچان ظاہر بھی کر دیتا۔ ایسی صورت میں میرا بھانڈا فوراً پھوٹ جاتا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک شخص نے دروازہ کھولا اور کمرے کے اندر آ گیا۔ یہ ستیش کے دوستوں میں سے ایک تھا۔ یہ بھدی آواز والا وہی شخص تھا جو ذرا لنگڑا کر چلتا تھا اور جسے میں حویلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔

عیار آنکھوں والا یہ شخص بڑی جلدی بے تکلف ہو جانے والوں میں سے تھا۔ اس نے سب سے پہلی اطلاع تو مجھے یہ دی کہ مختار راجپوت کی اپرادھن بیٹی کو پنڈت مہاراج کے حکم کے مطابق موت کے گھاٹ اتارنے کا عمل آج نہیں ہو گا اس میں تھوڑی سی تاخیر ہے۔

اس کی یہ اطلاع میرے لیے سکون کا باعث بنی۔ تاہم ابھی مجھے اس اطلاع پر پوری طرح یقین نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ستیش یا مہا گرو مجھے خود آ کر بتائیں مگر ستیش نہ جانے کن مصروفیات میں الجھا ہوا تھا۔ آدھ پون گھنٹے کی بات چیت میں بھدی آواز والا یہ ارجن نامی شخص مجھ سے مزید بے تکلف ہو گیا۔ وہ انتہا پسندی کی ہر تعریف پر پورا اترتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے اس میں کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا تھا، خاص طور سے مراد شاد اور ان کے حواریوں کے لیے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ چھوٹے سرکار کو اپنا دھرم تبدیل کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اور دھیرے دھیرے ٹل پانی کی راج گدی پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے منہ سے جیسے چنگاریاں چھوٹتی تھیں۔

وہ بولا۔ ''ہم نے بہت سہہ لیا ہے۔ اب ہم اینٹ کا جواب پتھر سے بلکہ گولی سے دیویں گے۔ اپنے ایک بالک کے بدلے میں ان کے دس بالکوں کی ہتھیا کریں گے۔ اپنی ایک عورت کے بدلے میں ان کی دس عورتوں سے بلادکار کریں گے۔ اب ہمارے ہاتھ کوئی ناہیں روک سکتا۔ اب ہمیں چپ ناہیں رہنا چاہیے۔ ہم میں سے کسی کو بھی چپ ناہیں رہنا چاہیے۔ میں تو تم کو بھی مشورہ دوں گا گوپال..... اب کنارے پر رہنے کا ناہیں، طوفان میں کودنے کا وقت ہے۔ جو کنارے سے تماشا دیکھیں گے، وہ پاپ کریں گے۔ تم بھی اپنے آپ کو کسی جتھے میں شامل کر لو۔ ضروری ناہیں کہ یہ ہمارا ہی جتھا ہو۔ بھگوان کی کرپا سے اب اور بھی بہت سے لوگ یہ کام کر رہے ہیں.....'' وہ جوش کے عالم میں بولتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ارجن نے گفتگو کا رخ ایک اور جانب موڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانیت چمکنے لگی اور مسکراتے لہجے میں زہر سرایت کر گیا۔ اس نے مجھے ایک اور مسلمان لڑکی کے بارے میں بتایا جو یہاں موجود تھی اور جسے اس کے کرموں کی قرار واقعی سزا مل رہی تھی۔ میں یہ سن کر لرز گیا کہ اس بے بس لڑکی کو یہاں موجود انتہا پسند دہشت گرد کئی روز سے زیادتی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔

ارجن نے ایک آنکھ میچ کر بڑے رازدارانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''اگر چاہو تو تم بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو سکت ہو۔''

''میں سمجھا ناہیں۔''

وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''سیانے کہتے ہیں جو چیز بے کار جا رہی ہو، اسے بے کار جانے سے پہلے استعمال کر لینا چاہیے۔ اس چھوکری کو بھی ایک دو دن میں مُکت (ختم) ہو جانا ہے تو پھر کیوں نہ یہ کسی کے کام آ جاوے۔''

''تمہارا مطلب ..... بلادکار سے ہے؟''

''بلادکار ناہیں ..... انصاف ..... انصاف..... نیائے'' ارجن کے لہجے میں پھر بے پناہ زہر اتر آیا۔ ''اس حرامزادی نے بھائی نے ایک برہمن لڑکی کے ساتھ زیادتی کی۔ بیاہ کا جھانسا دے کر اسے اغوا کیا۔ کئی روز تک ایک کرائے کے مکان میں بند رکھا۔ خود اس کے ساتھ سوتا رہا، اپنے دوستوں کو بھی سلاتا رہا۔ اس ''نیچ کام'' میں اس حرامزادے کی بہن بھی پوری طرح شریک تھی۔ دچولن بنی ہوئی تھی..... ملاقاتیں کراتی تھی۔''

میں حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔ ''اب کہاں ہے وہ لڑکا؟'' میں نے پوچھا۔

''بھاگ گیا کتا، احمد آباد کی طرف..... لیکن ہمارے بندے پیچھے ہیں۔ ایک نہ ایک روز ڈھونڈ لیں گے اسے۔''

''اور یہ لڑکی وہی ہے اس کی بہن..... ملاقاتیں کرانے والی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ناہیں، یہ وہ ناہیں۔ اس بدذات کو تو ہمرے جتھے کے جوانوں نے وہیں مار ڈالا تھا، اس کے گھر میں۔ مار مار کر بھرتا بنا دیا تھا اس حرامزادی کے تھوبڑے کا۔ یہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ زندہ ہاتھ آ گئی تھی گھر کے پچھلے کمرے سے۔ وہاں ایک بڑے جستی صندوق میں چھپ گئی تھی۔''

میری نگاہوں میں اس لاش کا منظر گھوم گیا جو چند دن پہلے ہم نے شہر کے ایک اندرونی محلے میں دیکھی تھی۔ تھانے دار محمود اور کپتان اے جے وغیرہ کو شک ہوا تھا کہ یہ شاید سلطانہ کی لاش ہے۔ مجھے لاش کا مسخ چہرہ یاد آیا اور جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ ارجن نامی غنڈا اسی بدقسمت لڑکی کا ذکر کر رہا ہے.....

اس نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھاما اور ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ''میں رات کو دس گیارہ بجے کے قریب آؤں گا۔ ستیش بابو سے ان باتوں کا ذکر کرنا ناہیں کرنا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ابنِ آدم جب پستی میں گرتا ہے تو کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض لوگ انتہاپسندی کو مسلمانوں کے ساتھ منسوب کرنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن یہ تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ توہم پرستی کے خمیر سے جنم لینے والے انتہاپسند ہر مذہب، ہر قوم میں پائے جاتے ہیں ..... اس کی ایک ناقابلِ تردید و کرب ناک مثال میرے سامنے تھی۔ میں کچھ ایسے لوگوں کے درمیان تھا جو انتہاپسندوں سے بھی آگے کی شے نظر آرہے تھے۔ وہ بداخلاقی اور سفاکی کی ہر حد سے گزرے ہوئے تھے۔

مقررہ وقت پر ارجن میرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس نے کسی شے کا نشہ بھی کیا ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تاڑی تھی۔ وہ ایک راہداری سے گزار کر مجھے ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا۔ یہاں سات آٹھ بندے موجود تھے۔ کچھ تاش کھیل رہے تھے، کچھ کانوں میں لینے سگریٹ پھونک رہے تھے اور گپ شپ کررہے تھے۔ ان سب نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور چپکے چپکے مسکرائے بھی۔

شیشے کی ایک لمبی بوتل تاڑی سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ارجن نے مجھے پینے کی پیشکش کی لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کردیا۔

ہم گپ شپ میں مصروف ہوگئے۔ ارجن کوشش کررہا تھا کہ میں باقی افراد سے بھی بے تکلف ہوجاؤں۔ وہ سب صورتوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ کئی ایک کے چہرے پر نئے و پرانے زخموں کے نشان موجود تھے۔ وہ مراد شاہ کے بارے میں اور اس کے ایک ہم زلف کے بارے میں نہایت نازیبا گفتگو کررہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ننگی گالیاں ہی بک رہے تھے۔ ساتھ ساتھ بینگن کے پکوڑے کھائے جارہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کمرے کا ایک بغلی دروازہ کھلا اور ایک لمباتڑنگا شخص تاڑی کے نشے میں ڈولتا اور اپنی قمیص درست کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ گنگنا رہا تھا..... رام تیری گنگا میلی ہوگئی..... ہو رام تیری گنگا میلی ہوگئی .....

اس نے دو تین پکوڑے کھائے اور پھر دھپ سے ایک چارپائی پر گر گیا۔ ارجن نے چند لمحے تک مجھے غور سے دیکھا پھر ایک آنکھ بھینچی اور مجھے ادھ کھلے دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں اس صورتِ حال کو اب کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اپنے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ سجائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ارجن نے مسرور لہجے میں کہا۔ "بجرنگ بلی کی جے ..... ہر شیر نکلے ہو بھئی۔" میں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ "کچھ اور نا ہیں تو یہی لے جاؤ۔"

میں نے پیکٹ ہوا میں دبوچ لیا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ اندر لالٹین کی مدھم سی زرد روشنی تھی۔ میں نے دروازہ بند کردیا۔ ایک پلنگ پر بوسیدہ سے لحاف کے نیچے مجھے بے بسی کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر آئی۔ یہ ایک بیس بائیس سال کی لڑکی تھی۔ اس کے روکھے پھیکے بال منتشر اور چہرہ لالٹین کی روشنی ہی کی طرح زرد اور بیمار تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں اور ہونٹ خشک ہو کر سیاہی مائل ہو چکے تھے۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح اپنے اردگرد سے لاتعلق پڑی تھی۔ رخسار پر ایک دو مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

اس نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا مگر چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ شرم نہ خوف، نہ غصہ نہ بیزاری۔ وہ بس اسی طرح پھول دار لحاف کے نیچے بے لباس پڑی رہی۔ روندی، مسلی ہوئی، کچلی ہوئی اجاڑی ہوئی۔ وہ جیسے صدیوں سے ایسے ہی پڑی تھی۔ آدم کے بیٹوں سے پوچھ رہی تھی۔ میں کائنات کا حسن ہوں۔ میں نازک ترین جذبوں کی کہکشاں ہوں۔ میں محبت کی خوشبو اور زندگی کی روح ہوں۔ میرے بے لوث جذبوں نے زندگی کو زندگی بنایا ہے۔ تو پھر..... میں زندگی کو زندگی بنانے والی ..... زندگی سے اس قدر دور کیوں کردی جاتی ہوں؟ کیوں مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے؟ کیوں ہر ظلم و ستم کا رخ کسی نہ کسی طور میری طرف موڑ دیا جاتا ہے؟ مجھے کچل مسل کر تاتار کی شناخت بنا دیا جاتا ہے؟ جیسے میں اب تمہارے سامنے پڑی ہوں۔ شاید تم بھول رہے ہو، میرے گرم ہونٹوں پر گلاب کھلا کرتے ہیں۔ میرے دل آویز جسم میں خوشبودار محبت کے چشمے بہا کرتے ہیں۔ میری بانہوں میں سما کر تم مرد و زن کی محبت کا ناقابلِ فراموش لمس حاصل کرسکتے تھے ..... لیکن اب تم کیا حاصل کرو گے؟ کچھ بھی نہیں۔ مجھے پانے سے پہلے ہی تم مجھے کھو چکے ہو۔ تم ایک سڑے باسی گوشت پر جھپٹے مارو گے۔ باآخر تمہارے حصے میں کراہت، ندامت اور پچھتاوے کے سوا

[illegible] کچھ نہیں۔

میں لحاف کے نیچے پڑی اس لڑکی کی خاموش آواز سنتا رہا۔ یہ آواز میرے رگ و پے میں سماتی رہی۔ وہ جو کہہ رہی تھی، ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں ہولے سے اس کے قریب کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ قدرے حیران ہوئی۔ اسے جیسے توقع نہیں تھی کہ میں بستر کے بجائے کرسی کی طرف بڑھوں گا۔ کئی سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ وہ میری طرف اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہر سلوک کے لیے تیار تھی لیکن اس سلوک کے لیے تیار نہیں تھی جو میں اس کے ساتھ کررہا تھا۔ میں نے لحاف کا کونا اوپر کی طرف کھینچا اور لڑکی کا عریاں کندھا اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے لباس پہننے کا کہوں لیکن میرے ایسا کہنے سے ارجن اور اس کے ساتھی چونک سکتے تھے ..... اور مجھے اپنا بہروپ برقرار رکھنا تھا۔

میں نے اس کے بوسیدہ بالوں کی لٹیں اس کے چہرے سے ہٹائیں اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ ہلکے سے بخار میں تھی۔ میرا نرم رویہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔ "کب سے ہو یہاں؟"

"کچھ یاد نا ہیں۔" وہ سسکی۔

"کیا واقعی تمہارے بھائی نے کسی لڑکی کو اٹھایا تھا..... اور اپنے پاس رکھا تھا؟"

"میں ..... اس بارے میں کچھ نا ہیں کہنا چاہتی ..... اور یہ سب کچھ بتانے سے ..... کچھ حاصل بھی نا ہیں ہے ..... ہونا وہی ہے جو پہلے ہوتا آیا ہے۔ تم بھی وہی کرو گے اور چلے جاؤ گے۔" اس نے بیزاری سے اپنا منہ پھیر لیا۔

"نا ہیں ..... میں وہ نا ہیں کروں گا جو ہوتا آیا ہے ..... میں تمہیں سوگند دیتا ہوں۔"

اس نے ایک بار پھر مجھے غیر یقینی نظروں سے دیکھا۔

میں اس کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اسی طرح پھول دار لحاف میں سمٹی لیٹی رہی، میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اس کا بھائی بے قصور تھا۔ وہ برہمن لڑکی خود ہی اس کے بھائی کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ ہر صورت اس سے بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ جب کوئی راستہ باقی نہ رہا تو وہ دونوں گھر چھوڑ گئے۔ بعد میں انہیں پکڑ لیا گیا اور اس کے بھائی پر بے شمار جھوٹے الزامات لگا دیے گئے۔ اس کی بڑی بہن کو اس الزام میں مار دیا گیا کہ وہ اس برہمن لڑکی کی ملاقاتیں بھائی سے کرواتی تھی۔ وہ لوگ اسے اٹھا کر یہاں لے آئے اور اب وہ آٹھ دس دن سے یہیں پر بند تھی۔ اس کا نام شکیلہ تھا۔

یہاں اس کے ساتھ جو کچھ ہورہا تھا، وہ اس کی حالت سے صاف ظاہر تھا۔ وہ بدمست خطرناک غنڈوں کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی اور چند ہی دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ یہاں سے زندہ نہیں نکل سکے گی۔ اتنی ہمت اس میں نہیں تھی کہ خودکشی کرسکتی ورنہ کب کا موت کو گلے لگا چکی ہوتی۔

کمرے کے ایک کونے میں اس کا لباس بکھرا پڑا تھا۔ طاق دان میں لالٹین کے ساتھ کھانسی اور بخار وغیرہ کی دوا رکھی تھی۔ یہیں پر ایک کونے میں، میں نے ایک بیلچہ پڑا دیکھا جس کے دستے پر گھنگرو بندھے ہوئے تھے..... اور کسی دیوی غالباً کالی ماتا کی شبیہ کھدی ہوئی تھی۔ بیلچے کے پھل کا رنگ گہرا سیاہ تھا اور زرد لالٹین کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے بیلچے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کالی ماتا کا بیلچہ ہے۔" وہ نحیف آواز میں بولی۔

"کالی ماتا کا بیلچہ؟ یہ یہاں کیوں رکھا ہے؟"

"میں اس سے مٹی کھودتی ہوں۔" وہ منمنائی۔ "وہ کہوت ہیں کہ میں تلسی کے پودے کے نیچے سے مٹی کھودوں گی تو مجھے وہاں سے شیوا جی کے نام کی مہر ملے گی اور اگر چار دن کے اندر مجھے یہ مہر مل گئی تو پھر وہ مجھے چھوڑ دیویں گے ..... لیکن ..... میں اب جینا نا ہیں چاہتی۔ تم لوگن مجھے مار ہی دو تو اچھا ہے۔" وہ واقعی زندگی سے بیزار نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف تو تھا مگر زندگی کا خوف شاید اس سے زیادہ تھا۔

اس نے اپنے آنسو صاف کرنے کے لیے اپنا ہاتھ لحاف سے باہر نکالا تو مجھے اس کی ہتھیلی پر چھالے نظر آئے۔ اس کے بتائے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ یہ چھالے بیلچہ چلانے کی وجہ سے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "شکیلہ! اگر تم زندگی سے اتنی ہی بیزار ہو چکی ہو تو پھر ان لوگن کے کہنے پر بیلچہ کیوں چلاوت ہو؟"

"یہاں کچھ بھی میری مرضی سے نا ہیں ہوتا۔" وہ سسکی۔ "کل میں نے مٹی کھودنے سے انکار کیا تھا،

میری قمیص پھاڑ دی گئی اور مجھے مارا گیا۔"

میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک طرف ایک الماری پر تہ شدہ جائے نماز رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کس کی جائے نماز ہے؟"

"میری .... میں اس پر نماز پڑھتی ہوں۔"

"کیا یہ لوگ تمہیں پڑھنے دیتے ہیں؟"

"ہاں، ان کو اعتراض نہیں۔ رات ہونے سے پہلے میں جو کچھ چاہوں کر سکتی ہوں۔" وہ دردناک لہجے میں بولی۔

میں اس صورت حال پر ششدر تھا۔ شیوا جی کی مہر والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کیا یہ سب کچھ بھی کسی کنڈلی کی وجہ سے کیا جا رہا تھا؟

میں نے اس شکیلہ نامی بدحال لڑکی سے سلطانہ کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ اسے اس بارے میں کچھ پتا نہیں کیونکہ اسے بہت کم اس کمرے سے باہر نکلنے دیا جاتا ہے۔ ہاں دو دن پہلے رات کے وقت بجر نگ بلی اور ہنومان کی جے کے زوردار نعرے سنائی دیے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ خوشی میں ہوائی فائرنگ بھی کی گئی ہے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو کوئی بڑی کامیابی ملی ہے۔ اس وقت اس نے گرو جی کی (چرم) چیلی راوھا جی کو ایک ملازم سے باتیں کرتے سنا تھا۔ ملازم گرو کی چیلی کو بتا رہا تھا کہ کسی لڑکی کو رسیوں سے باندھ کر یہاں لایا گیا ہے۔ وہ دیوی دیوتاؤں کو برے ناموں سے پکار رہی ہے اس لیے اس کے منہ میں مٹی بھر کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا گیا ہے۔

"کیا کوئی لڑکا بھی اس کے ساتھ یہاں آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"شاید کسی لڑکے کی بات بھی ہو رہی تھی۔" شکیلہ نے تصدیق کی۔

میں قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک شکیلہ کے پاس رہا۔ اس دوران میں، میں نے دو تین سگریٹ بھی پھونکے۔ میں شکیلہ سے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ میں اس کی مدد کرنے کی اپنی سی کوشش کروں گا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے اس موضوع سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ وہ جانتی ہے کہ وہ بچ نہیں سکتی اس لیے مرنے کے لیے تیار ہے۔ شاید وہ اپنے طور پر مزاحمت کا حق ادا کر چکی تھی اور اب اس نے خود کو کلی طور پر بدترین حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اس سے رخصت ہو کر باہر آ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اس کے لیے دوبارہ کچھ کر سکوں گا۔

میں اپنے سینے پر ایک بہت بڑا بوجھ لے کر اس کمرے سے نکلا۔ ارجن اور اس کے ساتھیوں نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے باہر آتے ہی ارجن کے ایک اور ساتھی نے اپنی مونچھوں کو سہلایا اور لڑکی والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

میں بستر پر لیٹا رہا۔ میرے اندر آگ سی روشن تھی۔ جی چاہ رہا تھا، اس کڑاکے کی سردی میں تیز بارش ہو۔ میں برہنہ جسم کسی منجمد جھیل کے کنارے، سرد ہواؤں کو چیرتا ہوا بھاگتا چلا جاؤں۔ میرا سینہ اتنا ہانپ جائے کہ پھٹنے لگے، میرے پاؤں خون اگلنے لگیں۔ پھر میرے سامنے میرا کوئی بپھرا ہوا دشمن آ جائے۔ اس کی آنکھوں میں قاتل سرخی ہو۔ وہ پوری وحشت سے مجھ پر جھپٹے اور میں پوری وحشت سے اس پر ٹوٹ پڑوں۔

میری سانس تیزی سے چلنے لگی۔ رگ پٹھے تن گئے۔ میں اٹھ کر اس مختصر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگا۔ باہر ہال کمرے میں شور تھا۔ لگتا تھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور ہلا گلا کر رہے ہیں۔ میں نے ایک میز پر چڑھ کر ایک روزن میں سے ہال کمرے میں جھانکا۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ ایک طرف فرش پر لمبی چٹائی بچھی تھی۔ اس پر تین چار افراد بیٹھے کچھ گھوٹ رہے تھے۔ لکڑی کے رنگین ڈنڈوں پر جھنگر چڑھے ہوئے تھے۔ پیالوں میں بھر بھر کر کچھ پیا بھی جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں بھنگ کا دور چل رہا ہے۔ ایک بڑا سا شخص جس نے چہرے پر بھبوت ملا ہوا تھا، ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں گہرا سرمہ لگایا ہوا تھا، مجمعے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تین نوک والا نیزہ تھا جسے ترشول کہا جاتا ہے۔ وہ شیو جی کے نام کے نعرے لگا رہا تھا اور کچھ افراد اس کے گرد رقص کر رہے تھے۔ دفعتاً میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میری تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ارد گرد کی ہر شے گردش میں آ گئی ہے اور میں زمین سے اٹھ کر فضائے بسیط میں معلق ہو گیا ہوں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پھر غور سے دیکھا۔ جو کچھ نظر آ رہا تھا وہ تصور یا تخیل نہیں تھا..... ایک جیتا جاگتا منظر تھا.... مجھے عمران دکھائی دیا۔ ہال کی دھواں دھواں فضا میں چہروں کے ہجوم میں، میں نے اس کا روشن چہرہ صاف اور

واضح دیکھا۔ ایک گلابی رومال تھا وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ بس ایک یا دو سیکنڈ کے لیے۔ پھر ایکا ایکی وہ چہروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

"عمران ..... عمران!" میں پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلایا۔

تب میں جست لگا کر میز سے اترا۔ ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھولا اور راہداری میں آ گیا۔ اندھا دھند بھاگتا ہوا میں ہال کمرے میں دھواں دھواں فضا میں پہنچا اور اسی مقام کی طرف لپکا جہاں میں نے اس کی جھلک دیکھی تھی۔ وہاں خاکستری رنگ کے گول ستون کے پاس وہ موجود نہیں تھا۔ "عمران .... عمران .... !" میں ایک بار پھر چلایا۔

کئی لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں دیوانوں کی طرح چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ تب مجھے پتھریلی سیڑھیوں کے پاس جہاں ہاتھی کا ایک شکستہ مجسمہ موجود تھا، پھر گلابی رومال کی جھلک نظر آئی۔ میں لوگوں کو چیرتا اور مختلف اشیا سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھا۔ تاہم میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے گلابی رومال اوجھل ہو چکا تھا۔

"کیا بات ہے ..... کس کو ڈھونڈتے ہو؟" ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں ہر آواز کو نظر انداز کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ دونوں طرف طویل برآمدے تھے اور شکستہ ستونوں کی قطاریں تھیں۔ یہاں بہت سی کوٹھڑیاں بھی موجود تھیں۔ میں دیوانوں کی طرح مختلف کوٹھڑیوں میں تھانکتا رہا .... لیکن کچھ نہیں ملا۔

میں وہیں ایک سیڑھی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کیا میری نظر دھوکا کھا رہی تھی؟ کیا میرا تصور مجھے فریب دے رہا تھا؟ اس کا تصور اکثر و بیشتر میرے حواس پر چھایا رہتا تھا اور میں اسے اپنے بہت قریب محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ تصور اب اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ تصور اور حقیقت میں تمیز مشکل ہو گئی تھی .... ؟

"کیا ہوا گوپال؟" ستیش کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں چونک گیا۔

ستیش میرے سر پر کھڑا تھا۔ چند دیگر افراد آٹھ دس قدم دور کھڑے قدرے تعجب سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیا کسی جان پہچان والے کو دیکھا ہے تم نے؟" ستیش نے پوچھا۔

ہاں [illegible] نہیں [illegible] تھا۔" میں نے مبہم جواب دیا۔

"کون تھا؟"

"بس .... تھا ایک پرانا دوست لیکن .... وہ یہاں کیسے ہو سکتا ہے؟ وہم ہی ہوا ہے۔"

کچھ دیر بعد میں اس ہنگامے سے نکل کر پھر اپنے کمرے میں تھا۔ جسم میں سنسناہٹ تھی اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو شدت سے چاہا جاتا ہے، وہ جدائی کے بعد بھی ہیولوں کی صورت میں ہمارے ارد گرد موجود رہتے ہیں۔ ہمیں چہروں میں ان کی جھلک نظر آتی ہے اور آوازوں پر ان کی آواز کا شبہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بار وندا جیلی کی مثال میرے سامنے تھی۔ میں نے اس کے چہرے میں عمران کی جھلک ڈھونڈ لی تھی .... حالانکہ یہ جھلک کچھ ایسی نمایاں بھی نہیں تھی۔

تو کیا اب مجھے کسی اور چہرے میں اپنے بچھڑے یار کی صورت دکھائی دی تھی؟ میں سوچتا رہا اور سر میں

تعلق

میرے ایک دوست کو اس کے بیٹے کے سلسلے میں اسکول طلب کیا گیا۔ ہیڈ ماسٹر کو لڑکے کے اسکول ورک کی طرف سے بڑی تشویش تھی۔

"دیکھیے انصاری صاحب!" اس نے میرے دوست سے کہا۔ "آپ کا بیٹا عاصم آج کل پڑھنے لکھنے پر کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ اس کی کلاس ٹیچر نے پوچھا کہ پانی پت کی لڑائی کس کس نے لڑی تھی تو عاصم نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔"

میرے دوست نے کہا۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب! اگر میرا لڑکا یہ کہتا ہے کہ اسے لڑائی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تو یقین کیجیے وہ بالکل معصوم اور سچا ہے۔ کسی لڑائی جھگڑے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

ہیڈ ماسٹر کی زبان اچانک گنگ ہو گئی۔ وہ تعجب سے میرے دوست کی طرف دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

میرا دوست اپنے بیٹے کو اسکول سے لے کر گھر واپس ہوا۔ راستے میں ایک جگہ سرخ روشنی پر اسے کار روکنی پڑی۔ وہ وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "عاصم ایک بات سمجھ لو۔ ہیڈ ماسٹر کے سامنے تو میں نے تمہیں بچا لیا ہے لیکن اگر آئندہ کبھی مجھے پتہ چلا کہ پانی پت کی لڑائی سے تمہارا کوئی تعلق رہا ہے تو میں تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔"

ٹیسیں سی اٹھنے لگیں [illegible] ذہنی کیفیت میں رہا۔ ہال کمرے سے دھیما شور اب بھی ابھر رہا تھا۔ میں اس شور کو سنتے سنتے سو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز شام تک بے چینی کی کیفیت رہی۔ اس بے چینی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ جھلک جو میں نے کل رات دھواں دھواں ہال کمرے میں دیکھی تھی۔ یہ میرا تصور ہرگز نہیں تھا اور اگر یہ چہروں کی مشابہت تھی تو بھی حیرت انگیز تھی۔ پریشانی کی دوسری وجہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تھے جو میں نے کل شب لٹی پنڈید کے ساتھ گزارے تھے۔ اس کھنڈر میں رائفلوں کے سائے تلے اور بارود کے گھیرے میں وہ بے بسی کی تصویر بن چکی تھی۔ اگر میں سلطانہ کے لیے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو پھر ضروری تھا کہ شکیلہ کے لیے بھی ایسا ہی ارادہ رکھوں۔

میری مہمان نوازی کا پورا پورا خیال رکھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ کٹر ہندو ہونے کے باوجود ارجن نے مجھے چپکے چپکے یہ آفر بھی کر دی کہ اگر میں ماس یعنی گوشت کھانا چاہوں تو وہ بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ سہ پہر کے وقت مجھے راہداری میں گرو جی کی چنی کی ایک جھلک بھی نظر آئی۔ وہ گردسے خاصی بھی اور خوب صورت بھی تھی .... اس کی مانگ میں سیندور تھا اور وہ نہایت چمکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ دو داسیاں مؤدب انداز میں اس کے ارد گرد موجود تھیں تاہم مجھے گرو کی یہ جوان سال دھرم پتنی کچھ بجھی بجھی سی نظر آئی۔

شام کے فوراً بعد ہال کمرے میں ہلچل سی محسوس ہونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ آج رات یہاں کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ بھجن مسلسل بڑھتے جا رہے تھے۔ گاہے بگاہے سنکھ کی آواز سنائی دیتی تھی اور پھر ایک نقارہ سا پیٹا جانے لگتا تھا۔ لگتا تھا کہ ہال کمرے میں ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ میں ایک بار پھر روزن میں سے دیکھنا چاہتا تھا مگر میں نے جو تپائی روزن تک پہنچنے کے لیے استعمال کی تھی، وہ کسی ضرورت کے تحت باہر لے جائی جا چکی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا .... چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ سلطانہ سے عنقریب میری ملاقات ہونے والی ہے اور نہایت سنگین حالات میں ہونے والی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے فضا میں تھوڑی سی حدت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

[illegible] رات نو بجے کا وقت تھا جب شور و غل میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ نقارہ اور زور سے پیٹا جانے لگا اور اس کی آواز سے در و دیوار گونجنے لگے۔ اچانک دروازہ کھلا اور مجھے ستیش کی صورت نظر آئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔ اندر آتے ساتھ ہی اس نے میرے گلے میں جھولنے والی نیلگوں پتھروں کی مالا کا معائنہ کیا اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس کے بعد میرے سر میں وہی عجیب خوشبو والا تیل ڈالا گیا جو حویلی میں ڈالا گیا تھا۔

ستیش اور اس کے ساتھی مجھے لے کر راہداری میں آئے تو ہال کمرے کا شور و غل زیادہ واضح سنائی دینے لگا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں وسیع و عریض ہال میں تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں ایک اور چھوٹا ہال نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے میری نظر اس پر نہیں پڑی تھی یا شاید کسی بڑے پردے کے ذریعے سے اس چھوٹے ہال یا چیمبر کو چھپایا گیا تھا۔ اس گول ہال کا فرش بڑے ہال کے فرش سے قدرے نیچا تھا۔ گنبد نما چھت میں ایک بڑا سوراخ چمنی کی طرح موجود تھا۔ میں نے اس گول ہال یا چیمبر کا منظر دیکھا اور خون میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ یہاں ایک بڑی چتا تیار تھی۔ شاید یہ ناگ پھنی کی لکڑی کی تھی۔ قریب ہی بڑے بڑے دوروغنی مٹکوں میں چتا کا تیل رکھا تھا۔ چتا کے قرب و جوار کو زرد پھولوں اور چمکیلے کاغذوں کی مدد سے سجایا گیا تھا۔ چتا کے اندر لکڑی کے مستطیل تختے پر جو لڑکی بے سدھ پڑی تھی، وہ سلطانہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ وہ نیم بے ہوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر ایک سرخی مائل چادر تھی جس کے نیچے سے اس کے جسمانی نشیب و فراز دکھائی دیتے تھے۔ اس کے بالوں کو ایک طرف سمیٹ کر کنپٹی کے قریب جوڑا سا باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ سانس لے رہی ہے۔ اس کی رگوں میں زندگی رواں ہے ..... لیکن اس زندگی کو بھڑکتے شعلوں میں بھسم کرنے کی پوری تیاری کی جا چکی تھی۔

وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ملیح چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ یہ نشان ان سختیوں کو ظاہر کر رہے تھے جو پچھلے چند دنوں میں اس نے جھیلی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر پہلی بار میرے سینے میں عجیب سی ٹیسیں اٹھیں۔ میں نے خود کو اس کے بہت قریب محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ وہ میرے جسم کا حصہ ہے۔ میری زندگی کا ایک جز ہے۔ میں نے

اس لمحے میں ان سارے احسانات کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کیا جو وہ ایک بیوی کی حیثیت سے مجھ پر کرتی رہی تھی..... اور ان ساری قربانیوں کا بوجھ بھی جو وہ میری بے خبری میں میرے لیے دیتی رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ دیوانہ وار بگوڈا کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھسی تھی اور اپنی جان پر کھیل کر مجھے باہر لائی تھی اور پھر اس کے بعد میری سلامتی کے لیے اس کی جدوجہد کا طویل دور شروع ہوا تھا۔ آج وہ خود شعلوں کی زد میں تھی۔ میں تو پھر بھی بگوڈا میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا، وہ تو آج ہوش و خرد سے بیگانہ بالکل لاچار سی تھی۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لیے عجیب سی [illegible] محسوس کی۔

چتا کے ارد گرد برپا شور و غل عروج پر پہنچ [illegible] بہت سے جوشیلے نوجوانوں کے ہاتھ میں ترشول تھے۔ ان میں سے کچھ نے بھبوت رمار کھا تھا یا اپنے چہروں پر رنگوں سے مختلف نقش و نگار بنائے ہوئے تھے۔ ان [illegible] انداز سے عیاں تھا کہ وہ ایک خاص رسم کی ادائیگی کے لیے بالکل تیار ہیں.....

چتا کے بالکل سامنے لکڑی کی ایک اونچی چوکی پر مہا گرو فقط ایک دھوتی پہنے، آلتی پالتی مارے بیٹھا [illegible] وہ تیزی سے مالا جپ رہا تھا اور گلا بے بگا سے اشلوک [illegible] پڑھتا تھا۔ ایک بوڑھا پجاری آگے بڑھا اور اس نے میرے ہاتھ میں ایک مشعل نما چیز تھما دی۔ میرے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی..... تو بدترین لمحے پہنچ گئے؟ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگلے ایک دو منٹ میں چتا پر تیل انڈیلا جانے والا ہے اور اس منحوس لکڑی کو روشن کیا جانے والا ہے تاکہ میں چتا کو اگنی دکھانے کا اعزاز حاصل کر سکوں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میرے سامنے بس ایک ہی راستہ ہے۔ اپنے ارد گرد موجود درجنوں رائفل برداروں میں سے میں کسی ایک کی رائفل چھین لوں اور اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دوں۔ مار دوں..... مر جاؤں یا پھر کسی طرح سلطانہ کی مدد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ کامیابی کا امکان معدوم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ "بہت کچھ" ختم ہونے والا ہے اور اس "بہت کچھ" میں سلطانہ اور میں بھی شامل ہیں۔ ایک نوجوان جس نے چہرے پر بھبوت ملا ہوا تھا، آنکھوں میں رنگ لگایا ہوا تھا اور فقط ایک دھوتی پہن رکھی تھی، وہ میرے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی۔ اس بوتل میں سے اس نے میرے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی پر تھوڑا سا تیل ڈالا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "پرتو! تم تیار ہو؟"

میں خاموش رہا۔

وہ بولا۔ "مجھ کو لگت ہے کہ تم کچھ کھوئے کھوئے ہو۔ کیا کسی کو ڈھونڈت ہو؟" شور میں اس کی آواز بہ مشکل میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس لیے وہ زور سے بول رہا تھا۔

میں نے بیزاری سے کہا۔ "تم کیا کہنا چاہت ہو؟"

جواب میں اس نے رازدارانہ انداز میں جو کچھ کہا، اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ وہ بولا۔ "پرتو! میں جانت ہوں..... تم اپنے کسی بچھڑے سنگی کو دیکھ رہے ہو۔ تمہارے من میں آشا ہے کہ شاید ان کٹھن گھڑیوں میں وہ تمہیں کہیں آس پاس مل جائے۔"

"تت..... تم..... کس کی بات کرت ہو؟"

"عمران کی۔" اس نے دوسرا دھماکا کیا۔ میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے زمین و آسمان کے قلابے جیسے ایک دم مل گئے۔ میرا پورا جسم لرزنے لگا تھا۔

"تت..... تم..... اس کو کیسے جانت ہو؟" میں نے دھندلائی نظروں سے اسے سر تا پا دیکھا۔

وہ مسکرایا۔ مجھے اس کے ہموار دانت کی قطار نظر آئی۔ اس کی ٹھوڑی کا گڑھا نظر آیا۔ اس کے ابھرے ہوئے رخسار دکھائی دیے۔ بھبوت سے لتھڑے ہوئے چہرے میں سے ایک اور چہرہ ابھرا۔ وہ میری زندگی کے سب سے حیرت ناک لمحے تھے۔ مجھے لگا کہ میں چکرا کر گر جاؤں گا۔ وہ اپنی اصل آواز میں بولا۔ "اتنی جلدی بھول گئے جگر! تمہاری یادداشت میں واقعی کوئی گڑبڑ گھوٹالا ہو چکا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو میری والدہ میرے کانوں میں بلکہ جسم کے دیگر سوراخوں میں بھی بادام روغن ڈال دیا کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے میرا حافظہ اب تک بہت اچھا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہاری نگہداشت اس طرح سے نہیں ہوئی....."

میں ارد گرد سے بیگانہ ہو کر جیسے ہواؤں میں معلق ہو چکا تھا۔

خطرناک [illegible] سرفروش جانباز [illegible] کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

...دو گز یا کو مل ساکت رہ گیا۔ چہرہ وہ ہنسا تو اس کے ہموار دانتوں کی قطار نظر آئی۔ وہ عمران تھا۔ میں
ہر گردے بیگانہ ہو کر جیسے ہواؤں میں معلق ہو چکا تھا

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مجھے لگا جیسے میں ایک بہت خوب صورت سپنا دیکھ رہا ہوں... لیکن یہ سپنا نہیں تھا۔ عمران جیتی جاگتی صورت میں میرے سامنے موجود تھا۔ بھوت سے لتھڑے ہوئے چہرے کے اندر سے عمران کا جانا پہچانا چہرہ جھانک رہا تھا۔ قریباً تین برس پہلے کی اُس تاریک و پُرآشوب رات کو میں نے نالے کے پُل پر اسے آخری بار دیکھا تھا۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں مجھے وہ ایک تیز رفتار پانی پر ایک پُل صراط جیسے رستے پر کھڑا دکھائی دیا تھا۔ اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا رکھے تھے پھر اس کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا۔ وہ ڈگمگایا اور اجل کے پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔

میری تمام تر حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگا کہ حیرت اور خوشی کے سبب میرا دل سینے میں پھٹ جائے گا اور میں یہیں تیورا کر گر جاؤں گا۔

بے پناہ شور کے درمیان میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ ”تم... زندہ ہو... عمران؟“

”عجیب بے وقوفی کا سوال ہے۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔ سانس لے رہا ہوں، بول رہا ہوں، اس کے باوجود تمہیں شبہ ہو رہا ہے کہ میں قیدِ حیات نہیں ہوں۔ اگر مُردے ایسے ہوتے ہیں تو پھر زندہ لوگ تو یقیناً قبروں میں آرام کر رہے ہوں گے... اور دوسری بات یہ ہے جگر کہ اس طرح ہونقوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر مجھے نہ دیکھو، ان لوگوں کو شک ہو جائے گا کہ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ بالکل سنجیدہ ہو جاؤ۔ تمہارے ہاتھ والی لکڑی میں میں نے تیل ڈال دیا ہے۔ اس کو آگ دکھاؤ اور چتا جلانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

میرا دل چاہا کہ دوڑ کر عمران سے لپٹ جاؤں۔ اس کو اپنے بازوؤں میں کس لوں اور دھاڑیں مار مار کر روتا چلا جاؤں۔ میرا سر بدستور چکرا رہا تھا۔ عمران کا چہرہ میری آنکھوں کے آنسوؤں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ سینے میں ایک دم ہی سیکڑوں سوال مچلنے لگے تھے لیکن ابھی سوال و جواب کا وقت کہاں تھا۔ ابھی تو ہم ایک نہایت سنگین مقام پر کھڑے تھے۔ یہاں ایک جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا۔ جنونیوں کا گروہ کسی وحشی قبیلے کے لوگوں کی طرح دیوانہ وار چتا کے گرد ناچ رہا تھا، سنکھ بجا رہا تھا اور نقارے پیٹ رہا تھا۔ جس جیتی جاگتی زندگی کو ختم کیا جانے والا تھا، وہ سلطانہ تھی... میری بیوی تھی۔

ایک دم مجھے لگا کہ میرے جسم میں توانائی کا ایک نیا سمندر لہریں لینے لگا ہے۔ میرا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ میرے رگ و پے میں ایک بے نام حرارت اتر تی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ کوئی مشکل... مشکل نہیں رہی۔ اب کوئی دیوار میرا راستہ نہیں روک سکے گی۔ اب میں اکیلا نہیں تھا... اب کوئی میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا تھا اور یہ ”وہ“ تھا جس کے دلیرانہ ساتھ کے لیے میں ایک مدت تک ترسا تھا۔ پُرآشوب گھڑیوں میں، میں نے پل پل جس کی توانا مسکراہٹوں کا انتظار کیا تھا، وہ آ گیا تھا... وہ میرے سامنے کھڑا تھا... اس کی روشن آنکھیں، اس کا چوڑا سینہ، اس کے توانا بازو سب کچھ وہی کا وہی تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا

تھا...

''اوئے باندر! میں پھر کہتا ہوں، ایسے مت گھورو۔ ان لوگوں کو شک ہوگا۔ دائیں طرف جو پہلا دیا جل رہا ہے، اس سے یہ لکڑی روشن کرلو۔'' عمران کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''عمران!'' میں نے ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔ ''میں ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ جو چتا میں لیٹی ہے، وہ میری بیوی ہے...''

''تو ایک شوہر کے لیے اس سے اچھا موقع اور کیا ہوسکتا ہے۔ نہ مقدمہ، نہ عدالت، نہ سزا... ایسی سچویشن کے انتظار میں تو شوہر لوگ اپنی زندگیاں گزار دیتے ہیں۔''

''عمران... اسے مذاق مت سمجھو... یہ میری بیوی ہے۔ میرے بچے کی ماں ہے۔ یہ سخت مصیبت میں ہے۔''

''تو میں اس مصیبت کو کون سا بڑھا رہا ہوں؟ میں اسے آگ لگانے کو تو نہیں کہہ رہا۔ بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ آگ لگانے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ اسے آگ نہیں لگے گی۔ کم از کم آج تو نہیں لگے گی۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔'' میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''تمہاری سمجھ میں کبھی پہلے میری کوئی بات آئی تھی جو اب آئے گی؟'' اس نے کہا اور محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ تاڑی کے نشے میں وہ سب لوگ بُری طرح اچھل کود رہے تھے۔ ترشول لہرا رہے تھے اور اشلوک پڑھے جا رہے تھے۔ ہر آنکھ میں اس بے بس لڑکی کے لیے نفرت و انتقام کی چنگاریاں تھیں جو چتا کے اندر بے حس و حرکت لکڑی کے تختے پر لیٹی تھی اور جن آنکھوں میں چنگاریاں نہیں تھیں، ان میں بے حسی تھی۔

عمران نے مالا جپتے ہوئے مہا گرو کی طرف اشارہ کیا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا پیٹ کسی براؤن غبارے کی طرح پھولا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ میرے کان کے قریب آکر قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''چتا کو آگ دکھانے کی آگیا (اجازت) مہا گرو صاحب کو دینی ہے۔ اور وہ آگیا تب دیں گے جب شبھ گھڑی آجائے گی... اور شبھ گھڑی آج نہیں آئے گی۔''

''تت... تمہیں کیسے پتا؟''

''مجھے اس لیے پتا ہے کہ مہا گرو میرے قبضے میں ہے۔''

''تمہارے قبضے میں ہے؟ کیا مطلب؟''

''بھئی میں نے اس پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں کوئی زندہ انسان تھوڑی ہوں۔ میں تو ایک روح ہوں جو اس رات اپنے پیکرِ خاکی سے نکل آئی تھی جس رات مجھے سینے پر گولیاں لگی تھیں۔ اب میں ایک بدروح ہوں یا سلیس لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ ایک چڑیلا ہوں... یعنی چڑیل کا مذکر... بڑی فائیو اسٹار شخصیت ہے میری۔''

میں نے یونہی نیچے دیکھا تو وہ نٹ بولا۔ ''شاید تم میرے پاؤں ملاحظہ کررہے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ پاؤں چڑیل کے الٹے ہوتے ہیں، چڑیلے کے نہیں۔ چڑیلے کے جسم کے ایک دو اور پارٹ الٹے ہوتے ہیں جو میں فی الحال تمہیں دکھا نہیں سکتا...'' وہ بے پر کی اڑا رہا تھا۔

اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس کا ہلکا پھلکا انداز دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ آج کوئی نہ کوئی کرشمہ ہوجائے گا۔ شاید یہ الیہ آج ٹل جائے جس کی پوری پوری تیاری کی جاچکی ہے۔

میں حیرت کا بُت بنا کھڑا رہا اور عمران کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا سرمہ تھا۔ آنکھوں کے گرد رنگ لگایا گیا تھا۔ سفید دھوتی کے اوپر اس کا شان دار کسرتی جسم چمک رہا تھا۔ مہا گرو آنکھیں بند کرکے مالا جپتا رہا اور آگے پیچھے جھولتا رہا... عمران کے اشارے پر میں نے اپنے ہاتھ کی مشعل نما لکڑی کو آگ دکھا دی اور ساکت کھڑا ہوگیا۔

مہا گرو کی مراقبہ ٹائپ کیفیت طویل ہوتی جارہی تھی۔ نقارے مسلسل بج رہے تھے۔ قریباً تین چار منٹ مزید اسی تناؤ بھری صورتِ حال میں گزرے پھر اچانک مہا گرو نے اپنا مالا والا ہاتھ اٹھایا اور آنکھیں کھول دیں۔

نقارے رک گئے۔ بھجن اور اشلوکوں کی آواز بھی تھم گئی۔ سب مہا گرو کی طرف دیکھنے لگے۔ مہا گرو عجیب انداز میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور بلند آواز میں بولا۔ ''یوگ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ شبھ گھڑی ٹل رہی ہے۔ اس رسم کو پوری طرح سے ادا کرنے کے لیے ایک خاص شے کی ضرورت ہے، جو اب ہمارے پاس نہیں ہے۔ اب اس خاص شے کی آشا تین دن بعد ہی کی جاسکتی ہے۔''

اسیج ہال کمرے کے اندر سناٹا سا چھا گیا۔ چند افراد کی ٹولی ایک بار پھر اشلوک پڑھنے لگی لیکن اب ان اشلوکوں میں جوش اور ہیجان کی جگہ ایک طرح کا ٹھہراؤ تھا۔ یہ مذہبی شعر اب طبع میں اچھال پیدا کرنے کے بجائے ہمواری پیدا کررہے تھے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''یہ روح کی کارستانی ہے اور روح تمہارے سامنے کھڑی ہے۔ اگر تفصیل پوچھنا ہو تو وہ بھی تمہیں بتاؤں گا...

مجھے تمہارے گھر کا پتا ہے، میں آج آدھی رات کے بعد تمہارے پاس آؤں گی... میرا مطلب ہے آؤں گا۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ میں چڑیل نہیں بلکہ چڑیلا ہوں... انسان تھا تو اچھی بھلی یادداشت تھی۔ اب تو ان لوگوں جیسا ہو گیا ہوں جنہوں نے بینکوں سے قرض لے رکھا ہے۔ اچھا، چلتا ہوں۔ لگتا ہے کہ گرد صاحب میری طرف ہی آرہے ہیں۔'' وہ چبوترے سے اترا اور لوگوں کے ہجوم میں گم ہوگیا۔ میری نگاہیں مسلسل اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ وہ پھر کہیں گم نہ ہوجائے۔ اس سے پہلے کہ میں بے ساختہ اس کے پیچھے لپک جاتا، ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ستیش میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ بولا۔

''یہ وقتی نراشا ہے۔ گرو جی نے کہا ہے کہ دو دن میں سب ٹھیک ہوجاوے گا۔ دو دن بعد ایک بار پھر یہ محفل سجے گی اور یہ اپرادھن لڑکی اپنے انجام کو پہنچے گی۔''

ستیش نے مشعل نما لکڑی میرے ہاتھ سے لے کر پانی کے برتن میں بجھا دی اور مجھے لے کر چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ سلطانہ اسی طرح بے ہوشی کی حالت میں چتا کی لکڑیوں پر پڑی تھی۔ میں کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میری بیوی تھی لیکن دوسروں کی دسترس میں تھی۔ میں اسے چھونے کا مجاز نہیں تھا۔

☆☆☆

رات ایک بجے کا وقت تھا، جب دروازہ کھلا اور عمران میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اب وہ معقول لباس میں نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک عام سی پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ چہرے پر سفید بھبوت بھی نہیں تھا۔ قمیص کے اوپر ایک نیلا سویٹر تھا۔ ہونٹوں پر وہی پیاری سی مسکراہٹ تھی جو اسے عام لوگوں سے جدا کرتی تھی۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور ہم بھاگ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ آنسو میری آنکھوں سے گرم آبشاروں کی طرح بہہ رہے تھے۔

''تم کہاں چلے گئے تھے یار! تمہیں کیا پتا میں نے یہ وقت تمہارے بغیر کیسے گزارا ہے؟'' میں نے سسک کر کہا۔

کوئی مزاحیہ فقرہ اچھالنے کے بجائے وہ خاموش رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی جذباتی کیفیت میں ہے۔

میں آنسوؤں کے درمیان بولتا چلا گیا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں۔ مجھے کسی طرف سے تمہارے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں مل سکی تھی۔ میڈم صفورا نے بھی اس اسٹیٹ میں موجود ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ تم اس رات گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے... میں نے... میں نے اس رات خود تمہیں گولیاں لگتے دیکھی تھیں پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں اس ڈیک نالے کے کنارے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میرے بعد کیا ہوا تھا۔ کیا تمہیں پانی سے نکال لیا گیا تھا؟ میرا مطلب ہے... میرا مطلب ہے...'' میں ہکلا کر رہ گیا۔

اس کی شوخیِ طبع پلٹ آئی۔ وہ میرے گلے سے لگے لگے بولا۔ ''میں پانی میں کہاں گرا تھا یار! میں تو آسمان کی طرف اٹھ گیا تھا... سیدھا اوپر بالکل راکٹ کی طرح۔ وہاں جب میں قطبی ستارے کے قریب پہنچا تو بہت سی ارواحِ خبیثہ سے میری ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے زبردستی مجھے اپنے گروہ میں شامل کرلیا۔ یہ عقل دشمن ارواحِ خبیثہ آج کل امن اور آشتی کے خلاف ایک زبردست مہم چلا رہی ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے قطبی ستارے کے پاس ہی ایک ٹی وی چینل بھی قائم کر رکھا ہے۔ اس کا نام ہے ''فساد پلس'' اور اس کا سلوگن ہے... ایک ہی رستہ ایک ہی منزل... افراتفری افراتفری۔ اس چینل میں ملازمت ملنے کی سب سے پہلی شرط ہی یہ ہے کہ بندے نے جاہلیت میں ڈبل ایم اے کیا ہوا ہو، کم سے کم دس جگہ سے دھکے دے کر ملازمت سے نکالا جاچکا ہو۔ سو میرے یار! آج کل میں اسی ''فساد پلس'' کا نمائندہ ہوں اور قریہ قریہ گھوم کر خبریں اکٹھی کررہا ہوں۔''

میری آنکھوں سے مسلسل آنسو رس رہے تھے۔ میری کیفیت دیکھ کر اسے بھی کچھ سنجیدہ ہونا پڑا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ بید کی کرسیوں پر آبیٹھا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری یہ حیرت بجا ہے تابی! سینے پر براہِ راست برسٹ کھا کر زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا لیکن ایک بات شاید تم بھول رہے ہو۔ جب ہم لاہور سے باہر گاڑی بھگا رہے تھے اور سیٹھ سراج اپنے ہرکاروں سمیت ہمارے پیچھے تھا، تم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ میں پہلے سے کچھ صحت مند لگ رہا ہوں۔ میری صحت مندی یعنی موٹاپے کا راز وہ امریکن بلٹ پروف جیکٹ تھی جو میں نے قمیص کے نیچے پہن رکھی تھی۔ یہی جیکٹ میری زندگی کا بہانہ بنی ہے۔''

عمران نے اپنا سویٹر اوپر اٹھایا اور قمیص و بنیان کے نیچے سے اپنے پیٹ پر گولی کے دو زخم دکھائے۔ ایک گولی تو شاید پہلو کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی، دوسری پیٹ میں لگی تھی۔ وہ بولا۔ ''بس یہی دو گولیاں تھیں جو مجھے لگیں، باقی کی جیکٹ نے بلاک کرلیں۔''

میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرزنے لگے۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ٹھنڈے ٹھار پانی میں گرا۔ پانی کی رفتار بڑی تیز تھی۔ میں غوطے کھاتا ہوا کافی آگے نکل گیا پھر سرکس کی ٹریننگ کام آئی۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلائے اور کسی طرح کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں ایک نوجوان زمیندار ریاست علی مجھے اپنی ٹریکٹر ٹرالی میں ڈال کر اسپتال تک لے گیا۔۔۔ پوری روداد کافی لمبی ہے۔ اگر اس کو مختصر نہیں کروں گا تو باقی رات اسی میں گزر جائے گی۔۔۔ اور تمہاری بھابی پوچھے گی۔۔۔ چن کتھاں گزاری آئی رات وے۔۔۔“

”بھابی۔۔۔ کیا مطلب؟“

”تو یار کیا تم اکیلے ہی رستم زماں ہو جو آنا فانا شادی کھڑکا سکتے ہو؟ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو بڑی بڑی مصیبتوں کو دعوت دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔“

”کیا کسی لڑکی سے شادی کر لی ہے تم نے؟“

”دیکھو، اگر اس فقرے میں تم نے شادی پر زور دیا ہے تو اور بات ہے لیکن اگر لڑکی پر زور دیا ہے تو تمہارا سوال اور بھی مذاقیہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے، شادی لڑکی سے ہی ہو گی لیکن شادی بھی کیا ضروری ہے؟ یہ نیا دور ہے یار! اس میں شادی تو اس وقت کی جاتی ہے جب بچے کہتے ہیں۔۔۔ سویٹ پاپا، ممی، اب شادی کر لیں۔ اور پھر شادی کے بعد تو ویسے بھی رومانس کو ایک دم فل اسٹاپ لگ جاتا ہے اور ہم تو بھئی رومانس کے بندے ہیں۔ ایک پیارا سا چہرہ مل گیا ہے یہاں بھی۔ ہو سکا تو دو چار روز میں تمہیں ملواؤں گا اس سے۔ بڑی اونچی شے ہے۔ کتھک ناچ ناچتی ہے اور ناچ ناچ کر اس نے جسم ایسا شیشے جیسا کر لیا ہے کہ کیا بتاؤں۔۔۔ اُف۔“

وہ بے تکان بول رہا تھا۔ حالات کی سنگینی اور میری بے پناہ حیرتوں کا جیسے اسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! مجھے اب بھی اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ لگتا ہے کہ ابھی دماغ کو ایک جھٹکا سا لگے گا اور سب کچھ ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔۔۔ مجھے بتاؤ عمران! تم یہاں کب اور کیسے پہنچے؟ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟ کیا تمہیں پتا تھا کہ میں یہاں ہوں؟ اور تم نے وہاں ہال کمرے میں بھیس کیوں بدل رکھا تھا؟ کیا تم اس گروہ میں شامل ہو؟ اور۔۔۔“

”بس بس۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”ایک ہی سانس میں تم نے اتنے سوال کر دیے ہیں کہ تمہارا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں آ سکتا ہے لیکن وہاں بھی تو سفارش اور تعلقات چلتے ہیں۔ دیکھو، میری بات سنو۔ ان سوالوں جوابوں کے لیے ابھی بہت سا وقت پڑا ہے۔ فی الحال ہم صرف دو باتیں کریں گے جو کرنا بہت ضروری ہیں۔ ابھی تم بس اتنا سمجھ لو کہ میں صرف تمہارے لیے یہاں موجود ہوں۔ اس گروہ کے لوگوں میں مجھے امیت کمار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک میں ایک اسمگلر ہوں اور انڈین ”بی ایس ایف“ سے جان چھڑاتا ہوا اس راجواڑے میں گھس آیا ہوں۔ فی الحال یہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی رہیں گے۔ کسی طرح کی کوئی شناسائی بھی ہم دونوں کے لیے سخت ترین مشکلیں پیدا کر سکتی ہے۔ کچھ کچھ اندازہ تو تمہیں ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔“

”مجھے صرف ایک بات بتا دو، کیا سلطانہ بچ جائے گی؟“

”تم بھی مجھے صرف ایک بات بتاؤ۔ کیا یہ واقعی تمہاری بیوی ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

وہ عجیب نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ چہرے کے تاثرات بھی عجیب تھے۔ پھر اس نے ہولے سے پوچھا۔ ”اور وہ، تمہارا جنون۔۔۔ ثروت؟“

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”عمران! جس طرح میرے سوالوں کے جواب بہت لمبے ہیں، اسی طرح تمہارے اس سوال کا جواب بھی بہت طویل ہے لیکن مجھے ابھی صرف اتنا بتا دو کہ ثروت کہاں ہے؟“

”میری آخری معلومات کے مطابق وہ جرمنی میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔“

”اور اس کی شادی؟“

”مجھے اس بارے میں ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔“ عمران نے جواب دیا۔

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ میں یہ جاننے میں ناکام رہا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”اور عاطف اور میری بہن فرح؟“

”تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی، وہ دونوں بہ خیریت اور بالکل حفاظت سے ہیں۔ میں تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔“

دروازے سے باہر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ عمران ایک دم چوکنا ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ لالٹین کی گول ناب پر رکھ دیا۔ غالباً وہ ارادہ رکھتا تھا کہ اگر خطرہ زیادہ محسوس ہوا تو لالٹین بجھا دے۔ بہرطور خیریت گزری۔ قدموں کی چاپیں آگے نکل گئیں۔

عمران بولا۔ ”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلطانہ خطرے سے دور ہے لیکن وقتی طور پر۔ ہم نے یہاں کے مہاگرو کی پتنی رادھا دیوی کو اپنا ”مہمان“ بنا رکھا ہے۔ اسی ”مہمان نوازی“ کا دباؤ ہے جس کے سبب گرو کو شبھ گھڑی نہیں مل سکی اور اس نے چتا جلانے کی رسم دو دن کے لیے ملتوی کر دی ہے۔ وہ سب کچھ اس نے مجبوری کے سبب کیا ہے لیکن اپنی پتنی کو مصیبت سے بچانے کے لیے وہ دیر تک اس منحوس رسم کو ملتوی نہیں کر سکتا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے پتلون کی جیب احتیاط سے ٹٹولی اور بولا۔ ”جس طرح کچھ جنات کی جان طوطے میں ہوتی ہے، اسی طرح گرو کی دھرم پتنی کی جان بھی ایک طوطے میں ہے۔ اور یہ طوطا میرے قبضے میں ہے۔ میں جب چاہوں، اس طوطے کی گردن شریف موڑ کر گرو کی پتنی کو جہانِ بالا کی سیر کرا سکتا ہوں۔ اور اگر دیکھا جائے تو گرو کی پتنی خود بھی ایک طوطے کی طرح ہے اور گرو کی جان اس دوسرے طوطے میں ہے۔ اگر پتنی جہانِ بالا کو گئی تو ہو سکتا ہے کہ گرو خود بھی اس کے پیچھے نکل جائے۔ اسے ادھیڑ عمری میں اور اتنی معمولی شکل صورت کے ساتھ اتنی جوان اور سندر پتنی ملی ہے، وہ ہزار جان سے اس پر فدا ہے۔ پتنی کو جہانِ بالا کی سیر سے بچانے کے لیے وہ اپنی پوری پوری کوشش کرے گا۔“

”تم میری الجھنوں کو اور بڑھا رہے ہو عمران۔۔۔ تم جنوں اور طوطوں کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟“

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں ایک چڑیلا ہوں اور صرف چڑیلا ہی نہیں، نیوز چینل کا نمائندہ بھی ہوں۔ ایسا ”بم بلاسٹ شخص“ جنوں بھوتوں کی باتیں نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا؟“

اس نے ایک بار پھر پتلون کی جیب ٹٹولی اور اس میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹا سا برقی آلہ نکال لیا۔ اس کی صورت چھوٹے موبائل فون جیسی تھی لیکن موبائل فون کے کی بورڈ کی طرح اس پر زیادہ بٹن نہیں تھے۔ صرف تین بٹن نظر آ رہے تھے۔ ایک سرخ اور دو سفید۔ یہ برقی آلہ سبز رنگ کا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”یہ دیکھو، اس کا رنگ ہرا ہے۔ اسی لیے تو میں اسے طوطا کہتا ہوں۔ گرو کی پتنی کی جان اس میں ہے۔۔۔ خاص طور سے اس بٹن میں۔“ وہ سرخ بٹن پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

ان لمحوں میں اس کے بظاہر معصوم چہرے پر وہی جارحیت نظر آنے لگی جس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ادھر یہ بٹن دبے گا، ادھر رادھا دیوی کی پتلی کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ دھماکے سے اڑ جائے گی۔ اور محبوب کی کمر چاہے کتنی بھی پتلی ہو لیکن ہونی تو چاہیے نا یار۔۔۔ اور میرے خیال میں مہاگرو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے۔“

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ کتنی آسانی سے کتنی خوفناک بات کہہ رہا تھا۔ وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ ویسے کا ویسے ہی تھا۔ دھیما، سادہ، ہنس مکھ۔۔۔ اور کبھی اس کے ساتھ ساتھ بہت بھیانک بھی۔ اب اگر مہاگرو کی پتنی کی کمر کے ساتھ واقعی کوئی بارودی بیلٹ بندھی ہوئی تھی تو سوچنے کی بات تھی کہ یہ بیلٹ عمران کو کہاں سے ملی تھی؟ اس بیلٹ اور بیلٹ کے ریموٹ کنٹرول کی ایکردی کیا تھی؟ اور یہ بیلٹ کس طرح رادھا کی کمر تک پہنچی تھی؟ میں یہ سب کچھ عمران سے پوچھنا چاہتا تھا مگر مجھے پتا تھا کہ ان میں سے کسی ایک سوال کا معقول جواب بھی مجھے نہیں ملے گا۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔۔۔ اور میں چونک گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا ہے کہ ”ہم“ نے گرو کی پتنی کو اپنا مہمان بنا رکھا ہے۔ ”ہم“ سے کیا مطلب ہے؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

”پچھلے تین سالوں میں کافی ہوشیار ہو گئے ہو تم اور کافی بدل بھی گئے ہو۔“ اس نے مجھے سر تا پا دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں تعریف کی جھلک تھی۔ اس نے میرے سینے پر ہلکا سا مکا مارا پھر دائیں بائیں دیکھ کر رازداری کے انداز میں بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ اقبال میرا دُم چھلا ہے۔ اور دُم جہاں ہوگی، چھلا بھی وہیں ہوگا۔ وہ مہاگرو کی قیام گاہ پر سیوک کے طور پر موجود ہے، یعنی خادم کے طور پر۔۔۔ اور گرو کی پتنی کی ”سیوا“ کر رہا ہے۔ وہ پرسوں سے ذرا بیمار ہے نا۔“ عمران نے آنکھ دبا کر کہا۔

مجھے یاد آیا کہ کل جب میں نے گرو کی پتنی رادھا کو داسیوں کے ساتھ راہداری سے گزرتے دیکھا تھا تو وہ کچھ گم صم نظر آئی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر عجیب سی زردی بھی۔ اب صورت حال کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔ عمران اور اقبال یہاں موجود تھے۔ کیسے موجود تھے، اس کے

بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ ان دونوں نے یہاں مہا گرد کی پتنی کو آڑے ہاتھوں لیا ہوا تھا۔ وہ غالباً دھماکا خیز مواد کے نشانے پر تھی اور یہ مواد ریموٹ کنٹرول تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی اور سنسنی میرے رگ و پے میں اترنے لگی اور ایک عجیب سی ترنگ سینے میں جاگ گئی۔ لیکن ابھی تک بہت کچھ اندھیرے میں تھا۔ میں عمران سے درجنوں بلکہ شاید سیکڑوں سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے ایک بار پھر تاکید کی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کوئی شناسائی ظاہر نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ اس نے یا اقبال نے جب مجھ سے رابطہ کرنا ہوا تو وہ خود ہی کریں گے۔

جانے سے پہلے وہ تھوڑا سا جذباتی ہو گیا۔ ہم ایک بار پھر پُرجوش انداز میں گلے ملے۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”سب کچھ بتاؤں گا... سب کچھ۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے شہزادے، تھوڑا سا اور کرلو۔“

اس کے جانے کے بعد میں جیسے ایک طوفان کی زد میں رہا۔ راجواڑے کے اس دور دراز کھنڈر میں عمران یوں میرے سامنے آئے گا اور حالات ایک دم ایسا رخ اختیار کریں گے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اگلا سارا دن بھی عجیب کشمکش اور سوچ بچار میں گزرا۔ شکیلہ سے بھی دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکی۔ پتا نہیں کہ وہ کس حال میں تھی۔ اس کی بے چارگی بار بار میرے تصور کو کچوکے لگاتی تھی۔ اس کے ساتھ یہاں ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا تھا اور اب پچھلے تین چار روز سے اس سے مٹی بھی کھدوائی جا رہی تھی۔ اس مشقت کا مقصد معلوم نہیں تھا... مجھے شکیلہ کی کسی ہوئی صورت یاد آئی، اس کے ہاتھوں کے چھالے یاد آئے اور دل اس کے لیے درد سے بھر گیا۔

اگلی رات پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اس زیرزمین کھنڈر میں مکمل سناٹا تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ شاید ہی دو چار افراد جاگ رہے ہوں جو پہرے پر تھے۔ کسی قریبی کمرے میں ارجن اور اس کے کچھ دوست بھی غالباً شیطانی کھیل کھیلنے کے بعد آرام فرما رہے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے ہولے سے ہلایا...

”کون؟“ میں نے پوچھا۔

دوسری طرف عمران تھا۔ اس کی مدھم آواز پہچان کر میں نے دروازہ کھول دیا۔

”خیریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے۔“ اس نے ترت جواب دیا۔ ”تمہیں میرے ساتھ آنا ہوگا، ورنہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔“

”لیکن تم تو کہتے تھے کہ ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے۔“

”مگر اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ کم از کم آج کی رات تو بالکل نہیں۔ اقبال زخمی ہو گیا ہے۔“

”کیسے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔ خود ہی دیکھ لینا۔“ اس نے کہا۔

”لیکن...“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جلدی کرو، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے... میں سیدھا چلتا جاؤں گا تم آٹھ دس قدم چھوڑ کر میرے پیچھے آنا۔ میں جس دروازے میں گھسوں، تم بھی گھس جانا مگر احتیاط کرنا کہ کوئی تمہیں گھستے ہوئے دیکھے نہیں۔“

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ صورتِ حال واقعی سنگین ہے۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ اپنے کمرے کی لالٹین میں نے بجھا دی تھی اور دروازہ اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کھنڈر استھان کا یہ زیرزمین حصہ عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ راہداریاں خالی تھیں۔ لالٹینوں اور گیس لیمپوں کی روشنیاں بھی جیسے غنودگی میں تھیں۔ ہم بڑے ہال کمرے کے قریب سے گزرے۔ وہاں بھی بڑے آتش دان میں کوئلے سلگ رہے تھے۔ ان کوئلوں کے قریب بہت سے افراد چٹائیوں اور نمدوں پر بے سدھ پڑے تھے۔ ہال کمرے سے نکلنے والی ایک راہداری میں سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ یقیناً یہ یہاں کے پہرے دار تھے۔ میں رات کو اکثر ان لوگوں کی آوازیں سنتا تھا۔ یہ بلند آواز میں قہقہے لگاتے تھے اور خود کو بیدار رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے دھول دھپا بھی کرتے رہتے تھے۔ ہم اس راہداری کے سامنے سے گزر گئے لیکن اس میں داخل نہیں ہوئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران کا رخ اسی طرف ہے جس طرف سے ہم یعنی میں اور ستیش وغیرہ چار پانچ دن پہلے یہاں داخل ہوئے تھے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ جلد ہی پانی گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہم اسی آبشار کے سامنے پہنچ گئے جو پتھروں پر گرتا تھا اور پھر ایک بڑے حوض کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اس حوض یا چھوٹی سی جھیل میں پتھر کا ایک بڑا مجسمہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ یہاں ایک طرف حوض کے کنارے کچھ دروازے نظر آئے۔ عمران ان دروازوں کے سامنے سے گزرتا ہوا اچانک ایک

دروازے میں داخل ہوگیا۔ عمران کی ہدایت کے مطابق میں نے اردگرد دیکھا۔ دور فاصلے پر کسی شخص کا متحرک سایہ نظر آرہا تھا۔ شاید کوئی دھری پہرے دار یوجا پاٹ میں مصروف تھا۔ تاہم وہ اتنی دور تھا کہ مجھے اس کی طرف سے دیکھے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ میں عمران کے پیچھے دروازے میں داخل ہوگیا۔

اندر داخل ہوتے ہی پتا چل گیا کہ یہ مہاگرو کی رہائش گاہ ہے۔ طاقوں میں جابجا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں اور تصویریں تھیں۔ ایک دیوار پر جاپ کرنے کے لیے بہت سی مالائیں جھول رہی تھیں۔

گرو کی رہائش گاہ کے دو حصے تھے۔ ایک کو مردانہ اور دوسرے کو زنانہ کہا جاسکتا تھا۔ ہم مردانے حصے میں داخل ہوئے تھے۔ تاہم گرو صاحب یہاں نظر نہیں آرہے تھے۔ ایک الماری میں گرو صاحب کے مختلف لباس ٹنگے ہوئے تھے۔ ان کی جوتیاں اور کھڑاویں وغیرہ پڑی تھیں۔ خشک میوے اور بیسن کا بہت سارا حلوہ ایک تھال میں ڈھکا رکھا تھا۔ عمران نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بولا۔ ”میں یہاں گرو کا ذاتی خدمت گار ہوں۔ چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ یہ حاجت خانے میں جاتا ہے تو لوٹا بھی مجھے پکڑنا پڑتا ہے۔ کسی وقت تو خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اسے طہارت بھی مجھے ہی نہ کرانی پڑے۔“

”اب کہاں ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”پانی میں بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ ہر سنیچر کی رات کو یہ جاپ اسے کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں گھر واپس آجائے گا۔ آؤ، میں تمہیں اس کی سُندر پتنی سے ملواؤں۔“

عمران مجھے لے کر ایک دروازے سے گزرا۔ ہم گھر کے مردانے حصے سے زنانے حصے میں داخل ہوگئے۔ یہاں بھی در و دیوار پر خوب گاڑھا رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ ریشمی پردے لگے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں بہت سے ساز پڑے تھے۔ یہ غالباً بھجن گانے میں استعمال ہوتے تھے۔ کتھک ناچنے والوں کی ایک بڑی تصویر بھی اس کمرے میں آویزاں تھی۔ مجھے ایک دروازے کے عقب سے کچھ دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے کوئی عورت کراہ رہی ہے اور اس کی آواز اس کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ جاتی ہے۔

”یہاں کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تیرہ من کی دھوبن، کیونکہ ایک من کے تو یہ زیور ہی پہنتی ہے۔ پچھلے جنم میں یہ یقیناً کوئی بھینس یا ہتھنی وغیرہ رہی ہے۔ اس جنم میں بھگوان نے اسے گرو کی دھرم پتنی کی داسی بنایا ہے۔ ایک نمبر کی خرانٹ عورت ہے۔ اقبال اسی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔“

عمران نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر مجھے کراہنے والی عورت کی جھلک دکھائی۔ وہ واقعی کسی سومو پہلوان کی طرح صحت مند تھی۔ اس نے چاندی اور پیتل کے بہت سے کڑے پہن رکھے تھے۔ ان کڑوں نے اس کے بازو کہنیوں تک چھپائے ہوئے تھے اور نصف پنڈلیاں بھی اوجھل نظر آرہی تھیں۔ وہ کسی بھینس ہی کی طرح نائیلون کی رسیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ غوں غاں کی آوازیں نکال رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر نیل تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں وہ سخت سردی محسوس کر رہی تھی اور اس کی بے چینی کا سبب بھی یہی تھا۔ عمران نے ایک طرف پڑا ہوا ایک لحاف اٹھا کر اس پر ڈال دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد میں نے زخمی اقبال کو بھی دیکھ لیا۔ عمران نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ یہاں اقبال کا نام راج ہے اور میں گرو کی پتنی کے سامنے اقبال سے شناسائی ظاہر نہ کروں۔ آج میں ایک طویل عرصے بعد اقبال کو دیکھ رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ ذرا سا فربہ ضرور ہوا تھا مگر اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جس چیز نے مجھے ششدر کیا، وہ اقبال کی آنکھیں تھیں۔ آنکھیں گہری سرخ تھیں اور اتنی سوج چکی تھیں کہ پپوٹوں کے درمیان بس ایک درز سی باقی رہ گئی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل پانی بھی رس رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی شدید تکلیف کے باعث مشکل سے ہی دیکھ پا رہا ہے۔ وہ ایک غالیچے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ہی ایک مسہری پر گرو کی سُندر پتنی رادھا کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اس کے سرہانے ہومیو پیتھک ادویہ کی کئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں وہ ایک دم مرجھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔

اقبال نے مجھے دیکھ لیا تھا اور میں نے اسے... ہمارے دل چاہ رہے تھے کہ بھاگ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوجائیں مگر عمران کی ہدایات آڑے تھیں۔ ہمارے چہروں نے ہمارے جذبات کی عکاسی کی...

عمران نے اقبال یعنی راج سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”راج! یہ ہے گوپال... سمجھو کہ یہ ہمارا نیا ساتھی ہے۔ اور گوپال! یہ راج ہے۔ اس خبیث موٹی نے راج کی آنکھوں میں سرخ مرچیں پھینکی ہیں اور صرف مرچیں ہی نہیں تھیں ان میں کچھ اور الا بلا بھی تھا۔ پپوٹوں کے نیچے سے تھوڑا تھوڑا خون بھی رستا ہے۔ اس کی آنکھوں کا بیڑا غرق ہوگیا ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے... اس کی جگہ اب تمہیں چار پانچ گھنٹوں کے لیے رادھا دیوی کے پاس رہنا ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں...“

”کیوں؟ تم بھی تو یہیں ہو۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، مجھے ابھی تین چار گھنٹوں کے لیے یہاں سے جانا ہے۔ تالاب پر جا کر گرو جی کی سیوا کرنی ہے۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے میں اور گرو جی اکٹھے ہی واپس آئیں گے... ہر سنیچر کی رات کو یہی کچھ ہوتا ہے۔“

گرو کی پتنی بالکل ساکت لیٹی تھی۔ ذرا سی جنبش بھی نہیں کر رہی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس نے جسم کو ہلایا تو کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ پھٹ جائے گی۔ اس کے چہرے پر وہی کیفیت تھی جو پھانسی گھاٹ کی طرف چل کر جانے والے مجرم کے چہرے پر ہوتی ہے... موت کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر بہت گہری تھیں۔

عمران نے مجھے اور اقبال کو اشارہ کیا کہ اگر ہم چاہیں تو ساتھ والے کمرے میں جا کر ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اور دو چار منٹ گزار سکتے ہیں۔ پہلے اقبال اٹھ کر گیا پھر میں بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ہم نے وہ سارے فقرے بولے جو بہت دیر سے بچھڑے ہوئے بے تکلف دوست دوبارہ مل کر بولتے ہیں اور خود کو خوشی کے دریا میں بہتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ میں نے اقبال سے پوچھا کہ اس کی آنکھوں کے ساتھ یہ معاملہ کیونکر ہوا ہے۔ اس نے مختصر لفظوں میں جو کچھ بتایا وہ یوں تھا۔

گرو کی پتنی والا چکر پچھلے تین چار روز سے چل رہا تھا۔ اس کی کمر کے ساتھ ایک بارودی بیلٹ موجود تھی جس کا ریموٹ کنٹرول عمران یا پھر اقبال کے پاس موجود رہتا تھا۔ عمران اور اقبال مہاگرو کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ سلطانہ کی جان بچانے میں مدد کرے۔ وہ شکیلہ کی بے بسی کے بارے میں بھی سب کچھ جانتے تھے اور اس کی بھی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مہاگرو ایک کٹر مذہبی شخص تھا اور منہ زور گھوڑے کی طرح تھا۔ اگر اس کی جوان سُندر پتنی عمران اور اقبال کے ہتھے نہ چڑھتی اور وہ بارودی بیلٹ کی مدد سے اسے زیر کرنے میں کامیاب نہ ہوتے تو گرو کے منہ میں ہرگز لگام نہیں ڈالی جاسکتی تھی۔ گرو نے اور اس کی پتنی نے اپنے ساتھ ہونے والے اس سنگین معاملے کو ہر کسی سے چھپایا تھا بلکہ انہیں چھپانا پڑا تھا۔ ریموٹ کنٹرول ہر وقت عمران یا اقبال کی تحویل میں رہتا تھا اور وہ کسی بھی وقت گرو کی چہیتی بیوی کو ٹکڑوں اور لوتھڑوں میں تبدیل کرسکتے تھے۔ گھر کے اندر آنے اور ملنے جلنے والوں کو یہی پتا تھا کہ رادھا دیوی کی کمر میں شدید درد ہے اور وہ آج کل زیادہ وقت بستر پر ہی گزار رہی ہے۔ راج یعنی اقبال یہاں رادھا کے معالج کے طور پر موجود تھا۔ اقبال یوں تو عمران ہی کی طرح یہاں مہاگرو کا سیوک تھا، تاہم اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ہومیو پیتھک دواؤں کے بارے میں بھی کافی کچھ جانتا ہے۔ وہ ہر دو تین گھنٹے بعد رادھا کو کوئی نہ کوئی دوا کھلا رہا تھا اور دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ وہ گرو کی پتنی کی خدمت کا حق ادا کر رہا ہے۔ رادھا کی خاص داسی بھی ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ وہی پہلوان نما عورت تھی جسے ہم نے کچھ دیر پہلے ایک چھوٹے کمرے میں بندھا پایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ داسیاں رادھا کی خدمت کے لیے یہاں آتی جاتی تھیں مگر انہیں اصل صورتِ حال کا کچھ علم نہیں تھا۔ صرف پہلوان نما داسی بھاگ متی جانتی تھی کہ یہاں کیا چکر چل چکا ہے اور مالک و مالکن کتنی بڑی مصیبت میں ہیں۔ آج رات پہلے پہر پہلوان نما بھاگ متی نے نمک حلالی کی ایک زبردست کوشش کی تھی اور اقبال پر اس وقت حملہ کر دیا تھا جب وہ رادھا کی مسہری کے قریب چٹائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ایک دم اقبال پر جھپٹی تھی اور اس کی آنکھوں میں پسی ہوئی مرچوں اور کسی تیز کیمیکل سے بنایا گیا سفوف ڈال دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو اقبال جیسے اندھا ہوگیا تھا۔ اس نے بلند آواز سے عمران کو پکارا تھا۔ عمران اس وقت گرو کا حلوہ تیار کر رہا تھا۔ وہ غیر معمولی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے اقبال کو ”پہلوان داسی“ کے چنگل سے نکالا۔ اسے چند سیکنڈ کی دیر بھی ہوئی ہوتی تو پہلوان داسی بھاگ متی نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دینا تھا۔ وہ ریموٹ کنٹرول اقبال سے چھین چکی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک ٹانگ ابھی تک اقبال کے ہاتھ میں تھی اور وہ بھاگ نہیں پارہی تھی۔ عمران پہنچ گیا اور اس نے بھاگ متی کو اپنی گرفت میں جکڑا۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے اقبال شدید کرب میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے مسلسل خنجر گھونپے جارہے تھے۔

اقبال نے مجھے اپنی مختصر روداد سنائی اور وہیں بے دم سا ہوکر ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے بتایا کہ آنکھیں بند کر لینے سے اور ان پر ٹھنڈا پانی ڈالنے سے اسے قدرے سکون ملتا ہے۔ میں باہر آیا تو عمران جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے

ریموٹ کنٹرول میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سفید بٹن ایکٹیویشن کا ہے۔ اس وقت یہ آن ہے۔ یہ دوسرا بٹن لاک کا ہے۔ اس کو میں نے کھول دیا ہے۔ اب اس سرخ بٹن پر ذرا سا دباؤ بھی پڑے گا تو رادھا دیوی کا دھماکا ہو جائے گا۔ بھگوان کی کرپا سے دس پندرہ ٹکڑے تو ضرور ہوں گے۔ اس لیے احتیاط سے رہنا اور چوکس بھی... رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ اب بے فکر رہو۔ باہر سے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

"اور اگر آیا تو؟"

"فرض محال آیا تو دروازہ نہیں کھولنا۔ لالٹین کی لَو بالکل نیچی کردو۔"

میں نے لَو نیچی کردی۔ کمرا نیم تاریک ہوگیا۔ عمران نے ریموٹ احتیاط سے میرے سامنے ایک تپائی پر رکھ دیا۔ مجھے ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ رادھا بھی لیٹی لیٹی اونگھنے لگی تھی۔ اس کے کالے گھنگرالے بالوں کی ایک لٹ اس کے زرد رخسار پر جھول رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ آج کل کچھ کھا پی نہیں رہی۔ اس کے ہونٹ سوکھ کر سانولے ہو چکے تھے۔ پتا نہیں وہ کیسے اس فربہ اندام ادھیڑ عمر گرو کی بیوی بن گئی تھی۔ شاید اس میں کچھ عمل دخل لالچ کا بھی رہا ہو۔ گرو کی اس رہائش گاہ اور رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی خوش حال ہے۔ استھان میں جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے اور نذر نیاز پیش کی جاتی تھی، اس کا بڑا حصہ یقیناً اس مہا گرو کے پاس آتا تھا۔ یہاں کے ریشمی پردے، غالیچے، قیمتی ساز و سامان اور خود رادھا کا لباس بھی گواہی دیتے تھے کہ اس جگہ خوش حالی کا دور دورہ ہے۔

کچھ دیر بعد رادھا نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ میری کمر میں بہت زیادہ چبھ رہا ہے، کیا تم اسے تھوڑا سا ڈھیلا کرسکت ہو۔" اس کا اشارہ اپنی کمر کی بارودی بیلٹ کی طرف تھا۔

میں نے کمبل ہٹایا پھر رادھا کی قمیص اوپر اٹھائی۔ ریشمی قمیص کے نیچے اس کی دبلی پتلی ریشمی کمر تھی اور کمر کے ساتھ براؤن رنگ کی وہ خوفناک بیلٹ ایک انچ چوڑے اسٹریپس کے ذریعے بندھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ "اگر تمہیں زیادہ تکلیف ہے تو میں اسے ڈھیلا کرسکتا ہوں لیکن اس میں خطرہ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانکاری نہیں ہے۔"

خطرے کا لفظ سن کر رادھا کا زرد رنگ کچھ اور زرد ہو گیا۔ اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں رہنے دو... رہنے دو۔"

میں نے کہا۔ "اس کو ڈھیلا کرنے کا کام امیت زیادہ اچھے طریقے سے کرسکے گا۔"

"لیکن اس کو تو گرو جی کے ساتھ ہی واپس آنا ہے اور ان کے آنے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی ہیں۔" وہ ذرا کراہ کر بولی۔ وہ پتی کو گرو جی ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر ناراض لہجے میں بولی۔ "تم دھرمی ہوکر بھگوان کے سیوک اور اس کی دھرم پتنی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کررہے ہو۔ تمہیں ذرا خوف نا ہیں کہ تمہارے اس اپرادھ کا انجام کیا ہووے گا؟"

میں نے کہا۔ "یہی تو مشکل ہے دیوی جی! یہاں پاپ اور پُن کا فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔ ایک ناری کو یہاں زندہ جلایا جانے والا ہے، کچھ لوگ اسے بہت بڑا پُن کہہ رہے ہیں اور بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جن کے نزدیک یہ مہا پاپ ہے۔"

"ایسے فیصلے میں اور تم نا ہیں کرسکتے۔ ایسے فیصلوں کے لیے ہی گرو جی اور ان جیسے دوسرے گیانی دھیانی لوگن ہوتے ہیں۔ ہم جیسے عام منشوں کو ان کے فیصلے ماننا پڑتے ہیں۔ اس لڑکی کے لیے یہ سزا بہت زیادہ نظر آوت ہے مگر اس کا اپرادھ بھی تو چھوٹا نا ہیں ہے۔ اس نے اوتار لڑکی کے ایک منش کو بے وردی سے قتل کیا ہے۔ جو سزا اس لڑکی کو مل رہی ہے، وہ اس کا بھی بھلا کرے گی۔ اس کے پاپ دُھل جاویں گے، اس کا اگلا جنم کسی بہت اچھے روپ میں ہووے گا۔"

وہ دیر تک بولتی رہی۔ میرے اور میرے دونوں ساتھیوں کی غداری کو بدترین انجام سے جوڑتی رہی۔ آخر میں اس نے اپنا لہجہ نرم کیا اور مجھے سمجھانے بجھانے کی کمزور کوششیں کرنے لگی۔ وہ بولی۔ "ایک بات یاد رکھو، گرو جی اپنے دھرم کے خلاف کچھ نا ہیں کریں گے۔ وہ جانت ہیں کہ ایسا کرنے کا انجام کتنا بُرا ہووے گا۔ نرگ کی اگنی کے سامنے اس سنسار کی ساری سزائیں بالکل معمولی ہیں۔ گرو جی میری ہتھیا قبول کرلیویں گے، اپنی ہتھیا بھی قبول کرلیویں گے... لیکن سوچو، اس کے بعد کیا ہووے گا؟ کیا یہاں کے لوگن تمہیں زندہ چھوڑیں گے؟ کبھی نا ہیں۔ اس لیے میں اب بھی کہتی ہوں کہ کوئی اور راستہ اختیار کرلو۔ اپنے دوستوں کو سمجھاؤ کہ یہ ضد چھوڑ دیں۔ یہ سب کو بہت مہنگی پڑے گی۔"

"ضد چھوڑنا ہی تو مشکل ہے۔ کیا تمہارا پتی اور اس کے ساتھی اپنی ضد چھوڑ رہے ہیں؟"

"وہ ضد نا ہیں ہے۔ وہ تو دھرم ہے۔ بھگوان کی اکھشا ہے اور اس کے خلاف چلنا مہا پاپ ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں دیوی جی۔ مہا پاپ اور مہا پُن کا فیصلہ ہی تو ہم سے ہو نہیں رہا۔ ہم اپنے جھوٹے عقیدوں اور واہموں کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔"

اس نے لرز کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے اور پھر پوجا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "ایشور تمہیں شما کرے۔ تم اپنی ناسمجھی میں بہت غلط باتیں کہہ رہے ہو۔"

"یہ غلط باتیں نہیں ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ..."

"بس بس، اب چپ ہو جاؤ۔" وہ تیزی سے میری بات کاٹ کر بولی۔ "جن باتوں کی تمہیں جانکاری نا ہیں، ان کے بارے میں بول کر اپنا انجام خراب مت کرو... بس چپ ہو جاؤ۔"

بات کرتے ہوئے وہ گاہے بگاہے خوف زدہ نظروں سے سبز رنگ کے ریموٹ کنٹرول کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ شاید عمران نے ٹھیک ہی کہا تھا، یہ ریموٹ کنٹرول ایک طوطے کی طرح تھا اور اس میں گرو کی پتنی کی جان تھی۔

اس دوران میں اندرونی کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ غوں غاں کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ پہلوان نما داسی شاید پھر مضطرب ہو رہی تھی۔ جس طرح بندھی ہوئی گائے بھینس ذبح ہونے سے پہلے ٹانگیں چلاتی ہیں، وہ بھی ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ جب یہ سلسلہ دراز ہوا تو میں نے جا کر دیکھنا مناسب سمجھا۔ چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک ننھی سی چیز تیزی سے باہر نکل گئی۔ یہ ایک چوہا تھا۔ داسی بھاگ متی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت کتنی بھی دلیر ہو، چوہا، چھپکلی، کاکروچ اور اس نوع کے دیگر جان دار اس کی کمزوری رہے ہیں۔ اگر عمران یہاں موجود ہوتا تو اس سچویشن پر چند دلچسپ فقرے ضرور چست کرتا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور واپس رادھا کے پاس آگیا۔ اس نے صورتِ حال پوچھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اس کی نوکرانی پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔ رادھا گاہے بگاہے عجیب انداز سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ آخر وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آئی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ "تم نے اتنی سخت ٹھنڈ میں بھی بس یہ قمیص پہن رکھی ہے۔ تمہیں سردی نا ہیں لگتی؟"

"نہیں لگتی۔ یا یوں سمجھ لو کہ لگتی ہے لیکن میں محسوس نہیں کرتا۔"

"کیا مطلب؟"

"بس یہ عقیدے عقیدے کی بات ہے۔ مجھے سردی جھیلنے میں مزہ آتا ہے، بالکل جیسے تمہارے پتی دیو کو سنیچر کی رات ٹھنڈے پانی میں جاپ کرکے مزہ آتا ہوگا۔"

"لل... لیکن وہ پانی ٹھنڈا تو نا ہیں ہوتا۔"

"تم نے ابھی خود بتایا تھا کہ وہ آدھی رات کے بعد ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر جاپ فرماتے ہیں۔ امیت بھی یہی کہہ رہا تھا۔"

"وہ پانی اس لحاظ سے ٹھنڈا ہووت ہے کہ اسے آگ پر گرم نا ہیں کیا جاتا۔" وہ لیٹے لیٹے بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہ دھرم کی باتیں ہیں۔ میری تمہاری بدھی (عقل) میں نا ہیں آسکتیں۔"

"لیکن اتنی بات تو ایک بالک کی سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ پانی کو آگ سے ہی گرم کیا جاسکتا ہے یا پھر دھوپ میں رکھ کر اس کی ٹھار ماری جاسکتی ہے... مگر آدھی رات کو تمہارے پتی دیو کو دھوپ کہاں ملتی ہوگی؟"

"آگ آگ میں فرق ہووت ہے۔" رادھا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "گرو جی کہوت ہیں کہ سنیچر کی رات والے پانی کو ایسے آدھ بجھے کوئلوں سے گرم کیا جاسکت ہے جن میں اگنی کی لپک نہ ہو۔ وہ تانبے کے جس حوض میں بیٹھ کر جاپ کرت ہیں، اس کے گرداگرد ملازم آدھ بجھے کوئلے ڈالتا رہتا ہے۔"

رادھا نے اس بارے میں کچھ مزید تفصیل بتائی۔ وہ جیسے خود بھی باتیں کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا دھیان اپنی بیلٹ اور ریموٹ کنٹرول وغیرہ سے ہٹا رہے۔ وہ کسی حد تک سادہ بھی تھی۔ اپنے شوہر یعنی گرو جی کے کمالات کا بہت سارا رعب اس کے دل و دماغ پر موجود تھا۔ میں دل ہی دل میں گرو کی چالاکی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ ایسی سخت سردی میں ٹھنڈے پانی کے اندر بیٹھ کر جاپ کرنے میں کوئی گھپلا ہوگا۔ اب یہ گھپلا سامنے آگیا تھا۔ گرو جی جیسے لوگوں کے پاس حیلے بہانے اور تاویلیں تو ہر وقت موجود رہتی ہیں۔ پانی کو گرم کرنے کے لیے اس نے یہ تاویل ڈھونڈ لی تھی کہ پانی کو آگ سے گرم نہیں کیا جاسکتا لیکن آدھ بجھا انگارہ جس میں شعلہ نہ ہو، آگ نہیں کہلائے گا... واہ! کیا سچائی تھی؟

میں دوسرے کمرے میں جاکر گاہے بگاہے اقبال کی مزاج پرسی کرتا رہا۔ رادھا سے باتیں بھی کرتا رہا اور عمران کا

انتظار بھی۔ رادھا کی گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ جو شخص رات بھر آدھ بجھے انگارے گرد کے حوض کے لیے مہیا کرتا رہتا ہے، وہ امیت یعنی عمران ہی ہے۔ وہ آدھی شب سے لے کر آخری پہر تک لکڑیوں کے ایک ڈھیر سے نبرد آزما رہتا ہے۔ تین بڑے چولہے جلتے رہتے ہیں اور تانبے کے حوض کو اَدھ بجھے انگاروں کی سپلائی جاری رہتی ہے۔

خدا خدا کر کے انتظار کا وقت کٹا اور دروازے سے باہر گرو اور عمران کی آمد ہوئی۔ یہ دروازہ مردانے حصے کی طرف تھا۔ میں درمیانی دروازے میں سے گزر کر مردانے میں پہنچا اور دروازہ کھولا۔ گرو نے خود کو ایک بھاری کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ عمران مؤدب انداز میں اس کے پیچھے تھا۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے تک اس نے اپنے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا جو ابھی ابھی دھویا گیا تھا۔ ان کے ساتھ دو مزید افراد بھی تھے۔ یہ نوجوان پجاری تھے۔ گرو کی طرح ان کے بال بھی بھیگے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے گرد کمبل لپیٹ رکھے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ بھی گرو کے ساتھ ہی پانی میں پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں۔ ان دونوں افراد کو گرو نے کچھ پرشاد دیا اور تھوڑی سی گفتگو بھی کی۔ اس کے بعد وہ دونوں واپس چلے گئے۔ جب تک وہ موجود رہے، عمران کا رویہ گرد کے ساتھ بہت مؤدب رہا لیکن اس کے فوراً بعد وہ اپنے اصل روپ میں آگیا۔ اس نے گرد کو زنانے میں چلنے کو کہا۔ انداز حکم دینے والا ہی تھا۔ گرو چار و ناچار اپنی توند مٹکاتا ہوا زنانے میں آگیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ یہاں رادھا مسہری پر اسی طرح بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ میاں بیوی نے بے چارگی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

گرد کو سردی لگ رہی تھی۔ اس نے عمران کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”بھاگ متی نے انگیٹھی ناہیں جلائی؟“

عمران نے اطمینان سے نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بھاگ متی نے انگیٹھی تو نہیں جلائی لیکن اس نے تمہارے جانے کے بعد ایک اور طرح کی آگ لگانے کی کوشش فرمائی تھی۔ اس ناکام کوشش کے نتیجے میں اب وہ چھوٹے کمرے میں بندھی پڑی ہے۔“

”کیا کہنا چاہت ہو؟“ گرو بوکھلا گیا۔

”اس نے راج کی آنکھوں میں مرچیں جھونکیں اور اس سے طوطا (کنٹرول) چھیننے کی کوشش فرمائی۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ خاص قسم کی مرچیں بھاگ متی کو تم نے ہی سپلائی کی ہوں گی۔“

گرد کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ ”ناہیں... میں نے ایسا کچھ ناہیں کیا۔ میں بھگوان کی سوگند کھاوت ہوں۔“

گرو کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور بھاگ متی نے جو کچھ کیا ہے، اپنے طور پر کیا ہے... مگر عمران نے گرو پر دباؤ برقرار رکھا اور اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ کافی غصے میں نظر آرہا تھا۔ اس نے گرد کو دوسرے کمرے میں لے جا کر اقبال کی حالت دکھائی اور پھر اسے دھکیلتا ہوا واپس رادھا کے پاس لے آیا۔ اس نے دوٹوک لہجے میں گرو سے کہا۔ ”میں اب تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تم نے جو فیصلہ بھی کرنا ہے، ابھی کرو اور زیادہ سے زیادہ کل تک اس پر عمل ہو جانا چاہیے۔“

گرو نے اپنے موٹے بھدّے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بے دم سا ہو کر لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گیا۔ اس نے چند لمبی سانسیں لیں اور جیسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”دیکھو امیت! بھگوان کی کتنی بڑی کرپا ہے کہ اس نے تمہیں ایک ہندو گھرانے میں پیدا کیا۔ انسان کے بھیس میں پیدا کیا اور سنسار کی ساری نعمتیں تم کو دیں۔ تم کسی مُسلے یا عیسائی کے گھر میں بھی پیدا ہو سکتے تھے... تمہاری جُون انسان کے بجائے کسی کتے بلی کی بھی ہو سکتی تھی۔ ہم دن رات بھگوان کا شکر ادا کرتے رہیں تو بھی کم ہے۔ ہم شکر ادا ناہیں کر سکتے لیکن کم از کم اس طرح کا مہاپاپ تو نہیں کریں۔ اس ناری کا چتا میں جلنا اس کے لیے ہی ناہیں، ہم سب کے لیے بھی چھٹکارے کا سبب بنے گا۔ اس کے اپرادھ کے مقابلے میں یہ سزا تو کچھ بھی ناہیں اور اگر...“

”تم یہ بکواس بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔“ عمران نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”میں یہ سب کچھ بہت دفعہ سن چکا ہوں۔ اب دوٹوک بات کرنی ہوگی۔ ہاں یا نہ...“

”مگر امیت...“

”بس گرد... ہاں یا نہ۔“ عمران نے بے لچک لہجے میں کہا۔

اس دفعہ رادھا بولی۔ ”اتنی جلدی مت کرو امیت... چلو، ہمیں دوپہر تک کا سمے اور دے دو۔“

”تاکہ تمہارے کسی چہیتے کو سرخ مرچوں جیسی چالاکی دکھانے کا ایک موقع اور مل جائے۔“ عمران نے ترت جواب دیا۔

”میں تمہیں وچن دیتا ہوں امیت، اب ایسا کچھ ناہیں ہوگا... اور میرا وشواس کرو، جو کچھ ہوا ہے اس میں بھی میرا یا رادھا کا دوش بالکل ناہیں۔“

”نہیں گرو۔“ عمران کا لہجہ دوٹوک تھا۔ ”تمہیں جو کچھ کرنا ہے کل کرنا ہوگا، ورنہ اپنی اس چہیتی پتنی کے دس پندرہ ٹکڑے اٹھانا ہوں گے، چتا کے پھول تیار کرنے کے لیے...“

عمران کے انداز نے گرد کا تاریک چہرہ تاریک تر کر دیا... وہ اپنے تھرتھر کانپتے جسم کو کمبل میں لپیٹتے ہوئے بولا۔ ”رادھا کو مارنے کے بعد تم تینوں بھی تو زندہ ناہیں رہ سکو گے۔ یہ کبھی ہونا ہیں سکتا کہ ستیش اور بڑے گرو تم کو یہاں سے زندہ جانے دیں... اور سلطانہ کو تو پھر بھی مرنا ہی مرنا ہے۔ جیون بڑی پیاری چیز ہے امیت! یہ بھگوان کا تحفہ ہے... اسے یوں کھونا بدھی کی بات ناہیں ہے۔“

”تم ہمیں موت سے نہ ڈراؤ گرد... ہم موت کے آگے نہیں، پیچھے بھاگنے والے لوگ ہیں۔“ عمران نے اطمینان سے کہا۔ اس کے لہجے میں وہی جانی پہچانی سچائی تھی جس نے مجھے دیوانہ بنایا تھا۔ یہ اس شخص کا لہجہ تھا جو واقعی جان ہتھیلی پر لے کر پھرتا تھا۔ موت اس کی محبوبہ تھی اور وہ اس سے بغل گیر ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار تھا۔

گرو نے ایک بار پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ عمران نے بڑے انداز سے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور لکڑی کے دستے والا ایک چھوٹا ریوالور نکال لیا۔ اس نے ریوالور کا چیمبر کھولا۔ وہ بھرا ہوا تھا۔ عمران نے اس میں سے چار گولیاں نکال لیں۔ پھر چرخی کو دو تین بار گھما کر ریوالور گرد کی گود میں پھینک دیا۔ گرو حیران سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں عمران کے اس پرانے کھیل کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

عمران بولا۔ ”چلو، سب کچھ بھگوان پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ابھی تم پانی کے اندر بڑی لمبی پرارتھنا کر کے نکلے ہو۔ بہت سے آشیرباد تمہارے ساتھ ہوں گے۔ چلو، مجھ پر گولی چلاؤ... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“

”کک... کیا مطلب؟“

”گولی چلانے کا مطلب گولی چلانا ہی ہوتا ہے، پرشاد کھانا نہیں۔ مجھ پر گولی چلاؤ، میری ٹانگ کا نشانہ لو۔ اگر گولی مجھے لگ گئی تو ہم تمہاری پتنی کی کمر سے پیٹی اتاریں گے اور تمہیں بغیر کچھ کہے یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر گولی نہ چلی تو پھر ایسے ہی چرخی گھما کر میں تم پر گولی چلاؤں گا۔ اس طرح دیکھتے ہیں کہ بھگوان کی طرف سے کیا اشارہ ملتا ہے۔“

ریوالور گرد کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی کپکپاہٹ میں اضافہ ہوگیا۔ چند سیکنڈ کے لیے محسوس ہوا کہ شاید وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے... لیکن پھر جلد ہی اس کے تاثرات نارمل ہو گئے اور وہی خوف آمیز بے بسی اس کے فربہ چہرے کو ڈھانپنے لگی جس کا مشاہدہ میں اب تک کر رہا تھا۔ اس نے ریوالور اٹھا کر دوبارہ عمران کے پاس رکھ دیا۔ ”تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تمہاری کچھ سمجھ ناہیں آرہی۔“ وہ کراہ کر بولا۔

”لیکن مجھے تمہاری ساری سمجھ آرہی ہے... تم صرف سمے ضائع کر رہے ہو اور کسی چمتکار کے انتظار میں ہو۔ لیکن ہم کب تک چمتکار کا انتظار کریں گے؟ کیوں نہ ہم خود ہی چمتکار کے پاس پہنچ جائیں۔“

”کیا مطلب؟“ گرو نے کہا۔

”مہاتما صاحب! یہ چمتکار ہی تو ہے۔“ عمران نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گولی لگ گئی تو چمتکار... تمہیں نہ لگی تو بھی چمتکار... چلو اگر تم میں اتنی شکتی نہیں تو میں خود ہی گھوڑا دبا دیتا ہوں۔ پہلے خود پر ٹرائی کرتا ہوں... پھر تم پر...“ عمران نے بڑے اعتماد سے ریوالور کی سیاہ نال اپنی دائیں ران پر رکھ لی۔

گرو اور رادھا کے چہرے دیدنی تھے۔ خاص طور سے گرو کا چہرہ تو بالکل تاریک ہوگیا۔ عمران نے شہادت کی انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ عمران کے اس کھیل میں عمران کا اعتماد ہی سب کچھ تھا اور یہ اعتماد ساون کی منہ زور بارش کی طرح تابڑ توڑ اس کے چہرے پر برس رہا تھا۔ ریوالور کی چرخی میں دو گولیاں موجود تھیں۔

چند ہی سیکنڈ بعد گرو کی ہمت جواب دے گئی۔ ”ٹھہرو۔“ وہ کراہا۔ ”ایسا مت کرو۔ اس طرح کی شرطیں باندھنا دھرم میں پاپ ہے۔ تمہارے دماغ کو خون چڑھا ہوا ہے، تم شاید بدھی کی کوئی بات سوچ ہی ناہیں سکت ہو۔“

”تمہارے دماغ کو تو خون نہیں چڑھا ہوا، پھر تم اس نردوش لڑکی کو زندہ جلانے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟“ عمران پھنکارا۔

”میں یہاں کا کار مختار ناہیں ہوں۔ مجھ سے تو بس رائے مانگی جاوت ہے۔ اصل حکم تو بڑے گرد کا ہی چلتا ہے یا پھر ستیش کا۔“

”لیکن دھرم کے ٹھیکیدار تو تم ہو، بڑا گرو تو نوے سال کا بڈھا کھوسٹ ہو چکا ہے۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ یہاں کوئی تمہاری رائے کے خلاف نہیں چل سکتا۔“

”جتنا دھرم کو میں جانت ہوں، اتنا وہ بھی جانت ہیں۔ میں کوئی غلط بات کہوں گا تو بھگوان کا دوشی ٹھہروں گا اور ساتھ ساتھ یہاں کے سب لوگ مجھ کو دوشی ٹھہرائیں گے۔“

''لیکن تم گرو اور استاد ہو... استادی ہوتی ہی یہ ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکالا جائے۔ اور درمیانی راستے تو ہر وقت تمہاری مٹھی میں رہتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا یہ سنیچر کی رات والا اشنان ہے۔ تم گرم پانی میں بیٹھ کر جاپ کرتے ہو اور کوئی تمہیں پکڑ بھی نہیں سکتا۔ اس کی ایک مثال تمہاری یہ پتنی ہے۔ یہ تم سے دس پندرہ سال تو چھوٹی ضرور ہے اور سندر بھی ہے۔ تمہارے جیسے گرو تو اکثر برہم چاری ہوتے ہیں لیکن تم دونوں مزے لے رہے ہو۔ گرو گھنٹال بھی بنے ہوئے ہو اور اپنا بستر بھی گرما گرم رکھتے ہو۔ یقیناً اپنے لیے یہ رعایت بھی تم نے کسی نہ کسی پوتھی (کتاب) سے ڈھونڈ ہی نکالی ہوگی۔''

گرو کی بولتی بند ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اپنے ساتھی کے زخمی ہونے کے بعد امیت (یعنی عمران) فیصلہ کن موڈ میں ہے۔

اس نے کچھ دیر تک مزید آئیں بائیں شائیں کی پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ عمران سے اجازت لے کر اس نے تھوڑی دیر تک پوجا پاٹ کی اور اپنی آنکھوں کو نم ناک کیا پھر کچھ پرانی پوتھیاں لے کر بیٹھ گیا اور ان کے ورق الٹ پلٹ کرنے لگا۔ جہاں تک میں نے اس کا تجزیہ کیا تھا، وہ ڈرامے باز گرو نہیں تھا۔ اس کے دل میں دھرم کا خوف اور اپنے عقیدے کا پختہ پن بھی موجود تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی اور اپنی پتنی کی جان بھی پیاری تھی۔

اسی دوران میں عمران نے انگیٹھی دہکا کر گرو کے قریب رکھ دی تاکہ وہ پوری یکسوئی سے اپنے ''مطلب'' کی کوئی تحریر ڈھونڈ سکے۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ مونگ پھلی نکال کر مجھے دی اور خود بھی ٹھکور ٹھکور کر کھانے لگا۔ اس کے بعد وہ دوسرے کمرے میں اقبال کی خبر گیری کے لیے چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو گرو پوتھیوں کی ورق گردانی سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر ہلکا ہلکا پسینا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دوسری ہتھیائیں تو کسی نہ کسی طرح شما ہو سکتی ہیں لیکن موہن کمار کی ہتھیا ایک ایسا مہا پاپ ہے جس کی چھوٹ کسی طور بھی نا ہیں ہے...''

''تو پھر۔'' عمران نے معنی خیز انداز میں سبز رنگ کی ڈیوائس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بس ایک چیز ایسی ہے جس کے بارے میں وچار کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے ایک بوسیدہ کتاب میں سے ایک نشانی لگے صفحے کو سامنے کیا اور اس پر لکھے ہوئے سنسکرت کے اشلوک زیر لب پڑھنے لگا۔

میری اور عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ گرو توضیح کرتے ہوئے بولا۔ ''کسی بھی مندر، دھرم استھان یا دھرم شالہ میں انسانی خون کا گرایا جانا سخت پاپ ہے۔ اگر اس بات کا وشواس ہو جائے کہ ہمارے کسی کرم کے کارن خون بہے گا تو پھر اس کرم سے رک جانا ضروری ہے...''

''اور تمہیں پورا وشواس کر لینا چاہیے کہ اگر تم ہماری بات نہیں مانو گے تو خون بہے گا اور بہت زیادہ بہے گا۔''

گرو نے چند لمحوں کے لیے مسہری پر دراز اپنی خوب صورت بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کا گورا رنگ، بھرا بھرا جسم، اس کے ریشمی بال... سب کچھ ان لمحوں میں برق کی طرح اس کی آنکھوں میں لہرا گیا اور اس کے ساتھ ہی زندگی کی وہ ساری چاشنی، حرارت اور رنگا رنگی بھی جس کا تجربہ وہ اس استھان کے ایک مکھیا فرد کی حیثیت سے کر رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ دھرم اور استھان کے پالن کی خاطر میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں اس پوتر جگہ کو ہتھیا کے خون سے گندا نا ہیں ہونے دوں گا۔''

عمران کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے مدد کے طریقۂ کار پر کوئی بات نہیں کی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ طریقۂ کار پر پہلے بات ہو چکی ہے اور اب جو کچھ ہوگا، اس کے مطابق ہوگا۔

عمران نے قریب رکھی پلیٹ میں سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور دوسرا ٹکڑا گرو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں اپنا اور اپنی پتنی کا نیا جیون مبارک ہو۔''

گرو نے مجبوراً مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا لیکن اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مٹھائی نہیں، کونین کی گولی کھا رہا ہے۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں صورتِ حال مجھ پر واضح ہو گئی۔ عمران نے گرو سے جس ''مدد'' کی بات کی تھی، اس کا طریقۂ کار پہلے بھی زیرِ بحث آ چکا تھا۔ استھان کی پہرے داری بیس بائیس افراد کے ذمے تھی۔ یہ لوگ رات نو بجے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر آتے تھے اور صبح کا اجالا نمودار ہونے تک رہتے تھے۔ ایک دوسرا جتھا دن کے وقت پہرے کے فرائض انجام دیتا تھا۔ چند دن کے وقفے سے یہ ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی۔ دن کے پہرے دار رات کی شفٹ میں چلے جاتے تھے اور رات والے دن کی شفٹ میں۔ ان بیس بائیس افراد میں سے آٹھ کے قریب تو استھان کے اندر ہی مختلف جگہوں پر ہوتے تھے، باقی نکاسی کے راستوں پر۔ ان کی ساری تفصیل عمران کو معلوم تھی۔ ان کی جسمانی حالت، ان کے

ہتھیاروں کی تعداد، ان کی صلاحیت، سب کچھ اس کے علم میں تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مہینوں سے یہاں موجود ہے... اور یقیناً اقبال بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

رات کے بھوجن کے بعد سب لوگ تاڑی سے شغل کرتے تھے۔ عام لوگ تو دل کھول کر پیتے تھے لیکن پہرے دار بھی اس ''نیک کام'' میں کسی حد تک شریک رہتے تھے۔ یہ خاص قسم کی تاڑی تھی جس میں بھنگ کا نشہ بھی شامل کیا جاتا تھا۔ ایک طرح سے یہ ان لوگوں کا مذہبی مشروب تھا جس کے پینے میں پاپ کے اندیشے کے بجائے ثواب کی توقع رکھی جاتی تھی۔ اس مشروب کے سربمہر مٹکے گرو کی تحویل میں رہتے تھے۔ گرو کے لیے یہ کام بہت آسان تھا کہ وہ اس تاڑی میں کوئی ایسی چیز شامل کر دیتا جس سے پینے والے مکمل طور پر انٹاغفیل ہو جاتے... اقبال کی آنکھوں کا کباڑا کرنے والی خاص سرخ مرچوں جیسی کچھ اور چیزیں بھی گرو کے پاس موجود تھیں... اور انہی چیزوں میں دھتورے کا وہ کشتہ بھی تھا جسے تاڑی میں ملائے جانے کا پروگرام تھا۔

عمران نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے اپنے ٹھکانے پر واپس جانا چاہیے تاکہ کسی کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ سب اچھا ہونے والا ہے اور وہ موقع دیکھ کر کل کسی بھی وقت مجھ سے ملاقات کرے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کسی طرح سلطانہ کی خیر خیریت دریافت کرے اور مجھے بتائے، اس کے علاوہ شکیلہ کے بارے میں بھی باخبر رہے۔ میں نے انگریزی زبان کا سہارا لیتے ہوئے اسے شکیلہ کی حالتِ زار کے بارے میں بتایا۔ وہ اس بارے میں پہلے سے نہیں جانتا تھا، تاہم اسے شک ضرور تھا کہ اس مسلمان لڑکی کو یہاں ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ میں نے تین دن پہلے جو کچھ شکیلہ کے ساتھ ہوتے دیکھا تھا، وہ عمران کے گوش گزار کیا۔ عمران کی آنکھوں کی بے قراری کچھ اور بڑھ گئی۔ گرو اور رادھا کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ ہماری باتیں سمجھ نہیں پا رہے۔

میں عمران سے بہت کچھ... بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ابھی ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ عمران مجھے گرو کی رہائش گاہ سے لے کر نکلا اور واپس میرے ٹھکانے کی طرف لے کر چل دیا۔ آدھے راستے سے میں نے اسے واپس بھیج دیا کیونکہ میں اب اپنے کمرے تک جا سکتا تھا۔

ابھی میں کمرے سے کچھ دور ہی تھا کہ مجھے رات کے سناٹے میں دھپ دھپ کی مدھم آواز سنائی دی جیسے کوئی بیلچے یا کسی سے مٹی کھود رہا ہو۔ فوراً میرا دھیان شکیلہ کی طرف چلا گیا۔ اس نے بھی تو کالی ماتا کے بیلچے اور مٹی کھودنے کی بات کی تھی۔ میں محتاط قدموں سے آواز کی سمت بڑھا۔ کمروں کی عقبی دیوار کے ساتھ کچے احاطے میں جہاں بہت سی خشک لکڑیاں پڑی تھیں اور تین بڑے بڑے چولہے بنے ہوئے تھے، مجھے دو تین سائے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی چولہے ہیں جن کا ذکر کچھ دیر پہلے گرو کی سادہ لوح پتنی رادھا نے کیا تھا۔ ان چولہوں میں گرو کے جل جاپ یعنی پانی کی پوجا کے لیے اُدھ بجھے انگارے تیار کیے جاتے تھے۔ یعنی جو پانی 10 کلو لکڑی سے گرم ہو سکتا تھا، اس کے لیے ڈیڑھ دو من لکڑی جلائی جاتی تھی۔ ایک چولہے میں ابھی تک مدھم آگ روشن تھی۔ میں تین سایوں کی حرکت اسی روشنی

وفادار شوہر

ہفتے کی رات تھی۔

وہ کلب کے ہنگاموں میں رات تین بجے تک مگن رہا۔

گھر پہنچا تو اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس نے شوہر کو دیکھا تو پوچھا۔ ''آج کلب میں کیا شغل رہا؟''

''آج کلب میں عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ تمبولا شروع ہونے سے پہلے سیکریٹری نے اعلان کیا کہ جو شخص کھڑا ہو کر سب کے سامنے اس امر کا دعویٰ کرے کہ جب سے اس کی شادی ہوئی ہے اس نے اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کی تو اس کی خدمت میں یہ نیا ہیٹ پیش کیا جائے گا۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

''ڈارلنگ تم سن کر حیران ہو گی کہ سارے مجمع میں سے کسی بھی شخص نے اس امر کا دعویٰ نہیں کیا۔''

''مگر تم نے کیوں دعویٰ نہیں کیا؟''

''میں نے...؟ میں تو کھڑے ہو کر اعلان کرنے ہی والا تھا کہ یکا یک مجھے خیال آیا کہ یہ ہیٹ میرے سائز کا نہیں۔''

چاند بی بی کا تعاون چکوال سے

میں دیکھ سکا تھا۔

ان میں سے ایک یقیناً لڑکی تھی۔ وہ کندھوں تک ایک گڑھے میں تھی، اس کے بازوؤں کی حرکت سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ رات کے اس یخ بستہ سناٹے میں مٹی کھود رہی ہے۔ نہ جانے یہ کیا معما تھا۔ اس رات شکیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تلسی کے پودے کے نیچے اس لیے مٹی کھود رہی تھی تاکہ اسے وہاں سے شیوا جی کے نام کی مہر مل سکے، اگر ایسا ہو گیا تو یہ لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ ارجن وغیرہ کا ڈھونگ ہی لگا تھا۔

میں شاید کچھ دیر مزید وہاں ٹھہرتا اور کچھ ٹوہ لگانے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں ایک آواز نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ یہ ایک تنومند پہرے دار کی آواز تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ چمک رہی تھی۔ ”مہاشے! یہاں کیا کر رہے ہو آپ؟“ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

پھر اس نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پھینکی اور چونکی ہوئی آواز میں بولا۔ ”گوپال صاحب! آپ یہاں... اس وقت... خیریت تو ہے؟“

”بس ذرا سینے میں جلن ہو رہی تھی اس لیے ٹہل رہا ہوں۔“

”اگر طبیعت خراب ہے تو بتائیے۔ یہاں دوا دارو کا انتظام بھی ہے۔“ اس نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ شکیلہ کی صورت تادیر نگاہوں میں گھومتی رہی۔ اس کا قصور کچھ نہیں تھا، اگر کوئی قصور تھا تو وہ اس کے بھائی کا تھا... اور وہ بھی بس اتنا کہ وہ ایک برہمن زادی کے دل میں سما گیا تھا۔ اس قصور کی پاداش میں اس کی ایک بہن قتل ہو چکی تھی اور وہ خود زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ اسے اس حال میں چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اسے اس دردناک صورتِ حال سے نکالنے کے لیے آخری حد تک کوشش کروں گا۔ اگر میرے علم میں یہ بات نہ آئی ہوتی تو اور بات تھی، اب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر فراموش کر دینا ممکن نہیں تھا۔

سہ پہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف عمران تھا۔ وہ جلدی سے اندر آ گیا۔ اس کے یہاں آنے کا مطلب یہ تھا کہ اقبال کی حالت اب بہتر ہے اور وہ ریموٹ کنٹرول کے ساتھ رادھا دیوی کے سرہانے موجود ہے۔ میرا یہ خیال درست نکلا۔ عمران نے کہا۔ ”اس کی آنکھوں کی سوجن تو کم نہیں ہوئی لیکن جلن اب ٹھیک ہے۔ وہ اب رادھا دیوی کو سنبھال سکتا ہے۔“

”اسے کسی اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔“

”لیکن جگر! یہاں سب مریض ہیں... نفسیاتی مریض، روحانی مریض... جنونی اور پتا نہیں کیا کیا... میں ان کو کیا لعن طعن کروں، میں خود ایک چڑیا ہوں۔“

پھر اچانک عمران کی نظر میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر پڑی۔ ریت کے تھیلے کے ساتھ میں گھنٹوں تک جو طبع آزمائی کرتا تھا، اس نے میری انگلیوں کی گانٹھوں کو سیاہ کر دیا تھا اور یہاں سے جلد سخت چمڑے جیسی ہو گئی تھی۔ میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا، تاہم مجھے یقین تھا کہ میں کسی دروازے کے موٹے سے موٹے تختے کو مکا مار کر توڑ سکتا ہوں۔ میں لگا ہے بگا ہے اپنی ضرب کی سختی کو جانچتا رہتا تھا اور مجھے روزافزوں بہتری کا احساس ہوتا تھا۔ عمران نے حیرت آمیز انداز میں میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے انگوٹھے سے میرے ہاتھ کی پشت کو سہلایا... پھر میرے دوسرے ہاتھ کی پشت کو دیکھا۔

”یہ سب کیا ہے تابی؟ میں تم میں بہت زیادہ تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔“

”اچھی یا بُری؟“ میں نے پوچھا۔

”اچھی... بلکہ شاید بہت اچھی... تم ایک... بدلے ہوئے شخص ہو اور یہ نشان جو تمہاری جلد پر ہیں، یہ بھی کوئی نئی کہانی سنا رہے ہیں۔ کہیں کوئی فائٹنگ شائننگ کا آرٹ تو نہیں سیکھ رہے ہو تم؟“

”فائٹنگ کا آرٹ تو نہیں... ہاں تم جینے کا آرٹ کہہ سکتے ہو۔“ میں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”کوئی باکمال استاد ہی لگتا ہے بھئی۔“ عمران نے آنکھیں نچائیں۔ ”کون ذاتِ شریف ہے؟“

”ہے نہیں... تھا۔“

”کون؟“

میں نے گہری سانس لی اور آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ ”وہ بہت انوکھا تھا عمران... بہت جدا... جب میں تمہاری کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا اور مجھے ہر چہرے میں تمہارا چہرہ نظر آتا تھا تو ایک روز اچانک وہ میری زندگی میں آ گیا... تمہارا بدل بن کر... تمہارے مداوے کی طرح... وہ مجھے ایک پرانی کشتی میں ملا۔ وہ عشق کے راستے کا تباہ حال مسافر تھا... ایک کمزور، اپاہج اور حقیر سا شخص۔ لیکن وہ جو نظر آتا تھا، وہ نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک بڑا انسان چھپا ہوا تھا۔ ایک بہت طاقتور، دلیر اور دانا شخص۔ وہ مارشل آرٹ کا ایک انٹرنیشنل سپر اسٹار تھا۔ باروندا جینی کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟“

”ہاں، کچھ کچھ لگ تو رہا ہے۔ شاید اس نے کسی فلم میں بھی کام کیا تھا۔“ عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔

”فلم اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ زندہ رہتا تو شاید فلموں کی ضرورت بن جاتا... وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ساتھ کوئی خدائی تحفہ لے کر دنیا میں آتے ہیں۔“

”تو کیا وہ زندہ نہیں؟“

”ہاں عمران، وہ مر گیا... لیکن مرنے سے پہلے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا گیا۔ جو کمی تم نے رہنے دی تھی، وہ اس نے پوری کر دی۔ اس لیے تو کہتا ہوں کہ وہ تمہارا بدل بن کر مجھے ملا تھا۔“

”کیا ہوا اس کے ساتھ؟“

”وہی جو پیار کرنے والوں اور اس پر قائم رہنے والوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ دنیا نے اسے محبت کی سزا دی اور اس نے ہنستے ہنستے قبول کر لی۔“ میری آنکھوں کے کنارے پھر جل اٹھے۔

”یہ تو کوئی لمبی کہانی لگتی ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کہانی نے تمہیں بہت دکھی کیا ہے۔“

”ہاں، میرے بارے میں تمہارے اکثر اندازے بالکل درست ثابت ہوتے ہیں عمران۔ اس کی جدائی نے مجھے بُری طرح توڑا پھوڑا ہے... لیکن میں قدرت کی کرشمہ سازی پر حیران ہوں۔ جب میں تمہارا خلا بُری طرح محسوس کر رہا تھا تو اسے پُر کرنے کے لیے باروندا جینی آ گیا اور جب باروندا جینی کے بعد مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا... مجھے پھر سے تم مل گئے۔ میں سچ کہتا ہوں عمران... مجھے ابھی تک اپنے حواس پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ تم کہاں چھپ گئے تھے؟ اور اب یہاں انڈیا کی اس دور دراز اسٹیٹ میں یہاں انتہا پسندوں کے اس ٹھکانے پر؟ یہ سب کچھ اتنا ڈرامائی ہے کہ بس ایک خیال کی طرح لگتا ہے۔“

”میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ تمہیں سب کچھ بتاؤں گا اور پوری تفصیل کے ساتھ۔“

میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ جذباتی نظر آیا مگر پھر اس کی فطری شوخی عود کر آئی۔ وہ میرے ہاتھوں کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ”زبردست۔ اب یہ ہاتھ مردوں والے ہاتھ لگتے ہیں۔ اب تو تمہارے باروندا کے بارے میں مزید جاننے کو دل چاہتا ہے۔“

”میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاؤں گا؟ میں تو خود بھی اسے زیادہ نہیں جان سکا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے اب تو...“ وہ ایک دم کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کی ساری دلکشی، شگفتگی اچانک اندوہ میں ڈھل گئی۔ آنکھوں میں دکھ کے سائے تیر گئے۔

”کیا بات ہے... تم کچھ کہنے لگے تھے؟“

اس نے اپنے مخصوص انداز میں کنپٹی کھجائی اور گمبھیر لہجے میں بولا۔ ”باقی سب کچھ تو ٹھیک ہے لیکن ایک بُری خبر بھی ہے۔“

میں ٹھٹک گیا۔ ”سلطانہ تو ٹھیک ہے؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”سلطانہ تو ٹھیک ہے... لیکن شکیلہ...“

”کیا ہوا شکیلہ کو؟“

”وہ... نہیں... رہی۔“

”نہیں رہی... کیا مطلب؟“

عمران کے لہجے میں عجیب سی آتش بھڑک گئی۔ ”انہوں نے مار دیا اسے۔ آج صبح سویرے تمہارے یہاں واپس آنے کے کچھ ہی دیر بعد۔“

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج گئیں... نگاہوں کے سامنے وہ منظر آ گیا جو آج سحری کے وقت میں نے دیکھا تھا۔ کمروں کے پچھواڑے کچے احاطے میں لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس کچھ سائے حرکت کر رہے تھے۔

”اوہ خدایا۔“ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے عمران کہ ایسا ہو گیا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، آج صبح سویرے اس کے سر پر چوٹ لگا کر اسے مارا گیا... پھر اس کی اپنی کھودی ہوئی قبر میں ہی دفن کر دیا گیا۔“

”اپنی کھودی ہوئی قبر؟“

”یہ درندگی کی ایک اور یادگار مثال ہے۔ وہ بے چاری پچھلے چار پانچ روز سے خود ہی تھوڑی تھوڑی کر کے اپنی قبر کھود رہی تھی۔ یہ بھی یہاں کی منحوس رسموں میں سے ایک رسم ہے۔ دھرم دشمنی کے جرم میں قتل کیا جانے والا کوئی شخص اگر اپنی قبر خود کھودتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کے خون کا بوجھ، خون کرنے والوں پر کم سے کم ہو جائے گا۔ گروسو بھاش صاحب فرما رہے تھے کہ کوئی ایک ہزار سال پہلے یہ استھان ایک رانی گلاب کماری صاحبہ نے بنوایا تھا۔ وہ بہت اونچے

درجے کی پجارن تھیں۔ انہوں نے جیون بھر کنوارہ رہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا... لیکن پھر ایک رات وہی کچھ ہوا... جو آج کل کی فلموں میں ہوتا ہے۔ ایک طوفانی رات میں ایک مسافر اس استھان میں آکر ٹھہرا۔ انسانی تقاضوں کے ریلے کے سامنے صبر وتحمل کی ساری ریتلی دیواریں بہہ گئی تھیں۔ یہ بات چھپی نہ رہ سکی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ رانی صاحبہ نے خود کو سزا دینے کا فیصلہ کرلیا... اور یہ سزا موت تھی۔ کوئی انہیں موت کی سزا دینے کو تیار نہیں تھا۔ رانی صاحبہ کا رُتبہ اور مرتبہ ہر کسی کو ڈرا رہا تھا۔ تب رانی صاحبہ نے خود اپنے لیے ایک گڑھا کھودا اور اپنے ایک وفادار سیوک کے ذریعے خود کو اس میں زندہ دفن کرلیا۔ تاہم کچھ روایتوں میں کہا جارہا ہے کہ رانی گلاب کماری کا یہ بلیدان ان کی موت کے بغیر ہی قبول ہوگیا اور اگلے روز جب لوگوں نے مٹی ہٹائی تو رانی صاحبہ کا شریر وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ زندہ حالت میں بنارس پہنچ چکی تھیں۔''

عمران کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ جلالی روپ پیش کررہا تھا۔ اس کا یہی روپ تھا جو اس کی خوش مزاجی اور قلندرے پن سے بالکل علیحدہ تھا... اور جو دیکھنے والے کو مسمرائز کرڈالتا تھا۔

اس نے مجھ سے زیادہ بات چیت نہیں کی اور آج رات کے لیے تیار رہنے کی ہدایت دی۔ اس کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب مزید انتظار بالکل کرنا نہیں چاہتا۔ شاید میری طرح اس کے دل میں بھی یہ اندیشہ آن موجود ہوا تھا کہ شکیلہ کی طرح کہیں سلطانہ کے معاملے میں بھی تاخیر نہ ہو جائے۔ یہ بے حد خطرناک لوگ تھے۔ جنون کی حد تک کٹر اور انتہا پسند۔ وہ کسی لمحے کچھ بھی کرسکتے تھے۔

عمران نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''تم سب کچھ روزانہ کے مطابق ہی کرنا۔ رات کا کھانا کھا کر لیٹ جانا اور لالٹین بجھا دینا۔ ہوسکتا ہے کہ میں اقبال کو بھیجوں، وہ آکر تمہیں لے جائے گا۔''

اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے ایک چھوٹا پسٹل نکالا۔ اسے رومال میں لپیٹا گیا تھا۔

''یہ رکھ لو... لوڈڈ ہے۔ کل تمہیں اس کے مزید راؤنڈز دوں گا۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہ بڑی فائیو اسٹار چیز ہے۔''

میں نے پسٹل لے کر بستر کے نیچے چھپا دیا۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں عمران سے ثروت... عاطف اور فرح کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھا۔

عمران کے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ شکیلہ نام کی اس لاچار لڑکی سے اپنی پہلی اور آخری ملاقات یاد آرہی تھی۔ وہ مرنے کے لیے بالکل تیار تھی اور وہ مرگئی تھی۔ ایک سفاک انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ عجیب سے پچھتاوے نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب چند گھنٹے پہلے میں نے تاریکی میں پچھواڑے کے احاطے میں متحرک سائے دیکھے تھے۔ یقیناً یہ وہی وقت تھا جب شکیلہ کو قتل کیا جارہا تھا۔ ایک ہانپی اور تھکی ہوئی زرد رو لڑکی تصور میں آئی۔ وہ بے خبری میں اپنی قبر خود کھود رہی تھی اور مشقت سے کراہ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے کس طرح مارا گیا تھا؟ وہ جلدی مرگئی تھی یا تکلیف سے؟ آہ... انسان کسی وقت جانوروں اور درندوں سے کتنی سبقت لے جاتا ہے۔

نل پانی کی شکیلہ لاچاری کی ایک ایسی ناقابلِ فراموش تصویر بن کر میرے ذہن سے چپک گئی جسے اب مدت تک خیالوں سے محو نہیں ہونا تھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس پہرے دار کو کوسنے لگا جو سحری کے وقت وہاں آگیا تھا اور جس کی وجہ سے میں جلد کمرے میں جانے پر مجبور ہوا تھا۔ اگر میں کچھ دیر وہاں اور کھڑا رہتا تو شاید یہ بات میری سمجھ میں آجاتی کہ شکیلہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور اگر ایسا ہوجاتا تو شاید میں اسے بچانے کے لیے کچھ کرسکتا۔ یہ ''شاید'' کا لفظ بھی بہت عجیب ہے۔ کوئی غیب داں کوئی پیشین گو یا بڑے سے بڑا عالم بھی اس لفظ کا معما حل نہیں کرسکا۔ بارونداجیکی نے ایک دن اس لفظ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ میرے دماغ میں گھومنے لگا۔

... جوں جوں رات قریب آرہی تھی، میرے جسم میں سنسنی کی لہریں ابھرتی اور پھیلتی جارہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ دھیرے دھیرے ایک ہنگامے کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اس قسم کی تناؤ والی صورتِ حال مجھے تین چار سال قبل توڑ پھوڑ دیا کرتی تھی۔ میں اتنا اعصاب زدہ ہوجایا کرتا تھا کہ اپنے آپ پر ترس آنے لگتا تھا... لیکن اب موسم بدل چکے تھے۔ میں وہ نہیں رہا تھا جو کبھی تھا اور اب تو میں اور بھی طاقتور ہوچکا تھا کیونکہ عمران میرے آس پاس موجود تھا۔

قدیم استھان کے اس زیرِ زمین حصے میں روزمرہ کے معمولات جاری تھے۔ کہیں پاس ہی کسی جگہ پر پٹاخے سے چھوٹ رہے تھے۔ یہ دراصل رائفل شوٹنگ کی تربیت دی جارہی تھی۔ اس مقصد کے لیے مصنوعی ٹارگٹ اور ربر کی گولیاں استعمال ہوتی تھیں۔ گاہے بگاہے سنکھ بجنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں یا پھر پوجا کی گھنٹیاں در و دیوار میں گونجنے لگتی تھیں۔ مذہب کے نام پر ان لوگوں نے اپنا ہی ناٹک رچا رکھا تھا۔ سفاکی اور تنتقم المزاجی اس ناٹک کے اہم ترین عناصر تھے۔ عمران نے جو کچھ مجھے بتایا تھا، اس سے پتا چلا تھا کہ یہ استھان گھنے جنگل میں واقع ہے... اس کے اوپر ایک بہت بڑی پھلواری ہے۔ اس پھلواری کو بالکل صاف پانی سے سینچا جاتا ہے اور اس کے پھول نل پانی کے سارے مندروں اور استھانوں وغیرہ کو بھیجے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس پھلواری کے نیچے پرانے استھان میں انتہا پسندوں کا اڈا قائم ہے اور پھلواری میں کام کرنے والے بیسیوں مزدور درحقیقت خطرناک دہشت گرد ہیں۔

مجھے یہاں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر لایا گیا تھا تاہم خوشبو کی وہ تیز لہریں میں نے ضرور محسوس کی تھیں جو یقیناً پھلواری کے اندر سے اٹھ رہی تھیں۔ یعنی اوپر خوشبو تھی اور نیچے بدبو و بدصورتی۔

رات کے دس بجے تک آوازیں دھیرے دھیرے معدوم ہوگئیں اور استھان خاموشی اور تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اب بس کہیں کہیں لالٹینوں یا مٹی کے تیل والے چراغوں کی روشنی نظر آرہی تھی۔ لکڑی کے قدیم دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ستیش تھا۔ اس کے ماتھے کا سفید قشقہ اور آنکھوں کا سرخی مائل رنگ لالٹین کی روشنی میں نمایاں تھا۔ ''کہو گوپال! خیریت سے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں... کوئی تکلیف نا ہیں... لیکن انتظار کچھ لمبا ہوتا جارہا ہے۔''

''میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ پرنتو کٹھن سمے گزر گیا ہے۔ گرو جی کا کہنا ہے کہ ستاروں کی چال اچھی ہے۔ کل دوپہر تک سب ٹھیک ہوجاوے گا۔ وہ شام کو شبھ گھڑی نکالیں گے اور رات آٹھ نو بجے تک تمہارا کام مکمل ہوجاوے گا۔''

''یہ آپ نے اچھی جانکاری دی ہے۔'' میں نے مؤدب انداز میں کہا۔

''ماتا جی نے تمہیں پیار بھیجا ہے... اور اب تک جو تکلیف تمہیں اٹھانا پڑی ہے، اس کے لیے پتا جی نے شکریہ ادا کیا ہے۔''

''ستیش جی! آپ کیسی بات کرت ہیں۔ شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔ آپ کے پریوار کی وجہ سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں ایک ادھرم ناری کو اپنے ہاتھ سے انجام تک پہنچاؤں۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کا کام ہے۔''

''مجھے وشواس ہے ایشور تمہیں اس کا بدل دے گا...''

جس وقت میں برہمن زادے ستیش سے باتیں کررہا تھا، میں نے اقبال کو دیکھا۔ وہ میری طرف آرہا تھا۔ مجھے اور ستیش کو ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور ایک طرف اوجھل ہوگیا۔ یقیناً وہ ستیش کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ ستیش کے جانے کے بعد چار پانچ منٹ کے اندر دروازے پر پھر دستک ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ یہ اقبال ہی ہے۔ میرا خیال درست نکلا۔ اقبال نے ایک گرم چادر لپیٹ رکھی تھی، اس کی آنکھیں متورم اور سرخ تھیں۔ ہاں، کل کے مقابلے میں افاقہ نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں تو پہلے ہی تیار تھا۔ ستیش کی فراہم کردہ کپڑے کی جیکٹ پہن چکا تھا۔ یہاں میں نے کسی کے پاس چمڑے کی جیکٹ یا جوتی نہیں دیکھی تھی۔ غالباً اپنے کٹر پن کی وجہ سے وہ چمڑے کا استعمال پاپ سمجھتے تھے۔

عمران نے کل رات مجھے جو پسٹل دیا تھا، وہ بھی میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اقبال اور میں آگے پیچھے چلتے ہوئے گرو کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہم نے اپنے درمیان پندرہ بیس قدم کا فاصلہ رکھا تھا۔ یہ قدیم استھان حسبِ سابق شب کے سناٹے میں اونگھ رہا تھا۔ کچھ لوگ سو رہے تھے، کچھ سونے کی تیاری میں تھے۔ آبشار گرنے کی آواز سنائی دینے لگی اور جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، یہ آواز نمایاں ہوتی گئی۔ پانی کے قدرتی تالاب کے اندر اوندھا پڑا مجسمہ دکھائی دیا اور پھر گرو کی رہائش گاہ کے دروازے کی جھلک نظر آئی۔ اس اوندھے پڑے مجسمے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ یہ ایک علامت ہے، فرسودہ عقیدوں اور کہنہ رسموں کے زوال کی۔ یہ ٹوٹا ہوا مجسمہ شاید سوچنے والوں کو دعوتِ فکر دے رہا تھا۔ انہیں وقت کے جدید تقاضوں کی طرف بلا رہا تھا۔

ہم گرو کے گھر میں داخل ہوئے۔ زنانے میں اس کی جوان پتنی ایک تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ کل ہی کی طرح ہلدی تھا۔ اس کے قریب عمران فرشتۂ اجل کی صورت موجود تھا۔ ''ہرا طوطا'' اس کے ہاتھ میں تھا۔ گرو بھی ایک طرف گم صم بیٹھا تھا۔ جونہی چیز نظر آئی، وہ بھاگ رہی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھی ہولے ہولے پان چبا رہی تھی۔ اس کا ایک رخسار ابھی تک گہرا نیلا تھا۔ فضا کا تناؤ بتا رہا تھا کہ نازک ترین گھڑیاں آن پہنچی ہیں۔

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کو دیکھا۔ اقبال

بولا۔ ''ہال کمرے میں تو خاموشی ہے۔ شاید ایک آدھ بندہ ہی جاگ رہا ہو۔ درمیانی ہال کی طرف سے کچھ آوازیں آرہی تھیں مگر زیادہ روشنی وہاں بھی نہیں تھی۔''

عمران بولا۔ ''مجھے زیادہ خطرہ بس اس کیدو کی طرف سے ہے۔ وہ خانہ خراب پانی کی طرح پیتا ہے۔ ایک دو پیالوں سے تو اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی طرف سے تسلی کرنا ہوگی۔ آج اس کی ڈیوٹی کس طرف ہے؟''

''میرے حساب سے تو وہ سیڑھیوں والے دروازے پر ہوگا۔ اردن، پٹیل اور گاڑی بان بھولا ناتھ وغیرہ بھی وہیں پر ہیں۔''

عمران اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک چکر ادھر کا لگا آؤں۔ خاص طور سے اس کیدو کو دیکھ لوں۔'' کیدو سے اس کی مراد ارجن تھی۔

''پانچ دس منٹ اور ٹھہر جاؤ۔'' اقبال نے رائے دی۔

ان باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ گروسو بھاش نے اپنا کام کر دیا ہے۔ بھنگ اور دھتورا ملی ہوئی تاڑی پہرے داروں کو پلائی جا چکی ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران اور اقبال پوری طرح تیار ہیں۔ عمران کے قریب ہی ایک سیون ایم ایم رائفل رکھی تھی۔ عمران کی جیکٹ کی جیبیں پھولی ہوئی تھیں۔ یقیناً ان میں بھی رائفل کے فالتو راؤنڈز اور میگزین موجود تھے۔ اقبال کی جیکٹ بھی اسی طرح بھاری بھرکم نظر آرہی تھی۔ اس کے پاس بھی رائفل تھی۔ انہوں نے اپنے اپنے ہتھیار چیک کیے اور مجھے مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہمیں کیا اور کس طرح کرنا ہے۔

گرو کی پُرزور درخواست اور گارنٹی پر پہلوان نما ملازمہ کو کل رات ہی رہا کر دیا گیا تھا۔ بھاگ متی نے ہی آج کسی طرح سلطانہ سے ملاقات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ تیار رہے، آج رات اسے اور اس کے بھتیجے کو یہاں سے نکال لیا جائے گا۔

جو کارروائی یہاں ہونے والی تھی، اس کے بارے میں ضروری ہدایات بھی بھاگ متی نے ہی سلطانہ تک پہنچائی تھیں۔ سلطانہ بڑے گرو کی ذاتی تحویل میں تھی اور اسے ایک ایسی کال کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا جس میں لوہے کا بس ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔

اس سے پہلے کہ عمران گھر سے باہر نکلتا، کچھ فاصلے سے چلانے کی آوازیں آئیں۔ کوئی شخص آرہ و بکا کرتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں فوراً چھپا دیں۔ اقبال نے مردانے میں جا کر باہر جھانکا اور پھر پریشان آواز میں بولا۔ ''یہ تو وہی لنگڑا ارجن ہے۔''

''اوہ گاڈ۔'' عمران نے بے ساختہ کہا۔

چند سیکنڈ بعد دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ارجن کی پھٹی پھٹی آواز سنائی دی۔ ''گرو جی... دروازہ کھولیں... گرو جی۔''

گرو کے چہرے پر کچھ مزید ہوائیاں اڑنے لگیں۔ عمران نے گرو کو اشارہ کیا کہ وہ خود دروازہ کھولے۔

گرو نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ ارجن لڑکھڑاتا اور ڈگمگاتا ہوا اندر آگیا۔ گرو نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سنبھالا۔ وہ بدمست آواز میں بولا۔ ''گرو جی! غضب ہو گیا ہے۔ کسی نے تاڑی میں کچھ ملا دیا ہے۔ سب بے ہوش ہو گئے ہیں۔ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے... کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔'' ارجن خود بھی جھوم رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی بھی وقت زمین بوس ہو جائے گا۔

عمران کے اشارے پر گرو اسے جلدی سے زنان خانے میں لے آیا۔ ارجن پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھدی آواز میں بولا۔ ''جلدی سے کچھ کریں گرو جی! مجھے تو لگتا ہے کہ شاید حکم جی کے لوگ یہاں گھس آئے ہیں۔''

گرو نے تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپکا۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ارجن ایک ایسے شخص کے پاس فریاد لے کر پہنچا تھا جو خود ساری صورت حال کا ذمے دار تھا۔ عمران کے اشارے پر گروسو بھاش، ارجن کو اس چھوٹے کمرے میں لے گیا جہاں دو دن پہلے تک فربہ اندام داسی بھاگ متی بند تھی۔ عمران نے ارجن کو زور سے دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ وہ اس اچانک افتاد پر دہشت زدہ نظر آنے لگا۔ اس کے حواس جواب دیتے جا رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بس ایک آدھ منٹ میں وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح اناغفیل ہو جائے گا۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا کر عمران نے چادر کی بکل ماری اور رائفل اٹھالی۔ یہ چھوٹے بیرل والی اسمارٹ سی رائفل تھی۔ باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ عمران مسلح ہے، کچھ یہی حال اقبال کا بھی تھا۔ عمران نے مجھے ایک مفلر نما گرم کپڑا دیا اور کہا کہ میں اس سے اپنا چہرہ ڈھانپ لوں۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم بعد میں اپنی بیوی سے منہ دکھائی وصول کر سکو گے۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کی مرضی تھی کہ سلطانہ مجھے گرو اور رادھا وغیرہ کے سامنے نہ پہچانے۔

''چلو گرو جی۔'' عمران نے تحکم سے کہا۔ ''اور تم بھی شریمتی جی۔'' عمران نے رادھا کی طرف اشارہ کیا۔

رادھا کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بوٹے سے قد کی متناسب جسم والی لڑکی تھی لیکن کمر میں بندھی ہوئی بیلٹ کی وجہ سے اس کا پیٹ بھاری نظر آرہا تھا۔ بادی النظر میں وہ حاملہ لگتی تھی۔ گرو پہلے سے کھڑا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عمران سے سوال کیا۔ ''سلطانہ تمہارے حوالے ہو جاوے گی تو پھر تم رادھا کی کمر سے پیٹی اتار لو گے اور ہمیں واپس آنے دو گے؟''

''میرے خیال میں یہ بات میں تم سے دس پندرہ دفعہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں... اور شاید اتنی ہی دفعہ راج (اقبال) نے بھی کہی ہے۔ اب صرف اسٹامپ پیپر پر انگوٹھا لگانے کی کسر رہ گئی ہے۔''

گروسو بھاش ایک دم نجل نظر آنے لگا۔ ہم آگے پیچھے گرو کی رہائش گاہ سے نکلے۔ گرو کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گڑوی تھی اور لکڑی کے موٹے دانوں کی مالا بھی۔ ایسی ہی مالا رادھا کے ہاتھ میں بھی تھی۔ اس کے صراحی دار گلے میں رات کی رانی کے پھولوں کا ہار بھی تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ وہ دونوں کسی خاص پوجا کے لیے بڑے ہال کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔ آبشار کے پاس سے گزر کر ہم استھان کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ایک طویل راہداری سے گزر کر ہم بڑے گرو کی قیام گاہ کی طرف آگئے۔ یہاں دیواروں پر مذہبی انتہا پسندی سے متعلق نعرے درج تھے اور دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ایک پتھریلی دیوار کے قریب کم از کم پانچ افراد بے سدھ پڑے تھے۔ ان کی رائفلیں بھی ان کے پاس ہی تھیں۔ چار افراد ایک جگہ تھے، پانچواں کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے منہ سے خون رس رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے وہ گرا ہے جس کی وجہ سے اسے چوٹ لگی ہے لیکن بعدازاں یہ قیافہ غلط ثابت ہوا۔ منہ سے خون رسنے کی وجہ کچھ اور تھی۔

گروسو بھاش نے اس زخمی پہرے دار کی جیبیں ٹٹولیں اور پیتل کی دو لمبی چابیاں نکال لیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ نظر آرہا تھا۔ یہ موٹی دیواروں والی وہی کال کوٹھڑی تھی جہاں سلطانہ کو رکھا گیا تھا۔ گرو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے کے آہنی قفل میں چابی گھمائی۔ وزنی دروازہ مدھم آواز کے ساتھ کھل گیا! اندر لالٹین کی زرد روشنی میں مجھے سلطانہ اور پندرہ سولہ سالہ طلال نظر آئے۔ وہ دونوں دروازہ کھلنے کے انتظار میں ہی تھے۔ دونوں خستہ حال اور مدقوق دکھائی دیتے تھے۔ سلطانہ کی طرح طلال کے چہرے پر بھی چوٹوں کے نئے پرانے نشان تھے۔ یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ سلطانہ کو کسی جانور کی طرح ایک زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ یہ زنگ آلود زنجیر اس کے دونوں پاؤں کو جکڑے ہوئے تھی۔ طلال زنجیر کے بغیر تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سلطانہ ان لوگوں کے نزدیک زیادہ خطرناک قیدی ہے یا پھر ہو سکتا تھا کہ اس نے قید کی حالت میں بھی مزاحمت جاری رکھی ہو۔ دوسری چابی سے گرو نے سلطانہ کی زنجیر کا قفل کھولا اور اس کے زخمی پاؤں آزاد کیے۔ سلطانہ نے مجھے دیکھا لیکن دیکھ کر بھی نہ دیکھ سکی۔ اس نے اپنے گرد ایک پھول دار گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ طلال ایک بوسیدہ سے کوٹ میں تھا۔

ہم ان دونوں کو لے کر واپس ہوئے۔ یہی وقت تھا جب ساتھ والے حجرہ نما کمرے کا دروازہ کھلا اور بالکل سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والا ایک نہایت بوڑھا شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ لاٹھی کے سہارے بہ مشکل کھڑا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے باہر کا سارا منظر دیکھا۔ اس کا رعشہ زدہ سر کانپتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے پوپلے منہ کے ساتھ گروسو بھاش سے کچھ کہا۔

گروسو بھاش نے آگے جا کر اپنا منہ بوڑھے گرو کے کان کے ساتھ لگایا اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''مہاراج... اپنے بستر پر واپس جاؤ، سب ٹھیک ہے۔''

جواب میں بوڑھے گرو نے کچھ کہنا چاہا لیکن گروسو بھاش نے اسے تقریباً دھکیل کر واپس کمرے میں پہنچا دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

گروسو بھاش کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑا گرو اب بس نام کا ہی گرو رہ گیا ہے، ورنہ اب یہاں اس کی کوئی سنتا نہیں ہے۔

ہم سلطانہ اور طلال کو لے کر واپس چل دیے مگر یہی وقت تھا جب ہم پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ارجن کسی طرح اس کمرے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب رہا ہے جہاں ہم اسے بند کر آئے تھے۔ وہ آفت کا پرکالا گرو کے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آبشار کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سینے کی پوری قوت سے چلا رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔ ہم سے اس کا فاصلہ بس چالیس پچاس قدم ہی ہوگا۔ دو افراد بھاگتے ہوئے اس کی طرف آئے اور اسے سنبھالا۔ ان

میں سے ایک طلال کی عمر کا ایک بالکل نوجوان لڑکا تھا۔ وہ بھی اس استھان میں رضا کارانہ خدمت انجام دیتا تھا۔ میں نے اسے مختلف کمروں میں پھول سجاتے اور کھانا لاتے دیکھا تھا۔ دوسرا پکی عمر کا شخص تھا۔ ارجن نے ان دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا اور چنگھاڑ کر بولا۔ ''گروجی ان لوگن کے ساتھ مل گئے ہیں۔ انہوں نے پہرے والوں کو زہریلی تاڑی پلا دی ہے... کچھ کرو، جلدی کچھ کرو...''

میں نے دیکھا کہ عمران کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ ''کتے کا بچہ۔'' وہ پھنکارا۔ اس کی یہ گالی یقیناً ارجن کے لیے تھی۔ اس نے اپنی چادر اتار پھینکی۔ چھوٹی نال والی رائفل سیدھی کی۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ قریباً 40 میٹر کی دوری پر گولی ارجن کے پیٹ میں کہیں لگی مگر اس گولی نے اتنا ہی نقصان کیا جتنا سر پر لگنے والی گولی کرتی۔ ارجن پہلے ہی لڑکھڑا رہا تھا، گولی کھا کر سیدھا تالاب کی گہرائی میں گیا۔ میں نے دیکھا، اس کا سر پانی میں اوندھے پڑے پتھر یلے مجسمے کے دیوہیکل کندھے سے ٹکرایا اور یقیناً کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

عمران کا دوسرا نشانہ ارجن کے قریب کھڑا دراز قد پہرے دار تھا۔ یہ گولی سر میں لگی اور بھیجا پھاڑ کر نکل گئی۔ نوعمر رضا کار لڑکا اندھا دھند بڑے ہال کی طرف بھاگا۔ عمران نے اس کی طرف رائفل سیدھی کی۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آیا کہ عمران اسے نشانہ نہ بنائے مگر میری سوچ کے مکمل ہونے تک وہ نشانہ بن چکا تھا۔ اسے پشت پر دو گولیاں لگیں اور وہ بھاگتے بھاگتے دو تین قلابازیاں کھا گیا۔

یہ سب کچھ بس دو یا تین سیکنڈ کے اندر ہوا۔ استھان میں ایک دم کہرام سا مچ گیا۔ لوگ ہڑبڑا کر اٹھے اور دھماکوں کے ماخذ کی طرف بڑھے۔ کچھ رائفلیں بھی لہراتی ہوئی نظر آئیں۔ ہم سلطانہ، طلال اور گرو وغیرہ سمیت الٹے قدموں سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ سیڑھیاں ہمیں بالائی منزل کی اس راہداری کی طرف لے جاسکتی تھیں جو نکاسی کے راستے کی طرف جاتی تھی۔

یکایک ایک کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''رک جاؤ... یہیں رک جاؤ۔ میں گولی چلا دوں گا۔''

میں نے دیکھا، ایک دیوار کی اوٹ میں نیم سرخ آنکھوں والا ستیش موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید رائفل تھی۔

ستیش کی اس للکار نے اردگرد موجود ہر شخص کو چوکس کر دیا۔ کئی رائفلیں نظر آئیں اور رائفل بردار ہماری سمت بڑھے۔ اب فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عمران کی طرح اقبال نے بھی چادر اتار پھینکی اور رائفل سیدھی کر لی۔ میں پہلے ہی کولٹ پسٹل جیب سے برآمد کر چکا تھا۔

عمران کے اشارے پر میں نے پسٹل کی نال گروسو بھاش کی کنپٹی سے لگا دی۔ عمران اور اقبال نے اپنی رائفلیں مخالفین پر تان رکھی تھیں اور اپنی انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لی تھیں۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دونوں طرف سے کوئی ایک گولی بھی چل جاتی تو پھر خون ریزی کو روکنا ممکن نہیں تھا۔

عمران نے ستیش کا نشانہ لے رکھا تھا اور ستیش نے شاید عمران کا۔ عمران کی جانی پہچانی گرج میرے کانوں تک پہنچی۔ ''ستیش! ہمیں روکنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے گرو کی لاش گرے گی... پھر اس کی پتنی پندرہ بیس ٹکڑوں میں تبدیل ہوگی۔ ہم نے اس کی کمر سے ٹی این ٹی باندھ رکھا ہے۔ بس... یہ ایک بٹن دبانے کی ضرورت ہے۔'' عمران نے گرین رنگ کا ریموٹ کنٹرول ہوا میں لہرایا۔

عمران کی طراری اب سمجھ میں آرہی تھی۔ اس کی سوچ ہمیشہ سے بڑی تیز رفتار رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اس نے ارجن سمیت تین افراد کو گولی سے اڑایا تھا تو اس عمل میں تھوڑی سی سفاکی نظر آئی تھی، خاص طور سے نوعمر لڑکے کے قتل میں... لیکن اس کا یہ اقدام بلاوجہ نہیں تھا۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی بچتا تو گروسو بھاش کی وہ حیثیت نہ رہتی جو اب تھی۔ اب وہ استھان کا غدار نہیں تھا۔ زہریلی تاڑی سے اس کا تعلق صیغۂ راز میں تھا۔ اب اس کی جان کی پروا کی جا سکتی تھی... اور ستیش اور اس کے رائفل برداروں کی باڈی لینگویج بتا رہی تھی کہ وہ پروا کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

عمران نے اشارہ کیا۔ ہم سب الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔ جوں جوں ہم پیچھے ہٹتے گئے، ستیش اور اس کے ساتھی آگے بڑھتے گئے۔ ان میں گاڑی بان بھولا ناتھ بھی تھا۔ اس کی اونچی ناک کے دونوں طرف اس کی عقابی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے ہٹنے والے ہر قدم کے بدلے ستیش اور اس کے ساتھی ایک قدم آگے بڑھا رہے تھے لیکن گولی چلانے کی ہمت ابھی تک کسی کو نہیں ہوئی تھی۔

ہم سیڑھیوں پر پہنچے تو ستیش نے ایک بار پھر خونی لہجے میں دھمکی دی۔ ''ہم تم لوگن کو اس طرح یہاں سے نکلنے نا ہیں دیں گے۔ ہمیں گولی چلانا پڑے گی۔''

گروسو بھاش گڑگڑایا۔ ''ستیش! انہوں نے رادھا کی کمر سے بارود کی پٹی باندھ رکھی ہے، یہ بٹن دبا دیں گے۔'' گرو کی آواز میں دل دوز فریاد چھپی تھی۔ وہ ستیش سے اپنی اور اپنی پتنی کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ دوسری طرف ستیش اور نیپال وغیرہ کو شرمناک شکست نظر آرہی تھی۔ وہ اپنی جس مجرمہ کو جان ہتھیلی پر رکھ کر حکم جی کے ہرکاروں سے چھین کر لائے تھے، وہ ان کے ہاتھوں سے بھی چھن رہی تھی۔ اپنی قرار واقعی سزا کے قریب پہنچ کر وہ صاف بچ رہی تھی۔

ستیش نے پھر کہا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اتنا بڑا پاپ نہ کرو۔ یہ تم کو ہضم نا ہیں ہووے گا اور نہ ہم ہونے دیں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، چلاؤ گولی اور دیکھ لو تماشا۔'' اقبال نے بے پناہ اعتماد سے کہا۔ عمران اور اقبال کا یہی اعتماد تھا جو حریفوں کو لرزہ براندام کر دیتا تھا۔

ہم قدم قدم پیچھے ہٹتے گئے... ستیش اور اس کے ساتھی قدم قدم آگے بڑھتے گئے۔ اب ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئے تھے اور اس طویل راہداری میں تھے جس کی دونوں جانب ہوا کی آمدورفت کے لیے روزن سے بنے ہوئے تھے۔ سب سے آگے عمران اور اقبال تھے۔ دونوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ ان کے عقب میں گرو، رادھا اور میں تھے۔ میں نے پسٹل کی نال گرو کے گنجے سر سے لگائی ہوئی تھی۔ آخر میں سلطانہ اور طلال تھے۔ درحقیقت اس استھان کے اصل رکھوالے تو وہی بیس بائیس پہرے دار ہی تھے جو تاڑی کی وجہ سے مدہوش پڑے تھے۔ یہ جو دوسرے لوگ تھے، ان میں ستیش اور اس کے ایک دو ساتھیوں کے علاوہ کسی میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ پورے جی جان سے ہمارے مقابل آسکتا۔

یکایک ستیش کے چہرے پر شدید اضطراب کے آثار نظر آئے، شاید اس نے کچھ بھانپ لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کر پاتا، عمران اور اقبال جیسے کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق تیزی سے دائیں بائیں ہٹے اور انہوں نے راہداری کا ایک آہنی دروازہ بڑی پھرتی سے بند کر دیا۔ تڑتڑ کی خوفناک آواز سے تین چار گولیاں چلیں لیکن انہوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ایک گولی اقبال کے سر کے اوپر سے گزر گئی، دو دروازے کے آہنی تختوں سے ٹکرائیں۔ عمران اور اقبال نے تیزی سے دروازے کا آہنی کھٹکا چڑھا دیا۔

''بھاگو۔'' عمران نے پکار کر کہا۔

ہم سب پلٹ کر دوڑے۔ دوسری طرف دروازے کو اندھا دھند دھکے دیے جارہے تھے لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی ٹینک کو پستول کی گولی سے توڑنے کی کوشش کی جاتی۔ یہ بہت وزنی دروازہ تھا۔ گروسو بھاش کو ہمارے ساتھ بھاگنا پڑ رہا تھا لیکن یہ کام اس کے لیے جتنا مشکل تھا، اتنا ہی مضحکہ خیز بھی تھا۔ اس کی توند بری طرح ہل رہی تھی اور لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اپنی توند کے بوجھ کی وجہ سے اوندھے منہ گر جائے گا۔ ہم نے ڈیڑھ دو سو میٹر کا فاصلہ تیزی سے طے کیا اور جھاڑ جھنکاڑ سے بند راستے کو کھول کر کھلی جگہ پر آگئے۔ یہاں دو گھوڑا گاڑیاں موجود تھیں۔ گاڑی بان اندر ہی کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔

عمران نے ایک گاڑی میں گھس کر گاڑی بان کو رائفل کے ٹہوکے سے جگایا۔ وہ سکھ تھا۔ وہ ششدر نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے گروسو بھاش کو پہچان لیا۔

عمران نے کہا۔ ''سردار! گروجی کے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ ان کو محفوظ جگہ پر پہنچانا ہے۔ گاڑی ہانکو اور جتنی رفتار سے چل سکتے ہو چل پڑو۔''

سکھ گاڑی بان نے کہا۔ ''گروجی کے لیے تو جان بھی حاضر ہے جی... پر وہ ہے کون جو گروجی کا دشمن ہو رہا ہے...؟''

''اس کا تو ابھی ٹھیک سے ہم کو بھی پتا نہیں۔'' اقبال نے کہا۔

اس دوران میں عمران نے دوسری گھوڑا گاڑی کے دونوں گھوڑے کھول دیے اور انہیں چھڑیاں مار کر بھگا دیا۔ اب کوئی اس دوسری گاڑی پر ہمارا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔ ہم سب سلطانہ اور طلال سمیت گاڑی پر سوار ہو گئے۔ گرو ابھی تک تذبذب میں کھڑا تھا۔ عمران نے تحکم سے کہا تو وہ اور اس کی پتنی بھی سوار ہو گئے۔ عمران کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ ابھی میاں بیوی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ گرو اور رادھا کے سوار ہوتے ہی گاڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔ ہم کچھ دیر تک ایک ڈھلوان راستے پر اترتے رہے۔ خوشبو کی زبردست لپٹیں ہمارے نتھنوں تک پہنچیں۔ میں نے نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ہم واقعی ایک بہت بڑی پھلواری سے گزر رہے تھے۔ تاروں کی روشنی میں دور تک پھول دار پودوں کے سلسلے نظر آتے تھے۔ دن کے وقت یہ منظر واقعی قابلِ دید ہوگا۔ ہم استھان سے دور آگئے تھے مگر ابھی تک خطرے سے دور نہیں تھے۔ عمران اور اقبال پوری طرح چوکس تھے۔ ان کی نگاہیں عقب میں دور تک دیکھ رہی تھیں۔ میری نگاہوں میں بار بار وہ منظر گھوم رہا تھا جب تاڑی کے کڑک نشے میں ڈگمگاتا ہوا ارجن پیٹ میں گولی کھا

کرتالاب نما پانی میں گرا تھا اور اس کا سر بُت کے شانے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوا تھا۔ شکیلہ کا کم از کم ایک قاتل تو میری نگاہوں کے سامنے اپنے انجام کو پہنچا تھا۔

☆☆☆

جب دن کا اجالا پھیلا، ہم اس قدیم استھان کی مہلک تاریکی سے قریباً تیس میل دور آچکے تھے۔ یہ کٹا پھٹا جنگلی علاقہ تھا۔ کہیں کہیں راستہ مسدود ہو جاتا اور ہمیں چکر کاٹ کر آگے بڑھنا پڑتا۔ راستے میں دو تین جگہ گھوڑوں کو آرام بھی دینا پڑا۔ اب ہم جنتر کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ایک نشیبی علاقے میں تھے اور خود کو کافی محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ گھوڑے بُری طرح تھک گئے تھے۔ ہمارے انجر پنجر بھی ہل گئے تھے۔ عمران نے گاڑی ایک ایسی ہموار جگہ پر روکی جہاں درخت جھنڈ کی صورت میں موجود تھے اور پانی بھی تھا۔

گھوڑے پانی پر لپک پڑے۔ ہم بھی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے نیچے اتر آئے۔ عمران کے چہرے سے خشونت رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک بار پھر شگفتگی کا ڈیرا تھا۔ ہم نے راستے میں بہت کم بات کی تھی اور میں تو تقریباً خاموش ہی رہا تھا۔ وہ مفلر نما گرم کپڑا ابھی میں نے چہرے سے لپیٹ رکھا تھا جو عمران نے استھان میں مجھے دیا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ نیم تاریکی میں ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی تو پھر بھی قدرے گرم تھی، باہر سردی کی یلغار تھی۔ دوسروں کے برعکس میں صرف ایک ہلکی پھلکی قمیص میں تھا۔ سردی گرمی کو برداشت کرنا مجھے اچھا لگتا تھا اور اب میرا جسم اس کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ میری جیکٹ گاڑی میں موجود تھی لیکن میں اسے پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

عمران نے گرو کو گاڑی سے باہر بلایا اور کہا۔ ”جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس شکیلہ نام کی لڑکی کی موت کے بدلے تم دونوں کو یہاں کسی کیچڑ والے گڑھے میں زندہ دفن کر دیا جائے تاکہ تم قیامت تک سردی سے ٹھٹھرتے رہو۔ اس بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟“

گرو نے پرنام کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”میں تمہیں بتا چکا ہوں امیت... میں استھان کا کارمختار نہیں ہوں۔ مجھ سے صرف رائے لی جاتی ہے جو میں پوتھیوں (کتابوں) کے مطابق دے دیتا ہوں۔ میں کسی کو بچا سکتا ہوں نہ مار سکتا ہوں۔“

”تو پھر تمہاری کیا مرضی ہے؟ کیا تم استھان واپس جانا چاہتے ہو؟“ اقبال نے پوچھا۔

گرو کا جواب غیر متوقع تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب میرے لیے وہاں بھی بہت خطرہ ہو جائے گا۔ مجھے اب وشواس نہیں کہ تاڑی میں دھتورا ملانے والی بات زیادہ دیر چھپی رہ سکے گی۔ لوگن یہی کہیں گے کہ میں نے اپنی اور پتنی کی جان بچانے کے لیے اپنے ہی ساتھیوں کی جان لی ہے۔“

”تم نے کس کی جان لی ہے؟ تمہارا دوش تو صرف اتنا ہے کہ تم نے پہرے داروں کو دھتورے والی تاڑی پلائی ہے۔“

”میرے وچار میں بات اس سے بڑھ کر ہے۔ تاڑی نے پہرے داروں کو صرف بے ہوش نہیں کیا۔“

”کیا مطلب؟“

”ان میں سے کئی مر گئے ہیں۔“ گرو نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ”میں نے جب پہرے دار کی جیب سے چابیاں نکالی تھیں، اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا... اس کی سانس بند ہو چکی تھی۔ ایک دوسرے پہرے دار کو بھی میں نے اسی حالت میں دیکھا ہے۔“

ہم سناٹے میں رہ گئے۔ پتھریلی دیوار کے پاس پہرے دار جس طرح گرے پڑے تھے، وہ منظر واقعی تشویشناک تھا... مگر ان میں سے کچھ یکسر ختم ہو چکے تھے، یہ بات اب گرو سے پتا چل رہی تھی... گرو کراہتے ہوئے بولا۔ ”اس کے علاوہ جو تین لوگن تمہاری گولیوں سے مرے ہیں، ان کی موت کا کارن بھی تو میں ہی ٹھہرتا ہوں... مجھے نہیں لگتا کہ اب میں اور رادھا واپس استھان جا سکتے ہیں۔“

”تو پھر کیا چاہتے ہو؟“ عمران نے پوچھا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مم... میں برباد ہو کر رہ گیا ہوں۔“ گرو بے دم سا ہو کر ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گیا۔ عمران کی فطری شوخی عود کر آئی۔ وہ گرو سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اتنی ٹھنڈی ٹھار زمین پر بیٹھتا رہو گے تو تمہاری تشریف سن ہو جائے گی۔ دماغ تو تمہارا پہلے ہی سن ہو چکا ہے، اوپر نیچے سے مفلوج ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے۔ تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے۔ تمہارے جیسے برباد حال اور بے ٹھکانا لوگوں کے لیے ایک بڑی اچھی جگہ ہے میرے پاس۔ نیوز چینل ”فساد پلس“ میں وہاں تمہیں ملازمت دلا سکتا ہوں۔ دماغ تو تمہارا آل ریڈی سن ہے، تم بڑی آسانی سے اینکر پرسن بن سکو گے۔ اینکر پرسن سمجھتے ہو نا تم؟ وہی شخص جو تین چار افراد کو سامنے بٹھا کر سوال پوچھتا ہے اور کسی کو جواب نہیں دینے دیتا۔ اور جب کوئی جواب دینے لگتا ہے تو بریک لے لیتا ہے۔“

”اور اس کی بیوی کا کیا بنے گا؟“ اقبال نے پوچھا۔

”گرو صاحب کی توند دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ بڑے اچھے کھانے پکا لیتی ہوگی۔ اس لیے اسے آسانی سے کسی کھیلوں کے پروگرام کی میزبان بنایا جا سکتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کھیلوں کی میزبان؟“ اقبال نے حیرت ظاہر کی۔ ”اگر وہ اچھے کھانے پکاتی ہے تو پھر اسے کسی کوکنگ پروگرام کی میزبان ہونا چاہیے۔“

”اوئے باندر! کوکنگ پروگرام کی میزبان تو بنے گی کوئی کھلاڑی۔ ان ٹی وی چینلز میں کوئی کام ڈھنگ سے ہو جائے تو پھر یہ انتظامیہ کی بہت بڑی نالائقی سمجھی جاتی ہے۔ منتظم افراد کو دقیانوس اور نامعقول گردانا جاتا ہے۔ وہ شرم سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ گرو جی! آپ فرمائیں کیا پروگرام ہے؟“

گرو نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ جو کچھ ہم دونوں کے ساتھ ہونے والا ہے... اس سے تو بہتر ہے کہ تم ہمیں گولی ہی مار دو۔“

عمران نے سوالیہ نظروں سے اقبال کی طرف دیکھا۔ وہ جھٹ بولا۔ ”نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ وہ جلدی سے گھوڑا گاڑی میں گیا اور رادھا کو لے کر باہر نکل آیا۔ وہ ساڑی میں تھی۔ اوپر سے اس نے ایک گرم شال لے رکھی تھی۔ وہ سکڑی سمٹی ہوئی باہر آگئی۔ استھان میں چلنے والی گولیوں اور ان سے ہلاک ہونے والے تین افراد کی موت کا منظر جیسے اب تک اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ عمران کے کندھے سے لگی ہوئی رائفل کو بے حد ہراساں نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”یہ کیا کرنے لگے ہو اقبال؟“ عمران نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

”گرو جی کو قتل کرنے لگا ہوں۔“

”لیکن یہ تو گرو کی پتنی ہے؟“ عمران نے کہا۔

”اسی میں تو گرو کی جان ہے یار! اسے ماروں گا تو گرو خود بخود عالم بالا کی سیر کو نکل جائے گا۔“

عمران نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ گرو اور رادھا دونوں کے رنگ ہلدی کی طرح نظر آنے لگے۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے۔ عمران نے رادھا کو کچھ فاصلے پر اس طرح بٹھا دیا کہ اس کی ٹیک ایک درخت کے ساتھ لگ گئی۔ اقبال نے سبز ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے لیا۔ رادھا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ وہ جوان تھی، خوب صورت تھی۔ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک بڈھے، بے ڈھنگے شوہر کی وجہ سے اسے بھی موت کا مزہ چکھنا پڑ رہا تھا۔ اس نے گھگیائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ غالباً بھگوان کا واسطہ دیا کہ اس کی جان بخش دی جائے... عمران اور اقبال نے بالکل کان نہیں دھرے۔

عمران نے کہا۔ ”میرے خیال میں سلطانہ کو بھی یہ منظر دکھانا چاہیے۔ وہ کہاں ہے؟“

اقبال نے آگے جا کر گاڑی میں جھانکا اور بتایا کہ وہ سو رہی ہے۔

وہ راستے میں بھی اونگھتی رہی تھی اور اب گاڑی کے اندر ہی سوئی ہوئی تھی۔ اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ واقعی سوئی ہوئی ہے یا اردگرد سے ناتا توڑنے کے لیے ایسا ظاہر کر رہی ہے۔ راستے میں طلائی نے عمران کو چپکے سے بتایا تھا کہ اس کی خالہ کو وہاں استھان میں کوئی ایسی شے کھلائی جاتی رہی ہے جس سے وہ زیادہ تر اونگھتی رہی ہیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے کال کوٹھڑی میں بھی اپنی مزاحمت جاری رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں زنجیر پہنائی گئی اور اسے کوئی نشہ آور دوا بھی دی جاتی رہی...

سکھ گاڑی بان نے عمران کی ہدایت پر خشک لکڑیاں جمع کر کے الاؤ بھڑکا دیا تھا اور اب عمران بڑے سکون سے اس الاؤ کے پاس آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور جیکٹ کی جیب سے چنے نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس شخص نے ابھی چند گھنٹے پہلے تین افراد کو جان سے مارا ہے۔ وہ گرو کو سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یار اقبال! مجھے نہیں لگتا کہ یہ اپنی پتنی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد یہ خود بخود مر جائے گا۔“

”نہیں مرے گا تو کیا ہوگا۔ ایک گولی ہی اور ضائع کرنا پڑے گی۔“

عمران نے پہلی بار اقبال کو اس کے اصل نام سے مخاطب کیا تھا۔ یہ نام سن کر گرو سوبھاش کو پتا چل گیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس کے مردہ چہرے پر ذرا سی زندگی جھلکی۔ وہ آخری کوشش کے طور پر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں ایک بار پھر کہتا ہوں، میں بالکل نردوش ہوں۔ وہاں استھان میں مجھ سے صرف رائے لی جاتی تھی جو میں پوتھیوں میں سے پڑھ کر دے دیتا تھا۔ میں اور کچھ نہیں کرتا تھا۔“

”تم سب کچھ کرتے تھے اور کر سکتے تھے۔“ عمران نے ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔ ”جب تم میاں بیوی کو اپنی جان کا خطرہ پڑا تو تم نے دھرم کو موم کی ناک بنا لیا۔ جو شبھ گھڑی تم

نے پانچ منٹ میں ڈھونڈ لیتی تھی، وہ تمہیں دو گھنٹے بعد بھی نہیں ملی۔ پھر تم نے پوتھیوں کے اندر سے ہی یہ مسئلہ بھی ڈھونڈ لیا کہ اگر استھان میں خون ریزی کا خطرہ ہو تو... جناب عالی... تاڑی میں دھتورے والی بھنگ ملائی جا سکتی ہے۔ اور یہ تو بس ایک دو چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں، ایسی پتا نہیں کتنی قلابازیاں تم اپنی مرضی سے لگاتے رہتے ہو اور اسے مقدس پوتھیوں کے سر تھوپتے رہتے ہو۔''

گرو لاجواب ہو گیا مگر اس نے اپنی داد فریاد جاری رکھی۔ وہ پھر گھگھیایا۔ ''دیکھو پرنتو! تم لوگن اس وقت غصے میں ہو اور غصہ بدھی کو کھا جاتا ہے۔ میں سچ کہوت ہوں، میرا اِدھکار وہاں زیادہ نا ہیں تھا۔ تم شبھ گھڑی کی بات کر رہے ہو، اگر میں وہاں دوسری بار بھی شبھ گھڑی نہ نکالتا تو پھر مجھے کیول ایک موقع اور دیا جاتا۔ اس میں بھی شبھ گھڑی نہ نکلتی تو ستیش وغیرہ بڑے گرو کی طرف سے خود ہی شبھ گھڑی نکال لیتے اور لڑکی کو جلا دیتے۔ میں سچ کہوت ہوں۔'' گرو کی آواز زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اس نے اشک بار آنکھوں سے اپنی جوان پتنی کی طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، جوانی اور خوب صورتی میں طاقت ہوتی ہے۔ تم بھی جان بچانے کے لیے کچھ کہو، شاید ان لوگوں کے دل پسیج جائیں۔

لڑکی سسک کر بولی۔ ''تم لوگن مسلمان ہو اور میں نے سنا تھا کہ مسلمان اپنے قیدی سے اچھا برتاؤ کرت ہیں۔ بے شک ہم دونوں تمہارے اپرادھی ہیں مگر اپنے کرموں پر تم سے شرمندہ ہیں۔ ہاتھ جوڑ کر تم سے جیون کی بھیک مانگت ہیں۔'' وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''قیدی تو وہ بدنصیب شکیلہ بھی تھی۔ وہ بھی رو رو کر زندگی کی بھیک مانگتی رہی ہوگی۔''

گرو بلک کر بولا۔ ''میں بڑی سے بڑی سوگند کھانے کو تیار ہوں۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے ستیش، پٹیل اور ارجن وغیرہ کرتے ہیں۔ خاص طور سے ستیش کی بات چلتی ہے اور ستیش وہی کچھ کرت ہے جو اس کی ماتا کہوت ہے۔ وہ بڑھیا بڑی کٹھور عورت ہے۔''

عمران بولا۔ ''تم موت کو سامنے دیکھ کر خود کو اس کٹھور پن سے علیحدہ کر رہے ہو... ورنہ تم بھی اس بے رحمی کا اٹوٹ انگ ہو۔ تمہاری منت سماجت پر تمہاری سزا تو معاف نہیں ہو سکتی۔ ہم بس اتنا کر سکتے ہیں کہ تمہیں زیادہ تکلیف نہ پہنچائیں اور جلدی سے تمہارے پرانوں کو تمہارے شریر (جسم) سے مکتی دلا دیں۔'' عمران نے ریموٹ کنٹرول اقبال کے ہاتھ سے لے لیا۔

گرو جیسے مرنے سے پہلے ہی مر گیا۔ وہ فریادی انداز میں زمین پر گر پڑا اور دُہائی دینے لگا۔ ''میرا جیون بخش دو۔ میں سوگند کھاوت ہوں، جیون بھر تمہارا داس بن کر رہوں گا۔ تمہاری غلامی کروں گا۔'' وہ جانتا تھا کہ اگر عمران کہہ رہا ہے تو مار بھی دے گا۔ وہ استھان میں عمران کے ہاتھوں تین افراد کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

عمران اور اقبال لطف لے رہے تھے۔ عمران نے گرو کو حکم دیا کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھے۔

وہ اپنی توند سے مٹی جھاڑتا ہوا بیٹھ گیا۔ استھان میں سانڈ کی طرح دندنانے والا گرو یہاں اس ویرانے میں کیچوے سے زیادہ حقیر نظر آ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''میں نیوز چینل فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ میں نے اپنی فیلڈ میں بڑے بڑے مطلبی لوگ دیکھے ہیں لیکن تم تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ ابھی تم نے فرمایا ہے کہ... میرا جیون بخش دو... یعنی اب تم نے اپنی داد فریاد میں سے اپنی پتنی کو بھی خارج کر دیا ہے۔ صرف خود کو بچانا چاہتے ہو۔ تمہارا یہ فقرہ سنہری حرفوں میں لکھا جانے کے قابل ہے... بھئی واہ۔''

''نا ہیں... نا ہیں... وہ تو بے دھیانی میں کہہ دیا... ہم دونوں تم سے جیون کی بھکشا مانگت ہیں۔'' گرو کراہا۔

رادھا ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اقبال نے آگ کے پاس بیٹھتے ہوئے، رائفل گود میں رکھی اور بولا۔ ''تم نے لوگوں کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ دھرم کو جدھر چاہا اپنی مرضی سے موڑ لیتے ہو۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تمہارا ٹھنڈے پانی میں بیٹھ کر جاپ کرنا ہے۔ بتاؤ، اس معاملے میں تم لوگوں کو دھوکا دے رہے ہو یا نہیں؟''

گرو نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ ہکلایا۔ ''میں تے... تو صرف...''

''بکواس نہیں چاہیے۔'' اقبال نے طیش میں اس کی بات کاٹی۔ ''ہاں یا نہ میں بتاؤ۔ تم دھوکا دے رہے ہو یا نہیں؟''

گرو کا سارا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس لرزش کی وجہ سے اس کی گرد آلود توند میں بھی ارتعاش تھا۔ اس نے اپنی ناک سے بہنے والا رقیق مادہ، اپنی چادر کے پلو سے صاف کیا اور پھر نہایت ندامت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیوں کرتے تھے ایسا؟'' اقبال نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ اقبال نے زیادہ کرخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو وہ کراہا۔ ''میری عمر زیادہ ہو گئی ہے میں اتنی شکتی نا ہیں اس لیے... ایسا کرنا پڑا...'' اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

''تمہاری عمر زیادہ ہو گئی ہے، شریر میں طاقت نہیں اس کے باوجود تم نے ایک نوعمر لڑکی کو پتنی بنایا ہوا ہے... اس کا مطلب ہے جب تم اور زیادہ بوڑھے ہو جاؤ گے تو تین چار پتنیوں کے بغیر تو تمہارا گزارہ ہی نہیں ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تمہیں زیادہ بوڑھا ہونے ہی نہ دیا جائے۔ کیا خیال ہے عمران؟''

''بالکل بجا ارشاد فرماتے ہو تم۔'' عمران نے تائید کی اور ریموٹ کنٹرول کو ''ایکٹی ویٹ'' کر دیا۔ ایک ننھا سا سرخ بلب جل اٹھا۔ گرو کی گھگھی بندھ گئی۔ رادھا کا رہا سہا لہو بھی نچڑ گیا۔ بالکل آخری کوشش کے طور پر گرو نے ایک بار پھر وہی انداز اختیار کیا اور ٹھنڈی جگہ پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ عمران کے پاؤں کو چھو رہے تھے۔ وہ زندگی کے لیے گڑگڑایا۔ ''ہمیں شما کر دو۔ میں تمہیں وچن دیوت ہوں، ہم دونوں جیون بھر تمہارے ادنیٰ سیوک بن کر رہیں گے۔ جو تم کہو گے وہ کریں گے۔ اپنی غلطیوں کا پرائشچت کریں گے۔ بس ہمیں ایک موقع دے دو...''

رادھا نے بھی اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا تھا اور گٹھری سی بن کر روتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ عمران ان دونوں کو چھوڑے گا یا نہیں لیکن کم از کم رادھا کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ عمران نے میری طرف دیکھا، پھر اقبال کی طرف۔ کچھ دیر تک لرزاں و ترساں میاں بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ تب گہری سانس لے کر بولا۔ ''تم دونوں کو کچھ شرطیں ماننا ہوں گی...''

وہ دونوں جیسے بلک پڑے۔ یقیناً انہیں ایسے ہی محسوس ہوا تھا جیسے تختۂ دار پر عین آخری وقت میں زندگی کی نوید مل گئی ہو۔ گرو سوبھاش گھگھیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہمیں ہر شرط منظور ہے۔ بغیر سنے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ ہم جیون بھر تمہاری غلامی کریں گے۔''

عمران نے ریموٹ کنٹرول کو ڈی ایکٹی ویٹ کر دیا۔ اس نے اقبال کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے رادھا کو کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ وہ معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس نے اسے کمر عریاں کرنے کو کہا۔ رادھا نے پہلے شال اتاری پھر ساڑی کا پلو گرا کر کمر عریاں کر دی۔ اب مختصر چولی سے ساڑی کی بیلٹ تک اس کا تراشا ہوا جسم دن کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اقبال نے عمران کو آنکھ ماری پھر بڑی احتیاط سے بیلٹ کے اسٹریپ کھولنے شروع کیے۔ وہ کافی کس کر باندھی گئی تھی۔ کھولنے میں وقت ہو رہی تھی۔ رادھا سی سی کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بالکل ساکت تھی۔ اس اندیشے سے شاید سانس بھی نہیں لے رہی تھی کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

یہ لمحے بڑے نازک محسوس ہو رہے تھے۔ گرو نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اقبال نے ذرا زور لگایا تو ایک اسٹریپ جھٹکے سے ٹوٹ گیا... رادھا بے ساختہ چلا اٹھی۔ ساتھ ساتھ وہ زیرِلب اشلوک بھی پڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال رادھا کی کمر سے بیلٹ علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ ایک سنسنی خیز صورت حال کا اچھا دی اینڈ تھا۔ الاؤ کی آگ اب کافی بھڑک اٹھی تھی اور ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو راحت پہنچا رہی تھی۔ دن کی روشنی میں قرب و جوار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ یہ علاقہ جنتر اور کیکر کے خودرو درختوں سے اٹا پڑا تھا۔ پتوں پر اوس چمک رہی تھی اور یہ اتنی زیادہ تھی کہ زمین بھی نم نظر آتی تھی۔ ہلکی دھند سردی کے احساس میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب عمران نے گھوم کر کچھ دیکھا اور پکارا۔ ''پکڑو۔''

اقبال گھوڑا گاڑی کے قریب تھا۔ وہ عمران کی آواز سن کر پلٹا اور دوڑا۔ تب مجھے پتا چلا کہ اقبال کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ بھاگنے والے سلطانہ اور طلال تھے۔ وہ نہ جانے کس وقت گاڑی سے نکلے تھے... وہ اندھا دھند گھنے درختوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ سکھ گاڑی بان ہوشیار سنگھ لکڑیاں اکٹھی کر کے مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو سلطانہ اور طلال کو روکنے کے لیے ان کے راستے میں آیا۔ یہ کوشش اسے مہنگی پڑی۔ سلطانہ نے بھاگتے بھاگتے پوری قوت سے ہاتھ گھمایا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ کلہاڑی ہوشیار سنگھ کی تھی اور اس نے گاڑی کی اگلی نشستوں کے نیچے چھپا رکھی تھی، سلطانہ نے وہاں سے نکال لی تھی۔ الٹی کلہاڑی کا وار ہوشیار سنگھ کی گردن پر لگا۔ وہ پیچھے کی طرف گرا اور خشک لکڑیاں اس کے ہاتھوں سے نکل کر چاروں طرف بکھر گئیں۔

میں اور عمران بھی ایک ساتھ الاؤ کے پاس سے اٹھے اور اقبال کے پیچھے لپکے... ''رک جاؤ... گولی مار دوں گا۔'' اقبال بھاگتے بھاگتے دہاڑا۔

وہ دونوں نہیں رکے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ بیس تیس قدم

آگے جا کر طلال بُری طرح پھسلا اور ایک آٹھ دس فٹ گہرے بارشی گڑھے میں جا گرا۔ اس گڑھے کی تہ میں دو تین فٹ تک کیچڑ کھڑا تھا۔ کچھ آگے جا کر اقبال نے سلطانہ کو چھاپ لیا۔ سلطانہ نے گھوم کر بے دریغ سیدھی کلہاڑی کا وار کیا لیکن مدمقابل بھی کوئی معمولی نہیں تھا۔ اقبال نے تیزی سے جھک کر یہ وار بچایا۔ سلطانہ نے چلّا کر دوسری مرتبہ کلہاڑی گھمائی۔ تاہم اس بار اقبال نے شروع میں ہی اس کی کلائی جکڑ لی۔ سلطانہ کے جسم میں وحشیانہ طاقت تھی۔ اس نے زور مارا اور اقبال جیسا شخص بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہ دونوں اوپر نیچے جنگلی گھاس میں گرے۔ سلطانہ اوپر تھی اور کسی صورت کلہاڑی چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ دیوانہ وار زور لگا رہی تھی۔ اسی دوران میں اقبال کی انگلی بے ساختہ رائفل کے ٹریگر پر دب گئی۔ دھماکے سے گولی چلی اور گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا بُری طرح اچھل کود کرنے لگا۔

میں سلطانہ کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی تندی تیزی اور بے خوفی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، وہ آج میرے سامنے تھا۔ وہ ایک جنگجو راجپوت نظر آتی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یہی لگا کہ شاید وہ اقبال کو بُری طرح گھائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ میں نے اپنا صافہ نما کپڑا چہرے سے اتار پھینکا تھا۔ ''سلطانہ... سلطانہ۔'' میں نے پکار کر کہا اور اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ اس کے لمبے بالوں نے بکھر کر اس کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں لگا کہ اس نے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا لیکن پھر یکایک وہ بُری طرح ٹھٹکی۔ اقبال نے ایک جھٹکے سے کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

''سلطانہ! ہوش کرو، یہ میں ہوں...''

چند سیکنڈ میں اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جیسے اس حیران کن صورتِ حال کا تجزیہ کر رہی تھی۔ تب اس کے چہرے پر ایک بار پھر خشونت نظر آئی۔ اس نے اپنا جسم چھڑایا اور کراہ کر بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو... مجھے جانے دو... میں کسی کی ناہیں... میرا کوئی ناہیں... مجھے جانے دو۔ مجھے مر جانے دو۔''

''ہوش کرو سلطانہ... میں مہروز ہوں... تمہارا شوہر۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔'' میں نے اس کے شانوں پر اپنی گرفت سخت کر دی۔

''میرا کوئی ناہیں... مجھے چھوڑ دو...'' اس نے ایک دم اپنے شانے چھڑائے اور اٹھنا چاہا۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا پھر الٹے ہاتھ کا دوسرا تھپڑ۔ اس کے ریشمی بال اچھل کر رہ گئے۔ اس نے چند سیکنڈ کے لیے ششدر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرے تھپڑوں نے اس کی ہسٹریائی کیفیت کو ایک دم کنٹرول کیا۔ اس کے جذبات کی شدت نے وفعتاً رخ بدلا۔ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں گھاس میں اس کے قریب ہی بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا بازو اس کے شانوں پر رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دل دوز آواز میں روتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ روتے روتے سسکنے لگی۔ ''میں اس کتّے کو جندہ ناہیں چھوڑوں گی۔ میں اسے مار دوں گی... یا خود مر جاؤں گی۔''

میں جانتا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ وہ اسی شخص کی بات کر رہی تھی جو میرے دل کا بھی داغ تھا۔ وہ شیطان صفت جارج گورا کی بات کر رہی تھی۔

☆☆☆

میں نے ایک بار سلطانہ کو اپنے ساتھ لگایا تو پھر خود سے جدا نہیں کیا۔ اسی طرح اپنے ساتھ لگائے لگائے اسے میں گھوڑا گاڑی کی نیم گرم فضا میں لے آیا۔ اس کا آنسوؤں سے تربتر چہرہ میرے سینے سے پیوست تھا۔ طلال کو کیچڑ آلود گڑھے سے نکالا جا چکا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پر معمولی چوٹ آئی تھی۔ اقبال اور سلطانہ کی دھینگا مشتی میں جو ایک گولی اتفاقاً چل گئی تھی، اس نے ہوشیار سنگھ کے ایک گھوڑے کو زخمی کر دیا تھا۔ تاہم یہ زخم بھی سنگین نوعیت کا نہیں تھا۔ گولی، چتکبرے گھوڑے کی گردن کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ہوشیار سنگھ اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔ گرو سو بھاش اور رادھا اسی طرح الاؤ کے گرد سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔ سلطانہ کی کیفیت عجیب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے زخموں سے چُور جسم میں جتنا بھی پانی ہے، وہ آج آنکھوں کے رستے بہا دے گی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والی گرم دھاریں میری گردن سے ہو کر میرے سینے تک جا رہی تھیں۔ وہ دل گیر آواز میں بولی۔ ''میں اپنا بدلہ لوں گی مہروز... میں اس سفید سور کو یونہی ناہیں چھوڑوں گی۔'' اس کا لہجہ غیر معمولی تھا اور اس کا جذبہ بھی۔

میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں زندہ ہوں۔ ابھی تم ایسی بات نہ کرو۔ اس شیطان کو میں اس کے انجام تک پہنچاؤں گا... اگر میں نہ رہا تو پھر تمہارا جو جی چاہے کرنا۔''

اس نے میرے سینے سے سر اٹھایا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان میں حیرت، خوشی، بے یقینی، بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ شاید اسے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے جو الفاظ سنے ہیں، وہ میں نے کہے ہیں۔

میں نے اس کا سر دوبارہ اپنے ساتھ لگا لیا۔ پچھلے چند مہینوں میں سلطانہ نے مجھے بتدریج بدلتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ مجھے بہت زیادہ مختلف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ''سلطانہ! ڈیڑھ دو سال پہلے تم نے جس شخص سے شادی کی تھی وہ کوئی اور تھا۔ اب جو شخص تمہارے ساتھ اس گاڑی میں بیٹھا ہے یہ اور ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، بہت کچھ بدل چکا ہے۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ تم دیکھنا، قدرت کی مدد شاملِ حال ہو گی۔ اس شخص کا انجام تمہاری توقع سے زیادہ بُرا ہو گا۔''

''میں تمہارے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی... یہ میرے بس میں ہی ناہیں ہے۔'' وہ کراہی۔

''تو تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے لیے خطرہ مول لے لوں؟''

''میری بات چھوڑ و میرو ج... میں اب مجرمہ بن چکی ہوں۔ میں نے چار بندوں کو قتل کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ اب یہ لوگ مجھے جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور پھر جب میں نے مرنا ہی ہو گا تو پھر کیوں نہ میں اس کتّے کو مار کر مروں۔''

میں نے پُرعزم انداز میں اس کا شانہ دبایا۔ ''کوئی تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا سلطانہ۔ تم نے جو دکھ سہنے تھے، وہ سہہ چکی ہو۔ اب کوئی آنچ نہیں آئے گی تم پر۔ میں تمہاری طرف بڑھنے والا ہر ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گا۔''

اس نے ایک بار پھر میرے سینے سے سر اٹھایا اور حیرت آمیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی ناک بالکل سرخ ہو رہی تھی۔ گھنے بال نصف چہرے کو ڈھانپ رہے تھے اور نصف کو نمایاں کر رہے تھے۔ وہ دھوپ چھاؤں کا عجیب امتزاج تھی۔ کہیں آگ تھی، کہیں شبنم، کہیں ریشم تھی، کہیں فولاد... میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہاں گھوڑا گاڑی کی اس نیم گرم فضا میں میرے اور سلطانہ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ ننھے بالو کا ذکر بھی بار بار آیا۔ سلطانہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اس منحوس استھان میں کب اور کس طرح پہنچا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے یہ روداد بتائی۔ وہ یہ جان کر حیران ہوئی کہ میں ایک ہندو گوپال کی حیثیت سے اس استھان میں موجود رہا ہوں۔ سلطانہ نے طلال کو بھی اندر بلا لیا تھا۔ طلال کی پنڈلی پر چوٹ آئی تھی جہاں اقبال نے پٹی وغیرہ باندھ دی تھی۔ وہ خاموش آنکھوں والا ایک ناراض اور بہت گہرا لڑکا تھا۔ بہت کم بات کرتا تھا لیکن جتنی کرتا تھا، وہ بہت وزنی ہوتی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اس دبلے پتلے لڑکے نے اپنی خالہ کے ساتھ مل کر زرگاں میں چار باحیثیت افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے مگر جب اس کی خاموش آنکھوں میں کوندتی ہوئی نفرت میں جھانکا جاتا تو یقین آنے لگتا تھا۔ اس کی مسیں ابھی پوری طرح بھیگی نہیں تھیں لیکن چھاتی چوڑی اور قویٰ اسٹیل کی طرح سخت تھے۔ اسے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ حکم کے بندوں نے ریسٹ ہاؤس سے ان دونوں کو پکڑنے کے بعد اس کی خالہ کو بُری طرح مارا پیٹا تھا اور وہ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔ وہاں اسے خود جو چوٹیں لگی تھیں ان کی پروا اسے نہیں تھی۔

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ہم کھانا کھانے سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ یہ کھانا ہم کو چاچا عبدالغنی نے دیا تھا۔ ہم کو جرا بھی شک ناہیں تھا کہ اس میں کچھ ملا ہوئیں گا۔ اگر ہم ہوش میں ہوتے تو حکم کے لوگ ہمیں ہاتھ بھی نہ لگا سکتے۔''

اس نے یہ بھی بتایا کہ استھان میں حراست کے دوران میں کچھ لوگ اسے ترغیب دیتے رہے ہیں کہ اگر وہ اپنا مذہب تبدیل کر لے تو وہ اس کی جان بخشی کر دیں گے۔

اسی دوران میں کہیں پاس سے فائر کی آواز آئی۔ یہ گن فائر تھا۔ میں بُری طرح چونک گیا۔ میں نے گھوڑا گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ فائر کی آواز یقیناً عمران نے بھی سنی تھی لیکن وہ مطمئن بیٹھا تھا۔

''یہ کیسی آواز تھی؟'' میں نے کھڑکی سے سر نکال کر عمران سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ اقبال نے کوئی شیر وغیرہ مارا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، بہت دن ہو گئے ہیں شیر کے کباب کھائے ہوئے۔''

اقبال ارد گرد موجود نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ فائر اس نے کیا ہو گا۔ جلد ہی صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔ اقبال اور سردار ہوشیار سنگھ ایک مادہ ہرن کو اٹھائے ہوئے جھاڑیوں سے نمودار ہوئے۔ اس میں سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ عمران

ایک دم خوش نظر آنے لگا۔ وہ پکار کر بولا۔ ''تابی! باہر آجاؤ... مجھے لگتا ہے کہ ابھی تک تمہارا ولیمہ نہیں ہوا ہے۔ یہ بڑا اچھا موقع ہے اس فرض سے سبکدوش ہونے کا۔''

میں نے سنی اَن سنی کر دی۔ وہ گھوڑا گاڑی میں آکر خود مجھے اور سلطانہ کو باہر لے گیا۔ اس کی نگاہوں میں سلطانہ کے لیے محبت تھی۔ اس نے اسے آگ کے قریب بٹھایا اور اس کے شانوں پر گرم چادر رکھی۔ پھر چہکا۔ ''بھابی! اب میں آگیا ہوں۔ اب تمہیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے اس نامعقول بندے کو میں تیر کی طرح سیدھا کر دوں گا۔ تمہارے اشاروں پر چلے گا۔ سمجھو کہ پتلی بن جائے گا، جس طرح چاہو نچا لینا... لیکن اس کے لیے تمہیں بھی میری ایک بات ماننا پڑے گی۔ یہ دیکھو... میں تمہارے پاؤں پکڑ لیتا ہوں۔ انکار نہ کرنا...''

اس نے واقعی شتابی سے سلطانہ کے پاؤں تھام لیے۔ سلطانہ نے گھبرا کر چھڑانا چاہے تو اس نے اقبال کو بھی اشارہ کر دیا۔ اس نے بھی جھٹ سلطانہ کے پاؤں تھام لیے... اقبال ذرا سا مسکرا رہا تھا۔ عمران نے بائیں ہاتھ سے اس کے سر پر جھانپڑ رسید کیا اور بولا۔ ''کھوتے کے پُتر! رونی صورت بناؤ۔ آنکھوں میں تھوڑی سی نمی لاؤ۔ بھابی کو منانا ہے، کوئی گوڈا پکڑائی دہشوں نہیں کرنی ہے۔''

اقبال نے فٹ رونی صورت بنالی۔ عمران کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی تھی۔ ''خدا کے لیے بھابی! بس ایک بات ماننی ہے۔ پچھلی ساری باتوں کو بھول جانا ہے۔ جو کچھ ہوا، جیسا ہوا، سمجھو وہ بس ایک بُرا خیال تھا۔ گزر گیا، فنا ہوگیا۔ اگر اسے یاد رکھنا ہے تو ہم رکھیں گے۔ ہم تیرے بھائی... تیرے نامعقول شوہر کے معقول یار... ہاں، ہم وہ سب کچھ یاد رکھیں گے اور یاد رکھنے کا حق بھی ادا کریں گے۔ تیرا کلیجا ایسے ٹھنڈا کریں گے بھابی کہ انڈیا کا بچہ بچہ مدتوں تک یاد رکھے گا... لیکن تمہیں ہماری بات ماننی ہے اور سب کچھ بھول جانا ہے...''

سلطانہ حیرت سے گنگ تھی۔ کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی عمران اور اقبال کی طرف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا پالا کیسے لوگوں سے پڑا ہے۔ میں اسے کیا بتاتا۔ مجھے خود آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

''میرے پاؤں چھوڑیں۔'' سلطانہ نے کراہ کر کہا۔

''چھوڑ دیتے ہیں بھابی! لیکن پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر فوری طور پر وعدہ نہیں کر سکتی ہو تو کم از کم ہمیں امید ضرور دلانا پڑے گی۔'' عمران نے کہا۔

''اور امید دلانے کا طریقہ یہ ہے کہ تمہیں ایک بار... مسکرا کر دکھانا ہوگا۔'' اقبال نے لقمہ دیا۔

وہ روہانسی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں پھر نمی جاگ گئی۔ ''میں نہیں مسکرا سکتی۔'' وہ دل دوز انداز میں بولی۔

''بالکل... بالکل غلط۔ بلکہ یہ فقرہ ہی غلط ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''خاص طور سے ایک مسلمان تو ایسا فقرہ ادا کر ہی نہیں سکتا۔ تم آج نہیں مسکرا سکتی ہو لیکن کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ تم کل یا پرسوں بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ اگلی جمعرات یا اگلے مہینے کی پندرہ بیس تاریخ تک بھی نہیں مسکرا سکو گی؟ یہ تو غیب دانی کا دعویٰ ہے اور ایسے دعوے اس گرد سو بھاش جیسے لوگ تو کر سکتے ہیں، ہم نہیں۔''

''تم نے بالکل غلط کہا ہے بھابی! اب تو ہم تمہارے پاؤں بالکل نہیں چھوڑیں گے۔'' اقبال نے کہا۔

''اور مجھے رو کر نہ دکھاؤ۔'' عمران نے لقمہ دیا۔ ''میں تم سے زیادہ رو سکتا ہوں اور اگر میں ایک بار رو پڑوں تو پھر مجھے چپ کرانا آٹھ دس بندوں کا کام نہیں ہوتا۔ ہاتھوں سے نکل نکل جاتا ہوں... پچھاڑیں کھاتا ہوں۔ محلوں کے محلے اکٹھے کر لیتا ہوں... اور کئی بار تو روتے روتے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہوں۔''

سلطانہ نے ایک بار پھر بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

''اس نامعقول کی طرف نہ دیکھو بھابی!'' عمران نے اس کا چہرہ پھیر دیا۔ ''جو کچھ کرنا ہے، ہمیں کرنا ہے۔ تمہارے پاؤں چھوڑنے نہ چھوڑنے اور رو رو کر خود کو ہلکان کرنے جیسی ساری اتھارٹی ہمارے پاس ہے۔ تمہیں مسکرانا پڑے گا۔ اگر نقد و نقد نہیں... مسکرا سکتی تو ارادہ ظاہر کرنا پڑے گا۔ ارادے میں بڑی طاقت ہوتی ہے بھابی! آدھا ثواب تو ارادے سے ہی مل جاتا ہے۔ تم بس تاریخ دے دو کہ کس دن مسکراؤ گی؟ ہم اسی سے مطمئن ہو جائیں گے۔''

سلطانہ کچھ بھی کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اقبال نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بھابی! چلو اتنا بتا دو کہ آج کی تاریخ میں مسکراؤ گی یا پھر کسی دن؟''

سلطانہ کی آنکھیں مسلسل رِستی رہیں اور وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ عمران نے کہا۔ ''میں اس کو تھوڑا سا اور آسان کر دیتا ہوں۔ آخر باڈی لینگویج بھی کوئی چیز ہوتی ہے بھابی! اگر تم... اگر تم اپنا بایاں پاؤں ہلاؤ گی تو اس کا مطلب ہوگا کہ آج ہی کسی وقت ہمیں اپنی مسکراہٹ سے نوازو گی۔ اگر دایاں پاؤں ہلاؤ گی تو مطلب ہوگا کہ کسی اور دن۔ یعنی ٹوٹل انکار نہیں، ٹھیک ہے؟''

چند سیکنڈ بعد شاید سلطانہ کا ایک پاؤں بے ساختہ ہی ہل گیا تھا۔ عمران چہکا۔ ''زبردست... زبردست... یو آر گریٹ بھابی! تم نے ہمارا مان رکھ لیا۔ چلو دایاں پاؤں ہلایا لیکن ہلایا تو سہی۔ کوئی بات نہیں۔ ہم تمہاری مسکراہٹ دیکھنے کے لیے دو چار دن اور انتظار کر لیں گے۔ شکریہ، تھینکس، دھنیواد۔ اب تم کہو گی کہ شکریہ کس بات کا؟ نہیں بھابی! یہ سب تکلف کی باتیں ہیں۔ اتنے بڑے حالات میں بھی تم نے مسکرانے کا وعدہ کیا، یہ کوئی معمولی بات نہیں... سچ، میرا جی چاہتا ہے کہ خوشی سے الٹی قلابازیاں لگاؤں اور میں صرف محاورتاً نہیں کہہ رہا۔ میں لگا بھی سکتا ہوں، یہ تو میرا پروفیشن ہے۔ اگر تم کہو بھابی تو میں لگا کے بھی دکھا سکتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ سلطانہ کوئی ردِعمل ظاہر کرتی، وہ طلال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''خاموشی کا مطلب ہے نیم رضامندی... یہ دیکھو۔''

وہ بیٹھے بیٹھے کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اچھلا اور ہوا میں دو الٹی سمرسالٹ لگا کر عین اسی جگہ لینڈ کر گیا جہاں سے فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس کی مہارت قابلِ دید تھی۔ میرے اور اقبال کے سوا سبھی دنگ رہ گئے۔ گرو کا چہرہ حیرت کی تصویر نظر آنے لگا۔ ہوشیار سنگھ جو ابھی سوجی ہوئی گردن پر ٹکور کر رہا تھا، آنکھیں پھاڑ کر عمران کو دیکھتا چلا گیا۔ ''واہ... واہ۔ آپ تو بڑے کاریگر نکلے ہو جی۔'' وہ ششدر لہجے میں بولا۔ ''ایسا کام تو روسی سرکس والے کرتے ہیں یہاں انڈیا کے وڈے وڈے شہروں میں۔ یا پھر جمناسٹک والے کھلاڑی ہوتے ہیں۔''

''میں تمہیں کیا لگتا ہوں... کھلاڑی یا سرکس والا؟''

وہ مسکرایا۔ ''میری مت نہیں ماری ہوئی کہ آپ کو سرکس والا کہہ کر آپ سے جھانپڑ کھاؤں۔ میرے خیال میں تو آپ کھلاڑی ہی ہیں۔''

''اور مجھے لگتا ہے کہ تم پکے سردار ہی نہیں ہو کیونکہ میں نے سنا تھا کہ سردار چغد ہوتے ہیں۔''

ہوشیار سنگھ بولا۔ ''شاید تھوڑا بہت نام کا اثر ہے جی۔ ورنہ کام تو میرے بھی اکثر بڑے بائی کلاس ہوتے ہیں۔'' اس نے خاموش بیٹھی سلطانہ کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''اب یہی دیکھ لیں۔ بی بی کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی لیکن مجھے دور سے یہی لگا کہ یہ ہانڈی میں پھیرنے والی ڈوئی ہے۔ یہ تو بھلا ہو میری بھین کا کہ انہوں نے الٹی ڈوئی... میرا مطلب ہے کلہاڑی ماری ورنہ میرا تو جھٹکا ہو جاتا تھا کھڑے

کھٹرنے۔''

''حیرت ہے، تمہیں ڈوئی اور کلہاڑی کے فرق کا پتا نہیں چلا۔ حالانکہ وہ ٹائم بھی کوئی ایسا دیسا نہیں تھا۔'' اقبال نے کہا۔

''میں سمجھ گیا جی! آپ بارہ بجے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن اب وہ بات پرانی ہوگئی ہے۔ اب ساری دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، گلوبل ویلیج۔ اور اس ویلیج میں کہیں نہ کہیں تو بارہ بجے ہی رہتے ہیں۔۔۔ ہو ہو ہو۔'' وہ خود ہی منہ کھول کر ہنس دیا۔

اقبال نے جیب سے شکاری چاقو برآمد کیا اور تیزی سے ہرن کی کھال اتارنے میں مصروف ہوگیا۔ ہوشیار سنگھ عارضی انگیٹھی بنانے کے لیے دو تین پتھر اٹھا لایا۔

''مسئلہ نمک مرچ کا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

عمران فٹ بولا۔ ''تو میں یہاں کس لیے ہوں، فساد پُس کا نمائندہ؟ میرا تو کام ہی نمک مرچ لگانا ہے۔ میں تو چودہ وزن کے باسی آلو مٹر کو ایسا تڑکا لگا سکتا ہوں کہ وہ تر و تازہ تندوری چرغا بن جائے۔ یہ تو پھر ہرن ہے یار۔''

''تو پھر کر دو اس کو نمکین؟'' اقبال نے کہا۔

''تم اس کی کھال تو اتارو۔ تمہیں پتا ہی ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

''تم بھی کچھ مدد فرماؤ نا۔ کھال ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' اقبال بولا۔

''مجھے بار بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ میں چپیل کا نمائندہ ہوں۔ چھوٹے موٹے کاموں سے میری توہین نہ کر دیا کر! کسی بال کی کھال اتارنی ہو یا کوئی اس سے بھی باریک شے ہو تو میرا احسان لینا۔ میں تمہارے لیے نمک کا انتظام کرتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر گھوڑا گاڑی میں گیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک کاغذ میں، مناسب مقدار میں نمک لے کر آگیا۔ میری طرح ہوشیار سنگھ بھی حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ نمک کہاں سے برآمد ہوگیا ہے۔ ہاں، اقبال کو حیرانی نہیں ہوئی۔

الاؤ اب خوب اچھی طرح بھڑک رہا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے گوشت بھوننے کے لیے کافی سارے کوئلے بنا لیے تھے۔ میں نے سرگوشی میں عمران سے پوچھا۔ ''یہ نمک کہاں سے آگیا؟''

''یار! جادو برحق ہے۔''

''مذاق نہیں۔ یہ کیا کیا ہے تم نے؟''

وہ مسکرایا۔ ''سچ بتاؤں؟''

''جی تو چاہتا ہے کہ کبھی یہ انہونی ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں میں بھید بھری چمک ابھری۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''بارودی بیلٹ میں سے نکالا ہے۔''

''بارودی بیلٹ؟ جو رادھا کی کمر سے اتاری ہے؟''

''ہاں۔''

''بارودی بیلٹ میں نمک بھی رکھا ہوا تھا؟''

''یار۔۔۔ بس نمک ہی تو رکھا ہوا تھا۔'' وہ ایک آنکھ میچ کر بولا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''یار! خود ہی تو سچ بولنے کو کہتے ہو پھر کیے بکے ہو جاتے ہو۔ اب یہ اپنا بھاڑ جیسا منہ بند کرو۔ مکھی گھس جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ گرو کو بھی شک ہو جائے۔ اگر اس کو پتا چل گیا کہ بیلٹ میں بارود اتنا بھی نہیں تھا، جتنا ہمارے سیاست دانوں میں خوفِ خدا ہوتا ہے تو پھر اس کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے، اسے لگے گا کہ اس کا تمام رونا دھونا بیکار گیا ہے۔۔۔ ہمیں اس طرح کسی کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔''

''اور وہ ریموٹ کنٹرول؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! تم نے اس ہرے طوطے کو غور سے نہیں دیکھا۔ وہ تو ''اڈاپٹر'' ہے ایک واکی ٹاکی کا۔۔۔ یونہی اقبال کو کہیں سے مل گیا تھا۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''مطلب کہ یہ سارا دھوکا تھا؟''

''دھوکا نہیں، تم اسے ڈراوا کہہ سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ استھان میں ہماری بے بے تو نہیں بیٹھی ہوئی تھی، ہمارے لیے بارودی بیلٹس اور ریموٹ کنٹرول لے کر۔ جو کچھ آس پاس سے ملا، ہم نے اس سے کام چلایا۔''

میں بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا۔

''عمران! تم کب سے ہو یہاں؟''

''ایک بار پھر سچ بتاؤں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''مجھے اور اقبال کو یہاں تقریباً ایک برس ہو چکا ہے۔ زبردست روداد ہے۔ سفرنامہ ''نکلے تیری تلاش میں'' اور اس طرح کی دوسری کارگزاریاں تو کوئی شے ہی نہیں ہیں۔ بہت جنگل کی خاک چھانی ہے تمہارے لیے جگر! آج رات کو ساری تفصیل بتاؤں گا۔''

اگلے دو تین گھنٹے ہم کافی مصروف رہے۔ بغیر مناسب ساز و سامان کے شکار شدہ ہرن کو کوئلوں پر بھوننا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے [illegible]

ان میں کٹ وغیرہ دے کر نمک لگایا گیا اور پھر بڑی احتیاط سے بھونا گیا۔ یہ ایک مزے دار کھانا ثابت ہوا۔ عمران اسے چپکے چپکے میرے ولیمے کا نام دے رہا تھا اور اس حوالے سے معنی خیز باتیں کر رہا تھا۔ گرو سوبھاش اور رادھا نے گوشت نہیں کھایا اور بس بیٹھے تھوک نگلتے رہے۔ میری اور عمران کی کوشش کے باوجود سلطانہ نے بھی ایک دو لقموں سے زیادہ نہیں لیے۔ وہ بدستور گمبھیر کیفیت میں تھی۔ اس نے مجھ سے بس اتنا کہا۔ ''کوچبان سے کہیں مجھے معاف کر دے۔ میں نے اسے کلہاڑی مار کر زخمی کر دیا ہے۔''

میں نے اس حوالے سے اسے تسلی دی۔ کھانے کے بعد سردار ہوشیار سنگھ پھر درختوں کی طرف نکل گیا۔ اس مرتبہ وہ خشک لکڑیوں کے ساتھ ساتھ خوبانی کی طرح کا ایک جنگلی پھل بھی لے کر آیا۔ یہ پھل ایک دفعہ میں نے بھی دیکھا تھا مگر بھوک کے باوجود کھانے کا رسک نہیں لیا تھا۔ یہ نیم میٹھا اور کسیلا پھل گرو اور رادھا کی بیٹ پوجا کے کام آسکتا تھا لیکن ابھی تک وہ صدمے میں تھے اس لیے کھانے سے انکار کر دیا۔

سب موجودہ صورتِ حال سے مطمئن تھے۔ ہوشیار سنگھ کا بھی یہ خیال تھا کہ ہم استھان اور پھلواری سے کافی دور آچکے ہیں اور گھنے درختوں سے گھری ہوئی اس ناپونما جگہ پر بالکل محفوظ ہیں لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی کسی طرف سے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں گی اور زرگاں کے ان گنت گھڑسوار ہمیں گھیر لیں گے۔ یہاں میرے خوف کی وجہ میرے سوا اور کون جان سکتا تھا؟ ایک منحوس الیکٹرانک چپ میرے جسم میں موجود تھی اور ہر جگہ میرے دشمنوں کو میری لوکیشن کا سراغ دے رہی تھی۔ وہ جلد یا بدیر مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔

میں عمران کو جلد از جلد اس صورتِ حال کے بارے میں بتا دینا چاہتا تھا لیکن اس سے اکیلے میں اطمینان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ سردیوں کا چھوٹا سا دن جلد ہی مغربی افق کے پیچھے اوجھل ہوگیا اور اس ویران جگہ کو کہر آلود اندھیرے نے ڈھانپنا شروع کر دیا۔ ویرانے میں رات بسر کرنے کے حوالے سے ہوشیار سنگھ کافی ہوشیار اور تجربہ کار لگتا تھا۔ اس نے گھوڑا گاڑی کے چاروں طرف درختوں سے تین چار مشعلیں باندھ دیں اور دو تین الاؤ بھی دہکا دیے۔ یوں گھوڑا گاڑی کی اندرونی فضا زیادہ گرم ہوگئی اور جنگلی جانوروں کی مداخلت کا خطرہ بھی کم سے کم ہوگیا۔ ہوشیار سنگھ [illegible] کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا

ہم دیر سے اس کی مدد کو پہنچے۔۔۔ اب اس کے دماغ میں سما چکی ہے کہ یہ اس ویران جزیرے کا دوسرا ادیب ہے

محمد طاہر مجاہد، پھالیہ سے کلکاریاں

تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم گرو سوبھاش کو کسی سے بچانے کے لیے استھان سے نہیں بھاگے تھے بلکہ گرو کو لے کر بھاگے تھے۔ اور اس لیے لے کر بھاگے تھے کہ گرو کا ''بیش بہا علم'' ایک بے قصور لڑکی کو واجب القتل ٹھہرانے والا تھا۔ مکمل صورتِ حال جاننے کے بعد اب ہوشیار سنگھ کی ساری ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوگئی تھیں اور وہ ایک ساتھی ہی کی طرح ہمارے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ وہ خاصا زندہ دل شخص تھا۔

عمران مسلسل اس کوشش میں تھا کہ سلطانہ اور طلال اپنی افسردہ کیفیت میں سے نکل آئیں۔ اس نے اقبال کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت بھیانک آواز میں گا سکتا ہے۔ اگر یہ گانا شروع کر دے تو رات بھر کوئی جنگلی جانور ہمارے قریب نہیں پھٹکے گا۔''

پھر وہ ایک واقعہ سنانے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ ''ایک بار ہم ضلع شیخوپورہ میں سور کے شکار پر تھے۔ ہمارے سرکس کے مالک چودھری اشفاق، اسسٹنٹ منیجر عباس گوجرانوالہ کے ڈی پی او اور کچھ دیگر لوگ بھی ساتھ تھے۔ ہم اپنا شوق

پورا کرنے کے لیے گھوڑوں پر سوار تھے۔ رات کو ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ جنگلی سوروں کے حملے کا ڈر تھا۔ رات کو اقبال کی ڈیوٹی لگی۔ یہ ایک خالی ٹین بجاتا اور ساتھ ساتھ اپنی کرخت آواز میں گاتا رہا۔ اس کی آواز کے سبب جانور تو دور ہی رہے، ہمارے اپنے گھوڑوں میں سے بھی تین ڈر کر بھاگ گئے۔''

عمران اور اقبال کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھوک شروع ہوگئی۔ طلال ان پُرمزاح باتوں میں تھوڑی تھوڑی دلچسپی لینے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد باقی لوگ سونے کے لیے گھوڑا گاڑی میں چلے گئے۔ میں، اقبال اور عمران آگ کے گرد بیٹھے رہے۔ میں نے الاؤ کے شعلوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''عمران! میں تم دونوں کو ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن تم کچھ خاص باتیں سننا بھی تو چاہتے ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''اب فیصلہ کرلو، پہلے خاص باتیں سناؤ گے یا سنو گے؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، پہلے تم سنالو پھر میں بتاتا ہوں۔''

عمران نے کسی کہانی گو کی طرح ایک درخت سے ٹیک لگائی۔ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر جھلملا رہا تھا۔ سرد ہوا میں اڑتی ہوئی چنگاریاں ماحول کو گرما رہی تھیں۔ ثروت، عاطف اور فرح کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے میری بے تابی پھر بڑھتی چلی گئی۔

عمران نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ''وہ بڑے دردناک دن تھے تابی! جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کے درد سے بھرے ہوئے۔ میں اسپتال میں تھا۔ وہیں پر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیفنس والی کوٹھی میں تمہاری والدہ کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ انہیں قتل کیا گیا ہے اور یہ قتل سیٹھ سراج اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے۔ تمہارا بھائی اور بہن فرح دونوں اوجھل تھے۔ ان کے بارے میں امید تھی کہ وہ نکل جانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ میں سب سے پہلے انہیں تلاش کر کے کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف چھوٹی میڈم نادیہ اسپتال میں دم توڑ چکی تھی اور میڈم صفورا کا غم و غصہ پورے عروج پر تھا۔ میں زخمی حالت میں ہی اسپتال سے نکل آیا تھا۔ تین چار دن کی سرتوڑ کوشش کے بعد میں اور اقبال عاطف کا کھوج لگانے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ گوجرانوالہ میں تھا۔ میں نے عاطف اور فرح کو فوراً راولپنڈی پہنچا دیا۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈھونڈنے اور سیٹھ سراج سے حساب برابر کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میرے ایک خاص بندے نے مجھے اطلاع دی کہ سیٹھ سراج اور شیرا زیرِزمین جا چکے ہیں اور اب چند مہینوں تک سامنے نہیں آئیں گے۔ میڈم صفورا کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ اپنی رہائش گاہ سے غائب تھی۔ اس کے بااعتماد ملازم بھی کچھ بتا نہیں پا رہے تھے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ کچھ پراسرار لوگ میڈم صفورا کے اردگرد دیکھے گئے ہیں... اور ان لوگوں کا تعلق بدھا کے اس مجسمے سے ہے جو پہلے ابرار صدیقی کے پاس تھا اور اب میڈم صفورا کے پاس آیا ہے۔ پھر یہ انکشاف ہوا کہ میڈم صفورا ہی نہیں، وہ خاص بدھا بھی غائب ہے جسے میڈم نے بڑی کوشش سے میرے ذریعے حاصل کیا تھا۔ کچھ ایسی شہادتیں ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ بدھا کے ساتھ ساتھ میڈم صفورا اور مولانا ابرار صدیقی کو بھی انڈیا پہنچایا جا چکا ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات لگ رہی تھی...''

ہماری گفتگو جاری تھی۔ اچانک میں بُری طرح چونک پڑا۔ اگر میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے تو میں نے انجن کی مدھم آواز سنی تھی۔ یہ آواز ہوا کے کسی آوارہ جھونکے پر تیر کر آئی تھی اور یقیناً عمران کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ میں نے عمران کو بھی چونکتے دیکھا... عمران نے اپنا ہاتھ رائفل کی طرف بڑھا دیا۔ اقبال نے بھی اس کی تقلید کی اور چوکنا نظر آنے لگا اور یہی وقت تھا جب آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ کافی واضح تھی۔ یہ کوئی جیپ نما گاڑی تھی جو ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

''اس ویرانے میں یہ کون ہوسکتا ہے؟'' اقبال نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

میرے ذہن میں موجود تمام تر اندیشے ابھر کر سامنے آگئے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ ''تم سے کہا تھا ناکہ پہلے میری خاص بات سن لو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ وہی ہے جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔''

میرے لہجے کی تشویش محسوس کر کے عمران کی پریشانی بڑھ گئی۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اب یہ سب کچھ بتانے کا وقت نہیں۔ اب پہلے یہ دیکھو کہ یہ آنے والے کون ہیں؟'' اس دوران میں درختوں کے درمیان سے ہیڈ لائٹس کی مدھم سی جھلک نظر آئی لیکن کچھ ہی دیر بعد یہ جھلک اوجھل ہوگئی۔ انجن کی آواز بدستور آرہی تھی اور اب مزید قریب آگئی تھی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ گاڑی والوں نے ہیڈ لائٹس بجھا دی ہیں۔'' عمران نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ دال میں کافی زیادہ کالا موجود ہے۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

''ہوسکتا ہے کہ کوئی بھٹکے ہوئے مسافر ہوں... یا پھر شکاری...؟'' عمران نے جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ اتفاقاً یہاں پہنچے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں لیکن اگر یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں تو پھر ان کی تعداد زیادہ ہونی چاہیے تھی، کم از کم بیس تیس لوگ ہوتے... پانچ چھ گاڑیاں ہوتیں۔''

''ہوسکتا ہے کہ باقی لوگ پیچھے ہوں۔'' میں نے اختلاف کیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ گاڑی اب تاریکی میں رک گئی ہے۔ ہیڈ لائٹس بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ گاڑی والوں کا یہ انداز انہیں اور زیادہ مشکوک بنا رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''عمران! ہمیں انہیں دیکھنا ہوگا۔''

عمران میرے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا اور اقبال سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''تم یہیں رکو گھوڑا گاڑی کے پاس، ہم دونوں جاتے ہیں۔''

''یس باس۔'' اقبال نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

میں اور عمران جھاڑیوں کے درمیان احتیاط سے چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ عمران کے ہاتھ میں رائفل اور میرے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ رگوں میں خون لہریں لے رہا تھا۔ کچھ کرنے اور اپنا حوصلہ آزمانے کو دل چاہ رہا تھا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ ہم گاڑی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں جھاڑیوں کے درمیان ایک سیاہ ہیولا سا نظر آیا۔ یقیناً یہ ایک بند جیپ تھی۔ اس کی چھت پر کچھ لدا ہوا تھا۔ شاید یہ چھولداری تھی۔ اچانک میرا پاؤں ایک گڑھے میں گیا اور میں سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا گر پڑا۔ میرے گرنے سے دھپ کی آواز پیدا ہوئی اور پسٹل کھناک سے کسی تنے کے ساتھ ٹکرایا۔

''کون... کون ہے؟'' کہیں پاس سے ایک گھٹی ہوئی بھاری آواز سنائی دی۔

ہماری موجودگی راز نہیں رہی تھی۔ یکایک بھاگتے قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ قدم ہماری طرف آنے کے بجائے مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ پھر دو سائے تیزی سے جیپ میں داخل ہوئے... اور جیپ آناً فاناً اسٹارٹ ہوکر حرکت میں آگئی۔ وہ جو بھی تھے، بھاگ رہے تھے۔

''ان کو پکڑو۔'' میں نے زمین سے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں اور عمران ایک ساتھ جیپ کی طرف دوڑے۔ وہ گھوم چکی تھی اور اب ہمیں اس کی سرخ ٹیل لائٹس دکھائی دے رہی تھی۔ ''رک جاؤ۔'' عمران دہاڑا۔

اس کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''رک جاؤ۔'' عمران نے پھر کہا اور بھاگتے بھاگتے سیون ایم ایم رائفل سے دو فائر کیے۔ ایک گولی جیپ کے پچھلے ٹائر میں لگی اور اسے برسٹ کر گئی۔ جیپ کنٹرول سے باہر ہوکر لہرائی اور پھر سائڈ کی طرف سے بُری طرح ایک درخت سے ٹکرائی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ جیپ کا دایاں اگلا پہیا ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر چڑھ گیا۔ جیپ میں سے دو سائے نکل کر بھاگے۔ ایک کا رخ دائیں طرف اور ایک کا بائیں طرف تھا۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ ایک کے پیچھے میں بھاگا، دوسرے کے پیچھے عمران لپکا۔ میرے والا کچھ زیادہ پھرتیلا تھا اور وہ غیر مسلح بھی نہیں تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کے قریب پہنچ رہا ہوں، اس نے ایک دم پلٹ کر مجھ پر فائر کیا۔ دھماکے سے ایک شعلہ نکلا اور گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری۔ یہ پستول کا فائر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوسرا فائر کرتا یا میں جوابی گولی چلاتا، اسے بُری طرح ٹھوکر لگی اور وہ دور تک رپٹتا چلا گیا۔

میں نے اسے چھاپ لیا لیکن وہ آسان مدمقابل نہیں تھا۔ اس نے بالکل غیر متوقع طور پر لیٹے لیٹے اپنے سر کے عقبی حصے سے میرے چہرے پر ضرب لگا دی۔ میری آنکھوں میں ستارے ناچے اور وہ میری گرفت سے نکل گیا۔ اس نے مجھ پر ٹانگ چلائی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور پھر اس کی دوسری ٹانگ کھینچ کر اسے اپنے برابر گرا لیا۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا مگر میرا ابھی میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس پر گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پستول کی ضرب اس کے بھاری بھرکم تھوبڑے پر لگائی تو وہ کراہ کر رہ گیا۔ لمبی جنگلی گھاس پر ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ تیس چالیس سیکنڈ کے اندر میں نے اس کا سارا دم خم نکال دیا۔ وہ دُہائی دینے لگا۔ ''ہم کو مت مارو، ہمرے پاس زیادہ کچھ نا ہیں ہے۔ جو کچھ ہے، وہ تم لے لو...''

میں نے عمران کو آوازیں دیں۔ میری تیسری چوتھی آواز پر وہ بھی ایک شخص کو آگے لگائے ہوئے نمودار ہوا۔ تاروں کی روشنی میں غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ مقامی لوگ ہی ہیں۔ انہوں نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی اور کھاتے پیتے

گھرانوں کے نوجوان لگتے تھے۔ ایک کے گلے میں امپورٹڈ دور بین لٹک رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' عمران نے ایک کو سر کے بالوں سے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

''شکار کے لیے نکلے ہیں بھائی، ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا ناہیں۔ نہ ہی کسی سے کوئی دشمنی ہے۔ میرا نام راہول ہے، یہ میرا چچازاد بھائی دلیپ ہے۔ ہم اکثر ہفتے کی رات کو نکلتے ہیں۔''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''بوہرا سے۔ ہمارا وہاں ڈیری فارم ہے۔''

''تم ہمیں دیکھ کر بھاگے کیوں تھے؟''

''سچی بات یہ ہے کہ... ہمیں خطرہ محسوس ہوا تھا کہ آپ ہم سے ہمارا سامان وغیرہ چھین لیویں گے۔ پچھلے دو تین مہینے میں کئی شکاریوں کے ساتھ اس طرح کی درگھٹنا ہوئی ہے۔''

''تم نے ہماری جلائی ہوئی آگ دیکھی اور پھر دور ہی گاڑی بند کر کے کھڑے ہو گئے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہم شش و پنج میں تھے۔ جاننا چاہ رہے تھے کہ آپ کون لوگن ہیں۔ بغیر تصدیق کے ہم آپ لوگن کے پاس جانا ناہیں چاہت تھے۔''

میں نے لیٹے ہوئے شخص کا گریبان پکڑتے ہوئے عمران کو بتایا۔ ''اس نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے کندھے کے پاس سے گزری ہے۔''

''میں بہت بہت شما چاہت ہوں۔ مجھے پتا ناہیں تھا کہ آپ کون لوگن ہیں۔ مجھے لگا تھا کہ اگر میں نے آپ پر گولی نہ چلائی تو آپ مجھ پر گولی چلا دیویں گے۔'' وہ لجاجت سے بولا۔

''کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟'' عمران نے لیٹے ہوئے شخص سے پوچھا۔

''ناہیں۔ ہم دونوں ہی ہیں۔ ہمارے دو اور دوستوں نے آج دوپہر ہمارے ساتھ شامل ہونا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ آ ناہیں سکے۔ ہم بہت تھک چکے تھے، یہاں کہیں چھولداری لگانے کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈ رہے تھے کہ آپ لوگن کی جلائی ہوئی اگنی پر نظر پڑ گئی...'' لیٹے ہوئے دلیپ نے جواب دیا۔

اندھیرے میں سے بہ مشکل دلیپ کا گرا ہوا پستول ڈھونڈا گیا۔ پستول میں نے اپنے پاس ہی رکھا۔ ہم ان دونوں کے ساتھ جیپ کی طرف واپس آئے۔ اس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ لائٹس بھی آن تھیں۔ ایک طرف کی کھڑکیوں کو کچھ نقصان پہنچا تھا۔ جیپ کی اندرونی روشنی میں ہم نے دیکھا۔ یہ دونوں کزن تجربہ کار شکاری لگتے تھے۔ جیپ کی نشستوں کے پیچھے ہموار جگہ پر کوئی دو درجن شکار کیے ہوئے چھوٹے بڑے پرندے موجود تھے۔ اس کے علاوہ کئی جنگلی خرگوش اور ایک بڑے سائز کا چیتل بھی تھا۔

دونوں افراد سے گفتگو کے بعد ہم کسی حد تک مطمئن ہو چکے تھے۔ ہم نے مل کر جیپ کے اگلے پہیے کو لکڑی کے تنے پر سے اتارا اور پھر برسٹ ٹائر کے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھ کر پڑاؤ میں واپس آ گئے۔ گولی چلنے کی آواز اقبال نے بھی سن لی تھی اور وہ پریشان نظر آتا تھا۔ بہرحال ہمیں بہ خیریت دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ ہم نے اقبال کو بھی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ گفتگو کے دوران میں ہی ہم نے مل کر گاڑی کا ٹائر بھی تبدیل کر دیا۔

یہ دونوں افراد خوش حال گھرانے سے لگتے تھے اور پڑھے لکھے بھی تھے۔ اپنی گفتگو میں گاہے بگاہے انگریزی کے الفاظ بھی بولتے تھے۔ ان کی لینڈ روور جیپ بھی تقریباً نئی ہی تھی۔ ایک اسٹائلش واکی ٹاکی اور مہنگے سگریٹوں کے پیکٹ ڈیش بورڈ پر رکھے تھے۔

عمران نے راہول سے پوچھا۔ ''اس واکی ٹاکی سے پرندوں کو کال کرتے ہو؟''

وہ مسکرایا۔ ''ناہیں جی... آپ کو دوسری پارٹی کا بتایا ہے نا۔ انہوں نے ہمیں جوائن کرنا تھا۔ ان سے رابطے کے لیے ساتھ لے لیا تھا۔ ویسے بھی شکاری مہم کے دوران میں ایسی چیزوں کا فائدہ ہوتا ہے۔''

پھر راہول نے ذرا جھجکتے ہوئے ہم سے ہمارے بارے میں پوچھا۔ عمران نے انہیں بتایا کہ شادی کی ایک تقریب میں شریک ہونے کے لیے زرگاں جا رہے ہیں۔

اسی دوران میں ہوشیار سنگھ بھی آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ وہ ذرا تعجب سے ان دو نئے مہمانوں کو دیکھ رہا تھا اور ان کی گاڑی کو بھی۔ وہ اپنی گردن کی چوٹ کی وجہ سے ذرا تکلیف میں نظر آتا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی گردن دیکھ کر دلیپ نے پوچھا۔ ''اس سردار کو کیا ہوا ہے؟''

عمران بولا۔ ''یہی ہوا ہے جس کا تم دونوں کو ڈر پڑ گیا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''یہاں سفر کرنے والوں کو ڈاکوؤں کا ڈر تو اکثر رہتا ہے۔ ہمیں بھی ڈر تھا۔ ہمارا ڈر سچ نکلا۔ پیچھے بوہرا ندی کے پاس تین چار گھڑسواروں نے ہمارا راستہ روکا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نہتے ہیں۔ تھوڑی سی مارا ماری ہوئی پھر جب ہم نے رائفلیں نکالیں تو وہ تتر بتر ہو گئے۔''

دلیپ ہنسا۔ ''یعنی جن کو ہم ڈاکو سمجھے تھے وہ خود ڈاکوؤں کے ڈسے ہوئے ہیں۔''

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''

راہول نے کہا۔ ''ویسے یہ علاقہ آج کل پہلے سے زیادہ خطرناک بنا ہوا ہے۔ شاید تمہیں پتا ہو، ایک مسلمان راجپوت لڑکی کے لیے بڑی کشمکش چل رہی ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر زرگاں میں کئی بندوں کی ہتھیا کی ہے۔ اب اسے کسی اور گروہ نے اغوا کر لیا ہے۔ زرگاں والے اسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بڑی مارا ماری چل رہی ہے۔''

''چھوڑو یار!'' اقبال نے کہا۔ ''یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک لڑکی اتنا کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ وہ اکیلی ہی سب کچھ کرتی رہی ہے۔ بس پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا اس کے ساتھ ہے۔''

''ہاں، یہ بات بھی کہی جاوت ہے۔'' راہول نے تسلیم کیا۔ ''وہ کوئی معمولی لڑکی ناہیں ہے۔ اس کی ماں نے حکم جی کی جان بچائی تھی اور اس کے بدلے میں حکم کے پتا رائے پرتاپ بہادر نے اس راجپوت پریوار کو بہت کچھ دیا تھا۔ لیکن نیچ کھوت ہیں، اچھوں سے بُرے اور بُروں سے اچھے جنم لیوت ہیں۔ یہ لڑکی نڈر اور دلیر تو بہت ہے لیکن غلط رستے پر چل نکلی ہے۔ اس نے پہلے ایک دم شادی کی اور راج بھون کی پری بننے سے انکار کیا، اب موہن جی جیسے بندے کی ہتھیا کر کے اس نے سب کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔''

دلیپ نے کہا۔ ''پچھلے دنوں میں زرگاں گیا تھا۔ وہاں لوگ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ کچھ تو یہ سمجھت ہیں کہ اس میں کوئی بری آتما گھسی ہوئی ہے۔ ورنہ ایک کمزور لڑکی اس طرح زرگاں میں دندنا سکت ہے؟ اور خون خرابا کر سکت ہے؟ بڑے پنڈت مہاراج کا وچار تو یہ ہے کہ ایسی اپرادھن ناری کو زندہ جلا دینا چاہیے تاکہ اس کی نحوست سے راجواڑے کو چھٹکارا مل جائے۔ مگر...''

''مگر کیا؟'' اقبال نے پوچھا۔

''لگت ہے کہ جارج گورا صاحب، اسٹیل صاحب اور اس جیسے دوسرے لوگن اسے زندہ گرفتار کرنا چاہت ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو کچھ کیا جائے قانون کے مطابق ہو۔ اس پر زرگاں میں چوہرے قتل کا مقدمہ چلے۔''

''اچھا یار! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تمہیں کچھ کھانا پینا ہے تو بتاؤ۔''

دلیپ نے کہا۔ ''بھوک تو بے شک لگی ہے لیکن ہم آپ لوگن کو تکلیف ناہیں دیں گے۔ جو کچھ کریں گے خود ہی کریں گے۔ ہمارے پاس روسٹ کرنے کا پورا سامان موجود ہے۔ بس آگ کی کمی تھی، وہ آپ لوگن نے جلائی ہوئی ہے... بلکہ آپ بتائیں آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟''

عمران چہکا۔ ''میں نے کچھ چیزیں زندگی میں کبھی نہیں کھائیں یا اگر کھائی ہیں تو مجھے پتا نہیں چلا۔ مثلاً مچھلی تو بہت کھائی ہے لیکن کبھی مچھلا نہیں کھایا۔ بڑا مزے دار خرگوش اور کبوتر کھایا ہے لیکن بڑی مزے دار خرگوشنی یا کبوتری کبھی نہیں کھائی... تم لوگوں نے جل مرغ تو شکار کر رکھا ہے۔ اگر کوئی جل مرغی بھی ہے تو میں ضرور کھانا پسند کروں گا۔''

دلیپ مسکرایا۔ ''آپ دلچسپ بندے ہیں۔ اس پہلو سے تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ویسے یہ کافی تحقیق طلب اور مشکل کام ہے۔''

''پرندے یا جانور کی دُم اٹھانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بس ہم نے طے کر رکھا ہے کہ ہر مچھلی مؤنث اور ہر خرگوش مذکر ہوتا ہے۔'' ایک قہقہہ پڑا۔

دلیپ اٹھ کر اپنی جیپ کی طرف گیا اور جیپ کی اندرونی لائٹ جلا کر شکار شدہ پرندوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کا انداز ماہرانہ تھا۔ وہ روسٹ کرنے کے لیے شکار منتخب کر رہا تھا۔ میں بھی یونہی ٹہلتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کے نیچے اچانک میری نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی جس نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ اپنے جسم کا سارا خون مجھے اپنے سر کی طرف دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جو چمکتی ہوئی شے میں نے دیکھی، وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔

میں دلیپ سے پوچھے بغیر آگے بڑھا۔ میں نے خون آلود پرندوں اور خرگوشوں کو دائیں بائیں ہٹایا اور اس چمکیلی شے کو وضاحت سے دیکھا۔ میں نے پوری طرح پہچان لیا۔ میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی انٹینا تھا جو میں اس سے پہلے رنجیت پانڈے کے لوگوں کے پاس دیکھ چکا تھا۔ ٹیلے کے قریب جب ہمارے اور پانڈے کے درمیان گھمسان کا رن پڑا تھا اور پانڈے کو بھاگنا پڑا تھا تو یہ منحوس انٹینا ہمیں دیگر سامان کے ساتھ پڑا ملا تھا۔ یہ وہی سگنل وصول کرنے والی ڈیوائس تھی جس کے ذریعے پانڈے اپنے

خوں خوار ساتھیوں کے ساتھ میرے اور جیکی تک پہنچا تھا۔

دلیپ نے بھی دیکھ لیا کہ میں نے کیا کیا ہے اور کیا دیکھا ہے۔ اس کے چہرے نے ایک دم رنگ بدلا۔ وہ پلٹا اور تیزی سے بھاگا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی ٹانگوں میں جتنی طاقت ہے، وہ ساری استعمال کر کے نکل جانا چاہتا ہے۔ میں نے پستول نکالا اور اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اس پر دو فائر کیے۔ میرا ایک فائر اس کے سر میں عین گردن کے بالائی حصے پر لگا۔ وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا ایک درخت سے ٹکرایا اور ساکت ہوگیا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا دوسرا ساتھی بھی جو اپنا نام راہول بتا رہا تھا، اٹھ کر اندھا دھند دوڑا۔ اس جانب درخت قریب ہی تھے۔ وہ ان میں گھس گیا۔ عمران تو لپکتا ہوا میری طرف آ رہا تھا، اس دوسرے شخص کا پیچھا ہوشیار سنگھ نے کیا۔ ہوشیار سنگھ اس پر ہاتھ ڈالنے میں بھی کامیاب ہوگیا تھا لیکن وہ اسے سنبھال نہیں سکا۔ اس کی قمیص کا ایک ٹکڑا پھٹ کر ہوشیار سنگھ کے ہاتھ میں رہ گیا اور وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا تاریک درختوں میں اوجھل ہوگیا۔

یہ سارا واقعہ بس دس پندرہ سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہو گیا۔ شور و غل اور فائرنگ کی آوازوں نے گھوڑا گاڑی میں موجود افراد کو بھی جگا دیا۔ طلال، گردسو بھاش اور سلطانہ وغیرہ بھونچکے سے باہر نکل آئے۔

''یہ کیا ہوا ہے تابی؟'' عمران نے مجھ سے پوچھا۔

''ہم سب خطرے میں ہیں عمران! ہمیں کسی بھی وقت گھیرا جا سکتا ہے۔ ہمیں فوراً یہ جگہ چھوڑنی ہوگی۔ ابھی... اسی وقت...''

''لیکن پتا تو چلے۔''

''میں ابھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا اور بتاؤں گا بھی تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بس یہ سمجھو کہ یہ دونوں حرامزادے، حکم کے ہرکارے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ واکی ٹاکی کے ذریعے حکم کے گارڈز کو ہمارے بارے میں اطلاع دے چکے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

اسی دوران میں اقبال شکار شدہ پرندوں کے نیچے سے وہ چمکیلا انٹینا نکال چکا تھا۔ ''یہ کیا ہے تابش؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کے بارے میں بھی بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا چاہیے۔''

میرے لب و لہجے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے عمران نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی اٹھا کر بڑے الاؤ پر ڈال دی۔ پھر ایک ایک کر کے مشعلیں بھی بجھا دیں۔ کچھ ہی دیر میں وہاں صرف تاروں کی روشنی باقی رہ گئی۔ اس روشنی میں حکم کے جواں سال ہرکارے کی لاش اوندھے منہ گھوڑا گاڑی کے پہیے کے پاس پڑی تھی۔ شکاریوں کے بھیس میں یہ لوگ حکم کے کھوجی تھے اور وہ کھوج لگاتے ہوئے ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ اب یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں مثلاً رنجیت پانڈے ..... یا بلرام رائے وغیرہ کو اپنی کامیابی کی اطلاع دے چکے ہوں۔ مرنے والے کے سر کے عقبی حصے سے بہنے والا خون زمین پر ایک سیاہ نقشہ سا بنا رہا تھا۔ صرف دو منٹ پہلے یہ خون اس شخص کی رگوں میں تھا اور یہ ایک پُرلطف ڈنر کا انتظار کر رہا تھا۔

ہم نے پوری سرعت سے اپنا سامان سمیٹا اور گھوڑا گاڑی میں رکھ دیا۔ عمران نے جیپ کی تلاشی لی۔ اس کے اندر سے ایک برانڈی کی بوتل، ایک شاٹ گن، ایک واکی ٹاکی اور کچھ دیگر اشیا ملیں۔ جیپ کے اندر کافی مقدار میں فیول موجود تھا۔

عمران نے کہا۔ ''ہم جیپ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آگے جا کر فیصلہ کرلیں گے کہ اسے چھوڑنا ہے یا گھوڑا گاڑی کو۔''

میں نے اور اقبال نے اس رائے کی تائید کی۔ تاہم میں نے یہ کہا کہ ہم جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا کر رکھیں گے۔ زخمی گھوڑے کو بھی گاڑی میں جوت دیا گیا۔ مردہ شخص کی لاش کو جوں کا توں چھوڑ کر ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ میں عمران کے ساتھ جیپ میں تھا۔ جیپ عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ پوری طرح ایکشن میں تھا اور کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار۔

''یار! کچھ اشارہ تو دو۔'' وہ گھوڑا گاڑی کے پیچھے پیچھے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

''اشارہ یہ ہے کہ حکم کے کتے ہر جگہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں کہیں بھی جاؤں، وہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''یہ جدید دور ہے۔ اس میں سب کچھ ممکن ہے۔''

''تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو تابی۔'' عمران کے لہجے میں بے چینی تھی۔ جیپ کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سے سرد ہوا فراٹے بھرتی اندر آ رہی تھی اور عمران کے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے۔ میں نے اس کا بایاں ہاتھ تھاما اور اٹھا کر اپنے سر کے پچھلے حصے پر رکھا۔ میں نے اس کی انگلیوں کی دو پوروں کو اس خاص جگہ سے ٹچ کیا جہاں میں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اس کی پوروں کو تھوڑی سی حرکت دی۔ ''کچھ محسوس کیا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس، ایک ابھار سا ہے۔''

''یہی ابھار ہے جس نے میرے لیے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ جہاں پہنچتا ہوں، میری مصیبتیں میرے ساتھ وہاں پہنچ جاتی ہیں... اور اسی کی وجہ سے پچھلے تین سال سے میں بے شمار کوششوں کے باوجود اس منحوس اسٹیٹ کی حدود سے نکل نہیں پایا۔''

''یہ... ہے کیا؟''

''ایک الیکٹرانک چپ... جو میرے اسپائنل کینال کے اوپری سرے کے ساتھ پلانٹ کی گئی ہے۔ یہ سگنل نشر کرتی ہے۔ یہ وہی تکنیک ہے جو ریسرچر، جانوروں پر استعمال کرتے ہیں۔ انہیں چپ یا کالر لگا کر آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن وہ آزاد نہیں ہوتے۔ وہ جہاں بھی ہوں، انہیں ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔''

''اوہ گاڈ۔'' عمران نے ہونٹ سکیڑے۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولا۔ ''کچھ عرصے پہلے میں نے ایک خاص بندے سے اس سے ملتی جلتی بات سنی تو تھی۔ اس نے کہا تھا کہ حکم جی اور جارج گورا اپنے خاص قیدیوں کو کہیں بھاگنے نہیں دیتے۔ سادہ لوح لوگوں کا خیال ہے کہ حکم جی اپنی روحانی شکتی سے ہر وقت ان پر نظر رکھتا ہے مگر پڑھے لکھے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کسی جدید طریقے سے اپنی نگرانی میں رکھا جاتا ہے۔''

''بس یہی ہے وہ نگرانی... اور اس نگرانی کا انچارج جارج گورا کا بہنوئی ڈاکٹر اسٹیل ہے۔ وہی یہ خاص چپ باڈی میں پلانٹ کرتا ہے۔ یہ پیچھے جو انٹینا پڑا ہے، اس کا تعلق اسی چپ سے ہے۔''

''کیا تمہارے ذہن میں کبھی اسے نکلوانے کا خیال آیا؟'' عمران نے سنسناتی آواز میں پوچھا۔

''یہی تو ان لوگوں کی اصل خباثت ہے عمران۔ تم نے تل پانی کے جاپانی سرجن ڈاکٹر لی وان کا نام سنا ہے؟'' عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''وہ بڑا قابل بندہ ہے۔ میرا ایک ڈاکٹر دوست مجھے اس تک لے کر گیا تھا۔ اس نے چند ٹیسٹ کرنے کے بعد بتایا تھا کہ یہ چپ نکالنے کے لیے زیادہ سہولتیں درکار ہیں اور یہ یہاں اسٹیٹ میں نہیں ہیں۔ یہ چپ نکالتے ہوئے اسپائنل میرو کو نقصان پہنچ سکتا ہے جو زندگی کے لیے خطرے کا

اسپیشل گیند

بیٹسمین، ایک باؤلر کی زبردست پٹائی کر رہا تھا۔ باؤلر کا حوصلہ پست ہوگیا تاہم اس نے اپنے کیپٹن سے کہا۔ ''میں اب اسے اپنی اسپیشل گیند کراؤں گا۔ آپ دیکھیے گا، وہ پریشان ہو جائے گا۔''

کیپٹن نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

باؤلر نے اسپیشل گیند کرائی اور بے بسی سے گیند کو باؤنڈری لائن کے پار جاتے دیکھتا رہا۔ کیپٹن نے قریب آ کر اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ ''واقعی، تم نے اسے پریشان کر دیا۔'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''وہ ڈبل مائنڈ ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس گیند پر چوکا مارے یا چھکا؟''

کراچی سے دور یشم کا انتخاب

گھوڑا گاڑی ہمارے آگے جا رہی تھی۔ اس میں سلطانہ اور طلال کے علاوہ گردسو بھاش اور رائمی کی سندر پتنی رادھا بھی موجود تھی۔ ان کی حفاظت و نگرانی کے لیے اقبال سیون ایم ایم رائفل کے ساتھ گھوڑا گاڑی کے اندر تھا۔ تاروں کی روشنی میں اونچے نیچے راستوں پر گھوڑا گاڑی درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ اس کے پیچھے تھی۔

''کچھ پتا ہے ہم کس طرف جا رہے ہیں؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمارا رخ کچے کی طرف ہے اگر ہم...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ اس کی نگاہیں جیپ کے عقب نما آئینے پر تھیں۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحے تک آئینے میں دیکھتا رہا، پھر اس نے آئینے کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ میں نے دھیان سے دیکھا اور جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ جنتر، کیکر اور جنگلی بیریوں کی گھنی قطاروں کے عقب میں کچھ روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ ساکت نہیں متحرک روشنیاں تھیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ لگانا فی الحال مشکل تھا۔ ''کون ہو سکتے ہیں یہ؟'' عمران نے مستحکم لہجے میں پوچھا۔

''نوّے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ حکم جی کے

بند ہے۔''

عمران خاموش رہا۔ میں بھی خاموش رہا۔ ہم اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بڑی سنگین سچویشن تھی۔ مجھے لگا کہ میرے سینے میں دھڑکن کسی نقارے کی طرح گونج رہی ہے... کسی جنگلی نقارے کی طرح۔ یہ جان کر مجھے دلی راحت ہوئی کہ میرے اندر خوف نہیں ہے۔ اور اگر تھوڑا بہت ہے بھی تو وہ ایک میٹھے میٹھے جوش کی لہروں میں دبا ہوا ہے۔ یہ تو شاید میرے سپنوں کی رات تھی... ایک گھنا جنگل... ایک سرد اندھیری رات۔ اس رات میں سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے خطرات کے سائے... ہر پیڑ کے عقب میں موت کی گھات، ہر موڑ پر آسیبی پرچھائیاں... اور میرے ساتھ عمران جیسا دوست، میرے کندھے سے کندھا ملائے ہوئے۔ وہی عمران جو سنگین ترین اندیشوں کو سینے سے لگانے کا فن جانتا تھا۔ جو جان لیوا خطرات کو قہقہوں میں اڑاتا تھا اور جس کا کفن ہر وقت ایک چمکیلی دستار کی طرح اس کے سر سے بندھا رہتا تھا۔ ہاں، میرے پسندیدہ ترین تصورات کی رات تھی۔

اس سے پہلے لاہور کے گلی کوچوں میں بھی کچھ مواقع ایسے آئے تھے جب میں اور عمران ایک ساتھ کسی خطرے میں گھرے تھے مگر تب کی بات اور تھی۔ تب میں ایک اپاہج کی طرح عمران کے ساتھ گھسٹتا تھا... یا شاید وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتا تھا۔ آج میں اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ عمران کا ساتھ دینے کا حق ادا کر سکتا تھا۔

عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ واقعی حکم جی کے لوگ ہیں اور الیکٹرانک چپ کے بارے میں جو کچھ تم نے کہا ہے، وہ بھی صحیح ہے تو پھر ایک بات طے ہے۔ ہم جس طرف بھی جائیں گے، یہ لوگ ہمارے پیچھے آئیں گے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے... لیکن ایک بات ہے... اس سے پہلے میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک زمین دوز سرنگ میں تھا۔ وہاں اس چپ نے کام نہیں کیا تھا۔''

''لیکن ایسی سرنگ اب کہاں ڈھونڈیں گے؟ یا پھر ایک اور طریقہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

سنگین صورتِ حال کے باوجود عمران کا کھلنڈرا پن لوٹ آیا تھا۔ وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا۔ ''سرنگ بنا لیتے ہیں... اوس کی وجہ سے زمین نرم ہو رہی ہے۔ گھوڑا گاڑی میں ایک بیلچہ بھی میں نے دیکھا ہے۔ دو تین چاقو بھی ہیں ہمارے پاس۔''

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے ہمیں یہ تصدیق کرنی چاہیے کہ یہ حکم کے لوگ ہی ہیں۔ اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اگلے آدھ پون گھنٹے میں ایک دو بار اپنا رخ بدلیں۔''

''تم اب پھینا جھپٹی بھی کرنے لگے ہو۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔''

سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ مدھم آوازیں ہم تک پہنچیں۔ یقیناً یہ بوگیر کتوں کی آوازیں تھیں۔ یہ جنگلی کتوں کی آوازوں سے بالکل مختلف تھیں۔ میں اب انہیں پہچاننے لگا تھا۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ جیسے کوئی زبردست چال اس کے ذہن میں آ رہی ہو۔

اس نے جیپ کی رفتار تھوڑی سی بڑھائی اور اسے گھوڑا گاڑی کے برابر لے آیا۔ ہوشیار سنگھ بڑی چابک دستی سے دونوں گھوڑوں کو ہانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رنگین چابک تھا۔ وہ تن کر اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''ہوشیار سنگھ! اب تم ہمارے پیچھے آؤ۔ ہم اپنا راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔''

''کیا کہا جی؟ رستا تبدیل کر رہے ہیں؟'' وہ ہماری طرف جھک کر بلند آواز میں بولا۔

''نہیں یار! راستہ تبدیل کر رہے ہیں۔ میں اب تمہارے آگے چلتا ہوں۔ اس کو پنجابی میں کہیں گے... کہ میں تیرے اگے اگے چلاں گا۔''

ہوشیار سنگھ نے بتیسی نکالی اور اثبات میں سر ہلایا۔

عمران نے لینڈ روور کو گھوڑا گاڑی کے آگے لگا دیا۔ ہم بائیں رخ پر مڑ گئے۔ کہیں دور گھنے جنگل میں تیندوے کی مخصوص آواز ابھری اور سنسناہٹ بن کر دور تک پھیل گئی۔ ابھی ہم اس آواز کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک اور آواز نے بری طرح چونکا دیا۔ یہ کسی دہشت زدہ شخص کے چلانے کی آواز تھی اور یہ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ کوئی جنتر کے درختوں میں ہمارے نزدیک موجود تھا... اور کرب کے عالم میں آہ و بکا کر رہا تھا۔ مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے
جانبازوں کی داستان کے بقیہ
واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

عمران نے بھی تاریکی سے ابھرنے والی یہ روتی چلاتی آواز سن لی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر عمران نے اپنی رائفل کا سیفٹی لاک ہٹایا اور جیپ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

جیپ کو یوں رکتے دیکھ کر گارڈ بان ہوشیار سنگھ نے بھی گاڑی روک لی۔ عمران کے پیچھے پیچھے میں بھی جیپ سے باہر آگیا۔ تاریک جنگل میں کھلی جگہ پر ہونے کا احساس بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آپ ہر طرف سے اندیشوں کے گھیرے میں ہیں۔ کسی وقت، کسی بھی طرف سے کوئی جان دار شے آپ پر جھپٹ پڑے گی یا پھر کوئی زہریلا کیڑا مکوڑا آپ کو مصیبت میں ڈال دے گا۔ موجودہ صورت حال تو مزید تشویش ناک تھی کیونکہ چند لمحے قبل ہم نے تاریک درختوں میں کسی شخص کی کرب ناک آواز سنی تھی۔ ایک سیکنڈ کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ ہمیں روکنے کے لیے کوئی چال تو نہیں مگر پھر فوراً ہی مجھے اپنے اس خیال کو رد کرنا پڑا۔ آواز دوبارہ ابھری، اس کی دردناکی گواہی دے رہی تھی کہ کوئی شخص سخت مصیبت میں ہے۔ اس بار ہم آواز کے رخ کا صحیح تعین کرنے میں بھی کامیاب رہے۔ ہماری دائیں جانب جنتر کے کوتاہ قد درخت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ اتنے گھنے تھے کہ ان میں سے بس پیدل شخص ہی گزر سکتا تھا۔ ان درختوں کے عقب میں زمین کا ایک گہرا کٹاؤ تھا۔ ہم نے پچھلے آٹھ دس منٹ میں اس کٹاؤ کے ساتھ ساتھ ہی سفر کیا تھا۔ اس سطح مرتفع جیسے علاقے میں ایسے کٹاؤ کافی موجود تھے۔ ہموار زمین پر چلتے چلتے بندے کو ایک دم پتا چلتا ہے کہ وہ ایک گہری کھائی کے کنارے کھڑا ہے۔ یہ کھائی نہیں ہوتی، دراصل ایک اور سطح زمین ہوتی ہے جو گہرائی میں واقع ہوتی ہے۔

جو کرب ناک آوازیں ہم سن رہے تھے، وہ جنتر کے درختوں اور گہرائی کے درمیان سے ابھر رہی تھیں۔ ہم ٹارچ روشن کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اس لیے تاریکی میں ہی راستہ بناتے آواز کی سمت بڑھے۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں کوئی جانور ہے۔'' میں نے مدھم آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہم گولی نہیں چلا سکتے۔'' عمران نے تاکیدی انداز اختیار کیا۔

ایک دم انسانی آواز معدوم ہوگئی۔ جانور کی پھنکاریں سنائی دیتی رہیں۔ ہم نے چند قدم مزید اٹھائے تو ایک سنسنی خیز منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک تنومند جانور کسی شخص کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ یہ ایک سرخی مائل ریچھ تھا۔ اس علاقے میں سرخی مائل ریچھ پائے جاتے تھے اور میں نے ان کے بارے میں کافی کچھ سنا تھا۔ آج میں ایک ایسے ہی جانور کو اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک لرزا دینے والا تجربہ تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی، تاہم عمران کی ہدایت بھی مجھے یاد تھی کہ گولی نہیں چلانی۔ ایک لمحے میں

ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ زمین پر پڑا شخص مر چکا ہے یا بے ہوش ہوگیا ہے۔

میں نے ایک اور تحیر خیز منظر دیکھا۔ ایسا کام عمران ہی کرسکتا تھا۔ اس نے رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑا اور اسے لاٹھی کی طرح استعمال کرتا ہوا جانور پر جھپٹا۔ اس نے اس کی کمر پر ایک زوردار ضرب لگائی اور ساتھ ہی ”ہو... ہو“ کی بلند آواز نکالی۔

نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ مشتعل جانور نے اپنے نامعلوم شکار کو چھوڑا اور غضب ناک آواز کے ساتھ عمران کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی آنکھیں دو گول بٹنوں کی طرح تھیں اور چمک رہی تھیں۔ میں بے ساختہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اور رائفل پر گرفت مضبوط کرلی۔

گھوڑا گاڑی پر سے ہوشیار سنگھ نے ڈری ہوئی آواز میں پکارا۔ ”بھائی جی! یہ حملہ کردے گا۔ گولی ماردو۔“

عمران کا انداز بالکل مختلف تھا۔ مجھے اس کی بے پناہ اعصابی توانائی کا اندازہ ہوا۔ یوں محسوس ہوا کہ وہ کھلے جنگل میں ایک خطرناک درندے کے سامنے نہیں بلکہ سرکس کے پنڈال میں ہے اور کوئی سنسنی خیز کرتب دکھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان لمحوں میں وہ اس حقیقت سے بھی بالکل بے پروا ہو گیا کہ کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں اور ان کی طرف سے ہمیں شدید خطرہ ہے۔

ریچھ کا انداز جارحانہ تھا۔ وہ عمران کی طرف بڑھنے کی کوشش کررہا تھا اور عمران رائفل کے ڈراوے سے اسے خود سے دور رکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک رائفل کو لاٹھی کے انداز میں ہی پکڑا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ منہ سے ”ہو... ہا“ کی آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ شاید اسے امید تھی کہ جانور اس صورتِ حال سے ڈر کر پسپائی اختیار کرجائے گا مگر ایسا ہو نہیں پا رہا تھا۔

پھر میں نے اس کی آواز سنی۔ وہ التجا آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”مان جا... بڑے بھائی مان جا... تجھے اپنی پیاری ریچھنی کا واسطہ... اپنے بزرگوں کا واسطہ...“

ریچھ نے ایک بار پھر جھپٹنے کا انداز اختیار کیا اور غضب ناک آواز نکالی۔

”غصہ حرام ہوتا ہے یار... کیوں اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو۔ جاؤ شاباش۔ اچھے ریچھ بنو... شاباش... شاباش۔“

اس شاباشی کا الٹا اثر ہوا۔ ریچھ ایک بار پھر خطرناک انداز میں جھپٹا...

گھوڑا گاڑی کے اندر سے چلانے کی آواز آئی۔ یہ گرو کی سندر دھرم پتنی راودھا تھی۔ عمران پوری طرح تماشا دکھانے کے موڈ میں تھا۔ وہ جیسے رِنگ میں تھا اور ایک رِنگ ماسٹر کی طرح خطرناک درندے سے اٹھکیلیاں کررہا تھا۔ اس کی خطرات پسندی کبھی کبھی حد سے تجاوز کرنے لگتی تھی۔ یکایک صورتِ حال سنگین تر ہوگئی۔ ریچھ نے ایک زوردار جھپٹا مارا اور مجھے اندازہ ہوا کہ رائفل عمران کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔

عمران ایک دم پلٹ کر دوڑا۔ جانور بھی شاید اسی انتظار میں تھا۔ وہ پورے طیش سے عمران کے پیچھے لپکا۔ میں نے ان دونوں کو آگے پیچھے درختوں میں گھستے دیکھا... ان لمحوں میں مجھے محسوس ہوا کہ عمران مہم جوئی کے شوق میں ایک سنگین غلطی کرچکا ہے۔ شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا... ہوشیار سنگھ اور اقبال بھی افراتفری کے عالم میں گھوڑا گاڑی سے اتر آئے۔ ہم عمران کو آوازیں دیتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑے۔

اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ عمران کی آواز نہ جانور کی چنگھاڑیں۔ بس درختوں پر پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندے تھے جنہیں ہمارے شوروغل نے نیند سے بیدار کردیا تھا... رسک کے باوجود اقبال نے ٹارچ روشن کرلی۔ وہ چلا کر بولا۔ ”عمران! کہاں ہو... کہاں ہو؟“

”اس کو گانے والے انداز میں کہو تو اچھا لگے گا۔ کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں یہ بہاریں یہ سماں۔“ عمران کی آواز نے ہمیں ہلا دیا۔ یہ چہکتی ہوئی جاں فزا آواز ہمارے سروں کے اوپر سے آئی تھی۔

اقبال نے ٹارچ کا روشن دائرہ گھمایا۔ وہ ایک کیکر کی شاخ سے بندر کی طرح جھول رہا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے جسم کو دو تین ہلکورے دیے اور گھوم کر شاخ کے اوپر بیٹھ گیا۔ یہ بالکل وہی انداز تھا جو وہ سرکس میں کرتب کے جھولوں پر اختیار کرتا تھا۔ وہ جس درخت پر چڑھا بیٹھا تھا، وہ اس کھائی کے بالکل کنارے پر تھا جو ہمیں تاروں کی روشنی میں دور تک دکھائی دے رہی تھی۔

وہ جست لگا کر درخت سے اترا اور اپنے کپڑوں کی گرد جھاڑتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب مجھے اپنے یاروں کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں نے وہی کچھ کیا ہے جو انڈیانا جونز اور اس جیسی دوسری ایکشن فلموں میں اکثر ہیرو لوگ کرتے ہیں۔ ”ٹریمر“ میں تو ایک بالکل اس سے ملتا جلتا سین موجود تھا۔

ہیرو صاحب نے چکما دے کر ایک موذی جانور کو گہری کھائی میں گرا دیا تھا۔“

”تت... تمہارا مطلب ہے...“ اقبال ہکلایا۔ وہ گہرائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بالکل یہی مطلب ہے لیکن سب کچھ ویسا ہی نہیں ہوا جیسا تم سوچ رہے ہو۔“

”مگر...“

”اگر مگر بعد میں۔ پہلے اس بے چارے کو تو دیکھو کہ زندہ ہے یا گزر گیا۔“

ہم لپکتے ہوئے واپس اس جگہ پہنچے جہاں ہم نے مشتعل ریچھ کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ خشک پتوں سے اٹی ہوئی نم زمین پر وہ زخمی شخص بالکل ساکت پڑا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا کندھا اُدھڑا ہوا نظر آیا۔ کندھے پر سے لباس کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔ عمران اور اقبال نے اسے الٹ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ سامنے آیا تو ہم بھونچکے رہ گئے۔ مجھے اس کی آواز یونہی جانی پہچانی نہیں لگی تھی۔ یہ وہ دوسرا شخص تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے لینڈ روور جیپ سے نکل کر راہِ فرار اختیار کر گیا تھا۔ اس نے اپنا نام راہول بتایا تھا۔ اس کے ساتھی نے خود کو دیپ کے نام سے متعارف کرایا تھا اور وہ بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے پستول کی گولی سے ہلاک ہوا تھا۔ اس کی لاش ابھی تک وہیں کہیں درختوں میں پڑی تھی۔ ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ ہم اس کے دوسرے مفرور ساتھی کو اتنی جلدی دوبارہ دیکھیں گے اور وہ بھی ایسی حالت میں۔

ہم نے اس زخمی کو فوراً اٹھا کر گھوڑا گاڑی میں پہنچایا۔ اقبال اس کے کندھے کا خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس راہول نامی شخص کو حیرت انگیز طور پر کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ کندھے کے بڑے زخم کے سوا اس کے جسم پر کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ بس چند چھوٹی بڑی خراشیں تھیں۔ اس شخص کے بے ہوش ہونے میں شاید چوٹ سے زیادہ ذہنی صدمے کو دخل تھا۔

اس راہول نامی شخص کی طرف سے مطمئن ہو کر میں، عمران اور ہوشیار سنگھ پھر اس جگہ پر آئے جہاں عمران سرکس کے تماشے کی طرح درخت کی شاخ سے جھولتا نظر آیا تھا۔ عمران نے ٹارچ کا روشن دائرہ نیچے گہرائی میں پھینکا اور بولا۔ ”یہ ریچھ بھائی بڑے خوش قسمت نکلے ہیں۔ لگتا ہے کہ ریچھنی بھابی نے ان کے بازو پر امام ضامن باندھ کر شکار کے لیے بھیجا تھا۔“

”پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو تم؟“ میں نے بیزار لہجے میں کہا۔

اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ ایک بار پھر گہرائی میں پھینکا اور مجھے کچھ دکھانے کی کوشش کی۔ یہ گہرائی کی عمودی ڈھلوان پر اُگی ہوئی دو جڑواں جھاڑیاں تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ نیم اُفقی رخ پر اگی ہوئی ہیں۔ ان جھاڑیوں پر کچھ ایسے نشانات دکھائی دیے جنہیں خون کے نشانات کہا جاسکتا تھا۔ بہرحال تیس چالیس فٹ کی گہرائی میں ٹھیک سے دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔

عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”بھائی ریچھ صاحب بچ گئے ہیں۔ وہ کسی میزائل کی طرح اندھا دھند میرے پیچھے لپکے تھے۔ میں تو کنارے پر پہنچ کر شاخ سے جھول گیا اور وہ نیچے تشریف لے گئے لیکن قسمت اچھی تھی جو تحت الثریٰ میں جانے کے بجائے ان جھاڑیوں میں گرے اور پھر یہاں سے سنبھل کر نیچے اتر گئے۔ میرے خیال میں اگر ہمارے پاس سرچ لائٹ ہوتی تو ہم انہیں نیچے کہیں حرکت کرتے دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح سے...“ عمران نے لنگڑاہٹ کے ساتھ تھوڑا سا چل کر دکھایا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ ”پھر ہمیں اتنی تسلی سے یہاں کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ بھائیا ریچھ صاحب دائیں بائیں سے چکر کاٹ کر پھر ہمارے پاس پہنچ جائیں۔“

عمران مجھ سے مخاطب ہو کر چہکا۔ ”جگر! اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ نہ دیکھو کہ کس نے بات کہی ہے، یہ دیکھو کہ کیا بات کہی ہے۔ سردار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب ہمیں یہاں سے کھسکنا چاہیے۔ ویسے بھی ہمارے سسرالی اب قریب آتے جارہے ہیں۔“ عمران نے دور نیچے درختوں میں حرکت کرتی روشنیوں کو دیکھ کر کہا۔

یہ ریچھ اور راہول والا سارے کا سارا واقعہ بہ مشکل چھ سات منٹ میں مکمل ہوگیا تھا... یا زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگے ہوں گے۔ اس دوران میں ہمارا تعاقب کرنے والی روشنیاں زیادہ واضح دکھائی دینے لگی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ روشنیاں بتدریج ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔

ہمارے واپس آنے تک گھوڑا گاڑی کے اندر اقبال نے راہول کے کندھے سے بہنے والا خون بند کرکے وہاں پٹی باندھ دی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک شدید صدمے اور نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کے لباس اور چہرے پر ریچھ کے سرخی مائل بال چپٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔ راہول کو دیکھنے کے بعد میں جیپ میں واپس آگیا۔ ہم پھر روانہ ہوگئے۔

اب جیپ آگے تھی اور گھوڑا گاڑی اس کی راہنمائی میں چل رہی تھی۔ ہم اپنے عقب سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ اچانک ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے گھوم کر اس انٹینا کو دیکھا جو شکار شدہ پرندوں کے ساتھ ہی جیپ کی عقبی نشست پر پڑا تھا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! کہیں ہمارا یہ اندازہ غلط تو نہیں کہ ہمارے پیچھے حکم جی کے لوگ ہیں؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''جو انٹینا سگنل وصول کرتا ہے، وہ ہمارے پاس ہے۔ اگر ان لوگوں کے پاس کوئی دوسرا انٹینا نہیں ہے تو وہ ہمارے پیچھے کیسے آسکتے ہیں؟''

''ہوسکتا ہے کہ ان کے پاس دوسرا انٹینا ہو۔''

''یہ تو ایک قیاس ہی ہے نا۔''

''چلو ابھی تھوڑی دیر میں پتا چل جاتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

میرا تجربہ ہے کہ بندہ بعض اوقات ایک چیز کے بارے میں قیاس کرتا ہے پھر اس کا قیاس پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور حالات کے سارے اشارے قیاس کو مضبوط کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ آخر میں وہ قیاس بالکل غلط ثابت ہوجاتا ہے۔ اب ہم سوچ رہے تھے کہ ہمارے پیچھے حکم جی کے لوگ آرہے ہیں۔ راہول اور دلیپ کے انٹینا سمیت پکڑے جانے کی وجہ سے ہمارے اندر ایک اندیشہ پیدا ہوا تھا اور اب یہ مضبوط ہوتا جارہا تھا۔ حالانکہ یہ غلط بھی ہوسکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ ستیش اور اس کے ساتھی ہوں جو استھان سے ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہوں یا پھر ڈکیتوں کا کوئی گروہ ہو، جیسا کہ دلیپ اور راہول نے بتایا تھا کہ یہاں ایسے جتھے گھومتے رہتے ہیں... اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بالکل ہی غیر متعلق لوگ ہوں جو بس اپنے کام سے کام رکھتے ہوں اور اپنی راہ پر چلے جارہے ہوں۔

ہم آگے بڑھتے رہے، روشنیاں ہمارے پیچھے رہیں۔ گھنے درختوں کے درمیان سے ہمیں گاہے بگاہے ان کی جھلک دکھائی دیتی تھی، تاہم ہم مکمل اندھیرے میں سفر کررہے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہماری رفتار بھی کم تھی۔ عقبی روشنیاں ہمارے قریب آتی جارہی تھیں مگر پھر ایک موقع ایسا آیا جب ہمیں اندازہ ہونے لگا کہ یہ حکم جی کے لوگ نہیں ہیں... ہمارے پیچھے آنے والی روشنیاں واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گئیں۔ کچھ روشنیاں تو ہماری سیدھ میں سفر کرتی رہیں اور کچھ ایک نیم دائرے کی شکل میں بائیں رخ پر نکل گئیں۔ یہ لوگ جیسے دو مختلف اطراف میں سفر کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ

انداز بتاتا تھا کہ وہ کسی کی تلاش میں ہیں لیکن جسے تلاش کر رہے ہیں، اس کی سمت کا ٹھیک پتا انہیں بھی نہیں ہے۔

''اب کیا خیال ہے تمہارا؟'' عمران نے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''شاید یہ حکم جی کے لوگ نہیں ہیں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''یہ بات تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ یہ لوگ سیدھے ہمارے پیچھے نہیں آرہے مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ حکم کے ہرکارے ہی ہوں مگر ان کے پاس سگنل وصول کرنے والا انٹینا نہ ہو... ابھی تم نے یہی بات کہا ہے نا؟''

''تمہاری بات درست ہے۔'' میں نے تائید کی۔ ''لیکن ایک اور بات بھی سوچنے کی ہے۔ اگر یہ حکم کے لوگ ہی ہیں اور دلیپ وغیرہ نے واکی ٹاکی پر انہیں ہمارے بارے میں اطلاع دی ہے تو پھر ابھی تک یہ واکی ٹاکی خاموش کیوں ہے؟''

''اب تمہاری عقل، کچھ کچھ کام کرنا شروع ہوگئی ہے۔'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

واکی ٹاکی ابھی تک چالو حالت میں تھا اور ڈیش بورڈ پر رکھا تھا۔ اس کی رینج اتنی تو ضرور رہی ہوگی کہ چار پانچ میل کے دائرے میں کام کرسکے اور اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس پر کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ تو ہونی ہی چاہیے تھی۔

ہم نے سفر جاری رکھا۔ جو ٹولی ہماری سیدھ میں آرہی تھی، اس کا فاصلہ اب ہم سے قریباً نصف کلومیٹر رہ گیا تھا۔ یہ لوگ یقیناً گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ شاید دو چار ٹارچیں بھی ہوں۔ مشعلوں کی سرخ روشنی ٹارچوں کی روشنی سے بالکل مختلف دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جو ٹولی ہمارے پیچھے آرہی ہے، اس کے پاس کتے نہیں ہیں۔ کتوں کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہماری کوئی نیکی ہمارے کام آنے والی ہے۔'' عمران نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، لگ تو مجھے بھی رہا ہے۔''

اور واقعی صورت حال میں اچھی تبدیلی نظر آرہی تھی۔ ہمارے پیچھے آنے والی ٹولی ہمارے پیچھے آنے کے بجائے تھوڑا سا بھٹکی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

درختوں کا ایک گھنا جھنڈ نظر آرہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''کیوں نہ ہم کچھ دیر کے لیے ان درختوں کے پیچھے رک جائیں؟''

''دیکھ لو، ان معاملوں میں تمہارا تجربہ کہیں زیادہ

ہے۔''

''صرف ان معاملوں کی بات نہیں، میرا تجربہ ویسے بھی زیادہ ہے۔'' اس نے کہا اور گاڑی روک دی۔

ہمارے عقب میں گھوڑا گاڑی بھی رک گئی۔ گھوڑوں کے نتھنوں سے بھاپ خارج ہورہی تھی۔ ان کے پاؤں کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ عمران جیپ کو آہستہ روی سے چلا کر جھنڈ کے پیچھے لے گیا۔ ہوشیار سنگھ بھی گاڑی وہیں لے آیا۔

''کیوں جی، رک کیوں گئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

عمران بولا۔ ''اسے رکنا نہیں، بریک لینا کہتے ہیں اور یہ بریک ایسی چیز ہے جس کے بغیر آج کل کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ٹی وی چینل تو چلتے ہی بریک لینے کے لیے ہیں۔ بس بریکوں کے درمیان کہیں کہیں پروگراموں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور غور کرو، کتنی برکت ہے ان بریکوں میں۔ اب ہر طرف چینل ہی چینل اور بریکیں ہی بریکیں نظر آتی ہیں۔''

''تو آپ بھی برکت کے لیے رکے ہیں؟'' ہوشیار سنگھ نے پوچھا۔

''بے شک، کبھی کبھی حرکت نہ کرنے میں بھی برکت ہوتی ہے۔'' عمران نے کہا اور دور عقب میں متحرک روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

یوں لگ رہا تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والے ہماری دائیں جانب کوئی دو تین سو میٹر کے فاصلے سے گزر جائیں گے۔ ہم اپنی جگہ دم سادھے بیٹھے رہے اور ان کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ روشنیاں قریب آتی گئیں۔ قریب آنے کے بعد ان کا رخ ایک بار پھر تبدیل ہونے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ سیدھا اس جھنڈ کی طرف ہی آجائیں گے۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ ہمارے ذہنوں میں موجود تمام تر اندیشے ایک بار پھر جاگ گئے۔ کہیں واقعی ہمیں کسی ذریعے سے ٹریس تو نہیں کیا جارہا تھا؟

اگر ایسا تھا تو پھر ہمارا یہاں رکنا واقعی بہت بڑی غلطی تھی۔ یہ جگہ ایسی نہیں تھی کہ مناسب طریقے سے مورچا بندی کی جاسکتی۔ بہرطور ہم نے اپنی رائفلیں وغیرہ تیار کرلیں اور ہر طرح کی صورت حال کے لیے الرٹ ہوگئے۔

متحرک روشنیاں ہمارے سامنے سے صرف ساٹھ ستر میٹر کی دوری سے گزر گئیں۔ یہ قریباً پچاس کے قریب گھڑسوار تھے۔ ان کی مشعلوں کی روشنی تاریک جنگل میں عجیب منظر پیش کررہی تھی۔ وہ آپس میں بلند آواز میں باتیں بھی کررہے تھے۔ پھر ان میں سے کسی نے بجرنگ بلی کا زوردار نعرہ لگایا اور جواب میں جے جے کار سنائی دی۔ انہیں دیکھنے اور سننے

نئی لغت

پانی: جس کی قیمت دودھ میں ڈال کر معلوم کی جاسکتی ہے۔

حقہ: دس سگریٹ، ایک ہی کش میں۔

شوہر: کاش یہ خطاب مجھے نہ ملا ہوتا۔

زبان: یہ بغیر پیٹرول کے چلتی ہے۔

دادی: پرانا ماڈل۔

عورت: ایک خطرہ، بغیر سگنل کا۔

خبرنامہ: پی ٹی وی کا سب سے پرانا کھیل۔

آرٹسٹ: چلتی پھرتی مشین۔

معیاری کھیل: انتظار فرمائیے۔

ثابت قدم: جو شادی کرکے بھی نہ پچھتائے۔

جوتے: کنواروں کے پہننے کے لیے اور شوہروں کے کھانے کے لیے۔

شعر: جس کے دونوں مصرعے آپس میں حقیقی بھائی ہوں۔

فورٹ عباس سے محمد عباس مرزا کی لغت

کے بعد ہمیں اس بات میں ذرا سا شبہ بھی نہیں رہا کہ یہ حکم جی کے لوگ نہیں ہیں۔ دراصل یہ لوگ استھان سے ہمارے پیچھے آئے تھے۔ یقیناً ان میں ستیش، مہندر، بھولا ناتھ اور ان کے بہت سے جنونی ساتھی بھی شامل تھے۔ یہ لوگ غصے میں بپھرے ہوئے تھے۔ ہم نے استھان میں ان کے کم از کم تین بندوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہی نہیں، ہم مہا گرو اور اس کی پتنی کو یرغمال بنانے کے قصوروار بھی تھے... اور اس کے علاوہ ہمارا ایک بڑا پاپ یہ تھا کہ ہم نے سلطانہ جیسی ''اپراودھن'' کو قرار واقعی سزا سے بچایا تھا اور اسے استھان میں سے لے کر صاف نکل آئے تھے۔

یہ غضب ناک ٹولہ ہمارے قریب سے گزرتا رہا اور ہم جھنڈ کے پیچھے ساکت و جامد موجود رہے۔ اس موقع پر ہمارے گھوڑوں میں سے کوئی ہنہناتا یا پھنکارنا شروع کردیتا تو بھی ہمارے لیے مشکل کھڑی ہوسکتی تھی۔ بہرطور یہ وقت بہ خیریت گزر گیا۔ روشنیاں ہم سے دور ہوتی چلی گئیں اور پھر دھیرے دھیرے تاریک درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئیں۔ اب بس کبھی کبھی ان کی جھلک سی دکھائی دیتی تھی۔ ہم ایک

نہایت نازک صورت حال سے بہ خیریت گزر گئے تھے اور ایسا صرف صبر و تحمل اور عمران کے مضبوط اعصاب کی وجہ سے ہو سکا تھا۔ اقبال، ہوشیار سنگھ اور طلال وغیرہ بھی گھوڑا گاڑی سے اتر آئے تھے۔

ہوشیار سنگھ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں جی۔ کبھی کبھی واقعی حرکت نہ کرنے میں بھی برکت ہوتی ہے۔''

ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہوا لیکن اس مرتبہ رخ تھوڑا سا مختلف تھا۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''ہم کہیں جا رہے ہیں یا بس یونہی سفر کرتے چلے جا رہے ہیں؟''

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''ہم سب کے سب کہیں جا رہے ہیں۔ راستے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔ ایک دن ہم سب نے ایک تاریک اندھیرے میں گم ہو جانا ہے۔''

''وہ تو ہو ہی جانا ہے لیکن میں اب کی بات کر رہا ہوں۔''

''اب ہم ایک ڈراما کرنے جا رہے ہیں۔'' عمران روانی سے بولا۔

''مجھے بھی ڈرامے میں کام کرنے کا بڑا شوق ہے جی۔'' ہوشیار سنگھ نے کہا۔ ''ادھر ہم انڈین پنجاب میں پاکستانی ڈرامے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ خاص طور سے اسٹیج ڈرامے۔ ہنس ہنس کر ہماری تو پسلیاں پیڑ کرنے لگتی ہیں۔''

''لیکن یہ اور طرح کا ڈراما ہے۔ یہ ہم جن کے لیے کر رہے ہیں، ان کو ہنسی نہیں آئے گی۔ رونا آ جائے تو اور بات ہے۔''

ہوشیار سنگھ نے عمران کو تھوڑا سا کریدنا چاہا مگر جب وہ مجھے بتا کر نہیں دے رہا تھا تو ہوشیار سنگھ کو کیسے بتا دیتا؟ ادھر اُدھر کی ہانک کر اس نے ہوشیار سنگھ کو خاموش کر دیا۔

ہم نے مناسب رفتار سے تقریباً پانچ کلومیٹر تک سفر کیا۔ یہاں تک کہ ایک پتھریلی ڈھلوان کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ وسیع ڈھلوان نیچے بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی... خاکستری پتھروں والی یہ ''ڈھلوان سطح'' دراصل اسی کھائی کا ایک حصہ تھی جہاں ہم کچھ دیر پہلے رکے تھے اور جہاں عمران نے بڑے ڈرامائی انداز سے ایک خطرناک جنگلی ریچھ سے پیچھا چھڑایا تھا۔ وہ مناظر ابھی تک ہم سب کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔

ڈھلوان کے عین کنارے پہنچ کر ہمارا مختصر قافلہ رک گیا۔ ایسا عمران کی ہدایت پر ہی کیا گیا تھا۔ عمران تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ بظاہر لگتا تھا کہ وہ آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہا ہے لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سب کچھ اس کے ذہن میں پہلے سے طے ہے۔

ذرا دیر بعد اس نے اسٹیئرنگ وہیل گھمایا اور جیپ کو ڈھلوان میں اتارنے کے بجائے دائیں رخ پر موڑ دیا۔ گھوڑا گاڑی بھی ہمارے پیچھے آئی۔ صرف سو ڈیڑھ سو میٹر چلنے کے بعد ہم پھر رک گئے۔ اس مرتبہ ہمارے سامنے ایک آبی گزرگاہ تھی جو شیشم، جنتر اور یوکلپٹس کے گھنے درختوں میں آہستہ روی سے بہتی ہوئی جنوب کی سمت جا رہی تھی۔ یہاں کناروں پر جنگلی گھاس تھی اور نیم تاریکی میں پانی کی مدھم کلکل سنائی دیتی تھی۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس جھاڑو پھیرنا ہے اور تھوڑی سی جھاڑ پونچھ کرنی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں اجلاس ہونا ہے درختوں کے نیچے۔ دراصل امریکی ریاست ہونولولو میں ہمارے نیوز چینل فساد پلس کے فوٹو گرافر کا کیمرا توڑا گیا ہے اور لیڈی رپورٹر کے بال کھینچے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر احتجاج کا پروگرام ہے۔ بہت سی چڑیلیں اور چڑیلے یہاں جمع ہونے والے ہیں...''

مجھے یقین تھا کہ عمران جھاڑو دینے والی بات مذاق میں کر رہا ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی جب دس پندرہ منٹ بعد عمران اور اقبال واقعی صفائی پر کمربستہ نظر آئے... انہوں نے چھوٹے دستے والی کلہاڑی کی مدد سے درختوں سے کئی ایک شاخیں توڑیں۔ ان شاخوں کے ساتھ پتے بھی موجود تھے اور وہ دیکھنے میں جھاڑوؤں کی طرح لگتی تھیں۔ عمران نے میرے علاوہ ہوشیار سنگھ، طلال اور گردو سو بھاش وغیرہ کو بھی یہ جھاڑو نما شاخیں تھما دیں۔

اگلے پندرہ بیس منٹ تک ہم کافی مصروف رہے۔ پختہ ڈھلوان سے واپس مڑ کر ہم نے قریباً ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس کچے راستے پر جیپ اور گھوڑا گاڑی کے پہیوں نے جو بھی ہلکے پھلکے نشانات بنائے تھے، وہ ہم نے شاخوں کی مدد سے یکسر ناپید کر دیے۔ یہاں خشک پتوں کی بہتات تھی۔ نشانات ختم کرنے میں ان پتوں نے بھی کافی مدد کی۔ عمران اور اقبال نے بیٹری بار ٹارچیں جلائیں اور مختلف جگہوں سے جائزہ لے کر اس بات کا اطمینان کیا کہ نشانات واقعی اوجھل ہو چکے ہیں۔

اب ہم ایک بار پھر گاڑیوں میں آ بیٹھے۔ عمران نے بلاتردد جیپ آبی گزرگاہ میں اتار دی۔ یہاں پانی اتھلا تھا۔ کئی جگہوں پر تو گہرائی ڈیڑھ دو فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ جہاں زیادہ تھی، وہاں بھی تین فٹ سے زیادہ نہ ہوگی۔ ہم بہاؤ کے رخ پر جیپ چلاتے آگے بڑھتے رہے۔ گھوڑا گاڑی کے گھوڑے پھنکارتے اور ہانپتے ہوئے ہمارے عقب میں رہے۔ اب میرے لیے یہ جاننا دشوار نہیں تھا کہ عمران نے اپنے سفر کے نقوش مٹانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر کچھ لوگ ہماری گاڑیوں کے پہیوں کے نشانات کے ذریعے ہمارا پیچھا کرتے تو سو فیصد بھٹک جاتے۔ وہ پتھریلی ڈھلوان تک پہنچتے اور یہی سمجھتے کہ ہم ڈھلوان پر اتر گئے ہیں... کیونکہ اس کے بعد انہیں اردگرد کہیں بھی ہمارے سفر کے نقوش نظر نہیں آتے۔

ہم نے پایاب پانی میں بہاؤ کے رخ پر قریباً آٹھ کلومیٹر تک سفر کیا۔ اس سفر کی رفتار تو سست رہی لیکن ہمیں کہیں بھی کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ صرف ایک دو جگہ ایسا ہوا کہ گھوڑا گاڑی کے پہیے پانی کے اندر کسی کھڈے میں اٹکے اور ہمیں اپنی پتلونیں اور پاجامے اڑس کر اور رخ پانی میں اتر کر اسے دھکا لگانا پڑا۔

بالآخر باریک سنگریزوں کے اوپر پانی کا یہ سفر ختم ہوا اور ہم اس آبی گزرگاہ سے باہر نکل آئے۔ اس سفر کے دوران میں عمران کی دلچسپ گفتگو جاری رہی تھی۔ اس نے کہا کہ آج جس طرح اس نے آٹھ نو کلومیٹر تک ندی میں جیپ چلائی ہے، اسی طرح وہ عنقریب سڑک پر کشتی چلا کر دکھائے گا اور ملک و ملت کا نام روشن کرے گا۔ اس بات پر ہوشیار سنگھ خوب ہنسا تھا۔

سفر میں لگنے والے مسلسل ہچکولوں کے سبب گھوڑا گاڑی میں زخمی براہول کو تکلیف ہوتی رہی تھی اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی کراہتا رہا تھا۔ اس کی کراہیں بار بار ہمارے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں۔ ان کراہوں میں تکلیف کے ساتھ ساتھ دہشت کا عنصر بھی شامل تھا۔ وحشت کی وجہ یقیناً وہ لرزہ خیز واقعہ ہی تھا جو اس شخص کے ساتھ تاریک درختوں میں پیش آیا تھا۔ جنگلی ریچھ کی دہشت، اس کا براہول کو چھوڑ کر عمران پر حملہ آور ہونا اور پھر خطرناک انداز میں اچھلنا اور جھپٹنا... سب کچھ میری نگاہوں میں آیا اور سنسنی جگا گیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ اس وقت عمران کی جگہ میں ہوتا، ریچھ اس کے بجائے میرا پیچھا کرتا اور عمران کے بجائے میں اس سے نمٹتا۔

ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ میں نے عمران سے کہا۔ ''کچھ بتاؤ بھی کہ ہمیں جانا کہاں ہے؟''

''یار! بتایا تو ہے کہ وہاں جانا ہے جہاں سب جاتے ہیں... اور کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ زندگی سفر اور منزل موت... یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ شیلے نے کہا تھا...''

''شیلے گیا بھاڑ میں۔ اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں واقعی تپ گیا۔

''اچھا... اچھا... اب ہم فتح پور جا رہے ہیں... واقعی فتح پور جا رہے ہیں۔ یہ قصبے کے پاس ہی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ یہاں سے گومتی ندی کی ایک بڑی شاخ گزرتی ہے۔ بہت ساری مچھلی پائی جاتی ہے اس پانی میں۔ یہاں کے لوگ مچھلی پکڑتے ہیں اور مزے کرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ میرے رشتے دار ہیں۔''

''رشتے دار ہیں؟''

''ہاں، میں نے یہاں کئی ایک شادیاں کر لی ہیں۔ آٹھ دس تو میرے سسرالی گھر ہیں۔ آگے ان کی رشتے داریاں ہیں۔ لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔''

''کیا ہانک رہے ہو؟''

''مذاق نہیں کر رہا جگر! یہاں آ کر میں نے جلال الدین اکبر اعظم کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اس شخص کو بھی باہمی رواداری اور امن محبت قائم رکھنے کا ایک بڑا اچھا گر ہاتھ آیا ہوا تھا۔ اس نے ہر مذہب فرقے اور ذات کی نیک بیبیوں سے شادیاں کر لی تھیں۔ انجوائے منٹ کی انجوائے منٹ اور امن کا امن۔ جہاں کہیں بغاوت پھوٹنے کا اندیشہ ہوتا تھا، مغلِ اعظم صاحب دولہا بن کر پہنچ جاتے تھے اور مستقبل کے باغی ان کے قریبی رشتے دار بن کر ان کی عنایتوں سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیتے تھے۔ اسی طرح بغاوتیں ٹل ٹل کر جناب چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کر گئے۔ میں نے بھی فتح پور میں اس طریقۂ حکومت کو چھوٹے پیمانے پر آزمانے کی کوشش کی ہے۔''

''اکبر اعظم نے تو اپنا دین بھی بنا لیا تھا۔ تم نے کون سا شوشا چھوڑا ہے؟'' میں نے اس کی گپ میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''اب تم آ گئے ہو تو شوشا چھوڑنے میں کون سی دشواری ہے۔ مل بیٹھ کر کچھ کر لیں گے۔''

وہ اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا لیکن اس بات کا صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ایک طے شدہ راستے پر جا رہا ہے۔

قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہمارے اردگرد درختوں کی بہتات دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ پھر سرکنڈے اور جھاڑیاں نظر آنی شروع ہوئیں۔ یہ مناظر اس بات کی علامت تھے کہ ہم کسی جھیل یا ندی کے قریب ہیں۔ جلد ہی

جمیں ایک چھوٹی سی بستی کے آثار نظر آئے۔ کسی کسی گھر میں لالٹین کی مدھم روشنی موجود تھی۔ بستی کے بیچوں بیچ ایک پرانے مندر کی مخروطی چھت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مسجد کا مینار بھی تھا۔ رات کا اندھیرا اب دھیرے دھیرے صبح کے اجالے میں مدغم ہو رہا تھا۔ نیم تاریک آسمان پر صبح کا تارا بہت روشن نظر آتا تھا۔ یہ چھوٹی سی بستی رات بھر کی نیند کے بعد جیسے ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔

ہمارے بستی تک پہنچتے پہنچتے کافی روشنی ہو گئی۔ بستی کی کچی زمین اوس سے نم تھی۔ دھند کے ریلے گلی کوچوں میں گشت کر رہے تھے۔ جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لیے لوگوں نے گھروں کے اردگرد باڑیں سی بنا رکھی تھیں۔ بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی عمران نے جیپ ایک جگہ گھنے سرکنڈوں کے اندر کھڑی کر دی۔ شکار کا گوشت اور اینٹینا وغیرہ جیپ سے نکال لیا گیا۔ اس اینٹینا کو راستے میں ہی عمران نے ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ دوبارہ کسی کے ہتھے چڑھے اور ہمارے لیے مصیبت کا باعث بنے۔ ہم پیدل ہی آگے بڑھے۔ گھوڑا گاڑی ہمارے ساتھ ساتھ بستی میں داخل ہوئی۔ دو نوجوان مویشیوں کو ہانکتے ہوئے کھیتوں کی طرف لے جا رہے تھے۔ انہوں نے گھوڑا گاڑی کو اور اس کے سکھ کوچبان کو ذرا تعجب سے دیکھا۔ پھر ان کی نگاہ میرے پہلو میں چلتے عمران پر پڑی اور ان کے چہروں سے تردد دور ہو گیا۔ ایک نوجوان نے دور ہی سے ہاتھ اٹھا کر ہانک لگائی۔

"سلام عمران بھیا۔" دوسرے نے کہا۔ "نمستے عمران بھائی۔"

عمران نے دونوں کے سلام کا جواب خوش دلی سے دیا۔ کچھ آگے گئے تو ایک بڑھیا نے عمران کی بلائیں لیں۔ لگتا تھا کہ وہ ہر جگہ کی طرح اس بستی میں بھی کافی مقبول ہے۔ چھوٹے بڑے اس سے بے تکلف دکھائی دے رہے تھے۔ عمران کو دیکھ کر ان کے چہروں پر عجیب سی خوشی چمک جاتی تھی۔

ہم مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد مندر کے پچھواڑے واقع ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے پہنچے۔ عمران نے لکڑی کے بند دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر اندر سے کسی بڑی عمر کے شخص نے ڈری ڈری آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں تایا۔" عمران نے جواب دیا۔

اندر والے کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ عمران نے بھی جواب دہرایا۔ مزید تصدیق کے لیے کسی نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا... اور آخر کنڈی ہٹا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے پچاس پچپن سال کا ایک کمزور شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مضبوط لاٹھی تھی۔

عمران نے اسے "سلام تایا" کہا۔

وہ بھی گھوڑا گاڑی کو دیکھ کر حیران ہوا۔ "ان میں کون ہے؟" اس شخص نے پھر ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا۔

"اپنے ہی لوگ ہیں تایا۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ بڑی دور سے آئے ہیں۔ کچھ کھانے وانے کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔"

اسی دوران میں مہاگرو سوبھاش، اس کی چٹی رادھا، طلال، سلطانہ اور اقبال وغیرہ بھی گاڑی سے اتر آئے۔ راہول ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کے اردگرد تین رائفلیں موجود تھیں اور وہ جانتا تھا کہ بھاگنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ گھر کا مالک اقبال اور عمران کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا۔ ہم سب عمران اور اقبال کے ساتھ اندر آ گئے۔ گھر کا صحن کشادہ تھا۔ ایک برآمدہ اور اس کے عقب میں تین چار نیم پختہ کمرے تھے۔ ایک طرف سرکنڈوں کے چھپر کے نیچے دو بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچے صحن میں مرغیاں بھاگتی پھرتی تھیں۔ گھر کی حالت سے گھر والوں کی کمزور مالی حالت کا اندازہ ہوتا تھا۔

ایک کمرے کی کھڑکی کے پیچھے تھوڑی سی ہلچل نظر آئی جس سے اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی پردہ دار عورت یا عورتیں موجود ہیں۔

عمران نے ادھیڑ عمر شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ تایا افضل ہیں... یہ یہاں کے پرانے چوکیدار ہیں۔ کچھ دن پہلے ان کی بیوی فوت ہوئی ہے۔ تب سے یہ چوکیداری چھوڑ چکے ہیں اور گھر میں ہی رہتے ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں بھی ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کھڑکی کے بوسیدہ پردے کے پیچھے جو ہلچل نظر آئی تھی، وہ ان کی بیٹیوں کی ہو گی۔

تایا افضل اتنے سارے مہمانوں کو دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ عمران نے زخمی راہول کو اقبال کی نگرانی میں دے دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہے۔ راستے میں راہول نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ حکم جی کے لیے ہی کام کرتا ہے اور اپنے ساتھی دلیپ کے ساتھ مجھے ٹریس کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ تاہم اس نے اصرار کے ساتھ کہا کہ میری یہاں موجودگی کا علم ابھی اس کے کسی ساتھی کو نہیں ہوا۔ اس کے تقریباً دو درجن مسلح ساتھی سات آٹھ میل

کی دوری پر ایک زرعی گودام میں موجود تھے۔ یہ لوگ رنجیت پانڈے کی کمان میں تھے۔ میرے ٹریس ہو جانے کے بعد دلیپ اور راہول اپنے کمان دار رنجیت پانڈے سے رابطہ کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ وائی ٹاکی پر کوشش کر رہے تھے لیکن اسی دوران میں وہ سگنل وصول کرتے ہوئے ہمارے زیادہ قریب چلے آئے اور ہمارے ساتھ ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔

عمران نے سلطانہ اور رادھا کو تو افضل کی بیٹیوں کے پاس کمرے میں بھیج دیا اور ہمیں لے کر ایک دوسرے کشادہ کمرے میں آ گیا۔ جب سلطانہ اور رادھا کمرے میں جا رہی تھیں، میں نے دیکھا کہ افضل کی نظر سلطانہ پر پڑی ہے اور وہ کچھ چونکا ہے۔ اس کے بعد اس کے چہرے کی پریشانی میں ایک طرح کا تجسس بھی شامل ہو گیا۔ وہ بار بار سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہا ہو۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ عمران کو کندھے سے پکڑ کر برآمدے کی طرف لے گیا۔

عمران کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں گھر کے اندر سے تلے ہوئے انڈوں اور حلوے وغیرہ کی دھیمی خوشبو آنے لگی تھی۔ حلوے کی خوشبو محسوس کرنے کے بعد مہا گرو کی بجھی ہوئی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک نمودار ہوئی۔ سرد موسم میں بھوک زیادہ لگتی ہے جبکہ گرو اور رادھا نے قریباً چھتیس گھنٹے سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

کسی قریبی کمرے سے برتنوں کی کھن کھن اور چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دیتی رہی اور پھر کھانا ہمارے سامنے آ گیا۔ دو بڑے چنگیروں میں پیٹ بھرنے کے مناسب لوازمات موجود تھے۔

کھانے کے دوران میں، میں نے اقبال سے سرگوشی میں پوچھا۔ ”لگتا ہے کہ تم اس گھر میں رہتے رہے ہو؟“

”رہتے رہے ہو... سے کیا مطلب... ہم یہاں اسٹیٹ میں آنے کے بعد زیادہ دیر رہے ہی یہاں پر ہیں۔“ اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

”یہ تاؤ افضل کچھ ڈرا ہوا سا بندہ لگتا ہے۔“

”بس حالات نے اسے ڈرایا ہوا ہے، ورنہ یہ دلیر شخص تھا۔ جو بندہ کالی راتوں میں جاگ کر بستی کا پہرا دیتا ہو اور یہاں رہنے والوں کی حفاظت کرتا ہو، وہ ڈرپوک تو نہیں ہوتا۔“

”حالات سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مدھم آواز میں پوچھا۔

اقبال نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ”بے چارہ دوسروں کی چوکیداری کرتا رہا اور اس کے اپنے گھر میں چوری ہو گئی بلکہ ڈاکا پڑ گیا۔“

”کون لوگ تھے؟“

”وہی جن کے جان مال کی زیادہ حفاظت کرتا تھا تاؤ افضل۔ بستی کے مکھیا رشید احمد کا بیٹا سلیمان اور اس کے یار دوست۔ وہ رات کو افضل کے گھر میں گھس آئے۔ اس کی جوان بیٹیوں سے زیادتی کرنا چاہی۔ نشے میں دھت ہو کر ان کے کپڑے پھاڑ دیے۔ ان کے جسم نوچ لیے۔ ان کی والدہ آڑے نہ آتی تو وہ سب کچھ کر گزرتے۔ کمزور عورت نے اپنی جان دے کر بیٹیوں کی عزت بچائی۔“

”اوہ... تمہارا مطلب ہے افضل کی بیوی؟“

اقبال نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”افضل کو بیوی سے بڑا پیار تھا۔ اس کی موت کا غم اسے لے بیٹھا۔ کبھی کبھی تو خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ تین تین دن فاقے سے گزار دیتا ہے۔ رات کو باہر والے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا ہے اور بیٹیوں کا پہرا دیتا ہے۔ خبطیوں کی طرح ان کی نگرانی کرتا ہے۔ ابھی تم نے دیکھا ہی ہو گا، جب ہم آئے تب بھی وہ لٹھ لیے دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔“

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور اقبال کچے صحن میں بچھی چارپائی پر آ بیٹھے۔ یہاں دھوپ تھی جو ہمارے رات بھر کے ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو سکون دے رہی تھی۔ دیہات کی مخصوص خوشبو جس میں بھیگی مٹی، گوبر اور نباتات کی باس ہوتی ہے، اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ اقبال نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”افضل اور اس کی بیٹیوں کی کہانی کچھ مختلف نہیں ہے۔ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا ہے جو طاقتوروں کی طرف سے کمزوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر عمران یہاں آ کر افضل اور اس کی بیٹیوں کا سہارا نہ بنتا تو اب تک یہ دونوں لڑکیاں مکھیا کے اوباش بیٹوں کے ہتھے چڑھ چکی ہوتیں۔“

میں نے کہا۔ ”عمران تو ڈھنگ سے کچھ بتا نہیں رہا۔ تم ہی بتاؤ کب سے ہو یہاں اور کیا کرتے رہے ہو؟“

”بس تمہیں ڈھونڈتے رہے ہیں اور کیا؟“

”لیکن تم یہاں پہنچے کیسے؟“

”میرے خیال میں یہ ساری تفصیل عمران ہی بتائے تو زیادہ اچھا ہے۔“

”اچھا اتنا بتا دو کہ یہاں تم کب سے ہو؟ میرا مطلب ہے فتح پور میں؟“

”پچھلے قریباً سات مہینوں سے۔ اب تو یہ ہمیں اپنی ہی بستی لگنے لگی ہے۔ عمران کا تو تمہیں پتا ہی ہے، جہاں جاتا ہے اپنے چاہنے والے پیدا کر لیتا ہے۔ لوگ بہت پیار کرنے لگتے ہیں اس سے۔ اور اس نے واقعی لوگوں کی مدد بھی کی ہے۔ سب سے بڑی مدد تو یہی ہے کہ اس نے رشید احمد اور اس کے بیٹوں کو لگام ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنی من مانیوں سے بستی والوں کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے بستی والوں کے لیے کئی چھوٹے بڑے کام کیے ہیں۔ اب ہم پانچ چھ ہفتے بعد بستی واپس آئے ہیں۔ تم دیکھ لینا تھوڑی دیر میں بہت سے لوگ یہاں ہماری خیر خیریت پوچھنے کے لیے جمع ہو جائیں گے۔“

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ تاؤ افضل اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا میری طرف آ گیا۔ میرے قریب بیٹھ کر غور سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ”میری نظر کمزور ہو گئی ہے لیکن اتنی نہیں کہ میں تمہیں پہچان ہی نہ سکوں۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”سمجھا تو میں بھی نہیں کہ تم انجان کیوں بن رہے ہو۔ میں تاؤ افضل ہوں... زرگاں میں تمہارے پڑوسی لوہار عبدالمجید کا بھائی۔ میں نے تمہاری بیوی سلطانہ کو بھی پہچان لیا ہے۔“

ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے لگا کہ جیسے میں نے واقعی لمبی ٹھوڑی والے اس ادھیڑ عمر شخص کو کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں اور کب؟ میں ٹھیک سے تعین نہ کر سکا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پھر وہی یادداشت والا معاملہ آ گیا ہے۔ کئی دوسرے لوگوں کی طرح یہ شخص بھی مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا لیکن میرے لیے یہ اجنبی تھا۔

میں نے یونہی کہا۔ ”مجھے تھوڑا تھوڑا یاد تو آ رہا ہے۔“

”مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ تمہیں تھوڑا تھوڑا یاد آ رہا ہے۔ مجھے تو ان دنوں کی ایک ایک بات یاد ہے۔ کہیں تم جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کر رہے ہو؟“

”نہیں، جان بوجھ کر تو نہیں کر رہا۔“

”میں پورے پانچ مہینے وہاں تمہارے پڑوس میں رہا تھا۔ عبدالمجید بیمار تھا۔ میں اس کی دیکھ بھال کے لیے وہاں رکا تھا۔ یاد آ رہا ہے؟“

”ہاں ہاں... میں سمجھ گیا۔“ میں نے ایک بار پھر یونہی بات بنا دی۔

افضل کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔ ”تمہاری ہچکی کا کیا بنا پھر؟“ اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

”ہچکی... وہ... تو... کون سی ہچکی؟“

”یار! تم تو واقعی بڑے بھلکڑ ہو۔ ان دنوں کھانا کھاتے ہوئے تمہیں ہچکی شروع ہو جاتی تھی۔ تین تین گھنٹے رکتی نہیں تھی۔ کتنے کمزور ہو گئے تھے تم۔ بخار تو ٹوٹتا ہی نہیں تھا تمہارا۔“

”ہاں، اس بخار نے تو واقعی پریشان کیا تھا۔“ میں نے گول مول بات کی۔

”تم اسے پریشانی کہتے ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تمہارے بچنے کی کوئی آشا ہی نہیں تھی۔ یہ تو تمہاری بیوی کی ہمت اور کوشش ہے جس کی وجہ سے اوپر والے کو بھی ترس آ گیا۔ وید جی نہ آتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔“

”ہاں... وید واقعی قابل بندہ تھا۔“

”مگر جتنا قابل تھا، اتنا ہی مہنگا بھی تھا... بلکہ شاید یہ کہنا چاہیے کہ اتنا ہی لالچی بھی تھا۔ میں اندر خانے کی ساری بات جانتا ہوں۔ اس نے تمہیں ٹھیک تو بے شک کر دیا لیکن اس کے بدلے تمہاری بیوی کا ایک ایک گہنا اتروا لیا۔ میں نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ویسے بھی سلطانہ بیٹی مجھ سے کچھ چھپاتی نہیں تھی۔“

مجھے اس معاملے میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے ایک بار پھر گول مول بات کرتے ہوئے کہا۔ ”زیور تو اس نے واقعی کوئی نہیں چھوڑا تھا۔“

”اور وہ رقم بھول گئے ہو جو نقد لی تھی اس نے؟“

”ہاں... رقم بھی تو تھی۔“ میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بھولا بسرا دھندلا سا منظر نگاہوں میں چمک گیا۔ جیسے کوئی فربہ ہاتھوں والا شخص کرنسی نوٹ گن رہا ہو اور سلطانہ گھٹتے ہوئے چہرے کے ساتھ میرے قریب کھڑی ہو۔

تاؤ افضل کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”بہت بڑا دل ہے سلطانہ کا۔ ایک ایک پائی جوڑ رکھی تھی اس نے بھائی کے علاج کے لیے۔“

”بھائی کے علاج کے لیے؟“

تاؤ افضل کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی۔ ”ارے... تمہیں نہیں پتا وہ رقم کس لیے تھی؟“

”نن... نہیں... میں تو یہ بات... آج آپ کے منہ سے سن رہا ہوں۔“

تاؤ افضل کے چہرے پر نظر آنے والی حیرت بڑھ گئی۔ وہ غیر یقینی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔ ”شاید تم مذاق کر رہے ہو۔“

”نہیں تاؤ... میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔“

تاؤ افضل چند لمحے تک مجھے بغور دیکھنے کے بعد بولا۔

"اب پتا نہیں کہ مجھے یہ بات تمہیں بتانی چاہیے یا نہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ سلطانہ نے وید جی کو زیوروں کے علاوہ جو پندرہ ہزار روپے نقد دیے تھے، وہ اس نے اپنے اپاہج بھائی کے علاج کے لیے جمع کیے تھے، سچ مچ ایک ایک پائی جوڑ کر۔ وہ ساری رقم اس نے تمہارے علاج کے لیے وید جی کو دے دی۔"

میں خاموشی سے تاؤ افضل کو دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ تاؤ کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "ایک اچھی بیوی اللہ کی سب سے خاص نعمت ہے۔ جس کو یہ نعمت ملے، وہ خوش بخت ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم خوش بخت ہو۔" اس نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ "سلطانہ کے بھائی کا اب کیا حال ہے؟"

"ابھی تو ویسا ہی ہے۔" میں نے کہا اور یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے مجھے سچ مچ بے پناہ افسردگی محسوس ہوئی۔

میں نے چند دن پہلے سلطانہ کے بیمار اور اپاہج بھائی نبیل کو نل پانی کے دیوان میں دیکھا تھا۔ وہ کمر کی تکلیف کی وجہ سے لاچاری کی تصویر تھا۔ جو کچھ مجھے آج یہ تاؤ افضل نامی شخص بتا رہا تھا، وہ واقعی درست تھا تو پھر نبیل راجپوت کی حالت زار کی ذمے داری مجھ پر بھی عائد ہوتی تھی۔ تاؤ افضل کی باتوں نے میرے ذہن میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ اپنے لیے سلطانہ کی قربانیوں کے بارے میں، میں پہلے بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ آج ایک اور قربانی میرے سامنے آرہی تھی۔

میں نے وہیں دھوپ میں بچھی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے، تاؤ افضل سے اس بارے میں کچھ مزید باتیں پوچھیں۔ اس مختصر گفتگو سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا، وہ کچھ اس طرح تھا... آج سے قریباً ایک سال پہلے میں شدید بیمار ہو گیا تھا۔ میرا بخار اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں بستر سے یوں لگا تھا کہ صحت مند ہونے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ رہی سہی کسر نہ رکنے والی ہچکی نے پوری کر دی تھی۔ یہ ہچکی کئی کئی گھنٹے میرے کمزور جسم کو ہچکولے دیتی رہتی تھی۔ میرے سر کے بال جھڑ گئے تھے اور ہونٹ سوکھ کر سیاہ ہو گئے تھے۔

زرگاں کے دو بڑے معالج مجھے لاعلاج قرار دے چکے تھے مگر انہی دنوں ایک خاص وید زرگاں آیا اور اس نے مجھے صحت یاب کرنے کی ضمانت دے کر گراں قدر رقم کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ علاج کے شروع میں تیسرا حصہ معاوضہ وصول کرے گا۔ ڈیڑھ ماہ بعد پھر تیسرا حصہ اور ڈیڑھ ماہ بعد آخری تیسرا حصہ۔ سلطانہ نے اپنی ساری جمع پونجی تین چار قسطوں میں وید کے حوالے کر دی اور واقعی میں ٹھیک ہو گیا۔ وہ میری جان بچانے میں کامیاب رہی۔ سلطانہ کی جمع پونجی میں وہ پندرہ ہزار روپے بھی شامل تھے جو وہ نبیل کے علاج کے لیے جمع کرتی رہی تھی۔

یہ ساری معلومات میرے لیے بہت حیران کن تھیں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ سلطانہ زیور نہیں پہنتی۔ میں یہ سمجھتا رہا تھا کہ شاید ایسا اس کے مزاج کی وجہ سے ہے لیکن آج کچھ اور بات سامنے آرہی تھی۔ وہ اپنے تمام زیورات ایک جان لیوا بیماری کی نذر کر چکی تھی اور یہ میری بیماری تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے نبیل کا بیمار جسم گھوم گیا۔ بہن کے لیے بھائی کی اہمیت کیا ہوتی ہے، میں اچھی طرح جانتا تھا اور نبیل تو پھر اکلوتا بھائی تھا۔

میں سوچتا رہا اور نا قابلِ فہم سلطانہ کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ پتا نہیں کیا کیا کرتی رہی تھی میرے لیے۔ کچھ باتوں کا مجھے پتا چل گیا تھا اور کچھ ابھی تک میرے علم میں نہیں تھیں۔ وہ خود تو کچھ بھی بتاتی نہیں تھی۔ وہ وفا کی پتلی، ایثار کا پیکر... بڑی خاموشی سے ایک شمع کی طرح جلتی رہی اور میرے لیے روشنی فراہم کرتی رہی تھی۔ اب وہ پگھل کر کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی ٹمٹما رہی تھی۔ اس کے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ان گنت دشمن اس کے پیچھے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں اس ٹمٹماتی شمع کے گرد اپنے ہاتھوں کا ہالہ بنا دوں۔ اپنے تن من سے اس طرح اسے ڈھانپوں کہ زمانے کی ساری سرد گرم ہوائیں اس تک پہنچنے میں ناکام ہو جائیں۔ میرا دل بے ساختہ اس کی طرف کھنچنے لگا۔

میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دن پہلے تک وہ مجھے اپنے جسم کو چھونے نہیں دیتی تھی... لیکن کل والے واقعے کے بعد کم از کم اتنی تبدیلی تو آئی تھی کہ وہ میرے سینے پر سر رکھ کر روئی تھی۔ اس نے میری بانہوں میں اپنا چہرہ چھپایا تھا۔

تاؤ افضل کے ساتھ میری گفتگو کے دوران میں ہی عمران اور اقبال بھی وہاں موجود رہے تھے۔ انہیں بھی میری بیماری کے بارے میں معلوم ہوا تھا اور یہ پتا بھی چلا تھا کہ مجھے صحت یاب کرنے کے لیے سلطانہ نے کس طرح تگ و دو کی تھی۔

رات کو مجھے سلطانہ سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ موقع بھی عمران نے ہی فراہم کیا۔ وہ چائے کا پیالہ لیے ہوئے میرے پاس آیا۔ آنکھوں میں حسبِ معمول ایک خوب صورت سی شوخی تھی۔ چائے کا لمبا گھونٹ لے کر بولا۔ "تم نے کہاں سونا

ہے؟"

"جہاں تم نے سونا ہے۔"

"جگر! ہم کنوارے ہیں۔ تم شادی شدہ ہو۔ تم اوپر والے کمرے میں سو جانا۔"

میں نے اس کی بات پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم نے تو اطلاع دی تھی کہ تم اکبرِ اعظم کے نقشِ قدم پر چل کر یہاں فتح پور میں کئی شادیاں رچا چکے ہو۔"

"لیکن یار! میں نے یہ کب کہا تھا کہ میں نے یہ شادیاں لڑکیوں یا عورتوں سے کی ہیں۔"

"تو پھر کس سے کی ہیں؟"

"ان لوگوں کے مسائل سے کی ہیں، ان کی مشکلوں سے، ان کی پریشانیوں سے۔ شادی کا مطلب مصیبتوں کو گلے لگانا ہوتا ہے، سو میں نے لگایا ہے۔ بہرحال، اس بارے میں تمہیں پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔ فی الحال میں تم سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ تم اوپر والے کمرے میں سو جانا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"

"بہت فرق پڑے گا۔ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ یعنی دو میاں بیوی اور نو بچے۔ تاہم اس کے لیے تنہائی اور یکسوئی وغیرہ ضروری ہے۔"

"تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ سلطانہ کی حالت ابھی ایسی نہیں کہ وہ میرے ساتھ ایک کمرے میں سکون سے رہ سکے۔ اگر تم نے اسے ٹھیک کرنا ہے تو بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوگا۔"

"تو یار میں کب کہہ رہا ہوں کہ ایک ہی رات میں نو بچے پیدا کر لو۔ لیکن تھوڑا بہت قدم بڑھاؤ گے تو سفر طے ہو گا نا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے... وہ میرے کمرے میں چلی آئے گی؟"

"کیوں نہیں آئے گی بھائی! سر کے بل آئے گی۔ جس دلیر سے اس کا پالا پڑا ہے، وہ کوئی معمولی شے نہیں ہے۔"

"کیا کہا ہے تم نے اس سے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ بس یہی بتایا ہے کہ تمہیں کل سے ہلکا بخار ہے اور... کبھی کبھی ہچکی بھی آتی ہے۔ وہ فوراً تمہیں دیکھنا چاہ رہی ہے... بلکہ شام کو ہی تمہارے پاس آنا چاہ رہی تھی۔"

"تم نے اسے کیوں پریشان کیا ہے... کیا پہلے کم پریشانیاں ہیں؟" میں نے بیزار لہجے میں کہا۔

"یار! تم خود ہی تو بار ونڈا جیکی کا سنہری قول دہراتے ہو۔ پریشانیوں کے اندر سے ہی خوشی اور سکون کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔"

"لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم اوپر کمرے میں چلو۔ ابھی تھوڑی دیر میں سرکار کچے دھاگے سے بندھی تمہارے پاس چلی آئیں گی... لیکن..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے میرا گھٹنا دباتے ہوئے کہا۔ "یار! میرا بھرم رکھ لینا۔ دو چار بار ہچکی لے کر دکھا دینا اسے۔"

"سوری، میں تمہاری بونگیوں میں شامل نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا چلو، ایسا کرتے ہیں، میں تمہارے کمرے میں تمہارے پلنگ کے نیچے گھس جاتا ہوں۔ تم بس منہ پر ہاتھ رکھنا، پلنگ کے نیچے سے ہچکی کی آواز میں نکال دوں گا۔"

میں بُرا سا منہ بنا کر خاموش ہو گیا۔

وہ شرارت سے بولا۔ "میں سمجھ گیا، یہ اسکیم زیادہ قابلِ عمل نہیں ہے۔ تم کافی دنوں بعد سلطانہ بھابی سے ملو گے۔ میں پلنگ کے نیچے رہوں گا تو پھر کیا خاک ملاقات ہوگی۔"

"تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ اتنی جلدی کچھ نہیں ہو سکتا... وہ آہستہ آہستہ ہی اپنے صدمے سے نکلے گی۔"

"خیر یہ سب کچھ اتنی جلدی بھی نہیں ہے جگر! رخصتی وغیرہ تو رہی ایک طرف... کل ایک ہرن اپنی جان پر کھیل کر تمہارے ولیمے کا سامان بھی کر چکا ہے۔ اچھے بچے شادی شدہ ہونے کے بعد اس طرح کچھوے کی رفتار سے نہیں چلتے۔"

وہ اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہا پھر اس نے مجھے اوپر کمرے میں بھیج دیا۔ یہ زیادہ بڑا کمرا نہیں تھا۔ دو پلنگ نما چارپائیاں تھیں۔ ایک طرف لکڑی کی الماری تھی۔ الماری کے اوپر لالٹین رکھی تھی۔ دیواریں پکی اینٹوں کی تھیں۔ نیم پختہ فرش پر ایک بوسیدہ نمدہ بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں مٹی کی انگیٹھی تھی جس میں انگارے سلگ رہے تھے۔ میں پلنگ نما چارپائی پر دراز ہو گیا۔ چہرے کی بڑھتی ہوئی شیو کو کھجانے لگا... 60 گھنٹے پہلے کے واقعات کسی فلم کی طرح میری نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ارجن کا زخمی ہو کر تالاب کی گہرائی میں گرنا اور پتھریلے مجسمے سے ٹکرا کر اس کا سر پاش پاش ہونا۔ دوا ندھا دھند بھاگتے ہوئے پجاریوں کو گولیاں لگنا اور ان کا سنگی فرش پر لڑھکنیاں کھانا... پھر ستیش اور اس کے

ساتھیوں کا ہم پر اسلحہ تاننا اور ہمارا قدم قدم پیچھے ہٹتے چلے جانا۔ تناؤ کی وہ شدید ترین کیفیت جس میں کسی بھی وقت فائرنگ شروع ہو سکتی تھی اور لاشیں گر سکتی تھیں۔ وہ سب کچھ میرے تصور میں آیا اور میں نے اپنے جسم میں سنسنی کی لہریں محسوس کیں۔

مجھے پلنگ پر دراز ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ قدموں کی چاپ نے میرا دل دھڑکایا، پھر دروازہ کھلا اور سلطانہ اندر آگئی۔ اس کے گندمی چہرے پر پریشانی کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ میں اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ''لیٹے رہو۔۔۔ لیٹے رہو۔''

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''تم ٹھیک نہیں ہو۔'' اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔ ''تمہارا دوست کہہ رہا تھا کہ تمہیں ہچکی بھی آرہی ہے۔ کیا تمہیں ہچکی آرہی ہے؟''

''نہیں۔''

''تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ مجھے تسلی دینا چاہتے ہو۔ کیا تمہیں بخار بھی ہے؟'' اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

''تم خود ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔''

وہ ذرا سا جھجکی پھر اس نے میرے بازو کو چھوا۔ ''بخار تو نہیں ہے لیکن۔۔۔ ہچکی تو آرہی ہے نا۔۔۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔۔۔ کہیں تم پھر بیمار تو نہیں ہو رہے۔ اللہ رحم کرے۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو۔'' وہ سرتاپا لرز سی گئی۔

اس کے چہرے اور ہاتھوں پر چوٹوں کے نشان اس بات کے گواہ تھے کہ وہ پچھلے چند دنوں میں بڑے سخت حالات سے گزری ہے لیکن اس وقت وہ اپنی ساری سختیاں بھول کر میرے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا لباس بھی بدلا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! تم خواہ مخواہ خود کو فکرمند نہ کرو۔ میرے دوست نے ایسے ہی مذاق کیا ہے۔''

''اس طرح کا مذاق میری جان لے سکتا ہے۔'' وہ آبدیدہ ہوگئی۔

''کیوں۔۔۔ ہچکی آجانا کوئی بہت خطرناک بات ہے؟''

''ہاں مہرو ج! تمہارے لیے خطرناک ہے۔۔۔ پتا نہیں کہ تمہیں یاد ہے یا نہیں۔ تم بہت زیادہ بیمار ہو گئے تھے۔ اتنے زیادہ کہ بس کیا بتاؤں۔ تمہیں جب بھی بخار ہوتا ہے، میرے دماغ میں وہی باتیں آجاتی ہیں۔''

''لگتا ہے کہ تم بہت وہمی ہو۔''

''ہاں۔۔۔ تمہارے بارے میں شاید وہمی ہی ہوں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

میں دھیان سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ پچھلے ایک دو ہفتے میں نہایت کٹھن صورت حال سے گزری تھی۔ اس کے شفاف رخساروں پر ابھی تک چوٹوں کے مدھم نشان موجود تھے۔ مجموعی طور پر اس کے چہرے میں ایک خاص طرح کی سادگی اور کشش تھی۔ خاص طور سے اس کے چوڑے رخساروں کی قدرے ابھری ہوئی ہڈیاں اور اس کی چوڑی پیشانی، نگاہ کو جذب کرتی تھی۔ اس کے شانے کشادہ اور جسم چھریرا تھا۔ وہ بولی۔ ''دیکھو، کتنی عجیب بات ہے مہرو ج! آج یہاں کتنے عرصے بعد تایا اجمل سے ہماری ملاخات (ملاقات) ہوگئی۔ تم نے تاؤ کو پہچان لیا ہے نا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں یا غلط۔

میں نے کہا۔ ''ایک بات تو بتاؤ سلطانہ! یہاں کی تقریباً تمام عورتیں ہلکے پھلکے زیور پہنتی ہیں لیکن میں نے کبھی تمہیں زیور پہنے نہیں دیکھا؟''

''بس شروع سے ہی ایسا ہے۔ مجھے شوق نا ہیں۔''

میں نے اپنی دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا اور اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں شوق نہیں یا تمہارے پاس زیور ہی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ذرا چونکی۔

''کچھ نہیں، بس یونہی کہہ رہا تھا۔''

''بالو کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا اور اس کے ملیح چہرے پر ممتا کا گہرا دکھ جھلکنے لگا۔

''وہ بالکل خیریت سے ہے۔ دیوان میں صفیہ اور ہاشو اس کی بڑی اچھی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ لیکن تمہاری کمی وہ بہت زیادہ شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ صبح اٹھتے ہی رو رو کر ہلکان ہو جاتا ہے۔'' میں نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑا۔

''تم اس کا بہت خیال رکھو مہرو ج۔'' وہ آزردہ لہجے میں بولی۔

''یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ دنیا کے جرموں کی سزا اپنے بچے کو مت دو۔ وہ تمہارے بغیر بہت دکھ اٹھا رہا ہے۔''

''میں کیا کروں؟'' وہ عاجز نظر آرہی تھی۔

''تم کچھ نہ کرو۔ تم بس ایک ماں بن جاؤ۔۔۔ اور ایک بیوی بن جاؤ۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اب وہ پہلے والا مہرو ج نہیں ہوں سلطانہ۔۔۔ میں تمہاری حفاظت کر سکتا ہوں

اور تمہارے بدلے بھی چکا سکتا ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

اس نے سسک کر اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ اس کے گھنے بالوں کی عجیب سی دیہاتی خوشبو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس نے میرا دایاں ہاتھ تھاما، اسے موڑا اور ہتھیلی کا رخ اپنے ہونٹوں کی طرف کر کے ہتھیلی کو چوم لیا۔ اس کے گرم ہونٹوں کے ریشمی لمس نے میرے پورے بازو اور جسم میں جھرجھری سی دوڑا دی۔

''یہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بس نفی میں سر ہلا دیا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

میں نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اس کا چہرہ پھر اوپر اٹھایا۔ ''بتاتی کیوں نہیں ہو۔۔۔ کیوں چوما میرا ہاتھ؟''

اس نے پلکیں اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے اس کی بھیگی آنکھوں میں پہلی بار ایک ہلکی سی چمک یا مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ اپنے بائیں رخسار پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے۔''

''کیا مطلب؟''

لیکن اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، میں نے غور سے اس کے رخسار کو دیکھا۔ وہاں ابھی تک اس طمانچے کا مدھم نشان موجود تھا جو میں نے پرسوں اس کے رخسار پر مارا تھا۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''تو تم اس لیے میری ہتھیلی چوم رہی ہو کہ میں نے تمہیں طمانچے مارے؟''

''کوئی اپنا سمجھ کر ہی ڈانٹتا اور مارتا ہے نا۔'' وہ میرے سینے میں منہ چھپا کر بولی۔

''اگر تم بھی مجھے اپنا سمجھتی ہو تو پھر۔۔۔ مجھ سے ایک وعدہ کرو۔ جو کچھ ہوا، سب کچھ بھول جاؤ گی۔ اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھو گی۔۔۔''

''میں جانتی ہوں مہرو ج! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو لیکن۔۔۔ مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وخت دو۔ ابھی میرا دل ٹھکانے پر نا ہیں ہے۔ اس میں تھوڑا وخت لگیں گا۔''

''جتنا مرضی وقت لے لو۔ مگر سلطانہ! اتنا وعدہ تو کرو کہ مجھ سے مشورہ کیے بغیر اب کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھاؤ گی۔ تمہارے، دیوان سے اچانک گم ہو جانے کا جتنا صدمہ مجھے ہوا تھا، میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں، چوہان اور انور خاں تمہیں دیوانوں کی طرح تل پانی کی گلیوں میں ڈھونڈتے رہے ہیں۔''

''مجھے بہت دکھ ہے کہ میں نے ایسا کیا۔ لیکن کیا کروں مہرو ج! کچھ بھی میرے بس میں نا ہیں ہے۔ مجھے جب وہ سب کچھ یاد آتا ہے تو میرا دل جندہ رہنے کو نا ہیں چاہتا۔''

''تمہیں اپنے بالو کے لیے زندہ رہنا ہوگا اور میرے لیے رہنا ہی ہوگا۔'' میں نے اسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لگا لیا۔ بالوں سے اٹھنے والی دیہاتی خوشبو فزوں تر ہوگئی۔ میں نے اس سیدھی سادی عام سی لڑکی کے لیے اپنے دل میں بے پناہ محبت محسوس کی۔ مجھے لگا کہ اگر میں اس لڑکی سے دور رہوں گا، اسے ایک شوہر کی محبت نہ دے سکوں گا تو بہت بڑا جرم کروں گا۔ ایک ایسا جرم جس کے لیے قدرت مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میں نے اپنی انگلیاں بہت آہستہ سے اس کے بالوں میں چلائیں۔ اس کے شفاف رخسار کو چھونے کے لیے اپنے ہونٹوں کو آگے بڑھایا لیکن۔۔۔ عین اس وقت جیسے ایک روشنی سی سلطانہ کے اندر بجھ گئی۔ وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹی اور اس کے پورے سراپا کو ایک نامعلوم گریز نے ڈھانپ لیا۔

''کیا ہوا سلطانہ؟''

بے بس باپ

☆ اسپتال سے خبر آئی۔ زچہ و بچہ خیریت سے ہیں، کسی نے اس بے چارے کو نہ پوچھا جو نیا نیا باپ بنا تھا۔

☆ لیڈی ڈاکٹر نے زچہ و بچہ کے لیے کھانے پینے کا پورا نسخہ لکھ دیا مگر باپ؟ آہ اسے کون پوچھتا ہے۔ کاش وہ اس کے لیے کم از کم ایک پیکٹ سگریٹ ہی لکھ دیتی۔

☆ جب باپ بننے کا پہلا تجربہ ہی ایسا دل شکن ہو تو وہ کون ہے جو باپ بننا پسند کرے گا؟

☆ زچہ اور بچہ کو دیکھنے اور تحائف دینے والیاں بے شمار نازنینان خوش جمال اور خوش کلام آئیں مگر کسی نے باپ کو ذرہ برابر لفٹ دینا گوارا نہ کیا۔ حالانکہ بچے نے رو رو کر محلے والوں کی نیند حرام کر دی تھی اور میں تھا انتہائی مہذب اور خاموش۔ زچہ و بچہ دونوں کے لیے آرام کا حکم تھا اور میرے لیے کام کا۔

☆ یہی تاریخ ہر بچے کے ساتھ دہرائی گئی۔

لورالائی سے کشمالا خان کی نکتہ بینی

"کچھ ناہیں۔" اس نے اپنا سر دائیں بائیں ہلایا۔ اس کی سانس قدرے تیزی سے چل رہی تھی۔ میں ٹھیک سے نہیں جان سکا کہ سانسوں کی یہ تیزی جذبات کے سبب ہے یا گریز کے سبب۔

تاہم مجھے ان سانسوں کی خوشبو کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ جیسے یہ سانسیں کسی وقت میرے بہت قریب رہی ہیں۔ میرے کانوں میں سرسراتی رہی ہیں اور میرے رخساروں سے لپٹتی رہی ہیں۔ کب ہوا تھا ایسے؟ اور کب تک ہوتا رہا تھا؟ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ ایک دھندلا سا پردہ تھا جس کے پیچھے سب کچھ چھپا ہوا تھا۔ یہ پردہ پہلے سے کچھ ہلکا ضرور ہو گیا تھا لیکن اب بھی مجھے اس کے پار دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ "سلطانہ! ایسا کیوں کرتی ہو؟ میں تمہارا شوہر ہوں، تمہارے بچے کا باپ ہوں۔"

اس کا سر جھکا رہا۔ دو موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے گر کر اس کی جھولی میں جذب ہو گئے۔ اس کے جسم میں وہی ہلکی سی لرزش نمودار ہو چکی تھی جو میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ دیوان میں جب میں نے بالو کو زبردستی اس کی گود میں دیا تھا اور پھر اسے دودھ پلانے کے لیے کہا تھا تو وہ اسی طرح سرتاپا کانپنے لگی تھی۔

"سلطانہ! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" میں نے اس کے بازو کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے معاف کر دو مہرو جی! بس مجھے معاف کر دو۔" اس نے تیزی سے کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ کمرا خالی ہو گیا تھا۔

میں اپنی جگہ حیران بیٹھا رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح کا ردعمل ظاہر کرے گی لیکن وہ ریشم کی طرح نرم تھی تو کہیں فولاد کی طرح سخت بھی۔ میں اس کے بارے میں جتنا سوچتا تھا، اتنا ہی الجھ جاتا تھا۔

وہ رات عجیب سی بے چینی میں گزری۔ بس پچھلے پہر تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگی۔ میں اٹھا تو ایک حیران کن منظر دیکھنے کو ملا۔ مہا گرو سو بھاش میرے لیے ایک ٹرے میں چائے لے کر آ رہا تھا۔ ساتھ میں گھر کے بنے ہوئے بسکٹ اور رس وغیرہ تھے۔ کچھ مٹھائی اور دودھ بھی تھا۔ چلتے ہوئے مہا گرو کی توند ہولے ہولے ہل رہی تھی۔ وہ سفید دھوتی کرتے میں تھا۔ بالائی جسم پر ایک ڈبی دار کمبل لپٹا ہوا تھا۔ گرو کے عقب میں گھاگرے اور چولی والی ایک تیز تیکھی عورت تھی۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ عمر کوئی پچیس چھبیس سال رہی ہو گی۔ اس نے ایک ہاتھ میں بالٹی اور دوسرے میں ایک بڑا سا لوٹا پکڑ رکھا تھا۔

میں نے مہا گرو کو دیکھ کر کہا۔ "یہ سب کیا ہے گرو جی؟"

"تمہارا ناشتا ہے۔"

"لیکن یہ آپ کیوں لے کر آئے ہیں؟"

گھاگرے چولی والی کھنک دار آواز میں بولی۔ "یہ آپ کا سیوک ہے جی۔ آپ کی خاطر داری کرے گا۔ اس نے یہ کام اپنی مرضی سے چنا ہے۔ اس کی پتنی ادھر دوسری طرف عورتوں کی خاطر داری کرے گی۔"

"یہ تو زیادتی ہے۔" میں نے کہا۔

"زیادتی تو تب ہوتی جب یہ کام کرنے میں ان کی اپنی مرضی ناہیں ہوتی۔" گھاگرے چولی والی نے کمر لچکا کر کہا۔

میں نے گرو کو دیکھا۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ٹرے نما چنگیر لے لی اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"ناہیں، میں کھڑا ہی ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا۔

وہ بے بسی کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ عمران اور اقبال نے اسے یہاں یہ رول ادا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ پرسوں صبح سویرے گرداور رادھا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ زندہ رہنے کے لیے بلکتے رہے تھے... گرد اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا تھا اور عمران کے قدموں پر سر رکھ کر کہا تھا کہ اگر اس کا جیون بخش دیا جائے تو وہ عمر بھر غلام بن کر رہے گا۔

اور آج وہ واقعی غلام دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے میرے دل میں گرو کے لیے ترس کا جذبہ ابھرا... لیکن پھر فوراً ہی ایک چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا اور یہ جذبہ معدوم ہو گیا۔ یہ شکیلہ کا اجڑا بجڑا چہرہ تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی، آنکھوں میں کھنڈروں کی ویرانی... جسم پامال۔ وہ اسی گرو کے استھان میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتتی رہی تھی اور پھر خود اپنی قبر کھود کر اس میں دفن ہو گئی تھی۔ یہ نام نہاد گرو کتنا بھی انکار کرتا لیکن وہ خود کو اس انسانیت سوز جرم سے علیحدہ نہیں کر سکتا تھا۔

تیز طرار لڑکی نے گرو کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ "کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے موئے! چل منہ ہاتھ دھلا بابو جی کا۔" لڑکی نے کھلے منہ والی بالٹی چارپائی کے سامنے رکھ دی اور گرم پانی والا لوٹا گرو کے ہاتھ میں تھما دیا۔

گرو لوٹا لے کر میری طرف جھک گیا۔ میرے دل میں عجیب سی بیزاری پیدا ہوئی۔ میں نے لوٹا گرو کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تم جاؤ یہاں سے۔ تمہاری صورت دیکھتا ہوں تو تمہارا ظلم یاد آتا ہے۔"

لڑکی نے چہک کر کہا۔ "اوئی ماں... بابو جی! تم تو بڑا اچھا ڈائیلاگ بولتا ہے۔ بالکل امیتابھ بچن کی طرح۔"

"تم کون ہو؟" میرے لہجے میں بدستور بیزاری تھی۔

"میرا نام نوری ہے جی۔ میں عمران بابو کی نوکرانی ہوں... بلکہ آپ مجھ کو ان کی لونڈی بھی کہہ سکت ہیں۔"

"لونڈی؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

"ہاں جی، عمران بابو نے مجھے پیسے دے کر خریدا ہے۔ مکھیا کے بڑے بیٹے سلمان سے... لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ عمران بابو بڑے نیک بندے ہیں۔ بالکل فرشتہ ہیں فرشتہ۔ کبھی میلی نظر سے ناہیں دیکھا مجھے اور نہ کسی دوسرے کو دیکھنے دیوت ہیں۔ کہتے ہیں کوئی اچھا سا بر دیکھ کر تیرا بیاہ کر دوں گا۔ وہ ہر کسی کا بھلا سوچت ہیں۔ میرے جیسی نیچ کمین کے لیے بھی ان کی سوچ ایسی ہی ہے۔" وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

"اچھا ابھی تم جاؤ۔ میں ناشتا کر لوں گا تو برتن لے جانا۔"

"آپ اکیلے ہی ناشتا کریں گے؟"

"تو کیا تجھے ساتھ بٹھا کر کروں گا؟" میں نے تپ کر کہا۔

"اوئی ماں! آپ تو غصے بھی ہوتے ہیں۔ میرا مطلب تھا کہ اتنا سارا ناشتا آپ اکیلے کیسے کریں گے؟"

میں نے غور کیا، واقعی ناشتا زیادہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ عمران اور اقبال بھی آنے والے ہیں۔ اسی دوران میں وہ دونوں دروازے پر نمودار ہو گئے۔ نوری ذرا شوخی سے بولی۔ "لو جی، ناشتے میں آپ کے ساجھے دار آ گئے۔ اب میں جاوت ہوں۔" وہ کمر لچکاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"کیسے ہو جگر؟" عمران نے میرے سر کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

"یہ بلا کون تھی؟" میں نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

"اچھی بھلی خوب صورت لڑکی کو بلا کہہ رہے ہو۔ کیا تم نے خدا کو جان نہیں دینی؟" عمران بولا۔

"میں نے تو خدا کو جان دینی ہے لیکن تم نے کس کو دینی ہے جو یہاں فتح پور میں لڑکیاں خریدتے پھرتے ہو۔"

"میں فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ مجھ سے ایسی بات مت کرو۔ ہر خبر کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر خبر بے مطلب ہوتی ہے۔ تمہیں یہ تو پتا چل گیا ہے کہ میں نے اس کو خریدا ہے لیکن کیسے خریدا ہے اور کیوں؟ اس بات کا پتا چلے گا تو تمہاری رائے بدل جائے گی۔"

"خیر، یہ تو مجھے پتا ہے کہ تم رابن ہڈ کی نسل سے ہو لیکن رابن ہڈ بھی تو انسان ہی تھا اور انسان سے غلطی ہو سکتی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ایسی خطرۂ ایمان لڑکی کو خریدو گے اور وہ داسی بن کر تمہارے آس پاس رہے گی تو پھر کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

ایک دم اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ اپنے خوب صورت دانتوں کی نمائش کر کے بولا۔ "ہمارے ساتھ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے جگر! اب اور کچھ نہیں ہو گا اور اگر ہو گا تو بس مذاق ہو گا۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایک بار پھر دل نے گواہی دی کہ عمران اپنے اندر کوئی سربستہ راز چھپائے پھرتا ہے۔ کوئی درد بھری کہانی۔ کوئی انوکھی کتھا، کوئی المیہ یا حادثہ...!

اسی دوران میں نوری نامی وہ لڑکی پھر کمر لچکاتی وہاں پہنچ گئی۔ وہ کچھ تازہ بہ تازہ پراٹھے اور انڈوں کا حلوہ لائی تھی۔ وہ انڈوں کا حلوہ میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ "تابش بابو! یہ خاص آپ کے لیے ہے۔"

"خاص میرے لیے کیوں؟" میں نے بھویں اچکائیں۔

"اس لیے کہ آپ نئے آئے ہیں۔"

عمران جھٹ بولا۔ "اور تم نے وہ گانا تو سنا ہی ہو گا۔ بمبئی سے آیا میرا دوست... دوستو سلام کرو۔"

"لیکن میں بمبئی سے نہیں آیا اور نہ مجھے فضول بکواس پسند ہے۔"

"یار! دیکھو تم نے پھر ایک لفظ ضائع کر دیا۔" عمران نے اعتراض کیا۔ "بکواس تو ہوتی ہی فضول ہے... اس کے ساتھ فضول لگانے سے مطلب؟"

حلوہ میرے سامنے رکھتے ہوئے نوری گھٹنوں کے بل جھک گئی تھی۔ گردن سے نیچے اس کا چمکیلا جسم خطرناک حد تک دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے نگاہ پھیر لی۔

"چلو، جاؤ تم۔" اقبال نے نوری سے تحکمانہ انداز میں

کہا۔
وہ اٹھی اور ”اوئی ماں“ کہتی ہوئی ایک دم لڑکھڑا گئی۔ سہارے کے لیے اس کا ہاتھ بے ساختہ میرے کندھے پر آیا۔ اس کے بال لہرا کر میرے چہرے سے ٹکرائے۔ ان میں چنبیلی کے تیل کی خوشبو تھی۔
”مم... معاف کردیں جی... پھسل گئی تھی۔“
”تمہارا پھسلنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب جاؤ۔“ اقبال نے پھر تحکم سے کہا۔
وہ مجھ پر ترچھی نظر ڈالتی ہوئی باہر چلی گئی۔
عمران نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا۔ ”یہاں کا مکھیا رشید احمد بڑا جابر قسم کا شخص ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں سلمان اور مستان عرف مانی۔ یہ دونوں بھی اول درجے کے ہلنگے اور بدمعاش ہیں۔ یہ لڑکی نوری دراصل سلمان کی رکھیل تھی۔ اس نے خانہ بدوشوں کو پیسے دے کر اسے خریدا تھا۔ یہ وہاں رشید کی حویلی میں گناہ کی زندگی گزار رہی تھی لیکن اس کے دل میں ہر عورت کی طرح یہ خواہش موجود تھی کہ یہ اپنا گھر بسائے۔ یہ خواہش صرف اس صورت میں پوری ہوسکتی تھی جب یہ سلمان کی غلامی سے نکلتی۔ میں نے کوشش کی اور بیس ہزار روپے نقد دے کر اسے سلمان سے حاصل کرلیا۔“
”لیکن راہن ہڈ صاحب! یہ بیس ہزار روپے تمہیں ملے کہاں سے؟“
”یہ تم نے بہت بونگا سوال پوچھا ہے۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ جہاں عمران موجود ہو وہاں پیسا خود بخود پہنچ جاتا ہے۔ یعنی دولت مابدولت کے لیے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہی۔“ وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔
اقبال نے شوخی سے کہا۔ ”مزے کی بات یہ ہے کہ عمران نے مکھیا کے بیٹے سے لڑکی کو چھڑانے کے لیے مکھیا سے ہی پیسے دلوائے ہیں۔ یعنی وہ بیس ہزار روپیا مکھیا کی گرہ سے ہی نکلا ہے۔“
”وہ کیسے؟“
”جیسے اس طرح کے بہت سے دوسرے کام ہمارے ہیرو صاحب نے کیے ہیں۔ آخر اسے یونہی تو ہیرو نہیں کہا جاتا۔“
پھر اس نے تفصیل بتائی۔ پتا چلا کہ یہاں اس بستی میں تماشا دکھانے والے کچھ بازی گر آئے تھے جنہیں یہاں نٹ کہا جاتا ہے۔ وہ تنے ہوئے رستے پر چل کر دو چار کرتب دکھاتے تھے... مکھیا اور اس کے یار دوست ایک بازی گر کے کرتب دیکھ کر واہ واہ کر رہے تھے۔ عمران نے کہا کہ وہ بھی ایسا کر کے دکھا سکتا ہے۔ مکھیا نہ مانا۔ تکرار ہوئی اور شرط لگ گئی۔ مکھیا کو کیا پتا تھا کہ عمران پیشہ ور جمناسٹر ہے اور اس سے کہیں بڑھ کر مہارت دکھا سکتا ہے۔ عمران نے رستے پر چل کر دکھایا اور سیکڑوں لوگوں کے سامنے پچیس ہزار روپے کی شرط جیت لی۔ بعد میں اس نے جیتی ہوئی رقم میں سے بیس ہزار روپے دے کر لڑکی کو آزاد کرایا۔
سارا دن مجھے سلطانہ کی جھلک دکھائی نہیں دی۔ پتا نہیں وہ کہاں چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ ڈر تھا کہ وہ اپنی جذباتی کیفیت میں پھر کوئی الٹی پلٹی حرکت نہ کر بیٹھے۔ عمران مجھ سے رات کی ملاقات کا احوال پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے مختصر لفظوں میں بتایا کہ کیا ہوا تھا۔ اس نے میرے لتے لینے شروع کر دیے۔ مجھے نکما، نکا دی، ہونق اور پتا نہیں کیا کیا قرار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے سلطانہ کے سامنے خود کو بیار ظاہر نہ کر کے غلطی کی ہے۔ اگر میں اس کی ہدایت کے مطابق سلطانہ کو ہچکیاں وغیرہ لے کر دکھاتا تو سلطانہ کا ردعمل یکسر مختلف ہوتا تھا۔
میری اور عمران کی گفتگو کے دوران میں ہی ہمیں طلال اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے شکن شکن پاجامہ کرتہ پہن رکھا تھا، اوپر سویٹر تھا اور کمبل کی بکل مار رکھی تھی... اسے دیکھ کر بالکل نہیں لگتا تھا کہ یہ لڑکا سلطانہ کے ساتھ مل کر زرگاں میں چار اہم افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ طلال کا چہرہ بجھا ہوا سا تھا۔ وہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔
”کیا بات ہے طلال؟“ میں نے محبت سے پوچھا۔
”خالہ صبح سے رو رہی ہے۔ اس نے کھانا بھی ناہیں کھایا۔“
”کیا کہتی ہے؟“
”کچھ بھی ناہیں۔“ طلال سادگی سے بولا۔
”چلو آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے کہا اور طلال کو لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔
تاؤ افضل بیرونی دروازے کے پاس لکڑی کی ایک چوکی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں لٹھ تھی۔ میں اور طلال ایک اندرونی کمرے میں پہنچے۔ سلطانہ کے ساتھ تاؤ افضل کی دونوں بیٹیاں بھی موجود تھیں۔ وہ پردہ کرتی تھیں۔ میری آمد کا جان کر وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔ طلال بھی کمرے سے باہر ہی رک گیا۔ سلطانہ کروٹ لیے چارپائی پر لیٹی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے دونوں ٹخنے زخمی تھے اور ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ پٹیاں استھان میں ہونے والے ظلم کی ایک نشانی تھیں۔

استھان میں سلطانہ کی حیثیت ایک خطرناک قیدی کی تھی۔ اسے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر رکھا گیا تھا۔ زنجیروں کی رگڑ نے اس کے ٹخنوں کو چھیل ڈالا تھا۔
”تم کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو؟“ میں نے گہرے سنجیدہ لہجے میں سوال پوچھا۔
”وہ... بس... دل ای چ ناہیں چاہ رہا تھا۔“
”تم خود کو تماشا بنا رہی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی۔“ میرے لہجے میں غصہ در آیا۔
وہ کانپ گئی۔ ”ایسا نہ کہو مہروج۔ اللہ نہ کرے میری وجہ سے آپ تماشا بنیں۔ آپ کی عزت کے لیے تو میں جان دے سکتی ہوں۔“
”طلال!“ میں نے آواز دی۔
”جی خالو۔“ اس نے مجھے نئے خطاب سے نوازا اور جلدی سے اندر آ گیا۔
”کھانا منگواؤ۔“ میں نے کہا۔
وہ ”جی اچھا“ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ سلطانہ اپنی جگہ بیٹھی انگلیاں مروڑتی رہی۔ اس کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک راجپوت تھی۔ اس کے خانوادے کی رگوں میں ایک جوشیلا خون تھا اور اس خون میں ایک خاص قسم کی آن بان تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ کسی طور بھی اس کے ساتھ سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی۔
کچھ ہی دیر بعد نوری اپنی چوڑیاں چھنکاتی اور کمر لچکاتی اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی چنگیر نما ٹرے تھی۔ میرے اشارے پر اس نے کھانا سلطانہ کے سامنے رکھا اور بولی۔ ”لو جی، اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ اور نوری جو کچھ کرت ہے، جی جان سے کرت ہے۔“
میں نے تحکمانہ انداز میں سلطانہ کو کھانے کا کہا تو وہ لقمہ توڑنے پر مجبور ہوگئی۔ میں نے بھی اس کا تھوڑا سا ساتھ دیا۔ اسی دوران میں نوری پھر وارد ہوگئی۔ وہ پانی لے کر آئی تھی۔ بڑے انداز سے میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”بابو جی! یہ سالن بھی ذرا چکھ کر دیکھو۔ میں نے خود بنایا ہے۔ یہ ڈولا مچھلی ہے۔ مچھلی تو بہت ساری ہووت ہیں لیکن ڈولے کی تو بات ہی اور ہووت ہے جی۔ اس کو کاٹ ڈالو، تب بھی اس کی بوٹیاں پھڑکتی رہتی ہیں۔ وہ کہاوت تو آپ نے سنی ہی ہووے گی۔ ڈولا جب مچھیرے کے جال میں آ جاوت ہے تو اپنی ماں سے کہوت ہے کہ ہانڈی میں پکنے تک میرے واپس آنے کی امید رکھنا۔“
”اچھا، اب تم جاؤ۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔
”لیکن آپ ایک نوالہ میرے سامنے لے لو جی۔ مجھے پتا چل جاوے گا کہ میں نے کیسا پکایا ہے۔“
میں نے نوالہ لیا اور کہا۔ ”بہت اچھا ہے۔“
وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ”بھوک کے ساتھ تو سب ہی کھا لیوت ہیں لیکن اگر عورت کے ہاتھ میں کرامات ہو تو پھر مرد بھوک کے بغیر بھی کھاوت ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ عورت اپنی ہوشیاری سے اسے بھوک لگا دیوت ہے۔“ وہ پتا نہیں کس بھوک کی بات کر رہی تھی۔
”اچھا، اب تم جاؤ۔“ میں نے طیش بھرے انداز میں کہا۔
”اوئی ماں! آپ تو بڑی جلدی غصہ ہو جاوت ہیں۔“
”میں بڑی جلدی ہاتھ بھی اٹھا لیتا ہوں۔“
”اف ماں! آپ تو واقعی بڑے کڑک ہیں۔“ اس نے پھر معنی خیز انداز اختیار کیا اور مجھ پر ترچھی نظر ڈال کر باہر چلی گئی۔ سلطانہ ذرا چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔
کچھ دیر بعد میں واپس جانے کے لیے برآمدے سے گزرا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ گرو کی سندر چنی رادھا ایک کمرے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ اسے اور گرو کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ جس بارودی بیلٹ کے ڈراوے میں آ کر وہ اور گرو دربدر ہوئے ہیں اور ایک بڑی آفت میں پھنسے ہیں، اس بیلٹ میں پسے ہوئے نمک کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں عمران اور اقبال کے پاس پہنچا تو وہ کمرے میں انگیٹھی دہکائے بیٹھے تھے۔ پرسوں راستے میں جیپ سے پکڑا جانے والا راہول بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کے کندھے پر ایک بڑی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ وہ کراہ کر بات کر رہا تھا۔ وہ طاقتور واکی ٹاکی بھی اس کے قریب رکھا تھا جو ہمیں جیپ میں سے ملا تھا۔ واکی ٹاکی آن تھا لیکن پرسوں رات کی طرح آج بھی اس سے کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ عمران اور اقبال کل بھی کوشش کرتے رہے تھے مگر اس واکی ٹاکی کے ذریعے کسی سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔
عمران نے راہول سے کہا۔ ”دیکھو، سچ بولو گے تو تمہاری نسل آگے چلے گی، ورنہ آج اسی جگہ وہ سارے بچے اور ان کے بچے بھی ختم ہو جائیں گے جنہوں نے تمہاری وجہ سے پیدا ہونا ہے... ہنسنا کھیلنا ہے اور زندگی کے مزے لینے ہیں۔“
اس کے ساتھ ہی عمران نے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے ہوئے ریوالور کی تھوڑی سی جھلک راہول کو دکھائی اور اسے یہ بھی باور کرایا کہ اس نے انگلی ٹریگر پر رکھی ہوئی ہے۔

راہول نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''میں سچ کہوت ہوں، پانڈے صاحب اور دوسرے لوگن کے پاس دوسرا انٹینا نا ہیں ہے۔ بس ایک ہی انٹینا تھا جو ہم نے جیپ میں رکھا ہوا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ لوگن ابھی تک یہاں نا ہیں پہنچے۔ اگر وہ سگنل ریسیو کر رہے ہوتے تو کب کے آپ سب کو گھیر چکے ہوتے۔''

''اچھا، یہ واکی ٹاکی اب تک خاموش کیوں ہے؟'' اقبال نے راہول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی دو وجہ ہوسکت ہیں۔ یا تو پانڈے صاحب اور دوجے لوگن ہم سے پندرہ بیس کلومیٹر سے زیادہ کی دوری پر ہیں یا پھر ان کے واکی ٹاکی کی بیٹری ختم ہوچکی ہے۔''

''اگر تمہارے والے سیٹ کی بیٹری ابھی ختم نہیں ہوئی تو اس کی کیسے ہوسکتی ہے؟'' اقبال نے سوال اٹھایا۔

''اس سیٹ کی بیٹری میں پہلے بھی مسئلہ تھا۔'' راہول نے کہا۔

''اگر واقعی بیٹری ختم ہو چکی ہے تو کیا پانڈے وغیرہ اسے دوبارہ چارج کر سکتے ہیں؟''

''ہاں... میرا وچار ہے کہ وہ کوشش کر رہے ہوں گے۔ پانڈے صاحب کے ساتھیوں میں کشور نام کا ایک الیکٹریشن بھی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے گاڑی کے چارجر کے ساتھ کچھ تار لگا کر واکی ٹاکی چارج کرلیا تھا۔''

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک کرشمہ ہوگیا۔ اچانک لونگ رینج کے اس واکی ٹاکی پر ایک سرخ بلب روشن ہوا اور اس کے اسپیکر میں کھٹ پٹ کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ پہلے تیز شائیں شائیں سنائی دیتی رہی پھر اقبال نے ایک ناب کو دائیں بائیں گھمایا تو واضح انسانی آواز ابھر کر ہمارے کانوں تک پہنچی۔ ''ہیلو... ہیلو... کہاں ہو تم لوگ... ہیلو۔''

میں اس آواز کو بہ آسانی پہچان گیا۔ یہ منحوس لب ولہجہ پانڈے کے سوا کسی اور کا نہیں ہوسکتا تھا۔

آواز پھر ابھری۔ ''ہیلو راہول... ہیلو دلیپ... ہیلو، میں پانڈے بول رہا ہوں۔ تم میری آواج سن رہے ہونا؟''

مجھے دوسرا شاک لگا جب راہول کے بجائے اقبال نے پانڈے کے سوال کا جواب دیا لیکن یہ آواز ہو بہو راہول کی تھی۔ اقبال نے کہا۔ ''ہاں پانڈے صاحب! میں راہول بات کررہا ہوں۔''

''یار! کہاں مر گئے تھے تم۔ ہم تمہارے انتجار میں سوکھ کر لکڑی ہوگئے ہیں۔ ہاں قسم اتنا انتجار فلم سٹار جی نت امان کا کیا ہوتا تو وہ بھی اپنے بستر میں گھس آتی۔ پورے چھتیس گھنٹے ہوگئے ہیں تمہاری جان کو روتے ہوئے۔''

''بس ملاقات ہوتی ہے تو ساری ڈیٹیل آپ کو بتاتے ہیں۔ یہاں بڑا پھڈا ہوگیا ہے۔''

''کیا چھوٹے سرکار راجیت صاحب کی بہن نے بکری کا بچہ جن دیا ہے جنگل میں؟''

''بس ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔'' اقبال نے ہو بہو راہول کی آواز کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

یہ تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اقبال مختلف آوازوں کی شاندار نقل کرتا ہے۔ اس نے لاہور میں بھی سیٹھ سراج کی آواز کی زبردست نقل کی تھی اور جب ہم عمران کے گھر میں تھے تو اقبال نے سیٹھ سراج کی آواز میں مولانا ابرار کو فون کر کے اس سے اہم معلومات حاصل کی تھیں۔ لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح واکی ٹاکی کے اچانک جاگنے پر وہ فوراً ہی راہول کی آواز میں گفتگو شروع کر دے گا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران اور اقبال نے اس کے لیے پہلے سے تیاری اور ریہرسل وغیرہ کر رکھی تھی۔ راہول کی آواز سن کر اس کی کاپی کرنے میں اقبال کو دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔

''یار! کچھ منہ سے پھوٹو گے یا پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے؟'' پانڈے نے ذرا کرخت آواز میں کہا۔

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ کس جگہ پر ہیں؟'' اقبال نے راہول کی آواز میں پوچھا۔

پانڈے نے کہا۔ ''ہم نے لکڑی کی چھوٹی پلیا پر سے ندی پار کرلی ہے۔ سامنے جو دو بڑے ٹیلے نجر آرہے تھے، ان کے بالکل پاس ہیں۔ کل رات بھی اسی جگہ پر گزاری ہے، تم دونوں کے نام کی مالا جپتے جپتے... اب تم بتاؤ کچھ کھوج کھرا ملا اس پاکستانی چھوکرا کا؟''

''لگتا ہے کہ ہیو کی قسمت اچھی ہے پانڈے صاحب... بس شکنجے میں آتے آتے نکل گیا ہے۔ کل صبح تک ہم کو بڑے اچھے سگنل مل رہے تھے۔ وہ کچھ کی طرف جا رہا تھا۔ شام کے وقت سگنل بالکل کمزور پڑے اور پھر بند ہو گئے۔ رات پچھلے پہر پھر ایک آدھ گھنٹے کے لیے سگنل ملے، اب پھر کوئی پتا نا ہیں چل رہا۔ اب جیپ کا ڈیزل بھی ختم ہونے کو ہے۔ میرا خیال ہے، ہم اور آگے نا ہیں جا سکیں گے۔''

''کوئی اچھی جانکاری نہ دینے کی تو شاید تم نے سوگند کھا رکھی ہے۔'' پانڈے کی آواز میں بیزاری تھی۔ پھر وہ کچھ

بڑبڑایا۔ شاید اس نے موجودہ صورتِ حال کو کوئی غلیظ گالی دی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ یہ گفتگو میرے بارے میں ہو رہی ہے۔ وہ میرے لیے بڑی حقارت سے پپو کا لفظ استعمال کرتا تھا۔ حالانکہ یہ پپو اسے دیوان میں ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔

پانڈے نے اپنے کسی ساتھی سے بات کی۔ الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آسکے۔ تب وہ راہول سے مخاطب ہو کر مائیک میں بولا۔ ”راہولے! اس پپو نے ہم کو چیلنج مارا ہے۔ جب تک اسے ننگا کر کے الٹا نہ لٹکاؤں گا، مجھے بھوجن ہضم نہیں ہووے گا اور نہ ہی حاجت ہووے گی۔ جیسے بھی ہو، ہم نے اس کتے کو پکڑنا ہے اور اس کے جسم کے کسی نازک حصے کو دبوچ کر اسے کھینچتے ہوئے یہاں لانا ہے۔“

”لیکن اس کے لیے ہم کو تھوڑا سا دھیرج کرنا پڑے گا پانڈے صاحب! معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”پہلے آپ ذرا جلدی سے مجھے یہ بتائیں کہ آپ سے رابطہ کیوں نہیں ہو پا رہا تھا؟“ اقبال نے راہول کی آواز میں پوچھا۔

”وہی جوتی کی بیٹری ٹھس ہو گئی تھی۔ پہلے ہر ایک گھنٹے بعد پاؤں بھاری ہو جاتا تھا پھر بالکل لمبی ہی لیٹ گئی۔ بڑی کوشش سے ٹھیک کیا ہے کشور نے... اب پتا نہیں پھر کب حاملہ ہو جائے۔“ پانڈے نے بیٹری پر غصہ نکالتے ہوئے کہا۔

اقبال نے راہول کی آواز میں کہا۔ ”پانڈے صاحب! ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے نل پانی کے دو مسٹنڈے سپاہی پکڑے ہیں۔ پہلے تو وہ کچھ بتا وت نہیں تھے۔ اب دس پندرہ منٹ پیٹھ پر جوتوں کی ٹکور کرانے کے بعد انہوں نے زبان کا تالا کھولا ہے۔ آپ اس وقت سخت خطرے میں ہو جی۔ ہمارا وچار ہے کہ آپ جتنی جلدی یہاں سے نکل جاویں، اتنا ہی اچھا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہاں سے روانہ ہونے کے لیے آپ کے پاس آدھ گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں ہے۔“

”یار! کیا بک رہے ہو؟“

”میں تفصیل آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کو جانکاری مل گئی ہے کہ آپ چھوٹی پلیا کے آس پاس موجود ہیں۔ آپ کو گھیرے میں لینے کے لیے ایک بڑا جتھا آپ کی طرف آرہا ہے۔ پکڑے جانے والے دونوں لڑکوں نے بتایا ہے کہ یہ کم از کم ڈیڑھ سو گھڑ سوار ہیں۔ تین چار جیپیں بھی ان کے ساتھ ہیں۔ چھوٹے سرکار یہ سمجھتا ہے کہ مختار راجپوت کی لونڈیا اب بھی ہمارے پاس ہے۔ وہ اسے ہم سے چھڑانا چاہت ہے۔“

”تم... تم اس سمے ہو کہاں؟“ پانڈے کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”میں اس سمے اپنی لوکیشن کے بارے میں ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بس چاروں طرف درخت ہی درخت ہیں۔“ اقبال بڑے اعتماد سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

”یعنی تم اس سمے بالکل کھلی جگہ پر ہو؟“

”جی ہاں۔“

”کوئی آبادی کوئی مکان وغیرہ دکھائی نہیں دیتا؟“

”نہیں... اور میں آپ کو پھر کہہ رہا ہوں، آپ باتوں میں سمے ضائع نہ کریں۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے، نرگاں کی طرف رخ کر لیں۔“

”اور تم دونوں؟“

”ہماری زیادہ چنتا نہیں کریں۔ ہم بھی کسی نہ کسی طرح نکل ہی جاویں گے۔“

”جو دونوں لڑکے تم نے پکڑے ہیں، کیا ان سے ایک منٹ میری بات کرا سکت ہو؟“

”ٹھیک ہے میں کرا دیتا ہوں لیکن آپ کے پاس ٹائم...“ اس کے ساتھ ہی اقبال نے بٹن دبا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

سلسلہ چونکہ فقرے کے درمیان منقطع ہوا تھا، دوسری طرف یقیناً یہی سمجھا گیا ہوگا کہ کسی وجہ سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔

اقبال نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور داد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران نے اس کے سینے پر ہلکا سا گھونسا جما کر اسے داد دی۔ یقیناً وہ تعریف کے قابل تھا۔ خود راہول بھی اس کی کامیاب نقالی پر حیران نظر آرہا تھا۔ آواز کا اتار چڑھاؤ، فقروں کی بناوٹ، لفظوں کا چناؤ... سب کچھ پرفیکٹ تھا۔

راہول کو باہر بھیج دیا گیا۔ عمران کافی حد تک مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ”چلو، اس دوسری بلا سے بھی جان چھوٹی۔“

”وقتی طور پر۔“ اقبال نے فقرہ مکمل کیا۔

”اور پہلی بلا سے کیا مراد ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یار! اتنی جلدی بھول گئے۔ استھان کے وہ سارے جنونی بلاؤں سے کم تو نہیں تھے۔ اگر پرسوں رات جنگل میں ان سے ٹاکرا ہو جاتا تو پانی پت کی تیسری لڑائی ہو جانی تھی۔“

”لیکن وہ جنونی ابھی ہمارے آس پاس ہی موجود ہیں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن ہم تک پہنچیں گے نہیں۔“ عمران نے وثوق سے کہا۔ ”ابھی تم دو چار دن آرام فرماؤ۔ ہماری بھابی کے ہاتھ کی گرم گرم روٹیاں کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ۔“ آخر میں اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

رنجیت پانڈے کی منحوس آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی... عمران نے میرے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا۔ ”یار! یہ پانڈے کیا شے ہے؟ بڑا تڑ چا سنا ہے اس کا۔ کہتے ہیں کہ حکم جی کی مونچھ کا بال کہلاتا ہے۔“

اقبال بولا۔ ”ظاہر ہے بھائی! جو شخص میڈم صفورا اور مولانا ابرار جیسے بندوں کو مرغیوں کی طرح دبوچ کر پاکستان سے انڈیا لا سکتا ہے، وہ معمولی چیز تو نہیں ہوگا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تابی سے اتنی محبت کیوں ہے اسے۔ بڑی شفقت سے اس کا نام لے رہا تھا۔“

”میرا اندازہ ہے کہ ماضی قریب میں کہیں تابی نے اس کی دُم پر پاؤں رکھا ہے یا شاید دُم اکھاڑنے کی کوشش ہی کی ہے۔“

عمران اور اقبال سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔

میں نے انہیں مختصر الفاظ میں اس زوردار جھڑپ کے بارے میں بتایا جو نل پانی کے دیوان میں میرے اور پانڈے کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جھڑپ میں تو پانڈے کو کامیابی نہیں ملی تھی لیکن وہ جاتے جاتے ایک بڑا نقصان پہنچا گیا تھا۔ اس کے رکھے ہوئے بم نے پھٹ کر دیوان میں کئی افراد کی جان لے لی تھی۔

عمران اور اقبال نے بڑی دلچسپی اور حیرت سے یہ روداد سنی۔ عمران نے میرے بازوؤں کے مسل تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”اقبال! میں تجھ سے کہتا تھا نا، اپنے تابی کی جون بدل چکی ہے۔ اب یہ ہم سے دو ہاتھ آگے ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہمیں اس کی شاگردی اختیار کرنی پڑے گی۔ پہلوانی کے سارے داؤ پیچ اس سے سیکھنے پڑیں گے پھر جب کہیں کوئی دنگل ہوگا تو پوسٹرز پر میرا اور تمہارا نام اس طرح لکھا جائے گا۔ اقبال پٹھا عمران، پٹھا تابش، پٹھا باروندا جنگلی نیپال والا، پٹھا فلاں فلاں۔“

اقبال مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”مذاق تو رہا ایک طرف، ویسے یار تابش! تم بہت تبدیل ہوئے ہو۔ میں سچ مچ حیران ہوتا ہوں... اب بھی تم نے سخت سردی میں صرف یہ ایک قمیص پہن رکھی ہے۔ آج صبح تم نے ٹھنڈے پانی سے ہی نہانا شروع کر دیا تھا۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ جس تابش سے ہم لاہور میں ملے تھے، وہ کوئی اور تھا... اب جو تابش ہمارے سامنے ہے، وہ کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر بھٹکنے والا کوئی درویش ہے جو دن رات جفاکشی کی تکلیفیں اٹھانے میں سکون محسوس کر رہا ہے۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اب تکلیف میں راحت ملنا شروع ہو گئی ہے۔ میں بڑ نہیں مار رہا ہوں۔ مجھے اب سردی محسوس ہی کم ہوتی ہے۔“

اقبال نے میرے ہاتھ تھامے اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میرے ہاتھوں کی رنگت گندمی ہو چکی تھی۔ ہاتھوں کی گانٹھوں پر چنڈیاں سی پڑ گئی تھیں۔ ہاتھ پاؤں کی کھال بتدریج سخت اور موٹی ہو گئی تھی۔ سینڈ بیگ پر میں نے اتنی زیادہ مشق کی تھی کہ اب ٹھوس دیوار پر بھی مکا چلا سکتا تھا۔

اقبال بولا۔ ”جو کچھ بھی ہے، میں تمہارے اس فلسفے سے کچھ زیادہ اتفاق نہیں کر پا رہا۔ اگر قدرت نے ہمیں کچھ آسانیاں دی ہوئی ہیں تو ہمیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے... زندگی جینے کے لیے ہے، خود کو مسلسل تکلیف میں ڈالے رکھنے کے لیے نہیں۔“

چندہ

رابی اسرائیل سے نقل وطن کر کے امریکا میں آباد ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے درخواست دی۔ انٹرویو کے دوران میں اس سے پوچھا گیا۔ ”لوگوں کے ایک بڑے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے تم کیا کرو گے؟“

رابی نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ امریکا میں مجمع منتشر ہونے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ البتہ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ تل ابیب میں مجمع منتشر کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔“

کہا گیا۔ ”اچھا یہی بتا دو کہ تل ابیب میں مجمع منتشر کرنے کے لیے کیا کرو گے؟“

رابی نے کہا۔ ”میں چندہ مانگنا شروع کر دوں گا۔“

ام کلثوم۔ کوٹ غلام محمد

”لیکن یہ بات تو ہے نا کہ کچھ بھی مسلسل نہیں رہتا... تکلیف نہ خوشی۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ مسئلہ تو صرف یہ ہے کہ ہم کتنی خوشی پانے کے لیے کتنی تکلیف اٹھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم کچھ زیادہ ہی کتابی باتیں نہیں کرنے لگے ہو۔“ اقبال نے جواب دیا۔

”یار اقبال! یہ اپنا جگر بڑی گہری بات کر رہا ہے۔“ عمران نے مداخلت کی۔ ”کسی وقت دھوپ میں بیٹھ کر، سگریٹ سلگا کر اور سامنے کڑک چائے رکھ کر اس کی بات پر غور کریں گے۔“

اسی دوران میں ایک قریبی کمرے سے رونے کی آواز آئی۔ یہ مردانہ آواز تھی۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ گرو ہے۔“ عمران نے کہا۔

ہم اٹھ کر گرو کے پاس پہنچے۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں منہ دیے کھڑا تھا اور ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ ہر ہچکی کے ساتھ اس کی توند ہلتی تھی اور توند کے ساتھ پورا جسم بھی ہل جاتا تھا۔ اس کی بیٹی رادھا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ وہ اپنے آنسو پونچھنے کے ساتھ ساتھ اپنے پتی کو دلاسا دینے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ نوری بھی وہیں موجود تھی۔

”کیا ہوا ہے تمہارے گرو کو؟“ عمران نے رادھا سے پوچھا۔

وہ بس منہ میں منمنا کر رہ گئی۔ اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

نوری بولی۔ ”میں بتاتی ہوں جی... اس موٹے کو رلانے کا کارنامہ میں نے انجام دیا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ عمران نے پوچھا۔

”دراصل جی، ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا ناہیں تھا کہ یہ خبر اس طرح ٹھاہ کر کے اس موٹے کی چھاتی پر لگے گی اور یہ یوں بھوں بھوں رونا شروع کر دیوے گا۔ خبر یہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بستی میں اطلاع پھیلی ہے کہ ٹل پالی کی بڑی پھلواری کے پاس کسی پرانے استھان میں درگھٹنا ہوئی ہے۔ مندر کے بارہ سیوکوں کو کسی نے زہر دے کر مار دیا ہے اور کچھ لوگن کو اغوا بھی کر لیا ہے۔“

میں، عمران اور اقبال چونک گئے۔ عمران نے پوچھا۔ ”یہ خبر پہنچائی کس نے ہے؟“

”ٹھیک سے تو پتا ناہیں عمران بابو! کسی مسافر نے ہی پہنچائی ہوگی۔ بس اتنی جانکاری ہوئی ہے کہ قاتلوں کو ڈھونڈنے کے لیے استھان کے بہت سے لوگن جنگل میں گھوم رہے ہیں اور کچھ کے آس پاس والی بستیوں کی تلاشی لے رہے ہیں۔“

عمران اشک بار گرو کو لے کر اپنے کمرے میں آگیا اور اس کی توند کو ٹھوکا دے کر بولا۔ ”یہ کیا تماشا لگا رہے ہو؟ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب تمہارے رونے دھونے سے کیا فائدہ ہوگا؟“

گرو آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ بولا۔ ”تم لوگن نے مجھے برباد کر دیا۔ میرے ہاتھوں سے بارہ ہتھیائیں ہو گئیں۔ بھگوان کے اتنے سارے سیوک مارے گئے۔ اب میرا کیا ہووے گا۔ یہ لوگن مجھے جینے دیں گے نہ مرنے۔“

عمران نے گرو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ تم نے خود ہی تو اس دن اشلوک پڑھا تھا کہ بندے کے ہر کام کو اس کی نیت سے جانچا جاتا ہے۔ تمہاری نیت کسی کو مارنے کی نہیں تھی۔ تم ان لوگوں کو صرف بے ہوش کرنا چاہتے تھے... اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ایک بے گناہ لڑکی کو زندہ جلنے سے بچایا جا سکے۔ ان لوگوں کا جیون پورا ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ اپنے کرموں کا حساب دینے کے لیے بھگوان کے پاس پہنچ گئے۔ اور جس طرح کے ان کے کرم تھے، ان کا حساب جلدی ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس میں تمہارا کوئی دوش نہیں۔“

گرو بولا۔ ”دوش ہے یا نہیں لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ اگر ستیش اور اس کے ساتھی کسی طرح اس گاؤں میں پہنچ گئے تو مجھے اور رادھا کو زندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ وہ اب تک بات کی تہ تک پہنچ چکے ہوں گے۔ بڑے گرو نے انہیں میرے خلاف اور بھی کر دیا ہووے گا۔“

”اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ اس بستی تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ان کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ ہم اس مچھیرا بستی میں ہیں۔ ان کی ساری بھاگ دوڑ کچے کے آس پاس رہے گی۔“ عمران نے پورے وثوق سے کہا۔

”پرنتو، ہونے کو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کل کی جانکاری تو ایشور کے سوا اور کسی کو ناہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر تمہارے پیٹ میں مروڑ کیوں اٹھ رہے ہیں؟ خوامخواہ خود کو ہلکان مت کرو۔ دیکھو، تمہاری پتنی جوان ہے۔ اسے زندگی کی زیادہ ضرورت ہے لیکن یہ پھر بھی حوصلے میں ہے۔ تم تو سارے مزے لوٹ چکے ہو۔ پتا نہیں کتنی داسیوں کے ساتھ خفیہ اور اعلانیہ بیاہ رچا چکے ہو۔ ہزاروں من حلوہ تو تمہارے پیٹ میں اتر ہی چکا ہوگا... اس کے علاوہ دیسی گھی کے پراٹھے، باداموں والی بھنگ کے بڑے بڑے کنستر اور پتا ناہیں کیا کچھ جا چکا ہے تمہارے اندر۔“

رادھا لجاجت سے بولی۔ ”لیکن یہ گرو ہیں۔ ان کو کچھ ہو گیا تو یہ ہم سب کے لیے مہاپاپ ہووے گا۔ میں ان کی جیون رکھشا کے لیے آپ کی منتی کرت ہوں۔“

”دیکھ لے موٹے۔“ اقبال نے کہا۔ ”یہ سیدھی سادی لڑکی اب بھی تیرے بارے میں سوچ رہی ہے جبکہ تو صرف اپنے بارے میں فکرمند ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ گرو ہونے کے باوجود اپنے دھرم پر تیرا وشواس اس لڑکی سے کم ہے۔“

رادھا لرز گئی۔ ”ناہیں جی! ایسا مت کہیں۔ مجھ کو پاپ لگے گا۔ ہم سب کو پاپ لگے گا۔“ اس نے جلدی سے نیچے بیٹھ کر گرو کے قدموں کو انگلیوں سے چھوا اور پھر یہی انگلیاں اپنی مانگ میں پھیریں۔

اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ دھرم کی خاطر اپنا تن من پورے یقین سے گرو کے سپرد کر چکی ہے اور ادھیڑ عمر گرو اس کی خود سپردگی اور سادگی سے ”خاطر خواہ“ فائدہ اٹھاتا ہے۔

عمران نے رادھا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اپنے اس گرو پتی کو میری طرف سے پوری تسلی دے۔ یہ اگر ہمارا سیوک بن گیا ہے تو پھر یہ ہماری حفاظت میں آگیا ہے۔ اوپر والے نے چاہا تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ لیکن اسے سیوا پوری کرنی پڑے گی، تب ہی اس کے اور تمہارے گناہ دھل سکیں گے۔“

رادھا نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

نوری سارا دن میرے آگے پیچھے ہی رہی۔ اس کا جسم مچلتے پارے کی طرح تھا۔ وہ اس پارے کے لشکارے دکھاتی پھر رہی تھی۔ عمران اور اقبال نے اسے مکھیا کے حوالے سے مظلوم بتایا تھا مگر فی الحال مجھے تو اس میں مظلومیت کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ چوڑیاں چھنکاتی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے کبھی کوئی معنی خیز فقرہ اچھال دیتی، کبھی مسکراہٹ کی چمک دکھاتی، کبھی چائے یا قہوے کی بے وقت پیشکش کرتی۔ شام کو جب میں کمرے سے نکل رہا تھا، وہ دفعتاً اپنے پورے جسمانی گداز کے ساتھ مجھ سے آٹکرائی۔ اس کے ہاتھوں سے پیتل کی تھالی نکل کر دور جا گری۔ وہ خود بھی لڑکھڑا گئی۔ ”اوئی ماں!“ وہ اپنے کندھے کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ”بابو جی! آپ تو ایک دم لوہا ہو۔ مجھ غریبنی کی چولیں ہلا ڈالیں۔“

”زیادہ تو نہیں لگی؟“ میں نے رسماً پوچھا۔

وہ تو شاید کسی ایسے ہی سوال کی تلاش میں تھی۔ سسکاری لے کر بولی۔ ”لگی تو زیادہ ہی ہے جی۔ پر کوئی بات نہیں۔ آپ نے ہی لگائی ہے نا۔“

”تم کیا شے ہو؟“ میں نے حیرانی ظاہر کی۔

”یہی سوال اگر آپ سے کروں تو؟ میرا مطلب ہے جی، آپ کی کچھ سمجھ ناہیں آوت ہے۔ نہ آپ کو سردی لگت ہے نہ گرمی، آپ ٹھنڈے پانی سے نہا لیوت ہیں۔ آپ کا بدن لوہے کی ماتن سخت ہے۔ لگتا ہے کہ آپ پہلوانی کرت ہیں۔ لیکن پہلوان تو بہت موٹے موٹے ہووت ہیں گرو کی طرح۔ آپ تو دبلے پتلے ہیں۔“ اس نے پھر دزدیدہ نظروں سے میرا سراپا دیکھا۔

”تم باتیں بہت کرتی ہو اور جتنی بھی کرتی ہو، وہ فضول ہوتی ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھو۔“ میں نے سخت خشک لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اس وقت مجھے سامنے کھڑکی کے پیچھے ہلچل سی نظر آئی، جیسے کوئی ہمیں وہاں سے دیکھ رہا ہو اور پھر پردہ برابر کر کے چلا گیا ہو۔ یہ تاؤ افضل کی بیٹیاں ہو سکتی تھیں... اور سلطانہ بھی۔ اگر یہ سلطانہ تھی تو پھر میرے لیے تشویش کی بات تھی۔ وہ نوری سے میری بات چیت کا کوئی غلط مطلب بھی لے سکتی تھی۔

مجھے شک تھا کہ نوری جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرائی ہے۔ تاہم یہ اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے واقعی حیرانی ہو رہی تھی کہ عمران نے یہ کیا شے پالی ہوئی ہے۔

میں سارا دن سلطانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اپنی تمام تر سادگی، خاموشی اور وفاکشی کے ساتھ میرے حواس پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے گریز کر رہی تھی اور اس کا گریز مجھے اس کی طرف کشش کر رہا تھا۔ میں اس کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ جارج گورا کے ہاتھوں اس کا جسم ہی نہیں، اس کی روح بھی زخمی ہوئی تھی۔ وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھ رہی تھی کہ میری بیوی اور بالو کی ماں کہلاتی۔ میرے نزدیک اس کی یہ سوچ یکسر غلط تھی۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ سمجھتا تھا کہ وہ آج بھی ویسی ہے جیسی اس بے مہر رات سے پہلے تھی۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ وہ میرے نزدیک پہلے سے زیادہ عزیز اور محترم تھی۔ اس کے جذبۂ قربانی اور ایثار نے میری نظروں میں اسے گرانے کے بجائے اور ابھار اتھا۔

رات کو میں اوپر کمرے میں بستر پر لیٹا اسی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ نوری کچے کوئلوں کی انگیٹھی دہکا کر کمرے میں لے آئی۔ وہ حسبِ معمول بے باک لباس میں تھی۔

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنی چنری شاید جان بوجھ کر سرکا دی تھی۔ اب وہ گلابی چنری ایک بے مصرف شے کی طرح اس کے کندھے پر پڑی تھی۔ انگیٹھی کی آنچ سے اس کا چہرہ بھی دہکا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

وہ انگیٹھی میرے بستر کے بالکل قریب رکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو سردی نا ہیں لگتی لیکن مہمان نوازی تو ہمارا فرض ہے نا جی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ نیچے دری پر اکڑوں بیٹھ گئی۔

''چلو فرض پورا ہو گیا ہے۔ اب جاؤ۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔

''شاباش بابو! آپ تو بہت روکھے ہو جی۔''

''روکھا ہی نہیں ہوں... مار پیٹ بھی کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ ڈرے بغیر بولی۔ ''یہ تو میں نے آج دوپہر دیکھ ہی لیا ہے۔ اتنی زور سے مارا ہے کہ... اُف... ہاتھ بھی نہیں لگتا۔''

''کیا مطلب؟''

اس نے اپنا کندھا دوسرے ہاتھ سے دبایا اور سسکاری لے کر ''اوئی اللہ'' کہا پھر بے تکلفی سے بولی۔ ''اتنی زور سے ٹکر ماری ہے جی کہ مجھ غریبنی کے کندھے پر نیل پڑ گیا ہے۔''

''اچھا، اب تم یہاں سے جاؤ۔ تمہیں مزید نیل پڑ سکتے ہیں۔''

''زہے قسمت۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ پھر میرے تیور دیکھ کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا جی، میں جاوت ہوں۔'' اس نے کہا۔

وہ دروازے کی طرف مڑی مگر دو قدم چل کر رک گئی۔ تب پلٹی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر گویا ہوئی۔ ''غصہ نہ کرنا جی... ایک بات کہوں آپ سے... آپ ہی کے فائدے کی ہے۔''

''کہو۔'' میرے تیور بدستور خراب تھے۔

''آپ کی گھر والی شاید آپ سے ناراض ہیں۔ اگر آپ نے انہیں منانے کے لیے کوئی پیغام شیغام دینا ہے تو مجھے بتائیں۔ میں ان تک پہنچا دوں گی۔''

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ادا سے مسکرائی۔ آنکھوں میں شوخی تھی۔

''کیا تم اس سے بات کر لیتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں نا ہیں جی۔ بات بھی کر لیوت ہوں اور ہنسی مذاق بھی۔ آپ فرمائیں، آپ نے کہنا کیا ہے؟'' وہ بے تکلفی سے مسہری کے بازو پر بیٹھ گئی۔

''یہ کیا حرکت ہے... کھڑی ہو جاؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ ایک دم کھڑی ہوئی اور چہرہ: نظر آنے لگی۔ ''چلو ادھر بیٹھو انگیٹھی کے پاس۔'' میں نے نیچے اشارہ کیا۔

وہ دو زانو ہو کر دری پر انگیٹھی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ''آپ بڑے سخت ہو جی۔'' اس نے کہا۔

''کیا سختی کی ہے میں نے؟''

''یہ دوپہر والی سختی کیا کم ہے؟'' وہ بولی۔

پھر اس نے اپنا کندھا عریاں کر کے مجھے دکھایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے انتہائی بے باکی سے اپنی چولی کندھے سے نیچے تک کھسکا دی۔ اس کا شفاف کندھا اور سامنے سے جسم نیم عریاں ہو گیا۔ اس کے کندھے پر ہلکا سا نیل نظر آ رہا تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' میں سچ مچ تپ گیا۔

اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ''یہ بے ہودگی نا ہیں جی... چوٹ ہے... اور ایسی ہی چوٹ میرے دل پر بھی آئی ہے۔ آپ حکم دیویں تو یہ دوسری چوٹ بھی دکھاؤں۔'' اس نے دلیری سے چولی کے دوسرے مونڈھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔

وہ حد پار کر رہی تھی۔ ''چولی اوپر کرو۔'' میں گرجا۔

مجھے تعجب ہوا جب وہ ڈری نہیں۔ بس اتنا ہوا کہ اس نے چولی کو بائیں جانب سے نہیں اتارا۔ وہ لجاجت سے بولی۔ ''آپ بڑے ظالم ہو جی۔ مارتے بھی ہو اور چوٹ بھی نہیں دکھانے دیتے۔''

''تم بکواس بند کرو اور نکلو یہاں سے۔ نہیں تو میں اٹھا کر پھینک دوں گا۔''

''چلو حضور، کسی بہانے اس داسی کو اٹھائیں گے تو سہی۔'' وہ بولی اور میرے مزید غصے سے بچنے کے لیے عریاں کندھا ڈھانپ لیا۔

''میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں۔ شرافت سے نکل جاؤ... نہیں تو۔''

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور سلطانہ اندر داخل ہوئی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بالکل نظر انداز کرتے ہوئے نوری کی طرف دیکھا اور اس کی طرف بڑھی۔ نوری گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی چنری سر پر رکھ لی۔ سلطانہ نے بے دریغ اسے چوٹی سے پکڑا اور جھٹکا دے کر کمرے کے وسط میں پہنچا دیا۔ وہ انگیٹھی کے اوپر گرتے گرتے بچی۔

''حرامجادی کلموہی... تجھے اتنی آگ لگی ہے تو بتا اپنے مالک کو۔ وہ کسی سے تیرے دو بول پڑھا دے۔''

''میں تو... میں تو جی۔'' نوری ہکلا کر رہ گئی۔

سلطانہ نے اسے پھر چوٹی سے دبوچا۔ میں ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ نوری کے گال پر پڑنے والا طمانچہ میں نے اپنے ہاتھ پر روکا۔ سلطانہ پھنکاری۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ میں اس کی جان لے لوں گی۔ یہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔''

میں نے بہ مشکل سلطانہ کو سنبھالا اور نوری کو دھکیل کر کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس کشمکش میں نوری کی کئی چوڑیاں ٹوٹیں۔ سلطانہ کو نوری کے پیچھے جانے سے روکنے کے لیے میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہ طیش سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس کا سینہ پھول پچک رہا تھا۔ گھنے بالوں کی لٹیں چہرے پر تھیں۔ میں نے اس کے کندھے تھامے۔ ''چھوڑو سلطانہ! ایسی دو ٹکے کی عورت کے لیے خود کو کیوں طیش میں لا رہی ہو؟ اسے اس کی بے شرمی کا بڑا اچھا جواب مل گیا ہے۔''

''اس کی نجر اچ خراب ہے۔ مجھے کل اچ اندا جا ہو گیا تھا۔ اس حرامجادی کمینی کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تمہارے کمرے میں آئی۔ میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔''

میرے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مدھم مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میرے دونوں ہاتھ سلطانہ کے کندھوں پر تھے۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! اگر تم برا نہ مانو تو تمہاری بات کا جواب دوں؟''

''کس بات کا مہروج؟''

''یہی کہ اس کمینی کو جرأت کیسے ہوئی کہ میرے کمرے میں آئی؟''

وہ اپنی بھیگی ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اسے یہ جرأت اس لیے ہوئی کہ تم یہاں میرے پاس نہیں تھیں۔''

وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔ پھر اس نے اپنا جسم چھڑایا اور اپنے کندھے میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکال لیے۔ میری پلنگ نما چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی اور اپنی اوڑھنی سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اس کی غم زدہ سادگی میں ایک خاص طرح کی کشش تھی۔ نوری اور نوری جیسی دوسری گوری چٹی چم چم کرتی تیز تیکھی لڑکیوں میں ایسی کشش کم ہی ہوتی ہے۔ میں ناقدانہ نظروں سے سلطانہ کو دیکھنے لگا۔ اس کے شانے چوڑے تھے اور شانوں کے مقابلے میں کمر نہایت دبلی پتلی اور چست تھی۔ غالباً اس کے جسم کی زیادہ تر کشش اس کی کمر کی وجہ سے ہی تھی۔ یہ کمر اب کسی کمان کی طرح مڑی ہوئی تھی اور سلطانہ اپنی اوڑھنی آنکھوں پر رکھے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ اشک بار آواز میں بولی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو مہروج! میں اچ بدحسمت (بدقسمت) ہوں۔ تمہارے خریب ہوتے ہوئے بھی خریب نا ہیں ہوں۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔ کچھ بھی میرے بس میں نا ہیں۔ بس خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ وہ میرے دل کو سکون دے دے یا پھر موت دے دے۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر اس کے کندھے پر بازو رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے اندر جیسے ایک زبردست کشمکش تھی۔ کشمکش کے اس آشوب میں اس کا لرزاں جسم کسی کشتی کی طرح ڈولتا تھا۔ پھر وہ اٹھ کر چلی گئی۔ کمرے کی طرح میرا دل بھی ایک دم خالی ہو گیا... میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ بستی کے گلی کوچوں میں سرد ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی... میرے سینے میں انگارے سلگ رہے تھے۔ جارج گورا کی صورت بار بار نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ یہ وہی تھا جس نے پہاڑی جھرنوں جیسی صاف شفاف چلبلی سلطانہ کو اپنی ہوس سے داغ دار کیا تھا اور اسے زندگی اور زندگی کی ساری رعنائیوں سے بہت دور کر دیا تھا۔ دوسری طرف جارج گورا ابھی اپنی قرار واقعی سزا سے بہت دور تھا۔ اپنے حفاظتی حصار میں معمول کی زندگی جی رہا تھا۔ سلطانہ نے اپنے طور پر اس سخت حصار کو توڑنے کی کوشش تو کی تھی مگر ناکام رہی تھی۔

میرے دل نے گواہی دی کہ میں جب تک سلطانہ کے ادھورے کام کو مکمل نہ کر دوں گا، وہ کبھی نارمل زندگی کی طرف نہیں آ سکے گی۔ اس پر عملاً ظلم ہوا تھا۔ اسے عملی داد رسی کی ضرورت تھی۔ زبانی باتوں سے اس کے زخم مندمل ہونے والے نہیں تھے۔

رات کو انگیٹھی کے گرد بیٹھ کر الائچی والا قہوہ پیتے ہوئے عمران اور اقبال کے درمیان اہم گفتگو ہوئی۔ عمران کی رائے تھی کہ ہم اگلے کم از کم پندرہ بیس دن بڑی خاموشی کے ساتھ گزاریں اور حالات کا جائزہ لیں۔ اس نے کہا۔ ''اس وقت یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہے۔ ہم دو طرفہ مصیبت میں ہیں۔ حکم جی کے ہرکارے اور استھان کا جنونی ٹولہ دونوں ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب ہوا تیز ہو تو لچک دار شاخیں جھک جاتی ہیں اور ٹوٹنے سے بچ جاتی ہیں۔''

''لیکن یہ مثال ہم پر صادق نہیں آتی۔'' میں نے کہا۔ ''اور ویسے بھی کبھی کبھی خاموشی گناہ بن جاتی ہے۔ جارج گورا اور حکم جی وغیرہ جو کچھ ہمارے ساتھ کر چکے ہیں، اس کے بعد

ہماری خاموشی بزدلی اور نامردی کہلائے گی۔"

"میں عارضی خاموشی کی بات کر رہا ہوں جگرا بڑے بڑے بہادر جنگجو بھی میدانِ جنگ میں حکمتِ عملی کے تحت پسپا ہوتے ہیں۔"

"تم چاہتے ہو کہ ہم کچھ دن کے لیے چپ سادھ لیں۔ مگر تم ایک بات بھول رہے ہو، ہم چپ بھی نہیں سادھ سکتے۔ کم از کم میری موجودگی میں تو تم دونوں ایسا نہیں کر سکتے۔"

"کیا مطلب؟" اقبال نے پوچھا۔

"میں اس کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" عمران بولا۔ "یہ چپ کی بات کر رہا ہے... چپ اس کے اندر موجود ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ ہماری نشاندہی بھی کر سکتی ہے۔ کیوں، یہی بات ہے نا؟" اس نے آخری جملہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تو کیا یہ غلط ہے؟" میں نے پوچھا۔

"درست ہے لیکن اس کا انتظام بھی میں کر چکا ہوں۔ بلکہ یہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں اس کے بارے میں سوچ چکا ہوں۔ وہ مندر دیکھ رہے ہو؟" عمران نے کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تاؤ انضل کے گھر کے بالکل عقب میں مندر کی مخروطی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ "مندر میں کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"مندر میں نہیں ہے، مندر کے نیچے ہے۔" عمران بولا۔ "اس مندر کے نیچے تین منزلہ تہ خانہ ہے۔ یعنی تہ خانہ پھر اس کا تہ خانہ پھر اس کا تہ خانہ۔ کچھ نہیں تو پچاس فٹ گہرائی تو ہوگی۔ ہم کل تک اس مندر کے سب سے نچلے تہ خانے میں شفٹ ہو جائیں گے اور اگلے کم از کم تین ہفتے وہیں گزاریں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اتنی گہرائی میں تمہاری مخبر چپ کسی طرح کے سگنل چھوڑ سکے گی۔"

"یہ تہ خانوں والی بات تم مذاق سے کہہ رہے ہو یا واقعی ایسا ہے؟"

"مذاق کی بات پر ہنسی آتی ہے۔ کیا اس تہ خانوں والی بات پر تمہاری ہنسی چھوٹی ہے؟" عمران نے الٹا سوال جڑ دیا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "واقعی اس مندر کے نیچے ایک سہ منزلہ تہ خانہ موجود ہے۔ یہ تہ خانہ اور مندر قریباً چھ سو سال پرانے ہیں... تہ خانہ مندر کا حصہ تو نہیں مگر اس کے ساتھ اٹیچ ہے۔ پرانے دور میں بیرونی حملہ آوروں سے بچنے کے لیے فتح پور کے خاص خاص باشندے اپنے بال بچوں سمیت ان تہ خانوں میں اتر جایا کرتے تھے۔ اب یہ تہ خانے مدت سے بند پڑے ہیں مگر یہاں کے ایک خاص بندے کو ان میں اترنے کا راستہ معلوم ہے اور راستے کی چابی بھی اس کے پاس ہے۔"

"کہیں کسی چوہے دان میں نہ پھنسا دینا۔" میں نے کہا۔

"گھبراؤ مت۔ جب تم سرے سے چوہے ہی نہیں ہو تو چوہے دان میں کیسے پھنسو گے۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ توقع رکھتا ہے۔"

عمران اور اقبال دیر تک انگیٹھی کے سامنے بیٹھنا چاہتے تھے اور گپ شپ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن میرا دھیان اوپر کمرے کی طرف تھا۔ دل میں یہ آس سی موجود تھی کہ شاید آج سلطانہ کے خیالات میں کچھ تبدیلی واقع ہو جائے اور وہ کمرے کا رخ کر لے۔ وہ شدید تذبذب میں نظر آئی تھی۔ شاید اس تذبذب کا نتیجہ مثبت نکل آتا۔

میں نو بجے کے قریب کمرے میں چلا گیا اور اس کے قدموں کی آہٹ کا انتظار کرنے لگا۔ نوری کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ سلطانہ کے طیش کا شکار ہونے کے بعد وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکی تھی۔ میں سلطانہ کا انتظار کرتا رہا۔ میں حکم دیتا تو وہ فوراً آجاتی لیکن میں اپنا اختیار استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے آئے۔ بستی کے نیم گرم مکانوں سے باہر ایک دھند آمیز سرد رات آہستہ خرامی سے گلی کوچوں میں سرسراتی رہی۔ دور جنگل سے رات کو گشت لگانے والے جنگلی جانوروں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں، کمرے کی ادھ بجھی انگیٹھی میں انگارے سلگتے رہے اور دھیرے دھیرے راکھ میں تبدیل ہوتے رہے۔ میری نظر گاہے بگاہے دروازے کی طرف اٹھتی رہی اور ناکام لوٹتی رہی۔

نصف شب گزر گئی تو ایک عجیب سی تپش میرے رگ و پے کو جھلسانے لگی۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر خاموشی سے دروازہ کھول کر چھت پر چلا گیا۔ سرد یخ ہوا میری ہلکی پھلکی قمیص سے گزر کر میرے جسم سے ٹکرائی، میری ہڈیوں میں اتری، درد کی ٹیسیں اٹھیں اور میرے بدن میں پھیل گئیں۔ باردندا جیکی مجھے جینے کے کئی ڈھنگ سکھا گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا... جب دل کا درد یعنی اندر کا درد حد سے گزر جائے اور بہت بے چین کر دے تو اسے جسمانی درد میں تبدیل کر دو... خود کو کسی بڑی مشقت میں غرق کر دو...

وہاں چھت پر ایک چارپائی کی ٹوٹی ہوئی ادوائن پڑی تھی۔ میں نے ادوائن کو ایک رسّے کی طرح استعمال کیا اور رسّا پھلانگنے لگا۔ میں پنجوں کے بل بے آواز اچھلتا رہا اور رسّا میرے پاؤں کے نیچے سے گزرتا رہا۔ رسّا پھلانگنا دوڑ لگانے ہی کی طرح پُرمشقت ہوتا ہے۔ پانچ دس منٹ کے اندر ہی میرے جسم کا ہر مسام پسینا اگلنے لگا۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ یہ کیفیت انتہا کو پہنچ گئی تو لگا کہ سینہ پھٹ جائے گا اور دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بس یہی کیفیت مجھے درکار ہوتی تھی۔ میں اس کو جھیلنے اور بڑھاوا دینے کی عادت ڈال رہا تھا۔

جب ٹانگیں جواب دینے لگیں اور مجھے لگا کہ میں بے دم ہو کر گر جاؤں گا تو میں نے رسّا ایک طرف پھینک دیا اور ٹھنڈی یخ چھت پر چت لیٹ کر اپنی سانسیں درست کرنے لگا۔ مجھے سینڈ بیگ کی ضرورت تھی جس پر میں اندھادھند ہاتھ پاؤں چلا سکتا... اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کو خون اگلنے پر مجبور کر سکتا... یا پھر میرا کوئی مدِمقابل روبرو ہوتا۔ میں پوری بیدردی سے اسے مارتا اور وہ مجھے مارتا... اور اگر یہ مدِمقابل جارج گورا ہوتا تو پھر کیا ہی بات تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ میرے سامنے آجائے تو میں ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر دیوانہ وار اس سے ٹکرا جاؤں۔ اس وقت تک اس سے لڑتا رہوں جب تک وہ مجھے مار دے یا میں اسے مار ڈالوں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی چھت کے اندھیرے میں میرے پاس موجود ہے۔ سلطانہ...؟ میرے ذہن میں یہ جاں افزا سوال برق کی طرح لہرایا۔

"کون؟" میں نے سیڑھیوں کے قریب ایک ہیولے کو دیکھ کر کہا۔

میرے سوال کے جواب میں ہیولے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ اقبال تھا۔ "تم نے تو ڈرا ہی دیا۔" وہ میرے قریب آ کر بولا۔ "مجھے کھانسی ہو رہی تھی اس لیے جاگ رہا تھا۔ اوپر سے دھم دھم کی مسلسل آوازیں آئیں تو دیکھنے کے لیے چلا آیا۔ یہ کیا کر رہے ہو یار تم؟"

"تم دیکھ تو رہے ہو۔"

"یار! بُرا نہ منانا۔ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے کوئی ٹین ایجر لڑکا مارشل آرٹ کی کسی جاپانی فلم سے متاثر ہو گیا ہے اور بروس لی بننے کی کوشش میں اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہا ہے۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تم جو بھی سمجھو لیکن میں کسی کو دکھانے کے لیے کچھ نہیں کر رہا۔ یہ میری اپنی FEELINGS ہیں۔ غلط ہیں یا صحیح، میں اس پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔"

"مجھے تو ڈر ہے کہ تم خود کو بیمار کر بیٹھو گے۔ تم اپنے ذہن کو جس تیزی سے تبدیل کر رہے ہو، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہاری سوچ یہ ہے کہ تم اس طرح خود کو بہت سخت جان بنا لو گے یا مارشل آرٹ کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیت حاصل کر لو گے تو یہ جذباتی سوچ ہی ہو سکتی ہے۔ ایسے کاموں اور تبدیلیوں کے لیے ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے یار... مستقل مزاجی سے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنا ہوتا ہے۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اقبال! مستقل مزاجی تو ہے یہاں... لیکن میں آہستہ آہستہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ جب کہیں آگ لگی ہو تو اسے بجھانے کے لیے آہستہ آہستہ پانی نہیں لایا جاتا۔ سب کچھ تیز رفتاری سے کرنا پڑتا ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ اپنا لہجہ خود مجھے بھی عجیب محسوس ہو رہا تھا۔

"تم کس آگ کی بات کر رہے ہو؟" وہ میرے قریب ایک چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"وہی آگ جو سیٹھ سراج اور جارج گورا جیسے لوگوں نے میرے اندر لگائی ہے۔ میں اس آگ کو اب اور برداشت نہیں کر سکتا۔ میری ماں کی موت جن حالات میں ہوئی فرح، ثروت اور عاطف کو جس طرح مجھ سے چھینا گیا، وہ سب کچھ تم لوگوں کو معلوم ہی ہے... اور اب یہاں صرف میری کم ہمتی اور کمزوری کی وجہ سے جو کچھ سلطانہ کے ساتھ ہوا ہے، وہ بھولے جانے کے قابل نہیں ہے۔ میں چاہوں بھی تو اسے نہیں بھول سکتا۔ اب میں آہستہ آہستہ نہیں چل سکتا اقبال... مجھے کچھ کرنا ہے یا پھر مرنا ہے۔"

"تو ایسی باتیں کرتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ تو ہمیں اپنا دوست ہی نہیں سمجھتا۔ تو اکیلا نہیں ہے تابی... جو کچھ گزری ہے، ہم سب پر گزری ہے۔ جو مری ہے، وہ ہم تینوں کی ماں تھی... جو بچھڑے ہیں، وہ ہم تینوں کے بہن بھائی تھے اور یہاں جو واقعہ سلطانہ کے ساتھ ہوا ہے، اس کا زخم ہم تینوں کے سینوں پر لگا ہے اور اس کا بدلہ بھی ہم تینوں چکائیں گے۔"

"تم اس طرح بات کرتے ہو تو میرا حوصلہ پہاڑ ہو جاتا ہے لیکن یار! مجھے ایک سچی بات کہنے دو۔ میں نے آج تک تم دونوں سے لیا ہی لیا ہے، دیا کچھ نہیں۔ میں اپنی ساری کمزوریوں سمیت تم دونوں پر بوجھ ہی بنا رہا ہوں۔ تمہارے لیے مصیبتیں ہی کھڑی کرتا رہا ہوں۔ میں اب مزید بوجھ بننا نہیں چاہتا۔ تمہاری دوستی سے بڑھ کر قیمتی شے میرے لیے اور کوئی نہیں لیکن میں اس دوستی کو اپنی بیساکھی بنانا نہیں چاہتا۔ میں تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر چلنا چاہتا ہوں

بلکہ شاید مصیبت کی گھڑی میں تم سے دو قدم آگے رہنا چاہتا ہوں۔"

"اور دو قدم آگے رہنے کے لیے تم اس وقت اس ٹھنڈی ٹھار چھت پر چت لیٹے ہوئے ہو؟"

"میں اپنے طریقے سے جو کچھ کر رہا ہوں، مجھے کرنے دو۔ یہ طریقہ جیسا بھی ہے لیکن مجھے اس میں حوصلہ اور جوش مل رہا ہے... اور اس کے ساتھ ساتھ سکون بھی۔ اگر میں اس میں ناکام بھی ہوا تو یہ میری ناکامی ہوگی۔ کسی دوسرے پر اس کا الزام نہیں آئے گا۔"

"نہیں یار! یہ بات نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آہستہ آہستہ تم، ہم سے بھی دور ہوتے جا رہے ہو۔ اپنی الگ دنیا بسا رہے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔ یا کسی طرح ہمیں قائل کر لو یا خود قائل ہو جاؤ۔"

"یہ قائل کرنے یا ہونے کی بات نہیں ہے اقبال۔" میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ "یہ تو دیوانہ پن ہے... اور ہر شخص کا اپنا اپنا دیوانہ پن ہوتا ہے۔"

"تم قائل کرنے کی کوشش تو کرو۔ مجھے سمجھاؤ تو سہی کہ سخت سردی برداشت کر کے، کھردرے فرش پر سو کر، گھنٹوں تک اندھا دھند بھاگ کر اور خود کو تکلیف دہ زخم دے کر میں کیا معراج پا سکتا ہوں۔"

میں مسکرایا۔ "میں تمہیں کیسے قائل کروں... تم اس عجیب الخلقت شخص سے ملے ہی نہیں جسے بارونداجیکی کہا جاتا تھا۔ تم نے اس کے ساتھ کسی کھوہ میں سردیوں کی سخت ترین راتیں نہیں گزاریں... اس کی باتیں نہیں سنیں... اس کے ہنر نہیں دیکھے اور نہ اس آگ کو محسوس کیا ہے جو اس کے انجر پنجر کے اندر دہکتی تھی۔" میں نے چند لمحے توقف کیا اور پھر طویل سانس لے کر کہا۔ "اقبال! وہ انوکھا شخص تھا۔ اسے اچانک عشق کا روگ نہ لگ جاتا اور وہ چند برس اور زندہ سلامت رہتا تو وہ بہت اوپر تک جاتا۔ ہم نے فائٹنگ آرٹ میں انوکی، بروس لی، محمد علی اور سونی لسٹن وغیرہ کے نام سنے ہیں۔ وہ ان سے کم پائے کا شخص نہیں تھا۔ اور کیا پتا کہ وہ ان سے بھی کچھ آگے جاتا کیونکہ وہ صرف ایک فائٹر ہی نہیں تھا، ایک روحانی شخص بھی تھا۔ اس کا فن اس شگوفے کی طرح ہے جو پوری طرح کھلنے سے پہلے مرجھا جاتا ہے۔ میں خود پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس شخص کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔"

اقبال ہار ماننے والے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور قدرے مزاحیہ انداز میں بولا۔ "اچھا جی بارونداثانی صاحب! اپنے گرو کی ساری تعلیمات پر آج ہی عمل کرنے کے بجائے ایک دو اسباق کل کے لیے بھی چھوڑ دیں۔ آج ٹھنڈ بھی کچھ زیادہ ہے۔ چلیں، نیچے تشریف لے چلیں۔"

اگلے روز صبح سویرے نوری نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں اٹھا تو وہ بولی۔ "بابو جی! آپ کو تازہ خبر ملی ہے؟"

"کیا ہوا؟"

"وہ مشٹنڈا... موٹا گرو بھاگ گیا۔ رات کسی وقت چپکے سے کہیں نکل گیا۔ وہ بستی میں اور آس پاس کہیں بھی نہیں ہے۔ اس کی پتنی رو رو کر بے حال ہو رہی ہے۔"

میں چپل پہن کر اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر عمران اور اقبال کے پاس پہنچا۔ عمران ابھی ابھی کہیں سے واپس آیا تھا۔ اقبال ادھیڑ عمر تاؤ افضل کے سر کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ سر سے بہنے والا خون تاؤ کی نیم سفید داڑھی تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے، ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔

میرے پوچھنے پر عمران نے بتایا۔ "لگتا ہے کہ وہ خبیث کہیں دور نکل گیا ہے۔ تاؤ نے بھی یہی بتایا ہے کہ اسے نکلے تین چار گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔"

"تاؤ کو کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تاؤ رات کو باہر والے دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا ہے۔ رات کو بھی یہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس موٹے نے نمک مرچ پیسنے والے ڈنڈے سے تاؤ کے سر پر چوٹ لگائی ہے۔ تاؤ بالکل بے ہوش ہو گیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔"

اندر سے رونے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ سلطانہ کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ گرو کی اشک بار پتنی کو دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی کمرے میں چلا گیا۔ رادھا سوگوار انداز میں چٹائی پر بیٹھی تھی۔ سلطانہ نے اسے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ رادھا سسکی۔ "مجھ کو بہت بڑا پاپ لگے گا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اگر ناراض نہ ہوتے تو مجھے بھی اپنے سنگ لے کر جاتے۔"

اتنے میں اقبال اندر داخل ہوا اور طنز سے بولا۔ "وہ بھگوڑا تجھ سے ناراض نہیں ہوا، وہ اس لیے تجھے ساتھ نہیں لے جا سکا کہ اسے صرف اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ تو اس کمرے میں باقی عورتوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ تجھے جگانے کے لیے وہ یہاں آتا تو اس کا "فراری پروگرام" گڑبڑ ہو جاتا۔"

"ان کو ایسا مت کہو... ان کو بھگوڑا نا ہیں کہو۔" رادھا کانپ کر بولی۔

"تو کیا اس کو شیر افگن کا خطاب دوں؟ تین روز سے بدبخت کو صرف اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ تمہارا تو نام بھی نہیں لے رہا تھا۔ ایسے پتی پر رونے سے کہیں بہتر ہے کہ آلو کر یلے پکاؤ، ساتھ میں حلوہ بناؤ۔ خود کھاؤ، ہمیں بھی کھلاؤ۔ اس موٹے سے چھٹکارے کا جشن مناؤ..."

رادھا اور زور زور سے رونے لگی۔ عمران نے اقبال کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "خیر، یہ جشن کا موقع بھی نہیں ہے۔ گرو کے یہاں سے نکلنے میں ہمارے لیے بھی خطرے چھپے ہوئے ہیں۔ اگر وہ کسی کے ہاتھ آ جاتا ہے تو پھر یہاں اس گاؤں میں ہماری موجودگی کا بھانڈا بھی پھوٹ سکتا ہے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟ ہم بھی اس لڑکی کے ساتھ رونا شروع کر دیں؟" اقبال نے اعتراض کیا۔

اقبال اور عمران کے مکالمے کے دوران میں ایک دو بار سلطانہ سے میری نظر ملی... میں اس کے انداز میں تذبذب اور جھجک صاف محسوس کر رہا تھا۔ وہ جیسے میری دلی کیفیت کو جانتی تھی اور اس حوالے سے پشیمان بھی تھی لیکن اس کے مداوے کے لیے کچھ کرنے سے قاصر تھی۔

اس دن بہت سے لوگ عمران سے ملنے کے لیے آئے۔ ان میں بوڑھے، بچے جوان سب ہی شامل تھے۔ سب اسے عمران بیٹا یا عمران بھیا کے نام سے پکار رہے تھے۔ وہ اس کی مسحور کن شخصیت کے اسیر تھے، اس کی دل نواز مسکراہٹوں کے شیدائی تھے۔ وہ ان کا ہمدرد و غم گسار تھا۔ وہ کسی کی بیماری کا علاج اپنی گرہ سے کرا رہا تھا۔ کسی کے جھگڑے نمٹانے میں اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ کسی بڑھیا کی لاٹھی بنا ہوا تھا۔ نوری جیسی ایک دو اور لڑکیاں بھی تھیں جن کے ہاتھ پیلے کرنے کا بیڑا اس نے اٹھا رکھا تھا۔ وہ جس نوجوان مچھیرے سے نوری کا بیاہ کرنا چاہ رہا تھا، وہ بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ وہ کھلے ہڈ پیر والا ایک سادہ سا نوجوان تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ عمران نے اسے ایک چھوٹا جال خرید کر دیا تھا۔ اس جال کی مدد سے انور نامی اس نوجوان نے معقول پیسے بنا لیے تھے اور اب ایک پرانی کشتی خریدنے اور اسے مرمت کر کے قابلِ استعمال بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ عمران کے ملنے والوں میں سے ہی ایک بیوہ عورت ایسی تھی جو اپنی ضروریات کے لیے اپنے مرحوم شوہر کی دو کشتیاں بیچنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ عمران نے دیکھتے ہی دیکھتے بڑی خوش اسلوبی سے ان دونوں افراد کا مسئلہ حل کرا دیا۔ بیوہ عورت اپنی ایک کشتی بیچ کر ازحد خوش ہوئی اور انور کشتی خرید کر۔

عمران نے میری طرف دیکھا اور اپنی مخصوص پرکشش مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "کیسی رہی یہ ڈیل؟"

"اچھی تھی۔"

"اچھی نہیں، بہت اچھی تھی۔ دراصل جگر! ہمارے اردگرد لوگ اپنے اپنے مسئلے اور اس کے حل کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ پرابلم صرف یہ ہوتا ہے کہ حل کسی کے پاس اور مسئلہ کسی دوسرے کے پاس ہوتا ہے۔ کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ ان دونوں افراد کو خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملا دیا جائے۔ ملانے والا خوامخواہ میں نیک نامی کما لیتا ہے اور جب لوگ اس پر بہت زیادہ اعتماد بھی کرنے لگتے ہیں تو وہ ہیرو بن جاتا ہے۔"

کچھ دیر بعد جب گھر کے صحن میں سے عمران کے پرستاروں کا مجمع چھٹا تو میں نے عمران سے کہا۔ "یار! تم نوری والے معاملے میں اس انور نامی لڑکے سے کچھ زیادتی نہیں کر رہے ہو؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو! وضاحت فرماؤ۔"

"نوری جس قماش کی ہے، تم نے دیکھا ہی ہوگا اور میں نے بھی تھوڑا بہت دیکھا ہے۔ تم اس سیدھے سادے لڑکے کو ایک آفت کے حوالے کر دو گے۔ اس بے چارے کی زندگی خراب ہو جائے گی۔"

"بھئی زندگی خراب ہوگی تو خبر بنے گی نا۔ اور ہم فساد پلس کے نمائندوں کو خبریں ہی تو درکار ہوتی ہیں۔ ہم صبح سویرے اٹھتے ہی دعا مانگتے ہیں، یا اللہ ہماری روزی میں برکت ڈال، ہم پر اپنی رحمت کا سایہ رکھ... اور باقی سب پر سے یہ سایہ اٹھا لے۔"

"ہم لٹھ لے کر خبر نویسوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، حالانکہ وہ صرف آئینہ دکھاتے ہیں۔"

"آئینہ تو دکھاتے ہیں لیکن عام طور پر یہ شکلیں بگاڑنے والا آئینہ ہوتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ نوری جیسی واہیات کو اس لڑکے کے پلے کیوں باندھ رہے ہو؟"

"بھئی ہو سکتا ہے کہ یہ اتنی واہیات نہ ہو جتنی تمہیں نظر آتی ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ۔"

"تو تمہارے خیال میں وہ نیک بی بی ہے؟"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہا لیکن... چلو... اس بارے میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔" وہ ایک دم بات ٹال گیا۔

"ہر بات کے بارے میں تم یہی کہتے ہو کہ بعد میں بتاؤں گا... تمہاری یہ "بعد" کب آئے گی؟"

''آئے گی... آئے گی... آئے گی۔ ایک دن یہ ''بعد'' ضرور آئے گی۔'' وہ انڈین گانے کا حلیہ بگاڑتے ہوئے بولا۔

اسی دوران میں گرو کی تلاش میں گئے ہوئے کچھ لوگ منہ لٹکا کر آ گئے۔ عمران ان سے مصروفِ گفتگو ہو گیا۔

اگلے روز آدھی رات کو عمران نے ہی مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ عمران کے چہرے سے گہری سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ وہ تیزی سے بولا۔ ''تابی! ہمیں ابھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔ گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''وہ اُلو کا پٹھا گرو سوبھاش پکڑا گیا ہے۔ استھان کے لوگ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''ایک بھروسے والا بندہ ہے۔ ہمارے پاس اب اور کوئی راستہ نہیں۔ ہمیں فوری طور پر یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔''

میں نے دیکھا، سارے گھر کے اندر ہلچل نظر آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے جیکٹ پہنی اور گرم چادر کی بکل ماری۔ بھرا ہوا پستول بھی میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ نیچے پہنچا تو اقبال اور طلال وغیرہ بھی روانگی کے لیے تیار نظر آ رہے تھے۔ تاؤ افضل کی دونوں بیٹیاں برقعے پہنے ڈیوڑھی میں کھڑی تھیں۔ ڈرا ہوا تاؤ افضل بھی اپنی لٹھ سمیت ان کے پاس موجود تھا۔

اسی دوران میں سلطانہ گرم چادر میں لپٹی ہوئی میرے پاس پہنچی۔ اس کے چہرے سے بھی پریشانی ٹپک رہی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر دھیمی آواز میں بولی۔ ''مہروج! یہ تمہارے دوست کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کہتے ہیں کہ وہ گرو پکڑا گیا ہے۔ استھان والے اس کو لے کر بڑی جلدی یہاں پہنچ جائیں گے۔ کیا سچ مچ ایسا ہوئیں گا؟''

''ہاں لگ تو یہی رہا ہے۔''

''لیکن مہروج! اتنی اندھیری رات میں اور ایسی سردی میں ہم گھر سے نکل کر کہاں جائیں گے؟''

''مجھے خود پتا نہیں لیکن مجھے عمران پر پورا بھروسا ہے۔ وہ جو کرے گا ٹھیک ہی کرے گا۔''

''لیکن وہ تو کوئی سیدھی بات ہی نہیں کرتا۔''

''اس کی باتوں پر نہ جاؤ۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

پانچ دس منٹ کے اندر اندر ہم آدھی رات کے وقت یہ گھر چھوڑنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ تاؤ افضل کے ہاتھ میں لوہے کا بڑا تالا نظر آ رہا تھا۔ یہ تالا وہ گھر کے بیرونی دروازے کو لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر کو بالکل خالی کیا جا رہا ہے۔ رنجیت پانڈے کے ساتھی زخمی راہول کو بھی عمران نے ساتھ لے لیا تھا۔ احتیاطاً اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اوپر سے ایک سوتی کھیس لپیٹ دیا گیا تھا۔ گرو کی چیلی، سکڑی سمٹی رادھا بھی عمران کے پاس ہی کھڑی تھی۔ حالات کی سنگینی کا احساس اسے تھرتھر کانپنے پر مجبور کر رہا تھا۔

رات واقعی خوفناک حد تک سرد تھی۔ دھند کی ایک دبیز چادر نے بستی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ رات کے اس پہر یہ بستی سکوت اور سناٹے کی مکمل تصویر تھی۔ اور تو اور کسی چوکیدار کی ''جاگتے رہو'' بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس اندھیری رات میں یوں عمران کا اس گھر سے نکل آنا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ ہم اس چار دیواری اور اس بستی سے نکل کر ایک خطرے سے تو بچ رہے تھے مگر بے شمار دوسرے خطروں کو دعوت دے رہے تھے۔ ان میں رات کو گشت لگانے والے جنگلی جانوروں کا خطرہ بھی شامل تھا۔

ہم گھر سے نکلے تو گلی سنسان تھی۔ شاید تاؤ افضل کے بعد اس بستی کو کوئی پاسبان میسر ہی نہیں آیا تھا لیکن یہ اندازہ غلط تھا۔ ابھی ہم دس پندرہ قدم ہی گئے تھے کہ ایک دراز قد شخص اپنے جسم کے گرد کمبل لپیٹے سامنے آ گیا۔ ایک طرف کونے میں اس نے اپلوں کی تھوڑی سی آگ جلا رکھی تھی۔ ''کون ہے بھائی؟'' اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

پھر اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ عمران کے چہرے پر پھینکا اور اسے پہچان لیا۔ ''عمران بھائی آپ ہیں۔''

اسی دوران میں ایک قریبی گھر کی کھڑکی بھی کھلی اور کسی نے باہر جھانکا۔ ''کون ہے؟'' کھڑکی کی دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''عمران بھائی ہیں۔'' دراز قد چوکیدار نے بلند آواز میں کھڑکی والے کو بتایا۔

ایک دو مزید کھڑکیاں کھل گئیں۔ ''عمران بیٹا! اس وقت کہاں جا رہے ہو؟'' کسی بوڑھے شخص نے کھانستے ہوئے دریافت کیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی افراد گلی میں نکل آئے۔ دو تین لالٹینیں بھی ہمارے گرد چکرانے لگیں۔ عمران اور تاؤ افضل کو یوں کوچ کرتے دیکھ کر سب پریشان نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی سے جھانکنے والا بوڑھا بھی لاٹھی ٹیکتا ہوا نیچے اتر آیا تھا۔ عمران اس بوڑھے کے علاوہ دراز قد چوکیدار اور ایک فربہ اندام سکھ کو ایک طرف لے گیا اور ان سے تین چار منٹ تک کھسر پھسر

کرنے کے بعد واپس آ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے ان لوگوں کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ کچھ جنونیوں کے ساتھ ٹکراؤ سے بچنے کے لیے بستی سے نکل رہا ہے۔ اس حوالے سے اس نے بستی والوں کو یقیناً کچھ مزید ہدایات بھی دی تھیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر ہم عجلت میں آگے بڑھ گئے۔ جانے سے پہلے عمران نے دراز قد چوکیدار آفتاب خاں کو ایک بار پھر اپنے پاس بلایا تھا اور اس سے کوئی بات کی تھی۔ سخت سردی اور دھند آلود تاریکی میں ہم نے اونچے نیچے راستوں پر قریباً تین میل تک سفر کیا اور نہایت گھنے جنگل میں پہنچ گئے۔ یہاں خطرات منہ کھولے کھڑے تھے۔ کسی بھی وقت کسی موذی جنگلی جانور سے سامنا ہو سکتا تھا۔ سب کے دل میں ڈر تھا لیکن زخمی راہول کا خاص طور سے بُرا حال تھا۔ یقیناً اسے چار دن پہلے والا بھیانک تجربہ یاد آ رہا تھا۔ سرخی مائل ریچھ نے اسے عدم آباد کا ٹکٹ تھما دیا تھا، یہ تو عمران کی ہوشیاری تھی کہ اس نے بروقت یہ ٹکٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر ''ریچھ بھائی'' کو اپنے پیچھے لگا لیا اور پھر گہرائی میں لڑھکا دیا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر ہم اسی طرح اس گھنے جنگل میں آگے بڑھتے رہے تو ریچھ کی طرز والا کوئی اور واقعہ پیش آ جائے گا۔ اس سفر کے دوران میں ایک جگہ مجھے ذرا سی ہچکی آئی تو میرے پہلو میں چلتی ہوئی سلطانہ بُری طرح چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ڈر اُمڈ آیا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ یہ کوئی خاص ہچکی نہیں ہے۔ یوں لگتا تھا کہ میری ہچکی والی تکلیف کے حوالے سے اس کے دل میں خوف بیٹھ چکا ہے... ہمارا سفر جاری رہا۔

ہمارے ہاتھوں میں اسلحہ تھا اور ہم کسی بھی ناخوشگوار صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر عمران رک گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے رک گئے۔ ہوشیار سنگھ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے جی... آگے کوئی خطرہ ہے؟''

''ہاں خطرہ ہی ہے۔ پانچ منٹ کے فاصلے پر۔'' عمران نے چمکیلے ڈائل والی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گیارہ بج کر پچپن منٹ ہو چکے ہیں۔ جونہی بارہ بجیں گے، تم کوئی نائیو اسٹار قسم کی حماقت کر ڈالو گے۔ اس لیے رک گیا ہوں۔''

''بارہ بجے کا وقت تو یونہی بدنام ہو گیا ہے جی۔ سچا خالصہ کسی بھی وقت کام دکھا سکتا ہے۔ جیسا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دکھایا ہے۔''

''کیا کیا ہے؟''

''وہاں پیچھے جھاڑیوں میں ذرا رک کر پیشاب کیا ہے۔

شلوار اتار لی ہے لیکن یہ یاد ہی نہیں رہا کہ نیچے باریک پاجامہ پہنا ہوا ہے۔ سارا بھیگ گیا ہے۔'' ہوشیار سنگھ نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''میرے خیال میں ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ یہ بہت بُرا شگون ہے۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جب سفر کے دوران میں اچانک کسی سردار کی پگڑی گر جائے تو سفر روک کر واپس پلٹ جانا چاہیے۔'' عمران نے کہا۔

''کیا مطلب جی... میری پگڑی کہاں گری ہے؟'' ہوشیار سنگھ حیران ہوا۔

''تم واقعی بے وقوف ہو۔ بات کی تہ تک نہیں پہنچ رہے۔ اب تمہارا پاجامہ پیشاب سے گیلا ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد تمہاری ٹانگوں میں خارش شروع ہو گی۔ تم ہماری عورتوں کے سامنے بار بار ٹانگیں اور رانیں کھجاؤ گے تو انہیں غصہ آ جائے گا۔ خاص طور سے تائی تو بالکل برداشت نہیں کرے گا کہ کوئی اس کی جوان گھر والی کے سامنے اس طرح بے شرمی سے ٹانگیں کھجائے۔ وہ یقیناً تمہیں تھپڑ دے مارے گا اور اس کا تھپڑ تو تم نے دیکھا ہی ہے۔ تمہاری پگڑی گرے ہی گرے۔''

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمران واقعی واپس پلٹ رہا ہے۔ اس نے سب کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ اقبال کے سوا سب ہی حیران تھے۔ میں نے زچ ہو کر کہا۔

''عمران! یہ کیا بے وقوفی ہے۔ پہلے تم نے اتنے خراب موسم میں ہمیں کمروں سے نکالا، اب واپس چلنے کا کہہ رہے ہو۔ تم اور اقبال خود ہی کوئی فیصلہ کر لیتے ہو اور پھر ہم سے پہیلیاں بجھواتے رہتے ہو۔''

''تم کون سا کوئی پہیلی بوجھ لیتے ہو... چلو یہی پہیلی بوجھو کہ ہم واپس کیوں جا رہے ہیں؟'' وہ مزہ لیتے ہوئے بولا۔ اب وہ بالکل مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''واپس فتح پور۔ گرما گرم کمرے ہمارا انتظار کر رہے ہیں اور اُبلے ہوئے انڈے، زبردست دودھ پتی اور باداموں والا گُڑ۔ ہم بڑی خاموشی سے فتح پور میں داخل ہوں گے اور سیدھے اپنے اپنے لحافوں میں گھس جائیں گے... اتنی سردی میں لحافوں کا ذکر مزے دار لگ رہا ہے نا؟''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میری سمجھ میں آنے لگا کہ عمران نے یہ کیا چکر چلایا ہے۔ وہ استھان کے جنونی ٹولے کے بستی میں پہنچنے سے پہلے ہی بستی چھوڑ آیا تھا لیکن یہ سب کچھ شاید دکھاوے کے لیے تھا۔ اب وہ بڑی خاموشی سے واپس بستی میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی چالیں ایسی ہی دماغ چکرا دینے والی ہوتی تھیں۔ میں نے تصدیق کے لیے عمران سے پوچھا کہ کیا اس نے ستیش اور اس کے مشتعل ساتھیوں کو چکمہ دینے کے لیے ایسا کیا ہے؟ اس نے میری بات کی تصدیق کی۔

ایسی بے مہر رات میں دربدر بھٹکنے کے بجائے، دوبارہ کسی نیم گرم کمرے میں ہونے کے خیال نے لطف دیا... اور اندیشے ہوا ہونے لگے۔ عمران نے بتایا کہ اب ان کی واپسی تاؤ افضل کے گھر میں نہیں کسی اور جگہ ہو گی۔

''اب پھر معمے حل کروا رہے ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتے کہ کہاں جانا ہے؟'' میں نے پھنکار کر کہا۔

''یار! تم تو ٹی وی ٹاک شوز کے شرکا کی طرح منہ سے آگ نکالنے لگتے ہو۔ میں نے تمہیں اشاروں کنایوں میں بتا تو دیا تھا مگر تم نے غور ہی نہیں فرمایا۔ ہم اب مندر کے تین منزلہ تہ خانے میں اتریں گے... اور اللہ کو منظور ہوا تو دو چار دن کے لیے چین کی بانسری بجائیں گے۔ بانسری بجانی آتی ہے نا تمہیں؟''

میں نے اسے کڑی نظروں سے گھورا تو وہ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''اچھا نہیں بجانی آتی تو سیکھ اور بجا لینا۔ لیکن جگر! اس طرح تو نہ گھورو... میرے پیٹ میں گڑگڑ ہونے لگتی ہے۔''

ہم چین کی بانسری کی بات کر رہے تھے مگر جس چیز کی آواز آئی وہ بانسری سے بالکل مختلف تھی۔ ہم سب ہل کر رہ گئے۔ یہ رائفل چلنے کی آواز تھی۔ گولی ہمارے سروں کے اوپر سے سنسناتی اور پتوں، شاخوں سے ٹکراتی گزر گئی۔ ہم ایک دم نیچے جھکے۔ ''لیٹ جاؤ۔'' عمران نے چلا کر کہا۔

یکے بعد دیگرے ہم سب اوندھے منہ زمین پر گر گئے۔ دو گولیاں مزید چلیں... دھماکوں سے جنگل گونج اٹھا۔ ہمیں نشانہ نہیں بنایا جا رہا تھا، صرف ڈرایا جا رہا تھا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے نکل رہی تھیں۔ پھر کسی قریبی درخت پر سے گرج دار آواز سنائی دی۔ کسی نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ ''اگر کوئی ہتھیار پاس ہے تو خود سے دور پھینک دو، ورنہ بُری طرح سے پچھتاؤ گے۔''

''یہ رانی خاں کا سالا کون ہے؟'' عمران نے اقبال سے پوچھا۔

''ظاہر ہے کوئی انسان ہی ہے۔ جنگلی جانور تو انسانی آواز میں بات نہیں کر سکتا۔''

آواز پھر گونجی۔ ''تم سب کے سب نشانے پر ہو۔ اگلی

گولیاں تمہارے کھوپڑوں میں گھس جاویں گی۔''

وہ جو کوئی بھی تھا، ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ سکتا تھا لیکن ہم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ ویسے بھی بلندی پہ تھا۔ ہم اس کے لیے بالکل آسان نشانہ تھے۔

سلطانہ اور رادھا نے خود کو ایک تناور درخت کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ نوری زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ عمران نے دبی آواز میں کہا۔ ''رانی خاں کا سالا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کے ستارے عروج پر ہیں۔ یہ ہمیں نشانہ بنا سکتا ہے۔ ہتھیار پھینک دینے چاہئیں۔''

سب سے پہلے عمران نے ہی اپنی رائفل خود سے دور پھینکی۔ اس کے بعد اقبال نے رائفل پھینکی۔ آخر میں، میں نے بھی پستول نکالنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میرا پستول دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اسے جیب سے تو نکال لیا مگر ہاتھ میں نہیں لیا۔

کسی درخت کے اوپر سے کرخت آواز پھر گونجی۔ ''ہیرے جاؤ۔ ان کی بندوقڑیاں اٹھا لاؤ۔''

سامنے والے چھتناور درخت سے ایک پرچھائیں جست کرتے ہوئے نیچے آئی اور ہماری طرف بڑھی۔ یہ ایک چاق و چوبند شخص تھا۔ یہ شخص قد میں چھوٹا لیکن چوڑائی میں بہت زیادہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جتنا لمبا ہے، اتنا ہی چوڑا بھی ہے۔ اس کے ہاتھ میں جدید پمپ ایکشن رائفل تھی۔ اس نے ایک بڑی ٹارچ کی روشنی ہم پر پھینک کر تیز نظروں سے ہمارا جائزہ لیا۔ پھر اس کی ٹارچ کا دائرہ درخت کے پیچھے دبکی ہوئی سلطانہ اور رادھا پر جم کر رہ گیا۔ اس روشن دائرے نے ان کے سراپا پر اوپر سے نیچے تک حرکت کی۔ تب چوڑے جسم والے شخص کی جوشیلی آواز ابھری۔ ''استاد! دو لونڈیا بھی ہیں... ناہیں ناہیں، تین ہیں۔ ایک وہ نیچے زمین پہ پڑی ہے۔'' اس نے ٹارچ کی روشنی نوری پر پھینکتے ہوئے کہا۔

''ارے ذرا غور سے دیکھ۔ لونڈیا اور تین تین۔ کہیں مردوں نے تو زنانے کپڑے ناہیں پہنے ہوئے؟''

''ناہیں استاد۔ ایک دم بجل لونڈیا ہیں۔ یہ دیکھو، سارا سامان پورا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر ٹارچ کا دائرہ رادھا کے جسم پر دوڑایا۔

اقبال نے اپنی جگہ سے ذرا سر اٹھانے کی کوشش کی تو درخت پر بیٹھا شخص گرجا۔ ''خبردار! بھیجا پھاڑ دوں گا۔ چپ چاپ لیٹے رہو اپنی جگہ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور فائر کیا۔ یہ بھی ڈراوے والا فائر تھا۔ گولی اقبال کے آس پاس سے گزر کر کچی زمین میں دھنس گئی۔

تاہم اس گولی نے ایک خاص کام کیا۔ دھماکے کے ساتھ جب شعلہ نکلا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ چوڑے چکلے جسم والے ہیرے نے بڑی احتیاط سے ہمارا جائزہ لیا تاکہ اسے پتا چل سکے کہ ہمارے پاس کوئی اور ہتھیار تو نہیں ہے۔ اسے ہوشیار سنگھ پر شک ہوا۔ اس نے اسے کھڑا کر کے اچھی طرح اس کی تلاشی لی اور اس کی قمیص کے نیچے سے کرپان برآمد کر لی۔ خوش قسمتی سے میرا پستول میرے پیٹ کے نیچے دبا رہا۔ ہیرا دونوں رائفلیں اور کرپان وغیرہ سمیٹ کر واپس اس درخت کے پاس چلا گیا جہاں سے جست لگا کر نیچے اترا تھا۔

اندازے کے مطابق ہمارا واسطہ ان راہزنوں سے پڑا تھا جو اس علاقے میں عام پائے جاتے تھے۔ ان کی تعداد ہمارے قیافے کے مطابق دو یا تین تھی اور یہ ہمیں شوٹ کرنے کے لیے بڑی شاندار پوزیشن میں تھے۔ عمران اس صورتِ حال سے پریشان ہونے کے بجائے شاید انجوائے کر رہا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے بہ آسانی نکل سکتا ہے۔ لیکن میرے دل میں ایک اور طرح کی امنگ پیدا ہو رہی تھی۔ اپنا حوصلہ آزمانے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں عمران سے کہا۔ ''مجھے کچھ کرنے دو۔''

''کیوں؟''

''بس میرا دل چاہتا ہے۔''

''صاف کیوں نہیں کہتے کہ بھابی کے سامنے نمبر بنانا چاہتے ہو۔''

''یہی سمجھ لو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ وہ مجھ پر اعتماد کرنا سیکھے۔''

''لیکن یہ تمہارے لیے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔''

''خطرناک کا لفظ عمران عرف ہیرو کے منہ سے کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے کہا۔

ایک اور وارننگ فائر ہوا۔ گولی ہمارے اوپر سے گزر کر کسی درخت کے تنے میں لگی۔ اقبال سب سے آگے لیٹا تھا۔ درخت کے اوپر سے ایک رسّی اچھلتی ہوئی آئی اور اقبال کے قریب گری۔ اس کے بعد رسّی کے ایسے ہی دو ٹکڑے مزید اس کے پاس گرے۔

''یہ کیا ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

کرخت آواز ابھری۔ ''تجھے بھی نظر آ رہا ہووے گا۔ یہ رسّیاں ہیں۔ اٹھو اور ان سے اپنے ان یاروں کے ہاتھ ان کی پیٹھ پر باندھو۔ چلو جلدی کرو۔ ہمارے پاس زیادہ سمے ناہیں

ہے۔ چلو شاباش۔''

''کیا بولتے ہو... میں جاؤں؟'' میں نے دوبارہ عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

عمران نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے مخصوص دلیرانہ انداز میں بولا۔ ''او کے... وش یو گڈ لک۔''

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''پستول میرے پیٹ کے نیچے ہے۔ میں اسے یہیں چھوڑ رہا ہوں۔ تمہارے کام آئے گا۔''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں زمین سے اٹھا اور دو زانو بیٹھ کر اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ ''کیا بات ہے...؟'' درخت کے اوپر سے کرخت آواز ابھری۔ ''لیٹ جاو ورنہ کھوپڑا پھوڑ دوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی عین میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

ثابت ہوتا تھا کہ درخت پر چڑھے ہوئے شخص کا نشانہ شاندار ہے۔

میں بدستور بیٹھا رہا اور پکارنے والے انداز میں بولا۔ ''استاد جی! میری بات سنو۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ میں ان حرام جادوں کا ساتھی ناہیں ہوں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاوت ہوں۔''

درخت پر چند لمحے سناٹا رہا، تب چوڑے چکلے جسم والے ہیرے نے ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکی اور بڑے دھیان سے میرا جائزہ لیا۔ میں نے درخت والے کو مخاطب کر کے کہا۔ ''استاد جی! آپ ان حرام جادوں کو اکیلا مت سمجھیں۔ ان کتوں کے ساتھ پندرہ بیس کتے اور بھی یہاں ہیں۔ وہ آپ کو گھیر لیویں گے۔ آپ مجھے پاس آنے دیں، میں آپ کو سب کچھ بتاوت ہوں۔''

ایک بار خاموشی کا ایک متذبذب وقفہ آیا۔ تب درخت والے نے ہیرے کو حکم دیا۔ ''اس کی پھر تلاشی لو اور اسے آگے لاؤ۔''

میں کھڑا ہو گیا۔ چوڑا چکلا ہیرا محتاط انداز میں آگے بڑھا۔ اس نے میری کیچڑ آلود جیکٹ کی جیبیں اچھی طرح ٹٹولیں۔ تھوڑی بہت نقدی تھی جو اس نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ٹھونس لی۔ اس کے بعد میری کلائی سے گھڑی اتروائی۔ پستول زمین پر پڑا تھا۔ وہ بھی کیچڑ آلود تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ہیرے کی نظر میں نہیں آئے گا۔ میری یہ امید پوری ہوئی۔ ہیرے نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا۔ ہیرا الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ خوفناک بیرل والی پمپ ایکشن بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ کسی ذرا سی غلط فہمی کے سبب بھی وہ فائر کر سکتا تھا۔

عمران کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے شاید سلطانہ یا رادھا میں کوئی بے چینی دیکھی تھی۔ اس نے پکار کر کہا۔ ''اپنی جگہ بیٹھی رہو۔ کچھ نہیں ہوگا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں اس درخت کے عین نیچے پہنچ گیا جہاں وہ استاد نامی شخص گھات لگائے بیٹھا تھا اور ہم سب اس کے نشانے پر تھے۔ اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ لوگ پہلے سے یہاں موجود تھے یا انہوں نے ہمیں ان گھنے درختوں میں گھستے دیکھا تھا اور پوزیشن لی تھی۔ ہم یہاں جنگلی جانوروں کی وجہ سے خوف محسوس کر رہے تھے مگر یہ خوف انسان نما جانوروں کے روپ میں سامنے آ گیا تھا۔ یہ اتر پردیش کے کم آباد علاقوں میں گھومنے والے وہی راہزن یا ڈکیت تھے جن کے بارے میں بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں اور فلمیں بنائی گئی ہیں... ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے اپنی گفتگو میں سلطانہ اور رادھا کا ذکر جس انداز سے کیا تھا، اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ اگر کہیں یہ لوگ ہم پر حاوی ہو گئے تو واقعی ان لڑکیوں کے لیے جنگلی جانور بن جائیں گے۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کی تعداد دو سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک شخص اوپر درخت پر چڑھا ہوا تھا اور دوسرا پمپ ایکشن گن کے ساتھ ہمارے سروں پر مسلط تھا... اور یہ بات باعث حیرت تھی۔ تعداد میں صرف دو ہونے کے باوجود انہوں نے بڑی دیدہ دلیری سے ہمارا راستہ روکا تھا اور ہمیں نشانے پر رکھ لیا تھا۔ اسے ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی کہا جا سکتا تھا۔

''کیا کہنا چاہتا ہے تو؟'' اوپر سے کرخت آواز میں پوچھا گیا۔

''میں ان کے سامنے ناہیں بتا سکتا۔ آپ نیچے آ جاویں یا مجھے اوپر آنے دیں۔'' میں نے کہا۔

''کوئی ہوشیاری تو دکھانا ناہیں چاہ رہے ہو؟''

''میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ آپ کے پاس اسلحہ ہے۔''

''تم نے جو کچھ کہنا ہے ہیرے سے کہو۔ یہ مجھے بتا دیوے گا۔''

''لیکن...''

''بس جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔'' اوپر سے کرخت آواز میں کہا گیا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر پاٹ دار آواز سے لگتا تھا کہ کافی لحیم شحیم شخص ہے۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، فائر ہوا۔ یہ 38.0 کے پستول کا فائر تھا... اور یہ وہی پستول تھا جو میں عمران کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ عمران کمال کا نشانے باز تھا۔ سرکس کے خطرناک کرتبوں میں، میں اس کی مہارت دیکھ چکا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی نشانے پر لگی۔ درخت میں چھپا ہوا نامعلوم شخص ایک کراہ کے ساتھ شاخوں سے ٹکرایا اور پھر دھم سے زمین پر گرا۔ اس نے گرنے کے بعد بھی اپنے حواس برقرار رکھے اور اوپر تلے دو فائر کیے۔ ایک گولی میرے اور نوری کے اوپر سے گزری اور کسی درخت کے تنے میں لگی۔ دوسری گولی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس نے اقبال کے قریب لیٹے زخمی راہول کو ہٹ کیا۔ اس کے منہ پر لگ کر یہ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔

پہلے فائر کے ساتھ ہی میں چوڑے چکلے ہیرے پر جھپٹا تھا۔ میں نے اس کی پمپ ایکشن پر ہاتھ ڈالا اور اس کا رخ اوپر کی طرف موڑ دیا۔ اسی دوران میں ہیرے نامی اس شخص نے ٹریگر دبا دیا۔ نہایت گرج دار آواز کے ساتھ فائر ہوا اور چھرے اوپر کی طرف نکل گئے۔ میں اور ہیرا گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ عجیب جسمانی ساخت کا شخص تھا۔ اس کے جسم میں کسی بریڈ فورڈ ٹرک جیسی طاقت تھی۔ میں اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرے پیٹ پر ٹانگ مار کر مجھے دور پھینک دیا۔ خوش قسمتی یہ رہی کہ میں اس کے ہاتھ سے پمپ ایکشن نکالنے میں کامیاب رہا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ رائفل میرے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ کسی کے ہاتھ میں بھی نہ رہی۔ اچھل کر تاریکی میں کہیں جا گری۔ گرتے ہوئے میرا چہرہ کسی تنے سے ٹکرایا اور گردن کے پچھلے حصے پر بھی چوٹ آئی۔ ان چوٹوں کو خاطر میں لائے بغیر میں تیزی سے اٹھا۔ میں اور چوڑا چکلا ہیرا آمنے سامنے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ مجھے میری مرضی کا مدمقابل ملا ہے۔ میں اور وہ، پوری طاقت سے بھڑ گئے۔ اس تصادم سے تین چار سیکنڈ پہلے عمران نے میرے پستول سے اوپر تلے دو فائر کیے تھے اور زمین پر

گرے پڑے استاد کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

ہیرا ان علاقوں میں گردش کرنے والا ایک روایتی ڈاکو تھا۔ بھوری چٹان کی طرح سخت اور بپھرے ہوئے جانور کی طرح خطرناک۔ اس نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے حملہ کیا۔ اس کا طوفانی مکا میری ٹھوڑی پر پڑا اور میں لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ اس مکے نے میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دیں لیکن ان چنگاریوں نے مجھ پر کچھ اور طرح کا اثر کیا۔ بجائے اس کے کہ میں دیوانہ وار مدِمقابل پر ٹوٹ پڑتا، میرے اندر ایک غضب ناک ضد سی پیدا ہوئی۔ میں نے مدِمقابل کو خود پر مزید حملے کرنے کا موقع دیا اور خود کو ان حملوں سے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ہیرے نے کم از کم تین طوفانی مکے میرے جبڑے پر رسید کیے جنہیں میں نے حیران کن طور پر جھیلا۔ تیسرا مکا کھانے کے بعد میں نے بھی پوری طاقت سے ہیرے کے جبڑے پر ہاتھ رسید کیا۔ وہ قوی ہیکل ہونے کے باوجود لڑکھڑایا۔ اس کے بعد جیسے یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ پھنکار کر مجھے مکا رسید کرتا، میں اسے اپنے چہرے پر لگنے دیتا اور پھر اسے جوابی مکا مارتا جسے وہ بھی چہرے پر لگنے دیتا۔ چند ہی سیکنڈ کے اندر یہ ضد انا اور برداشت کی لڑائی بن گئی تھی۔

یہ بات تو طے تھی کہ ہم اب خطرے سے باہر آ گئے ہیں۔ میرا اور اس گوریلا نما شخص کا تصادم اب ایک تماشے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا... لیکن یہ ایک سنگین تماشا تھا۔ عمران اور اقبال سمیت سارے افراد اس سنگین تماشے کے تماشائی تھے۔ ہیرا نامی یہ شخص جسمانی طور پر مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس کے بہت بڑے تھوبڑے پر زخموں کے کئی پرانے نشان تھے جو اس کی جنگجو فطرت کو ظاہر کرتے تھے۔ اگر میں اس کے مکوں کی تاب لا رہا تھا اور بدستور اپنے پاؤں پر کھڑا تھا تو یہ میری وہ قوتِ برداشت ہی تھی جو پچھلے کچھ عرصے میں، میں نے اپنے اندر پیدا کی تھی۔ آج یہاں اس تاریک جنگل میں اس برداشت کا مظاہرہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عمران مجھے دیکھ رہا تھا... اور سلطانہ بھی۔

میری ٹھوڑی پر ایک دو گہری چوٹیں لگی تھیں۔ منہ میں نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا اور ناک سے بھی خون رس رہا تھا۔ دوسری طرف مدِمقابل کا تھوبڑا بھی لہولہان تھا۔ یہ لڑائی جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی، اسی طرح اچانک ہی ختم ہو گئی۔ میرا ایک زوردار پنچ کھا کر مدِمقابل گھٹنوں کے بل بیٹھا اور پھر پہلو کے بل کیچڑ میں گر گیا۔

عمران کسی ریفری کی طرح میرے اور میرے مدمقابل کے درمیان آ گیا۔ عمران کے روکنے پر میں رک گیا۔ اقبال نے آگے بڑھ کر دو زوردار ٹھوکریں اس شخص کے سر پر رسید کیں اور اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ہمارا خیال تھا کہ اس شخص نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اب ہمارے رحم و کرم پر ہے لیکن یہ ہماری توقع سے زیادہ آتش مزاج اور خطرناک نکلا۔ اچانک اس نے اپنے میلے کچیلے لباس کے اندر سے ہوشیار سنگھ والی خم دار کرپان برآمد کی اور ایک چنگھاڑ کے ساتھ اقبال پر جھپٹا۔ اقبال کو اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک لمحے کی دیر بھی ہوتی تو اس کا پیٹ چاک ہو جاتا اور انتڑیاں باہر آ جاتیں۔ تیز دھار کرپان کی نوک اس کی جیکٹ کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ عمران نے بے دریغ پستول کا فائر کیا جو سیدھا اس کی کنپٹی پر لگا... وہ مُردہ چھپکلی کی طرح پتاخ سے کیچڑ میں گرا اور دوبارہ اینٹھ کر ساکت ہو گیا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے گرد آلود سر سے بہنے والا خون اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کے شانوں کی چوڑائی غیر معمولی تھی۔ اگر میرے پاس ناپنے والا فیتہ ہوتا تو میں ضرور اس چوڑائی کو ناپتا۔ اس کے ایک شانے پر ابھی تک گولیوں والی بیلٹ موجود تھی۔ یہ ان اونچی نیچی گھاٹیوں میں گھومنے والا وہ روایتی ڈکیت تھا جس کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اپنے تمام طمطراق کے ساتھ زندہ تھا، اب ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔

اس کا ساتھی جو عمران کے شاندار نشانے کا شکار ہو کر درخت سے نیچے گرا تھا، اب ساکت و جامد پڑا تھا۔ تین چار منٹ پہلے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ یہ بھی کافی جیم شحیم شخص تھا۔ عمر کوئی پینتیس چالیس سال رہی ہو گی۔ گرانڈیل ہیرے نے اسے استاد کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یہ بھی شکل و صورت سے خطرناک قاتل نظر آتا تھا۔ اس کے پاس جدید ''اے کے 56'' رائفل تھی۔ گولیوں والی بیلٹ اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ایک قریبی درخت پر ایک چھوٹی سی مچان بھی موجود ہے۔ اس مچان تک پہنچنے کے لیے سن کے رسّے کی ایک سیڑھی بھی بنی ہوئی تھی۔ اقبال نے اوپر چڑھ کر اس خستہ حال مچان کی تلاشی لی... یہاں سے تاڑی کی دو بوتلیں، سگریٹوں کے پیکٹ اور کچھ نقدی وغیرہ برآمد ہوئی۔ سری دیوی اور مادھوری ڈکشٹ کی نیم عریاں تصویریں بھی اس سامان کا حصہ تھیں۔

میری گردن کے پچھلے حصے سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ یہاں درخت کی کوئی ٹوٹی ہوئی شاخ لگی تھی۔ میرے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر سلطانہ بے چین ہوئی۔ ایسے موقعوں پر عورت کی اوڑھنی ہی کام آتی ہے۔ سلطانہ نے بھی اوڑھنی پھاڑی اور میرا خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

حکم کا ہرکارہ راہول بھی ایک جھاڑی میں مُردہ پڑا تھا۔ ''اے کے 56'' رائفل کی گولی اس کا سر پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے تھے اور منظر کو حسرت ناک بنا رہے تھے۔ عمران نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور اس کی کھلی ہوئی آنکھیں ہاتھ سے بند کر دیں۔ یہ شخص چار دن پہلے جنگلی جانور کے حملے سے تو بچ گیا تھا لیکن آج ''جنگلی ڈاکو'' کے حملے سے نہ بچ سکا۔

تینوں لاشوں کو گھسیٹ کر ایک گڑھے میں رکھا گیا اور ان کے اوپر گھاس پھوس اور پتے وغیرہ ڈال دیے گئے۔ دونوں ڈاکوؤں کی قیمتی رائفلیں اور ایمونیشن ہم نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ یقیناً ان چیزوں پر ہمارا حق تھا۔ عین ممکن تھا کہ عام رواج کے مطابق ان لوگوں کے سر کی قیمت وغیرہ بھی مقرر کی گئی ہو۔ ہم وہ قیمت تو حاصل نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ قیمتی رائفلیں تو ہمیں انعام میں مل سکتی تھیں۔

عمران نے کہا۔ ''ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ یہاں فائرنگ ہوئی ہے۔ اگر ان کے کچھ ساتھی آس پاس موجود ہیں تو وہ یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

ہم فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ عمران نے میرا پستول میرے حوالے کر دیا اور پمپ ایکشن بھی مجھے تھما دی۔ ''یہ تمہارا انعام ہے جگر! تمہاری پہلی ٹرافی۔'' وہ میرا شانہ تھپک کر بولا۔ اقبال بھی مجھے قدرے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ اس حوالے سے کچھ بولا نہیں۔ میں واقعی اپنے اندر فخر و انبساط محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آج پھر خود کو آزمایا تھا اور اس آزمائش سے مطمئن ہوا تھا۔ اب میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ کل کلاں میرا سامنا جارج گورا یا اس جیسے کسی اور بدمعاش سے بھی ہوا تو میں مزاحمت کا حق ادا کر سکوں گا۔

سلطانہ میرے پہلو میں چل رہی تھی اور بار بار میری خونچکاں گردن کو دیکھ رہی تھی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''اب میں کیا کروں؟ چوٹ بھی ایسی جگہ لگی ہے جہاں پٹی بھی نہیں باندھی جا سکتی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بڑی ٹھنڈ ہے۔ تھوڑی دیر میں خون کا رسنا خود ہی بند ہو جائے گا۔''

''لیکن چوٹ تو اپنی جگہ پر ہے نا۔ تمہیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔'' اس کے لہجے میں فکرمندی کے ساتھ ساتھ گوناگوں حیرت بھی تھی۔ وہ بار بار تعجب سے میری طرف دیکھنے لگتی تھی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک خطرناک ڈکیت سے دوبدو مقابلہ کیا ہے اور اس خونی مقابلے کو کھیل تماشے کی سی حیثیت دی ہے۔

عمران بھی گاہے بگاہے کن انکھیوں سے مجھے دیکھ لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، کیوں کیا ہے۔ وہ میری اس کارروائی کو بجا طور پر سلطانہ کے ساتھ نتھی کر رہا تھا۔ وہ میرے بارے میں سلطانہ کی فکرمندی بڑھانے کے لیے بولا... ''گردن کے پچھلے حصے پر لگنے والی چوٹ اچھی نہیں ہوتی۔ تمہیں مکمل آرام اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ہم جتنی جلدی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''مگر ہم نے جانا کہاں ہے؟'' سلطانہ نے پوچھا۔

''وہیں پر جہاں سے آئے ہیں بھابی... ٹھکانے پر پہنچ کر تابی آپ کو سب کچھ بتا دے گا۔''

نوری اور رادھا بالکل گم صم تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تین بندے موت کے گھاٹ اترے تھے، اس واقعے نے انہیں دم بخود کر رکھا تھا۔ خاص طور سے رادھا تو بالکل نیم جان ہو رہی تھی۔ ہوشیار سنگھ اس کی ہمت بندھانے میں لگا ہوا تھا۔

ہم قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے یخ بستہ سفر کے بعد واپس فتح پور کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اب رات کا چوتھا پہر شروع ہونے والا تھا۔ فتح پور تاریکی اور سناٹے کی لپیٹ میں تھا۔ بس کسی کسی گھر میں لالٹین یا دیے کی مدھم روشنی دکھائی دیتی تھی۔ یہ روشنی بھی دھند کی چادر میں لپٹ کر مدھم تر ہو جاتی تھی۔

ہم بستی کے قبرستان کے قریب ایک جھنڈ میں پہنچ کر رک گئے۔ صرف عمران آگے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو وہی دراز قد چوکیدار اس کے ساتھ تھا جس کا نام ہمیں آفتاب خاں معلوم ہوا تھا۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ اس ساری صورتِ حال میں یہ شخص عمران اور اقبال کا رازدار ہے۔

آفتاب خاں نے عمران اور اقبال کے ساتھ تھوڑی دیر تک کھسر پھسر کی پھر وہ ہم سب کو لے کر ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کی دونوں طرف گھروں کے دروازے بند تھے۔ کہیں کوئی حرکت یا روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم اس طویل بل کھاتی گلی میں دراز قد آفتاب کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' سلطانہ مسلسل الجھن میں تھی۔

میرے جواب دینے سے پہلے ہی سلطانہ کو جواب مل گیا... اور مجھے بھی۔ بل کھاتی گلی اچانک ہی ختم ہو گئی اور

ہمیں اپنے سامنے مندر نظر آ گیا۔ مندر کے ساتھ ہی تاؤ افضل کا گھر تھا مگر ہم گھر کی طرف نہیں، مندر کی طرف نمودار ہوئے تھے۔ یہ مندر کا پچھواڑہ تھا۔ رات کے اس پہر دھند میں لپٹا ہوا یہ مندر عجیب پُراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ نانک چندی اینٹوں کی خستہ حال سیڑھی ہمارے سامنے تھیں۔ ان سیڑھیوں کے بالائی سرے پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر ایک بلی کسی ہڈی کو بھنبھوڑنے میں مصروف تھی۔ ہڈی کے ساتھ اس کے دانتوں کے ٹکرانے کی آواز سناٹے میں واضح سنائی دیتی تھی۔

دراز قد آفتاب سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے سامنے پہنچا اور چابی کے ذریعے بڑی خاموشی سے دروازے کا قفل کھولا۔ اس کے اشارے پر ہم سب نے وہ سات آٹھ سیڑھیاں طے کیں اور ادھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اندر عجیب سی بُو باس تھی، وہ یہ جگہ جیسے ایک طویل عرصے سے بند پڑی تھی۔ لکڑی کی گھسی ہوئی سیڑھیاں بل کھاتی نیچے اتر رہی تھیں۔ کہیں کہیں جالے بھی لگے ہوئے تھے۔ آفتاب خاں کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ ہم اس کی روشنی میں بہت سنبھل سنبھل کر نیچے اتر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ خطرناک سیڑھیاں تحت الثریٰ تک یونہی چلتی جائیں گی۔ خدا خدا کر کے ہم ایک ہموار جگہ پر پہنچے۔ یہاں قدیم طرز کے تین چار کمرے تھے۔ ان کمروں میں لکڑی کے پلنگ، الماریاں، مندے اور اسی طرح کی دیگر چیزیں موجود تھیں۔ طاق دانوں میں مٹی کے دیے موجود تھے جنہیں آفتاب نے بہ آسانی روشن کر دیا۔ ایک لالٹین ہماری...... آمد سے پہلے ہی ان کمروں میں ہلکی روشنی بکھیر رہی تھی۔

عمران نے چاروں طرف گھوم کر ناقدانہ نظروں سے اس جگہ کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”لگتا ہے کہ یہ تہ خانہ کافی پرانا ہے اور سیلاب کے وقت لوگوں نے اس میں پناہ لی تھی۔“

اقبال بولا۔ ”سیلاب میں لوگ پہاڑوں پر چڑھتے ہیں، تہ خانوں میں نہیں اترتے۔“

”کافر لوگ تہ خانوں میں ہی اترتے ہیں۔ عذاب دیکھ کر ان کی مت ماری جاتی ہے۔“ عمران نے فلسفہ بگھارا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم اس ساتھ والے کمرے میں لیٹ جاؤ۔ آفتاب خاں تمہارے لیے مرہم پٹی کا انتظام کرتا ہے۔“

”ان کا خون بند ہو جائیں گا نا؟“ سلطانہ پریشانی سے بولی۔

”خون تو شاید بند ہو جائے مگر اسے بہت زیادہ آرام اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اسے کروٹ کے بل لیٹنا پڑے گا۔ رات کو بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ کہیں چت نہ ہو جائے۔ زخم کو ٹانکے تو لگ نہیں سکتے، احتیاط سے ہی ٹھیک ہوگا۔“ عمران نے کہا۔

آفتاب خاں بولا۔ ”یہاں سے ہلدی اور چونا وغیرہ مل جائے گا۔ خون بند کرنے کے لیے راکھ بھی ہوگی۔ بس یہاں تو یہی کچھ ہو سکے گا۔“

”چلو جو کچھ ہے جلدی سے لے آؤ۔“ عمران نے ضرورت سے زیادہ فکرمندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

اگلے پانچ دس منٹ میں اس نے میری اس چوٹ کے بارے میں ہی گفتگو کی۔ اس چوٹ کے حوالے سے ایسے ایسے میڈیکل اور نان میڈیکل نکتے پیش کیے کہ مجھے خود بھی محسوس ہونے لگا کہ موت کے منہ میں ہوں اور اب کوئی کرشمہ ہی مجھے زندگی کی طرف واپس لا سکتا ہے... میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ فالج، لقوہ اور برین ہیمرج جیسے کئی موٹے موٹے امراض نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ دوسری طرف اس نے سلطانہ کو بھی اس بات پر تقریباً قائل کر لیا کہ اگر میرے صحت یاب ہونے کا تھوڑا بہت چانس ہے تو وہ اسی صورت میں ہے کہ وہ دن رات مجھ سے چپٹی رہے اور میری تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔

پھر وہ لاہور کا ایک واقعہ بیان کرنے بیٹھ گیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے اس کے ایک ساتھی کو گردن کے پچھلے حصے پر چوٹ لگی تھی اور کس طرح اس کی بیوی کی غفلت کی وجہ سے وہ دوبارہ غسل خانے میں پھسل گیا تھا اور اس کی چوٹ کا زہر اس کے پورے بدن میں پھیل گیا تھا۔ اس زہر کو عمران نے ایسا لمبا چوڑا میڈیکل نام دیا کہ سلطانہ تھرا کر رہ گئی۔ اقبال مکمل طور پر عمران کا چمچہ بنا ہوا تھا اور اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

مجھے چوٹ تو واقعی لگی تھی اور گردن بھی کچھ اکڑی اکڑی لگ رہی تھی مگر صورت حال ایسی بھی نہیں تھی جیسی عمران بتا رہا تھا۔ بہرحال، اس کی چرب زبانی کا خاطر خواہ اثر ہوا... سلطانہ پوری دل جمعی سے میری تیمارداری اور دل جوئی میں لگ گئی۔

اس نے مجھے ہلدی ملا دودھ پلایا۔ میرے چہرے کی چوٹوں پر ٹکور کرنے کے لیے نمک کی پوٹلی گرم کی۔ میری مرہم پٹی کے بعد اس نے مجھے لحاف اوڑھایا اور میرے سرہانے بیٹھ کر میرے کندھے دبانے میں مصروف ہو گئی۔ ساتھ ساتھ

وہ بڑی فکرمندی سے اپنے بچے بالو کے بارے میں باتیں کر رہی تھی۔

اب صبح ہونے والی تھی مگر اس سہ منزلہ تہ خانے میں دن اور رات کا مطلق پتا نہیں چلتا تھا۔ تہ خانے کی حالت دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ اسے ہماری رہائش کے لیے پہلے سے تیار کیا جا چکا ہے۔ یہاں صفائی ستھرائی کی گئی تھی، بستر بچھائے گئے تھے۔ دس پندرہ افراد کے لیے دو تین ہفتوں کا راشن یہاں اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ آفتاب خاں نے عمران اور تاؤ افضل کو بتایا تھا کہ وہ بس رات کو دوسرے پہر کے بعد ہی یہاں آ جا سکے گا۔

آفتاب خاں کی آمد اگلی رات کو بارہ بجے کے بعد ہوئی۔ عمران اس کی آمد کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا۔ آفتاب کا چہرہ دیکھ کر ہی ظاہر ہو گیا کہ وہ کوئی خاص خبر لایا ہے۔ اس نے عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”عمران بھائی! ام سب کو خدا کا بہت بہت شکر کرنا چاہیے... خو تم نے جو کچھ کیا، بالکل ٹھیک کیا۔ تم سب بال بال بچ گیا ہے... اگر تم ابھی تک تاؤ کے گھر میں ہوتا تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ کچھ لوگ آئے ہیں؟“

”آئے ہیں جی، بالکل آئے ہیں۔ اور دس بیس نہیں... سو ڈیڑھ سو بندہ آیا ہے۔ یہ سب لوگ بڑا اکڑ قسم کا ہندو ہے بلکہ ام تو سمجھتا ہے کہ ان کو ہندو بھی نہیں کہنا چاہیے... یہ جنونی لوگ ہے۔ کسی کا بھی دوست نہیں۔ ان کے چہرے ہی بتاتے ہیں کہ یہ خونی اور قاتل ہیں۔ وہ موٹا گرد بھی ان کے ساتھ ہے۔ اس کے چہرے پہ چوٹوں کا کئی ایک نشان ہے۔ لگتا ہے کہ اسے مارا پیٹا گیا ہے۔ وہی ان لوگوں کو لے کر یہاں آیا ہے۔“

”کب پہنچے تھے وہ لوگ؟“

”کوئی آٹھ نو گھنٹے پہلے۔ عصر کی اذان کے وقت۔ سب سے پہلے انہوں نے تاؤ کے گھر پہ ہلا بولا۔ دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا۔ تاؤ کے پڑوسیوں کو پکڑ لیا۔ مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ وہ آپ سب لوگوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ آپ لوگ کل رات کو ہی گاؤں چھوڑ کر جا چکا ہے... پھر ان لوگوں نے مکھیا رشید اور اس کے بیٹوں کو بلا لیا۔ مکھیا رشید، خانہ خراب کا بچہ کمینگی پر اتر آیا ہے۔ وہ آپ لوگوں کو ڈھونڈنے میں استھان والوں کی پوری پوری مدد کر رہا ہے۔ اس کی وجہ سے تاؤ افضل کے دو تین رشتے داروں کو بُری طرح مارا پیٹا گیا ہے۔“

تاؤ افضل کا چہرہ پریشانی کی آماج گاہ بن گیا۔ اس کی

رٹا

انسپکٹر آف اسکولز ایک اسکول کا معائنہ کرنے والے تھے۔ استاد نے مختلف سوالات کے جواب لڑکوں کو رٹا دیے۔ شہزاد کے ذمے یہ سوال تھا کہ ہمیں کس نے بنایا۔ جواب تھا کہ ہمیں خدا نے بنایا ہے۔ اتفاقاً معائنے والے دن شہزاد غیر حاضر تھا۔ جب انسپکٹر نے یہ سوال پوچھا۔ ”بچو! ہمیں کس نے بنایا؟“ تو تمام بچے خاموش بیٹھے رہے۔

انسپکٹر نے سوال دہرایا تو ایک لڑکا بولا۔ ”جناب جسے خدا نے بنایا تھا، وہ آج غیر حاضر ہے۔“

بلگرام سے دلاور خان کی شوخی

دونوں باپردہ بیٹیاں بھی سکڑ سمٹ سی گئیں۔

اقبال نے پوچھا۔ ”اب وہ لوگ کہاں ہیں؟“

آفتاب بولا۔ ”بیس بیس بندوں کی دو تین ٹولیاں آپ لوگوں کی تلاش میں نکلی ہیں۔ باقی لوگ مکھیا کے مکان میں ہے۔ وہ سب خبیث لوگ ایک دم تھانے دار بنا ہوا ہے۔ جس کسی پر شک ہو رہا ہے، اسے مکھیا کے گھر بلا رہا ہے اور بے عزت کر رہا ہے۔ شام کے بعد ام کو بھی بلا کر زمین پہ بٹھایا تھا اور پولیس والوں کی طرح ام سے سوال جواب کیا تھا۔ امارا خون کھول رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے ام کو کوئی گالی مالی نہیں نکالا، ورنہ ام سے برداشت نہیں ہونا تھا۔“

”نہیں نہیں، کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو برداشت کرنی ہے۔ ہم سب کی خاطر برداشت کرنی ہے... اور اس بات کا بھی یقین رکھنا ہے کہ ہم بعد میں اس کا پورا پورا حساب چکائیں گے۔“

عمران کا فیصلہ حیران کن حد تک درست ثابت ہوا تھا۔ ہم اس تہ خانے میں موجود تھے اور بستی میں ایک شخص کے سوا کسی کو پتا نہیں تھا کہ ہم یہاں ہیں۔

عمران نے آفتاب خاں کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور واپس بھیج دیا۔ میری گردن کے پچھلے حصے میں واقعی تکلیف تھی۔ پٹھے اکڑ سے گئے تھے مگر ایسی تکلیفوں کو جھیلنا اور جھیلنے کے لیے ان کی گہرائی میں اترنا، اب مجھے اچھا لگتا تھا۔ سلطانہ میرے ساتھ تھی۔ اس کی موجودگی مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

آفتاب خاں کچھ پھول لے کر آیا تھا۔ ان میں دو چار پھول موتیے اور گیندے کے بھی تھے۔ میں نے وہ پھول نکال کر سامنے تپائی پر رکھ دیے۔ ان پھولوں کی موجودگی نے سلطانہ کے مزاج پر اچھا اثر کیا۔ سلطانہ رات آخری پہر تک جاگتی رہی اور میری دیکھ بھال کرتی رہی۔ آخری پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ میں بھی سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو گردن کے پچھلے حصے اور کمر پر چپچپاہٹ کا احساس ہوا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نیند کی حالت میں چت لیٹ گیا تھا اور زخم پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے خون پھر جاری ہو گیا تھا۔ یہ مسلسل رستے رہنے والا خون اب گیلے پن کا احساس دے رہا تھا۔

میں نے دیکھا اڑتالیس گھنٹے کی تھکی ہاری سلطانہ میرے بستر کے قریب ہی دری پر سکڑی سمٹی سو رہی تھی۔ اس نے ایک پھول دار لحاف اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے اسے جگانا چاہا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔

گیلی قمیص میں نے اتار کر پھینک دی۔ دوسری قمیص پاس ہی پڑی تھی لیکن اسے پہننے سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنی کمر صاف کر لوں۔ ایک کپڑے سے میں نے کوشش کی مگر پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں اچانک نوری اندر آ گئی۔ شاید وہ کھڑکی میں سے میرا مسئلہ دیکھ رہی تھی۔

اپنے مخصوص انداز میں ہولے سے بولی۔ ''ناراض نہ ہونا بابو جی۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کی کمر صاف کر دیوت ہوں۔''

مجھے ذرا تذبذب ہوا پھر میں نے کپڑا نوری کو تھما دیا۔ وہ گھوم کر میرے عقب میں آ گئی اور بستر پر بیٹھ کر بڑی ملائمت سے میری کمر صاف کرنے لگی۔ اس کی چوڑیاں میرے کانوں کے قریب چھن چھنا رہی تھیں۔ لگا ہے لگا ہے وہ میرے کندھوں پر ہاتھ بھی پھیر رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو۔ جلدی کرو۔'' میں نے ذرا تحکم سے کہا۔

''بابو جی! صاف ہی کر رہی ہوں۔ آپ کے کندھوں کے بال بھی تو لتھڑے ہوئے ہیں۔۔۔ اوئی ماں۔ دیکھیں پھر خون رسنے لگا ہے۔'' وہ ایک بار پھر گڑبڑ کر رہی تھی۔ اس کا انداز لبھانے اور رجھانے والا تھا۔ اس کا جسم عقب سے بار بار میری پشت سے چھو جاتا تھا۔

''چلو چھوڑو۔ ٹھیک ہے۔'' میں ذرا اینٹھا سا گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹتی، اس کا پاؤں نیچے رکھے ہوئے ایک جگ سے ٹکرایا اور اسٹیل کا یہ جگ فرش پر لڑھک گیا۔ آواز پیدا ہوئی اور سلطانہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا مہروج؟'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

پھر اس کی نظر میرے عقب میں بستر پر براجمان نوری پر پڑی اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں غصے کا دریا امڈ پڑا ہے۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ پھنکاری۔

''مم۔۔۔ میں۔۔۔ جی۔۔۔ وہ بابو جی نے ہی بلایا تھا۔ دیکھیں ان کا پنڈا پیچھے سے لہولہان ہو گیا ہے۔'' اس نے ہوشیاری سے سلطانہ کی توجہ میری کمر کی طرف مبذول کروائی۔

سلطانہ کمر کی طرف متوجہ ہوئی تو نوری خاموشی سے کھسک گئی۔

''یہ کیا کیا تم نے مہروج! زخم کا منہ پھر کھل گیا ہے۔'' وہ بڑے درد سے بولی۔

اس نے کپڑا گیلا کیا اور میرا پنڈا پونچھنے میں مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پنڈا صاف کرنے اور زخم سے خون کا رساؤ بند کرنے میں کامیاب ہو گئی تو اس نے خفا لہجے میں کہا۔

''مہروج! یہ کمینی کیوں آئی تھی یہاں؟''

میں نے چونک کر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کی نمی تھی اور آنکھوں میں طیش اور رقابت کی سرخی تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے نوری کے بارے میں عمران کی بات یاد آ گئی۔ عمران نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکی ویسی نہ ہو جیسی نظر آ رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بھی شک ہوا تھا کہ نوری نے جان بوجھ کر جگ کو اپنے پاؤں سے گرایا ہے تاکہ آواز پیدا ہو اور سلطانہ جاگ جائے۔۔۔ تو کیا وہ جان بوجھ کر سلطانہ کے دل میں حسد اور رقابت کے جذبے کو جگا رہی تھی؟ کہیں وہ۔۔۔ عمران کی ہدایت پر تو ایسا نہیں کر رہی تھی؟ ابھی میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ بالائی تہ خانے کی سیڑھیوں سے کسی کے دھڑ دھڑ اترنے کی آواز آئی۔ پھر دراز قد آفتاب خاں دھواں دھواں چہرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ باہر سے کوئی بری خبر لایا تھا۔۔۔

آفتاب خاں سیڑھیاں اتر کر سیدھا میری طرف آیا اور ہکلائی ہوئی آواز میں بولا۔ "باف کرنا جی! ام نے آپ کو پریشان کیا۔ دراصل ام عمران بھائی کو ڈھونڈ رہا ہے۔"

"وہ ابھی کچھ دیر پہلے سویا ہے۔ پچھلے کمرے میں ہے۔" میں نے کہا۔

"باہر حالات کچھ اچھا نہیں ہے جی۔ ام کو خون خرابے کا بو آ رہا ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"استھان کے لوگوں نے جنگل میں سے وہ تینوں لاشیں ڈھونڈ لیا ہے جن کو آپ گڑھے میں چھپا آیا تھا۔ اب ان کو یقین ہو گیا ہے کہ آپ فتح پور کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فتح پور کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہو۔۔۔ کیونکہ ایک دو جگہ سے ایسا کھرا ملا ہے جن سے ان کو اندازہ ہوا ہے کہ جنگل والی فائرنگ کے بعد آپ پھر فتح پور کی طرف پلٹا ہے۔"

"فتح پور کے آس پاس تو ہمارا کھرا نہیں ملا؟"

"نہیں جی۔۔۔ لیکن وہ لوگ شک میں ضرور پڑ گیا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہوا ہے کہ استھان والوں کو پتا چل گیا ہے کہ آپ تینوں ہندو نہیں، مسلمان ہیں۔ عمران بھائی اور اقبال بھائی کے بارے میں تو بستی والوں نے بتا دیا ہے اور آپ کے بارے میں اس خبیث موٹے نے گواہی دی ہے۔ اس نے استھان والوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کے اور سلطانہ بی بی کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے۔ یہ بات جان کر کہ آپ تینوں مسلمان ہیں، وہ لوگ بہت بپھرا ہوا ہے۔ فتح پور کے سارے مسلمانوں کا کم بختی آ گیا ہے۔ ان کو بکری کی طرح مارا پیٹا جا رہا ہے۔ افسوس کا بات یہ ہے کہ کھیا رشید مسلمان ہونے کے باوجود استھان والوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ وہ اپنا بدلہ چکانے کی فکر میں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"عمران بھائی نے یہاں فتح پور میں اس کی بدمعاشی کا راستہ روکا تھا اور تاؤ افضل کو خاص طور سے سہارا دیا تھا۔ اب رشید اور اس کے بیٹوں کا سارا غصہ تاؤ افضل کے رشتے داروں پر اتر رہا ہے۔ تاؤ افضل کا چچیرا بھائی حسن دین ساتھ والی بستی میں رہتا ہے۔ کھیا کے لوگ اس کو پکڑنے گئے تھے۔ وہ تو نہیں ملا۔ کھیا کے لوگ اس کے گھر والوں کو پکڑ کر لے آئے ہیں۔ ان میں کھیا کی دو بہوئیں، ایک بیٹی اور تین چھوٹے بچے بھی شامل ہیں۔ ان سب کو کھیا کی حویلی میں رکھا گیا ہے۔ سب کو پتا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو گا۔"

اس قسم کے اندیشے پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود تھے۔ میں نے آفتاب خاں سے کہا۔ "تاؤ افضل یا اس کی بیٹیوں کو ابھی اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ وہ پہلے ہی

پریشان ہیں۔''

''ٹھیک ہے جی... ام نہیں بتائے گا... لیکن... امارا خون مسلسل ابال کھارہا ہے جی۔ ام کو ڈر ہے کہ ام غصے میں کچھ کرنہ بیٹھے۔ ام کو سب سے زیادہ طیش اس حرامی کھیا پر آرہا ہے۔ وہ کافروں سے بڑھ کر کافر ہو گیا ہے۔ کھیا کا کام تو اپنے لوگوں کا حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ وہ باہر والے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائی بندوں کا دشمن بن گیا ہے۔''

میں نے آفتاب خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، عمران بھائی نے کل بھی تم سے یہی کہا تھا کہ برداشت کرنا ہے۔ ایسے موقع پر تمہاری کوئی بھی غلطی تمہیں اور ہم سب کو سخت مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔ اس وقت بہادری یہی ہے کہ اپنے غصے کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا جائے۔''

آفتاب خاں نے کہا۔ ''دوپہر سے ایک بڑھیا بھی یہاں آئی ہوئی ہے۔ اس نے الگ ناٹک رچا رکھا ہے۔ گاؤں کے سارے ہندوؤں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کے سامنے واویلا کر رہی ہے۔ کہتی ہے کہ جس لڑکی کو استھان سے نکال کر یہاں لایا گیا ہے، وہ بہت بڑی اپرادھن ہے۔ اس کا اپرادھ اتنا بڑا ہے کہ وہ اب لڑکی نہیں رہی، بدآتما بن گئی ہے۔ وہ اگر آزاد رہے گی تو اس پورے علاقے پر بہت بڑا آفت آئے گا اور جو شخص اس بدآتما کی مدد کرنے یا اس پر ترس کھانے کا پاپ کرے گا، اس کا جیون اس دنیا میں ہی نرگ کا نمونہ بن جائے گا۔ اس بڑھیا کے ساتھ ایک بوگس پنڈت بھی ہے۔ وہ پتا نہیں کیا جنتر منتر پڑھ رہا ہے۔ اس نے دو کبوتر چھوڑ رکھا ہے اور وہ دونوں مسلسل گاؤں کے اوپر چکر کاٹ رہا ہے۔ پنڈت کا کہنا ہے کہ ان کبوتروں کی وجہ سے وہ اپرادھن کھنچ کر گاؤں کی طرف چلی آئے گی اور اگر گاؤں میں ہے تو سامنے آنے پر مجبور ہو جائے گی۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے آفتاب خاں سے بڑھیا کا حلیہ وغیرہ پوچھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بڑھیا کون ہو سکتی ہے۔ یہ انتہا پسند ستیش کی وہی سخت گیر کٹر دادی تھی جس سے میری ملاقات نل پانی میں ہوئی تھی۔ یہ عمر رسیدہ دقیانوسی عورت اپنے فرسودہ عقیدوں کو پوری شدت سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ اپنے گھرانے پر بھی کڑی نظر رکھتی تھی اور کسی کو اس کی مرضی کے خلاف چلنے کی جرأت نہیں تھی۔ مجھے اس کی بھیا لا یاد آئی جو روشن خیال تھی اور اپنی دادی ساس سے اختلاف رکھتی تھی۔

''یہ بڑھیا یہاں کیسے آ پہنچی ہے؟'' میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''کیا آپ اس کو جانتا ہے؟'' آفتاب خاں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی یہاں آیا ہے؟''

''ہاں جی، بیٹا ہے جس کا نام رام پرشاد ہے۔ اس کا عمر بھی پچاس پچپن تو ہوگا ہی۔ ساتھ میں اس کا بہو ہے اور ایک دو بچہ لوگ بھی ہے۔ یہ سب لوگ رات کو مندر میں پوجا پاٹ کرتا رہا ہے... اور رو رو کر اشلوک پڑھتا رہا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اپرادھن لڑکی کے بھاگ جانے کی وجہ سے یہ سب لوگ پاپی بلکہ مہا پاپی ہو گیا ہے۔''

''مہا پاپی تو یہ لوگ ہیں ہی لیکن کسی اور معنی میں۔'' میں نے کہا۔

میری بات آفتاب خاں کی سمجھ میں نہیں آئی تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے آفتاب خاں سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور چوکس ہو کر حالات کا جائزہ لیتا رہے۔ کچھ دیر وہاں رک کر آفتاب خاں جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھے پوری تسلی دی کہ ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں اور فتح پور میں کسی کے سان گمان میں بھی نہیں ہو سکتا کہ مندر کے نیچے تہ خانوں میں کوئی چھپ سکتا ہے۔ جاتے جاتے آفتاب خاں نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی مصیبت آئی تو وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا لیکن ہم سب پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔

آفتاب خاں ایک سیدھا سادہ غیور پٹھان تھا۔ جی داری کے حوالے سے دیکھا جاتا تو وہ کسی طرح بھی انور خاں سے کم نہیں تھا۔ میری سوچ کا رخ انور خاں اور چوہان وغیرہ کی طرف ہو گیا۔ میں کئی روز پہلے انہیں بغیر کچھ بتائے نل پانی کے دیوان سے نکل آیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ میری گمشدگی سے بہت پریشان ہوں گے۔ میں کسی بھی طرح انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے جیکی کی سوگوار محبوبہ شکنتلا کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ یقیناً حکم جی کے جاسوسوں اور ہرکاروں سے جس طرح مجھے اور سلطانہ کو خطرہ تھا، اسی طرح شکنتلا کو بھی خطرات لاحق تھے۔

میری اور آفتاب خاں کی گفتگو کے دوران میں سلطانہ ایک گوشے میں سمٹی سمٹی بیٹھی رہی تھی۔ اس کے سر پر اوڑھنی تھی اور چہرہ متبسم سا تھا۔ یقیناً اس نے بھی وہ ساری باتیں سنی تھیں جو آفتاب خاں نے کہی تھیں۔ میں اس کے پاس پہنچا تو وہ ہولے سے بولی۔ ''مہروج! میں تم سے ٹھیک اچ کہتی ہوں نا کہ یہ لوگن اب مجھے چھوڑیں گے ناہیں۔ بڑے پنڈت کے داماد موہن کمار کو مار کر میں نے اپنے بہت سے دشمن بنا لیے ہیں۔ اب دیکھو، کچھ لوگن مجھے بدآتما کہہ رہے ہیں اور مجھے ڈھونڈنے کے لیے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔''

''جو لوگ تمہیں ایسا کہہ رہے ہیں وہ خود جنونی بدروحیں ہیں۔ وہ اپنی آگ میں خود جلیں گے۔ تمہیں ان کی وجہ سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور جہاں تک تم اپنے دشمنوں کی بات کر رہی ہو تو وہ اکیلے تمہارے ہی دشمن نہیں ہیں۔ میرے بھی ہیں۔ ہم دونوں کو ایک ہی طرح کے خطرے لاحق ہیں لیکن ان خطروں کا سامنا کرنے کی بات کی جائے تو پھر میرا حق زیادہ ہے کیونکہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں اور اللہ کے فضل سے اب اتنا حوصلہ بھی ہے کہ ان خطروں کا منہ موڑ سکوں۔''

''تم... کیا کہنا چاہتے ہو مہروج؟''

میں نے اس کے کندھے پر ملائمت سے ہاتھ پھیرا۔ ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں سلطانہ کہ تم اب کسی بھی صورت، کوئی ایسا کام نہیں کرو گی جس سے تم کسی مشکل میں پڑو۔ ایک اچھی بیوی کی طرح تم میری دی ہوئی محفوظ چار دیواری میں رہو گی اور چار دیواری سے باہر کے سارے معاملے مجھے نمٹانے دو گی۔ ہاں اگر... خدانخواستہ... خدانخواستہ میں ناکام ہوا اور تمہارے لیے زندہ نہ رہا تو پھر تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو گی۔''

اس نے بے تاب ہو کر اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ ''خدا کے لیے ایسا مت بولو مہروج۔ آپ میرے مجازی خدا ہو۔ آپ نہ ہوں گے تو پھر میں بھی نہ ہوں گی۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسے گھما کر اپنے ہونٹ ہاتھ کی پشت سے لگا دیے۔ وہ سرتاپا لرز گئی۔ اس نے سر جھکایا اور اس کے گندمی چہرے پر حیا کی ہلکی سی سرخی نظر آنے لگی۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھی۔ وہ اب جس طرح سکڑی سمٹی ٹھٹھری سی بیٹھی تھی، کوئی اسے دیکھ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ورنگال میں چار افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار چکی ہے لیکن اس نے یہ سب کیا تھا۔ بے شک جواں سال طلال بھی اس کے ساتھ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ان خونی واقعات میں زیادہ اہم کردار سلطانہ کا ہی رہا ہے۔ چند ہفتے پہلے وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح نل پانی سے نکلی تھی اور تمام خطرات کو پس پشت ڈال کر دیوانہ وار ورنگال میں گھس گئی تھی۔ وہ بہادر راجپوت ماں کی بے خوف بیٹی تھی۔ اس کی ماں نے سنگین ترین صورت حال میں حکم جی کی جان بچائی تھی اور اب کئی برس بعد سلطانہ نے ثابت کیا تھا کہ جو لوگ وفاداری نبھانے کے لیے جان بچا سکتے ہیں اور جان دے سکتے ہیں، وہ وقت پڑنے پر جان لے بھی سکتے ہیں۔

سلطانہ کے چہرے پر حیا کی سرخی موجود رہی۔ پھر اس کا دھیان ایک دم اس صورت حال کی طرف چلا گیا جو آفتاب خاں کے آنے سے پہلے یہاں موجود تھی۔ اس نے اس ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے نوری کھسک کر غائب ہوئی تھی۔ حیا کی سرخی کی جگہ غصے کی ہلکی سی سرخی نے لے لی۔ وہ بولی۔ ''مہروج! مجھے لگتا ہے... یہ کمینی... کسی دن میرے ہاتھوں سے بری طرح پٹے گی۔ میں بہت برداشت کر چکی ہوں اسے۔''

''برداشت تو میں بھی بہت کر چکا ہوں۔ دراصل اس طرح کی خبیث عورتیں کسی ''گنجائش'' کے چکر میں رہتی ہیں۔''

''تم... کس گنجائش کی بات کر رہے ہو مہروج؟''

''میری اور تمہاری دوری۔ نوری کو پتا ہے کہ ہمارے درمیان کچھ ناراضی ہے۔ وہ اسی ناراضی اور دوری کے درمیان گھسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک دن مجھ سے کہہ رہی تھی، میں آپ اور آپ کی بیوی کے درمیان صلح کرا سکتی ہوں۔ ایسی صلح کرانے والیاں صلح کراتے کراتے خود ہی کچھ بن بیٹھتی ہیں۔'' میں نے سخت بیزار لہجہ بنا کر کہا۔

سلطانہ کا چہرہ تمتما گیا اور سانس کی آمد و رفت تیز ہو گئی۔ اگر واقعی عمران نے ہی نوری کو میرے پیچھے لگایا تھا تو پھر اس کی عقل کو داد دینے کو دل چاہتا تھا۔ وہ واقعی ایک تیز طرار دیوند کا کردار ادا کر رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ شیطان کو یاد کیا جائے تو وہ آن موجود ہوتا ہے۔ دروازہ کھلا اور عمران سوئی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں حلوے کی پلیٹ تھی اور وہ اس میں سے کھاتا ہوا آ رہا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں بھابی! میں نے آپ دونوں کو ڈسٹرب کیا۔ دراصل مجھے باتوں کی آواز آ رہی تھی اس لیے سمجھ گیا کہ آپ جاگ رہے ہیں۔ آپ نے برا تو نہیں مانا؟''

''نا ہیں... ایسی بات ناہیں۔'' سلطانہ نارمل لہجے میں بولی۔

''دراصل آج کل وقت بے وقت بھوک لگ جاتی

ہے۔ یہ تھوڑا سا حلوہ پڑا ہوا تھا، میں نے سوچا اسی سے کام چلا لیتا ہوں۔ ویسے یار! یہ نوری جیسی بھی اوٹ پٹانگ ہے لیکن حلوہ خوب پکاتی ہے۔ کل تم اس کی تعریف ٹھیک ہی کر رہے تھے۔"

"میں تعریف کر رہا تھا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

عمران نے فوراً سلطانہ کی نظر بچا کر مجھے آنکھ ماری۔ "ہاں... کل دوپہر جب ہم کھانا کھا رہے تھے۔ اور کھانے کی تعریف کرنا کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔ تم تو پریشان ہو گئے ہو... بھابی آپ بھی چکھ کر دیکھیں۔"

"ناہیں... اس وقت ناہیں۔" سلطانہ نے بجھے ہوئے انداز میں کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے عمران کو غصیلی نظروں سے گھورا... پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اور وہ لکڑی کی قدیم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے تہ خانے میں آ گئے۔ "یہ کیا حماقتیں کر رہے ہو تم؟" میں نے اس سے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"میں تمہاری مدد کر رہا ہوں، تم اسے حماقت کہہ رہے ہو؟"

"خاک مدد کر رہے ہو۔ وہ پہلے ہی غصے سے بھری بیٹھی ہے، تم اوپر سے اسے یہ بتا رہے ہو کہ میں نوری کے کھانے کی تعریفیں کر رہا تھا۔"

"یار! کبھی کبھی مریض کا درد دور کرنے کے لیے اسے تھوڑا سا اور درد دینا پڑتا ہے۔ انجکشن لگانا پڑتا ہے۔ تم اسے انجکشن ہی کہہ سکتے ہو۔"

"تم اپنی یہ ڈاکٹریاں اپنے پاس رکھو تو زیادہ اچھا ہے۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے... اور ہاں... ایک بات مجھے بالکل سچ سچ بتاؤ۔ یہ نوری والا چکر تم نے ہی چلایا ہوا ہے نا؟"

"کیا مطلب؟"

"ڈرامے مت کرو۔ تم کہہ رہے تھے کہ یہ نوری ویسی نہیں ہے جیسی نظر آ رہی ہے۔ مجھے شک ہے کہ اسے تم نے ہی میرے پیچھے لگایا ہوا ہے۔"

عمران کے ہونٹوں کے گوشوں پر بے ساختہ ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً سنجیدگی میں چھپا لیا۔ "دیکھو جگر! اب تم الزام تراشیاں کر رہے ہو اور یہ بھی نہیں سوچ رہے کہ ایسی الزام تراشیوں سے خود تمہاری ہی مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہو گی۔"

"مارکیٹ ویلیو؟"

"ہاں بھئی... اب دیکھو نا، نوری تمہارے آگے پیچھے پھرتی ہے تو سب تمہیں رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دل ہی دل میں تمہاری کشش اور مردانہ وجاہت کے معترف ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھابی بھی ضرور متاثر ہوتی ہوں گی۔ اب جب تم یہ کہو گے کہ کسی نے زبردستی نوری جیسی حسینہ کو تمہارے پیچھے لگایا ہوا ہے تو پھر ویلیو تو ڈاؤن ہو گی نا۔ فتح پور کی اور بہت سی لڑکیاں جنہوں نے ابھی تم پر عاشق ہونا ہے اور تمہارے لیے ٹھنڈی آہیں بھرنی ہیں، وہ سب کی سب اپنے ارادے بدل لیں گی۔"

"تم بکواس نہ کرو۔ میں سب سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا چاہ رہے ہو۔ تمہارے دماغ میں گھسا ہوا ہے کہ نوری اس طرح میرے آگے پیچھے رہے گی تو سلطانہ میں جلاپا پیدا ہو گا اور وہ میرے قریب آ جائے گی... لیکن وہ اور طرح کی لڑکی ہے۔ تمہاری اس حماقت سے کوئی الٹا اثر بھی لے سکتی ہے۔"

"تم صنفِ نازک کے بارے میں میرے تجربے اور علم کی توہین کر رہے ہو۔ میں نے عرق النسا نکالا ہوا ہے شہزادے۔ نفسیات الخواتین کے اندر اتنی گہرائی میں اترا ہوا ہوں کہ اب کچھ بھی میرے لیے راز نہیں۔ تم دیکھنا، دو چار دن کے اندر بھابی سلطانہ میں بڑی خوش گوار تبدیلیاں آئیں گی۔"

"تو تم یہ تسلیم کر رہے ہو کہ نوری کو تم نے ہی میرے پیچھے چھوڑا ہے؟"

"وہ بڑی بھلی مانس لڑکی ہے یار... تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

"اسے شیطان ثابت کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ تم اسے بھلا مانس کہہ رہے ہو۔"

"دیکھو، تم نیوز چینل والے سے متھا لگا رہے ہو اور شاید تمہیں پتا نہیں کہ ہمارا کیمرا واش روم تک بندے کا پیچھا کرتا ہے۔"

ہمارے درمیان یہ نوک جھوک شاید کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں چِکّی چِکّی کر والا تا ذا افضل وہاں آ گیا۔ عمران بولا۔ "اب ہم یہاں لیتے ہیں چھوٹا سا بریک۔" تا ذا افضل کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح نادیدہ خوف کے سائے تھے۔ لٹھ حسبِ معمول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں نم تھیں۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے بیٹا! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے دوسرے لوگن کو نقصان پہنچ جاوے۔ مکھیا رشید دل کا بڑا کھوٹا ہے۔ وہ میرے رشتے داروں کی جان عذاب میں ڈال سکت ہے۔"

میں اسے کیسے بتاتا کہ اس کا اندیشہ درست ثابت ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا ایک چچیرا بھائی مصیبت میں آ گیا ہے۔

عمران نے تا ذا افضل کو تسلی تشفی دی۔ ابھی تا ذا پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا کہ گرو کی پتنی رادھا بھی وہاں آ گئی۔ اس کی آنکھیں بھی رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے محترم شوہر کے لیے پریشان تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور خوب صورت آنکھوں میں اندیشوں کے گہرے سائے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اسے شوہر سے محبت نہیں ہے۔ وہ صرف ڈر کی وجہ سے اس کے ساتھ نتھی ہے یا یوں کہا جائے کہ صرف دھرم کا پالن کر رہی ہے۔ اسے یہ خوف ہے کہ اگر اس کی وجہ سے اس کے پتی دیو پر کوئی مصیبت آئی تو بھگوان بھی اس سے ناراض ہو جائے گا... اور وہ کہیں کی نہیں رہے گی۔

وہ عمران سے جاننا چاہتی تھی کہ اس کے پتی دیو کہاں اور کس حال میں ہیں۔

عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھو رادھا! تمہیں اس کے بارے میں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جہاں بھی ہے، خود گیا ہے اور جس حال میں بھی ہے، اپنی مرضی سے پہنچا ہے۔ اس کے لیے تم کچھ کر سکتی ہو نہ ہم کر سکتے ہیں۔ بس پرارتھنا کی جا سکتی ہے اور وہ یقیناً تم کر رہی ہو گی۔"

"لیکن سب کچھ میری وجہ سے ہی شروع ہوا تھا نا۔ تم لوگن نے میری کمر سے بارود باندھا۔ میرا جیون بچانے کے لیے ہی گرو جی نے تاڑی میں بے ہوشی کی دوا ملائی۔ اچھا ہوتا کہ انہوں نے میری ہتھیا ہو جانے دی ہوتی۔ مر جانے دیا ہوتا مجھ ابھاگن کو۔"

"اب اس نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ وہ تمہیں مرنے کے لیے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ صرف اپنی جان بچا کر بھاگا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم زندہ ہو اور وہ بھگوان کی پکڑ میں آ گیا ہے۔"

عمران کی اس بات نے رادھا کو خاموش کر دیا مگر اس کے شفاف رخساروں پر آنسو بدستور پھسلتے رہے۔ وہ ہولے سے بولی۔ "اس کے پیچھے بھی ضرور کوئی نہ کوئی وجہ ہووے گی۔ کوئی کارن ہووے گا۔ گرو جی کا کوئی کرم بھگوان کی منشا سے خالی ناہیں ہوتا۔"

"ہاں، کوئی نہ کوئی بہانہ تو اس کے پاس ضرور ہو گا۔ اس کے دماغ میں بہانہ ساز فیکٹری لگی ہوئی ہے اور مزہ یہ ہے کہ ہر بہانہ دھرم کے عین مطابق بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی بہانے سے تاڑی پی لیتا ہے۔ کسی بہانے تم جیسی لڑکی سے بیاہ رچا لیتا ہے۔ کسی بہانے جاپ کے ٹھنڈے پانی کو گرم کر لیتا ہے۔ بڑا کمال کا بندہ ہے تمہارا پتی۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"

رادھا نے کانپ کر نفی میں سر ہلایا اور سسکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کی ملائم شفاف کمر پر ابھی تک بیلٹ کے فیتوں کے نیلگوں نشان موجود تھے۔ وہ واقعی نازک اندام اور معصوم تھی۔ گرو اس کی معصومیت سے خاطر خواہ "خراج" وصول کرتا رہا تھا۔

رادھا اور تا ذا افضل کے جانے کے بعد میں نے عمران کو بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے آفتاب خاں کیا کچھ بتا کر گیا ہے۔ تا ذا افضل کے چچیرے بھائی کی مصیبت کا سن کر عمران کے ماتھے پر بھی شکن آ گئی۔ میں جانتا تھا کہ اسے بستی والوں سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ ان کا دکھ سکھ اپنے سینے میں محسوس کرتا تھا۔ یہ جان کر کہ بستی میں مسلم گھرانوں پر مصیبت آئی ہوئی ہے وہ بے چین سا نظر آنے لگا۔ تاہم میری طرح وہ بھی جانتا تھا کہ بڑی مصیبت سے بچنے کے لیے اس چھوٹی مصیبت کو برداشت کرنا ضروری ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت جب میں سلطانہ کے پاس بیٹھا تھا اور بالو کی باتیں کر کے اس کی ممتا کو مزید ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا، اچانک بالائی سیڑھیوں پر آفتاب نمودار ہوا۔ وہ رات کے وقت آتا تھا۔ اس کا سہ پہر کے وقت آنا خلافِ معمول تھا۔ میں اور عمران سب سے نچلے تہ خانے میں قیام پذیر تھے۔ آفتاب سیدھا ہمارے پاس ہی آیا۔ وہ سرگوشیوں میں عمران سے باتیں کرنے لگا۔ میں بھی ان دونوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "بڑا عجیب سین ہے جی۔ ام تو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔ وہ لوگ ایسے رو رہا ہے اور بین کر رہا ہے جیسے ان کا پورا قبیلہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔"

"وہ بڑھیا بھی ہے؟"

"جی ہاں، وہی کھوسٹ تو سب سے زیادہ واویلا کرتا ہے۔ پتا نہیں کیا کیا جنتر منتر پڑھ رہا ہے۔ کبھی دیوی کے قدموں میں سر رکھ کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا ادھیڑ عمر بیٹا اور بہو بھی ساتھ ہیں۔ ساتھ میں چودہ پندرہ سال کا ایک بچہ بھی ہے جس نے سادھوؤں جیسا حلیہ بنایا ہوا ہے۔"

"بچہ کون ہے؟"

"ہمارے اندازے کے مطابق یہ بھی بڑھیا کا نواسا ہے۔ یہ سب لوگ کل ایک ساتھ ہی نل پانی سے یہاں آیا ہے۔"

بچے کا سن کر میرے ذہن میں فوراً وہ لڑکا آ گیا جس نے رام پرشاد کے گھر سے مجھے نیلے پتھروں والا ہار پہنا کر اور خوشبو لگا کر رخصت کیا تھا۔

آفتاب خاں سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''اگر آپ لوگ یہ تماشا دیکھنا چاہتا ہے تو ام آپ کو دکھا سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہاں اوپر والے تہ خانے کی بغل سے ایک تنگ زینہ اوپر مندر تک جاتا ہے۔ اس کا کچھ سیڑھیاں گر چکا ہے لیکن پھر بھی ام تھوڑا سا کوشش کر کے اوپر چڑھ سکتا ہے۔ مندر میں کالی کی مورتی کے پیچھے دیوار میں ایک چھوٹا سا ہوادان ہے۔ یہ ہوادان فرش سے بس ڈیڑھ دو فٹ اونچا ہے۔ اس میں لال پتھر کا جالی لگا ہوا ہے۔ ام اس جالی میں سے پوجا والے کمرے کا نظارہ کر سکتا ہے۔''

ہمارے اور آفتاب کے درمیان اس بارے میں تھوڑی سی بات چیت مزید ہوئی پھر ہم آفتاب کے ساتھ ان تاریک، تنگ زینوں کی طرف بڑھ گئے۔ آفتاب کی ہدایت پر ہم نے اپنے چہروں کے گرد کپڑے لپیٹ لیے۔ آفتاب نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ خود کو چھپانے کے لیے نہیں تھا۔ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ یہ تنگ زینے نامعلوم عرصے سے بند پڑے تھے اور گرد آلود جالوں سے اٹے ہوئے تھے۔ چہروں کو ڈھانپنے کی وجہ سے ہم ان جالوں سے محفوظ ہو گئے۔

آفتاب کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور وہ سب سے آگے تھا۔ اس نے لالٹین اس طریقے سے پکڑ رکھی تھی کہ ہمیں بھی روشنی مہیا ہوتی رہے۔ نانک چندی اینٹوں کے زینے دو تین جگہوں پر بالکل مسمار ہو چکے تھے۔ ہمیں یہاں احتیاط سے اوپر چڑھنا پڑا۔

ایک موڑ کاٹنے سے پہلے آفتاب نے لالٹین بجھا دی۔ ذرا دیر بعد ہم ایک مستطیل روشن دان کے سامنے تھے۔ آفتاب نے اسے ہوادان کا نام دیا تھا۔ اس کی چوڑائی بہ مشکل ڈھائی تین فٹ اور اونچائی ڈیڑھ فٹ ہوگی۔ اس میں سرخ پتھر کی جالی لگی ہوئی تھی۔ ہم تاریکی میں تھے لیکن جالی کی دوسری طرف شمع دانوں اور چراغوں وغیرہ کی روشنی تھی۔ ایک طرف لوہے کی ایک بڑی انگیٹھی بھی دہک رہی تھی۔ ہمیں پوجا پاٹ کے ایک وسیع کمرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا اور یہ منظر چونکا دینے والا تھا۔ مجھے اس منظر میں کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ سب سے اہم چہرہ تو سرخ آنکھوں اور گھڑی ناک والے برہمن زادے ستیش کا تھا۔ ستیش مجھے استھان میں لے کر گیا تھا اور ستیش سے میری آخری ملاقات بھی استھان کے ہنگامے میں ہوئی تھی۔ تب وہ رائفل تانے قدم قدم ہماری طرف بڑھ رہا تھا... اور ہم قدم قدم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ اب وہی ستیش سر جھکائے پوجا پاٹ میں مصروف تھا۔ اس کے پہلو میں اس کا پتا یعنی گھر کا سربراہ رام پرشاد اپنی فربہ بیوی سمیت نظر آ رہا تھا۔ بائیں طرف ستیش کی عمر رسیدہ دادی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے ایک بڑی مالا پکڑ رکھی تھی اور جھوم جھوم کر کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کے عقب میں گرو کی پہلوان نما ملازمہ بھاگ متی موجود تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے نہایت وزنی کڑے موٹی شمعوں کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ سب کے چہروں سے گریہ زاری ظاہر ہو رہی تھی۔ رام پرشاد کی جواں سال بہو بھی مجھے وہیں پر نظر آئی۔ تاہم وہ سب سے پیچھے بیٹھی تھی اور اس گریہ زاری کے ماحول سے قدرے الگ دکھائی دیتی تھی۔

بہت سے اور لوگ بھی اس کمرے میں موجود تھے اور اپنے اپنے انداز سے پرارتھنا کر رہے تھے۔ پوجا کے کمرے کے ماحول میں عجیب سی سوگواری اور گمبھیر تا رچی ہوئی تھی۔ اتنی بوجھل فضا تھی کہ اس کے بوجھ کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

آفتاب نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''ام کو تو یہ لوگ عام ہندوؤں سے بھی مختلف لگتا ہے۔ یہ دیکھو، اس بڑھیا نے اور اس کے بیٹے نے کس طرح اپنا ماتھا رنگا ہوا ہے۔ ام کو تو یہ خون لگتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے بھی جوابی سرگوشی کی۔

''پتا نہیں کیوں امارے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ یہ لوگ یہاں کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے۔ ان کا نیت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

شاید آفتاب ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ پوجا کے کمرے کا ماحول سخت گمبھیر ہونے کے ساتھ ساتھ پُراسرار بھی تھا۔ غالباً پوجا کے اس کمرے میں اس بستی کا کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا۔ یہ سب لوگ باہر سے ہی آئے ہوئے تھے اور ان میں زیادہ تر استھان ہی کے تھے۔ ان میں سے سات آٹھ چہروں کو تو میں اچھی طرح پہچان رہا تھا۔ عقابی آنکھوں والا گائک بان بھولا ناتھ، امری اور پٹیل جس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی لوگ۔ ایک طرف کونے میں مجھے وہ لڑکا بھی نظر آیا جس کے بارے میں آفتاب نے ابھی بتایا تھا کہ وہ رام پرشاد کا بیٹا اور ستیش کا چھوٹا بھائی ہے۔ تاہم ستیش کا ایک خاص ساتھی مہندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گرو کا کوئی چیلا بھی نظر نہیں آیا۔

رام پرشاد کی لرزتی کانپتی ہوئی آواز ابھری اور پوجا کے کمرے میں پھیل گئی۔ ”بھگوان! ہمرا اور امتحان نہ لو، ہمیں شما کر دو۔ بس ہمیں شما کر دو۔ ہمیں دکھا دو کہ تم نے ہمری پرارتھنا سویکار کی ہے۔ ہمیں دکھا دو بھگوان۔“

”ہمیں دکھا دو بھگوان... دکھا دو۔“ کئی گڑگڑاتی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

”ہم نے پرائشچت کیا ہے بھگوان۔ لیکن ہم کمزور ہیں۔ ہمرا پرائشچت بھی کمزور ہے مگر جیسا بھی ہے تو اسے قبول کر لے۔ ہم پر سے اپنا قہر ہٹا لے۔“ رام پرشاد کی آواز دوبارہ ابھری۔

”ہم پر سے قہر ہٹا لے۔“ باقی آوازوں نے تائید کی۔

کچھ دیر تک رونے گڑگڑانے کا سلسلہ جاری رہا پھر رام پرشاد کے گھر نظر آتے والا سوکھا سڑا پنڈت بھگوان داس اپنی جگہ سے اٹھا اور دھوتی سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پوجا کے کمرے میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک بڑا سا پیالہ تھا۔ پیالے کو اوپر سے ایک تھالی کے ساتھ ڈھکا گیا تھا۔ پنڈت بھگوان داس نے یہ پیالہ بڑی احتیاط سے دیوی کے قدموں کے پاس ایک چھوٹے چبوترے پر رکھ دیا۔ یہاں کئی دیے پہلے سے روشن تھے۔

رام پرشاد نے اپنی عمر رسیدہ ماں کو سہارا دے کر اٹھایا اور پیالے کے قریب لے آیا۔ اس نے پیالہ اٹھا کر بڑھیا کے پاس کیا۔ پیالے میں یقیناً کوئی سیال تھا۔ بڑھیا نے یہ چلّو بھر سیال لیا اور دیوی کے قدموں میں چھڑک دیا۔ ہم دنگ رہ گئے۔ یہ سیال کچھ اور نہیں، خون تھا... بڑھیا کی انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سی ہیجانی کیفیت تھی۔ خون چھڑک کر وہ لرزتی کانپتی پیچھے ہٹ گئی اور اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

اس کے بعد بڑھیا کے بیٹے رام پرشاد نے یہی عمل کیا پھر جواں سال ستیش کی باری آئی۔ خاندان کے سبھی افراد نے باری باری یہ رسم پوری کی۔ آخر میں رام پرشاد کی بہو مالا کی باری تھی۔ وہ اپنی جگہ سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ رام پرشاد ہاتھ میں پیتل کا پیالہ لیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بڑھیا نے قہر آلود نظروں سے مالا کو گھورا اور پھر مالا کے شوہر ستیش سے کچھ کہا۔

ستیش کے چہرے پر بھی طیش تھا۔ اس نے غصیلے لہجے میں مالا کو پکارا۔ ”اٹھو، ادھر آؤ۔“

وہ جیسے تھرا کر رہ گئی۔ ستیش نے دوبارہ کہا تو وہ چار و ناچار اٹھی اور پیالے کی طرف بڑھی۔ اس کے چہرے پر سخت ناگواری تھی اور وہ پیالے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے لرز رہی تھی۔ بڑی کراہت کے ساتھ اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو ذرا سا تر کیا اور دیوی کے قدموں پر جھٹک دیا۔

اس کا انداز دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ عام خون نہیں ہے۔ اس میں کوئی خاص بات ہے۔

”کہیں یہ کسی انسان کا خون تو نہیں تھا؟“ یہ سوال تیزی سے میرے ذہن میں ابھرا اور سنسنی بن کر پورے جسم میں پھیل گیا۔

میں نے کن انکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ نیم تاریکی میں اس کے چہرے پر بھی سنسنی آمیز الجھن کے آثار تھے۔

سوچنے کی بات تھی... اگر یہ کسی انسان کا خون ہے تو پھر کس کا ہے؟ کیا اس کے جیتے جاگتے جسم سے یہ خون کشید کیا گیا ہے یا پھر اسے مار ہی ڈالا گیا ہے... ان گنت سوال ذہن میں کھلبلی مچانے لگے۔ اندر کی فضا مزید بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے صاف دیکھا کہ رام پرشاد کی بہو مالا واپس جاتے ہوئے سسکیوں کے ساتھ رو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد بڑھیا اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کی بیوی اور بہو مالا بھی اٹھ گئیں۔ وہ چودہ پندرہ سالہ لڑکا بھی اٹھ گیا جس کا نام مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا تھا۔ تیرہ سن کی دھوبن بھاگ متی بھی ان سب کے پیچھے جھومتی اور ڈگمگاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے بازوؤں کے کڑے کھڑکھڑا رہے تھے اور ماحول کی پُراسراریت میں اضافہ کر رہے تھے۔

اب پوجا کے وسیع و عریض کمرے میں صرف مرد رہ گئے۔ سوکھے سڑے پنڈت کے دو تین ساتھیوں نے بلند آواز میں اشلوک پڑھنا شروع کر دیے۔ رام پرشاد جیسے وجد کے عالم میں تھا اور پیتل کی ایک بڑی گھنٹی کو مسلسل حرکت دیتا چلا جا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز در و دیوار میں سرایت کر رہی تھی۔ یہ آواز لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی چلی گئی۔ اشلوک بھی ہیجان خیز ہو گئے۔ اس کے بعد پنڈت پہلے کی طرح اٹھا اور باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پنڈت واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پیتل کا ایک بڑا گول تھال تھا۔ اس تھال میں کوئی تربوز جیسی شے اروی کے پتوں سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ تھال کے کناروں پر پھول سجائے گئے تھے۔ پنڈت نے یہ تھال بمشکل اٹھا رکھا تھا۔

چند قدم آگے بڑھ کر پنڈت نے یہ تھال دیوی کے قدموں میں رکھ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر الٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ رام پرشاد عجیب انداز میں گھنٹی کو حرکت دیتا چلا گیا۔ اشلوکوں کی آواز بلند ہوتی گئی۔ ہر چہرہ مجسم ہیجان تھا۔

پنڈت نے آگے بڑھ کر اپنا منحنی جسم پیتل کے تھال پر جھکایا اور تربوز نما شے کے اوپر سے اروی کے بڑے بڑے پتے جدا کر دیے۔ شمع دانوں اور چراغوں کی مدھم روشنی میں جو منظر ہمیں دکھائی دیا، وہ دہلا دینے والا تھا۔

سب کچھ ہمارے سامنے تھا مگر ہمیں اپنی بصارت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ پیتل کے گول تھال میں ایک خون آلود انسانی سر رکھا تھا... اور... یہ گرو سوبھاش کا سر تھا۔ ہاں، یہ گرو سوبھاش ہی تھا۔ اس کا منڈا ہوا سر، اس کا عقابی چہرہ، اس کی پھولی ہوئی ناک سب کچھ ہمارے سامنے تھا۔ گرو کی گردن، ٹھوڑی کے بالکل پاس سے کاٹی گئی تھی اور گردن کے زخم کو پتوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود یہ منظر سینہ شق کر دینے والا تھا۔

”او خدایا!“ آفتاب خان نے سرسراتی سرگوشی کی۔ ”یہ تو وہی موٹا ہے جو راتوں رات یہاں سے بھاگ گیا تھا۔“

”ہاں وہی ہے۔“ عمران نے نہایت تاسف سے تائید کی۔

”میرا خیال ہے کہ پیالے میں لہو بھی گرو ہی کا تھا۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

ہم سب سناٹے میں تھے۔ اندر پوجا کا منظر قابلِ دید تھا۔ سب اوندھے لیٹ گئے تھے اور گریہ زاری کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ یہ نہایت سنگ دل لوگ تھے۔ پھر بھی ان میں سے کئی ایسے تھے جو یہ دلدوز منظر دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ پیتل کے تھال میں رکھا ہوا انسانی سر جس کے گرد پھولوں کا گھیرا تھا، فربہ چہرہ خون آلود تھا اور نقوش پر آخری وقت کی دہشت اور اذیت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ گرو کی نیچے لٹکی ہوئی ٹھوڑی اور ایک رخسار پر چوٹوں کے نشان تھے جو اس امر کے گواہ تھے کہ گرو پر اس کے اپنے ہی لوگوں نے تشدد بھی کیا ہے۔

رام پرشاد نے فرش پر اوندھے لیٹے لیٹے بلند آواز میں کہا۔ ”دیوی! یہ بلیدان سویکار کر۔ ہمیں آنے والی آفت سے بچا لو۔ ہمیں شما کر دو۔“

اسی طرح کی گریہ زاری دوسرے لوگ بھی کر رہے تھے۔ مندر میں ان کی پوجا کا انداز بالکل جدا تھا۔ یہ عمومی نہیں بلکہ ایک خاص فرقے کا انداز تھا۔

یہ گرو استھان کے تیرہ سیوکوں کا قاتل تھا۔ ہم نے اس کی سزائے موت کا منظر اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا مگر چشمِ تصور سے یہ منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ گرو کو جان بہت پیاری تھی۔ یقیناً اس نے زندہ رہنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے۔ اپنے ساتھیوں کو من گھڑت دلیلوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ آخری وقت میں زور آزمائی بھی کی ہو۔ ذبح ہونے والے جانور کی طرح تڑپا پھڑکا بھی ہو لیکن اس کی کوئی پیش نہیں چلی تھی۔

اس کے انجام پر کچھ ترس تو آرہا تھا لیکن وہ قابلِ ترس ہرگز نہیں تھا۔ اسی کی زیرِ ہدایت و نگرانی میں شکیلہ جیسی بے گناہ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا... کچھ دیر بعد یہ خصوصی پوجا ختم ہو گئی اور خون آلود سر کو دوبارہ پتوں سے ڈھانپ کر دیوی کے سامنے سے اٹھا لیا گیا۔

ہم بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اتر کر زیریں تہ خانے میں واپس پہنچ گئے۔ سب خاموش تھے۔ واقعے کی سنگینی نے چہروں کو گمبھیر کر رکھا تھا۔ راودھا اپنے کمرے میں نوری کے ساتھ سو رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے پتا دیو کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ وہ جتنی دیر تک بے خبر رہتی، اتنا ہی اچھا تھا۔

”خس کم جہاں پاک۔“ آخر اقبال نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

عمران نے اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجایا اور ہلکی سی انگڑائی لے کر بولا۔ ”محاورہ تھوڑا سا غلط ہو گیا ہے۔ خس تنکے کو کہا جاتا ہے اور گرو تو کافی بھاری بھرکم چیز کا نام تھا۔“

میں نے کہا۔ ”جتنا بھاری بھرکم تھا، اتنا ہی خطرناک بھی تھا۔ جو لوگ اپنے مذہب کو اپنی من مانیوں کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وہ گولہ بارود چلانے سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔“

”لیکن گرو کو مارنے والے شاید گرو سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ جو لوگ اپنے ایک ساتھی کو اتنی بے دردی سے قتل کر سکتے ہیں، وہ ہمارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔“

”بات تو بالکل ٹھیک ہے۔“ اقبال نے عمران کی تائید کی۔

آفتاب خان پہلی بار تھوڑا سا نروس نظر آیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آفتاب کا یوں بار بار یہاں تہ خانے میں آنا جانا کوئی مسئلہ پیدا نہ کرے۔“

آفتاب بولا۔ ”ام کو اپنا فکر نہیں ہے جی۔ ام تو اکیلا ہے۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ام کو آپ کی طرف سے ڈر لگتا ہے۔ آپ کے ساتھ پانچ جوان عورتیں بھی ہے اور یہ کمیا وغیرہ بڑا ذلیل ہے۔ عورتوں کے لیے ایک دم خطرناک ہے۔“ پھر اس نے اپنی آواز کچھ مزید دھیمی کر لی اور بولا۔ ”ام نے رات کو

تاؤ کے چچازاد بھائی کے بارے میں بتایا تھا نا۔ یہ ذلیل لوگ اس کے گھر والوں کو پکڑ کر یہاں لایا ہے۔ آج سویرے باقی عورتوں کو تو چھوڑ دیا ہے مگر ایک گورا چٹا جوان لڑکی ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس بے چاری کا عزت بچا رہے گا۔''

آفتاب خاں نے ہمیں کلثوم نامی اس لڑکی کے بارے میں تفصیل بتائی۔ اس نے کہا کہ کل شام لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ اس جرم میں کھیا نے اسے بری طرح مارا پیٹا بھی تھا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ لڑکی بہت کچھ جانتی ہے اسی لیے اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔

آفتاب خاں نے کہا۔ ''آپ سچ پوچھتا ہے تو مجھے تو یہ استھان والا لوگ ایک دم دیوانہ لگتا ہے۔ اتنا غصہ ہے ان لوگوں میں کہ ام آپ کو کیا بتائے۔ آپس میں بھی لڑ جھگڑ رہا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ یہاں آکر دو دھڑوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک تو وہ کٹری ناک والا ستیش ہے جس کو ابھی ام نے مندر میں دیکھا ہے۔ دوسرا اس کا ساتھی مہندر ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ گرو کو مارنے کے بارے میں بھی ان دونوں میں جھگڑا رہا ہے۔ ستیش شاید گرو کو مار دینا چاہتا تھا اور مہندر اس کا چیلا ہونے کی وجہ سے اس سے تھوڑا بہت رعایت کرنا چاہتا تھا۔ اب بھی آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ مندر میں مہندر نام کا وہ بندہ پرارتھنا میں موجود نہیں تھا۔ ام کو گرو کا کوئی چیلا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہمارے درمیان کافی دیر گفتگو ہوئی۔ آفتاب خاں ہمارے لیے بڑا کارآمد ثابت ہو رہا تھا۔ وہ باہر کی ساری صورتِ حال کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ مہندر اور گرو کے چار پانچ چیلے مستقل طور پر کھیا رشید کی حویلی میں ہیں جبکہ ستیش، اس کا پتا رام پرشاد، وادی اور چند ساتھی ایک دوسرے زمیندار کے گھر میں قیام پذیر ہیں۔

جو خوفناک واقعہ ہم نے مندر میں دیکھا تھا، اس کے بارے میں اپنے دیگر ساتھیوں کو کچھ نہیں بتایا۔ تاؤ افضل، رادھا، نوری، سلطانہ اور طلال وغیرہ اس واقعے سے بالکل بے خبر رہے۔

سلطانہ کے حوالے سے میں شام تک سخت کشمکش میں تھا۔ مجھے اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تاہم شام کے بعد کچھ بہتری کے آثار نظر آئے اور مجھے لگا کہ سلطانہ کے بارے میں عمران جو ''ماہرانہ'' پیش گوئیاں کر رہا ہے، وہ شاید درست ہیں۔ شام کے وقت سلطانہ کا موڈ کچھ بدلا ہوا نظر آیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ آج اس کے بال کچھ سنورے ہوئے ہیں۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا تھا۔ آنکھوں میں ہلکا سا کاجل بھی لگایا تھا۔ اس تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ہی وہ اچھی بھلی دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ میرے لیے کھانا لے کر آئی تو اس میں ایک پلیٹ ڈھکی ہوئی بھی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''حلوہ... تمہارے لیے مہروج۔''

میں نے دیکھا، یہ سوجی کا حلوہ تھا۔ اس پر تھوڑا سا خشک میوہ بھی ڈالا گیا تھا۔ یہ اسی طرز کا حلوہ تھا جو نوری نے بنایا تھا۔

''یہ تم نے بنایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوں۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

میں نے حلوہ چکھا۔ وہ واقعی نوری کے حلوے سے کہیں بہتر تھا۔ بہرحال میں نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''کیسا ہے؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بس... ٹھیک ہے۔'' میں نے عام لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پہ مایوسی کا سایہ لہرا گیا اور وہ ایک دم چپ ہوگئی۔

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''زبردست سلطانہ... تم نے واقعی کمال کا بنایا ہے۔''

وہ جیسے اندر سے کھل اٹھی پھر اپنے تاثرات چھپانے کے لیے پانی لینے کے بہانے اندر چلی گئی۔

کتنا فرق تھا اس کی شخصیت کے دو رخوں میں۔ وہ ایک خونی قاتلہ کے روپ میں سامنے آئی تھی لیکن اب بھی اس کے اندر ایک عورت مکمل طور پر مری نہیں تھی... وہی عورت جو اپنے شریکِ حیات کے ساتھ جینا چاہتی ہے۔ اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر نہال ہوتی ہے۔ اپنے شیرخوار کو اپنے سینے پر لٹا کر اس سے اٹھکیلیاں کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ ہاں، ابھی وہ عورت کسی نہ کسی درجے میں زندہ تھی اور میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس زخم زخم عورت کو زندہ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔

رات کو وہ دیر تک جاگتی رہی۔ میرے پاس بیٹھی اپنے بالو کی باتیں کرتی رہی۔ اس کی ممتا بیدار ہو چکی تھی۔ وہ جلد از جلد بالو کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی چھاتی سے لپٹانا چاہتی تھی۔ یہ صورتِ حال امید افزا تھی۔ اگر ممتا اس کے اندر زندہ ہو گئی تھی تو پھر امید تھی کہ مکمل عورت بھی زندہ ہو جائے گی جس کی آنکھوں میں حسرتوں کے قبرستان نہیں ہوں گے۔ جو میرے چھونے سے سرتاپا لرزے گی نہیں۔

جب ہم اپنے اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹے تو میں نے اس کا ہاتھ آہستہ سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں ہولے ہولے اس کے بالوں میں چلاتا رہا۔ بالوں کا یہ لمس میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ماضی میں، میں ان بالوں کے اندر چہرہ چھپاتا رہا ہوں۔ ان کی خوشبو اپنی سانسوں میں اتارتا رہا ہوں... دھندلی سی گواہی تھی مگر موجود تھی۔ میں اس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔ وہ اپنے تمام تر پیار بھرے ایثار کے ساتھ میرے دل میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں رات کی اس تنہائی میں اس کی طرف بڑھتا تو شاید... شاید وہ مجھے راستہ دینے پر آمادہ ہو جاتی لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس کی آزادی اور رضا بھی اس کی زندگی ہی کی طرح عزیز تھی۔ میں نے اپنی ذات کا دروازہ اس کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پوری آزادی اور پوری عزتِ نفس کے ساتھ اس دروازے میں خود قدم رکھے۔

وہ سو گئی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بالوں کی دو موٹی لٹیں اس کے گندمی چہرے پر تھیں۔ مجھے اس کے چہرے پر جارج گورا کے گندے ہاتھوں کا کوئی ہلکا سا نشان بھی نظر نہیں آیا۔ وہ چاندنی، شبنم اور سورج کی روپہلی کرنوں کی طرح شفاف اور پاک تھی۔

سلطانہ کو دیکھتے دیکھتے میرا دھیان اس کلثوم نامی لڑکی کی طرف چلا گیا جو بقول آفتاب خاں اس وقت اپنی آبرو کے خطرے سے دوچار تھی... میں سہ پہر سے اس لڑکی کے بارے میں کئی بار سوچ چکا تھا۔ کیا ایک اور سلطانہ ایک اور جارج گورا کے پنجے ہوس میں جکڑی جانے والی تھی؟ کیا اس مرتبہ بھی میں کچھ نہیں کر سکوں گا یا پھر اس مرتبہ بھی مجھے تاخیر ہو جائے گی... جیسے شکیلہ والے معاملے میں ہوئی تھی؟ استھان میں اپنی آبرو کے بعد وہ اپنی زندگی بھی نہیں بچا سکی تھی اور اپنی کھودی ہوئی قبر میں دفن ہو گئی تھی۔ میں اور عمران سوچتے ہی رہ گئے تھے۔

میں جانتا تھا کہ عمران بھی اس کلثوم نامی لڑکی کے سلسلے میں بے چین ہے لیکن میری بے چینی شاید اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس بے چینی میں میرے اندر کی بے چینی اور وحشت بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا... کسی مشکل سے ٹکرانا چاہتا تھا... خود کو کسی بے پناہ صورتِ حال کے روبرو کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ مجھے درد درکار تھا۔ اذیت چاہیے تھی۔ میری سہی ہوئی اذیت سے اگر کچھ لوگوں کے لیے آسانیوں کے در کھل جاتے تو یہ اور بھی اچھی بات تھی۔

میں نے سلطانہ کو سوتے چھوڑا اور بے چین سا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ آفتاب خاں باہر کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے یہاں آئے گا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے اپنا پسٹل جیکٹ کے نیچے لگایا اور خاموشی سے زینوں کی طرف آگیا۔ میں جانتا تھا کہ عمران کچھ دیر کے لیے سو گیا ہے اور اقبال اوپر والے تہ خانے پر تاؤ افضل اور رادھا کی دل جوئی میں مصروف ہے۔ میں خاموشی سے زینے چڑھ کر بالائی تہ خانے پر آگیا۔ یہاں کاٹھ کباڑ پڑا تھا اور تاریکی تھی۔ میں خاموشی سے لکڑی کے ایک ٹوٹے ہوئے گرد آلود بینچ پر بیرونی دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ چار پانچ دن پہلے ہم اسی دروازے سے گزر کر ان تہ خانوں میں داخل ہوئے تھے۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر عمران وغیرہ کو معلوم ہوتا کہ میں باہر جانا چاہ رہا ہوں تو وہ مجھے کبھی نہ جانے دیتے۔ ان کی سب سے وزنی دلیل یہی ہوتی کہ اگر خدانخواستہ میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا۔ وہ لوگ مجھے تشدد کے شکنجے میں جکڑیں گے اور مندر کے تہ خانوں تک پہنچ جائیں گے۔ یہ بہت وزنی دلیل تھی مگر میں جانتا تھا کہ یہ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اذیت برداشت کرنے کے حوالے سے میرے اندر عجیب سا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ ناقابلِ برداشت اذیت کو جھیلنا میری فطرت بنتا جا رہا ہے۔ برداشت کی حد آتی تھی تو میں رک جاتا تھا اور اگلی دفعہ اس حد کو بڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔

دروازے سے باہر مدھم آہٹیں سنائی دیں۔ پھر تالا کھلنے کی ہلکی سی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ یخ بستہ ہوا کا جھونکا اور آفتاب خاں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ آفتاب خاں مجھے وہاں تاریکی میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ہم نہایت مدھم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ آفتاب خاں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ میں اس وقت مندر سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تابش بھائی! ام کو آپ کا بات سمجھ میں نہیں آ رہا۔ باہر آپ کے لیے بہت خطرہ ہے۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو...''

''دیکھو، میں جو بات کہہ رہا ہوں، پوری طرح سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے برے بھلے کا ذمے دار ہوں اور تمہیں پورا یقین دلاتا ہوں کہ میری وجہ سے کسی دوسرے پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔''

"مگر..."

"آفتاب! میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ تم بس یہ کرو کہ مجھے مکھیا رشید کے گھر کے دروازے تک پہنچا دو۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام..."

"مگر... مگر وہاں آپ کرے گا کیا؟"

"یہ سب کچھ میں تمہیں واپس آکر بتاؤں گا... کل رات۔"

"کیا مطلب؟ آپ آج واپس نہیں آئے گا؟"

"میں تو انشاء اللہ آجاؤں گا مگر تم آج نیچے نہیں جاؤ گے۔ تم سے ہماری ملاقات اب کل رات ہی ہوگی۔"

"اماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ آپ ام کو ذرا تفصیل سے بتائیں، شاید ہمارے کھوپڑے میں کچھ آجائے۔" آفتاب کی آواز بھرّا گئی۔

اگلے چار پانچ منٹ میں وہیں سیڑھیوں کی تاریکی میں سب کچھ طے ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق مجھے اور آفتاب خان کو آگے پیچھے مندر میں سے نکلنا تھا۔ ہمارے درمیان کم و بیش بیس تیس قدم کا فاصلہ رہنا تھا۔ آفتاب نے مجھے مکھیا کے مکان تک پہنچانا تھا اور پھر سیدھا آگے نکل جانا تھا۔ اس نے مجھے مکھیا کے مکان کا سارا حدود اربعہ بھی بتا دیا اور اس امر سے بھی آگاہ کر دیا کہ وہاں اندازاً کتنے لوگ اور کہاں کہاں موجود ہو سکتے ہیں۔ اس گفتگو کے آخر میں آفتاب خاں کی سمجھ میں یہ بات تقریباً آگئی کہ میں مکھیا کے گھر سے اس کلثوم نامی لڑکی کو نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اس ارادے نے اسے حیران تو بہت کیا تاہم اس نے اس حوالے سے کوئی تبصرہ کرنے کی ہمت نہیں کی۔

باہر نکل کر آفتاب نے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا پھر میں بھی باہر آگیا۔ آفتاب نے میری ہدایت کے مطابق دروازہ بند کیا اور تالا دوبارہ لگا دیا۔ اس نے تالے کو بند نہیں کیا لیکن بظاہر وہ بند ہی نظر آتا تھا۔ رات بہت ٹھنڈی تھی۔ آسمان پر ہلکے بادل تھے، مدھم ہوا چل رہی تھی۔ میں اور آفتاب آگے پیچھے گاؤں کی گلیوں میں جارہے تھے۔ آفتاب کے ہاتھ میں لالٹین اور لاٹھی تھی۔ ایک پرانا ماؤزر بھی اس کے لباس کے اندر موجود تھا۔ چلتے چلتے وہ گاہے بگاہے آواز بلند کر دیتا تھا۔ "جاگتے رہو۔"

وہ کہہ تو رہا تھا کہ "جاگتے رہو" لیکن فی الوقت وہ خواہش یہی کر رہا تھا کہ "سوتے رہو" اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو ہونے دو۔ گلیوں میں آوارہ کتوں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی گھر میں لالٹین یا دیے کی مدھم روشنی دکھائی دیتی تھی۔ جنگلی جانوروں سے تحفظ کے لیے اکثر گھروں کے گرد کانٹوں اور جھاڑیوں کی باڑیں لگائی گئی تھیں۔ میرے سینے میں عجیب سا جوش بھر گیا تھا اور اس نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔

چھوٹے بڑے گھروں کے درمیان مجھے ایک نیم پختہ اور کشادہ مکان نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی مکھیا کا گھر ہے۔ گھر کا احاطہ وسیع تھا۔ پھاٹک سے باہر دو تین خالی چھکڑے کھڑے تھے۔ یہاں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آرہا تھا۔ آفتاب نے بتایا تھا کہ مکھیا کے مویشی اور گھوڑے وغیرہ احاطے کے اندر ہی ایک اصطبل میں ہوتے ہیں۔ حسب پروگرام مکھیا کے گھر کی نشان دہی کرنے کے بعد آفتاب سیدھا نکلتا چلا گیا۔

آفتاب نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ مکھیا کے مکان کی دیوار کہاں سے بہ آسانی پھاندی جا سکتی ہے اور کس طرف سے احاطہ پار کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں نے آفتاب کی ہدایت کے مطابق ایک جگہ سے چھ فٹ اونچی کچی دیوار پھاندی اور احاطے میں چلا گیا۔ مجھے ایک طویل برآمدے میں داخل ہونے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ یہاں چقیں لگی تھیں اور دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سی بوریاں چنی ہوئی تھیں۔ ان کی بو سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں خشک مچھلی ہے۔ ایک دم مجھے رکنا پڑا۔ کسی قریبی گوشے سے بھاری آواز میں گانے کی مدھم صدا ابھر رہی تھی۔ کوئی شخص بھرائی ہوئی نشہ زدہ آواز میں بار بار یہ بول دہرا رہا تھا۔ نند لالا پن گھٹ پر چھیڑ گیو رے... میری چولی کے بٹنے ادھیڑ گیو رے... میری چولی... میری چولی...

میں کچھ دیر تک یہ بھونڈی آواز سنتا رہا اور سمت کا تعین کرتا رہا پھر پستول نکال کر ایک تنگ راہداری کی طرف بڑھا۔ لالٹین کی بہت مدھم روشنی میں ایک ہٹا کٹا شخص فرش کی دری پر لیٹا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس دیسی بوتل کی ساخت سے ہی پتا چل جاتا تھا کہ اس میں تاڑی ہے۔ ویسے بھی اب میں تاڑی کی بو اچھی طرح پہچاننے لگا تھا۔ یہ شخص دری پر اینٹھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ خمار کے عالم میں گاتا جا رہا تھا۔ نند لالا پن گھٹ پر... نند لالا...

مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں اپنے سائے کا دھیان نہیں رکھ سکا۔ سامنے دیوار پر میرے سائے کی مدھم حرکت دیکھ کر ہٹا کٹا شخص بے طرح چونک گیا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس پر جھپٹ پڑوں۔ میں نے ڈیڑھ کلو وزنی پستول کا دستہ پورے زور سے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ وہ کراہ کر ایک تکیے

پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر چلاتا اور کسی کو اپنی مدد کے لیے بلاتا، میں اس پر سوار ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کا منہ ہی ڈھانپا۔ اس کی آواز اس کے گلے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ وہ خاصا زورآور تھا۔ غالباً نشے نے اس کے زور میں مزید اضافہ کیا تھا۔ اس نے غیر معمولی طاقت کے ساتھ ہاتھ پاؤں چلائے اور میری گرفت سے نکل جانا چاہا۔ اس کی مزاحمت توڑنے کے لیے میں نے اس کی زخمی کنپٹی پر پستول کا ایک اور وار کیا۔ وہ نڈھال سا ہو گیا۔ میں نے اس کے ادھ کھلے منہ میں ایک کپڑا ٹھونسا اور پھر اس کپڑے کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ اردگرد مکمل خاموشی تھی۔ غالباً اس مکان کے مکین بند کمروں میں لحاف اور کمبل لپیٹے سو رہے تھے۔

میں نڈھال شخص کو بے آواز گھسیٹتا ہوا برآمدے میں لے آیا۔ برآمدے کے آخری سرے پر جہاں بہت سی چارپائیاں اُفقی رخ پر کھڑی تھیں، ایک چھوٹا دروازہ نظر آرہا تھا۔ میں اس وزنی شخص کو گھسیٹتا اور کھینچتا ہوا اس دروازے تک لے آیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا، اس میں بھوسا بھرا ہوا تھا۔ یہ چھوٹا سا کمرا مکان کے وسیع احاطے میں تھا۔ اس کے دو دروازے تھے، ایک برآمدے میں اور دوسرا احاطے میں کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر میں اپنے شکار سمیت کمرے میں آگیا اور دونوں دروازے اندر سے بند کر دیے۔ یہ میری خوش قسمتی رہی تھی کہ اس ساری کارروائی کے دوران میں گھر کے باقی مکین بے خبر رہے تھے۔

میں نے جیکٹ سے چھوٹی ٹارچ نکال کر جلائی اور روشنی اپنے شکار کے چہرے پر پھینکی۔ اس کی کنپٹی لہولہان تھی اور وہ ناک کے راستے کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ بہر حال، وہ ہوش میں تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ اسی بستی کا رہائشی لگتا تھا۔ تاڑی کے نشے سے اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ میں نے پستول اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تم جتنا بھی سوچ رہے ہو، میں اس سے زیادہ بے رحم ہوں۔ تمہاری گردن توڑ کر تمہیں اس پرالی کے ڈھیر میں پھینک جاؤں گا، کل کا سورج نہیں دیکھ سکو گے..."

وہ دیکھ چکا تھا کہ میں نے کتنی بے دردی سے اسے پستول کی دو شاندار چوٹیں لگائی تھیں۔ وہ سخت جان نہ ہوتا تو شاید یہ چوٹیں ہی اسے عدم آباد روانہ کر دیتیں۔ وہ میری جسمانی مضبوطی کا بھی اندازہ کر چکا تھا۔ میں نے اس کی اندھا دھند مزاحمت کو بے اثر کر دیا تھا اور اسے اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ حالانکہ میری گردن کے عقب میں گہرا زخم بھی موجود تھا۔ اس زورآزمائی کی وجہ سے یہ زخم پھر کھل گیا تھا اور میں ایک بار پھر اپنی پشت پر لہو کی ہلکی سی نمی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم واویلا نہ کرو اور میرے دو تین سوالوں کے جواب دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ میں سے کپڑا نکال سکتا ہوں۔"

اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پستول کی نال اس کی چوڑی پیشانی پر رکھے رکھے اس کی جامہ تلاشی لی... اس کے کوٹ کی جیبوں سے کچھ نقدی، سگریٹ کا پیکٹ اور چھوٹی موٹی اشیا نکلیں... یہ اشیا میں نے دوبارہ اس کی جیبوں میں ٹھونس دیں۔ ایک چیز میرے علم میں نہیں آسکی اور وہ اس شخص کی قمیص کے نیچے رہی۔

میں نے اس کے منہ میں بری طرح ٹھنسا ہوا کپڑا نکال لیا اور اس سے پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "پہلے تو یہ بتاؤ تم کون ہو؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"شاید تم عمران اور اقبال کے ساتھ ہمارے گاؤں میں آئے تھے۔"

"میں تمہارے سوال کا جواب ہاں میں دیتا ہوں... اور دیکھو، یہ آخری سوال ہے اور اس کو آخری ہی رہنا چاہیے۔ نہیں تو گولی دماغ میں جائے گی اور تمہارا یہ گندا بھیجا ناک کے راستے باہر آجائے گا۔" میں نے پستول کا دباؤ اس کی پیشانی پر اتنا بڑھایا کہ وہاں گہری خراش آگئی اور خون رسنے لگا۔

"پپ... پوچھو۔"

"تمہارا نام؟"

"سس... سلمان... سلو۔"

"او... ہو... تو تم مکھیا عبدالرشید کے نورِ چشم ہو؟"

"ہم سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟" وہ ہکلایا۔

"پھر سوال۔ میں نے کہا تھا کہ سوال نہیں پوچھنا۔" میں نے پستول کا بے رحم دباؤ پیشانی پر بڑھا دیا۔ وہ تھرا کر رہ گیا۔

میں نے ٹارچ کے روشن دائرے میں غور سے اس کا صحت مند چہرہ دیکھا۔ تو یہ تھا وہ عیاش چوہدری زادہ جس نے نوری کو کھلونے کی حیثیت سے رکھا ہوا تھا اور اسی نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر تاؤ شکیل کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آج

رات اس طرح اچانک اس شخص سے ملاقات ہوجائے گی۔ بہرحال، میں یہاں اس کے جرائم اور گناہوں کا حساب کتاب کرنے نہیں آیا تھا، میرا مقصد کچھ اور تھا اور میری خواہش تھی کہ میں فی الحال اسی مقصد تک محدود رہوں۔

میں نے سلمان سلو نامی اس جواں سال شخص سے پوچھا کہ وہ لڑکی کلثوم کہاں ہے جسے اس گھر میں بند کیا گیا ہے اور مارا پیٹا جارہا ہے۔

اس نے صاف انکار کردیا کہ یہاں کوئی لڑکی موجود ہے۔ اس نے کہا کہ تاڑی کی رشتے دار ساری عورتوں کو کل ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا اور اسے کہا کہ میں صرف دس تک گنوں گا، اس کے بعد ہر نتیجے سے بے پروا ہو کر گولی چلا دوں گا۔

اس نے میرے لہجے کی بے پناہ تپش محسوس کی اور اس کی تاڑی زدہ آنکھوں میں خوف جم گیا۔ میں نے چھ تک ہی گنا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا... پسینے سے تر پیشانی کے ساتھ بولا۔ ”میں تم سے جھوٹ نا ہیں بول رہا۔ وہ لونڈیا یہاں نا ہیں ہے۔ میں قسم کھاوت ہوں۔“

”تو پھر کہاں ہے؟“

”وہ... وہ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کے پاس ہے۔ وہ اسے آج شام ہی ہمارے گھر سے لے گئے تھے۔“

”پھر جھوٹ؟“

”میں قسم کھاوت ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ ستیش اسے خود لینے کے لیے آیا تھا۔ اس کی پتنی مالا بھی اس کے ساتھ تھی۔“

”وہ کیوں لے گئے تھے؟“

”مجھے... ٹھ... ٹھیک سے تو پتا نا ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کو ڈر تھا۔ خاص طور سے ستیش کی پتنی مالا کو ڈر تھا۔“

”کیسا ڈر؟“

”شاید... وہ سمجھت تھی کہ یہاں اس لونڈیا کے ساتھ اچھا برتاؤ نا ہیں ہووے گا۔ وہ کہوت تھی کہ ہم خود اس سے پوچھ گچھ کر لیویں گے۔“

یہ میرے لیے انکشاف تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے سلمان کو دیکھا... شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اب وہ کہاں ہے؟“

”ہمارے... ساتھ والے تین گھر چھوڑ کر چوتھے گھر میں۔ زمیندار پردیپ کے مکان میں ستیش اور اس کے گھر والے بھی وہیں ہیں۔ عورتیں زنانے میں ہیں، مرد دوسرے حصے میں۔“

میں نے تھوڑی سی مزید تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ زمیندار پردیپ کے گھر میں زنانہ حصہ مکان کی بالائی منزل پر ہے... اور امکان ہے کہ لڑکی کلثوم ستیش کی پتنی مالا کے ساتھ سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں ہوگی... یہ تفصیل میرے لیے کارآمد ثابت ہوسکتی تھی۔ میں نے مکان کا حدود اربعہ بھی سلمان سے دریافت کیا اور وہاں پہرے وغیرہ کی صورتِ حال بھی دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ زمیندار پردیپ کے گھر میں داخل ہونے کے لیے مجھے کھیا کے مکان میں سے نکلنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں اگر کوشش کروں تو چھتوں کے اوپر سے ہی اس چھت پر پہنچ سکتا ہوں۔

میں نے کہا۔ ”تم نے مجھے سب کچھ بتایا ہے لیکن یہ ابھی تک نہیں بتایا کہ مجھے دائیں طرف والے تین گھر چھوڑنے ہیں یا بائیں طرف والے؟“

”دائیں طرف والے۔“ سلمان نے ہکلا کر کہا۔

جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں کمینگی کی جھلک نظر آئی۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید وہ مجھے غلط معلومات فراہم کر رہا ہے لیکن جلد ہی پتا چل گیا کہ یہ دوسرا معاملہ ہے اور میری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک بھی۔

سلمان کی قمیص کے نیچے ایک تیز دھار چاقو موجود تھا۔ یہ چاقو اس نے چمڑے کی بیلٹ کے ذریعے پیٹ کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جو تلاشی لی تھی، اس میں یہ چاقو میرے علم میں نہیں آسکا تھا۔ غیر محسوس طور پر سلمان سلو اپنے ہاتھ کو کھسکاتا ہوا اس چاقو تک پہنچا چکا تھا۔ یکایک وہ مچھلی کی طرح تڑپا۔ یہ اتنا برق رفتار وار تھا کہ میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ چاقو سیدھا میری گردن کی طرف آیا۔ یہ میری اضطراری حرکت ہی تھی جس نے میری گردن کو چاقو کی مہلک نوک سے بچایا۔ موت جیسے مجھے چھو کر نکل گئی تھی۔ میں نے اندھا دھند ایک طوفانی مکا مدِمقابل کے سر پر رسید کیا۔ سینڈ بیگ کے ساتھ جنگی نے مجھے جو لگاتار مشقیں کرائی تھیں، انہوں نے میرے ہاتھوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ خاص طور سے ہاتھ کی ہڈیوں، کلائی اور کہنی کے جوڑ میں غیر معمولی سختی پیدا ہوچکی تھی۔ سلمان سلو نامی اس بدمعاش کے سر پر میں نے جو مکا رسید کیا، اس سے پہلی مرتبہ مجھے اپنے وار کی اصلی طاقت اور اثر کا اندازہ ہوا۔ اس وار نے جیسے مدِمقابل کی کھوپڑی کو چٹخا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر ایک اور زوردار ضرب اس کے سر پر لگائی۔ ایک دم اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ تیسری ضرب کے لیے میں نے ہاتھ اٹھائے لیکن ضرب لگائی نہیں۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ تیسری ضرب کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک خفیف جھرجھری کے ساتھ مدِمقابل کا جسم ساکت ہوگیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور آنکھیں بے جان ہوگئیں۔ چاقو ابھی تک اس کے ادھ کھلے ہاتھ میں تھا۔ میں نے چاقو اس کے ہاتھ سے علیحدہ کیا اور بند کرکے جیب میں ڈال لیا۔

مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ اگر سلمان یہ اچانک حملے والی حرکت نہ کرتا تو میں اسے زندہ چھوڑتا یا نہیں۔ بہرحال اپنی اس حرکت سے اس نے میری ایک بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ میں نے اپنے دفاع میں اس پر حملہ کیا تھا اور اس حملے میں لگنے والی چوٹ سے اس کی جان چلی گئی تھی۔

میں نے دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ احاطے میں مکمل خاموشی تھی۔ ایک چھپر تلے دو بلیاں گتھم گتھا تھیں اور چلا رہی تھیں۔ چھپر کے پاس ہی ایک چھوٹا کنواں نظر آرہا تھا۔ اس کے اوپر پانی نکالنے کے لیے لکڑی کی چرخی لگی ہوئی تھی۔ غالباً یہ کنواں خشک تھا۔ ایسے کنوئیں کو دیہات میں ”کھوئی“ کہا جاتا ہے۔ پنجاب میں تو جہاں زیرِ زمین پانی کی سطح بلند ہے، ایسی کھوئیاں عام نظر آتی ہیں۔

میں نے تیزی سے سوچا اور واپس اس کمرے میں پہنچا جہاں کچھ دیر پہلے سلمان قالین نما دری پر لیٹا تاڑی پی رہا تھا اور تندلالا... گنگنا رہا تھا۔ تاڑی کی نصف بوتل ابھی تک وہیں پڑی تھی۔ میں نے بوتل اٹھائی اور جا کر کنوئیں میں پھینک دی۔ بوتل کے گرنے سے اندازہ ہوا کہ کنواں واقعی خشک ہے۔ بوتل کے بعد میں نے سلمان کی لاش بھی کنوئیں میں دھکیل دی۔ یہ قدرے گونج دار آواز سے گری۔ میں تھوڑی دیر تک ایک تاریک گوشے میں رک کر ردِعمل کا انتظار کرتا رہا۔ حسبِ توقع ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے بھوسے والے کمرے میں جا کر چھوٹی ٹارچ روشن کی اور تین چار منٹ کے اندر وہ سارے آثار مٹا دیے جن سے یہاں کسی کی موجودگی کا شبہ ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد میں سیڑھیاں چڑھ کر کھیا کے مکان کی چھت پر آگیا۔

سلمان سلو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دائیں طرف کچھ چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ یہاں سرد ہوا سوئیوں کی طرح جسم میں چبھ رہی تھی اور یہ چبھن مجھے مزہ دے رہی تھی۔ گردن کے زخم سے اٹھنے والی ٹیسیں بھی اسی مزے دار کیفیت کا ایک حصہ تھیں۔ آہستہ آہستہ درد، دوا بنتا جارہا تھا اور یہ میرے اندر کی بڑی انقلاب آفریں کیفیت تھی۔

مجھے چھتیں پھلانگنے میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی۔ ایک منڈیر پر میں پھسلتے پھسلتے بچا، تاہم تین چار منٹ کے اندر میں زمیندار پردیپ کی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں اپنے اردگرد سے پوری طرح باخبر تھا۔ چار پانچ سیڑھیاں اتر کر میں اس دروازے کے سامنے پہنچ گیا جس کی نشان دہی کھیا کے بیٹے سلمان سلو نے کی تھی۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر مجھے چند مدھم آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کان دروازے سے لگا دیا۔ کوئی لڑکی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ پھر نیند میں ڈوبی ہوئی سی ایک اور نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”اچھا، میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔“

”مم... مجھے اکیلا نا ہیں چھوڑو دیدی۔“ وہ کراہتی ہوئی آواز نے کہا۔

”یہاں کوئی نا ہیں آسکتا۔ بالکل بے فکر رہو۔ میں بس دو منٹ میں آوت ہوں۔“ دوسری آواز ابھری۔

میں جلدی سے ایک تاریک گوشے میں سمٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد دروازے کی چٹخنی گری اور ایک سایہ نظر آیا۔ میں ایک لحظے میں پہچان گیا۔ یہ رام پرشاد کی بہو اور ستیش کی پتنی مالا تھی۔ وہ حسبِ سابق امیرانہ لباس میں تھی۔ کانوں میں طلائی جھمکوں کی چمک بھی نظر آئی۔ وہ اپنی گرم چادر سنبھالتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔ اندر سے ہولے ہولے کراہنے کی آواز بدستور آتی رہی۔ مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ کمرے میں اب ایک لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر داخل ہوگیا۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں دو پلنگ، لکڑی کی الماری اور جستی صندوق وغیرہ نظر آرہے تھے۔ ایک کونے میں ادھ بجھی انگیٹھی بھی سلگ رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ایک لڑکی بستر پر اوندھی پڑی ہے۔ اس کا بالائی جسم یکسر عریاں تھا۔ شاید انگیٹھی کی حرارت کے سبب وہ لحاف کی ضرورت محسوس نہیں کررہی تھی۔ اس کی سفید شفاف کمر پر چھڑیوں کے کئی نیلگوں نشان تھے۔ کہیں کہیں سے خون بھی رس آیا تھا۔ ان نشانات پر کوئی دوا لگائی گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی نے اپنا ایک ہاتھ کاندھے پر رکھا ہوا تھا اور کراہ رہی تھی۔

یقیناً میرے اندر داخل ہونے سے مدھم آہٹ پیدا ہوئی ہوگی مگر لڑکی چونکی نہیں اور نہ ہی اس نے بستر پر سیدھا ہونے کی کوشش کی۔ غالباً وہ یہی سمجھی تھی کہ رام پرشاد کی بہو مالا واپس آگئی ہے۔

میں نے قریب پہنچ کر اچانک لڑکی کا منہ اپنے ہاتھ سے دبوچا اور پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ وہ بری طرح بِکلی مگر میں نے اسے اپنے بوجھ تلے دبا لیا تھا۔ میری سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود آواز نہ نکال سکی۔ اس کا منہ میری ہتھیلی سے پوری طرح ڈھک چکا تھا۔ میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ”کلثوم! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے تاؤ افضل نے بھیجا ہے۔ میں یہاں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔“

اس نے ایک بار پھر تڑپ پھڑک دکھائی اور غوں غاں کی آوازیں نکالیں۔ میں نے پستول اس کی کنپٹی سے ہٹا لیا اور نرمی سے کہا۔ ”دیکھو... اگر شور کرو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔ میں پکڑا جاؤں گا اور تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔“

اس کا جسم قدرے ڈھیلا پڑ گیا۔ اب وہ چہرہ گھما کر مجھے دیکھنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کی اور کہا۔ ”اگر تم وعدہ کرو کہ شور نہیں مچاؤ گی تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا دیتا ہوں اور... تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں یہاں سے کیسے نکلنا ہے۔“

اسے پُرسکون کرنے کے لیے مجھے دو تین فقرے مزید بولنے پڑے۔ آخر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا سکتا ہوں۔

میں نے ہاتھ ہٹایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تیزی سے پلٹے گی اور میرا چہرہ دیکھے گی لیکن وہ اوندھی پڑی رہی۔ اس نے فقط اپنا چہرہ گھمانے پر اکتفا کیا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک ہراس اور بے یقینی کی کیفیت موجود تھی تاہم شکر کا مقام تھا کہ اس نے کوئی آواز نہیں نکالی۔

”کک... کون ہو تم؟“ وہ بری طرح ہکلائی۔

”فی الحال تم صرف اتنا جانو کہ میں تمہارا ہمدرد ہوں اور مجھے تاؤ افضل نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔ باقی ساری باتیں ہم یہاں سے نکلنے کے بعد کریں گے۔“

وہ یک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ اس نے خود کو سمٹا رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی بے لباسی کی وجہ سے سیدھی نہیں ہو رہی۔ میں نے اسے ایک گرم چادر دی تاکہ وہ اپنا جسم ڈھانپ لے۔ وہ چادر لپیٹ کر سیدھی بیٹھ گئی۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا اور سفید رنگ بالکل لٹھے کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کی عمر بمشکل اکیس بائیس سال رہی ہو گی۔ وہ اچھے نین نقش کی ایک غریب دیہاتن نظر آتی تھی۔ شاید نارمل حالات میں اسے خوب صورت بھی کہا جا سکتا ہو مگر فی الوقت دہشت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ میں نے پستول اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔

”تت... تاؤ... خود کہاں ہیں؟“

”اگر تم مجھ پر بھروسا کرو اور میرے کہنے کے مطابق چلو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے آدھ گھنٹے میں تم اپنے تاؤ اور تاؤ زاد بہنوں سے مل سکو گی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔

اس کے چہرے کا تناؤ ایک دم کم ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ بھروسے کی طرف آ رہی ہے۔

”لیکن... تم نکلو گے کیسے؟“ وہ منمنائی۔

”یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس یہ کرو کہ قمیص اور جوتی وغیرہ پہن لو۔“

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں آئیں۔ کلثوم کے چہرے پر ایک دم ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ”میرا خیال ہے... دیدی آ رہی ہے۔“ وہ بولی۔

میں نے آوازوں پر بغور کان لگائے۔ کوئی واقعی سیڑھیوں کے پاس موجود تھا۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ اب باہر نکلنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر مجھے چھپنا تھا تو کمرے کے اندر ہی چھپنا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ بہترین جگہ الماری کا عقبی خلا تھا۔ اب قدموں کی چاپ سیڑھیوں پر سنائی دے رہی تھی۔ میں کلثوم کو اس کے حال پر چھوڑ کر تیزی سے الماری کے پیچھے چلا گیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور مالا اندر آ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز ابھری۔ ”یہ دیکھو، سرسوں کے تیل میں لہسن کی پھلی جلا کر لائی ہوں۔ یہ بہترین دوا ہے کان کے درد کے لیے۔“

کلثوم اب بھی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ میں نے الماری کی اوٹ سے دیکھا۔ وہ اسی طرح اوندھی لیٹی تھی جیسے میرے آنے سے قبل تھی۔ مالا اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل یا تانبے کی چھوٹی سی پیالی اور چمچ تھا۔ اس نے چمچ کی مدد سے تھوڑا سا گرم تیل کلثوم کے کان میں انڈیلا اور پھر کان کو ہاتھ سے ہولے ہولے ہلانے لگی۔ کلثوم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

”دیکھنا، ابھی پانچ دس منٹ میں آرام آ جائے گا۔ یہ بڑا پرانا نسخہ ہے۔“ وہ غنودگی بھری آواز میں بولی۔

اس کے حلیے سے پتا چلتا تھا کہ کلثوم کی کراہیں وغیرہ سن کر وہ نیند سے بیدار ہوئی ہے۔

وہ دو چار منٹ کلثوم کے سرہانے بیٹھی رہی۔ پھر اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ اس نے اندر آتے ہی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ کلثوم بھی اسی طرح آنکھیں بند کیے اوندھی لیٹی رہی۔ لالٹین کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا رخسار ہلکا نیلا نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مار پیٹ کے دوران میں اسے زوردار تھپڑ مارا گیا ہے۔ غالباً اسی تھپڑ کے سبب اس کے کان میں ہوا بھر گئی تھی اور درد شروع ہو گیا تھا۔

کلثوم کی حالت دیکھ کر وہ تمام اندیشے درست ثابت ہو گئے تھے جو ہمارے ذہن میں موجود تھے۔ اسے یہ لوگ جسمانی تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے... پہلے وہ مہندر پٹیل اور کھیا وغیرہ کے پاس تھی۔ اب یہاں آ گئی تھی مگر یہاں بھی کون سے فرشتے تھے۔ ستیش، بھولا ناتھ اور ارون وغیرہ بے رحم انتہا پسند تھے۔ وہ کسی بھی وقت اس لڑکی کو بدترین حالات سے دوچار کر سکتے تھے۔ اکیلی مالا کہاں تک اس کے آگے ڈھال بن سکتی تھی۔ غالباً اس صورتِ حال کو کلثوم بھی سمجھ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اب تک مالا کو میری موجودگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں الماری کے عقب میں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ میری گردن کے زخم سے درد کی ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ بار وندا جنگلی کہتا تھا... درد اتنا نہیں ہوتا جتنا ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔ ہم درد کے ساتھ اپنی طرف سے بہت کچھ شامل کر لیتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ درد کے اصل حجم اور شدت کو سمجھنا چاہیے... اور وہ ٹھیک کہتا تھا۔

چند منٹ بعد مالا نے نیند بھری آواز میں کلثوم سے پوچھا۔ ”کچھ فرق پڑا؟“

”ہاں، کچھ پڑا ہے۔“ کلثوم نے اسی طرح لیٹے لیٹے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر بعد مالا اپنے پلنگ پر سو چکی تھی۔ اس کی بھاری سانسیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

میں اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور بغیر آواز پیدا کیے کلثوم تک پہنچ گیا۔ تب تک کلثوم قمیص پہن کر گرم چادر اپنے گرد لپیٹ چکی تھی۔ تاہم وہ ابھی تک پلنگ پر ہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ ایک بار پھر تذبذب میں نظر آئی مگر جب میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ڈری ہوئی نظروں سے مالا کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی۔ اس کی آمادگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں مالا کی موجودگی کے باوجود وہ باقی لوگوں سے سخت خوف زدہ ہے۔

سب سے مشکل مرحلہ یہ لگ رہا تھا کہ بغیر آواز پیدا کیے چٹخنی گرائی جا سکے اور دروازہ کھولا جا سکے۔ میں نے پستول پھر ہاتھ میں لے لیا۔ بہت احتیاط کے ساتھ میں نے چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھولا تو ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ مالا ذرا کسمسائی مگر بیدار نہیں ہوئی۔ میں کلثوم کو لے کر کمرے سے باہر آیا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

اگلا آدھ گھنٹا کافی سنسنی خیز تھا۔ اس آدھ گھنٹے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں نے احاطے میں اترنے کے بجائے چھتوں کے راستے واپس جانا مناسب سمجھا۔ دو چھتیں پار کرنے کے بعد وہی خطرناک منڈیر آ گئی جہاں سے میں پھسلتے پھسلتے بچا تھا مگر میں اس مرحلے کو طے کرنے کا لائحۂ عمل پہلے سے سوچ چکا تھا۔ یہاں پچھواڑے کی طرف گلی میں پرالی کا ایک بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ پہلے میں نے کلثوم کو چھلانگ لگانے پر آمادہ کیا۔ وہ تقریباً چھ فٹ نیچے پرالی پر بے آواز گری۔ میں نے بھی کلثوم کے پیچھے چھلانگ لگائی۔ کہیں قریب موجود دو پہرے داروں کو کچھ شبہ ہوا۔ وہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے پرالی کے ڈھیر کے پاس پہنچے۔ کچھ دیر ادھر ادھر چکراتے رہے اور ایک ٹارچ کو حرکت دیتے رہے پھر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد ہم پرالی کے ڈھیر سے نکلے اور دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے مندر کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

آدھ گھنٹے بعد میں کلثوم کے ساتھ مندر کے سب سے نچلے تہ خانے کی خوش گوار حرارت میں موجود تھا۔ عمران، اقبال، تاؤ افضل، سلطانہ سب ہمارے گرد جمع تھے۔ تمام چہرے حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں، میں نے جو کچھ کیا تھا... وہ میری توقع سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔ بے شک وہ سب کچھ جذباتی اور کسی حد تک غیر دانش مندانہ بھی تھا لیکن وہ جو کچھ بھی تھا، کامیابی سے ہو گیا تھا اور کامیابی ایک ایسی دلیل ہے جو ہر بڑی سے بڑی دلیل پر حاوی آ جاتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فتح اور کامرانی کو منطق درکار نہیں ہوتی۔

تاؤ افضل نے کلثوم کو اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا اور مسلسل اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔ تاؤ افضل کو بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہوتا رہا ہے۔ پہلے کھیا اور مہندر وغیرہ نے اس سے بری طرح مار پیٹ کی تھی۔ پھر اسے ستیش اور ارون وغیرہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں بھی

اس سے سخت رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ طیش میں آکر ستیش نے اسے زوردار تھپڑ بھی رسید کیا تھا جس سے اس کا کان اب تک سُن تھا اور اندر سے درد بھی کر رہا تھا۔

کلثوم نے تاؤ کو بتایا۔ ”یہ لوگ مجھ سے آپ کے بارے میں اور آپ کے مہمانوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ میں اس بارے میں جانتی ہوں کیونکہ میں نے کھیا کے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔“

”تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟“ تاؤ نے شفقت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اس کی گردن جھک گئی۔ وہ دکھ آمیز شرم کے ساتھ بولی۔ ”کھیا بہت برا بندہ ہے۔ مجھ کو اس سے ڈر لگتا تھا۔ وہ شراب پی کر مجھ کو لال لال آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ بے شرمی کی باتیں کرتا تھا۔“

عمران اور اقبال یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ میں کس طرح مندر سے نکلا اور کیسے کلثوم کو استھان والوں کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ میں نے انہیں تفصیل بتائی۔ بہرحال، اس تفصیل میں، میں نے سلمان سلو کی موت کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بات میں عمران کو اکیلے میں بتانا چاہتا تھا۔ عمران مجھے مصنوعی ناراضی سے گھورتا رہا۔ اس کے گھورنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے میری اس دیدہ دلیری پر خوش بھی ہے... اس نے کہا۔ ”کام تو تم نے دلیری کا کیا ہے اور بڑا فائیو اسٹار کیا ہے... لیکن تہ خانے سے نکلتے ہوئے تم شاید اپنی ”چپ“ کے بارے میں بھول گئے تھے۔“

”نہیں... یہ نحوست مجھے یاد تھی مگر میں زیادہ دیر باہر نہیں رہا ہوں۔“

”پھر بھی رسک تو رسک ہی ہوتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”تم نے کئی دفعہ تین گولیاں ریوالور میں رکھ کر اپنے اوپر ٹریگر دبایا ہے۔ اس سے تو کم رسک ہی تھا۔“

”اچھا، اکیلے میں تم سے بات کروں گا۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔

میری کارروائی کے حوالے سے سلطانہ کی حیرت سب سے زیادہ تھی۔ وہ ماضی میں مجھے ایسی حالت میں دیکھتی رہی تھی جب میں اپنا بوجھ بھی سہار نہیں سکتا تھا... لیکن اب میں بدترین حالات میں بڑی بے خوفی سے دوسروں کا سہارا بن رہا تھا۔

وہ میری قمیص پر گردن کے پاس خون کے داغ بھی دیکھ چکی تھی۔ ان نشانات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ میرا زخم پھر خون اگلنے لگا ہے۔ وہ بے چین تھی کہ میں اپنی بات چیت ختم کروں تو وہ مجھے کمرے میں لے جائے اور میرا زخم دیکھے۔

عمران نے بھی میرے زخم سے خون کا رساؤ دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے کمرے میں جانے اور قمیص بدلنے کا کہا... رات آخری پہر تک سلطانہ میری دیکھ بھال میں مصروف رہی۔ وہ اندر سے خوش بھی تھی۔ وہ مجھ سے اس سارے واقعے کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تفصیل پوچھ رہی تھی۔ آخر میں اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”تم نے بہت خطرناک کام کیا ہے مہروج! اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو پھر...؟“

”تو کیا تمہاری دعا میرے ساتھ نہیں تھی؟“

”وہ تو ساتھ ہی ہوتی ہے۔“

”کیا آئندہ بھی ساتھ رہے گی؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو مہروج؟“

”جب میں جارج گورا کو لاش کی شکل دینے کے لیے اس کی طرف جاؤں گا... اس وقت بھی تمہاری دعا میرے ساتھ ہوگی نا؟“

وہ سسک کر میرے کندھے سے لگ گئی۔ میں نے اس کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ میرے ہاتھ اس کے کشادہ شانوں پر متحرک تھے۔ یہ شانے... یہ شانے میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ میں انہیں جانتا تھا۔ بہت اچھی طرح، بہت قریب سے... اور ان شانوں کو ہی نہیں، شاید اس پورے جسم کو جانتا تھا۔ ہاں، یہ ایک بے پناہ جسم تھا۔ یہ اپنی ساری رعنائی اور پُرجوش محبت کے ساتھ میرے بہت قریب رہا تھا۔ مجھے اس جسم کے تمام ترلمس یاد آ رہے تھے۔ یہ کسی گمشدہ خزانے کی طرح تھا۔ مجھے لگا کہ اس جسم کے لیے، ان شناسا شانوں کے لیے، اس نہایت لچکیلی اور پتلی کمر کے لیے اور ان گھنے بالوں کے لیے میرے اندر ایک بہت بڑا خلا موجود ہے... مجھے یہ سب درکار تھا۔ پوری شدت اور چاہت سے درکار تھا۔ مجھے لگا کہ میں سلطانہ سے محبت کرنے لگا ہوں... کیا یہ محبت اب شروع ہوئی تھی یا پھر بہت پہلے سے شروع تھی جب وہ اس جسم کے ساتھ میری خلوتوں کی ساتھی بنی تھی؟

میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر اس کا شفاف رخسار چوما تو... پھر وہی ہوا جو اس سے پہلے ہوتا رہا تھا۔ کوئی شے جیسے ایک چھناکے سے سلطانہ کے اندر بجھ گئی۔ اس کے جسم میں لرزش نمودار ہوئی اور وہ اپنا آپ سمیٹنے لگی۔ اس کے بازو میرے ہاتھوں کی گرفت سے نکل گئے جیسے سوکھی ریت مٹھی سے نکل جاتی ہے۔ اس کا سر جھکتا چلا گیا۔

میں ایک دم اکیلا ہو گیا۔ میرے قریب ہونے کے باوجود وہ قریب نہ رہی۔ پھر وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ میرے قریب آتے آتے دور چلی جاتی تھی۔ پتا نہیں، یہ کیسی دیوار تھی جو ہم دونوں کے درمیان حائل ہو جاتی تھی۔

کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگ گئی۔ جاگا تو سلطانہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ اسے اپنے اردگرد نہ پا کر مجھے شاک سا محسوس ہوتا تھا۔ یہ خوف برق کی طرح ذہن میں لہرا جاتا تھا کہ کہیں وہ پھر تو کسی طرف رخ نہیں کر گئی۔

”سلطانہ... سلطانہ۔“ میں اسے پکارتا ہوا اندرونی کمرے کی طرف گیا... وہ نانک چندی اینٹوں کے بنے ہوئے قدیم غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں۔ لگتا تھا کہ آج وہ پھر اس کیفیت سے دوچار ہوئی ہے جس سے نل پانی میں ہوتی رہی تھی۔ وہ پہروں تک نہاتی تھی اور پتھر سے اپنے جسم کو رگڑ رگڑ کر سرخ کر لیتی تھی۔ میں نے دیکھا، آج بھی اس کی کلائیاں، ہاتھ اور گردن وغیرہ پتھر کی رگڑ سے سرخ دکھائی دے رہے تھے... میرا دل رو دیا۔ اس کا ذہنی صدمہ اس کے اندر بہت گہرائی تک اتر گیا تھا۔ وہ کسی طور اس سے چھٹکارا نہیں پا رہی تھی۔ کوشش کرتی تھی مگر ناکام ہو جاتی تھی۔ دو تین دن پہلے مجھے لگا تھا کہ وہ خود کو بدل رہی ہے مگر اب پھر صورتِ حال جوں کی توں تھی۔

میرے دل نے گواہی دی کہ سلطانہ کو اس کی نارمل زندگی کی طرف واپس لانا آسان نہیں ہے۔ میرے اندر سے طیش کی ایک لہر اٹھی۔ یہ لہر اس شخص کے لیے تھی جو کسی مجبور عورت کو اپنے مردانہ اختیار تلے روندتا ہے۔ تھوڑی دیر کی عشرت کے لیے اس کی زندگی پر ایک نہ مٹنے والا داغ لگا دیتا ہے... اور وہ عشرت بھی کیا عشرت ہوتی ہے۔ وہ کھوکھلی خوشی اکثر مہیب پچھتاووں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ میرے اندر جارج گورا کے لیے بھڑکنے والی آگ کچھ اور بھی شعلہ فشاں ہو گئی۔

اگلے روز میں نے عمران کو اس سنگین ترین واقعے کے بارے میں بتا دیا جو کھیا عبدالرشید کے مکان میں پیش آیا تھا۔ کھیا کا بیٹا سلمان سلو اتفاقیہ مجھ سے ملا تھا اور پھر جہنم واصل ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش احاطے کے خشک کنوئیں میں پھینک دی تھی۔

ہم سارا دن اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ اصل حالات کا علم تو آفتاب خاں کی آمد کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ امکان یہی تھا کہ اس موت نے فتح پور میں زبردست ہلچل مچائی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس واقعے کو کوئی خاص رنگ دیا جا رہا ہو۔ آفتاب خاں کی آمد رات بارہ بجے سے کچھ پہلے ہی ہو گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ آج بھی اس کے پاس ہمارے لیے اہم خبریں موجود ہیں۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ فتح پور میں زبردست ہلچل تو ہے مگر یہ ہلچل سلمان سلو کی موت کی وجہ سے نہیں، لڑکی کلثوم کی وجہ سے ہے۔ آفتاب خاں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”خو، سلو کی موت کو سب نے اتفاقیہ ہی سمجھا ہے جی۔ سب کا خیال ہے کہ وہ تاڑی کے زوردار نشے میں تھا۔ باہر نکلا اور کنوئیں میں گر گیا۔ اس کا بوتل بھی کنوئیں سے ہی ملا ہے۔“

پھر آفتاب میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ کیا کہتا ہے تابش بھائی! یہ اتفاقیہ تھا یا پھر...؟“

”تمہارے سوال کا جواب وہی ہے جو تمہارے ذہن میں بھی ہے۔“ عمران نے معنی خیز انداز میں کہا۔

آفتاب خاں نے تفہیم میں سر ہلایا اور کچھ مزید پُرجوش نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”عمران بھائی! آپ سب کے لیے ایک اچھا اطلاع ہے۔ کلثوم بی بی کے غائب ہو جانے کی وجہ سے استھان والا آپس میں جھگڑا ملگڑا کر رہا ہے۔ مرنے مارنے پر آ گیا ہے۔ بڑا زوردار تماشا لگا ہوا ہے۔“

”کیسا تماشا؟“ عمران نے پوچھا۔

”مہندر اور کھیا وغیرہ نے رام پرشاد پر الزام لگایا ہے کہ اس کی بہو مالا نے لڑکی کو جان بوجھ کر بھگا دیا ہے۔ اس طرح اس نے دھرم کو بری طرح نشٹ کیا ہے۔ وہ اس کو سزا دینے کا بات کر رہا ہے۔“

یہ دلچسپ صورتِ حال تھی۔ عمران نے کہا۔ ”ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“

آفتاب بولا۔ ”ام نے اندازہ لگایا ہے جی کہ یہ سب جنونی لوگ ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کی آنکھوں سے شعلہ نکلنے لگتا ہے۔ پرسوں رام پرشاد کا بہو مالا اور بیٹا ستیش اس لڑکی کلثوم کو کھیا کے پاس سے لے آیا تھا۔ دراصل یہ سب مالا کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کو پتا چل گیا تھا کہ یہ لڑکی کھیا اور مہندر وغیرہ کے پاس رہا تو اس کا عزت خراب ہو جائے گا۔ کھیا اور مہندر نے سب کے کہنے پر کلثوم کو بھیج تو دیا تھا، پر ان کو یہ سب بہت برا لگا تھا۔ گرو کی موت کی وجہ سے بھی ان لوگوں میں تھوڑا بہت چپقلش موجود تھا۔ کل سویرے جب یہ پتا چلا کہ کلثوم زمیندار پردیپ کمار کے گھر سے غائب ہے تو

مہندر اور ان کا ساتھی لوگ ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ انہوں نے رائفلیں اور تلواریں تان لیا اور کوئی ایک سو بندہ پردیپ کمار کے گھر کے سامنے جمع ہو گیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ رام پرشاد کی بہو نالا مجرم ہے۔ اس نے لڑکی کو بھگا دیا ہے، حالانکہ وہ لڑکی اپنے تاؤ اور سلطانہ وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا تھا۔"

"رام پرشاد کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنی بہو کو بالکل بے گناہ بتا رہا ہے۔ سنتش بھی یہی کہتا ہے۔ وہ بولتا ہے کہ اس کی بیوی کو کچھ پتا نہیں۔ وہ کلثوم کے ساتھ اوپر والے کمرے میں سو رہی تھی۔ گھر کے اندر اور باہر پہرے دار تھے۔ گھر کی نگرانی ان پہرے داروں کا ذمے داری تھا، میری بیوی کا نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کسی نے سلو کے مرنے اور کلثوم کے غائب ہونے والے معاملے کو آپس میں جوڑا تو نہیں؟"

"ابھی تک تو ایسا کچھ نہیں ہوا جی۔ کسی کا دھیان بھی اس طرف نہیں گیا اور ہمارا خیال ہے کہ جائے گا بھی نہیں۔"

"اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟" اقبال بولا۔

"کون سا اونٹ جی؟" آفتاب خاں نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اب صورت حال کس طرف جاتی نظر آتی ہے؟"

"ام ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا جی... معاملہ گڑبڑ ہے۔ دونوں طرف سے بہت سخت باتیں ہو رہا ہے... ام نے سنا ہے کہ کل کچھ اور لوگ بھی یہاں پہنچ رہا ہے۔ کھیا کی حویلی پر کوئی بہت بڑا پنچایت ہوگا۔ اگر اس پنچایت میں فیصلہ نہ ہو سکا تو پھر جھگڑا اور بڑھ سکتا ہے۔ اب بھی دو چار لوگ ایسا ہے جو غصے میں جھگڑا اجڑ جانے والا باتیں کر رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ام نے ابھی شام کو سنا ہے۔ مہندر کا ایک ساتھی چوپال میں کہہ رہا تھا کہ اگر رام پرشاد کو یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ مہندر صاحب کے پاس اس لڑکی کا عزت محفوظ نہیں تھا تو ام بھی رام پرشاد اور اس کے بیٹے پر اس طرح کا شک کر سکتا ہے۔ کیا پتا وہاں زمیندار کے گھر میں اس لڑکی کا عزت لوٹا گیا ہو اور اسے مار کر کہیں گاڑ دیا گیا ہو۔ بس جی اس طرح کا بہت سا باتیں گاؤں میں چکر لگا رہا ہے۔"

یہ بالکل نئی صورت حال سامنے آئی تھی۔ دنیا بھر کے انتہا پسندوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ روز بروز محدود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے بے لچک رویوں کی وجہ سے وہ گروہ در گروہ تقسیم ہوتے ہیں۔ ان میں فرسٹریشن بڑھتی ہے اور وہ زیادہ سفاک اور بداخلاق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لگتا تھا کہ یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔

اگلے چوبیس گھنٹے عجیب کشمکش و بے چینی میں گزرے۔ ہمیں دیکھنا تھا کہ باہر کے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ گرو کے بے رحمانہ قتل کے بعد تو ان لوگوں کی سفاکی میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ آفتاب خاں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اردگرد سے اور بہت سے لوگ بھی یہاں ننج پور میں جمع ہو رہے ہیں... وہ ہر صورت اپرا جن یعنی سلطانہ کو اس کے انجام تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس علاقے میں جاہلیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا... اور اب یہ جادو دھیرے دھیرے اس بچھیرا بستی کو اپنے پنجوں میں جکڑ رہا تھا۔

میں سلطانہ کی طرف سے بھی بہت پریشان تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک حصہ میری طرف آنا چاہتا ہے اور اپنے شیر خوار بچے کی طرف۔ دوسرا حصہ اسے ہم دونوں سے دور لے جا رہا ہے۔ اس حصے کو زرگاں کشش کر رہا ہے۔ زرگاں جہاں اس کی عزت کا قاتل جارج گورا اپنی پوری نحوست اور نجاست کے ساتھ موجود ہے۔ ہر طرح کی من مانیاں کرتا ہوا اور اپنی من پسند لڑکیوں میں گھرا ہوا۔ جنہیں وہ اور حکم چا نہیں کس ناتے سے پریاں قرار دیتے تھے۔

اب پچھلے تقریباً چھتیس گھنٹے سے سلطانہ بالکل گم صم تھی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ وہ ٹھیک سے کچھ کھا بھی نہیں رہی تھی۔ رات کو میری ناراضی کے ڈر سے اس نے چند لقمے لیے اور کلثوم کے ساتھ تھوڑی بہت باتیں کیں۔ رات کو ہم اپنے اپنے بستر پر خاموش لیٹے رہے۔ ہم دونوں جاگ رہے تھے مگر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ زمین کی اس گہرائی میں باہر کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اندھیری رات ہے یا چاندنی۔ بارش ہو رہی ہے یا کڑاکے کی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ باہر کی دنیا سے ہمارے رابطے کا واحد ذریعہ آفتاب تھا اور اسے آج پتا نہیں آنا تھا یا نہیں۔

میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ "مہروج!" اچانک سلطانہ کی مدھم آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسی طرح اپنے بستر پر چت لیٹی تھی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مہروج!" وہ پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔

"ہاں ہاں... کہو۔"

"مہروج! میں تمہیں بہت دکھ دے رہی ہوں نا؟ تمہیں رات دن پریشان کر رہی ہوں۔"

"میں صرف اس وجہ سے دکھی ہوں کہ تم دکھی ہو۔ تم خود کو سنبھال نہیں پا رہی ہو۔"

"مہروج! کیا تم مجھے ماف نا ہیں کر سکتے؟"

"کیا مطلب؟"

"مہروج! تم مجھ کو بھول جاؤ۔ سمجھو... کہ... میں نل پانی سے جانے کے بعد دوبارہ تمہیں ملی ہی نا ہیں تھی۔"

"اگر تم نے اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو بہتر ہے کہ سو جاؤ۔"

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "مہروج! میں جانتی ہوں کہ تم کسی سے پیار کرتے تھے، بہت جیادہ پیار کرتے تھے۔ وہ تم سے دور چلی گئی اور میں تم دونوں کے بیچ میں آ گئی۔ شاید یہ اسی کی سجا ہے جو مجھے ملی ہے۔"

"یہ تم کیا باتیں لے بیٹھی ہو؟" میں جھلا گیا۔

"مہروج! جن دنوں تم اپنے ہوش میں نا ہیں تھے، تم راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کا نام پکارتے تھے۔ تم آج بھی اس کو پریم کرتے ہو مہروج! اور شاید وہ بھی کہیں پر بیٹھی تمہاری راہ دیکھتی ہو گی۔ کیا ایسا نا ہیں ہو سکتا مہروج کہ وہ پھر تم کو مل جائے۔ تم اس راجواڑے سے نکلنے کے بعد اسے ڈھونڈو۔ مہروج! مجھے یقین (یقین) ہے کہ وہ جرور تمہیں ملے گی، جرور ملے گی۔ وہ تمہاری جندگی کی ہر کمی کو پورا کر دے گی۔ تم میرے بالو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا مہروج! بالو کو اس کی گود میں ڈال دینا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری طرح وہ بھی بہت اچھی ہو گی۔ وہ میرے بچے کو اپنے بچوں کی طرح پیار دے گی۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو مہروج؟"

میرا دماغ ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ سلطانہ کو اس کے شانوں سے پکڑوں اور بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دوں۔ پھر دھکا دے کر دور گرا دوں یا پھر یہاں سے اٹھوں اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جاؤں... کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

وہ اپنے جذباتی دھارے میں بہتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک اٹھ کر اس نے اپنا سر میرے پاؤں میں رکھ دیا اور سسک کر بولی۔ "مہروج! مجھے تم سے کوئی گلہ نا ہیں ہو سکے گا۔ تم تو مجھ پر بہت بڑا احسان کرو گے۔ میری جندگی کا کوئی پتا نا ہیں لیکن جب تک جندہ رہوں گی تم کو یاد رکھوں گی۔ تمہارے لیے دعائیں کرتی رہوں گی۔ یہ سوچ کر مجھے خوشی ملے گی کہ تم جہاں کہیں ہو آباد ہو اور اس کے ساتھ ساتھ میرا بچہ بھی آباد ہے۔ میری خاطر مہروج! میری خاطر... میری یہ بات مان لو۔ سمجھو کہ میں تم سے جندگی میں پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہی ہوں۔"

میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے پاؤں ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے چھڑائے اور چارپائی سے اتر کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی سسکتی رہی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکایا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کی موٹی چوٹی نے بستر پر کنڈلی مار رکھی تھی۔

میں نے اس کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔ "سلطانہ! بدقسمتی سے جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، وہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر تمہارا کوئی بس نہیں تھا مگر اب تم جو کچھ کر رہی ہو، یہ اس سے کہیں زیادہ برا ہے۔ جو دکھ تم اب دے رہی ہو، یہ بالکل ہی برداشت سے باہر ہے۔ تم مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دو گی۔ ساری امنگیں ترنگیں جو مجھ میں پیدا ہوئی تھیں، میرے اندر ہی مر جائیں گی۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ شاید ماں سے پہلے باپ کا سایہ بالو کے سر پر سے اٹھے گا۔"

"خدا کے لیے مہروج! ایسی بات مت کرو۔" اس نے بے تاب ہو کر میرا بازو تھام لیا۔

میں نے بازو چھڑایا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ نل پانی کی نیلی جھیل ہو۔ یخ بستہ ہوائیں بدن کو چیر رہی ہوں۔ میں جھیل کے کنارے بھاگتا چلا جاؤں، بھاگتا چلا جاؤں یہاں تک کہ بے دم ہو کر گر پڑوں۔ لیکن جھیل تھی نہ کنارہ، نہ یخ بستہ ہوائیں۔ میں اپنے ساتھیوں سمیت اس تین منزلہ تہ خانے کا اسیر تھا۔ میں اس قبر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

میں بالائی تہ خانے میں آ گیا اور بے قراری سے ایک برآمدہ نما مستطیل کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر مدھم آہٹیں ابھریں۔ یقیناً آفتاب خاں آیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ اپنی لاٹھی اور لالٹین سمیت میرے سامنے تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بولا۔ "بہت خاص خبریں ہیں تابش بھائی۔ عمران بھائی کدھر ہے؟"

میں آفتاب کو لے کر سیڑھیاں اترا اور زیریں تہ خانے میں آ گیا۔ عمران اور اقبال میری ایک آواز پر ہی کمرے سے نکل آئے۔ یقیناً وہ بھی آفتاب کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ آفتاب نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "امارا تو مت مارا گیا ہے جی۔ ام نے سنا تھا کہ کچھ لوگ اپنے دین دھرم

کے لیے بالکل جنونی ہو جاتا ہے۔ یہ ادھر استھان والا لوگ بھی ایک دیوانہ پن دکھا رہا ہے۔ آج سارا دن گاؤں میں خوب تماشا لگا ہے۔"

پھر آفتاب نے اپنی گول ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھی اور تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔ "جھگڑا بہت لمبا ہو گیا ہے جی۔ آج سارا دن چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ فتح پور میں آتا رہا ہے۔ اب یہاں ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب لوگ جمع ہو چکا ہے۔ آج دوپہر مکھیا کے مکان پر بہت بڑا پنچایت ہوا ہے۔ اس پنچایت میں مہندر اور اس کے ساتھیوں نے یہ الزام دہرایا ہے کہ رام پرشاد کی بہو نے لڑکی کلثوم کو بھگایا ہے اور ایک ایسا اپرادھ کیا ہے جس کا سخت سے سخت سزا ملنا چاہیے۔ دوسری طرف رام پرشاد اور اس کے بیٹے ستیش نے اس الزام کو ماننے سے صاف انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لڑکی موقع دیکھ کر خود فرار ہوا ہے۔۔۔ ان کا صفائی ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں ہے۔ خود مہندر اور اس کے سیکڑوں ساتھیوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اگر ستیش کی پتنی مالا سچا ہے تو پھر وہ پرکھشا دے۔"

"پرکھشا سے کیا مطلب؟" اقبال نے پوچھا۔

"وہ اس کا آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی بہت پرانی رسم کا بات کر رہا ہے۔ اس میں ستیش کی پتنی کو بہت نقصان پہنچنے کا ڈر ہے۔"

"کیسا نقصان؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ لوگ کہتا ہے کہ اگر ستیش کا بیوی یعنی رام پرشاد کا بہو سچا ہے تو وہ مندر میں جا کر اپنا سچ ثابت کرے۔ وہ ابلتے ہوئے تیل کی کڑاہی کا بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ستیش کی پتنی سچا ہے تو تیل میں اپنا ہاتھ ڈال کر ثابت کرے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے کہا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ "یہ میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔ دراصل ہندوؤں کی دیومالا میں یہ واقعہ موجود ہے۔ جب رانی سیتا جی پر بہتان لگا تھا تو اس نے تیل کی ابلتی ہوئی کڑاہی میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دیا تھا۔ بھگوان کی کرپا سے اس کے ہاتھ جلنے سے بچ گئے تھے۔ کچھ خبطی لوگ اس بات کو اب تک لے کر چل رہے ہیں۔ جب کسی بڑے جرم میں کسی کو اپنی صفائی پیش کرنی ہوتی ہے تو اس کو اس آزمائش سے گزرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔"

"یہ تو بڑی جاہلیت کی بات ہے۔" عمران نے کہا۔ "مکر و فریب کے اس دور میں ایسی آزمائش کا مطلب بھی مکر و فریب ہی ہے۔"

"لیکن جناب! اپنا لوگ سچ کہتا ہے کہ بندہ جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔" آفتاب خان نے مونچھیں سہلا کر کہا۔ "اب بات یہ ہے کہ ستیش کا دادی وہ کھوسٹ بڑھیا بھی ایک دو موقع پر ایسے ہی دوسرے لوگوں کو یہ آزمائش دینے پر مجبور کر چکا ہے۔ اب اس کا مخالف لوگ یہی بات پکڑ رہا ہے۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تب ایسا آزمائش کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا تو اب کیوں نہیں۔ اس بڑھیا کی وجہ سے اب اس کا بیٹا رام پرشاد اور اس کا پچھلی (فیملی) پھنس گیا ہے۔ یا تو اب رام پرشاد کی بہو کو یہ آزمائش دینا پڑے گا یا اس کو مجرم ٹھہرا دیا جائے گا۔"

یہ واقعی دلچسپ اور سنگین صورتِ حال تھی۔ ان لوگوں کا بے پناہ کٹرپن اور ان کے اندر کی سفاکی تو اب ثابت ہو ہی چکی تھی۔ یہ لوگ جس طرح سلطانہ کو زندہ جلانے پر تل گئے تھے اور پھر جس طرح انہوں نے اپنے ہی "محترم گرو" کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس کا کٹا ہوا سر دیوی کے چرنوں میں رکھا تھا، اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ اپنے عقیدے کی پیروی میں ہر حد تک جا سکتے ہیں۔

عمران نے پوچھا۔ "اب پنچایت کس نتیجے پر ختم ہوئی ہے؟"

آفتاب بولا۔ "خو، پورا نتیجہ تو اب تک کوئی نہیں نکلا ہے جی۔ جب شور بہت بڑھ گیا اور پنچوں نے فیصلہ دیا کہ ستیش کی پتنی کو آزمائش دینا پڑے گی تو ستیش ایک دم طیش میں آ گیا۔ اس نے کہا کہ میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ اگر تم نے ہاتھ جلانے ہی ہیں تو پھر میں اپنے ہاتھ جلاؤں گا۔ بڑے پنچ نے کہا کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر تم کو وشواس ہے کہ تمہارا پتنی سچا ہے تو پھر تم اس کے نام پر آزمائش دے سکتا ہے۔ اگر تمہارا پتنی سچا ہے تو بھگوان تمہارا رکھشا کرے گا۔"

"ستیش کی پتنی کیا کہتی ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"وہ تو مسلسل رو رہا ہے جی۔ ایک ہی بات کہہ رہا ہے کہ اگر وہ دوشی ہوتا تو فوراً اپنا دوش مان لیتا۔ اس نے یہ سب نہیں کیا ہے۔ کلثوم خود وہاں سے نکلا ہے۔ کس طرح نکلا ہے، اسے کچھ پتا نہیں۔"

اندازہ ہو رہا تھا کہ مہندر اور گرو کے چیلوں نے گرو کا قتل ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا ہے۔ اب انہیں رام پرشاد کی بہو کے خلاف اپنا اندرونی غصہ نکالنے کا موقع مل رہا ہے اور وہ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

آفتاب خان باہر کی خبریں دے کر چلا گیا۔ ہم پھر انتظار کی سولی پر لٹک گئے۔ تہ خانوں کے اندر فضا بہت بوجھل اور یاسیت سے بھری ہوئی تھی۔ میرے اور سلطانہ کے

درمیان بول چال تقریباً ختم تھی۔ ایک ہی کمرے میں ہوتے ہوئے ہم جیسے ایک دوسرے سے طویل فاصلے پر تھے۔ یہ فاصلہ اس رات کی سیاہی سے بھرا ہوا تھا جب بے بسی کی انتہا کو چھو کر سلطانہ نے مجھے جارج گورا کے کمرے سے نکالا تھا اور خود کو اس فاتح کے حوالے کرنے کے لیے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھالی تھی۔

گرو کی پتنی رادھا ہر وقت پرارتھنا کرتی رہتی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے پتی کے سفاکانہ قتل سے بے خبر تھی۔ وہ اس کی طرف سے پریشان رہتی تھی اور اس سے بڑھ کر پریشانی اسے اس بات کی تھی کہ کہیں اس کے گرو جی کو پہنچنے والے کسی نقصان کی وجہ سے بھگوان اس سے ناراض نہ ہو جائیں۔ آفتاب جب بھی آتا تھا، وہ اس سے گرو کے بارے میں پوچھتی تھی۔ آفتاب خان اسے گول مول جواب دے کر مطمئن کر دیتا تھا۔

اگلے روز کی ساری خبریں چونکا دینے والی تھیں۔ سب سے پہلے تو یہی بات چونکانے والی تھی کہ آفتاب خان آدھی رات کو آنے کے بجائے شام کو ہی آ گیا تھا۔ دن کے وقت اسے مندر میں آنے کے لیے خصوصی احتیاط کرنا پڑتی تھی۔

اس نے اطلاع دی کہ باہر ڈرامائی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ رام پرشاد نے کہا ہے کہ اسے اپنے بیٹے ستیش اور بہو مالا پر پورا اعتماد ہے۔ وہ جو کہہ رہے ہیں، سچ کہہ رہے ہیں اور سانچ کو آنچ نہیں۔ لہٰذا اپنے بیٹے ستیش کی جگہ وہ خود پرکھشا دے گا۔ پنچوں نے پنڈت بھگوان داس سے مشورہ کرنے کے بعد اس کی یہ پیشکش قبول کر لی ہے۔ اب فیصلہ ہوا ہے کہ کل شام کے بعد پہلے پہر کی دوسری گھڑی میں اسی مندر کے اندر خاص خاص پجاریوں اور پنڈتوں کے روبرو رام پرشاد از خود اپنی بہو اور بیٹے کی سچائی کے لیے آزمائش دے گا۔

"یہ سب تو پرانے زمانے کی کہانیوں جیسا لگ رہا ہے۔" اقبال نے کہا۔

ہوشیار سنگھ بولا۔ "لیکن یہاں انڈیا میں کچھ لوگ اب بھی پرانے زمانے کی طرح ہی رہ رہے ہیں۔ کئی علاقے تو ایسے ہیں جہاں اب تک بڑی باقاعدگی سے دیوی دیوتاؤں کو زندہ بچے بچیوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ اس بلیدان کو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق کئی نام دیے جاتے ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں سنا تھا کہ راجستھان میں ایک ایسی ہی خونی رسم کو اپارشا کہا جاتا ہے۔"

آفتاب بولا۔ "رام پرشاد بہت کٹر قسم کا بندہ ہے۔ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر ضرور عمل کرے گا۔ اس کو پورا یقین ہے کہ اس کا بہو اور بیٹا سچا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر بھگوان ضرور بہ ضرور اس کا مدد کرے گا۔ اس نے آج شام سے آٹھ پہر کا بھرت رکھ لیا ہے اور پوجا پاٹ میں مصروف ہو گیا ہے۔ اس نے کسی خاص پنڈت سے اپنے ماتھے پر قشقہ لگوایا ہے اور کسی تیرتھ سے آنے والا سفید لباس پہنا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کڑاہے میں ڈالنے کے لیے ایک دم تیار ہے۔"

"وہ بڑھیا کیا کہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ پہلے تو چپ رہا ہے لیکن اب اس نے رام پرشاد کو ہلاشیری دینا شروع کر دیا ہے۔ رام پرشاد کی طرح بڑھیا نے بھی بھرت رکھا ہے۔ اس نے رام پرشاد کو نیلے پتھروں والا

ایک ماں اپنے بچے کے ٹیچر کے پاس گئی اور اس سے کہا۔ "پلیز، مجھے وہ تینوں ڈکشنری دے دیجیے۔"

"کون سی ڈکشنریاں؟" ٹیچر نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی جو میرے بیٹے نے پچھلے ہفتے میں لی تھیں۔ جب اس نے مجھے بتایا تھا، تبھی میں نے اس سے کہا تھا کہ ڈکشنریاں ہمیشہ گھر لایا کرو لیکن کم بخت بہت نافرمان ہے۔"

❖ ❖ ❖

یکسانیت

باؤلر کی ماں اسٹینڈ میں بیٹھی اپنے بیٹے کو باؤلنگ کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اچانک اس کے برابر بیٹھے ہوئے تماشائی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "باؤلر اچھا ہے لیکن اس کی لینتھ برقرار نہیں رہتی۔"

"کیسی ناقابلِ یقین بات کر رہے ہو۔" ماں نے اس تماشائی کو ڈانٹا۔ "وہ گزشتہ تیس سال سے ساڑھے پانچ فٹ کا ہے اور اتنا ہی رہے گا۔"

ایک مالا پہنایا ہے اور اسے وشواس دلایا ہے کہ وہ اپنی آزمائش میں ضرور کامیاب ہوگا۔''

نیلے پتھروں والی مالا سے یاد آیا کہ مجھے بھی رام پرشاد کے گھر میں اس کی بوڑھی ماتا نے ایسی ہی مالا پہنائی تھی۔ یہ بوڑھی عورت کہنہ رسموں رواجوں کی ایسی گٹھڑیوں میں سے تھی جن کی گرہیں کھولنا بڑے بڑے دانشوروں اور نفسیات دانوں کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ گٹھڑیاں اپنی بوسیدگی سمیت جل جاتی ہیں، مٹی میں دفن ہو جاتی ہیں لیکن کھلتی نہیں ہیں۔ اب رام پرشاد اور اس بڑھیا کا اندھا عقیدہ انہیں ایک خاص صورتِ حال کی طرف لے جا رہا تھا۔

آفتاب خاں بولا۔ ''ام بھی وہیں پنچایت والی جگہ پر موجود تھا جی۔ رام پرشاد بڑے غصے میں بول رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، ایشور کے بنائے ہوئے اصول کسی ایک زمانے کے لیے نہیں ہوتے۔ ہر زمانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اگر سچ کی پرکھشا دینے والے لوگ پرانے زمانے میں جلتے تیل سے بچ سکتے تھے تو آج بھی بچ سکتے ہیں۔ بات صرف پکے وشواس کی ہے اور من کی شکتی کی ہے... اور وہ یہ سب سچ کر کے دکھا دے گا۔ اس موقع پر رام پرشاد کا بیٹا ستیش پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ یہ سراسر ظلم ہے۔ یہ مہندر اور اس کا ساتھی لوگ ام سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ رام پرشاد بیٹے پر بھی بگڑ گیا۔ اس نے اسے بری طرح جھڑکا اور کہا کہ بس یہی فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ تم آزمائش دینے سے پہلے ہی ہارے ہوئے ہو۔ اس لیے کہ تم ایشور کے چمتکاروں (معجزوں) پر پورا وشواس نہیں رکھتے اور یہ سارا کھیل ہی وشواس کا ہے۔ بڑھیا نے بھی بیٹے رام پرشاد کا حمایت ہی کیا اور پوتے کو یقین دلایا اور کہا کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ رام پرشاد کے ہاتھ جلنے سے بچ جائیں گے۔''

''کچھ نہ کچھ سے بڑھیا کا کیا مطلب ہے؟'' عمران نے سوال کیا۔

''جہاں تک اماری عقل میں آیا ہے جی... بڑھیا کا خیال ہے کہ اگر رام پرشاد اور وہ خود اپنے ارادے پر قائم رہے تو آزمائش سے پہلے ہی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آزمائش ٹل جائے اور اگر نہ بھی ٹلا اور رام پرشاد کو اپنے ہاتھ تیل میں ڈالنا ہی پڑا تو دیوی مدد کرے گا۔ رام پرشاد کا ہاتھ کسی خاص نقصان سے بچا رہے گا۔ پنچایت کے بعد بڑھیا نے ایک دو ایسا مثالیں بھی دیا جن میں کسی سچے شخص نے پورے وشواس کے ساتھ اپنا دونوں ہاتھ ابلتے تیل میں ڈالا اور ہاتھوں پر بس معمولی سا نشان ہی پڑ سکا اور یہ چھوٹا موٹا نشان بھی چند دن تک گنگا جل لگانے سے ٹھیک ہو گیا۔''

یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ یہ بات تو ہرگز یقین کرنے والی نہیں تھی کہ رام پرشاد ابلتے ہوئے تیل میں ہاتھ ڈالے گا اور ہاتھ جل بھن کر کباب ہونے سے بچ جائیں گے۔ ہاں، اس میں کوئی شعبدہ بازی ضرور ہو سکتی تھی۔ کوئی کیمیکل یا کوئی ایسی شے ہاتھوں اور بازوؤں پر لگائی جا سکتی تھی جو چند سیکنڈ کے لیے ہاتھوں کو تیل کی بے پناہ حدت سے بچا لیتی۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا مخالف ٹولہ اس قسم کی شعبدہ بازی چلنے دے گا؟ وہ کوئی سیدھے سادے دیہاتی نہیں تھے، رام پرشاد اور ستیش کے ساتھی ہی تھے اور استھان کے سارے اچھے برے بھیدوں سے آگاہ تھے۔

آفتاب خاں نے کہا کہ اگر کل شام کے بعد واقعی مندر میں یہ تماشا لگا تو پھر وہ ہمیں یہ تماشا دکھانے کے لیے پہلے کی طرح اوپر لے جائے گا اور ہوادان کے سوراخوں میں سے ہال کمرے کا منظر دکھائے گا۔

اگلے چوبیس گھنٹے بڑے تجسس میں گزرے۔ اقبال کا خیال یہی تھا کہ اس آزمائش سے پہلے ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا اور رام پرشاد کو کھولتے تیل میں ہاتھ نہیں ڈالنا پڑیں گے۔ تاہم ہوشیار سنگھ کی رائے مختلف تھی۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ''بارہ صرف سکھوں کے ہی نہیں بجتے۔ کسی نہ کسی موقع پر کسی نہ کسی ڈھنگ سے ساری قوموں کے بارے بجتے ہیں۔ آپ لوگ دیکھنا، یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا نتیجہ واہگرو کی کرپا سے برا ہی نکلنا ہے۔ یہ لوگ ہندو دھرم سے زیادہ ہٹ دھرم کو ماننے والے ہیں۔ یہ اپنی اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

ہوشیار سنگھ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگلے روز شام سے کچھ پہلے ہی آفتاب خاں نمودار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''ام آپ کو لینے آیا ہے جی۔ ادھر اوپر بس تماشا شروع ہونے ہی والا ہے۔ آپ ذرا غور سے سنیں۔ ڈھول کا آواز یہاں تک بھی سنائی دے رہا ہے نا۔''

ہم نے کان لگا کر سنا۔ واقعی کسی بہت بڑے ڈھول کی مدھم گونج ان تہ خانوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ پہلے کی طرح ہم آفتاب خاں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جانے والوں میں، میں، عمران، اقبال اور ہوشیار سنگھ شامل تھے۔ طلال کو سلطانہ کے پاس ہی رہنے دیا گیا۔ کل رات سے اسے بخار تھا اور وہ گاہے بگاہے شدید سردی بھی محسوس کر رہی تھی۔ غالباً یہ اس کی بے وقوفی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ وہ اس دن دیر تک ٹھنڈے پانی سے نہاتی رہی تھی۔

حسبِ سابق ہم ان تنگ و تاریک زینوں میں پہنچے جہاں سے بمشکل ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ گرد و غبار اور جالوں سے بچنے کے لیے ہم نے اپنے چہرے ایک بار پھر کپڑوں میں لپیٹ لیے تھے۔ عمران کے پاس رائفل تھی۔ میں اور اقبال بھی مسلح تھے۔ زینوں میں داخل ہوتے ہی ہمیں ڈھول کی دھا دھم صاف سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ سنکھ بھی بجائے جا رہے تھے۔ جوں جوں ہم اوپر گئے، یہ آوازیں مزید بلند ہوتی گئیں۔ زینوں کا ایک چوبی دروازہ کھولنے سے پہلے آفتاب نے لالٹین بجھا دی اور اشاروں سے ہمیں سمجھا دیا کہ اب ہمیں بالکل خاموش رہنا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی پوجا کے ہال کمرے کا بے پناہ شور ہمارے کانوں سے ٹکرایا۔ یہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جلد ہی ہم اس قابل ہو گئے کہ اپنی آنکھیں ہوادان کی پتھریلی جالی سے لگا سکیں۔ ہال نما کمرے کا منظر دیدنی تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ سو افراد یہاں موجود تھے... اور اس سے کئی گنا افراد شاید باہر موجود تھے۔ ان سب کا شور بھی ہماری سماعتوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ہال کمرے میں موجود افراد ایک نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ ان کے عقب میں دیواروں کے ساتھ ساتھ بھی درجنوں افراد کھڑے تھے۔ بہت سے افراد کے ہاتھ میں لاٹھیاں اور بھالے تھے۔ کسی کسی کی کمر سے تلوار بھی بندھی ہوئی تھی۔ زیادہ تر کے سروں پر رنگ دار پگڑ نظر آ رہے تھے۔ پجاری حضرات اور چیلے وغیرہ اپنے مخصوص لباسوں میں تھے۔ اس اجتماع میں عورتیں بھی موجود تھیں تاہم ان کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان میں مجھے رام پرشاد کی فربہ اندام بیوی بھی نظر آئی۔ تاہم رام پرشاد کی بہو مالا اور بیٹا ستیش کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہال کمرے میں موجود ہر فرد کے چہرے پر بے پناہ تناؤ نظر آ رہا تھا۔ بہت بڑے ڈھول کی دھنا دھن سے دیواریں لرز رہی تھیں۔

ہال کمرے میں دیوی کی مورتی کے سامنے قریباً بیس مربع فٹ جگہ خالی تھی۔ یہاں لوہے کے ایک بڑے چولہے پر تیل کی کڑاہی دھری تھی۔ چولہے میں سرخ انگارے دہک رہے تھے اور آگ کی لپک پیدا ہو رہی تھی جو اس امر کی شاہد تھی کہ تیل میں کوئی بھی چیز ڈالی گئی تو وہ سیکنڈوں میں راکھ ہو جائے گی۔

''وہ فساد کی جڑ بڑھیا کہاں ہے؟'' عمران نے سرگوشی میں آفتاب سے پوچھا۔

''امارا خیال ہے کہ وہ رام پرشاد کے ساتھ ہی اندر آئے گا۔'' آفتاب نے جواب دیا۔

''اور وہ کب آئے گا؟''

''بس آنے ہی والا ہے۔ وہ دیکھیں جی! مہندر اور اس کا ساتھی لوگ اندر آ رہا ہے۔'' آفتاب نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے بھی لمبوتری شکل والے دراز قد مہندر کو پہچان لیا۔ وہ اپنے قریباً ایک درجن ساتھیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا اور پہلے سے مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت دکھائی دے رہا تھا۔ ایک پستول ہولسٹر میں بند اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس کے ساتھ گہرے سیاہ رنگ والا ایک فربہ اندام شخص تھا۔ اس نے رنگ دار پگڑ باندھ رکھا تھا، یہ شخص بھی پستول سے مسلح تھا۔

''یہ کالے منہ والا کون ہے؟'' میں نے آفتاب سے پوچھا۔

''یہی کھیا رشید ہے۔'' آفتاب کے بجائے عمران نے جواب دیا۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ مجھے اس شخص کی صورت میں سلمان سلو کی تھوڑی بہت جھلک نظر آئی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے... ہال کمرے میں بے چینی کی لہر بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اکثر لوگ مڑ مڑ کر داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''کہیں رام پرشاد اڑن چھو تو نہیں ہو گیا؟'' اقبال نے سرگوشی کی۔

عمران بولا۔ ''میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ وہ واقعی اڑن چھو ہو جائے اور اس کی جگہ یار لوگ اس بڑھیا کو پرکھشا دینے پر مجبور کر دیں۔ سارے فسادوں کی بنیاد تو وہی ہے۔''

''ایسے لوگ اپنا امتحان کبھی نہیں دیتے، بس دوسروں کو آگے کرتے ہیں۔ یہ جتنے بوڑھے ہوتے ہیں، ان کو زندگی اتنی ہی پیاری ہوتی جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''بلکہ ان میں سے زیادہ تر تو بوڑھے ہی نہیں ہوتے۔'' عمران نے کہا۔ ''دل ہی دل میں یہی الاپتے رہتے ہیں، ابھی تو میں جوان ہوں...''

یکا یک ڈھول کی دھنا دھن مزید بلند ہو گئی۔ اکتارکی سنکھ بجنے لگے۔ پھر ڈھول کی سماعت شکن آوازوں میں گھنٹیوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ داخلی دروازے سے پانچ چھ افراد والہانہ رقص کرتے اور جھومتے ہوئے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے عقب میں پچاس پچپن سالہ رام پرشاد تھا۔ اس نے ایک لمبا سفید چولا پہن رکھا تھا۔ ماتھے پر قشقہ اور گلے میں نیلے پتھروں والی وہی مالا تھی۔ رام پرشاد

کے دونوں ہاتھوں میں پیتل کی گھنٹیاں تھیں جنہیں وہ زور زور سے بجا رہا تھا اور آنکھیں بند کر کے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ رام پرشاد کے عقب میں اس کی بوڑھی ماتا تھی۔ وہ زرد ساڑی میں تھی۔ اس کے چہرے پر بھی وجدانی کیفیت تھی اور اس نے بھی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ لکڑی اور پتھر کی دو تین مالائیں اس کے گلے میں بھی جھول رہی تھیں۔ ان دونوں کے عقب میں سوکھا سڑا پنڈت بھگوان داس تھا۔ وہ رام پرشاد اور اس کی ماتا پر کوئی چیز چھڑکتا چلا آ رہا تھا۔

ان لوگوں کے اندر داخل ہوتے ہی مندر کا اندرونی منظر مزید ڈرامائی اور سنسنی خیز ہو گیا۔ ہمیں یہی لگ رہا تھا کہ ہم پندرھویں صدی کے جدید دور میں نہیں، کسی قدیم زمانے میں بیٹھے ہیں۔ رام پرشاد کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی گھنٹیوں کو زور زور سے بجا رہا تھا اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ گھنٹیوں کی آواز میں شدت آتی جا رہی تھی۔ جوں جوں گھنٹیوں کی لے بلند ہوئی، رام پرشاد کے گرد رقص کرنے والے افراد کے رقص میں بھی تیزی آتی گئی۔ رام پرشاد خود بھی جھومنے والے انداز میں اپنے سر کو آگے پیچھے حرکت دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اور یہی کیفیت بڑھیا کے چہرے کی بھی تھی۔ گھنٹیاں بجاتے بجاتے اور اپنے سر کو حرکت دیتے دیتے رام پرشاد نے صرف ایک دو سیکنڈ کے لیے آنکھیں کھولیں۔ شمع دانوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ نظر آئیں۔ اب معلوم نہیں کہ یہ سرخی اس کے اندرونی جذبات کے سبب تھی یا اس نے خود کو ایک خاص کیفیت میں لانے کے لیے بھنگ آمیز مشروب پیا تھا۔ اس نے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ بظاہر اس کے ہاتھوں پر کوئی بھی چیز لگی نظر نہیں آئی۔

ڈھول تاشوں اور سنکھوں کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ رام پرشاد کڑاہی کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اب وہ کسی بھی وقت خود کو پرکھشا کے عمل سے گزار سکتا تھا، لیکن یوں لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر تاخیر کر رہا ہے یا شاید اسے تاخیر کرنے کے لیے کہا گیا تھا... اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے کہ عین موقع پر مخالف گروہ آزمائش کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائے۔

تین چار منٹ مزید گزر گئے۔ مہندرا اور اس کے قریبی ساتھیوں کے چٹانی چہروں پر کسی طرح کی نرمی نمودار نہیں ہوئی۔

رقص کرنے والوں نے جوش میں آ کر ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ سوکھے سڑے پنڈت بھگوان داس نے آگے بڑھ کر رام پرشاد کا کندھا مخصوص انداز میں دبایا۔ رام پرشاد نے مزید زور سے گھنٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ اس کے چہرے پر وجدانی کیفیت تھی۔ یہ کیفیت بے پناہ وشواس اور جذبے میں لتھڑی ہوئی تھی۔ رام پرشاد جانتا تھا کہ اس کی بہو اور بیٹے پر غلط الزام لگایا جا رہا ہے، وہ سچا ہے... اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سب سے بڑی چیز وشواس اور جذبہ ہی ہے اور اب یہ ثابت کرنے کی گھڑی آ گئی تھی۔

وہ ایک ہیجانی منظر تھا۔ شور سے کانوں کے پردے شق ہو رہے تھے۔ رام پرشاد نے دونوں گھنٹیوں کو پورے زور سے آخری بار حرکت دی اور پھر انہیں دونوں طرف پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک پُرجوش نعرہ بلند کیا۔ جذبے میں لتھڑے ہوئے اس زوردار نعرے کے ساتھ ہی وہ کڑاہی کی طرف جھکا۔ ہم نے وہ منظر دیکھا جسے دیکھنے کے لیے مضبوط دل گردے کی ضرورت تھی۔ رام پرشاد نے اپنے دونوں ہاتھ تقریباً کہنیوں تک ابلتے ہوئے تیل میں جھونک دیے۔

...اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بے حد لرزہ خیز تھا۔ ہال کمرے میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ گرم تیل کی بلند چڑچڑاہٹ سنائی دی... اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کرب ناک انداز میں چلایا۔ اس نے دیوانہ وار اپنے دونوں ہاتھ کڑاہی میں سے کھینچے، ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں نے کڑاہی کے کنارے سے رگڑ کھائی۔ وہ ایک دل دوز منظر تھا۔ اس کے بازوؤں کی گندمی کھال اتر گئی اور نیچے سے سرخ سرخ گوشت جھانکنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک بے طرح جل چکے تھے۔ وہ فرش پر گر پڑا اور تکلیف سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

یہ سب کچھ ہم سے فقط چھ سات فٹ کی دوری پر ہو رہا تھا۔ ہوادان کی پتھریلی جالی کے سوراخوں میں سے ہم سب کچھ بالکل واضح دیکھ رہے تھے۔ زمین پر لوٹ پوٹ ہونے سے رام پرشاد کے ہاتھوں اور بازوؤں کی جلی ہوئی کھال کئی اور جگہ سے بھی اتر گئی... جلے ہوئے گوشت کی مکروہ بو ہمارے نتھنوں تک پہنچی۔

اس وقت میری نگاہ روتی چلاتی ہوئی بڑھیا پر پڑی۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر دنیا جہان کی حیرتیں سمٹ آئی تھیں۔ اسے جیسے اپنی نگاہ پر یقین ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ یکایک مہندرا اور اس کے ساتھیوں نے گرجدار نعرہ بلند کیا۔ ''جے ماتا کی'' آواز بڑی شدت سے در و دیوار میں گونجی۔ بہت سی لاٹھیاں اور بلم وغیرہ فضا میں بلند ہوئے۔ وہ سب

لوگ جو رام پرشاد اور اس کے بچوں کو جھوٹا سمجھ رہے تھے، ایک دم بپھرے ہوئے نظر آئے۔ وہ للکارے مارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے تمتما گئے اور آنکھوں میں جنون نظر آیا۔ یوں لگا کہ آزمائش میں ناکام ہونے کے بعد وہ رام پرشاد کو واجب القتل سمجھ رہے ہیں۔

اس کے بعد جو منظر ہم نے دیکھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ مہندرا آگے آیا اور پکار کر بولا۔ ''پھیسلہ (فیصلہ) ہو گیا... بھگوان کا پھیسلہ ہو گیا۔'' اس کی آواز میں بلا درجے کی درندگی تھی۔

یکایک بہت سے لوگ فرش پر لوٹ پوٹ ہوتے رام پرشاد پر جھپٹے۔ ایک ہٹے کٹے شخص نے اس طرح کھینچ کر تلوار چلائی کہ وہ تقریباً ایک فٹ تک رام پرشاد کے پیٹ میں گھس گئی۔ اس کے بعد کئی افراد اس پر پل پڑے۔ رام پرشاد کی آخری کرب ناک آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ وہ مشتعل ہجوم کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

ہم اپنی جگہ سکتہ زدہ بیٹھے تھے۔ مکھیا کی گرجدار آواز ہجوم کے شور میں سے ابھری۔ ''اس حرامی کا بیٹا اور بہو کہاں ہیں۔ وہ اصل دوشی ہیں۔ ان کو پکڑو...''

ایک اور للکار ابھری۔ ''اس کی بہو پاپی ہے۔ اس کتیا کو جندہ نا ہیں چھوڑیں گے۔ جان سے ماریں گے۔''

''... ہاں جان سے ماریں گے۔'' کئی آوازیں ابھریں۔

ہجوم میں ایک لہر سی دوڑی۔ کچھ لوگ باہر کی طرف لپکے۔ جونہی ہاتھ جلنے کے بعد رام پرشاد فرش پر گرا تھا اور مخالفین نے فلک شگاف نعرے بلند کیے تھے، رام پرشاد کے حمایتی وہاں سے کھسکنا شروع ہو گئے تھے۔ اب مندر کے اندر مہندرا اور اس کے ساتھیوں کا غلبہ تھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

''لگتا ہے کہ اب مالا کی جان کو بھی خطرہ ہے۔'' ہوشیار سنگھ لرزاں آواز میں بولا۔

ہجوم کے درمیان سے ہمیں اب رام پرشاد کی خونچکاں لاش سیاہی مائل فرش پر نظر آ رہی تھی۔ اس کا سفید براق چولا خوں رنگ تھا۔ لوگ اسے روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اس کے پاس ہی مندر کا بہت بڑا ڈھول اوندھا پڑا تھا۔

''لو، وہ بھی آ گئی۔'' عمران نے سنسناتی سرگوشی کی۔

میں نے دیکھا، کچھ مشتعل لوگ مالا کو کھینچتے ہوئے مندر میں لا رہے تھے۔ ان مشتعل لوگوں میں لمبی ناک اور عقابی آنکھوں والا گاڑی بان بھولا ناتھ سب سے آگے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مالا کے بال تھے اور دوسرے میں ایک چھوٹی تلوار تھی۔ کئی دوسرے لوگوں نے بھی مالا کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ دہشت سے چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب ایک بلند دہاڑ سنائی دی۔ یہ برہمن زادہ ستیش تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا سیاہ پستول تھا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں کہوت ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔'' وہ چنگھاڑا اور اس نے مندر کے اندر ہی کئی ہوائی فائر کیے۔

لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے۔ چند لمحوں کے لیے لگا کہ ستیش آگے بڑھ کر اپنی پتنی کو چھڑانے اور شاید یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر پھر اچانک دو افراد نے جھپٹ کر ستیش کو عقب سے دبوچ لیا۔ ستیش نے فائر کیا تاہم پستول کا رخ اب زمین کی طرف تھا۔ دھماکے سے گولی چلی اور کسی کے پاؤں میں پیوست ہو گئی۔ پکڑنے والوں نے ستیش کو اوندھے منہ پکے فرش پر گرا دیا اور جکڑ لیا۔ تب وہ لوگ اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے مندر سے باہر لے گئے۔ اسی دوران میں مالا کی نگاہ فرش پر پڑی۔ وہاں اپنے سسر کی خونچکاں لاش دیکھ کر وہ کرب ناک انداز میں چلانے لگی۔

''پتاجی... پتاجی۔''

اسے پکڑنے والوں نے اسے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ اس کے بازو پیچھے موڑ کر اس کے ہاتھ ایک رسی سے باندھ دیے گئے۔ پاؤں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اس کی ساڑی بالائی جسم پر سے کھل گئی تھی اور بالائی جسم نیم عریاں ہو رہا تھا۔ اس کی عریانی تو رہی ایک طرف، اس کی جان کی پروا بھی کسی کو نہیں تھی۔ وہ لوگ بے دردی سے اسے ادھر ادھر گھسیٹ رہے تھے۔ فرش پر اوندھا گرنے سے اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ وہ چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کے لیے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ تاہم میں نے دیکھا کہ دہشت کے پہلے شدید جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب اس کے چہرے پر عجیب طرح کا طیش بھی پایا جا رہا تھا۔

وہ مہندر کی طرف منہ کر کے اشکبار انداز میں پکاری۔ ''تم جانور ہو، تم ہتھیارے ہو۔ تم بھگوان کے نام پر راکھشس کے پجاری ہو۔ تمہارا انجام بہت برا ہووے گا... بہت برا ہووے گا۔''

بھولا ناتھ کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ اس نے تلوار سونتی اور خطرناک انداز میں مالا کی طرف بڑھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

”نا ہیں... نا ہیں، یہ ٹھیک نا ہیں۔“

”کیوں ٹھیک نا ہیں؟“ مہندر کا ساتھی پٹیل گرج کر بولا۔ ”یہ لڑکی دھرم دشمن ہے۔ یہ ہمیشہ سے دھرم دشمن رہی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ... رام پرشاد کی جان لینے والی بھی یہی ہے۔ اسے دہری سزا ملنی چاہیے۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ حرامزادی کے ٹکڑے کر دو یہیں پر لٹا کر...“ ایک اور کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”پھر اسے کڑاہے میں ڈال دو۔“

یوں لگا جیسے کئی افراد مالا کی طرف بڑھنا چاہ رہے ہیں ایک دم ہجوم میں شدید ہلچل نظر آئی۔

ہوشیار سنگھ نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”یہ لوگ اس لڑکی کو مار دیں گے جی۔ کڑاہے میں پھینک دیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ پرکھشا نا کام ہو تو ایسا ہی کیا جاتا ہے۔“

بپھرا ہوا ہجوم اب بالکل آگ گولا دکھائی دے رہا تھا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی، آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹتی ہوئیں وہ سب کے سب ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہجوم کی نفسیات ایک اکیلے شخص کی نفسیات سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ ہجوم میں موجود شخص ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے جن کا انفرادی طور پر وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہجوم کے اندر منفی اور مثبت دونوں طرح کی کیفیات انتہائی عروج پر پہنچ سکتی ہیں۔ جیسے بہادری، ہمت، ایثار اور جواں مردی یا پھر نفرت، انتقام، خوں خواری اور درندگی۔

یہاں اس ہال کمرے میں بھی اچانک درندگی اپنے عروج پر پہنچی نظر آئی۔ دہشت کی لہر نے ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آیا کہ تیل کی کڑاہی اتنی بڑی کیوں تھی۔ کھولتے ہوئے تیل میں ہاتھ ڈالنے کے لیے تو چھوٹی سی کڑاہی بھی کام دے سکتی تھی۔ یہ شاید کوئی قدیم کڑاہا تھا جو خاص اسی رسم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

”ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔“ عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں نے چونک کر عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا کھلنڈرا انداز اس کے اندر کہیں بہت دور گہرائی میں جا چھپا تھا۔

کچھ مشتعل لوگوں نے بندھی ہوئی مالا کو اٹھایا اور بلاتردد تیل کے کڑاہے کی طرف بڑھے۔ ان میں مہندر بھی شامل تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب آٹھ دس افراد کا ایک ٹولہ زبردستی ہال کمرے میں گھس آیا۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ ستیش کے دوستوں میں سے تھے۔

ان میں سے ایک گرجا۔ ”مالا بہن کو چھوڑ دو۔ نا ہیں تو گولی چلے گی۔“

”چلاؤ گولی... چلاؤ۔“ مہندر زہرناک انداز میں دہاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مالا کو اس کے پاؤں پر کھڑا کیا اور پستول کی نال اس کے سر پر رکھ دی۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ ٹریگر دبانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ اس کا چہرہ ایک انتہا پسند کا چہرہ تھا۔ ان گنت صدیوں سے یہ چہرہ مذہب کے نام پر سفاکی اور درندگی کی بدترین مثالیں قائم کرتا رہا ہے۔ اب دونوں طرف سے رائفلیں تان لی گئی تھیں۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ مہندر کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ ماحول گواہی دے رہا تھا کہ یہ فساد اب روکنے سے رکے گا نہیں۔ میں نے دیکھا، عمران نے اپنی رائفل کی نال جالی کے ایک سوراخ میں رکھ دی ہے اور کسی ماہر نشانہ باز کی طرح رائفل کا کندا اپنے شانے سے لگا کر نشانہ باندھ رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ایک نہایت خطرناک نشانہ لگانے جا رہا ہے۔ یہ نشانہ خطا جاتا یا پوری طرح کارگر نہ ہوتا تو مالا کی جان جا سکتی تھی۔ وہ مالا کے عقب میں مہندر کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا اور مالا کے پیچھے مہندر کے چہرے کا ایک تہائی حصہ ہی نظر آ رہا تھا۔ اسے اندازاً دو انچ چوڑے اور چھ انچ لمبے ٹارگٹ کو نشانہ بنانا تھا... مگر یہ بھی عیاں تھا کہ اب اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ مجھے وہ تماشا یاد آ گیا جو عمران اور اقبال نے لاہور میں مجید مطہر کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے سر پر سیب رکھ کر عمران نے حیران کن مہارت سے نشانہ لگایا تھا۔ شاید آج پھر وہی مہارت استعمال ہونے والی تھی۔

اور پھر دھماکا ہوا۔ میں نے مالا کے پیچھے مہندر کی پیشانی پر ایک داغ نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے پختہ فرش پر گرا۔ عمران کے بے مثال نشانے کا دوسرا شکار مہندر کا قریبی ساتھی پٹیل تھا۔ اس کی کنپٹی نشانہ بنی اور وہ پہلی گولی چلانے کی حسرت دل میں لیے سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا۔ ان دونوں فائرز کے درمیان بمشکل ایک سیکنڈ کا وقفہ تھا۔ اتنے مختصر وقت میں دوسری مرتبہ اتنا صاف نشانہ لینا حیرت ناک تھا۔

میں نے مالا کو مہندر کے ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ فرش پر گرتے دیکھا۔ اس کے بعد جیسے یکایک قیامت برپا ہو گئی۔ دھماکوں اور شعلوں نے ہال کمرے کو ڈھانپ لیا۔ کئی افراد زخمی ہو کر گرے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ ستیش کا ایک ساتھی

مالا کو بچانے کے لیے مالا کے اوپر گر گیا تھا۔ تب ہم نے دیکھا کہ تیش کے دو ساتھی مالا کو چھلنے فرش پر گھسیٹتے ہوئے ہال سے باہر لے گئے اور وہ اندھی گولیوں کی زد سے بچ گئی... اور ہم فی الوقت یہی چاہتے تھے۔ ہمارے سامنے خوں ریز مناظر تھے۔ آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ نہایت نزدیک سے ایک دوسرے پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ آتشیں اسلحے کے علاوہ تلواریں بھی نکل آئی تھیں۔ جس ہوادان سے ہم جھانک رہے تھے، اس کے عین سامنے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر کھیا رشید نے ایک شخص کی گردن پر تلوار ماری اور اس کی شہ رگ کاٹ کر رکھ دی۔ دفعتاً وہ کچھ ہوا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ کوئی اندھی گولی اس بڑے شمع دان کے رسے سے ٹکرائی جو تیل کے کڑاہے کے عین اوپر جھول رہا تھا... پیتل کا شمع دان اپنی قریباً دو درجن موم بتیوں سمیت ابلتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں گرا۔ ابلتا ہوا تیل اچھلا۔ کئی افراد کرب سے بے تاب ہو کر چلائے۔ اس کے ساتھ ہی تیل نے آگ پکڑ لی۔ ہم نے ایک شخص کو آگ کی لپیٹ میں آ کر بگولے کی طرح بیرونی دروازے کی طرف دوڑتے اور پھر راستے میں ہی گرتے دیکھا۔ کڑاہا الٹ چکا تھا۔ اس کا تیل جہاں جہاں گیا، اپنے ساتھ آگ کا ریلا سا لے گیا۔ چند سیکنڈ پہلے جو جنونی ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے، اب اپنی جانیں بچانے کے لیے بیرونی دروازوں کی طرف دوڑے۔ دروازے صرف دو تھے اور نکلنے والے درجنوں۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ سیاہ گاڑھا دھواں ہر شے کو ڈھانپتا چلا جا رہا تھا۔ یہ دھواں ہوادان کے اندر سے ہماری طرف بھی آ رہا تھا۔ اب ہمارا یہاں رکنا خطرناک تھا۔

”نیچے چلیں جی۔“ آفتاب خاں پکار کر بولا۔

ہم آگے پیچھے تنگ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ چند زینے اتر کر ہم نے وہ دروازہ بند کر دیا جسے کھول کر اوپر آئے تھے۔ اس دروازے کے بند ہونے سے عارضی طور پر سیڑھیاں دھوئیں سے محفوظ ہو گئیں۔ جن کپڑوں سے ہم نے چہرے لپیٹے تھے، وہ ابھی تک ہمارے پاس تھے۔ ہم نے ان میں سے دو تین کپڑے دروازے کی درزوں میں ٹھونس دیے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم زیریں تہ خانے میں موجود تھے۔

”کیا ہوا؟“ سب سے پہلے رادھا نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

اسے ہر وقت اپنے شوہر نامدار کی پڑی رہتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شوہر صاحب کو سورگ باشی ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں اور اب اس کی وفات سے کہیں زیادہ اہم خبریں موجود ہیں۔

مندر میں جو آگ بھڑکی تھی، وہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ ہم یہاں ان تہ خانوں کے اندر سے کچھ دیکھ نہیں سکتے تھے مگر تصور کی نگاہ ہمیں سب کچھ دکھا رہی تھی۔ قدیم مندر دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ شعلے اس کے دروازوں سے نکل کر باہر تک جا رہے تھے۔ تاریکی میں ہر طرف ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔

”گولیاں چل رہی ہیں۔“ عمران نے بیرونی آوازوں پر کان دھرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ غور سے سننے پر فائرنگ کی بہت مدھم آواز یہاں بھی نوٹ کی جا سکتی تھی۔

”اگر آگ یہاں لکڑی کے زینے تک پہنچ گئی تو؟“ اقبال نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔ ”تو ہم گانا گائیں گے۔ خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے زینے میں۔“ عمران نے حسبِ عادت بات کو مذاق میں اڑایا۔

لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ آگ جس طرح بھڑکی تھی، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ تہ خانے بھسم ہو سکتے تھے۔ اگر آگ مندر کے اس بیرونی دروازے تک ہی پہنچ جاتی جس میں سے گزر کر آفتاب خاں ہر رات یہاں ہمارے پاس آتا تھا تو بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

”کیا خیال ہے آفتاب خاں؟“ میں نے پوچھا۔ ”آگ نیچے تو نہیں آ جائے گی؟“

”نہیں جی، آپ سب کی طرح ہم بھی دعا ہی کر سکتا ہے۔ خطرہ تو ہر صورت میں موجود ہے۔ اگر آگ یہاں تک نہ پہنچا لیکن دھواں بھر گیا تو بھی ہم سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔“

آفتاب خاں درست کہہ رہا تھا۔ ہم دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہلکا ہلکا دھواں سیڑھیوں سے اتر بھی رہا تھا مگر یہ اتنی کم مقدار میں تھا کہ ہم فی الحال خطرے سے باہر تھے۔ تہ خانوں میں گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔

عمران اور میں، آفتاب کے ہمراہ ایک بار پھر تنگ زینوں پر چڑھے اور اس دروازے کو ائرٹائٹ کرنے کی کوشش کی جہاں سے دھواں اندر آ رہا تھا۔ اس کوشش میں ہم بری طرح کھانسنے لگے اور آنسو بہاتے ہوئے واپس آئے۔ بہرطور یہ کوشش فائدہ مند ہوئی اور دھوئیں کی آمد کم ہو گئی۔

... اگلا تقریباً ایک گھنٹا سخت تشویش میں گزرا۔ پھر صورتِ حال بہتر ہونے لگی۔ فائرنگ کی آوازیں بھی اب معدوم ہو چکی تھیں... فائرنگ کے علاوہ اور کسی طرح کا شور یہاں پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب رات کے قریباً دس بجنے والے تھے۔ ہمیں اتنا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ باہر آگ بجھائی جا چکی ہے لیکن باقی حالات کیا ہیں، اس کے بارے میں آفتاب خاں ہی کوئی خبر لا سکتا تھا... اور آفتاب ابھی تک ہمارے پاس موجود تھا۔ رات قریباً ایک بجے کے لگ بھگ وہ بالائی دروازے تک گیا اور سن گن لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ اب مندر کے اردگرد خاموشی ہے۔ وہ باہر نکلنے کا چانس لے سکتا ہے۔ عمران نے اسے تھوڑی دیر مزید انتظار کرنے کے لیے کہا۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ ابھی کچھ دیر مزید انتظار کرے۔ آخر رات تین بجے کے لگ بھگ آفتاب باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنی لاٹھی اور لالٹین سنبھال لی۔ بستی سے غیر حاضری کے لیے اس کے پاس ایک نہایت معقول جواز موجود تھا۔ اس کے ایک دوست کی بیوی سخت بیمار تھی۔ شام کو اس نے کھیا سے اجازت لی تھی کہ وہ ایک دو گھنٹوں کے لیے اپنے دوست کی طرف جائے گا۔ اب وہ کہہ سکتا تھا کہ اسے وہاں دیر ہو گئی ہے۔

اب آفتاب کو کل رات ہی کسی وقت آنا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کل رات بھی نہ آ سکتا۔ اس کی واپسی تک ہمیں انتظار کی سولی پر لٹکنا تھا۔ مندر کے خونی مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ خاص طور سے جو کچھ مالا کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا قصور اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی اس کو سزا دی جا رہی تھی۔ کھینچا تانی کے دوران میں وہ نیم عریاں ہو گئی تھی۔ اس کی جسمانی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حاملہ بھی ہے۔ اگر اسے سچ مچ تیل کے کھولتے ہوئے کڑاہے میں ڈال دیا جاتا تو آناً فاناً دو زندگیاں ختم ہو جاتیں۔

... اگلے روز دوپہر کا واقعہ ہے۔ سلطانہ اوپر والے تہ خانے میں کلثوم اور نوری کے پاس تھی۔ کلثوم کے کان کا درد ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا، وہ تکلیف میں تھی۔ اس کی کمر کو بھی مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ میں رات کا جاگا ہوا بستر پر لیٹا تو نیند آ گئی۔ اچانک کسی آہٹ کے سبب میں جاگ گیا۔ تہ خانوں میں رات دن برابر تھے۔ کمروں میں شمعیں یا لالٹینیں جلتی رہتی تھیں۔ میرے کمرے میں لالٹین بجھی ہوئی تھی اس لیے تاریکی تھی۔ مجھے کمرے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک ہیولا سا حرکت کرتا نظر آیا۔ یہ سلطانہ تو ہرگز نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ بے حرکت لیٹا دیکھتا رہا۔ ہیولا اس کھونٹی کی طرف بڑھا جہاں جیکٹ کے نیچے میرا پستول لٹک رہا تھا۔

میں نے پہچان لیا۔ یہ پندرہ سالہ طلال تھا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ میرے پستول تک رسائی حاصل کی اور اسے ہولسٹر سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

”طلال!“ میں نے اچانک بلند آواز میں کہا۔

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ہولسٹر جلدی سے کھونٹی پر لٹکا دیا..... میں نے ماچس جلا کر موم بتی روشن کی۔ وہ دیوار سے لگا کھڑا تھا اور ایک دم پریشان نظر آ رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہے تھے؟“ میں نے تحکم سے پوچھا۔

”کچھ نہیں جی۔ میں وہ... دراصل... آپ کا پستول دیکھنا چاہ رہا تھا۔“

”دیکھنا چاہ رہے تھے یا لے جانا چاہ رہے تھے؟“

”نا ہیں جی۔ میں بس دیکھنے لگا تھا۔“

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”طلال! مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟“

اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ اس کے تاثرات دیکھ کر مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ واقعی اس لڑکے نے سلطانہ کے ساتھ مل کر رزگاں میں چار سنگین وارداتیں کی ہیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی سرد مہری تھی۔

”طلال! ادھر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے سامنے نشست کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ہچکچاتا ہوا بیٹھ گیا۔ ”مجھے سچ بتاؤ طلال! تم نے ایسا کیوں کیا؟... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، تم کچھ چھپاؤ گے نہیں تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ اگر تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مدد بھی کروں گا۔“ اچانک میں چونک گیا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں طلال کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نمودار ہوئی۔

میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”طلال! مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟“

وہ اشک بار ہو گیا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔ ”میری خالہ مر جائے گی۔ وہ اپنی جان دے دے گی۔ میں اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ اس سے پہلے میں مر جانا چاہتا ہوں یا پھر اس کتے کو مار دینا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے جانے دیں... خدا کے لیے جانے دیں۔“ اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ اس کے آنسوؤں میں آگ بھی تھی اور زہر بھی تھا۔

”کیا تم جارج گورا کی بات کر رہے ہو؟“

”اور کس کی کر سکتا ہوں۔ وہی ہے جس نے میری خالہ کو

برباد کیا۔ اسے جندوں میں چھوڑا نہ مردوں میں۔ ہر جگہ اس کو بدنام کر دیا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ فیصلہ کر چکی ہے۔ وہ ایک دو دن میں چپ کر کے یہاں سے نکل جائے گی۔ وہ جارج گورا سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ اس بدلے کے بغیر وہ جندہ نا ہیں رہ سکتی... اور میں نا ہیں چاہتا کہ وہ یہ خطرناک کام کرنے کے لیے جائے۔ وہ عورت جات ہے۔ وہ اسے بہت تکلیف دے کر ماریں گے۔ یہ کام میں کروں گا۔ میں جارج کو قتل کروں گا... اس کا سر لا کر خالہ کے خدموں (قدموں) میں ڈالوں گا... یا پھر خود بھی وہیں رہ جاؤں گا۔"

میں طلال کی باتوں اور اس کے انداز پر ششدر تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تم کیسے جانتے ہو کہ وہ ایک دو دن میں یہاں سے چلی جائے گی؟"

"مجھے سب پتا ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کے ساتھ رہا ہوں۔ وہ میری بہن بھی ہے، ماں بھی اور خالہ بھی۔ میں سب جانتا ہوں کہ وہ کب کیا کریں گی۔ ان کے پاس زہر کی پڑیا ہے۔ جب وہ نل پانی سے گئی تھیں تو یہ پڑیا انہوں نے اپنے بالوں میں چھپائی ہوئی تھی۔ بعد میں جب ہم یہاں آئے تو میں نے وہ پڑیا ان سے چھین لی تھی اور چھپالی تھی۔ وہ پڑیا پھر غائب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ پڑیا پھر انہوں نے لے لی ہے۔ ان کی باتیں بھی مجھے یہی سمجھا رہی ہیں کہ انہوں نے بس ایک دو روج میں اب یہاں سے نکل جانا ہے۔"

میں سناٹے کی سی کیفیت میں طلال کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا اور وہ باتیں بھی بڑی ہی کر رہا تھا۔

ایک دم مجھے لگا کہ میں مجرم ہوں۔ میں سلطانہ کا ہی نہیں ان سب لوگوں کا مجرم ہوں جو سلطانہ کے قریبی ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں۔ ان میں طلال بھی شامل تھا۔ سلطانہ کا بوڑھا والد مختار راجپوت بھی اور اس کا اپاہج بھائی بھی۔ جس نے میری صحت کے بدلے میں ایک تکلیف دہ بیماری گلے لگائی ہوئی تھی اور اب اپنی بہن کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ میں سلطانہ سمیت ان سب لوگوں کا مقروض تھا۔ ان کے بے پایاں احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ ان احسانوں کے بے پناہ بوجھ سے نکلنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا۔ میں کسی طرح... کسی طرح سلطانہ کو پھر سے زندہ کر سکتا۔ اور اسی جگہ، اسی گھڑی... وہیں اس تنہا وشک بارلز کے سامنے بیٹھے بیٹھے میں نے یہ تہیہ کیا کہ میں یہ کام کروں گا... اور اس کے کرنے میں مزید تاخیر نہیں کروں گا۔ اندازہ تو مجھے پہلے ہی تھا، آج کامل یقین بھی ہو گیا تھا کہ سلطانہ کے مردہ تن میں جان ڈالنے کی کوشش ایک ہی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس کی کچلی مسلی زخمی روح کو انصاف دیا جائے۔

میں نے کہا۔ "طلال! تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اس طرح میرا پستول لے کر یہاں سے نکل جاؤ گے اور نور نگاں پہنچ کر جارج کو گولی مار دو گے؟ تم اپنی جان گنوانے کے سوا اور کچھ نہیں کرو گے۔ وہ ایک آسان دشمن نہیں ہے۔ وہ تمہیں کسی بازار میں گھومتا ہوا نہیں مل جائے گا۔ اس نے اپنی حفاظت کا مضبوط گھیرا بنا رکھا ہے۔ کیا تمہیں پہلے تجربہ نہیں ہوا کہ یہ گھیرا کتنا مضبوط ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد سسکی لے کر بولا۔ "مجھے بتائیں میں کیا کروں... میں کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ تم اپنی خالہ کے بہت قریب ہو۔ اسے میرے بارے میں بتاؤ کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو وہ خود کرنا چاہتی ہے اور میں یہ سب کروں گا بھی۔ جارج گورا اب زیادہ دن سانس نہیں لے پائے گا۔ یہ تمہاری خالہ سے میرا وعدہ ہے۔"

طلال نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ "طلال! میں کوئی ہوائی بات نہیں کر رہا۔ میں اب وہ "مہروج" نہیں رہا جو کبھی تھا۔ کیا تمہیں مجھ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی؟" وہ اب بھی خاموش رہا۔ تاہم اس کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ میری بات سے اختلاف نہیں کر رہا۔ وہ اتنا بھی ناسمجھ نہیں تھا۔ وہ بھی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں رنجیت پانڈے کی جو درگت بنی تھی وہ تو اس کی اور سلطانہ کی نگاہوں سے اوجھل رہی تھی لیکن ابھی پانچ دن پہلے کا واقعہ تو اس نے دیکھا تھا۔ میں تن تنہا مندر سے نکلا تھا اور کلثوم کو چھڑا کر یہاں لے آیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ کتنا مشکل کام تھا۔ میرے اس کام پر اعتراض تو کیے گئے تھے لیکن اندر سے سب معترف ہوئے تھے۔

طلال روہانسی آواز میں بولا۔ "آپ کہہ رہے ہیں کہ میں انہیں سمجھاؤں۔ میں انہیں کیا سمجھاؤں گا؟ میں کس گنتی میں آتا ہوں۔ وہ تو آپ کے سمجھانے سے بھی نا ہیں سمجھ رہیں۔ اور جتنا کہا وہ آپ کا مانتی ہیں، کسی اور کا نہیں مانتیں۔ وہ آپ سے جتنا پیار کرتی ہیں مجھے میں اچ (ہی) جانتا ہوں۔ وہ آپ کو بہت چاہتی ہیں خالو! بہت اچ

جیادہ۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ وہ نہیں چاہتی۔"

"لیکن آپ کو اندازا نا ہیں کہ وہ آپ کو کیا سمجھتی ہیں... وہاں استھان میں بھی وہ دن رات آپ کا نام لیتی رہتی تھیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا مطلب؟"

"آپ نے دیکھا اچ ہو گیں گا کہ وہاں خالہ کو زنجیریں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ خالہ کو یقین ہو چکا تھا کہ استھان والے موہن کمار کے قتل کے بدلے میں ان کو جندہ جلا دیں گے۔ ان کو وہ دن بھی بتایا گیا تھا جب ان کو جندہ جلایا جانا تھا۔ اس سے ایک رات پہلے انہوں نے مجھ سے کہا تھا... طلال! تم جندہ رہو گے اور ایک نہ ایک دن اپنے خالو سے جرور ملو گے۔ جب بھی ملو، ان سے کہنا میری خالہ آپ سے بہت پریم کرتی تھی۔ اتنا جیادہ جتنا سوچا جا سکتا ہے۔ آپ ان کو دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر پیارے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر اللہ میاں نے بندوں کی پوجا کی اجاجت دی ہوتی تو وہ آپ کی پوجا کرتیں۔ پھر انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔"

"وہ کیوں؟"

"کہنے لگی تھیں۔ یہ دیکھو... جس طرح میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں، اسی طرح میری طرف سے ان کے سامنے ہاتھ جوڑنا اور کہنا کہ وہ میری غلطیوں کے لیے مجھے ماف کر دیں۔"

طلال نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "جس روج ان کو چتا میں جلایا جانا تھا، اس روج شام سے پہلے انہیں کھانے میں بے ہوشی کی دوا دے دی گئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں بے ہوش ہونے والی ہوں۔ اب دوبارہ ہوش میں نا ہیں آؤں گی، میری باتیں یاد رکھنا۔ بے ہوش ہوتے ہوئے انہوں نے بس ایک دو بار بالو کا نام لیا، اس کے بعد آپ ہی کا نام لیتی رہیں اور نام لیتے لیتے ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔"

شاید میری اور طلال کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں لکڑی کے زینوں پر سلطانہ کی جانی پہچانی چاپ سنائی دی۔ وہ نیچے آ رہی تھی... ہم خاموش ہو گئے۔

رات تک میں بے چینی سے آفتاب کا انتظار رہا۔ خدا خدا کر کے گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر یکجا ہوئیں۔ دس پندرہ منٹ بعد سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور آفتاب خاں اپنی لاٹھی اور لالٹین کے ساتھ اندر آ گیا۔ میں اس وقت کپڑے بدل رہا تھا۔ کپڑے بدل کر

نمونہ

کانسٹیبل نے ایک شخص کو عین اس وقت پکڑ لیا جب وہ سٹی جیٹی کے پل پر سے چھلانگ لگانے والا تھا۔ اور بولا۔ "دیکھیے جناب، اگر آپ نے چھلانگ لگائی تو مجھے بھی آپ کے پیچھے کودنا پڑے گا آج سردی بہت ہے، ایمبولینس پہنچنے تک ہم دونوں کو نمونیا ہو جائے گا اور ہم مر جائیں گے۔ تو جناب ذرا صبر سے کام لیجیے، گھر جائیے اور رسی کا پھندا گلے میں ڈال لیجیے۔"

❖❖❖

تنبیہ

ماں نے اسکول جا کر اپنے بچے کی استانی سے کہا۔ "دیکھیے مس، اگر میرا منا کبھی کوئی غلطی کرے تو اسے سزا نہ دیں۔ یہ بڑا حساس واقع ہوا ہے۔ اگر واقعی سزا دینا ضروری ہو تو اس کے برابر والے بچے کو سزا دے دیں، میرا منا سہم کر خود ہی ٹھیک ہو جائے گا اور آئندہ کبھی غلطی نہیں کرے گا۔"

میں درمیانی تہ خانے میں پہنچا تو آفتاب خاں عمران کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہ رہے ہیں لیکن جب میں نے عمران سے پوچھا تو وہ بولا۔ "یار! ہر جگہ ناک کیوں گھساتے ہو۔ ہر بندے کی پرائیویسی ہوتی ہے، میری بھی ہے۔"

"کس طرح کی پرائیویسی؟" میں نے پوچھا۔

"دو ٹانگوں والی۔ عمر کوئی بیس چوبیس سال۔ نین نقشہ اچھا ہے۔ ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔"

"کس کی؟"

"بھئی پرائیویسی کی... اگر تم شادی شدہ نہ ہوتے تو تمہارا عشق بھی چھوٹی سے لگوایا جا سکتا تھا۔ مقامی حسن کا بے مثال نمونہ ہے وہ بھی۔"

"یار! کیا ہانک رہے ہو؟"

"ہانک نہیں رہا جگر! میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہاں ایک لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں کچھ کچھ ہوتا ہے اور مجھے دیکھ کر اس لڑکی کو کچھ کچھ ہوتا ہے... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں کو دیکھ کر لڑکی کے اباجی کے دل میں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور جہاں کہیں میری شکل دیکھتے ہیں، ہوا میں لٹھ گھمانا شروع کر دیتے ہیں... آفتاب یہی بتا رہا تھا کہ اس کے اباجی یہاں فتح پور میں دیکھے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میرے دل میں بھی کچھ کچھ ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ غصہ رفع کرنے کے لیے تمہارا سر پھاڑ دوں یا اپنا پھاڑ لوں۔"

اسی دوران میں اقبال بھی آ گیا۔ اس نے آتے کے ساتھ ہی آفتاب پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میری طرح وہ بھی یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اوپر کے حالات کیا ہیں۔

آفتاب نے اپنے مخصوص پٹھانی لب و لہجے میں جو انکشافات کیے، وہ کچھ اس طرح تھے... مندر کی آگ بجھ چکی تھی۔ سیکڑوں افراد نے قریبی جوہڑ سے پانی بھر بھر کر آگ پر پھینکا تھا اور اسے پوری طرح پھیلنے سے روک لیا تھا۔ تاہم اس دوران میں مندر کا قریباً ایک تہائی حصہ جل کر راکھ ہو گیا تھا اور کہیں کہیں سے یہ راکھ ابھی تک سلگ رہی تھی۔ اس آگ میں اور آگ سے پہلے ہونے والی لڑائی میں تقریباً نو افراد کی جانیں گئی تھیں۔ زخمیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ قریباً ایک سو افراد زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے دس پندرہ افراد کو آگ یا تیل سے جلنے کے زخم آئے تھے۔ ان میں سے کچھ کی حالت تشویش ناک تھی۔ مکھیا عبدالرشید بھی آگ میں جھلس کر شدید زخمی ہوا تھا۔ اسے نل پانی لے جانے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مہندر، اس کا دوست پٹیل اور اس کے دو اور ساتھی موقع پر ہی مارے گئے تھے۔

اچھی خبر یہ تھی کہ مالا اور ستیش جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ زوردار ہنگامے کے دوران میں ہی ستیش اپنی فیملی کے ساتھ فتح پور سے نکل گیا تھا۔ اس کے پتا کی لاش ساری رات مندر کے اندر پڑی رہی اور جل کر بری طرح مسخ ہو گئی۔

عمران نے پوچھا۔ "اب اس کے پتا اور مہندر وغیرہ کی لاشیں کہاں ہیں؟"

"آج صبح علاقے کا بہت سا معزز لوگ فتح پور میں جمع ہوا ہے جی۔ ان میں پنچایت والا بڑا لوگ بھی شامل ہے۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ جب تک گاؤں میں پورا امن نہیں ہو جاتا، وہ لوگ یہاں رہے گا اور نگرانی کرے گا۔ ان لوگوں نے دونوں طرف کا لاشیں بھی ان کے وارثوں کے حوالے کیا ہے۔ شام کے وقت وہ لوگ اپنا اپنا لاشیں لے کر چلا گیا ہے۔ باہر کا جو پندرہ بیس لوگ ابھی تک گاؤں میں موجود ہے، ان سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ صبح تک گاؤں چھوڑ دے۔ ان لوگوں سے ہتھیار وغیرہ لے لیا گیا ہے۔ جب یہ لوگ گاؤں چھوڑے گا تو انہیں ہتھیار واپس دے دیا جائے گا۔"

میں آفتاب خان کی باتیں سن رہا تھا اور میرے سینے میں عجیب سا دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ جاہلیت اور توہم پرستی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ وہ اندھے عقیدوں کا غلام بن جاتا ہے۔ ان عقیدوں کا نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلے، اپنے خیالات پر اس کا یقین پختہ سے پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انتہا پسندی کی وجہ سے یہ لوگ اپنے ہی دشمن ہونے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں۔ ذرا ذرا سے اختلاف پر ایک دوسرے کو دین دھرم سے خارج قرار دے دیتے ہیں۔ یہاں بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔ انتہا پسندی کی وجہ سے موہن کمار کی قاتلہ (یعنی سلطانہ) کو بے دردی سے زندہ جلانے کی سزا دی گئی تھی۔ اسی انتہا پسندی نے ایک اور خود ساختہ فیصلہ کیا اور تیرہ سیوکوں کی ہتھیا کرنے کے الزام میں اپنے ہی ساتھی گرو سوبھاش کو موت کے گھاٹ اتارا اور اس کا سر دیوی کے چرنوں میں رکھا۔ اس سفا کی کا ردعمل یہ ہوا کہ اب مہندر، پٹیل اور خود رام پرشاد موت کے گھاٹ اتر چکے تھے اور ابھی یہ سلسلہ رکا نہیں تھا۔ دونوں طرف کے مرنے والے خود کو رتبہ شہادت پر فائز سمجھ رہے تھے۔ بڑھیا کی دقیانوسیت اپنے پچاس پچپن سالہ صحت مند بیٹے کی جان لے چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی اس خونی حماقت کو بھی ایشور کا کوئی بھید قرار دے رہی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جب اندھے بھگوان کے ساتھ رام پرشاد اپنے ہاتھ تیل کی کڑاہی میں ڈال رہا تھا۔ ایک جھرجھری سی آ گئی۔

یہ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ تہ خانوں میں زیادہ تر افراد سو چکے تھے، شاید تاؤ افضل جاگ رہا ہو۔ عمران اور اقبال والے کمرے میں بھی خاموشی تھی۔ سلطانہ میرے ساتھ والے بستر پر سوئی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ زرد نظر آ رہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی تھیں۔ وہ زیادہ خوب صورت نہیں تھی مگر اس کے چہرے کی

سادگی میں ایک کشش تھی۔ جسمانی موزونیت اور اس کشش نے مل کر اس کی شخصیت کو پُراثر بنا دیا تھا۔ کسی وقت جب وہ ہلکا سا سنگھار کر لیتی تھی تو مزید قابلِ توجہ ہو جاتی تھی۔

مجھے لگا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ثروت مجھ سے دور جا چکی تھی۔ ثروت کے بے پناہ خلا کو پُر کرنے کے لیے سلطانہ میری زندگی میں آئی تھی... اور اس نے آنے کا حق ادا کیا تھا۔ کچھ باتیں میرے علم میں تھیں اور کچھ نہیں تھیں۔ ہمارے ایک استاد کہا کرتے تھے: محبت اور ناکامی میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ محبت میں ناکامی کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ کچھ لوگ تو سچی محبت ہی اس کو کہتے ہیں جو ناکام ہو۔ مرد جب محبت میں ناکام ہوتا ہے تو بری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ زندگی گزارنا دنیا کا دشوار ترین کام لگنے لگتا ہے۔ ایسے میں ایک "دوسری عورت" اس کی زندگی میں آتی ہے۔ یہ دوسری عورت تائیدِ غیبی کی طرح ہوتی ہے۔ یہ مرد کی زندگی کے مسمار کھنڈر میں سے ایک نئی عمارت کے خدوخال ابھارتی ہے۔ خداداد صلاحیتوں، جذبوں اور خوب صورتیوں کی مدد سے مرد کی زندگی کو پھر سے زندگی بناتی ہے۔ پہلی عورت بے شک پہلی ہوتی ہے لیکن یہ دوسری بھی قدرت کی صناعیوں اور عنایتوں کا بے مثل نمونہ ہے۔ یہ دوسری چارہ گر عورت نہ ہوتی تو شاید ناکام محبت کا عفریت اَن گنت بدنصیبوں کو نگل چکا ہوتا۔

یہ بات کہنے کے بعد ہمارے استادِ محترم نے کلاس میں بیٹھی ہوئی ایک کم صم لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا تھا... ہاں اس "دوسری عورت" کی طرح ایک دوسرا مرد بھی ہوتا ہے۔ قدرت نے مرد و زن میں سے کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے۔

میں سلطانہ کو دیکھ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ آج میں اس "دوسری عورت" کو دیکھ رہا ہوں۔ جب میں نے ثروت کو کھویا تھا تو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، زخم زخم ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے مہلک زخموں کا مداوا کرنے والی وہ دوسری عورت لاہور سے ہزاروں میل دور اتر پردیش کے اس دور دراز راجواڑے کے ایک چھوٹے سے گھر میں موجود ہے اور میری تقدیر مجھے اس کی طرف کھینچ رہی ہے۔

نیند کی حالت میں سلطانہ کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھے تھے۔ یہی وہ ہاتھ تھے جن سے اس نے مجھے کبھی جلتے ہوئے پگوڈا کے اندر سے نکالا تھا۔ میں نے محبت سے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ نرمی سے اس کے بالوں کو چھوا، پھر نگاہوں سے اس کی پیشانی کو الوداعی بوسہ دیا اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہاں، میں جانے کے لیے تیار تھا۔ میرے اندر کے بے پناہ اضطراب کا علاج اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا کہ میں سارے اندیشوں اور خطروں کو ایک دیوانی ٹھوکر مار کر یہاں سے نکل جاؤں۔ زرگاں کا رخ کروں اور سلطانہ کی عزت کے ہتھیارے سے قرار واقعی انتقام لے لوں۔ میں نے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اس بارے میں بہت سوچ بچار کی تھی۔ ہر چھوٹی بڑی تفصیل پر غور کیا تھا۔ اس وقت میرے کپڑے کی جیکٹ کی جیب میں بھرا ہوا پسٹل موجود تھا۔ پسٹل کے دو فالتو میگزین اور قریباً سو راؤنڈ بھی میرے پاس تھے۔ اس کے علاوہ ایک شکاری چاقو اور ٹارچ بھی تھی۔ تھوڑا سا خشک راشن بھی میں نے لے لیا تھا۔

کل دوپہر جب سلطانہ میری گردن کے زخم کی پٹی کرنے کے بعد اوپر کلثوم اور رادھا کے پاس چلی گئی تھی، میں نے دروازہ اندر سے بند کیا تھا اور طلال کے ساتھ مل کر کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ ایک دراز میں بچھے ہوئے میلے کپڑے کے نیچے سے مجھے پوٹھین کی وہ چھوٹی سی پڑیا مل گئی جس کا ذکر طلال نے کیا تھا۔ اس پڑیا میں نیلے تھوتھے جیسا کوئی مہلک سفوف موجود تھا۔ طلال اپنی عمر سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر سمجھا دیا تھا کہ میں کہاں جانے اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے اور طلال کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ میرے جانے کے بعد وہ سلطانہ اور عمران وغیرہ کو بتا دے گا کہ میں کہاں گیا ہوں... اور میری طرف سے سلطانہ کو پوری تسلی بھی دے گا کہ میں تین چار دن کے اندر اندر یہاں واپس پہنچ جاؤں گا۔

نصف شب کی ان گھڑیوں میں، میں نے خود کو ریاست کپل وستو کے راجا سدھارت کی طرح محسوس کیا، جو آدھی رات کو اپنی محبوب بیوی کو سوتا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا تھا اور نامعلوم منزلوں کا راہی ہو گیا۔ میں بھی یہاں سے نکل رہا تھا لیکن... لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں زیادہ دور نہیں جا سکوں گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرے ساتھ کچھ ایسا ہوگا جو میرے پروگرام میں بالکل شامل نہیں۔

پروگرام یہی تھا کہ میں پہلے کی طرح مندر سے نکلوں گا۔ مجھے سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کے کمرے میں جانا تھا جہاں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ امید تھی کہ بارہ سوا بارہ کے قریب آفتاب یہاں آئے گا......... مجھے دروازے پر سے ہی ساتھ لے کر باہر نکل جانا تھا اور اسے پابند کر دینا تھا کہ وہ آج رات واپس مندر میں، عمران وغیرہ کے پاس نہیں

آسنے گا۔

حسبِ پروگرام میں خاموشی سے لکڑی کی کشادہ سیڑھیاں چڑھ کر سب سے اوپر والے تہ خانے میں پہنچا اور پھر کاٹھ کباڑ والے تاریک کمرے میں چلا گیا۔ آفتاب کی آمد میں اب پندرہ بیس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ آج کہیں ناغہ نہ کر لے۔ میرے کان باہر کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ آوارہ کتوں کی مدھم آوازوں کے علاوہ باہر مکمل خاموشی تھی۔

اچانک ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکایا۔ یہ باہر سے نہیں تاریک کمرے کے اندر سے ہی آئی تھی۔ یہ عمران تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”جگر! چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے۔ یہ تو آدھی رات ہے... بھئی یہ تو آدھی رات ہے۔“

وہ بلی کی چال چلتا ہوا اتنی صفائی و مہارت سے مجھ تک پہنچا تھا کہ میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ مجھ سے فقط دو تین فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔

”تت... تم یہاں؟“ میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے... یہ تو آدھی رات ہے...“ اس نے پھر شعر پڑھا۔ ”میں آفتاب کا انتظار کر رہا تھا۔“

”کس لیے؟“

”بتانا ضروری ہے؟“ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

”نہیں... کیونکہ مجھے کافی حد تک اندازہ ہو گیا ہے۔“ اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے میری جیکٹ کے ابھرے ہوئے حصے کو ٹٹولا۔ یہاں پسٹل کے فاضل راؤنڈ موجود تھے۔ میں جھنا گیا۔ کبھی کبھی وہ حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارا؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”مسئلہ تو تمہارا ہے جو اس طرح بغیر کسی کو بتائے آفتاب کے ساتھ باہر نکل جاتے ہو۔ اور میرا اندازہ ہے کہ اس مرتبہ تمہارا ارادہ یہیں آس پاس جانے کا نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے... ٹھیک ہے میں جا رہا تھا... بلکہ میں جا رہا ہوں۔ میں تمہارا ماتحت نہیں ہوں کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تم سے اجازت لوں۔“

”جگر! یہاں کوئی ماتحت اور باس نہیں ہے لیکن ہمارا نفع نقصان تو ایک ہے نا۔ ہم میں سے کوئی نہیں چاہے گا کہ اس کی وجہ سے کسی دوسرے کا نقصان ہو۔“

”میرے جانے سے بھی کسی کا نقصان نہیں ہوگا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اپنی جان دے دوں گا لیکن تم لوگوں کے بارے میں ایک لفظ... ہاں، ایک لفظ زبان سے نہیں نکالوں گا۔“

”واہ... یہ بات تم نے اچھی کہی ہے۔ کیا تمہارے جان دے دینے سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا؟ گدھے! ہم تو جیتے جی مر جائیں گے۔ کم از کم میں تو ضرور وفات پا جاؤں گا۔“

”مسخرہ پن نہ کرو عمران... میں نے فیصلہ کر لیا ہے مجھے یہاں سے جانا ہے۔“

”جارج گورا کی طرف؟“ اس نے ڈرامائی لہجے میں پوچھا۔

”ہاں، جارج گورا کی طرف۔“ میں نے سینہ تان کر کہا۔

وہ چند لمحے تک میرے پُرتپش، باغی لہجے پر غور کرتا رہا پھر بولا۔ ”جارج گورا کی طرف ہم دونوں جائیں گے لیکن اس وقت جب جانا مناسب ہوگا۔“

”مناسب اور نامناسب کا فیصلہ تم مت کرو۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ اس معاملے سے میں ہی نمٹوں گا۔“

”یہاں کسی کا کوئی معاملہ ذاتی نہیں ہے۔“ عمران کے لہجے میں پہلی بار تُرشی آئی۔ ”ہم سب کی قسمت ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے دوسروں کے لیے مصیبت ہو۔“

”میں نے کہا ہے نا میری وجہ سے تم لوگوں کو...“

”پلیز تابی، پلیز... سمجھنے کی کوشش کرو... ہمارا دشمن بہت خطرناک ہے۔ ہماری جلد بازی اسے اور خطرناک بنا سکتی ہے... ہمیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”انتظار... انتظار... میں نہیں کر سکتا اب انتظار۔ وہ مر جائے گی... وہ مر رہی ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔“

اسی دوران میں بیرونی دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں۔ چند لمحے بعد آفتاب اپنے ٹریڈ مارک لالٹین اور لاٹھی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی نہایت سرد ہوا کا جھونکا بھی اندر آیا۔ آفتاب کے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی تھی جس میں راشن وغیرہ تھا۔ ہم دونوں کو تناؤ کی حالت میں وہاں کھڑے دیکھا تو... حیران رہ گیا۔

میرے اندر عجیب سا اشتعال پیدا ہو چکا تھا۔ دروازہ کھلا تو میں بے جھجک دروازے کی طرف بڑھا۔ عمران نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روکا۔ ”کیا کرتے ہو تابی! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟“

”ہاں... اور تم بھی ہوش کرو... آقا بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، سوچ سمجھ کر رہا ہوں۔“

”تم سوچ سمجھ کر نہیں کر رہے۔ تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ ادھر آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ اس نے میرا بازو پکڑا اور اس کے ساتھ ہی آفتاب کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ آفتاب نے دروازے کو کنڈی چڑھا دی۔

”آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہاری آنکھیں کھولوں۔“ عمران نے کہا۔ میرا بازو بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔

”تم جو مرضی کر لو عمران... لیکن میں آج رکوں گا نہیں۔“

”پہلے میری بات سن لو پھر فیصلہ کرنا۔“

عمران مجھے لے کر بالائی تہ خانے میں آ گیا۔ اس نے آفتاب کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ ایک کمرے میں آ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ یہاں ایک بڑی لالٹین روشن تھی اور فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ عمران نے مجھے اور آفتاب کو چٹائی پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”تمہیں خطرے کا اتنا احساس نہیں جتنا ہونا چاہیے۔ تمہیں یاد ہے کل میں آفتاب سے باتیں کر رہا تھا اور تمہیں دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ تم نے پوچھا تھا، کیا باتیں ہو رہی ہیں۔“

”اور تم نے ہمیشہ کی طرح بات کو مذاق میں ٹال دیا تھا۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”اس مذاق کی کوئی وجہ تھی۔ اگر میں وجہ بتا دیتا تو شاید تمہارا اب تک کا وقت بڑی پریشانی میں گزرتا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”چھ سات دن پہلے تم نے اپنی من مانی کی اور باہر چلے گئے۔ ٹھیک ہے کہ اس من مانی کا نتیجہ اچھا نکلا اور تم کلثوم کو ستیش اور مہندر وغیرہ سے بچا کر یہاں لے آئے لیکن اس کا ایک نتیجہ برا بھی نکلا ہے۔ بے شک تم تھوڑی دیر کے لیے تہ خانے سے باہر رہے ہو مگر یہ تھوڑی دیر بھی نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ آفتاب خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم بتاؤ خان۔“

آفتاب نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ ”تابش برادر! منگل کے روز صبح سویرے کچھ لوگ ایک جیپ پر سوار ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس وقت گاؤں کا سب لوگ سو رہا تھا۔ ان جیپ والوں نے ام کو بتایا کہ وہ شکاری ہے اور ایک ایسے بندے کو ڈھونڈ رہا ہے جو ان کا دو انگلش رائفلیں اور بہت سا کارتوس لے کر بھاگ گیا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ایک تصویر دکھایا۔ ام یہ تصویر دیکھ کر ایک دم حیران رہ گیا۔ وہ آپ کا تصویر تھا۔ لگتا تھا کہ آپ جیل میں کھڑا ہے... شاید زرگاں کے جیل میں۔ آپ نے جیل کے قیدیوں والا وردی بھی پہنا ہوا تھا۔ ام یہ تصویر دیکھ کر حیران تو بہت ہوا لیکن ام نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ام نے کہا کہ کچھ مہمان وغیرہ تو گاؤں میں ضرور آیا ہوا ہے لیکن ام ان سب کو جانتا ہے۔ ان میں یہ بندہ تو نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ام کو آپ کا دو فوٹو اور بھی دکھایا لیکن ام نے ماننے سے صاف انکار کیا۔“

آفتاب نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ ”ان لوگوں کے پاس جیپ میں ایک انٹینا قسم کا چیز بھی رکھا تھا۔ وہ اس انٹینا کو لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ کھیا کے گھر کی طرف بھی گیا پھر مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اس نے جاتے جاتے ام کو پانچ سو روپیا بخشش دیا اور بولا۔ ”خان! ہمارے آنے کے بارے میں تم کسی کو بتاؤ گے نہیں۔ اس شکل کے بندے کا دھیان رکھنا۔ ام کچھ دن بعد پھر یہاں کا چکر لگائے گا۔ اس کے بعد وہ لوگ چلا گیا۔“

عمران نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تابی! اس رات تم اور ہم سب اس لیے اس قسم کے لوگوں سے بچے رہے کہ تم سب سے نیچے والے تہ خانے میں تھے۔ اگر تم اوپر والے تہ خانے میں ہی ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ وہ منحوس انٹینا تمہاری چپ کے سگنل پکڑ لیتا... وہ لوگ رفان نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اس علاقے میں تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب تم کلثوم کی مدد کرنے کے لیے اوپر بستی میں گئے تو ان لوگوں نے تمہارے سگنل پکڑے۔ تمہارے باہر نکلنے کا مطلب پکڑے جانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔“

”یا خدا! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ایک گاڑھا دھواں میرے سینے میں بھرنے لگا۔ مجھے لگا جیسے میں آزاد نہیں ہوں۔ ایک نہایت تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند ہوں۔ اتنی تنگ کوٹھڑی ہے کہ میں سیدھا کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اب سے نہیں نامعلوم زمانوں سے اس کوٹھڑی میں

ہوں۔ بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن بھاگ نہیں سکتا۔

میری فرسٹریشن انتہا کو پہنچ گئی۔ شدید جھنجلاہٹ اور تپش کے زیراثر میں نے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر زوردار مکا مارا۔ موٹی لکڑی کی یہ تپائی ٹوٹ گئی... میرے بازو میں ہاتھ سے لے کر کندھے تک درد کی ٹیس اٹھی لیکن ایسی ٹیسیں مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں کرتی تھیں۔

آفتاب حیرت سے کبھی میری طرف اور کبھی ٹوٹی ہوئی تپائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران بھی کچھ دیر بھونچکا رہا۔ پھر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ "حوصلہ رکھو تابی! سب ٹھیک ہوجائے گا مگر... ہمیں طریقے سے چلنا ہوگا۔ سب سے پہلے ہم اس منحوس "چپ" سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی ہم یہاں سے نکلنے اور کچھ کرنے کے قابل ہوسکیں گے... تم دیکھنا..."

"کچھ نہیں ہوگا... کچھ نہیں۔" میں نے تیزی سے عمران کی بات کاٹی اور پاؤں پٹختا ہوا نچلے تہ خانے کی طرف چلا گیا۔

میرے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا ابھی جیکٹ سے شکاری چاقو نکالوں اور آئینے کی طرف پشت کر کے کھڑا ہوجاؤں۔ پھر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی گردن کا پچھلا حصہ چیر ڈالوں اور اس منحوس دھاتی ٹکڑے کو اکھاڑ کر پھینک دوں جس نے کئی برس سے مجھے اس "اسٹیٹ" میں زنجیر کر رکھا ہے۔ میرے اس دیوانے "آپریشن" کا نتیجہ کچھ بھی ہو مگر میں یہ کام کر گزروں۔

میرے ہاتھ سے تھوڑا سا خون رسنے لگا تھا۔ میں نے روئی سے اسے صاف کیا۔ سلطانہ ابھی تک سو رہی تھی۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے ملیح چہرے پر وہی کرب تھا جو بیداری میں اسے گھیرے رکھتا تھا۔ اس کرب اور بے قراری کی وجہ وہ بے پناہ زخم تھا جو سلطانہ کے جسم سے لے کر اس کی روح تک اترا ہوا تھا۔ مجھے اس زخم کا مرہم تو معلوم ہوگیا تھا مگر مرہم تک رسائی ممکن نظر نہیں آرہی تھی۔

طلال ابھی جاگ رہا تھا۔ اس نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں اسے لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا اور اسے بتایا کہ میری روانگی ملتوی ہوگئی ہے۔ کم از کم میں آج رات تو نہیں جارہا۔

"کیوں جی؟"

"بس کوئی وجہ ہے... تم ابھی اپنی خالہ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔"

"ٹھیک ہے جی۔" اس نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔

میں نے طلال سے پوچھا۔ "تمہاری خالہ کو اب تک پتا کا پتا تو نہیں چلا؟"

"نہیں جی۔ ابھی تک تو نہیں۔"

"کوئی اور بات کی ہے انہوں نے؟"

"نہیں جی... لیکن کل دوپہر جب آپ اوپر عمران بھائی اور نادر افضل کے ساتھ بیٹھے تھے، وہ نوری سے کچھ بات چیت کر رہی تھیں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میں نے سنا تو کچھ نا ہیں جی... پر میں نے نوری کو خالہ کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ ایک دم گم صم نظر آرہی تھی۔"

میرے اور طلال کے درمیان دو چار منٹ مزید بات ہوئی پھر وہ سونے کے لیے چلا گیا۔

میں نے بے حد مایوسی کے عالم میں اپنا پسٹل، ٹارچ اور فالتو راؤنڈز وغیرہ جیکٹ سے نکال کر پھر سے الماری میں رکھ دیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ اندر کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد میں پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ دفعتاً دھیان نوری کی طرف چلا گیا۔ وہ مجھے بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ سلطانہ سے زبردست جھاڑیں کھانے کے بعد وہ جیسے ایک دم اوجھل ہوگئی تھی۔ آج بند کمرے میں سلطانہ اس سے نہ جانے کیا بات کرتی رہی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں سیڑھیاں چڑھا اور درمیانی تہ خانے میں آگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ رات کو دیر سے سوتی ہے اور پھر دن چڑھے تک پڑی رہتی ہے۔ شاید اس کی یہ عادت کھیا کی حویلی میں پختہ ہوئی تھی جہاں وہ سلمان سلو کی رکھیل تھی۔ یقیناً سلمان سلو کے ساتھ ساتھ اسے اس کے یار دوستوں کی میزبانی بھی کرنا پڑتی ہوگی اور ایسی میزبانیاں زیادہ تر رات کو ہی ہوتی ہیں۔

میں نوری کے کمرے کے پاس سے گزرا تو اندر لالٹین کی مدھم روشنی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی گنگنانے کی نہایت مدھم آواز بھی سنائی دی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ نوری ابھی جاگ رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس میں نوری کے ساتھ پہلے گرو کی چیلی رادھا بھی سوتی تھی لیکن رادھا ایک دھرمی لڑکی تھی۔ ایک مسلمان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا اس کے دھرم کو کلپٹ کرتا تھا اس لیے اسے اوپر والے تہ خانے میں نسبتاً بڑا کمرا دے دیا گیا تھا جہاں پوجا کے لیے بہت سی مورتیاں موجود تھیں۔

میں نے تھوڑی سی کوشش کی اور ایک کھڑکی میں ایک باریک سی جھری ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ میں نے جھری سے آنکھ لگائی۔ کمرے کا ایک تہائی منظر ہی نظر آسکا۔ اس منظر میں نوری بھی شامل تھی۔ وہ حسب معمول گھٹا گرا چولی میں تھی تاہم سر پہ چنری نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ پر مہندی لگائی ہوئی تھی اور دائیں ہاتھ سے اپنے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی لالی لگا رہی تھی۔ اس کے سامنے پرانی طرز کا ایک بیضوی آئینہ تھا۔

لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ ان تاثرات میں انتظار، امید، خواہش سب کچھ شامل تھا۔ شاید یہ امید اور خواہش وہی تھی جو ہر لڑکی کے دل میں اس کی عمر کے ساتھ پروان چڑھتی ہے اور پھر ایک روز شدید تمنا کا روپ دھار لیتی ہے... ایک شوہر، ایک گھر اور پھر ایک ہمکارتے ہوئے بچے کی آمد۔ خوش رنگ شام، کسی کے قدموں کی چاپ کا انتظار... اور پھر پھولوں بھرے آنگن میں زندگی کی کھٹی میٹھی خوشیاں۔ نوری کوئی کنواری دوشیزہ نہیں تھی۔ اس کے جسم پر نہ جانے کتنے گندے ہاتھوں کے نشان تھے لیکن پھول تو سڑے ہوئے کیچڑ میں بھی اگتے ہیں۔ آرزوؤں پر کوئی روک نہیں لگائی جاسکتی۔ عمران نے نوری کو ایک اچھی زندگی کی آس دلائی تھی اور شاید وہ اس وقت آئینے میں اسی آس کے نقش دیکھ رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا... اور پھر اندر چلا گیا۔ نوری نے مجھے گھوم کر دیکھا اور ایک دم ٹھٹک گئی۔ اس نے چنریا کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ وہ سامنے کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ وہ اسے لینے کے لیے لپکی۔ مہندی والی تھالی پر اس کا پاؤں پڑا اور بری طرح رپٹ گیا۔ وہ گر گئی۔ "اوئی اللہ جی۔" اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے اسے اٹھانا چاہا مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بری طرح سمٹی ہوئی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے چنری کھونٹی سے اتاری اور اپنا سر اور سینہ ڈھانپ لیا۔

وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی تھی۔ "بابو جی! آپ یہاں کیسے؟" وہ ہکلائی۔

"یونہی روشنی دیکھ کر آگیا ہوں۔ پر تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"کچھ نا ہیں جی۔ آپ کی "وہ" بڑی سخت ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا تو میرا حشر نشر کر دیویں گی۔ آپ کا تو کچھ نا ہیں جاوے گا، پر ان کی مار سے مجھ غریبنی کی ساری چمڑیں ہل جاویں گی۔" وہ بار بار سینے پر دوپٹا درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سلطانہ نے اس حوالے سے اسے خاص ہدایات دے رکھی ہیں۔

میں نے کہا۔ "زیادہ گھبرانے کی بات نہیں۔ وہ اس وقت کمرے میں ہے اور سو رہی ہے۔ اس کے ادھر آنے کا چانس بالکل نہیں۔"

"لیکن... بب... بابو جی... میں... دراصل... اس طرح کی لڑکی نا ہیں ہوں۔ وہ تو آپ کو پتا لگ ہی گیا ہوگا۔ مجھے عمران بابو نے کہا تھا کہ آپ سے ذرا ہنس کھیل کر بات کروں۔ وہ چاہت تھے کہ آپ میاں بیوی میں ذرا جلدی سے صلح ہو جاوے۔ اس کے علاوہ کوئی بات نا ہیں تھی جی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے سب پتا ہے۔ تمہیں صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہی تھی۔ "میں تم سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کل دوپہر سلطانہ نے تمہیں کیوں بلایا تھا... کچھ کہا تھا اس نے؟"

"کوئی خاص بات تو نا ہیں تھی جی۔ بس وہی باتیں تھیں جو وہ پہلے بھی دو تین بار کر چکی ہیں... وہ آپ سے بہت زیادہ پریم کرتی ہیں جی۔ جتنا آپ کو بتاتی ہیں، شاید اس سے بھی کئی گنا زیادہ۔ وہ آپ کے پاس میرا سایہ بھی دیکھنا نا ہیں چاہتیں بلکہ شاید کسی لڑکی کا سایہ بھی نا ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہوں نے مجھے بس چھوڑا ہے، معاف نہیں کیا اور اگر آئندہ مجھ سے اس بارے میں کوئی چھوٹی سی غلطی بھی ہوئی تو وہ ایسا کچھ کر گزریں گی کہ میں سوچ بھی نا ہیں سکتی۔ انہوں نے مجھ سے کہلوایا کہ میں آپ کو اپنا بھائی سمجھت ہوں۔ میں نے فوراً کہہ دیا۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نا ہیں ہے جی۔ میں نے بتایا ہے نا، میں نے جو کچھ کیا..."

"ہاں ہاں، مجھے پتا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا عمران کے کہنے پر کیا۔ میں صرف یہی پوچھنے آیا تھا کہ تمہارے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟"

"باتیں تو بس یہی ہوئی تھیں جی... بس مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے... کہیں چلے جانا ہے اور وہ سوچ رہی ہیں کہ ان کے جانے کے بعد بھی میں کوئی ایسی ویسی غلطی نہ کروں... یا پھر شاید وہ ویسے ہی بہت زیادہ وہمی ہوگئی ہیں۔" نوری نے اپنے کشادہ گریبان پر پھر آنچل درست کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا کہ اسے کہیں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس جی، یونہی۔ ایویں میرے دل میں بات آرہی تھی۔ وہ مجھے سمجھا رہی تھیں کہ بندہ، بندوں سے تو چھپ سکت ہے لیکن خدا سے نا ہیں چھپ سکت۔ یہ بات کبھی نا ہیں سوچنی چاہیے کہ جھوٹ چھپا رہے گا۔ جلدی یا دیر سے اس کا پتا ضرور چل جاوت ہے۔ بس اس طرح کی باتیں کر رہی تھیں۔"

ایک دم سیڑھیوں کی طرف آہٹ ہوئی۔ نوری کا رنگ

ہلدی ہوگیا۔ اس نے آنچل کو مضبوطی سے سینے پر تھاما اور ڈری ڈری آواز میں بولی۔ ”کوئی آرہا ہے۔“

میں نے دروازے پر پہنچ کر نیچے جھانکا۔ کوئی سیڑھیوں پر تھا مگر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے میں نے سیڑھیوں کی اوپری ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھے اور اپنا جسم آگے کو جھکایا تاکہ نیچے دیکھ سکوں۔ اس کے لیے مجھے گردن کو پورا خم دینا پڑا۔ گردن کے پچھلے حصے میں سر کے نیچے، زخم میں ٹیس سی اٹھی۔ بہرحال میں دیکھنے میں کامیاب رہا۔ وہ تایا افضل تھا۔ ہاتھ میں چوکیداری والی لٹھ لیے وہ ڈگمگاتا ہوا دو تین زینے چڑھا پھر ایک زینے پر بیٹھ گیا۔ میں نے رات کو اسے اکثر اسی زینے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ زینہ اس دروازے کے عین سامنے تھا جہاں اس کی دونوں بیٹیاں کلثوم کے ساتھ سوتی تھیں۔ وہ اس نہ جانے میں بھی ان کا پہرا دیتا تھا۔ اس کا دل شاید یہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹیاں چند لمحوں کے لیے بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوں۔ وہ فتح پور کا نگہبان تھا۔ کالی راتوں میں وہ اپنے گھر کو بھول کر دوسروں کے گھروں کا پہرا دیتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس کے اپنے ہی گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ اس کی بیوی جان سے چلی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا زخم تھا جس نے فتح پور کے اس نگہبان کو نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ اب وہ صرف اپنی جوان بیٹیوں کا نگہبان تھا۔ ان کی طرف سے آنکھ جھپکنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

میں واپس مڑا۔ نوری سے چند منٹ اور گفتگو کی۔ وہ بہت ڈر رہی تھی اس لیے میں نے زیادہ دیر اس کے کمرے میں رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ نوری سے گفتگو کے دوران میں بھی میری گردن سے ٹیسیں اٹھتی رہیں لیکن میں نے انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی۔ گردن کے اس زخم کا مناسب علاج کہیں ہوسکتا تھا اس لیے ذرا سے کھچاؤ کے سبب زخم سے خون رسنا شروع ہوجاتا تھا۔

میں واپس اپنے کمرے میں آگیا اور آئینے میں دیکھ کر خود ہی خون کا رساؤ روکا۔ تازہ پٹی باندھ کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ درد میں کمی واقع نہیں ہورہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گردن کا سارا پچھلا حصہ اور کندھے دھیرے دھیرے سن ہورہے ہیں..... میں درد برداشت کرنے میں ماہر ہوگیا تھا۔ میں درد کی لہروں میں ڈوب جاتا تھا اور جس طرح دھند کے اندر چلے جانے سے دھند اوجھل ہونے لگتی ہے، میرا درد بھی شدت کھونے لگتا تھا۔ مگر آج معاملہ کچھ مختلف تھا۔ جوں جوں رات بھیگتی گئی، درد کی شدت بڑھتی گئی۔ یہی کیفیت میں نے کچھ دیر کے لیے کل رات بھی محسوس کی تھی مگر آج تو حد ہورہی تھی۔

میں درد سے لڑتا رہا۔ بار ونداجیکی اس حوالے سے مجھے بہت کچھ سونپ گیا تھا اور وہ جو کچھ سونپ گیا تھا، میں اسے بروئے کار لا رہا تھا۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ میں ہولے ہولے کراہنے پر مجبور ہوگیا۔ میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ لگایا تو وہ پسینے سے تر تھی۔ گردن ہی نہیں پورے جسم میں درد کی شدت سے اینٹھن محسوس ہورہی تھی۔ بے پناہ درد سے لڑتے لڑتے مجھے محسوس ہونے لگا جیسے درد کے حوالے سے میرا سارا فلسفہ بے کار ہے۔ تکلیف، تکلیف ہی ہوتی ہے..... اسے کب تک اور کس حد تک سہا جا سکتا ہے مگر پھر فوراً ہی اپنے اس خیال کو...... رد بھی کیا۔ رات تین بجے کے قریب میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا..... تاہم میں نے سلطانہ کو جگایا اور نہ کسی دوسرے کو مدد کے لیے پکارا۔ میرے اور درد کے درمیان ایک جنگ جاری تھی اور ہم میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ایک ضد سی میرے اندر پروان چڑھتی جارہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بے ہوش ہوجاؤں گا لیکن کسی کو مدد کے لیے نہیں بلاؤں گا۔

اور تب واقعی مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بے ہوش ہورہا ہوں۔ میرے کندھے اور ریڑھ کی ہڈی سن ہوتی چلی جارہی تھی۔ دفعتاً ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا اور مجھے بری طرح چونکا گیا۔ میری گردن کا یہ تازہ زخم اس جگہ کے بالکل قریب تھا جہاں زرگاں کے سرجن اسٹیل نے میرے اندر ”چپ“ پلانٹ کر رکھی تھی۔ کہیں میرا یہ زخم اس ”چپ“ کو تو افیکٹ نہیں کر رہا تھا؟

یہ خیال کسی دہکتی ہوئی سلاخ کی طرح میرے سینے میں لگا۔ ڈاکٹر لی وان نے کہا تھا کہ وہ چپ بڑی نازک جگہ پر پلانٹ کی گئی ہے۔ اسے نکالتے ہوئے میرے عصبی نظام کو بھی گزند پہنچ سکتی ہے..... کیا میرے ساتھ کچھ اسی طرح کا معاملہ تو نہیں ہونے والا تھا؟

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پسینے سے میرے سارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ کرب کی شدت سے میری آنکھوں کے سامنے تاریکی سی چھانے لگی۔

”کیا بات ہے مہروج؟“ سلطانہ کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ تشویش سمٹ آئی تھی.....

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آگئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر سیٹھ سراج نے مجھے زدوکوب کیا اور میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صنوبرا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صنوبرا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ وہ عمران کو حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سرد مہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا۔ سلیم کی موت کا بدلہ لینے کے لیے عمران نے نادیہ کو گولی مار دی۔ میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ میرے اہل خانہ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو موقع سے بھگا دیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگالیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسد خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اترپردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھان گڑھ اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی تل پانی میں آگئی۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کارمختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ بعدازاں مجھے زرگاں میں گوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صنوبرا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے گوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ مجھ پر تشدد کر کے سلطانہ کو مجبور کیا گیا اور اس نے جارج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر میں بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے چوہان اور دیگر لوگ مل گئے جو وہاں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے جارج گورا کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ سلطانہ بھی یہیں تھی۔ میں وہاں کے تین افراد کے ساتھ خاموشی سے جارج کو قتل کرنے کے ارادے سے نکل پڑا مگر جارج نے اپنا راستہ بدل دیا۔ پھر ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہم نے ایک نہر کے پاس پہنچ کر کشتی میں سفر کیا۔ اس کشتی میں ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعدازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا سور چیمپئن ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ماریا کے اغوا کا مقصد اپنی بہت ساری باتیں منوانا تھا۔ فہر جو بان اور میں نے یہ پتا لگالیا کہ میرے جسم میں ایک چپ نصب کی گئی ہے۔ ماریا کے وارثوں کو دی گئی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہمارے بہت سے مطالبات مان لیے۔ ہمارے سات افراد کو رہا بھی کیا گیا۔ ہمیں غار سے نکلنے کا راستہ دیا گیا مگر غار سے نکلنے سے پہلے جیکی وہاں سے غائب ہو گیا۔ سفر کے دوران ہم ایک چوکی میں ٹھہر گئے۔ وہاں ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم چوکی سے نکلے لیکن اس کوشش میں احمد اور مہیش سمیت ہمارے چار ساتھی مارے گئے۔ ہم بھاگتے رہے اور ایک جگہ گھنے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔ میں خاموشی سے وہاں سے نکل پڑا۔ دوسرے دن چلتے چلتے اچانک مجھے زمین پر بیساکھی کے نشانات ملے اور میں اسے کھوجتا ہوا رودا جیکی تک جا پہنچا۔ پھر دشمن یہاں بھی پہنچ گئے اور انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہاں مقابلہ شروع ہو گیا۔ دشمن کو وہاں سے مار بھگایا گیا۔ مجھے اور جیکی کو تل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ کی ذہنی حالت خراب تھی۔ ایک دن وہ خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تل پانی پہنچنے والوں میں شکنتلا بھی شامل ہے۔ سلطانہ کے غیاب کے بعد اس کی تلاش جاری تھی۔ اسی تلاش کے دوران ہم سلطانہ کے دھوکے میں شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ میں نے شکنتلا کو جیکی کے بارے میں نہیں بتایا مگر ایک رات شکنتلا جیکی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ صبح ڈاکٹر لی وان کو بلایا گیا۔ اس نے جیکی کو اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا مگر راستے میں ہی جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ پر شک کیا جا رہا تھا۔ میں ایک روز اچانک اپنی نگرانی پر مامور لوگوں کو چکمہ دے کر دیوان سے نکل پڑا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ کٹر ہندو تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سلطانہ کو اپنے طور پر سزا دینا چاہتے ہیں لیکن ان کے پنڈت کے مطابق وہ سزا ایک خاص آدمی دینا جو وہ مجھے سمجھ رہے تھے۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ انہوں نے سلطانہ کو جارج اور حکم جی کے لوگوں سے چھڑا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے اور اسے سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ وہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے گیا۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ میرے ہاتھ میں مشتعل نما لکڑی تھما دی گئی۔ پھر ایک نوجوان اس پر تیل ڈالنے آیا۔ اس نے چہرے پر بھبوت مل رکھا تھا۔ اس نے عمران کا ذکر کیا تو میں ساکت رہ گیا۔ پھر وہ ہنسا تو اس کے ہموار دانتوں کی قطار نظر آئی۔ وہ عمران تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رات کو وہ مجھ سے ملنے آیا لیکن اپنے بارے میں زیادہ کچھ نہیں بتایا مگر اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ اس نے بتایا کہ مہاگر داور اس کی بیوی اس کے قبضے میں ہیں۔ گرو نے سلطانہ کی سزا تین دن کے لیے ملتوی کر دی۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر عمران نے مہاگرو کے ذریعے تاریکی میں دستور الٹا دیا اور وہاں موجود تمام پہرے دار بے ہوش ہو گئے۔ ہم ایک سکھ سردار کی گھوڑا گاڑی میں وہاں سے فرار ہوئے۔ اچانک درختوں سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ یہ آواز راہول کی تھی جسے ایک ریچھ بھنبھوڑنے میں مصروف تھا۔ عمران نے اس ریچھ کو بھگایا اور راہول کی جان بچائی۔ ہم ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے اور تاؤ افضل نامی شخص کے مکان میں ٹھہرے۔ وہاں قیام کے دوران گردسو بھاش وہاں سے بھاگ نکلا۔ یہ صورت حال تشویشناک تھی۔ ہم نے تاؤ افضل کا گھر چھوڑ دیا اور جنگل میں سفر کرنے لگے۔ ہمارا وہاں مزید ٹھہرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ تاؤ افضل اور اس کی بیٹیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ جنگل میں ہمیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ میں نے عمران سے کہا کہ وہ مجھے کچھ کرنے دے تاکہ سلطانہ کا مجھ پر اعتماد بحال ہو۔ میں نے ایک ڈاکو سے دو بدو مقابلہ کیا اور اس مقابلے کو تماشے کی شکل دے دی۔ مجھے کئی چوٹیں آئیں مگر میں نے اپنے مدمقابل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکوؤں کی فائرنگ سے راہول مارا گیا۔ ہم واپس بستی میں آئے مگر ہم نے ایک مندر کے تہ خانے میں قیام کیا۔ ہمارا وہاں قیام آفتاب خان نامی شخص کے تعاون سے ہوا۔ رات کو آفتاب باہر سے کوئی بری خبر لایا۔ اس نے بتایا کہ حالات ٹھیک نہیں۔ وہاں کافی ہندو جمع تھے۔ ہم نے ہوادان سے مندر کا منظر دیکھا۔ جنوبی ہندوؤں نے گردسو بھاش کا سر کاٹ دیا تھا اور پوجا پاٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے تاؤ افضل کے چچیرے بھائی کی فیملی کو بھی یرغمال بنا لیا تھا۔ [illegible] نے باقی لڑکوں کو تو چھوڑ دیا مگر کلثوم نامی جوان لڑکی کو پکڑ لیا تھا۔ میں رات کو آفتاب کی مدد سے مندر کے تہ خانے سے باہر نکل پڑا اور مکھیا کے مکان میں گھس لیا اور مکھیا کے بیٹے سے لڑکی کا پتا پوچھا۔ اس دوران میں وہ مجھ پر حملہ آور ہوا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میں نے اس کی لاش گھر میں موجود کنوئیں میں پھینک دی۔ میں اس مکان تک پہنچ گیا اور کلثوم کو وہاں سے نکال لایا۔ ہم واپس تہ خانے میں پہنچ گئے۔ سب میری اس دلیری پر حیران تھے۔ گردسو بھاش کی موت کے بعد جنوبی ہندوؤں کے دو گروہ بن گئے تھے اور ان میں کسی بھی وقت تنازع چھڑ سکتی تھی۔ کلثوم کے فرار کے بعد مہندر نے اس کا الزام رام پرشاد کی بہو پر لگایا اور فیصلہ ہوا کہ رام پرشاد جلتے تیل میں ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے گا۔ پھر پرکھشا کا وقت آگیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل میں ہاتھ ڈال دیے۔ وہ چلانے لگا۔ اس کے ہاتھ جل گئے تھے پھر جنوبی ہندوؤں نے رام پرشاد کو ہلاک کر دیا اور مالا کو پکڑ لائے۔ اب اسے جلتے تیل میں پھینکا جانے والا تھا۔ پھر عمران نے کچھ کرنے کا کہا اور گولی چلا دی۔ مہندر مارا گیا۔ ستیش کے آدمیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور وہ لوگ مالا کو نکال لے گئے۔ مندر میں آگ لگ گئی تھی۔ ہم واپس تہ خانے میں آگئے۔ میں رات میں دوبارہ مندر سے نکلنا چاہتا تھا مگر عمران نے مجھے روک لیا۔ میری گردن کے زخم سے خون کا رسا پھر شروع ہو گیا تھا اور تکلیف بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں درد سے لڑتا رہا۔ درد شدید تھا۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ سلطانہ نے مجھے آواز دی۔ وہ بھی اٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ تشویش تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

درد کی ٹیسیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے سلطانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کچھ نہیں۔ بس زخم میں تھوڑا سا درد ہے۔'' کوشش کے باوجود میری آواز لڑکھڑا گئی۔

سلطانہ چونک کر کھڑی ہو گئی اور سیدھی میری طرف آئی۔ اس کے چہرے کی تشویش کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اب چھوٹی موٹی تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ میری غیر معمولی جسمانی قوت برداشت کی بھی قائل ہو چکی تھی۔ وہ بہت ذہین تھی۔ سمجھ گئی کہ اگر اتنی برداشت کے باوجود میرے چہرے پر تکلیف کے آثار ہیں اور میں نے درد کی بات کی ہے تو پھر یہ کوئی معمولی درد نہیں ہے۔

وہ پلٹ کر میرے عقب میں آئی۔ اس نے میری گردن پر ہاتھ رکھا۔ اس کا ہاتھ مجھے ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا محسوس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری گردن اور شاید پورا جسم بری طرح تپ رہا ہے۔ اس نے منہ سے چیخ چیخ کی آواز نکالی اور سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ''مہروج! لگتا ہے کہ زخم خراب ہو رہا ہے۔ ساری جگہ سرخ ہو رہی ہے۔ سوجن بھی زیادہ ہو گئی ہے... میں عمران کو بلا کر لاتی ہوں۔''

میرے روکتے روکتے وہ باہر نکل گئی۔ ذرا دیر بعد عمران اور اقبال بھی میرے کمرے میں تھے۔ میری صورت دیکھتے ہی وہ دونوں سمجھ گئے کہ میں بے پناہ تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ عمران نے بھی میرے زخم کا معائنہ کیا۔ بے شک زخم کی حالت اچھی نہیں تھی لیکن میرا درد زخم کی نوعیت سے زیادہ تھا۔

جلد ہی عمران بھی اس نتیجے پر پہنچ گیا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں پہنچا تھا۔ وہ دبے دبے لہجے میں بولا۔ ''یہ معاملہ کچھ اور لگ رہا ہے...''

سلطانہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید وہ وضاحت چاہ رہی تھی لیکن عمران نے وضاحت نہیں کی۔ اس نے ایک طرف جا کر اقبال سے کچھ کہا۔ اقبال کمرے سے باہر گیا اور چند ہومیو پیتھک دوائیں لے کر آیا۔ یہ وہی دوائیں تھیں جو وہ استھان میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے ستیش اور گردسو بھاش وغیرہ کے سامنے خود کو ہومیو پیتھک ڈاکٹر ظاہر کیا ہوا تھا اور اس طرح گردسو بھاش کی نگاہوں میں اہمیت حاصل کر رکھی تھی۔ حالانکہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا اور ہومیو پیتھی کے بارے میں بھی معمولی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ ان دواؤں میں ایک دو درد کش ادویات موجود تھیں۔ عمران اور اقبال نے ان دواؤں کے ذریعے میرا درد کم کرنے کی کوشش کی۔ کچھ فرق نہیں پڑا۔ میرا بالائی دھڑ سُن ہوتا جا رہا تھا۔ سلطانہ کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اگر درد کوئی چھین لینے والی چیز ہوتی تو وہ کسی کو خاطر میں لائے بغیر اور اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے یہ درد مجھ سے چھین لیتی اور کسی صورت واپس نہ کرتی۔

بے پناہ درد اور میری قوت برداشت کے درمیان پانی پت کی لڑائی جاری رہی۔ ہم میں سے کوئی بھی ہارا نہیں۔ میں نے اپنی ہر کراہ کو اپنے ہونٹوں کے اندر محصور رکھا پھر قدرت کو مجھ پر ترس آگیا۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہوش

سے بے ہوشی کی سرحد میں داخل ہوتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا ہے اور کپڑے بھیگ چکے ہیں۔ سلطانہ میرے چہرے پر ہاتھ پھیر رہی ہے اور کرب ناک انداز میں کچھ کہہ رہی ہے۔ عمران کی آواز بھی مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

...دوبارہ ہوش آیا تو میں کروٹ لیے بستر پر لیٹا تھا۔ سر بھاری تھا اور ہلکا سا خمار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میری نگاہ سامنے بیٹھے اقبال پر پڑی۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اب طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میرا دھیان فوراً اپنی گردن کے درد کی طرف گیا۔ درد کی لہریں اب بھی اٹھ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی جس کے سبب میں ان لہروں کو زیادہ شدت سے محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ڈاکٹر افضل نے تمہیں افیم کھلانے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مشورہ کامیاب رہا ہے۔ تم پچھلے آٹھ پہر اطمینان سے سوتے رہے ہو۔'' اقبال نے اطلاع دی۔

میں حیران رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ میں اپنی صورتِ حال سے بے خبر رہا ہوں۔ متلی کی سی کیفیت محسوس ہوئی، اس کے علاوہ مثانے پر بوجھ بھی محسوس ہوا۔

''سلطانہ کدھر ہے؟'' میں نے اقبال سے دریافت کیا۔

اقبال نے انگلی سے دائیں طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا، سلطانہ ایک گوشے میں گدیلے پر کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ نڈھال ہو کر سوئی ہے۔

اقبال نے بتایا۔ ''بھابی، کل رات پچھلے پہر سے مسلسل جاگ رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ ایسے تو آپ خود بیمار ہو جائیں گی۔ بڑی مشکل سے کہہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے لٹایا ہے۔''

''عمران کہاں ہے؟''

''وہ کہیں گیا ہے۔ کل صبح سویرے نکل گیا تھا۔''

''اب کیا وقت ہوا ہے؟''

''صبح کے چار بجنے والے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ عمران کو نکلے تقریباً چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں... اس نے بتایا نہیں کہ کدھر جا رہا ہے؟'' میرے لہجے میں تشویش داخل ہو گئی۔

''تمہیں تو پتا ہی ہے، اس سے کچھ پوچھنا کتنا مشکل ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے لیے ہی گیا ہے۔ شاید کوئی ڈاکٹر یا حکیم وغیرہ ڈھونڈنے کے لیے۔''

ہم بہت مدھم آواز میں بات کر رہے تھے لیکن جب بات کرتے کرتے میں کھانسا تو سلطانہ ذرا سا کسمسائی۔ چند لمحے کے لیے لگا کہ وہ جاگ جائے گی مگر پھر کمبل اپنے جسم پر درست کرتے ہوئے دوبارہ بے حرکت ہو گئی۔

میرا گلا خشک ہو رہا تھا اور جسم کی حدت بتا رہی تھی کہ بخار بھی جوں کا توں موجود ہے۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی مگر پانی پینے سے پہلے میں اس پانی کا بوجھ کم کرنا چاہتا تھا جو میرے مثانے میں موجود تھا۔ میں بستر سے اٹھا تو یوں لگا جیسے گردن کے عقبی حصے پر کسی نے ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔ ایک بار پھر کندھے سن ہونا شروع ہو گئے۔ اقبال نے سہارا دینا چاہا مگر میں جیسے تیسے خود ہی غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو درد کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر میں نے اپنی قوتِ برداشت کو آواز دی۔ کتنی ہی دیر تک درد سے لڑتا رہا۔ اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا رہا اور اس کے سامنے جھکنے سے انکار کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے آنکھیں پھر بوجھل ہو گئیں، احساس کند ہونے لگا۔ میں پھر سو گیا یا شاید نیم بے ہوش ہو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو سلطانہ میرے پاس موجود تھی۔ غالباً اس نے ہولے ہولے آواز دے کر مجھے جگایا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی۔ یہ کپڑے وہ نہیں تھے جو میں نے پہلے پہن رکھے تھے۔ ''میرے کپڑے کس نے بدلے؟'' میں نے سلطانہ سے پوچھا۔

''میں نے... آپ کے زخم کو صاف کر کے نئی پٹی کی تھی۔ کپڑوں کو خون وغیرہ لگ گیا تھا۔'' سلطانہ نے سادگی سے جواب دیا۔

زرگاں کے حجام عبدالرحیم نے کچھ عرصے پہلے مجھے سلطانہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ماضی میں جب میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا، وہ بچوں کی طرح میری دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی۔ میرا منہ ہاتھ دھلاتی تھی، غسل کراتی تھی، میرے کھانے پینے اور سونے جاگنے کا دھیان رکھتی تھی۔ شاید آج اس نے جو کچھ کیا، وہ اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

میں اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ اس نے بند کمرے میں میرا پورا لباس تبدیل کیا تھا۔ وہ اکثر بہت سنجیدہ رہتی تھی لیکن جب وہ کسی بات پر شرماتی تھی تو اس کے چہرے پر عجیب سے دلکش رنگ

بکھر جاتے تھے۔ ان رنگوں کو چھپانے کے لیے وہ دائیں بائیں ہو جاتی تھی۔ آج بھی اس نے یہی کیا۔ ''میں تمہارے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

اسی دوران میں آفتاب خاں کمرے میں داخل ہو گیا۔ گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''اب آپ کا حالت پہلے سے کچھ اچھا لگتا ہے۔'' اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کچھ فرق تو ہے۔''

''دراصل میں کل شام آپ کی بی بی نے اقبال بھائی کے ساتھ مل کر آپ کا زخم اچھی طرح صاف کیا ہے اور پٹی وغیرہ بھی باندھا ہے۔''

''عمران واپس آیا یا نہیں؟'' میں نے آفتاب سے پوچھا۔

''آ گیا جی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی ساتھ لے کر آیا ہے۔''

''کہاں ہے ڈاکٹر؟''

آفتاب خاں چند سیکنڈ تک چپ رہا پھر سرگوشی میں بولا۔ ''اگر آپ اٹھ کر آ سکتا ہے تو آئیں... ام آپ کو دکھاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خو، زیادہ دور نہیں۔ بس عمران بھائی کے کمرے تک۔''

میں اٹھا اور آفتاب کے ساتھ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر عمران کے کمرے تک پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ آفتاب خاں مجھے ایک جانب سے گھما کر کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف لے گیا۔ اس نے ادھ کھلے پٹ میں سے مجھے اندر کا منظر دکھایا۔ منظر دیکھنے سے پہلے ہی مدھم آوازیں میرے کانوں میں پڑنا شروع ہو گئیں۔ ان میں سے عمران کی آواز کو میں نے بہ آسانی پہچان لیا۔ اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر ایک جانے پہچانے چہرے پر پڑی۔ یہ ڈاکٹر لی وان تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے جاپانی خدوخال صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس نے فر کا کوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے کھچڑی بالوں کا ہم رنگ تھا۔ وہ اپنے دبلے پتلے جسم کے ساتھ کرسی پر تن کر بیٹھا تھا۔ طیش کے سبب اس کی آنکھوں سے شرارے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

''...تم علاج کی بات کرتے ہو، میں تم لوگوں کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ تم لوگ مجھے زبردستی لے کر آئے ہو۔ مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کیا ہے تم لوگوں نے۔ میں تمہارے خلاف مقدمہ کروں گا۔ تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔'' وہ غصے کے سبب کرسی سے اچھل پڑ رہا تھا۔

عمران نے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں ڈاکٹر! لیکن میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ آپ میری بات سمجھ نہیں پا رہے تھے اور میرے پاس وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ یقین کریں ڈاکٹر...''

''میں تمہاری کوئی بکواس سننا نہیں چاہتا۔'' ڈاکٹر لی وان دہاڑا... ''تم میری آنکھوں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ... میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ۔'' ڈاکٹر نے طیش میں سالن سے بھری ہوئی ایک پلیٹ اٹھا کر عمران کو دے ماری۔ عمران نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ کر خود کو پلیٹ کی زد سے بچایا۔

عمران کے بچ جانے سے ڈاکٹر کے طیش میں مزید اضافہ ہوا۔ اس نے ٹرے میں سے دو تین برتن اٹھا کر عمران کو کھینچ مارے، آخر میں اسٹیل کی وزنی ٹرے بھی عمران کی طرف روانہ کر دی۔ عمران نے اچھل کود کر یہ سارے وار بچائے۔ عمران پر چیزیں پھینکنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر چلا بھی رہا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

عمران کو نشانہ بنانے کی کوششوں میں ناکام ہو کر ڈاکٹر نے دیوار پر سے کالے رنگ کا چھاتا اتار لیا۔ اس چھاتے کو چھڑی کی طرح پکڑ کر وہ عمران پر پل پڑا... وہ عمران جیسے برق رفتار کو کیسے نشانہ بنا سکتا تھا... یہ عمران کی مہربانی تھی کہ اس نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے دو چار چوٹیں ڈاکٹر سے کھا لیں۔ اس سے ڈاکٹر کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ اس مارا ماری میں چھاتا بھی ٹوٹ گیا۔ ڈاکٹر نے پھنکارتے ہوئے چھاتا ایک طرف پھینکا اور پھر نیم جان سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ اس کا سینہ بری طرح پھول پچک رہا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ۔'' وہ ایک بار پھر چنگھاڑا اور اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ عمران اور اقبال پر نہ پڑے۔ سرہانے کی طرف ڈاکٹر کا جہازی سائز میڈیکل باکس بھی نظر آ رہا تھا۔

چھاتے کی چوٹیں عمران کے کندھوں پر لگی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کندھوں کو ذرا سا سہلایا پھر اس کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے چند سیکنڈ تک ڈاکٹر کے مزید ردِعمل کا انتظار کیا پھر ہولے سے اس کے پاؤں کی طرف چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر بدستور آنکھوں پر

بازو رکھے لیٹا تھا... عمران نے ہولے ہولے اس کے پاؤں دبانا شروع کر دیے۔ غیر متوقع طور پر ڈاکٹر نے کوئی خاص ری ایکشن نہیں دکھایا۔ موقع بہتر جان کر عمران نے اقبال کو بھی آنکھ سے اشارہ کیا۔ اقبال بھی خاموشی سے ڈاکٹر کے سرہانے بیٹھ گیا اور نرمی سے اس کے کندھے دبانے لگا۔

آفتاب نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”عمران بھائی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے لگتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کسی کو گولی مار دے گا یا پھر اپنے آپ کو شوٹ فرما لے گا۔“

تین چار منٹ اسی طرح گزر گئے۔ ڈاکٹر لی وان چارپائی پر چت لیٹا رہا اور عمران اور اقبال خشوع و خضوع سے اس کی مٹھی چاپی کرتے رہے۔ آخر ڈاکٹر لی وان کی بھرائی ہوئی ناراض آواز سنائی دی۔ ”کہاں ہے تمہارا مریض؟“

عمران بولا۔ ”میں آپ کو بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ کو مجھے معاف کرنا پڑے گا۔ یہ دیکھیں، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں اور سچے دل سے معافی مانگتا ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھ ڈاکٹر کے سامنے جوڑ دیے۔

ڈاکٹر نے منہ پھیر لیا۔ عمران اٹھ کر گیا اور قریبی دیوار سے ایک اور چھاتا اتار کر لے آیا اور ڈاکٹر کے پاس رکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ کا غصہ کم نہیں ہوا تو مزید مار لیں لیکن پلیز آخر میں معاف ضرور کر دیں۔“

اس نے اتنی مسکین صورت بنا رکھی تھی کہ ڈاکٹر کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا... اس نے گہری سانس لی اور اٹھ کر چارپائی پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ قدرے نرم آواز میں بولا۔ ”اب خوامخواہ وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے بتاؤ مریض کہاں ہے؟“

عمران نے بڑے جذباتی انداز میں ”تھینک یو ڈاکٹر“ کہا پھر اسے بتایا کہ مریض یہاں پاس ہی ایک کمرے میں ہے۔

میں اور آفتاب کھڑکی کے سامنے سے ہٹے اور تیزی کے ساتھ واپس کمرے میں پہنچ گئے۔ سلطانہ گرم دودھ لیے میری چارپائی کے قریب کھڑی تھی اور کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

میں اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ نقل و حرکت کی وجہ سے گردن میں اٹھنے والی ٹیسیں شدید تر ہو گئی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ابھی چند سیکنڈ میں اس راجواڑے کا قابل ترین ڈاکٹر کمرے میں قدم رکھنے والا ہے۔ میں اس کے لیے نیا مریض نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی نل پانی کے مضافات میں اپنے اسپتال کے اندر میرا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر چوہان بھی میرے ساتھ تھا۔ میرے معائنے کے بعد ڈاکٹر لی وان نے یہ حتمی رائے دی تھی کہ راجواڑے میں سہولتیں ناکافی ہیں۔ ان ناکافی سہولتوں کے ساتھ میرا آپریشن ایک بہت بڑا رسک ہو گا۔

سوچنے کی بات تھی کہ کیا اب یہاں ڈاکٹر لی وان اپنی رائے تبدیل کر سکے گا جبکہ یہاں اتنی سہولتیں بھی نہیں تھیں جتنی نل پانی کے اسپتال میں تھیں۔

میں نے سلطانہ کو دودھ سمیت کمرے سے باہر بھیج دیا۔ حسب توقع چند سیکنڈ بعد عمران اور اقبال ڈاکٹر لی وان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنی تفصیلی روداد میں عمران کے سامنے ڈاکٹر لی وان کا ذکر تو کیا تھا مگر اب یوں لگ رہا تھا کہ عمران اور اقبال اس امر سے بے خبر ہیں کہ یہی وہ ڈاکٹر ہے جس کے پاس چوہان مجھے لے کر گیا تھا۔

مجھے بغور دیکھ کر ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے اپنی عینک درست کی اور ایک بار عمران کی طرف دیکھنے کے بعد دوبارہ مجھ پر نظر جما دی۔ ”تو یہ ہے مریض؟“ اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا... اور ڈاکٹر کا میڈیکل باکس تپائی پر رکھ دیا۔

”ہم ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہارا نام تابش ہے نا... جکی کی ڈیتھ کے بعد تم ڈاکٹر چوہان کے ساتھ میرے پاس آئے تھے۔“

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے ٹھیک پہچانا ہے ڈاکٹر۔“

”تمہیں یہاں اتنی دور دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہو رہی ہے۔ بہرحال، یہ باتیں تو بعد میں بھی پوچھی جا سکتی ہیں۔ فی الحال تمہارا فوری مسئلہ کیا ہے؟“

میں نے گردن گھماتے ہوئے کہا۔ ”چند روز پہلے یہاں پیچھے کی طرف مجھے زخم آیا تھا۔ یہ زخم اب بہت تکلیف دینے لگا ہے... بہت زیادہ۔“

ڈاکٹر نے اپنے میڈیکل باکس میں سے ایک ٹارچ اور دو چار اوزار نکالے۔ اس کے بعد بڑی توجہ سے میرا زخم دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ سیٹی کی سی آواز نکلی اور وہ میرے زخم پر کچھ اور بھی جھک گیا۔

”یہ تو بہت سیریس معاملہ ہے۔“ چند سیکنڈ بعد جاپانی ڈاکٹر نے لرزاں آواز میں کہا۔

”اسی لیے تو آپ کو یہاں لائے ہیں۔“ عمران نے گہرے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

ڈاکٹر نے سنسنی خیز نظروں سے پہلے مجھے اور پھر عمران کو دیکھا۔ تب عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟“

”ہم بہت قریبی دوست ہیں۔“

”اپنے قریبی دوست کے بارے میں تم کیا کچھ جانتے ہو؟ خاص طور سے اس کے اس زخم کے بارے میں؟“

”آپ کس حوالے سے پوچھ رہے ہیں؟“

میں نے اس موقع پر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”عمران! ڈاکٹر لی وان ہی وہ ڈاکٹر ہیں جن کے پاس چوہان مجھے لے کر گیا تھا۔ انہوں نے اپنے اسپتال میں میرے ٹیسٹ لیے تھے اور تفصیلی معائنہ بھی کیا تھا۔ اتفاق ہے کہ آج تم ڈاکٹر لی وان کو ہی میری مدد کے لیے لائے ہو۔“

عمران نے ہونٹ سکیڑے اور ایک بار پھر غور سے لی وان کو دیکھنے لگا۔ یقیناً اسے اور اقبال کو وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو میں نے انہیں اس ماہر ڈاکٹر کے بارے میں بتائی تھیں۔

آخر عمران نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہمیں اب ڈاکٹر صاحب کو زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”ہاں، تمہیں زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور نہ ہی مجھے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت پڑے گی۔“ ڈاکٹر کا لہجہ ایک بار پھر ترش ہو گیا۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ عمران نے پوچھا۔

اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر نے ایک بار پھر ٹارچ روشن کی اور میری گردن کے عقبی حصے کا بغور معائنہ کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے ایک لفظ کہے بغیر اپنے اوزار وغیرہ واپس میڈیکل باکس میں رکھ دیے اور گمبھیر انداز میں بولا۔ ”میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ اس مریض کا جلد سے جلد اسٹیٹ سے باہر جانا ضروری ہے تاکہ الٰہ آباد یا جھانسی وغیرہ میں اس کا آپریشن ہو سکے۔ اب تم لوگوں نے معاملہ بہت خراب کر لیا ہے۔“

”آپ... کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ زخم تمہیں کیسے لگا؟“ ڈاکٹر لی وان نے پوچھا۔

”ہم جنگل سے گزر رہے تھے۔ ڈکیتوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کے ساتھ لڑائی ہوئی جس میں یہ چوٹ لگی۔“ میں نے سچ بتا دیا۔

”یہ چوٹ تمہیں ایسی جگہ پر لگی ہے جہاں ہرگز ہرگز نہیں لگنی چاہیے تھی۔ تمہارا اندر کا نظام گڑبڑ ہو گیا ہے۔“

”آپ چپ کی بات کر رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر لی وان نے تاسف سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”چپ کے اردگرد کا ایریا متاثر ہو گیا ہے... تمہارے کندھے اور کمر کا اوپر والا حصہ تو سن نہیں ہو رہا ہے؟“

”ہاں، ایسا تو اب بھی محسوس ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

ڈاکٹر لی وان کے نہایت تجربہ کار چہرے کی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ وہ عمران اور اقبال کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ ان کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں ناقابلِ برداشت درد سے میری طویل جنگ جاری رہی۔ ڈاکٹر کمرے میں واپس نہیں آیا تھا۔ عمران اور اقبال کے چہرے ستے ہوئے تھے۔

میں سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ”پریشانی کی بات نہیں۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”یار! یہ رسمی باتیں مت کرو۔ سیدھی طرح بتاؤ، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“

وہ چند لمحے تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”ڈاکٹر کہتا ہے کہ معاملہ اور بگڑ سکتا ہے۔ فوری آپریشن ضروری ہے... اور یہ آپریشن یہاں کسی صورت نہیں ہو سکتا۔“

”...اور اس کے لیے اسٹیٹ سے باہر جانا ہو گا۔“ میں نے عمران کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں، اب وہ یہ نہیں کہہ رہا۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ زیادہ دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہم کسی طرح نل پانی پہنچ سکیں تو وہ وہاں اپنے اسپتال میں یہ آپریشن کر دے گا... لیکن...“

”لیکن کیا؟“ میں نے پوچھا۔

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ کہہ رہا ہے کہ اس میں بھی کچھ نہ کچھ خطرہ تو ہے۔“

میں جانتا تھا کہ عمران صورت حال کی سنگینی کو بہت کم کر کے بیان کر رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر نے پہلے کی طرح اس آپریشن کے سلسلے میں خاصے خدشات کا اظہار کیا ہو گا۔

”پھر کیا خیال ہے؟“ میں نے اپنی کراہیں سینے کے اندر ہی گھونٹتے ہوئے کہا۔

”کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا پڑے گا اور جلد ہی نکالنا

پڑے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں تکلیف بہت زیادہ ہے۔''

عمران بہت کم پریشان نظر آتا تھا مگر اس وقت وہ پریشان تھا۔ کچھ یہی کیفیت اقبال کی بھی تھی۔ صورتِ حال واضح تھی۔ اگر ہم اس تین منزلہ تہ خانے سے نکل کر ٹل پانی پہنچنے کی کوشش کرتے تو زیادہ دور نہ جا سکتے۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ حکم کے لوگ ارد گرد موجود ہیں اور پوری جاں فشانی سے چپ کے سگنل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس تہ خانے کے اندر رہتے تو بھی نتیجہ سامنے تھا... میری تکلیف ہر گھڑی بڑھتی جا رہی تھی۔

ابھی ہم تینوں کی بات چیت جاری تھی کہ آفتاب خان اپنے کپڑے جھاڑتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''عمران بھائی! آپ یہ کیا چیز پکڑ لایا ہے۔ آپ اس کو ڈاکٹر کہتا ہے لیکن ام کو تو یہ خود مریض لگتا ہے۔ ایسا چڑ چڑا بندہ تو ام نے پورے انڈیا میں نہیں دیکھا۔''

''ایسے بندے انڈیا میں نہیں جاپان میں ہوتے ہیں لیکن ہوا کیا ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''بس ایک دم آگ بگولا ہو رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ام کو واپس چھوڑ کر آؤ۔ ام ایک منٹ یہاں نہیں رکے گا۔ ام اس کا دل بہلانے کے لیے چائے لے کر گیا لیکن اس نے چائے کا پیالی ام پہ پھینک دیا۔ یہ دیکھیں، سارا کپڑا خراب ہو گیا امارا۔ یہ آپ کا لحاظ ہے کہ ام چپ رہا۔ ورنہ ایسے چڑچڑے بندے کو تو ایک دم مسل کر رکھ دے۔''

''خبردار! کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی۔'' عمران نے اسے جھاڑا۔ ''اس کے چڑچڑے پن پر نہ جاؤ... وہ ایک بہت بڑا ڈاکٹر ہے اور اس وقت ہمیں اس کی بہت سخت ضرورت بھی ہے۔ اس کی ہر بات برداشت کرنی ہوگی۔''

''نن... نہیں جی... ام نے اس کے سامنے تو کوئی بات نہیں کہی۔ صرف آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ اب وہ مسلسل آپ کو بلا رہا ہے۔ اب کیا کہوں اس سے؟''

''ٹھیک ہے، میں خود دیکھتا ہوں۔'' عمران نے کہا اور اٹھ کر ڈاکٹر کی طرف چلا گیا۔

دوپہر تک میری حالت مزید بگڑ گئی۔ بخار 104 تک چلا گیا اور کمر کا بالائی حصہ بالکل سُن ہونے لگا۔ سلطانہ مسلسل میرے سرہانے بیٹھی تھی اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں میری پیشانی پر رکھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ گیلا کپڑا میرے پورے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر بھی پھیر دیتی تھی۔ عمران نے ڈاکٹر لی وان کی ہدایت کے مطابق مجھے کچھ پین کلرز دی تھیں، تاہم محسوس ہوتا تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان دواؤں کا اثر ختم ہوتا جا رہا ہے... اب تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں طویل سفر کے قابل ہی نہیں رہا... اگر عمران وغیرہ مجھے ٹل پانی لے جانا چاہیں تو میں جا نہیں پاؤں گا۔ مجھے گاہے بگاہے غشی کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی تھی اور یہ میری تکلیف کے لیے خطرناک علامت تھی۔

سہ پہر کے وقت جب میری طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو عمران اور ڈاکٹر ایک بار پھر میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے دوبارہ میرے زخم کا معائنہ کیا... تب وہ دونوں بغیر کچھ کہے سنے واپس چلے گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد اقبال اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر امید کی ہلکی سی کرن تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا... ڈاکٹر لی وان آپریشن کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔''

''کہاں؟''

''یہیں پر... وہ کہتا ہے کہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تیاری کر لیتا ہوں۔ پھر ''لوکل اینستھیسیا'' دے کر آپریٹ کر دوں گا۔ ابھی اس نے تمہارے زخم کو اچھی طرح دیکھا ہے... اس نے امید دلائی ہے کہ وہ چپ علیحدہ کر لے گا۔''

اقبال میرے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ سلطانہ کو حوصلہ دینے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ وہ اصل صورتِ حال بتا نہیں سکتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ اصل صورتِ حال کہیں زیادہ سنگین ہے۔

ڈاکٹر لی وان تو ٹل پانی میں بھی آپریشن کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس تہ خانے کے نامناسب ترین حالات میں کیسے تیار ہو گیا؟ اس سوال کا ایک ہی جواب تھا... اور وہ یہ کہ میری جان خطرے میں تھی۔ تاخیر کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ''کوشش'' کے بغیر ہی مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے۔

عمران اور جیکی جیسے لوگوں کے ساتھ رہنے کے بعد میں بہت بدل چکا تھا۔ میری کم ہمتی ایک خاص قسم کی بے خوفی اور دلیری میں ڈھل چکی تھی۔ مگر زندگی کی خواہش تو انسان بلکہ ہر جاندار کی فطرت میں شامل ہے۔ میں بھی یوں مرنا نہیں چاہتا تھا... میں ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ ابھی میرے کندھوں پر کچھ ''بوجھ'' تھے۔ اگر میں یہ بوجھ لے کر راہیِ ملکِ عدم ہو جاتا تو شاید مر کر بھی میری روح بے قرار بھٹکتی رہتی۔

کچھ دیر بعد مجھے کسی قریبی کمرے میں طبی اوزاروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ اسپرٹ اور پائیوڈین وغیرہ کی بو بھی نتھنوں میں گھسنے لگی۔ غالباً میرے آپریشن کی تیاری ہو رہی تھی۔

کمرے میں، میں اور میرا درد تنہا تھے۔ اگر کوئی اور تھا تو وہ سلطانہ تھی۔ وہ مسلسل میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ دیوانوں کی طرح میری تیمارداری میں مصروف تھی۔ کبھی میرا سر تکیے پر رکھتی۔ کبھی آغوش میں لے لیتی۔ کبھی گیلے کپڑے سے میرے چہرے اور ہتھیلیوں کو تر کرنے میں مصروف ہو جاتی۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! اگر مجھے کچھ ہو گیا تو... میں ایک شکوہ اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو مہروج!'' وہ سسک پڑی اور میرا سر آغوش میں دبا لیا۔

میں نے کہا۔ ''پوچھو گی نہیں، کیا شکوہ ہے؟''

''تم کیا کہہ رہے ہو مہروج؟''

''میں تمہاری من مانی کی بات کر رہا ہوں سلطانہ... میں نے تمہاری منت کی تھی کہ آئندہ مجھے اس طرح کا دکھ نہ دینا جیسا ٹل پانی میں دیا تھا۔ مجھے بتائے بغیر کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھانا... لیکن تم نے بڑی بے حسی کے ساتھ میری بات رد کی...'' تکلیف اور دکھ کے بوجھ سے میری آواز بھرا گئی۔

''میں نے ایسا نہیں کیا مہروج! تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہوئیں گی۔ کیا میں اس جگہ سے باہر کہیں گئی ہوں؟''

''تم نہیں گئیں... لیکن جانے کا ارادہ تو رکھتی تھیں اور مجھے پتا ہے تم نے چلے جانا تھا۔''

''نہیں مہروج! میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تم خود کو خوامخواہ کیوں پریشان کر رہے ہو؟'' وہ مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر بولی۔

میں نے درد کی بے پناہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو اب تم مجھے دہرا دکھ دے رہی ہو۔ مجھ سے جھوٹ بھی بول رہی ہو۔ تم مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی ہو اور یہ دیکھو اس کا ثبوت۔'' میں نے اپنی جیب سے نیلے تھوتھے والی پڑیا نکال کر سلطانہ کو دکھائی۔

اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ وہ بے ساختہ بولی۔ ''یہ... یہ تمہیں کہاں سے ملی؟''

''جہاں تم نے چھپائی تھی۔''

میں نے طلال کے حوالے سے ساری باتیں اسے بتائیں اور دو تین منٹ کے اندر لاجواب کر دیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس کی نگاہیں بھی جھکی ہوئی تھیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ! میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میں ایسی جگہ کھڑا ہوں جہاں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے تم سے جدا ہو جاؤں۔ کیا آج بھی تم میرا شکوہ دور نہیں کرو گی؟''

ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ناک سرخ ہو گئی۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''ایسی باتیں مت کرو مہروج! میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتی ہوں...''

''تو پھر مجھ سے ایک وعدہ کرو۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

وہ سر تا پا لرز گئی۔ اس نے ڈری ڈری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ایک دو لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنا ہاتھ میرے سر پر سے کھینچنا چاہتی ہے لیکن پھر اس نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا اور نڈھال لہجے میں بولی۔ ''کہو مہروج! کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھ سے وعدہ کرو سلطانہ! میری زندگی میں، تم میری مرضی کے بغیر، میری چار دیواری سے باہر قدم نہیں نکالو گی اور چارج گورا والا معاملہ مکمل طور پر... مکمل طور پر مجھ پر چھوڑ دو گی۔''

وہ کچھ دیر آنسو بہاتی رہی۔ پھر دل دوز آواز میں بولی۔ ''ٹھیک ہے مہروج! میں وعدہ کرتی ہوں۔''

''اس طرح نہیں سلطانہ! یہ سارے الفاظ دہرا کر وعدہ کرو۔''

وہ کچھ دیر جھجکتی رہی پھر اس نے میرے کہے ہوئے تمام الفاظ دہرا دیے اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس نے ذرا جھک کر اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ اس نے اپنا ''سر'' نہیں جیسے اپنا دکھ میرے سینے پر رکھا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اس انداز سے رائی تھی۔ وہ دل فگار لہجے میں بولی۔ ''وہ شیطان جندہ رہنے کے قابل ناہیں ہے مہروج! اسے ماف نہ کرنا... اسے ماف نہ کرنا۔''

...ایک گھنٹے کے اندر اندر میری حالت مزید خراب ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ فالج کس طرح اور کس انداز میں حملہ آور ہوتا ہے مگر لگ یہی رہا تھا کہ میرا بالائی دھڑ مفلوج ہوتا جا رہا ہے۔ اب میں ڈاکٹر لی وان کی ''آپریشن ٹیبل'' پر تھا۔ یہ آپریشن ٹیبل بھی عجیب تھی... لکڑی کا ایک بوسیدہ تخت تھا جس کے نیچے کچھ اینٹیں رکھ کر آفتاب خان نے اسے کچھ اونچا کر دیا تھا۔ روشنی بڑھانے کے لیے اقبال نے ان تہ خانوں کی تقریباً ساری لالٹینیں اس کمرے میں جمع کر دی تھیں۔ اسٹیل کی ایک دیگچی میں ڈاکٹر لی وان کے چند سرجیکل آلات

ابل رہے تھے۔ عمران، ڈاکٹر لی وان کے معاون کا کردار ادا کررہا تھا۔ عمران کی موجودگی سے مجھے ایک عجیب طرح کا حوصلہ مل رہا تھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی جسے میں کبھی سمجھ نہیں سکا اور نہ بیان کرسکا... اور شاید اس طرح کی حوصلہ بخش کیفیت ہر وہ شخص محسوس کرتا جو اس کے اردگرد موجود ہوتا تھا اور اس سے محبت کا تعلق رکھتا تھا...

شروع میں آگ بگولا ہونے کے بعد ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر پُرسکون تھا۔ آپریشن پر رضامند ہونے کے بعد اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز کرلی۔ وہ اور عمران آپس میں گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر لی وان نے کہا۔ ''ریڑھ کی ہڈی میں انجکشن دے کر اوپر والے حصے کو سن کیا جاسکتا ہے... لیکن اس میں تھوڑا بہت خطرہ موجود رہے گا۔ میرے ذہن میں آرہا ہے کہ کیوں نہ انجکشن کے بغیر ہی کام چلایا جائے۔''

''یہ زیادہ تکلیف دہ تو نہیں ہوگا؟'' عمران نے پوچھا۔

''تکلیف تو ہوگی... لیکن تمہارا یہ دوست اس حوالے سے کافی ہمت دکھا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ برداشت کرلے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ پچھلے تین دن سے یہ بغیر کسی خاص پین کلر کے اتنی تکلیف جھیل رہا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس کی برداشت دیکھ کر مجھے امید ہے کہ یہ بغیر انجکشن کے بھی آپریشن کروالے گا۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری رائے لی۔ میں نے کہا کہ میں تیار ہوں۔

آپریشن کا عمل شروع ہوا۔ میرے جسم کو زیادہ کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ یہاں زخم تو پہلے سے ہی موجود تھا۔ بس ڈاکٹر نے اپنے میڈیکل کٹر سے اس زخم کو تھوڑا کشادہ اور گہرا کرلیا۔ اصل مسئلہ چپ کی ''سپریشن'' کا تھا۔ جب ڈاکٹر لی وان کے باریک نشتر نے چپ کو چھونا شروع کیا تو میری گردن کے پچھلے حصے اور دونوں کندھوں میں جیسے آگ سی بھر گئی۔ میں درد کے ایک سے بھنور میں گھر گیا۔

اس سے درد سے لڑنے کے لیے میں نے اپنے پردۂ تصور پر بارو تدا جیکی کی شبیہ کو نمایاں کیا۔ وہ برداشت کا پیکر، ... درد کا خوگر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ اپنے فلسفے کے حوالے سے بڑی وزنی دلیلیں دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا... جب ہمارے جسم کے کسی سنگین زخم کو مرہم پٹی کے لیے چھیڑا جاتا ہے تو ہم شدید تکلیف محسوس کرتے ہیں مگر اس تکلیف میں سے پچھتر فیصد تکلیف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم اپنے زخم کو دیکھ رہے ہوتے ہیں یا کم از کم اس کی نوعیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر وہی زخم ہماری نظر کے سامنے نہ ہو اور نہ ہی ہمیں اس کی نوعیت کا پتا ہو تو یہ تکلیف صرف پچیس فیصد رہ جائے گی یا شاید اس سے بھی کم۔

میں نے بھی اپنا دھیان اپنے زخم کی طرف سے ہٹا لیا۔ تمام واہمے، خدشات اور اندیشے ذہن سے نکال دیے۔ ڈاکٹر لی وان ایک ماہر ترین سرجن تھا اور سرجن کا بیشتر کمال اس کے ہاتھوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جیسے ایک مصور یا ہیرا تراش کے ہاتھوں کی معمولی سی لرزش اس کے کام کو تباہ کرسکتی ہے، سرجن کے ہاتھ کی لرزش بھی اس کے مریض کو زیرِ زمین پہنچا سکتی ہے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کی بے پایاں مہارت ہی تھی کہ وہ لالٹینوں کی روشنی میں بغیر کسی تھیٹر کے یہ نازک آپریشن کرنے پر تیار ہوگیا۔

''اوگاڈ... او مائی گاڈ۔'' ڈاکٹر نے نرزاں لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ روک لیے۔

کیا ہوا؟'' عمران نے ٹھٹک کر پوچھا۔

ڈاکٹر لی وان نے چہرے سے ماسک ہٹایا۔ اپنی عینک اتاری اور ایک جانب رکھی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ماتھا پکڑ لیا تھا۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر؟'' عمران نے پھر پوچھا۔

''یہ بہت خبیث لوگوں کا کام ہے۔ بہت عیار اور... بے رحم۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہو ڈاکٹر؟''

''ہم یہ نہیں کرسکیں گے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔'' ڈاکٹر لی وان نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں کروٹ لے کر لکڑی کے تختے پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا سردی کے باوجود ڈاکٹر کے ماتھے پر پسینے کی چمک تھی۔

''آپ کچھ وضاحت تو کریں۔'' عمران نے کہا۔

ڈاکٹر کچھ دیر خاموش رہا، جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے میرے سامنے اپنی مشکل بیان کرنی چاہیے یا نہیں۔ پھر اس نے وہی فیصلہ کیا جو آج کل عام معالج کرتے ہیں... یعنی مریض کو اندھیرے میں نہ رکھنے کا فیصلہ۔

وہ ایک گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے دوبارہ عینک لگائی اور ماسک چڑھایا پھر عمران کے ساتھ میرے عقب میں آن کھڑا ہوا۔ اس نے کسی اوزار کی مدد سے میرے جسم میں لگی ہوئی چپ کو آہستہ سے چھوا۔ ایک بار پھر پورے جسم میں درد کی لہریں دوڑنے لگیں۔

ڈاکٹر نے نہایت بے بسی سے بتایا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اگر ہم نے اس چپ کو اسپائنل کینال کی ہڈی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی تو اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''اگر واقعی ایسا ہے تو یہ بہت خطرناک ہے۔'' عمران نے زیرِ لب کہا۔

ڈاکٹر اور عمران پھر نشستوں پر جا بیٹھے۔ میں بھی چند تکیوں کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پورے کمرے میں اسپرٹ اور دیگر ادویات کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ سرجن اسٹیل شیطان صفت بندہ ہے۔ میرے خیال میں تو ایسے شخص کے نام کے ساتھ ڈاکٹر یا سرجن وغیرہ کے الفاظ لگانا ہی گناہ ہے۔ یہ قاتل شخص ہے۔ طب کے شعبے پر ایک بدنما دھبا ہے۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ چپ اسی شخص نے پلانٹ کی ہے۔ اس قسم کا گھناؤنا کام وہی کرسکتا ہے۔''

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' عمران نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اب ہم اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتے کہ زخم کو صاف کریں اور ٹانکے لگا کر بند کردیں۔ باقی خدا پر چھوڑ دیں۔'' ڈاکٹر کے لہجے سے مایوسی اور نقاہت جھلک رہی تھی۔

''لیکن تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود ہی کہا تھا کہ فوری آپریشن کے سوا کوئی راستہ نہیں۔'' عمران نے کہا۔

''اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے نکالنا اس قدر خطرناک ہوگا۔'' ڈاکٹر نے جھلائی ہوئی بلند آواز میں کہا۔

ان مشکل ترین حالات میں بھی عمران کا حوصلہ برقرار تھا۔ اس نے تسلی بخش انداز میں میرا شانہ دبایا اور ڈاکٹر کے پیچھے باہر نکل گیا۔

میں سناٹے میں تھا۔ ڈاکٹر اسٹیل، جارج گورا اور اس کی بہن ماریا وغیرہ کے منحوس چہرے میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ماریا، ڈاکٹر اسٹیل کی بیوی تھی۔ یہ وہی ماریا تھی جس کی انگلی اسحاق نے کاٹی تھی۔ یہ دونوں میاں بیوی بے رحمی و بے حسی میں یکتا تھے۔ آج ڈاکٹر لی وان نے جو انکشاف کیا، وہ دہلا دینے والا تھا۔ اسٹیل نے میرے سر کے پچھلے حصے میں جو چپ ڈال رکھی تھی، وہ پھٹ سکتی تھی اور اس کے پھٹنے سے میرا اسپائنل میرو یعنی حرام مغز ختم ہوسکتا تھا۔ حرام مغز ختم ہونے کا مطلب فوری موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

کسی قریبی کمرے سے بحث و تکرار کی مدھم آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ بحث اور تکرار یقیناً عمران اور ڈاکٹر لی وان کے درمیان ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کسی وقت بہت بلند آواز میں بولتا تھا اور اس کے لہجے سے غصہ چھلکا پڑتا تھا۔

پین کلرز کا اثر کم ہو رہا تھا۔ درد کی ٹیسیں پھر بلند ہونے لگیں۔ بہت ضبط کے باوجود میں ایک بار پھر ہولے ہولے کراہنے پر مجبور ہوگیا۔ اسی دوران میں ادھ کھلے دروازے سے میری نگاہ سلطانہ پر پڑی۔ اس نے سہمے سہمے انداز میں کمرے میں جھانکا۔ اس کے گداز ہونٹ خشک تھے اور دنیا جہان کے اندیشے اس کی سیاہ آنکھوں میں سمٹے ہوئے تھے۔ اسے دروازے میں کھڑے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ عمران کی آواز آئی۔ وہ سلطانہ کو بلا رہا تھا۔ شاید وہ ڈاکٹر کو قائل کرنے کے لیے سلطانہ کی مدد بھی چاہتا تھا۔

میرے حواس پر ایک بار پھر غنودگی کی دھند چھانے لگی۔ اردگرد کے مناظر مدھم ہونے لگے، آوازیں جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دینے لگیں۔ نہ جانے کتنا وقت اسی کیفیت میں گزرا۔ شاید پچیس تیس منٹ... یا شاید ایک ڈیڑھ گھنٹا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ عمران اور ڈاکٹر لی وان ایک بار پھر میرے قریب موجود ہیں۔ وہ دونوں ایک بار پھر میری زخمی گردن پر جھکے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں مجھے ایک دو انجکشن بھی دیے گئے۔ ان انجکشنز کے بعد میرے حواس پر چھائی ہوئی دھند قدرے چھٹ گئی اور درد میں بھی عارضی افاقہ محسوس ہونے لگا۔ میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ڈاکٹر! جو بھی کرنا ہے جلدی کرو...''

ڈاکٹر نے میرے کندھے پر تھپکی دی مگر کہا کچھ نہیں۔

کچھ دیر بعد میں نے ڈاکٹر کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل کیمرا دیکھا۔ اس جدید کیمرے سے ڈاکٹر نے میری گردن کے عقبی حصے کی کئی تصویریں اتاریں۔ یہ کیمرا ان تصویروں کو بیس تیس گنا بڑا کر کے دکھا سکتا تھا۔ ان تصویروں میں، میں نے پہلی بار وہ منحوس چپ دیکھی جس نے ایک طویل عرصے سے مجھے پابہ زنجیر کیا ہوا تھا۔ کیمرا اپنی اسکرین پر اس چپ کو کئی گنا بڑا کر کے دکھا رہا تھا اور اس کی سنہری مائل سطح کی ساری جزئیات نظر آرہی تھیں۔

''پلیز ڈاکٹر! آپ رسک لیں۔ اگر میری زندگی ہے تو کچھ نہیں ہوگا اور اگر نہیں ہے تو پھر کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔''

ڈاکٹر ایک بار پھر بڑی باریک بینی سے چپ کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ یہ معائنہ ڈیجیٹل تصویروں کے ذریعے کررہا

تھا۔ وہ ماہر ترین سرجن تھا۔ نہ جانے کتنے نازک مرحلوں سے گزر چکا تھا... اس کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینا چمک رہا تھا۔ بالآخر فیصلہ کن مرحلہ آ گیا۔ ڈاکٹر لی وان نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک حوصلہ مند شخص ہو مسٹر تابش! میں نے تم سے کچھ بھی چھپایا نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ کرنا پڑ رہا ہے، یہ میرا جاب نہیں ہے۔ میں ایک سرجن ہوں لیکن یہاں مجھے سرجری کے ساتھ ساتھ دوسری کارروائی بھی کرنا پڑ رہی ہے۔ اب یہ سارا قسمت کا کھیل بن گیا ہے، اس میں کسی طرح کی مہارت یا صلاحیت کو عمل دخل نہیں ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میں بالکل سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر! آپ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں۔ میں ہر صورت میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ اگر آپ کو کسی طرح کی تحریری اجازت چاہیے تو وہ بھی میری طرف سے عمران آپ کو دے سکتا ہے یا میری بیوی دے سکتی ہے۔''

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے دستانے پہننے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی نصف درجن لالٹینیں میرے اردگرد روشن تھیں۔ عمران کے ہاتھ میں ایک بڑی ٹارچ بھی تھی جو اسے بوقتِ ضرورت روشن کرنا تھی۔ اس بند کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ تاہم اس کمرے سے باہر جس طرح کی ہلچل مچی ہوئی تھی، وہ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔ سلطانہ اور میرے سارے ساتھی یقیناً میرے لیے دست بہ دعا تھے اور بڑی بے قراری سے اس انوکھے آپریشن کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس ہنگامی آپریشن کا نتیجہ کیا نکلنا تھا، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

پھر ایک اور اندیشہ میرے ذہن میں سر اٹھانے لگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس چپ کو ہلانے یا نکالنے کے سبب دوبارہ میری یادداشت کے ساتھ کوئی معاملہ ہو جائے۔ میں ایک بار پھر اپنے اردگرد کو فراموش کر کے کسی بے نام تاریکی میں کھو جاؤں۔

ڈاکٹر اور عمران میری گردن کے زخم کے ساتھ مصروف ہو گئے، میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے پیاروں کے چہرے تصور میں بسا لیے۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ آخر عمران کی گمبھیر آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''ہمت کریں ڈاکٹر! جو سمجھ میں آتا ہے کر گزریں۔'' یکا یک میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ میری پائنتی کی طرف اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا اس کے دستانہ پوش ہاتھوں میں ایک سرجیکل قینچی تھی مگر ابھی تک ڈاکٹر یہ کام کر نہیں سکا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر نظر آیا۔ آنکھیں زرد ہو رہی تھیں۔

''یہ گیمبلنگ ہے۔ یہ میں نہیں کر سکوں گا۔ بہت بڑا رسک ہے یہ۔'' ڈاکٹر عجیب اضطراب کے عالم میں بولا۔

یکا یک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کمرے میں ایک اور شخص موجود تھا جو بڑے بڑے رسک لے سکتا تھا۔ وہ قسمت کا دھنی تھا، تقدیر اس کا ساتھ دیتی تھی۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر کا چہرہ تک رہا تھا...

میں نے ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر! میری ایک خواہش ہے... میں چاہتا ہوں کہ یہ کام، میرا یہ دوست کرے۔''

عمران اور ڈاکٹر نے ایک ساتھ چونک کر مجھے دیکھا۔

''... ہاں ڈاکٹر! مجھے یقین ہے... یہ جو کرے گا میرے لیے بہت اچھا ہوگا۔'' میں نے اپنی بات دہرائی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' عمران نے حیران ہو کر کہا۔

''کیا یہ کوئی بہت مشکل کام ہے؟''

''لیکن...''

''پلیز عمران! تم یہ کام کرو۔ ڈاکٹر صاحب تمہاری مدد کریں گے۔''

ڈاکٹر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔

''کیا تم ایسا کرو گے؟'' ڈاکٹر نے عمران سے پوچھا۔

''ہاں، یہ کرے گا۔'' عمران کے بجائے میں نے جواب دیا۔ ''آپ دستانے، سرجیکل اوزار اس کو دے دیں۔''

میرے لہجے میں چھپے ہوئے یقین کو محسوس کرنے کے بعد عمران کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ لیکن پھر وہ ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔ کہنے لگا۔ ''یار! کیوں مروانا ہے مجھے۔ اگر میں ناکام ہو گیا تو...''

''مذاق نہیں عمران! تم یہ کام کرو... اور جلدی کرو۔''

''بڑی بھاری ذمے داری ڈال رہے ہو۔'' عمران کا لہجہ پھر گمبھیر ہو گیا۔

''کسی نہ کسی کو تو یہ ذمے داری اٹھانی ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ تم اٹھاؤ۔''

... کچھ ہی دیر بعد عمران میڈیکل باکس میں سے سرجیکل دستانے نکال کر پہن رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔ عمران اور ڈاکٹر میری پشت پر آن کھڑے ہوئے۔ لالٹینوں کی لو اونچی

کر دی گئی۔ بڑی ٹارچ اب ڈاکٹر لی وان کے پاس تھی۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے عمران کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دائیں ہاتھ میں قینچی لے کر عمران میری گردن پر جھک گیا۔ میرے اردگرد ایک اذیت ناک دھند تھی۔ میں نے غنودگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ مشکل نہیں عمران! تم پہلے بھی بہت دفعہ کر چکے ہو... دو خانے میں گولی... چار خانے خالی...'' عمران نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

عمران کا حوصلہ اکثر ''دو... چار'' کے کھیل میں جیت جاتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ اس مرتبہ بھی جیت جائے گا؟

''او گھاڑ!'' ڈاکٹر لی وان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس آواز میں اطمینان اور خوشی کی لہر تھی۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ میرے عقب میں عمران اور ڈاکٹر بغل گیر ہو گئے ہیں۔ عمران نے جھک کر میرے سر کو بوسہ دیا اور کندھا تھپکا۔ پھر مقامی لہجے کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ ''وشواس نا ہیں ہو وت ہے کہ میں نے اس منحوس چپ کو اپنی جگہ سے ہلا دیا ہے۔ یہ تو چمتکار ہے۔ نیا جیون مبارک۔''

ڈاکٹر لی وان نے ہلکے ہلکے جوش کے ساتھ کہا۔ ''اچھا مسٹر عمران! اب تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ مجھے باقی کا کام کرنے دو۔ اب مجھے چپ کو ٹشوز سے علیحدہ کرنا ہے اور یہ بھی مشکل کام ہے۔''

اگلے دس منٹ تک ڈاکٹر لی وان بڑے انہماک سے اس کام میں مصروف رہا۔ اس کام میں کچھ دقفے شدید درد کے بھی آئے، بالآخر عمران نے اسٹیل کا باؤل آگے کیا اور اس میں ''ٹن'' کی آواز سے چپ گری۔ ''تمہیں مبارک ہو مسٹر تابش! تم اب ایک آزاد شخص ہو۔''

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ ابھی مجھے لیٹے رہنا ہے۔ میرے زخم کو ٹھیک سے صاف کر کے اسٹیچز لگائے گئے اور پٹی باندھ دی گئی۔

میں نے واقعی خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرا دل چاہا کہ ابھی اس تین منزلہ تہ خانے کی گہرائی سے نکلوں اور کھلی جگہ پہ پہنچ جاؤں۔ پوری آزادی سے سانس لوں اور ہر اندیشے سے بے نیاز ہو کر کھیتوں کھلیانوں میں اور آبی گزرگاہوں کے کناروں پر بھاگوں دوڑوں۔ خوشی سے چلاؤں... آج میں آزاد ہوں۔ آج مجھے اپنے ہر ارادے کو پورا کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ مجھے لگا کہ اب میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ سلطانہ کے لیے، اپنی کچلی مسلی ہوئی عزتِ نفس کے لیے اور پھر اس اسٹیٹ کی حدوں سے پار نکلنے کے لیے بھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسٹیل کے باؤل میں اس چھوٹے سے دھاتی ٹکڑے کو دیکھا جس نے ماضی قریب میں مجھے ان گنت زخموں سے دوچار کیا تھا۔ سلطانہ، چوہان اور دیگر لوگ مجھے بتاتے تھے کہ میں اس اسٹیٹ سے نکل جانے کے لیے ان تھک کوششیں کرتا رہا ہوں اور ناکامیاں جھیلتا رہا ہوں۔ بہت دنوں بعد مجھے ثروت کی یاد بھی آئی۔ وہ کہاں تھی؟ کس حال میں تھی؟ عمران کی مبہم باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شاید اس کی شادی ہو چکی ہے۔ لیکن جو کچھ بھی تھا، میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر وہ واقعی آباد ہو چکی تھی اور خوش تھی تو پھر اسے اچھے طریقے سے خیر آباد کہنا چاہتا تھا۔

ایک دم میرا دھیان سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ آپریشن سے پہلے وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے اس کی سیاہ آنکھوں میں دنیا جہان کے اندیشے سمٹے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کے خشک ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے۔ میں نے عمران سے کہا۔ ''وہ بہت پریشان ہو گی۔ اسے بتا دو اور اقبال کو بھی...''

عمران چہکا۔ ''اقبال کا نام تو تم بس یونہی لے رہے ہو۔ اصل میں تو سلطانہ بھابی کو اطلاع دینا چاہ رہے ہو۔ ویسے یہ بیویاں اتنی پریشان ہوتی نہیں جتنی نظر آتی ہیں۔''

''کیوں، تمہارا کوئی ذاتی تجربہ ہے؟'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''کوئی ایک تجربہ ہے... میں تو اس پر پوری کتاب لکھ سکتا ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے اپنے چینل فساد پلس پر اس حوالے سے پچاس پچاس منٹ کے کوئی دس پروگرام پیش کیے ہیں۔ پروگرام کا عنوان تھا 'بیویوں کے اصل چہرے...' اس پروگرام کو دیکھ کر بیویاں اتنا طیش میں آئیں کہ انہوں نے چینل کے دفتر پر چڑھائی کر دی۔ پروگرام کے پروڈیوسر صاحب ایک باتھ روم میں سے زندہ پکڑ لیے گئے۔ مظاہرین کا خیال تھا کہ انہیں دفتر کے سامنے گولی مار دی جائے لیکن مظاہرین کی لیڈر آنسہ شاہ زوری نے کہا کہ مار دینا کوئی سزا نہیں۔ آج کل پروڈیوسر صاحب شاہ زوری صاحبہ کے شوہر ہیں...''

''اس چپ کا اب کیا کرنا ہے؟'' ڈاکٹر لی وان نے باؤل میں پڑی خون آلود چپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عمران نے اپنی زبان پھر متحرک کر دی۔ ''دل تو چاہتا ہے کہ یہ چپ کسی نیولے کے جسم میں رکھ دی جائے۔ وہ سارے جنگل میں بھاگتا پھرے اور حکم کے کارندے اس کے پیچھے ہلکان ہوتے رہیں۔ کتنا مزہ آئے کہ جب دو تین مہینے کی بھاگ دوڑ کے بعد نیولا پکڑا جائے تو حکم کے کارندے فرطِ حیرت سے بے ہوش جائیں اور پھر نیا محاورہ وجود میں آئے... کھودا پہاڑ نکلا نیولا۔''

ڈاکٹر لی وان نے کہا۔ ''واقعی کوئی ایسا کام کیا تو جا سکتا ہے جس سے اس بدمعاش سرجن اسٹیل کو عبرت حاصل ہو۔''

چپ نکلتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میری گردن اور کندھوں میں کبھی درد ہوا ہی نہیں، جسم کے اس حصے میں فالج کا سا احساس بھی ناپید ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد سب میرے اردگرد جمع تھے۔ سلطانہ، اقبال، ہوشیار سنگھ، تاؤ افضل اور شکیلہ وغیرہ۔ سب خوش تھے۔ ڈاکٹر لی وان کا خیال تھا کہ ابھی مجھے آرام اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ اس کے کہنے پر عمران نے ایک ایک کر کے سب کو باہر بھیج دیا۔ آخر میں وہ اور سلطانہ رہ گئے۔ سلطانہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب تو ہمارے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اور ایک اور فرشتہ یہاں تمہارے پاس بھی تو کھڑا ہے۔''

وہ حیرت سے عمران کو دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اس نے دوسری مرتبہ میری جان بچائی ہے۔ آج اس نے آپریشن میں ڈاکٹر کی مدد کی ہے۔ اس کی مدد کے بغیر شاید یہ آپریشن مکمل نہ ہو سکتا۔ اور آج سے کچھ سال پہلے بھی اس نے ایسا ہی ایک کام کیا تھا۔ تب میں اپنی جان کا خود دشمن بنا ہوا تھا۔ خودکشی کی حرام موت مرنے کے لیے گندم کی گولیاں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور واپس جینے کے راستے پر کھینچ لایا تھا۔''

عمران بولا۔ ''اب مجھے اوتار ہی نہ بنا دینا۔ یہ نہ ہو کل یہاں کے لوگ میرا مجسمہ بنا کر پوجا شروع کر دیں... اور مجسمہ بنانے کے سلسلے میں یہ لوگ بڑے بے صبرے ہیں۔ بعض اوقات زندہ اوتار کو ہی گردن توڑ کر مار دیتے ہیں اور پھر مسالے وغیرہ لگا کر اس کا مجسمہ بنا دیتے ہیں۔'' وہ ہنستا ہوا اور انہیں خدا حافظ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں خالی خالی نظروں سے دروازے کو دیکھتا رہا۔ سلطانہ بولی۔ ''عمران بھائی بہت اچھے ہیں، پر ان کے بارے میں مجھے جیادہ پتا نا ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں... کون ہیں؟ آپ دونوں کا ملنا کیسے ہوا؟''

''مجھے ابھی تک خود اس کے بارے میں زیادہ پتا نہیں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔''

''اچھا مہروج! ابھی تم جیادہ باتیں نا ہیں کرو۔ ڈاکٹر جی نے آرام کا کہا ہے... لیکن یہ گندم کی گولیوں والی کیا بات تھی؟''

''زبردست۔ ایک طرف باتیں نہ کرنے کا کہہ رہی ہو اور دوسری طرف اتنی لمبی چوڑی داستان بھی پوچھ رہی ہو؟''

''کتنی لمبی ہوئیں گی؟'' وہ سادگی سے بولی۔

''جتنی لمبی تمہاری، نیلے تھوتھے کی پڑیا والی داستان ہے۔'' وہ ایک دم خجل سی ہو گئی۔

وہ تھوڑی دیر سر جھکا کر بیٹھی رہی پھر میرے گھٹنے کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ''مجھے ماف کر دینا مہروج! میں نے تم سے وعدہ کر لیا ہے۔ اب ایسا نا ہیں ہوئیں گا۔ میرے من پہ جو کچھ بھی بیتے، پر میں اپنا وعدہ نا ہیں توڑوں گی۔''

''ایک وعدہ میں نے بھی تم سے کیا ہے اور میں بھی وہ نہیں توڑوں گا۔ جب تک جارج کو راستے بدلہ نہیں لے لیتا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔''

وقتِ رخصت ڈاکٹر لی وان کے گلے شکوے کافی حد تک دور ہو چکے تھے۔ عمران نے اس سے دست بستہ معافی مانگ لی تھی اور ڈاکٹر نے اسے معاف بھی کر دیا تھا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہوا، اس کے مطابق عمران نے ڈاکٹر تک پہنچنے کے لیے تل پالی کے نواح تک سفر کیا تھا۔ ہوشیار سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں کھیت مزدوروں کے روپ میں نکلے تھے۔ ان کے پاس ایک ایسا چھکڑا تھا جس پر ترپال ڈالی گئی تھی اور ترپال کے نیچے سبزیاں تھیں۔ پُرخطر سفر کے بعد عمران نے ڈاکٹر کو اس کے بیڈ روم میں جا پکڑا تھا۔ ڈاکٹر اپنے اصولوں کا پابند تھا۔ کسی صورت اسپتال سے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً عمران کو دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس نے گن پوائنٹ پر ڈاکٹر کو زبردستی چھکڑے میں بٹھایا۔ عمران اور ہوشیار سنگھ ویران لیکن دشوار راستوں پر سفر کرتے ہوئے بصد مشکل یہاں تک پہنچے۔ کم از کم دو مقامات ایسے تھے جہاں ان کی مڈبھیڑ حکم کے کارندوں سے ہوتے ہوتے رہی۔ چھکڑا ہوشیار سنگھ نے ہانکا تھا۔ عمران ریوالور سمیت ڈاکٹر لی وان کے ساتھ موجود رہا تھا۔ فتح پور پہنچنے سے کافی پہلے ہی ڈاکٹر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

اب یہ سب کچھ ماضی قریب کا حصہ بن چکا تھا۔ میرے آپریشن کو دو روز ہو چکے تھے۔ اس کامیاب آپریشن کے بعد ڈاکٹر لی وان اب تل پالی واپس جا رہا تھا۔

''اگر کالی بلیوں نے راستہ کاٹا تو پھر؟'' کالی بلیوں سے مراد حکم کے ہرکارے تھے۔

''پھر ان سے وہی کچھ کہنا ہے جو طے کیا ہے... وہی پہلے والے فرضی نام ہیں ہمارے۔ میرا نام امیت اور تمہارا گوپال۔ ہم کھیا عبدالرشید کی طرف سے یہ سامان لے کر زرگاں کے راج بھون جارہے ہیں۔''

ہم نے اپنا اسلحہ اور ایمونیشن سبزی کے اندر اس طرح چھپایا تھا کہ سخت کوشش کے بعد ہی اسے تلاش کیا جاسکتا تھا لیکن اگر ہم چاہتے تو دو تین سیکنڈ کے اندر ان اشیا تک رسائی حاصل کرسکتے تھے۔

عمران کے ساتھ نے میرے اندر ایک عجیب سا جوش بھر دیا تھا۔ کل شام جب ہم اس کارروائی کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تو عمران نے کہا تھا۔ ''بے شک یہ خطرناک کام ہے لیکن ہمیں اس کے تناؤ اور خطرناکی کو خاطر میں لائے بغیر اسے انجوائے کرنا ہے۔'' اور واقعی آج یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی خطرناک مشن پر نہیں، سیر و تفریح کے لیے جارہے ہیں۔ عمران نکا ہے لگا ہے کوئی فلمی گانا گنگنانے لگتا تھا یا پھر اپنی کسی فرضی محبوبہ کو یاد کرکے آہیں بھرنے لگتا۔ پیاز کی طرح اس کے اوپر تہ در تہ چھلکے تھے۔ اس کے اندر کیا ہے؟ کچھ خبر نہیں ہوتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''بس مجھے ایک ہی فکر ہے عمران! ہماری غیر موجودگی میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوجائے۔ میرا مطلب ہے کہ آفتاب کا تہ خانوں میں آنا جانا کہیں بھانڈا نہ پھوڑ دے۔''

''لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ میں نے آفتاب کو منع کر دیا ہے۔ وہ ہماری واپسی تک تہ خانوں میں نہیں جائے گا۔''

''تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''بس یونہی۔ جب تم مجھ سے سوال پوچھتے ہو تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ میں خود کو باس باس محسوس کرنے لگتا ہوں۔''

''اور میرا خیال ہے کہ تمہارے دماغ میں کیڑا ہے۔ تم دوسروں کو الجھن میں رکھ کر خوشی محسوس کرتے ہو۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ میں دوسروں کو بے خبر رکھ کر انہیں پریشانیوں سے بچاتا ہوں۔ اب یہی دیکھو۔ نالا پار کرنے کے بعد پچھلے ایک گھنٹے تک ہم سخت خطرے میں رہے ہیں لیکن تم مزے سے جماہیاں لیتے رہے ہو اور میرے گانے سنتے رہے ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''نالا پار کرتے ہی ''کلرے'' کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہاں کے سرکنڈوں میں بے تحاشا سانپ ہیں۔ ہوشیار سنگھ نے بھی کہا تھا کہ یہ چار پانچ میل کا راستہ ہمارے سفر کا سب سے خطرناک حصہ ہے۔ سانپ گھوڑا گاڑیوں میں گھس آتے ہیں اور سواری کے جانوروں کو ڈس لیتے ہیں۔ اگر میں تمہیں بتا دیتا تو اس کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہونا تھا کہ پچھلا ایک گھنٹا تم بھی سخت ٹینشن میں گزارتے۔''

''لیکن اس سے میرا اعتماد تو گڑبڑ ہوا ہے نا۔ اب آئندہ بھی تم مجھ سے پتا نہیں کیا کیا چھپاؤ گے۔''

''نہیں... باقی سب کچھ تمہارے علم میں ہے۔ سوائے ایک بات کے۔'' اس نے آخری الفاظ عجیب سے لہجے میں کہے۔ اس کے لہجے میں یہ عجب پن بس تین چار سیکنڈ پہلے ہی آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، اس نے بیٹھے بیٹھے جست لگائی اور سبزیوں کے اوپر جا گرا۔ میں نے گھبرا کر ٹارچ جلائی اور یہ دیکھ کر سکتے میں رہ گیا کہ عمران کے ہاتھ میں ایک سانپ کی گردن ہے۔ یہ درمیانے سائز کا سانپ تھا اور اس کے جسم پر گول داغ سے تھے۔ سانپوں کے بارے میں میرا علم زیادہ نہیں تھا۔ بس یہی سنا تھا کہ ایسے سانپ کو ''کوڑی والا'' سانپ کہا جاتا ہے اور یہ بہت زہریلا ہوتا ہے۔ گردن پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے سانپ کا منہ پورا کھل گیا تھا اور اس کے نکیلے دانت دکھائی دینے لگے... عمران نے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر سبزیوں کے نیچے سے موٹے کینوس کا وہ چھوٹا بیگ نکالا جس میں ریوالورز کے راؤنڈز رکھے تھے۔ عمران کے اشارے پر میں نے بیگ کو الٹا کر خالی کیا۔ عمران نے بڑی چابک دستی سے سانپ کو بیگ میں ڈال کر اوپر سے زپ کھینچ دی۔

اب ہمیں شک ہوگیا تھا کہ گاڑی میں کوئی اور سانپ بھی نہ ہو۔ ہم نے گاڑی روک دی اور ٹارچ کی مدد سے اچھی طرح تلاشی لی۔ سبزیوں کو بھی الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔

''لگتا ہے کہ یہ اکیلا ہی تھا۔'' میں نے کہا۔

''تم اتنے یقین سے ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ اکیلا تھا۔''

''کیا مطلب... گاڑی کا ایک ایک انچ تو دیکھ لیا ہے۔''

''تم ایک ایک ملی میٹر بھی دیکھ لو تو یہ نہیں کہہ سکتے۔''

''بھئی، کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''یار! ہوسکتا ہے کہ یہ اکیلا نہ ہو بلکہ اکیلی ہو۔ ہم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نر ہی ہے۔ اس کے لیے تو دن کی روشنی میں تفصیلی معائنے کی ضرورت پڑے گی اور اگر سانپ نہیں سانپنی ہے تو ہوسکتا ہے کہ ہم مردوں سے معائنہ کرانے سے ہی انکار کر دے۔ آخر ''تانیثی حقوق'' بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔''

''تانیثی حقوق؟''

''بھئی جس طرح انسانی حقوق ہوتے ہیں...''

وہ پٹری سے اتر گیا تھا پھر بولتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چھکڑا بھی چلتا رہا۔ دور جنگل کی گہرائی سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں۔

☆☆☆

یہ اگلی رات، گیارہ بارہ بجے کا عمل تھا۔ ایک طویل اور پُرخطر سفر طے کر کے ہم زرگاں کی بکھری بکھری آبادی میں داخل ہوچکے تھے۔ زرگاں میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں کم از کم تین جگہ روکا گیا تھا اور باقاعدہ سوال جواب کیے گئے تھے۔ چھکڑے میں رکھی سبزیوں کا بھی سرسری معائنہ ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ راج بھون اور اس کے گرد و نواح سے اس طرح کی سوغاتیں اکثر راج بھون کے لیے آتی رہتی ہیں۔ زرگاں کے مسلح محافظوں نے ہمیں زیادہ شک و شبے کا نشانہ نہیں بنایا۔ بہرحال، اگر ہمارا خیال یہ تھا کہ ہم اسی طرح چھکڑا ہانکتے ہانکتے راج بھون میں داخل ہوجائیں گے تو یہ ہماری غلط فہمی تھی۔ راج بھون سے کچھ فاصلے پر ہی مسلح محافظوں نے ہمیں روک لیا اور چھکڑا ایک طرف لگانے کا حکم دیا... یہاں پہلے سے کئی چھکڑے، گھوڑا گاڑیاں اور لوڈر وغیرہ کھڑے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر پر وہ سامان خورونوش تھا جو راج بھون میں جانا تھا۔ سبزیاں، دودھ، پھل اور اسی قسم کی دیگر اشیا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک گھوڑا گاڑی میں شراب کی بہت سی بوتلیں لدی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ خوبرو طوائفیں اور ان کے سازندے وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب لوگ منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ راج بھون میں جانا چاہتے ہیں مگر انہیں اس کی اجازت نہیں مل سکی۔ راج بھون کی شاندار عمارتیں ایک اونچی فصیل نما دیوار کے اندر محفوظ تھیں۔ میں یہ دیوار پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن اب یہ پہلے سے زیادہ اونچی نظر آرہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے زرگاں میں ہونے والے پے در پے خونی واقعات کے بعد ہی اس دیوار کو مزید بلند کیا گیا ہے۔ اس طرح کے اضافی حفاظتی انتظامات ہر جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ بھی تھی کہ سامان

ایک نیگرو کا انتقال ہوگیا۔ جب وہ عدالت الٰہیہ میں پیش ہوا تو اس نے فریاد کی۔

''خدایا! کیا تو یہ بتا سکتا ہے کہ تو نے میری جلد کا رنگ اس قدر سیاہ کیوں بنایا تھا؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں تاکہ تو افریقہ میں سورج کی شدید تمازت کا مقابلہ کر سکے۔''

''تو میری ٹانگیں اتنی لمبی کیوں بنائی تھیں؟''

''اس لیے کہ جب جنگلی درندے تیرا پیچھا کریں تو تو تیز بھاگ سکے۔''

''میرے بال اتنے گھونگریالے کیوں بنائے تھے؟''

''تاکہ وہ لمبے نہ ہونے پائیں اور جنگل میں بھاگتے وقت درخت کی شاخوں میں نہ الجھیں۔''

سیاہ فام نیگرو نے سر جھٹکا لیا اور بولا۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ بتا کہ ان تمام صفات کے ساتھ تو نے مجھے شکاگو میں کیوں پیدا کر دیا؟''

لیاری سے قادر بلوچ کی فریاد

خورونوش والی گاڑیاں اب براہ راست راج بھون کی حدود میں نہیں جاسکتی تھیں۔ یہ سارا سامان اب یہاں سے خاص شاہی گھوڑا گاڑیوں میں منتقل کیا جارہا تھا اور ان گاڑیوں کو راج بھون کے باوردی کوچبان چلا رہے تھے۔

راج بھون کی تقریباً ایک درجن عمارتوں میں وہ عمارت بھی شامل تھی جہاں جارج گورا آج کل رہتا تھا۔ اس سے پہلے جارج گورا، راج بھون کی حدود سے باہر رہائش پذیر تھا مگر جب سے سلطانہ والا واقعہ ہوا تھا اور بپھرے ہوئے لوگوں نے اس کی رہائش گاہ پر دیوانہ وار چڑھائی کی تھی، وہ اپنی رہائش راج بھون کی حدود کے اندر لے آیا تھا۔ وہ آہنی رکاوٹوں، بلند دیواروں اور مسلح محافظوں کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ ہمیں یہ سارے گھیرے توڑ کر اس تک پہنچنا تھا۔ مارنا تھا یا مر جانا تھا۔

''تم نے ایک خاص چیز نوٹ کی؟'' عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ہم دونوں اپنے چھکڑے کے قریب ہی کھڑے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''راج بھون میں ضرورت سے زیادہ روشنی

نظر آرہی ہے۔''

''اور میرے خیال میں آتش بازی بھی ہورہی ہے... وہ دیکھو ایک اور ہوائی تھی۔'' میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔

''اس کا مطلب ہے، کوئی جشن وغیرہ ہے۔''

عمران نے قریب کھڑے ایک گاڑی بان سے پوچھا تو اس نے مقامی لب و لہجے میں بتایا۔ ''آج بڑا شبھ دن ہے۔ بھگوان نے ہمیں خوشی دکھائی ہے۔ حکم جی کے ہاں بیٹے نے جنم لیا ہے...''

وہ اور گاڑی بان بھی وہاں آگئے اور اس پُرمسرت موقع کے حوالے سے باتیں کرنے لگے۔ عمران نے مجھے ٹھوکا دیا اور ہم اپنے چھکڑے میں چلے آئے۔ سب سے پہلے ہم نے سبزیوں کے نیچے سے اپنا اسلحہ نکالا۔ یہ دو ریوالوروں اور دو عدد شکاری چاقوؤں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ گولیاں وغیرہ تھیں۔ یہ سب کچھ ہم نے موٹے پولیتھین میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا تاکہ بارش یا پانی وغیرہ سے محفوظ رہے۔ ایک ریوالور، ایک چاقو اور تھوڑا سا ایمونیشن میں نے اپنے لباس میں رکھ لیا اور اوپر سے گرم چادر کی بکل مار لی۔ باقی اشیا عمران نے سنبھال لیں۔ ان میں وہ کینوس بیگ بھی تھا جس میں ایک آوارہ سانپ استراحت فرما رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''اس چھکڑے کے ساتھ راج بھون میں گھسنے کی امید تو ختم ہوگئی ہے۔ اب دوسرے آپشن پر عمل کرنا ہوگا۔ دوسرا آپشن پتا ہے نا؟''

''اتنا ہی پتا ہے جتنا تم نے بتایا تھا۔ راج بھون کی شمالی دیوار کی طرف ایک جھیل ہے جس میں سے گزر کر دیوار تک پہنچا جاسکتا ہے۔''

''بندے کو جتنا تھوڑا پتا ہوتا ہے، وہ اتنا ہی سکون میں رہتا ہے۔ اب اگر میں تمہیں یہ بتا دیتا کہ جھیل کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہے اور اس میں سے گزرتے ہوئے ہمیں دیوار پر سے دیکھا جاسکتا ہے اور ہم پر چاند ماری ہوسکتی ہے... اور جھیل پار کرنے کے بعد ہمیں بغیر کسی سیڑھی کے قریباً پینتیس فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا ہوگا تو یقیناً تمہاری صحت پر بہت بُرے اثرات پڑتے۔''

''میری صحت کا اتنا خیال رکھنے کا بہت شکریہ... ٹھنڈے پانی اور چاند ماری کی زیادہ فکر نہیں۔ جو کچھ ہوگا، دونوں کے ساتھ ہوگا لیکن یہ جو دیوار کی بات کررہے ہو، اس کا کیا کریں گے...؟''

''یہ بڑا اور بجنل سوال ہے اور اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تم بالغ ہوگئے ہو۔ اب تم وہ ساری فلمیں دیکھ سکتے ہو... جو پہلے بھی دیکھ لیتے تھے... اور جن میں قابلِ اعتراض بات صرف یہی ہوتی تھی کہ ان میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں تمہارے اس اور بجنل سوال کا جواب دیتے ہوئے بہت مسرت محسوس کررہا ہوں۔''

''فرماؤ... کیا جواب ہے؟''

''اوئے گھامڑ! تمہارے ساتھ سرکس کی دنیا کا نمبر ون جمناسٹر موجود ہے... یہ دیوار پینتیس فٹ کے بجائے پینتیس میٹر بلند بھی ہوتی تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میری معلومات کے مطابق یہاں ہمارے لیے ایک بونس سہولت بھی موجود ہے۔ ایک رسّی اس دیوار پر چڑھنے کے لیے پہلے سے لٹک رہی ہے اور امید ہے کہ وہ اب تک لٹک رہی ہوگی۔''

''کس نے لٹکائی ہے؟''

''جادو برحق ہے یار۔'' اس نے بات کو گول کیا اور مجھے لیتا ہوا چھکڑے سے باہر آگیا۔ راج بھون کے اردگرد رات میں بھی دن کا سماں تھا۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ کھا پی رہے تھے اور ہلا گلا کررہے تھے۔ کہیں سے طربیہ ساز بجنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے راج بھون کے اردگرد بھی آتش بازی شروع ہوگئی۔ ہم راج بھون کی بیرونی فصیل کے ساتھ ساتھ ایک طویل چکر کاٹ کر شمال کی جانب آگئے۔ یہاں نسبتاً سکون تھا۔ روشنیاں بھی بس کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، خاموشی مزید گہری ہوتی گئی۔ یہاں دور تک برفیلی جھیل کا پانی چمک رہا تھا۔ قریباً دو سو میٹر چوڑی جھیل کے آخری سرے پر راج بھون کی بلند فصیل تھی اور فصیل کے اندر چراغاں اور آتش بازی کی روشنی تھی۔ فصیل نما دیوار کے اوپر بھی کہیں کہیں مشعلیں اور قندیلیں روشن نظر آتی تھیں۔ ہم دونوں نے خود کو زمانہ قدیم کے جنگجوؤں کی طرح محسوس کیا جو دشمن کے کسی اہم قلعے پر شب خون مارنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک پُرخطر تاریکی میں اتر رہے تھے۔

ہمارے ہتھیار موٹے پولیتھین میں لپٹے تھے اور بالکل محفوظ تھے۔ ہم نے میچ کا آغاز کرنے والے پُرجوش کھلاڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور یخ بستہ پانی میں اتر گئے۔ اس پانی کو صرف یخ بستہ کہنا کافی نہیں تھا۔ یہ سیال برف تھی جو ہمارے جسم سے ٹکرائی اور اپنی ٹھنڈک کو ہماری ہڈیوں تک لے گئی۔ پانی ہماری کمر تک پہنچ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سینے تک چلا گیا پھر ہم تیرنے پر مجبور ہو

گئے۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ جہاں جھیل ختم ہوگی اور دیوار شروع ہوگی، وہاں اِکّا دُکّا محافظ موجود ہوں گے۔ ہماری خواہش یہی تھی کہ پانی کی گہرائی جلد از جلد کم ہوجائے تاکہ ہم تیرنے کے بجائے چل سکیں۔ تیرنے سے شور پیدا ہوتا تھا اور یہ ہمارے لیے خطرناک تھا۔

جلد ہی ہماری پریشانی اطمینان میں بدل گئی۔ ہمارے پاؤں پھر سے زمین سے لگنا شروع ہوگئے۔ اب پانی پر ہاتھ پاؤں چلنے کی آواز معدوم ہوگئی اور ہم خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے صرف سر ہی پانی سے باہر تھے۔ اب ہمیں فصیل کے اندر کا بلند و بالا شور بھی ایک بھنبھناہٹ کی صورت سنائی دینے لگا تھا۔ گاہے بگاہے تاریک آسمان پر آتش بازی کے رنگ بکھرتے تھے اور ان کا مدھم عکس جھیل کے پانی پر جھلک دکھاتا تھا۔

ابھی ہم پانی کے اندر ہی تھے کہ ہمیں دیوار نما فصیل کے پاس پہرے داروں کی موجودگی کا احساس ہوگیا۔ ایک کیبن نما جگہ پر ہلکی سی روشنی دکھائی دی اور قہقہوں کی آواز آئی۔ کیبن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ یہاں تین چار افراد موجود ہوں گے۔ عمران اور میں انتہائی خاموشی کے ساتھ پانی سے باہر نکلے اور یخ بستہ ریت پر اوندھے لیٹ گئے۔ تیز ہوا ہمارے تربتر کپڑوں سے ٹکرائی اور یوں لگا کہ جھیل سے باہر کی سردی جھیل کی سردی سے زیادہ ہے۔ عمران نے کمال مہارت کے ساتھ لکڑی کے کیبن کی طرف رینگنا شروع کیا۔ میں نے بھی جیسے تیسے اس کی تقلید کی۔ ہم ہر طرح کے خطرے اور مار دھاڑ کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ہم کیبن کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے جب اچانک لکڑی کا دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ ایک ہٹا کٹا پہرے دار جو واضح طور پر نشے میں تھا، کندھے سے رائفل لٹکائے باہر نکلا۔ ہمیں دیکھے بغیر وہ ہم سے صرف دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوگیا اور ایک پتھر کی طرف منہ کرکے پیشاب کرنے لگا۔ اس کی حاجت ابھی آخری مراحل میں تھی کہ عمران کسی عفریت کی طرح اس پر جا پڑا۔ یہ ایک پرفیکٹ حملہ تھا۔ ہٹا کٹا پہرے دار ہلکی سی آواز بھی نہیں نکال سکا۔ فقط اس کے گرنے سے مدھم آواز پیدا ہوئی... عمران نے اس کا سر اتنی شدت کے ساتھ پتھر سے ٹکرایا کہ اس نے ایک لمحے میں ہاتھ پاؤں پھینک دیے۔ عمران نے پھرتی سے اس کی رائفل کندھے سے اتار لی۔

ہٹے کٹے پہرے دار کے گرنے سے جو مدھم آواز پیدا ہوئی تھی، اس نے کیبن تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ ''کانتے! یہ کیا آواج ہے بھائی؟''

عمران نے تیزی کے ساتھ بے ہوش پہرے دار کو گھسیٹ کر پتھر کی اوٹ میں کیا۔ اسی دوران میں کیبن کا دروازہ پھر چرچرایا۔ دوسرا پہرے دار باہر نکلا۔ اس نے ہاتھ میں بوتل پکڑ رکھی تھی۔ اس نے کھوجی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور ایک بار پھر اپنے ساتھی کانتے کو آواز دی۔

میں تاریکی میں کیبن کی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور اس سے فقط چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا۔ میں نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ میرا ریوالور والا بازو اس کی گردن سے لپٹ گیا اور خالی ہاتھ سے میں نے اس کا منہ ڈھانپ لیا۔ اس کی خاردار مونچھیں میری ہتھیلی پر چبھیں۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ بارہا ندا جیکی نے مجھے انسانی گردن کے ان نازک حصّوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا جن پر خاص انداز میں دباؤ ڈالنے سے انسان ہوش و حواس سے بیگانہ ہوسکتا ہے۔ میں نے اس تربیت کو آزمانے کی کوشش کی لیکن صرف جزوی کامیابی حاصل ہوسکی۔ میرے شکار کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور نرم ریت پر گری۔ میں نے تب تک اس کی گردن پوری طاقت سے دبائے رکھی جب تک وہ میرے ہاتھوں میں چھپکلی کی طرح جھول نہیں گیا۔ میں نے اسے آرام سے ریت پر لٹا دیا۔ عمران نے ستائشی نظروں سے میری طرف دیکھا اور دونوں انگوٹھے اوپر اٹھا کر ''ویلڈن'' کا اشارہ دیا۔

اندر فقط ایک اور پہرے دار موجود تھا مگر اس کے خلاف کسی طرح کی کارروائی کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ شراب کے نشے میں اتنا ٹن تھا کہ بس نیم مردہ ہی نظر آتا تھا... ایک آہنی انگیٹھی کے قریب وہ بےسدھ پڑا تھا۔

عمران نے اس باوردی پہرے دار کو ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ حکم کے گھر للا پیدا ہونے کی خوشی میں یہ فوت ہوچکا ہے یا صبح تک ہوجائے گا۔''

کیبن میں سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے اور یہاں وہاں تاش کے پتے پڑے تھے۔ کیبن کی کھونٹیوں پر پہرے داروں کی تین چار وردیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں مزید افراد بھی متعین ہیں لیکن فی الحال وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہ گشت پر ہوں یا پھر راج بھون کے جشنِ طرب میں شریک ہونے کے لیے فصیل کے اندر چلے گئے ہوں۔

ہمارے کپڑے بُری طرح بھیگ چکے تھے۔ سرد ہوا

کے سبب عمران جیسا شخص بھی کپکپانے پر مجبور ہو رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اس سردی کو خوش دلی سے برداشت کر رہا ہوں۔

میں نے کیبن کی کھڑکی میں سے باہر نظر دوڑائی۔ دور جھیل کے کنارے پر ایک روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ یقیناً یہ بھی کوئی ایسا ہی کیبن تھا۔ بہرحال، وہ ہم سے خاصی دوری پر واقع تھا۔ میں نے دیکھا کہ عمران وردیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ پھر ایک وردی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے جسم پر فٹ آئے گی۔''

''اور تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بھی کوئی ڈھونڈ لیتا ہوں یار۔'' اس نے کہا۔

کیبن میں نظر دوڑانے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پتھر کے قریب بے ہوش پڑے شخص کے جسم سے وردی اتار رہا ہے۔

صرف چار پانچ منٹ بعد وہ نئے روپ میں میرے سامنے آگیا۔ اب وہ وردی اور سرخ پگڑی کے ساتھ حکم کا ایک چوکس محافظ نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی عمران کی تقلید کی اور باہر تاریکی میں جا کر کپڑے تبدیل کر آیا۔ ایک ایک رائفل بھی ہم نے اپنے کندھوں سے لٹکالی۔

یہ بات ہمیں بڑی اچھی طرح معلوم تھی کہ اس جانب سے راج بھون کی فصیل میں سے گزرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس حوالے سے عمران نے بس ہلکا سا اشارہ دیا تھا کہ کوئی رسّی یہاں لٹک رہی ہے جس کے ذریعے بتیس پینتیس فٹ اونچی دیوار پر چڑھا جا سکتا ہے۔ ہم کیبن سے نکلے اور فصیل نما دیوار کے ساتھ ساتھ رسّی کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ ہمیں زیادہ آگے نہیں جانا پڑا... ہمیں وہ رسّی نظر آگئی۔

راج بھون کی فصیل اور جھیل کے درمیان ریت کی ایک تنگ پٹی سی تھی۔ کہیں یہ پٹی دس پندرہ فٹ چوڑی تھی اور کہیں دو تین فٹ رہ جاتی تھی۔ کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں یہ پٹی موجود ہی نہیں تھی اور جھیل کا پانی فصیل نما دیوار کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ یہ رسّی ایک ایسی ہی جگہ پر جھول رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چمڑے کی ایک مضبوط بیلٹ ہے۔ اس کے بالائی سرے پر لکڑی کی ایک بڑی چرخی تھی اور نچلے سرے سے ربر کا ایک تھیلا سا بندھا ہوا تھا۔ کھلے منہ والے اس لچکیلے تھیلے کو عام طور پر ''بوکا'' کہا جاتا ہے اور اس سے کنوئیں کے اندر سے پانی کھینچا جاتا ہے۔

اب ساری صورتِ حال سمجھ میں آرہی تھی۔ فصیل کے اوپر لگی ہوئی چرخی کے ذریعے جھیل میں سے پانی کھینچا جاتا تھا۔ یہ انتظام کرنے والوں نے شاید سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کوئی اس طرف سے برفاب جھیل کو پار کرے گا اور اس چرخی اور رسّی کو کمند کے طور پر استعمال کرنے کا پروگرام بنائے گا۔

رات کے اس پہر فصیل کا یہ حصہ بالکل تاریک اور بڑی حد تک خاموش نظر آتا تھا... چرخی کے اردگرد کسی طرح کی نقل و حرکت کے آثار نہیں تھے۔

''میں کیسے چڑھوں گا؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''تم چڑھو گے نہیں، چڑھائے جاؤ گے۔'' وہ ترت بولا۔

اس کے بعد اس نے اپنے کندھے سے رائفل اتار کر ربر کے بوکے میں رکھ دی اور مجھے بھی ایسا کرنے کی ہدایت کی۔ پھر سرگوشی میں کہنے لگا۔ ''میں اوپر جا رہا ہوں۔ اوپر پہنچ جاؤں تو تم بوکے میں بیٹھ جانا۔ میں چرخی گھما کر تمہیں اوپر کھینچ لوں گا۔''

وہ اتنے اطمینان سے بات کر رہا تھا جیسے تیس پینتیس فٹ اونچی فصیل پر نہیں، کسی گھر کی قدِ آدم باؤنڈری وال پر چڑھنے کا ارادہ کر رہا ہے... اور وہ ایسا انداز اختیار کر بھی سکتا تھا۔ کودنا، پھلانگنا اور چڑھنا اترنا اس کے پیشے کا حصہ تھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر اوپر جاتے جاتے تم زیادہ اوپر چلے گئے تو؟''

''تو تم میری ساری بیویوں سے شادی کر لینا... اور میرا لاہور والا مکان بیچ کر میرے حلقے کے ایم این اے کو دے دینا۔ بے چارہ بڑا غریب سیٹھ ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی مہارت سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ فقط ایک منٹ میں وہ فصیل پر تھا۔

اس کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق میں ربر کے بوکے میں بیٹھ گیا۔ عمران نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ فصیل پر کھڑے ہو کر میں نے راج بھون کی وسعت میں جھانکا تو وہاں رنگ و نور کا سیلاب نظر آیا۔ کچھ رنگین ہوائیاں ہمارے سروں کے اوپر سے اڑتی ہوئی گئیں اور جھیل کے پانی میں گم ہوگئیں۔

عمران ہانپ رہا تھا۔ ''یار! تمہاری باتوں میں تو اتنا وزن نہیں لیکن خود کافی وزنی ہو۔''

''اور تم دونوں طرف سے ہلکے ہو۔''

''تمہیں بھی زبان لگ گئی ہے۔ کوئی بات نہیں، اگلے آدھ پون گھنٹے میں تمہاری بولتی ضرور بند ہو جائے گی۔''

''بے فکر رہو۔ اگر ہوگی تو دونوں کی ہوگی۔''

''لو... لگ رہا ہے کہ کام شروع ہونے والا ہے۔'' عمران نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ دو پہرے دار چوڑی فصیل پر چلتے ہوئے سیدھا ہماری طرف آرہے تھے۔ ہم دونوں نے چہرے ایک دوسرے کی طرف کر لیے اور باتوں میں مصروف ہوگئے۔ عین ممکن تھا کہ یہ پہرے دار ہماری طرف توجہ دیے بغیر گزر جاتے۔

یقیناً گزر جاتے مگر یہاں ہم سے ایک غلطی ہوئی جس کا پتا ہمیں بعد میں چلا۔ ان پہرے داروں کی سرخ پگڑیوں میں ایک نیلی دھاری تھی جس کا مطلب تھا کہ یہ ہم سے سینئر ہیں۔ مروجہ اصول کے مطابق ہمیں ان کو نمستے کرنا چاہیے تھا۔ ہمارے خاموش رہنے کے سبب وہ ٹھٹک گئے۔ انہوں نے مڑ کر ہمیں دیکھا اور پھر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے ٹارچ کی روشنی ہم پر پھینکی۔ ''تمہاری ڈیوٹی کہاں ہے؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ بُری طرح چونکا۔ غالباً وہ یہاں موجود پہرے داروں کو صورتوں سے پہچانتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے... وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ حرکت اس کی موت پر مہرِ تصدیق لگا چکی ہے۔ عمران کی بھرپور لات اس کے سینے پر پڑی۔ پیچھے کی طرف لڑکھڑانے کے لیے اس کے پاس ڈیڑھ دو فٹ سے زیادہ جگہ نہیں تھی۔ وہ پیچھے گیا اور پھر دیوار پر سے جھیل کی طرف پرواز کر گیا۔ دیوار یعنی فصیل کی موٹائی نیچے سے زیادہ تھی۔ وہاں ایک کنارہ سا بن گیا تھا۔ بدقسمت شخص پہلے اس کنارے سے ٹکرایا پھر جھیل کے برفاب میں چلا گیا۔ دوسرا شخص کافی قوی ہیکل تھا۔ اس نے مجھ پر اندھا دھند ہاتھ چلایا... وزنی مکا میری ٹھوڑی پر لگا۔ گردن کو لگنے والے دھچکے کے سبب میرے نیم مندمل زخم میں ٹیسیں اٹھیں اور دماغ میں چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ اس ہٹے کٹے شخص کا دوسرا وار میں نے جھک کر بچایا اور اس کے سر پر ایک زوردار جوابی مکا رسید کیا۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں نے اندھا دھند دو اور مکے اس کے کھوپڑے پر ہی رسید کیے۔ وہ پیٹ کے بل گرا اور اس کی ناک سے خون جاری ہوگیا۔ میرے زوردار مکوں کا یہ وہی نتیجہ تھا جو اس سے پہلے مکھیا عبدالرشید کی حویلی میں نکلا تھا۔ میں نے پورے طیش سے سلمان سلو کے سر پر دو تین ضربیں لگائی تھیں اور اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا تھا۔

اسی دوران میں ایک قریبی برجی کے پیچھے سے ایک نہایت جوشیلا پہرے دار نکل کر عمران پر جھپٹا۔ غالباً اس کے جوش و خروش میں کچھ حصہ شراب نوشی کا بھی تھا۔ وہ بھی یہ بات فراموش کر گیا کہ اگر اس کا وار خالی گیا تو انجام کیا ہوگا۔ عمران نے پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر خود کو اس کی اندھی زد سے بچایا۔ وہ ریت پر گرا۔ ایک سیکنڈ کے لیے فصیل کے کنارے پر نظر آیا۔ پھر ڈکراتا اور ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا جھیل کی طرف پرواز کر گیا۔

''بچہ ابھی سیکھ رہا تھا۔'' عمران نے گہرائی میں دیکھتے ہوئے تاسف سے کہا۔ پھر گھوم کر ٹارچ کی روشنی اس پہرے دار کے چہرے پر پھینکی جو ابھی تک دیوار کے اوپر ہی تھا۔

اس کا سامنا مجھ سے ہوا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ کر اس کی گھنی مونچھوں کو بھگو رہا تھا۔ ''زندہ ہے یا مر گیا؟'' میں نے پوچھا۔

اصول

نقب لگانے کے بعد اچانک چوروں کو پتا چلا کہ جس مکان میں وہ لوگ گھسے تھے، وہ مشہور و معروف مکے باز محمد علی کلے کا مکان تھا۔ سارے چور یہ معلوم ہوتے ہی تھر تھر کانپنے لگے۔

ایک نے کہا: ''چپکے سے کھسک لو، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔''

دوسرا بولا: ''ہائے! محمد علی مکے مار مار کر ہماری ہڈی پسلی ایک کر دے گا۔''

تیسرے نے جو معمر اور تجربے کار تھا، ساتھیوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں یارو۔ میں محمد علی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ جب تک کم سے کم پچاس ہزار ایڈوانس نہ لے لے، ایک مکا بھی نہیں مارے گا۔''

منظر خان کی تحقیق... ہری پور ہزارہ سے

لفٹ کا جادو

دیہات کا ایک لڑکا شہر میں لفٹ چلانے پر ملازم ہوگیا۔ اتفاقاً اس کا چچا اس سے ملنے آیا اور دیکھا کہ بھتیجے کی لفٹ میں ایک بوڑھی عورت سوار ہو رہی ہے۔ لفٹ بڑی بی کو اوپر لے گئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک نوجوان لڑکی لفٹ میں سوار ہوگئی اور نیچے لڑکے کے چچا کے سامنے باہر نکلی۔ چچا نے فوراً بھتیجے سے کہا: ''بیٹے میں اب کے آؤں گا تو تمہاری چچی کو ساتھ لاؤں گا تم ایک چکر اسے بھی لگا دینا۔''

لورالائی سے کشمالا کا انتخاب

"سر کی ہڈی ٹوٹ کر مغز میں گھس جائے تو اکثر لوگ زندہ رہنا پسند نہیں کرتے۔" عمران نے کہا اور مجھے ذرا حیرت سے دیکھ کر ٹارچ بجھا دی۔

یہ فصیل تقریباً تین فٹ چوڑی تھی۔ کہیں کہیں باقاعدہ برجیاں تھیں اور وہاں اس کی چوڑائی چھ سے آٹھ فٹ تک تھی۔ ہم دونوں نے مُردہ پہرے دار کی لاش گھسیٹ کر پینتیس فٹ نیچے یخ بستہ جھیل میں پھینک دی اور محافظوں کے انداز میں اکڑ کر چلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

سیڑھیاں زیادہ دور نہیں تھیں۔ ہم نے تقریباً پچاس عدد سیڑھیاں طے کیں اور ایک کھلے احاطے میں داخل ہو گئے۔ یہاں راج بھون کے بیسیوں ملازم اور محافظ وغیرہ جمع تھے۔ کچھ ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ کچھ ساز بجا رہے تھے۔ یہاں وہاں مٹھائی بھی تقسیم ہو رہی تھی۔ عمران نے سرگوشی میں کہا۔ "ایک نئے آقا کے نئے ظلم سہنے کا کتنا چاؤ ہے ان لوگوں کو۔"

عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ظالم ابنِ ظالم اور مظلوم ابنِ مظلوم کی روایت صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ ہم نے تھوڑی سی مٹھائی لی اور ہلا گلا کرتے لوگوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ہمارا رخ سنہری کلسوں والی اس بلند و بالا عمارت کی طرف تھا جو جنریٹرز کی روشنی سے پوری طرح جگمگا رہی تھی۔ سیکڑوں رنگ برنگے قمقمے تھے اور ابھی مزید لگائے جا رہے تھے۔ یہی عمارت اس اسٹیٹ کے طاقتور فرماں روا رائے وشوا ناتھ عرف حکم جی کی جائے رہائش تھی۔ عمران کی معلومات کے مطابق سفید چمڑی والے جارج کا عشرت کدہ بھی اسی عمارت کے ساتھ تھا۔

یہاں آ کر میں نے اور عمران نے نوٹ کیا کہ جن پہرے داروں کی پگڑیوں میں دھاریاں تھیں، وہ سینئر تھے اور عام پہرے دار پاس سے گزرتے ہوئے انہیں باقاعدہ سر جھکا کر تعظیم پیش کرتے تھے۔ ہم نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔ اس کے علاوہ ہم کوشش کر رہے تھے کہ ہمارا آمنا سامنا باوردی افراد کے ساتھ کم سے کم ہو۔ فصیل کے عظیم الشان مین دروازے سے وہ خاص خاص مہمان اندر داخل ہو رہے تھے جنہیں اس پُرمسرت موقع پر اندر آنے کی اجازت ملی تھی۔ ان معزز مہمانوں کی شان دار گاڑیاں اور بگھیاں باہر ہی روک لی گئی تھیں۔ وہ پیدل اندر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ بیگمات بھی تھیں... کچھ مقامی طوائفیں سنگِ مرمر کے ایک چبوترے پر رقص کر رہی تھیں۔ ان کا لباس، رقص سے بڑھ کر اور رقص، لباس سے بڑھ کر ہیجان خیز تھا۔ وہ گانا بھی گا رہی تھیں۔ یمایماں... یمایماں... بس آج کی رات ہے زندگی۔ کل ہم کہاں تم کہاں... کچھ اس طرح کا گیت تھا۔

گیت کی لہریں، موسیقی، پھڑکتے جسم اور آتش بازی... یہ سب مل جل کر عجیب سماں باندھ رہے تھے۔ اور اس صورتِ حال میں... ہم دونوں ایک نہایت خطرناک ارادے کے ساتھ دھیرے دھیرے حکم جی کی رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"وہ دیکھو، ادھر ہجوم ہے۔" عمران نے ایک جانب اشارہ کیا۔

یہ جگہ حکم جی کی عالی شان رہائش گاہ کے عین سامنے تھی۔ ہم لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس ہجوم کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک جگہ رنگ برنگے فواروں کے درمیان کھلے احاطے میں پُرجوش لوگوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، ملازم پیشہ افراد بھی اور محافظ بھی۔ کسی مقامی رسم کے مطابق یہ لوگ ایک دوسرے پر چینی پھینک رہے تھے اور چہروں پر رنگ مل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہولی کے بغیر ہی ہولی منائی جا رہی ہے۔

عمران نے آگے بڑھ کر ایک محافظ کے چہرے پر رنگ ملا تو جواباً اس نے بھی بہت سا رنگ عمران کو مل دیا۔ عمران نے چمکیلے رنگ کی مٹھی بھری اور میرا چہرہ بھی رنگ دیا۔ اس کوشش میں ہم دونوں کی مخصوص پگڑیاں گر گئی تھیں۔ ہم نے یہ پگڑیاں پھر سروں پر رکھیں۔ پہلے تو میں نے عمران کی اس حرکت کو صرف اس کی شوخی سمجھا لیکن پھر اندازہ ہوا کہ اس "شوخی" کی آڑ میں ہم دونوں کافی حد تک اپنی شناخت چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بہت سے لوگ اپنی رنگ برنگی پگڑیاں لہرا رہے تھے۔ ان میں راج بھون کے گارڈز اور سپاہی بھی شامل تھے۔ عمران نے بھی پگڑی اتار کر لہرانی شروع کر دی۔ کسی طرف سے نعرہ بلند ہوا۔ "ہمارے حکم جی کی..." سیکڑوں لوگوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ "جے۔"

"ہمارے ولی عہد کی..."

سیکڑوں لوگوں نے کہا۔ "جے۔"

ہم بھی ان نعروں میں شریک ہو گئے اور قدم بہ قدم آگے بھی بڑھتے رہے۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "لو... آج حکم جی کو بھی دیکھ لو۔"

"کہاں؟"

"وہ دائیں طرف دیکھو، بالکونی میں۔"

اور پھر واقعی میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ مجھے پہلی بار نظر آیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں جو تصور قائم کر رکھا تھا، وہ اس سے زیادہ بارعب اور اونچا لمبا تھا۔ اس کے قدوقامت میں کچھ عمل دخل شاید اس چمک دار پگڑی کا بھی تھا جو اس نے بڑے شاہانہ ٹھاٹ سے باندھ رکھی تھی۔ وہ کافی دوری پر تھا۔ اس کے گلے کی نہایت قیمتی مالائیں اور انگشتریاں وغیرہ پھر بھی چمک دکھا رہی تھیں۔ بالکونی میں اس کے ساتھ شاہی خاندان کے اور بھی کئی مرد و زن موجود تھے۔ ان میں زرق برق لباسوں والی چار رانیاں بھی موجود تھیں۔ تاہم مہارانی رتنا دیوی یقیناً ان میں نہیں تھی کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق بچہ اسی کو تولد ہوا تھا۔

یکایک مجھے لگا کہ میرے جسم کا سارا لہو میرے سر کو چڑھ رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ دل اتنی شدت سے دھڑکا کہ لگا، پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بالکونی میں معزز افراد کے درمیان میری نگاہ شیطانِ اعظم جارج گورا پر پڑی۔ اپنے نہایت سرخ و سپید چہرے اور نمایاں قد کاٹھ کے سبب وہ علیحدہ پہچانا جا رہا تھا۔ ہاں، یہی تھا وہ شخص جس کے خون کی پیاس روز و شب میرے اندر بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ اسی نے میری سلطانہ کو روندا تھا، اسی نے اسے توڑ پھوڑ کر ناقابلِ شناخت بنایا تھا۔ اسے کوئی حق نہیں تھا مسکرانے کا، شاہی بالکونی میں کھڑے ہو کر چہکنے کا... سانس لینے کا اور زندہ رہنے کا... ہاں، کوئی حق نہیں تھا۔

عمران نے بھی جارج گورا کو بالکونی میں دیکھ لیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے نگاہ ملائی اور اس بے پناہ حرارت کو محسوس کیا جو گورا کی شکل دیکھنے کے بعد ہمارے رگ و پے میں دوڑی تھی۔ لیکن ہمارے اور اس شیطان کے درمیان بہت فاصلہ تھا، بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ بالکونی خاصی بلندی پر تھی اور بالکونی کے آگے ایک وسیع رقبے کو بالکل خالی رکھا گیا تھا۔ اس رقبے کے گرد آہنی باڑوں اور محافظوں کی دُہری تہری قطاروں نے حد بندی کر رکھی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ بس ایک حد تک ہی آگے جا سکیں گے۔ زیادہ آگے گئے تو مشکوک قرار پائیں گے...

پھر بھی ہم کوشش کرنا چاہتے تھے، شاید کوئی راہ مل جاتی اور شاید ہم کسی ایسی جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے جہاں سے جارج گورا پر رائفل کا فائر کیا جا سکتا۔ حالانکہ کسی ایسی کوشش کی کامیابی کا امکان بہت کم اور پکڑے جانے کا اندیشہ بہت زیادہ تھا۔ تب میری نظر جارج گورا کے ساتھ کھڑے دو دوسرے افراد پر پڑی۔ ان میں سے ایک مرد تھا اور دوسری عورت۔ اس عورت کو بھی میں سیکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ یقیناً یہ ماریا تھی۔ اسے ہم نے اپنی شرائط منوانے کے لیے اغوا کیا تھا لیکن یہ ہمارے گروپ کے ایک غدار کو "ایک رشوت" پیش کر کے فرار ہو گئی تھی۔ ماریا کے ساتھ جو شخص کھڑا تھا، وہ بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ سرجن اسٹیل تھا، ماریا کا شوہر نامدار... اسی نے میرے جسم میں وہ منحوس چپ رکھی تھی جس نے ایک طویل عرصے تک مجھے پابندِ سلاسل کیا اور میں مسلسل کوششوں کے باوجود اس اسٹیٹ کی حدود سے نکل نہ سکا۔

ہم آگے کو کھسکتے رہے لیکن پھر ایک جگہ ہمیں رکنا پڑا۔ ہمیں لگا کہ اب اس سے آگے نہیں جا سکیں گے۔ یہاں طوائفیں اور راج بھون کی خدمت گار عورتیں بھی ہجوم میں گھسی ہوئی تھیں۔ بدمست مردان سے چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔ کہیں کہیں یہ چھیڑ خانیاں دست درازیوں میں بدل چکی تھیں، تاہم خوشی کے اس موقع پر یہ عورتیں کچھ زیادہ معترض نہیں تھیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس صورتِ حال کو نظر انداز کر رہی تھیں۔

اس سے پہلے میں نے حکم جی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ صرف ایک مرتبہ بارونداجیکی کے پاس چند تصویریں دیکھی تھیں۔ یہ تصویریں دراصل جیکی کی محبوبہ شکنتلا کی تھیں۔ ان میں حکم جی بھی موجود تھا، تاہم جیکی نے اظہارِ نفرت کے طور پر حکم جی کے چہرے اور جسم کے دیگر حصوں پر سیاہی پھیر دی تھی... آج حکم میرے سامنے تھا۔ بے شک وہ آج بھی کافی فاصلے پر تھا مگر میں کم از کم اسے دیکھ تو سکتا تھا۔ اسے حکمراں کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی راہنما کا درجہ بھی دیا جاتا تھا... اور میں دیکھ رہا تھا کہ بالکونی میں اس کا انداز مذہبی راہنماؤں جیسا ہی ہے۔ ایک زرنگار چوغہ اس کے کندھوں پر تھا اور وہ گاہے بگاہے بڑے "برگزیدہ" انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے لگتا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ ہم اس سے آگے نہیں جا سکیں گے۔" میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

"اور ہمارے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔" عمران نے کہا۔ "جھیل کے کنارے بے ہوش پڑے پہرے داروں کو کسی بھی وقت دیکھا جا سکتا ہے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"چڑی بے چاری کیا کرے... ٹھنڈا پانی پی مرے۔" عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

اچانک وہ کچھ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔

بالکونی میں کھڑے شاہی افراد کی سخاوت اور دریا دلی نے جوش مارا۔ حکم جی نے وہی کچھ کیا جو قدیم زمانوں سے پُرشکوہ حکمران اپنی ”بیچ“ رعایا کو خوش کرنے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ اس نے مٹھیاں بھر بھر کر کچھ چیزیں نیچے نچھاور کرنا شروع کر دیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، ان میں کرنسی نوٹوں کے علاوہ سونے چاندی کے سکے اور قیمتی پتھر وغیرہ بھی شامل تھے۔ حکم جی کے ساتھ ہی ان کی رانیاں اور دو چار دیگر افراد بھی اس شاہانہ سخاوت میں شریک ہوئے۔ جب بالکونی کے سامنے خالی احاطے میں قیمتی اشیا کی غیر متوقع بارش ہوئی تو کوئی رکاوٹ رکاوٹ نہ رہی۔ لوگ ایک سیلاب کی طرح اُمڈے اور ان اشیا پہ جھپٹے۔ باڑیں اکھڑ گئیں، محافظوں کا حصار تتر بتر ہو گیا...

یہ ایک نادر موقع تھا۔ ”چلو۔“ عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ہم بھی اس انسانی ریلے کا حصہ بن گئے جو احاطے کی طرف لپک رہا تھا۔ اس اچانک بھگدڑ کے سبب کئی لوگ گر گئے تھے۔ دوسرے انہیں روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے... میں نے دیکھا کہ باوردی محافظ بھی اپنے اہم فریضے کو لات مار کر قیمتی اشیا پر جھپٹنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ منظر دیدنی تھا۔ میں اور عمران باڑیں پھلانگتے ہوئے احاطے میں پہنچے... کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ لوگ بھوکے جانوروں کی طرح قیمتی سکوں پر جھپٹ رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے اور چلا رہے تھے۔

ہم نے بھی چند اشیا اٹھائیں اور جھک کر دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب ہم نے بکھری ہوئی رائفلیں اپنے ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم بالکونی کے عین سامنے تھے۔ یہ سنگِ سرخ کی شان دار بالکونی زمین سے کم و بیش تیس فٹ بلند تھی۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس طرف سے اوپر جانے کا راستہ تھا ہی نہیں... فقط ایک جانب ایک چھوٹی سی گلی نظر آ رہی تھی۔ یہ گلی غالباً محل کے اندرونی حصوں کی طرف جانے کے لیے تھی۔ تاہم اس گلی کے سامنے حکم جی کے خصوصی محافظوں کا دستہ چوکس کھڑا تھا۔

”کیا کریں؟“ میں نے تقریباً چلا کر عمران سے پوچھا۔

”یہیں سے فائر کرو۔“ اس نے ہانپتی آواز میں کہا۔

ہمیں بالکونی میں حکم، جارج گورا، مرجن اسٹیل اور ماریا وغیرہ کے بس بالائی دھڑ نظر آ رہے تھے۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی ہم نے رائفلیں سیدھی کیں۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی ٹریگر دباتا، لوٹ مار میں مصروف ایک ہٹا کٹا شخص توپ کے گولے کی طرح عمران سے ٹکرایا۔ عمران لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کی رائفل کا میگزین علیحدہ ہو کر دور جا گرا۔

میں نے ایک سیکنڈ کے نصف حصے میں یہ سب کچھ دیکھا اور سمجھ گیا کہ اب عمران فائر نہیں کر سکے گا۔ میں نے رائفل اندازے سے جارج گورا کی طرف سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ رائفل میڈیم برسٹ پر سیٹ تھی۔ خوفناک تڑتڑاہٹ سے فضا گونجی اور بالکونی کی ریلنگ کے آس پاس چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ میں نے فوراً ہی دوسرا برسٹ مارا۔ بالکونی میں نظر آنے والی چمکیلی پگڑیاں اور رنگین آنچل ایک دم ہی اوجھل ہو گئے۔ میں لوگوں سے ٹکراتا اور انہیں پھلانگتا ہوا واپس پلٹا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ دور ہٹ کر بالکونی پر مزید برسٹ ماروں لیکن پھر میری نظر ایک چہرے پر پڑی اور میرا جسم سنسنا گیا۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ وہ مجھ سے تقریباً بیس میٹر کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے فائر کرتے دیکھ لیا تھا۔

”پکڑو... پکڑو...“ وہ میری طرف انگلی اٹھا کر دھاڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی برق رفتاری سے میری طرف آیا۔

اب رکنا فضول تھا۔ میں اور عمران پلٹ کر دوڑے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس جگہ یہ نہایت خطرناک شخص ہمیں نظر آئے گا۔ وہ نہ صرف نظر آیا تھا بلکہ اب پوری رفتار سے ہمارے پیچھے بھی آ رہا تھا۔ عمران نے ابھی تک رنجیت پانڈے کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس لیے اسے علم نہیں تھا کہ ہمارے پیچھے کون سی بلا لگ گئی ہے۔

ہم شاہی بالکونی کے سامنے جو کچھ زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے، وہ کر چکے تھے۔ اب ہمیں یہاں سے کسی طرح بھاگنے کی کوشش کرنا تھی۔ ہم باڑیں پھلانگ کر واپس بڑے ہجوم کے اندر گھس گئے۔ یہاں ابھی تک بیشتر لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ بالکونی کے سامنے کیا ہوا ہے... فائرنگ کی تڑتڑ آتش بازی کی آوازوں میں گم ہو گئی تھی اور ہلچل تو ویسے بھی ہر طرف مچی ہوئی تھی۔ ہم ہجوم کو چیرتے ہوئے فصیل کے جنوبی دروازے کی طرف بڑھے مگر جب ادھر سے بھی گارڈز کو حرکت کر کے اپنی طرف آتے دیکھا تو رخ بدل لیا۔ سامنے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا، ہم اس میں گھس گئے۔ یہ راج بھون کا وسیع و عریض باورچی خانہ تھا۔ ایک قطار میں درجنوں دیگیں آگ پر دھری تھیں۔ ہم ان دیگوں کو پھلانگتے ہوئے ایک بڑے ہال نما کمرے میں گھس گئے۔ یہاں بہت سی عورتیں دو رویہ بیٹھی تھیں، ان کے سامنے تالینوں پر بڑے بڑے تھال

تھے۔ وہ پکوانوں میں ڈالنے کے لیے خشک میوہ جات کاٹ رہی تھیں۔ ہم تند بگولوں کی طرح ان کے درمیان سے گزر گئے، وہ چلاتی اور ہڑبڑاتی رہ گئیں۔ ایک طویل برآمدے میں سفید وردیوں والے درجنوں خانساماؤں نے ہمیں حیرت اور خوف کے عالم میں دیکھا۔ عمران کا دھکا لگنے سے ایک گیم شیم باورچی اوندھے منہ ایک بڑے دیگچے میں گرا اور ہمیں صرف اس کی اوپر اٹھی ہوئی ٹانگیں نظر آئیں۔

ہمارے عقب میں ہوائی فائرنگ ہو رہی تھی اور رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آندھی کی طرح اڑا چلا آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پانڈے مجھے پہچان نہیں سکا ہو گا۔ میرے چہرے پر رنگ ملا ہوا تھا۔ اس نے مجھے صرف فائرنگ کرتے دیکھا تھا اور مجھے پکڑنے کے لیے جھپٹ پڑا تھا۔ اس حوالے سے اس کی تیز نگاہی کی داد دینا پڑتی تھی۔ اندرونی دروازے سے بیس تیس قدم پہلے تین چار گارڈز ہمارے راستے میں آئے مگر وہ شدید تذبذب میں تھے۔ جیسے سمجھ نہ پا رہے ہوں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ہمیں روکنا ہے یا کسی اور کو روکنا ہے۔ ایک گارڈ نے عمران کا راستہ روکا تو عمران نے اس کے چہرے پر رائفل کے دستے سے طوفانی ضرب لگائی۔ ایک دوسرے گارڈ کو میں نے دھکا دے کر دور پھینکا... کچھ فاصلے پر ایک لوڈر حرکت کرتا ہوا فصیل کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں ترپال تنی ہوئی تھی۔ عمران مجھ سے آگے تھا، وہ دوڑتا ہوا لوڈر کے بائیں طرف والے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ایک سیکنڈ بعد میں نے لوڈر کے ڈرائیور کو اچھل کر دوسرے دروازے سے باہر گرتے دیکھا۔ یقیناً عمران ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں بھی عمران کے ساتھ جا کر بیٹھ سکتا۔ میں نے جست لگائی اور چلتے ہوئے لوڈر کے عقب میں سوار ہو گیا۔ تاہم اس کوشش کے دوران میں میری رائفل گر گئی۔

عمران نے مجھے سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گیئر بدلا اور یکایک لوڈر کی رفتار بڑھا دی۔ مجھے درمیانی شیشے میں سے ونڈ اسکرین دکھائی دے رہی تھی۔ بیرونی دروازے پر بیریئر تھا اور مسلح گارڈز تھے۔ عمران ایک دھماکے سے بیریئر کو توڑتا ہوا نکل گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ نصف درجن گارڈز ہکا بکا رہ گئے۔ ان میں سے شاید ایک دو گارڈز نے گولی چلائی ہو گی لیکن تب تک ہم مین راستے پر آ چکے تھے۔ یہاں بھی بہت سی گھوڑا گاڑیاں اور چھکڑے وغیرہ موجود تھے۔ عمران ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

”ٹھیک ہو؟“ اس نے لوڈر کے کیبن میں سے ہانک لگائی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔ پر رائفل گر گئی ہے۔“

”کوئی بات نہیں... اللہ اور دے گا۔“

”لگتا ہے کوئی پیچھے آ رہا ہے۔“ میں نے اطلاع دی۔

”کون ہے؟“

”یہ وہی ذلیل رنجیت پانڈے ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ واقعی کسی بلا کی طرح ہمارے پیچھے تھا۔ وہ پوری رفتار سے ہمارے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھی کافی پیچھے رہ گئے تھے۔ شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ میری رائفل گر گئی ہے۔ اسے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ میں اس پر فائر کر سکتا ہوں۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لوڈر کی رفتار تیز ہونے سے پہلے وہ چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو جائے۔ لوڈر سے اس کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میں نے وردی کے نیچے سے اپنا لوڈڈ ریوالور نکال لیا۔ میں مکمل تاریکی میں تھا۔ آندھی کی طرح لوڈر کے پیچھے آتا ہوا رنجیت پانڈے میری حرکات و سکنات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ریوالور دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پانڈے کا نشانہ لے لیا لیکن پھر پتا نہیں کیوں... میں نے اس پر گولی نہیں چلائی... میں نے اسے جست کر کے لوڈر پر چڑھنے دیا۔

وہ کسی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ چنگھاڑتا ہوا میرے اوپر آ پڑا۔ تاریکی میں مجھے بس اس کی آنکھیں ہی چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔ غالباً اس کے چہرے پر بھی کسی نے تھوڑا سا رنگ مل دیا تھا۔ ہم اوپر نیچے لوڈر کے دھاتی فرش پر گرے۔ گرتے گرتے پانڈے نے میری ٹھوڑی پر زوردار ٹکر رسید کی اور اپنی طبع کے مطابق ایک غلیظ گالی دی... اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا سرکاری پستول نکال کر میری کنپٹی پر رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے راستے میں ہی اس کی کلائی پکڑ لی اور پوری طاقت سے مروڑ کر جوابی ٹکر اس کے تھوبڑے پر رسید کی۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو میں نے اسے ٹانگوں پر اچھال کر لوڈر کی سائڈ سے دے مارا۔ جب وہ گھوما تو اس کی کلائی بدستور میری گرفت میں تھی۔ کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح سنائی دی۔ پانڈے کی کراہ کرب ناک تھی۔ پستول پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہو گیا۔ اس نے تلملا کر میرے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔ دیوان کی طرح ایک بار پھر مجھے اس کی بے پناہ جسمانی قوت کا اندازہ ہوا۔ یہ ایک گھونسا کسی بھی شخص کو ہوش و حواس سے

بیگانہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ میری برداشت نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے اس مہلک گھونسے کو برداشت کرتے ہوئے جوابی وار کیا... اور یہ کوئی معمولی وار نہیں تھا۔ یہ پانڈے جیسے خطرناک غنڈے اور قاتل کے شایانِ شان تھا۔ یہ اس دس انچ لمبے پھل والے شکاری چاقو کا وار تھا جو میں نے دو تین سیکنڈ پہلے اپنی پنڈلی میں سے کھینچا تھا۔ یہ چاقو پورے کا پورا پانڈے کے پہلو میں گیا۔ وہ بڑے دردناک انداز میں چلایا۔ اس کی آنکھیں تکلیف اور حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے بے رحمی سے چاقو کو اوپر کی طرف کھینچتے ہوئے باہر نکالا۔ پانڈے کا پیٹ کئی انچ تک پھٹ گیا۔

آخری کوشش کے طور پر اس نے میرا چاقو والا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اب اس کے فولادی جسم کی طاقت نصف بھی نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دوسرا وار اس کی ناف سے ذرا اوپر پیٹ میں کیا۔ چاقو پھر اس کی انتڑیوں میں چلا گیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور اس نے بائیں ہاتھ سے میری آنکھیں نوچنے کی کوشش کی۔ وہ نزع کے عالم میں داخل ہو گیا تھا... بی ایس ایف کا درندہ صفت افسر، دہشت و بربریت کا نشان، حکم جی کی سونچھ کا بال... اس تیز رفتار لوڈر کی تیرگی میں آنا فاناً اپنے سارے منافع بخش عہدوں سے ''مستعفی'' ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اب وہ موت کے روبرو تھا۔ میں نے پے در پے تین اور وار اس کے پیٹ اور سینے پر کیے... اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا... اچانک لوڈر کو ایک شدید ترین جھٹکا لگا۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ لوڈر کی بائیں جانب والی دیوار نے ایک مقناطیس کی طرح مجھے اپنے ساتھ چپکا لیا ہے۔ لوڈر الٹ رہا تھا۔ تب ایک خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی اور سب کچھ تہ و بالا ہو گیا۔ میں نے پانڈے کے جسم کو اچھل کر چھت سے ٹکراتے دیکھا۔ خود میں بھی اسی طرح چھت سے ٹکرایا... تب کئی لڑھکنیاں کھا کر کسی نرم چیز پر گرا۔ میرے چاروں طرف نیم تاریکی تھی اور گرد و غبار تھا۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ لوڈر کسی گھر کی دیوار توڑ کر کسی کمرے میں گھسا ہے۔ جونہی میں گرا تھا، میرے کانوں سے کسی کے چلانے کی سریلی آواز بھی ٹکرائی تھی۔ یہ آواز میرے نیچے سے بلند ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ میں ایک قالین پر گرا تھا اور میرے نیچے ایک جواں سال لڑکی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو ذرا ہاتھ پاؤں چلا کر میرے نیچے سے نکل جاتی مگر وہ اتنی وحشت زدہ تھی کہ مسلسل چلانے کے سوا کچھ بھی کر نہیں پا رہی تھی۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اس وقت میں نے عمران کو بھی سڑک کے کنارے سے اٹھتے دیکھا۔ لوڈر ایک طرف الٹا پڑا تھا۔ اس کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے، ہیڈ لائٹس ابھی تک روشن تھیں۔ جونہی میں پیچھے ہٹا، لڑکی اٹھ کر کسی نامعلوم سمت میں بھاگ گئی۔ تب میں نے ایک فربہ اندام ہندو عورت کو بھی ملبے سے نکل کر بھاگتے اور تاریکی میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ میں نے نیم تاریکی میں دائیں بائیں ہاتھ چلایا اور خوش قسمتی سے اپنا ریوالور ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔

یہ دراصل سڑک کے بالکل کنارے پر ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ لوڈر اس کی بیرونی دیوار توڑتا ہوا اندر گھس گیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ چائے خانہ ایک ہندو بیوہ اور اس کی بیٹی کا تھا اور وہ بند چائے خانے کے اندر ہی سو رہی تھیں۔

''وہ آرہے ہیں؟'' عمران نے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

راج بھون سے ہمارے پیچھے لگنے والی گھوڑا گاڑیاں سرپٹ بھاگی چلی آرہی تھیں۔ ہمارے پاس صرف چند سیکنڈ کا وقت تھا۔ ہم ملبے میں سے نکلے اور جس طرف رخ تھا، اسی طرف دوڑ نکلے۔ ہمارے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ عمران بھی اپنی ناکارہ رائفل راج بھون میں ہی چھوڑ آیا تھا۔

''پکڑو... پکڑو'' کئی آوازیں ہمارے کانوں سے ٹکرائیں۔

ہم نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے نہر کا چوبی پل پار کیا اور ایک آبادی میں گھس گئے۔ ہمارے عقب میں فائرنگ بھی ہوئی لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ ایک بھری پُری آبادی تھی لیکن اس وقت گلیاں سو رہی تھیں اور ہر طرف سناٹا تھا۔ ہم ایک طویل خم دار گلی میں دوڑتے چلے گئے۔ ہمارے عقب میں بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں تھیں۔

''مارے گئے۔'' عمران کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

آگے گلی بند تھی۔ ہم واپس پلٹے۔ وہ بڑے نازک لمحے تھے۔ عمران کے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔ اس نے دو تین قریبی دروازوں کو اپنے کندھے سے زوردار ضربیں لگائیں۔ جس تیسرے دروازے کو اس نے کندھے سے ضرب لگائی، اس کے اندر کی چٹخنی ٹوٹ گئی۔ ہم پلک جھپکتے میں اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں تاریکی تھی۔ غور سے دیکھنے پر ایک بڑا گملا نظر آیا۔ عمران نے اور میں نے گملا گھسیٹ کر دروازے کے سامنے کر دیا۔ یوں چٹخنی نہ ہونے کے باوجود دروازہ بند ہو گیا۔

کوئی بڑی عمر کا شخص زور سے کھانسا۔ کسی قریبی

کمرے سے اس کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے بھیا؟''

تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ابھری، وہ ڈیوڑھی کی طرف آرہا تھا۔ میں نے دائیں جانب والے ایک دروازے کو دھکیلا، وہ کھل گیا۔ ہم ایک نیم گرم کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں لالٹین کی بہت مدھم روشنی میں ایک جواں سال لڑکی ریشمی بستر پر نظر آئی۔ یقیناً چند سیکنڈ پہلے وہ سو رہی تھی۔ اب آوازیں سن کر جاگ گئی تھی مگر ابھی پوری طرح جاگی بھی نہیں تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے حیرت سے آنکھیں کھولیں۔ اس سے پہلے کہ وہ چلاتی اور کسی کو مدد کے لیے بلاتی، میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کے ہونٹ پوری سختی سے بند کر دیے تھے۔ وہ میری گرفت میں بس تڑپ پھڑک کر رہ گئی۔ جب میں نے اس کی نازک گردن پر اپنے بازو کا دباؤ بڑھایا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اگر وہ زیادہ مزاحمت کرے گی تو اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ وہ ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس دوران میں عمران کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر چکا تھا۔ پھر اس نے لالٹین بھی بجھا دی۔

''کون ہے بھیا۔'' گھر کے مالک کی بھرائی ہوئی آواز پھر ابھری۔

جواب میں خاموشی تھی۔ وہ شخص ڈیوڑھی تک آیا۔ چند سیکنڈ تک سن گن لیتا رہا۔ غالباً تاریک ڈیوڑھی میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ واپس چلا گیا۔ عمران نے خوفناک پھل والا شکاری چاقو نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دیا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اگر شور مچاؤ گی تو ایک سیکنڈ میں اس چاقو سے شہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔ اگر چپ رہو گی تو وعدہ کرتا ہوں تمہیں خراش تک نہیں آئے گی... ہاتھ تک نہیں لگائیں گے تمہیں۔''

دھیرے دھیرے اب ہماری آنکھیں کمرے کی تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو رہی تھیں۔ یہ درمیانے سائز کا کمرا تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا بغلی دروازہ بھی نظر آرہا تھا۔ یہ کوئی اسٹور نما جگہ تھی۔ ایک طرف طاق میں مورتیاں وغیرہ بھی ہوئی تھیں۔ ہم ایک ہندو گھر میں داخل ہوئے تھے۔

لڑکی ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سمجھ دار ہے۔ صورتِ حال کو سمجھ گئی ہے اور ہمارے ساتھ، کم از کم وقتی طور پر تعاون کرنے کو تیار ہے۔ عمران نے چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھی اور میں نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔

وہ گھگیائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ہم کو کچھ نا ہیں کہنا... جو جی چاہتا ہے یہاں سے لے لو... اور چلے جاؤ... بھگوان کے لیے...'' اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''چلے جاتے ہیں... لیکن تھوڑی دیر بعد... اس سے پہلے اگر تم نے کوئی حرکت کی تو تمہارا جیون تو جائے گا ہی... باقیوں کے لیے بھی بہت برا ہو گا۔''

''بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں، کچھ نا ہیں بولوں گی۔''

''آہستہ بولو۔'' عمران پھنکارا۔

''بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں، کچھ نا ہیں بولوں گی۔'' اس نے اتنی باریک آواز میں اپنے الفاظ دہرائے کہ ایسے گمبھیر موقع پر بھی صورتِ حال میں مزاح کی جھلک محسوس ہوئی۔

عمران نے اسے بازو سے پکڑا اور کہا۔ ''چلو... اس چھوٹے کمرے میں چلو۔''

وہ پہلے تو جھجکی لیکن جب عمران نے تحکم سے کہا تو وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی ہمارے ساتھ چھوٹے دروازے میں داخل ہو گئی۔ میرے اندازے کے عین مطابق یہ ایک بالکل چھوٹا سا اسٹور روم تھا۔ عمران نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکال کر جلائی۔ یہ اسٹور کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہو گی۔ وہ ہلکی پھلکی گھریلو ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ لڑکی نے ہمارے جسموں پر سرکاری وردی دیکھی اور اس کا زرد چہرہ کچھ اور زرد ہو گیا۔ اس کی حیرت کی وجہ یہ بات بھی تھی کہ ہمارے چہرے رنگ سے لتھڑے ہوئے تھے۔ لوڈر الٹنے سے ہمارے جسم پر خراشیں بھی آئی تھیں۔ ایسی ہی ایک بڑی خراش عمران کے بازو پر تھی۔ وہاں سے جرسی پھٹ گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ میری وردی پر پانڈے کے خون کے دھبے تھے۔

''تمہارا نام؟'' عمران نے پوچھا۔

''...وجنتی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''اس گھر میں تمہارے علاوہ اور کون کون ہے؟''

''میرے ماتا پتا اور چھوٹا بھائی جگدیش۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

اسی دوران میں باہر گلی سے شور شرابا بلند ہونے لگا۔ دروازے کھٹکھٹائے جا رہے تھے اور گرجتی برستی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

اب عمران کے ہاتھ میں شکاری چاقو کی جگہ ریوالور نظر آرہا تھا۔ ایسا یقیناً اس نے وجنتی نامی اس لڑکی پر دباؤ ڈالنے

کے لیے کیا تھا۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ”دیکھو، کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ وہ جب تک یہاں آس پاس ہیں، ہم تمہارے گھر میں رہیں گے، اس کمرے میں۔ تم اپنے گھر والوں کو بھی ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔ اگر تم نے ہمیں چھپالیا تو ہم وچن دیتے ہیں کہ تمہیں کچھ بھی کہے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”مم... میں کسی کو کچھ ناہیں بتاؤں گی۔“ وہ ایک بار پھر گھگیائی۔

”اور تم سارا وقت ہماری آنکھوں کے سامنے رہو گی۔ میرا مطلب ہے کہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلو گی۔“ عمران نے ریوالور کو ہاتھ میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

”ناہیں نکلوں گی۔ وچن دیوت ہوں، ناہیں نکلوں گی۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

”ہم یہاں اس اسٹور روم میں رہیں گے۔ تم اس ریوالور کے نشانے پر رہو گی... اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ تم چالاکی دکھا رہی ہو تو میں گولی چلا دوں گا۔ ہم دو خون ابھی تھوڑی دیر پہلے کر چکے ہیں، تیسرا اور چوتھا کرنے میں بھی ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ عمران کے آخری الفاظ نے لڑکی پر خاطر خواہ اثر کیا اور وہ بالکل زرد نظر آنے لگی۔

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے پھر قدموں کی چاپ ابھری۔ وجنتی کا پتا اب پھر ڈیوڑھی کی طرف جا رہا تھا۔ شاید اس نے بھی گلی سے ابھرنے والا شور سن لیا تھا۔ ڈیوڑھی کی طرف والے دروازے کی نچلی درز سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اب بوڑھے کے ہاتھ میں لالٹین ہے۔ کچھ دیر بعد بوڑھے کے بڑبڑانے کی آوازیں آئیں۔ یقیناً اس نے دیکھ لیا تھا کہ بیرونی دروازے کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی ہے اور دروازے کو بند کرنے کے لیے اس کے آگے گملا رکھا گیا ہے۔

عمران نے تیز سرگوشی میں لڑکی سے کہا۔ ”دروازے کے آگے گملا ہم نے رکھا ہے۔ اگر تمہارا پتا پوچھے تو اس سے کہنا کہ یہ تم نے رکھا ہے کیونکہ دروازے کی چٹخنی خراب ہو گئی ہے۔“

لڑکی زود فہم تھی۔ فوراً ہی عمران کی بات سمجھ گئی۔ اتنے میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ”جی پتا جی۔“ لڑکی وجنتی نے نیند میں ڈوبی ہوئی سی آواز میں کہا۔

”دروازے پر گملا تم نے رکھا تھا؟“

”ہاں پتا جی... کواڑ ناہیں لگ رہے تھے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ بڑی عمر کے شخص کی آواز آئی۔

اسی دوران میں دروازے کے عین سامنے کچھ لوگوں کے بولنے کی بھاری آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً یہ راج بھون کے گارڈز تھے۔ وجنتی کے پتا نے دروازہ کھولا۔ ایک کرخت آواز نے پوچھا۔ ”تم لوگن خیریت سے ہو؟“

”جج... جی ہاں۔“

”دو خطرناک بندے یہاں کہیں آس پاس چھپے ہوئے ہیں۔ پوری طرح چوکس رہو۔ اگر کوئی شک ہو تو فوراً اطلاع کرو۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ وجنتی کے پتا نے پریشان آواز میں کہا۔

بھاری آوازوں والے افراد آگے چلے گئے۔ وجنتی کے پتا نے دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد وجنتی کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ عمران نے وجنتی کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ وجنتی نے بڑے کمرے میں جا کر دروازہ کھولا۔ ہم چھوٹے سے اسٹور میں موجود ہے۔ وجنتی کا پتا لالٹین تھامے اندر آ گیا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا پچاس ساٹھ سالہ شخص تھا۔ اس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا اور گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ ہراساں لہجے میں بولا۔ ”محلے میں کوئی ڈکیت گھس آئے ہیں۔ سپاہی آئے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے ہیں، سب کو ہوشیار رہنا چاہیے۔“

اتنے میں باہر کے کسی کمرے سے کسی عورت کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ”کیا بات ہے جگدیش کے پتا؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ ناہیں... سو جاؤ۔“ بوڑھے نے وہیں سے کہا۔ اپنے لب و لہجے سے یہ شخص ذرا سخت مزاج دکھائی دیتا تھا۔ اس نے وجنتی سے کہا۔ ”آجاؤ... تم ہمارے کمرے میں آجاؤ۔“

”نن... ناہیں پتا جی... کوئی بات ناہیں۔“ وجنتی بولی۔

”اچھا پھر دروازہ اندر سے بند کرلو۔“ اس کے پتا نے کہا۔

وجنتی نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ باہر ڈیوڑھی میں کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ وجنتی کا پتا ہتھوڑی کے ساتھ اکھڑی ہوئی چٹخنی کو پھر سے اس کی جگہ پر جما رہا تھا۔ گلی میں گاہے بگاہے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجنے لگی تھیں اور اہل کاروں کی بلند آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس علاقے کو گھیرے ہوئے ہیں۔

دس پندرہ منٹ بعد قدرے سکون ہو گیا۔ وجنتی کا پتا

چٹخنی مرمت کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ گلی میں بھی نسبتاً خاموشی تھی، ہاں کچھ دوری سے مدھم آوازیں ضرور سنائی دیتی تھیں۔ غالباً یہ آوازیں جائے حادثہ سے آ رہی تھیں۔ یعنی جس جگہ لوڈر الٹا تھا۔

عمران کی ہدایت پر لڑکی وجنتی نے لالٹین پھر سے روشن کر دی تاہم اس کی لو اتنی دھیمی رکھی کہ کمرے میں ہلکی سی روشنی ہی پھیل سکی۔ عمران نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔ ”لوڈر پر کون چڑھا تھا؟“

”وہی پانڈے تھا اور کون؟“

”مار دیا؟“

”پتا نہیں۔ زخمی تو اچھا خاصا ہوا ہے۔“

”تم کچھ زیادہ ہی کھلتے جا رہے ہو۔“ عمران نے ناراضی سے کہا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ مصنوعی ناراضی ہے اور اندر سے وہ خوش ہے۔

”اور تم نے لوڈر کی قلابازی کیوں لگوائی؟“ میں نے پوچھا۔

”آگے دو بندے آ گئے تھے، انہیں بچانے کی کوشش کی۔“ عمران نے مختصر جواب دیا۔

وجنتی انگریزی نہیں جانتی تھی۔ وہ منہ کھولے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ بہرحال، وہ اب پہلے سے کچھ کم خوف زدہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کی وجہ بھی تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آ گئی۔

میں نے وجنتی سے پوچھا۔ ”تمہارا پتا کیا کام کرتا ہے؟“

”وہ لکڑی کا کام کرت ہیں۔“

”لکڑی کا کیا کام؟“ عمران نے ذرا تفصیل سے وضاحت چاہی۔

”بندوقوں کے دستے وغیرہ بناوت ہیں۔ اس سے پہلے...“ وہ رک گئی۔

”اس سے پہلے... کیا؟“

”پہلے وہ راج بھون کی فوج میں تھے۔ دو سال پہلے ہی ان کی ملازمت پوری ہوئی ہے۔ ملازمت ختم ہونے پر راج بھون سے پیسا ملتا ہے، اسی سے پتا جی نے اپنا کاروبار شروع کیا ہے۔“

گھر کی ظاہری حالت اچھی تھی۔ عمران نے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے کہ حکم جی رحم دل واقع ہوا ہے۔ ملازموں کو کافی پیسا دیتا ہے۔“

”آپ بھی تو فوجی ہو۔ کیا آپ کو پتا ناہیں؟“ وہ ہمیں ذہین نظروں سے سرتاپا دیکھ کر بولی۔

عمران نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”اگر ہم کہیں کہ ہم فوجی نہیں ہیں تو پھر؟“

”مم... مجھے پہلے ہی لگ رہا ہے جی کہ... آپ وہ ناہیں ہو جو نظر آوت ہو۔“

”یہ بات تمہارے دماغ میں کیوں آئی؟“ عمران نے پوچھا۔

”اس لیے کہ آپ کو راج بھون کے فوجی ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”ہم باغی فوجی بھی تو ہو سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”پر آپ کی بولی اور طرح کی ہے۔ آپ کے پاس جو پسپ... پستول ہیں، وہ بھی اور طرح کے ہیں۔“

”بچی سیانی ہے بھئی۔“ عمران نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

میں نے اسے پھر دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو، اگر تم ہمارے کہنے پر چلو گی تو ہم کسی کو بغیر کوئی نقصان پہنچائے یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم سے ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ خود کو پرسکون رکھو۔“

”مم... مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا لیکن اب کم لگ رہا ہے۔“ وہ صاف گوئی کے انداز میں بولی۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ آپ حکم جی کے سپاہی ناہیں ہو۔“

”تو تم حکم کے سپاہیوں سے ڈرتی ہو؟“

”ہر کوئی ڈرتا ہے۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی خاص معاملہ ہے۔“ عمران نے کھوجنے والے لہجے میں پوچھا۔

”نن... ناہیں۔ ایسی تو کوئی بات ناہیں۔“

”اگر ہے تو بتا دو۔ ہو سکتا ہے ہم تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔“

وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہم ایک آدھ دن کے لیے تمہارے اس اسٹور میں محفوظ ہیں؟“

”پتا جی اور جگدیش کی تو خیر ہے... لیکن ماتا جی کسی کام سے اسٹور میں آسکت ہیں۔“

”تو پھر؟“

”یا پھر میں دروازے کو تالا لگا دوں گی اور کہوں گی کہ چابی گم ہو گئی ہے۔“ وہ روانی میں کہہ گئی۔

”کیا ہم تمہیں شکلوں سے اتنے ہی بے وقوف نظر

آتے ہیں کہ تمہیں تالا لگانے دیں گے؟'' عمران نے کہا۔

وہ سٹپٹا گئی۔ ''نن... ناہیں۔ میرا یہ مطلب ناہیں تھا۔ میں... میں ماتاجی کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لوں گی۔''

اب سپیدۂ سحر نمودار ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''اگر تم تھوڑی دیر کے لیے سونا چاہتی ہو تو بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ ہم یہاں اسٹور میں رہیں گے۔''

وہ تذبذب میں تھی۔ کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ تو گئی لیکن اس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کیں۔ عمران کی جادوئی شخصیت کی وجہ سے اس کا خوف کافی حد تک کم ہو گیا تھا مگر اب وہ اتنی بھی بے خوف نہیں ہوئی تھی کہ ہماری موجودگی میں آرام کرنے کے بارے میں سوچتی۔

ہم اسٹور میں موجود رہے۔ یہاں دیگر چیزوں کے ساتھ بند بتوں کے کئی مکمل اور نامکمل ڈھیر بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک دیوار پر ایک پرانی تصویر بھی لگی تھی جس میں وجنتی کا پتا فوجی وردی میں تھا اور باقاعدہ حکم جی کی قدم بوسی کر رہا تھا۔ حکم نے کسی مذہبی پیشوا کی طرح اس کے سر پر اپنے ہاتھ کا سایہ کیا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جیتی کے پتا آنجہانی رام پرشاد کی طرح یہ شخص بھی ایک کٹر مذہبی شخص ہے۔ ایک عیاش حکمران سے اس طرح کی عقیدت دقیانوسیت ہی کہلا سکتی تھی۔

میں اور عمران بیٹھے رہے، ہم دونوں کے ذہنوں میں راج بھون میں پیش آنے والے ہنگامہ خیز واقعات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے... میں نے بالکونی کی طرف دو برسٹ چلائے تھے۔ تاہم ان برسٹوں کا رزلٹ مجھے معلوم نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد کھڑکیوں سے مدھم روشنی نظر آنے لگی۔ ایک پُر ہنگام شب کی صبح ہونے والی تھی۔ تاہم اس صبح میں بھی ان گنت اندیشے تھے۔ وجنتی کا پتا جاگ گیا تھا... اور صحن میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا... پھر وہ بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے وجنتی سے پوچھا تو اس نے مدھم آواز میں بتایا کہ پتاجی اس وقت دودھ لینے جاوت ہیں۔ پھر وہ بولی۔ ''اگر ماتاجی یہاں آ گئیں اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ابھی تک یہاں کیوں بیٹھی ہوں اور باہر نکل کر منہ ہاتھ کیوں ناہیں دھوتی؟''

''لحاف اوڑھ کر لیٹی رہو۔ ان سے کہنا میری طبیعت خراب ہے۔''

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ ریوالور مسلسل عمران کے ہاتھ میں تھا اور وہ وجنتی کو باور کرا رہا تھا کہ کسی بھی الٹی سیدھی حرکت کا نتیجہ خطرناک نکلے گا۔

وجنتی کے پتا نے گھر واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس نے زور زور سے وجنتی کے کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ وجنتی نے لحاف سے نکل کر دروازہ کھولا۔ وجنتی کے پتا نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے بٹیا! رات کو راج بھون میں زبردست گولی چلی ہے۔ بڑے ڈاکٹر اسٹیل کے بھائی صاحب مارے گئے ہیں۔ ایک دو بندے زخمی بھی ہوئے ہیں۔ چھوٹا پانڈے بھی بہت زیادہ زخمی ہے۔ کہوت ہیں کہ وہ بچ ناہیں پائے گا۔''

''ہائے رام۔'' وجنتی نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

اسی دوران میں وجنتی کی فربہ اندام ماتا بھی اندر آ گئی۔ اس نے بھی اپنے پتی کی بات سن لی تھی اور اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ''ہائے بھگوان! یہ کیا کلجگ ہوا ہے، کیا واقعی بڑے ڈاکٹر صاحب...؟''

''ہاں بھاگوان! وہ دو را کھشس تھے۔ پتا ناہیں کس طرح راج بھون میں گھس گئے۔ نہ صرف گھس گئے بلکہ اس جگہ تک بھی پہنچ گئے جہاں حکم جی رانیوں کے ساتھ کھڑے تھے اور بالک کے جنم کی خوشی میں دان کر رہے تھے۔ ان دونوں نے فوجی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس سرکاری رائفلیں بھی تھیں۔ انہی رائفلوں سے انہوں نے فائرنگ کی ہے۔''

''وشواس ناہیں ہو رہا...'' وجنتی کی ماں نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''وہاں تو اتنا کڑا پہرا ہووت ہے۔ چڑیا بھی پر ناہیں مارتی۔''

''کچھ لوگن کہتے ہیں کہ وہ دو یا تین بندے تھے اور راج بھون کے پچھواڑے جھیل کی طرف سے اندر گھسے ہیں۔ وہاں جھیل کے کنارے بھی ایک سپاہی کی ہتھیا ہوئی ہے اور ایک سخت گھائل ہوا ہے۔ راج بھون کی باہری دیوار کے اوپر سے بھی دو سینکوں کو نیچے گرا کر مارا گیا ہے... باہر ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی ہے۔''

''یہ کون ہو سکت ہیں؟'' فربہ اندام عورت نے کہا۔

''یہ مختار راجپوت کی لونڈیا کے ساتھی بھی ہو سکت ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکت ہے کہ یہ حمیدہ کے دیور کو پھانسی سے بچانے کے لیے کوئی کوشش کرنا چاہت ہوں۔''

وجنتی کی ماں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''ہائے رام! اب کیا ہووے گا؟ حالات دن بدن بگڑتے چلے جاوت ہیں۔ ہم جیسے لوگن تو کسی گنتی میں ناہیں آتے، اب تو راج بھون بھی ان سے بچا ہوا ناہیں ہے۔''

''میں نے تو سنا ہے کہ وہ دونوں بدمعاش رات کو ہماری گلی تک بھی پہنچے ہیں... اور کیا پتا کہ اب تک یہاں کسی گھر میں ہی چھپے ہوئے ہوں۔''

وجنتی کی ماں رام رام کرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وجنتی کے پتا نے وجنتی سے کہا۔ ''آج بالکل گھر سے قدم باہر ناہیں نکالنا۔ تم کل کہہ رہی تھیں کہ بازار جانا ہے۔''

''ناہیں پتاجی... ویسے بھی طبیعت ذرا خراب ہے۔ ٹھنڈ لگ رہی ہے۔''

''بس ٹھیک ہے۔ شانتی سے لیٹی رہو۔ آج سردی ہے بھی بہت۔''

سخت نقوش والا ادھیڑ عمر شخص باہر چلا گیا۔ ہم یہ سارا منظر اسٹور روم کی گہری تاریکی میں سے دیکھتے رہے تھے۔ عمران نے اسٹور کا دروازہ بند کر دیا تھا تاہم اس میں ایک دو انچ کی جھری رہنے دی تھی۔

کچھ دیر بعد وجنتی کی ماں پھر آئی اور بیٹی کا حال چال پوچھنے لگی۔ وہ لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ اس نے ماں سے کہہ دیا کہ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا اس لیے وہ ناشتا بھی نہیں کرے گی۔ اس کی ماں باتیں کرتی کرتی اسٹور روم کی طرف آئی۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ شاید اس سارے ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے لگا ہے لیکن پھر وہ دہلیز سے ہو کر واپس چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وجنتی کا چھوٹا بھائی جلد جلد ناشتا کر کے اسکول چلا گیا اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہی وجنتی کا پتا بھی باہر نکل گیا۔ اب گھر میں وجنتی اور اس کی ادھیڑ عمر والدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ والدہ نے ایک بار کمرے میں جھانکا اور یہ دیکھ کر کہ بیٹی لحاف اوڑھے سو رہی ہے، سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی گئی۔ غالباً وہاں اسے صفائی ستھرائی کرنا تھی۔ اس کے جانے کے بعد عمران کی ہدایت پر وجنتی نے اندر سے دروازے کو کنڈی لگا لی۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر دبا دبا ہراس نظر آ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ''تو آپ دونوں نے بڑے ڈاکٹر کے بھائی کو مارا ہے اور پانڈے صاحب کو بھی؟''

''اس کے علاوہ دو تین گارڈز کو بھی جہنم واصل کیا ہے۔ کیا تم نے اپنے پتا سے سنا نہیں؟''

''ہائے رام... یہ تو بہت بڑا جرم ہے۔ راج بھون والے آپ لوگن کو زمین کی ساتویں تہ سے بھی نکال لیویں گے۔'' اس کے چہرے پر خوف کم اور پریشانی زیادہ تھی۔

''کیا تم ہمارے لیے پریشان ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے صاف سیدھے انداز میں کہا۔

''کیوں؟ ہم نے تو تم پر ریوالور تانا ہوا ہے... تمہیں یرغمال بنایا ہوا ہے؟''

''میں جانت ہوں۔ مجھ سے آپ کی کوئی دشمنی ناہیں۔ آپ حکم جی کے سپاہیوں سے بچنا چاہت ہیں اور واقعی آپ کو بچنا چاہیے۔ یہ بہت کٹھور لوگ ہیں۔ بہت ہی پتھر دل...''

''اچھا، ابھی تمہارے پتا نے کسی کی پھانسی کا ذکر کیا ہے، وہ کون ہے؟'' عمران نے سوال کیا۔

''ہے ایک بدقسمت۔''

''کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''اسے تو ناہیں لیکن اس کی بھابی کو جانت ہوں... وہ... وہ...'' وجنتی کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ اور درد اتر آیا تھا۔

''لگتا ہے کہ تم ہم سے کچھ چھپا رہی ہو۔ تم بتاؤ، ہو سکتا ہے کہ ہم تمہاری مدد کر سکیں یا کوئی مفید مشورہ ہی دے سکیں۔'' عمران نے اپنے مخصوص پُر اثر لہجے میں کہا۔

ایک دم وجنتی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب اس کے چہرے پر ہمارے حوالے سے خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ ہم حکم اور جارج وغیرہ کے دشمن ہیں۔ شاید اس ناتے سے وہ ہمیں اپنا ہمدرد سمجھنے لگی تھی۔

''بتاؤ وجنتی... تم ہمیں بتا کر کسی طرح کا نقصان نہیں اٹھاؤ گی، ہو سکتا ہے کہ کوئی فائدہ ہو جائے۔'' عمران نے شفقت آمیز محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

وہ سسک کر بولی۔ ''آپ لوگن کون ہیں؟ آپ نے ابھی تک مجھے اپنے بارے میں کچھ ناہیں بتایا۔''

''اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ شاید تم مزید الجھ جاؤ۔ بس اتنا جان لو کہ ہم انسان دوست ہیں اور حکم جیسے انسان دشمنوں کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے کفن باندھ کر نکلے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ ہم تمہیں وچن دیتے ہیں کہ جو تم کہو گی، وہ صرف اور صرف ہم تک ہی رہے گا۔ ہم وچن پر جان دینے والے لوگ ہیں۔''

چند منٹ کی مزید کشمکش کے بعد وجنتی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''کل جس بندے کو راج بھون کے سامنے چوک میں سرِعام پھانسی دی جا رہی ہے، اس کی بھابی حمیدہ میری گہری سہیلی ہے۔ وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی ہے لیکن ہم نے بچپن اور لڑکپن اکٹھے ہی گزارا ہے۔ آج کل میری یہ سہیلی بڑی مشکل میں ہے... بھگوان اس پر اپنی کرپا کرے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' عمران نے بات آگے بڑھانے کے لیے کہا۔

''حمیدہ خوب صورت ہے۔ ایک سال پہلے اس کا پتی فوت ہوگیا تھا۔ اب وہ راج بھون میں ہے... اور جارج گورا صاحب کے پاس ہے۔ وہ اس سے بیاہ کرنا چاہت ہے... زبردستی اسے پتنی بنانے پر تلا ہوا ہے۔''

''کیا علاقے کے لوگ اور خاص طور سے مسلمان اندھے بہرے ہیں... کیا انہیں یہ زبردستی نظر نہیں آرہی؟''

''آتو سب کو رہی ہے جی... پر اصل میں... حمیدہ کے دیور سے بھی ایک دوش ہوا ہے۔ پتا ناہیں یہ دوش ہے بھی یا ناہیں لیکن بہت سے لوگن اسے دوش ہی کہتے ہیں۔ کچھ مہینے پہلے حمیدہ کے دیور نے اپنے کچھ مسلمان ساتھیوں کے ساتھ مل کر گورا صاحب کی بہن ماریا کو اغوا کرلیا تھا۔ وہ اسے نل پانی کی طرف لے جانا چاہت تھے۔ انہوں نے اسے ایک سرنگ میں رکھا تھا اور وہاں اس کی انگلی بھی کاٹ ڈالی تھی۔ بعض لوگ یہ الزام بھی لگاوت ہیں کہ... ان لوگن نے ماریا کے ساتھ... ماریا کے ساتھ... برا سلوک کیا تھا۔ بعد میں ماریا کسی طرح جان بچا کر ان لوگن کی قید سے بھاگ نکلی تھی...''

عمران اور میں وجنتی کی باتیں سن کر سناٹے میں رہ گئے۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''جارج گورا صاحب نے اسی کا بدلہ لیتے ہوئے حمیدہ کو گھر سے اٹھوایا ہے اور راج بھون میں رکھا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ اگر آنکھ کے بدلے آنکھ کے قانون پر عمل کیا جاوے تو پھر یہ قانون بھی بنایا جاسکتا ہے کہ اغوا اور زیادتی کے بدلے اغوا اور زیادتی ہو۔ لیکن وہ ایسا ناہیں کر رہے۔ انہوں نے حمیدہ کو اغوا ناہیں کیا، بس اپنے پاس اپنی حفاظت میں رکھا ہے۔ اگر حمیدہ کا کوئی پیارا اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہت ہے تو وہ اپنے بازو کے زور پر ایسا کرسکت ہے۔''

''بازو کے زور پر؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں جی... آپ کو یہ بات کچھ عجیب سی لگے گی۔ لیکن ہمارے اس راجواڑے میں ایسی اور بھی بہت سی عجیب باتیں ہیں۔ ہم بچپن سے بہت کچھ دیکھتے اور سنتے آئے ہیں۔''

''اچھا، ایک منٹ۔'' میں نے اسے ٹوکا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ پھانسی کس کو دی جا رہی ہے؟ میرا مطلب ہے اس کا نام؟''

''اس کا نام اسحاق ہے جی۔ وہ بڑا دیور ہے حمیدہ کا۔''

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ اسحاق میرا، انور خان اور چوہان کا ساتھی تھا۔ ہم نے مل کر بہت سی مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ نل پانی کی طرف سفر کرتے ہوئے بے شمار سختیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ میں جب سلطانہ کی مدد کے لیے چوری چھپے نل پانی سے نکلا تھا تو اسحاق اس وقت انور اور چوہان وغیرہ کے ساتھ دیوان میں ہی تھا۔ وہ کب وہاں سے نکلا، کب یہاں پہنچا اور اب کن حالات میں تھا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ اور اب یہ وجنتی نامی لڑکی اسحاق کے حوالے سے ایک خوفناک بات بتا رہی تھی۔

عمران بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ''کیا یہ تمہارے ساتھیوں میں سے ہے؟'' اس نے انگریزی میں پوچھا۔

''ہاں، یہ وہی ہے جس نے ماریا کی انگلی کاٹی تھی۔'' میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا پھر وجنتی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''کیا اسحاق نام کے اس بندے کو پکڑ کر یہاں لایا گیا ہے؟''

''ناہیں جی... وہ خود آیا تھا... مجبور ہوکر۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ گورا صاحب نے کیا اعلان کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ حمیدہ کا جو کوئی وارث اسے چھڑانا چاہت ہے، وہ آئے اور اسے چھڑا کر لے جائے۔ بس اسے گورا صاحب کے ساتھ سامبر کرنا پڑے گا... اور یہ پورے انصاف کے ساتھ ہوگا۔''

''یہ سامبر کیا ہے؟''

''یہ بھی سویمبر کی طرح ایک رسم ہے جی۔ سویمبر میں تو کسی ناری کا چاہنے والا ہی اس کے لیے لڑتا ہے لیکن سامبر میں ناری کا کوئی بھی ہمدرد اس کو کسی کے قبضے سے نکالنے کے لیے کوشش کرسکت ہے۔ اس کا پتا، بھائی یا بیٹا وغیرہ بھی...''

میں نے پوچھا۔ ''تو تمہارا مطلب ہے کہ یہ جو اسحاق نام کا بندہ یہاں پکڑا گیا ہے، وہ اپنی بھابی حمیدہ کو چھڑانے کے لیے یہاں آیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''اسے دھوکے سے پکڑ لیا گیا؟''

''ناہیں جی... یہ جارج گورا صاحب ایسے معاملوں میں دھوکا ناہیں کرت ہے۔ وہ جو کہتا ہے، وہی ہووت ہے۔ سامبر کی اس رسم کے مطابق اگر کوئی بندہ کسی سے لڑنا چاہت ہے تو پھر ایک کا مقابلہ ایک سے ہووت ہے۔ باہر سے کوئی لڑنے والوں کی مدد ناہیں کرسکتا اور گورا صاحب بھی ایسا ہی کرت ہے۔ اس کو اپنے اوپر بہت وشواس ہے جی۔ اب پتا ناہیں کہ اس کو بہادری یا جواں مردی کہنا چاہیے یا ناہیں، پر سچ یہی ہے کہ گورا صاحب ایسے کاموں کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنے کے لیے ہر سمے تیار رہوت ہے۔ وہ اتنا بڑا آدمی ہوکر بھی اپنے ساتھ سامبر کرنے والے کسی بھی منش کو پورا پورا موقع دیوت ہے۔''

''تو اس نے اسحاق کے ساتھ لڑائی کی؟''

''جی ہاں، اس نے اعلان کروایا تھا کہ اگر اس مہینے کی نو تاریخ تک کوئی سامبر کے لیے آنا چاہت ہے تو آجاوے۔ نو تاریخ کو حمیدہ کا دیور یہاں پہنچ گیا تھا۔ سنا ہے کہ گورا صاحب نے اس سے صاف کہا تھا کہ وہ اس کی بہن ماریا کے اغوا کا ذمے دار ہے لیکن اگر وہ سامبر جیت گیا تو وہ اسے کچھ ناہیں کہے گا بلکہ وہ اپنی بھاوج کو بھی یہاں سے لے جاسکے گا۔ دوسری صورت میں اس کو پوری پوری سزا ملے گی اور یہ سزا موت سے کم ناہیں ہووے گی۔ اسحاق کو یہ شرطیں ماننا پڑی تھیں...''

''تو وہ ہار گیا؟'' عمران نے پوچھا۔

وجنتی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے تھے۔

''کس قسم کا مقابلہ ہوا تھا؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''مجھے اس بارے میں کچھ جانکاری ناہیں۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ ہار گیا تھا۔ گورا صاحب سے جیتنا کوئی آسان کام ناہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ سخت جان ہے۔ پھر لڑنے والے پر لڑنے سے پہلے ہی اس کا بہت رعب پڑ جاتا ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس طرح کے بہت سے مقابلے کرچکا ہے اور کبھی ہارا ناہیں۔ وہ تلوار بازی بھی کرلیوت ہے، خالی ہاتھوں سے بھی لڑتا ہے۔ کبھی کسی کے سامنے چاقو یا پستول پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اسے اس سے پہلے اٹھا کر دکھائے اور وار کرے...''

میری آنکھوں کے سامنے ماضی قریب کا وہ دردناک نقشہ گھوم گیا۔ جارج نے اس رات میرے سامنے بھی تو پستول پھینکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیلنے لگی۔

میں نے خود کو بمشکل سنبھالا اور وجنتی سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یعنی اسحاق ہار گیا اور اب اسے پھانسی دی جا رہی ہے؟''

وجنتی نے گردن جھکا کر ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو اس کی جھولی میں گرے۔ وہ سسک کر بولی۔ ''اس پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ کل پتا جی بتا رہے تھے کہ اس کے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ اس طرح سے اس سے گورا صاحب کی بہن ماریا کی انگلی کا بدلہ لیا گیا ہے۔ کل یہاں چھٹی کا دن ہے۔ کل راج بھون کے سامنے چوک میں اس کی ہتھیا کر دی جاوے گی۔''

''اور تمہاری سہیلی حمیدہ؟'' عمران نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

''وہ جارج گورا صاحب کے پاس ہی ہے۔''

''ابھی اس سے بیاہ نہیں کیا گیا؟''

''نا ہیں... گورا صاحب کہتے ہیں کہ وہ ابھی اس کے وارثوں کو ایک اور موقع دینا چاہت ہیں۔''

یہ سب کچھ دل دہلا دینے والا تھا۔ خاص طور سے میرے رگ و پے میں آگ سی بہنے لگی تھی۔ سارے زخم تازہ ہو گئے تھے۔

وجنتی اپنی سہیلی کے لیے مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ عمران نے اس سے کچھ مزید تفصیلات پوچھیں۔ کہیں کہیں میں نے بھی سوالات کیے۔ آخر میں عمران نے بڑی نرمی سے وجنتی کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اپنے مخصوص پُراثر لہجے میں بولا۔ ''وجنتی! ہم اس پوزیشن میں تو نہیں کہ تم سے کوئی وعدہ کر سکیں لیکن اتنی تسلی ضرور دیتے ہیں کہ ہم ابھی یہاں زرگاں میں ہی ہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکا، ضرور کریں گے۔''

''ہم... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں اس معاملے میں میرا نام آ گیا تو ہمارے پریوار کے لیے بڑی مصیبت ہو جاوے گی۔ حکم جی کے کچھ لوگن کو میں پہلے ہی بہت بُری لگ رہی ہوں۔''

''وہ کس طرح؟''

''جس دن حکم جی کے سپاہی حمیدہ کو اس کے گھر سے لینے کے لیے آئے، میں بھی اس کے پاس ہی تھی۔ وہ حمیدہ کو زبردستی لے جانے لگے تو میں نے اور اس کی ساس نے انہیں روکا۔ میں سپاہیوں سے جھگڑ پڑی۔ میں نے ایک کی وردی پھاڑ دی۔ انہوں نے مجھے دھکے مارے اور دھمکیاں دی تھیں۔ اب اگر پھر کہیں میرا نام اس معاملے میں آ گیا تو وہ لوگن میرے پیچھے پڑ جاویں گے۔''

عمران نے پھر محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''اس بارے میں بے فکر رہو۔ ہم نے تم سے کہا ہے نا کہ ہم وچن توڑنے والے نہیں، جان دینے والے لوگ ہیں۔''

''میں بھی آپ کو وچن دیوت ہوں کہ اس گھر میں جو کچھ ہو سکا آپ کے لیے کروں گی۔''

میں نے عمران کی طرف اور عمران نے میری طرف دیکھا۔ وجنتی کے لہجے میں سچائی تھی۔ وہ بہت حد تک دلیر اور سمجھ دار بھی تھی۔ اس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے وجنتی! اگر تم چاہو تو ضرورت پڑنے پر اس کمرے سے باہر جا سکتی ہو... ہم امید کرتے ہیں کہ تم ہمارے وشواس پر پوری اترو گی۔'' اس کے ساتھ ہی عمران نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی تو ہم جلدی سے تاریک اسٹور روم میں چلے گئے۔ وجنتی کی فربہ اندام والدہ کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وجنتی نے دروازے کی چٹخنی اتار دی اور واپس آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ وجنتی کی والدہ نے اس کا احوال دریافت کیا پھر اس سے کہا کہ وہ منہ ہاتھ دھو لے اور تھوڑا سا کھا پی لے۔

اس مرتبہ وجنتی نے انکار نہیں کیا اور ماں کے ساتھ باہر چلی گئی۔

ہم نے وجنتی کو باہر بھیج کر بے شک رسک لیا تھا لیکن ہم جس راستے پر چلے تھے، اس پر خطرات، اندیشوں اور خدشوں سے واسطہ تو قدم قدم پر پڑنا تھا۔ ہم اسٹور روم کے اندر ہی رہے۔ ہم نے اپنے رنگین چہرے گیلے کپڑے سے رگڑ رگڑ کر اچھی طرح صاف کر لیے تھے۔ عمران کے بازو پر گہری خراش آئی تھی۔ اس نے وہیں اسٹور روم سے ایک پٹی لے کر بازو پر باندھ لی تھی۔ درحقیقت کل شام سے اب تک ہم نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ بھاگ دوڑ بھی بہت ہوئی تھی، نہایت سرد پانی میں تیرنا پڑا تھا... اب بھوک اور نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک کا تھوڑا سا ذکر عمران نے وجنتی سے بھی کیا تھا اس بات کی امید تھی کہ شاید وہ کچھ کھانے کو لے آئے۔ اسے واپس آنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ تاخیر سے پریشانی تو تھی لیکن نہ جانے کیوں یقین سا تھا کہ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔

کل رات کے واقعات ایک بار پھر ہماری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ کئی سال پہلے جب لاہور میں اس طرح کی ہنگامہ آرائیاں ہوئی تھیں تو میں نے خود کو عمران کے ساتھ ایک عضوِ معطل کی طرح محسوس کیا تھا... لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ میں نے ہر جگہ عمران کے شانے سے شانہ ملائے رکھا تھا اور ایک دو موقعوں کے سوا کہیں بھی اس سے پیچھے نہیں رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''لاہور میں، میں نے تمہاری زبردست ڈرائیونگ دیکھی تھی۔ کل مجھے توقع نہیں تھی کہ تم لوڈر کو الٹا دو گے۔''

وہ مسکرایا۔ ''اپنی ڈرائیوری کو بے داغ رکھنے کے لیے میں دو بے گناہوں کی جان لے لیتا تو تم نے ہی مجھے لعنت ملامت شروع کر دینی تھی... ویسے اس موقع پر کام تم نے بھی کمال کا کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں تو تمہیں پرہیزگار سمجھتا تھا، تم بڑی تیز نظر رکھتے ہو۔''

''کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔''

''لوڈر الٹنے کے بعد گرے بھی تو ایک جوان لڑکی پر... حالانکہ وہاں گرنے کے لیے کئی اور جگہیں بھی تھیں۔ اور اگر کسی نرم نرم جگہ پر ہی گرنا تھا تو لڑکی کی ادھیڑ عمر والدہ بھی تو وہیں تھی۔ مجھے وہ محاورہ یاد آ رہا ہے کہ بنیا اگر گرتا ہے تو کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے۔''

''چلو اگر پھر ایسا موقع آیا تو تم اپنی من پسند جگہ پر گر لینا۔ میں بعد میں گر لوں گا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں ہاں بھئی! آہستہ آہستہ زبان لگ رہی ہے تمہیں۔ اور مجھے لگ رہا ہے کہ اندر سے تم کافی کھوچل بھی ہو۔ سلطانہ بھابی کے سامنے تو یونہی سائیں چپ شاہ بنے رہتے ہو۔ بہرحال، کچھ بھی ہے میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ سچی کھری بات کرنے سے باز نہیں رہوں گا۔ میں کنوارا ہوں اور تم شادی شدہ ہو۔ میری موجودگی میں تم نے ایک جوان لڑکی کے اوپر گر کر میرا استحقاق مجروح کیا ہے۔ کوئی کمک مکا کر لو ورنہ میں اس معاملے کو اوپر تک لے جاؤں گا۔''

''کیا کرو گے؟''

''سب کچھ سلطانہ بھابی کو بتاؤں گا۔ فساد کرا دوں گا۔ پھر بیٹھے دانشور اسٹوڈیو میں بلاؤں گا۔ تین تمہاری طرف سے، تین سلطانہ بھابی کی طرف سے۔ انہیں اتنا لڑاؤں گا... کہ باقی سارے قومی اور بین الاقوامی معاملات اس ''اہم موضوع'' کے سامنے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔''

''لیکن یہ سب تو تب ہو گا جب ہم یہاں سے زندہ نکل سکیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، یہ مسئلہ تو بہرحال ہے۔'' اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔

اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہم الرٹ ہو گئے۔ عمران نے ریوالور پھر ہاتھ میں لے لیا۔ اندر آنے والی وجنتی ہی تھی۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ وہ کسی رومال وغیرہ میں کوئی چیز چھپا کر لائے گی لیکن وہ تو باقاعدہ ٹرے اٹھائے چلی آ رہی تھی۔ اس میں پراٹھے اور انڈوں کا نمکین آملیٹ نظر آ رہا تھا۔

وہ اسٹور میں چلی آئی۔ ''تمہاری ماں جی نے نہیں

بیس مزدوروں نے تین دن کی لگاتار محنت کے بعد جوزف فیلڈ مین کے چار کمروں والے اپارٹمنٹ سے ایک لاکھ پندرہ ہزار مجلد کتابیں سات ٹرکوں پر لاد کر دوسری جگہ منتقل کیں...... ان کتابوں کا پتا اس وقت چلا جب اپارٹمنٹ کی نچلی منزل میں آگ لگی اور اوپر سے پانی پھینکنے کے لیے کچھ فائرمین جوزف فیلڈ مین کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ کتابیں دنیا کے ہر موضوع پر تھیں اور سب سے زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ ان میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں تھی جو جوزف فیلڈ مین نے جیب سے رقم خرچ کر کے خریدی ہو۔ کچھ کتابیں ایسی تھیں جو دوستوں سے مستعار مانگ کر واپس نہیں کی گئی تھیں جبکہ زیادہ تر کتابیں وہ تھیں جنہیں شہر کی مختلف لائبریریوں سے چوری کیا گیا تھا۔

جوزف فیلڈ مین سے دریافت کیا گیا کہ اس نے اتنی بڑی تعداد میں کتابوں کا ذخیرہ کیوں اکٹھا کر رکھا تھا تو اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''مجھے مطالعے کا شوق ہے۔'' اور جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں کتابیں چرانے میں کس طرح کامیاب ہوا تو پہلے تو اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا اور بعد میں جب بہت زیادہ اصرار کیا گیا تو بتایا کہ ''میں ایک معزز شخص ہوں اور سب ہی لائبریرین مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔''

لاہور سے کاشان قاسمی کی اعتنا و پسندی

"دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھا ہے بلکہ انہوں نے ہی بنا کر دیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔" ہم دونوں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے ماں جی کو سب بتا دیا ہے۔ آپ نے بالکل بھی فکر نہیں کرنا۔ میرے اور ماں کے بیچ کوئی بھی بات چھپی نہیں ہوتی۔ وہ وہی کریں گی جو میں کہوں گی۔"

"لو کر لو تماشا۔" عمران نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں جی؟" دھنتی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ لیکن کہیں ماں جی کی وجہ سے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

"اگر میں ماں جی کو نہ بتاتی، تب گڑبڑ ہونے کا ڈر تھا۔ اب ہم اس معاملے کو سنبھال لیں گے۔" دھنتی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھر میں صرف اپنے والد سے ڈرتی ہے اور اسے اب یہ خوف ہے کہ کہیں اس کے گھر میں ہونے والی خطرناک گڑبڑ کا پتا اس کے والد کو نہ لگ جائے۔ ہمیں یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ راج بھون سے ریٹائرمنٹ کے باوجود دھنتی کے پتا کی ہمدردیاں راج بھون اور حکم جی سے ہیں اور وہ ان لوگوں میں سے ہے جو راج بھون میں ہونے والے ہر کام میں کوئی نہ کوئی اچھائی تلاش کر ہی لیتے ہیں۔

دھنتی نے کہا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں اپنی ماتا کو ان سے ملانے کے لیے یہاں لائے گی۔

کھانے کے دوران میں ہم بالکل خاموش رہے۔ دھنتی کی آمد سے پہلے عمران نے کچھ ہلکی پھلکی باتیں کر کے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کی تھی تاہم میں جانتا تھا کہ میری طرح اس کا دماغ بھی مسلسل مصیبت زدہ اسحاق اور اس کی بھابی حمیدہ میں الجھا ہوا ہے۔

میں نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے عمران کہ اس کمینے جارج نے اسحاق کی بھاوج کو ایک چارے کے طور پر استعمال کیا ہے... اور شاید وہ آئندہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے... اس نے اس عورت کے خیر خواہوں کو مزید قسمت آزمانے کا موقع دیا ہے۔"

دھنتی بولی۔ "میرا وچار ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اسحاق کے ایک اور دوست نے گورا صاحب کے سامنے آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا نام انور خاں

کے مسلمان اسے بہت مانتے ہیں۔ کچھ ماہ پہلے جب مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ جیل کے بجائے گورا صاحب کے گھر میں ہے تو علاقے کے مسلمان ایک دم بھڑک اٹھے تھے۔ انہوں نے گورا صاحب کے گھر پر چڑھائی کر دی تھی۔ اس وقت انور خاں نے بہت ہمت دکھائی تھی۔ اب وہ کچھ عرصے سے ٹل پانی میں ہے۔ سنا ہے کہ وہ گورا صاحب کی سامبر چنا میں آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ شاید انور خاں وہ اکیلا شخص ہے جس کی گورا صاحب کے مقابلے میں جیتنے کی تھوڑی بہت امید کی جا سکتی ہے۔"

یہ نئی اطلاع بھی سنسنی خیز تھی۔ دھنتی کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ جس سلطانہ کی بات کر رہی ہے، میں اس کا شوہر ہوں اور انور خاں میرا قریبی ساتھی ہے۔ میں انور خاں کے بارے میں عمران کو بہت کچھ بتا چکا تھا۔ دھنتی سے انور کا ذکر سن کر عمران کے چہرے پر بھی سنسنی نظر آنے لگی۔

ہماری غیر موجودگی میں یہ جارج گورا نے انوکھا کھیل کھیلا تھا۔ اس کی کمینگی اور عیاری کھل کر سامنے آ رہی تھی۔ اس نے واقعی حمیدہ کو چارے کے طور پر استعمال کر کے اسحاق کی غیرت کو جگایا اور اسے یہاں بلانے میں کامیاب رہا تھا۔ اب وہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے والا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ انور خاں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے کا ارادہ رکھتا تھا...

جو کچھ بھی تھا لیکن ایک بات تسلیم کرنی پڑتی تھی۔ سیکڑوں جنگجو افراد کا کمان دار ہونے کے باوجود، جارج گورا بوقت ضرورت خود میدان میں اترتا تھا اور اپنے مقابل کو نیچا دکھاتا تھا۔ اس نفسیاتی برتری کے بعد وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد ہو جاتا تھا۔ جو رہی سہی کسر تھی، وہ حکم جی کی معاونت سے پوری ہو جاتی تھی۔

میرے سینے میں ایک عجیب سی آگ دہکنے لگی۔ مجھے لگا کہ ایک طویل عرصے سے میں جس "ٹاکرے" کا انتظار کر رہا تھا، اس کے لیے اسٹیج خود بخود تیار ہو رہا ہے۔ میرے پٹھے تن گئے۔ سینے کی دھڑکن میں ایک نامانوس اضافہ ہو گیا۔

دھنتی کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "کیا آپ دونوں میری سہیلی کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟"

عمران نے کہا۔ "سہیلی سے پہلے تو اس کے دیور کی بات کرنی چاہیے جس کے بارے میں تم کہہ رہی ہو کہ اسے کل

پھانسی یا سولی دی جانے والی ہے...“

”اس کے لیے اب کیا ہو سکتا ہے؟“ وہ بے حد مایوسی سے بولی۔ ”اس کے لیے کچھ کرنے کا سمے اب گزر چکا ہے لیکن حمیدہ کے بچاؤ کے لیے تو ابھی کافی سمے ہے۔ شاید کسی بڑی سفارش سے کوئی فائدہ ہو جائے... یا پھر اسے راج بھون سے نکالنے کی ہی کوئی کوشش کی جا سکے۔“ بات کرتے ہوئے دجنتی کے ہونٹ سوکھ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ سرد رات ہم نے اسی تاریک اسٹور روم میں گزاری۔ دجنتی کی ماتا واقعی اس کے کہے کے مطابق چلتی تھی۔ شام کا کھانا ہمارے لیے وہی لے کر آئی تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اور ہاتھ جوڑ کر بس ایک ہی بات کہی اور وہ یہ کہ اگر یہاں سے نکلنے کے بعد خدانخواستہ ہم پکڑے جائیں تو اس گھر کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ دجنتی کی طرح ہم نے اس کی ماتا کو بھی یہ حلف دیا تھا۔ دجنتی کی ماتا سے ہمیں ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی... اس نے بتایا کہ پانڈے کی جان نہیں بچائی جا سکی اور آج سہ پہر شاہی اسپتال میں اس کا دیہانت ہو گیا ہے۔

اب رات کی اس تیرگی میں میرے ذہن میں بار بار وہ مناظر گھوم رہے تھے جب سرپٹ بھاگتی گھوڑا گاڑی میں، میں نے پانڈے کو جان لیوا طور پر گھائل کیا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں پانڈے جیسے موذی کو جہنم واصل کر چکا ہوں۔ اس نے دیوان میں بم بلاسٹ کر کے بڑی سفاکی سے بے گناہ لوگوں کے چیتھڑے اڑائے تھے۔ آج ان لوگوں کو انصاف مل گیا تھا۔

رات کو گلی میں مسلسل گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی رہیں۔ گاہے بگاہے کچھ للکارے بھی سنائی دیتے رہے۔ پتا چلتا تھا کہ ہماری تلاش جاری ہے... صبح اپنے پتا اور چھوٹے بھائی کے گھر سے چلے جانے کے بعد دجنتی ہمارے لیے ناشتا لے کر آئی... اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ آج سہ پہر حمیدہ کے دلیر اسحاق کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ وہ پھانسی کا لفظ استعمال کر رہی تھی لیکن ہمیں معلوم تھا کہ یہاں پھانسی کے بجائے سولی چڑھایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بغاوت کے جرم میں جن افراد کو جیل کے اندر سزائے موت دی گئی، انہیں بھی سولی پر لٹکایا گیا تھا۔ اس کی لرزہ خیز تفصیلات ہمیں دوسرے لوگوں سے پتا چلی تھیں۔ دجنتی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کل رات ڈاکٹر اسٹیل کے بھائی کا کریا کرم ہو گیا ہے اور ابھی تھوڑی دیر بعد پانڈے کی آخری رسوم بھی ادا کی جائیں گی۔ پورے زرگاں میں سوگ کی فضا ہے۔

جب ہم دہی کلچے اور چنے کا ناشتا کر رہے تھے، دجنتی نے پوچھا۔ ”دوپہر کو آپ کیا کھائیں گے؟“

”جو مرضی بنا لو۔“ عمران نے کہا۔

”آپ... ابھی... یہاں رہیں گے نا؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”نہیں... اسی لیے تو کہا ہے جو مرضی بنا لو۔“ عمران نے جواب دیا۔

وہ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش، بے یقینی، اطمینان، سب کچھ گھل مل گیا تھا۔ ”اپنی بہن کو بہت زیادہ تکلیف دی ہے ہم نے... اب اور نہیں دیں گے... اور جو کچھ کہا ہے وہ بھی یاد رکھیں گے... حمیدہ کے لیے جو کچھ ہو سکا ضرور کریں گے۔“ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم بھی کچھ کہو...“

”سب کچھ تو تم خود کہہ دیتے ہو۔“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”باہر آپ کے لیے گمبھیر خطرہ ہوگا یا پھر... آپ آج کی رات اور رک جاویں...“

”نہیں، تمہارا بہت امتحان لے لیا ہے ہم نے... تمہارا بہت بہت دھنیواد۔“ عمران نے کہا۔

”اور تمہارا یہ احسان یاد بھی رکھیں گے۔“ میں نے اضافہ کیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ عمران نے کہا۔ ”بس ایک آخری چھوٹی سی تکلیف تمہیں دینی ہے۔ کسی طرح ہمارے لیے دو جوڑوں کا انتظام کر دو تا کہ ہم یہ منحوس وردیاں اتار سکیں۔“

...اور اب یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ہم دجنتی کے گھر سے باہر آ چکے تھے۔ سردی عروج پر تھی۔ باہر آ کر ہمیں پتا چلا کہ گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور تیز ہوا بھی چل رہی ہے... ہم مقامی لباس دھوتی کرتے میں تھے۔ سروں پر رنگ دار پگڑیاں تھیں اور ہم نے گرم چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ ہمارا اسلحہ ان چادروں میں چھپا ہوا تھا۔ سردی کے سبب مقامی لوگ اکثر اپنی پگڑیوں کو منڈاسے کی صورت باندھ لیتے تھے۔ اس سے چہرہ بھی کافی حد تک چھپ جاتا تھا۔ آج تو پھر یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے اپنی پگڑیوں اور گرم چادروں کو اپنا آپ چھپانے کے لیے استعمال کیا اور تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے اس بہت بڑے ہجوم میں داخل ہو گئے جو راج بھون سے کچھ فاصلے پر ایک چوک میں جمع تھا اور بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں سے لوگ ٹولیوں کی شکل میں نکلتے تھے اور اس جم غفیر میں شامل ہو جاتے تھے۔ راج بھون کے ایک عظیم الشان دروازے سے باہر ایک پتھریلا چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر باوردی افراد چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کے تین عدد بہت بڑے بڑے کراس بھی یہاں نصب تھے۔ یہ وہ سولیاں تھیں جن پر حکم کے معتوبین کو لٹکایا جاتا تھا۔

ہم ہجوم میں گھستے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ یہ وہی انداز تھا جو ہم نے دو دن پہلے راج بھون میں اختیار کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج یہ سب کچھ راج بھون کی چار دیواری سے باہر ہو رہا تھا اور ہجوم میں امنگ ترنگ کی جگہ غم و غصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ لوگ ایک شخص کی اذیت ناک موت دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ غصیلے نعرے لگاتے ہوئے وہ مکے لہرا رہے تھے۔

چبوترے کے اوپر ہلچل میں اضافہ ہو گیا۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا پھر بھی ہم دیکھ سکتے تھے۔ کچھ افسران ٹائپ لوگ چبوترے پر دکھائی دیے۔ ان کی پگڑیاں اونچی اور بھاری تھیں۔ تیز یخ بستہ ہوا میں ان پگڑیوں کے شملے لہرا رہے تھے... چبوترے کے گرد بے شمار مسلح محافظ اور سپاہی موجود تھے۔ کچھ اونچی جگہوں پر بھی محافظوں کی پوزیشنیں تھیں۔ غالباً یہ اضافی حفاظتی انتظامات پرسوں رات پیش آنے والے واقعات کے بعد کیے گئے تھے۔ شاید دجنتی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب اس آخری وقت میں اسحاق کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی ہم کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ کیا کرنا چاہتے تھے؟ یہ خود ہمارے ذہنوں میں بھی واضح نہیں تھا۔

ایک طویل انتظار کے بعد بالآخر اس تماشے کا کلائمکس شروع ہو گیا۔ دور چبوترے پر ہم نے ایک زرد رنگ چہرہ دیکھا۔ یہ شخص سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور اسے دو افراد نے سہارا دے رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں نے فلک شگاف نعرے لگائے اور ہجوم میں اضطراب کی بلند لہریں پیدا ہوئیں۔

”یہی ہے اسحاق؟“ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”ہاں۔“ درد و کرب کے سبب میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

وہ ہزاروں افراد میں گھرا ہوا تھا۔ یہاں کوئی اس کا دوست نہیں تھا، سب دشمن تھے اور اس کے خون کے پیاسے تھے۔ ہم ہجوم میں داخل ہو کے آگے بڑھتے رہے۔ آخر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے مسلح محافظوں کا دہرا حصار شروع ہوتا تھا۔ اگر ہم اس جگہ تھوڑی سی ہلچل پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو آگے بڑھنے اور کچھ کر گزرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ کامیابی کا امکان بہت کم تھا لیکن ہم چھوٹے سے چھوٹے امکان کو بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ہم حتی الامکان حد تک آگے پہنچ گئے۔ کینوس کا وہ سفید بیگ ابھی تک عمران کے کندھے سے جھول رہا تھا جس میں فالتو ایمونیشن رکھا جاتا ہے لیکن اس وقت بیگ میں ایمونیشن نہیں تھا۔ ایک زہریلا سانپ تھا جسے ہم نے زرگاں کے راستے میں جنگل سے پکڑا تھا اور اپنا ہم سفر بنا لیا تھا۔ میں اور عمران اس سانپ کو یہاں ہجوم میں چھوڑنے اور خوف و ہراس پیدا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ عمران نے گرم چادر کے اندر اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ وہ کینوس بیگ کھولنے جا رہا تھا۔ لیکن اچانک ایسا ہوا کہ عمران کے اندر کوئی روشنی سی بجھ گئی۔ چادر کے اندر اس نے اپنے ہاتھ بھی روک لیے۔

”کیا ہوا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”وہ دیکھو۔“ اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

محافظوں کی قطاروں کے درمیان تھوڑی سی جگہ خالی نظر آ رہی تھی۔ یہاں سے خاردار تاروں کے قریباً پانچ فٹ اونچے بڑے بڑے چھلے نظر آئے۔ چھلوں سے بنی ہوئی اس ناقابلِ عبور باڑ نے چبوترے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ”او گاڈ!“ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

”ہم یہ کسی صورت پار نہیں کر سکیں گے۔“ عمران کی آواز میں مایوسی تھی۔

بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہم نے اس ڈھلتی سہ پہر میں اس چبوترے کے سامنے... ان سیکڑوں لوگوں کے درمیان... بڑی وضاحت سے محسوس کیا۔

ایک دم ہمیں لگا کہ ہم ہار گئے ہیں۔ کم از کم آج کا دن کسی طرح بھی ہمارے حق میں نہیں ہے۔ وقت بہت کم تھا اور ہم کسی بھی طرح ان لاتعداد محافظوں اور اس مخصوص خاردار باڑ سے گزر کر اسحاق تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اب ہماری حیثیت بھی تماشائیوں سے زیادہ نہیں رہی تھی اور تماشا تقریباً شروع ہو چکا تھا۔ یہاں قریباً چودہ پندرہ ہزار کا مجمع تھا اور ہر نگاہ حکم اور جارج کے گناہ گار پر جمی تھی۔ وہ غالباً کسی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور خود کو جلادوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ میں اتنی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا، اس کا ایک ہاتھ سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ یقیناً

یہ وہی ہاتھ تھا جس کی انگلیاں پرسوں کاٹ دی گئی تھیں۔ اسحاق کے چہرے پر بھی مار پیٹ کے گہرے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اسے ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ دو تین افراد نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ لکڑی کے ایک کراس کو آٹھ دس افراد نے مل کر چبوترے پر لٹایا پھر اس کراس پر اسحاق کو لٹا دیا گیا۔ ایک پہلوان نما جلاد کے ہاتھ میں ایک بڑا ہتھوڑا نظر آیا۔ تب وہ کارروائی شروع ہوئی جو میرے سینے میں دل کو ٹکڑوں میں بدل گئی۔ یہ سب کچھ دیکھنے اور سہنے کے لیے لوہے کا دل درکار تھا۔ اسحاق کی ہتھیلیوں اور ٹانگوں پر ٹخنوں کے قریب لمبی آہنی کیلیں ٹھونکی جانے لگیں ہم کافی دوری پر ہونے کے باوجود اس کی کرب ناک آوازیں سن سکتے تھے۔

اس وقت میں نے سوچا کہ اگر ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے تو یہاں آتے ہی نہ ہوتے اور یقیناً عمران بھی ایسا سوچ رہا تھا۔ ہم ہزاروں پُرجوش تماشائیوں کے درمیان ساکت کھڑے تھے۔ پھر درجن بھر افراد نے مل کر لکڑی کے کراس کو کھڑا کر دیا۔ اسحاق اس صلیب پر ٹنگا ہوا تھا۔ چلا چلا کر وہ شاید نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں سے بہتے ہوئے خون کی سرخی ہم اتنی دور سے بھی دیکھ سکتے تھے۔

وہ ہمارے گروپ کا سب سے جوشیلا رکن تھا۔ تھوڑا سا غصیلا بھی تھا لیکن اس کا غصہ بے وجہ نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس کے غصے کی جڑیں اس کے ماضی سے پیوست تھیں۔ اس کی جوان بہن پر مقامی عورتوں کے بدنام رسیا (جارج) نے رال ٹپکائی تھی... جارج کے ہاتھوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس لڑکی نے زہر کھایا تھا۔ اس کے پھیپھڑے بند ہو گئے تھے اور وہ سانس کو ترستے ترستے راہیِ عدم ہو گئی تھی۔ اب اس کے خاندان کی ایک اور عورت ایسی ہی صورتِ حال کا شکار ہوئی تھی اور وہ اسے بچانے کی کوشش کرتے کرتے اس سولی تک آ پہنچا تھا۔

پہلوان نما جلاد آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی ہتھوڑا نظر آیا جس سے اس نے اسحاق کے جسم میں میخیں ٹھونکی تھیں۔ اس مرتبہ جلاد نے اس ہتھوڑے کو ایک اور طرح کی سفاکی کے لیے استعمال کیا۔ ہتھوڑے کی زوردار ضرب اسحاق کی پنڈلی پر لگائی گئی۔ یقیناً پنڈلی کی ہڈی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہوگی۔ یہاں کوئی لاؤڈ اسپیکر نہیں لگا ہوا تھا، پھر بھی اسحاق کے چلانے کی دردناک آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ایسا ہی سلوک اسحاق کی دوسری پنڈلی سے کیا گیا۔ پھر بازوؤں کی باری آئی۔ ہر بار جب ضرب لگتی تھی اور مرتا ہوا اسحاق چلاتا تھا تو جواب میں جوشیلے نعرے بلند ہوتے تھے۔ کبھی کبھی انسان کتنا سنگ دل ہو جاتا ہے... ہجوم کی نفسیات اس سنگ دلی کو انتہا تک پہنچا دیتی ہے۔

ہمارے لیے اب وہاں مزید کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے دم توڑتے اسحاق کو دیکھا... اور دل ہی دل میں کہا۔ ”اے دوست! ہم نے وہ سب دیکھا جو ان دشمنوں کے درمیان تجھ پر بیتا۔ ہاں، ہم نے سب دیکھا... اور سب ہمارے دل پر نقش ہوا۔ اور ہم وعدہ کرتے ہیں تجھ سے کہ ہم تیری تکلیف اور بے بسی کو بھولیں گے نہیں۔ تیرے خون کا حساب لیں گے... اور اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش بھی کریں گے جس کی خاطر تو نے اس اجنبی جگہ پر... بے مہر لوگوں کے درمیان... بے بسی کے عالم میں تڑپ تڑپ کر جان دی ہے...“

اب ایک دوسرا جلاد آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے اسحاق کے کولہوں کی ہڈیاں توڑنا تھیں۔ لیکن کھیل تو شاید اس سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ سولی پر ٹنگا ہوا اسحاق تقریباً بے جان نظر آ رہا تھا۔ عمران نے میرا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ ”چلو آؤ تابش...“ اس کی آواز میں انتہا درجے کا رنج تھا۔

ہم ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے واپس چل رہے۔ جب ہم ایک ایک قدم کھسکتے ہوئے نسبتاً کشادہ جگہ پر پہنچے، مشتعل ہجوم نے فلک شگاف نعرے لگا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا... پتا چلا کہ مصلوب کے سینے میں خنجر گاڑ کر اس کا قصہ تمام کر دیا گیا ہے۔

ہم نکلتے چلے گئے۔ ہمارے سینوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ چوک سے باہر نکل کر ہم چھوٹی گلیوں میں داخل ہو گئے۔ سرد ہوا کی کاٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ اچانک ہم ٹھٹک گئے۔ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آ رہا تھا۔ آنے جانے والوں کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ایک سخت گیر افسر ایک راہ گیر پر گرج برس رہا تھا۔ اس نے اسے کوٹ اتار کر تلاشی دینے کا حکم دیا پھر کسی بات پر مشتعل ہو کر اسے تھپڑ دے مارا۔ میں اس افسر کو دیکھ کر سکتہ زدہ رہ گیا... نگاہ پر بھروسا نہیں ہوا۔ کیا مُردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں؟ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔

ہوادان سے مندر کا منظر دیکھا۔ جنونی ہندوؤں نے گرو سو بھاش کا سرکاٹ دیا تھا اور پوجا پاٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے تاؤ الفضل کے چچیرے بھائی کی فیملی کو بھی یرغمال بنالیا تھا۔ انہوں نے باقی لوگوں کو تو چھوڑ دیا مگر کلثوم نامی جوان لڑکی کو پکڑ لیا تھا۔ میں رات کو آفتاب کی مدد سے مندر کے تہ خانے سے باہر نکل پڑا اور کلثوم کو وہاں سے نکال لایا۔ ہم واپس تہ خانے میں پہنچ گئے۔ سب میری اس دلیری پر حیران تھے۔ گرو سو بھاش کی موت کے بعد جنونی ہندوؤں کے دو گروہ بن گئے تھے اور ان میں کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی تھی۔ کلثوم کے فرار کے بعد مہندر نے اس کا الزام رام پرشاد کی بہو پر لگایا اور فیصلہ ہوا کہ رام پرشاد جلتے تیل میں ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے گا۔ پھر پرکھشا کا وقت آگیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل میں ہاتھ ڈال دیے۔ وہ چلّانے لگا۔ اس کے ہاتھ جل گئے تھے پھر جنونی ہندوؤں نے رام پرشاد کو ہلاک کر دیا اور مالا کو پکڑ لائے۔ اب اسے جلتے تیل میں پھینکا جانے والا تھا۔ پھر عمران نے کچھ کرنے کا کہا اور گولی چلا دی۔ مہندر مارا گیا۔ ستیش کے آدمیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور وہ لوگ مالا کو نکال لے گئے۔ مندر میں آگ لگ گئی تھی۔ ہم واپس تہ خانے میں آگئے۔ میں رات میں دوبارہ مندر سے نکلنا چاہتا تھا مگر عمران نے مجھے روک لیا۔ میری گردن کے زخم سے خون کا رساؤ پھر شروع ہوگیا تھا اور تکلیف بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں درد سے لڑ رہا۔ درد شدید تھا۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ درد بڑھتا جا رہا تھا۔ عمران ڈاکٹر لی وان کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے آیا اور اسے میرا آپریشن کرنے پر مجبور کیا۔ صورت حال خطرناک تھی۔ اس میں میری جان بھی جا سکتی تھی۔ خیر میرا آپریشن ہوگیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ دس روز بعد میں پوری طرح صحت یاب ہوگیا تھا۔ میں اور عمران تہ خانے سے باہر نکلے۔ ہمیں راج بھون پہنچنا تھا۔ ہم نے ایک چھکڑے پر سبزیاں لادیں اور راج بھون پہنچ گئے۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی تھا۔ ہم وہاں موجود پہرے داروں کو چکمہ دے کر راج بھون میں داخل ہوئے۔ وہاں حکم جی کے بیٹے کی پیدائش پر جشن منایا جا رہا تھا۔ ہم اس جشن کا فائدہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے اور فائرنگ کر دی۔ ڈاکٹر اسنیل کا بھائی اس فائرنگ میں مارا گیا۔ ایک دو بندے زخمی ہوئے۔ پانڈے نے ہمارا پیچھا کیا مگر وہ بھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم ایک ہندو فیملی کے گھر میں گھس گئے اور وجنتی نامی لڑکی کو یرغمال بنالیا مگر اس نے ہم سے پورا تعاون کیا۔ اسی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ اسحاق کو سزائے موت دی جارہی ہے۔ ہم وہاں سے نکلے مگر اسحاق کے لیے کچھ نہ کر پائے۔ اسے بے انتہا اذیت دے کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ہم نے عہد کیا کہ اسحاق کی ایک ایک چیخ، ایک ایک درد کا بدلہ ضرور لیں گے۔ ہم وہاں سے نکل رہے تھے کہ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آیا۔ وہاں موجود افسر کو دیکھ کر میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہمارے اور رنجیت کے درمیان کم و بیش پچاس میٹر کا فاصلہ تھا۔ رنجیت کا دھیان ہماری طرف نہیں تھا۔ میں نے عمران کا بازو دبایا۔ ہم رک گئے اور پھر جلدی سے ایک بغلی گلی میں مڑ گئے۔

میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ ”کیا بات ہے؟“ عمران نے چلتے چلتے پوچھا۔

”تم نے اس افسر کو دیکھا جو ناکے پر تلاشی لے رہا تھا؟“

”ہاں... وہی بینگن کی رنگت والا...“

”وہ رنجیت پانڈے ہے۔“

”کون سا پانڈے؟“

”رنجیت پانڈے... جسے پرسوں میں نے چاقو مارے تھے... اور جس کے بارے میں وجنتی نے بھی بتایا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔“

”تو یہ کوئی اور ہوگا۔ اس کا ہم شکل... اس کا پارٹ ٹو۔“ عمران نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”نہیں یار! وہ سو فیصد وہی ہے۔ میں نے اسے دھیان سے دیکھا ہے۔ اس کی آواز سنی ہے۔ یہ وہی بدبخت ہے۔“ میری آواز کانپ رہی تھی۔

”تو پھر جسے تم نے اس روز لوڈر میں مارا، وہ کوئی اور ہوگا۔ وہاں تو بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔“

میری آنکھوں کے سامنے لوڈر کے تہلکہ خیز مناظر گھومنے لگے۔ وہ دوڑ کر لوڈر پر چڑھ آیا تھا اور آتے ساتھ ہی مجھ پر جھپٹ پڑا تھا۔ وہاں اندھیرا تھا... اور شاید اس کے چہرے پر کچھ رنگ بھی ملا ہوا تھا۔ میں سناٹے میں رہ گیا... تو کیا میں اب تک اس غلط فہمی کا شکار رہا ہوں کہ میں نے رنجیت پانڈے کو مار دیا ہے؟

ذہن میں بہت سے سوال ابھر رہے تھے لیکن ابھی ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ ابھی ہمیں کسی سے ملنا تھا... بلکہ مجھے کسی سے ملنا تھا اور اس ملاقات کا پروگرام ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ ہمارا رخ زرگاں کے عظیم الشان پگوڈا کی طرف تھا۔ میری معلومات کے مطابق میڈم صفورا اسی پگوڈا میں تھی اور مجھے گرو سو بھاش سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ اب اسے پگوڈا میں کچھ آزادیاں حاصل ہوگئی ہیں اور وہ پگوڈا میں آنے والے سفید فام لوگوں سے راہ و رسم بھی بڑھا رہی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میڈم صفورا جارج گورا تک پہنچنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔ اس نے خود بھی تو کہا تھا کہ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور یہاں را جواڑے میں ہمارا فائدہ نقصان ایک ہے۔ لیکن میڈم صفورا سے ملنے میں ایک گمبھیر مسئلہ بھی تھا اور وہ یہ کہ عمران میرے ساتھ تھا۔ پچھلی ملاقات میں صفورا نے عمران کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ مجھے ابھی تک یاد تھے۔ وہ عمران کو مسلسل شیطان اور قاتل جیسے القابات سے نوازتی رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس کی بہن نادیہ کا قاتل ہے اور وہ اسے کبھی معاف نہیں

کرے گی۔
بے شک عمران کے حوالے سے اس کا رویّہ بڑا سخت تھا لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی کہ پچھلے تین چار برس میں میڈم صفورا کے غم و غصے میں خاطر خواہ کمی بھی واقع ہوئی تھی۔ حالات کے شکنجے میں جکڑے جانے کے بعد اس کے دل میں نرمی پیدا ہوئی تھی اور اس کے مزاج کے چڑھتے ہوئے دریا کو ہموار انداز میں بہنا آ گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں اچھے طریقے سے اس کے ساتھ بات کرتا اور اسے یہ سمجھاتا کہ موجودہ حالات میں عمران ہمارا کس قدر مددگار ثابت ہو سکتا ہے تو وہ اس کے بارے میں بھی نرم رویّہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتی۔ ہمارا پروگرام یہی تھا کہ میں اکیلا پگوڈا میں جاؤں اور عمران باہر کہیں مناسب جگہ پر میرا انتظار کرے گا۔

شام کے سائے لمبے ہو کر جھٹ پٹے میں اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ ہوا تیز تھی اور یخ بستہ ٹھنڈ، شام کے شانہ بہ شانہ زرگاں کے گلی کوچوں میں اتر رہی تھی۔ ہم نے مقامی انداز میں اپنے چہرے پگڑیوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ اسحاق کی موت کا بے پناہ غم اور پانڈے کی دید کی زبردست حیرت سینے میں چھپائے ہم ندی کی طرف بڑھتے رہے۔ یہ مٹیالے پانی والی وہی ندی تھی جو راج بھون کی دیواروں کو چھوتے ہوئے گزرتی تھی۔ اس کے کنارے تفریحی باغ بنے ہوئے تھے۔ اچھے موسم میں یہاں شام کے وقت یقیناً اہلِ زرگاں کی بھیڑ ہوتی ہوگی لیکن اس نہایت سرد شام میں بس اِکا دُکا لوگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جانب ایک قہوہ خانہ نظر آ رہا تھا۔ یہ نیم گرم جگہ بیٹھنے اور انتظار کرنے کے لیے مناسب تھی۔ عمران قہوہ خانے میں چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہیں اندازاً کتنا وقت لگے گا؟“

”یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جلدی بھی آ سکتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں رات گئے تک انتظار کرنا پڑے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں قہوہ خانے میں یا اس کے آس پاس ہی ملوں گا۔“

عمران سے رخصت ہو کر میں پگوڈا کی طرف بڑھ گیا۔ وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک باغ کے درختوں کے عقب سے پگوڈا کی مخروطی چھت کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں تنگ گلیوں سے گزر کر آگے بڑھتا رہا۔ راج بھون کے سامنے خونی تماشا دیکھ کر واپس آنے والوں کی ٹولیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے کر لوٹ رہے تھے۔

جلد ہی میں پگوڈا کی وسیع و عریض سیڑھیوں کے سامنے تھا۔ اس سرد شام میں یہاں بھی کم کم لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ گرد و پیش کو دیکھ کر میری نگاہوں میں کئی بھولے بسرے مناظر تازہ ہو گئے۔ مجھے اور سلطانہ کو جب نل پانی سے پکڑ کر زرگاں لایا گیا تو میں سب سے پہلے اسی بودھ مندر میں آیا تھا۔ یہاں میری حیثیت ایک خدمت گار قیدی کی سی تھی۔ ایک بار مجھے انہی سیڑھیوں پر الٹا لٹا کر بید بھی مارے گئے تھے۔ اب بھی ان سیڑھیوں پر ایک درمیانی عمر کا شخص اوندھا پڑا سسک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اسے بیدزنی کی سزا دی گئی ہے۔ ایک طرف دو تین کوڑھی افراد پھٹے پرانے کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔ گیروا کپڑوں والے بھکشو اندر باہر آ جا رہے تھے۔ عام لوگ بھی سیڑھیاں اترتے چڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جوتے اتارے اور اسی طرح پگڑی لپیٹے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے وہ کوٹھری نظر آئی جو میرا مسکن تھی اور پھر ہیشن یاد آیا۔ وہ جواں سال بھکشو جو ہمارا ہم سفر بنا تھا اور نل پانی کے راستے میں ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گیا تھا۔

صفورا کو یہاں کورتی کہا جاتا تھا۔ میں نے پگوڈا کے وسیع و عریض احاطے میں اس امید پر نگاہ دوڑائی کہ شاید کہیں کورتی یعنی صفورا گھومتی پھرتی دکھائی دے جائے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نہایت ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلتا مٹھ کی طرف بڑھا۔ صفورا کی رہائش اسی مٹھ (مدرسے) کی طرف تھی۔ نوجوان بھکشوؤں کی ایک ٹولی تھالیوں میں پھول سجائے پگوڈا کے اندرونی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ اندر سے ڈھول بجنے کی مدھم آواز باہر آ رہی تھی۔ مٹھ کے عین سامنے برآمدے میں مجھے ایک بوڑھا شخص بیٹھا نظر آیا۔ اس نے کمبل لپیٹ رکھا تھا اور ڈھول کی لے پر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ میں نے اس شخص کو یہاں پہلے بھی دیکھا تھا۔ یہ نابینا تھا۔ میں سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔

میں نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ ”بابا جی! میں کورتی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

بوڑھے نے اپنا بے نور آنکھوں والا چہرہ میری طرف پھیرا اور قدرے حیرت سے بولا۔ ”کون ہو تم؟“

”میرا نام دکھیت ہے جی۔ فتح پور سے آیا ہوں۔ پچھلی بار جب میں آیا تھا تو کورتی نے مجھ سے انگلیوں کی خارش کی دوا منگوائی تھی...“

”لیکن وہ تو یہاں سے چلی گئی ہے...“ بوڑھا روانی سے بولا۔

”کہاں؟“ میں نے بھی ترت پوچھا۔

”لال بھون میں...“

”لال بھون میں؟“

”ہاں، وہ گوری چمڑی والے لے گئے ہیں اسے۔ وہاں بڑی موجیں ہیں اس کی۔ پر وہ بدھا کی گناہ گار ہے۔ وقتی طور پہ سکھ شانتی حاصل بھی کر لیوے گی تو انجام بُرا ہی ہونا ہے...“

شاید میں کچھ دیر مزید اس بوڑھے کے پاس بیٹھتا اور اسے کریدنے کی کوشش کرتا مگر اسی دوران میں دور سے دو منڈے ہوئے سروں والے بھکشو بوڑھے کی طرف آتے دکھائی دیے۔ میں اپنی بات مختصر کر کے بوڑھے کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔

لال بھون کا نام میں نے پہلے نہیں سنا تھا۔ تاہم بوڑھے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی مشہور عمارت رہی ہوگی۔ میں اس کا کھوج لگا سکتا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ پگوڈا کے وسیع و عریض احاطے سے باہر نکل کر میں نے جس پہلے راہ گیر سے لال بھون کے بارے میں پوچھا، اس نے انگلی سے اشارہ کر کے کچھ فاصلے پر ایک سرخی مائل عمارت کی نشان دہی کر دی۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ اب شہر کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ گھوڑا گاڑیوں اور چھکڑوں پر بھی لیمپ روشن ہو گئے تھے۔ گلیوں کی رہی سہی رونق بھی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں لال بھون کے سامنے کھڑا تھا۔ پرانی طرزِ تعمیر کی یہ کافی وسیع عمارت تھی۔ یہاں بھی جنریٹرز کی موجودگی کا پتا چلتا تھا۔ گیٹ کے پاس برقی قمقمے روشن تھے اور اندر بھی کچھ کھڑکیوں میں برقی روشنی نظر آ رہی تھی۔

میں ہر خطرے سے بے نیاز لال بھون کی سرخی مائل عمارت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میری گرم چادر کے نیچے بھرا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور اور شکاری چاقو موجود تھا۔ جونہی میں گیٹ کے سامنے پہنچا، ایک باوردی پاسبان سامنے آیا۔ اس کی رنگین پگڑی کا شملہ دو فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ سخت سردی کے سبب اس کے نتھنوں سے بھاپ خارج ہو رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے مجھے سر تا پا گھور کر پوچھا۔

”مجھے کورتی صاحبہ سے ملنا ہے۔ فتح پور سے آیا ہوں۔ وہ مجھے جانتی ہیں۔“

”کون کورتی؟“ نہایت کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

ایک دم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میڈم صفورا کے لیے کورتی کا لقب پگوڈا میں استعمال کیا جاتا تھا اور یہ کوئی اچھا لقب نہیں تھا۔ اس کا مطلب شاید گناہ گار عورت تھا۔ اب صفورا پگوڈا میں نہیں تھی۔ اس پر کچھ غیر مقامی لوگوں کی نظرِ کرم ہوئی تھی اور وہ اب اس عالی شان عمارت میں تھی۔

میں نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پاسبان سے کہا۔ ”میں اس خاتون صاحب سے ملنا چاہتا ہوں جو پاکستانی ہیں اور اس سے پہلے پگوڈا میں سیوا کرتی تھیں...“

”تم میڈم صفورا جی کی بات کرتے ہو؟“ پاسبان نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”لیکن تم ہو کون اور کہاں سے آئے ہو؟ اور سب سے پہلے یہ چادر اتار کر ایک طرف رکھو۔“ پاسبان کا انداز سخت ہوتا جا رہا تھا۔

اسی دوران میں دو اور محافظ نما شخص بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ مسلح تھے۔ میں نے کہا۔ ”میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میڈم مجھے بڑی اچھی طرح جانتی ہیں۔ آپ بس ان تک میرا پیغام پہنچا دیں۔ ان کے آنے سے پہلے میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا اور اگر آپ لوگ زبردستی پوچھنے کی کوشش کریں گے تو میڈم بہت ناراض ہوں گی۔“

”ان کی راضی اور ناراضی کی پروا نہ کرو تم... یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم یہ چادر اور پگڑی اتار دو... چلو شاباش، جلدی کرو۔“

”تم اپنے ساتھ ساتھ میڈم جی کا بھی نقصان کر رہے ہو۔“ میں نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

ہمارے درمیان تکرار شروع ہو گئی لیکن اس سے پہلے کہ یہ تکرار زیادہ سنگین شکل اختیار کرتی اور مجھے زبردستی عمارت میں گھسنا پڑتا، ایک شان دار گھوڑا گاڑی گیٹ کی طرف آتی دکھائی دی۔ دو گھوڑوں والی اس چمکیلی گاڑی کو دیکھتے ہی محافظ تن کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سلام کے انداز میں اپنے ہاتھ اپنے ماتھوں سے لگا دیے... تاہم ایک موچھیل محافظ نے مجھے بازو سے تھامے رکھا۔

گھوڑا گاڑی کی کھڑکی کا پردہ سرکا۔ مجھے میڈم صفورا کی شکل نظر آئی... آخری بار میں نے اسے بڑی خستہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور جسم پر چیتھڑے تھے لیکن آج وہ اپنے مخصوص بوائے کٹ اسٹائل میں نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا۔ یہ تقریباً وہی روپ تھا جو ہم لاہور کی لال کوٹھیوں میں دیکھا کرتے تھے۔ ایک اسمارٹ جواں سال اور دبنگ عورت۔

صفورا نے محافظوں کے چہروں پر ہیجان کے آثار دیکھ لیے تھے۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔

”یہ بندہ زبردستی اندر گھسنا چاہتا ہے جی۔ تلاشی بھی نا ہیں دے رہا۔“

"پگڑی ہٹاؤ۔" میڈم صفورا کرخت لہجے میں بولی۔

"آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں میڈم... لیکن میں ان کے سامنے پگڑی ہٹانا نہیں چاہتا۔"

میری آواز سن کر صفورا ذرا چونکی مگر اس کا ذہن ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا... میں نے اسے اشارہ دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے نادیہ کی موت کا بہت افسوس ہے میڈم۔ میں اسی بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک لحظے میں صفورا نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا رنگ بدلا... اس نے مونچھیل محافظ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "چھوڑ دو انہیں۔"

محافظ ایک دم بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میڈم صفورا نے مجھے گاڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔

میں شان دار گاڑی کی نیم گرم فضا میں آ گیا۔ گاڑی طویل ڈرائیو وے کو طے کر کے عمارت کے پورچ میں رکی۔ جلد ہی میں میڈم صفورا کے ساتھ لال بھون کے اندر تھا۔ یہ عمارت باہر سے تو درمیانی حالت کی نظر آتی تھی لیکن اس کا "اندر" دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بلند چھتیں، محرابی دروازے، دبیز قالین، خوب صورت غالیچے اور بڑے بڑے فانوس... باوردی ملازم اور ملازمائیں جھکتے پاؤں، بے آواز چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی حصے سے موسیقی کی آواز ابھر رہی تھی اور شوخ لڑکیوں کے سریلے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے... در و دیوار سے رنگ و بو کے غیر مرئی سوتے پھوٹ رہے تھے۔ ایک فوارے اور شان دار حوض کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم ایک شان دار کمرے میں داخل ہو گئے۔

میڈم صفورا نے انگریزوں کی طرح پتلون قمیص اور جرسی پہن رکھی تھی۔ اس کے پاؤں میں جوگر ٹائپ جوتے تھے۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ میں نے پگڑی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ "او تابش! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں تمہیں پھر اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ اٹ از رئیلی ونڈر فل۔" اس نے مجھے چھوتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی یقین نہیں آ رہا۔ پچھلی بار ہماری دونوں ملاقاتیں بڑے بُرے حالات میں ہوئی تھیں۔ ہم دونوں کی گردنوں میں آہنی کڑے تھے۔ آپ کا سر منڈا ہوا تھا اور باقی کا حلیہ بھی قابلِ رحم تھا۔ لیکن اب... اب تو آپ وہی لاہور والی میڈم صفورا نظر آ رہی ہیں..."

"خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ بھی تبدیلی آئی ہے، اس کے لیے کافی محنت کرنا پڑی ہے مجھے۔ تفصیل بتاؤں گی تو تم حیران رہ جاؤ گے لیکن... یہ سب باتیں تو بعد کی ہیں۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آ پہنچے؟ مجھے تو تمہارے بارے میں بُری بُری خبریں مل رہی تھیں۔"

"خبریں تو اب بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہیں میڈم... آپ کو پتا چل ہی گیا ہوگا کہ جارج گورا نے سلطانہ کے ساتھ اپنے گھر میں کیا کیا تھا؟"

"ہاں تابش! وہ واقعہ تو واقعی افسوس ناک تھا۔ وہ اسے جیل سے نکال کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس ساری بات کا پتا تو اس وقت چلا جب اس کے گھر پر حملہ ہوا... اور جارج کے محافظوں نے لوگوں پر اندھا دھند گولیاں چلائیں۔"

"اس واقعے کے بعد بھی واقعات کا ایک سلسلہ ہے میڈم... جارج نے اپنے پاپوں کا گھڑا بھر لیا ہے، اب اس گھڑے کو ہر صورت پھوٹنا ہی پھوٹنا ہے۔"

میڈم صفورا گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر طویل سانس لے کر بولی۔ "میں نے سنا تھا کہ تم میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب تم وہ پہلے والے تابش نہیں رہے ہو۔ مجھے یقین نہیں ہوتا تھا لیکن اب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔"

"بس میڈم! ایسی تبدیلیاں یونہی تو نہیں آتیں۔ ان کے پیچھے حالات کا لمبا جبر ہوتا ہے... اگر موقع ملا تو میں آپ کو یہ طویل کہانی ضرور سناؤں گا۔"

میڈم کی عقابی نگاہیں جیسے میرے اندر تک دیکھ رہی تھیں۔ اس نے میری گرم چادر کے نیچے اسلحے کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا اور شاید اس آگ کو بھی دیکھ لیا تھا جو میرے سینے میں بھڑک رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر طویل سانس لے کر بولی۔ "تو تم جارج گورا کے لیے یہاں آئے ہو؟"

"کچھ ایسا ہی سمجھ لیں میڈم۔"

"اکیلے ہو یا کوئی اور بھی ساتھ ہے؟"

"ایک ساتھی بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کہاں ہے؟"

"یہیں زرگاں میں۔ ایک قہوہ خانے میں چھوڑ کر آیا ہوں اسے۔"

میڈم نے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور قیمتی لائٹر سے سلگا کر دھیمی آواز میں بولی۔ "تابش! بہت خطرناک اور مشکل کام کا ارادہ لے کر پہنچے ہو یہاں... بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔"

"آپ مجھے ڈرا رہی ہیں۔"

"میں تمہیں کیا ڈراؤں گی... سچ پوچھو تو میں خود ڈری ہوئی ہوں۔ یہ بہت سفاک لوگ ہیں اور آج کل ایک دم ہائی الرٹ بھی ہیں۔ جارج گورا تک پہنچنا تو بہت دور کی بات ہے تابش! آج کل اس کے کسی ادنیٰ افسر تک رسائی بھی مشکل ہے۔"

میں نے عجیب اعتماد سے کہا۔ "میڈم! آپ نے خود کہا ہے کہ یہ وہ تابش نہیں ہے جسے آپ جانتی تھیں۔ اور میڈم... یہ نیا تابش آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ نہ صرف جارج گورا تک پہنچے گا بلکہ اس کے دس بیس ٹکڑے بھی کرے گا۔ اور صرف یہی نہیں میڈم... ہم اس منحوس جگہ سے نکلیں گے... اپنی آزاد دنیا میں واپس پہنچیں گے۔ اپنے پاکستان، اپنے لاہور، اپنے جانے پہچانے گلی کوچوں میں۔ بہت جلد میڈم۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر بند کر لیا۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولی۔ "وہ دوسرا بندہ کون ہے جو تمہارے ساتھ آیا ہے؟"

"میں آپ کو اس کے بارے میں بھی بتاتا ہوں۔ لیکن پلیز پہلے تھوڑا سا اپنے بارے میں بتا دیجیے۔ میرا کنفیوژن دور ہوگا۔ آپ پگوڑا کی مصیبت سے نکل کر اس شان دار لال بھون میں کیسے پہنچیں؟"

"تمہیں معلوم کیسے ہوا کہ میں یہاں ہوں؟" میڈم نے جوابی سوال کیا۔

"میں پہلے پگوڑا میں ہی گیا تھا۔ وہیں سے پتا چلا۔ میں سیدھا یہاں آ گیا۔"

"یہ حماقت تمہیں مہنگی پڑ جاتی تو پھر؟"

"کیا مطلب میڈم؟"

"گارڈز سے تمہاری تکرار ہو رہی تھی۔ وہ تمہاری پگڑی اتروا دیتے تو عین ممکن تھا کہ تمہیں پہچان لیتے اور پھر تم نے چادر کے نیچے اسلحہ بھی لگایا ہوا ہے۔"

"میڈم! اردو کا وہ محاورہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا، جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈرنا۔ سچ پوچھیں تو میں کشتیاں جلا کر یہاں آیا ہوں۔ جارج نام کے اس پھوڑے کو جڑوں سے کاٹوں گا یا پھر خود ختم ہو جاؤں گا۔"

میرے پُرجوش لب و لہجے نے میڈم صفورا کو ایک بار پھر چونکایا۔ وہ دھیان سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میرے اور صفورا کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی، پھر صفورا نے مجھے بتایا کہ وہ پگوڑا سے یہاں کیسے پہنچی۔ وہ بولی۔ "میرے خیال میں میرے یہاں پہنچنے میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ میں انگلش روانی سے بول لیتی ہوں۔ پگوڑا میں جارج گورا کے ساتھی سرجن اسٹیل نے ایک بار مجھ سے تھوڑی سی بات چیت کی اور پھر ہمارے درمیان اکثر بات ہونے لگی۔ اسٹیل نے ہی جارج سے میری سفارش کی اور کہا کہ میں کافی سزا کاٹ چکی ہوں، اب میرے ساتھ کچھ رعایت کی جائے۔ یہ اسی سفارش کا ہی نتیجہ تھا کہ مجھے پگوڑا سے نکال کر یہاں پہنچا دیا گیا... تم ٹھیک کہتے ہو، یہ واقعی پاز یٹو چینج ہے۔ یہاں مجھے ہر طرح کا سکون آرام حاصل ہے۔ میری حیثیت حکم جی کی معمولی ملازمہ کی سی ہے۔ پھر بھی جاب اچھا اور انٹرسٹنگ ہے۔"

"کیسا جاب؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔ "یہ آوازیں سن رہے ہو تم؟"

میں نے کان دھرے۔ لال بھون کے کسی دور افتادہ حصے سے لڑکیوں کے گانے کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ شاید کورس کی شکل میں کوئی الرہبیہ نغمہ گا رہی تھیں یا گانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"یہ گانے کی آوازیں ہیں۔"

"ہاں، یہاں مجھے کچھ لڑکیوں کی نگہبانی سونپی گئی ہے اور یہ کوئی عام لڑکیاں نہیں ہیں۔ ان چالیس لڑکیوں کو پورے راجواڑے میں سے چنا گیا ہے۔ ان کی عمریں اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان ہیں۔ ان میں سے صرف پانچ مسلمان ہیں، باقی ساری ہندو ہیں۔ میرا کام یہاں ان لڑکیوں کو بنانا سنوارنا اور ادب و آداب سکھانا ہے۔ میری مدد کے لیے کچھ اور لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔ ہندی ڈانس کی تربیت دینے والی گیتا مکھی، ایک ماسٹر ہندو گائیک، ایک جڑی بوٹیوں کا ماہر وید اور اس طرح کے دوسرے لوگ۔"

"ان لڑکیوں کا کیا کیا جائے گا؟"

"میرے خیال میں تم نے بھی ساتویں کے جشن کا سنا ہوگا۔ یہ اس راجواڑے کا سب سے بڑا فیسٹیول ہوتا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میڈم صفورا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس فیسٹیول میں راج بھون کے لیے جو سات پریاں چنی جاتی ہیں، وہ انہی لڑکیوں میں سے چنی جائیں گی۔ ان میں سے زیادہ تر سادہ اور گم صم ٹائپ کی ہیں۔ انہیں بنانا سنوارنا اور راج بھون کے ادب و آداب سکھانا سب کچھ یہیں لال بھون میں ہوتا ہے۔"

میں نے ساتویں کے جشن اور سات رنگوں کی پریوں کے بارے میں پہلے بھی کافی کچھ سنا تھا۔ یہ سب کچھ بہت داستانی لگتا تھا مگر یہاں اس اسٹیٹ میں یہ ایک ٹھوس حقیقت کی صورت میں موجود تھا۔ یہ قدیم رسم پورے اہتمام کے ساتھ یہاں جاری ساری تھی... بلکہ خود سلطانہ پر بھی ایک بڑا الزام یہ تھا کہ اس نے خود کو پری بننے کے اعزاز سے جان بوجھ

کرمحروم کیا... اور یوں کے چناؤ سے پہلے ہی آناً فاناً شادی کر لی۔

میری اور میڈم صفورا کی گفتگو جاری تھی کہ اچانک دروازے پر عجلت آمیز دستک ہوئی۔ ”کون؟“ میڈم نے بارعب آواز میں پوچھا۔

”میڈم! میں ہوں ثمرین۔“ روتی ہوئی سی آواز ابھری۔

”اوہ گاڈ۔“ میڈم نے سٹپٹائے لہجے میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ ”میں ایک منٹ میں آئی۔“

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ مجھے روتی سسکتی لڑکی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ میڈم ساتھ والے لاؤنج میں ایک خوبرو لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک مختصر سا چمکیلا لباس تھا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”یہ دیکھیں میڈم! یہ کپڑے پہننے کو کہہ رہی ہے مجھے گیتا دیدی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“

یہ لباس کپڑے کے دو نہایت مختصر ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ لڑکی کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔

میڈم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے جھڑک کر بولی۔ ”اچھا! ہر بات پر رونا دھونا شروع کر دیا کرو۔ پہلے مجھے بتایا تو کرو کہ پرابلم کیا ہے۔ چلو آؤ میرے ساتھ...“ وہ خوش شکل لڑکی کے ساتھ ایک راہداری میں اوجھل ہوگئی۔

اسی دوران میں دو اور خوب صورت لڑکیاں لٹک مٹک کر چلتی ہوئی کھڑکی کے سامنے سے گزریں۔ انہوں نے بہ عین وہی مختصر لباس پہن رکھا تھا جو ابھی ثمرین نامی لڑکی نے میڈم کو دکھایا تھا۔

میں کھڑکی بند کر کے واپس اپنی جگہ آ بیٹھا اور میڈم کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی واپسی میں چار پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

”کون تھی یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ یہ تمہاری ایک دور کی رشتے دار تھی تو پھر؟“ میں چونک کر میڈم کو دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا دی۔ ”یونہی مذاق کر رہی تھی۔“

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ پوچھتا، وہ سگریٹ کا ایک تیکھا کش لے کر بولی۔ ”جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر وہ واقعی صحیح ہے تو پھر... تم بڑے سنگین وقت پر اور بڑے سنگین ارادوں سے یہاں آئے ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم سے کیا کہوں۔“

”آپ کچھ بھی نہ کہیں۔ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ جو کچھ آپ کہنا چاہ رہی ہیں، وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ اس حوالے سے ہم بعد میں تفصیل سے بات بھی کر سکتے ہیں۔“

وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر ایک اور کش لے کر بولی۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو تابش؟“

میں نے کہا۔ ”میڈم! چاہتا تو بہت کچھ ہوں اور جو چاہوں گا وہ ہم سب کے بھلے میں ہوگا لیکن فی الوقت تو ہمیں بس دو تین روز کا ٹھکانا دے دیجیے۔“

”اوکے... مل گیا۔“

”میں اپنے ساتھی کو بلا سکتا ہوں؟“

”بلا لو۔ کون ہے وہ؟“

میں نے نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! اب تک آپ نے جو سوال پوچھے ہیں، ان میں یہ سوال سب سے ٹیڑھا ہے... لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کی فہم و فراست اور محبت اس سوال کو اور اس کے جواب کو اتنا ٹیڑھا نہیں رہنے دے گی۔“

”کھل کر بات کرو تابش!“

کھڑکیوں سے باہر ایک سرد رات نے پنجے گاڑ رکھے تھے... یہ پوری عمارت قالینوں، غالیچوں کی وجہ سے گرم تھی پھر بھی کمرے میں ہلکی خنکی محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں نے مناسب الفاظ کا چناؤ کیا اور پھر میڈم صفورا کو دھیرے دھیرے عمران کے بارے میں سب بتا دیا۔ میڈم کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ سب سے پہلے تو اسے اسی بات کا یقین نہیں آیا کہ عمران تاحال زندہ ہے۔ دوسری بڑی حیرت یہ تھی کہ وہ یہاں اس اسٹیٹ میں، اس شہر میں موجود ہے اور اس گھر سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قہوہ خانے میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔

ایک طویل سکتے کی سی کیفیت سے نکلنے کے بعد میڈم صفورا بولی۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ سراج اور شیر بے وغیرہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے سینے پر گولیاں لگی تھیں اور وہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔“

”بے شک میڈم! یہ سب کچھ ہوا تھا لیکن وہ پھر بھی زندہ رہا۔ اس کے جسم پر بس ایک دو گولیاں ہی لگ سکیں اور اس کے نشان اس کے جسم پر موجود ہیں۔“

میں نے میڈم صفورا کو امریکن بلٹ پروف جیکٹ کے بارے میں بتایا اور وہ باقی باتیں بھی بتائیں جو عمران نے

میرے گوش گزار کی تھیں۔ میں نے دیکھا صفورا کی پیشانی پر پسینا ہے۔ اس کی آنکھوں کے اندر گہرائی میں وہ سارے پرانے کرب جاگ گئے تھے جن کا تعلق لاہور والے واقعات سے اور پھر چھوٹی میڈم نادیہ کی موت سے تھا۔

میں نے لجاجت سے کہا۔ ”میڈم! وقت کے ساتھ بہت کچھ تبدیل ہوا ہے۔ میں تبدیل ہوا ہوں، آپ ہوئی ہیں... ہمارے حالات، ہمارا گرد و پیش سب کچھ بدل گیا ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا، اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ میڈم! بے شک وہ صدمہ شدید تھا جو آپ کو پہنچا۔ اس جیسے کم شدت کے اور بھی کئی صدمے ہیں جن کا تعلق ان دنوں سے ہے۔ کتنا اچھا ہو میڈم... اگر ہم ان صدموں کو بھلا کر اپنی موجودہ مصیبت سے نکلنے کے لیے کوئی مشترکہ کوشش کر سکیں۔“

میڈم خاموش رہی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ لگتا تھا، وہ بڑی مشکل سے اپنے آتشیں آنسوؤں کو روکے ہوئے ہے۔ میں نے کہا۔ ”میڈم! میں بڑے مان سے آپ کے پاس آیا ہوں اور وہ مان یہ ہے کہ جس طرح آپ نے مجھے معاف کیا ہے، اسی طرح عمران کو بھی کر دیں گی... بے شک جرم بہت بڑا ہے لیکن مجھے آپ کے ظرف کا آسرا ہے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ آپ کا ظرف آپ کے غم و غصے سے کہیں زیادہ ہے... پلیز میڈم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، ہم آپ کی دی ہوئی معافی کا حق ادا کر دیں گے۔ ہم آپ کے ایک اشارے پر اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ لیں گے۔ اللہ نے چاہا تو اس راجواڑے کی اونچی دیواریں اب زیادہ دیر ہمارا راستہ نہیں روک سکیں گی...“

میں جو کچھ کہہ رہا تھا، دل کی گہرائی سے کہہ رہا تھا اور کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے... میں نرم و گداز لہجے میں بولتا رہا اور میڈم خاموشی سے سنتی رہی... کبھی اس کے چہرے پر گہرا کرب جھلکتا، کبھی وہ ایک طویل آہ بھر کر رہ جاتی... میری گفتگو کے دوران میں اس نے ایک دو سخت جملے بھی کہے تاہم میں نے ان جملوں کا توڑ کیا... اور عمران کے حوالے سے میڈم صفورا کا غم و غصہ دور کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کوشش کا نتیجہ مثبت نکلا۔ بالآخر میڈم نے عمران کو یہاں لانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ تاہم اس نے کہا۔ ”وہ فی الحال میرے سامنے نہیں آئے۔ میں ایک دو دن میں خود ہی اس سے ملاقات کروں گی۔ اس دوران میں مجھے خود کو سنبھالنے میں مدد ملے گی۔“

”آپ جیسا کہتی ہیں، ویسا ہی ہوگا میڈم! جو کچھ ہوا اس کا افسوس اور دکھ اسے بھی بے چین رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب تک آپ سے معافی نہیں مانگے گا اور آپ اسے معاف نہیں کریں گی، وہ ذہنی سکون سے دور رہے گا۔“ میں نے اپنی طرف سے بات بناتے ہوئے کہا۔

میڈم نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں کے نم کناروں کو صاف کیا اور اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں پھیر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ”میں اپنے منیجر مدن کو بھیجتی ہوں، وہ تمہیں میری گاڑی میں لے جائے گا۔“

کچھ دیر بعد ایک ہٹا کٹا خرانٹ سا شخص آن موجود ہوا۔ اس کی عمر تیس سال سے اوپر ہی ہوگی۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام مدن ہے۔ میں نے مقامی طرز کی پگڑی پھر سر اور چہرے پر لپیٹ لی۔ بہرحال، مدن نے مجھے سلطانہ کے شوہر مہروز کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ ہم باہر نکل کر اسی شاندار گھوڑا گاڑی میں آ بیٹھے جس میں صفورا یہاں پہنچی تھی۔ یہ بالکل بند گھوڑا گاڑی تھی۔ یخ بستہ ہوا اور سردی کے اثرات سے کافی حد تک محفوظ۔ ہم اس گھوڑا گاڑی پر دھند آلود ندی کے کنارے کنارے چلتے مطلوبہ جگہ پر پہنچے۔ میں گھوڑا گاڑی کے اندر ہی رہا اور منیجر مدن قہوہ خانے کے اندر سے عمران کو لے آیا۔ ہم نے واپسی کا سفر مکمل خاموشی سے طے کیا... منیجر مدن نے بات چیت کرنے کی کوشش کی تاہم میں نے مختصر جواب دے کر اسے خاموش کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم لال بھون کے ایک نہایت آرام دہ بیڈ روم میں موجود تھے۔ یہاں آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ شیشے کی الماری میں شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں اور خوب صورت تپائی پر بسکٹ، پیسٹری، کاجو اور اس طرح کے دیگر لوازمات موجود تھے۔

ہم نے اپنی چادریں اور پگڑیاں وغیرہ اتار دیں اور ایزی موڈ میں ہوگئے۔ توقع کے مطابق میڈم صفورا دوبارہ نظر نہیں آئی، تاہم کھانا پُرتکلف تھا۔ بعد میں سبز چائے سے تواضع کی گئی۔ کھانے کے دوران میں ہم دھیمے لہجے میں بات کرتے رہے اور میں نے عمران کو اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس عمارت میں ہونے والی سرگرمیوں کی روداد نے عمران کو بھی حیران کیا۔ وہ بولا۔ ”جگر! یہ تو میرے فساد پلس کے لیے بڑی زبردست اسٹوری ہے۔ اس کا عنوان ہوسکتا ہے... چالیس لڑکیاں چالیس کہانیاں بلکہ اکتالیس کہانیاں۔ میڈم صفورا خود بھی تو ایک کہانی ہے۔ اب اندازہ لگاؤ، اکتالیس کہانیوں کی کہانی پچاس منٹ کے دورانیے میں بتایا جائے اور ہر دورانیے میں پچاس بریک ہوں تو یہ بن گئے تقریباً دو ہزار بریک۔ ہر بریک میں آج کل شریف چینلز

بھی چودہ پندرہ اشتہار تو چلا ہی دیتا ہے۔ تو یہ ہو گئے تقریباً تیس ہزار اشتہار... اور مجھے تو لگتا ہے کہ اتنی زبردست لڑکیوں... میرا مطلب ہے اسٹوریوں کے لیے یہ تیس ہزار اشتہار بھی کم رہیں گے۔"

"یہاں سے زندہ بچ کر نکلو گے تو اشتہار چلاؤ گے نا۔" میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"جگر! مجھے ایسی باتوں سے مت ڈرایا کرو۔ ہمارا تو کام ہی ہے پلٹ کر جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا۔"

"جو کچھ تم لوگ "جھپٹ" کر پلٹتے ہو اس کا بھی سب کو پتا ہے۔"

"خبردار، ہم پر رشوت کا الزام نہ لگانا۔ ورنہ بریکنگ نیوز میں جگہ پا جاؤ گے۔ ہم شاہین صفت لوگ ہیں۔"

"لیکن ہم نے تو دیکھا ہے کہ جہاں واقعی خطرہ ہو، وہاں پولیس والوں کی طرح تم لوگ بھی پلٹ کر پلٹتے اور پلٹتے ہی پلٹتے چلے جاتے ہو۔"

"میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ شاہین صفت لوگوں سے یوں طنزیہ لہجے میں بات نہیں کرتے۔ اور یہ وہ اقبال والا شاہین نہیں ہے۔"

"یہ کون سا ہے؟"

"یہ لاہور کا مشہور رس فروش ہے۔ گنے کا رس بیچتا ہے۔ اس نے ایسا ڈبل ایکشن بیلنا بنوایا ہے کہ خشک سے خشک گنے سے بھی دو چار گلاس رس نکال کر دکھا دیتا ہے... بلکہ اس کا تو کہنا ہے کہ کسی بھی پلاسٹک یا لکڑی وغیرہ کے ٹکڑے پر "گنا" لکھ دیا جائے تو وہ اس میں سے بھی رس نکال کر دکھا دے گا۔"

"اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟" میں نے اپنا بستر درست کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی جس طرح شاہین رس فروش، سوکھے سڑے گنے سے بھی رس نکال لیتا ہے، ہم بھی نہایت پُرسکون حالات اور لوگوں کے اندر سے تہلکہ خیز خبریں نکال سکتے ہیں..." اس نے ایک بار بولنا شروع کیا تو بولتا چلا گیا۔

اسحاق کی دردناک موت نے میرا دل بوجھل کر رکھا تھا اور یقیناً ایسا ہی بوجھ عمران کے دل و دماغ پر بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری اور اپنی توجہ اس گمبھیر دکھ سے ہٹانے کے لیے یہ اوٹ پٹانگ گفتگو کر رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ بیچ وہ کچھ سنجیدہ باتیں بھی کر جاتا تھا۔ ان باتوں کا تعلق اس لال بھون اور یہاں کی کرتا دھرتا میڈم صنوبرا سے تھا... صنوبرا کے حوالے سے عمران کے ذہن میں ابھی خدشات موجود تھے۔ یہ خدشات اسی وقت دور ہو سکتے تھے جب عمران اور صنوبرا میں آمنے سامنے بات ہوتی اور وہ دونوں ماضی کو بھلا کر آگے کی طرف دیکھنے کا فیصلہ کرتے۔

میں عمران کے خدشات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ خدشات بدترین صورت میں صحیح ثابت ہونے والے ہیں اور بہت جلد۔

ہم کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد سو گئے۔ میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے اردگرد ہر چیز دھندلائی ہوئی سی نظر آئی۔ سر پر جیسے منوں بوجھ تھا۔ کئی سیکنڈ مجھے یہ سمجھنے میں ہی گزر گئے کہ میں کہاں اور کس حالت میں ہوں۔

ایک پھنکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"حرامزادے... تم کیا سمجھتے تھے... میری میزبانی انجوائے کرو گے۔ میری چھت تلے بیٹھ کر میری روٹیاں توڑو گے... میں اتنی جلدی بھول جاؤں گی اپنی بہن کے قاتل کو... اتنی جلدی معاف کر دوں گی..."

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سر بُری طرح چکرا رہا تھا اور تب میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ اور پاؤں بڑی سختی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔

میں نے اپنے سامنے صنوبرا کو دیکھا۔ وہ تن کر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور آنکھیں شعلہ نشاں تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھے عمران سے مخاطب تھی۔ غنودگی کے سبب میں یہ سارا منظر بہ مشکل دیکھ پا رہا تھا۔

میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ عمران کے ہاتھ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہوئے ہیں اور اس کے پاؤں کے گرد نائیلون کی سرخ رسی کی مضبوط بندش ہے۔ میرے جاگنے سے پہلے شاید اسے مارا بھی گیا تھا۔ وہ بستر کے بجائے قالین پر نظر آ رہا تھا اور اس کے ہونٹ خون آلود تھے۔

میرا ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ متلی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل میڈم صنوبرا کو پکارا۔ "میڈم! یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ نے تو وعدہ کیا تھا..."

"خاموش۔" ایک بھاری مردانہ آواز نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میری پسلیوں پر ایک بے رحم ٹھوکر لگی۔ میں کراہ کر رہ گیا۔

ٹھوکر زوردار تھی تاہم اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ میرے دماغ پر چھائی ہوئی گہری دھند چھٹنا شروع ہو گئی۔ میں نے کوشش کی اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عمران قالین پر تھا اور اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی ازلی اطمینان تھا جو بدترین حالات میں بھی اس کے چہرے

سے جدا نہیں ہوتا تھا۔

میڈم صفورا نے عمران کے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور زوردار جھٹکے دے کر بولی۔ ”یو باسٹرڈ! تم نے تین چار سال کو کافی عرصہ سمجھا... شاید تمہیں پتا نہیں، تمیں چالیس سال بھی گزر جاتے تو مجھے تمہاری شکل بھولنا تھی اور نہ تمہارا جرم... تم نے میری بہن کو مارا ہے۔ اس کے بدلے تمہیں اپنی جان دینا پڑے گی... اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔“ اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ہاں... یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا... تم تمنا کرو گے کہ کاش تم اسی رات ڈیک نالے پر مر گئے ہوتے۔“ صفورا کے لہجے میں آگ تھی اور جنون تھا۔ وہ اس عورت سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی جسے چند ماہ پہلے میں نے پگوڈا میں فرش کی صفائی کرتے دیکھا تھا... اور اس عورت سے بھی جس سے کل شام میں نے اسی عمارت میں ڈیڑھ دو گھنٹے بات چیت کی تھی۔

میں نے اپنے ڈوبتے ذہن کو سنبھالا اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ”میڈم! آپ جلد بازی کر رہی ہیں۔ آپ جانتی نہیں کہ ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو جائے گا۔“

”شٹ اپ۔“ میڈم گرجی۔ ”تم اپنی عقل و دانش اپنے پاس ہی رکھو۔ اگر تم میں عقل ہوتی تو تم اسے یہاں لے کر ہی نہ آتے۔ تم کیا سمجھتے تھے، میں اتنی ہی کمزور اور بھلکڑ ہوں۔“

میں نے محسوس کیا کہ واقعی مجھ سے اندازے کی بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ حالات کی بے رحم چکی میں پسنے کے بعد میڈم کی کیمسٹری میں غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں لیکن میں بھول گیا تھا کہ عورت کو داناؤں نے ہمیشہ ایک پہیلی قرار دیا ہے اور میڈم صفورا جیسی عورت تو ویسے بھی ”مجید پہیلی“ ہوتی ہے۔

ہمیں یقیناً کھانے میں بے ہوشی کی زود اثر دوا دی گئی تھی۔ مجھے کھانے کے بعد کی کوئی بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم کھانا کھاتے کھاتے ہی سو گئے تھے اور پھر یہ نیند گہری بے ہوشی میں بدل گئی تھی۔ یقیناً یہ گہری بے ہوشی ہی تھی کہ عمران جیسا شخص بھی کچھ نہیں کر پایا تھا اور اب میری ہی طرح بندھا ہوا پڑا تھا۔ میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی اور میری حیرانی میں اضافہ ہو گیا۔ اب صبح کے چار بجنے والے تھے۔ یعنی ہم تقریباً چھ گھنٹے بعد ہوش میں آئے تھے۔ عمران غالباً مجھ سے پہلے ہوش میں آ گیا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ جب میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے تو عمران کے ساتھ میڈم صفورا کا تنصیلا مکالمہ جاری تھا۔

میڈم صفورا نے عمران کے پہلو میں ٹھوکر بوٹ کی زوردار ٹھوکر رسید کی اور پھنکاری۔ ”بتا، کیا قصور تھا میری بہن کا؟ بس یہی نا کہ وہ تجھ سے دوستی کر بیٹھی تھی۔ اتنے سے جرم کی اتنی سخت سزا دے دی تو نے اسے...“

”میڈم! وہ آپ کی بہن تھی۔ آپ کو اس کا کوئی قصور نظر نہیں آئے گا لیکن اگر کوئی انصاف سے اس کے قصور لکھنے بیٹھے تو شاید ایک کتاب بن جائے۔ اس پوری کتاب کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور اس کا صرف ایک جرم ہی دیکھا جائے تو وہ بھی اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا تھا۔ بے گناہ سلیم کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھی میڈم... لیکن ہم ان باتوں میں پڑیں گے تو یہ بحث کبھی ختم نہیں ہو سکے گی۔“ عمران بولا۔

”گھبراؤ مت۔ میں تمہیں بحث کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں چھوڑوں گی۔“ میڈم پھنکاری۔ ”تمہیں صرف اپنی جان کی دہائی دینے کے سوا کوئی خیال ہی نہیں آئے گا۔“

ایک دم عمران اپنے مخصوص ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا اور بولا۔ ”میڈم! شاید آپ کو کسی نے بتا دیا ہے کہ آپ غصے میں زیادہ خوب صورت نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہر دو منٹ بعد گرجنے برسنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔“

”میرا اندازہ ہے کہ تم بھی روتے چلاتے اور مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے کافی اچھے لگتے ہو گے۔ میں اس کی تصدیق کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ خوفناک انداز میں بولی۔

”یہ دیکھیں... جوں جوں آپ کا غصہ بڑھ رہا ہے، آپ کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو آپ اگلے دو چار منٹ میں ضرور قلوپطرہ بن جائیں گی۔“

”اگلے دو چار منٹ میں اور بھی بہت کچھ ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ ایک مسخرہ اپنی چوکڑی بھول کر کس طرح روتا چلاتا ہے اور زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔“ میڈم نے کہا۔

”آپ مستقبل کی بات اتنے یقین سے کیوں کرتی ہیں میڈم۔ گلوکار مکیش صاحب کہہ گئے ہیں... آگے بھی جانے نہ تو، پیچھے بھی جانے نہ تو، جو بھی ہے بس یہی ایک پل ہے۔“

میڈم صفورا بغیر کچھ کہے، لکڑی کی الماری کی طرف گھومی۔ اس نے الماری کھولی اور اندر سے ایک سرنج اور انجکشن نکال لیا۔ میڈم کے چہرے پر انتہا درجے کی بے رحمی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وہی میڈم تھی جسے ہم نے ایک عرصے پہلے لال کوٹھیوں میں دیکھا تھا... اس کے رعب داب سے ارد گرد کی ہر شے سہمی ہوئی سی رہتی تھی۔ اس کے طور اطوار میں کسی متحملہ مزاج ملکہ کی جھلکیاں تھیں۔

”یہ کس چیز کا انجکشن ہے میڈم؟“ عمران نے معصومیت سے پوچھا۔

”یہ بولتی بند کرنے کے لیے ہے۔“ اس نے ترت جواب دیا۔

”تو پھر یہ آپ خود کو کیوں نہیں لگا لیتیں؟ مجھے تو ڈر ہے کہ آپ اسی طرح بولتی رہیں اور آپ کا غصہ شریف بڑھتا رہا تو آپ قلوپطرہ سے بھی دو چار ہاتھ آگے نکل جائیں گی۔ اتنا زیادہ حسن ہم سے برداشت نہیں ہوگا۔ خاص طور سے مجھ سے تو بالکل بھی نہیں۔ یہ نہ ہو کہ میں یہ رسیاں توڑ کر دھڑام سے آپ کے اوپر آ گروں اور یہیں اس قالین پر عشق کی انتہا ہو جائے۔“

میڈم نے اس مرتبہ جواب میں کچھ نہیں کہا۔ غالباً وہ عمران کی خوش گفتاری کا عملی جواب دینا چاہتی تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے انجکشن کے وائل کو ٹھیک کیا اور پھر اسے اوپر اٹھا کر سرنج میں بھرنا شروع کر دیا۔ یہ ہلکے سبز رنگ کا انجکشن تھا۔ اچانک مجھے جارج گورا کی جیل کے قیدی عبدالرحیم کی بات یاد آ گئی۔ اس نے جارج کی جیل میں ستم گری کے ہتھکنڈوں کا ذکر کرتے ہوئے خاص قسم کے انجکشن کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ منحوس انجکشن جارج کے بہنوئی سرجن اسٹیل کا ایجاد کردہ ہے۔ یہ معتوب قیدی کو لگایا جاتا ہے اور وہ کم از کم بارہ گھنٹے کے لیے زندگی اور موت کے درمیان لٹک جاتا ہے۔ پورے جسم پر سرخ نشان نمودار ہو جاتے ہیں اور اتنا شدید درد ہوتا ہے کہ قیدی بلک بلک کر موت کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔ سخت سے سخت جان قیدی بھی اس طرح کے زیادہ سے زیادہ تین انجکشن برداشت کر پاتا ہے اور چھتیس گھنٹے بعد موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

میرے جسم کے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ آہنی دروازے والے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں عمران بھی اس مہلک ترین انجکشن کا شکار ہونے والا ہے۔ مجھے اس انجکشن کا نام یاد نہیں آ رہا تھا تاہم عبدالرحیم نے اس کا رنگ سبزی مائل بتایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ انجکشن کی سزا کو سولی کے بعد دوسری بدترین سزا سمجھا جاتا ہے۔ عمران کو یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا لیکن اتنی بات تو یقیناً وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ میڈم صفورا اس سرنج کے ذریعے کوئی مہلک دوا داخل کرنے والی ہے جو اسے شدید ترین تکلیف میں مبتلا کر دے گی یا پھر ہو سکتا ہے کہ موت سے ہی ہم کنار کر دے۔

سرنج بھرنے کے بعد میڈم صفورا نے دراز قد گارڈ کو اشارہ کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میری پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی تھی۔ دراز قد گارڈ آگے بڑھا اور عمران کو الٹا کرنے کے لیے نیچے جھکا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنا خطرناک کام کرنے جا رہا ہے... اور ہم میں سے بھی کسی کو معلوم نہیں تھا... اچانک میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ عمران نے اپنی بندھی ہوئی ٹانگیں پورے زور سے گارڈ کے سینے پر ماریں..... وہ اچھلتا ہوا اس میز سے ٹکرایا جس پر ہمارا ذاتی سامان پڑا تھا۔ میز ٹوٹ گئی اور گارڈ کراہتا ہوا فرش بوس ہوا۔

تب ایک اور حیران کن منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ عمران کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی نائیلون کی رسی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ وہ کم از کم تین جگہ سے ٹوٹی تھی، اس کے بل ایک دم کھلتے چلے گئے۔ عمران اچھل کر کھڑا ہوا۔ میڈم تانبے کے ایک وزنی گل دان کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ عمران نے جھک کر بہ آسانی یہ وار بچایا۔ اپنی پشت پر ٹانگ کی شدید ضرب کھا کر میڈم لڑکھڑاتی ہوئی آتش دان کے قریب گری۔ اس دوران میں دراز قد گارڈ سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھا رہا تھا جب عمران نے اس پر وار کیا۔ یہ ایک بے مثال وار تھا۔ مجھے اب فائٹنگ آرٹ کی کافی سمجھ بوجھ آ چکی تھی۔ میں عمران کے اس وار کی ٹائمنگ، ایکوریسی اور طاقت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ عمران نے پوری طاقت سے اپنی ٹانگ گھما کر گارڈ کے چہرے پر رسید کی تھی۔ میں نے جبڑا ٹوٹنے کی آواز بالکل صاف سنی۔ گارڈ کا سر بڑی شدت کے ساتھ آہنی دروازے سے ٹکرایا اور وہ مُردہ چھپکلی کی طرح قالین پر لڑھک گیا۔

میڈم جھپٹتی ہوئی اس ساؤنڈ پروف کمرے کے شمالی گوشے کی طرف گئی۔ یہ ایک طرح سے اس طویل کمرے کا دوسرا پورشن تھا، اسے نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میڈم کے یوں اس حصے کی طرف جھپٹنے کی وجہ چند لمحے بعد سمجھ میں آئی۔ جس وقت گارڈ چوٹ کھا کر گرا، پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ گرتے وقت پستول ہاتھ سے پھسلا اور نشست گاہ کی طرف چلا گیا تھا۔

جونہی عمران نے محسوس کیا کہ میڈم پستول پر جھپٹی ہے، عمران نے بھی جست لگائی اور ٹوٹی ہوئی میز کے قریب گرا۔ یہاں ہماری ذاتی اشیا بکھری ہوئی تھیں اور ان میں عمران کا ریوالور بھی شامل تھا۔ عمران اپنے ریوالور تک پہنچ گیا... لیکن اس سے پہلے میڈم پستول تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے عمران پر دو فائر کیے۔ عمران پھرتی سے لیٹ گیا۔ یہاں اس کی بے مثال ”لک“ نے بھی کام کیا۔ دونوں گولیاں عقب میں آہنی دروازے پر لگیں۔ عمران کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے

ہوئے تھے۔ اس نے کسی پیراک کی طرح جست لگائی اور ہوا میں اڑتا ہوا وزنی چوبی الماری کے پیچھے گرا۔ یہ وہی الماری تھی جس میں سے کچھ دیر پہلے میڈم نے انجکشن نکالا تھا۔ اس کے بعد میں نے جو منظر دیکھا، وہ عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتا۔ عمران کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں کو اس نے زور لگا کر اس طرح موڑ لیا کہ وہ الماری کے عقب سے میڈم پر فائر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میڈم نشست گاہ میں تھی اور وہاں کی نیم تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غالباً وہ بھی کسی چیز کے پیچھے پوزیشن لے چکی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر کم از کم تین تین فائر کیے۔ دھماکوں سے یہ کمرا گونج اٹھا۔ میں بغیر کسی آڑ کے بستر پر پڑا تھا۔ کوئی آوارہ گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ تاہم ایسا نہیں ہوا۔ میرے محفوظ رہنے سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی اور وہ یہ کہ میڈم کے سارے غیظ و غضب کا رخ عمران کی طرف تھا اور وہ مجھے بخشنے پر آمادہ تھی۔

وہ فائر کرنے کے ساتھ ساتھ چنگھاڑ بھی رہی تھی۔ ”حرامزادے... کتے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تجھے بڑی بُری موت دوں گی۔“

میں نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو اس طرح مردانہ وار للکارتے اور باقاعدہ گولی چلاتے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ پستول استعمال کرنے میں مہارت بھی رکھتی تھی۔

دفعتاً عمران کے ریوالور سے ”ٹرچ“ کی آواز نکلی۔ وہ خالی ہو چکا تھا۔ یہ بڑی تشویشناک صورتِ حال تھی۔ یقیناً یہ آواز میڈم کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ اس کا پلڑا بھاری ہو چکا تھا۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میرا ریوالور بھی کمرے میں موجود تھا مگر وہ خاصے فاصلے پر تھا۔ عمران الماری کے عقب سے نکل کر اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو یقیناً میڈم صفورا کی گولی کا شکار ہو جاتا۔ لیکن پھر وہ کچھ ہوا جس کا ہم میں سے کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ایک بالکل ڈرامائی واقعہ تھا۔ گارڈ سمیت اس کمرے میں ہم کُل چار ذی روح موجود تھے لیکن ہم ایک کو بھولے ہوئے تھے۔

اچانک میں نے میڈم کی کربناک آواز سنی۔ بالکل یہی لگا جیسے کسی نے اچانک اس پر خنجر چلا دیا ہے۔ وہ نہ صرف چلائی بلکہ لڑکھڑا کر کسی چیز پر گری۔ ”او گاڈ... او گاڈ...“ وہ دہشت سے پکارتی جا رہی تھی۔

عمران چند سیکنڈ تک الماری کے عقب میں رہا۔ شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میڈم کوئی چال تو نہیں چل رہی۔ تاہم میڈم کا لہجہ گواہی دینے لگا تھا کہ وہ تکلیف اور دہشت کے سخت گھیرے میں ہے۔ عمران الماری کے عقب سے نکل کر میڈم کی طرف بڑھا... میں نے بھی بہ مشکل خود کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور تب میری نگاہ سانپ پر پڑی۔ وہی گول داغوں والا مہلک ترین جان دار جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ڈسا پانی طلب نہیں کرتا۔ ہم نے اسے زرگاں کے راستے میں ایک دلدلی علاقے سے پکڑا تھا اور یہ اب تک ایک کینوس کے تھیلے میں ہمارے ساتھ تھا۔ کمرے میں ہونے والی دھینگا مشتی کے دوران میں ہماری ساری اشیا یہاں وہاں بکھر گئی تھیں۔ یقیناً ان میں یہ کینوس کا تھیلا بھی شامل تھا۔ خبر نہیں کہ یہ کب تھیلے میں سے نکلا اور کب کسی کونے کھدرے میں رینگ گیا۔ اب وہ میری طرف آ رہا تھا۔ اس کی ”آمد“ کا نظارہ ایک دل خراش تجربہ تھا۔ عمران نے میڈم کا گرا ہوا پستول اٹھایا اور تاک کر فائر کیا۔ پہلے فائر میں ہی سانپ کی کھوپڑی صاف اڑ گئی۔ خون کے چھینٹے صوفے کے سفید غلاف کو رنگین کر گئے۔

میڈم نے اپنی پنڈلی دونوں ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھی اور تکلیف کی شدت سے صوفے پر ڈھیری ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً سخت جان تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید بے ہوش ہو چکی ہوتی۔ عمران اور میں پشت جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ عمران نے پھرتی سے میرے ہاتھ کھول دیے، میں نے عمران کے کھولے۔ عمران میڈم کی طرف لپکا۔ وہ زبردست برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی تاہم تکلیف اس کے چہرے اور پورے جسم سے ظاہر تھی۔ اس کے صاف شفاف رنگ میں ہلکی سی نیلاہٹ کی آمیزش ہوتی جا رہی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ کراہی۔ ”مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔“

اس کی ٹوٹی ہوئی آواز سن کر یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہی عورت کچھ دیر پہلے شیرنی کی طرح گرج رہی تھی۔

سانپ نے اپنے دانت میڈم صفورا کے ٹخنے میں ذرا اوپر گاڑے تھے۔ نیلی جراب کے نیچے سے خون رس رہا تھا۔ اپنا ”جوگر“ وہ پہلے ہی اتار چکی تھی۔ عمران نے اس کی جراب بھی کھینچ دی۔ ”اس کا مفلر دینا مجھے۔“ عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر بے ہوش گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے بے سدھ پڑے شخص کے گلے سے مفلر کھینچ کر عمران کو دیا۔ عمران نے یہ مفلر کس کر زخم سے ذرا اوپر باندھ دیا۔

سریع الاثر زہر کے اثرات کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا مگر آج پہلی بار آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ زخم کے اردگرد صفورا کی جلد تیزی سے نیلی پڑتی جا رہی تھی...

”چابی کہاں ہے؟“ عمران نے خشک لہجے میں صفورا سے پوچھا۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بے ہوش گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ گارڈ کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ شاید وہ دم توڑ چکا ہے۔ صرف سانس کی مدھم حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بقیدِ حیات ہے۔

میں اپنے پاؤں کھول چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر گارڈ کی جیبیں ٹٹولیں اور کمرے کی چابی برآمد کر لی۔ یہ ڈھائی تین انچ لمبی اسٹیل کی خاص چابی تھی۔ میں نے اور عمران نے آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کیا پھر میں دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا اور تب میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ جس بھی قفل کے سوراخ میں، میں نے چابی گھمائی تھی، وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں تھا۔ اندھا دھند فائرنگ کے دوران میں گولیاں اس اسٹیل کے دروازے سے ٹکرائی تھیں اور قفل کا سوراخ ناکارہ ہو گیا تھا۔

”چابی اندر نہیں جا رہی۔“ میں نے عمران کو اطلاع دی۔

”چابی اندر نہیں جائے گی تو اس کی جان باہر آ جائے گی۔“ عمران نے کہا۔

اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تکلیف، صفورا کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ زخم کے اردگرد کی جلد کا رنگ بدل رہا تھا۔ عمران نے میرے ساتھ مل کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش یکسر ناکام ہوئی۔ ہم نے دروازے کو زور زور سے پیٹنا اور صفورا کے ملازمین کو پکارنا شروع کیا۔ جلد ہی اس آہنی دروازے سے باہر لوگ جمع ہو گئے۔ وہ باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم اندر سے لگے رہے مگر یہ دروازہ ”مستقبل قریب“ میں کھلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ کمرے میں سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ایک دروازہ تھا۔ کوئی کھڑکی، روشن دان، بغلی دروازہ کوئی شے نہیں تھی۔ کمرے کے اندر اور باہر ایک دم ہی تہلکہ سا مچ گیا۔ دونوں طرف سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی... وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ عمران نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”شاید اسی موقع کے لیے کہا جاتا ہے... لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔“

وہ پلٹ کر میڈم صفورا کی طرف بڑھا اور اس کے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میرا یہ یار واقعی انوکھا تھا۔ سب سے منفرد، سب سے جدا۔ وہ یونہی تو دلوں میں جگہ نہیں بناتا تھا، یونہی تو وہ رگِ جاں میں سما کر دھڑکنوں کا حصہ نہیں بن جاتا تھا۔ وہ اگر وقت پڑنے پر فولاد تھا تو وقت پڑنے پر ریشم کی طرح نرم اور چاندنی کی طرح گداز بھی تھا۔ میں عمران کی بات کر رہا ہوں... جو میری توانائیوں کا سرچشمہ تھا اور میرے لیے زندگی کا دوسرا نام بن چکا تھا۔ اس نے میڈم صفورا کی پنڈلی کو دونوں ہاتھوں سے دبایا اور پھر اس کے نہایت خطرناک زخم پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ اپنے ہونٹوں کی پوری طاقت سے زخم کا مواد چوس چوس کر ایک گلاس میں تھوکنے لگا۔

”عمران! یہ کیا کر رہے ہو؟“ میں بے تاب ہو کر بولا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور اپنا کام جاری رکھا۔ گلاس میں خون جمع ہو رہا تھا اور اسی خون سے عمران کے خوب صورت ہونٹ بھی لتھڑے ہوئے تھے۔ بظاہر یہ صرف خون تھا لیکن اس میں یقیناً سانپ کا سریع الاثر زہر بھی شامل تھا۔ جب زخم سے نکلنے والا مواد کم ہو گیا تو عمران نے شکاری چاقو کی مدد سے زخم کے گرد دو اور گہرے کٹ لگائے اور وہاں سے بھی SUCKING شروع کی۔ میڈم پر اب غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

کمرے میں رکھے ایک انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ باہر سے میڈم صفورا کے منیجر مدن کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اندر کیا ہو گیا ہے... دروازہ کیوں نہیں کھل رہا؟“

”میڈم شدید زخمی ہو گئی ہیں۔ انہیں فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی طرح دروازہ کھولو۔ نہیں کھلتا تو توڑ دو۔“ میں نے کہا۔

صرف چند سیکنڈ بعد آہنی دروازے پر باہر سے وزنی ہتھوڑے کی زوردار ضربیں لگائی جانے لگیں۔ یہ ضربیں خصوصی قفل کی جگہ پر لگائی جا رہی تھیں۔ ضربوں سے پیدا ہونے والا شور قیامت خیز تھا۔ مُردے بھی قبروں میں جاگ سکتے تھے اور گارڈ مرا نہیں، صرف بے ہوش ہوا تھا۔ وہ کسمسانے اور کراہنے لگا۔ میں اس کی طرف سے چوکس ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مقامی طرز کی رنگین پگڑی میں، میں نے اپنا منہ پھر لپیٹ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لال بھون کے عام ملازمین میری صورت دیکھیں۔ اسی دوران میں آہنی دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ صفورا کے درجنوں ملازمین نتھرا مار کر اندر گھس آئے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ کسمساتا ہوا زخمی گارڈ... سانپ کی لاش... عمران کا خون آلود منہ... یہ سارے مناظر انہیں مزید ششدر کر رہے تھے۔

عمران گرجا۔ ”جلدی کرو۔ میڈم کو اسپتال لے جانا ہے۔“

کئی افراد میڈم پر جھک گئے اور اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔

☆☆☆

میڈم کو اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہیں لال بھون میں ڈاکٹر اسٹیل کا ایک تجربہ کار معاون پہنچ گیا۔ اس نے میڈم کو ایک دو انجکشن دیے، ڈرپ لگائی اور میڈم کی طبیعت بحال ہونا شروع ہوگئی۔ درحقیقت عمران کے بروقت اور دلیرانہ اقدام نے میڈم کو شدید خطرے سے دوچار ہونے سے بچالیا تھا۔

لیکن عمران کو بھی اس کا کچھ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ رات کو عمران کا منہ سوج گیا اور یہ سوجن باہر ہی نہیں منہ کے اندر بھی تھی۔ اسے زبان ہلانے میں بھی دشواری ہونے لگی... علی الصباح میں نے میڈم کے منیجر مدن کو بتایا۔ اس کو بھی یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ عمران نے ہنگامی طبی امداد کے طور پر میڈم کے زخم پر منہ رکھا تھا اور اس کا زہر نکالا تھا...... عمران کے اس دلیرانہ ایثار نے ڈاکٹر کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ ان میں مدن بھی شامل تھا... وہ خود ہی ڈاکٹر کے پاس گیا اور عمران کی کیفیت بتا کر دوا لے آیا۔ ڈاکٹر نے تسلی دی کہ اگر مریض کے منہ کے اندر کوئی تازہ زخم نہیں تو پریشانی کی بات نہیں... ایک دو دن میں اس کی حالت بہتر ہوجائے گی۔ میں نے ٹارچ کی مدد سے اچھی طرح عمران کے منہ کا اندرونی معائنہ کیا۔ کوئی زخم نظر نہیں آیا۔ رات کو عمران کو تھوڑا سا بخار بھی ہوگیا لیکن مجموعی طور پر اس کی حالت زیادہ خراب نہیں ہوئی۔ دوسری طرف میڈم کی حالت تیزی سے بہتر ہورہی تھی۔

اگلی صبح میں میڈم کی خبرگیری کے لیے اس پورشن کی طرف گیا جہاں میڈم کی رہائش تھی۔ میڈم تک پہنچنے میں منیجر مدن نے میری مدد کی۔ ہم ایک ایسی راہداری میں سے گزرے جہاں کسی ملازم یا گارڈ سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے ایک گرم ٹوپی اور مفلر سے اپنا دوتہائی چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ ایک بلند و بالا دروازے سے گزر کر ہم ایک شان دار بیڈروم میں پہنچے۔ یہاں ایرانی قالین بچھے تھے اور کھڑکیوں پر دبیز پردے جھول رہے تھے... میڈم سفید اجلے بستر پر لیٹی تھی۔ اسے ابھی تک ڈرپ لگی تھی۔ پاؤں پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی۔ آنکھیں بھی بالکل بے تاثر تھیں۔ اگر میرا خیال تھا کہ میڈم کے انداز میں نرمی یا احسان مندی نظر آئے گی تو مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اس نے مختصر جواب دیے۔ میں کئی منٹ اس کے پاس رکا۔ اس دوران میں، میں منتظر رہا کہ شاید وہ عمران کے بارے میں کچھ پوچھے... مگر ایسا نہیں ہوا... بالآخر میں اس سے اجازت لے کر واپس ہوگیا۔ منیجر مدن بھی میرے ساتھ تھا۔ جب ہم کمرے کے دروازے پر پہنچے تو میڈم صفورا نے مجھے آواز دی۔

''شاباش!''

''جی میڈم!'' میں نے پلٹ کر کہا۔

''تمہارے دوست کا حال اب کیسا ہے؟''

''جی... میڈم! کل شام تک تو ٹھیک نہیں تھا، اب تھوڑا سا بہتر ہے۔''

''مدن لال!'' میڈم نے منیجر کو مخاطب کیا۔

''جی میڈم!'' اس نے ادب سے جھک کر کہا۔

''ناشتے کے بعد ڈاکٹر کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ وہ اس کے دوست کو اچھی طرح دیکھے اور میڈیسن تجویز کرے۔''

میڈم کے لہجے میں مثبت تبدیلی محسوس کرکے مجھے عجیب سے اطمینان اور خوشی کا احساس ہوا۔ عمران دل جیتنے کا ہنر جانتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی یہ صلاحیت جادو جیسی لگتی تھی۔ شاید یہاں بھی اس جادوگری نے کام دکھایا تھا۔

... یہ چار روز بعد کی بات ہے۔ میں، عمران اور میڈم صفورا ایک بند کمرے میں بیٹھے تھے اور صورتِ حال پر کھل کر بات کررہے تھے۔ میڈم صفورا اور عمران کے تعلقات میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوچکی تھی۔ اس تبدیلی کا محور و منبع پانچ چھ روز پہلے کا وہی ڈرامائی واقعہ تھا جس نے میڈم اور عمران دونوں کو جان کے لالے ڈال دیے تھے... میڈم صفورا نے ہمیں یہ بات بتا کر حیران کیا کہ پانچ چھ روز پہلے جب لال بھون کے مین گیٹ پر میرے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی تو وہ چیراسیے میں اسحاق کی سولی کا منظر دیکھ کر واپس آرہی تھی۔ میں نے بھی اسے بتایا کہ اسحاق ہمارے ساتھیوں میں سے تھا اور اس کی دردناک موت نے ہمیں شدید صدمہ پہنچایا ہے۔ میڈم نے بھی اسحاق کی موت کے حوالے سے وہی روداد سنائی جو اس سے پہلے ہم ریٹائرڈ فوجی کی بیٹی رجنی سے سن چکے تھے۔ اپنی بہن ماریا کے اغوا کا بدلہ لینے کے لیے جارج گورا نے اسحاق کی بھاوج کو اٹھوایا تھا اور اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی اس عورت کو چھڑوانا چاہے تو اس کے لیے میدان کھلا ہے۔ وہ آئے اور اس سے دو دو ہاتھ کرکے عورت کو چھڑوالے۔ دوسری صورت میں اس عورت پر اس کا پورا حق ہوگا اور وہ اپنی سوچ کے مطابق اس کے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔

یہ تقریباً ویسا ہی ہتھکنڈا تھا جو پولیس والے یا دوسرے بااثر لوگ اپنے مفرور مجرموں کو پکڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان کے اہلِ خانہ کو دھر لیتے ہیں... اور اپنے اہلِ خانہ کو بچانے کے لیے مجرم یا ملزم کو سامنے آنا پڑتا ہے۔

میڈم نے بتایا کہ اسحاق، جارج گورا سے دوبدو مقابلے کے لیے آیا تھا اور یہ مقابلہ اسے کرنا پڑا۔ حالانکہ اس میں اسحاق کی کامیابی کا امکان دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ سب تو جنگل کے قانون جیسا لگتا ہے۔ جس میں زور ہو، وہ اپنی مرضی کا فیصلہ ٹھونسنے کے لیے آزاد ہوجائے۔''

''بس کچھ ایسا ہی ہے۔'' میڈم نے کہا۔ ''اس رسم کو یہاں سامبر کہا جاتا ہے اور یہ پتا نہیں کب سے چلی آرہی ہے۔''

''کب ہوئی تھی یہ زورآزمائی؟'' عمران نے پوچھا۔

''پچھلے بدھ کو۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کہ سامبر کے اصول کے مطابق حمیدہ کے دیور اسحاق کو پورا پورا موقع دیا گیا تھا۔ دونوں میں تلوار بازی ہوئی تھی۔ یہاں چھوٹے سائز کی قریباً دو فٹ لمبی تلوار استعمال ہوتی ہے جسے کٹار یا کٹاری کہا جاتا ہے۔ جارج ایسے مقابلوں میں بہت مہارت حاصل کرچکا ہے اور کسی کو ایسے ''باؤٹس'' میں اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتا۔ اس نے لڑائی شروع ہونے کے ڈیڑھ دو منٹ بعد ہی اسحاق کی کٹار گرادی تھی اور اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا مگر پھر اس نے اسحاق کو ایک اور موقع دیا۔ اس مرتبہ بھی وہ دو منٹ سے زیادہ اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ اس کی ران پر زخم لگا اور وہ گر گیا۔ جارج نے کٹار کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ اس مقابلے سے پہلے ہی جارج نے واضح کردیا تھا کہ اگر سامبر میں اس کے مقابلے میں آنے والا مقابلہ ہار گیا تو اسے ماریا کے اغوا کی پوری پوری سزا ملے گی اور یہ سزا حمیدہ کے دیور کو دی گئی۔ مقابلے کے فوراً بعد جارج نے اس کے ہاتھ کی انگلیاں کٹار سے کاٹ ڈالی تھیں۔ بعد میں اسے سولی چڑھا دیا گیا۔''

عمران نے پوچھا۔ ''اب اس لڑکی حمیدہ کے حوالے سے صورتِ حال کیا ہے؟''

میڈم صفورا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''انور خاں یہاں زرگاں کا ایک دلیر مسلمان ہے۔ سنا ہے کہ حمیدہ کو چھڑانے کے لیے اس نے جارج کے سامنے آنے کا ''اناؤنس'' کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین روز کے اندر زرگاں میں ایک اور خونی واقعہ ہوجائے۔''

''کیا انور خاں یہاں زرگاں میں آئے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ اسے یہیں آنا پڑے گا۔''

''کیا اس مقابلے سے پہلے ہی ہم کسی طرح اس ''لڑاکے مرغے'' کا سر قلم نہیں کرسکتے؟'' عمران نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

''سوچا تو بہت کچھ جاسکتا ہے لیکن تھیوری اور پریکٹیکل میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' میڈم نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔

''کیا آپ کی رسائی جارج تک نہیں ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''مجھے یہاں آئے تقریباً تین ماہ ہوچکے ہیں۔ اس دوران میں صرف ایک بار جارج سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی یہاں نہیں راج بھون میں۔ آج کل یہ سارے لوگ اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بہت چوکس ہیں۔ خاص طور سے حکم جی، جارج اور سرجن اسٹیل، ماریا وغیرہ... ایک ہفتے پہلے بھی ایک خونی واقعہ ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے راج بھون کے اندر گھس کر کارروائی کی ہے۔ ساری سیکیورٹی کو درہم برہم کرکے وہ راج بھون کے اندر پہنچے، گارڈز سے رائفلیں چھینیں اور اندھا دھند فائرنگ کی۔ سرجن اسٹیل کے بھائی کے علاوہ کئی گارڈز بھی مارے گئے۔ اس کے علاوہ...''

ایک دم میڈم صفورا بات کرتے کرتے چپ ہوگئی۔ اس نے جیسے چونک کر ہم دونوں کو دیکھا۔ پھر ٹھٹکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم دونوں بھی زرگاں دو تاریخ کو ہی پہنچے تھے نا؟''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ واقعہ بھی اسی دن ہوا۔ کہیں... میرا مطلب ہے... کہیں...؟'' وہ کھوجتی نظروں سے ہماری طرف دیکھتی جارہی تھی۔

عمران نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف نگاہ دوڑائی۔

میڈم بولی۔ ''کہیں تم دونوں کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو؟''

عمران نے میڈم کی اجازت سے اس کے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ لیا اور بولا۔ ''میڈم! ہم چھپا رہے تھے لیکن اب چھپانا نہیں چاہتے۔ ہمیں قدرت نے ایک ہی راستے پر لا کھڑا کیا ہے اور اب ہمیں ایک ہی رخ پر جانا ہے...''

اس کے بعد میں نے اور عمران نے اپنی کہانی کا وہ حصہ بھی میڈم کے گوش گزار کردیا جو اب تک اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ جان کر ششدر ہوئی کہ یہ ہم ہی تھے جنہوں نے اس رات راج بھون میں تہلکہ مچایا تھا... اور پھر صاف بچ کر نکل گئے تھے۔ میڈم کے ساتھ اس گفتگو میں ہم پر ایک اور انکشاف بھی ہوا اور وہ یہ کہ اس رات میں نے سریٹ بھاگتی..... گاڑی کے اندر جس شخص کو جہنم واصل کیا، وہ رنجیت پانڈے نہیں اس کا

چچازاد گرومیت پانڈے تھا۔ دونوں کی شکل اور قد کاٹھ کافی حد تک ملتے جلتے تھے۔ ان کو قریب سے نہ جاننے والے اکثر دھوکا کھا جاتے تھے۔ مجھے دھنتی کے پتا کا وہ فقرہ بھی یاد آیا جو اس نے پانڈے کی موت کی اطلاع دیتے ہوئے بولا تھا۔ اس نے ''چھوٹے پانڈے'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔

ہمارے اور میڈم کے درمیان ہونے والی یہ طویل گفتگو کئی لحاظ سے کارآمد رہی۔ کئی طرح سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ اسی گفتگو میں میڈم کے ایک سوال کے جواب میں عمران نے یہ بھی بتایا کہ جب بے ہوشی کی حالت میں میڈم نے اس کے اور میرے ہاتھ پاؤں بندھوا دیے تھے تو وہ اچانک اپنے پاؤں کی رسّی توڑنے میں کامیاب کیسے ہوگیا تھا۔ عمران نے بتایا کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس رسّی کو ایک میز کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ساتھ رگڑتا رہا تھا اور اسے کمزور کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ ایڈووکیٹ..... ابرار صدیقی کی بھی بتایا سزا معاف ہونے کی امید ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ بھی چار پانچ روز میں ایک قریبی پگوڈے سے یہاں لال بھون میں پہنچ جائے۔ یہاں لال بھون کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کئی انکشافات ہوئے۔ میں، عمران اور میڈم سر جوڑ کر بیٹھے اور پہلی بار مشترکہ طور پر سوچا کہ ہم اس واجواڑے کی تاریکی سے نکل کر کس طرح آزاد فضاؤں میں پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اہم ترین مقصد بھی زیرِ بحث آیا جس کے لیے ہم یہاں پہنچے تھے اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھی تھی... یعنی جارج گورے کی موت...

یہ دوسرے روز کی بات ہے، عمران لان کی طرف چہل قدمی کے لیے گیا تھا۔ میں کمرے میں تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے میں نے ایک دن کے لیے بھی ورزش نہیں چھوڑی تھی۔ جہاں اور جس وقت موقع ملتا، میں دن میں کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹا اپنی جسمانی فٹنس کو ضرور دیتا تھا۔ اب بھی میں کمرے کے اندر ہی اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ مارشل آرٹ اور باکسنگ وغیرہ میں ایک لفظ ''شیڈو فائٹ'' استعمال ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کھلاڑی کا بغیر کسی حریف کے خیالی لڑائی لڑنا اور اس طرح خود کو چست رکھنا۔ کچھ دیر تک شیڈو فائٹ کرنے کے بعد میں ڈِپس لگانے میں مصروف ہوگیا۔ یہ کوئی دس بیس یا سو پچاس ڈِپس نہیں تھے بلکہ میں گنتی کرتا ہی نہیں تھا۔ ایک بار شروع ہوتا تھا تو پھر جب تک بازو بے دم نہیں ہوجاتے تھے، لگا رہتا تھا۔ جیکی یہی کہا کرتا تھا۔ جہاں ہمت جواب دے جاتی ہے، وہیں سے غیر معمولی ''امپروومنٹ'' کا آغاز ہوتا ہے۔

اس دن میں اپنے جسم پر شاید کچھ زیادہ ہی سختی کرگیا۔ ورزش ختم کی تو پیٹ کے بالائی حصے میں اینٹھن شروع ہوگئی۔ میں قالین پر لیٹ گیا اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھڑکیوں سے باہر لان کا منظر نظر آرہا تھا۔ دوپہر ہوچکی تھی مگر سرما کی دھوپ میں ابھی تک کوئی دم خم نہیں آیا تھا۔ میں نے دیکھا دور ایک روش پر عمران اکڑوں بیٹھا ہوا میڈم صفورا کے چھوٹے رشین کتے کو پچکار رہا تھا۔ میڈم بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ کتے کو غالباً کوئی چوٹ آئی تھی۔ عمران اس کی چوٹ پر دوا لگانے میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ میڈم سے باتیں بھی کرتا جارہا تھا۔ اس نے جب کسی کو رام کرنا ہوتا تھا تو اس کی خوش گفتاری عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ میڈم سنجیدہ نظر آتی تھی۔ وہ بس عمران کی کسی بات کا ہی جواب دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد میڈم کا ملازم کتے کو گود میں اٹھا کر میڈم کے پیچھے پیچھے درختوں میں اوجھل ہوگیا۔ عمران واپس کمرے کی طرف آگیا۔ وہ کمرے میں پہنچا اور میرے تاثرات دیکھ کر چونک گیا۔ ''جگر! کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''کچھ نہیں... پیٹ میں ذرا درد ہورہا ہے۔''

''ذرا نہیں ہورہا۔ تم تو پیلے پڑے ہوئے ہو لیکن یہ ہوا کیوں... مجھے تو لگتا ہے تم نے اندھا دھند ورزش فرمائی ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح بہت جلد درست نتیجے پر پہنچ گیا۔

میں خاموش رہا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''کبھی کبھی تم جنون کی حد تک چلے جاتے ہو۔ خود اپنے آپ پر ظلم کرنے لگتے ہو۔ نقصان اٹھاؤ گے۔''

پھر وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور میرے پیٹ کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ ''کہاں ہے درد؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے خود پتا نہیں چل رہا۔'' میں زبردستی مسکرایا۔

''میں میڈم سے بات کرتا ہوں۔''

میں نے اسے روک دیا۔ ''خوامخواہ بات کا بتنگڑ نہ بناؤ۔ اب میں پہلے سے بہتر ہوں۔''

تھوڑی سی کوشش کرکے میں نے اسے قائل کرلیا کہ درد ناقابلِ برداشت نہیں اور اب کم ہوتا جارہا ہے۔

حقیقت میں ایسا نہیں تھا... درد شدید تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، اب اپنی کسی بھی تکلیف کے لیے مجھے دوا کا سہارا لینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں تکلیف کو دوا کے بغیر برداشت کرتا تھا اور اکثر یہ بُرا وقت گزر ہی جاتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ آدھ پون گھنٹے تک درد نے زور مارا پھر دھیرے دھیرے کم ہوکر ختم ہوگیا۔

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی اور میڈم اندر آگئی۔ وہ نسبتاً اچھے موڈ میں تھی۔ سانپ کے ڈسنے کے اثرات اب اس پر نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ ہمارے کمرے کے آہنی دروازے کی مرمت ہوچکی تھی اور بے ہوش ہوجانے والا دراز قد گارڈ بھی اب روبہ صحت تھا۔ میڈم نے سگریٹ سلگایا اور ہمیں بھی پیشکش کی۔ عمران نے یہ پیشکش شکریے کے ساتھ قبول کرلی۔ میڈم بولی۔ ''آج کل یہاں زرگاں میں ایک اور بات گردش کررہی ہے۔ لوح یا تختی والی بات۔ تم نے کچھ سنا ہے اس بارے میں؟''

''نہیں میڈم۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ تو تمہیں پتا ہی ہے نا کہ حکم جی کے خاص قیدی اگر جیل وغیرہ میں نہ بھی ہوں تو اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں سکتے۔ انہیں پکڑ لیا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے حکم جی کی روحانی طاقت کا کرشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ اب کچھ لوگ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ جس میجک کے ذریعے ان قیدیوں کو اسیر کیا جاتا ہے، وہ کسی لوح یا تختی پر لکھا جاتا ہے اور پھر یہ چھوٹی سی لوح قیدی کے جسم میں ڈال دی جاتی ہے۔ یہ اس لوح کی شکتی ہے کہ وہ قیدی جہاں بھی جاتا ہے، حکم جی کی نظروں میں رہتا ہے...''

عمران زیرِ لب مسکرایا اور بولا۔ ''اس بارے میں آپ کا کیا آئیڈیا ہے میڈم؟''

میڈم سگریٹ کا طویل کش لے کر بولی۔ ''اسٹیٹ کے عام لوگ تو اسی میجک اور لوح والی بات کو درست سمجھتے ہیں لیکن چند پڑھے لکھے ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو میجک یا لوح اور نقش وغیرہ کہا جاتا ہے، وہ شاید کوئی جدید ڈیوائس ہے... کوئی الیکٹرانک چپ وغیرہ...''

کچھ دیر کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ نے مجھ سے ابھی تک یہ اہم سوال نہیں پوچھا کہ میں زرگاں سے فرار ہونے کے بعد حکم کے ہرکاروں کی نگاہ سے کئی ہفتے تک کیسے بچا رہا اور کیسے پھر چوری چھپے یہاں زرگاں پہنچ گیا؟''

''بے شک یہ سوال میرے ذہن میں آتا رہا ہے۔'' میڈم نے کہا۔

''آپ نے جو تختی والی بات کی ہے میڈم... وہ بالکل درست ہے اور میں اب تک اسی لیے بچا رہا ہوں کہ میں اپنے اندر اس تختی کی موجودگی سے باخبر ہوگیا تھا۔''

''باخبر ہوگیا تھا؟''

''جی میڈم! اور مجھے پتا چل گیا تھا کہ مجھے اس کا توڑ کیسے کرنا ہے۔''

میڈم نے پہلے میری طرف پھر عمران کی طرف اور تب دوبارہ میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم اس کی وضاحت کرنا پسند کروگے؟'' اس نے کہا۔ تختی والی بات اسے ششدر کررہی تھی۔

ہمیں میڈم کا اعتماد اور بھروسا درکار تھا اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا تھا جب ہمارے درمیان کم سے کم پردہ باقی رہے۔ میں نے میڈم کو چپ کے حوالے سے تقریباً سبھی کچھ بتادیا... اور یہ بھی بتادیا کہ بالآخر یہ چپ کیسے اور کیونکر میرے جسم سے نکل سکی ہے۔ میڈم یہ ساری روداد بہت حیرت کے عالم میں سنتی رہی، بیچ میں کہیں کہیں اس نے سوالات بھی کیے۔ میں نے میڈم کو اس نہایت خطرناک آپریشن کا نشان دکھایا اور دیگر تفصیلات بتائیں۔

اس کے بعد میڈم ہی کے کہنے پر میں نے میڈم کے سر کے پچھلے حصے کا معائنہ بھی کیا۔ میرے ذہن میں اس بات کا ساٹھ ستر فیصد امکان موجود تھا کہ میڈم صفورا اور..... ابرار صدیقی کے جسم میں بھی چپ رکھی گئی ہوگی مگر کم از کم میڈم صفورا کی حد تک تو یہ اندازہ غلط نکلا۔ فوری طور پر میڈم کے جسم میں چپ کی موجودگی کا سراغ نہیں ملا۔ ہماری یہ سنسنی خیز گفتگو جاری تھی کہ کسی عورت کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ وہ شاید کسی کو ڈانٹ رہی تھی اور مار بھی رہی تھی۔ پھر جس کو مارا جارہا تھا، اس کے چلّانے کی آواز بھی ابھری۔ یہ اسی دن والی ثمرین نامی لڑکی کی آواز تھی۔

''اوہ گاڈ! یہ پھر تماشا لگ گیا ہے۔'' میڈم نے بیزار لہجے میں کہا۔ ہم سے معذرت کرکے وہ باہر چلی گئی۔

اسے باہر کا معاملہ سنبھالنے اور واپس آنے میں قریباً دس منٹ لگ گئے۔

''اس لڑکی کا کیا مسئلہ ہے میڈم؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں جو لڑکیاں تربیت کے لیے اور پالش وغیرہ ہونے کے لیے آتی ہیں، ان میں سے کچھ تو ایسی ہوتی ہیں جن کی اپنی مرضی بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ وہ راج بھون کی رنگینیوں اور وہاں کے آرام و آسائش میں جانے کا شوق دل میں رکھتی ہیں لیکن کچھ کو یہ سب کچھ مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے اور وہ دل ہی دل میں یہ خواہش رکھتی ہیں کہ وہ ''فیری سلیکشن'' سے بچ جائیں تو اچھا ہے۔ اب ان میں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو چپ رہتی ہیں اور دوسری وہ جو تھوڑی بہت مزاحمت کرتی ہیں۔ یہ ثمرین نامی لڑکی بھی مزاحمت کرنے والیوں میں ہے۔ یہ اکثر کسی بات پر اڑ جاتی

ہے اور پھر بار بیٹ کا شکار ہوتی ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ تمہاری بیوی سلطانہ کے گھرانے سے بھی اس کا تھوڑا بہت تعلق ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میڈم چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولی۔ ''یہ سلطانہ کی رشتے دار ہے۔ اس کی شادی سلطانہ کے بھائی نبیل سے ہونے والی تھی لیکن پھر نبیل کمر پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے مفلوج ہو کر بستر پر پڑ گیا۔ پہلے امید تھی کہ شاید وہ علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ پھر وہ لوگ ویسے ہی زرگاں چھوڑ کر نل پانی چلے گئے... اب یہ لڑکی نظر میں آ گئی ہے۔''

''نظر میں آ گئی... کیا مطلب؟'' عمران نے پوچھا۔

''ساتویں کا جشن شروع ہونے سے قریباً چھ مہینے پہلے راج بھون کے خاص اہل کاروں کی ٹیم جس میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں، دوشیزاؤں کی تلاش میں نکلتی ہے۔ جو لڑکیاں سلیکٹ ہوتی ہیں ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ''نظر میں آ گئی ہیں۔ اس ''تلاش'' میں وہ سیکڑوں عورتیں بھی مدد کرتی ہیں جو مقامی آبادی میں موجود ہوتی ہیں اور ان کے رابطے راج بھون سے ہوتے ہیں۔''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ اس ثمرین نامی لڑکی کی شادی سلطانہ کے بھائی سے ہونے والی تھی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''بالکل ایسا ہی تھا اور ان لڑکیوں میں آٹھ دس اور بھی ایسی ہیں جو بالکل ناخوش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت کو کوستی ہوں جب وہ کسی وجہ سے نظر میں آ گئیں۔''

میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ میں نے میڈم سے اس بارے میں دو چار سوال مزید پوچھے۔ میڈم نے بتایا کہ اس ثمرین نامی لڑکی نے اسے خود یہ ساری تفصیل بتائی ہے۔ وہ اس لڑکے کی یاد اب بھی دل میں بسائے ہوئے ہے۔

مجھے وہ ساری باتیں یاد آئیں جو تاج افضل نے مجھے سلطانہ اور اس کے بھائی کے بارے میں بتائی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ سلطانہ اپنے بھائی کا علاج کرانے کی شدید خواہش رکھتی تھی۔ اس نے محنت مزدوری کر کے پندرہ ہزار روپے کی رقم جمع کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ رقم نبیل کے کام آتی، میں خود بیمار پڑ گیا تھا۔ میرا بخار اترنے کا نام نہیں لیتا تھا اور ایک ہچکی ہر وقت میرا سینہ دہلائی رہتی تھی۔ سلطانہ نے اپنی جمع پونجی بشمول اپنے زیورات، بے دریغ میرے علاج پر خرچ کر دی تھی۔ پتا نہیں کہ خاموشی اور رازداری کے ساتھ اس لڑکی نے کتنے احسان لادے ہوئے تھے میرے سر پر۔ میں جدھر رخ کرتا تھا، مجھے اس کے بے مثال ایثار کے نشان نظر آتے تھے۔ اس ایثار کی وجہ سے وہ خود مشکلوں کا شکار ہوئی تھی اور اس کے قریبی بھی۔

جواں سال نبیل کا بیمار اور مایوس چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ مجھے لگا کہ میں اس کی بربادیوں میں اہم حصے دار ہوں۔ میری وجہ سے وہ اپنی صحت سے دور ہوا اور شاید اپنی محبت سے بھی۔

''کن خیالوں میں کھو گئے ہو؟'' میڈم کی آواز نے مجھے چونکایا۔

''میں اس لڑکی سے مل سکتا ہوں؟''

''مل کر کیا کرو گے؟''

''میں اس سے تھوڑی سی بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو کر لینا، اس میں کون سی رکاوٹ ہے۔ ابھی وہ ذرا رو دھو رہی ہے۔ گیتا مکھی سے آج پھر اس کی لڑائی ہوئی ہے۔ ایک لڑکی نے اپنے سر کے بال سامنے سے کٹوانے تھے۔ اس نے ثمرین سے کہا۔ بال تھوڑے سے زیادہ کٹ گئے۔ بناؤ سنگار والی ٹیچر نے گیتا کو بتایا۔ گیتا نے ثمرین کو ڈانٹا ڈپٹا ہے۔ جس کے بال کٹے ہیں اس کی تو اچھی درگت بنی ہے۔ چھڑی سے مار پڑی ہے اسے۔ یہاں ایسے معاملوں کی بڑی سختی ہے۔ انتخاب کے لیے نظر میں آنے والی لڑکیوں کو بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ خلاف ورزی پر جان تک کے لالے پڑ سکتے ہیں۔''

اس بارے میں ہماری معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے میڈم نے بتایا۔ ''حکم جی کو یہاں اوتار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تربیت پانے والی لڑکیوں کو بتایا جاتا ہے کہ اوتار اور اس کے خاص مصاحبوں کی خوشی کا خیال رکھ کے وہ ہر جنم میں اعلیٰ رتبہ پا سکتی ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگر کسی وقت ان کی قسمت جاگے اور حکم جی یا ان کا کوئی مصاحب ان کی طرف خاص انداز کی ''پیش قدمی'' کرے تو انہیں کس طرح خوش آمدید کہنا ہے اور ان کو رجھانے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کرنے ہیں، گیتا مکھی اس تربیت کی ماہر ہے اور گیتا مکھی سے اکثر ثمرین کی چپقلش ہو جاتی ہے۔'' یہ ساری باتیں تن بدن میں آگ لگا دینے والی تھیں۔ حکم جی اور اس کے حواریوں کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، وہ بالکل سچ ثابت ہو رہا تھا۔

ان باتوں سے تصدیق ہوتی تھی کہ جنگی کی حسین محبوبہ شکنتلا والی کہانی بھی بالکل سچ تھی۔ شکنتلا کی ''پریم کہانی'' کی وجہ سے حکم جی اسے اپنی پتنی تو نہ بنا سکا لیکن اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے شکنتلا کو فیری یا پری کا درجہ دے دیا۔ اس کے لیے سبز رنگ کا چناؤ کیا گیا اور وہ راج بھون کی سبز پری کے طور پر حکم جی کے کٹہرے کی مچھلی بن گئی۔ ایسی نہ جانے کتنی شکنتلائیں اور ثمرینیں حکم جی اور جارج گورا وغیرہ کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں اور ابھی چڑھنے والی تھیں۔

میڈم کے جانے کے بعد بھی میں اور عمران ثمرین کے بارے میں بات کرتے رہے۔ عمران کو بھی اس لڑکی سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ''اس کا معاملہ بھی تمہاری ثروت جیسا ہی لگتا ہے... وہ کیا کہتے ہیں، ٹوٹی کہاں کمند۔ مجھے ایک وظیفہ یاد آ رہا ہے جو ایسی لڑکیوں کو مصیبت سے بچانے کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ اگر وہ پورا یاد آ گیا تو شاید ہم اس کو بچا لیں۔'' وہ ایسی ہی گول مول باتیں کرتا تھا۔

اس رات میں سونے کے لیے لیٹا تو دیر تک باروندا جنگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا اپنے کٹے پھٹے جسم کے ساتھ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آگ اور ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔ مجھے بھولنا نہیں۔ مجھے یاد رکھنا اور میری بے بسی کو بھی۔ اور اپنا حوصلہ بلند رکھنا۔ میں نے تمہیں کمزور نہیں رہنے دیا ہے۔ اپنی ساری آگ تمہیں سونپ دی ہے اور اپنے دشمن کے بارے میں بھی بتا دیا ہے...

پھر میرا دھیان سلطانہ کی طرف چلا گیا۔ میں اسے مندر کے تہ خانوں میں چھوڑ آیا تھا اور کہہ آیا تھا کہ میں وہ کام پورا کر کے آؤں گا جس کے لیے وہ اپنا سر ہتھیلی پر لے کر پھرتی رہی ہے۔ میرا نشانہ جارج گورا تھا اور میں جلد از جلد اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں جوں جوں جارج گورا کے بارے میں زیادہ جان رہا تھا اور اس کی خصلت کو زیادہ پہچان رہا تھا، میرے دل میں اس کے لیے نفرت اور انتقام کا بہاؤ تیز تر ہو رہا تھا۔ وہ گوری چمڑی والا یہاں کے لوگوں کو شاید انسان ہی نہیں سمجھتا تھا۔ زرگاں اس کے لیے شکارگاہ تھی۔ یہاں کے مرد و زن اس کے لیے پُرگوشت چوپایوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ خاص طور سے مقامی خواتین اس کا من پسند شکار تھیں اور وہ اس حوالے سے کسی طرح کی شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ برملا کہتا تھا... مجھے مقامی عورتیں بھاتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرے دل میں انہیں حاصل کرنے کی خواہش جاگتی ہے۔ میں اس حوالے سے کمزور ہوں۔ ہوا اور پانی کے بغیر تو میں شاید زندہ رہ جاؤں لیکن خوش شکل نمکین عورتوں کے بغیر نہیں۔

یہ عورت باز شخص میری سلطانہ کو داغ دار کر چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر بدنامی کا ٹیکا لگا چکا تھا۔ وہ راجپوت خاندان کی طرح دار بیٹی تھی۔ جارج نے اس کا پندار توڑا تھا، اس کی آن بان خاک میں ملائی تھی... اور وہ ابھی تک زندہ تھا، راج بھون کی بلند دیواروں کے اندر سانس لے رہا تھا، زندگی کی ساری لذتوں سے بہرہ مند ہو رہا تھا... اور حمیدہ جیسے نئے شکار پھانس رہا تھا۔

میرے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلے الاؤ بن گئے۔ میں بے قرار ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا... مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک دوسرے بستر پر عمران سو رہا تھا۔ اسے کیا پتا تھا، میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ میں ہر مصلحت اور اندیشے کو بالائے طاق رکھ دینے کے مرحلے میں آ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں ایک واشگاف فیصلے تک پہنچ گیا... میں نے دیوار پر لٹکے ہوئے ہولسٹر میں سے بھرا ہوا ریوالور نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھا اور جیکٹ پہن لی... ایک سرخ دھند سی میری آنکھوں کے سامنے چھاتی چلی جا رہی تھی۔ میں عمران کو سوتا چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

رات کے قریباً دس بج چکے تھے۔ نیم گرم کمرے سے باہر سردی تھی اور میں جانتا تھا کہ لال بھون سے نکلتے ہی میرا سامنا کڑاکے کی ٹھنڈ سے ہو گا لیکن سردی، گرمی، بھوک پیاس، چوٹ اور بے آرامی کی دی ہوئی تکلیفیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ یہ تکلیفیں میرے بے تکلف دوستوں جیسی ہو گئی تھیں۔ مجھے ان کے ساتھ مل بیٹھنا اور ان کی ''کمپنی'' میں خوش رہنا آ گیا تھا۔ جیسے نہایت تیز مرچ مسالے کی وجہ سے آنسو آ جاتے ہیں لیکن انسان مزہ بھی محسوس کرتا ہے... کچھ ایسا ہی مزہ مجھے دکھ جھیل کر آتا تھا۔

میں دو راہداریوں میں سے گزر کر ایک بڑے لاؤنج میں پہنچا۔ ایک قریبی ہال نما کمرے سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ٹی وی اور اس جیسی دوسری الیکٹرانکس اشیا یہاں خال خال ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔ ٹی وی پر وی سی آر کے ذریعے لڑکیاں کوئی رومانی فلم دیکھ رہی تھیں... یا شاید انہیں ''تربیت'' کے طور پر دکھائی جا رہی تھی۔ گاہے بگاہے نوخیز لڑکیوں کی کھلکھلاہٹ بھی بند دروازے کے عقب سے ابھرتی تھی۔ میں برآمدے میں چلا آیا۔ کڑک سردی نے استقبال کیا۔ وسیع لان میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف الاؤ روشن تھا مگر وہاں کوئی پہرے دار نظر نہیں آیا۔ غور کیا تو پہرے دار صاحبان ایک کھڑکی سے چپکے نظر آئے۔ وہ تاریکی میں کھڑے تھے اور ادھ کھلی کھڑکی میں سے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ یہاں یہ چیز یقیناً ''تجوبہ تفریح'' کے زمرے میں آتی تھی۔

میں پہرے داروں کی نظر بچاتا ہوا باغیچے کی طرف چلا

گیا۔ دن کی روشنی میں، میں اس جگہ کا معائنہ کر چکا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ لال بھون سے چوری چھپے نکلنے کے لیے یہ راستہ بہترین ہے۔ سامنے سے ایک گارڈ ٹارچ ہلاتا آ رہا تھا۔ میں جلدی سے ایک مور پنکھ کی اوٹ میں ہوگیا۔ وہاں سے ایک روش پر چلتا ہوا میں دس فٹ اونچی بیرونی دیوار تک پہنچ گیا۔ یہاں کچنار، مہندی اور جامن وغیرہ کے پیڑ تھے۔ میں ایک درخت پر چڑھ کر دیوار پر آیا اور پھر خاموشی سے دوسری طرف کود گیا۔

لال بھون کی عمارت پانچ چھ کینال میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں عمارت کا چکر کاٹ کر روشن سڑک پر آ گیا۔ یہاں اِکا دُکا گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، سڑک کشادہ ہوتی گئی اور رونق میں بھی قدرے اضافہ ہوگیا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیدھا راج بھون کی طرف جا رہا تھا۔ راج بھون کے بلند و بالا محرابی دروازے کی روشنیاں کافی دور سے دکھائی دے رہی تھیں۔ آج میں نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ اس سے پہلے میں اور عمران پگڑیوں میں چہرہ چھپا کر زرگاں میں پھرتے رہے تھے۔ آج پگڑی نہیں تھی اور پتا نہیں کیوں مجھے چہرہ چھپانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا، یہاں میرا کوئی شناسا مجھے پہچان سکتا ہے۔ میں جارج کا مفرور قیدی تھا اور اب تو اور کئی الزام بھی میرے سر آ چکے تھے جن میں تیواری لال اور ڈیوڈ کے قتل کے علاوہ ماریا کے اغوا کو بھی شامل کیا جا سکتا تھا۔

اِن اندیشوں کو دیوانی ٹھوکر سے اڑاتا ہوا میں سیدھا راج بھون کے بلند و بالا دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے اور رگوں میں لہو کی جگہ آگ دوڑ رہی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق، ابھی میں راج بھون کے عظیم الشان دروازے سے پچاس ساٹھ قدم دور ہی تھا کہ مسلح گارڈز نے مجھے روک لیا۔

''کیا بات ہے... کہاں جا رہے ہو؟'' ایک افسر نما شخص نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''میں جارج گورا سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میرا لہجہ سپاٹ اور مستحکم تھا۔

کئی گارڈز میرے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ اچانک مجھے پہچان لیا گیا۔ ایک شخص نے حیرت بھری آواز میں کہا۔ ''...یہ تو وہی ہے... مختار کی بیٹی کا شوہر۔''

سب سناٹے میں رہ گئے۔ میرے چہرے پر ٹارچوں کی روشنی چھینکی گئی۔ ایک دم دو گارڈز نے رائفلوں کا رخ میری طرف کر دیا۔ ''تم مہروز ہو؟'' انچارج گارڈ کی چونکی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''ہاں... اور جارج کو بتاؤ۔ میں اس سے ابھی ملنا چاہتا ہوں۔''

''ملاتے ہیں... ملاتے ہیں... ابھی تم ادھر آؤ۔'' انچارج نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ ایک دوسرے گارڈ نے تیزی سے میری تلاشی لی اور ریوالور میری قمیص کے نیچے سے نکال لیا۔

وہ مجھے مین گیٹ کے پاس ہی واقع ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف کھینچنے لگے۔

''چھوڑ دو۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''تم نے میری تلاشی لے لی ہے، اب مجھے جارج کے پاس جانے دو۔ میں اس سے بات کرنے آیا ہوں۔''

''تمیز سے بولو۔ اور کیا بات کرنے آئے ہو تم؟''

''میں اس کے اعلان کے جواب میں آیا ہوں۔ اس نے سامبر کا چیلنج دے رکھا ہے۔ میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔'' بہت سے لوگ اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے اور میں یہی چاہتا تھا۔

میں نے چیلنج کی بات کی تو گارڈز میں ایک دم سنسنی سی دوڑ گئی۔ ان کا سخت رویّہ بھی قدرے نرم پڑ گیا۔ میں نے اپنی بات دُہرائی۔ ''جارج کو بتا دو کہ میں سامبر میں اس کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔''

''کوئی نشہ وغیرہ تو نہیں کر رکھا۔ میرا مطلب ہے جو کہہ رہے ہو، ہوش حواس میں کہہ رہے ہو نا؟'' انچارج گارڈ کے لہجے میں ہلکا سا طنز داخل ہوگیا۔

''ہاں، ہوش حواس میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی ہوش حواس کے ساتھ سنو۔ مجھے جارج سے ملواؤ۔''

مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ایک بار پھر مزید احتیاط سے میری تلاشی لی گئی۔ اردگرد ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ انچارج گارڈ نے مجھ سے کچھ مزید سوالات پوچھے جن کے میں نے طے شدہ جواب دیے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں یہاں اکیلا پہنچا ہوں اور آج ہی آیا ہوں۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد میں نے ایک منحوس صورت کو اپنے روبرو پایا۔ یہ جارج کا بہنوئی اور ماریا کا شوہر سرجن اسٹیل تھا۔ وہ خاصا دراز قد تھا۔ نشے کے سبب اس کی آنکھیں قدرے سوجی ہوئی تھیں۔ چند دن پہلے میری رائفل کی گولی اس کے بھائی کو لگی تھی اور وہ جہنم واصل ہوگیا تھا۔ اس موت کا غم بھی اس کے چہرے پر تلاش کیا جا سکتا تھا۔

اس نے مجھے سرتاپا دیکھا اور اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں حقارت آمیز تجسس نظر آنے لگا۔ وہ بناوٹی لہجے میں بولا۔

''خوش آمدید۔ تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوا۔ بہت اچھا بات... کہ تم کو ڈھونڈنے میں ہام کو زیادہ ''اسٹرگل'' ناہیں کرنا پڑا۔''

میں نے بے خوف ہو کر کہا۔ ''مجھے بھی خوشی ہے کہ مجھے پالتو کتوں سے نہیں لڑنا پڑا۔ میں سیدھا ان کے مالک سے دو دو ہاتھ کر سکتا ہوں۔''

''تم اپنی بکواس بند کرو۔'' انچارج پھنکارا اور اس نے میرے سر پر چوٹ لگانے کے لیے رائفل کا دستہ فضا میں بلند کیا۔

''نہیں۔'' سرجن اسٹیل نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔ ''اس نے چیلنج قبول کیا۔ اب یہ ہام کی حفاظت میں ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوئیں گا، اب رُول کے مطابق ہوئیں گا۔''

انچارج پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد دو تین اور اہم افراد وہاں آن موجود ہوئے، یہ مقامی فوج کے افسران ہی لگتے تھے۔ میں نے خدا بخش کو بھی دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جو چند ماہ پہلے موہن کمار وغیرہ کے ساتھ تل پانی پہنچا تھا تاکہ مجھے اور سلطانہ کو چھوٹے سرکار کی پناہ سے نکال کر واپس زرگاں لا سکے۔ مجھے پہچاننے کے بعد ہر چہرے پر سنسنی کے آثار نظر آ رہے تھے... مجھ سے بار بار پوچھا گیا کہ کیا میرے ساتھ کوئی اور بھی یہاں زرگاں پہنچا ہے؟ میں نے ہر بار اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔ دراصل ان لوگوں کو انور خاں کے بارے میں شک تھا... سرجن اسٹیل نے مجھ سے کہا۔ ''ہام کو معلوم ہوا تھا کہ وہ بھگوڑا انور خاں بھی یہاں آنا مانگتا۔ وہ بھی چیلنج قبول کرتا۔''

''وہ بھگوڑا نہیں سرجن... وہ باغی ہے اور ابھی اس جیسے اور کئی باغی تم لوگوں کو ناکوں چنے چبوائیں گے۔ اور جہاں تک اس کے آنے کی بات ہے تو اس کی جگہ میں آ گیا ہوں۔''

ہمارے درمیان کچھ دیر تک گفتگو جاری رہی۔ سرجن اسٹیل کی طرف سے خدا بخش کوئی پیغام لے کر جارج گورا کی طرف گیا۔ اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ جارج گورا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر تک سرجن اسٹیل اور فوجی افسران سے کھسر پسر کی۔ اس کے بعد خدا بخش نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''سامبر سے پہلے کے دو چار دن تم کہاں رہنا چاہتے ہو؟''

''میں تمہارے اس راج بھون کے سوا کہیں بھی رہنے کو تیار ہوں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''یہاں اور کون سی جگہ ہے؟''

میں نے چند سیکنڈ تک سوچنے کی اداکاری کی پھر کہا۔ ''تم لوگ مجھے پگوڈا میں ٹھہرا سکتے ہو۔''

''پگوڈا میں کیوں؟'' سرجن اسٹیل نے دریافت کیا۔

''وہاں میری پرانی ساتھی کورتی (میڈم صفورا) موجود ہے۔''

''تو تم کورتی کے پاس رہنا مانگتا۔'' اسٹیل نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ میں نے بھی اسی طرح سر کو حرکت دی۔

''لیکن کورتی تو کہیں اور ہے۔'' خدا بخش نے کہا۔

''وہ جہاں بھی ہے، میں اس کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔''

''اوکے۔ اس کا ارینجمنٹ ہو جائیں گا۔'' اسٹیل بولا۔

گفتگو کے دوران میں وہ برابر مجھے تفتیشی نظروں سے گھور رہا تھا۔ کسی وقت اس کے تاثرات عجیب سے ہو جاتے تھے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے میرے سر کے اندر منحوس چپ پلانٹ کی تھی۔ وہ چپ جو میرے جسم کا حصہ بن گئی تھی اور جسے اپنی مرضی سے جدا کرنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ غالباً اسٹیل کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے تھے۔ ان میں سے ایک اہم سوال یہ رہا ہوگا کہ مجھے زرگاں سے باہر ہر طرف دور دور تلاش کیا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ سگنل وصول کرنے والے کئی انٹینا یہاں وہاں چکرا رہے ہوں۔ میں اس ساری تلاش کو ناکام کر کے یہاں راج بھون کے عین سامنے آ نمودار ہوا تھا۔ یہ کیونکر ہو سکا تھا؟ کیا یہ ایک اتفاق تھا؟ یا پھر اس کی چپ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا؟ یا پھر کوئی اور مسئلہ ہو گیا تھا؟

میں سمجھ گیا کہ بہت جلد مجھے اس چپ کے حوالے سے بھی اسٹیل وغیرہ کو جواب دینا پڑے گا۔

کچھ دیر تک مجھ سے پوچھ تاچھ جاری رہی... پھر کڑے پہرے میں مجھے میڈم صفورا کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ میں گھوڑا گاڑی میں تھا۔ تین مسلح گارڈ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک گھوڑا گاڑی آگے اور ایک پیچھے تھی۔ ان میں بھی چوکس محافظ موجود تھے۔ ہر نگاہ میں میرے لیے تجسس، حیرت اور طنز کا ملا جلا تاثر تھا۔ جو کوئی دیکھ رہا تھا، مجھے تولنے والی نظروں سے ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میرے اندر کیا ہے جس کے بل بوتے میں جارج گورا جیسے شخص کو للکارنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اپنے انجام کی پروا کیے بغیر موت کے جبڑوں میں سر دے رہا ہوں۔ یہ گارڈز وغیرہ اپنے افسران کی وجہ سے چپ تھے ورنہ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھ پر حقارت اور طنز کے تیر چلانا شروع کر دیتے۔

پھر بھی ایک گارڈ سے برداشت نہیں ہو سکا، وہ ایک طرف تھوک کر بولا۔ ''بھگوان کا شکر کرو، تمہیں بڑوں کی طرف

سے رکھشا ل گئی ہے، ناہیں تو اس گاڑی کے اندر تمہاری ایک بوٹی بھی نہ ملتی۔“

”تم بھی شکر کرو کہ میں یہاں کتوں بلوں سے نہیں، ان کے مالک سے لڑنے کے لیے آیا ہوں۔“

گارڈ نے مشتعل ہو کر میرا گریبان پکڑنا چاہا لیکن دوسرے نے اسے روک دیا۔ ”چھوڑو یار! یہ اپنی موت آپ مرنے والا ہے۔“

”اور یہ کوئی آسان موت ناہیں ہووے گی، اس کے ساتھی کی طرح اس کی بھی ایک ایک ہڈی ٹوٹے گی پہلے۔ جتنا بڑا اپرادھ ہے، اس سے بڑی سزا ہووے گی۔“

”کس اپرادھ کی بات کرتے ہو تم؟ میں نے کسی کی ماں بہن کے ساتھ کیا کر دیا ہے؟“

”تم نے کیا ہے... اور یہ ساری دنیا جانت ہے۔ تم ان لوگن میں شامل ہو جنہوں نے سرجن صاحب کی دھرم پتنی کو اغوا کیا اور ان کی آبرو خراب کی۔“ گارڈ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ”اور تم نے ان کو گولی مار کر زخمی بھی کیا۔“ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ماریا کی بات کر رہا ہے۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”مجھے تم جیسے کرائے کے ٹٹوؤں کے سامنے صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن پھر بھی سن لو کہ سرجن کی پتنی اور جارج کی بہن ماریا کو سلطانہ کے بدلے میں اٹھایا گیا تھا... اور وہ بدبخت اٹھائے جانے کے قابل تھی لیکن یہاں دوسری بات بھی یاد رکھو۔ اسے اٹھانے والے مسلمان تھے۔ انہوں نے تمہاری عورت کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو تم نے ان کی عورت کے ساتھ کیا۔“

گارڈ پھنکارا۔ ”کوئی ناری بھی کسی مرد پر ایسا جھوٹا الزام ناہیں لگا سکتی... کیا تم انکار کرت ہو کہ شریمتی ماریا کی عزت خراب ہوئی؟“

”نہیں، میں انکار نہیں کرتا۔ شریمتی جی کی عزت خراب ہوئی لیکن کسی نے نہیں، اس نے خود کی۔ اس نے اندھیری رات میں ایک یاری کو اپنا جسم رشوت کے طور پر پیش کیا اور اس کی مدد سے بھاگ نکلی...“

”یہ بکواس ہے۔“ گارڈ گرجا۔ ”اس طرح کی باتیں تم مسلوں نے ہی پھیلائی ہیں۔ اپنے گندے اپرادھ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے تم لوگن نے۔ ناری کی عزت...“

”کون ناری؟ کیسی عزت؟“ میں نے جھڑک کر اس کی بات کاٹی۔ ”یہ گوری چمڑی والے جنہیں تم نے اپنا آقا بنایا ہوا ہے، عزت آبرو، پوترا اور شرم حیا جیسے لفظوں کا مطلب ہی نہیں جانتے۔ ان کے دیس میں جا کر دیکھو، یہ ماریا جیسی میمیں ایک برگر اور ایک کوک کے لیے کسی کے ساتھ بھی جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں... اور یہاں برگر کوک کا نہیں، جان کا معاملہ تھا۔“

گارڈ نے دانت پیسے۔ ”بھگوان کی سوگند... اگر مجھے بڑوں کا ڈر نہ ہوتا تو میں اسی جگہ تمہاری کھوپڑیا میں سوراخ کر دیتا۔“

”اچھا، تم دونوں چپ ہو جاؤ۔“ دوسرے گارڈ نے ذرا تحکم سے کہا۔ وہ قدرے سینئر دکھائی دیتا تھا۔

اسی دوران میں اس قافلے کی گاڑیاں لال بھون کے سامنے پہنچ گئیں۔ کئی دیگر اہم عمارتوں کی طرح یہ عمارت بھی جنریٹر کی برقی رو سے روشن تھی۔ گاڑیاں مین دروازے کے سامنے رک گئیں اور وردی میں ملبوس وہ افسر نما افراد لال بھون کے اندر چلے گئے۔ یقینی بات تھی کہ وہ میڈم صفورا کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے گئے تھے۔ مجھے میڈم کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی پر اعتماد تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی گفتگو سے ان افسران کو کسی طرح کا شک نہیں ہونے دے گی۔ میں ابھی صرف چند گھنٹے پہلے یہاں سے گیا اور اب ایک نئی حیثیت سے واپس آیا تھا۔

دونوں افسران پندرہ بیس منٹ بعد واپس آئے اور مجھے نیم گرم گھوڑا گاڑی سے اتار کر لال بھون کے اندر لے گئے۔ گیٹ پر موجود گارڈز اور دیگر ملازمین نے اس سے پہلے میری صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں میڈم صفورا کا وہی مہمان ہوں جو چند روز پہلے یہاں پہنچا تھا۔ ممکن تھا کہ اب ان لوگوں میں سے کچھ نے مجھے سلطانہ کے شوہر کی حیثیت سے پہچان لیا ہو، بہر حال وہ سب خاموش تھے۔

لال بھون کی عالی شان راہداریوں سے گزر کر میں جلد ہی میڈم صفورا کے سامنے تھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ نیند سے جاگی ہے۔ میری توقع کے عین مطابق میڈم صفورا مجھ سے اسی انداز میں ملی جس میں اسے ملنا چاہیے تھا۔ اس نے قدرے حیرت ظاہر کی کہ میں اس وقت اس حال میں یہاں زرگاں میں موجود ہوں۔ اس نے اپنی اس حیرت میں ہلکی سی ”ناگواری“ بھی شامل کر لی تھی۔

ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی پھر فوجی افسر نے میڈم صفورا کو بتایا۔ ”جو کچھ بھی ہے میڈم، یہ شخص فی الحال سر جارج کے مہمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرجن صاحب کا حکم ہے کہ اسے یہاں لال بھون میں رہنے کی آگیا دی جاوے اور ہر طرح کی سہولت بھی مہیا کی جاوے۔ اس کے بارے میں مزید احکامات سر جارج بعد میں دیویں گے۔“

میڈم نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، اگر یہ سر کا آرڈر ہے تو یہ یہاں رہ سکتا ہے۔ لیکن اس کی حفاظت...“

”اس کے لیے آپ کوئی چنتا نہ کریں۔ ٹھیک اسی وقت سے یہ عمارت ہمارے ”سکیورٹی گھیرے“ میں رہے گی۔ عمارت کے اندر بھی سر جارج کی اسپیشل فورس کے لوگن موجود رہیں گے۔“

میڈم صفورا کو علیحدگی میں کچھ ہدایات دینے کے بعد فوجی افسران واپس چلے گئے... جونہی تنہائی میسر آئی، ایک دروازے کے عقب سے عمران بھی نمودار ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ”اوئے گھامڑ، یہ کیا گڑبڑ گھوٹالا کیا ہے تو نے؟“ اس نے مجھے گدی سے دبوچ لیا اور زور سے آگے پیچھے ہلایا۔

”سب کچھ بتاتا ہوں۔ بتانے کے لیے ہی تو یہاں آیا ہوں۔“ میں نے اس سے اپنی گردن چھڑاتے ہوئے کہا۔

”غضب خدا کا اتنا بڑا دھوکا۔ نہ کوئی صلاح نہ مشورہ۔ مجھے سوتا چھوڑ کر نکل گئے اور جا پہنچے راج بھون کے سامنے... یار! سچی بات ہے، مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ تم اتنے بے وفا اور کمینے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے تم نے مجھ سے یا میڈم سے بات تک نہیں کی۔ نہیں نہیں... ضرور میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا...“ وہ اداکاری کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ واقعی بہت حیران بھی تھا۔

”تم نے جو کچھ سنا ہے، وہ صحیح ہے ڈیئر۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یعنی تم جارج گورا کا چیلنج قبول کر آئے ہو... اور اسے للکار آئے ہو کہ اس سے دو بدو لڑائی کرو گے؟“

”ایسا ہی ہے۔“

وہ میڈم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میڈم! اس نے ضرور کوئی زہریلی چیز کھالی ہے۔ یہ زہر اس کے دماغ کو چڑھ گیا ہے یا پھر اس نے نشہ کیا ہے۔ اس کا ڈوپ ٹیسٹ کراؤ میڈم... یہاں ڈوپ ٹیسٹ ہو سکتا ہے نا... چل بھئی چل... اٹھ...“

اسی دوران میں کمرے کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ گیتا نے میڈم کو پکارا۔ غالباً کوئی ایمرجنسی کام تھا۔ میڈم ’ابھی آئی‘ کہہ کر باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی عمران ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں سے گہری فکرمندی جھانکنے لگی ہے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تابی! یہ کوئی اچھا کام نہیں کیا تو نے... کم از کم مشورہ ہی کر لیتا۔ اس کا مطلب ہے کہ تو مجھے اپنا نہیں سمجھتا۔“

”اپنا سمجھتا ہوں لیکن مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔ مشورہ کرتا تو تم مجھے کبھی نہ جانے دیتے۔ اس کام میں سے سیکڑوں خطرے نکال کر مجھے بتا دیتے اور بعد میں ہو سکتا تھا کہ یہ سارے خود مول لے لیتے۔“

”تو کیا ساری مصیبتوں، پریشانیوں اور سارے خطروں کا ٹھیکا تو نے لے لیا ہے؟“

”یہ ساری مصیبتیں اور پریشانیاں پیدا بھی تو میری ہی کی ہوئی ہیں۔ تمہارا جارج اور حشم وغیرہ سے کیا واسطہ ہے۔ یہ ساری دشمنیاں میری ہی پالی ہوئی ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن میں نے آج تک تم سے لیا ہی لیا ہے۔ ہر قدم پر تمہارا سہارا مانگتا رہا ہوں اور تم کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر یہ سہارا مجھے دیتے رہے ہو۔ لیکن اب نہیں... اب پلیز مجھے اپنے طور پر کچھ کرنے دو۔ مجھے میرے ہونے کا احساس ہونے دو...“

”لیکن تابی...“

”نہیں عمران! اب اس بارے میں کچھ نہ بولو۔ ویسے بھی جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اب اگر کر سکتے ہو تو ایک کام کرو... کسی بھی ذریعے سے انور خاں تک اطلاع پہنچا دو۔“

”کیسی اطلاع؟“

”یہی کہ اب وہ زرگاں نہ آئے۔ وہ جس کام کا ارادہ رکھتا تھا، وہ اب میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اب اسے جان مصیبت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

عمران ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اسی دوران میں میڈم بھی واپس آ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش اور برہمی تھی۔ وہ بولی۔ ”تابش! یہ بہت جذباتی فیصلہ کیا ہے تم نے۔ یہ قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم نے آناً فاناً خود کو ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال لیا ہے۔“

”مصیبت میں تو ہم سب ہیں آنٹی۔“

”لیکن تمہیں کیا ضرورت تھی جارج کے ”مرضی کے محاذ“ پر لڑنے کی؟ تم اس کام کے لیے کوئی اور راستہ بھی ڈھونڈ سکتے تھے۔ ہم تینوں مل کر سوچتے تو کوئی حل نکل آتا۔“

”اب تو جو ہونا تھا ہو چکا میڈم۔“ میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

وہ بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ ”بے وقوفی ہوئی ہے تم سے۔ کم از کم مشورہ ہی کر لیتے تم... جارج نے ایک

پھندا لگایا ہوا ہے اور تم نے اس کے پھندے میں آنے کے لیے شان دار پھرتی دکھائی ہے۔ اب واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے تمہارے پاس۔"

"میں واپس آنا چاہتا بھی نہیں ہوں میڈم... اور آپ اتنا زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے اب زمانے کا بہت گرم سرد دیکھ لیا ہے۔ مرنے مارنے کی ہمت آ چکی ہے مجھ میں۔ میں جارج گورا کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گا۔ آپ یقین رکھیں، اس شخص کو اس کی توقع سے کہیں زیادہ مزاحمت ملنے والی ہے۔" میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

میرے لہجے کی حرارت اور توانائی کو محسوس کرکے میڈم کے چہرے کے تناؤ میں ایک بے ساختہ کمی واقع ہوئی۔ وہ ایک نشست پر بیٹھ گئی اور مجھے تولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ ٹھیک ہے کہ پچھلے چند ماہ میں تم بہت زیادہ بدلے ہو۔ تمہارے بارے میں اڑتی اڑتی خبریں بھی ہم تک پہنچتی رہی ہیں۔ ان میں رنجیت پانڈے والی خبر بھی شامل تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے تن تنہا پانڈے سے مارا ماری کی تھی اور وہ اس مارا ماری میں زخمی بھی ہوا تھا... واٹ سوایور... میں سمجھتی ہوں کہ یہ جارج بالکل اور طرح کا بندہ ہے۔ میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہو کہ اس کا ٹمپرامنٹ ایک پروفیشنل فائٹر جیسا ہو چکا ہے۔ پچھلے تین چار سالوں میں اس نے اس طرح کی لڑائیوں کا خاطر خواہ تجربہ حاصل کیا ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ ہر طرح کی فائٹنگ میں ایک نہایت طاق اور سخت جان حریف ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ وہ یہاں اسٹیٹ میں آباد ہونے سے پہلے انگلینڈ میں کیا کرتا تھا؟"

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔

"برمنگھم میں مارشل آرٹس کا ایک بہت بڑا کلب ہے۔ یہ کلب 1925ء میں جارج کے دادا نے شروع کیا تھا۔ دادا کے بعد جارج کا باپ اور پھر خود جارج اس کلب کا کرتا دھرتا رہا۔ فائٹنگ آرٹ میں اس شخص کی دلچسپی خاندانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مجرمانہ ذہن کا مالک بھی ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے دودھاری تلوار کہہ سکتے ہیں۔ اس تلوار کو زہر کی پان لگانے کے لیے حکم جی کی دوستی اور مکمل پشت پناہی بھی موجود ہے۔ ہم اس برصغیر کے لوگ فطری طور پر محکوم طبیعت کے مالک ہیں۔ جو چیز باہر سے اور خاص طور سے مغرب سے آتی ہے، وہ ہمیں بہت جلد متاثر کرتی ہے اور اگر اس چیز میں واقعی کوئی بات بھی ہو تو پھر تو سونے پر سہاگا ہے۔ جارج باہر سے آیا ہے اور اس میں ٹیلنٹ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقامی لوگ پوجنے کی حد تک اس سے متاثر ہیں لیکن توہم پرست تو اسے شکتی کا دیوتا تک کہہ ڈالتے ہیں۔ حکم جی کی طرف سے اس کو "سر" کا خطاب ملا ہوا ہے۔"

"اور دوسری طرف ان سر جی نے راجواڑے کو اپنی شکارگاہ بنایا ہوا ہے۔" عمران نے کہا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ طاقت اپنے قانون خود بنا لیتی ہے۔ جس کے پاس اختیار ہوتا ہے اس کے لیے ہزارہا آسانیاں مہیا ہو جاتی ہیں اور اگر اختیار گورے کے پاس ہو تو پھر کیا ہی بات ہے۔ گورا ہم جیسے لوگوں پر اپنا اختیار استعمال کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ لوگ یونہی تو دو سو سال یہاں حکومت نہیں کر گئے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "میڈم! میں اپنی جلد بازی پر شرمندہ ہوں لیکن ایک بار پھر کہوں گا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ میرے دو کام کر دیں۔"

"کیسے کام؟"

"زیادہ مشکل کام نہیں۔ آپ بہ آسانی کر سکتی ہیں میڈم۔"

"کچھ کہو گے تو پتا چلے گا۔"

"کسی طرح تل پانی میں انور خاں تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ یہاں آنے کا پروگرام فوراً ختم کر دے کیونکہ میں نے جارج کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔"

میڈم صفورا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے... اور دوسرا کام۔"

"مجھے اس عمارت میں ایک علیحدہ پورشن دیں جہاں میں دو چار دن میں اپنی فٹنس کو بہتر کر سکوں۔"

"علیحدہ پورشن کی کیا ضرورت ہے، یہاں ایک چھوٹا سا "جم" موجود ہے۔ تم چاہو تو صبح گیارہ بارہ بجے تک اسے آزادی سے استعمال کر سکتے ہو لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ تو پتا چلے کہ سامبر رچنا والے کیا کہتے ہیں۔"

"سامبر رچنا والے... کون؟" میں نے پوچھا۔

"پنڈت مہاراج اور ان کے چیلے۔ اس سامبر کی رسم میں دو حریفوں کے آمنے سامنے آنے کا حتمی فیصلہ یہ لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔ باقاعدہ کنڈلیاں وغیرہ نکالی جاتی ہیں اور مناسب وقت بھی طے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں حریف کس طریقے سے ایک دوسرے کا سامنا کریں گے۔ یعنی لڑائی خالی ہاتھ ہوگی یا کوئی ہتھیار استعمال کیا جائے گا... اور اگر ہتھیار استعمال کیا جائے گا تو کون سا ہوگا اور اس ہتھیار سے بچاؤ کے لیے کیا انتظام ہوگا۔ اصولی

طور پر سامبر کی لڑائی صرف حریف کو زیر کرنے کے لیے ہوتی ہے لیکن کچھ موقعوں پر ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ شدید زخمی ہوئے ہیں یا پھر ان کی جان ہی چلی گئی ہے۔"

ہم تینوں کے درمیان رات آخری پہر تک گفتگو جاری رہی۔ اس گفتگو کے آخر میں میڈم نے وعدہ کیا کہ وہ صبح سب سے پہلا کام یہی کرے گی کہ کسی طرح انور خاں تک میرا پیغام پہنچائے گی۔ اس لال بھون میں ایک بندہ ایسا تھا جس پر میڈم اندھا اعتماد کر سکتی تھی۔ اس کی حیثیت یہاں میڈم کے خاص الخاص کارندے جیسے ہو گئی تھی۔

میڈم کے جانے کے بعد میں اور عمران سو گئے۔ بار بندا جنکی نے میری تربیت کے دوران میں جو ہدایات مجھے دی تھیں، ان میں یہ بھی شامل تھی کہ میں نرم بستر پر سونے سے گریز کروں اور کئی دوسری ہدایتوں کی طرح میں اس ہدایت پر بھی عمل کرتا تھا بلکہ مجھے ایسا کرنا اچھا لگتا تھا۔ یہاں بھی میں قالین پر چادر بچھا کر سوتا تھا۔ عمران نے کئی بار چاہا کہ میں اس کی طرح بستر استعمال کروں لیکن میں ٹال گیا... ہم دوپہر سے کچھ ہی دیر پہلے بیدار ہوئے۔ کئی دن کے ابر آلود موسم کے بعد یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ بھون کے وسیع سبزہ زار میں نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں میڈم نے ہی بیدار کیا تھا۔ وہ خاصی جلدی میں نظر آتی تھی۔ اس نے اطلاع دی۔ "جارج صاحب آ رہے ہیں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے تیار ہو جاؤ... اور تم بھی کسی کمرے میں چلے جاؤ۔ جب تک جارج صاحب یہاں ہیں، باہر نہیں آنا۔" میڈم نے آخری الفاظ عمران سے مخاطب ہو کر کہے۔

عمران سے بات کرتے ہوئے وہ اس سے نگاہ نہیں ملاتی تھی۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ زہریلے سانپ والے ڈرامائی واقعے کے بعد وہ عمران کو معاف کر چکی ہے یا کم از کم اتنا تو ہو چکا ہے کہ وہ اسے برداشت کر رہی ہے۔ لیکن اس کی دلی کیفیت کے بارے میں ابھی حتمی رائے قائم کرنا مشکل تھا۔

"آپ کا کیا اندازہ ہے، جارج کے آنے کا مقصد کیا ہوگا؟" عمران نے پوچھا۔

"میرے خیال میں اس کے ساتھ پنڈت مہاراج ہوں گے جو کنڈلی وغیرہ نکالیں گے... اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ سامبر کے بارے میں ڈسکشن ہو۔" میڈم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور میڈم کا فراہم کردہ لباس پہنا۔ یہ پینٹ شرٹ اور سویٹر پر مشتمل تھا۔ شیو کئی دن سے بڑھی ہوئی تھی۔ مجھے شیو کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا۔

آدھ پون گھنٹے میں، میں بالکل فریش ہو گیا اور حقیقتاً میں اندر سے بھی بہت فریش تھا۔ راج بھون کے سامنے جا کر جارج گورا کو للکارنے کے بعد میرے اندر کا غبار نکل گیا تھا۔ میرے رگ و پے میں دوڑنے والی بے پناہ بے قراری ایک طرح کے ٹھہراؤ میں بدل گئی تھی۔ اب مجھے یہ سوچ کر لطف محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے بدترین دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کروں گا اور اس کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آؤں گا۔

جارج گورا کی آمد کی وجہ سے لال بھون میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ملازمین بھاگے پھر رہے تھے۔ گارڈز بھی چوکس اور ہوشیار نظر آتے تھے۔ قریباً ایک بجے کے قریب جارج گورا اپنے دو درجن اسپیشل گارڈز کے ساتھ لال بھون کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ اس کے یہ اسپیشل گارڈز پگڑیوں کے بغیر تھے۔ ان میں مجھے چند سفید فام افراد بھی نظر آئے اور یقیناً یہی لوگ سیکیورٹی کے انچارج بھی تھے۔ ان میں سے کچھ افراد نے پہلے سے موجود گارڈز کے ساتھ بیرونی حصے میں پوزیشن سنبھال لی۔ باقی جارج گورا کے ساتھ عمارت کے اندر چلے آئے۔ گارڈز کے وزنی بوٹوں سے برآمدوں کے فرش لرز اٹھے۔ ایک دہشت کی سی فضا پیدا ہو گئی۔ اسپیشل فورس کے دو گارڈز، جارج سے پہلے ہی اندر آ گئے۔ انہوں نے مجھے سرتاپا دیکھا۔ یہ دونوں سفید فام تھے۔ مجھے "گڈ نون" کہنے کے بعد انہوں نے اچھی طرح میری تلاشی لی اور پھر مجھے ایک ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لے گئے۔ یہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دو تین منٹ بعد جارج گورا اپنے تین مسلح گارڈز کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میڈم صفورا اور منیجر مدن وغیرہ بھی اس کے عقب میں موجود تھے۔

جارج کو میں نے چند دن پہلے راج بھون کی شاہی بالکونی میں دیکھا تھا لیکن اس وقت ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد آج میں اسے اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں نہایت خطرناک چمک تھی۔ یہ آنکھیں کسی انسان سے زیادہ درندے کی آنکھیں لگتی تھیں۔ غیر متوقع طور پر اس نے مجھ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ "زرگاں میں خوش آمدید۔"

اس نے اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میرے ہاتھ پر قائم کر رکھی تھی۔ شاید اس طرح وہ میری جسمانی طاقت اور اعصابی مضبوطی کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

وہ مجھ سے فقط دو فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس نے

اختیار اور جسمانی طاقت کے نشے میں سلطانہ کو روندا تھا۔ جی چاہا کہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اس پر جا پڑوں اور تب تک خود کو اس سے جدا نہ کروں جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتا لیکن عملی طور پر ایسا ممکن نہیں تھا۔ تین گارڈز موجود تھے، وہ مجھے چھلنی کر کے رکھ دیتے۔ مجھے ابھی صبر کرنا تھا۔

جارج نے کہا۔ ''ہام کا خیال ہے کہ تم انگلش سمجھ سکتا۔''

''ہاں، میں سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

''او کے... ویسے تو تم سے پوچھنے کی بہت سی باتیں ہیں لیکن فی الوقت ہم صرف اس اعلان کے حوالے سے بات کریں گے جو تم نے کل راج بھون کے سامنے کیا ہے۔'' جارج کا لہجہ خشک تھا۔

''میں بھی صرف اسی حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے شستہ انگریزی میں جواب دیا۔

''تمہیں شرائط کا پتا ہے؟''

''مجھے تمہاری ہر شرط بغیر سنے منظور ہے۔ میں صرف تم سے لڑنا اور تمہیں ہرانا چاہتا ہوں۔''

''بہت خوب... بہت خوب۔'' میرے لہجے کی آگ کو محسوس کر کے اس نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''یسوع بُری نظر سے بچائے، مورال بہت اونچا ہے تمہارا۔''

''شکریہ۔''

''پھر بھی میں تمہیں شرائط بتا دینا چاہتا ہوں۔ تم ایک مفرور مجرم ہو۔ تم پر جو سنگین الزامات ہیں، ان کی کم سے کم سزا موت ہے۔ لیکن تم نے دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ چوہے کی طرح پکڑے جانے کے بجائے خود یہاں پہنچ گئے ہو۔ اب تم پر ریاست کا قانون نہیں بلکہ کھیل کے اصول لاگو ہوں گے۔ تم میرے ساتھ ون ٹو ون زور آزمائی کرو گے۔ اگر تم جیت گئے تو تمہارے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ تم یہاں سے جا سکو گے بلکہ اپنے دوست کی بھاوج کو بھی لے جا سکو گے... لیکن اگر تم ون ٹو ون باؤٹ میں ہار گئے تو پھر تمہارا انجام وہی ہوگا جو تمہارے دوست اسحاق کا ہوا۔ تمہیں بغیر کسی ٹرائل کے سزائے موت دی جائے گی۔ راج بھون کے سامنے سولی چڑھا دیا جائے گا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے بلا توقف کہا۔

''او کے... لیکن اس سے پہلے پنڈت مہاراج کو تمہاری کنڈلی وغیرہ دیکھنی ہوگی اور مقامی رواج کے مطابق شبھ گھڑی کا چناؤ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم یہ طے کریں گے کہ ہماری لڑائی کس طرح کی ہوگی اور اس کے رولز اور ریگولیشن کیا ہوں گے۔''

''اس حوالے سے میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں لیکن چلو... پہلے تم کنڈلیاں وغیرہ نکلوا لو۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں کنڈلیاں وغیرہ نکلوا لیتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے بھی کچھ کرنا ہے۔ یہ کنڈلیوں والا کام آج نہیں کل ہو سکے گا۔ آج میں کسی اور چیز کی تصدیق کے لیے یہاں آیا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

جارج نے ایک گارڈ کو اشارہ کیا، وہ باہر چلا گیا۔ جارج نے میڈم صفورا اور مدن وغیرہ کو بھی باہر بھیج دیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے حکم دیا۔ میں قالین پر بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔

وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں بھی اس پر جمی تھیں۔ اس کی عمر پینتیس چالیس کے قریب تھی تاہم وہ اپنی عمر سے کم نظر آتا تھا۔ وہ ایک نہایت مضبوط اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ خاص طور سے اس کی گردن اور شانے غیر معمولی طور پر مضبوط نظر آتے تھے۔ قد کاٹھ کے لحاظ سے وہ مجھ سے کہیں بہتر تھا اور جسم کے پھیلاؤ میں تو کافی فرق تھا۔ اس نے مجھے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا تھا اور اب پتا نہیں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اسی دوران میں باہر جانے والا گارڈ دوبارہ واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر نما شخص بھی تھا۔ اس کے ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ اس نے ایک سرنج پکڑی ہوئی تھی۔ غالباً وہ مجھے کچھ انجیکٹ کرنا چاہ رہا تھا۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔'' جارج نے کہا۔ ''تمہاری صحت اور سلامتی کا سب سے بڑا ضامن اب میں خود ہوں۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے، اسامبر کے دن تک تمہیں کچھ نہیں ہوگا...''

''یہ انجکشن کس لیے ہے؟''

''سمجھو، تمہاری جسمانی صحت کو چیک کرنے کے لیے ہے۔ اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔''

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ آخر وہ چپ والا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے اشینٹ میری پوزیشن کو لوکیٹ نہیں کر رہے تھے اور وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ ایسا کیوں ہے۔ غالباً مجھے کوئی نشہ آور دوا دی جا رہی تھی۔ کمرے میں جارج کے علاوہ صرف تین افراد تھے اور یقیناً یہ جارج کے اعتبار کے لوگ تھے...

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''جارج! میں سمجھ گیا ہوں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اگر تم اپنا وقت بچانا چاہتے ہو تو میں براہِ

راست تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔''

''تم کیا بات کر رہے ہو؟'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں چپ کی بات کر رہا ہوں۔''

میرے الفاظ نے جارج جیسے مضبوط شخص کو ہلا دیا۔ اس کے تینوں ساتھی بھی بُری طرح چونک گئے۔ جارج نے ایک گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا اور بولا۔ ''کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرنا پسند کرو گے...؟''

''بالکل پسند کروں گا۔ میں اس چپ کی بات کر رہا ہوں جسے یہاں لوح یا تختی کہا جاتا ہے۔ یہ تختی میرے اندر بھی موجود تھی۔ شاید مجھے اس کا پتا بھی نہ چلتا... یا اگر چلتا بھی تو میں اس کی حقیقت بھی معلوم نہ کر پاتا۔ لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ صورتِ حال ایک دم بدل گئی۔''

میں نے ذرا توقف کیا اور اپنی گردن کے عقب میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم لوگ دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ یہاں کیا ہوا ہے۔''

ڈاکٹر اور جارج ایک ساتھ آگے بڑھے۔ ڈاکٹر نے میری گدی کا معائنہ کیا۔ یہاں آپریشن کا نشان تھا اور ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ ''یہ کیا ہے؟'' سفید فام ڈاکٹر نے پوچھا۔

''مجھے یہاں چوٹ لگی تھی اور زخم ہو گیا تھا۔ پھر زخم میں انفیکشن ہو گیا۔ میرا پورا جسم درد کے شدید شکنجے میں جکڑ گیا اور کسی وقت یوں لگنے لگا کہ مجھے اوپر کے دھڑ کا فالج ہو رہا ہے۔ طبیعت بہت بگڑ گئی تو پتا چلا کہ یہ سب اس ''چپ'' کی وجہ سے ہے۔ میرے ساتھی ڈاکٹر چوہان نے جیسے تیسے اس چپ کو نکال دیا...''

جارج اور ڈاکٹر حیرانی سے سن رہے تھے۔

میری بتائی ہوئی تفصیل جارج وغیرہ کے لیے حیران کن تھی اور یقیناً اس سے زیادہ یہ بات حیران کن تھی کہ میں نے چپ اپنے جسم سے علیحدہ کرا لی اور اس کے باوجود جان لیوا صورتِ حال سے بچا رہا۔

ڈاکٹر کے علاوہ جارج نے بھی میری جلد کو دبا دبا کر اس بات کی تصدیق کی کہ چپ میرے جسم میں موجود نہیں ہے۔

آخر جارج ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''کیا واقعی اس بھگوڑے ڈاکٹر چوہان نے یہ کام کیا ہے؟''

''میں وہی بتا رہا ہوں جو میرے ساتھ ہوا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

جارج اور سفید فام ڈاکٹر کچھ دیر تک الجھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر جارج نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''اگر واقعی سب کچھ ویسا ہی ہوا ہے جیسا تم بتا رہے ہو تو پھر تم ایک خوش قسمت شخص ہو۔ جب ڈاکٹر چوہان سے ملاقات ہوگی تو میں اسے اس آپریشن پر ''شاباش'' ضرور دوں گا۔'' اس نے شاباش کا لفظ معنی خیز انداز میں کہا تھا اور اس لفظ میں ایک سفاک دھمکی کی ساری سنگینی بھری ہوئی تھی۔

سفید فام ڈاکٹر نے امریکن لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''اب وہ چپ کہاں ہے؟''

''مجھے اس بارے میں ٹھیک سے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے ڈاکٹر چوہان نے کہیں پھینک دیا تھا۔''

''پھینک دیا تھا تو بھی اس کے سگنل تو ملنے چاہئیں۔'' جارج نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''اتنی عقل تو ڈاکٹر چوہان میں بھی تھی۔ اس نے چپ نکالتے ہی اسے ضائع کر دیا تھا۔ ضائع کرنے کے بعد ہی اس نے اسے کہیں پھینکا ہوگا۔''

''تم اتنی بے یقینی سے بات کیوں کر رہے ہو؟ کیا چوہان نے تمہیں اس بارے میں اصل صورتِ حال نہیں بتائی؟''

''یہ ایک اتفاق ہے کہ آپریشن کے بعد چوہان سے میری تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔'' میں نے پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔

کچھ دیر تک اس بارے میں بات چیت جاری رہی۔ تب جارج یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ وہ کل پھر آئے گا... اور اس سے پہلے پنڈت مہاراج یہاں پہنچیں گے اور کنڈلی وغیرہ نکالیں گے۔ چپ کے حوالے سے جارج کی الجھنیں ابھی پوری طرح دور نہیں ہوئی تھیں۔

جب جارج اپنے مسلح گارڈز کے ہمراہ کمرے سے نکل رہا تھا، ایک بار پھر میرا جی چاہا کہ ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ کر اس پر جھپٹ پڑوں۔ اس کو سانس لینے کے لیے... اور مسکرانے کے لیے اور زمین پر دندنانے کے لیے چند منٹ بھی زندہ نہ چھوڑوں... مار دوں یا مر جاؤں۔ اس عیاش، عورت باز کو دیکھ کر میرے اندر ایک ایسی ناقابلِ برداشت نفرت جاگتی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔

لال بھون سے نکلتے ہوئے جارج اور اس کے ساتھی دو چار منٹ کے لیے اس بڑے ہال کمرے میں ٹھہرے جہاں

لڑکیاں کتھک ناچ کی تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ جارج کے پہنچتے ہی موسیقی رک گئی اور لڑکیاں ایک قطار میں کھڑی ہو گئیں۔ میڈم صفورا مؤدب انداز میں گرانڈیل جارج کے پہلو میں موجود تھی۔ وہ لڑکیوں کی صحت اور تعلیم و تربیت کے بارے میں جارج کو معلومات فراہم کر رہی تھی۔ وہ کافی فاصلے پر تھے، ان کی باتیں میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد جارج، مسلح گارڈز کے جلو میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

تنہائی میسر آتے ہی عمران اور میڈم صفورا پھر میرے پاس موجود تھے۔ میڈم صفورا کے چہرے پر بہت تجسس نظر آ رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اسے کمرے سے نکالنے کے بعد جارج گورا نے مجھ سے کیا بات چیت کی ہے اور جارج کے ساتھ ڈاکٹر کی آمد کا مقصد کیا تھا۔

میں نے میڈم اور عمران کو وہ ساری گفتگو بتائی جو چپ کے حوالے سے میرے اور جارج کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ واقعی اہم گفتگو تھی۔ میں نے جارج کو بتایا تھا کہ چوہان نے چپ میرے جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد توڑ پھوڑ کر ضائع کر دی تھی لیکن وہ چپ صحیح سالم حالت میں اب بھی مندر کے زیریں تہ خانے میں موجود تھی۔ عمران کا خیال تھا کہ ہم اس چپ کو کسی موقع پر اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں۔

...اگلے روز علی الصباح ہی پنڈت مہاراج اپنے پورے پروٹوکول کے ساتھ لال بھون میں آ دھمکا۔ یہ ایک پچاس پچپن سالہ شخص تھا۔ اس کے گلے میں بہت سی مالائیں تھیں۔ وہ سفید دھوتی قمیص میں تھا۔ ایک نہایت اعلیٰ درجے کی کشمیری شال اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کی وضع قطع دیکھ کر سورگ باشی گرو سوبھاش کی یاد آتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ پنڈت مہاراج کے بال بہت لمبے تھے اور اس کی شخصیت مجموعی طور پر بہت بارعب نظر آ رہی تھی۔

پنڈت نے مجھے سرتاپا گھورا اور منہ میں کچھ اشلوک وغیرہ پڑھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت آمیز شناسائی کی جھلک صاف محسوس کی۔ اس نے اپنے گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھ سے چند سوال کیے۔ میرے اندازے کے مطابق ان سوالوں کا مقصد صرف یہ جاننا تھا کہ میں ماضی میں واقعی یادداشت کے مسئلے کا شکار رہا ہوں یا پھر یہ کوئی ڈراما قسم کی چیز تھی۔

معلوم نہیں کہ وہ میرے جوابات سے کس حد تک مطمئن ہوا، بہرحال اس نے اپنا اصل کام شروع کرتے ہوئے مجھ سے چند سوالات کیے۔ میری تاریخ پیدائش، مقام اور والدین کے نام دریافت کیے۔ اس کے بعد وہ اپنے ایک چیلے کے ساتھ لمبے چوڑے حساب کتاب میں مصروف ہو گیا۔ چیلے کے پاس کچھ پرانے کاغذات اور پوتھیاں وغیرہ بھی تھیں۔ وہ نہ جانے ان پوتھیوں کی ورق گردانی سے کیا کیا ڈھونڈتا رہا اور پنڈت مہاراج کو بتاتا رہا، جسے پنڈت صاحب تحریر فرماتے رہے۔ آخر وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

اس کے کوئی پندرہ بیس منٹ بعد بھون میں کل والی سنسنی آمیز ہلچل محسوس ہوئی۔ گارڈز کی بھاگ دوڑ دکھائی دی۔ ملازمین الرٹ ہو گئے۔ تب زرگاں میں شکتی کا دیوتا، یعنی حکم جی کے بعد اہم ترین شخص سر جارج گورا اپنے دو درجن گارڈز کے جلو میں دکھائی دیا۔ اس کی آمد سے پہلے میری اور کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی گئی، تب وہ دندناتا ہوا اندر آ گیا۔

آج جارج گورا نے کوٹ کے بجائے بند گلے کی ایک پتلی سی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ اس ہائی نیک جرسی کے نیچے غالباً قمیص وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اس ڈریس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ مجھے اپنے شاندار کسرتی جسم کی جھلک دکھا کر مرعوب کرنا چاہتا تھا یا پھر اس نے میری نقل کی تھی۔ آج کی طرح ایک دن پہلے بھی بہت سردی تھی۔ میں نے تب بھی بس ایک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شاید اس نے مجھے بتایا تھا کہ اگر میں صرف ایک ٹی شرٹ میں موسم کی سختی جھیل سکتا ہوں تو وہ بھی ایسا کر سکتا ہے۔

آج پھر اس نے بھرپور توانائی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرے بازو کو باقاعدہ جھنجوڑا۔ کسی تمہید کے بغیر ہی وہ اصل موضوع پر آ گیا اور بولا۔ ”پنڈت مہاراج کی طرف سے کلیئرنس مل گئی ہے۔ سامبر کی رسم بدھ کو سہ پہر کے وقت ہو گی۔ بدھ کو سہ پہر کے وقت۔“ اس نے دُہرایا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”کس طرح لڑنا پسند کرو گے؟“

”میں کسی بھی طرح لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کل کہا تھا، اس لڑائی کے حوالے سے میں ایک تجویز دینا چاہتا ہوں۔“

”کہو۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ تم یہ تجویز مان لو گے...“

”کیا تم پہیلیاں بجھوانا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کہ یہ لڑائی مرنے یا مار دینے پر ختم ہو۔“

اس نے ذرا چونک کر مجھے دیکھا پھر اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بہت خوب... بہت خوب۔ دلیری دکھا رہے ہو

اور چالاکی بھی۔"

"چالاکی سے کیا مطلب؟"

"لڑائی کسی بھی طرح کی ہو، ہارنے کی صورت میں تمہیں تو مرنا ہی ہے۔ اور میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تم سولی چڑھنے کے بجائے گولی یا چاقو وغیرہ کے زخم سے مرو۔"

"تمہاری دلیری اور بے خوفی کے بارے میں تمہارے چیچے بہت شور مچاتے ہیں لیکن اب مجھے لگ رہا ہے کہ وہ سب 'شور' ہی ہے۔ جو دلیل تم پیش کر رہے ہو اس میں کوئی خاص وزن نہیں ہے۔"

"مجھے اکسانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آ گیا ہے۔ اب اسے ماننا یا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔"

جارج کی نیلگوں آنکھوں میں ایک بار پھر نفرت اور رقابت کی برق لہرائی۔ وہ اندر سے ابل رہا تھا۔ یہ جان کر مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ وہ مجھے قرار واقعی اہمیت دے رہا ہے۔ میرے خیال میں اس اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے ان لوگوں کو کچھ ثابت کر کے دکھایا تھا۔ پہلے جارج کی حراست سے فرار ہونا اور پھر پانڈے جیسے گھمنڈی کو یادگار مزاحمت دینا معمولی واقعات نہیں تھے۔

جارج ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا تھا۔ بڑے اسٹائل سے کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اس بارے میں بھی سوچ لیتے ہیں۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ کس طرح لڑنا پسند کرو گے؟ تم ویسٹرن انداز میں ڈیول کھیل سکتے ہو، تلوار بازی کر سکتے ہو، کشتی، چاقو زنی، باکسنگ... جو تمہارا دل چاہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ ہم بغیر کسی ہتھیار کے خالی ہاتھ لڑیں اور تب تک لڑتے رہیں جب تک کوئی ایک حتمی طور پر جیت نہ جائے۔"

"تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے جیسے یہ لڑائی شاید بہت دیر تک چلے گی۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ خاصی غیر دلچسپ لڑائی ہوگی۔ ایک دو منٹ میں ہی تمہارا جنازہ تیار ہو جائے گا۔"

"کچھ ایسے ہی خیالات تمہارے بارے میں میرے بھی ہیں۔" میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بہت خوب... بہت خوب۔" اس نے ایک بار پھر اوپر نیچے سر ہلایا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "ایک طرف تم کہہ رہے ہو کہ تم 'مرو یا مارو' کی لڑائی لڑنا چاہتے ہو۔ دوسری طرف خالی ہاتھ لڑنے کی بات کر رہے ہو۔ خالی ہاتھوں سے بندہ مارنے میں کافی دقت پیش آیا کرتی ہے اور میری کھال بھی تھوڑی سی موٹی ہے۔"

"تو اپنا کوئی من پسند ہتھیار رکھ لو۔ چاقو یا کٹاری... یا کچھ اور..."

"ٹھیک ہے۔ اس بارے میں تمہیں کل بتا دیا جائے گا۔" جارج نے مبہم انداز میں کہا۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے طرز تخاطب نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کے اندر طیش کا دریا ابل رہا تھا۔ وہ اس ابال کو ضبط کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ مجھے جان کی امان دے چکا تھا ورنہ شاید اسی جگہ یہ خوں ریز لڑائی شروع ہو جاتی جس کی منصوبہ بندی کی جا رہی تھی۔

اس کے طیش اور اس کی آتش پائی نے مجھے لطف دیا۔

عمران ابھی سو رہا تھا۔ میں اس ہال کمرے کی طرف چلا گیا جہاں جسمانی ورزش کا ساز و سامان موجود تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اس جگہ کو "جم" کہا جا سکتا تھا۔ ایک دو دیواروں پر انڈین فلمی اداکاراؤں ہیما مالنی، زینت امان اور سری دیوی وغیرہ کی تصویریں لگی تھیں۔ ان تصویروں میں ان خواتین کی جسمانی "دلکشی" نمایاں نظر آتی تھی۔ سہ پہر کے بعد ٹریزا گیتا دیدی لڑکیوں کو لے کر یہاں آتی تھی اور ڈیڑھ دو گھنٹے گزارتی تھی۔ فی الوقت یہ "جم" خالی پڑا تھا۔ ایک گوشے میں جاگنگ مشین موجود تھی اور سینڈ بیگ بھی جھول رہا تھا۔ میں جاگنگ مشین پر ایکسر سائز میں مصروف ہو گیا۔ قریباً آدھے گھنٹے تک میں نے اندھا دھند ورزش کی اور پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پھر میں سینڈ بیگ پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ جب میں یہ کام شروع کرتا تھا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ ارد گرد کا احساس تو دور کی بات ہے، مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ بارونڈا جیکی کی تربیت نے مجھے کسی اور ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ میں نے سینڈ بیگ کو اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ وہ جگہ جگہ سے خوں رنگ ہو گیا۔ یہ میرا اپنا ہی خون تھا جو میرے ہاتھوں کی جلد سے اور ناخنوں سے رس رہا تھا۔ یہ ورزش نہیں تھی، مشق بھی نہیں تھی... یہ ایک جنون تھا، ایک آگ تھی جو سینڈ بیگ کے روبرو ہوتے ہی میرے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ غیظ و غضب کے عالم میں کچھ ہو جاتا تھا مجھے۔ آج کل اسحاق کی دردناک موت کی یاد نے میرے رگ و پے میں کچھ اور بھی چنگاریاں بھر دی تھیں۔ جب میں دیوانہ وار اپنے کام میں لگا ہوا تھا، عمران کی آمد نے مجھے چونکایا۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں باکسنگ کے ہلکے گلوز نظر آ رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر دلکش انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "لگتا ہے کہ مارشل آرٹ کی کسی دھواں دھار فلم کا اثر ہو گیا ہے تم پر۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بے زبان کو مارنا اچھی بات نہیں ہے۔ کوئی ایسا ہو جو تھوڑا بہت جواب بھی دے سکے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے دستانوں کی ایک جوڑی میری طرف بھی پھینک دی۔

میں نے دو گلاس پانی پیا اور دستانے پہن لیے۔ وہ چہکا۔ "بس میری ناک پر نہ مارنا کیونکہ یہ میں نے جگہ جگہ کھسیڑ لی ہوتی ہے اور ہو سکے تو پڑپڑی (کنپٹی) کو بھی چھوڑ دینا کیونکہ سنا ہے شریف لوگ یہاں لگنے والی چوٹ سے اکثر فوت ہو جاتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تم زبان درازی کرنے لگے ہو لیکن خیر، اس کی سزا میں تمہیں 'رنگ' میں دوں گا۔ لو تگڑے ہو جاؤ۔"

ہم دونوں لکڑی کے ہموار فرش پر باکسنگ میں مصروف ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اور عمران اس طرح آمنے سامنے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ عمران ایک زبردست "لڑاکا" ہے۔ میں لاہور میں، مری میں اور پھر جہلم وغیرہ میں اس کی غیر معمولی پھرتی اور توانائی کے مظاہرے دیکھ چکا تھا۔ وہ سنگین ترین صورتِ حال میں بھی بڑے سکون سے لڑتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ لڑ نہیں رہا، سرکس میں کوئی خطرناک آئٹم دکھا رہا ہے۔ میں نفسیاتی طور پر ہمیشہ اس سے مرعوب رہا تھا... لیکن اب یہ مرعوبیت میری اندرونی تبدیلیوں کے دھارے میں کافی حد تک دب گئی تھی۔

ہم ہلکے وارم اپ ہوتے رہے پھر ایک دوسرے پر ہلکے ہلکے حملے کرنے لگے۔ یکایک عمران نے اپنے دائیں بازو کو بجلی کی سی تیزی سے حرکت دی۔ بے حد کوشش کے باوجود میں خود کو اس کے طوفانی مکے سے نہ بچا سکا۔ آنکھوں میں تارے سے ناچے اور میں لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

وہ مسکرایا۔ "جارج سے لڑنا چاہتے ہو تو اس کے لیے زندہ رہنا ضروری ہے اور مجھے تمہاری خیریت مشکوک نظر آ رہی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ ایک قریبی الماری کی طرف گیا اور وہاں سے دو "فیس گارڈز" لے آیا... ہم دونوں نے یہ گارڈز پہن لیے اور ایک بار پھر باکسنگ اسٹائل میں آ گئے۔ اب میں کافی احتیاط کر رہا تھا۔ تکنیک میں عمران مجھ سے کہیں بہتر تھا۔ میں نے اسے دو تین مکے رسید کیے لیکن جواب میں مجھے اس کے پانچ چھ سہنے پڑے۔ باکسنگ کے ساتھ ساتھ وہ فقرے بازی بھی کر رہا تھا۔ ہم بُری طرح ہانپنے لگے۔ اسی دوران میں وہ پھر ایک جھکائی دے گیا۔ بایاں ہاتھ استعمال کرتے کرتے اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا اسٹاک مُکا استعمال کیا۔ اس بار میں قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور گر گیا۔

وہ خود ہی گنتی گننے لگا۔ "ایک... دو... تین... چار۔" اس کے آٹھ تک پہنچتے پہنچتے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کھڑے ہوتے ہی وہ چیتے کی طرح جھپٹا۔ ایک بار پھر تابڑ توڑ وار کیے۔ میں دوبارہ چیت ہو گیا۔ ذہن پر دھند سی چھانے لگی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک آگ بھی بھڑک اٹھی۔ میری قوتِ برداشت کام آئی اور میں عمران کے گنتی شروع کرتے ہی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

اب ہم دونوں نے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ میرے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔ عمران کے رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔ مجھے لگا کہ شاید عمران اپنی کارکردگی دکھا کر اپنی اندرونی خفگی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو بائی پاس کیا تھا اور بڑی خاموشی سے راج بھون جا کر جارج کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ شاید وہ اس طرح یہ بتانا چاہتا تھا کہ جارج کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے وہ مجھ سے بہتر ہے۔

اس کی یہ بات غلط ثابت کرنے کے لیے میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اگلے راؤنڈ میں اسے چند سخت مکے رسید کیے مگر تب اچانک پھر اس کی بہتر تکنیک کام کر گئی۔ عمران نے راؤنڈ پنچ کے انداز کا ایک مکا میری ٹھوڑی پر رسید کیا اور اس مرتبہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب میں گرا اور کب لکڑی کے فرش نے میری پشت کو چھوا۔ دماغ لٹو کی طرح گھوم گیا تھا۔

عمران نے پھر گنتی شروع کی... چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ... میں پھر کھڑا ہو گیا۔ دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ ایک بار پھر ہم ایک دوسرے پر جھپٹے... اگلے قریباً پانچ منٹ میں واقعی بہت سخت لڑائی ہوئی۔ میں نے عمران کو زیادہ چوٹیں لگائیں اور یہ سخت بھی تھیں مگر عمران کی چوٹوں میں صفائی اور ایکوریسی تھی۔ ان پانچ منٹ میں، میں قریباً تین بار فرش بوس ہوا اور دو بار اپنا توازن قائم کر کے اٹھا۔

"بس بھئی بس۔" عمران پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "اب سلطانہ بھابی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑے گا۔"

اس نے فیس گارڈ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون رسنے لگا تھا۔ چہرے پر ایک دو نیل بھی تھے۔ میں نے بھی فیس گارڈ اتار دیا۔ ایک طرف سے میڈم صغورا نمودار ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے

تھے۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی اوٹ میں کھڑی ہوکر یہ ساری لڑائی دیکھتی رہی ہے۔

عمران نے پسینا پونچھتے ہوئے میڈم کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''کیا خیال ہے میڈم! میں ٹھیک کہہ رہا تھا نا؟''

''لگتا تو ایسے ہی ہے۔'' میڈم نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا رمزیہ باتیں کررہے ہو آپ دونوں؟'' میں نے دستانے اتارتے ہوئے عمران سے پوچھا۔

''سچ سچ بتا دوں یا گول مول بات کر دوں؟'' وہ مسکرایا۔

''سچ سچ ہی بتا دو کیونکہ یہ نیکی تم کم کم ہی کرتے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ پانی پیتے ہوئے بولا۔ ''میں میڈم کو چھوٹا سا ثبوت دینا چاہتا تھا۔''

''کس بات کا ثبوت؟''

''میں میڈم کو بتانا چاہتا تھا کہ تم کچھوکوے بن چکے ہو۔ کچھوکوا سمجھتے ہونا تم؟ جسے انگلش میں پچھوا کہتے ہیں۔''

''انگلش میں نہیں، اردو میں کہتے ہیں۔'' میں نے تصحیح کی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اب اس بات کا بھی ثبوت مل رہا ہے کہ تمہارے مکے میں کافی جان ہے۔ میری یادداشت کی چولیں ہل گئی ہیں اور انگریزی اردو آپس میں گڈمڈ ہوگئی ہے... ہاں تو میں بات کررہا تھا کچھوکوے کی... میں میڈم کو بتانا چاہتا تھا کہ تم اپنے لائف اسٹائل کی وجہ سے اس جانور کی طرح ڈھیٹ اور سخت جان ہوتے جا رہے ہو اور یہ ثابت ہوگیا ہے۔''

''کیا بکواس کررہے ہو؟''

میڈم مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں بتاتی ہوں... دراصل بات یہ ہے کہ میری رائے میں اگر جارج گورا سے دو دو ہاتھ کرنے ہی ہیں تو پھر تمہارے بجائے عمران کو آگے ہونا چاہیے تھا کیونکہ میرا خیال یہ تھا اور کسی حد تک اب بھی ہے کہ لڑائی بھڑائی کے فن میں عمران تم سے آگے ہے۔ دوسری طرف عمران کا کہنا یہ تھا کہ تم ایک اور حوالے سے اس سے کہیں آگے ہو۔ اور یہ ایسا حوالہ ہے جو فائٹنگ آرٹ میں سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی قوتِ برداشت اور درد سہنے کی صلاحیت... اور میرے خیال میں یہ بات پچھلے بیس پچیس منٹ میں کافی حد تک ثابت ہوئی ہے۔ میں واقعی تمہاری برداشت کی صلاحیت سے ''امپریس'' ہوئی ہوں۔ اتنی چوٹیں کھا کر گرنا اور پھر پاؤں پر کھڑے ہو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ یس، اِٹ از ونڈرفل۔''

''تو یہ میرا سرپرائز ٹیسٹ ہو رہا تھا۔'' میں نے عمران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو ایسا ہی سمجھ لو برخوردار... اوہ... سوری... میں نے تمہیں برخوردار کہہ دیا۔ دماغ گھوم گیا ہے۔ تمہارے مکے میں کافی طاقت ہے یار۔'' اس نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔

میں اس کی مسخری پر یکسر خاموش رہا۔ چند سیکنڈ تک کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔

وہ اس گمبھیر خاموشی کو توڑنے کے لیے مسکرایا۔ ''لگتا ہے کہ تم کچھوکوا کہنے کی وجہ سے ناراض ہوگئے ہو۔ لیکن تمہاری سخت جانی کی وجہ سے میں نے تمہیں کچھوکوا کہا ہے۔ تیزی اور پھرتی میں تم خود کو کسی اور جانور سے تشبیہ دے سکتے ہو... مثلاً باہروالا۔''

وہ سور کی بات کررہا تھا۔ اس کی بکواس پر میرا پارا پھر اوپر چلا گیا لیکن میڈم کی موجودگی کی وجہ سے میں بولا کچھ نہیں۔

میڈم بولی۔ ''یہ باہروالا کیا ہوتا ہے بھئی؟''

''یہ... یہ چیتے کی طرح کا ایک جانور ہوتا ہے جی۔'' عمران نے بات بنائی۔

''بھئی اس لحاظ سے تو تم دونوں ہی باہروالے ہو۔ میں تمہاری فائٹ سے متاثر ہوئی ہوں۔''

عمران بولا۔ ''آپ بھی تو کم ''باہروالی'' نہیں ہیں۔ میں نے کچھ موقعوں پر آپ کو بڑی تیزی سے فیصلہ کرتے اور حرکت میں آتے دیکھا ہے۔''

''اچھا چھوڑو اس بات کو۔ اب دونوں اپنا حلیہ درست کرو۔ شام کو کچھ لوگ تابش کو دیکھنے آرہے ہیں۔''

''لیکن یہ تو شادی شدہ ہے۔''

وہ عمران کے فقرے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ خبر پورے زرگاں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے کہ سلطانہ راجپوت کا شوہر زرگاں واپس پہنچ گیا ہے اور وہ جارج گورا سے لڑنا چاہتا ہے۔ ہر طرف اس بارے میں چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک دلچسپ مقابلہ ہوگا۔''

''اس خیال کی وجہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''رنجیت پانڈے۔'' میڈم نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ ''رنجیت پانڈے زرگاں کا سب سے کرخت اور دبنگ افسر ہے۔ اس رنجیت پانڈے کے ساتھ نل پانی کے دیوان میں

تابش کی ٹکر ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تابش نے نہ صرف پانڈے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ اسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس کامیابی کا کریڈٹ ملنے کے بعد تابش کو یہاں کافی شہرت حاصل ہوئی ہے... زرگاں میں اکثر لوگ اس کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ لوگوں کے لیے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو ڈیڑھ دو سال پہلے تک ایک عضوِ معطل کی طرح اپنی بیوی کے آسرے پر جی رہا تھا، اب پانڈے جیسے بندے سے ٹکر لینے کے قابل ہوگیا ہے... اب جو نئی صورت سامنے آئی ہے، اس نے مزید ہلچل مچائی ہے۔ راج بھون کے دروازے کے سامنے جاکر جارج کو للکارنا اور اس کا چیلنج قبول کرنا، ہر جگہ زیرِ بحث ہے۔ شام کو جو لوگ آرہے ہیں، یہ زرگاں کے عمائدین میں سے ہیں۔''

''یہ کیا کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے ناخن دیکھیں گے کہ کہیں تم لڑائی کے دوران میں جارج کو کھرونڈے سے مارنا نہ شروع کردو۔'' عمران نے کہا۔

میڈم اس کے مذاق کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''کچھ نہیں، بس یہ لوگ تم سے ملیں گے اور تمہیں یقین دلائیں گے کہ چیلنج قبول کرنے کے بعد تمہاری حیثیت ملزم یا مجرم کی نہیں رہی ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، وہ سامبر کے قدیم اصولوں کے مطابق ہوگا اور تمہیں مقابلے کے دن تک ہر طرح کی سہولت حاصل رہے گی، وغیرہ وغیرہ۔''

''میڈم! میرے کام کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں... تمہارا کام ہوگیا ہے... میں نے پرسوں شام ہی تمہارا پیغام نل پانی روانہ کردیا تھا۔ اب تک انور خاں کو یہ اطلاع پہنچ چکی ہوگی کہ اسے فی الحال زرگاں آنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے وہ تمہارے اور جارج کے مقابلے کا نتیجہ دیکھ لے۔''

''اس بات کی تصدیق کب تک ہو سکے گی کہ اطلاع پہنچ گئی ہے؟''

''کل شام تک۔ لیکن تم بالکل مطمئن رہو۔ یہ کام ہو چکا ہے۔''

میڈم کے جانے کے بعد میں نے عمران کو گھورا۔ اس نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔ ''جگر! اگر کہیں زیادہ چوٹ لگی ہے تو معاف کردینا۔''

''چوٹیں تو تمہیں بھی کم نہیں لگیں۔ تمہارا تھوبڑا سوجتا جارہا ہے... اور میرے خیال میں میرا بھی یہی حال ہے۔''

''یعنی بقول شاعر، دونوں طرف ہے سوج برابر چڑھی ہوئی۔'' وہ چہکا۔ ہم ہنسے اور بغل گیر ہوگئے۔

رات کو بڑی بڑی پگڑیوں اور فربہ جسموں والے کچھ مقامی لوگ مجھ سے ملنے آئے۔ ان کا رویہ بس لیے دیے جیسا رہا۔ تاہم ان کی نگاہوں میں میرے حوالے سے دلچسپی اور گوناگوں تجسس تھا۔ میں ان کے لیے جیسے کوئی عجوبہ قسم کی شے تھا۔ وہ میری ''کایا کلپ'' کے بارے میں جاننے کے خواہش مند تھے لیکن کھل کر کوئی سوال بھی نہیں کررہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے سلطانہ اور اس کے اہلِ خانہ کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا، حالانکہ یہ سوال بھی ان کے ذہنوں میں ہلچل مچا رہا تھا۔

رات کو میں اور عمران ایک ہی کمرے میں لیٹے تھے۔ میں اپنے معمول کے مطابق سخت فرش پر دراز تھا (قالین پر) جبکہ عمران بستر پر لحاف اوڑھے لیٹا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے اس طرح سونے کی عادت ہوگئی تھی۔ میں حیران تھا کہ اب مجھے سردی بے چین نہیں کرتی تھی۔ دوپہر والی مارا ماری کے سبب عمران کی ناک کافی سوج گئی تھی مگر وہ ایسی باتوں کی پروا کب کرتا تھا۔ اس نے اپنے خوب صورت بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''یار! کبھی کبھی تو میں بارودندا جیکی سے واقعی بہت متاثر ہوتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس کی اور میری ملاقات نہ ہو سکی، ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی اس کی شاگردی اختیار کر لیتا۔''

''پھر کوئی ڈراما رچا رہے ہو؟''

''نہیں جگر! میں سنجیدہ ہوں۔ جیکی نے تم جیسے پھوہڑ بندے کی کیمسٹری چند مہینوں میں تبدیل کرکے رکھ دی ہے۔ درد کے حوالے سے جو فلسفہ اس نے تمہیں دیا ہے، میں اس سے پورا متفق تو نہیں لیکن اس کے نتائج کو جھٹلانا بھی بہت مشکل ہے۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر تم سے اظہارِ یکجہتی کے طور پر آج مابدولت بھی فرش پر استراحت فرمائیں گے۔'' اس نے چھلانگ لگائی اور میرے پہلو میں آکر قالین پر لیٹ گیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اظہارِ یکجہتی کرنا ہے تو پورا کرو۔ لحاف کیوں لپیٹ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم نے وہ شعر نہیں سنا۔ آپ سے پہلے تم ہوئے، پھر تو کا عنوان ہوگئے۔ ہر کام آہستہ آہستہ ہوتا ہے بھائی۔ اتنا اظہارِ یکجہتی بھی نہ کراؤ کہ کل سویرے اکڑا ہوا پایا جاؤں اور لوگ اظہارِ افسوس کے لیے تمہارے پاس آنے لگیں۔ تم سے پوچھا جائے کہ کیا ہوا؟ تو بولو، بس جی اظہارِ

ٹھٹھی ہوگیا... اچھی بھلی رضائی پڑی تھی مگر رضائی کی جگہ اس نے ''ٹھٹھی'' اوڑھ لی... اور صبح تک اپنے مرحوم بزرگوں سے اظہار یکجہتی کر گیا۔''

اگلے دن صبح میں اور عمران پُرتکلف ناشتے سے فارغ ہونے کے کچھ دیر بعد جم میں چلے گئے۔ میں ورزشوں میں مصروف ہوگیا اور عمران اس قدیم کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا جو منیجر مدن نے اسے دی تھی۔ یہ کتاب اس راجواڑے یعنی بھانڈیل اسٹیٹ کی قدیم رسموں کے بارے میں تھی اور اس میں سوئمبر اور سامبر وغیرہ کا ذکر بھی تھا۔ اس کتاب میں اس مورتی کا تذکرہ بھی کیا گیا تھا جسے چرانے کی پاداش میں ہم یہاں پہنچے تھے اور سنگین مسائل کا شکار تھے۔ لوگ ایک مدت سے بدھا کی اس مورتی کو آرا کوتے کے نام سے پکارتے رہے تھے، یعنی وہ شے جو اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے والوں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ ابھی تک تو یہ مورتی آرا کوتے ہی ثابت ہوئی تھی۔

لال بھون کے وسیع سبزہ زار پر ابھی یخ بستہ اوس کے قطرے موجود تھے۔ طویل قطاروں میں کیاریوں کے اندر سرما کے پھول جیسے زردی مائل دھوپ سے حظ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جم کے قریب دو باوردی گارڈز موجود تھے اور صرف جم ہی نہیں، پورے لال بھون کو اسپیشل فورس کے کمانڈوز نے گھیرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہم جدھر جاتے ہیں، درجنوں نگاہیں ہمارا پیچھا کرتی ہیں۔

میری ورزش اور مشق جاری تھی۔ پھر میں نے عمران کو بھی اس میں شامل کرلیا۔ ابھی ہم دونوں کو مصروف ہوئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ گیتا کی آواز سنائی دی اور پھر کئی لڑکیوں کی جلترنگ جیسی آوازیں ابھریں۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ قریباً ڈھائی درجن نہایت خوبرو لڑکیاں ہمارے سامنے کھڑی تھیں۔ یہ سب کی سب وہی تھیں جنہیں ساتویں کے جشن میں 'سات پریوں' کے انتخاب میں حصہ لینا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر ایسی تھیں جنہوں نے اب خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ ان میں چمک دمک آگئی تھی۔ ان کے عارض دہکتے تھے اور زلفیں لہرائی تھیں۔ وہ بات بات پر کھلکھلاتی تھیں، ایک دوسرے سے چہلیں کرتی تھیں اور آنکھوں آنکھوں میں بھید بھری باتیں کہتی رہتی تھیں۔

''کیا بات ہے گیتا دیوی؟'' میں نے ان کی ٹرینر سے پوچھا۔

''یہ سب تم سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''کس لیے؟''

''بھئی جس لیے لوگ مشہور لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہیں قریب سے دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''میں ایسا مشہور تو نہیں ہوں۔''

''یہ تو تمہارا خیال ہے نا... ذرا یہاں سے باہر نکل کر تو دیکھو۔ ہر طرف تمہارے چرچے ہیں۔'' گیتا بولی۔

''کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے۔''

''کئی وجہیں ہیں... اور ان میں سے ایک وجہ تمہارا یہ رہن سہن ہے۔'' وہ مسکرائی اور سخت سردی میں میرے بالکل ناکافی کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

اب لڑکیوں نے مجھے گھیرا ڈال لیا تھا۔ ان کے جسموں سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ آپس میں شوخ سرگوشیاں بھی کر رہی تھیں۔ ان میں وہ لڑکی بھی نظر آئی جس کا نام میڈم نے ثمرین بتایا تھا اور جس کے بارے میں کہا تھا کہ اس کی شادی سلطانہ کے بھائی سے ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ وہ آج بھی خوش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک لڑکی نے ہمت کر کے کہا۔ ''سنا ہے کرنل پالی میں آپ کی لڑائی پانڈے صاحب سے ہوئی تھی؟''

''بالکل ہوئی تھی... لیکن اس شخص کے نام کے ساتھ ''صاحب'' لگا کر اس لفظ کی توہین نہ کرو۔''

چند لڑکیوں کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ نظر آئی۔ ان میں ثمرین بھی شامل تھی۔

''سنا ہے، آپ کو درد نہیں ہوتا؟'' ایک دوسری لڑکی نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''کون کہتا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''یہاں کے ملازمین کہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے آپ کو یہاں ''جم'' میں ورزش کرتے دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کے شریر سے خون بھی رسنے لگے تو آپ کو پتا نہیں چلتا۔''

ایک لڑکی نے لقمہ دیا۔ ''اور آپ بے موسم کے کپڑے پہن کر گھومتے ہیں، فاقے کرتے ہیں، فرش پر سوتے ہیں اور عام پانی سے اشنان بھی کر لیتے ہیں۔''

ثمرین نے کہا۔ ''لیکن جہاں تک ہم کو جانکاری ہے، آپ پہلے تو ایسے نا ہیں تھے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کی یادداشت کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا۔''

''اپنے سوال کا جواب تم نے خود ہی دے دیا ہے۔'' عمران نے مدبرانہ انداز میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''خیر سے آپ کون ہیں؟'' زرق برق کپڑوں والی ایک لڑکی نے تنک کر عمران سے پوچھا۔

''میں میڈم کا ملازم ہوں۔ لیکن آج کل یہاں جم میں آرہا ہوں، ٹریننگ میں تابش کا ساتھ دینے کے لیے بلکہ... بلکہ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ مجھے اس کا استاد بھی کہا جا سکتا ہے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟'' ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

''استاد تو یہ واقعی ہے... بلکہ بہت استاد ہے۔ اور آپ بھی اس سے ذرا دور ہٹ کر کھڑی ہوں۔ یہ لڑکیوں کو بہت جلد شاگردی میں لے لیتا ہے۔''

''دیکھو مسٹر تابش... اٹ از ٹو مچ۔ میں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بھی اتنی زیادہ لڑکیوں کے سامنے۔''

''تو لڑکیاں کم کر دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کو باہر بھیج دیتے ہیں۔''

اس نے مجھے مُکّا دکھایا پھر لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اے خوش جمال... پری پیکران۔ میں آپ کو ایک بہت اونچی بات بتاتا ہوں۔ جس طرح بد سے بدنام زیادہ بُرا ہوتا ہے، اسی طرح اچھے سے مشہور زیادہ عزت دار ہو جاتا ہے۔ یہ تابش صاحب بس مشہور ہو گیا ہے، ورنہ یہ کوئی ایسا رستم سہراب بھی نہیں ہے۔''

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔ ایک بولی۔ ''ہم تو اتنا جانت ہیں جی کہ جو شخص پانڈے صاحب جیسے شخص سے ٹکر لے سکتا ہے... وہ جارج گورا صاحب کے لیے بھی ضرور مشکل پیدا کرے گا۔''

''تو آپ سب یہ چاہتی ہیں کہ جارج صاحب کے لیے مشکلیں پیدا ہوں؟''

لڑکیاں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ان کی ٹرینر گیتا جلدی سے بولی۔ ''نا ہیں، ایسی بات تو نا ہیں۔ جارج صاحب کی حیثیت ہمارے مالک کی سی ہے۔ ہم ایک غیر کے مقابلے میں ان کی ہار کا کیوں سوچیں گے؟ ہم چاہت ہیں کہ بھگوان ہمیشہ کی طرح ان کو کامیاب کرے...'' اس کے ساتھ ہی اس نے سوالیہ نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

کئی لڑکیوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بہر حال، ان کے تاثرات ان کے اندرونی جذبات کی چغلی کھا رہے تھے۔ ان میں سے شاید ہی دو چار ہوں جو دلی طور پر گیتا کی بات سے اتفاق کر رہی ہوں۔ اور مجھے تو لگ رہا تھا کہ شاید گیتا بھی وہ نہیں کہہ رہی جو اس کے دل میں ہے۔ وہ کمیں پینتیس سال کی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اب سے پانچ دس سال پہلے تک وہ خاصی حسین رہی ہوگی۔ اس کے جسم میں بھی کشش تھی۔ عین ممکن تھا کہ ماضی قریب میں وہ بھی جارج کی عیش پرستی کا شکار رہی ہو۔

میڈم صفورا نے بتایا تھا کہ وہ بہت باتونی ہے۔ اس ملاقات میں اس کا ثبوت بھی ملا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں جتنی باتیں ساری لڑکیوں نے کیں، اس سے دگنی صرف گیتا نے کیں۔ عمران بھی ٹھیک ٹھاک چرب زبان تھا۔ وہ گیتا کا خوب ساتھ دے رہا تھا۔ گیتا زرگاؤں کے بڑے بڑے لوگوں سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتا رہی تھی اور یہ بتا رہی تھی کہ وہ رقص کی کون کون سی اکیڈمی میں منیجر کی حیثیت سے وزٹ کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان دونوں کی گفتگو کا رخ جارج گورا کی طرف مڑ گیا۔ گیتا ایک نمک خوار کی حیثیت سے اس کی تعریفیں کرنے لگی اور بتانے لگی کہ اپنی کچھ چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود وہ زبردست قسم کا سوشل ورکر ہے اور کھل کر خیر خیرات کرتا ہے۔ عمران اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

میں گیتا کے سامنے بات کرتے ہوئے خاص احتیاط کر رہا تھا۔ مجھے میڈم کی یہ بات یاد تھی کہ گیتا پیٹ کی ہلکی ہے اور اس کے سامنے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا ہے۔

میرا خیال تھا کہ عمران کو بھی میڈم کی یہ نصیحت یاد ہوگی لیکن پھر جوشِ گفتار میں وہ کہیں کا کہیں نکل گیا۔ گیتا کی ایک بات پر وہ شد و مد سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل... گیتا دیوی... تم صحیح کہہ رہی ہو۔ بہت بڑا دل ہے جارج صاحب کا۔ وہ ایسے ہی بڑے نہیں بنے۔ اب ترسوں کی بات ہی لو، جب وہ یہاں آئے تھے۔ سامبر کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ طے ہو رہا تھا کہ مقابلہ کس طرح کا ہوگا۔ حضرت تابش صاحب نے جوش میں آکر فرما دیا کہ یہ ''مرو یا مارو'' کی فائٹ ہونی چاہیے۔ یعنی FIGHT TILL DEATH۔ اب اگر کوئی کم ظرف ہوتا تو وہیں آگ بگولا ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہیں پر مارا ماری شروع ہو جاتی۔ لیکن جارج صاحب نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ کہا کہ سوچ کر بتائیں گے۔ اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ خدانخواستہ وہ ڈر گئے۔ یہ بڑے دل گردے کی بات ہے کہ ایک بااختیار بندہ کسی بے اختیار بندے کی غلط بات حوصلے سے سنے۔ کیوں گیتا دیوی! غلط تو نہیں کہا؟''

''سولہ آنے ٹھیک ہے۔'' گیتا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ''مجھے تو واقعی حیرانی ہو رہی ہے کہ اس طرح کی بات ہوئی ہے... میں تو یہ کہوں گی کہ...''

"میں سمجھ گیا ہوں، آپ جو کہنا چاہ رہی ہیں۔" عمران نے تیزی سے گیتا کی بات کاٹی۔ "اگر جارج صاحب نے سوچنے کا وقت لیا ہے تو اس واسطے نہیں کہ وہ گھبرا گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سامبر کے بارے میں جو کچھ طے ہوا ہے، وہ اسی طرح رہے اور کوئی نئی شروعات نہ ہو... یہی بات ہے نا گیتا دیوی؟"

گیتا نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر عمران کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ "میں خود بھی فائٹنگ آرٹ کی تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جارج صاحب مہا فائٹر ہیں۔ ہم تابش صاحب سے صرف ہمدردی کا اظہار کر سکتے ہیں یا پھر یہ دعا کر سکتے ہیں کہ ان کے لیے جارج صاحب کے دل میں کچھ رحم پیدا ہو جائے اور وہ سامبر کی شرطوں میں کچھ ردوبدل کر دیں۔"

"یہ بہت مشکل ہے۔" گیتا نے دبے لہجے میں کہا اور پھر ایک جھرجھری سی لی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی قینچی زبان کو پھر حرکت دیتی عمران دوبارہ پہل کر گیا۔

"میں سمجھ گیا گیتا دیوی کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ میری آنکھوں میں بھی وہی دو تاریخ والا منظر ہے... کیا نام تھا اس بدقسمت کا؟"

"اسحاق۔" گیتا نے کہا۔

"ہاں... اسحاق... میں نے اس کا آخری وقت دیکھا تھا، اللہ ہر کسی کو ایسے وقت سے بچائے۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور ایک بار پھر بولتا چلا گیا۔ گیتا کا چہرہ دیدنی تھا۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی لیکن عمران کہیں سانس لیتا تو وہ منہ کھولتی۔ سیر کو سوا سیر ٹکر گیا تھا۔ گیتا کچھ دیر تک پیچ و تاب کھاتی رہی۔ اسی دوران میں اندر سے اسے میڈم کا بلاوا آ گیا اور وہ اپنی شاگرد لڑکیوں کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی عمران مسکرانے لگا۔ "جگرا! لگتا ہے گیتا دیوی کا پیٹ آج ضرور پھول جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے خاموش رہنا عذاب سے کم نہیں ہوتا۔"

میں غصے میں کھول رہا تھا۔ جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ تو نے کیا ڈراما کیا ہے بھئی۔ میڈم نے سمجھایا بھی تھا کہ گیتا کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرنی۔ تو نے سارا کچا چٹھا کھول دیا۔ یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ میں نے جارج کو 'مرو یا مارو' والی تجویز دی ہے؟"

"یار! اس میں برائی ہی کیا ہے؟ لیکن اگر تم ناراض ہوتے ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہوں۔" وہ اٹھ کر چل دیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"الفاظ واپس لینے۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"دیکھو، تم دوسروں کو بے وقوف سمجھنے کی عادت چھوڑ دو۔ مجھے بتاؤ تم نے گیتا کے سامنے یہ سب کچھ کیوں کہا ہے؟"

"اچھا... تم بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے کیوں کہا ہے؟" اس نے جوابی سوال جڑ دیا۔

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم یہ بات پھیلانا چاہ رہے ہو۔"

"کیوں؟"

"شاید تم سب کو بتانا چاہتے ہو کہ میں نے دلیری دکھائی ہے اور جارج کو 'مرو یا مارو' کا چیلنج دیا ہے۔"

"ونڈر فل، یار! تمہارے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا ہے۔ تم واقعی جینئس ہو۔ میرے اندر سے ایسی عقل مندی ڈھونڈ نکالی جو میرے میں تھی ہی نہیں۔ ویسے یہ بات ہے تو بڑی زبردست۔ ہر کس ناکس کو پتا چل جائے گا کہ تم نے اس لڑائی میں جارج کو 'مرو یا مارو' والا چیلنج دیا ہے۔ اب اس کے لیے اس چیلنج کو قبول نہ کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ بہت خوب یار... بہت خوب۔"

میں اسے گھورتا رہا۔ کبھی اس پر طیش آتا، کبھی اس کی چالاکی کی تعریف کرنے کو دل چاہتا۔ وہ ایسا ہی گورکھ دھندا تھا۔ کبھی سیدھا سادہ، کبھی جلیبی کی طرح گول گول۔ یقینی بات تھی کہ اس نے گیتا سے جو کہا، پلاننگ کے ساتھ کہا تھا۔

اس پلاننگ کا نتیجہ صرف پندرہ بیس گھنٹے میں سامنے آ گیا۔ اگلے روز صبح ناشتے پر میڈم اپنے کتے سمیت آ دھمکی۔ اس نے بتایا۔ "زرگاں میں کھلبلی ہے۔ یہ بات پھیل گئی ہے کہ سلطانہ راجپوت کے 'پاکستانی پتی' نے جارج گورا کو سامبر کے لیے تجویز دی ہے کہ یہ لڑائی کسی ایک فریق کی موت تک جاری رہے۔"

"یہ بات پھیلی کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔ اس کا پتا تو جارج کے علاوہ بس ہم دو تین لوگوں کو تھا۔ بہرحال جو بھی ہے... اب یوں لگ رہا ہے کہ اس حوالے سے جارج کا فیصلہ چند گھنٹوں میں ہی سامنے آ جائے گا۔"

جارج کا فیصلہ تو سامنے نہیں آیا۔ ہم رات نو دس بجے کے لگ بھگ میڈم صفورا ہمارے بیڈ روم میں آئی۔ میں اور عمران اس وقت مونگ پھلی کھانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ ہماری گفتگو کا موضوع ہزاروں لوگوں کے سامنے اسحاق کی دردناک موت ہی تھی۔ وہ منظر کوشش کے باوجود ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ اس کی بے بسی،

اس کا کرب، ان گنت مشتعل لوگوں کے درمیان وہ یکسر تنہا اور زخم زخم تھا۔

میڈم کے آتے ہی ہم خاموش ہو گئے۔ وہ بولی۔ "تم لوگ راج بھون میں ہلچل مچا کر یہاں آرام سے بیٹھے ہوئے ہو۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی پنڈت مہاراج یہاں آئے ہوئے تھے۔ کسی خاص الخاص موقع کے سوا وہ کم ہی خود چل کر کسی کے پاس آتے ہیں۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ ان پر جج منٹ کی بھاری ذمے داری آن پڑی ہے۔ وہ خود کو پھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اگر درست فیصلہ دیتے ہیں تو حکم جی سمیت جارج کے خیرخواہ ناراض ہوتے ہیں اور غلط فیصلہ دے نہیں سکتے کیونکہ سب کچھ پرانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ جو لوگ دھرم کو سمجھتے ہیں، وہ اس فیصلے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔"

"کیا آپ سامبر کی لڑائی کی بات کر رہی ہیں؟"

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ "یہ بات پوری طرح پھیل گئی ہے کہ سلطانہ کے شوہر نے سر جارج کو 'مرو یا مارو' کا چیلنج دیا ہے۔ اب سامبر کے پرانے اصولوں کے مطابق جارج کو تابش کی یہ للکار قبول کر لینی چاہیے... اور یہی دلیرانہ فیصلہ بھی کہلائے گا مگر کچھ لوگ ایسا نہیں چاہتے۔ ان کا پوائنٹ آف ویو یہ ہے کہ یہ دو 'ہم رتبہ' افراد کا مقابلہ نہیں ہے۔ ایک عام شخص ہے، دوسرا ریاست کا ایک اہم ترین فرد ہے۔ اس پر بہت سی ذمے داریاں ہیں، بے شمار لوگوں کی بہتر زندگی اس کی سلامتی سے وابستہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسی سوچ رکھنے والے زیادہ تر لوگ وہی ہیں جن کا تعلق حکمران طبقے اور ہائی جینٹری سے ہے۔"

"اب پنڈت مہاراج کیا کہتا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"میں نے بتایا ہے نا کہ وہ پھنس گیا ہے۔ اب اس مسئلے کو حل کرنے کی ساری ذمے داری اس پر ڈال دی گئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کو لاء کی تشریح کرنی ہے اور یہ فیصلہ دینا ہے کہ جارج، تابش کا مطالبہ پورا کرنے کا پابند ہے یا نہیں۔ اب شاید وہ اس اہم 'جج منٹ' سے فرار حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔"

"درمیانی راستہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، وہ مجھ سے یہی بات کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ اگر تم خود ہی اپنے اس مطالبے سے دست بردار ہو جاؤ تو فیصلے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ یعنی تم کہہ دو کہ تم جارج سے 'مرو یا مارو' کی فائٹ نہیں چاہتے ہو۔"

"اس کے بدلے میں مجھے کیا حاصل ہوگا؟ مجھے تو ہارنے کی صورت میں سولی ہی چڑھنا ہے۔"

"میں نے بھی پنڈت مہاراج سے یہی بات کہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہو سکتا ہے، وہ اس سلسلے میں حکم جی سے تھوڑی بہت رعایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔"

"یعنی مجھے دو چار گھنٹے کے لیے سولی پر لٹکانے کے بجائے عمر بھر کے لیے لٹکا دیا جائے۔ زرگاں کی جیل میں ڈال دیا جائے... نہیں میڈم... مجھے یہ کڑی سزا منظور نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ جو بھی ہونا ہے، بس ان دو چار دنوں میں ہو جائے۔" میرا لہجہ حتمی اور فیصلہ کن تھا۔

میڈم نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر وہ عمران کو دیکھ کر بولی۔ "تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟"

چند لمحوں کے لیے میری اور عمران کی نگاہیں ٹکرائیں۔ ایک بجلی سی کوندی۔ یہ وہی بجلی تھی جو ہمیں ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ جو ہمیں یاد دلاتی تھی کہ ہم موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرا فیصلہ وہی ہوگا میڈم جو تابش کا ہوگا۔"

"تابش تو فیصلہ دے چکا ہے۔"

"تو میں بھی دے رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے میڈم! سزا میں رعایت کے نام پر جارج کی جیل میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک جانے کے بجائے آناً فاناً موت کو گلے لگانا اس کے لیے بہتر رہے گا۔"

میڈم کی آنکھوں میں ایک تعجب سا نظر آنے لگا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر اور دھواں فضا میں چھوڑ کر بولی۔ "بہرحال... تم لوگ کل تک اس بارے میں مزید سوچ لو۔"

"سوچ لیا میڈم۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میرا جواب ایک دن بعد بھی یہی ہوگا اور ایک ماہ یا ایک سال بعد بھی یہی۔ آپ پنڈت کو بتا دیں کہ میں اپنے پورے ہوش و حواس سے اپنے مطالبے پر قائم ہوں۔"

میڈم چلی گئی۔ میں نے عمران کی طرف دیکھا اور عمران نے میری طرف۔ میں یونہی تو اس پر ناز نہیں کرتا تھا۔ وہ میری رگ جاں سے قریب تر تھا۔ بارو بندا جیکی نے مجھے جسمانی طور پر مضبوط بنایا تھا لیکن عمران نے اس سے بڑا کام کیا تھا۔ اس نے مجھے روحانی اور ذہنی استقامت دی تھی۔ مجھے اندر سے بدلا تھا۔ اب بھی وہ اس نازک موقع پر مجھے ایک ایسی توانائی دے رہا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔ وہ

میرا دل بن کر میرے دل میں دھڑک رہا تھا۔ وہ میرے بازو بن گیا تھا، میرا حوصلہ بن گیا تھا۔

میری آنکھوں میں نمی آگئی۔ ''تھینک یو عمران۔'' میں نے دل کی گہرائی سے کہا۔

وہ چند لمحے چپ رہا پھر ایک دم پٹری سے اتر گیا۔ ''تھینک یو کس بات کا؟ یہ تو میرا پیشہ ہے یار۔ لوگوں کو ذرا کھڑکا کر ایک دوسرے سے لڑانا اور پھر کھٹا کھٹ بریکنگ نیوز بناتے جانا۔ اب دیکھنا، فساد پلس پہ کیسی کیسی لیڈ چلے گی... اور اس کے بعد تبصرے، تجزیے اور تڑفیے چلیں گے۔ تڑفیے سمجھتے ہو نا تم؟ ایسے ٹاک شوز جن میں گنجے دانشور اچھل اچھل کر تڑاق تڑاق کر لڑتے ہیں۔ اب ذرا تم سوچو، ایک تو دانشور ہو اوپر سے گنجا... وہ کیا قیامت ڈھائے گا۔ بس مزہ آجائے گا۔ یارا! آٹھ دس کروڑ تو ہم یہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی بنا لیں گے۔''

''یہ پنڈت مہاراج کی منافقت پر غور کیا ہے تم نے؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''یارا! غور کرنے کے لیے ناظرین جو ہوتے ہیں۔ ہمارا کام تو بس لپوڑی ڈالنا ہے اور وہ ہم انشاء اللہ ڈالیں گے۔''

میں نے اس کی طنزیہ گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہی منافقت ہے جو ہر مذہب کے کٹر لوگوں میں نظر آتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے علم کا سارا زور مذہب کو موم کی ناک بنانے پر صرف کر دیتے ہیں۔ اپنے گرو سورگ باشی سوبھاش کی کارستانیاں تو تمہیں یاد ہیں نا؟ اس کے دوغلے پن کی ایک چھوٹی سی مثال وہ گرم ٹھنڈے پانی والا معاملہ تھا۔ اپنی سہولت کے لیے اس نے ادھ بجھے انگاروں کو آگ کی تعریف سے خارج کر دیا تھا۔ اب دیکھو، یہی کچھ یہاں یہ لمبی زلفوں والا پنڈت مہاراج کر رہا ہے۔ ایک مشکل فیصلے سے بچنے کے لیے ''بیک ڈور'' کارروائیاں کر رہا ہے۔''

ہماری گفتگو کافی دیر جاری رہی پھر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اب میری طرح عمران بھی سخت قالین پر ہی سوتا تھا، ہاں وہ لحاف ضرور اوڑھتا تھا۔

ہم لال بھون کی اونچی دیواروں میں بند تھے۔ چاروں طرف کڑا پہرا تھا۔ پھر بھی زرگاں کی صورت حال کی کچھ کچھ جھلکیاں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان جھلکیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ زرگاں کی فضاؤں میں ارتعاش اور ہلچل ہے۔ یہ ہلچل دو طرح کی تھی۔ ایک تو یہی جارج اور میری لڑائی والا معاملہ تھا۔ اس لڑائی کو یوں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ اس سے پہلے میں نل پانی میں رنجیت جیسے شخص کو ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ دوسری ہلچل ساتویں سالانہ جشن کی تھی۔ یہ جشن بھی چند روز میں پہنچا چاہتا تھا۔ اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہماری معلومات کے مطابق زرگاں کے گلی کوچوں کو سجایا سنوارا جا رہا تھا۔ مختلف کھیل تماشوں کا انتظام ہو رہا تھا۔

ایسے ہی کچھ کھیل تماشوں کی تیاری لال بھون کے اندر بھی ہو رہی تھی۔ میں حسب معمول دوپہر سے ذرا پہلے جم میں ورزش اور مشق کے لیے چلا گیا۔ عمران کچھ دیر میرے ساتھ رہا پھر وہ گیتا مکھی کے ساتھ ایک پھول دار روش پر ٹہلتا ٹہلتا کسی طرف نکل گیا۔ میں اکیلا ہی لگا رہا۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹنے لگا اور رگ پٹھے اپنی برداشت کی آخری حد کو چھونے لگے۔ میں اپنی دیوانہ وار کوشش سے ہر روز اس حد کو تھوڑا سا وسیع کر دیتا تھا۔ دوران مشق میں جم کے دروازے کھڑکیاں بند کر لیتا تھا کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ لال بھون کے گارڈز اور ملازمین کھڑکیوں اور دروازوں کی جھریوں سے مجھے دیکھنا پسند کرتے تھے۔

عمران کو اوجھل ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ ورزش ختم کر کے میں نے پسینا پونچھا۔ کچھ دیر تک سانسیں درست کیں اور پھر عمران کی تلاش میں نکلا۔ وہ یہاں بھی بڑی تیزی سے اپنی جگہ بنانے لگا تھا۔ کبھی کسی سے گپ شپ کرتا نظر آتا تھا، کبھی کسی کا کوئی مسئلہ حل کرنے میں لگا ہوتا تھا۔ لال بھون میں سب کو یہی معلوم تھا کہ وہ میڈم کا خصوصی ملازم ہے۔ اسے مارشل آرٹ کی کچھ سمجھ بوجھ ہے اور میڈم کا ارادہ اسے اپنے ذاتی محافظوں میں شامل کرنے کا ہے۔

میں عمران کو ڈھونڈتا ہوا اندرونی حصے میں پہنچا تو وہ مجھے ایک بڑے ہال کمرے میں ملا۔ یہاں بڑی رونق تھی۔ خوبرو لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی بازی گری اور شعبدہ بازی کی ریہرسل کر رہی تھی۔ لڑکے لڑکیوں کی عمریں پندرہ بیس سال کے درمیان رہی ہوں گی۔ میں آج انہیں پہلی بار یہاں دیکھ رہا تھا۔

ایک طرف جمناسٹک کے انتظامات تھے۔ ایک طرف تنے ہوئے رسّے پر چلا جا رہا تھا۔ پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی چالیس عدد لڑکیاں بھی اس ریہرسل کو انجوائے کر رہی تھیں۔ ایک جانب منیجر مدن بھی بیٹھا تھا۔ مدن کے قریب عمران ایک نوخیز لڑکی کے ساتھ تند و تیز گفتگو میں مصروف تھا۔ لڑکی نے سرخ رنگ کا نیم عریاں لباس پہن رکھا تھا۔

میں نے قریب کھڑی گیتا سے پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے؟''

وہ بولی۔ ''یہ لال کپڑوں والی لڑکی بہت زبردست بازی گر ہے۔ اسے یہاں لٹل مس انڈیا کہا جاتا ہے۔ تمہارا دوست خوامخواہ اس کے ساتھ میچ ڈال کر بیٹھ گیا ہے۔''

''کیسا میچ؟''

''یہ لڑکی لوہے کے اس چکر کے اوپر کھڑی ہو کر اسے اپنے پاؤں سے چلاتی ہے اور ساتھ ساتھ کرتب دکھاتی ہے۔ تمہارا دوست کہتا ہے کہ وہ بھی ایسا کر لے گا۔'' گیتا نے تھوڑی دور پڑے ایک آہنی چکر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کڑا نما چکر زمین سے قریباً آٹھ فٹ اونچا تھا۔ اسے ایک چھ سات انچ چوڑی آہنی پٹی کو گول کر کے بنایا گیا تھا۔ اس پر چڑھنے کے لیے لکڑی کا ایک اسٹول بھی پڑا تھا۔

بظاہر اس چکر کے اوپر چڑھ کر اسے پاؤں سے گول گول دھکیلنا اور ساتھ ساتھ کوئی کرتب دکھانا کافی مشکل کام لگتا تھا لیکن عمران جیسے شخص کے لیے ہرگز مشکل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں کوئی جانتا نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ماہر فنکار ہے اور اس سے کئی گنا زیادہ مشکل کام کر سکتا ہے۔

معاملہ کافی گرما گرم تھا۔ لٹل مس انڈیا کے حمایتی اس کے حق میں چلا رہے تھے اور عمران کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ اپنا دعویٰ ثابت کر کے دکھائے۔ سترہ اٹھارہ سالہ نوخیز لڑکی بھی لال بھبوکا ہو رہی تھی۔ وہ زور سے بولی۔ ''اچھا تم باقی چھوڑو، پہلے والا آئٹم ہی کر کے دکھا دو۔''

''اوکے۔'' عمران نے سینہ تان کر کہا۔ ''میں کروں گا۔''

''لو، میں تمہارے لیے ایک بار پھر دہرا دیتی ہوں۔'' لڑکی تند لہجے میں بولی۔

گیتا مکھی نے ایک چھوٹے اسٹول پر کھڑے ہو کر اناؤنسمنٹ کے انداز میں کہا۔ ''لو بھئی، لڑکے لڑکیو! لٹل مس انڈیا بمقابلہ بگ مسٹر پاکستان۔''

''ہو ہا'' کا شور بلند ہوا... سرخ کپڑوں والی نوخیز لڑکی پھرتی سے اسٹول پر چڑھی اور پھر لوہے کے چکر پر کھڑی ہو کر توازن درست کرنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلا دیے تھے۔ ایک دوسری لڑکی نے اس کی دونوں ہتھیلیوں پر دو لمبی تلواریں رکھ دیں۔ یہ بالکل سیدھی تلواریں تھیں۔ لڑکی نے رومن اسٹائل تلواریں اپنی دونوں ہتھیلیوں پر عمودی رخ سے کھڑی کیں اور انہیں بیلنس کر لیا پھر وہ اپنے پاؤں کے ساتھ، چھ سات انچ چوڑے آہنی چکر کو گول گول دھکیلنے لگی۔ اس نے تماشائیوں کے درمیان دو راؤنڈ مکمل کیے۔ تلواروں کو ہتھیلیوں پر بیلنس رکھنے کے ساتھ ساتھ چکر کو دھکیلنا واقعی مشکل کام لگتا تھا۔

لڑکی نے دو راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد تلواریں پھینکیں اور خوب صورت انداز میں قلابازی لگا کر فرش پر آگئی۔ تالیوں سے ہال گونج گیا۔

اب عمران کی باری تھی۔ اس نے پہلے فرش پر کھڑے ہو کر تلواروں کو اپنی ہتھیلیوں پر کھڑا کیا۔ بھرپور کرتب کے لیے اسٹول پر چڑھ کر چکر پر کھڑا ہو گیا۔ کرتب مشکل تھا لیکن عمران جیسے شخص کے لیے نہیں۔ اس نے تلواروں کو ہتھیلیوں پر کھڑا کر کے بیلنس کیا پھر آہستہ آہستہ آٹھ فٹ اونچے چکر کو اپنے پاؤں سے دھکیلنے لگا۔ دو چار لوگ عمران کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے مگر اکثریت لٹل مس انڈیا کی حمایتی تھی۔ یہ لوگ عمران کو ''ہوٹ'' کر رہے تھے اور ڈرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

عمران نے ایک راؤنڈ مکمل کیا پھر دوسرا شروع کیا اور تب وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ کم از کم مجھے تو ہرگز نہیں تھی۔ عمران لڑکھڑایا، سنبھلنے کی کوشش کی۔ ایک تلوار گر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا توازن دوبارہ حاصل کرتا، آہنی چکر اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گیا... وہ آٹھ فٹ کی بلندی سے اڑتا ہوا نیچے آیا۔ ایک دم شور بلند ہوا، اس میں قہقہے بھی شامل تھے۔ عمران نیچے بیٹھے تماشائیوں پر گرا تھا۔ یہ وہی پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی دوشیزائیں تھیں۔ جو ایک دو لڑکیاں اس کے نیچے آئیں، وہ بُری طرح چلائیں۔ عمران کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے نیچے آنے والی لڑکیوں میں سے ایک زخمی ہوئی تھی۔ عمران نے جو تلوار پکڑ رکھی تھی، اس کی نوک لڑکی کی گردن کو چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ لڑکی کا خون رسنے لگا تھا اور وہ تکلیف سے دُہری ہو گئی تھی۔ میں دیکھ کر بُری طرح ٹھٹکا۔ یہ ثمرین تھی۔ میں تیزی سے اس کی طرف گیا۔ زخم گہرا نہیں تھا لیکن پانچ چھ انچ لمبا اور قریباً دو انگل چوڑا تھا۔ وہ گردن سے شروع ہو کر اس کے کان کی لو تک چلا گیا تھا۔

''ویری ساری... ویری ساری۔'' عمران بار بار کہہ رہا تھا۔

''اوہ گاڈ۔'' گیتا زخم دیکھ کر بڑبڑائی۔

اس نے اپنی ساڑی کے پلو سے ثمرین کا خون روکا اور اسے لے کر ہال سے نکل گئی۔ سرخ کپڑوں والی لڑکی کے حمایتی، فاتحانہ نعرے لگا رہے تھے۔ عمران پہلے تو کھسیانا نظر آیا... پھر اس نے کھلے دل سے ہار مان لی اور تند و تیز فقروں کی

طرف سے کان لپیٹ کر وہاں سے نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم آگے پیچھے کمرے میں آئے۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' میں نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''وہی جو تم نے دیکھا ہے۔''

''مسخری مت کرو عمران... مجھے بتاؤ ایسا کیوں کیا ہے؟''

''یار! کیا خوبرو لڑکیوں کے اوپر گرنا تمہارا ہی حق ہے۔ آخر ہم بھی سینے میں دل رکھتے ہیں۔ جب گر ہی گئے تو سوچا کہ چلو کسی اچھی جگہ پر گریں...''

''تم بکواس کر رہے ہو... تم... تم... جان بوجھ کر گرے ہو۔ جان بوجھ کر ہارے ہو۔ کیا ضرورت تھی اس طرح اپنی بے عزتی کرانے کی... اور پھر اس لڑکی کو جو چوٹ لگی ہے، اس کا ذمے دار کون ہے؟''

''ذمے دار کوئی نہیں... ایسا حادثہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے یار۔ جہاں تک بے عزتی کی بات ہے، ہم پہلے ایسے کون سے نواب عزت بیگ تھے۔''

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو... ہپناٹزم کرنے کا ارادہ ہے کیا؟'' وہ بولا۔

میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''تم بہت اونچی شے ہو عمران... تم نے... جان بوجھ کر ثمرین کو زخم لگایا ہے نا؟''

''توبہ توبہ۔'' وہ گال پیٹنے لگا۔ ''اتنا بڑا الزام اور وہ بھی جمعتہ المبارک کے دن۔''

''یہ الزام نہیں... حقیقت ہے... میں سمجھ گیا ہوں... سب سمجھ گیا ہوں۔ تم نے کہا تھا ثمرین بچ سکتی ہے... اور تم نے اس کو بچایا ہے... تم نے اسے داغ دار کیا ہے... کیونکہ تم جانتے ہو کہ بے داغ اور بے عیب لڑکی ہی فیری سلیکشن میں حصہ لے سکتی ہے۔''

اس نے دیدے گھمائے۔ ''زبردست... ونڈرفل... یار! تم واقعی سپر جینئس ہو۔ بندے کے اندر ایسی عقل مندیاں ڈھونڈ لیتے ہو جو اس نے کی ہی نہیں ہوتیں۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بھئی واہ... یہ مجھ سے کیا بے ساختہ کارنامہ سرزد ہو گیا ہے۔ بھئی واہ۔''

مجھے پتا تھا، وہ بدستور بکواس کر رہا ہے۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''تم کو سمجھنا بڑا مشکل ہے عمران... پتا نہیں کیا شے ہو تم؟''

''میں کوئی شے نہیں۔ بس یہ تمہارا حسنِ نظر ہے۔ شہزادے۔ مجھے ایسی فلموں کا ہیرو بنا دیتے ہو جن کا میں نے صرف نام سنا ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہے، فلم پاکیزہ میں دلیپ کمار کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

میں خاموش رہا۔ وہ میری طرف سے خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا۔ تم کہنا چاہ رہے ہو کہ فلم پاکیزہ میں تو دلیپ کمار تھا ہی نہیں... بھئی یہی ہوا تھا نا۔ اسے فلم میں لیا ہی نہیں گیا اور اس کی جگہ راج کمار کو لے لیا گیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ فلم آن میں بھی ہوا تھا...'' وہ ایک بار پھر اوٹ پٹانگ بولتا چلا گیا۔

...وہ رات خاصی تاریک تھی۔ میں اور عمران پہلو بہ پہلو قالین پر لیٹے تھے۔ وہ رو دن سے زبردستی مجھے بھی لحاف اوڑھا رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے لیکن دونوں کے ذہنوں میں یقیناً ایک ہی طرح کے خیالات گھوم رہے تھے۔ وہ مقابلہ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے زرگاں میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ صیاد خود اپنے دام میں آ گیا ہے۔ اب بات خود جارج کے ہاتھ سے بھی نکلی ہوئی لگتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس مقابلے کی نوعیت اور دیگر شرائط کے بارے میں جو فیصلہ بھی ہونا ہے، وہ پنڈتوں، پنچوں اور دیگر عمائدین نے کرنا ہے اور آخری رائے پنڈت مہاراج کی ہوتی ہے۔

رات کا پتا نہیں وہ کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی، فقط ایک کھڑکی میں سے تھوڑی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ مجھے عمران نے ہی ہلا کر جگایا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکنا اور چوکس نظر آتا تھا۔ اس نے دونوں لحافوں کو قالین پر اسی طرح پڑا رہنے دیا جیسے ان کے نیچے کوئی لیٹا ہو۔ پھر وہ قالین پر اوندھے منہ رینگتا ہوا غسل خانے کے دروازے کی طرف گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میری ساری حسیات آناً فاناً بیدار ہو گئی تھیں اور میں سمجھ گیا تھا کہ ہم کسی شدید خطرے میں ہیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم تاریک سرد غسل خانے کے اندر تھے۔ عمران نے دروازے میں تھوڑی سی جھری رہنے دی اور باہر دیکھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے کمرے کی کھڑکی کے پاس کسی سائے کی حرکت محسوس ہوئی...

پہنچ سکتے تھے اور ان میں کسی بھی وقت لڑائی چھڑ سکتی تھی۔ کلثوم کے فرار کے بعد مہندر نے اس کا الزام رام پرشاد کی بہو پر لگایا اور فیصلہ ہوا کہ رام پرشاد جلتے تیل میں ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے گا۔ پھر پرکھشا کا وقت آ گیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل میں ہاتھ ڈال دیے۔ وہ چلانے لگا۔ اس کے ہاتھ جل گئے تھے پھر جنونی ہندوؤں نے رام پرشاد کو ہلاک کر دیا اور مالا کو پکڑ لائے۔ اب اسے جلتے تیل میں پھینکا جانے والا تھا۔ پھر عمران نے کچھ کرنے کا کہا اور گولی چلا دی۔ مہندر مارا گیا۔ پنچایت کے آدمیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور وہ لوگ مالا کو نکال لے گئے۔ ہم واپس تہ خانے میں آ گئے۔ میری گردن کے زخم سے خون کا رساؤ پھر شروع ہو گیا تھا اور تکلیف بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں درد سے تڑپتا رہا۔ درد شدید تھا۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ عمران ڈاکٹر لی وان کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے آیا اور اسے میرا آپریشن کرنے پر مجبور کیا۔ اس میں میری جان بھی جا سکتی تھی۔ خیر میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ دس روز بعد میں پوری طرح صحت یاب ہو گیا تھا۔ میں اور عمران راج بھون پہنچ گئے۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی تھا۔ ہم وہاں موجود پہرے داروں کو پچھاڑ کر اندر داخل ہوئے۔ وہاں ٹھکم جی کے بیٹے کی پیدائش پر جشن منایا جا رہا تھا۔ ہم نے فائرنگ کر دی۔ ڈاکٹر واسکل کا بھائی اس فائرنگ میں مارا گیا۔ ایک دو بندے زخمی ہوئے۔ پانڈے نے ہمارا پیچھا کیا مگر وہ بھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم ایک ہندو فیملی کے گھر میں گھس گئے اور جنتی نامی لڑکی کو یرغمال بنا لیا مگر اس نے ہم سے پورا تعاون کیا۔ اسی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ اسحاق کو سزائے موت دی جا رہی ہے۔ ہم وہاں سے نکلے مگر اسحاق کے لیے کچھ نہ کر پائے۔ اسے بے انتہا اذیت دے کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ہم نے عہد کیا کہ اسحاق کی ایک ایک چیخ، ایک ایک درد کا بدلہ ضرور لیں گے۔ ہم وہاں سے نکل رہے تھے کہ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آیا۔ وہاں موجود افسر کو دیکھ کر میں سکتہ زدہ رہ گیا۔ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ جو مارا گیا تھا، وہ اس کا چچا زاد گرومیت پانڈے تھا۔ پھر میں عمران کو ایک قہوہ خانے میں چھوڑ کر میڈم صفورا کے پاس چلا گیا۔ اس کی سزا معاف ہو گئی تھی اور وہ لال بھون پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا اور عمران کے بارے میں بھی بتا دیا۔ پھر عمران بھی وہاں پہنچ گیا مگر میڈم نے ہمیں دھوکا دیا اور کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔ وہ اپنی بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ وہاں میڈم کے گارڈز اور اس کے ساتھ لڑائی ہوئی تاہم اس دوران میں میڈم کو سانپ نے کاٹ لیا۔ عمران نے میڈم صفورا کی جان بچا لی۔ میڈم کا رویہ فی الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہو گیا۔ پھر میں ایک رات خاموشی سے نکل کر راج بھون پہنچ گیا اور جارج گورا کو ساہبر کا چیلنج کر ڈالا۔ مجھے ایک مہمان کے طور پر واپس میڈم صفورا کے پاس بھیج دیا گیا۔ عمران اور میڈم صفورا نے مجھے کہا کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ بہرحال میں نے وہاں اپنی جسمانی ورزش جاری رکھی اور مقابلے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک رات میں اور عمران سو رہے تھے کہ میری آنکھ عمران کے جگانے پر کھلی۔ عمران نے انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم غسل خانے کی طرف رینگ گئے۔ ہم نے دروازے میں تھوڑی جھری رہنے دی۔ یہی وقت تھا جب کھڑکی کے پاس کسی سائے کی حرکت محسوس ہوئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہم غسل خانے کی تاریکی میں دم سادھے کھڑے رہے اور صورت حال کا جائزہ لیتے رہے۔ سایہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ہم رات کو دروازہ مقفل کر کے سوتے تھے۔ یہ آہنی دروازہ تھا اور اس دروازے سے ملتا جلتا تھا جو چند روز پہلے فائرنگ کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا اور اسے کھولنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اب ہمارا کمرا تبدیل ہو چکا تھا۔

چند سیکنڈ مزید گزرے، پھر دروازے کے آہنی قفل میں چابی گھومنے کی بہت مدھم آواز سنائی دی۔ شک تو ہمیں پہلے ہی ہو رہا تھا، اب یقین ہونے لگا کہ یوں چوری چھپے ہمارے کمرے میں داخل ہونے والا اسی عمارت میں موجود افراد میں سے ہی کوئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہمارے محافظوں میں سے کوئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ بے آواز کھل گیا اور ایک دراز قد شخص دبے پاؤں اندر آیا۔ اس نے وارداتیوں کی طرح اپنا چہرہ ایک کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی جس کا بیرل معمول سے زیادہ لمبا نظر آ رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اندر آنے والے شخص کے جسم پر محافظوں والا مخصوص لباس ہے۔ وہ چند سیکنڈ تک تاریکی میں کھڑا دونوں لحافوں کو گھورتا رہا پھر اس نے رائفل سیدھی کی اور بڑی تیزی سے دونوں لحافوں پر پانچ چھ فائر کیے۔ فائرنگ کی آواز سے انکشاف ہوا کہ رائفل پر سائلنسر چڑھا ہوا ہے۔

فائرنگ کے فوراً بعد وہ مڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب عمران نے اپنی جگہ سے تیز رفتار حرکت کی اور غسل خانے سے نکل کر اڑتا ہوا سا حملہ آور پر جا پڑا۔ حملہ آور اس کے نیچے اوندھے منہ گرا اور گرتے ہوئے آہنی دروازے سے ٹکرایا۔ اس تصادم سے زبردست شور پیدا ہوا۔ حملہ آور یقیناً ایک زور آور شخص تھا لیکن اس کے لیے حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ جیسے تیورا کر رہ گیا۔ میں عمران کی مدد کے لیے آگے بڑھا تھا کہ اس وقت دروازے پر ایک اور پرچھائیں نظر آئی۔ یہ بھی ایک محافظ تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے بلاتردد مجھ پر فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ شعلہ چمکا اور گولی میرے آس پاس سے گزر گئی۔ میں نے حملہ آور کو دوسرے فائر کا موقع نہیں دیا اور اس پر جا گرا۔ میں نے سب سے پہلے اس کا پستول والا ہاتھ دبوچا۔ پھر دائیں ہاتھ کا مکا اس کے چہرے پر رسید کیا۔ یہ بڑی شدید ضرب تھی۔ مدمقابل کے دو تین دانت ضرور اپنی جگہ چھوڑ گئے ہوں گے۔ وہ کراہا اور اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس دوران میں وزنی بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور سات آٹھ گارڈز موقع پر پہنچ گئے۔ مجھے ایک دو لمحے کے لیے شدید خطرہ

محسوس ہوا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ گارڈز ہماری مدد کریں گے یا اپنے بیٹی بھائیوں کی۔

''خبردار... خبردار۔'' کی آوازیں گونجیں۔

دو محافظوں نے میرے نیچے دبے ہوئے شخص کے سر سے رائفلیں لگا دیں۔ چند محافظوں نے عمران کا ہاتھ ہٹایا اور دوسرے حملہ آور کو دبوچ لیا۔ لال بھون میں ہر طرف کھلبلی مچ گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں اور بھاگتے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دونوں حملہ آوروں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ سیاہ رنگ کے ڈھاٹے ان کے چہروں سے علیحدہ کیے گئے، ہم نے پہچان لیا۔ یہ ہمارے محافظوں میں سے ہی تھے۔ ہم دن میں کئی بار انہیں اپنے آس پاس دیکھتے تھے۔ جس شخص کو میرا مکا لگا تھا، اس کے دہن کا کباڑا ہو گیا تھا۔ دونوں ہونٹ پھٹ گئے تھے اور دو تین دانت اپنی مقررہ جگہ سے غیر حاضر تھے۔

ہم پر گولی چلانے والا دراز قد محافظ پہلے تو سکتہ زدہ رہا پھر میری طرف رخ کر کے طیش میں چلانے لگا۔ ''تم کو جندہ ناہیں چھوڑیں گے۔ ماریں گے تم کو۔ تم بچ جات... تم گندی نالی کے کیڑے۔ تم کو یہ جرأت ناہیں کرنے دیں گے، ناہیں کرنے دیں گے۔''

یقیناً وہ سامبر کی لڑائی کا ذکر کر رہا تھا اور اپنی اس تکلیف کا اظہار کر رہا تھا جو راج بھون کے بلند و بالا دروازے کے سامنے میری ''للکار'' نے اسے پہنچائی تھی۔ محافظوں نے دونوں حملہ آوروں کی مشکیں کس دیں۔ اسی دوران میں منیجر بدن اور میڈم صفورا وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ میڈم سلیپنگ گاؤن میں تھی اور اس کے چہرے پر سخت اچلجل تھی۔

''کیا ہو رہا ہے؟ واٹ از گوئنگ آن ہیئر؟'' وہ گرجی۔

پھر چند ہی سیکنڈ میں ساری صورت حال اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ اگر محافظوں میں سے دو محافظ قاتل کا روپ دھار سکتے ہیں تو دو چار اور بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ضروری تھا کہ مجھے فوراً موقع سے ہٹا لیا جاتا۔ اس نے ہمیں اپنے ساتھ لیا اور اپنے خصوصی پورشن میں لے آئی۔ یہ لگژری پورشن الیکٹرک ہیٹرز سے گرم تھا۔ ''جب تک میں نہ کہوں، تم دونوں یہاں سے باہر نہیں نکلنا۔'' وہ بولی۔

''آپ بے فکر رہیں۔'' عمران نے اسے تسلی دی۔

وہ جلدی سے باہر چلی گئی۔

''یہ سب کیا ہے یار؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''اسے اردو میں شب خون اور انگریزی میں نائٹ اٹیک کہتے ہیں۔ فرانسیسی میں بھی اس کے لیے ایک بھلا سا لفظ ہے، اس وقت یاد نہیں آرہا۔''

''لیکن اس قاتلانہ حملے کا مقصد کیا تھا؟''

''اصل مقصد تو میڈم ہی ڈھونڈ کر لائے گی۔ ہم تو بس اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔ بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ یہ لوگ تمہیں جارج گورا کے مدِمقابل دیکھنا نہیں چاہتے۔''

''تمہیں پتا کیسے چلا کہ کوئی ہمارے کمرے کی طرف آرہا ہے؟''

''یار! میں نیوز چینل کا چڑیلا ہوں۔ ایک تو چڑیلا دوسرا نیم چڑھا۔ ہماری ناک بہت تیز ہوتی ہے بلکہ ہم تو مجسم ناک ہوتے ہیں۔ ان واقعات کی بو بھی سونگھ لیتے ہیں جن کی بو ہی نہیں ہوتی، یعنی جو وقوع پذیر ہی نہیں ہوتے لیکن جس تازہ واقعے کی تم بات کر رہے ہو، اس کا شک مجھے کل شام سے ہی تھا۔ دراصل بڑے پنڈت کا یہاں آنا اور میڈم سے مل کر تمہیں مقابلے سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ہر صورت تمہیں سامبر سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''تم نے سامبر کی صورت ہی ایسی بنا دی ہے۔ اسے مرو یا مارو کی لڑائی کا ناک نقشہ دے دیا ہے اور یہ بات ہر جگہ پھیل بھی چکی ہے۔''

''اسے پھیلانے والے بھی تم ہی ہو۔ تم نے جان بوجھ کر گیتا کے سامنے بات کی۔ تم بڑے زبردست قسم کے کھوجی ہو عمران۔ میں اب آہستہ آہستہ تمہیں سمجھنا شروع ہو گیا ہوں۔''

''ایسے ہی موقع کے لیے محمد رفیع صاحب بڑے فلسفے کی بہت گہری بات کہہ گئے ہیں۔ تم نے بھی سنا ہوگا، میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے۔''

''یہ کیا بے تکی بات ہے؟''

''اور پھر بھی تم کہہ رہے ہو کہ آہستہ آہستہ مجھے سمجھنا شروع ہو گئے ہو؟ اس شعر میں چاند کے ٹکڑے سے مطلب انسان کے بیکار خیالات ہیں اور ''کھڑکی'' دماغ کا استخارہ ہے۔''

''یہ استخارہ نہیں استعارہ ہوتا ہے... اور اب تم چپ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔''

میں اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم ایک خطرناک حملے سے بال بال بچے ہیں۔ یہ سب کھلی آنکھوں کے خواب جیسا لگ رہا تھا۔

میڈم کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے بتایا۔ ''پکڑے جانے والے حملہ آوروں کے نام امرت اور ٹھکر ہیں۔ ان کے چار اور ساتھی بھی حراست میں لے لیے گئے ہیں۔ یہ سارے یہاں کے گارڈز ہیں۔''

''یہ سب کرایا کس نے ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''ابھی پورے یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر لگتا یہی ہے کہ اس کے پیچھے حکم جی کے کسی قریبی ساتھی کا ہاتھ ہو گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے میڈم نے اپنی آواز بہت دھیمی کر لی۔

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''یہ لوگ ظاہر تو نہیں کر رہے لیکن اندر خانے ان کی مرضی یہی ہے کہ تمہارے اور جارج کے درمیان مرو یا مارو والی فائٹ نہ ہو۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کا اتنا قریبی دوست کسی ایسی لڑائی کا شکار ہو جائے... لیکن میں پھر کہتی ہوں، ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ ان دو گارڈز کا انفرادی فعل ہی ہو۔ بہرحال یہ بات تو کنفرم ہے کہ تمہیں یہاں بہت زیادہ سیکیورٹی کی ضرورت ہے... اور میں اس سیکیورٹی کا ارجنٹ انتظام کر رہی ہوں۔''

ہم دونوں پر ہونے والے اس قاتلانہ حملے کی خبر بھی بہت جلد زرگاں میں پھیل گئی... اگلے روز دوپہر کے وقت میں اور عمران ''جم'' جانے کے لیے کمرے سے نکلے تو بڑی بڑی مونچھوں والے ایک سینئر گارڈ نے ہمیں روک لیا۔

''ناہیں سر!'' اس نے ادب سے کہا۔ ''اوپر سے آرڈر ہے۔ آپ ابھی کمرے سے ناہیں نکل سکتے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟ میڈم کہاں ہیں؟'' میں نے تنک کر پوچھا۔

''میڈم ابھی بھون سے باہر ہیں۔ وہ تھوڑی دیر میں آوت ہیں تو ان سے بات کر لیجیے گا۔'' گارڈ بولا۔

''تم زیادہ تھانے دار بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں اپنی ذمے داری پر جا رہا ہوں۔''

''میں شما چاہت ہوں سرکار۔ یہ میری نوکری کا سوال ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، آپ کی رکھشا کے لیے کر رہے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میری اور سینئر گارڈ کی گفتگو تکرار کی شکل اختیار کرتی، گیتا بھی وہاں آ گئی۔ وہ بہت چست لباس پہنتی تھی اور اس کے جسم میں ماہر رقاصاؤں جیسا لوچ تھا۔ اس نے مداخلت کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ اندر آنے کے لیے کہا۔ میں اور عمران، گیتا کے ساتھ واپس کمرے میں آ گئے۔ گیتا عمران سے خفا خفا نظر آتی تھی۔ اس خفگی کی وجہ وہی ثمرین والا واقعہ تھا۔ اس دن وہاں بالکل ''مقابلے'' والا ماحول بن گیا تھا۔ مس انڈیا اور مسٹر پاکستان کے نعرے گونجے تھے۔ عمران کرتب دکھاتے ہوئے بلندی سے ثمرین پر گرا تھا اور اسے زخمی کر دیا تھا۔ یہ بات اب تقریباً طے تھی کہ گیتا بھی اپنی ایک قیمتی شاگرد سے محروم ہو چکی ہے۔

کمرے میں آ کر گیتا نے مجھے مخاطب کیا اور اپنے مخصوص بازاری انداز میں بولی۔ ''اس بے چارے سے آپ کیوں مغز ماری کرت ہو۔ وہ آرڈر سے مجبور ہے۔ ابھی میڈم جی آجاوت ہیں، جو کہنا ہے ان سے کہہ لینا۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ دونوں کا جیون بچ گیا۔ ویسے ابھی بھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں۔ کل رات میڈم جی نے یہاں کے تقریباً سارے گارڈز تبدیل کر دیے ہیں۔ سات آٹھ بندوں کو پکڑا بھی گیا ہے۔''

''شہر کی کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

''آج تو میرا من بھی چاہ رہا ہے کہ لڑکیوں کی طرح آپ جناب سے آٹو گراف مانگوں اور سوال جواب کروں۔ رات والے واقعے کے بعد آپ کی شہرت میں ایک دم اضافہ ہوا ہے۔ ہر جگہ آپ ہی کا چرچا ہے۔ زیادہ تر لوگن کا یہی وچار ہے کہ راج بھون میں حکم جی کے کچھ ساتھی ناہیں چاہت ہیں کہ آپ جارج گورا سے دوبدو مقابلہ کریں۔ وہ یہ مقابلہ رکوانے کے لیے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری طرف راج بھون سے سختی کے ساتھ اس بات سے انکار کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ دو تین لوگن کا ذاتی جرم ہے اور اس کا بوجھ دوسروں کے سر نہیں ڈالنا چاہیے۔ راج بھون کی طرف سے لوگن سے اور خاص طور سے مسلمان شہریوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ پُرسکون رہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہووے گا، قانون قاعدے کے مطابق ہووے گا۔''

''مسلمانوں سے خاص اپیل کرنے کی ضرورت کیوں پڑی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

گیتا بولی۔ ''سچی بات یہ ہے کہ جب سے جارج صاحب اور سلطانہ والا واقعہ ہوا ہے، مسلمان آبادی جارج صاحب کے خلاف ہے۔ اب انہیں پتا چلا ہے کہ سلطانہ کا پتی جارج صاحب سے دوبدو لڑائی کے لیے یہاں پہنچا ہے تو ان

کا جوش تازہ ہوگیا ہے اور پرانے زخم بھی ہرے ہوگئے ہیں۔ ان لوگن نے اس مقابلے کے ساتھ اپنی بہت سی آشائیں جوڑ لی ہیں۔ اگر تم یہاں زرگاں میں راتوں رات مشہور ہوئے ہو تو اس کا ایک کارن یہ بھی ہے۔ ان لوگن کو پورا وشواس ہے کہ صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ تمہارا جارج کے محافظوں کو ادھیڑ کر یہاں سے بھاگنا، پھر نل پانی میں پانڈے کو نیچا دکھانا، پھر یہاں آنا اور جارج صاحب کو للکارنا... اور آخر میں انہیں ''مرد یا مارد'' کا چیلنج دینا یہ ساری باتیں ان لوگن کے لیے بڑے اچنبھے کی ہیں۔ ان کا یہ دچار پکا ہو رہا ہے کہ تمہارے کارن کوئی انہونی ہو گی۔''

''جارج گورا صاحب کیا فرماتے ہیں؟'' عمران نے گیتا سے استفسار کیا۔

وہ عمران کو ناگواری سے دیکھ کر بولی۔ ''گورا صاحب بہت غصے میں ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی ساکھ خراب ہو رہی ہے۔ لوگن ان کو شکتی دیوتا کے نام سے یاد کرت ہیں مگر اب اس طرح کی سوچ پھیل رہی ہے کہ شاید جارج صاحب خود بھی سامبر لڑنا نا ہیں چاہتے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آج کا دن بہت اہم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شام سے پہلے جارج صاحب تمہارے چیلنج کے بارے میں کوئی واضح اعلان کر دیں۔''

''میرا چیلنج؟''

''ہاں، یہی مرد یا مارد والی بات۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیویں اور اس شبھ گھڑی کا اعلان بھی کر دیویں جو پنڈتوں نے نکالی ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جارج صاحب ایسے خطروں سے ڈرنے والے نا ہیں۔ تم وشواس رکھو کہ اگر تمہارا مقابلہ ہوا تو ایک دلیر آدمی سے ہووے گا۔''

''دلیر نہیں گھمنڈی۔'' میں نے کہا۔

''تم کچھ بھی کہہ لو لیکن یہ بات اپنی جگہ ٹھوس حقیقت ہے کہ یہاں جارج صاحب کے بے شمار پرستار بھی ہیں۔ اچھائیاں برائیاں تو ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ جارج صاحب کی ایک بڑی اچھائی یہ ہے کہ وہ بڑے دل کے مالک ہیں۔ ان کے پاس دھن ہے اور وہ دھن کو خرچ کرنا بھی جانت ہیں۔ زرگاں کے بے شمار لوگن کو ان کی خیر خیرات سے فائدہ پہنچتا ہے۔''

''تمہاری عقل کا ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے گیتا کھی۔ تم جیسے ہندوستانی ہی ہیں جنہوں نے ہر دور میں باہر سے آنے والے زور آوروں کے سامنے سر جھکانے کی ریت نبھائی ہے۔ جس کو تم خیر خیرات کہہ رہی ہو یہ زناکاریوں اور عیش پرستیوں کا عوضانہ ہے اور یہ عوضانہ بھی تمہارے ہی خون پسینے کی کمائی سے دیا جاتا ہے۔ ان گوری چمڑی والوں کے لیے یہاں کے لوگ بھک منگوں اور بے غیرتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ جو کچھ ان بھک منگوں اور بے غیرتوں کو دے رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ وصول کرتا ہے اور اس کام میں تمہارا حکم جی اس کا مددگار ہے۔''

میرے ان سخت ریمارکس پر گیتا کھی نے ناراضی کا اظہار کیا لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس ناراضی کی تہ میں کہیں میری دبی دبی تائید بھی موجود ہے۔

گیتا کھی ایک چلتی پھرتی جہاندیدہ عورت تھی۔ اس نے جارج گورا کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ درست ثابت ہوا۔ شام سے پہلے ہی سرجن اسٹیل اپنے سالے جارج کی نمائندگی کرتے ہوئے لال بھون میں پہنچ گیا۔ وہ ہم سے انگلش میں بات کرتا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا۔ ''جارج صاحب نے پنڈتوں سے مشورے کے بعد تمہارا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ''مرد و مارد'' کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بہرحال، اس کے لیے چند چھوٹی چھوٹی شرطیں بھی ہیں۔''

''مجھے یہ شرطیں بغیر سنے منظور ہیں۔ مجھے بتاؤ مقابلہ کب ہے؟'' میں نے اسٹیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''پنڈت مہاراج نے دو شبھ گھڑیاں نکالی تھیں۔ ایک شبھ گھڑی عین ساتویں کے جشن کے روز آ رہی ہے۔ دوسری جشن کے تین دن بعد۔ مشورے سے فیصلہ ہوا ہے کہ تمہارے اور جارج صاحب کے درمیان سامبر کی رسم جشن کے بعد ہوگی۔ جشن کے تیسرے روز سورج ڈوبنے سے کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے۔''

''یہ کس طرح کی لڑائی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس میں کوئی آتشیں ہتھیار استعمال نہیں ہوگا کیونکہ تمہاری خواہش کے مطابق یہ دست بدست لڑائی ہے۔ موقع پر تین یا چار تیز دھار آلے رکھے جائیں گے۔ جارج صاحب تمہیں پیشکش کریں گے کہ تم ان میں سے کوئی سا ایک آلہ اٹھا کر ان سے لڑ سکتے ہو۔ تم جو آلہ چنو گے، جارج صاحب بھی اس جیسا آلہ استعمال کرنے کے حق دار ہوں گے۔'' پھر سرجن اسٹیل نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ ان آلاتِ ضرب میں کٹاری، چاقو اور چھوٹے دستے کی کلہاڑی جسے مقامی زبان میں دتی کہا جاتا ہے، شامل ہوں گے۔

اسٹیل نے کچھ دیگر شرائط بھی بتائیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی کہ مرد یا مارد کی لڑائی کے باوجود جارج گورا کے پاس مجھے سزائے موت دینے یعنی سولی پر ٹانگنے کا آپشن موجود رہے گا۔ اپنے جیتنے کی صورت میں جارج گورا مجھے موقع پر ختم کرنے کے بجائے سولی پر چڑھانے کا شوق پورا کر سکے گا۔

دیگر شرائط کی طرح میں نے یہ شرط بھی فوراً منظور کر لی... میں کشتیاں جلا چکا تھا، اب مجھے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا تھا۔ مجھے صرف جیتنا تھا اور جیتنا تھا... اور جب مجھے صرف جیتنا تھا تو پھر سزائے موت کا تذکرہ میرے نصاب سے باہر تھا۔ میں وجدانی جوش کے ایک ایسے دھارے میں بہا جا رہا تھا جس کے رخ اور بہاؤ کا خود مجھے بھی ٹھیک سے علم نہیں تھا۔ یہ ایک جنون تھا، دیوانہ پن تھا۔ یہ وہی ضد تھی جو شیشے کو پتھر سے ٹکراتی ہے اور پھر پتھر کو توڑنے کا عزم بھی رکھتی ہے۔

میں نے اسٹیل کی ساری باتوں کے جواب میں بس ایک ہی بات کہی۔ ''میری صرف ایک ہی شرط ہے مسٹر اسٹیل! اور یہ وہ شرط ہے جو جارج شروع میں ہی مان چکا ہے۔ میرے جیتنے کی صورت میں اسحاق کی بھاوج کو آزاد کر کے میرے حوالے کر دیا جائے گا اور مجھے نل پانی تک پہنچنے کا محفوظ راستہ دیا جائے گا۔''

''یہ بالکل طے ہے اور اس کی ضمانت اس تحریر میں بھی دی گئی ہے جو تمہارے اور جارج صاحب کے مقابلے کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ اس پر حکم جی، پنڈت مہاراج اور دیگر اہم لوگوں کی گواہی موجود ہوگی۔ مقابلے کے وقت اس تحریر پر تمہارے اور جارج صاحب کے دستخط بھی لیے جائیں گے۔''

ہماری اس گفتگو کے دوران میں میڈم صفورا بھی موقع پر موجود رہی تھی۔ اسٹیل اور جارج کی موجودگی میں وہ بالکل مؤدب کھڑی رہتی تھی اور صرف اس وقت بولتی تھی جب اس سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا۔

رات کو میں سونے کے لیے لیٹا تو سلطانہ بڑی شدت سے یاد آنے لگی۔ اس کے گداز ہونٹ، اس کے گھنے بال اور سب سے بڑھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہر وقت عجز و انکساری نظر آتی تھی اور میرے لیے غیر مشروط محبت و اطاعت ٹپکتی رہتی تھی۔ میں اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ جارج گورا سے بدلہ لے کر آؤں گا یا پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ اور اس نے مجھے اشک بار آنکھوں سے رخصت کیا تھا اور کہا تھا... ''میں تمہاری کامیابی کی دعا کروں گی مہروج! اور یہ دعا بھی کروں گی کہ میری عمر تمہیں لگ جائے۔''

اب وہ یہاں سے طویل فاصلے پر اس مندر کے سہ منزلہ تہ خانے میں تاؤ افضل، ہوشیار سنگھ اور آفتاب خاں وغیرہ کے ساتھ موجود تھی۔ مجھے معلوم تھا، وہ ہر گھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ ہر آہٹ پر چونکتی ہے، ہر چاپ پر سراپا نگاہ بن جاتی ہے لیکن مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میں سرخرو ہو سکوں گا یا نہیں... اور اگر سرخرو ہو گیا تو اس کے پاس جا سکوں گا یا نہیں... اور اگر چلا گیا تو کیا وہ مجھے اس مندر میں بخیر و عافیت مل پائے گی یا وہاں حالات بدل چکے ہوں گے؟ اَن گنت سوالات تھے اور جواب کوئی نہیں تھا۔

مجھے نوری یاد آ گئی۔ درحقیقت اس نے سلطانہ کو پھر سے میرے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور اگر غور کیا جاتا تو یہ کردار بھی اصل میں عمران نے ہی ادا کیا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے نوری کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ وہ ہر گھڑی میرے اردگرد نظر آتی تھی اور اس کی وجہ سے سلطانہ کے اندر سوئی ہوئی عورت دھیرے دھیرے بیدار ہوئی تھی۔ بچے کی محبت نے اس عورت کو بیدار کرنے میں مزید مدد کی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا، ایک بار کم از کم ایک بار، سلطانہ کی آنکھوں کا سپنا ضرور پورا کر دوں۔ اس کی گود میں بالو ہو، اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کر شرمائے اور جب میں اسے چھوؤں تو اس پر وہ اذیت ناک کپکپی طاری نہ ہو جو اس کے جسم کا خون نچوڑ لیتی تھی۔

اس پر کیوں طاری ہوتی تھی وہ کپکپی؟ اس سوال کا جواب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کپکپی کا ماخذ جارج گورا تھا اور مجھے اسے مارنا تھا۔ اس کی خون آلود لاش کو اپنے پاؤں تلے روندنا تھا... اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر سلطانہ کو بتانا تھا کہ میں نے اس کی آن بان اور عزت کے ہتیارے کے ساتھ کیا کیا ہے۔

ایک بار پھر میرے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ رگ پٹھوں میں ایک بے نام حرارت لہریں لینے لگی۔ میں ہمیشہ کی طرح بے چین ہو اٹھا۔ قالین سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ آج سردی معمول سے بڑھ کر تھی۔ کبھی کبھی گرج چمک کا احساس بھی ہوتا تھا۔ میں راہداری میں پہنچا تو سینئر گارڈ جگ موہن نے مجھے روکا۔ ''آپ کہاں جاوت ہیں سر؟''

''تم میری آیا مت بنو۔'' میں پھنکارا۔ ''مجھے اس چار دیواری میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہے۔''

جارہے تھے۔ شیشے کی رنگین کھڑکیوں سے باہر بارش اب ایک دھیمی ہموار رفتار سے برس رہی تھی اور گاہے بگاہے بجلی بھی چمک دکھا جاتی تھی۔ ہم ایک طویل گیلری میں پہنچے۔ گیلری کی چھت اونچی تھی اور یہاں اوپر تک لکڑی کی پالش شدہ الماریاں چنی ہوئی تھیں۔ یہ دراصل اس لال بھون کا شان دار کتب خانہ تھا۔

میڈم ایک الماری تک پہنچی اور اس نے کتابوں کے درمیان سے ایک بڑا سا البم نکال لیا۔ یہ دراصل سامبر کی مصور کہانی تھی۔ اس جہازی سائز کے البم میں ڈیڑھ دو سو تصویریں تھیں۔ اس میں سامبر کی تاریخ درج تھی اور پچھلے بیس پچیس سال میں جو اہم لڑائیاں ہوئی تھیں، ان کا باتصویر تذکرہ بھی تھا۔ زیادہ تر تصویریں کیمروں سے کھینچی گئی تھیں۔ کچھ ہاتھ کے بنے ہوئے اسکیچ بھی تھے۔ تصویروں کے ساتھ جو ٹیکسٹ تھا، وہ انگلش میں تھا اور وہ بھی ہر جگہ ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں راجواڑے کے اندر کتب یا اخبار وغیرہ چھاپنے کی سہولت موجود نہیں ہے۔

سوئمبر اور سامبر کی تاریخ ہزاروں سال پرانی تھی۔ اس کے بارے میں اس البم کے اندر کافی کچھ لکھا گیا تھا۔ ماضی میں ہونے والے کئی سامبر مقابلوں کا ذکر بھی اس میں موجود تھا۔ شروع میں درج تھا۔ ”کسی مطلوبہ شے کے لیے نر جاتی کے درمیان زور آزمائی کرنے کا رواج اتنا ہی پرانا ہے جتنی اس زمین کی تاریخ۔ کہنے کو تو ہم سوئمبر اور سامبر کو رسم کہتے ہیں لیکن یہ رسم نہیں ہے۔ یہ عین فطرت ہے... اور یہ فطرت انسان اور حیوان دونوں میں ایک جیسی ہے۔ مادہ کے حصول کے لیے نر جان دار ہمیشہ سے سوئمبر رچاتے آئے ہیں۔ چرند، پرند، چوپائے درندے سب اس میں شامل ہیں۔ یہ جان دار اپنی مادہ کے حصول کے علاوہ علاقے اور خوراک وغیرہ کے لیے بھی دو بدو مقابلہ کرتے ہیں۔ زور آور اپنا مقصد پاتا ہے اور کمزور اپنی شکست تسلیم کر کے مزید نقصان اور خون خرابے سے بچتا ہے۔ یہ سب قدرت کے اصولوں کے مطابق ہے۔ اس تصویر کے نیچے پنسل سے بنا ہوا ایک اسکیچ تھا جس میں دو جوان بارہ سنگوں کو ایک مادہ کے لیے اندھادھند لڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

اس طرح کی اور چھوٹی بڑی تصویریں اور تحریریں بھی البم میں موجود تھیں۔ ان میں سامبر کے مختلف طریقوں اور واقعات پر روشنی پڑتی تھی۔ کیمرے کی ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹو میں حکم کے ایک ماموں کو ایک مغویہ کے سلسلے میں ایک ڈکیت سے مقابلہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ چھوٹی تلوار یعنی کٹاری کا مقابلہ تھا۔ دونوں حریفوں نے باقاعدہ زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے۔ سروں کی حفاظت کے لیے آہنی ٹوپیاں تھیں۔ تصویر میں حکم کا گرانڈیل ماموں، ڈکیت کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور اس نے کٹاری اس کی گردن پر رکھی ہوئی تھی۔

میڈم نے بتایا۔ ”یہ دیکھو، نیچے اس مقابلے کی تاریخ بھی درج ہے۔ 8 ستمبر 1938ء ۔ حکم کا ماموں یہ ”باؤٹ“ جیت گیا تھا اور اس نے مغویہ لڑکی کو ڈکیت سے چھڑا کر اس سے باقاعدہ میرج کی تھی۔ اور یہ دیکھو، یہ تصویر۔“ میڈم نے ایک اور فوٹو گراف کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں دو آدمی ”ڈیول“ کے انداز میں ایک دوسرے پر پستول سے گولی چلا رہے تھے۔ فوجی وردی والا شخص گولی چلانے میں پہل کر گیا تھا اور اس کا حریف زخمی ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ کون کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”حکم جی کے والد رائے پرتاپ کا سیناپتی اشوکا اور حکم کا عسکری استاد اقلن راجپوت۔ دونوں کے درمیان ایک خوب صورت خانہ بدوش لڑکی کے لیے جھگڑا کھڑا ہوا تھا۔ اقلن اس لڑکی کی شادی اپنے چھوٹے بھائی سے کرانا چاہتا تھا جبکہ سیناپتی اسے خود اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں سیناپتی جیت گیا تھا۔“

”اور حکم کا استاد... اللہ کو پیارا ہو گیا؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں، وہ بھی زندہ بچ گیا تھا۔ دراصل سامبر میں اگر اس طرح کا مقابلہ ہو تو اس میں ربر کی گولیاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ صرف زخمی کرتی ہیں۔ سامبر اور سوئمبر کی لڑائی عام طور پر حریف کو صرف زیر کرنے کے لیے لڑی جاتی ہیں۔“

”سوئمبر اور سامبر میں اصل فرق کیا ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”یہ پڑھو۔ یہ فرق یہاں لکھا ہے۔“ میڈم نے تھوڑی سی ورق گردانی کر کے ایک تحریر عمران کو دکھائی۔

انگریزی میں لکھا تھا۔ ”سوئمبر کسی عورت کے لیے رچایا جاتا ہے۔ وہ کچھ خواہش مند لوگوں میں سے اپنے لیے شوہر چنتی ہے۔ یہ چناؤ عام طور پر جسمانی طاقت کے مقابلے سے ہوتا ہے۔ تاہم سامبر کا دائرہ وسیع ہے۔ اس میں عورت کے علاوہ جائداد، زیور یا کوئی بھی قیمتی چیز تنازعے کی وجہ ہو سکتی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ سامبر کا مقابلہ صرف دو دعوے داروں کے درمیان نہیں ہوتا۔ دعوے داروں کی جانب سے کوئی بھی شخص اس رسم میں حصہ لے سکتا ہے۔ مثلاً ایک قیمتی

گھوڑے کی ملکیت پر کسی ادھیڑ عمر شخص کی طرف سے اس کا چھوٹا بھائی یا بیٹا سامبر میں حصہ لے سکتا ہے...“

تحریر میں اس حوالے سے اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔

عمران نے پوچھا۔ ”مرد یا مارو والی لڑائی اس سے پہلے بھی ہوتی رہی ہے؟“

”بالکل، ایسی مثالیں موجود ہیں۔ یہ دیکھو... یہ ایک تصویر۔“ میڈم نے چند صفحات پلٹے۔

یہ ایک سنسنی خیز منظر تھا۔ رنگین تصویر تھی۔ نیچے تاریخ درج تھی۔ نو جنوری 1972ء — بڑی بڑی مونچھوں والا ایک انگریز، رقص کے انداز میں اچھل رہا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک کالا بھجنگ مقامی پڑا تھا۔ اس تنومند مقامی شخص کے سینے میں دستے تک ایک خنجر پیوست تھا اور وہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ میڈم بولی۔ ”یہ پڑھو۔ مرنے والے کا نام کمار ہے۔ یہ مقامی شکاری تھا۔ اس نے حکم جی کے والد کے مہمان مسٹر ڈی جون کو ”فائٹ ٹل ڈیتھ“ کا چیلنج کیا۔ ڈی جون بھی ایک مشہور شکاری تھا اور کوگر شیروں پر ریسرچ کے لیے انڈیا آیا ہوا تھا۔ وہ اب بھی شاید زندہ ہے۔ دونوں میں ایک قیمتی باز کے حوالے سے جھگڑا ہوا تھا اور اس جھگڑے میں وقفے وقفے سے چار بندوں کا مرڈر بھی ہوا تھا۔ بالآخر بات سامبر تک پہنچی تھی۔ اس مقابلے نے بھی اسٹیٹ میں بہت شہرت پائی تھی۔ دراصل جب کبھی بھی کوئی ”مرد یا مارو“ والا مقابلہ ہوتا ہے اس کو بہت شہرت مل جاتی ہے۔ اس مقابلے میں یہ انگریز شکاری ڈی جون جیت گیا۔ اس تصویر کے بعد بھی ڈی جون نے اپنے دم توڑتے حریف پر خنجر کے دس پندرہ وار کیے تھے اور اسے زخم زخم کر دیا تھا۔ وہ تصویر اس البم میں شامل نہیں ہے۔“

البم میں کچھ تصویریں چونکا دینے والی تھیں بلکہ ان کو شرمناک بھی کہا جا سکتا تھا۔ ان کی تعداد آٹھ دس ہو گی۔ ”یہ تصویریں کیا ہیں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”اس کو راندی کہا جاتا ہے۔“ میڈم نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“

”یہ مقامی زبان کا لفظ ہے۔ مطلب ہے لعنت بھیجنا۔ یہ سامبر کے طور طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ یہ راندی ان لوگوں کے ساتھ کی جاتی ہے جو سامبر لڑتے ہیں اور اپنے مدمقابل سے بُری طرح ہار جاتے ہیں۔ بُری طرح ہارنے سے مطلب ایک خاص طریقے سے ہارنا ہے۔ یہ دیکھو، یہاں اس بارے میں تھوڑی سی تفصیل لکھی ہے... جب سامبر میں ایک حریف دوسرے کو اس طرح سے ہرائے کہ اس کے پورے بوجھ کو سر سے بلند کر کے اکھاڑے میں پٹخ دے تو وہ راندی کرنے کا حق دار ہوتا ہے اور یہ مقابلہ اس کے ساتھ ہی فوراً ختم بھی ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھو... میں تمہیں دکھاتی ہوں۔“

میڈم نے جلدی جلدی چند ورق پلٹے اور سامبر کا ایک منظر دکھایا۔ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں ایک پہلوان نما شخص اپنے حریف کو باقاعدہ بازوؤں پر اٹھا کر زمین پر پٹخنے کی تیاری میں تھا۔

میڈم بولی۔ ”سامبر میں اس داؤ کے چل جانے کو دوسرے حریف کی بدترین شکست سمجھا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف ہارتا ہے بلکہ راندی کا شکار بھی ہوتا ہے۔“

یہ اس ساری تفصیل کا ایک اور دلچسپ پہلو تھا اور کسی حد تک شرمناک بھی۔ ہم نے راندی زدہ افراد کی تصویریں دیکھیں۔ وہ مکمل برہنہ کر دیے گئے تھے اور جیتنے والا حریف ان کی پشت پر لات مار کر انہیں اکھاڑے سے باہر پھینک رہا تھا۔ دو چار تصویریں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ہارنے والے کو گارڈز وغیرہ نے زبردستی برہنہ کیا ہے اور انہیں بازوؤں سے جکڑ رکھا ہے تاکہ جیتنے والا حریف ان کی ننگی پیٹھ پر لات رسید کرنے کی رسم ادا کر سکے۔

”زبردست۔“ عمران نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ”میں جارج گورا کو اس حالت میں دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کروں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مرد اور مارو والی فائٹ میں بھی یہ رول لاگو ہوتا ہے؟“

”بالکل ہوتا ہے۔“ میڈم نے کہا۔ ”بلکہ اس سلسلے میں تمہیں مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔ آئی تھنک، یہ ایک بہت خطرناک رُول ہے۔ لڑائی کے کسی بھی مرحلے میں اگر تمہارا حریف تمہیں بازوؤں پر سیدھا اوپر اٹھا کر پٹخ دے تو سمجھو کہ کھیل وہیں پر ختم ہو گیا۔ یعنی مرد یا مارو والی لڑائی بھی وہیں پر ختم ہو جائے گی اور پٹخا جانے والا حریف دفاع کے قابل بھی ہوا تو مکمل طور پر دوسرے حریف کے رحم و کرم پر آ جائے گا لیکن...“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”لیکن کیا میڈم؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے مارشل آرٹ وغیرہ کی اتنی سمجھ بوجھ تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ حقیقی لڑائی میں کسی شخص کا اپنے جیسے مدمقابل کو بازوؤں پر اٹھا کر سر سے بلند کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ ایسا واقعہ شاذ و نادر ہی رونما ہوتا ہو گا۔“ وہ سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' عمران نے تائید کی۔ ''تورا کشتیوں کے سوا ایسا کبھی کبھار ہی ہو پاتا ہے... بہرحال، خطرہ تو خطرہ ہی ہوتا ہے اور اس خطرے کا ثبوت یہ آٹھ دس فوٹوگراف بھی ہیں۔''

''ہاں، میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ جارج بھی کم از کم ایک بار تو یہ کارنامہ انجام دے ہی چکا ہے۔''

میڈم نے ورق گردانی کی اور ایک رنگین فوٹوگراف دکھایا۔ یہ قریباً تین برس پرانی تصویر تھی۔ اس لڑائی میں چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں استعمال ہوئی تھیں۔ دونوں حریفوں نے زرہ بکتر جیسے لباس پہن رکھے تھے اور سروں پر آہنی ٹوپیاں تھیں۔ جارج نے اپنے مدِمقابل کو بازوؤں پر اٹھا کر سر سے بلند کر رکھا تھا اور اسے پٹخنے کے مرحلے میں تھا۔ ان کے اردگرد سیکڑوں پُرجوش تماشائی نظر آرہے تھے۔ جس کو اٹھایا گیا تھا، وہ تنومند شخص تھا۔ زرہ بکتر نما شے نے اسے مزید بوجھل کر رکھا تھا۔ اس منظر سے جارج کی غیر معمولی جسمانی طاقت کا سراغ بھی ملتا تھا۔ میڈم نے بتایا کہ اس شخص کو خاص طریقے سے ہرانے کے باوجود جارج نے اس کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی۔ یعنی اسے کپڑے اتارنے پر مجبور نہیں کیا۔ ہاں، غصے کے اظہار کے لیے اس پر تھوکا تھا اور دھکا دے کر اکھاڑے سے باہر کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ یہاں نیچے درج ہے۔ ایسے ہی چھوٹے بڑے واقعات کی وجہ سے یہاں جارج کے پرستاروں کا حلقہ موجود ہے جو اسے شکتی دیوتا کا نام دیتا ہے۔''

لگتا تھا کہ میڈم نے اس ضخیم البم کے ٹیکسٹ کو کافی غور سے پڑھ رکھا تھا۔ اس نے ہمیں گراں قدر معلومات فراہم کیں۔

میڈم آج ہم دونوں کے ساتھ کافی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو تمہارے اور جارج صاحب کے سامبر کے بارے میں سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ شبھ گھڑی بھی آ چکی ہے لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ شاید یہ لڑائی نہ ہو سکے یا اس میں کوئی اور رکاوٹ آجائے۔ بس ایک خیال سا ہے میرا۔''

''خیال کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے میڈم؟'' عمران نے کہا۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور عمران کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہیں اتنی انفارمیشن دیں، اتنا کچھ بتایا لیکن تم دونوں بہت کچھ چھپاتے ہو اور چھپا رہے ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں میڈم؟'' عمران نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''مجھے ایک بات سچ سچ بتانا... کیا اس دن تم کرتب دکھاتے ہوئے واقعی گرے تھے یا یہ ایک ڈراما تھا؟''

عمران ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا۔ ''آپ کے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا؟''

''ثمرین جو زخمی ہوئی ہے، سلطانہ کی بھابی بننے والی تھی۔ یقیناً تم دونوں کے دلوں میں اس کے لیے نرم گوشہ ہو گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے ''فیری سلیکشن'' سے بچانے کے لیے تم نے اسے زخمی کیا ہے؟''

میڈم ایک نہایت جہاندیدہ عورت تھی۔ ہمیں پہلے ہی شبہ تھا کہ اس کا دھیان ضرور اس طرف جائے گا۔ اب اس بات کو چھپانا میڈم سے فاصلہ بڑھانے کے مترادف تھا اور ہم یہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد عمران نے یہ بات تسلیم کر لی۔ میڈم نے خفگی کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ بڑی خطرناک حرکت تھی۔ اگر کسی کو ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ جان بوجھ کر ایسا کیا گیا ہے تو تمہارے ساتھ ساتھ ثمرین بھی سخت مصیبت کا شکار ہوتی۔ اب بھی گیتا اور منیجر مدن وغیرہ کو غفلت کا الزام دیا جا رہا ہے اور ان سے سخت باز پرس ہوئی ہے۔ یہاں کی سزائیں بڑی سخت ہیں۔ تمہیں درد کے انجکشن والی بات یاد ہے نا؟ ثمرین جیسی لڑکی تو اتنی دوا کی ہلکی سی ڈوز بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوتی رہی۔ پھر میڈم کی ناراضی کم ہو گئی اور وہ نارمل نظر آنے لگی۔ وہ نارمل ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ ''آپ ابھی یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ سامبر کی لڑائی میں اب بھی رکاوٹ ہے؟''

وہ چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''کل ایک بڑھیا حکم جی کی کچہری میں پیش ہوئی ہے۔ مجھے پوری بات کا تو پتا نہیں۔ سنا ہے، اس نے حکم جی کے سامنے واویلا کیا ہے اور کہا ہے کہ سلطانہ اور اس کا پتی دھرم درودھی ہیں۔ ان مہاپاپیوں کو کسی بھی رسم یا شرط وغیرہ کی آڑ میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے ان دھرم برودھیوں کی سزا کی خاطر اپنا بیٹا اور بہو قربان کیے ہیں۔ اپنے پوتے کے سہارے بے گھر ہوئی ہوں، وغیرہ وغیرہ۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دھیان فوراً مالا کی دادی ساس یعنی ستیش کی کھوسٹ دادی کی طرف چلا گیا جو

دنیا نومیت اور توہم پرستی میں اپنی مثال آپ تھی۔ اس کے ساتھ ہی فتح پور کے مندر میں پیش آنے والے خونی واقعات بھی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ ان واقعات کے بعد ستیش، مالا اور اس کی دادی ساس اچانک ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

"یہ بڑھیا کون ہے؟" میں نے اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے میڈم سے پوچھا۔

"ابھی مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن سنا یہی ہے کہ تل پانی سے آئی ہے۔ میں صبح اس بارے میں انفارمیشن لوں گی۔"

ہم جب اپنے کمرے میں واپس پہنچے تو عمران گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "تابش! میں اپنی پہلے دن والی رائے پر قائم ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے راج بھون کے سامنے جا کر اور جارج کو للکار کر جلد بازی کی ہے۔ میں اسے بہادرانہ بے وقوفی کہوں گا۔ پہلے تو اس بات میں بھی ابھی تک شبہ موجود ہے کہ جارج کے ساتھ تمہارا "مرو یا مارو" والا دو بدو مقابلہ ہوگا لیکن اگر یہ مقابلہ ہو بھی گیا تو اس کے بعد کی صورتِ حال واضح نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم جیت گئے تو ہمیں خراماں خراماں واپس تل پانی جانے کی اجازت دے دی جائے گی... خدانخواستہ دوسری صورت ہوئی تو تمہیں سولی پر لٹکا کر قصہ ختم کر دیا جائے گا... لیکن میرے خیال میں یہ دونوں کام مشکل ہیں۔ ہار یا جیت، دونوں ہی صورتوں میں تمہارے لیے سلطانہ والا مسئلہ وہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں تم سے معلومات حاصل کیے بغیر یہ لوگ تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے۔"

"لیکن جارج علی الاعلان یہ "کمٹمنٹ" کر چکا ہے۔"

"اس کمٹمنٹ کی چولیں ہلانے کے لیے یہ پنڈت پجاری وغیرہ جو موجود ہیں۔ جس طرح یہ اپنے مطلب کی کنڈلی نکال لیتے ہیں، اسی طرح ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔"

"لیکن ابھی تک پنڈت مہاراج نے تو کسی حد تک اصول پسندی دکھائی ہے۔ اس نے منصف کے طور پر ایک ایسا فیصلہ دیا ہے جو بہت سے لوگوں کو پسند نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے، میری اور جارج کی "مرو یا مارو" والی فائٹ کروانے کا فیصلہ۔"

"ہاں، یہ تو ہے لیکن ہو سکتا ہے اس میں وہ دیگر پنڈتوں اور پوتھیوں، شاستروں میں لکھی ہوئی تحریروں کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہو۔ پھر بھی اس نے اندر خانے تمہیں تمہارے مطالبے سے ہٹانے کی کوشش تو کی۔"

ہمارا خیال تھا کہ اگلے روز میڈم راج بھون سے بڑھیا کے بارے میں کوئی خبر لائے گی لیکن ہوا یہ کہ خود ہمیں ہی راج بھون سے بلاوا آ گیا۔ میں اور عمران اس وقت ثمرین کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ وہ ابھی ہمارے سامنے سے گزر کر اندرونی پورشن کی طرف گئی تھی۔ وہ قدرے کمزور نظر آتی تھی۔ عمران کی تلوار سے لگنے والا زخم اس کی گردن سے شروع ہو کر کان کی لو تک چلا گیا تھا۔ سات آٹھ ٹانکے لگے تھے۔ اب پٹی کھل چکی تھی تاہم اب بھی زخم پر کوئی دوا لگی ہوئی تھی۔ اس زخم نے اس کے حسن کو گہنایا تھا مگر اس کی آبرو کو ایک فوری خطرے سے محفوظ کر دیا تھا... اور داغ تو چاند کے چہرے پر بھی ہوتے ہیں۔ مجھے اور عمران کو یقین تھا کہ ثمرین موجودہ صورتِ حال سے خوش ہوگی۔ ہمیں پتا چلا تھا کہ اسے ایک دو دن میں ہی اس کے گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ میں سوچنے لگا، کیا مستقبل قریب میں ایسا ہو سکے گا کہ ثمرین اور سلطانہ کے بھائی نبیل کو ان کی کھوئی ہوئی محبت مل سکے؟

ہم ثمرین کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جب میڈم افراتفری میں ہمارے کمرے میں آئی اور اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں دربار میں بلایا گیا ہے۔"

"دربار میں؟"

"ہاں، حکم جی نے تمہیں راج بھون میں بلایا ہے۔ بس آدھ گھنٹے کے اندر ہمیں وہاں حاضر ہونا ہے۔"

"خیریت تو ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ تو وہاں جا کر پتا چلے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی برہمن بڑھیا والا معاملہ ہو یا کوئی اور پرابلم ہو سکتا ہے۔"

عمران نے پوچھا۔ "کیا میں بھی ساتھ جا سکتا ہوں؟"

"تم کس حیثیت سے جاؤ گے؟"

"آپ کے گارڈ کے طور پر جا سکتا ہوں۔"

"دیکھو، کہیں مروا نہ دینا۔ مجھے سب سے بڑا اندیشہ یہی ہے کہ کہیں تمہارے اور تابش کے درمیان کسی طرح کا تعلق ثابت نہ ہو جائے۔"

"اس بارے میں آپ بالکل بے فکر رہیں۔" اس نے میڈم کو یقین دہانی کرائی۔

☆☆☆

اور اب میں راج بھون کی عظیم الشان عمارت کے اندر حکم کے پُرشکوہ دربار میں تھا۔ یہ دربار جدید اور قدیم آرائش کا خوب صورت امتزاج تھا۔

مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں محافظوں کے کڑے حصار میں یہاں تک لایا گیا تھا۔ میڈم اور عمران وغیرہ دوسری گھوڑا گاڑی میں یہاں تک پہنچے تھے۔ محافظوں کی ایک کھلی چھت والی جیپ ہمارے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ بلند و بالا چھت والے شان دار دربار کے اندر کھڑے ہو کر میں خود کو کسی قدیم داستان کا حصہ محسوس کرنے لگا۔ سامنے ایک زرنگار چبوترے پر ایک بہت بڑی منقش کرسی رکھی تھی۔ اس پر سونے کے پتّرے جڑے تھے اور قیمتی پتھر دمک رہے تھے۔ یقیناً یہ حکم جی کی نشست تھی۔ اردگرد آٹھ دس مزید کرسیاں موجود تھیں۔ ان پر مصاحبین بیٹھتے ہوں گے۔ ابھی یہ ساری نشستیں خالی تھیں تاہم دربار میں کافی افراد نظر آ رہے تھے۔ مجھے بھی زرنگار چبوترے کی ایک جانب نشست پر بٹھا دیا گیا۔ دربار میں موجود اکثر افراد کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ان کے لیے یقیناً ایک دلچسپ چیز تھا۔ ایک ایسا شخص جو کچھ عرصہ پہلے تک مفلوج و معذور سمجھا جاتا تھا، اب ایک نئے روپ میں ان کے سامنے آیا تھا۔ اس کی ساری ہیئت ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ داستانی لیکن ٹھوس حقیقت تھا اور پچھلے چند ماہ میں، میں کئی جگہ اس کا ثبوت مہیا کر چکا تھا۔

کچھ دیر بعد زرنگار چبوترے کی اداسی ختم ہو گئی۔ ایک عقبی دروازے کا مخملی پردہ حرکت میں آیا اور حکم جی پورے کروفر کے ساتھ نمودار ہوا۔ میں پہلی بار اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا تھا۔ رنگ گندمی اور سر پر ایک تاج نما پگڑی تھی۔ ایک قیمتی کام دار چغا اس کے پاؤں تک پہنچ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر روحانیت طاری کرنے کی شعوری کوشش کر رکھی ہے۔ اس نے آنکھیں نیم وا کر رکھی تھیں اور نپے تلے قدموں سے اپنی طلائی کرسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تمام درباری کھڑے ہو گئے اور رکوع کے بل جھک کر اسے تعظیم پیش کی۔ اس نے ہاتھ کے مدبرانہ اشاروں سے لوگوں کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے بھی بیٹھنا چاہا مگر ایک گارڈ نے مجھے کھڑا رہنے کی ہدایت کی۔

حکم جی کے ساتھ کوئی ایک درجن مصاحبین بھی تھے۔ ان میں سے کچھ چبوترے پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کچھ چبوترے کے سامنے پہلی قطار میں۔ چبوترے پر بیٹھنے والوں میں حکم کی تین بیویاں یعنی رانیاں شامل تھیں اور ان میں ایک مہارانی رتنا دیوی تھی۔ اس کا حسن آنکھیں چندھیا دینے والا تھا۔ یہی رتنا دیوی تھی جس سے جھگڑا کر کے سلطانہ زرگاں سے فرار ہو گئی تھی۔

حکم کے ساتھ جلوہ افروز ہونے والوں میں مجھے ایک جانی پہچانی صورت بھی دکھائی دی۔ یہ جارج کی بہن ماریا تھی۔ وہ ایک لمبے انگریزی اسکرٹ میں تھی۔ ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ شاید یہ دستانے انگلی کا عیب چھپانے کے لیے پہنے گئے تھے۔ کٹی ہوئی انگلی کی جگہ غالباً کوئی "پیکنگ" وغیرہ رکھ کر اسے برابر کر لیا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میری اور ماریا کی نظریں ملیں۔ ایک بجلی سی کوند گئی۔ وہ سارے منظر میرے ذہن میں بھی تازہ ہو گئے جن کا تعلق ماریا کے اغوا اور دیگر واقعات سے تھا۔

حکم جی دیگر حاضرین کی طرح مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بارعب آواز میں کہا۔ "کیا تم ہمارے ایک دو سوالوں کے جواب دینا پسند کرو گے؟"

"فرمائیں۔"

"کہا جا رہا ہے کہ جب تم جیل سے فرار ہو کر تل پانی پہنچے تو تمہارے ساتھ ایک قریب المرگ شخص بھی تھا جس کا ایک بازو اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے بے باک لہجے میں کہا۔ "عزت مآب! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں جیل سے نہیں، جارج کے گھر سے فرار ہوا تھا۔ جیل میں تو مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ رکھا ہی نہیں گیا تھا اور دوسری بات یہ کہ جس قریب المرگ شخص کی بات آپ کر رہے ہیں، آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کا نام باروندا جنگی تھا اور وہ "قریب المرگ" بھی آپ کے دوست جارج کی وجہ سے ہوا تھا۔"

"سر جارج کا نام احترام سے لو۔" چبوترے پر براجمان ایک فربہ شخص نے گرج کر کہا۔

"میرے دل میں جس کے لیے احترام نہیں، میں اپنی زبان پر اس کے لیے احترام کیسے لا سکتا ہوں؟ اور دوسری بات یہ جناب عالی کہ اس وقت ہم دونوں کے درمیان سامبر کی لڑائی طے ہو چکی ہے۔ اس رو سے ہم دونوں صرف حریف ہیں اور حریفوں کا درجہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔"

فربہ شخص نے مزید مشتعل ہو کر کچھ کہنا چاہا لیکن حکم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ "تم باروندا کے قریب المرگ ہونے کی بات تو کرتے ہو لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس کا اپرادھ کتنا بڑا تھا۔ اس نے شاہی پریوار کی عزت پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال، ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہم صرف یہ

پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی تم باروندا جیکی کے شاگرد ہو؟ کیونکہ یہاں کچھ لوگن یہ بات بڑے وشواس کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کس حوالے سے شاگردی کی بات کرر ہے ہیں؟"

"تمہارا رہن سہن، ، تمہارا برتاؤ، ، تمہارے لڑنے کا انداز . . . اور اس جیسی دوسری چیزیں۔"

"میں خود کو اس بہت بڑے شخص کا شاگرد کہلوانے کا حق دار تو نہیں سمجھتا لیکن میں مانتا ہوں کہ میں نے اس سے تھوڑا بہت سیکھا ضرور ہے۔"

"سنا ہے کہ درد کے حوالے سے تمہارا کوئی خاص فلسفہ ہے اور تم خود کو آرام و آسائش سے دور رکھ کر اور جسمانی اذیتیں دے کر خوش ہوتے ہو؟"

"اس میں خوش ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ بس میں برداشت بڑھانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔"

"اس چکر میں بھی تمہیں باروندا نے ہی ڈالا ہے؟"

"آپ اسے چکر کہہ لیں لیکن میرے نزدیک یہ بھی جینے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے . . . ایک طرز حیات۔ میرا مذہب مجھے ایسے ہی سادہ اور پُر مشقت زندگی کی تلقین کرتا ہے۔ کم کھانا، کم سونا، خود کو تریادہ آسائشوں اور نفسانی لذتوں سے حتیٰ الامکان دور رکھنا، یہ سب کچھ تو کوئی بھی شخص اپنا سکتا ہے۔ آپ بھی اپنا سکتے ہو لیکن اس کے لیے اندر کی جرأت درکار ہے۔"

"اپنا لہجہ درست رکھو۔" فربہ شخص ایک بار پھر گرجا۔

حکم نے اسے دوبارہ ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

مجھے گھورتے ہوئے حکم نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ "اپنے مذہب پر بہت اتراتے ہو تم لوگن اور ہر جگہ اس کی مثالیں بھی دیوت ہو لیکن جب پڑھے لکھے لوگن میں بیٹھ کر تمہیں اپنے وچاروں کا دفاع کرنا پڑت ہے تو اکثر تم سپل (کامیاب) ناہیں ہو پاتے۔ خاص طور سے جب تم لوگن کی انتہا پسندی اور دہشت گردی کی بات ہووت ہے۔"

مجھے اپنے اندر آگ کی تپش محسوس ہوئی۔ میں نے جلتے لہجے میں کہا۔ "مسلمانوں پر انتہا پسندی کا لیبل لگانا آج کی دنیا کا فیشن بن چکا ہے اور آپ جیسے کچھ لوگ اس میں پیش پیش ہیں۔ ورنہ انتہا پسندی کس مذہب اور قوم میں موجود نہیں۔"

"یہ بڑا گھسا پٹا جملہ بولا ہے تم نے . . . یہ اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں تمہاری انتہا پسندی کی ایک چھوٹی سی جھلک دکھا سکتا ہوں؟" حکم نے کہا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے استفسار کیا۔

حکم نے اپنی دائیں جانب دیکھ کر ایک سینئر گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ ادب سے سر جھکا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور پھر گھوم کر باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کے ساتھ مجھے دو جانے پہچانے چہرے دکھائی دیے۔ میں ششدر رہ گیا۔ ایک منحوس چہرہ تو رنجیت پانڈے کا تھا۔ وہ وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے سیاہی مائل چہرے پر اس کی سرخی مائل آنکھیں دہکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی اور میری نگاہیں بس ایک ثانیے کے لیے ملیں۔ اس ایک ثانیے میں وہ ساری نفرت اور کدورت جاگ گئی جو میرے اور رنجیت کے درمیان موجود تھی۔ مجھے لگا جیسے اس نے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہا۔

"بچو . . . آخر اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا نا۔ اب تو ہمارے رحم و کرم پر آنے والا ہے۔ اگلی پچھلی ساری کسریں نکلنے والی ہیں۔"

رنجیت کے ساتھ جو دوسرا چہرہ تھا، اسے دیکھ کر مجھے زیادہ حیرانی ہوئی۔ مجھے اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہوا۔ یہ سلطانہ کا گونگا ملازم ہاشم عرف ہاشو تھا۔ میں اسے نل پانی کی شاہی رہائش گاہ "دیوان" میں چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ ملازمہ حفیہ کے ساتھ مل کر ہمارے بچے بالو کی دیکھ بھال بھی کر رہا تھا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں ہاشو کو یہاں دیکھوں گا اور وہ بھی اس حالت میں۔ ہاشو کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور اس کے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے تدرے فربہ چہرے پر گہرے نیل نظر آ رہے تھے۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پینتیس چالیس سالہ ہاشو لاچاری کی تصویر نظر آتا تھا۔ ایسے شخص کے ساتھ یہ سلوک سمجھ سے باہر تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے تقریباً چلا کر پوچھا۔

"یہ تم لوگن کی امن پسندی، شانتی اور پریم کا شاہکار ہے۔" حکم کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"کیا جرم کیا ہے اس نے؟"

"کوئی ایک جرم ہو تو تمہیں بتایا جاوے۔ یہ ایک لمبی لسٹ ہے اور اگر یہ دو ہفتے پہلے نل پانی سے پکڑا نہ جاتا تو یہ لسٹ اور بھی لمبی ہو جاتی تھی۔"

حکم نے رنجیت کو اشارہ کیا کہ وہ ہاشو کے بارے میں بتائے۔ رنجیت نے کہا۔ "یہ شخص بہت پرانا ہندو دشمن ہے۔ آج کل بھی یہ ایک بہت بڑے جرم کا تانا بانا بن رہا تھا۔ اگر ہمارے مخبر بروقت کھوج ناہیں لگا لیتے تو بہت جیادہ نقصان ہو جاتا تھا . . ."

حکم نے گونگے ہاشو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا تم خود اپنے اس شان دار ایراوہ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے؟"

ہاشو کچھ دیر تک جلتی نظروں سے حکم کو گھورتا رہا پھر گرج کر بولا۔ "اگر خدا کے دشمنوں کو مارنا اپرادھ ہے تو ہم یہ اپرادھ کرتے رہیں گے۔ اپنی آخری سانس تک . . . خون کے آخری قطرے تک۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ ہاشو بول رہا تھا۔ اس کی غضب ناک آواز دربار میں گونجتی اور پھیلتی چلی گئی۔ "خدا کی اس زمین سے ناپاک لوگن کے وجود کو ختم کرنا ایک ایسا کام ہے جس کے لیے میرے جیسی سیکڑوں زندگیاں خوشی سے قربان کی جا سکت ہیں۔ مجھے اگر سو بار بھی زندگی ملے تو میں سو بار اسی کام پر نثار کر دوں گا۔"

ہاشو کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور اس کا سینہ پھیل کر چوڑا ہو گیا تھا۔

حکم بولا۔ "کیا تمہیں جانکاری ہے کہ تم جو کام کرنے جا رہے تھے، اس میں سیکڑوں لوگن مارے جاتے؟ ان میں عورتیں، بوڑھے اور معصوم بچے بھی شامل ہوتے اور ہو سکت ہے کہ کچھ مسلمانوں کے پران بھی چلے جاتے۔"

ہاشو نے پلٹ کر رنجیت پانڈے کی طرف دیکھا اور گرجا۔ "اور اس کتے نے کچھ دن پہلے دیوان میں جو بم پھوڑا تھا، کیا اس میں بے گناہ لوگن کی جانیں ناہیں گئی تھیں؟"

پانڈے نے ایک زوردار تھپڑ ہاشو کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر اگلی نشستوں پر جا گرا۔ دو تین محافظ اس پر ٹوٹ پڑے اور بے دریغ اسے مارنے لگے۔ چند ہی لمحوں میں ہاشو کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا اور وہ نیم جان ہو گیا۔

اس حالت میں بھی وہ پکار رہا تھا۔ "کسی کو ناہیں چھوڑیں گے۔ ہر کافر کو مار دیں گے۔ پورے راجواڑے کو آگ لگا دیں گے . . ."

پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے فرش پر گرے ہوئے ہاشو کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تاکہ وہ بدزبانی نہ کر سکے۔ حکم جی نے پانڈے کو اپنے قریب بلا کر کچھ کہا۔ وہ تیزی سے باہر گیا اور پھر پولیتھین کا ایک لفافہ لے کر واپس آیا۔ اس میں ایک نیلگوں پاؤڈر سا تھا۔ اس کا وزن آدھ کلو سے کچھ ہی کم ہوگا۔ یہ ویسا ہی پاؤڈر تھا جیسا سلطانہ کے پاس سے نکلا تھا۔ اس پاؤڈر میں نیلے تھوتھے کی آمیزش تھی اور

تخلصِ راشد

ایک روز منٹو صاحب بڑی تیزی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے کہ وہاں برآمدے میں مڈگارڈوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر دوسرے ہی لمحہ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک چمک دوڑ گئی اور وہ چیخ کر کہنے لگے۔

"راشد صاحب! راشد صاحب! ذرا باہر تشریف لائیے۔" شور سن کر ن م راشد کے علاوہ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے کارکن بھی ان کے گرد جمع ہو جائے۔

"راشد صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں اسے۔" منٹو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل، خدا کی قسم! سائیکل نہیں بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی نظم ہے۔"

عمیر احمد۔ لاہور

پاؤڈر کی وہ پڑیا اب بھی میرے سامان میں موجود تھی۔

حکم کے اشارے پر پانڈے نے وہ پاؤڈر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ "جب ہمارے مخبروں نے اسے نل پانی کے ایک مندر کے پاس سے پکڑا تو اس پیکٹ جیسے تین پیکٹ اس کے پاس موجود تھے۔ یہ کالی کے مندر میں بکنے والے پرشاد کے اندر یہ جہر ملا چکا تھا۔ ابھی اسے کم از کم دو اور بڑے مندروں میں جانا تھا۔ ایک مندر میں اس نے بھینٹ چڑھائے جانے والے دودھ کے اندر یہ جہر ملانا تھا اور دوسرے مندر میں حلوے کے پرشاد کے اندر۔ یہ اتنا تیج جہر ہے کہ اس کی ایک چٹکی تین چار بندوں کی ہتھیا کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر یہ اپنے ارادے میں سپل ہو جاتا تو نل پانی میں کم از کم ایک ہجار ہندو موت کے منہ میں چلے جاتے اور ہو سکت ہے کہ کئی مسلمان بھی مرتے کیونکہ کئی جگہوں پر یہ لوگن بھی پرشاد کھالیوت ہیں۔"

حکم نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "اور . . . یہ بندہ ایسے شبھ کام اب سے ناہیں، کئی برس سے کر رہا ہے۔ اس کا اصل نام ہاشم رازی ہے۔ یہ ایک بہت کٹر مسلا ہے۔ اب اس نے سب کچھ اپنی زبان سے بتایا ہے۔ یہ کئی برس سے گونگا بن کر مختار راجپوت کے گھر میں رہ رہا تھا۔ ابھی

یہ کھوج لگانا باقی ہے کہ مختار راجپوت اور اس کے پریوار کو اس کی اصل حقیقت کا پتا تھا یا ناہیں... اور اگر پتا تھا تو پھر وہ کس حد تک اس کے کاموں میں شریک تھے۔ اس شخص کی حقیقت ایک خطرناک خفیہ دشمن کی ہے۔ یہ زرگاں کے اندر کی خبریں اپنے پیرومرشد مراد شاہ تک پہنچاتا تھا اور مراد شاہ کا پتا کسے ناہیں؟ یہی وہ شخص ہے جو ٹل پانی میں راج پاٹ حاصل کرنے کے سپنے دیکھ رہا ہے۔ اس نے ہمارے چھوٹے بھائی کو ہم سے دور کیا ہے، دھرم اور سنسار کی ساری سچائیوں سے دور کیا ہے...'' حکم نے ایک گہری سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہاں بات مراد شاہ کی ناہیں، اس زبان دراز گونگے کی ہو رہی ہے۔ یہ انہی جنونی لوگن میں سے ہے جن کے ذہن تنگ ہو کر سوکھے اخروٹوں جیسے ہو گئے ہیں۔ ان کی نظریں کیول اپنے سامنے تک ہی دیکھ سکت ہیں۔ اب اس جانور کو کون سمجھائے کہ اس طرح بے گناہ معصوم لوگن کی جانیں لے کر یہ اپنے خدا کو خوش ناہیں کر سکتا۔''

حکم کے پہلو میں شاہانہ ٹھاٹ سے بیٹھی رتنا دیوی نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ صرف ہندو جاتی کا ہی ناہیں، اپنی جاتی کا بھی دشمن ہے۔ اس نے دو تین سال پہلے ایک مسلمان لڑکے کو صرف اس لیے گھوڑا گاڑی تلے دے کر مار دیا کہ وہ بانسری بجاتا تھا... بانسری بجانا اس کے نزدیک بہت بڑا پاپ تھا۔ پچھلے سے پچھلے سال اس نے مسلمان بچیوں کے ایک اسکول میں آگ لگائی۔ اس آگ میں تین بچیاں جھلس کر ہلاک ہو گئیں۔ ان بچیوں کا دوش یہ تھا کہ وہ انگریزی پڑھتی تھیں۔ اپنے ان پاپوں کا یہ شخص اعتراف کر چکا ہے۔ تم چاہو تو اس سے پوچھ سکت ہو۔''

میں ششدر کھڑا تھا۔ رنجیت نے رتنا دیوی کے اشارے پر ہاشو کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ گرجا اور ایک بار پھر ان لوگوں کو بے نقط سنانے لگا جن کے خیالات اس کے خیالات سے نہیں ملتے تھے۔ اس کی پُرطیش باتوں سے اندازہ ہوا کہ ابھی رتنا نے اس پر جو الزامات لگائے ہیں، وہ انہیں قبول کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے فعل کو پورے یقین کے ساتھ درست بھی سمجھتا ہے۔

وہ جب زیادہ آگ بگولا ہونے لگا تو اس کے منہ میں پھر کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ رنجیت پانڈے اور حکم کے دیگر گارڈز اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

حکم بے حد طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''کیا وہ جار نے تمہارا اس طرز کے بھائی بندوں کے بارے میں؟''

''چند لوگوں کے سخت رویے کی وجہ سے آپ کسی طبقے یا پوری قوم کو الزام نہیں دے سکتے۔''

''لیکن تم لوگن نے تو اپنی شناخت ہی اس گندے رویے کو بنا رکھا ہے۔''

اچانک عمران کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''عالی جناب! کیا آپ کے اس سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں؟''

میں نے مڑ کر عمران کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ ایسی بے پناہ سنجیدگی میں نے اس سے پہلے کبھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

''تم کون ہو؟'' حکم کی پاٹ دار آواز دربار میں گونجی۔

''عزت مآب! اگر آپ اجازت دیں تو میں بتاؤں؟'' میڈم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں بتاؤ۔''

''جناب! یہ پاکستان میں سیالکوٹ شہر کا رہنے والا ہے۔ عمران دانش نام ہے۔ پناہ کے لیے بھاگ کر انڈیا میں آیا اور پھر یہاں تک پہنچ گیا۔ لڑائی بھڑائی کا اچھا کام خوب کر لیتا ہے۔ میں نے چھان بین کر کے اسے اپنے سیکیورٹی گارڈز میں شامل کیا ہے۔''

حکم کی تیز نظروں نے کچھ دیر عمران کو گھورا پھر وہ بولا۔ ''کہو، کیا کہنا چاہت ہو؟''

''میں حضور کو اس کا جواب تفصیل سے دوں گا لیکن میری ایک گزارش ہے۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو پہلے وہ معاملہ نمٹا لیجیے جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے جناب! ٹل پانی کی عمر رسیدہ خاتون والا معاملہ۔''

حکم کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں آئیں، تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔ اس نے اپنے سامنے والے کلاک کی طرف دیکھ کر پہلو میں بیٹھے پنڈت مہاراج سے تھوڑی سی کھسر پسر کی پھر رنجیت پانڈے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بزرگ خاتون کو لایا جائے۔''

حکم کے اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے بزرگ خاتون کو دیکھا۔ یہ وہی ہٹ دھرم، کھوسٹ بڑھیا تھی جس کے کہنے پر اس کے پچاس سالہ بیٹے رام پرشاد نے مندر میں پرکھشا کی خوفناک رسم ادا کی تھی اور جان سے گیا تھا۔ بڑھیا ساڑی میں تھی۔ کندھوں پر موٹی شال اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں۔ اسے حکم کے زرنگار چبوترے کے سامنے ہی ایک آرام دہ نشست پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جھریوں بھرے چہرے پر نفرت اور طیش کی یلغار ہو گئی۔ اس نے اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور چلا اٹھی۔ اس کے منہ میں بس دو چار دانت ہی تھے۔ اس کی بات مشکل سے ہی سمجھ میں آتی تھی۔ خاص طور سے جب وہ غصے میں تیز تیز بولتی تھی۔ وہ ہاتھ نچا نچا کر پتا نہیں کیا کچھ کہنے لگی۔ جو جملے سمجھ میں آئے، وہ اس طرح تھے۔ ''تم راکھشس ہو... تمہاری پتنی راکھشس ہے۔ ہم کو کیا خبر تھی ہم نے جس کو اتنے بڑے پُن کام کے لیے چنا ہے، وہ اتنا بڑا پاپی نکلے گا۔ تم دونوں کی سزا موت ہے، اس کے سوا کچھ ناہیں...'' وغیرہ وغیرہ۔

مجھ پر اس زبانی حملے کے دوران میں بڑھیا نے اپنی نشست سے اٹھنے کی کوشش بھی کی لیکن گارڈز نے اس کے کندھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

بڑھیا قدرے پُرسکون ہوئی تو حکم کا فربہ اندام مشیر چبوترے سے اتر کر بڑھیا کی نشست کے قریب آیا اور بولا۔ ''ماتا جی! حکم جی چاہت ہیں کہ آپ نو تاریخ کو ہونے والے سامبر کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہت ہیں، تفصیل سے کہیں۔''

وہ فوراً بولی۔ ''تفصیل سے کیا کہوں۔ مجھ کو کوئی لمبی چوڑی بات ناہیں کرنی ہے۔ میں بس یہ کہوں گی کہ اس راکھشس اور اس کی اپرادھن پتنی کی سزا موت کے سوا اور کچھ ناہیں۔ اس کتے کو الٹا لٹکا کر اس سے اس کی پتنی کا اتا پتا پوچھا جاوے اور پھر دونوں کو فوراً جوتے مار مار کر مار دیا جاوے یا سولی چڑھا دیا جاوے۔ بس... بس اس کے سوا ہم جو کچھ بھی کریں گے، وہ ہمارا پاپ ہووے گا۔ ہم اپنے لیے نرگ کی اگنی کا انتجام کریں گے۔''

بڑھیا فرطِ جذبات سے سرتاپا کانپ رہی تھی۔

حکم نے شاہانہ انداز میں پنڈت مہاراج کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''پنڈت جی! آپ اس بارے میں کیا کہنا چاہت ہو؟''

ادھیڑ عمر پنڈت نے اپنے دراز گیسوؤں کو کندھوں پر سہلایا اور مؤدب انداز میں بولا۔ ''جناب! میں نے ماتا جی کی پوری کتھا سنی ہے۔ ماتا جی کے پریوار سے ایک جرم تو ضرور ہوا ہے۔ ان لوگن نے مختار راجپوت کی لونڈیا کو ہم سے چھینا اور پھر اپنے استھان میں لے گئے۔ ان لوگن کا خیال تھا کہ زرگاں میں مختار کی لونڈیا کو مناسب سزا ناہیں مل سکے گی۔ ان لوگن نے استھان میں مختار کی لونڈیا کی ارتھی جلانا چاہی تھی مگر یہ کام ہو نہ سکا۔ بہرحال مختار کی لونڈیا کو چھین کر لے جانے کی سزا اس پریوار کو مل گئی۔ ماتا کا بڑا بیٹا رام پرشاد اپنے ہی ساتھیوں کے درمیان ہونے والی لڑائی میں ہلاک ہوا۔ رام پرشاد کی پتنی کا دیہانت دل کے دورے سے ہو گیا۔ ماتا کا پوتا اور پوتے کی پتنی اس کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ میں یہ کہوں گا کہ ماتا اور اس کے پریوار نے جو کچھ کیا یہ غلط تھا... لیکن اس کے پیچھے جو کارن تھا، وہ یہی تھا کہ یہ لوگن اپنی سمجھ کے مطابق دھرم کا نام اونچا کرنا چاہت تھے اور اپرادھن کو سزا دینے کی اکھشا رکھتے تھے۔''

حکم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب تو ٹھیک ہے پنڈت جی... ہم آپ سے یہ جانکاری چاہت ہیں کہ کیا موجودہ حالت میں ماتا جی کی بات ماننا چاہیے کہ سامبر کی لڑائی روک دی جاوے اور سلطانہ کے پتی کو مجبور کیا جاوے کہ وہ سلطانہ کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے اسٹیٹ کی مدد کرے؟''

پنڈت کے بولنے سے پہلے ہی بڑھیا پھر چلا اٹھی۔ ''آپ کو ایسا کرنا پڑے گا۔ اس کام کے لیے میرا بیٹا قربان ہوا ہے۔ میں نے اپنی بہو کا بلیدان دیا ہے۔ میرا پوتا اور اس کی پتنی مجھ سے دور ہوئے ہیں۔ میں سنسار میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ اگر میرے یہ سارے بلیدان بیکار ہیں اور اس راکھشس نے سامبر کی آڑ میں چھوٹ کر یہاں سے چلے جانا ہے یا اسے آسان موت مل جانی ہے تو پھر مجھے بھی زندہ ناہیں رہنا۔ مجھے ناہیں چاہیے ایسا جیون۔ میں سوگند کھاوت ہوں، میں آتم ہتھیا کر لوں گی۔ میں سب کے سامنے خود کو زندہ جلا لوں گی...''

بڑھیا کے سوکھے سڑے جسم میں نہ جانے اتنا زور کہاں سے آ گیا تھا۔ وہ پکڑنے والوں کی گرفت سے نکل نکل جا رہی تھی۔

اسی دوران میں عمران آگے آیا۔ اس نے حکم کے سامنے ادب سے جھک کر کہا۔ ''اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں ماتا جی سے ایک دو سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔''

حکم نے چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ''پوچھو۔''

عمران بڑھیا کے سامنے جا کر بولا۔ ''کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کے بیٹے کی موت کس طرح ہوئی اور آپ کے پوتے اور اس کی پتنی نے آپ کا ساتھ کیوں چھوڑا؟''

وہ کڑک کر بولی۔ ''کون ہو تم؟ میں تمہاری باندی ناہیں کہ تمہارے سوالوں کے جواب دوں۔ میں نے جن کو

بتانا تھا، انہیں سب بتا چکی ہوں۔‘‘

فربہ اندام مشیر آگے آیا اور عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ’’جو پوچھ رہے ہو، میں بتا دیتا ہوں۔ ماتا جی کے بیٹے رام پرشاد کی ہتھیا آپس کی لڑائی کے کارن ہوئی۔ استھان کے لوگن ’’دھرمی اختلاف‘‘ کے کارن دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ نے رام پرشاد کو مار دیا۔ رام پرشاد کی پتنی دل کے دورے سے سورگ باشی ہوئی۔‘‘

’’اور ماتا جی کا پوتا ستیش... اور اس کی بیوی مالا؟‘‘ عمران نے پوچھا۔

’’وہ دونوں مخالف گروہ سے ڈر گئے۔ ویسے بھی ستیش کلر چنتی امید سے تھی۔ ستیش اس کی اور اپنی جان بچانے کے لیے کہیں نکل گیا۔‘‘

’’یہ باتیں آپ کو ماتا جی نے بتائی ہیں؟‘‘ عمران نے تصدیق چاہی۔

فربہ اندام شاہی مشیر نے اثبات میں جواب دیا۔

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ’’مجھے افسوس ہے جناب! یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ مشیرِ خاص نے آنکھیں نکالیں۔ حکم جی نے بھی تیوری چڑھالی۔

عمران اپنی ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ ’’ماتا جی کی عمر ایسی ہے کہ ہمیں ہر صورت ان کی عزت کرنی چاہیے لیکن یہ اس معاملے میں جھوٹ بول رہی ہیں اور کئی باتیں چھپا رہی ہیں۔‘‘

’’کتے! میں جھوٹی ہوں۔ میں ادھرمی ہوں۔ حرامجادے... نیچ بدجات! میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔‘‘ بڑھیا چلائی اور اس نے ایک بار پھر نشست سے اٹھنے کی کوشش کی۔

گارڈز نے اسے سنبھال لیا۔ وہ پوپلے منہ سے پتا نہیں کیا اول فول بکتی چلی گئی۔ جو ایک فقرہ سمجھ میں آرہا تھا اور وہ بار بار دہرا رہی تھی، وہ یہ تھا کہ ’’تم ہو کون؟ تم ہو کون؟‘‘ وہ مجھے تو جانتی تھی لیکن عمران اس کے لیے یکسر اجنبی تھا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ ہم دونوں اس سارے خونی واقعے کے چشم دید گواہ ہیں جو فتح پور کے اس چھوٹے سے گاؤں کے مندر میں رونما ہوا۔ جس میں گردو سو بھاش کا کٹا ہوا سر تھال میں سجایا گیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل کے کڑاہے میں ہاتھ ڈالے۔

بڑھیا ذرا شانت ہوئی تو عمران نے بڑے ہموار اور اثر انگیز لہجے میں کہا۔ ’’عزت مآب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں کچھ ایسے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں جو ماتا جی آپ سے چھپا رہی ہیں۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ یہ واقعات سچے ہیں اور اگر جھوٹ ثابت ہوں تو میں ہر بڑی سے بڑی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔‘‘

’’مختصر شبدوں میں بتاؤ، کیا بتانا چاہتے ہو؟‘‘ حکم نے کہا۔

’’جیسا کہ میڈم صاحبہ نے آپ کو بتایا ہے، میں پناہ کے لیے اس راجواڑے میں داخل ہوا ہوں۔ مجھے آپ کی عنایتوں کا آسرا ہے۔ آج سے چند روز پہلے تک میں زرگال پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نل پانی سے آگے نکل آیا تھا اور فتح پور نام کی بستی کے قریب ایک سانسی چرواہے کے جھونپڑے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرا وہاں فتح پور میں ہونا زبردست اتفاق تھا۔ اس اتفاق کی وجہ سے مجھے وہ مناظر دیکھنے کا موقع ملا جن کا تعلق فتح پور کے مندر سے ہے اور ساتھ ہی آپ کے سامنے کھڑی اس بڑی بی سے بھی۔‘‘

بڑھیا نے پھر داویلا شروع کر دیا۔ گارڈز نے بہ مشکل اسے چپ کرایا۔ حکم نے عمران کو بات جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

عمران نے کہا۔ ’’اس روز چرواہے کو بکریوں کا دودھ بیچنے بستی کے اندر جانا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ بستی میں بہت ہلچل نظر آرہی تھی۔ آس پاس کی چھوٹی بستیوں کے کئی لوگ بھی وہاں جمع تھے۔ بڑی پگڑیوں والے کئی پنچ بھی تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں مندر میں آج کوئی شخص جلتے تیل کے کڑاہے میں اپنے ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے رہا ہے۔ میرے میزبان چرواہے صدیق نے تفصیل معلوم کی تو پتا چلا کہ یہ کٹر ہندوؤں کے دو گروہ ہیں۔ کسی لڑکی کا معاملہ ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ لڑکی کو دوسرے گروہ والوں نے غائب کیا ہے۔ دوسرا گروہ یہ ماننے سے انکار کر رہا ہے۔ اب پرکھشا سے فیصلہ ہونا ہے کہ سچ کیا ہے۔ مندر کے ارد گرد بھی خوب رونق تھی۔ اندر سنکھ بج رہے تھے اور اشلوک پڑھے جارہے تھے۔ پھر میں نے آپ کے سامنے کھڑی اس بزرگ خاتون کو دیکھا۔ یہ زور زور سے اشلوک پڑھ رہی تھی اور اپنے پچاس پچپن سالہ بیٹے رام پرشاد کو پرکھشا کے لیے مندر کے اندر لے جارہی تھی۔ رام پرشاد بھی نشے کی سی حالت میں تھا۔ یہ لوگ ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل میں اندر چلے گئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد مندر کے اندر ہاہاکار مچ گئی۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ آوازیں آنے لگیں کہ بھگوان نے فیصلہ کر دیا... دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔ چند ہی لمحے بعد پتا چلا کہ مندر کے اندر بڑھیا اور اس کا ادھیڑ عمر بیٹا پرکھشا میں ناکام ہو گئے ہیں اور لوگوں نے بڑھیا کے بیٹے کو جان سے مار دیا ہے۔‘‘

عمران نے چند لمحے توقف کیا۔ دربار میں سناٹا طاری تھا۔ لوگ توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ صرف بڑھیا کبھی کبھی اپنے پوپلے منہ سے بول رہی تھی مگر اب اس کی آواز میں تن تن نہیں تھی۔ اس کے الفاظ بھی کسی کے پلے نہیں پڑ رہے تھے۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’جناب! اس کے کچھ ہی دیر بعد میں نے ایک جواں سال لڑکی کو دیکھا۔ وہ شاید حاملہ بھی تھی۔ کچھ لوگ اسے بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے مندر کے اندر لے جارہے تھے۔ مجھے لوگوں سے پتا چلا کہ بڑھیا اس لڑکی کی دادی ساس ہے... کیونکہ پرکھشا ناکام ہوگئی ہے اس لیے اس لڑکی کو بھی مار دیا جائے گا۔ اس کے بعد جی مندر کے اندر زبردست ہنگامہ ہوا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ مندر کا بڑا دروازہ اس ہنگامے میں ٹوٹ گیا۔ میں ہمت کر کے اس دروازے کے قریب چلا گیا۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے اندر کے خونی منظر دیکھے۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے پر کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے حملہ کر رہے تھے۔ لگتا ہے گولی بھی چل رہی تھی۔ کم از کم تین لاشیں تو میں نے خود دیکھیں۔ ان میں سے ایک لاش بڑھیا کے ادھیڑ عمر بیٹے کی تھی۔ پھر تیل کا ابلتا ہوا کڑاہا الٹ گیا اور مندر میں آگ لگ گئی۔ میرا دوست چرواہا مجھے کھینچ کر مندر کے قریب سے پیچھے لے آیا اور ہم کسی مصیبت سے بچنے کے لیے اپنے جھونپڑوں کی طرف چلے گئے۔

’’اگلے روز مجھے معلوم ہوا کہ مندر کے خونی ہنگامے میں نو دس بندے مرے اور درجنوں بری طرح زخمی ہوئے تھا۔ یہ بھی پتا چلا کہ اس واقعے کی زیادہ تر ذمے داری اسی بزرگ خاتون پر ہے۔ اسی نے اپنے بیٹے کو ایک خطرناک پرکھشا دینے پر مجبور کیا۔ اس سے دو چار دن پہلے یہ ایک اور خطرناک کام بھی کر چکی تھی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں اور اس کا پورا ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔‘‘

’’اپنی بات جاری رکھو۔‘‘ حکم نے ہدایت کی۔

عمران نے کہا۔ ’’اسی بزرگ خاتون اور اس کے کٹر ساتھیوں نے ایک گرو کو قتل کیا اور اس کا کٹا ہوا سر ایک تھال میں سجا کر کالی ماتا کے چرنوں میں رکھا۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ انہوں نے ایسا کیا یا نہیں؟‘‘

دربار میں سناٹا تھا۔ بس بڑھیا ہی اول فول بول رہی تھی۔ فربہ اندام مشیر نے اسے بہ مشکل چپ کرایا اور پوچھا کہ کیا فتح پور بستی کے مندر میں کسی گرو کا سر کاٹا گیا تھا؟ بڑھیا اب بوکھلا چکی تھی۔ طیش کے سبب اس کے منہ میں جو آرہا تھا، بولتی چلی جارہی تھی۔ اس نے اپنے پوپلے منہ سے پھُس پھُس کی غصیلی آوازیں نکالتے اور ہاتھ نچاتے ہوئے جو واویلا کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا... ’’وہ گرو اپرادھی تھا۔ اس کے مرنے میں ہی اس کی مکتی تھی۔ اپرادھی کو اس کی سزا ملنی چاہیے۔ نہ ملے تو اس کا وبال ساری ہندو جاتی پر پڑتا ہے۔ کھیت سوکھ جاتے ہیں، ناریاں بانجھ ہو جاتی ہیں... بیماریاں آتی ہیں اور خون خرابے ہوتے ہیں۔ اگر اس اپرادھن سلطانہ کو سزا نہ مل سکی تو بھی یہی کچھ ہوگا...‘‘ وہ بولتی چلی جارہی تھی۔

عمران کی خوب صورت آنکھوں میں ایک تیز چمک تھی۔ چہرے پر چھائی ہوئی بے پناہ سنجیدگی نے اس چمک کو کچھ اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’عزت مآب! میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ انتہا پسند ہر جگہ موجود ہیں اور جہاں بھی ہیں، قابلِ مذمت ہیں۔‘‘

عمران کا یہ ایک فقرہ لاتعداد دلیلوں اور تاویلوں سے زیادہ وزنی تھا۔ کچھ دیر کے لیے کوئی کچھ بھی نہیں بولا۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’میں کوئی سیاست دان یا دانشور نہیں ہوں جناب عالی... مگر اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں شدت پسندی اور انتہا پسندی سے نفرت کرنی چاہیے، کسی خاص قوم، مذہب یا فرقے سے نہیں۔ انتہا پسندی انسان کو جنونی بناتی ہے۔ انسان ایسے ایسے کام کر گزرتا ہے جو شاید وہ عام حالت میں کبھی نہ کرتا۔ اب آپ اس بزرگ خاتون کو ہی دیکھیے۔ یہ عمر کے اس حصے میں ہیں جب انسان جھوٹ بولنے جیسی غلطیوں کو بھی بہت بڑے گناہوں میں شمار کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ پورے وشواس اور زور و شور سے جھوٹ بول رہی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان کا پوتا ستیش اور اس کی پتنی مالا اس لیے ان سے جدا ہو گئے کہ وہ مخالف گروہ سے خوف زدہ ہو گئے تھے لیکن ایسا نہیں ہے عزت مآب۔‘‘

’’تو پھر کیا ہے؟‘‘ حکم نے دریافت کیا۔

’’اب تک میں نے جو کچھ بتایا ہے، میں اس کا چشم دید گواہ ہوں لیکن جو بات میں اب بتاؤں گا، وہ میں اندازے سے بتا رہا ہوں۔ مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ

میرا یہ اندازہ درست ہے۔ بزرگ خاتون کی توہم پرستی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ یہ اپنے عقیدے کی اتنی پکی ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتیں۔ جلتے کڑاہے میں ہاتھ ڈالنے والا امتحان اس لیے دیا گیا تھا تاکہ بزرگ خاتون کے پوتے اور اس کی پتنی مالا کی بے گناہی ثابت ہو سکے۔ ہاتھ ڈالنے والے کے ہاتھ جل گئے کیونکہ انہیں جلنا ہی تھا لیکن یہ بزرگ خاتون پھر بھی اپنی بے مثال دقیانوسیت پر قائم ہے۔ پرکھشا کے طریقے پر نظرثانی کرنے کے بجائے اب یہ اپنے پوتے اور اس کی بے گناہ پتنی کے خلاف ہو چکی ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ وہ واقعی مجرم تھے، اگر مجرم نہ ہوتے تو رام پرشاد کے ہاتھ کیوں جلتے۔ اسی بات پر پوتا اور اس کی پتنی مالا اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ عزت مآب! شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انتہا پسند دن بہ دن محدود اور تنہا ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ زہریلے بھی۔"

بڑھیا پوپلے منہ سے پھنکاری۔ "یہ نیچ کمینہ جھوٹ بولت ہے، بکواس کرت ہے... ایسا... کچھ ناہیں ہوا..."

اس کا لہجہ ہی گواہی دے رہا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے۔ اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔ وہ زیادہ واویلا کرنے لگی تو حکم کے اشارے پر پہرے دار اسے سمجھاتے اور سنبھالتے ہوئے باہر لے گئے۔

میں حیرت سے عمران کو تک رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں کسی عدالت میں ہوں اور کسی بہت بڑے وکیل نے بڑی مہارت اور خوب صورتی سے آناً فاناً جیوری کو لاجواب کیا ہے۔ میرے لیے سب سے بڑی حیرت وہ خاص قسم کی سنجیدگی تھی جو میں نے آج پہلی بار عمران کے چہرے پر طاری دیکھی تھی۔

میں ابھی تک عمران کے ماضی میں نہیں جھانک سکا تھا۔ یقیناً وہاں کوئی خاص کہانی موجود تھی... کہیں... ایسا تو نہیں تھا کہ عمران بھی کسی ایسی ہی انتہا پسندی اور جنونیت کا ڈسا ہوا ہو؟ ان مہلک رویّوں نے کوئی گہرا زخم لگایا ہوا ہے؟

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑھیا کے جنونی رویّے کی وجہ سے بڑھیا کا کیس کافی حد تک کمزور ہو گیا ہے۔ وہ سامبر کا مقابلہ رکوانا چاہتی تھی اور اس کی دلیل یہ تھی کہ میری سزا دردناک موت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ بہرحال، اب یہ معاملہ پنڈت مہاراج اور اس کے ساتھیوں کے سامنے پیش تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ حکم دل ہی دل میں اب بھی یہی چاہتا ہے کہ یہ مقابلہ نہ ہو لیکن وہ لکھے ہوئے قانون اور پنڈتوں کی رائے کی اہمیت سے بھی آگاہ تھا۔

لمبے بالوں والے پنڈت اور اس کے درجن بھر ساتھیوں کے درمیان تادیر مشورہ ہوا، چند سال خوردہ کتابوں اور پوتھیوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ آخر پنڈت مہاراج نے سب کے سامنے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "عزت مآب! ہمارے پاس سامبر کے بارے میں بہت کھلی اور واضح جانکاریاں موجود ہیں۔ اگر کوئی منش کسی دوسرے منش کو سامبر کی دعوت دے دیوت ہے اور دوسرا اسے قبول بھی کر لیوت ہے اور سامبر کی شبھ گھڑی بھی نکل آوت ہے تو پھر واپسی کی گنجائش ناہیں رہتی۔ اگر کوئی دوسرا معاملہ ہو بھی تو پہلے سامبر رچنا کا ہونا ضروری ہو جاوت ہے۔"

پنڈت مہاراج نے سنسکرت کی ایک قدیم کتاب کا اقتباس پڑھتے ہوئے کہا۔ "سن 512 ب، مہینا بیساکھ، تاریخ 30۔ راجستھان کے راجواڑے واشو کے مشہور راجا کرشن کمار سہائے کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تھا۔ ایک شخص آنند لال پر چوری اور ہتھیا کا الزام تھا لیکن اس کے پکڑے جانے سے پہلے ہی اس کا سامبرا اپنے سوتیلے بھائی سے طے ہو چکا تھا۔ راجا نے ہتھیارے کو سزا دینے سے پہلے اس کا سامبر کرانے کا حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ ہو سکتا ہے سامبر کے مقابلے میں ہی انصاف ہو جاوے۔ یہ مرد اور مارو کا مقابلہ تھا۔ اس میں ملزم آنند لال بچ گیا اور اس کا سوتیلا بھائی مارا گیا۔ بعد میں یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ ملزم بے گناہ تھا اور اصل دوشی اس کا سوتیلا بھائی ہی تھا... اور عزت مآب! ایسی اور بھی کئی مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں۔"

حکم نے کہا۔ "پنڈت جی! کیا آپ یہ چاہت ہیں کہ سلطانہ کے پتی کو سامبر کی آگیا دی جاوے اور اگر یہ اس یدھ (لڑائی) میں کامیاب ہو جاوے تو پھر اسے مطلوبہ عورت کے ساتھ جل پانی جانے دیا جاوے؟"

"بالکل سرکار! ہم کو ایک مرتبہ تو ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ بھگوان نہ کرے اگر یہ شخص سامبر جیت جاوت ہے تو پھر اسے کم از کم ایک بار تو زرگاں کی حدوں سے نکل جانے کی آگیا دینی ہو گی۔"

اس موقع پر میں نے پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن میں آپ کے لفظوں کو درست نہیں سمجھتا۔ مجھے زرگاں کی حد سے نکلنے کی نہیں، جل پانی پہنچنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ یہ تو سراسر مذاق ہو گا کہ آپ مجھے زرگاں سے تو نکلنے دیں لیکن آپ کے اہل کار میرے ساتھ ساتھ رہیں اور زرگاں کی حد ختم ہوتے ہی مجھے پھر دھر لیا جائے۔"

"تم بال کی کھال مت اتارو۔" حکم نے پہلی بار برہم ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم خوب اچھی طرح سمجھت ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ اور یہ مت سمجھو کہ ہم تمہیں اور تمہاری پتنی کو جل پانی سے واپس ناہیں لا سکتے۔ اگر ہم چاہیں تو تمہیں زمین کی ساتویں پرت سے بھی کھینچ لیا جاوے گا۔"

پنڈت مہاراج نے اپنے لمبے بالوں کو کندھوں پر سنوارتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے بھگوان سے پوری آشا ہے جناب کہ اس سب کی نوبت ہی ناہیں آوے گی۔ اس پاپی کے پاپوں کا گھڑا سامبر کے مقابلے میں ہی پھوٹ جاوے گا۔"

جارج کی بہن ماریا اپنی جگہ سے اٹھی اور پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ "میں اس موقع پر پنڈت مہاراج، حکم جی اور دیگر معزز ارکان سے بس ایک ہی بات کہنا چاہوں گی۔ یہ شخص جرم وار ہے اور خدا نے چاہا تو یہ سامبر میں ضرور شکست کھائے گا لیکن اس کو اکھاڑے میں ہی مار دیا گیا تو یہ ان سب لوگوں کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہو گی جو مختار راجپوت کی بیٹی کو انصاف کے کٹہرے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری پرزور درخواست ہے کہ سامبر کے بعد اس شخص سے اس کی بیوی کا اتا پتا دریافت کیا جائے اور اسے برآمد کیا جائے۔" پنڈت مہاراج نے ماریا کی باتوں کی تائید کی۔

چند منٹ مزید گفتگو جاری رہی اور پھر وہیں دربار میں سب کچھ طے پا گیا۔ دو روز بعد ساتویں کا جشن تھا اور اس سے دو روز بعد یعنی نو تاریخ کو میرا اور جارج کا مقابلہ دن کے تیسرے پہر میں ہونا تھا۔

آخر میں حکم جی نے مجھے پیشکش کی کہ اگر میں راج بھون کی سیر کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ اس نے متعلقہ لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ مجھے راج بھون میں گھمائیں پھرائیں۔

ساتویں کا جشن دو روز بعد تھا لیکن اصل میں یہ جشن شروع ہو چکا تھا۔ گارڈز کے نرغے میں حکم کے فربہ اندام مشیر خاص اوم پرکاش نے ہمیں راج بھون کے مختلف حصے دکھائے۔ ہمارے ساتھ میڈم صنوبرا، رنجیت پانڈے اور اس کے ایک درجن ساتھی بھی تھے۔ مجھے پانڈے کی نگاہوں میں اپنے لیے طیش اور کینہ صاف نظر آ رہا تھا۔

راج بھون کے مختلف حصوں کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ یہ سب کچھ آنکھیں چندھیا دینے والا تھا۔ شاید مجھے سیر کرانے کا مقصد مجھ پر اس شان و شوکت کا رعب ڈالنا بھی تھا۔

ساتویں کے جشن کی سب سے اہم خوب صورتی، رنگینی

وہ ایک بہت بڑا قطعہ تھا جسے جنت ارضی کی طرح سجایا گیا تھا۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا بے ستون کا ہال تھا۔ اس کی چھت گنبد نما تھی۔ اس گنبد نما چھت کو اس طرح پینٹ کیا گیا تھا کہ دن میں بھی رات کا سماں ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہزاروں ستارے ٹمٹما رہے ہیں اور ان کے درمیان چاند کی خوب صورت ٹکیا روشن ہے۔ یہ چاندنی فرش تک پہنچتی تھی اور نشیب و فراز کو عجیب کیفیت میں رنگ دیتی تھی۔ یہاں تین بڑی آبشاریں تھیں جن کا پانی موسیقی بکھیرتا چھوٹے چھوٹے جھرنوں میں تبدیل ہوتا تھا اور پھر ایک بڑے حوض میں گرتا تھا۔ یہ حوض طول میں کم و بیش پچاس میٹر اور عرض میں چالیس میٹر ہوگا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی خوب صورت کشتیاں تیر رہی تھیں۔ ان کشتیوں میں شراب کی صراحیاں، جام اور دیگر لوازمات سجے ہوئے تھے۔ ہر کشتی میں خلوت فراہم کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا کانچ بھی تھا۔ اس طرح کا ہر کانچ تازہ پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان میں سے کچھ کشتیوں پر راج بھون کے خواص اپنی بیگمات کے ساتھ موجود تھے اور خوش فعلیاں کر رہے تھے۔ حوض کے کنارے موجود خوش لباس سازندے موسیقی کی تانیں بکھیر رہے تھے اور چند خوبرو لڑکیاں حوض کے اردگرد رقص فرما تھیں۔ کھلی جگہ کے مقابلے میں اندر کا ماحول نیم گرم تھا۔ یہی حرارت تھی جس کے سبب رقاصاؤں نے نہایت مختصر لباس پہن رکھے تھے اور پھر بھی خوش و خرم تھیں۔ اس وسیع و عریض کمپاؤنڈ کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا فوارہ نصب تھا۔ فوارے میں سے سات رنگوں کا شفاف پانی پھوٹتا تھا اور فوارے کے اردگرد بنے ہوئے ایک گول حوض میں جمع ہوتا تھا۔ شیشے کے اس گول حوض کی چاروں طرف آرام دہ نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ ان نشستوں پر کچھ لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے اور رقاصاؤں کے تھرکتے جسموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ لطف اندوزی صرف دیکھنے تک محدود نہیں تھی۔ گاہے بگاہے کوئی شخص اپنے اردگرد ناچتی رقاصہ کو چھوتا تھا یا آغوش میں کھینچ لیتا تھا۔ گل پوش کشتیوں میں بیٹھی بیگمات ان مناظر سے صرف نظر کرتی تھیں۔ غالباً یہ ساری رعایتیں اور گنجائشیں ساتویں کے جشن سے نسبت رکھتی تھیں۔

میڈم نے مجھے بتایا۔ ”جشن کے دن اس فوارے میں یہ سات رنگوں والا پانی نہیں ہوگا۔“

”پھر کیا ہوگا؟“

”مہنگی ترین امپورٹڈ شراب۔ اس شراب سے یہ گول حوض لبالب بھر جائے گا۔ لوگ اس کے اردگرد بیٹھ کر رقص دیکھیں گے اور ساتھ ساتھ مے نوشی کریں گے۔ رقاصائیں بھی یہ نہیں ہوں گی۔ یہ وہی چالیس لڑکیاں ہوں گی جن میں سے سات رنگوں کی سات پریاں چنی جاتی ہیں۔“

”وہ کیا ہے میڈم؟“ میں نے شیشے کے ایک بڑے چوکور ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے اندر کوئی سنہری چیز ہلکورے لیتی تھی۔

”لیکوئیڈ گولڈ... سیال سونا۔“ میڈم نے بتایا۔

”کیا مطلب؟“

میڈم کے بجائے ایک فوجی افسر بولا۔ ”یہ پگھلا ہوا سونا ہے۔“

میں اور عمران دنگ رہ گئے۔ اگر یہ واقعی سونا تھا تو یہ ڈیڑھ دو من تو رہا ہوگا۔ اس سیال سونے کے بیچوں بیچ ایک برہنہ لڑکی کی دو فٹ اونچی مورتی نظر آرہی تھی۔ یہ مسکراتی ہوئی مورتی کسی بہت سخت شیشے سے بنی ہوئی تھی لیکن لگتا تھا کہ یہ موم کی ہے۔ یعنی پگھلے ہوئے سونے کے اندر موم کی لڑکی۔ لڑکی کا صرف بالائی دھڑ نظر آتا تھا پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی سیال سونے میں اوجھل ہو گئی۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ دوبارہ ابھری تو سیال سونے میں لتھڑی ہوئی نظر آئی۔ لیکن شیشے کے باکس کے اندر اس قدر درجۂ حرارت تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پگھلا ہوا سونا پانی کی طرح اس کے بلوری جسم سے ڈھلک کر واپس گر گیا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی... پگھلے ہوئے سونے میں مسکراتی لڑکی کا برہنہ جسم۔ یہ چھوٹا سا تماشا ایک طرح کی علامتی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ سونا دولت اور اختیار کی علامت تھا... دولت اور اختیار جو عورت کے برہنہ جسم کو عیش و عشرت کی آگ میں جھلساتے تھے۔ وہ جھلستی تھی لیکن پھر بھی سب کچھ جھیلتی اور مسکراتی رہتی تھی۔

لڑکی کی مورتی کو پگھلے ہوئے سونے میں ڈبونے اور پھر ابھارنے کے لیے کوئی مشینی تکنیک استعمال کی گئی تھی۔ ہر بیس تیس سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ سیال سونے میں غوطہ زن ہوتی تھی اور پھر باہر نکل آتی تھی۔ اس تماشے کا سب سے بہترین منظر وہ تھا جب پگھلا ہوا سونا پانی کی دھاروں کی طرح اس کے بلوری جسم سے جدا ہوتا تھا۔

ہماری چاروں جانب بجتے ہوئے ساز رکے تو رقص بھی تھم گیا۔ رقاص لڑکیاں مختلف گوشوں میں اوجھل ہو گئیں۔ ایک خوبرو لڑکی اپنی ساڑی کو چٹکیوں میں ٹخنوں سے اوپر اٹھائے دوڑتی ہوئی آئی... وہ ہنس رہی تھی اور اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ اس کے عقب میں نشے میں دھت ایک امیر زادہ تھا۔ وہ غالباً پریمی جوڑا تھا۔ لڑکا، لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی بل کھا کر لہرائی اور چکما دے کر اس کی زد سے نکل گئی۔ دونوں ہنستے ہوئے ایک جانب اوجھل ہو گئے۔

یہاں ہر طرف سرمستی اور مدہوشی کا ماحول نظر آرہا تھا۔ ابھی ایک دو دن میں اس ماحول کو مزید پروان چڑھنا تھا اور جشن کے دن کلائمیکس تک پہنچنا تھا۔

مجھے اس وسیع و عریض کمپاؤنڈ کی کھڑکیوں کے نیلے شیشوں میں سے راج بھون کے وسیع لان کا منظر نظر آیا۔ باہر دن اور اندر رات تھی۔ راج بھون کی بیرونی دیوار پر خاردار باڑ لگی تھی۔ اس فصیل نما دیوار کے اوپر باڑ کے ساتھ ساتھ مسلح پہرے دار گشت کر رہے تھے۔ ان میں سے دو پہرے داروں کے ہاتھوں میں مجھے رکھوالی کے کتے بھی دکھائی دیے۔

چند روز پہلے ہم اسی دیوار کی طرف سے راج بھون میں گھسے تھے اور تہلکہ مچایا تھا۔ اب یہاں سخت نگرانی تھی اور چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی لیکن اس ساری نگرانی کے باوجود ہم کسی اور روپ میں راج بھون کے اندر موجود تھے۔

...رقص اب ختم ہو چکا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر گانے والی اپنے چاندی بال چمکاتی ہوئی سازندوں کے قریب جا بیٹھی اور ایک ہندی گیت گانے لگی۔ مغنیہ کی آواز پرسوز تھی۔ لے بھی اچھی تھی۔ رقص کی دھنا دھن سے یہ موسیقی کہیں بہتر تھی۔ گیت کے بولوں کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

رنگ و بو کے دھاروں میں
روز و شب کے پرشور ہنگاموں میں
گرجتی برستی بارشوں میں اور تیز آندھیوں میں
غرض زندگی کے کسی بھی تیز بہاؤ میں
میں تجھے بھول نہیں پاتا
تیری یاد میرے ساتھ رہتی ہے، سردیوں کی دھوپ کی طرح
اور صحرا کی رم جھم کے مانند
باغوں کی چاندنی کی مثال
اور جلتے راستوں پر ملنے والے گھنے پیڑوں کی طرح

گیت کے بول میرے دل میں سرایت کرنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا، میں بھی کسی کو یاد کرتا ہوں۔ کوئی ہر وقت میرے ساتھ بھی رہتا ہے۔ وہ کون ہے؟ شاید سلطانہ جو میری زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ جس کی دل نواز محبت مدھم بارش کی طرح میرے دل کی زمین میں اندر تک سرایت کر گئی تھی۔ میں اس کے پاس واپس جانا چاہتا تھا، آنکھوں میں فتح مندی اور کامیابی کی چمک بھر کر۔ پھر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا اور اس کی شفاف آنکھوں سے نکلنے والے سارے آنسو اپنے ہونٹوں سے چن لینا چاہتا تھا۔ ہاں، وہ ایک سائے کی طرح میرے ساتھ تھی... لیکن... لیکن اس سائے کے پیچھے ایک اور سایہ بھی تو تھا۔ ایک اور مدھم سا ہیولا بھی، ایک لڑکی... جو ایک سہانی شام کی راہ تکا کرتی تھی۔ جو ڈائری پر لکیریں کھینچ کر انتظار کی تاریخیں کاٹا کرتی تھی اور جو شہنائیوں کی گونج سے پہلے ہی کہیں گم ہو گئی تھی... کبھی نہ ملنے کے لیے۔ سلطانہ کے سائے کے پیچھے اس کا سایہ بھی تو تھا۔ میں ایک بار... زندگی میں بس ایک بار اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس کو دیکھنا چاہتا تھا اور اگر وہ سننا پسند کر لیتی تو اس سے صرف معذرت کہنا چاہتا تھا۔

ہاں، سلطانہ کے سائے کے پیچھے وہ سایہ بھی تو تھا۔ کیا میں اب بھی اس سے محبت کرتا تھا؟ کیا ایسا ممکن تھا کہ میں ایک ہی وقت میں سلطانہ کو چاہوں اور ثروت کو دیکھنے کی حسرت بھی دل میں رکھوں؟ کیا سلطانہ سے میری محبت جسمانی رخ اختیار کر چکی تھی اور ثروت سے روحانی؟ سلطانہ کے لیے میرے اندر طلب تھی کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی بے خبری کے زمانے میں اس کے بہت قریب رہا ہوں۔ اس کے جسم کی ساری حرارت اور رعنائی میرے اندر جذب ہوتی رہی ہے۔ اب میں اس حرارت اور رعنائی کا خلا محسوس کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بیوی کی حیثیت سے سلطانہ کی بے پناہ قربانیاں بھی مجھے اس کی طرف کشش کرتی تھیں۔ لیکن ثروت کی محبت اس کانٹے کی طرح تھی جو جسم کے اندر ٹوٹ چکا تھا۔ ایک بار تکلیف برداشت کر کے اس کانٹے کو نکالا جانا ضروری تھا۔

لیکن یہ سب کچھ تو تب ہوتا جب میں اپنے مہلک حالات کے گھیرے سے نکل سکتا۔ ابھی مجھ پر صرف موت کا پہرا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ آنے والے چار پانچ دنوں میں میرے ساتھ کیا ہونا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر جارج کے ساتھ میرا مقابلہ ہوا تو یہ یادگار اور بہت خوفناک ہوگا۔ مغنیہ کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ گیت کے آخری مرحلے میں تھی۔

ہمارے آنسو کبھی تمہارے دامن پہ نہ بہہ سکے
افسوس یہ ہے کہ تمہیں الوداع بھی نہ کہہ سکے
اور دل میں بے شمار باتیں لیے
کچھ دکھی برساتیں اور بے چین راتیں لیے

یادوں کی جھولی میں چند ادھوری ملاقاتیں لیے
ہم تم سے دور جانے پر مجبور ہوئے
ہاں بہت دور ہوئے

... بہت جلد اس گنبد نما وسیع وعریض چیمبر میں مجھے پہچان لیا گیا۔ بیشتر لوگ اپنی دلچسپ مصروفیات چھوڑ کر میری طرف آ گئے۔ ان میں راج بھون کے حکام تھے۔ شاہی مہمان اور ان کی بیگمات و ساتھی خواتین تھیں۔ حتیٰ کہ رقاصائیں اور ملازمین وغیرہ بھی مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور میرے گرد اکٹھے ہونے لگے تھے۔

یہ صورت حال پانڈے کو بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لوگ میرے گرد اکٹھے نہ ہوں لیکن وہ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ سب کے سب معززین میں سے تھے۔ پانڈے انہیں تو کچھ نہ کہہ سکا مگر رقاصاؤں اور دیگر ملازمین پر بگڑنے لگا۔ ”آپ لوگ کیا کرتے ہو، یہ تماشا نا ہیں۔ چلیں اپنے اپنے کام کریں۔ پیچھے ہٹ جائیں۔“

میرے ہاتھوں کی جلد سینڈ بیگ کی مار سے سیاہ ہو چکی تھی۔ سوکھے چمڑے کی طرح کھردری اور سخت۔ ایک گورا چٹا چودھری نما شخص آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر ہولے سے بولا۔ ”سنا ہے تم خالی ہاتھ سے بندے کی کھوپڑیا توڑ سکت ہو؟“

اس کا ساتھی بولا۔ ”مجھے پتا ہے، تم اس سے کس کی کھوپڑیا تڑانا چاہت ہو۔“

”کیا بکواس ہے؟“ پہلا شخص بولا۔

دوسرے نے کہا۔ ”معشوق کے لیے پتنی کو مروانا بڑا پرانا رواج ہے اور پتنی کھوپڑیا ٹوٹنے سے مرے، یہ تو اور بھی مزے کی بات ہے۔“

”مجھ کو لگت ہے کہ تم اپنے گھریلو حالات یہاں بیان کر رہے ہو۔“ پہلے شخص نے کہا اور بھنایا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

رنجیت پانڈے جھلا کر مشیر خاص ادم پرکاش سے بولا۔ ”میں اسی لیے کہوت ہوں جناب! یہ میرا اب ختم کیجیے۔“

اس سے پہلے کہ مشیر خاص جواب میں کچھ کہتا، ایک نوجوان امیر زادہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے کیمرے سے کھٹا کھٹ میری دو تین تصویریں اتار لیں۔ ایک تصویر اس نے خاص طور سے میرے ہاتھوں کی اتاری تھی۔

بڑی بڑی مونچھوں والا ایک شخص جو کوئی امیر کبیر مراٹھی سیٹھ لگتا تھا، آگے بڑھا اور شرابی لہجے میں کیمرے والے کو ڈانٹ کر بولا۔ ”یہ کیا ناٹک ہے بھئی۔ یہ سالا کوئی تو کوئی ہیرو ہے جس کے فوٹو اتار رہے ہو؟ یہ اپرادھی ہے اور جوتوں کا حق دار ہے۔ اگر اس کی فوٹو ہی اتارنی ہے تو تب اتارنا جب سولی پر ٹانگ کر اس کی ہڈیوں کا چورا کیا جاوے گا کتا... ذلیل۔“

”اپنا منہ سنبھال کر بات کرو۔“ میں نے پھنکارتے لہجے میں کہا۔

سیٹھ نما شخص آگے بڑھا اور اس نے بالکل غیر متوقع طور پر ایک زوردار مکا میرے منہ پر رسید کیا۔ میں بے خبر تھا، اچھی خاصی چوٹ لگی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ بے ساختہ میرا دایاں ہاتھ گھوما۔ غالباً سیٹھ کو بھی امید نہیں تھی کہ اتنا فوری اور ایسا سخت جواب ملے گا۔ حالانکہ میں نے زیادہ زوردار ہاتھ نہیں مارا تھا پھر بھی وہ شخص ڈکراتا ہوا پیچھے کی طرف گیا اور حوض میں گر گیا۔ وہ تیرنا نہیں جانتا تھا، ایک دم غوطے کھانے لگا۔ دو گارڈز نے پانی میں چھلانگیں لگائیں اور اسے سنبھالا۔ اس کے ہونٹوں سے خون جاری تھا۔ وہ گالیاں بکنے لگا۔ گارڈز نے مجھے گھیرا ڈال لیا اور شرابی سیٹھ کو بھی سنبھال کر مجھ سے دور لے گئے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ میرے اس جچے تلے مکے نے سیٹھ کا دم خم ختم کر ڈالا تھا اور ساتھ ہی اس کا نشہ بھی ہرن ہوا تھا۔ اسی دوران میں ایک شخص پکار کر بولا۔ ”جارج گورا صاحب اس طرف آ رہے ہیں۔“ یہ سن کر میڈم صفورا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں بولی۔ ”یہ شخص جسے تم نے گھونسا مارا ہے، جارج صاحب کے کلوز فرینڈز میں سے ہے۔ جارج کو پتا چلا تو وہ پھڈا کرے گا۔“

رنجیت پانڈے نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ مشیر خاص ادم پرکاش مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب تمہیں یہاں سے نکلنا چاہیے ورنہ معاملہ خراب ہو جاوے گا۔ چلو اس طرف سے آ جاؤ۔“

اس نے ایک بغلی دروازہ کھولا اور مجھے وہاں سے نکلنے کو کہا۔

ہم ”جنت ارضی“ کی خوش گوار حرارت سے نکل کر دروازے میں داخل ہوئے اور ایک طویل راہداری سے گزر کر سیدھے اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کھلی جگہ پر پہنچ کر عجیب سا احساس ہوا۔ یہاں سرما کی زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا جبکہ ابھی ہم جنت ارضی والے کمپاؤنڈ کے اوپر تاروں بھرا آسمان دیکھ رہے تھے اور چاند کی چاندنی گنگناتی آبشاروں کو منور کر رہی تھی۔ یوں لگا جیسے پچھلے آدھ گھنٹے سے ہم جاگتی آنکھوں کے ساتھ خواب دیکھ رہے تھے۔ ہمیں فوراً گھوڑا گاڑیوں میں بٹھایا گیا اور وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔

جارج کے ساتھ ایک ممکنہ ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا جیسا کہ ہمیں بعد میں پتا چلا، جارج بہت غصے میں وہاں پہنچا تھا اور اس نے مسلح گارڈز کو سخت برا بھلا کہا تھا جن کے ہوتے ہوئے سیٹھ کے ساتھ میرا جھگڑا ہوا اور میں اسے ایک شدید ضرب لگانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ گھوڑا گاڑیاں راج بھون کا وسیع احاطہ پار کر کے مین گیٹ کی طرف بڑھیں۔ دور بائیں طرف ہمیں وہ بلند بالکونی نظر آ رہی تھی جہاں چند دن پہلے رتنا دیوی کے ہاں بچے کی پیدائش کا جشن منایا جا رہا تھا اور میں نے عمران کے ہمراہ، اس بالکونی پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے جشن کو درہم برہم کیا تھا۔ وہاں شاید ہماری چلائی ہوئی گولیوں کے نشان ابھی تک موجود تھے۔

پھر وہ مین دروازہ دکھائی دیا جہاں سے میں اور عمران اندھا دھند بھاگتے ہوئے فرار ہوئے تھے اور پانڈے کا... ہم شکل ”چچازاد“ ہمارے پیچھے آیا تھا۔ ہم گیٹ سے باہر نکلے تو یہاں ایک اور ہی منظر دکھائی دیا۔ گیٹ کے باہر راستے کی دونوں جانب سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ یہ زیادہ تر مسلمان نظر آتے تھے۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ سب لوگ مجھے یہاں دیکھنے کے لیے جمع ہیں۔ میڈم میرے ساتھ ہی گاڑی میں موجود تھی، وہ بولی۔ ”یہ دیکھو، تمہاری للکار نے کام دکھایا ہے۔ زرگاں کے ایک بڑے طبقے نے تمہیں اپنے خیالوں کا مرکز بنا لیا ہے۔ یہ لوگ تمہاری ایک جھلک دیکھنا چاہتے ہیں۔“

پانڈے کے چہرے پر برہمی تھی۔ اس نے جھلاہٹ کے عالم میں گاڑی کی کھڑکیوں کے پردے نیچے گرا دیے۔

باہر لوگوں کا شور تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے گاڑی کا راستہ روک رکھا ہے۔ گارڈز انہیں راستے سے ہٹانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ گرج برس رہے تھے اور سیٹیاں بجا رہے تھے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک گاڑی کا عقبی دروازہ کھلا اور ایک سفید ریش بوڑھے شخص کا سرخ و سپید تمتمایا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ جوش کے سبب اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں... وہ چلا کر بولا۔ ”ہم تمہارے ساتھ ہیں... فتح تمہاری ہوگی۔ اللہ مدد کرے گا۔ تم جیتو گے...“ وہ ہیجانی لہجے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے عقب میں ایک گارڈ نمودار ہوا۔ اس نے بوڑھے شخص کو کالر سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور پیچھے گھسیٹ لیا۔ تب مزید دو افراد کے چہرے نمودار ہوئے۔ وہ بھی شکلوں سے مسلمان ہی لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے محبت اور خیر خواہی کی بلند لہریں تھیں، اس کے ساتھ ساتھ ایک جوشیلا رنگ تھا۔ ان افراد کو بھی گارڈز نے عقب سے کھینچ کر گاڑی سے دور ہٹا دیا۔

اس کے بعد شاید کچھ لاٹھیاں وغیرہ بھی چلیں۔ بھگدڑ کے آثار نظر آئے اور گاڑی متحرک ہو کر آگے بڑھی۔ ”تیز چلاؤ۔“ گاڑی کے اندر سے رنجیت نے کرخت لہجے میں کوچبان کو حکم دیا۔ گاڑی نے رفتار پکڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے راج بھون سے دور آ گئی۔ اب وہ تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ میڈم صفورا نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ رنجیت پانڈے کے سامنے اس نے کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ پانڈے طیش سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ مجھے اسی جگہ شوٹ کر دیتا اور شوٹ کرنے کے بعد بھی میری لاش پر گولیاں برساتا رہتا۔ یہ بات وہ بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر مجھے یہاں آناً فاناً شہرت ملی ہے اور لوگوں نے مجھے جارج کا خطرناک مدِمقابل سمجھنا شروع کیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ میں نے نل پانی کی لڑائی میں اسے نیچا دکھایا ہے۔ یہ بات اب شاید کسی سے بھی چھپی نہیں رہی تھی کہ دیوان کے اندر ہونے والی لڑائی میں رنجیت پانڈے نے ہوشیاری سے مین سوئچ آف کر کے اندھیرا کیا تھا اور موقع سے کھسک کر اپنی جان بچائی تھی۔

میڈم کی رہائش گاہ لال بھون میں واپس پہنچ کر میں عجیب الجھن کا شکار ہو گیا۔ میرے ذہن میں بار بار ہاشو کی شبیہ ابھر رہی تھی۔ اس کا کردار عجیب ڈھنگ سے سامنے آیا تھا۔ وہ گونگا نہیں تھا اور گونگے کے طور پر ایک مدت سے مختار راجپوت کے گھر میں مقیم تھا۔ اس پر راج بھون کی طرف سے بہت سے الزامات لگائے جا رہے تھے اور یہ نہایت سنگین الزام تھے۔ ہاشم عرف ہاشو خود اعتراف کر رہا تھا کہ جو زہر کے پیکٹ ہمیں دکھائے گئے، وہ اسی کے تھے اور وہ ان سے بہت سے لوگوں کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سب کے سامنے برملا کہا تھا کہ اگر ابھی اس کی زندگی باقی ہوتی اور اسے آزاد فضا میں پہنچنا نصیب ہوا تو وہ پھر یہی کچھ کرے گا جو اس نے اب کیا ہے۔

میری گہری سوچ اور فکر مندی عمران کو بھی متاثر کر رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”کس فکر میں کھو گئے ہو جگر؟“

”وہی ہاشو والا معاملہ...“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بھی دیکھ لیا ہوگا... اس پیکٹ میں ویسا ہی

زہر تھا جیسا سلطانہ کے پاس پڑیا میں تھا۔"

"ہاں... یہ بات تو واقعی غور کرنے والی ہے مگر اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ سلطانہ کے پاس وہ پڑیا ملنے کا مطلب خدانخواستہ یہ تو ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ ہاشو کے کاموں میں شریک ہے یا اس کے مقصد سے جڑی ہوئی ہے۔"

"پھر بھی ذہن میں وسوسہ تو پیدا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور وسوسوں کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وسوسہ ہی رہتا تھا کہ ہے یا نہیں۔ ویسے یار! مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ حکیم لقمان کی وجۂ شہرت اس کی قابلیت تھی یا پھر یہ محاورہ تھا۔"

میں نے قالین پر لیٹ کر اپنا سر بازو کے تکیے پر رکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ فکر مندی دل و دماغ میں سرایت کر رہی تھی۔ کہیں سلطانہ کا تعلق سچ مچ تو ایسے لوگوں سے نہیں تھا جن کا مذہب اور عقیدہ صرف اور صرف خوں ریزی ہوتا ہے۔ کیا وہ اس طرح کی سوچ ذہن میں پال سکتی تھی؟ ذہن نے فوراً جواب دیا... نہیں، وہ ایسی نہیں ہوسکتی۔

لیکن یہ تو ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی ناسمجھی کے سبب کسی کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہو۔ کسی اَن چاہے دھارے میں بہہ گئی ہو۔ ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں تھا۔ شاید میں واقعی ایک شوہر کی حیثیت سے اسے پیار کرنے لگا تھا۔ اس کے اچھے بھلے کی فکر کرنے لگا تھا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر تشویش کی یہ لہریں کیوں میرے رگ و پے میں ہلچل مچا رہی تھیں۔

ہاشو کا کردار کسی طور بھی قابلِ تعریف نہیں تھا، بالکل جیسے مالا کی دادی ساس کا کردار قابلِ تعریف نہیں تھا۔ بہرحال، جو کچھ بھی تھا آج عمران نے بھرے دربار میں حکم، اس کے مصاحبوں، پنڈتوں اور عاملوں کا منہ بڑی خوب صورتی سے بند کیا تھا۔ انتہا پسند کس جگہ موجود نہیں ہیں... ہاں کس جگہ موجود نہیں ہیں۔

میں وہیں لیٹے لیٹے اونگھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میرے کانوں میں عمران اور ایک لڑکی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گوری نامی یہ لڑکی ہماری دو خادماؤں میں سے تھی۔ پارسن ہونے کے باوجود یہ گوری چٹی اور قبول صورت تھی۔ عمران اکثر اس سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ عمران کسی لڑکی کی طرف متوجہ ہو اور وہ توجہ نہ دے... وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور یہی نہیں، اس کی گفتگو کی مقناطیسی طاقت کسی کو اپنے جال سے نکلنے نہیں دیتی تھی۔ یہ گوری نامی لڑکی ان بے دام کی کنیزوں میں سے تھی جو اپنے مالکوں کی ہر "قسم" کی خدمت کے لیے ہر وقت اور ہر جگہ تیار رہتی ہیں... عمران اشارہ بھی کرتا تو وہ اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاتی اور اسے خوش قسمتی بھی سمجھتی۔ لیکن وہ تو صرف وقت گزاری کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بڑے خلوص سے لڑکی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی تعریف کر رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ ایسی آنکھیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں ایک امراؤ جان ادا ہوئی تھی یا پھر اب وہ ہے جو ایسی دھانسو آنکھیں رکھتی ہے۔

پھر وہ بولا۔ "لیکن گوری! ایسی بڑی بڑی لاجواب آنکھیں رکھنے کے باوجود تم کپڑے ٹھیک سے استری نہیں کرتی ہو۔ اب دیکھو، تم یہ جو پینٹ استری کر کے لائی ہو، یہ اوپر سے اب بھی سلوٹوں والی ہے۔"

وہ ہکلائی۔ "دراصل... اوپر سے... اوپر سے... آپ کا پتلون استری کرتے ہوئے ہام کو شرم آتا ہے..."

"ہائیں، یہ کیا بات ہوئی؟"

"بس جی... پہلے ایسا ناہیں تھا، پر اب ایسا ہوتا ہے۔"

"یہ کیا پہیلی ہے... کیا کوئی بھی پتلون استری کرتے ہوئے ایسا ہوتا ہے؟"

"ناہیں جی ناہیں... بس آپ کا پتلون۔" وہ کسی دوشیزہ کے انداز میں ہنسنے لگی۔

"پھر کیا کرتی ہو؟"

"ہام آنکھیں بند کر کے استری پھیرتا ہے۔"

"وہ تو پتلون دیکھ کر ہی پتا چل رہا ہے۔"

"آپ ہام کو بہت اچھا لگتا، ہام آپ کے لیے یہ گلاب کلی لایا۔" پھر اس نے شاید اپنے لباس کے اندر سے کوئی کلی نکال کر عمران کو دی۔

عمران نے کہا۔ "سچی بات ہے کہ تم بھی ہام کو بہت اچھا لگتا۔ ہام تم سے شادی کرنا مانگتا۔ لیکن اگر ہام شادی کرنا مانگتا تو ہمارا پہلا دو وائف ہمارا سر توڑنا مانگتا۔"

"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ نے شادی ناہیں بنائی۔"

"ہام نے کہاں بنائی، ہام سے زبردستی بنائی گئی اور ایک بار نہیں دو بار۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "ہام کا اتنا قسمت کہاں کہ ہام آپ سے شادی بنانے کا سوچے۔ ہام تو بس آپ کا خوشبو سونگھ کر پٹی ہو جاتا۔" اس کے لہجے میں نوخیزی اور الھڑپن کی جھلک تھی۔

"اوہ، خوشبو سے یاد آیا کہ کل غسل خانہ ٹھیک سے صاف نہیں ہوا تھا۔" عمران نے کہا۔

"اوہ سوری! ہام ابھی کرتا، بالکل شیشہ بنا دیتا۔" اس نے کہا۔

اس کے قدموں کی آواز آئی۔ یقیناً وہ عمران کو اپنی چال کی دل ربائی دکھاتی ہوئی غسل خانے کی طرف چلی گئی تھی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ عمران میرے قریب آکر لیٹ گیا۔ دو تین منٹ بعد میں نے کروٹ بدلی تو میری نگاہ غسل خانے کے ادھ کھلے دروازے پر پڑی۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے تیزی سے اٹھنا پڑا۔ مجھے غسل خانے میں گوری فرش پر گری نظر آئی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پکار کر پوچھا اور تیزی سے غسل خانے کی طرف بڑھا۔

عمران بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ "رک جاؤ۔" مجھے اپنے عقب سے عمران کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں اس وقت تک غسل خانے کے دروازے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ یکایک میرے پاؤں کے نیچے سے قالین نکل گیا۔ قالین کو زور سے پیچھے کی طرف کھینچا گیا تھا۔ میں اوندھے منہ عین دروازے کے سامنے گرا۔ قالین کھینچنے والا عمران تھا۔

عمران لپکتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اب ہم دونوں باتھ روم میں دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ گوری گیلے فرش پر پڑی تھی... اور مر چکی تھی... اسے غسل خانے کی ٹونٹی سے بجلی کا زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس کا گورا چٹا ہاتھ ابھی تک ٹونٹی پر تھا اور عجیب انداز سے مڑا ہوا تھا۔

"آگے نہ جانا۔" عمران نے ایک بار پھر وارننگ دی۔ "نلکوں میں کرنٹ دوڑ رہا ہے۔"

عمران کی زوردار آوازیں سن کر دو گارڈز کھڑکی کے سامنے آگئے تھے۔ "کیا ہوا سر؟" ایک نے بلند آواز میں پوچھا۔

"یہاں کرنٹ ہے۔ مین سوئچ بند کردو۔"

گارڈز دوڑتے ہوئے ایک طرف اوجھل ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد بجلی کی رو منقطع ہوگئی۔ ہم غسل خانے میں گئے۔ گوری کو اٹھا کر کمرے میں لائے۔ اس میں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ پھر بھی ہم دونوں نے اسے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے منیجر مدان اور درجن بھر گارڈز کمرے میں پہنچ گئے۔

برنارڈ شا

ایک صحافی نے جارج برنارڈ شا سے انٹرویو کے دوران پوچھا۔ "آپ کی طویل العمری کا راز کیا ہے؟" برنارڈ شا نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ سر ٹھنڈا اور پاؤں گرم رکھتا ہوں۔" انٹرویو شائع ہوا تو برنارڈ شا کے لاکھوں مداحوں نے پڑھا اور پھر ہزاروں لوگوں نے سر پر برف رکھنا شروع کردی اور پاؤں بھی سینکنے شروع کردیے۔ نتیجہ میں کسی کو سرسام ہوگیا تو کسی کو بخار۔ چنانچہ ایک ہفتے کے بعد لوگوں کا ایک بہت بڑا جلوس مظاہرہ کرتا ہوا برنارڈ شا کے دروازے پر پہنچا تو برنارڈ شا نے مظاہرین سے کہا۔ "بیوقوفو! تم نے جو کچھ کیا غلط ہے۔ میرا مطلب وہ نہ تھا جو تم سمجھ بیٹھے ہو۔ دراصل سر ٹھنڈا رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ میں کبھی غصہ میں نہیں آتا اور پاؤں گرم رکھنے سے میری مراد یہ تھی کہ میں ہمیشہ پیدل چلتا ہوں۔ یہی میری طویل العمری کا راز ہے۔"

حنیفہ عمران، سیالکوٹ

منیجر مدان نے گوری کو طبی امداد کے لیے لے جانا چاہا مگر جلد ہی اسے بھی اندازہ ہوگیا کہ وہ مر چکی ہے۔ صرف چند منٹ پہلے عمران کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرنے والی اور دلنشیں انداز میں مسکرانے والی یہ توخیز ملازمہ اب مٹی کا ڈھیر بن چکی تھی۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" منیجر مدان نے ہکلا کر پوچھا۔

"یہ ہوا نہیں کیا گیا ہے۔ نلکوں میں جان بوجھ کر کرنٹ چھوڑا گیا ہے۔" عمران نے پورے وثوق سے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ دوسرے غسل خانوں میں بھی کرنٹ آرہا ہو۔" مدان بولا۔

"بالکل نہیں۔ تم چیک کر کے دیکھ لو۔"

میں اور عمران منیجر مدان کے ساتھ دوبارہ غسل خانے میں آئے۔ ایک منٹ کے اندر اندر ساری صورتِ حال سمجھ میں آگئی۔ غسل خانے کے بلب کے پیچھے سے ایک تار نکالا گیا تھا اور اسے ایک پائپ کے پیچھے پیچھے چھپا کر نہانے والی ٹونٹی تک پہنچایا گیا تھا۔

"یہ اس لمبے گارڈ کا کام ہے جسے تم لوگ لمبو کہتے ہو۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

"وہ کیسے؟" مدان نے پوچھا۔

"کل میں نے نہانا تھا مگر پانی نہیں آرہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ پانی نہیں آرہا... وہ دو تین اوزار لے کر غسل خانے میں گیا اور چار پانچ منٹ وہاں رہا۔ بعد میں دیر ہو جانے کی وجہ سے میں نے نہانے کا پروگرام کینسل کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اسی بندے کا کام ہے بلکہ اس نے پانی بھی جان بوجھ کر بند کیا ہوگا۔"

منیجر مدن تین چار گارڈز کو لے کر بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔

گوری کی نیلگوں لاش کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی سراسیمگی تیرنے لگی تھی۔ اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ ہم پر دوسرا قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ ہم دونوں اور بالخصوص "میں" اس حملے کا نشانہ تھا۔ کچھ لوگ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے آقا و مربی جارج گورا کے سامنے آؤں اور اس سے "مرو یا مارو" کی فائٹ کروں... کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا بھی ہانپتی کانپتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اسے سارے واقعے کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ دو تین گارڈز اپنی ڈیوٹی پر موجود نہیں اور ان میں دو دراز قد گارڈ بھی شامل ہے۔

یہ بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔ میڈم صفورا کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ "میں اسی لیے تم سے بار بار کہہ رہی ہوں کہ تمہیں اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ خاص طور سے فائٹ کے روز تک۔"

منیجر مدن، میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اگر یہ خبر باہر نکلی تو لوگوں میں بڑا غم و غصہ پیدا ہووے گا۔ عام لوگن میں پہلے ہی یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ کچھ بڑے لوگن ہرگز ناہیں چاہتے کہ سابر کا مقابلہ ہو۔ وہ تابش صاحب کو راستے سے ہٹانے کا جتن کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہاں بھون کے معاملات کا مجھے زیادہ تجربہ نہیں لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ خبر باہر نہ پھیلے تو پھر یہاں موجود گارڈز اور ملازموں کو کسی صورت باہر جانے کی اجازت نہ دیں۔ خاص طور سے لڑکیوں کی ٹریز گیتا مکھی کو۔"

"یہ سب کچھ میرے ذہن میں بھی آرہا ہے۔ میں اس بارے میں کچھ کرتی ہوں۔" میڈم صفورا نے کہا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

چوکس گارڈز ہمارے ارد گرد آ موجود ہوئے۔ یہ سب کے سب میڈم صفورا اور منیجر مدن کے انتہائی قابلِ اعتماد لوگ تھے۔ لیکن کسی کے دل میں کس نے جھانک کر دیکھا ہوتا ہے؟ ان لوگوں کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں تھیں اور انہوں نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں۔ واقعی ایک محافظ کے لیے قاتل بننا کتنا آسان ہوتا ہے۔

میں نے عمران سے کہا۔ "میرا تو دل چاہتا ہے ان سارے خدائی فوجداروں کو اپنے ارد گرد سے ہٹا دوں۔ یہ سیکیورٹی دے رہے ہیں اور سیکیورٹی رسک بھی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر تو ہمارا خون ویسے ہی خشک ہو جائے گا اور خون خشک ہو گیا تو ہمارا پسٹن یعنی دل جام ہو جائے گا۔"

میں اور عمران کمرے میں آگئے اور دھات کا بنا ہوا سلائیڈنگ دروازہ بند کر دیا۔ میں نے عمران کو تشکر کی نظروں سے دیکھا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولا۔

"ایک بار پھر تم نے مجھے خودکشی کرنے سے بچایا ہے۔"

"خودکشی؟"

"ہاں... آج گندم میں رکھنے والی گولیاں نہیں تھیں... بجلی کا کرنٹ تھا۔ میں تو بھاگا جا رہا تھا گوری کو تھامنے کے لیے۔ تم نے میرے نیچے سے قالین کھینچا اور مجھے گرا دیا۔ بڑی بروقت کارروائی تھی۔ آئی رئیلی ایپری شیٹ یو۔"

"لگتا ہے تم پر میڈم کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ ورنہ تم اردو میں بھی شکریہ ادا کر سکتے تھے۔ شکریہ اردو میں ادا کیا جائے تو خوشی بھی اردو میں ہوتی ہے..." وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا اور مجھے اپنے موضوع سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ شام کے بعد کا ذکر ہے۔ ہمارے لیے کھانا آیا۔ حسبِ معمول یہ کھانا آٹھ بجے کے قریب آیا۔ سیکیورٹی کے نکتۂ نظر سے ہمیں کھانا پہنچانے کا کام ملازمین کے سپرد نہیں کیا گیا تھا۔ منیجر مدن خود ہمارے لیے کھانا لاتا تھا۔ اس کھانے کو باقاعدہ چیک بھی کیا جاتا تھا۔ آج اس حوالے سے مزید احتیاط نظر آئی۔ میڈم صفورا خود کھانا لائی۔ ایک ملازمہ نے بڑی ٹرے اٹھا رکھی تھی اور میڈم اس کے ساتھ چلی آرہی تھی۔

کھانے کے دوران میں میڈم ہمارے پاس ہی موجود رہی۔ اس نے کہا کہ دراز قد گارڈ کی تلاش میں مختلف جگہوں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں اور ایک دو بندوں کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ اس نے ہمیں شہر کی صورتِ حال سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ نو تاریخ کو ہونے والے مقابلے کے حوالے سے لوگوں میں زبردست جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سارا زرگاں دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک طرف جارج گورا کے حمایتی ہیں اور دوسری طرف تمہارے۔ چھوٹے بڑے جلوس نکالے جا رہے ہیں۔ دیواروں پر چاکنگ کی گئی ہے اور گلیوں میں کپڑے کے بڑے بڑے بینرز آویزاں کیے جا رہے ہیں۔

"کون کس کی حمایت کر رہا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ غیر واضح ڈویژن ہے۔" میڈم نے جواب دیا۔ "اوورآل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ننانوے فیصد مسلمان تمہاری سائڈ پر ہیں۔ اس کے علاوہ نچلا طبقہ اور ہندوؤں کی نیچ ذاتوں کے لوگ بھی تمہاری حمایت کر رہے ہیں۔ دراصل یہ نفسیاتی قسم کی صورتِ حال ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر ایسی سچویشن بن جایا کرتی ہے۔ لوگوں کی دبی ہوئی نفرت اور محرومی مناسب موقع دیکھ کر ابھر آتی ہے اور انہیں اپنے آقاؤں کے خلاف کھڑا کر دیتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن یہ ماحول خطرناک بھی تو ہے۔ یہ کوئی حق و باطل کی جنگ تو نہیں ہے۔ یہ دو بندوں کے درمیان ایک انفرادی مقابلہ ہے۔ اس میں کسی کی پیٹھ بھی لگ سکتی ہے۔ اگر کسی ایسے مقابلے کے ساتھ بہت زیادہ جذبات اور عقیدے وابستہ کر لیے جائیں تو پھر فرسٹریشن بھی بڑی گمبھیر ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن رائے عامہ کا ایک اپنا بہاؤ ہوتا ہے۔ یہ بہاؤ اپنا راستہ خود سلیکٹ کرتا ہے۔ اس کا رخ موڑنا یا اس میں کمی بیشی کرنا بہت جان جوکھم کا کام ہے۔"

کھانا مزے دار تھا۔ لکھنوی طرز کی چٹ پٹی بریانی کے ساتھ دہی پودینے اور ٹماٹر کا رائتا تھا۔ ساتھ میں کھڑے مسالے والا چکن، ماش کی دال اور گرما گرم روٹیاں تھیں... ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ میڈم کے جانے کے بعد بھی ہم گپ شپ میں مصروف رہے... ہماری گفتگو کا اہم موضوع آج پیش آنے والا حادثہ ہی تھا۔ کھڑکیوں سے باہر ایک تاریک سرد رات گلی کوچوں کو اپنے نرغے میں لے چکی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی خاموشی اور تنہائی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہر کے باسی شاید آج جلدی سو گئے ہیں۔

... اچانک یوں لگا کہ خاموشی کی اس جھیل میں زبردست شور کے ساتھ سیکڑوں پتھر آگرے ہیں۔ یکایک ایک نقارے کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی بے شمار دھماکے ہوئے اور مختلف رنگوں کی ان گنت روشن لکیریں فضا میں بلند ہوئیں۔ کچھ بلندی پر جا کر ان لکیروں میں سے پٹاخے چھوٹے اور آتش بازی کے ہزار ہا رنگ زرگاں کی فضاؤں میں بکھر گئے۔

"اوہ گاڈ! لگتا ہے ساتویں کا جشن شروع ہو گیا ہے۔" عمران نے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، یہ ساتویں کے جشن کا آغاز تھا۔ زرگاں کا آسمان لاتعداد رنگوں سے جگمگایا اور اس کے گلی کوچوں میں شورِ محشر برپا ہو گیا۔ اس شور میں باجا گاجا تھا، نعرہ زنی تھی اور آتش بازی کے دھماکے تھے۔ ہمارے کمرے کی کھڑکی میں سے دور کچھ فاصلے پر کسی گھر کی بلند چھت نظر آرہی تھی۔ اس چھت پر ایک ساتھ کئی انار چلائے گئے۔ ان اناروں میں سے شرارے فواروں کی طرح پھوٹے اور قرب و جوار کو منور تر کر گئے۔ ان شراروں کی روشنی میں چھت پر مرد و زن رقص کرتے نظر آئے۔

ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ شدید ترین آتش بازی تو قریباً آدھ گھنٹے تک رہی لیکن اس کے بعد بھی یہ کام رکا نہیں۔ ہم کمرے میں آرام دہ نشستوں پر بیٹھے رہے اور یہ مناظر دیکھتے رہے۔ ایسے ہی مناظر میں نے کچھ عرصہ پہلے نل پانی میں دیکھے تھے۔ اس وقت عمران میرے ساتھ نہیں تھا۔ میں اس کی یاد میں تڑپ رہا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ میں اسے ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں۔ لیکن آج وہ میرے ساتھ تھا۔ ہم ایک دوسرے کا بازو تھے۔ ایک اور ایک گیارہ کی زندہ مثال کی طرح۔ بے شک، ہم دشمنوں کے گھیرے میں تھے اور کل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن آج ہمارا تھا... اور ہم اس "آج" کو اس کی ساری خطرناکیوں کے ساتھ انجوائے کر رہے تھے۔ ایک میٹھا میٹھا درد بھی تھا، کچھ تیز تیکھے اندیشے بھی تھے۔ کھڑکی سے باہر کوریڈور کی دیوار پر فلمسٹار ریکھا کی تصویر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہی تھی۔

ہمارے سامنے چائے کے مگ تھے۔ عمران سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے کش لے رہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر شعلے دکھائی دیے، ان شعلوں کے درمیان ایک بندر اچھل کود کر رہا تھا... اس کی دُم میں آگ لگی تھی۔ دراصل یہ ایک تنومند شخص تھا جس نے ہنومان کا روپ دھارا ہوا تھا اور جو شعلے نظر آرہے تھے، وہ راون کی لنکا کے جلنے کے تھے۔ بھون کے وسیع و عریض گراسی لان میں یہ ناٹک رچایا جا رہا تھا۔ یہ ہندو دیومالا کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ تھا۔

عمران نے ایک آہ بھری اور کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ "کل منیجر مدن کہہ رہا تھا، دیومالا کے واقعات کو ناٹک کے طور پر پیش کرنے سے بلائیں ٹلتی ہیں اور بھگوان کی طرف سے روزی میں برکت ہوتی ہے۔ اور منیجر مدن ایک تعلیم یافتہ

شخص ہے۔" میں سمجھ گیا کہ عمران کیا کہنا چاہ رہا ہے۔۔۔ وہ دقیانوسیت اور توہم پرستی کی بات کر رہا تھا۔ اچانک مجھے آج سہ پہر والا سارا واقعہ یاد آگیا۔ عمران نے جس طرح بھری محفل میں حکم اور اس کے مصاحبوں کو لاجواب کیا، وہ یادگار تھا۔۔۔ اس کے علاوہ اس موقع پر عمران کے شوخ چہرے پر جو بے پناہ سنجیدگی دکھائی دی، وہ بھی ایک خاص الخاص چیز تھی۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "عمران! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم بھی کسی ایسی ہی دقیانوسیت کے ڈسے ہوئے ہو جس کے منظر آج حکم کے دربار میں نظر آئے۔۔۔ اور ہاشو اور مالا کی داوی ساس جیسے لوگ جس کے نمائندے ہیں۔"

"میں تو سمجھتا ہوں جگر کہ ساری انسانیت ہی ایسے مہلک واہموں کی ڈسی ہوئی ہے۔ کوئی تھوڑا متاثر ہے، کوئی زیادہ اور کوئی بہت زیادہ۔"

میں نے بغور عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے نشست سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ خوب صورت آنکھوں میں کھوئی کھوئی کیفیت تھی۔ زرگاں میں ہونے والی آتش بازی کے رنگ اس کے چہرے پر منعکس ہو رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "عمران! ہماری دوستی کو کئی سال ہو گئے ہیں لیکن تم آج بھی میرے لیے ایک پہیلی ہو۔ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ایسا کیوں ہے یار؟"

"تم اکیلے ہی تو میرے بارے میں بے خبر نہیں ہو۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

"لیکن تم مجھے اپنا قریبی دوست اور ہمدم کہتے ہو۔ کیا قریبی دوست اور ہمدم اسی طرح بے خبر ہوتے ہیں؟"

"یار! کیوں گڑے مردے اکھاڑنا چاہ رہے ہو؟ بہت سے زخم چھل جائیں گے، مہینوں تک خون رستا رہے گا۔"

وہ پھر مسکرایا۔ اب اس کی مسکراہٹ میں حزن کی آمیزش تھی۔

میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "عمران! صرف چار دن بعد میری زندگی میں ایک بہت اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی موت کی لڑائی لڑنے والا ہوں جسے یہاں شکتی کا دیوتا کہا جاتا ہے۔۔۔ وہ دیوتا ہے یا نہیں، یہ علیحدہ بات ہے لیکن یہ بات تو تم بھی مانو گے کہ وہ ایک نہایت خطرناک حریف ہے۔ چار دن بعد میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے یار! اور اگر واقعی میرے ساتھ کچھ ہو گیا تو کیا میں تمہارے بارے میں کچھ جاننے کی حسرت دل میں لے کر ہی چلا جاؤں گا؟ کیا تمہیں یہ سب اچھا لگے گا؟"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ کچھ بولے گا لیکن وہ بولا نہیں۔ کتنی ہی دیر تک کمرے میں گمبھیر خاموشی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر آتش بازی کے رنگ بکھرتے رہے اور باجے گاجے کا مدھم شور ہمارے کانوں تک پہنچتا رہا۔ پھر عمران نے نیا سگریٹ سلگایا اور بغیر کسی تمہید کے اکا ایکی بولنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز گم گشتہ یادوں کے بوجھ سے لدی ہوئی تھی۔ اس کے الفاظ دھیرے دھیرے میرے سامنے ایک کہانی کی پرتیں کھولنے لگے۔ ایک گداز روداد کے پیچ و خم میرے سامنے نمایاں ہوتے چلے گئے۔ واقعات کا ایک جہاں سا آباد ہو گیا۔ میں عمران کی اس روداد کو اپنے الفاظ میں قارئین کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ اس میں پچانوے فیصد باتیں عمران کی کہی ہوئی ہیں۔ جہاں جہاں خلا تھا، وہ میں نے اپنے تصور سے پُر کیا ہے۔ اس میں جو انوکھا پن ہے، وہ غیر حقیقی نہیں۔ اس کی سائنسی بنیاد موجود ہے۔ نفسیات کے ماہر بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی ذہن کی کیمسٹری کے بارے میں ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے۔ عمران کی کہانی کچھ یوں ہے۔

وہ شمالی پنجاب کا ایک گاؤں تھا۔ برسات کی ایک طوفانی رات تھی۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور پھر گھن گرج سے در و دیوار لرز جاتے تھے۔ ہر جاندار و بے جان شے سہمی ہوئی نظر آتی تھی اور ان سب سے زیادہ سہمے ہوئے وہ دو نفوس تھے۔ ایک تنہا کچے گھر میں ایک ماں اور اس کا بیٹا۔ چاندی بالوں والی ماں کی عمر تقریباً پچاس سال رہی ہوگی۔ بیٹا تقریباً سولہ سال کا تھا۔ اس خوفناک طوفانی رات میں ماں نے بیٹے کو یوں بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا جیسے مرغی چوزے کو پروں سے ڈھانپتی ہے۔

یہ واقعی بہت خوفناک رات تھی۔ یوں لگتا تھا کہ مکان مسمار ہو جائیں گے اور درخت جڑوں سے اکھڑ جائیں گے۔ آسمان اپنے ذخیروں کا سارا پانی زمین پر الٹ دینا چاہتا تھا اور ہوائیں اپنی ساری سرکشی آزما لینا چاہتی تھیں۔ اچانک بڑے زور سے بجلی چمکی۔ اس کا لشکارا گھروں کے اندر تک آیا پھر ایسا کڑاکا سنائی دیا کہ سینوں میں دل دہل گئے۔ عورت نے چلا کر اپنے جواں سال بچے کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

"یا اللہ خیر۔۔۔ یا اللہ خیر۔۔۔ لگتا ہے بجلی پنڈ میں گری ہے۔" اس نے بے تاب ہو کر کہا۔

"نہیں امی، کہیں کھیتوں میں گری ہوگی۔" لڑکا بولا۔

"کھیتوں میں نہیں پنڈ میں گری ہے۔ تجھے پتا ہی ہے، سارے لوگ کہتے ہیں کہ بجلی چودھری کے پتر نیاز پر عاشق ہے۔"

"نہیں امی! یہ باتیں ہوتی ہیں۔ ماسٹر جی کہتے ہیں کہ ایسی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ بجلی تو اس لیے چمکتی ہے کہ ایک بادل پر جمع کا چارج ہوتا ہے، دوسرے پر تفریق کا۔۔۔ جب یہ دونوں بادل۔۔۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا بس کر۔۔۔ اب اپنی تقریر شروع نہ کر دینا۔۔۔ کچھ اللہ توبہ کر۔۔۔ آیت الکرسی آتی ہے نا۔۔۔ بس وہ پڑھتا رہ۔۔۔"

لڑکے کے لیے ماں کا کہا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا اور اس نے منہ میں ورد شروع کر دیا۔

بجلی تڑپتی رہی، بادل دہاڑتے رہے اور پانی برستا رہا۔ ماں بیٹا دیے کی لو میں ایک دوسرے سے لپٹے بیٹھے رہے۔ یہ ایک طوفانی رات تھی اور طوفانی راتوں کی ہلاکت خیزیاں صبح کے وقت عیاں ہوتی ہیں۔ اس طوفانی رات کی صبح بھی اس ماں بیٹے کے لیے ایک بڑی مصیبت لے کر آرہی تھی۔

بیٹے کا نام عمران تھا۔ اسے پیار سے مُنّو کہا جاتا تھا۔ وہ اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا تھا۔ اس سے پہلے اس کے چار بہن بھائی ایک سال کی عمر کے اندر ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اس کی ماں بس اسے پروان چڑھا سکی تھی اور اب وہ اس کا واحد سہارا تھا۔ پانچ چھ سال پہلے عمو کا والد بھی ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا کاشت کار تھا۔ اس کے پاس بہت تھوڑی سی زمین تھی تاہم اس زمین کو اس نے اتنے اچھے طریقے سے استعمال کیا تھا کہ اس چھوٹے سے کنبے کی گزر بسر آسانی سے ہو جاتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ یعنی عمو کی والدہ اس زمین کو سنبھال نہیں سکی تھی۔ اس نے گھر چلانے کے لیے یہ زمین ٹھیکے پر دے دی تھی۔ کچھ اناج اور کچھ پیسے مل جاتے تھے جس سے وہ جیسے تیسے زندگی کی گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ اس کا عمران پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی بن جائے۔۔۔ ایک افسر، ایک ڈاکٹر یا پھر ایسا ہی کوئی قابلِ عزت شخص۔ وہ اسے اپنا پیٹ کاٹ کر پڑھا رہی تھی۔ وہ ایک مثالی ماں تھی۔ ایثار، شفقت اور وفا کا پیکر۔ عمو کے لیے وہ ایک ایسے شجر سایہ دار کی طرح تھی جس کے تلے وہ دنیا کے ہر رنج و غم سے دور تھا۔ اس کی زندگی کا محور صرف اور صرف اس کی ماں تھی۔

اس طوفانی شب کی صبح بھی ماں اسے اسکول بھیجنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کی کتابیں سنبھالنے کے بعد رومال میں اس کا کھانا باندھ رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر جا کر عمو نے ہی دروازہ کھولا۔ وہ اپنے سامنے اونچی پگڑی والے چودھری سجاول اور اس کے منشی اکبر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

چودھری سجاول نے عمو کے سر پر پیار دیا اور پھر کھنگورے مارتا ہوا اندر آگیا۔ عمو کی ماں نے گاؤں کے چودھری کو اپنے سامنے دیکھ کر جلدی سے اوڑھنی درست کی اور ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

"چودھری جی! ہمارے اتنے بھاگ کہ آپ ہمارے گھر میں آئے۔ یہاں تو ایسی کرسی بھی نہیں کہ آپ کو بٹھا سکیں۔"

چودھری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "بہین شریفاں! میں آج یہاں چودھری نہیں سوالی بن کر آیا ہوں۔"

"ہائے میں مر گئی چودھری جی۔۔۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ ہم غریبوں کی اتنی حیثیت کہاں کہ آپ ہم کو کوئی ضرورت بتائیں۔"

"بس آج کوئی ایسی ہی بات ہے بہین شریفاں۔" چودھری نے خلافِ معمول عجز کے لہجے میں کہا پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ "تمہیں پتا ہے، رات کو کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا ہے چودھری جی۔" عمو کی ماں نے چونک کر پوچھا۔ یقیناً اسے رات کو سنائی دینے والا بجلی کا زبردست کڑاکا یاد آگیا تھا۔

چودھری نے بتایا۔ "حویلی کے پچھواڑے، باہر والی دیوار کے بالکل پاس بجلی گری ہے۔ دو بھینسیں مر گئی ہیں، بوڑھ کا درخت بھی جل کر کوئلہ ہو گیا ہے۔"

"ہائے میں مر گئی۔" عمو کی والدہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے رات کو ہی لگا تھا کہ بجلی پنڈ کے اندر ہی کہیں گری ہے۔"

"بس بہین شریفاں! بال بال بچے ہیں۔ ایویں آٹھ دس قدموں کا فرق رہ گیا۔ ساتھ ہی تو وہ کمرے ہیں جہاں سوتے ہیں ہم۔۔۔ بس یہ سب وہی پتر نیاز والا معاملہ ہے۔ پچھلے مہینے میں اسے گجرات کے قریب شہنشاہ پیر کے مزار پر بھی لے کر گیا تھا۔ وہاں کے گدی نشین پیر صادق شاہ نے بھی یہی کہا ہے۔ نیاز پہلوٹی کا بچہ ہے اور بجلی اس پر عاشق ہے۔ یہ اس کو کسی بھی وقت نقصان پہنچا دے گی۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو، نیاز کے بڑے تایا کی جان بھی اسی طرح گئی تھی۔ اللہ نہ کرے۔۔۔ اللہ نہ کرے اس کی زندگی کو بھی۔۔۔" چودھری کی

آواز بھرا گئی اور وہ پگڑی کے پلو سے نادیدہ آنسو خشک کرنے لگا۔

''آپ ایسی بات منہ سے کیوں نکال رہے ہیں چودھری جی؟ رب نہ کرے چھوٹے چودھری پر کوئی آنچ آئے۔ ہماری جندگی، ہمارے بچوں کی جندگی چھوٹے چودھری کو لگ جائے۔''

چودھری کچھ دیر خاموش رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''بہین شریفاں! اللہ تمہاری اور تمہارے بچے کی حیاتی لمبی کرے... میں تم سے بس ایک چھوٹی سی منت کرنے آیا ہوں اگر تم مان لو تو۔''

''آپ حکم کریں چودھری جی۔'' عمو کی والدہ نے کہا۔ ''لیکن پہلے آپ بتائیں آپ کی کیا خدمت کروں... کوئی لسی پانی، دودھ وغیرہ؟''

چودھری نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بہین شریفاں! میں نے تمہیں بتایا ہے نا، پچھلے مہینے کی دوسری جمعرات میں پیر صادق شاہ کے آستانے پر گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پتر نیاز پر سے یہ مصیبت ٹالنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کا سر منڈوا کر اسے چولا پہنایا جائے اور کم از کم ایک سال کے لیے مزار کی خدمت کے لیے بھیج دیا جائے۔ اس کا کھانا پینا، سونا سب کچھ وہیں مزار کے اندر ہو۔ میں اس کام کے لیے بالکل تیار تھا لیکن یہاں مصیبت یہ آپڑی ہے کہ پتر نیاز کو ملٹی بخار چڑھا ہوا ہے۔ ایک مہینا ہو گیا ہے، بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ نیاز کو مکمل علاج اور آرام کی لوڑ ہے۔ میں نے اس بارے میں پیر صادق شاہ سے بات کی تھی۔ انہوں نے اس کا ایک حل بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی ایسا بچہ جو نیاز کی عمر کا ہو اور اپنے ماں پیو کی آخری اولاد ہو، نیاز کی جگہ مزار پر خدمت کر سکتا ہے۔ اس کے لیے پیر صاحب نے ایک دو شرطیں بتائی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ دس ہزار روپے کا نذرانہ مزار کو دینا پڑے گا۔ یہ سب کچھ تو اتنا مشکل نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ وہ بچہ مل جائے جو نیاز کی جگہ ایک سال کے لیے اپنے گھر والوں سے دور رہ سکے۔''

عمو کی والدہ نے ایک دم چونک کر چودھری سجاول کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یکایک ان گنت اندیشے جاگ اٹھے۔

منشی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''وڈی آپا! اگر تمہارا بیٹا عمو، پتر نیاز کی جگہ لے سکے تو چودھری صاحب اور ہم سب تمہارے بڑے احسان مند ہوں گے۔ پتر عمو کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہم اس کا وہاں پورا پورا خیال رکھیں گے۔ تم دو ڈھائی مہینے میں ایک بار وہاں جا کر اس سے مل بھی سکو گی۔''

چودھری نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اگر چاہو تو حویلی میں ہمارے مہمان کی طرح رہ سکو گی۔ تمہیں ہر طرح کا آرام ہوگا۔ زمین کی طرف سے بھی فکر کرنے کی کوئی لوڑ نہیں ہو گی۔''

''لل... لیکن چودھری جی! عمو کے تو دسویں کے امتحان ہونے والے ہیں؟''

''اس کی فکر نہ کرو بہین! اگلے سال اس کو دو جماعتیں اکٹھی پاس کرا دیں گے۔''

''پر چودھری جی! یہ تو... یہ تو میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا... کملا ہو جاتا ہے میرے بغیر۔ یہ کیسے رہ سکے گا ایک سال تک گجرات میں؟''

''بہین شریفاں! تم سے کہا تو ہے کہ تم ڈیڑھ دو مہینے بعد جا کر اس سے مل سکو گی۔ ہم بھی پورا دھیان رکھیں گے اس کا۔'' چودھری سجاول کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ عمو کو اپنے بیٹے نیاز کی جگہ گجرات کے اس دور دراز دیہہ میں بھیجنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا ہے، اب عمو کو وہاں جانا ہی جانا ہے، پیار محبت سے یا پھر دباؤ سے۔

عمو کی والدہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس اچانک آفت کا مقابلہ کیسے کرے اور گاؤں کے چودھری کو کیا جواب دے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ یہ آسان معاملہ نہیں ہے اور اسے ٹالنا بھی نہایت مشکل ہوگا۔ چودھری کو اپنے لاڈلے بیٹے پر سے بلا ٹالنے کے لیے کسی کی قربانی کی ضرورت تھی۔ اسے نیاز کا ایک ہم عمر لڑکا چاہیے تھا اور وہ بھی ایسا جو اپنے والدین کی آخری اولاد ہو اور وہ مزار کا خادم بننے کے لیے رضامند بھی ہو جائے۔ یہ ساری شرطیں گاؤں میں کہیں اور پوری ہونے کا امکان نہیں تھا۔

عمو کی والدہ، چودھری سجاول اور منشی اکبر میں بات چیت جاری رہی۔ عمو کو کچھ دیر کے لیے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا۔ مدھم آوازیں عمو کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بات چیت میں تلخی آ چکی ہے۔ چودھری سجاول کا لہجہ اب واضح ناراضی لیے ہوئے تھا۔ وہ گاہے بگاہے ان احسانوں کا ذکر بھی کر رہا تھا جو ماضی میں حویلی والوں کی طرف سے عمو کے گھرانے پر کیے گئے تھے۔

عمو کے سینے میں کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ وہ ماں کے بغیر چند گھنٹے مشکل سے گزارتا تھا۔ اسکول کے بعد گھر کی طرف یوں لپکتا تھا جیسے لوہ چون، مقناطیس کی طرف۔ اگر کسی دن کسی مجبوری کے سبب ماں گھر میں نہ ہوتی تو اسے سب کچھ خالی خالی لگتا، بھوک مر سی جاتی اور اسے محسوس ہوتا کہ چھٹی ہو کر بھی چھٹی نہیں ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد عمو نے دیکھا کہ چودھری سجاول غصے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے باہر جا رہا ہے۔ چھوٹے قد کا منشی اکبر بھی اس کے ساتھ تھا۔ عمو نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے ماں کو دیکھا، وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ ابھی عمو سوچ ہی رہا تھا کہ ماں کے پاس جائے یا نہیں کہ گھر کے دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ ماں نے جلدی جلدی آنسو پونچھتے ہوئے عمو کو آواز دی۔ ''دیکھ ذرا باہر کون ہے؟''

عمو نے صحن میں جا کر دروازہ کھولا۔ منشی اکبر پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ منشی اکبر نے عمو کے سر پر پیار دیا اور اندر آ گیا۔ وہ کمرے میں آ کر عمو کی ماں کے قریب ہی پیڑھی پر بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں اسے سمجھانے بجھانے لگا۔ ''وڈی آپا! چودھری جی مشکل میں ہیں۔ چودھرانی جی کا بھی رو رو کر برا حال ہے۔ دیکھو وڈی آپا! میں تمہیں اندر خانے کی بات بتاتا ہوں۔ چودھری جی مجبور ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی رستہ ہی نہیں ہے کہ نیاز کی جگہ عمو کو مزار کی خدمت کے لیے بھیجیں۔ ہمارے پنڈ میں اور ارد گرد کے پنڈوں میں کوئی اور ایسا لڑکا ملا ہی نہیں جو پیر جی کی بتائی ہوئی شرطوں پر پورا اتر سکے۔ صرف میاں پور میں ایک ملا تھا مگر وہ لوہار برادری کا ہے۔ پیر جی کی یہ شرط بھی ہے کہ لڑکا کمی ذات کا نہ ہو۔ وڈی آپا! اب یہ بات تو صاف ہے کہ عمو کو گجرات جانا ہی پڑے گا۔ تمہاری رضامندی سے چلا جائے گا تو اس میں اس کا فائدہ ہو گا اور تمہارا بھی۔ چودھری جی تمہیں خوش کر دیں گے۔ دوسری صورت میں تمہارے لیے مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ تمہیں پتا ہی ہے تمہاری زمین والے کاغذوں میں تھوڑی سی گڑبڑ ہے۔ پٹواری عاشق بڑا کمینہ بندہ ہے۔ اگر وہ اب تک چپ بیٹھا ہوا ہے تو یہ چودھری جی کی ہی مہربانی ہے۔ نہیں تو اس نے ضرور کوئی نہ کوئی پنگا ڈال دینا تھا...''

عمو کی والدہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''پر بھائی اکبر، کاغذوں میں وہ ہیرا پھیری کی بھی تو پٹواری نے ہی ہے... پورا پنڈ جانتا ہے کہ یہ زمین اللہ بخشے عمو کے پیو کے حصے میں آئی تھی۔ سارے بھائیوں کے انگوٹھے ہیں اور...''

''وڈی آپا! یہ قانونی چکر ہیں، تم نہیں سمجھو گی۔'' اکبر نے تیزی سے بات کاٹی پھر مزید دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اور

سچی بات یہ ہے وڈی آپا کہ یہ چودھری لوگ اگر کسی کو تنگ کرنے پر آجائیں تو پھر ان کے پاس سو طریقے ہوتے ہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ اگر چودھری جی بڑے ماسٹر صاحب کو کہہ دیں کہ اسکول میں سے عمو کا نام کٹ جائے تو کیا کوئی ایسا بندہ ہے جو عمو کی پڑھائی چالو کرا سکے؟ میں بس تمہیں ایک مثال دے رہا ہوں۔“

عمو کی والدہ سسکنے لگیں۔

...ٹھیک پانچ دن بعد چودھری سجاول کی حویلی میں عمو کے سر کے بال مونڈ دیے گئے اور اسے ایک لمبا چغا پہنایا گیا۔ کلائیوں میں تانبے کے دو کڑے ڈالے گئے اور ایک ایسے تانگے میں بٹھا کر جس کی چاروں طرف کپڑے سے پردہ کیا گیا تھا، اسے گجرات کے اس دور دراز گاؤں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ وقتِ رخصت ماں اسے دیر تک اپنے ساتھ لپٹا کر روئی تھی اور عمو کو بھی یوں لگا تھا جیسے اس کا دل سینے میں سو ٹکڑے ہو گیا ہے لیکن اس نے کوشش کر کے اپنے آنسو روکے رکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ماں اس کے آنسو دیکھے گی تو اور دکھی ہو گی اور وہ اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

شیخوپورہ کے مضافاتی گاؤں سے تانگے کے ذریعے عمران کو پکی سڑک تک پہنچایا گیا۔ وہاں سے بس کا سفر شروع ہوا جو گجرات پر ختم ہوا۔ یہاں سے ایک کھٹارا کار میں نہایت مشکل اور ناہموار راستوں پر سفر کر کے وہ قریباً دو گھنٹے میں ایک دیہہ تک پہنچے۔ اس دیہہ کا نام مرشد والی تھا۔ دیہہ کا بہت بڑے گنبد والا مزار کافی فاصلے سے ہی نظر آ جاتا تھا۔ عمو کے ساتھ یہاں تک آنے والوں میں منشی اکبر کے علاوہ چودھری کے دو دیگر ملازم بھی تھے۔ وہ عمو کو مزار کے خدمت گاروں کے پاس چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

مزار میں پہنچنے سے پہلے ہی عمو کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسے یہاں ایک سال نہیں بلکہ سترہ چاندوں تک رہنا ہے اور یہ قریباً ڈیڑھ سال بنتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی درست نہیں تھی کہ اس کی ماں ہر ڈیڑھ دو مہینے بعد آ کر اس سے ملاقات کر سکے گی۔ یہ پیر صاحب کی مرضی پر تھا کہ وہ عمو کے کسی رشتے دار کو کب اس سے ملنے کی اجازت دیتے ہیں۔

مزار کا کرتا دھرتا پیر مخدوم صادق شاہ تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی، اچھی صحت اور خوراک کی وجہ سے وہ پینتیس کے لگ بھگ نظر آتا تھا۔ رنگ سرخ و سپید تھا، لمبے بال تیل میں چپڑے رہتے تھے اور آنکھیں ہر وقت سرمے کی دکان نظر آتی تھیں۔ اس کے چار خاص ماتحت تھے جنہیں درویش کہا جاتا تھا۔ یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ مخدوم صادق شاہ نے ان چاروں مریدوں کو ”اثر“ دیا ہوا ہے۔ یہ لوگ پیر صاحب کی جگہ لوگوں کو تعویذ دیتے تھے، جھاڑ پھونک کرتے تھے اور اس طرح کے دیگر فرائض انجام دیتے تھے۔ اردگرد کے دیہات سے لوگ کثیر تعداد میں یہاں آتے تھے۔ پیر صادق شاہ سے فیض یاب ہونے کا شرف بس خاص خاص لوگوں کو ہی حاصل ہوتا تھا۔ مزار کافی بڑے رقبے پر واقع تھا۔ درویشوں، خاص مریدوں اور ملازمین کے کمرے تھے۔ روزانہ دو طرح کے لنگر بھی یہاں پکائے جاتے تھے۔ قریباً بیس مرد خادم اور اتنی ہی خادمائیں مزار کے انتظام و انصرام میں مصروف رہتے تھے۔

عمران عرف عمو صبح سویرے سے رات تک صفائی ستھرائی کے کاموں میں مصروف رہتا اور پھر اپنی کوٹھری میں دیر تک آنسو بہانے کے بعد سو جاتا۔ ماں کی یاد ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں چبھی ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا، ماں کیا کر رہی ہو گی؟ کیا سوچ رہی ہو گی؟ اس نے کھانا کھایا ہو گا یا نہیں؟ اس نے آرام کیا ہو گا یا نہیں؟

قریباً ایک ماہ بعد جب وہ بہت بے تاب ہوا تو اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے پتا چلا کہ یہاں نگرانی کا کافی سخت انتظام ہے۔ پہرے داروں نے اسے روک لیا اور واپس مزار میں پہنچا دیا۔

اس رات وہ ماں کے لیے بہت رویا تھا۔ اس کے ساتھی لڑکے قاضی نے اسے بمشکل چپ کرایا اور تھوڑا بہت کھانے پر مجبور کیا۔ قاضی کئی دوسرے لڑکوں کی طرح دو تین سال سے یہاں خدمت انجام دے رہا تھا اور یہاں کی اونچ نیچ کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

اس نے کہا۔ ”عمو! اس دفعہ تو تمہیں کچھ نہیں کہا گیا اور پیار محبت سے سمجھا دیا گیا ہے لیکن اگلی دفعہ ایسا نہیں ہو گا۔ یہ لوگ سختی کریں گے اور پھر نوبت زنجیروں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہاں دو تین لڑکے اب بھی ایسے ہیں جنہیں زنجیر ڈالی جاتی ہیں اور پھر سوچو کہ بھاگ کر جاؤ گے بھی کہاں؟ ماں کے پاس... اور ماں تمہیں پھر یہاں بھیج دے گی۔ وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہے۔“

”میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ میرے بغیر نہیں۔“ عمو سسکا۔

”لیکن یار سوچو یہ ہمیشہ کی بات تو نہیں ہے۔ سال ڈیڑھ سال کی بات ہے۔ تم دیکھنا، دو تین مہینوں میں تمہارا دل یہاں لگ جائے گا۔ پھر باقی کے دن کاٹنا تمہارے لیے زیادہ مشکل نہیں رہے گا...“

بات عمو کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ یہاں سے بھاگتا تو بھی اسے جانا تو ماں کے پاس ہی تھا۔ ماں چودھری کے حکم سے مجبور تھی، وہ اسے پھر یہاں بھیج دیتی۔ ماں کی جدائی کے علاوہ عمو کو یہاں مزار میں کوئی زیادہ تکلیف بھی نہیں تھی۔ بس مشقت تھی جو اسے دوسرے خادموں کے ساتھ مل کر کرنا پڑتی تھی۔ وہ صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتا تھا۔ فرش دھوتا تھا۔ دستی نلکوں سے پانی بھرتا تھا اور کبھی کبھی درویشوں کی مٹھی چاپی بھی کرتا تھا... وہ لڑکوں میں سب سے خوب صورت تھا۔ قد کاٹھ بھی دلکش تھا۔ ایک درویش ارباب علی اس سے بہت لگاؤ رکھتا تھا اور اسے بیٹا کہہ کر بلاتا تھا۔ ارباب علی کی کوشش سے ہی عمو کو شام کے وقت کچھ دیر کھیل کود کی اجازت بھی مل گئی۔ عصر کے بعد مزار کے پچھواڑے احاطے میں والی بال اور گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلا جاتا تھا۔ ارباب کی کوشش سے ہی عمو کو کسی وقت اچھے والے لنگر سے کھانا بھی ملنے لگا۔

تین مہینے بعد عمو کی ماں اس سے ملنے کے لیے آئی۔ منشی اکبر اور چودھری کا ایک کاماں منظور بھی اس کے ساتھ تھا۔ ماں بیٹا مل کر خوب روئے۔ ماں اس کے لیے گاؤں سے کئی سوغاتیں لے کر آئی تھی۔ ماں نے عمو کو اور عمو نے ماں کو تسلی دی۔ ماں نے انگلیوں پر گن کر عمو کو بتایا کہ تین مہینے گزر گئے ہیں، اب بس تیرہ چودہ مہینے باقی ہیں۔

ماں سے ملاقات کے دس بارہ روز بعد تک عمو بہت دکھی رہا لیکن پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنا دل ٹھکانے پر کر لیا اور ماں سے اگلی ملاقات کے لیے دن گننے شروع کر دیے۔ ارباب علی نے عمو کو یقین دلایا تھا کہ اگلی ملاقات تین مہینے کے وقفے سے ہو گی اور ضرور ہو گی۔

قاضی کی باتوں سے عمو کو... صادق شاہ کے بارے میں کافی کچھ پتا چلتا رہتا تھا۔ صادق شاہ اپنے مرحوم والد کے برعکس کافی خوش خوراک شخص تھا۔ اس کی تین بیویاں تھیں۔ ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور ایک کو طلاق دے کر اس سے دوبارہ شادی بھی کی تھی۔ صادق شاہ کو گھوڑوں اور بندوقوں وغیرہ کا بھی شوق تھا۔ اس کے زمیندار مرید اکثر اس کے شوق کے مطابق تحفوں کا انتظام کرتے رہتے تھے۔

ایک دن درویش عطا محمد نے عمو اور قاضی کو صادق صاحب کے حجرے سے دسترخوان اٹھانے کے لیے بھیجا۔ عمو اور قاضی پیر صاحب کے وسیع و عریض حجرے میں داخل ہوئے۔ یہاں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور قالین پر ایک خوب صورت دسترخوان بچھا تھا۔ بھنے ہوئے بٹیر، مچھلی، دیسی مرغ کا گوشت، سندھی بریانی اور پتا نہیں کیا کچھ یہاں موجود تھا۔ پلیٹیں ہڈیوں سے بھری ہوئی تھیں اور روغنی نانوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔

جن تین چار مہمانوں نے یہ دعوت اڑائی تھی، ان میں سب سے نمایاں ایک عورت تھی... اسے بلاشبہ ایک گرانڈیل عورت کہا جا سکتا تھا۔ عمر پینتیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس کا چہرہ بہت بڑا تھا، رنگ سانولا، نقوش سخت اور ناک بالکل چپٹی تھی۔ اس کی دبنگ شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو اس کا لباس تھا۔ اس نے مردوں کی طرح کالی دھوتی اور کڑھائی والی کالی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ مردوں ہی کی طرح آلتی پالتی مارے پیر صادق کے قریب بیٹھی تھی۔

اس نے غور سے عمو کو دیکھا اور بھاری آواز میں بولی۔

”یہ منڈا کون ہے؟“

صادق شاہ بولا۔ ”شیخوپورہ کا رہنے والا ہے۔ خدمت کے لیے آیا ہوا ہے۔“

”صادق شاہ! تم نے بڑے ملائم منڈے رکھے ہوئے ہیں اپنے پاس۔“ وہ ہنس کر بولی۔ اس کے دانت پان سے متاثر تھے۔ پھر وہ عمو سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”کیا نام ہے تیرا کاکا؟“

”عمو جی۔“

”میرے ساتھ چلو گے؟“

”کک... کہاں جی؟“ وہ ڈر کر بولا۔

اس کے ڈرنے کے انداز نے عورت اور اس کے ساتھیوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ عورت کا ایک نشیلی آنکھوں والا ساتھی عمو کی پیٹھ پر ہلکا سا دھپ مار کر بولا۔ ”او نئے ڈر

بینک بیلنس

لڑکی نے شرما کر لڑکے سے پوچھا۔ ”تم نے ابو سے بات کی؟“

”ہاں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”پھر انہوں نے کیا کہا؟“

”انہوں نے پوچھا کہ میرا بینک بیلنس کتنا ہے، میں نے کہا دس ہزار۔“

”پھر کیا ہوا؟“ لڑکی نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا، انہوں نے وہ رقم مجھ سے ادھار لی اور کہا کہ تم تو دو کوڑی کے آدمی بھی نہیں ہو۔“

شوکت علی قریشی، جیکب آباد سندھ

کیوں رہا ہے۔ تُو کوئی لڑکی ہے جو تجھے لے جا کر بازار میں بیچ دیں گے؟''

عمو نے بے بسی سے صادق شاہ کی طرف دیکھا۔ صادق شاہ کے چہرے پر ہلکا پھلکا تاثر تھا۔ وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ ''اچھا اچھا، تم پلیٹیں اٹھاؤ اور جاؤ۔''

عمو پلیٹیں وغیرہ اٹھا کر باہر نکل آیا۔ قاضی دسترخوان کو صاف کرنے اور سمیٹنے لگا۔

عمو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اگلے روز صبح سویرے کیا ہونے والا ہے... عمو کو خلافِ معمول منہ اندھیرے ہی اٹھا دیا گیا۔ ایک خادم نے اسے بتایا کہ عطا محمد نے اسے حجرے میں بلایا ہے۔ وہ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر حجرے میں پہنچا تو وہاں ...... ارباب علی بھی موجود تھا۔ ارباب کی آنکھوں میں دکھ تھا اور اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک عطا اور ارباب میں کسی بات پر زوردار بحث ہوتی رہی ہے۔

عطا محمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمو! تجھے کچھ دنوں کے لیے یہاں سے باہر جانا ہوگا۔ صادق صاحب کی مہمان جو کل یہاں آئی ہیں، انہیں اپنے ڈیرے پر ایک کامے کی لوڑ ہے۔ ان کا پرانا کاما کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی آئے گا، تم یہاں واپس آ جاؤ گے۔''

ایک دم عمو کی آنکھوں کے سامنے کل والی عورت کا کرخت چہرہ گھوم گیا۔ وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ پھر اس کا لہجہ، اس کے دیکھنے کا انداز۔ بچپن میں اس نے اپنی ماں سے ایک ایسی خطرناک عورت کی کہانی سنی تھی جو گھروں کی ڈیوڑھیوں سے معصوم بچے اٹھا کر فروخت کر دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں، اس عورت کو دیکھ کر عمو کے ذہن میں وہ کہانی گھومنے لگی تھی۔

وہ کچھ بول نہ سکا۔ بس خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ عطا محمد بولا۔ ''گھبرانے کی لوڑ نہیں۔ زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا بلکہ یہاں سے بھی ہلکا کام ہوگا۔''

''پپ... پر... مم... میری۔'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔ آواز گلے میں اٹک گئی۔

''بولو... بولو کیا بات ہے؟'' عطا نے تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

وہ بمشکل بولا۔ ''مم... میری امی... آ رہی ہے... اگلے ہفتے۔''

عطا محمد کے چہرے پر ناگواری کی شکن ابھری لیکن اس نے اپنی آواز ہموار ہی رکھی اور بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اگلے ہفتے تم واپس ہی آ جاؤ۔ اور دیکھو، یہ صادق صاحب کا حکم ہے۔ ہم اس میں کسی طرح کی چوں چراں نہیں کر سکتے۔ چلو جا کر تیار ہو جاؤ۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ان لوگوں نے یہاں سے جانا ہے۔''

عمو نے ارباب کی طرف دیکھا۔ وہ یکسر خاموش تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے عمو کو مزید پریشان کیا۔ عمو چاہتا تھا کہ ارباب کچھ بولے لیکن وہ بولا نہیں۔ عمو اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا حجرے سے باہر آ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کا سارا سامان باندھا جا چکا ہے۔ جستی ٹرنک کے پاس ہی اس کا بستر بھی گول کیا ہوا پڑا تھا۔ عطا تو کہہ رہا تھا کہ اسے چند دن کے لیے جانا ہے۔ اگر چند دن کی بات تھی تو پھر سارے سامان کی کیا ضرورت تھی؟ بہرحال سوالات کی گنجائش یہاں نہیں تھی۔

وہ لوگ گھوڑوں پر سوار وہاں سے روانہ ہوئے۔ وہ کُل آٹھ افراد تھے۔ ان میں گرانڈیل عورت بھی شامل تھی جس کا نام عمو کو بعد میں ماجھاں معلوم ہوا۔ ان سب نے کچے راستے کے گرد و غبار سے بچنے کے لیے منہ سر کپڑوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ چار افراد کے پاس بڑی رائفلیں موجود تھیں۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے ڈاکوؤں یا وارداتیوں کا گروہ کہیں کارروائی ڈالنے کے لیے جا رہا ہو۔

عمو کو گھڑسواری کا زیادہ تجربہ نہیں تھا اس لیے اسے ایک صحت مند گھوڑے پر ایک دوسرے شخص کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ یہ خاردار داڑھی والا شخص تھا اور اس کے جسم سے مردار کی سی بو اٹھ رہی تھی۔ وہ عمو کے پیچھے بیٹھا تھا۔ جب گھوڑا بھاگتا اور عمو دائیں بائیں کھسکتا تو وہ شخص مذاق کے انداز میں کہتا۔ ''اوئے، سنبھل کر بیٹھ کاکا۔ کیا صابن کی ٹکاچی کی طرح پھسل رہا ہے۔''

ایک بار اس نے عمو کی کمر پر بہت زور سے چٹکی بھی کاٹی۔ عمو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

یہ سفر کافی طویل ثابت ہوا۔ گرمی اور دھوپ نے اسے مزید مشکل بنا دیا... راستے میں کہیں کہیں اکا دکا لوگ ملے۔ ماجھاں اور اس کے ساتھیوں کی ان سے مختصر بات چیت بھی ہوئی۔ اس بات چیت سے عمو کو معلوم ہوا کہ گرانڈیل عورت کا نام ماجھاں ہے اور اسے مالکن یا چودھرانی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی موضع ''کیکراں'' کے رہنے والے تھے اور وہیں جا رہے تھے۔

تپتے دن میں نہایت دشوار راستوں پر سفر کر کے وہ لوگ شام سے کچھ ہی پہلے ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہاں سو فیصد مکان کچے تھے۔ گاؤں کی مسجد اور حویلی بھی کچی تھی۔ حویلی کا احاطہ بہت بڑا تھا اور اس کے ارد گرد بہت سے درخت لگے تھے۔ ان درختوں میں زیادہ تر کیکر ہی نظر آتے تھے۔ اس جگہ کیکروں کی بہتات تھی، شاید اسی لیے اس گاؤں کا نام کیکراں تھا... حویلی کے احاطے میں ایک جگہ بہت سی بیل گاڑیاں اور گھوڑے خچر وغیرہ دکھائی دے رہے تھے۔ عمو کو حویلی سے ملحقہ ایک ڈیرا نما جگہ پر پہنچا دیا گیا۔

☆☆☆

اگلے تین چار روز میں عمران عرف عمو کو یہاں کے حالات کے بارے میں بہت کچھ پتا چلا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ جرائم پیشہ لوگوں کا گاؤں تھا۔ بارڈر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں شراب کی بھٹیاں تھیں۔ یہاں کی شراب ارد گرد کے دیہات میں بھی بھیجی جاتی تھی۔ یہاں اسمگلنگ کا سامان بھی آتا تھا۔ یہاں جوئے کی ایک بڑی بیٹھک تھی جسے عرفِ عام میں سراں کہا جاتا تھا۔ علاقے کی پولیس کو ان غیر قانونی کاموں میں مداخلت کی ہمت کم ہی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ ماجھاں تھی۔ وہ بڑے دھڑلے کی عورت تھی۔ وہ دو مشہور ڈکیتوں ساجے اور ناجے کی سگی بہن تھی۔ ساجا تو کوئی دو سال پہلے مارا گیا تھا مگر ناجا زندہ تھا۔ وہ پچھلے تقریباً ایک سال سے روپوش تھا۔ ماجھاں خود بھی بہت دلیر تھی۔ اس کی آتشیں طبع کا ایک ثبوت وہ گہرا زخم بھی تھا جو اس کی پیشانی سے رخسار تک چلا گیا تھا اور جس کی وجہ سے اس کی ناک ضرورت سے زیادہ چپٹی نظر آتی تھی۔

ابھی تک عمو کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے اور اس سے کیا کام لیا جائے گا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ ماجھاں کو ''کامے'' کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا کاما کہیں گیا ہوا ہے لیکن یہاں تو کئی کامے موجود تھے اور ان میں عمو کے ہم عمر تین چار لڑکے بھی تھے۔

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا، کچھ دیر پہلے ہلکی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے گرمی کا زور ذرا ٹوٹ گیا تھا۔ ایک ملازمہ شہناز عمو کے پاس آئی۔ وہ عمو کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''وے تجھے مالکن نے بلایا ہے۔''

''کون مالکن؟''

''وے چودھرانی جی اور کون؟ یہاں تیری ماں تو مالکن نہیں ہے۔''

عمو ملازمہ کے ساتھ ہو لیا۔ ڈیرے اور حویلی کا درمیانی دروازہ پار کر کے وہ حویلی میں آ گئے۔ ملازمہ شہناز اسے اندر لے گئی۔ یہاں ایک کمرے میں رنگین پایوں والا شان دار پلنگ بچھا ہوا تھا۔ چھت پر کوئی چھ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا جھالر والا پنکھا حرکت کر رہا تھا۔ اس پنکھے کو کسی ساتھ والے کمرے سے ڈوری کے ذریعے حرکت دی جا رہی تھی۔ پلنگ پر مالکن ماجھاں موجود تھی۔ عمو کو دیکھ کر وہ پلنگ سے اٹھی اور رنگین پایوں والی، بان کی ایک کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کے بوجھ سے جیسے کرسی چرچرا اٹھی۔

اس نے عمو کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اور بھاری بھرکم آواز میں بولی۔ ''اوئے منڈیا! کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا نہیں۔ کیا بوتھی نکالی ہوئی ہے۔ رنگ بھی پیلا ہو گیا ہے۔''

''کھاتا ہوں جی۔'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

''زور ہے تیرے میں؟'' اس نے پوچھا۔

عمو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا، چل دیکھ لیتی ہوں۔ ذرا مونڈھے دبا میرے۔''

عمو سکتہ زدہ سا کھڑا رہا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں عمو کو ماں کی گالی دی اور بولی۔ ''اوئے... ایسے کیا تک رہا ہے بٹر بٹر؟ کیا کبھی کسی کا پنڈا نہیں دبایا؟''

عمو جلدی سے اس کے عقب میں آ گیا اور اس کے چربی دار مونڈھوں کو اپنے ہاتھوں سے دبانے لگا۔

اسی دوران میں سانولے رنگ کا ایک غریب صورت شخص اندر آیا۔ اس نے پہلے زمین کو دونوں ہاتھ لگا کر اس بات کا اشارہ دیا کہ وہ ماجھاں کے پاؤں چھو رہا ہے پھر وہ کمرے کی دہلیز پر ہی جوتیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے عاجزی سے دانت نکالے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مالکن! میرے پتر نے چوری نہیں کی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا جی۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ وہ بھلا کسی کی بھینس چوری کرے گا؟ میں آپ کے سامنے ہتھ جوڑتا ہوں۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔ اس کی جان بچائیں... پلس والے مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔''

ماجھاں نے اطمینان سے کہا۔ ''پر تھانے دار تا در کہتا

ہے کہ اس نے لوٹا فال نکالی ہے اور فال میں تیرا پتر امین ہی سامنے آیا ہے۔"

غریب صورت شخص روتے ہوئے بولا۔" آہو جی، انہوں نے لوٹا گھمایا تھا... پر لوٹا غلط بھی تو گھوم سکتا ہے نا۔ میرا امین چور نہیں ہے۔"

ماجھاں نے بلاتردد غریب صورت شخص کو گالی دی اور بولی۔" پچھلے سال جب تیری دھی کا داج (جہیز) چوری ہو گیا تھا تو تو نے خود وہائی مچائی تھی اور کہا تھا کہ لوٹا گھما کر چور کا پتا لگایا جائے۔ تو نے کہا تھا یا نہیں؟"

غریب صورت شخص کا سر مزید جھک گیا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔" مالکن! میں اتنا جانتا ہوں، میرے پتر نے رسا گیری نہیں کی۔ اس پر الزام لگایا گیا ہے..."

"اچھا، دوسروں کی واری لوٹا سچا اور اپنی واری جھوٹا۔" ماجھاں نے طنزیہ انداز میں کہا اور غریب صورت شخص کی نامعلوم بہن کا رشتہ ایک پلید جانور سے جوڑا۔

اس شخص نے ایک بار پھر زمین پر دونوں ہاتھ لگا کر اپنی عاجزی کا اظہار کیا اور بولا۔

"مالکن! تم مائی باپ ہو۔ تمہارے سوا کسی کا آسرا نہیں۔ میرے بچے کی جان بچاؤ۔ وہ پلس کی مار کھانے جوگا نہیں۔" اس نے اپنا سر زمین سے ٹکایا اور بھوں بھوں رونے لگا۔

ماجھاں کچھ دیر چپ رہی پھر گمبھیر آواز میں بولی۔ "چل اٹھ۔ کیا زنانیوں کی طرح اتھرو ڈگا رہا ہے۔"

غریب صورت شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی چھدری داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔ ماجھاں نے اسے چند سخت باتیں سنائیں پھر کہا۔" چل جا، میں کچھ کرتی ہوں اس کے لیے۔"

وہ شخص سلامیں کرتا ہوا چلا گیا۔ ماجھاں نے نوکرانی شہناز کو آواز دے کر بلایا اور اسے اپنے پاؤں کے ناخن کاٹنے کا حکم دیا۔ نوکرانی شہناز، اس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ایک چھوٹی قینچی سے اس کے پاؤں کے ناخن کترنے لگی۔

عمو بدستور اس کے سخت کندھے دبا رہا تھا۔ نوکرانی ناخن کاٹ کر چلی گئی تو خضاب لگے سر اور گھنی مونچھوں والا ایک شخص اندر آیا۔ اس کے کندھے سے ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ اس نے ماجھاں کو سلام کیا اور بولا۔" مالکن! وہ دیناں مسکی میرے پاس بیٹھا زنانیوں کی طرح رو رہا ہے۔ اس کا کیا کرنا ہے؟"

"کرنا کیا ہے؟" ماجھاں نے پوچھا۔

"وہ کہتا ہے کہ آپ نے اس کے پتر کو پلس سے چھڑانے کا وعدہ کیا ہے... ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"ہاں، وعدہ تو کیا ہے۔" ماجھاں بولی۔

"تو پھر... اگر آپ کا حکم ہو تو میں اس کے ساتھ چلا جاؤں تھانے؟" گھنی مونچھوں والے نے پوچھا۔

"ہاں چلے جاؤ۔ تھانے دار تارڑ سے مل لینا... ویسے کے سامنے اس کے پتر کو چھوڑنے کی بات کرنا۔ پر ابھی اس ذلیل کو چھڑانا نہیں ہے۔ چار پانچ روز ابھی اس کو رگڑے لگنے دیتے ہیں۔ اس کو ہیضہ ہو گیا ہے اپنی پڑھائی کا۔ الو کا پتر، خود کو لاٹ صاحب سمجھنے لگا ہے۔"

گھنی مونچھوں والے نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور سلام کر کے باہر چلا گیا۔ عمو حیرانی سے سوچتا رہا۔ یہ کتنی دغاباز عورت تھی۔

کندھے دبا دبا کر عمو کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا بلکہ پچھلے آدھ گھنٹے سے سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی اسے بس کرنے کا کہے گی لیکن وہ تو جیسے اسے آرڈر کر کے بھول ہی چکی تھی۔ عمو کی عمر سولہ سال سے تھوڑی ہی زیادہ ہو گی۔ اس نے تھوڑا قد کاٹھ نکال لیا تھا لیکن ابھی اس کے جسم میں وہ مردوں والا زور کہاں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ اور بازو شل ہو گئے۔ جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔ وہ مست بیٹھی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اذیت پسند طبع رکھتی ہے۔ جانتی بھی تھی کہ عمو بری طرح تھک چکا ہے پھر بھی اسے رکنے کے لیے نہیں کہہ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جب عمو کے ہاتھوں میں بالکل جان نہ رہی تو اس نے گھوم کر اسے دیکھا اور بولی۔" اوئے لکڑی دے باندر! تو تو کہتا تھا کہ زور ہے تیرے اندر۔ یہ چھ خاک ات رہا ہے کہ مونڈھے دبا رہا ہے؟"

عمو کچھ نہیں بولا۔ اس کے ماتھے پر پسینا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو ماجھاں کے کندھوں پر حرکت دیتا رہا۔

چند سیکنڈ بعد وہ بولی۔" اچھا چل چھوڑ۔ وہ سامنے الماری میں سے پانی کی بوتل پکڑ کر لا۔"

عمو اس کے اشارے پر الماری کی طرف گیا۔ اس نے الماری کھولی اور بوتل تلاش کرنے لگا۔ پانی کی بوتل تو نظر نہیں آئی لیکن شراب کی سیاہی مائل بوتل وہاں موجود تھی۔ ماجھاں کی بھاری آواز اس کے کانوں میں پڑی۔" اوئے بٹر بٹر کیا دیکھ رہا ہے، یہی بوتل لانی ہے۔"

عمو نے لرزتے ہاتھوں سے بوتل تھامی اور اسے ماجھاں کے سامنے تین ٹانگوں والی گول میز پر رکھ دیا۔

یہاں گلاس پڑا تھا اور ایک جگ میں تھوڑا سا پانی بھی رکھا تھا۔ ماجھاں نے ملازمہ شہناز کو اپنی بھاری بھرکم آواز میں پکارا۔ وہ چند سیکنڈ میں اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ ٹرے کے اندر پلیٹ میں برف کے ٹکڑے رکھے تھے اور کچھ نمکو وغیرہ تھی۔ عمو کو عجیب الجھن ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عورت کیا کر رہی ہے۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ شراب بہت بری چیز ہے۔ اسے بدمعاش لوگ پیتے ہیں اور پینے کے بعد زیادہ خبیث ہو جاتے ہیں۔ اسے ہرگز پتا نہیں تھا کہ کچھ عورتیں بھی شراب پیتی ہیں۔

ماجھاں کی آنکھوں میں عجیب سی سرخی اترتی جا رہی تھی۔ اس نے جگ میں برف کے ٹکڑے ڈال کر جگ کو ہلایا پھر عمو سے مخاطب ہو کر بولی۔" چل، یہ کالا پانی ڈال۔"

"کک... کس میں؟"

"اپنی بے بے کے سر میں۔ اوئے اس گلاس میں ڈال... یہ جو تیرے سامنے رکھا ہے۔"

عمو نے لرزتے ہاتھوں سے بدبودار سیال گلاس میں انڈیلنا شروع کیا۔ گلاس ایک تہائی بھر گیا تو ماجھاں نے عمو کا ہاتھ روک دیا۔ پھر اس نے اپنے حساب سے اس میں ٹھنڈا پانی مکس کیا اور غٹاغٹ چڑھا گئی۔

اس کمرے میں اس نے یہی عمل دو تین بار دہرایا اور اس کا چہرہ تمتما گیا۔ آنکھیں سرخ نظر آنے لگیں... بالکل انگاروں کی طرح۔ عمو کو اس سے ڈر لگنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ کہیں اسے مارنا نہ شروع کر دے۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی اٹھی۔ اس نے عمو کے گال پر ایک سخت چٹکی لی اور کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

عمو کے سینے میں دل کبوتر کی طرح پھڑک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کچھ غلط ہونے والا ہے۔ یک دم کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اب کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط ہلکی سرسراہٹ اور چرخی کی مدھم آواز سے پتا چلتا تھا کہ چھت پر جہازی سائز کا جھالروالا پنکھا حرکت کر رہا ہے۔

یکایک عمو نے سخت جسم والی ماجھاں کو اپنے بالکل پاس محسوس کیا۔ اس کی سانسوں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اس کے بازو عمو کے اردگرد تھے۔ عمو کو گھن محسوس ہوئی۔ وہ مرد عورت کے تعلق کے بارے میں جانتا تھا لیکن یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی بڑی عمر کی اور ایسی بھدی عورت اس سے کوئی تعلق بنائے گی۔

"مم... میں نے باہر جانا ہے۔" وہ ہکلایا۔

"باہر چلے جانا۔ ابھی تو ادھر چلو۔"

"کہاں... جی؟"

"اوئے ادھر۔" اس نے اسے بستر پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت اب پہلے سے سخت تھی۔

چند ہی لمحے بعد عمو نے خود کو ایک بے پناہ بوجھ تلے محسوس کیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس بدبودار عورت کے چہرے پر زوردار دو ہتڑ مارے اور یہاں سے بھاگ نکلے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہاں بڑے کرخت قسم کے پہرے دار موجود ہیں اور ان کے کندھوں سے ہر وقت بندوقیں جھولتی رہتی ہیں۔ شہنشاہ کے مزار کے پہرے دار ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔

وہ بڑے مکروہ اور اذیت ناک لمحے تھے۔ وہ خود کو کسی شکاری جانور کے پنجوں میں محسوس کر رہا تھا۔ کراہ رہا تھا اور کسمسا رہا تھا۔ ماجھاں جب مطلب برآری میں ناکام ہوئی تو ایک دم جھلا اٹھی۔ اس نے عمو کو اس کی گردن سے پکڑ کر زوردار جھٹکے دیے اور پھر اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ پہلے وہ اسے خالی ہاتھوں سے مارتی رہی پھر اس نے چمڑے کا ایک دیسی جوتا پکڑ لیا۔ یہ بڑے ذلت ناک لمحے تھے۔ وہ بے دردی سے اس کے جسم پر ضربیں لگاتی رہی اور گالیاں بکتی رہی۔ کوئی عمو کو چھڑانے نہیں آیا۔ کسی نے مداخلت نہیں کی۔ عمو کراہتا رہا اور بستر پر لوٹتا رہا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا اور عمو کی پشت پر لات رسید کر کے اسے باہر پھینک دیا۔ ایک سیکنڈ بعد عمو اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز سن رہا تھا۔

ایک گوشے سے ملازمہ شہناز نمودار ہوئی۔" چل اٹھ جا۔" اس نے ترس آمیز اور کسی حد تک طنز آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔

عمو کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

اس رات اپنے کمرے میں جا کر عمو خوب رویا تھا۔ اس نے آج رات عورت کا ایک نیا روپ دیکھا تھا۔ ان گھڑیوں میں شاید اسے عورت ذات سے ہی نفرت ہو جاتی اگر اس کے تصور میں چاندی بالوں والے ایک مقدس چہرے کی شبیہہ نہ ابھر آتی۔ یہ اس کی پیاری ماں کا چہرہ تھا۔ وہ روتا رہا اور سوچتا رہا کہ کتنا فرق ہے ان دو عورتوں میں۔ اسے اپنی ماں ٹوٹ کر یاد آئی۔ آج سے سات آٹھ روز بعد اس کی ماں کو اس سے ملنے شہنشاہ پیر کے مزار پر آنا تھا۔ یقیناً وہ دن گن گن کر اس وقت کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ مزار پر نہیں تھا۔ خبر نہیں کہ عمو کو وہاں نہ پا کر اس کی ماں پر کیا گزرنی تھی۔ اس نے اپنی ماں کی ویران آنکھیں اور اس کا زرد چہرہ

دیکھا۔ اس کا دل سینے میں ٹوٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا۔ وہ ساری رات سسکتا رہا اور اپنی چوٹوں کو سہلاتا رہا۔ اسے بے پناہ توہین کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت جب ہر طرف چلچلاتی دھوپ پھیلی تھی، ملازمہ شہناز پھر مالکن ماجھاں کا بلاوا لے کر پہنچ گئی۔ عمو اندر تک لرز گیا۔ کل والے سارے کراہت انگیز واقعات اسے پھر یاد آ گئے تھے۔ وہ چاروناچار پھر شہناز کے ساتھ ماجھاں کے پاس پہنچا۔ آج وہ ذرا مختلف موڈ میں تھی۔ آج وہ برآمدے میں تھی اور سُوتر کی بنی ہوئی ایک رنگین چارپائی پر پھیل کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے نیچے گاؤ تکیہ تھا۔ پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی اس کے سرہانے کھڑی ایک بڑا پنکھا دونوں ہاتھوں سے جھل رہی تھی۔ اٹھارہ انیس سال کا ایک گورا چٹا لڑکا اس کے لیے حقہ تازہ کر رہا تھا۔ حقہ تازہ کر کے اس نے ماجھاں کے قریب رکھا اور اس کی لمبی نے ماجھاں کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ ماجھاں نے پنکھا جھلتی ہوئی لڑکی کو بھی صحن میں بھیج دیا اور عمو کو ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا... عمو بیٹھ گیا۔

وہ بولی۔ ''کل پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں تمہیں مار بیٹھی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ پر اس میں تمہارا بھی تھوڑا بہت قصور ہے۔ میرے کہنے پر چلو گے تو بہت خوش رہو گے۔ ہر طرح کا آرام ملے گا۔ لیکن اپنی مرضی دکھاؤ گے تو پھر میں بڑی سخت بھی ہوں۔ ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا۔'' اس کا لہجہ آخر میں دھمکی آمیز ہو گیا۔

عمو بس سر جھکا کر رہ گیا۔ اس کے ہونٹوں نے ایک بے ساختہ حرکت ضرور کی مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

''کیا کہنا چاہتا ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''کک... کچھ نہیں جی۔''

''میں بتاتی ہوں۔ تو واپس جانا چاہتا ہے اور تیرے دل میں یہاں سے بھاگنے کا فتور بھی ہے۔ یہ بھاگنے والا فتور اپنے دل دماغ سے بالکل نکال دے۔ جب تک میں نہ چاہوں گی، تیرے فرشتے بھی یہاں سے نکل نہیں سکتے... اگر آزمانا چاہتا ہے تو آزما کر بھی دیکھ لے۔ اور اگر نہ ہی آزمائے تو چنگا ہے۔'' ماجھاں کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کہتی ہے، کر کے بھی دکھاتی ہے۔

عمو اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گیا۔ کہیں پاس ہی طویلے کی طرف رکھوالی کے بڑے بڑے کتے پُرہول آواز میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ عجیب شکل صورت کی عورت تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ وہ گاؤ تکیے پر سیدھی ہو کر بیٹھی تو تکیہ تھوڑا سا ایک طرف کھسک گیا۔ تکیے کے نیچے سیاہ رنگ کے پستول کی جھلک نظر آئی۔

ماجھاں نے حسبِ سابق کالا تہ بند پہن رکھا تھا۔ ویل کی سفید قمیص تھی جس کے بازو اس نے مردوں کی طرح اڑس رکھے تھے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ خاصی خوش خوراک بھی ہے۔ عمو کی موجودگی میں ہی اس نے پکی لسی کی ایک بڑی گڑوی ایک ہی ڈیک میں خالی کر دی اور پھر مردوں کے انداز میں زوردار ڈکار لی۔

اسی دوران میں اچانک احاطے کے پھاٹک پر کھڑے پہرے داروں میں ہلچل سی نظر آئی پھر ایک تازی گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی رکاب میں کسی شخص کا پاؤں بُری طرح پھنسا ہوا تھا۔ وہ شخص گھوڑے کے ساتھ ساتھ ہی گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ گھوڑے کے عقب میں کئی افراد تھے۔ وہ شاید اسے روکنا چاہ رہے تھے لیکن وہ ان کی پہنچ سے دور تھا اور اگر پاس بھی ہوتا تو شاید اس کی سرکشی کے سبب وہ اسے روک نہ سکتے۔ ایسا جوان اور قدکاٹھ والا گھوڑا عمو کی نظروں سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔ وہ دیوانی رفتار سے وسیع احاطے کے اندر دوڑ رہا تھا۔ زخمی سوار کسی ہلکی پھلکی چیز کی طرح اس کے ساتھ گھسٹتا اور پلٹتا چلا آ رہا تھا۔ سامنے سے لپکنے والے دو افراد نے گھوڑے کے راستے میں آنے کی کوشش کی۔ وہ بلا خیز تیزی کے ساتھ انہیں چکما دے گیا اور شمالی حصے کی طرف بڑھا۔

اور یہی وقت تھا جب عمو کی نگاہ گھوڑے کے پیچھے گھسٹتے ہوئے شخص پر پڑی۔ عمو لرز گیا۔ اس سے پہلے اس نے اپنے گاؤں میں اڑوس پڑوس میں مرنے والوں کے مُردہ جسم دیکھے تھے مگر ایسی بھیانک لاش کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بدنصیب شخص نہ جانے کتنی دور سے گھوڑے کے پیچھے رگڑتا چلا آ رہا تھا اور کہاں کہاں ٹکرایا تھا۔ اس کا سر تربوز کی طرح پھٹ چکا تھا اور سامنے کی طرف سے سینے کی کھال مکمل طور پر اتر چکی تھی۔ ایک سائیس نما شخص نے گھوڑے کی لگام تھامنا چاہی مگر اس نے گھوم کر ایسی دولتی چلائی کہ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ایک شخص نے اضطراب کے عالم میں گھوڑے پر رائفل تانی۔

''اوئے... اوئے۔ گولی نہیں چلانا۔'' ماجھاں دہاڑی اور گھوڑے کی طرف بڑھی۔

ذلیل ہوا کہ رام پرشاد جلتے تیل میں ہاتھ ڈال کر پرکھشا دے گا۔ پھر پرکھشا کا وقت آگیا اور رام پرشاد نے جلتے تیل میں ہاتھ ڈال دیے۔ اس کے ہاتھ جل گئے پھر جنونی ہندوؤں نے رام پرشاد کو ہلاک کر دیا اور بالا کو پکڑ لائے۔ اب اسے جلتے تیل میں پھینکا جانے والا تھا۔ پھر عمران نے کچھ کرنے کا کہا اور گولی چلا دی۔ مہندر مارا گیا۔ سینٹس کے آدمیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور وہ لوگ بالا کو نکال لے گئے۔ ہم واپس تہ خانے میں آ گئے۔ میری گردن کے زخم سے خون کا رساؤ پھر شروع ہو گیا تھا اور تکلیف بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں درد سے تڑپتا رہا۔ عمران ڈاکٹر لی وان کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے آیا اور اسے میرا آپریشن کرنے پر مجبور کیا۔ اس میں میری جان بھی جا سکتی تھی۔ خیر میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ دس روز بعد میں پوری طرح صحت یاب ہو گیا تھا۔ میں اور عمران راج بھون پہنچ گئے۔ ہم وہاں پہرے داروں کو پچھاڑ کر اندر داخل ہوئے۔ بالا سنگھ جی کے بیٹے کی پیدائش پر جشن منایا جا رہا تھا۔ ہم نے فائرنگ کر دی۔ ڈاکٹر اسٹیل کا بھائی اس فائرنگ میں مارا گیا۔ ایک دو ہندو زخمی ہوئے۔ پانڈے نے ہمارا پیچھا کیا مگر وہ بھی میرے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم ایک ہندو فیملی کے گھر میں گھس گئے۔ وہاں دہشتی نامی لڑکی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ احاق کو سزائے موت دی جا رہی ہے۔ ہم احاق کے لیے کچھ نہ کر پائے۔ اسے بے انتہا اذیت دے کر موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ہم وہاں سے نکل رہے تھے کہ ایک گلی میں سپاہیوں کا ناکا نظر آیا۔ میرے سامنے رنجیت پانڈے کھڑا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ جو مارا گیا تھا، وہ اس کا چچا زاد گردمیت پانڈے تھا۔ پھر میں عمران کو ایک قہوہ خانے میں چھوڑ کر میڈم صنورا کے پاس چلا گیا۔ اس کی سزا معاف ہو گئی تھی اور وہ لال بھون پہنچ گئی تھی۔ پھر عمران بھی وہاں پہنچ گیا مگر میڈم نے ہمیں دھوکا دیا اور کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔ وہ اپنی بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ وہاں میڈم کے گارڈز اور اس کے ساتھ لڑائی ہوئی تاہم اس دوران میں میڈم کو سانپ نے کاٹ لیا۔ عمران نے میڈم صنورا کی جان بچائی۔ میڈم کا رویہ الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہو گیا۔ پھر میں ایک رات خاموشی سے نکل کر راج بھون پہنچ گیا اور جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ مجھے ایک مہمان کے طور پر واپس میڈم صنورا کے پاس بھیج دیا گیا۔ ایک رات میں اور عمران سو رہے تھے کہ میری آنکھ عمران کے جگانے پر کھلی۔ ہم غسل خانے کی طرف رینگ گئے۔ یہی وقت تھا جب کھڑکی کے پاس کسی سائے کی حرکت محسوس ہوئی۔ یہ کوئی محافظ تھا۔ اس نے ہمارے بستروں کی طرف رخ کر کے فائرنگ کی۔ ہم نے اسے پکڑ لیا۔ ہماری سیکیورٹی سخت کر دی گئی۔ اوجرا سنگھ نے مجھے بتایا کہ جارج نے سامبر کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ راج بھون سے ہمارا بلاوا آ گیا۔ وہاں رام پرشاد کی ماں موجود تھی۔ اس نے حکم سے کہا کہ سامبر کا چیلنج ختم کر کے مجھے سزا دی جائے تاہم عمران کے دلائل نے سب کو خاموش کرا دیا۔ سامبر کی تاریخ دے دی گئی۔ ایک بار پھر ہمیں مارنے کا منصوبہ بنایا گیا تاہم وہ بھی ناکام رہا۔ میں اور عمران بیٹھے تھے کہ باتوں باتوں میں، میں نے اسے اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ پہلے تو وہ منع کرتا رہا پھر اپنی کہانی سنانے لگا۔ عمران شمالی پنجاب کے ایک گاؤں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ گاؤں کا چودھری عمران عرف عمو کو دور دراز گاؤں کے ایک مزار پر ایک سال خدمت کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ عمران وہاں جا کر بہت رونا ہے تاہم اسے ایک سال تک وہاں رہنا تھا۔ عمو وہاں صبح سویرے سے رات تک صفائی کرتا۔ ایک روز عمو پیر صادق شاہ کے حجرے سے دسترخوان اٹھانے گیا۔ وہاں کچھ مہمان تھے۔ ان میں ایک عورت ماجھاں تھی۔ اس نے عمو کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ عمو کو نہیں پتا تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ ماجھاں نامی عورت ایک ڈاکو کی بہن تھی۔ ایک روز اس نے عمو کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ عمو سے تعلق قائم کرنا چاہتی تھی تاہم عمو کو اس سے گھن محسوس ہوئی۔ اپنی مرضی پوری نہ ہونے پر اس نے عمو کو خوب مارا۔ ایک روز عمو ماجھاں کے پاس تھا کہ باہر احاطے میں ہلچل محسوس ہوئی۔ ایک تازی گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رکاب میں کسی شخص کا پاؤں پھنسا تھا اور وہ اس کے ساتھ گھسٹا چلا جا رہا تھا۔ کئی لوگوں نے گھوڑے کو پکڑنا چاہا مگر ناکام رہے۔ ایک شخص نے گھوڑے پر رائفل تانی مگر ماجھاں نے دہاڑ کر گولی نہ چلانے کا حکم دیا اور گھوڑے کی طرف بڑھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماجھاں نے گھوڑے کو اس کے نام سے پکارا۔ ”ہیرے... ہیرے۔“ پھر وہ ایک دم چکما دے کر بائیں طرف سے آگے بڑھی۔ وہ گھوڑے کی لگام تھامنا چاہتی تھی لیکن گھوڑا تو جھلا دیا بنا ہوا تھا۔ وہ ہنہناتا ہوا اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑا ہوا اور تقریباً الف ہو کر واپس پلٹا۔ واپس پلٹنے کی وجہ سے اس کا رخ سیدھا عمو کی طرف ہو گیا۔ پانی کے دو بڑے مٹکوں کو توڑتا اور ایک چارپائی الٹتا ہوا وہ عمو کی طرف آیا۔ عمو اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا۔ اس نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش کی مگر دیر ہو چکی تھی۔ سرکش گھوڑا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے بے اختیار اندھا دھند اپنا ہاتھ گھمایا۔ اس دوران میں اس کی آنکھیں بے ساختہ بند ہو چکی تھیں۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آ گئی۔ اس کے بازو کو شدید جھٹکا لگا۔ وہ بری طرح ڈگمگایا مگر گرنے سے بچ گیا۔ یہی لمحے تھے جب تنومند ماجھاں گھوڑے پر جھپٹی۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد گھوڑا چند لمحوں کے لیے ششدر سا ہو گیا۔ شاید یہ صورت حال اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی یا وہ پھر سے دیوانہ وار اچھل کود شروع کرنے کے لیے پینترا بدل رہا تھا۔ ماجھاں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے لمبے بدن کے ساتھ گھوڑے کی گردن پر جا پڑی۔ گردن کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس نے کچھ اس طرح زور لگایا کہ گھوڑا زمین پر آ رہا۔ اس کے گرنے کی دیر تھی کہ موقع پر موجود افراد چیونٹیوں کی طرح اس سے چمٹ گئے۔ جس کے ہاتھ میں گھوڑے کے جسم کا جو حصہ آیا، اس نے جکڑ لیا۔ دو تین افراد گرے ہوئے گھوڑے کے اوپر ہی چڑھ بیٹھے۔ اس کی چرمی لگام ابھی تک عمو کے ہاتھ میں تھی۔ عمو نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑا رہا۔ سائیس نما شخص نے ایک دوسرے ملازم کے ساتھ مل کر تیزی سے گھوڑے کی ٹانگیں باندھنا شروع کیں۔ دو تین منٹ کے اندر سرکش تازی گھوڑا لوہے کی طرح بے بس ہو

چڑا تھا۔

گھوڑے کو سنبھالنے اور گرانے میں زیادہ کردار ماجھاں ہی کا تھا۔ بہرطور اس میں کچھ نہ کچھ حصہ عمو کا بھی تھا۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد ہی گھوڑے کی غیر معمولی سرکشی میں کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کوشش میں عمو کی ایک کہنی بُری طرح چھل گئی اور اس سے خون رسنے لگا۔ دو تین مزید افراد کو بھی چوٹیں آئیں۔ بہرحال، سب سے خوفناک منظر اس لاش کا تھا جو سرکش گھوڑے کے ساتھ گھسٹتی ہوئی حویلی کے احاطے میں پہنچی تھی۔ یہ لاش ایک چالیس بیالیس سالہ شخص کی تھی۔ اس کے جسم پر عام سا لباس تھا۔ اس کی پگڑی اور جوتے وغیرہ اتر چکے تھے۔ سارا جسم زخموں اور خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ سر کی چوٹ سب سے مہلک تھی۔ کھوپڑی تربوز کی طرح پھٹ کر کھل چکی تھی۔ لاش پر فوراً چادر ڈال دی گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں احاطے کے اندر بہت سے افراد جمع ہو گئے۔ مرنے والے کا نام فاضل تھا۔ وہ حویلی کے ''کاموں'' میں سے تھا۔ مشتعل گھوڑا اسے قریباً دو کلومیٹر سے گھسیٹتا ہوا حویلی تک لایا تھا۔ اچانک عمو کو ایک روتی پیٹتی لڑکی نظر آئی۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی لاش کی طرف بڑھی۔ ''ہائے ابا جی... ہائے ابا جی۔'' وہ پکار رہی تھی۔

عمو نے پہچان لیا۔ یہ وہی پندرہ سولہ سالہ معصوم صورت لڑکی تھی جسے اس نے کل ماجھاں کے سرہانے کھڑا دیکھا تھا، وہ اسے مسلسل پنکھا جھل رہی تھی۔

لڑکی نے لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹائی اور پھر اس سے لپٹ گئی۔ اس کی گریہ زاری دل دوز تھی۔ ''ہائے ابا جی! آپ کو کیا ہو گیا... آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ ہائے اللہ! اب میں کیا کروں گی۔ مجھے بھی موت آجائے... یا اللہ! مجھے بھی موت آجائے۔''

لاش کے مسخ چہرے پر دوبارہ کپڑا ڈال دیا گیا۔ ماجھاں کے اشارے پر حویلی کی ملازماؤں نے لڑکی کو بہ مشکل سنبھالا اور اسے لاش سے دور لے گئیں۔ عمو بھی حویلی کے اس حصے میں واپس آ گیا جسے ڈیرا کہا جاتا تھا۔ اس کے زخمی بازو کی بھی مرہم پٹی کر دی گئی۔

☆☆☆

روتی چلاتی لڑکی کا نام شبانہ تھا۔ وہ گھوڑے سے گر کر مرنے والے فاضل کی بیٹی تھی اور باپ کے ساتھ ہی یہاں حویلی میں رہتی تھی۔ اس کی والدہ اور دو چھوٹے بھائی ایک قریبی موضع کے رہنے والے تھے۔ وہ لاش لے کر اپنے علاقے کی طرف چلے گئے تھے۔

عمو کی کہنی پر اچھا خاصا زخم آیا تھا۔ تیسرے روز ماجھاں نے اسے حویلی میں بلایا اور اس کا حال چال پوچھا۔ عمو کو ہلکا سا بخار بھی تھا۔ ماجھاں نے ملازمہ شہناز سے کہا۔ ''جب تک اس منڈے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی، یہ حویلی میں ہی رہے گا۔ اسے ایک کمرا دے دو اور ذرا اچھی طرح کھلاؤ پلاؤ اسے۔ دیکھو کس طرح ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں خبیث کی۔''

''مم... میں اُدھر ہی ٹھیک ہوں جی... ہلکا سا بخار ہے، کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔'' عمو منمنایا۔

''تو زیادہ ڈاکٹر نہ بن۔ جو کہہ رہی ہوں وہ کر۔'' ماجھاں رعب سے بولی اور شہناز کو اشارہ کیا کہ وہ عمو کو لے جائے۔

شہناز نے عمو کو لیا اور احاطے کے اندر ہی ایک ہوادار کمرے میں لے آئی۔ یہاں تین طرف سلاخ دار کھڑکیاں تھیں۔ ویسے بھی یہ کمرا نیم کے درخت کی گھنی چھاؤں میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں گرمی کا گزر ہی نہیں۔ ایک پلنگ، ایک الماری اور ضرورت کی دیگر چیزیں اس کچے کمرے میں موجود تھیں۔ شہناز نے مسکراتی ہوئی معنی خیز نظروں سے عمو کو دیکھا اور بولی۔ ''تمہاری تو لاٹری نکلی ہوئی ہے۔ کھاؤ پیو اور آرام کرو۔ کام شام کرنے کے لیے ہم غریب غربا جو ہیں۔''

عمو جل کر بولا۔ ''میری جگہ تم آجاؤ۔ میں تمہارے کام شام کر لیتا ہوں۔''

وہ ہنس ہنس کر دُہری ہونے لگی۔ ''تمہاری جگہ میں کیسے لے سکتی ہوں۔ تمہاری جگہ تم ہی لے سکتے ہو۔''

اس کے جانے کے بعد عمو پلنگ پر چت لیٹ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ اس کا دل غم و اندوہ سے بھر گیا۔ ماں کے چاندی بال اس کی نگاہوں میں چمکنے لگے اور اس کی تھکی تھکی ویران آنکھوں کا تصور عمو کی آنکھوں میں نمی جگانے لگا۔

اس کمرے میں اسے واقعی ہر طرح کا آرام ملا۔ بہترین کھانا، نئے ریشمی کپڑے، اس کے علاوہ آرام دہ بستر، نہ کبھی نہ مچھر۔ دو دن بعد ایک دو بار ماجھاں کی جھلک بھی نظر آئی۔ اس کا رویّہ اب بہتر نظر آتا تھا۔ اس کے کہنے پر اس کا ملازم خاص باکھا عمو کو گاؤں کے حکیم کے پاس بھی لے کر گیا اور اس کے بازو کی مرہم پٹی کرا کے لایا۔ لیکن چوتھے روز وہی ہوا جس کا عمو کو ڈر تھا۔ وہ بالائی دار دودھ کا بڑا گلاس پی کر بستر پر سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ شہناز آ گئی اور سپاٹ لہجے میں عمو سے بولی کہ اسے مالکن یاد کر رہی ہے۔ یہ ایک اندھیری رات تھی۔ حویلی میں کہیں کہیں چراغوں کی مدھم روشنی تھی۔ عمو دھڑکتے دل کے ساتھ حویلی کے وسیع صحن میں سے گزرا۔ باکھا اور حویلی کے دیگر مسلح ملازم ایک طرف چارپائیوں پر بیٹھے شراب پی رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک بڑی لالٹین روشن تھی۔ اس روشنی میں رکھوالی کے تین بڑے کتے بھی اپنے کھونٹوں سے بندھے نظر آ رہے تھے۔

عمو کو اندرونی حصے کی طرف جاتے دیکھ کر باکھے نے ظلی آواز میں ہانک لگائی۔ ''دو پُتر اناراں دے۔ تیرا حسن رکھیا تے کھو تے نس گئے کمہاراں دے...''

ملازمہ شہناز، عمو کو ماجھاں کے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ عمو کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ماجھاں مونڈھے پر پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ آج پھر تمتما رہا تھا اور سانسوں سے بُو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ تپائی پر شراب کی آدھی بوتل پڑی تھی۔ وہ عجیب انداز سے عریاں عرق عمو کو دیکھتی رہی پھر نرمی سے بولی۔ ''چل وہ دروازہ بند کر دے۔''

عمو لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے تک گیا اور اسے بند کر دیا۔ ''اوئے نامعقولا! کنڈی بھی لگا نا۔'' وہ ذرا درشتی سے بولی۔

عمو نے کنڈی بھی چڑھا دی۔ ''چل بیٹھ جا ادھر میرے پاس۔'' اس نے اپنے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی موٹی کلائی میں ایک چمک دار و ہالی کڑا نمایاں نظر آتا تھا۔

یہ دو نشستوں والا مونڈھا تھا۔ عمو پھنس کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا وزنی بازو عمو کے کندھے پر ڈالا اور بھرائی ہوئی پاٹ دار آواز میں بولی۔ ''دیکھ، مجھ سے ڈرنے کی لوڑ نہیں۔ بڑے آرام سے بیٹھ... سمجھ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔''

عمو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ اس سے پوچھنے لگی کہ وہ کس طرح شہنشاہ پیر کے مزار تک آیا تھا... اور اس قسم کی دوسری باتیں۔ تاہم ان باتوں کے ساتھ ساتھ وہ اس کے قریب بھی آتی جا رہی تھی۔ اب اس کا بازو وہی عمو کے کندھوں پر نہیں تھا، وہ خود بھی اس پر لدی گئی تھی۔ عمو کے اندر وہی سات دن پہلے والی کراہت جاگ گئی۔ وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا مگر اس کا دم گھٹنے لگا۔ ماجھاں کا انداز بتدریج جارحانہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے اس کی قمیص اتار پھینکی اور اس کی بدبودار سانسیں عمو کے چہرے سے ٹکرانے لگیں۔

کچھ دیر بعد اس نے لالٹین کی لَو دوبارہ اونچی کر دی۔ وہ خفا نظر آ رہی تھی۔ تاہم اس خفگی کا کھلا اظہار اس نے عمو پر نہیں کیا۔ کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر سگریٹ کے چند طویل کش لے کر بولی۔ ''پانی پیے گا؟''

عمو کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ماجھاں نے شیشے کا گلاس تپائی پر رکھنے کے بعد پانی کے بجائے ''کالے پانی'' کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے گلاس میں تھوڑی سی شراب انڈیلی پھر اس میں ٹھنڈا پانی ملایا اور بولی۔ ''لے تھوڑا سا پی لے۔ ایک دم بھلا چنگا ہو جائے گا۔''

''نہیں... نہیں... اس میں سے بُو آتی ہے۔''

''اوئے باندرا! یہی بُو تو بندے کو شیر بناتی ہے۔ چل پی لے تھوڑا سا۔ چل شاباش۔'' اس نے گلاس پکڑ کر عمو کے ہونٹوں سے لگایا۔

عمو نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ اس کے کانوں میں ماں کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے عمو کو بتایا تھا، شراب بہت بُری چیز ہے۔ کبھی بھول کر بھی اس کے پاس نہیں جانا۔ یہ انسان کو جانور بنا دیتی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر کر دیتی ہے... اور اس نے عمو کو منع کیا تھا کہ وہ ایسے بندوں کے پاس بھی نہیں بیٹھے گا جو نشہ کرتے ہیں۔

اس نے اپنے ہونٹ بند رکھے اور منہ پھیر کر کراہت کا اظہار کرتا رہا۔ دوسری طرف ماجھاں کا اصرار بڑھتا گیا۔ وہ اب اس سے باقاعدہ زبردستی کر رہی تھی۔ ''دو گھونٹ پی لے۔ مر نہیں جائے گا۔ میرے کہنے پر پی لے...'' اس نے انگلیوں کا بے رحم دباؤ ڈال کر عمو کا منہ کھولنا چاہا۔ شراب کا تلخ ذائقہ عمو کی زبان پر آیا۔ اسے ابکائی سی آ گئی۔ اس نے ہاتھ جھٹکا۔ گلاس ماجھاں کے تومند ہاتھ سے نکل کر کچے فرش پر گرا۔ ماجھاں کا پارا ایک دم ساتویں آسمان پر چلا گیا۔ وہ دو سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہی، تب یکایک عمو پر پل پڑی۔ ''اوئے، کتے دے پتر! تیری یہ جرأت؟ تیری یہ جرأت؟'' اس نے عمران عمو پر گالیوں کے ساتھ ہی تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بھی بارش کر دی۔ اس کے اندر حیوانی قوت تھی۔ وہ واقعی ایسی عورت تھی جس سے خوف کھایا جانا چاہیے تھا۔ اس نے عمو کو اٹھا اٹھا کر دیواروں سے پٹخا پھر وہی چرمی جوتا پکڑ لیا جس نے سات دن پہلے عمو کی چمڑی ادھیڑی تھی۔ ایک بار پھر عمو زبردست چھترول کی زد میں آ گیا۔ اس کے پنڈے اور ٹانگوں پر انگارے سے دہکنے لگے۔ اس کے زخمی بازو سے درد کی لہریں ابھریں اور پورے جسم میں پھیل گئیں۔ مارنے کے ساتھ ساتھ وہ عمو کو غلیظ ترین گالیاں دے رہی تھی۔ عمو کے لیے ان میں سب سے اذیت ناک وہ گالیاں تھیں جن میں اس کی ماں کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ ہانپ گئی تو اس نے پہلے دن کی طرح ایک بار پھر اسے

لات مار کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔ ”ناجو... ناجو۔“ اس نے ملازمہ شہناز کو آوازیں دیں، وہ ڈری ہوئی سی سامنے آگئی۔ ماجھاں، عمو کی طرف اشارہ کر کے پھنکاری۔ ”لے جاؤ اس کتے کو اور ماکھے سے کہو سراں میں رکھ کر اس کا دماغ ٹھیک کرے۔“

شہناز نے اثبات میں سر ہلایا اور عمو کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ماجھاں نے کمرے کا دروازہ بند کیا لیکن پھر فوراً ہی کھول دیا۔ شہناز سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”...اور اس اچھو کو بھیج دے میرے پاس۔“

عمو آنسو بہاتا ہوا شہناز کے ساتھ باہر صحن میں آیا۔ ماکھا ابھی تک اپنی ٹولی میں بیٹھا ہوا تھا۔ شہناز نے اس کے پاس جا کر کچھ کھسر پھسر کی۔ ماکھے نے اثبات میں سر ہلایا اور عمو کو گدی سے دبوچ کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ عمو کا جسم جوتوں کی مار سے سلگ رہا تھا۔ اس نے بس ایک شلوار پہن رکھی تھی۔ ماکھے کی ٹولی کے افراد نے عمو کو تمسخر آمیز نظروں سے دیکھا۔

جب عمو حویلی کے احاطے سے باہر نکل رہا تھا، اس نے انیس بیس سال کے گورے چٹے لڑکے اچھو کو دیکھا۔ وہ شہناز کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ غالباً آج رات اسے عمو کی جگہ پُر کرنا تھی۔

خضاب لگے سر والا لمبا تڑنگا ماکھا عمو کو لے کر ڈیرے کے پچھواڑے سراں میں آ گیا۔ یہ دراصل وہی مکان تھا جس میں جوئے کی بہت بڑی بیٹھک بھی تھی اور شام کو یہاں خوب گہما گہمی ہوتی تھی۔ حقے گڑگڑاتے تھے، شراب کی بوتلیں کھلتی تھیں اور تاش کے پتے بکھرتے تھے۔ ماکھے نے عمو کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اس کی دیواریں کچی لیکن بہت موٹی تھیں۔ کوٹھڑی میں بس ایک دروازہ اور ایک سلاخ دار کھڑکی تھی۔ کچا فرش گیلا اور بدبودار تھا۔ اس بُو سے عمو کو اندازہ ہوا کہ یہاں شاید کتے بھی باندھے جاتے ہوں گے۔ عمو کا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ صبح سویرے دو دیوہیکل بلڈاگ بھی عمو کے ساتھ ہی اس کوٹھڑی میں باندھ دیے گئے۔ انہیں مضبوط کھونٹوں سے باندھا گیا لیکن پھر بھی ان کی قربت کی دہشت عمو کے اعصاب چٹخانے لگی۔ کوٹھڑی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اسے خود کو ایک گوشے تک محدود کرنا پڑا۔

وہ بالکل بھوکا پیاسا اڑتالیس گھنٹے تک اس کوٹھڑی میں بند رہا۔ سارا دن دونوں کتے اس کے ساتھ بندھے رہتے تھے، رات کو انہیں نکال لیا جاتا تھا۔ ان کے فضلے اور پیشاب کی بُو نے شروع میں تو عمو کو بے حد پریشان کیا لیکن پھر بتدریج اس کی حسِ شامہ کند ہی ہو گئی۔ تیسرے دن دوپہر کو جب وہ خود کو بھوک پیاس کی وجہ سے قریب المرگ محسوس کر رہا تھا، سلاخ دار کھڑکی کی طرف تھوڑی سی آہٹ ہوئی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا، وہی پندرہ سولہ برس کی معصوم صورت لڑکی کھڑکی کے سامنے تھی جو چند دن پہلے اپنے باپ کی ناگہانی موت پر دیوانہ وار روئی تھی۔ غالباً وہ اپنے باپ کی تجہیز و تکفین کے بعد حویلی واپس آ چکی تھی۔ اس کے سر پر روٹیوں والی بڑی چنگیر تھی اور ہاتھ میں لسی کا ڈول تھا۔ اس نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ شکر ہے دوپہر میں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے نمکین لسی کا گلاس بھر کر عمو کی طرف بڑھایا جسے وہ غٹاغٹ پی گیا۔ لڑکی نے ایک تہ کی ہوئی روٹی بھی عمو کی طرف بڑھائی، اس کے اندر سالن بھی تھا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”چھپا کر کھانا۔ نہیں تو ماکھا تمہاری جان کو آ جائے گا اور میری بھی شامت آئے گی۔“

پھر وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ عمو کو اس لڑکی کا نام شبانہ معلوم ہوا تھا... وہ اچھے خدوخال کی تھی اور اس کے چہرے پر خصوصیت اس کی آنکھیں تھیں جن میں معصومیت اور محبت سچے موتیوں کی طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

رات کو ماکھا عمو کے لیے تھوڑا سا بدمزہ کھانا اور پانی لے کر آیا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ عمو کو آج بھی کچھ نہ دیا گیا تو صبح تک کوٹھڑی میں اس کی لاش سے ”ملاقات“ بھی ہو سکتی ہے۔

جب عمو روکھی سوکھی روٹی، نیم ٹھنڈے پانی کے ذریعے گلے سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا، ماکھے نے اس کی ٹھوڑی کو اپنے پنجے میں دبوچ کر اس کے سر کو زور سے دائیں بائیں ہلایا اور پھنکارا۔ ”اڑیل ٹٹو نہ بن بے دتو نا... جندڑی برباد ہو جائے گی تیری... مالکن کا دل تیرے اوپر آیا ہوا ہے۔ اسے خوش رکھ، وہ تجھے خوش رکھے گی۔“

عمو خاموش رہا۔

ماکھے نے زور سے اس کے بازو پر ٹھوکا دیا۔ ”اوئے بولتا کیوں نہیں... ابھی تو نے مالکن کے غصے کی چھوٹی سی جھلکی دیکھی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، فلم کا ٹیلر دیکھا ہے، فلم نہیں دیکھی ہے ابھی۔ اس نے ابھی تو تجھے صرف کتوں کے ساتھ بندھوایا ہے پھر کتا بھی بنا دے گی۔ اور صرف کتا ہی نہیں بنائے گی، تجھے اپنے پاؤں چاٹنے پر بھی مجبور کرے گی۔ کرنا تو تجھے وہی پڑے گا جو مالکن چاہے گی لیکن جو کام پیار محبت سے ہو جائے، وہی چنگا ہوتا ہے۔“

”پپ... پر... یہ تو گناہ ہے۔ بہت بڑا گناہ ہے۔“

”ایے... اوئے مولوی ثناءاللہ... زیادہ فتوے بازی نہ کر۔ یہاں گناہ ثواب کا مطلب کچھ اور ہے۔ گناہ وہی ہے جو مالکن کو پسند نہ ہو... اور اپنے گناہ گاروں کے لیے مالکن کے پاس دوزخ بھی اپنا ہی ہے۔ دو چار دن میں تجھے اٹھا کر پھینک دے گی اس میں۔“

عمو کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اپنی ماں کی دردناک آواز کسی مقدس سرگوشی کی طرح اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

ماکھے نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”اگر تو تیار ہے تو میں جا کر مالکن سے بات کروں؟“

عمو کا دل ایک بار پھر کراہت سے بھر گیا۔ ایک بدبودار بوجھ کے تصور سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ ماکھے نے اپنا سوال دُہرایا تو عمو نے نفی میں سر ہلا دیا اور دائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

ماکھے نے اسے ایک گالی دی اور بولا۔ ”لگتا ہے تیری تقدیر ہی خراب ہے۔“ پھر وہ اس کے ہاتھ سے سالن والی پلیٹ چھینتا ہوا باہر چلا گیا۔

اگلے چھ سات روز عمو کے لیے بہت اذیت ناک تھے۔ اس کے جسم پر فقط ایک شلوار تھی۔ اس کے ننگے پنڈے پر ساری رات مچھر کاٹتے تھے اور دن کے وقت مکھیاں ستاتی تھیں۔ کوٹھڑی کی صفائی بس ایک دو بار ہی کی گئی تھی۔ بُو سے اس کے حواس مختل رہتے تھے۔ دن کے وقت اسے کتوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ یہ بڑے خوں خوار قسم کے کتے تھے تاہم غیر متوقع طور پر عمو کے ساتھ ان کا رویہ نرم ہی تھا یا انہوں نے مجبوری کے تحت اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

عمو کو بس ایک وقت روکھی سوکھی روٹی بچے کھچے سالن یا دہی وغیرہ کے ساتھ دی جاتی تھی۔ وہ اس کی جسمانی ضروریات کے لیے بالکل ناکافی تھی۔ اگر اسے شبانہ کا چوری چھپے کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید وہ بالکل نیم جان ہو جاتا۔ شبانہ دراصل سراں میں ”کامیوں“ کو کھانا وغیرہ پہنچانے آتی تھی۔ واپسی پر وہ عمو والی کوٹھڑی کے سامنے سے گزرتی تھی۔ رات کے وقت عموماً اس طرف گہرا اندھیرا ہوتا تھا۔ وہ نظر بچا کر کچھ کھانا کھڑکی میں سے اندر ”پاس“ کر دیتی تھی۔ کبھی روٹی جس پر بھنے ہوئے مرغ کا پیس رکھا ہوتا تھا، کبھی سموسے یا جلیبی وغیرہ، کبھی کوئی پھل۔ وہ اسے عمو بھائی کہہ کر بلاتی تھی اور اس سے بہت ہمدردی رکھتی تھی۔

ایک رات وہ آئی تو عمو نے کہا۔ ”تو ایسا نہ کیا کر شبانہ! کسی نے دیکھ لیا تو تیرے لیے مصیبت ہو جائے گی۔“

”کوئی بات نہیں عمو بھائی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں سنبھال لوں گی۔“ وہ جلترنگ بجاتی ہوئی آواز میں بولی۔

”کیسے سنبھال لو گی؟“ عمو نے سرگوشی میں پوچھا۔

”بس کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔ تم فکر نہ کیا کرو۔“ وہ تہ شدہ روٹی کھڑکی میں سے عمو کو تھماتے ہوئے بولی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی چوڑیاں چھنکیں اور اس کے ملائم ہاتھوں کا لمس عمو کے سراپا میں بجلی دوڑا گیا۔ یہ روٹی کے بجائے دیسی گھی میں پکا ہوا پراٹھا تھا اور اس پر آلو کی بھجیا رکھی تھی۔

عمو نے کہا۔ ”شبانہ! مجھے تیرے ابا جی کی موت کا بڑا دکھ ہے۔ اتنے دن گزر گئے، اب بھی کبھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو تیرے ابا جی کا لہولہان چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔“

”بس عمو بھائی! ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ وہ ہر طرح کے گھوڑوں، گھوڑیوں کو سدھا لیتے تھے، پر اس منحوس گھوڑے پر کاٹھی ڈالتے ہوئے ان کو بھی ڈر لگتا تھا۔ انہوں نے مالکن سے کہا بھی تھا کہ اس گھوڑے کو گولی مار دیں یا پھر کہیں بکتا ہے تو بیچ دیں لیکن مالکن اڑ گئی۔ اس نے کہا کہ یہ گھوڑا یہیں حویلی میں رہے گا اور تم اس کو سدھاؤ گے بھی۔ میرے ابا جی سمجھ گئے کہ اگر اب انہوں نے انکار کیا تو نوکری تو جائے گی ہی، اوپر سے کوئی سخت مصیبت بھی آ جائے گی۔ گھر میں پہلے ہی بیماری اور بھوک تھی۔ وہ کیا کرتے۔ مالکن کے کہے پر عمل کیا...“ شبانہ کی آواز بھرا گئی اور وہ آنسو پونچھنے لگی۔

عمو نے سوچا، اس نے خوامخواہ اس کے ابا کی موت کا ذکر چھیڑ کر اسے دکھی کر دیا ہے۔ اس نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔ ”اب تو اکیلی ہی نوکری کرتی ہے یہاں؟“

”ہاں عمو بھائی، ماں بیمار ہے۔ کسی طرح گھر تو چلانا ہے نا لیکن پانچ چھ مہینے بعد جب چلی جاؤں گی تو پھر شاید ماں کو ہی یہاں آنا پڑے۔“

”کہاں چلی جاؤ گی؟“

”میری شادی ہے نا۔“ وہ جیسے روانی میں کہہ گئی۔ تاہم کہنے کے بعد ایک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

اچانک عمو کو لگا جیسے اس کے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی ہے اور سینے کے اندر کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ شبانہ کی شادی کا سن کر اسے شاک لگا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس کے ساتھ کیا تعلق تھا عمو کا؟ ابھی چند روز پہلے ہی تو وہ ایک دوسرے سے آشنا ہوئے تھے... اور وہ اسے عمو بھائی کہہ کر بلاتی تھی۔ چند بار کسی کی سانسوں کی مہکار محسوس کر لینے سے اور چوڑیوں کی چھنکار سن لینے سے اور ہاتھوں کا لمس لینے سے... کسی سے کوئی

تعلق تو نہیں بن جاتا... پھر عمو کو تعلق ٹوٹنے کا جھٹکا کیوں محسوس ہوا تھا؟

وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ ''عمو بھائی! کیا بات ہے۔ تم چپ کیوں ہو گئے؟''

''کچھ نہیں... بس یونہی سوچ رہا ہوں... ابھی تو... میرا مطلب ہے، ابھی تو تمہاری عمر چھوٹی ہے؟'' وہ ہکلایا۔

''ہمارے ہاں شادیاں چھوٹی عمر میں ہی ہوتی ہیں۔ میری بہن کی شادی صرف چودہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ میں تو پھر بھی اس سے ڈیڑھ دو سال بڑی ہوں۔''

رات گہری ہو چکی تھی۔ سراں میں دیے جل چکے تھے مگر کوٹھڑی کے پچھواڑے جہاں شبانہ کھڑی تھی، مکمل اندھیرا تھا۔ عمو جانتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر کتوں کو بچا کھچا گوشت اور روٹی وغیرہ ڈالتی تھی۔ اب بھی اگر کوئی اتفاقاً ادھر آ جاتا تو وہ کوئی معقول بہانہ بنا سکتی تھی۔

عمو نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''شبانہ! کہاں ہو رہی ہے تیری شادی؟''

''میرے چاچے کا پتر ہے اشرف۔ شہر میں ویلڈنگ کا کام کرتا ہے۔'' شبانہ نے کہا۔

شبانہ نے یہ فقرہ عام سے لہجے میں کہا تھا مگر یہ فقرہ کہتے ہوئے اس کے انداز میں ایک ایسی اداسی اتر آئی جسے عمو نے بہت واضح محسوس کیا۔

وہ کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن اسی دوران میں کسی گھڑسوار کی ٹخ ٹخ سنائی دی اور شبانہ اپنی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

یہ سلسلہ پندرہ بیس دن مزید جاری رہا۔ مالکن ماجھاں اسے کتوں کے ساتھ بند کروا کے جیسے بھول ہی گئی تھی۔ پھر عمو کو شبانہ کی زبانی پتا چلا کہ وہ کسی کام سے گاؤں سے باہر ہے۔ شبانہ موقع دیکھتے ہی اس کی کوٹھڑی کے پچھواڑے کھڑکی پر آ جاتی تھی۔ اس بدبودار کوٹھڑی میں وہ عمو کے لیے تازہ ہوا کا واحد جھونکا تھی۔ وہ اس کا انتظار کرتا تھا۔ اگر کسی دن وہ نہ آ پاتی تو وہ اداس ہو جاتا۔ لگتا کہ کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے۔ اسے خلا محسوس ہوتا، قدموں کی مدھم چاپ کا، چوڑیوں کی چھنکار کا اور بدن کی خوشبو کا۔ اور کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ شبانہ بھی اس سے ملنے کو بے قرار ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ تو اسے عمو بھائی کہتی تھی اور اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کی باتوں سے عمو کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی... مگر چونکہ یہ بچپن کا بندھن تھا اور ماں باپ کا دیا ہوا قول نبھانا تھا، اس لیے وہ آمادہ تھی۔

گرم بے چین راتوں کی تنہائی میں عمو اپنا سر گھٹنوں میں دے لیتا اور خوب روتا۔ اسے ماں ٹوٹ کر یاد آتی۔ وہ سوچتا، ماں کتنے انتظار کے بعد اس سے ملنے شہنشاہ پیر کے مزار پر آئی ہو گی اور پھر اسے وہاں نہ پا کر اس پر کیا گزری ہو گی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ فریب انداز... صادق شاہ نے اور اس کے مریدوں نے اس کی ماں کے سامنے کیا بہانہ بنایا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس کی ماں کو یہ بتایا ہو کہ اس کا بیٹا یہاں سے بھاگ گیا ہے... اور کچھ چرا کر بھی لے گیا ہے... یا اس طرح کی کوئی اور کہانی سنادی ہو۔ یہ بات تو عمو کی سمجھ میں اچھی طرح آ چکی تھی کہ اس کی جان جلد ہی یہاں سے چھوٹنے والی نہیں ہے۔ وہ کچھ خطرناک لوگوں میں آن پھنسا تھا اور ان میں سب سے خطرناک خود ماجھاں تھی۔ وہ بدنام ڈکیت ناجے کی بہن تھی۔ اس کی بدمعاشیاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ کوئی آٹھ دس سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی اور کہا جاتا تھا کہ اس نے اپنی ساس اور اپنے شوہر کو خود اپنے ہاتھوں سے کلہاڑیوں کے وار کر کے ہلاک کیا تھا۔ اب وہ چاروں شرعی عیبوں کے ساتھ اس گاؤں کی مختار کل تھی۔ وہ شراب پیتی تھی اور شراب کا کاروبار بھی کرتی تھی۔ اس کی جوئے کی بیٹھک پورے علاقے میں مشہور تھی اور بڑے بڑے بھرے والے لوگ یہاں آتے تھے۔ ماجھاں نے کھلم کھلا ناجائز تعلقات بھی قائم کر رکھے تھے۔ سب سے پہلے وہ جنوبی پنجاب سے ابرار نامی ایک کشمیری لڑکے کو اغوا کر کے یہاں لائی تھی اور اسے حویلی میں اپنے ساتھ رکھا تھا۔ چند مہینوں بعد اس لڑکے نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ ایک کماد میں چھپ گیا۔ وہاں جنگلی سور بھی چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے مار ڈالا... ماجھاں کو اس کے مرنے کا افسوس ہوا لیکن پھر اس کے بعد یہ سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔ اب کئی لڑکے اس کی حویلی میں اور ڈیرے پر موجود تھے۔ ان میں نیا اضافہ خود عمو تھا۔

ماجھاں اپنے کام سے فارغ ہو کر گاؤں واپس آ گئی تو ایک بار پھر ماکھے نے عمو سے بات کی۔ وہ ایک بڑے پیالے میں اس کے لیے دودھ جلیبیاں لے کر آیا۔ ساتھ میں آلو والے کرارے نان اور دہی کا رائتا تھا۔ انہوں نے ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر یہ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ماکھا بولا۔ ''مالکن تجھ سے بہت ناراض ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کسی وقت وہ تیرا کوئی ہتھ پیر ہی نہ توڑ ڈالے۔ اس کا غصہ بڑا بُرا ہے۔ مجھے تجھ پر بڑا ترس آتا ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ اگر تو کہے تو میں مالکن سے تیری ہاں کی بات کر کے دیکھوں؟''

''ہاں... سے کیا مطلب... ہے؟'' عمو نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں سے مطلب یہی ہے کہ تجھے مالکن کا غصہ دور کرنا ہو گا۔ اس کے کہنے پر چلنا ہو گا جس طرح اچھو چلتا ہے، مقبول چلتا ہے اور دوسرے چلتے ہیں...''

عمو نے نفی میں سر ہلایا... اس کے ساتھ ہی وہ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر ماکھے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''نہیں نہیں، اتنی جلدی جواب نہ دے۔ ایک آدھ دن اور چنگی طرح سوچ لے۔ میں پرسوں پھر تجھ سے بات کروں گا۔''

عمو اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس کا جواب دو دن بعد بھی یہی ہو گا اور دو سال بعد بھی لیکن آواز اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ دوبارہ کتوں والی کھولی میں کتوں کے ساتھ بند ہو گیا۔ اس کے اندر آہستہ آہستہ بغاوت پروان چڑھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے ایک طیش سا اس کے اندر سے ابھرنے لگتا تھا۔ مگر وہ جانتا نہیں تھا کہ یہ طیش آمیز بغاوت بہت جلد دم توڑنے والی ہے۔

یہ اگلے روز شام کے بعد کی بات ہے۔ کتے اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے کوٹھڑی سے باہر جا چکے تھے۔ شبانہ پورے تین روز سے دکھائی نہیں دی تھی۔ عمو اس کے لیے بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کئی طرح کی فکروں نے بھی اسے گھیرا ہوا تھا۔ وہ کیوں نہیں آئی؟ حالانکہ وہ جانتی بھی تھی کہ وہ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہا ہے۔ اندھیرا ذرا گہرا ہو گیا تو کھڑکی کے پاس کھٹ پٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی مرغ پلاؤ کی مدھم خوشبو بھی اس کے نتھنوں تک پہنچی۔ یہ شبانہ ہی تھی۔ اس نے محتاط انداز میں چاولوں والا شاپر سلاخوں میں سے عمو تک پہنچایا۔ عمو نے بے چین لہجے میں کہا۔ ''تم کہاں چلی گئی تھیں؟''

''کہیں نہیں، ماں آئی ہوئی تھی۔ آج ہی واپس گئی ہے۔ پیسے لینے آئی تھی۔ وہ بہت پریشان ہے۔ میرا ہونے والا گھر والا تنگ کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے پندرہ ہزار روپیا چاہیے... میں نے شہر میں کرائے پر دکان لینی ہے۔ پہلے بھی اسی طرح وہ پندرہ ہزار لے کر جا چکا ہے۔ پر کیا کرایا کچھ بھی نہیں... خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم ٹھیک تو ہو نا عمو بھائی؟''

''ٹھیک ہوں... پر تمہاری وجہ سے بہت پریشان رہا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر ہولے سے بولی۔ ''پریشان نہ ہوا کرو۔ مجھے تو ایک دو مہینے میں چلے جانا ہے۔ پھر کیا کرو گے؟''

''پھر میں بھی چلا جاؤں گا۔''

''کہاں؟''

''یہ تو پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے نکل جاؤں اور پھر واپس جا کر کسی دور کے رشتے دار کے گھر چھپ جاؤں... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں سے نکلنے سے پہلے ہی یہ لوگ مجھے گولی مار دیں اور میں اوپر ہی چلا جاؤں۔ پھر میری لاش بھی ابرار کی طرح کماد کے کسی کھیت میں دبا دی جائے۔''

شبانہ نے بے چین ہو کر عمو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''شام ویلے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔'' وہ داناؤں کی طرح بولی۔

عمو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی نرم کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کے ہاتھ کے لمس نے عمو کے بدن میں برق سی دوڑا دی۔ پھر پتا نہیں یہ کیسے ہوا؟ اس نے بے ساختہ اس کا ہاتھ چوم لیا۔

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ''شبانہ!'' عمو نے کہا لیکن وہ تیزی سے گھوم کر واپس چلی گئی۔

عمو ایک دم پسینے میں نہا گیا۔ اسے لگا کہ اس نے سنگین غلطی کر دی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ چاول کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن یہ مجبوری تھی۔ وہ انہیں کھڑکی سے باہر نہیں پھینک سکتا تھا۔ اگر کوٹھڑی میں رکھتا تو صبح ماکھا اس سے پوچھ سکتا تھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں۔ کتے بھی رکھوالی کے لیے جا چکے تھے ورنہ وہ ان کے آگے ہی ڈال دیتا۔ اس نے نم آنکھوں کے ساتھ جیسے تیسے چاول گلے سے نیچے اتارے اور بے دم سا ہو کر لیٹ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شبانہ کے حوالے سے تمام غلط خیالات اپنے دماغ سے نکال دے گا۔ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا اور اگر وہ کسی وقت کھڑکی پر آئے بھی تو اسے منع کر دے گا۔

اگلے روز دوپہر کے بعد اس نے کھڑکی ویسے ہی بند کر دی۔ پھر شام ہو گئی۔ اس نے کوٹھڑی میں لالٹین روشن کر دی۔ کتے رکھوالی کے لیے چلے گئے۔ آج کوٹھڑی کی صفائی ہوئی تھی۔ بُو قدرے کم محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کچی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی، اسے بند کھڑکی کی دوسری جانب مدھم آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے کھڑکی کے پٹ پر ہاتھ ڈال کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں کھلی۔ تب مدھم دستک دی گئی۔ اس دستک کے ساتھ چوڑیوں کی ہلکی سی چھن چھن بھی شامل تھی۔ عمو کا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ اس نے کھڑکی کھولی

اور ڈرتے ڈرتے شبانہ کی طرف دیکھا۔ اسے لگا کہ وہ کوئی سخت بات کہہ دے گی مگر جب اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مدھم مسکراہٹ دیکھی تو اس کی جان میں جان آئی۔

''کھڑکی کیوں بند کی؟'' اس نے پوچھا۔

''بس... بس یونہی... مچھر آرہے تھے۔''

''ناراض تو نہیں ہو؟''

''کس بات پر؟'' عمو کے سینے میں جلترنگ سے بج اٹھے۔

''کل میں جلدی سے چلی گئی تھی۔ تمہارے بلانے پر بھی رکی نہیں۔''

عمو خاموش رہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا دھڑکنیں تھیں۔ شبانہ نے کل والی ''بے ساختہ حرکت'' کا برا نہیں مانا تھا۔

''شبانہ! میں... ہر وقت... تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔'' وہ عجیب لرزتے لہجے میں بولا۔

''کیوں؟'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''پتا نہیں۔''

''ایسا نہ کیا کرو عمو... بھائی۔'' اس نے آخری لفظ ذرا اٹک کر ادا کیا۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے... تم... جانتے ہو میری شادی ہونے والی ہے۔''

''مجھے سب پتا ہے شبانہ... پھر بھی...''

''پھر بھی کیا؟'' اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

''تم سب کچھ مجھ سے ہی پوچھتی جاتی ہو، اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی ہو۔ کیا... تم بھی... میرا مطلب ہے، تم بھی میرے بارے میں سوچتی ہو؟''

اس نے شرما کر عمو کی طرف دیکھا اور پھر عجب دل رُبا انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑی لیکن ٹھٹک گئی۔ دوبارہ پلٹ کر اس نے ہاتھ میں تہ کی ہوئی روٹی عمو کی طرف بڑھائی۔ اس پر شکر اور مکھن لگا ہوا تھا۔ وہ لجاتے ہوئے انداز میں عمو کو روٹی تھما کر واپس ہو جانا چاہتی تھی مگر عمو نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ چوڑیوں کی کھن کھن، کلائی کا نرم لمس... عمو کے سینے میں ترنگ سی دوڑ گئی۔

''مجھے زیادہ انتظار نہ کرایا کرو شبانہ... میں، بس شام کے انتظار میں ہی سارا دن کاٹتا ہوں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولی۔ ''ہاتھ چھوڑو عمو بھائی... کوئی آجائے گا۔''

عمو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہاتھ کو پھر چوم لے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک گرج دار آواز سنائی دی۔ ''اچھا یہاں یہ چکر چل رہے ہیں۔''

شبانہ نے ہڑبڑا کر اپنا ہاتھ عمو کے ہاتھ سے چھڑایا۔ عمو بھی سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ حویلی کا خطرناک صورت ملازم اور اس کا ایک ساتھی کھڑکی کے سامنے تھے۔ کالیے نے شبانہ کو چوٹی سے پکڑا اور آگے پیچھے زوردار جھٹکے دیے۔ شبانہ کی اوڑھنی اتر کر دور جا گری۔ کالیے نے زوردار آوازیں دیں۔ ''ماکھے بھائی... شوکے... صوفی۔''

یکایک اردگرد ہلچل نظر آنے لگی۔ چند سیکنڈ کے اندر کھڑکی سے باہر کافی افراد جمع ہو چکے تھے۔ ماکھا بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر کالیا پھنکارا۔ ''یہاں عشق مشوق کا چکر چل رہا ہے ماکھا بھائی۔ یہ دو چھٹانک کی کڑی خیر سے ہیر بنی ہوئی ہے اور یہ اندر رانجھا کھڑا ہے۔ یہ اس کے لیے چوریاں لے کر آرہی ہے۔ ہم پچھلے تین دن سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک تھپڑ شبانہ کو مارا۔

وہ چھریرے جسم کی تھی، لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ ماکھا بھی آگ بگولا نظر آنے لگا۔ اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور دندناتا ہوا اندر آگیا۔ عمو کو گریبان سے پکڑ کر اس نے زوردار جھٹکا دیا اور باہر گھاس پر پھینک دیا۔ چند ہی لمحے میں عمو کا جسم تھپڑوں اور ٹھوکروں کی زد میں آگیا۔ اسے غلیظ گالیوں سے بھی نوازا جا رہا تھا۔ دوسری طرف شبانہ کی مرمت بھی ہو رہی تھی۔ اس کے چلانے کی آوازیں عمو کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان اذیت ناک لمحوں میں اس نے سوچا، ان کا قصور تو اتنا بڑا نہیں ہے جتنی بڑی انہیں سزا دی جا رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ماجھاں بھی وہاں آن موجود ہوئی۔ اس کو ساری بات معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے بھی شبانہ کو دو تین تھپڑ مارے پھر عمو کو شلوار کے نیفے سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہ پہلے ہی نشے میں دھت تھی۔ اس کے منہ میں الائچی سپاری پان دبا ہوا تھا۔ ''اچھا تو یارانے پالے جا رہے ہیں یہاں؟'' اس نے عمو کے گال کو چٹکی میں دبایا اور بے دردی سے آگے پیچھے جھلایا۔

عمو کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ نمکین ذائقہ اس کے منہ میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ کراہنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔

''کتنی دیر سے یہ عشقیہ فلم چل رہی تھی رانجھا صاحب؟'' وہ اسے گریبان سے دبوچ کر بولی۔

''ایسا کچھ نہیں تھا جی... وہ تو بس ترس کھا کر کسی وقت مجھے روٹی دینے آجاتی تھی۔''

''روٹی نہیں مکھن والی چُوری۔ پھر تو عشق کی بانسری بجانا ہوگا اور وہ تیرے صدقے واری جاتی ہوگی۔ میری واری موت پڑتی تھی تجھے... موت پڑتی تھی؟''

''آپ کو... غلطی لگ رہی ہے جی...''

اس نے عمو کے گریبان کو اندھا دھند جھٹکے دیے اور اسے پھاڑ کر رکھ دیا۔ وہ زہرناک انداز میں پھنکاری۔ ''مجھے غلطی لگ رہی ہے نا... پر اب تو غلطی نہ کرنا۔ جو کچھ کیا ہے، سب کو صاف صاف بتا دینا۔ وہ کتنی واری تیری کوٹھری کے اندر آئی تھی؟ اور اس کے علاوہ کیا کیا کرتے رہے ہو تم؟ یہاں سے بھاگ جانے کا پروگرام تو ضرور بہ ضرور بنایا ہوگا تم نے؟ میں پھر کہہ رہی ہوں، جھوٹ بولنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ بہت برا ہوگا۔''

ماجھاں کا انداز عمو کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ وہ اب اس پر پوری طرح حاوی ہونے کا سوچ رہی تھی۔ لیکن وہ بھی دل میں پوری طرح ٹھان چکا تھا کہ ماجھاں کی کسی من مانی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کی ہڈیاں ہی توڑ ڈالے گی نا۔ اس کو جان سے ہی مار دے گی نا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے اندر پیدا ہونے والی بغاوت اب کچھ قد نکال چکی تھی۔

ماجھاں کا کراہت آمیز وجود ایک ''دھمکی'' کی طرح اس کے سامنے تھا اور وہ اپنا دم گھٹتا محسوس کر رہا تھا۔

ماجھاں سرسراتی آواز میں بولی۔ ''دیکھ منڈیا! اگر تو سچ نہ بتائے گا نا تو پھر میں اس نمک حرامن سے پوچھوں گی اور وہ جھوٹ نہیں بول سکے گی۔ میرے پوچھنے کا طریقہ ہی ایسا ہو گا۔ میں اس شتونگڑی کو دو تین گھنٹے کے لیے کالیے کے حوالے کردوں گی اور کالیا ابھی جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ ڈھائی سال سے اس نے زنانی کی شکل نہیں دیکھی۔''

ایک دم عمو کو بے پناہ کمزوری محسوس ہوئی۔ اسے لگا اس کے اندر کا سارا دم خم مسمار ہو رہا ہے۔ وہ اس چھٹی پرانی اوڑھنی والی، معصوم صورت لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ اسے ہرگز ہرگز گوارا نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے اس لڑکی پر کوئی آفت آئے۔ وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔

شاید زمانہ ساز ماجھاں نے بھی اس کے چہرے کی بدلی ہوئی رنگت دیکھ لی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کے فقرے بڑے کارگر رہے ہیں اور جب وہ ایک بار سمجھ گئی تو پھر عمو کے پاس ہار ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس نے اپنے اندر کی کراہتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا...

☆☆☆

...اور اب عمو کی حیثیت ماجھاں کے زرخرید غلام کی سی تھی۔ وہ جب چاہتی، اسے اپنی خلوت میں بلا لیتی۔ بعض دفعہ نشے میں دھت ہو کر اس سے توہین آمیز سلوک بھی کرتی۔ اس کے علاوہ بھی اسے ماجھاں کی خدمات انجام دینا پڑتیں۔ وہ اس کا حقہ تازہ کرتا، اس کو پنکھا جھلتا، اس کے پاؤں دباتا۔ جب وہ قدرے مہربان ہوتی تو اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا بھی کھلاتی لیکن جب موڈ آف ہوتا تو ذرا ذرا سی بات پر اسے ڈانٹتی اور گالیاں دیتی۔ اب عمو کو اچھا کھانا اور اچھا لباس مل رہا تھا۔ بس ماجھاں کی منحوس قربت کے سوا اسے کوئی تکلیف نہیں تھی اور یہ تکلیف اسے اکثر تنہائی میں خون کے آنسو رلاتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ شبانہ کے لیے برداشت کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں اس نے سرکشی دکھائی، شبانہ پر عرصۂ حیات تنگ ہونا شروع ہو جائے گا۔ شبانہ سے ملاقات کا موقع اسے کم ہی ملتا تھا۔ وہ بس دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ شبانہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی خاطر عمو کس طرح کے امتحان سے گزر رہا ہے۔

ایک شام کسی زمین کی ملکیت پر ایک زوردار جھگڑا ہوا۔ ماجھاں کا ایک کارندہ صوفی شدید زخمی ہو کر گاؤں آیا۔ اس کے ساتھ ہی ماجھاں اور اس کے درجنوں ساتھیوں نے گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالیں اور اسلحہ لہراتے ہوئے گاؤں سے نکل گئے۔ حویلی میں بس اکا دکا افراد ہی تھے۔ ہیڈ ملازمہ شہناز عرف ناجو بیمار تھی اور چھت پر جا کر لیٹی ہوئی تھی۔ شبانہ اور عمو کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کی یہ ملاقات قریباً تین مہینے بعد ہوئی تھی۔ یہ بھوسے والی کوٹھڑی تھی۔ یہاں مکمل تاریکی تھی۔ شبانہ یہاں بھوسہ لینے آئی تھی۔ عمو نے اسے دیکھ لیا تھا اور ہمت کر کے وہ بھی کوٹھڑی میں چلا گیا تھا۔

''شبانہ۔'' عمو نے اسے ہولے سے پکارا۔

شبانہ نے اسے پہچان لیا اور پھر وحشی ہرنی کی طرح آدھ کھلے دروازے سے باہر دیکھا۔

''گھبراؤ نہیں شبانہ! یہاں کوئی نہیں۔ شہناز اور زینب بھی اوپر چھت پر ہیں۔''

عمو کے اس فقرے نے شبانہ کی گھبراہٹ ذرا کم کی۔ وہ دوپٹا منہ پر رکھ کر سسکنے لگی۔

عمو نے دل گیر لہجے میں کہا۔ ''شبانہ! تم نے تو یہاں سے چلے جانا تھا۔ تم گئی کیوں نہیں ہو؟''

''مالکن جانے دے تب نا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ جان گئی ہے کہ میں جب تک یہاں ہوں، تم بھی اس کا کہا ماننے پر مجبور ہو۔ وہ اب مجھے بالکل نہیں جانے دے گی۔''

''اور تمہاری شادی؟''

''اللہ جانے۔'' شبانہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئی۔

''شبانہ! تم یہاں سے چلی جاؤ۔ یہاں تمہاری عزت ہر وقت خطرے میں ہے۔ یہاں شرابی ڈشکرے ہیں۔ کوئی کسی بھی وقت تم پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔''

''یہ بڑی بری عورت ہے عمو... بھائی۔ آسے پاسے کے سارے پنڈوں میں اس کے بندے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر چڑی بھی پر نہیں مار سکتی۔ تمہیں شاید پتا ہو، پچھلے مہینے مسلی کے پتر سلیم نے مالکن سے اجازت لیے بغیر یہاں سے جانے کی کوشش کی تھی۔ مالکن نے اسے پکڑ کر پھر پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ پچھلی بار اس پر چوری کا الزام تھا، اس بار ایک کڑی سے زبردستی کا الزام لگا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوتا ہے اس دچارے کے ساتھ۔''

''پر اس طرح کب تک چلے گا شبانہ؟ مجھے ہر وقت تمہارے بارے میں ڈر لگا رہتا ہے۔ میں تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔''

''میرے بارے میں نہ سوچا کرو۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''کیوں؟''

''بس نہ سوچا کرو... تمہیں بتا دیا ہے۔''

عمو نے گہری سانس لی۔ آدھ کھلے دروازے میں سے خالی تاریک برآمدہ دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''شبانہ! سچ بتاؤ، کیا تم اس لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''میں وہی کروں گی جو میرے وڈے کہیں گے۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

تاریکی اور تنہائی عمو کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ اس نے شبانہ کا نرم ہاتھ ہولے سے تھام لیا اور بولا۔ ''ایک بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتانا شبانہ... میں تو ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں، کیا کبھی تم بھی میرے بارے میں سوچتی ہو؟''

''کبھی کبھی۔'' وہ ذرا شرما کر لیکن اداس لہجے میں بولی۔

''کیا سوچتی ہو؟''

''وہی کھڑکی والی ساری باتیں یاد آتی ہیں جب میں تمہیں کھانے کی چیزیں دینے آتی تھی۔'' اس نے کہا اور ہاتھ چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی۔

عمو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ بولا۔ ''کھڑکی والی ساری باتوں میں ایک خاص بات بھی تھی۔ تمہیں یاد ہے؟''

''ک... کیا؟'' وہ ذرا چونک کر بولی۔

''م... میں نے... تمہارا ہاتھ چوما تھا۔'' عمو کی آواز میں لرزش تھی۔

''اچھا... مجھے جانے دو۔'' وہ جلدی سے بولی اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

''ایک بار اور ایسا کرنے دو شبانہ۔'' عمو نے التجا کی۔

''عمو بھائی! ایسی باتیں نہ کرو مجھ سے۔'' وہ بدک کر بولی اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا... پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ عمو اپنی جگہ ہکا بکا اور خجل کھڑا رہ گیا۔ اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ وہیں تاریکی میں پرالی کے گٹھوں پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل غم اور ندامت سے بھر گیا تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ آتشیں آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ پھر ان کا بہاؤ تیز ہوتا گیا۔ اس کے گھٹنے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ حویلی کے رہے سہے مرد ملازم بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر اور کلہاڑیاں وغیرہ لہراتے ہوئے حویلی سے نکل گئے ہیں۔ شاید پنڈ سے باہر ہونے والی لڑائی شدت اختیار کر گئی تھی۔ اب حویلی میں بس چند پہرے دار اور رکھوالی کے کتے تھے۔

آدھ پون گھنٹے بعد شبانہ پھر بھوسے والی کوٹھڑی کے دروازے پر نظر آئی۔ وہ کچھ دیر دہلیز پر کھڑی عمو کو دیکھتی رہی، پھر اندر آ گئی۔ اس کی چوڑیاں عمو کے کان کے بالکل قریب چھن چھنائیں۔ اس کی نرم گرفت عمو نے اپنے پسینے سے بھیگے ہوئے بازو پر محسوس کی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''اب اٹھ جاؤ یہاں سے۔ وہ لوگ واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ تم ابھی ڈیرے سے دودھ بھی لے کر نہیں آئے... چلو اٹھو...''

عمو اسی طرح بیٹھا رہا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

اس نے ذرا زور لگا کر اسے اٹھانا چاہا اور بولی۔ ''دیکھو ایسا مت کرو عمو... بھائی! نہیں تو میں بھی رونا شروع کر دوں گی...''

''تم جاؤ، میں آ جاتا ہوں۔'' عمو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''غصے ہو گئے ہو نا؟''

''ہاں... لیکن اب کبھی نہیں ہوں گا۔ تم سے پکا وعدہ کرتا ہوں۔'' عمو کی آواز آتشیں آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

''اس کا مطلب ہے، بہت زیادہ غصے میں ہو۔''

عمو چپ رہا۔ وہ بھی چپ رہی۔ ایک سنسناتی خاموشی کوٹھڑی کی تاریکی میں لہریں لے رہی تھی۔ ''...اچھا... یہ لو...'' اچانک اس نے اپنے نرم ہاتھ کی پشت عمو کے ہونٹوں سے لگا دی۔

یکا یک عمو کی رگوں میں جوش آمیز محبت کے بہاؤ نے ہجوم مچا دیا۔ شبانہ کا الٹا ہاتھ عمو کے ہونٹوں پر دھرا تھا۔ اس نے چاہت بھری وارفتگی سے اس ہاتھ کو چوما... پھر بازو کو... پھر اس نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس نے معمولی گریز دکھانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا... اس کے گلے سے لگ گئی۔ عمو کے رخساروں پر تازہ آنسو بہنے لگے۔ ''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا شبو! میں تجھ سے پیار کرنے لگا ہوں۔ بہت زیادہ... بہت زیادہ۔'' وہ چومتا چلا گیا، اس کے بالوں کو، پیشانی کو، رخساروں کو۔

کوئی موم کی زنجیر تھی جو پگھل گئی... کوئی ریت کی دیوار تھی جو بہہ گئی۔ وہ گم گشتہ آواز میں بولی۔ ''عمو... تم یہاں سے چلے جاؤ... کسی طرح نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ بہت برے لوگ ہیں۔''

''میں اکیلا نہیں، تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی۔ ہم دونوں نکلیں گے۔''

''لیکن کیسے عمو؟ تم تو... تم تو لڑکے ہو۔ بھاگ دوڑ کر جان بچا سکتے ہو... میں تمہارے ساتھ ہوں گی تو تم جلدی پکڑے جاؤ گے۔''

''نہیں شبو! جائیں گے تو دونوں، نہیں تو دونوں نہیں جائیں گے۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ ''میں تو ایک اور بات کہتا ہوں شبو۔ یہ بڑا چنگا ویلا ہے۔ وہ سور دی بچی حویلی سے باہر گئی ہوئی ہے۔ بہت سے بندے بھی باہر ہیں۔ کیوں نہ ابھی یہاں سے نکل چلیں؟''

وہ لرز سی گئی۔ اس سے علیحدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی مگر کوٹھڑی کی گہری تاریکی میں وہ ایک دوجے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ بس محسوس کر سکتے تھے۔ ان کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ ان کی دھڑکنیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھے لیکن ان کا جذبہ ان کی طاقت بن گیا تھا۔ ان کے خون کی حرارت ان کی راہنمائی کر رہی تھی... یہ عجیب انقلاب تھا۔ اب سے صرف دس پندرہ منٹ پہلے وہ کچھ اور تھے، اب کچھ اور بن گئے تھے۔ پندرہ منٹ پہلے وہ اپنی بے بسی پر اشک بہا رہے تھے، اپنی لاچاریوں کو ناقابلِ شکست سمجھ رہے تھے۔ اب وہ یہاں سے بھاگ نکلنے کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رہے تھے۔ ایک ہی جست میں انہوں نے اظہار سے اقرار تک اور اقرار سے منزل کی جستجو تک بہت سے مرحلے طے کر لیے تھے۔

اور پھر وہ نوخیز جوڑا محبت کا ہاتھ تھام کر مالکن ماجھاں کی حویلی سے بھاگنے کو تیار ہو گیا۔ شبانہ نے ٹوپی والا دیسی برقع پہن لیا۔ عمو نے سر پر ایک صافہ سا ڈال لیا۔ دونوں حویلی کے پچھلے احاطے میں پہنچے۔ یہاں رکھوالی کا ایک بڑا کتا جکڑا رہتا تھا۔ عمو اور شبانہ کو دیکھ کر اس نے اپنے کان کھڑے کیے اور دُم کو تیزی سے گردش دینے لگا۔ عمو نے اسے پچکارا اور اس کے سامنے کچے گوشت کا ایک چھوٹا ٹکڑا پھینکا۔ غیر متوقع طور پر خطرناک کتے نے ان دونوں کے ساتھ اپنا رویّہ جارحانہ نہیں رکھا۔ وہ چھوٹے عقبی دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں پہرے دار سالار خاں موجود تھا۔ وہ اس کے اِدھر اُدھر ہٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد سالار خاں نے اپنا ازار بند کھولا اور ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ سنہری موقع تھا، وہ دونوں نکلے اور تیزی سے تاریکی میں اوجھل ہو گئے۔ اب وہ گاؤں کی گلیوں میں تھے۔ اِکا دُکا لوگوں سے ان کا سامنا ہوا مگر کوئی بھی ان کی طرف سے شک میں نہیں پڑا۔ جلد ہی وہ گاؤں سے باہر تھے۔ جوار کے اونچے کھیتوں میں چلتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

”ہائے میں مرگئی۔“ شبانہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ٹھٹک کر عمو کے بازو سے لگ گئی۔

ان کے عین سامنے سے گھوڑے دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ یہ ماجھاں اور اس کے ساتھی تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کامیاب لوٹے ہیں۔ وہ اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔ عمو اور شبانہ سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح ایک طرف جھاڑیوں میں دبک گئے۔ تنومند ماجھاں نے مردوں کی طرح ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور اس کے کندھے پر رائفل تھی۔ یہ لوگ ان کے قریب سے گزرے اور گاؤں کی طرف چلے گئے۔

عمو نے سرگوشی میں کہا۔ ”شبّو! اب یہ لوگ ہمارے پیچھے آنے میں زیادہ دیر نہیں کریں گے۔ ہمیں جلدی کرنی پڑے گی۔“

شبّو نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اونچے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں اور دھول سے اٹے ہوئے کچے راستوں پر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور دھڑکنیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر ان کے اندیشے درست ثابت ہو گئے۔ انہیں دور اپنے عقب میں لالٹینوں کی متحرک روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں گاؤں کی جانب سے بتدریج ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

شبانہ نے اب اپنا دیسی برقع اتار پھینکا تھا۔ تیز ہوا میں اس کے بال اڑ رہے تھے۔ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی ”عمو! اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ میری ٹانگوں میں جان نہیں رہی۔“ وہ بے دم سی ہو کر ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔

”نہیں شبّو! ہمیں ہمت کرنی پڑے گی۔ دریا زیادہ دور نہیں ہے۔ کسی طرح ہم پار کر گئے تو پھر پکڑے نہیں جائیں گے۔“

شبّو ہمت کر کے دوبارہ اٹھی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ پاؤں اور پنڈلیوں میں کانٹے چبھے ہوئے تھے۔ عمو کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ اگلے بیس تیس منٹ میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ دریا تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ گھڑ سوار تیزی سے ان کے قریب پہنچ رہے تھے۔ وہ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اب عمو اور شبانہ کو پناہ کی تلاش ہوئی۔ جلد ہی انہیں ایک چھوٹا سا ڈھارا نظر آیا۔ اس کی چھت نہیں تھی اور دیواریں بھی ٹوٹی پھوٹی تھیں۔ اس میں بہت ساری پرالی پرالی پڑی تھی۔ وہ اس پرالی کے اندر گھس گئے اور اپنے اوپر بھی بہت سی پرالی ڈال لی۔ عام حالات میں وہ اس سڑاند مارتی پھپھوندی زدہ پرالی میں گھسنے کی ہمت کبھی نہ کرتے۔ یہاں کیڑے مکوڑے حتیٰ کہ سانپ بھی ہو سکتے تھے۔ مگر اب بیرونی خطرے نے انہیں پرالی کے اندرونی خطروں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

یہ جگہ ان کے لیے ایک اچھی پناہ گاہ ثابت ہوئی... ان کے پیچھے آنے والے بس پانچ دس منٹ میں ہی ان کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ ان کے گھوڑوں کی آوازیں، ان کی باتیں سب کچھ عمو اور شبانہ کے کانوں تک پہنچیں۔ انہوں نے ماجھاں کی للکارتی ہوئی آواز بھی صاف پہچانی۔ یہ لوگ ان کے قریب سے ہو کر تیزی سے دریا کی طرف بڑھ گئے... چوڑے پاٹ والا دریائے چناب وہاں سے بس دو تین فرلانگ کی دوری پر ہی تھا۔ یقیناً ماجھاں اور اس کے ساتھیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دونوں دریا کی طرف گئے ہیں۔ راستے میں ملنے والے راہ گیروں اور کسانوں نے انہیں اس بارے میں اشارہ دیا ہوگا۔

قریباً ایک گھنٹا اسی طرح دل کی دھڑکنیں گنتے ہوئے گزر گیا۔ تب عمو اور شبانہ کو اندازہ ہوا کہ وہ لوگ دریا سے واپس آرہے ہیں۔ اب ان کا رخ گاؤں کی طرف تھا۔ لیکن اگر عمو اور شبانہ یہ سمجھ لیتے کہ یہ لوگ واپس گاؤں پہنچ جائیں گے اور پھر ٹھنڈی ہوا میں لمبی تان کر سو جائیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہوتی۔ عمو جانتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ رات

بھر دریا کے آس پاس اور قریبی بستیوں میں ان کی تلاش جاری رہے گی۔

رات آہستہ آہستہ آگے کو سرکتی رہی۔ وہ پسینے میں شرابور پھپھوندی زدہ پرالی میں لیٹے رہے۔ آثار گواہی دے رہے تھے کہ وہ لوگ ان کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ کبھی کسی گھوڑے کی ٹاپ سنائی دے جاتی، کبھی کوئی بلند آواز تیز ہوا کے دوش پر تیر کر ان تک پہنچتی۔

وہ اسی طرح ایک دوسرے کے پہلو میں دراز رہے۔ تاہم تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے انہوں نے پرالی میں تھوڑا سا خلا پیدا کرلیا۔ خطرے کا احساس قدرے کم ہونے لگا تو انہوں نے ایک دوسرے کے جسم کا لمس محسوس کیا۔ شبانہ ہولے سے ایک طرف کھسک گئی۔ لیکن وہ کتنا بھی کھسکتی، وہ لیٹے تو پہلو بہ پہلو تھے۔ عمو کے بازو نے شبانہ کے سر کے نیچے تکیہ بنا رکھا تھا۔ عمو کو اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔ عمو نے اس کے آنسو پونچھے اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔

''پریشان نہ ہو شبو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں دریا میں بہت سی کشتیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں گے اور پھر کہیں آگے جا کر کسی کشتی والے کو پندرہ بیس روپے دیں گے اور دریا پار کر جائیں گے۔ وہاں پکی سڑک ہے اور بسیں چلتی ہیں۔ ہم ایک بار بس پر بیٹھ گئے تو پھر ان کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔''

وہ آزردہ آواز میں منمنائی۔ ''یہاں سے نکلنا مشکل ہے عمو۔ لیکن اگر نکل بھی گئے تو جائیں گے کہاں؟''

عمو نے ایک گہری سانس لی اور اس کی آنکھوں میں اپنی چاندی بالوں والی ماں کا مقدس چہرہ گھوم گیا۔ وہ بولا۔ ''شبو! میں اور تم ایک بار امی تک پہنچ گئے تو پھر کوئی ڈر نہیں رہے گا۔ میری امی کے پاس ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ وہ یہ حل بھی نکال لے گی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ہم دونوں کو لے کر کسی دور کے رشتے دار کے پاس چلی جائے یا پھر ملتان لے جائے۔ وہاں امی کی ایک بڑی پکی سہیلی رہتی ہے۔ بچپن سے اس کی بہن بنی ہوئی ہے۔''

''لگتا ہے اپنی امی پر بڑا بھروسا ہے تمہیں؟'' شبانہ نے کہا۔

''ہاں شبو! بڑا بھروسا ہے۔'' وہ اس کے سوا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اس کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں تھے کہ وہ اپنی ماں کے حوالے سے اپنی کیفیت کا اظہار کرسکتا۔ وہ اس کے نزدیک دنیا کی سب سے زیادہ محبت کرنے والی، سب سے بڑھ کر مہربان اور چارہ گر عورت تھی... اور اگر وہ ایسا سوچتا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ عمو کو اپنی سولہ سترہ سالہ زندگی کا ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ اپنی ماں کی محبت میں بھیگا ہوا نظر آتا تھا۔ اپنی ماں سے بچھڑنے کے بعد وہ ہر پل اس کی یاد میں تڑپ رہا تھا۔ اب بھی وہ اس تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ جلد سے جلد اس کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کرلینا چاہتا تھا۔

وہ اسی طرح پرالی کے اندر دم سادھے لیٹے رہے... سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح... نصف شب کے قریب انہیں بوگیر کتوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ لیکن شکر کا مقام تھا کہ یہ آوازیں شمال کی طرف سے آرہی تھیں اور ہوا جنوب سے شمال کی طرف چل رہی تھی۔ عمو کو پتا تھا کہ اگر ہوا الٹی سمت میں چل رہی ہو تو بوگیر کتے اپنے شکار کی بو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔ آدھ پونے گھنٹے بعد کتوں کی آوازیں معدوم ہوگئیں وہ کسی اور طرف چلے گئے۔

عمو اور شبانہ کے جسموں پر چھوٹے موٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔ کسی وقت انہیں اپنے آس پاس چوہے یا چھپکلی وغیرہ کا احساس بھی ہوتا تھا مگر وہ یہ سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

عمو نے شبانہ کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ صبح روشنی ہونے سے پہلے پہلے ہم یہاں سے نکل کر دریا کی طرف چل پڑیں۔ اب ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ ایک تو دن کے وقت یہاں اتنی گرمی ہو جائے گی کہ ہمارے کباب بن جائیں گے... دوسرے دن کے وقت یہ لوگ بھی زمین سے ہمارا کھرا اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ہمارے پیروں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے اس پرالی تک پہنچ سکتے ہیں۔''

عمو کی بات شبانہ کی سمجھ میں آگئی لیکن وہ ڈری ہوئی بھی تھی۔

جب چڑیوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں تو وہ دونوں اس پرانی پرالی سے نکلے اور جھاڑیوں کے اندر چلتے ہوئے دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انہیں بتا رہے تھے کہ دریا زیادہ دور نہیں ہے۔ پھر انہیں پانی کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ وہ دریا کے کنارے چلتے چلے گئے اور ڈیڑھ دو میل آگے نکل گئے۔ یہاں انہیں ایک پرانی کشتی نظر آئی۔ اس میں چپو بھی پڑے تھے... ارد گرد کوئی دکھائی نہیں

دے رہا تھا۔ عمو نے بڑی احتیاط سے کشتی کا رسّا کھولا۔ پھر وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور عمو اسے دوسرے کنارے کی طرف کھینے لگا۔ اچانک کنارے کے سرکنڈوں میں ایک ٹارچ کی روشنی چمکی۔ کسی نے پکار کر کہا۔ ''اوئے کون ہے؟''

عمو کی رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے تیزی سے چپو چلانے شروع کردیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کنارے پر کئی افراد کے ہیولے نظر آنے لگے۔ تب تک عمو اور شبانہ دریا کے وسط تک پہنچ چکے تھے اور تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہے تھے...

''رک جاؤ... نہیں تو گولی مار دیں گے۔'' ایک پکارتی ہوئی آواز آئی۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ ماجھاں ہی کے لوگ تھے۔ وہ کنارے پر موجود تھے اور انہوں نے گھات لگا رکھی تھی۔ یہ کشتی بھی انہوں نے غالباً پھندے کے طور پر ہی یہاں باندھی ہوئی تھی۔

''ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟'' شبانہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

عمو کیا کہتا۔ وہ تو خود سرتاپا پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اور تیزی سے چپو چلانا شروع کردیتا۔ کنارہ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ کوشش کرتے تو اس تک پہنچ سکتے تھے۔ پھر فائرنگ کی آواز گونجی۔ چند لمحے کے لیے تو عمو اور شبانہ کو لگا کہ آخری وقت آگیا ہے تاہم یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ انہوں نے فضا میں بلند ہوتی چنگاریاں صاف دیکھیں اور تب ان پر ایک اور انکشاف ہوا... دریا کے دوسرے کنارے پر بھی ماجھاں کے کارندے موجود تھے۔ یہ ہوائی فائرنگ انہیں ہوشیار کرنے کے لیے کی گئی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد دوسرے کنارے پر بھی ایک دو ٹارچیں چمکنے لگیں اور ہیولے دکھائی دینے لگے...

شبانہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا عمو! یہ لوگ ہمیں نکلنے نہیں دیں گے۔ اب... پتا نہیں کیا ہوگا ہمارے ساتھ۔''

عمو کے ہاتھ پاؤں سے بھی جیسے جان نکل چکی تھی۔ اس نے بے دم سا ہو کر چپو کشتی میں گرا دیے اور خالی نظروں سے شبانہ کو دیکھنے لگا۔ ان کے سر پر نیم تاریک آسمان تھا اور صبح کے چند آخری تارے چمک رہے تھے۔ ان دونوں کے ذہنوں میں ایک جیسا خیال ہی کوند رہا تھا۔ کیا وہ خود کو چناب کے اس رواں پانی میں ڈبو کر اپنی زندگیوں کا خاتمہ کرلیں... یہ چناب شاید ہمیشہ سے ایسا ہی مزاج رکھتا تھا۔ یہ ''محبت'' کو ہوا دیتا تھا، اس کی پرورش کرتا تھا لیکن پھر محبت کرنے والوں کو نگل بھی لیتا تھا۔ کچے گھڑے ٹوٹ جاتے تھے اور لہریں سوہنیوں کو اپنے اندر چھپا لیتی تھیں۔

لیکن یہ کہانی نہیں تھی۔ یہ ایک زندہ حقیقت تھی۔ وہ مٹیالے رنگ کی ٹوٹی پھوٹی کشتی میں سکڑے سمٹے بیٹھے تھے... اپنی جان دینے کا سوچ رہے تھے... اور حقیقت کی دنیا میں جان دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ سوچتے رہے اور کشتی دھیرے دھیرے بہتی رہی۔ بہنے کے ساتھ وہ بتدریج کنارے کی طرف بھی کھسک رہی تھی۔ کنارہ... جہاں کوئی ایک درجن مسلح افراد ان دونوں کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ کنارے تک رسائی پانا، خوشی کا استعارہ ہے مگر آج اس استعارے نے اپنا مفہوم بدل لیا تھا۔

☆☆☆

اور اب وہ دونوں پھر سے حویلی میں تھے۔ بہت بڑے چہرے اور سرخ آنکھوں والی ماجھاں سرتاپا قہر نظر آرہی تھی۔ اس نے پہلے تو شبانہ کو بُری طرح مارا اور اس کے ناک منہ سے خون چھڑا دیا پھر وہ عمو پر پل پڑی۔ اس کے جسم میں مردوں سے بڑھ کر طاقت تھی۔ اس نے عمو پر تھپڑوں اور ٹھڈوں کی بارش کردی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور لگتا ہے وہ اسے پستول کا دستہ بھی مار رہی تھی۔ وہ اسے بالوں سے گھسیٹ کر صحن کے درمیان لے آئی اور غلیظ گالی دے کر بولی... ''چل مرغا بن... مرغا بن یہاں۔''

عمو کے اندر بغاوت جنم لے رہی تھی۔ لگتا ہے لگتا ہے اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس خبیث عورت پر جھپٹ پڑے۔ اسے دھکا دے کر دور گرائے اور نتائج سے بے پروا ہو کر یہاں سے بھاگ نکلے... لیکن ہر بار اس کے سامنے شبانہ کا چہرہ آجاتا تھا۔ وہ اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا... وہ ابھی ہر ستم برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

''سنا نہیں بچے! مالکن کیا کہہ رہی ہے۔'' ماکھے نے کہا پھر اس کا سر پکڑ کر زبردستی اس کے گھٹنوں میں گھسا دیا اور بازو ٹانگوں کے نیچے سے گزار دیے۔ وہ سخت دھوپ میں مرغا بنا کھڑا رہا۔ اسے مزید اذیت پہنچانے کے لیے اس کی کمر پر چند کچی اینٹیں رکھ دی گئیں۔ اس کی ناک سے پسینے اور خون کے قطرے ایک ساتھ گر رہے تھے اور یہ سب کچھ شبانہ کے سامنے ہو رہا تھا۔

ماجھاں نے گاؤں کے حجام کو بلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی

ہی دیر بعد روتی سسکتی زخمی شبانہ کا سر استرے سے مونڈ دیا گیا اور پھر اس کی بھویں بھی صاف کر دی گئیں۔

بے بسی کے آنسو تواتر کے ساتھ عمو کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ کتنی تیزی سے تبدیل ہوا تھا سب کچھ۔ تین چار گھنٹے پہلے تک وہ اپنی ماں سے ملنے کے لیے اور اس کی گود میں سر رکھنے کے لیے پُرامید تھا اور اب گاؤں والوں کے سامنے ایک تماشا بنا ہوا تھا۔ جب کمر پر رکھا ہوا بوجھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جسم سے پسینا باقاعدہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ خون کے دباؤ سے چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ماجھاں ایک بار پھر اس پر پل پڑی اور ایک سوٹے سے اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی۔ جب وہ نیم جان ہو گیا تو اسے اٹھا کر کتوں والی کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔

وہ سارا دن اور رات گئے تک درد سے سسکتا اور کراہتا رہا۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے پھر اسے بھی نیند آگئی۔ اگلے روز شدید گرمی کی وجہ سے آنکھ کھلی تو ذہن میں پہلا خیال شبانہ کا ہی آیا۔ پتا نہیں کہ اس کے ساتھ کیا بیتی تھی؟ وہ کس حال میں تھی؟ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی وجہ وہ خود ہی تھا۔ وہی اسے لے کر یہاں سے نکلا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت اسے پھر ماجھاں کی منحوس شکل نظر آئی۔ اسے شدید اذیت اور ذلت سے دوچار کرنے کے باوجود ابھی اس کا غصہ پوری طرح اترا نہیں تھا۔ وہ نشے میں بہت تھی اور اس کی آنکھوں میں خباثت کا دریا بہہ رہا تھا۔ جب وہ کچھ بدتر کرنے کے موڈ میں ہوتی تھی تو اس کی ناک کچھ اور بھی چپٹی اور سیاہ دکھائی دینے لگتی تھی۔ اب بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔

وہ پھنکاری۔ ”تجھے کہا تھا نا کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت بُری طرح پیش آؤں گی... اور ایک دار نہیں دس وار کہا تھا۔ بول کہا تھا نا؟“ اس نے جوتے کی نوک سے عمو کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

عمو کچھ نہیں بولا۔

”حرامزادے! اب منہ میں گھنگنیاں کیوں ڈال لی ہیں؟ اس کمینی کے لیے سب کچھ کیا ہے نا تو نے۔ اسی کتی کے عشق کا بخار چڑھا ہوا تھا نا تجھے؟“

عمو نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔

ماجھاں نے اپنی ویل کی سفید قمیص سامنے سے اوپر اٹھائی اور اپنے سیاہ تہ بند کی ڈب میں سے پستول نکال لیا۔ شراب ایک زہر کی طرح اس کے آتشیں دماغ کو چڑھی ہوئی تھی۔ ”اوئے! کسی گونگے کے تخم... بولتا کیوں نہیں؟ بولا ہے یا پھر ٹکاؤں تیرے اندر گولیاں؟“

عمو کو لگا کہ وہ چاہے بھی تو نہیں بول سکے گا۔ وہ بس سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ ”اچھا نہیں بولے گا تو... نہیں بولے گا تو؟“ وہ بہکی ہوئی خطرناک آواز میں بولی۔ اس نے پستول کا حفاظتی کھٹکا ہٹایا۔ اسے عمو کی طرف سیدھا کیا اور جنونی لہجے میں دھاڑی۔ ”...نہیں بولے گا تو... نہیں بولے گا؟“

اس کے ساتھ ہی اس نے عمو پر فائرنگ کر دی۔ عمو چلا اٹھا۔ ماجھاں نے پستول کی چھ کی چھ گولیاں عمو پر چلا دیں۔ آخری وقت میں عمو نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور زمین پر گر گیا تھا۔ اسے لگا کہ شاید وہ مرنے والا ہے۔ لیکن پھر یکایک اسے احساس ہوا کہ گولیاں اس کے جسم پر نہیں لگیں۔ اس کے بالکل آس پاس پکی زمین میں لگی ہیں۔

وہ جیسے موت کو چھو کر واپس آگیا تھا۔ ماجھاں اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ بڑی بے رحم تھی۔ کئی گولیاں عمو کے جسم کو جیسے چھو کر گزری تھیں۔ ایک طرح سے اس نے اپنے بہترین نشانے کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

وہ عمو کی ٹانگ پر پاؤں رکھتے ہوئے بولی۔ ”ایک دن تو نے ناجو کو بتایا تھا نا کہ مالکن کے پنڈے سے تمباکو کی بو آتی ہے۔ بتایا تھا نا؟“

عمو چپ رہا۔ اسے یاد آیا کہ شاید کچھ دن پہلے اس نے بے دھیانی میں کوئی ایسی بات کہی تھی۔ وہ پھنکاری۔ ”تیری یہ ناک بڑی تیز ہے۔ اس کی تیزی مارنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کالیے کو آوازیں دیں۔

کالیا بھاگتا ہوا آیا۔ وہ ایک صافہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ ”اس میں تھوڑا سا گوبر لا اور ساتھ میں ایک رسی بھی۔“

کالیا جیسے پہلے سے جانتا تھا کہ مالکن کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ ”جی اچھا“ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ مطلوبہ چیزوں کے ساتھ حاضر تھا۔ وہ ساتھ میں لمبے تڑنگے ماکھے کو بھی لایا تھا۔ دونوں نے مل کر عمو کو زبردستی الٹا کیا اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ پھر اس کے پاؤں بھی رسی کی بے رحم گرفت میں جکڑ دیے گئے۔ تب نیلے رنگ کا صافہ جس میں گوبر تھا، عمو کے منہ پر باندھ کر سر کے پیچھے مضبوط گرہ لگا دی گئی۔

وہ عمو کے لیے زندگی کی اذیت ناک ترین گھڑیاں تھیں۔ ماں اس کے سر میں چنبیلی کا خوشبودار تیل لگاتی تھی اور جب وہ اسکول جاتا تھا تو اس کے بستے میں گلاب کے پھول رکھ دیا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی، گلاب کی خوشبو بندے کو شاہ دماغ بناتی ہے۔ آج اس کے منہ پر تعفن زدہ گوبر بندھا ہوا تھا اور اس کا دم سینے میں گھٹ رہا تھا۔ وہ لوگ اسے بند کر کے چلے گئے اور وہ مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ وہ صافے کو اپنے منہ سے ہٹانا چاہ رہا تھا لیکن ایسا کر نہیں پا رہا تھا۔ اسے مسلسل ابکائیاں آرہی تھیں۔ پیٹ پرسوں شام سے خالی تھا، ورنہ اس کی مصیبت اور بڑھ جاتی۔ بالآخر وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ شاید گوبر کی بُو نے بھی دھیرے دھیرے اثر کھونا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد حویلی میں عمران عرف عمو کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس سے ساری سہولتیں چھین لی گئیں۔ عام ”کاموں“ کی طرح اسے گھٹیا لباس پہنایا گیا اور مویشی خانے میں کام پر لگا دیا گیا۔ مویشی خانے کا نگراں وہی کالیا نامی کرخت شخص تھا۔ وہ کام لینے کے معاملے میں بہت سخت بلکہ سفاک تھا۔ عمو کے پاؤں میں باقاعدہ ایک زنگ آلود بیڑی ڈالی گئی تھی۔ اسے اس بیڑی سمیت صبح منہ اندھیرے سے شام تک مختلف کام کرنا پڑتے تھے۔ ان میں سے سخت ترین کام ونتی ٹوکے پر چارا کاٹنا تھا۔ ہر روز کم از کم چھ گھنٹے کے لیے عمو کو ایک دوسرے لڑکے مولے کے ساتھ مل کر چارا کترنا پڑتا تھا۔ وہ پسینے میں نہا جاتے تھے اور دم جیسے آنکھوں میں آجاتا تھا مگر کالیے کی بے رحم نگاہوں کا خوف انہیں ہاتھ چلائے رکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ سستی کی صورت میں کالیا نہ صرف غلیظ گالیاں دیتا بلکہ بے دریغ مار پیٹ بھی کرتا تھا۔

مویشی خانے میں کُل پانچ ملازم تھے۔ ان میں سے صرف عمو اور مولے کو یہ ”امتیاز“ حاصل تھا کہ انہیں بیڑیاں لگائی گئی تھیں۔ بیڑی کی وجہ سے وہ دونوں شلوار نہیں پہن سکتے تھے۔ انہیں اپنا جسم صرف لنگوٹی یا دھوتی سے ڈھانپنا ہوتا تھا۔

تقریباً دو مہینے بعد مولے کی بیڑی تو اتار دی گئی مگر عمو کی بدستور رہی اور اس کے ٹخنوں کو مسلسل زخمی کرتی رہی۔ ماجھاں کی منحوس شکل اب اسے کم ہی نظر آتی تھی۔ اسے پتا چلا تھا کہ آج کل دینے مسلی کا پڑھا لکھا بیٹا باؤ سلیم ماجھاں کی زد میں ہے۔ ماجھاں نے اسے پتا نہیں کن کن چکروں میں پھنسایا تھا کہ وہ بے چارہ حویلی کا چاکر بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے ذمے ”منشی“ کا کام لگایا گیا تھا۔ وہ گھنگریالے بالوں والا بائیس تیئس سال کا قبول صورت لڑکا تھا۔ شلوار قمیص پہنتا تھا۔ عمو نے اکثر اسے ایک بوسیدہ سے رجسٹر کے ساتھ حویلی میں آتے جاتے دیکھا۔

ایک دن جب عمو چارے کا وزنی گٹھر کندھے پر اٹھائے حویلی کے مین دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا، اسے ماجھاں کے گرجنے برسنے کی آواز آئی۔ ادھ کھلے پھاٹک سے اس نے ماجھاں کی بس ایک جھلک دیکھی... اور بھونچکا رہ گیا۔ ماجھاں باؤ سلیم پر برس رہی تھی۔ باؤ سلیم کے گلے میں ایک رسی تھی۔ اس رسی کا دوسرا سرا ماجھاں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے کسی جانور کی طرح برآمدے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ باؤ سلیم کے چہرے پر چپتوں کے نشان تھے۔ وہ جب کسی کو تھپڑ وغیرہ مارتی تھی تو اس کی کلائی کا وزنی کڑا بھی اس ”کارِ خیر“ میں شریک ہو جاتا تھا اور مضروب کے چہرے پر نشان چھوڑ جاتا تھا... ماکھا اور کالیا وغیرہ قریب ہی کھڑے مضحکہ خیز انداز میں باؤ سلیم کی یہ درگت دیکھ رہے تھے۔

ماجھاں کے لیے ایک عجیب سی نفرت عمو کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اس عورت کو چیر کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا اور دیوہیکل بوہلی کتوں کے آگے ڈال دیتا۔

رات کو اس نے مولے سے ذکر کیا۔ مولا بولا۔ ”باؤ سلیم نے وہی غلطی کی تھی جو اس جیسے پڑھے لکھے لوگ عام طور پر کرتے ہیں۔ اس نے پنڈ میں پانچویں تک کا اسکول کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بس اسی بات پر چودھرانی ماجھاں سے اس کی ٹسل ہو گئی۔ چودھرانی سے ٹکر لے کر بھلا اس علاقے میں کوئی رہ سکتا ہے۔ یہ تو بندے کو اپنے پاؤں چٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔“

”کوئی اس کا کچھ کر نہیں سکتا؟“ عمو نے دکھی لہجے میں کہا۔

”تو نے کیا کر لیا ہے؟“ مولے نے الٹا اس سے سوال کیا۔

اس سوال نے عمو کو چپ کرا دیا۔ مولا بولا۔ ”یہ بڑی ہی دراچھی زنانی ہے۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا... اور سچی گل پوچھتا ہے نا تو مجھے تو اس کڑی شبو کی طرف سے بھی خطرہ ہی رہتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ عمو نے چونک کر پوچھا۔

”وہ بگیاڑوں کے اندر بکری کے بچے کی طرح ہے۔ اس کے ساتھ کسی ویلے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔“

مولے کی بات نے عمو کے اندر دبے ہوئے سارے اندیشے ایک دم ابھار دیے۔ اس کے سینے میں کچھ سلگنے لگا۔ پچھلے دو ڈھائی مہینے میں بس دو چار بار ہی وہ شبو کو دیکھ سکا تھا۔

اس کے سر پر اب چھوٹے چھوٹے بال آگئے تھے۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد نظر آتا تھا۔ سخت گیر شہناز کی زیرِ نگرانی وہ حویلی کے کام کاج کرتی دکھائی دیتی تھی۔ شاید مولا سچ ہی کہہ رہا تھا۔ مانکھے، کالیے اور صوفی جیسے بگیاڑوں کے درمیان وہ ایک کمزور بکری ہی تو تھی۔

مولے کی آواز نے اسے چونکایا۔ ''مجھے تو ایک اور شک ہو رہا ہے عمو۔ سنا ہے کہ چودھرانی کا ڈکیت بھائی ناجا ڈیڑھ دو مہینے تک حویلی واپس آرہا ہے۔ وہ پھر حویلی میں ہی رہے گا۔ کہتے ہیں کہ علاقے کی پلس کے ساتھ اس کا لمبا چوڑا ٹنک ٹمکا ہو گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ چودھرانی نے شبو جیسی چکل کڑی کو اپنے بھائی کی دل پشوری کے لیے ہی بچا کر رکھا ہوا ہے۔''

مولے کے بات کرنے کے انداز سے عمو بھنا گیا۔ ''مولے! اس کے بارے میں تمیز سے بات کر۔''

''یار تو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے وہ معشوق نہیں، زنانی ہے تیری۔''

عمو اندر سے کھول کر رہ گیا۔ وہ منہ پھیر کر اٹھا اور دوسری طرف چلا گیا۔ مویشی خانے کی تاریکی اور بُو میں وہ رات دیر تک جاگتا رہا اور بان کی چارپائی پر پہلو بدلتا رہا... مولے کی باتوں نے شبو کے حوالے سے اس کے بدترین اندیشوں کو ہوا دی تھی اور اب وہ بُری طرح بے قرار تھا۔ ہو سکتا تھا کہ مولے نے ماجھاں کے ڈکیت بھائی کے حوالے سے جو اندیشہ بیان کیا تھا، وہ پوری طرح درست نہ ہو لیکن یہ بات توٹھوس حقیقت تھی کہ اس حویلی میں لاچار شبو کے ساتھ کسی بھی وقت کوئی ''معاملہ'' ہو سکتا ہے۔

صرف تین چار روز بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ پتا چلا کہ حویلی میں دو تین بندے زخمی ہو گئے ہیں۔ ان میں دینے مسلّی کا بیٹا باؤ سلیم بھی شامل تھا۔ باؤ کو شدید چوٹ آئی تھی۔ پتا چلا کہ اس کی دو پسلیاں ٹوٹ کر اس کے پھیپھڑے میں جا گھسی تھیں اور اسے زخمی حالت میں تحصیل اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ یہ حادثہ گھوڑوں اور گھوڑیوں کو نمبر لگانے کے دوران میں پیش آیا۔ نمبر لگانے کے لیے جانوروں کو داغا جاتا ہے۔ جب ماجھاں کے لاڈلے تازی گھوڑے کو داغا جانے لگا تو وہ اپنی روایتی سرکشی پر اتر آیا۔ اس نے مختصر سے طویلے میں زبردست اودھم مچایا۔ باؤ سلیم جو منشی کے طور پر وہاں موجود تھا اور نمبر لگوا رہا تھا، وہ بھی گھوڑے کی زد میں آیا اور اس کی دولتی سے شدید زخمی ہوا۔ یہ وہی منہ زور گھوڑا تھا جو اس سے پہلے بھی سائیس اور اس کے ساتھی کو زخمی کر چکا تھا۔

باؤ سلیم گھائل ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور اس کے آٹھ دس روز بعد ہی ماجھاں کی ''نظرِ کرم'' ایک بار پھر عمو پر پڑ گئی۔ وہ اپنی بدعادات سے مجبور تھی۔ عمو کو کسی بھولی ہوئی غلیظ چیز کی طرح مویشی خانے کے ''اسٹور روم'' سے نکالا گیا اور جھاڑ پونچھ کر پھر اپنے عشرت کدے میں سجایا گیا... وہی نیم تاریک کمرا، وہی کراہت، وہی بدبودار بوجھ، وہی غلیظ سانسیں۔ وہ اب پہلے سے دگنا کالا پانی یعنی شراب پیتی تھی اور اس کی خباثت میں بھی اسی شرح سے اضافہ ہوا تھا۔ وہ عمو کی دکھتی رگ جان چکی تھی۔ اس نے شبانہ کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ لڑکی یہاں اسی وقت تک خیریت سے ہے جب تک عمو سیدھا سیدھا چلتا رہے گا۔

... اب وہ عمو کو گاہے بگاہے حویلی میں بلانے لگی۔ تاہم عمو کی وہ سہولتیں بحال نہیں ہوئیں جو شروع میں اسے حاصل تھیں۔ وہ بدستور مویشی خانے میں قیام پذیر تھا اور سارا دن جانور کی طرح مشقت کرتا تھا۔ اس کا کھانا پینا بھی حویلی کے ادنیٰ کارندوں کے ساتھ تھا۔ صرف اتنا فرق پڑا کہ اس کی بیڑی اتار لی گئی۔

وہ بڑے تکلیف دہ شب و روز تھے۔ سردیوں کے بعد بہار شروع ہو رہی تھی۔ نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، مست ہوا چلتی تھی لیکن عمو کے اندر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی... وہ ہر وقت معصوم چہرہ شبانہ کی سلامتی کے بارے میں سوچتا رہتا اور اس فکر میں رہتا کہ وہ کسی طرح اس مہلک جال میں سے نکل جائے۔ عمو کو معلوم ہو چکا تھا کہ شبانہ کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور وہ ایک ناپسندیدہ شوہر کے پلّے بندھنے سے بچ گئی ہے مگر اس کے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات ہوئی تھی۔ وہ اب ماجھاں کے پاس تھی۔ بظاہر تو اس کی حیثیت ملازمہ کی تھی۔ اس کے رشتے داروں کو حویلی میں آکر اس سے ملنے کی اجازت بھی تھی لیکن حقیقت میں وہ قیدی تھی۔ اس کے گرد ایک نادیدہ پنجرہ تھا۔

عمو پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ اس کا تھوڑا سا مزید قد بھی نکلا تھا اور اس کے شانوں کی چوڑائی بڑھی تھی۔ اس کے اندر بغاوت کسی انگارے کی طرح سلگتی رہتی لیکن اس انگارے کو شعلہ بننے کا موقع دور دور نظر نہیں آتا تھا... ہاں، وہ بہار کے دن تھے۔ بہار کی ہواؤں میں نمو کی تاثیر ہوتی ہے۔ اس ہوا میں زردی کے اندر سے سبزہ پھوٹتا ہے... بیجوں سے کونپلیں بنتی ہیں اور کبھی کبھی جذبوں کے انگارے بھی شعلوں میں بدل جاتے ہیں۔ ان دنوں حویلی میں راجا نام کا ایک نوجوان بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ راجا کے پاس ایک بہت کھٹارا لوڈر تھا۔ اس پر اردو میں ''پاٹے خاں'' لکھا ہوا تھا۔ یہ دراصل اس لوڈر کا نام تھا۔ راجا اس لوڈر میں دو تین پنجرے رکھ کر لایا تھا... ان میں چار پانچ شکاری کتے تھے۔ عمو کو معلوم ہوا تھا کہ یہ بندہ شکاری کتوں کو سدھاتا ہے اور پھر انہیں فروخت کرتا ہے۔ اس دن عمو بہت اداس بیٹھا تھا۔ اتنے میں کالیا آگیا۔ اس نے عمو سے کہا کہ وہ بھوری بھینس کا دودھ دھو دے۔ بھوری کبھی کبھی اڑ جاتی تھی اور اسے ٹیکا لگا کر دودھ دھونا پڑتا تھا مگر عمو ایسے موقعوں پر بغیر ٹیکے کے ہی اسے رام کر لیتا تھا۔

وہ اسٹیل کی بڑی بالٹی لے کر بھوری کے پاس آیا۔ اس کے چمکیلے پنڈے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اور اس کے تھنوں کو سہلا سہلا کر اسے تیار کرتا رہا۔ پھر بالٹی اپنے دونوں گھٹنوں میں دبائی اور بھوری کے نیچے بیٹھ گیا۔

یہ مویشی خانے کا ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جس میں صرف دو بھینسیں اور بندھی ہوئی تھیں۔ اچانک بھگدڑ کی آوازیں آئیں۔ ایک زوردار کڑاکا سنائی دیا اور احاطے کا لکڑی کا دروازہ ٹوٹ کر دور جا گرا۔ ایک گھوڑا اپنے گھڑسوار سمیت تیزی سے اندر داخل ہوا۔ عمو نے فوراً پہچان لیا۔ یہ ماجھاں کا وہی سرکش گھوڑا تھا جس نے دہشت پھیلا رکھی تھی۔ عمو نے اس کے سوار سالار خاں کو اچھل کر ہوا میں تیرتے اور پھر بھینسوں کی کھرلی کے پاس گرتے دیکھا۔ گرتے ہوئے اس کا سر کھرلی سے ٹکرایا تھا اور وہ بے سدھ ہو گیا تھا۔ گھوڑے کی ٹانگ لگنے سے عمو بھی دور لڑھک گیا اور دودھ والی بالٹی ہوا میں اڑتی نظر آئی۔ گھوڑا بلند آواز میں ہنہنا رہا تھا اور چاروں طرف ٹانگیں چلا رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اگر سالار خاں چند سیکنڈ بھی اپنی جگہ پڑا رہا تو وحشی گھوڑا اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دے گا۔ یہی وقت تھا جب عمو اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور نتائج سے بے پروا ہو کر گھوڑے پر جا پڑا۔ گھوڑے نے گردن کے زوردار ہلارے سے عمو کو ضرب لگائی اور چارے کے گٹھوں پر گرا دیا۔ عمو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پھر اٹھا اور گھوڑے پر جھپٹا۔ اس مرتبہ گھوڑے کی لگام عمو کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے لگام کو دو تین جھٹکے دیے۔ یکایک اسے لگا کہ گھوڑا غیر متوقع طور پر شانت ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی غیر معمولی مستی کافور ہو گئی۔ عمو نے اس کے ساتھ بھاگتے بھاگتے احاطے کا ایک چکر لگایا۔ لگام بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ پھر اس نے ہمت کی اور جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ یہ غیر معمولی اقدام تھا۔ اس وقت ماجھاں سمیت حویلی میں موجود کوئی بھی شخص ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ عمو نے گھوڑے کو سنبھالتے ہوئے گھڑسواری کا انداز اختیار کیا۔ وہ اس کی اچھل کود کو بتدریج کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اسے بڑے احاطے میں لے آیا اور بڑے اعتماد سے اسے اِدھر اُدھر دوڑانے لگا۔ ماجھاں اس وقت حویلی میں نہیں تھی لیکن جو لوگ اسے دیکھ رہے تھے، وہ یقیناً حیرت زدہ تھے۔ اس سرکش گھوڑے پر اتنی کامیابی سے ابھی تک کوئی نہیں بیٹھا تھا۔

ان دیکھنے والوں میں ماجھاں کا مہمان راجا بھی تھا۔ کچھ دیر بعد جب عمو گھوڑے سے اترا اور اس کی گردن پر تھپکیاں دینے کے بعد اسے ایک کھونٹے سے باندھ دیا تو راجا دھیمے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ راجا چھریرے بدن کا تھا، اس کے بال لمبے تھے۔ آنکھیں چمکیلی اور نقوش تیز تھے۔ وہ عام سی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس نے عمو کا کندھا تھپکا اور بولا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''عمران... ویسے عمو کہتے ہیں۔''

''لگتا ہے گھوڑوں کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہو... اور گھڑسواری میں بھی ماہر ہو۔''

''نہیں، بہت کم گھوڑے پر بیٹھا ہوں۔ یہاں حویلی میں آکر تو تین چار بار سے زیادہ نہیں بیٹھا۔''

''یا تم جھوٹ بول رہے ہو... یا پھر...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

بے ہوش سالار خاں کو اٹھا کر باہر لایا جا رہا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ راجا نے دیگر ملازموں سے بھی پوچھا۔ انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ عمو کبھی کبھار ہی گھوڑے پر بیٹھتا ہے۔ وہ کوئی ماہر گھڑسوار نہیں۔

راجا، عمو کو لے کر حویلی کے اس حصے میں آگیا جہاں مہمان وغیرہ ٹھہرتے تھے۔ یہ دراصل ڈیرے ہی کے تین چار کمرے تھے۔ یہاں بڑی بڑی دو چارپائیاں اور تازہ حقے پڑے رہتے تھے... یہیں پر ایک طرف نیم کے درختوں کے نیچے وہ آہنی پنجرے پڑے تھے جنہیں راجا کسی جگہ لے کر جا رہا تھا۔ ان میں کتے تھے۔ ایک کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ راجا نے اپنے کان کی چھوٹی سی طلائی بالی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''تیرے اندر فن ہے بھائی! میں خود بھی گھوڑے سدھاتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی ایسے گھوڑے کو اتنی آسانی سے رام ہوتے نہیں دیکھا۔''

''میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے پہلے کبھی کسی ایسے گھوڑے پر سواری نہیں کی۔'' عمو سادگی سے بولا۔

"اچھا اس گھوڑے سے پہلے بھی کبھی تمہارا آمنا سامنا ہوا ہے؟"

"بس دو چار بار ہی ہوا ہے۔"

"کبھی ایسی حالت میں بھی سامنا ہوا ہے جب یہ اسی طرح مستا (بپھرا) ہوا تھا؟"

عمو نے ذہن پر زور دیا اور بولا۔ "ہاں، جب میں شروع شروع میں یہاں آیا تو ایک دن اس گھوڑے نے بڑا اودھم مچایا تھا۔ وہ ایک سوار کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا یہاں لایا تھا اور وہ بے چارہ مر چکا تھا۔"

راجا بڑے دھیان سے عمو کی بات سن رہا تھا۔ وہ بولا۔ "اس وقت گھوڑے سے تمہارا سامنا ہوا؟"

اچانک اس وقت کے مناظر عمو کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ گھوڑے نے سائیس کو ٹکرایا تھا پھر ماجھاں اسے چکما دے کر اس کی لگام تھامنے کے لیے آگے بڑھی تھی لیکن وہ تو چھلاوا بنا ہوا تھا۔ ایک دم الف ہو گیا اور گھوم کر سیدھا عمو کی طرف آیا۔ عمو نے حفاظت خود اختیاری کے طور پر اندھا دھند اپنا ہاتھ گھمایا تھا۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آ گئی تھی۔ عمو کے بازو کو شدید جھٹکا لگا۔ لگام عمو کے ہاتھ میں آنے کے بعد گھوڑا چند لمحوں کے لیے سکتہ زدہ سا ہو گیا تھا۔ ماجھاں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تنومند جسم کی پوری طاقت کے ساتھ گھوڑے کی گردن سے لپٹ گئی تھی۔

"کس خیال میں کھو گئے؟" راجا کی آواز نے اسے چونکایا۔

"ہاں اس وقت بھی پانچ دس سیکنڈ کے لیے اس سے میرا سامنا ہوا تھا۔" عمو نے راجا کے سوال کے جواب میں کہا۔

راجا نے عمو سے چند مزید سوال پوچھے۔ اس کے لب و لہجے میں حیرت بدستور موجود تھی۔

اسی دوران میں اندرونی کمرے سے زرق برق کپڑوں والی ایک لڑکی نے راجا کو پکارا۔ راجا اس کی بات سننے کے لیے کمرے میں چلا گیا۔ عمو کتوں کو دیکھنے کے لیے پنجرے کی طرف آ گیا۔ ایک کتا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی آوازیں کل رات بھی مسلسل حویلی کے مکینوں کو بے آرام کرتی رہی تھیں۔ یہ پتلی کمر اور لمبی تھوتھنی والا ہاؤنڈ کتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور تیور خطرناک تھے لیکن اب پچھلے دس پندرہ منٹ سے وہ قدرے خاموش نظر آ رہا تھا۔ اس کتے کو علیحدہ پنجرے میں بند کیا گیا تھا۔ عمو کتے کے نزدیک پہنچا تو وہ دُم کو ہولے ہولے گردش دینے لگا اور اس نے اپنی تھوتھنی پنجرے کی سلاخوں سے لگا دی۔ کتے عام طور پر عمو سے جلد ہی مانوس ہو جاتے تھے۔ ماجھاں نے اپنے کلیش کے دور میں عمو کو کئی ماہ تک "بل ڈاگز" کے ساتھ ایک بدبودار کوٹھڑی میں بند رکھا تھا۔ ان کتوں سے شروع میں عمو کو خطرہ محسوس ہوا لیکن پھر بڑی تیزی سے یہ خطرہ کم ہوتا چلا گیا تھا۔

ہاؤنڈ کتے نے اپنی پتلی تھوتھنی کا ایک تہائی حصہ تک سلاخوں کے خلا سے باہر نکال لیا تھا۔ عمو نے اپنی انگلی سے تھوتھنی کے بالائی حصے کو ہولے ہولے سہلایا۔ کتے کی دُم کی بے ساختہ گردش تیز ہو گئی۔ اسی دوران میں راجا واپس آ گیا۔ وہ عمو کو کتے کے پاس دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے عمو کو کتے سے پیچھے ہٹایا اور بولا۔ "زیادہ بہادری نہ دکھاؤ یارا... یہ کسی بھی ویلے حملہ کر سکتا ہے۔"

عمو اور راجا دوبارہ جہازی سائز چارپائی پر آ بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ راجا عمو سے پوچھنے لگا کہ وہ یہاں کیسے اور کیونکر آیا۔ یہاں ہر کسی کو عمو کی کہانی معلوم تھی۔ عمو نے راجا کو بھی یہ سب کچھ بتانے میں عار نہیں سمجھا۔ اس نے اسے بتا دیا کہ کیسے وہ ایک چودھری کے پتر کو آسمانی بجلی والی نحوست سے بچانے کے لیے شہنشاہ نامی پیر کے مزار پر پہنچا اور کیسے یہاں ٹنگراں گاؤں تک آیا... اس گفتگو کے دوران میں ہی راجا تھوڑا سا چونکا۔ ہاؤنڈ کتے نے اب پھر پنجرے میں چکرانا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ راجا کچھ دیر تک پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر اس کے قریب گیا۔ اس نے عمو کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ عمو پنجرے کے سامنے پہنچا تو کتے کی بے قراری کم ہو گئی۔ اس کا شور بھی تقریباً معدوم ہو گیا۔ وہ اپنی تھوتھنی سلاخوں سے رگڑ رہا تھا۔

کچھ دیر تک کتے کے پاس رک کر عمو اور راجا پھر چارپائی پر جا بیٹھے۔ ایک ملازمہ ان دونوں کے لیے مکھن والی میٹھی لسی لے آئی۔ کتا اب پھر حسبِ معمول پنجرے میں چکرا رہا تھا اور شور مچا رہا تھا۔

لسی پینے کے بعد راجا نے اپنی تیکھی مونچھیں صاف کیں اور ایک زوردار ڈکار لینے کے بعد کھوئی کھوئی نظروں سے عمو کو دیکھنے لگا... کچھ دیر بعد بولا۔ "میرے استاد، اللہ بخشے بابا مہر مشتاق کہا کرتے تھے، کچھ بندوں کے ساتھ پالتو جانور خاص طور سے کتے اور گھوڑے وغیرہ بڑی جلدی ہل جاتے (مانوس ہو جاتے) ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بھی ان لوگوں میں سے ایک ہو۔ کوئی خاص بات ہے تمہارے اندر... یا پھر ہو سکتا ہے کہ آہستہ آہستہ پیدا ہو رہی ہو۔"

"ہم... میں سمجھا نہیں بھا راجا؟"

"شاید میں تمہیں سمجھا نہ سکوں۔ استاد جی کی ساری باتیں تو میری کھوپڑی میں بھی نہیں آتی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ... ہر بندے کے اندر سے کچھ لہریں نکلتی ہیں۔ یہ لہریں اس بندے کے آسے پاسے کے سارے جی جناوروں پر اثر ڈالتی ہیں... یہ لہریں ان جی جناوروں کو بتاتی ہیں کہ یہ بندہ چنگا ہے، بُرا ہے، یا بہت چنگا ہے یا بہت بُرا ہے۔ بس اس طرح کی بات کہا کرتے تھے استاد جی۔ اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو پھر مجھے لگتا ہے کہ تیری لہریں بھی بڑی ٹیٹ قسم کی ہیں۔"

"یہ ٹیٹ کیا ہوتا ہے؟"

"یارا! انگریزی کا لفظ ہے۔ مطلب ہے تگڑی مضبوط۔"

عمو سمجھ گیا کہ وہ "ٹائٹ" کو ٹیٹ کہہ رہا ہے۔

رات کو عمو سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ راجا کی کہی ہوئی ساری باتیں اس کے ذہن سے نکل چکی تھیں۔ وہ بس ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ وہ شبانہ کو اس خطرناک حویلی سے کیسے نکال کر لے جا سکتا تھا؟ وہ اس کے لیے بہت اہم ہو چکی تھی۔ اس کی رگِ جاں میں بس گئی تھی اور خون بن کر اس کی شریانوں میں دوڑتی رہتی تھی۔ وہ اس سے عشق کرنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے عشق کو بچانے کے لیے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شبانہ کی ماں اور دیگر رشتے داروں میں تو اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شبانہ کو ماجھاں کے چنگل سے نکال کر لے جا سکتے۔ ایسا کرنے والوں کا حشر یہاں دینے مسلی کے بیٹے بابو سلیم جیسا ہی ہوتا تھا۔

ایک دن بعد راجا سے پھر عمو کی ملاقات ہوئی۔ وہ اسے بڑی محبت سے ملا۔ دونوں مہمان خانے میں بیٹھے تربوز کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ راجا کا ہر دم شور مچانے والا..... خوفناک کتا آج پھر پہلے دن والے رویے کا مظاہرہ ..... کر رہا تھا۔ وہ قدرے پُرسکون نظر آ رہا تھا... اس نے حیران کن طور پر عمو کو اپنے بندے پر ہاتھ لگانے کی اجازت بھی دی تھی۔

تربوز کھانے کے دوران میں عمو نے راجا سے پوچھا۔ "وہ رنگ برنگے کپڑوں والی کڑی کہاں گئی؟"

"واپس چلی گئی ہوگی اپنے کوٹھے پر۔" راجا نے بیڑی سلگا کر کہا۔

"کیا مطلب؟ وہ طوائف تھی؟"

"اوئے کھوتے، آہستہ بول۔ آپاں ماجھاں نے سن لیا تو غصہ کرے گی۔ تجھے پتا ہی ہے، سچی بات اسے کتنی کڑوی لگتی ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں بھا راجے۔"

وہ آواز دبا کر بولا۔ "آپاں ماجھاں نے یہ کڑی مجھے ذرا موج میلے کے لیے دی تھی۔ کہتی تھی گھریلو کڑی ہے۔ بڑی مشکل سے پھنسا کر لائی ہوں۔ وہ بھی بات بات پر ہائے اللہ، توبہ اللہ، نہیں جی، نہ جی کہتی تھی۔ پر یارا! ہم نے بھی تھاں تھاں کا پانی پیا ہے۔ زنانی کی آواز سن کر بتا دیتے ہیں کہ یہ کس کھیت کی مولی ہے۔ بازاری کڑی تھی خانہ خراب... میں نے بھی سوچا چلو وقت ہی پاس کرنا ہے نا۔"

"تو اس میں اصل قصور تو مالکن ماجھاں کا ہوا نا۔" عمو نے کہا۔

"یہ تیری مالکن ماجھاں بڑی کتی شے ہے عمو... میں اس کے ساتھ کبھی کبھی کاروبار کرتا ہوں اس لیے مجبوراً اسے آپاں کہنا پڑتا ہے۔ ایسا کہتے ہوئے جو میرے دل پر گزرتی ہے، میں ہی جانتا ہوں لیکن میں اس کی کسر "ماجھاں" کہتے ہوئے نکال دیتا ہوں۔ شاید تو نے غور نہیں کیا۔ میں اسے ماجھاں کے بجائے ماچاں کہتا ہوں۔"

"ماچاں کا کیا مطلب؟"

"بڑا کرارا مطلب ہے۔ ایک دم ٹیٹ۔" وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ عمو کے استفسار پر اس نے بتایا۔ "ماچاں، پوٹھوہار کے خانہ بدوشوں کی بولی کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے جنگلی سور کی مادہ جس کے پیٹ میں بچہ ہو..." بات کرتے کرتے راجا ایک دم ٹھٹک گیا۔ اپنی شریر مسکراہٹ سمیٹ کر بولا۔ "لو آ گئی آپاں ماچاں۔"

ماجھاں اپنے تنومند جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی وہاں پہنچی۔ اس کے منہ میں تمباکو والا پان تھا۔ ایک نگاہ غلط انداز عمو پر ڈالنے کے بعد وہ راجا سے مخاطب ہوئی۔ "ہاں بھئی راجے... کیسی تھی کڑی؟"

"ایک دم ٹیٹ۔ وہ آپاں ماچاں۔" وہ آنکھ دبا کر بولا۔

"ویسے راجے! تو ہے بڑا کمینہ۔ اسے دو چار سو روپیا ہی دے دیتا۔"

"کیسی بات کرتی ہو آپاں! وہ گھریلو کڑی تھی۔ غصہ کر جاتی تو پھر؟ اگلی بار آؤں گا تو کوئی تحفہ شحفہ لاؤں گا۔"

"تو بہت وڈا کھوچل ہے۔" ماجھاں نے تیوری چڑھا کر کہا۔ پھر بولی۔ "اچھا وہ انگریزی بوتل کہاں ہے جس کا کہہ رہا تھا؟"

"ہاں ہاں آپاں ماچاں! وہ تو تیرے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ قسم سے ایک دم انگریزی ہے، بالکل سیل بند۔"

راجا اندر گیا اور پھر اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی امپورٹڈ شراب کی ایک نفیس بوتل اٹھا لایا۔ ”یہ لو... کیا یاد کرو گے اپنے بھائی کو۔“ وہ بولا۔

تھوڑی سی مکالمے بازی کر کے ماجھاں واپس چلی گئی تو راجا کے چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ”ایسے مسکرا کیوں رہے ہو بھاراجے؟“ عمو نے پوچھا۔

”سچی سچی بتاؤں؟“

”ہاں ہاں... مجھے کون سا کسی کو بتانا ہے۔“

راجا خود کو عمو سے کافی بے تکلف محسوس کرنے لگا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔ ”کہتے ہیں نا کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اس نے مجھے کنڈم گڑ کی دی، میں نے اسے کنڈم شراب تھما دی۔ وہ ٹیسٹ کو ”اچھے“ اور کنڈم کو ”خراب“ کے معنوں میں استعمال کرتا تھا۔

”کنڈم شراب؟ کیا مطلب؟“ عمو نے پوچھا۔

”یہ سیل بند بوتل نہیں ہے اور اس میں جو شراب ہے، وہ بھی بچی کھچی ہے۔ کچھ دن پہلے فیروز آباد گاؤں کے زمیندار ملک آفتاب کے ڈیرے پر ایک بڑی شراب پارٹی ہوئی تھی۔ وہاں بڑی ٹیسٹ انگریزی شراب چلی تھی۔ میں بھی وہاں تھا۔ پارٹی کے بعد میں نے گلاسوں میں بچی کھچی شراب اس بوتل میں جمع کر لی تھی...“ وہ دبی آواز میں ہنسا۔

”اور یہ بوتل کی سیل؟“ عمو نے پوچھا۔

”یہ سیلیں شیلیں جھوٹی ہوتی ہیں یارا... ہر طرف ایک دم کنڈم مال چل رہے ہیں۔“ وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔

اگلے دو تین روز میں راجے سے عمو کی چند ملاقاتیں مزید ہوئیں۔ وہ عمو سے بہت متاثر نظر آتا تھا۔ اسے عمو کی تقریباً ساری روداد معلوم ہو چکی تھی۔ یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ یہاں عیاش ماجھاں نے اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا ہے۔ ماں کے حوالے سے اپنی تڑپ کے بارے میں بھی عمو نے راجا کو بہت کچھ بتایا تھا۔ ایک دن بیڑی پیتے پیتے اس نے اچانک عمو سے پوچھا۔ ”یہاں سے بھاگنا ہے عمو؟“

عمو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ... کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ ہکلایا۔

”یہ مجھ پر چھوڑ۔ یہ بتا یہاں سے بھاگنا ہے تجھے؟“

عمو نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر بولا۔ ”ہاں... پر اکیلے نہیں۔ شبّو کے ساتھ۔“

”ٹھیک ہے، اس کو بھی لے چلتے ہیں لیکن... میری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”گھبرا مت یارا۔ کوئی ایسی شرط نہیں۔ تُو آسانی سے پوری کر دے گا لیکن تجھے بتاؤں گا بعد میں۔“

”لیکن... تم ہمیں یہاں سے نکالو گے کس طرح؟“ عمو نے پوچھا۔

”کہا ہے نا، یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ بس تمہیں تھوڑی سی ہمت دکھانی پڑے گی۔“

”تمہارے اندازے سے بڑھ کر ہمت دکھاؤں گا۔“ عمو نے عجیب ولولے سے کہا پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ ”مگر پروگرام کب کا ہے؟“

”بس ایک دو دن کے اندر۔ تیری مالکن ماجھاں سے کوئی شے خریدنی ہے۔ اس کا سودا ہو جاتا ہے تو پروگرام پکا کر لیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے بھاراجے... پر میری تو ملاقات شبّو سے ہوتی نہیں ہے۔ کسی طرح تو اس سے ملاقات کر لے اور اسے بتا دے کہ وہ بھاگنے کے لیے تیار رہے۔“

”اور اگر وہ نہ مانی تو؟“

”تم اسے ساری بات بتانا نا۔ اسے بتانا کہ ماجھاں کا ڈکیت بھائی بس دو تین ہفتے میں یہاں تشریف لانے والا ہے۔ وہ آ گیا تو پھر اس کے لیے بڑی مصیبت ہو جائے گی۔ اسے ساری حقیقت کھول کر سمجھا دینا۔“

راجا نے چالاکی دکھائی اور اگلے روز مہمان خانے میں شبّو سے ملاقات کر لی۔ نہ صرف ملاقات کر لی بلکہ کالے اور صوفی کو چکما دے کر دو تین منٹ کے لیے عمو کو بھی اس ملاقات میں شریک کر لیا۔ شبّو بھی شاید اپنی طرف بڑھنے والے خطروں کو بھانپ چکی تھی۔ اس نے نیم رضا مندی ظاہر کر دی۔

اگلا روز عمو کے لیے بہت افسوس ناک تھا۔ وہ بمشکل اپنے آنسو ضبط کر سکا۔ صبح سویرے حویلی میں یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ دینے مسلی کا پڑھا لکھا بیٹا باؤ سلیم جو شدید زخمی تھا، گجرات کے اسپتال میں انتقال کر گیا ہے۔ وہ ماجھاں کے ظلم کے... شاہ کاروں میں سے ایک شاہ کار تھا۔ اس کی خطا صرف یہ تھی کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی اور جاہلیت میں غرق اس ”ٹبکیراں گاؤں“ میں بچوں کو پڑھانا چاہتا تھا۔ وہ افسر بننے کے لائق تھا، پر ماجھاں نے اسے حویلی میں رکھ کر کتّی... کا کام سونپا تھا۔ اسے اپنی عیاشی کا سامان بنایا تھا اور ذلیل و خوار کیا تھا۔ وہ بیس بائیس سال کا تھا۔ اس عمر میں تو زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ سپنے دیکھے جاتے ہیں۔ راستے چنے جاتے ہیں۔ تازہ حوصلوں کے ساتھ سہانی مسافتوں کی شروعات ہوتی ہے اور وہ خشک ہونٹوں، ویران آنکھوں کے ساتھ منوں مٹی کے نیچے جا سویا تھا۔ بظاہر اس کی موت گھوڑنے والے حادثے کی وجہ سے ہوئی لیکن یہ حادثہ نہ ہوتا تو کوئی اور ہو جاتا۔ اس حویلی میں اس کی زندگی کو برباد تو ہونا ہی تھا۔

باؤ سلیم والے واقعے نے عمو کے ارادے کو مزید پختہ کیا۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ راجا کا تعاون حاصل کرے گا اور شبّو سمیت اس حویلی سے نکلنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ اس دن شام کو جب وہ راجا کے ساتھ ڈیرے پر بیٹھا تھا اور اس کے ہاؤنڈ کتّے کو اپنے ہاتھ سے گوشت کھلا رہا تھا، راجا نے سرگوشی میں ماجھاں کو ایک کلاسیکل گالی دی اور بولا۔ ”عمو! تیری خاطر ایسا کنڈم سودا کر رہا ہوں، نہیں تو قسم سے لات مار دیتا اس مال پر اور مال والی کی ”تشریف“ پر۔“

”کس مال کی بات کر رہے ہو بھاراجے؟“ عمو نے پوچھا۔

راجے نے قمیص کے نیچے سے چاقو نکالا اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد قریب رکھے ایک چھوٹے سے تربوز کو بیچ میں سے کاٹ دیا۔ عمو دنگ رہ گیا۔ تربوز اندر سے بالکل خالی تھا۔ اس کے خول میں پولیتھین کا ایک موٹا لفافہ تھا۔ لفافے میں کوئی سیاہی مائل شے نظر آ رہی تھی۔ یہ افیم تھی۔ راجا نے تھوڑی سی افیم نکالی۔ اسے چٹکی میں مسلا۔ زبان کی نوک سے چکھا پھر ناک سے لگایا... اور دوبارہ ماجھاں کو گالی دی۔ ”ایک دم کنڈم ہے۔ جتنے پیسے مجھ سے لے رہی ہے، اس سے آدھے بھی نہیں دینے چاہئیں۔ پر تیری اور شبّو کی خاطر یہ گھاٹا بھی قبول ہے۔“ وہ اپنے خاص انداز میں مسکرایا۔

”تو کیا تمہیں یہ افیم کہیں لے کر جانی ہے؟“

”تو کیا خود کھا کر اللہ بخشے ہونا ہے؟“

عمو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”ایسے چھوٹے سائز کے آٹھ دس تربوز ایسے ہیں جن میں یہ افیم بھری گئی ہے۔ ان تربوزوں کو دوسرے تربوزوں میں ملا کر لوڈر میں بھر دیا جائے گا۔ کسی کے باپ کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ تربوزوں میں ”کھوچل“ تربوز بھی ہیں۔“

”پہلے بھی یہ کام کرتے رہے ہو؟“

”ہاں، دو چار بار تو کیا ہے۔ ایک دم ٹیسٹ کام ہے۔ یہ دیکھو، تربوز پر مٹی وغیرہ بھی لگی ہوئی ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ جوڑ کہاں ہے۔ اسے آپاں ماجھاں کے کارندے مسالا لگا کر بڑی صفائی سے جوڑ دیتے ہیں۔“ ماجھاں کو ماجاں کہتے ہوئے اس کے چہرے پر شریری سی چمک آ جاتی تھی۔

عمو نے کہا۔ ”بھاراجے! تم نے یہ کیوں کہا ہے کہ یہ گھاٹے کا سودا تم میرے اور شبّو کے لیے کر رہے ہو؟“

اس نے اپنے لمبے بالوں کو سہلایا اور بولا۔ ”یارا! ان تربوزوں کی آڑ میں ہی تو تم دونوں کو یہاں سے لے کر جانا ہے۔ لوڈر پر تربوزوں کا ڈھیر ہو گا اور اس کے اندر ہی تمہارے بیٹھنے کے لیے جگہ ہو گی۔“

”بھاراجے! کہیں تربوزوں کے نیچے ہماری سانس ہی نہ گھٹ جائے۔ تم نے دیکھا ہی ہے، شبانہ تو ویسے بھی ملوک سی ہے۔“

”اور یہ تربوز بھی تو دیکھو ملوک سے ہیں۔ بڑے خربوزے جتنا سائز ہے ان کا۔“ راجا نے تربوز کو ہاتھوں میں گھمایا۔

☆☆☆

قریباً اڑتالیس گھنٹے بعد وہ تینوں حویلی سے نکلنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ راجا کو صبح سویرے حویلی سے روانہ ہونا تھا۔ کتّوں والے تین پنجرے اور تربوز رات کو ہی لوڈر پر بار کر دیے گئے تھے۔ آدھی رات کے بعد راجا نے ان تربوزوں میں سے پچیس تیس دانے علیحدہ کر کے ڈیرے میں پڑی پرالی کے اندر چھپا دیے۔ یہ تربوز کم ہونے سے اتنی گنجائش پیدا ہو گئی کہ عمو اور شبانہ بھی تربوزوں میں چھپ سکیں اور تربوزوں کا حجم بھی زیادہ نظر نہ آئے۔ مویشی خانے میں اپنے دیرینہ ساتھی مولے سے عمو نے رات ہی کو الوداعی ملاقات کر لی تھی۔ بہرحال، مولے کو یہ ہرگز پتا نہیں تھا کہ یہ الوداعی ملاقات ہے۔ پروگرام کے مطابق صبح اجالا ہونے سے پہلے ہی عمو اور شبانہ ڈیرے پر راجا کے پاس پہنچ گئے۔ راجا نے بڑی احتیاط سے انہیں خستہ حال لوڈر کے اندر تربوزوں میں چھپا دیا۔ تربوزوں کے اندر خلا موجود تھا، اس لیے عمو اور شبانہ کو سانس لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ بہرطور پھل کا بوجھ وہ اپنے جسموں پر ضرور محسوس کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ حالات ان کے حق میں ہیں۔ آدھی رات کے وقت ہی ماجھاں تین گھڑ سواروں کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ ان میں عقابی آنکھوں والا ماکھا بھی شامل تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ ماجھاں کا ڈکیت بھائی کسی پاس کے گاؤں میں آیا ہوا ہے اور وہ اس سے ملنے گئی ہے۔

صبح کے ملگجے میں راجا کا لوڈر ایک جگر پاش آواز کے ساتھ اسٹارٹ ہوا۔ یوں لگا کہ پوری حویلی اس کی پاٹ دار آواز سے تھرّانے لگی ہے۔ وہ اتنا دھواں اگل رہا تھا کہ کئی ٹرک ایک ساتھ مل کر بھی نہیں اگل سکتے تھے۔ کچھ دیر اس کے پہیوں نے حرکت کی اور وہ حویلی کے بڑے پھاٹک سے گزر کر کچے راستے پر آ گیا۔ یہاں ماجھاں کے مسلح کارندے

موجود تھے اور وہ جانتے تھے کہ اس لوڈر میں کیا جارہا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ "جو کچھ" جارہا ہے اس کے نیچے کیا جارہا ہے۔

لیکر اس گاؤں کی مختلف گلیوں سے گزرنے کے بعد لوڈر باہر جانے والے کشادہ راستے پر آ گیا۔ گاہے بگاہے راجا کی چہکتی ہوئی آواز عمو اور شبانہ کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ وہ راہ میں ملنے والے کسی شخص کو سلام کرتا یا اس کے سلام کا جواب دیتا تھا۔ ان ملنے والوں میں زیادہ تر یقیناً ماجھاں کے کارندے ہی تھے۔

لوڈر کے اندر تربوزوں کے نیچے عمو اور شبانہ ایک دوسرے سے پیوست ہو کر لیٹے تھے، ایسا کرنا ان کی مجبوری تھی۔ صورتِ حال تناؤ بھری تھی، اس کے باوجود شبانہ کے جسم کا پُرگداز لمس عمو کے سراپا میں سنسنی دوڑا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ شبانہ کے چھوٹے چھوٹے ملائم بالوں پر رکھ دیے اور سرگوشی میں بولا۔ "شبّو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، ہم ساتھ جئیں مریں گے۔"

"میں بھی..." شبّو نے اپنا چہرہ اس کے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی خوب صورت ناک کی چبھن اپنے سینے پر عمو کو بڑی بھلی محسوس ہوئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں چھپا لے۔ اسے اتنا پیار کرے کہ گزرے ہوئے سال کے ان سارے زخموں کا مداوا ہو جائے جو اس کے کومل جسم پر لگے ہیں۔

لوڈر کو لگنے والے جھٹکے بتا رہے تھے کہ اب اس کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ ان جھٹکوں کے ساتھ تربوزوں کا بوجھ بھی تکلیف دہ ہوتا جارہا تھا۔ کبھی کبھی شبانہ کو کراہنا پڑتا اور وہ کسمسانے لگتی۔ ایک جگہ پہنچ کر لوڈر کی رفتار سست ہونے لگی اور پھر وہ رک گیا... عمو سمجھ گیا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں اور راجا شاید ان پر سے تربوزوں کا بوجھ کم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے... لیکن اصل صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ عمو اور شبانہ اس سے یکسر بے خبر تھے...

چند سیکنڈ بعد انہیں اپنے اردگرد گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں اور پھر ایک پاٹ دار آواز سن کر عمو کا کلیجا منہ کو آ گیا۔ یہ ماجھاں کی آواز تھی اور وہ راجا سے اس کا حال چال پوچھ رہی تھی۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس گاؤں کی طرف جارہی ہے۔

شبانہ کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ سہم کر عمو سے چمٹ سی گئی۔ چند لمحے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہو گئی۔ ماجھاں کی آواز آئی۔ اس نے راجا سے پوچھا۔ "مال ٹھیک ٹھاک جارہا ہے؟"

"بالکل ٹیٹ آپاں۔" راجا نے مختصر جواب دیا۔

ماجھاں تربوزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ کسی کسی تربوز کو وہ انگلی کی گانٹھ سے ٹھونک کر بھی چیک کرتی۔ عمو کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ دونوں کسی بھی وقت ماجھاں کی نظر میں آ سکتے تھے۔ وہ دم سادھے لیٹے رہے۔ یکایک عمو کے پاؤں کے پاس حرکت ہوئی۔ وہاں سے تربوز اٹھایا گیا تھا۔ عمو کا پاؤں ننگا ہو چکا تھا۔ دو سیکنڈ بعد ماجھاں کی پُرحیرت آواز عمو کے کانوں میں پڑی۔ "اوئے... یہ کیا ہے؟"

اس کے ساتھ ہی عمو نے ایک کرخت گرفت اپنے ٹخنے پر محسوس کی۔ یقیناً یہ ماجھاں ہی تھی۔ اس نے عمو کی ٹانگ کو پوری طاقت سے کھینچا اور اسے تربوزوں کے نیچے سے باہر گھسیٹ لیا۔ سورج کی چمکیلی کرنوں میں عمو نے ماجھاں کا بہت بڑا تھوبڑا دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب ناک چمک تھی اور اس کی رنگت "سیاہی مائل سرخ" ہو رہی تھی۔ عمو نے دیکھا کہ راجا لپک کر دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا ہے۔ عمو کے اندر ایک مدت سے دھیرے دھیرے جو بغاوت پروان چڑھ رہی تھی، وہ یکایک توانائی بن کر اس کے دست و بازو میں دوڑ گئی۔ اَن گنت شب و روز سے سینے کے اندر سلگتا ہوا انگارہ دفعتاً شعلہ جوالا بن گیا۔ عمو نے پوری طاقت سے اپنا دایاں ہاتھ گھمایا اور ماجھاں کے چربی دار تھوبڑے کو نشانہ بنایا۔ یہ مکا نہیں تھا، نہ ہی تھپڑ تھا۔ یہ دونوں کی درمیانی شکل تھی... یہ بڑی کارگر ضرب تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی... اس کے پیچھے بہت سے زخموں کا درد، بہت سے دکھوں کی تلخی اور بہت سی توہین کا زہریلا احساس موجود تھا۔ اس چوٹ نے "چٹاخ" کی آواز پیدا کی اور ماجھاں اپنے تنومند جسم کے ساتھ اچھل کر دور جا گری۔ اس کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔

یہی وقت تھا جب ماکھے نے عمو کو ایک گندی گالی دی اور اچھل کر لوڈر پر چڑھا۔ اب عمو کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ یہ چاقو اسے راجا نے ہی علی الصباح دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ماکھا اپنی رائفل کندھے سے اتارتا اور اسے عمو اور شبانہ کی طرف سیدھا کرتا، عمو ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا۔ راجا نے اسے تاکید کی تھی کہ کسی کو جان سے نہیں مارنا ہے۔ اگر یہ تاکید عمو کے ذہن میں نہ ہوتی تو وہ شاید سیدھا ماکھے کے پیٹ میں چاقو گھونپتا لیکن اس نے ماکھے کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ پہلے اس نے ماکھے کی بائیں ران میں دستے تک چاقو اتارا پھر اس کی دائیں ران پر جانگ کے بالکل پاس وار کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سر کی شدید ضرب ماکھے کے پیٹ میں لگا کر اسے لوڈر سے نیچے پھینک دیا۔ اس وقت تک لوڈر حرکت میں آ چکا تھا اور اپنے پیچھے سیاہ دھوئیں کے بادل چھوڑتا رفتار پکڑ رہا تھا۔

"تیز چلاؤ بھارا جے۔" عمو نے پکار کر کہا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا اور اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

اس نے زخمی ماکھے کو گرد میں لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ باقی دو افراد ماجھاں سمیت تیزی سے گھوڑوں پر سوار ہوتے نظر آئے۔ دھول سے اٹے ہوئے اونچے نیچے راستے پر راجا کا پاٹے خاں تیزی سے بھاگتا چلا گیا۔ اس نے غیر متوقع رفتار پکڑ لی اور اس رفتار کی وجہ سے بعض جگہ کئی کئی فٹ اچھل رہا تھا۔ خطرے کو محسوس کر کے کتے قیامت خیز شور مچا رہے تھے۔ تربوز لڑھک لڑھک کر لوڈر سے نیچے گرتے چلے جارہے تھے۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے عمو اور شبانہ نیچے بیٹھ گئے اور ایک اینگل آئرن کا سہارا لے لیا۔

"وہ... وہ پیچھے آ رہے ہیں۔" عمو نے چلّا کر راجا کو اطلاع دی۔

"جو آتا ہے آنے دو۔" کیبن کی طرف سے راجا کی پُرجوش آواز آئی اور اس کے ساتھ لوڈر کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔

ماجھاں کے دونوں ساتھیوں میں سے کالیے کے کندھے پر رائفل موجود تھی۔ تاہم سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے پر سے گولی چلانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ لوڈر کی طرف دو تین فائر کیے گئے مگر ان میں سے کوئی لوڈر کو نہیں لگا۔ عمو نے دیکھا، سامنے ایک بہت بڑا بارشی جوہڑ تھا اور راستہ بند نظر آتا تھا۔ دائیں بائیں اونچے اونچے کھیتوں نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ "ہائے... اب کیا ہوگا؟" شبانہ نے بالکل مری ہوئی آواز میں کہا۔

یہی سوال عمو کے دماغ میں بھی تھا لیکن پھر یہ دیکھ کر عمو کو حیرت ہوئی کہ راجا نے لوڈر کو بلاتردد جوہڑ میں اتار دیا ہے۔ کھٹارا لوڈر کا سائلنسر تھوڑی سی بلندی پر لگایا گیا تھا تاکہ پانی وغیرہ سے محفوظ رہے۔ یہ جان کر عمو کو حیرت ہوئی کہ لوڈر جیسے تیسے ہچکولے کھاتا اس ڈھائی تین فٹ اونچے پانی سے گزرتا چلا گیا۔ عقب میں دھول اور دھوئیں کے بادل چھٹ گئے تھے۔ ماجھاں اور اس کے دونوں ساتھی نظر آ رہے تھے۔ ماجھاں کے دونوں ساتھی گھڑسوار تو جوہڑ کے کنارے کنارے بائیں طرف بھاگے تاکہ کلاوا کاٹ کر جوہڑ کی دوسری طرف پہنچ جائیں مگر مشتعل ماجھاں نے اس نصف فرلانگ چوڑے جوہڑ کا چکر کاٹنے کا رسک نہیں لیا اور اپنا گھوڑا لوڈر کے پیچھے ہی سیدھا جوہڑ میں ڈال دیا۔ غیظ و غضب نے اسے جیسے دیوانہ کر رکھا تھا۔ جوہڑ کے درمیان پہنچ کر ماجھاں کے گھوڑے نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ماجھاں نیچے اتری اور پا پیادہ ہی لوڈر کے پیچھے لپکی۔ وہ کسی فربہ اندام آبی مخلوق کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ چلّا رہی تھی اور لوڈر کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوڈر یعنی راجا کے پاٹے خاں نے توقع سے بڑھ کر اس کا ساتھ دیا اور جوہڑ سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ ماجھاں تب تک کافی نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اس کے پاس پستول نہیں تھا ورنہ اس موقع پر وہ ضرور فائر کرتی۔ راجا کے پاس بھرا ہوا پستول موجود تھا لیکن اس نے یہ ساری کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی عمو کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی کی جان سے مارنے کا رسک نہیں لیں گے۔ اگر بہت زیادہ پھنس گئے تو پھر زخمی کرنے کی حد تک جائیں گے۔

جونہی پاٹے خاں خشکی پر پہنچا، ماجھاں بھی پہنچ گئی۔ اس کا جسم فربہ ضرور تھا لیکن ساتھ ہی صحت مند اور زور آور بھی تھا۔ بہ وقتِ ضرورت وہ خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کر سکتی تھی۔ اب بھی وہ اپنے گھٹنے ہوئے جسم کی پوری توانائی کے ساتھ پاٹے خاں کے پیچھے لپکی تاکہ اس پر ہاتھ ڈال سکے اور پھر پائدان پر پاؤں رکھ کر اس پر چڑھ سکے۔ اور وہ جانتی تھی کہ یہ کام اسے پاٹے خاں کے رفتار پکڑنے سے پہلے پہلے کرنا ہے... یہ بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے تیزی سے پاٹے خاں پر ہاتھ ڈالا۔ آہنی کنارہ اس کے ہاتھ میں آیا... مگر اس کا پاؤں ٹھیک سے پائدان پر نہیں پڑا۔ وہ گری اور پھر لوڈر کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

شبانہ عمو سے چمٹی ہوئی تھی اور چلّا رہی تھی۔ اس کے لیے ماجھاں کسی "موذی جانور" کی طرح تھی جو لوڈر پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے عمو حیران ہوا کہ ماجھاں کی گرفت کتنی مضبوط ہے جو وہ بھاری تن و توش کے ساتھ لوڈر کے پیچھے گھسٹتی چلی آ رہی ہے۔ مگر پھر اسے اصل حقیقت کا پتا چلا۔ ماجھاں کی کلائی کا موٹا دھاتی کڑا لوڈر کے ایک زیریں ہُک میں اٹک گیا تھا۔ ایسے ہُک عموماً ترپال وغیرہ تاننے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

راجا نے چلتے لوڈر کی کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی پھر پکار کر پوچھا۔ "کہاں ہے ماجاں؟"

"پیچھے گھسٹ رہی ہے۔ چھوڑ نہیں رہی۔" عمو ہانپی آواز میں بولا۔

"چھڑا دو۔ کوئی چیز مار دو۔"

"اس کا کڑا ہُک میں پھنس گیا ہے۔"

"زور لگا کر نکال دو۔" راجا پکارا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دونوں گھڑسواروں نے جوہڑ کا چکر مکمل کرلیا ہے اور اب تیزی سے لوڈر کے پیچھے آرہے ہیں۔

تنومند ماجھاں کے لوڈر کے پیچھے گھسٹنے کا منظر دیدنی تھا۔ وہ قریباً کندھوں تک گھسٹ رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ غضب ناک انداز میں چلا بھی رہی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اپنا دوسرا ہاتھ استعمال کرتی تھی اور کڑے کو ہُک سے نکالنے کی کوشش کرتی تھی... لوڈر کو لگنے والے کسی جھٹکے کی وجہ سے کڑا خود بخود بھی ہُک میں سے نکل سکتا تھا... عمو کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ نفرت الاؤ بن چکی تھی۔ ماں بہن کی وہ ان گنت گالیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں جو گزرے ماہ وسال میں اسے دی گئی تھیں۔ وہ سارے تھپڑ، وہ سارے زخم، ساری توہین اور وہ سارے کراہت آمیز لمحے اس کے تصور میں تھے جن سے اس کا واسطہ پڑتا رہا تھا۔

اس نے ماجھاں کی کلائی اور آہنی ہُک کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا کہ ان کے "جدا" ہونے کا امکان کم سے کم ہوگیا۔ فرنٹ سیٹ پر سے راجا کی آواز آئی۔ "ہاں عمو! کڑا چھوٹ گیا؟"

"نہیں بھاراجے... بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔" وہ ایسے انداز میں بولا جیسے کڑا چھڑانے کے لیے زور لگا رہا ہو۔ حالانکہ وہ کڑا پھنسائے رکھنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا سفاک جھوٹ تھا جو اس نے بولا... ماجھاں کی موت کا منظر بڑا بھیانک تھا۔ وہ لوڈر کے پیچھے گھسٹتے ہوئے اچھل رہی تھی، پلٹ رہی تھی، چلا رہی تھی۔ اس کا چربیلا جسم لہو لہو ہو رہا تھا۔ کپڑے پھٹ رہے تھے، چمڑی اتر رہی تھی۔ کچے راستے کے کنارے، ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے سے وہ ٹکرائی، اس کا لہولہان چہرہ ایک طرف سے پچکا ہوا نظر آیا۔ اپنی آنکھوں کو ان مناظر سے محفوظ رکھنے کے لیے شبانہ لوڈر کے فرش پر بیٹھ گئی تھی اور اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔

راجا جانتا تھا کہ کالیا اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تیزی سے پیچھے آرہے ہیں۔ وہ اپنے "پاٹے خاں" کی رفتار کم نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے پھر چلّا کر پوچھا۔ "کڑا چھوٹا؟"

"نہیں بھاراجے۔" عمو نے پھر وہی جواب دیا۔

ماجھاں اب تقریباً ایک لاش میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اس کے جسم کے کئی حصوں کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہ دیکھنے کے بعد عمو نے اس کی کلائی اپنی طرف کھینچ کر تھوڑا سا زور لگایا اور دھاتی کڑے کو ہُک میں سے نکال دیا۔ ماجھاں کی خونچکاں لاش چند پلٹیاں کھا کر کنارے پر اگی ہوئی جھاڑی میں جا رکی۔

لوڈر کی رفتار ایک دم تیز ہوگئی۔ عقب میں دھول کے بادل کچھ اور دبیز ہوگئے۔ کچھ ہی دیر بعد ماجھاں اور اس کے دونوں ساتھی ان بادلوں کی اوٹ میں اوجھل ہوگئے۔

☆☆☆

راجا کا مکان ٹھیکرا نامی گاؤں میں تھا۔ مکان کا احاطہ کافی بڑا تھا۔ ایک طرف گھوڑوں کو سدھانے اور بھگانے کے لیے علیحدہ جگہ تھی۔ لوہے کے کئی زنگ آلود پنجرے بھی یہاں نظر آرہے تھے۔ عمو نے ماجھاں کو بہت بُری حالت میں دیکھا تھا لیکن وہ ابھی تک یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مری ہے یا نہیں۔

راجا ازحد پریشان تھا۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتا تھا کہ ماجھاں پر کیا بیتی ہے۔ عمو اور شبانہ کو گھر چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح آیا تھا۔ کتوں والے پنجرے اور بچے کھچے تربوز ابھی تک لوڈر میں ہی تھے۔ راجا آتے ساتھ ہی چلایا۔ "عمو... جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ بس دو منٹ لگاؤ۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"جو نہیں ہونا چاہیے تھا... مرگئی ہے۔ کیکراں میں تر تھلی مچی ہوئی ہے۔ اب کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" اس نے لوہے کا ایک پنجرہ گھسیٹ کر لوڈر کے قریب کیا۔ اس میں کتے کے چند چھوٹے پلّے تھے۔

عمو نے اس خبر پر بظاہر دکھی چہرہ بنایا لیکن درحقیقت اس کے سینے میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ راجا کے ساتھ مل کر اس نے پلّوں والا پنجرہ لوڈر پر چڑھایا۔ راجا نے افراتفری میں کچھ چیزیں ایک بیگ میں رکھیں اور لوڈر میں آبیٹھا۔ اس کے اشارے پر عمو اور شبانہ بھی سوار ہوگئے۔ پاٹے خان کا انجن پُرشور آواز سے بیدار ہوا۔ غالباً سائیلنسر کو نقصان پہنچنے سے پاٹے خاں کچھ اور بھی "پاٹے خاں" ہوگیا تھا۔ دو منٹ کے اندر اندر وہ لوگ گھر چھوڑ چکے تھے اور تیز رفتاری سے کسی نامعلوم مقام کی طرف جارہے تھے۔

شبانہ کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ اس کے لیے وہ مناظر ہی کم خوفناک نہیں تھے جو جوہڑ سے نکلنے کے بعد پیش آئے تھے۔ اب وہ ماجھاں کی موت کی مصدقہ اطلاع بھی سن رہی تھی... اور ماجھاں کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ وہ اس علاقے کی "پھولن دیوی" تھی۔ ہر جگہ اس کے تعلقات تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تاجے جیسے ڈکیت کی بہن تھی۔ اگر راجا پریشان تھا تو اس کی پریشانی سمجھ میں آتی تھی۔

اس مرتبہ پاٹے خاں پر ان کا سفر بغیر رکے قریباً آٹھ گھنٹے جاری رہا۔ ڈیزل ختم ہوگیا تو کیبن میں رکھا ہوا ایک "دکین" کام آیا۔ ایک جگہ انہیں سخت جان پاٹے خاں کا پہیا بھی تبدیل کرنا پڑا۔ ان کا سارا سفر کچے راستوں اور بے آباد زمینوں کا تھا۔ چھوٹے موٹے ٹیلے اور کٹی پھٹی زمین ان کے راستے میں آرہی تھی۔

وہ اب پنجاب کی ایک اور دور دراز بستی میں پہنچے۔ اس کا نام شادپورہ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں سے قریب ترین پکی سڑک قریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ نزدیکی شہر خوشاب تھا اور اس کا فاصلہ بھی کم وبیش چالیس کلومیٹر تھا۔ شادپورہ سے باہر ہی آموں کا ایک بڑا باغ تھا۔ اس باغ کے اندر ایک کھلے احاطے والا گھر تھا۔ یہ باغ اور جگہ کبیر احمد نامی ایک ادھیڑ عمر شخص کی ملکیت تھی۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا اور بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ دو تین سال پہلے کبیر کو راجا نے ایک بڑے حادثے سے بچایا تھا۔ ان دنوں کبیر کی اپنی ٹریکٹر ٹرالی تھی۔ وہ پھل بیچ کر خوشاب منڈی سے گاؤں واپس آرہا تھا۔ نوانا کے قریب اسے موٹر سائیکل سوار راہزنوں نے روک لیا اور لوٹنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ فائر کی آواز سن کر راجا اپنے لوڈر پر وہاں پہنچا۔ اس کے پاس پستول تھا۔ اس نے ہوائی فائر کیے اور ڈاکوؤں نے اس پر سیدھی فائرنگ کردی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ ڈاکوؤں کا ایک ساتھی شدید زخمی ہوا، دوسرے کو راجا نے پکڑ لیا تھا۔ اردگرد کے کھیت مزدور موقع پر پہنچ گئے اور ڈاکو فرار ہوگئے۔

کبیر احمد اس واقعے کے بعد راجا کا بہت زیادہ احسان مند تھا۔ اس نے دو تین بار راجا کو خط لکھا کہ وہ اس کے پاس شادپورہ آئے۔ وہ خود تو ٹانگ کے زخم کی وجہ سے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب راجا، عمو اور شبانہ سمیت اس شخص کے پاس پناہ کے لیے پہنچا تھا۔

چالیس پینتالیس سالہ کبیر احمد ایک خوش اخلاق اور ہمدرد شخص ثابت ہوا۔ اس نے ان تینوں کو محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر ہیں۔ راجا نے کبیر احمد کو اصل کہانی تو نہیں سنائی تھی، تاہم بتایا تھا کہ ایک دشمنی کی وجہ سے اسے کم از کم ڈیڑھ دو ماہ کے لیے یہاں پناہ چاہیے۔ کبیر احمد نے مسکرا کر کہا تھا۔ "ڈیڑھ دو ماہ کیا یار! تم ویسے ہی یہاں پر ٹک جاؤ۔ یہ دیکھو، باغ اجڑ رہا ہے۔ میرا آگے پیچھے کون ہے جو اسے سنبھالے گا۔ گھر والی اللہ کے پاس چلی گئی ہے۔ ایک بیٹی تھی جو بیاہ کر اپنے گھر کی ہوگئی ہے۔ بیٹا ایسا دبئی گیا ہے کہ اس نے چھ سال سے پلٹ کر نہیں دیکھا۔"

یہ بڑی ٹھنڈی اور پُرسکون جگہ تھی۔ ہر طرف درختوں کے سائے تھے۔ کبیر نے ایک چھوٹا ٹیوب ویل لگا رکھا تھا جسے پیٹی کہتے تھے۔ یہ پیٹی ڈیزل انجن سے چلتی تھی۔ کبیر نے شاید اپنی تنہائی کم کرنے کے لیے بہت سی مرغیاں، بطخیں اور طوطے پال رکھے تھے۔ کچھ بطخیں اور مرغیاں بہت مہنگی تھیں جنہیں وہ لاہور سے لے کر آیا تھا۔ کبیر یہاں اپنے نہایت قابلِ اعتماد ملازم محمد شریف اور اس کی بیوی مریم کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ دونوں بے اولاد تھے۔ کبیر نے عمو کو پتر اور شبانہ کو دھی رانی کہہ کر بلانا شروع کردیا۔ راجا کو وہ اس کے نام سے بلاتا تھا۔ راجا اسے وڈا بھا کہتا تھا۔ گاؤں میں کبیر نے اپنے ملنے والوں کو یہی بتایا کہ یہ اس کے دور پار کے رشتے دار ہیں۔

وہ تینوں ایک نہایت محفوظ مقام پر آگئے تھے، اس کے باوجود راجا، عمو اور شبانہ کے دلوں میں ماجھاں کی موت کا خوف موجود تھا۔ یقینی بات تھی کہ علاقے میں بڑی کھلبلی مچی ہوگی۔ شبانہ کو یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں اس واقعے کی وجہ سے اس کی والدہ اور دیگر رشتے داروں پر کوئی آفت نہ آئے۔ وہ ہر وقت گم صم رہتی۔ عمو اور راجا اس کی دل جوئی میں لگے رہتے۔ وہ ہر آہٹ پر چونک جاتی۔ ہر اجنبی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ بہرحال جب بیس پچیس روز خیریت سے گزر گئے تو بتدریج ان کا خوف کم ہونے لگا۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ وہ یہاں خیریت سے ہیں۔

ایک روز، رات کو بڑی مزیدار ہوا چل رہی تھی۔ عمو اور راجا گھر کی چھت پر چارپائیاں ڈالے لیٹے تھے اور سگریٹ پھونک رہے تھے۔ عمو نے دل فگار لہجے میں کہا۔ "بھاراجا! میری ماں کا پتا کراؤ۔ اللہ جانے وہ کس حال میں ہوگی۔ وہ تو میرے بغیر ایک دن بھی بڑی مشکل سے گزارتی تھی۔ یہ ڈیڑھ دو سال اس نے پتا نہیں کیسے گزارے ہوں گے۔"

راجا بولا۔ "جو کچھ تُو سوچ رہا ہے، میں بھی وہی سوچ رہا ہوں۔ لیکن یارا! ابھی دو چار ہفتے ہمیں بالکل سکون سے گزارنے چاہئیں اور کسی طرح کا چھوٹا بڑا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔"

"لیکن بھاراجا..."

"میں تیرے اندر کی حالت سمجھتا ہوں عمو۔ تُو فکر نہ کر۔ میں نے اس بارے میں شریف سے تھوڑی بہت بات کی تھی۔ وہ بالکل ایک نمبر کا بچّل بندہ ہے۔ ہر لحاظ سے بالکل ٹیسٹ۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے تیرے گھر کا ایڈریس دے کر سنگھو پورہ

بھیجوں۔ سب کچھ معلوم کرلے گا۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم ماں جی کو یہیں بلالیں۔“

اس رات وہ اس بارے میں دیر تک بات کرتے رہے۔ شبانہ کا معاملہ بھی زیرِ بحث آیا۔ راجا نے عمو کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ”میں تو ایک بات جانتا ہوں عمو! جو کرنا ہے کرو، دنیا سے مت ڈرو۔ یہ دنیا کمینی ایک دم کنڈم ہے۔ تم شبانہ سے پیار کرتے ہو، وہ تم سے کرتی ہے۔ اس کا پہلا رشتہ کنڈم ہو چکا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں کسی مولوی کو بلا لاتے ہیں۔ ایک ٹیٹ سا کھانا پکاتے ہیں۔ خود کھاتے ہیں، مولوی صاحب کو بھی کھلاتے ہیں اور تمہارے دو بول پڑھا دیتے ہیں۔“

”یہ اتنی جلدی کیسے ہوسکتا ہے بھارا جا! کم از کم ماں کو تو یہاں ہونا چاہیے اور پھر ابھی تو میں نے شبو سے بھی ٹھیک طرح بات نہیں کی۔ کیا پتا، وہ اس طرح شادی پر راضی بھی ہو یا نہیں۔“

”تو بھی نرا بدھو ہے۔ پیارے ہم زنانی کی چال دیکھ کر اس کے پورے خاندان کے بارے میں بتادیتے ہیں۔ وہ تجھ پر سو جان سے مرتی ہے کھوتے۔ ہاں، ماں کے یہاں پہنچنے والی بات پر غور کیا جاسکتا ہے۔“

اچانک رات کے سناٹے میں بطخوں کی خوفناک قیں قیں گونجی اور اس کے ساتھ ہی شکاری کتے کا زبردست شور سنائی دیا۔ عمو اور راجا بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اترے۔ صحن کا منظر خوفناک تھا۔ راجا کا گرے ہاؤنڈ کتا جسے اس کی شعلہ مزاجی کی وجہ سے راجا علیحدہ پنجرے میں بند کرتا تھا، کسی طرح باہر نکل آیا۔ شاید پنجرے کا دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہوا تھا۔ اب یہ کتا کبیر احمد کی نایاب بطخوں پر حملہ آور تھا۔ وہ ایک بطخ کو ادھیڑ کر پھینک چکا تھا اور اب دوسری پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ کبیر احمد بھی اپنی بیساکھی کے سہارے باہر نکل آیا تھا اور بری طرح چلّا رہا تھا۔ کتے نے اب جس بطخ کو منہ میں دبوچا تھا، وہ نر یعنی بطخا تھا۔ چھ مادہ بطخوں کے لیے یہ نر کبیر احمد نے بڑی مشکلوں سے ڈھونڈا تھا۔ اب یہ پرندہ کسی بھی وقت ٹکڑوں میں تقسیم ہوسکتا تھا۔

”پارے... پارے۔“ راجا نے کتے کو اس کے نام سے پکارا اور اسے روکنے کی کوشش کی۔

کتے نے فقط ایک سیکنڈ کے لیے تڑپتے ہوئے بطخے کو چھوڑا اور دوبارہ پکڑ لیا۔ وہ پوری طرح مشتعل تھا۔ ”چھوڑ دے پارے۔ میں کہتا ہوں چھوڑ۔“ راجا نے ایک بار پھر پارے کے پٹے پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

عمو بے ساختہ راجا کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے بھی پارے کو اس کے نام سے پکارا۔ یکا یک صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہوئی۔ کتے نے زخمی پرندے کو چھوڑا اور زبردست شور مچاتا ہوا احاطے میں چکرانے لگا۔

”رک جا پارے... رک جا۔“ عمو اس کے راستے میں آیا۔

یہ عمل خطرناک تھا مگر کارگر رہا۔ کتا عمو کے اردگرد چکرانے لگا۔ پھر چند ہی سیکنڈ بعد اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ عمو نے اس کی تھوتھنی سہلائی۔ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اپنے کلاوے میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے راجا کو اشارہ کیا۔ وہ پہلے سے تیار تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کتے کے منہ پر حفاظتی جالی چڑھا دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اسے دوبارہ پنجرے کے اندر پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔

بڑے سائز کے خوب صورت بطخے کو زخم تو آئے تھے مگر طبی امداد سے اس کی جان بچائی جاسکتی تھی۔ کبیر احمد اور شریف اسے لے کر جلدی سے گودام کی طرف چلے گئے۔

اس واقعے نے راجا کی نظر میں عمو کی اہمیت اور بڑھا دی۔ عمو پر اس کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوا۔ اگلی صبح جب ایک گرم اور طویل دوپہر کی شروعات ہو رہی تھی اور وہ گھنے باغ کی ٹھنڈی چھاؤں میں چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے، راجا نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”عمو یار! تیرے اندر کوئی بات ہے ضرور۔ شاید کسی پیر فقیر کی دعا ہے تجھے۔ پالتو جانور تجھ سے بڑی جلدی ہل جاتے ہیں۔“

”یہ بات تم ہی مجھے بتا رہے ہو۔ پہلے تو کسی نے نہیں کہا۔“

”پہلے کسی نے غور ہی نہیں کیا ہوگا۔ پر میرا تو کام ہی جانوروں کو سدھانا ہے... خاص طور سے اڑیل جانوروں کو۔“

”اچھا بھارا جا! مجھے یاد آیا، جب ہم ماجھاں کی حویلی سے نکلنے کا پروگرام بنا رہے تھے، تم نے کہا تھا کہ تمہاری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔“

”ہاں... لیکن وہ کوئی ایسی خاص شرط نہیں ہے۔ تم آسانی سے پوری کرسکتے ہو... بلکہ اب تو یہ تمہارے فائدے میں بھی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ عرصہ میرے ساتھ... میرے پاس ہی رہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم گھوڑوں اور شکاری کتوں کو سدھانے میں میری زبردست مدد کرسکتے ہو۔ اگر میں تمہیں کچھ خاص خاص گر بتا دوں تو تم دیکھتے ہی دیکھتے ماسٹر بن سکتے ہو۔ اور میں تمہیں سچ کہتا ہوں، اس کام میں بڑا فائدہ ہے۔ ایک سدھایا ہوا ٹیٹ نسل کا کتا آرام سے پندرہ دس ہزار کا بک جاتا ہے۔ خرچہ وغیرہ نکال کر اس میں سے سات آٹھ ہزار تو بچ ہی جاتا ہے۔ یہ چودھری لوگ پیسے دے کر اپنے گھوڑوں کو بھی شکار کے لیے ٹرینڈ کرواتے ہیں۔“

”پر بھارا جے! میں تو ماں اور شبو کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور پتا نہیں وہ یہاں رہنا چاہیں گی یا نہیں؟“

”جب ساری بات کا پتا تمہاری امی کو چلے گا تو دیکھنا وہ خود کہے گی کہ تم ابھی یہیں رہو۔ ماجھاں کی جان نہ جاتی تو پھر اور بات تھی۔ پر اب تو اس کے وارث ہم تینوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ وہ ہمیں دور دور تک ڈھونڈیں گے۔ ہم تینوں جتنے محفوظ اس جگہ ہیں، کہیں اور ہو ہی نہیں سکتے۔“

راجا کی باتوں میں وزن تھا۔ ابھی تک اس کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ عمو اس کے بارے میں شک وشبے کا شکار ہوتا۔ اس میں کچھ خامیاں خرابیاں ضرور تھیں۔ وہ شراب اور عورت کا شوقین بھی تھا لیکن عمو اور شبانہ سے اس کا رویّہ بہت اچھا تھا۔ شبانہ کے ساتھ اس کا رویّہ بڑے بھائی جیسا تھا۔

رات کو عمو سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو وہ ساری باتیں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں جو آج دوپہر راجا کے ساتھ ہوئی تھیں۔ کل رات اس نے جس طرح مشتعل پارے کو کنٹرول کیا اور سنبھالا تھا، وہ خود اس کے لیے بھی حیران کن تھا۔ وہ سوچنے لگا کیا واقعی اس میں کوئی خاص صلاحیت موجود ہے... یا پیدا ہو رہی ہے؟ اسے کئی باتیں یاد آنے لگیں... جب ایک موقع پر ماجھاں نے سخت ناراض ہونے کے بعد اسے کتوں والی کوٹھڑی میں بند کرادیا تھا تو وہ بہت سہما ہوا تھا۔ اسے پتا تھا کہ خوفناک کتے یہاں اس کا جینا حرام کرسکتے ہیں لیکن پھر ایک دو دن میں ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ کتوں نے اس کمرے میں اسے اپنے ساتھ شریک کرلیا ہے۔ اس صورتِ حال نے راکھے اور کالے وغیرہ کو بھی حیران کیا تھا۔ پھر اسے ڈیرے کی بھوری بھینس والا واقعہ یاد آیا۔ یہ بڑی شان دار بھینس تھی لیکن دودھ دھونے کے لیے کسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔ سب کوشش کرکے ہار گئے تھے مگر عمو نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے رام کرلیا تھا۔

یہ باتیں یاد کرکے عمو کے اندر خوشی کی ایک لہر سی دوڑنے لگی۔ اس نے کہیں سے سنا تھا کہ قدرت جب دکھ دیتی ہے تو اس کا مداوا بھی کرتی ہے۔ کئی دفعہ دکھ بہت بڑا ہوتا ہے۔ انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے لیکن اس کا مداوا بھی کسی صورت میں آس پاس ہی موجود ہوتا ہے... اور اگر انسان ہمت نہ ہارے تو یہ ”مداوا“ اسے ملتا ہے۔ عمو کے لیے ماں سے جدائی کا دکھ بھی بہت بڑا تھا... ناقابلِ بیان و ناقابلِ برداشت... عمو نے یہ دکھ جھیلا تھا، شاید اسی دکھ کے اندر سے خوشی اور صلاحیت کی یہ چھوٹی سی کونپل پھوٹی تھی...

عمو عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے پہلو میں راجا اپنی چارپائی پر سو رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر کبیر احمد اور شریف کی چارپائیاں تھیں۔ شبو نیچے برآمدے میں شریف کی بیوی کے ساتھ سو رہی تھی۔

عمو ننگے پاؤں آہستہ آہستہ کچی سیڑھیاں اتر کر نیچے احاطے میں آگیا۔ پارے کے پنجرے کی چابی اس نے راجا کے تکیے کے پاس سے اٹھالی تھی۔ وہ پارے کے پنجرے تک پہنچا۔ پارا ایک غیر معمولی قد کاٹھ والا، نہایت طاقتور لیکن خطرناک جانور تھا۔ راجا بھی فی الحال اس کے قریب جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ عمو نے اس کا پنجرہ کھولا۔ ایک عجیب سا اعتماد تھا عمو کے اندر... سینے میں سنسنی خیز دھڑکنیں جاگی ہوئی تھیں۔ اپنے غیر معمولی اعتماد کے سہارے ہی عمو نے ہاتھ بڑھائے اور بگیاڑی یعنی حفاظتی جالی پارے کی تھوتھنی سے اتار دی۔ دروازہ کھلتے ہی پارا عمو کی طرف آیا۔ اس نے سیدھا اس کی گردن پر جھپٹا مارا۔ وہ چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں عمو کی شہ رگ ادھیڑ سکتا تھا لیکن یہ دوستانہ جھپٹا تھا۔ وہ اس کی گردن سے اپنی گرم تھوتھنی رگڑنے لگا۔ اس کا پارا صفت جسم مچل رہا تھا اور دُم کی گردش بڑی تیز تھی۔ عمو نے اس کی کمر اور تھوتھنی پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا تو اس کی بے قراری کم ہوتی چلی گئی۔ اب وہ عمو کے پاؤں میں لوٹ رہا تھا اور ہولے ہولے اپنا جسم اس کے جسم سے رگڑ رہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی آواز میں پسندیدگی کا اظہار تھا۔

یک لخت عمو چونک گیا۔ ایک ڈری ہوئی تیز سرگوشی عمو کے بالکل پاس سے ابھری۔ ”یہ کیا کر رہے ہو عمو؟“

عمو نے مڑ کر دیکھا، یہ شبو تھی۔ مدھم چاندنی میں اس کی پھول دار اوڑھنی سینے پر پھیلی ہوئی تھی اور بال جو اب کافی بڑے ہوگئے تھے، ریشم کی طرح چمک رہے تھے۔

”کچھ نہیں شبو۔ یہ بالکل رام ہے... دیکھو... کیسے لاڈ کر رہا ہے۔“

”لل... لیکن یہ تو بہت خطرناک ہے۔ اس نے تو راجا بھائی کو بھی زخمی کردیا تھا۔“

”مگر ہمیں نہیں کرے گا۔ یہ دیکھو، کس طرح لوٹیں لگا رہا ہے۔“ عمو نے سرگوشی میں کہا۔ شبو حیرت زدہ تھی۔ اسے

جیسے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔
عمو اسے سہلا رہا تھا، پچکار رہا تھا اور گاہے بگاہے اپنے ساتھ لپٹا رہا تھا۔ شبانہ ڈرے ہوئے انداز میں کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ پھر عمو نے شبانہ کا حوصلہ مزید بڑھانے کے لیے اپنی ننگی کلائی پارے کے کھلے ہوئے جبڑے میں دے دی۔ ایک یقین تھا کہ پارا اسے نقصان نہیں پہنچائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ پارے نے عمو کی کلائی اپنے نہایت نکیلے دانتوں میں ہولے سے دبائے رکھی اور اپنی ادائیں دکھاتا رہا۔
''کہا ہے نا پاس آجاؤ۔ کچھ نہیں کہے گا۔'' عمو نے سرگوشی میں شبانہ کو پاس بلایا۔
وہ ہمت کر کے دو قدم آگے آگئی مگر وہ اب بھی خوف زدہ تھی۔ عمو بولا۔ ''چلو اس کی کمر پر ہاتھ لگاؤ۔''
''نہیں... نہیں۔'' وہ کچھ اور سمٹ گئی۔ ''اس کو پنجرے میں بند کر دو۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔
اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر کے عمو نے پارے کو پنجرے کی طرف بلایا۔ وہ جو پنجرے میں واپس جاتے ہوئے راجا کو ناکوں چنے چبوا دیتا تھا، فوراً ہی پنجرے میں چلا گیا۔ دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد عمو شبانہ کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں لکڑی کے خالی کریٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے بچھی چارپائی پر جا بیٹھے۔ آج وہ کافی دنوں بعد ملی تھی۔ عمو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پھر بے قراری سے اپنے ساتھ لگا لیا۔
''یہ... تم سب کیسے کر لیتے ہو عمو؟'' وہ اس کے سینے سے لگی لگی منمنائی۔
''کیا مطلب؟''
''تم نے مالکن کے اتھرے گھوڑے ہیرے کو رام کر لیا۔ نجوری جیسی اڑیل بھینس تمہیں دودھ دینے لگی۔ تم کیا کرتے ہو؟''
''تمہیں بتاؤں؟'' وہ دبی دبی شرارت سے بولا۔
''ہاں بتاؤ نہ۔'' وہ معصومیت سے کہنے لگی۔
عمو نے اسے اپنے ساتھ بھینچا۔ شبو نے خود کو پیچھے ہٹایا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ''بتاؤ نا؟''
عمو نے گہری سانس لی اور مدھم چاندنی میں اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سچی بات ہے شبو! میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔ بھارا جا کہتا ہے کہ میرے ہتھ میں کرامات ہے۔ جانور مست ہو جاتا ہے...'' پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا تم کو لگتا ہے کہ میرے ہتھ میں کرامات ہے۔''
''کیا مطلب؟''
عمو نے بڑی نرمی سے اس کا ملائم گال سہلایا اور بولا۔

''کچھ لگا تمہیں؟''
وہ اس کی بات سمجھ کر ایک دم اپنے آپ میں سمٹ گئی اور شرما کر بولی۔ ''تم بڑے خراب ہو۔ کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔ میں چلتی ہوں۔''
''تم... مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟''
''تم سے نہیں... لوگوں سے ڈرتی ہوں۔''
''کیا... تمہارا دل نہیں چاہتا... میرے پاس بیٹھنے کو؟''
''چاہتا ہے... پر... اس طرح سے نہیں۔'' وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے بولی۔
عمو کے اندر جیسے ایک دم سے کوئی روشنی بجھ گئی۔ وہ اداس ہو گیا۔ شبو جو جانے کے لیے بالکل تیار تھی، عمو کی اداسی محسوس کر کے رک گئی۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر شبو نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''
عمو بولا۔ ''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شبو... جیسے جو کچھ ہے میرے ہی دل میں ہے۔ تیرے دل میں کچھ نہیں۔ بس مجبوری کی وجہ سے تو میرے ساتھ ہے۔''
وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہی، تب عجیب لہجے میں بولی۔ ''عمو! تجھے پتا ہے کہ میرا رشتہ کیوں ٹوٹا؟''
''کیوں ٹوٹا؟''
''اس لیے کہ میں نے اپنے پنڈ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ جب مالکن کے بندے مجھے اور تمہیں دریا سے پکڑ کر واپس لائے اور مالکن نے ہم دونوں کو مارا پیٹا تو اس کے ڈیڑھ دو مہینے بعد مالکن کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میری ماں نے اس کا منت ترلا کیا، اس کے پاؤں کو ہتھ لگائے اور اس نے ماں کو اجازت دے دی کہ وہ مجھے حویلی سے لے جا سکتی ہے۔ جہاں میرا رشتہ ہوا تھا، ان لوگوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوا تھا۔ وہ میری ڈولی لے جانے کو تیار تھے، پر میں نے کہا کہ میں پنڈ نہیں جاؤں گی۔ میں... میں تمہارے پاس رہنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ حویلی میں کسی وقت میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے، پر میں تمہاری دوری برداشت نہیں کر سکتی تھی...'' شبو کی آواز بھرا گئی۔
عمو ٹھٹکا ہوا اس کی جانب دیکھتا رہا۔ اس حوالے سے ان دونوں میں چند سوال جواب مزید ہوئے۔ عمو کو یقین ہو گیا کہ شبو جو کچھ بتا رہی ہے، ویسا ہی ہوا ہے۔ اس کا اپنا دل بھی بھر آیا۔ اس نے شبو کو پھر گلے سے لگا لیا۔ وہ اس کے بھیگے رخساروں کو چومنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے

گئے۔
عمو نے کہا۔ ''شبو! بھارا جا کہتا ہے، ہم دونوں شادی کر لیں۔''
''اپنے بڑوں کے بغیر ہم اکیلے یہ کیسے کر سکتے ہیں عمو! ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی تو مجھے ہر ویلے اپنی ماں اور ماموؤں کی فکر لگی رہتی ہے۔ ہماری برادری کافی بڑی ہے، پر سارے غریب لوگ ہیں۔ اگر مالکن کے مرنے کی وجہ سے ان پر کوئی آفت آئی تو وہ تو رُل کر رہ جائیں گے...''
''بھارا جا کہتا ہے، بس دو چار ہفتے گزر جائیں تو وہ شریف کو بھیج کر سارے حالات کا پتا کرا لے گا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کسی طرح میری اور تمہاری ماں بھی یہاں پہنچ جائیں۔ یا ہم ہی کہیں جا کر ان سے مل سکیں۔''
شبانہ الجھی الجھی نظروں سے عمو کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں چاندنی کا عکس تھا اور ایک سوالیہ رنگ بھی تھا۔ وہ بولی۔ ''عمو! ایک بات سچ بتانا۔ اس دن تم نے جان بوجھ کر مالکن ماجھاں کا کڑا گاڑی کے کنڈے سے نہیں چھڑایا تھا نا؟''
وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''نہیں شبو... میں نے تھوڑی سی کوشش تو کی تھی... شاید اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔''
''نہیں عمو! تم نے کوشش نہیں کی تھی... بلکہ... شاید تم نے یہ کوشش کی تھی کہ کہیں کڑا چھوٹ ہی نہ جائے... بولو... ایسا ہی ہے نا؟''
عمو کچھ دیر خاموش رہا، تب گہری سانس لے کر بولا۔
''اگر تم جانتی ہو تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟''
اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ ''عمو! تم اپنی ماں سے بہت پیار کرتے ہو نا... اور تم نے ماجھاں کو اس لیے اس طرح مارا نا کہ وہ تمہاری ماں کو گالیاں دیتی تھی؟ بولو، ایسا ہی ہوا نا؟''
عمو کے نوخیز چہرے پر چٹان کی سی سختی نمودار ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اندرونی کمروں سے کھٹ پٹ سنائی دی۔ پھر شریف کی بیوی مریم کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شبو... شبو... کہاں ہو؟''
''ہائے میں مر گئی۔'' شبو نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرا اور اوڑھنی سنبھالتی ہوئی اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ عمو کچھ دیر تک اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ جب اندرونی حصے میں خاموشی چھا گئی اور وہ دونوں چارپائیوں پر لیٹ گئیں تو عمو پنجرے میں پارے کو پچکارنے کے بعد اوپر چھت کی طرف چلا گیا۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک شبو کے بارے میں سوچتا رہا۔ ماجھاں کے مویشی خانے میں اس کا دوست مولا کہا کرتا تھا، عورت ایک بجھارت کی طرح ہوتی ہے... اس کا اندر باہر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ آج اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ ایک موقع پر ماجھاں نے شبو کو حویلی سے جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر حویلی کے خطروں کو نظر انداز کیا تھا اور وہیں پر اس کے ساتھ رہی تھی۔ اس طرح وہ اپنے رشتے سے بھی جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور یہ سب کچھ عمو کے لیے تھا۔
تین چار ہفتے بعد عمو کے لیے شدید پریشانی کا دور شروع ہوا۔ راجا نے وعدے کے مطابق شریف کو عمو کی والدہ کا اتا پتا دے کر شیخوپورہ بھیجا اور اسے ساری ضروری ہدایات بھی دیں۔ شریف کی واپسی پورے چھ دن بعد ہوئی۔ عمو بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شریف کو عمو کے گاؤں سے پتا چلا کہ کوئی ایک سال پہلے عمو کی ماں شریفاں بی بی بیٹے کی جدائی میں سخت بیمار ہو گئی تھی۔ عمو کے پنڈ میں یہی مشہور تھا کہ عمو کی والدہ شریفاں بی بی اور گاؤں کے چودھری سجاول کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کے مطابق شریفاں کے پتر عمران عرف عمو کو قریباً ڈیڑھ سال تک شہنشاہ پیر کے مزار پر خادم بن کر رہنا تھا تاکہ چودھری کے پُتر پر سے آسمانی بجلی والی نحوست ختم ہو سکے۔ اس کام کے لیے شریفاں بی بی نے چودھری سجاول سے کافی سارے پیسے لیے تھے اور اپنی زمین کے کاغذات وغیرہ بھی ٹھیک کروائے تھے۔ اس نے چودھری سجاول سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا پُتر عمو پورے سترہ چاندوں تک شہنشاہ پیر کے مزار پر چاکری کرے گا لیکن صرف پانچ مہینے بعد ہی اس کا پُتر عمو مزار سے فرار ہو گیا۔ اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی گئی، پر وہ نہیں ملا۔ کسی نے بتایا کہ وہ کراچی کی طرف نکل گیا ہے۔ مزار سے بھاگتے وقت اس نے مزار کا چندے والا گلا بھی توڑا تھا اور اس میں سے تین چار ہزار روپے نکال کر لے گیا تھا۔ صادق شاہ صاحب نے کہا تھا کہ چودھری سجاول کے پُتر والی نحوست اب اس بھگوڑے کے پیچھے ہے اور وہ کہیں بھی چلا جائے، چین سے نہیں رہ سکے گا... یہی حالات تھے جن میں عمو کی والدہ بیمار پڑی اور اس نے اپنی زمین اونے پونے داموں بیچ دی۔ اس کے بعد ایک دن پتا چلا کہ وہ پنڈ چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کو بہت ڈھونڈا گیا مگر کہیں خبر نہیں ملی۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے اپنے پُتر عمو کا پتا چل گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس پہنچ گئی ہے اور اب وہ سندھ کے کسی شہر میں چین سکون سے رہ رہے ہیں۔
شریف نے عمو کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''عمو! میں

پوری پوری پر جول کر کے آیا ہوں۔ تمہارے پنڈ میں دو دن رہنے کے بعد میں کوٹ لکھپت میں تمہارے رشتے دار نوازش علی کے گھر پہنچا۔ وہاں سے بھی ساری بات پتا کی۔ بھائی نوازش نے بھی وہی کچھ بتایا جو تمہارے پنڈ سے پتا چلا تھا۔ اس کے بعد میں ملتان گیا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہاں ایک عورت تمہاری والدہ کی پرانی سہیلی ہے بلکہ منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔ تمہاری والدہ وہاں بھی نہیں تھی۔ صغراں نامی یہ عورت خود بھی تمہاری والدہ کی گمشدگی پر سخت پریشان ہے اور کئی مہینوں سے اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

شریف کی باتیں سن کر عمو کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ اسے لگا جیسے اس کے اردگرد ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی ہے۔ اس کے ننگے پاؤں کے نیچے جلتی زمین ہے اور وہ اپنی ماں کو آوازیں دیتا پھر رہا ہے۔ کہیں... اس کی ماں کو کچھ ہو ہی نہ گیا ہو۔ وہ بیمار تھی، اس کی جدائی میں ٹوٹی ہوئی تھی، کوئی آسرا دینے والا نہیں تھا اسے۔ وہ کہاں گئی ہو گی؟ اس کی صورت دیکھنے کے لیے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی رہی ہو گی۔

اسے صادق شاہ پر، اس کے چار درویشوں پر اور چودھری سجاول وغیرہ پر بے پناہ غصہ آیا۔ اس کے سینے میں شعلہ بن جانے والی بغاوت کی چنگاری اب الاؤ کا روپ دھارنے لگی۔ ہاں، اب وہ کمزور نہیں تھا۔ اب وہ بہت کچھ کر سکتا تھا اور اسے پتا تھا کہ اگر اس کی ماں نہ ملی تو وہ "ذمے داروں" کو دن میں تارے دکھا دے گا۔ ہاں... وہ کافی بدل چکا تھا۔ وہ چاقو ابھی ہر وقت اس کے پاس رہتا تھا جس سے اس نے دو ماہ پہلے ماکھے کی ٹانگوں پر مہلک وار کیے تھے۔

☆☆☆

شریف نے اپنا کام یقیناً ذمے داری سے نبھایا تھا مگر عمو جب تک خود ماں کو نہ ڈھونڈ تا، اس کی تسلی کیسے ہو سکتی تھی قریباً ایک ماہ بعد وہ راجا کے ساتھ بڑی خاموشی سے لاہور پہنچا اور پھر اپنے خالو نوازش علی سے ملاقات کی۔ خالو نوازش علی عمو کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ "اوئے عمران! تو تو ایک دم جوان ہو گیا ہے۔" اس کے خالو نے لرزتی آواز میں کہا۔

عمو اور راجا دو دن نوازش علی کے گھر میں رہے۔ انہوں نے اپنے پتے ٹھکانے کے بارے میں نوازش علی کو کچھ نہیں بتایا تاہم اس سے سارے حالات پوچھے... خاص طور سے عمو نے اپنی والدہ کے حوالے سے سب کچھ جاننے کی کوشش کی۔ اس ساری بھاگ دوڑ میں صرف ایک نئی بات معلوم ہو سکی اور وہ یہ کہ عمو کی والدہ نے زمین بیچی نہیں تھی بلکہ اسے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ قیمتی زمین اونے پونے بیچ دے۔ اور یہ زمین اپنے ایک مزارعے کے ذریعے دراصل چودھری سجاول نے ہی خریدی تھی۔ دولت، طاقت اور جبر کی وہی صدیوں پرانی کہانی... غربت، کمزوری اور لاچاری کی وہی پرانی روداد۔

عمو شاد پورہ واپس آ گیا۔ دل میں بے پناہ درد لیے ہوئے... وہ دیوانوں کی طرح اپنی ماں کی تلاش میں گھومنا چاہتا تھا لیکن راجا نے اسے سمجھایا۔ "ابھی ماجھاں کی موت والا واقعہ تازہ ہے۔ ہم زیادہ گھومیں پھریں گے تو ہمارے لیے ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ ابھی ہمیں چار چھ ماہ بالکل چپ کر کے گزارنے پڑیں گے۔"

عمو شاد پورہ یوں واپس آیا جیسے کوئی اپنا سب کچھ لٹا کر کسی ویرانے میں آ جاتا ہے۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ بھوک نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس کی سوچیں بس اپنی ماں کے گرد ہی گھومتی تھیں۔ کہیں وہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر تو نہیں چلی گئی؟ یہ سوال تیر کی طرح اس کے دل میں لگتا تھا اور اس کی دنیا اندھیر ہو جاتی۔

ان جاں گسل لمحات میں اگر اسے شبو کی ڈھارس اور بے لوث محبت میسر نہ ہوتی تو شاید وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ وہ اس کی امید بندھاتی تھی۔ اس کے اندر آس جگاتی کہ اس کی ماں زندہ ہے اور ایک دن ضرور وہ اس کے سینے سے لگے گا۔ راجا اور شبانہ کی کوششوں سے دھیرے دھیرے عمو کو کچھ قرار آنے لگا۔ وہ مایوسی کے اندھیرے میں آس کی روشنی جلا کر دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگا۔

پارے جیسا خوفناک کتا اب عمو کا بالکل مطیع ہو چکا تھا۔ وہ اس کے اشاروں پر چلتا... کبیر احمد، شریف اور شبو وغیرہ عمو کے لیے اس کی اطاعت مندی دیکھ کر حیران ہوتے... اور بات صرف اکیلے پارے ہی کی نہیں تھی، دوسرے جانور بھی بہت جلد اس سے مانوس ہو جاتے۔ راجا ہاؤنڈ نسل کے جو نایاب پلے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا، وہ تیزی سے بڑے ہو رہے تھے۔ راجا نے انہیں شکار کے لیے سدھانے کا کام عمو کو سونپا تھا اور وہ یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔ یوں لگتا کہ اسے زیادہ محنت ہی نہیں کرنی پڑتی، جانور خود بخود اس کی مرضی و منشا سمجھنے لگتا ہے۔

کچھ دن بعد راجا کہیں سے دو مشکی گھوڑے لے کر آیا۔ یہ بھی ماجھاں کے ہیرے کی طرح اوّل درجے کے سرکش جانور تھے۔ دونوں بھائی تھے۔ ان کے رنگ ڈھنگ بالکل ایک جیسے تھے۔ اگر راجا انہیں خود سدھانے کی کوشش کرتا تو شاید اس کے لیے مہینوں درکار ہوتے لیکن عمو کے ساتھ مل کر

اس نے تین چار ہفتوں میں ہی گھوڑوں کو ایک دم سواری اور شکار کے لیے ٹرینڈ کر دیا۔ راجا دونوں گھوڑوں کو اپنے ''پاٹے خاں'' پر لاد کر لے گیا اور اس زمیندار کو دے آیا جس سے لے کر آیا تھا۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی ایک دو گھوڑے، کبھی دو چار کتے وہاں کبیر احمد کے باغ میں پہنچنے لگے۔ راجا اور عمو انہیں مل کر سدھاتے۔ گھوڑوں کو ڈکی اور سرپٹ چال سکھاتے۔ مالک کے اشاروں کو سمجھنے کی تربیت دیتے، کتوں کو پلٹنے اور جھپٹنے کی ٹریننگ دیتے۔ شکار کو پکڑنے اور پھر مالک تک لانے کا طریقۂ کار انہیں سمجھاتے... یہ دلچسپ لیکن نہایت مشکل اور کسی حد تک خطرناک کام تھا۔ عمو کی موجودگی نے اس کام کو آسان کر دیا بلکہ اب زیادہ تر ذمے داری وہ خود اٹھا رہا تھا۔ جانور کی تربیت مکمل ہو جاتی تو راجا اسے مالک کے پاس واپس لے جاتا... یا پھر مالک خود وہاں آ جاتا اور ایک دو روز وہیں باغ میں رہ کر اپنے اور اپنے جانور کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا... کام کا معاوضہ وغیرہ راجا ہی وصول کرتا۔ وہ اخراجات کے لیے عمو کو معقول رقم دے دیتا تھا۔ ویسے بھی وہ ہر طرح عمو اور شبانہ کا خیال رکھتا تھا۔ بہر حال اس کی خامیاں خرابیاں بھی اس کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ گاہے بگاہے اپنی دل پشوری کے لیے اپنے ''پاٹے خاں'' سمیت باغ سے غائب ہو جاتا اور اگلے دن یا پھر ایک دن بعد واپس آ جاتا۔

زندگی ایک ہموار رفتار سے آگے بڑھنے لگی تھی۔ جون، جولائی کے دن تھے۔ پھل پک کر تیار ہو چکا تھا۔ کبیر احمد کے لیے چلنا پھرنا اب مزید دشوار ہو گیا تھا۔ وہ ٹانگ کے ساتھ ساتھ اپنے ایک کولہے کو بھی مفلوج محسوس کرتا تھا اور وہیل چیئر استعمال کرنے لگا تھا۔ وہ، شریف، اس کی بیوی اور دو ملازم لڑکے سارا دن باغ کے کاموں میں مصروف رہتے۔ اکثر شبانہ بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگتی۔ راجا اور عمو ایک کھلے احاطے میں گھوڑوں کو دوڑاتے، ان پر سواری کرتے، بانس یا رسّی کے سرے پر گوشت کے ٹکڑے باندھ کر شکاری کتوں کو پلٹنے جھپٹنے کی تربیت دیتے۔ عمو شعلہ مزاج جانوروں کا سامنا بالکل بے خطر ہو کر کرتا اور راجا حیرت سے دیکھتا رہ جاتا۔ طویل گرم دوپہروں میں جب ہر طرف سناٹا چھا جاتا، وہ باغ کی ٹھنڈی چھاؤں میں چار پائیاں ڈال لیتے... ٹیوب ویل کے شفاف پانی میں نہاتے، اپنے باغ کے آم چوستے اور کچی لسّی کے گلاس بھر بھر کر پیتے۔ رات کا کھانا وہ سب اکٹھے کھاتے اور چھت پر بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ان ساری مصروفیات میں عمو کا دل لگا رہتا لیکن جب وہ فارغ اور اکیلا ہوتا تو ماں کی

جدائی کا غم ایک آسیب کی طرح اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیتا اور بے حال کر دیتا۔

وہ بھی ایک ایسی ہی تاروں بھری رات تھی۔ رات کی رانی اور پختہ آموں کی ملی جلی خوشبو ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ نیچے صحن میں شبانہ اور مریم رات کے کھانے کے بعد برتن دھو رہی تھیں۔ صحن میں پاٹے خاں کی پھٹی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ راجا ابھی ابھی کہیں سے واپس آیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی سیڑھیاں چڑھ کر عمو کے پاس آن موجود ہوا۔ اب وہ عمو کو اکثر عمران کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی ہلکی بو آ رہی تھی۔ وہ عمو کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''عمران! بڑا ٹیٹ آرڈر ملا ہے۔ چار سور مار گھوڑے ہیں۔ سور مار سمجھتے ہو نا تم؟ جن پر بیٹھ کر برچھی وغیرہ سے سور کا شکار کھیلتے ہیں۔ ایسے گھوڑوں کو سدھانا تھوڑا مشکل ہوتا ہے۔ پر فی گھوڑا تین ہزار روپیا دے رہے ہیں۔ سودا فٹ ہے...''

عمو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا۔ ''کیا بات ہے یارا! تیری بتی آج پھر بجھی ہوئی ہے؟''

عمو نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''بھارا جا! تم نے کہا تھا کہ برسات سے پہلے پھر نکلیں گے اور ماں کا کھوج لگا کر ہی واپس آئیں گے۔''

''مجھے سب یاد ہے عمران! بلکہ تم سے بھی کچھ زیادہ ہی یاد ہے۔ میں بس باہر کے حالات دیکھ رہا ہوں۔ کہیں ذرا سی گنجائش ملی نہیں اور ہم یہاں سے نکلے نہیں۔''

''حالات کو کیا ہے؟''

راجا نے بھی سگریٹ سلگایا اور ماچس کی تیلی پاؤں سے مسل کر بولا۔ ''عمران! میں تجھے اور شبّو کو سب کچھ بتاتا نہیں ہوں کہ تم دونوں کو بھی پریشانی ہوگی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ابھی کیکراں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ماچاں کا بھائی ناجا بہت غصے میں ہے۔ پچھلے مہینے اس نے میرے ''دشیکرا'' والے گھر پر ہلا بولا ہے۔ پہلے وہاں توڑ پھوڑ مچائی پھر ہوائی فائرنگ کی اور بعد میں آگ لگا دی۔ پولیس کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ ناجے نے پنڈ میں اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو میرا اتا پتا بتائے گا، وہ اس کا منہ نوٹوں سے بھر دے گا اور جو مجھے چھپانے کی کوشش کرے گا اس کا حشر نشر ہو جائے گا۔''

''پر... یہ سب کچھ کب تک چلتا رہے گا بھارا جے! ہم کب تک چوہوں کی طرح چھپ کر یہاں بیٹھے رہیں گے؟''

''میں نے سنا ہے کہ پچھلے دو تین ہفتوں سے ناجا کیکراں میں نظر نہیں آ رہا۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے وڈے

افسر پھر اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ وہ کبھی کبھی قبائلی علاقے کی طرف بھی نکل جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہمارے لیے آسانی ہو جائے گی۔''

''لیکن... میں کیا کروں بھارا جے... میرے لیے اب ایک ایک دن گزارنا مشکل ہے۔'' عمو کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

راجا نے سگریٹ کے دو طویل کش لیے اور اپنی تیز تیکھی ناک سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''عمران! میں تو تجھے پھر وہی رائے دوں گا۔ تو شبّو سے دو بول پڑھوا لے۔ یہ دنیا ایک دم کنڈم ہے یار! کل کے لیے اس پر بالکل اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ جو کچھ آج مل رہا ہے نا، وہ لے لینا چاہیے۔ دیکھ، وہ تجھے چاہتی ہے اور تو اس پر مرتا ہے۔ تم دونوں کے درمیان کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔ بس ایک مولوی صاحب کی لوڑ ہے اور دو گواہوں کی...''

''پر بھارا جے! وہ اس طرح نہیں مانتی۔ میں نے دو تین دفعہ بات کر کے دیکھی ہے۔''

''اوئے ذرا ٹیٹ ہو کر بات کر۔ اسے سمجھا کہ یہاں آنے جانے والے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر نکاح ہو جائے گا تو پھر کسی کو شک کرنے کی ہمت ہی نہیں رہے گی۔''

''میں نے کہا ہے بھارا جے... پر وہ رونے لگتی ہے۔ کہتی ہے...'' وہ اٹک گیا۔

''کیا کہتی ہے؟''

''کہتی ہے... میں تمہاری ہوں... اور آخری ساہ (سانس) تک تمہاری ہی رہوں گی۔ پر ہمیں اس طرح یہاں شادی نہیں کرنی چاہیے۔''

''لیکن اگر کل کلاں کوئی اور پھڈا پڑ گیا تو؟''

''وہ کہتی ہے... ہماری محبت سچی ہے۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم ضرور ملیں گے۔''

... یہ پندرہ بیس روز بعد کی بات ہے۔ ایک طویل گرم دن گزر چکا تھا۔ ملازم لڑکوں نے احاطے میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا تھا اور مٹی کے گھڑوں میں تازہ پانی بھر دیا تھا۔ عمو کمرے میں کتوں کے لیے راتب تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں راجا کے پاٹے خاں کی آواز آنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھاٹک کھلا اور پاٹے خاں دھواں چھوڑتا ہوا اندر آ گیا۔ خلافِ معمول راجا اسے سیدھا برآمدے کے آخری تاریک کونے میں لے گیا۔ پاٹے خاں کے اوپر ترپال تنا ہوا تھا۔ انجن بند کرنے کے بعد راجا نیچے آیا اور برآمدے کی جہازی سائز کی چق نیچے گرا دی۔ یوں لوڈر مکمل طور پر نظر سے

اوجھل ہو گیا۔ راجا پیسے کمانے کے لیے ہر طرح کے کام کر لیتا تھا۔ عمو نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ آج پھر کوئی افیم یا چرس قسم کی شے لے کر آیا ہے۔ انڈین شراب کا بھی امکان ہو سکتا تھا... لیکن تھوڑی دیر بعد عمو نے ایک عجیب بات نوٹ کی۔ دیوہیکل ہاؤنڈ کتا پارا مسلسل شور مچا رہا تھا۔ اس کی گونجیلی آواز در و دیوار کو لرزا رہی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد راجا اس کے پاس پہنچا۔ اپنے لمبے بال پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''عمران! آج ایک بڑی ٹیٹ ڈیل ہوئی ہے۔'' اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا اور آنکھوں میں سنسنی لہریں لے رہی تھی۔

''کچھ بتاؤ گے تو پتا چلے گا۔''

''یہ بتانے والی نہیں دکھانے والی شے ہے۔'' راجا نے سرگوشی کی اور عمو کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

راتب تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ عمو نے ہاتھ دھوئے اور راجا کے ساتھ ہو لیا۔ اب شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ کبیر احمد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ دوا کھا کر پچھواڑے کے باغیچے میں سویا ہوا تھا۔ راجا نے شریف کے کمرے سے فالتو لالٹین لی اور برآمدے کی طرف آ گیا۔ طویل برآمدے کے آخری گوشے میں سرکنڈے کی چقوں کے پیچھے پاٹے خاں کھڑا تھا۔ اس کے اوپر ترپال اس طرح تنا ہوا تھا کہ وہ چاروں طرف سے ڈھک گیا تھا۔ صحن کی طرف سے پارے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ عمو کی چھٹی حس بھی جیسے کچھ مبہم اشارے دے رہی تھی۔

''بھارا جا! کیا چکر ہے؟'' عمو نے پوچھا۔

راجا نے لالٹین عمو کو تھمائی اور ترپال کے تسمے کھول کر اسے پچھلی طرف سے دائیں بائیں ہٹا دیا۔ عمو بھونچکا رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ لوڈر کے اندر ایک بڑا آہنی پنجرہ رکھا تھا اور اس میں دو آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ کسی کتے یا دوسرے پالتو جانور کی آنکھیں نہیں تھیں۔ یہ ایک دھاری دار شیر تھا۔ وہ اپنے کانوں کو چوکنے انداز میں حرکت دے رہا تھا اور سیدھا ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا... جیسے حملہ کرنے کے لیے بس ایک نادیدہ اشارے کا منتظر ہو۔ وہ ایک جوان شیر تھا۔ ابھی اس کا جسم پوری طرح بھرا نہیں تھا پھر بھی اس کی دید لرزہ طاری کرتی تھی۔

راجا نے ترپال پھر برابر کر دیا اور عمو کو لے کر واپس احاطے میں آ گیا۔ ''یہ کہاں سے لے آئے ہو بھارا جا؟'' عمو نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”بس لے آیا ہوں۔۔۔ اور زیادہ ڈرنے کی لوڑ نہیں۔ یہ بالکل ہی ”اَن ٹرینڈ“ نہیں ہے۔ تھوڑا بہت سکھایا ہوا ہے۔ جو کسر رہ گئی ہے، وہ ہم دو چار ہفتوں میں پوری کر دیں گے۔ کتے کے پچاس بلے سدھانے سے اتنے پیسے نہیں ملتے جتنے اس اکیلے کے مل جائیں گے۔ پورے چالیس ہزار میں بات ہوئی ہے۔“

”پر بھارا جا۔۔ یہ تو بڑا خطرناک کام ہے۔ مم۔۔۔ میں نے تو اس سے پہلے چڑیا گھر سے باہر شیر دیکھا ہی نہیں۔“

”لیکن میں نے تو دیکھا ہے نا۔ گو گھبرا مت، ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو یہ سارا کام ایک دم حلوہ ہو جائے گا۔ صرف تین چار ہفتے میں چالیس ہزار روپے۔ یار عمران! یہ تھوڑی رقم تو نہیں ہے۔“

اس نے اپنی خوش گفتاری سے عمران کو چپ کرا دیا۔

عمران اب اتنا نا سمجھ نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ راجا اسے جو کچھ بتاتا ہے، اس سے کہیں زیادہ کماتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کبھی کوئی ”ناجائز پھیرا“ بھی لگا لیتا تھا۔ اس کے پاس کافی پیسے آئے تھے لیکن یہ پیسے اس کے پاس ٹکتے نہیں تھے۔ وہ انہیں شراب اور عورت وغیرہ پر اڑا دیتا تھا۔ جہاں تک جانوروں کو سدھانے کا تعلق تھا، یہ کام بھی زیادہ تر عمو کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ راجا نے اسے شروع میں چند بنیادی باتیں بتائی تھیں، اس کے بعد اس نے سارا بوجھ عمو پر ہی ڈال دیا تھا اور عمو کو کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کام بھارا جا دو مہینے میں کرے گا، وہ خود پندرہ دن میں کر لے گا۔ حیران کن طور پر جانور اس سے غیر معمولی انس محسوس کرتے تھے اور وہ بھی ان سے وابستگی محسوس کرنے لگتا۔ لیکن یہ شیر والا کام اسے واقعی پُرخطر محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اس کے رگ و پے میں پھیل گئی تھی۔

اگلے روز تک کبیر احمد، شریف، اس کی بیوی اور شبو کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ راجا کسی سرکس کے مالک سے ایک نر شیر لے کر یہاں آیا ہے اور اسے سدھانا چاہتا ہے۔ راجا کا دعویٰ تھا کہ وہ دو ڈھائی سال پہلے بھی ایک ایسے شیر کو ٹریننگ دے چکا ہے۔ شبو کو جب یہ ساری بات پتا چلی تو وہ روہانسی ہو گئی۔ اس نے عمو سے کہا۔ ”عمران! تمہارے یہ کام کسی دن میری جان لے لیں گے۔ بھارا جا جو کہتا ہے تم کرتے چلے جاتے ہو۔ اب بات خطرناک گھوڑوں، کتوں سے آگے بڑھ کر شیر تک جا پہنچی ہے۔“

رات بھر سوچنے کے بعد اب عمو کے اندر خوف کی جگہ ایک عجیب سی ترنگ جاگ چکی تھی۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے اندر کچھ خاص ہے۔ اب وہ اس ”خاص“ کو ایک جنگلی درندے کے سامنے آزمانا چاہتا تھا۔

اس نئے کام کے لیے باغ کے ایک کشادہ گودام کو ”رِنگ“ کی شکل دی گئی۔ راجا نے دھاری دار شیر کو ذرا سست اور ڈھیلا کرنے کے لیے اسے گوشت کے ٹکڑوں پر کوئی دوا لگا کر کھلائی تھی۔ مزید احتیاط کے طور پر اس کے گلے میں دو مضبوط رسیاں ڈالی گئی تھیں تاکہ اگر وہ بپھرے تو اسے دونوں طرف سے کھینچ کر کنٹرول کیا جا سکے۔

پہلے روز عمو کو کچھ خطرہ محسوس ہوا لیکن پھر حالات حیران کن تیزی سے بدلتے چلے گئے۔ راجا اور اس کا معاون ساتھی بھی ششدر رہ گئے۔ خوں خوار خصلت والا رائل بنگال ٹائیگر بڑی تیزی سے عمو سے مانوس ہوتا چلا گیا۔ غالباً اس ساری صورتِ حال میں اس بے پناہ اعتماد کو بھی دخل تھا جو پچھلے چند ماہ سے مسلسل عمو کے اندر پیدا ہو رہا تھا۔

پانچ چھ روز میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ عمو نے کئی احتیاطی تدابیر ترک کر دیں اور کئی بار اکیلا ہی جانور کے سامنے جانے لگا۔ راجا بہت خوش تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ چار پانچ مہینوں والا کام بس دو ڈھائی ماہ میں مکمل کر لیں گے۔ انہیں بس دو اہم مراحل مکمل کرنے تھے۔ شیر کو ایک بڑے آہنی کڑے میں سے گزرنے پر آمادہ کرنا اور جست لگا کر ایک چار فٹ اونچی رکاوٹ کو پار کرنا۔

ایک روز تربیت کے دوران میں ٹائیگر نے راجا کے معاون نذیر کو پنجہ مارا اور بازو پر سے اس کی کھال ادھیڑ دی۔ اس روز کے بعد راجا اور نذیر مزید پیچھے ہٹ گئے اور عمو کی ذمے داری مزید بڑھ گئی۔ کتے کی نایاب نسل ”بلو کی ہاؤنڈ“ کے پلے بھی اب بڑے ہو چکے تھے۔ عمو ان کی تربیت بھی تن دہی سے کر رہا تھا۔

☆☆☆

نو دس ہفتے میں ہی ٹائیگر والی ذمے داری تقریباً پوری ہو گئی۔ اس دوران میں سرکس کا مالک جان محمد دو تین بار اپنے جانور کو، دیکھنے بھی آیا۔ وہ چھوٹی داڑھی والا ایک ملنسار اور خلیق شخص نظر آتا تھا۔ بہرحال عمران کی کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس سے ہر طرح کی ڈیل راجا ہی کرتا تھا۔ جان محمد کے ساتھ پینٹ شرٹ والی ایک خوبرو لڑکی بھی ہوتی تھی۔ پتا چلا کہ وہ اس کی بھتیجی ہے۔ راجا، جان محمد کے علاوہ اس کی بھتیجی سے بھی خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا۔ وہ لوگ بھی راجا کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ ان کے نزدیک تو ٹائیگر کو سدھانے والی ساری فن کاری راجا ہی کی تھی۔

جب بنگال ٹائیگر کو جان محمد صاحب کے ساتھ روانہ کیا گیا تو راجا خود بھی ساتھ ہی گیا اور تین چار روز تک خوشاب میں جان صاحب کی مہمان نوازی کا لطف اٹھا کر واپس آیا۔ آتے ہوئے وہ خوشاب سے ہی چار پانچ تربیت یافتہ کتوں کی فروخت کا آرڈر بھی پکڑ کر لایا تھا۔۔۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں اس کا کام چل نکلا ہے۔

کبیر احمد اب بیمار رہنے لگا تھا۔ باغ کی زیادہ تر ذمے داری شریف اور اس کی فیملی کے سر پر تھی۔ ایک روز جب راجا اپنے پائے خاں کے نئے ٹائر ڈلوانے اور اس کی نوک پلک ٹھیک کروانے خوشاب گیا ہوا تھا، عمران اور شریف پچھواڑے کی پھلواری میں آ بیٹھے۔ وہ ابھی ابھی ایک زخمی کتے کی مرہم پٹی سے فارغ ہوئے تھے اور اب نومبر کی آخری سہ پہروں میں سے ایک سہ پہر کی سنہری دھوپ کا لطف اٹھانا چاہ رہے تھے۔

گفتگو کے دوران میں شریف نے عمران سے پوچھا۔ ”سنا ہے کہ ٹائیگر والے کام کے لیے راجا نے تمہیں کوئی انعام شام بھی دیا ہے؟“

”ہاں۔۔۔ مجھے اور شبو کو دو دو نئے جوڑے سلوا کر دیے ہیں۔ تین ہزار روپیا نقد بھی دیا ہے۔“

”تین ہزار؟“ شریف نے پوچھا۔ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ شریف کچھ دیر خاموش رہا پھر دھیمے انداز میں بولا۔ ”سنا ہے اس نے خود تو کافی پیسے لیے ہیں۔۔۔ شاید ساٹھ ستر ہزار روپیا۔ اوپر کا خرچہ اس کے علاوہ ہے۔“

ساٹھ ستر ہزار کے ہندسے نے عمران کو بھی تھوڑا سا چونکایا لیکن اس نے اپنے اندرونی احساسات کو چہرے پہ نہیں آنے دیا۔ وہ نارمل لہجے میں بولا۔ ”چلو کوئی بات نہیں۔۔۔ اپنا وقت ٹھیک گزر رہا ہے۔“

شریف بولا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ جان صاحب کی بھتیجی نیلم بھی راجا کے چکر میں ہے۔ آج کل اسی لیے راجا بھی خوشاب کے چکر لگا رہا ہے۔۔۔ پچھلے ہفتے جب جان صاحب شیر لینے آئے تھے تو نیلم نے شیر کے ساتھ راجا کی کئی تصویریں بھی اتاری تھیں۔ وہ تو راجا کو ہی ماسٹر سمجھتی ہے نا۔ اور بات صرف اس لڑکی کی ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ راجا کو باکمال فن کار سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تو بس ہم دو چار بندوں کو پتا ہے نا کہ اصل فن کاری کس کی ہے۔“

”چلو، میں نے کون سا تمغہ لگوانا ہے۔ اگر بھارا جے کی عزت بن رہی ہے تو سمجھو ہماری بن رہی ہے۔“

شریف مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عمران کی غیر دلچسپی دیکھ کر خاموش رہا۔ عمران کھلے دل کا مالک تھا۔ ویسے بھی وہ راجا کو اپنا محسن و سرپرست سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بھارا جا جو کر رہا ہے، صحیح کر رہا ہے۔

راجا اب پہلے سے اچھا لباس پہننے لگا تھا۔ پہلے وہ ہفتے میں ایک رات باہر گزارتا تھا، اب دو تین راتیں باہر گزارنے لگا تھا۔ اب وہ اپنے دیرینہ ساتھی پائے خاں کو بھی فروخت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس پرانے لوڈر کی جگہ کوئی اور اچھی گاڑی لی جائے۔ عمران کو اس کا یہ پروگرام زیادہ پسند نہیں آیا۔ پتا نہیں کیوں اسے اس پرانی گاڑی سے اُنس سا ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس گاڑی نے کوئی ایک سال پہلے بڑی سخت جانی کا مظاہرہ کر کے عمران اور شبانہ کو کیکراں گاؤں کی جان لیوا حدود سے نکالا تھا۔ بہرحال راجا کے اپنے فیصلے ہوتے تھے۔ ایک روز وہ پائے خاں کو کہیں چھوڑ آیا اور اس کی جگہ ایک اچھی حالت کا سیکنڈ ہینڈ لوڈر لے آیا۔

یہ پانچ چھ دن بعد کی بات ہے۔ راجا اپنے نئے لوڈر پر آندھی طوفان کی طرح باغ میں داخل ہوا۔ وہ کل دوپہر سے کہیں گیا ہوا تھا۔ اسے لوڈر سے اترتے دیکھ کر عمران اور شریف حیران رہ گئے۔ شبو تو باقاعدہ چلا اٹھی۔ راجا کا سوئٹر سامنے سے اُدھڑا ہوا تھا۔ قمیص کا گریبان بھی کنا پھٹا تھا۔ راجا کی گردن اور چہرے پر زخم نظر آ رہے تھے۔ ان زخموں سے بہنے والا خون ناف تک چلا گیا تھا۔ راجا لنگڑاتا ہوا عمران کی طرف آیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”چلو عمران! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“

”کہاں؟ اور تم تو اتنے زخمی ہو؟“

”کوئی بات نہیں، تم بس آؤ میرے ساتھ۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”کسی ہتھیار وغیرہ کی لوڑ تو نہیں؟“

”نہیں نہیں۔ بس تم آ جاؤ۔“

عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن وہ راجا کے ساتھ اس کے نئے لوڈر میں آ بیٹھا۔ عمران نے راجا کے زخموں کو غور سے دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ زخم کسی آلے وغیرہ سے نہیں آئے تھے۔ یہ پنجوں کے زخم تھے۔ عمران کا دھیان سیدھا دھاری دار بنگال ٹائیگر کی طرف چلا گیا۔

لوڈر تیزی سے کچے پکے راستے پر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ عمران نے پوچھا۔ ”بھارا جا! کہیں جان صاحب کے شیر نے تو کام نہیں دکھایا؟“

راجا نے اپنے مفلر سے خون صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اسے پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔ کسی طرح سنبھالا ہی نہیں جا رہا۔ ایک ملازم کا تو اس نے تقریباً پیٹ ہی پھاڑ دیا ہے۔ ایک دو اور بندوں کو بھی زخم آئے ہیں۔''

''اوہو... کہاں ہے وہ؟''

''جان صاحب کے گاؤں والے مکان پر۔ صحن میں گھوم رہا ہے۔ ہم نے صحن کے دونوں دروازے باہر سے بند کر دیے ہیں۔ وہ لڑکی نیلم ابھی اندر کے ایک کمرے میں ہے۔ اسے ہم نہیں نکال سکے۔''

راجا اونچے نیچے راستے پر لوڈر کو اڑائے چلا جا رہا تھا۔ وہ دونوں بُری طرح اچھل رہے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے راجا نے پہلے خود کوشش کی ہے، جب کوئی بس نہیں چلا تو عمران کی طرف بھاگا ہے۔

قریباً ایک گھنٹے میں وہ دونوں مطلوبہ گاؤں کے مطلوبہ مکان پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک پھاٹک کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مکان کے احاطے کی دیوار سات آٹھ فٹ اونچی تھی۔ لوگ اردگرد کی چھتوں پر سے احاطے میں جھانک رہے تھے۔ کچھ لوگ ریڑھوں وغیرہ پر کھڑے ہو کر بیرونی دیوار کے اوپر سے احاطے میں جھانکنے کی کوشش میں تھے۔ ہر چہرے پر گمبھیر تجسس اور ہراس نظر آتا تھا۔ یہاں عمران کو جان محمد صاحب اور ان کے دو تین ملازم بھی نظر آئے۔ ایک ملازم زخمی تھا اور اس کے بازو پر تازہ تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جان محمد صاحب کے ہاتھ میں پمپ ایکشن رائفل تھی اور وہ پھاٹک کی درز میں سے احاطے میں جھانکنے کی سعی میں مصروف تھے۔ عمران کے وہاں پہنچتے ہی ہر طرف ہلچل نظر آئی۔ سب لوگ گہرے تجسس اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ عمران کے پھاٹک کے سامنے پہنچتے ہی راجا نے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھلوایا اور عمران کو اندر داخل کر دیا... خود وہ اپنے اعشاریہ تین آٹھ سے کے ریوالور کے ساتھ دروازے میں کھڑا ہوگیا تاکہ کوئی ناخوش گوار صورتِ حال پیش آنے کی صورت میں مناسب ردِعمل ظاہر کر سکے۔

ہمیشہ کی طرح عمران کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس کا ہتھیار بس اس کے اندر کا اعتماد اور وجدان تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا سینہ پُرجوش دھڑکنوں سے بھر جاتا تھا۔ وہ ہاتھ میں بس ایک چھوٹی سی چھڑی لیے بڑے نپے تلے قدموں سے برآمدے کی سمت گیا۔ اسے بتایا گیا تھا اور اسے خود بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ شیر برآمدے کی طرف ہے۔

چند ہی سیکنڈ بعد شیر یعنی رائل بنگال ٹائیگر اور عمران آمنے سامنے تھے۔ ٹائیگر کی آنکھوں میں آج وحشت چمک رہی تھی اور اس کی حرکات و سکنات میں تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے اندر سے ایک بے ساختہ گونج برآمد ہو رہی تھی۔ اس دھیمی لیکن پاٹ دار گونج میں، غیظ و غضب اور خوں خواری کی ساری علامات موجود تھیں۔ وہ خطرناک انداز میں عمران کی طرف بڑھا۔ عمران جانتا تھا کہ یہی فیصلے کا لمحہ ہے۔ اب اگر اس نے قدم پیچھے ہٹائے تو بپھرا ہوا جانور کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اپنے بے پناہ اعتماد اور وجدان کے سہارے وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ نہ صرف کھڑا رہا بلکہ اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔ چھڑی سے مخصوص اشارہ کیا... اور اسے حکم دیا۔ ''بیٹھ جاؤ... بیٹھ جاؤ۔'' اس کے حکم میں سختی کی جگہ ایک محبت بھری نرمی تھی۔

چند سیکنڈ تک انسان اور درندے نے اپنی آنکھیں ایک دوسرے میں پیوست رکھیں اور پھر فیصلہ ہوگیا۔ عمران کا جادو پھر کام کر گیا۔ ٹائیگر کا دیا اپنی پچھلی ٹانگوں پر کم ہوگیا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ جارحانہ انداز ترک کر چکا ہے۔ چند سیکنڈ بعد اس کے آگے کو جھکے ہوئے کان نارمل حالت میں آ گئے۔ عمران نے اسے چھڑی کے اشارے سے چند قدم پیچھے ہٹایا پھر دلیری سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ وہ اس کے سینے سے اپنا سر رگڑنے لگا۔ عمران اسے پچکارتا ہوا اس کے آہنی پنجرے کی طرف لے گیا۔ کسی اندرونی کمرے سے نیلم کے چلّانے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

ٹائیگر کو پنجرے میں بند کرنے کے بعد عمران نیلم کی طرف متوجہ ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ جب اس نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ جانور دوبارہ پنجرے میں جا چکا ہے تو اس نے دروازے کی کنڈی گرائی اور بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد کسی طرف اوجھل ہو گئی۔ بدحواسی میں اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ وہ اپنا کمرا ایک اجنبی کے سامنے کھلا چھوڑے جا رہی ہے۔ وہ اپنی ریشمی نائٹی میں بھاگی تھی۔ اس کے شان دار پلنگ پر اس کا لباس بکھرا ہوا تھا اور زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ایک طرف میز پر ایک مردانہ کوٹ بھی پڑا ہوا تھا... عمران کے لیے اس کوٹ کو پہچاننا بالکل مشکل نہیں تھا۔ یہ راجا کا کوٹ تھا۔ یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ شیر والا واقعہ پیش آنے سے پہلے راجا اس شہری لڑکی کے ساتھ یہاں اس کمرے میں موجود تھا۔ اسی دوران میں راجا بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور سب سے پہلے اس نے اپنا کوٹ ہی اس کمرے میں سے نکالا۔

عمران کی مہارت اور دلیری نے موقع پر موجود لوگوں کو ستائش کرنے پر مجبور کر دیا۔ جان محمد صاحب نے عمران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راجا سے پوچھا۔ ''یہ وہی لڑکا ہے ناجو وہاں تمہارے پاس کتوں کا راتب وغیرہ بناتا ہے؟''

''ج... جی ہاں۔'' راجا ہکلایا۔ ''اس کے علاوہ یہ جانوروں کی سکھائی میں بھی میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ بڑا گن ہے جی اس کے ہتھ میں۔''

جان محمد صاحب گہری نظروں سے کبھی راجا اور کبھی عمران کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ایک جہاندیدہ زیرک شخص تھے۔ انہیں یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہاں ''پسِ پردہ'' بھی کچھ ہے۔

ٹائیگر کے بارے میں پتا چلا کہ پچھلے دو دن سے اس کی طبیعت میں اشتعال موجود تھا۔ صبح تجربہ کار ملازم غلام رسول اس کے پنجرے کی صفائی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بس ایک سیکنڈ کے لیے پنجرے کا دروازہ کھولا۔ ٹائیگر خوفناک تیزی سے اس پر جھپٹا اور اسے شدید زخمی کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً ایک گھنٹے تک اس نے حویلی میں تہلکہ مچائے رکھا اور کسی طرح کنٹرول نہیں ہوا۔

اب وہ حالانکہ دوبارہ پنجرے میں بند ہو چکا تھا مگر اس کے تیور معمول پر نہیں آئے تھے۔ جان محمد صاحب کی خواہش تھی کہ عمران ابھی ایک دو دن یہیں رہے۔ راجا نے بھی اس بات کی تائید کی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس صورتِ حال پر زیادہ خوش نظر نہیں آتا تھا۔

دو دن میں ہی عمران کو معلوم ہوگیا کہ جان محمد صاحب بہت اچھی طبیعت کے مالک ہیں۔ ایک بڑے سرکس میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی ساجھے داری تھی اور پچھلے تریا پندرہ سال سے یہ ساجھے داری بڑے اچھے طریقے سے چل رہی تھی... اور لگتا تھا کہ آئندہ بھی چلتی رہے گی۔ پینٹ شرٹ والی لڑکی نیلم، جان صاحب کی بھتیجی نہیں بلکہ معاون تھی... یا یہ کہہ لیں کہ سیکریٹری تھی۔ ایک دفعہ اس کی شادی ہو کر ختم ہو چکی تھی اور اب وہ دوسری دفعہ شادی کرنے کی فکر میں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس مرتبہ اس نے ایک ایسا شخص شادی کرنے کے لیے چنا تھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رہا تھا اور آئندہ بھی پینا چاہتا تھا۔

عمران کو اندازہ ہوا کہ ٹائیگر والے تازہ واقعے کے بعد جان محمد صاحب راجا کے بارے میں ٹھٹک گئے ہیں اور وہ اس کے بارے میں اچھی طرح ٹوہ لگانا چاہتے ہیں۔ شاید یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ راجا الیف سولہ کی رفتار سے نیلم کے قریب آتا جا رہا تھا اور وہ نیلم کو اپنی بھتیجی کہتے تھے۔ رات کو تھوڑی دیر کے لیے موقع ملا تو جان صاحب نے راجا کے بارے میں ٹوہ لینے والے سوال عمران سے پوچھے۔ عمران نے بس گول مول جواب دے کر وقت ٹال دیا۔ جان صاحب عمران کی مہارت سے بہت متاثر نظر آتے تھے اور وہ اچھی طرح جان چکے تھے کہ راجا کی ''شان دار قابلیت'' کے پیچھے اصل ہاتھ کس کا ہے۔ درحقیقت ٹائیگر والے واقعے نے ایک طرح سے راجا کا پول کھول کر رکھ دیا تھا۔

دو دن بعد عمران واپس تو چلا گیا مگر جان صاحب سے اس کا ایک قلبی تعلق سا بن گیا... یہ دس بارہ روز بعد کی بات ہے۔ راجا کسی نوخیز طوائف کے پہلو میں رات گزارنے کے لیے خوشاب گیا ہوا تھا۔ جان محمد صاحب کا ملازم غلام رسول آیا۔ اس نے بتایا کہ ٹائیگر پھر بگڑا ہوا ہے اس لیے اسے فوراً حویلی پہنچنا ہوگا۔ غلام رسول جیپ پر آیا تھا۔ کبیر صاحب سے اجازت لے کر اور پریشان شبو کو تسلی دے کر عمران غلام رسول کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ بہت کم اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلتا تھا لیکن جب بھی نکلتا تھا، ایک عجیب سا خوف اس پر طاری رہتا تھا۔ اس خوف کا تعلق ماجھاں کی موت اور ماجھاں کے خطرناک ساتھیوں سے ہوتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ جان محمد صاحب کی حویلی پہنچ گیا۔ یہاں پنجروں میں سرکس کے فن کار یعنی دو بندر، ایک ریچھ اور کتے وغیرہ بند تھے۔ بنگال ٹائیگر بھی تھا لیکن غیر متوقع طور پر وہ بالکل پُرسکون نظر آیا۔ عمران کو حیرت ہوئی۔ اس کی حیرت دیکھ کر جان محمد صاحب مسکرائے اور بولے۔ ''آؤ میں تمہاری حیرت دور کرتا ہوں۔''

وہ دونوں حویلی کی نشست گاہ میں جا بیٹھے۔ جان صاحب کے فربہ چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی۔ انہوں نے کہا۔ ''عمران بیٹے! ٹائیگر ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں بہانے سے بلایا ہے۔ میں تم سے اس خبیث راجا کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

راجا کے لیے خبیث کے خطاب نے عمران کو شاک پہنچایا۔ وہ ذرا سنبھل کر بولا۔ ''جان صاحب! بھا راجا کو میں اپنے بڑوں کی طرح سمجھتا ہوں۔''

''تم سمجھتے ہو لیکن وہ بڑا ہے نہیں... میرے خیال میں تو بڑے تم ہو جو بہت کچھ جانتے ہوئے بھی چپ ہو اور اس کی ہر بات پر ''جی جی'' کہتے ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ کل میں نے

اسے ذلیل کر کے گھر سے باہر کر دیا ہے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی حیا ہے تو اب ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، نیلم سیدھی سادی لڑکی ہے۔ شہری لڑکیوں جیسی ہوشیاری چالاکی اس میں نہیں ہے۔ یہ خبیث راجا اس کو دھوکا دینے کے چکر میں تھا۔ ایک طرف اس سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا تھا، دوسری طرف شہر میں ایک طوائف کے پاس بھی راتیں گزار رہا تھا۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ کل رات بھی وہ اسی کے بستر پر شراب پیتا رہا ہے۔"

"آ... آپ کے پاس کیا ثبوت ہے جان صاحب؟"

"میرے پاس راجا اور اس تھرڈ کلاس لڑکی کی تازہ تصویریں ہیں... اور گھبراؤ مت، میرے پاس ہر بات کا مکمل ثبوت ہے۔"

جان صاحب نے چند سیکنڈ توقف کیا پھر ایک رسید دکھاتے ہوئے بولے۔ "یہ دیکھو، یہ رقم چند روز پہلے راجا نے مجھ سے وصول کی ہے۔ یہ اس کے دستخط ہیں۔ پڑھو، کتنی رقم ہے؟"

"بیس ہزار... اور اس کے نیچے ستر ہزار۔ کُل نوّے ہزار۔" عمران نے جواب دیا۔

جان محمد صاحب بولے۔ "یہ بیس ہزار ٹائیگر کی خوراک وغیرہ کا خرچہ تھا اور ستر ہزار روپیا اس نے ٹائیگر کی سدھائی کا لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دو، چار ہزار کے علاوہ یہ ساری رقم اس کی اپنی جیب میں ہی گئی ہے۔ اور دیکھو، بات صرف ٹائیگر کی سدھائی ہی کی نہیں ہے، میں نے سارا پتا کرایا ہے۔ جانوروں کی سدھائی کی ساری محنت تمہاری ہوتی ہے اور اس محنت کا راجا ٹھیک ٹھاک معاوضہ بھی وصول کرتا ہے۔ تمہیں وہ اس معاوضے کا چوتھا حصہ بھی نہیں بتاتا۔ یہ ساری رقم شراب اور نت نئی لڑکیوں پر خرچ ہوتی ہے۔"

عمران خاموش رہا۔ جان صاحب جانتے تھے کہ عمران کبھی کبھار سگریٹ پیتا ہے۔ انہوں نے اسے سگریٹ پیش کیا جو اس نے جھجکتے ہوئے قبول کر لیا۔ جان صاحب بولے۔ "مجھے سچ سچ بتاؤ عمران! تم اس راجا تک کیسے پہنچے اور کب سے اس کے ساتھ ہو؟"

عمران اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے گول مول بات کی اور بتایا کہ وہ اپنے کچھ رشتے داروں کے پاس گجرات میں ٹھہرا ہوا تھا، وہیں راجا سے جان پہچان ہوئی۔

جان صاحب نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولے۔ "تم گجرات میں نہیں، گجرات کے ایک پنڈ میں ٹھہرے ہوئے تھے... اور اپنے کسی رشتے دار کے پاس نہیں، ایک بدمعاش عورت ماجھاں کے گھر میں تھے۔"

عمران ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ جان صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "ایک روز راجا نے مجھے اس بارے میں تھوڑا سا بتایا تھا۔ بعد میں، میں نے اپنے طور پر چھان بین کی اور مجھے تمہارے بارے میں اور بھی کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔"

"کیسی باتیں جی؟"

جان صاحب ہولے سے مسکرائے اور اس کے چوڑے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے عمران! میرا وعدہ ہے، ہم دونوں کے تعلقات آگے چل کر کیسے بھی ہوں، میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"اس بات کا تو مجھے یقین ہے جی۔"

"مجھے پتا چلا ہے کہ تم ماجھاں نام کی ایک بدمعاش زمیندارنی کے پاس ملازمت کرتے تھے۔ وہ شراب پیتی تھی اور نوجوان لڑکوں کو اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ تمہارے ساتھ بھی اس کا سلوک بہت بُرا تھا۔ بات نہ ماننے پر وہ تمہیں کتوں کے ساتھ بھی بند رکھتی تھی۔ تم نے ایک دو دفعہ بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر ایک روز تمہیں راجا کے ذریعے موقع ملا کہ وہاں سے بھاگ نکلو۔ ماجھاں اور اس کے دو ساتھیوں نے گھوڑوں پر اس لوڈر کا پیچھا کیا جس پر تم سوار تھے۔ لوڈر پر چڑھنے کی کوشش میں ماجھاں گر پڑی اور بڑی دور تک لوڈر کے ساتھ ہی گھسٹتی چلی گئی۔ اس حادثے میں اس کی موت ہو گئی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

عمران اثبات میں سر ہلانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

جان صاحب بولے۔ "ماجھاں کی موت کی وجہ سے تم اور راجا بہت خوف زدہ ہو گئے۔ لہٰذا تم یہاں شادپورہ آکر باغبان کبیر احمد کے پاس چھپ گئے۔ یہاں تک میں ٹھیک ہوں؟"

"جی ہاں۔" عمران نے کہا۔

"اب اس سے آگے میں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں، وہ تمہاری نظر سے بھی اوجھل ہے۔" جان صاحب نے کہا پھر نیا سگریٹ سلگا کر بولے۔ "تمہارا کیا خیال ہے، اس وقت کیکراں نام کے گاؤں میں حالات کیا ہیں؟"

"مجھے کچھ زیادہ تو پتا نہیں جی۔ راجا نے بتایا تھا کہ ماجھاں کا بھائی ناجا ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔ چار مہینے پہلے اس نے راجا کے پرانے ڈیرے پر آگ بھی لگا دی تھی اور پنڈ والوں کو دھمکیاں دی تھیں راجا کے بارے میں۔"

"اگر میں کہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تو پھر؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

جان صاحب بولے۔ "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ناجے کو پولیس مقابلے میں مرے پورے دس مہینے ہو گئے ہیں۔ تمہارے آنے کے کچھ ہی دن بعد یہ واقعہ ہو گیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد مخالف پارٹی کے لوگوں نے ایک دم طاقت پکڑ لی... اور ایک دو زوردار لڑائیوں کے بعد ماجھاں کے رشتے داروں کو بھی کیکراں گاؤں سے مار بھگایا۔ اب کیکراں میں ان لوگوں کا نام و نشان تک نہیں۔ تم پتا نہیں کہاں پھر رہے ہو۔"

عمران واقعی ششدر رہ گیا... وہ کتنی ہی دیر سناٹے میں رہنے کے بعد بولا۔ "تو کیا بھا راجا نے جھوٹ بولا تھا؟"

"سفید جھوٹ... اور یہ سب کچھ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ وہ اپنے مطلب کے لیے کسی کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ تمہیں خوف زدہ کر کے رکھنا چاہتا تھا تاکہ تم کہیں جانے کا سوچ بھی نہ سکو۔ وہ تم سے زبردست فائدے لے رہا تھا اور اب بھی لے رہا ہے عمران۔"

عمران ہکا بکا سا بیٹھا رہا... اس کے سینے میں کچھ سلگنے لگا۔ وہ پچھلے ایک عرصے سے بُری طرح اپنی ماں کے لیے تڑپ رہا تھا اور راجا نے اسے فریب کے جال میں پھنسا کر شادپورہ میں قید کیا ہوا تھا۔

جان صاحب بولے۔ "عمران! تمہارے اندر گُن ہے۔ تمہیں اللہ نے صلاحیت دی ہوئی ہے۔ تم ترقی کر سکتے ہو، آگے جا سکتے ہو۔ تمہارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی راجا ہے۔ اس کمینے سے جان چھڑا لو۔ کہیں بھی چلے جاؤ۔ تمہیں عزت ملے گی اور پیسا بھی۔ اور اگر تم چاہو تو میرے پاس آ جاؤ۔ میں ابھی لمبے چوڑے وعدے تو نہیں کر سکتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہاں تمہاری محنت کا بھرپور صلہ ملے گا۔"

عمران کا دماغ ابھی تک کیکراں کے اردگرد گھوم رہا تھا، وہ بولا۔ "جان صاحب! کیا واقعی ناجا ختم ہو چکا ہے؟"

جان صاحب اٹھ کر الماری کی طرف گئے اور ایک پرانا اخبار لے آئے۔ "میں نے کہا ہے نا کہ میرے پاس ہر بات کا ثبوت ہے۔"

یہ نو دس ماہ پرانا اخبار تھا۔ عمران نے دیکھا، اس میں ناجے ڈکیت اور اس کے تین ساتھیوں کی ناگہانی ہلاکت کا سارا واقعہ موجود تھا۔ ایک دم عمران کو لگا کہ وہ آزاد ہو گیا ہے، اس کے پنجرے کی تیلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس بارے میں عمران نے جان صاحب سے دیر تک بات کی اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے سارے پردے اٹھ گئے۔

...شام سے پہلے عمران شادپورہ واپس آ گیا۔ راجا ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ وہ رات کو بھی نہیں آیا۔ رات عمران دیر تک بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ راجا یقیناً اس سے جھوٹ بولتا رہا تھا لیکن عمران کو پتا تھا کہ شریف نے جھوٹ نہیں بولا۔ اس کی والدہ واقعی شیخوپورہ میں موجود نہیں تھی اور نہ کہیں اور اس کا سراغ ملا تھا۔ عمران سب سے پہلے اپنی والدہ کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ میں ان لوگوں کے خلاف بھی نفرت بڑھ رہی تھی جنہوں نے اسے اس کی ماں سے جدا کیا اور پھر دردر دھکے کھانے پر مجبور کیا۔ ان میں چودھری سجاول اور صادق شاہ جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ وہ ان لوگوں کو ان کے کیے کا مزہ چکھانا چاہتا تھا... لیکن کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جہاں تک راجا کی بات تھی، اس کے لیے عمران کے دل میں نفرت نہیں تھی... ہاں، افسوس ضرور تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ راجا اسے اس طرح اندھیرے میں رکھے گا اور فریب کرے گا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں تیزی سے سوچ رہا تھا اور اب اس سوچ بچار میں راجا ہرگز شامل نہیں تھا۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت راجا نشے میں دھت واپس آیا اور اس کے ساتھ عمران کی دوٹوک بات ہوئی۔ عمران نے راجا کو اخبار کا وہ ٹکڑا دکھایا جس میں دس مہینے پہلے ناجے ڈکیت کی موت کی خبریں چھپی تھیں اور لاش کی تصویریں شائع ہوئی تھیں۔

راجا یہ سب دیکھ کر ششدر ہوا لیکن بہت جلد بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ معلومات عمران کو کیسے اور کس سے ملی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ آخر میں راجا نے کہا۔ "عمو یار! ٹھیک ہے کہ میں نے تجھے خطرے سے بچانے کے لیے ناجے کے بارے میں غلط اطلاع دی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم دشمن بن گئے۔ ہم اب بھی دوست ہیں۔ دشمن وہ بندہ ہے جو تمہیں ورغلا رہا ہے۔ تمہیں مجھ سے توڑ رہا ہے۔"

عمران نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "جو بھی ہے بھا راجا! اب ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ اب زیادہ باریکیوں میں جائیں گے تو دکھ اور رنجش کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں تم مجھے معاف کر دو۔ ہمیں دشمنوں کی

طرح نہیں، دوستوں کی طرح علیحدہ ہوجانا چاہیے۔''
راجا نے کئی پینترے بدلے مگر عمران چونکہ تہیہ کر چکا تھا، اس لیے وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا اور پھر وہ دونوں نم ناک آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔
عمران نے علی الصباح ہی شبّو کو اس بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ساتھ چلنے کو تیار تھی۔ وقتِ رخصت راجا نے شبّو کے سر پر پیار دیا اور آٹھ دس ہزار روپے زبردستی اس کی مٹھی میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''اپنی شادی پر مجھے بھول نہ جانا۔''
وہ اپنی طرز کا جدا بندہ تھا۔ کہیں بہت بُرا، کہیں صرف بُرا اور کہیں اچھا۔

☆☆☆

عمران اور شبّو سیدھے جان محمد صاحب کے قصبہ نما گاؤں میں ان کی حویلی میں آ گئے۔ جان صاحب نے خوش دلی اور محبت سے ان کا استقبال کیا۔ حویلی میں دو معزز مہمان بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک تو کوئی مولوی صاحب تھے، دوسرے جان محمد صاحب کے منہ بولے بھائی اور پارٹنر حاجی احمد اشفاق صاحب تھے۔ اس رات جان صاحب نے حاجی اشفاق سے بھی عمران کی ملاقات کرائی۔ انہوں نے حاجی اشفاق کو بتایا۔ ''قدرت جب کچھ چھینتی ہے تو اس کے بدلے کچھ دیتی بھی ہے۔ اس بچے سے نوعمری میں اس کی پیاری ماں چھن گئی۔ یہ دن رات اس کے لیے تڑپا، ماں تو اسے نہ ملی... کم از کم ابھی تک تو نہیں ملی، پر اس کا صلہ اسے ایک اور شکل میں مل گیا۔ اللہ نے اس کے ہاتھ میں بڑی کرامات دی ہیں...''
پھر جان محمد صاحب اپنے ساجھے دار کو ان حیران کن واقعات کے بارے میں بتانے لگے جو عمران اور جانوروں کے حوالے سے ان کے مشاہدے میں آئے تھے، یا انہوں نے سنے تھے۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا مگر ہاتھ کے کنگن کو آرسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حاجی اشفاق بھی عمران سے بہت متاثر ہوئے۔
شبّو، جان صاحب کی بیوی صدیقہ بی بی کے ساتھ زنان خانے میں چلی گئی تھی۔ عمران کا بستر حویلی کی بیٹھک میں لگایا گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں آنے والی تیز رفتار تبدیلیوں پر حیران ہو رہا تھا۔ جوں جوں اسے اختیار، آزادی اور جسمانی توانائی مل رہی تھی، اپنی ماں کے لیے اس کی تڑپ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے لیے سب سے مقدم اپنی ماں کی تلاش تھی۔ رات گئے تک ماں کی تصویر اس کی نگاہوں میں پھرتی رہی۔ وہ غنودہ حالت میں بستر پر لیٹا رہا۔
اچانک ایک آواز نے اسے بُری طرح چونکایا... وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھک کے کسی قریبی کمرے سے کسی شخص نے بڑے وجدانی انداز میں حق ہُو کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ایسا نعرہ عمران نے پہلے بھی کہیں سنا تھا۔ ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ ایسے آوازے اس نے کہاں سنے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں بجلی سی لپک گئی۔ وہ اٹھا اور کچے فرش پر ننگے پاؤں چلتا ہوا آواز کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹی راہداری سے گزر کر وہ ایک کمرے کے سامنے پہنچا۔ اس نیم پختہ کمرے کے اندر گیس لیمپ کی سفیدی مائل روشنی تھی۔ عمران نے تھوڑی سی کوشش کی اور پھر ایک چوبی کھڑکی کی جھری میں سے اندر جھانکنے میں کامیاب رہا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ کل اسے پتا چلا تھا کہ یہاں مہمان خانے میں کوئی مولوی صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن یہ مولوی صاحب نہیں تھے۔ یہ تو شہنشاہ کے مزار کا وہی پیر فرتوت مخدوم صادق شاہ تھا جس نے ڈھائی تین سال پہلے عمران کو بڑی بے حسی سے بدمعاش ماجھاں کے سپرد کیا تھا اور پھر پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ اور فربہ ہو چکا تھا۔ سرے سے بھری ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ وہ غالباً بھنگ کے نشے میں تھا۔ جان محمد صاحب کی معاون نیلم کسی خادمہ کی طرح اس کے سامنے مؤدب کھڑی تھی۔ وہ خود پلنگ پر نیم دراز تھا۔ اس نے نیلم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرا نہیں بچے۔ تیری شادی ہو گی اور بڑی جلدی بڑا اچھا دولہا ملے گا۔ تیری برادری کا ہی لڑکا ہو گا۔''
پھر اس نے نیلم کو اوڑھنی یعنی گرم شال اتارنے کو کہا۔ نیلم نے فوراً اتار دی۔ صادق شاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور نیلم کے جسم پر اوپر سے نیچے تک ہاتھ پھیرنے اور کچھ پڑھنے لگا۔ صادق شاہ کو دیکھ کر عمران کے سینے میں انگارے دہکنے لگے۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اس شخص سے اتنی جلدی مل پائے گا۔ اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ آج کی رات کو صادق شاہ کے لیے یادگار اور عبرت ناک بنا دے۔ اس کے اندر وہی سفاک تدبر سر اٹھانے لگا جو ماجھاں کی موت کے وقت اس کے ذہن میں نمودار ہوا تھا۔
وہ تیزی سے سوچنے لگا۔

ایک رات خاموشی سے نکل کر راج بھون پہنچ گیا اور جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ مجھے ایک مہمان کے طور پر واپس میڈم مطورا کے پاس بھیج دیا گیا۔ ادھر اسٹیل نے مجھے بتایا کہ جارج نے سامبر کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ راج بھون سے ہمارا بلاوا آگیا۔ وہاں رام پرشاد کی ماں موجود تھی۔ اس نے حکم سے کہا کہ سامبر کا چیلنج ختم کر کے مجھے سزا دی جائے تاہم عمران کے دلائل نے سب کو خاموش کرا دیا۔ سامبر کی تاریخ دے دی گئی۔ ہمیں مارنے کے منصوبے بنائے گئے مگر وہ ناکام رہے۔ میں اور عمران بیٹھے تھے کہ باتوں باتوں میں، میں نے اسے اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ پہلے تو وہ منع کرتا رہا پھر اپنی کہانی سنانے لگا۔ عمران شمالی پنجاب کے ایک گاؤں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ گاؤں کا چوہدری عمران عرف عمو کو دور دراز گاؤں کے ایک مزار پر ایک سال خدمت کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ عمران وہاں جا کر بہت روتا ہے تاہم اسے ایک سال تک وہاں رہنا تھا۔ عمو وہاں صبح سویرے سے رات تک صفائی کرتا۔ ایک روز عمو پیر صادق شاہ کے حجرے سے دسترخوان اٹھانے گیا۔ وہاں کچھ مہمان بیٹھے۔ ان میں ایک عورت ماجھاں تھی۔ اس نے عمو کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ عمو کو نہیں پتا تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ ماجھاں نامی عورت ایک ڈاکو کی بہن تھی۔ ایک روز اس نے عمو کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ عمو سے تعلق قائم کرنا چاہتی تھی تاہم عمو کو اس سے گھن محسوس ہوئی۔ اپنی مرضی پوری نہ ہونے پر اس نے عمو کو خوب مارا۔ ایک روز عمو ماجھاں کے پاس تھا کہ باہر احاطے میں ہلچل محسوس ہوئی۔ ایک تازی گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رکاب میں کسی شخص کا پاؤں پھنسا تھا اور وہ اس کے ساتھ گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ عمو کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام آگئی اور ماجھاں وغیرہ نے گھوڑے پر قابو پا لیا۔ گھوڑے سے گر کر مرنے والا شخص وہاں کام کرنے والی لڑکی شبانہ کا باپ تھا۔ ماجھاں نے عمو کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی اور ناکامی پر عمو کو سزا کے طور پر کتوں کی کوٹھری میں بند کروا دیا۔ شبانہ وہاں چوری چھپے عمو کو کھانا دینے لگی۔ عمو شبانہ سے محبت کرنے لگا اور ایک روز موقع پا کر عمو اور شبانہ نے فرار کی کوشش کی مگر وہ پکڑے گئے۔ ماجھاں نے عمو اور شبانہ پر تشدد کیا۔ اب عمو وہاں کے عام ملازموں کی طرح تھا اور اس کے پاؤں میں زنجیر آلود بیڑی ڈال رہی تھی۔ ایک روز اچانک ماجھاں کے اسی سرکش گھوڑے نے خوب اودھم مچایا اور ایک دو بندوں کو زخمی کر دیا مگر حیران کن طور پر عمو نے گھوڑے پر قابو پالیا اور اس پر سواری بھی کی۔ وہاں ماجھاں کا مہمان راجا نامی شخص بھی موجود تھا۔ اس نے عمو کو گھوڑے کو قابو کرتے دیکھا تو اسے بہت حیرت ہوئی اور یہ انکشاف بھی ہوا کہ عمو میں قدرتی صلاحیت موجود ہے اور جانور اس سے جلدی مانوس ہو جاتے ہیں۔ راجا اور عمو کی دوستی ہو گئی پھر راجا نے عمو اور شبانہ کو وہاں سے نکالنے کا پروگرام بنایا اور وہ لوگ بھاگ نکلے۔ راستے میں ماجھاں سے ٹکراؤ ہو گیا مگر اس ٹکراؤ میں ماجھاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ماجھاں کی موت کے بعد وہ لوگ شاہ پور میں روپوش ہو گئے اور 45 سالہ کبیر احمد کے گھر رہنے لگے۔ کبیر احمد کا بہت بڑا باغ تھا۔ وہ جانوروں کو بھی سدھاتے تھے۔ سدھانے کا کام عمو کے ذمے ہی تھا۔ نام راجا کا ہوتا اور پیسے بھی وہی لیتا۔ عمو کی والدہ اچانک اپنے گاؤں سے غائب ہو گئی تھی۔ عمو اپنی ماں کو ڈھونڈنا چاہتا تھا مگر راجا نے کہا کہ ان کا باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔ ایک روز راجا بنگال ٹائیگر لے کر آگیا اور عمو کو مجبور کیا کہ وہ اسے سدھانے میں مدد دے۔ حیران کن طور پر عمو نے یہ کام بھی کر لیا۔ بنگال ٹائیگر سرکس کے مالک جان محمد کا تھا۔ ایک روز ٹائیگر بپھر گیا اور ایک دو بندوں کو زخمی کر دیا۔ راجا عمو کو اپنے ساتھ لے گیا اور عمو نے ٹائیگر کو رام کر لیا۔ اس طرح راجا کی اصلیت کھل گئی۔ جان محمد نے عمو کو اصل حقیقت بتا دی اور کہا کہ راجا عمو کو دھوکا دے رہا تھا۔ اس طرح عمو راجا کو چھوڑ کر جان محمد کے پاس آگیا اور ان کی حویلی میں ٹھہر گیا۔ عمو رات کو سونے کے لیے لیٹا تو اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اچانک ایک آواز نے اسے چونکایا۔ وہ اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں سے آواز آئی تھی۔ عمو نے دیکھا کہ کمرے میں صادق شاہ موجود ہے۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس شخص سے اتنی جلدی ٹکراؤ ہو پائے گا۔ اس کے اندر وہی سفاک تدبر سر اٹھانے لگی جو ماجھاں کی موت کے وقت اس کے ذہن میں نمودار ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے سوچنے لگا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کمرے کے اندر صادق اور نیلم میں گفتگو جاری تھی۔ صادق نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ کل ظفر پھر یہاں آرہا ہے۔ جب تم دونوں میں طلاق مکمل ہو چکی ہے تو پھر وہ یہاں کیا لینے آتا ہے؟ اس کا کیا کام ہے یہاں؟“

”مجھے تو یہ خود اچھا نہیں لگتا شاہ جی۔“ نیلم کے چہرے پر نفرت نظر آئی۔

”تم خود جان صاحب سے کہو کہ وہ یہاں نظر نہ آیا کرے۔ تمہیں یاد ہے کہ پچھلی دفعہ جب یہاں آیا تھا تو میرے ساتھ کتنی بدتمیزی سے بولا تھا وہ؟ اس خبیث کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اسے تم سے دور کرنے میں میرا ہاتھ ہے۔ حالانکہ یہ اس کے کرتوت ہیں جنہوں نے اسے ذلیل کیا ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں... یہ تمہاری ہمت ہے کہ تم اس جیسے گندے بندے کے ساتھ دو تین سال گزار گئی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ پچھلے دنوں وہ کسی تھیٹر کے گانے والے کے ہاتھوں بھی ذلیل وخوار ہوا ہے۔“

”ہاں جی، اس کمبخت کے ساتھ مل کر وہ کوئی نیا تھیٹر بنا رہا تھا۔ وہ بندہ اس سے بھی بڑا فریبی نکلا۔ اس کا پانچ چھ لاکھ روپیا کھا گیا۔ اب اس کا ہاتھ کافی تنگ ہے۔ اسی لیے یہاں کے چکر لگا رہا ہے اور بچیا سے جھگڑ رہا ہے۔“

عمران یعنی عمو کھڑکی میں سے ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جس بندے کا نام ظفر لیا جا رہا ہے، یہ وہی ہے جس سے نیلم کی طلاق ہوئی ہے۔

”اب کیا جھگڑا ہے؟“ صادق شاہ نے نیلم سے پوچھا۔

”جھگڑا تو کوئی خاص نہیں ہے جی۔ بس وہ خوامخواہ اس کو بڑھا رہا ہے۔ جہیز کا سامان ہم نے واپس لینا ہے اور شادی کے موقع پر جو زیور وغیرہ ان لوگوں نے مجھے پہنایا تھا، وہ ہم نے واپس دینا ہے۔ وہ زیور کو بڑھا چڑھا کر بتا رہا

ہے۔۔۔“

صادق شاہ نے اپنے تیل میں چپڑے ہوئے بالوں کی لٹ چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ وہ خبیث تمہیں ملنے اور پھر سے اپنے جال میں پھنسانے کے ارادے سے یہاں آتا ہے، حالانکہ اس گدھے کو پتا ہونا چاہیے کہ طلاق مکمل ہو چکی ہے اور اب اس کا تمہاری طرف دیکھنا بھی گناہ ہے۔“

”مجھے بھی یہی لگتا ہے جی کہ وہ مجھ سے بات وغیرہ کرنا چاہتا ہے لیکن اب مجھے تو اس کی صورت سے ہی ڈر لگنے لگا ہے۔“

صادق شاہ نے اپنی ٹانگیں پسار یں اور نیلم کسی خادمہ کی طرح اس کی پائنتی بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگی۔ صادق شاہ نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”اور مجھے تو وہ دوسرا لڑکا راجا بھی ایک دم فراڈیا لگتا ہے۔ وہ تمہیں بس شادی کا جھانسا دے رہا ہے۔ بُری عورتوں سے اس کا ملنا جلنا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہاری دوسری شادی تمہاری برادری ہی کے کسی لڑکے سے ہوگی اور بڑی جلدی ہوگی۔“

نیلم اور زور زور سے اس کی ٹانگیں دبانے لگی۔ صادق شاہ نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔ ”بالکل فکر نہیں کرنا۔ سب اچھا ہو جائے گا۔ فقیروں کی دعا ہے تیرے ساتھ۔ بس اپنے چچا سے کہو کہ اس ظفر سے فوراً جان چھڑا لیں۔“

کچھ دیر بعد نیلم نے صادق شاہ کو ادب سے سلام کیا اور اجازت لے کر کمرے سے چلی گئی۔ وہ بھینسے کا بھتیجا کچھ دیر تک بستر پر پڑا اپنی ٹانگیں کھجاتا رہا پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ عمو کی آتشیں نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

اس سے اگلے روز عمو نے نیلم کے سابقہ شوہر کو دیکھا۔ اس وقت عمو گھر کے وسیع صحن میں جان محمد صاحب کے ساتھ سرکس کے بے زبان فن کاروں یعنی جانوروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ مختلف جانوروں ریچھ، بندر، بارہ سنگھے وغیرہ کے پنجرے ایک قطار میں رکھے تھے۔ جان محمد صاحب کا سلوک اپنے ملازموں کے ساتھ ساتھ اپنے جانوروں سے بھی بہت اچھا تھا۔ وہ ان کی بہترین نگہداشت کے قائل تھے۔ مکمل تربیت سے پہلے ان کے سرکس کے جانور اسی جگہ رہتے تھے اور بہترین مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس وقت بھی جان محمد صاحب ایک نیم تربیت یافتہ بندر کو اپنے ہاتھ سے ڈبل روٹی مکھن کھلا رہے تھے۔ دروازہ کھلا اور نیلم کا سابقہ شوہر ظفر دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے کلف دار کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کندھوں پر گرم چادر تھی۔ اس کی پھولی ہوئی ناک سے اس کی کرخت طبع کا اندازہ ہوتا تھا۔ عمو کو معلوم ہوا تھا کہ یہ شخص خوشاب شہر میں ایک پیٹرول پمپ چلاتا ہے۔ تاہم شکل سے وہ کاروباری شخص کے بجائے ایک اجڈ زمیندار نظر آتا تھا۔

اس کے ساتھ ایک ملازم نما شخص بھی تھا۔ جان صاحب سے بے دلی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد ظفر ان کے ساتھ بیٹھک میں چلا گیا۔

پانچ دس منٹ کے بعد بیٹھک کے اندر سے تیز لہجے میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔۔۔ جان محمد صاحب اور ظفر کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ غالباً وہی زیورات والا معاملہ تھا۔ کبھی جان صاحب کی آواز بلند ہو جاتی تھی، کبھی ظفر کی۔ ظفر کی بوجھل آواز میں کبھی کبھی شرابیوں کی سی لڑکھڑاہٹ بھی آ جاتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں دیکھتے ہی بندے کے ذہن میں ناپسندیدگی کی لہر سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس گفتگو میں ایک دو بار صادق شاہ کا نام بھی آیا۔ شاید صادق شاہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ ظفر نامی شخص اپنی اور نیلم کی طلاق میں صادق شاہ کو قصور وار سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صادق شاہ نے نیلم کو الٹے سیدھے تعویذ پلائے ہیں۔۔۔ جب یہ بحث چل رہی تھی، صادق شاہ مہمان خانے میں سویا ہوا تھا۔ اس نے بھنگ پی رکھی تھی۔ امید نہیں تھی کہ وہ جلد ہی جاگے گا۔

عمو (عمران) کل رات سے بہت محتاط تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ صادق شاہ کی نظروں میں نہ آ جائے۔ کل جان محمد صاحب نے جس طرح عمو کا تعارف اپنے پارٹنر خاجی احمد اشفاق سے کروایا تھا، اسی طرح صادق شاہ سے بھی کرا سکتے تھے۔ بہر حال خیریت ہی گزری۔ ایک تو صادق شاہ سہ پہر سے پہلے جاگا ہی نہیں۔ دوسرے جاگتے ساتھ ہی وہ مصروف ہو گیا۔ گاؤں کا چودھری اور دو تین دیگر معزز افراد اس سے ملنے چلے آئے۔ وہ اس کے لیے نذرانے وغیرہ بھی لائے تھے جن میں دیسی گھی، سوہن حلوہ اور گرم چادریں وغیرہ شامل تھیں۔۔۔ یہ محفل رات تک چلتی رہی۔ نیلم کا سابقہ شوہر ظفر بھی ابھی تک حویلی میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے کل صبح جان محمد صاحب سے حتمی بات کرنی تھی اور زیورات والا معاملہ طے کر کے واپس جانا تھا۔ عمو نے محسوس کیا تھا کہ صادق شاہ اور ظفر ایک دوسرے سے کلام نہیں کرتے۔

عمو کے ذہن میں جس منصوبے نے پرورش پائی تھی، اس کے لیے حالات مزید سازگار ہو گئے تھے۔ شام کو عمو نے شبانہ کے ہاتھ کے تلے ہوئے بینگن پکوڑے کھائے اور دیر تک اس سے باتیں کیں۔ جان محمد صاحب کی خوش خلق بیوی صدیقہ بی بی بھی وہیں موجود تھی۔ عمو اور شبانہ اسے خالہ کہنے لگے تھے۔ وہ بھی ان دونوں کا اپنے بچوں ہی کی طرح خیال رکھنے لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بگاہے ان دونوں کے لیے ملاقات کا موقع فراہم کر دیتی تھی۔

رات گہری ہوئی تو عمو کے سینے میں سلگتے ہوئے انگارے آگ کا روپ دھارنے لگے۔ وہ صادق شاہ کو یادگار سبق سکھانا چاہتا تھا۔ وہ بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ آخر اسے اندازہ ہوا کہ جان محمد کے اس حویلی نما گھر میں سب لوگ سو چکے ہیں۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا اور محتاط قدموں سے جانوروں کے پنجروں تک پہنچ گیا۔ جانوروں کو سردی سے بچانے کے لیے پنجروں پر ترپالیں وغیرہ ڈال دی گئی تھیں۔ رائل بنگال ٹائیگر کے پنجرے پر بھی ترپال تھی۔

بنگال ٹائیگر یوں تو تربیت پا چکا تھا اور جان محمد نے اس کی تربیت سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی راجا کو ادائیگی کی تھی، تاہم بعد میں صورتِ حال بدل گئی تھی۔ اپنے مزاج کے کسی اندرونی اشتعال کی وجہ سے بنگال ٹائیگر نہ صرف بپھر گیا تھا بلکہ اس نے ایک ملازم کا پیٹ بھی پھاڑ ڈالا تھا۔ اب عمو یہاں موجود تھا اور اسے اندازہ تھا کہ آنے والے دنوں میں اسے ٹائیگر کے ساتھ مزید محنت کرنا پڑے گی۔

عمو نے ٹائیگر کے پنجرے کی ترپال اوپر اٹھائی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور تیزی سے دُم ہلانے لگا۔ عمو کو پہچاننے کے بعد اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ٹائیگر کے پنجرے کے دروازے کو یوں کھولنے کی ہمت یہاں عمو کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ بلکہ عام ملازم تو اس کے پنجرے کے پاس بھی نہیں جاتے تھے۔ عمو نے دروازہ کھولا۔ ٹائیگر تیزی سے باہر آیا۔ یوں لگا جیسے وہ حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ دوستانہ جھپٹ تھی۔ عمو نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کی پشت سہلا سہلا کر اسے پچکارنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کے جادو نے کام کر دکھایا۔ ٹائیگر کا پارے کی طرح مچلتا ہوا جسم پُرسکون ہونے لگا۔ عمو نے اسے پوری طرح اپنے کلاوے میں لیا پھر اسے اس کے کالر سے پکڑ کر دھیرے دھیرے اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں صادق شاہ سو رہا تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ جس وقت عمو ٹائیگر کے ساتھ صادق شاہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کے پاؤں میں اپنی جوتی نہیں تھی۔ یہ ظفر کی جوتی تھی جو اس نے اس کے کمرے کے سامنے سے اٹھائی تھی۔ یہ براؤن رنگ کی گرگابی عمو کے پاؤں میں ذرا سی کھلی تھی تاہم کام چل رہا تھا۔

عمو بڑی احتیاط سے تقریباً چار سو دس پونڈ وزنی اس ٹائیگر کو صادق شاہ کے کمرے تک لایا۔ اسے معلوم تھا کہ دروازہ بند ہے لیکن اسے اندر سے کنڈی نہیں چڑھائی گئی۔ عمو نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ ٹائیگر کے جسم میں ایک بار پھر ہلکا سا اضطراب پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی دھاری دار دُم کو تیزی سے حرکت دے رہا تھا اور گردن معمول سے لمبی نظر آ رہی تھی۔ عمو نے اسے کمرے میں دھکیلا اور دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔

اس کے بعد وہ تیزی سے پلٹا۔ ظفر کی جوتی اس کے کمرے کے سامنے اتاری اور پھر بڑی احتیاط سے گھاس والی جگہ پر پاؤں رکھتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

اسے معلوم تھا کہ بہت جلد یہاں قیامت کا شور بلند ہونے والا ہے۔ اسے پتا تھا کہ ٹائیگر کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر صادق شاہ زبردست واویلا کرے گا۔ اس کا یہ واویلا اور اضطراب ہی اس کی بدبختی کا سبب بننے والا تھا۔ ٹائیگر کا مشتعل ہونا لازمی تھا۔

۔۔۔اور پھر یہی کچھ ہوا۔ صادق شاہ کے کمرے سے تہلکہ خیز آوازیں بلند ہوئیں۔ صادق شاہ دہشت ناک انداز میں چلا رہا تھا اور کمرے کے بند دروازے کو دھڑا دھڑ کوٹ رہا تھا۔

”بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ دروازہ کھولو۔“ صادق شاہ کی کرب ناک آواز اتنی زوردار تھی کہ بند کمرے سے بلند ہونے کے باوجود پوری حویلی میں پھیل رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد جان صاحب کے ایک ملازم نے چلا کر کہا۔ ”مالک۔۔۔ ٹائیگر پنجرے میں نہیں ہے۔۔۔ مالک۔۔۔“

عمو نے دروازے کی جھری سے دیکھا۔ جان محمد صاحب ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں ٹارچ لیے بھاگتے ہوئے برآمدے میں پہنچے۔ فوری طور پر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے بس صادق کی دہشت زدہ پکار سنی۔ ”بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ دروازہ کھولو۔“

جان صاحب بے ساختہ صادق کے کمرے کی طرف لپکے۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر ان پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ ٹائیگر بھی کمرے کے اندر ہے۔ ٹائیگر کی لرزہ خیز آواز کو پہچاننا ان کے لیے ہرگز مشکل نہیں تھا۔

چند لمحوں کے لیے جان صاحب حواس باختہ نظر آئے۔ تب وہ پیچھے ہٹے اور انہوں نے عمران کو پکارنا شروع کیا۔

’’عمو... عمو!‘‘

عمران کمرے کے اندر بے حس بنا کھڑا رہا۔ یہ وہی سناک بے حسی تھی جو اس پر ماجھاں کی موت کے وقت طاری ہوئی تھی۔ اس بے حسی کا تعلق یقیناً ان بے رحم حالات سے تھا جن سے وہ گزرا تھا۔ ورنہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ وہ تو کتابوں، پھولوں اور موسموں سے پیار کرنے والا لڑکا تھا۔ اسے وہ سب کچھ اچھا لگتا تھا جو اس کی من موہنی ماں کو اچھا لگتا تھا اور وہ سب کچھ بُرا لگتا تھا جو اس کی ماں کے نزدیک بُرا تھا۔ اس کی خوب صورت دنیا اس کی ماں سے شروع ہو کر ماں پر ختم ہو جاتی تھی۔ اب ظالم لوگوں نے اس سے اس کی ماں چھین لی تھی۔ اس طویل جدائی نے عمران کے دل میں جو زہر بھرا تھا، اس کا تریاق ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

وہ حویلی میں برپا ہونے والا شورِ محشر سن رہا تھا مگر بہرا بنا کمرے کی تاریکی میں کھڑا تھا۔ اب کئی ملازم صحن میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ تب عمران نے دیکھا کہ جان صاحب بھاگتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف آ رہے ہیں۔ اب وہ مزید تاخیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی چپل پہنی اور خود ہی کمرے سے نکل آیا۔

جان صاحب اسے دیکھ کر چلّائے۔ ’’عمو! ٹائیگر... پیر جی کے کمرے میں گھس گیا ہے۔‘‘ دکھ اور دہشت کی شدت سے ان کی آواز پھٹ رہی تھی۔

عمران ان کے ساتھ لپکتا ہوا صادق شاہ کے کمرے تک پہنچا۔ صادق شاہ کی زخمی آواز مدھم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ غالباً مشتعل درندے کے سامنے اس کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

عمران نے اپنے ہاتھ بند دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھائے تو جان صاحب کے دو ملازموں نے رائفلیں سونت لیں۔ عمران نے دروازہ کھولا۔ ٹارچوں کی روشنی کمرے میں گئی۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ صادق شاہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کا جسم خون چکاں تھا۔ مشتعل درندے نے پلٹ کر عمران کی طرف دیکھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دکھائی دیں۔ اس کے منہ پر تازہ خون کے نشان تھے۔ ایک سیکنڈ کے لیے لگا کہ وہ عمران پر بھی جھپٹ پڑے گا...

عمران کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ پکارا۔ ’’ٹائیگر... ٹائیگر۔‘‘ اس کا خیال تھا کہ ٹائیگر اس کی سمت آئے گا مگر وہ بے مہار ہو رہا تھا۔

وہ واپس پلٹا۔ اس نے طیش کے عالم میں مخملی لحاف پر پنجہ مارا اور اسے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ عمران ہمت کر کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کی وہ خداداد صلاحیت کام آئی جو اسے جانوروں سے قریب تر کر کے اسے ان کی فطرت پر اختیار دے دیتی تھی۔

چند سیکنڈ کے اندر عمران نے مشتعل درندے کو سنبھال لیا اور پھر اسے اپنے کلاوے میں لیتا ہوا آہنی پنجرے کی سمت لے گیا۔ پوری حویلی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لالٹینیں روشن ہو گئی تھیں اور ملازم بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ کتوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

عمران نے اپنے عقب میں جان صاحب کی وحشت زدہ آواز سنی۔ وہ ملازموں سے کہہ رہے تھے۔ ’’اٹھاؤ... جلدی کرو۔ اسپتال لے جاؤ۔ ابھی یہ زندہ ہے۔‘‘

تب عمران نے دیکھا کہ چند ملازم فربہ اندام صادق شاہ کو ہاتھوں میں اٹھائے جیپ کی طرف لے جا رہے ہیں۔ صادق شاہ کی ادھڑی ہوئی خون چکاں شلوار زمین پر گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جیپ آندھی طوفان کی طرح حویلی کے پھاٹک سے نکلی اور خوشاب کے سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

جان صاحب دہاڑے۔ ’’یہ سب کیسے ہوا؟ ٹائیگر کس طرح نکلا ہے پنجرے سے؟ کیسے پہنچا ہے پیر صاحب کے کمرے میں؟‘‘ یقیناً یہی سوال سب لوگوں کے دماغوں میں بھی گھوم رہا تھا۔

حاجی احمد اشفاق نے لرزاں آواز میں کہا۔ ’’یہ حادثہ نہیں ہے۔ یہ کوئی چکر لگتا ہے۔ کسی نے جان بوجھ کر جانور کو کھولا ہے۔ وہ پنجرے سے باہر آیا ہے اور سب سے نزدیک پیر صادق کا کمرا ہی پڑتا تھا، وہ اس میں گھس گیا ہے۔‘‘

’’ایسا کون کر سکتا ہے؟ کس کو ہو سکتی ہے اتنی ہمت؟‘‘ جان صاحب شدید الجھن کے عالم میں بولے۔

یکایک ایک ملازم حسن دین پکارا۔ ’’مالک! دیکھیں... یہ پنجرے کے پاس تازہ قدموں کے نشان ہیں۔‘‘

حسن دین اپنی طاقتور ٹارچ کا روشن دائرہ کچی زمین پر پھینک رہا تھا۔ یہاں دو طرح کے تازہ نشان تھے۔ ایک عمران کی چپل کا تھا۔ یہ نشان تھوڑی ہی دیر پہلے بنا تھا جب عمران ٹائیگر کو کنٹرول کرنے کے بعد پنجرے کی طرف لایا تھا۔ دوسرا نشان گرگابی کا تھا۔ یہ نشان پنجرے کے سامنے سے شروع ہو کر نیم پختہ برآمدے کی طرف گیا تھا۔ ملازم حسن دین کچھ دیر تک تذبذب میں رہا پھر اس نے جان صاحب کے کان میں کچھ کہا... جان صاحب کے چہرے پر بھی ہلچل نظر آنے لگی۔ تاہم انہوں نے اپنے اندرونی جذبات کو چھپایا اور نارمل لہجے میں حسن دین سے پوچھا کہ ظفر کہاں ہے؟

اسی دوران میں ظفر بھی شراب کے نشے میں ڈگمگاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ’’کیا ہوا ہے؟ کیسا شور ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’پیر صادق صاحب سخت زخمی ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں بچتے بھی ہیں یا نہیں۔ انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں۔‘‘ جان صاحب نے ظفر کو بتایا۔

ظفر نشیلے انداز میں ہاتھ لہرا کر بولا۔ ’’وہ کیسے زخمی ہو سکتا ہے؟ وہ تو دوسروں کو زخمی کرتا ہے۔ اس کی راکھی (حفاظت) تو اس کے دو درجن موکل کرتے ہیں۔‘‘

جان صاحب غصے سے بولے۔ ’’یہ مذاق ٹھٹھے کا وقت نہیں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب کو پتا تھا، ٹائیگر خطرناک ہو رہا ہے۔ پھر اس کا پنجرہ کس نے کھولا؟‘‘

’’تو آپ کا مطلب ہے کہ صادق کو شیر نے زخمی کیا ہے؟‘‘ ظفر نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

جان صاحب نے ظفر کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ’’ظفری! تم کہاں تھے؟‘‘

’’ظاہر ہے مردانے میں ہی تھا۔ زنانے میں تو اب جا نہیں سکتا کیونکہ آپ جناب کی منہ بولی بھتیجی مجھ سے طلاق لے چکی ہے۔‘‘ وہ بدستور نشیلی آواز میں بولا۔ ’’لیکن... لیکن آپ جناب مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟‘‘

’’یونہی۔‘‘ جان صاحب نے مختصر جواب دیا اور ایک بار پھر غور سے پنجرے کے اردگرد کی کچی زمین پر قدموں کے نشانات کو دیکھنے لگے۔ ان کے پریشان چہرے پر شک کی پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا عمران نے چاہا تھا۔ کسی کا دھیان عمران کی طرف گیا ہی نہیں۔ صادق شاہ اور نیلم کے سابق شوہر ظفر میں رنجش چلی آ رہی تھی۔ ظفر ایک دو بار صادق شاہ کو دھمکی بھی دے چکا تھا۔ پھر پنجرے کے آس پاس ظفر کے قدموں کے تازہ نشان بھی ملے۔ ہر کسی نے یہی نتیجہ نکالا کہ ظفر نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر صادق شاہ سے خوفناک بدلہ لیا ہے۔ اس نے پنجرہ کھولا ہے۔ اسے پتا تھا کہ شیر جب پنجرے سے نکلے گا تو سب سے پہلے وہ جس دروازے تک جائے گا، وہ صادق شاہ کے کمرے کا ہی ہو گا۔

صادق شاہ شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ ہنسلی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ بپھرے جانور نے اس کا ایک کندھا تقریباً چبا ڈالا تھا۔ پتا چلا کہ اسپتال میں اس کی ذہنی کیفیت بھی ابتر ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں چلّا اٹھتا ہے اور ’’بچاؤ جان صاحب... بچاؤ جان صاحب‘‘ کی دہائی دینے لگتا ہے۔ خوشاب سے اسے لاہور کے اسپتال لے جایا گیا۔ جیسے تیسے اس کی جان تو بچ گئی مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کئی ماہ اسپتال میں گزارنے پڑیں گے۔

واقعے کے اگلے دن ہی ظفر عرف ظفری کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ’’شک‘‘ اس کی طرف جا رہا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ صادق شاہ کے سیکڑوں مرید آگ بگولا ہو رہے ہیں۔ اگر وہ ان میں سے کسی کے ہتھے چڑھ گیا تو اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ وہ جان صاحب کی حویلی سے گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا۔ اس کے خلاف کچی رپورٹ بھی درج ہو گئی تھی۔

جان صاحب نے ایک بار تو ٹائیگر کو ان کے بیچنے کا ارادہ کر لیا مگر پھر عمران آڑے آیا۔ اس نے جان صاحب کو یقین دلایا کہ وہ ٹائیگر کو ٹھیک کر لے گا اور ایسا ٹھیک کرے گا کہ وہ بکری کی طرح اشاروں پر چلے گا۔ جان صاحب کو بھی عمران کی حیرت انگیز صلاحیتوں پر یقین تھا۔ انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

آٹھ دس ہفتے میں حالات معمول پر آ گئے... اب ایک بار پھر جان صاحب کی حویلی میں پکوان پکتے تھے، شطرنج ہوتی تھی۔ ملازمین جانوروں کی دیکھ بھال میں مصروف نظر آتے تھے اور کبھی کبھار جب خوشاب شہر سے سرکس کا کوئی مزاحیہ فن کار آ جاتا تھا تو قہقہے بکھرتے تھے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں صادق شاہ کے ساتھ جو ہوا وہ کس نے کیا اور اس کے پیچھے کتنی پرانی کہانی تھی۔

عمران اور شبانہ بتدریج جان صاحب کے گھرانے کے فرد بنتے جا رہے تھے۔ جان صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کی گھر والی صدیقہ بی بی بڑی محبت کرنے والی اور دانا عورت تھی۔ عمران اور شبانہ اسے خالہ کہتے تھے۔ وہ ان دونوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ خصوصاً وہ شبانہ سے بہت پیار کرنے لگی تھی۔ اسے شبانہ کی یہ بات بہت پسند آئی تھی کہ اس نے پورا پورا موقع ہونے کے باوجود عمران سے صرف اس لیے شادی نہیں کی کہ وہ اس شادی میں اپنے گھر والوں کی مرضی شامل کرنا چاہتی ہے۔ اس نے شبانہ کو یقین

دلایا کہ وہی کچھ ہوگا جو وہ چاہتی ہے اور جو عمران چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔ ”شبانہ! اس شادی کے سارے انتظام میں خود کراؤں گی۔ دیکھنا ہم اس کو ایک یادگار شادی بنا دیں گے۔“

خالہ صدیقہ نے جان صاحب سے کہہ کر شبانہ کے گھر والوں کا پتا ٹھکانا معلوم کرلیا تھا۔ شبانہ کی والدہ اور ماموں وغیرہ ابھی تک گجرات کے اس گھوئکی نامی گاؤں میں ہی مقیم تھے۔ آخر ایک دن جان صاحب کا خاص ملازم حسن دین خود گھوئکی گاؤں گیا تاکہ شبانہ کے گھر والوں کو شبانہ کے بارے میں خوش خبری سنائے اور انہیں لے کر خوشاب آئے۔

اب شبانہ کے جانے کا وقت تھا۔ عمران کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا، کیا وہ دونوں ایک ہو پائیں گے؟ کہیں ان کے درمیان کوئی دیوار تو کھڑی نہیں ہو جائے گی؟ اگلے روز شبانہ کے گھر والوں کو خوشاب پہنچ جانا تھا اور شبانہ کو واپس اپنے گاؤں لے جانا تھا۔ اس دن عمران بہت اداس تھا۔ شبانہ بھی چپ چپ تھی۔ خالہ صدیقہ نے رنگین پیڑھی پر شبانہ کو اپنے سامنے بٹھایا اور اس کے لمبے بالوں میں تیل لگاتے ہوئے بولیں۔ ”شبو! تو ذرا فکر نہ کر۔ ہم بڑی جلدی تجھے پھر واپس یہیں پر لے آئیں گے۔ تیری اور نمو کی شادی کے سارے انتظام ہم خود کریں گے۔ دیکھنا یہ بڑی دھوم دھام والی شادی ہوگی۔“

”لیکن خالہ! ابھی عمران کی امی جی کا تو کچھ پتا نہیں چلا ہے۔“

”وہ بھی جلد ہی چل جائے گا۔ تمہارے خالو پوری کوشش کر رہے ہیں اور اگر فرض محال ابھی کوئی کھوج کھرا نہ بھی ملا تو بھی یہ شادی تو اب ہونی ہی ہے۔ ہم سب مل کر عمران کو راضی کرلیں گے۔ کیوں نمو؟“ خالہ صدیقہ نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

عمران خاموش رہا۔ خالہ نے عمران کو بھی اپنے قریب بٹھا لیا۔ پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ ”نمو! مجھے پتا ہے تم نے اپنی والدہ کو ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی ہے... ہم بھی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ جو کچھ ہو سکا کریں گے لیکن اگر خدانخواستہ... تمہاری امی کا پتا نہ بھی چلا تو بھی ہم تم دونوں کا نکاح کر دیں گے۔ سیانے کہتے ہیں کہ نیک کام میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے اور اس کام میں تو پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“

عمران خاموش رہا۔ وہ ”ہاں“ میں جواب کیسے دے سکتا تھا۔ اس کی تو زندگی کا دوسرا نام ہی ماں تھا۔ وہ ابھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ماں کے بغیر وہ یہ شادی کر سکے گا یا نہیں۔

رات کو شبانہ اور عمران تنہائی میں ملے۔ حویلی کی چھت پر ہلکی سی سردی تھی۔ سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ بستی سو رہی تھی لیکن دو پیار کرنے والے دل دھڑک رہے تھے اور ان میں غم ناک کسک جاگی ہوئی تھی۔

عمران نے شبانہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”کل تمہارے گھر والے تمہیں لے جائیں گے شبو! میں بہت اکیلا رہ جاؤں گا۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ”ہم بڑی جلدی پھر ملیں گے عمران۔ اس بات کا یقین رکھنا۔ میں اب تمہارے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔“

”اس طرح کے وعدے کبھی کبھی ٹوٹ بھی تو جاتے ہیں شبو۔“

”میری طرف سے نہیں ٹوٹیں گے عمران! میں... مرتے دم تک تمہاری ہوں۔“ وہ سسک کر بولی۔

عمران نے اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگی۔ ”تم مجھے بھول جاؤ تو بھول جاؤ۔ میں نہیں بھول سکتی عمران... تمہیں بھول کر میں زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔“

”اور میں کیا زندہ رہ سکتا ہوں؟ تمہیں کیا پتا تمہارے بغیر ایک ایک دن کس طرح گزاروں گا۔“

اس نے اپنی پیاری سی ناک عمران کی گردن میں گھسا دی۔ عمران نے اسے پوری طرح اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ فلک دیکھ رہا تھا... وہ ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے۔ پیار کرنے والوں کو... بچھڑنے والوں کو... وعدے کرنے والوں کو اور پیمان باندھنے والوں کو... وہ سب جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے لیکن خاموش رہتا ہے۔ صدیاں اس کے نیچے سے دبے پاؤں گزرتی چلی جاتی ہیں اور وہ محبت و نفرت کی ہزارہا داستانوں کا شاہد بنتا ہے۔

اگلے روز شبانہ کی والدہ اور دو ماموں گجرات کے اس دور دراز گاؤں سے خوشاب کی اس نواحی بستی میں پہنچے۔ اپنی والدہ سے شبانہ کے ملنے کا منظر دیدنی تھا۔ دونوں رو رو کر ہلکان ہو گئیں۔ شبانہ کے دونوں ماموں بھی بھانجی کو دیر تک گلے سے لگائے رہے۔ سہ پہر کو وہ لوگ واپس گجرات کے گاؤں گھوئکی روانہ ہو گئے۔

اس کے تیسرے دن عمران ایک بار پھر حسن دین کے ساتھ اپنی والدہ کی تلاش میں شیخوپورہ روانہ ہو گیا۔ وہ اس سلسلے میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی کسر بھی اٹھا نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ شیخوپورہ روانگی سے اسے ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ شبانہ کی جدائی سے وقتی طور پر اس کا دھیان ہٹ گیا۔ حسن دین کے ساتھ اس نے کئی جگہوں کی خاک چھانی، کئی لوگوں سے ملا۔ اس کی ملاقات اس کہانی کے ایک اور ناپسندیدہ کردار چودھری سجاول سے بھی ہوئی۔ چودھری سجاول کو شوگر کا مرض لاحق ہو چکا تھا اور وہ پہلے سے کافی کمزور دکھائی دیتا تھا۔ چودھری سجاول نے عمران سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ اس نے قسمیں کھا کر عمران کو یقین دلایا کہ اس کی طرف سے اس کی والدہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ اس نے اپنی زمین مرضی سے بیچی تھی اور اپنی مرضی سے ہی گاؤں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے عمران سے کہا کہ وہ شریفاں بی بی کی تلاش میں ہر طرح اس کی مدد کرنے کو تیار ہے اور اس سلسلے میں پولیس میں بھی اپنا اثر رسوخ استعمال کر سکتا ہے۔ اس نے عمران کو یقین دلایا کہ شہنشاہ کے مزار سے اس کے گم ہو جانے کے بعد انہوں نے اسے ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی تھی لیکن مزار والوں کی طرف سے انہیں یہی بتایا گیا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

چودھری سجاول ان لوگوں میں سے تھا جن پر پیاز کی طرح تہ در تہ چھلکے ہوتے ہیں۔ ان کی اصلیت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ چودھری سجاول کے علاوہ وہ اپنے آبائی گاؤں کے کچھ اور لوگوں سے بھی ملا۔ ان میں ماسٹر عطا صاحب اور قاری سلیم وغیرہ شامل تھے... ماسٹر عطا صاحب کی تو خیر اور بات تھی مگر باقی کسی شخص میں بھی اسے گرم جوشی یا ہمدردی نظر نہیں آئی۔ وہ لوگ اس سے لیے دیے ہوئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر لوگوں کے نزدیک وہ شہنشاہ کے مزار کا بھگوڑا تھا۔ بہرحال قاری سلیم کے گھر میں اسے بہ وجہ دو تین گھنٹے رکنا پڑا کیونکہ تیز بارش ہونے لگی تھی۔ اس نے وہاں کھانا کھایا اور حسن دین کے ساتھ تھوڑی دیر آرام بھی کیا۔

... قریباً دو ہفتے کی بھاگ دوڑ کے بعد عمران اور حسن دین ایک بار پھر ناکام ہو کر خوشاب کی اس نواحی بستی چک میں جان صاحب کے پاس واپس آ گئے۔

ہر طرف ناکامی نظر آتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں عمران کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز ابھرتی تھی کہ اس کی ماں ابھی زندہ ہے۔ وہ جو اسے ”گھر“ میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتی تھی، دنیا میں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے؟ ابھی اس نے ماں کے ہاتھ سے بہت سے محبت بھرے لقمے کھانے ہیں۔ ابھی اس کی گود میں بڑے دنوں تک سر رکھ کر لیٹنا ہے اور ابھی اس کی شفقت کی بہت سی بارشوں میں بھیگنا ہے۔

ٹائیگر کے حوالے سے عمران نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس نے آٹھ دس ہفتوں میں ہی کر دکھایا۔ یہ تیز طرار جانور ایک دم شانت ہو گیا اور اشاروں پر چلنے لگا۔ جان محمد اور حاجی احمد اشفاق عمران سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے اسے باقاعدہ اپنے سرکس میں ملازمت دے دی اور عمران ”چک“ کی حویلی چھوڑ کر خوشاب آ گیا۔

جان محمد اور حاجی اشفاق کا سرکس وسطی پنجاب کا جانا پہچانا سرکس تھا اور ترقی کر رہا تھا۔ اس کا نام ”اسٹار سرکس“ تھا۔ ابھی یہ لوگ چھوٹے شہروں کے میلوں ٹھیلوں اور عرسوں وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ اس سرکس کے مختلف شعبے تھے۔ مثلاً جسمانی کرتب... رقص و موسیقی، جوکرز اور پھر وہ کرتب جن میں مختلف جانور، ہاتھی، گھوڑے، کتے، شیر اور پرندے وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ عمران کو اس آخری شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔ یہاں آ کر عمران کو ایسے ہی لگا جیسے مچھلی پانی میں آ گئی ہے۔ وہ جیسے مدتوں سے یہ کام کر رہا تھا اور اس کی ہر ہر باریکی سے آگاہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سب کچھ کمال مہارت سے سنبھال لیا۔ اب وہ ایک جگہ مقیم نہیں تھا۔ سرکس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں اور شہروں میں اس کی حرکت جاری رہتی تھی۔

انہی دنوں میں جان محمد صاحب اور خالہ صدیقہ نے گھوئکی گاؤں میں عمران کے رشتے کی بات چلا دی۔ اس رشتے میں سب سے زیادہ اہمیت شبانہ کی والدہ اور اس کے ماموؤں کی تھی۔ ان سب نے دو چار دن کی سوچ بچار کے بعد رضامندی ظاہر کر دی۔ ظاہر تھا کہ ان کے نزدیک اپنی بیٹی کی مرضی اہم تھی۔ خوشاب میں ہونے والی ملاقات میں بھی شبانہ کی والدہ نے عمران کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ان دنوں عمران کی زندگی میں خوشی کی ایک لہر آئی اور اس لہر نے وقتی طور پر ماں کی جدائی کا غم ہلکا کر دیا۔ یہ وہ دن تھے جب اس کی آنکھوں میں شبانہ کی سادہ مسکراہٹ جھلکتی رہتی۔ اس کی ہنسی کے مدھر سُر عمران کے کانوں میں گونجتے اور اس کے جسم کی خوشبو اس کے حواس کو معطر کرتی۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ گھوڑوں پر سواری کرتا۔ خطرناک جانوروں کی ٹریننگ میں شریک ہوتا اور ٹرینڈ جانوروں کی دیکھ بھال انجام دیتا۔ تاہم ان سارے کاموں کے دوران میں اس کا دھیان شبانہ کی طرف ہی رہتا۔ ایک روز جب ان کا سرکس میانوالی میں تھا اور وہ پنڈال کے پچھواڑے رائل بنگال ٹائیگر کے پنجرے کی صفائی کروا رہا تھا، جان صاحب وہاں پہنچے۔ انہوں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ”تم

ضرورت سے زیادہ کام کر رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تین چار روز کی چھٹی کرلو اور خوشاب جا کر اپنی خالہ سے مل آؤ۔“

وہ بولا۔ ”لیکن انکل! شادی پر بھی تو چھٹیاں ہوتی ہی ہیں۔ ابھی مجھے کام کرنے دیجیے۔“

”جب شادی کا وقت آئے گا، تب شادی کی چھٹیاں بھی کرلینا۔ ابھی منگنی کی دو چار چھٹیاں کرلو۔“ وہ مسکرائے۔

”منگنی؟“

”ہاں، اسے منگنی بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل یا پرسوں وہ لوگ کوئی نشانی وغیرہ کرنے آئیں۔ ابھی تو شبانہ کے ماموں شیخوپورہ گئے ہوئے ہیں۔“

”وہ کس لیے؟“

”بھئی آخر وہ لڑکی والے ہیں۔ لڑکی والوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے اور یہ ان کا حق بھی ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں چھان بین کریں۔“

”سب کچھ تو ہم بتا چکے ہیں۔“ عمران نے کہا۔

”پھر بھی وہ تمہارے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہوں گے۔“

”تو ٹھیک ہے، جان لیں۔ ہم نے کیا چھپایا ہے۔“

”ارے ہاں، یاد آیا۔ یہ دیکھو، یہ چھوٹی سی انگوٹھی ہے۔ تمہاری خالہ نے کہا تھا کہ جب عمران آئے تو یہ انگوٹھی لیتا آئے۔ تمہاری ہونے والی بیوی کے لیے ہے۔“ جان صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سرخ ڈبیا میں بند خوب صورت طلائی انگوٹھی عمران کو دے دی۔

اگلا دن کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ عمران نے شام کو خوشاب جانا تھا مگر دوپہر کو جب جان صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ بجھے ہوئے نظر آئے۔ وہ پریشان ہوتے تھے تو اس کی نشانی یہ ہوتی کہ وہ سگریٹ کو مسلسل ہونٹوں میں دبائے رکھتے اور اسی طرح گفتگو بھی کرتے۔ اس وقت بھی وہ اپنے ”شامیانہ دفتر“ میں بیٹھے یہی کچھ کر رہے تھے۔

عمران نے ان کے سامنے بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”خیریت تو ہے انکل!“

وہ کچھ دیر خاموشی سے عمران کو دیکھتے رہے پھر گمبھیر انداز میں بولے۔ ”تمہارے گاؤں جھنڈ والی سے شبو کے دونوں ماموں کوئی اچھی رائے لے کر نہیں لوٹے۔ مجھے لگتا ہے کہ چودھری وغیرہ نے انہیں الٹا سیدھا بتایا ہے۔“

عمران کے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں انکل؟“

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ”... تم نے وہ جو آسمانی بجلی والی بات بتائی تھی نا، وہ ابھی تک لوگوں کے ذہنوں سے نکلی نہیں ہے۔ خاص طور سے چودھری گھرانا تو وہ بات بڑے یقین سے کہتا ہے۔“

”کیا کہتا ہے؟“

”یہی کہ تم مقررہ میعاد یعنی سترہ چاندوں تک شہنشاہ کے مزار پر رہنے کے بجائے دو تین مہینے بعد ہی وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اس لیے آسمانی بجلی والی نحوست تم پر آ گئی ہے۔ مطلب ہے کہ جو کچھ پہلے چودھری کے پتر کے ساتھ ہوتا تھا، وہ اب تمہارے ساتھ ہوگا بلکہ ہو رہا ہے۔“

”کک... کیا ہو رہا ہے؟“

”آسمانی بجلی تمہارے پیچھے رہتی ہے۔“

”یہ سب بکواس ہے۔“ عمران کا خون کھول اٹھا۔

جان صاحب نے سگریٹ ہونٹوں میں دبائے دبائے ایک گہرا کش لیا اور بولے۔ ”میں بھی جانتا ہوں، یہ سب بکواس ہے لیکن ایسی بکواس جب دلوں کے اندر گھر کر لیتی ہے اور بندے کا یقین بن جاتی ہے تو پھر اسے کھرچنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا پچھلے مہینے تم پھر شیخوپورہ گئے تھے اور چودھری سجاول، ماسٹر اور قاری سلیم وغیرہ سے بھی ملے تھے؟“

”ہاں۔“ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

جان صاحب بولے۔ ”اس دن بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ تم بارش میں ہی واپس آئے تھے۔ تمہاری واپسی کے دس پندرہ منٹ بعد ہی قاری سلیم کے ٹیوب ویل پر آسمانی بجلی گری۔ ایک بھینس مر گئی اور ایک لڑکے کے دونوں بازو جل گئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بالکل ایک اتفاق ہے۔ ایسے واقعے پچھلے مہینے کی بارشوں میں کئی جگہ ہوئے ہوں گے۔ کہیں کہیں جانی نقصان بھی ہوا ہوگا مگر میں نے کہا ہے نا کہ جب وہم ہمارا یقین اور عقیدہ بن جاتا ہے تو پھر اس سے جھٹکارا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس واقعے کو بھی تمہاری آمد کے ساتھ نتھی کر کے بتا رہے ہیں۔“

عمران کے اندر آگ سی دہکنے لگی تھی۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے جان انکل سے پوچھا۔ ”شبو کے ماموں کیا کہہ رہے ہیں؟“

وہ ذرا توقف سے بولے۔ ”یہاں بدقسمتی یہ ہے عمران... کہ... شبانہ کے گھر اور برادری والے بھی ان باتوں پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ خاص طور سے اس کے ماموں اور دوسرے ننھیال والے۔ ان میں سے ایک دو گھرانے تو خاصے پیر پرست واقع ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس لڑکے کی زندگی کو اتنا بڑا روگ چمٹا ہوا ہے اور کسی بھی وقت اس کے ساتھ کچھ ہو سکتا ہے، اسے اپنی لڑکی نہیں دینی چاہیے۔“

”یعنی وہ انکار کر رہے ہیں؟“

”فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ جان انکل نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

عمران اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اس دقیانوسیت اور توہم پرستی سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ اسی دقیانوسیت نے اس سے اس کی ماں چھینی تھی اور اب یہی اس کی زندگی کی ایک اہم ترین خوشی کے راستے میں حائل ہوئی تھی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ جان انکل نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”گجرات۔ میں خود بات کروں گا شبانہ سے اور اس کے گھر والوں سے۔“

”نہیں، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ اس سے بات اور بگڑ جائے گی۔ ہم جو ہیں تمہاری طرف سے بات کرنے کے لیے۔“ جان انکل نے اس کے کندھے تھام کر اسے نیچے بٹھا دیا۔

اگلے چار پانچ روز بے حد تناؤ میں گزرے۔ جان صاحب سب کام چھوڑ کر خود خوشاب گئے اور پھر خالہ صدیقہ کے ساتھ گھوکی پہنچے۔ عمران کی اطلاع کے مطابق انہوں نے گھوکی کے دو چکر لگائے... لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ عمران کو معلوم ہوا کہ اس معاملے پر گھوکی گاؤں کی پوری برادری ایک ہو گئی ہے اور انہوں نے رشتہ دینے سے معذرت کر لی ہے۔

اب عمران کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔ ایک دوپہر وہ میانوالی سے روانہ ہوا اور رات تک شبانہ کے پنڈ جا پہنچا۔ اس کے سینے میں آگ سلگ رہی تھی اور آنکھوں میں گہرے دکھ کی نمی تھی۔ کوئی اس سے اس کی زندگی کیسے چھین سکتا تھا...؟ وہ اور شبانہ محبت کی ناقابلِ شکست ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بے شمار شب و روز ایک دوسرے کے قریب گزارے تھے لیکن پھر بھی بہت دور رہ کر۔ انہیں اپنی محبت پر بھروسا تھا اور یقین تھا کہ وہ اپنے بڑوں کی رضامندی اور خوشنودی کے ساتھ ایک ہوں گے۔ لیکن اب یقین ٹوٹ کر بکھر رہا تھا اور عمران نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسے بکھرنے نہیں دے گا۔ وہ سب سے پہلے شبانہ سے ملنا چاہتا تھا۔

اسی رات اس نے سیدھا جا کر شبانہ کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا شبانہ کا بڑا

ماموں نیاز احمد تھا۔ کہنے کو تو وہ ایک چھوٹا سا کاشت کار تھا لیکن اپنے اندر زمینداروں کی سی اکڑفوں رکھتا تھا۔ اس نے عمران کو پہچان لیا اور فوراً ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''کیا بات ہے عمو؟'' اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس سے؟''

''آپ سے اور شبانہ سے بھی۔''

''خبردار! اگر ہماری لڑکی کا نام لیا تو... بہت بُرا ہو گا۔'' نیاز احمد پھنکارا۔

''وہ میری منگ ہے۔ میں اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔'' عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوئے کون منگ؟ کس کی منگ؟'' نیاز کا انداز مزید بگڑ گیا۔

اسی دوران میں شبانہ کا چھوٹا ماموں اشرف بھی باہر آ گیا۔ وہ بڑے ماموں سے زیادہ سمجھ دار تھا۔ اس نے لڑائی کو بڑھنے سے روکا اور عمران کو ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''تم شبانہ سے بات کرنا چاہتے ہو تو میں تمہاری بات کراؤں گا۔ پر ابھی نہیں۔ کل سویرے۔''

''ٹھیک ہے، میں انتظار کر لیتا ہوں مگر ایک بات آپ لوگ ذہن میں رکھیں۔ اگر شبانہ کو کسی طرح مجبور کیا گیا یا اسے کوئی ازار دیا گیا تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''جب تم خود بات کرو گے تو پھر سب کچھ تم پر کھل جائے گا۔'' شبانہ کے چھوٹے ماموں نے کہا۔

یہ اجنبی گاؤں تھا۔ عمران نے جیسے تیسے گاؤں کے ''دائرے'' میں رات گزاری۔ وہ یہاں اکیلا چلا آیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر اس کے دل میں ڈر نہیں تھا۔ اب اسے اپنے ڈر کو دبانا اور خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا آ چکا تھا۔ اب وہ نمایاں قد کاٹھ اور مضبوط جسم کا مالک نوجوان تھا۔ اس کی پیشانی روشن اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

شبانہ کے چھوٹے ماموں نے اگلے روز علی الصباح شبانہ اور عمران کی ملاقات کرا دی۔ مگر یہ ملاقات شبانہ کے گھر میں نہیں بلکہ گھر سے باہر ایک کنوئیں پر ہوئی۔ کنوئیں کے ساتھ دو تین کچے کوٹھے سے تھے۔ ایک کوٹھے میں شبانہ موجود تھی۔ اس بات کا پتا عمران کو بعد میں چلا کہ عمران کی ملاقات گھر میں اس لیے نہیں کرائی گئی کہ کہیں اس کی نحوست گھر پر اثر انداز نہ ہو جائے اور کوئی آفت نہ ٹوٹ پڑے۔

عمران اس کچے کوٹھے کے اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اسے مزید حیرانی ہوئی کہ کمرے کے درمیان کپڑے کا ایک پردہ تھا اور شبانہ اس پردے کی دوسری جانب تھی۔ یعنی وہ اس سے بات تو کر سکتا تھا مگر دیکھ نہیں سکتا تھا۔

وہ جو خوش رنگ سویروں اور چاندنی راتوں میں ہر وقت اس کے قریب رہتی تھی، آج اس کمرے میں اسے اپنی صورت بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہ کیسا دل فگار انقلاب تھا۔ شبانہ کے ماموں وغیرہ آس پاس ہی موجود تھے۔ ایک ماموں زاد کے ہاتھ میں باقاعدہ رائفل نظر آ رہی تھی۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی ان کے پاس آتشیں ہتھیار موجود ہوں گے۔

عمران نے کہا۔ ''شبانہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تمہارے گھر والے انکار کر رہے ہیں اور میں جانتا ہوں، ایسا صرف اس چودھری سجاول کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس نے بالکل بیکار کی باتیں کر کے تمہارے ماموؤں کو گمراہ کیا ہے۔ یہ پرانے زمانے کے جاہلوں والے خیال ہیں۔ زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ ان جعلی پیروں کے ہاتھ میں نہیں۔ کیا تم ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہو؟''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ یہ بڑی بوجھل خاموشی تھی۔ آخر اس خاموشی کی دیوار ٹوٹی اور شبانہ کی گمبھیر آواز سنائی دی۔ ''جو کچھ بھی ہے عمران... مم... میرا فیصلہ وہی ہے جو میرے بڑوں کا ہے۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔''

''کیوں... شبانہ کیوں...؟'' عمران تڑپ کر بولا۔

''بس میں نے کہا ہے نا۔ میں اپنے بڑوں کے خلاف نہیں جا سکتی... وہ میرے لیے جو سوچیں گے ٹھیک ہی سوچیں گے۔'' شبانہ کی آواز کی تہ میں اشکوں کا بہاؤ تھا لیکن اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

''شبانہ! یہ کیسی بٹی باتیں ہیں... تم اندر کی بات نہیں بتا رہی ہو۔ تمہیں مجبور کیا جا رہا ہے شبانہ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا۔'' شبانہ کے لہجے میں اشکوں کا بہاؤ کم ہو گیا اور مضبوطی کچھ بڑھ گئی۔ وہ جملہ مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہیں پہلے دن سے کہا تھا عمران! میں اپنی ماں اور اپنے بڑوں کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ راضی ہو جاتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا مگر اب یہ نہیں ہو سکتا عمران۔ تمہیں میری اور اپنی عزت کے لیے خود کو سنبھالنا ہوگا... سب کچھ بھولنا ہوگا... اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے... اگلے مہینے میری شادی ہو رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اب تم دوبارہ یہاں ہمارے پنڈ آؤ... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا کہ کسی کھوہ میں چھلانگ مار دوں۔ میں سچ کہتی ہوں... میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا...'' اس کی آواز بھرا گئی۔

دکھ کی شدت نے عمران کو بے بس کر دیا۔ وہ پردہ ہٹا کر شبو کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ ''خدا کے لیے شبو! ایسی باتیں مت کرو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں سب کچھ ختم کر دوں گا۔ تمہیں کسی اور کی نہیں بننے دوں گا۔ شبو... خدا کے لیے شبو۔''

اس نے اسے جھنجوڑ دیا۔ فرطِ غم میں اس نے اسے اپنے گلے لگانے کی کوشش کی، اسے اپنے اندر چھپانا چاہا۔ وہ ایک دم غیر ہو گئی۔ اس نے اسے پیچھے دھکیلا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ ''چھوڑ دو مجھے... چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ کراہی۔

عمران نے اسے چھوڑ دیا... وہ ایک گوشے میں سمٹ گئی... وہ اپنے چہرے پر دنیا جہان کی التجا سمیٹ کر بولا۔ ''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا شبو۔ میرے ساتھ ایسا مت کرو... میں نے...''

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ شبانہ کے رشتے دار آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے شبانہ کی احتجاجی آوازیں سن لی تھیں۔ شبانہ کے بڑے ماموں نے گھما کر پستول کا دستہ عمران کے سر پر مارا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ چھوٹا ماموں ان کے درمیان آ گیا۔ اس نے عمران پر حملہ آور ہونے والوں کو روکا اور گرجا۔ ''اس کو مار دو گے... تو اپنی بدنامی کا اشتہار لگاؤ گے۔ اس کو ایک موقع دو دفع ہو جانے کے لیے۔ اگر یہ دوبارہ یہاں آیا تو میں تمہارے ساتھ مل کر اس کے ٹوٹے کروں گا...''

حملہ آور بہت بپھرے ہوئے تھے لیکن شبانہ کے چھوٹے ماموں کی بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔

شبانہ کا چھوٹا ماموں عمران کو کھینچ گھسیٹ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اپنے ایک ساتھی سے کہہ کر اس نے عمران کے سر پر پٹی بندھوائی۔ پھر اسے سمجھایا کہ اس کے لیے اب یہاں سے چپ چاپ چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔ ورنہ یہ لوگ اسے ابھی کاٹ کر نہیں کھیتوں میں دبا دیں گے۔

عمران نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''چاچا! تمہاری ایسی باتوں سے مت ڈرا۔ لیکن... میں تیرے کہنے پر چلا جاتا ہوں۔ ہاں یہ بات تو بھی اچھی طرح سن لے اور دوسروں کو بھی سمجھا دے، میں اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔ تم لوگوں نے ہاں کی ہوئی ہے۔ اب اس ہاں کو نہ میں نہیں بدلنے دوں گا۔ تم لوگ شبانہ پر زبردستی کر سکتے ہو، مجھ پر نہیں۔ میں ہر حد تک جاؤں گا۔''

شبانہ کے ماموں نے بے رخی سے کہا۔ ''میں بھی تجھے بتا دوں۔ اگلی دفعہ میں کسی کا ہاتھ نہیں روکوں گا۔ اگر تو اس پنڈ کی جوہ میں داخل ہوا تو تیرے ٹوٹے ہو جائیں گے۔''

''جو کچھ تم میرے ساتھ کر رہے ہو، اس کے مقابلے میں مجھے ہزار دفعہ مرنا بھی قبول ہے۔'' عمران نے بھی آتشیں لہجے میں کہا۔

پھر وہ گھونگی گاؤں سے چلا آیا۔

صورتِ حال بڑی عجیب ہو گئی تھی۔ جہاں جاہلیت اور ناخواندگی کا اندھیرا ہو، وہاں توہم پرستی کا آسیب بڑی تیزی سے پھیلتا ہے۔ گھونگی گاؤں میں رہنے والی برادری کے لوگوں کو بھی پورا یقین ہو گیا کہ آسمانی بجلی کی نحوست والی بات درست ہے اور اگر اس نوجوان کی شادی برادری میں ہو گئی تو یہ نحوست برادری میں آ جائے گی۔ برادری میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ویسے بھی برادری کے باہر شادی کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

ایک روز جان محمد صاحب نے عمران کو بتایا۔ ''مجھے پتا لگا ہے کہ شبانہ کے ماموؤں نے کسی نام نہاد مولوی سے فتویٰ بھی لیا ہے۔ اس نے بھی یہی کہا ہے کہ آسمانی بجلی والی نحوست پہلوٹی کے بعض بچوں میں ہوتی ہے اور یہ نحوست ایک بچے سے دوسرے بچے اور ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں جا سکتی ہے... یہ لوگ تمہارے گاؤں والے واقعے کو بھی بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قاری سلیم کے گھر پر صرف اس لیے بجلی کی آفت آئی کہ تم وہاں رکے تھے اور تم نے کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد بجلی گاؤں کے پاس پیلے کے درختوں پر کوندتی رہی... جیسے تمہیں ڈھونڈ رہی ہو۔''

''آپ کو ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہے یا رونا آتا ہے؟'' عمران نے جان صاحب سے پوچھا۔

''دونوں... لیکن بات وہی جاہلیت کے قصوں کی ہے... اور واہموں کی ہے۔ تم نے ناگ اور ناگن والی بات تو سنی ہوگی۔ لوگوں کو یقین ہے کہ اگر کوئی ناگ کو مار دے تو ناگن اس کا بدلہ لیتی ہے اور ہر سال ایک خاص وقت میں مارنے والے کو ڈسنے کے لیے آتی ہے... اور ایسی بے شمار

باتیں ہیں یار۔''

عمران نے گہری سانس لی۔ ''ان جاہلوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اگر بجلی کو مجھ سے ایسی ہی دشمنی ہے تو پھر پچھلے تین چار سال سے میں زندہ کیسے بچا ہوا ہوں؟''

''جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔'' جان صاحب نے کہا۔ ''ان لوگوں کا خیال ہے کہ تم ایک روپوش شخص ہو۔ جب آسمان پر بادل ہوتے ہیں تو تم چھت کے نیچے سے نہیں نکلتے۔ خاص طور سے بارش کے موسم میں۔ کسی دن جب بھی کسی کھلی جگہ پر تمہارا اور بارش کا آمنا سامنا ہوگا، تمہاری موت ہو جائے گی۔''

اگلے دو تین ہفتے میں عمران نے جان صاحب کے ساتھ مل کر بہت کوشش کی مگر اچھے طریقے سے اس معاملے کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ شبانہ کے گھر والے کسی بھی طرح کی بات چیت کا دروازہ بند کر چکے تھے۔ پھر عمران کو پتا چلا کہ شبانہ کی شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس کی شادی اس کے اپنے ماموں زاد سے ہو رہی تھی جسے اس نے گھونگی گاؤں سے باہر کنوئیں پر دیکھا تھا۔ قدرے چھوٹے سر اور بڑے منہ والا وہ اکھڑ سا لڑکا جو کندھے سے رائفل لٹکائے پھرتا تھا۔

سینے میں بھڑکنے والی آگ اس کے پورے بدن میں پھیلنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے شبانہ کے چھوٹے ماموں اشرف کو ایک خط بھی لکھا۔ اس خط میں اس نے لکھا کہ وہ باقیوں کے مقابلے میں سمجھ دار ہے۔ آخر وہ بھی ایسی بیکار کی باتوں پر یقین کیوں کر رہا ہے۔ یہ سب جعلی پیروں فقیروں اور تعویذ گنڈے والوں کی بیان بازیاں ہوتی ہیں۔ زندگی موت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور اگر کوئی اس بات پر بہت پکّا یقین رکھتا ہے کہ مجھ پر آسمانی بجلی کی نحوست ہے اور میں گھر میں چھپا رہتا ہوں تو میں اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر کوئی میرا امتحان لینا چاہتا ہے تو لے لے۔ مجھے بارش میں کھڑا کر دو۔ ایک دن نہیں، دو دن نہیں، جتنے دن مرضی یہ آزمائش کر لو۔ اگر مجھ پر بجلی گر گئی تو آپ سب لوگوں کی جان مجھ سے چھوٹ جائے گی اور اگر یہ بات بکواس ثابت ہوتی ہے تو پھر آپ لوگوں کو اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔

یہ طویل خط اس نے جان صاحب کے ملازم حسن دین کے ذریعے گجرات میں شبانہ کے چھوٹے ماموں تک پہنچایا... کئی دن کے انتظار کے باوجود اس کا ذرا سا ردِعمل بھی ظاہر نہیں ہوا۔ شاید جان صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا... جو لوگ اندھے عقیدے بنا لیتے ہیں، ان کے پاس اپنے عقیدوں کے حوالے سے ہر سوال کا جواب موجود ہوتا ہے۔

ایک دن جب جانِ گُسل بے قراری عروج پر تھی، عمران شادی پورہ پہنچا اور آموں کے باغ میں اپنے پرانے یار راجا سے ملا۔ راجا ابھی تک یہیں باغبان کبیر کے گھر رہائش پذیر تھا۔ اس کے باقی مشغل بھی اسی طرح جاری تھے۔ افیم کا نقل و حرکت، گھوڑوں اور کتوں کی سدھائی، شراب نوشی اور طوائف بازی بھی۔ اپنے میزبان کبیر احمد سے راجا کے تعلقات میں وہ پہلے والی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ عمران کو اندازہ ہوا کہ شاید راجا جلد ہی واپس گجرات جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

راجا، عمران سے تپاک سے ملا۔ عمران نے اس سے کہا۔ ''بھا راجا! مجھے تمہاری ضرورت آن پڑی ہے۔''

وہ خوش ہو گیا۔ عمران کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر مخصوص انداز میں بولا۔ ''یارا! اب اگر کوئی ضرورت بتانے لگے ہو تو ''ٹیٹ'' سی بتانا۔ کوئی کنڈم بات نہ کرنا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کوئی زوردار کام ہو۔ راجے کی شان اور تیری شان کے مطابق۔''

''کام تو کچھ ایسا ہی ہے۔'' عمران نے کہا۔ پھر ذرا وقفے سے بولا۔ ''شبو کی شادی ہو رہی ہے۔''

''اوئے مبارکاں۔ یعنی تیری اور شبو کی شادی۔''

''نہیں راجا! اس کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے۔'' عمران نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کنڈم خبر دے رہا ہے۔'' راجا ششدر رہ گیا۔

عمران نے اگلے پندرہ بیس منٹ میں اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس پر بیتا تھا۔

☆☆☆

شبانہ کی شادی ہو رہی تھی۔ آج اس کی مہندی کی رات تھی۔ گھونگی گاؤں کے اس گھر میں سرسوں کے بہت سے دیے جل رہے تھے اور کئی لالٹینیں روشن تھیں۔ گاؤں کی الھڑ مٹیاریں شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ ڈھولک بج رہی تھی اور کبھی کبھی کوئی لڑکی رقص بھی کرنے لگتی تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ آلو گوشت کی دیگ ابھی ابھی خالی ہوئی تھی اور چھوٹی لڑکیاں اور بڑی عمر کی عورتیں برتن وغیرہ سمیٹ رہی تھیں۔ اس گھر کے پچھواڑے مکئی کے اونچے کھیتوں میں عمران موجود تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ اس کے رگ و پے میں خون کی جگہ سیال آگ دوڑ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی۔ اس کے ساتھ اٹھائیس گولیوں والا میگزین اٹیچ تھا۔ یہ رائفل اسے راجا نے فراہم کی تھی۔ راجا بھی اس کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے پاس بھی پمپ ایکشن گن تھی۔ ان کا لوڈر تھوڑے ہی فاصلے پر درختوں میں کھڑا تھا۔

''یہ بڑا ٹھیک وقت ہے۔'' راجا نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔ ''میرے اندازے کے مطابق گھر میں تین چار سے زیادہ مرد نہیں ہیں۔''

عمران نے جیسے سن کر بھی نہیں سنا۔ اس کا چہرہ خون کے بے پناہ دباؤ سے سرخ تھا۔ اس نے رائفل کو بے حد مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا تھا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ رائفل کا لوہا اس کی ہتھیلیوں میں پیوست سا ہو گیا تھا۔

اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ شبانہ کی معصوم صورت اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔ ''عمران! کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا کہ میں کھوہ (کنوئیں) میں چھال مار دوں۔ میں سچ کہتی ہوں، میرے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں ہوگا۔''

اسے اپنے گھر والوں کی عزت اپنی جان سے پیاری تھی۔ وہ اس کے لیے جان دے سکتی تھی۔ تو کیا وہ اسے جان دینے پر مجبور کر دے گا؟ کیا اس کا یہ اقدام اسے موت کے اندھیروں میں لے جائے گا؟ وہ اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ وہ اس کی بربادی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ایک بار پھر ہاتھ جوڑے، آنکھوں میں آنسو لیے اس کے سامنے کھڑی ہے۔ اسے کہہ رہی ہے... اپنے قدم روک لو عمران! کچھ باقی نہیں بچے گا اور تمہارے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا۔ میں جان دے دوں گی۔ ہمارا پیار قربانی مانگ رہا ہے۔ ہمیں یہ قربانی دینی ہوگی۔ خدا کے لیے عمران...

رائفل کے دستے پر عمران کی گرفت بہت مضبوط رہی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے رہے لیکن اس کے اندر کی کیفیت بدلنے لگی۔ اس کے غیظ و غضب کو بے بسی کی ایک بلند و بالا دیوار نے گھیر لیا۔ اس کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکے۔ ڈھولک کی مدھم آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ لڑکیاں گا رہی تھیں۔ اساں چڑیاں دا چنبہ ہو... بابل اساں اڈ جاناں۔

راجا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''عمران! یہ بڑا چنگا ویلا ہے۔ مجھے پتا ہے، دو منٹ لگیں گے اور شبو ہماری گڈی میں ہوگی۔''

عمران خاموش رہا۔

''اوئے تو سوچ کیا رہا ہے؟ کہیں تیرا ارادہ تو ڈانواں ڈول نہیں ہو رہا... اوئے کھوتے، ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔'' راجا نے عمران کا کندھا جھنجوڑا۔

دونوں کے درمیان ایک نہایت بوجھل خاموشی طاری رہی۔ پھر عمران نے نہایت عجیب لہجے میں کہا۔ ''نہیں راجے... میں... نہیں کر سکتا۔''

''کیا مطلب؟''

عمران جواب دینے کے بجائے اٹھ کھڑا ہوا اور لوڈر کی طرف چل دیا۔ راجا کچھ دیر ٹھٹکا رہا پھر وہ بھی اس کے پیچھے لوڈر میں آ گیا۔ اس نے عمران کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''راجا! چلو یہاں سے۔''

اس کے ان چار لفظوں میں کچھ ایسا درد تھا... اور کچھ ایسی فیصلہ کن کیفیت تھی کہ راجا کچھ بول نہیں پایا۔ اسے لوڈر اسٹارٹ کرنا پڑا۔ اس نے عمران کو کبھی ایسی گمبھیر کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔

گھونگی گاؤں سے تقریباً دو میل دور آنے کے بعد عمران نے راجا کو لوڈر روکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے لوڈر روک دیا۔

''مجھے شراب دو۔'' عمران نے کہا۔

راجا نے انڈین شراب کی بوتل اسے تھما دی۔ اس نے بوتل منہ سے لگائی اور عجب دیوانگی کے عالم میں اس سیال آگ کو سینے میں اتارتا چلا گیا۔ دو تین سانسوں میں وہ آدھی سے زیادہ بوتل چڑھا گیا۔ اس نے اپنا سر ڈیش بورڈ پر جھکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ راجا کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کہنا سننا فضول ہے۔ عمران وہی کرے گا جو وہ چاہتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکھڑاتا ہوا سا نیچے اتر آیا۔ الکحل اس پر اثر انداز ہو چکی تھی... اس نے رائفل لوڈر میں پھینک دی اور اپنے لڑکھڑاتے قدم واپس گھونگی گاؤں کی طرف بڑھائے۔

''کہاں جا رہے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟'' راجا چلّایا۔

وہ ٹوٹی آواز میں بولا۔ ''کچھ نہیں کر رہا۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں اس کو برباد نہیں کر سکتا۔ میں تو... میں تو ایک بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کل جب وہ دلہن بنے گی... لال جوڑا پہنے گی، اس کے ماتھے پر جھومر لگے گا تو وہ کتنی پیاری لگے گی۔ میں بس ایک بار... ایک بار

اسے دور سے دیکھوں گا اور پھر واپس خوشاب آجاؤں گا۔ بس ایک بار۔"

"کیسی جھلّوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔" راجا نے اسے ڈانٹا۔ "اس طرح جائے گا تو وہ تیرا قیمہ کر کے کنوئیں کو ڈال دیں گے۔"

"تو ڈال دیں۔ میں پہلے کون سا زندہ ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" اس نے ہاتھ لہرائے۔

راجا نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ "چل... چل گڈّی کے اندر بیٹھ۔"

"یار! ایسے کیوں کرتے ہو۔ میں کچھ مانگ تو نہیں رہا۔ کچھ چھین تو نہیں رہا۔ میں ایک بار اسے لال کپڑوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یار! اب میرا اتنا حق بھی نہیں ہے؟ تم مجھے اتنا بھی نہیں کرنے دیتے۔ یار تم کیسے یار ہو؟" وہ سسک اٹھا۔

راجا نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور خود بھی اشک بار ہو گیا۔ وہ اسے کھینچ کھینچ کر لوڈر تک لایا۔

عمران لوڈر میں بیٹھ گیا لیکن جب راجا نے لوڈر اسٹارٹ کیا تو وہ دروازہ کھول کر پھر باہر نکل آیا۔

"اب کیا ہے؟" راجا نے پوچھا۔

"یار! مجھے ایک بار جانے دو۔ بس ایک بار... میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا... کسی کے سامنے نہیں آؤں گا۔ اپنا منہ چھپا کر رکھوں گا۔ بس دور سے اس کو دیکھوں گا۔"

راجا پھر اس پر جھپٹا۔ "تجھے چڑھ گئی ہے۔ چل بیٹھ گڈّی میں۔ اور اگر نہیں تو پھر آ میرے ساتھ... آ میرے ساتھ... اٹھا لیتے ہیں اس کو۔ لے جاتے ہیں کہیں دور۔ دیکھتے ہیں ان میں سے کون مائی کا لال روکتا ہے ہمیں۔" اس نے رائفل پھر عمران کے ہاتھ میں تھما دی۔

عمران نے رائفل تھام لی۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت رائفل پر بے ساختہ سخت ہوتی چلی گئی۔ چہرہ انگارہ نظر آنے لگا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ اس کی نگاہ دور گھونگی کی مدھم روشنیوں پر تھی۔ وہ روشنیاں جہاں ایک گھر کے اندر مہندی کے گیت گائے جا رہے تھے، ایک ماں اپنی بیٹی کی بلائیں لے رہی تھی۔ عمران کی آنکھوں میں آتشیں آنسو جھلملانے لگے۔ تب عجیب ہیجانی انداز میں اس نے رائفل کا رخ کئی کلو میٹر دور نظر آنے والی ان روشنیوں کی طرف کیا اور ٹریگر دباتا چلا گیا۔ بیرل سے شعلے نکلے اور دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ تاریک سناٹا لرز گیا۔ گولیاں لاتعداد اندھیرے میں کہیں گم ہو گئیں۔ تب اس نے وحشت بھرے انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ سرخ ڈبیا نکالی جو اسے جان صاحب نے دی تھی۔ اس میں خوب صورت انگوٹھی تھی۔ اس نے ڈبیا زمین پر پھینکی اور ایک پورے برسٹ سے اسے اڑا کر رکھ دیا۔ تب اس نے رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر اندھا دھند ایک درخت کے تنے پر مارا۔ وہ شاید اسے مزید مارتا اور برباد کر کے رکھ دیتا مگر راجا نے اسے سنبھال لیا۔ رائفل اس سے چھینی اور اسے کھینچتا ہوا لوڈر تک لے آیا۔ عمران کی آنکھوں سے آتشیں آنسو اب تواتر کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنا سر لوڈر کے ڈیش بورڈ پر پٹخ دیا۔ راجا نے لوڈر کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

... صبح ہونے تک وہ لوگ واپس خوشاب پہنچ گئے۔

لیکن عمران جیسے واپس آ کر بھی واپس نہیں آیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا صرف بت باقی ہے، روح وہیں گھونگی گاؤں کے آس پاس کہیں رہ گئی ہے۔ ڈھولک کی تھاپ میں گم ہو گئی ہے، یا لڑکیوں کے گیتوں میں، یا مہندی کی خوشبو میں۔

وہ جینا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی بوجھ بن گئی تھی اور ہر گزرنے والے دن کے ساتھ یہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ماں تو بہت پہلے ہی اس سے بچھڑ گئی تھی، اب وہ ہستی بھی بچھڑ گئی تھی جس نے اس میں پھر سے زندہ رہنے کی امنگ جگائی تھی۔

اب کیا کرنا تھا جی کر... وہ ہر وقت یہی سوچ رہا تھا۔ راجا کی تسلیاں، جان صاحب کی محبت اور خالہ صدیقہ کی شفقت کچھ بھی اس کے دکھ کا مداوا نہیں تھا۔ ہاں، اب وہ اور جینا نہیں چاہتا تھا۔

اسے اب سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ شبانہ کو اس شادی کے لیے اس طرح مجبور کیا گیا تھا کہ بالآخر اس کے پاس اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ خاندان، برادری کا زور چل گیا تھا۔ اس کی والدہ نے ایک روز خود پر مٹی کا بہت سا تیل چھڑک کر ماچس ہاتھ میں پکڑ لی تھی اور قسم کھائی تھی کہ اگر شبانہ نے شادی کے لیے ہاں نہیں کی تو وہ ابھی اسی وقت خود کو جلا کر کوئلہ کر لے گی۔ شبانہ نے اس سے ماچس لے لی تھی اور اس کے قدموں میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

بہرحال اب یہ سب کچھ ماضی بن چکا تھا۔ حال یہ تھا کہ عمران زندگی اور موت کے درمیان لٹک گیا تھا۔ سانس ایک تیز زہریلی کٹار تھی جو ہر لمحہ اس کے سینے کو چیر رہی تھی۔ پھر بھی شاید بہت دور، دل کی اتھاہ گہرائی میں کہیں آس کا دیا ٹمٹماتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب تک سانس تب تک آس۔ کرب کے بے رحم پنجوں میں تڑپتے ہوئے وہ کبھی کبھی سوچتا تھا... کیا کوئی انہونی ہو سکتی ہے؟ کیا کسی وقت شبو اس کی طرف پلٹ

سکتی ہے؟ انہونیوں کی خواہش پالنا شاید انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

شبانہ کی شادی کو تین چار ہفتے گزر گئے تھے جب ایک اور اندوہناک سانحہ ہوا اور ہر امید ختم ہو گئی۔ اس سانحے نے عمران کی زندگی یکسر اندھیر کر دی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب زندگی کا زہر مزید پینے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا۔ ایک دن صبح سویرے جان انکل کے ملازم حسن دین نے عمران کو روتے ہوئے یہ خبر سنائی کہ شبانہ اور اس کا شوہر حادثے کا شکار ہو گئے ہیں اور اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

عمران کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کی زندگی کے لیے تو اس نے اتنا بڑا جہنم اپنے سینے میں اتارا تھا۔ وہ کیسے چلی گئی؟ وہ کیسے مر گئی؟ شروع میں پتا چلا کہ رائفل صاف کرتے ہوئے رائفل کا برسٹ چلا اور دونوں میاں بیوی موقع پر ہی دم توڑ گئے لیکن پھر رات کے وقت اصل تفصیل سامنے آئی۔ معلوم ہوا کہ شبانہ کے سخت گیر شوہر نے اس سے جھگڑا کیا تھا۔ اس نے بے قصور شبانہ پر بدچلنی کا الزام لگایا اور پھر اسے بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں شبانہ کا چھوٹا ماموں اشرف وہاں پہنچ گیا۔ اس نے شعلہ مزاج بھتیجے کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی۔ اسی بات پر چچا بھتیجا میں شدید جھگڑا ہو گیا۔ شبانہ کے شوہر سجاد نے پستول نکال لیا۔ اپنی جان خطرے میں دیکھ کر اشرف نے دیوار سے آٹھ ایم ایم رائفل اتار لی۔ روتی بلکتی شبانہ، شوہر اور ماموں کے بیچ آ گئی۔ سخت کھینچا تانی کے دوران میں آٹھ ایم ایم رائفل چل گئی۔ اس کی ایک ہی گولی شبانہ اور سجاد دونوں کے جسم سے پار ہو گئی۔ شبانہ نے تو وہیں اپنے کمرے میں دم توڑ دیا۔ سجاد گجرات کے سرکاری اسپتال میں پہنچ کر ختم ہو گیا۔

عمران دو تین دن تک اپنے ہوش میں ہی نہیں رہا۔ وہ نشے میں غرق تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس نے یہ دو تین دن کہاں اور کس حال میں گزارے ہیں۔ آہ... یہ کیا انجام تھا اس کی محبت بھری داستان کا۔ وہ داستان جو دریائے چناب کے کنارے کی ہواؤں میں پروان چڑھ کر جوان ہوئی تھی اور اپنے شباب کو پہنچی تھی۔ سب کچھ کس طرح اور کتنی جلدی ختم ہو گیا تھا۔ عمران نے وہ فیصلہ کر لیا جو کئی ہفتے سے اس کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اپنی شبانہ کے پاس پہنچ جائے گا۔ وہ اس دنیا میں نہیں مل سکے شاید اس دنیا میں قدرت کو ان پر رحم آ جائے۔

☆☆☆

یہ وہ دن تھے جب وہ بے حد سنجیدگی کے ساتھ اپنی جان لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اپنے حوالے سے ایک عجیب سی بے حسی اس پر طاری ہو چکی تھی۔ لباس کے علاوہ وہ کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ اپنے جانوروں کی طرف سے بھی وہ بالکل غافل ہو چکا تھا۔ اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی کسی کام میں۔ وہ ہر چیز کو اوپری اور الوداعی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ان کا سرکس سرگودھا میں تھا۔ ایک روز وہ اپنے شامیانے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا کہ سرکس میں کام کرنے والی نئی لڑکی شاہین اس کے پاس آئی۔ وہ چند ہفتے پہلے جمناسٹک کے شعبے میں بھرتی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

"عمران! تمہیں کچھ پتا بھی ہے کہ دفتر میں کیا ہوا ہے؟"

عمران اپنی سوجی سوجی آنکھوں اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بولی۔ "گولڈن سرکس کے لوگوں نے جان صاحب سے جھگڑا کیا ہے۔ گالی گلوچ تک نوبت آئی ہے۔ وہ دھمکیاں دے کر گئے ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

"وہی پرانی بات۔ ان علاقوں میں ہمیں کام نہیں کرنے دیں گے۔ اگر ہم کریں گے تو پچھتائیں گے۔"

"جان انکل ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتے ہیں۔" عمران نے آنکھیں بند کر کے گہرا کش لیا اور لاتعلق سا نظر آنے لگا۔

... مگر دو دن بعد وہ لاتعلق نہیں رہ سکا۔ شام کا وقت تھا۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ اتوار کی وجہ سے کافی رش بھی تھا۔ عمران کے کانوں میں ہوائی اڑتی سی خبر پہنچی کہ گولڈن سرکس والوں نے اپنے کچھ لوگ تماشائیوں کے روپ میں اس شو میں بھیج دیے ہیں اور وہ ہنگامہ کریں گے۔ بہرحال ابھی اس خبر کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والا ہر دل عزیز فن کار "بادشاہ" موجود نہیں ہے۔ اسے ہر جگہ تلاش کیا گیا ہے لیکن وہ نہیں ملا۔ موت کے کنوئیں پر موجود سیکڑوں تماشائی ہلڑبازی کے موڈ میں ہیں۔ اس بات کا پتا اگلے روز چلا کہ بادشاہ کو گراں معاوضہ دے کر گولڈن سرکس والوں نے بھرتی کر لیا تھا اور یہ کام اس طرح کیا گیا تھا کہ جان صاحب کے اسٹار سرکس میں زوردار ہنگامے کا ماحول بن سکے۔

جان صاحب مصیبت میں تھے اور ان کے عمران پر بہت سے احسان تھے۔ عمران کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ وہ کبھی کبھی بادشاہ کی بھاری بھرکم موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کنوئیں کے اندر نیچے ہی نیچے ایک دو چکر لگانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ آج وہ بادشاہ کی جگہ لے اور

کنوئیں کے اندر موٹر سائیکل چلائے۔ یہ بڑا سنسنی خیز خیال تھا۔ شاید ایک دو ماہ پہلے تک وہ ایسی خطرناک حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اب اس کی ذہنی کیفیت کچھ اور تھی۔ وہ خود کو زندگی سے دور اور موت کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ وہ مرنا چاہ رہا تھا اور جب مرنا تھا تو پھر زندگی جانے کا خوف کیا...؟

اس نے ڈریسنگ روم میں جا کر کاسٹیوم پہنا اور کنوئیں میں آ گیا۔ تب تک بجلی واضح نظر آنے لگی تھی۔ تماشائی شور مچا رہے تھے۔ کنوئیں کے اندر سگریٹوں کے خالی پیکٹ، پھلوں کے چھلکے اور جوس کے ڈبے وغیرہ پھینکے جا رہے تھے۔ جان صاحب وہاں موجود نہیں تھے۔ اسسٹنٹ منیجر عباس نے بتایا کہ وہ بادشاہ کے نوآموز شاگرد انور کو ہلکے پھلکے تماشے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں مگر وہ سخت خوف زدہ ہے۔

عمران نے عجیب ہیجانی انداز میں کہا۔ ''عباس بھائی! یہ کام میں کروں گا۔''

عباس حیرت سے عمران کا چہرہ تکنے لگا۔ عمران نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تو عباس سامنے آ گیا۔ ''نہیں عمران! میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا۔ اگر تم کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو پھر جان صاحب کو آ جانے دو۔''

عمران نے اس بات کا جواب یوں دیا کہ ریس گھما کر ایک جھٹکے سے موٹر سائیکل کا کلچ چھوڑا اور اسے لہراتا ہوا، عباس کے پہلو سے نکال لے گیا۔ اس کے ذہن پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اردگرد کی ہر شے اسے بے معنی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی موت بھی اور یہ خیال بھی کہ وہ شدید زخمی ہو جائے گا۔ اسے اس کھیل کی بنیادی تکنیک کا پتا تھا۔ جتنی زیادہ رفتار، اتنی زیادہ بلندی اور اتنی ہی زیادہ کنوئیں کی دیواروں پر پہیوں کی ''گرپ''۔ وہ بے خوف ہو کر رفتار بڑھاتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا چلا گیا۔ وہ ایک عجیب تجربہ تھا، وہ ایک دیوانی کوشش تھی۔ اس نے سنا تھا کہ ڈر سے آگے کامیابی ہوتی ہے۔ آج یہ کہاوت عملی شکل میں اس کے سامنے تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے اپنی پوزیشن کو دیکھا تو خود ہی حیران رہ گیا۔ اس کی برق رفتار موٹر سائیکل کنوئیں کے بالائی کنارے سے بس چار پانچ فٹ ہی نیچے رہ گئی تھی۔ موٹر سائیکل کے زبردست ''مومینٹم'' سے چوبی کنوئیں کی دیواریں ہل رہی تھیں۔ تماشائی دم بخود تھے۔ عمران اندھا دھند رفتار بڑھاتا ہوا موٹر سائیکل کو آخری حد تک لے گیا۔ اب وہ بالائی کنارے کے بالکل ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ تماشائی تالیاں پیٹنے لگے۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سے گرا تو سیدھا کنوئیں کی تہ میں گرے گا اور پھر شاید اٹھ نہ سکے۔ لیکن یہ متوقع سانحہ بھی اسے خوف زدہ کرنے میں ناکام تھا۔ اس نے ''ریس'' کے گھماؤ کو ایک جگہ ایڈجسٹ کرنے کے بعد ''بادشاہ'' کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اطراف میں پھیلا دیے۔ موٹر سائیکل اسی طرح آندھی کی رفتار سے دوڑتی رہی۔ ... عمران اس ایکشن کو بہت مشکل سمجھا کرتا تھا مگر یہ اتنا مشکل نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا... یا شاید عمران کی بے خوفی نے اسے آسان بنا دیا تھا۔ بادشاہ اس اسٹیج پر کچھ اور پوز بھی بناتا تھا لیکن وہ عمران کے بس میں نہیں تھے۔ عمران جو کچھ کر چکا تھا، وہ تماشائیوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ رفتار کم کی اور پھر موٹر سائیکل کو تہ میں لے آیا۔

جان محمد صاحب، عباس اور دیگر لوگ ہکا بکا تھے۔ جان صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا تاہم اس غصے کی تہ میں محبت بھی شامل تھی۔ ان کا سگریٹ مسلسل ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔

تماشائیوں کی ساری توقعات تو پوری نہیں ہوئی تھیں۔ بہرحال وہ منتشر ہونے لگے۔ یقیناً یہ ساری صورتِ حال ان لوگوں کے مفاد میں نہیں تھی جو تماشائیوں کو توڑ پھوڑ پر اکسانا چاہتے تھے۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ سنبھل گیا ہے تو انہوں نے اپنے طور پر گڑبڑ کر دی۔ سرکس کا ایک میٹر فنکار ''سیٹھو'' بھاگتا ہوا آیا اور اس نے جان صاحب کو بتایا۔ ''سر! ایک بندے نے پنڈال کے پیچھے خیمے میں آگ لگا دی ہے۔ چوکیداروں نے اسے پکڑ لیا ہے۔ کچھ لوگ اسے چھڑانے کے لیے جھگڑا کر رہے ہیں۔''

یہی وقت تھا جب اوپر تلے پستول کے دو فائر ہوئے۔

''یہ وہی لوگ ہیں جی۔'' سیٹھو نے اڑی اڑی رنگت کے ساتھ کہا۔

جان صاحب اور دیگر لوگ موقع کی طرف لپکے۔ عمران بھی ان کے ساتھ تھا۔ پنڈال کے عقب میں آگ بھڑک رہی تھی اور کئی لوگ آپس میں گتھم گتھا تھے۔ ان میں گولڈن سرکس والوں کے غنڈے صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس دن عمران پر عجیب سی وحشت طاری ہو گئی۔ وہ کم ہمت تو پہلے بھی نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی کرتا اور خم ٹھونک کر میدان میں آنا جانتا تھا... لیکن اس روز وہ اس انداز سے لڑا کہ سب دنگ رہ گئے۔ وہ دیوانہ وار گولڈن سرکس کے غنڈوں میں گھس گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط ہاکی تھی۔ اس ہاکی سے کئی افراد کے سر پھٹے اور دو تین کی ہڈیاں بھی ٹوٹیں۔ پھر ہاکی ٹوٹ گئی اور عمران کے ہاتھ میں ایک چاقو آ گیا۔ یہ چاقو بھی ہاکی ہی کی طرح مخالفین کے لیے مہلک رہا۔ عمران کے بازو پر ایک گہرا زخم آیا۔ اس زخم کے بدلے اس نے کم از کم تین افراد کو زخمی کیا۔ اسی دوران میں پولیس کود پڑی۔ پولیس اہل کاروں نے اندھا دھند ہوائی فائرنگ کر کے متحارب گروہوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔

بعد ازاں عمران کو بھی دیگر زخمیوں کی طرح مرہم پٹی کے لیے اسپتال لے جایا گیا۔ وہاں سے پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ جان صاحب نے اسے دو دن سے زیادہ تھانے میں نہیں رہنے دیا اور پرچے سے اس کا نام خارج کرا کے واپس لے آئے۔

دو دن بعد عمران نے ایک اور حیران کن کام کیا۔ وہ کسی کو بھی بتائے بغیر خاموشی سے گولڈن سرکس والوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی شلوار کے نیفے میں بھرا ہوا بریٹا پسٹل تھا اور کمر سے گولیوں کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دندناتا ہوا گولڈن سرکس کے مالک کے دفتر میں جا گھسا۔ وہ مرنا یا مار دینا چاہتا تھا اور جب بندہ ایسا چاہتا ہے تو پھر دیواریں گرتی ہیں۔ بند گلیوں سے رستے نکلتے ہیں اور لوہا ہاتھوں میں موم ہوتا ہے۔ عمران کی اس آمد نے گولڈن سرکس والوں کو ہکا بکا کر دیا۔ عمران نے سرکس کے مالک ''چودھری جی'' سے کہا۔ ''بادشاہ نے جان محمد صاحب سے ستر ہزار روپیا ایڈوانس لیا ہوا ہے اور اپریل تک کا معاہدہ کیا ہوا ہے۔ اگر آپ اس کو اپنے پاس رکھو گے تو پھر کام بگڑ جائے گا۔''

جو کام شاید بہت سی گفتگو اور میٹنگز وغیرہ کے بعد بھی نہیں ہو سکتا تھا، وہ صرف دس منٹ میں ہو گیا۔ عمران، جان صاحب کے پرانے ملازم بادشاہ کو اپنے سرکس واپس لے آیا۔

عمران کی اس جرأت اور دلیری نے جان صاحب اور حاجی اشفاق کو ششدر کر دیا... جان صاحب کے نزدیک پہلے بھی عمران کی بہت اہمیت تھی، اب یہ اہمیت اور بڑھ گئی۔ وہ اسے مزید ذمے داریاں سونپنا چاہتے تھے لیکن عمران جانتا تھا کہ وہ تو پہلی ذمے داریاں سنبھالنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ جانوروں سے اس کی رغبت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اپنے اردگرد کے لوگوں سے وہ بالکل لاتعلق ہو چکا تھا۔ وہ تو مرنے کی جگہ ڈھونڈتا پھرتا تھا...

اگلے چند دن میں اس نے کئی ایسے کام کیے جن میں مرنے کا خطرہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ سرگودھا کے ایک پوش علاقے میں گنگڑے تنگڑے امیرزادے، موٹر سائیکلوں کی ایک خوفناک ''ریس'' لگاتے تھے۔ عمران نے اس ریس میں حصہ لیا اور حیران کن طور پر نہ صرف محفوظ رہا بلکہ دوسرا انعام بھی جیت گیا۔

پھر اس نے جان صاحب کے ایک اور پرانے حریف استاد جھیمے تھیٹر والے کو للکارا اور اس کے دو غنڈوں کو بُری طرح مار پیٹ کر اسپتال پہنچا دیا۔ اس پھڈے کا نتیجہ بھی فوری اور مفید نکلا۔ استاد جھیمے کی طرف ڈوبا ہوا جان صاحب کا ایک لاکھ روپیا نکلنے کی قوی امید پیدا ہو گئی... اور اس رقم کی پہلی قسط تقریباً تیس ہزار روپے جان صاحب کے ہاتھوں میں بھی پہنچ گئے۔

...اس کے بعد ایک روز عمران نے راجا کو ساتھ لیا اور دندناتا ہوا شیخوپورہ میں اپنے گاؤں جھنڈ والی پہنچ گیا۔ اس کی قمیص کے نیچے بریٹا پستول لگا ہوا تھا اور تیز دھار چاقو تھا جبکہ راجا کی گرم چادر کے نیچے چھوٹی نال کی رائفل چھپی ہوئی تھی۔ نومبر کی وہ سرد ابر آلود رات گاؤں کے چودھری سجاول پر بہت بھاری گزری۔ عمران اور راجا حویلی کی پچھلی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ کچھ دیر تک پرال کے ڈھیر میں دبکے رہے پھر ایک پہرے دار کے سر پر بندوق کا وزنی دستہ مار کر اسے نیم جان کیا اور اس کی مشکیں کسنے کے بعد سیدھے اس کمرے میں جا پہنچے جہاں چودھری سجاول اپنی فربہ اندام بیوی کے ساتھ سو رہا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے اسے اس کی ماں سے جدا کیا اور پھر اسی کی ماں کو بھی سب کچھ چھوڑ کر دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اپنے لاڈلے بیٹے کو ایک بے حقیقت نحوست سے بچانے کے لیے ان میاں بیوی نے عمران کی ہنستی بستی زندگی کو زہرناک حقیقتوں کے حوالے کیا تھا اور آج وہ خود عمران کے حوالے تھا۔

راجا نے وسیع کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور عمران نے پستول کی نال چودھری سجاول کی پیشانی سے لگا دی۔ شوگر کے مرض نے بہتے کلے چودھری سجاول کو خزاں رسیدہ پتے جیسا کر رکھا تھا۔ وہ لرزنے لگا۔ اس کی فربہ اندام بیوی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بولی۔ ''یہاں سے جو کچھ لے کر جانا ہے لے جاؤ، پر ہمیں کچھ نہ کہو۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اپنے طلائی کڑے اتارنے لگی۔

عمران نے چہرے سے مفلر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پہچان چودھرائن! میں یہاں کچھ لوٹنے نہیں آیا۔ اس کا حساب لینے آیا ہوں جو تم لوگوں نے لوٹا ہے۔ بتاؤ کیا کیا تھا تم لوگوں نے میری مسکین ماں کے ساتھ؟ بتاؤ کس طرح اگلو گے

لگوائے تھے اس سے زمین کے کاغذوں پر۔۔۔اور مجھے بتاؤ کہاں پھینکا تھا اسے؟''

چودھرائن ہکی بکی عمران کو دیکھ رہی تھی۔ چودھری نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالنے کی کوشش کی مگر عمران کے ایک ہی زوردار جھانپڑ نے اس کے سارے کس بل نکال دیے۔ وہ پختہ دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ عمران کے قدموں میں گر کر کراہنے لگا۔ عمران نے اسے سیدھا کر کے بٹھایا اور اپنے سوال دہرائے۔ یہ گفتگو قریباً پندرہ منٹ جاری رہی۔۔۔اس دوران میں حویلی کے اندر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ چودھری کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ چودھری سجاول اور اس کی بیوی نے رو رو کر عمران کو یقین دلایا کہ انہیں اس کی والدہ کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ہاں۔۔۔چودھری سجاول نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اپنے ایک ملازم کے ذریعے اس نے شریفاں بی بی کی زمین خود ہی خریدی تھی۔ وہ اسی وقت زمین کی رجسٹری ایک آہنی الماری میں سے نکال کر لایا اور عمران کے حوالے کر دی۔ عمران اپنے ساتھ کچھ اسٹامپ پیپر لے کر آیا تھا۔ اس نے اسی وقت ان اسٹامپ پیپرز پر چودھری سجاول کے سائن انگوٹھے کروا لیے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد چودھری کو امید پیدا ہونے لگی کہ اس کی جان بخشی ہو جائے گی مگر عمران کے دل و دماغ میں چودھری کے لیے زہر کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ آج اس کی دو چار ہڈیاں توڑے بغیر یہاں سے جانے والا نہیں تھا۔

چودھری نے گھگیائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں بیمار ہوں۔ مجھے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔۔۔یہ سب کچھ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔''

عمران نے کہا۔ ''جو کچھ پچھلے ایک گھنٹے سے تم پر بیت رہی ہے، وہ مجھ پر کئی سال سے بیت رہی ہے۔ مجھے بھی ہر گھڑی یہی لگتا رہا ہے کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔ میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔''

چودھری بولا۔ ''میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ ہم نے اپنے بچے کی محبت میں تمہیں تمہاری ماں سے دکھرا کر دیا۔ شاید اسی کی سزا مجھے اس ظالم بیماری کی شکل میں ملی ہے۔ میری ہڈیاں کھر کھر کر میرے پیشاب کے ساتھ نکلتی جاتی ہیں۔ میں نے اب زیادہ وقت نہیں جینا۔ تم میرا خون اپنے سر نہ لو۔''

عمران بولا۔ ''ابھی تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ تمہارے جیسے شیطان کی ٹانگیں قبر میں چلی جائیں تو بھی وہ اپنی آخری شیطانیوں سے باز نہیں آتا۔۔۔گجرات سے کچھ لوگ میرے بارے میں سن گن لینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ وہ مجھے اپنی دھی کا رشتہ دینا چاہتے تھے۔ تم نے اور تمہاری اس ''جینئس بیوی'' نے بڑی اچھی طرح ان کو اطمینان دلایا۔۔۔میری تعریفوں کے پل باندھے اور میرے رستے کے سارے کانٹے اپنے ہاتھوں سے چن لیے۔ یہی کیا نا تم دونوں نے؟'' اس کے لہجے میں طنز کی تیز کاٹ تھی۔

چودھری کا رنگ جو تھوڑی دیر کے لیے نارمل ہوا تھا پھر ہلدی ہو گیا۔ اس کی بیوی چاپلوسی کے انداز میں عمران کو ''عمو پتر'' کہنے لگی اور منت ترلے میں مصروف ہو گئی۔

تب اچانک وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ چودھری کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آئے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا۔ پھر وہ یک ایک طرف کو جھکتا چلا گیا۔ ''ہائے میں مری۔'' اس کی بیوی پکاری اور دوڑ کر الماری کی طرف گئی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چودھری کی زبان کے نیچے گولی رکھی۔ تب تک چودھری تقریباً بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ کراہی۔ ''اسے دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔ اسے اسپتال لے جاؤ۔''

عمران نے پستول چودھرائن کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہم اسے ماریں گے نہیں تو بچائیں گے بھی نہیں۔ اپنے پتر کو بلاؤ، وہی اس کا کچھ کرے گا۔ اور ایک اور بات پورے دھیان سے سن لو اگر یہاں ہمارے بارے میں کسی کو پتا چلا تو تیری اور تیرے پتر کی خیر نہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو، ہم تمہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے۔''

''نہیں۔۔۔میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' چودھرائن نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''تو ٹھیک ہے، بلاؤ جس کو بلانا ہے۔'' راجا نے کہا۔

عمران اور راجا دونوں نے اپنے ہتھیار چھپا لیے۔ عمران نے پہلے کی طرح مفلر میں اپنا منہ سر لپیٹ لیا۔ چودھرائن نے اپنے پتر کا نام لے کر دہائی دی۔ ''نیازے۔۔۔نیازے جلدی آؤ۔ تمہارے پیو کو کچھ ہو گیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے کا دروازہ بھی چوپٹ کھول دیا تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ نیازے کا کمرا کہیں پاس ہی ہے۔ چودھرائن کی دوسری آواز پر ہی نیازا ہکا بکا وہاں پہنچ گیا۔ وہ عمران ہی کا ہم عمر تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ بال بکھرے تھے۔ یقیناً بستر سے نکلا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی جواں سال بیوی بھی تھی۔ وہ بھی سر پاؤں سے ننگی تھی۔ جب اس نے کمرے میں دو غیر مردوں کو دیکھا تو جلدی سے اپنا سر

ڈھانپنے کی کوشش کی۔

چودھری کو بے ہوشی کے عالم میں پڑے دیکھ کر ہی نیازے اور اس کی بیوی کو اندازہ ہو گیا کہ ابا جی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ ایک دم کھلبلی سی مچ گئی۔ ملازموں کو آوازیں دی گئیں اور بھاگتے دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ اس افراتفری میں کسی کو عمران اور راجا کی طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ جب بے ہوش چودھری سجاول کو ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی، عمران اور راجا وہاں سے کھسک آئے۔۔۔اور پھر اگلے چند گھنٹوں میں واپس خوشاب پہنچ گئے۔

چوتھے دن راجا ہی کی زبانی عمران کو یہ اطلاع ملی کہ چودھری سجاول دل کے اس شدید دورے سے جانبر نہیں ہو سکا۔۔۔اور انجام کو پہنچ گیا ہے۔

ان دنوں عمران کے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کبھی اس کا دل خودکشی کرنے کو چاہتا تھا۔ کبھی دل چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کو ختم کر لے لیکن اس طریقے سے کہ کوئی اسے حرام موت قرار نہ دے۔ یہی پراگندہ خیالات تھے جن کے زیر اثر وہ اپنی صحت و سلامتی کی طرف سے بالکل بے پروا ہو گیا تھا اور خطرناک ترین کام بھی کر گزرتا تھا۔ ایک روز وہ موت کے کنوئیں میں اندھا دھند موٹر سائیکل چلاتے ہوئے گر کر سخت زخمی بھی ہوا اور اسے دس بارہ روز اسپتال میں گزارنا پڑے لیکن اس کے طرز زندگی پر کوئی اثر پڑا۔۔۔اور نہ اس کی سوچوں میں کوئی فرق آیا۔ اسپتال میں قیام کے دوران میں کئی بار اس کے ذہن میں آیا کہ شاید چودھرائن اور اس کے پتر نیازے کی طرف سے کسی طرح کا کوئی ردعمل ظاہر ہو لیکن حیران کن طور پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یوں لگا کہ وہاں چودھری سجاول کی حویلی میں کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔ غالباً چودھرائن نے بھانپ لیا تھا کہ عمران نے جو کچھ کہا ہے، وہ کر دکھائے گا۔ وہ خاوند سے تو محروم ہو ہی چکی تھی، اب بیٹے سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے دم سادھ لیا تھا۔

عمران کو اسپتال سے آئے ہوئے پانچ چھ روز ہوئے تھے، جب ایک انگریز پروفیسر صاحب، جان محمد صاحب کے ہاں آئے۔ وہ پچاس پچپن برس کے صحت مند شخص تھے۔۔۔فرنچ کٹ داڑھی اور عینک ان کے چہرے کا حصہ تھی۔ ان کا پورا نام تو کچھ اور تھا مگر جان صاحب انہیں مسٹر رچی یا رچی صاحب کہتے تھے۔ رچی صاحب اپنے ساتھ ایک خوفناک سینٹ برنارڈ کتا بھی لائے تھے۔ اس کا وزن سو کلو کے لگ بھگ ہوگا۔ اس کے پورے جسم پر بال اور آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی۔

جان صاحب نے عمران کو حیران کرتے ہوئے بتایا۔ ''رچی صاحب تمہارے لیے ہی یہاں آئے ہیں۔''

''میرے لیے؟''

''ہاں۔۔۔یہ تمہارے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے جب تم ٹائیگر کو ''ٹرینڈ'' کر رہے تھے، عباس نے تمہاری ویڈیو فلم بنائی تھی۔۔۔یہ فلم کسی طرح اسلام آباد۔۔۔میں مسٹر رچی تک پہنچی۔ اس کے بعد اور بھی کچھ لوگوں نے یہ فلم دیکھی۔ پچھلے مہینے مسٹر رچی نے اسلام آباد سے عباس سے رابطہ کیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کام کے سلسلے میں عباس راولپنڈی تو جا ہی رہا تھا، اس نے رچی صاحب سے ملاقات کا پروگرام بھی بنا لیا۔ وہاں رچی صاحب اور ان کے دو دوستوں نے عباس سے تمہارے بارے میں بہت سی معلومات لیں۔ یہ لوگ جانوروں کے ساتھ تمہارے رویے اور تمہارے ساتھ جانوروں کے رویے سے بہت زیادہ حیران ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب رچی صاحب خود یہاں موجود ہیں۔''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''بس تم سے ملنا اور تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''میں کوئی عجوبہ ہوں؟'' عمران کا لہجہ روکھا تھا۔

''نہیں۔۔۔لیکن جو کچھ تمہارے اندر ہے، وہ ضرور عجوبہ ہے۔ جس طرح یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے، اسی طرح رچی صاحب اور ان کے دوستوں کی سمجھ سے بھی باہر ہے۔''

رات کو ایک پُرتکلف کھانے پر رچی صاحب سے عمران کی ملاقات ہوئی۔ عمران اس صورت حال سے بیزار تھا مگر جان صاحب کے کہنے پر اس نے رچی صاحب کو تفصیلی انٹرویو دیا۔ رچی صاحب کافی عرصے سے پاکستان میں مقیم تھے اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کر لیتے تھے۔۔۔ان کے کچھ سوالوں کے جواب عمران نے تفصیل سے دیے، کچھ کو وہ گول کر گیا۔

رچی صاحب نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ ''عمران! تمہیں اپنے ساتھ جانوروں کے خاص رویے کا پتا پہلی بار کب چلا؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں جی۔ میں نے آپ سے ماجھاں نامی عورت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا سرکش گھوڑا ''ہیرا'' تھا۔ کوئی اسے سنبھال نہیں پاتا تھا مگر میں نے تھوڑی سی کوشش سے اسے سنبھال لیا۔ اس وقت مجھے

تھوڑا بہت اندازہ ہوا۔"

"کیا تمہیں اپنے بچپن کی کوئی ایسی بات یاد ہے جب کسی جانور نے تمہارے ساتھ خاص رویے کا مظاہرہ کیا ہو؟"

عمران نے نفی میں سر ہلایا۔ رچی صاحب نے اس طرز کے اور کئی سوال عمران سے پوچھے۔ پھر ٹی وی اسکرین پر وہ ویڈیو دیکھی گئی جس میں عمران، ٹائیگر اور چند دوسرے جانوروں کو تربیت دیتے ہوئے نظر آتا تھا۔ اس ویڈیو کو دیکھنے کے دوران میں رچی صاحب نے کئی بار "ونڈرفل اور امیزنگ" کے الفاظ استعمال کیے۔

اگلے روز عمران کا عملی امتحان تھا۔ پنجرے میں بند خوفناک سینٹ برنارڈ کتے کو ٹریننگ والے احاطے میں چھوڑا گیا۔ اب عمران کو اس احاطے میں داخل ہونا تھا۔ عمران کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور صورت حال میں کیا تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا لیکن اس کا ہلکا سا احساس عمران کی چھٹی حس کو ضرور ہو رہا تھا... وہ مختصر احاطے میں داخل ہوا۔ اس کے چاروں طرف دیوار تھی جس کے اوپر خاردار تار لگائے گئے تھے۔

سینٹ برنارڈ کا انداز خطرناک تھا۔ وہ اپنی دُم کو تیزی سے گردش دے رہا تھا اور اس کے چوڑے جبڑے میں سے نکیلے دانتوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ عمران نے اسے پچکارا اور اس کے قریب چلا گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کتا چند قدم آگے بڑھا۔ عمران نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کو حرکت دی اور اسے شانت رہنے کا اشارہ دیا۔

وہ ذرا سا جھجکا لیکن اگلے ہی لمحے بھیانک انداز میں عمران پر جھپٹا۔ عمران کو اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک لمحے کی دیر ہوئی تو اس کا نرخرہ ادھڑ چکا ہوتا۔ جانور کے بالوں کا لمس اُس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا اور اس کی حیوانی بو اس کے نتھنوں میں گھسی۔ اگلے آٹھ دس سیکنڈ بڑے تہلکہ خیز تھے۔ بپھرا ہوا کتا عمران کو ذرا خاطر میں نہیں لایا۔ یہ صرف عمران کی غیر معمولی پھرتی تھی جس نے اسے کتے کے تند و تیز حملوں سے بچایا... جان صاحب کے گارڈز نے رائفلیں تان لی تھیں۔ جان صاحب چلا رہے تھے۔ "باہر آجاؤ... جلدی کرو۔"

رچی صاحب بھی کچھ اسی طرح کا واویلا کر رہے تھے۔ عمران نے ہنگامی راستہ استعمال کیا اور ٹریننگ والے احاطے سے باہر آ گیا۔ عمران حیران تھا اور اس سے بھی زیادہ دیگر لوگ حیران تھے۔ اسی احاطے میں انہوں نے ٹائیگر جیسے خطرناک جانوروں کو عمران کے اشارے پر چلتے اور اس کی گود میں سر رکھتے دیکھا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں عمران پر یہ انوکھا انکشاف ہوا کہ اس کے اور جانوروں کے درمیان جو ایک غیر معمولی و خصوصی تعلق تھا، وہ ختم ہو چکا ہے یا بہت ماند پڑ چکا ہے۔ وہ ٹائیگر کے پاس گیا، سفید ریچھ کے پاس گیا، اسٹار سرکس کی معروف ہتھنی نازو کے پاس گیا، ہر جگہ اس کا یہ احساس قوی تر ہوا کہ صورتِ حال بدل چکی ہے۔

دوسرے روز رچی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے عمران سے تفصیلی بات چیت کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہارے بارے میں جو اندازے لگائے تھے، وہ درست ثابت ہوئے ہیں۔ بے شک کل تم کسی بھی طرح کی کارکردگی دکھانے میں ناکام ہوئے ہو... لیکن تمہاری یہ غیر متوقع ناکامی اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے اندر وہ خاص صلاحیت موجود ہے جس کے بارے میں، میں اور میرے ساتھی غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ اس صلاحیت کا کچھ عرصے کے لیے اوجھل ہو جانا ہی اس کی موجودگی کا ثبوت ہے۔"

"میں سمجھا نہیں جی۔" عمران نے کہا۔

پروفیسر رچی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے غور سے عمران کو دیکھا اور بولے۔ "جانوروں کے ماہر اور نفسیات دان بڑے عرصے سے یہ بات مانتے ہیں کہ کچھ انسانوں اور جانوروں میں ایک خاص قسم کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی طرح جانوروں میں بھی ایک طرح کی مقناطیسیت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کی مقناطیسیت حیوانوں کی مقناطیسیت سے ایک جدا "لنک" بنا لیتی ہے۔ عام طور پر یہ صلاحیت قدرتی ہوتی ہے مگر اپنی کوشش اور محنت سے اسے بہت بہتر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اس صلاحیت کو ANIMAL MASTERY کہا جاتا ہے۔ مسمریزم سمجھتے ہو تم؟" رچی صاحب نے آخر میں عمران سے پوچھا۔

"جی... جسے ہپناٹزم کہتے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔ عرصہ پہلے فرانز مسمر نام کا شخص ہوا کرتا تھا۔ اسی کے نام سے مسمریزم کا لفظ نکلا۔ فرانز مسمر نے بھی اسی خاص قسم کی کشش کی بات کی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کشش سے حیران کن نتیجے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے جدید دور میں بھی جانوروں کو ہپناٹائز کرنا ایک ٹھوس حقیقت کی طرح جانا جاتا ہے۔" اس کے بعد پروفیسر رچی نے اس

حوالے سے چند ایک مثالیں دیں۔

پروفیسر رجی کی کہی ہوئی باتیں بہت اہم اور توجہ طلب تھیں لیکن عمران کو اس ساری گفتگو میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ اسے کسی چیز میں دلچسپی رہی ہی نہیں تھی۔ کسی صلاحیت کا حاصل ہو جانا... کھو جانا... اور پھر دوبارہ ملنے کی امید ہونا... یہ سب اس کے لیے بے معنی باتیں تھیں۔ وہ تو کسی اور ہی آگ میں جل رہا تھا، کسی اور ہی اذیت سے گزر رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ سچ مچ چلی گئی ہے... ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ گئی ہے۔ امید آس کی ہلکی سی کرن بھی نہیں چھوڑ گئی جس میں اسے اپنی زندگی کی شکل نظر آ سکے۔ اس نے بارہا سوچا تھا کہ وہ کیسے گئی ہوگی۔ جب وہ اپنے ہی خون میں لت پت ہو کر گری ہوگی تو اس نے کیا سوچا ہوگا؟ کیا آخری بار اس نے اسے یاد کیا ہوگا؟ اس کے دل نے اسے آواز دی ہوگی؟ آہ... برسوں کی پیار کہانی کتنی جلدی ختم ہوئی تھی۔ بس دو چار ماہ کے اندر ہی ان کی جدائی ہوئی۔ وہ دلہن بنی اور پھر قبر میں جا سوئی۔ اس کی معصوم مسکراہٹ عمران کی آنکھوں میں چمکتی رہتی۔ اس کے سادہ فقرے اس کے کانوں میں گونجتے رہتے اور اس کی دلکش ہنسی عمران کی روح کو چرکے لگاتی رہتی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھی، کتنے سہانے سپنے تھے اس کی آنکھوں میں... اور ایک آٹھ ایم ایم کی گولی نے وہ سب کچھ ختم کر ڈالا تھا۔

عمران اسے بھولنا چاہتا تھا مگر بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ راتوں کو دیوانہ وار خوشاب شہر کی گلیوں میں پھرتا، شراب پیتا، جھگڑے کرتا اور پھر نڈھال ہو کر سو جاتا۔ اس کی دلیری اور بے خوفی کے چرچے ہونے لگے۔ یہ چرچے دو طرح کے تھے۔ ایک تو وہ جھگڑے اور جھگڑے تھے جن میں وہ بے دریغ ''انوالو'' ہو جاتا تھا۔ دوسرے سرکس میں اس کی خطرناک پرفارمنس تھی... جانوروں سے دور ہونے کے بعد اس نے دیگر شعبوں کی طرف خطرناک تیزی کے ساتھ غیر معمولی توجہ دی اور دیکھنے والوں کو حیران کر دیا۔ ''موٹر سائیکلسٹ بادشاہ'' کا سرکس سے معاہدہ ختم ہونے سے پہلے ہی عمران نے اس فن میں حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے بھی خاطر خواہ مدد کی۔ اب وہ موت کے کنوئیں میں شان دار پرفارمنس دینے کے قابل ہو گیا تھا... بلکہ کچھ آئٹمز میں بادشاہ سے دو ہاتھ آگے نکل گیا تھا۔

اس کے لیے بدترین خطرات کے لیے ایک بھوک سی پیدا ہو چکی تھی۔ جان صاحب اور خالہ صدیقہ وغیرہ کے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے جھولوں پر بازی گری بھی شروع کر دی... اس کی غیر معمولی دلیری و بے خوفی اسے ہر دلعزیز بنا رہی تھی۔ وہ جہاں کہیں کسی ناتواں لاچار شخص پر زیادتی ہوتے دیکھتا، سینہ تان کر اس کے دفاع میں کھڑا ہو جاتا اور اس حوالے سے اپنی جان کی بھی پروا نہ کرتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ احسان مند شخص اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ اسے اپنے اردگرد سے محبتیں ملنے لگیں۔ لوگ اس سے اپنائیت محسوس کرنے لگے اور مشکل وقت میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کی طرف اٹھنے والی الفت بھری نظریں اس کے اندر دھیرے دھیرے ایک تبدیلی کو راہ دینے لگیں۔ اسے اپنی بیکار زندگی کا موہوم سا مقصد نظر آنے لگا۔ وہ اپنے اردگرد ایسے آنسو تلاش کرنے لگا جنہیں پونچھ سکے... ایسے بے وسیلہ لوگ ڈھونڈنے لگا جن کا وسیلہ بن سکے۔ اس کی تباہ حال زندگی غیر محسوس طور پر ایک نیا رخ اختیار کرنے لگی۔ اب اس کے لباس میں ہر وقت بھرا ہوا ریوالور رہتا تھا لیکن یہ ریوالور زیردستوں کے لیے نہیں، ان زبردستوں کے لیے تھا جو محبت کی زبان نہیں سمجھتے۔ عام لوگوں کے لیے تو وہ سراپا مہر تھا۔ وہ بڑی اپنائیت سے اسے عمران بھائی اور ہیرا بھائی جیسے القابات سے نوازتے تھے۔

جان صاحب کے اسٹار سرکس میں کئی خوبرو لڑکیاں تھیں۔ عمران کی مردانہ وجاہت اور اس کی غیر معمولی دلیری صنفِ مخالف کو بڑی شدت سے اپنی طرف کشش کرتی تھی۔ دو تین لڑکیاں ہر وقت عمران کی قربت کی خواہش مند رہتی تھیں... مگر وہ تو یہ باب اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے بند کر چکا تھا... ان میں سے صرف ایک لڑکی تھی جسے وہ کسی حد تک قابلِ توجہ سمجھتا تھا لیکن وہ بھی ایک عورت کی حیثیت سے نہیں، صرف ایک ''مصیبت زدہ'' کی حیثیت سے۔ اس کا نام شاہین تھا۔ شاہین اور اس کے اہلِ خانہ ایک شاطر عامل کے چکروں میں پھنسے ہوئے تھے... وہ شخص نہ صرف ان سفید پوش لوگوں سے ہزاروں روپے بٹور چکا تھا بلکہ اپنی عیاریوں کے ذریعے اس نے ان کا مکان بھی اپنے ایک چہیتے مرید کے پاس گروی رکھوا دیا تھا۔ شاہین، عمران کے ساتھی فن کاروں میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس لیے بھی شاہین کی مدد ضروری سمجھتا تھا کہ اسے ان نام نہاد عاملوں اور جعلی پیروں، فقیروں سے خدا واسطے کا بیر پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ آتشیں اسلحہ لے کر نکلتا اور جہاں کہیں اسے ایسی جاہلیت کا کوئی علم بردار نظر آتا، اسے بھون کر رکھ دیتا۔ جو کام شاہین اور اس کے سفید پوش گھر والے پچھلے تین برسوں سے نہیں کر سکے تھے، وہ عمران نے صرف دو روز میں

کر دیا۔ عامل کے چیلے نے نہ صرف مکان کا قبضہ چھوڑا بلکہ عامل نے اس رقم کا کافی حصہ بھی واپس کیا جو اس نے عملیات کے نام پر سادہ لوح گھرانے سے ہتھیایا تھا۔

شاہین، عمران کو کسی اور نظر سے دیکھنے لگی تھی لیکن عمران نے اس پر بالکل واضح کر دیا کہ اس کی زندگی میں اب عورت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہاں، اس کی دل جوئی کے لیے وہ اس سے ملتا بھی تھا اور ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیتا تھا۔ کسی وقت اسے ڈر بھی لگتا کہ کہیں آگے جا کر ان کا تعلق کوئی اور رخ اختیار نہ کر لے لیکن پھر شبانہ کا غم بے پناہ شدت کے ساتھ اس کے سینے کو بھر دیتا اور اسے یقین ہونے لگتا کہ اس مختصر سی زندگی میں تو یہ غم اسے کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت نہیں دے گا۔ اسے شبانہ کے ساتھ اپنی ''وفا'' بالکل محفوظ نظر آنے لگتی اور یہی اس کی آخری خواہش تھی۔ وہ اس وفا کو آخری دم تک محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

دھیرے دھیرے اس کی زندگی تبدیل ہونے لگی۔ اس نے خود کو دوسروں کی آسانیوں اور خوشیوں میں گم کر دیا۔ اپنے اردگرد کے نچلے طبقے سے اسے خاص طور پر وابستگی پیدا ہونے لگی۔ جاہلیت و توہم پرستی کے مسائل کا شکار لوگ اس کی خصوصی توجہ کے مستحق ٹھہرے۔

وہ اندر سے جھلس رہا تھا مگر اس کو اپنے ہونٹوں پر ہنسی سجانا آ گیا۔ اس کا کلیجا چھلنی تھا مگر اس نے خوش خلقی کو اپنے اشکوں کا پردہ بنا لیا۔ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اور چہرے پر مسکان سجا کر ایک اور ڈھنگ سے جینے لگا۔ جان صاحب اور خالہ صدیقہ کے لیے وہ سگی اولاد کی طرح تھا۔ وہ اسے اپنے کاروبار میں کوئی انتظامی حیثیت دینا چاہتے تھے مگر عمران اپنے ڈھب سے جینے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ اب جان صاحب کے سرکس کا سب سے مقبول فن کار تھا... خطروں سے کھیلنا اس کی فطرتِ ثانیہ ہو گیا تھا۔ وہ ہیرو کہلاتا تھا اور شاید ایسا کہلانے کا حق دار بھی تھا۔ اپنی ماں کی یاد اور اپنی شبانہ کی تصویر کو سینے سے لگائے وہ اپنے ڈھنگ سے جیتا رہا... اور جیتا رہا۔

☆☆☆

...اب میں اسی جگہ واپس آتا ہوں جہاں سے عمران کی طویل کہانی شروع ہوئی تھی... ہاں، یہ زرگاں کی وہی پُرفسوں رات تھی۔ ساتویں کے جشن کا آغاز ہو چکا تھا۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہو گیا تھا مگر آسمان پر ابھی تک گاہے بگاہے آتش بازی کے رنگ بکھرتے تھے اور قرب و جوار کو منور کر جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ زرگاں آج سونے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ موسیقی کی لہریں، نعروں کا شور، ہاتھیوں کی آوازیں، آتش بازی کی تڑتڑاہٹ یہ سب کچھ ایک دل نواز ارتعاش پیدا کرتا تھا اور ہر جان دار و بے جان شے ایک سرمستی میں ڈوب جاتی تھی۔

ہمارے سامنے چائے کے کئی خالی مگ رکھے تھے۔ عمران کے اردگرد سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ اس کی کہانی نے میرے دل میں عجیب سا گداز بھر دیا تھا۔ میں نے اس کے خوبرو چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک یادوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''ماں کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا؟''

''نہیں۔'' اس نے نیا سگریٹ سلگا کر مختصر جواب دیا۔

''تم نے تلاش ختم کر دی؟''

''نہیں جگر! وہ تو زندگی کی آخری سانس تک ختم نہیں ہو سکتی۔ لیکن پتا نہیں کیوں، اب کبھی کبھی آس ٹوٹ جاتی ہے۔''

''تمہارا شیخوپورہ والا آبائی گھر تمہارے پاس ہے؟''

''ہاں، کئی بار سوچا کہ اسے بیچ ڈالوں لیکن نہیں بیچا۔ پتا نہیں کیوں دل کہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی اس گھر میں، میں اور ماں اکٹھے ہوں گے۔ اس کے صحن میں بیری کے نیچے بیٹھیں گے۔ اس کے کمروں میں ہماری آوازیں گونجیں گی۔ بڑی یادیں ہیں اس گھر کے ساتھ۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اسے کبھی بیچ سکوں گا۔''

''اور چودھری سجاول وغیرہ؟ چودھری کے وارثوں نے کبھی تم سے بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی؟''

عمران نے کہا۔ ''چودھرائن ڈیڑھ دو سال تو خاموش رہی۔ پھر اس نے پتا نہیں کس موڈ میں اپنے پتر نیاز اور داماد شیر افگن کے سامنے سب کچھ بک دیا۔ ان لوگوں نے مجھ پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی...''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر کیا ہونا تھا۔'' وہ مخصوص انداز میں مسکرایا۔ ''تیرا یار اب تر نوالہ نہیں، لوہے کا چنا بن چکا ہے۔ تیری دعا سے نیاز ے اور افگن جیسے لوگ اب یہاں اس جیب میں رہتے ہیں۔'' اس نے اپنی جیب تھپتھپائی جیسے واقعی وہاں نیاز اور افگن موجود ہوں اور وہ انہیں تھپک رہا ہو۔

''اور... وہ تمہارا یار راجا؟''

عمران نے گہرا کش لیا۔ ''راجا، اپنی طرز کا وکھرا کریکٹر تھا۔ میں نے بہت روکا لیکن وہ اپنے شغلوں سے باز

نہیں آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن لاہور کی ہیرا منڈی کے قریب ایلیٹ فورس کے ہتھے چڑھ گیا۔ منشیات اور فراڈ کے تین سنگین کیسوں میں اسے سات سال قید کی سزا ہوئی۔ اب وہ پنجاب ہی کی کسی جیل میں ہے۔ کافی عرصے سے اس کی کچھ خبر نہیں...''

''اور شاہین؟''

عمران کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک زخمی مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ بولا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں اور اقبال قریباً ایک سال پہلے پاکستان سے تمہارے کھوج میں روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت تک وہ بقیدِ حیات تھی۔ میں اس پر زور دے کر آیا تھا کہ وہ منگنی ختم کرا لے بلکہ میری واپسی تک اس کی شادی اور ایک آدھ بچہ بھی ہو جانا چاہیے۔ وہ خوب ہنسی تھی۔''

''کیوں؟''

''میں نے کہا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ تین چار مہینوں میں واپس آ جاؤں گا۔ اسے یقین تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں وہ بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ لیکن اب تو سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میری فرمائش پوری کر دے۔''

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی تم... میرا مطلب ہے تمہیں اس سے کوئی لگاؤ نہیں؟''

''نہیں تابی!'' وہ پورے یقین سے بولا۔ ''میں اسے صاف بتا چکا ہوں کہ مجھ پر یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ میری دوستی ہے، ہنسی مذاق بھی ہے اور ایسا دیگر لڑکیوں کے ساتھ بھی ہے لیکن... میرے دل میں جو کچھ مر چکا ہے، وہ پھر زندہ نہیں ہو سکتا۔ شاید میں چاہوں تبھی تو نہیں ہو سکتا۔ اِٹ اِز آل اوور۔ اور اب ان باتوں کو چھوڑو یار۔ تم ماضی میں بہت غوطے دے چکے ہو مجھے۔ اب میرا سانس گھٹنے لگا ہے۔ اب مجھے باہر نکالو ورنہ ساتویں کا جشن دیکھنے سے پہلے ہی میرا اپنا ساتواں اور دسواں ہو جائے گا۔''

وہ دھیرے دھیرے پھر اپنی مخصوص خوش گفتاری کی طرف پلٹ رہا تھا لیکن میرا دل اس کے لیے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہی لگ رہا تھا کہ معصوم صورت شاہانہ کی ناگہانی موت میرے سامنے واقع ہوئی ہے اور میں اس سارے درد و کرب کا چشم دید گواہ ہوں جو چناب کے کنارے پیار کرنے والے دو دلوں کے حصے میں آیا اور جسے انہوں نے آنسوؤں کے دریا میں تیر کر جھیلا۔

میرا یہ قیاس سو فیصد درست نکلا تھا کہ عمران بھی کسی ایسی ہی وقیانوسیت کا ڈسا ہوا ہے جو یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں کسی عفریت کی طرح پنجے گاڑے ہوئے ہے۔

سادہ لوحی اور توہم پرستی کی کوکھ سے جنم لینے والی یہ دقیانوسیت عمران کی ہنستی بستی زندگی کو چاٹ گئی تھی اور ایسی نہ جانے کتنی زندگیاں قرنوں سے اس کی بھینٹ چڑھ رہی تھیں۔ میں گہری نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ''جب تم ایسے دیکھتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ ہپناٹزم سیکھ رہے ہو اور اس کا پہلا پہلا تجربہ مجھ پر کرنا چاہتے ہو۔ دیکھو جگر! اناڑی جادوگر بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ بندے کو غائب کر دیتا ہے اور پھر واپس نہیں لا سکتا... بعد ازاں ایسے جادوگر متاثرین کے ڈر سے قبائلی علاقے میں فرار ہو جاتے ہیں۔''

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''عمران! ایک بات کہوں؟ تمہیں عجیب تو لگے گی لیکن ہے حقیقت۔''

''ہاں ہاں کہو۔ عجیب باتیں سننے کے لیے میں ہی تو رہ گیا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ابنِ صفی مرحوم کا ایک کردار ہوا کرتا تھا علی عمران... کالج کے دور تک ہم نے اسے خوب پڑھا ہے۔ بڑی دلچسپ جاسوسی کہانیاں ہوتی تھیں اور کہانیوں سے زیادہ دلچسپی ہمیں اس اوٹ پٹانگ کردار میں ہوا کرتی تھی۔ اتفاق سے تمہارا نام بھی عمران ہے، صرف اس میں دانش کا اضافہ ہے۔ مجھے تمہارے اندر اس کردار کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کہیں تم اس کردار کا دوسرا جنم تو نہیں ہو؟''

''دیکھو، اب تم نے ہندوؤں میں رہ کر ہندوؤں جیسی باتیں شروع کر دی ہیں۔ کل تم یہ بھی کہو گے کہ سلطانہ تمہاری بیوی نہیں بلکہ دھرم پتنی ہے اور تم اسے پیار نہیں کرتے بلکہ پریم کرتے ہو اور تمہارا بچہ دراصل ''ڈیشل'' کے بغیر ہنومان کا چالیسواں جنم ہے۔''

''ہاں ہاں، وہ بھی ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''فرق صرف یہ ہے کہ ابنِ صفی کے مطابق وہ تم سے ذرا کم خوب صورت اور تم سے ذرا زیادہ عقلمند تھا اور اس کی کرچین محبوبہ ابھی زندہ تھی اور وہ در پردہ ایک بڑا سرکاری عہدیدار تھا... سیکرٹ سروس کا چیف وغیرہ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ادیبوں اور دیگر فن کاروں کا ذہن تخلیق کرتا ہے وہ سراسر خیالی نہیں ہوتا۔ چاہے اس میں کتنی بھی فینٹسی ہو، ایسی جیسی یا اس سے ملتی جلتی چیزیں اس دنیا میں فی الواقع موجود ہوتی ہیں۔ شاید تم بھی ایک ایسی ہی ملتی جلتی چیز ہو۔''

اچانک ایک دھماکا ہوا اور ہماری گفتگو کو بریک لگ

گئے۔ یہ دھماکا عمارت کی بیرونی دیوار کے اندر ہوا تھا۔ یہ زیادہ زوردار نہیں تھا۔ کسی کریکر یا آتش بازی والے بم کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی ملی جلی آوازیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ عمارت سے باہر بہت سے لوگ جمع ہیں اور نعرہ زنی کر رہے ہیں۔

رات کے اس پہر یہ صورتِ حال تعجب خیز تھی مگر آج تو یہ شاید رات ہوئی ہی نہیں تھی۔ زرگاں کی بیشتر آبادی ناچ گانے اور عیش عشرت میں مصروف تھی۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

''لگتا ہے کہ کچھ لوگ شاید تم پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔ آوازیں غور سے سنو۔''

مدھم آوازیں اب ہمارے کمرے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ انہیں زیادہ وضاحت سے سننے کے لیے عمران نے ایک کھڑکی وا کر دی۔

''قاتل ہے... پھانسی دو... زندہ جلاؤ۔'' اس طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر کسی نے نعرہ مارا۔ ''سامبر مقابلہ۔''

جواب میں بیسیوں آوازیں بلند ہوئیں۔ ''نامنظور۔''

یہ نعرہ کئی مرتبہ دہرایا گیا اور مظاہرین میں ہلچل نظر آنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ عمارت کے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہوائی فائرنگ شروع ہو گئی۔ یقیناً یہ فائرنگ اسپیشل گارڈز کر رہے تھے جو ہماری حفاظت پر یہاں مامور تھے۔

کچھ ہی دیر بعد یہ ہنگامہ سرد ہو گیا اور مظاہرین جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی، منتشر ہو گئے۔ یہ صورتِ حال ہمارے لیے نئی نہیں تھی، ہمیں معلوم تھا کہ زرگاں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو جارج گورا جیسے ''مہان شخص'' سے میرے دوبدو مقابلے کا مخالف ہے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ میں ایک معمولی شخص ہونے کے ساتھ ساتھ اسٹیٹ کا مجرم بھی ہوں۔ جارج کے ساتھ دوبدو مقابلے کے پروگرام نے مجھے جارج کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ہم دونوں کے حقوق برابر ہو گئے ہیں اور یہ کسی طور بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

علی الصباح میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا۔ ''وہ مٹھی بھر لوگ تھے۔ گارڈز کی ہوائی فائرنگ سے منتشر ہو گئے۔'' پھر وہ دھیمی آواز میں رازداری کے لہجے میں بولی۔

''میرے خیال میں یہ بھی تم پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کا ایک طریقہ ہے۔ مقابلے سے پہلے یہ لوگ تمہیں زیادہ سے زیادہ پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انتظامیہ چاہتی تو یہ مٹھی بھر لوگ یہاں پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ انہیں کہیں دور ہی روک لیا جاتا۔ جیسے دوسرے لوگوں کو روکا گیا...''

''دوسرے لوگ کون؟'' میں نے پوچھا۔

''کل رات تمہارے حق میں بھی بہت سے لوگ نکلے ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار کا جلوس تو ہوگا۔ یہ لوگ تمہاری جیت کے لیے نعرے لگا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں غصہ بھی تھا۔ کسی طرح یہ خبر نکل ہی گئی ہے کہ کل تم پر پھر حملہ ہوا ہے۔ غسل خانے کے نلکے میں کرنٹ چھوڑ کر تمہاری جان لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ لوگ احتجاج کرتے ہوئے یہاں تک آنا چاہتے تھے اور شاید اس سے آگے راج بھون بھی جانا چاہتے ہوں لیکن گارڈز نے انہیں روک لیا اور مار پیٹ کر منتشر کر دیا۔''

وہ جشن کا دن تھا۔ اس روز میں نے اور عمران نے زرگاں میں حیرت انگیز نظارے دیکھے۔ یوں لگتا تھا کہ زرگاں کے بیشتر باشندے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں اور انہوں نے خود کو مستیوں میں غرق کر لیا ہے۔ جشن کا ایک اہم نظارہ ہاتھیوں کا جلوس تھا۔ یہ جلوس دوپہر کے فوراً بعد راج بھون سے روانہ ہوا۔ اسے شہر کے اہم راستوں سے گزر کر شام کے بعد واپس راج بھون پہنچنا تھا۔ ہماری قیام گاہ کے سامنے سے یہ شاندار جلوس سہ پہر کے وقت گزرا۔ یہ درجنوں سجے سجائے ہاتھی تھے۔ ان پر خوب صورت ہودے تھے اور ہودوں میں زرگاں کے معزز مرد و زن تھے۔ جلوس کے راستے کی دونوں جانب سیکڑوں ہزاروں لوگ جمع تھے۔ کھڑکیوں، چوباروں اور چھتوں پر بھی اہلِ زرگاں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ جلوس میں سب سے آگے جو دیوہیکل ہاتھی تھا، وہ سب پر بازی لے گیا تھا۔ اس کی سجاوٹ بھی دیدنی تھی۔ اس کے ہودے میں حکم جی اپنی چھوٹی بیٹی رتنا دیوی کے ساتھ موجود تھا۔ رتنا کو بچہ تولد ہوئے زیادہ دن نہیں گزر رہے تھے پھر بھی وہ تمام مصروفیات میں حصہ لے رہی تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ وہ پیچھے رہی تو کوئی دوسری رانی اس کی جگہ لے لے گی۔

دو رویہ کھڑے لوگ جلوس پر گل پاشی کر رہے تھے۔ جواباً شاہی ہاتھیوں پر سے عوام الناس پر سکوں کی بارش کی جا رہی تھی۔ ہم یہ سب کچھ لال بھون کی چھت کے اوپر سے دیکھ رہے تھے۔ نعروں اور باجے گاجے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

''کاش میں بھی ایک ہاتھی ہوتا۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
''کیوں، ایسی کیا ضرورت پیش آگئی؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ دیکھو۔'' عمران نے ایک طرف اشارہ کیا۔
میں نے دیکھا، ایک ہاتھی کی سونڈ میں ایک خوبرو نیم برہنہ لڑکی بیٹھی تھی اور تماشائیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تو یہ ہتھنی ہے۔ کیا تم ایک لڑکی کو اپنی سونڈ پر بٹھانے کے لیے ہتھنی بننا پسند کرو گے؟''
''یہ ہتھنی ہو ہی نہیں سکتی۔'' عمران نے وثوق سے کہا۔ ''تم دیکھ نہیں رہے ہو، وہ کتنا خوش ہے۔ کتنی طاقت آگئی ہے اس کی سونڈ میں۔ یہ محاورہ بالکل درست ہے کہ ہاتھی اور مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔''
''یہ محاورہ گھوڑے اور مرد کے بارے میں کہا گیا ہے۔'' میرے اور عمران کے عین پیچھے کھڑی گیتا لکھی نے کہا۔
ہم نے مڑ کر اسے دیکھا۔ رقاصہ لڑکیوں کی یہ بے باک استاد ہمیشہ کی طرح ہوشربا لباس میں تھی۔ اپنی عادت کے مطابق وہ گفتگو کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''لگتا ہے گیتا دیوی تمہیں ایسے ''محاوروں'' میں خاصی دلچسپی ہے۔''
''تمہیں نا ہیں ہے؟'' وہ نیم باز آنکھوں سے بولی۔
''ہوتی تو غلط محاورہ نہ بولتا۔'' عمران نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''دیا گیتا دیوی، تمہیں آج کے دن تو کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تم نے اپنے کپڑوں پر بالکل بھی پیسے خرچ نہیں کیے۔ اتنا تھوڑا سا لباس۔ یہ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔''
وہ بے باکی سے مسکرائی۔ ''اور تم اسے کنجوسی کہہ رہے ہو؟ یہ تو فراخ دلی ہے... زرگاں کی بیشتر عورتیں آج کے دن ایسی ہی فراخ دل ہو جاتی ہیں۔''
''کیا تم بھی ''بیشتر'' عورتوں میں شامل ہو؟''
''ہاں... لیکن ہر کسی کے لیے نا ہیں۔'' وہ عمران کو خاص نظروں سے دیکھ کر بولی اور تھوڑا سا اس کی طرف کھسک آئی۔
عمران نے جلدی سے موضوع بدلا اور گیتا سے پوچھا کہ یہ جلوس یہاں سے گزر کر کس طرف جائے گا۔ گیتا نے بتایا کہ یہاں پاس ہی ایک اسٹیڈیم نما جگہ ہے جہاں بہت سے کھیل تماشے ہو رہے ہیں۔ جلوس کے شرکا کچھ دیر تک وہاں رکیں گے پھر راج بھون روانہ ہو جائیں گے۔ راج بھون میں آج جشن کی رات ہے۔ کل چونکہ زرگاں میں عام چھٹی ہے، اس لیے یہ جشن رات گئے تک جاری رہے گا۔ مسابقت پریوں کا انتخاب اور اس کے علاوہ بھی بہت سی تقریبات ہوں گی۔
زرگاں کی وہ رات قابلِ دید تھی۔ گھروں پر چراغاں کیا گیا۔ دیسی گھی کے دیے روشن ہوئے۔ انواع و اقسام کے پکوان بنائے گئے اور لوگوں نے زرق برق لباس پہنے۔ مجھے اور عمران کو علم نہیں تھا کہ ہم بھی راج بھون جا سکیں گے یا نہیں؟ تاہم شام سے تھوڑی دیر پہلے میڈم صفورا نے مجھ سے کہا۔ ''حکم جی نے تمہیں راج بھون آنے کی اجازت دی ہے لیکن یہ اجازت مشروط ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''ظاہر ہے کہ جارج صاحب بھی وہیں موجود ہوں گے۔ وہ تمہیں دیکھ کر طیش میں آ سکتے ہیں یا تمہاری طرف سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس لیے تم عام حاضرین میں نہیں بیٹھو گے بلکہ ایک گیلری تک محدود رہو گے اور وہیں سے جو کچھ دیکھ سکو، دیکھو گے۔ ہاں، عمران میرے گارڈز میں شامل ہو کر میرے ساتھ رہے گا اور ہر جگہ جا سکے گا۔''
شام سے کچھ دیر پہلے ہی مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار کیا گیا۔ میڈم صفورا اور منیجر مدن وغیرہ بھی میرے ساتھ موجود تھے۔ نہایت سخت حفاظتی انتظامات میں ہم راج بھون کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم نے جشن کے پُرجوش مناظر دیکھے۔ جگہ جگہ آتش بازی ہو رہی تھی۔ نوجوان رقص کر رہے تھے۔ راستوں پر شراب کی خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں۔ ہیجڑے بھی رنگین کپڑوں میں ملبوس، اس گہما گہمی کا حصہ تھے۔ وہ نہر جو راج بھون کی عظیم الشان سیڑھیوں کے پاس سے گزر رہی تھی، کشتیوں اور رنگ برنگے تفریحی بجروں سے بھری ہوئی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی کرنیں بادبان چمک رہے تھے اور موسیقی کی لہریں پھیل رہی تھیں۔
ہم راج بھون کے سامنے پہنچے تو روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ سارا بھون دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ خوب صورت فواروں سے ہفت رنگ پانی کی پھواریں پھوٹ رہی تھیں... رنگین آنچل لہراتے تھے اور قہقہے بکھرتے تھے۔ گارڈز کے گھیرے میں مجھے راج بھون کے اندر پہنچایا

گیا اور مختلف راہداریوں سے گزار کر ایک گیلری میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بھی جنریٹرز کی برقی روشنی موجود تھی اور کرسیاں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک بہت بڑا مخملی پردہ کھنچا تھا۔ اس پردے کی دوسری جانب سے خوشبوؤں کی لپٹیں آتی تھیں اور سریلے قہقہے سنائی دیتے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پردے کی دوسری جانب بہت سے لوگ موجود ہیں۔
میڈم صفورا اور منیجر مدن کے علاوہ چند دیگر لوگ بھی اس گیلری میں موجود تھے۔ یہ بھی زرگاں کے معزز باشندوں میں سے تھے۔ ان سب کی نظروں میں میرے لیے بے پناہ دلچسپی موجود تھی۔ میری طرف دیکھ کر وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے اور پھر چور نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ میں ان کے لیے بے حد توجہ کی چیز تھا۔ صرف دو دن بعد راج بھون کے سامنے جارج گورا سے میرا دو بدو مقابلہ ہونے والا تھا... فائٹ ٹل ڈیتھ۔ میں نے ایک ایسے شخص کو للکارا تھا جس کے مقابلے میں میری کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ غالباً یہ لوگ مجھے ایک چلتی پھرتی لاش کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ اور کچھ یہی حال ان گارڈز کا بھی تھا جو اس بالکونی نما گیلری میں میری حفاظت پر مامور تھے۔ وہ کن انکھیوں سے مجھے تاکتے تھے جیسے نگاہوں نگاہوں میں مجھے تولتے ہوں اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوں کہ میں جارج گورا جیسے فائٹر کے سامنے کتنی دیر تک کھڑا رہ سکوں گا۔
میری تیاریوں اور رہن سہن کے حوالے سے بھی بہت سی سچی جھوٹی باتیں پھیل چکی تھیں۔ ان باتوں کا علم ہمیں زیادہ تر گیتا لکھی اور میڈم صفورا سے ہی ہوتا تھا۔ مثلاً یہ بات بتا نہیں کیسے پھیل گئی تھی کہ میں گھنٹوں برف کی سل پر لیٹا رہتا ہوں اور اپنے جسم کو زہریلے کیڑوں سے ڈسواتا ہوں جس سے میرے جسم کی کھال بالکل بے حس ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے، یہ بے بنیاد بات تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد نیم تاریک گیلری کا مخملی پردہ ہٹایا گیا۔ سامنے کا منظر ہوش ربا تھا۔ یہ وہی وسیع و عریض بغیر ستون کا ہال تھا جو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ آج یہ ہال پہلے سے زیادہ مرصع و مزین نظر آتا تھا۔ ہال کی گنبد نما چھت پر مصنوعی ستاروں کی بارات تھی اور چاند دلہا کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ تین آبشاروں کا پانی وسیع تالاب میں گرتا تھا۔ اس تالاب میں چھوٹی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ راجواڑے کے اُمراء خوش پوش نازنینوں کے ساتھ مصروفِ سیر تھے۔ تالاب کے کنارے ناچنے والیوں نے مختصر ترین لباس پہن رکھے تھے۔ سخت سردی میں وہ یہ مظاہرہ کرنے میں اس لیے کامیاب ہوئی تھیں کہ اس سارے چیمبر کو مصنوعی طریقے سے

سر کا کمال - لکھے حروف بھی لہرانے لگے

گرم کر دیا گیا تھا۔
میڈم صفورا نے ٹھیک کہا تھا۔ اس وسیع ہال کے بیچوں بیچ نصب فوارے میں سے آج پانی کی جگہ شراب پھوٹ رہی تھی اور فوارے کے گرد بنے ہوئے بلوری حوض میں جمع ہو رہی تھی۔ اس حوض سے جام بھر بھر کر پیے جا رہے تھے اور ''پینے والے'' اپنی ساتھی حسیناؤں کے ساتھ بے تکلف ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آج کی شب کے لیے سارے قانونی و اخلاقی قاعدے ضابطے معطل ہو چکے ہیں... اور یہاں کی جلوت... خلوت بن گئی ہے۔
ایک طرف ڈانسنگ فلور بنا ہوا تھا۔ یہاں موسیقی کی دھنا دھن پر جوڑے محوِ رقص تھے۔ انہی جوڑوں میں ایک بلند قامت شخص نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ میرا مدمقابل جارج گورا تھا۔ ایک مقامی حسینہ کو اپنے ساتھ پیوست کیے وہ محوِ رقص تھا۔ پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور میری نگاہ حکم جی پر پڑی۔ وہ ایک بلند مرمریں چبوترے پر اپنی تینوں رانیوں کے ساتھ تشریف فرما تھا۔ اس کے گرد بھی جام گردش کر رہے تھے اور خوش بدن شاہی خادمائیں چکرا رہی تھیں۔ کئی دیگر مصاحبین بھی اس چبوترے پر حکم کے عقب میں موجود تھے۔
کچھ دیر بعد اس وسیع ہال میں جیسے رنگ و نور کا سیلاب

سا آگیا۔ روشنیوں کے زاویے بدل گئے۔ موسیقی کی پُرجوش تانوں نے ماحول کو گرمایا۔ وہ چالیس حسینائیں جگمگاتے اسٹیج پر ایک ساتھ نمودار ہوئیں جو پچھلے کئی ماہ سے اس تیاری میں تھیں کہ دیکھنے والوں پر بجلیاں گرائیں اور ان کے دل و دماغ کو اپنے سحر میں جکڑ لیں۔ یہ زرگاں کے گلشنِ حسن کے منتخب پھول تھے اور ان میں سے آج سات بہترین پھول منتخب کیے جانے تھے۔ اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹا حشر خیز تھا۔ لڑکیوں نے مشترکہ رقص کیا اور اپنے حسن و شباب کے جلوؤں سے دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیا۔ حاضرین بار بار تالیاں پیٹتے رہے اور آہیں بھرتے رہے۔

میڈم صفورا نے کہا۔ ''لڑکیوں کا کمال تو ہے لیکن اس میں گیتا سکھی کی ٹریننگ کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ یہ لڑکیوں کی کایا پلٹنے میں ماہر ہے۔''

''کیا اب سات لڑکیوں کا سلیکشن ہو جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی کہاں۔'' وہ بولی۔ ''ابھی ان کا ایڑی چوٹی کا زور لگے گا۔ اپنے بہت سارے کپڑوں سے بھی محروم ہو جائیں گی۔''

اس کے بعد اگلا دور شروع ہوا۔ لڑکیوں نے لباس تبدیل کیے اور کیٹ واک کے انداز میں ایک ایک کر کے اسٹیج پر آنا شروع کیا۔ ان کی چال، مسکراہٹ، اٹھنے بیٹھنے کا انداز، خوش لباسی، سب کچھ نوٹ کیا جا رہا تھا۔ منصف خواتین و حضرات کی تعداد دس کے قریب تھی۔ وہ بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ حاضرین خاموش رہ کر یا تالیاں بجا کر ان کی مدد کر رہے تھے۔

اس کے بعد آخری مرحلے کا آغاز ہوا۔ یہ بھی بڑا سنسنی خیز تھا۔ دوشیزائیں مختصر لباس میں اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ وہ پانچ پانچ کی ٹولیوں میں آئیں۔ انہوں نے رقص کے مختلف انداز اپنائے اور داد وصول کی۔ بعدازاں چالیس کی چالیس لڑکیاں اکٹھی نمودار ہوئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے انداز سے رقص کیا۔ پھر وہ اسٹیج سے اتر کر وسیع ہال میں پھیل گئیں۔ انہوں نے حاضرین کے درمیان پرفارمنس دی۔ آخر یہ طویل کارروائی ختم ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد ان لڑکیوں میں سے سات رنگوں کی سات پریاں چن لی گئیں۔ یہ سات لڑکیاں تالیوں کی گونج اور پھولوں کی بارش میں چبوترے پر آ گئیں۔ انہوں نے باری باری حکم اور اس کی تینوں بیویوں کے چرن چھوئے۔ تب وہ حکم، جارج، اسٹیل اور دیگر حکام کے قدموں میں فرش پر بیٹھیں اور تصویریں بنوائیں۔

اس اہم مرحلے کے بعد شراب نوشی کا دور شروع ہوا۔ ساتوں پریاں حکم اور اس کے مصاحبین و بیگمات کے لیے ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ پھر کھانے کا دور شروع ہوا۔ اس پُرشکوہ و شان دار شاہی ضیافت کے بعد حاضرین ہاتھوں میں قہوے کی پیالیاں اور جام وغیرہ لیے پھر سے اپنی نشستوں پر آ بیٹھے۔ ایک عجیب سی سرمستی نے ہر ذی نفس کو گھیرا ہوا تھا۔ اب زیادہ تر بیگمات یہاں سے جا چکی تھیں۔ مرد حضرات رہ گئے تھے یا وہ حسینائیں جو آج کے دن اپنے حسن و شباب کا سارا سرمایہ اپنے پرستاروں پر لٹانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ ان میں سے کچھ خود بھی ''شیری'' طرز کا مشروب پی رہی تھیں اور اپنے ساتھی مردوں کی بے باکی کو خوش دلی سے قبول کر رہی تھیں۔ ان میں مجھے جارج گورا اور اسٹیل وغیرہ بھی نظر آئے۔ جارج گورا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ایک مقامی حسینہ کو اپنی بغل میں لیے وہ اس نہایت مضبوط بلوری شوکیس کے پاس بیٹھا تھا، جس میں پگھلا ہوا سونا ہلکورے لیتا تھا اور لڑکی کی برہنہ مورتی اس میں ڈوبتی ابھرتی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ پرسوں کا انتظار نہ کروں۔ آج ہی سارے بندھن توڑ کر اس گورے عیاش پر جا پڑوں اور اسے اس پگھلے ہوئے سونے میں ایک مکمل غوطہ دے دوں۔

لیکن میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ میں صرف سوچ سکتا ہوں۔ عمران بھی اسی نیم تاریک گیلری میں میڈم صفورا کے سیکیورٹی گارڈ کی حیثیت سے موجود تھا۔ میری اور اس کی نظر گاہے بگاہے ملتی تھی۔ اچانک عمران مجھے چونکا ہوا نظر آیا۔ میں نے دیکھا، وسیع و عریض حال میں ایک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ایک شخص نے رم کی ایک خالی بوتل کے اوپر لکڑی کا ایک مستطیل ٹکڑا رکھا اور اس پر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے لکڑی کے ٹکڑے پر ایک اور خالی بوتل رکھی اور اس پر لکڑی کا ٹکڑا رکھنے کے بعد اس پر بھی اپنا توازن برقرار رکیا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر اسے داد دی۔ اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا مگر چوتھی بوتل پر کھڑا ہونے کی کوشش میں وہ گر گیا اور بوتلیں لڑھک گئیں۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے میڈم سے پوچھا۔

''یہاں کا بہت پرانا کھیل۔ رم کی خالی بوتلوں کو اوپر نیچے رکھ کر ان پر کھڑا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے، ایک جشن کے موقع پر رتنا دیوی نے ترنگ میں آ کر یہ آفر کر دی تھی کہ جو شخص اس طرح آٹھ بوتلوں کے اوپر کھڑا ہو جائے گا وہ اسے شاہی اصطبل کے

بہترین آٹھ گھوڑے انعام میں دے لی۔ اس کے علاوہ وہ طلائی زیورات کا بھی حق دار ہوگا۔''

''کون سے زیورات؟'' میں نے پوچھا۔

''رتنا دیوی کی جیولری۔ یعنی وہ جیولری جو ان کی ملکیت ہے۔ حکم جی کی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیوی ہونے کی حیثیت سے رتنا دیوی کے پاس سب سے زیادہ جیولری ہے۔ تقریباً تین باکس بھرے ہوئے ہیں جن کے کل وزن کا شاید رتنا دیوی کو بھی نہیں پتا۔ رتنا دیوی نے کہا ہوا ہے کہ جو اس شرط کو پورا کرے گا، وہ جیولری باکس میں سے دو مٹھی بھر کر زیورات لے سکتا ہے۔ اب اس کی قسمت کہ اس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے۔ دو مٹھیوں میں کچھ نہیں تو لاکھوں کے زیورات تو آ ہی سکتے ہیں۔ یہ جڑاؤ زیورات معمولی قیمت کے تو نہیں ہوں گے۔''

''عجیب بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''ان راجوں مہاراجوں کی تفریحات اسی طرح کی ہوتی ہیں۔ دینے پر آئیں تو بے وجہ لاکھوں کروڑوں لٹا دیں، نہ دیں تو پھوٹی کوڑی کے بدلے جان لے لیں۔ اب پچھلے تین چار سال سے شغل بنا ہوا ہے کہ کھانے کے بعد جب لوگ گپ شپ کے لیے بیٹھتے ہیں تو یہ کھیل شروع کر دیتے ہیں۔ اچھا، وہ دیکھو... آج وہ بھی قسمت آزمانے آئی ہے۔''

''کون؟''

''وہی مس انڈیا... وہ دیکھو لنگی ٹانگیں چلاتی آ رہی ہے۔'' میڈم صفورا نے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہاں، یہ وہی سولہ سترہ سالہ تیز طرار لڑکی تھی جس نے لال بھون میں ریہرسل کے دوران میں جمناسٹک کا شان دار مظاہرہ کیا تھا۔ بعدازاں اس نے عمران سے بحثا بحثی شروع کر دی تھی۔ اس تکرار کا انجام یہ ہوا تھا کہ عمران نے اس لٹل مس انڈیا سے مقابلہ کیا تھا اور بعدازاں جان بوجھ کر ہار گیا تھا۔ اس ہار کے اندر جو جیت چھپی ہوئی تھی، اس کا پتا ہمیں بعد میں چلا تھا۔

آج یہ لٹل مس انڈیا پھر میدان میں تھی۔ کھیل تماشوں میں حصہ لینے والے دو اور نوجوانوں نے آٹھ بوتلوں والی شرط پوری کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک نوجوان باقاعدہ ''جگر'' تھا۔ وہ بھی پانچویں بوتل کے بعد توازن برقرار نہ رکھ سکا اور قہقہوں کے درمیان قالین پر گر گیا۔ گرنے والوں کو ہلکی پھلکی خراشیں بھی آ رہی تھیں۔ تاہم موج مستی کے اس ماحول میں چھوٹی موٹی چوٹوں کی پروا نہیں کی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لٹل مس انڈیا کی باری آ گئی۔ وہ زیادہ بااعتماد نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کھیل اس کی ٹریننگ کا حصہ نہیں تھا۔ بہرحال انعام کے لالچ میں وہ قسمت آزمائی کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط اور بڑے دھیان سے کھیل کا آغاز کیا۔

وہ رم کی بوتل رکھتی پھر اس پر لکڑی کا مستطیل ٹکڑا رکھتی اور کھڑی ہو جاتی۔ بہتر توازن حاصل کرنے کے بعد وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی۔ معاون لڑکی رم کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھماتی۔ لٹل مس انڈیا بوتل کو بڑے دھیان سے لکڑی کے ٹکڑے پر جماتی۔ جس مستطیل ٹکڑے پر وہ کھڑی ہوتی تھی، وہ شمالاً جنوباً ہوتا تو وہ اوپر والا ٹکڑا شرقاً غرباً رکھتی تاکہ نچلے والے ٹکڑے پر پاؤں جمے رہیں۔

اسی طریقے سے وہ ساتویں بوتل تک پہنچ گئی۔ حاضرین نے سانسیں روک لیں۔ میڈم نے کہا۔ ''یہ ہائیسٹ اسکور ہے بھئی... اگر...''

ابھی میڈم کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ بوتلوں کا مینار ٹوٹا اور وہ دھڑام سے نیچے گری۔ کچھ قہقہے ابھرے لیکن زیادہ تر لوگوں نے تالیاں بجا کر لڑکی کی ہمت کو داد دی۔ حکم جی کے پہلو میں بیٹھی رتنا دیوی نے لڑکی کو اپنے پاس بلایا اور اس کی انتھک کوشش کے لیے اسے کوئی تحفہ دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ اور ادب سے جھک کر قبول کیا۔

میں نے کہا۔ ''میڈم! یہ کھلا مقابلہ ہے نا؟ میرا مطلب ہے ہر کوئی حصہ لے سکتا ہے؟''

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! ایک مزے کی بات بتاؤں آپ کو۔ آپ عمران کو کہیں کہ وہ یہ کھیل کھیلے۔''

میڈم چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ وہ میری بات کو وزن دے رہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ عمران ایک پروفیشنل فن کار ہے... بلکہ شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ لاہور میں اسٹار سرکس کے شوز کے دوران میں کبھی کبھی خاص شوز بھی ہوتے تھے جن کو خاص لوگ دیکھتے تھے اور نڈر فن کار اس میں نہایت خطرناک ''پرفارمنسز'' دیتے تھے۔ تو جو شخص پنڈال کی خطرناک بلندی پر بغیر کسی حفاظتی انتظام کے شان دار مہارتوں کا مظاہرہ کرتا تھا، وہ یہ رم کی خالی بوتلوں والا کھیل بھی کھیل سکتا تھا۔

میں نے عمران کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ میڈم صفورا اس سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ عمران کے چہرے پر ہلکا پھلکا تاثر تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ وہ یہ کام کر

لے گا۔

چند منٹ بعد میڈم صفورا گیلری سے نکل کر نیچے ہال میں پہنچی۔ منیجر مدن بھی اس کے ساتھ تھا۔ منیجر مدن نے ادب سے جھک کر رتنا دیوی سے کچھ کہا۔ رتنا دیوی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا... پھر میڈم صفورا کی طرف دیکھ کر بھی سر کو اثباتی حرکت دی۔

کچھ ہی دیر بعد عمران وسیع وعریض ہال میں حاضرین کی توجہ کا مرکز تھا۔ اس کے جسم پر سیکیورٹی گارڈز والا مخصوص لباس تھا... تاہم بہتر کارکردگی کے لیے اس نے اپنے جوتے اور موزے اتار لیے تھے۔ اب یہاں کافی لوگ عمران کو پہچاننے لگے تھے۔ عمران کی پہچان دراصل صرف ڈیڑھ دن پہلے راج بھون کے بھرے پُرے دربار میں ہوئی تھی جب عمران نے حکم کے سوالوں کے مدلل جواب دیے تھے اور ثابت کیا تھا کہ انتہا پسندی اور کٹرپن کا الزام صرف مسلمانوں پر لگانا کسی طور درست نہیں۔ اس کی باتوں نے جہاں کھوسٹ بڑھیا کی بولتی بند کی تھی، وہاں حکم کے مصاحبین کو بھی کچھ دیر کے لیے سانپ سونگھ گیا تھا۔

آج عمران ان معززین کے سامنے ایک دوسری طرح کے چیلنج کے لیے موجود تھا۔ چار بوتلوں تک تو عمران بہ آسانی پہنچ گیا۔ پانچویں اور چھٹی بوتل پر اسے دقت ہوئی۔ ساتویں بوتل کی باری آئی تو وسیع ہال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ اس سنسنی خیز خاموشی میں بس فواروں اور آبشاروں میں حرکت کرتے پانی کی آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ سازندوں نے بھی اپنے ہاتھ روک لیے تھے اور ان کی نگاہیں تماشے پر جمی تھیں۔ ''کیا وہ کر لے گا؟'' میڈم نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''مجھے یقین ہے۔'' میں نے کہا۔

ہاں، مجھے یقین تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ اور اس کی شخصیت میں کرامات ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ اس نے ساتویں بوتل پر لکڑی کا مستطیل ٹکڑا رکھنے کے بعد اس پر اپنے پاؤں جمائے اور مکمل توازن حاصل کیا تو سازندوں نے سازوں کو زور سے چھیڑا اور وسیع وعریض ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اب عمران کو آخری بوتل پر چڑھنا تھا۔ وہ زمین سے تقریباً آٹھ فٹ بلند ہو چکا تھا۔

آخری مرحلہ شروع اور ختم ہونے میں قریباً پانچ منٹ لگے۔ دھڑکنیں تھم گئی تھیں اور نگاہیں جامد ہو گئی تھیں۔ خواتین نے ہاتھ سینوں پر رکھے ہوئے تھے۔ عمران نے وہ کر دکھایا جس کی میں اس سے توقع کر رہا تھا۔ جب وہ آٹھویں بوتل پر کھڑا ہوا اور اس نے فاتحانہ انداز میں اپنے دونوں بازو دونوں طرف پھیلائے تو مس انڈیا اور اس کے ساتھیوں کے چہرے دیکھنے کے قابل تھے۔ چند روز پہلے کی چھوٹی سی فتح کا خمار، زبردست کھسیانے پن میں بدل چکا تھا۔ ان لوگوں نے خود ہی اسے مس انڈیا اور مسٹر پاکستان کے مقابلے کا نام دیا تھا۔ اب یہ ''نام'' اس کے لیے اضافی ہزیمت کا باعث تھا۔

عمران نے اس پر بس نہیں کیا۔ اس نے اپنی جیت کو مزید واضح اور مستحکم کرنے کے لیے ایک اور بوتل طلب کی۔ ہال تالیوں سے گونجا۔ مختصر لباس والی معاون لڑکی نے ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر بوتل اور لکڑی کا ٹکڑا عمران کو تھمایا... عمران نے بے پناہ داد کے شور میں یہ آخری STEP بھی کر دکھایا...

☆☆☆

یہ نئے دن کی صبح تھی۔ گیارہ بج چکے تھے... لیکن راج بھون میں بیشتر لوگ سوئے پڑے تھے۔ ساتویں کا جشن کل رات آخری پہر تک جاری رہا تھا۔ اس کے اختتام پر شراب پانی کی طرح استعمال ہوئی۔ رقص وموسیقی نے ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کیا اور آخر بدمست جوڑے خلوت گاہوں میں جا گھسے۔ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر لگتا یہی تھا کہ وہ تمام تینتیس لڑکیاں بھی ان خلوت گاہوں کا حصہ بنی ہیں جنہوں نے پریوں کے انتخاب میں حصہ تو لیا تھا مگر چنی نہیں جا سکی تھیں۔ ان لڑکیوں نے کل رات راج بھون کے اعلیٰ ترین افراد کی تنہائیوں کو رنگین کیا تھا۔ انہیں چند دن یہیں رہنا تھا۔ پھر تحائف سے لد پھند کر گھروں کو لوٹ جانا تھا۔ یہ سب کچھ یہاں معمول کے مطابق تھا۔ گیتا لکھی نے بتایا تھا کہ ایسی لڑکیوں کی بعدازاں باقاعدہ شادیاں ہوتی ہیں اور وہ نارمل زندگی گزارتی ہیں۔ راج بھون میں گزری ہوئی دو چار راتوں کے لیے انہیں کبھی مطعون نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے تو ذمے دار شخص حکم کے عتاب کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ پریوں کو یہاں ایک خاص الخاص درجہ حاصل ہو جاتا تھا۔ وہ مستقل طور پر راج بھون کے ساتھ منسلک ہو جاتی تھیں۔ شروع شروع میں یہ سات پریاں پاکیزگی اور تقدس کا نشان ہوتی تھیں مگر گزرتے زمانے کے ساتھ ساتھ روایتیں تبدیل ہوئی تھیں۔ اور اب یہ پریاں چند ماہ، بلکہ ہفتوں کے اندر ہی اعلیٰ سطح پر ''رکھیلوں'' کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ حرص وہوس نے اپنی بقا کے راستے ڈھونڈ لیے تھے۔

غالباً دھرم کے ٹھیکیداروں نے ہی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے اس رسم میں کچھ ایسی شقیں ڈھونڈ نکالی تھیں جن کی رُو سے حکم اور اس کے نہایت قریبی ساتھی ان پریوں سے جسمانی ربط قائم کر سکتے تھے۔ اس کی ایک مثال باروندا جیکی کی محبوبہ شکنتلا تھی جسے پتنی بنانے میں ناکام ہو جانے پر حکم نے اسے پری کا درجہ دیا اور اپنے حرم میں شامل کیا۔

میں اور عمران ابھی تک راج بھون میں ہی تھے۔ دوپہر کے بعد خمار زدہ لوگوں نے جاگنا اور چلنا پھرنا شروع کیا۔ سہ پہر کے وقت میڈم صفورا کے ذریعے عمران کو رتنا دیوی کا بلاوا آیا۔ یقیناً یہ بلاوا اسے وعدے کے مطابق انعام سے نوازنے کے لیے تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے میں بھی میڈم صفورا، منیجر مدن اور عمران وغیرہ کے ساتھ شاہی اصطبل میں چلا گیا۔ میری وجہ سے درجن بھر مسلح گارڈز کو بھی میرے ساتھ حرکت کرنا پڑی۔ ہم شان دار اصطبل میں پہنچے۔ یہاں بیش قیمت گھوڑے گھوڑیوں اور ان کے بچوں کی طویل قطاریں موجود تھیں۔ طویل اصطبل کے ایک حصے میں پارٹیشن کر کے اسے گیراج کی حیثیت دی گئی تھی اور یہاں شاہی استعمال کی چند گاڑیاں موجود تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد رتنا دیوی اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں آن موجود ہوئی۔ اس نے عمران کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اپنے گارڈ سے کہو کہ یہ بلا جھجک اپنی پسند کے آٹھ بہترین گھوڑے یہاں سے چن لے۔ ہم اس سے بہت خوش ہیں۔ بے شک ہمیں یہ جانکاری بھی ہوئی ہے کہ یہ شخص شوقیہ کھلاڑی نہیں تھا۔ یہ کسی سرکس میں کام کرتا رہا ہے اور جسمانی کمالات دکھاتا رہا ہے۔ لیکن ہمیں پتا ہے کہ پچھلے تین چار سالوں میں اس شرط کو پورا کرنے کے لیے کھلاڑی لوگ بھی آتے رہے ہیں۔ جیسے کل رات وہ مس انڈیا نام کی لڑکی آئی تھی مگر اس کے سوا کوئی بھی سپھل (کامیاب) نہیں ہوا ہے۔ ہم اس کو انعام دیتے ہوئے من سے خوش ہیں۔ یہ گھوڑے چن سکتا ہے اور یہ رہا اس کا دوسرا انعام۔'' رتنا دیوی نے ایک خادمہ کو اشارہ کیا اور اس نے ایک مخملی پوٹلی عمران کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا ہے رانی؟'' عمران نے ادب سے پوچھا۔

''طلائی زیور... تمہاری دو مٹھیاں کتنی بھی بڑی ہوتیں یہ ان سے زیادہ ہی ہے۔'' رتنا نے جواب دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ یہ زیادہ زیور تھا۔

عمران نے پوٹلی لے تو لی مگر اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اسے لینا نہیں چاہتا۔ عمران کی اکثر باتیں سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی تھیں۔ رتنا دیوی نے ایک بار پھر عمران سے کہا کہ وہ اپنی مرضی کے آٹھ گھوڑے شاہی اصطبل میں سے چن لے۔

عمران نے میڈم صفورا کی طرف دیکھا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''رانی صاحبہ! میں آپ کی ان نوازشوں کے قابل نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ بہت مہنگے گھوڑے ہیں... لیکن میں انہیں کہاں رکھوں گا اور سچ یہ ہے کہ مجھے گھڑسواری کا شوق بھی نہیں ہے۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں چاہوں گا کہ یہ گھوڑے شاہی اصطبل میں ہی رہیں اور ان لوگوں کے استعمال میں آئیں جو ان کو برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔''

رتنا دیوی سمیت کئی افراد نے عمران کو حیرت کی نظروں سے دیکھا۔ وہ عجب سیر چشمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ رتنا دیوی نے کہا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم نے جو وچن دے رکھا ہے اسے پورا کریں گے۔ اگر تم گھوڑے لینا نہیں چاہتے ہو تو اس کی قیمت لے لو۔ یہاں کوئی بھی گھوڑا، ایک لاکھ سے کم قیمت کا نہیں ہے۔ یہ کافی بڑی رقم بن جاوے گی۔''

''لیکن رانی صاحبہ! میں یہ رقم لینا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ نہیں چاہیے۔ میرے لیے آپ کی توجہ اور مہربانی ہی بڑا انعام ہے۔ میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے مجھے کسی قابل جانا اور میری ستائش کی۔ میں بصد احترام اور خوشی یہ زیورات بھی واپس کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس قابل نہیں ہوں جی کہ ان کا بوجھ اٹھا سکوں۔ آپ کے قدموں میں نچھاور ہو جائے، میرے لیے یہی بڑی بات ہے۔'' عمران کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

وہ زبردست اداکار تھا۔ بظاہر سادہ مگر اندر سے پیچیدہ۔

رتنا دیوی کا تنا ہوا چہرہ قدرے نرم پڑ گیا۔ وہ میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''صفورا! تمہارا یہ سیکیورٹی گارڈ تماشے کی چیز ہے۔ جو کچھ اسے مل رہا ہے، اس سے اس کے اگلے دس بیس سال بڑے آرام سے گزر سکتے ہیں لیکن یہ لینے سے انکار کرت ہے۔''

''جی رتنا دیوی! یہ ایسا ہی ہے۔ بس اپنے آپ میں خوش اور مست رہنے والا۔''

رتنا دیوی نے بھرپور نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ بےساختہ مسکرانے لگی۔ مسکراتے ہوئے اس کے جبڑے کا تھوڑا سا ٹیڑھا پن ظاہر ہوتا تھا۔ یہ دراصل اس پرانے حادثے کی نشانی تھا جب سلطانہ اور رتنا کا جھگڑا ہوا تھا۔ شاہی پن گھٹ کی سیڑھیوں پر رتنا شاید اپنے ہی زور میں گری

تھی اوراس کا جبڑا ابل گیا تھا۔ اس معمولی سے نقص کے سوا رتنا دیوی ایک نہایت پُرکشش عورت تھی۔

اس نے عمران کا نام پوچھا اور پھر اسے نام سے مخاطب کر کے بولی۔ ''تمہیں کچھ نہ کچھ تو لینا پڑے گا۔ ورنہ ہمیں نراشا ہوگی۔''

عمران نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ''محترمہ رانی صاحبہ! یہاں کوئی بھی ایسی چیز نہیں کہ میں خود کو جس کے قابل سمجھ سکوں۔''

''تم نراش کر رہے ہو۔'' رتنا دیوی کے ماتھے پر ہلکی سی سلوٹ نظر آئی۔

عمران نے گیراج کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''پاکستان میں کچھ عرصہ میں نے گاڑیوں کا کام کیا ہے جی۔ مجھے اچھی گاڑیوں کا شوق ہے اور ڈرائیونگ بھی اچھی کر لیتا ہوں۔۔۔ اگر آپ کا اصرار ہے تو مجھے ان گاڑیوں میں سے کوئی عنایت کر دیجیے۔''

رتنا دیوی بولی۔ ''تو پھر تم خود چن لو۔۔۔ وہ تمہارے سامنے کھڑی ہیں۔''

عمران گاڑیوں کے پاس گیا۔ کچھ دیر گھوم پھر کر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک فور وہیل ڈرائیو، چھوٹی جیپ کا انتخاب کیا۔ یہ اسپیشل ماڈل کی شان دار جرمن گاڑی تھی۔ حالت بھی اچھی تھی۔ رتنا دیوی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تردد نظر آیا۔ شاید یہ اس کی پسندیدہ گاڑی تھی۔ ویسے بھی اس بھانڈیلی اسٹیٹ میں گنتی کی گاڑیاں ہی تھیں اور ان میں سے اکثر فاضل پرزوں کی عدم دستیابی کے سبب کھڑی رہتی تھیں۔ ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد رتنا دیوی کے چہرے سے تردد کے آثار اوجھل ہو گئے۔ یقیناً اس نے حساب کتاب لگایا تھا۔ جو کچھ عمران اپنی منشا سے چھوڑ رہا تھا، وہ اس جیپ کی قیمت سے، کہیں تو بیس پچیس گنا زیادہ تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بس یا کچھ اور؟''

''بس رانی صاحبہ۔''

''ٹھیک ہے، یہ تمہاری ہوئی۔'' رتنا دیوی نے کہا۔

میں نے عمران کی دلکش آنکھوں میں دیکھا۔ ان میں ایک چمک سی تھی۔

☆☆☆

سنسنی خیز گھڑیاں قریب پہنچ رہی تھیں۔ پورے زرگاں میں اس مقابلے کی دھوم تھی جو کہ میرے اور جارج گہورا کے درمیان ہونا تھا۔ وہ شکتی دیوتا تھا۔ وہ شکست کھانا نہیں جانتا تھا اور میں اسے شکست دینے کا اعلان کر چکا تھا۔

اس شام ہم لال بھون میں واپس آ گئے۔ ہم ''جم'' میں پہنچے اور تقریباً تین گھنٹے تک اندھا دھند پریکٹس کی۔ یہ درد اور برداشت کا مقابلہ تھا۔ عمران بیٹھ گیا مگر میں لگا رہا۔ آخر میں بھی تھک کر چور ہوا اور گدے پر گر گیا۔ عمران نے مجھے پانی پلایا اور پھر کیلوں کا ایک گچھا لے آیا۔ اس نے ایک کیلا چھیل کر بڑی محبت سے میری طرف بڑھایا۔ ''لو، منہ میٹھا کرو اور اس میں توانائی بھی بہت ہوتی ہے۔''

''منہ میٹھا کس خوشی میں؟'' میں نے پوچھا۔

''میری ترقی کی خوشی میں۔ سہ پہر کو رتنا دیوی کی ہدایت پر میڈم صفورا نے مجھے سیکیورٹی گارڈ سے پروموشن دے کر اسسٹنٹ انچارج بنا ڈالا ہے۔''

''بھئی واہ۔ رتنا، میڈم نادیہ اور گیتا کھی جیسی عورتوں کو شیشے میں اتارنا تمہیں خوب آتا ہے۔''

''تم بھی تو کچھ کم نہیں ہو۔ تم نے بھی تو یہاں آ کر سلطانہ جیسی منہ زور لڑکی کو شیشے میں اتارا ہے۔''

سلطانہ کے ذکر نے ایک دم مجھے اداس کر دیا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''عمران! کل کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو تم کیا کرو گے؟''

''میں گانا گاؤں گا۔ ساتھی رے۔۔۔ تیرے بنا بھی کیا جینا۔۔۔ جب دودھ میں بس پانی رہ گیا تو دودھ کا کیا پینا۔۔۔ اس کے بعد میں گیتا کھی کی آخری خواہش پوری کر کے آتما ہتھیا کر لوں گا۔ ویسے خودکشی کے مقابلے میں آتما ہتھیا قدرے بہتر چیز ہے۔ اس میں دوسرے جنم کی امید تو رہتی ہے نا۔''

''گیتا کھی کی آخری خواہش؟ کیا مطلب؟''

''یار، وہ سونا چاہتی ہے میرے ساتھ۔ اور تمہیں پتا ہے کہ وہ سوئے گی ہرگز نہیں۔''

''میں بہت سنجیدہ ہوں عمران۔''

''تو پہلے بتانا تھا۔ میں نے سمجھا شاید کوئی لطیفہ سنا رہے ہو۔ دیکھو جگر! ہم وصیتوں وغیرہ کی باتیں تو تب کریں جب ہمیں ہارنا ہو۔ ہمیں ہارنا ہے ہی نہیں۔ بس جیتنا ہے۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ مڑ کر دیکھنے والے پتھر ہو جاتے ہیں اور ویسے بھی پیچھے کچھ نہیں۔ کل تم کشتیاں جلا کر میدان میں اترو گے اور جیت کر باہر نکلو گے۔''

''لیکن عمران! غیب کا علم تو قدرت کے سوا کسی کو نہیں۔ اور جب ہم غیب نہیں جانتے تو پھر ہمیں صرف ایک ہی رخ پر تو نہیں سوچنا چاہیے۔ کچھ پلاننگ تو ہونی چاہیے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اگر کل مجھے کچھ ہوگیا تو تم تین کام ضرور کرو گے۔ پہلا یہ کہ سلطانہ اور بالو کو سنبھالنا اور انہیں اسٹیٹ کے اندر یا باہر کسی محفوظ جگہ تک پہنچانا... دوسرا پاکستان جاکر فرح اور عاطف کا خیال رکھنا اور تیسرا...''

میں کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ آواز بیٹھ سی گئی۔

''ہاں... ہاں۔ اب بولنا شروع کیا ہے تو بول دو۔''

''ہو سکے تو ثروت کا کھوج لگانا۔ اور اگر کبھی اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہنا، میں نے اس سے بہت پیار کیا ہے... اور آخری سانس تک کیا ہے۔''

''یہ سب باتیں تم اس سے خود ہی کہو گے... اگر سلطانہ نے کہنے کی اجازت دی تو۔ باقی جگر! دلیپ کمار وغیرہ تو خوامخواہ مشہور ہوگئے ہیں۔ اگر تم فلموں میں روند و ہیرو کے روپ میں آجاؤ تو سب کی چھٹی کرا دو۔''

وہ ایسے ہی باتوں کو ہوا میں اڑا رہا تھا اور نہایت گمبھیر و کشیدہ ماحول کو بھی کسی دوسرے رخ پر دھکیل دیتا تھا۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ امکانات پر غور کرتے رہے اور آمدہ گھڑیوں کی حشر خیز چاپ سنتے رہے۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری کہانی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ لگتا ہے کہ میں سارے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔ ویسے مجھے ایک بات بتاؤ... مجھے ذرہ بھر بھی شک نہیں کہ جانوروں سے اپنے حیران کن تعلق کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا ہے حرف بہ حرف سچ ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ خصوصی تعلق ایک دم ختم کیسے ہوگیا؟ کیا اس میں تمہاری کوئی کوتاہی تھی یا اسے ہونا ہی تھا۔ اور پھر پروفیسر رچی صاحب کی پیشین گوئی کہ یہ خاص صلاحیت پھر سے تمہارے اندر آسکتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ زیادہ شدت سے آئے۔ کیا یہ سب درست ہے؟''

عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسے سچ سمجھوں۔ ہوسکتا ہے کہ جیسے اچانک ہی یہ سب کچھ میرے پاس سے چلا گیا، ایسے ہی واپس آجائے۔ اور ہوسکتا ہے نہ بھی آئے۔''

''کیا اب بھی تم جانوروں سے اسی طرح لگاؤ محسوس کرتے ہو؟''

''سچی بات یہ ہے جگر کہ زیادہ لگاؤ تو میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا۔ جو کچھ تھا، دوسری طرف سے ہی تھا جو اب نہیں ہے۔ ابھی دو تین دن پہلے ہی میں غلطی سے شیڈ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں بندھے ہوئے، منجبر مدتا سکے کتے نے مجھ پر جھپٹا مارا اور ٹانگ زخمی ہوتے ہوتے رہ گئی۔''

''اچھا اور ایک بات مجھے الجھن میں ڈال رہی ہے۔ تم اندر کی بات نہیں بتا رہے ہو۔ آج تم نے رتنا دیوی کی اتنی بڑی آفرز ٹھکرا کر وہ جیپ کیوں چنی ہے۔ کیا اس سے کوئی خاص کام لینا چاہ رہے ہو؟''

''یار! اب تم میرے سیدھے سادے کاموں میں بھی ''پلاننگ'' ڈھونڈنے لگتے ہو۔ بس وہ گاڑی مجھے اچھی لگی اور میں نے لے لی۔ دوسری طرف میں نے رتنا کی آفر کو ٹھکرا کر اس کی انا کو ٹھیس بھی پہنچائی۔ وہ آج جتنی بھی میٹھی بنی ہوئی تھی مگر ہے تو تمہاری اور سلطانہ کی دشمن نا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا، کل بھی تم پر کیسی قہر بھری نظر ڈالتی تھی خانہ خراب۔''

''اس گاڑی کا کیا کرو گے؟''

''کل تمہاری جیت کے بعد تمہیں اس میں بٹھاؤں گا اور فاتحانہ پورے زرگاں کا چکر لگاؤں گا...''

''اور اگر معاملہ الٹ ہوا تو؟''

''اب آگے بولو گے تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔'' اس نے گل دان اٹھا لیا۔

میں خاموش ہوگیا تو اس نے ایک کتاب اٹھا کر میری طرف بڑھائی۔ ''اس میں ٹائم لگاؤ، فائدہ ہوگا۔''

یہ وہی مخطوطہ یعنی ہاتھ سے لکھی ہوئی باتصویر کتاب تھی جو چند روز پہلے میڈم صفورا نے ہمیں دکھائی تھی۔ اس کا عنوان ''سو بیر اور سابیر'' تھا۔ آج میں نے میڈم سے فرمائش کر کے یہ کتاب منگوائی تھی اور کافی دیر تک اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اس سے کئی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ میں باقی ماندہ کتاب پر نگاہ دوڑانے لگا۔ ساتھ ساتھ ہم دونوں باتیں بھی کرتے جارہے تھے۔ ہم قریباً نصف شب تک اپنی آخری تیاریوں میں مصروف رہے... پھر فرش کے بستر پر پہلو بہ پہلو لیٹے اور سو گئے۔ کتنا حوصلہ بخش ساتھ تھا عمران کا۔

☆☆☆

راج بھون کے عظیم الشان محرابی دروازے کے سامنے، جہاں تک نظر جاتی تھی لوگوں کے سر دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایک اسٹیڈیم نما جگہ تھی۔ بیٹھنے کے لیے پختہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی مقابلے ہوچکے تھے لیکن آج کے مقابلے نے بے نظیر شہرت پائی تھی۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں ایسے پوسٹرز اور بینرز نظر آرہے تھے جن پر جارج گورا کی تصویر تھی اور اسے شکتی دیوتا کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے اور ہزاروں کی

تعداد میں رنگ برنگی پگڑیاں لہرا رہے تھے۔ میدان کے بیچوں بیچ لڑائی کا اکھاڑا تھا۔ اس کی چاروں طرف آہنی جنگلا تھا جس میں بس ایک داخلی دروازہ تھا۔ وسیع گول اکھاڑا قریباً بیس میٹر قطر کا ہوگا۔ اس اکھاڑے کے درمیانی حصے کو لکڑی کے ایک گول سائبان کے ذریعے ڈھانپا گیا تھا۔ سائبان کم و بیش بارہ فٹ اونچا تھا۔ اکھاڑے سے باہر حکم اور شاہی خاندان کے افراد کے بیٹھنے کے لیے ایک شان دار گیلری تھی۔ یہاں نہایت شان دار نشستیں تھیں اور سردی سے بچانے کے لیے انگیٹھیاں وغیرہ دہکائی گئی تھیں۔ بالکونی نما گیلری کی دائیں جانب وہ منحوس سولی کٹہری تھی جس کا نظارہ میں نے اور عمران نے چند دن قبل کیا تھا۔ میرے دیرینہ ساتھی اسحاق کو یہاں بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی آخری دردناک آوازیں ابھی تک میرے کانوں میں زہر گھولتی تھیں۔ دائیں جانب ایک چھوٹا سا احاطہ اور بھی تھا۔ اسے بھی آہنی جنگلے اور خاردار تاروں سے محفوظ کیا گیا تھا۔ یہ جگہ بھی خاص لوگوں کے بیٹھنے کے لیے تھی۔ یہاں شامیانے وغیرہ تنے ہوئے تھے۔

''بڑے خونی مقابلے'' سے پہلے یہاں تین چار چھوٹے مقابلے بھی ہونے تھے۔ ان سارے مقابلوں میں حصہ لینے والے افراد ایک چھوٹے سے احاطے میں موجود تھے اور خود کو وارم اپ کررہے تھے۔ شاہی مہمانوں کی گیلری کے ساتھ ہی میں ایک پختہ کمرے میں موجود تھا۔ میرے ارد گرد گارڈز کا سخت پہرا تھا۔ سخت سردی کے باوجود میرے جسم پر فقط ایک کالر والی شرٹ اور پتلون تھی۔ بے شمار لوگ میری جھلک دیکھنے کے خواہش مند تھے تاہم سخت سیکیورٹی کے سبب نزدیک نہیں آسکتے تھے۔ جارج کہاں تھا، مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ عمران میرے ساتھ ہی تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ میڈم صفورا کا پاکستانی گارڈ (عمران) ٹریننگ میں میری معاونت کرتا رہا ہے۔ لہٰذا میرے ساتھ اس کی موجودگی پر کسی کو تعجب نہیں تھا۔ عمران کی موجودگی مجھے بے پناہ حوصلہ دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی مجھے دو تین تجربہ کار معاون فراہم کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک درمیانی عمر کا پارسی تھا۔ اس نے اکھاڑے کے اندر لڑائی کے دوران میں میری دیکھ بھال کرنا تھی۔

اب تک ہم نے جارج گورا کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، ان کے مطابق لڑائی میں جارج کا اہم ترین ہتھیار اس کی ''بدزبانی'' تھی۔ وہ اپنے حریف کو تاؤ دلاتا تھا اور غلطی کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ جوڈو کی ایک تکنیک

''نیک لاک'' اس کا پسندیدہ ترین داؤ تھا۔ اپنے بیشتر حریفوں کو اس نے اسی طرح پچھاڑا تھا کہ ان کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی تھی اور انہیں بے بس کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں جارج کے حریف کے پاس دو ہی راستے ہوتے تھے کہ وہ اپنی گردن تڑوا لے یا پھر ہار مان لے۔

عمران نے مجھ سے کہا تھا۔ ''جگرا جس طرح اپنے حریف کے خطرناک ہتھیار کا پتا ہونا چاہیے، اسی طرح اپنے بہترین ہتھیار کا بھی علم ہونا چاہیے۔ تمہیں پتا ہے تمہارا بہترین ہتھیار کیا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ''تمہاری برداشت، تمہاری درد سہنے کی گنجائش۔ تم نے مہینوں تک اپنی جان کو جس طرح رولا ہے، اس نے تمہارے اندر درد سہنے کی زبردست صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ تمہاری یہ صلاحیت تمہارے مدمقابل کو کسی بھی وقت دھوکا دے سکتی ہے۔ وہ جس وقت تمہیں تکلیف کے شکنجے میں سمجھ رہا ہوگا اور یہ سمجھ رہا ہوگا کہ تم مزید وار نہیں کر سکتے تم وار کرنے کی پوزیشن میں ہو گے اگر تم کسی ایسے موقع سے فائدہ اٹھا سکو تو... تمہارے لیے بہت اچھا رہے گا۔''

بات کرتے کرتے اس نے تیزی سے مکا چلایا۔ میں نے بے ساختہ ایک طرف جھک کر اس کا وار بچایا اور جوابی مکا مارا۔ یہ مکا عمران نے اپنی ہتھیلی پر روکا۔ ''ہاں، میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔'' وہ بولا۔ ''تمہارے دائیں مکے کی طاقت سے مجھے بڑی امیدیں ہیں، چند روز پہلے تم نے فصیل پر جس طرح پہرے دار کی کھوپڑی توڑی تھی... ایسے ہی ایک بدبودار ناریل ادھر بھی توڑ ڈالو تو مزہ آ جائے۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی چھوٹے مقابلے شروع ہو چکے تھے۔ ایک مقابلہ زرہ بکتر جیسا لباس پہن کر کیا گیا اور اس میں چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں استعمال ہوئیں۔ ایک شخص کے زوردار وار سے اس کے حریف کا آہنی خود پچک گیا۔ منصف نے مقابلہ وہیں روک دیا اور زوردار وار کرنے والے کو فاتح قرار دیا۔

دوسرا مقابلہ خاصا یک طرفہ تھا۔ صرف تین چار منٹ میں ختم ہو گیا۔ جیتنے والے نے سر کی ایک زوردار ٹکر سے اپنے کمزور تر مقابل کو لمبا لٹا دیا۔ وہ نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے اٹھا کر باہر لے جانا پڑا۔ اس کے فوراً بعد تیسرے مقابلے کی شروعات ہو گئی۔

آخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کا انتظار بے پناہ شدت سے کیا جا رہا تھا۔ جس کے لیے لوگوں کا چین سکون حرام ہوا تھا۔ وہ مقابلہ جس پر بیش بہا شرطیں لگ چکی تھیں اور جس کے نتیجے کے بارے میں ہزار ہا قیاس آرائیاں فضاؤں میں تیر رہی تھیں۔ رنجیت پانڈے جیسے ''ارجن'' کو چند منٹ میں پسپا کر دینے والا شخص... شکتی دیوتا کے مدمقابل تھا۔

عمران جیسا ''لکی'' شخص میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بدترین رسک لیتا تھا اور کامیاب ہوتا تھا۔ خطرات اس سے آنکھیں چرا کر گزرتے تھے... اور ''بازیاں'' اس کے حق میں پلٹنے کو تیار رہتی تھیں۔ اکھاڑے میں داخل ہوتے وقت ایک بار پھر میرے ذہن میں آیا... کہیں عمران کے ہوتے ہوئے میں جارج کے مقابل جانے میں غلطی تو نہیں کر رہا۔ لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو رد کیا۔ عمران کی ساری آشیرباد میرے ساتھ تھی۔ وہ اپنی بہترین تمناؤں کے ساتھ مجھے اکھاڑے میں داخل کر رہا تھا۔ میں اس سے بغل گیر ہوا۔ میں نے اس کا شانہ چوما۔ اس نے میرا اور پھر میں اکھاڑے میں آ گیا۔

ہوا خنک تھی۔ میں اور جارج گورا آمنے سامنے تھے۔ اس نے پتلون اور بغیر آستین کی بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کا فولادی جسم ڈھلتے سورج کی کرنوں میں دمک رہا تھا۔ میں پاؤں سے ننگا تھا جبکہ جارج نے جوگرز پہن رکھے تھے۔ ہماری بائیں جانب لوہے کی ایک مستطیل میز تھی۔ اس پر تین تیز دھار آلے رکھے تھے۔ چھوٹے دستے کی دو کلہاڑیاں، دو رام پوری چاقو اور دو چھوٹی تلواریں یعنی کٹاریاں۔ ہم ان میں سے کوئی سے بھی ایک جیسے دو ہتھیار چن سکتے تھے۔

دو فربہ اندام شخص میدان میں آ گئے۔ ان میں سے ایک نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس میں چند کاغذ تھے۔ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج بھی عقب میں موجود تھا۔

''ان کاغذوں پر تمہارے دستخط ہوں گے۔'' عینک والے نے فائل میرے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

میں نے سرسری نظر ڈالی۔ اردو میں وہی تحریر لکھی گئی تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ یعنی یہ ساہیر مقابلہ میری مرضی و رضامندی سے ہو رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لڑائی ہم دونوں حریفوں میں سے کسی ایک کی موت تک جاری رہے گی... میری موت کی صورت میں میرے وارثوں کو کسی طرح کا کوئی دعویٰ نہیں ہوگا... اور یہ کہ میں اپنی تحریری یا زبانی وصیت کر چکا ہوں اور مجھے اس حوالے سے مزید کچھ نہیں کہنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بلاتردد ان کاغذوں پر دستخط کر دیے۔ جارج گورا نے فقرہ کسا۔ ''اس پر یہ نوٹ بھی لکھ دو کہ میرے بعد میری بیوی کو اجازت ہے کہ وہ شادی کیے بغیر جارج کے ساتھ رہ سکے۔''

میرے بدن میں انگارے دہک گئے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ تو شروعات ہے۔ مجھے آخر تک اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنا ہے۔

میرے بعد جارج گورا نے کاغذات پر دستخط کیے۔ اب بے پناہ شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ یہ امر میری حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ اس ٹھاٹھیں مارتے ہجوم میں میرے حمایتی بھی کم نہیں ہیں۔ جارج نے اپنی زہریلی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اب ان ہتھیاروں کی طرف آؤ اور دیکھو کہ تم کس ہتھیار سے مرنا پسند کرو گے۔''

سرجن اسمتھ نے مجھے بتا رکھا تھا کہ جارج مجھے ہتھیار چننے کی پیشکش کرے گا۔ یہ ایک طرح سے زبردست نفسیاتی حربہ بھی تھا۔ غالباً اس طرح وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ لڑائی کے ہر طریقے پر عبور رکھتا ہے۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے رام پوری چاقو اٹھا لیا۔ یہ مضبوط دستے کا وزنی چاقو تھا۔ اس کی دھار اور لو دونوں شان دار تھے۔ درمیان میں خم سا تھا۔

''گڈ چوائس۔'' جارج نے کہا۔ پھر انگلش میں ہی بولا۔ ''لگتا ہے، یہ لڑائی زیادہ دیر نہیں چلے گی۔'' اس کے بعد اس نے بھی چاقو اٹھا لیا۔

ایک ہٹا کٹا معاون آگے بڑھا اور آہنی میز اوزاروں سمیت اٹھا کر میدان سے باہر لے گیا۔ منصف کے فرائض انجام دینے والے سفید فام شخص نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر ہم دونوں کا لباس چیک کیا اور آخری ہدایات دینے کے بعد ہمارے درمیان سے ہٹ گیا۔ یہ آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی۔ اب میں اور جارج گورا آمنے سامنے تھے۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ہزاروں تماشائیوں کے ساتھ ساتھ جیسے نیلگوں آسمان بھی تماشائی تھا۔ یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لیے ہوا بھی ساکن ہو گئی ہے اور ڈھلتا ہوا سورج بھی اپنی حرکت بھول کر اس منظر میں کھو گیا ہے۔

ہم ایک دوسرے پر گہری نظر رکھے نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرتے رہے۔ جارج نے زہر افشانی کی۔ ''تمہارا باپ ضرور ہوں لیکن اس وقت مجھے اپنی والدہ کا شوہر نہ سمجھو... بس حریف سمجھو حملہ کرو۔''

ایک بار پھر تن بدن میں آگ بھڑکی لیکن میں نے خود کو ٹھنڈا رکھا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے ایک مناسب موقع نظر آیا۔ جارج گورے کا ایک پاؤں ہوا میں تھا۔ دوسرے پر ابھی پورا وزن نہیں پڑا تھا۔ میں نے جھپٹ کر وار کیا۔ جارج نے خود کو بچانے کی بڑی کوشش کی۔ میرا چاقو اس کے پیٹ میں لگا۔ چاقو کی نوک نے اس کے جسم پر ایک سرخ لکیر سی کھینچ دی۔ لیکن یہ معمولی نقصان تھا۔ لکیر گہری نہیں تھی۔ اس حملے کے جواب میں جارج گورا مغلظات بکتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے چاقو کے کم از کم چھ وار کیے۔ ان میں سے ایک وار نے میرے کندھے پر کھرونچ ڈالی۔ باقی وار میں نے کامیابی سے بچائے۔ اسی دوران میں میرا داؤ چل گیا۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے۔ ایک بھرپور لات گورا کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ مجھے اٹھنے کا موقع ملا اور میں پھر بازو کھول کر اس کے سامنے آ گیا۔

میرے دوبارہ کھڑے ہو جانے پر میرے خیرخواہوں نے شور بلند کیا اور جوش کے عالم میں پگڑیاں ہوا میں لہرائیں۔ جارج آگے کو جھکا ہوا تھا۔ ماہر چاقو زنوں کے انداز میں وہ چاقو کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر رہا تھا۔ اچانک وہ ہوا جس کی توقع گورا کو ہرگز ہرگز نہیں تھی۔ شاید مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں یہ وار اتنی کامیابی سے کر سکوں گا۔ اس وار کے لیے بے حد پھرتی اور ٹائمنگ درکار تھی جو میرے اندر کی آگ نے مجھے فراہم کی۔ میں نے اپنی ٹانگ چلائی۔ جارج گورا کا چاقو اس وقت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جا رہا تھا۔ وہ کسی ہاتھ میں بھی نہیں تھا۔ میرے پاؤں کی ضرب نے اسے ہوا میں اچھالا اور وہ اڑتا ہوا سا اکھاڑے کے آخری کنارے تک چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ جارج سنبھلتا، میں نے زوردار حملہ کیا۔ رام پوری چاقو کی نوک گورا کے عین دل کے مقام پر لگتی مگر اس نے بروقت پینترا بدلا اور چاقو اس کے بازو میں پیوست ہوا۔ میں نے چاقو کھینچ کر دوسرا وار کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی گورا نے اس میدان نما اکھاڑے کے کنارے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ اپنے چاقو تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ نصف راستے میں تھا کہ میں نے جست لگا کر اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ تاہم اس کوشش میں چاقو میرے ہاتھ سے بھی نکل گیا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ لڑھکنیاں کھاتے ہوئے ہم پھر میدان کے وسط میں پہنچ گئے۔ دونوں چاقو ہماری پہنچ سے دور رہ گئے۔ میں جارج گورا کے منحوس بوجھ تلے دب گیا۔ جارج نے پھر زہر افشانی کی۔ ''اپنی چچی سے بس تھوڑا سا ہی زیادہ زور ہے تمہارے اندر۔''

میں نے اس کا جواب ایک بھرپور مکے سے دیا۔ یہ مکا

جارج کے جوڑے تھوبڑے پر لگا۔ چند لمحوں کے لیے وہ تیورا گیا۔ میں اس کے اوپر آ گیا اور یہیں پر مجھ سے وہ غلطی ہوئی جو نہیں ہونی چاہیے تھی۔۔۔ اور جس کے حوالے سے میں الرٹ بھی تھا۔ پتا نہیں یہ کیسے ہوا؟ اچانک میں نے اپنی گردن کو ایک آہنی شکنجے میں محسوس کیا۔ میں نے تڑپ کر نکلنا چاہا مگر دیر ہو چکی تھی۔ جارج مجھے اپنے بدنامِ زمانہ داؤ میں لے چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ میں اب یہاں سے زندہ نہیں نکلوں گا۔ میں نے دوبارہ بھرپور کوشش کی مگر گردن پر اس کے فولادی بازو کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ کوشش ناکام ہوئی۔ بے پناہ شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یقیناً یہ جارج گورا اور حکم کے حمایتی ہی تھے۔ میری نگاہ شاہی بالکونی میں گئی۔ وہاں بھی تماشائی جوش کے عالم میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں جارج کی بہن ماریا اور بہنوئی سرجن اسٹیل پیش پیش تھے۔ ان کے سرخ چہرے تمتما رہے تھے۔

اگلے تقریباً بیس منٹ کا وقت میری زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ میں موت و حیات کے درمیان لٹک گیا تھا۔۔۔ میں گردن چھڑانے کے لیے بس ایک خاص حد تک زور لگاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھتا تھا تو لگتا تھا کہ گردن ٹوٹ جائے گی اور ذہن تاریکیوں میں ڈوب جائے گا۔ میں نے ایک ہاتھ کی مٹھی میں جارج گورا کے سر کے بال جکڑ رکھے تھے اور دوسرا ہاتھ اس کے آہنی شکنجے میں اس طرح گھسا دیا تھا کہ وہ میری گردن پر ایک حد سے زیادہ دباؤ نہ ڈال سکے۔ یہ ایک طرح کا ڈیڈلاک بن گیا تھا۔ جارج اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ زور لگا کر میری گردن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکے۔ دوسری طرف میں بھی اس کے بازو کا شکنجہ کھولنے میں ناکام تھا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ اگر میں اندھا زور لگا کر گردن چھڑانے کی کوشش کرتا تو جارج کو اپنے بازو کے لیے اضافی توانائی مل جاتی اور وہ اس خونی ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔۔۔ یا پھر مجھے بے ہوش ہی کر دیتا۔

۔۔۔ وہ ناقابلِ فراموش گھڑیاں تھیں۔ میری سانس رک رہی تھی، آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا رہی تھی۔ لگتا تھا پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔۔۔ یہ درد سہنے کی خواہش تھی جو مجھے ابھی تک اپنے پاؤں پر برقرار رکھے ہوئے تھی اور یہ جاں گسل اذیتوں سے میرا ناتا ہی تھا جو مجھے مزاحمت کا حوصلہ دے رہا تھا۔ وہ مجھے میدان میں اِدھر اُدھر گھما رہا تھا اور جنونی لہجے میں بک رہا تھا۔ ''تمہاری بہن کا جسم بڑا کومل ہے۔ کیا ایسے جسم والی تمہاری کوئی اور قریبی رشتے دار بھی ہے؟''

اسی قسم کے زہریلے فقرے تھے جو وہ بار بار میرے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔

میں اسے دھکیلتا ہوا کئی قدم پیچھے لے جاتا تھا پھر آگے آتا تھا، پھر اپنے دائیں ہاتھ کو اس کے بالوں سے ہٹا کر اس کی جانگ تک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ بڑا عیار تھا۔ اس نے معقول انتظام کر رکھا تھا کہ میں اپنا ہاتھ اس کی ناف تک نہ پہنچا سکوں۔ جونہی میں اپنا ہاتھ نیچے لاتا، وہ اپنا آزاد ہاتھ میری بغل میں حائل کر دیتا اور یوں میری حرکت رک جاتی۔

میرے حمایتیوں کو چپ لگ چکی تھی۔ کان پھاڑ دینے والا شور جارج کے پرستاروں کا تھا۔ میری سانس ٹوٹنے لگی۔ جارج کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ مجھے یہ آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ ''۔۔۔ تم حاملہ بکری ہو۔ تمہاری گردن نرشیر کے پنجوں میں ہے۔ اگر تم اپنی گردن نکال لو تو میں ابھی سب لوگوں کے سامنے اپنے ہاتھ سے اپنی شہ رگ کاٹ لوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں کاٹ لوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے کسی قصاب کی طرح نیچے کو زور لگایا۔ میری پیشانی زمین سے جا لگی۔ وہ حیوانی قوت سے میرا چہرہ زمین سے رگڑنے لگا۔ میرا باقی جسم آزاد تھا لیکن وہ عضوِ معطل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ سلطانہ کا چہرہ میرے ڈوبتے ذہن میں چمکا۔۔۔ اس کے بعد بار بار رنداجیکی کی شبیہ نمودار ہوئی۔۔۔ پھر اسحاق کی زندگی کے آخری دردناک مناظر نگاہوں میں گھومے۔ میں نے اپنے جسم کی رہی سہی قوت جمع کی، ایک حتمی اور آخری کوشش کی۔ بے پناہ زور لگایا اور اپنا بایاں ہاتھ جارج کے مڑے ہوئے بازو میں گھسا کر اس کی بندش توڑنا چاہی۔ میری جنونی مزاحمت نے چند لمحوں کے لیے جارج کو ہلا دیا۔ یوں لگا کہ اس مرتبہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میرے حمایتیوں میں جان پیدا ہوئی۔۔۔ مگر پھر اچانک ہی جارج نے ایک چنگھاڑ بلند کی اور اپنی اس وحشیانہ طاقت کا مظاہرہ کیا جس کے لیے وہ مشہور تھا۔ مجھے لگا کہ میری گردن پیچھے سے ادھڑ گئی ہے۔ یہ وہی کچا پکا زخم تھا جو میں فتح پور کے ترخانے سے لے کر آیا تھا۔ میں نیچے جھکتا چلا گیا اور میرا چہرہ ایک بار پھر بے بسی کی مٹی میں لتھڑ گیا۔ میرے پھیپھڑوں میں آکسیجن کا دخول اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سُن ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ اگلے دو تین منٹ میں، میں ختم ہونے والا ہوں۔ تو یہ تھا انجام۔۔۔ اس خونی مقابلے کا؟

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور زندگی کی ڈور کو تھامنے کی کمزور کوشش کرنے لگا۔

دفعتاً مجھے لگا کہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ کچھ ایسا ہو رہا تھا جو نہ ہونا تھا۔ ہماری لڑائی میں کسی کو بھی مداخلت نہیں کرنا تھی لیکن کوئی کر رہا تھا۔ کوئی جارج کو میری جان لینے سے روک رہا تھا۔ کون تھا؟ کون ہو سکتا تھا؟ میں اوپر دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میری دھندلائی نگاہوں کو صرف پاؤں نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج تھا۔ ''چھوڑ دیجیے سرکار۔۔۔ چھوڑ دیجیے اسے۔۔۔ سمے ختم ہو گیا ہے۔۔۔''

پنڈت مہاراج کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے ابھر کر میرے کانوں تک پہنچی۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ پنڈت مہاراج اور اس کے دو تین چیلے مجھے جارج کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ''وقت'' کا ذکر کر رہے تھے اور جارج کو بتا رہے تھے کہ مقابلے کے قاعدے کے مطابق ''وقت'' ختم ہو گیا ہے۔ سورج ڈوب گیا ہے۔

جارج نہیں سن رہا تھا۔ وہ ایک آخری جھٹکا دے کر ڈراپ سین کرنا چاہتا تھا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ میری مزاحمت کم ہوتے ہوتے ختم ہو رہی ہے۔

اچانک میری نگاہ کچھ دور عمران پر پڑی۔ وہ جست لگاتا ہوا میدان میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ برق رفتاری سے ہماری طرف آیا اور ان تین چار افراد میں شامل ہو گیا جو مجھے جارج گورا کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عمران کی آمد نے یکایک صورتِ حال بدل دی۔ اس کی ''پکڑ'' معمولی نہیں تھی۔ جارج کے فولادی بازو پر عمران کی پکڑ قائم ہوتے ہی مجھے اپنے سانس کی آمد و رفت بحال ہوتی محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد میں اچانک جیسے موت سے زندگی کی طرف آیا۔ میری گردن جارج کے شکنجے سے نکل گئی۔ میں نے دیکھا جارج غضب ناک انداز میں عمران پر جھپٹ رہا تھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ ''یو باسٹرڈ۔۔۔ یو باسٹرڈ منکی۔''

اس نے عمران پر کئی مکے چلائے جنہیں عمران نے کمال صفائی سے بچایا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دفاعی انداز میں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ یکایک بہت سے گارڈز جارج اور عمران کے درمیان کود پڑے۔ کچھ گارڈز نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ میرے لیے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ گارڈز مجھے سہارا دیتے ہوئے اس خونی میدان سے باہر لے آئے۔

☆☆☆

اور یہ رات کا وقت تھا۔ میں راج بھون کے اندر ہی ایک مہمان خانے میں تھا۔ عمران اور میرے تین چار معاون بھی میرے ساتھ تھے۔ ان میں پارس معاون بھی تھا۔ وہ ایک اچھے کمپاؤنڈر کے فرائض بھی انجام دے سکتا تھا۔ وہ میرے زخموں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ میری گردن کا پرانا زخم مسلسل خون اگل رہا تھا۔ اس کے علاوہ پسلیوں پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ کسی وقت مجھے سانس لینا بھی دشوار محسوس ہونے لگتا تھا۔ اگر میں زندہ بچا تھا تو اس میں میری خوش قسمتی کو بھی دخل تھا۔ جیسا کہ چند دن پہلے ہی مجھے بتا دیا گیا تھا کہ شبھ گھڑی کے مطابق یہ مقابلہ سورج غروب ہونے سے قریباً ایک گھنٹا پہلے شروع ہو گا اور غروبِ آفتاب تک جاری رہے گا۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ یہ مقابلہ اتنی دیر چلے گا۔ ایسی خونی لڑائیاں عموماً بیس پچیس منٹ کے اندر ہی اختتام پذیر ہو جاتی تھیں اور بعض اوقات تو پہلے دو تین منٹ کے اندر ہی فیصلہ ہو جاتا تھا مگر اس لڑائی نے غیر متوقع طول پکڑا تھا۔ یہاں تک کہ پنڈتوں کی رائے کے مطابق سورج غروب ہو گیا تھا۔ اب بھی اگر مقابلہ جاری رہتا تو یہ سراسر ''پاپ'' ہوتا۔۔۔ لہٰذا اسے روک دیا گیا۔ اب کل سورج نکلنے کے بعد یہ مقابلہ پھر شروع ہونا تھا۔۔۔ اور پہلے پہر کی تیسری گھڑی تک جاری رہنا تھا۔

آج کی لڑائی ایک نہایت مایوس کن موڑ پر ختم ہوئی تھی۔ عمران خاموش تھا۔ میرے معاونوں کے چہرے بھی اترے ہوئے تھے۔ پارس گوئل نے کہا۔ ''تابش صاحب! آپ کی قسمت نے آپ کا ساتھ دیا ہے۔ ورنہ جارج صاحب کے اس داؤ میں آ کر کوئی نکلتا نہیں۔ کل پھر وہ شروع میں ہی آپ کو اس داؤ میں پکڑنے کی کوشش کریں گے۔۔۔ اور آپ گھائل بھی ہیں۔''

''کیا تم صرف نراشا کی باتیں کرنے کے لیے یہاں بیٹھے ہو؟'' دوسرے معاون نور محمد نے تڑخ کر کہا۔

''میں وہ کہہ رہا ہوں جو نظر آ رہا ہے۔ تم ان کی گردن کا زخم نہیں دیکھ رہے ہو۔ یہ کھل گیا ہے۔ میں نے بڑے جتن سے پٹیاں باندھ کر خون روکا ہے۔ اور یہ پسلیوں والی چوٹ بھی معمولی نہیں ہے۔''

''لیکن کچھ بھی ہے، ہمیں حوصلہ بڑھانے والی بات کرنی چاہیے۔۔۔ اگر ہم۔۔۔'' ایک دم معاون نور محمد کو خاموش ہونا پڑا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

عمران نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دو گارڈز کے پیچھے آٹھ دس افراد اندر آ گئے۔ ''نمستے نمستے'' کی کئی آوازیں گونجیں۔ اندر آنے والے اپنے حلیے سے نچلی ذات کے ہندو

لگتے تھے۔ ان کے لباس بھی معمولی تھے۔ پگڑیاں سر سے چپکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر مسکین لہجے میں کہا۔ ”سرکار! ہم آپ سے بات کرنا چاہت ہتے۔ بڑی مشکل سے اجاجت ملی ہے جی۔ کئی جگہ تلاشیاں دے کر یہاں تلک آئے ہیں۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے جی کہ اس سامبر مقابلے میں ہم جیسے بہت سے لوگن کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ کی جیت چاہت ہتے اور... اب بھی چاہت ہیں۔ لیکن سرکار... مم... میرا مطلب ہے کہ... سرکار...“ وہ بُری طرح ہکلا گیا۔

عمران بولا۔ ”جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے لجاجت سے کہا۔ ”سرکار! آپ ہماری بات کا بُرا نہیں مانیے گا لیکن یہ بات بالکل درست ہے کہ آپ کی دھرم پتنی سلطانہ بی بی سے ایک اپرادھ ہوا ہے۔ ان سے ایک برہمن مہاشن کمار جی کی ہتھیا ہوئی ہے۔ ہتیا ہونے کے کارن اس کا کچھ نہ کچھ بوجھ تو آپ پر بھی پڑتا ہے۔ ہم نے اپنے طور پر آپ کے اور آپ کی پتنی جی کے زائچے بنوائے ہیں اور فالیں بھی نکلوائی ہیں۔ آنے والے سمے کا ٹھیک ٹھیک پتا تو بھگوان کو ہی ہے لیکن جیوتش کا بھی آدیش ہے کہ... آپ... یہ لڑائی جیت نا ہیں سکیں گے۔ ہم آپ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ ہم ہاتھ جوڑ کر آپ سے بنتی کرت ہیں کہ آپ اس لڑائی سے پیچھے ہٹ جاویں۔“

اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی گدلی آنکھوں میں واقعی سچی خیرخواہی نظر آتی تھی۔ میں نے اپنی گردن کی ٹیسوں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں پیچھے ہٹ جاؤں تو کیا ہوگا؟ یہ برہمن زادے مجھے چھوڑ دیں گے... اور وہ سفید شیطان میری جان بخشی کر دے گا؟“

”میں نے پنڈت مہاراج سے بھی بات کی تھی جی... وہ کہوت ہیں کہ ایشور کی طرف سے آپ کو ایک موقع تو ملا ہے۔ یہ لڑائی سورج ڈوبنے کے کارن رک گئی ہے۔ اگر آپ لڑائی سے پیچھے ہٹ جاویں اور کچھ شرطیں مان لیں تو ہو سکت ہے کہ آپ کی موت کی سجا کسی اور سجا میں بدل جاوے۔“

عمران بولا۔ ”اور ان شرطوں میں سب سے پہلی شرط یہی ہوگی کہ تابش اپنی بیوی کا پتا بتائے اور اسے ان بے رحم قاتلوں کے حوالے کرے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”اس بات کا تو ٹھیک سے پتا نا ہیں جی۔ پر شاستروں سے نکالی گئی فالیں جھوٹ نہیں بتا سکتیں جی۔ ساری فالوں کا یہی کہنا ہے کہ یہ لڑائی...“ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”تم نے کچھ اور کہنا ہے یا بس؟“ میں نے پوچھا۔

”بس سرکار! یہ ہم سب کے من کی آواج تھی جو ہم آپ تلک پہنچانا جروری سمجھتے تھے۔ آخری فیصلہ تو آپ نے کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تمہاری ہمدردی اور تمہارے مشورے کا شکریہ۔“ میں نے کہا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لوگ اب چلے جائیں۔ مجھے اور عمران کو حیرانی ہوئی جب باہر جانے سے پہلے ان سب مسکین صورت لوگوں نے باری باری میرے پاؤں چھو دیے۔

ان کے جانے کے بعد عمران نے ایک گہری سانس لی اور دھیمی آواز میں بولا۔ ”تو ہم پرستی کے اسی بُت کو تو ہم نے توڑنا ہے۔ اب ہمارا جیتنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے... اور ہم جیتیں گے۔“ اس کی آواز میں وہی ولولہ تھا جو اسے کسی بھی دوسرے شخص سے ممتاز کرتا تھا۔

وہ درد اور تناؤ کی رات تھی۔ ہم آتش دان کے پاس بیٹھے تھے۔ عمران ہر پل میرے ساتھ تھا۔ کبھی میری مرہم پٹی کرتا ہوا، کبھی میرے بازو دباتا ہوا اور مجھے حوصلہ دیتا ہوا۔ کبھی مجھے تکنیکی مشوروں سے نوازتا ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اپنے زخموں کی وجہ سے میں کچھ کمزور پڑ رہا ہوں۔ ایسی صورت میں جارج مجھے اچانک غیر متوازن کر کے اپنے سر سے اوپر اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ مجھے سامبر مقابلے کے اس ”ناک آؤٹ داؤ“ سے ہوشیار رہنے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ آخر میں اس نے اپنا وہ پسندیدہ فقرہ بھی میرے سامنے دہرایا۔ میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر اور دلکش انداز میں مسکرا کر بولا۔ ”تابش جگر! جب ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور جب مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا...“

اگلے روز سورج نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد میں اور جارج پھر آمنے سامنے تھے۔ مجھے پتا چلا تھا کہ بہت سے تماشائی سرد موسم کے باوجود ساری رات اس اسٹیڈیم نما جگہ پر موجود رہے ہیں۔ جو گھروں کو چلے گئے تھے، وہ بھی صبح سویرے اپنی جگہوں پر لوٹ آئے تھے۔ سخت سردی میں ہلکی ہلکی دھند پھیلی تھی۔ جوں جوں سورج اوپر آ رہا تھا، یہ دھند

اوجھل ہو رہی تھی۔ سنہری دھوپ درختوں پر سے اڈیں چھن رہی تھی اور قرب و جوار کی ہر شے کو نکھارتی جا رہی تھی۔ شاہی بالکونی کل کی طرح پھر کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ نقارے بج رہے تھے اور نعروں کے شور سے زمین دہل رہی تھی۔

ہمارے لباس کل والے ہی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ گرانڈیل جارج کے کندھے پر ایک سفید پٹی نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف میری گردن اور پسلیوں پر بھی پٹیاں موجود تھیں۔ کل والے رام پوری چاقو پھر سے ہمارے حوالے کر دیے گئے۔ ہم وسیع اکھاڑے کے بیچوں بیچ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ آج جارج کل سے زیادہ پُراعتماد نظر آتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بجلی سی کوندر ہی تھی۔ وہ مجھ سے انگلش میں بات کرتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اشتعال انگیزی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ خیرات کی زندگی تمہیں پنڈتوں کی طرف سے ملی ہے۔ تم لوگ ہوتے ہی بے غیرت ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم رات کو ہی اپنے گلے پر چھری پھیر لیتے لیکن کوئی بات نہیں۔ آج ”ہم“ یہ کام کریں گے اور زیادہ اچھے طریقے سے کریں گے۔“

میں کل کی طرح آج بھی یکسر خاموش رہا۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کو نظروں میں تولتے رہے پھر جارج نے ہی حملے کا آغاز کیا۔ اس نے اپنے چاقو سے میری گردن کو نشانہ بنانا چاہا۔ چاقو کی دھار میری گردن کی پٹی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کا دوسرا وار میں نے جھک کر بچایا۔ اس نے پھرتی سے گھٹنا چلایا۔ ضرب میری ٹھوڑی پر لگی۔ میں اچھل کر دور جا گرا۔ وہ مجھ پر جھپٹا۔ مجھے اس کے چاقو سے زیادہ اس کے خطرناک داؤ کا اندیشہ تھا۔ میں اپنی گردن بچانے کے لیے بائیں طرف جھکا اور اپنے دائیں بازو کو اس کے چاقو سے نہ بچا سکا۔ ایک انگارہ سا گوشت میں اتر گیا۔ کندھا زخمی ہوا اور خون نکلنے لگا۔ میں کئی پلٹیاں کھا کر جارج کی زد سے نکلا۔ جارج کے ساتھیوں نے جارج کے کار گر وار پر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ مقابلے کے شروع میں ہی یہ زخم لگ جانے سے جارج کا پلڑا اور بھاری ہو گیا۔ لگتا تھا کہ اسے فتح یقینی نظر آنے لگی ہے۔

مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میری شکست کی صورت میں کیا ہوگا۔ غالب امکان یہی تھا کہ جارج مجھے اکھاڑے میں مارنا نہیں چاہے گا بلکہ سولی چڑھانے کے لیے زندہ رکھے گا۔

ایک دم میں چونکا۔ میں اپنی شکست کے بارے میں سوچ رہا تھا اور عمران نے یہی کہا تھا کہ شکست کے بارے میں نہیں سوچنا۔ کچھ اسی سے ملتی جلتی بات بارہ ندا جینی بھی کہہ گیا تھا۔ وہ کہتا تھا... تکلیف اور توہین (شکست) کا ڈر ہی فائٹر کو کمزور کرتا ہے۔

یکایک میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ جارج نے آج میرے ساتھ وہی کیا تھا جو کل میں نے مقابلے کے شروع میں اس کے ساتھ کیا تھا، ایک طرح سے اس نے میرے کل والے جادوئی وار کا جواب دیا تھا۔ میں زخمی کندھے کے سبب اپنے چاقو کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کر رہا تھا جب اس نے زبردست ٹائمنگ کے ساتھ ٹانگ چلائی اور چاقو میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ ہوا میں اڑ کر اوپر لکڑی کے سائبان میں پیوست ہو گیا۔ اب وہ میری پہنچ سے دور تھا اور میں خود کو نہتا دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر جارج کے حمایتیوں نے شورِ قیامت بلند کیا۔ ان میں سے بہت سے اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ جارج نے اپنے چاقو کو اس طرح پکڑا کہ اس کا رخ نیچے کو ہو گیا۔ اب جارج کا انگوٹھا چاقو کے دستے کے آخری سرے پر تھا۔ اس نے مجھے جھکائی دے کر پہلے بائیں طرف ہٹایا پھر اچانک تڑپ کر وار کیا۔ میری خوش قسمتی کہ اس کی چاقو والی کلائی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اپنے زخمی جسم کی رہی سہی طاقت جمع کر کے اس کی کلائی مروڑ دی۔ میں چاقو اس کے ہاتھ سے چھڑانا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ گورے کا دوسرا ہاتھ آزاد ہے اور میری یہ چاقو چھڑانے والی دیوانہ وار کوشش میری گردن کو پھر سے گورے کے شکنجے میں لا سکتی ہے مگر اب رسک لینے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور چاقو چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ چاقو گرا تو میں نے اسے پاؤں کی ٹھوکر سے اکھاڑے کے آخری کنارے تک پہنچا دیا لیکن پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ میرے ذہن میں موجود تھا اور غالباً بہت سے تماشائی بھی جانتے تھے۔ جارج گھوم کر میرے پیچھے آیا اور میری زخمی گردن ایک بار پھر اس کے منحوس شکنجے میں پھنس گئی۔ اس مرتبہ تماشائیوں کا شور فلک شگاف تھا۔ شکتی دیوتا والے کتبے ہوا میں لہرانے لگے اور سیکڑوں بینرز محوِ رقص ہو گئے۔

جارج پھنکارا۔ ”باسٹرڈ! میں نے کہا تھا نا، حاملہ بکری اور نر شیر کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔“

اگلے آٹھ دس منٹ پھر اسی اذیت ناک صورت حال میں گزرے جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں اور اگر کروں گا تو یہ خوں ریز روداد طوالت کا شکار ہو گی۔ یہ بارہ ندا جینی کا انوکھا فلسفہ ہی تھا جو مجھے ان جاں گسل لمحوں میں

درد سہنے کا حوصلہ دے رہا تھا... میری سانس اکھڑتی جارہی تھی۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ میری زخمی پسلی ٹوٹ چکی ہے۔ میری گردن اور کندھے سے خون کا اخراج بڑھتا جارہا تھا۔ یہ اخراج میری ناتوانیوں کو تیزی سے بڑھا رہا تھا۔ میں مسمار ہورہا تھا... مٹ رہا تھا۔ بعینہٖ کل والی صورتِ حال تھی۔ جارج کا لاک مکمل تھا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے لاک میں پھنسایا ہوا تھا تاکہ اپنی گردن پر اس کے بازو کا دباؤ کم رکھ سکوں۔ دوسرے ہاتھ سے میں اسے کوئی جسمانی تکلیف پہنچانے کی جوابی کوشش کرتا تھا تو وہ میرے آگے بڑھائے ہوئے ہاتھ کو ''بلاک'' کردیتا تھا۔ میں نہتا تھا۔ میرا چاقو کہیں اوپر سائبان میں اٹک چکا تھا اور جارج والا چاقو میں خود پاؤں کی ٹھوکر سے اکھاڑے سے باہر پھینک چکا تھا۔

تو کیا سب کچھ ختم ہوگیا؟ میں نے خود سے پوچھا۔

کیا باروندا جیکی کی حسرت ناک موت کا بدلہ نہ لیا جاسکا؟ مرتے وقت اس نے جو آگ میرے ارادوں کو سونپی تھی، وہ رائگاں گئی؟

کیا اپنے گھر کے بند دروازے کے پیچھے سلطانہ کے بانکپن اور آبرو کی دھجیاں اڑانے والا جانور ایک بار پھر اپنی غلیظ زندگی کو طول دینے میں کامیاب رہا؟

کیا ہزاروں کے مجمعے میں سسک سسک کر تنہا جان دینے والے اسحاق کی موت بھی فی الحال بیکار ہی رہی؟

میرے ڈوبتے ذہن میں یہ سارے سوال ابھر رہے تھے اور میرے کلیجے کو شق کررہے تھے۔

اسی دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ جارج گورا ایک بار پھر اپنے آزاد ہاتھ کو میری دونوں ٹانگوں کے درمیان پہنچانے کی کوشش کررہا ہے۔ میں جانتا تھا، وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔ وہ مجھے ہوا میں اٹھانا چاہ رہا تھا۔ عمران کی بات درست ثابت ہورہی تھی۔ مجھے سامبر کے سارے اصول یاد تھے اور ان میں ایک اصول ''راندگی'' کا بھی تھا۔ جو شخص اپنے حریف کو سر سے بلند کرکے زمین پر پٹخنے میں کامیاب ہوتا تھا، وہ اسے ذلیل و خوار کرنے کا حق دار بھی ٹھہرتا تھا۔ وہ اسے ننگا کرسکتا تھا۔ اس کی پشت پر تھوک کر اور اسے لات رسید کرکے اکھاڑے سے باہر پھینک سکتا تھا۔ ''مرو یا مارو'' کے مقابلے میں بھی اس داؤ کے چل جانے کے بعد مقابلہ وہیں ختم ہوجاتا تھا اور پٹخے جانے والے حریف کو ''ناک آؤٹ'' قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد فاتح، اس شخص کو جان سے مارنے کا حق دار ٹھہرتا تھا۔ کل اور آج کی لڑائی میں جارج نے متعدد بار ایسی کوشش کی لیکن میں اس طرف سے پوری طرح چوکس تھا۔

دوسری طرف میں نے بھی کل ایک دو موقعوں پر یہ ''ترائی'' کی تھی لیکن جارج جیسا شخص جو سامبر کا ایکسپرٹ تھا، مجھے اتنی آسانی سے یہ موقع کیسے دے سکتا تھا؟ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا کر خود کو حتی الامکان حد تک اکھاڑے کی مٹی کے قریب کرلیا اور یوں خود کو اوپر اٹھائے جانے کی کوشش ناکام بنادی۔

ایک بار پھر وہی جدوجہد شروع ہوگئی جو پچھلے دس منٹ سے جاری تھی۔ غالباً جارج گورا میری گردن کو اتنی دیر تک اپنے شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتا تھا کہ میری سانس رک جائے اور میں بے ہوش یا بے جان ہوکر زمین بوس ہوجاؤں۔ دوسری طرف میں سانسوں کی کمزور ڈور کو ٹوٹنے سے بچا رہا تھا اور کسی ایسے موقعے کی تلاش میں تھا جو مجھے جارج کا شکنجہ توڑنے میں کامیاب کرتا... بہرحال، یہ موقع کل کی طرح آج بھی مجھ سے دور تھا۔ بلکہ اب تو دور دور نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بجلی سی لپک گئی۔ دماغ کے تاریک ترین گوشے بھی ایک لمحے کے لیے منور ہوگئے۔ مجھے لگا میں جیت سکتا ہوں۔ میں اب بھی جیت سکتا ہوں۔ ہم سائبان کے نیچے تھے۔ یہی جگہ تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے جارج نے میری ٹانگوں میں ہاتھ دے کر مجھے سر سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی یہ کوشش... اس کی شکست کا باعث بن سکتی تھی۔

مجھے ایک ایسی چیز نظر آرہی تھی جو اس کو شکستِ فاش دے سکتی تھی۔ وہ مجھے بدترین طریقے سے ہرانا چاہتا تھا اور اس کی اسی خواہش میں اس کی ''ہار'' کے قوی امکانات چھپے ہوئے تھے۔

میں نے فیصلہ کرلیا، میں اسے موقع دوں گا۔ میں اسے خود کو اوپر اٹھانے کا موقع دوں گا۔ اور میں جانتا تھا، وہ میرے زخم زخم جسم کو اٹھا لے گا... وہ سامبر مقابلوں کا ماہر ترین کھلاڑی تھا... سامبر کے ہر داؤ کا شناور تھا لیکن وہ ایک چیز نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس رام پوری چاقو کو نہیں دیکھ رہا تھا جو قریباً بارہ فٹ کی بلندی پر لکڑی کے سائبان میں پیوست تھا۔ شکتی دیوتا اپنی تمام تر جسمانی اور روحانی شکتی کے باوجود اس چاقو کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

... مجھے لگا کہ باروندا جیکی کی بے بسی، سلطانہ کے لاچار آنسو اور اسحاق کے خونچکاں زخم سب ایک پلڑے میں آگئے ہیں اور انہوں نے آناً فاناً جارج کی توانائیوں اور برتریوں سے لدا ہوا پلڑا ہواؤں میں اٹھادیا ہے...

ممو نے گھوڑے پر قابو پالیا اور اس پر سواری بھی کی۔ وہاں ماجھاں کا مہمان راجا نامی شخص بھی موجود تھا۔ راجا اور ممو کی دوستی ہوگئی مگر راجا نے ممو اور شبانہ کو وہاں سے نکالنے کا پروگرام بنایا اور وہ لوگ بھاگ نکلے۔ راستے میں ماجھاں سے ٹکراؤ ہوگیا مگر اس ٹکراؤ میں ماجھاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ماجھاں کی موت کے بعد وہ لوگ شادی پورہ میں روپوش ہوگئے اور کبیر احمد کے گھر رہنے لگے۔ کبیر احمد کا بہت بڑا باغ تھا۔ وہ جانوروں کو وہیں سدھاتے۔ ممو کی والدہ اچانک اپنے گاؤں سے غائب ہوگئی تھی۔ ممو اپنی ماں کو ڈھونڈنا چاہتا تھا مگر راجا نے کہا کہ ان کا باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔ ایک روز راجا بنگلہ ٹائیگر لے کر آگیا اور ممو کو مجبور کیا کہ وہ اسے سدھانے میں مدد دے۔ حیران کن طور پر ممو نے یہ کام بھی کر لیا۔ بنگلہ ٹائیگر سرکس کے مالک جان محمد کا تھا۔ ایک روز وہ ٹائیگر بپھر گیا اور ایک دو بندوں کو زخمی کر دیا۔ راجا ممو کو اپنے ساتھ لے گیا اور ممو نے ٹائیگر کو رام کر لیا۔ اس طرح راجا کی اصلیت کھل گئی۔ ممو راجا کو چھوڑ کر جان محمد کے پاس آگیا اور ان کی حویلی میں ٹھہر گیا۔ وہاں اسے پیر صادق شاہ نظر آگیا۔ عمران نے اس سے بدلہ لینے کے لیے بنگلہ ٹائیگر کو اس پر چھوڑ دیا۔ اس کی جان تو بچ گئی مگر وہ مہینوں کے لیے اسپتال میں پڑ گیا۔ ادھر شبانہ کے گھر والوں کا پتا ٹھکانا معلوم کر کے شبانہ کو اس کے گھر بھیج دیا گیا اور عمران کا رشتہ شبانہ سے طے ہوگیا مگر توہم پرستی کا شکار لوگوں نے ممو اور شبانہ کو جدا ہونے پر مجبور کر دیا۔ شبانہ کی شادی ہوگئی اور ایک روز گھریلو جھگڑے میں شبانہ یہ دنیا چھوڑ کر چلی گئی۔ ممو کی زندگی اندھیر ہوگئی۔ وہ خودکشی کرنے کا سوچنے لگا اور یوں وہ خطرات سے کھیلنے لگا۔ ممو نے دکھی لوگوں کی مدد کو اپنا مقصد بنا لیا۔ عمران کی کہانی سننے کے بعد میں نے اس سے کئی سوال کیے۔ ٹیگر جشن کے دن ہمیں راج بھون لے جایا گیا۔ وہاں کا ماحول خواب ناک تھا۔ پریوں کے چناؤ کے بعد عمران نے وہاں لوگوں پر کھڑا ہونے کا کرتب دکھایا اور مقابلہ جیت لیا۔ رتنا دیوی عمران سے متاثر ہوئی اور انعام کی پیشکش کی مگر عمران نے صرف اپنے لیے ایک گاڑی لی۔ پھر سا مبر مقابلے والا دن آگیا۔ میں اور جارج مدمقابل تھے۔ میں نے جارج پر حملے کیے مگر پھر اچانک میری گردن جارج کے آہنی شکنجے میں آگئی۔ میں موت و حیات کے درمیان لٹک گیا مگر مقابلے کا وقت ختم ہوگیا اور مجھے جارج کے داؤ سے چھڑا لیا گیا۔ دوسرے دن جارج سے مقابلے میں میرا چاقو اوپر لکڑی کے بنے سائبان میں جا لگا، میں نہتا تھا۔ جارج نے پھر گردن پر داؤ لگا دیا۔ میری ہمت ٹوٹ رہی تھی اور میں زیر ہوتا جا رہا تھا۔ جارج مجھے سر سے بلند کر کے زمین پر پٹخنا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ چاقو سائبان میں ہے اور جارج اس سے بے خبر ہے۔ وہ مجھے اوپر اٹھاتا تو میں اسے حاصل کر سکتا تھا۔ مجھے لگا ہار رونا، اچھی کی بے بسی، سلطانہ کے لاچار آنسو اور اسحاق کے خونچکاں زخم سب ایک پلڑے میں آگئے ہیں اور جارج کی برتریوں کا پلڑا ہوا میں اٹھ گیا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مکافات عمل جارج گورا کو آواز دے چکی تھی مگر زبردست شور بلند ہوا۔۔۔ میں نے اپنی دھندلائی نگاہوں کے ساتھ سائبان کی چھت کو دیکھا۔ رام پوری چاقو مجھ سے فقط دو تین فٹ کی دوری پر تھا۔ میں اپنے زخم زخم جسم کے ساتھ جس ہتھیار تک پہنچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہاں تک خود میرے حریف نے مجھے پہنچا دیا تھا۔ ابھی اس نے یہ آواز سنی نہیں تھی۔ وہ اپنی امکانی فتح کے نشے میں چور تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ٹوٹی ہوئی پسلی کی وجہ سے میرے لیے حرکت کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ گردن کے پچھلے حصے اور کندھے سے بہنے والے خون نے میرے تقریباً پورے جسم کو رنگین کر دیا تھا۔ میری گردن بدستور جارج کی آہنی گرفت میں تھی۔ یقیناً جارج کو بھی حیرت تھی کہ میں ابھی تک دم گھٹنے کے سبب ہوش و حواس سے بیگانہ کیوں نہیں ہوا۔ اس کا جواب بڑا مختصر تھا۔ میری غیر معمولی برداشت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ورنہ مجھ سے زیادہ تن و توش اور طاقت رکھنے والا جارج کب کا فتح کا جھنڈا لہرا چکا ہوتا۔

یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ اس سے پہلے کہ جارج دوسری مرتبہ جھنجھناتا اور مجھے اکھاڑے میں پٹختا، اس سے پہلے کہ اس کی فتح کا ڈنکا بجتا اور شور قیامت بلند ہوتا، میں سائبان میں اٹکے ہوئے چاقو کو اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ اس کے لیے مجھے زیادہ زور نہیں لگانا پڑا تھا۔ بس ایک ہلکے سے جھٹکے نے مجھے چاقو کا قبضہ سونپ دیا۔ یہ سب کچھ ساعتوں میں ہوا۔

میں نے وہی کیا جو میں نے سوچا تھا۔ میں نے جارج کو وہ موقع دیا جس کا وہ کافی دیر سے متلاشی تھا۔ اس نے جھک کر میری ٹانگوں تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کی تو میں نے اسے ایسا کرنے دیا۔ جارج اس سنہری موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ وہ مجھے سر سے بلند کر کے اکھاڑے میں پٹخ دیتا تو اس کی یہ عظیم فتح اور بھی چمک دار ہو جاتی۔ جونہی میری ایک ران پر اس کی گرفت قائم ہوئی، اس نے میری گردن کے گرد لپٹے ہوئے اپنے بازو کی پوزیشن تبدیل کی۔۔۔ پھر ایک زوردار جھٹکے اور چنگھاڑ کے ساتھ اس نے میرے خونچکاں جسم کو ہوا میں اٹھا لیا۔ تماشائی پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے۔

میں نے پہلا وار اوپر سے نیچے کی طرف جارج کی گردن کی جڑ میں کیا۔ وزنی چاقو دستے تک جارج کی چربی دار گردن میں گھسا۔ وہ جیسے ایک لمحے کے لیے سکتے میں رہ گیا۔ اس کی کرب ناک کراہ میرے کانوں سے ٹکرائی اور مجھے ”میراب“ کر گئی۔ جارج اپنے قدموں پر لڑکھڑایا اور پیچھے کی طرف گرا۔ میں بھی اس کے ساتھ گرا۔ جارج کی نیلی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ ناقابل یقین نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھٹکے سے چاقو کھینچا اور دوسرا وار اس کے سینے پر کیا۔۔۔ ”یہ جیکی کے لیے جسے تم نے اپاہج کر کے مارا۔“ میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

تکلیف کی شدت سے جارج کا منہ وا ہو گیا۔

میں نے چاقو کھینچ کر دوسرا وار اس کے عین دل کے مقام پر کیا۔ ''...اور یہ سلطانہ کی عزت کے بدلے میں...'' میں نے جارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

نو انچ لمبا پھل ایک بار پھر دستے تک اس کے سینے میں گھس چکا تھا۔ اس مرتبہ وہ بے پناہ تکلیف کے سبب بلند آواز میں ڈکرایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں اکڑاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ہزاروں تماشائی یکسر خاموش تھے۔ وہ بھی جیسے اس اچانک تبدیلی کے سبب سکتے کی سی کیفیت میں چلے گئے تھے۔

اس مرتبہ مجھے چاقو جارج کے جسم سے نکالنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے زور لگانا پڑا۔ اس کے زخموں سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ آخری وار میں نے اس کے پیٹ پر کیا... اور وار کرنے کے بعد چاقو کو نیچے کی طرف کھینچا... جارج کا پیٹ ناف تک کھل گیا اور انتڑیاں نکل آئیں۔

''...اور یہ اسحاق کو تڑپا تڑپا کر مارنے کے لیے۔'' میں نے دم توڑتے جارج کے سامنے سر سراتی ہوئی وضاحت کی۔

اس نے سنا لیکن وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اپنی آخری منزل کی طرف اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس کی نظر پتھراتی چلی جا رہی تھی۔ شاہی بالکونی کی طرف سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں ماریا کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ اپنے بھائی کا یہ اچانک انجام دیکھ کر یقیناً اسے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ حیرت کے پہلے شدید جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد اب تماشائی بھی اپنا ردِعمل ظاہر کرنے لگے۔ یہ دو طرح کا ردِعمل تھا۔ کچھ لوگ تو شاک کی کیفیت میں تھے اور کچھ غیظ و غضب دکھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ملا جلا شور بھی تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ ان میں سے ایک ہاتھ کے اندر خون آلود چاقو بھی تھا۔ میں جیت چکا تھا... اس ہجوم میں میرے سیکڑوں حمایتی بھی تھے لیکن انہوں نے میری فتح کی خوشی میں اچھل کود کی اور نہ نعرہ ہائے تحسین بلند کیے۔ وہ سب سہمے ہوئے تھے۔ جو ہوا تھا، وہ بالکل غیر متوقع تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے ہر کسی کو چپ لگا دی تھی۔ شاہی ردِعمل کیا ہوگا؟ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔

سائبان کے نیچے جارج گورا کی تازہ لاش پڑی تھی اور شاہی بالکونی کی طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تب میں نے دیکھا کہ بالکونی کے نیچے سے تماشائیوں کا ایک ریلا سا اکھاڑے کی طرف بڑھا۔ بے شک یہ جارج کے مشتعل حمایتی ہی تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ میدان میں داخل ہو کر میری تکا بوٹی کر دینا چاہتے ہوں۔ انہیں روکنے کے لیے کئی درجن گارڈز سامنے آ گئے اور انہوں نے اکھاڑے میں کھلنے والا راستہ بلاک کر دیا۔ اسی دوران میں ایک اور اچھی پیش رفت ہوئی۔ لمبے بالوں والا پنڈت مہاراج اپنے کئی ساتھیوں کے ہمراہ اکھاڑے میں آ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے حفاظتی گھیرے میں لے لیا۔ میں نے ایک نظر شاہی بالکونی پر ڈالی... ماریا نوحہ کناں تھی۔ کچھ لوگ اسے سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ جگم جی، رتنا دیوی اور سرجن اسٹیل وغیرہ کے چہرے بھی دھواں دھواں نظر آ رہے تھے۔ شکتی دیوتا، خاک اور خون میں لتھڑا ہوا میرے پاؤں میں پڑا تھا۔ مجھے لگا کہ بارونا کہیں، میرے آس پاس ہے اور مسکرا رہا ہے...

☆☆☆

اگلے چوبیس گھنٹے بڑے غیر یقینی اور پُرخطر تھے۔ میں زرگاں کے سرکاری اسپتال میں تھا۔ میری گردن کے ٹوٹے ہوئے ٹانکے دوبارہ لگے تھے اور میری مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ سب سے پریشان کن صورتِ حال میرے دائیں پہلو کی تھی۔ نیچے سے چوتھی پسلی ٹوٹ گئی تھی... یہاں جارج کی ایک تباہ کن ٹھوکر لگی تھی۔ اس نے وزنی جوگرز پہن رکھے تھے۔ پسلی میں ایک بڑا فریکچر ہوا تھا۔ تاہم خوش قسمتی سے اندھا دھند لڑائی کے باوجود پسلی ''ڈس لوکیٹ'' نہیں ہوئی تھی یا شاید ''ڈس لوکیٹ'' ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنے مقام پر آ گئی تھی۔ ڈاکٹر سے مشورے کے بعد عمران نے مجھے بتایا۔ ''تمہیں کم از کم تین ہفتے آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی تم یہاں سے جانے کے قابل ہو سکو گے۔''

''اور ان تین ہفتوں میں یقیناً جارج کے حمایتی اپنا کام کر گزریں گے۔ کسی رات وہ اسپتال میں گھسیں گے اور میری باقی پسلیاں توڑ کر مجھے اناللہ کر دیں گے۔''

عمران میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرایا۔ ''اب یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جگر! تم نے جارج گورے کو شکست دی ہے، کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو نہیں پچھاڑا۔ شکتی دیوتا کو ہرانے کے بعد اب تم شکتی دیوتا ہو۔ لوگ نہ بھی مانیں، پھر بھی ان کا دل دماغ تو یہی کہتا ہوگا کہ اب تم ''شکتی دیوتا صاحب'' کی جگہ پر ہو۔ اور شکتی دیوتا صاحب کی چاہے ایک پسلی ٹوٹی ہوئی ہو، اس پر شب خون مارنا آسان نہیں ہوتا...''

''مجھے بانس پر چڑھا رہے ہو؟'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''نہیں جگر!'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ''تم نے وہ کر دکھایا ہے جو یہاں کے لوگ مدتوں یاد رکھیں گے... اور کچھ تو آخری دم تک بھول نہیں سکیں گے۔ بے شک تمہاری فتح پر کسی نے جشن نہیں منایا، کہیں ڈنکے بجے ہیں اور نہ چراغاں ہوا ہے لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ زرگاں کے بے شمار لوگوں کے دلوں کے اندر ضرور جشن کا سماں ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں اور نچلی مسلی ذاتوں والے ہندو بھی۔ اور وہ سب لوگ بھی جن کو کسی نہ کسی طور جارج کی مس مائیون اور خرمستیوں سے واسطہ پڑا ہے۔ تمہیں پتا ہے کل رات جارج کی جیل میں کیا ہوا ہے؟''

میں سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔

وہ دائیں بائیں نظر دوڑا کر سرگوشی میں بولا۔ ''کسی نے راتوں رات جیل کی دیواروں پر چاکنگ کر دی ہے۔ قیدیوں کو جارج گورے کی موت کی مبارک باد دی گئی ہے اور اس کے بارے میں اور بھی کئی سخت باتیں لکھی گئی ہیں۔ اس حرکت کے شبہے میں دو تین قیدی گرفتار ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں آج دوپہر جارج کی آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد جیل میں اور گرفتاریاں بھی ہوں گی۔ پانڈے اس سلسلے میں بڑا سرگرم ہے۔''

''لیکن پانڈے تو کل رات تک یہیں اسپتال کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔''

''وہ ان گارڈز کا انچارج تھا جو یہاں اسپتال میں تمہاری حفاظت پر مامور ہیں۔ رات گئے میں نے اور میڈم صفورا نے مشورہ کیا۔ اس مشورے کے بعد میڈم صفورا نے پنڈت مہاراج سے رابطہ کیا اور ان سے کہا کہ رنجیت پانڈے جیسے افسر کو تمہاری سیکیورٹی کا ذمے دار بنانا ٹھیک نہیں۔ پنڈت مہاراج نے انتظامیہ سے بات کی اور پانڈے کو اس کے ماتحتوں سمیت یہاں سے ہٹوا دیا۔ اب میڈم صفورا والا سیکیورٹی اسٹاف ہی یہاں ڈیوٹی دے رہا ہے اور میں خیر سے اس اسٹاف میں اسسٹنٹ انچارج ہوں۔'' عمران نے اپنے یونیفارم کے بازو پر لگے سرخ نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو اچھی خبر ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ جھٹ بولا۔ ''نیوز چینل کا چیلا... میرا مطلب ہے نمائندہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہمیشہ بُری خبر ہی دوں گا۔ ابھی پچھلے سے پچھلے مہینے میں نے ''بزبانِ خود'' قوم کو بڑی اچھی خبر سنائی تھی۔''

''وہ کیا؟'' میں نے درد سے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے کہا۔

''میں نے کہا تھا، ناظرین آج کوئی خبر نہیں ہے۔''

''تو یہ اچھی خبر تھی؟''

''بالکل، اس دور میں تو ایسی خبروں کو بھی اچھا ہی سمجھنا چاہیے۔ اتنی تیزی سے خبریں آ رہی ہیں اور اتنی بُری کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ پچھلے ہفتے ہمارے ایک ساتھی کی سالی لاپتا ہو گئی۔ ہمارے ساتھی کو اس ''گمشدگی'' سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ کہیں کوئی دوسرا چینل یہ خبر پہلے نشر نہ کر دے۔ لہٰذا اس نے پہلے سالی کے اغوا کی خبر چلائی۔ پھر تصدیق کرنے کے لیے گھر ٹیلی فون کیا تو سالی صاحبہ کہیں سے ایزی لوڈ کرا کے واپس بھی آ چکی تھیں... اس کے بعد موصوف کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ واقعی ''بریکنگ نیوز'' کے زمرے میں آتا تھا... بیوی نے مار کھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے، اب یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا سا بریک... یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا سا بریک لیکن بیوی نے بھی اس وقت تک بریک نہیں لیا جب تک موصوف کی ہنسلی کی ہڈی بریک نہیں ہو گئی اور... اور زبان میں فریکچر نہیں ہو گیا۔''

''زبان میں فریکچر؟ تمہارا مطلب ہے زبان میں ہڈی ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تو تم کیا سمجھتے ہو، ہم ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے یوں ہی بول لیتے ہیں؟''

''تم میڈیا پر طنز کرتے ہو مگر میڈیا کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ مجھے اس وقت درد ہو رہا ہے ورنہ میں اس موضوع پر لمبی بحث کر سکتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ تمہارے اچھے ہونے کا انتظار کر لیتے ہیں۔'' اس نے فراخ دلی سے کہا۔ کل صبح والے خونی مقابلے اور اس کے انجام کے بعد سے زرگاں میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہر کے سارے جذبات یعنی غصہ، خوف، حیرت، خوشی... سب کچھ اس خاموشی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ جارج کے حمایتیوں میں زیادہ تر اعلیٰ طبقہ اور کھاتے پیتے لوگ شامل تھے... انہیں جارج کی شکست اور موت بڑی مشکل سے برداشت ہوئی تھی۔ ایک طرح سے یہ ایک نہایت کڑوی گولی تھی جو انہیں کسی نہ کسی طور نگلنا پڑی تھی۔ دھرم کے حوالے سے یہاں انصاف کا ترازو پنڈت مہاراج کے ہاتھ میں تھا اور اسے وہی کچھ کرنا تھا جو کتابوں میں درج تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت، موقع دیکھ کر عمران پھر

میرے پاس چلا آیا۔ اس نے گلاب کی ایک کلی میرے سرہانے رکھ دی۔ میں نے کہا۔ ”عمران! تمہارا کیا خیال ہے... جارج کی شکست اور موت کی خبر سلطانہ اور اقبال وغیرہ تک پہنچ گئی ہوگی؟“

”ہاں، میں بھی کل سے یہی سوچ رہا ہوں۔ ویسے جگر! یہ اتنی بڑی خبر ہے کہ پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں اس کی گونج سنائی دی ہوگی۔ مجھے نہیں لگتا کہ فتح پور والے بے خبر ہوں گے۔“

”لیکن سلطانہ وغیرہ تو مندر کے تہ خانوں میں ہیں اور تم نے آفتاب خاں کو تہ خانوں میں جانے سے منع کر دیا تھا۔“

”مگر اشد ضرورت کے وقت وہ جا بھی سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی خوش خبری سنانے کے لیے اس نے مندر کا ایک چکر لگا ہی لیا ہو۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ایک زخمی چڑیا کی طرح ہر وقت پھڑپھڑاتی رہتی تھی۔ جارج کی شکست اور میری کامیابی کی خبر اس کے زخموں پر مرہم کا کام دے سکتی ہے... بلکہ ضرور دے گی۔“

شاید میں مزید بھی کچھ کہتا مگر اسی دوران میں دروازے پر گارڈز نمودار ہوئے۔ ان کے عقب میں میڈم صفورا، میجر مدن اور پنڈت مہاراج کی صورتیں نظر آئیں۔ پنڈت مہاراج کی تعظیم کے لیے میں نے تکیے سے سر اٹھایا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پنڈت مہاراج کے ساتھ ایک جواں سال، قبول صورت لڑکی بھی تھی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ باقی جسم گرم شال نے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں حزن و ملال کی عجیب سی کیفیت تھی۔

میڈم صفورا نے ہولے سے کہا۔ ”یہ تمہارے دوست اسحاق کی بھاوج حمیدہ ہے۔ وعدے کے مطابق پنڈت مہاراج اسے تمہارے سپرد کرنے کے لیے آئے ہیں۔“

میں نے ایک بار پھر چونک کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے مجھے سلام کیا اور خاموش ہوگئی لیکن اس کی خاموشی بات کر رہی تھی۔ یہ خاموشی مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ”میرے محسن! میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میں ایک درندے کی تحویل میں تھی۔ اس نے میرے دیور کو موت کے جال میں جکڑنے کے لیے مجھے چارا بنا رکھا تھا اور وہ کامیاب ہوا۔ اس نے میرے بھائی جیسے دیور کو سولی پر لٹکایا اور اس کے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا اور اب میری باری آنے والی تھی۔ میں اس کے ”بستر ہوس“ پر پامال ہونے والی تھی۔ میرا روگ اذیت ناک موت کا دوسرا نام تھا۔ تم مسیحا بن کے آئے... تم نے میرے زہر کو تریاق دیا اور میری زنجیروں کو پگھلا کر مجھے پھر سے زندہ کیا۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟“

پنڈت مہاراج نے اپنے مخصوص اسٹائل سے اپنے لمبے بالوں کو کندھوں کے پیچھے پھینکا اور ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”اب تمہارا حال کیسا ہے؟“

”مجھے پہلے سے بہتر لگ رہا ہے مہاراج۔“

”بھگوان نے چاہا تو تم جلد ہی بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔ یہاں تمہیں ہر طرح کی سہولت ملے گی... اور پوری رکھشا بھی کی جاوے گی۔“

”مجھے آپ کے انصاف پر پورا بھروسا ہے۔“ میں نے کہا۔

پنڈت مہاراج نے حمیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ تمہاری امانت ہے۔ تم جیسے ہی ٹھیک ہو گے، اسے یہاں سے لے جا سکو گے۔ حکم جی نے اس سلسلے میں ضروری ہدایتیں دے دی ہیں۔“

میں نے ایک مرتبہ پھر پنڈت مہاراج اور حکم جی کا شکریہ ادا کیا۔

پنڈت مہاراج نے مجھے بتایا کہ میرے صحت یاب ہونے تک حمیدہ لال بھون میں میڈم صفورا کے پاس رہے گی اور وہاں اس کی حفاظت کا پورا انتظام ہوگا۔

کچھ دیر بعد پنڈت مہاراج اپنے ساتھیوں اور گارڈز وغیرہ کے ساتھ واپس چلا گیا۔ میڈم صفورا بھی اسحاق کی بھاوج حمیدہ کو لے کر لال بھون چلی گئی۔ میں ایک بار پھر اپنے سفید بستر پر اکیلا رہ گیا۔

سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا۔ شہر کی فضا بھی پُرسکون تھی۔ اس کے باوجود محسوس ہوتا تھا کہ سینوں کے اندر ہلچل موجود ہے۔ شہر کے باسی اپنے اپنے طور پر اس بہت بڑے واقعے کے اثرات سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ اسپتال سرجن اسٹیل کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ یہاں تین سفید فام ڈاکٹروں کے علاوہ دو تین مقامی ڈاکٹر بھی کام کرتے تھے۔ یہ مقامی ڈاکٹر وہ تھے جنہوں نے ڈاکٹر جے مان ہی کی طرح انڈین حکومت سے بھاگ کر اس بشوار گزار علاقے میں پناہ لی ہوئی تھی۔ بے شک یہاں میرا علاج ہو رہا تھا لیکن یہ اندیشے اپنی جگہ موجود تھے کہ علاج ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ میں اپنے حفاظتی انتظامات پر بھی

پورا بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس حوالے سے عمران یہاں موجود نہ ہوتا تو شاید میں مسلسل تناؤ کا شکار ہو جاتا۔

سہ پہر کے وقت بتدریج اندھیرا چھا گیا اور پھر تیز بارش شروع ہوگئی۔ سردی میں اضافہ ہوگیا۔ ایک چھوٹی انگیٹھی میرے قریب دہکا دی گئی۔ کچھ دیر بعد عمران بھی مجھے کمپنی دینے کے لیے میرے پاس آ بیٹھا۔ گارڈز کی ہلکی نیلی یونیفارم اس کے جسم پر جچتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس پر ہر لباس ہی جچتا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! سچ پوچھو تو تمہاری کہانی ایک گہرے دکھ کی طرح میرے دل کی تہ میں بیٹھ گئی ہے۔ میں نے شبانہ کو دیکھا نہیں، پر اس کی غم زدہ صورت نگاہوں میں گھومتی رہتی ہے۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں نے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں تھا۔ تم دونوں لمبے عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ تمہارے رستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ راجا اور کبیر صاحب وغیرہ بار بار تم سے کہتے رہے کہ شادی کر لو... اور تم نے نہیں کی۔“

”اسی کو تقدیر کہتے ہیں جگر! کبھی بہت آسان کام بھی نہیں ہو پاتے اور کبھی ناممکن، عین ممکن ہو جاتا ہے۔ باقی جہاں تک شادی نہ ہونے کی بات ہے تو اس میں مجھ سے زیادہ شبانہ ہی کا قصور تھا۔ وہ اپنے فیصلے میں اپنے گھر والوں کو شامل کرنا چاہتی تھی۔ اس بے چاری کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا نہیں ہو سکے گا اور حالات اس طرح پلٹا کھا جائیں گے۔“

”یار! وہ تو لڑکی تھی۔ اس کی سمجھ محدود تھی مگر تم نے تو کافی سرد گرم دیکھا ہوا تھا۔ تمہیں تو پتا ہونا چاہیے تھا کہ ایسے معاملے کسی بھی وقت اُلٹ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم اصرار کرتے اور زور دیتے تو وہ شادیورہ میں تم سے شادی پر رضامند ہو جاتی۔“

عمران نے گہری سانس لی۔ ”سانپ کی لکیر پیٹنے سے کبھی کوئی فائدہ ہوا ہے جو ہمیں ہوگا؟ ایسی باتیں دُہرانے سے بس دکھ ہی بڑھتا ہے۔ جو بگڑ گیا سو بگڑ گیا... جو ابھی نہیں بگڑا اسے بچانا چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“

”یہی کہ حال کے بارے میں سوچنا چاہیے اور حال میں... سلطانہ بھی شامل ہے... اس نے تمہیں بہت چاہا ہے یار! تمہارے لیے پورے زرگاں سے ٹکر لی ہے۔ جب تم اپنے حواس میں نہیں تھے، وہ تمہارے بچاؤ کے لیے ایک دیوار بن کر کھڑی رہی ہے۔ ایسی ہمت والی، بے جگر عورتیں کم کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ بہت انوکھی ہے... اور تمہارے لیے اس کا پیار بھی اتنا ہی انوکھا ہے۔ لوگ شادی سے پہلے رومانس کرتے ہیں لیکن اس نے تم سے شادی کے بعد رومانس کیا اور ایسا کیا کہ حق ادا کر دیا۔ اب اسے تمہاری محبت اور سہارے کی ضرورت ہے تابی۔“

میری نگاہوں میں سلطانہ کا چہرہ گھوم گیا۔ رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں، انار جیسا رنگ، پتلی کمر لیکن مضبوط جسم جس سے جنگلی پھولوں کی باس آتی تھی... وہ میرے لیے سراپا محبت اور اطاعت تھی۔ شاید میں اسے پہاڑ سے کودنے کے لیے کہتا تو وہ بس ایک بار میری خواہش کی تصدیق کرتی اور پھر کود جاتی۔ میرا دل اس کے لیے محبت سے بھر گیا۔ جی چاہا کہ اڑ کر اس تک پہنچ جاؤں... مگر پھر اچانک دل میں یہ وسوسہ جاگا، کہیں میرے اور سلطانہ کے درمیان بھی تو کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو جائے گی؟ آنکھوں کے سامنے ہاشو کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ایک انتہا پسند شخص ثابت ہوا تھا۔ اس کے پاس سے نیلگوں زہریلے پاؤڈر کے جو پیکٹ ملے، اسی جیسا زہر سلطانہ کے پاس بھی موجود تھا۔ یہ زہر ایک پڑیا میں تھا اور یہ پڑیا اب میرے پاس تھی۔ سلطانہ کے پاس یہ زہر کیوں تھا؟ کہیں... کسی طور اس کا تعلق بھی تو ہاشو وغیرہ سے نہیں تھا؟ یہ سنگین سوال بار بار میرے ذہن میں ابھرتا اور مجھے جھنجوڑ دیتا۔ سلطانہ بھی ایک باغی تھی۔ اپنی دلیر والدہ کی طرح وہ بھی خطروں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ مرنا اور مارنا جانتی تھی... زرگاں کے بااثر ہندوؤں سے اس کا ٹکراؤ دیرینہ تھا۔ کہیں وہ بھی تو زرگاں میں موجود ”خطرناک شدت پسندی“ کا حصہ تو نہیں تھی؟

”کیا سوچ رہے ہو؟“ عمران نے میرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“

”بالکل غلط۔ سائیکالوجسٹ نادر اکبر گوندل صاحب نے کہا ہے کہ انسان کا دماغ کچھ سوچے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ ہم ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں۔“

”یہ نادر اکبر گوندل تو شاید کسی ڈی پولیس افسر کا نام تھا؟“

”تو تمہارا کیا خیال ہے، پولیس افسر سائیکالوجسٹ نہیں ہوتے؟ کدھے! ان سے بڑا نفسیات داں اور کون ہوگا۔ عشق کا بھوت سب سے تگڑا ہوتا ہے۔ یہ اسے بھی دو چار گھنٹے میں اتار دیتے ہیں اور ”مریض“ اپنی محبوبہ کو باجی کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ یہ لوگ ”چھترول“ کے ذریعے

تحلیل نفسی کرتے ہیں اور ماضی کے ان سارے حادثوں کا پتا چلا لیتے ہیں جو کبھی وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے ہوتے۔ دیگر امراض کے علاوہ ''نحوست'' بھی دراصل ایک نفسیاتی روگ ہے۔ ان معالجوں کے علاج سے یہ بھی جڑ سے ختم ہو جاتا ہے۔ مریض اپنی ساری جمع پونجی بلکہ قرض اٹھائی ہوئی رقوم بھی بے دریغ خرچ کرتا اور لٹانا شروع کر دیتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی اس ''لیاقتی'' کا پچانوے فیصد فائدہ بھی اس کے معالجوں کو ہی ہوتا ہے...''

اچانک زور سے بجلی چمکی۔ میں اور عمران کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔ بارش زور پکڑ رہی تھی۔ دن میں ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ بعد بادل زور سے گرجے اور در و دیوار دہل گئے۔ عمران سگریٹ کا کش لے کر زخمی انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''دیکھا تم نے۔ آسانی بجلی مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ میں باہر برآمدے میں نکلا نہیں اور جل کر کوئلہ ہوا نہیں۔''

اس کے لہجے نے مجھے آزردہ کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''یار! یہ وہم پرستیاں ہمارے دماغوں سے کس طرح نکل سکتی ہیں... کس طرح ہم ان پھپھوندی زدہ عقیدوں کے جال کو توڑ سکتے ہیں؟''

''اس کا کوئی فوری حل نہیں۔ اس کے لیے کوشش کرنا ہوگی، طویل انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے لیے انسان کے اندر کی مضبوطی درکار ہے۔ اور اندر کی مضبوطی میں سب سے اہم کردار علم کی روشنی کا ہے... نالج از پاور... اور سیانے کہتے ہیں جہاں ''پاور'' بڑھتی جاتی ہے وہاں ''بارڈ'' کم ہوتا جاتا ہے۔''

''مگر یار! عقل سلیم بھی تو کوئی شے ہے۔ بڑی بڑی ہستیاں اس دنیا میں ایسی آئی ہیں جو ان پڑھ تھیں مگر انہوں نے خداداد عقل سے سچ اور جھوٹ میں پہچان کی ہے۔ بیکار عقیدوں پر لعنت بھیج کر انہیں کچرے کے ڈھیر پر پھینکا ہے۔''

عمران مسکرایا اور مقامی زبان کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک کہوت ہو بھیا۔ لیکن میں عام لوگن کی بات کرت ہوں۔ یہ جو عام لوگن ہووت ہیں نا، یہ بڑے کٹر ہووت ہیں۔ جہاں اڑ گئے بس اڑ گئے۔ پہاڑ میں سے زندہ اونٹنی نکلنے والا معجزہ دیکھ لیں پھر بھی نہ ماننے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں... اگر تمہاری بیکار سمجھ میں نا ہیں آیا تو میں تمہیں ایک اور مثال دیوت ہوں...''

وہ ایک بار شروع ہوا تو پھر بولتا چلا گیا... اس کے پاس ہر موضوع پر باتوں کا ذخیرہ رہتا تھا۔ اچانک دروازے سے باہر شور سنائی دیا۔ یوں لگا جیسے گارڈز کسی شخص کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر یکایک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور سانولے رنگ کا ایک شخص طوفانی رفتار سے میری طرف بڑھا۔ اس کے لباس سے پتا چلتا تھا کہ وہ اسپتال کے عملے کا ہی آدمی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار آلہ چمک رہا تھا۔ وہ چلّاتا ہوا خطرناک انداز میں مجھ پر جھپٹا۔ لیکن وہ مجھے نقصان کیسے پہنچا سکتا تھا؟ میرے اور اس کے درمیان عمران تھا۔ وہ شخص جو میری طرف بڑھنے والے ہر خطرے کے لیے ایک فلک بوس آہنی دیوار تھا۔ حملہ آور دوگنا پھرتی کا مظاہرہ بھی کرتا تو عمران کو مجل نہ دے سکتا۔

عمران نے مجھ سے دس بارہ فٹ دور ہی اسے روک لیا۔ ''مار دوں گا۔'' حملہ آور گرجا اور اس نے اندھا دھند عمران پر وار کیا۔ عمران نے نیچے جھک کر تیز دھار آلے کا وار بچایا اور اسے اس طرح بازوؤں میں جکڑا کہ اس کا آلے والا ہاتھ بھی بازوؤں کے گھیرے میں آ گیا۔ عمران اسے دھکیلتا ہوا دیوار کی طرف گیا۔ یہ کافی تیز رفتار عمل تھا۔ حملہ آور کا سر شدت سے پختہ دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ وہ ڈکرانے والے انداز میں چلّایا۔ تیز دھار آلے پر اس کی گرفت کمزور پڑ چکی تھی۔ عمران نے پاؤں کی ٹھوکر سے یہ آلہ اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ دو تین گارڈز بھاگتے ہوئے آئے اور حملہ آور سے لپٹ گئے۔ فرش پر گرنے والا تیز دھار آلہ دراصل سرجری میں استعمال ہونے والا ایک خطرناک کٹر تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ شخص سرجن اسمتھ کے ماتحت عملے میں سے تھا اور اس کا تعلق اسی برادری سے تھا جس کے دو افراد نے چند دن پہلے لال بھون میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ دونوں افراد لال بھون کے گارڈز میں شامل تھے۔

سر پر لگنے والی سخت چوٹ کے سبب حملہ آور نڈھال ہو گیا۔ اس کے باوجود اس کا واویلا جاری تھا۔ ''تم مکار ہو۔ تم نے دھوکا کیا ہے۔ سر جارج نے تم کو بازوؤں پر اٹھایا تھا۔ تم ہار چکے تھے۔ تم نے ہارنے کے بعد ان پر وار کیا۔ تم نے جیت نا ہیں پائی، تم نے... ہتھیا لی ہے۔ تم ہتھیارے ہو۔ تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ اس جنم میں بھی اور بعد کے ہر جنم میں بھی...''

وہ دہاڑتا رہا۔ گارڈز اسے کھینچ کر باہر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اور اچھل اچھل کر بول رہا تھا۔ ''تم نے ایک مہان شخص کی ہتھیا کی ہے۔ ایک ایسے بندے کو مارا ہے جس کی وجہ سے سیکڑوں

گھروں کے چولہے جلتے تھے۔ ہزاروں کنیاؤں کی ڈولیاں اٹھتی تھیں۔ بھگوان تمہیں کبھی شما نا ہیں کرے گا... او زنہ ہم کریں گے۔'' وہ اتنے زور سے بول رہا تھا کہ اس کی آواز بیٹھ گئی اور الفاظ گڈمڈ ہو گئے...

گارڈز اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ تیز دھار آلہ عمران کے ہاتھ میں تھا۔ عمران نے مزید احتیاط کے طور پر میرے کمرے کی طرف آنے والے تمام دروازے بند کرا دیے اور نگرانی پر مامور گارڈز کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔

''ایک بار پھر جان بچانے کا شکریہ۔'' میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ تم صرف میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایسی متوالا نہ حرکتیں کرتے ہو۔''

''تم دیکھ ہی رہے ہو، میں نے کچھ نہیں کیا بلکہ ابھی تو میں کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔''

''ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا پھر میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھا! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسی بارے میں بات کر رہے تھے۔ توہم پرستی کا روگ آسانی سے جان نہیں چھوڑتا۔ ایسے روگیوں کے پاس ہر بڑی سے بڑی دلیل کا جواب موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنے پھپھوندی زدہ عقیدوں کو اپنے سامنے پاش پاش ہوتے دیکھتے ہیں لیکن انہیں پھر سے جوڑ لیتے ہیں۔ اب دیکھو... یہ وہی لوگ ہیں جو کہہ رہے تھے کہ تمہاری پتنی کے پاپ کی وجہ سے تمہاری شکست لازم ہے۔ اب وہ اس لڑائی کے نتیجے کو ہی تسلیم نہیں کر رہے۔ لیکن ایسا کرنے والے بہت کم لوگ ہی ہوں گے۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ ساری دنیا نے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کے پاس فیصلہ کرنے کی اتھارٹی تھی، انہوں نے بھی متفقہ طور پر تمہیں فاتح قرار دیا ہے۔''

''یہ بندہ کیا بکتا رہا تھا؟''

''یہ بڑا کمزور نکتہ تھا۔ کہہ رہا تھا کہ جارج تمہیں بازوؤں پر اٹھا کر سر سے بلند کر چکا تھا... اور لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ یہ بات کوئی نہیں مانے گا۔ سامبر کے اصولوں کے مطابق لڑائی تب ختم ہوتی ہے جب وہ تمہیں اکھاڑے میں پٹخ دیتا۔ خیر چھوڑو، یہ تو فاضل بحث ہے۔ اب نئی صورتِ حال پر غور کرو۔ تم پر پھر قاتلانہ حملے کی کوشش ہوئی ہے... یہ خبر بھی دو تین گھنٹے کے اندر پورے نگر میں پھیل جائے گی۔ لوگوں میں پھر ہلچل پیدا ہو گی۔ شہر کی آبادی پہلے ہی دو دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔''

''یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے تو یہی لگتا ہے عمران کہ جتنی جلدی ہو ہم یہاں سے نکل جائیں۔''

''تمہارے زخموں کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم کوشش کرتے۔''

''اب بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی ذمے داری پر جانا چاہیں تو انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

''اعتراض کی بات تو ہے یار! ابھی تم ملنے جلنے کے قابل بھی نہیں ہو۔ دشوار راستوں کا طویل سفر تو دور کی بات ہے۔''

☆☆☆

میرے اگلے چار پانچ روز کافی تکلیف میں گزرے لیکن پھر بتدریج طبیعت بہتر ہونے لگی۔ میری سیکیورٹی پہلے سے زیادہ سخت کر دی گئی تھی۔ عمران بھی زیادہ وقت میرے آس پاس ہی گزارتا تھا۔ تاہم کسی وقت وہ اوجھل بھی ہو جاتا... ساتویں کے جشن کے روز جو گاڑی اس نے انعام میں جیتی تھی، وہ اسے مل گئی تھی۔ وہ کسی وقت اس پر سیر کے لیے بھی نکل جاتا۔ ایک دو بار وہ اپنے ساتھ گیتا لکشمی کو بھی لے گیا۔ اس کی یہ مصروفیت میرے لیے پریشان کن تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ یہ تو یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ میرا قریبی ساتھی ہے اور مجھے بجانڈیل اسٹیٹ سے نکالنے کے لیے یہاں آیا ہوا ہے مگر یہ تو سب جانتے تھے کہ وہ بھی پاکستانی ہے اور میری ٹریننگ وغیرہ میں میرا ساتھ دیتا رہا ہے۔

میں نے ایک دو بار اسے آزادانہ گھومنے سے منع بھی کیا لیکن وہ سنتا کب تھا۔ دوستیاں بنانا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور وہ مشکل ترین لوگوں میں بھی اپنے پرستار پیدا کر لیتا تھا۔ یہاں بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر پھر ایک روز ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی ہم دونوں میں سے شاید کسی کو توقع نہیں تھی۔

منیجر مدن میرے پاس آیا اور بولا۔ ''تمہیں پتا چلا ہے، عمران کو چوٹیں لگی ہیں۔''

''کیسے؟'' میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مجھے پوری جانکاری تو نا ہیں... لیکن معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اس سے اس کی گاڑی چھینی ہے۔''

میں نے اتھا پکڑ لیا۔ مدن نے کہا۔ ''ایمرجنسی والے کمرے میں اس کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ دیسے وہ بالکل خیریت سے ہے۔''

یہ پریشان کن خبر تھی۔ کچھ ہی دیر بعد عمران سر اور ہاتھ پر پٹی باندھے مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ ''شا اچھا! یہ نام

دکھایا ہے تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''ضرورت مند ڈاکو تھے۔ مجھے ان پر ترس آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بھائی صاحب! یہ ہماری پہلی پہلی واردات ہے۔ اگر کوئی غلطی ہو گئی تو معاف کر دیں۔ میں سمجھ گیا کہ انہوں نے کیا غلطی کرنی ہے۔ انہوں نے ڈر کر خوامخواہ ہی گولی چلا دینی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ مفت میں گولی کھانے کے بجائے، ان کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی کر دی جائے۔ کیریئر کے شروع میں نوجوانوں کو واقعی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔''

میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے اندر جھانکنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ کبھی کبھی حیران کن فیاضی کا مظاہرہ بھی کر جاتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''کہیں سچ مچ کسی کو تحفے میں تو نہیں دے آئے گاڑی؟''

''تابش صاحب! اگر دے بھی آیا ہوں تو کسی دوسرے کی دُم پر تو پاؤں نہیں آنا چاہیے۔ میری اپنی گاڑی تھی۔''

شاید وہ پھر اپنی ہانکنا شروع کر دیتا مگر مجھے سنجیدہ دیکھ کر اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔ ویسے بھی منیجر کی موجودگی میں وہ میرے ساتھ زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ وہ زرگاں کی نہر کے ساتھ ساتھ کچھ آگے تک چلا گیا۔ واپسی پر جیپ کا پہیا پنکچر ہو گیا۔ وہ پہیا بدل کر اٹھ ہی رہا تھا کہ چار بندوں نے اس پر اسلحہ تان لیا۔ اس کے پاس میڈم صفورا کا فراہم کردہ پستول تو موجود تھا مگر وہ جیپ کے ڈیش بورڈ میں رکھا تھا۔ ایک شخص نے اچانک اس پر پیچھے سے رائفل کے دستے کا وار کیا، وہ گر گیا۔ انہوں نے اس پر دو رائفلیں تانے رکھیں اور جیپ لے کر نکل گئے۔

عمران جیسے بندے سے یوں گاڑی چھین کر لے جانا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ کئی دفعہ جب بندہ خطرے کی طرف سے بالکل غافل ہوتا ہے تو بے دست و پا ہو بھی سکتا ہے۔ پھر عمران کو جو چوٹیں لگی تھیں، ان سے بھی تصدیق ہوتی تھی کہ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔

عمران نے میری تفتیشی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے تابش صاحب، ابھی تمہاری پوری تسلی نہیں ہوئی... پر حقیقت وہی ہے جو میں نے بتا دی ہے۔ میں لڑائی بھڑائی کر سکتا تھا لیکن اس میں کافی ''رسک'' تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو دن میں ہی حکم جی کے ہرکارے کہیں نہ کہیں سے گاڑی برآمد کر لیں گے۔ یہاں کوئی ایسا قبائلی علاقہ تو ہے نہیں جہاں لے جا کر گاڑی کا تہ و بالا غائب کر دیا جائے۔''

منیجر مدن لال بولا۔ ''خیر! اس لحاظ سے تو تم نے واقعی عقل مندی کی ہے کہ گاڑی کے لیے کوئی بڑا خطرہ مول نہیں لیا۔ یہاں اس علاقے میں اس طرح کی کچھ وارداتیں پہلے بھی ہوئی ہیں۔ راہزنوں کی دو تین ٹولیاں ہیں جو ایسے کام کرتی رہتی ہیں۔ لیکن عام طور پر ان کی واردات پکڑی جاتی ہے۔''

اسی دوران میں شاہی محافظوں کا ایک لمبا تڑنگا انچارج اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے عمران کی خیر خیریت دریافت کی پھر اس سے واقعے کی تفصیل جاننے میں مصروف ہو گیا۔

اسی روز شام کو اطلاع ملی کہ زرگاں کی جیل میں زبردست بلوا ہوا ہے۔ قیدیوں نے جیل توڑنے کی کوشش کی ہے۔ جیل کی انتظامیہ نے پہلے ہوائی اور پھر سیدھی فائرنگ کی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں کم و بیش آٹھ قیدی ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے ہیں۔ طاقت کے بے رحمانہ استعمال کے بعد انتظامیہ قیدیوں کو واپس بیرکوں میں بند کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے مگر کشیدگی برقرار ہے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد عمران اس سلسلے میں پوری تفصیل لے کر آ گیا۔ اس نے بتایا۔ ''اس واقعے کی وجہ وہی والی چاکنگ ہی ہے جس میں قیدیوں کو جارج کی شکست اور موت کی مبارک باد دی گئی تھی۔ جیل حکام نے اس سلسلے میں پانچ چھ افراد کو گرفتار کیا تھا۔ پتا چلا ہے کہ بعد میں ان میں سے چار قیدیوں کو ٹیکا لگا کر مار دیا گیا ہے۔''

''کیسا ٹیکا؟'' میں حیران رہ گیا۔

''وہی جو ایک دفعہ ہماری میڈم صفورا ہمیں لگانے لگی تھی۔ اس نے ساری تفصیل تو بتائی تھی تمہیں۔ وہ درد کا ٹیکا ہے لیکن درد روکنے والا نہیں، درد شروع کرنے والا۔''

مجھے ساری تفصیل یاد آ گئی۔ وہ سبزی مائل مہلک دوا جس کے بارے میں میڈم نے بتایا تھا کہ یہ بندے کو مچھلی کی طرح تڑپاتی ہے اور اس کی دوسری ڈوز اسے زندگی کی سرحد پار کرا دیتی ہے۔ میڈم کے مطابق زرگاں میں سولی کی سزا کے بعد یہ دوسری بڑی سزا تھی اور یہ سزا چار افراد کو صرف اس بنا پر دی گئی تھی کہ انہوں نے اپنے بے رحم صیاد کی موت پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

عمران نے بتایا۔ ''ٹیکے کی سزا والی خبر پھیلی تو قیدی مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے گارڈز کی وردیاں پھاڑ دیں، انہیں مارا پیٹا... اور کوٹھریوں میں بند کر دیا۔ وہ شاید جیل توڑنے میں بھی کامیاب ہو جاتے مگر زبردست فائرنگ نے انہیں بے بس کر دیا۔ اب جیل حکام نے سو کے قریب قیدیوں کو پکڑ لیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ان میں سے تیس چالیس قیدیوں کو مثالی سزا دی جائے گی تاکہ باقیوں کو عبرت ہو۔''

''مثالی سزا سے کیا مطلب؟''

''اسحاق والی سزا۔ سرِعام سولی پر ٹانک کر ہڈیوں کا چورا اور پھر موت۔'' عمران نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کوئی قانون بھی لاگو ہوتا ہے یہاں؟ یا جو کچھ حکم جی کے دماغ میں آئے وہی قانون ہے۔'' میں نے کہا۔

''حکم جی کا تو نام ہی حکم ہے، وہ حکم صادر نہیں کرے گا تو کیا گنگو تیلی کرے گا... لیکن یہ بات سچ ہے کہ اس طرح کی حاکمیت بغاوت کو جنم دیتی ہے اور یہی کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ پکڑے جانے والے زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک آدھ دن میں تل پانی سے بھی کوئی گرماگرم خبر آ جائے گی۔ اس سے پہلے بھی زرگاں اور تل پانی میں اسی وجہ سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جارج گورا کی جیل میں انور خان کا ساتھ دینے والے کئی قیدیوں کو سرِعام سولی چڑھایا گیا تھا۔''

''لگتا ہے کہ حالات پھر کشیدہ ہو رہے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم کسی گڑبڑ سے پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں۔'' میں نے پوچھا۔

عمران بولا۔ ''کل میڈم صفورا تمہارے ڈاکٹر سے بات کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں کم از کم دس دن اور بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا۔ لیکن... میرا خیال ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو بہتر بناؤ... اور ذرا چل پھر کر دکھاؤ تو ہو سکتا ہے کہ چار پانچ روز میں ہی چھٹی مل جائے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ میں اب سفر کر سکتا ہوں۔'' میں نے بستر سے اٹھ کر چند قدم کمرے کے اندر ہی چہل قدمی کی۔

''تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ تمہیں درد ہو رہا ہے۔''

''درد تو اب اپنا ''عشق'' ہے یار! اس کی کوئی پریشانی نہیں ہے مگر کچھ اور باتیں ضرور فکر مند کرتی ہیں۔''

''مثلاً؟'' عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے دائیں بائیں دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ حکم جی اور اس کے ہزاروں بے رحم ہرکارے ہمیں حمیدہ سمیت یہاں سے نکل جانے دیں گے؟''

''یہ بات واقعی سوچنے کی ہے۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ پنڈت مہاراج نے یہاں انصاف کا جھنڈا لہرایا ہوا ہے۔ وہ یہاں وہی کچھ کر رہا ہے جو دھرم کی کتابوں اور پوتھیوں شاستروں وغیرہ میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن اندر سے اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ وہ بھی اسی حد تک جا سکتا ہے جس حد تک اسے اپنی خیریت نظر آئے گی۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو... کیا ہمیں یہاں سے روانہ کرنے کی باتیں بس ڈھکوسلا ہیں؟''

''خیر! ایسا تو نہیں ہے۔ زرگاں کے مسلمانوں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لیے حکم اور اس کے ساتھیوں کو کچھ تو کرنا ہوگا۔ وہ زبان دے چکے ہیں، اگر صاف مکر یں گے تو ان کی ساکھ کا بیڑا غرق ہوگا۔ ہاں، ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ عین موقع پر تمہاری اور حمیدہ کی روانگی روکنے کے لیے کوئی زبردست عذر تراش لیں یا پھر ایک خاص فاصلے تک تمہیں محفوظ راستہ دینے کے بعد دوبارہ پکڑ لیں۔ یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ...'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''کیا بھی ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''چلو چھوڑو یاران باتوں کو۔ لوگ تو پہلے ہی کہتے ہیں کہ یہ نیوز چینلز والے تصویر کا سب سے مجبار رخ دکھاتے ہیں اور بعض اوقات صرف رخ ہی رخ ہوتا ہے تصویر ہوتی ہی نہیں۔'' وہ ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔

''اور لوگ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ یہ چکنے گھڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ صرف وہی بات بتاتے ہیں جو بتانا چاہتے ہیں۔''

''خدا کا خوف کرو۔ تم مجھے چکنا گھڑا کہہ رہے ہو جبکہ میرے سر پر بال ہی بال ہیں اور یہ بال یونہی میرے سر پر نہیں ہیں۔ اس کے لیے بڑی محنت ہوئی ہے۔ اپنے دماغ کو بہت بچا کر رکھتے ہیں ہم لوگ۔ بُرے سے بُرے حالات میں بھی اس پر زور نہیں پڑنے دیتے۔ یہ دانش کا دور نہیں، نیس ویلیو کا دور ہے۔ اسکرین پر اپنی آب و تاب برقرار رکھنا پڑتی ہے۔ باقی دانش کا کیا ہے؟ یہ تو انٹرنیٹ سے آ ہی جاتی ہے۔ میں منٹ انٹرنیٹ کے سامنے بیٹھو، کسی بھی موضوع پر علامہ کا درجہ پا جاؤ گے...''

وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا اور اصل موضوع وہیں دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بہرحال، یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ہماری روانگی کے حوالے سے عمران کے ذہن میں بھی بہت سے خدشات موجود ہیں۔ آنے والا وقت ایک گہری دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اس دھند میں داخل ہونے سے پہلے یہ جاننا مشکل تھا کہ اندر کیا ہے۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور میں لال بھون میں میڈم صفورا کے پاس آ گیا۔ لال بھون میں آج کل سناٹا تھا۔ ساتویں کا جشن گزرے ابھی پندرہ بیس دن ہی ہوئے تھے۔ پریوں کے انتخاب میں حصہ لینے والی دوشیزاؤں کی تربیت کی گہما گہمی اب یہاں نہیں تھی۔ وہ گھنگروؤں کی جھنکار، وہ سریلے قہقہے... اور رنگ برنگے آنچل۔ وہ سب کچھ کہیں اور تھا۔ غالباً وہ سب کچھ ابھی تک راج بھون کی خلوت گاہوں کو چمکا رہا تھا۔ رنگ برنگے آنچلوں میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے دودھیا ہاتھ مے نوشوں کے لیے جام بنا رہے تھے... سریلی ہنسی شباب پرستوں کے کانوں میں رس گھول رہی تھی... اور لال بھون میں سناٹا تھا۔

گیتا کبھی بھی بس آرام ہی فرما رہی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہی سنوری نظر آتی تھی اور شاید اس کی ایک وجہ عمران بھی تھا۔ وہ اس کی ہلکی پھلکی حوصلہ افزائی کرتا رہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ حوصلہ افزائی صرف باتوں تک محدود ہے۔ دونوں گفتگو کے دھنی تھے۔ گیتا سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے بولتی تھی اور عمران کے پاس اس رفتار کا توڑ موجود تھا۔

حمیدہ بھی لال بھون میں ہی موجود تھی۔ وہ سوگوار حسن کی مثال نظر آتی تھی۔ اس کا شوہر صرف ایک سال پہلے اسے دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یقیناً وہ ابھی اس کی موت کا غم بھول نہیں سکی تھی۔ اب اس کا دیور بھی اسے ایک نہ بھولنے والا دکھ دے گیا تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں یہ خوف جما ہوا تھا کہ ابھی وہ خطرے میں ہے۔ غالباً ہماری طرح اسے بھی یقین نہیں تھا کہ وہ زرگاں سے بحفاظت نکل سکے گی۔ اس کی عجیب سی کیفیت تھی۔ ذرا سی آہٹ پر چونک جاتی۔ کوئی آواز دیتا تو بدک اٹھتی۔ کہتے ہیں کہ درندے کی دہشت، درندے کے جانے کے بعد بھی تادیر اس کے شکار پر طاری رہتی ہے۔ حمیدہ بھی جارج کا شکار تھی۔ وہ اس کے قبضے میں رہی تھی۔ اب وہ عدم آباد روانہ ہو چکا تھا۔ حمیدہ آزاد تھی مگر گزرے دنوں کا ہراس جیسے اس کی روح میں جذب ہو گیا تھا۔

مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ میں نے تادیر اس سے گفتگو کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد میرے ساتھ آزاد فضاؤں میں پہنچنے والی ہے۔ وہ بس 'ہوں ہاں' میں جواب دیتی رہی۔ آخر میں اس نے لرزتی آواز میں بس اتنا کہا۔ ''میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے میری خاطر اتنا بڑا خطرہ جھیلا۔ اتنے سارے زخم کھائے۔ میں جتنی دیر زندہ رہی، آپ کی یہ مہربانی بھول نہیں سکوں گی۔''

''تم سے کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے گردن جھکائی اور نفی میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد ہولے سے بولی۔ ''لیکن جب میرے دیور اسحاق نے میرے لیے لڑائی کی اور ہارا تو جارج صاحب نے بہت شراب پی تھی۔ لڑکیوں کا ناچ دیکھا تھا اور مجھے بھی ناچنے کے لیے کہا تھا۔ میں نہیں ناچ سکی تو انہوں نے مجھے سخت بُرا بھلا کہا اور بولے... تم اب بہت جلد میری جورو بننے والی ہو۔ میرے طریقے کے مطابق چلنا سیکھو۔''

''اب پریشانی کی کوئی بات نہیں حمیدہ۔'' میں نے کہا۔ ''اب وہ ذلیل 'اپنے طریقے' کے مطابق چلتا ہوا قبر میں اتر چکا ہے اور ہم اپنے طریقے پر چل کر انشاء اللہ تل پانی پہنچیں گے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر ہولے سے بولی۔ ''آپ نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہارے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ ہم دونوں اسحاق کے دوست ہیں۔ تم اس کی بھابی تھیں تو ہماری بھی بھابی ہو۔''

اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ وہ اپنی سفید اوڑھنی سے آنکھوں کے کنارے پونچھ کر بولی۔ ''آپ کو میرے بارے میں اسحاق نے بتایا تھا؟''

''نہیں، یہ کوئی اور تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اسی نے ہمیں تمہاری ساری کہانی سنائی اور بتایا کہ تم کس حال میں ہو۔''

''کون تھا وہ؟'' وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔

''تمہاری ایک خیرخواہ... لیکن اس کے بارے میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

اسی دوران میں میڈم صفورا کی آواز آنے لگی۔ وہ راج بھون سے واپس آئی تھی اور ملازموں کو ضروری ہدایات دے رہی تھی۔ باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ عمارت کی ڈیوڑھی سے اندر آنے کے لیے میڈم کو یقیناً چھتری کی ضرورت تھی۔ عمران نے مجھے آنکھ ماری اور پھر ایک چھتری لے کر بڑے ''خادمانہ'' انداز میں جلدی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں عمران نے میڈم کے ساتھ اپنے تعلقات کافی سے زیادہ بہتر کر لیے تھے۔ اسے دلوں میں گھر کرنے کا فن آتا تھا۔ وہ اپنے مخالفین پر زبردست خوش اخلاقی اور اپنائیت سے حملہ آور ہوتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی نفرت کے دانت کھٹے کر دیتا تھا۔ میڈم کی ''دشمنی'' پر اس نے پہلا شدید حملہ تب کیا جب ہند کرنے میں زہریلے سانپ نے میڈم کو ڈسا تھا۔ عمران نے بے دریغ اپنے ہونٹ میڈم کے زہریلے زخم پر رکھ دیے تھے اور دراصل یہیں سے ان کے تعلق نے ایک نیا موڑ لینا شروع کر دیا تھا۔ میڈم کے لیے اپنی چھوٹی بہن کے قاتل کو معاف کرنا آسان نہیں تھا... مگر دھیرے دھیرے ایسا ہو رہا تھا... اور اب تو کسی وقت لگتا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔

تھوڑی دیر بعد میڈم اور عمران باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عمران خود بھیگ گیا تھا مگر میڈم کے اوپر چھتری موجود رہی تھی۔ میڈم کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ راج بھون سے کامیاب لوٹی ہے۔ دراصل میں نے میڈم صفورا سے کہہ رکھا تھا کہ وہ حکم سے اس بات کی اجازت لے کہ میں عمران کو اپنے ساتھ تل پانی لے جا سکوں۔ وہ اسی سلسلے میں راج بھون گئی ہوئی تھی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ میڈم نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ حکم جی نے میری یہ استدعا قبول کر لی ہے۔ میں اپنے ہم وطن کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔

عمران نے کہا۔ ''کیا بات ہے میڈم! ہماری ہر استدعا مانی جا رہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہو تو کہیں کچھ غلط بھی ہوتا ہے۔''

میڈم فوری جواب دینے کے بجائے سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر بعد بولی۔ ''اس موقع پر یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندیشے غلط ہوں۔ پنڈت مہاراج نے واقعی راج بھون والوں کو قائل کر لیا ہو کہ ''کٹ منٹ'' کے مطابق تابش کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ کل رات بھی پنڈت مہاراج اور حکم جی کی طویل میٹنگ ہوئی ہے۔ اس میٹنگ میں رنجیت پانڈے شریک نہیں تھا حالانکہ ایسے موقعوں پر وہ شریک ہوتا ہے۔ تمہاری بحفاظت روانگی اور سیکیورٹی کی ذمے داری ایک مسلمان فوجی افسر بشارت علی خان کو سونپی گئی ہے۔ وہی تمہیں زرگاں کی آخری حد تک لے جائے گا۔ بہرحال ابھی اس بارے میں حتمی فیصلہ ہونا ہے...'' وہ آگے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر خاموش ہو گئی۔

عمران نے کریدا۔ ''آپ کچھ بتانے لگی تھیں؟''

اس نے طویل سانس لی اور بولی۔ ''کچھ باتیں شک رفع کرنے والی ہیں تو کچھ شک ڈالنے والی بھی ہیں۔ تمہیں وہ بڑھیا تو یاد ہے نا جس نے حکم جی کے دربار میں ہنگامہ مچایا تھا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میڈم بولی۔ ''گیتا بھی او

اردگرد کی بڑی خبر رہتی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ پرسوں صبح بڑھیا نے پھر بڑا غدر مچایا ہے۔ اس نے چار پانچ دن سے کھانا پینا بند کر رکھا تھا۔ پرسوں صبح وہ محافظوں کے روکنے کے باوجود بھرے دربار میں چلی آئی۔ اس نے اس بات پر سخت احتجاج کیا کہ سامبر کی آڑ میں تم جیسے بڑے اپرادھی کو چھوڑا جارہا ہے۔ اس نے واویلا کیا کہ دھرم کے پالن کے لیے اس نے اپنی پوری فیملی قربان کی ہے۔ اب وہ خود کو بھی قربان کردے گی۔ اس نے خود کو باقاعدہ آگ لگانے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے اسے سنبھالا گیا۔ بعدازاں حکم جی اور رتنا دیوی وغیرہ نے اسے علیحدگی میں سمجھایا بجھایا۔ یہ بڑھیا اب بالکل مطمئن نظر آتی ہے۔ گیتا مکھی بتارہی تھی کہ وہ اب کھا پی بھی رہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ اس میں یہ تبدیلی کیوں آئی ہے...''

کچھ دیر تک اس بارے میں بات ہوئی پھر عمران نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''میڈم! تو پھر آپ نے اپنے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کب پہنچ رہی ہیں نل پانی؟''

''تمہیں اتنی فکر کیوں ہے میری؟''

''آپ کی فکر کیوں نہیں ہوگی۔ یقین کریں ان چند ہفتوں میں آپ کی اتنی عادت ہوگئی ہے کہ آپ کی کمی بے طرح محسوس ہوگی... اور ویسے بھی ہمارا ساتھ کوئی آج کا تو نہیں ہے میڈم۔ برسوں کی بات ہے۔''

''الومت بناؤ۔ میں جانتی ہوں تم یہاں اسٹیٹ میں صرف تابش کے لیے آئے۔ میرے یا ابرار صدیقی کے بارے میں تم نے بھول کر بھی نہیں سوچا ہوگا۔''

''ایسا مت کہیں میڈم! آپ نہیں جانتیں کہ آپ ہمارے لیے کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ یقین کریں، میں تو چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ آپ ہمارے ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوں۔''

''اور تم جانتے ہو، ایسا ممکن نہیں ہے۔'' میڈم مسکرائی۔ پھر سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، مستقبل قریب میں امید رکھی جاسکتی ہے۔ میں کوئی ایسا موقع تلاش کروں گی کہ یہاں سے نکل کر نل پانی پہنچ سکوں۔''

''لیکن آپ کوئی بڑا خطرہ مول مت لیں۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔ ''اگر بڑا خطرہ مول لینا پڑے تو پھر آپ انتظار کریں۔ ہمارا وعدہ ہے میڈم! ہم آپ کو اور ابرار صدیقی کو لیے بغیر اسٹیٹ سے نہیں جائیں گے۔''

''میں نے بہت پہلے وعدوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بہرحال، اچھے کی امید تم بھی رکھو میں بھی رکھتی ہوں۔'' میڈم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ پھر ذرا توقف کرکے کہنے لگی۔ ''تابش! تم اپنا بہت خیال رکھو۔ تم نے جارج جیسے شخص کو ہرا کر جہاں ایک بے مثال وکٹری حاصل کی ہے، وہاں اپنے بہت سے دشمن بھی بنا لیے ہیں۔ یہ دشمن صرف یہاں ہی نہیں نل پانی میں بھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتے ہیں۔''

میں نے میڈم صفورا کو یقین دلایا کہ میں اس کی ہدایات پر عمل کروں گا۔

...اور پھر ہماری روانگی کی تیاری مکمل ہوگئی۔ ہم عجب تذبذب کی کیفیت میں تھے۔ کبھی لگتا تھا کہ ہمیں نیک نیتی کے ساتھ یہاں سے روانہ کیا جارہا ہے۔ کبھی دال میں کچھ کالا لگتا تھا۔ ایک دن پہلے پنڈت مہاراج نے لال بھون آکر مجھے آشیرباد دی اور کہا کہ نہایت نامساعد حالات کے باوجود حکم جی اپنا وعدہ پورا کررہے ہیں اور مجھے حمیدہ بی بی کے ساتھ زرگاں سے روانہ کیا جارہا ہے۔

میں نے پنڈت مہاراج کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میری سلامتی اور بخیریت واپسی میں ان کا کردار ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

پنڈت مہاراج ان لوگوں میں سے تھا جو میانہ رو ہوتے ہیں۔ انہیں برا کہا جاسکتا ہے نہ اچھا، نہ سیاہ نہ سفید۔ ان میں انسانی خوبیاں اور خامیاں ایک عجیب امتزاج کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔

روانگی سے ایک رات پہلے میں نے لال بھون کے ایک کمرے میں عجیب منظر دیکھا۔ عمران اور میں ساتھ ساتھ ہی فرش پر سوتے تھے۔ رات کے وقت میری آنکھ کھلی تو عمران موجود نہیں تھا... میں نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ دروازے کے ہینڈل کو گھمایا۔ وہ لاک نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عمران باہر نکلا ہے۔ میں نے باہر نکل کر راہداری میں جھانکا۔ آخری سرے پر جہاں لڑکیوں کی ٹریٹر گیتا مکھی کا کمرا تھا روشنی نظر آرہی تھی۔ میں دبے پاؤں دروازے تک پہنچا۔ کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر مدھم بلب کی روشنی تھی۔ شروع میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر کمرے کے اندر حرکت ہوئی اور خوش قسمتی سے میں عمران اور گیتا مکھی کو دیکھنے میں کامیاب رہا۔ گیتا مکھی کی جوانی ڈھل رہی تھی اور ساتھ ہی اس کا اوج دار جسم بھی۔ وہ زیادہ خوش شکل بھی نہیں تھی۔ بس اس کا فن اور رقص میں اس کی مہارت تھی جس کی وجہ سے اس

کی قدر تھی۔ لڑکیوں کی استاد کی حیثیت سے وہ اچھی خاصی تنخواہ پاتی تھی۔ زرگاں کے خواص سے اس کے تعلقات تھے۔ عمران اس سے دل لگی کرتا رہتا تھا لیکن یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں عمران جیسے وجیہہ اسمارٹ شخص کو گیتا جیسی ڈھلی ہوئی عورت کے اتنا قریب پاؤں گا۔ میں نے اسے عمران کے بالکل پاس کھڑے ہوکر باتیں کرتے دیکھا۔ پھر وہ عجب جذباتی انداز میں عمران کے گلے لگ گئی اور عمران کے رخسار کا بوسہ لیا۔ یہ کافی طویل بوسہ ثابت ہوا۔ اسی دوران میں اس نے عمران کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ عمران نے بھی اپنی بانہیں اس کے گرد حمائل کردیں۔ عمران کے رخسار کے بعد اس کے ہونٹوں کی باری آئی... وہ اس کے ساتھ پیوست سی ہوگئی۔ وہ قریباً نصف منٹ تک اسی طرح کھڑے رہے پھر وہ لال بھبوکا چہرے کے ساتھ عمران سے علیحدہ ہوگئی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران باہر آنا چاہ رہا ہے۔ میں جلدی سے ہٹ گیا اور واپس کمرے میں پہنچ کر فرشی بستر پر دراز ہوگیا۔ ایک دو منٹ بعد عمران بھی واپس آگیا۔ اس نے کھوجی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ میں جاگ تو نہیں رہا۔ پتا نہیں کہ اس کا شک رفع ہوا یا نہیں، بہرحال وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ میں نے بھی خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ وہ اپنی طرز کا انوکھا بندہ تھا۔ اس کی کسی بھی بات کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔

اگلے روز علی الصباح ہم لال بھون سے روانہ ہوگئے۔ سردی کا زور کم ہوتا جارہا تھا۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ زرگاں کے مندروں اور گرجوں کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ راج بھون کی عظیم الشان عمارت کی بلندیاں بھی لشکارے مار رہی تھیں۔ اس عظیم الشان عمارت میں چند ہفتے پہلے ہم دونوں نے ''نزول'' کیا تھا اور بار دھاڑ کے موسم کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں پر بھرے دربار میں حکم جی اور عمران کے درمیان یادگار مکالمہ ہوا تھا جس میں عمران نے فتح پائی تھی۔ یہیں پر ساتویں کا جشن برپا ہوا تھا اور رنگ و بو کا سیلاب آیا تھا۔ یہیں پر میرے اور جارج گورا کے درمیان یادگار مقابلہ ہوا اور جارج گورا ایک سنگین غلطی کے سبب رام پوری چاقو کا شکار ہوا۔

زرگاں حد نگاہ تک ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا اور اس کی ساری خوبیوں اور خامیوں سمیت ہم اسے چھوڑ کر جارہے تھے۔ اس کی ساری خوب صورتیاں اور بدصورتیاں، ساری محبتیں اور نفرتیں ہم سے جدا ہورہی تھیں۔ لیکن کیا ہم واقعی جارہے تھے؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں، حمیدہ اور عمران ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار تھے۔ نیجر مدن بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس گھوڑا گاڑی کو چاروں طرف سے مسلح گارڈز نے گھیرا ہوا تھا۔ ایک اور گھوڑا گاڑی بھی نظر آرہی تھی۔ نیجر مدن نے بتایا کہ اس میں پنڈت مہاراج کا ایک نمائندہ ہے اور دربار کے ایک دو عہدے دار ہیں۔

میڈم صفورا نے بتایا تھا کہ ہماری روانگی کو راز رکھا جارہا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں اندازہ ہوا کہ مسلح گارڈز کے حصار سے آگے بہت سے عام لوگ بھی موجود ہیں... ان میں ہمارے حمایتی تھے اور مخالف بھی۔ بہرحال حمایتیوں کی تعداد زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ ان کے نعرے ہم تک پہنچ رہے تھے۔ دوسری طرف مخالفانہ نعروں کی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک رسائی حاصل کررہی تھیں۔ مخالفانہ نعروں کا مفہوم یہ تھا کہ میں اپرادھی ہوں، میری جگہ نل پانی نہیں، زرگاں کی جیل ہے وغیرہ وغیرہ۔

میری حمایت کے نعرے کچھ دبے دبے تھے مگر نعرہ زن افراد کی تعداد زیادہ تھی... میں نے سوچا ہوسکتا ہے کہ ان نعرہ زن افراد میں وہ لڑکی بھی شامل ہو جس نے شروع شروع میں ہمیں زرگاں میں پناہ دی تھی۔ اس کا نام جنتی تھا۔ ہم اتفاقاً اس کے گھر میں گھسے تھے۔ وہ حمیدہ کی سہیلی نکلی تھی اور اسی نے ہمیں حمیدہ کی مصیبت سے سب سے پہلے آگاہ کیا تھا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ ریٹائرڈ فوجی اہلکار کی وہ خوش باطن لڑکی بھی ہمیں الوداع کہنے والوں میں شامل ہے اور اپنی سہیلی کی رہائی کی خوشی اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر چمک رہی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''جنتی! اگر تو ہمیں دیکھ رہی ہے تو جان لے کہ ہم نے یہاں تک اپنا وعدہ پورا کیا۔ اسحاق کے بے رحم قاتل کو جہنم واصل کیا اور تیری سہیلی کو رہائی دلائی۔ اب آگے کیا ہونا ہے، یہ ہم نہیں جانتے۔ انسان کا کام کوشش ہے اور وہ ہم کررہے ہیں۔''

ہمارے سیکیورٹی گارڈز کا انچارج وہی بشارت علی خان نامی افسر تھا۔ وہ اپنے چتکبرے گھوڑے پر سوار ہماری گھوڑا گاڑی کے بالکل ساتھ جڑا کھڑا تھا۔ اس کی شخصیت متاثر کن تھی۔ مسلح گارڈز کے عقب میں میری نگاہ ایک اور شخص پر پڑی۔ یہ رنجیت پانڈے تھا۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ ہمارے ساتھ نہیں جارہا تھا۔ شاید وہ ہماری روانگی کا نظارہ کرنے کے لیے یہاں موجود تھا۔ اس کا سانولا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نفرت کی سرخی تھی۔ جارج کی

شکست نے جہاں ہمارے اور بہت سے بدخواہوں کو گہری مایوسی میں دھکیلا تھا، وہاں رنجیت پانڈے کے غیظ و غضب کی کمر بھی توڑ کر رکھ دی تھی۔ سامبر مقابلے کے بعد سے رنجیت پانڈے ایک بار بھی میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ اب بھی وہ گھوڑا گاڑی سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا۔

ہمیں "الوداع" کرنے والوں میں گیتا کھی بھی شامل تھی۔ وہ میڈم صفورا کے عقب میں کھڑی تھی۔ میں جب سے یہاں آیا تھا، گیتا کھی کو باتیں کرتے ہی دیکھا تھا۔ آج وہ پہلی بار گم صم نظر آئی۔ گھوڑا گاڑی حرکت میں آئی تو اس نے بھی الوداعی انداز میں ہماری طرف ہاتھ ہلایا مگر مجھے لگا کہ اس نے یہ ہاتھ صرف عمران کے لیے ہلایا ہے۔

نل پانی کی طرف ہمارا سفر شروع ہوا۔ میجر مدن نے ہمیں بتایا۔ "یہاں سے قریباً ساٹھ کلومیٹر کی دوری پر وہ جگہ ہے جسے "جوڑا ٹیلے" کہا جاوت ہے۔ یہ دراصل دو ٹیلے ہیں جہاں پر زرگاں کی حد ختم ہو جاوت ہے۔ ان ٹیلوں کے پاس سے گزرنے والے ایک برساتی نالے کو ہم زرگاں کی سرحد بھی کہہ سکت ہیں۔ آپ لوگن کے ساتھ جو گارڈز جا رہے ہیں، وہ آپ کو اس سرحد تک پہنچانے کے ذمے دار ہیں۔ اس سے آگے آپ خود سفر کریں گے۔"

"اسی گھوڑا گاڑی پر؟" میں نے پوچھا۔

"نا ہیں جی۔ آگے کچھ دشوار راستے بھی ہیں جہاں گھوڑا گاڑی کے لیے چلنا مشکل ہووے گا۔ آپ کو گھوڑے دیے جاویں گے۔ دو دن کا راشن دیا جاوے گا۔ اپنی رکھشا کے لیے آپ کو دو رائفلیں بھی مہیا کی جاویں گی۔"

"اس کے بعد ہم جائیں اور ہمارا کام؟" عمران نے لقمہ دیا۔

"ہاں، پنڈت مہاراج کے فیصلے کے مطابق اس کے بعد آپ کو خود ہی سفر کرنا ہووے گا۔"

سنہری دھوپ حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ گاڑی کے اندر بھی خوش گوار حرارت محسوس ہو رہی تھی۔ سفر میں لگنے والے ہچکولوں کی وجہ سے میری متاثرہ پسلی میں بار بار درد کی لہر اٹھتی تھی مگر یہ قابلِ برداشت درد تھا۔ حمیدہ بدستور سہمی بیٹھی تھی۔ کسی ایسی چڑیا کی طرح جس پر خون خوار عقاب کی دہشت نے سکتہ طاری کر رکھا ہو۔ شاید اسے ابھی تک بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ اسے جارج گورا جیسے شخص سے چھڑا لیا گیا ہے اور اب وہ آزاد فضاؤں میں پہنچنے والی ہے۔

ایک جگہ درختوں کے درمیان ایک قدرتی چشمے کے قریب رک کر ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور ہمارا سفر پھر سے شروع ہوا۔ عمران اپنی پُرمزاح باتوں سے اس تناؤ کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا جو سفر کے آغاز سے ہمارے اندر موجود تھا۔

سہ پہر کے وقت ہم اس خاص مقام تک پہنچ گئے جسے "جوڑا ٹیلے" کہا جاتا تھا۔ چند ہفتے پہلے جب میں اور عمران سبزیوں سے لدی ہوئی گھوڑا گاڑی کے ساتھ دیہاتیوں کے روپ میں زرگاں پہنچے تھے تو تب بھی یہ جڑواں ٹیلے ہماری نگاہوں سے گزرے تھے۔ تاہم اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے زرگاں کی حد شروع ہوتی ہے۔

جس برساتی نالے کا مدن نے ذکر کیا تھا، وہ بالکل خشک تھا۔ اس کی گہرائی بھی معمولی سی تھی۔ اس کے کنارے ہمیں جنگلی جانوروں کے پاؤں کے نشانات نظر آئے۔ جھاڑیوں کی حالت اور درختوں کی شکست و ریخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ پالتو ہاتھی بھی یہاں سے گزرتے رہتے ہیں۔ ایک مقام پر ہمارا قافلہ رک گیا۔ پنڈت مہاراج کی نمائندگی ایک چھوٹے قد کا سیاہی مائل پنڈت کر رہا تھا۔ اس کے سر پر لمبی بودی اور گلے میں نصف درجن مالائیں تھیں۔

ہم گھوڑا گاڑی سے اترے۔ پنڈت نے ہمیں آشیرباد دی۔ سیکیورٹی کے انچارج فوجی افسر بشارت علی خان نے ہمیں بتایا کہ یہاں پر ان کی ذمے داری ختم ہو جاتی ہے۔ اب آگے ہم کو خود ہی سفر کرنا ہوگا۔

اس نے دو رائفلیں اور ایمونیشن کے دو چھوٹے بیگ ہمارے حوالے کر دیے۔ چھ صحت مند گھوڑے ہمارے لیے تیار کھڑے تھے۔ یہ تازہ دم گھوڑے پہلے سے یہاں موجود تھے۔

بشارت نے نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تین گھوڑے آپ تینوں کی سواری کے لیے ہیں۔ اس سفید گھوڑے پر آپ لوگوں کا سامان اور راشن وغیرہ ہے۔ باقی دو گھوڑے فالتو ہیں۔ راستے میں آپ کو ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

پنڈت نے کہا۔ "بھگوان سے ہماری پرارتھنا ہے کہ تم لوگن کا باقی کا سفر بھی خیریت سے گزرے۔ ہمارے لائق کوئی اور سیوا ہو تو ہمیں بتا دو۔"

"ایک گرم گرم دودھ پتی مل جاتی تو کیا بات تھی۔" عمران نے سرگوشی کی جو بس میں ہی سن سکا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" پنڈت نے عمران سے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی۔ آپ لوگوں کا پریم دیکھ کر آپ سے جدا ہونے کو دل نہیں چاہ رہا... کتنا اچھا ہوتا اگر آپ کچھ دیر اور ہمارے ساتھ رہتے۔"

"کوئی بات نا ہیں۔ ہماری پرارتھنا تو آپ کے ساتھ ہے۔"

عمران نے دائیں بائیں دیکھا۔ "کدھر ہے جی؟"

"کون؟"

"پرارتھنا۔" عمران نے کہا۔

"پرارتھنا کا مطلب ہے کہ ان کی دعا ہمارے ساتھ ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

"اوہ، میں سمجھا پنڈت جی اپنی سندر بیٹی کی بات کر رہے ہیں۔ ان سے مندر کی سیڑھیوں پر ملاقات ہوئی تھی۔ میں سمجھا شاید اس کا نام پرارتھنا ہے۔" عمران نے بتیسی نکال کر کہا۔

پنڈت کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے ناگواری سے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے سمجھ نہیں پایا کہ اس کی اس اوٹ پٹانگ بات کا کیا جواب دے۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ بے ہودگی برداشت کی اور اشلوک پڑھ کر ہمیں جانے کی اجازت دی۔

عمران نے حمیدہ کو سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا۔ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے۔ باقی تینوں گھوڑے بھی ایک ہی رسی سے بندھے ہوئے ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے زرگاں کی خیالی سرحد پار کی اور مشرق کی سمت بڑھنے لگے۔ یہ ویران راستہ تھا۔ کہیں کہیں جھاڑیاں یا اونچی جنگلی گھاس تھی۔ زمین نیم پختہ تھی۔ گھوڑے ہلکی چال چلتے "جوڑا ٹیلے" سے دور ہونے لگے۔

ہم تقریباً نصف کلومیٹر دور آ گئے تو عمران نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ہمیں رخصت کرنے والے اب ایک سیاہ لکیر کی طرح نظر آ رہے تھے۔ عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پتا ہے تابی... یہ لوگ ہمیں بڑی گرم دودھ پتی پلانے والے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یار دودھ پتی کا مطلب دودھ پتی ہوتا ہے۔ اور یہ اتنی زیادہ گرم ہوگی کہ اگر ہم نے پینے میں بے احتیاطی کی تو ہمارے تالو جل جائیں گے اور روزِ حشر تک یہ جلن کم نہیں ہو گی۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ میں نے کہا۔ "یار! سیدھی بات کیوں نہیں کر رہے ہو؟"

وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ "ان لوگوں نے ہمیں آزاد نہیں کیا... بس چھوڑا ہے... وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے۔"

"تمہارا مطلب ہے...؟" آواز میرے گلے میں اٹک گئی۔

"ہاں، میرا خیال ہے۔ ان سامنے والے درختوں تک پہنچتے پہنچتے سب کچھ سامنے آ جائے گا لیکن ابھی تم مڑ کر نہ دیکھنا... بس اسی طرح چلتے رہو۔" عمران نے جھنجلائی آواز میں کہا۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ہم نے یہ گفتگو دھیمے لہجے میں کی تھی پھر بھی ہمارے آگے جاتی ہوئی حمیدہ کچھ چونک سی گئی۔ اس نے مری مری آواز میں پوچھا۔ "کیا کوئی خطرہ ہے بھائی؟"

"نہیں... ابھی تو نہیں۔ لیکن تمہیں چوکس رہنا ہے۔" میرے بجائے عمران نے جواب دیا۔

"ایک رائفل مجھے دے دو۔" میں نے عمران سے کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ یہ کام نہیں کریں گی۔" عمران نے پورے یقین سے کہا۔

میری بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ جونہی ہم تنڈ منڈ درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پہنچے، عمران نے مڑ کر دیکھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دور ہمارے عقب میں "جوڑا ٹیلے" کے پاس سیاہ لکیر حرکت میں آ چکی تھی۔ یہ دراصل دو درجن مسلح گھڑسوار تھے جو ہمارے محافظ بن کر ہمیں یہاں تک چھوڑنے آئے تھے۔ اب وہ آندھی کی رفتار سے پھر ہماری طرف آ رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارا بدترین اندیشہ حقیقت کا روپ دھار گیا ہے۔ یہ لوگ پھر سے ہمیں پکڑنے کے لیے آ رہے تھے۔ یہ منافقت اور ریاکاری کی انتہا تھی۔ یہ ان پنڈتوں پجاریوں کی بے مثال دھوکا دہی تھی۔ پہلے ہمیں چھوڑ کر اپنے دھرم اور عقیدے کا منہ بند کیا گیا پھر ہمیں دوبارہ پکڑنے کا جواز ڈھونڈ لیا گیا۔

عمران نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھوڑے پر پیچھے بیٹھی حمیدہ والے گھوڑے کی لگام بھی تھام لی اور چلایا۔ "بھاگو تابش!"

ہم نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور انہیں ہنکا دیا۔ ہمارے عقب میں رسد والا گھوڑا اور اس کے عقب میں دونوں اضافی گھوڑے بھی بھاگ اٹھے۔ یہ کافی رفتار تھی لیکن پھر بھی اس رفتار کے مقابلے میں بہت کم تھی جو ہمارے پیچھے آنے والوں نے

پکڑ رکھی تھی۔ صاف اندازہ ہوا کہ وہ تیزی سے ہمارے قریب آرہے ہیں۔ سامنے چٹیل میدان تھا۔ اس میں بس کہیں کہیں جھاڑیاں اور خودرو درختوں کے جھنڈ تھے۔ کہیں کوئی قابل ذکر جائے پناہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''تیز دوڑاؤ تابی!'' عمران نے پھر پکار کر کہا۔

میں نے گھوڑے کی رفتار کو حتی الامکان حد تک بڑھایا۔ پسلیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ عمران کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ ہم زیادہ دور تک اس طرح نہیں جاسکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہم دو تین کلومیٹر تک اس طرح جاتے اور پھر دھر لیے جاتے۔ غالباً ہم نہتے بھی تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے عمران نے خود کہا تھا کہ نہیں دی گئی رائفلیں کام نہیں کریں گی اور لگتا تھا کہ اس نے درست کہا ہے۔۔۔

''عمران! وہ پاس آرہے ہیں۔'' میں نے ایک بار پھر پکار کر کہا۔

''آنے دو۔ تم بس آگے دھیان رکھو۔'' اس نے حمیدہ والے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے عقب میں دھول ہی دھول اور اس دھول کے عقب میں کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر زرگاں کے ہرکارے طوفانی رفتار سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اب ایک قوس کی سی شکل بنالی تھی۔ یہ قوس لحظہ بہ لحظہ ہم سے اپنا فاصلہ کم کرتی جارہی تھی۔ اچانک عمران نے اپنے مشکی گھوڑے کا رخ ترچھا کیا۔ ہم ہانپتے کانپتے اور تھوہر کے درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچے۔ یہاں درختوں کے درمیان گھنی شاخوں کا سایہ تھا اور بارش کے پانی کا ایک چھوٹا سا جوہڑ نظر آرہا تھا۔ اس جوہڑ کے کنارے درختوں میں وہی جرمن جیپ کھڑی تھی جو عمران کے مطابق چند دن پہلے اس سے چھین لی گئی تھی۔

عمران نے بڑی تیزی سے راشن کا سامان گھوڑے سے اتارا اور اسے جیپ میں پھینک دیا۔ اس دوران میں، میں اس کے کہنے پر حمیدہ کو سہارا دے کر گھوڑے پر سے اتار چکا تھا۔

''چلو جلدی کرو۔۔۔ جیپ میں بیٹھو۔'' عمران چلایا۔

ہم دو تین سیکنڈ کے اندر جیپ میں تھے۔ جیپ ایسے رخ سے کھڑی کی گئی تھی کہ اسے بس اسٹارٹ کرنے کی دیر تھی، وہ سیدھی آگے نکل سکتی تھی۔ عمران نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اگنیشن میں چابی لگائی۔ میں عمران کے پہلو میں تھا۔ حمیدہ ہکا بکا سی پچھلی نشست پر تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ جیپ نے پہلے ''سیلف'' پر اسٹارٹ ہو لی۔ عمران نے ایک جھٹکے سے اسے آگے بڑھا دیا۔ ہم درختوں کے اس جھنڈ سے یوں نکلے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ ہم نے اپنے عقب میں زرگاں کے تیز رفتار ہرکاروں کو دیکھا۔۔۔ ان سے اب ہمارا فاصلہ مزید کم ہوچکا تھا۔ ان کی مدھم آوازیں بھی اب ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ غیظ و غضب سے لتھڑی ہوئی یہ آوازیں لحظہ بہ لحظہ واضح ہوتی جارہی تھیں۔۔۔ لیکن اب ہمیں فکر نہیں تھی۔ ہمارے نیچے ہانپتے ہوئے گھوڑے نہیں، اسپیشل ماڈل کی شاندار جرمن گاڑی تھی۔ عمران اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ایک انگلش ساخت کی طاقتور ''گن'' رکھی تھی۔ اس پر ٹیلی اسکوپ بھی چڑھی ہوئی تھی۔

میں نے گن اٹھا کر عقب میں دیکھا۔ ٹیلی اسکوپ میں موت کے ہرکاروں کی شکلیں نظر آئیں۔ ان کی آنکھوں میں چنگاریاں تھیں مگر ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ درختوں کے جھنڈ سے یوں اچانک جرمن جیپ نکلے گی اور ان کی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کردے گی۔ پھر یکایک مجھے تعاقب کرنے والے گھڑسواروں میں ایک چہرہ نظر آیا اور میرا خون کھول اٹھا۔ یہ زرگاں کا خطرناک ترین کمانڈو اور سفاک پولیس افسر رنجیت پانڈے تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے چند قدم آگے گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ وہ گھوڑے کی پشت سے چپکا ہوا تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے بار بار گھوڑے کو کوئی چابک وغیرہ رسید کرتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ چلانے والے انداز میں اپنے ساتھیوں کو احکامات وغیرہ بھی جاری کر رہا تھا۔

میرے سینے میں ایک لہر سی اٹھی۔ وقت کا پھیر زرگاں کے اس خطرناک ترین شخص کو میرے نشانے پر لے آیا تھا۔ لیکن میرا نشانہ بہت اچھا نہیں تھا۔ ہاں میں کوشش کرسکتا تھا۔ میں نے گن کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور عمران سے پوچھا۔

''لوڈڈ ہے نا؟''

''لوڈڈ ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمیں پکڑ نہیں سکیں گے۔''

''ضرورت ہے عمران!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ کتا میرے نشانے پر آرہا ہے۔''

''کون؟''

''رنجیت پانڈے۔''

یہ اطلاع عمران کے لیے بھی دلچسپ تھی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر بولا۔ ''لیکن تم چلتی جیپ میں اتنی دور سے نشانہ نہیں لے سکو گے۔''

''کوشش تو کرسکتا ہوں نا۔'' میں نے کہا اور ٹیلی اسکوپ

سے آنکھ لگا دی۔

ناہموار راستے پر جیپ ہچکولے کھا رہی تھی۔ دوسری طرف ٹارگٹ بھی متحرک تھا۔ پھر بھی میں نے پوری یکسوئی کے ساتھ ٹیلی اسکوپ میں دیکھتے ہوئے پہلی گولی چلائی۔ زوردار دھماکا ہوا۔ رنجیت پانڈے کے پہلو میں گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک گارڈ الٹ کر گرا اور گھوڑے اسے روندتے ہوئے گزر گئے۔

طاقتور گن کی دوسری گولی رنجیت پانڈے سے آٹھ دس فٹ دائیں جانب ایک دوسرے گھڑسوار کو لگی۔ یہ شخص دوڑتے گھوڑے پر سے رائفل کا فائر کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ یقیناً اس کا نشانہ ہماری جیپ ہی تھی۔ گولی کھا کر یہ شخص بھی اپنی رائفل سمیت گھوڑے کی پشت پر سے اوجھل ہوگیا۔

میں نے کل چار گولیاں چلائیں۔ ان میں سے تین نے ٹھم کے گارڈز کو ہٹ کیا اور وہ اس دوڑ میں سے خارج ہو کر زمین بوس ہوئے۔ رنجیت پانڈے گن کے ہلاکت خیز بوسے سے بچا رہا۔ شاید میری یہ "شوٹنگ" ان تین افراد کی موت کا بہانہ تھی جنہیں میں مارنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ قدرت اسی طرح انسانی ارادوں کو خام کرتی ہے اور مستقبل کے وہ نقشے ترتیب دیتی ہے جو تقدیر کہلاتے ہیں۔ رنجیت کو ابھی زندہ رہنا تھا اور مرنے سے پہلے ایک سنگین واقعے کا سبب بننا تھا۔

... جرمن جیپ اپنی فور وہیل پاور سے اڑی جارہی تھی۔ ہمارا تعاقب کرنے والے دیکھتے ہی دیکھتے بہت پیچھے رہ گئے۔ یقیناً انہوں نے ہمت ہار دی تھی۔ وہ جیپ کی رفتار کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ رہی سہی کسر گن کی مہلک فائرنگ نے پوری کردی تھی۔

عمران بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب سکون کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور گہری سانس لے کر کہا۔ "تو یہ تھا ہمارا گیم؟"

"گیم... کون سا گیم؟"

"تم بڑی کھوچل شے ہو عمران! مجھے شروع سے شک تھا کہ تم نے جتنی قیمت انعام چھوڑ کر یہ جیپ لی ہے تو اس کی کوئی وجہ ہے۔"

"نہیں نہیں... تم خواہ مخواہ شک کررہے ہو۔ اس وقت میرے دماغ میں کوئی بات نہیں تھی۔"

"اور میرا خیال ہے کہ اپنے پیدا ہونے سے پہلے بھی تمہارے دماغ میں باتیں موجود تھیں اور تم پوری پلاننگ کے ساتھ ہی پیدا ہوئے ہوگے۔"

"دیکھو تم مجھ پر جوکنگ کا الزام لگاتے ہو اور اب خود جگتیں لگا رہے ہو۔"

"پتا نہیں کیوں، مجھے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ واقعی تم سے کوئی جیپ چھین کر لے گیا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس میں کوئی ہیر پھیر ہے..."

"دیکھو، اب تم مجھ پر ہیرا پھیری کا الزام بھی لگا رہے ہو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم گھوڑوں پر ہی یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے اور برساتی نالے کے آس پاس کہیں فوت ہوجاتے۔ کم از کم مجھے ایک خوب صورت خاتون کے سامنے یوں ذلیل تو نہ ہونا پڑتا۔"

سنگین صورتِ حال کے باوجود میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کہا۔ "گویا تم یہ بات مان رہے ہو کہ یہ ساری تمہاری پلاننگ تھی؟"

"میں کہاں مان رہا ہوں... میں تو برساتی نالے کے کنارے فوت ہونے کی بات کررہا ہوں... ویسے... یار تابش! برساتی نالے کے کنارے فوت ہونے کا اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے۔ تمہیں تو سب یاد ہی ہوگا، اس سے پہلے ایک دفعہ میں لاہور جی ٹی روڈ کے قریب ایسی وفات کا مزہ چکھ چکا ہوں۔ واہ واہ... کیسا دل بہار سین تھا جب اکٹھی چار گولیاں میرے سینے پر لگی تھیں۔ جان یوں جسم میں سے نکلی تھی جیسے مکھن سے بال نکلتا ہے۔"

"اور اتنا کچھ ہونے کے باوجود تم زندہ ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ جینا بھی کوئی جینا ہے یار! چڑیلے کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ زندوں میں نہ مردوں میں۔ اور پھر اگر اس چڑیلے کو نیوز چینل کا پیٹ بھی بھرنا ہو تو اور بڑا عذاب ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ قیامت تک میری روح یونہی بھٹکتی رہے گی۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"لیکن اتنا خوش ہونے کی ضرورت بھی نہیں تمہیں... میرے لیے "یوں قیامت تک بھٹکنے" میں ایک پہلو اطمینان کا بھی ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے چینل پر قیامت کی خبر دے سکوں گا۔ ذرا سوچو، کتنا مزہ آئے گا جب میں ٹی وی اسکرین پر نمودار ہوکر اپنا دو فٹ لمبا غمگین پریشان چہرہ ناظرین کو دکھاؤں گا اور کہوں گا... خواتین و حضرات! قیامت آ گئی ہے۔ بالآخر ہم قیامت لانے میں کامیاب رہے ہیں... اب کتنا جائے گا مت۔ ہم اس حوالے سے طویل دورانیے کی خصوصی ٹرانسمیشن شروع کررہے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے لقمۂ اجل بننے تک یہ ٹرانسمیشن جاری رہے گی..."

حمیدہ ہم دونوں کی اوٹ پٹانگ باتیں سن کر حیران ہورہی تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی تھی۔ پیچھے اب دور دور تک تعاقب کرنے والوں کا نشان نہیں تھا مگر وہ پھر بھی خوف زدہ تھی۔ جیپ تیز رفتاری سے اونچے نیچے راستوں کو نگلتی چلی جارہی تھی۔

ہم نے بغیر رکے اپنا سفر جاری رکھا۔ جیپ کے اندر وافر مقدار میں فیول تھا۔ اس کے علاوہ فیول سے بھرا ہوا ایک فالتو ٹینک بھی تھا۔ گن کے اضافی راؤنڈز، ٹارچ، شکاری چاقو اور اس طرح کی کئی اشیا پہلے سے جیپ میں موجود تھیں۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ عمران نے پوری تیاری کے ساتھ جیپ کو وہاں چھپایا تھا۔ گھوڑے سے اترنے والا راشن بھی جیپ کے اندر موجود تھا اور یہ ہم تینوں کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ عمران نے بالکل درست کہا تھا۔ وقتِ رخصت بشارت علی خاں وغیرہ کی طرف سے جو دو رائفلیں ہمیں دی گئی تھیں، وہ بیکار تھیں۔ ان میں گڑبڑ کی گئی تھی۔ انہیں بس لاٹھی کے طور پر ہی استعمال کیا جاسکتا تھا۔

ہم نے کھانا بھی چلتی جیپ میں کھایا۔ ہمارے اصرار کے باوجود حمیدہ نے ایک دو لقموں سے زیادہ نہیں لیے۔ رات کے وقت ہم اسی پُرخطر علاقے سے گزرے جس کے بارے میں عمران نے کہا تھا کہ یہ "سانپوں کا علاقہ" کہلاتا ہے۔ اس وقت کے سارے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ تب میں اور عمران گھوڑا گاڑی پر سوار تھے۔ ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ زرگاں کی طرف سفر کررہے تھے اور ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے زندہ پلٹ سکیں گے یا نہیں... اور پھر ہماری گھوڑا گاڑی میں ایک زہریلا سانپ رینگ آیا تھا۔ بعد ازاں لال بھون میں اس سانپ نے میڈم اور عمران کو ایک دوجے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس گھنے جنگل میں یہ سفر ہمارے لیے دشوار ثابت ہوا۔ ہم جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی آن نہیں کررہے تھے۔ بس پارکنگ لائٹس کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ کئی جگہ عمران کو یا مجھے نیچے اتر کر جیپ کے لیے راستہ بنانا پڑا۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں ہمارے لیے اضافی تناؤ کا باعث تھیں۔ خاص طور سے حمیدہ کا بُرا حال تھا۔ وہ مسلسل منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ وہ ہم دونوں کو بھائی جی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ گاہے بگاہے کہتی۔ "بھائی جی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

عمران کہتا۔ "اس کا ایک ہی حل ہے بھائی جی... بس ڈرتی رہو۔ عشق کی طرح ڈر پر بھی کسی کا زور نہیں ہوتا۔ یہ وہ آگ ہے جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔"

ایک بار پھر جب حمیدہ نے کہا "بھائی جی، مجھے ڈر لگ رہا ہے" تو عمران بولا۔ "دیکھو بھائی جی! تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو تم ڈر کو لگ جاؤ۔ ڈر کو لگنے کا طریقہ یہ ہے کہ اچھی اچھی باتیں یاد کرو۔ جیسے میں اور تابش کررہے ہیں۔ تابش اس وقت اپنی طرح دار بیوی کو یاد کررہا ہے اور رضائی کے اندر گھس کر... اس کے ہاتھ کے گرم گرم پکوڑے کھانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر فقرے میں "کما وقفہ" دیا تھا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اسی طرح میں اس کھوسٹ بڑھیا کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس نے اپنی ضد سے اپنا پورا پریوار تباہ کردیا اور اب شاید خود بھی تباہ ہونے والی ہے۔"

"کون بڑھیا جی؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"وہی جس نے ٹھکم کے دربار میں میرے ساتھ "ٹاک شو" کیا تھا۔ ذرا تصور کرو تابش! اس وقت کیا حالت ہوگی اس کی۔ اس نے تو پانچ چھ دن پہلے ہی خود کو آگ لگا کر بدروح بن جانا تھا۔ غالباً پنڈت مہاراج وغیرہ نے اسے تسلی دی ہوگی کہ ہمیں آزاد نہیں کیا جارہا۔ چھوڑنے کے بعد ہمیں پھر پکڑ لیا جائے گا... لیکن اب، جب اس "ہائی اسپیڈ بڑھیا" کو پتا چلا ہوگا کہ ہم نکل گئے تو اس نے یقیناً قیامت مچا دی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اب تک وہ اپنے تئیں "شہید" بھی ہوچکی ہو۔"

ازلی بڑھیا کے ذکر نے مجھے بھی محظوظ کیا لیکن میں نے عمران کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا۔ "یار! ایسے لوگ خود شہید نہیں ہوتے، دوسروں کو شہید کرانا زیادہ باعثِ ثواب سمجھتے ہیں۔ خاص طور سے نوجوانوں کو۔ یہ بڑھیا اپنے خاندان کو برباد کرچکی ہے لیکن اب بھی اس کے پاس اپنے حق میں بڑی ٹھوس دلیلیں موجود ہوں گی۔"

عمران نے میری بات سے اتفاق کیا۔

ہم نے اگلے روز بھی وقفے وقفے سے سفر جاری رکھا۔ ہم بتدریج سرسبز علاقے میں داخل ہورہے تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ اس علاقے میں کسی سے بھی ملاقات ہوسکتی ہے۔ ایک طرح سے یہ سارا علاقہ زرگاں اور نل پانی کے درمیان "نو مین لینڈ" تھا۔ ہوشیار سنگھ اور آفتاب خاں وغیرہ نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں زرگاں اور نل پانی دونوں کے گارڈز اور جاسوس حرکت کرتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ قیام کرلیا جائے۔ اگر ہم چلتے رہتے تو ہمیں بغیر روشنی کے سفر کرنا پڑتا اور یہ بہت دشوار تھا۔ اس کے

علاوہ پچھلے قریباً چھتیس گھنٹے میں تھکاوٹ بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ خاص طور سے حمیدہ کا تو بُرا حال تھا۔

ہم نے ایک نسبتاً اونچی جگہ پر درختوں کے درمیان جیپ روک دی۔ سردی کافی تھی مگر ہم جیپ کا ہیٹر آن نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ فیول اب گز ارے لائق ہی رہ گیا تھا۔۔۔

تھوڑا سا کھانا کھا کر حمیدہ پچھلی نشست پر لیٹ گئی۔ میں نے عمران سے کہا۔ ”تم بھی اپنی سیٹ اسٹریچ کر کے تھوڑی دیر آرام کرلو۔“

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، حمیدہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”بھائی جی! آپ نے بتایا نا ہیں کہ زرگاں میں میری مصیبت کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا تھا؟ آپ کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی عورت تھی؟“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”عورت نہیں لڑکی۔ تمہاری سہیلی وجنتی۔۔۔ ہم اتفاقاً اس کے گھر میں جا گھسے تھے۔ اسی سے ہمیں ساری باتیں پتا چلیں۔“

”وجنتی؟“ حمیدہ ششدر رہ گئی۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں سب کچھ بتایا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ بولی۔ ”جب جارج صاحب کے سپاہی مجھے پکڑنے کے لیے میرے گھر آئے تو وجنتی بھی وہیں تھی۔۔۔ اس نے انہیں روکنے کی بڑی کوشش کی۔ وہ ان سے لڑ پڑی تھی۔ سپاہیوں نے اسے گالیاں اور دھکے دیے تھے۔ میں اس کے بارے میں بڑی فکرمند تھی۔ آپ نے یہ بتا کر میری تسلی کی ہے کہ وہ خیریت سے ہے لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا؟“

”۔۔۔ جب میں نے آپ سے زرگاں میں اس بارے میں پوچھا تھا تو آپ نے تب کیوں نا ہیں بتایا؟“

”اس کا جواب سیدھا سادہ ہے حمیدہ۔“ میرے بجائے عمران نے جواب دیا۔ ”تب تک ہم دشمنوں میں تھے، خطرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ تمہیں وجنتی کے بارے میں بتانا، کوئی مسئلہ پیدا کرسکتا تھا۔“

بات حمیدہ کی سمجھ میں آگئی اور وہ اثبات میں سر ہلانے لگی مگر۔۔۔ پھر بھی نشست پر لیٹی نہیں۔ ہچکچاہٹ کے عالم میں بیٹھی رہی۔ عمران اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آگئی کہ وہ ہماری موجودگی میں بے آرامی محسوس کر رہی ہے۔۔۔ عمران اور میں جیپ سے باہر نکل آئے۔ طاقتور گن عمران کے ہاتھ میں تھی۔ ”آ۔۔۔ آپ کہاں جارہے ہیں؟“ وہ ہڑبڑائی۔

”کہیں نہیں۔ ہم ذرا سگریٹ وغیرہ پئیں گے۔ یہیں جیپ کے پاس بیٹھ رہے ہیں۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔“ عمران نے کہا۔

جیپ کے پاس ہی صاف ستھری پتھریلی جگہ تھی۔ ہم نے وہاں ایک چٹائی بچھائی اور تناور درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے ہم اپنے اردگرد زیادہ اچھی طرح نگاہ رکھ سکتے تھے۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ مدھم روشنی درختوں سے چھن چھن کر خشک پتوں سے اٹی زمین پر پڑ رہی تھی۔ ہلکی سرد ہوا درختوں کے درمیان سے یوں گزر رہی تھی جیسے کوئی دوشیزہ اپنا لمبا آنچل لہراتی بے شمار ستونوں والے محل سرائیں بھاگ رہی ہو۔۔۔ اس کی پائل مدھر آواز پیدا کرتی ہو اور اس کی خوشبو قرب و جوار کو مہکاتی ہو۔۔۔ یوں لگتا تھا کہ اس سنسان جنگل میں میلوں تک ہم تینوں کے سوا اور کوئی ذی نفس نہیں۔ یہاں جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔

عمران نے سگریٹ سلگا کر اسے اپنے ہاتھ کی قوس سے ڈھانپ لیا اور اپنا دوسرا ہاتھ میری زخمی پسلی پر چلاتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ درد تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”مجھے لگتا ہے کہ تمہیں درد کے حوالے سے نہیں کہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ کچھ بھی ہوجائے تم ’نہیں‘ ہی کہو گے۔“

”کیا یہ بُری عادت ہے؟“

”بالکل نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اسی ’نہیں‘ کی وجہ سے تم جارج گورا جیسے شخص کو مات دینے میں کامیاب ہوئے ہو۔ وہ جس طرح تمہیں زخمی کر چکا تھا اور تمہاری گردن جکڑ چکا تھا، لگتا نہیں تھا کہ تم کھڑے رہ پاؤ گے۔ میرا خیال ہے کہ اس ’نہیں‘ کے سلسلے میں تو تمہاری شاگردی اختیار کر لینی چاہیے۔“

”خیر، ایسی بھی بات نہیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے ہم دونوں ایک دوسرے کی شاگردی اختیار کر سکتے ہیں۔ کچھ باتیں تمہارے اندر ایسی ہیں جو مجھ میں نہیں۔“

”مثلاً؟“

میں ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آگیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مثلاً بات کو چھپانے اور گول کرنے کا فن۔“

”میں نے کیا چھپایا ہے؟“

”تم نے بتایا کیا ہے، ہر معاملے میں گھپلا کیا ہے۔ تمہیں پتا تھا کہ حکم کی نیت میں فتور ہے، وہ ہمیں صرف

دکھاوے کے لیے چھوڑ رہا ہے۔ اس کی پلاننگ کو ناکام بنانے کے لیے تم نے بھی لمبی چوڑی پلاننگ کی۔ رتنا دیوی والی جیپ حاصل کی پھر اس کے چھینے جانے کا ڈراما کیا پھر اسے پوری تیاری کے ساتھ مناسب جگہ پر چھپایا اور مجھے خبر تک نہیں ہونے دی۔“

اس نے کش لے کر تنے سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے کسی چیز کے بارے میں بھی یقین نہیں تھا۔ یہ سب اندازے تھے جو غلط بھی ہوسکتے تھے اور صحیح بھی۔ شکر ہے کہ یہ صحیح ہوئے۔ دوسری بات یہ کہ میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں بتا دوں کہ میں جیپ کے چھینے جانے والا ڈراما کرنے والا ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس کے بعد تمہیں مسلسل اداکاری کرنا پڑے گی۔ اور ہوسکتا ہے کہ کہیں کہیں تمہاری اداکاری زیادہ اچھی نہ ہو اور حکم کے ہرکاروں کو شک گزرے۔“

”شک تو خیر مجھے شروع سے ہی تھا۔“ میں نے کہا۔ ”حکم اور پنڈت مہاراج وغیرہ جس طرح ہماری ہر بات مانتے چلے جارہے تھے۔۔۔ خاص طور سے جس طرح انہوں نے تمہیں بھی میرے ساتھ آنے کی اجازت فراخ دلی سے دے دی تھی، لگتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے لیکن کچھ باتیں اب بھی الجھن میں ڈالتی ہیں۔ مثلاً تمہارا جیپ کو بالکل صحیح جگہ پر چھپانا۔۔۔ تمہیں اس بات کا پہلے سے علم ہونا کہ جو رائفلیں ہمیں دی گئی ہیں، وہ ناکارہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔“

وہ مسکرایا۔ ”ابھی تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ کچھ معاملوں میں تم بھی میری شاگردی اختیار کر سکتے ہو۔ درست اندازے لگانا بھی تو ایک فن ہے جگر۔۔۔ اور اس حوالے سے میں تم سے تھوڑا سا آگے ہوں۔“

”تم بہت سے معاملوں میں آگے ہو۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”چھپے رستم ہو۔۔۔ بہت پہنچی ہوئی شے ہو بلکہ مستی میں ضرورت سے زیادہ ہی ’پہنچ‘ جاتے ہو۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ چاندنی اس کی ٹھوڑی کے دلکش گڑھے کو نمایاں کر رہی تھی۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کوئی نئی بات نہیں کر رہا۔ وہی پرانی دُہرا رہا ہوں۔ اگر باتوں کو چھپانے اور گول کرنے کا کوئی عالمی مقابلہ ہو تو تم ضرور گولڈ میڈل لے جاؤ۔“ میں مسکرایا۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ اس کی تیز عقابی نگاہیں میری آنکھوں کے راستے جیسے میرے دماغ کے اندر جھانکنے لگیں۔ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”تم نے میری مستی کی بات کیوں کی ہے؟ کیا تم نے کچھ دیکھا ہے؟“

میں نے بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں دیکھا ہے اور سخت حیران بھی ہوا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ گیتا کبھی ایسی زوردار لڑکی ہے۔“

اس نے نتھنوں سے دھوئیں کی طویل لکیریں خارج کیں اور قدرے پُرسکون نظر آنے لگا۔۔۔ اب اس کے چہرے پر الجھن کے بجائے ایک طرح کی چمک سی آگئی۔ چند لمحے بعد وہ مسکرایا اور بولا۔ ”انڈیا کا ایک مشہور فلمی گانا ہے، میرا تو جو بھی قدم ہے وہ تیری راہ میں ہے۔۔۔ کہ تو کہیں بھی رہے میری نگاہ میں ہے۔ اسی طرح بھی ہم بھی جو کچھ کرتے ہیں تمہارے لیے ہی کرتے ہیں۔ تمہارے سکون کے لیے۔۔۔ تمہاری خوشی کے لیے۔“

”یعنی تم نے میرے سکون اور خوشی کے لیے گیتا سے زبردست قسم کے رومانی سین کیے۔ بھئی واہ۔۔۔ زبردست۔۔۔ کل تم کہو گے کہ میرا غم غلط کرنے کے لیے تم نے شراب کی بوتل پی لی یا پھر میری پسلی کا درد کم کرنے کے لیے اسپرین کی چار گولیاں پھانک لیں۔“

”میں نے کہا ہے نا اب تمہیں باتیں کرنا آگئی ہیں۔ وہ وقت بھول گئے جب منہ میں زبان ہی نہیں تھی۔“

”خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔“

”لیکن خربوزے کو دیکھ کر ناشپاتی تو رنگ نہیں پکڑتی۔ تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔۔۔ اور اگر تم رنگ پکڑ بھی رہے ہو تو غلط پکڑ رہے ہو۔ تم شک زیادہ کرنے لگے ہو۔“

”میں شک نہیں کر رہا۔ میں نے سب کچھ اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

”تو کیوں دیکھا ہے بھئی؟ تمہیں کس نے دیا دیکھنے کا لائسنس؟“

”ہاں یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ اس پر بعد میں بحث ہوسکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر تک مجھے مصنوعی غصے سے گھورتا رہا۔ پھر اس نے مجھے مکا مارنا چاہا۔ میں ایک دم پیچھے جھک گیا لیکن اس نے مکا مارا نہیں۔ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ”ڈرتے بھی ہو اور باز بھی نہیں آتے لیکن زخمی ہو اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔“

”اس رحم دلی کا بڑا شکریہ۔۔۔ مگر میرا سوال اپنی جگہ ہے۔“

اب اس کی آنکھوں میں مخصوص شوخ چمک نظر آرہی تھی۔ سگریٹ کا ایک اور کش لے کر اس نے ہائی مانند

سگریٹ کو جوتے کے تلوے سے رگڑ کر بجھایا اور بولا۔ ”میں ابھی تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا مگر اب تم پیچھے پڑ گئے ہو تو بتانا پڑے گا۔ فلم ”بھابی دیاں چوڑیاں“ دیکھی تھی تم نے؟“

”یہ فلم کی بات کیسے آگئی درمیان میں؟“

”اس بات کو چھوڑو۔ کوئی بھی بات، کسی بھی بات کے درمیان میں کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ اب یہ دیکھو، یہ میری اپنی زندگی تھی لیکن تم اس کے درمیان میں کود پڑے نا... اس طرح کی اور بھی کئی اوٹ پٹانگ نامعقول مثالیں موجود ہیں۔ تم میرے سوال کا جواب دو، فلم دیکھی تھی تم نے؟“ میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ ”اس فلم میں لڑکے کی بھابی کی چوڑیاں شاید دلہن صاحب کے قبضے میں چلی جاتی ہیں۔ وہ ان چوڑیوں کو واپس لینا اپنا نصب العین بنالیتا ہے اور آخر یہ کام کر کے دکھا دیتا ہے۔ میرے دل میں بھی یہ شدید خواہش تھی کہ میں ایسا ہی کچھ کروں لیکن اس کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری تھا۔ ایک بھابی اور دوسرے چوڑیاں۔ چوڑیوں کا انتظام تو شاید میں کسی طور کر لیتا لیکن بھابی کہاں سے لے کر آتا۔ میرا تو کوئی بھائی شائی ہی نہیں تھا۔ مگر پچھلے دنوں میری یہ مشکل آسان ہوگئی جب تم نے مجھے یہ بتایا کہ تم سلطانہ سے شادی کر چکے ہو۔ اس لحاظ سے وہ میری بھابی بن گئی۔ کچھ روز بعد ایک اور بڑا خوش گوار اتفاق ہوا، جب تائی افضل کی زبانی مجھے پتا چلا کہ ایک موقع پر تمہیں طویل بخار سے صحت یاب کرنے کے لیے سلطانہ نے اپنا سارا زیور اور جمع پونجی ایک وید صاحب کی جھولی میں ڈال دی تھی اور تمہاری جان بچائی تھی۔ بس اس دن سے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں ”بھابی دیاں چوڑیاں“ والا سارا سین پارٹ اصل زندگی میں دہراؤں گا۔ سلطانہ کا کھویا ہوا زیور اسے واپس لوٹاؤں گا۔“

”مجھے تمہاری کسی بات کی سمجھ نہیں آرہی۔“ میں نے کہا۔

”اس فلم میں بھی نکمے شوہر کو کسی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی۔“ اس نے کہا۔ وہ کچھ دیر مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنی جیکٹ کی زپ کھولی۔ اس کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک وزنی موٹی لفافہ نکال لیا۔ ”ٹارچ جلاؤ۔“ اس نے کہا۔

میں نے ٹارچ روشن کی اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ موٹی لفافے میں خوب صورت طلائی زیورات جگمگا رہے تھے۔ ”یہ... یہ کس کے ہیں؟“ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”سلطانہ کے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”یہ وہی ہیں جو ڈھائی تین سال پہلے اس نے تم پر وار دیے تھے۔ یہ زرگاں کے اسی وید کے پاس تھے جس نے تمہارا علاج کیا تھا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ میں اس تک کیسے پہنچا۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ایک ہوشیار رہتا لی نے میری مدد کی اور یہ مشکل کام آسان ہوگیا۔“

”مجھے... یقین... نہیں آرہا۔“

”اس فلم میں بھی اس احمق شوہر کو کسی بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔“

میری نگاہیں زیورات پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ ساٹھ ستر تولے سونا تو رہا ہوگا... میں زیورات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ایک بار پھر ذہن پر چھائی ہوئی دھند میں سے فراموش کردہ ماضی کے کچھ مناظر ابھرنے لگے۔ مجھے لگا کہ سلطانہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔ اس کے اردگرد مسہری پر چمکیلی سرخ پنّیوں کی جھالریں ہیں۔ یہ جھالریں لالٹین کی روشنی میں دمک رہی ہیں اور خود سلطانہ بھی لشکارے مار رہی ہے۔ اس کے گلے میں ایسا ہی گلوبند تھا۔ اس کی ناک میں ایسی ہی نتھ تھی... میرا دل گواہی دینے لگا، شاید عمران ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ سلطانہ کے ہی گہنے ہیں۔

”کس سوچ میں کھو گئے شہزادے؟“ عمران نے مجھے ٹہوکا دیا تو میں چونک گیا۔

میری کھوجی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ میں نے پوچھا۔ ”کب ملے تمہیں یہ زیور؟“

”جن دنوں تم نے اپنی پسلی کی ”ویلڈنگ“ کرائی تھی اور اسپتال میں تھے۔“ وہ مسکرایا۔

مجھے یاد آیا کہ ان دنوں عمران کافی گھومتا پھرتا رہا تھا۔ جیپ کی ڈرائیونگ کا بہانہ کر کے وہ تین چار بار اسپتال سے نکلا تھا اور دیر تک باہر رہا تھا۔

ایک دم میں نے چونک کر پوچھا۔ ”لیکن... ہم بات تو کچھ اور کر رہے تھے۔ میں نے تم سے تمہارے اور گیتا بھی کے بارے میں پوچھا تھا۔“

”تو وہی تو بتا رہا ہوں یار۔ ان زیوروں کی دستیابی اور گیتا بھی میں گہرا تعلق ہے۔ تمہیں کچھ عجیب تو لگے گا لیکن میں وہی بتا رہا ہوں جو سچ ہے۔ ایک دن میں اور گیتا بھی بڑے اچھے موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ طوفانی رفتار سے بول رہی تھی اور اپنے ماضی کے قصے سنا رہی تھی۔ میں نے اس سے سلطانہ کے زیورات کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی اور بتایا کہ وہ زیور کیسے اور کن حالات میں زرگاں کے ایک تجربہ کار وید کے پاس چلے گئے تھے۔ میں نے گیتا بھی سے کہا کہ وہ ایک چلتا پرزہ ہے۔ زرگاں کے چپے چپے کی خبر اسے رہتی ہے۔ کیا وہ کسی طرح اس وید کا اور زیوروں کا پتا نہیں چلا سکتی؟ وہ موڈ میں تھی۔ الائچی سپاری پان چبا کر بولی کہ وہ یہ کام کر دے گی لیکن اس کے بدلے مجھ سے ایک من پسند تحفہ لے گی۔ میں نے کہا کہ تحفہ تو دینے والے کی مرضی کا ہوتا ہے۔ وہ بولی لیکن میں اپنی مرضی کا لوں گی۔ میں ذرا چونک گیا۔ میں نے کہا، اگر کوئی ایسی چیز ہوئی جو میں نہ دے سکا تو؟ وہ بولی۔ میں تمہیں بڑی اچھی طرح جان گئی ہوں عمران صاحب! کوئی ایسی چیز نہیں مانگوں گی جو تم نہ دے سکو۔ بس اس طرح ہمارے درمیان ایک ”ڈیل ٹائپ“ کی چیز ہوگئی... گیتا بھی نے میری توقع سے زیادہ صلاحیت دکھائی۔ ایک دو جگہ میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ آٹھ دس دن کے اندر ہم اس وید صاحب تک اور ان زیوروں تک جا پہنچے۔ وید صاحب ان زیوروں کے منہ مانگے پیسے مانگ رہا تھا لیکن لالچی شخص اکثر ڈرپوک بھی ہوتا ہے۔ میں نے اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ معقول رقم پر زیور واپس کرنے پر رضا مند ہوگیا... وید کو قائل کرنے کے سلسلے میں گیتا بھی نے بھی کردار ادا کیا۔“

”اور زیورات کے لیے رقم کہاں سے لی تم نے؟“ میں نے پوچھا۔

”جگر! تمہیں بتایا ہے نا کہ پیسوں کے سلسلے میں تمہارے یار کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔“

”پھر بھی پتا تو چلے؟“

”میڈم صغورا سے ادھار لیے تھے۔ اگر اللہ نے اسے زندگی دی تو جلد ہی لوٹا دوں گا۔“

”مجھے یقین نہیں آرہا کہ میڈم صغورا جیسی عورت تمہیں ادھار دے سکتی ہے۔“

”وہ بہت کچھ دے گی اور لے گی، اگر اس کی زندگی رہی تو۔ تم آگے آگے دیکھنا۔“

”اس کی زندگی کی بڑی فکر ہے تمہیں۔ خود تو جیسے آب حیات پی رکھا ہے تم نے۔“

”چڑیلے کو موت نہیں آتی یار... وہ مر کر بھی تو چڑیل بنتا ہے۔“

چاندنی درختوں میں اپنا زاویہ بدل چکی تھی۔ ہلکی اوس گرنا شروع ہوگئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر کیچڑ میں لتھڑی ہوئی جرگن جیپ کے اندر حمیدہ شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔ کسی چکور کی آواز بلند ہوئی اور سناٹے میں دور تک پھیل گئی۔ میں نے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”تو پرسوں رات میں نے لال بھون کے کمرے میں جو کچھ دیکھا وہ گیتا بھی کا من پسند تحفہ تھا؟“

”تم کہہ سکتے ہو۔ ان عورتوں کی خواہشیں بھی انہی کی طرح عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ وہ کہتی تھی، میں تمہیں اپنے ہونٹوں سے الوداع کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا کر لو بھئی۔ اس نے میرے ساتھ اس کمرے میں اپنی مرضی کے ایک دو منٹ گزارے اور اسی میں خوش ہوگئی۔ کوئی اس طرح خوش ہو جائے تو اسے کر دینا چاہیے یار۔ ہمارے حقوق کون سے بحقِ زوجہ محفوظ ہیں۔“

میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والا شخص تھا۔ لفافے میں لپٹے ہوئے زیورات چاندنی میں دمک رہے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”عورت کی زندگی میں گہنوں کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے اور عروسی گہنے تو اس کی روح کے اندر رکھتے ہیں۔ انہیں کھو کر وہ اندر سے تاریک ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کل یا پرسوں رات جب تم سلطانہ سے تنہائی میں ملو تو اپنے ہاتھ سے اسے یہ گہنے پہناؤ۔ مجھے یقین ہے تمہارے ہاتھوں سے یہ سونا پہن کر وہ اندر سے روشن ہو جائے گی۔“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔ ”لیکن ایک بات کا تمہیں مجھ سے ابھی اور اسی وقت وعدہ کرنا ہوگا اور اگر تم نے وہ وعدہ توڑا تو پھر ہمارے درمیان جنگِ عظیم ہو جائے گی۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ بہت نقصان ہوگا ہماری دوستی کا۔“

”کیسا وعدہ؟“ میں نے پوچھا۔

”سلطانہ بھابی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ گہنے برآمد کرنے میں میرا عمل دخل ہے۔ میں یہ کریڈٹ تمہارے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے میری یہ خواہش پوری نہ کی تو... سچ کہتا ہوں، ہماری لڑائی ہو جائے گی۔“ وہ واقعی سنجیدہ تھا۔

میں نے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کہیں پاس کے درختوں میں ایک بار پھر چاندنی میں نہائی ہوئی... چکور کی رومان انگیز آواز سنائی دی۔ عمران کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ”سلطانہ بڑی اسپیشل لڑکی ہے تابی۔ وہ باہر سے شاید بہت خوب صورت نظر نہ آتی ہو مگر اندر سے حسین و جمیل ہے۔ وہ تمہارے پیار کی اتنی زیادہ حق دار ہے جتنا سوچا جا سکتا ہے۔ تم نے اسے ٹوٹ کر بکھرنے سے بچایا ہے، اب اس کی زندگی کو زندگی بنانا بھی تمہارا ہی کام ہے...“

☆☆☆

یہ اگلی شب، دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ ہم ایک بار پھر اس مچھیرا بستی فتح پور کے نواح میں تھے۔ فتح پور کا قدیم مندر دو کلومیٹر دور سے ہی نظر آرہا تھا۔ ہلکی چاندنی میں ہم دونوں اپنی کیچڑ زدہ جرمن جیپ کے پاس کھڑے تھے۔ جیپ کا انجن خاموش تھا۔ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔

حمیدہ کو اس کی شدید خواہش کے مطابق ہم نے شام کے وقت یہاں سے چالیس پچاس کلومیٹر دور ایک بستی "شاہی پور" میں اتار دیا تھا۔ شاہی پور میں حمیدہ کے دو شادی شدہ تایازاد بھائی رہتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ان کے ذریعے بحفاظت تل پانی میں اپنے دیگر رشتے داروں کے پاس پہنچ سکتی ہے۔ وقتِ رخصت وہ بے حد ممنون اور احسان مند نظر آتی تھی۔ خاص طور سے میری طرف دیکھ کر اس کی آنکھیں بار بار ڈبڈبا جاتی تھیں۔

اور اب ہم فتح پور میں داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔ فتح پور میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں ایک نہایت ناپسندیدہ کام کرنا تھا۔ اور وہ یہ کہ اپنی اسپیشل جرمن جیپ کو، جس نے کٹھن راستوں پر ہمارا بے مثال ساتھ دیا تھا... پانی میں غرق کرنا تھا۔ اس کام کے لیے ہم ایک بڑا بارشی جوہڑ پہلے ہی منتخب کر چکے تھے۔ عمران چونکہ کئی ماہ سے یہاں فتح پور میں رہ رہا تھا اس لیے وہ اور اقبال یہاں کے نشیب و فراز کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ جوہڑ کافی گہرا تھا۔ دوسرے جوہڑوں کی طرح اس میں بھی چھوٹے سائز کی مچھلیاں موجود ہوتی تھیں لیکن انہیں پکڑنے کے لیے کوئی اس جوہڑ کی طرف نہیں آتا تھا۔ یہاں بھی وہی توہم پرستی کارفرما تھی۔ پچھلے کچھ عرصے میں اوپر تلے تین لڑکے بالے اس جگہ ڈوب کر ہلاک ہو چکے تھے اور حسبِ رواج یہ جوہڑ آسیب زدہ قرار پا گیا تھا۔

ہم نے جیپ میں سے تمام ضروری اشیا نکال لی تھیں... جیپ بالکل جوہڑ کے کنارے پہ کھڑی تھی۔ اس کے دروازے بند کرنے کے بعد ہم نے اسے آہستہ آہستہ دھکیلنا شروع کیا اور وہ جوہڑ کے مٹیالے پانیوں میں اترتی چلی گئی۔ ایک منٹ کے اندر اس کا نام و نشان مٹ گیا... ہم نے جوہڑ کے قریب سے اس کے چوڑے ٹائروں کے نشان ختم کر دیے۔ امید تھی کہ دو چار دن میں جب بارش ہو جائے گی تو باقی ماندہ نشانات بھی ختم ہو جائیں گے۔

اب مسئلہ آفتاب خاں کو ڈھونڈنے اور اسے بتانے کا تھا کہ ہم واپس پہنچ گئے ہیں۔ پروگرام کے مطابق اس کام کے لیے عمران کو آگے جانا تھا۔ ہمارے رسد کے سامان میں دو بڑے سائز کی گرم چادریں بھی موجود تھیں۔ عمران نے ایک چادر مقامی انداز میں اس طرح جسم کے گرد لپیٹی کہ اس میں منہ سر بھی چھپ گیا۔ ایک لاٹھی کے ساتھ اس نے کپڑوں والی گٹھڑی باندھ کر کندھے سے لٹکا لی۔ اس حلیے میں وہ ایک مقامی مسافر ہی نظر آنے لگا۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر اس نے دور مار رائفل بھی اپنی چادر کے نیچے ہی چھپا لی تھی۔ میرے پاس ہتھیار کے نام پر بس ایک چاقو تھا۔ یہ بڑا خاص چاقو تھا اور میرے لیے اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔

ہم پیدل ہی فتح پور کی طرف روانہ ہوئے۔ دل کی دھڑکنیں بڑھتی جارہی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ مندر کے تہ خانوں میں صورتِ حال کیا ہو گی؟ وہ سب لوگ خیر خیریت سے ہوں گے جنہیں ہم یہاں چھوڑ کر گئے تھے؟

فتح پور کے بالکل پاس آکر میں درختوں کے ایک جھنڈ میں ٹھہر گیا اور عمران آگے چلا گیا۔ میں ایک ایک پل گن کر گزارنے لگا۔ قریباً ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا، ہمارا اپنے ساتھیوں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ جہاں ان سے ملنے کی خوشی تھی، وہاں ان گنت اندیشے بھی ذہن میں سر ابھار رہے تھے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا میں آج رات سلطانہ کو اپنے روبرو دیکھ سکوں گا؟

مجھے عمران پر پورا بھروسا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ فتح پور میں داخل ہو کر وہی کچھ کرے گا جو موجودہ صورتِ حال میں بہترین ہوگا۔

انتظار کے پل، برسوں کی طرح گزرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ آخر مجھے ایک شخص کا سایہ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ عمران تو ہرگز نہیں تھا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے چاقو پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ آنے والا دراز قد تھا۔ پھر میں نے پہچان لیا۔ وہ آفتاب خاں تھا۔ میں درختوں کی اوٹ سے باہر نکلا، ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

آفتاب خاں نے جوش کے عالم میں میرا کندھا چوما اور بولا۔ "مرحبا... مرحبا تابش بھائی! آپ نے... آپ نے ام سب کا سر فخر سے اونچا کر دیا۔ آپ نے وہ کر دکھایا جس کا ام سب لوگ بس سپنا ہی دیکھ سکتا تھا۔ امارے بس میں ہوتا تو ام آپ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتا اور آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر گاؤں میں لے جاتا۔"

اس نے ایک بار پھر جوش سے میرا کندھا چوما۔

میں نے کہا۔ "سب خیریت سے ہیں نا آفتاب خاں... میرا مطلب ہے، اقبال، تاؤ افضل، ہوشیار سنگھ اور

سلطانہ؟"

"سب ایک دم خیریت سے ہے جی۔ بس ایک بندہ خیریت سے نہیں ہے، اس کے بارے میں ام آپ کو بعد میں بتائے گا۔"

"سلطانہ اور اقبال تو خیریت سے ہیں نا؟" میں نے بےتاب ہو کر پوچھا۔

"بالکل جی، ایک دم ٹھیک ٹھاک۔ ام لوگوں کو زرگاں میں ہونے والے زبردست دنگل کا خبر دس پندرہ دن پہلے ہی مل گیا تھا۔ ام کو یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ایک بہت بڑے مقابلے میں ایک جوان نے جارج گورا کو جان سے مار ڈالا ہے۔ لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ مارنے والا کون ہے۔ کچھ لوگ اسے تل پانی کے انور خاں کا کارنامہ بتاتا تھا، کچھ چھوٹے سرکار کے ایک فوجی افسر کا نام لیتا تھا لیکن ام کو یقین تھا کہ یہ آپ دونوں میں سے ہی کوئی ہوگا۔ ایک دو روز بعد سارا تفصیل معلوم ہو گیا اور اس بات کا پکا پکا تصدیق ہو گیا کہ یہ کارنامہ آپ نے ہی کیا ہے۔" آفتاب خاں اتنا پُرجوش تھا کہ اس کی آواز بار بار بھترا رہی تھی۔

"عمران کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ام انہیں مندر میں چھوڑ آیا ہے۔ وہ خود بھی میرے ساتھ یہاں آنا چاہتا تھا لیکن ام نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں۔"

آفتاب مجھے اپنے ساتھ لے کر مندر کی طرف روانہ ہوا۔ ٹھٹھری ہوئی چاندنی میں فتح پور کے سنسان گلی کوچے سو رہے تھے۔ بس کہیں کہیں کسی بکری کی ممیاہٹ یا آوارہ کتے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ حسبِ معمول آفتاب خاں کے ہاتھ میں لاٹھی اور لالٹین تھی۔ اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی اور اس بکل میں یقیناً چھوٹا موٹا اسلحہ بھی موجود تھا... مندر کا جلا ہوا مسمار شدہ حصہ دوبارہ تعمیر کیا جارہا تھا۔ تعمیر کا سامان یہاں وہاں بکھرا ہوا تھا۔ ارد گرد احتیاط سے دیکھنے کے بعد آفتاب خاں مندر کی شکستہ سیڑھیاں چڑھ کر چوبی دروازے تک پہنچا اور اس کا قفل کھول دیا۔ تب اس نے اشارے سے مجھے بھی اوپر بلا لیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر کے نیم گرم ماحول میں چلے گئے۔ بالائی تہ خانے میں ہمارے سارے ساتھی موجود تھے۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہونے والا اقبال ہی تھا۔ اس نے جوش کے عالم میں مجھے اٹھایا اور کئی چکر دیے۔ اس کے بعد خلال، تاؤ افضل اور دیگر لوگوں نے میرا استقبال کیا۔ مجھے سلطانہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ میری نگاہ اس کی تلاش میں بھٹکنے لگی۔ دھڑکتے دل سے سر اٹھانے لگے۔ "سلطانہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

عمران چہکا۔ "ہم ڈھونڈتے ہیں ان کو جو مل کے نہیں ملتے... روٹھے ہیں نہ جانے کیوں جہاں وہ میرے دل کے۔" پھر اس نے نیچے والے تہ خانے کی طرف اشارہ کیا۔

تاؤ افضل بولا۔ "چلو جاؤ۔ وہ وہاں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جب سے پتا چلا ہے کہ تم آ گئے ہو، مسلسل رو رہی ہے۔"

میں سیڑھیاں اتر کر زیریں تہ خانے میں پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ دروازہ بند تھا... میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ وہ پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ پہلے اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی پھر بے بس ہو گئی اور بلند آواز سے رونے لگی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ دل فگار انداز میں بولی۔ "وہ مر گیا ہے نا... وہ مر گیا ہے نا مہرو جی؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں سلطانہ! میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے میں نے نہیں تم نے مارا ہے۔ تمہاری دی ہوئی طاقت نے مارا ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔"

"سچ کہو مہرو جی... سچ کہو۔"

"ہاں سلطانہ... وہ تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔ اس کی انتڑیاں اس کے پیٹ سے باہر تھیں۔ وہ اپنے خون میں لت پت تھا۔"

"وہ رویا چلایا بھی تھا؟"

"ہاں سلطانہ! میں نے اسے کئی زخم لگائے۔ وہ ہر زخم پر ڈکراتا تھا اور اس کی آواز پورے میدان میں گونجتی تھی۔"

وہ اور جوش کے عالم میں مجھ سے لپٹ گئی اور شدت سے رونے لگی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ میری جیکٹ کو بھگوتی رہی۔ پھر میں نے اسے خود سے جدا کیا۔ میں نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ رام پوری چاقو نکالا جس سے میں نے جارج گورا کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے خم دار پھل پر ابھی تک اس کے خون کا نشان موجود تھا۔

"یہ دیکھو سلطانہ! یہ ہے وہ ہتھیار جس سے میں نے اس شیطان کو ڈھیر کیا۔" اس نے چاقو میرے ہاتھ سے لیا اور بےساختہ اس کے دستے کو چوم لیا۔ پھر وہ میرے سینے سے لگ گئی اور ایک بار پھر تشکر کے آنسو بہانے لگی۔

مندر کے تہ خانوں میں وہ رات جشن جیسی تھی۔ سب میرے اور عمران کے گرد جمع تھے... دو آتش دانوں میں کوئلے دہک رہے تھے۔ ہم نے منہ ہاتھ دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن لیے تھے۔ تاؤ افضل کی بیٹیوں نے نوری اور سلطانہ کے ساتھ مل کر بڑی تیزی سے گوشت بھونا تھا اور چاول پکائے تھے۔ سب نظر آرہے تھے مگر گاڑی بان ہوشیار سنگھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ قتل ہو جانے والے گرو کی جواں سال بیٹی رادھا بھی نظر نہیں آئی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ درمیانی تہ خانے میں سو رہی ہے۔

''ہوشیار سنگھ کہاں ہے؟'' میں نے آفتاب خان سے پوچھا۔

وہ ذرا ٹھٹکا پھر اقبال کی طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ ''تابش بھائی! ابھی باہر ام نے آپ کو بتایا تھا ناکہ امارے ساتھیوں میں سے بس ایک بندہ خیریت سے نہیں ہے... وہ یہی خانہ خراب ہوشیار سنگھ ہے۔ وہ ہوشیاری دکھا کر یہاں سے نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ اپنے ساتھ گرو کی بیٹی رادھا کو بھی لے گیا۔''

''او گاڈ... یہ کیسے ہوا؟'' میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ عمران بھی حیران پریشان نظر آنے لگا۔

اقبال نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔ ''رادھا ہر وقت اپنے گرو پتی کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ ایک دن میں نے اسے بتا دیا کہ وہ مر گیا ہے۔ اس خبر پر اس نے بڑا واویلا مچایا۔ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کلائیوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں سیندور مٹا دیا اور پتا نہیں کیا کچھ کیا۔ ہوسکتا ہے کہ اسے گرو کی موت کا غم بھی ہو مگر اس سے زیادہ خوف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے ''نیچان'' شخص کی ہتھیا کی وجہ سے کوئی بڑی سخت مصیبت آئے گی۔ لال آندھی چلے گی، باڑ تباہی مچا دے گی یا بیماری پھوٹ پڑے گی۔ وہ رونے چلانے لگی اور اس نے کہا کہ وہ اپنے گرو پتی کے ساتھ ہی ستی ہونا چاہتی ہے۔ وہ خود کو آگ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے اسے روکا۔ دو تین دن یہی سلسلہ چلتا رہا۔ وہ ستی ہونے کی کوشش کرتی اور ہم اسے پکڑ دکڑ کر روکتے۔ پھر ایک دن میری برداشت ختم ہوگئی۔ میں نے مٹی کے تیل کی بوتل لی، ماچس پکڑی اور یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ میں نے کہا، اگر تم نہیں رہ سکتیں تو پھر ہو جاؤ ستی۔ اگلے دن سے وہ بالکل ٹھیک ہوگئی۔ اس نے سفید کپڑے پہن لیے، زمین پر سونا شروع کیا اور روکھی سوکھی روٹی بس دو وقت کھانے لگی۔

اس نے کہا کہ وہ گرو کے غم میں بیوہ کی زندگی گزارے گی... میں نے ہوشیار سنگھ کو رادھا کی دیکھ بھال پر لگایا ہوا تھا اور یہ میری غلطی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار سنگھ نکلا۔ اسے پتا تھا کہ اگر رادھا ستی ہونے کے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی تو ''بیوگی'' کے فیصلے پر بھی نہیں رہ سکے گی۔ وہ بھرپور جوان تھی اور ابھی ایک موٹے بڈھے شوہر کے سوا اس نے دیکھا ہی کچھ نہیں تھا۔ ہوشیار سنگھ نے پتا نہیں کیا کرامات دکھائی کہ تھوڑے ہی دنوں میں جوان رادھا کو پوری طرح شیشے میں اتار لیا۔ ہمیں ہوشیار سنگھ کے اس ''سنہری کارنامے'' کا پتا تب چلا جب نوری نے ہوشیار سنگھ اور رادھا کا پول کھولا۔ دراصل نوری کو ان دونوں پر شک ہو چکا تھا۔ ایک شام اس نے چالاکی دکھائی اور رادھا کے کمرے کی چٹخنی کو ہتھوڑی سے چوٹ لگا کر خراب کر دیا۔ رات کسی وقت ہوشیار سنگھ اپنی جگہ سے اٹھا اور رادھا کے پاس چلا گیا۔ نوری نے ایک ٹارچ کا انتظام پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور ہم رادھا کے کمرے میں جا گھسے۔ ہم نے جو کچھ وہاں دیکھا، وہ ان خواتین کے سامنے دہرانا مناسب نہیں... مختصر یہ کہ وہ دونوں سخت نازیبا حالت میں تھے۔ ہم نے دونوں پر بہت لعن طعن کی۔ ہوشیار سنگھ دو تین دن اپنے کمرے میں ہی گھسا رہا۔ اس دن کے بعد سے نوری اور کلثوم نے رادھا کے کمرے میں سونا شروع کر دیا۔

''اگلے آٹھ دس روز میں معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا اور ہمیں لگنے لگا کہ دونوں سدھر گئے ہیں مگر ہوشیار سنگھ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ اسے اپنی بے عزتی کا رنج بھی تھا۔ دوسری طرف رادھا کی جوانی کا نشہ اسے لگ گیا تھا۔ اس نے چپکے سے ایک منصوبہ بنایا اور ایک رات رادھا کو لے کر مندر سے نکلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ آفتاب خاں تالا کھول کر مندر میں آیا تو ہوشیار سنگھ اور رادھا دونوں سب سے اوپر والے کمرے میں کاٹھ کباڑ کے اندر موجود تھے۔ ہوشیار سنگھ نے آفتاب کو سیڑھیوں سے دھکا دے کر نیچے گرایا اور رادھا کے ساتھ نکل گیا۔ آفتاب جس بری طرح گرا تھا اس کی موت بھی ہوسکتی تھی مگر ایک خوش گوار اتفاق یہ ہوا کہ جہاں وہ گرا تھا وہاں دو تین لحاف پڑے تھے۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بس سر پر ایک زخم لگا۔ زوردار آوازیں سن کر میں بھی اوپر آگیا۔ میں اور آفتاب مندر سے نکل کر ہوشیار سنگھ اور رادھا کے پیچھے لپکے۔ وہ شاید گاؤں کی طرف بھاگتے تو ان کے لیے اچھا ہوتا۔ لیکن رات کے بارہ بجے تھے اور شاید ہوشیار سنگھ کے بھی بجے ہوئے تھے، وہ جنگل کی طرف گیا۔

کچھ آگے جاکر انہوں نے برساتی نالا پار کرنے کی کوشش کی۔ صرف ایک گھنٹا پہلے تک تیز بارش ہوتی رہی تھی۔ نالے میں بہاؤ بڑا تیز تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ ٹھیک اندازہ نہ لگا سکے۔ ہم نے ان کے چلانے کی آوازیں سنیں لیکن ہم بھی کچھ نہ کر سکے۔ کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ پانی کے ساتھ بڑی تیزی سے آگے نکل گئے۔''

''یعنی ان کا کچھ پتا ہی نہیں چلا؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں جی، دو تین دن تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔'' اقبال کی جگہ آفتاب خاں نے جواب دیا۔ ''ام سب سخت پریشان تھا۔ اگر وہ زندہ بچ گئے تھے تو پھر ام سب اس مندر میں بالکل بھی خیریت سے نہیں تھے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ تھا تو بھی خطرہ موجود تھا۔ کبھی کبھی کسی کی موت کا دعا بھی مانگنا پڑتا ہے۔ ام نے بھی مانگا اور یہ قبول ہوا۔ تیسرے دن ام کو پتا چلا کہ نیچے کی طرف کھوڑی نام کی جگہ پر نالے نے دو لاشیں اگلا ہے۔ ایک کسی جوان سکھ کا اور دوسرا ہندو ناری کا ہے...''

یہ روداد میرے اور عمران کے لیے بڑی سنسنی خیز رہی۔ رادھا کے ساتھ جو کچھ ہوا، شاید یہ بھی انتہا پسندی کا ایک شاخسانہ تھا۔ وہ جوان خوب صورت لڑکی صرف دھرم کی خاطر ایک ادھیڑ عمر بدوضع پتی کی ''خواہشوں'' کا شکار رہی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس جال سے نکل نہیں سکی تھی۔ اس کے آدرش کہتے تھے کہ وہ خودکشی کر لے یا پھر ایک ہندو بیوہ بن کر زندہ درگور ہو جائے لیکن اس کے اندر کی عورت ان غیر فطری سوچوں کے خلاف جنگ کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ ٹوٹی تو ریزہ ریزہ ہوگئی۔ اقبال اور نوری نے اسے موقع پرست ہوشیار سنگھ کی آغوش میں دیکھا۔

اس روداد کے المناک پہلو نے ہمیں جہاں افسردہ کیا، وہاں اس بات کا احساس بھی دلایا کہ چند دنوں کے ساتھ میں کسی بھی شخص کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ ہم نے ہوشیار سنگھ اور رادھا دونوں کے بارے میں جو علیحدہ علیحدہ اندازے لگائے تھے، وہ دونوں اس سے بہت مختلف نکلے تھے۔

☆☆☆

...اور یہ رات میرے اور سلطانہ کے ملن کی رات تھی۔ ہمیں تہ خانوں میں واپس آئے ہوئے اب تقریباً اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ سفر کی تھکان اور تکلیف ختم ہونے کے بعد میری جسمانی حالت اب کافی بہتر ہو چکی تھی۔ ہمارے کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ میرے کہنے پر آفتاب خان باہر سے سلطانہ کے پسندیدہ پھول لایا تھا۔ گیندے اور موتیے کے یہ پھول میں نے سلطانہ کے تکیے کے قریب رکھ دیے۔ اس نے ہلکے گلابی پھولوں والا سفید جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کے نہایت گھنے بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے آج پھر میرے لیے اپنے ہاتھ سے حلوہ بنایا تھا۔ اب وہ اس حلوے کی تعریف سننے کی منتظر تھی۔ میں نے حلوے کے بجائے حلوہ بنانے والی کی تعریف شروع کر دی تو اس کے چہرے پر حیا کا رنگ لہرانے لگا...

آج یہ وہ سلطانہ نہیں تھی جو میرے چھونے سے کپکپانے لگتی تھی اور جس کا چہرہ دھواں ہو جاتا تھا۔ میری تعریف کے جواب میں وہ سادگی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں، میں جیادہ خوب صورت ناہیں ہوں۔ یہ آپ اچ ایں جنہیں میری تعریفوں کے پل باندھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔''

''کبھی خود کو میری آنکھوں سے دیکھو تو تمہیں اپنی اہمیت کا پتا چلے۔'' میں نے کہا۔

''میں تو آپ کے قدموں کی خاک بھی ناہیں ہوں مہروج! آپ نے میرے اندر پھر سے جندگی ڈالی ہے۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

''اپنوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا سلطانہ۔ اگر کیا جاتا ہوتا تو میں تمہارے سامنے شکریے کے انبار کھڑے کر دیتا۔''

''ناہیں مہروج۔'' اس کی جھیل آنکھوں میں پانی چمکنے لگا۔ ''میں جانتی ہوں آپ نے وہاں زرگاں میں میرے لیے بہت مصیبت اٹھائی ہوئے گی۔ بہت جیادہ خطرے مول لیے ہوئیں گے۔ میرا بس چلے تو آپ کے ان زخموں کے لیے مرہم بن جاؤں۔''

''تم مرہم ہو سلطانہ! تم سے بڑا مرہم اور کیا ہوسکتا ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو... تم نے ابھی تک مجھ سے بیویوں والی کوئی بات نہیں کی۔''

''کیا جی؟'' وہ چونک کر بولی۔

میں مسکرایا۔ ''شوہر جب سفر سے گھر واپس آتے ہیں تو بیویاں پوچھتی ہیں کہ وہ ان کے لیے کیا لائے ہیں۔''

''آپ خود آگئے ہیں، میرے لیے اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہوئیں گا۔'' وہ بولی۔ وہ اب بڑے تواتر سے مجھے ''تم'' کے بجائے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ یہ تبدیلی بھی ان تبدیلیوں میں سے ایک تھی جو اس میں رونما ہوئی تھیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے علاوہ بھی تو کچھ پوچھا جاسکتا ہے۔"

"آپ جو بھی لائے ہوں گے، وہ میرے لیے سب سے اچھا ہوئیں گا۔"

"اچھا، مجھے ایک بات بتاؤ سلطانہ! آخر تم زیور کیوں نہیں پہنتی ہو؟ میں نے کسی غریب سے غریب مقامی عورت کو بھی چھوٹے موٹے زیور کے بغیر نہیں دیکھا؟"

"میں نے بتایا تھا نا مہروج! مجھے عادت اچھی نہیں ہے۔"

"عادت ہی نہیں ہے یا پھر زیور ہی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب مہروج؟" وہ چونک سی گئی۔

میں نے کہا۔ "سلطانہ! بات وہی ہے جس کا تمہیں پتا ہے اور مجھے بھی۔ کچھ عرصہ پہلے تم اپنے سارے زیور اور جمع پونجی، میری زندگی بچانے پر خرچ کر چکی ہو۔ تمہاری شادی کے گہنے جن میں تمہاری ماں کے گہنے بھی شامل تھے، اب تمہارے پاس نہیں ہیں۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ میں نے اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈالا اور موٹی کاغذ میں لپٹے ہوئے سلطانہ کے گہنے اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی چلی گئی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے ان طلائی زیورات کو ٹٹولا اور اس کی حیرت بڑھتی گئی۔ "یہ... یہ آپ کو کہاں سے ملے مہروج؟"

"ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی ملتا ہے، یہ تو پھر گہنے تھے سلطانہ۔ یہ ابھی تک زرگاں کے اسی وید کے پاس تھے جس نے میرا علاج کیا۔ بے شک وہ ایک بہت قابل اور بہت لالچی وید ہے۔ میں نے ان زیورات کے لیے اسے باقاعدہ قیمت دی ہے اور موجودہ بھاؤ کے مطابق دی ہے۔"

سلطانہ کے سادہ چہرے پر ایک عجیب معصوم سی چمک نمودار ہوگئی۔ اس چمک میں اندرونی خوشی کا عکس تھا۔ اس نے ایک بار پھر زیورات کو اپنی کپکپاتی انگلیوں سے ٹٹولا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ میرے گلے سے لگ گئی۔

میں نے اسے پیچھے ہٹا کر اس کے ماتھے پر جھومر سجایا، اس کے گلے میں گلوبند پہنایا، اس کے کانوں میں جھمکے آویزاں کیے اور اسے ایک بار پھر گلے سے لگا لیا۔ آج کی شب وہ زر و زیور سے جگمگا گئی تھی۔

"مہروج! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ میرے لیے اتنا کچھ کریں گے۔" وہ نیاز مندی سے میرے گھٹنوں پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کا سر اٹھایا اور اپنے ہونٹوں کو اس کے چہرے سے ہم کلام کر دیا... ہاں، آج اس کا مرمریں جسم اس لیکی سے محفوظ تھا جو میرے چھوتے ہی اس پر طاری ہو جاتی تھی۔ اس نے بڑی "عاجزانہ خود سپردگی" کے ساتھ خود کو میرے اندر جذب کر دیا۔ میں نے لالٹین بجھا دی۔ ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں گم ہو گئے۔ اس کے جسم میں پہاڑی بارشوں کا ترنم تھا... جنگلی پھولوں کی مہک تھی اور خودرو درختوں کا بانکپن تھا۔ وہ بڑی محبت سے میرا نام پکارتی رہی۔ اس کی یہ حسین سرگوشی ریشمی اندھیرے میں جذب ہوتی رہی...

اگلے آٹھ دس روز بڑے حسین تھے۔ میری گردن کا زخم غیر متوقع تیزی سے ٹھیک ہوا تھا۔ پسلی کا درد بھی اب نہ ہونے کے برابر تھا۔ کلثوم، تاؤ افضل کی بیٹیوں اور نوری وغیرہ سے بہت گھل مل چکی تھی۔ یہ کلثوم وہی لڑکی تھی جسے میں نے فتح پور کے چودھری اور ستیش وغیرہ سے نجات دلائی تھی۔ کلثوم، نوری اور تاؤ افضل کی بیٹیاں ان خانوں کو بہت صاف ستھرا رکھتی تھیں۔ وہ دیگر امور خانہ داری کے علاوہ مزے دار کھانے بھی پکا رہی تھیں۔ کئی ہفتوں کی جان توڑ مشقت اور خطرات کی یلغار کے بعد مجھے اور عمران کو راحت کی گھڑیاں نصیب ہوئی تھیں۔ سلطانہ بھی بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کے کانوں میں اب جھمکے چمکتے تھے اور کلائیوں پر چوڑیاں گنگناتی تھیں۔ وہ ہر شام صاف ستھرا لباس پہنتی، خود کو تھوڑا سا سنوارتی اور اس کی آنکھوں میں شرگیں سائے لہراتے... ان خوب صورت شب و روز میں اگر اس کے ذہن میں کوئی کسک تھی تو وہ بالو کے حوالے سے تھی۔ ہمارا بچہ ہم سے دور تھا۔ بے شک، محفوظ ہاتھوں میں تھا اور خیریت سے تھا لیکن دوری تو تھی۔

ایک شب کے ریشمی اندھیرے میں جب میں چت لیٹا تھا اور سلطانہ کا سر میرے سینے پر تھا، میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "ایک بات پوچھوں سلطانہ؟"

"جی۔" اس نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

"تمہیں پتا ہے کہ تمہارا پرانا ظالم باشعل پانی میں نہیں ہے؟"

اس نے چونک کر میرے سینے سے سر اٹھایا اور بولی۔

"کہاں ہے وہ؟"

"زرگاں میں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں

جواب دیا۔ ”اور وہ وہاں اچھی حالت میں بھی نہیں ہے۔“
”کیا مطلب مہروج؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
میں نے لالٹین کی لَو اونچی کی تو کمرے میں مدھم روشنی پھیل گئی۔ سلطانہ نے اپنے بوڑھے شانوں کے گرد گرم شال لپیٹ لی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سلطانہ! مجھے ایک بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتانا۔ کیا تمہیں پتا تھا کہ ہاشو گونگا نہیں ہے؟“
اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر بولی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مہروج! ہا... ہاشو بول ناہیں سکتا۔ یہ سب جانتے ہیں...“
”لیکن... وہ بول سکتا ہے سلطانہ! میں نے اسے خود بولتے سنا ہے۔“
”کب... کہاں؟“
”حکم کے دربار میں... جہاں اسے زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اسے ٹل پانی سے پکڑا ہے جہاں وہ ایک بڑی سنگین واردات کرنے جا رہا تھا۔“
سلطانہ کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”میری سمجھ میں کچھ ناہیں آ رہا مہروج! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کہیں... کہیں وہ کوئی اور شخص تو ناہیں جسے آپ نے زرگاں میں دیکھا ہے؟“
”مجھے اتنا ہی یقین ہے کہ وہ ہاشو ہے، جتنا اس بات کا یقین ہے کہ تم سلطانہ ہو۔“
”یہ کیسے ہو سکتا ہے... کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔
اس کے کہنے پر میں نے اسے تفصیل سے سارے واقعات بتائے۔ میرا اور عمران کا حکم کے بھرے دربار میں پہنچنا، وہاں سخت مزاج بڑھیا سے ہمارا مکالمہ، ہاشو کا پابہ زنجیر نمودار ہونا۔ پانڈے کے ہاشو کے بارے میں انکشافات... زہر سے بھرے ہوئے پیکٹ کی رونمائی... میں نے سب کچھ سلطانہ کے گوش گزار کیا۔ آخر میں، میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ہاشم عرف ہاشو نے کس طرح بیانگِ دہل خود پر لگائے جانے والے الزامات قبول کیے اور بچ جانے کی صورت میں اپنے اقدام کو دہرانے کا اعلان کیا۔
سلطانہ سخت حیرت کے عالم میں سب کچھ سنتی رہی۔ اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔
”میں ایسا سوچ بھی ناہیں سکتی تھی۔“ وہ آخر میں لرزاں آواز میں بولی اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

میں اس سے زہر والی پڑیا کی بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کی کیفیت دیکھ کر خاموش رہا۔ وہ اگلے روز بھی بالکل گم صم رہی۔ تیسرے روز اس نے خود ہی اس پڑیا کی بات چھیڑ کر مجھے حیران کر دیا۔ نوری نے بڑا زبردست پلاؤ بنایا تھا۔ ہم رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک سلطانہ نے کہا۔ ”مہروج! میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“
”کہو سلطانہ۔“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔
”جن دنوں میں بہت زیادہ دکھی تھی اور جارج کی جان لینے کے لیے طلال کے ساتھ زرگاں چلی گئی تھی، میں نے خود کو مارنے کا فیصلہ کیا تھا۔“
”کیا مطلب سلطانہ؟“
”میں نے فیصلہ کیا تھا مہروج کہ اگر میں زرگاں میں پکڑی گئی تو بے عزت ہونے کے بجائے موت کو گلے لگا لوں گی۔ میں نے جہر کی ایک پڑیا اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ یہ جہر بس تھوڑے سے سے میں بندے کو مار سکتا ہے۔ یہ جہر مجھے ہاشو نے دیا تھا۔ پرسوں آپ نے جہر والے لفافے کی بات کی ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ جہر بھی اسی لفافے کا ہو۔“
”تم بڑے ڈرا دینے والے انکشاف کر رہی ہو سلطانہ! مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اس حد تک جا چکی ہو۔ کیا ان دنوں تمہیں میرا اور بالو کا خیال بھی نہیں آتا تھا؟“
وہ کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔ ”اگر سچ پوچھتے ہیں... مہروج... تو ناہیں آتا تھا۔ میں اس وقت خود کو جندہ سمجھتی اِچ ناہیں تھی، ہاں... سمجھتی اِچ ناہیں تھی۔ مرنا میرے لیے اتنا اِچ آسان تھا جتنا آنکھیں بند کرنا...“ وہ عجب لہجے میں بات کر رہی تھی۔
”اب وہ پڑیا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”اب وہ کہیں ناہیں ہے۔ اگر ہوتی بھی تو سمجھیں کہ ناہیں تھی۔ اب میں ان باتوں کے بارے میں سوچنا اِچ ناہیں چاہتی۔“
”کہیں پھینک دی ہے؟“
”ناہیں... کھو گئی ہے۔“
”تمہاری بہت سی کھوئی ہوئی چیزیں میرے پاس سے ملتی ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔
میں نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نیلگوں پاؤڈر والی چھوٹی سی پڑیا سلطانہ کے سامنے کر دی۔

ایک بار پھر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ”یہ... یہ آپ کو کہاں سے ملی؟“
”جہاں تم نے چھپائی تھی۔“ میں نے کہا... اور پڑیا اس کے ہاتھ میں تھما دی۔
اس نے لرزاں ہاتھوں سے اس پڑیا کو کھولا۔ کچھ دیر تک اشکبار آنکھوں سے اس نیلگوں پاؤڈر کو دیکھتی رہی جو کسی بھی شخص کو دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی سرحد پار کرا سکتا تھا۔ پھر اس نے اس پڑیا کو انگیٹھی کے دہکتے انگاروں پر الٹ دیا اور میرا بازو تھام کر میرے کندھے سے سر ٹکا دیا۔
ہاشو کے بارے میں، میں نے جو انکشافات پرسوں سلطانہ کے سامنے کیے تھے، انہوں نے بظاہر سلطانہ کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک شخص اتنا عرصہ ان کے گھر میں ان کے ساتھ گونگا بن کے رہا اور وہ اس کے بارے میں جان نہ سکے۔ اس کے علاوہ وہ صرف ہاشو نہیں تھا بلکہ ہاشم رازی تھا اور اس کی اہمیت اور حیثیت ان کی سوچوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ ”میں آپ کو اور عمران بھائی کو جھٹلا نہیں سکتی مہروج! اگر کوئی اور یہ بات کہتا تو میں کبھی بھی ناہیں مانتی۔“
اس رات بھی ہم دیر تک ہاشو اور اس کے جنونی رویے کے بارے میں بات کرتے رہے۔ اس کے علاوہ زرگاں کے وہ حالات بھی ہماری گفتگو کا موضوع بنے جو مقامی حکمرانوں کی من مانیوں سے پیدا ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے فرقہ پرستی اور شدت پسندی کو ہوا مل رہی تھی... اور وہ عروج پر پہنچ رہی تھی۔
سلطانہ نے ہاشو کے حوالے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا تھا۔ پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ اس معاملے میں تھوڑا بہت پیچ ضرور ہے۔
عمران اپنی باتوں سے ان تہ خانوں کی گھٹن اور سنجیدگی دور کرنے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ وہ اکثر اپنی باتوں سے محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتا تھا۔ اور تو اور تابش افضل جیسا بے رنگ شخص اور طلال جیسا نہایت سنجیدہ لڑکا بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ طلال سلطانہ کا سگا بھانجا تھا اور ہر سرد گرم میں اس کے ساتھ شریک رہا تھا۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ وہ بھی اپنی خالہ پر جان چھڑکتا تھا۔ درحقیقت یہ طلال ہی تھا جس نے مجھ پر انکشاف کیا تھا کہ اس کی خالہ، جارج گورا سے بدلہ لینے کے لیے تڑپ رہی ہے اور وہ کسی بھی وقت خاموشی کے ساتھ ان تہ خانوں سے نکل کر دوبارہ زرگاں کا رخ کر لے گی۔ یہ سب کچھ مجھے بتاتے ہوئے وہ زار و قطار روتا بھی رہا تھا۔ اس کی باتوں نے میرے دل پر ایسا اثر کیا تھا کہ مہینوں میں ہونے والا کام دنوں میں ہوا اور میں عمران کے ساتھ جارج گورا کی طرف نکل کھڑا ہوا۔
طلال اب بھی ہر وقت سلطانہ کے آس پاس ہی رہتا تھا۔ اپنی خالہ سے اس کا ایک قلبی تعلق بن چکا تھا۔ جارج کے ساتھ اپنی لڑائی کی روداد میں پوری تفصیل سے سب کو سنا چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ سب مزید سننا چاہتے تھے۔ یہ تذکرہ تہ خانے کے سارے مکینوں کے لیے زبردست دلچسپی کا باعث تھا۔ خاص طور سے طلال کے لیے۔ وہ اس سارے واقعے کی مکمل جزئیات جاننے کا خواہش مند تھا۔ آج بھی وہ موقع دیکھ کر میرے پاس آن بیٹھا تھا اور سامبر کے اس مقابلے کی باتیں کرنے لگا۔
میں نے اس کی دل شکنی مناسب نہیں سمجھی اور اس کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔ اس کے سوالوں میں سادگی بھرا تجسس ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”خالو تابش! جب آپ کی گردن جارج کے بازو میں پھنس گئی اور آپ اسے نکال ناہیں سکے تو آپ کیا سوچ رہے تھے؟ کیا آپ کو امید تھی کہ آپ نکل سکیں گے؟“
”امید پر ہی تو دنیا قائم ہے۔ سیانے بھی کہتے ہیں کہ امید اور کوشش کا دامن آخر تک نہیں چھوڑنا چاہیے۔“
”میرا مطلب ہے جی کہ سورج ڈوب جانے کی وجہ سے پنڈتوں نے لڑائی رکوا دی۔ فرج (فرض) کیا اگر وہ یہ لڑائی ناہیں رکواتے تو کیا آپ نکل جاتے؟“
”میں اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ میری برداشت ساتھ دیتی رہی اور میں لڑائی کو لمبا کھینچتا رہا، یہاں تک کہ لڑائی کا وقت ختم ہو گیا۔ اسی لیے کہتے ہیں نا کہ قدرت بھی ان کا ساتھ دیتی ہے جو کوشش کرتے ہیں۔“
طلال کی نگاہوں میں میرے لیے ستائش ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ مجھ سے مختلف سوال پوچھتا رہا۔ میں اتنی سردی گرمی کیسے برداشت کر لیتا ہوں؟ میں بھوک کیسے جھیل لیتا ہوں؟ میں کھردرے فرش پر کیسے سو جاتا ہوں؟ کیا واقعی مجھے درد محسوس نہیں ہوتا؟ وغیرہ وغیرہ۔
اس دوران میں آفتاب خان بھی وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھال تھا اور اس میں میٹھے چاول تھے۔
”یہ کیا ہے آفتاب؟“ میں نے پوچھا۔
وہ جذباتی انداز میں بولا۔ ”تابش صاحب! ام نے

منت مان رکھا تھا کہ اگر آپ زرگاں سے کامیاب ہو کر خیریت کے ساتھ واپس آگیا تو ام لوگوں کا منہ میٹھا کرائے گا۔ ام نے آج زردے کا یہ دیگ پکوایا تھا اور بچوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ کچھ چاول ام یہاں لے آیا۔ ام چاہتا ہے کہ آپ امارے سامنے اپنا منہ میٹھا کرے۔"

میں نے اور طلال نے ایک ایک لقمہ لیا۔ "تمہیں جارج کے مرنے کی خوشی ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اتنا زیادہ کہ آپ سوچ نہیں سکتا۔ لوگ کہتا ہے کہ دشمن کے مرنے پر بھی خوشی نہیں منانا چاہیے لیکن یہ ایسا گندہ دشمن تھا کہ ام خوشی منائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا... اور یہ صرف امارا بات ہی نہیں ہے۔ اس راجواڑے کا زیادہ تر لوگ خوش ہے۔ پتا ہے، جب زرگاں سے یہ خبر یہاں پہنچا تو لوگوں کا چہرہ چمک اٹھا۔ آپ جاتے جاتے ام کو منع کر گیا تھا کہ ام تہ خانے کے اندر نہیں جائے گا۔ پر ام سے برداشت ہی نہیں ہو سکا۔ رات تک کا وقت ام نے پتا نہیں کس طرح کاٹا اور پھر تہ خانے میں آگیا۔ اس وقت آپ کا بی بی سلطانہ مصلے پر بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔ خوشی کے مارے امارے منہ سے بات ہی نہیں نکلا۔ ام بس اتنا ہی کہہ سکا... وہ خبیث مر گیا، ختم ہو گیا..."

آفتاب خاں نے اس دن کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچا جب فتح پور میں جارج گورا کے مرنے کی اطلاع پہنچی تھی۔

ہمارے یہاں تہ خانوں میں آنے کے بعد آفتاب خاں تقریباً روزانہ ہی اندر آ رہا تھا۔ وہ رات کو فتح پور کی گلیوں میں پہرا دیتا تھا۔ اس پہرے کے دوران میں ہی نصف شب کے وقت وہ چپکے سے مندر کا پرانا دروازہ کھولتا تھا اور اپنی لاٹھی اور لالٹین سمیت تہ خانوں میں اتر آتا تھا۔ مجھے اس حوالے سے تھوڑی سی تشویش تھی۔ اسی تشویش کی وجہ سے میں نے اور عمران نے زرگاں جاتے وقت آفتاب سے کہا تھا کہ وہ تہ خانوں میں آنے سے گریز کرے۔

میں نے ایک بار پھر اس سے یہی بات کہی۔ میں نے کہا۔ "آفتاب! دل تو یہ چاہتا ہے کہ تم ہر وقت ہمارے پاس رہو مگر مسئلہ وہی ہے کہ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اگر کسی رات کسی نے تمہاری آمدورفت دیکھ لی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"آپ کہتے ہیں تو ام آنا کم کر دیتا ہے۔ لیکن ام آپ کو ایک بات کا پورا یقین دلاتا ہے، اماری وجہ سے کبھی کسی کو آپ کے یہاں ہونے کا پتا نہیں چلے گا..."

پھر اس نے تفصیل سے بتایا کہ وہ مندر کی سیڑھیاں چڑھنے اور دروازہ کھول کر اندر آنے میں کیا کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرتا ہے۔

اگلے روز آفتاب خاں نے تہ خانوں میں آکر جو خبر سنائی، وہ واقعی سنسنی خیز تھی۔ یہ خبر اسی نحوست بڑھیا کے بارے میں تھی جسے ہم اس کی ساری نحوست سمیت زرگاں میں چھوڑ آئے تھے۔ آفتاب خاں نے بتایا کہ پچھلے چار پانچ روز سے بڑھیا نے مرن بھرت رکھا ہوا تھا۔ وہ زرگاں کے بڑے مندر کی سیڑھیوں پر دھرنا دیے بیٹھی تھی۔ کمزور عقیدہ لوگوں کا ایک جم غفیر اس کے گرد اکٹھا رہتا تھا۔ بڑی عمر کے کچھ اور مرد و زن بھی اس کے ساتھ اس بھوک ہڑتال میں شریک ہوتے گئے اور اچھا خاصا تماشا بن گیا تھا۔ پرسوں رات کو بڑھیا بیٹھے بیٹھے لڑھک گئی۔ پتا چلا کہ وہ مر گئی ہے۔ اس کے دیہانت کی خبر نے زرگاں میں ہلچل مچا دی۔ انتہا پسند ہندو بھڑک اٹھے۔ انہوں نے مندر کے قریب ہی مسلمانوں کے ایک محلے پر حملہ کیا۔ مسلمانوں کے مکانوں کو چاروں طرف سے گھیرا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ اس نہایت سنگین واقعے میں کم و بیش ساٹھ لوگوں کے ہلاک ہونے کی اطلاع تھی۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ بہت سے لوگ زخمی بھی ہوئے تھے...

یہ دل خراش اطلاع تھی۔ زرگاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتعال بڑھ رہا تھا۔ خاص طور سے اونچی ذات کے ہندو بہت مشتعل تھے۔ مسلمانوں نے جس طرح میری اور جارج کی لڑائی میں میری حمایت کی تھی اور جس طرح چپکے چپکے میری جیت کی خوشی منائی تھی، اونچی ذات کے ہندوؤں کو یقیناً بہت تاؤ چڑھا تھا۔ اب اس کا بدلہ مسلمانوں کے پورے ایک محلے کو جلا کر لیا گیا تھا۔

یہ بہت افسردہ کر دینے والی خبر تھی اور اس میں افسردہ کر دینے والا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ کم بخت بڑھیا اس سارے فساد کے باوجود ابھی زندہ تھی۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا جہاں چند گھنٹوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اب پتا نہیں کہ وہ واقعی بے ہوش ہوئی تھی یا یہ اس کا کوئی مکر تھا۔ زرگاں کے ضعیف العقیدہ لوگ اسے بھی بھگوان کا چمتکار قرار دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسا واقعہ بس کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

اگلے روز سب بجھے بجھے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی کسی نے نہیں کھایا۔ سلطانہ بھی افسردہ تھی۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ "لگتا ہے کہ زرگاں اور تل پانی میں حالات پھر سنگین ہوتے

جا رہے ہیں۔ شاید اس بار لڑائی تک نوبت آ جائے۔"

"ہاں، یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ساٹھ لوگوں کے مرنے کی خبر ہے۔ بہت سے زخمی بھی ہیں۔"

"اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔" عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ وہ وجہ زیادہ اہم ہے۔ جب ہم زرگاں سے آ رہے تھے تو وہاں جیل میں ہنگامہ ہوا تھا بلکہ اسے بغاوت ہی کہنا چاہیے۔ سو کے قریب قیدیوں کو پکڑ لیا گیا تھا۔ کہا جا رہا تھا کہ ان میں سے تیس چالیس کو سولی کی سزا ہو جائے گی... اگر واقعی ایسا ہو گیا تو مجھے نہیں لگتا کہ یہاں امن رہ سکے گا۔"

"آئندہ کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں، تاؤ افضل کی کسی دختر سے شادی کر کے اسے جلدی سے دو تین بچوں کا نانا بنا دوں۔ اگر یہاں ہونے والی لڑائی میں مر بھی گیا تو کوئی میرا نام لینے والا تو ہو گا..." وہ پھر پٹری سے اتر گیا۔

"بس اب اپنی بکواس شروع کر دو۔" مجھے بھی تاؤ آ گیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر بمشکل بٹھایا اور خلاف توقع سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "تابی! ہم زیادہ دیر یہاں رہ نہیں سکتے۔ تمہیں پتا ہی ہے، حکم کے سامنے مجھے بتانا پڑا تھا کہ میں فتح پور کے مندر میں ہونے والے خونی ہنگامے کا چشم دید گواہ ہوں۔ اب ہمارے فرار کے بعد ہماری تلاش شروع ہو چکی ہے۔ دیکھنا ایک دو دن میں حکم کے سپاہی یہاں فتح پور تک بھی پہنچیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آفتاب خاں سے بھی پوچھ گچھ کریں۔ کسی بھی وقت ہماری یہاں موجودگی کا پول کھل سکتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"ہمیں جلد از جلد تل پانی پہنچ جانا چاہیے۔ وہیں سے ہماری واپسی کا کوئی راستہ نکل سکے گا۔"

"لیکن اگر تل پانی پہنچنے کی کوشش میں دھر لیے گئے تو پھر؟"

"اس کا ایک حل ہے۔ لیکن وہ حل یہاں سے سات آٹھ میل کی دوری پر ہے۔ مجھے پہلے اس حل تک پہنچنا ہو گا۔"

"کھل کر بات کرو یار۔"

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "جب تمہاری گردن سے "الیکٹرانک چپ" نکلوانے کے لیے میں ڈاکٹر لی وان کو یہاں لے کر آیا تھا تو راستے میں ہنومان نامی ایک بستی میں رکا تھا۔ یہاں ایک ٹیلے پر ایک بڑا گوڈا ہے۔ اس بستی میں نتھا کمار نامی ایک شودر سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ شخص خاندانی شکاری ہے۔ اس علاقے کی ہر اونچ نیچ کو جس طرح جانتا ہے، شاید ہی کوئی دوسرا جانتا ہو۔ مجھے یقین ہے اگر ہم اس بندے کو کچھ رقم دیں تو یہ ہمیں نہایت محفوظ رستوں سے تل پانی کے نواح تک پہنچا سکتا ہے۔ اور یہی نہیں، ہمارے لیے مناسب سواری کا انتظام بھی کر سکتا ہے۔"

اس حوالے سے میرے اور عمران کے درمیان آدھ پون گھنٹا گفتگو ہوئی۔ حسب معمول عمران یہ کام بھی اکیلے ہی کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں اڑ گیا کہ اگر جانا ہے تو پھر ہم اکٹھے جائیں گے۔ ورنہ نہیں جائیں گے... کافی بحث و تمحیص کے بعد عمران رضامند نظر آیا۔ ہم نے اس بارے میں دیگر تفصیلات طے کرنا شروع کر دیں۔ بے شک اس میں خطرہ موجود تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ عمران کی طرح مجھے بھی خطرات کو گلے لگانا اچھا لگنے لگا ہے۔

اس رات میں نے سلطانہ کو بھی بتا دیا کہ میں اور عمران ایک دو روز کے لیے مندر سے باہر جائیں گے تاکہ تل پانی پہنچنے کا معاملہ آسان ہو سکے۔ سلطانہ نے اس پر کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ وہ کرے گی اور مجھے باہر جانے سے روکے گی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی تھی۔ میں اسے زرگاں سے آنے والی دل خراش خبر کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔ دوسرے تیسرے دن مجھے پتا چلا کہ ایسا نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ میرے لیے بالکل ناقابل یقین ثابت ہوا۔ آفتاب خاں کا ایک اور روپ میرے سامنے آیا جس نے مجھے بھونچکا کر کے رکھ دیا... بلکہ بنیادوں تک ہلا ڈالا۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ پسلی کے درد کی وجہ سے میں نے کروٹ بدلی تو مجھے لگا کہ سلطانہ میرے پہلو میں موجود نہیں ہے۔ میں نے لحاف ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لالٹین روشن کر کے میں نے دیکھا، کمرا خالی تھا۔ سلطانہ کی چپل بھی موجود نہیں تھی۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے غسل خانے میں دیکھا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی تہ خانے میں گیا۔ نوری، کلثوم، تاؤ افضل کی بیٹیاں اور طلال وغیرہ سب سو رہے تھے۔ یہاں تک کہ تاؤ افضل بھی جو رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارتا تھا، سویا ہوا تھا۔ اچانک مجھے سب سے اوپر والے تہ خانے کی طرف سے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک کمرے میں کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔ میں لکڑی کے قدیم زینوں پر ننگے پاؤں چلتا ہوا اوپر گیا۔ ایک دم مجھے ایک

دروازے کی اوٹ میں ہونا پڑا۔ میں نے کاٹھ کباڑ والے کمرے میں سے سلطانہ کو نکلتے دیکھا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ اگلے ہی لمحے مجھے ادھ کھلے دروازے میں آفتاب خاں نظر آیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے سلطانہ سے کچھ کہا پھر ایک چھوٹا سا مستطیل ڈبا سلطانہ کو تھمایا جسے سلطانہ نے لے کر اپنی چادر میں چھپالیا۔

وہ اب واپس پلٹنے والی تھی۔ میں تیزی سے نیچے اترا۔ کمرے میں واپس جاکر لالٹین بجھائی اور بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ رہا ہے۔ یہ میں کیا دیکھ آیا تھا؟ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہورہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد سلطانہ کا ہیولا کمرے میں داخل ہوا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کیے بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے آفتاب سے حاصل ہونے والا گتے کا ڈبا پلنگ کے نیچے کہیں چھپایا۔ جو ہلکی پھلکی آوازیں پیدا ہوئیں، ان سے مجھے شک ہوا کہ ڈبے میں چوڑیاں یا اس قسم کی کوئی شے ہے۔

باقی کی رات میں نے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سلطانہ ایسی ہرگز نہیں تھی۔ یقیناً یہ کوئی اور معاملہ تھا۔ لیکن کیا تھا؟ اور اگر تھا تو وہ مجھ سے کیوں چھپارہی تھی؟

میں نے سلطانہ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن میرے دل و دماغ میں زبردست ہلچل تھی۔ اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے مجھے وہ ڈبا دیکھنے کا موقع ملا جسے سلطانہ نے پلنگ کے نیچے چھپایا تھا۔ میرا خدشہ درست نکلا۔ اس میں پیلی اور سرخ چوڑیاں تھیں۔ یہ خوب صورت چوڑیاں وہ آفتاب سے لے کر آئی تھی۔۔۔ اور آفتاب وہ شخص تھا جسے میں نے اپنی غیر موجودگی میں تہ خانے میں آنے سے منع کیا تھا اور وہ پھر بھی آتا رہا تھا۔ میرے دل و دماغ میں تہلکہ سا مچ گیا۔ عمران سارا دن مجھ سے پوچھتا رہا کہ میں کھویا کھویا کیوں ہوں؟

میں مختلف حیلوں سے اسے ٹالتا رہا۔ اس کی عقابی نگاہیں جان چکی تھیں کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ ''ہماری پیاری سی بھابی سے پھر تو کوئی جھگڑا نہیں ہوگیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، ایسا کچھ نہیں۔''

''اگر ہے تو بتاؤ یار! میں ایک اچھے دیور کا کردار بڑی خوبی سے ادا کرسکتا ہوں بلکہ ضرورت ہو تو بارعب جیٹھ بن کر بھی دکھا سکتا ہوں۔ بھابی کے پاس اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہوگا کہ میاؤں میاؤں۔۔۔ میرا مطلب ہے، میں آؤں، میں آؤں کرنے لگے۔''

اس روز آفتاب خاں رات دس بجے کے قریب تہ خانے میں آیا۔ حسب معمول اس کے پاس باہر کی خبریں موجود تھیں۔ آج کی اہم ترین خبر وہی تھی جس کا اندیشہ دو دن پہلے عمران نے ظاہر کیا تھا۔ آفتاب نے بتایا کہ سہ پہر کے وقت دو جیپوں پر سوار آٹھ دس مسلح افراد بستی میں آئے تھے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔

''کس طرح کی پوچھ گچھ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پوچھتا تھا کہ دو ڈھائی ماہ پہلے مندر میں جو ہنگامہ ہوا، وہ کس طرح کا تھا۔ اس میں کتنا لوگ مرا تھا وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ یہ پوچھنے لگا کہ باہر کا جو مسلمان لوگ یہاں ٹھہرا ہوا تھا، وہ دوبارہ یہاں آیا ہے یا نہیں۔ خود انہوں نے ہر گھر میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں تفصیل تفصیل پوچھا اور کہا کہ اگر کسی نے کچھ چھپانے کا کوشش کیا تو اس کا حشر خراب ہو جائے گا۔ وہ دوبارہ آنے کا کہہ کر شام کے وقت واپس گیا ہے۔''

آفتاب خاں بالکل معمول کے مطابق باتیں کر رہا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا کہ وہ کل کیوں نہیں آیا؟

''بس جی۔۔۔ کل مندر کے پاس ہی ایک گھر میں فوتیدگی ہوا۔ لوگ جاگ رہا تھا۔ ام نے ٹھیک نہیں سمجھا۔''

اس کے سفید جھوٹ نے میرے تن بدن کی آگ کو مزید بھڑکایا۔ اس گفتگو کے دوران میں سلطانہ بھی پاس ہی موجود تھی۔ اس نے چائے کی پیالی آفتاب خاں کی طرف بڑھائی۔۔۔ دونوں کی نظریں چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے میں گڑی رہیں۔ مجھے لگا کہ کوئی میرے منہ پر طمانچے رسید کر رہا ہے۔

یہ کیا ہوا تھا میرے ساتھ؟ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ سلطانہ جو ایک بیوی سے زیادہ ایک زرخرید باندی کی طرح میری اطاعت گزاری میں مصروف رہتی تھی، اپنے کردار کا ایسا رخ پیش کرے گی، یہ بعید از گماں تھا۔

اگلی رات صورت حال کچھ اور بھی واضح ہوگئی۔ نصف شب کا وقت تھا۔ میں بستر پر جاگ رہا تھا لیکن آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ سینے میں بے چین دھڑکنیں جاگی ہوئی تھیں۔ سلطانہ میرے پہلو میں ساکت لیٹی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ سو رہی ہے یا نہیں۔ پروگرام کے مطابق آج آفتاب خاں کو نہیں آنا تھا۔ رات کوئی ڈیڑھ بجے کا وقت ہوگا جب سلطانہ بستر سے اتری اور چپل پہن کر دبے پاؤں کمرے سے نکل گئی۔ میری بے قراری کچھ اور بڑھ گئی۔ میں نے

پندرہ، بیس منٹ انتظار کیا پھر خود بھی اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں نے احتیاطاً اپنا ریوالور شلوار کے نیفے میں اڑس لیا تھا۔ درمیانی تہ خانے سے تایا افضل کی غنودگی بھری کھانسی سنائی دے رہی تھی۔ یہ کھانسی تھی تو میں درمیانی تہ خانے سے گزر کر بالائی تہ خانے میں آیا۔ آج پھر کاٹھ کباڑ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر ہلکی روشنی تھی جو یقیناً آفتاب خاں کی لالٹین ہی کی تھی۔ میں دبے پاؤں دروازے کے بالکل قریب چلا گیا۔ مجھے کسی جھری یا درز کی تلاش تھی تاکہ اندر جھانک سکوں۔ کافی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بس میں اندر، مدھم آواز میں بولے جانے والے دو تین جملے ہی سن سکا۔۔۔ سلطانہ کی دبی دبی آواز آئی۔۔۔ ''ناہیں آفتاب! اب یہ ممکن ناہیں۔ میں اسے اور دھوکے میں ناہیں رکھ سکتی۔ اسے کسی بھی وخت (وقت) پتا چل جائے گا۔ اب بھی بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ مجھے فکر تھی کہ تم انتظار کرتے رہو گے۔ اب میں چلتی ہوں۔''

''ابھی تو ام نے کوئی بات ہی نہیں کیا۔'' آفتاب کی آواز ابھری۔

''ناہیں، کافی باتیں ہوگئیں۔''

''چلو ٹھیک ہے لیکن پرسوں تو تم ٹائم پر آجائے گا نا؟''

''اس شرط پر کہ مہرو ج اپنے کام سے چلا گیا۔۔۔ اور دوسری بات یہ آفتاب کہ یہ۔۔۔ آخری بار ہوئیں گا۔ بالکل آخری بار۔'' سلطانہ کا لہجہ حتمی تھا۔

آفتاب نے شاید ٹھنڈی سانس بھری اور کچھ منمنایا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس کے بعد بس ایک ہی مختصر سا جملہ میری سمجھ میں آسکا۔ آفتاب خاں نے کہا تھا۔ ''گرم چادر ضرور لے کر آنا۔''

زندگی میں پہلی بار اس طرح کی صورت حال سے پالا پڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ دل چاہا کہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں اور دونوں کے سینوں میں گولیاں ٹھونک دوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوچ بھی تھی کہ کہیں یہ سب کچھ واہمہ ہی نہ ہو۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ جو کچھ دکھایا سنا جائے وہ یقیناً ویسا ہی ہو جیسا سمجھ میں آرہا ہو۔ یہ آدھی رات کی ملاقاتیں اور باتیں کسی اور حوالے سے بھی تو ہوسکتی تھیں۔ ابھی تک کوئی ایسا ثبوت میرے سامنے نہیں آیا تھا جسے حتمی کہا جاسکے۔

میں سیڑھیاں اتر کر واپس کمرے میں آگیا اور بستر پر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ دو تین منٹ بعد سلطانہ بھی آگئی۔

بیوی کا مشورہ

کاشف کا انگوٹھا زخمی ہوگیا۔ وہ اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے انگوٹھے کو دیکھ کر کہا۔

''گھر جاؤ اور انگوٹھے کو دو تین گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں ڈبوئے رکھو۔''

گھر جاکر کاشف نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسی اثنا میں اس کی بیوی آگئی اور پوچھا۔ ''کیا کر رہے ہو؟'' شوہر نے کہا۔

''میرے انگوٹھے میں تھوڑی سی چوٹ آگئی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے اگر میں دو تین گھنٹے تک اسے ٹھنڈے پانی میں رکھوں گا تو ٹھیک ہوجائے گا۔''

''کیا بے وقوف ڈاکٹر ہے۔'' بیوی نے کہا۔ ''زخمی انگوٹھے کو ٹھیک کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے گرم پانی میں ڈبویا جائے۔''

بیوی کے کہنے پر کاشف نے دو تین گھنٹے تک انگوٹھے کو گرم پانی میں رکھا اور انگوٹھا واقعی ٹھیک ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد اس کی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا۔

''میں نے تمہارے کہنے پر عمل نہیں کیا تھا بلکہ بیوی کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے انگوٹھے کو گرم پانی میں ڈبویا تھا جس کی وجہ سے انگوٹھا ٹھیک ہوگیا۔''

''عجیب بات ہے۔'' ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ ''میری بیوی تو ایسی حالت میں ہمیشہ انگوٹھا ٹھنڈے پانی میں ڈبونے کو کہتی ہے۔''

پرسوں کی طرح بغیر کوئی آواز پیدا کیے اس نے پھر پلنگ کے نیچے کچھ چھپایا اور میرے پہلو میں لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔

اگلے روز دوپہر کے کھانے پر سلطانہ نے خود ہی میرے جانے کا ذکر چھیڑ دیا۔۔۔ عام سے لہجے میں بولی۔ ''مہروج! کل پھر جارہے ہیں آپ؟''

''جانا تو چاہیے۔'' میں نے بے دلی سے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

''عمران بھائی بھی ساتھ جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی۔ ''کتنے بجے نکلیں گے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، کتنے بجے نکلوں تو تمہیں آسانی رہے گی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میری گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ چونکا۔ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر خود بھی ”گن“ ایک طرف رکھ کر گھاس پر بیٹھ گیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس مشکوک جوہڑ کی طرف کوئی آئے گا نہیں۔۔۔ دیگر خطرات سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس ہتھیار موجود تھے۔ عمران کی بھاری چادر کے نیچے وہی دور مار رائفل تھی۔ میرے تہ بندکی ڈب میں ریوالور تھا اور جیب میں وہی تاریخی چاقو جس نے جارج گورا کے عروج کو دائمی زوال دیا تھا۔

عمران نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے یار! دو تین دن سے تمہاری ٹی گم ہے۔ تم کچھ چھپا رہے ہو؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گہرے اندھیرے میں اپنے سامنے دیکھتا رہا۔۔۔ اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔ ”کچھ بولو یار! ہم ہی ایک دوسرے کو نہ بتائیں گے تو اور کون بتائے گا۔۔۔ اچھا۔۔۔ چلو یہی بتا دو کہ یہاں کیوں رکے ہو؟“

”اس لیے کہ ہم نے آگے نہیں جانا۔ آج رات یہیں رکنا ہے۔“

”کیوں رکنا ہے؟ وہ کیوں؟“

”میں ایک بندے کی اصلیت جاننا چاہتا ہوں۔“

”کون بندہ؟“

”آفتاب خاں۔۔۔“ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ دکھ کے بوجھ سے میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

”آفتاب خاں؟ اس نے کیا کیا ہے؟“

”وہ جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔۔۔ اور شاید تمہاری سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔“ مجھے اپنی آنکھیں نم محسوس ہوئیں۔

عمران ایک ایسا دوست تھا جس کو میں اپنی ہر غمی خوشی میں شریک کر سکتا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ ہمارے درمیان کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ لیکن آج عمران سے سلطانہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ میں نے حوصلہ جمع کیا اور دل فگار لہجے میں وہ سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا جو اب تک صرف میں جانتا تھا۔

گہری تاریکی میں، میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کا چہرہ بھی حیرت کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ اس نے مجھ سے کئی سوال جواب کیے۔۔۔ اور آخر میں وہ بھی اسی گومگو کی کیفیت میں چلا گیا جس میں، میں تھا۔ سلطانہ کے ساتھ گزارے پل کی طرف دیکھتے تھے تو سب جھوٹ لگنے لگتا تھا، نگاہ کا فریب محسوس ہوتا تھا۔۔۔ مگر وہ تعاقب کی گواہی کچھ اور کہانی سناتی تھی۔

عمران نے درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”۔۔۔ تو تمہارا خیال ہے کہ آج رات سلطانہ مندر سے آفتاب خاں کے ساتھ نکلے گی اور کسی قریبی گھر میں جائے گی۔“

”یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر لگتا یہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دس بجے کے بعد سے مندر کے آس پاس موجود رہیں تاکہ ہمیں آفتاب کے آنے اور جانے کا پتا چلے۔“

عمران نے ماتھا ہاتھ میں پکڑ لیا اور کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنے چمکیلے ڈائل والی گھڑی دیکھی۔ اب نو بجنے والے تھے۔ وہ بولا۔ ”اگر ہمیں مندر کی طرف ہی جانا ہے تو پھر اٹھ جائیں۔ دس پندرہ منٹ پہلے گیا اور بعد میں کیا۔ جاتے جاتے بھی آدھ گھنٹا تو لگ ہی جاتا ہے۔“

میں نے گن اٹھائی۔ پگڑی درست کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ عمران بھی اٹھ گیا۔ وہ ایک دم پژمردہ نظر آنے لگا تھا۔ تاہم مجھے حوصلہ دینا بھی وہ اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”گھبراؤ نہ تانی! جو ہوگا ہمارے لیے اچھا ہی ہوگا اور پتا نہیں کیوں اب بھی میرا ذہن اس ساری صورتِ حال کو مان نہیں رہا ہے۔“

ہم گھنے درختوں میں چلتے ہوئے جوہڑ سے واپس روانہ ہوئے۔ آدھ گھنٹے میں ہم واپس مندر کے آس پاس پہنچ گئے۔ آسمان پر ہلکا سا ابر تھا جس کے سبب تاریکی کچھ زیادہ ہی گہری ہو گئی تھی۔ نج پور کی زیادہ تر روشنیاں اب بجھ چکی تھیں۔ گلیوں میں ہلکی دھند تھی اور آوارہ کتوں کا شور تھا۔

ہم نے درختوں کے درمیان ایک مناسب جگہ دیکھی اور گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے جب ہمیں ایک روشنی مندر کی طرف آتی دکھائی دی۔ دھیرے دھیرے وہ روشنی مندر کی سیڑھیوں تک آ گئی۔ یہ یقیناً آفتاب خاں ہی تھا۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر اس نے لالٹین بجھا دی۔ چند لمحے بعد غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ آفتاب کا ہیولا سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد ہیولا اوجھل ہو گیا۔ وہ مندر میں جا چکا تھا۔

اب انتظار پہلے سے زیادہ کٹھن ہو گیا۔ نصف شب کے سناٹے کا فائدہ اٹھا کر آفتاب مندر کے اندر تھا اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں طویل پکڑتی گئیں۔ ایک ہی جگہ سردی میں بیٹھے بیٹھے جسم اکڑنا شروع ہو گیا تھا۔ میں تو ایسی سختی کا کچھ عادی ہو گیا تھا لیکن عمران اس موسم کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ انتظار ختم ہوا۔ مندر کا دروازہ کھلا اور سیڑھیوں پر حرکت نظر آئی۔ اس مرتبہ آفتاب کے ہیولے کے ساتھ دو اور ہیولے بھی تھے۔ ایک ہیولا واضح طور پر عورت کا تھا اور یہ یقیناً سلطانہ ہی تھی۔ اس نے خود کو سر تا پا چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ تینوں ہیولے سیڑھیوں سے اترے اور انہی درختوں کی سمت بڑھے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ ہم نے خود کو لمبی گھاس اور گھنی شاخوں میں کچھ اور بھی ”کیموفلاج“ کر لیا۔ ہم سے قریباً پندرہ بیس میٹر کی دوری پر آ کر تینوں ہیولے جھاڑیوں میں ٹھہر گئے۔ میرے اندازے کے مطابق تیسرا ہیولا ہمارے دوست اقبال کا تھا۔ اس نے سلطانہ کو کندھوں سے تھاما ہوا تھا اور وہ تھوڑا سا جھکی ہوئی تھی جیسے تکلیف میں ہو۔ آفتاب کی مدھم آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ ”آپ بس دو منٹ یہاں رکیں۔ ہم اس سامنے والے احاطے سے بائیسکل لے کر آتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

چند سیکنڈ بعد اقبال کی جانی پہچانی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ سلطانہ کو تسلی دے رہا تھا۔ ”کچھ نہیں بھابی! پیٹ کا معمولی درد ہے۔ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ آفتاب بتا رہا ہے، بڑا سیانا حکیم ہے۔ پورا علاقہ مانتا ہے اسے۔“

سلطانہ شاید ہولے سے کراہی تھی۔ پھر اس نے ایک بوتل میں سے دو گھونٹ پانی پیا۔ اسی دوران میں آفتاب خاں بھی سائیکل لے کر آ گیا۔ اقبال نے سلطانہ کو سہارا دے کر سائیکل کے چوڑے کیریئر پر بٹھایا۔ اس کی مدھم ہائے ہائے سنائی دی۔ اقبال نے پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”یہ اجوائن اور سونف کا پانی ہے۔ دو دو گھونٹ پیتی جائیں اس سے فائدہ ہوگا۔“

آفتاب خاں سائیکل پر سوار نہیں ہوا بلکہ اسے یونہی چلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔۔۔ اقبال تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا پھر واپس مندر کی طرف چلا گیا۔ اب ہمارے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہیں کھڑے رہتے۔ ہم درختوں میں سے نکلے اور ایک محفوظ فاصلے سے بائیسکل کا پیچھا کرنے لگے۔ سلطانہ بدستور کیریئر پر تھی اور آفتاب اسے پیدل دھکیلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

یقین کرنا تو مشکل تھا کہ سلطانہ واقعی بیمار ہو گئی ہے۔ یہ سب کچھ اسی ڈرامے کا حصہ لگتا تھا جس کے کچھ سین میں پچھلے تین چار روز سے دیکھ رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ سلطانہ اور آفتاب خاں نے مندر سے باہر آنے کے لیے بیماری والا کھیل کھیلا ہے۔ اقبال کو تو خواتین کی حفاظت کے لیے مندر میں ہی رہنا تھا۔ آجا کے آفتاب خاں ہی تھا جو ناگہانی تکلیف کی صورت میں سلطانہ کو کسی معالج کے پاس لے جا سکتا تھا۔ اب یہ ”تکلیف“ کیا تھی، اس کا ”علاج“ کیا تھا اور معالج کون تھا، اس کا پتا تو آنے والی گھڑیوں میں ہی چل سکتا تھا۔ کچھ آگے جا کر آفتاب خاں نے اپنی لالٹین روشن کی اور سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا لی۔ حفاظت کے لیے اس کے پاس اپنی رائفل بھی موجود تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ گھنے درختوں میں سفر نہیں کر رہا تھا۔ لالٹین روشن ہونے سے ہمیں تعاقب میں مزید آسانی ہو گئی اور ہم نے احتیاطاً اپنا اور آفتاب خاں کا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا۔

یہ سفر بغیر کسی وقفے کے جاری رہا اور میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا کہ آفتاب اور سلطانہ کی منزل کہیں آس پاس ہی ہے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم اپنے مقامِ آغاز سے تقریباً پانچ میل آگے آ چکے تھے۔۔۔ یہاں ان دونوں نے آدھ گھنٹے کا وقفہ کیا اور ایک بار پھر چل پڑے۔ سفر کی شکل اب بھی وہی تھی۔ سلطانہ سائیکل کے کیریئر پر تھی اور آفتاب پیدل چل رہا تھا۔ جس قسم کے راستے تھے، وہ سوار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سفر کا یہ دوسرا دورانیہ اندازاً ایک گھنٹے کا رہا۔ نہایت ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ صبح صادق کا وقت قریب آ گیا ہے۔

سلطانہ اور آفتاب کا یہ دوسرا قیام گھنی خودرو جھاڑیوں میں ہوا۔ ہم ابھی تک بڑی کامیابی سے تعاقب کر رہے تھے۔ ہم اب بھی ان دونوں کے زیادہ قریب نہیں گئے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے کی وجہ سے تاریکی ذرا کم محسوس ہونے لگی تھی۔ عمران نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ آفتاب سائیکل کے پاس اکیلا کھڑا ہے۔“

”سلطانہ کہاں ہے؟“

”شاید اپنی کسی ضرورت کے لیے درختوں میں گئی ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سلطانہ کے ہیولے کو خودرو جھاڑیوں اور درختوں میں سے نمودار ہوتے دیکھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ اپنے کپڑے بدلنے کے لیے جھاڑیوں میں گئی تھی۔ اب اس کے جسم پر ہندو لڑکیوں کی طرح لہریے دار ساڑی تھی۔

آفتاب اور سلطانہ کا سفر ایک بار پھر شروع ہوا۔ اب وہ دونوں ہی سائیکل کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ اجالا ہونے کی وجہ سے تعاقب ہمارے لیے دشوار ہو گیا تھا لیکن یہ دشواری تادیر برقرار نہیں رہی۔ اچانک ہی ہمیں

اندازہ ہوا کہ ہم کسی بستی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ایک بڑے مندر کا کلس دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور بھجن کی آواز بھی کانوں میں پڑنے لگی۔ درختوں کے درمیان گھری ہوئی اس بستی میں کافی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مختلف رنگوں کے جھنڈے لہراتے نظر آئے... اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی مذہبی تہوار ہے۔ یہ ہندوؤں کا گاؤں تھا۔ مسلمان نہ ہونے کے برابر نظر آ رہے تھے۔ غالباً اردگرد کی چھوٹی موٹی بستیوں سے بھی لوگ یہاں پہنچ رہے تھے۔ ہم سلطانہ کو دور سے دیکھ سکتے تھے۔ اس نے اپنا نصف سے زیادہ چہرہ ساڑی کے پلو سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ اپنے حلیے سے ایک ہندو لڑکی نظر آتی تھی۔ ہمیں دور سے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا مگر لگتا ایسے ہی تھا کہ اس نے ماتھے پر تلک بھی لگا رکھا ہے۔ اچانک میرے ذہن میں وہ نتھ اور جھمکے وغیرہ آ گئے جو تہ خانوں میں آفتاب نے اسے دیے تھے۔ کیا وہ چیزیں بھی سلطانہ کو صرف روپ بدلنے کے لیے دی گئی تھیں؟ صورت حال تشویش ناک تھی، پھر بھی میرے سینے میں خوش گوار دھڑکنیں جاگنے لگیں۔ کچھ بھی تھا مگر سلطانہ کے حوالے سے میرا بدترین اندیشہ ماند پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

عمران کی آواز نے مجھے چونکایا۔ ”سلطانہ اور آفتاب نے ہمارا یہ حلیہ دیکھا ہوا ہے... ان کی نظر ایک بار بھی ہم پر پڑ گئی تو وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔“

ہم ایک شامیانے کی اوٹ میں چلے گئے اور ان دونوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگے۔ سلطانہ اب ہرگز بیمار نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے ایک عارضی دکان سے پوجا کی کچھ چیزیں خریدیں اور اس طرف چلی گئی جدھر عورتوں کا ہجوم تھا۔ آفتاب خان اب اس سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ مندر کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ مندر میں داخل ہونے کے لیے عورتوں اور مردوں کے علیحدہ علیحدہ راستے تھے۔ کم عمر بچے بھی عورتوں کے ساتھ تھے۔ اندر داخل ہونے کے لیے قطاریں بنائی گئی تھیں۔ سیکیورٹی سخت تھی۔ عورتوں کی تلاشی لینے کے لیے عورتیں موجود تھیں۔ سلطانہ بھی ایک قطار میں لگ چکی تھی۔ ہمارے قریب سے گزرتی ایک ہندو عورت کی کلائیوں پر لال اور پیلی چوڑیاں چمک رہی تھیں۔ ہندو عورت کے کندھے سے لگا ہوا ایک شیر خوار بچہ مجھے دیکھ کر بے وجہ مسکرایا۔ پھر ماں بیٹا بھیڑ میں اوجھل ہو گئے۔

ہم نے دیکھا کہ آفتاب خان ایک سائیکل مرمت والے کے پاس بیٹھ گیا ہے۔ ہم بھی ایک قریبی چائے خانے میں گھس گئے۔ یہاں سے ہم آفتاب پر نگاہ بھی رکھ سکتے تھے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ساری سائیکل کھلوا کر اسے ”اوورآل“ کرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یقیناً یہ بھی وقت گزاری کا ایک بہانہ تھا۔

”یہ تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے پیارے۔“ عمران نے چائے خانے کی خستہ میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔

”ہاں چکر تو کوئی اور ہی ہے۔“ میں نے تائید کی۔ میرے اندر خوشی اور دکھ کی عجیب ملی جلی سی کیفیت تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ سلطانہ کے کردار کے حوالے سے جو جان لیوا شکوک میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے، وہ اب باطل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نسبت سے میرے سینے میں پیدا ہونے والا گاڑھا سیاہ دھواں اب چھٹتا چلا جا رہا تھا۔ اب اس کی جگہ ایک دوسری طرح کے فکر و غم نے لے لی تھی۔ کچھ عرصے پہلے سلطانہ کے پاس سے ایک زہریلی پڑیا ملی تھی۔ اس پڑیا میں ویسا ہی نیلگوں زہر تھا جیسا زرگاں میں ہاشم رازی عرف ہاشو کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ تب میرے ذہن میں یہ اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں سلطانہ کا تعلق بھی تو کسی طور پر ہاشو کی سرگرمیوں سے نہیں؟ آج کی صورت حال چلا چلا کر اعلان کر رہی تھی کہ میرا وہ اندیشہ درست تھا۔

”مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے۔“ میں نے چائے کی پیالی کو گھورتے ہوئے کہا۔

”وہ تو مجھے بھی آ رہی ہے۔ سلطانہ کسی بہت خاص مقصد سے اندر گئی ہے۔“

”کہیں یہ وہی زہر والا معاملہ تو نہیں؟“ میری آواز میں لرزش آ گئی۔

”ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اس بارے میں ہمیں... آفتاب خان ہی بتا سکتا ہے۔“

”تو پہنچیں اس کے پاس؟“

”تمہیں تابش! یہ معاملہ اتنا آسان نہیں لگتا۔ آفتاب خان بھی وہ نہیں جو ہمیں نظر آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے کوئی اور ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک اس کے پاس جائے۔ دوسرا دور رہ کر اردگرد کا جائزہ لے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ دیکھو، ان شامیانوں کے پیچھے گنے کے کھیت نظر آ رہے ہیں۔ تم کسی طرح آفتاب کو ان کھیتوں میں لے آؤ۔ میں بھی تمہارے آس پاس ہی رہوں گا۔“

تھوڑی سی تفصیل طے کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں سیدھا سائیکلوں کی اس دکان پر پہنچا جہاں آفتاب بیٹھا اپنی سائیکل سروس کرا رہا تھا اور ساتھ ساتھ جلیبی کھا رہا تھا... مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ چند لمحوں کے لیے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اوہو، تابش بھائی! آپ یہاں؟ یہ ام... کیا دیکھ رہا ہے؟“

”مجھے بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا... تم یہاں کیسے؟“ میں نے کہا۔

”ام نے یہاں ایک بندے کو ادھار پیسا دیا ہوا ہے۔ اس سے لینے آیا تھا۔ یہاں اس میلے میں یہ سائیکل کا دکان دیکھا تو سوچا کہ سائیکل کو بھی ٹھیک ٹھاک کرا لے۔ لیکن... لیکن آپ تو ہنومان گاؤں گیا تھا نا۔ خو، اس کا راستہ تو نالے کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔“

میں نے آواز دبا کر کہا۔ ”نالے کے ساتھ ساتھ ہی جا رہے تھے مگر راستے میں گڑبڑ ہو گئی۔ کچھ لوگ پیچھے لگ گئے۔ شاید زرگاں کے ہی تھے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر اس طرف کو نکلے ہیں۔“

”عمران بھائی کہاں ہے؟“

”وہ سامنے کھیتوں میں۔ اسے تھوڑی سی چوٹ بھی لگ گئی ہے۔“

آفتاب خان بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ یقیناً اس کے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور آفتاب خان گنے کے کھیتوں میں پہنچ گئے۔ یہ آٹھ دس فٹ اونچے کھیت تھے۔ ”کہاں ہے عمران بھائی؟“ آفتاب نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا۔

میں نے اپنے تہ بند کی ڈب میں سے ریوالور نکال لیا۔ آفتاب کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ”خبردار آفتاب! اپنے ہاتھ اپنی جیبوں سے دور رکھو... اور نیچے بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں اردگرد کے پودوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور عمران بھی وہاں آ گیا۔ اپنی گرم چادر کے نیچے اس نے رائفل پر اپنے ہاتھوں کی گرفت رکھی ہوئی تھی۔ آفتاب سمجھ گیا کہ معاملہ سنگین ہے۔ ”نیچے بیٹھ جاؤ۔“ میں نے پھر پھنکار کر کہا۔

اب آفتاب کا رنگ سرخ ہونا شروع ہو گیا۔ بہرحال، وہ نیچے بیٹھ گیا۔ عمران نے بھی دور مار رائفل کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ میرا ریوالور پہلے سے ہی میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے آفتاب کی پھولی ہوئی واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک شکاری چاقو، نسوار کی ڈبیا، تھوڑی سی کرنسی اور چند کاغذ نکلے۔ رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ یہ چھوٹی

نال والی رائفل میں نے اتار لی اور ریوالور پھینک دی۔

''ہمارے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' وہ سنبھل کر بولا۔

''پہلے تم بتاؤ کہ تم ہمارے ساتھ یہ سب کیا کر رہے ہو؟'' عمران نے کہا۔

''ہم نے کیا کیا ہے؟''

''سلطانہ، اندر کیا کرنے گئی ہے؟'' عمران نے رائفل آفتاب کے سر سے لگا کر پوچھا۔

آفتاب ایک بار پھر بھونچکا رہ گیا۔ وہ ہم دونوں کی طرف حیرت سے دیکھ رہا تھا... عمران نے کہا۔ ''دیکھیے آفتاب! چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ تہ خانوں کے اندر اور تہ خانوں سے باہر جو کچھ ہوا ہے، وہ ہم دیکھتے رہے ہیں۔ جب تم ''بیمار'' سلطانہ کو سائیکل پر بٹھا کر فتح پور سے روانہ ہوئے تھے، تب بھی ہم تمہارے پیچھے تھے۔ اب کوئی سوال نہ کرنا۔ بس جواب دینا... سلطانہ کو تم نے کس کام سے اندر بھیجا ہے؟''

''ہم نے نہیں بھیجا۔ وہ خود گیا ہے۔ وہ خود جانا چاہتا تھا۔'' آفتاب خودسری کے انداز میں بولا۔

''کیوں جانا چاہتی تھی وہ؟''

''ہم نہیں جانتا... اور اگر جانتا بھی ہوتا تو تم کو نہ بتاتا۔'' آفتاب کا لہجہ اب واشگاف ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس کے چہرے پر جو ہراس نظر آیا تھا، اب ناپید ہو چکا تھا۔

''تم سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے تو ہم دوسری طرح پوچھیں گے۔'' میں نے ریوالور اس کی طرف سیدھا کیا۔

''آپ کا جس طرح مرضی پوچھو۔ ہم اپنے باپ کا اولاد ہی نہیں اگر تم کو ایک لفظ بھی بتائے۔'' آفتاب کا انداز مزید آتشیں ہو گیا۔ اب وہ سرتاپا ایک خر دماغ پٹھان نظر آتا تھا۔ ''اور ہم تم کو ایک اور بات بتاتا ہے۔ جو ہونا ہے، وہ تو ہونا ہی ہے۔ اگر تم زیادہ واویلا کرے گا تو پھر سلطانہ بی بی کا جان بھی چلا جائے گا۔ یہ لوگ اس کا بوٹیاں نوچ لے گا۔ بہتر ہے کہ جو ہو رہا ہے وہ ہونے دو۔ اور یہ سب کچھ ہمارے فائدے میں بھی ہے۔''

''کس فائدے کی بات کر رہے ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

وہ چند سیکنڈ چپ رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ زبان کھولے یا نہیں۔ پھر پھنکارتی آواز میں بولا۔ ''کیا تم مسلمان نہیں ہے؟ کیا تمہارا دل اس ظلم پر خون نہیں ہوتا جو یہ لوگ ہم پر کر رہا ہے؟ کیا تم نے زرگاں میں جل کر مرنے والے بچوں کی آخری پکاروں کو بھلا دیا ہے؟ ان کا بدلہ لینا ہم سب کا فرض ہے اور ہم لیں گے۔''

عمران نے ایک دم اپنا لب و لہجہ بدل لیا۔ اس نے گن کی نال جھکا دی اور بولا۔ ''ہماری سوچیں تم سے علیحدہ نہیں ہیں آفتاب! جو آگ تمہارے دل میں بھڑک رہی ہے، وہی ہمارے دل میں بھی ہے۔ لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ تم ہمارے ساتھی ہوتے ہوئے بھی ہم سے سب کچھ چھپا رہے ہو۔''

''اور یہی کچھ سلطانہ نے بھی کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ مجھے اعتماد میں لے لیتی تو مجھے یہ دکھ نہ ہوتا۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ شاید تم نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔''

''نہیں... ہم نے کسی کو مجبور نہیں کیا... اور یہ سارا کام مجبوری کا ہے بھی نہیں۔ یہ تو اندر کی غیرت اور جوش کا کام ہے۔ یہ نہ زبردستی کروایا جا سکتا ہے، نہ زبردستی رکوایا جا سکتا ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''اگر ہمیں دوست سمجھتے ہو آفتاب خاں تو سب کچھ کھول کر بتا دو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جائیں۔''

''ہم کیا بتائے؟''

''تم اور سلطانہ کس کے کہنے پر یہ سب کچھ کر رہے ہو؟''

''ہم نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یہ بس اندر کا جذبہ ہوتا ہے۔''

''اندر کا جذبہ تو ہمارے اندر بھی ہے... لیکن ہم کچھ کر نہیں پا رہے۔ تم نے کچھ کیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی تمہیں راہ دکھا رہا ہے۔ ہمیں صاف بتاؤ آفتاب خاں! ہمیں لگ رہا ہے کہ تمہارے، سلطانہ اور باشو وغیرہ کے درمیان تعلق ہے۔''

آفتاب کے چہرے پر رنگ سا گزرا لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں۔ سنبھل کر بولا۔ ''ہم باشو وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم کو صرف اتنا پتا ہے کہ وہ سلطانہ بی بی کے گھر میں کام کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سوچ بھی ہمارے جیسا ہو مگر ہمارے اور اس کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

آفتاب کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ باشو، سلطانہ، طلال، آفتاب شاید کسی ایک ہی ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔

میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ...''

''کیا مطلب؟'' وہ ذرا چونکی۔

''میرا مطلب ہے، بہت سویرے نکلوں گا تو تمہیں جلدی اٹھنا پڑے گا۔ کھانا وغیرہ بنانا ہوگا۔ صبح پانچ چھ بجے کے قریب نکلیں گے، یا پھر شام کو۔''

''اور واپسی؟''

''دو راتیں تو تمہیں اکیلے گزارنا پڑیں گی۔''

''مہروج! اس کام میں جیاد، خطرہ تو نہیں ہے؟'' اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''خطرہ ہے تو اچھی بات ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''خطروں سے ہی تو راستے نکلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اسی دوران میں طلال اندر آ گیا۔ اس نے سلطانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''خالہ! نوری کو بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے، وہ تمہیں بلا رہی ہے۔''

سلطانہ، طلال کے ساتھ بالائی تہ خانے کی طرف چلی گئی۔ کھانا زہر لگ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف رکھ دیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے پلنگ کے نیچے ہاتھ چلایا۔ ایک تاریک خلا میں چوڑیوں والے ڈبے کے ساتھ ایک بالکل چھوٹی سی پوٹلی بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے باہر نکال لی۔ یہ ایک ریشمی رومال تھا جس میں کچھ باندھا گیا تھا۔ میں نے کھول کر دیکھا۔ یہ چاندی کے جھمکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی خوب صورت طلائی نتھ تھی۔ ایسی نتھ میں نے یہاں اکثر ہندو عورتوں کو پہنے ہوئے دیکھی تھی۔ عطر کی ایک چھوٹی سی شیشی بھی ان چیزوں کے ساتھ موجود تھی۔ سلطانہ کے واپس لوٹنے سے پہلے میں نے یہ اشیا بجرانی جگہ پر رکھ دیں۔ دروازہ کھولا اور بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ رگوں میں آگ دوڑ رہی تھی۔ رات کو جو جو نے پھوٹے فقرے سنے تھے، وہ زہریلے تیروں کی طرح سوچوں میں سنسنا رہے تھے۔ ایک فقرہ بار بار ذہن میں آ رہا تھا۔ آفتاب نے سلطانہ سے کہا تھا۔ گرم چادر لے کر آنا... اس سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے مندر سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیا وہ سلطانہ کو کسی قریبی گھر میں لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو کیوں تھا؟ اس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا تھا۔ وہ کاٹھ کباڑ والے سرد کمرے کے بجائے کسی آرام دہ ماحول میں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ بہرحال جو کچھ تھا، فی الحال اندازوں اور قیافوں کے زمرے میں آتا تھا۔ یقین سے کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا تھا۔

اس روز میں نے عمران کے ساتھ مل کر مندر سے باہر نکلنے اور ''ہنومان گاؤں'' میں نتھا کمار نامی اس ہندو شکاری سے ملنے کا پروگرام بنا لیا۔ ہمیں اگلے روز شام کا اندھیرا ہوتے ہی مندر سے نکل جانا تھا۔ دیہاتیوں کے بھیس میں ہمیں پیدل سفر کرنا تھا اور ہنومان گاؤں پہنچنا تھا۔ ہمارے دیہاتیوں والے بھیس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے آفتاب نے ہمیں دو کسیاں بھی فراہم کر دی تھیں جنہیں ہم نے کاشت کاروں کے انداز میں کندھے پر رکھنا تھا۔ مقامی دیہاتیوں والے لباس ہمارے پاس پہلے سے موجود تھے۔ میں نے عمران کو اپنی اندرونی ہلچل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔

اگلے روز شام ہونے تک ہم جانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ہماری غیر موجودگی میں یہاں کا کرتا دھرتا اقبال ہوتا تھا۔ اب بھی رہی تھا۔ میں سلطانہ کو چور نظروں سے دیکھتا تھا اور اس کے اندرونی اضطراب کو محسوس کر کے دل خون ہونے لگتا تھا۔ وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن ہماری روانگی کے حوالے سے بڑی فکرمند تھی۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ کوئی اڑچن پیدا ہونے سے ہمارا پروگرام بدل نہ جائے۔

کیا یہ وہی سلطانہ تھی جسے میں جانتا تھا اور شوہر سے جس کی وفاداری کے قصے مشہور تھے؟ میں اس سوال کا جواب ڈھونڈتا تھا تو ذہن میں دھند سی بھرنے لگتی تھی۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی آفتاب خاں مندر میں پہنچ گیا اور ہم اس کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ فتح پور میں ابھی چراغ جل رہے تھے تاہم گلیاں گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مندر کی تعمیر کے لیے اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگے تھے۔ ہم ان ڈھیروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے گھنے درختوں میں داخل ہو گئے۔ کچھ آگے جا کر ہم نے آفتاب خاں کو ''الوداع'' کہا اور اپنے منتخب راستے پر چل دیے۔

تقریباً ایک فرلانگ آگے آ کر میں ٹھٹک گیا اور شہوہر کے گنجان درختوں میں رک گیا۔ یہیں پر وہ آسیب زدہ جوہڑ بھی تھا جس میں چند دن پہلے ہم نے شان دار جرمن جیپ کو غرقاب کیا تھا۔ عمران بولا۔ ''یہاں کیوں رک گئے ہو؟ ابھی کوئی جن بھوت آ کر کہے گا، السلام علیکم۔ اپنا شناختی کارڈ دکھائیں اور یہاں تھاں پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو چیٹنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کاشت کاروں والی ''کسی'' کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھی اور بیٹھ گیا۔ عمران نے آنکھیں نکالیں۔ ''اونے، تم تو سچ مچ بیٹھ گئے ہو۔ کیا واقعی مرنے کا ارادہ ہے؟''

یہ بتاؤ، سلطانہ کتنے پیکٹ لے کر گئی ہے اندر؟“

”کک... کون سے پیکٹ؟“

”زہر کے پیکٹ۔ جو پرشاد میں ملائے جانے ہیں۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”آ... آپ پتا نہیں کیا بات کر رہے ہیں... وہ کسی اور کام سے گیا ہے، رجو، ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔“ مجھے لگا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ آفتاب کا کھوکھلا لہجہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اندر سے ہل گیا ہے۔ عمران نے کہا۔ ”دیکھو، اگر تم ہمیں دوست نہیں سمجھو گے تو گھاٹے میں رہو گے۔ تمہیں بعد میں پچھتانا ہوگا۔“

”آپ ہمارا دوست ہے لیکن اس بارے میں ابھی ہم آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ ابھی یہ کام ہو لینے دو۔“ وہ اٹل آواز میں بولا۔ اس کے اندر وہی سختی موجود تھی جو انتہا پسند گروہوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی خاموشی برقرار رکھنے کے لیے ہر خطرہ مول لینے اور ہر حد تک جانے کو تیار تھا۔

آفتاب کی تلاشی سے برآمد ہونے والی چیزیں ابھی عمران کے ہاتھ میں تھیں۔ ان میں دو تین تہ شدہ کاغذ بھی تھے۔ ایک رقعہ نما کاغذ پر عمران کی توجہ مبذول ہوگئی۔ اچانک مجھے لگا کہ آفتاب، عمران پر جھپٹے گا اور رقعہ نما کاغذ اس سے چھین لے گا۔ میں نے .... ریوالور کا رخ ایک بار پھر اس کے سر کی طرف کر دیا۔ ”آفتاب! اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ حرکت کرو گے تو اچھا نہیں ہوگا۔“

عمران نے دو قدم پیچھے ہٹ کر تحریر پڑھنا شروع کی۔ وہ کچھ اس طرح تھی۔ ”...ش تمہارے پاس آرہا ہے۔ اس کے پاس دو تھیلی ہے۔ ایک اپنے پاس رکھو، دوسری کام میں لاؤ۔ تیڑ ھاوے کا میلا تین چار اور پانچ تاریخ کو ہوگا۔ ان میں سے کوئی تاریخ چن لو۔ عورتوں والے حصے میں جانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ س حلیہ بدل کر جا سکے گی۔ س کا کام بس یہ ہوگا کہ وہ تھیلی گلزار تک پہنچا دے۔ گلزار ”میٹھا“ بانٹنے والی عورتوں کی کرتا دھرتا ہے۔ وہ دونوں ٹانگوں سے معذور ہے۔ مندر کے اندر ہی رہتی ہے۔ باقی کام وہ کرے گی۔“

یہ تحریر رونگٹے کھڑے کرنے والی تھی۔ تحریر میں موجود اشارے واضح تھے۔ تھیلی کا مطلب زہریلے پاؤڈر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ س کا اشارہ سلطانہ کی طرف تھا۔ میٹھے سے مراد پرشاد تھا۔

یہ وہی بے رحم انتہا پسندی تھی جو ہم نے ہاشم عرف ہاشو میں دیکھی تھی۔ یہ اندھا جوش کہیں بھی ہوتا، کسی بھی مذہب، فرقے یا گروہ میں ہوتا، یہ قابلِ قبول نہیں تھا۔ میرے ذہن میں وہ چھوٹا سا بچہ آیا جو اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا، میری طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور بے وجہ شرمایا تھا۔ وہ بچہ صرف ایک بچہ تھا۔ ایک بے گناہ... یہی بچہ چند روز پہلے زرگاں میں جل کر مرا تھا... اب یہی بچہ پھر یہاں، زہر کھا کر مرنے والا تھا۔ اس بچے کو نہیں مرنا چاہیے تھا۔ یہ کوئی بھی تھا، یہ اس دنیا کا ”کل“ تھا۔ یہ امید کی کرن تھا۔ یہ آس کی ڈور تھا۔ میں یا آفتاب خاں یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے تھے کہ کل یہ بچہ، خدا کا نام لیوا نہیں ہوگا، یہ سچائیوں کا علم نہیں اٹھائے گا، کہنہ عقیدوں کو نہیں توڑے گا اور زخموں کا مرہم نہیں بنے گا۔ ہم اسے مرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ان لمحوں میں مجھے آفتاب خاں، ہاشو، کھوسٹ بڑھیا اور ستیش میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا۔

عمران نے میری اور میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ ہم ایک نازک ترین موڑ پر کھڑے تھے۔ سلطانہ جو میری بیٹی تھی، جو میرے سانسوں میں بستی تھی، مندر کے اندر پہنچ چکی تھی۔ اس کے لباس میں زہر چھپا ہوا تھا۔ یہ زہر پرشاد میں ملایا جانے والا تھا، یا ملایا جا چکا تھا۔ ہم حرکت میں آتے تو سلطانہ کی زندگی کو خطرہ تھا۔ نہ آتے تو بے شمار عورتیں اور بچے موت کے منہ میں چلے جاتے۔ حرکت میں آنا ضروری تھا۔

اچانک بندوق کا زوردار فائر سنائی دیا۔ یہ فائر مندر کے عین سامنے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کئی لوگ چلائے۔ ایک سیکنڈ کے لیے... صرف ایک سیکنڈ کے لیے میری اور عمران کی توجہ اس دھماکے کی طرف گئی، آفتاب نے فائدہ اٹھایا اور اٹھ کر تیزی سے فصل میں گھس گیا۔ ”رک جاؤ۔“ عمران دہاڑا۔

اس نے رائفل سیدھی کی مگر فائر کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ چند قدم اس کے پیچھے دوڑا مگر آفتاب اونچے گنوں کے اندر کافی آگے پہنچ چکا تھا۔ اس کا پیچھا کرنا بے سود تھا۔ ہم واپس پلٹے اور اس ہنگامے کی طرف متوجہ ہوئے جس نے مندر کے سامنے تہلکہ مچا دیا تھا۔ لوگ چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک گھوڑا گاڑی کے گھوڑے بدک گئے تھے اور وہ خالی ہی ایک طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نے کسی کو لپک کر اس گھوڑا گاڑی میں گھستے دیکھا۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ مجھے سبز اوڑھنی کی جھلک نظر آئی تھی۔ سلطانہ کی اوڑھنی بھی سبز تھی۔

عمران نے بھی سبز اوڑھنی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اسے بھی وہی شک ہوا جو مجھے ہوا تھا۔ کیا اس ہمگنٹ دوڑتی ہوئی خالی گھوڑا گاڑی میں سلطانہ داخل ہوئی تھی؟ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی نے تیزی سے یوٹرن لیا اور گھوڑا گاڑی کے پیچھے روانہ ہوئی۔ چار پانچ مقامی افراد چھلانگیں لگا کر اس ٹریکٹر ٹرالی پر چڑھے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا اور دوڑتی ہوئی ٹرالی پر چڑھ گئے اور اکیلی یہ ٹریکٹر ٹرالی ہی نہیں تھی جو گھوڑا گاڑی کے پیچھے لپکی تھی اور دو تین گھوڑا گاڑیاں اور گھڑسوار بھی گھوڑا گاڑی کو روکنے کے لیے دوڑ پڑے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ بہت سے لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ گھوڑا گاڑی میں سبز اوڑھنی والی عورت گھسی ہے اور یقیناً یہی عورت مندر میں ہنگامے کی ذمے دار تھی۔ اب ہمارے لیے اس بات میں شبے کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی کہ گھوڑا گاڑی میں گھسنے والی سلطانہ تھی۔

گھوڑا گاڑی برق رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ دونوں طرف مکئی اور گنے کے بلند کھیت تھے۔ وہ کافی آگے نکل گئی تھی۔ بھاری بھرکم ٹریکٹر ٹرالی کو اس کا پیچھا کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ پیچھے سے آتے ہوئے گھڑسواروں میں سے ایک نے چلا کر کہا۔ ”رستہ دو۔“

ٹرالی ڈرائیور نے ٹرالی کو راستے کے بائیں کنارے پر کر لیا۔ یوں گھڑسواروں کو تیزی سے آگے جانے کا موقع مل گیا۔ ہماری بوسیدہ ٹرالی اور دیگر دو گھوڑا گاڑیوں نے بھی تعاقب جاری رکھا۔

ٹرالی پر سوار افراد بھی دیگر لوگوں کی طرح مشتعل نظر آتے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر دیہاتی کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے گرج کر کہا۔ ”میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اسی گاڑی میں گھسی ہے وہ۔“

دوسرا شخص بولا۔ ”اس کے پاس چاقو تھا۔ میں نے اسے چاقو چلاتے دیکھا ہے..... جیادہ عمر کی بھی ناہیں ہے۔ لڑکی سی لگتی ہے۔“

ایک اور آواز آئی۔ ”ایسی گندی ناری کو کون ہندو کہے گا۔ مندر میں گھس کر فساد کرت ہے۔ یہ تو ہندو کے بھیس میں کوئی راکھشس لگت ہے۔“

”اس نے کیا کیا ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”ابھی پکڑی جاوے گی تو پتا چل جاوے گا۔“

ایک نوجوان نے کلہاڑی ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں دیہاتی حلیے میں تھے۔ ہماری کندھوں پر رکھی ہوئی ”کسیاں“ ہمارے بہروپ کو پختہ کر رہی تھیں۔ ٹرالی کے اگلے حصے میں کھڑا ایک پنڈت نما شخص بولا۔ ”یہ زنانے حصے کی طرف سے بھاگتی ہوئی نکلی تھی۔ دو تین گوپیاں اس کے پیچھے تھیں اور پکڑو پکڑو کی دہائی دے رہی تھیں۔ چھوٹے پجاری نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے چاقو چلا دیا۔ پھر دو اور بندوں کو بھی گھائل کیا اور باہر نکل آئی۔“

میں نے عقب میں دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ ایک دو گاڑیاں اور چند مزید گھڑسوار بھی اس تعاقب میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہی وقت تھا جب سب سے آگے بھاگتی ہوئی گھوڑا گاڑی میں سے اوپر تلے پستول کے دو فائر ہوئے۔ یہ فائر ان گھڑسواروں پر کیے گئے جو اس تعاقب میں سب سے آگے تھے اور گھوڑا گاڑی کے کافی قریب پہنچ چکے تھے۔ یہ بڑے کارگر فائر ثابت ہوئے۔ پہلی گولی تو براہِ راست گھڑسوار کو لگی۔ ہم نے اسے گھوڑے سے الٹ کر پیچھے راستے کی دھول میں گم ہوتے دیکھا۔ دوسری گولی نے ایک گھوڑے کو "ہٹ" کیا۔ گھوڑا ہڑک کر اچھلا اور پھر مکئی کے کھیتوں میں گھس کر ہنہنانے اور گول گول چکرانے لگا۔

تعاقب کرنے والے گھڑسوار بُری طرح ٹھٹک گئے۔ ان میں سے کوئی بھی مسلح نہیں تھا۔ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ گھوڑا گاڑی سے اپنا فاصلہ بڑھا دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہماری ٹریکٹر ٹرالی کے آس پاس آگئے۔ دو چار گھڑسوار رک گئے اور راستے کے کنارے پر پڑے اس موچھیل گھڑسوار کو دیکھنے میں مصروف ہو گئے جو گھوڑا گاڑی سے چلنے والی گولی کا شکار ہوا تھا۔

"لگتا ہے کہ کسی گاڑی میں رائفل بھی ہے۔" ایک شخص چنگھاڑا۔

"لیکن چلی تو پستول ہی تھی۔"

"ہوسکتا ہے کہ کھیتوں میں سے نکل کر اس کا کوئی یار بھی گھس گیا ہو اندر۔" پنڈت نما شخص نے خیال ظاہر کیا۔

میرا دھیان سیدھا آفتاب خان کی طرف چلا گیا۔ اس واقعے سے ایک منٹ پہلے آفتاب موقع سے فائدہ اٹھا کر کھیتوں میں بھاگ نکلا تھا۔ عمران اس پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سلطانہ کو فرار ہوتے دیکھ کر وہ بھی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گیا ہو؟

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی شاید اسی انداز میں سوچ رہا ہے۔

تعاقب طول پکڑتا جا رہا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر ٹرالی بُری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ ہچکولوں کی وجہ سے پنڈت نما شخص دوبار فرش پر لڑھکا اور کھڑا ہوا تھا۔ سب لوگوں کے چہرے اور جوش کے ساتھ ساتھ ہراس بھی نظر آ رہا تھا۔ غالباً انہیں توقع نہیں تھی کہ گھوڑا گاڑی میں سے ان پر فائرنگ کی جائے گی۔ وہ سب کے سب کلہاڑیوں اور تلواروں سے مسلح تھے۔ ہمیں صرف ایک گھڑسوار کے کندھے پر رائفل نظر آ رہی تھی لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ بھاگتے گھوڑے پر سے فائر کر سکتا۔ ویسے بھی وہ زیادہ باہمت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کافی پیچھے آگیا تھا۔ دوسری رائفل ایک تنومند شخص کے پاس تھی اور وہ ایک گھوڑا گاڑی پر سوار تھا۔ یہ گھوڑا گاڑی ٹرالی سے بھی پیچھے تھی۔ تنومند شخص اپنی رائفل کو ٹھیک سے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

یوں یہ تعاقب طویل سے طویل ہوتا جا رہا تھا.....

اگلے پندرہ منٹ میں فرار ہونے والی گھوڑا گاڑی میں سے پستول کے چار فائر مزید ہوئے۔ تین فائر تو ہوائی تھے اور گھڑسواروں کو ڈرانے کے لیے کیے گئے تھے لیکن چوتھا فائر سیدھا تھا۔ یہ اس گھڑسوار کے عین سر میں لگا جو دلیری دکھا کر گھوڑا گاڑی کے زیادہ قریب آگیا تھا۔ یہ گھڑسوار گولی کھا کر بھی گھوڑے کی پشت سے ہی چپکا رہا لیکن وہ زندہ حالت میں نہیں تھا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد وہ ریت کی بوری کی طرح گھوڑے سے لڑھک گیا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ گھوڑا گاڑی سے چلنے والی گولیوں نے دو افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ نشانے کی درستگی اس شبے کو تقویت دے رہی تھی کہ گھوڑا گاڑی میں دوسرا فرد شاید آفتاب خان ہے۔ دوسرے گھڑسوار کے شکار ہونے کے بعد پیچھے آنے والی گھوڑا گاڑی سے تنومند رائفل بردار نے چار فائر کیے مگر یہ بے مقصد فائر تھے۔ رائفل اور نشانے کے درمیان ٹریکٹر ٹرالی اور دو گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ وہ شخص درست نشانہ لے ہی نہیں سکتا تھا.....

یہ عجیب و غریب تعاقب قریباً ایک گھنٹا مزید جاری رہا۔ راستے میں بھی کچھ گھڑسوار تماشا دیکھنے کے لیے اس تعاقب میں شامل ہو چکے تھے۔ یہ سب مقامی دیہاتی تھے۔ گھوڑے اب ہانپنا شروع ہو گئے تھے۔ آگے جانے والی گھوڑا گاڑی کی رفتار بھی سست پڑتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پندرہ بیس منٹ یہ سلسلہ مزید جاری رہا تو گھوڑے بے دم ہو جائیں گے۔ تعاقب کرنے والے بھی شاید اسی وقت کے منتظر تھے..... مگر پھر جو کچھ ہوا اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔

ایک بستی کے آثار نظر آئے۔ یہ چند سو نفوس پر مشتمل کوئی کچا پکا گاؤں تھا..... گاؤں کے درمیان سے گزرتے گزرتے گھوڑا گاڑی نے ایک دم موڑ کاٹا اور سیدھی ایک نیم پختہ احاطے میں گھس گئی۔

تعاقب کرنے والے رک گئے۔ ٹریکٹر ٹرالی کی رفتار سست ہوئی پھر وہ بھی ٹھہر گئی۔ گھوڑا گاڑی جس احاطے میں داخل ہوئی تھی، اس کے آخر میں آٹھ دس نیم پختہ کمرے اور برآمدے نظر آ رہے تھے۔ چھت پر پانی کی اونچی پختہ ٹینکی تھی۔ دیکھنے میں یہ کوئی اسکول لگتا تھا مگر پھر میری نظر لکڑی کے پھاٹک کے قریب لگے ایک بورڈ پر پڑی۔ یہ ایک شفا خانہ تھا۔ اس کے ایک علیحدہ پورشن میں شاید جانوروں کا علاج بھی ہوتا تھا۔ ہم کافی فاصلے پر تھے پھر بھی احاطے میں بندھے ہوئے مویشی اور خچر وغیرہ نظر آ رہے تھے۔

تعاقب کرنے والے اپنی اپنی سواریوں سے اترے۔ افراتفری کے عالم میں انہوں نے اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہی وقت تھا جب عمارت کے اندر سے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ تب ہم نے ایک تنو مند ادھیڑ عمر عورت کو عمارت کے اندر سے بھاگ کر باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے سر پر چادر تھی اور نہ ہی پاؤں میں چپل۔ ابھی وہ احاطے کے وسط میں بھی نہیں پہنچی تھی کہ عقب سے دو فائر ہوئے اور وہ اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گئی۔ اس جواں سال عورت کے نیلگوں لباس کو دیکھ کر مجھے لگا کہ اس طرح کا وردی نما لباس میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس عورت کو عمارت سے نکل کر بھاگنے کی سزا دی گئی ہے۔ سزا دینے والا آفتاب خان بھی ہوسکتا تھا۔

چار پانچ منٹ کے اندر اس پُرسکون بستی میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ عمارت کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ کچھ آس پاس کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ کھڑکیوں میں بھی ڈرے ڈرے چہرے نظر آنے لگے۔

میں اور عمران بھی کچھ قریب چلے گئے۔ کھلے ہوئے پھاٹک سے ہمیں وہ گھوڑا گاڑی نظر آگئی جس کا پیچھا کرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ گھوڑا گاڑی کو احاطے میں یونہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہانپتے ہوئے گھوڑے پانی اور گھاس کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ یہی وقت تھا جب ہم پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے بدترین اندیشے درست ہیں۔ آفتاب خان اس عمارت میں ہی موجود تھا۔ ہم نے چھت پر اس کی جھلک دیکھی۔ وہ بھاگ کر پانی والی ٹینکی کے پیچھے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل صاف نظر آئی۔

"یہ تو وہی ہے۔" عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"اور اس کا مطلب ہے کہ سلطانہ بھی اندر ہی ہے۔"

"یہ تو بڑا خطرناک کام ہو گیا ہے۔ یہ لوگ اب انہیں چھوڑیں گے نہیں۔" عمران نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

عمران کی بات سو فیصد درست تھی۔ کم از کم تین لاشیں تو ہمارے سامنے گر چکی تھیں۔ دو راستے میں اور تیسری یہاں احاطے میں۔ اس کے علاوہ وہ کہا جا رہا تھا کہ بھاگنے والی عورت نے مندر میں بھی جا کر چلایا ہے۔ ہوسکتا تھا کہ وہاں کسی کی کوئی موت ہوئی ہو۔

ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارے کندھوں پر "کسّیاں" تھیں۔ ہم دیہاتیوں کے لباس میں تھے اور ہجوم کا حصہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ ہم دونوں ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ ہم نے ابھی تک سلطانہ کو دیکھا نہیں تھا۔ اب بھی دل میں یہ موہوم سی امید موجود تھی کہ شاید سلطانہ اس خردماغ قاتل پٹھان کے ساتھ نہ ہو۔

میں نے کہا۔ "سوچنے کی بات ہے کہ آفتاب کے پاس رائفل کہاں سے آئی؟ ہم نے تو اس کی رائفل کھیت میں پھینک دی تھی..... سلطانہ کے پاس بھی کوئی ایسا ہتھیار نہیں تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ اسے اس عمارت کے اندر سے ہی ملی ہے۔" عمران نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، آفتاب کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا کہ وہ بھاگ کر اسی جگہ گھسے گا؟"

"لگتا تو نہیں۔" عمران نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "تم نے دیکھا ہی ہو گا، گاڑی نے سیدھا چلتے چلتے ایک دم موڑ کاٹا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آفتاب نے اندازہ لگایا تھا کہ گھوڑے اب زیادہ دیر ساتھ نہیں دیں گے۔"

"ایسے علاقے میں ایسی صاف ستھری عمارت کا ہونا بھی حیران کن ہے۔ مجھے تو ایک شبہ ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟" عمران نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔ میں بتاتا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور ایک جواں سال دیہاتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے گلے میں کئی تعویذ تھے اور وہ حلیے سے کھیت مزدور ہی لگتا تھا۔ بہت سے تماشائیوں کی طرح وہ بھی ہمارے پاس ہی کھڑا تھا اور دیوار کی اوٹ سے بار بار شفا خانے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس صاف نظر آتا تھا۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے مقامی لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی اسپتال ہے بھیا؟"

"ہاں بھیا! اندر مریض بھی ہیں۔ تیس چالیس تو ضرور ہوں گے۔ چھوٹے بچے بھی ہیں اور خود بڑے ڈاکٹر جی اور ان کے ملازم بھی۔"

"اوہو۔" میں نے حیرت ظاہر کی پھر عام لہجے میں پوچھا۔ "بڑے ڈاکٹر جی کون ہیں؟"

"جاپانی ہیں۔ ہم ان کو بس بڑے ڈاکٹر جی ہی کہتے ہیں۔" دیہاتی نے جواب دیا۔

قریب کھڑا ایک دوسرا شخص بولا۔ "جاپانی ڈاکٹر ہیں۔ بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے ان کے ہاتھ میں۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں نے کہا۔ ”ان کا نام لی وان تو نا ہیں؟“

”ہاں، اسی طرح کا ہے۔“ دیہاتی نے جواب دیا۔ ”ہر مہینے تین روج کے لیے یہاں آتے ہیں۔ بڑا لمبا سفر کرتے ہیں۔ بھگوان ان کی اور ان کے ملاجموں کی رکھشا کرے۔“ دیہاتی کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ اس کی نگاہیں احاطے کے وسط میں پڑی لاش پر جم گئیں۔

”یہ کون ہے جس کو گولی لگی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بڑے ڈاکٹر جی کی ملاجم ہے۔ زبیدہ نام ہے۔ ہمارے گاؤں ہی کی ہے۔ بڑی اچھی عورت تھی۔“ دیہاتی کی آواز بھرا گئی۔

دراصل اس عورت کی نیلگوں وردی دیکھ کر ہی مجھے شک گزرا تھا کہ ایسا لباس میں کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ اب سب کچھ یاد آگیا تھا۔ جب میں نل پانی میں تھا تو ڈاکٹر چوہان مجھے لے کر ڈاکٹر لی وان کے شان دار اسپتال میں گیا تھا۔ تب اس نے لی وان سے میری الیکٹرانک چپ کے بارے میں ڈسکشن کی تھی۔ وہیں اسپتال میں، میں نے ایسے کپڑوں والی دو تین نرسیں دیکھی تھیں۔

اچانک چھت پر سے بڑی گھن گرج کے ساتھ رائفل کے تین فائر ہوئے۔ لوگ سہم سہم کر مختلف چیزوں کی اوٹ میں ہوگئے۔ ہمارے ساتھ بات کرنے والے دونوں دیہاتی بھی سراسیمہ ہوکر نیچے بیٹھ گئے۔ کسی شخص نے پکار کر کہا۔ ”ڈاکو گولی چلا رہے ہیں۔ سب لوگن یہاں سے دور ہٹ جاویں۔ ورنہ نقصان ہو جاوے گا۔“

اندازہ ہو رہا تھا کہ آفتاب خاں نے لوگوں کو احاطے سے دور رکھنے کے لیے ہوائی فائر کیے ہیں۔ وہ بڑی چابک دستی اور سفاکی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے اور سلطانہ نے مل کر عمارت میں موجود مرد و زن کو یرغمال بنا لیا ہے اور کسی کو باہر نہیں نکلنے دے رہے۔

صورت حال میں بڑی تیز رفتار تبدیلیاں آئی تھیں جنہوں نے عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی چکرا کر رکھ دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آنے والی گھڑیوں میں کیا ہوگا۔ سلطانہ کا جو روپ میرے سامنے آیا تھا، وہ ناقابل تصور تھا۔ صرف ایک ہفتہ پہلے میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری بانہوں میں آکر اور آنکھیں بند کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانے والی سلطانہ کو میں ایک نہایت سنگین صورت حال سے دوچار دیکھوں گا اور یہ صورت حال اس کی اپنی پیدا کردہ ہوگی .... میرا دل خون ہونے لگا تھا۔

آفتاب خاں کی پکارتی ہوئی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ بڑی پاٹ دار آواز میں بول رہا تھا۔ تعجب تھا کہ اتنے فاصلے سے بھی اس کے الفاظ صاف سنائی دیے۔ اس نے جنوبی لہجے میں کہا۔ ”ام تم لوگوں کو صاف بتاتا ہے، اگر کسی نے اندر آنے کا کوشش کیا تو ام ان سب کو بھون ڈالے گا جو یہاں امارے پاس ہے۔ کسی سے کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ اسپتال کے پھاٹک اور دیواروں سے دور رہو، ورنہ اپنے نقصان کا ذمے دار تم خود ہوگا۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ ایک اونچی پگڑی والے شخص نے پکار کر پوچھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ شخص اس ”الھرا“ نامی گاؤں کا مکھیا تھا۔

”بس فی الحال ام یہی چاہتا ہے کہ کوئی اندر آنے کا کوشش نہ کرے۔ اگر کوئی ام سے بات کرنا چاہتا ہے تو وہ اکیلا اندر آئے اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔“

ہمارے ساتھ ٹرالی پر سوار ہوکر یہاں آنے والا ایک شخص گرج کر بولا۔ ”تم ہتھیارے ہو۔ تم نے خون کیے ہیں۔ ہم تم جیسے حرامزادے سے بات کاہے کو کریں گے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈالیں گے۔“

ہمارے ساتھ یہاں پہنچنے والے تنومند رائفل بردار نے ایک گندی گالی دی اور آفتاب خاں کی طرف اندھا دھند دو فائر کیے۔

گاؤں کا مکھیا تڑپ کر رائفل بردار کے سامنے آگیا اور اسے مزید فائر کرنے سے روک دیا۔ وہ چلّا کر بولا۔ ”یہ کیا کرت ہو تم؟ تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟ اندر ہمری عورتیں اور بچے ہیں۔ ان کا جیون خطرے میں ہے۔“

دو تین مقامی افراد آگے بڑھے اور انہوں نے تنومند رائفل بردار سے زبردستی رائفل چھین لی۔ رائفل بردار بھی طیش میں آگیا۔ اس سے پہلے کہ یہ لوگ آپس میں جھگڑ پڑتے، عمران ان کے درمیان آگیا۔ اس نے مقامی لب و لہجے میں کہا۔ ”کیا کرت ہیں آپ لوگ۔ یہ جھگڑنے کا نا ہیں، سوچنے کا وقت ہے۔ یہ ایک دم ہتونی لوگن ہیں۔ ان کے سر پر خون سوار ہے۔ کسی بھی وقت کچھ کر سکت ہیں۔ ہمیں ان سے بات کرنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ اصل میں کون ہیں اور کیا چاہت ہیں۔“

”کون بات کرے گا آگے جا کر؟“ مکھیا نے ارد گرد دیکھ کر پوچھا۔

سب ٹھٹکے ہوئے نظر آنے۔ عمران ترت بولا۔ ”میں کرتا ہوں جی۔ یہ پٹھان لوگن ہیں اور مجھے تھوڑی بہت پشتو بھی آوت ہے۔“

مکھیا چند لمحے تذبذب میں نظر آیا پھر عمران کے چہرے کا اعتماد دیکھ کر وہ بولا۔ ”اگر تم اپنی مرضی سے جانا چاہت ہو تو چلے جاؤ۔ اگر بھگوان نہ کرے کوئی دُرگھٹنا ہوئی تو ہم ذمے دار نا ہیں ہوں گے۔“

”نا ہیں جی۔ آپ کی کوئی ذمے داری نا ہیں۔ آپ بس پرارتھنا کریں۔“

”کیا بات کرو گے؟“ سانولی رنگت والے مکھیا نے پوچھا۔

”وہی جو آپ کرنا چاہت ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔“

چند سیکنڈ میں عمران نے مکھیا اور اس کے ساتھیوں کو شیشے میں اتار لیا بلکہ ہمارے ساتھ یہاں پہنچنے والا پنڈت نما شخص بھی اس بات پر راضی ہوگیا کہ عمران اندر جائے۔ عمران نے اپنی چادر اتار پھینکی اور پگڑی بھی کھول کر گٹھڑے میں ڈال لی۔ بہرحال چادر اتارنے سے پہلے اس نے اپنی رائفل بڑی صفائی سے میری چادر کی بغل میں منتقل کر دی تھی۔ رائفل دو حصوں میں تھی، اس کا بیرل کھول دیا گیا تھا۔ اپنی دھوتی کو اچھی طرح اڑس کر وہ بڑے اعتماد سے احاطے میں داخل ہوا۔ چھت پر سے یقیناً آفتاب نے عمران کو دیکھ لیا تھا اور پہچان بھی لیا تھا۔ میرے دل میں اندیشہ تھا کہ آفتاب کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جس سے مقامی دیہاتیوں کے سامنے ہمارے بھانڈا پھوٹ جائے۔ بہرطور اس حوالے سے خیریت ہی گزری۔

چند سیکنڈ بعد آفتاب کی بلند آواز سنائی دی۔ اس نے عمران کو مخاطب کر کے کہا۔ ”تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”قمیص اٹھا کر دکھاؤ۔“

عمران نے قمیص اٹھا کر دکھا دی۔

”دھوتی کھولو۔“ آفتاب نے چھت پر سے حکم صادر کیا۔

عمران نے اپنے میلے کچیلے تہبند کے بند کھول کر دکھا دیے۔ تہبند کے نیچے زیر جامہ تھا۔

”ٹھیک ہے، آگے آجاؤ۔“

عمران سیڑھیوں کی طرف اوجھل ہوگیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ آفتاب اب دوست نہیں دشمن تھا۔ وہ گھنٹے پہلے ہم نے اس پر رائفل تانی تھی۔ اب عمران اس کی رائفل کے نشانے پر تھا۔ ابھی تک یہ کنفرم نہیں تھا کہ آفتاب کے ساتھ صرف سلطانہ ہی ہے یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی گھوڑا گاڑی سے نکل کر عمارت میں روپوش ہوا ہے۔ مجھے عمران کی صلاحیتوں اور اس کی ”لک“ پر بھروسا تھا۔ وہ مشکل ترین حالات میں بھی راستے نکال لیتا تھا۔ اسے گفتگو اور قائل کرنے کا فن آتا تھا مگر دوسری طرف بھی ایک نہایت سرپھرا شخص تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے یوں بیگانہ ہوا تھا جیسے کوئی جان پہچان ہی نہ ہو۔ اب اس کے سر پر خون سوار تھا۔

عمران کی واپسی میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ اب تقریباً پانچ چھ سو مرد و زن اس نیم پختہ عمارت کے گرد اور آس پاس جمع ہو چکے تھے۔ بہت سی لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور رائفلیں اپنی چمک دکھانے لگی تھیں۔ بہرحال، یہ سارے کے سارے مقامی دیہاتی تھے اور یہی وجہ تھی کہ ابھی تک کسی نے مجھے میری اصل حیثیت سے نہیں پہچانا تھا۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے زرگاں میں جارج گورا کو عبرت ناک شکست دے کر اس کا پیٹ چاک کرنے والا شخص ایک، گرد سے اٹے ہوئے دیہاتی کے روپ میں ان کے درمیان موجود ہے۔

عمران کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ عمران کو دیکھ کر ہجوم میں ہلچل نمودار ہوئی۔ عمران پھاٹک سے گزر کر ہمارے درمیان آگیا۔ اسے قریب سے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ اس کے تہبند کی ڈب میں کوئی ایسی شے موجود ہے جو پہلے نہیں تھی..... لیکن یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ عمران نے گاؤں کے مکھیا بلرام اور اس کے ساتھیوں کو بتایا کہ اندر ایک عورت اور دو بندے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پٹھان اور دوسرا مقامی لگتا ہے۔ دونوں کے پاس رائفلیں ہیں، اس کے علاوہ دھماکا خیز مواد بھی ہے۔ انہوں نے یہ دھماکا خیز مواد اسپتال کے اکلوتے وارڈ میں اس طرح رکھ دیا ہے کہ اسے کسی بھی وقت اڑایا جا سکتا ہے۔ بڑا ڈاکٹر لی وان بھی اندر ہی ہے۔ وہ اور اس کا عملہ حملہ آوروں کے قبضے میں ہے۔ سب کی زندگی کو شدید خطرہ ہے۔

”یہ لوگن چاہتے کیا ہیں؟“ مکھیا نے پوچھا۔

”پہلے تو وہ بات ہی نا ہیں سن رہے تھے جی۔ پھر میں نے پٹھان سے پشتو میں بات کی اور اس کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے وہ تھوڑے سے نرم پڑے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ یہاں سے جانا چاہت ہیں۔ انہیں تازہ دم گھوڑوں والی ایک بڑی گھوڑا گاڑی دی جاوے۔

اس کے علاوہ گھوڑا گاڑی کے دو فالتو گھوڑے دیے جاویں..... اور وشواس دلایا جاوے کہ ان کا پیچھا ناہیں کیا جاوے گا۔ ایسا ہو گیا تو وہ چلے جاویں گے۔"

ہمارے ساتھ آنے والا پنڈت نما شخص ترخ کر بولا۔ "یہ ناہیں ہو سکت۔ ان لوگن نے ہمارے گاؤں کے کم از کم دو بندوں کا جیون لیا ہے۔ یہاں آ کر بھی انہوں نے ایک نردوش ناری کی ہتھیا کی ہے۔ اب یہ ہمیں الٹا دھمکا رہے ہیں اور یہاں سے نکل جانا چاہت ہیں۔"

کھیا اور پنڈت نما شخص ایک بار پھر الجھ پڑے۔ کھیا نے کہا۔ "تم بدھی (عقل) کی بات ناہیں کر رہے ہو پنڈت۔ کیا تم یہ چاہت ہو کہ اگر تمہارے گاؤں کے بندے مارے گئے ہیں تو اس گاؤں کے بھی دس بیس بندے مارے جاویں؟ تم دیکھ رہے ہو ان لوگن کے سر پر خون سوار ہے۔ انہوں نے بڑے ڈھٹائی کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچوں کو بند کر لیا ہے۔ یہ سب کچھ اڑا دیں گے تو پھر کیا ہووے گا؟ ہمیں اس بارے میں ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیے۔"

پنڈت نما شخص بولا۔ "تم لوگن ضرورت سے زیادہ ڈر گئے ہو۔ دھماکے سے سب کو اڑا دینا اتنا آسان ناہیں ہے۔ اور کیا پتا ان کے پاس بارود ہے بھی یا وہ کیول ڈرا وا دے رہے ہیں۔"

عمران جلدی سے بولا۔ "میں نے خود دیکھا ہے جی۔ انہوں نے وارڈ میں دو تین جگہ کچھ رکھا ہوا ہے۔ کالے رنگ کے تار بھی بچھائے ہوئے ہیں۔ وہ بارود کے تار ہی ہو سکت ہیں۔ مجھے وشواس ہے جی....."

پنڈت نما شخص کا نام مہاویرا تھا۔ وہ بولا۔ "جو کچھ بھی ہے لیکن ہم کو جلد بازی ناہیں کرنی چاہیے۔ ہم کو چاہیے کہ ان لوگن کو کچھ دیر باتوں میں لگائیں اور ایک دو گھنٹے کا وقت گزار دیں۔ اتنے میں ہم اپنے کچھ بندے ہنومان گاؤں کی طرف بھیجیں۔ وہاں چوکی موجود ہے۔ چوکی سے سپاہی یہاں آ سکت ہیں۔ ہو سکت ہے کہ اتنی دیر میں کسی دوسری جگہ سے بھی مدد آ جائے۔ تب ان قاتلوں کے ساتھ اچھے طریقے سے معاملہ نمٹایا جا سکت ہے۔"

عمران نے کہا۔ "لیکن آپ لوگن نے میری آخری بات تو سنی ہی ناہیں۔"

"کیسی بات؟"

"ان کتوں نے ہمیں گھوڑا گاڑی دینے کے لیے صرف آدھ گھنٹے کا سمے دیا ہے اور اس سمے میں سے آٹھ دس منٹ گزر بھی چکے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر آدھ گھنٹے میں گاڑی ناہیں پہنچی تو وہ ایک بندے کو گولی مار کر باہر برآمدے میں پھینک دیویں گے اور پھر ہر پندرہ منٹ بعد ایک بندے کی ہتھیا کرتے جاویں گے۔ پٹھان کے پاس گھڑی ہے اور اس نے گھڑی دکھا کر مجھے ٹائم بتایا ہے۔"

مہاویرا اور کھیا بلرام سمیت کئی افراد کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ "اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔" عمران نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ کہوت ہیں کہ ہم یہاں سے جاتے وقت آٹھ دس بندوں کو ضمانت کے طور پر اپنے ساتھ رکھیں گے۔ جب سمجھیں گے کہ محفوظ جگہ پر پہنچ گئے ہیں تو انہیں چھوڑ دیویں گے۔ ضمانتیوں میں کوئی عورت ناہیں ہووے گی۔ بڑا اور چھوٹا ڈاکٹر ہووے گا اور کچھ دوسرے بندے ہوویں گے۔"

کھیا بلرام نے اپنے ماتھے سے پسینا پونچھا اور ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ابھی پنچایت میں مشورہ کرے گا۔ اس نے اپنے آس پاس موجود پنچوں کو اکٹھا کیا اور حویلی کی طرف چلا گیا۔ لوگ عمران کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ اس سے اندر کے حالات جاننا چاہ رہے تھے۔ عمران نے انہیں بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے کھیا اور دیگر لوگوں کو بتایا تھا۔ وہ اندر کی صورت حال کو سنگین بتا رہا تھا۔ تاہم میرا اندازہ تھا کہ وہ اس سنگینی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے۔ اس کا یہ انکشاف بھی مجھے مشکوک لگ رہا تھا کہ اندر آفتاب خاں کے ساتھ اس کا ایک ساتھی بھی ہے۔

کچھ دیر بعد جب عمران کے گرد سے بھیڑ چھٹی تو میں نے مدھم لہجے میں اس سے پوچھا۔ "کیا واقعی آفتاب کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ایک نیوز چینل والا اپنی 'خبر' دوسرے چینل کو نہیں دیتا، اپنی جان دے دیتا ہے۔"

"لیکن میں چینل والا نہیں ہوں۔"

"کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ چینل والا ہے یا نہیں۔ آج کل تو اینٹ اکھاڑیں تو نیچے سے کیمرے والا اچھل کر باہر آ جاتا ہے۔ ناظرین کم پڑتے جا رہے ہیں، چینل زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر اینکر ایک ہی دہائی دے رہا ہے، ہمارے ساتھ رہیے گا۔ اب تو بچے بھی اور کھلونوں کی جگہ چینل چینل کھیلتے نظر آتے ہیں۔ دیکھنا بہت جلد ہر فیملی کا اپنا اپنا چینل ہوگا۔ فیملی کا سربراہ ہی اس کا ڈائریکٹر کہلائے گا۔"

"تم بکواس ہی کرو گے یا کچھ بتاؤ گے؟"

"میں بتاؤں گا، تب بھی تم کہو گے کہ بکواس کر رہا ہے۔"

"نہیں کہتا۔"

"آفتاب خاں اکیلا ہے۔" عمران نے خلاف توقع سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کے ساتھ صرف سلطانہ ہے۔ سلطانہ نیچے ہے، آفتاب چھت پر ہے۔ چھت پر ایک روشن دان ہے۔ اس روشن دان کے نیچے مریضوں سے بھرا ہوا وارڈ ہے۔ آفتاب اوپر سے کسی بھی مریض کو یا اس کے لواحقین کو شوٹ کر سکتا ہے..... وہ بالکل جنونی نظر آ رہا ہے۔"

"بارود والی جو بات تم نے کی ہے؟"

"وہ بھی درست نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ لوگ دباؤ میں آئیں اور آفتاب کو یہاں سے نکلنے کا راستہ دینے میں دیر نہ کریں۔ آفتاب کے پاس بس ایک رائفل ہے اور اس کے پچاس ساٹھ راؤنڈز ہیں۔ یہ رائفل اس نے یہیں اسپتال کے چوکیدار سے چھینی ہے۔"

"کیا تم نے سلطانہ کو دیکھا ہے؟"

"نہیں لیکن اس میں شک کی کوئی بات نہیں کہ آفتاب کے ساتھ سلطانہ ہی بھاگ کر یہاں پہنچا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ عمران کی اس اطلاع کے بعد یہ امید دم توڑ گئی کہ شاید اس واردات میں شریک ہونے والی سلطانہ نہ ہو۔ سینے میں اندھیرا سا اتر گیا۔

"سلطانہ کے پاس بھی کوئی ہتھیار ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آفتاب نے بتایا نہیں مگر لگتا ہے کہ ہتھیار ہے۔ ورنہ وہ اسے نیچے اکیلا چھوڑ کر اوپر نہ آتا۔"

"آفتاب کا رویہ کیسا رہا ہے تمہارے ساتھ؟"

"وہی جو دشمن کا دشمن سے ہوتا ہے۔ وہ ایک دم غیر نظر آ رہا ہے۔ اس نے مجھے خود سے پندرہ بیس فٹ دور رکھا ہے اور تمام وقت رائفل مجھ پر تانے رکھی ہے۔ پہلے تو وہ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ صرف مرنے اور مارنے کی بات کر رہا تھا۔ پھر میں نے کوشش کی اور اس کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ابھی وقت ہے، وہ سلطانہ کے ساتھ یہاں سے نکل سکتا ہے۔ ابھی اس کے گرد صرف مقامی لوگ ہیں۔ کچھ گھنٹے دو گھنٹے بعد جب حکم کے کارندے اور وردیوں والے مسلح کارندے اپنے جدید اسلحے کے ساتھ یہاں پہنچ گئے تو اس کے لیے اپنی کوئی شرط منوانا ناممکن ہو جائے گا۔ شکر ہے کہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ اب اللہ کرے یہ کھیا اور پنچ وغیرہ بھی کوئی عقل کا فیصلہ کر لیں۔"

"اگر انہوں نے نہ کیا تو پھر؟"

"پھر خون خرابا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آفتاب اپنی دھمکی کو عملی شکل دے گا۔ وہ بے گناہ لوگوں کو مارنا شروع کر دے گا۔"

"کیا جو لوگ سندر سے آفتاب اور سلطانہ کا پیچھا کرتے یہاں پہنچے ہیں، وہ انہیں یہاں سے نکلنے دیں گے؟"

"اگر یہ دونوں جلدی نکل جائیں تو نکل بھی سکتے ہیں۔ میں نے بتایا ہے نا کہ آفتاب اور سلطانہ اکیلے نہیں نکلیں گے۔ وہ اپنے ساتھ کم از کم آٹھ دس یرغمالی رکھیں گے۔ اسی لیے آفتاب نے بڑی گھوڑا گاڑی بھی مانگی ہے..... میں تو اس کی باتیں سن سن کر حیران ہوا ہوں۔ یہ وہ آفتاب لگتا ہی نہیں جس کے ساتھ ہم نے تھانوں میں وقت گزارا ہے۔"

ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے جب پھر کئی افراد عمران کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے اندر کے حالات پوچھنے لگے۔ یہ سب سیدھے سادے مقامی دیہاتی تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ ابھی تک اس دور دراز جگہ پر کسی نے ہمیں پہچانا نہیں تھا۔ یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں سے باہر دور تک کھیت تھے اور ان کے درمیان پگڈنڈیاں اور راستے تھے۔ اس گاؤں کے بیشتر مکان کچے تھے۔ کچی چھتوں پر ابر کنیوں کی ٹکڑیوں پر نیم عریاں بچے اور رنگ برنگی اوڑھنیوں والی دیہاتنیں نظر آتی تھیں..... ایک حویلی کی دیوار پر بہت سے اپلے لگائے گئے تھے۔ ان اپلوں کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔

اچانک کھیا بلرام اور اس کے پنچ تیز قدموں سے واپس آتے دکھائی دیے۔ ان کے پیچھے روتی پیٹتی عورتیں اور بچے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کے عزیز اسپتال کے اندر گھر گئے تھے۔ اس کے علاوہ احاطے میں مری پڑی عورت کے لواحقین بھی گریہ زاری کرتے دکھائی دیے۔ وہ انگلیوں سے احاطے کی طرف اشارے کر رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ آگے جاتا اور عورت کی لاش کو اٹھا کر لے آتا۔

کھیا اور پنچوں نے عمران سے چند ایک سوال مزید پوچھے۔ تب دو پنچ عمران کے ساتھ احاطے کے اندر گئے۔ آفتاب خاں چھت پر بالکل چوکس موجود تھا۔ اس نے پہلے یہ یقین کیا کہ اندر آنے والے افراد بالکل غیر مسلح ہیں پھر اس نے انہیں آگے جانے کی اجازت دی۔

اس بار ہونے والی گفتگو پانچ دس منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہی۔ پنچ دھوتیاں پھڑپھڑاتے ہوئے واپس

آ گئے۔ ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ حملہ آور طیش میں ہیں۔ آدھ گھنٹے سے اوپر ہو چکا ہے۔ انہوں نے چھوٹے ڈاکٹر کو مارنے کی تیاری کر لی ہے۔ وہ چار منٹ اور گزر گئے تو وہ اس راج نامی ڈاکٹر کو گولی مار کر چھت سے نیچے پھینک دیں گے۔

پنچوں کے واپس آنے کے صرف پانچ منٹ بعد مکھیا بلرام نے اعلان کیا کہ انہوں نے اندر موجود لوگوں کا جیون بچانے کے لیے حملہ آوروں کی بات ماننے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہیں گھوڑا گاڑی اور گھوڑے دیے جا رہے ہیں۔ یہ پیغام لے کر عمران ایک ادھیڑ عمر پنچ کے ساتھ اندر گیا۔ مکھیا بلرام اور اس کے دیگر پنچ ان لوگوں کو سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گئے جنہیں یہ فیصلہ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ امید تھی کہ عمران اور پنچ جلد ہی لوٹ آئیں گے مگر ان کی واپسی میں پھر تاخیر ہوئی۔ کچھ گڑبڑ لگ رہی تھی۔ وہ دونوں قریباً پندرہ منٹ بعد واپس آئے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ادھیڑ عمر پنچ نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔

”وہ تو ارادے بدل گئے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ کسی کو چھوڑیں گے اور نہ یہاں سے جائیں گے۔ اگر کسی نے اندر گھسنے کی کوشش کی تو وہ سب کچھ اڑا ڈالیں گے۔ انہوں نے بڑے ڈاکٹر جی کے ہاتھ پیچھے موڑ کر ایک رسّی سے باندھ دیے ہیں اور انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔“

”وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ مکھیا نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”کچھ پتا نہیں جی۔ شاید ان کو شبہ ہے کہ ان کے ساتھ دشواس گھات ہوگا۔ وہ باہر نکلے تو مارے جاویں گے۔“

”لیکن اس سے پہلے تو وہ سب کچھ مان رہے تھے؟“

ایک پنچ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”لیکن اب وہ کچھ نہیں مان رہے۔ پٹھان نے کہا ہے کہ وہ سرکاری لوگن سے بات کرنا چاہت ہیں۔“

”سرکاری لوگن؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، وہ کہت ہیں کہ کسی سرکاری بندے کو بلایا جاوے..... یا پھر کوئی فوجی افسر یہاں آوے۔“

یہ تبدیلی حیران کن تھی۔ عمران بھی الجھا ہوا اور خاموش نظر آیا۔

ہجوم میں اب اور طرح کا اضطراب نظر آنے لگا تھا۔ جن لوگوں کے عزیز اندر تھے، وہ زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کئی پھر واویلا کرنے لگے۔ آفتاب خاں نے عورت کی لاش احاطے میں سے اٹھانے کی اجازت دے دی تھی۔ عمران اور پنچ امام دین دو دیگر افراد کے ساتھ احاطے میں گئے اور عورت کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر باہر لے آئے۔ سات ایم ایم رائفل کی گولی اس کی پشت دونوں کندھوں کے درمیان لگی تھی اور سامنے سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کی نیلی یونیفارم سے اٹھنے والی ”دواؤں کی بو“ بتا چلتا تھا کہ وہ بے چاری یہاں نرس کے طور پر مریضوں کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ اس کی موت نے ہر کسی کو افسردہ اور خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس کے رشتے دار نوحہ کناں تھے جن میں اس کا اسکول ماسٹر شوہر اور دو چھوٹے بچے بھی تھے۔

میں نے عمران کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ ”یہ کیا چکر چل گیا ہے یار؟“

”ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا..... لگتا ہے کہ آفتاب اور سلطانہ نے اچانک اپنا ارادہ تبدیل کیا ہے۔ شاید کوئی نئی بات ان کے سامنے آئی ہے جس کی وجہ سے وہ جانا نہیں چاہ رہے۔“

”وہ سرکاری لوگوں کو بلانے کی بات بھی کر رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔“

عمران نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں تھیں۔ وہ بے خیالی میں اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو انگلی سے چھو رہا تھا۔ یہ بھی اس کے سوچنے کا ایک انداز تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ مجھ سے بولا۔ ”اب ہم زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتے۔ کسی بھی وقت ہمیں پہچانا جا سکتا ہے۔“

”تو پھر؟“

”ہمیں کھسکنا پڑے گا۔“ اس نے کہا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

میری سمجھ میں بھی یہی بات آ رہی تھی کہ اب یہاں سے کھسکنا ہی بہتر ہے۔ زیادہ تر لوگ جواں سال عورت کی لاش کی طرف متوجہ تھے۔ ہم ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے کھیتوں کی طرف بڑھے۔ اچانک میری نظر تین گھڑسواروں پر پڑی وہ چمکیلی دھوپ میں گرد اڑاتے تیزی سے موقع واردات کی طرف آ رہے تھے۔ یہ سرخی مائل پگڑیوں والے زرگاں کے مسلح سپاہی تھے۔ عمران نے بھی انہیں تاک لیا تھا۔ ہم دونوں نے چہرے اپنی میلی کچیلی پگڑیوں میں چھپائے اور رخ پھیر کر دوسری طرف نکل گئے۔ قریباً دس منٹ بعد ہم موقع واردات سے محفوظ فاصلے پر کماد کے کھیت میں موجود تھے۔ ہم ایک ہموار جگہ پر بیٹھ گئے۔ عمران کے کہنے پر میں نے چادر کے نیچے سے دور مار رائفل نکالی اور اس کے بیرل کو

اَفِٹ کر کے اسے تیار حالت میں کر لیا۔ اس دوران میں عمران نے اپنے تہ بند کی ڈب میں سے ایک چھوٹا سا ریڈیو نما آلہ نکال لیا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ ایک واکی ٹاکی تھا۔

”اوئے! یہ کہاں سے ملا تجھے؟“ میں نے پوچھا۔

”اسپتال سے۔ یہ ڈاکٹر لی دان کا ہے، پر اب آفتاب کے قبضے میں ہے۔ اس کا دوسرا ”سیٹ“ آفتاب کے پاس ہے۔“

”اس نے خود دیا تھا؟“

”تو کیا میں چھین کر لایا ہوں؟“ عمران نے کہا اور سیٹ کو آن کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ مجھے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے شبہ تھا کہ عمران کی قمیص کے نیچے تہ بند کی ڈب میں کچھ ہے۔ اب یہ شبہ درست نکلا تھا۔ عمران نے ”سیٹ“ کا چمکیلا انٹینا کھینچا۔ بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کی۔ سیٹ کے بیٹری سیل وغیرہ دیکھے لیکن اس میں زندگی کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ کافی دیر کوشش کرنے کے بعد اس نے جھلا کر سیٹ کو تھپتھپایا۔ وہ ایک دم جاگ اٹھا۔ اس پر دو چھوٹی لائٹس روشن ہو گئیں، ایک سرخ دوسری سبز۔ اسپیکر سے گھوں گھوں کی مدھم آواز آنے لگی۔

عمران نے ایک کھٹکا دبایا تو بیپ کی باریک آواز ابھری۔ یہ بیپ دوسرے سیٹ پر جا رہی تھی۔ آٹھ دس دفعہ کی بیپ کے بعد کھٹ پٹ ہوئی اور اسپیکر پر آفتاب کی آواز ابھری۔ وہ کاٹ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ”ہیلو..... کون ہے؟“

”عمران بول رہا ہوں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”یہ کیا کر رہے ہو تم؟ بے موت مارے جاؤ گے۔ ساتھ میں وہ بھی جان سے جائے گی۔“

”تم اپنا نصیحت اپنے پاس رکھو۔ ام جو کچھ کر رہا ہے، سوچ سمجھ کر کر رہا ہے۔ اور ایک بار پھر ام تم کو بتا دینا چاہتا ہے، کسی نے کوئی چالاکی مالاکی دکھایا تو بہت خون خرابا ہوگا۔ ام کسی کو نہیں چھوڑے گا۔“

”لیکن اب کیا نئی بات ہوئی ہے؟ تمہارا مطالبہ تو مان لیا گیا تھا۔ مکھیا نے بڑی گھوڑا گاڑی اور گھوڑوں کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ یہ لوگ تمہیں راستہ دینے پر تیار ہیں۔ تم اپنے ساتھ ضمانت کے طور پر کچھ لوگوں کو بھی رکھ سکتے ہو۔“

”نہیں، اب ام نہیں جائے گا۔ اب امارا مطالبہ کچھ اور ہے اور یہ مطالبہ ام کسی اور کو نہیں، صرف حکم کے لوگوں کو بتائے گا۔“

عمران نے کہا۔ ”حکم کے لوگ دس بیس کی تعداد میں نہیں سیکڑوں کی تعداد میں آئیں گے اور بہت جلد ان کو یہ شک بھی ہو جاتا ہے کہ جولی کی تمہارے ساتھ بھاگ کر یہاں پہنچی ہے، وہ سلطانہ ہے..... ایک بار ان کو یہ شک ہو گیا تو سمجھ لو کہ وہ آخری حد تک جائیں گے۔ تم اس پورے گاؤں کو بھی گولیوں سے اڑا دو تو وہ تمہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔“

”وہ جانے دیں گے۔ ان کا باپ بھی ام کو نہیں روک سکتا۔ تم خوامخواہ اپنا وقت برباد مت کرو عمران صاحب۔ تم اس معاملے سے نکل جاؤ ورنہ پچھتانا پڑے گا۔“

میں نے واکی ٹاکی پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”آفتاب خاں! میں اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایک بار اسے بلا دو۔“

”وہ اپنی جگہ پر ہے۔ وہ اب نہیں آ سکتا۔ اس کی طرف سے بھی تم دونوں کے لیے یہی پیغام ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ بُری طرح پھنس جاؤ گے۔“

اس کے ساتھ ہی کسی بڑی عمر کے مرد کی زور زور سے رونے کی آواز آئی اور آفتاب خاں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سلطانہ کی اصلیت سامنے آنے والا صدمہ ہی کچھ کم نہیں تھا، اب یہ نئی آفت آ گئی تھی۔ آفتاب یہاں سے بحفاظت نکلنے کے بجائے ایک بڑی مصیبت کو دعوت دے رہا تھا۔

ہم نے پھر آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ واکی ٹاکی یکسر خاموش تھا۔

عمران نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ آفتاب کے ہاتھ میں کوئی ایسی شے لگی ہے جس کے بعد اس کے اعتماد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور اب وہ اپنی کچھ شرطیں منوانا چاہتا ہے۔“

”ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے؟“

”ہو سکتا ہے کہ اسلحہ..... یا پھر کوئی ایک ایسا شخص جو حکم وغیرہ کے لیے بہت اہم ہو..... یا پھر حکم اور اس کے ساتھیوں کی کوئی خاص کمزوری۔“

قریباً ایک گھنٹے کے اندر صورتِ حال بہت تبدیل ہو گئی۔ حکم کے کم و بیش دو درجن سپاہی یہاں پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایک جیپ پر آئے تھے۔ یہ جیپ غالباً ان جیپوں میں شامل تھی جو ہماری تلاش میں یہاں چکرا رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد ایک اور جیپ بھی پہنچ گئی۔ پہلی جیپ

بڑی تیز رفتاری سے واپس روانہ ہوگئی۔ غالباً یہ لوگ مزید نفری لانے اور حکام بالا کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے لپکے تھے۔ ہم یہ ساری نقل وحرکت گنے کے اونچے کھیت کے اندر سے دیکھ رہے تھے۔ اب ہمارے لیے ہرگز ممکن نہیں تھا کہ واپس بستی میں پہنچیں۔ آفتاب اور سلطانہ بھی وہ قیمتی وقت ضائع کر چکے تھے جو انہیں یہاں سے نکال سکتا تھا۔ حکم کے سپاہیوں کے آنے کے بعد اب یقیناً وہ آوازیں بھی دب گئی تھیں جو اندر پھنس جانے والے لوگوں کے عزیزوں کی تھیں۔ اب یہ لوگ اصرار نہیں کر سکتے تھے کہ حملہ آوروں کی بات مان کر لوگوں کو رہا کرالیا جائے۔

مزید ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ کوشش کے باوجود ہم دوبارہ آفتاب یا سلطانہ سے رابطہ نہیں کر سکے۔ گماد کا کھیت ہمارے لیے نہایت محفوظ پناہ گاہ تھا۔ اگر کوئی دیہاتی اس طرف آتا بھی تو ہم خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے دائیں بائیں ہو سکتے تھے۔ حرکت کرنے سے پودوں میں سرسراہٹ کی آواز ضرور پیدا ہوتی تھی لیکن اس سرسراہٹ کو کسی کتے بلی کی حرکت سے بھی منسوب کیا جا سکتا تھا۔

واپس جانے والی جیپ کچھ دیر بعد تیز رفتاری سے دھول اڑاتی واپس آگئی۔ اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ خوش گوار سنہری دھوپ میں سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ہم نے دور سے دیکھا، جیپ میں سے کوئی اعلیٰ فوجی افسر نکل کر شفاخانے کی عمارت کی طرف بڑھا۔ اس کی کمر سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس واقعے کے بیس پچیس منٹ بعد اچانک ہمارا رابطہ ایک بار پھر آفتاب خاں سے ہو گیا۔ عمران نے بٹن دبایا تو اسپیکر پر آفتاب کی آواز ابھری۔

”ہیلو..... کون؟“

”میں عمران بول رہا ہوں۔ یہ جیپ پر ابھی کون آیا ہے یہاں؟“

”حکم کا ہندو فوجی افسر تھا۔ ام نے اسے بتا دیا ہے کہ ام کیا چاہتا ہے۔ اگر وہ امارا ڈیمانڈ پورا کرتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ام ان سب کو ایک ایک کر کے مارے گا اور لاشیں باہر برانڈے میں پھینکے گا۔“ آفتاب کی آواز میں شعلے لپک رہے تھے۔

”کیا ڈیمانڈ کی ہے تم نے؟“

”ام کو ہاشم صاحب کی رہائی چاہیے..... فوراً..... ان لوگوں کو ہاشم صاحب کو چھوڑنا پڑے گا اور یہاں پہنچانا پڑے گا۔“

”ہاشم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس بات کو چھوڑ دو۔ بس ام چاہتا ہے کہ حکم اس کو رہا کرے اور وہ یہاں پہنچ جائے۔“

”لیکن وہ تمہاری بات کیوں مانیں گے؟“ عمران نے پوچھا۔

”اس لیے کہ ان کا ایک خاص بندہ ہمارے قبضے میں آگیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”راج بھون کا کاپر (کافر) عورت امارے پاس ہے۔ وہ لوگ امارا بات نہیں مانے گا تو ام اس ترامزادی کو ننگا کرے گا اور اس کے سر میں روشن دان کھول کر اسے برانڈے میں پھینکے گا۔ اور یہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ یہ جارج گوبرا کا بہن اور سرجن اسٹیل کا بیوی ہے۔“

میں اور عمران سناٹے میں رہ گئے۔ میں نے پوچھا۔ ”تم..... ماریا کی بات کر رہے ہو؟“

”جی ہاں۔ یہ امارے سامنے بیٹھا ہے۔ ام نے اس کو مرغی کی طرح باندھ کر ڈالا ہوا ہے۔ کسی بھی وقت اس کے گلے پر چھری چلا دے گا۔“

اس کے ساتھ ہی چلّانے کی نسوانی آواز سنائی دی۔ آفتاب خاں نے شاید اسے ٹھوکر ماری تھی۔ ہم ششدر تھے۔ میں نے تقریباً پہچان لیا۔ یہ آواز ماریا ہی کی تھی۔

”یہ یہاں کیسے؟“ میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

”برا وقت بندے کو خود گھیر کر اس کی اصل جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔“ آفتاب بولا۔ ”یہ یہاں شکار پر آیا ہوا تھا۔“

”شکار..... کس کا شکار؟“

”ڈاکٹر لی دان کا..... یہ سفید کتیا اس پر ڈورے ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس سے تم دونوں کے بارے میں سن گن لینا چاہتا تھا۔ یہ دو دن پہلے مریضہ کے روپ میں اپنا منہ سر لپیٹ کر یہاں پہنچا تھا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ مقامی کپڑوں میں یہ انگریز عورت ہے۔ یہ تو سلطانہ بی بی نے اسے پہچانا اور ام کو بتایا۔“

”ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ عمران بولا۔

”ابھی ام تم کو سمجھا بھی نہیں سکتا۔ ابھی ام تم سے صرف یہ کہتا ہے کہ اس علاقے سے نکل جاؤ۔ ام کو امارے حال پر چھوڑ دو۔ ام ان لوگوں سے اچھی طرح نمٹ سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اس پر بھی غور کر لیتے ہیں لیکن ہمیں یہ تو بتاؤ کہ ماریا یہاں پہنچی کیسے؟“ میں نے سوال کیا۔

دوسری طرف چند سیکنڈ کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ بس ہلکی گھوں گھوں کی آواز آتی رہی۔ ہمیں لگا کہ شاید آفتاب نے پھر سلسلہ منقطع کر دیا ہے مگر پھر اس کی آواز ابھری۔ ”ام نے تم کو بتایا ہے نا کہ یہ شکارن ہے، اور یہ بندوق سندوق سے نہیں اپنے حسن سے شکار پر مارتا ہے۔ یہ ڈاکٹر لی دان کو اپنی گوری چمڑی پر ریجھانے کے لیے یہاں آیا تھا۔ سامبر مقابلے میں اپنے بھائی کی موت کے بعد سے یہ جلے پاؤں کا بلی..... بلکہ کتیا بنا ہوا ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح یہ بھی تم دونوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس کے خصم سرجن اسٹیل کو شک تھا کہ تمہاری گردن سے ”بجلی کا چپ“ کسی عام شخص نے نہیں نکالا۔ کسی بہت سیانے ڈاکٹر نے ہی ایسا کیا ہوگا۔ ان لوگوں کے دماغ میں ڈاکٹر لی دان یا چھوٹے ڈاکٹر کے بارے میں شک تھا۔ یہ کتیا جس کو تم ماریا کہتا ہے، مریض کے روپ میں ڈاکٹر لی دان کے پاس آیا۔ یہ اس سے اندر کا بھید لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ یہ بھید لیتا، اس کا اپنا بھید کھل گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ شکاری خود شکار ہوا۔“ اس نے ایک بار پھر اپنے سامنے لیٹی ماریا کو ٹھوکر وغیرہ رسید کی۔ اس کے چلّانے اور پھر انگلش میں گالیاں دینے کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔

”خاموش۔“ آفتاب دہاڑا۔ ”ابھی تمہارا ایک انگلی کٹا ہوا ہے۔ ام باقی بھی کاٹ ڈالے گا پھر یہ سارا انگلی تمہارے اندر ٹھونسے گا..... تمہارے پلید منہ کے اندر اور تمہیں پھانسی پر لٹکا دے گا۔“ آفتاب کا لہجہ لرزا دینے والا تھا۔

ہم صورت حال کی اس قطعی غیر متوقع کروٹ پر ششدر تھے۔ اب اس بات میں شبہے کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی کہ سرجن اسٹیل کی بیوی اور جارج کی بہن، آفتاب کے قبضے میں آگئی ہے۔

ماریا نے غالباً پھر واویلا شروع کر دیا تھا۔ آفتاب نے واکی ٹاکی آف کر دیا۔

اب پوزیشن سمجھ میں آنے لگی تھی۔ آفتاب نے یہ بات تو ٹھیک ہی کہی تھی کہ ماریا ایک شکارن تھی۔ وہ اپنے جسم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اس سے پہلے ہم دیکھ ہی چکے تھے کہ وہ رات کے اندھیرے میں ایک پارٹی کو ”جسمانی رشوت“ دے کر راہ فرار اختیار کر گئی تھی۔ شاید یہاں وہ ڈاکٹر لی دان یا اس کے اسسٹنٹ کو جنس کے جال میں جکڑنے کے لیے وارد ہوئی تھی۔ آفتاب کا کہنا تھا کہ وہ ان سے ہمارے بارے میں کوئی ”کلیو“ حاصل کرنا چاہتی تھی۔

”اب کیا ہوگا؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔

''اس کا جواب لاہور میں اکثر رکشوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے، وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔'' وہ بولا۔

''یہ تو بہت لمبا چکر چل گیا ہے۔ اگر واقعی ماریا، آفتاب کے قبضے میں آچکی ہے تو زرگاں میں تہلکہ مچ جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ انہیں ہاشم رازی کو رہا ہی کرنا پڑ جائے۔''

''لیکن یہ جو کچھ بھی ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ یہ اس بھانڈیل اسٹیٹ کو بڑی تیزی سے لڑائی اور تباہی کی طرف لے جارہا ہے۔'' عمران کی پیشانی پر بال لہرا رہے تھے اور آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔

موسم تبدیل ہورہا تھا لیکن رات کے وقت اب بھی کافی سردی ہوتی تھی۔ جوں جوں شام کے سائے لمبے ہوتے گئے، کماد کے اس کھیت میں خنکی بڑھتی گئی۔ شام کے فوراً بعد ہی اوس بھی گرنا شروع ہوگئی۔ بستی میں چراغ روشن ہوگئے۔ شفاخانے کی عمارت کے ارد گرد اب ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ زرگاں کے بیسیوں مسلح سپاہی اور گارڈز بھی یہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے شفاخانے کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے ہر طرف حرکت کر رہے تھے۔

میرے سینے میں دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ سلطانہ کی صورت بار بار نگاہوں میں گھومتی تھی اور دل کو درد سے لبریز کر دیتی تھی۔ دو چار دن میں ہی کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ اوپر تلے دل فگار انکشاف ہوئے تھے اور اب وہ ایک بدترین صورتِ حال سے دوچار تھی۔ اس کا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ جب دو دن پہلے میں نے تہ خانوں میں آفتاب اور سلطانہ کو رازدارانہ گفتگو کرتے سنا تھا۔ سلطانہ نے کہا تھا..... آفتاب! ایک بات ذہن میں رکھنا، یہ آخری بار ہوگا..... یقیناً وہ اسی خطرناک مہم جوئی کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ زہر سے بھرا ہوا ایک پیکٹ اپنے لباس میں چھپا کر مندر میں کسی گلزار نامی معذور عورت تک پہنچائے گی۔ اس کے بعد اس کا کام ختم ہو جائے گا۔ لیکن انسانی ارادے اور منصوبے ہمیشہ تو پورے نہیں ہوتے۔ جہاں، سلطانہ کے خیال میں اس کا کام ختم ہو جانا تھا، وہیں سے صورتِ حال نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا تھا۔ مندر کے اندر گڑبڑ ہوئی اور سلطانہ خود کو بچانے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے دفاع میں تیز دھار آلہ بھی استعمال کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے تھا۔ وہ اور آفتاب کم از کم تین افراد کے قتل میں ملوث ہوچکے تھے اور اب سیکڑوں افراد کے گھیرے میں تھے۔ ان کے حوالے سے اگر کوئی امید تھی تو یہی تھی کہ وہ اپنے پاس سفید فام ماریا کی موجودگی کا دعویٰ کر رہے تھے۔

عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ سردی کے سبب وہ قدرے لرزاں آواز میں بولا۔ ''کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ واقعی تمہاری شاگردی اختیار کرلی جائے۔''

''کس معاملے میں؟''

''سردی، گرمی اور بھوک پیاس جھیلنے کے معاملے میں۔ یار! تم تو ایسے بیٹھے ہو جیسے خالہ جی کا ڈرائنگ روم ہو اور باقاعدہ انگیٹھی دہک رہی ہو۔ یہاں تو اپنی قلفی جمی جارہی ہے۔''

''تو بن جاؤ شاگرد۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''لو بن گیا۔'' اس نے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب اپنے شاگرد کے لیے کچھ کرو۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! اپنے شاگرد کی جان بچاؤ۔ اس کے لیے کہیں سے کوئی انگیٹھی وغیرہ لے کر آؤ۔ کوئی مونگ پھلی، چلغوزے، کوئی دودھ پتی وغیرہ۔''

''ایسے کام تو شاگرد اپنے استادوں کے لیے کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ پرانے زمانے کی پرانی باتیں ہیں استاد جی۔ ہم نئے لوگ ہیں۔ ہمیں ایسی فرسودہ رسموں کو ختم کرنا چاہیے بلکہ آج ہی سے اس نیک کام کا آغاز کردینا چاہیے۔'' اس نے میری گرم چادر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

مجھے واقعی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے چادر اتاری اور اس کی طرف بڑھا دی۔ ''لو، اسے اپنی چادر سے جوڑ کر ڈبل کرلو..... تمہارا گزارہ ہو جائے گا۔''

''نہیں نہیں، یہ نہیں ہوسکتا استاد جی۔ مجھے اکڑ کر مرنا قبول ہے لیکن یہ طعنہ مجھ سے ہرگز برداشت نہیں ہوگا کہ میں نے صرف یہ چادر تم سے ہتھیانے کے لیے استادی شاگردی کا ڈراما رچایا تھا۔ نو ناٹ ایٹ آل۔''

''رکھ لو۔ مجھے واقعی ٹھنڈ نہیں لگ رہی۔''

''تمہیں ٹھنڈ نہیں لگ رہی لیکن مجھے تو بے عزتی لگ رہی ہے نا۔'' اس نے کہا۔

پھر اس مسئلے کا درمیانی حل ہم نے یہ نکالا کہ دونوں گرم چادروں کو آپس میں جوڑا اور اس کی ایک ہی بکل بنا کر اس میں گھس گئے۔ ہم نہایت سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے مگر عمران کی حسبِ مزاج ہمیشہ کی طرح برقرار تھی۔ وہ میرا دھیان بنانے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ساتھ بے مثال تھا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ ایک اور ایک گیارہ کا محاورہ کسی عمران جیسے ساتھی کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہوگا جب ایک بار پھر سیون ایم ایم رائفل کی خوفناک آواز نے سناٹے کو چکنا چور کیا۔ اس کے فوراً بعد بستی میں ہلچل کے آثار نظر آئے۔ پانچ دس منٹ بعد عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے دور سے دیکھا۔ کچھ لوگ ایک چارپائی اٹھائے احاطے سے نکل رہے تھے۔ یہ ویسا ہی سین تھا جیسا ہم نے صبح کے وقت دیکھا تھا۔ جب ماری جانے والی نرس کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر احاطے سے نکالا گیا تھا۔ اب یقیناً کوئی اور لاش نکالی جارہی تھی۔

آفتاب کا رویہ بے حد جارحانہ تھا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یہ جارحیت بڑھ رہی تھی۔ ''لگتا ہے کہ یہ ہوش کھو چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہوش کھونے کے لیے ہوش کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس میں تو شاید ہوش ہے ہی نہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

''ڈر لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ سیکڑوں کا مجمع ہے، اگر طیش میں آکر یہ لوگ ایک دم اندر گھس گئے تو دونوں کی تکا بوٹی کردیں گے۔''

ابھی بات میرے منہ میں ہی تھی کہ اچانک بہت سے لوگوں کی نعرہ زنی سنائی دی۔ جے جے کار کا زوردار آوازہ گونجا اور اندازہ ہوا کہ مشتعل افراد کا ایک بڑا گروہ شفاخانے کے پھاٹک کی طرف بڑھنا چاہ رہا ہے۔ یہی وقت تھا جب پھاٹک کے قریب شعلے سے چمکے اور رائفل کے کئی فائر ہوئے۔ آگے بڑھنے والا گروہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہوائی فائرنگ کرنے والے یقیناً حکم کے سپاہی ہی تھے۔ وہ مشتعل لوگوں کو آگے بڑھنے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے۔ اندر ایک اہم ترین عورت یرغمالی کی حیثیت سے موجود تھی۔ وہ جارج گورا کی بہن اور سر جن اسٹبل کی بیوی تھی اور سر جن اسٹبل جیسے سفید فام لوگ حکم کی ناک کا بال تھے۔ وہ ان سے معاملات بگاڑنے کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لے سکتے تھے..... وہ جانتے تھے ان لوگوں کے پاس جدید ترین ہتھیار ہیں، پیسا ہے، اسٹیٹ کے کئی امرا اندرخانے ان سفید فاموں کے وفادار ہیں۔ جارج کے بعد اگر ماریا کو بھی کچھ ہو جاتا تو یہ بہت بڑے نقصان کی بات تھی۔

مشتعل لوگوں کو نہ صرف منتشر کر دیا گیا بلکہ تمام ہجوم کو بھی شفاخانے کی چار دیواری سے دور ہٹا دیا گیا۔ ہم دور سے صاف نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اندازہ ہورہا تھا کہ رسیاں وغیرہ لگا کر عمارت اور لوگوں کے درمیان ایک فاصلہ بنایا جارہا ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے کے وقفے سے سیون ایم ایم کا ایک اور فائر ہوا۔ اس کے بعد ایک بار پھر وہی شور و غوغا برپا ہوا۔ چند منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ ٹارچوں اور گیس لیمپس کی روشنی میں ایک چارپائی اٹھا کر احاطے سے باہر لائی جارہی ہے۔ یقیناً اس چارپائی پر بھی ایک لاش تھی اور یہ لاش آفتاب خان کی طرف سے محاصرہ کرنے والوں کو تیسرا تحفہ تھی۔

رات کے ٹھٹھرے ہوئے سناٹے میں ایک بار پھر عورتوں کے بین گونجے۔ ہجوم میں ہلچل نظر آئی۔ گاہے بگاہے حکم کے فوجیوں کے للکارے بھی سنائی دے رہے تھے۔ یہ للکارے عام لوگوں کو پُرسکون رکھنے کے لیے بلند کیے جا رہے تھے۔

میں اور عمران ایک بار پھر واکی ٹاکی پر آفتاب خاں سے رابطے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ دوسری طرف یکسر خاموشی تھی۔ ہم بھی تادیر یہ کوشش جاری نہیں رکھ سکتے تھے، بیٹری کے کمزور پڑنے کا خدشہ تھا۔ آفتاب بالکل دیوانے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس طرح کا دیوانہ پن بندے کو حیران کن کامیابی دلاتا ہے یا برباد کر دیتا ہے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آفتاب نے ہاشم عرف باشو کی رہائی کے لیے حکم کے ہرکاروں کو ایک خاص مہلت دی ہے۔ وہ مہلت چونکہ ختم ہوگئی ہے اس لیے وہ یرغمالیوں میں سے کچھ لوگوں کو مار کر باہر پھینک رہا ہے۔

''یار! اس نے کہیں ڈاکٹر لی وان کو ہی نہ مار دیا ہو؟'' میں نے کہا۔

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔ مقامی عورتیں جس طرح واویلا کر رہی ہیں، یہی لگتا ہے کہ کوئی مقامی ہی مرا ہے۔''

''مگر مقامی لوگ ڈاکٹر کو بھی تو بہت چاہتے ہیں۔ اس کی موت بھی انہیں دکھی کرسکتی ہے۔'' میں نے نکتہ اٹھایا۔

''لیکن میرا نہیں خیال کہ آفتاب اتنی جلدی کسی اہم یرغمالی کو مارے گا۔ وہ ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ ہوشیار اور تجربہ کار ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ باقاعدہ ایک تنظیم ہے، عام لوگوں میں آفتاب اور معذور گلزار جیسے لوگ موجود ہیں۔ یہ لوگ اپنے ظاہری روپ سے کہیں زیادہ خطرناک اور تربیت یافتہ ہیں۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہاشم رازی، ان کے بڑوں میں سے ہو، یا پھر ان کا سرغنہ ہی ہو؟''

''یہ بھی ہو سکتا ہے۔ حکم کے دربار میں ہم نے ہاشم کی جو شعلہ فشانی دیکھی تھی، وہ ناقابلِ فراموش تھی۔''

''لیکن اگر وہ اہم ترین شخص ہے تو پھر اس کی رہائی زرگاں والوں کے لیے اتنی آسان نہیں ہوگی۔''

''مگر ادھر بھی تو دیکھو جگر! یہاں ماریا جیسی لڑکی پھنسی ہوئی ہے۔ یہاں کے گورے ہرگز نہیں چاہیں گے کہ ماریا کو کچھ ہو۔ وہ حکم کو ماریا کے لیے ہر قیمت دینے پر تیار کر لیں گے۔ حکم اور اس کے حواریوں کے لیے ان انگریزوں کی بات ٹالنا آسان نہیں ہے۔ انہوں نے یہاں اپنے پنجے بڑی مضبوطی سے گاڑے ہوئے ہیں۔''

''یہ انگریز کتنی تعداد میں ہوں گے یہاں اسٹیٹ میں؟'' میں نے پوچھا۔

''تعداد تو زیادہ نہیں ہے۔ گیتا کبھی بتا رہی تھی کہ یہ ایک ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔ اتنے ہی لوگ فوج کے مختلف عہدوں پر ہیں۔ لیکن اس انگریز خانہ خراب میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ ہمیشہ سے مقامی لوگوں کو تقسیم کر کے اپنا کام نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے برصغیر کی تاریخ پچھلے ڈھائی سو سال سے اسی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ یہاں بھی ان لوگوں نے تعداد میں کم ہونے کے باوجود اندر خانے اپنی طاقت بنائی ہوئی ہے۔ شروع شروع میں یہ لوگ کوہ گرشیر ڈل پر ریسرچ کرنے اور تیندوؤں کا شکار کرنے یہاں آئے تھے۔ اب یہاں یہ کافی تعداد میں ہیں۔ راج بھون میں ان کا اثر رسوخ ہے۔ فوج میں انہوں نے اہم عہدے سنبھالے ہوئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے مقامی لوگوں میں سے ہی ایسے وفادار ڈھونڈ لیے ہیں جو وقت پڑنے پر حکم کو بھی تگنی کا ناچ نچا سکتے ہیں۔ اصل میں حکم کی جو شان و شوکت نظر آ رہی ہے وہ ان گوروں کی وجہ سے ہی ہے۔ حکم کے پیچھے گورے ہیں جن کی وجہ سے مقامی لوگ حکم کی ساری عیاشیوں کے باوجود اسے اوتار کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال، وہ قیدیوں کو ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ لینے والی بات ہے۔''

''ان دیکھی زنجیریں؟''

''یار! وہی بے ہودہ افواہ کہ حکم کے خاص قیدی اگر جارج گورے کی جیل سے بھاگ بھی جائیں اور کسی طرح اسٹیٹ کی حدوں سے نکلنا چاہیں تو نکل نہیں سکتے۔ حکم نے انہیں روحانی عمل سے پابند کرا ہوا ہے اور وہ کہیں بھی ہوں، پکڑ لیے جاتے ہیں۔ اب ہم جان ہی چکے ہیں، یہ ''روحانی عمل'' دراصل وہی منحوس الیکٹرانک چپ ہے جو سرجن اسٹیل خاص قیدیوں کے جسموں میں پلانٹ کرتا ہے۔ اسی طرح کے اور کئی شعبدے ہیں جن کے ذریعے حکم کی ''روحانیت'' کو جلا بخشی جاتی ہے۔''

''تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! پھر وہی بے ہودہ سوال؟ تم جانتے بھی ہو کہ میں فساد پلس کا نمائندہ ہوں۔ میرا تو کام ہی ریسرچ کرنا ہے۔ ابھی تو مجھے اپنے سر کے خوب صورت بالوں کا خیال رہتا ہے، اگر میں گنجا ہو جاؤں [illegible] رڈ کر لوں اور اپنے دماغ کو اس کی پوری گنجائش کے مطابق استعمال کرنے لگوں تو میں ''بالکل بکواس چینل'' اور ''چغد لکھے ناپینا چینل'' کو بھی مات دے دوں۔''

''یہ کون سے چینل ہیں بھئی؟'' میں نے پوچھا۔

''یار وہی ..... بالکل بکواس چینل یعنی بی بی سی اور چغد لکھا ناپیتا، سی این این۔''

وہ پٹری سے اتر رہا تھا۔ میں اسے بمشکل واپس لایا۔

وہ گرم چادر میں سمٹتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بہادر شاہ ظفر کا نام سنا ہوگا؟ وہی مغلیہ سلطنت کا آخری تاج دار۔ اسے انگریزوں نے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ وہ بس نام کا بادشاہ رہ گیا تھا۔ اصل حکم انگریزوں کا ہی چلتا تھا۔ کچھ ایسی ہی ملتی جلتی صورتِ حال یہاں بھی نظر آ رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اورنگ زیب کا پڑپوتا بہادر شاہ مسلمان تھا اور حکم جی ہندو ہے۔ جو کچھ نتیجہ میں نے نکالا ہے، اس کے مطابق حکم نے بس اپنے راج پاٹ کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ وہ اچھا کھا پی رہا ہے۔ ایک ہندو کی حیثیت سے ناچ گانے اور خوب صورت عورتوں کی صحبت سے لطف لیتا ہے۔ ساتویں کے جشن جیسی تقریبوں کی آڑ میں اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ جو کچھ چل رہا ہے اسی طرح چلتا رہے۔ وہ ان گوروں کے خلاف کسی طرح کا سخت رویہ اختیار کر کے اپنے آرام سکون کو تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں ان گوروں کا اصل دشمن کوئی اور ہے۔''

''کون؟''

''یہاں کے مسلمان۔ مراد شاہ اور انور خاں جیسے لوگ۔ جو کٹنا اور جھکنا نہیں جانتے ..... جو حکم کے چھوٹے بھائی ''چھوٹے سرکار'' کے ساتھ مل کر ٹل پانی میں بہت طاقت پکڑ چکے ہیں اور کسی بھی وقت زرگاں میں حکم اور اس کے انگریز دوستوں کے لیے شدید خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ نچلی ذاتوں کے کچلے مسلے ہندو اور بودھ بھی زرگاں کے عیش پرستوں کے لیے خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں۔''

''فی الوقت تو تم واقعی ایک صحافی لگ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''صحافی ایک نسبتاً چھوٹا لفظ ہے۔ تم میرے لیے مناسب لفظ استعمال کرنا چاہو تو وہ دان شور (دانشور) ہے۔ دان شور سمجھتے ہو نا تم؟ عقل مند، صاحب ذی شور۔''

''ذی شعور۔'' میں نے کہا۔

وہ میری تصحیح کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''عقل تو بچپن سے ہی میرے اندر بہت زیادہ تھی بلکہ میری ماں تو پریشان ہو جاتی تھی۔ مجھے کہتی تھی، کبھی دوسروں کے سامنے کوئی بے وقوفی کی بات بھی کر لیا کرو، ورنہ لوگ سمجھیں گے تم بڑے ہو۔ میری ہوشیاری کا اندازہ لگاؤ، جہاں دوسرے لوگ پانی کے بھرے ہوئے لوٹے سے طہارت کرتے ہیں، میں صرف آدھے کپ پانی سے کام چلا لیتا تھا۔ بارہ ٹہنی کھیلنے میں، میں اپنے محلے کا چیمپئن تھا۔ ایسی ذہنی چالیں چلتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ میرے ماسٹر صاحب کہا کرتے تھے، تم میں قدرتی طور پر ایک اچھا ''ڈاکو'' بننے کی صلاحیت ہے۔ اگر تم فوج میں چلے جاؤ تو بڑے اچھے جرنیل بن سکتے ہو۔ میں اپنے بے تحاشا ''آئی کیو'' کی وجہ سے فوج میں نہ جا سکا۔ انٹرویو کرنے والے نے پوچھا جلدی سے بتاؤ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں ..... میں نے کہا، دینے ہوں تو چار اور لینے ہوں تو بائیس۔ اس نے برا سا منہ بنایا اور پوچھا۔ نو دو اور گیارہ کتنے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا، وہ تو ہوتے ہی نہیں کیونکہ وہ تو بھاگ جاتے ہیں۔ اس نے کہا..... ٹھیک ہے تم بھی بھاگ جاؤ۔ یو آر ٹوٹلی ریجیکٹڈ۔ میں فوج میں تو نہ جا سکا لیکن میں نے ایک اور بہت اچھا کام کیا۔ میں نے بارہ ٹہنی کے تجربے کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا۔ پتا ہے کس طرح؟''

''کس طرح؟'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میں نے جنگی چالوں اور لڑائی کی حکمتِ عملیوں پر ایک کتاب لکھی۔ وہ پاپولر ہوئی۔ بڑے بڑے لوگوں نے اس کتاب کو اور میری دان شوری کو تسلیم کیا۔ یقین کرو بہت سی حالیہ جنگوں میں میری کتاب کی دی ہوئی تکنیکیں ہی استعمال ہوئی ہیں۔ بلکہ جگر..... کبھی کبھی تو مجھے شک پڑتا ہے کہ پلاسی کے میدان میں انگریزوں نے سراج الدولہ کے خلاف بھی یہی تکنیکیں استعمال کی تھیں۔''

''حضور! یہ بڑی پرانی بات ہے۔ آپ اس وقت دنیا میں موجود نہیں تھے۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں موجود ہوتا تو انگریزوں کو اپنی کتاب کی نقل کرنے دیتا..... ؟ اور سراج الدولہ صاحب کو شکست ہونے دیتا؟'' وہ ترخ کر بولا۔

میں خاموش رہا۔ وہ بے سرو پا باتیں کر کے میری توجہ صورتِ حال کی سنگینی سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ سنگینی ایک بہت بھاری پتھر کی طرح رات کے سینے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ اسے کچل رہی تھی۔

یہ پہاڑ جیسی رات تھی۔ صورتِ حال کی بے یقینی نے اسے مزید گراں کر دیا تھا۔ آخری فائر رات ساڑھے دس بجے کے قریب ہوا تھا۔ اس کے بعد سے مکمل خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں بس کبھی کبھی بوگیر کتوں کی آوازیں گونجتی تھیں یا مسلح محافظوں کے بلند آوازے سنائی دیتے تھے۔ اب کم از کم چار جیپیں یہاں موجود تھیں۔ جیپوں کو شفا خانے کے اطراف میں مختلف جگہوں پر کھڑا کر کے ان کے انجن اسٹارٹ رکھے گئے تھے اور ان کی ہیڈ لائٹس کو سرچ لائٹس کی طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔

عمران واکی ٹاکی سے مسلسل بھیجا چھاڑ کر رہا تھا۔ رات کوئی ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ وہ ایک بار پھر آفتاب سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو آفتاب؟ تم نے دو بندے اور مار دیے ہیں۔ تم اپنے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہو۔ تم مرو گے اور تمہارے ساتھ سلطانہ کی جان بھی جائے گی۔''

''ام مرنے سے نہیں ڈرتا اور نہ سلطانہ بی بی ڈرتا ہے۔ مرنے سے تم جیسا بزدل ڈرتا ہے۔ امارا راستہ ایک دم سیدھا ہے۔ غازی یا شہید۔''

''لیکن بے گناہ نہتے لوگوں کو مارنا کون سا جہاد ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ بے گناہ نہیں، یہ کافر لوگ ہے۔''

''کہاں کہا گیا ہے کہ غیر مسلموں کو اس طرح مارا جا سکتا ہے؟''

''جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ تو کافروں کا ہی بنایا ہوا مقولہ ہے۔''

''ام مقولوں شقولوں کو نہیں جانتا، ام صرف اتنا جانتا ہے کہ اگر ان لوگوں نے ہاشم صاحب کو نہیں چھوڑا تو ام ان سب کو اگلے جہان روانہ کرے گا۔ لیکن ام کو لگتا ہے کہ شاید اس کا نوبت نہ آئے۔ یہ بزدل لوگ اندر سے ڈھیلا پڑ چکا

ہے۔ یہ ہاشم صاحب کو چھوڑ دے گا...... ان کو چھوڑنا پڑے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''دیکھو آفتاب! اگر تم زیادہ سختی دکھاؤ گے تو پھر تمہارا نقصان ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی برداشت کھو دیں اور تم پر حملہ کر دیں۔ ہم نے اپنی طرف سے تمہاری ہوا باندھ رکھی ہے۔ گاؤں کے سرکردہ لوگوں کو یہ جتایا ہوا ہے کہ اندر دو سے زیادہ لوگ موجود ہیں۔ ان کے پاس دھماکا خیز مواد بھی ہے جو انہوں نے مریضوں کے وارڈ میں نصب کیا ہوا ہے۔ اسی طرح کی باتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ لوگ ڈرے ہوئے ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ تم صرف دو ہو اور رائفل کے علاوہ تمہارے پاس کوئی کارگر ہتھیار بھی نہیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ تم پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا لیں۔''

آفتاب بے پروائی سے بولا۔ ''ان کا جو جی چاہتا ہے کرے لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر کچھ کرے گا تو سب کا خانہ خراب ہوگا۔ کم از کم یہ سفید رنگ کی کتیا تو بالکل بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

ایک بار پھر ماریا کے چلّانے اور کراہنے کی آواز آئی۔ آفتاب جب بھی اس کا ذکر کرتا تھا، اسے کوئی ٹھوکر وغیرہ بھی رسید کرتا تھا۔

''ڈاکٹر لی وان کہاں ہے؟'' میں نے آفتاب سے پوچھا۔

''وہ ایک دم سڑی بڈھا ہے۔ ام اس کا عزت کرتا ہے کیونکہ اس نے مندر میں تمہارا آپریشن کر کے ام سب کا مدد کیا تھا۔ ام نے کل اس سے کہا تھا کہ اگر وہ یہاں سے نکلنا چاہتا ہے تو ام اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہے لیکن وہ بک بک کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے مریضوں کو اور اپنے اسپتال کو چھوڑ کر یہاں سے نہیں جائے گا۔ وہ ان کے ساتھ جینا مرنا پسند کرے گا۔ ام نے کہا ٹھیک ہے، اگر تمہاری قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا ہے تو پھر مرو۔''

''اب وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ لگاتار بک بک کر رہا تھا۔ پھر اس نے چیزیں اٹھا اٹھا کر ام کو مارنا شروع کر دیا۔ ام نے اسے غسل خانے میں بند کر دیا اور باہر سے تالا لگا دیا ہے۔ اب اس نے جو واویلا بھی کرنا ہے، اندر ہی کرتا ہے۔''

''تم نے اسے مارا بھی ہے؟''

''اس نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے مار کھایا ہے...... لیکن زیادہ نہیں...... بس ام نے رائفل کے دستے سے ایک چوٹ لگایا ہے اس کی کنپٹی پر۔ ہاں، اگر یہ اپنا منحوس واویلا بند نہیں کرے گا تو اور مار کھائے گا۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں طیش نے اندھا کر رکھا ہے آفتاب خان! ڈاکٹر لی وان ایک خدا ترس شخص ہے۔ اس نے اس دور دراز علاقے میں یہ اسپتال بنایا ہے...... ہر مہینے بارہ چودہ گھنٹے کا مشکل سفر کر کے یہاں پہنچتا ہے۔ ضرورت مندوں کا مفت علاج کرتا ہے۔ ان ضرورت مندوں میں مسلمان بھی ہوتے ہیں.....''

''لیکن وہ خود تو کافر ہے نا...... اور کافر کافر ہی ہوتا ہے...... کافر ہی ہوتا ہے۔'' آفتاب کے لہجے میں پھر آگ بھڑک اٹھی۔

شاید یہ بحث طول کھینچتی مگر عمران نے مداخلت کی اور آفتاب سے درخواست کی کہ وہ کم از کم ایک بار سلطانہ کی بات ہم سے کرا دے۔ پہلے تو آفتاب نہیں مانا لیکن پھر اس نے رائے بدل لی۔ شاید دوسری طرف بھی سلطانہ کی طرف سے بھی ایسی خواہش کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ واکی ٹاکی لے کر نیچے جا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں سلطانہ سے بات کراتا ہے۔

دور ناگ پھنی اور کیکر کے درختوں کے پیچھے بہت سی روشنیاں حرکت کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ فوجیوں کو مزید کمک مل گئی ہے اور گھیرا مضبوط کیا جا رہا ہے۔ آنے والی گھڑیوں میں یہاں کیا ہوگا، ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اسی اثنا میں سلطانہ کی پژمردہ آواز واکی ٹاکی کے اسپیکر پر ابھری۔

''مہروج...... مہروج! آپ میری آواج سن رہے ہیں؟''

''ہاں سلطانہ! میں سن رہا ہوں۔'' میری آواز میں خود بخود درد کی لہریں لینے لگا۔

''آپ کہاں ہو مہروج؟''

''تمہارے آس پاس ہی ہوں۔ اور تم کہاں ہو؟''

''ہم...... میں یہاں اسپتال کے اندر۔''

''اور کوئی ہے تمہارے پاس...... میرا مطلب ہے آفتاب خان کہاں ہے؟''

''وہ چلا گیا ہے۔ اس وخت (وقت) میں اکیلی ہوں۔'' سلطانہ کی آواز بار بار بھرا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! ایسا کیوں کیا تم نے؟ کیوں مجھے اس طرح اندھیرے میں رکھا؟ میں تمہارا شوہر تھا سلطانہ...... تمہارا شریکِ زندگی...... تم نے اتنا بڑا جھوٹ بولا مجھ سے۔ تم ان لوگوں کا حصہ تھیں جن میں آفتاب، ہاشو اور گلزار بی بی جیسے خطرناک قاتل شامل ہیں لیکن تم نے میرے سامنے ایک گھریلو عورت کا روپ بنائے رکھا۔ تم نے مجھے بتایا کہ تمہاری زندگی مجھ سے اور بالو سے شروع ہو کر ہم دونوں پر ہی ختم ہو جاتی ہے...... ایسا کیوں کیا تم نے؟''

جواب میں سلطانہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شاید آنسو بہا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم نے ہر قدم پر مجھے دھوکا دیا ہے سلطانہ۔ یہاں تک کہ پرسوں رات کو بھی تم نے بس مندر سے میرے جانے کا ہی انتظار کیا اور پھر آفتاب کے ساتھ اپنے کام پر نکل کھڑی ہوئیں۔ یہ سب کیا تھا سلطانہ؟''

دوسری طرف چند لمحے گہری خاموشی طاری رہی۔ تب دھیمی سسکی کی آواز ابھری۔ سلطانہ نے کہا۔ ''اپنی صفائی میں کہنے کے لیے میرے پاس کچھ ناہیں ہے مہروج! میں بس آپ سے ماپھی مانگ سکتی ہوں۔ اتنا جرور کہوں گی کہ میں جو کچھ ہوں، پہلے سے ہوں۔ اس وخت آپ بھی میری جندگی میں ناہیں آئے تھے۔''

''لیکن تم کیا ہو؟ مجھے پتا تو چلے سلطانہ...... میں جسے اپنی بیوی کہتا رہا ہوں، وہ اصل میں ہے کیا؟''

''وہ آپ کی بیوی اِج ہے۔'' وہ جذباتی انداز میں بولی۔ ''اور آپ سے اتنا پیار کرتی ہے...... کہ...... آپ...... سوچ بھی ناہیں سکتے...... لیکن......''

''لیکن کیا؟''

وہ گمبھیر توقف کے بعد بولی۔ ''میں جو کچھ ہوں، مجھے حالات نے بنایا ہے مہروج! جب حکم جی اور جارج گورے جیسے حاکم تقدیروں کے مالک بن جاتے ہیں، لوگن پر جلم ڈھاتے ہیں، غریبوں کا خون چوستے ہیں، راہ چلتی عورتوں کو بُری نجر سے دیکھتے اور انہیں بے عجت کرنا چاہتے ہیں، تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے بہت جلم سہا ہے مہروج! ہم راجپوت ہیں، ہمارا دوش بس یہ تھا کہ ہم حکم اور گورے جیسے لوگن کی من مانیوں کے سامنے سر ناہیں جھکاتے تھے۔ شاید کسی وخت ہم ہار ہی جاتے لیکن پھر ہمیں ہاشم صاحب جیسا آسرا مل گیا۔ ہاشم صاحب وہ سب کچھ کر سکتے تھے جو ہم ناہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا، خفیہ ٹھکانے تھے اور بڑے نڈر ساتھی بھی تھے۔ ہاشم صاحب گونگے ملازم کے روپ میں ہمارے گھر رہنے لگے تھے۔ صرف میں، میرے اباجی اور بھائی نبیل جانتے تھے کہ ہاشم صاحب کیا ہیں۔''

''سلطانہ! تم میری شریکِ زندگی ہونے کا دعویٰ کرتی ہو اور مجھے اتنی اہم باتوں سے بے خبر رکھا؟''

''میں نے کئی بار چاہا کہ آپ کو سب کچھ بتا دوں لیکن ہر بار ڈر گئی۔ مجھے لگا کہ میں آپ کو کھو دوں گی۔ آپ مجھ سے بہت دور چلے جائیں گے۔ میں یہ ناہیں کہتی مہروج کہ میں نے ہاشم صاحب کے کہنے پر جو کچھ کیا، وہ سب ٹھیک اِج تھا لیکن وہ سب کچھ غلط بھی ناہیں تھا۔ یہ ان گوروں کا کٹھ پتلی حکم جی، کم جور مسلمانوں پر جس طرح کے جلم ڈھا رہا ہے، وہ سب جانتے ہیں۔ ہاشم صاحب اور ان کے ساتھی اس کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ لیکن ان سے جیادتی بھی ہو جاتی ہوئے گی مگر جیادتیاں تو دونوں طرف ہو رہی ہیں۔''

میں نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''زرگاں جانے سے پہلے میں نے تم سے کیا کہا تھا سلطانہ؟ میں نے کہا تھا کہ...... اب میں ہوں...... اب اپنے سارے غم دکھ مجھے دے دو۔ ایک بیوی کی طرح گھر کی چار دیواری میں آ جاؤ۔ میں تمہارے ہر دکھ کا مداوا کروں گا، تمہارے سارے آنسو پونچھوں گا۔ میں نے کہا تھا نا؟''

وہ ایک بار پھر سسک اٹھی۔ چند لمحے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے انکار ناہیں ہے مہروج! آپ نے کہا تھا اور آپ اپنے کہے کا پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ اب وہی کچھ کروں جو آپ چاہتے ہیں لیکن قدرت کو شاید یہ منجور ناہیں تھا۔ میں آپ کے لیے سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی مہروج! لیکن ایک آخری کام مجھے کرنا تھا...... اور...... یہ کوئی جیادہ خطرناک کام بھی ناہیں تھا۔ لیکن...... لیکن ہم پھنس گئے مہروج...... اور اب جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ اگر......'' اس کی آواز ٹوٹ گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

''وہاں مندر میں کیا ہوا تھا؟'' میں نے سلطانہ سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ ''میں اس بڑے کمرے کی طرف جا رہی تھی جہاں پرشاد پکایا جاتا ہے۔ وہاں پہ مجھے گلزار سے ملنا تھا مگر راستے میں ایک بار پھر تلاشی ہو گئی۔ اس تلاشی میں بڑی گوپی کو میرے کپڑوں میں چھپے لفافے کا پتا چل گیا۔ اس نے لفافہ نکال لیا اور مجھے پکڑنے کی کوشش کی۔ پاس ہی ایک چھری پڑی تھی۔ میں نے چھری اٹھائی اور بھاگ نکلی۔ دو تین لوگن میرے راستے میں آئے۔ میں نے ان پر وار کیا اور پھر ایک بھاگتی ہوئی گھوڑا گاڑی میں چڑھ گئی۔ اس وخت مجھے بالکل جانکاری ناہیں تھی کہ آفتاب خان بھی مجھ سے مل جائیں گا۔ گھوڑا گاڑی کھیتوں میں تھوڑا اِج آگے گئی تھی کہ وہ ایک طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔''

''اسے پتا تھا کہ تم گھوڑا گاڑی میں ہو؟''

''ہاں، اس نے مجھے گاڑی میں چڑھتے دیکھ لیا تھا.....''

اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا۔ خبر نہیں کہ سگنل آنا بند ہو گئے تھے یا پھر ویسے ہی واکی ٹاکی آف کر دیا گیا تھا۔

میں اور عمران کوشش کرتے رہے لیکن دوبارہ رابطہ بحال نہیں ہوا۔ سلطانہ سے گفتگو شروع کرنے سے پہلے درختوں کے درمیان جو متحرک روشنیاں نظر آئی تھیں، ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں حکم کے گارڈز اور سپاہیوں کو کافی بڑی کمک مل گئی ہے۔ ایک طرف آفتاب کہہ رہا تھا کہ اس کا مطالبہ مانا جانے والا ہے اور بہت جلد ماریا کے بدلے میں ہاشم رازی کو رہا کر کے یہاں پہنچایا جانے والا ہے..... جبکہ دوسری طرف اسپتال کا گھیرا مضبوط تر کیا جا رہا تھا۔ حالات تیزی سے پینترے بدل رہے تھے۔ سلطانہ سے بات کرنے کے بعد میں بالکل گم صم ہو گیا تھا۔ رگ و پے میں تاریکی سی اتر گئی تھی۔ سلطانہ وہ ہستی تھی جس نے مجھے نئے سرے سے جینا سکھایا تھا۔ ثروت کے بے پناہ غم کو بھلانے میں اس کی سحر انگیز شخصیت نے میری بہت مدد کی تھی۔ وہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ نڈر، بے دھڑک اور اپنے پیاروں پر اپنا سب کچھ لٹا دینے والی۔ وہ جب میرے پاس ہوتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا مرکز و محور بس میں ہی ہوں۔ لیکن یہ غلط نکلا تھا۔ ایک بہت بڑا بھرم ٹوٹا تھا اور اس کے ٹوٹنے نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔

''کوئی آرہا ہے۔'' عمران کی سرگوشی نے مجھے ایک دم خیالوں سے چونکا دیا۔

میں نے کان لگا کر سنا۔ گنے کے پودوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ یہ سرسراہٹ پچیس تیس قدم دور تھی تاہم اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ گہری تاریکی میں ہم کچھ دیکھنے کے قابل تو نہیں تھے لیکن اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ یہ ایک سے زیادہ افراد ہیں۔ عمران نے رائفل کو تیار حالت میں کر لیا۔ میں بھی چوکس ہو گیا۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟ اگر کوئی دیہاتی اپنی ''حاجت روائی'' کے لیے آیا ہوتا تو اکیلا ہوتا.....

ہم دم سادھ کر بیٹھے رہے اور سرسراہٹ کا اتار چڑھاؤ سنتے رہے۔ آنے والوں کی خوش قسمتی یا بدقسمتی انہیں ہمارے بالکل قریب لا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب کسی بھی لمحے وہ ہمارے سامنے ہوں گے..... لیکن پھر اچانک ہم سے صرف چھ سات میٹر کے فاصلے پر سرسراہٹ رک گئی۔ ایک باریک ذری ذری نسوانی آواز ابھری۔ ''کیا ہوا جی؟''

''بس یہیں بیٹھ جاوت ہیں۔'' ایک مردانہ آواز نے جواب دیا۔

ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی لڑکی لڑکا ہیں۔ پودوں کے درمیان سے ہمیں ان کے موہوم سے ہیولے بھی دکھائی دیے۔ لڑکا شاید بیٹھنے لگا تھا مگر نوجوان لڑکی نے جلدی سے کہا۔ ''ناہیں جی..... آپ کے کپڑے خراب ہوویں گے۔ میں اپنی چادر بچھا دیت ہوں۔''

نوجوان لڑکا منع کرتا رہا مگر لڑکی نے ہموار جگہ پر اپنی اوڑھنی بچھا دی۔ پھر نوجوان غالباً بیٹھ گیا مگر لڑکی کھڑی رہی۔

''بیٹھو نا تم بھی۔'' نوجوان نے کہا۔

''نن..... ناہیں جی..... آپ کھتری ہیں، میں شودر..... میں آپ کے برابر بیٹھوں گی تو مجھ کو پاپ لگے گا۔''

''ناہیں..... کچھ ناہیں ہوگا۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں..... بیٹھ جاؤ۔'' پھر شاید نوجوان نے لڑکی کو کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہم سے اتنے قریب تھے کہ اگر ہم حرکت کرتے یا اونچی سانس بھی لیتے تو شاید انہیں شک ہو جاتا۔

لڑکی سنگین آواز میں بولی۔ ''باپو کہوت ہیں کہ ہم لوگن کا سایہ بھی آپ پر ناہیں پڑنا چاہیے۔ آپ کی پوترا بھرشٹ ہو جاوت ہے۔''

''لیکن یہ تو کالی رات ہے چمپی! اس میں تو سایہ ہوتا ہی ناہیں۔ اور ویسے بھی میں تم سے کہوت ہوں کہ یہ ساری بیکار کی باتیں ہیں۔ بھگوان نے سب کو ایک جیسا بنایا ہے۔ یہ ذات پات، یہ اونچ نیچ کی سیڑھیاں، یہ سڑی ہوئی رسمیں، یہ سب کچھ تو ہمارا بنایا ہوا ہے۔''

''ناہیں جی! باپو کہوت ہیں ایشور نے سب کو ایک جیسا ناہیں بنایا۔ کوئی آپ کی طرح عقل مند اور شکتی والا ہے، کوئی ہماری طرح کم عقل اور کم جور ہے۔ کوئی پیسے والا ہے، کوئی گریب، کوئی گورا، کوئی کالا، کوئی مالک کوئی چاکر..... اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سنسار ہی ناہیں چل سکتا تھا۔''

''سارے پرانے لوگن کی طرح تمہارے باپو کے دماغ میں بھی بھس بھرا ہوا ہے چمپی! یہ نیا دور ہے۔ کبھی کسی بڑے شہر میں جا کر دیکھو۔ چھوٹی سے چھوٹی جاتی کے لوگن بھی پڑھ لکھ کر بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ بڑی جاتیوں کے ناکارہ لوگن ان کی نوکری کرنے پر مجبور ہو جاوت ہیں۔ ہمارے دھرمی بھائیوں نے دھرم کو توڑ موڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب دیکھو یہ جو کچھ ہمارے گاؤں میں ہو رہا ہے اس کا کارن بھی تو یہی ظلم اور انیائے ہے نا۔ حکم جی ان سفید چمڑی والوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ پھر ان مسلمانوں میں سے کچھ سر پھرے خون خرابا شروع کر دیوت ہیں۔''

''چھوٹے مالک! مجھ کو تو بڑا ڈر لگت ہے۔ میری دیدی کا دیور بھی اسپتال کے اندر ہے۔ دیدی کی سانس اوپر سسر تلے سے رو رہے ہیں۔ کچھ لوگن اب کہوت ہیں کہ فوجی کبھی بھی اندر والوں کی بات ناہیں مانیں گے۔ وہ ایک دم اندر گھس جاویں گے اور پھر بہت خون خرابا ہو جاوے گا.....''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر نوجوان کی آواز ابھری۔ ''چلو چمپی! چھوڑو ان باتوں کو۔ ابھی تو سب اندازے ہی ہیں۔ جو کچھ ہوگا، سامنے آجاوے گا۔ تمہیں ٹھنڈ تو ناہیں لگ رہی؟''

''ناہیں جی۔''

''پر تمہارے گال تو ٹھنڈے ہیں۔''

''ہائے رام..... ایسا نہ کرو مالک۔ آپ کو پاپ لگے گا۔''

''تمہیں چھونے سے مجھے پاپ لگے گا؟'' وہ مسکراتی آواز میں بولا۔

''تو اور کیا مالک! آپ پلید ہو جائیں گے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''تو تمہیں چھوؤں گا ناہیں تو پریم کیسے کروں گا؟''

''مم..... مجھے بہت ڈر لگت ہے جی۔ آپ..... مجھے کپڑوں کے اوپر سے ہاتھ لگا لیں۔''

''چلو کہیں کہیں ایسا بھی کر لیں گے لیکن پاس تو آؤ نا۔'' پھر شاید اس نے چمپی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لوگن کو پتا لگ گیا تو میری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ پر آپ کے چرن چھوتی ہوں، مجھے شما کر دیں۔''

''دیکھو، غلطی میں کر رہا ہوں اور شما تم مانگ رہی ہو۔ اس کو کہوت ہیں الٹی گنگا..... ویسے میں نے ایک دن پنڈت جی سے پوچھا تھا۔ وہ کہوت تھے کہ اگر نیچی ذات کی ناری اونچی ذات کے مرد کو سیوا (خدمت) کی نیت سے چھووے گی اور ناری صاف ستھری بھی ہووے گی تو پھر پاپ ناہیں لگے گا۔ تم یہ سمجھو کہ تم سیوا کر رہی ہو۔''

''لل..... لیکن..... مالک.....'' پھر شاید نوجوان نے لڑکی کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔

وہ دونوں اب زمین پر بچھی چادر پر لیٹ گئے تھے۔ ان کی ہانپتی ہوئی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ منمنائی۔ ''آپ ایسا نہ کریں۔ آپ کو صبح اپنے پتا کے ساتھ مندر جانا ہے۔ میرے انگ سے لگ کر آپ پلید ہو رہے ہیں۔''

''یہ کوئی پلیدی ناہیں ہے۔ میں اشنان کرا لوں گا۔''

''بڑے پجاری جی کہوت ہیں، ایسی پلیدی اشنان سے دور ناہیں ہوتی۔''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں بڑے پجاری کو بھی۔ چار سال پہلے جھنگن کی بیٹی کو جو جڑواں بچے ہوئے تھے اور مر گئے تھے، وہ اسی پجاری کے تھے.....''

''ہائے رام! آپ کیسی باتیں کرت ہیں؟'' اچھوت لڑکی لرز کر بولی۔

کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں الجھے رہے پھر لڑکی خود کو اپنے پریمی کی بانہوں سے جدا کرنے میں کامیاب ہو گئی..... ''بس مالک! اب مجھ کو جانے دو۔ کچھ دیر میں پو پھٹ جاوے گی پھر میرا جانا مشکل ہو جاوے گا۔''

دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نوجوان اسے چوم کر بولا۔ ''مجھ سے پریم کرتی ہو نا؟''

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر دبی آواز میں بولی۔ ''بہت زیادہ..... لیکن اس پریم کا انت کیا ہووے گا؟''

''میں تم سے بیاہ کروں گا۔''

''یہ کیسے ہو سکت ہے جی؟ میں آپ کی باندی تو بن سکت ہوں، پتنی ناہیں۔''

''میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔ ہم دونوں نل باڑی چلے جاویں گے۔ وہاں ڈنکے کی چوٹ پر بیاہ کریں گے۔''

وہ دو چار منٹ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ پھر لڑکی نے اوڑھنی جھاڑ کر اپنے سر پر لی اور کھیت سے نکل کر چلی گئی۔ نوجوان وہیں رکا رہا۔ وہ شاید لڑکی کے ساتھ ہی کھیت سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہیولا نظر آیا لیکن وہ واپس جانے کے بجائے تھوڑا سا آگے آیا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنے لیے کوئی اچھا گنا منتخب کرنا چاہ رہا ہو یا پھر شاید وہ ویسے ہی نظر دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً اسے ہماری موجودگی کے بارے میں شک ہو گیا۔ وہ ذرا ٹھٹکا پھر اس نے تیزی سے اپنی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ قمیص کے نیچے سے اپنا دیسی ساخت کا ریوالور نکالنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''کون ہے؟''

عمران تڑپ کر اس پر جا پڑا۔ اس نے پھرتی سے پیچھے

بچنے کی کوشش کی مگر وہ تین چار گنا زیادہ پھرتیلا نہیں ہوتا تو شاید عمران سے بچ نہ سکتا۔ وہ عمران کے نیچے عین اس جگہ پر گرا جہاں کچھ دیر پہلے وہ چچی کے ساتھ موجود تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے چچی اس کے نیچے تھی، اب وہ خود کسی کے نیچے تھا۔ عمران نے دائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبایا اور بائیں ہاتھ سے اس کی وہ کلائی پکڑ لی جو قمیص کے نیچے تھی۔ اس نے نیچے پڑے پڑے عمران پر مکا چلایا جو خالی گیا۔ عمران نے جواباً اس کی ناف میں گھٹنا رسید کیا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ عمران نے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا اور اسے سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جدوجہد فضول ہے۔ عمران نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا۔ ماچس کی تیلی روشن کر کے ہم نے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا گورا چٹا نوجوان تھا۔ اس نے مقامی انداز کی سفید دھوتی قمیص پہن رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تراشی ہوئی مونچھیں تھیں۔ حلیے سے کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا تھا۔ ''یہ کون سی فلم کا سین ہو رہا تھا یہاں؟'' عمران نے اس کی گردن میں ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

''مم..... میں تو پیشاب کرنے آیا تھا۔''

''پیشاب کرتے ہوئے تم باتیں بہت کرتے ہو..... ہم سب کچھ سن رہے تھے۔'' عمران نے جواب دیا۔

وہ بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں اس نے سب کچھ مان لیا۔ اس نے اپنا نام بھرت کمار بتایا۔ وہ گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار کا بیٹا تھا۔ اچھی یہاں اس کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ ان کی حویلی کے ایک غریب نوکر کی بیٹی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے سچا پریم کرتا ہے اور اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔

بھرت نامی اس نوجوان کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ ہم دونوں کی یہاں موجودگی پر بھی حیران تھا۔ میں اور عمران اس سے مقامی دیہاتیوں کے انداز میں ہی بات کرتے رہے لیکن وہ ہمارے اس انداز سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ غالباً اسے شبہ تھا کہ ہمارا تعلق نل پانی سے یا پھر حکم کے دیگر مخالف لوگوں سے ہے اور ہم یہاں ''اتھرا'' گاؤں میں ہونے والے واقعات کی ٹوہ لے رہے ہیں۔

بھرت نامی اس نوجوان سے ہمیں تازہ ترین صورتِ حال معلوم ہوئی اور یہ تشویش ناک تھی۔ اس نے بتایا کہ اسپتال کی عمارت کے اندر جن حملہ آوروں نے لوگوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے، ان میں مختار راجپوت کی خطرناک بیٹی سلطانہ بھی شامل ہے۔

ہمارا بدترین اندیشہ درست ثابت ہو گیا تھا کہ بہت جلد ان لوگوں کو یہاں سلطانہ کی موجودگی کا علم ہو جاتا ہے۔ اس انکشاف کی تفصیل بتاتے ہوئے بھرت نے کہا۔ ''حکم جی کے لوگن پہلے ہی سلطانہ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ شاید آپ کو بھی پتا ہووے گا کہ کچھ مہینے پہلے سلطانہ نے زرگاں میں گھس کر چار اہم ہندوں کو جان سے مار دیا تھا۔ ان میں موہن کمار بھی تھا جسے یہاں اوتار کا درجہ دیا جاتا تھا۔ لیکن اب پتا چلا ہے کہ یہ سلطانہ کسی خطرناک گروہ میں بھی شامل ہے۔ کل یہ ایک زہریلا لفافہ لے کر پونم پور کے مندر میں گھسی تھی۔ وہاں یہ لفافہ اس نے کسی ایسی عورت کو دینا تھا جو اسے پرشاد کے حلوے میں ملا سکے..... تلاشی میں لفافے کا پتا چل گیا اور سلطانہ دو ہندوں کو گھائل کر کے وہاں سے بھاگ نکلی۔ اب سوال یہ تھا کہ سلطانہ زہر والا لفافہ کس کو دینا چاہتی تھی۔ مندر والوں کو تین عورتوں پر شک تھا۔ ان تین عورتوں کو باری باری ٹیکا لگایا گیا اور ان میں سے ایک نے اپنا اپرادھ قبول کر لیا۔''

''ٹیکا لگایا گیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہی درد والا ٹیکا جو حکم کے سپاہی لگاتے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے، وہ چار منٹ میں پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔''

میں اور عمران سمجھ گئے کہ بھرت اسی منحوس انجکشن کی بات کر رہا ہے جو دو ڈھائی ماہ پہلے ہم نے میڈم صنوبرا کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ مقامی لوگوں میں اس انجکشن کے حوالے سے بڑا ہراس پایا جاتا تھا۔ بھرت نے روانی میں اپنی بات جاری رکھی اور بتایا کہ جرم کا اعتراف کرنے والی ایک شوبھا نام کی عورت ہے لیکن اس کا اصل نام گلزار معلوم ہوا ہے۔ یہ ٹانگوں سے معذور ہے اور مندر کے اندر ہی رہتی ہے۔ اس نے مانا ہے کہ وہ مسلمان ہے اور مختار راجپوت کی بیٹی سلطانہ، اسی کو زہر کا پیکٹ دینے کے لیے مندر میں گھسی تھی۔

بھرت کے اس انکشاف کے بعد کہ سلطانہ کو پہچانا جا چکا ہے، یہ بات بھی ہماری سمجھ میں آ گئی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں فوجیوں کی مزید کمک کیوں آئی ہے اور گھیرے کو مضبوط کیوں کر دیا گیا ہے۔ اب یہ زبردست تناؤ والا معاملہ بن چکا تھا۔ ایک طرف ماریا کی زندگی تھی اور دوسری طرف سلطانہ کو چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کا معاملہ تھا۔

بھرت نامی اس کھتری نوجوان نے بتایا۔ ''رات گیارہ بجے کے قریب ہی یہ خبر ہر طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ اسپتال کے اندر حملہ آوروں میں جو لڑکی ہے، وہ مختار راجپوت کی بیٹی ہے۔ اب علاقے کے ہندوؤں..... میں بہت جوش پایا جاتا ہے۔ وہ کہوت ہیں کہ مختار کی بیٹی کو کسی صورت بھی نل پانی کی طرف جانے کی آگیا نہیں دینی چاہیے۔ اسے یہیں پکڑ لینا چاہیے اور اس کو اس کے کرموں کی سزا ملنی چاہیے۔ لیکن کچھ لوگن یہ بھی کہوت ہیں کہ ایسا نا ہیں ہو سکے گا۔ حکم جی انگریزوں کی مرضی کے خلاف نا ہیں چل سکتا اور انگریز بالکل بھی نا ہیں چاہیں گے کہ سلطانہ کو مار دینے کے چکر میں اسٹیل گورا صاحب کی بیٹی ماریا بھی ماری جاوے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا اپنا کیا خیال ہے..... کیا ہونا چاہیے؟''

وہ سادگی سے بولا۔ ''میں نئی نسل کے ان لوگن میں سے ہوں جو دھرم کے کٹرپن کو اچھا نا ہیں سمجھتے۔ اگر سلطانہ نے زرگاں میں چار لوگن کو مار کر اپرادھ کیا تو حکم اور جارج نے بھی دھرم کی آڑ میں سلطانہ کو پری بنانے اور رکھیل بنانے کی کوشش کر کے اپرادھ کیا تھا۔ سب کو پتا ہے کہ اب تک ساتویں کے جشن کے نام پر راجواڑے کی سیکڑوں لڑکیاں ''پری'' بن کر عزت گنوا چکی ہیں۔ حکم اور اس کے غیر ملکی دوست ان پریوں کو نوچ کر انہیں ہمیشہ کے لیے راج بھون کی غلام گردشوں اور تہ خانوں میں سسکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ دکھ سہہ سہہ کر مر جاوت ہیں اور کچھ پرانی ہو کر نچلے درجے کے عہدیداروں کا کھلونا بن جاوت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر سلطانہ نے اس انجام سے بچنے کی کوشش کی تو کچھ غلط نا ہیں کیا۔ اگر اس کے اس اپرادھ کے کارن کچھ لوگن اسے زندہ جلانا چاہت ہیں تو وہ خود بہت بڑے اپرادھی ہیں۔''

آدھ پون گھنٹے کی گفتگو میں ہمیں یقین ہو گیا کہ بھرت نامی یہ نوجوان، نئی پیڑھی کے ان لوگوں میں سے ہے جو دھرم کرم کی ناک بہانے والے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ دقیانوسیت اور توہم پرستی سے پیدا ہونے والی تمام خرافات کو دل سے برا جانتے ہیں۔ یہ نوجوان ہمیں اپنے لیے بالکل بے ضرر محسوس ہو رہا تھا۔

بھرت ہمیں مسلسل کھوجنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''دیکھیں، میں نے آپ کو اپنے بارے میں ساری جانکاری دے دی ہے لیکن آپ نے ابھی تلک کچھ نا ہیں بتایا۔ مم..... میرا مطلب ہے کہ آپ ہیں کون؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم کون ہیں؟'' میں نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔

وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کھیت مزدور نا ہیں ہو اور نہ ہی آپ کا تعلق اس علاقے سے ہے۔ شش..... شاید آپ نل پانی سے آئے ہیں..... اور..... کسی خاص کام سے یہاں پر ہیں۔''

''کس قسم کا خاص کام؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''کہیں آپ کا تعلق چھوٹے سرکار کے سپاہیوں سے تو نا ہیں؟ میرا مطلب ہے، کچھ لوگن خفیہ جانکاریاں لینے کے لیے بھی تو نل پانی سے یہاں آوت ہیں۔''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری پہلی بات تو درست ہے کہ ہمارا تعلق نل پانی سے ہے لیکن اگر تم ہمیں جاسوس وغیرہ سمجھ رہے ہو تو یہ غلط ہے۔ تمہاری طرح ہم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو اس خون خرابے کو برا سمجھتے ہیں۔ ہمیں کل دوپہر یہ اڑتی اڑتی سی خبر ملی تھی کہ ''پونم پور'' کے مندر میں کوئی ہنگامہ ہوا ہے اور ایک عورت نے چھری چلا کر دو تین ہندوں کو زخمی کر دیا ہے۔ ہم اسی بارے میں جاننے کے لیے اس علاقے میں آئے تھے کہ یہاں اس گاؤں میں بھی ہنگامے کا پتا چلا۔''

بھرت نے کہا۔ ''بھائی صاحب! یہ سارا علاقہ بڑا شانتی والا تھا۔ کوئی ہلچل نا ہیں تھی کیونکہ یہ نل پانی سے دور ہے اور زرگاں سے بھی۔ یہاں کسی کا بھی زیادہ اثر رسوخ نا ہیں ہے لیکن زرگاں چونکہ ذرا کم دور ہے، اس لیے حکم کے سپاہی یہاں نظر آتے رہوت ہیں۔ گڑبڑ اس وقت سے ہوئی ہے جب سے زرگاں میں سا سبز والا مقابلہ ہوا ہے۔ آپ لوگن کو بھی پتا ہووے گا، اس مقابلے کی گونج پورے راجواڑے میں سنائی دی ہے..... سلطانہ کے پاکستانی پتی سے جارج گورا کے ہارنے اور پھر مارے جانے کی اطلاع نے سب کو ہکا بکا کر ڈالا ہے۔ اب کچھ لوگن کا کہنا ہے کہ سلطانہ کا پتی اور اس کا پاکستانی ساتھی جیت تو گئے تھے مگر حکم جی وغیرہ انہیں چھوڑنا نا ہیں چاہت تھے۔ صرف دھرم کی مانگ پوری کرنے کے لیے انہیں عارضی طور پر چھوڑا گیا تھا..... انہوں نے اس عارضی چھوٹ کا زبردست فائدہ اٹھایا اور چکما دے کر نکل بھاگے۔ اب زیادہ لوگن کا خیال یہی ہے کہ وہ ابھی نل پانی واپس نا ہیں پہنچے اور اسی علاقے میں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ جیپ سوار فوجی ان کی تلاش میں بھاگ دوڑ کرتے رہوت ہیں۔ اب یہ دوسرا واقعہ مختار راجپوت کی بیٹی والا ہو گیا ہے۔ خون خرابا ہوا ہے اور ابھی لوگن کو اور زیادہ خون خرابے کی بو آ رہی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''بھرت! تمہاری کیا رائے

ہے..... اس معاملے کا انجام کیا ہونا چاہیے؟'' اب میں اور عمران پہلے کی طرح بھرت سے مقامی لہجے میں بات نہیں کر رہے تھے۔

بھرت نے بے تکلفی سے عمران کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر اس کے دو کش لیے اور پھر پُرسوچ نظروں سے گاؤں کی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے مدھم خدوخال دیکھ سکتے تھے۔ اوس سے بھیگے ہوئے کھیت میں خنکی بہت بڑھ چکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد بھرت نے کہا۔ ''میری تو بھگوان، اللہ اور واہگرو سے یہی پرارتھنا ہے کہ یہ معاملہ شانتی سے حل ہو جاوے۔ سلطانہ اور میم (ماریا) دونوں کا جیون بچ جاوے۔ حملہ آور جو بندہ مانگ رہے ہیں، انہیں دے دیا جاوے، اس طرح میم بھی مرنے سے بچ جاوے گی اور سلطانہ بھی زندہ سلامت یہاں سے نکل جاوے گی۔ پر پتا نا ہیں کیوں لگت ہے کہ کچھ لوگن ایسا نا ہیں ہونے دیویں گے۔ وہ چاہت ہیں کہ ایسا نہ ہو۔''

''وہ لوگ کون ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہ علاقے کے اردگرد کے کچھ لوگن ہی ہیں۔ اس کے چند فوجی افسر، کچھ مذہبی سوچ رکھنے والے رشتے دار، پنڈت مہاراج اور اس کے کچھ ساتھی۔۔۔۔ اور ایک بڑی کڑک بڑھیا بھی۔''

بڑھیا کے ذکر پر میں اور عمران چونکے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا دھیان سیدھا مالا کی دادی ساس پر گیا۔ ''تم کس بڑھیا کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے بھرت سے پوچھا۔

''ہے ایک ..... اس نے آج کل بڑا اودھم مچایا ہوا ہے زرگاں میں۔ بے شمار بے وقوف اس کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ پتا نا ہیں اسے کس کس دیوی کا نیا روپ قرار دے رہے ہیں۔ زرگاں میں اس بڑھیا کی ضد تھی کہ سلطانہ کے پاکستانی پتی کو جارج گورے سے مقابلے کی آگیا نہ دی جاوے بلکہ اس سے ایک بڑے اپرادھی کا سلوک ہو اور اس کو مار پیٹ کر اس سے اس کی اپرادھن پتنی کا پتا ٹھکانا پوچھا جاوے۔ لیکن پنڈتوں نے کہا کہ سلطانہ کا پتی چونکہ جارج گورے کو مقابلے کی دعوت دے چکا ہے، اس لیے اسے قید میں نا ہیں رکھا جا سکتا۔ تقریباً سارے پنڈتوں کا خیال یہ تھا کہ سلطانہ کا پتی سامبر مقابلہ ہار جاوے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی پتنی کا کھوج دینے پر بھی مجبور ہو جاوے گا لیکن ہو گیا، اس کے الٹ۔ اس پر اس بڑھیا نے زبردست واویلا مچایا تھا اور مرن بھرت رکھ لیا تھا۔ اس مرن بھرت میں بھوک پیاس کی وجہ سے یہ بڑھیا دم بلب ہو گئی۔ لوگن نے سمجھا کہ یہ بھگوان کو پیاری ہو گئی ہے۔ انہوں نے مشتعل ہو کر خوفناک ہنگامہ کر دیا۔ اس ہنگامے میں تقریباً تین نردوش مسلمان زندہ جل گئے لیکن بعد میں اسپتال جا کر پتا چلا کہ فساد کی جڑ ابھی جوں کی توں موجود ہے۔ بڑھیا زندہ تھی۔ لوگن نے اس کو بھی چمتکار قرار دیا۔ اس کو چاندی میں تولا گیا اور اب اسے ''بڑی ماتا'' کا خطاب دے دیا گیا ہے۔ زرگاں کے ہزاروں لوگن اسے کسی سوامی کی سی عزت دے رہے ہیں۔ یہ ہے ہم لوگن کی سمجھ بوجھ۔''

''یہ بڑی ماتا اب کیا فرماتی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس کی بس ایک ہی ہٹ ہے۔ کہتی ہے کہ میں نے مختار راجپوت کی لونڈیا کو سزا دلوانے کے لیے اپنا پورا پریوار قربان کر دیا ہے۔ اس کو سزا ضرور ملنی چاہیے۔ نہ ملے گی تو زرگاں پر تباہی اور بربادی آوے گی۔ یہاں کی گلیوں میں لوگن کی لاشوں پر کتے بلیاں منہ ماریں گے۔ بس اسی طرح کی پیش گوئیاں کرت ہے۔ یہ بڑی کٹر اور خرانٹ بڑھیا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانت ہوں۔ اس کی ایک قریبی رشتے دار ہمارے ہی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ وہ آج کل بھی یہاں ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بڑھیا کی پوتی کی بہو۔ مالا نام ہے اس لڑکی کا۔ تھوڑا پڑھی لکھی بھی ہے۔ اچھے برے کی سمجھ بوجھ رکھتی ہے لیکن اس کی قسمت کہ بیاہ کر سخت کٹر گھرانے میں چلی گئی۔''

مالا کے نام نے مجھے اور عمران کو چونکایا۔ وہ اجلے چہرے والی روشن خیال لڑکی جو اپنے کٹر سسرالی گھرانے سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ جب فتح پور کے پرانے مندر میں بڑھیا کا ادھیڑ عمر بیٹا آزمائش میں ناکام ہوا اور اس کے دونوں ہاتھ تیل میں جھلس گئے تو وہاں زبردست ہنگامہ ہوا تھا۔ اس ہنگامے کے بعد سے مالا اور اس کا شوہر ستیش غائب تھے۔ آج اتنے دنوں بعد مالا کے بارے میں کوئی خبر ملی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم بھرت نامی اس نوجوان سے مالا کے بارے میں کچھ اور پوچھتے، ایک بار پھر اسپتال میں سیون ایم ایم رائفل گرجی اور اس کے ساتھ ہی گاؤں میں ہلچل نظر آئی.....

اب رات کا اندھیرا کافی حد تک اجالے میں ڈھل چکا تھا۔ اردگرد کے سارے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ فائر کے فوراً بعد اسپتال کے اردگرد موجود

سپاہیوں اور گارڈز نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں لگا کہ یہ لوگ اسپتال پر ہلا بول دیں گے اور سب کچھ ختم ہو جائے گا مگر پھر ایک ہم قدرے ٹھہراؤ محسوس ہوا۔ ہم نے دو تین انگلش فوجی افسران کو دیکھا۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور مقامی فوجیوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ ان کے حکم پر مقامی فوجی اور گارڈز وغیرہ رک گئے۔ نہ صرف رک گئے بلکہ تھوڑا پیچھے بھی ہٹ گئے۔ کچھ دیر بعد پھر وہی منظر دہرایا گیا جو ہم اس سے پہلے دوبارہ دیکھ چکے تھے۔ عورتوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ چار پانچ افراد ایک چارپائی لے کر احاطے میں گئے اور ایک لاش اٹھا کر باہر لے آئے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ سرپھرے آفتاب خاں نے اپنی خوفناک دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایک اور یرغمالی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

”کہیں ڈاکٹر لی وان ہی نہ ہو۔“ عمران نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

”لیکن جس طرح مقامی عورتیں رو پیٹ رہی ہیں، شاید کوئی مقامی ہی مرا ہے۔“ میں نے کہا۔

میں نے بھرت کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظر کا انداز سمجھ کر بولا۔ ”اگر آپ کہو تو میں جا کر ٹھیک جانکاری لے آتا ہوں؟“

میری اور عمران کی نگاہیں ملیں۔ یقیناً ہم دونوں ہی بھرت کو بھروسے کے قابل سمجھ رہے تھے۔ وہ ہمیں اپنا ہم خیال لگ رہا تھا اور یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ ہمارے اور اس کے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی اور پھر ہم نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ عمران نے اس کا دیسی ریوالور بھی واپس کر دیا۔

اب اجالا پھیل گیا تھا۔ قرب و جوار کی ہر شے روشن تر تھی۔ گاؤں کی گلیوں میں بہت سی جیپیں اور فوجی گھڑسوار نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اسپتال کے گرد مختلف جگہوں پر پوزیشنیں بھی لی ہوئی تھیں۔ عام لوگوں کو اسپتال کی عمارت سے بہت دور ہٹا کر راستوں کی ناکا بندی کر دی گئی تھی۔ اسپتال کے اردگرد کے تمام مکانات خالی کرا لیے گئے تھے۔ ان گھروں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں دوربینوں کے شیشے چمک رہے تھے اور رائفلوں کے بیرل صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ سلطانہ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے بہت دور چلی گئی ہے۔ میں اب اسے کبھی اپنے سامنے زندہ سلامت نہیں دیکھ سکوں گا..... میرا وہ سپنا اب کبھی پورا نہیں ہوگا جس میں ایک خوش رنگ شام کو میں اور سلطانہ اکٹھے ہوتے اور سلطانہ کی بانہوں میں ہنستا مسکراتا بالو ہوتا۔

”وہ دیکھو تابی!“ عمران نے دور ایک طرف سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کیا ہے؟“

”میرے خیال میں گاؤں کا شمشان گھاٹ ہے۔ کوئی لاش جلائی جا رہی ہے۔“

شمشان گھاٹ سے اٹھتے ہوئے ارتھی کے دھوئیں نے ماحول کو کچھ اور بھی گمبھیر کر دیا۔ اسپتال سے کچھ فاصلے پر تازہ لاش کے گرد بین کرتی عورتوں کی دل خراش آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہوا کے دوش پر یہ آوازیں کبھی بلند اور کبھی دھیمی محسوس ہوتی تھیں۔

ہم نے کافی دیر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ جو آخری چیز ہم نے لی، وہ بے مزہ سی چائے کا ایک کپ تھا۔ یہ کپ ہم نے تب پیا تھا جب آفتاب خاں سائیکل مرمت کی دکان پر سائیکل ٹھیک کروا رہا تھا اور سلطانہ مندر میں جا چکی تھی۔ ہم نے چائے خانے میں بیٹھ کر آفتاب پر نگاہ رکھی تھی۔ ان واقعات کو اب چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ بہرحال، بھوک کی جتنی شدت محسوس ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی بڑی وجہ موجودہ تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ یہ اور بات ہے کہ خالی پیٹ ہونے کے سبب ایک نقاہت سی رگ و پے میں اتری ہوئی تھی۔

بھرت کے جانے کے بعد ہم تناؤ محسوس کرنے لگے۔ بار بار ذہن میں خیال آ رہا تھا کہ کہیں ہمارا بھروسا غلط تو نہیں۔ اس نے آدھ پون گھنٹے میں آنے کا کہا تھا مگر اب ڈیڑھ گھنٹا ہو چلا تھا۔ اس کی واپسی کے آثار کہیں نہیں تھے۔ میں نے کہا۔ ”اگر یہ بھرت اکیلا آنے کے بجائے میں پچیس مسلح سپاہیوں کو ساتھ لے آیا تو پھر؟“

”پھر میں تمہیں یرغمال بنا لوں گا اور کہوں گا کہ اگر ان میں سے کوئی آگے آیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“ وہ بولا۔

”تو پھر کیا ہوگا؟ وہ کہیں گے کر دو شوٹ۔ تمہارا ہی ساتھی ہے۔“

”میں انہیں ساری حقیقت بتاؤں گا جگر! انہیں بتاؤں گا کہ اپنے اس ساتھی کے قیمتی مشوروں کی وجہ سے ان لوگوں کا کتنا فائدہ ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ نالائق دوست سے عقل مند دشمن کے بہتر ہونے والا مقولہ حکم کے سپاہیوں نے بھی سن رکھا ہوگا۔“

”میں نے کون سا بے عقلی کا مشورہ دیا ہے تمہیں؟“

”بہت سے ہیں۔ تازہ ترین مثال تو یہی ہے کہ تم نے گنے کے کھیت میں گھسنے کا مشورہ دیا جبکہ میں مکئی کے کھیت میں گھسنا چاہتا تھا۔ مکئی کا کھیت ہوتا تو ہم بھوک سے یوں تو نہ بلکتے ..... دو چار بھٹے توڑتے اور بھون کر کھا لیتے۔“

”بھٹے بھوننے کے لیے آگ درکار ہوتی ہے۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”آہ .....“ اس نے لمبی آہ بھری۔ ”آگ کی بات بھی تم نے خوب کہی ہے۔ آگ تو عاشق کے دل کے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔ وہ سنا نہیں تم نے ..... خدا بند یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں ..... میں نے تم سے ریما جی کا ذکر کیا تھا نا۔ انہوں نے سینے میں ایسی آگ بھڑکا دی ہے کہ دو چار بھٹے تو کیا دو چار بکرے بھی روسٹ ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ یہ یک طرفہ معاملہ ہے۔ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔ تمہیں بتایا تھا نا کہ شوٹنگ میں موٹر سائیکل کا کرتب دکھاتے ہوئے میں اور ریما جی گر گئے تھے۔ بس اسی وقت سے یہ محبت شروع ہو گئی ..... بلکہ میرے خیال میں موٹر سائیکل بعد میں گری، محبت پہلے شروع ہو گئی تھی ..... اب تم پوچھو گے کہ اگر آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے تو پھر شادی میں اڑچن کیا ہے۔ پوچھو گے نا؟“

”نہیں پوچھوں گا۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”بڑے شرارتی ہو ..... اصل میں اڑچن یہ ہے کہ ریما جی شادی کے بعد بھی فلموں میں کام کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے یہ منظور نہیں کہ وہ شان اور معمر رانا جیسے گرم اور خطرناک ہیروز کے ساتھ ہیروئن آئیں۔ اس کا جواب وہ یہ دیتی ہیں کہ ان کی خاطر میں خود بھی فلم لائن میں آ جاؤں۔ انہیں پتا ہے کہ میں بنا بنایا ہیرو ہوں، فوراً ہٹ ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ صرف ان فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائیں گی جن میں، میں ہیرو ہوں گا۔ اب یہاں پھر ایک مسئلہ ہے۔ میں اداکاری کر کر کے تنگ آ چکا ہوں بلکہ مجھے اس شعبے سے چڑ سی ہو گئی ہے۔ اب یقیناً تم پوچھو گے کہ میں نے کہاں اداکاری کی ہے..... پوچھو گے نا؟“

”فرماؤ ..... کہاں کی ہے؟“

”یہ بالکل بیکار سوال ہے اور اسی لیے تم نے کیا ہے۔ میرے بھائی! یہ نیوز کاسٹر اور اینکر پرسن ہونا اداکاری ہی تو ہے۔ خاص طور سے نیوز کاسٹری تو اداکاری کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں اداکاری کا جتنا مارجن ہے، وہ ویسا اور کچھ اور فلموں میں بھی نہیں ہے۔ تم دیکھنا عنقریب نانا پاٹیکر اور نصیر الدین شاہ جیسے لوگ خبریں پڑھا کریں گے .....“

اس کی طولانی گفتگو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچتی مگر اسی دوران میں ہمیں دور سے بھرت کمار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہمارے اندیشے درست ثابت نہیں ہوئے تھے..... کھیتوں کے قریب پہنچ کر بھرت نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی بھی تھی۔ دو منٹ بعد وہ کماد کے نہایت گھنے اور بلند کھیت کے اندر ہمارے سامنے تھا۔

”بڑی دیر لگا دی۔“ عمران نے کہا۔

”شما چاہتا ہوں۔ میں پہلے گھر چلا گیا تھا۔ اصل میں مجھے لگ رہا تھا کہ آپ دونوں کو بھوک لگی ہووے گی۔ یہ کچھ بھوجن لایا ہوں آپ کے لیے۔“ اس نے پوٹلی کھولی۔ اس میں مکھن، روٹی سالن اور ایک بوتل میں چھاچھ تھی۔

”اس کے لیے بہت شکریہ۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے ہمیں گاؤں کی خبر دو۔ گولی کس کو ماری گئی ہے؟“

بھرت بولا۔ ”ڈاکٹر لی وان کے بارے میں آپ کا اندازہ غلط تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسپتال کی دوسری نرس مالتی کو مار دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں مالتی کا چناؤ اس لیے ہوا ہے کہ اس نے بال تراشے ہوئے تھے، انگریزی بھی بول لیتی تھی اور کھلے ڈلے انداز میں بات کرتی تھی۔ یہ ذرگاؤں سے یہاں آئی ہوئی تھی۔“

یہ افسوس ناک صورتِ حال تھی۔ ہم نے کبھی مالتی کو دیکھا نہیں تھا، اس کے بارے میں کچھ جانتے نہیں تھے پھر بھی رنج ہوا۔ یقیناً یہ جو کچھ ہو رہا تھا، آفتاب ہی کر رہا تھا۔ اس میں سلطانہ کا زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔ میں نے بھرت سے پوچھا۔ ”اب اسپتال کی صورتِ حال کیا ہے؟“

بھرت نے کہا۔ ”مالتی کو گولی لگنے کے بعد ایک دم ہلچل ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ سپاہی ایک دم اسپتال پر دھاوا بول دیویں گے مگر انگریز افسروں اور پانڈے صاحب وغیرہ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔“

پانڈے کا نام سن کر ہم دونوں کے کان کھڑے ہوئے۔ عمران نے کہا۔ ”یہ پانڈے وہی ..... رنجیت پانڈے ہے نا جو حکم کا خاص آدمی ہے؟“

بھرت نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اب انگریز افسر اینڈرسن صاحب اور حملہ آوروں کے درمیان بات ہوئی ہے۔ اینڈرسن صاحب نے کل سہ پہر چار بجے تک کا سمے مانگا ہے اور کہا ہے

کہ حملہ آوروں کا مطالبہ پورا کر دیا جاوے گا۔''

''یعنی ہاشم کو یہاں پہنچا دیا جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.... اور یہاں سے نل پانی جانے کے لیے ایک بڑی گھوڑا گاڑی اور چار گھوڑے بھی دے دیے جاویں گے۔ پٹھان حملہ آور نے یہ سمے دے دیا ہے اور کہا ہے کہ کل چار بجے تک وہ مزید کسی شخص کی ہتھیا ناہیں کریں گے۔ اس بات چیت کے بعد مسلح فوجی اسپتال کے پھاٹک سے کچھ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ اینڈرسن صاحب نے باہر سے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی اندر بھیجا تھا لیکن حملہ آوروں نے وہ واپس کر دیا ہے۔ شاید ان کو اس بارے میں کوئی شک ہووے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارے پاس کھانے پینے کو بہت کچھ ہے۔''

میں نے اور عمران نے دیکھا۔ بھرت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ زرگاں کے مسلح کمانڈوز جو کچھ دیر پہلے اسپتال کے گیٹ کے عین سامنے پوزیشنیں سنبھال چکے تھے اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت اندر گھس جائیں گے، اب ذرا پیچھے ہٹ گئے تھے۔

رنجیت پانڈے کی یہاں موجودگی اضافی تشویش کا باعث تھی۔ یہ زرگاں کا خطرناک ترین پولیس افسر تھا اور یہ جہاں بھی موجود ہوتا تھا، وہاں خطرات کے بادل منڈلانے لگتے تھے۔

بھرت نے بڑی اپنایت سے ہمیں ناشتا وغیرہ کرایا۔ وہ میرا لباس دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میں سوئٹر یا کوٹ کے بغیر تھا۔ گرم چادر کی بھی خاص ضرورت مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بھرت نے کہا۔ ''بھائی جی! آپ کو گرم کپڑوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں گھر سے آپ کے لیے کچھ لے آؤں؟''

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

عمران فوراً بولا۔ ''یہ انڈین فوج میں رہا ہے اور سیاچن پر ڈیوٹی دیتا رہا ہے۔ اس میں سردی محسوس کرنے کی حس ختم ہو چکی ہے۔ جون، جولائی میں تو اسے برف کے بلاک پر لیٹنا پڑتا ہے۔''

بھرت نے مسکرا کر سر ہلایا۔ پھر میرے ہاتھ پاؤں کو دیکھنے لگا۔ مارشل آرٹ کی کڑی مشقوں اور سینڈ بیگ کے مسلسل استعمال سے ہاتھ پاؤں کی کھال موٹی ہو کر رنگ بدل چکی تھی۔

بھرت بولا۔ ''لگتا ہے فوج میں آپ نے لڑائی بھڑائی کی بھی خاصی ٹریننگ کی ہے؟''

''ہاں، ہمیں ایک خاص آپریشن کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ بڑی سخت ٹریننگ ہوئی تھی لیکن بعد میں ایک شرابی افسر سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ میں فوج سے بھاگ آیا..... اور یہاں پہنچ گیا۔'' میں نے گول مول بات کی۔

عمران نے بھی بھرت کو اس سے ملتی جلتی کہانی سنائی۔ اس نے اپنا نام شیام اور میرا کرشن بتایا۔ ہم ایک دوسرے پر کافی حد تک بھروسا کرنے لگے تھے۔ ہم نے بھرت کو بتایا کہ اس سارے معاملے کے انجام تک ہم یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ وہ فراخ دلی سے بولا۔ ''آپ میرے گھر پر آجاویں۔ بڑے بھیا زرگاں گئے ہوئے ہیں۔ باپو کی طبیعت ٹھیک ناہیں، وہ اپنے کمرے تک ہی رہت ہیں۔ میں آپ کو مہمان خانے میں ٹھہراؤں گا۔ کوئی اس طرف ناہیں آوے گا..... میں ملازموں کو بھی منع کر دوں گا۔''

عمران نے کہا۔ ''اچھا اس بارے میں سوچ لیتے ہیں۔'' پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا خیال ہے، رات تک تو یہیں ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک تو ہے لیکن اگر کھیت کا مالک یا کام کرنے والے مزدور اس طرف آنکلے تو پھر؟''

بھرت مسکرایا۔ ''ایسا کوئی خطرہ ناہیں۔ یہ کھیت میرا ہے۔ آپ دونوں بے فکر ہو کر بیٹھو اور من چاہے تو گنا وغیرہ بھی چوسو۔ جس مزدور نے اس کھیت کو دیکھنا تھا، میں اسے کسی دوسری طرف بھیج دوں گا۔''

''زبردست۔'' عمران نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

بھرت کے جانے کے بعد ہم ستانے کے لیے لیٹ گئے۔ اب ہر طرف خوش گوار دھوپ پھیل گئی تھی۔ اوس تیزی کے ساتھ پتوں اور گھاس پر سے غائب ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹھنڈک کا احساس بھی کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کی طرف اب سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ غالباً کل تک کی مہلت کے بعد دونوں فریق ہی کم تناؤ محسوس کر رہے تھے۔ ہم نے رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہی گزارا تھا۔ اب نرم دھوپ کا لمس محسوس ہوا تو اونگھ آنے لگی۔ رائفل بالکل تیار حالت میں عمران کے سینے پر دھری تھی۔

تقریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزرا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ عمران اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ میں بھی اٹھ بیٹھا۔ کسی خطرے کے وقت عمران کی تمام حسیں برق رفتاری سے بیدار ہو جاتی تھیں۔ اب بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ نہ صرف ہمہ تن گوش تھا بلکہ ہوا میں بھی کچھ سونگھ رہا تھا۔

''کیا ہے؟'' میں نے مدھم سرگوشی کی۔

''کوئی آ رہا ہے۔'' اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

چند لمحے بعد مجھے بھی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ عمران نے رائفل ہاتھ میں لے لی۔ یہ کون ہو سکتا تھا؟ کوئی دشمن یا پھر کوئی عام دیہاتی جو اپنی ضرورت کے تحت کھیت میں گھسا تھا یا پھر کوئی جانور وغیرہ؟ یہ بھرت تو ہرگز نہیں تھا کیونکہ وہ ہوتا تو سامنے سے آتا اور ہمیں دکھائی بھی دیتا۔

چند سیکنڈ سخت تناؤ میں گزرے۔ آواز قریب آتی گئی۔ آخر آنے والا سامنے آگیا۔ یہ ایک بڑے سائز کا آوارہ کتا تھا۔ یہ عام حالت میں بھی بندے کو خوف زدہ کر سکتا تھا مگر اب وہ جس حالت میں تھا، وہ بڑی دہشت ناک تھی۔ اس کتے کی تھوتھنی پر ایک گہرا زخم تھا..... اس کے گلے میں ایک رسّی اس قدر کس کر باندھی گئی تھی کہ اس کا منہ سوج کر اصل سائز سے تقریباً دگنا ہو گیا تھا۔ آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور ان کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ کتے کی آواز گمبھیر اور لرزا دینے والی تھی۔ یوں لگا کہ وہ کسی بھی لمحے ہم پر حملہ کر دے گا۔

عمران نے پہلے تو رائفل اس کی طرف سیدھی کی لیکن پھر اسے نیچے کر لیا۔ وہ گہری نظروں سے جانور کی طرف دیکھتا رہا، تب منہ سے پچ پچ کی آواز نکالی اور اسے پچکارا۔ میں نے دیکھا، حیران کن طور پر کتے کا اشتعال کم ہو گیا۔ عمران کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور بغیر کسی کراہت کے کتے کے سر کو ہاتھ سے سہلایا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاقو مانگ رہا ہے۔ میں نے چاقو اسے تھما دیا۔ کتا اضطراب کے عالم میں کبھی ایک قدم پیچھے ہٹتا، کبھی ایک قدم آگے آتا تھا۔ رسّی اس کی گردن میں دھنسی ہوئی تھی۔ عمران نے بڑی چابک دستی سے پہلے اس رسّی کو چاقو کی دھار سے کمزور کیا پھر توڑ دیا۔ گردن کا آزاد ہونا اس جانور کے لیے موت سے زندگی کی طرف آنے کی طرح تھا..... اس نے ہمارے گرد ایک چکر کاٹا پھر تیزی سے فصل میں گم ہو گیا۔

آج مجھے عمران میں اسی عمو کی جھلک نظر آئی تھی جو چند سال پہلے تک سرکس کے خطرناک جانوروں کو سدھاتا تھا اور شیر، بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پینے پر آمادہ کر دیتا تھا۔ غالباً اس میں وہ پہلے جیسی صلاحیت تو موجود نہیں تھی لیکن اب بھی تھوڑے بہت اثرات اس میں پائے جاتے تھے۔

''زبردست۔'' میں نے تعریفی انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے کہ جانوروں کے حوالے سے اب بھی کچھ نہ کچھ بات تم میں موجود ہے۔''

''وہ تو ظاہر ہے کیونکہ تم جیسے سرکش کو اپنے ساتھ لیے پھرتا ہوں۔'' اس نے فوراً چوٹ کی۔

میں نے کہا۔ ''فضول بحث شروع کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنے تعریفی الفاظ واپس لے لوں۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''بس یہی سرکشی ہے تمہاری۔ فوراً جواب دینے لگے ہو۔ بڑوں کا احترام ختم ہوتا جا رہا ہے تمہارے اندر۔''

میں نے کہا۔ ''ایک طرف بزرگ بنتے ہو، دوسری طرف یہ بتاتے ہو کہ رنما سے تمہارا عشق زوروں پر ہے۔''

''عشق کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ پکی عمر کا عشق پرانی شراب کی طرح زیادہ نشے والا ہوتا ہے۔ لیکن میں یہاں عمر کی بات نہیں کر رہا۔ میں ''عقل'' کے لحاظ سے تمہارا بزرگ ہوں بلکہ اس لحاظ سے تم مجھے اپنا پڑدادا کہہ سکتے ہو۔''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر اس عقل کو سات پردوں میں چھپا کر کیوں رکھتے ہو؟ میں نے تو کبھی اس کی جھلک نہیں دیکھی۔'' میں بھی بحث کے موڈ میں آگیا۔

''ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اس عقل مندی کا مشاہدہ کرنا ہو تو کبھی ٹی وی پر میرا ٹاک شو دیکھنا..... چار چار گنجے دانشوروں کو اپنے سامنے بٹھا کر بات کرتا ہوں..... اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان چاروں کو ایک ساتھ بولنے پر مجبور کرتا ہوں۔ ایک گھنٹے کے شو میں اگر ان کی ایک بات بھی کسی کی سمجھ میں آجائے تو میں اپنا نام بدل دوں۔''

''تو تمہارا مطلب ہے کہ ان کی بات کا سمجھ میں نہ آنا کوئی قابل تعریف چیز ہے؟''

''اوئے گھامڑ..... یہی تو قابل تعریف چیز ہے۔ ان کی بیہودی باتیں اور پیش گوئیاں سننے والوں کی سمجھ میں آجائیں تو بھٹا بیٹھ گیا نا ٹاک شو کا۔ اینکر پرسن کا کمال ہی یہ ہوتا ہے کہ ''دانشور'' بس بولتے ''نظر'' آئیں، سنائی نہ دیں۔ اور اگر سنائی دینے لگیں تو اینکر پرسن مزید شور و غوغے کے لیے خود بھی بحث میں کود پڑے.....''

میں نے کہا۔ ''دیکھو، تم ہر وقت طنزیہ انداز میں بات کرتے ہو اور تصویر کا ایک ہی رخ دکھاتے ہو۔ میڈیا کی بہت سی اچھی باتیں بھی تو ہیں۔''

''بہت سی اچھی باتیں نہیں، میڈیا میں ہیں ہی اچھی باتیں۔ تم مجھے ورغلانے کی کوشش نہ کرو۔''

''میں کیا ورغلاؤں گا، تم پہلے ہی ورغل شدہ ہو بلکہ ورغل ہو۔ اب دیکھو..... میڈیا ریاست کا ایک اہم ستون بن کر سامنے آیا ہے۔ کیمرے کی آنکھ دور دور تک اور گہرائی تک دیکھ رہی ہے۔ غیر قانونی کاموں پر، حکومتی غفلتوں اور قدرتی آفتوں وغیرہ پر اتنا شور مچایا جاتا ہے کہ بچہ بچہ باخبر ہو جاتا ہے۔ نقب زن جس طرح روشنی سے ڈرتا ہے، اسی طرح قانون شکن میڈیا سے ڈر رہا ہے۔''

''اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہماری قدر کرو۔ وہ کیا شعر ہے، ڈھونڈو گے ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم۔''

''مگر تم یہ سب کچھ طنز کے انداز میں کہتے ہو۔ تمہاری آنکھوں کی شرارت سو میل دور سے نظر آتی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، میں اپنے ہی ساتھ شرارت کرتا ہوں۔ یعنی ہاتھ پیچھے کر کے خود کو ہی پتھر مارتا ہوں اور خود ہی حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہوں۔''

''ایسا ہی کرتے ہو..... تمہیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ یہ لوگ مشکل ترین حالات میں کام کر رہے ہیں۔ خطرناک ترین جگہوں پر رپورٹنگ کرتے ہیں۔ بدترین لوگوں کی دشمنیاں مول لیتے ہیں۔ بے شک ان سے بھی غلطیاں کوتاہیاں ہوتی ہیں، پر غلطیاں کوتاہیاں تو ہر شعبے میں ہیں۔''

''تو پھر سلام کرو نا مجھے۔''

''میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں سلام کروں لیکن دور ہی سے۔''

''یعنی تم اپنا راستہ الگ کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں سچ مچ زبان لگ گئی ہے..... اب تم ہر بات پر پیچ ڈالنے کے موڈ میں آتے جا رہے ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ ملاؤ ہاتھ۔'' اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ اس میں بھی شرارت کر رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''یہی ہاتھ تم نے پانچ منٹ پہلے بدبودار کتے کو لگایا ہے۔ ویری سوری۔''

''بڑے کھوچل ہو گئے ہو تم۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ہاتھ پیچھے کر لیا۔

دوپہر سے سہ پہر اور پھر شام ہو گئی۔ کماد کا یہ کھیت ایک بار پھر تاریکی اور سردی میں ڈوبتا چلا گیا۔ گاؤں کے اندر گاڑیوں، اسلحے اور گارڈز کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بڑا جنریٹر بھی یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس جنریٹر کی گھوں گھوں مسلسل ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ جنریٹر کی مدد سے چلنے والی روشنیوں نے اسپتال اور اس کے گرد و اطراف کی گلیوں کو پوری طرح روشن کر دیا تھا۔ یقیناً یہ معاملہ زرگاں کے لیے بے حد اہمیت اختیار کر چکا تھا اور اس کی وجہ ماریا اور سلطانہ کا ایک اسپتال کے اندر موجود ہونا تھا۔

بھرت نے کہا تھا کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد ہمیں لینے آئے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم یہاں سخت سردی میں کھلے آسمان تلے رات گزارنے کے بجائے اس کی آرام دہ حویلی میں قیام کریں۔ وہ ہمیں ہر طرح کی سہولت اور حفاظت کا یقین دلا رہا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ آیا نہیں تھا۔ شاید پھر کسی وجہ سے اسے دیر ہو گئی تھی۔ اچانک میں نے عمران کو پھر چونکا ہوا محسوس کیا۔ ایک بار پھر اس کی غیر معمولی حسیات اسے کسی کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ جلد ہی مجھے بھی یہ احساس ہو گیا۔ ہمارے آس پاس کھیت کے اندر یا ساتھ والے کھیت میں کوئی موجود تھا۔ عمران نے سگریٹ فوراً بجھا دیا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور جھکے جھکے انداز میں اردگرد دیکھنے کی کوشش کی۔ دفعتاً ہمیں ساتھ والے کھیت میں کچھ سائے نظر آئے۔ مکئی کے اس کھیت میں پراسرار انداز میں حرکت کرنے والے سایوں کی تعداد سات کے لگ بھگ تھی۔ وہ چھاپا مار کارروائی کرنے والے سپاہیوں کی طرح جھک کر چلتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ ذہن میں پہلا سوال یہی آیا کہ کیا بھرت کے بارے میں ہمارا اندازہ غلط نکلا ہے؟ عمران نے رائفل تیار حالت میں کر لی۔ میں نے بھی اپنا ریوالور پنڈلی کی ڈب سے نکال لیا اور بالکل چوکس ہو گیا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ ہمارے سامنے دو راستے تھے۔ اپنی پوزیشن پر رہیں اور اگر وہ ہم پر فائر کھولیں تو ہم جوابی فائر کر کے انہیں مارنے یا بھگانے کی کوشش کریں۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ہم اپنی یہ پوزیشن چھوڑ کر بھاگ نکلیں اور روپوش ہونے کی کوشش کریں۔ دونوں صورتوں میں خطرات موجود تھے۔ ان لمحوں میں عمران کی اعصابی مضبوطی اور ان معاملوں میں اس کی مہارت کا اندازہ ہوا۔ میں اکیلا ہوتا تو شاید ان لوگوں کے قریب آنے پر فائر کرتا یا پھر بھاگ کر دوسرے کھیت میں گھسنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس کی آنکھ وہ دیکھ چکی تھی جو میری آنکھ نہیں دیکھ پائی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری کلائی پر رکھ کر مجھے یہ اشارہ دیا کہ میں فائر وغیرہ کرنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ خود بھی اپنی جگہ بالکل بے حرکت اور جامد بیٹھا تھا۔ آنے والے ہماری طرف بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہمیں ان کے قدموں کی چاپ چند میٹر کی دوری پر محسوس ہوئی۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ہماری طرف نہیں آ رہے۔ وہ ہم سے قریباً دس قدم کے فاصلے سے اور بالکل سامنے سے گزر رہے۔ ہم نے اپنے سانس تک روک لیے تھے۔ رنجیت پانڈے کی منحوس آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

''اور کتنی دور ہے؟'' اس نے کہا۔

''بس پہنچ گئے جی۔ وہ سامنے کیکر کے پیڑوں کے پاس۔'' ایک دوسری آواز سنائی دی۔

وہ ہمارے پاس سے گزر کر درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھے۔ وہ اندھیرے میں بغیر کسی لالٹین یا ٹارچ کے جا رہے تھے۔ انداز سخت محتاط تھا۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔

''دیکھنا پڑے گا۔'' عمران نے کہا۔ ''وہ کتا پانڈے بھی ساتھ ہے۔''

ہم نے دیکھا، درختوں کے قریب جا کر وہ سائے رک گئے پھر غائب ہو گئے۔ وہ نشیب میں اتر گئے تھے۔ ''تم اِدھر رکو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بھی ساتھ چلنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

عمران پہلے تو انکار کے موڈ میں نظر آیا پھر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے ہر موقع پر وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے خطرے سے بچانا بھی چاہتا تھا، دوسری طرف خطروں کا خوگر بھی کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں نے اپنی جگہ چھوڑی اور بے حد احتیاط سے اس نشیب کی طرف بڑھے جہاں رنجیت اور اس کے ساتھی اوجھل ہوئے تھے۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر ہم اوندھے لیٹ گئے اور سن گن لینے لگے۔ اندازہ ہوا کہ رنجیت اور اس کے ساتھی جھنڈ کے بالکل قریب نشیبی جگہ پر موجود ہیں۔ ان کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

اب زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہم رینگتے ہوئے آگے گئے۔ ہماری انگلیاں اپنے ہتھیاروں کے ٹریگرز پر تھیں اور ہم کسی بھی صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھے۔ درختوں کی طویل قطار کے آگے زمین کا کٹاؤ نظر آیا۔ یہاں ایک چھوٹی جوہڑ کی سی شکل بن گئی تھی مگر یہ جوہڑ تقریباً خشک تھا۔ متحرک سائے اس نشیب میں موجود تھے۔ اب انہوں نے دو ٹارچیں روشن کر لی تھیں اور کسی خاص چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد رنجیت کی مدھم لیکن کرخت آواز ابھری۔ ''پائپ تو یہی لگتا ہے لیکن پتا نہیں کب سے بند پڑا ہے۔ پہلے اسے کھولنا پڑے گا۔''

''بس مٹی وغیرہ سے بند ہو گیا ہے۔ ابھی کھل جاوت ہے جی۔'' دوسری آواز ابھری۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہاں کدال چلنا شروع ہو گئی۔ کدال چلانے والا کوئی مزدور ٹائپ شخص تھا۔ وہ وردی کے بجائے ہماری طرح دھوتی اور پگڑی میں نظر آ رہا تھا۔ رنجیت پانڈے نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''اوئے بہن کے چھکنے! دھیان سے کدال چلا۔ کہیں پائپ پر نہ مارنا۔''

ایک دو منٹ بعد کدال واقعی پائپ پر لگی اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز سناٹے میں دور تک گئی۔ پانڈے پھنکارا۔ ''تجھے کہا بھی تھا کہ اس ہال کو دھیان سے چلا۔'' اس کے ساتھ ہی چٹاخ کی آواز آئی۔ یقیناً شعلہ مزاج پانڈے نے مزدور کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ پھر وہ پھنکارتی آواز میں کسی سپاہی سے بولا۔ ''راموں! تو پکڑ کدال..... اور خبردار آواز پیدا نہیں ہونی چاہیے۔''

دوسرا شخص کدال چلانے لگا۔ ایک ٹارچ کا روشن دائرہ مسلسل کھدائی والی جگہ پر مرکوز تھا۔ جلد ہی ہمیں ایک پرانے سیوریج پائپ کا دہانہ نظر آنے لگا۔ سیمنٹ کا یہ پائپ قریباً تین فٹ قطر کا ہو گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ بھانڈیل اسٹیٹ کا خطرناک ترین کمانڈو رنجیت پانڈے اپنے ایک سفید فام ساتھی کے ہمراہ پائپ میں داخل ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ سفید فام بھی کوئی تربیت یافتہ کمانڈو ہی تھا۔ یہ دونوں افراد پوری طرح مسلح نظر آ رہے تھے۔ ہمیں یہ شک بھی پڑا کہ یہ شاید دو کے بجائے تین افراد ہیں۔ یہ بڑی

سنگین صورتِ حال تھی۔ سب کچھ تقریباً واضح ہو چکا تھا۔ یہ پرانا سیوریج پائپ اسپتال کی عمارت کے اندر تک جا رہا تھا۔ اسپتال میں موجود آفتاب خاں اور سلطانہ کو زبردست قسم کا ''شاک'' پہنچنے والا تھا۔

عمران نے میرا بازو دبایا۔ ہم تیزی سے واپس مڑے۔ رینگتے ہوئے بیس پچیس میٹر کی دوری تک گئے۔ ... کھیت میں داخل ہوتے ہی ہم کھڑے ہوگئے اور جھک کر بھاگتے ہوئے اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھے۔ آفتاب یہاں اسپتال میں جو کچھ کر رہا تھا، ہم ہرگز اس کے حق میں نہیں تھے لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اور سلطانہ ..... پانڈے جیسے شخص کے ہاتھوں بے موت مارے جائیں۔

گنے کے کھیت میں اپنے ٹھکانے تک پہنچتے ہی عمران نے واکی ٹاکی اٹھایا اور اس پر آفتاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے بار بار بیپ دینے والا بٹن دبایا۔ انٹینا کو گھمایا۔ پاور کو آن آف کیا لیکن حسبِ معمول رابطہ نہیں ہو سکا۔ واکی ٹاکی بے جان پڑا تھا۔ دو تین منٹ کی سرتوڑ کوشش کے بعد عمران نے سخت جھلاہٹ میں واکی ٹاکی کو ایک طرف پٹخ دیا۔ وہ جاگ اٹھا۔ سبز اور سرخ روشنیاں جل اٹھیں۔ بیپ کی مدھم آواز پیدا ہونے لگی۔ یہ بیپ دوسری طرف آفتاب والے سیٹ پر جا رہی تھی۔ ہم ہمہ تن گوش تھے۔ چند سیکنڈ بعد دوسری طرف سے آفتاب کی بھاری آواز ابھری۔ ''ہیلو۔''

عمران بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ''آفتاب! تم پر حملہ ہو رہا ہے۔ پانڈے اور اس کے ساتھی کسی بھی وقت اندر گھس جائیں گے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' آفتاب کی چونکی ہوئی آواز ابھری۔

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں غور سے سنو۔ سوال نہ کرنا۔ ابھی چار پانچ منٹ پہلے ہم نے پانڈے اور اس کے ساتھیوں کو کھیتوں میں دیکھا ہے۔ یہاں ایک پرانا سیوریج پائپ ہے۔ یقیناً اس کا دوسرا سرا اسپتال کے احاطے یا پھر پچھلے صحن میں کہیں ہوگا۔ ان لوگوں نے اس پائپ کو کھولا ہے۔ پانڈے اور اس کا ایک انگریز ساتھی اس پائپ میں گھسے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت عمارت کے اندر پہنچ جائیں گے۔ ان کے پاس جدید رائفلیں ہیں۔ تم دیکھ لو، تم نے اپنا بچاؤ کیسے کرنا ہے.....''

''ٹھیک ہے۔ ام دیکھتا ہے۔'' آفتاب نے جلدی سے کہا اور واکی ٹاکی آف کر دیا۔

ہم جو کچھ کر سکتے تھے، ہم نے کر دیا تھا۔ اب آگے آفتاب اور سلطانہ کی قسمت تھی۔

پندرہ بیس منٹ سخت بے چینی کے عالم میں گزرے، تب اسپتال کی عمارت کی طرف ہلچل محسوس ہوئی۔ پہلے یکے بعد دیگرے رائفل کے تین فائر ہوئے۔ پھر ایک برسٹ چلا۔ عمران نے بتایا کہ یہ ایل ایم جی کا برسٹ ہے۔ اس برسٹ کے بعد دو طرفہ گولیاں چلیں۔ یہ سلسلہ بمشکل ایک منٹ جاری رہا اور پھر سناٹا چھا گیا۔ عمارت کے اردگرد دور جنوں ٹارچیں گردش کر رہی تھیں۔ جیپوں کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں۔ ایک چھکڑا ایمبولینس کی گول گھومتی سرخ بتی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔ بہت سے امکانات ذہن پر یورش کر رہے تھے۔ کیا آفتاب اور سلطانہ مارے گئے ہیں؟ کیا پانڈے اور اس کا ساتھی ناکام ہوئے ہیں؟ کیا وہ اب بھی اندر موجود ہیں؟ اس طرح کے اَن گنت سوالات تھے۔ وہی پندرہ منٹ اسی شدید کشمکش میں گزرے پھر ہمیں درختوں کے جھنڈ کی طرف حرکت کے آثار نظر آئے۔ نشیب میں سے دو ٹارچوں کے روشن دائرے اوپر آئے اور گنے کے کھیتوں کی طرف آنے لگے۔

''میرا خیال ہے کہ وہ واپس جا رہے ہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''اور ان کے ساتھ کوئی زخمی بھی ہے۔'' عمران نے اپنی تیز نگاہی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دو منٹ بعد پانڈے اور اس کے ساتھی ہمارے قریب سے گزرے۔ پانڈے کا انگریز ساتھی زخمی ہو چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر لا رہے تھے۔ اس کی کرب ناک کراہیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ تب پانڈے کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''جلدی کرو۔ خون جی (تیزی) سے بہہ رہا ہے۔'' وہ اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ اس کے بعد اس نے کسی کو گالی دی اور کہا کہ وہ زخمی کی ٹانگیں اوپر اٹھا کر رکھے۔ پچیس تیس سیکنڈ میں وہ لوگ تیزی سے چلتے ہوئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

اطمینان کی ایک طویل سانس عمران کے سینے سے خارج ہوئی۔ وہ بولا۔ ''لگتا ہے پانڈے کا آپریشن پی جی ناکام ہوا ہے۔''

''آپریشن پی جی کیا مطلب؟''

''آپریشن براستہ پائپ اور گٹر۔'' اس نے روانی سے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، عمارت کے اندر سے پھر سیون ایم ایم کا گونج دار فائر سنائی دیا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے سرپھرے آفتاب نے پھر کسی کو لڑھکا دیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یرغمالی کو؟''

عمران نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ صورتِ حال بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک بار پھر عمارت کے اردگرد شدید اضطراب نظر آنے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے درجنوں فوجی اور مشتعل دیہاتی اپنی برداشت کھو کر عمارت کے اندر گھس جائیں گے اور اس ڈرامے کا خونی ڈراپ سین سامنے آ جائے گا۔ مگر انگریز افسروں کو پتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو ماریا بھی ماری جائے گی اور یہ انہیں کسی طور قبول نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں لالٹینوں اور ٹارچوں کی روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ تین چار افراد ایک چارپائی کے ساتھ اندر گئے ہیں اور تازہ لاش لے کر باہر آ گئے ہیں۔ ایک بار پھر رونے پیٹنے کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ ایک بار ٹارچ کی ایک روشنی اسپتال کی چھت پر پانی والی گول ٹینکی کے قریب بھی نظر آئی۔ یقیناً یہ آفتاب خاں ہی تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چھت پر سے حکم کے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کچھ کہہ بھی رہا ہو مگر فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ہم کچھ سن نہیں سکتے تھے۔

عمران ایک بار پھر واکی ٹاکی پر رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ آفتاب نے ''پاور آف'' کر رکھا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ہماری بائیں طرف سے ایک ہیولا کھیتوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چال ڈھال سے اندازہ ہو گیا کہ یہ بھرت ہی ہے۔ بھرت محتاط انداز سے کھیت میں داخل ہوا اور ہمارے پاس پہنچ گیا۔ وہ بولا۔ ''شما چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر ہو گئی۔ وہاں اسپتال کے اندر کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ فائرنگ کی آواز تو آپ دونوں نے بھی سنی ہووے گی۔''

''ہاں، آواز تو سنی ہے، پر ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے گھر پہنچتے ہیں پھر میں سب کچھ بتاوت ہوں۔'' بھرت نے کہا۔

ہم بھرت کے ساتھ چلنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ یخ بستہ ٹھنڈ نے ہڈیوں میں اترنا شروع کر دیا تھا۔ منہ سے بھاپ خارج ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہم نے گرم چادروں کی بکلیں ماریں، پگڑیاں اس طرح لپیٹیں کہ چہرے بھی کافی حد تک چھپ گئے۔ ہمارا واحد سامان کسیاں ہی تھیں۔ یہ ''کسیاں'' ہم نے کھیت مزدوروں کی طرح کندھوں پر رکھیں اور بھرت کے ساتھ گاؤں کی روشنیوں کی طرف چل دیے۔

بھرت کا حویلی نما مکان گاؤں کی شمالی جانب تھا۔ یہ جگہ اسپتال کی عمارت سے قریباً آدھا فرلانگ کے فاصلے پر ہوگی۔ ہم دو بڑی گھوڑا گاڑیوں کے قریب سے گزرے۔ یہ دونوں گاڑیاں باوردی سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں اور ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھیں۔ مسلح پہرے دار بھی نظر آئے۔ چونکہ بھرت ہمارے ساتھ تھا، اس لیے کسی نے ہمیں شک کی نظروں سے نہیں دیکھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی جانور کھیتوں میں سے نکل کر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ یہ وہی بڑے سائز کا کتا تھا جس کے گلے میں دھنسی ہوئی رسی عمران نے کاٹی تھی۔ وہ یقیناً ابھی تک ہمارے اردگرد ہی موجود تھا۔ اس کا ہمارے پیچھے پیچھے آنا ایک اتفاق بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عمران کے اچھے سلوک کی وجہ سے اسے ہمارے ساتھ وابستگی پیدا ہو گئی ہو۔ عموماً جانور اس طرح کے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس کی ایک تیسری وجہ بھی ہو سکتی تھی اور یہ زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔ عمران کی طویل روداد میں، میں نے اس کی اس خاص صلاحیت کے بارے میں جانا تھا جو وہ جانوروں کے حوالے سے رکھتا تھا..... یہ بظاہر ناقابلِ یقین تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ عمران کے حوالے سے کچھ بھی ناقابلِ یقین نہیں ہو سکتا۔ وہ بے پناہ مقناطیسی کشش کا مالک تھا۔ یہ کشش انسانوں پر اثر کرتی تھی تو دیگر جانداروں کو بھی متاثر کر سکتی تھی۔

عمران نے بھی کتے کو اپنے ساتھ ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔ کتے کے چہرے کی غیر معمولی سوجن اب بہت کم رہ گئی تھی۔ وہ ذرا لنگڑاتا ہوا ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔ بھرت نے ایک دو بار اسے شش کارا۔ وہ ٹھٹکا ضرور لیکن ہم سے دور نہیں گیا۔

ہم جلد ہی بھرت کے نیم پختہ مکان میں پہنچ گئے۔ بھرت نے ہمیں مکان کے بیرونی حصے میں ٹھہرایا۔ یہ ایک لمبا برآمدہ تھا جس کے ساتھ دو تین بیٹھک نما کمرے تھے۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کسی کھاتے پیتے ہندو زمیندار کی رہائش گاہ ہے۔ بھرت کا بڑا بھائی زرگاں میں تھا۔ والد دمے کی تکلیف کی وجہ سے اپنے کمرے تک محدود تھے۔ گھر میں کئی نوکر چاکر تھے۔ ان میں گندمی رنگت والی وہ لڑکی بھی

شامل تھی جس کا نام ہمیں چمپی معلوم ہوا تھا اور جس نے گنے کے کھیت میں بھرت سے مبہت بھر کی ملاقات کی تھی۔ چمپی کی ادھیڑ عمر والدہ بھی اسی گھر میں خدمت گار تھی۔ مکان کے وسیع احاطے میں ایک طرف بھینسوں اور بکریوں وغیرہ کا باڑا تھا۔

نخ بستہ کھیت میں سے اس آرام دہ گھر میں منتقل ہونا ہمیں کافی اچھا لگا۔ بھرت نے دیسی مرغی کے سالن، تندوری روٹی اور حلوے سے ہماری تواضع کی۔ ہندو گھرانوں میں عام طور پر گوشت نہیں پکتا لیکن بھرت نے ہمارے لیے پکوا لیا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے ہمیں راز داری کے انداز میں بتایا کہ اسپتال میں سخت گڑبڑ ہوئی ہے۔ حملہ آوروں نے طیش میں آ کر چھوٹے ڈاکٹر راج کو مار ڈالا ہے اور لاش اسپتال کے احاطے میں پھینک دی ہے۔

طیش کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''مجھے ٹھیک سے معلوم تو ناہیں بھیا لیکن لگت ہے کہ حکم کے سپاہیوں نے خفیہ طور پر اسپتال کے اندر گھسنے کی کوئی کوشش کی ہے۔ اس خیال کا ایک کارن یہ بھی ہے کہ پانڈے صاحب یہاں موجود ہے اور جہاں پانڈے صاحب موجود ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی ہلچل والا کام تو ہوتا ہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اسپتال میں گھسنے کی یہ کوشش ناکام ہوگئی ہے اور ایک گورے افسر بیٹر صاحب کو ٹانگوں پر گولیاں بھی لگی ہیں۔ اس واقعے کے فوراً بعد ہی اندر موجود پٹھان حملہ آور نے بے دردی سے چھوٹے ڈاکٹر صاحب کو گولی سے اڑا دیا..... اور چھت پر چڑھ کر دھمکی دی کہ اگر سپاہیوں کی طرف سے کوئی اور چال چلی گئی تو وہ سب کچھ ختم کر ڈالیں گے۔''

''اب کیا صورتِ حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''چھوٹے ڈاکٹر صاحب کی ہتھیا کے بعد تو ایسا لگت تھا کہ لوگن اسپتال پر چڑھ دوڑیں گے مگر انگریز افسر مسٹر اینڈرسن نے لوگن کو روکا۔ اب مجھے لگت ہے کہ گورے افسروں نے حملہ آوروں کی ''مانگیں'' ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہو سکت ہے کہ مہلت کے ختم ہونے سے پہلے پہلے ہاشم رازی رہا ہو کر یہاں پہنچ جائے۔''

''کیا ہندو برادری کو اس کی رہائی قبول ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''بھیا! یہ ہے تو بڑا مشکل۔ سنا ہے کہ سب سے زیادہ شور وہی بڑی بی مچا رہی ہے۔ زرگاں کا بہت سا لوگن اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔ وہ نئی نئی بھبتیں گھڑ رہی ہے۔ دوسرے شبدوں میں اس نے حکم جی کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ حکم کے لیے ممکن ہی ناہیں کہ وہ اپنے انگریز دوستوں کے خلاف چل سکے۔ اسے ہر حال میں وہی کرنا ہو دے گا جو انگریز افسر اور مسٹر اسٹیل وغیرہ کہیں گے۔ چاہے اس کے لیے اسے بڑی بی اور اس کے خاص حمایتیوں کو جیل میں ڈالنا یا انہیں سورگ باشی کرنا پڑے۔''

وہ رات ہم نے بھرت کے آرام دہ گھر میں گزاری۔ اگلا سارا دن بھی سخت تناؤ میں گزرا۔ ہم بھرت کے مکان کی چھت سے اسپتال اور اس کے اردگرد کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ چھوٹے ڈاکٹر کی موت کے بعد صورتِ حال مزید سنگین ہو چکی تھی۔ اسپتال گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے وسیع احاطے اور برآمدوں میں کسی طرح کی کوئی سرگرمی نظر نہیں آتی تھی۔

رات قریباً دس بجے کا وقت ہوگا۔ ہم بھرت کے ہمراہ اس کے گھر کی چھت پر تھے، اچانک گاڑیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ گاؤں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ کل تین جیپیں تھیں۔ یہ اسپتال کے عین سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ ہر طرف ہلچل نظر آنے لگی۔ بھرت نے کہا۔ ''میں دیکھ کر آوت ہوں کہ کیا معاملہ ہے۔''

وہ گیا اور دس پندرہ منٹ بعد اس نے آ کر بتایا کہ حملہ آوروں کا مطالبہ پورا ہو گیا ہے۔ ہاشم رازی زرگاں سے رہا ہو کر یہاں پہنچ گیا ہے۔ بھرت نے بتایا۔ ''حملہ آوروں کو ایک گھوڑا گاڑی دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے تاکہ وہ یہاں سے روانہ ہو سکیں۔''

''اور ماریا کا کیا بنے گا؟'' عمران نے پوچھا۔

''جب ہاشم رازی کو اندر بھیج دیا جاوے گا تو ماریا باہر آ جاوے گی۔ ماریا کے ساتھ ہی اندر موجود کچھ عورتوں اور بچوں کو بھی چھوڑ دیا جاوے گا۔ باقی لوگن یرغمالی کے طور پر حملہ آوروں کے پاس رہیں گے۔ ان میں ایک انگریز بھی شامل ہے۔ یہ لوگن گھوڑا گاڑی پر یہاں سے روانہ ہوں گے۔ نل پانی کی حد پر پہنچ کر جب حملہ آوروں کو پورا وشواس ہو جاوے گا کہ اب وہ محفوظ ہیں تو باقی یرغمالیوں کو چھوڑ دیا جاوے گا۔''

''یرغمالیوں میں انگریز کون ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اصل میں پانڈے کے ساتھ ایک ناہیں دو گورے کمانڈو اندر گئے تھے۔ ان میں سے ایک کی ٹانگوں میں تو گولیاں لگی ہیں لیکن دوسرے کو زخمی حالت میں قیدی بنا لیا گیا ہے۔''

ہمارا یہ شک درست نکلا تھا کہ پانڈے کے ساتھ دو گورے پائپ لائن میں گھسے تھے..... عمران نے بھرت سے پوچھا۔ ''ماریا اور ہاشم رازی کا تبادلہ کب ہوگا؟''

''آج رات ہی کسی وقت ہو جاوے گا۔ اس سلسلے میں زرگاں کی بڑی جامع مسجد کے امام قادر بخش صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ اصل میں یہ سارا معاملہ انہوں نے ہی طے کروایا ہے۔ انہوں نے دونوں طرف سے وعدے کی پاسداری کی ضمانت دی ہے۔ حکم کے افسروں کی طرف سے بھی وچن دیا گیا ہے کہ وہ نل پانی کے راستے میں کسی طرح کی کوئی کارروائی ناہیں کریں گے اور حملہ آوروں کو ہاشم رازی سمیت نل پانی میں داخل ہونے دیویں گے۔''

آدھ پون گھنٹے بعد بھرت دوبارہ سن گن لینے کے لیے اسپتال کی طرف چلا گیا۔ ہمارے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ کمرے میں گھس کر ہم نے واکی ٹاکی آن کیا اور ایک بار پھر آفتاب سے رابطے کی کوششیں شروع کر دیں۔ خوش قسمتی سے رابطہ ہو گیا۔ آفتاب خان اب قدرے پُرسکون محسوس ہوتا تھا۔ اسے پتا چل چکا تھا کہ ہاشم رازی یہاں آ چکا ہے اور اب کسی بھی وقت ماریا کے ساتھ اس کا تبادلہ ہو جائے گا۔ اس کے فوراً بعد ان لوگوں کو ڈاکٹر لی وان اور دیگر یرغمالیوں کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو جانا تھا۔ میرے کہنے پر وہ نیچے گیا اور اس نے سلطانہ سے بھی میری بات کروائی۔ سلطانہ کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے حد تھکی ہوئی ہے تاہم اس کا اعصابی تناؤ اب کم محسوس ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سلطانہ! تم لوگ کب تک یہاں سے نکلو گے؟''

''آفتاب کہہ رہا ہے، ابھی دو ڈھائی گھنٹے تو لگیں گے۔ شاید..... ہم کل شام تک نل پانی پہنچ سکیں..... اگر سب کچھ ٹھیک (ٹھیک) رہا تو۔'' اس نے آخر میں اضافہ کیا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبراؤ مت..... اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک رہے گا۔ کل رات ہم نل پانی کے دیوان میں ملیں گے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بالو، وہیں ہے نا؟'' میں نے اس کی بات کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ کہنے لگی۔ ''میں اسے بہت پیار کرنا چاہتی ہوں مہروج۔ میں نے اس معصوم کو بہت دکھ دیا ہے۔ بڑا انتظار کرایا ہے اسے۔ میں بہت بری ماں ہوں مہروج۔ میرا اللہ مجھے معاف کر دے گا نا؟''

''اگر سچے دل سے معافی مانگی جائے تو وہ ضرور معاف کرتا ہے۔''

''اور..... آپ..... بھی کر دیں گے نا؟''

''مجھے کوئی گلہ نہیں ہے سلطانہ۔''

''لیکن میں نے آپ کو رنج تو دیے ہیں نا۔ اگر آپ.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ واکی ٹاکی پر کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کچھ فاصلے پر دو افراد بلند آواز میں گفتگو کرنے لگے۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ سلطانہ نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے ہاشم صاحب اندر آ گئے ہیں..... ہاں، یہ ہاشم صاحب ہی ہیں۔ امام صاحب بھی ان کے ساتھ ہیں۔ آفتاب انہیں لے کر اندر آ گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اب ہمیں یہاں سے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ لیکن آپ کہاں ہیں مہروج؟''

''میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔ بے فکر رہو۔''

''مجھے یقین نہیں ہو رہا مہروج کہ سب کچھ ٹھیک ہوتا جا رہا ہے۔ میں تو اپنی آشا بھی ختم کر چکی تھی۔ اچھا اب میں بند کرتی ہوں۔ آفتاب اور ہاشم صاحب اس طرف آ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔'' میں نے کہا۔

سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بھرت ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلے گئے اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے دیکھا، وہ زخمی کتا ابھی تک گلی میں گھوم رہا تھا جس سے گنا کے کھیت میں ملاقات ہوئی تھی۔ عمران نے بھی اسے دیکھا مگر تبصرہ نہیں کیا۔ تبصرے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

بھرت کے بوڑھے پتا جی صحن میں گھوم رہے تھے اور مسلسل کھانس رہے تھے۔ بھرت نے ابھی تک انہیں ہماری موجودگی سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ ہم چھت کی تاریکی میں سے انہیں دیکھتے رہے۔ وہ بمشکل چل پا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے فربہ جسم کے ساتھ ڈگمگاتے ہوئے کسی کمرے میں چلے گئے..... تاہم ان کی کھانسی کی آواز آتی رہی۔ ہمیں ابھی تک یہ اندیشہ تھا کہ یہاں کوئی ہمیں پہچان نہ لے۔ خاص طور سے بھرت کے بڑے بھائی کی فکر تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گھومنے پھرنے والا شخص ہے۔ وہ اب بھی زرگاں میں تھا۔ اگر اس نے زرگاں میں ہمیں دیکھا ہوتا تو اس کی واپسی کے فوراً بعد ہمارے لیے مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔

بھرت کی واپسی میں دیر ہوئی تو ایک بار پھر ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں پھر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی تھی؟ بھرت نے واپس آنے میں آدھا گھنٹا مزید لگا دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی واضح نظر آ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر گڑبڑ ہوگئی..... اور اس دفعہ بڑی سخت ہوئی ہے۔ پتانا ہیں بھگوان کو کیا منظور ہے۔''

میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ہمارے پوچھنے پر بھرت نے بتایا۔ ''ہاشم رازی کے بارے میں سن رکھا تھا کہ یہ بہت ہی سخت اور کٹر بندہ ہے..... بلکہ کچھ لوگن اس کو جنونی کہوت ہیں۔ آج یہ بات ثابت ہوگئی ہے۔ اس نے اندر پہنچ کر صاف کہا ہے کہ وہ ابھی ماریا کو نا ہیں چھوڑے گا۔ ماریا کو اس سے رہائی ملے گی جب وہ ٹل پانی کی حد تک پہنچ جاویں گے۔ اس کی وجہ سے امام قادر بخش سخت مصیبت میں آ گئے ہیں۔ وہ اس سمجھوتے کے ضامن تھے اور وہی ہاشم رازی کو اندر لے گئے تھے۔ انگریز افسروں اور پانڈے وغیرہ نے امام صاحب کو دھمکی دی ہے کہ اگر ماریا کو کچھ ہوا تو وہ بھی برابر کے جرم وار ٹھہریں گے۔ ان بے چاروں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔''

یہ سب کچھ قطعی غیر متوقع تھا۔ اس ہاشم رازی کے بارے میں پہلے بھی ہمارے خیالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ ہم نے حکم کے دربار میں اسے جنونیوں کی طرح چنگھاڑتے اور منہ سے جھاگ اڑاتے دیکھا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگتا تھا جو اپنے قریبی ساتھیوں اور ہم خیالوں کے سوا ہر شخص کو کافر یا منافق قرار دیتے ہیں اور انہیں ہر طرح کا نقصان پہنچانا جائز سمجھتے ہیں۔ حکم کے دربار میں ہی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ہاشم نے اپنے ہیجانی خیالات کے زیر اثر کئی مسلمانوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

عمران نے پوچھا۔ ''جب سب کچھ طے تھا تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

بھرت بولا۔ ''میرا وچار ہے کہ اندر جا کر ہاشم کو کل رات والے واقعے کی جانکاری ملی ہے۔''

''کون سا واقعہ؟''

''وہی پانڈے اور دو گورے چھاپا ماروں کے اندر گھسنے والا واقعہ۔ اس کے بعد ہی وہ بھرا ہے اور اس نے کہا ہے کہ یہ لوگن پھر دھوکا دیں گے۔ حالانکہ میری سمجھ کے مطابق اس کا یہ وچار بالکل غلط ہے۔ اس کو کسی اور پر نا ہیں تو بڑے امام صاحب پر تو وشواس کرنا چاہیے۔ اور پھر اتنے یرغمالی بھی ہیں اس کے پاس جن میں ڈاکٹر لی وان کے علاوہ دو زخمی انگریز افسر بھی ہے۔''

اسی دوران میں اسپتال کی چھت کی جانب سے کسی کے غضیلے انداز میں دہاڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بھرت بولا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ یہ ہاشم بول رہا ہے۔ انگریز افسر اینڈرسن صاحب نے اسے بات چیت کرنے کے لیے بیٹری سے چلنے والا لاؤڈ اسپیکر بھجوایا ہے۔''

ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آئے۔ یہ واقعی ہاشم رازی تھا۔ وہ اسپتال کی چھت پر موجود تھا مگر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میگافون کے ذریعے بات کر رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر تیر کر اس کی مشتعل آواز ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا: ''..... بکواس مت کرو۔ تم لوگن خود دغاباز ہو، فریبی ہو۔ اب ہم تمہارا فریب نا ہیں چلنے دیں گے۔ وہی کچھ ہووے گا جو ہم چاہیں گے۔ میم تب چھوٹے گی جب ہم ٹل پانی پہنچ جاویں گے۔''

ایک قریبی گھر کی چھت سے ایک دوسری آواز آئی۔ یہ بھی میگافون کے ذریعے آئی تھی۔ بولنے والا حکم کا کوئی افسر تھا۔ اس نے انگریز افسر اینڈرسن کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ''اینڈرسن صاحب کہوت ہیں، تم زبان دے کر پھر رہے ہو۔ کیا تمہارا دھرم تمہیں اس کی اجازت دیوت ہے؟ یہ سراسر جھوٹ اور مکاری ہے۔ اس کے بعد تمہاری اور کس بات پر وشواس کیا جا سکتا ہے؟''

''یہ جھوٹ اور مکاری نا ہیں۔'' ہاشم دہاڑا۔ ''یہ سب کچھ لڑائی کا حصہ ہے اور تم لوگن خود کہوت ہو کہ محبت اور لڑائی میں سب کچھ جائز ہووت ہے.....''

حکم کے افسر نے کہا۔ ''اچھا..... یہ ایک منٹ امام صاحب سے بات کرو۔''

چند سیکنڈ بعد میگافون پر امام قادر بخش صاحب کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''ہاشم! تم نے وعدہ کر رکھا ہے۔ اس طرح وعدے سے پھرنا ٹھیک نا ہیں۔ اس سے فساد ہو گا..... اور اس فساد میں اگر کچھ جانیں گئیں تو اس کا بوجھ بھی تم پر آئے گا۔ میں نے تمہیں ضمانت دی ہے اور ایک بار پھر پوری ذمے داری کے ساتھ یہ ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں تمہارے ساتھیوں سمیت ٹل پانی جانے کی اجازت دی جائے گی.....''

''میں آپ کی عزت کرتا ہوں امام صاحب! لیکن آپ ایک سیدھے سادے شخص ہو۔ آپ کی دوڑ گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر تک ہے۔ آپ ان گوروں کے چلتر نا ہیں جانتے۔ جب ہم ان کے نشانے پر آگئے تو یہ طوطے کی طرح آپ کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں گے۔ ایک نا ہیں سنیں گے آپ کی۔ آپ اس معاملے سے ایک طرف ہو جائیں۔''

''میں کس طرح ایک طرف ہو جاؤں ہاشم؟ میں ضامن ہوں تمہارا۔ یہ مجھے بھی تمہارا ساتھی کہنے لگے ہیں۔ یہ مجھے اور میرے سارے خاندان کو جیل میں سزا دیں گے۔ کیا تم ایسا چاہتے ہو؟''

''ایسا کچھ نا ہیں ہوگا مولانا! یہ حرامجادے آپ پر صرف دباؤ ڈال رہے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات ہو بھی تو آپ کی طرف سے اس کارِ خیر میں حصہ سمجھا جاوے گا۔ یہ سچ اور جھوٹ کی لڑائی ہے۔''

''لیکن اس لڑائی میں بے گناہوں کا خون بہے گا ہاشم۔ ان بیمار بچوں اور عورتوں کا کیا قصور ہے جنہیں تم لوگوں نے قیدی بنایا ہوا ہے؟ ان کا لہو کس کی گردن پر ہوگا؟''

''یہ کھلی جنگ ہے مولانا..... اور جنگوں میں فوجیوں کے ساتھ شہری بھی مرتے ہیں۔ لیکن جو بے گناہ مریں گے، ان کو صلہ ملے گا۔ ان کی بخشش ہووے گی.....'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر دہاڑتی آواز میں بولا۔ ''اور میں ایک بار پھر سب کو وارننگ دیوت ہوں۔ اگر کل سویرے ہمیں یہاں سے نکلنے کی اجازت نہ دی گئی تو ہم ناپاک لوگن کی لاشوں کو صحن میں پھینکنا شروع کر دیویں گے اور سب سے پہلے مرے گا یہ بڈھا لی وان.....''

بڈھا لی وان..... اس کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجتی محسوس ہوئی۔

ڈاکٹر لی وان وہ شخص تھا جو اپنی خداداد قابلیت کے ساتھ مقامی لوگوں کی بے لوث خدمت کر رہا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے جسم کو گھسیٹتا ہوا اس دور دراز علاقے میں اپنے کسی ذاتی مطلب سے نہیں پہنچا تھا۔ اس کی ہمت کی داد دینا پڑتی تھی۔ ایک موقع پر آفتاب نے اسے اسپتال سے بحفاظت نکال دینے کی آفر کی تھی لیکن اس نے اپنے عملے اور اپنے مریضوں کو چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اکثر قابل ترین لوگوں کی طرح کچھ سنکی اور موڈی تھا مگر اس کی ان کیفیات میں بھی ایک طرح کی خوب صورتی تھی۔ اور اب چھوٹے ڈاکٹر راج کی طرح ڈاکٹر لی وان بھی موت کے دہانے پر تھا۔ صورتِ حال ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ گمبھیر ہو چکی تھی۔

میگافون پر ہونے والی بات چیت ختم ہو چکی تھی۔ ہم بھی چھت سے نیچے آگئے۔ گھر کے اندر خوش گوار حرارت موجود تھی۔ چمپی نے ہمارے بستر لگا دیے تھے اور انگیٹھی وغیرہ دہکا دی تھی۔ وہ پرکشش صورت اور جسم کی مالک تھی۔ بھرت کے ارد گرد وہ یوں رہتی تھی جیسے کوئی داسی دیوتا کے گرد پروانہ وار منڈلاتی ہے..... اس کی نگاہیں جیسے ہر وقت اپنے دیوتا کے چرن چھوتی رہتی ہیں۔ بھرت نے ہمیں بتایا تھا کہ اپنے پتا کی طرح وہ بھی چکنی مٹی اور چونے وغیرہ سے بڑے خوب صورت مجسمے بنا لیتی ہے۔ اس کا پتا ان مجسموں کو بیچ دیتا ہے اور اس رقم سے چمپی کا جہیز بناتا ہے۔

مجسموں کی بات چلی تو بھرت نے ہمیں چمپی کے بنائے ہوئے چند STATUE دکھائے۔ جوتیاں گانٹھتا ہوا موچی، کھیت میں ہل چلاتا ہوا کسان، پن گھٹ سے پانی لاتی ہوئی عورت..... یہ واقعی خوب صورت کام تھا۔ بھرت نے یہ مجسمے ایک چوبی الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ عمران کی عقابی نظر نے دیکھ لیا کہ الماری میں ایک چور خانہ بھی ہے اور غالباً اس میں بھی مجسمے رکھے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بھرت بھیا! کیا وہاں کچھ خاص نمونے ہیں؟''

بھرت نے دو لمحے توقف کیا پھر مسکرا کر بولا۔ ''اب آپ دونوں سب کچھ جان ہی چکے ہیں تو یہ بھی دیکھ لیں۔''

اس نے ایک چابی سے چور خانہ کھولا۔ اس میں وہ مجسمے تھے جو غالباً چمپی نے جذبات میں ڈوب کر بنائے تھے۔ یہ ایک دیوتا کے لیے ایک داسی کی بے مثال محبت اور خود سپردگی کی تصویر پیش کرتے تھے۔ شاید یہ مجسمے بناتے ہوئے چمپی خود بھی شرمائی تھی اور اس کی یہ شرم داسی کے خوب صورت چہرے پر بھی نقش ہوگئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھرت نے اصرار کر کے چمپی سے یہ مجسمے بنوائے ہوں۔ تین چار مجسمے COUPLE STATUES کی شکل میں تھے۔ ان میں داسی قریباً عریاں نظر آتی تھی۔ وہ اپنے دیوتا کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی۔ کہیں اسے اپنے پرکشش جسم کی نذر پیش کر رہی تھی۔ کہیں اس کی آغوش میں تھی۔

غالباً ایسے ہی خیالات عملی زندگی میں بھی چمپی کے رہے ہوں گے۔ ہم اس کی ایک جھلک رات کے وقت گنے کے کھیت میں دیکھ چکے تھے۔ وہ اپنے بابا کی نگاہ بچا کر وہاں پہنچی تھی اور بھرت سے ہم آغوش ہوئی تھی۔ ان دونوں کے تعلقات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر بھرت چاہے تو وہ اپنی اس شوخ و شنگ خادمہ کو کسی بھی وقت اپنی ''بھرپور خدمت'' پر آمادہ کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا چاہتا نہیں تھا۔ وہ اس سے پیار کرتا تھا اور اسے پوری عزت کے ساتھ بیاہ کر ایک اچھی مثال قائم کرنا چاہتا تھا۔

کچھ اور مجسمے بھی چور خانے میں موجود تھے لیکن یہ جذبات انگیز مجسمے نہیں تھے۔ یہ تو سیدھے سادے دیوی دیوتاؤں کے STATUE تھے۔ درگا دیوی، لکشمی دیوی، کرشن، لکشمن، ہنومان وغیرہ۔

میں نے کہا۔ ”ان بے ضرر مجسموں کو کیوں چھپا کر رکھا ہوا ہے؟“

بھرت بولا۔ ”اس لیے کہ یہ جیبی نے بنائے ہیں۔ وہ نچلی ذات کی ہے۔ دھرم کے ٹھیکے داروں سے یہ آگیا تا ہیں دیتے کہ وہ دیوی دیوتاؤں کو ہاتھ لگائے۔ وہ شوق پورا کرنے کے لیے چوری چھپے ایسا کام کرتی ہے۔“

باہر کسی تاریک گلی سے کتے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ وہی کتا تھا۔ عمران نے بھرت سے کہا۔ ”یار! یہ کتا زخمی ہے۔ اس کے گلے میں شاید شرارتی لڑکوں نے بہت کس کر رسی باندھ دی تھی۔ یہ مرنے کے قریب تھا۔ ہم نے کھیت میں اس کی رسی کھولی تھی۔ اگر ہو سکے تو کسی نوکر کو بھیج کر اسے اندر بندھوا دو اور اس کی مرہم پٹی کرا دو۔ یہ بڑا پُن کا کام ہے۔“

بھرت نے کہا۔ ”ہاں، میں نے بھی کل اسے دیکھا تھا۔ چلو میں کسی نوکر سے کہتا ہوں۔ ویسے لگتا ہے کہ تم کو جانوروں سے کافی پریم ہے؟“

”ہاں .... کچھ ایسا ہی ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو یہ بے پر کی بھی اڑاتے ہیں کہ میں پہلے ایک جانور تھا یعنی بندر .... پھر ڈھائی تین کروڑ سال میں آہستہ آہستہ بندہ بن گیا۔ یعنی بندر کی ”ر“ اڑ گئی اور ”ہ“ لگ گئی۔ غور کریں تو اب بھی بندے کے لفظ میں تین چوتھائی حصہ بندر کا ہی ہے.... اور کچھ لوگوں میں تین چوتھائی عادتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔“ اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا، شاید بحث کے موڈ میں تھا۔ بہرحال میں نے اسے نظر انداز کیا۔

بھرت مسکرایا۔ ”تمہاری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں شیام بھائی۔“

بھرت کے باہر جانے کے بعد میں اور عمران ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ جو کچھ اسپتال میں ہو رہا تھا، بہت تکلیف دہ تھا۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک سلطانہ مطمئن اور پُرسکون نظر آرہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید تین رات پہلے فتح پور کے پرانے مندر سے سنگین واقعات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ اب رک جائے گا اور وہ موت کے گھیرے سے نکل کر پھر آزاد فضاؤں میں پہنچ سکے گی۔ اس ہٹ دھرم ہاشم عرف باشو نے ایک بار پھر صورتِ حال کو دور رس گمبیر بنا دیا تھا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا اندازہ ہے؟ کیا مسٹر اینڈرسن اور پانڈے وغیرہ ہاشم کی یہ بات مان لیں گے کہ وہ ماریا سمیت یہاں سے نکل جائے؟“

”نہیں .... لگتا ہے کہ وہ نہیں مانیں گے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ اگر ہاشم رازی اتنے سخت گھیرے میں بھی ان کی بات نہیں مان رہا تو پھر وہ ٹل پانی کی سرحد پر پہنچ کر بھی نہیں مانے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ خون خرابا ہوگا؟“ میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

”آثار تو ایسے ہی ہیں۔“

”اس کو روکنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں عمران؟ کیا ہم خاموش تماشائی بنے رہیں گے؟“

”نہیں، کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔“

ہم رات کو بہت تھوڑی دیر کے لیے سوئے۔ صبح سویرے بھرت کی زبانی ایک خبر ملی جو بڑی اندوہناک تھی۔ معلوم ہوا کہ شعلہ صفت ہاشم نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا ہے اور ڈاکٹر لی وان کے سر میں دو گولیاں اتار کر اس کی لاش چھت پر سے صحن میں پھینک دی ہے۔ وہ شخص اپنی جان کی بازی ہار گیا تھا جس نے بے لوث جذبے کے ساتھ اس راجواڑے کے بے شمار لوگوں کی جانیں بچائی تھیں۔ ہمارے دل غم سے لبریز ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے وہ مناظر گھومنے لگے جب عمران ڈاکٹر کو ٹل پانی سے زبردستی فتح پور لے کر آیا تھا تاکہ وہ میری گردن میں سے الیکٹرانک چپ نکال سکے۔ شروع میں ڈاکٹر بے حد سیخ پا ہو رہا تھا اور اس نے کمرے سے چیزیں اٹھا اٹھا کر عمران کو مارنا شروع کر دی تھیں۔ مگر جب عمران نے بڑے اسٹائل سے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ لی تھی تو وہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور پھر اس نے اپنی تمام توجہ اور مہارت میری گردن کے آپریشن پر صرف کر دی تھی۔

ہم کتنی ہی دیر خاموش اور آزردہ بیٹھے رہے۔ یہ کیفیت اس بوڑھے ناتواں شخص کے لیے تھی جس نے دلیری سے موت کو گلے لگایا تھا۔ ڈوبتے ہوئے جہاز کے کپتان کی طرح اس نے شدید خطرے کے وقت اپنا اسپتال اور اپنے مریض چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور موت کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ بھرت کے مطابق وہ پورے دو دن سے بھوکا پیاسا اپنے مریضوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں اس نے فوزیہ نامی ایک کم سن بچی کے گلے کا آپریشن اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ اب وہ ہم میں نہیں تھا۔ اس کی لاش گاؤں کے کھیا بلرام کی حویلی میں پڑی تھی اور سیکڑوں لوگ اس کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔

بھرت نے ہمیں چھوٹے ڈاکٹر کی موت کے بارے میں بھی تفصیل بتائی۔ چھوٹے ڈاکٹر راج سنہا کو کل رات مارا گیا تھا۔ بھرت نے بتایا کہ اب بہت سی باتیں کھل گئی ہیں۔ میم ماریا یہاں ڈاکٹر لی وان پر ڈورے ڈالنے آئی تھی۔ وہ اس سے کوئی خاص کام لینا چاہتی تھی لیکن لی وان کی طرف سے ناکام ہو کر اس نے چھوٹے ڈاکٹر راج کو اس کام کے لیے چنا۔

میں نے پوچھا۔ ”تم کس خاص کام کی بات کر رہے ہو؟“

بھرت گہری سانس لے کر بولا۔ ”ٹھیک سے تو پتا نا ہیں۔ لیکن جو لوگ اندر کی بات جانتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر لی وان کو سلطانہ کے پتی کے ٹھکانے کے بارے میں پتا تھا اور شاید چھوٹا ڈاکٹر راج بھی جانتا تھا۔ میم ماریا بھی اس کا ٹھکانا ہی جاننا چاہتی تھی۔ سامبر متا بلے میں اپنے سوتیلے بھائی جارج کی موت کے بعد سے وہ دیوانوں کی طرح سلطانہ کے پتی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ یہاں آکر ماریا کو جلد ہی پتا چل گیا ہوگا کہ ڈاکٹر لی وان اور طرز کا بندہ ہے اور اس کے ڈھب پر نا ہیں آوے گا۔ اس نے نوجوان ڈاکٹر راج پر اپنے حسن کا جال پھینکا اور کسی حد تک اسے گھیرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اسپتال کے ایک ملازم نے جانکاری دی ہے کہ یہ میم صاحب ایڑھ دو گھنٹے تک چھوٹے ڈاکٹر راج کے کمرے میں رہی تھی اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ مگر پھر اور ہی چکر چل گیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا جو آپ کے اور میرے سامنے ہے۔ چھاپا ماروں نے اسپتال کو یرغمال بنا لیا۔ چھوٹے ڈاکٹر کی موت شاید اسی کارن ہوئی کہ وہ میم ماریا کے حسن کا شکار ہو گیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ عمران نے پوچھا۔

”چھوٹے ڈاکٹر نے ماریا کی مدد کرنے کے لیے احمقانہ بہادری دکھائی اور رات پٹھان چھاپا مار سے رائفل چھیننے کی ناکام کوشش کی۔ سب کو وشواس ہے کہ اسی ناکام کوشش کی وجہ سے کل اسے گولی مارنے کے لیے چنا گیا تھا۔“

بھرت کی بات ختم ہوئی تو عمران نے کُرتے کی جیب سے ایک چھوٹا سا رقعہ نکال کر بھرت کو دیا۔ ”بھرت! یہ ایک بہت ضروری کام کرو۔ کسی طرح یہ پیغام انگریز افسر مسٹر اینڈرسن تک پہنچا دو۔“

”مسٹر اینڈرسن؟ کیا وہ تم کو جانت ہے؟“ بھرت نے پوچھا۔

”نہیں لیکن اس رقعے کو وہ ضرور اہمیت دے گا۔“ عمران نے کہا۔

”اس میں کیا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ بھرت بھی کچھ کھٹکا ہوا نظر آرہا تھا۔

عمران بھرت کو ایک طرف لے گیا۔ دھیمی آواز میں اسے کچھ سمجھایا۔ بھرت کی تشویش قدرے کم ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

”یہ سب کیا ہے عمران؟ تم کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے اطمینان سے کندھے اچکائے۔

”رقعے میں کیا لکھا ہے تم نے؟“

”کچھ خاص نہیں۔ میں نے اسے لکھا ہے کہ وہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی میرے ساتھ کر دے۔ میں اس کا داماد بن جاؤں گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ یہاں کے ہندوؤں سے تو پہلے ہی گوروں کی بنتی ہے، زیادہ دشمنی تو مسلمانوں سے ہی ہے۔ اس رشتے داری سے بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے گی اور میری یہ دیرینہ تمنا بھی پوری ہو جائے گی کہ کسی گوری چمڑی والی حسینہ کو .... سمجھ گئے ہو نا تم؟“ اس نے ایک آنکھ میچی۔

میں نے کہا۔ ”عمران! کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم مسخرے ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بے حس بھی ہو۔ وہاں اسپتال میں لاشیں گر رہی ہیں اور تم اوٹ پٹانگ بول رہے ہو۔“

”تم بھی تو سوال پر سوال کرتے ہو۔ کبھی اپنا دماغ بھی استعمال کیا کرو .... بلکہ میرے خیال میں تو یہ بات تمہارے دماغ شریف میں بھی آنی چاہیے تھی کہ اینڈرسن سے رابطہ کیا جائے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا عمران! کہیں ہم کسی مصیبت کو دعوت نہ دے لیں۔ کیا تم نے اینڈرسن کو یہاں اپنی موجودگی کے بارے میں بتایا ہے؟“

وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ”میں نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر میں بتا بھی دیتا تو کوئی زیادہ خطرے والی بات نہیں تھی۔ تم ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”حکم اور اس کے انگریز دوستوں میں بڑا اچھا بھائی چارہ ہے لیکن فی الوقت دونوں کی سوچ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ ہندو افسر اور سپاہی ہر صورت دھرم دشمن سلطانہ کو پکڑنا یا قتل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف انگریزوں اور انگریز افسروں کے

نزدیک سب سے اہم بات ماریا کی زندگی بچانا ہے۔ اور میں نے اینڈرسن کو جو رقعہ لکھا ہے، وہ اسی حوالے سے ہے اور اس کی تحریر اینڈرسن کے دل کو ضرور لگے گی۔"

"کیا کہا ہے تم نے؟"

"فی الحال بس اتنا بتایا ہے کہ وہ کسی بھی ہندو فوجی افسر یا سپاہی کو بتائے بغیر مجھ سے ملاقات کرے۔ میرے پاس اس کے لیے ایک بہت اہم اطلاع ہے اور اس اطلاع کا تعلق سلطانہ کے پتی تابش اور اس کے ساتھی عمران سے ہے۔"

"اوہ گاڈ...... یہ کیا کر رہے ہو تم۔ یہ تو بڑا رسک والا کام کر دیا ہے تم نے۔" میں کراہا۔

"رسک والا کام ہی تو ہم کرتے ہیں۔ پچاس فٹ کی بلندی پر ایک جھولے سے دوسرے پر بغیر جال کے چھلانگ لگانا، سر پر سیب رکھ کر چاقو سے نشانہ لینا، ریوالور کے چیمبر کو گھما کر تین چھ کا کھیل کھیلنا...... یہ سب کچھ رسک ہی تو ہے جگر! اور رسک ہی اپنی زندگی ہے۔ کیونکہ رسک سے آگے کامیابی ہوتی ہے۔" اس نے عجیب کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ وہ خطروں کا کھلاڑی تھا اور اس کھیل میں اس کی خوش قسمتی اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلتی تھی۔ اب پتا نہیں وہ کس موڈ میں تھا کہ انچارج انگریز افسر کو خط لکھ مارا تھا۔

عمران نے جو کچھ کیا تھا، اس کا نتیجہ میری توقع کے خلاف اور عمران کی توقع کے عین مطابق نکلا۔ قریباً پینتالیس منٹ بعد بھرت ہانپتا ہوا نمودار ہوا اور اس نے عمران سے کہا کہ مسٹر اینڈرسن اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

حویلی کی ڈیوڑھی کے پاس بھرت کی ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھے۔ بھرت نے خود کوچبان کی نشست سنبھالی اور گھوڑا گاڑی حویلی نما مکان کے پھاٹک سے نکل کر ایک طرف روانہ ہو گئی۔ دن چڑھ آیا تھا مگر ابھی گلیوں میں آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ اکا دکا افراد خالی ہاتھ یا لوٹے وغیرہ لیے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ مویشیوں کے ایک دو ریوڑ بھی کھیتوں کی جانب جاتے دکھائی دیے۔ ان کی گھنٹیاں اس ٹھٹھری ہوئی دھند آلود صبح میں ارتعاش پیدا کرتی تھیں...... کہیں کہیں تکلم کا کوئی باوردی فوجی بھی ٹہلتا نظر آ جاتا تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی گاؤں سے باہر نکلی اور ایک چھوٹے سیم نالے کے ساتھ چلتی چلتی کوئی نصف میل باہر آ گئی۔ کماد کی ایک فصل کے پیچھے جوار کے کٹے ہوئے کھیت میں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ یہ چاروں طرف سے بند تھی۔ اس کو لوڈر نما گاڑی کہا جا سکتا تھا...... ترپال کے ذریعے اسے چاروں طرف سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سفید فام ڈرائیور بیٹھا تھا۔ بھرت ہم دونوں کو اس کیچڑ آلود گاڑی میں لے گیا۔ ہم اندر چلے گئے اور وہ باہر کھڑا رہا۔ اس لوڈر کے اندر ایک چھوٹا سا آرام دہ صوفہ پڑا تھا۔ دو تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ صوفے پر پینتالیس اڑتالیس سال کا ایک بارعب فوجی افسر بیٹھا تھا۔ اس کے ہولسٹر میں چمک دار پستول لگا ہوا تھا اور منہ میں سگار تھا۔

اس نے ہمیں دھیان سے دیکھا۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں تحیر کے آثار ابھرے۔ اس نے یقیناً ہم دونوں کو پہچان لیا تھا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"ہیلو مسٹر آمران اور ہیلو مسٹر تابش۔" اس نے ہم دونوں کے نام بگاڑتے ہوئے کہا۔

"ہیلو مسٹر اینڈرسن۔" عمران نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔ "ویل ڈن...... ویل ڈن...... بہت اچھا کیا کہ تم نے ام سے رابتا (رابطہ) کر لیا۔ اور اس سے بھی زیادہ اچھا یہ کیا کہ ہام کو اکیلے میں بلایا۔ آئی ایم ریئلی امپریسڈ۔"

"اس میں خطرہ موجود تھا۔ مسٹر اینڈرسن...... لیکن ہمیں آپ کی فہم و فراست پر یقین بھی تھا۔ ہمیں امید تھی کہ آپ کا رویہ ہمارے لیے نرم ہو گا اور ہم اس سنگین سچویشن میں ایک دوسرے کے کام آ سکیں گے۔"

"وائی ناٹ...... وائی ناٹ۔ ہام کو خوشی ہوا کہ تم نے ایسا دلیری کا فیصلہ بنایا...... اور ہام کا خیال ہے کہ ہام تینوں انگلش میں بھی بات کر سکتا ہو گا۔"

"بالکل جی! اس میں ہم تینوں کو آسانی رہے گی۔" عمران نے انگلش میں کہا۔

اب گفتگو انگریزی میں ہونے لگی۔ عمران نے کہا۔ "جناب! اذرگاں کے مامبر مقابلے میں جو کچھ ہوا، وہ کھیل کا حصہ تھا۔ اس خونی کھیل میں کسی ایک کو تو ہارنا تھا۔ پھر بھی ان واقعات کا رنج ہے۔"

"چھوڑ دو...... ان باتوں کو اب چھوڑ دو۔ وہ سب ماضی کا حصہ ہے۔" اینڈرسن نے تیزی سے کہا۔ "اب ہمیں موجودہ صورت حال کو دیکھنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس میں سے کیسے بحفاظت نکل سکتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "آپ نے ہندوؤں کا رویہ تو ملاحظہ کر لیا ہو گا۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو ہر صورت سلطانہ کی موت چاہتے ہیں، چاہے اس کے لیے کچھ قیمت بھی دینی پڑے۔ یہاں آ کر ہمارا اور آپ کا مفاد ایک ہو گیا ہے۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے ہیں اور آپ مس ماریا کو...... اور انگلش آفیسر لوگ۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اس معاملے کو ہینڈل کرنے کا موقع دیں۔"

"تم کس طریقے سے ہینڈل کرنا چاہتے ہو؟"

"بات چیت کے ذریعے۔ اور اگر یہ طریقہ کام نہ آیا تو پھر کسی بھی طریقے سے...... تابش کا خیال ہے کہ سلطانہ اب شاید خود بھی وہاں سے نکلنا چاہتی ہے۔ اگر اسے کسی طرح پتا چل جائے کہ تابش یہاں موجود ہے اور اس معاملے کے حل کی کوشش کر رہا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اندر سے کوئی ایسی کوشش کرے جس سے بازی ہمارے حق میں پلٹ جائے۔"

"تم اندر کے لوگوں سے کس طرح رابطہ کرو گے؟" اینڈرسن نے اپنی بارعب آواز میں دریافت کیا۔

"آپ ہمیں اسپتال کے آس پاس کی کسی قریبی چھت تک رسائی دلا دیں۔ باقی ہم خود سنبھال لیں گے۔" عمران نے کہا۔ اس نے اینڈرسن کو یہ بات نہیں بتائی کہ اسپتال کے اندر رابطہ کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک واکی ٹاکی کا برا بھلا سہارا بھی موجود ہے۔ ہمارے اور مسٹر اینڈرسن کے درمیان یہ گفتگو قریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ اس دوران میں بھرت اور انگریز ڈرائیور باہر دھوپ میں بیٹھے رہے۔ اگر کوئی اس طرف آ بھی جاتا تو شاید یہی سمجھتا کہ کوئی صاحب بہادر رفع حاجت فرمانے کے لیے اس طرف آیا ہوا ہے۔

مسٹر اینڈرسن یہ یقین دہانی چاہتا تھا کہ ہم جو کچھ بھی کریں گے، اس میں ماریا کی زندگی کے لیے کسی طرح کا خطرہ موجود نہیں ہو گا۔ عمران نے اپنی بے مثال مدلل گفتگو کے ذریعے اینڈرسن کا یہ اندیشہ کافی حد تک کم کر دیا۔ دوسری طرف ہمیں اس یقین دہانی کی ضرورت تھی کہ مسٹر اینڈرسن یا اس کے دو چار قریبی انگریز ساتھیوں کے سوا کسی کو ہماری یہاں موجودگی کا علم نہیں ہو گا۔ اینڈرسن نے ہمیں یقین دہانی کرا دی۔ اس کے ساتھ ہی یہ عہد بھی کیا کہ اگر یہ معاملہ خیریت کے ساتھ طے ہو جاتا ہے اور ماریا باہر آ جاتی ہے تو وہ ہماری اور سلطانہ کی [illegible] واپسی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالے گا بلکہ کسی اور کو بھی نہیں ڈالنے دے گا۔ دراصل سلطانہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کا اصل خبط تو کٹر ہندوؤں پر ہی سوار تھا۔

گفتگو کے انجام تک اینڈرسن اچھے موڈ میں آ چکا تھا۔ اس نے مجھے اور عمران کو سگار پیش کیے۔ عمران نے شکریے کے ساتھ سگار قبول کر لیا۔ اینڈرسن پاٹ دار آواز میں بولا۔

"ہمارے دور میں برصغیر کے اندر جو کچھ بھی ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم نے وعدہ خلافیاں نہیں کیں۔ ہم نے کسی کو دوست بنایا تو اس کا ساتھ نبھایا۔ کسی کو جان کی امان دی تو اس کی حفاظت کی۔ اس کی ایک مثال آخری تاج دار بدرشے ظافر (بہادر شاہ ظفر) بھی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ وہ اپنے جرنیل بخت کے بلند بانگ دعوؤں سے متاثر ہو گیا اور اس کے ساتھ مل کر برٹش فوج کو دلی سے دور رکھنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ لیکن ہم نے چونکہ اس کی بیوی زینات محل (زینت محل) اور بچے کو جان کی امان دی ہوئی تھی، اس لیے سخت مشکلوں کے باوجود ان کی حفاظت کی اور انہیں ہندوستان کے بھڑکتے شعلوں سے نکال کر رنگون پہنچایا...... اور برادرز! یہ تو بس ایک مثال ہے......"

"ہم جانتے ہیں جی، آپ ایسی بہت سی مثالیں دے سکتے ہیں۔" عمران نے نیازمندی سے کہا۔ "ہم آپ پر ہمارا یہ بھروسا ہی ہے جس نے ہمیں اپنی جان خطرے میں ڈالنے اور آپ سے رابطہ کرنے پر آمادہ کیا ہے۔"

اینڈرسن نے عمران کو گہری نظروں سے دیکھا...... جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس کے لہجے کی تہ میں کوئی طنز وغیرہ تو نہیں۔ لیکن وہ عمران ہی کیا تھا جس کے اندر جھانکا جا سکتا۔ ہمارے اور اینڈرسن کے درمیان کئی تفصیلات طے ہوئیں۔ آخر یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ میں نے اس گفتگو میں بہت تھوڑا حصہ لیا تھا۔ اینڈرسن ہم دونوں سے تھوڑا تھوڑا متاثر ہوا تھا۔ عمران کی گفتگو اور حاضر جوابی نے اسے متاثر کیا تھا جبکہ میرے کریڈٹ میں میری جسمانی فٹنس تھی اور وہ تاریخی مقابلہ تھا جس نے جارج جیسے فائٹر کو خاک چٹوائی تھی۔ بہرحال، ہمارے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو کے دوران میں اینڈرسن کی آنکھوں میں احساس برتری کی وہی چمک نظر آئی تھی جو ہمارے جیسے محکوم ملکوں میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں کی نگاہوں میں سما جاتی ہے۔

...... شام سے پہلے ہی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ پھر بادل چھا گئے اور سردی میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم نے بھرت کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا...... یہ جان کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں کہ میں ہی وہ

شخص ہوں جو سلطانہ کا شوہر کہلاتا ہوں اور میں نے ہی زرگاں کے مقابلے میں راجواڑے کے شکتی دیوتا کو خاک و خون میں لوٹایا تھا۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ اس آگاہی کے بعد وہ ہم دونوں سے اور خصوصاً مجھ سے بہت مرعوب نظر آنے لگا تھا۔ وہ سیدھا سچا شخص تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر معذرت کے انداز میں کہا۔ ''اگر میں نے بے خبری میں کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دی ہو تو مجھے شما کیجیے۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اتنا بڑا شخص ہمارے گھر میں موجود ہے۔ ہمارا مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ راجواڑے کے ہزاروں لوگ ان ہوں گے جو آپ کی صرف ایک جھلک دیکھنا چاہتے ہوں گے۔''

میں نے بھرت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ میں کچھ خاص نہیں بھرت۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ یہاں کے لوگوں کی بد دعائیں اور آہیں تھیں جو جارج کو لے ڈوبی ہیں۔''

''کچھ بھی ہے تابش صاحب! آپ نے ایک مہان کام کیا ہے۔ یہ راجواڑہ آپ کی اس جیت کو مدتوں یاد رکھے گا۔''

عمران نے کہا۔ ''یار! تعریف کے دو بول میری طرف بھی پھینک دو۔ آخر میں نے بھی کچھ کردار ادا کیا ہے۔''

جواب میں بھرت نے کہا کہ آپ دونوں ہی تعریف کے قابل ہیں۔ عمران بولا۔ ''ہاں اب کچھ بیلنس ہوا ہے۔''

پروگرام کے مطابق ہم نے شام سات بجے تک تیاری کر لی۔ ہم نے اپنے کپڑے بدل لیے تھے۔ بھرت نے ہمارے لیے اپنے دو جوڑے فراہم کر دیے۔ سائزوں میں تھوڑا بہت فرق تھا لیکن گزارہ ہو گیا۔ ان شلواروں قمیصوں کے ساتھ جوتوں کا انتظام بھی بھرت کو کرنا پڑا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ایک بند گھوڑا گاڑی بڑی خاموشی کے ساتھ آئی اور ہمیں لے کر ایک جانب روانہ ہو گئی۔ اس میں ایک انگریز فوجی افسر موجود تھا۔ ہم رات کی تاریکی میں ایک مکان کے پچھواڑے رکے اور گاڑی سے اتر گئے۔ مکان کے عقبی دروازے کے ذریعے ہم گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دو تین روز پہلے ہی مکینوں سے خالی کرا لیا گیا تھا۔ گرد آلود سیڑھیاں چڑھ کر ہم چھت پر پہنچے۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ہم اسپتال کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اسپتال کی چھت اور اس گھر کی چھت کے درمیان محض ایک پچیس تیس فٹ چوڑا راستہ ہی تھا۔ ہم ایک برساتی نما کمرے میں آ گئے۔

عمران نے انگریز افسر ملیارڈ سے انگریزی میں گفتگو کی۔

''یہ بہت اچھا کام ہے۔ ہم کافی نزدیک آ گئے ہیں۔''

''لیکن بہت احتیاط بھی کرنا ہو گی۔'' ملیارڈ نے کہا۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہاں کھڑکی میں گولیوں کے تین چار سوراخ نظر آئے۔ ملیارڈ نے بتایا کہ پرسوں ذرا سے شک کی بنیاد پر پٹھان حملہ آور نے اس طرف گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ شاید کوئی اس طرف حرکت کر رہا ہے۔

''وہ اب بھی چھت پر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک بندہ تو ہر وقت چھت پر رہتا ہے۔ وہ گول ٹینکی دیکھ رہے ہو نا؟ اس کے پیچھے پوزیشن ہے اس کی۔ چاروں طرف نظر رکھتا ہے۔ اس کے پاس سیون ایم ایم رائفل ہے اور زبردست نشانہ ہے باسٹرڈ کا۔''

ملیارڈ اپنے ساتھ جو سامان لایا تھا، اس میں دو رائفلیں، ایک ٹیلی اسکوپ، ایک بڑی ٹارچ اور ایمونیشن وغیرہ تھا۔ ملیارڈ دو منٹ کے لیے نیچے گیا تو ہمیں آپس میں بات کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا۔ ''حیرت ہے یہاں ڈھائی تین سو فوجی موجود ہیں لیکن وہ دو دن تک اکیلے آفتاب کے خلاف کچھ کر نہیں پائے؟''

عمران نے کہا۔ ''اس کی بڑی وجہ تو بار یا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم نے آفتاب کی ہوا باندھ دی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ اندر آفتاب کے ساتھی موجود ہیں اور انہوں نے دھماکا خیز مواد نصب کر رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ..... یہ سب کچھ یہاں نہیں ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا ہمیں پتا ہے اور دوسروں کو نہیں۔ آفتاب کے پاس کوئی دھماکا خیز مواد تھا ہی نہیں اور یہی حقیقت ہمارے لیے آسانیاں پیدا کر سکتی ہے۔''

اچانک مجھے اور عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ہمیں توقع نہیں تھی کہ کام اتنی جلدی شروع ہو جائے گا۔ یکا یک پانی کی گول ٹینکی کے پیچھے سے کسی لڑکے یا جوان لڑکی کے ذبح ہونے سسکنے کی صدا آئی۔ اس کے ساتھ ہی ہاشم کی چنگھاڑتی ہوئی آواز گونجی۔ ''نو بج گئے ہیں۔ ایک اور بکرے کی قربانی کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اس بکرے کا کھوپڑا توڑ کر نیچے پھینک رہا ہوں۔ تم اپنی ضد نہیں چھوڑو گے تو ایسے ہی اپنے چہیتوں کی لاشیں گنو گے۔'' وہ میگا فون پر بول رہا تھا..... اسپتال کے اردگرد ہر طرف ہلچل نظر آئی۔

میں نے ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ ہلکی روشنی میں مجھے ایک چونکا دینے والا منظر نظر آیا۔ تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا تومند ہاشم کی گرفت میں تھا۔ ہاشم نے اس کی دبلی پتلی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ رکھی تھی اور اس کے سر سے رائفل کی نال لگا رکھی تھی۔ لڑکا کسی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ رو رہا تھا اور غالباً جان بخشی کے لیے منت سماجت بھی کر رہا تھا۔ اس کے خدوخال نے مجھے مزید چونکایا، وہ مقامی نہیں تھا۔ اس کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ شاید جاپانی ہے اور آج صبح قتل ہونے والے ڈاکٹر لی وان سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔

چند سیکنڈ بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ہاشم میگا فون پر پھر دہاڑا۔ اس نے گھیرا ڈالنے والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ جس کی لاش نیچے آ رہی ہے، یہ لی وان کا پوتا ہے۔ امید ہے کہ پوتے کو دیکھ کر دادا خوش ہو جاوے گا۔ اس کے بعد اس انگریز کی باری آوے گی...''

ہمیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ آنجہانی ڈاکٹر لی وان کے ساتھ اس کا کوئی عزیز بھی یہاں اسپتال میں پھنسا ہوا ہے۔ اب اس لڑکے کو دیکھ کر حقیقت کا پتا چل رہا تھا۔ روتا بلکتا لڑکا انگریزی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کا کوئی کوئی لفظ ہی سمجھ میں آتا تھا۔ وہ ہاشم رازی کو انکل کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور اس سے اپنی جان کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یقیناً اس سے پہلے اس نے خونچکاں لاشیں دیکھی تھیں جن میں اس کے دادا کی لاش بھی شامل تھی۔ موت کا خوف اس لڑکے کو پوری طرح جکڑے ہوئے تھا۔ وہ پاؤں سے ننگا تھا۔ سر پر پی کیپ تھی اور اس نے دھاری دار سویٹر پہن رکھا تھا۔

عمران نے بھی ٹیلی اسکوپ کے ذریعے یہ منظر دیکھا۔ یہ فیصلے کا وقت تھا۔ دوسری کئی لاشوں کی طرح یہ بچہ بھی لاش میں تبدیل ہو کر چھت سے احاطے میں گرنے والا تھا۔ ہاشم رازی کی آواز کی وحشت گواہی دے رہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت بچے کے سر میں گولی مار دے گا۔

میگا فون پر انگریز افسر اینڈرسن کی آواز گونجی۔ وہ گلابی اردو بول رہا تھا۔ اس نے ہاشم کو اس عمل سے باز کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں ہاشم نے کہا کہ وہ لوگ انہیں مع یرغمالیوں سمیت یہاں سے نکلنے کا راستہ دیں۔ اینڈرسن نے دوٹوک لہجے میں کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ''گورنمنٹ'' کے مطابق انہیں پہلے مار یا کو چھوڑنا پڑے گا۔ تاہم اس دوٹوک مؤقف کے ساتھ ساتھ اینڈرسن نے ہاشم سے صبح تک کی مہلت بھی مانگی تاکہ مزید مشورہ کیا جا سکے۔

مشورے کی بات پر ہاشم رازی ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ وہ دہاڑا۔ ''تم ذلیل دھوکے باز ہو۔ تمہارا مشورہ ہمیں صرف دھوکا دینے کے لیے ہے۔ تم اپنی چالیں چلنے کے لیے وقت چاہ رہے ہو اور یہ وقت میں تمہیں نا ہیں دوں گا۔ بالکل نا ہیں دوں گا۔''

وہ روتے چلاتے بچے کو کھینچ کر منڈیر کے قریب لے آیا۔ تاہم وہ دونوں ابھی تک پانی والی ٹینکی کی اوٹ میں

تھے۔ ہاشم اور اینڈرسن کے درمیان ہونے والے مکالمے کے دوران میں ہی عمران نے اسنیپر گن کے بیرل کو گن کے ساتھ اٹیچ کرلیا تھا۔ اس نے گن کو کھڑکی کی درز میں رکھا۔ ایک گھٹنا زمین پر ٹکایا اور آنکھ گن کی ٹیلی اسکوپ سے لگا دی۔ وہ ایک انتہائی قدم اٹھانے جارہا تھا۔ غالباً اس نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ اس قدم کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اب یہ منٹوں کا نہیں سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اگر ہم لڑکے کی جان بچانا چاہتے تھے تو پھر فوری ایکشن کی ضرورت تھی۔ اس ایکشن کے لیے ہم سب سے نزدیک اور مناسب ترین جگہ پر موجود تھے۔ سوال بس ایک ہی تھا۔ ہمیں ہاشم پر حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ یقینی بات تھی کہ عمران نے بھی اس بارے میں ضرور سوچا ہوگا۔ سنگین صورتِ حال میں وہ بہت تیزی سے فیصلہ کرتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین چار سیکنڈ کے اندر وہ اپنے اردگرد سے یکسر بے خبر ہوگیا۔ اسنیپر گن جیسے اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی انگلی لبلبی پر تھی اور آنکھ دوربین سے لگی ہوئی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک خطرناک ترین نشانہ لینے جارہا ہے۔ اسے اپنے ٹارگٹ یعنی ہاشم کا بہت تھوڑا حصہ نظر آرہا تھا اور جو آرہا تھا، وہ بھی تین چوتھائی لڑکے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنے والی ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ لڑکے کے سر کے پیچھے ہاشم کے سر کے بال اور نصف پیشانی ہی دکھائی دے پارہی تھی۔

”غلطی کی گنجائش نہیں ہے عمران۔“ میں نے سرگوشی کی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لکڑی کی طرح ساکت ہوچکا تھا۔

میں نے کہا۔ ”یہ بھی سوچ لینا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟“

اس نے سر کو موہوم سی حرکت دی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ سوچ لیا ہے۔

ہاشم چنگھاڑا۔ ”یہ لو سنبھال لو اس کو بھی۔“ اس کے ساتھ ہی شاید اس نے فائر کرنا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے عمران لبلبی دبا چکا تھا اور یہ کسی عام شخص کا فائر نہیں تھا۔ یہ وہ ماہر نشانہ باز تھا جو ہر شام سیکڑوں لوگوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا اور انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ وہ موت کا کھلاڑی تھا اور قسمت کی دیوی اس کے کندھوں پر سوار رہتی تھی۔

ٹیلی اسکوپ میری آنکھوں پر تھی۔ میں نے ہاشم رازی کو اچھل کر لڑکے سے الگ ہوتے اور پھر ٹینکی کے قریب گرتے دیکھا۔ لڑکا چلاتا ہوا چھت پر چکرانے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ غالباً چند لمحوں کے لیے اس نے یہ بھی سوچا کہ چھت سے نیچے چھلانگ لگا دے لیکن چھت بہت اونچی تھی۔ اسی دوران میں سیڑھیوں کی طرف سے آفتاب خاں لپک کر آیا اور دہشت زدہ لڑکے کو دبوچ کر تاریکی میں اوجھل ہوگیا۔

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”ہاشم مرگیا ہے۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی ہے۔“

”مجھے پتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کہیں آفتاب خاں مریضوں پر برسٹ نہ چلا دے۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ ایسا کرے گا لیکن اگر باہر سے کوئی حرکت ہوئی تو پھر وہ ضرور وحشی ہوجائے گا۔“

اسی دوران میں فیارڈ جھک کر دوڑتا ہوا اس برساتی نما کمرے میں آگیا۔ اس کے گلے میں بھی ٹیلی اسکوپ جھول رہی تھی۔ وہ ہانپی ہوئی لرزاں آواز میں بولا۔ ”بہت خوب! مجھے لگتا ہے کہ تمہاری گولی نے ہاشم کو ہٹ کیا ہے۔ وہ گرا پڑا ہے۔“

”لیکن تم لوگوں نے باہر سے کسی طرح کی کارروائی نہیں کرنی۔ ورنہ یہ لوگ سب کچھ بارود سے اڑا دیں گے۔ کچھ باقی نہیں بچے گا۔“ عمران نے کہا۔ فیارڈ اٹھا اور جھک کر دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔ یقیناً وہ عمران کا یہ پیغام اینڈرسن تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔

صرف دو تین منٹ بعد مسٹر اینڈرسن خود بھی ہمارے پاس چھت پر چلا آیا۔ وہ بھی ہانپا ہوا تھا۔ جوش کے سبب اس کا سرخ چہرہ تمتما رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”جناب! ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس شخص کی وجہ سے یہ کام زیادہ بگڑ گیا تھا، وہ ختم ہوگیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے پرانی شرطوں پر بات ہوسکتی ہے اور میرے خیال میں انہیں قائل بھی کیا جاسکتا ہے۔“

اینڈرسن نے کہا۔ ”میں خود بھی چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ بغیر کسی مزید خون خرابے کے حل ہوجائے۔ تم دونوں نے کہا تھا کہ تم ان لوگوں سے مذاکرات کرسکتے ہو۔ اگر تم تیار ہوتو میں تم دونوں کو اندر بھجوا سکتا ہوں لیکن... لیکن... یہ تمہارے لیے بہتر نہیں رہے گا۔ تم ہندو آفیسرز کے سامنے آنا نہیں چاہتے۔“ اس کی کشادہ پیشانی پر چند لمحے کے لیے سوچ کی لکیریں نظر آئیں پھر وہ تیزی سے بولا۔ ”میں ایک واکی ٹاکی کا انتظام کرتا ہوں۔ ایک سیٹ اندر بھجواتا ہوں، دوسرا تمہیں دے دیتا ہوں۔“

”میرے خیال میں یہ طریقہ ٹھیک رہے گا۔“ عمران نے کہا۔ پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

ہم اینڈرسن وغیرہ کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ ہمارے درمیان پہلے سے وائرلیس رابطہ موجود ہے۔ ویسے یہ رابطہ زیادہ قابلِ بھروسا بھی نہیں تھا۔ ہمارا ”سیٹ“ کسی وقت اڑیل ٹٹو کی طرح کوئی بات بھی مان کر نہیں دیتا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ کے اندر ایک اچھی حالت کا واکی ٹاکی ہمارے پاس آن موجود ہوا۔ اس کا دوسرا سیٹ اندر آفتاب خاں تک پہنچا دیا گیا تھا۔ عمران نے مسٹر اینڈرسن سے کہا۔ ”جناب! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آپ کا اور اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ آپ جلدی سے میرے لیے دو باتوں کی وضاحت فرمادیں۔“

”کہو۔“ اینڈرسن نے افسرانہ شان سے جواب دیا۔

”پہلی بات تو یہ جناب کہ آپ کا اور ہمارا مفاد اس وقت ایک ہی ہے۔ ہم اس معاملے کو اس طرح حل کرنا چاہتے ہیں کہ محترمہ ماریا اور سلطانہ دونوں کی زندگی بچ جائے۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ اس حوالے سے ہمارا ارادہ کتنا مضبوط ہے۔ اندر موجود لوگوں میں سے بدترین شخص کو ہم نے شوٹ کردیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے بات چیت نسبتاً آسان ہوگئی ہے۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں ہم پر اعتماد کریں اور ہمیں یہ بات چیت تنہائی میں کرنے کی اجازت دیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں یا مسٹر فیارڈ یہاں موجود نہ ہوں؟“

”بہت معذرت کے ساتھ میرا مطلب یہی ہے جناب! یوں ہمیں بات چیت کرنے میں زیادہ آسانی رہے گی۔“

اینڈرسن چند لمحوں کے لیے متذبذب نظر آیا۔ پھر اس نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر ہامی بھرلی۔ عمران نے کہا۔ ”بعد میں، میں آپ کو ساری بات چیت سے تفصیلاً آگاہ کردوں گا جناب۔“

”اوکے... اوکے! دوسری بات کیا ہے؟“ اینڈرسن نے پوچھا۔

”ہم ان سے ”کمٹمنٹ“ کی بات کریں گے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ اپنے وعدے کی پاسداری کریں۔ باہر سے بھی پاسداری ہوگی۔ اگر وہ محترمہ ماریا کو چھوڑ دیتے ہیں تو انہیں یہ رعایت دی جائے گی کہ وہ باقی یرغمالیوں کو کھلے پانی کی حدود میں پہنچنے کے بعد آزاد کریں۔ اور کھلے پانی پہنچنے تک ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔“

”بالکل... تم لوگ ان سے اس ”کمٹمنٹ“ کی بات کرسکتے ہو۔ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے ایک بار پھر گارنٹی دیتا ہوں کہ اگر وہ مس ماریا کو رہا کردیں تو ہم بھی اپنے عہد کی پاسداری کریں گے۔ یہ پاسداری ہم پہلے بھی کر رہے تھے۔ جو کام بھی خراب ہوا ہے، وہ ہماری طرف سے نہیں ان کی طرف سے ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے پیش امام صاحب کو زبان دے کر اس سے روگردانی کی۔ ان کے لیے شرمندگی کا باعث ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جناب! اس ساری صورتِ حال کا ذمے دار وہ اکیلا شخص تھا جو ابھی دس منٹ پہلے مارا گیا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ اینڈرسن نے کہا۔ ”ہماری اور تم دونوں کی توقعات ٹھیک ثابت ہوں۔ میری اور محترم حکم جی کی طرف سے تم انہیں معاہدے کی پاسداری کی پوری ضمانت دے سکتے ہو۔“

طے شدہ پروگرام کے مطابق اینڈرسن نیچے چلا گیا۔ تاہم اس کا ماتحت آفیسر فیارڈ اور دو انگریز رائفل مین چھت پر ہی رہے لیکن وہ برساتی نما کمرے کے اندر نہیں تھے۔ یوں ہم اپنی مرضی سے آفتاب اور سلطانہ وغیرہ سے بات کرسکتے تھے۔ حالانکہ اس بات کا اندیشہ بھی موجود تھا کہ کسی ذریعے سے اینڈرسن وغیرہ ہماری بات چیت سن نہ لیں۔

عمران نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا خیال ہے اپنی طرف سے آفتاب کو مسٹر اینڈرسن وغیرہ کی ضمانت دی جاسکتی ہے؟“

”اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ویسے سنا تو یہی تھا کہ یہ گورا اینڈرسن وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ شاید تم ہی نے بتایا تھا۔“

”اور مجھے گیتا نکھی نے بتایا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے اور درات رات کا مزہ لیا ہوا ہے۔ شاید اس نے اپنا کوئی ذاتی تجربہ بیان کیا ہو۔“

”عمران! میرے خیال میں ہمیں اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ تم بات کرو آفتاب سے۔“

عمران نے واکی ٹاکی آن کیا۔ پہلی ہی کوشش میں آفتاب سے رابطہ ہوگیا۔ اس کی دہاڑتی آواز سنائی دی۔ ”تم لوگوں نے اپنی موت پر خود مہر لگا لی ہے۔ اب ہم کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کتے کا موت مارے گا سب کو اور سب

سے پہلے یہ بھینسے کے منہ والا تمہارا گورا افسر مرے گا۔۔۔"

عمران نے کہا۔ "میں عمران بول رہا ہوں آفتاب۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ۔۔۔"

"ام اب کسی کا بکواس سننا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں نے ہاشم صاحب کو شہید کر دیا ہے۔ اب ان کو بھی موت کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ ام ان کو صرف ایک گھنٹے کا مہلت دیتا ہے۔ یہ لوگ یہاں سے امارے جانے کا انتظام کرے۔ ورنہ چارپائی لے کر آئے اور احاطے میں سے اپنے ذلیل افسر کا لاش اٹھا کر لے جائے۔ صرف ایک گھنٹا۔۔۔ پورے ساٹھ منٹ۔" مہلت کی بات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہاشم کی نسبت آفتاب خاں میں لچک موجود ہے۔

عمران نے دھیمے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "آفتاب خاں! میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ ہاشم صاحب کا رویّہ ایک دم بہت سخت ہو گیا تھا۔ شاید ان کی جان جانے کی وجہ بھی یہی ہے۔ انہوں نے امام صاحب کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ اپنی طرف سے پوری گارنٹی دے رہے تھے۔"

آفتاب گرجا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، ام اس میم کو چھوڑ دے گا تو یہ ام پر حملہ نہیں کرے گا؟ یہ ایک سیکنڈ کا دیر نہیں لگائے گا اور امارا تکا بوٹی کر دے گا۔ اس گورے افسر کا زیادہ اہمیت نہیں ہے ان لوگوں کی نظروں میں۔"

"اہمیت ہے آفتاب۔۔۔ اہمیت ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "ابھی پانچ منٹ پہلے یہاں کے انچارج افسر اینڈرسن سے ہماری بات ہوئی ہے۔ وہ ہر صورت میں اپنے اس بندے کو بچانا چاہتے ہیں۔ پھر بہت سے دوسرے لوگ تمہارے پاس اندر موجود ہیں۔ ان لوگوں کے بے شمار وارث یہاں دھرنا دیے بیٹھے ہیں۔ ان کو ہر صورت اپنے عزیز زندہ چاہیے ہیں۔ وہ افسروں پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں۔ لی وان کا پوتا بھی تمہارے پاس موجود ہے۔ ماریا کو چھوڑنے کے بعد بھی تمہیں کچھ خاص گھاٹا نہیں ہونے والا ہے۔"

عمران بولا۔ "اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہم نے مسٹر اینڈرسن کے ذہن کو پوری طرح ٹٹولا ہے۔ اس کا ارادہ یہی ہے کہ اگر ماریا کو یہاں رہا کر دیا جائے اور باقی لوگوں کو نل پانی کے اندر جا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔"

"ام کیسے یقین کر لے اس بات پر؟ اس انگریز کے دماغ کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔" آفتاب کے لہجے میں تلخی برقرار تھی۔

میں نے کہا۔ "تم ہماری بات پر اس لیے یقین کرو کہ یہ مسئلہ جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی ہمارا بھی ہے۔ میں سلطانہ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے، میرے بچے کو اس کی ضرورت ہے۔"

"کچھ بھی ہے۔ ام یہاں سے نکلنے سے پہلے اس سفید کتیا کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی صورت نہیں۔" اس کے الفاظ سخت تھے لیکن لہجے میں تھوڑا سا ڈھیلا پن بھی محسوس ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ "تم سلطانہ سے مشورہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی خون خرابا نہیں چاہے گی۔ کیا تم اس سے میری بات کرا سکتے ہو؟"

"بالکل نہیں۔ وہ نیچے ہے۔ وہاں سے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ہل سکتا۔" آفتاب نے کہا۔

میرے، عمران اور آفتاب کے درمیان یہ گفتگو قریباً آدھ گھنٹا جاری رہی۔ ہاشم رازی کی اچانک موت کے غم نے آفتاب کو ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ہاشم رازی کا رویّہ غیر معمولی طور پر سخت تھا۔ غالباً یہ رویّہ آفتاب اور سلطانہ کے لیے بھی اچنبھے کا باعث بنا تھا۔ آفتاب یقیناً ہاشم رازی کی موت کی وجہ انگریز اور ہندو فوجیوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اسے اسپتال کے ساتھ والی چھت سے ہم نے شوٹ کیا ہے۔

ہاشم اس سارے "سین" میں آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح رخصت ہو گیا تھا۔ اب اس ساری صورتِ حال میں فیصلے کی طاقت ایک بار پھر آفتاب کے پاس تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے والا فیصلہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یعنی ماریا کو چھوڑنا اور باقی یرغمالیوں کے ساتھ روانہ ہونا۔

قریباً دس منٹ بعد آفتاب نے ہم سے واکی ٹاکی پر رابطہ کیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے خود رابطہ کیا تھا۔ ایک بار پھر ہمارے اور اس کے درمیان گفت و شنید شروع ہوئی۔ وہ سمجھوتے کے مطابق ماریا کو چھوڑنے پر رضامند تو تھا لیکن ایک شرط کے ساتھ اور وہ شرط بھی کچھ اتنی زیادہ سخت نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسپتال کے احاطے سے نکلتے وقت اپنے ساتھ دس یرغمالی بٹھائے گا، ان میں زخمی انگریز اور لی وان کا پوتا بھی شامل ہوں گے۔ ان میں کوئی عورت نہیں ہو گی۔ یہ سب کچھ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ نئی شرط یہ تھی کہ احاطے سے نکلتے ہوئے ماریا بھی ان کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گی۔ بہرحال، گاؤں سے باہر نکلنے کے فوراً بعد وہ ماریا کو گاڑی سے اتار دے گا۔

آفتاب کی یہ نئی شرط فوری طور پر قابلِ قبول نہیں تھی تو اسے ناقابلِ قبول بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس بارے میں انگریز افسروں سے بات کی جا سکتی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ شاید وہ یہ شرط مان بھی جائیں گے۔

غالباً آفتاب خاں کو اندیشہ تھا کہ یرغمالیوں کے ساتھ اسپتال کے اندر سے نکل کر گھوڑا گاڑی میں سوار ہونے کا مرحلہ خاصا مشکل ہوگا۔ وہ اچانک حملے کے خطرے سے دوچار ہوں گے۔ اس کے بعد جب وہ گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں کی گلیوں سے گزریں گے تو تب بھی خطرے میں ہوں گے۔ لیکن گاؤں سے نکل کر کھلے راستے پر پہنچنے کے بعد وہ نسبتاً محفوظ ہو جائیں گے۔ تب وہ ماریا کو اتار دے گا۔

ہم نے آفتاب خاں سے پندرہ منٹ کا وقت لیا اور واکی ٹاکی پر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہم نے آفیسر خیارڈ سے کہا کہ وہ اینڈرسن صاحب کو یہاں بلا لائے۔ خیارڈ گیا اور پانچ منٹ میں اینڈرسن کو لے آیا۔ اینڈرسن اور خیارڈ وغیرہ کی یہ ساری آمد و رفت بڑی رازداری سے ہو رہی تھی۔ ہندو آفیسر اور فوجی اس سارے معاملے سے بے خبر تھے۔ عام لوگوں کو بھی اس بات کی بھنک نہیں پڑنے دی گئی تھی کہ اس رہائشی مکان کی چھت پر کون موجود ہے اور یہاں کس طرح کے مذاکرات چل رہے ہیں۔

عمران نے پُرامید لہجے میں کہا۔ "جناب اینڈرسن صاحب! ہمارا خیال ہے کہ یہ معاملہ حل کے قریب آ گیا ہے۔ بس ایک چھوٹی سی رکاوٹ ہے۔ ہاشم کی موت کے بعد اس کے ساتھیوں نے ایک چھوٹی سی شرط رکھی ہے۔ وہ اپنے تحفظ کے حوالے سے زیادہ محتاط ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ محترمہ ماریا کو اسپتال میں نہیں بلکہ گاؤں سے باہر کھلی جگہ پر نکل کر چھوڑیں گے۔"

"کھلی جگہ سے کیا مطلب ہے؟" اینڈرسن نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ گاؤں کی آبادی سے نکلنے کے فوراً بعد۔" میں نے جواب دیا۔

اینڈرسن نے سگار کے دو طویل کش لیے پھر بولا۔ "تم دونوں کا کیا خیال ہے، اس میں کوئی چکر بازی تو نہیں ہو گی؟"

"میں نے تفصیلی بات کی ہے۔" عمران نے کہا۔ "ہاشم کی موت کے بعد وہ لوگ کچھ ڈرے ہوئے ہیں۔ شاید انہیں خطرہ ہے کہ گاڑی میں منتقل ہونے کے دوران میں ان پر حملہ نہ ہو جائے۔"

میں نے کہا۔ "مسٹر اینڈرسن! آپ ان معاملوں میں زیادہ بہتر فیصلہ دے سکتے ہیں لیکن جو چیز مجھ جیسے بندے کو بھی نظر آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ پورا گاؤں فورس کے گھیرے میں ہے۔ عمارت کے اندر کی نسبت گھوڑا گاڑی میں ان لوگوں کی پوزیشن کہیں زیادہ کمزور ہو گی۔ اگر وہ گاؤں سے نکلتے ہی محترمہ ماریا کو رہا کرنے کی بات کر رہے ہیں تو یہ سمجھ میں آتی ہے۔"

اس معاملے میں ہمارے درمیان چند منٹ بات ہوئی۔ دو چار منٹ کے لیے سیکنڈ آفیسر خیارڈ بھی اس میں شامل ہوا۔ آخر طے ہوا کہ اگر حملہ آور باقی ساری شرائط مان رہے ہیں تو ان کو یہ گنجائش دے دی جائے۔ اینڈرسن وغیرہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ اندر دو سے زیادہ حملہ آور موجود ہیں۔

اینڈرسن کی موجودگی میں ہی ہم نے واکی ٹاکی پر آفتاب خاں سے رابطہ کیا۔ اس رابطے میں ساری تفصیلات طے ہو گئیں۔ ہم نے آفتاب کو بتایا کہ دو گھوڑوں والی بڑی گھوڑا گاڑی تیار ہے۔ دو اضافی گھوڑے بھی موجود ہیں۔ راستے کے لیے راشن وغیرہ بھی مہیا کیا جا رہا ہے۔

آفتاب بولا۔ "ٹھیک ہے، ام آدھ گھنٹے کے اندر اندر تیس عورتوں اور مردوں کو چھوڑ دے گا۔ دس بندہ امارے ساتھ رہے گا۔ ام ایک بار پھر سب لوگوں کو بتانا چاہتا ہے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی حرکت ہوا تو ان سب میں سے کوئی ایک بھی زندہ حالت میں نہیں ملے گا۔"

اینڈرسن کے اشارے پر عمران نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم ماریا یا آفیسر ٹام سے بات کرا سکتے ہو؟"

"نہیں، ابھی کسی سے بات نہیں ہو سکتا۔" اس نے بھڑک کر کہا۔ "ابھی تم فوجیوں سے کہو کہ وہ گھوڑا گاڑی کو احاطے میں لے کر آئیں اور برآمدے کے پاس بائیں طرف کھڑا کر کے باہر نکل جائیں۔ پھاٹک کے سامنے اور آس پاس کوئی کالا گورا فوجی نہیں ہونا چاہیے۔ پوری تسلی ہونے کے بعد ہی ام لوگوں کو چھوڑے گا۔"

آدھ گھنٹے کے اندر اندر یہ سب کچھ ہو گیا۔ آفتاب نے ایک بار پھر چھت پر چڑھ کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ ہمیں واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پانی والی گول ٹینکی کے پیچھے بس اس کے ہیولے کی جھلک ہی دکھائی دیتی تھی۔ ہاشم کی اچانک موت کے بعد وہ زیادہ محتاط ہو چکا تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق ہاشم کی لاش بھی ابھی تک ٹینکی کے آس پاس ہی پڑی تھی۔

آفتاب نیچے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہم نے دھڑکتے دلوں کے ساتھ دیکھا کہ اسپتال کا ایک اندرونی دروازہ کھلا اور ایک قطار میں کچھ لوگ باہر نکلے۔ ان میں چھ سات عورتیں اور تین بچے بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کی کُل تعداد تیس کے قریب رہی ہوگی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھا۔ ان میں سے کچھ افراد زخمی بھی تھے۔ ایک مریض کی ٹانگ پر پلاسٹر تھا اور وہ بیساکھی کے سہارے باہر آرہا تھا۔ قریباً بہتر گھنٹے کے اعصاب شکن دباؤ کے بعد ان لوگوں کو کھلی ہوا میں سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ ان کا یہ سفر موت سے زندگی کی طرف تھا۔ وہ احاطے میں پہنچے اور باہر نکل آئے۔ پھاٹک سے پچیس تیس میٹر کی دوری پر ان کے لواحقین موجود تھے۔ وہاں رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ایک فاقہ زدہ یرغمالی عورت جس کا شوہر آفتاب خاں کی گولی کا شکار ہوکر مر گیا تھا، باہر آکر بے ہوش ہوگئی اور لوگ اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔

صبح چار بجے کے قریب وہ مرحلہ شروع ہوا جس کا ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا۔ آفتاب خاں نے واکی ٹاکی پر بتایا۔ ”ام لوگوں کو لے کر باہر نکل رہا ہے۔ ام ایک بار پھر کہہ رہا ہے کہ احاطے کے آس پاس اور پھاٹک کے قریب کسی کو موجود نہیں ہونا چاہیے۔“

”کوئی موجود نہیں ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”اور تم سے بھی گزارش ہے کہ خود کو پُرسکون رکھو۔ اب جو کچھ ہونا ہے، وہ سب طے ہے۔ کوئی چکر، کوئی چالبازی اب یہاں نہیں ہے۔“

چند منٹ بعد ہم نے چھت پر سے اسپتال کے برآمدے کا منظر دیکھا۔ نیازو بھی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اندرونی دروازہ کھلا اور یرغمالیوں کی قطار باہر نکلی۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے چل رہے تھے۔ ان میں ہمیں ڈاکٹر لی وان کا سہا ہوا پوتا بھی نظر آیا۔ سب سے آخر میں ماریا تھی۔ اس کے ہاتھ بھی پشت پر کَسے گئے تھے۔ آفتاب نے اپنی طاقتور سیون ایم ایم کی نال اس کی پشت سے لگا رکھی تھی۔ یقیناً اس رائفل کے دو تین برسٹ چند سیکنڈ میں ان دس گیارہ یرغمالیوں کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ پھر ہم نے سلطانہ کو دیکھا۔ اس کا یہ روپ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چادر میں اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی نال کی رائفل تھی۔ اس کا رائفل تھامنے کا انداز اور اس کا اعتماد بتاتا تھا کہ وہ اسلحہ شناس ہے اور بوقتِ ضرورت اسے بے دریغ استعمال بھی کر سکتی ہے۔ وہ یرغمالیوں کی قطار کی دائیں جانب تھی۔ صرف زخمی انگریز آفیسر نام وہ شخص تھا جس کے ہاتھ پشت کے بجائے سامنے کی طرف باندھے گئے تھے۔ ٹیلی اسکوپ میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے کندھے پر گہرا زخم ہے۔ وہ لنگڑاتا ہوا بہ مشکل چل پا رہا تھا۔

یرغمالیوں کی قطار احاطے میں کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھی۔ یہ بے حد تناؤ بھرے لمحے تھے۔ اسپتال کے اردگرد گلیوں میں اور گھروں کی چھتوں پر سیکڑوں سپاہی اور گارڈز موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے براہِ راست یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ابھی پہلا یرغمالی گھوڑا گاڑی میں داخل ہوا تھا کہ وہ کچھ ہوا جس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ میں نے آفتاب کو ایک دم لڑکھڑاتے اور جھکتے دیکھا... اس کے ساتھ ہی آفتاب نے اپنی رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ تڑتڑ کی لرزہ خیز آواز گونجی۔ کئی گولیاں ماریا کے جسم کے آر پار ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی سلطانہ نے بھی اوپر تلے فائر کیے۔ میں نے یرغمالیوں میں سے کم از کم دو افراد کو زمین بوس ہوتے دیکھا۔

ایک دم کہرام مچ گیا اور شب کا سناٹا چنگھاڑتی آوازوں سے چکناچور ہوگیا۔ کئی طرف سے فائر ہونے لگے۔ میں نے دیکھا کہ زخمی آفتاب تیزی سے رینگتا ہوا ایک طرف اوجھل ہوگیا ہے۔ رائفل بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ سلطانہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ لگتا تھا کہ وہ بھی کسی اوٹ میں ہوگئی ہے۔ گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

دفعتاً میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ میرے پہلو میں نہیں تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا چھت کے آخری کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے پیچھے لپکا ہے۔ چھت کی منڈیر تک پہنچ کر اس نے ہوا میں جست لگائی۔ یہ ویسی ہی جست تھی جیسی پیراک سوئمنگ پول میں کودنے کے لیے لگاتے ہیں لیکن عمران کے نیچے سوئمنگ پول نہیں تھا۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پرالی کے ایک بڑے ڈھیر پر گرا ہے اور وہاں سے لڑھک کر زمین پر آگیا ہے۔ اٹھ کر وہ پھر کسی کے پیچھے لپکا۔ اب میں نے بھاگنے والے کا سایہ بھی دیکھ لیا۔ وہ برق رفتاری سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔

ایک دم میری سمجھ میں آگیا کہ عمران کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ جن دو فائرز کی وجہ سے ہنگامہ شروع ہوا، وہ ہماری دائیں جانب والی دو تین چھتوں میں سے کسی ایک چھت پر ہوئے تھے۔ غالباً عمران نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا تھا اور اب اس کو پکڑنا چاہ رہا تھا۔ اس شخص نے بھاگتے بھاگتے ایک دم پلٹ کر عمران پر گولی چلائی۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ عمران نے نیچے گر کر خود کو بچایا تاہم اس وقت یہ اندیشہ بھی میرے ذہن میں آیا کہ کہیں اسے گولی تو نہیں لگ گئی۔ عمران نے نیچے لیٹے لیٹے وہ جوابی فائر کیے لیکن یہ فائر مدِمقابل کو لگے نہیں۔ میں نے اسے برق رفتاری سے گنے کے کھیتوں میں اوجھل ہوتے دیکھا۔

جونہی عمران کھڑا ہوا، میں نے ایک اور لرزہ خیز منظر دیکھا۔ ایک جانب سے ایک اور لمبا تڑنگا شخص برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس کا ارادہ عیاں تھا، وہ عقب سے عمران کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ یہ بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ میں نے ٹیلی اسکوپ پھینک کر رائفل پکڑی۔ ابھی مجھے رائفل سیدھی کرنے اور نشانہ لینے میں تین چار سیکنڈ لگنے تھے اور میرا نشانہ بہت اچھا بھی نہیں تھا لیکن یہ تین چار سیکنڈ شروع ہونے سے پہلے ہی وہ کچھ ہوگیا جس کی توقع نہیں تھی۔ قریبی کھیت میں سے ایک ہیولا سا نکلا اور برق رفتاری سے رائفل بردار پر جا پڑا۔ یہ ایک کتا تھا۔ اس کی آواز کھیتوں کے درمیان دور تک گونجی۔ میں نے کتے اور رائفل بردار کو اوپر نیچے گرتے دیکھا۔ دونوں گتھم گتھا تھے۔ ان کے درمیان فائر کا شعلہ لپکا... یہ وہ وقت تھا جب عمران کو اندازہ ہوا کہ اس کے عقب میں کیا ہوا ہے... عمران پلٹا۔ مگر تب تک کھیل ختم ہو گیا۔ تنومند کتے نے ایک دم رائفل بردار کو چھوڑا اور کھیتوں میں اوجھل ہوگیا۔ یوں لگا جیسے وہ فائر کی خوفناک آواز سے بدک گیا ہے لیکن جو کچھ بھی تھا، کتا اپنا کام کر گزرا تھا۔ رائفل بردار بے سدھ پڑا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، دیوہیکل کتے کی اچانک جست کے سبب اس کی رائفل سے گولی چل گئی تھی۔ رائفل کا رخ اوپر کی طرف تھا اس لیے گولی نے رائفل بردار کو ہی نشانہ بنا ڈالا تھا۔ پگھلا ہوا قریباً بیس گرام سیسہ رائفل بردار کی ٹھوڑی کے نچلے حصے میں داخل ہوا تھا اور اس کا تالو پھاڑ کر کھوپڑی میں گھس گیا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کوئی اور نہیں، وہی کتا ہے جو پچھلے دو تین دن سے ہمارے اردگرد منڈلا رہا تھا۔

آفتاب کو گولی لگنے سے لے کر کتے کے نمودار ہونے اور پھر نامعلوم رائفل بردار کی ہلاکت تک کے سارے واقعات صرف آٹھ دس سیکنڈ کے اندر ہی رونما ہوئے۔ عمران دوڑتا ہوا دوبارہ گھر میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر پھر چھت پر آگیا۔ اسپتال کے احاطے کے اندر قیامت برپا تھی۔ اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہمیں احاطے میں کم از کم پانچ لاشیں نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے ایک واضح طور پر ماریا کی تھی۔ وہ اوندھی پڑی تھی، اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

”اب یہ لوگ سلطانہ اور آفتاب کو نہیں چھوڑیں گے۔“ عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میرے سینے میں کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا اور اس کی کرچیاں پورے جسم میں پھیل گئیں... ”ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے کراہتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

عمران نے جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں احاطے پر جمی تھیں۔ جنریٹر چل رہا تھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں سب کچھ نظر آرہا تھا۔ درجنوں مسلح گارڈز اور کمانڈوز نے ایک دم تین اطراف سے اسپتال پر ہلّا بول دیا تھا۔ وہ بارش کی طرح گولیاں برساتے ہوئے اسپتال کے احاطے میں گھس گئے اور مختلف چیزوں کی آڑ لے لی۔ کمانڈوز کی ایک ٹولی احاطے کا ایک بغلی دروازہ توڑ کر اندر گھس گئی۔ انہوں نے برآمدے کے بالکل قریب پوزیشن لے لی۔ ان کی اندھا دھند فائرنگ نے اسپتال کے سارے اندرونی شیشے توڑ ڈالے۔ ہر طرف شعلے لپکتے نظر آئے اور دھواں پھیل گیا۔ میں ٹیلی اسکوپ سے دیکھ رہا تھا۔ تب اچانک میری نظر ایک منظر پر پڑی اور ہر امید دم توڑ گئی۔ یہ آفتاب خاں کی لاش تھی۔ وہ برآمدے کے ایک چوکور ستون کے پیچھے اوندھا پڑا تھا۔ اس کے لباس پر خون کے دھبّوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا سارا جسم چھلنی ہوگیا ہے۔ اس کی لمبے بیرل والی سیون ایم ایم رائفل بھی اس کے پاس پڑی تھی۔

میں نے کہا۔ ”عمران! سلطانہ اکیلی رہ گئی ہے شاید۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیلی اسکوپ عمران کی طرف بڑھائی اور برآمدے کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ عمران نے دیکھا اور اس کے ہونٹ بھی سکڑ گئے۔

”اس کا مطلب ہے کہ جوابی فائر صرف سلطانہ کر رہی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ... وہ تین منٹ سے زیادہ نہیں نکال سکے گی۔“ میری آواز رندھ گئی۔

احاطے کے اندر اور برآمدے کے آس پاس کمانڈوز کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ان میں سفید فام کمانڈوز بھی تھے۔ ماریا کی موت نے گھیراؤ ڈالنے والوں کو جیسے وحشی کر دیا

تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسی جگہ آفتاب اور سلطانہ کا قیمہ کر دینا چاہتے ہیں۔

''کیا خیال ہے عمران... اسے بچانے کی کوشش کریں؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''کوشش کرنی چاہیے لیکن اس کے لیے ہمیں نیچے جانا ہوگا۔ سب کے سامنے آنا ہوگا۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو...؟''

''میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

عمران ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اترے پھر ایک گلی سے گزر کر اسپتال کی طرف آگئے۔ لوگ کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہر طرف دہشت برس رہی تھی۔ ہم پھاٹک پر پہنچے۔ ہندو گارڈز نے ہمیں دیکھا۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں پہچان لیا۔ ان کی آنکھوں میں ہراس آمیز حیرت نظر آئی۔ پانڈے کے ایک ماتحت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے پستول کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب عمران کی نظر فیارڈ پر پڑ گئی۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ''مسٹر فیارڈ! بات سنیے۔''

فیارڈ بھی ہمیں کھلے عام سب کے سامنے دیکھ کر حیران ہوا۔ عمران اسے ایک طرف لے گیا۔ ان دونوں کے درمیان بس چار پانچ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ احاطے میں ہونے والی فائرنگ شدید ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سلطانہ نے کہیں اچھی پوزیشن لی ہوئی ہے اور بھرپور جواب دے رہی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ عمران نے فیارڈ سے کیا کہا ہے۔ یقیناً اس نے اس سے درخواست کی تھی کہ اسے آگے جانے کا موقع دیا جائے۔ وہ سلطانہ کو ہتھیار ڈالنے اور گرفتاری دینے پر آمادہ کر دے گا۔ فیارڈ کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ عمران کی بات کا اس پر مثبت اثر ہوا ہے۔ وہ تیزی سے پیچھے گیا۔ غالباً آپریشن انچارج مسٹر اینڈرسن سے اجازت لینے گیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گیا تھا، دوڑتا ہوا ہی واپس آیا۔ اس دوران میں ہندو سپاہی ہمیں شعلہ بار نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ واپس آتے ہی فیارڈ نے ہم دونوں کو ساتھ لیا اور چکر کاٹ کر احاطے کے اس بغلی دروازے پر پہنچا جسے توڑ کر کمانڈوز چار پانچ منٹ پہلے اندر گھسے تھے۔

احاطے میں داخل ہونے سے پہلے فیارڈ نے میری اور عمران کی رائفلیں لے کر اپنے ساتھیوں کو تھما دیں۔ اس کے بعد اس نے بلند آواز میں کمانڈوز کو حکم دیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے فائرنگ روک دیں... فائرنگ مدھم ہوئی اور پھر رک گئی۔ تاہم کمانڈوز نے اپنی پوزیشنیں برقرار رکھیں۔ رائفلوں کے کندے ان کے شانوں سے لگے رہے اور نگاہیں ٹارگٹ پر جمی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ سلطانہ اسٹور روم کے قریب ایک دس فٹ اونچی گیلری میں موجود ہے... اور اس کے اندر سے جوابی فائر کر رہی ہے... قیامت خیز فائرنگ میں وقفہ آیا تو دبی ہوئی آوازیں ابھر آئیں۔ ایک آواز کسی شدید زخمی کی تھی جو برآمدے کے اندرونی حصے میں پڑا تھا اور مدد کے لیے تڑپ رہا تھا... دوسری آواز احاطے میں تڑپتے پھڑکتے زخمی گھوڑے کی تھی۔ اس کے علاوہ احاطے کے باہر اور اردگرد کی چھتوں پر گونجنے والی صدائیں تھیں۔ مسلح فوجی اور کمانڈوز ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ہدایات دے رہے تھے یا لے رہے تھے۔

''آجاؤ اندر۔'' فیارڈ نے ہم دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہا۔

ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے فیارڈ کے پیچھے، برآمدے تک پہنچے اور ایک چھوٹی سی دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ آفتاب خاں کی لاش بس آٹھ دس قدم کے فاصلے پر چوکور ستون کے پیچھے پڑی تھی۔ لگتا تھا کہ کمانڈوز نے وحشت میں اس کی لاش پر بھی گولیاں برسائی ہیں۔ چوکور ستون کی اوٹ میں کھڑے ایک انگریز نے بھاگ کر اپنی پوزیشن تبدیل کی تو گیلری کی طرف سے فوراً رائفل کا فائر ہوا۔ کمانڈو بال بال بچا۔

فیارڈ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا میگا فون میری طرف بڑھایا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''سلطانہ! گولی چلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنی رائفل نیچے پھینک دو اور خود بھی باہر آجاؤ۔ فیارڈ صاحب نے وعدہ کیا ہے، تم پر فائر نہیں کیا جائے گا۔''

کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر اندر سے چلّا کر کچھ کہا گیا۔ یہ سلطانہ ہی تھی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن آواز واضح طور پر پہنچ رہی تھی۔ میں نے میگا فون ایک طرف رکھ دیا اور بلند آواز سے کہا۔ ''سلطانہ! یہ لوگ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے۔ تم فوراً رائفل باہر پھینک دو اور ہاتھ اٹھا کر نکل آؤ۔''

جواب میں سلطانہ نے پھر چلّا کر کچھ کہا۔ اس مرتبہ الفاظ بھی ہماری سمجھ میں آئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''ناہیں مہروج... میں بندوق ناہیں پھینکوں گی۔ میں... آخری دم تک لڑوں گی...'' اس کی آواز میں زخمی شیرنی جیسا درد موجود تھا اور طنطنہ بھی۔ یہ اسی راجپوت لڑکی کی آواز تھی جو سر جھکانے سے سر کٹانا بہتر سمجھتی تھی۔ یہ آواز کہہ رہی تھی... ''ہوا'' کو زنجیریں کون پہنا سکتا ہے اور میں گھنے جنگلوں کی مست ''ہوا'' ہوں۔ اور سمندر کو قید کون کر سکتا ہے؟ میں ساحلوں کے گھیرے میں نہ رہنے والا سمندر ہوں اور حق کی آواز کو کوئی ''ظلم'' کیسے دبا سکتا ہے اور میں حق کی وہی سرکش آواز ہوں۔

میں نے ہر دور میں ظلم کو للکارا ہے۔ میں ہر دور میں لہولہان ہوئی ہوں اور ہر آنے والے دور میں نئی طاقت اور نئے جوش کے ساتھ ابھری ہوں۔

میں نے اور عمران نے دیکھ لیا تھا کہ سلطانہ موت کے گھیرے میں ہے۔ کسی بھی وقت اس کی جان جا سکتی ہے۔ یہ گھنٹوں یا منٹوں کی نہیں، سیکنڈوں کی بات تھی۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر بچانا چاہتے تھے۔ وہ زندہ گرفتار ہو جاتی تو پھر شاید اس کی زندگی کے لیے کوئی راستہ بھی نکل آتا، کوئی وسیلہ بھی پیدا ہو جاتا۔ انہونیوں کی گنجائش تو ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ امید کی آنکھیں ہمیشہ کرشموں کی راہ دیکھتی ہیں اور کبھی کبھی یہ انتظار رنگ بھی لاتا ہے۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو اس موجودہ واقعے میں سلطانہ کا کردار سنگینی میں سب سے کم تھا۔ خون خرابے کے اصل ذمے دار آفتاب اور پھر ہاشم رازی تھے۔ ممکن تھا کہ سلطانہ کے گرفتار ہو جانے کی صورت میں مسٹر اینڈرسن اور دوسرے انگریز عہدیداروں کے دلوں میں اس کے لیے رحم کی کوئی رمق پیدا ہو جاتی۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کہ مسٹر اینڈرسن اور فیارڈ وغیرہ سلطانہ کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔

سلطانہ کا انکار سننے کے بعد کمانڈوز نے پھر گیلری کا نشانہ لے لیا تھا۔ اب مسٹر اینڈرسن خود بھی وہاں آن موجود ہوا تھا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں بھی جدید ماؤزر تھا۔ اس کے صرف ایک اشارے پر ایک بار پھر سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو سکتی تھی۔ میں مسٹر اینڈرسن کے سامنے آگیا۔ میں نے کہا۔ ''جناب! آپ ان لوگوں سے کہیں کہ کوئی فائر نہ کرے۔ میں سلطانہ سے بات کر رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ گرفتاری دے دے گی۔''

''جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو۔'' مسٹر اینڈرسن کا لہجہ سخت تھا۔

میں کمانڈوز اور مسٹر فیارڈ کی ہدایات کو نظرانداز کرتا ہوا تھوڑا سا اور آگے چلا گیا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''سلطانہ! میں تمہارا شوہر ہوں۔ میں... زندگی میں پہلی بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ انکار نہ کرنا سلطانہ... بات تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن مان لو۔ رائفل کھڑکی سے باہر پھینک دو اور خود بھی نکل آؤ...''

چند سیکنڈ بعد سلطانہ کی گلوگیر آواز ابھری۔ ''مہروج... خدا کے لیے... مجھے اتنی بڑی آزمائش میں ناہیں ڈالو۔ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔''

''سخت امتحانوں میں سے ہی بہتری کا راستہ بھی نکل آتا ہے سلطانہ... اور مجھے امید ہے نکلے گا۔ میری اور بالو کی خاطر بات مان لو۔ باہر نکل آؤ۔ میں نے بڑے صاحب سے بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ تم بس کھڑکی کھول کر رائفل باہر پھینک دو۔''

وہ خاموش رہی۔ یوں لگا کہ وہ فیصلے کی سولی پر لٹک رہی ہے۔ مسٹر اینڈرسن نے دیوار کی اوٹ سے دہاڑ کر کہا۔ ''میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اسے کہو باہر نکل آئے۔''

کمانڈوز اب آگے بڑھتے ہوئے گیلری کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔ ''سلطانہ... باہر آجاؤ... میری خاطر۔''

پندرہ بیس سیکنڈ... پندرہ بیس گھنٹوں کی طرح گزر رہے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ گیلری کا دروازہ کھلا۔ سلطانہ باہر نکلی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں پونم پور کے مندر میں گئی تھی۔ اس کے جسم پر لہریے دار ساڑی تھی، کانوں میں چاندی کے جھمکے، کلائیوں میں وہی پیلی اور سرخ چوڑیاں تھیں جو اسے آفتاب نے لا کر دی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک ہندو ناری کا روپ دھارنے کے لیے تھا۔ میں نے دیکھا اس کی ساڑی کندھے پر سے خون آلود ہے۔ یقیناً وہ زخمی بھی تھی۔ اس کے ہر وقت قندھاری اناروں کی طرح دہکنے والے رخسار زرد نظر آتے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے رائفل پھینک دی۔ یہ رائفل پُرشور انداز میں سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آگئی۔ یہی وقت تھا جب میری نظر سیکنڈ آفیسر فیارڈ پر پڑی۔ اس نے کمانڈوز کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے کوئی اشارہ کیا۔ اگلا لمحہ قیامت کا تھا۔ ایک ساتھ تین چار رائفلوں سے تڑتڑ کی خوفناک آواز بلند ہوئی۔ سلطانہ کا جسم اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ گیلری کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آگیا۔

''سلطانہ!'' میرے سینے کی گہرائی سے پکار بلند ہوئی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف لپکا۔

میں اس کے اوپر گر گیا۔ ان حشر خیز لمحوں میں شاید میرے دماغ کے اندر یہ آیا تھا کہ میں اس کے اوپر گر جاؤں گا تو وہ مزید گولیوں کی زد سے محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن اسے

مزید گولیوں کی ضرورت ہی کہاں تھی؟ اس کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ شاید اس کی زندگی کے آخری دو تین سیکنڈ تھے۔ ''بہروج'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔۔۔ وہ مرچکی تھی۔ میرے زخموں پر اپنے محبت بھرے ہونٹ رکھنے والی، میرے رستے کے کانٹے اپنی پلکوں سے چننے والی، میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دینے والی، مرچکی تھی اور اس کا سر میری بانہوں میں تھا۔

۔۔۔ میں پلٹا۔۔۔ مجھے اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آیا۔ بس ایک سرخ چادر تھی جو آنکھوں کے سامنے تن گئی تھی۔ اس چادر کے اندر سے کمانڈوز کے منحوس چہرے پرچھائیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ میں دہاڑا۔ مجھے نہیں معلوم میں نے کیا کہا اور کس کو کہا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ اس آواز کی گونج مجھے اپنے پورے جسم میں اور سارے در و دیوار میں محسوس ہوئی۔ میں اپنے قریب ترین انگریز کمانڈو کی طرف بڑھا۔ یہ انہی میں سے تھا جنہوں نے میری ہتی سلطانہ پر گولی چلائی تھی۔ اس کے جسم کو چھلنی کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کمانڈو نے میری طرف رائفل سیدھی کی ہے۔ اس وقت یہ قاتل رائفل مجھے دنیا کی حقیر ترین چیز محسوس ہوئی۔ میں کمانڈو سے ٹکرایا اور اسے اپنے نیچے لیتا ہوا دور جا گرا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ملیارڈ کو دیکھا۔ وہ میری طرف رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ ایک طرف سے عمران عقاب کی طرح جھپٹا اور ملیارڈ کی رائفل کی نال اوپر اٹھادی۔

اچانک میرے سر پر کوئی بہت وزنی چیز لگی۔ اس کے ساتھ ہی محسوس ہوا کہ درجنوں ہاتھوں نے مجھے دبوچ لیا ہے۔ ایک بار پھر کوئی وزنی شے سر سے ٹکرائی۔ میری آنکھوں کے سامنے تنی ہوئی سرخ چادر کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ وہ بتدریج سیاہ ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

پتا نہیں میں کتنی دیر بے ہوش رہا اور کس حال میں رہا۔ دوبارہ حواس بحال ہوئے تو میرے اردگرد لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ میں کچھ دیر تک بالکل خالی ذہن کے ساتھ لیٹا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر کیا قیامت بیت چکی ہے۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سر سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں۔ لیکن شاید اس سے دس گنا زیادہ درد بھی ہوتا تو مجھے وہ کرنے سے نہ روک سکتا جو میں نے کیا۔ میں اٹھا اور نیم دیوانگی کی سی کیفیت میں ''سلطانہ۔۔۔ سلطانہ۔۔۔'' پکارنے لگا۔ پھر میں کمرے کے بند دروازے پر پل پڑا۔ میں نے دو ہتڑ چلائے، اسے ٹھوکریں رسید کیں۔ میری آواز نے در و دیوار کو لرزا دیا۔ میں چلا رہا تھا۔ ''دروازہ کھولو حرام زادو۔۔۔ تم نے اسے مار دیا۔ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، میں تمہیں زندہ جلا دوں گا۔ میں سب کو راکھ کردوں گا۔ میرا کچھ نہیں بچا۔ کان کھول کر سن لو۔ کسی کا کچھ نہیں بچے گا۔ کسی کا نہیں بچے گا۔'' میں پھر دروازے پر حملہ آور ہوا۔ چوبی دروازہ بہت مضبوط تھا پھر بھی چٹخنے لگا۔

ایک طرف سے عمران نمودار ہوا اور اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ''ہوش کرو تابی! اس طرح کچھ نہیں ہو گا۔ جانے والی جاچکی ہے۔۔۔ اب صبر اور ہمت سے کام لینا ہوگا۔''

میں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ ''تم لو صبر اور ہمت سے کام، میں نہیں لوں گا۔ میں مر جاؤں گا اور ان سب کو مار ڈالوں گا۔ انہوں نے میری ہتی سلطانہ کو مارا ہے۔ وہ میرے کہنے پر باہر آئی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے خود کو حوالے کیا تھا۔ اس سفید سور ملیارڈ اور اینڈرسن نے مروایا اسے۔ انہوں نے دھوکا دیا۔''

عمران نے ایک بار پھر مجھے بازوؤں میں بھرا۔ ''نہیں تابی! موت کا وقت مقرر ہے۔ جو ہوا ایسے ہی ہونا تھا۔ اور کیا پتا۔۔۔ یہ اچھا ہی ہوا ہو۔ وہ پکڑی جاتی تو اس کی موت مشکل ہو جاتی۔ ان لوگوں نے اسے معاف تو نہیں کرنا تھا نا۔ یہ تو اس کی بوٹیاں نوچنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اب اسے خدا کی رضا سمجھو۔ اپنے آپ کو سنبھالو تابی۔''

درد میری برداشت سے باہر تھا۔ میں کراہا۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ مرجانے دو مجھے۔ اس کے پاس چلے جانے دو۔''

میں نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ عمران نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میں نے اسے زوردار جھٹکے دیے۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے گرفت میں نہ رکھ سکتا مگر اس کے فولادی بازوؤں نے مجھے گھیرے رکھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر زور لگایا۔ اس کی گردن پیچھے مڑ گئی مگر بازوؤں کی گرفت برقرار رہی۔ میں پھنکارا۔

''تم نے کیا کیا۔۔۔ تم نے بھی بس تماشا دیکھا؟ میری طرح تم نے بھی اسے مرنے دیا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ چھلنی ہوگئی۔ مجھے چھوڑ دو۔''

میں نے پورا زور لگایا۔ ہم دونوں دیوار سے ٹکرائے پھر پختہ فرش پر گر گئے لیکن عمران نے مجھے چھوڑا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ میں پھر دروازے پر پل پڑوں گا۔ اسے توڑ دوں گا یا خود کو شدید زخمی کرلوں گا۔ اس کی مضبوط گرفت اس کی

دوستی ہی کی طرح ناقابلِ شکست تھی۔

کچھ دیر بعد میری وحشت ایک دم شدید غم واندوہ میں ڈھل گئی۔ میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اپنا سر اس کے سینے سے لگا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہم اسی طرح فرش پر گرے رہے۔ میں روتا رہا، وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچتا رہا، میرا سر چومتا رہا۔ مجھے لگا میرے جسم کا سارا پانی آنکھوں کے راستے نچڑ جائے گا۔ میری نگاہوں میں چند دن پہلے کے وہ مناظر تھے جب مندر کے تہ خانے میں وہ میرے ساتھ تھی۔ شب کے اندھیرے میں وہ اپنی تمام تر نسوانیت اور حلاوت کے ساتھ میرے اندر سما جاتی تھی۔ وہ ہولے ہولے میرا نام پکارتی تھی۔ میں اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کرتا تھا۔ وہ جواب دیتی تھی۔ وہ نل پانی کی ان سہانی شاموں کا سپنا دیکھتی تھی جب ہم دیوان کے وسیع احاطے میں گیندے اور موتیے کے پھولوں کی کیاریوں کے درمیان ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دور تک چلتے چلے جاتے۔ ہمارا بالو ہماری بانہوں میں ہوتا اور ہم باری باری اس کے گال چومتے۔ وہ اب اپنے اس سپنے سمیت مٹی کے نیچے سو رہی تھی، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ وہ بس تین چار دن کے اندر ہی سوکھی ریت کی طرح میری مٹھی میں سے پھسل گئی تھی۔

میں رو رو کر نڈھال ہو گیا۔ میں نے جسم کا درد سہنا تو کسی حد تک سیکھ لیا تھا لیکن دل کا درد سہنا مجھے کہاں آتا تھا؟ میں تڑپ تڑپ کر نیم جان ہو گیا تو عمران کے ساتھ ہی چٹائی پر نیم دراز ہو گیا۔ شاید یہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو بدستور اندھیرا تھا۔ لالٹین روشن تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بالکل بند جگہ ہے۔ کوئی کھڑکی، روشن دان، کوئی درز کچھ بھی نہیں۔ بس وزنی چوبی دروازے کے اندر ایک چوکور خانہ سا تھا اور وہ بھی بند تھا۔ یہاں رات اور دن کی تمیز مشکل تھی۔ عمران میرے سرہانے بیٹھا تھا۔ میرے سر کے زخم سے رسنے والے خون کو روئی سے پونچھ رہا تھا۔

”ہم کہاں ہیں عمران؟“ میں نے پوچھا۔

”زرگاں میں۔“

میں نے اردگرد دیکھ کر کہا۔ ”زرگاں کی جیل میں؟“

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کب پہنچے ہم یہاں؟“

”کل رات۔“

”اور سلطانہ؟“ میری آواز دکھ کے بوجھ سے بیٹھ گئی۔

”وہ بھی آ گئی تھی۔ اسے کل رات دفن کیا گیا۔ یہاں زرگاں میں اس کے کچھ عزیز موجود ہیں۔ اس کی میت انہیں دے دی گئی تھی۔“

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے تازہ گرم آنسو رسنے لگے۔ عمران کہہ رہا تھا۔ ”اس کا جنازہ گڑے پیرے میں پڑھا گیا۔ شاید پندرہ بیس لوگ ہی ہوں گے۔ لیکن پتا چلا ہے کہ آج دوپہر زرگاں میں ہزاروں لوگوں نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی ہے۔“

اسپتال میں سلطانہ کے آخری لمحات میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا اندازہ غلط نکلا عمران! ہمارا خیال تھا کہ شاید یہ گورے اسے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں لیکن وہ نہیں چاہتے تھے۔ میں نے خود اس سفید سور ضیا زڈ کو اشارہ کرتے دیکھا تھا۔ اس کے اشارے پر ہی سپاہیوں نے گولیاں چلائیں۔“

عمران نے طویل سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ان چٹی چمڑی والوں کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ دراصل انہوں نے سوچ لیا تھا کہ سلطانہ والا معاملہ وہیں پر ختم کر دینا ہے۔ اپنے حساب سے انہوں نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سلطانہ کو زندہ پکڑا گیا تو اسے مارنے اور نہ مارنے کا مسئلہ بہت بڑا ایشو بن جائے گا۔ بہت سی مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔ راجواڑے کے حالات تو پہلے ہی سے بہت خراب ہیں۔“

میں نے سسک کر کہا۔ ”عمران! یہ سب کیوں ہوا؟ سب کچھ تو ٹھیک ہونے جا رہا تھا۔ سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ وہ گولی کس نے چلائی جس نے آفتاب کو زخمی کیا اور پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔“

عمران نے کہا۔ ”وہ ایک نہیں دو گولیاں تھیں۔ اور مجھے یقین ہے وہ اس بندے نے چلوائیں جو اس راجواڑے میں ہمارا سب سے کمینہ اور خطرناک دشمن ہے... وہ پانڈے نے چلوائیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو جائے۔ سلطانہ بچ کر یہاں سے نکل جائے۔“

میرا لہو کھول گیا۔ میں نے کہا۔ ”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ پانڈے نے چلوائیں؟“

”یہ گولیاں ہمارے پیچھے والی ایک چھت سے چلائی گئی تھیں۔ میں نے اس بندے کا سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ چھت سے کودا اور بھاگ نکلا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو۔ وہ ایک پاؤں ذرا دبا کر بھاگ رہا تھا۔ پانڈے کا ایک چوڑی ناک والا ماتحت بھی ایک پاؤں دبا کر چلتا ہے۔ سریش نام ہے اس کا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی بندہ تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہے کہ... ماریا کی جان جانے کے علاوہ اور بھی جو جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار بھی رنجیت پانڈے ہے۔“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اپنے دوسرے ساتھی کیپٹن ٹام اور باقی یرغمالیوں کی جان بچانے کے لیے ان گوروں نے سلطانہ اور آفتاب کو نل پانی میں داخل ہونے دینا تھا۔“

ایک جاں گسل افسوس اور دکھ نے مجھے گھیر لیا۔ واقعی اگر وہ دو گولیاں نہ چلتیں تو حالات اس وقت کتنے مختلف ہوتے۔ ہو سکتا تھا کہ اب سلطانہ کے علاوہ ہم دونوں بھی نل پانی کے خوب صورت دیوان میں ہوتے۔ وہ اپنے بچے کو بانہوں میں لے کر نہال ہو رہی ہوتی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے ستارے چمکتے۔ لیکن اب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک ناقابلِ تلافی دکھ تھا۔ ایک آگ تھی جو میری رگوں میں دوڑ رہی تھی اور میرے تن بدن کو بار بار بھسم کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”عمران! وہ دوسرا بندہ کون تھا جس پر کتے نے حملہ کیا؟“

”وہ یقیناً سریش کمار کا کوئی ساتھی ہوگا۔“

میری نگاہ میں سارا منظر پھر سے گھوم گیا۔ اس شخص کا عقب سے عمران کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنا۔ کھیت میں سے اچانک جسیم کتے کا نکلنا اور اس پر جا پڑنا۔ کتے کی لرزہ خیز آوازیں، اس شخص کی دردناک چنگھاڑ، پھر گولی کا چلنا اور کتے کا پلک جھپکتے میں اوجھل ہونا...

میں خالی خالی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! یہ کتا وہی تھا نا جس کی رسّی تم نے کھیتوں میں کھولی تھی؟“

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کتا بڑا وفادار جانور ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، وہ تب سے ہمارے آس پاس ہی تھا۔“ عمران نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ عمران کچھ اور بھی کہے گا... اس نے کچھ نہیں کہا... لیکن میرے ذہن میں وہ تمام الفاظ گونجنے لگے جو عمران نے اپنی روداد بیان کرتے ہوئے کہے تھے... اس نے جانوروں کے ساتھ اپنے خصوصی اور حیرت انگیز تعلق کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ خاص کشش جس کی وجہ سے وہ پہلے جان صاحب کی مردم شناس نظر میں آیا اور پھر اسٹار سرکس میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ بعدازاں امریکن پروفیسر رچرڈ رچی نے عمران کی اس انوکھی صلاحیت کو ”اسپیشل اینیمل ماسٹری“ کا نام دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وقتی طور پر یہ صلاحیت عمران کے اندر دب گئی ہے یا کہہ لیا جائے کہ زائل ہو گئی ہے لیکن امکان ہے کہ یہ کچھ عرصے بعد پھر بحال ہو جائے گی۔

تو کیا وہ صلاحیت بحال ہو رہی تھی؟

”کیا سوچ رہے ہو؟“ عمران نے کہا۔

”یہی کہ اگر وہ کتا اچانک نمودار نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟“

”یہ ”اگر“ بڑا عجیب لفظ ہے تابی! اس کے بارے میں زیادہ غور نہیں کرنا چاہیے۔ جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب آئندہ کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

اچانک ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ واضح طور پر کوئی بڑا بارودی دھماکا تھا۔ در و دیوار لرز گئے۔ اس کے فوراً بعد رائفلوں کی گرج سنائی دی۔ جیل کے آس پاس کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔ ”یہ سب کیا ہے؟“ میں نے عمران کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”لگتا ہے کہ زرگاں میں گڑبڑ چل رہی ہے۔ رات کو تم تو سوئے پڑے تھے، پر میں گولیوں کی آوازیں سنتا رہا ہوں۔ رات تین بجے کے قریب دستی بموں کے کئی دھماکے بھی ہوئے تھے۔“

”تمہارا کیا اندازہ ہے؟“

”کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ انگریزوں اور ان کے پٹھو حکم جی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ گڑبڑ تو یہاں پہلے سے ہی چل رہی تھی۔“

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کوٹھڑی کے وزنی چوبی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور دروازے میں موجود چوکور خانہ کھل گیا۔ اس ڈیڑھ فٹ مربع کے خانے میں اب ایک موٹی آہنی سلاخ نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف ایک باوردی گارڈ موجود تھا۔ اس کے عقب میں ایک دوسرا گارڈ مسلح کھڑا تھا۔ پہلے گارڈ نے چوکور خانے میں سے کھانے کے برتن اندر پہنچا دیے۔ ایک قہر آلود نگاہ ہم پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے چوکور خانہ پھر سے بند کر دیا۔ کوٹھڑی میں ایک بار پھر صرف لالٹین کی روشنی رہ گئی۔

عمران نے مجھے کھانا کھلانا چاہا مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ گلے میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اسپتال کے اندر تین دن تک بھوکی پیاسی رہی اور پھر آزاد فضا میں سانس لینے سے پہلے ہی گولیوں سے چھلنی ہو گئی۔ اس کا زرد چہرہ، اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے، اس کے سوکھے

ہونٹ، سب کچھ میری نگاہوں میں گھوما ۔۔۔۔ میں ٹھنڈے فرش پر ایک کونے میں لیٹ گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ماں کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا جو میں نے جھیلا تھا اور اس نے مجھے اندر سے جھلسا ڈالا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ وہ سارے گھنے چینے آنکھوں میں کاجل لگائے میرے سامنے کھڑی ہے۔ میرے کانوں میں جیسے اس کی جیتی جاگتی آواز گونجی۔ ''مہروج! آپ نے کھانا کیوں نا ہیں کھایا؟ آپ کو پتا اِج ہے کہ آپ نا ہیں کھائیں گے تو میں بھی نا ہیں کھاؤں گی۔ بھوکی اِج رہوں گی۔''

میں تصور میں کراہا۔ ''سلطانہ! کہاں چلی گئی ہو تم؟ میں تو ٹوٹا پھوٹا برباد پردیسی تھا۔ تم نے مجھے پھر سے جینا سکھایا۔ مجھے پھر سے زندگی دی۔۔۔ میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ میری ناتوانیوں کو سہارا دیا۔ میرے لیے ساری دنیا سے ٹکر لے لی لیکن مجھے اکیلا نہیں چھوڑا۔ اب کیوں چھوڑ گئی ہو مجھے؟ تم نے کہا تھا۔۔۔ میں جب بلاؤں گا تم آؤ گی۔۔۔ دیکھو، میں بلا رہا ہوں تمہیں۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہمارے بچے کو تمہاری ضرورت ہے۔۔۔ وہ معصوم تمہاری راہ دیکھتا ہوگا۔ ایک بار آ جاؤ سلطانہ۔۔۔ پھر میں تمہیں اپنی بانہوں میں چھپا لوں گا۔ تمہیں اتنی دور لے جاؤں گا کہ اس آگ کی گرم ہوا بھی تمہیں چھو نہ سکے۔''

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے کانوں میں سنہری جھمکے ہلتے رہے۔ اس کے سینے پر طلائی ہار چمکتا رہا۔ وہ بولی۔ ''مجھے میری غلطیوں پر معاف کر دینا مہروج۔۔۔ میں اب آ نا ہیں سکتی۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔۔۔ میں موتیے اور گیندے کے پھولوں میں آپ کو ملوں گی۔۔۔ اور چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں اور صبح دم چلنے والی ہوا میں۔۔۔ اور مہروج! جب کسی تپتی دوپہر میں برسات کے بادل چھائیں گے تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گی۔۔۔ جب سردیوں کی نرم دھوپ آپ کے شہر میں پھولوں اور بچوں کے منہ چومے گی تو میں آپ کے آس پاس ہی ہوں گی۔۔۔ ہاں، میں آپ کو اور اپنے بالو کو چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہوں۔''

اس کا ہیولا مدھم ہوتا چلا گیا۔۔۔ پھر اوجھل ہو گیا۔ میری جلتی آنکھوں میں نمی تھی۔۔۔ اس کا تصور آنکھوں میں بسائے بسائے میں سو گیا۔

دوبارہ میں زوردار آوازوں کی وجہ سے جاگا۔ گارڈ چلا رہے تھے۔ کسی قریبی کوٹھڑی کا دروازہ زور سے کھلا پھر بند ہو گیا۔ تب ہماری کوٹھڑی کا دروازہ بھی دھماکے سے کھلا۔

مسلح گارڈز نے دو افراد کو اندر دھکیلا، پھر ایک تیسرے شخص کو اٹھا کر بیدردی سے کوٹھڑی کے پختہ فرش پر پھینکا اور دروازہ دوبارہ باہر سے لاک کر دیا۔

میری طرح عمران بھی جاگ گیا تھا اور حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جس شخص کو اٹھا کر فرش پر پٹخا گیا تھا وہ بے ہوش تھا۔ وہ حلیے سے مسلمان لگتا تھا۔ اس کی کھچڑی داڑھی خون سے رنگین تھی۔ باقی دو افراد میں سے ایک شخص کو دیکھ کر میں اور عمران بری طرح چونکے۔ ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ اسے یہاں دیکھیں گے اور وہ بھی اس حالت میں۔ وہ بھرت تھا۔ اس کے نفیس کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور چہرے پر ضربوں کے نیلگوں نشان تھے۔ بھرت بھی ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شاید اسے بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اس جیل کے اندر ہماری ہی کوٹھڑی میں بند کیا جائے گا۔ ہم کچھ دیر تک ساکت و جامد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ''یہ تمہارے ساتھ کیا ہوا بھرت؟'' عمران نے پوچھا۔

''جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، وہ زرگاں میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور ان میں زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ زرگاں میں گوروں اور حکم جی کے سپاہیوں کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔'' بھرت کا لہجہ انکشاف انگیز تھا۔

''یہ بغاوت نہیں، یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے اور یہ جنگ ہم جیتیں گے۔'' بھرت کے ساتھ کوٹھڑی میں بند کیا جانے والا دوسرا شخص جوش سے بولا۔

اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے مسلمان نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر کسی کند آلے کا زخم تھا۔ رائفل کی ایک گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چیرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس زخم پر ایک خون آلود پٹی بندھی تھی۔

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا کوئی نام نہیں۔ میں بس مسلمان ہوں اور ان سور خور گوروں کو اپنے شہر سے نکالنا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا خون چوسنے والے درندے ہیں، یہ ہماری عزتوں کے قاتل ہیں۔ یہ مٹھی بھر پلید جانور ہمارے راجواڑے پر حکومت نہیں کر سکتے۔ ہم انہیں یہاں سے مار بھگائیں گے۔''

ہم نے دیکھا کہ جس بے ہوش شخص کو بیدردی سے فرش پر پھینکا گیا تھا، وہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ جو کھانا ہمارے لیے اندر آیا تھا، اس میں پانی بھی موجود تھا۔ عمران نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی۔ یہ پانی اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔ ہم نے پہرے داروں کو آوازیں دیں لیکن کسی نے نہیں سنیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ ادھیڑ عمر شخص جان

کی بازی ہار گیا۔ اس کے سینے پر تلوار کا گھاؤ تھا اور یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کے گلے میں دو تین تعویذ تھے۔ اس کے بازو پر امام ضامن بندھا ہوا تھا۔ یہ امام ضامن یقیناً اس کے کسی پیارے نے اسے باندھا تھا اور باندھ کر اس لڑائی میں بھیجا تھا جو گوروں کے خلاف لڑی جا رہی تھی یا لڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مسلح گارڈز نے دروازہ کھولا۔ کم از کم چار رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور یہاں یہ اکیلے چار گارڈز ہی نہیں تھے۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ یہاں ہر طرف باوردی گارڈز موجود ہیں۔ مر جانے والے شخص کی لاش گھسیٹ کر باہر نکالی گئی۔ بھرت کے ساتھ اندر آنے والا دوسرا شخص چلایا۔ ''تم گوروں کا ساتھ دے رہے ہو۔ تم کتوں کی موت مرو گے۔ تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا اس راجواڑے سے۔ تم نے۔۔۔''

ابھی اس کا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ ایک ہندو گارڈ نے رائفل کا دستہ پورے زور سے گھما کر اس کے منہ پر مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہمیں یہ خدشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ بھی ختم ہو گیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ تین چار منٹ بعد وہ کسمسانے اور بڑبڑانے لگا۔ اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل گئی تھی۔

''تم اسے جانتے ہو؟'' عمران نے بھرت سے پوچھا۔

''نا ہیں۔۔۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں میں شامل ہے جو زرگاں کے اندر پچھلے دو دن سے مختلف کارروائیاں کر رہے ہیں۔ شاید تم کو پتا نہ ہو، باغیوں نے جامع مسجد کے علاقے میں فوجیوں کا ایک بڑا ڈپو دھماکے سے اڑا دیا ہے۔ وہاں پندرہ بیس سپاہی زندہ جل مرے ہیں۔ ان میں تین چار گورے بھی شامل ہیں۔''

''ہاں، ایک بڑا دھماکا تو ہوا تھا آج آدھی رات کے وقت۔'' عمران نے کہا۔

''یہ وہی ڈپو والا دھماکا تھا۔ اس کے بعد زرگاں میں حکم کے سپاہیوں اور گورے فوجیوں پر کئی جگہ حملے ہوئے ہیں۔ گوروں کے کئی گھروں کو بھی آگ لگائی گئی ہے۔ ان کی عورتیں اور بچے پناہ کے لیے راج بھون کی طرف جا رہے ہیں۔''

''تم کس جرم میں پکڑے گئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بے گناہی کے جرم میں۔'' وہ تاسف سے بولا اور اپنی پیشانی سے رسنے والا خون پونچھنے لگا۔

ہم کونے میں بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ''کسی شک میں پکڑا گیا ہے تمہیں؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''شک میں نا ہیں، وشواس میں پکڑا گیا لیکن یہ بالکل جھوٹا وشواس تھا۔'' بھرت نے آہ بھری۔

''تمہارے گھر والے اور چیچی وغیرہ تو خیریت سے ہیں نا؟''

''میرے آنے تک تو خیریت سے تھے، اب کا پتا نا ہیں۔''

تفصیل بتاتے ہوئے بھرت نے کہا۔ ''سچ پوچھیں تو زرگاں شہر میں بہت خون خرابا ہو رہا ہے۔ بلوائیوں نے جگہ جگہ آگ لگا دی ہے۔ آپ کو آواز آ رہی ہوگی۔۔۔ سنیں اب بھی گولیاں چل رہی ہیں۔''

واقعی کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔

بھرت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شہر میں فساد کی خبریں سن کر میں گاؤں سے یہاں پہنچا تھا۔ آپ کو پتا ہے نا، میرے بڑے بھیا یہاں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی چنتا تھی۔ میں یہاں اپنے ایک دوست مدن کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ کل رات ایک انگریز فیملی مدن کے پاس پناہ کے لیے آئی۔ اس میں اٹھائیس تیس سال کی ایک جواں سال ناری اور اس کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکے کی عمر سات آٹھ سال ہووے گی، لڑکی چار پانچ برس کی تھی۔ یہ مدن دراصل سرکاری ملازم بھی ہے۔ یہ اسی انگریز عورت کرسٹی کے محلے میں رہتا ہے۔ اس عورت نے سوچا ہووے گا کہ یہاں وہ محفوظ ہو جاوے گی۔ لیکن اسے پتا نا ہیں تھا کہ بغاوت پھوٹنے کے بعد بہت کچھ بدل چکا ہے۔ پرائے، اپنے بن گئے ہیں اور دوستوں نے دشمنوں کا روپ دھار لیا ہے۔ مدن نے کرسٹی کو پناہ تو دے دی لیکن اندر خانے اس کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے اپنی پتنی سے کہا کہ کرسٹی اور اس کے بچے یہاں گھر میں محفوظ نا ہیں ہیں۔ بلوائیوں کو شک ہو گیا تو وہ انہیں گھسیٹ کر یہاں سے لے جاویں گے اور گلی میں جا کر ان کی ہتھیا کر دیویں گے۔ شاید میں نے بتایا نہیں، یہ کرسٹی محلے دار ہونے کے کارن مدن کی پتنی کی سہیلی بھی تھی۔ وہ بھی ڈر گئی کہ کہیں کرسٹی اور اس کے بچوں کے ساتھ کچھ ہو نہ جاوے۔ مدن نے کہا کہ وہ کرسٹی کو اپنی باغ والی حویلی میں لے جاتا ہے۔ وہ اسے وہاں لے گیا۔ وہاں اس کے دو دوست بھی موجود تھے۔ تیسرا میں تھا۔ باغ والی حویلی میں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ مدن کی نیت کیا ہے۔۔۔''

میں نے بھرت کو روکتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بات کاٹ رہا ہوں… کہیں یہ مدن وہ… منیجر مدن تو نہیں جو لال بھون میں کام کرتا ہے؟“

بھرت نے کہا۔ ”مجھے لال بھون کا تو پتا نا ہیں لیکن اتنا جانت ہوں کہ وہ منیجر ہے۔ اس کے بال جلدی سفید ہو گئے ہیں اس لیے کبھی کبھی خضاب بھی لگاوت ہے۔“

میں اور عمران جان گئے کہ وہ اسی منیجر مدن کی بات کر رہا ہے جو لال بھون میں ”پریوں“ کی تربیت کے کام میں میڈم منفورا کی مدد کرتا تھا۔ دیکھنے میں وہ جنٹل مین لگتا تھا لیکن اب جو صورتِ حال سامنے آرہی تھی، وہ کسی دوسری طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے بھرت سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ بھرت نے تفصیل میں جاتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب کچھ یوں ہے۔

مدن اور اس کے دونوں دوستوں کی نیت کرسٹی پر خراب ہو چکی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے کبھی عورت نہیں دیکھی تھی۔ ہاں، یہ بات ضرور تھی کہ انہوں نے کبھی گوری عورت نہیں دیکھی تھی۔ جس طرح ٹکٹیں جمع کرنے کے شوقین ہر طرح کی ٹکٹیں اپنے البم میں جمع کرنا چاہتے ہیں، ایسے ہی عیاش لوگ ہر طرح کی اور ہر رنگ ڈھنگ کی عورت کے ساتھ شب بسری کی خواہش رکھتے ہیں۔ کچھ یہی کیفیت مدن اور اس کے دوستوں کی تھی۔ وہ کسی انگریز میم کی قربت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن جو سنسنی خیز اور خطرناک صورتِ حال پیدا ہوئی تھی، اس نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ ایک میم کو اپنے تصرف میں لائیں۔ دوسری طرف میم کرسٹی بھی اچھی طرح جان گئی تھی کہ اگر وہ اپنی اور اپنے معصوم بچوں کی جان بچانا چاہتی ہے تو اسے مدن کمار کی ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔ مدن کمار نے اسے مجبور کیا کہ وہ نہا دھو کر ہندوستانی کپڑے پہنے، خوشبو لگائے اور ان سب کو شراب پلائے۔ درحقیقت یہ لوگ اپنے طور پر یہ حتمی نتیجہ نکال چکے تھے کہ انگریزوں اور ان کے پٹھو حکم جی کے خلاف، یہ خونی ایجی ٹیشن کامیاب ہونا ہے اور کرسٹی اور اس جیسی دوسری عورتوں کی حیثیت مالِ غنیمت سے زیادہ نہیں۔

بھرت فطرتاً اچھا آدمی تھا۔ جو کچھ مدن اور اس کے دوست کرنے جا رہے تھے وہ اسے کسی طور قبول نہیں تھا۔ اس نے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ باز نہیں آئے۔ ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ نوبت گالم گلوچ تک آئی۔ بھرت نے کہا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا، وہ جا کر چوکی میں اطلاع کرے گا۔ بھرت کے یہ تیور دیکھ کر مدن کمار اور اس کے دوستوں نے بھرت کو ایک اسٹور روم میں بند کر دیا۔ بھرت شور مچاتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح وہاں سے نکل سکے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے کرسٹی کے ساتھ عیاشی شروع کر دی۔ کرسٹی کے دونوں بچے بالائی منزل کے ایک کمرے میں سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ کرسٹی کو امید تھی کہ وہ اپنی اور بچوں کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گی اور اس کی ”خدمات“ کے عوض یہ ہندوستانی اسے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیں گے لیکن جو کچھ ہوا، اس کا علم کرسٹی کو نہیں تھا اور مدن وغیرہ بھی بے خبر تھے۔

حکم کے وفادار سپاہیوں کی ایک گھوڑا گاڑی اس عمارت کے پاس سے گزری۔ ان سپاہیوں میں ایک گورا افسر بھی شامل تھا۔ ان لوگوں نے بالائی منزل کی ایک کھڑکی میں ایک سفید فام بچی کو روتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ کرسٹی ہی کی بچی تھی۔ سپاہیوں نے حقیقتِ حال جاننے کے لیے عمارت کے اندر آنا چاہا… مدن کے چوکیدار نے رنگ رلیوں میں مصروف مدن کمار کو اطلاع دی۔ اسی دوران میں سپاہیوں نے پھاٹک پھلانگ کر اندر آنے کی کوشش کی۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کے پاس اسلحہ تھا۔ مدن تو قدرے ڈرپوک بندہ تھا مگر اس کے ساتھیوں نے گولی چلا دی۔ دوسری طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک گولی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر آئی اور کرسٹی کے سر کے سنہری بالوں میں سرخ پھول کھل گیا۔ وہ چند سیکنڈ میں دم توڑ گئی۔ حکم کے سپاہیوں میں سے ایک کو عمارت کے احاطے میں گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا شدید زخمی ہوا۔ باقی دو بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاید انہیں اندر سے اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ اب یقیناً وہ کمک لینے گئے تھے۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اب انہیں فوراً یہاں سے کھسکنا ہوگا۔ تاہم جاتے جاتے انہوں نے بھرت کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسٹور روم میں آئے۔ مدن تو بھرت سے گالم گلوچ کرتا رہا جبکہ اس کے دونوں ساتھیوں نے اچانک عقب سے بھرت کو دبوچ لیا۔ اس کے منہ پر بڑی سختی سے ایک بدبودار رومال رکھ دیا گیا۔ چند سیکنڈ میں بھرت بے ہوش ہو گیا۔

جب آدھ پون گھنٹے بعد وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں آیا اور اس نے بوجھل آنکھوں سے اپنے اردگرد دیکھا تو خود کو عجیب حالت میں پایا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور کرسٹی کی برہنہ لاش کے ساتھ بستر پر پڑا تھا۔ کرسٹی کی برہنہ لاش کے اوپر چادر ڈال دی گئی تھی۔ ان کے اردگرد کئی گورے اور مقامی فوجی موجود تھے۔ گورے فوجیوں نے اسے ٹھوکریں ماریں اور گندی گالیاں دیں۔ اسے کرسٹی کے روتے ہوئے بچوں کے سامنے لایا گیا۔ بچوں نے بھی تصدیق کی کہ بھرت ان بندوں کا ساتھی ہے جنہوں نے ان کی ماما کو پکڑا تھا۔ بھرت نے بہت دہائی دی مگر اس کی کسی نے نہیں سنی۔ اس کی مدہوشی کو بھی شراب اور منشیات کی مدہوشی سے ہی تعبیر کیا گیا اور اب بھرت یہاں اس جیل میں تھا۔ پکڑ دھکڑ کی وجہ سے جیل میں گنجائش کم پڑ رہی تھی۔ لہٰذا بھرت کو بھی دیگر دو قیدیوں کے ہمراہ ہماری کوٹھڑی میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

ہم نے پوری توجہ سے بھرت کی روداد سنی اور بیچ میں سوالات بھی کیے۔ بھرت نے باہر کے حالات کی مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”ماریا کی موت کا گورا جاتی کے لوگن (انگریز کمیونٹی) نے بہت سوگ منایا ہے۔ ماریا کو گورا قبرستان میں جارج کے پہلو میں دفن کیا گیا ہے۔ سرجن اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ نے سوگند کھائی ہے کہ وہ ماریا کے قاتلوں کو عبرتناک انجام سے دوچار کریں گے۔“

”اس زخمی افسر کیپٹن ٹام کا کیا بنا؟“ عمران نے پوچھا۔

”وہ خبیث بچ گیا ہے۔ سنا ہے کہ اسے بچانے کے لیے پولیس افسر رنجیت پانڈے نے خود کو خطرے میں ڈالا تھا۔ وہ اسے برستی گولیوں میں اپنا ”کور“ دے کر احاطے سے باہر لے آیا تھا۔“

عمران نے کہا۔ ”لیکن ٹام کو اور باقی لوگوں کو خطرے میں ڈالنے والا بھی تو یہی کتا پانڈے تھا۔“

”کیا مطلب؟“ بھرت نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ عمران بات گول کر گیا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”آفتاب اور ہاشم کی لاشوں کا کیا بنا؟“

”ان کی لاشیں کسی نے وصول ہی نا ہیں کیں۔ ان کا جو کچھ کیا ہوگا، حکم کے سپاہیوں نے ہی کیا ہوگا یا پھر ہو سکت ہے کہ انہیں امام مسجد قادر بخش صاحب کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ کچھ کٹر قسم کے لوگن یہ الزام بھی لگا رہے ہیں کہ امام قادر بخش صاحب کے دہشت گردوں سے رابطے ہیں اور ان کی بدعہدی کی وجہ سے ماریا کی جان گئی ہے۔ حالانکہ سب جانت ہیں کہ امام صاحب نے معاملے کو سنبھالنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ یہ ہاشم رازی کی ہٹ دھرمی تھی جس کے کارن معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ بہرحال، جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ کچھ لوگن کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ دونوں یعنی آپ اور تابش، گورے افسروں کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے اور ماریا کے بدلے میں سلطانہ بی بی کا جیون بچانا چاہت تھے…“

عمران نے کہا۔ ”اب باہر کے حالات کیا ہیں بھرت؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ گوروں اور حکم کے وفادار سپاہیوں کے خلاف عام لوگوں کی یہ بغاوت کامیاب ہو جائے گی؟“

بھرت نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”ابھی وشواس سے کچھ نا ہیں کہا جا سکتا۔ فی الوقت جو بھی کارروائیاں ہو رہی ہیں، ان میں زیادہ تر مسلمان ہی حصہ لے رہے ہیں۔ کہیں کہیں نچلی جاتیوں کے ہندو اور بودھ بھی اس میں شریک ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ گوروں اور حکم جی کے پاس جدید اسلحہ اور طاقت ہے۔ ایک باقاعدہ فوج ہے۔ جب تک دلی یا نئی میں چھوٹے سرکار کی طرف سے کوئی حرکت نا ہیں ہووے گی، اس لڑائی کا فوری نتیجہ نکلنا آسان نا ہیں ہے…“

”غلط… بالکل غلط۔“ اچانک فرش پر لیٹے زخمی نے دہاڑ کر کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ جوش سے بولا۔ ”زرگاں کے جی داروں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اکیلے ہی ان مٹھی بھر گوروں کو چیر کر چیل کوؤں کے آگے پھینک دیں۔ انور خان ہمارا سالار ہے… اور اب وہ ہمارے درمیان ہے۔ اس شیر کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور کی مدد کی ضرورت نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ انور خاں کا ایک ایک جاں نثار… کرائے کے ان سو سو ٹٹوؤں پر بھاری ہے…“

انور خاں کا نام سن کر میں چونکا۔ اس کا روشن چہرہ، اس کی کشادہ پیشانی، اس کا چوڑا سینہ اور اس کا پُرجوش انداز… سب کچھ ایک لمحے میں میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ زرگاں کے مسلمان انور خاں کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ یہ انور خاں ہی تھا جس نے سلطانہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بعد جارج گورا کو آڑے ہاتھوں لیا تھا… انور کی قیادت میں سیکڑوں پُرجوش لوگوں نے جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہلا بولا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اب یہ زخمی شخص بتا رہا تھا کہ انور خاں پھر زرگاں میں ہے اور باغی گروہوں کی قیادت کر رہا ہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ حوصلہ افزا صورتِ حال تھی۔ میں نے زخمی شخص سے پوچھا۔ ”تم کیسے جانتے ہو کہ انور خاں یہاں ہے؟“

”بچہ بچہ جانتا ہے۔ یہ جو انگریزوں اور دیسی انگریزوں کی دم میں نمدہ فٹ ہو رہا ہے، یہ یونہی نہیں ہو رہا۔ لوگ جانتے ہیں کہ شیر بھیڑیوں میں گھس آیا ہے اور اب ان

بھیڑوں کو بھاگتے ہی بنے گی۔ تم دیکھنا چند دن کے اندر زرگاں کی گلیوں میں حکم کے بھاڑے کے ٹٹوؤں اور ان گوروں کی لاشیں گھسیٹی جائیں گی۔"

بھرت نے کہا۔ "بے شک انور خاں دلیر شخص ہے۔ بہت سے لوگ اس سے ہمدردی بھی رکھتے ہیں لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ زرگاں میں ابھی تک کہیں نظر نہیں آیا۔ یہی کارن ہے کہ ابھی تک بہت سے لوگ یہ وشواس نہیں کر رہے کہ وہ واقعی یہاں موجود ہے۔"

"وہ ہے... وہ ہے۔ میں نے خود اسے دیکھا ہے اور باقی بھی جلد دیکھیں گے۔" زخمی شخص پورے اعتماد سے بولا۔ "کل جن جاں بازوں نے اسلحہ گودام میں آگ لگائی ہے، ان میں انور خاں بھی شامل تھا۔"

اسی دوران میں ایک اور بڑے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ دھماکا شہر کے وسط میں کہیں ہوا تھا۔ گونج سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بھی ایک بڑا دھماکا ہے... اس کے ساتھ ہی چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ بھی سنائی دینے لگی۔ زخمی شخص نے پُرجوش انداز میں ایک فاتحانہ نعرہ بلند کیا اور پھر اپنے گلے میں موجود چاندی کے ایک چمکیلے تعویذ کو کئی بار چوما۔

ہم کچھ دیر تک کان لگا کر سنتے رہے۔ قریباً پانچ منٹ بعد فائرنگ ختم ہوگئی۔ زخمی شخص نے عمران اور بھرت کے پوچھنے پر اپنا نام ابراہیم بتایا۔ وہ بولا۔ "آج رات بارہ بجے تک پورے شہر میں کارروائیاں ہوں گی۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔"

"مبارک دن؟" میں نے پوچھا۔

"آج چاند کی سات تاریخ ہے اور بدھ کا دن ہے۔ چاند کی سات اور بدھ کا دن ان گوری چمڑی والوں کے لیے بہت منحوس ہے۔ اسی طرح اگر چاند کی پانچ یں اور تیرھویں تاریخ کو بدھ کا دن آئے گا تو وہ بھی ان گوروں اور حکم کے ہرکاروں کے لیے بڑا نحس ہوگا۔ اور میرا تو خیال ہے کہ اب آنے والا ہر دن ہی ان مردودوں کے لیے نحس ہوگا۔ بہت جلد ان کا بیڑا غرق ہونے والا ہے۔ ان کا ظلم ہی ان کے گلے کا پھندا بننے والا ہے۔"

"یہ چاند کی تاریخوں والی بات کس نے بتائی ہے؟" بھرت نے ابراہیم سے پوچھا۔

ابراہیم نے چاندی کے تعویذ کو چوما اور عقیدت سے بولا۔ "ہمارے حضرت صاحب نے۔ اور یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں۔ نہ ہی تم ان کو وہم سمجھ سکتے ہو۔ ان گوری چمڑی والوں کے دن اس راجواڑے میں پورے ہو چکے ہیں۔ اب ان کو یہاں سے بھاگنا ہے یا کتے کی موت مرنا ہے۔" اس نے ایک بار پھر پُرجوش نعرہ لگایا۔

کوٹھڑی کے چوبی دروازے میں موجود چھوٹا چوکور پٹ کھلا اور ایک گارڈ نے شعلہ بار نظروں سے ہمیں گھورا۔ وہ زخمی ابراہیم کو مخاطب کر کے بولا۔ "گندے کتے کی طرح زیادہ ابلتا مت جا۔ چپ کر کے بیٹھ ورنہ ابھی گلا کاٹ کر پھینک دیویں گے۔"

ابراہیم پھنکارا۔ "گلا کاٹ بھی دو گے تو یہ آواز بند نہیں ہوگی۔ تم کتنے گلے کاٹو گے، کتنی آوازیں بند کرو گے؟"

گارڈ نے زہرناک لہجے میں کہا۔ "دوسروں کا تو کہہ ناہیں سکتا لیکن تیری بولتی ضرور صبح تک بند ہو جاوے گی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے چوکور خانے کا پٹ زور سے بند کر دیا۔

ابراہیم نے بلند آواز میں اسے کوسا پھر دروازے کی طرف تھوک دیا۔

گارڈ کی دھمکی اور اس کا لہجہ قابلِ غور تھے۔ "یہ کیا کہہ کے گیا ہے؟" عمران نے ابراہیم سے پوچھا۔

"جان سے مارنے کی دھمکی دیتے ہیں لیکن نہیں مار سکتے۔ جب تک میری زندگی ہے، کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اس نے ایک بار پھر عقیدت سے چاندی کے تعویذ کو چوما۔ اس کے چہرے پر فکر تردد کا نشان تک نہیں تھا۔

ابراہیم ان ہزاروں لوگوں میں سے ایک تھا جن کے دلوں میں انگریزوں اور ان کے کٹھ پتلی حکم جی کے خلاف شعلے بھڑک رہے تھے۔ سلطانہ کی موت کے بعد یہ شعلے کچھ اور بلند ہو گئے تھے... وہ مرنا یا مار دینا چاہتے تھے...

رات بھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ علی الصباح مسلح گارڈز آئے۔ انہوں نے ابراہیم کو بتایا کہ بڑے صاحب محترم اینڈرسن اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ابراہیم نے جانے میں پس وپیش کی لیکن وہ اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ ہمیں مختلف آوازوں سے اندازہ ہوا کہ اردگرد کی کوٹھڑیوں سے بھی کچھ قیدیوں کو نکال کر لے جایا جا رہا ہے۔ ایسے کچھ قیدی مزاحمت بھی کر رہے تھے۔

صرف آدھ گھنٹے بعد ساری صورتِ حال سامنے آگئی اور یہ کافی سنگین تھی۔ یہ سنگین صورتِ حال ہمیں دکھانے کے لیے گارڈز نے ہماری کوٹھڑی کے دروازے میں موجود چھوٹا چوکور پٹ کھول دیا۔ آہنی سلاخ کی دوسری جانب دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود ایک دوسرا دروازہ بھی کھول دیا گیا تھا۔ اب ہمیں جیل کے ایک چھوٹے احاطے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں ایک سرسری سماعت کی عدالت لگی ہوئی تھی۔ بس ایک لمبی میز تھی جس کے پیچھے اسٹیٹ کے چار فوجی افسر بیٹھے تھے۔ دو مقامی اور دو انگریز تھے۔ انگریزوں میں تمتماتے چہرے والا اینڈرسن بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میری رگوں میں لہو کی جگہ آگ بہنے لگی۔ سلطانہ کی اچانک موت کے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔

اسٹیٹ کے فوجی افسروں کے سامنے ایک قطار میں قریباً پندرہ افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ مضبوط رسیوں سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں کو بھی اسی طرح باندھ دیا گیا تھا۔ ان کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ابراہیم بھی ان میں شامل تھا۔ لگتا تھا کہ ان قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اینڈرسن نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ "تم لوگوں پر یہ الزام ثابت ہوتا ہیں کہ تم نے عام شہریوں پر حملے کیے۔ اسپیشلی تم نے برٹش عورتوں اور بچوں کا مرڈر کیا۔ ان کی پراپرٹی کو نقصان پہنچایا... اور کھلے عام بغاوت کی... اس کے علاوہ دوسروں کو بغاوت پر اکسایا۔ ان کرائمز کے لیے یہ کورٹ تم کو سزائے موت دیتا..."

قیدیوں میں سے دو افراد چلانے لگے۔ ان میں ایک ابراہیم تھا۔ وہ اینڈرسن کے فیصلے کو یکسر رد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ انہوں نے عورتوں اور بچوں کو نہیں، اپنے ساتھ لڑنے والے مسلح لوگوں کو مارا۔ ان ظالموں کو مارا جنہوں نے یہاں کے لوگوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔

اینڈرسن اور دیگر افسروں کے چہرے پتھر کی طرح سپاٹ تھے۔ ان پر ان باتوں کا بالکل اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان قیدی کا رنگ یکسر ہلدی نظر آیا۔ اس نے التجا کے لہجے میں کچھ کہا۔ شاید افسروں کی منت سماجت کی۔ غالباً وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ان لوگوں میں شامل نہیں ہوا۔ موت کو بالکل سامنے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس کی حالت ترس ناک تھی مگر یہاں انہیں ترس کھانے کے لیے نہیں، شوٹ کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لی وان کا تیرہ چودہ سالہ پوتا یاد آگیا۔ وہ بھی تو ایسے ہی رو یا بلکا تھا۔ بھرت کی زبانی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اسپتال کے خونی ہنگامے میں وہ بچ گیا ہے۔ ابراہیم دہاڑنے لگا۔ "تم گوری چمڑی والوں کی موت بڑی دردناک ہوگی۔ کتوں کی طرح زرگاں کی گلیوں میں گھسیٹے جاؤ گے۔ موت کو ترسو گے لیکن موت نہیں ملے گی۔" پھر اس نے اپنا سینہ تان لیا۔ جیسے گولی کھانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا ہو۔

اس کو دیکھ کر اور کئی افراد نے بھی سینے تان لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان میں سے اکثر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ رائفل اسکواڈ بالکل تیار کھڑا تھا۔ یہ چھ باوردی سپاہی تھے جو جدید رائفلیں کندھوں سے لگائے بالکل تیار حالت میں کھڑے تھے۔ اینڈرسن نے اپنے ہاتھ میں سفید رومال پکڑ لیا تھا۔ رومال کے اس اشارے پر قیدیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جانا تھی۔ یہ بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔ مجھے کچھ عرصے پہلے اسحاق کی دردناک موت یاد آگئی۔ دو مسلح سپاہی آگے بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیز دھار چاقو تھے۔ انہوں نے قیدیوں کے تعویذ اور امام ضامن وغیرہ کاٹ کر ان کے جسموں سے علیحدہ کر دیے۔ ایک پارسی نوجوان کے لباس سے ایک چھوٹی سی... پاکٹ سائز کی مذہبی کتاب بھی نکلی۔ یہ اشیا قیدیوں کے جسموں سے علیحدہ کرنے کے بعد قیدیوں کو بتایا گیا کہ وہ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق خدا سے گناہوں کی معافی مانگ لیں، انہیں گولی ماری جا رہی ہے۔

نوجوان لڑکا آخری کوشش کے طور پر پھر منت سماجت کرنے لگا۔ آٹھ دس سیکنڈ بعد اس کی آواز فائرنگ کی خوفناک آواز میں دب گئی۔ فائرنگ اسکواڈ نے اندھا دھند برسٹ چلائے اور پندرہ کے پندرہ قیدیوں کو چھلنی کر دیا۔ ان کے جسم اوندھے سیدھے گرے اور تیزی سے خون اگلنے لگے...

ہماری طرح یہ منظر جیل کے اور بھی بہت سے قیدیوں نے دیکھا۔ ایک دہشت زدہ سی خاموشی نے سب کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مقدمہ چلا تھا۔ استغاثہ اور صفائی کے دلائل سنے گئے تھے اور سزائے موت دے دی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازے کا چوکور روزن بند کر دیا گیا اور ہماری کوٹھڑی میں صرف لالٹین کی مدھم روشنی باقی رہ گئی۔

"یہ لوگ درندگی پر اتر آئے ہیں۔ انصاف کے تقاضے پورے کیے بغیر نردوشوں کو مارا جا رہا ہے۔" بھرت نے تاسف سے کہا۔

"جب پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگے تو ظالم حکمراں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔" عمران نے بوجھل لہجے میں کہا۔

زخمی ابراہیم نے دو گھنٹے پہلے جن برتنوں میں ناشتا کیا تھا، وہ اسی طرح ایک کونے میں پڑے تھے۔ اس کی خون میں بھیگی ہوئی ایک پٹی بھی ایک گوشے میں رکھی تھی لیکن وہ خود اب نہیں تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ ان پندرہ قیدیوں کو سرِعام سزا اس لیے دی گئی ہے کہ دیگر قیدی عبرت پکڑیں اور عملے کے احکام

پر بے چوں چراں عمل کریں۔ اس نعرے کے بعد دروازے کا روزن بند ہو چکا تھا اور ہمیں امید نہیں تھی کہ وہ جلد ہی دوبارہ کھلے گا۔ مگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلا۔ دروازے کی دوسری جانب ایک دو منٹ تک کھٹ پٹ ہوتی رہی۔ یوں لگا جیسے کوئی وزنی کرسی گھسیٹ کر دروازے کے پاس لائی گئی ہے۔ پھر روزن یعنی چوکور جانے کا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا گیا۔ دوسری طرف کا منظر تعجب خیز تھا۔ ہم سے صرف سات آٹھ فٹ کی دوری پر مسٹر اینڈرسن بڑی شان سے ایک صوفہ نما نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگار اور دوسرے میں وھسکی کا جام تھا۔ اس کا سرخ چہرہ ہمیشہ سے زیادہ تمتما رہا تھا۔ اس کے عقب میں دو مسلح انگریز فوجی موجود تھے۔ وہ اپنے چمکیلے جوتے والے ایک پاؤں کو مسلسل ہلا رہا تھا۔

میرا خون ایک بار پھر رگوں میں سیال آگ کا روپ دھار گیا۔ جی چاہا کہ اردگرد کی ساری رکاوٹوں سے ٹکرا جاؤں، ان کو توڑ دوں یا خود ختم ہو جاؤں... اور اگر ان کو توڑ دوں تو پھر اس تمتمائے چہرے والے سفید شیطان پر جا پڑوں اور خالی ہاتھوں سے اس کا جسم پھاڑ کر رکھ دوں۔

اس نے سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ ”افسوس ہے کہ مجھے تمہیں یہاں دیکھنا پڑ رہا ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”ہمیں بھی افسوس ہے کہ ہم یہاں ہیں۔ آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ ہمارے درمیان کچھ طے ہوا تھا۔“

اینڈرسن نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے کھڑے دونوں انگریز محافظ ایک طرف اوجھل ہو گئے۔

اینڈرسن بولا۔ ”ہمارے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا، اس کی پہلی شرط تو یہی تھی کہ تم دونوں ہندو سپاہیوں کے سامنے نہیں آؤ گے۔ لیکن جب تم آ گئے اور بہت سے لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا تو پھر ہمارا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔“

عمران نے جواب دیا۔ ”ہم اس وقت سامنے آئے تھے جب سارا کھیل بگڑ چکا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ کم از کم سلطانہ کو ہی بچایا جا سکے اور پھر...“

یکایک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ایک طرف سے وزنی بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر رنجیت پانڈے ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی میں ایک سرخ رنگ کی پٹی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے ایک فاتحانہ نظر ہم پر ڈالی اور پھر مسٹر اینڈرسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے کاغذات مسٹر اینڈرسن کے حوالے کیے اور دھیمے لہجے میں کچھ کہا بھی۔ ”ویل ڈن... ویل ڈن۔“ اینڈرسن نے سر ہلایا۔

ہم پر ایک اور ترچھی نظر ڈال کر وہ واپس چلا گیا۔ بڑی زہریلی کمینگی تھی اس نظر میں۔

عمران نے اینڈرسن سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”لگتا ہے پانڈے صاحب کی پروموشن ہو گئی ہے۔“

”کیوں نہیں... کیوں نہیں۔ ہمیں اچھے اور قابل ساتھیوں کی قدر کرنا آتی ہے۔ پانڈے نے اتھرا گاؤں میں کارکردگی دکھائی ہے۔“

”ہاں کارکردگی تو اس نے واقعی دکھائی ہے۔“ عمران نے ہولے سے کہا۔

”تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اینڈرسن نے پوچھا۔

”کچھ نہیں... آپ... پانڈے صاحب کی کارکردگی کا بتا رہے تھے۔“

اینڈرسن نے گلاس میں سے ایک سنہری گھونٹ لیا اور بولا۔ ”اسپتال میں اندھا دھند فائرنگ کے وقت پانڈے نے زخمی کپتان ٹام بریرے کو بچانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ وہ برستی گولیوں میں اس تک پہنچا اور اسے اپنی اوٹ میں لے کر فائرنگ کی زد سے نکال لیا۔ اور یہی نہیں، اس سے صرف دو منٹ پہلے وہ ایک اور اہم کارنامہ انجام دے چکا تھا۔“

”وہ بھی بتا دیجیے جناب۔“ عمران نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس جنونی قاتل آفتاب خان کو شوٹ کیا۔ اگر وہ جلد ہی ایسا نہ کرتا تو شاید اور کئی لوگوں کی جان جاتی... بہرحال، وہ تیسرا بندہ کہیں نہیں مل سکا جو آفتاب اور سلطانہ کے ساتھ تھا۔“

عمران خاموش رہا۔ ہم جانتے تھے کہ تیسرے بندے کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ یہ ساری گفتگو حسب سابق انگلش میں ہو رہی تھی۔ عمران چند سیکنڈ خاموش رہا، پھر اینڈرسن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ”واقعی جناب! وہاں پانڈے صاحب کی کارکردگی زبردست رہی ہے۔ بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ محترمہ ماریا کی موت کا ”کریڈٹ“ بھی پانڈے صاحب کو ہی جاتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ اینڈرسن نے عمران کو گھورا۔

عمران نے کہا۔ ”آپ نے سوچا ہے کہ وہ گولی کس نے چلائی جس کی وجہ سے یہ ساری گڑبڑ ہوئی اور محترمہ ماریا سمیت کئی افراد کی جان چلی گئی؟“

اینڈرسن نے سگار کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔ دھوئیں کے پس منظر میں وہ قیدی مزدور نظر آ رہے تھے جو ”سرسری عدالت“ کے فرش پر سزائے موت پانے والے قیدیوں کا خون صاف کر رہے تھے۔ کسی ساتھ والی راہداری میں پہرے داروں کے جوتوں کی ٹھک ٹھک گونج رہی تھی۔ ماحول میں عجیب سی سہمی ہوئی خاموشی تھی۔ اینڈرسن نے ایک ابرو اٹھائی اور انگلش اسٹائل میں بولا۔ ”مجھے یقین ہے گولی چلانے والا کوئی باسٹرڈ مقامی ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہی ہو۔ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ سر جارج کی معزز بہن اس صورتِ حال میں سے زندہ سلامت نکل جائے۔ اس نے کسی قریبی چھت پر سے فائرنگ کی اور سب کچھ درہم برہم کر دیا۔ یہ مسلمان زیادہ تر ہوتا ہی جنونی ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ گولی چلانے والا اور اس سارے معاملے کو خراب کرنے والا آپ کا چہیتا افسر رنجیت پانڈے تھا تو پھر...“

”میں تمہاری اس بکواس پر ہرگز یقین نہیں کروں گا۔“

”بہت اعتماد ہے آپ کو اس پر؟“

”اعتماد بھی ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ گولیاں چلیں، اس وقت وہ میرے ساتھ موجود تھا۔“

”اس نے وہ خود نہیں چلائیں۔ اس کے ساتھیوں نے یہ کام کیا۔“

”کیا میں شکل سے تمہیں اتنا گاؤدی نظر آتا ہوں کہ تمہاری باتوں پر بھروسا کروں گا؟“

”اسی لیے تو آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔“

اینڈرسن جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”اپنی اطلاع تم اپنے پاس رکھو۔ میں تم دونوں سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اور مجھے اپنے سوالوں کا صحیح صحیح جواب چاہیے؟“

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر ہم آپ سے تعاون کریں تو ہمارے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟“

اینڈرسن نے دھواں نتھنوں سے خارج کیا۔ ”تم نے اسپتال والے ہنگامے میں سب کے سامنے آ کر غلطی کی۔ اس غلطی کا خمیازہ تو تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ کیا خمیازہ ہوگا، ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“

”آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ عمران نے کہا۔

”انور خاں کے بارے میں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ تابش کا ساتھی رہا ہے۔ وہ اس وقت یہاں زرگاں میں موجود ہے۔ یہاں ہونے والی تخریبی کارروائیوں میں اس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ میں تابش سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہاں زرگاں میں انور خاں کا ٹھکانا کہاں ہو سکتا ہے۔ مجھے زرگاں میں اس کے قریبی دوستوں کے کوائف بھی درکار ہیں۔“

میں اب تک ہونے والی گفتگو میں بالکل خاموش رہا تھا۔ میری آنکھیں اینڈرسن کی دید سے جل رہی تھیں اور سینے میں آتشیں طوفان ابل رہا تھا۔

اینڈرسن نے عمران سے توجہ ہٹا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”ہاں... انور خاں کے بارے میں تم کیا بتا سکتے ہو ہمیں...“

میں خاموش رہا۔ عجیب سی بے حسی طاری تھی مجھ پر۔ اینڈرسن چنگھاڑا۔ ”میں کچھ پوچھ رہا ہوں آپ جناب سے... اپنے ساتھی انور خاں کے بارے میں کیا جانتے ہو تم؟“

میں نے اینڈرسن کی نیلگوں آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”میں صرف اتنا جانتا

ہوں کہ انور خاں تم جیسے سارے سفید کتوں کی ٹانگیں چیرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ ضرور چیرے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ یہ کام نہ کر سکا تو پھر کوئی اور کرے گا۔ میں کروں گا یا میرے جیسا کوئی دوسرا۔ لیکن کچھ بھی ہو، اس راجواڑے میں تم ولیلوں کی بدمعاشیوں کے دن گزر گئے ہیں... گزر گئے ہیں۔" میں نے آخری الفاظ اتنی بلند آواز میں کہے کہ در و دیوار میں گونج محسوس ہوئی۔

میرا یہ جواب اور لب ولہجہ بالکل غیر متوقع تھا۔ پہلے اینڈرسن کی آنکھوں میں شدید حیرت نظر آئی پھر اس کا چوڑا چکلا سرخ چہرہ سرخ تر ہوتا چلا گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "باسٹرڈ... بدذات کالے... تیری یہ جرأت..." وہ صوفے پر سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے چنگھاڑ کر آواز دی۔ "جوزف... ڈیوی... ادھر آؤ... جلدی کرو۔"

پھر اس نے فرطِ طیش میں جھپٹ کر اپنا توانا بازو دروازے کے چوکور خلا سے اندر گھسا دیا۔ وہ میری گردن پکڑنا چاہ رہا تھا لیکن میری گردن اس کی پہنچ سے قریباً ایک فٹ دور تھی۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا اور خوفناک آواز میں دہاڑا۔ "لگتا ہے سامبر مقابلے نے تیرے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہنے دیے۔ اس جھوٹی فتح کی زہریلی خماری تیرے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ میں تیرا علاج کرتا ہوں۔ بڑا کارگر علاج کرتا ہوں۔ اگر آج کے بعد تجھے ایسے کمینے پن کی شکایت ہوئی تو میرا نام بدل دینا..."

یہی وقت تھا جب دونوں انگریز گارڈز لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ اینڈرسن نے ان میں سے ایک کے ہاتھ سے ٹرپل ٹو رائفل لی اور دروازے کے چوکور خلا میں سے میرا نشانہ لے لیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ پہلے قدم کے طور پر میری ٹانگ کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس نے بے دریغ گولی چلائی جو میری ٹانگ کو تقریباً چھوتے ہوئے گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ میری ٹانگوں پر دوسرا فائر کرتا، عمران تڑپ کر چوکور خلا کے سامنے آ گیا۔ "نہیں جناب! گولی نہ چلائیں۔ میں اس کی غلطی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ اس نے غلطی کی ہے لیکن..."

"تم آگے سے ہٹ جاؤ باسٹرڈ۔ ورنہ تمہیں بھی شوٹ کر دوں گا۔" اینڈرسن دہاڑا۔ اس نے رائفل کندھے سے لگا رکھی تھی اور اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

عمران نے پھر لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ "بیوی کی موت کے بعد یہ اپنے حواس میں نہیں ہے جناب! اول فول بک رہا ہے۔ ہوش ٹھکانے آئیں گے تو آپ سے معافی مانگے گا۔"

"ہوش تو اس کتے کے ابھی ٹھکانے آ جاتے ہیں۔ تم پیچھے ہٹو۔" اینڈرسن بپھر کر گرجا۔

عمران اپنی جگہ ڈٹا رہا اور دو تین منٹ کی کوشش سے اینڈرسن کا پارا نیچے لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس تند و تیز گفتگو کے آخر میں اینڈرسن نے پھنکارتے لہجے میں کہا۔ "میں تم دونوں کو کل اس وقت تک کی مہلت دیتا ہوں۔ تمہیں انور خاں کے بارے میں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، اس کے ذمے دار تم خود ہو گے۔" وہ اپنے بھاری بوٹوں سے فرش کو کوٹتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد عمران نے مجھے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن مجھ پر تو جیسے اس کی باتوں کا کچھ اثر ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ ارد گرد کا سارا ماحول ہی مجھ پر بے اثر تھا۔ ایک عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ نگاہوں کے سامنے صرف سلطانہ کا دم توڑتا ہوا چہرہ تھا۔ اکھڑی سانسیں، مجھے حسرت سے تکتی نظریں اور پھر اس کے بعد رنجیت پانڈے کی منحوس شکل۔ اس کا چہرہ میرے لیے دنیا کی سب سے قابلِ نفرت شے بن گیا تھا۔ اسی شخص کی مکاری نے اسپتال میں بساط الٹی تھی۔ اس شیطان نے بارود کو چنگاری دکھا کر سب کچھ ختم کیا تھا۔

اینڈرسن نے ہمیں انور خاں کے حوالے سے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی لیکن یہ مہلت پوری ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ ہمیں اس امتحان سے گزرنے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ سارا دن ہی عجیب سے تناؤ اور غیر یقینی کیفیت میں گزرا۔ صبح سویرے جس طرح پندرہ قیدیوں کو سب کے سامنے گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا، وہ ناقابلِ فراموش منظر تھا۔ ان قیدیوں کی آخری کراہیں جیسے ابھی تک در و دیوار میں گونج رہی تھیں۔ عمران کے بے حد اصرار پر میں نے شام کے وقت کھانے کے دو تین لقمے لیے اور پھر ایک گوشے میں پڑ کر لیٹ گیا۔ بھرت ایک خوش گفتار شخص تھا مگر اس کوٹھڑی میں آنے کے بعد سے بالکل خاموش تھا۔ اس پر نہایت سنگین نوعیت کے الزامات تھے اور وہ آج دیکھ ہی چکا تھا کہ سزا دینے میں یہ گورے کتنے سفاک اور بے حس ہیں۔ عمران کی خوش کلامی بھی سنجیدگی کی گمبھیرتا میں چھپی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا ذہن تیزی سے موجودہ صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

رات کوئی نو دس بجے کا وقت ہوگا۔ بھرت نڈھال سا سو رہا تھا۔ عمران ایک گوشے میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں بولا۔

"ادھر آؤ۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔"

جب اس نے دوسری بار اصرار سے کہا تو میں اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اٹھتے بیٹھتے سے میرے سر کے گومڑوں میں ٹیسیں اٹھتی تھیں لیکن ایسی ٹیسوں کو میں نے اب خاطر میں لانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے زخموں کے حوالے سے میں ایسی بے پروائی برتتا تھا کہ کبھی کبھی بھول ہی جاتا تھا کہ مجھے زخم لگا ہے۔ میں عمران کے پاس پہنچا تو اس نے انگلی سے پتھریلی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے غور کیا اور حیران رہ گیا۔ یہاں کسی نکیلی شے سے انگریزی کے پانچ حرف کندہ کیے گئے تھے۔ ان حرفوں سے جو لفظ بنتا تھا وہ "جیکی" تھا۔

عمران نے کہا۔ "لگتا ہے تمہارے روحانی استاد بارونڈا جیکی نے اسی کوٹھڑی میں اپنے اسیری کے دن گزارے تھے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ حیرت انگیز اتفاق تھا۔ میں نے چاروں طرف سر گھما کر پہلی بار اس کوٹھڑی کو بغور دیکھا۔ یہ قریباً دس ضرب بارہ فٹ کی مختصر جگہ تھی۔ یہاں رات اور دن میں تمیز کرنا ناممکن تھا۔ کوٹھڑی کی عقبی دیوار کے ساتھ موٹے لوہے کا ایک چھوٹا سا زنگ آلود دروازہ تھا۔ یہ دروازہ قریباً پانچ ضرب چار فٹ کے ایک بدبودار غسل خانے میں کھلتا تھا۔ تو یہ تھی وہ جگہ جہاں جارج گورا نے بارونڈا جیکی کو رکھا اور اس پر ستم کے پہاڑ ڈھائے۔

عمران نے لالٹین کی روشنی میں مجھے کوٹھڑی کا ایک اور گوشہ دکھایا۔ یہاں جیکی کے نام کا پہلا حرف "جے" اور اس کی محبوبہ شگفتلا کے نام کا پہلا حرف "ایس" کندہ تھا۔ ان دو حرفوں کے اوپر یقیناً کوئی رومانی فقرہ لکھا گیا تھا مگر اس فقرے کو بعد ازاں رگڑ کر اس طرح مٹا دیا گیا تھا کہ اسے پڑھنا مشکل تھا۔ ظاہر ہے یہ کام جیل کی انتظامیہ نے ہی کیا ہوگا۔ اب اس بات میں شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ بارونڈا جیکی نے اپنی قید کے دن یہاں کاٹے تھے۔ یا کم از کم اپنی قید کا کچھ عرصہ یہاں کاٹا تھا۔

ہم لالٹین کی زرد روشنی میں ان دیواروں کو بغور دیکھتے رہے۔ یہ جگہ میرے لیے ایک دم تاریخی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ایک جگہ جیکی کا سب سے پسندیدہ فقرہ لکھا ہوا نظر آیا۔

"نو پین... نو گین۔" یعنی درد نہیں تو کامیابی بھی نہیں۔

...ہاں، یقیناً یہی وہ جگہ تھی جہاں جیکی رہا تھا۔ یہاں کی دیواروں پر اس کا لمس تھا۔ یہاں کی فضا میں اس کی سانسیں رچی ہوئی تھیں۔

رات گہری ہو گئی۔ میں سونے کے لیے لیٹا تو جیکی کا تصور میرے سامنے آ گیا۔ کٹا پھٹا اپاہج جسم، مدقوق چہرہ، اندر دھنسی ہوئی لیکن چمکیلی آنکھیں۔ میں نے سوچا، وہ بھی ایسے ہی اس فرش پر چت لیٹتا ہوگا۔ ایسے ہی لالٹین کی زرد روشنی میں سیاہی مائل چھت کو دیکھتا ہوگا۔ اپنی شگفتلا کو یاد کرتا ہوگا۔ ایک دم مجھے لگا کہ وہ میرے آس پاس ہے۔ اس کی روح اپنے اس پرانے مسکن میں موجود ہے۔ میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جیکی! تم نے اس تاریک کوٹھڑی میں کرب کے جو شب و روز گزارے تھے، ان کا مداوا تو شاید کوئی نہ کر سکے لیکن تیرے بدترین دشمن جارج گورا کو اس کے انجام تک میں نے پہنچا دیا ہے۔ اس نے تیرے ہاتھ پاؤں کٹوا کر تجھے اس تاریک قبر میں پھنکوایا تھا، آج وہ خود "گورا قبرستان" کی ایک قبر میں موجود ہے..."

میں تصور میں جیکی سے محوِ کلام تھا جب اچانک مجھے اس چاقو کا خیال آیا جو جارج کی موت کی یادگار تھا اور میں نے اپنے پاس محفوظ کیا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے جیبیں ٹٹولیں۔ ہماری گرفتاری کے وقت یقیناً وہ چاقو بھی دوسری اشیا کے ساتھ فوجیوں کے پاس چلا گیا تھا... میں اس بارے میں سوچ رہا تھا جب یکایک ایک بار پھر جیل کی چار دیواری سے باہر دھماکے سنائی دیے۔ عمران کا کہنا تھا کہ یہ دستی بموں کے دھماکے ہیں۔ ساتھ میں فائرنگ بھی شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ یہ فائرنگ کافی شدید تھی اور لگتا تھا کہ جیل کے آس پاس ہو رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو طرفہ فائرنگ شدت پکڑ گئی۔ عمران اور بھرت بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

عمران نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ جیل پر حملہ ہوا ہے۔"

"ایسے ہی لگتا ہے۔" بھرت بولا۔

ہم فائرنگ اور دھماکوں کی آوازوں کو بغور سنتے رہے۔ یہ آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ پھر اس کے ساتھ نعروں کی مدھم گونج بھی سنائی دینے لگی۔ "یہ تو لگتا ہے کہ جیل کے احاطے میں لڑائی ہو رہی ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"اور لڑنے والے کافی زیادہ تعداد میں ہیں۔" عمران نے اضافہ کیا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ جیل پر ایک بڑا حملہ ہوا ہے اور کچھ لوگ جیل توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہنگامہ شدت اختیار کرتا

گیا۔ چھوٹے بڑے ہتھیاروں کی فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بارود کی تیز بو ہماری بند کوٹھری تک پہنچ رہی تھی۔ یوں لگا کہ اب کچھ ہی دیر میں ہمیں ایک نئی صورتِ حال کا سامنا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ جارج کی جیل پر مارے جانے والا یہ زبردست شب خون کامیاب ہو جاتا اور ہم اپنی کوٹھری کے دروازے کو اپنے سامنے کھلا پاتے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں کیا کرنا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمارے ذہن تیزی سے سوچ رہے تھے۔

تین چار منٹ بعد محسوس ہونے لگا کہ لڑائی ہماری کوٹھریوں کے آس پاس ہی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ جیل کا دفاع کرنے والے بھی جم کر لڑ رہے ہیں۔ ہم نے اپنی کوٹھری کے قریب ہی کسی انگریز افسر کی للکارتی ہوئی آواز سنی۔ وہ اپنے ماتحتوں کو ہدایات دے رہا تھا اور ''کالے باغیوں'' کو گالیوں سے نواز رہا تھا۔ دو تین ایسے دھماکے بھی سنائی دیے جو دستی بموں کے دھماکوں سے مختلف تھے۔ عمران نے کہا۔ ''شاید راکٹ لانچر ہے۔''

یہ فیصلہ کن معرکہ آٹھ دس منٹ جاری رہا، پھر یکایک صورتِ حال پلٹی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ فائرنگ کی آوازیں قدرے فاصلے پر چلی گئیں۔ پھر یوں لگا جیسے جیل پر حملہ کرنے والے پسپا ہو رہے ہیں۔ غالباً جیل کی چھت پر سے بھی گارڈز نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ قریباً پندرہ منٹ مزید یہ ہنگامہ جاری رہا۔ ہم اس بند کوٹھری میں صرف اندازے ہی لگا سکتے تھے۔ ہماری کوٹھری کے عین سامنے بھی گارڈز کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان کی آوازوں سے جوش و خروش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں فائرنگ کی آوازیں مزید فاصلے پر چلی گئیں۔ یوں محسوس ہوا کہ انتظامیہ کے مسلح لوگ، بھاگتے ہوئے حملہ آوروں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری کوٹھریوں کے سامنے گارڈز کا جمگھٹا ہوا۔ کوٹھریوں کے دروازے کھلنے لگے اور پکڑے جانے والے لوگوں کو گالیوں کی بوچھاڑوں کے ساتھ کوٹھریوں میں ٹھونسا جانے لگا۔ ہماری کوٹھری کا دروازہ بھی کھلا اور ایک زخمی قیدی کو بیدردی سے دھکا دے کر کوٹھری کے گندے فرش پر پھینک دیا گیا۔ میں نے انگریز افسر فیلارز کو دیکھا، اس نے نفرت سے قیدی پر تھوکا اور اسے ''کالے ذلیل... سور'' کے خطابات دیے۔

وزنی دروازے کو ایک بار پھر دھماکے سے بند کر دیا گیا۔ زخمی کا ایک بازو کلائی پر سے ٹوٹ چکا تھا اور عجیب انداز میں مڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بھی زخم تھا اور اس زخم سے بہنے والے خون نے اس کے پورے چہرے کو لتھڑا ہوا تھا۔ بس اس کی آنکھیں ہی دیکھی جاسکتی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا... ''انور خاں تم؟'' میرے منہ سے بےساختہ نکلا۔ مجھے اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔

انور خاں کوئی جواب نہ دے سکا۔ بس کھینچ کھینچ کر سانس لیتا رہا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے سینے سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ یہاں کسی رائفل کی سنگین یا کوئی اور تیز دھار چیز لگی تھی۔

عمران نے بھی سن لیا تھا کہ میں نے زخمی کو کس نام سے پکارا ہے۔ وہ بھی جلدی سے پاس آگیا۔ چوبی دروازے کا چوکور خانہ کھلا۔ ایک مقامی گارڈ نے ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا ہماری طرف پھینکا اور پھنکارا۔ ''اس کی مرہم پٹی کر دو۔''

چرمی تھیلے میں مرہم پٹی کا سامان تھا لیکن یہ انور خاں کے زخموں کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ زخموں سے چور... بےبسی کی تصویر بنا ہمارے سامنے پڑا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی کل کی بات تھی، ابراہیم نامی شخص انور خاں کے حوالے سے کتنے جوش و خروش کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ انور خاں زرگاں کے لیے نجات دہندہ کا کردار ادا کرنے والا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انور خاں کی قیادت میں حکیم کے باغی زرگاں میں تہلکہ مچانے والے ہیں۔ وہ بہت جلد سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیں گے۔ اس حوالے سے اس بےچارے نے بڑے جوش سے چاند کی سات تاریخ اور بدھ کا ذکر بھی کیا تھا۔

لیکن یہ توقعات غلط ثابت ہوئی تھیں۔ بےشک انور اور اس کے ساتھیوں نے ایک بہت دلیرانہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ جارج کی جیل توڑنے کے لیے بڑی قوت سے حملہ آور ہوئے تھے لیکن بالآخر یہ کوشش ناکام ہوئی تھی۔ اور اس ناکامی سے بھی بڑھ کر مایوس کن بات یہ تھی کہ انور خاں خود بھی شدید زخمی حالت میں یہاں موجود تھا۔ اس کے زخموں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے آخری وقت تک کوشش کی ہے کہ اسے زندہ نہ پکڑا جا سکے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

''انور خاں... آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو... میں تابش ہوں۔'' میں نے اس کے کندھوں کو ہلایا۔

اس نے پلکیں اٹھائیں۔ تھوڑی دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلایا۔ یوں اس نے مجھے سمجھایا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے۔

اس نے خشک، خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ عمران اور کبیرت اس کے سر سے بہنے والا خون بند کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کی کلائی کی حالت بھی تشویش ناک تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''... مجھے ختم کر دو... یہ لوگ مجھے... بہت بری موت مارنا چاہتے ہیں...''

عمران نے عجیب گونجتے سے لہجے میں کہا۔ ''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے انور خاں... تم حوصلہ رکھو۔''

انور خاں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون ہے۔ میں نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ ''یہ دوست ہے اپنا... پاکستان سے آیا ہے...''

انور خاں کی خون آلود آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر عمران کے ہاتھ پر رکھا اور ایک بار پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں... آخری فتح ہماری ہوگی۔ ان گوروں کو ہمارا راجواڑہ چھوڑنا ہوگا۔ لوگ جاگ پڑے ہیں... وہ قربانیاں دے رہے ہیں...''

زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے انور خاں پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ اسے کسی اچھے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا مگر وہ یہاں ہمارے درمیان اس تاریک سرد کوٹھری میں موجود تھا۔ ہم کئی گھنٹے تک اس کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ اس کی حالت قدرے اچھی ہو گئی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ رات کو قریباً چار سو مسلح جاں بازوں نے جیل پر حملہ کیا تھا۔ ان کو یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہو جانا تھا۔ یہ زبردست منصوبہ بندی تھی لیکن عین موقع پر ایک شخص نے دغا کیا اور بازی پلٹ دی۔ ہم نے انور خاں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ شخص کون تھا مگر انور خاں نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی۔

میں نے آج انور خاں کو کئی ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ میں اس سے نل پانی کے حالات پوچھنا چاہتا تھا۔ اپنے دوست ڈاکٹر چوہان، کپتان اجے، عبدالرحیم اور شکنتلا وغیرہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ مگر انور کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ان سوالوں کے جواب دے سکتا۔ اس سے صرف اتنا پتا چلا کہ ڈاکٹر چوہان ابھی یہاں زرگاں میں موجود ہے۔

سارا دن انور خاں کی حالت کبھی بگڑتی اور کبھی سنبھلتی رہی۔ اس کے سینے پر شدید اندرونی ضرب آئی تھی اور اس وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

شام کے وقت انور خاں سو گیا۔ عمران نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ کہنے لگا۔ ''سچ کہتے ہیں تابی! تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ہم نے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد، ان کے قبضے، ان کی چالاکیوں اور ریشہ دوانیوں کے بارے میں صرف پڑھا اور سنا تھا، آج ہم وہ سب کچھ یہاں اس بھانڈیل اسٹیٹ میں دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماحول بھی وہی ہے۔ یہاں بندوقوں اور مشین گنوں کے ساتھ تلواریں اور کلہاڑیاں بھی ہیں۔ موٹر کاروں کے ساتھ گھوڑے اور گھوڑا گاڑیاں بھی ہیں۔ یہاں بھی ان مٹھی بھر گوروں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کر رکھا ہے اور اپنے لیے کٹھ پتلیاں ڈھونڈی ہوئی ہیں۔ اور ابھی انور خاں بتا رہا تھا کہ خیر سے میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس عمران کی باتیں سنتا رہا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بولنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں بس خاموش رہنا چاہتا تھا۔

عمران بولا۔ ''جب ہم یہاں آئے تھے تو ہم نے سمجھا تھا کہ حکیم جی زرگاں کا حکمراں ہے اور انگریز اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں لیکن اب کھلا ہے کہ یہاں کے تو حکمراں ہی یہ انگریز ہیں۔ حکیم جی کو ایک ڈمی کے طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔ وہ شراب اور عورت کے نشے میں غرق رہتا ہے۔ عملی طور پر اس نے یہاں کی باگ ڈور سرجن اسٹیل اور اینڈرسن جیسے لوگوں کو تھما رکھی ہے۔''

رات کسی وقت زرگاں کے وسطی علاقے میں پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ پھر یہ فائرنگ اور بھی دو تین علاقوں تک پھیل گئی۔ ہم اس قبر نما کوٹھری میں بس آوازیں ہی سن سکتے تھے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ فقط اس ڈیڑھ ضرب ڈیڑھ فٹ کے چوکور خلا کے ذریعے تھا۔ اس خلا میں سے ہمیں کھانا اور ضرورت کی دیگر اشیا پہنچائی جاتی تھیں۔ یہ اشیا فراہم کرنے والے تین شخصوں میں کام کرتے تھے۔ رات کی شفٹ میں کام کرنے والا ایک گہرا سانولا ہندو تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا لہجہ اور آواز مجھے کچھ پہچانی سی لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ آواز کچھ دن پہلے میں نے کہیں سنی ہے۔ کہاں؟ یہ یاد نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اس بارے میں عمران سے پوچھا تو وہ بھی کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ بہرحال یہ آواز میرے ذہن میں کھٹکتی رہی۔

رات کو پھر سلطانہ کی موت کے دردناک مناظر نظروں کے سامنے گھومتے رہے... یہ سوچ کر میری آنکھیں نم ہوتی

رہیں کہ معصوم بالو اب کبھی اپنی ماں کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس کو کبھی پتا ہی نہیں چلے گا کہ ماں کا محبت بھرا لمس کیا ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ اگر میں موت کے اس گھیرے سے نکل کر واپس فتح پور کے مندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تو وہاں میرے دل کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہاں سلطانہ کے ذاتی استعمال کی چیزیں ہوں گی۔ اس کے کپڑے، اس کے برتن، اس کے زیور... اور وہ سب کچھ جو وہ چھوڑ کر جا چکی ہے۔ سلطانہ کے قاتلوں کے ساتھ ساتھ کٹر انتہا پسند ہاشم رازی کا چہرہ بھی میری نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ بھی تو بالواسطہ سلطانہ کے قتل میں شریک رہا تھا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں اور جسم میں لاوا سا بہنے لگا۔

رات کسی وقت میں جاگا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کا چوکور خانہ کھلا ہوا ہے۔ خانے کی اکلوتی سلاخ کی دوسری جانب وہی پکی رنگت والا پہرے دار موجود ہے اور عمران سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے کروٹ بدلی اور پھر سو گیا۔

صبح میں نے دیکھا کہ انور خاں ہولے ہولے کراہ رہا ہے۔ اس کی چوٹوں میں شدید درد تھا۔ جب انور خاں جیسا فولادی بندہ کراہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ درد معمولی نہیں ہے۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد ایک انگریز گارڈ کا ٹماٹر جیسا چہرہ چوکور خلا میں نظر آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ شاید یہ اس فتح کا نشہ تھا جو ان کو ملی تھی یا مل رہی تھی۔ ”کیا تکلیف ہے؟“ وہ انگریزی میں بولا۔

”انور خاں کو بہت درد ہے۔“

”اس کا درد بڑی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک دم ختم۔ بس تھوڑی دیر انتظار کرو۔“ اس کے معنی خیز لہجے نے میرے ذہن میں اندیشوں کی بھرمار کر دی۔

کچھ اسی طرح کی دھمکی ان گارڈز نے اس وقت دی تھی جب زخمی ابراہیم کو گولی سے اڑانے کے لیے اس کوٹھری سے لے جایا گیا تھا۔

تو کیا اب انور خاں کی باری آنے والی ہے؟ میں نے بے حد کرب سے سوچا۔

اور اگر ایسا ہوا تو کیا ہم اب بھی تماشائی بنے دیکھتے رہیں گے؟ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ آٹھ بجے کے قریب مسلح گارڈز آ گئے۔ میں سمجھا کہ وہ انور خاں کو لے جانے آئے ہیں لیکن انہوں نے پہلے بھرت کو باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ان کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں تھیں اور تیوروں سے پتا چلتا تھا کہ اگر ہم حکم عدولی کریں گے تو وہ ہمیں اندر ہی بھون سکتے ہیں یا اس بری طرح زخمی کر سکتے ہیں کہ ہم پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہی نہ رہیں۔ وہ لوگ بھرت کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ پھر ہم سب کو باری باری باہر نکالا گیا اور ہمارے ہاتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ پشت پر رسیوں سے باندھ دیے گئے۔ ہمارے اردگرد درجنوں رائفلوں کا پہرا تھا۔ یہاں کسی بھی طرح کی مزاحمت خودکشی کے مترادف تھی۔ انور خاں کو سب سے آخر میں ایک اسٹریچر پر باہر لایا گیا۔ اس کے ہاتھ بھی مضبوط رسی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے تھے اور تیور خطرناک۔ پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے لگا کہ میں بارونداجیکی کی یہ تاریخی کوٹھری آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

ہمیں برہنہ پا اور برہنہ سر چند تنگ راہداریوں سے گزارا گیا اور پھر ہم صحن میں آ گئے۔ ہماری آنکھیں روشنی میں چندھیا گئیں۔ آج ہم پورے چار دن بعد سورج کی روشنی دیکھ رہے تھے۔ جارج کی اس بدنام زمانہ جیل کے در و دیوار میں اس سے پہلے بھی ایک بار دیکھ چکا تھا جب مجھے سلطانہ کے ہمراہ پکڑ کر زرگاں لایا گیا تھا اور پھر میری خدمات جارج گورا کے حوالے کی گئی تھیں۔ لیکن آج جارج گورا تھا اور نہ سلطانہ۔

گارڈز کے نہایت سخت پہرے میں ہم جیل کے پھاٹک سے باہر آئے اور یہی وقت تھا جب ہمیں زرگاں کی اصل صورتِ حال کا پتا چلا۔ یہ سب کچھ تعجب خیز تھا۔ جیل کی بیرونی دیوار اور پھاٹک وغیرہ گولیوں سے چھلنی تھے۔ یقیناً یہ نشانیاں اس زبردست شب خون کی تھیں جو دو دن پہلے باغیوں کی طرف سے مارا گیا تھا اور جو بقول انور خاں ایک غدار کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔ ہم نے اپنے اردگرد درختوں پر کچھ لاشیں لٹکتی دیکھیں۔ ان لوگوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے، ہم نے زرگاں کے لرزہ خیز منظر دیکھے۔ ایک چوراہے میں کئی جلی ہوئی لاشیں ایک چھوٹے سے ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ کچھ منہدم اور ادھ جلے مکان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں اور مختلف پولوں سے لٹکتی ہوئی لاشیں جابجا دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے، کچھ کے چہرے مسخ تھے۔ ان میں سے چند ایک کے سوا سب مسلمان دکھائی دیتے تھے۔

”لگتا ہے کہ بغاوت پوری طرح کچل دی گئی ہے۔“ میرے پہلو میں چلتے ہوئے عمران نے سرگوشی کی۔ ہم آخری قطار میں تھے۔ ہر قیدی کے عقب میں ایک مسلح گارڈ تھا جس نے اسے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔

ہم جیل سے نکلنے والے تقریباً چالیس قیدی تھے۔ تین قیدی اسٹریچرز پر تھے۔ ان میں انور خاں بھی شامل تھا۔ بھرت بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ کچھ اچھا ہونے نہیں جا رہا۔ میم کی عزت لوٹنے کے جرم میں وہ بے گناہ پکڑا گیا تھا مگر یہاں اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔

جب ہمارا قافلہ ایک کشادہ سڑک پر مڑا تو بھرت نے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے زیرِ لب کہا۔ ”ہم قاسمیہ کے علاقے میں جا رہے ہیں۔ یہاں مسلمان آبادی ہے بلکہ یہ زرگاں میں مسلمانوں کا گڑھ ہے۔“

اردگرد کے مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سے سہمے ہوئے چہرے جھانک رہے تھے۔ ہر طرف ہراس کی فضا تھی۔ ہم نے ایک چھوٹا سا محلہ دیکھا جو پورے کا پورا جلا ہوا تھا۔ یہاں نمائش کے لیے ایک سربریدہ لاش چوراہے کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ جب ہم اس علاقے کی تنگ گلیوں میں داخل ہوئے تو ایک فوجی گاڑی ہمارے قافلے کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ میں نے اور بھرت نے مڑ کر دیکھا۔ اس گاڑی میں منحوس تھوبڑے والا اینڈرسن موجود تھا۔ نا ہم ایک شخص اینڈرسن سے بھی اہم اس گاڑی میں موجود تھا۔ وہ دراز قد سرجن اسٹیل تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت برس رہی تھی۔ چند ہفتوں کے اندر اس نے اپنے سگے بھائی کے علاوہ اپنی بیوی بھی کھو دی تھی۔ اس کا لمبوترا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے اندر بدلے کی آگ بھڑک رہی ہے۔

بھرت کے پیچھے چلنے والے مقامی گارڈ نے اس کی گردن پر زوردار تھپڑ رسید کیا اور حکم دیا کہ وہ صرف آگے دیکھے۔

ہم پابجولاں چلتے رہے۔ چند منٹ بعد پیچھے آتی ہوئی گاڑی میں سے اینڈرسن کی کرخت آواز بلند ہوئی۔ وہ میگافون کے ذریعے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بول رہا تھا۔

”یہ اسٹیٹ اور حکم جی کے مجرم ہیں۔ آج ان لوگوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے عبرت ناک پنشمنٹ دیے جائیں گا۔ ہام تم کو دکھائیں گا کہ باغیوں کا انجام کیا ہوتا۔ دیکھو اور عبرت پکڑو۔“

اس نے یہ چند فقرے بار بار دہرائے۔ ایک چھوٹے چوراہے پر یہ قافلہ رک گیا۔ یہاں ایک مسجد نظر آ رہی تھی۔ اردگرد کی دیواروں پر انگریزوں اور حکم کے خلاف باغیانہ نعرے لکھے تھے جنہیں بعدازاں مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہاں آبادی گنجان تھی۔ اردگرد کے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں لاتعداد لوگ موجود تھے۔ اگر یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر ایک دم ٹوٹ پڑتے تو ان دو ڈھائی سو فوجیوں کی تکا بوٹی کر ڈالتے لیکن عملی طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اینڈرسن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”یہی جگہ ہے جہاں سے پانچ دن پہلے تم لوگوں نے ایجی ٹیشن شروع کیا۔ اسی جگہ سے وہ آگ بھڑکا جس نے اسٹیٹ کے پُرامن لوگوں کا بہت زیادہ نقصان کیا۔ سیکڑوں بے گناہ لوگوں کا مرڈر ہوا۔ ہاں، یہی وہ جگہ ہے۔“

اینڈرسن نے مسلح سپاہیوں کو حکم دیا۔ انہوں نے قیدیوں میں سے چند افراد چنے۔ رائفلوں کی سنگینوں کے ذریعے ان کے کپڑے چاک کر دیے گئے اور انہیں زمین پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ اینڈرسن چنگھاڑا۔ ”یہی وہ جگہ ہے جہاں پُرامن شہری ڈاکٹر ولیم اور اس کی وائف کا کپڑا پھاڑا گیا اور ان کو مار مار کر بے ہوش کر دیا گیا۔ اگر تم لوگوں نے وہ سین دیکھا تھا تو آج یہ بھی دیکھو۔“

اوندھا لٹائے جانے والے چھ قیدیوں کو اس طرح بے بس کیا گیا کہ ان کے سر کے بال اور ٹخنے گارڈز نے اپنی گرفت میں لے لیے... پھر ان پر چمڑے کے وزنی جوتوں کی بارش کر دی گئی۔ وہ چلاتے رہے، چلاتے رہے۔ ان کی جلد سے خون رسنے لگا۔ ان میں سے تین نیم بے ہوش اور تین مکمل بے ہوش ہو گئے۔ مکمل بے ہوش ہو جانے والوں کو بھی اسٹریچرز پر ڈال لیا گیا اور انہیں بغیر کوئی طبی امداد دیے یہ قافلہ آگے کو روانہ ہو گیا۔

چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے نکل کر لوگ اس قافلے کے پیچھے چلنے لگے تھے۔ ان کی حیثیت صرف تماشائیوں کی تھی۔ مزاحمت تو دور کی بات ہے، وہ مسلح فوجیوں کے سائے سے بھی خوف زدہ تھے۔ ان میں زیادہ تر لڑکے بالے تھے۔

قیدیوں کو چپ لگ گئی تھی۔ ان کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔ سب کو انجام دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک سرسری سی عدالتی کارروائی، تین چار منٹ کا رسمی مکالمہ اور پھر سزائے موت۔ مجھے لگا کہ میں کوئی ڈیڑھ سو سال پیچھے 1857ء میں کھڑا ہوں۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت کچل دی گئی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ لوگوں کو سرِعام پھانسیاں دی جا رہی ہیں۔ ان کے سر جدا کیے جا رہے ہیں۔

کمپنی کی حکومت نے ساڑھے تین سو سالہ مغلیہ دورِ حکومت کو ختم کر دیا ہے اور لوگوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھا رہی ہے۔۔۔ ہاں، یہ سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کا برائے نام اقتدار ایک ہندو کے پاس تھا اور وہ ان گوروں کا کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔

میں نے سوچا۔ "تو کیا آج ہماری زندگیوں کو فل اسٹاپ لگنے والا ہے؟" میں نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ اس کے سپاٹ چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

آخر ہم ایک بڑے چوراہے میں پہنچے۔ یہ قاسمیہ چوک تھا۔ ہماری آمد سے پہلے ہی یہاں بہت سے افراد جمع تھے۔ ہماری آمد کے بعد اور بھی ہجوم ہو گیا۔ گھروں کی چھتوں اور گلیوں میں بھی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ جو کچھ یہاں ہونے جا رہا ہے، وہ انہیں خون کے آنسو رلا رہا ہے مگر وہ اسے روکنے کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ یہاں بھی درختوں پر کئی لاشیں لٹکی نظر آئیں۔ ابھی ان میں سے بو اٹھنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ غالباً ان بدنصیبوں کو کل رات کسی وقت پھانسی دی گئی تھی۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے۔

یہاں ہمیں ایک قطار میں دس سولیاں گڑی نظر آئیں۔ ایک طرف بہت سی کرسیاں رکھی تھیں اور میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر صاف ستھرے کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ یہاں درجنوں انگریز صاحبان پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر شراب سے شغل کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک لرزہ خیز تماشے کی ہوس تھی۔ اس جگہ چاروں طرف خاردار باڑ تھی۔

ہمیں ایک چبوترے پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ برہنہ کیے جانے والے چھ افراد میں سے تین تو اسٹریچرز پر تھے، باقی تین ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے جسموں پر کپڑے کی ایک دھجی تک نہیں تھی۔ سولیاں ہم سے فقط پندرہ بیس قدم کی دوری پر تھیں۔ دو بجے تک جلاد نما افراد یہاں موجود تھے۔ ایذا رسانی کے بیشتر آلات بھی یہاں نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کے دستے والے وزنی ہتھوڑے، چھوٹی ہتھوڑیاں، آہنی میخیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ میری نگاہوں میں ایک بار پھر اسحاق کی لرزہ خیز موت کے مناظر گھوم گئے۔ ہزاروں افراد کے سامنے اس "جاں بہ لب" کو میخوں کے ذریعے سولی پر ٹھونکا گیا اور پھر اس کی ہڈیوں کا چورا کر دیا گیا تھا۔

فوجی افسر فیارڈ ٹہلتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ ہم چالیس قیدیوں کی تین قطاروں میں سب سے آخری قطار میں تھے۔۔۔ لیکن بھرت کو اب پہلی قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ قیدیوں والے چار اسٹریچرز بھی ایک طرف رکھے تھے۔ اسٹریچرز کی بیلٹس باندھ کر قیدیوں کو ملنے جلنے سے روک دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ انور خاں کی آنکھیں بند ہیں اور وہ منہ میں مسلسل کچھ پڑھ رہا ہے۔ فیارڈ ٹہلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی میں بولا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ بہرحال، تمہارے لیے ایک خبر اچھی ہے اور ایک بری۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اچھی خبر یہ ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ابھی سزا نہیں دی جا رہی۔ تمہاری سزا ملتوی ہوئی ہے۔"

میرے سینے میں لہر سی دوڑ گئی۔ "اور بری خبر؟" میں نے پوچھا۔

وہ سفاکی سے بولا۔ "یہ سزا زیادہ دیر کے لیے ملتوی نہیں ہوئی۔ آدھے قیدیوں کو یہاں سزا دی جا رہی ہے۔ آدھے قیدیوں کو ڈیڑھ دو میل دور قاسمیہ کے دوسرے چوک میں دی جائے گی۔۔۔ چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ تمہیں دو ڈھائی گھنٹے اور زندگی مل گئی ہے اور زندگی تو پھر زندگی ہی ہوتی ہے۔"

میں آزاد ہوتا تو شاید اس سفید سور پر پل پڑتا مگر میرے ہاتھ پشت پر بے انتہا سختی سے بندھے ہوئے تھے اور درجنوں رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

فیارڈ نے بڑی ادا سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "یہ اردگرد کا نظارہ تم کو کیسا لگ رہا ہے؟ دیکھو، یہ صرف دو ڈھائی سو سپاہی ہیں۔ انہوں نے اردگرد کے ہزاروں تماشائیوں کو ہپناٹائز کر رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ اندر سے کھول رہے ہیں، ابل رہے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ انسان نہیں بھیڑ بکریاں ہیں اور بھیڑ بکریاں بھی ایسی جو ہپناٹائز ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں عزت مآب اسٹیل صاحب کی بہادری کی داد دینی چاہیے۔ لوگ کہتے تھے کہ قاسمیہ چوک کے علاقے میں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ لیکن ہم یہاں موجود ہیں اور قاسمیہ کے ان باغی قیدیوں کو ان کے عزیز و اقارب کے سامنے ہی کتے کی موت مارنے والے ہیں۔ ہے نا بہادری؟" فیارڈ نے ستائش طلب نظروں سے مجھے اور عمران کو دیکھا۔

”لیکن یہ نہتے لوگ ہیں۔“ عمران نے کہا۔
وہ ہنسا۔ ”اتنے بھی نہتے نہیں ہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہے ان کے پاس۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس توپیں اور راکٹ لانچر بھی ہوں تو یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لڑائی ہتھیار سے نہیں یہاں سے ہوتی ہے... یہاں سے۔“ اس نے اپنے سینے کو بائیں طرف سے ٹھونکا۔
سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ”اسٹیل صاحب اور مسٹر اینڈرسن چاہتے تو یہاں بہت ساری نفری بھی لا سکتے تھے۔ یہاں کے ہر کالے کے سر پر ایک رائفل بردار کھڑا کر سکتے تھے لیکن وہ صرف دو کمپنیوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو سپاہی۔ اور تم ان ڈھائی سو سپاہیوں کی دہشت دیکھ رہے ہو۔ یہ اس سے آدھے بھی ہوتے تو نتیجہ یہی ہوتا تھا۔ اب تو تمہیں یہ بات ماننی چاہیے کہ ایک برٹش سپاہی ایک سو کالے جنگجوؤں پر بھاری ہے...“
میارڈ صرف بڑ نہیں مار رہا تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ سیکڑوں تماشائی واقعی انسانوں کے بجائے بھیڑ بکریاں نظر آ رہے تھے۔ دور فاصلے پر چند ٹولیاں ضرور ایسی تھیں جو نعرے لگا رہی تھیں اور احتجاجی رویّے کا اظہار کر رہی تھیں مگر باقی سب سکوت تھا۔
اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ ایک شاندار میز کے عقب میں مخملی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ہلکی سنہری دھوپ میں ان کے چہرے کچھ اور بھی سرخ دکھائی دیتے تھے۔ اینڈرسن اپنی جگہ سے اٹھ کر چبوترے پر آیا اور ایک بار پھر میگا فون کے ذریعے دہاڑا۔ ”... ہام دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ یہ تمہارے سامنے عبرت کا تصویر بنا وہ سب ذرلی لوگ کھڑا ہے جس نے اپنی اوقات سے بڑھ کر ظلم کیا۔ پچھلے پانچ دن تک ان لوگوں نے اس شہر کو جہنم بنائے رکھا۔ اب ان کا انجام تم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ یہ سب کا سب اپنے کرائمز کو تسلیم کر چکا ہے۔ حکم جی کے قانون میں ان کے لیے کوئی رعایت ناہیں اور نہ ہی ہام دیں گا۔ اب کہاں ہیں وہ موٹی گردنوں والے سرکردہ لوگ جنہوں نے ان کو بھڑکایا۔ ان میں سے بہت سا بھاگ چکا اور بہت سا چوہوں کی طرح انڈر گراؤنڈ ہے۔ یہ بیویوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں رہنے والے، جھوٹے دغاباز، فریبی عیاش تم کو کچھ ناہیں دے سکتے۔ اسپرین کا ایک گولی، جنریٹر کا ایک پرزہ، رائفل کا ایک راؤنڈ... کچھ بھی ناہیں۔“
قوی ہیکل اینڈرسن کئی منٹ تک دہاڑتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”ہام ڈرنے والا ناہیں، لڑنے والا لوگ ہے۔ ہام کو اپنے بازو پر بھروسا ہے اور اسی لیے ہام یہاں موجود ہے۔ اگر کسی کو کسی بھی ٹائم اپنے دل کا ارمان نکالنا ہے تو ہام اس کے لیے تیار ہے۔“
اینڈرسن کی تقریر ختم ہوئی تو ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ یہاں کوئی سرسری سماعت بھی نہیں ہوگی اور اگلے چند منٹ کے اندر کم از کم بیس قیدیوں کو مقامی طریقے کے مطابق سولی چڑھا دیا جائے گا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انور خاں اور بھرت بھی ان بیس افراد میں شامل ہوں گے۔ ہم نے دیکھا کہ بھرت کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ آفیسر میارڈ اس کے قریب ہی موجود تھا۔ بھرت نے دو تین بار اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن گارڈز نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ یقیناً وہ ان آخری لمحوں میں پھر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوگا۔ ان کو بتانا چاہتا ہوگا کہ وہ میم کرسٹی کو مارنے والوں میں نہیں بچانے والوں میں شامل تھا... مگر صاف پتا چلتا تھا کہ اب صفائی دہائی کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ کسی فریادی کی کسی فریاد پر اب کان نہیں دھرا جائے گا۔
اسی دوران میں میری نظر میڈم صفورا پر پڑی۔ وہ کرسیوں پر بیٹھے معزز مہمانوں کی آخری قطار میں نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر اتنی دور سے بھی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔ چند سیکنڈ کے لیے میری اور اس کی نگاہیں ملیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کے سوا ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ صفورا میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ یہاں بیٹھ کر سفاکانہ طریقے سے سولیاں چڑھائے جانے کا منظر دیکھ سکے۔ یقیناً وہ صرف ہمیں دیکھنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ خونی تماشا شروع ہونے سے پہلے ہی اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔
عمران نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ”میڈم کو اپنانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ آہ... اب اس کو بھی پتا نہیں چل سکے گا کہ میں اس پر کس طرح فدا تھا۔“
میں نے حیرت سے عمران کو دیکھا۔ سلطانہ کی موت کے بعد سے میری طرح اسے بھی چپ سی لگ گئی تھی۔ آج وہ کئی دنوں کے بعد تھوڑا سا چہکا تھا۔ ہم بے حد سنگین صورتِ حال کا سامنا کر رہے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں وہ اپنے مخصوص انداز میں کیوں بولا تھا؟
میں نے بھی اپنی خاموشی توڑی۔ میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”عمران! کیا آج پھر ہم دیکھتے رہ جائیں گے؟ ہم اسحاق کو نہ بچا سکے، کیا انور خاں اور بھرت کے لیے بھی کچھ نہ کر سکیں گے؟“
”نہیں یار! اس دفعہ تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“
”کیسے ہو جائے گا؟“
”یار! جب تم چاہو گے تو ہو جائے گا۔ تم کوئی ایویں شیویں چیز ہو؟ تم نے یہاں کے شکتی دیوتا جارج گورا کو ناکوں چنے چبوائے ہوئے ہیں۔ اکھاڑے میں اسے موت کے گھاٹ اتارا ہوا ہے۔ تم کوشش کرو گے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم زور لگاؤ تو تمہارے ہاتھوں کو جکڑنے والی رسّی ٹوٹ جائے گی۔“
”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے بیزاری سے کہا۔
”یار! میں نے کبھی خبروں کے علاوہ جھوٹ بولا ہے؟ میں وہی کہہ رہا ہوں جو ہو سکتا ہے۔“ عمران نے جواب دیا۔
ہم دونوں پنجابی میں بات کر رہے تھے اور لہجہ بہت دھیما تھا۔ گارڈز کچھ فاصلے پر تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہماری بات نہیں سمجھ رہے ہوں گے۔ عمران کی اس بے وقت کی راگنی پر میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے کنارے جل اٹھے۔
”عمران!“ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔
وہ سنجیدہ ہو گیا اور بدلے ہوئے آہنگ میں بولا۔ ”یار! تمہارے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسّی اتنی مضبوط نہیں ہے کہ تم اسے توڑ نہ سکو۔“
”کیا مطلب؟“
”مطلب یہ کہ اسے کمزور کر دیا گیا ہے۔ تمہارے پیچھے چلنے والا گارڈ اسے کمزور کرتا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریزر بلیڈ کا ایک ٹکڑا تھا۔ وہ اس ٹکڑے کو رسّی کے بلوں پر چلاتا رہا ہے۔ اب یہ رسّی سات آٹھ جگہ سے کمزور پڑ چکی ہے۔ ہمارے پیچھے دیوار ہے اس لیے ہمارے بندھے ہوئے ہاتھ کسی کو نظر نہیں آ رہے۔“
میں نے اپنے ہاتھ ہلا کر دیکھے۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں... ابھی زور نہیں لگانا۔ ابھی زور لگانے کا وقت نہیں آیا۔“
میں نے سرگوشی کی۔ ”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی... اگر... رسّی کمزور کی ہے تو کس نے کی ہے... اور کیوں؟“
”تمہیں بتایا تو ہے کہ تمہارے پیچھے چلنے والے گارڈ نے کی ہے۔ اور کیوں کی ہے، اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔ اس پر تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔“ وہ عجیب کھوئے سے انداز میں بولا۔ میں اس کا اطمینان اور ٹھہراؤ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ یہ اطمینان اور ٹھہراؤ میرے اندر ایک بے نام امید جگا رہا تھا۔
میں نے کہا۔ ”چلو تم طویل جواب نہ دو، مختصر دے دو۔“
ہم بڑے عام سے انداز میں بات کر رہے تھے۔ بات کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ گارڈز نے ابھی تک ہمارا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔
عمران بدستور کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”کہتے ہیں نا کہ چیونٹی بھی اپنی طاقت کے مطابق اپنا دفاع کرتی ہے۔ کچھ لوگ چیونٹیوں ہی کی طرح حقیر اور بے حیثیت سمجھے جاتے ہیں۔ جب رنجیت پانڈے جیسے لوگ ان کی انا کے منہ پر تھپیڑ مارتے ہیں تو وہ اندر سے بدل جاتے ہیں۔ وہ رہتے تو چیونٹی ہی ہیں لیکن یہ زہریلی چیونٹی ہوتی ہے۔ ہاتھی کو گرا دیتی ہے...“ عمران کا لب و لہجہ معنی خیز تھا۔
عمران کی بات نے میرے اندر ایک چھناکا سا کیا۔ دماغ میں روشنی سی بھر گئی۔ پانڈے اور تھپیڑ والی بات سے مجھے چند روز پہلے کا ایک منظر یاد آ گیا... اور اس کے ساتھ ہی یہ یاد آ گیا کہ ہماری کوٹھڑی پر پہرا دینے والے گہرے سانولے گارڈ کی آواز میں نے پہلے کہاں سنی تھی۔ وہ آواز مجھے یوں ہی جانی پہچانی نہیں لگی تھی۔ جب ہم اٹھرا گاؤں میں کماد کے کھیت میں چھپے ہوئے تھے تو رات کی تاریکی میں رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کمانڈو ایکشن کے لیے نکلا تھا۔ یہ لوگ سیوریج کی ایک پرانی پائپ لائن تک پہنچے تھے اور اسپتال میں گھسنے کے لیے اس پائپ لائن کے سرے پر سے مٹی ہٹائی تھی۔ پانڈے کی ہدایت پر اس کا ماتحت کدال چلا رہا تھا۔ کدال سیمنٹ کے پائپ سے ٹکرا گئی تھی اور آواز پیدا ہوئی تھی۔ پانڈے نے بھنا کر اس ماتحت کو تھپیڑ رسید کیا تھا۔ تھپیڑ کی آواز سناٹے میں دور تک گونجی تھی۔ پانڈے اور اس کے اس مزدور نما ماتحت کے درمیان جو مختصر مکالمہ ہوا تھا، اس میں یہ آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی۔ یہ بھرائی ہوئی سی آواز والا ماتحت اس وقت ایک دیہاتی کے حلیے میں تھا اور دھوتی کرتا پہنے ہوئے تھا۔
ایک دم واقعات کی بہت سی کڑیاں مل گئیں۔ کوٹھڑی میں، میں نے دو تین بار اس سانولے ماتحت گارڈ کو عمران سے باتیں کرتے سنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں کوئی کھچڑی پکی تھی۔ کوئی پلان بنا تھا۔ عمران نے دوبارہ تیز سرگوشی کی۔ ”میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔ ابھی زور نہیں لگانا۔ جب وقت آئے گا، میں بتا دوں گا۔“

دوسری طرف اجتماعی سولیوں کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ ورزشی جسم والے مقامی جلاد بالکل تیار تھے۔ ہزاروں کا مجمع مضطرب لیکن خاموش تھا۔

میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ دھڑکن بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”لیکن میرے پیچھے چلنے والا گارڈ تو کوئی اور تھا؟“

”وہ اس کا ساتھی ہے۔“ عمران نے مختصر جواب دیا۔

اب مجھے کچھ دیر پہلے کی وہ ساری صورتِ حال یاد آرہی تھی۔ جب ہم یہاں آرہے تھے، سب قیدیوں کے پیچھے ایک ایک گارڈ تھا اور ہر گارڈ نے اپنے قیدی کو باقاعدہ بازو سے پکڑا ہوا تھا۔ میرے والے گارڈ نے بھی میری کلائی تھامی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میرے ہاتھوں کی بندش کے ساتھ کچھ کیا جارہا ہے۔

”عمران! اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کریں۔ یوں نہ ہو کہ وقت پھر ہاتھ سے نکل جائے۔“ میں نے سرگوشی کی۔

”بس تھوڑا سا انتظار... تھوڑا سا... کسی نے یہاں آنا ہے۔“

”کس نے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ٹھیک سے مجھے بھی پتا نہیں... لیکن وہ آئے گا ضرور۔“

”تم پھر پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ تمہیں سب پتا ہوگا۔“

”سب نہیں... ہاں تھوڑا بہت پتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جب آئے گا تو سیدھا ان میز کرسیوں کی طرف جائے گا جہاں یہ گورے بیٹھے، انگور کی بیٹی سے کھیل رہے ہیں۔ ایک دم ہلچل مچ جائے گی... اور یہی وقت ہوگا تمہارے زور لگانے کا۔ تم اپنی رسیاں توڑ دینا اور سیدھا سرجن اسٹیل کی طرف جانا۔“

”سرجن اسٹیل کی طرف؟ وہ تو وہاں بیٹھا ہے۔ ان آخری کرسیوں کی طرف۔“

”تب وہ وہاں نہیں ہوگا۔“ عمران نے کہا۔ ”وہ یہاں ہوگا، ہمارے سامنے۔ وہ ذلیل ان تین بندوں کو اپنے ”دستِ مبارک“ سے سولی چڑھانا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی آنجہانی ماریا کی روح کو خوش کرنا چاہتا ہے۔“

ایک تنومند گارڈ ہمارے قریب آیا اور دانت پیس کر بولا۔ ”تم دونوں لگاتار باتیں کررہے ہو۔ چپ ہوجاؤ ورنہ پہلے تمہاری باری آجاوے گی۔“

میں اور عمران اس زہرناک وارننگ کے بعد خاموش ہوگئے۔ میڈم صفورا اب اپنی جگہ سے اٹھ کر جاچکی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ اب بھی کہیں پیچھے تماشائیوں میں موجود ہو۔ عمران کا کہا درست ثابت ہوا۔ دراز قد سرجن اسٹیل اپنی جگہ سے اٹھا اور گارڈز کے ساتھ چلتا ہوا چبوترے پر آگیا۔ سولیاں اب بالکل تیار تھیں۔ قطار میں کھڑے پہلے قیدی کا رنگ بالکل سفید ہوچکا تھا۔ یقیناً پہلی باری اسی کی تھی۔ اسٹریچرز پر لیٹے قیدیوں کو بھی چبوترے پر چڑھا دیا گیا۔ ان میں انور خان بھی تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ہمارے لیے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ بے ہوش ہے یا نہیں۔

اینڈرسن، ضیارڈ اور دیگر معزز گورے اپنی اپنی کرسیوں پر موجود تھے۔ وہ اس سفاکی کا نظارہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار و آمادہ تھے جو یہاں روا رکھی جانے والی تھی... پہلے قیدیوں کو سولیوں سے باندھا جانا تھا۔ پھر ان کی ہتھیلیوں اور ٹخنوں میں آہنی میخیں ٹھونکی جانی تھیں۔ پھر آہنی ہتھوڑے کی ضربوں سے ان کے جسم کی اہم ہڈیاں ٹوٹنی تھیں۔ آخر میں رائفل کی گولی یا خنجر کے وار سے ان کا قصہ تمام ہونا تھا۔

...اور وہ کون تھا جسے آنا تھا؟ جس کے آنے کی امید عمران کو تھی... وہ کون ہوسکتا تھا؟ ڈاکٹر چوہان؟ کپتان اسے؟ چھوٹے سرکار کا کوئی جاں باز یا پھر اقبال جسے ہم فتح پور کے تہ خانے میں چھوڑ آئے تھے؟

...تین قیدیوں کو سولی سے باندھا جاچکا تھا۔ میری دھڑکن عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ہونٹ خشک ہورہے تھے۔ میں نے بے حد اضطراب کے ساتھ عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھوں آنکھوں میں مجھے انتظار کرنے کو کہا... دو تین منٹ مزید گزرے اور پھر وہی ہوا۔ آنے والا آگیا۔ وہ کون تھا؟ میں نے اسے کافی فاصلے سے دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ بھی ایک ڈھاٹے میں چھپایا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس کے قد کاٹھ، اس کی جسامت اور اس کے بھاگنے کے انداز سے پہچانا۔ اور یہ وہ تھا جس کے بارے میں، میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔ میں اسے بھولا ہوا تھا... شاید میں نے لاشعوری طور پر بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یہاں نظر آسکتا ہے... وہ طلال تھا۔ سلطانہ کا پندرہ سولہ سالہ بھانجا... جو کسی رشتے سے اس کا بھتیجا بھی تھا... کم گو، کم آمیز۔ بڑی بڑی بھید بھری آنکھوں والا۔ سلطانہ اس کے لیے خالہ بھی، ماں بھی اور بہن بھی۔ وہ اس سے بے حد محبت رکھتا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں حالات کچھ ایسے رہے تھے کہ میں نے طلال کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا اور نہ ہی یہ غور کیا تھا کہ جب فتح پور مستوہ کے تہ خانوں میں سلطانہ کی موت کی خبر پہنچے گی تو اس کے اس راجپوت بھانجے پر کیا گزرے گی۔ اور اب اچانک وہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

اس کی آمد کا منظر قابلِ دید تھا۔ وہ اور اس کی برادری کے قریباً دس پندرہ افراد اچانک ہجوم میں سے نکلے تھے اور اندھا دھند ان نشستوں کی طرف دوڑے جہاں گورے مہمان مے نوشی میں مصروف تھے۔ طلال سب سے آگے تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں چھوٹی نال والی رائفل نظر آئی۔ وہ لگاتار فائر کرتا اور چلاتا ہوا سلطانہ کے قاتلوں اینڈرسن اور ضیارڈ وغیرہ کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ کے لیے جیسے درجنوں گارڈز سکتہ زدہ ہوگئے۔ پھر انہیں ہوش آیا۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کیں۔ دھماکوں سے فضا کچھ اور بھی لرز اٹھی۔ طلال کے چار پانچ ساتھی رستے میں ہی گر گئے لیکن باقی خاردار باڑ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ طلال کے پیچھے آنے والے شخص کے ہاتھ میں قریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا اور دس بارہ فٹ لمبا تختہ تھا۔ اس نے یہ تختہ خاردار باڑ کے گول چھلوں کے اوپر پھینکا، پلک جھپکتے میں طلال اپنے تین چار ساتھیوں سمیت اس تختے پر چڑھا اور خاردار رکاوٹ پار کر گیا۔ میں نے اس کی گولی سے سیکنڈ آفیسر ضیارڈ کو زخمی ہوتے اور میز پر اوندھے گرتے دیکھا۔

سولیوں کے قریب کھڑے درجنوں گارڈز اپنے ”وی آئی پیز“ کو بچانے کے لیے چبوترے سے اترے اور خاردار تاروں کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب عمران نے مجھے کہا۔ ”توڑ دو۔“

اور میں نے پشت پر بندھے ہاتھوں کی بندش توڑ دی۔ رسّی کے کئی بل تڑاخ سے ٹوٹے اور وہ میرے ہاتھوں سے علیحدہ ہوگئی۔ میں پوری رفتار سے دراز قد سرجن اسٹیل کی طرف دوڑا۔ اس کا رخ بھی خاردار باڑ اور اس کے اندر موجود معززین کی طرف تھا۔ ایک گارڈ نے مجھ پر فائر کیا۔ گولی میرے کندھے کو بوسہ دیتی ہوئی نکل گئی۔ میں اپنے پورے زور سے اسٹیل پر جاپڑا۔ سلطانہ کی موت کے بعد جو آگ میرے اندر جمع ہوئی تھی، اسے ایک دم نکاسی کا راستہ ملا۔ وہ شعلہ جوالا بن گئی۔ آسمانی بجلی کا روپ دھار گئی۔ اسٹیل اور میں لڑھکتے ہوئے تین فٹ اونچے چبوترے سے نیچے گرے۔ تب تک اسٹیل کا چمکیلا پسٹل میرے قبضے میں آچکا تھا۔ میں نے پسٹل اس کی زرافے جیسی لمبی لیکن مضبوط گردن سے لگا دیا... اور اسے گھسیٹتا ہوا دیوار کے بالکل پاس لے گیا۔ کئی گارڈز نے رائفلیں میری طرف سیدھی کیں۔

”خبردار... گولی ماردوں گا۔ اڑا دوں گا اسے۔“ میں نے چلا کر کہا۔

گارڈز ایک لمحے کے لیے ٹھٹکے لیکن اسی دوران میں بائیں طرف سے ایک گارڈ نے گولی چلا دی۔ یہ گولی میرے سر کے بالوں کو چھو کر گزر گئی۔ میں نے بھی اپنی دھمکی سچ کر دی۔ میں نے تیتے پھڑکتے، زور لگاتے اسٹیل کی گردن میں گولی ٹھونک دی... میرا دوسرا فائر اس کے نچلے جبڑے کو چیر کر یقیناً اس کے سر میں گھسا ہوگا۔ وہ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں اس کے جسم کو ڈھال کی طرح استعمال کر کے پیچھے ہٹا اور پھر جست لگا کر ایک فوجی جیپ کے عقب میں گرا۔ یہ جگہ جوابی فائرنگ کے لیے بہترین تھی۔

ہر طرف کہرام سا مچ گیا تھا۔ سلیقے سے رکھی ہوئی میزیں الٹ چکی تھیں۔ گورے بدحواسی میں چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ میں نے طلال کی ایک جھلک دیکھی۔ میرے سامنے اس نے زمین پر گرے ایک فربہ اندام انگریز کی توند میں تلوار گھونپی اور دستے تک اتار دی۔ پھر وہ نیچے جھک کر بھاگتا ہوا ایک طرف اوجھل ہوگیا۔

یہی وقت تھا جب صورتِ حال نے ایک بالکل غیر متوقع کروٹ لی۔ کچھ دیر پہلے تک یہ کروٹ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھی۔ ڈیڑھ دو ہزار کا وہ مجمع جسے انگریزوں اور مسلح گارڈز نے اپنی دہشت سے ہپناٹائز کر دیا تھا... اس ”ٹرانس“ میں سے اچانک ہی نکل آیا۔ عمران کہتا تھا، جادو ایسے ہی ٹوٹا کرتے ہیں۔ زنجیریں ایسے ہی کسی اچانک واقعے کی حدت سے پگھل جاتی ہیں اور رکے ہوئے پانی ایسے ہی کسی ہلچل کے سبب بلند و بالا ڈیموں کو بہا کر لے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ انگریزوں اور ان کے گارڈز کو تتر بتر دیکھ کر ایک دم مجمع حرکت میں آگیا۔ کچھ دیر پہلے تک جو لوگ بالکل غیر مسلح نظر آتے تھے، اب ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں لاٹھیاں، تلواریں اور ایسی ہی دیگر اشیا نظر آئیں۔ وہ نعرہ زنی کرتے ہوئے کسی سیلاب کی طرح آگے بڑھے۔ گارڈز نے رائفلوں کے منہ کھول دیے۔ دھماکے ہوئے، شعلے لپکے۔ لیکن ہجوم رکنے کے لیے نہیں بڑھا تھا۔ وہ منظر گواہی دے رہا تھا کہ یہاں شاید توپیں بھی نصب ہوتیں تو ان دیوانے لوگوں کو روک نہ سکتیں۔ تابڑ توڑ فائرنگ سے زخمی ہوکر بہت سے لوگ گرے لیکن وہ رکے نہیں۔ یہ بڑا کلاسیکل منظر تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے مجھے یوں لگا کہ میں پھر ڈیڑھ سو برس پیچھے چلا گیا ہوں اور آزادی کی جنگ کا ایک ٹکڑا دیکھ رہا ہوں۔ لوگ للکارتے ہوئے خاردار تار کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ شاید ایسے ہی کسی موقع کے لیے یہ شعر کہا جاتا

ہے۔ کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو' بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت...

اور پھر تصادم ہوگیا۔ زرگاں شہر کا قاسمیہ چوک میدانِ جنگ بن گیا۔ میں نے عمران کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹریل ٹو رائفل تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا عمران کے ہاتھ چند سیکنڈ پہلے اسی "سیاہ رنگت اور روشن دل" والے غریب گارڈ نے کھولے تھے جس نے میرے ساتھ مہربانی کرائی تھی۔

عمران لپکتا ہوا چبوترے پر چڑھا اور اس اسٹریچر تک پہنچا جس پر انور خاں دراز تھا۔ میں بھی اوٹ سے نکل کر بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ہم نے انور کے اسٹریچر کو اٹھایا اور فائرنگ کی زد سے دور ایک بڑی ٹرک نما گاڑی کی اوٹ میں لے گئے۔ باقی چار اسٹریچرز پر موجود افراد گولیوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ ہم نے چھٹے اسٹریچر کو بھی محفوظ اوٹ میں پہنچا دیا۔ طلال کے کچھ ساتھی چبوترے پر چڑھ آئے تھے اور انہوں نے ان تین قیدیوں کی رسیاں کاٹ دی تھیں جنہیں سولیوں سے باندھا جا چکا تھا۔ ان میں سے بھی ایک شخص راہیٔ عدم ہو گیا تھا لیکن باقی دو سلامت تھے۔

میری نگاہیں صرف اور صرف سلطانہ کے قاتلوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں ان سے اپنی سلطانہ کا بدلہ نہ لے سکا تو اپنی ہی آگ میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔ رنجیت پانڈے، فیارڈ اور اینڈرسن میں سے کوئی مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یہاں موجود تھے۔ مجھے پتا تھا وہ موجود ہیں۔ میں نے ماؤزر نما پسٹل پر گرفت مضبوط کی اور خاردار تاروں کی طرف بڑھا۔ یہ ساری جگہ دو طرفہ فائرنگ کی زد میں تھی۔

عمران نے میرا ارادہ بھانپ کر مجھے روکا۔ "کیا کر رہے ہو تابش؟"

"نہیں، مجھے جانے دو عمران... مجھے مر جانے دو یا مار دینے دو۔"

"حوصلہ کرو... سب کچھ ہوگا۔"

"اب نہیں ہوگا تو کب ہوگا؟" میں نے خود کو عمران سے چھڑایا اور مختلف چیزوں کی آڑ لیتا ہوا خاردار تاروں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جب عمران نے دیکھا کہ میں رکوں گا نہیں تو وہ بھی میرے ساتھ ہو گیا۔ ہم دونوں دیوانہ وار ان پوزیشنوں میں گھس گئے جہاں سے انگریز اور مقامی گارڈز اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم نے کم از کم چار گارڈز کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماری۔ یہاں ہماری دست بدست لڑائی بھی ہوئی۔ عمران نے بے دریغ ایک گورے سپاہی کے سینے میں رائفل کی سنگین گھونپی اور میں نے ایک مقامی گارڈ کے پیٹ میں گولی مار کر اس کی رائفل چھین لی۔ اور تب ہمیں فیارڈ نظر آیا... اس کا ایک کندھا طلال کی گولی سے شدید زخمی ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں میگا فون تھاما ہوا تھا۔ شاید چند سیکنڈ پہلے تک وہ اپنے بچے کھچے گارڈز کو یہ ہدایات دے رہا تھا کہ گولیوں کی بارش کر دو۔ ان لوگوں کو چیونٹیوں کی طرح مسل دو۔ لیکن وہ بھول رہا تھا کہ ہر جگہ جلیانوالہ باغ نہیں ہوتی اور نہ ہر جگہ جنرل ڈائر جیسے ظلم کا سکہ چلتا ہے۔ میں نے عمران سے سنگین چڑھی رائفل لی اور اپنی رائفل اسے دے دی۔ یہی وقت تھا جب فیارڈ نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہی شخص تھا جس نے سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے لیے گورے کمانڈوز کو آنکھ کا قاتل اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھ کو ہی نشانہ بنایا۔ نکیلی سنگین قوت کے ساتھ اس کی آنکھ سے ٹکرائی اور وہ سب کچھ تباہ کر گئی جو اس کی آنکھ کے پیچھے اور کھوپڑی کے اندر موجود تھا۔ شاید میں کچھ زور اور لگاتا تو سنگین کھوپڑی توڑ کر دوسری طرف سے باہر آ جاتی۔ فیارڈ کی دوسری آنکھ اور چہرے کے تاثرات بڑے بھیانک تھے۔

ایک انگریز رائفل مین نے قریبی گلی کے اندر سے عمران کو نشانہ بنایا۔ عمران کی بے مثال لک کہاں کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے یہاں بھی کام کیا۔ گولی سیدھی عمران کو لگتی مگر راستے میں عمران کی رائفل آ گئی۔ گولی اس کے دستے سے ٹکرائی تھی۔ عمران نے مہارت سے جوابی فائر کر کے رائفل مین کو ڈھیر کر دیا۔

اب یہ وقت تتر بتر ہونے کا تھا۔ چبوترے کے اردگرد اور میز کرسیوں والے احاطے میں تیس چالیس لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے بیس پچیس تو ضرور گارڈز کی ہوں گی۔ ان بیس پچیس میں کئی انگریز بھی نظر آ رہے تھے۔ یقیناً دو سب سے اہم لاشیں سرجن اسٹیل اور فیارڈ کی تھیں۔ اب کسی بھی وقت راج بھون سے کمک یہاں پہنچ سکتی تھی۔ اگر کمک پہنچ جاتی تو راہِ فرار اختیار کرنے والے اور گلیوں میں روپوش ہونے والے سرکاری فوجی بھی واپس آ کر لڑائی میں شامل ہو جاتے۔ نہتے شہری کہاں تک مسلح فوجیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

"بھرت کہاں ہے؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"ابھی تک مجھے بھی کہیں نظر نہیں آیا۔"

ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے واپس اس گاڑی تک پہنچے جس کے عقب میں دونوں اسٹریچرز رکھے تھے۔ یہاں نہتے اور نیم مسلح شہریوں کا جمگھٹا تھا۔ ہم بھرت کے ساتھ ساتھ اس معرکے کے اصل ہیرو طلال کو بھی ڈھونڈ رہے تھے لیکن وہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ شہری فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے سرجن اسٹیل کی لاش کو گھسیٹنے کی کوشش بھی کی مگر عمران کے اشارے پر میں نے انہیں منع کر دیا۔ جمع ہونے والے لوگ مجھے بے حد اہمیت دے رہے تھے۔ میں نے جارج، یہاں کے ٹکلی دیوتا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہی میری پہچان تھی۔ کچھ لوگ وہ ٹوٹی ہوئی رسّی دیکھ رہے تھے جسے توڑنے کے بعد میں اسٹیل پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ یہ رسّی ایک دوسرے کو دکھا رہے تھے اور تبصرے کر رہے تھے۔ ان میں سے شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس رسّی کے ٹوٹنے میں مجھ سے زیادہ ایک ریزر بلیڈ کا کمال ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں مرکزِ نگاہ بن گیا۔ میرے گرد ہجوم بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں نے میرے اور انور خاں کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ وہ میرے اور انور خاں کے حق میں فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ نعرہ زنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

عمران نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا۔ "ان لوگوں سے کہو کہ وقت ضائع نہ کریں۔ بہت جلد سرکاری فوجی پوری طاقت سے یہاں ہلا بولیں گے۔ لوگ اپنے دفاع اور بچاؤ کی تیاری کریں۔ گھروں اور محفوظ جگہوں پر مورچے بنالیں۔ خاص طور سے ان دو اہم راستوں کو روک لیں جو قاسمیہ میں داخل ہوتے ہیں... یقیناً ان میں کچھ لیڈر ٹائپ بندے بھی ہوں گے۔ ان کے ذریعے فوری بندوبست کریں۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب باتیں تم خود کیوں نہیں کہتے؟"

"نہیں یار! تمہاری بات کا اثر ہوگا۔ یہ لوگ تمہیں اہمیت دے رہے ہیں اور ٹھیک ہی دے رہے ہیں۔"

"لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ چلو شروع ہو جاؤ۔" اس نے ایک بندے سے میگا فون لے کر میری طرف بڑھایا۔ یہ وہی خون آلود میگا فون تھا جو ابھی ہم نے فیارڈ کی لاش کے پاس سے اٹھایا تھا۔

میں نے کبھی تقریر کی تھی اور نہ اس طرح لوگوں کا سامنا کیا تھا۔ پھر بھی عمران کے کہنے پر میں چبوترے پر چڑھ گیا۔ دور تک پُرجوش لوگ نظر آ رہے تھے۔ خاردار تاروں کے اردگرد کالے اور گورے فوجیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے کچھ لاشوں پر چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ قاسمیہ کے نوجوان، فوجیوں کی بکھری ہوئی رائفلیں اور ایمونیشن وغیرہ اکٹھا کر رہے تھے۔ میں نے میگا فون ہونٹوں کے قریب کیا۔ یہی وقت تھا جب دو افراد مجمع چیرتے ہوئے آئے اور چبوترے پر آ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ یہ ڈاکٹر چوہان اور عبدالرحیم تھے۔ چوہان کو میں نے بس اس کی آواز سے پہچانا۔ ان دونوں نے اپنے چہرے منڈاسوں میں چھپا رکھے تھے۔ کندھوں سے رائفلیں جھول رہی تھیں۔ چوہان نے مجھے زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ "مجھے پتا تھا، میں تمہیں ایک دن ضرور زندہ دیکھوں گا... مجھے پتا تھا۔"

عبدالرحیم بھی میرے گلے لگ گیا۔ عبدالرحیم ان قیدیوں میں سے تھا جو اسحاق اور انور خاں وغیرہ کے ساتھ ہمارے ہمراہ نل پانی پہنچے تھے۔ عبدالرحیم زرگاں کے اسی محلے میں رہتا تھا جہاں سلطانہ کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ ادھیڑ عمر عبدالرحیم ہچکیوں سے رونے لگا۔ "سلطانہ بی بی چلی گئی۔ وہ ہم سب کو چھوڑ گئی۔ اس کی کوئی عمر تھی جانے کی۔"

عمران نے اسے بمشکل مجھ سے علیحدہ کیا۔ پھر میرے کان میں تیز سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "وقت کم ہے۔ جو کچھ کہنا ہے جلدی سے اس کا اعلان کر دو۔"

میں نے میگا فون اپنے سامنے کیا اور بلند آواز سے وہ الفاظ دہرانے شروع کر دیے جو عمران نے کہے تھے۔

لوگوں کا جوش و خروش عروج پر پہنچ گیا۔ وہ ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ تلواریں، لاٹھیاں اور کلہاڑیاں ہوا میں لہرانے لگیں۔ کچھ دیر پہلے تک ان لوگوں کو اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ مردہ سمجھ رہے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے ہی ان کے پیاروں کو بدترین طریقے سے مار کر اپنی ہیبت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے مگر ایک "پُرجوش واقعے" نے انہیں زندہ کر دیا تھا۔ ایک شخص نے فوجی جیپ کی چھت پر چڑھ کر حکم کے لیے مردہ باد کا نعرہ لگوایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا اور کڑک کر بولا۔ "آپ فکر نہ کریں جی۔ ہم ان گوروں اور ان کے چمچوں کے لیے قاسمیہ کو قبرستان بنا دیں گے۔ ان کو اپنی لاشیں اٹھانے کی ہمت بھی نہیں ہوسکے گی۔"

ایک اور شخص جیپ پر چڑھ گیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی انور خاں کا ایک قریبی ساتھی حسنات بھائی تھا۔ وہ دہاڑتی آواز میں بولا۔ "تابش صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں اکٹھا ہونے کا فائدہ نہیں۔ اپنے گھروں میں جاؤ۔ عورتوں اور بچوں کو پیچھے پرانے قلعے میں پہنچا دو۔ ہر گھر کو مورچہ بنا لو۔ ہر گلی میں ان سفید سوروں کے لیے موت

کا نا کا لگا دو۔ اب ہم پیچھے ناہیں ہٹ سکتے۔ اب ہمیں مرنا ہے یا مار دینا ہے۔"

عمران نے پھر مجھے بولنے کے لیے کہا۔ میں نے خون آلود میگا فون اپنے سامنے کیا تو لوگ پھر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں نے کہا۔ "بھائیو! آج یہاں قاسمیہ چوک میں جو کچھ ہوا ہے، اس نے پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہلچل مچا دی ہے۔ میں غائب کا علم نہیں جانتا اور نہ انور خان جانتا ہے لیکن میں آپ سب کو وشواس دلاتا ہوں کہ اب "ٹل پانی" نے خاموش نہیں رہنا۔ اب وہاں سے سیلاب ضرور آئے گا اور یہ سیلاب ہمارے ساتھ مل کر ان گورے کالے حکمرانوں کو بہا کر لے جائے گا۔ راج بھون کی اینٹ سے اینٹ بجے گی۔ ہاں، اینٹ سے اینٹ بجے گی۔"

لوگوں کا جوش و خروش عجیب رنگ اختیار کر گیا۔ مجھے لگا کہ اگر میں اس وقت اس چبوترے پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہوں کہ وہ میرے ساتھ چلیں اور راج بھون پر ہلّا بول دیں تو وہ فوراً تیار ہو جائیں گے۔ سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ دیں گے۔

زندگی میں پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عوام الناس کس طرح کسی کو اچانک بلند ترین درجے پر پہنچا تے ہیں اور پھر اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی لوگوں کو کسی انتہائی اقدام کی طرف لے جانے کا وقت نہیں آیا اور غالباً اسٹریچر پر لیٹے ہوئے انور خان کی سوچ بھی یہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں، وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔

عمران کے اسرار پر سانولی رنگت والا گارڈ امرناتھ بھی چبوترے پر آ گیا۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اس کو بھی چند لفظ بولنے کا موقع دو۔"

میں نے میگا فون امرناتھ کو تھمایا۔ وہ چند لمحے تک ہچکچایا پھر جذباتی انداز میں بولا۔ "ہمار کو جیادہ بولنا ناہیں آوت۔ اور نہ ہم نے جیادہ کچھ کہنا ہے۔ بس یہی کہنا ہے کہ ہم سب نے مل کر ان جالموں کو یہاں سے نکالنا ہے۔ اب مرنا ہے یا مار دینا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے جھک کر مجھے پرنام کیا۔ میگا فون مجھے تھمایا اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ پیچھے چلا گیا۔

عمران کے اشارے پر میں نے لوگوں کو منتشر ہونے اور ہدایات پر عمل کرنے کا کہا۔۔۔ لوگ منتشر ہونے لگے۔

☆☆☆

سہ پہر ہونے والی تھی۔ ہم زرگاں کے پرانے قلعے میں تھے۔ یہ کافی قدیم عمارت تھی۔ اس کا ایک چوتھائی حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ اسے چاروں طرف سے گنجان آبادی نے گھیرا ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کی آبادی تھی۔ یہ کھنڈر قلعہ اس راستے پر واقع تھا جو مشرقی سمت سے قاسمیہ میں داخل ہوتا تھا۔ چوہان، عبدالرحیم اور انور خان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انور خان کی حالت میں بہتری واقع ہوئی تھی۔ وہ اب دھیمے لہجے میں بات بھی کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے بھرت بھی بچ بچا کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی محبوبہ چمپا عرف چمپی اور اس کی ماتا بھی تھی۔ چمپی کا یہاں آنا اس کے لیے خطرناک تھا مگر بھرت تو اسے کنوئیں میں کودنے کو کہتا تو بھی وہ ایک سیکنڈ کی دیر نہ لگاتی۔ بہرحال دونوں ماں بیٹی اوڑھنیوں میں لپٹی بڑی سہمی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ قاسمیہ چوک میں لڑائی شروع ہوتے ہی بھرت نے چبوترے سے چھلانگ لگا دی تھی اور ایک قریبی گلی میں روپوش ہو گیا تھا۔ لوگوں نے پکڑ کر اس کے ہاتھ کھولے تھے اور اسے گوروں سے بچانے کے لیے کئی گھنٹے ایک بیکری میں چھپائے رکھا تھا۔

سرکاری فوج نے ابھی تک قاسمیہ پر کسی طرح کی کارروائی نہیں کی تھی۔ یقیناً انہیں پتا چل چکا تھا کہ وہاں زبردست مزاحمت کا ماحول پیدا ہو چکا ہے۔ ہر گھر نے ایک مورچے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب وہ بڑی احتیاط اور پوری طاقت کے ساتھ کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ بس چند گھنٹوں کے اندر ہی میں بالکل غیر متوقع طور پر مزاحمت کاروں کا لیڈر بن گیا تھا۔ وہ میرے گرد پروانوں کی طرح جمع تھے۔ قاسمیہ چوک میں میرا جست لگا کر چبوترے سے اترنا اور پھر سرجن اسٹیل پر جھپٹنا ایک ایسا واقعہ تھا جو ہر کسی کی زبان پر تھا۔ میں نے اسٹیل کو اس کے اپنے ہی ماؤزر نما پسٹل سے قتل کیا تھا۔ یہ پسٹل ابھی تک میرے پاس تھا۔ لوگوں کے لیے یہ اسپیشل پسٹل بھی "زیارت" کی چیز بنا ہوا تھا۔ جارج کی عبرت ناک شکست کے بعد جو "ہوا" میرے سلسلے میں بندھی تھی، اب وہ اور زور پکڑ گئی تھی۔ میرا اپنے ہاتھوں کی بندش کو توڑنا بھی لوگوں کے لیے زبردست حیرت اور تحریک کا باعث تھا۔ جبکہ میرے خیال میں اس صورتِ حال کا اصل ہیرو عمران تھا یا پھر گارڈ امرناتھ کا وہ ساتھی جس نے میری بندش کو بڑی صفائی سے قابلِ شکست بنایا تھا۔

میرے بعد اگر لوگ کسی کو تھوڑا بہت کریڈٹ دے رہے تھے تو وہ راجپوت نوجوانوں کا وہ جتھا تھا جس نے

اچانک ہجوم میں سے نکل کر ہنگامے کا آغاز کیا۔ اس جتھے کے تقریباً چار نوجوان جاں بحق اور دو سخت زخمی ہوئے تھے۔ ان کو ڈاکٹر چوہان وغیرہ قلعے کے اندر ہی طبی امداد دے رہے تھے۔ جتھے کے باقی نوجوانوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، اتنی تسلی ضرور ہوئی تھی کہ طلال مرنے والوں میں شامل نہیں۔

سرجن اسٹیل اور خیارڈ کی موت نے میرے اندر بھڑکتی آگ پر پانی کے کچھ چھینٹے تو ڈالے تھے مگر اس کی حدت میں خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے ہاتھوں اور بازوؤں میں ابھی تک سرجن اسٹیل کے خونچکاں جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا۔

یہی شخص تھا جس نے اپنی سائنسی مہارت سے بھانڈیل اسٹیٹ کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ وہ اس سلسلے میں حکم کو کٹھ پتلی کی طرح استعمال کرتا تھا اور لوگ حکم کو بہت بڑا اوتار سمجھنے لگے تھے۔

عمران نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "جگرا آج تم نے سرجن صاحب کو ٹھنڈا کر کے اپنا بہت پرانا بدلہ چکا دیا ہے۔"

"کون سا بدلہ؟"

"الیکٹرانک چپ والا بدلہ۔ دراصل یہ چپ ہی تو تھی جس نے تمہیں برسوں اسٹیٹ کا قیدی بنائے رکھا ہے۔"

"لیکن حکم اور اینڈرسن ابھی زندہ ہیں عمران۔"

"یہ جوا یکشن سے بھرپور فلم شروع ہوئی ہے، اس میں ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ بہت سے لوگ مریں گے۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"لیکن یہ گارنٹی نہیں دیتا کہ ان فوت شدگان میں ہم شامل نہیں ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "کم از کم میں تو شامل ہو ہی جاؤں تو اچھا ہے۔"

میری آنکھوں میں پھر سلطانہ کا غم جاگ اٹھا۔ آنکھوں کے کنارے جلنے لگے۔ عمران کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں کتنی ہی دیر تک اپنی ٹھوڑی اس کے کندھے پر ٹکائے آنکھیں بھگوتا رہا۔ اچانک ایک آواز نے ہمیں چونکایا۔ "دیکھو تابش! کون آیا ہے؟" یہ چوہان کی آواز تھی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ میرے سامنے کھوسٹ بڑھیا کی پوتی بہو مالا اور پوتا ستیش کھڑے تھے۔ مالا کے ہاتھوں میں ایک نومولود بچہ تھا۔ وہ بہت کمزور اور خستہ حال نظر آتی تھی۔ مالا اور ستیش کو ہم نے آخری بار فتح پور کے مندر میں دیکھا تھا۔ ایک خونی ہنگامہ ہوا تھا۔ ستیش کے والد کے ہاتھ تیل کے کڑاہے میں جلے تھے اور پھر لوگوں نے اسے دوشی ٹھہرا کر قتل کر دیا تھا۔ مالا کی جان بھی بمشکل بچ پائی تھی۔ اس کے بعد سے مالا اور ستیش منظر سے یکسر اوجھل تھے۔

ستیش ایک نہایت کٹر اور انتہا پسند برہمن زادہ تھا لیکن جو اطلاعات ملی تھیں، ان سے پتا چلا تھا کہ وہ اب بہت حد تک بدل گیا ہے۔ اس کے بدلنے کی ایک وجہ تو یقیناً اس کی خوبرو اور روشن خیال پتنی مالا ہی تھی۔ دوسرے اس نے اپنے بزرگوں کا جو انتہائی دقیانوسی رویہ دیکھا تھا، اس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ستیش کا ایک بازو پلاسٹر میں جکڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سنگین اور بگڑی ہوئی چوٹ اسی مندر والے ہنگامے کی یادگار ہے۔ وہ بیمار اور کمزور بھی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اور عمران نے ان دونوں کو خوش آمدید کہا۔ ان دونوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ ہمارا رویہ ان کے ساتھ کیسا ہوگا۔ بہرحال، میرے دو چار فقروں نے ہی ان کے خدشات دور کر دیے۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا گیا۔ مالا اور ستیش ان تمام حالات سے آگاہ تھے جو پچھلے ڈھائی تین ماہ میں پیش آئے تھے۔ سامبر مقابلے میں جارج کی عبرت ناک شکست اور موت کی تفصیلات بھی انہیں معلوم تھیں۔

مالا نے اشک بار لہجے میں مجھے بتایا۔ "ناتا جی ہماری جان کی دشمن ہو رہی ہیں، تابش بھیا۔ آپ کو پتا ہی ہو دے گا، یہاں زرگاں میں ان کے بہت سے عقیدت مند پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ ان کے اشارے پر ہر کام کرنے کو تیار ہو جاوت ہیں۔ ناتا جی نے چند خطرناک لوگن کو ہمارے پیچھے لگا رکھا ہے۔ ان لوگن کو حکم ہے کہ میں جہاں بھی ملوں، میری ہتھیا کر دی جاوے۔ میرے بچے اور ستیش کو پکڑ کر ان کے پاس لایا جاوے۔ ہم دو مہینوں سے جگہ جگہ چھپتے پھر رہے ہیں۔"

عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بہت جلد آپ دونوں کو کہیں چھپنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ دونوں یہاں قلعے میں آ گئے ہیں، یہ بڑا اچھا کیا ہے۔"

اس گفتگو میں مالا کے پتی ستیش نے بھی حصہ لیا۔ وہ اپنے سابقہ رویّے پر بڑا نادم تھا۔ اسے اس بات پر بھی افسوس تھا کہ اس نے استھان میں سلطانہ کو زندہ جلانے کی کوشش میں حصہ لیا اور بعد ازاں وہ گرو کی موت کا سبب بھی

بنا۔ وہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھ کو وشواس نہیں ہوتا کہ دادی جی اس حد تک جا سکتی ہیں۔ وہ میری پتنی اور میرے بچے کے جیون کی دشمن ہو رہی ہیں۔ ان کے ہرکارے ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

یہ واقعی کٹّرپن کی انتہا تھی۔ وہ بڑھیا کہنہ عقیدوں کی پجارن تھی۔ اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ پرانی نسل کے ایسے ہزاروں لوگ یہاں موجود تھے۔

اسی دوران میں انور خاں کے ساتھی حسنات احمد کے ایک مخبر نے اطلاع دی کہ حکم کے فوجی دستے بڑی تعداد میں قاسمیہ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ان کی کمان اینڈرسن صاحب خود کر رہے ہیں۔ وہ ایک بند فوجی جیپ میں سوار ہیں۔ اس جیپ کے علاوہ بھی درجنوں گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں اس کارروائی میں شریک ہیں۔

مخبر فیروز احمد نے کہا۔ ”وہ لوگ اسپیکروں کے ذریعے بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ علاقے کے لوگ اپنے گھر خالی کر کے پیچھے ہٹ جاویں ورنہ ان کو دشمن سمجھا جاوے گا اور اپنے انجام کے وہ خود ذمے دار ہوویں گے۔“

حسنات احمد نے مجھ سے کہا۔ ”اس وقت قاسمیہ کے لوگن اور زرگاں کے دوسرے مسلمانوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ ان کے درمیان ہوویں گے تو ان کے حوصلے بلند ہو جاویں گے۔ وہ ایک دو دن تک تو ان حکم کے ٹٹوؤں کو قاسمیہ میں داخل ہی نہیں ہوتے دیویں گے۔“

میں عمران سے تنہائی میں بات کرنا چاہ رہا تھا مگر تنہائی کہیں نہیں تھی۔ پورا قلعہ عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں عمران کو لے کر ایک ڈیوڑھی میں آ گیا۔ مجھے اپنے دل دماغ پر بڑا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! تم دیکھ رہے ہو، یہ لوگ مجھ پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں جارج کو مار سکتا ہوں تو سب کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن تمہیں تو پتا ہے یہ سب کچھ میرے بس کا روگ نہیں۔“

”کیا تمہارے بس کا روگ نہیں؟“

”یار! انجان نہ بنو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح کی مار دھاڑ کر سکتا ہوں اور کروا سکتا ہوں۔ یہ لوگ مجھے کمانڈر وغیرہ بنانے کے چکر میں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ لڑیں اور میں ان کو لڑاؤں۔“

”تو یار! اس میں مشکل کیا ہے؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ... تم یہ سمجھو کہ سب کچھ میں نے ہی سنبھالا ہوا ہے، تم صرف آرڈرز جاری کر رہے ہو۔“

”مگر...“

”یار! کوئی مسئلہ نہیں۔ سب ہو جائے گا۔ اصل کام تو یہاں کے لوگوں کے جذبے اور حوصلے نے ہی کرنا ہے۔ بس ان کو تھوڑی سی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ راہنمائی ہم کریں گے۔“

”ہم نہیں، تم کرو گے۔“

”چلو، میں ہی کروں گا۔ کیا ہم انور خاں کا اتنا ساتھ بھی نہیں دے سکتے؟ اب یوں کرو کہ قلعے سے باہر نکلتے ہیں۔ جیپ پر علاقے کا ایک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ میگا فون ساتھ لے لیتے ہیں۔ راستے میں دو چار جگہ رک کر لوگوں کو حوصلہ دیں گے... انہیں بتائیں گے کہ وہ جم کر اپنا دفاع کریں۔ کم از کم اتنی دیر تک ان گوروں اور کالوں کو روکیں جب تک نل پانی سے ”ایکشن“ نہیں آ جاتا۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ نل پانی سے ایکشن آئے گا؟“

”ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ سویرے قاسمیہ چوک میں ہزاروں کا مجمع تھا اور دو ڈھائی سو مسلح سپاہیوں نے انہیں بھیڑ بکری بنایا ہوا تھا۔ مگر جب طلال اور اس کے ساتھیوں نے ہلا بولا اور تم نے سرجن امینٹل کی گردن دبوچی تو دیکھتے ہی دیکھتے سارا منظر بدل گیا۔ یار! یہ منظر ایسے ہی بدلتے ہیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اب نل پانی چپ نہیں رہے گا۔ مراد شاہ اور اچھوتے سرکار دیکھ رہے ہیں کہ حکم مکمل طور پر ان گوروں کا کٹھ پتلی بن چکا ہے۔ وہ اب آئیں گے، ضرور آئیں گے۔ اب تک یہ لڑائی ٹلتی رہی ہے مگر اب نہیں ٹلے گی۔“

ہم نے گوروں سے چھینی ہوئی دو جیپوں پر قاسمیہ کے اندر ایک چکر لگایا۔ حسنات اور آٹھ دس مسلح محافظ ہمارے ساتھ تھے۔ ہم اہم جگہوں پر تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رکے۔ عمران کے کہنے پر میں نے میگا فون کے ذریعے لوگوں کے جوش و جذبے کو ابھارا۔ ہر جگہ فلک شگاف نعروں سے فضا گونجی۔

ہم رات دس بجے کے قریب واپس آئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد گوروں اور حکم کے دستوں کی طرف سے حملہ شروع ہو گیا۔ یہ حملہ دو طرف سے تھا۔ حملے کی جگہ قلعے سے خاصی دور تھی۔ پھر بھی تابڑ توڑ فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں سے ہلچل مچ گئی... ہمیں معلوم تھا کہ سرکاری دستوں کے لیے تیزی سے آگے بڑھنا ناممکن ہوگا۔ دفاع کرنے والے گھروں میں مورچہ بند تھے اور سرکاری سپاہیوں کو گلی گلی جگہ جگہ پر آگے بڑھنا تھا۔ حسنات اپنے دیگر اہم کمان داروں کے ساتھ دفاعی لائن پر موجود تھا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کم از کم چوبیس گھنٹے تک سرکاری دستوں کو قاسمیہ کی گلیوں میں داخل نہیں ہونے دے گا۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ ”ہم دونوں میں سے کسی ایک کو لڑائی والی جگہ پر موجود ہونا چاہیے۔ اور میرا خیال ہے کہ میرا جانا مناسب ہے۔“

”تم نے ہر خطرے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟“

”مجھے پتا تھا کہ تم یہ فقرہ ضرور بولو گے۔ لیکن ایک طرف تم مجھے مکمل ذمے داریاں سونپ رہے ہو، دوسری طرف میرے اختیارات میں مداخلت بھی کر رہے ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو۔ یہاں عورتیں، بچے اور بوڑھے ہیں۔ ان پر خوف طاری ہے۔ لیکن اگر یہ اب تک حوصلے کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ان کے درمیان ہو۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔ باقی جہاں تک لڑائی کی بات ہے، فی الحال میں نے لڑنا ہے اور نہ تم نے۔“

اس نے مجھے وہاں رہنے پر مجبور کیا اور خود چوہان، عبدالرحیم اور دیگر مسلح افراد کے ساتھ قلعے سے نکل گیا۔

پتا نہیں کیوں وہ مجھے قائل کر لیتا تھا۔ اور مجھے ہی کیا، وہ ہر کسی کو قائل کر لیتا تھا۔ اگر وہ قائل نہ کر سکا... تو شاید ایک لڑکی کو نہ کر سکا... شبو کو آمادہ نہ کر سکا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام لے اور سارے بندھن توڑ کر اس کے ساتھ آزاد فضاؤں کا رخ کر لے۔ یا شاید اس نے اسے قائل کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگایا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے اس کی اپنی خواہش اور اندر سے پیدا ہونے والی رضا کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ بہرحال، اب یہ سب دور افتادہ ماضی کی باتیں تھیں۔

شدید لڑائی کی صورتِ حال قریباً ڈیڑھ گھنٹا رہی۔ پھر غیر متوقع طور پر ایک دم سکون ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد عمران اور چوہان وغیرہ قلعے میں واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ حکم کے وفاداروں کا پہلا بڑا حملہ روک دیا گیا ہے۔ ہاں، جنوبی راستے سے وہ لوگ قریباً ایک فرلانگ اندر آ گئے ہیں اور انہوں نے دو محلوں پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ عمران کو کندھے پر معمولی زخم بھی آیا تھا۔ یہ کسی شاٹ گن کا چھرّا تھا جو اس کے کندھے سے چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔

عمران، چوہان اور میرے درمیان لڑائی کی صورتِ حال کے بارے میں بات ہوئی... عمران نے کہا۔ ”ہمیں حقیقت سے نظر نہیں چرانی چاہیے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ہم اکیلے انگریزوں اور ان کے کٹھ پتلی حکم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاں، یہ ہے کہ ہم انہیں کچھ دیر تک روک سکتے ہیں۔ اگر اس دوران میں نل پانی حرکت میں آ جاتا ہے تو پھر راج بھون کی باقاعدہ فوج کے ساتھ زوردار مقابلے کا ماحول بن سکتا ہے۔“

قرائن سے پتا چلتا تھا کہ اب سویرے تک کوئی نیا حملہ نہیں ہوگا۔ اس دوران میں قاسمیہ کے اندر گھس آنے والے دستے اپنی پوزیشنیں بہتر بنائیں گے۔ اتفاقاً اس لڑائی میں دونوں فریقوں کا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دونوں طرف سے صرف سات آٹھ افراد ہلاک اور دو درجن کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تعداد حکم اور اینڈرسن کے فوجیوں کی تھی۔

چوہان، حسنات، بصرت اور عبدالرحیم وغیرہ کو نگرانی کا کام دے کر میں اور عمران تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ کل کے ہنگامہ خیز دن کی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم تھوڑی دیر آرام کر لیتے۔ حسنات احمد نے قلعے کی دوسری منزل پر ایک محفوظ کمرا ہمارے لیے منتخب کیا تھا۔ یہاں ایک بڑا پلنگ تھا جس پر کمبل پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں انگیٹھی کی حرارت بھی موجود تھی۔ دور کہیں قلعے کی بیرونی دیوار کے پاس کسی کتے کی آواز بار بار سنائی دیتی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ وہی کتا تو نہیں لیکن پھر اس ”فضول“ خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ ابھی ہمیں لیٹے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ کمرے کے قدیم طرز کے منقش چوبی دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ عمران نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف انور خاں کا ساتھی حسنات احمد تھا۔ مجھے شک گزرا کہ شاید انور خاں کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے لیکن یہ شک صحیح نہیں تھا۔ حسنات احمد سے کچھ دیر تک کھسر پھسر کرنے کے بعد عمران نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے اندر آیا۔ اس نے بے تابی سے دائیں بائیں دیکھا جیسے چھپنے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ واقعی جگہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن اپنے چھپنے کے لیے نہیں، میرے چھپنے کے لیے... اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور جلدی سے ایک قدِ آدم آبنوسی الماری کے پیچھے موجود خلا میں چھپا دیا۔ میں سرگوشیوں میں پوچھتا رہ گیا کہ کیا بات ہے مگر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ یہ کوئی اہم معاملہ لگ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ کمرے کا دروازہ کھولا اور کسی کو اندر لے آیا۔ یہ ایک لمبی گرم چادر میں لپٹی ہوئی جواں سال عورت تھی۔

دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے چادر سر سے سرکائی تو میں دنگ رہ گیا۔ گیس لیمپ کی سفیدی مائل روشنی میں میرے سامنے گیتا لکھی کھڑی تھی۔ وہی لڑکیوں کی ڈانس انسٹرکٹر، پکی عمر لیکن چست جسم والی "چلتی پرزی۔" اس کے ہونٹوں پر لالی تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگتا کہ وہ ہلکے سے نشے میں ہے۔ اس نے عجیب دل ربا انداز سے عمران کو دیکھا۔ گرم چادر اس کے شانوں سے ڈھلک رہی تھی۔ جسمانی نشیب و فراز نمایاں تر ہو رہے تھے۔ عمران نے ذرا جھنجلاہٹ سے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے اپنا ہاتھ عمران کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

"بیکار میں ناہیں آئی ہوں۔ بڑے کام کی خبر لائی ہوں۔ تمہارا من خوش ہو جاوے گا۔ تم کہو گے، مانگو گیتا آج کیا مانگتی ہو۔"

عمران نے کہا۔ "گیتا! یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہم جنگ کی حالت میں ہیں۔ تمہیں سنائی دے رہا ہوگا، اب بھی فائرنگ کی آوازیں آرہی ہیں۔"

"مجھے کیا بتا رہے ہو۔ جتنا زرگاں کے بارے میں، میں جانتی ہوں کوئی اور ناہیں جان سکتا۔ زرگاں گیتا لکھی سے ہے اور گیتا لکھی زرگاں سے ہے۔" اس نے عجیب بے باکی سے کہا اور عمران کو نیم باز آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اس کے بالکل قریب چلی آئی۔

یہ زرگاں کے شبستانوں کی راز داں وہی تیز طرار عورت تھی جو اس سے پہلے زرگاں سے ہماری واپسی کے وقت، عمران کے ساتھ ایک رومانی سین کر چکی تھی۔ یہ رومانی سین ان کوششوں کا عوضانہ تھا جو اس نے سلطانہ کے زیور ڈھونڈنے کے حوالے سے کی تھیں۔

... لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی بے باک نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی چادر تھوڑی سی اور سرکائی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ چادر کے نیچے اس نے دو حصوں پر مشتمل مختصر ترین لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے عمران کو کندھوں سے تھاما اور جذباتی انداز میں اس کا گال چوم لیا۔ عمران جھنا گیا۔ اسے ذرا دھکیل کر بولا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم میں شرم کی اتنی کمی ہو سکتی ہے۔"

وہ نشیلے انداز میں بولی۔ "اپنوں سے شرم ناہیں ہوتی۔ شاید تم میری گستاخی پر ناراض ہو رہے ہو۔ لیکن اگر یہ گستاخی ہے بھی تو سوچو کہ کیوں ہے؟ کوئی تو ایسی بات ہووے گی جس کی وجہ سے تمہاری اس بندی کو اتنی جرأت ہوئی ہے۔"

عمران نے غور سے اسے دیکھا اور تاڑ لیا کہ اس کے پاس کوئی بہت اہم خبر ہے۔ وہ اپنے لہجے کو ذرا نرم کر کے بولا۔ "گیتا! مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ بات بتاؤ۔"

"بات کی قیمت؟" وہ صرف دو تین انچ کے فاصلے سے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا قیمت؟"

وہ اس کے گلے لگ گئی۔ عمران نے جیکٹ اور قمیص اتاری ہوئی تھی۔ اس نے عجیب جذباتی انداز میں اس کے کندھے کی خونی خراش پر اپنے احمریں ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ کسی جونک کی طرح اس کے کندھے سے رسنے والا خون چوس رہی تھی۔ عمران نے اسے بالوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔ "یہ کیا حرکت ہے گیتا؟"

"یہ پریم ہے عمران... اور پریم کی کئی قسمیں ہووت ہیں۔ کچھ پریم بلیدان دیتے ہیں، کچھ نہیں دیتے۔ ایسے پریموں میں ایک ہاتھ دیا جاتا ہے، دوسرے ہاتھ لیا جاتا ہے۔"

"تم کیا دینا چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں بھانڈیل اسٹیٹ کی تقدیر بتانا چاہت ہوں۔ میں تمہیں ایک ایسی جانکاری دینا چاہت ہوں جو اس لڑائی کا نقشہ بدل دیوے گی۔"

"کیسی جانکاری؟"

وہ نشیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "سب کچھ بتا دوں گی تو پھر مجھ بے چاری کے پاس کیا رہ جاوے گا۔ چلو تمہیں تھوڑا سا بتا دیوت ہوں۔ نل پانی سے آنے والی بڑی بی جسے اب لوگن ماتا جی کہنے لگے ہیں، اس سارے کھیل میں ترپ کے پتے جیسی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس بڑی بی نے اب سے تھوڑے سے پہلے تاسمیہ کے علاقے اور قلعے پر زوردار حملے کے لیے ایک شبھ گھڑی بھی نکالی ہے۔ یہی کارن ہے کہ ہندو فوجیوں کے مشورے سے گوبر ان نے ابھی لڑائی روک دی ہے۔ لیکن اس بڑی بی کے حوالے سے اگلی بات بہت زیادہ خاص ہے..."

"کیا؟" عمران نے پوچھا۔

"قیمت؟" گیتا لکھی نے عمران کو خمار آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

باتیں اور شرطیں پھر کسی اور وقت کے لیے رکھ چھوڑو۔ یہ نہ ہو کہ تم مجھے معلومات بھی دے دو اور وہ کسی کام کی بھی نہ رہیں۔"

یوں محسوس ہوا کہ عمران کی بات کسی حد تک گیتا کے دل کو لگی ہے۔ اس نے ذرا ٹھٹک کر عمران کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ابھریں۔ بہرحال، وہ اتنی جلدی مکمل ہار ماننے والی عورت نہیں تھی۔ اس نے بل کھا کر عمران کی گردن میں بازو ڈالے۔ اس کے کنگنوں کی چھنکار کمرے میں گونجی۔ میں نے الماری کی اوٹ سے دیکھا۔ وہ عمران سے جڑی کھڑی تھی، بڑی ادا سے بولی۔ "محبت اور جنگ دونوں بڑی خاص چیزیں ہیں عمران! ہم ایک کے لیے دوسری کو قربان تو نا ہیں کر سکتے۔"

"لیکن گیتا! جو کچھ تم چاہ رہی ہو، اس کے لیے ذہنی سکون اور اندر کی خوشی درکار ہے۔ ہم اس وقت بڑی آزمائش کی گھڑیوں سے گزر رہے ہیں۔ اس آزمائش کو اور زیادہ سخت مت کرو۔"

"میں نے کیا کہا ہے، بس تم سے تھوڑا سا سمے ہی تو مانگا ہے۔" وہ نشیلے لہجے میں بولی۔

"یہ سمے ہی تو قیمتی ہے گیتا۔ میں رات تمہارے پہلو میں گزاروں گا تو بہت سے کام بگڑ جائیں گے۔"

اس نے ایک طویل آہ بھری... اور اپنے موقف پر ذرا ڈھیلی نظر آنے لگی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ "چلو کچھ دیر ہی سہی... لیکن اس کے ساتھ ساتھ کوئی وچن بھی تو دو۔"

"کیا وچن؟"

وہ مسکرائی۔ "یہی کہ جب تمہاری یہ آزمائش ختم ہو جاوے گی تو اپنے ہزار برس کے جیون میں سے ایک رات بس اس دیوانی کے نام کر دو گے۔"

"ٹھیک... ٹھیک ہے۔ وچن دیتا ہوں۔"

وہ عمران سے چمٹ گئی۔ اس نے اس کی گردن، چہرے اور ہونٹوں پر گرم بوسوں کی بارش کر دی۔ عمران نے بھی تھوڑی بہت جوابی کارروائی کی۔ وہ عمران کو دھکیلتی ہوئی بستر پر جا گری۔ اس کے لمبے ریشمی بال منتشر ہو گئے۔ عمران بڑے تحمل اور دانش مندی سے اسے اس کی حدود کے اندر رکھنے میں کامیاب رہا۔

دس پندرہ منٹ بعد گیتا کے جذبات کا چڑھا ہوا دریا کسی حد تک اتر گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں کہنیاں گاؤ تکیے پر ٹکا کر ٹیک لگائی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ اس خلوت گاہ میں ایک اور شخص بھی موجود ہے اور آبنوسی الماری کے عقب سے یہ سارے مناظر دیکھ رہا ہے۔ عمران کی سوالیہ نظریں گیتا کلمھی پر تھیں۔ دور کہیں قاسمیہ کی کسی گلی میں فائرنگ ہو رہی تھی اور یہ گونجتی ہوئی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی۔

گیتا کلمھی نے محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔ "اس بڑی بی کی چوتھی پشت اس راجواڑے کے ایک راجا، راہول جگجیت رائے سے ملتی ہے۔ جگجیت رائے کے زمانے میں راجواڑے کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کافی لڑائیاں ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی قاسمیہ کے مسلمان اس قلعے کی دیوار گرانے اور اندر گھسنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کہا جاوت ہے کہ اس لڑائی میں دونوں طرف کے کم از کم چار ہزار لوگن مارے گئے تھے۔ اس لڑائی کے بعد راجا جگجیت رائے نے ایسا انتظام کیا تھا کہ اگر پھر کبھی اسی طرح کی صورتِ حال بن جاوے اور مسلمان قلعے کے اندر بند ہو جاویں تو ان کو باہر نکالنے میں آسانی ہووے۔ کچھ لوگن کا خیال ہے کہ راجا نے اس وقت کوئی ایسا زمین دوز راستہ بنایا تھا جس کو استعمال کر کے قلعے کے اندر داخل ہوا جا سکے۔ لیکن یہ بات سچ نا ہیں ہے۔ قلعے کے اندر گھسنے کا کوئی خفیہ راستہ نا ہیں ہے۔"

اپنی بات ختم کر کے گیتا داد طلب نظروں سے عمران کو دیکھنے لگی۔

عمران نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے بُرا سا منہ بنایا اور بولا۔ "لیکن تمہاری اس اہم جانکاری سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

گیتا نے جھٹ سے عمران کے گال کا بوسہ لیا اور بولی۔ "ابھی میری بات مکمل نا ہیں ہوئی۔ لیکن جتنی بات میں نے تم کو بتائی ہے، اس کی تعریف تو کرو۔"

"چلو ٹھیک ہے... تعریف کرتا ہوں۔"

"نا ہیں، منہ زبانی تعریف مجھے نا ہیں چاہیے۔" وہ اس کے گلے لگ کر بولی۔

چاروناچار عمران نے اسے چوما، وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "بڑی بی جسے اب بہت سے لوگن بڑی روانی سے بڑی ماتاجی کا خطاب دے رہے ہیں، ایک بڑا خاص الخاص انکشاف سامنے لائی ہے۔ یہاں نزرگاں میں بڑی بی کی ایک بڑی پرانی آبائی حویلی ہے۔ اس حویلی میں کچھ جدی کاغذات پڑے ہوئے تھے۔ یہ کاغذات بڑی بی نے مکھم جی کو پیش کیے ہیں۔ ان سے پتا چلا ہے کہ وہ پرانی بات کچھ

وہ سراپا دعوت عمران کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ دے... ایک ہاتھ لے کی عملی تفسیر نظر آتی تھی۔ وہ عمران کو "ہونے والی لڑائی" کے حوالے سے کوئی خاص الخاص بات بتانا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی اس "انفارمیشن" کے بدلے وہ عمران کی قربت کی خواہش رکھتی تھی... عمران جیسے ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "گیتا! ہم اس وقت جنگ کی حالت میں ہیں۔ ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ یہ ساری

ایسی غلطی بھی نا ہیں تھی جو اس قلعے کے حوالے سے کہی جاوت ہے۔ اس قلعے میں ایک بڑی خامی ہے۔۔۔ اور راجا رائے کے دور میں یہ خامی جان بوجھ کر رکھی گئی تھی۔۔۔ تا کہ اگر کسی آنے والے سمے میں مسلمان اس قلعے میں قلعہ بند ہوں تو ان پر حملہ کیا جا سکے۔۔۔“

عمران کے چہرے پر دلچسپی کے تاثرات ابھرے اور اس کی توجہ بڑھ گئی۔ گیتا، عمران کی اس کیفیت سے محظوظ ہوئی۔ وہ نیم دراز ہوگئی اور اس کی گود میں سر ٹکا کر بولی۔

”تمہارا کیا خیال ہے عمران! وہ خامی کیا ہووے گی؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

وہ اس کے سینے کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”یہ وہی خامی ہے جو سات پردوں میں چھپی ہوئی اکیلی ناری کے اندر ہووت ہے۔ اس خامی کو سات پردوں کی وجہ سے دور نا ہیں رکھا جا سکتا۔ یہ خامی تو ناری کے اندر ہی ہووت ہے۔ وہ اوپر سے چاہے بڑی مضبوط نظر آوت ہو لیکن اس میں چھپی ہوئی کمزوری اسے مضبوط نا ہیں رہنے دیتی۔“

عمران نے کہا۔ ”تمہارا فلسفہ سمجھنے میں مجھے تھوڑی دیر لگے گی۔۔۔ اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

”عمران! قلعے کی فصیل پرانی ہونے کے باوجود بہت مضبوط ہے لیکن ایک جگہ ایسی ہے جہاں یہ فصیل بالکل مضبوط نا ہیں ہے۔ وہ دیکھنے میں مکمل فصیل نظر آوت ہے لیکن اندر سے بالکل کھوکھلی ہے۔ شاید ایک بڑا فوجی ٹرک بھی اس سے ٹکرا جاوے تو وہ گر سکتی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ ہے عمران۔ اور میں تمہیں اس کا مکمل ثبوت دے سکت ہوں۔۔۔ فصیل کا وہ حصہ دراصل کبھی ایک بڑا دروازہ ہوا کرت تھا۔ راجا رائے کے زمانے میں وہ دروازہ گرا دیا گیا اور وہاں پر بھی فصیل بنا دی گئی۔ مگر فصیل کا یہ ٹکڑا اندر سے بالکل کھوکھلا بنایا گیا ہے۔ سمجھو کہ نا تک چندی اینٹوں کی دو عام سی دیواریں ہیں جن کے درمیان آٹھ دس فٹ جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ یہ سارا کام راتوں کے اندھیرے میں بڑی رازداری سے کیا گیا ہووے گا۔ ہو سکتا ہے کہ جن کاریگروں نے یہ کام کیا ہو، ان کو ویسے ہی جان سے مار دیا گیا ہو یا پھر قید میں ڈال دیا گیا ہو۔ بہرحال، فصیل کا یہ کھوکھلا ٹکڑا ایک چھپی ہوئی حقیقت ہے اور بڑی ماتا نے یہ حقیقت اپنے جدی کاغذوں کے ذریعے حکم جی وغیرہ پر کھول دی ہے۔“

میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ یقیناً عمران کی کیفیت بھی مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ گیتا کا انکشاف اگر درست تھا تو بڑا خطرناک تھا۔ ہماری حالت اس شخص کی سی تھی جو کسی جنگل میں کسی درندے سے بچنے کے لیے درخت پر چڑھ جائے اور اچانک اسے پتا چلے کہ وہ جس درخت پر چڑھا ہے، وہ جڑوں کے بغیر ہے اور زمین بوس ہو رہا ہے۔

”وہ جگہ کون سی ہے؟“ عمران نے گیتا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”دیکھو، سب کچھ مجھ سے چھین رہے ہو اور اس کا صلہ بھی کوئی نہیں۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”پلیز گیتا۔۔۔ پلیز۔ ہم بڑی نازک سچویشن سے گزر رہے ہیں۔ اور جو کچھ تم بتا رہی ہو، وہ سچ ہے تو پھر سچویشن اور نازک ہو جاتی ہے۔“

”وہ تو میں بھی اچھی طرح جانت ہوں۔“ اس نے عمران کے ہونٹوں پر انگلی چلا کر کہا۔ ”یہ بات تو طے ہے کہ کل سویرے قاسمیہ کے لوگن برٹش فوجیوں اور حکم کے سپاہیوں کا حملہ زیادہ دیر نا ہیں روک سکیں گے۔ ہو سکت ہے کہ وہ دس بارہ گھنٹوں کے اندر ہی چاروں طرف سے پسپا ہو کر قلعے کے اندر آ جائیں اور دروازے بند کر دیں۔ ہزار ڈیڑھ ہزار عورتیں اور بچے تو اب بھی قلعے میں موجود ہیں۔ پھر یہاں موجود لوگن کی تعداد کئی ہزار تک ہو جاوے گی۔ ان سارے لوگن کے جیون اسی صورت میں بچے رہ سکیں گے جب یہ قلعہ ان کی رکھشا کرے گا۔ اگر قلعہ رکھشا نہ کر سکا تو بڑی جلدی سب کچھ ختم ہو جاوے گا۔“

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، بالکل درست تھا۔ عمران کے تاثرات بھی یہی کہہ رہے تھے کہ وہ گیتا کی بات کے وزن کو پوری طرح محسوس کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”گیتا! اٹھو۔۔۔ مجھے وہ جگہ دکھاؤ۔“

”لیکن پہلے اپنے وچن کی تصدیق تو کرو۔“

”کیا کروں؟“

”دستخط کر دو۔“

”کہاں؟“

”یہاں۔“ اس نے اپنے بالائی جسم کو بے لباس کر دیا اور کوئی مارکر نما شے عمران کے ہاتھ میں تھما دی۔

عمران سٹپٹایا ہوا نظر آیا مگر وہ بحث کر کے وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ڈھلتی جوانی والی طرار گیتا مکھی شاید آج اپنا ہر مطالبہ پورا کرانے پر تلی ہوئی تھی۔ عمران نے اس کا یہ بے ہودہ مطالبہ بھی پورا کیا اور پھر اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ گیتا مکھی نے خود کو سرتاپا گرم چادر سے ڈھانپا اور عمران کے پہلو میں چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ سیاہ چادر میں سے فقط اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ عام لوگوں کے لیے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ کون ہے۔ اب میرا وہاں رکنا بھی بیکار تھا۔ میں الماری کی اوٹ سے نکل کر ان کے پیچھے گیا۔ قلعے کے طویل برآمدوں اور وسیع و عریض احاطوں میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ بے شمار مشعلیں اور گیس کے ہنڈولے قرب و جوار کو روشن کر رہے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ جوش و خروش کے آثار بھی تھے۔ عمران اور گیتا مکھی درمیانی احاطے سے گزر کر فصیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ میں نے رسماً عمران سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ عمران کو بھی معلوم تھا کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ اس نے مجھے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ حسنات اور چوہان وغیرہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ ہم قلعے کے مرکزی دروازے سے، فصیل کے ساتھ ساتھ چلتے سو ڈیڑھ سو قدم شمال کی طرف آئے۔ یہاں پہنچ کر گیتا مکھی کچھ دیر تک قرب و جوار کا جائزہ لیتی رہی اور وہ نشانیاں ڈھونڈتی رہی جو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھیں۔ آخر اس نے فصیل کے ایک حصے کو منتخب کیا۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”یہاں سے اینٹیں نکال کر دیکھو۔“

حسنات کی ہدایت پر فوراً ہی دس بارہ افراد وہاں پہنچ گئے۔ ان کو کدالیں وغیرہ فراہم کر دی گئیں۔ فصیل پر کدالیں چلنا شروع ہوئیں۔ پہلی دو چار اینٹیں نکالنے میں دشواری ہوئی لیکن اس کے فوراً بعد اینٹیں گرنا شروع ہو گئیں۔ وہاں موجود تمام افراد کے چہرے تحیر کی آماجگاہ بن گئے۔ فصیل کا یہ حصہ واقعی کھوکھلا تھا۔

یہ ایک تہلکہ خیز انکشاف تھا۔ حسنات کی ہدایت پر اور بھی بہت سے افراد کدالیں اور ہتھوڑے وغیرہ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو شاید آدھ پون گھنٹے میں فصیل کا یہ ٹکڑا منہدم کر ڈالتے لیکن ہم نے آپس میں مشورے کے بعد انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ یہ فصیل جیسی بھی بری بھلی تھی لیکن اس کا کھڑا رہنا اس کے منہدم ہونے سے بہتر تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ فصیل کا یہ حصہ گرنے کی صورت میں دفاع کا متبادل انتظام موجود ہو۔ یہ انتظام کیا ہو؟ اور اسے جلد سے جلد کس طرح مکمل کیا جائے؟ یہ دونوں بڑے اہم سوال تھے۔ اس موقع پر ایک بار پھر عمران کے مشورے

نے مجھے طاقت بخشی۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ ”بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟ سب تمہاری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔“

”یار! تم نے مجھے بُری طرح پھنسا دیا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ یہ سب کچھ میرے بس کا نہیں ہے۔“

”کسر نفسی سے کام مت لو۔ جو شخص جارج گورا کو ہرا سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ لوگ تمہیں نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں یار۔ کچھ تو خیال کرو ان کے جذبات کا۔“

”میں نے گھونسا مار کر تمہاری بتیسی ہلا دینی ہے۔“ میں دھیمی آواز میں پھنکارا۔

”تمہیں گھونسا مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بس آنکھ سے اشارہ کر دو۔ تمہارے یہ سیکڑوں پرستار میری ہڈیوں کا چورا کر ڈالیں گے۔ آخر کمان دار ہو تم۔ لیڈر شپ ہے تمہارے پاس۔“

”عمران... عمران۔ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔“ میں نے اسے سختی سے ٹوکا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا۔ تھوڑی کھجا کر بولا۔ ”دیکھو، بات میری ہو گی لیکن زبان تمہاری ہو گی۔ اس ”ڈی“ فصیل کے پیچھے ہمیں ایک اور دفاعی لائن قائم کرنی پڑے گی۔ اتنے تھوڑے وقت میں کوئی دیوار وغیرہ تو بنائی نہیں جا سکتی۔ ہاں، ایک نیم گول خندق ضرور کھودی جا سکتی ہے......“

”تمہارا مطلب ہے کہ اگر فصیل کا کمزور حصہ ٹوٹ بھی جائے تو آگے خندق ہو؟“

”بالکل... یہ بات جب تم کہو گے تو اس کا زیادہ اثر ہو گا۔ ابھی درجنوں لوگ کام پر لگ جائیں گے۔“

اگلے آدھ گھنٹے میں وہی ہوا جو عمران نے کہا تھا۔ میں نے حسنات اور مبارک علی وغیرہ سے مشورہ کیا اور وہی تجویز دی جو عمران نے میرے کان میں ڈالی تھی۔ اس تجویز کو سب نے مان لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کدالوں اور کسیّوں والے قریباً ڈھائی تین سو افراد جمع ہو گئے اور فصیل کے کمزور حصے کے سامنے نیم دائرے میں ستر فٹ لمبی خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ اندازہ ہوا کہ یہ کام حیران کن تیزی سے بس پانچ چھ گھنٹے کے اندر ہی مکمل ہو جائے گا۔

یہی وقت تھا جب تین گھڑسوار بڑی تیزی سے قلعے کے اندر داخل ہوئے۔ وہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے احاطے میں پہنچے۔ وہیں سے ان کی نظر مجھ پر اور حسنات وغیرہ پر پڑ گئی۔ وہ سیدھا ہماری طرف آئے۔ ان میں انور خاں کا ایک اور قریبی ساتھی مبارک علی تھا۔ اس کے علاوہ امرناتھ اور ایک دوسرا شخص تھا۔ وہ باہر سے کوئی اہم خبر لے کر آئے تھے۔

”کیا بات ہے مبارک؟“ حسنات نے دریافت کیا۔

مبارک بولا۔ ”قاسمیہ کے داخلی دروازے کے پاس بہت بڑا ہجوم ہو گیا ہے۔ وہاں ایک بہت خاص خبر آپ لوگن کا انتظار کر رہی ہے۔“

”کیسی خبر؟“ میں نے پوچھا۔

مبارک نے میری طرف دیکھا اور مؤدب انداز میں کہا۔ ”وہاں ایک چوبارے پر ہم نے بڑا پکا مورچا بنا رکھا ہے۔ ابھی پہلے پہر کو جو حملہ ہوا تھا، اس کا مقابلہ اس مورچے کے اندر سے بہت ڈٹ کر کیا گیا تھا۔ یہاں ایک بڑی دوربین بھی ہے جی جو کل کی لڑائی میں ہم نے گوروں سے چھینی تھی۔ وہ دوربین چوبارے کی سب سے اونچی جگہ پر لگائی گئی ہے۔ اس دوربین کے ذریعے ہم کو ایک بڑی خاص جانکاری ملی ہے جی۔ ہم نے اس بڑھیا کو دیکھ لیا ہے جسے لوگن بڑی ماتا کہہ رہے ہیں اور اس کو دیوی کا درجہ دے رہے ہیں۔“

”کہاں ہے بڑھیا؟“ میں نے پوچھا۔

”دھرم شالا کے تالاب کے اندر جو اونچا مینارہ ہے اس پر چڑھی ہوئی ہے۔ کوئی خاص قسم کی پوجا پاٹ کر رہی ہے۔ دو اور پجارنیں بھی اس کے ساتھ ہیں۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے حسنات احمد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ”یہاں قاسمیہ کے ساتھ ہی ہندو آبادی میں ایک بڑا دھرم شالا ہے۔ دھرم شالا کے تالاب کے اندر ایک چوکور مینارہ ہے۔ اس کو ناگ مینارہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے اردگرد پتھر کا ایک بڑا سا سانپ لیٹا ہوا دکھایا گیا ہے۔ پرانے وقتوں سے پنڈت اور پجاری وغیرہ خاص چلّے کاٹنے کے لیے یا خاص قسم کی پوجا پاٹ کے لیے اس پر چڑھتے ہیں۔“

یہ خبر واقعی اہم تھی۔ اگر کہیں سے واقعی بڑی بی نظر آ رہی تھی تو پھر ہم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ایک بند جیپ میں سوار مبارک علی کے ساتھ جا رہے تھے۔ مبارک علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ جیپ میں میرے ساتھ حسنات احمد، عمران اور بھرت تھے۔ ہم قاسمیہ کی مختلف گلیوں سے گزرے۔ جگہ جگہ مورچے نظر آ رہے تھے۔ جو مورچے کھلی جگہوں پر تھے، ان کو ریت کی بوریوں اور اینٹوں وغیرہ سے محفوظ کیا گیا تھا۔ مسلح افراد ہر طرف گشت کر رہے تھے۔ خوراک سے بھرے ہوئے بہت سے چھکڑے قلعے کی طرف جا رہے تھے۔ یہ انتظام اس لیے تھا کہ اگر قلعے میں محصور ہونا پڑے تو دشواری پیش نہ آئے۔

جلد ہی ہم قاسمیہ کے داخلی راستے کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں ہم ایک زیادہ تنگ گلی میں مڑے۔ پھر اپنی سواریوں سے اترے اور بیس تیس قدم فاصلہ طے کر کے ایک دروازے میں داخل ہو گئے۔ اردگرد سیکڑوں افراد جمع تھے۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں پہچان لیا اور فلک شگاف نعرے لگائے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ایک چار منزلہ چوبارے کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ چوبارے کی ساری منزلوں پر مسلح افراد کا ہجوم تھا۔ وہ بے حد پُرجوش نظر آتے تھے۔ انگریزوں اور حکم کے ہرکاروں کے خلاف زبردست نعرہ زنی کر رہے تھے۔ یہاں مجھے ایک چونکا دینے والا منظر بھی نظر آیا۔ ایک راہداری میں ایک انگریز کی برہنہ لاش کو الٹا لٹکایا گیا تھا۔ غالباً یہ شخص کل صبح ہونے والے معرکے میں مرا تھا یا پکڑا گیا تھا۔ لاش کے جسم پر تشدد کے بہت سے نشان تھے۔ یقیناً یہ لاش اس سفاکی کا ردِعمل تھی جو ”تہذیب یافتہ گوروں“ کی طرف سے پچھلے پانچ چھ دنوں میں یہاں روا رکھی گئی تھی۔ جیل سے قاسمیہ کی طرف آتے ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے درجنوں افراد کی درختوں سے جھولتی لاشیں دیکھی تھیں۔ ان بدنصیبوں کو حکم اور ایسٹ انڈیا ... کے جوانوں نے سرِعام پھانسیاں دی تھیں اور لاشیں چیل کوّوں کے لیے چھوڑ رکھی تھیں۔

سیڑھیاں طے کر کے ہم چوبارے کی چھت پر پہنچ گئے۔ اب صبح صادق کا اجالا نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس چوبارے کے اردگرد چاروں طرف لاتعداد لوگ گھروں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں نظر آ رہے تھے۔ رائفلیں لہرا رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ چوبارے کی چھت پر قاسمیہ کے سرکردہ افراد اور جنگجو موجود تھے۔ ایک تین فٹ لمبی ٹیلی اسکوپ ایک اسٹینڈ پر رکھی گئی تھی اور اس کے اردگرد ہجوم تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ہجوم نے راستہ دیا۔ میں اور عمران، حسنات احمد کے ساتھ ٹیلی اسکوپ پر پہنچے۔ سب سے پہلے مجھے ہی مطلوبہ منظر دکھایا گیا۔ منظر واقعی چونکا دینے والا تھا۔ ٹیلی اسکوپ کو بڑی خوبی سے قریباً نصف کلومیٹر دور ایک مینار پر فوکس کیا گیا تھا۔ مینار کے بالائی سرے پر برقی روشنی نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ روشنی جنریٹر کی مرہونِ منت رہی ہو گی۔ غور سے دیکھنے پر بڑی بی کی شبیہ نظر آتی تھی۔ وہ آلتی پالتی مارے شاید فرش پر ہی بیٹھی تھی۔ اس کے سر کے عین اوپر ایک سیاہ بکرے یا بکری کا کٹا ہوا سر جھول رہا تھا۔ خاصی سردی میں بھی بڑی بی کے جسم پر فقط سفید سوتی ساڑی ہی دکھائی دیتی تھی۔ تاہم غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ اس کے کندھوں پر کوئی شال قسم کی چیز بھی ہے۔ درمیانی عمر کی دو اور عورتیں بھی بڑی بی کے ساتھ تھیں۔

”آپ لوگ بھی دیکھو۔“ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے عمران اور حسنات وغیرہ کو دعوت دی۔

باری باری سب نے یہ منظر دیکھا۔ آخر میں پھر مجھے دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ بڑی بی دوسری طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔ تاہم کسی وقت وہ اپنے کندھوں پر پھونک مارنے کے لیے اپنی گردن گھماتی تو اس کا چہرہ بھی نظر آتا تھا۔ اچانک شور اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ قاسمیہ کے کچھ مکین آپس میں ہی گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ تین چار باریش افراد کو لوگ بُری طرح مار رہے تھے۔ انہیں غدار، دھوکے باز اور پتا نہیں کیا کیا قرار دے رہے تھے۔ دیگر افراد انہیں چھڑانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔ ”یہ کیا تماشا ہے؟ ختم کرو یہ۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

شدید گرما گرمی میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی لیکن پھر بھی کھینچا تانی اور بدزبانی جاری رہی۔ حسنات اور مبارک وغیرہ نے آگے بڑھ کر یہ ہنگامہ بمشکل کنٹرول کیا۔ دو چار افراد اب بھی بُری طرح گرج برس رہے تھے۔ ”تم منافق ہو۔ تم غیروں سے ملے ہوئے ہو۔ تم جیسے لوگن کی وجہ سے یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔“

اس طرح کے فقرے چاروں طرف گونج رہے تھے۔ مار کھانے والے زخمی افراد کو موقع سے ہٹا لیا گیا۔ مارنے والے سیکڑوں کی تعداد میں تھے، وہ اور جوش و خروش سے نعرے لگانے لگے... ان کے نعروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ بڑی بی کو فوراً سے پہلے شوٹ کر دینے کے خواہش مند ہیں۔

حسنات مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے جھگڑے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ”ایک قبیلے کے لوگوں نے رائے دی ہے کہ بوڑھی عورت پر گولی نہ چلائی جاوے۔ یہ بدشگونی ہووے گی۔“

”بدشگونی سے کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کا کہنا ہے کہ ان کے عقیدے کے مطابق جنگ میں کسی پر اس کی بےخبری میں پیچھے سے وار کرنا بالکل غلط ہے... اور جس پر وار کیا جاوے، وہ ناری ہو اور عمر رسیدہ بھی ہو تو یہ اور بھی غلط ہے۔ بس اسی بات پر باقی لوگن غصے میں آ گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کوئی عام عورت نا ہیں، یہ فساد کی جڑ ہے۔ یہ اس لڑائی میں بڑے بڑے فیصلے کر رہی ہے۔ یہ مرے گی تو دشمنوں کی کمر ٹوٹے گی۔ وہ اسے مارنے میں ذرا

سی بھی دیری کرنا نہیں چاہتے۔"

"ظاہر ہے ان حالات میں تو یہ سنہری موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی دور نشانہ لگ بھی سکے گا؟" عمران نے کہا۔

"وہ دیکھیں جی، جہاں بہت سے لوگ جمع ہیں... چھت کے اس کونے میں۔" مبارک علی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

عمران کے ساتھ ساتھ میں نے بھی دیکھا۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ پھر مجھے ایک دور مار رائفل بھی نظر آئی۔ یہ کافی بڑی رائفل تھی۔ اس کے اوپر بھی ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ کئی اہم جنگجو کمانڈر یہاں جمع تھے۔ حسنات احمد نے کہا۔ "یہ زرگاں کے تین چار بہترین نشانے باز ہیں جی۔ اڑتے پرندے پر سو فیصد ٹھیک نشانہ لگا لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے، ان میں سے کوئی ایک بڑی بی کے کھوپڑے میں سوراخ کر دے گا۔"

چھت پر موجود لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بالکل غیر متوقع طور پر ان کو ایک بڑی شاندار کامیابی ملنے والی ہے۔ اس ٹیلی اسکوپ نے اتفاقیہ طور پر ایک ایسا کام کر دکھایا تھا جو بظاہر بہت مشکل تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی ماہرِ فلکیات اپنی ٹیلی اسکوپ سے آسمان کا طول و عرض ناپ رہا ہو اور اچانک ایک ایسا ستارہ اسے نظر آ جائے جس کی خبر پہلے کسی کو نہ ہو۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی حیران کن دریافت تھی۔ وہ بڑی بی جو زرگاں کے شعلوں پر تیل ڈالنے کا کام بڑی ہٹ دھرمی سے کر رہی تھی، اچانک ہی اس ٹیلی اسکوپ کے عدسوں پر نمودار ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا، باریک نقوش اور تیکھی لمبی ناک والا ایک نشانے باز دور مار رائفل میں بلٹ ڈال رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہی شخص بڑھیا پر نشانہ لگانے والا ہے۔ سیکڑوں تماشائیوں کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ عمران نے میرا کندھا دبایا۔ ہم نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھے۔ حسنات احمد اور چوہان نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ چوہان ہماری روانگی کے بارے میں پوچھتا، عمران نے اسے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ اردگرد موجود ہر شخص کا دھیان، دور مار رائفل اور نشانے باز کی طرف تھا۔ سانسیں جیسے رک گئی تھیں اور نگاہیں دھرم شالا کے دوزانو وہ مینارے پر جمی ہوئی تھیں۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے دیکھا بھی تو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔ زینوں کی جانب کی میں پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ عمران کوئی خاص کام کرنا چاہ رہا ہے۔

"کچھ بتاؤ گے بھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ آن ایئر ہونے سے پہلے کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس نے کہا اور مجھے تقریباً کھینچتا ہوا نچلی منزل پر لے آیا۔ یہاں تاریکی تھی۔ کسی نے ہمیں پہچانا نہیں۔ وہ مجھے لے کر سیدھا ایک کمرے میں گھس گیا اور کمرے کا دروازہ شتابی سے بند کر دیا۔ میں نے دیکھا یہاں بھی ایک کھڑکی کے پاس ایک لمبی رینج کی رائفل پڑی تھی۔ بہر حال، یہ اوپر والی رائفل سے کم طاقتور تھی۔ اس رائفل کو چلانے والا بھی غالباً بڑی بی کی ہلاکت کا منظر دیکھنے کے لیے بالائی منزل پر چلا گیا تھا۔ عمران نے رائفل کو فوراً چیک کیا۔ اس میں دو بلٹس موجود تھیں۔ رائفل پر چھوٹے سائز کی ٹیلی اسکوپ بھی لگی ہوئی تھی۔

"بڑھیا کو مارنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اسے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ رائفل لوگوں کو زندہ کرنے کے لیے ہی تو ہوتی ہے... یار... کبھی کبھی کیسا احمقانہ سوال کرتے ہو تم۔"

"لیکن تمہیں پنگا لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اوپر بڑی گن سے فائر کرنے تو لگے ہیں وہ لوگ۔"

"میں نشانہ چوکنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ اگر نشانہ چوک گیا تو دو تین سیکنڈ میں بڑی بی غائب ہو جائے گی۔ پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔"

"لیکن ان لوگوں کے پاس بڑی گن ہے۔ حسنات بتا رہا ہے کہ وہ لوگ زرگاں کے بہترین نشانے باز ہیں۔"

"زرگاں اور لاہور میں بڑا فرق ہے۔ لاہور... لاہور ہے۔ اور لاہور کا نشانے باز بھی، لاہور کا نشانے باز ہے۔"

"لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم شکار دیکھو، شکاری دیکھو اور نشانہ دیکھو۔"

وہ بڑے اعتماد سے رائفل کے سامنے جا بیٹھا۔ مینارہ اور اس کی بالائی روشنی یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ رات کی تاریکی بتدریج دن کے اجالے میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ "میں نشانہ لینے لگا ہوں۔ اگر دروازے پر دستک ہو بلکہ اگر کوئی دروازے کو اکھاڑ بھی دے تو تمہیں دروازہ نہیں کھولنا ہے۔"

"عمران! دیکھ لو۔ بڑا نازک معاملہ ہے۔"

"تمہیں پتا ہے، میں صرف نازک معاملوں کو ہی دیکھتا ہوں۔ نزاکت مجھے پسند ہی بڑی ہے۔ خاص طور سے اگر لڑکیوں اور ان کے معاملوں میں ہو تو......"

میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ جو کرنے جا رہا ہے، کر کے رہے گا۔ اسے روکنا بیکار تھا۔ اسی دوران میں میری نگاہ ایک اور دوربین پر پڑ گئی۔ یہ کمرے کی ایک دیوار پر لگی کھونٹی سے جھول رہی تھی۔ میں نے یہ چینل کی دوربین اتار کر آنکھوں سے لگا لی۔ عمران رائفل کے سامنے اوندھا لیٹ کر شست باندھ چکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ وہ کمال کا نشانے باز تھا۔ میں نے آج تک اس کا نشانہ خطا ہوتے نہیں دیکھا تھا... مگر آج... اس نے نشانہ خطا کیا۔ اور ایک نہیں دونوں نشانے خطا کیے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھا۔ بڑھیا ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کی دونوں ساتھی عورتیں بھی اٹھیں۔ میں نے ان کے ہیولوں کو تیزی سے اوجھل ہوتے دیکھا۔

"او و شٹ۔" عمران نے دانت پیس کر رائفل پر مکا رسید کیا۔

پھر وہ مجھے لیے تیزی سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف ہلچل تھی۔ اوپر تلے ہونے والے دو فائرز کی گرج دار آواز سن کر لوگ بالائی منزل کی طرف دوڑے جا رہے تھے، تاہم کچھ اوپر سے نیچے بھی آ رہے تھے۔ ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔ تاریکی اور بھگدڑ میں کسی نے ہمیں کمرے میں داخل ہوتے یا نکلتے نہیں دیکھا۔ کم از کم کسی نے ہمیں پہچانا ہرگز نہیں۔ ہم بھی زینے طے کر کے اوپر آ گئے۔ یہاں دور مار رائفل کے قریب موجود چوٹی کے نشانے باز، بُری طرح آگ بگولا ہو رہے تھے۔ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ ان کے فائر کرنے سے پہلے ہی کسی اور نے گولی چلا دی ہے اور اس اچانک فائرنگ کے نتیجے میں "شکار" اوجھل ہو گیا ہے۔ لمبی ناک والا شخص زینوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور دہاڑ رہا تھا۔ "نیچے دیکھو۔ وہاں سے گولی چلائی ہے کسی حرامزادے نے۔"

چند مسلح افراد دوڑتے ہوئے زینے اتر گئے۔ "کیا ہوا حسنات؟" عمران نے پوچھا۔

"گڑ بڑ ہو گئی عمران بھائی۔ بڑھیا بچ گئی۔ لگتا ہے کہ ہم سے پہلے کسی اور نے گولی چلا دی۔ لیکن وہ اس خبیث کو لگی نہیں۔"

میں جب سے عمران کے ساتھ تھا، مجھے پہلی بار اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس سے جلد بازی ہوئی تھی۔ اس نے نسبتاً چھوٹی گن سے اور افراتفری میں نشانہ لیا تھا... بہر حال، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ شاید اس میں کوئی بہتری ہو۔ ایک نشانے باز اب بھی بڑی گن کے پاس موجود تھا۔ اس گن کی دوربین بھی نسبتاً بڑی تھی۔ نشانے باز نے مسلسل دوربین سے آنکھ لگا رکھی تھی۔ مگر اب توقع نہیں تھی کہ بڑھیا پھر نشانے پر آئے گی۔

چوبارے کے اندر اور اردگرد موجود سیکڑوں لوگوں میں مایوسی کی لہر سی دوڑ گئی۔ تاہم کچھ لوگ امید ظاہر کر رہے تھے کہ شاید بڑھیا کو گولی لگ ہی گئی ہو۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور عمران دیگر ساتھیوں کے ہمراہ واپس قلعے میں آ گئے۔ فصیل کے کمزور حصے کے سامنے قوس کی شکل کی سرنگ تیزی سے کھودی جا رہی تھی۔ سیکڑوں مرد و زن اور بچے قلعے کے مختلف حصوں میں موجود تھے۔ وہ اپنی اپنی اہلیت کے مطابق مختلف کام انجام دے رہے تھے۔ کہیں ناشتا بنایا جا رہا تھا، کہیں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ دفاعی انتظامات میں بھی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی تھیں۔ گیتا کہیں اب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ان سیکڑوں عورتوں کے درمیان کہیں موجود تھی یا شاید واپس جا چکی تھی۔ میں اور عمران دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ پتا نہیں کیوں، مجھے عمران کی نشانے بازی پر مسلسل شک سا ہو رہا تھا... میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "عمران! تم مجھے ہر وقت الجھن میں رکھتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری کون سی بات کو حقیقت سمجھوں اور کس کو جھوٹ؟"

"بھئی! میڈیا کا تو کام ہی الجھن میں رکھنا ہوتا ہے۔ ایک الجھن کے ختم ہونے سے پہلے دوسری الجھن شروع ہو جانی چاہیے۔ ورنہ ناظرین بھاگ جائیں گے اور اینکر بے چارے پکارتے رہ جائیں گے، جائیے گا نہیں... جائیے گا نہیں۔" وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں، میں نہیں بھاگوں گا۔ مگر مجھے سچ سچ بتایا کرو۔"

"ٹھیک ہے، آئندہ سچ بتایا کروں گا۔"

"یعنی تم بالواسطہ اعتراف کر رہے ہو کہ یہ سچ نہیں تھا۔ تم نے... تم نے جان بوجھ کر بڑھیا کو بھگایا ہے؟"

"یار بھگایا تو جوان اور خوب صورت عورتوں کو جاتا ہے۔ بڑھیا کو بھگانے سے کیا فائدہ۔ کتنا بے ہودہ الزام لگا رہے ہو... ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں نے بڑی بی کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔"

"کیوں؟"

''یار! دشمن پر پیچھے سے وار کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا اور دشمن بھی اتنا پرانا، جتنا یہ قلعہ ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ بڑھیا ضرور بہادر شاہ ظفر کا حقہ تازہ کرتی رہی ہے۔۔۔ یا کم از کم مہاتما گاندھی کی گرل فرینڈز میں شامل رہی ہے۔''

''تم پھر بکواس کر رہے ہو۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، دروازے پر دستک ہوئی اور پھر حسنات اور ڈاکٹر چوہان اندر آ گئے۔ حسنات کچھ دیر پہلے تک کافی افسردہ نظر آتا تھا مگر اب اس کی کیفیت بدلی ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ''میں انور بھائی سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ بڑھیا کا بچ جانا ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہے۔''

''کس لحاظ سے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہے ہیں، اس بڑھیا نے قاسمیہ پر بھرپور حملے کے لیے شبھ گھڑی نکالی ہوئی ہے۔ اس شبھ گھڑی کی وجہ سے ہی ابھی تک ہندو فوجی حملے سے رکے ہوئے ہیں۔ مجبوراً گورے فوجیوں کو بھی رکنا پڑا ہے۔ حالانکہ یہ گورے وقت ضائع کرنا نہیں چاہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اب تک ہم پر حملہ نہیں ہوا تو اس کی وجہ یہ بڑھیا ہی ہے۔ اگر یہ بڑھیا مر جاتی تو ہم پر ابھی حملہ ہو جاتا تھا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' عمران نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس نے معصوم صورت بنا رکھی تھی۔ کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکتا تھا کہ بڑھیا کو بھگانے والا کام عمران نے کیا ہے اور اس طرح سے کیا ہے کہ اس کام سے اختلاف کرنے والوں کو اختلاف کا موقع ہی نہیں مل سکا۔

حسنات نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''انور بھائی کہہ رہے ہیں، یہ بہت ضروری ہے کہ ابھی دس بارہ گھنٹے تک ہم پر اٹیک نہ ہو۔ امید ہے کہ آج رات تک ہمیں باہر سے زبردست کمک مل جاوے گی۔''

''کمک سے تمہاری مراد تل پانی سے آنے والی مدد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل جناب! ہمارے مخبر بتا رہے ہیں کہ تل پانی سے کم و بیش چار ہزار سپاہی روانہ ہو چکے ہیں۔ ان کی قیادت خود چھوٹے سرکار کر رہے ہیں۔''

یہ بڑی سنسنی خیز اطلاع تھی۔ یہ بات بھی بالکل واضح سمجھ میں آ رہی تھی کہ ہم پر حملے کا آغاز جتنی دیر سے ہوگا، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔

☆☆☆

گورے اور کالے فوجیوں کی طرف سے ہم پر حملے کا آغاز شام سے کچھ دیر بعد ہوا۔ یہ بھرپور حملہ تھا اور ہم سب اس حملے کے لیے پوری طرح تیار بھی تھے۔ عمران نے مجھے پابند کر دیا تھا کہ میں قلعے میں رہوں اور یہاں کے معاملات کو کنٹرول کروں۔ خود وہ حسنات، چوہان اور مبارک علی کے ساتھ لڑائی کی جگہ پر تھا۔ قاسمیہ پر دو طرف سے حملہ کیا گیا تھا۔ لڑائی کی شدت سے در و دیوار لرزنے لگے اور قاسمیہ کے مختلف حصوں میں آگ بھڑکتی دکھائی دی۔

انور خاں کی حالت اب بہتر تھی۔ ہم دونوں قلعے کی بالائی منزل پر موجود تھے۔ انور خاں بستر پر نیم دراز تھا اور گاہے بگاہے مجھ سے بات بھی کر رہا تھا۔ انور خاں نے عمران کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔ خاص طور سے ایسے سنگین حالات میں عمران کا ٹھہراؤ اور اس کا مطمئن انداز انور خاں کو بہت پسند آیا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تابش! تم نے پہلے بھی اپنے اس دوست کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیا یہ بھی پاکستان سے تمہارے ساتھ آیا تھا؟''

''نہیں انور بھائی! یہ مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ میرا ایک دوسرا دوست اقبال بھی اس کے ساتھ ہے۔''

انور خاں نے کہا۔ ''مجھے اس شخص کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آتی ہے جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی بجھتی نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ مردِ میدان ہے۔ نہ صرف خود لڑ سکتا ہے بلکہ ساتھیوں کو بھی لڑا سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انور بھائی! سچ پوچھو تو میں نے یہاں ابھی تک جو فیصلے کیے ہیں، وہ اسی کے مشورے سے ہوئے ہیں۔ ظاہری طور پر میں کمان دار کا کردار ادا کر رہا ہوں لیکن اصل میں سب کچھ عمران ہی کر رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔''

انور خاں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ کراہتے ہوئے ذرا پہلو بدلا اور بولا۔ ''خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے تابش! تم نے یہاں زرگاں میں جو کچھ کیا ہے وہ مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ تم نے ایک دوبدو مقابلے میں اس شخص کو مات اور موت دی ہے جو خود کو ناقابلِ شکست سمجھتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے ایک بہت بڑا بت توڑا ہے۔ اس بت کے ٹوٹنے سے ہی لوگ زندہ ہوئے ہیں اور اپنا آپ منوانے کے لیے گلی کوچوں میں آئے ہیں۔۔۔۔''

ہم باتیں کر رہے تھے اور فائرنگ کی آوازیں بتدریج پھیلتی اور بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ قیامت کا شور تھا جس میں گاہے بگاہے لرزہ خیز بارودی دھماکے بھی سنائی دیتے تھے۔

قلعے کے طول و عرض میں پُرجوش مسلمان نوجوانوں کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔۔۔ ''شہادت یا موت۔''

انور خاں نے کہا۔ ''انسان حوصلہ نہ ہارے تو کچھ نہیں ہارتا۔'' پھر وہ تکیے سے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ اینڈرسن اور حکم کے دستے آگے بڑھ رہے ہیں۔ شاید وہ قاسمیہ کے درمیان تک پہنچ چکے ہیں۔''

انور بولا۔ ''یہ بات تو طے ہے کہ ہمیں پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ ہمارا آخری مورچا یہ قلعہ ہی ہوگا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم کتنی دیر تک اپنے حریفوں کو قاسمیہ کے گلی کوچوں میں روک سکتے ہیں۔ اس بارے میں تمہارا اندازہ کیا ہے؟''

میں نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر بغور اردگرد کا جائزہ لیا۔ مجھے صورتِ حال زیادہ حوصلہ افزا نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے عام شہری اور نیم فوجی دستے ایک باقاعدہ فوج کا مقابلہ زیادہ دیر نہیں کر سکتے تھے۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اب لڑائی قاسمیہ کے عین وسط میں ہو رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ''انور بھائی! لگتا ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہمیں قلعے میں محصور ہونا پڑے گا۔''

''جو خندق تم کھدوا رہے ہو، اس کی پوزیشن کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ جگہ مجھے یہاں سے نظر نہیں آ رہی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ مکمل ہو چکی ہے۔''

''یہ اللہ کا خاص کرم ہوا ہے۔'' انور خاں بولا۔ ''لیکن۔۔۔ وہ عورت کون تھی جس نے تمہیں فصیل کے کمزور حصے کے بارے میں بتایا؟''

''سچی بات یہ ہے انور بھائی کہ اس میں بھی مجھ سے زیادہ عمران کا کردار ہے۔ وہ عورت عمران کی کوئی جاننے والی تھی۔ اسی نے عمران کو یہ اطلاع دی تھی۔''

''شاباش! اگر ہم یہ لڑائی جیتنے میں کامیاب ہو گئے تو اس میں اس ''اطلاع'' کا بھی بہت بڑا حصہ ہوگا۔''

زخمی انور خاں نے جو اگلا سوال مجھ سے کیا، اس نے ایک بار پھر مجھے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیا۔ اس نے پوچھا۔ ''شاباش! تمہارا بچہ ماں کے بغیر بے حال ہے۔ سلطانہ اب کہاں ہے؟''

میں ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایک ٹیس سینے سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔

میں نے کہا۔ ''انور بھائی! سلطانہ اب وہاں ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ شاید تمہیں پتا نہیں چل سکا۔ وہ زرگاں کے قبرستان میں سو رہی ہے۔''

انور خاں کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے بھی سلطانہ کے آخری لمحات کا منظر گھومنے لگا۔ اس کا سر میری گود میں تھا۔ رخساروں کے انار، آنکھوں کی روشنی کی طرح بجھتے چلے جا رہے تھے۔۔۔ اس نے خاموشی کی زبان میں کہا تھا۔۔۔ خدا حافظ میرے شریکِ حیات۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔ میں موتیے اور گیندے کے پھولوں میں آپ کو ملوں گی۔۔۔ اور چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں اور صبح دم چلنے والی ہواؤں میں۔ اور مہرو جی! جب کسی تپتی دوپہر میں برسات کے بادل چھائیں گے تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گی اور۔۔۔۔۔۔

انور خاں کی بھرائی ہوئی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''یہ کب ہوا تابش۔۔۔ اور کیسے؟''

میں نے مختصر الفاظ میں انور خاں کو وہ ساری دل فگار روداد سنا دی۔ سلطانہ اور آفتاب خاں کا گھیرے میں آنا۔ ہاشم رازی عرف ہاشو کی ہٹ دھرمی۔ رنجیت پانڈے کی عیاری۔۔۔ اور پھر ماریا کے ساتھ ساتھ سلطانہ کی موت۔۔۔ میں نے سب کچھ انور کے گوش گزار کیا۔۔۔۔۔

ہمارے ٹھکانے یعنی پرانے قلعے کے گرد لڑائی کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ قاسمیہ کے گلی کوچوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہتھیار استعمال ہو رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ حکم اور اینڈرسن کے سپاہیوں کے پاس ایل ایم جی۔۔۔ اور ایم جی تھری ٹائپ کی گنز بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دستی بموں اور راکٹ لانچرز کے دھماکے بھی تواتر سے سنائی دے رہے تھے۔ مرکزی حصے میں جگہ جگہ آگ بھڑکی ہوئی تھی۔۔۔ زخمی تیزی سے قلعے میں آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان زخمیوں کی جگہ لینے کے لیے تازہ دم جوانوں کو باہر بھیجنا ضروری ہے۔ میں انور خاں سے اجازت لے کر نیچے چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بے شمار مسلح افراد میرے گرد جمع ہو گئے۔ ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔۔۔ میں نے ایک کمان دار سے کہا کہ وہ فوری طور پر سو ڈیڑھ سو افراد کا دستہ تیار کرے اور دفاع کرنے والوں کو کمک مہیا کرے۔

میرے کہنے کی دیر تھی کہ اس ہدایت پر عمل ہو گیا۔ دو منٹ کے اندر ایک لہریئے دار جھنڈے کے نیچے ڈیڑھ دو سو جنگجو جمع ہو گئے اور پھر اپنے کمان دار کے عقب میں گھوڑے دوڑاتے قلعے سے باہر نکل گئے۔ جوں جوں لڑائی کی شدت بڑھ رہی تھی، عمران اور چوہان وغیرہ کی سلامتی کے حوالے سے میرے خدشے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔ یہی وقت تھا

جب قلعے سے صرف نصف فرلانگ کی دوری پر کئی زوردار دھماکے ہوئے۔ بھڑکنے والے شعلوں کا نارنجی عکس اب قلعے کے اندر تک پہنچ رہا تھا۔ چند گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے اندر داخل ہوئے۔ ان میں مبارک علی بھی شامل تھا۔ اس کا کندھا زخمی تھا اور خون اس کے سفید لباس کو تربتر کر رہا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ ادب سے سلام کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”جناب! لڑائی قلعے کے سامنے ہو رہی ہے۔ حسنات بھائی اور ان کے قریباً ایک ہزار جاں نثاروں نے کہا ہے کہ وہ آخر دم تک لڑیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ باقی سب لوگ اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر قلعے میں گھس جائیں اور دروازے بند کر لیں۔ انہوں نے اس بارے میں آپ سے اجازت مانگی ہے.....“

”عمران صاحب کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی اگلی صفوں میں ہیں۔ انہوں نے بھی یہی بات کہی ہے۔“ پھر مبارک علی نے اپنی خون آلود قمیص میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر بولا۔ ”عمران صاحب نے یہ رقعہ بھی بھیجا ہے آپ کے لیے۔“

میں نے جلدی سے رقعہ کھولا، اس پر بس ایک ہی جملہ لکھا تھا۔ ”میری رائے ہے کہ باہر لڑنے والوں کو اب اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔“

میں نے مبارک علی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم لوگ موقع پر موجود ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اب واپس آ جانا چاہیے اور دروازے بند کر لینے چاہئیں تو ایسا کر لو۔“

مبارک علی تعظیمی انداز میں سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ اس کے چاروں پانچوں ساتھی بھی واپس چلے گئے۔ میں بالائی منزل پر انور خاں کے پاس پہنچا تو وہ شدید زخمی ہونے کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور مختلف دستہ سالاروں کو پوزیشن سنبھالنے کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا۔

.... ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑائی قلعے کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ پھر قلعے کے دو بڑے دروازے کھول دیے گئے اور مزاحمت کرنے والے مسلح شہری اور جنگجو تیزی سے قلعے میں داخل ہونے لگے۔ ان میں لڑکے، کم عمر نوجوان یہاں تک کہ عورتیں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے لڑائی کی تربیت حاصل نہیں کر رکھی تھی، صرف اپنے جذبے اور حوصلے کی مدد سے انہوں نے کئی گھنٹوں تک حکم کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ کیا تھا۔

پروگرام کے مطابق حسنات احمد اور اس کے جاں نثار ساتھیوں نے حملہ آور دستوں کو آخر وقت تک روکے رکھا یہاں تک کہ قلعے کے دروازے بند کر دیے گئے۔

میں قلعے کی بالائی منزل سے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے ایسے مناظر کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا یا فلموں میں دیکھا تھا۔ آج یہ سب کچھ جیتی جاگتی حالت میں نگاہوں کے سامنے تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑیں، زخمیوں کی پکاریں، جگہ جگہ پڑی ہوئی لاشیں، بارود کی بو، دھواں اور شعلے۔ شاید میں ڈیڑھ سو سال پہلے کی دلی میں تھا۔ انگریزوں اور سکھوں نے لال قلعے کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ تاجدار ہندوستان پر آخری ضرب لگانے کے لیے اور ہمیشہ سے تاراج ہونے والی دلی کو پھر سے تاراج کرنے کے لیے وہ اپنی توپوں کو لوڈ کر رہے تھے اور اپنی سنگینوں کو چمکار رہے تھے۔ لیکن یہ دلی نہیں تھا، یہ ہانڈیل اسٹیٹ تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ مگر کیا تاریخ نے آخر تک خود کو دہرانا تھا؟

قلعے کے اندر واپس آنے والوں میں مجھے عمران نظر نہیں آیا۔ میری نگاہیں بے قراری سے اسے تلاش کرنے لگیں۔ آخر اس کی جھلک دکھائی دی اور میرے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ اور چوہان صحیح سلامت تھے۔ ایک گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ہونٹوں میں بڑے اسٹائل سے سگریٹ دبا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس نہایت سنگین صورت حال کو بھی انجوائے کر رہا ہے۔ عمران اور چوہان سیدھے میرے پاس آئے۔ دونوں کے چہرے دھوئیں اور گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ قلعے کے دروازے بند ہو جانے کے بعد لڑائی کچھ دیر کے لیے تھم گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ قلعے پر فیصلہ کن حملہ کرنے سے پہلے کمانڈر اینڈرسن صف بندی کر رہا ہے۔

اسی دوران میں، میں نے حسنات احمد کو بھی دیکھ لیا۔ وہ بھی اپنے بیشتر ساتھیوں کے ساتھ بالکل آخری وقت میں قلعے کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوا تھا۔ یہ حوصلہ افزا بات تھی۔... عمران نے سگریٹ کا دھواں میری طرف چھوڑتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”ٹھیک ٹھیک بتانا.... میں اس وقت فرسٹ بلڈ کے ہیرو جان ریمبو کی طرح نہیں لگ رہا؟“

”لگ رہے ہو۔ لیکن فرسٹ بلڈ میں جان ریمبو زندہ بچ گیا تھا۔ یہاں ایسا سین نظر نہیں آ رہا۔“

”جگر! تمہاری سوچ ہمیشہ منفی ہوتی ہے۔ ہم یہ لڑائی جیتیں گے اور زندہ بھی رہیں گے.... نہ صرف زندہ رہیں گے بلکہ لاہور بھی پہنچیں گے.... نہ صرف لاہور پہنچیں گے بلکہ ہفتے کی کسی خوب صورت شام کو پی سی میں بوفے ڈنر بھی کریں

گے۔۔۔ اور نہ صرف ڈنر کریں گے بلکہ واپسی پر میں تمہیں رکشے میں بھی بٹھاؤں گا۔۔۔۔“

”کیا مطلب؟“

”بھئی واپسی پر تم میرے ساتھ موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکو گے نا۔ میرے ساتھ تو ریما جی ہوں گی۔ ہم نہر کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں دور تک جائیں گے۔۔۔ اوہو ہو۔۔۔ جب ریما جی میرے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوں، موٹر سائیکل اڑی جارہی ہو اور راستے میں اسپیڈ بریکر آجائے۔۔۔ تو تمہاری قسم مزہ ہی آجاتا ہے۔ ایک بار تو شونگ پہ۔۔۔۔“

یکایک رائفل کا ایک برسٹ آیا۔ کھڑکی کے تختوں میں چھید ہو گئے اور ہماری عقبی دیوار سے بہت سا پرانا پلاسترا کھڑ کر فرش پر آگرا۔

میں اور عمران بے ساختہ نیچے جھک گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر حسنات اور چوہان بھی موجود تھے۔ بہرحال، کوئی نقصان نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ”تم جب بھی جھوٹ بولتے ہو اس طرح کا کوئی واقعہ ہو جاتا ہے۔“

”میں نے تو ابھی کچھ کہا ہی نہیں تھا۔“

”لیکن کہنے تو لگے تھے۔“

”مجھے لگتا ہے اینڈرسن کے فوجیوں میں ضرور کوئی ریما جی کا عاشق موجود ہے۔“ اس نے ہولے سے کہا اور اپنی گر جانے والی پی کیپ اٹھا کر پھر سر پر رکھ لی۔

لڑائی کی شدت میں واقع ہونے والی کمی صرف پانچ دس منٹ تک رہی۔ اس دوران میں ہم سب نے اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اچانک ہی اینڈرسن کی زیرِ کمان باقاعدہ فوج نے قلعے پر زبردست ہلا بول دیا۔ اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ جدید ہتھیاروں سے لیس یہ دستے زبردست تربیت یافتہ تھے۔ وہ طوفان کی طرح قلعے کی طرف بڑھے۔ فصیل کے اوپر سے مسلمان سپاہیوں اور مسلح نوجوانوں نے ان پر زبردست فائرنگ اور خشت باری کی۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ وہی ہوا جس کی توقع تھی اور جس کے بارے میں گیتا لکھی نے پیش گوئی کی تھی۔ اینڈرسن نے فصیل کے اسی کمزور حصے کو نشانہ بنایا جس کے سامنے ہم قوس نما خندق کھدوا چکے تھے۔ خندق سے نکلنے والی مٹی کنارے کے ساتھ ساتھ جما دی گئی تھی اور اس مٹی نے خندق کو اور بھی ناقابلِ عبور بنا دیا تھا۔

راکٹ لانچروں کے پے در پے دھماکے ہوئے۔ یہ بڑے سائز کے ڈیڑھ دو درجن راکٹ فصیل کے اسی کمزور حصے پر داغے گئے جو اینڈرسن اور اس کے ساتھیوں کے لیے ترپ کے پتے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس جگہ سے فصیل میں بڑے بڑے شگاف ہو گئے اور وہ مسمار ہو گئی۔ ہر طرف دھواں اور بارود کی تیز بو پھیل گئی۔ مسمار ہونے والی فصیل کے عین سامنے قلعے کے احاطے میں ہم نے ایک مضبوط مورچا بنا رکھا تھا۔ انور خاں کے دو درجن بہترین ”لڑاکے“ اس مورچے میں میرے اور عمران کے ساتھ موجود تھے۔ جب وہی کچھ ہو جو بندے نے سوچ رکھا ہو تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں بھی جو کچھ ہوا تھا، ہماری توقع کے عین مطابق ہوا تھا۔ جونہی فصیل کا کمزور حصہ مسمار ہوا، اینڈرسن کے گورے اور کالے فوجی سیلابی ریلے کی طرح اندر گھسے۔۔۔ تب انہیں علم ہوا کہ ان کے لیے راستہ صاف نہیں ہے۔ ان کے سامنے گہری خندق کی صورت میں ایک زبردست رکاوٹ موجود ہے۔ وہ رک گئے۔۔۔ ان کے رکنے، پلٹنے اور پوزیشنیں سنبھالنے میں جو دو تین منٹ کا وقت لگا، اس نے ان پر قیامت ڈھا دی۔ ہمارے مورچے سے ان پر گولیوں کی بارش کر دی گئی۔ یہ لرزہ خیز منظر تھا۔ اس وقت کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔ ٹریگر دبا کر کسی زندہ شخص پر گولی چلانا اور پھر اسے گھائل ہو کر گرتے ہوئے دیکھنا۔۔۔ اور پھر دوسرے کو نشانہ بنانا۔ ان کی بے بسی، ان کی ناکام جدوجہد اور ان کی تڑپ پھڑک کو دیکھنا، یہ سب کچھ اور ہی طرح کا عمل تھا۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کی آخری کربناک آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔۔۔۔

تین چار منٹ کے اندر فصیل کو گرانے والے اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت چکے تھے۔ وہاں درجنوں لاشیں گری ہوئی تھیں۔ کچھ ہلاک شدگان خندق کے اندر بھی گر گئے تھے۔ اس فوری صدمے سے سنبھلنے کے بعد اینڈرسن کے گورے اور مقامی فوجیوں نے پیچھے ہٹ کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں اور فائرنگ میں مصروف ہو گئے۔ ایک لحاظ سے ہم قلعے پر اینڈرسن اور حکم کا پہلا بڑا حملہ روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لڑائی کی شدت میں بتدریج کمی آتی چلی گئی۔ ظاہر تھا کہ اب اینڈرسن اور اس کے اہم کمان دار ساتھی سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور کوشش کریں گے کہ یہ رات گزرنے سے پہلے پہلے کسی اور طرف سے زوردار حملہ کیا جائے۔ قلعے کی بالائی منزل سے ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ گھیرا ڈالنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے پورے قلعے کو گھیرا ہوا تھا۔ اردگرد کی سیکڑوں عمارتوں کی چھتوں پر بھی یہ لوگ موجود

تھے۔ ان کی کثیر تعداد کا اندازہ ان کی حرکت کرتی ہوئی مشعلوں اور ٹارچوں وغیرہ سے بھی ہوتا تھا۔ ان کا زیادہ اجتماع قلعے کے مرکزی دروازے کی طرف دکھائی دیتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اگر وہ سیلابی ریلے کی طرح دروازے کی طرف بڑھے اور انہوں نے دروازہ توڑنا چاہا تو تادیر انہیں روکا نہیں جا سکے گا۔

میں نے عمران سے کہا۔ ”یار! اگر اب بھی تل پانی سے کوئی مدد نہ آئی تو پھر کب آئے گی؟“

”ہاں، اب تو انہیں آجانا چاہیے۔۔۔۔“ عمران کے بجائے چوہان نے جواب دیا۔

یہ بڑے قیمتی لمحے تھے اور ان کی قدر و قیمت ہم سب کو معلوم تھی۔ اسی دوران میں حسنات احمد کا ایک ساتھی بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس نے حسنات احمد کے کان میں کچھ کہا۔ حسنات کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ وہ کچھ دیر جھجکتا رہا پھر میرے قریب آکر بولا۔ ”جناب! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔“

میں اور عمران، حسنات کے ساتھ سیڑھیاں اترے۔ حسنات کے دو تین ساتھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ بھی کچھ سراسیمہ نظر آتے تھے۔ ہم قلعے کے برآمدے سے گزرے اور پھر ایک چھوٹے سے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہ تہ خانہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شہتیر، بالے، لکڑی کے قدیم تختے، نہ جانے کیا کچھ یہاں بھرا ہوا تھا اور ان سب چیزوں کے بیچ ٹوٹے پھوٹے فرش پر گیتا لکھی کی خون آلود لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے پر بائیں طرف کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا تھا۔ گیتا لکھی کے مرمریں گالوں پر انگلیوں کے گہرے نشانوں سے واضح ہوتا تھا کہ اس کا منہ کافی دیر تک دبا کر رکھا گیا ہے۔ گیتا نیم عریاں پڑی تھی۔ اس کے جسم پر سگریٹ سے داغنے کے کئی نشان بھی تھے۔

ہم حیرت اور صدمے سے گنگ کھڑے رہ گئے۔ حسنات کے ساتھی نے آگے بڑھ کر ایک گرم چادر گیتا کے خونچکاں جسم پر پھیلا دی۔

حسنات بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ گیتا لکھی ہے۔ یہ راج بھون کی خاص ملازماؤں میں سے ہے۔ یہ راج بھون میں ناچنے والی لڑکیوں کو ٹریننگ دیتی تھی۔ اس کے سمبندھ بڑے بڑے لوگوں سے تھے۔ اوہ خدایا! یقین نہیں آرہا کہ یہ یہاں مری پڑی ہے۔“

عمران نے تاسف انگیز انداز میں کہا۔ ”اس پر دست درازی کی گئی ہے اور مارا پیٹا بھی گیا ہے۔۔۔۔“

عمران بغور موقع واردات کو دیکھنے لگا۔ حسنات کے ساتھی نے ایک گیس لیمپ اونچا پکڑ لیا۔ فرش پر قدموں کے نشان تھے۔ اس کے علاوہ گیتا لکھی کو گھسیٹے جانے اور مارنے پیٹنے کے شواہد بھی ملتے تھے۔ ایک نم کپڑا بھی ملا۔ اندازہ ہوا کہ یہ کپڑا گیتا لکھی کے منہ میں ٹھونسا گیا تھا یا ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تھی۔ گیتا کی ایک ہاتھ کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا۔

عمران نے غور سے انگلیوں کا معائنہ کیا۔

”لاش سب سے پہلے کس نے دیکھی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے جناب!“ حسنات کا ایک ساتھی بولا۔ ”ہمیں مشعلوں کے لیے لکڑیوں کی جرورت تھی۔ ہم یہاں آئے تو دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ ہم نے درواجا کھولا تو خون کی لکیر نجر آئی۔ جرا آگے بڑھے تو یہ لاش تھی۔“

”تمہیں پتا چل گیا کہ یہ کس کی لاش ہے؟“

”ج۔۔۔ جی ہاں۔“ دوسرا شخص بولا۔ ”یہ بڑی مشہور عورت ہیں جی۔ ہم نے ان کی بہت سی تصویریں بھی دیکھی ہوئی ہیں۔“

”تم لوگ کسی پر شک کر سکتے ہو؟“

”ناہیں جی۔ ہمیں کچھ اندازا ناہیں۔ ہم تو اس بات پر حیران ہو رہے ہیں کہ یہ لال بھون کے ناچ گھر سے یہاں اس قلعے میں کیسے پہنچی ہیں؟“

عمران کا چہرہ تو سپاٹ تھا لیکن اس کے اندر کا گہرا دکھ میں نے محسوس کیا۔ یہ جواں سال عورت جس کا نام گیتا لکھی تھا، اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اب تک ہمارے لیے سودمند ہی ثابت ہوئی تھی۔ صرف ایک رات پہلے تک یہ عمران کے ساتھ ایک تنہا کمرے میں موجود تھی اور اپنی معلومات کے عوض اس کے پیار اور قربت کی طالب ہو رہی تھی۔ اب وہ اپنی تمام خواہشات سمیت مٹی کا ڈھیر ہو چکی تھی۔ اور یوں لگتا تھا کہ وہ عمران سے اپنی خفیہ ملاقات کی وجہ سے ہی موت کا شکار ہوئی ہے۔

لاش کے بارے میں حسنات کے آدمیوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد ہم اوپر واپس انور خاں کے پاس آگئے۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دو جاں نثار محافظ اس کی دونوں جانب چوکس کھڑے تھے۔

عمران کے اشارے پر میں نے ان محافظوں کو باہر

بھیج دیا۔ اب کمرے میں میرے اور عمران کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ انور خاں کو اس سارے معاملے کی خبر تھی جو یہاں ہمارے اور گیتا لکھی کے درمیان ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں ہم نے خندق کھدوانے والا نہایت مفید کام کیا تھا۔

گیتا لکھی کے اس بہیمانہ قتل کی اطلاع نے انور خاں کو بھی پریشان کردیا۔ وہ بولا۔ ”میرے اندازے کے مطابق یہ کافی پیچیدہ معاملہ ہے برادرز۔۔۔ میں نے تمہیں جیل میں بتایا تھا نا کہ جیل پر ہم نے ایک زبردست حملہ کیا تھا۔ اگر وہ حملہ ناکام ہوا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ہمارے اندر سے یہ غداری ہوئی۔ ہمارے شب خون کی اطلاع پہلے سے جیل کے گارڈز کو ہوچکی تھی۔ اب یہاں بھی کوئی ایسی ہی بات لگ رہی ہے۔ ہمارے اندر ہی کوئی ایسا بندہ موجود ہے جو ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس بندے کو گیتا لکھی اور عمران کی ملاقات کا علم ہوا ہے اور اس کا نتیجہ گیتا لکھی کی موت کی شکل میں نکلا ہے۔“

”کون ہوسکتا ہے؟“ عمران کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔

”میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ انور خاں نے کہا۔ ”جیل والے واقعے کے بعد مجھے اپنے ایک ساتھی پر شبہ تھا مگر وہ شبہ درست نہیں نکلا۔ ہاں، اس بات کا یقین مجھے اب پہلے سے زیادہ ہوگیا ہے کہ وہ بندہ ہمارے قریبی ساتھیوں میں موجود ہے۔“

میں نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑائے۔ کون ہوسکتا تھا؟ انور خاں کے ساتھ جو لوگ یہاں زرگاں پہنچے تھے، وہ تو سب بھروسے کے تھے اور انہیں ہم اچھی طرح جانتے بھی تھے۔ ان میں ڈاکٹر چوہان، عبدالرحیم اور راجے کمار بھی شامل تھے۔ اس کے بعد بھرت اور امرناتھ تھے۔ مالا تھی اور اس کا شوہر ستیش جو اب کافی حد تک بدل چکا تھا۔ مبارک علی، تخبر فیروز اور حسنات کے بارے میں بھی کسی طرح کا شبہ رکھنا غلط تھا۔ وہ انور خاں کے جاں نثار تھے اور ان کی اب تک کی کارکردگی سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل تھی۔

ہم دیر تک اس معاملے پر غور کرتے رہے، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ انور خاں کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جس شخص یا اشخاص نے جیل کا شب خون ناکام بنایا تھا، وہی اب گیتا لکھی کی دردناک موت کا بھی ذمے دار ہے۔۔۔ یا ذمے دار ہیں۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہم سب کو حد سے زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

عمران اور انور خاں نے میری بات کی تائید کی۔ میں نے حسنات اور مبارک علی کو بتایا اور ان دونوں کو اس سلسلے میں ضروری ہدایات دیں۔ انور خاں کو بولنے میں کافی دقت ہورہی تھی، اس لیے زیادہ تر ہدایات میری زبانی ہی جاری ہورہی تھیں۔ ہم نے اسلحے کے گودام کی سیکیورٹی تین گنا کردی۔ دیگر اہم مقامات پر بھی نفری میں اضافہ کردیا گیا۔

ڈاکٹر چوہان جی جان سے زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ چند اور افراد بھی اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ان میں آنجہانی ڈاکٹر لی وان کا ایک اسسٹنٹ بھی شامل تھا۔ میں چوہان کی حوصلہ افزائی کے لیے شفا خانے کی طرف گیا۔ یہ عارضی شفا خانہ ہنگامی بنیادوں پر قلعے کے شمالی حصے میں قائم کیا گیا تھا۔ یہاں دو تین جنریٹرز کا اہتمام بھی تھا۔

زخمیوں میں سے زیادہ تر کو گولیوں اور تلواروں کے زخم آئے تھے۔ ہر طرف زخمیوں کی کراہیں اور سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ان کو حتی الامکان طبی امداد دی جارہی تھی۔ ڈاکٹر چوہان ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ آخر عمران نے اسے شفا خانے کے اسپیشل وارڈ میں دیکھ لیا۔ یہاں زیادہ نازک حالت والے زخمی تھے۔ ان میں سے کچھ کو جلنے سے زخم آئے تھے۔ ایک زخمی کے پیٹ میں راکٹ کے پرخچے لگے تھے۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایک شخص کا بازو بارودی دھماکے میں جھلس گیا تھا۔ چوہان ایک نرس کی مدد سے اس کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے ہولے سے اس کا کندھا تھپکا۔ وہ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے تھکن ٹپکی پڑ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بس ایک چھوٹے سے وقفے کے سوا پچھلے چوبیس گھنٹے سے کام کررہا ہے۔ اسے آرام اور اچھے کھانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ اپنا خیال نہیں رکھے گا تو پھر خود بھی مریضوں میں شامل ہوجائے گا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، دو تین گھنٹے بعد وہ کچھ دیر کے لیے اوپر جاکر آرام کرلے گا۔

بھرت بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ مسلمانوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اونچی ذات کا ہندو ہے۔ وہ ایک مریض کے پاؤں سے بہنے والا خون اپنے ہاتھ سے صاف کررہا تھا۔ بھرت کی شخصیت اسے ایک مختلف فرد بناتی تھی۔ وہ ایک ناکردہ گناہ کی سزا میں گوروں کے جبر کا شکار ہوا تھا اور پھر یہاں پہنچا تھا۔ وہ اپنا نہیں تھا لیکن بیگانہ بھی نہیں تھا۔

میں اپنے سامنے لیٹے ایک تنومند زخمی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سینہ اور چہرہ بھی جھلسا ہوا نظر آتا تھا۔ پورے چہرے پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس نے سینے تک ایک سفید چادر کھینچی

ہوئی تھی۔ اس نے چادر ہٹائی تو نیچے خطرناک سیون ایم ایم رائفل نظر آئی۔ بڑی پھرتی سے اس نے رائفل میری اور عمران کی طرف سیدھی کی اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”خبردار۔۔۔ چھلنی کردوں گا۔“ وہ دہاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مہارت سے گولی چلائی۔ ایک گارڈ جو رائفل سیدھی کرنی چاہ رہا تھا، الٹ کر دروازے کے پاس گرا۔ گولی عین اس کے دل کے مقام پر لگی تھی۔

”خبردار۔۔۔ اڑا دوں گا۔ اڑا دوں گا۔ ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ رائفل بردار پھر بولا۔ اس کی صورت نظر نہیں آرہی تھی مگر اس کی آواز نے بتادیا کہ وہ رنجیت پانڈے ہے۔

بھانڈیل اسٹیٹ کا عیارترین اور خطرناک قاتل۔ اس کا سارا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور یہ پٹیاں یقیناً صرف چہرہ چھپانے کے لیے ہی لپیٹی گئی تھیں۔

میں نے اور عمران نے ہاتھ کھڑے کردیے۔ چوہان چونکہ رنجیت کے بستر سے قریب تھا، اس نے بلا کی تیزی سے رنجیت پانڈے کی رائفل پر جھپٹا مارا۔ مگر یہ جعلی مریض، اصلی ڈاکٹر کو مات دے گیا۔ اس سے پہلے کہ چوہان اپنا ہاتھ پانڈے کی رائفل تک پہنچاتا، سیون ایم ایم کی گولی اس کی پیشانی توڑ کر اندر گھس گئی۔ رائفل پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔

اس سے بہت پہلے کہ چوہان کا جسم فرش سے ٹکراتا، پانڈے کی رائفل پھر ہماری طرف سیدھی ہوچکی تھی۔ وہ ذرا سا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میری سکتہ زدہ نظریں چوہان پر جمی تھیں، اس کی پیشانی سے خون کی پہلی بوندیں خارج ہورہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہوکر پانڈے پر جھپٹتا، میری گردن سے کوئی سخت چیز آلگی۔

”خبردار! گولی ماردوں گا۔“ عقب سے ایک جانی پہچانی آواز ابھری۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ عبدالرحیم کی آواز تھی۔ میں نے اور عمران نے تقریباً ایک ساتھ ہی مڑ کر دیکھا۔ عبدالرحیم ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر اجنبیت اور سفاکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں ایک اور مریض اچھل کر بستر سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی چھوٹے بیرل کی رائفل نظر آئی۔

ڈاکٹر چوہان کی اچانک موت کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ میں برداشت کھو دوں گا اور کچھ ایسا ہوجائے گا جو نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ لیکن پھر عمران کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ اور اس کے تاثرات دیکھ کر میں نے خود کو سنبھالا۔۔۔ اس پچویشن میں مزاحمت کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ سفید پٹیوں کے اندر سے پانڈے کی فقط آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔۔۔ اور یہ آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ ان کے اندر خون کی پیاس۔۔۔ جنون بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جنون، ان نازک لمحوں میں کوئی بھی قیامت برپا کرسکتا تھا۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔

ایک بار پھر رنجیت پانڈے نے بیدردی سے کئی بار رائفل کا ٹریگر دبایا۔ سائیلنسر لگی رائفل سے سات آٹھ بار ”ٹھک ٹھک“ کی آواز بلند ہوئی۔ اس اسپیشل وارڈ میں موجود پانچ چھ مریض پلک جھپکنے میں زندگی سے موت کی طرف روانہ ہوگئے۔ پانڈے نے بڑی مہارت سے ان کے سینوں یا سروں میں گولیاں ماری تھیں۔ یہ بربریت کی انتہا تھی۔ عبدالرحیم اور پانڈے کے دوسرے ساتھی کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ یہ جدید رائفلیں تھیں، ایک سیکنڈ میں گولیوں کی بوچھاڑ کرسکتی تھیں۔ ان کی موجودگی میں صبر کا دامن چھوڑنے کا مطلب، خود موت کے جبڑوں میں اپنا سر دے دینے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

یہ دردناک منظر تھا۔ وارڈ میں موجود کم و بیش چھ مریض جو پہلے ہی اپنے جان لیوا زخموں کی وجہ سے کراہ رہے تھے، تین چار سیکنڈ کے اندر خون میں نہا گئے۔ ایک درمیانی عمر کے باریش شخص نے سینے پر گولی کھانے کے باوجود اٹھنے کی کوشش کی مگر پانڈے کی اگلی گولی نے اس کی شہ رگ چیر کر رکھ دی اور وہ بستر سے گر کر ٹھنڈا ہوگیا۔

”چلو آگے لگو میرے بچو۔“ پانڈے نے مجھ سے مخاطب ہوکر جنونی لہجے میں کہا۔ اس کی انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کے درمیان جیسے ایک ٹیلی پیتھی جیسا رشتہ قائم ہوچکا تھا۔ اکثر اوقات ہم بغیر کچھ کہے سنے بھی ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے۔۔۔ شاید اکثر دوست جو پُرہنگام حالات میں زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور کٹھن واقعات کا سامنا کرتے ہیں، اسی طرح ایک دوسرے کے رمز شناس ہوجاتے ہیں۔ ہم دونوں نے پانڈے کی ہدایت پر بے چون و چرا عمل کیا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ بھرت بھی ہمارے ساتھ تھا۔

یہ لوگ ہمیں اندرونی سیڑھیوں کی طرف لے گئے۔ یہ نسبتاً تنگ اور تاریک سیڑھیاں تھیں۔ ہم قلعے کی بالائی منزل

پر پہنچے۔ جب ہم ایک غلام گردش سے گزر رہے تھے، کئی افراد نے ہمیں اس حالت میں دیکھا اور حیران ہوئے لیکن ان افراد میں سے کوئی بھی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کر سکا۔ یہ سب لوگ چونکے ضرور لیکن اس سے پہلے کہ ان کا چونکنا کسی طرح کی کارروائی کا سبب بنتا، ہم اس کمرے میں داخل ہو چکے تھے جہاں انور خاں ایک بستر پر نیم دراز تھا۔ مبارک علی بھی اس کے پاس موجود تھا اور اس کے زخمی کندھے کی پٹی بدل رہا تھا۔

اس سچویشن نے ان دونوں کو بھی بُری طرح چونکایا۔ اندر داخل ہوتے ہی پانڈے نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور کھڑکیوں کو بھی چٹخنیاں چڑھا دیں۔ کمرے میں موجود ایک گارڈ نے جاں بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہولسٹر سے پستول نکالا... مگر اس کے پستول سیدھا کرنے سے پہلے ہی ٹھک کی منحوس آواز بلند ہوئی اور یہ گارڈ ماتھے پر گولی کھا کر ایک میز پر گرا اور اسے چکنا چور کر کے فرش بوس ہو گیا۔

''میرا نشانہ چوکتا ناہیں حرامجادو۔ گولی چلا کر اڑتی مکھی کا پَر کاٹتا ہوں۔'' پانڈے زہری ناگ کی طرح پھنکارا۔ لگتا تھا کہ وہ آج سفاکی کی ہر حد سے گزرنے کو تیار ہے۔

اس نے اپنے چہرے کی طویل پٹیاں اتار کر ایک طرف پھینک دیں۔ وہ ایک تنگی ٹائپ جیکٹ اور پتلون میں ملبوس تھا۔ اس نے جیکٹ کے اندر سے لوہے کے دو کڑے نکالے۔ دیکھنے میں یہ کڑے بائیسکل کو لگائے جانے والے تالے کی طرح لگتے تھے مگر اس تالے سے کچھ بڑے تھے۔ اسٹیل کے بنے ہوئے ان کڑوں کی ایک جانب ایک ڈیجیٹل میٹر بھی بنا ہوا تھا اور ہندسے حرکت کر رہے تھے۔ پانڈے نے اپنی قاتل رائفل ہماری طرف سیدھی رکھی اور ایک کڑا اپنے تنومند ساتھی کو تھما دیا... اس نے آگے بڑھ کر اسٹیل کا یہ کڑا شدید زخمی انور خاں کی گردن میں پہنا دیا۔ ''کھٹ'' کی آواز سے کڑا لاک ہوا اور اس پر ایک سرخ بلب جل اٹھا۔ یہ سارا عمل بس چار پانچ سیکنڈ کے اندر مکمل ہو گیا۔

دروازے سے باہر ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ پھر حسنات احمد کی پریشان آواز سنائی دی۔ ''مبارک! دروازہ کھولو... کون ہے اندر؟''

جب حسنات نے یہ فقرہ دو تین بار دہرایا تو پانڈے کرخت آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بچو! دیکھتا کیا ہے۔ سسرے کھڑکی کھول... اور اس ذلیل سے بول کہ ابھی کچھ دیر چھری کے نیچے سانس لے۔ اندر انور خاں کی ماں، بہن کے ساتھ جروری کام ہو رہا ہے۔''

میں نے یہ فقرہ بمشکل برداشت کیا اور عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ فی الحال پانڈے کی ہدایت پر عمل کرنا ہی مناسب ہے۔

میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ باہر حسنات اور مبارک کے مشتعل ساتھیوں کا ہجوم نظر آیا۔ ہر ایک کا چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

''خبردار! کوئی فالتو بات کی تو تیرا گندا بھیجا دیوار سے چپکا دوں گا۔'' پانڈے پھنکارا۔

میں نے حسنات سے کہا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں دروازہ کھولتے ہیں۔''

''لیکن... آپ پر رائفلیں اٹھانے والے یہ لوگ کون ہیں؟ اور ان میں سے ایک تو شاید عبدالرحیم ہے۔''

''ہاں... وہ بھی ہے لیکن اب معاملہ طے ہو رہا ہے۔ کچھ دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے حسنات احمد کو تسلی دی۔

''ہمارے پاس زیادہ ٹائم ناہیں ہے جی۔ بڑے دروازے کے سامنے اینڈرسن کے لڑاکا دستے جمع ہو رہے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت ہلا بول سکت ہیں...'' حسنات نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم زیادہ وقت ناہیں لگائیں گے۔'' میں نے کہا اور کھڑکی بند کر دی۔

پانڈے آتشیں نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے گہرے سانولے چہرے پر جلنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ اس نے لپیا ہوتے مسلمان سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں گھسنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ اس نے ایک زخمی کی حیثیت سے اپنا منحوس تھوبڑا پٹیوں میں لپیٹ لیا تھا اور یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کی عیاری اور خطرات پسندی کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آج یہ سب کچھ درست ثابت ہوا تھا۔ ٹل پانی کے دیوان کی طرح وہ یہاں بھی بے خوف گھس آیا تھا اور اب ایک جنونی قاتل کی حیثیت سے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دائیں طرف عبدالرحیم کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اسی بدترین شخص کا چہرہ تھا جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے اندر رہا ہے اور آستین کے سانپ کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق پیچھے کی طرف پلٹتے جائیں، یہ شخص اپنی تمام تر نحوست کے ساتھ ہر کٹھن وقت میں پایا جائے گا۔ عبداللہ بن ابی سے لے کر میر جعفر اور میر صادق تک، اور پھر وہاں سے لے کر موجودہ دور کے نامی گرامی غداروں تک یہ شخص ہر جگہ کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ یہاں بھی انور خاں کے قریبی ساتھی عبدالرحیم کی صورت میں موجود تھا۔ اب اس میں شک کی گنجائش نہیں تھی کہ انور خاں کا یہی ساتھی تھا جس نے جیل پر کیے جانے والے زوردار حملے کو ناکام بنایا تھا۔ یقیناً اینڈرسن یا ملیارڈ جیسے کسی شاطر گورے نے اسے ''چمک'' دکھا کر اپنے جال میں پھنسایا تھا اور بازی پلٹی تھی۔

میں نے عبدالرحیم کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بھی پوری ڈھٹائی سے میری طرف دیکھ رہا تھا... دو دن پہلے یہ شخص میرے گلے لگ کر رویا تھا اور سلطانہ کی موت پر آنسو بہائے تھے۔ آج یہ بڑے طمطراق سے مجھ پر رائفل تانے کھڑا تھا۔ اپنے آقاؤں کے ایک اشارے پر یہ میرے جسم میں ایک درجن سوراخ کر سکتا تھا۔ اب یہ بات بھی ثابت تھی کہ گیتا کی موت کا ذمے دار بھی یہی عبدالرحیم ہے۔ جب گیتا کبھی، عمران سے ملاقات کے لیے کمرے میں داخل ہوئی تھی... یہ کمرے سے باہر پہرے والوں کے ساتھ موجود تھا۔

پانڈے نے سگریٹ سلگایا اور بڑے اطمینان سے بولا۔ ''بچو! میرا خیال ہے کام کی بات کر لیویں۔ ہمارے پاس جیادہ سمے ناہیں ہے۔ ویسے بھی تم سب کو بڑے جور کی لگ رہی ہووے گی۔ جتنی جلدی فارغ ہو جاؤ، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اسٹیل کا کڑا ہمیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسٹیل کا کڑا ہے اور مجے کی بات یہ ہے کہ اسٹیل صاحب کا ہی بنایا ہوا ہے۔ مرنے سے پہلے یہ آخری تحفہ وہ تم دونوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے پوری آشا ہے کہ جب یہ تحفہ تم دونوں کی دم میں تمد بفٹ کرے گا تو اسٹیل صاحب کی آتما کو جرور شانتی ملے گی۔''

''جو بکواس کرنی ہے صاف صاف کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

وہ بولا۔ ''یہ کڑا عجب مآب جناب خان صاحب کی گردن میں فٹ ہو چکا ہے۔ اس میں جبردست قسم کا دھماکا خیج مواد ہے۔ یہ پھٹے گا تو خان صاحب کے چیتھڑے اڑ جاویں گے۔ ان کے شریر (جسم) کے سارے ظاہری اور پوشیدہ ٹکڑے اڑ اڑ کر اس کمرے کی دیواروں سے چپکیں گے۔ یہ دیکھ لو، اس کے اوپر میٹر چل رہا ہے۔ الٹی گنتی ہو رہی ہے۔ صرف اور صرف تیس منٹ ہیں تم لوگن کے پاس... بلکہ اب تیس بھی کیا صرف ستائیس رہ گئے ہیں۔ اب تم دونوں کے ذلیل دماغوں میں جرور آئے گا کہ اپنے خان صاحب کی جان اس کڑے سے کیونکر چھڑوائی جاوے... تم سوچو گے کہ کسی طرح ہمیں ''ناک آؤٹ'' کر دو اور پھر یہ کڑا خان صاحب کی گردن شریف سے اتار پھینکو... لیکن ایک بات میں تم کو بالکل صاف صاف بتا دیوت ہوں۔ یہ کڑا کسی بھی طرح خان صاحب کی گردن سے اتارنے کی کوشش کی گئی تو یہ بلاسٹ ہو جاوے گا... اس کو کھولنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ بس ایک ہی...''

ہم خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی حرکات و سکنات اور اپنے لب و لہجے سے واقعی بے حد خطرناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہمارے چہرے دیکھے پھر اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتے ہوئے بولا۔ ''اس کی کوئی چابی وابی ناہیں ہے۔ اس کی چابی اس کا کوڈ ہے۔ بارہ ہندسوں کا کوڈ... اور وہ کوڈ صرف میں جانت ہوں۔ اور میں بہت بڑا کمینہ ہوں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ اس کی آنکھیں نشے میں سرخ تھیں... ''اور یہ کمینہ پن میں نے اپنے تک ناہیں رکھا۔ آگے بھی چلایا ہے۔ بھگوان کی کرپا سے زرگاں کے آدھے سے جیادہ کمینے بچے میرے ہی چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں بہت سے غیر قانونی سالے ہیں میرے۔ یہ عجب مآب خان صاحب بھی ان میں سے ایک ہو سکتے ہیں...'' اس کے لہجے میں زہر تھا اور آگ بھی۔

انور خاں سے یہ ریمارکس برداشت نہیں ہوئے۔ سخت زخمی ہونے کے باوجود اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ پانڈے نے بے دریغ گولی چلائی۔ ''ٹھک'' کی آواز کے ساتھ گولی انور خاں کی ناک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

''حرامجادے! اگلی گولی سے تیرا انار ریل پھوڑ دوں گا۔''

انور خاں کا چہرہ سرخ... انگارہ ہو گیا لیکن یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ ان لمحوں میں دلیری دکھانا، ہوش و حواس کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

رنجیت پانڈے کا پارا چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اس کڑے کو کھولنے کا کوڈ صرف میں جانت ہوں۔ اور وہ کہیں لکھا ہوا ناہیں ہے۔ بس یہاں ہے یہاں... میرے کھوپڑے میں۔'' اس نے انگلی سے اپنی کنپٹی کو ٹھونکا۔ ''اگر تمہارے گندے دماغوں میں مجھے مارنے کا کیڑا رینگ رہا ہے تو اس کیڑے کو کچل دو کیونکہ اگر کسی وجہ

سے میں مر گیا تو تمہارے اس خان صاحب کو دو ڈھائی ہجار ٹکڑوں میں بٹنے سے کوئی ناہیں بچا سکے گا۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی بتا دیوت ہوں پپو۔ پہلے تم دونوں کے کھوپڑوں میں گھسے ہوئے شک کا کچومر تو نکال دوں۔ مجھے پتا ہے تم دونوں کو گیر کتوں جیسے ہو... بڑی دور دور کی بو سونگھنے کی کوشش کرت ہو۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے، اس کے ثبوت کے لیے یہ دوسرا ”اسٹیل رنگ“ حاجرِ خدمت ہے۔“

اس نے وہ دوسرا کڑا ہماری آنکھوں کے سامنے لہرایا جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کڑے پر بھی بالکل دوسرے کڑے کی طرح ڈیجیٹل میٹر لگا ہوا تھا۔ اس نے اس کڑے کو لاک کیا۔ اس پر سرخ بلب روشن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میٹر پر الٹی گنتی شروع ہو گئی۔ پچیس... چوبیس... تیئیس.....

رنجیت بولا۔ ”تم دونوں کے والد سوبرگ باشی اسٹیل صاحب نے یہ بڑے کمال کی چیز بنائی ہے۔ یہ دیکھو اس ”رنگ“ پر پچیس سیکنڈ کا ٹائم فکس تھا۔ پندرہ سیکنڈ گزر چکے، دس سیکنڈ باقی ہیں۔ لو اس کی کارکردگی ملاحجہ کرو۔“ اس نے احاطے کی طرف والی کھلی کھڑکی میں سے اسٹیل رنگ باہر پھینک دیا۔ احاطے میں یقیناً یہ اسٹیل رنگ لوگوں کے درمیان ہی گرا ہوگا۔ کچھ کرنے یا کہنے سننے کا وقت ہی نہیں تھا۔ پانچ چھ سیکنڈ بعد ایک زبردست دھماکا ہوا۔ دھماکے کے ساتھ تیز چمک بھی تھی۔ بچوں اور عورتوں کے چلانے کی کربناک آوازیں بلند ہوئیں۔ احاطے کے اس حصے میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے دیکھا۔ انسانی گوشت کا ایک ٹکڑا کھڑکی کے پٹ سے آچپکا تھا۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ کپڑے کی ایک دھجی بھی تھی۔ یہ شاید کسی بچی کا پھول دار فراک تھا۔

پانڈے کے چہرے پر درندگی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ کتنا بھیانک شخص ہے۔ نل پانی میں میرے ساتھ لڑتے ہوئے وہ کسی وجہ سے پسپا تو ضرور ہوا تھا مگر پسپا ہوتے ہوتے بھی ایک خوف ناک بم بلاسٹ کر گیا تھا جس میں درجنوں افراد کی جان گئی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر بولا۔ ”میرا وچار ہے کہ اب تمہیں وشواس ہو گیا ہوگا کہ یہ کوئی ناٹک نہیں ہے۔ خان صاحب کی گردن شریف میں جو پٹا ڈالا گیا ہے، وہ جرور ان کے جسم کے پوشیدہ ٹکڑوں کو اس کمرے کی دیواروں اور چھت سے چپکائے گا۔“ پھر اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”اور اب ہمارے پاس بچا ہے فقط بیس منٹ کا سمے۔ ان بیس منٹوں کے اندر اندر تمہیں اس قلعے کا بڑا دروا جا کھلوانا ہے اور اس سارے معاملے کو بغیر لڑائی مار کٹائی اور جیادہ خون خرابے کے حل کرنا ہے۔ اور میں جانت ہوں کہ یہ کام عجت مآب جناب خان صاحب کر سکت ہیں یا تم کر سکت ہو۔“ اس نے اپنی بھدی کالی انگلی میری طرف سیدھی کی۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی کی رگ ابھری ہوئی تھی۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔

”تم چاہتے ہو ہم اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لیں؟“ عمران نے کہا۔

”یہ گلا کاٹنا ناہیں ہووے گا۔ یہ جندہ رہنے کا اور امن شانتی کا معاہدہ ہووے گا۔ اینڈرسن صاحب بہادر کی طرف سے یہ وچن ہے کہ دروا جا کھول دیا جاوے تو کسی عورت، مرد، بچے سے کوئی جیادتی ناہیں ہووے گی۔ عام معافی کا اعلان کیا جاوے گا۔“

انور خاں پھنکارا۔ ”تم جیسے دغاباز اور اینڈرسن جیسے عیار لومڑ کی باتوں پر یقین کرنے والا کوئی دیوانہ ہی ہوگا۔ اینڈرسن اپنی گندی زبان سے پہلے بھی ایسے بہت سے وعدے کرتا رہا ہے... اور یہی کام جارج گورا کا ہوا کرتا تھا.....“

”دیکھو خان صاحب! یہاں لمبا بھاشن ناہیں چلے گا۔ سمے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں تم کو صاف صاف بتا دیوت ہوں۔ ہمارے فوجی دستوں نے اندر تو آنا ہی آنا ہے۔ یہ دروا جا کھلے گا ناہیں تو پھر ٹوٹ جاوے گا۔ اور اگر یہ ٹوٹے گا تو پھر بہت برا ہووے گا۔ یہاں کیچڑ ہو جاوے گا تم لوگن کے خون سے۔ اور اس کیچڑ پر تمہاری روتی چلاتی عورتوں سے برا بھلا بھی کریں گے ہمارے سینک۔ خود پر اور اپنے بال بچوں پر کرپا فرماؤ۔ دروا جا کھلوا دو۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔ کسی صورت نہیں۔“ انور خاں کراہتے ہوئے بولا۔ ”یہ بم پھٹتا ہے تو پھٹنے دو۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔“

پانڈے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم کیا کہتے ہو پپو؟ تمہیں بھی جناب خان صاحب کے جیون کی کوئی پروا نہیں؟ یہ محترم خان صاحب ہی ہیں جن کی لعنتی شخصیت کی وجہ سے زرگاں کے یہ مسلے یک جان ہیں، ورنہ یہ گندی نالے کے کیڑے ایک جگہ جمع ہونے کے بجائے زرگاں کی ایک سو دس نالیوں میں علیحدہ علیحدہ بہہ رہے ہوتے۔“

انور خان کی گردن میں ”اسٹیل رنگ“ تھا اور اس ”رنگ“ کا ڈیجیٹل میٹر بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ یہ وحشت ناک صورتِ حال تھی۔ مجھے لگا کہ میری پیشانی پر پسینا چمکنے لگا ہے۔ پانڈے نے دونوں راستے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیے تھے۔ ہمیں قلعے کا بڑا دروازہ کھلوانا تھا یا پھر اپنی اور انور خاں کی موت کو قبول کرنا تھا۔ ہمارے یعنی میرے، عمران اور بھرت وغیرہ کے لیے تو پھر بھی چانس موجود تھا۔ ہم پانڈے اور اس کے دونوں ساتھیوں پر غلبہ پانے کی کوشش کر سکتے تھے مگر انور خاں کی زندگی تو سو فیصد نشانے پر تھی۔ ہم کسی طرح پانڈے، عبدالرحیم اور تیسرے شخص کو بے بس کر بھی لیتے تو انور خاں کا کیا کرتے... پانڈے بتا چکا تھا کہ اس بلاسٹ ڈیوائس کی الٹی گنتی کو بس کوڈ لگا کر ہی بند کیا جا سکتا ہے اور کوڈ بس پانڈے کو معلوم تھا۔ ہم پانڈے کو جان سے مار کر بھی انور خاں کو نہیں بچا سکتے تھے۔

”اب صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔“ پانڈے نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”چابیاں نکالو اور دروا جا کھلواؤ۔ ورنہ کچھ باقی ناہیں بچے گا اور خان صاحب کی موت کی تو پوری گارنٹی ہے۔“

عبدالرحیم رائفل تھامے، کمرے کے کونے میں بالکل چوکس کھڑا تھا۔ وہ بکا ہوا شخص تھا اور اس کی آنکھوں میں بے غیرتی ناچ رہی تھی۔ وہ ایک عام سا شخص تھا لیکن اپنے ہم وطنوں سے بے وفائی کا تمغہ سینے پر سجا کر وہ عام نہیں رہا تھا۔ گھر کا بھیدی ہونے کی حیثیت سے وہ انور خاں کو اور ہم سب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا چکا تھا۔

کمرے سے باہر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اندر کی صورتِ حال جاننے کے لیے بے قرار تھے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ کچھ دیر پہلے کمرے کی کھڑکی سے احاطے میں کوئی مہلک چیز پھینکی گئی ہے جس سے زبردست بلاسٹ ہوا ہے اور لوگوں کی جانیں گئی ہیں۔ یقیناً ہماری سلامتی کے حوالے سے بھی باہر کے لوگوں کے خدشات بڑھتے جا رہے تھے۔

ہمارے اور پانڈے کے درمیان اعصاب شکن مکالمہ ہوا۔ انور خاں کے گلے میں آویزاں ”اسٹیل رنگ“ کو ”ڈی ایکٹی ویٹ“ کرنے کے لیے پانڈے کی بس ایک ہی شرط تھی۔ قلعے کا دروازہ کھلوا دیا جائے اور اینڈرسن کے دستوں کو پُرامن طریقے سے اندر آنے کی اجازت دی جائے... یہ شرط ہمارے لیے اور خاص طور سے انور خاں کے لیے کسی صورت قابلِ قبول نہیں تھی۔ وہ ایک حوصلہ مند حریت پسند تھا۔ زرگاں میں اس کی جدوجہد کی داستان طویل تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی درجنوں بار اپنی جان ہتھیلی پر رکھ چکا تھا۔ اس نے آج بھی جان ہتھیلی پر رکھ دی تھی... اور ڈیجیٹل میٹر تیزی سے پیچھے کو جا رہا تھا۔ اب صرف آٹھ منٹ کا وقت باقی تھا۔ پانڈے پھنکارا۔ ”صرف آٹھ منٹ... اس کے بعد خاں صاحب کی رخصتی تو یقینی ہے... پھر تم تینوں کو بھی باری باری جانا پڑے گا۔“

”لیکن تم.....“

”لیکن... کچھ ناہیں۔“ پانڈے نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ”اب ساڑھے سات منٹ ہیں۔ اس میں تم بڑی مشکل سے دروا جے تک پہنچ سکو گے اور اسے کھلوا سکو گے... جونہی دروا جا کھلے گا، میں کوڈ لگا کر گنتی اسٹاپ کر دوں گا۔ جلدی کرو۔ اب اٹھ جاؤ۔“

وہ خبیث اپنے موقف سے ایک ملی میٹر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا اور وقت واقعی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ بھی صورتِ حال کے بے پناہ دباؤ کو محسوس کر رہا تھا۔ اب یہ بات یقینی ہو چکی تھی کہ اگر ہم دروازہ نہیں کھلوائیں گے تو کم از کم انور خاں تو فوری طور پر موت کے منہ میں چلا جائے گا۔

”ٹھیک ہے۔“ عمران نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”پانڈے! تم تھوڑی دیر کے لیے اسے اسٹاپ کر دو تاکہ ہمیں دروازے تک پہنچنے اور اسے کھلوانے کے لیے مناسب وقت مل سکے۔“

”یہی تو پرابلم ہے پپو کے یار! اس ڈیوائس کو بس ایک ہی دفعہ آن اور ایک ہی دفعہ آف کیا جا سکت ہے۔ اگر میں نے اسے ایک بار آف کر دیا تو پھر یہ میرے لیے اتنا ہی بیکار ہو جاوے گا جتنا کسی ہیجڑے کے لیے منگل سوتر ہوتا ہے۔ میں تم سے پھر کہوت ہوں۔ اب بھاگو یہاں سے، وقت نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔“

”اوکے... اوکے۔“ عمران نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آؤ تابش!“

ہم مڑ کر دروازے کی طرف بڑھے اور یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ میری چھٹی حس مجھے پہلے سے خبردار کر رہی تھی کہ عمران کچھ کرنے والا ہے اور اس نے کر دیا تھا۔ میں نے اس کا وہی خطرناک روپ دیکھا جو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔ عبدالرحیم کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے تڑپ کر اس کی رائفل پر

ہاتھ ڈالا۔ یہ ایسی برق رفتار حرکت تھی جس کی تیزی کو شاید الفاظ میں بیان نہ کیا جاسکے۔ عمران نے بیرل کو تھاما۔ یہی وقت تھا جب عبدالرحیم کی انگلی بے ساختہ ٹریگر پر دب گئی۔ عمران شاید جانتا تھا کہ یہ ہوگا۔ اس نے بیرل کا رخ اپنی مرضی کے رخ پر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ رائفل سے چھ گولی کا برسٹ چلا اور پانڈے کے تیم حکیم ساتھی کو چھلنی کر گیا۔ چند گولیاں کھڑکی کے تختوں سے پار ہوگئیں۔ میں پانڈے سے قریب تھا۔ پوری طاقت اور تیزی سے اس پر جا پڑا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے کندھے کے اوپر سے گزری۔ میں نے اسے دوسری بار ٹریگر دبانے کا موقع نہیں دیا۔ پانڈے کی اپنی ہی رائفل کا آہنی بیرل، وزنی سائیلنسر سمیت اس کے چہرے پر لگا۔ یہ اتنی بھرپور ضرب تھی کہ میں نے پانڈے کی ناک کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنی۔ وہ پشت کے بل پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ میرے گھٹنے کی طوفانی ضرب اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگی۔ یہ بھی ایک بے مثال ضرب تھی۔ زرگاں میں ان گنت ناجائز بچوں کا سینہ باپ گھٹنوں کے بل گرا لیکن... اس نے ابھی تک اپنی رائفل نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے ایک بار پھر رائفل میری طرف سیدھی کرنے کی کوشش کی مگر تب تک عمران... طوفان کی طرح اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے عبدالرحیم سے چھینی ہوئی رائفل کا دستہ گھما کر پانڈے کی کھوپڑی پر مارا۔ وہ اچھل کر اپنے مردہ ساتھی کے پہلو میں گرا۔ اس مرتبہ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ تاہم گرتے ساتھ ہی وہ یوں اٹھا جیسے اس کے پورے جسم میں اسپرنگ لگے ہوں۔ وہ بلا خیز رفتار سے عمران کی طرف آیا۔ عمران نے اس پر لاٹھی کی طرح رائفل چلائی مگر وہ جھک کر بچ گیا۔ اس کے کندھے کی ٹکر عمران کے سینے پر لگی۔ دونوں اوپر تلے فرش پر گرے۔ چند سیکنڈ کے لیے ان دونوں کے درمیان زبردست کشمکش نظر آئی۔ دونوں لڑائی بھڑائی کے فن میں طاق تھے مگر پھر عمران کا داؤ چل گیا۔ وہ پلٹ کر پانڈے کو اپنے نیچے لے آیا۔ اور یہی وقت تھا جب وہ کچھ ہوا جس کی توقع مجھے یا عمران کو نہیں تھی۔ پانڈے نے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور اپنے مردہ ساتھی کے ہولسٹر میں سے اچانک پستول کھینچ لیا۔ بس ایک سیکنڈ کی بات تھی، وہ گولی عمران کے سر پر ٹھونک سکتا تھا۔ پانڈے کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں ... جان گیا کہ اگر ایک سیکنڈ کے اندر میں نے یہ رائفل استعمال نہیں کی... اور بالکل درست استعمال نہیں کی تو میں عمران کو کھو دوں گا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ سائیلنسر لگی رائفل سے ایک بار پھر "ٹھک" کی ہلاکت خیز آواز بلند ہوئی۔ گولی کھا کر پانڈے کا سر ایک جھٹکے سے پیچھے کو گیا۔ اس کی کنپٹی میں موت کا روشن دان کھل گیا تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ... مردہ چھپکلی کی طرح واپس، پٹ سے فرش پر گرا۔ اس کی کنپٹی بڑی سرعت سے سرخ ہوتی چلی گئی۔ زرگاں میں ہمارا خطرناک اور مکارترین دشمن موت کے گھاٹ اتر چکا تھا اور یہ سب کچھ حیران کن سرعت سے ہوا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب مجھے اور عمران کو ایک ساتھ صورت حال کی بدترین سنگینی کا احساس ہوا۔ انور خاں کی زندگی خطرے میں تھی۔ انور خاں کے گلے میں منتقل ہوجانے والے "اسٹیل رنگ" کا میٹر چل رہا تھا اور سرخ بلب روشن تھا۔ اب صرف چھ منٹ باقی تھے۔ پانڈے نے کہا تھا کہ اس میٹر کی الٹی گنتی کو روکنے کا کوڈ صرف وہ جانتا ہے اور اگر اس "اسٹیل رنگ" کو کسی بھی طرح انور خاں کی گردن سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو یہ بلاسٹ ہوجائے گا۔ اور قرائن سے لگتا تھا کہ پانڈے کی دونوں باتیں درست تھیں۔ عمران نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ حسنات اور مبارک علی سمیت کئی افراد اندر آگئے۔ اندر پڑی ہوئی خونچکاں لاشوں نے ان سب کو ششدر کردیا۔ ان میں سے صرف عبدالرحیم کے جسم میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی... باقی پانڈے سمیت داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ عبدالرحیم کا سر بھی عمران کی ایک سخت ضرب کی وجہ سے پھٹ چکا تھا۔ عمران نے تیزی سے پانڈے کے لباس کی تلاشی لی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ پانڈے نے بارہ ہندسوں والے جس کوڈ کی بات کی تھی، وہ کسی کاغذ پر لکھا ہوا ہو اور پانڈے کی جیبوں میں موجود ہو۔ لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ ہم کوئی ایسا نمبر نہیں ڈھونڈ سکے۔ اسی دوران میں حسنات اور مبارک وغیرہ بھی ساری صورت حال سے آگاہ ہوچکے تھے۔ میں نے حسنات کو تیزی سے باہر نکلتے اور ایک جانب اوجھل ہوتے دیکھا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی خاص بات آئی تھی۔

حسنات جس تیزی سے گیا تھا، اسی تیزی سے واپس آگیا۔ وہ کسی قریبی کمرے سے چند انگریز قیدیوں کو ہانک کر لایا تھا۔ ان میں دو لڑکیاں اور تین مرد تھے۔ ان کے چہروں پر چوٹوں کے نشان تھے۔

حسنات نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ سرجن اسٹیل کے ساتھی ہیں جی۔ اس کے ساتھ لیبارٹری میں کام کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی اس رنگ کے کوڈ کے بارے میں جانتا ہووے گا۔"

میں نے بغور ان پانچوں افراد کو دیکھا۔ ان میں سے دو نوجوان تھے، باقی ادھیڑ عمر تھے۔ ایک بھوری داڑھی والے کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ یہ گرفتار شدگان تھے۔ اب بھی ان کی طرف تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ بظاہر ان کی تن فن ختم ہوچکی تھی مگر اندرونی اکڑ باقی تھی۔ شاید یہ اکڑ مغربی ممالک کے باشندوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ نفسیاتی طور پر خود کو دوسرے لوگوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ ہزیمت اٹھا کر بھی وہ اپنی گردن کا تناؤ برقرار رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جلد ہی ان کی شکست جیت میں بدل جائے گی۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے چند سیکنڈ بعد ہی یہ پانچوں افراد یہاں کی سنگین ترین صورت حال کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ بستر پر نیم دراز انور خاں کی گردن میں موت کا پھندا موجود ہے اور ہندسے تیزی سے پیچھے کی طرف حرکت کررہے ہیں۔ سرجن اسٹیل اس قسم کے جتنے بھی منحوس آلات تخلیق کرتا تھا، وہ انہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اسٹیل کے اس مہلک رنگ کو ڈی ایکٹی ویٹ کرنے کا کوڈ ان میں سے کسی کو معلوم ہو۔

میں نے اور عمران نے ان پانچوں سے بڑی تیزی کے ساتھ اس بارے میں سوالات کیے۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اس الیکٹرانک رنگ کو کوڈ کے ذریعے پھٹنے سے روکا جاسکتا ہے لیکن کوڈ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ یا معلوم تھا اور وہ بتا نہیں رہے تھے۔ یہ بڑے دردناک لمحات تھے۔ ہماری پیشانیاں پسینے سے تر ہوگئی تھیں۔ میں نے بھوری داڑھی والے کے سر پر رائفل کی نال رکھ دی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تمہارے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے۔ کوڈ بتادو۔"

"میں نہیں جانتا۔ میں یسوع مسیح کی قسم کھاتا ہوں، مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا یہ ڈیوائس تم لوگوں نے نہیں بنایا؟ اس کے کل پرزے تم نے نہیں جوڑے؟"

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں اس کام کی دوسری اسٹیج میں شریک رہا ہوں مگر کوڈ کی تفصیل مجھے پتا نہیں۔ اگر تم مجھے اس کوڈ کی وجہ سے ماردو گے تو یہ غلط وجہ ہوگی۔"

میں نے کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت کے بال پکڑے۔ وہ انگریزی میں بولی۔ "مجھے نہیں معلوم... مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس میں کوئی کوڈ لگتا ہے... اگر... اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اس شخص کی جان بچانے کے لیے بتادیتی۔"

وہ سارے کوڈ کی جانکاری سے انکاری تھے۔ اور وہ سب قریبی ماتحتوں کی حیثیت سے سرجن اسٹیل کی شعبدہ ساز لیبارٹری میں کام بھی کرتے رہے تھے۔ یہ بات کچھ ہضم نہیں ہورہی تھی۔

اب تین ساڑھے تین منٹ کا وقت باقی رہ گیا تھا۔ انور خاں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"اب تم لوگ کمرے سے باہر چلے جاؤ۔ میرے ساتھ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہے۔"

اس نے اصرار کے ساتھ ہم سب کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ وہ قیامت کی ساعتیں تھیں۔ وہ بے بسی کا عروج تھا۔ زرگاں کا ہر دل عزیز حریت پسند، جبر کی آنکھوں میں ہر پل آنکھیں ڈال کر رکھنے والا انور خاں موت کے منہ میں تھا اور ہم اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

اچانک کرشمہ ساز عمران کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ اس نے رائفل کا دستہ ایک انگریز قیدی کی پیٹھ پر رسید کیا اور اسے واپس انور خاں کے کمرے میں دھکیل دیا۔ اس بٹے کٹے شخص کو پانڈے کی لاش سے ٹھوکر لگی اور وہ انور خاں کے بستر کے قریب گرا۔ پھر عمران نے ایک دوسرے قیدی کی پیٹھ پر لات رسید کی اور اسے بھی کمرے میں پھینک دیا۔

وہ گرجا۔ "ان سارے حرامزادوں کو کمرے میں پھینکو۔ اگر انور خاں جائے گا تو پھر یہ بھی ساتھ جائیں گے۔"

یہ ایک اچھی پیش رفت تھی۔ ڈیجیٹل میٹر کی الٹی گنتی اب دو منٹ تک پہنچ چکی تھی۔ ہم نے پانچوں انگلش ٹیکنیشنز کو دھکیل کر انور خاں والے کمرے میں پہنچا دیا اور دروازہ باہر سے بند کردیا۔ قیدی ٹیکنیشنز کے رنگ برف کی طرح سفید ہوگئے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ انور خاں کے ساتھ ہی وہ بھی "اڑنے" والے تھے۔ موت کو عین سامنے دیکھ کر ان کا صبر و تحمل اور ٹھہراؤ جواب دے گیا۔ وہ دہائی دینے لگے۔ اندر سے دروازہ پیٹنے لگے۔ شارٹ اسکرٹ والی نوجوان انگریز لڑکی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ یہ سارے مناظر ہم کمرے کی سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھ رہے تھے۔

"اسٹیل رنگ" کا میٹر پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ایک منٹ تیس سیکنڈ... ایک منٹ پچیس سیکنڈ... ایک منٹ بیس...

موت آتی ہوئی نظر نہیں آتی... لیکن یہاں اس کمرے میں وہ نظر آرہی تھی۔ انگریز قیدیوں کے چہروں پر، ان کی آنکھوں میں۔ انور خاں نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں

اور یہی وقت تھا جب کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت تیزی سے مڑی اور لڑکھڑاتی ہوئی انور خاں کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے اسٹیل کے ”رنگ“ کا ایک کھٹکا کھولا۔ نیچے سیاہ رنگ کا چھوٹا سا ”کی پیڈ“ تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنی کانپتی انگلیاں چلائیں۔ وہ کوڈ پریس کررہی تھی... اور وہ زندگی کا کوڈ تھا۔ بارہ ہندسوں کا کوڈ... جو موت کے میسج کو ”ڈیلیٹ“ کر کے زندگی کو جاری رکھنے کی انسٹرکشنز دے سکتا تھا۔ اور پھر الٹی گنتی رک گئی۔ آخری ریڈنگ بیس سیکنڈ تھی۔ بیس سیکنڈ کے فرق سے موت کا فرشتہ راستہ بدل گیا تھا۔ عمران کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ تھی جو اس کے اندر کے اطمینان کو ظاہر کیا کرتی تھی۔

ہم سب اندر داخل ہوئے۔ کھچڑی بالوں والی عورت کانپتے ہاتھوں سے انور خاں کی گردن سے مہلک ڈیوائس اتار رہی تھی۔ بیشتر قیدی سر تھامے بیٹھے تھے۔ نوجوان لڑکی زار زار رو رہی تھی۔ یقیناً اس کے رونے کی وجہ فوری موت سے بچ جانے کا احساس تھا... اور وہ خوشی تھی جو کسی ریلے کی طرح اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔

انور خاں سے بغل گیر ہونے کے بعد، میں اور عمران زیریں منزل کی طرف لپکے۔ ہمیں ایک فیصد امید بھی نہیں تھی کہ ڈاکٹر چوہان زندہ ہوگا... لیکن اس ”آس امید“ کا کیا کیا جائے۔ یہ آخر تک انسان کا دامن نہیں چھوڑتی۔ ہمارے دلوں میں بھی یہ جلتی بجھتی سی کرن موجود تھی کہ شاید چوہان کی زندگی کی راکھ میں کوئی چنگاری موجود ہو۔

ہم نیچے پہنچے۔ ہجوم کو چیرتے ہوئے اسپیشل وارڈ میں داخل ہوئے۔ چوہان ایک بستر پر تھا۔ اس کی لاش پر ایک سفید چادر کھینچ دی گئی تھی۔ یہ چادر گواہی دے رہی تھی کہ راکھ ہی راکھ ہے۔ چنگاری کہیں نہیں۔ میں نے اس کے پاؤں کو چھوا۔ اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ وہ ”سو رہا تھا“۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے مسلسل کام کر رہا تھا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ بھوکا بھی تھا... ہلکا سا بخار بھی محسوس کر رہا تھا اور اسی طرح ”روانہ“ ہو گیا تھا۔ یہ سفر ہی ایسا ہوتا ہے۔ کسی بھی وقت شروع ہو جاتا ہے، کسی بھی حالت میں۔ میں نے اس کا ماتھا چوما اور میرے دو آنسو اس کے خون آلود رخساروں پر گرے پھر اس کی بڑھی ہوئی شیو کے بالوں میں رینگ گئے۔

قلعے سے باہر ہونے والے زوردار دھماکوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اینڈرسن نے حملہ شروع کروا دیا ہے۔ چوہان کے چہرے پر چادر ڈال کر میں اور عمران واپس مڑے۔ اس اسپیشل وارڈ کے بستروں پر مریض نہیں تھے، خونچکاں لاشیں تھیں۔ چوہان کی لاش کی طرح ان لاشوں پر بھی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں تقریباً ایک گھنٹا پہلے پانڈے نے بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اب وہ خود بھی اپنے مقتولوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں اور عمران سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے واپس بالائی منزل پر پہنچے۔

عبدالرحیم کو گہری بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے اٹھایا جا چکا تھا۔ پانچوں انگریز قیدیوں کو واپس ان کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ باقی لاشیں ابھی تک وہیں پڑی تھیں۔ ان میں خونچکاں کھوپڑی اور ٹوٹی ہوئی ناک والا رنجیت پانڈے بھی تھا۔ وہ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا جس سے اس نے عمران کو شوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مرنے کے بعد بھی وہ جیسے اسی پستول کے ذریعے اپنی مزاحمت جاری رکھنا چاہتا تھا... عمران نے پستول پانڈے کے مردہ ہاتھ سے چھڑایا اور اس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک کونے میں کر دیا۔

انور خاں نے کہا۔ ”اینڈرسن نے حملہ شروع کرا دیا ہے۔ اگر ان لوگوں کے پاس مزید راکٹ ہیں تو وہ ”مین“ دروازے پر استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش کو ناکام بنانا ہوگا۔“

”کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوشش کی جائے کہ یہ راکٹ دروازے کے قریب پہنچنے ہی نہ پائیں۔ فصیل کے اوپر سے لمبی رینج کی رائفلوں کے ساتھ راکٹ لانچروں کو نشانہ بنایا جائے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ ان لوگوں کے پاس اب زیادہ راکٹ نہیں ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”عمران! میرا خیال ہے کہ ہمیں لڑائی والی جگہ پر پہنچنا چاہیے۔“ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے مبارک اور جرأت کو ہدایت کی کہ وہ انور خاں کے قریب رہیں اور اس کی سیکیورٹی کی ذمے داری اٹھائیں... اس کے علاوہ انور خاں کے پیغامات کو کمان داروں تک پہنچانے کا انتظام بھی کریں۔ میں، عمران اور حسنات احمد قلعے کے اس حصے کی طرف روانہ ہوئے جہاں زوردار لڑائی ہونے لگی تھی۔ رات کی سیاہی میں ہر طرف شعلہ فشاں دھماکے ہو رہے تھے اور پگھلا ہوا سیسہ آتشیں بارش کی طرح برس رہا تھا۔

ایسی لڑائیوں کے بارے میں پڑھا اور سنا تھا لیکن آج ہم خود اس قدیم طرز کی لڑائی کا حصہ تھے۔ اور تب مجھے یہ احساس ہوا کہ ایسی لڑائیوں کا تناؤ اور خوف لڑائی سے قبل زیادہ ہوتا ہے۔ جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے، جب نعرے بلند ہوتے ہیں اور خون اچھلتا ہے تو پھر صورتِ حال کا ڈر بتدریج دل سے نکلتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے دلوں سے ”ڈر“ یوں بھی بہت دور تھا کہ اس کی جگہ ایک بھڑکتے ہوئے طیش نے لی ہوئی تھی۔ ہم نے تھوڑی ہی دیر پہلے گیتا لکھی اور ڈاکٹر چوہان کی لاشیں اٹھائی تھیں اور اس سے بھی بہت بڑی بات تھی کہ ہم نے معصوم بالو کی ماں کی لاش اٹھائی تھی... سلطانہ کی لاش اٹھائی تھی۔ وہ لاش جیسے ابھی تک میرے ہاتھوں پر دھری تھی۔ اتنے دن گزرنے کے باوجود میرے بازوؤں پر نہ اس کی گرمی کم ہوئی تھی، نہ اس کا لمس مدھم پڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی... مجھے بھولنا نہیں... میں چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں آپ سے ملوں گی اور صبح دم چلنے والی ہواؤں میں اور...

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ اعصاب تن گئے۔ جسم میں پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک اِک آگ سی پھیل گئی۔ جلد ہی ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ قلعے کی فصیل کا وہ حصہ تھا جو مین دروازے کے عین اوپر تھا۔ قریباً بارہ فٹ چوڑی اس فصیل پر حسنات اور اس کے قریبی ساتھیوں نے زبردست مورچابندی کر رکھی تھی۔ وہ فصیل کے رخنوں میں سے نیچے، اینڈرسن کے گورے اور مقامی فوجیوں پر زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔ گاہے بگاہے دستی بم بھی نیچے پھینکے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ پیٹرول اور ڈیزل بم تھے۔ مٹی کے ہنڈیلوں اور شیشے کی بوتلوں میں تیل بھر کر اور ان میں آگ کی بتی رکھ کر نیچے پھینکا جاتا تھا اور آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ کچھ بڑے سائز کی تھری جی ٹائپ گنز بھی یہاں موجود تھیں۔ ان کے عقب میں زرگاں کے ماہر نشانے باز بیٹھے تھے اور ان کے چلائے ہوئے برسٹ حملہ آور فوجیوں کے لیے زبردست مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ میں نے یہاں عورتوں اور نوعمر لڑکوں کو بھی دیکھا۔ وہ لڑنے والے سپاہیوں کی اعانت کر رہے تھے۔ ایمونیشن کی نقل و حرکت میں مصروف تھے۔ رائفلوں، میگزینز میں گولیاں بھر رہے تھے۔ زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ حسنات کے مشورے سے عمران اور میں نے بھی ایک جگہ پوزیشن سنبھال لی۔ حملہ آوروں کا اجتماع بہت بڑا تھا۔ وہ قلعے کے چاروں طرف چیونٹیوں کی طرح موجود تھے۔ وہ اپنے راکٹ لانچرز کو بار بار قلعے کے دروازے کے سامنے لانے کی کوشش کر رہے تھے اور فصیل پر سے ہونے والی زوردار فائرنگ انہیں اس عمل سے روک رہی تھی۔ اس لڑائی میں جانی نقصان بھی ہو رہا تھا اور زیادہ نقصان حملہ آوروں کا ہی تھا۔ قلعے کے دروازے سے قریباً سو قدم کے فاصلے پر مجھے کئی لاشیں نظر آئیں۔ شعلوں کی سرخ روشنی میں یہ خون آلود لاشیں سنسنی خیز منظر پیش کر رہی تھیں۔ بارود کا زہریلا دھواں، شعلے... دھماکے اور للکارے۔ ایک داستانی سا منظر تھا۔

دروازے کے عین سامنے سے قریباً سو ڈیڑھ سو قدم کی دوری پر ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ یہ بکتر بند ٹائپ گاڑی تھی۔ اندازہ ہوا کہ اس گاڑی کے پیچھے ایک ٹریکٹر ٹرالی باندھی گئی ہے اور اس ٹرالی پر دو تین راکٹ لانچر رکھ کر دروازے کی طرف لائے جا رہے ہیں تاکہ مناسب فاصلے اور زاویے سے دروازے کو نشانہ بنایا جا سکے۔ ایک بار پھر فصیل پر موجود نشانے بازوں نے زبردست نشانے لگائے اور گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیے... تب یکایک گاڑی میں آگ بھڑک اٹھی۔ ٹرالی اور راکٹس کو بچانے کے لیے گورے سپاہیوں نے ٹرالی کو پھرتی سے جلتی ہوئی گاڑی سے علیحدہ کیا اور پیچھے لے گئے۔ اس کوشش میں کئی افراد کو گولیاں لگیں اور ان میں سے تین چار میدان میں ہی کھیت رہے۔ مگر اس ناکام کوشش کے فوراً ہی بعد ایک اور گاڑی حرکت کرتی نظر آنے لگی۔

عمران نے کہا۔ ”یہ لوگ حوصلے میں تو کم ہو سکتے ہیں لیکن تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور باقاعدہ تربیت یافتہ بھی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم زیادہ دیر اس دروازے کو بچا نہیں سکیں گے۔“

عمران کا فقرہ ختم ہوا ہی تھا کہ رائفل کا ایک برسٹ ہمارے بالکل قریب فصیل کے پتھروں سے ٹکرایا۔ بہت سی دھول اور سنگریزے ہمارے اردگرد بکھر گئے۔ حملہ آوروں کی طرف سے فائرنگ کی شدت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہر طرح کے چھوٹے بڑے ہتھیاروں سے فائر کر رہے تھے۔

حسنات احمد ہم سے کچھ فاصلے پر سپاہیوں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی، وہ جھک کر دوڑ رہا تھا۔ مبادا کوئی آوارہ گولی اس کے مزاج نہ پوچھ جائے۔ اس کے عقب میں ایک اور سپاہی بھی تھا۔ وہ وردی میں تھا۔ یہ وہ مسلمان سپاہی تھے جو شکم کی فوج میں شامل تھے مگر بغاوت ہونے کے بعد مزاحمت کاروں کے ساتھ مل گئے تھے۔ ایسے کم و بیش پانچ سو سپاہی اس وقت

قلعے کے اندر موجود تھے اور حکم کے خلاف لڑائی میں حصہ لے رہے تھے۔

حسنات نے آکر مجھے بتایا۔ ”جناب! انگریزوں کی طرف سے ایک ایلچی آیا ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اسے لایا جائے؟“

میں نے عمران کی طرف دیکھ کر اس کے تاثرات سے اس کا عندیہ لیا اور حسنات احمد سے کہا کہ اسے لایا جائے۔

دو منٹ بعد ایک انگریز کی صورت نظر آئی۔ وہ لڑائی کے لباس میں تھا لیکن فی الوقت غیر مسلح نظر آرہا تھا۔ اس لمبے تڑنگے انگریز کے ساتھ ایک درمیانے قد کا انڈین بھی تھا۔ یہ بھی فوجی لباس میں تھا۔ حسنات احمد اور اس کے دو ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ یہ سب افراد گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے جھک کر چل رہے تھے۔ ہم دونوں ایلچیوں سمیت ایک محفوظ برجی میں آکر کھڑے ہو گئے۔

انگریز اور انڈین فوجی نے مجھے باقاعدہ سیلیوٹ کیا۔ انگریز فوجی کا عہدہ کیپٹن کا جبکہ انڈین کا سیکنڈ لیفٹیننٹ کا تھا۔ انگریز کیپٹن نے انگلش میں کہا۔ ”میرا خیال ہے جناب کہ میں اس وقت قلعے کے کمانڈر سے بات کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔“

”کمانڈر انور خاں ہے۔ میں اس کی جگہ ڈیوٹی دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم کام کی بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”آپ کی انگریزی بہت اچھی ہے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ جناب اینڈرسن نے آپ کے لیے ایک نامہ ارسال کیا ہے۔ اسے پڑھ لیجیے۔“

اس نے اپنی وردی کے اندر سے خاکی لفافہ نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں نے لفافہ چاک کیا، اس میں ایک خط تھا۔ تاہم خط کے علاوہ بھی ایک چیز تھی۔ اس چیز نے مجھے تھوڑا سا چونکایا مگر میں نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

میں نے خط نکالا اور عمران سے کہا کہ وہ اسے پڑھے۔ عمران نے حسنات احمد اور دیگر ساتھیوں کے سامنے خط پڑھنا شروع کیا۔ یہ اینڈرسن کی طرف سے تھا اور اردو میں تھا۔ نیچے اینڈرسن کے دستخط تھے اور کمانڈر کی حیثیت سے اس کی مہر بھی لگی تھی۔ اینڈرسن نے لکھا تھا۔

”دوستو! تم نے ہماری طاقت دیکھ لی ہوگی اور یہ بھی جان لیا ہوگا کہ ہمیں ہر صورت قلعے کے اندر داخل ہونا ہے۔ یہ کام ایک دو گھنٹے کے اندر اندر ہو جانا ہے۔ بہرحال، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خوں ریز لڑائی ہوگی اور اس میں دونوں طرف سے جانی نقصان ہوگا۔ ہم اس دو طرفہ جانی نقصان سے بچنا چاہتے ہیں، کیونکہ اگلے ایک دو گھنٹوں میں یہاں جو بھی مرے گا، وہ بھانڈیل کا باشندہ ہوگا۔ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو یا برٹش، وہ اس دھرتی کا بیٹا ہوگا۔ دھرتی ماں پچھلے چند دنوں میں اپنے بہت بیٹے کھو چکی ہے۔ ہم اسے مزید دکھ سے بچانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک معاہدے کے تحت تم لوگ قلعے کے دروازے کھول دو اور عالی جناب حکم جی کے دستوں کو قلعے میں داخل ہونے دو۔ ایسی صورت میں ہماری طرف سے ہر بچے، بوڑھے اور عورت کو جان کی امان دی جائے گی۔ لڑنے والے لوگوں میں سے بھی جنہوں نے کوئی جنگی جرم نہیں کیا، ان کے لیے عام معافی کا اعلان ہوگا۔ کسی بھی مجرم کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور اسے عام عدالت میں صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ اس معاہدے کی دیگر شرائط ہم ابھی مل بیٹھ کر طے کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے اس خط کا جواب ہمارے ہی ایلچی کے ذریعے دینا چاہتے ہیں تو ہمارا ایلچی انتظار کر لیتا ہے۔“

عمران نے خط ختم کیا تو ہم سب خاموش تھے۔ میں عمران کو لے کر سیڑھیاں اترا اور نیچے ایک خالی کمرے میں آگیا۔ یہ جگہ زخمیوں کی آمد کے پیشِ نظر خالی کرائی گئی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

میں نے اسے وہ خاکی لفافہ دکھایا جس میں سے خط برآمد ہوا تھا۔ لفافے کے کاغذ پر اندر کی طرف بھی باریک قلم سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ ایک موٹے سرخ مارکر سے لکھا گیا یہ فقرہ فوراً پڑھا جا سکتا تھا۔ ”یہ صرف تابش اور عمران صاحب کے لیے۔“

”یہ کیا ہے بھئی؟“ عمران نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہ خط کے اندر خط ہے جو لفافے کے اندرونی حصے پر لکھا گیا ہے۔“

ہم نے لفافے کو احتیاط سے چاک کیا۔ لفافے نے خط کی شکل اختیار کر لی۔ اس اندرونی خط کو لکھنے والا بھی انگریز کمانڈر مسٹر اینڈرسن ہی تھا۔ اس خط کی انگریزی تحریر کچھ یوں تھی۔

”ہو سکتا ہے کہ تم دونوں کے اردگرد کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جن کے سامنے مجھے پوری بات نہیں لکھنی چاہیے۔ اس لیے اس دوسرے خط کا سہارا لے رہا ہوں۔ ہمارے درمیان پہلے بھی دوستی کا رشتہ رہا ہے۔ یہ دوستی یقیناً ہم سب کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتی مگر ایک اچانک حادثے کی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ہمیں محترمہ ماریا سے اور تمہیں سلطانہ بی بی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بہرحال، اب ہمیں ماضی کو بھول کر آگے دیکھنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم دونوں، قاسمیہ کے اہم کمان داروں کو اپنا ہم خیال بنانے اور قلعے کے دروازے کھلوا کر خون خرابے کو روکنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہو۔ اور تم دونوں کو یہ کردار ادا کرنا بھی چاہیے۔ میں کرنل اینڈرسن۔۔۔ عالی جناب محترم ”وشوا ناتھ حکم جی“ کی طرف سے تم دونوں کو تحفظ کی ضمانت دیتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم اپنا کردار ادا کرو تو تمہارے اس عمل کی ”قدر“ تمہاری توقع سے بڑھ کر کی جائے گی۔ تم بھانڈیل اسٹیٹ میں رہنا چاہو یا بھانڈیل اسٹیٹ سے جانا چاہو، دونوں صورتوں میں تمہیں سہولت دی جائے گی۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہمارے دوست تاحیات ہماری دوستی پر ناز کر سکیں۔۔۔

جواب کا منتظر۔

خیر اندیش اینڈرسن۔“

خط پڑھنے کے بعد عمران نے دانت پیسے۔ ”سن آف اے بچ۔“

میں نے گہری سانس لے کر لفافہ تہ کیا اور اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ عمران کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں اس کی اندرونی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ خود میرے اندر بھی نفرت کی نئی لہر ابھر آئی تھی۔ عمران چنگھارا۔ ”یہ سفید کتا! ہمیں بکاؤ مال سمجھتا ہے۔۔۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں اس نے ہمیں بے غیرتی کے بازار میں، ہوس کے سکوں کے عوض بکنے کی پیشکش کی ہے اور۔۔۔ میرا خیال ہے کہ یہ آج کی بات نہیں، ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ ان سفید بندروں نے ہمارے خطے پر دو سو سال حکومت کی ہے تو اسی مکاری کے زور پر کی ہے۔ انہوں نے ہمیں تقسیم کیا ہے۔ ہمارے اندر سے غدار ڈھونڈے ہیں اور پھر ہمارے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”سچ کہتے ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آج اس کے ذریعے تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ خط میوزیم میں رکھے جانے کے قابل ہے۔“

”اس سفید بندر نے ہمارے سامنے ہڈی پھینکنے کی جو ناکام کوشش کی ہے، اس کا مطلب سمجھ رہے ہو نا تم۔۔۔ تمہیں سہولت دی جائے گی۔ یعنی اگر ہم اسٹیٹ میں رہنا چاہیں تو ہمیں ہز ہائی نس کی طرف سے کوئی جاگیر شاگیر عطا فرمائی جائے گی اور اگر ہم اپنے ملک واپس جانا چاہیں تو شاید ہمیں زر و جواہر میں تول کر سب کچھ ہمارے حوالے فرما دیا جائے۔ لعنت۔۔۔ ایک لاکھ ایک ہزار ایک سو ایک دفعہ لعنت۔“ اس نے خستہ دیوار پر تھوکا۔

”تمہارے خیال میں اس تاریخی خط کا جواب کیا ہونا چاہیے؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔

”تم بتاؤ۔“

”چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں۔۔۔ بلکہ لکھ دیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور عمران کی جیب میں سے قلم نکال لیا۔

باہر جنگی نعروں کی گونج تھی۔ دھماکوں کا شور تھا اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ۔ شاید یہ 1857ء کی ہی ایک جھلک تھی۔ انگریزوں اور سکھوں کی فوجیں دہلی کے لال قلعے کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ایک آخری ضرب لگانے کے لیے صفیں باندھ رہی تھیں اور ہتھیار تول رہی تھیں۔ میں نے تہ شدہ خط جیب سے نکالا۔ اسے کھولا اور اس کی پشت پر لکھ دیا۔ ”تم پر لعنت۔۔۔ یہ انیسویں نہیں، اکیسویں صدی ہے۔ اس دفعہ نہیں اینڈرسن۔۔۔ اس دفعہ نہیں۔“ یہ فقرہ لکھنے میں مجھے اتنا مزہ آیا جو شاید ہزارہا الفاظ پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھنے میں بھی نہ آتا۔ میں سرتاپا ایک عجیب سے اطمینان اور ولولے سے بھر گیا۔ مجھے لگا اب جیت یا ہار۔۔۔ زندگی یا موت کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل فتح یہی ہے کہ اکڑی ہوئی گردنوں والے ان شیطانوں سے پوری توانائی کے ساتھ لڑا جائے اور آخری سانس تک لڑا جائے۔

عمران نے بھی میرے فقرے کو سراہا۔ ہم نے یہ جواب انگریز ایلچی اور اس کے ہندو ساتھی کے حوالے کیا اور انہیں بحفاظت واپس بھیج دیا۔

ہم دوبارہ فصیل پر پہنچے۔ لڑائی کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایلچی کے واپس جانے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی انگریز اور مقامی حملہ آوروں نے قلعے پر ایک اور زوردار حملہ کر دیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ حملہ اس جواب کا نتیجہ ہے جو ہم نے بھینسے کے چہرے والے غصیلے اینڈرسن کو دیا ہے۔ اس کی غرور سے تنی ہوئی گردن، اس کی نیلی آنکھوں میں چھپی حقارت، اس کا طنزیہ لہجہ، سب کچھ میرے ذہن میں آیا۔ مجھے وہ جارج گورا ہی کی طرح قابلِ نفرت محسوس ہوا۔ جی چاہا وہ میرے سامنے ہو، میں اسے مار ڈالوں یا وہ مجھے مار ڈالے۔ سلطانہ کا اصل قاتل تو وہی تھا۔

اسی دوران میں ہمیں یہ پریشان کن اطلاع ملی کہ مشرقی جانب سے مدِمقابل سپاہیوں کے دو دستے فصیل پر چڑھ آئے ہیں۔۔۔ اور وہاں زوردار لڑائی ہو رہی ہے۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ فوری طور پر اپنی جگہ چھوڑ کر اس جگہ تک پہنچ سکتے۔ مبارک علی اپنے بہترین ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا اور حسنات کو یقین تھا کہ وہ آسانی سے اینڈرسن کے ہرکاروں کو آگے نہیں آنے دے گا۔

فصیل پر ایک بڑی ٹیلی اسکوپ بھی موجود تھی۔ یہ گوروں سے چھینی ہوئی وہی ٹیلی اسکوپ تھی جس میں سے ہم نے کمل مالا کی دادی ساس یعنی بڑی ماتا کو دھرم شالا کے مینارے پر پوجا کرتے دیکھا تھا۔ عمران نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگا رکھی تھیں اور اسے اسٹینڈ پر اِدھر اُدھر حرکت دے رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے ٹیلی اسکوپ کو ایک جگہ فوکس کیا اور پھر مجھے اس میں دیکھنے کی دعوت دی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائیں۔ مجھے فصیل کے اس حصے کا منظر دکھائی دیا جہاں سے ہمارے "مدِمقابل" اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہاں واقعی زوردار لڑائی ہو رہی تھی۔ گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ لاتعداد مشعلوں اور گیس کے ہنڈولوں کی روشنی میں مناظر واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ فصیل پر دو جگہ بھڑکتی ہوئی آگ نے بھی اردگرد کے منظر کو روشنی فراہم کر رکھی تھی۔

"کچھ نظر آیا؟" عمران نے پوچھا۔

"کیا؟"

"جو کور برجی پر سے جو دو بندے فائرنگ کر رہے ہیں، ان میں سے ایک بھرت ہے۔"

میں نے دھیان سے دیکھا۔ وہ بھرت ہی تھا۔ اس کا گلابی دھاری دار سویٹر اتنی دوری سے بھی پہچانا جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان گورے سپاہیوں کا بھرپور مقابلہ کر رہا تھا جو فصیل پر چڑھ آئے تھے اور اپنی پوزیشن پکی کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "یہ بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ یہاں کسی بھی وقت...." ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں نے بھرت کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ دھاری دار سویٹر برجی کی آٹھ دس سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا فصیل پر گرا۔ "او گاڈ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا ہوا؟" عمران نے پوچھا۔

"اسے گولی لگ گئی۔" میں نے کہا اور عمران کو دیکھنے کی دعوت دی۔

عمران نے اپنی آنکھیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے لگائیں اور وہ بھی سکتہ زدہ رہ گیا۔ کیا گیتا مکھی اور ڈاکٹر چوہان کی طرح بھرت کمار بھی اس لڑائی کا ایندھن بن چکا تھا؟

عمران نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائے لگائے کہا۔ "ہو سکتا ہے، یہ زخمی ہو لیکن بڑی خطرناک جگہ پر گرا پڑا ہے۔ یہاں کسی بھی وقت مزید گولیاں اسے لگ سکتی ہیں۔"

میں نے عمران کو پیچھے ہٹا کر ایک بار پھر ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائیں۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بھرت کھلی جگہ پر پڑا تھا، یہاں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا... پچویشن ایسی تھی کہ کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک طرف سے ایک لڑکی جھک کر بھاگتی ہوئی آئی اور بھرت کے جسم کو ڈھال فراہم کرنے کے لیے اس کے اوپر جا گری۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن شکل دیکھے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کون ہے... یقیناً وہ چمپی تھی۔ وہ جو محبت کرتی تھی... اور جو پوجا کرتی تھی۔ وہ اپنے محبوب کی طرف آنے والی موت اپنے جسم پر سہنے کے لیے اس کے اوپر گری ہوئی تھی۔ اسے اپنے جسم سے ڈھانپے ہوئے تھی۔ یہ وہ نیچ ذات کی ادنیٰ خادمہ تھی جس کا سایہ بھی اعلیٰ ذات کے لوگوں کو بھرشٹ کرتا تھا۔ لیکن یہ نیچ ذات، کمی کمین لڑکی اپنی نقد جان لے کر اپنے محبوب کی موت کے سامنے ڈھال بن گئی تھی۔

میں نے عمران کو یہ منظر دکھایا۔ وہ بھی مبہوت رہ گیا۔ اس جگہ اردگرد یقیناً ہمارے سپاہی موجود تھے لیکن وہ لڑائی میں اس بُری طرح انگیج تھے کہ چند لمحوں کے لیے بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور بھرت اور چمپی موت کی زد میں تھے۔ یا یوں کہہ لیں کہ ایک اور "پیار کہانی" فرشتۂ اجل کے نشانے پر تھی۔ ہم بے چین ہونے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

تب عمران چونکا ہوا نظر آیا۔ اس نے کچھ دیر تک نگاہیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے چپکائے رکھیں۔ پھر مجھے دیکھنے کی دعوت دی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا... منظر کچھ بدلا ہوا تھا۔ چمپی کے ساتھ ایک اور لڑکی آ گئی تھی۔ وہ دونوں بھرت کمار کے مُردہ یا بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر دوطرفہ فائرنگ کی زد سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ جھکی ہوئی تھیں اور بھرت کو بازوؤں سے گھسیٹ رہی تھیں۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ دوسری لڑکی "بڑی ماتا" کی پوتی بہو مالا تھی۔ میں نے اسے اس کے لباس اور بالوں سے پہچانا۔ وہی روشن دماغ لڑکی جو ایک کٹر برہمن گھرانے کی بہو ہونے کے باوجود اپنے سینے میں ایک گداز اور انسان دوست دل رکھتی تھی۔ کڑے پہرے بھی جس کی سوچوں کو زنجیریں نہیں پہنا سکے تھے۔ اب وہ اپنے شوہر سمیت اس تہلکہ خیز مزاحمت کا حصہ تھی جو حکم اور اینڈرسن کے خلاف کی جا رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں دیوانہ وار لگی رہیں اور بھرت کو گھسیٹ کر ایک محفوظ آڑ میں لے گئیں۔

"کیا بنا؟" عمران نے اپنی "ایم 16" رائفل سے نیچے فائر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اسے لے گئیں۔" میں نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا۔

"زبردست... کاش میرے پاس کیمرا ہوتا۔"

ایک گولی عمران کے سر کے عین اوپر سے سیٹی بجاتی گزر گئی اور اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ ہمیں کچھ اور نیچے جھکنا پڑا۔ اب فصیل کے اوپر سے بھی فائر آ رہا تھا... اور یہ فائر یقیناً اینڈرسن کے ان دستوں کی طرف سے تھا جو مشرقی جانب فصیل کے اوپر جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہماری ٹیلی اسکوپ کے عین اوپر سے بھی مختلف "کیلیبر" کی گولیاں سرسراتی گزر رہی تھیں۔ موت سامنے تھی اور اس کی حقیقت اور دہشت اپنی اہمیت کھوتی جا رہی تھی۔

میں نے دوربینی جائزہ جاری رکھا۔ بھرت کا جسم خطرناک رینج سے ہٹایا جا چکا تھا۔ وہاں اب بارش کی طرح گولیاں برس رہی تھیں۔ اینڈرسن کے باوردی سپاہی اب کچھ اور آگے آ گئے تھے... اس جگہ فصیل پر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً میں نے دفاع کرنے والوں کی مزاحمت میں شدت محسوس کی۔ میں نے ایک بار پھر نوعمر طلال کو دیکھا۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں ہم نے دو روز پہلے اسے پھانسی گھاٹ پر دیکھا تھا۔ جب بھرت اور انور خاں سمیت کم و بیش پندرہ افراد کو دردناک طریقے سے سولی چڑھایا جانے والا تھا۔ طلال اور اس کے نڈر دوست، عقابوں کی طرح حکم کے سپاہیوں پر جھپٹے تھے اور ان کی اس خوں ریز جھپٹ نے ہزاروں افراد کے مُردہ ہجوم کو زندہ کر دیا تھا۔

سلطانہ کا یہ چہیتا راجپوت بھانجا آج پھر اسی دلیری اور ولولے کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں یقیناً اس کی برادری ہی کے جاں نثار ساتھی تھے۔ ان کی رائفلوں پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں صرف دیکھ سکتا تھا، مجھے سنائی کچھ نہیں دے رہا تھا... وہ لوگ اپنی جگہ سے نکلے اور نعرے بلند کرتے ہوئے مخالف پوزیشنوں کی طرف دوڑے۔ گھمسان کی لڑائی میں یہ بڑا جارحانہ انداز سمجھا جاتا ہے۔ عسکری زبان میں اسے "چارج کرنا" کہتے ہیں۔ اس میں حملہ آوروں کی CASUALTIES تو ہوتی ہیں لیکن دشمن پر دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ یہاں بھی حملہ آوروں کو گولیاں لگیں اور دو گرے بھی مگر وہ آناً فاناً گوروں اور ان کے ساتھیوں کی پوزیشنوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ دستی بموں کے دھماکوں سے ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ میری نظر کا راستہ مسدود ہو گیا۔

میں نے کہا۔ "عمران! وہاں بہت سخت جھڑپ ہو رہی ہے۔ ہمیں وہاں مدد پہنچانی چاہیے۔"

عمران نے میرا سر پکڑ کر نیچے جھکا دیا۔ میں بے دھیانی میں تقریباً سیدھا کھڑا ہو گیا تھا... وہ بولا۔ "کہیں انہیں مدد پہنچانے سے پہلے خود اللہ میاں کے پاس حاضر نہ ہو جانا۔ فائر بہت بُرے اینگل سے آ رہا ہے۔"

تقریباً تین چار منٹ بعد ہم نے دوبارہ ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھا۔ اب فصیل کے اس حصے سے گہرا دھواں چھٹ گیا تھا اور صورتِ حال کی تھوڑی بہت جھلک نظر آ رہی تھی۔ یوں لگا کہ طلال اور اس کے ساتھی اوپر چڑھ آنے والے دستوں کو کافی حد تک پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یقیناً پیچھے ہٹنے اور پسپا ہونے والوں میں سے بہت سے نیچے بھی گرے ہوں گے۔ زوردار فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ طلال اور اس کے ساتھیوں نے اب کافی آگے جا کر پوزیشنیں لے لی ہیں....

اسے اطمینان بخش صورتِ حال کہا جا سکتا تھا، تاہم یہ اطمینان تادیر برقرار نہیں رہا۔ بہت جلد پھر سے فصیل کے اس حصے پر گورے اور مقامی سپاہیوں کا اجتماع ہو گیا۔ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

عمران نے حسنات سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں وہاں پہنچنا ہو گا۔ وہاں اپنی تعداد میں بھی اضافہ کرنا ہو گا۔"

"وہاں پہنچنا ہی تو مشکل ہے جی۔ مجھے اس کے لیے پہلے راستہ بنانا پڑے گا۔"

"تو پھر بناؤ راستہ... یہ ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

حسنات احمد نے اثبات میں سر ہلایا اور میری ہدایت پر عمل کرنے کے لیے فصیل کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں ایمونیشن میں آگ لگنے کی وجہ سے مسلسل شعلے بھڑک رہے تھے اور راستہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔

دل میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ کہیں ہم نے غلط فیصلہ تو نہیں کر لیا؟ کیا ہمیں اینڈرسن کی پیشکش پر مزید غور کر لینا چاہیے تھا؟ قلعے کی حفاظت کب تک کی جا سکے گی اور اگر اینڈرسن اور حکم کے دستے قلعے میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر کیا صورتِ حال ہو گی؟ یہاں قاسمیہ کی بے شمار عورتیں

اور بچے موجود تھے۔ فتح اور شراب کے نشے میں چور سپاہی، خاص طور سے ہندو سپاہی کچھ بھی کر سکتے تھے۔ یہی وقت تھا جب میں نے بلند فصیل کے کنگروں کے اوپر سے دور تاریکی میں نظر دوڑائی۔ ایک دم یوں لگا میرے جسم کا سارا لہو میری بصارت میں سمٹ آیا ہے۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ زرگاں کی ٹمٹماتی روشنیوں سے بہت آگے گہری تیرگی میں مجھے ایک روشن لکیر سی نظر آئی۔ یہ لکیر یہاں پہلے نہیں تھی... یہ کیا تھا؟

میں نے لرزتے ہاتھوں سے آہنی اسٹینڈ پر وزنی ٹیلی اسکوپ کو گھمایا اور اسے اس روشن لکیر پر فوکس کرنے کی کوشش کی جو شمالی افق پر نمودار ہوئی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں کامیاب ہو گیا... میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ہزاروں مشعلیں تھیں جو تیز رفتاری سے زرگاں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ یہ وہ ''کمک'' تھی جس کا انتظار کرتے کرتے زرگاں کے باسیوں نے کئی برس گزار دیے تھے... یہ ٹل پانی کی سر بکف فوج تھی اور اس کی قیادت یقیناً مراد شاہ اور چھوٹے سرکار کر رہے تھے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب مصیبت میں گھرے ہوئے شخص کو اپنے دوستوں کی پکار سنائی دیتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ''ہمت نہ ہارو، ہم آرہے ہیں'' تو اس شخص کے اندر سے ہی اتنی توانائی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی ''مصیبت'' کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ میں نے اس کیفیت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور یہ ایک یادگار کیفیت تھی۔ میں نے لرزاں آواز میں عمران سے کہا۔ ''عمران! وہ آگئے ہیں۔''

''کون؟'' اس نے فائر کرتے ہوئے کہا۔

''خود دیکھو۔'' میں نے اسے ٹیلی اسکوپ کی طرف بلایا۔

اس نے میگزین کے آخری دو فائر کیے اور جھک کر ٹیلی اسکوپ کی طرف آیا۔ اس نے دیکھا اور وہ بھی مبہوت رہ گیا۔ ''زبردست۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا...

میں نے کہا۔ ''یہ بہت بڑی تعداد میں ہیں... اور ابھی کچھ فاصلے پر ہیں۔ ہم بلندی پر ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ پا رہے ہیں۔''

کچھ دیر بعد عمران نے ٹیلی اسکوپ سے نگاہ ہٹائی اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا تھا تابی! وہ ضرور آئیں گے۔ انہیں حرکت میں لانے کے لیے جس ڈنکے کی ضرورت تھی، وہ ڈنکا ہم نے یہاں بجا دیا تھا... ڈنکے کے بغیر کچھ نہیں ہوتا تابی...''

☆☆☆

اس سے آگے کا احوال تفصیلات سے لکھا جائے تو اس کے لیے بہت سے صفحات درکار ہوں گے۔ وہ ایک خوں ریز لڑائی تھی۔ غالباً اینڈرسن کے دستوں کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ جب فتح کے قریب پہنچ چکے ہوں گے، اچانک ان پر عقب سے یلغار ہو جائے گی۔ درحقیقت چھوٹے سرکار راجیت رائے اور مراد شاہ بالکل درست وقت پر پہنچے تھے۔ وہ کم و بیش چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایک سیلاب کی طرح زرگاں میں داخل ہوئے اور بلاتوقف اینڈرسن کے دستوں پر جا پڑے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ قلعے کے اندر سے ہمارے جنگجوؤں نے بھی زوردار حملہ کیا۔ انور خاں بالائی منزل کی کھڑکی سے یہ سارا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے رائے دی کہ اب قلعے کے دروازے کھول دیے جائیں اور باہر نکل کر گوروں پر ہلا بولا جائے۔

انور خاں کا یہ پیغام میرے ذریعے حسنات اور مبارک علی وغیرہ تک پہنچا۔ پھر چار پانچ منٹ کے اندر قلعے میں موجود ہزاروں پُرجوش سپاہیوں تک پہنچ گیا۔ قلعے کے دو دروازے کھول دیے گئے۔ حسنات، مبارک اور دوسرے کمان داروں کی قیادت میں مسلمان سپاہی اور جنگجو بلائے ناگہانی کی طرح اینڈرسن کے دستوں پر جا پڑے۔ اینڈرسن کی فوج بلاشبہ زبردست تربیت یافتہ تھی۔ ان کے پاس بہترین اسلحہ بھی موجود تھا، مگر جب وہ دوطرفہ حملے کی زد میں آئی تو اس گندم کی طرح پس گئی جو چکی کے پاٹوں کے درمیان آتی ہے۔ اس لڑائی میں ہم نے زیادہ حصہ نہیں لیا۔ ہمیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ درحقیقت ہم اپنے کرنے والا کام کر چکے تھے۔ ہم نے حسنات، مبارک علی اور طلال جیسے جاں نثاروں کے ساتھ مل کر وہ طبل بجا دیا تھا جس کی گونج پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں پھیلی تھی۔ مُردہ ساعتیں زندہ ہوئی تھیں اور لوگوں نے بدمست فرماں رواؤں کے لیے اس یوم کو یوم حساب بنا دیا تھا۔

اصل اور فیصلہ کن لڑائی تقریباً ایک گھنٹا ہی جاری رہ سکی۔ اس میں خاصا جانی نقصان بھی ہوا۔ ظاہر ہے زیادہ نقصان اینڈرسن اور حکم کے وفاداروں کا تھا۔ قلعے کے سامنے اور قاسمیہ کے گلی کوچوں میں ہر طرف گورے اور مقامی سپاہیوں کی لاشیں بکھری نظر آرہی تھیں۔ گورے سپاہیوں اور افسروں کی لاشیں نفرت اور انتقام کا نشانہ بنیں۔ انہیں تاراج کیا گیا اور گھسیٹا گیا۔ سیکڑوں زخمی ہوئے اور لاتعداد افراد

کو گرفتار کیا گیا۔ اب مسلح سپاہیوں اور عام لوگوں نے خود کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا۔ ایک حصہ مراد شاہ اور حسنات وغیرہ کی قیادت میں بھگوڑے فوجیوں کے تعاقب میں روانہ ہوا، دوسرا نرگاں کے عظیم الشان راج بھون کی طرف بڑھنے لگا۔ وہی راج بھون جو دورِ قدیم کے شاہی محلات سے کہیں زیادہ شان و شوکت، دبدبہ اور رنگینی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ یہاں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ یہاں پریوں کے جھمگھٹے تھے اور رائے وشوا ناتھ عرف حکم جی، راجا اِندر کی طرح یہاں دادِ عیش دیتا تھا۔ اس ''راجا اِندر'' کے حواری وہی جارج گورا، سرجن اسٹیل، اینڈرسن اور مِنیارڈ جیسے لوگ تھے۔

میں اور عمران بھی اس نعرہ زن ہجوم کا حصہ تھے جو راج بھون کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راج بھون کے سامنے پہنچ کر مسلح دستے اور عام لوگ چاروں طرف پھیل گئے۔ انہوں نے راج بھون کو گھیر لیا تھا۔ یہاں بمشکل ڈیڑھ دو سو گارڈز ہوں گے یا پھر حکم کا خاص محافظ دستہ تھا جس کی تعداد سو سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ لوگ کتنی بھی جاں نثاری دکھاتے، ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ حکم کا دفاع کر سکتے۔ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ مبارک علی تھا۔ اس نے کہا۔ ''جناب! آپ کو چھوٹے سرکار یاد فرما رہے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں جیپ میں بیٹھے ہیں۔'' مبارک علی نے بتایا۔

میں اور عمران لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس گرد آلود لینڈ روور جیپ تک پہنچے جس پر ایک بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا اور مسلح گارڈز نے جسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ میں اور عمران موقع پر پہنچے تو چھوٹے سرکار جیپ سے اتر آئے۔ وہ شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ نل پانی میں ان سے کئی بار ملاقات ہو چکی تھی لیکن آج وہ پہلی بار فوجی وردی میں تھے اور ان کے جسم پر اسلحہ سجا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے معانقہ کیا پھر عمران سے ہاتھ ملایا۔ میں نے عمران کا تعارف کرایا تو پھر اس سے بھی ''شاہی معانقہ'' ہوا۔ چھوٹے سرکار کے ذاتی گارڈز نے مجھے باقاعدہ سیلوٹ کیا۔ اس سیلوٹ کو دیکھ کر عمران نے بہت بُرا سا منہ بنایا اور مجھے سرگوشی میں مخاطب کر کے بولا۔ ''زیادہ بانس پر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح جہانگیر کی کامیابیوں کے پیچھے نور جہاں کا ہاتھ تھا، تمہارے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔''

ہمیں بڑے احترام کے ساتھ اس شاہی جیپ میں سوار کیا گیا۔ چھوٹے سرکار نے سب سے پہلے مجھ سے انور خاں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا۔ ''انور خاں زخمی ہے جناب... لیکن خطرے سے باہر ہے۔ وہ اس وقت تکیے میں ہے۔''

''دھ بھگوان کا شکر ہے۔'' چھوٹے سرکار نے کہا۔ ان کی اونچی ناک کا بانسہ کامیابی کی خوشی میں ہمیشہ سے زیادہ چمک رہا تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''ہم جانت ہیں، اس سمے یہاں تمہاری حیثیت ایک کمان دار کی ہے۔ لوگن تمہارے اشاروں پر چل رہے ہیں... بلکہ شاید تم دونوں کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔'' چھوٹے سرکار نے آخری الفاظ عمران کی طرف دیکھ کر کہے۔

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس میں عمران نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔''

''ہاں، ہمیں بہت سی جانکاریاں ملی ہیں۔ بہرحال، ان تفصیلی باتوں کے لیے سمے چاہیے۔ اب ہم نے تمہیں ایک خاص بات کہنے کے لیے بلایا ہے۔''

''جی فرمائیے۔''

''لوگن راج بھون میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم چاہت ہیں کہ صرف خاص لوگن ہی اندر داخل ہوں اور اگر بھائی صاحب واقعی اندر موجود ہیں تو ان کو زندہ گرفتار کیا جاوے... اور ان کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ نہ ہو۔''

میں نے چونک کر چھوٹے سرکار اجیت رائے کی طرف دیکھا۔ بڑے بھائی حکم کی طرف سے چھوٹے بھائی پر کیا ظلم روا نہیں رکھا گیا تھا۔ ناانصافی اور نفرت کی حد کر دی گئی تھی لیکن اس کے دل میں پھر بھی کسی نہ کسی درجے میں بھائی کا احترام موجود تھا۔ یہ اس چھوٹے بھائی کے بڑے پن کی نشانی تھی۔

میں نے کہا۔ ''آپ جو حکم کریں گے ویسا ہی ہوگا چھوٹے سرکار! اب آپ آگئے... ہیں جناب! اب میں، عمران یا انور خاں کچھ نہیں ہیں۔ اب جو کچھ ہیں آپ ہیں۔''

چھوٹے سرکار نے میرا کندھا تھپکا۔

... کچھ دیر بعد میں راج بھون کے عظیم الشان محرابی دروازے کے سامنے ایک جیپ کی چھت پر موجود تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک لاؤڈ اسپیکر تھا۔ میں نے بہ آوازِ بلند اعلان کیا کہ چھوٹے سرکار کے حکم کے مطابق سب لوگ راج بھون کے سامنے سے ہٹ کر کم از کم دو سو گز پیچھے چلے جائیں... راج بھون کا صرف ایک دروازہ کھولا جائے گا اور اس دروازے میں سے بھی صرف ایک فوجی دستہ اندر داخل ہوگا جس کی کمان میں خود کروں گا۔

میں نے یہ اعلان دو تین بار دہرایا۔ لوگ پیچھے ہٹنے لگے اور پھر معقول حد تک پیچھے چلے گئے۔ میں، عمران اور مبارک علی کمانڈوز کی تین ٹولیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ہم نے میگا فونز پر بار بار وارننگ دی کہ راج بھون کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے اور کسی طرح کی مزاحمت بیکار ہے۔ لہٰذا اندر موجود گارڈز فائر نہ کریں اور خود کو حوالے کر دیں۔ حکم سے بھی کہا گیا کہ وہ باہر نکل آئے اور اپنی گرفتاری پیش کر دے۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ ہم راج بھون کے وسیع و عریض احاطے سے گزر کر اس شاندار شاہی بالکونی کے سامنے پہنچے جہاں چند ہفتے پہلے حکم کی چہیتی بیوی رتنا دیوی کے ہاں بچے کی ولادت کی خوشی منائی گئی تھی اور حکم نے مٹھیاں بھر بھر کے نیچے کھڑے لوگوں پر سونا چاندی نچھاور کیا تھا۔ آج یہ بالکونی سنسان پڑی تھی مگر بالکل سنسان بھی نہیں تھی۔ یہاں شاہی گارڈز کی پوزیشنیں موجود تھیں۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ہماری طرف سے بھی بھرپور جواب دیا گیا۔ دو تین منٹ کے اندر بالکونی خاموش ہوگئی اور وہاں آگ بھڑک اٹھی۔

ہم راج بھون کے اندرونی حصے میں داخل ہوگئے۔ مزاحم گارڈز کو شوٹ کر دیا گیا اور باقی کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ درجنوں ملازماؤں، خواجہ سراؤں اور خوب صورت لڑکیوں نے محل کے اندرونی حصوں سے نکل کر خود کو ہماری حفاظت میں دیا۔ مرد خادموں کی تعداد بھی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی۔ حکم اور اس کی بیوی رتنا کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں پہنچ کر ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ قالین پر خواتین اور بچوں کی کم و بیش بیس لاشیں پڑی تھیں۔ ان لوگوں پر اندھا دھند مشین گن کے برسٹ چلائے گئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور تھے۔ دیواروں اور فرنیچر وغیرہ پر گولیوں کے ان گنت نشان دکھائی دے رہے تھے۔ مرنے والے بچوں کی عمریں تقریباً پندرہ اور دو تین سال کے درمیان تھیں۔

مبارک علی نے کہا۔ ''یہ حکم کے اہلِ خانہ ہیں جی۔ یہ اس کی تینوں رانیاں ہیں۔ یہ بچے ہیں۔ یہ بچوں کی بڑی پھوپی ہے... یہ شاید چھوٹی ہے......'' مبارک بتا رہا تھا اور ہم حیران کھڑے تھے۔ رعایا کی عزت آبرو کو کھلونا سمجھنے والے لوگ اپنی آن عزت کے حوالے سے کتنے حساس ہوتے ہیں۔ جب یومِ حساب آتا ہے اور انہیں اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ مکافاتِ عمل کی وجہ سے ان کی اپنی عزت پر حرف آئے گا تو وہ خود سے وابستہ خواتین اور دیگر لوگوں کو بے دردی سے موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔

مبارک علی اور دو دیگر افسر الٹ پلٹ کر خونچکاں لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ مبارک علی نے ایک کونے میں پڑی اکٹھی چار لاشوں کو دیکھ کر بتایا۔ ''یہ اس آخری جشن والی پریاں ہیں۔ لگتا ہے کہ حکم جی نے ان کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔''

خوب صورت لڑکیاں، نودمیدہ کلیوں جیسے چہرے، خوش گلو، خوش اندام و خوش اطوار۔ انہیں حکم اور اس کے حواریوں کی راتوں کو رنگین کرنے کے لیے سخت ترین تربیت اور آزمائشوں سے گزارا گیا تھا۔ نہ جانے یہ کن کن آنگنوں سے یہاں لائی گئی تھیں؟ کن کن آنکھوں کا نور تھیں؟ ان کی عمر مرنے کی نہیں تھی لیکن وہ مری پڑی تھیں... فراعینِ مصر کی طرح حکم نے اپنی ان جواں سال کنیزوں کو اپنے انجام کے مقبرے میں زندہ دفن کرنے کی رسم نبھائی تھی۔

''ان میں رتنا دیوی بھی ہے؟'' میں نے مبارک سے پوچھا۔

''نا ہیں جی۔ وہ کہیں نظر نا ہیں آرہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ ان لوگوں کو آدھ پون گھنٹے پہلے مارا گیا ہے۔'' مبارک کے ساتھی افسروں نے اس کی تائید کی۔

ہم دیگر کمروں کی طرف بڑھے۔ دروازے توڑ کر حکم کے پُرشکوہ بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ یہ بیڈ روم جدید اور قدیم طرزِ آرائش کا شاندار نمونہ تھا۔ جدید ترین بستر، قیمتی شرابوں سے بھرا ہوا اور خودکار طور پر گھومنے والا ''بار''... آڈیو اور ویڈیو سسٹم، گھوڑا گاڑیوں اور لالٹینوں والے اس شہر میں جو کچھ بھی تھا مگر اس بیڈ روم میں ہر جدید سہولت موجود تھی۔ اس بیڈ روم میں پہنچ کر ہمیں پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ شاید حکم یہاں سے فرار ہوگیا ہے۔ ہماری نگاہیں ایک بھاری بھرکم خفیہ سیف کے ادھ کھلے دروازے پر پڑیں۔ وہاں اب بھی دو چار مرصع طلائی زیور اور قیمتی پتھر موجود تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ حکم نے اس سیف کا قیمتی ساز و سامان افراتفری میں نکالا ہے اور اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

ہمارے ساتھ آنے والے قریباً ڈیڑھ سو مسلح کمانڈوز راج بھون میں چاروں طرف پھیل گئے اور اہم افراد کی تلاش شروع ہوئی۔ میں اور عمران کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اس وسیع و عریض عشرت کدے میں پہنچے جہاں ساتویں کا جشن اپنے کلائمکس پر پہنچا تھا... وہی آبشار جو ایک بلوری تالاب

میں گرتا تھا۔ جس کی چاروں جانب شاندار نشستیں تھیں اور دن میں بھی رات کا سماں نظر آتا تھا۔ عشرت کدے کی گنبد نما چھت تاریک آسمان کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور اس پر چاند تارے چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ بہرحال، فی الوقت یہ سب کچھ نہیں تھا۔ ایک عجیب سی اداسی اور خاموشی نے در و دیوار کو گھیرا ہوا تھا۔ آبشار بند تھی، وہ تالاب جس میں سنہری شراب چھلکتی تھی، خالی پڑا تھا... پگھلے ہوئے سونے میں ڈوبتے ابھرنے والی عریاں مورتی بھی بے حرکت تھی۔

"یہ دیکھو تابی!" عمران نے میری توجہ ایک گوشے کی طرف دلائی۔

ہم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ دو خوبرو لڑکیاں تھیں۔ ان کے جسم نیلے پڑ کر اکڑ گئے تھے۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے پناہ اذیت جھیل کر مری ہیں۔

ان لڑکیوں کو دیکھتے ہی مبارک بولا۔ "ان بے چاریوں کو یقیناً درد کا ٹیکا لگایا گیا ہے جی۔ یہ ڈبل ٹیکا بندے کی جان لے لیوت ہے۔"

پھر اس نے ایک لڑکی کے عریاں بازو پر ٹیکے کے دو تازہ نشان دریافت کر لیے... لڑکیوں کی حالت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ تڑپ تڑپ کر مری تھیں۔ ان کی ایڑیوں سے خون رس رہا تھا۔ جاں کنی کی بے پناہ اذیت ان کے خوبرو چہروں پر یوں نقش ہو گئی تھی کہ دیکھنے والی نگاہ کانپ جاتی تھی۔

مبارک نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ دو تین گھنٹے پہلے ان لڑکیوں کو کسی جرم کی سزا دی گئی ہے۔ شاید ان پر مخبری وغیرہ کا شبہ ہو۔"

اچانک ایک دروازہ کھلا اور میں میڈم صفورا کو اپنے سامنے دیکھ کر دنگ رہ گیا... اس نے خود کو "ہینڈز اپ" کر رکھا تھا۔ اس کے عقب میں آٹھ دس سہمی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ ان کے رنگ زرد تھے۔ انہوں نے میڈم کے پیچھے خود کو یوں سمیٹ رکھا تھا جیسے وہ ان کے لیے ایک ڈھال کی حیثیت رکھتی ہو۔

مجھے اور عمران کو پہچاننے کے بعد میڈم نے ہاتھ نیچے گرا دیے اور آگے بڑھ آئی۔ وہ ہم سے گلے ملی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی بار ہلکی سی نمی دیکھی۔ اس نے کہا۔ "ہم نے اپنی لائف بڑی مشکل سے بچائی ہے۔ حکم نے اپنے بہت سے گھر والوں اور خدمت کرنے والی لڑکیوں کو مار دیا ہے۔ میں ان لڑکیوں کو لے کر یہاں اس اسٹور میں چھپ گئی تھی۔ حکم اور کرنل اینڈرسن کے ذاتی گارڈز یہیں آس پاس سرچ کرتے رہے۔ پھر چلے گئے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ پتا نہیں۔ لگتا ہے کہ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے کسی طرح یہاں سے نکل گئے ہیں۔"

"اینڈرسن بھی ساتھ تھا؟" عمران نے پوچھا۔

"اندازہ تو یہی ہوتا ہے۔ جب حکم نے اپنے فیملی ممبرز کو گولیاں ماریں تو اینڈرسن بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم نے اسٹور روم کے پاس بھی اس کے گرجنے برسنے کی آوازیں سنیں۔"

میں نے کہا۔ "میڈم! آپ کے خیال میں راج بھون میں کوئی ایسی جگہ جہاں وہ چھپ سکتا ہو؟"

"آپ لوگوں نے لیبارٹری کا ایریا دیکھ لیا ہے؟" میڈم نے پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیا۔ میڈم نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم نے خوف زدہ لڑکیوں کو مبارک علی کی حفاظت میں دیا اور خود میڈم کے ساتھ لیبارٹری کی طرف بڑھے۔ ایک کوریڈور میں ہمیں ایک اور لڑکی کی نیلگوں لاش نظر آئی۔ شدید اذیت کے سبب اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ مرنے سے پہلے وہ اس بری طرح تڑپی پھڑکی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں کی جلد جگہ جگہ سے چھل گئی تھی۔

میڈم نے کہا۔ "حکم نے اپنے پانچ ملازموں کو زہر والا ٹیکا لگوایا ہے۔ یہ گرین رنگ کا وہی PAIN GIVING INJECTION ہے جو جسم میں شدید ترین تکلیف پیدا کرتا ہے۔ ان پانچ ملازموں میں سے چار لڑکیاں تھیں اور ایک خواجہ سرا۔ ان کے بارے میں حکم کو شک تھا کہ انہوں نے باغیوں سے رابطہ رکھا ہوا ہے اور راج بھون کی نیوز باہر دے رہے ہیں۔"

ایک سپاہی نے لڑکی کی اکڑی ہوئی لاش پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ ہم ایک سلائیڈنگ دروازے کو کھول کر سرجن اسٹیل کی وسیع لیبارٹری میں داخل ہوئے۔ اس لیبارٹری کے تین چار پورشن تھے۔ یہاں جدید ساز و سامان موجود تھا۔ وہ تمام "شعبدے" یہیں پر تخلیق پاتے تھے جو بھانڈیل اسٹیٹ کے سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بناتے تھے۔

ہم نے چار درجن مسلح کمانڈوز کے ساتھ مل کر اس لیبارٹری کا چپا چپا چھان مارا مگر حکم، رتنا دیوی یا اینڈرسن کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس لیبارٹری کو کھنگالنے کے دوران میں

ہم نے کئی اہم چیزیں دیکھیں۔ ہمیں وہ خاص الیکٹرانک چپس اور ان کے سگنلز وصول کرنے والے انٹیناز بھی نظر آئے۔ اس سبز رنگ کی دوا کے درجنوں وائلز بھی جن سے درد کا انجکشن تیار ہوتا تھا۔ زہریلی گیس، اعصاب شل کرنے والی گیس، طاقت بخش ادویات اور اس طرح کی نہ جانے کتنی اشیا یہاں موجود تھیں۔

میڈم صفورا مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گئی۔ وہ رازداری کے انداز میں بولی۔ "حکم اور اینڈرسن یہاں سے فرار ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ وہ کہیں بھی چلے جائیں، ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"جیسے وہ اپنے قیدیوں کو ڈھونڈ لیتے تھے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"میں نے حکم کا طریقہ اسی پر الٹ دیا ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "حکم جہاں بھی ہے، اپنے ساتھ ایک الیکٹرانک چپ لے کر گھوم رہا ہے۔ ہم انٹیناز کے ذریعے اس کا سگنل وصول کر سکتے ہیں۔"

یہ واقعی حیران کن اطلاع تھی... "چپ کیسے رکھی آپ نے؟" عمران نے پوچھا۔

"آخری وقت میں مجھے شک ہو گیا تھا کہ حکم اپنی وائف کے ساتھ یہاں سے بھاگنا چاہ رہا ہے۔ یہاں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ میں یہاں لیبارٹری میں آئی اور یہاں سے دو الیکٹرانک چپس نکال لیں۔ ان کے نمبرز میرے پاس نوٹ ہیں۔ ان میں سے ایک چپ میں نے اس سفری بیگ میں ڈال دی جو حکم کے کمرے میں تیار رکھا تھا..."

اگر واقعی ایسا ہو چکا تھا تو یہ زبردست بات تھی۔ میڈم صفورا کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی پر ہمیں کبھی شبہ نہیں رہا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو ہر طرح کے ماحول میں جینے کی راہیں نکال سکتی تھی اور پیچیدہ گرہیں اپنے ناخنِ تدبیر سے کھول لیتی تھی۔

عمران نے پوچھا۔ "ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ چپ ہماری مدد کر سکتی ہے؟"

میڈم نے ہم سے صرف پانچ منٹ مانگے۔ وہ جن لڑکیوں کے ساتھ چیمبر کے اسٹور روم میں چھپی ہوئی تھی، ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے آئی۔ پتا چلا کہ یہ لڑکی سرجن اسٹیل کی اسسٹنٹس میں سے ایک ہے۔ میڈم صفورا نے چند منٹ کے اندر ایسے دو انٹیناز ڈھونڈ لیے جو اس خاص چپ کو ٹریپ کر سکتے تھے جو حکم کے سفری بیگ میں موجود تھی۔ ان دونوں انٹیناز کی بیٹریاں پہلے سے چارج تھیں۔

☆☆☆

.....اور اب ہم ایک بند جیپ پر سوار شہر کے نواح کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ مسلح کمانڈوز والی پانچ چھ گاڑیاں اور کوئی دو درجن گھڑسوار تھے۔ انٹینا سگنل وصول کر رہا تھا۔ ان سگنلز سے اندازہ ہوتا تھا کہ حکم یہاں سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل میں موجود ہے اور شمال کی طرف حرکت کر رہا ہے۔

ہم شہر کی مختلف سڑکوں پر سے گزر رہے۔ یہاں جشن کا سماں تھا۔ ہزاروں شہری ہتھیار لہرا رہے تھے اور نعرہ زنی کر رہے تھے۔ حکم اور اس کے انگریز حواریوں سے ہمدردی رکھنے والے لوگ کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ ان میں سے جنہوں نے زیادہ وفاداری دکھانے کی کوشش کی تھی، انہیں برے نتائج بھگتنا پڑ رہے تھے۔

ایک جگہ ہمیں بڑا ہجوم نظر آیا۔ راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ ہماری گاڑیاں رک گئیں۔ یہاں ہمیں تین لاشیں الٹی لٹکی ہوئی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک لاش ہم نے بذراہی سے پہچان لی۔ یہ اس اسٹیٹ کے سب سے سفاک پولیس آفیسر رنجیت پانڈے کی تھی۔ اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ ایک شخص لپک کر ہمارے پاس آیا۔ یہ کانسٹیبل امرناتھ تھا... وہی سانولا سلونا غریب صورت شخص جس نے ایک رات اپنے چہرے پر پانڈے کا نفرت بھرا تھپڑ وصول کیا تھا... اور پھر اس تھپڑ کی بازگشت بڑی دور تک گئی تھی۔ قاسمیہ کے "قاسمیہ چوک" میں میری کلائیوں کے گرد لپٹی ہوئی رسیاں اس تھپڑ کی بازگشت سے ہی ٹوٹی تھیں۔ ایسے نفرت بھرے تھپڑوں کے اثرات بڑی دور تک جاتے ہیں... ہر دور کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔

امرناتھ ہماری جیپ کی کھڑکی سے آلگا۔ اس نے ہمیں بتایا۔ "جناب الوگن نے پانڈے کی لاش کو گلیوں میں گھسیٹا ہے اور یہاں الٹا لٹکا دیا ہے۔ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ قلعے میں گیتا لکھی کے شریر کو سگریٹوں سے جلانے والا اور اس کی ہتھیا کرنے والا یہی پانڈے صاحب ہے۔"

"اس بات کا کیسے پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"قلعے کی نچلی منجل (منزل) پر کام کرنے والے دو چاکروں نے سب کچھ بتایا ہے جی۔ انہوں نے اپنی انکھیوں سے یہ جلم ہوتے دیکھا تھا۔" امرناتھ کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں تھیں اور سیاہ چہرے پر انتقام کا جوش تھا۔

سپاہیوں نے ہجوم میں سے راستہ بنایا اور ہمارا قافلہ آگے بڑھ گیا۔ جلد ہی ہم زرگاں کے نواحی علاقے سے گزرے اور پھر جنگل میں پہنچ گئے۔ جس جیپ میں، میں اور عمران تھے، مبارک علی بھی اسی پر سوار تھا۔ شہر میں سگنل مدھم تھے مگر جونہی ہم کھلے علاقے میں پہنچے، یہ واضح ہوتے چلے گئے۔ حکم اور اینڈرسن غالباً کسی جیپ پر سوار تھے اور یہ ایک دشوار گزار علاقے میں سفر کر رہی تھی۔ یہاں ٹیلے تھے اور ان کے درمیان راستے بھول بھلیوں کی طرح تھے۔ اگر ہمیں سگنلز کی راہنمائی نہ ہوتی تو ہم شاید حکم کی گرد بھی نہ پا سکتے۔

کہیں کہیں سگنلز مدھم بھی ہو جاتے اور ہمیں پریشانی ہوتی لیکن جلد ہی ان کی کوالٹی پھر سے لوٹ آتی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم سگنلز کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اب ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ حکم جس چیز پر سواری کر رہا تھا، وہ ٹھہر چکی ہے۔ یہ اونچے نیچے ٹیلوں سے اٹا ہوا گھنا جنگل تھا۔ جلد ہی ہمیں ایک گاڑی کے ٹائروں کے نشانات بھی مل گئے۔ ہم ان نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ سگنلز اب بالکل صاف ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر ہم نے دوربینوں سے جگہ کا معائنہ کیا۔ تقریباً دو کلومیٹر کی دوری پر ایک ٹیلے کے دامن میں ہمیں کسی رہائشی مکان کی جھلک نظر آئی۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ چھوٹا سا بوسیدہ گھر اس ویرانے میں پتا نہیں کیوں موجود تھا۔ یقیناً وہ جیپ بھی اس گھر کے آس پاس ہی موجود تھی جس پر حکم اور غالباً گورا اینڈرسن یہاں پہنچے تھے۔ درختوں کی وجہ سے وہ جیپ ہمیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اب گاڑیوں سے اتر جانا چاہیے۔" عمران نے تجویز پیش کی۔

میرے ذہن میں بھی یہی خیال آ رہا تھا۔ میری ہدایت پر مبارک علی نے کمانڈوز کو اترنے کا حکم دیا۔

ہم بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہم پھیلتے بھی جا رہے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ ایریا کور کیا جا سکے۔ جلد ہی ہم نے اس بوسیدہ گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہمیں وہ شاندار لینڈ کروزر بھی نظر آ گئی جس پر شاہی جوڑا یہاں پہنچا تھا... میں نے کہا۔ "مبارک علی! چھوٹے سرکار کی طرف سے سخت ہدایات ہیں کہ حکم کو زندہ گرفتار ہونا چاہیے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ ایسا ہی ہووے گا جناب... اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے جناب کہ حکم کا کمانڈر اینڈرسن صاحب بھی اندر ہے۔" مبارک دبے دبے جوش سے بولا۔

مبارک علی نے مجھے لینڈ کروزر کے قریب ہی کچی مٹی پر بڑے سائز کے فوجی بوٹوں کے نشانات دکھائے اور کہا۔ "مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ یہ اینڈرسن صاحب کے بوٹوں کا نشان ہی ہے... اور یہ دیکھیں جی، یہ دوسرے جوتے کا نشان۔ یہ بھی فوجی بوٹ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان لوگن کے ساتھ ایک یا دو فوجی بھی ہیں۔"

ہم ایک کٹے ہوئے ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ ہمارے کمانڈوز چاروں طرف پوزیشنیں لے چکے تھے۔ میں نے میگا فون کے ذریعے بلند آواز میں کہا۔ "راجہ وشوا ناتھ اور اینڈرسن صاحب! آپ چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکے ہیں۔ بھاگنے یا چھپنے کی کوشش بیکار ہے۔ بہتر ہے کہ آپ خود کو ہمارے حوالے کر دیں۔"

دوسری طرف مکمل خاموشی رہی۔ عمران کے مشورے سے میں نے یہ اعلان دوبار مزید کیا۔ آخری اعلان میں، میں نے کہا۔ "ہم آپ کو فیصلہ کرنے کے لیے پانچ منٹ کا وقت دیتے ہیں۔ اگر آپ باہر نہیں آئے تو ہمیں اندر گھسنا پڑے گا اور اس صورت میں اپنے نقصان کی ساری ذمے داری آپ پر ہوگی۔"

اعلان کے بعد ہم نے گھڑی دیکھی اور انتظار کرنے لگے۔ میں نے مبارک علی سے پوچھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ کچے کے ساتھ والا علاقہ ہے۔ آپ نے جلا ہوا جنگل دیکھا ہے نا... وہ یہاں سے بس سات آٹھ میل کی دوری پر ہے... اور... آپ کو پتا ہے، یہ گھر کس کا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے پُرتجسس انداز میں کہا۔

"یہ ایک اچھوت بلورام کا گھر ہے جی۔ چار پانچ سال پہلے تک یہ بندہ راج بھون کے بھنگی خانے میں کام کرتا تھا۔ بھون کا خاندانی چاکر تھا۔ پھر اس بے چارے کو کوڑھ ہو گیا۔ اس کو راج بھون کی نوکری سے نکال دیا گیا بلکہ شہر سے ہی نکلنے کا حکم دیا گیا۔ کافی سمے تک تو بلورام کا کچھ پتا ناہیں چلا۔ پھر زرگاں کے دو شکاریوں نے بتایا کہ بلورام اپنی پتنی اور دو بچوں کے ساتھ "کچے" کے قریب جنگل میں کٹیا بنا کر رہت ہے۔ یہ اسی بلورام کا گھر ہے جی۔" مبارک کے لہجے میں طنز تھا۔

میں اور عمران حیران رہ گئے۔ جان بچانے کی خاطر انسان کیا کچھ کرتا ہے... اور کبھی کبھی کس درجے تک گر جاتا ہے۔ زرگاں کے اونچی شان والے راجا وشوا ناتھ عرف حکم کو پناہ ملی بھی تو کہاں؟

مبارک علی نے کہا۔ "اگر ہمیں ان سگنلز کی مدد حاصل

ناہیں ہوتی تو ہم کبھی یہاں تک نہ پہنچتے۔ اور اگر پہنچ بھی جاتے تو شاید یہ نہ سوچتے کہ حکم جی اور اینڈرسن صاحب بہادر نے اس کمی کمین کوڑھی کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہووے گا۔"

...... پانچ منٹ گزر گئے۔ چھٹا اور ساتواں منٹ بھی گزر گیا۔ اب حرکت میں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مبارک علی کے اشارے پر کمانڈوز نے گھر کی کھڑکیوں اور دروازے پر چند راؤنڈ فائر کیے۔ جواب میں اندر سے تابڑ توڑ گولیاں چلیں... اور ہمارا ایک کمانڈو کندھے پر گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر والے بھرپور مزاحمت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمیں اب اپنا لائحہ عمل سوچنا تھا۔ سورج ڈھل گیا تھا اور اب جلد ہی شام کے سائے تاریکی میں بدلنے والے تھے۔ تاریکی کے بعد گھر کے اندر گھسنے کی کامیاب کوشش کی جا سکتی تھی۔ ہم نے اس کے لیے صلاح مشورہ شروع کر دیا۔

جونہی تاریکی گہری ہوئی، ہم نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اس کام کے لیے عمران نے سب سے پہلے خود کو پیش کیا۔ مبارک علی بھی اندر جانے پر آمادہ تھا مگر پھر اسے باہر کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ اس کی جگہ میں کارروائی میں شامل ہوا۔ میرے اندر اینڈرسن اور اس کے ساتھیوں کے لیے بے پناہ آگ تھی۔ سلطانہ کا اصل قاتل تو یہی نیلی آنکھوں اور بھینسے کے جسم والا انگلش کمانڈر تھا۔ ہمارے ساتھ چیدہ اور منتخب جوان اندر جانے کے لیے تیار تھے۔

پروگرام کے مطابق، مبارک علی اور اس کے ساتھیوں نے گھر میں موجود افراد کو سامنے کی طرف سے فائرنگ میں انگیج کیا۔ یہ بڑی زوردار فائرنگ تھی۔ ہم بغلی طرف سے گھر کی بیرونی چار دیواری کی طرف بڑھے۔ یہاں درخت زیادہ تھے جو ہمیں کیموفلاج کر رہے تھے۔ سب سے پہلے عمران گھر کے اندر کودا... اس نے ایک کھڑکی نما دروازہ کھول دیا۔ ہم بھرا مار کر اندر گھس گئے۔ شدید فائرنگ کی زد میں آ کر دو بکریاں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھیں۔ تیسری شاید ہلاک ہو چکی تھی۔ عمران نے ایک کھڑکی کو زوردار لات رسید کی۔ وہ کھل گئی۔ ایک رائفل بردار گورا عمران کے سامنے آیا مگر اس کی تیزی عمران کی تیزی کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ عمران کا چلایا ہوا پانچ گولی کا برسٹ اس گورے کو چھلنی کر گیا۔ ہم کمرے میں کود گئے۔

یہی وقت تھا جب ہم پر بائیں جانب سے فائرنگ ہوئی۔ ایک گولی میرے سامنے کھڑے کمانڈو اشرف کے سر میں لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا۔ ایک دوسرے کمانڈو کو بھی میں نے اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ میں نے رائفل کے شعلے سے حملہ آور کی پوزیشن کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میں نے اس پر گولی چلائی اور ساتھ ہی اس پر جست کی۔ میری چلائی ہوئی گولی تو اسے نہیں لگی لیکن میری رائفل کی سنگین اس کے سینے میں اندر تک گھس گئی۔ میں نے لات رسید کر کے اسے اپنی رائفل سے علیحدہ کیا۔ اس کی اپنی رائفل اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی۔

اسی دوران میں ایک کمانڈو مجھ سے مخاطب ہو کر چلایا۔ "یہ دیکھیں جی۔"

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ گولیوں کے بہت سے خولوں اور ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے ٹکڑوں کے درمیان کچے فرش پر رتنا دیوی اور اس کے بچے کی لاش پڑی تھی۔ رتنا دیوی اس حال میں بھی گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے اندھا دھند ہونے والی "کراس فائرنگ" میں گولی لگی ہے۔ یہ ایک ہی گولی تھی جو پہلے اس کے بچے کو لگی پھر اس کے اپنے سینے سے پار ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک پاؤں بھی اس کی شاہی جوتی سمیت خون سے رنگین نظر آ رہا تھا۔

"حکم اور اینڈرسن آس پاس ہی ہوں گے۔" عمران نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھ کر کہا۔

یہی وقت تھا جب دو کمانڈوز حکم کو پکڑ کر لے آئے۔ یہ نظارہ بھی عبرت ناک تھا۔ زرگاں کا تاجدار جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا، مٹی میں لت پت نظر آتا تھا۔ اس کی کام دار سنہری پگڑی اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

"یہ بھوسے والے کمرے میں چھپے ہوئے تھے جی۔" کمانڈو نے اطلاع دی۔

"یہ پستول ان کے لباس سے نکلا ہے۔" دوسرے کمانڈو نے بھرا ہوا قیمتی بریٹا پسٹل میری طرف بڑھایا۔

لگتا تھا کہ گرفتاری کے وقت وشوا ناتھ عرف حکم جی نے تھوڑی بہت مزاحمت بھی کی ہے۔ اس کا چغا نما لباس ایک طرف سے پھٹا ہوا تھا اور انگلیاں بھی زخمی تھیں۔

"تلاشی لے لی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ناہیں جناب۔" کمانڈو آفیسر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تلاشی لو۔" میں نے کہا۔

حکم گرجا۔ "اپنے گندے ہاتھ ہم سے دور رکھو۔ ہمارے پاس کچھ ناہیں۔"

میں نے رائفل کی نال حکم کے سینے کی طرف کی اور انگلی

ٹریگر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان کے ہاتھ کتنے بھی گندے ہوں گے مگر اس شخص کے ہاتھوں سے گندے نہیں جسے تم اچھوت اور کوڑھی کہتے ہو۔۔۔ اور جس کے گھر میں پناہ لیے ہوئے ہو۔“

میرے اشارے پر کمانڈو آگے بڑھا اور اس نے حکم کی مزاحمت کی پروا کیے بغیر اس کی تلاشی لی۔ حکم کی آنکھوں میں ہر وقت جلتی ہوئی آگ کی جگہ اب راکھ نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کسی نہایت قیمتی لیکن ٹوٹے ہوئے فانوس کی طرح تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر اس کی چہیتی بیٹی اور بیٹے کی لاشیں پڑی تھیں۔ غالباً اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک نظر انہیں دیکھ ہی سکے۔ کمانڈوز اسے گن پوائنٹ پر باہر لے گئے۔

مبارک علی ایک کمرے سے یہاں کے مکینوں کو نکال کر لے آیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کے دو لڑکے تھے۔ لڑکوں کی عمریں اٹھارہ بیس سال رہی ہوں گی۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ عورت کے ہاتھ کوڑھ زدہ ہیں۔ یہ غریب صورت عورت صورتِ حال کی سنگینی کے سبب تھر تھر کانپ رہی تھی۔

”ان کو بھی باہر لے جاؤ۔“ میں نے مبارک علی سے کہا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ عمران نے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہاں سے بھی گولی چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ صاحب بہادر اینڈرسن صاحب وہیں پر چھپے ہوئے ہیں۔“

اگلے دو تین منٹ میں یہ بات ثابت ہو گئی۔ اینڈرسن وہیں موجود تھا۔ اس کے پاس ایک ”ایل ایم جی“ تھی اور یقیناً کافی تعداد میں راؤنڈز بھی تھے۔ مگر جو کچھ بھی تھا، اپنی تمام تر ہوشیاری اور دیدہ دلیری کے باوجود وہ اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں ایک چوہے کی طرح ٹریپ ہو چکا تھا۔ ایک گوشت خور سفید چوہا جو ذہانت اور دلیری میں خود کو حرفِ آخر سمجھتا تھا اور بات بات پر تاریخی حوالے بھی دیتا تھا۔ وہ یہاں زرگاں میں کمانڈر انچیف کی حیثیت رکھتا تھا مگر اب ہمارے اور اس کے درمیان ایک بوسیدہ چوبی دروازے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ”اینڈرسن صاحب! باہر آ جاؤ۔ اس کے سوا تمہارے پاس اب کوئی راستہ نہیں ہے۔“

چند سیکنڈ بعد یہی بات عمران نے بھی دہرائی۔

کچھ دیر تک اندر خاموشی طاری رہی۔ پھر اینڈرسن کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ وہ برٹش لب و لہجے میں بولا۔ ”کیا تم ضمانت دیتے ہو کہ میں گرفتاری دے دوں تو تم گولی نہیں چلاؤ گے؟“

میں نے کہا۔ ”اینڈرسن صاحب! تم کوئی بھی شرط منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ۔ ہم تمہیں زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔“

ہمارے درمیان مختصر مکالمہ ہوا۔ پھر ہماری ہدایت کے مطابق اینڈرسن نے اپنی خطرناک ”ایل ایم جی“ کھڑکی سے باہر پھینکی۔ تب اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ وہ فوجی وردی میں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔ اسے تین اطراف سے مسلح کمانڈوز نے نشانے پر لیا ہوا تھا۔ اس کی ذرا سی غلط حرکت اس کے لیے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کا ایک کندھا خون آلود ہے۔

”گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔“ میں نے گرج کر کہا۔

وہ ذرا سا جھجکا۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیے۔ فوری موت سے بچنے کے لیے اس نے اپنے ہاتھ بالکل سیدھے کھڑے کر رکھے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی توقع اینڈرسن کو نہیں تھی۔ میری چلائی ہوئی گولی اینڈرسن کے سینے پر لگی۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا اور آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ گولی کے جھٹکے سے اس کی کیپ اچھل کر دور جا گری۔

میں نے کہا۔ ”اینڈرسن صاحب! یاد کرو۔ اس طرح کا سین پہلے بھی دہرایا جا چکا ہے۔ اٹھرا گاؤں میں سلطانہ راجپوت نے بھی اسی طرح ہتھیار پھینکے تھے اور خود کو تمہارے حوالے کرنا چاہا تھا لیکن تم نے اس کی حوالگی قبول نہیں کی تھی۔ تم نے اسے مار ڈالا تھا۔“

اینڈرسن کی حالت ایک زخمی درندے کی سی تھی مگر اس کی بے پناہ تکلیف کے سامنے اس کی درندگی بے بس تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا اور دو زانو بیٹھ گیا۔ میں نے دوسری گولی اس کے سر پر ماری۔ وہ اس کا رخسار توڑ کر سر میں گھس گئی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور اس کا لہو ایک ریلے کی طرح دروازے کی طرف بہتا چلا گیا۔

میری آنکھوں میں آتشیں سی لگی تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس کی لاش پر بھی گولیاں برسائی جائیں لیکن پھر خود پر ضبط کیا۔ عمران کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ اس کی بھرپور تائید کرتا ہے۔

”یہ بھی مر گیا ہے جی۔“ مبارک علی نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں ایک اور مقامی کی لاش پڑی تھی۔ کالے رنگ کا یہ دبلا پتلا شخص اس گھر کا سربراہ بلو رام تھا۔ اس کے جسم پر بھی کوڑھ تھا اور یہ کافی بڑھ چکا تھا۔ حکم نے اپنے اس حقیر ملازم کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا لیکن اس شخص نے حقِ نمک ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک رائفل بھی پڑی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ آخری لمحوں میں حکم اور اینڈرسن وغیرہ کے ساتھ مل کر وہ بھی ہم پر گولی چلاتا رہا ہے۔ میں نے دیکھا۔ کمرے میں رتنا دیوی کی لاش سے نکلنے والا خون اور اس کوڑھی اچھوت کا خون گھل مل گئے ہیں۔۔۔ سچ کہتے ہیں، موت ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو برابر کر دیتی ہے۔ ساری اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے۔

یہ بڑی عبرت ناک صورتِ حال تھی۔ زرگاں کے فرماں روا اور اس کے سپہ سالار نے جان بچانے کے لیے ایک ایسے شخص کے گھر میں پناہ لی، عام حالات میں جس کا سایہ بھی وہ خود پر پڑنے نہ دیتے۔ گھر کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ وہاں کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ ہاں، گندم رکھنے والے ایک بڑے مٹکے کے اندر سے ایک گٹھڑی دستیاب ہوئی۔ ایسی ہی ایک گٹھڑی ایک چارپائی کے نیچے سے ملی۔ یہ گٹھڑیاں زیورات اور جواہرات سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی مالیت لاکھوں میں نہیں، کروڑوں میں تھی۔ یہ اس بھانڈیل اسٹیٹ کے لوگوں کا خون پسینا تھا۔

”یہ دیکھو، ہمارا دوست اور راہنما۔“ عمران نے اس سفری بیگ کی طرف اشارہ کیا جو ایک جستی ٹرنک پر رکھا ہوا تھا۔ یہی بیگ تھا جس میں حاضر دماغ میڈم مغورا نے الیکٹرانک چپ ڈالی تھی۔ مبارک علی اور عمران نے تین چار منٹ کی کوشش سے وہ چپ ڈھونڈ نکالی۔

ہم باہر پہنچے تو دشوانا تھ عرف حکم جی کو بند جیپ میں بٹھایا جا چکا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”کتنا ہمدرد راجا ہے، زرگاں میں ہونے والے جانی نقصان پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔“

”زرگاں میں ہونے والے جانی نقصان پر نہیں، اپنی چہیتی بیٹی اور بیٹے کی موت پر۔“ میں نے کہا۔ ”زرگاں میں تو اس سے دس گنا نقصان بھی ہو جاتا تو اس کے کان پر جوں نہ رینگتی۔“

وہ بولا۔ ”دیکھو، تم کہتے ہو کہ ہم ٹی وی چینلز والے ہر واقعے کا منفی پہلو دیکھتے ہیں۔ اب تم خود منفی پہلو دیکھ رہے ہو۔ میرے خیال میں تو راجا صاحب کے رونے کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ اپنے بعد زرگاں کے انجام کا غم کر رہے ہیں۔ اب شراب خانوں میں دھڑا دھڑ شراب بنانے والے مزدوروں کے گھروں کے چولہے کیسے جلیں گے؟ اب کون خیال رکھے گا غریبوں کا اور ان کی خوب صورت بیٹیوں کا؟ اب مسکین انگریز پردیسیوں کی مہمان نوازیاں کس کے ذمے ہوں گی؟ اب یہاں ناچ گھروں میں رات دن خون پسینا ایک کرنے والی شریف عورتیں اور نیک خواجہ سرا زندگی کی گاڑی کیسے کھینچیں گے؟ اُف۔۔۔ ایسی پتا نہیں کتنی سوچیں چکرا رہی ہیں حکم صاحب کے دماغ میں۔“

ہماری آواز حکم تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن کمانڈوز اس کے لیے جو توہین آمیز نعرے لگا رہے تھے، وہ ضرور اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ یہ انجام تھا اس آرام طلب و عیش پرست شخص کا جس نے دنیاوی لذتوں کے بدلے ڈھیر رے ڈھیرے اپنے سارے اختیار عیار گوروں کے حوالے کر دیے تھے۔۔۔ اور یوں اپنے عوام کی بربادی کا سبب بنا تھا۔

عمران نے کہا۔ ”مجھے حکم کو دیکھ کر برادرِ محترم شہنشاہ جہانگیر صاحب یاد آ رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”سنا ہے کہ بھائی جہانگیر صاحب نے بھی آخری دنوں میں اپنے سارے اختیارات میڈم نور جہاں۔۔۔ ہم۔۔۔ میرا مطلب ہے ملکہ نور جہاں کے حوالے کر دیے تھے۔ لگتا ہے کہ یہاں زرگاں میں حکم نے بھی انگریزوں کے ساتھ کچھ اسی طرح کا پیکیج کیا ہوا تھا۔ کچھ نرم ملائم ”کچا گوشت“۔۔۔ دو تین کلو بھنا ہوا گوشت اور انگریزی شراب کی دو چار بوتلیں باقی سب کچھ انگریزوں کے پاس۔“

☆☆☆

یہ اگلے روز دوپہر کی بات ہے۔ چوہان کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ اپنے اس دیرینہ دوست اور ساتھی کو الوداع کرتے ہوئے میں کرب کے کئی جانکاہ مرحلوں سے گزرا۔۔۔ راج بھون میں اب جشن کا سماں تھا۔ راج بھون کے عظیم الشان دروازے عام لوگوں کے لیے کھول دیے گئے تھے۔ بھون کے اندرونی حصوں کے سوا وہ ہر جگہ دندنا رہے تھے۔ ناچ رہے تھے، گا رہے تھے۔ نعرہ زنی کی گونج سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خاص و عام ہمیں مبارک بادیں دے رہے تھے۔۔۔ ہماری تعریف کے پل باندھ رہے تھے اور میں اس ہجوم میں اس چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا جو عام لوگوں کے لیے اجنبی تھا لیکن زرگاں کی خون ریز لڑائی میں جس کا کردار اہم ترین تھا۔ میں طلال کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اور میری ہدایت پر اور بھی بہت سے

افراد اس کی تلاش میں تھے۔ وہ پتا نہیں کہاں کھو گیا تھا۔

چھوٹے سرکار کو راج بھون کے شاندار تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے دائیں بائیں درجنوں مصاحب اور خواص کی کرسیاں تھیں۔ مجھے اور عمران کو بھی وہیں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کے قریب نشستیں دی گئی تھیں۔ لیکن میں پچھلے ایک گھنٹے سے اپنی نشست پر موجود نہیں تھا۔ میں طلال کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

آخر طلال کا کھوج قبرستان میں ملا۔ ایک ہرکارے نے آکر بتایا کہ طلال کے حلیے سے ملتا جلتا ایک لڑکا قبرستان میں موجود ہے اور ایک قبر سے لپٹا رو رہا ہے۔ میں دو محافظوں اور اس ہرکارے کے ساتھ قبرستان میں پہنچا۔ میں نے طلال کو دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ سلطانہ کی قبر پر موجود تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا اور ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

باقی لوگ فاصلے پر ہی کھڑے رہے۔ میں آگے گیا اور طلال کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے اپنا تر بتر چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ بلند آواز سے رونے لگا۔ وہ بس ایک ہی فقرہ کہے جا رہا تھا۔ ”خالو جان... وہ چلی گئیں۔“

اس نے میری آنکھیں بھی ایک بار پھر نم کر دیں۔ ہم کافی دیر تک اس کی قبر پر موجود رہے اور اسے اپنے آنسوؤں کا خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے۔

راج بھون میں واپس آکر میں نے طلال کو چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب کے سامنے پیش کیا۔ میں نے کہا۔ ”جناب! زرگاں کی جنگ میں طلال کا کردار بڑا اہم رہا ہے۔“

چھوٹے سرکار نے طلال کو سرتاپا دیکھا۔ پھر اسے اپنے قریب بلایا اور کندھا تھپکا۔ مراد شاہ صاحب بولے۔ ”ہم نے سنا تھا کہ جب قاسمیہ چوک میں انور خاں اور کچھ دوسرے قیدیوں کو سولی چڑھایا جا رہا تھا تو چند راجپوت لڑکوں نے ہجوم سے نکل کر اچانک ہلا بول دیا تھا۔ کیا یہ ان میں شامل تھا؟“

میں نے کہا۔ ”جناب! یہ نہ صرف ان میں شامل تھا بلکہ ان کا لیڈر بھی تھا۔ یہ ان میں سب سے آگے تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں جناب کہ اس ساری لڑائی کا نقشہ بدلنے میں وہ واقعہ سب سے اہم تھا۔ یہ وہی موڑ تھا جہاں سے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی اور انہوں نے گارڈز پر حملہ کرنے کا حوصلہ کیا۔“

چھوٹے سرکار نے طلال کو بے حد تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ دوبارہ شاباش دی اور اس بار شاباش کے ساتھ ہی اپنے گلے سے سچے موتیوں کا ایک ہار نکالا اور طلال کو دیا۔ بہت جھجکتے ہوئے اس نے یہ ہار لے لیا۔ طلال کو اگلی نشستوں پر جگہ دی گئی۔ مراد شاہ صاحب نے اسی وقت طلال سمیت زندہ رہ جانے والے اور جان دینے والے ساتھیوں کے لیے مختلف انعامات اور مراعات کا اعلان کیا۔

ہمارا مقامی دوست کھتری بھرت کمار زخمی ہوا تھا اور سیکڑوں دوسرے زخمیوں کی طرح اس کا علاج بھی راج بھون کے ساتھ واقع شفا خانے میں ہو رہا تھا۔ میں اور عمران بھرت کو دیکھنے پہنچے۔ وہ اسی دھاری دار سویٹر میں تھا جس میں اسے گولی لگی تھی اور وہ چوکور برجی کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے گرا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اسے نکال دیا گیا تھا مگر اس کی حالت ابھی مکمل طور پر خطرے سے باہر نہیں تھی۔ گندمی رنگت والی خوش شکل چمپی اب بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ہولے ہولے اس کے پاؤں دبا رہی تھی اور ساتھ ہی ان پاؤں پر اپنے آنسو بھی گرا رہی تھی۔ مالا بھی وہیں موجود تھی اور تیمارداری میں اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ درحقیقت یہ دونوں لڑکیاں ہی تھیں جو بھرت کو یقینی موت کے منہ سے کھینچ کر لائی تھیں۔ میں نے چمپی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے دلاسا دیا۔ ”گھبراؤ نہیں، چمپی! یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری محبت نے اسے بچایا ہے اور تمہاری محبت ہی اسے زندہ بھی رکھے گی۔“

چمپی کے آنسو اور تیزی سے گرنے لگے۔ وہ یوں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی جیسے بہت بڑی مجرم ہو اور یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے، بس اسی کی بدقسمتی کا نتیجہ ہے۔ ہم بڑے ڈاکٹر سے ملے اور اسے بھرت کمار کے علاج اور نگہداشت کے سلسلے میں خصوصی ہدایات دیں۔

جب ہم واپس جانے والے تھے، اچانک چونک گئے۔ ہم نے بھرت کے والد کو دیکھا۔ وہ سفید براق دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ اپنے فربہ جسم کے ساتھ ڈگمگاتا اور مسلسل کھانستا ہوا بھرت کی طرف آ رہا تھا۔ چمپی نے اسے نہیں دیکھا کیونکہ وہ اس کے عقب میں تھا۔ کھانسی کی آواز سن کر چمپی پلٹی اور ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

بھرت کے والد نے دیکھ لیا تھا کہ چمپی بھرت کے پاؤں دبا رہی تھی۔ وہ ترخ کر بولا۔ ”تو یہاں کیا کرت ہے؟ تو نے چھوٹے مالک کو ہاتھ کیوں لگائے؟ تجھے دیا نا ہیں آئی؟ کیا کام تھا تیرا یہاں؟ کیا کام تھا؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے چمپی کو ٹہوکے دیے۔

مالا جھپٹ کر آگے بڑھی۔ اس نے بھرت کے پتا کو روکا اور کہا۔ ”چاچا جی! یہ لڑکی آپ کے بیٹے کو ہاتھ نہ لگاتی تو یہ اس وقت زندہ بھی نہ ہوتا۔ یہی ہے جو اسے برستی گولیوں سے نکال کر لائی ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

عمران نے کہا۔ ”مطلب تمہیں میں بتاتا ہوں۔ یہاں شور شرابا کرو گے تو اسپتال والے چپت مار مار کر تمہارا ٹنڈ لال کر دیں گے۔“

بھرت کا پتا ہکا بکا رہ گیا۔ اسے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ میری طرح عمران نے بھی چمپی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے کہا کہ وہ بھرت کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری جاری رکھے۔ مسلح گارڈز بھرت کے پریشان حال پتا کو لے کر باہر آ گئے۔ میں نے انچارج گارڈ کو سمجھایا کہ وہ بھرت کے اس خرد ماغ باپ کو ساری بات بتائے اور اسے وارننگ دے کہ اگر اس نے چمپی یا اس کی والدہ کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ ایک گارڈ نے بھرت کے والد کو بتا دیا تھا کہ اس سے مخاطب ہونے والے کون ہیں۔ میرا اور عمران کا تعارف بھرت کے والد کو ہکا بکا کرنے اور لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔

زرگاں کی لڑائی کا ایک اہم غدار... ہمارا سابقہ ساتھی عبدالرحیم بھی اسی اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ عمران نے اس کے سر پر رائفل کے دستے سے ایک تباہ کن ضرب لگائی تھی... جس کی وجہ سے وہ چار پانچ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ اب وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کی مرہم پٹی بھی ہو چکی تھی۔ اسپتال کے ہی ایک کمرے میں اس سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اس کے دو چار مزید ساتھی بھی اس مخبری والے ”کارِ خیر“ میں اس کے ساتھ شریک ہوں گے۔ تاہم ابھی تک عبدالرحیم نے اس بارے میں کچھ بتایا نہیں تھا۔ وہ ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا۔

ہم عبدالرحیم کے کمرے میں پہنچے۔ اسے ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ زنجیر کا سرا بیڈ کے ساتھ منسلک تھا۔ عبدالرحیم کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور شکل ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ عبدالرحیم سے پوچھ گچھ کی ساری ذمے داری حسنات احمد پر تھی۔ وہی پچھلے بارہ گھنٹے سے اس کے ساتھ سر کھپا رہا تھا۔ ہم پہنچے تو عبدالرحیم کا سر جھک گیا۔ وہ ہم سے نظریں ملانے کے قابل نہیں تھا...

حسنات احمد مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے رازداری سے کہا۔ ”بڑا سخت جان ہے۔ ابھی تک کوئی

جانکاری نا ہیں دی اس نے... لیکن جانکاری بہت ضروری ہے۔ ورنہ اس کی وجہ سے ہمیں مزید نقصان پہنچ سکت ہے۔ بہرحال، آپ بڑے اچھے سمے پر آئے ہیں۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ٹیکا لگوایا ہے۔ اس پر اثر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی زبان کا تالا کھل جاوے گا۔“ میں چونک گیا۔ ٹیکے سے حسنات کی مراد وہی درد والا ٹیکا تھا۔

دوسرے کمرے میں عبدالرحیم کے کراہنے کی آوازیں آنے لگی تھیں... یہ آوازیں بتدریج بلند ہو رہی تھیں۔ آج ہم پہلی بار اس سبز رنگ کے مہلک انجکشن کے اثرات ملاحظہ کر رہے تھے جو زرگاں میں دہشت کی علامت تھا۔ اس مہلک انجکشن کی ڈبل ڈوز کا مطلب ایک دردناک موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں تین خوبرو لڑکیوں کی وہ اکڑی ہوئی لاشیں یاد آئیں جو ہم نے ایک دن پہلے راج بھون کے عشرت کدے میں دیکھی تھیں۔

اور اب یہ سنگل ڈوز والا انجکشن عبدالرحیم کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہا تھا... حسنات احمد نے اس کمرے کی کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کروا دیے تھے تاکہ عبدالرحیم کی آہ و بکا باہر نہ جا سکے۔ عبدالرحیم کے چہرے پر ڈھیرے ڈھیرے اذیت کے آثار نمایاں ہوتے چلے گئے۔ پھر وہ تڑپنے لگا۔ ”میں مر گیا... مجھے بچاؤ... میں مر گیا۔“ وہ بار بار یہی الفاظ کہہ رہا تھا۔

وہ کبھی اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتا تھا۔ کبھی سینے پر... اسے جیسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تکلیف ہو کہاں رہی ہے۔ پھر وہ اپنے ہاتھ کی زنجیر کو دیوانہ وار جھٹکے دینے لگا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہ لاحاصل کوشش تھی۔ دو تین منٹ کے اندر اندر اس کی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ بیڈ پر سے ایک ایک بالشت اچھلنے لگا۔ وہ کند چھری سے ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلا رہا تھا۔ اس کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ پھر وہ چلاتے چلاتے بستر سے گر گیا۔ تڑپ تڑپ کر اس نے اپنے پاؤں زخمی کر لیے۔ جب تکلیف انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو انسان کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ بالکل جیسے سرکٹ بریکر کی وجہ سے مشین بند ہو جاتی ہے۔ لیکن سرجن اسٹیل کے بنائے ہوئے اس انجکشن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ بندے کو حتی الامکان حد تک ہوش میں بھی رکھتا تھا۔ یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔

”خدا کے لیے... خدا کے لیے۔“ عبدالرحیم ہولناک آواز میں پکارا۔

حسنات احمد کے اشارے پر ایک کمپاؤنڈر نے تین ایم ایل کا ایک انجکشن بھرا... حسنات نے عبدالرحیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمہیں درد کا انجکشن لگایا گیا ہے۔ اس دوسرے انجکشن سے پہلے انجکشن کا اثر ختم ہو جائے گا۔ صرف ایک منٹ لگے گا۔ لیکن پہلے تمہیں ہمارے سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔''

''میں بتاتا ہوں۔ خدا کے لیے... خدا کے لیے۔''

اس کا زیریں لباس گیلا ہو چکا تھا۔ جسم کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔

حسنات احمد نے جو جو کچھ پوچھا، عبدالرحیم بتاتا چلا گیا۔ ساتھ ساتھ وہ رحم کی بھیک بھی مانگتا جا رہا تھا... اس کی آواز کرب کی شدت سے پھٹ رہی تھی اور اس کے الفاظ سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ حسنات کے اشارے پر فربہ اندام کمپاؤنڈر نے مخصوص قسم کی پین کلر دوا عبدالرحیم کے مسل میں انجیکٹ کی۔ اس کام کے لیے تین افراد کو بڑی مضبوطی سے عبدالرحیم کو دبوچنا پڑا۔ ایک دو منٹ بعد عبدالرحیم کی غیر معمولی اذیت کم ہونا شروع ہو گئی۔ تاہم وہ حسنات کے سوالوں کے جواب روانی سے دے رہا تھا۔

میں اور عمران اسپتال کی عمارت سے باہر نکل آئے۔

عمران نے کہا۔ ''کاش میرے پاس کیمرا ہوتا، میں عبدالرحیم کے تڑپنے پھڑکنے کی فلم بنا سکتا۔ کتنا مزہ آتا اگر یہاں بھاٹڑیل اسٹیٹ میں بھی پندرہ بیس چینل کام کر رہے ہوتے۔ عبدالرحیم کی فلم بننے کے فوراً بعد میں اپنے ''فساد چینل'' پر پٹی چلانا شروع کر دیتا۔ ناظرین ہمیں مظلوم عبدالرحیم پر بدترین تشدد کی فوٹیج موصول ہو گئی ہے۔ جلد ہی آپ دیکھ سکیں گے۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے تک تو ناظرین کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ''کہیں جائیے گا مت۔'' ڈیڑھ دو گھنٹے میں کم از کم پندرہ سو اشتہارات دکھانے کے بعد ہم یہ فوٹیج چلاتے اور ساتھ میں بتاتے کہ 18 بچوں کے باپ عبدالرحیم نے چونکہ مبینہ طور پر اعلیٰ افسروں کو رشوت نہیں دی تھی اس لیے اس پر ظلم کی انتہا کر دی گئی ہے۔ ہم فوٹیج پر سرخ دائرے لگا لگا کر بتاتے کہ یہ عبدالرحیم کو ٹیکا لگایا جا رہا ہے... یہ تکلیف اور خوف کی وجہ سے اس کا پاجامہ گیلا ہوتا جا رہا ہے... یہ دیکھیے... یہ دیکھیے... یہ مزید گیلا ہو گیا ہے۔ اور یہ دیکھیے، اس تیسرے سرخ دائرے کے اندر یہ بندہ مسکرا رہا ہے۔ اسی نے رشوت طلب کی تھی۔ رات کے ٹاک شو میں ہم چار دانشوروں سے اس فوٹیج پر تبصرہ کراتے اور وہ بڑی آسانی سے درد کے اس انجکشن کے ڈانڈے امریکا کی اندرونی پالیسی اور نیو ورلڈ آرڈر سے جوڑ دیتے۔ عبدالرحیم کسی بڑے ایرانی سائنس دان کا اسسٹنٹ قرار پاتا۔''

''لیکن دو روز بعد یہ سب کچھ غلط ثابت ہو جاتا۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر کیا ہوتا۔ یہ ایک اور بریکنگ نیوز بن جاتی... عبدالرحیم مظلوم کے بجائے ظالم نکلا۔ اس سے کسی نے رشوت طلب نہیں کی تھی... اس کی بے وفائی اور غداری کے ٹھوس ثبوت منظر عام پر آ گئے... وغیرہ وغیرہ۔''

''چلو، تمہارا یہ چینل چینل کھیلنے والا شوق بھی جلد پورا ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب بھاٹڑیل اسٹیٹ سے ہماری واپسی کا وقت قریب آ گیا ہے۔''

''ہائے۔'' عمران نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا تیر مارا ہے تم نے دل پر۔ ایک دم ریماجی کی یاد آ گئی... وہ لاہور کی سڑکیں، وہ سردیوں کی سنہری دھوپ، وہ نہر کا کنارہ۔ وہ مزے مزے کے ریستوران......''

پھر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے بھی خاموشی نے گھیر لیا۔ سامنے بی بی زرگاں کا قبرستان نظر آ رہا تھا۔ وہ قبرستان جہاں سلطانہ دفن تھی۔ اپنی تمام تر سادگی، دلیری اور محبت کے ساتھ۔ مجھے پتا تھا کہ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا، مجھے یہ جگہ بہت یاد آئے گی۔ شیشم اور بیری کے پیڑوں کے نیچے وہ کچی قبر جس میں میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی سو رہی تھی۔ قریباً تین برس تک وہ شب و روز سائے کی طرح میرے ساتھ رہی تھی۔ اس کی قربانیوں نے مجھے زندہ رکھا اور اس کی بے لوث محبتوں نے میرے دل و دماغ میں انمٹ رستے بنائے۔ لیکن اب مجھے ہمیشہ کے لیے اسے یہاں چھوڑ کر جانا تھا۔ خوش آئند بات بس ایک ہی تھی۔ اس کی ایک نشانی میرے پاس موجود تھی۔

اچانک مجھے اور عمران کو چونکنا پڑا۔ اسپتال کی طرف سے دو گھڑ سوار گھوڑے بھگاتے چلے آ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا، ان کے عقب میں کھوسٹ بڑھیا کی پوتی بہو مالا بھی دوڑی چلی آ رہی تھی۔ یہ تینوں ہماری ہی طرف بڑھ رہے تھے۔ یقیناً کوئی بہت خاص بات تھی۔ ہم ٹھٹک کر رک گئے۔

''یا اللہ خیر۔'' عمران نے کہا۔ ''کیا ابھی کچھ ہونا باقی ہے سر؟''

دونوں گھڑسوار اور مالا ہمارے قریب آکر رک گئے۔ اتنے میں پانڈے کا اچھوت ماتحت امرناتھ بھی بھاگتا ہوا آیا اور ہمارے پاس آکر رک گیا۔

مالا نے ہانپی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کیا اور بولی۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، ماتا جی کہاں ہوں گی؟''

میں نے کہا۔ ''میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آج صبح کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ زندہ نہیں بچیں۔''

''یہ غلط ہے۔'' مالا نے کہا۔ ''میں پورے وشواس سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ زندہ ہیں۔ اس کا ثبوت ہمیں ابھی ابھی اسپتال سے ملا ہے۔''

''کیسا ثبوت؟'' عمران نے پوچھا۔

''پتا چلا ہے کہ رات کو کچھ لوگ اسپتال میں آئے تھے۔ انہیں جانکاری ملی تھی کہ یہاں اسپتال میں کوئی ایسی ناری موجود ہے جو ودھوا ہے اور اس کی عمر تیس بتیس ورش کے لگ بھگ ہے۔ ان لوگوں کو اسپتال میں تو ایسی عورت نہیں ملی مگر پھر پتا چلا کہ اسپتال کے صحن میں جو چھوٹا سا مندر ہے، وہاں ایک ایسی ودھوا عورت سیوا کا کام کرتی ہے۔ یہ لوگ اس عورت کے پاس پہنچے اور اسے ایک گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ دیکھنے والے نے بتایا ہے کہ گھوڑا گاڑی میں ایک بوڑھی عورت بھی موجود تھی جس نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دیکھنے والے کا وچار ہے کہ وہ کالے کپڑوں والی عورت ماتا جی ہی تھی۔''

''تم اپنی اس ساری بات سے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو مالا؟'' عمران نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ماتا جی نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنی عادت کے مطابق کوئی خطرناک شوشہ چھوڑنے والی ہیں۔ وہ اسپتال کے اندر سے ایک تیس ورش کی بیوہ عورت کو ڈھونڈ کر لے گئی ہیں۔ مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ میں نے تیس ورش کی بیوہ کا ذکر ماتا جی کی زبانی کسی پرانی رسم کے سلسلے میں سنا تھا۔ کوئی ایسی رسم جو بہت بری تھی۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے۔ پر میرا من کہہ رہا ہے کہ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔ ماتا جی کا کٹرپن اور ان کا ''میں نہ مانوں'' والا رویہ کوئی مصیبت کھڑی کرنے والا ہے۔''

امرناتھ نے لجاجت سے کہا۔ ''میں اس قابل تو نہیں ہوں جی لیکن اگر آپ کی اجازت ہو تو ایک مشورہ دیتا ہوں۔ ہم کو اس بارے میں پنڈت مہاراج سے پوچھنا چاہیے۔ ان کو بہت سی پوتھیاں اور شاستر یں منہ جبانی یاد ہیں۔ پنڈت مہاراج ہمیں فوراً بتا سکتے ہیں کہ اگر بھگوان نہ کرے ماتا جی کوئی بُری رسم ادا کرنے والی ہیں تو وہ کیا ہووے گی۔''

مالا نے فوراً تائید کی۔ ''میرا بھی خیال ہے کہ ہمیں فوراً ماتا جی کے ارادے کے بارے میں جاننا چاہیے۔ یہ بات تو طے ہے کہ کچھ لوگ اسپتال سے تیس ورش کی ودھوا ناری کو اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں۔ اور اگر اسے لے جانے والوں میں ماتا جی بھی ہیں تو پھر ہمیں جانکاری ہونی چاہیے کہ وہ کیا کرنا چاہ رہی ہیں۔''

تھوڑے سے مزید مشورے کے بعد ہم سیدھے راج بھون میں پنڈت مہاراج کے پاس پہنچے۔ پنڈت مہاراج کو عارضی طور پر راج بھون کے ایک رہائشی پورشن میں نظر بند کیا گیا تھا۔ پنڈت مہاراج اپنے لمبے بالوں اور اپنے گلے میں جھولنے والی درجنوں مالاؤں کے ساتھ لکڑی کی چوکی پر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ جارج گورا کے ساتھ میرے سامبر مقابلے سے پہلے اور مقابلے کے بعد بھی پنڈت مہاراج نے کچھ اچھے فیصلے دیے تھے اور ہمارے دل میں جگہ بنائی تھی لیکن آخر میں وہ بھی موقع پرستی اور مصلحتوں کا شکار ہوا تھا۔ دھرم کا منہ بند کرنے کے لیے پہلے مجھے، عمران اور حمیدہ کو آزاد کیا گیا تھا اور جب ہم ایک خاص حد سے آگے نکلے تھے تو ہمیں پھر سے پکڑنے کے لیے گھوڑے دوڑا دیے گئے تھے۔

آج اگر پنڈت مہاراج شرمسار اور سرنگوں نظر آرہا تھا تو اس کی وجہ وہی واقعات تھے۔ بہرحال، اس موقع پر ہم نے پنڈت مہاراج کو مزید شرمسار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے میں نے اسے تسلی تشفی دی اور اسے باور کرایا کہ دیگر دھرمی لوگوں اور پنڈتوں پجاریوں کی طرح اس سے بھی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ مالا نے پنڈت مہاراج سے وہ سوال پوچھے جو بڑی شدت سے اس کے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ اس نے تیس سالہ بیوہ کا ذکر کیا اور اس خونی رسم کا ذکر کیا جس کے بارے میں اس نے کوئی ادھوری سی بات کہیں سنی تھی۔

پنڈت مہاراج کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ وہ اس حوالے سے کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں سے ایک موٹی تگڑی قدیم شاستر کھولی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک تحریر کی نشاندہی کی۔ یہ سنسکرت میں تھی۔ مالا کی درخواست پر پنڈت مہاراج نے تحریر کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ وہ کچھ اس طرح تھا۔

''بھانڈیل کی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں جب بھی بھگوان کے سینکوں (سپاہیوں) کو دشمن کے خلاف یدھ (جنگ) میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے ہورا کی رسم کا سہارا لیا۔ ہورا کی رسم بلیدان کی وہ رسم ہے جس سے ہمیشہ

ہاری ہوئی جنگ جیتی گئی ہے۔ یہ بلیدان ایشور کو اتنا پسند آتا ہے کہ وہ کایا پلٹ دیتا ہے۔ انہونی، ہونی ہو جاتی ہے۔ اتہاس (تاریخ) میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔''

... نیچے کچھ مثالیں لکھی ہوئی تھیں۔

آخر میں درج تھا۔ ''ہورا کی رسم کے مطابق کالے رنگ کی تینتیس بکریوں کو جنگ کے میدان میں ترشول سے مارا جاتا ہے اور ان کے مُردہ جسم مٹی میں دبا دیے جاتے ہیں۔ اگر بالکل سیاہ رنگ کی تینتیس بکریاں میسر نہ آسکیں تو ان کے بدلے دو سیاہ ہتھنیوں کا بلیدان بھی دیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا کرنے کے باوجود بھی ورودھیوں (دشمنوں) کی شکست اور اپنی فتح کے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر اس سے بڑا بلیدان دیا جاتا ہے۔ ہورا کی اس دوسری رسم میں تین ناریوں کا بلیدان ہوتا ہے۔ ان تینوں ناریوں کو ودھوا ہونا چاہیے اور ان کی عمریں تیس سال سے کم نہ ہوں۔ یہ ناریاں دھرم کے پالن کے لیے اپنی خوشی اور اکھشا سے اپنا جیون قربان کریں... تو یہ بھی ہو نہیں سکتا کہ ہاری ہوئی جنگ جیتی ہوئی جنگ میں نہ بدل جائے۔''

اس کے علاوہ بھی اس رسم کے حوالے سے دو چار شرائط لکھی ہوئی تھیں۔

مالا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ پورے یقین سے بولی۔ ''اب مجھے سب کچھ یاد آگیا ہے۔ بے شک... بے شک یہی باتیں تھیں جو میں نے اپنے گھر میں اپنی دادی ساس سے سنی تھیں اور مجھے پورا وشواس ہے کہ یہاں بھی کچھ اسی طرح کا کام ہونے جا رہا ہے۔''

''لیکن آپ تو ایک عورت کی بات کر رہی ہیں۔ یہاں تین عورتوں کا ذکر ہے۔'' میں نے مالا سے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ ہو سکتا ہے کہ میری دادی ساس نے دو عورتوں کا انتظام پہلے سے کر رکھا ہو۔ وہ جو کام کرنے کی ٹھان لیوت ہیں پھر وہ کر گزرتی ہیں۔''

''اب سوچنے کی بات ہے کہ یہ کام کب اور کہاں ہوگا؟'' عمران نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ کسی ہجوم والی جگہ پر ہووے گا۔ جہاں بہت سارے لوگن اس کو دیکھ سکیں اور ان کے اندر جوش اور شکتی پیدا ہو سکے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ شہر کے ''زیادہ ہندو آبادی'' والے علاقے میں ماتاجی کو تلاش کرایا جائے۔ بہت سے بندوں کو فوری طور پر اس کام پر لگا دیا جاوے۔ یہ بھی ہو سکت ہے کہ ماتاجی اور ان کے قریبی ساتھیوں نے کسی مندر یا دھرم شالے میں پناہ لے رکھی ہو۔''

مالا کی رائے میں وزن تھا۔ ہم نے وہیں کھڑے کھڑے مشورہ کیا۔ فوری طور پر مبارک علی کو بلایا گیا اور اسے ساری صورت حال بتا کر تلاش کی ذمے داری سونپ دی گئی۔

ہم دوبارہ راج بھون کے دربار میں پہنچے تو وہاں فتح کا جشن جاری تھا۔ یہاں ہماری ملاقات اپنے ایک پرانے ساتھی اجے سے بھی ہوئی۔ اجے نل پانی کی فوج میں کپتان تھا۔ وہ انور خاں کے ساتھ ہی یہاں زرگاں میں پہنچا تھا۔

اب یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہو چکی تھی کہ زرگاں کے حکمراں وشوا ناتھ عرف حکم جی نے جان بچانے کے لیے ایک کوڑھ زدہ بھنگی کے گھر میں پناہ لی تھی اور اسے وہیں سے پکڑا گیا ہے۔ رتنا دیوی کی اتفاقیہ موت کی خبر بھی ہر جگہ پھیل چکی تھی۔ انگریز کمان دار ایڈرسن کی لاش راج بھون میں لائی جا چکی تھی۔ اس کی لاش کو کڑی حفاظت میں رکھا گیا تھا ورنہ فیارڈ اور پانڈے کی لاش کی طرح وہ بھی لوگوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنتی۔

چھوٹے سرکار نے اپنے بڑے بھائی حکم جی کے لیے فی الحال نظر بندی کے احکام جاری کیے تھے۔ اس سے ضروری کاغذات پر دستخط وغیرہ کرانے کے بعد اسے اپنے اہلِ خانہ کی آخری رسومات میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کا ٹھکانا راج بھون کا تہ خانہ تھا۔ کچھ دیر بعد حسنات احمد بھی دربار میں پہنچ گیا۔ وہ اسپتال میں انور خاں کے غدار ساتھی عبدالرحیم سے تفتیش کر کے یہاں پہنچا تھا۔ درد کا انجکشن جو پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کرتا تھا، عبدالرحیم کی زبان کھلوانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

حسنات احمد نے بتایا۔ ''عبدالرحیم نے انگریز افسر فیارڈ کے ساتھ معاملہ طے کیا تھا۔ راج بھون کی ایک ''پری'' عبدالرحیم کے پیچھے لگائی گئی۔ اس نے ایک ہی رات میں نہ صرف عبدالرحیم کو شیشے میں اتار لیا بلکہ عبدالرحیم کے ذریعے انور خاں کے دو تین اور ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ فیارڈ کی طرف سے ان افراد کو فی کس پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ ہوا اور ایک ایک لاکھ روپیا نقد فراہم کیا گیا۔ عبدالرحیم کو خصوصی رشوت کے طور پر زرگاں کی ایک قیمتی زمین دینے کا وچن بھی دیا گیا۔''

''باقی لوگ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ انور خاں کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ ان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں اور شہر کے ناکوں پر ان کے لیے خاص ہدایتیں جاری کر دی گئی ہیں۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک پیغام رساں بڑی

تیزی سے وہاں پہنچا۔ اس نے حسنات کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کچھ گفتگو کی۔ حسنات نے مجھے اور عمران کو بھی بلا لیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔

''بڑھیا کی کارستانی سامنے آگئی ہے جی۔'' حسنات نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''وہ قاسمیہ کے قریب دھرم شالے میں موجود ہے۔ وہی دھرم شالہ جس کے مینار پر چڑھ کر اس نے تین دن پہلے پوجا پاٹ کی تھی۔''

''کیا کسی نے اسے دیکھا ہے وہاں؟'' کپتان اجے نے پوچھا۔

''ابھی دیکھا تو نا ہیں لیکن امید ہے کہ وہ خانہ خراب بھی وہیں پر ملے گی۔ جس ودھوا عورت کو وہ اسپتال کے مندر سے اپنے ساتھ لے کر گئی تھی، وہ دھرم شالے کے مینارے پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور عورت بھی ہے۔ دونوں عورتیں آتما ہتھیا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہاں بہت سے ہندو جمع ہو گئے ہیں اور نعرے وغیرہ لگا رہے ہیں... مجھے لگت ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں تیسری عورت بھی مینارے پر چڑھ جاوے گی اور پھر رسم کے مطابق یہ تینوں ودھوائیں آتما ہتھیا کر لیویں گی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہورا کی رسم کے مطابق، ہاری ہوئی جنگ کو جیتنے کے لیے قربانی دیں گی۔'' میں نے کہا۔

حسنات نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بالکل ایسا ہی ہے جی۔ لگت تو یہی ہے کہ وہ سیکڑوں لوگن کے سامنے مینارے سے چھلانگ لگا دیویں گی... اور شہر میں ایک نئے فساد کی شروعات ہو جاوے گی۔''

''نہیں، اب کوئی فساد نہیں ہوگا۔'' عمران نے یقین سے کہا۔ ''فساد کرنے والوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ پھر بھی ہمیں اس معاملے کو پوری سنجیدگی سے لینا چاہیے اور فوری سدباب کرنا چاہیے۔''

حسنات نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے جی کہ فساد کی اصل جڑ بڑھیا بھی دھرم شالے کے اندر ہی ہے۔ وہی ان تین عورتوں کو اس خونی کھیل کے لیے تیار کر رہی ہے۔''

میں، عمران، اجے اور حسنات فوراً وہاں سے روانہ ہوئے۔ ایک بند فوجی گاڑی میں ہم بیس منٹ کے اندر ایک بار پھر قاسمیہ کے نواح میں پہنچ گئے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ لوگ جگہ جگہ ٹولیوں کی شکل میں جمع تھے۔ نل پانی کے سپاہیوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ہر طرف طربیہ ماحول کی جھلکیاں تھیں مگر جب ہم دھرم شالے کے نواح میں پہنچے تو وہاں کچھ اور طرح کی فضا دکھائی دی۔ وسیع دھرم شالے کے بیچوں بیچ

ایک تالاب میں کھڑا چوکور مینار لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا... اردگرد کی چھتوں اور گلیوں میں چار پانچ سو افراد جمع ہو چکے تھے اور ابھی مزید آ رہے تھے۔ بلند و بالا مینار پر ہمیں دو عورتیں نظر آئیں۔ دونوں نے گہرے زرد رنگ کے چولے پہن رکھے تھے۔ انہوں نے بال کھولے ہوئے تھے اور اپنے سروں کو ہیجانی انداز میں ہلا کر کچھ اشلوک وغیرہ پڑھ رہی تھیں۔

''تیسری عورت نظر نہیں آ رہی۔'' میں نے حسنات احمد سے پوچھا۔

''شاید اسی کا انتظار ہو رہا ہے۔'' حسنات احمد نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اب زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' عمران نے کہا۔

ہم بند فوجی گاڑی کے اندر ہی بیٹھے تھے۔ اردگرد کسی شخص کو معلوم نہیں تھا کہ اس گاڑی میں اہم لوگ موجود ہیں لیکن پھر بھی دھرم شالا کے ایک پجاری کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ یہ ادھیڑ عمر شخص تیزی سے گاڑی کی طرف آیا اور کھڑکی کے شیشے سے چمٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ فریادی انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ مینار کی بلندی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''اسے اندر آنے دو۔'' عمران نے حسنات احمد سے کہا۔

حسنات نے دروازہ کھول لیا اور اسے گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا اور فریاد کناں لہجے میں بولا۔ ''ان دونوں ناریوں کا جیون بچاؤ جی۔ یہ آتما ہتھیا کر لیویں گی۔ بڑی ماتا ان کو آتما ہتھیا پر مجبور کر دیوے گی۔ یہاں جو کچھ ہونے جا رہا ہے... وہ بڑی ماتا ہی کروا رہی ہے۔ پرنتو! وہ وہی کچھ کرت ہے جو اس کے اپنے من میں آوت ہے۔''

عمران نے پوچھا۔ ''وہ ان کو آتما ہتھیا پر کیوں مجبور کر رہی ہے؟''

جواب میں ادھیڑ عمر پجاری نے قریباً وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے مالا نے بتایا تھا۔ ادھیڑ عمر پجاری نے ''ہورا'' کی رسم کا ذکر کیا اور بتایا کہ کچھ لوگوں کے عقیدے کے مطابق اگر تین ودھوا ناریاں جن کی عمریں تیس سال سے زیادہ اور پینتیس سال سے کم ہوں، اپنی مرضی سے اپنے جیون کی بلی دیں تو ہاری ہوئی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ ادھیڑ عمر پجاری نے یہ بھی بتایا کہ دو ودھوا عورتیں مینار پر چڑھ گئی ہیں۔ دھرم شالا کے اندر سے ہی ایک تیسری عورت کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔ بس چند منٹ میں وہ بھی مینار کے اوپر نظر آئے گی اور پھر تینوں عورتیں مینار سے چھلانگ لگا کر خود کو ختم کر لیں گی۔

عمران نے کہا۔ ''ہمیں ہورا کی اس رسم کے بارے میں پنڈت مہاراج نے ایک شاستر میں سے پڑھ کر بتایا تھا۔ کیا تمہارے پاس بھی کوئی ایسی شاستر یا پوتھی ہے؟''

''کیوں ناہیں جی... دھرم شالا میں ایسی کئی پوتھیاں ہیں جن میں یہ سب کچھ لکھا ہے۔''

''کیا تم کوئی ایسی پوتھی ہمیں دکھا سکتے ہو؟''

''بالکل دکھا سکتا ہوں جی... مگر ابھی سمے بہت کم ہے۔ آپ پہلے ان ناریوں کا جیون بچانے کے لیے کچھ کریں۔''

''جیون ضرور بچے گا، تم گھبراؤ مت۔ تم فٹافٹ اندر سے کوئی پوتھی لے کر آؤ۔ جلدی کرو۔'' عمران نے پجاری کو تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا۔

وہ چاروناچار گاڑی سے اترا اور اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا دھرم شالے کے دروازے کی طرف بھاگا۔ دھرم شالے کے اردگرد ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔ مینار پر چڑھی ہوئی عورتوں کا انداز مزید ہیجانی ہوگیا تھا۔

ادھیڑ عمر پنڈت فقط دو تین منٹ میں واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور کتاب کی ورق گردانی کرتا چلا آرہا تھا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے گرم صافوں میں چھپائے اور کپتان اجے کے ساتھ گاڑی سے نکل آئے۔ ہم نے ادھیڑ عمر پجاری کو بھی ساتھ لے لیا۔ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ہم مینار کے داخلی دروازے تک پہنچ گئے۔ یہاں بھی ہندو اور مسلمان سپاہی موجود تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹا جائے۔

ہم نے طویل سیڑھیاں طے کیں اور مینار کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں سے زرگاں کی آبادی دور تک دکھائی دیتی تھی۔ تاسمیہ کا پرانا قلعہ، راج بھون کے چمکتے ہوئے کلس، لال بھون کی اونچی چھتیں، شہر کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہوئی نہر اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

گہرے زرد لباس والی دونوں عورتیں ہمیں دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ ان دونوں کے سانولے چہروں پر عجیب سی جنونی کیفیت تھی۔ ''کک... کون ہو تم؟'' ایک عورت نے پوچھا۔

''میں اجے کمار ہوں، آپ دونوں کی مدد کے لیے مجھے بڑی ماتا نے کہا ہے۔'' اجے کمار آگے بڑھ کر بولا۔

''ہماری تیسری بہن کہاں ہے؟'' عورت نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔ تیسری بہن سے اس کی مراد اپنی تیسری ساتھی تھی۔

''وہ بس آرہی ہے۔'' اجے نے مبہم جواب دیا۔

جب اجے کمار دونوں عورتوں سے مکالمہ کررہا تھا، میں اور عمران پندرہ بیس سیڑھیاں نیچے اترے اور بڑی ماتا کو تلاش کرتے ہوئے ایک چھوٹی سی حجرہ نما جگہ پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ مینار کے اندر ہی واقع تھی۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں سنتیس کی کھوسٹ دادی یعنی بڑی ماتا تین عورتوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تینوں عورتیں یہاں کی پجارنیں تھیں۔ ایک چوتھی عورت فرش پر گری ہوئی تھی اور اس کے سانولے سلونے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے جارہے تھے۔ اس فرش بوس عورت نے بھی اوپر والی عورتوں کی طرح گہرے زرد رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

ہمیں دیکھ کر بڑی ماتا اور اس کی ساتھی عورتیں بری طرح ٹھٹکیں۔ ''کون ہو تم؟'' بڑی بی یعنی بڑی ماتا نے کڑک کر پوچھا۔

''ہمیں اوپر والے نے بھیجا ہے۔'' عمران بڑے اطمینان سے بولا۔ ''دراصل آپ دھرم کے لیے اتنا کچھ کر رہی ہیں کہ اوپر والے کو آپ پر پیار آگیا ہے۔ وہ اب آپ کی ساری پریشانیاں ختم کرنا چاہتا ہے۔ سورگ کی ٹھنڈی ہوائیں آپ کا انتظار کررہی ہیں۔''

''کیا بکتے ہو... کون ہو تم؟'' بڑھیا بھڑک اٹھی۔

''میں موت کے دیوتا کا اردلی ہوں۔ آپ کو سنسار کے دکھوں سے نجات دلانے آیا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں... مکتی دلانے آیا ہوں۔''

غیر معمولی پیرانہ سالی کے باوجود بڑھیا کی یادداشت غضب کی تھی۔ اس نے عمران کی آواز پہچان لی۔ ''کون ہو تم؟ میں کہتی ہوں یہ کپڑا ہٹاؤ اپنے منہ سے۔''

عمران نے کپڑا ہٹا دیا۔ میں نے بھی ہٹا دیا۔ بڑھیا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تو تم یہاں بھی آگئے ہو ملعونو... سورے... مردود...''

''بس آپ کا پیار کھینچ لایا ہے ہمیں۔ ہم آپ کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتے۔'' عمران نے اپنے لباس میں سے بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ تینوں عورتیں چلا کر ایک کونے میں سمٹ گئیں۔

بڑھیا عمران کو مارنے دوڑی۔ عمران نے اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ وہ کسی بدروح کی طرح چلانے لگی۔

اس کی ایک ساتھی عورت لرز کر بولی۔ ''بھگوان کی مار سے ڈرو۔ چھوڑ دو ان کو۔ تم کو کچھ پتا نا ہیں تم کیا کررہے ہو۔''

''ہمیں پتا ہے، ہم کیا کررہے ہیں۔ اور یہ بھی پتا ہے کہ تم کیا کررہی ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''تم نے دو عورتوں کو قربانی کی بکریاں بنالیا ہے اور انہیں اوپر چڑھادیا ہے۔ اب اس تیسری کو تیار کرنے کی ناکام کوشش کررہی ہو۔ یہ بےچاری موت کے خوف سے بےہوش پڑی ہوئی ہے۔ تم اسے ہوش میں لانا چاہ رہی ہو تاکہ اسے دھرم کا واسطہ دے کر آخری سفر پر روانہ فرما سکو۔''

بڑھیا خود کو چھڑانے کے لیے مسلسل جدوجہد کررہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ مدد کے لیے پکار بھی رہی تھی۔ ہم اسے حجرے سے باہر لے آئے۔ باقی عورتوں کو اندر ہی رہنے دیا۔ حجرے کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھادی گئی۔ ہم شور مچاتی بڑھیا کو لے کر اوپر اس جگہ آگئے جہاں بلی دینے والی دونوں بیوہ عورتیں موجود تھیں۔ ادھیڑ عمر پجاری اور اجے ان کو باتوں میں مصروف رکھے ہوئے تھے۔ بڑی ماتا کو ہمارے ساتھ دیکھ کر یہ دونوں عورتیں بھی ہکا بکا رہ گئیں۔ بڑی ماتا عمران کو بددعائیں دے رہی تھی اور بدترین گالیوں سے نواز رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اس کا منہ نوچنے کی کوشش بھی کررہی تھی۔ عمران کی گردن سے خون رسنے لگا تھا۔ تاہم وہ یہ سب بڑے تحمل سے برداشت کررہا تھا۔

اوپر پہنچ کر عمران نے بڑھیا کی دونوں کلائیاں اجے کمار کے حوالے کردیں تاکہ وہ اسے سنبھال کر رکھے پھر اس نے پجاری سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''پجاری جی! تم ''ہورا'' کے بارے میں پوتھی کی تحریر پڑھ کر سناؤ۔''

پریشان حال پجاری نے تحریر پڑھی۔ یہ پوری تحریر کچھ اس طرح تھی۔ ''رسم کے مطابق تینتیس کالی بکریوں کو جنگ کے میدان میں ترشول سے مارا جاتا ہے اور ان کے جسم مٹی میں دبا دیے جاتے ہیں۔ اگر بالکل سیاہ رنگ کی تینتیس بکریاں میسر نہ آسکیں تو ان کے بدلے دو سیاہ بھینسوں کا بلیدان بھی دیا جاسکتا ہے۔ ایسا کرنے کے باوجود بھی اگر وجے (فتح) کے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر اس سے بڑا بلیدان دیا جاتا ہے۔ اس میں تین ناریوں کا بلیدان ہوتا ہے۔ ان ناریوں کو ودھوا ہونا چاہیے اور ان کی عمریں تیس پینتیس سال کے درمیان ہوں۔ یہ ناریاں اپنی مرضی سے اپنا جیون قربان کریں... تو یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ ہاری ہوئی جنگ جیتی ہوئی جنگ میں نہ بدل جائے۔ اگر کسی کارن تیس سال کی تین ودھوا ناریاں نہ مل سکیں تو پھر مجبوری کی صورت میں تیس سال سے تین گنا عمر والی ودھوا ناری بھی یہ بلیدان دے سکتی ہے۔''

عمران نے اجے کمار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اجے! مجھے لگتا ہے کہ اس دھرمی تحریر میں یہ آخری فقرہ سب سے اہم ہے...''

میری طرح بات اجے کی سمجھ میں بھی آچکی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو عمران بھائی۔ اس طرف تو پہلے ہم میں سے کسی کا دھیان ہی ناہیں گیا۔''

پھر اجے ادھیڑ عمر پجاری سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''آپ کا کیا وچار ہے پجاری جی۔ اگر شرط کے مطابق تین ناریاں نہ مل سکیں تو پھر ایک ہی بڑی عمر کی ناری کی قربانی ہو سکت ہے؟''

گمبھیر صورت حال کی وجہ سے... پجاری تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تحریر کو پھر پڑھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے اپنا مٹکا سا سر اثبات میں ہلایا۔ ''جی ہاں... ایسا ہو سکت ہے۔ شبدوں میں یہی کچھ لکھا ہے۔ میں نے پنڈت مہاراج سے بھی اس بارے میں سنا تھا۔''

پجاری کی بات سن کر زرد لباس والی دونوں عورتوں کے دھواں دھواں چہروں پر ہلکی سی چمک نظر آئی۔ بڑی ماتا کی صورت مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتن جیسی ہوگئی۔ وہ تڑپ کر بولی۔ ''اپنی بک بک بند کرو منحوسو! چھوڑ دو مجھے...'' مینار کے نیچے کھڑے سیکڑوں لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے واویلا کرنے لگی لیکن اس کی آواز وضاحت سے نیچے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اگلے دو تین منٹ میں کپتان اجے، ادھیڑ عمر پجاری اور بڑی ماتا کے درمیان زوردار مکالمہ ہوا۔ پہلے اجے اور پھر پجاری نے بھی بڑی ماتا کو قائل کرنا چاہا کہ اگر وہ ہورا کی رسم ادا کرنا ہی چاہتی ہے اور اس کے لیے شبھ گھڑی بھی نکال چکی ہے تو پھر خود یہ قربانی دے... کیونکہ شرائط کے مطابق تین عورتیں میسر نہیں ہیں۔ نہایت سنگین اور عبرت ناک ہونے کے باوجود یہ صورت حال کسی حد تک دلچسپ بھی تھی۔ بڑی ماتا اپنے جیون کی نوے سے زیادہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ اس کی انتہا پسندی اور کٹرپن کی وجہ سے اب تک نہ جانے کتنے نوجوانوں کی جانیں گئی تھیں لیکن وہ اب بھی جینا چاہتی تھی۔ وہ ''ہورا'' کے حوالے سے کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی اور ہمارے ہاتھوں سے نکل نکل جارہی تھی۔

اجے نے ابھی تک اسے دونوں کلائیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اب اجے کا چہرہ غصے سے سرخ دکھائی دینے لگا تھا۔ بڑی ماتا کی ایک گندی گالی کے جواب میں وہ چیخ کر بولا۔ ''دھرم تمہاری مرضی کا نام ناہیں ہے بڑھیا۔ دھرم کے پالن کے لیے اور ہندو جاتی کا نام اونچا کرنے کے لیے اگر یہ عورتیں قربانی دے سکت ہیں تو تم بھی دے سکت ہو۔ تم ودھوا ہو۔

تمہاری عمر بھی تیس سے تین گنا یعنی نوّے ورش سے اوپر ہے۔ پھر تم کیوں آگے ناہیں آتی ہو؟ تم دوسروں کو سورگ کی خوش خبریاں سناوت ہو، اب جب سورگ کے لیے تمہاری اپنی ٹکٹ پکی ہو رہی ہے تو تم بھاگ رہی ہو۔“

وہ پوپلے منہ سے اجے کو کوس رہی تھی۔ اسے گالیاں دے رہی تھی۔ اس نے اجے کے منہ پر تھوکنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ ایک جگہ اچانک اجے کا پاؤں پھسلا۔ بڑی بی کی کلائیوں پر اس کی گرفت کمزور ہوئی۔ وہ ایک دم اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اس نے تیزی سے سیڑھیاں اترنا چاہیں مگر اس کی اپنی ہی سفید ساڑی اس کے پاؤں میں الجھی۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اسے تھامتا، وہ وہیں پندرہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے گری۔ اس کا سر شدت کے ساتھ پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ میں سیڑھیوں کے پاس تھا۔ میں لپک کر اس تک پہنچا، اسے اٹھایا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ وہ شدید زخمی ہو چکی تھی۔

اسی دوران میں امرناتھ اور مالا بھی کچھ دیگر افراد کے ساتھ مینار پر پہنچ چکے تھے۔ ہم نے بڑھیا کو حجرہ نما کمرے میں لٹا دیا۔ امرناتھ تو نیچے دوڑا تاکہ اس کے لیے طبی امداد لا سکے۔ اندازہ ہوا کہ بڑھیا آخری سانسیں لے رہی ہے۔ مالا نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ پکارتی چلی گئی۔ ”دادی جی... دادی جی۔“ اس کی آواز دکھ کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

دادی نے اپنی سفید سفید آنکھوں سے مالا کو دیکھا۔ ان لمحوں میں بھی اس کی آنکھوں میں اپنی پوتی بہو کے لیے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دھرم شالا کا ایک سیوک گنگا جل لے آیا۔ مالا نے گنگا جل بڑی ماتا کے منہ میں ٹپکانا چاہا مگر اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ وہ اپنا سر مالا کی گود سے نکالنا چاہ رہی تھی۔ یہی وہ کہنہ ہٹ دھرمی ہے جو ہزار ہا سال سے انسان کے اندر سفر کر رہی ہے۔ یہ جب ایک بار دل میں جگہ بناتی ہے تو آخری سانس تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس ہٹ دھرمی کا سرچشمہ اکثر فرسودہ عقیدے ہی ہوتے ہیں۔

مالا سمجھ گئی کہ وہ اپنی دادی ساس کے آخری لمحات کو مزید اذیت ناک بنا رہی ہے۔ اس نے دادی ساس کا لہولہو سر چوما اور پھر یہ سر ایک خدمت گار عورت کی گود میں دے دیا۔ بڑی بی نے خدمت گار عورت کے ہاتھ سے گنگا جل پیا۔ کچھ دیر کھینچ کھینچ کر سانس لیتی رہی پھر بے ہوش ہو گئی۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں چند منٹ بعد اس کی نبض رک گئی۔ وہ جا چکی تھی... جذبات میں آ کر رسم کے لیے تیار ہو جانے والی دونوں بیوہ عورتیں اب اجے کمار کے سپاہیوں کی تحویل میں تھیں۔ انہیں حفاظت سے نیچے اتار لیا گیا۔

☆☆☆

دو تین روز کے اندر زرگاں میں حالات معمول پر آنے لگے۔ ہمارا یار غار اسد اب فتح پور سے زرگاں پہنچ چکا تھا۔ نوری بھی اس کے ساتھ تھی۔ اسد نے بتایا تھا کہ تاؤ افضل اپنی بیٹیوں سمیت بالکل خیریت سے ہے۔ فتح پور کے نئے مکھیا نے تاؤ افضل اور اس کی بیٹیوں کی حفاظت کی پوری ذمے داری لی تھی۔ اسد اور نوری کو سلطانہ کی موت کی اطلاع مندر میں ہی مل گئی تھی مگر انہیں ابھی تک اس کا یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ دیر تک روتے رہے۔ وہ اس بات پر بھی ششدر تھے کہ بظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا چوکیدار آفتاب ایک انتہا پسند گروہ کا حصہ تھا... اور وہ اپنی موت کے ساتھ ساتھ سلطانہ کی بے وقت موت کا سبب بھی بنا تھا۔

اقبال نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ مجھے ایک پوٹلی تھمائی اور بولا۔ ”اس میں سلطانہ بھابی کی چیزیں ہیں اور وہ زیور بھی جو وہ مندر کے تہ خانے میں چھوڑ آئی تھیں۔“

میں نے لرزتے ہاتھوں سے پوٹلی کھولی۔ ایک تھیلی میں رکھے ہوئے وہ گہنے میری نگاہوں میں جگمگانے لگے جو اس کے جسم اور چہرے پر دمکا کرتے تھے۔ میں نے تھیلی بند کر دی۔ گٹھڑی کی دیگر اشیا میں اس کے استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ تھوڑی سی نقدی جو ایک رومال میں بندھی ہوئی تھی۔ عطر کی ایک چھوٹی شیشی جو میں نے اسے نل پانی میں دی تھی۔ کچھ تصویریں جن میں ایک بڑی تصویر ہمارے بالو کی تھی۔ بالو سے دور ہو کر اس نے نہ جانے کتنی بار اس تصویر کو چوما ہوگا، اس کے لیے روئی ہوگی۔ اس تصویر کی دید نے میری آنکھیں بھی نم کر دیں۔

میں اسد کو لے کر ایک بار پھر سلطانہ کی قبر پر گیا۔ ہم دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ اسے آنسوؤں کا خراج پیش کرتے رہے۔ وہ جو کچھ بھی تھی، جارج گورا اور حکم جیسے لوگوں کے جبر کا ردعمل تھی۔ پھر وہ آفتاب اور ہاشم جیسے شدت پسندوں کے ہتھے چڑھ گئی اور نادانستہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

میں اور اسد قبرستان سے واپس آئے تو حسنات میرا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ پی کیپ والے اس لڑکے کو میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ ڈاکٹر لی وان کا بھتیجا تھا۔ عمران نے اس کی جان بڑے ڈرامائی انداز میں بچائی تھی۔ ہاشم اس لڑکے کو شوٹ کرنا چاہتا تھا مگر بالکل آخری لمحات میں عمران نے ایک صحیح نشانہ لگا کر ہاشم کو شوٹ کر دیا تھا۔

میں نے لی وان کے بھتیجے کو گلے سے لگایا۔ حسنات نے کہا۔ ”جناب! یہ آج صبح مجھ سے ملا تھا۔ اس کے پاس آپ کے لیے ایک چیز تھی۔ اس نے مجھے دی اور کہا کہ آپ تک پہنچا دوں لیکن میں نے کہا کہ تم خود ہی پہنچاؤ تو بہتر ہے۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے لڑکے کو دیکھا۔

اس نے واسکٹ کی جیب میں سے ایک تہ شدہ لفافہ نکالا اور مجھے تھما دیا۔ ”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ ”یہ آپ کے لیے ہے۔ مجھے آپ کی وائف نے دیا تھا۔“

”سلطانہ نے؟“

”جی ہاں۔“

”کب دیا تھا؟“

”جب ہم اسپتال میں بند تھے۔“

میں نے اس بارے میں لی وان کے بھتیجے سے تھوڑی سی تفصیل پوچھی۔ پتا چلا کہ اٹھرا گاؤں میں جب آفتاب اور ہاشم نے ہندو اور مسلمان مریضوں کو یرغمال بنا رکھا تھا اور حالات خراب سے خراب ہو رہے تھے تو سلطانہ نے یہ رقعہ اس کو دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اسے مجھ تک پہنچا دے۔

لی وان کے بھتیجے اور حسنات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں کمرے میں آیا اور بلب کی روشنی میں یہ تحریر پڑھی۔ میری نم آنکھوں میں تازہ آنسو امڈ آئے۔ سارے واقعات ذہن میں پھر تازہ ہو گئے۔ یہ ڈاکٹر لی وان کے نسخہ جات والے پیڈ کا کاغذ تھا۔ اس کاغذ پر سلطانہ نے نیلی روشنائی سے لکھا تھا۔ ”مہروج! امید بندھ کر پھر ٹوٹ گئی ہے۔ حالات خراب ہو گئے ہیں۔ ہاشم نازی اس بات پر بالکل تیار ناہیں کہ ہم ماریا کو یہاں آزاد کریں۔ وہ اسے نل پانی جا کر رہا کرنا چاہتے ہیں۔ ماریا کے وارثوں کو یہ بات قبول ناہیں۔ اللہ جانے اب کیا ہو سکیں گا۔ ایک ایک کر کے لوگن مرنا شروع ہو جائیں گے اور پھر... شاید... میری باری بھی آ جائے۔ مہروج! اگر ایسا ہو گیا تو تم میرے بالو کا بہت خیال رکھنا۔ اسے زندگی میں کوئی دکھ نہ ہونے دینا۔ اسے یہ بھی مت بتانا کہ اس کی ماں کے ساتھ کیا اور کیوں ہوا تھا۔

”اور ہاں مہروج! ایک بہت اہم ضروری بات بھی تم سے کرنی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم بہت بہت اچھے ہو۔ تم نے میرا بہت بہت خیال رکھا ہے۔ لیکن تم محبت صرف اور صرف اس لڑکی سے کرتے ہو جو پاکستان میں تم سے بچھڑ گئی

تھی۔ تم بھول گئے ہو لیکن میں ناہیں بھولی۔ جب تم اپنے ہوش میں ناہیں تھے، میں نے راتوں کے اندھیروں میں تمہیں اس لڑکی کے لیے سسکتے اور روتے دیکھا ہے۔ اس کے لیے تڑپتے دیکھا ہے۔ جیسے کوئی بے کل پرندہ اپنا پنجرہ توڑ کر نکلنا چاہتا ہو۔ تم بھی اس راجواڑے کا پنجرہ توڑ کر ثروت تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اور مجھے وشواس ہے، تم اب بھی چاہتے ہو گے۔ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو مہروج۔ اور اگر تم کرتے ہو تو وہ کیوں نہ کرتی ہوئے گی۔ وہ جہاں بھی ہوئے گی، تمہاری راہ دیکھ رہی ہوئے گی۔ ضرور دیکھ رہی ہوئے گی۔ تم اسے ڈھونڈو مہروج۔ وہ تمہیں ملے گی۔ اور جب وہ ملے گی، میں جہاں بھی ہوں گی ضرور خوش ہوں گی۔ اگر دنیا میں نہ ہوئی تو میری روح خوش ہوئے گی۔ پھر اگر ہو سکے تو میرے بالو کو اس کی گود میں دینا اور اسے میرے بارے میں بتانا... اور اس سے کہنا کہ دور اتر پردیش کے ایک راجواڑے میں اس کی ایک بہن تھی۔ وہ بن دیکھے اس سے بہت پیار کرتی تھی... تمہاری سلطانہ۔“

میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ نظر دھندلا گئی۔ میں دیر تک اس خط کے تاثر میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ شام ہو گئی۔ عمران کی آواز نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ ویسی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”اٹھ جاؤ، کب تک ایسے بیٹھے رہو گے؟ دیکھو، تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔“

میں نے مڑ کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ نل پانی میں دیوان کی ملازمہ صفیہ کھڑی تھی۔ اس کی گود میں ننھا بالو تھا۔ عمران نے بالو کو اپنی بانہوں میں لیا، اس کا منہ چوما اور پھر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اس ننھی جان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ میرے اندر جذب ہو گیا، میرے جسم کا حصہ بن گیا۔ مجھے اس کے بدن سے اس کی ماں کی مہک آئی۔ وہ اپنی گول مٹول مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

وہ معصوم اس جانکاہ حادثے سے بے خبر تھا جو اس پر گزر چکا تھا۔ اس کی قریب ترین ہستی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اسے اب بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ماں کیا ہوتی ہے اور اس کا پیار کیا ہوتا ہے۔ وہ ہستی کیا ہوتی ہے جو کوکھ سے جنم دیتی ہے اور پھر زندگی کی ہر مشکل کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی بے خبری پر میرا دل خون ہو گیا۔

میں نے اسے بہت پیار کیا۔ پھر اسے صفیہ کے حوالے کر کے ضروری ہدایات دیں۔ صفیہ کے چہرے پر تھکن کے

آثار تھے۔ وہ بالو کے ساتھ طویل سفر کر کے ابھی کچھ ہی دیر پہلے نل پانی سے یہاں پہنچی تھی۔

عمران نے مجھے بتایا۔ ”مراد شاہ صاحب کل زرگاں سے واپس نل پانی جا رہے ہیں مگر چھوٹے سرکار پانچ چھ مہینے یہیں گزاریں گے۔ وہ یہاں مختلف انتظامات کریں گے۔ اپنا نائب مقرر کریں گے اور بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے کا عمل شروع ہوگا۔ انہوں نے برٹش باشندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیں... ٹھیک تیس روز بعد جو غیر ملکی یہاں ہوگا، وہ گرفتار ہو جائے گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ نکل جائیں گے؟“

”نکل جائیں گے نہیں... وہ لوگ نکل رہے ہیں۔ ان کا بس چلے تو اڑ کر یہاں سے اوجھل ہو جائیں۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ اب یہاں ان کے اور ان کے بچوں کے سروں پر موت کی تلوار لٹک رہی ہے۔“

میڈم صفورا بہت پریشان تھی۔ وہ ابرار صدیقی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میڈم صفورا نے ہمیں صدیقی کے بارے میں جو آخری اطلاع دی تھی، وہ یہی تھی کہ صدیقی ایک قریبی پگوڈا میں خدمت گار کی حیثیت سے اپنی اسیری کے دن کاٹ رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ صدیقی کی سزا کو معطل کرانے کی کوششیں بھی کرتی رہی تھی... اور اب جبکہ ہم سب کی سزائیں ختم ہو چکی تھیں اور سزائیں دینے والے خود سزاؤں کی زد میں تھے، مولانا صدیقی ناپید ہو چکے تھے۔ یہ بڑے افسوس کی بات تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید پانچ چھ روز تک جاری رہنے والے خونی فسادات کے دوران میں صدیقی کے ساتھ کچھ ہو گیا ہو یا پھر وہ خود ہی کہیں روپوش ہو۔ صدیقی اپنی طرز کا ایک عجیب کردار تھا۔ دین دار اور پارسا بھی۔ لالچی اور موقع پرست بھی۔ وہ نوادرات میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا اور اسی دلچسپی کے سبب وہ بدھا کے مجسمے کی چوری میں ملوث ہوا اور میڈم صفورا کے ساتھ پاکستان سے یہاں لا پہنچا گیا۔

اگلے روز میڈم صفورا نے ایک اہم اطلاع دی۔ اس نے بتایا۔ ”پگوڈا کے ایک عمر رسیدہ بھکشو کا کہنا ہے کہ صدیقی چار پانچ روز پہلے زرگاں سے نکل چکا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک اسٹیٹ سے ہی نکل چکا ہو۔“

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”پہلے تو نہیں تھا لیکن آج کل ہے۔ خاص طور سے جن دنوں زوردار لڑائی ہو رہی تھی، سرحدی پوسٹوں پر سارا سسٹم درہم برہم تھا۔ بہت سے لوگ جن پر مقدمے چل سکتے ہیں، ان چار پانچ دنوں میں اسٹیٹ سے نکلے ہیں۔ ان میں برٹش افراد بھی ہیں۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔“ میں نے کہا۔ ”بہرحال، آپ اس بارے میں پوری تسلی کر لیں۔ ابھی ہماری یہاں سے روانگی میں پانچ چھ روز باقی ہیں۔“

”پانچ چھ نہیں... آٹھ دس روز۔“ عمران نے فوراً کہا۔ ”ابھی ہمیں یہاں ایک شادی میں شرکت کرنی ہے اور کچھ دیگر ضروری کام نمٹانے ہیں۔“

”کس کی شادی؟“

”بھرت کمار اور چمپی کی۔ اس کے لیے مہورت نکالا جا چکا ہے۔ اونچی ذات کے لڑکے اور اچھوت لڑکی کی یہ شادی اس اسٹیٹ میں نئے رجحانوں کی بنیاد رکھے گی۔ اس جاہلیت پر ایک بڑی کاری ضرب لگائے گی جس کے علمبردار حکم اور بڑی ماتا جیسے لوگ ہیں۔“

”لیکن بھرت تو زخمی ہے شاید؟“ میڈم صفورا نے کہا۔

”اس کی حالت اب بہتر ہے۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ سکتا ہے۔ سینئر ڈاکٹر نے کہا ہے، وہ تین چار روز تک ڈسچارج ہونے کے قابل ہوگا۔“

اجیت رائے عرف چھوٹے سرکار کے بارے میں اکثر لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے ہیں، یا ہونے والے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں کوئی مصدقہ بات تو معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ تاہم اس بات میں تو شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ایک انصاف پسند اور روشن خیال شخص ہیں۔ جن دنوں میں سلطانہ کے ساتھ پہلی بار نل پانی گیا تھا، میں نے چھوٹے سرکار کے انصاف کا ایک یادگار منظر دیکھا تھا۔ ایک شاہی ہاتھی نے ایک غریب مزدور کو کچل دیا تھا۔ یہ ہاتھی چھوٹے سرکار کے چھوٹے بھائی کا تھا۔ چھوٹے سرکار نے اپنے بھائی کنور کو وہی سزا دی تھی جو کسی عام شخص کو دی جاتی۔ اسے بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا اور جیل کی ہوا کھانا پڑی تھی۔

یہاں زرگاں میں چھوٹے سرکار نے بھرت کمار اور چمپی کی شادی کو آفیشل شادی قرار دیا اور اس کی سادہ سی باوقار تقریب راج بھون میں ہوئی۔ گندمی رنگت والی اچھوت لیکن دلکش چمپی دلہن بن کر کھشتری بھرت کمار کی حویلی میں پہنچ گئی۔ چھوٹے سرکار نے چمپی کے داج یعنی جہیز کا انتظام اپنی طرف سے کیا۔ اور یہ انتظام اتنا بیش قیمت تھا کہ بھرت کمار کے پتا کے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ یقیناً ساری عمر کے لیے اس کا اور اس کے پورے خاندان کا منہ بند ہو چکا تھا... اور پھر چمپی کی ڈولی راج بھون سے اٹھی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسے معمولی بات سمجھنے والا آنے والے دنوں میں زبردست مشکلات کا شکار ہو سکتا تھا۔

ابرار صدیقی کا ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا اور اب میڈم صفورا کے نزدیک ستر اسی فیصد امکان اس بات کا تھا کہ صدیقی خونی ہنگاموں اور لڑائی کے دوران میں یہاں سے نکل چکا ہے۔ اب ہم اپنا رخت سفر باندھ رہے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں بڑی خاموشی کے ساتھ زرگاں سے رخصت ہونا تھا۔ چھوٹے سرکار کے خصوصی حفاظتی دستے نے ہمیں اپنی نگرانی میں لینا تھا اور ایک طویل سفر کے بعد ہمیں اسٹیٹ کی حدود سے باہر نکالنا تھا۔ اسٹیٹ کی حدود سے آگے کا چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر ہمیں کپتان اجے کے ساتھ کرنا تھا۔ کپتان اجے کی ذمے داری تھی کہ ہمیں الہ آباد میں ایک مستقیم نامی شخص تک پہنچا سکے۔ یہ چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر ہمیں اپنے رسک اور اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔ بے شک اس سفر میں ان راستوں کا شناور کپتان اجے ہمارے ساتھ تھا پھر بھی اس سفر کے بہ خیریت طے ہونے میں ہماری قسمت کو بہت عمل دخل تھا۔ ہمیں مقامی طرز کے دیہاتی لباس فراہم کر دیے گئے تھے۔ یہ چرواہوں کے لباس تھے اور زنانہ مردانہ دونوں طرح کے تھے۔

وہ ایک سرد شب کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف دھند پھیلی ہوئی تھی۔ زرگاں سو رہا تھا۔ اپنے سارے گلی کوچوں، شبستانوں اور جلوہ گاہوں سمیت۔ اس کے بارونق بازار خالی پڑے تھے۔ اس کے گھر غنودگی کے جھونکوں میں تھے... اور ہم زرگاں کو اس حالت میں چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہے تھے۔ یہ ہمارا اپنا فیصلہ تھا کہ ہماری رخصتی خاموشی سے ہوگی۔ اگر یہ علی الاعلان ہوتی تو شاید ہزاروں لوگ ہمارے راستوں پر جمع ہو جاتے۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہوتے جن کے لیے ہماری واپسی حوصلہ شکن ہوتی۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے لوگ ہم دونوں اور خاص طور سے مجھے بہت اہمیت دینے لگے تھے۔ ان میں سے اکثر خاص و عام کی یہ خواہش تھی کہ ہم یہاں سے روانہ نہ ہوں۔ کم از کم... چند ماہ تک تو کہیں نہ جائیں۔

لیکن ہمیں جانا تھا۔ یہاں ہمارا دانہ پانی پورا ہو چکا تھا۔ کچھ نئے راستے ہمیں پکار رہے تھے... اور ہم اس آخر شب کے دھند آلود سناٹے میں زرگاں کو الوداع کہہ رہے تھے... زخمی انور خاں، طلال... بھرت کمار... مستیش... حمید الغنی... حسنات اور مبارک وغیرہ بھی ہمیں بڑی محبت اور بڑے دکھ بھرے انداز میں الوداع کہا۔ چھوٹے سرکار اور ان کے قریبی مصاحب بھی اس موقع پر موجود تھے۔ اس موقع پر مجھے چھوٹے سرکار کی طرف سے ایک گراں قدر تحفہ بھی دیا گیا۔ یہ وہی چاقو تھا جس سے میں نے جارج گورا کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا۔ جب اکھرا گاؤں سے ہمیں پانڈے وغیرہ نے گرفتار کیا تھا تو یہ چاقو میرے لباس سے نکال لیا گیا تھا۔

سب سے رخصت ہو کر ہم بند جیپ میں آ بیٹھے۔ ایک نم ناک سی فضا میں ہمارا قافلہ چل پڑا۔ گاڑیاں حرکت میں آئیں تو ایک طرف سے طلال دوڑتا ہوا آیا اور گاڑی کی کھڑکی سے لپٹ گیا۔ میں نے دروازہ کھلوایا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ ”مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ چلی گئیں، آپ بھی جا رہے ہیں۔ میرے لیے اب یہاں کچھ بھی نہیں۔“

میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔ اس کا ماتھا چوما۔ اسے پیار سے سمجھایا۔ ”تم یہاں سے نہیں جا سکتے طلال۔ تم تو آنے والے کل کی امید ہو۔ تم نے یہاں ذمے داریاں سنبھالنی ہیں۔ آنے والے وقت میں یہاں کچھ اور رنجیت پانڈے، جارج گورے اور حکم جی پروان چڑھ سکتے ہیں۔ تمہیں انہیں پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم کرنا ہے۔ تم یہیں رہو گے طلال۔“

پتا نہیں، وہ میری باتیں سمجھا یا نہیں لیکن میرے تسلی بخش انداز نے اسے حوصلہ دیا...

عمران نے کہا۔ ”طلال! ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں، تم سے رابطہ رکھیں گے۔ کسی نہ کسی طور ہم یہاں کے حالات سے باخبر رہیں گے... تم سے وعدہ ہے۔“

ہم طلال کو بمشکل سنبھالنے اور الوداع کہنے میں کامیاب ہوئے۔

...ہم کافی دور نکل گئے تو میں نے مڑ کر زرگاں کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھا۔ انہی روشنیوں میں کہیں وہ قبرستان تھا جہاں ایک بے مثال لڑکی اپنی تمام تر دلیری، شجاعت اور وفاداری کے ساتھ ابدی نیند سو رہی تھی۔

”خدا حافظ سلطانہ۔“ میں نے زیر لب کہا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اگلا دن ابر آلود تھا۔ ٹھٹھرا ہوا سورج چند منٹ کے لیے اپنی بیمار صورت دکھاتا اور پھر بادلوں کی اوٹ میں چلا جاتا۔ ہمارا سفر درمیانی رفتار سے جاری رہا۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ حکم کے بچے کچھے سپاہی کہیں کہیں جو مزاحمت کر رہے

تھے، وہ بھی پگھلی جا چکی تھی۔ پھر بھی گھڑسوار سپاہیوں کی نقل و حرکت دکھائی دیتی تھی۔

شام کو ہم نے گھنے سنسان جنگل میں پڑاؤ کیا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بلند و بالا درخت بھیگے ہوئے خاموش کھڑے تھے جیسے کسی بات پر شرمسار ہوں۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اچانک میں چونکا۔ یہ جگہ جانی پہچانی لگی۔ تھوڑا سا غور کیا تو سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ یہ وہی علاقہ تھا جہاں میں نے جارج گورا کی حراست سے فرار ہونے کے بعد دو نہایت مشکل راتیں گزاری تھیں۔ ہاں، یہ وہی جگہ تھی۔ یہ چھوٹی سی آبی گزرگاہ جو جنگل کے بیچوں بیچ بل کھاتی ہوئی جاتی تھی اور جس کے کنارے جنگلی جانوروں کے قدموں کے بہت سے نشان تھے۔

دفعتاً مجھے ایک اور بات یاد آئی اور میں پھر چونک گیا۔ عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ بولا۔ ''تم تو اس جگہ کو یوں دیکھ رہے ہو جیسے پچھلے جنم میں یہاں کسی ہندو ناری کے ساتھ لو سین کرتے رہے ہو۔''

''ہندو ناری کے ساتھ تو نہیں مگر اپنی تنہائی کے ساتھ لو سین کرتا رہا ہوں۔''

''یہ کیا بے ہودہ بات ہے۔ ''تنہائی'' نے کوئی ساڑی تھوڑی پہن رکھی ہوتی ہے۔ نہ ہی تنہائی کے سر پر لمبے ریشمی بال ہوتے ہیں۔ نہ ہی پتلی کمر ہوتی ہے۔ لو سین کے لیے ایسی دو چار چیزوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے، جب میں جارج گورا کی رہائش گاہ سے فرار ہوا تھا تو انہی جگہوں پر بھٹکتا رہا تھا۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ میں نے اس ندی کے کنارے بیٹھ کر کیا کیا تھا؟''

''وہی کیا ہوگا جو تمہارے آباؤ اجداد گاؤں کے کھیتوں میں کرتے رہے ہیں۔''

''یار! تم مذاق سمجھ رہے ہو... لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔ اس وقت بڑی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی میری۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں کبھی اس اسٹیٹ کی حدوں سے نکل نہیں سکوں گا۔ دوڑ دوڑ کر اور پھڑ پھڑا کر مر جاؤں گا لیکن مجھے آزادی نہیں ملے گی۔ اس وقت یہاں پانی کے کنارے بیٹھ کر میں نے ایک عجیب کام کیا۔ میں نے ایک خط لکھا اور اسے بوتل میں بند کر کے اس ندی میں بہا دیا۔ وہ بوتل میرے سامنے بہتے بہتے دور چلی گئی۔ دریا کی طرف۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ آگے نکل گئی ہو۔ کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہو... اور دریاؤں کا آخری ٹھکانا تو سمندر ہی ہوتا ہے۔ کیا پتا کہ وہ سمندر تک پہنچی ہو۔ کسی کشتی راں یا کسی جہاز کے سواروں نے اسے دیکھا ہو۔ پانی سے نکالا ہو۔ میرا خط پڑھا ہو۔''

''بالکل ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امریکا نے اپنا ساتواں بحری بیڑا تمہاری تلاش میں روانہ کر دیا ہو۔ وہ اپنے پانیوں میں چلتا چلتا دریائے آمو میں پہنچا ہو اور پھر اگلے منگل تک یہاں اس جنگل میں پہنچ جائے۔ زبردست... کتنا مزہ آئے کہ یہ بیڑا یہاں آ کر ریت میں پھنس جائے۔ بیڑے کے سارے مرد فوجیوں کو تیندوے کھا جائیں یا ہاتھی کچل دیں۔ بس لڑکیاں بچ جائیں۔ ہو ہو ہو... ہر بندے کے حصے میں پانچ پانچ لڑکیاں اور وہ بھی امریکن۔ نیو ورلڈ آرڈر...''

اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتا، ہمیں اجے کمار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ بوندا باندی سے بچنے کے لیے اس نے چھتری لے رکھی تھی۔ ایک اضافی چھتری وہ ہمارے لیے لا رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے یہ چھتری مجھے تھما دی۔

''کیا کہیں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جانا تو نہیں لیکن اگر آپ چاہیں تو جا بھی سکتے ہیں۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور ایک جنگل باسی کی جھونپڑی ہے۔ ایک عمر رسیدہ مسلمان بزرگ ہے، اپنے دو مریدوں کے ساتھ عرصے سے یہیں رہوت ہے۔ مسافر محفوظ سفر کے لیے اس سے دعائیں کرواتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ بھی کروا سکتے ہیں۔''

''اگر زیادہ دور نہیں تو چلتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے شام کا اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ ہم رم جھم میں ندی کے ساتھ چلتے رہے۔ اجے کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس جھٹپٹے میں اس طرح چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ قریباً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد ہم گھنی جھاڑیوں میں داخل ہوئے اور پھر ایک نسبتاً اونچی جگہ پر واقع ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ جھونپڑی تین درختوں کے تنوں کے اوپر زمین سے قریباً دس فٹ کی بلندی پر تیار کی گئی تھی۔ اوپر چڑھنے کے لیے بانس کی سیڑھی موجود تھی۔ اندر مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ سیڑھی کے قریب ایک نوجوان باریش شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے دستے والی کلہاڑی تھی... ہم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ اس نے ہم سے دو چار سوال کیے۔ وہ اس بات پر کچھ حیران بھی تھا کہ ہم اس ابر آلود شام میں کیچڑ زدہ راستے پر چلتے ہوئے اس جگہ آ پہنچے ہیں۔ وہ سیڑھی چڑھ کر اوپر گیا۔ ایک مدت بعد اس نے

ہمیں بھی اوپر بلالیا۔

بزرگ کی عمر اَسی پچاسی برس رہی ہوگی۔ لمبی سفید داڑھی، بھاری پلکیں... وہ ایک بوسیدہ کمبل لیے بیٹھے تھے۔ چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک نیکوکار اور ہر وقت عبادت و ریاضت میں گم رہنے والے شخص ہیں۔ اجے کے بقول یہ بات مشہور تھی کہ ان کی دعا سے سفر کی مشکلیں آسان ہوتی ہیں اور بھٹکے ہوئے راہیوں کو راستے ملتے ہیں۔

ہم نے بھی ان سے اپنے لیے دعا کرائی... انہوں نے گڑ اور سوکھی کھجوروں سے ہماری تواضع کی۔ جب ہم اٹھنے والے تھے، اچانک میری نظر ایک چیز پر پڑی اور میں حیران رہ گیا... میں نے غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔ کچھ دیگر اشیا کے ساتھ وہ شیشے کی بوتل بھی ایک کونے میں پڑی تھی جسے کچھ عرصہ پہلے میں نے چلتے پانی میں بہایا تھا... ہاں، یہ وہی بوتل تھی... سو فیصد وہی تھی۔ میں نے اسے کسی دور دراز کے سفر کے لیے ندی میں بہایا تھا مگر... وہ دور دراز کے سفر پر نہیں گئی تھی۔ یہ تو بس ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا سفر طے کر کے اس جھونپڑی کے گوشے میں پڑی تھی۔

میں حیران رہ گیا۔ بوتل کے اندر وہ مڑا تڑا کرنسی نوٹ بھی اسی طرح موجود تھا جو میں نے اس میں ڈالا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بیٹا جی!'' عمر رسیدہ شخص نے میری نظر کا تعاقب کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ... یہ بوتل... آپ کو کہاں سے ملی؟''

عمر رسیدہ شخص نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر ہولے سے بولے۔ ''سامنے والی ندی سے... گھاس میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں وضو کر رہا تھا۔ میری نظر پڑ گئی۔ میں نے نکال لی۔''

میں نے بزرگ کی اجازت سے بوتل اٹھائی۔ اس میں دو انگلیاں ڈال کر اپنا لکھا ہوا خط نکالا۔ بزرگ مسکراتے ہوئے بولے۔ ''مجھ کو لگت ہے کہ تم یہ بوتل پہچانتے ہو... کہیں... تم نے ہی تو اسے پانی میں ناہیں بہایا تھا...''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔ یہ چند مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ ندی کنارے اداس بیٹھا تھا۔ کنارے پر اگی ہوئی اس بوتل پر نظر پڑ گئی۔ یونہی وقت گزاری کے لیے میں نے نوٹ پر یہ رقعہ لکھ کر اس میں ڈال دیا اور پانی میں چھوڑ دیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں کی یہیں رہے گی...''

بزرگ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''دیکھو کتنا عجیب اتفاق ہے۔ تم نے اس بوتل کو جہاں پھینکا تھا، یہ وہی سے تم کو مل گئی۔ تم کہہ سکت ہو کہ یہ کہیں نہیں گئی لیکن اس نے کہیں نہ جا کر بھی بہت لمبا سفر کیا ہے اور اپنا مقصد حاصل کیا ہے۔ کیا یہ بڑی بات ناہیں ہے؟''

''میں سمجھا نہیں بزرگوار۔''

وہ بولے۔ ''ہوسکت ہے کہ یہ ہزاروں میل کا سفر کر کے بھی کسی کی نظر میں نہ آ سکتی... کسی کی توجہ کا مرکز نہ بنتی۔ لیکن یہ ایک بالکل چھوٹا سا سفر کر کے مجھ تک آ گئی۔ میں نے تمہاری تحریر پڑھی... تمہارے درد کو محسوس کیا۔ میرے ناچیز ذہن میں تمہارے لیے فکر جاگی۔ میں نے تمہارے لیے اپنے رب کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ وہ غفور الرحیم ہے... سنتا ہے۔ مجھ جیسا حقیر بندہ بھی جب ''دل'' سے کچھ مانگتا ہے تو وہ عطا کرتا ہے۔''

میں گم صم کھڑا تھا، عمران اور اجے بھی خاموش تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں بزرگ کا سرخ و سپید چہرہ کسی تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں بزرگوار... وہ عطا کرتا ہے۔ ہم نے پچھلے چند ہفتوں میں اس کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے۔ ہم سخت مرحلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب ہمیں آگے بھی کچھ سخت مرحلے درپیش ہیں۔ ہمیں آپ کی مزید دعاؤں کی ضرورت ہے جناب۔ آپ ہمارے لیے خصوصی دعا فرمایئے...''

بزرگ کے پاس گزرے ایک دو گھنٹوں کا پتا ہی نہیں چلا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس درویش صفت شخص سے رخصت ہو کر واپس اپنے پڑاؤ میں پہنچ چکے تھے۔ وہ بوتل اب میرے پاس تھی۔ اس کے اندر رکھا جانے والا رقعہ میری جیب میں تھا۔ عمران نے کہا۔ ''بھئی واہ... آج تک تو ہم نے ایسی بوتلوں کے بارے میں یہی سنا تھا کہ وہ لمبے سفر کر کے دور دیس کے نامعلوم لوگوں تک پہنچتی ہیں اور پھر ان میں موجود خطوں سے کہانیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ پہلی بوتل ہے جو کہیں گئی بھی نہیں اور پھر بھی اپنا کام دکھا گئی ہے... پڑھ کر تو سناؤ اس میں لکھا کیا تھا تم نے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بس دو تین فقرے تھے۔'' میں نے کہا اور مڑا تڑا کاغذ نکال کر عمران کے سامنے پڑھا۔ اس کاغذ یعنی کرنسی نوٹ کے کنارے پر میں نے شاخ سبز کے قلم اور اپنے زخم کے خون سے لکھا تھا۔ ''میرے پیارو! میں زندہ ہوں۔ میرا انتظار کرنا۔ میں ایک دن ضرور آؤں گا... تابش۔''

نوٹ پر تین نام یعنی فرح، عاطف اور ثروت بھی لکھے تھے۔ ہم دیر تک اس نوٹ اور اس کی تحریر پر تبصرہ کرتے رہے۔

اپنوں سے ملنے کا سپنا آنکھوں میں اجاگر ہو گیا۔

... بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلنا ایک سپنے جیسا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم کسی بہت بڑی جیل سے اچانک آزاد فضاؤں میں پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے تقریباً پچاس کلومیٹر کا سفر چرواہوں کے بھیس میں طے کرنا تھا۔ ہم ایسے چرواہے تھے جنہیں بھیڑ بکریاں چرانے سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ فی الوقت بھی ہمارے پاس بھیڑ بکری نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ہم نے چرواہوں کے لباس پہن لیے۔ سروں پر پگڑ بھی رکھ لیے۔ مسلسل سفر نے حلیے پہلے ہی خراب کر رکھے تھے۔ مزید خرابی کے لیے بالوں میں دھول ڈالی گئی۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا گیا۔ مردوں نے کانوں میں بالیاں ڈالیں۔ میڈم صفورا، نوری اور صفیہ نے کنگن پہنے۔ میڈم صفورا کا حلیہ دیکھنے کے لائق تھا۔ وہ جینٹ شرٹ اور بوائے کٹ بالوں والی ایک اسٹائلش عورت تھی۔ چرواہی کے بھیس میں اسے چولی اور گھاگرا پہننا پڑا۔ اپنا منہ سر بھاری اوڑھنی میں چھپانا پڑا۔ اسے دیکھ کر عمران کی ہنسی چھوٹی تو اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ وہ منہ پھیر کر ہنستا رہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میڈم جانتی تھی مگر خاموش رہی۔ اسے اب عمران کو برداشت کرنا آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ عمران اپنی طرز کا الو کا بندہ ہے۔ وہ عمران کا احسان بھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ عمران نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک نہایت زہریلے سانپ کا زہر میڈم کے بدن سے چوسا تھا۔ وہ سنگین واقعہ ہم سب کی یادداشت میں درج تھا۔

ہمارے لیے بھیڑ بکریوں کا انتظام اسٹیٹ کی حدود ختم ہونے سے دو تین میل پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک خاصا بڑا ریوڑ تھا۔ اس میں ایک اصلی چرواہا اور چرواہی بھی موجود تھے۔ ہمارے لباسوں کے اندر اسلحہ چھپا ہوا تھا۔ کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے میرے اور عمران کے علاوہ اسد نے بھی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ ریوڑ میں ایک خچر بھی موجود تھا۔ اس پر کاٹھ کباڑ لدا ہوا تھا۔ اس کاٹھ کباڑ میں وہ شاندار دور مار رائفل بھی موجود تھی جس سے عمران نے پچھلے دنوں میں چند یادگار نشانے لیے تھے۔

بہرحال، ہمارا یہ سفر خیریت سے گزرا۔ راستے میں دو تین جگہ ہمارا گزر چیک پوسٹوں کے قریب سے ہوا۔ ایک جگہ ہمیں روکا بھی گیا۔ صفورا، نوری اور صفیہ لمبے گھونگھٹ نکالے ہوئے تھیں۔ ہماری صورتوں پر شک کیا جا سکتا تھا مگر ہماری جگہ اصلی چرواہے نے ہی بی ایس ایف کے اہلکاروں سے بات کی اور ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کے لیے ہمیں بی ایس ایف کے اہلکاروں کو معمولی رشوت بھی دینا پڑی۔ یعنی بکریوں کا چار پانچ کلو دودھ اور ایک چھوٹا سا میمنا۔

کپتان اے جے کمار ہمارا بہترین راہنما اور مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بھی مقامی چرواہے کے بھیس میں تھا، تاہم ہمارے خیریت کے اس سفر میں اس کی راہنمائی کے علاوہ چھپے سرکار کے انتظامات کو بھی مکمل دخل تھا۔ ہم جہاں پہنچتے تھے، ہمارے پروگرام کے مطابق ہمارے لیے اسباب پہلے سے موجود ہوتے تھے۔ الٰہ آباد سے تقریباً تیس کلومیٹر دور ماچھی گڑھ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک مسلمان زمیندار کے گھر میں ہماری شب بسری کا انتظام کیا گیا تھا۔ ماچھی گڑھ میں ہم چرواہوں کے بھیس سے دوبارہ عام لوگوں کے بھیس میں آ گئے۔ اصلی چرواہا اور چرواہی اپنی بھیڑ بکریوں سمیت ہم سے جدا ہو گئے۔ وہ دونوں بڑے سادہ اور خوش اخلاق تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا سفر بڑا اچھا گزرا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ دونوں سگے بہن بھائی تھے۔ بہن ایک سال بڑی تھی۔ بھائی چھوٹا تھا۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ بہن کی نسبت ہمیں بھائی کسی حد تک افسردہ نظر آیا تھا۔ بہن اسے ہنسانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس نوجوان چرواہے کی بیوی شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد اپنے نومولود بچے سمیت پانی کے ایک گڑھے میں گرنے سے مر گئی تھی۔ وہ بیوی اور بچے سے بہت پیار کرتا تھا۔ ان کی موت نے اسے نیم دیوانہ کر دیا تھا مگر اب وہ بتدریج سنبھل رہا تھا۔

میرے سینے میں بھی تو ایک ایسا ہی غم انگاروں کی طرح دہکتا رہتا تھا۔ میری سالیانہ بھی تو مجھے چھوڑ گئی تھی لیکن مجھے اس چرواہے کا غم اپنے غم سے بڑا لگا... شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ نانک دکھیا سب سنسار۔

ماچھی گڑھ میں ایک رات قیام کے بعد ہمیں الٰہ آباد کی طرف روانہ ہونا تھا۔ اس رات میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ عجیب اور ناقابلِ یقین۔ مجھے ایک بار پھر اندازہ ہوا کہ عمران میں کچھ خاص صلاحیتیں موجود ہیں۔ رات کوئی ایک ڈیڑھ بجے کا عمل ہو گا۔ میں اور عمران حویلی کے ایک ہی کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ مجھے گاؤں کی کسی قریبی گلی میں کتے کی آواز سنائی دی۔ یہ بھاری آواز مسلسل تاریکی کی لہروں پر ڈوب ابھر رہی تھی۔

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ عمران اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔ میں نے لالٹین کی لو اونچی کر کے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اسی دوران میں گلی میں سے ایک بار پھر کتے کی گونجتی ہوئی آواز ابھری۔ مجھے اپنے جسم میں جھرجھری سی

محسوس ہوئی... مجھے لگا میں نے یہ آواز پہلے بھی سنی ہوئی ہے۔ یہ وہی آواز تھی۔ یہ وہی جسیم کتا تھا جسے ہم نے اتھرا گاؤں کے ٹھٹھرے ہوئے کھیت میں دیکھا تھا۔ میں چپل پہن کر تیزی سے برآمدے میں آیا۔ وسیع صحن کے آخری سرے پر حویلی کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رات کے اس پہر اردگرد کوئی موجود نہیں تھا۔ میں دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آ گیا۔ یخ بستہ ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مجھے عمران نظر آ گیا۔ وہ گلی کے نکڑ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ ایک سایہ سا اس کے پاؤں میں حرکت کر رہا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ وہی کتا تھا۔ وہ عمران کے پاؤں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔ الٹا سیدھا ہو رہا تھا۔ اس کی دم بے ساختہ تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ عمران اپنے ہاتھوں سے اس کا سر اور گردن کے بال سہلا رہا تھا۔

میں چند قدم آگے آیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کتا اتھرا گاؤں سے قریباً ایک سو بیس کلومیٹر دور یہاں تک ہمارے پیچھے آیا ہے... اچانک عمران کو احساس ہو گیا کہ میں اس سے کچھ فاصلے پر یہاں گلی میں موجود ہوں۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔

”عمران! یہ وہی کتا ہے؟“ میری آواز حیرت سے لرز رہی تھی۔

”ہاں، یہ وہی ہے۔ مجھے کل رات بھی شک ہوا تھا کہ یہ ہمارے خیمے کے آس پاس موجود ہے۔ شاید یہ مسلسل ہمارا پیچھا کرتا رہا ہے۔“

”یار! یہ بڑی حیران کن بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ اور پھر اپنے ہاتھوں میں ”اینیمل ماسٹری“ بھی تو ہے۔ یہ تو تم ہی ناقدرے ہو جو گھاس نہیں ڈالتے ہو جگر! اتنا پیار کسی پتھر سے بھی کروں نا تو وہ بیچ میرے پیچھے آنا شروع ہو جائے۔“ وہ ادا سے مسکرایا۔

میں الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا..... ان لمحوں میں اس کی آنکھوں کے شیشے میں واقعی ایسا کچھ نظر آیا جو عام لوگوں میں نہیں ہوتا۔ کچھ دیر تک اس جسیم کتے کو بہلانے اور پچکارنے کے بعد اس نے اسے واپس بھیج دیا۔ اور وہ واقعی یوں واپس چل پڑا جیسے اس سے وداع ہو کر جا رہا ہو۔ کچھ دیر تک اس کا متحرک ہیولا ماچھی گڑھ کی تاریکی میں نظر آتا رہا پھر اوجھل ہو گیا۔ ماچھی گڑھ میں ایک رات قیام کے بعد ہم شہر رنگ و بو الٰہ آباد میں داخل ہوئے۔ مجھے لگا کہ میں ایک طویل عرصہ کسی الگ تھلگ جزیرے پر گزارنے کے بعد ایک جیتی جاگتی، ہنستی بستی دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔ بڑے شہروں کے جانے پہچانے مناظر نگاہوں کے سامنے آئے۔ سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک، انسانوں کا ہجوم، بارونق بازار، ٹی وی، سینما ہاؤس، چائے خانے، ریسٹورنٹ، پارک، تفریح گاہیں۔ میں ہر منظر کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میرے لیے ایک عجوبہ تھا۔ ہمیں ایک فور اسٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں ہمارا اندراج فرضی ناموں سے تھا۔ شام کے وقت ہم بالائی منزل کی لابی میں بیٹھے نیچے سڑک پر رواں دواں زندگی کا نظارہ کرنے لگے۔ میڈم صفورا، اسد اور راجے بھی وہیں تھے۔

عمران نے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے کسی اُلّو کو اندھیری جگہ سے نکال کر اچانک روشنی میں بٹھا دیا گیا ہو۔ نالائق شخص، ایسے ہر چیز کو ندیدوں کی طرح دیکھو گے تو مشکوک قرار پاؤ گے۔ خاص طور سے لڑکیوں کو دیکھنا تو بالکل ترک کر دو۔ تمہاری جگہ یہ کام میں کیے دیتا ہوں۔ میں یہ کام نسبتاً اچھے طریقے سے کر لوں گا۔“

اس نے جیب سے ہلکے رنگ والے سن گلاسز نکالے اور لگا لیے۔ سن گلاسز اسے ہمیشہ اچھے لگتے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”جیمز بانڈ لگ رہا ہوں یا نہیں؟“

”جیمز بانڈ تو نہیں، انعامی بانڈ لگ رہے ہو۔ اور وہ بھی ایسا جو پانچ سو قرعہ اندازیوں میں شامل ہونے کے بعد بھی نہ نکلا ہو۔“

”تم میری توہین کر رہے ہو اور یہ بھول رہے ہو کہ جس طرح ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، تمہارے پیچھے میرا ہاتھ ہے... بلکہ میں پورے کا پورا تمہارے پیچھے ہوں۔“

اسد بولا۔ ”یعنی... تمہارا مطلب ہے کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے ضروری نہیں کہ ہمیشہ ایک عورت کا ہاتھ ہی ہو۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر اس بندے میں تھوڑی سی بھی احسان شناسی ہوتی تو اپنے گلے میں ڈھول ڈالتا اور میرے آگے آگے ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے چلتا۔ اے الٰہ آباد کے رہنے والو! استقبال کرو میرے محسن کا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے تابی کو تابی بنایا۔ اس کی انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اور اتنا سکھایا اتنا سکھایا کہ ایک دن وہ جارج گورا جیسے شخص سے متھا لگانے اور اسے مار گرانے کے قابل ہوا۔ اور ایک جارج گورا ہی نہیں، اس نے تابی کو ہر ہر موڑ پر جارج گوروں اور سیٹھ سراجوں اور میڈم صفوروں سے لڑنا سکھایا ہے۔“

”میڈم صفوروں“ کا لفظ اس نے ہولے سے بولا تھا۔

پھر بھی میڈم کو بھنک پڑ گئی۔ وہ کافی پیتے پیتے چونک کر بولی۔ ”تم نے میرے بارے میں کیا کہا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں میڈم۔“ وہ صاف مکر گیا۔

”میں نے خود سنا ہے۔ تم نے میڈم کہا ہے۔“

”نن... نہیں... میں تو میڈم نور جہاں کی بات کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ تابی اور میڈم نور جہاں کی لڑائی ہو گئی تھی نا... تو میں نے صلح کرائی تھی۔ یہ بھی بڑا عجیب واقعہ ہوا تھا۔“ وہ تالی بجا کر بولا۔ ”میڈم نور جہاں... فلمسٹار ریما کو بیٹیوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی شریف، خوش شکل اور مخلص بندے سے شادی کر کے اپنا گھر بسائے۔ فلم لائن میں تو انہیں ایک بھی ایسا بندہ نظر نہیں آتا تھا۔ آجا کے ان کی نظرِ کرم مجھ پر آ کے جاتی تھی۔ وہ ہم دونوں کو قریب لانا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ یا تو میں سرکس چھوڑ کر فلموں میں اداکاری شروع کر دوں یا پھر ریما جی فلمیں چھوڑ کر موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلایا کریں۔ ایک روز اس سلسلے میں انہوں نے بات کرنے کے لیے مجھے بلایا۔ تابی بھی ساتھ تھا... تابی نے غلطی سے میڈم کے سامنے ڈکار مار دی۔ بس انہیں غصہ آ گیا۔ انہوں نے گرج کر کہا، وے توں ڈکار مار کے مینوں دس رہیا ایں کہ توں گھروں رج کے آیا ایں۔ یعنی تم ڈکار مار کر مجھے بتا رہے ہو کہ گھر سے کھا پی کر آئے ہو۔ تابی نے بھیرا کہا کہ غلطی سے ڈکار نکل گئی ہے مگر وہ واقعی غصے میں تھیں۔ وہ تو ہمارے لیے لمبے چوڑے لنچ کا انتظام کر رہی تھیں... وہ بڑی محبت کرنے والی خاتون تھیں... لیکن جب...“

اچانک عمران چپ ہو گیا۔ اس کی نظر سامنے ایک جگہ جم کر رہ گئی۔ میں اب اس کا رمز شناس ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ ہوٹل کی سیڑھیوں کے قریب میں نے ایک شخص کو تیزی سے ایک دروازے میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ عمران کے اندر جیسے اچانک ہی کوئی روشنی سی بجھ گئی۔ اس کے بعد وہ چائے تو پیتا رہا اور باتوں میں بھی حصہ لیتا رہا مگر اس کی چہکار ختم ہو چکی تھی۔ محفل برخاست ہوئی تو ہم اپنے اپنے کمرے میں آ گئے۔ میں اور عمران ایک ہی کمرے میں تھے۔ میں نے عمران کو پہلے اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے... کچھ بتاؤ گے نہیں؟“ میں نے اس کی انگلیوں سے سگریٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”تمہارے ساتھ رہنے کے بعد اب میری نظر بھی کافی تیز ہو گئی ہے۔ میں نے لابی میں چائے پیتے ہوئے کچھ دیکھا ہے۔“

”کیا دیکھا ہے؟“

”وہی جو تم چھپا رہے ہو۔ کالی جیکٹ والا وہ بندہ جو تمہیں دیکھ کر اچانک سیڑھیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد سے تمہارا چہکنا بالکل بند ہے۔“

”بولوں تب مصیبت، نہ بولوں تب مصیبت۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اب خاموش رہنا چاہیے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو اعتماد میں لینا چاہیے۔“

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”وہ بہت خطرناک بندہ ہے یار۔“

”تم سے بھی خطرناک؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرے تیرے جیسے اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔ وہ بہت ہی زیادہ گڑبڑ بندہ ہے... اور میرا خیال ہے کہ وہ اب کسی بھی وقت یہاں ہمارے کمرے میں پہنچنے والا ہے۔“

”یہاں پہنچنے والا ہے؟ کیا کرے گا وہ یہاں آ کر؟“

”یہ تو پتا نہیں لیکن... جو ہوگا بہت برا ہوگا۔“

”مگر یہ ہے کون؟“ میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

”سفید کپڑوں میں ایک پولیس والا۔ تباہ موہل نام ہے اس کا۔ بظاہر یہ تمہیں عام سا شخص لگے گا مگر اس کی خطرناکی کو صرف اور صرف میں سمجھ سکتا ہوں۔“

”یہ تمہیں پہلے سے کیسے جانتا ہے... تم تو شاید پہلی بار انڈیا آئے ہو؟“

”تمہارے ساتھ پہلی بار آیا ہوں۔ اس سے پہلے اپنے سرکس کے ساتھ آیا تھا۔ کچھ روسی فن کار بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے بمبئی کے علاوہ اور کئی شہروں میں بھی چمک ماری تھی۔“

”سرکس میں کام کرنا کوئی جرم ہے جو تم اس الٰہ آبادی پولیس والے سے ڈر رہے ہو؟“

”یہ لمبی کہانی ہے۔ پھر کبھی سہی۔ ابھی ہمیں باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ اٹھا اور تکیے کے نیچے سے اپنا پستول نکال کر چیک کرنے لگا۔ چیک کرنے کے بعد اس نے پستول دوبارہ تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ وہ خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”یار! ہمارے لیے خطرناک قسم کے پولیس والے ہی رہ گئے ہیں۔ خدا خدا کر کے پانڈے سے

جان چھوٹی ہے تو اب تم اس نئی آفت کا ذکر فرما رہے ہو۔“
”اسی کو کہتے ہیں آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ ابھی اسٹیٹ سے باہر تشریف لائے دو ہی دن ہوئے ہیں اور اس ناہنجار سے ملاقات ہوگئی ہے...“

اچانک ہمارے بائیں جانب والی کھڑکی ایک دھماکے سے کھلی۔ کسی نے اسے باہر سے ٹانگ رسید کی تھی۔ ایک نوجوان کود کر اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے عقب میں وہی سیاہ جیکٹ والا شخص تھا۔ اس کی عمر پینتیس چھتیس سال رہی ہوگی۔ کھچڑی بال مہندی میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ صورت سے ہی کرخت مزاج اور غصیلا نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ تاہم یہ پستول اس کی جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب کے اندر ہی تھا۔ وہ بے پناہ اعتماد سے کھڑکی سے باہر ہی کھڑا رہا۔ اس کے ساتھی نوجوان نے مقامی لب و لہجے میں دھمکایا۔ ”خبردار! ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ یو آر انڈر اریسٹ۔“

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ مجھے لگا کہ میں جھپٹ کر اس نوجوان پر حملہ کرسکتا ہوں۔ دوسری طرف عمران کھڑکی کے پاس تھا۔ وہ جست لگا کر کالی جیکٹ والے کو دبوچ سکتا تھا لیکن جب میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں لکھا ہوا پیغام صاف نظر آیا۔ وہ مجھے حملہ کرنے سے روک رہا تھا اور خود بھی ہرگز حملے کا نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجے... ”بظاہر یہ تمہیں عام سا بندہ لگے گا مگر اس کی خطرناکی کو صرف اور صرف میں سمجھ سکتا ہوں...“

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ درحقیقت میرے اور عمران کے درمیان ایک ٹیلی پیتھی جیسا رشتہ پیدا ہو چکا تھا۔ میں اس بارے میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے بہت رمز شناس ہوگئے تھے۔ میں واضح طور پر محسوس کر چکا تھا کہ عمران مجھے ری ایکٹ کرنے سے روک رہا ہے اور خود بھی ری ایکٹ کرنے کا رسک نہیں لے رہا۔

پستول بردار نوجوان جو بعدازاں خود بھی پولیس والا نکلا، دروازے کی طرف گیا اور اس نے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ جیکٹ والا اندر آگیا۔ ہمارا کمرا طویل کوریڈور کے آخری سرے پر تھا۔ اتفاقاً اردگرد کے چند کمرے خالی تھے۔ باقی کمروں کے دروازے بند تھے۔ یہاں ہونے والی کارروائی کا پتا کسی کو نہیں چلا۔ جیکٹ والے نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”مجھے وشواس نہیں تھا کہ میں تمہیں دوبارہ دیکھ پاؤں گا... اور وہ بھی پھر اسی شہر میں۔“

عمران بولا۔ ”میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں قانونی طور پر انڈیا آیا ہوں۔ میرے پاس کاغذات ہیں۔“
”تم قانونی طور پر انڈیا آئے ہوگے لیکن یہاں سے بھاگے تو قانونی طور پر نہیں تھے۔ تمہاری پوری فائل ہے میرے پاس۔ اور اب اسی فائل کے آخری صفحے پورے کرنے کا سمے آگیا ہے۔“
”لیکن میری بات سنو...“
”باقی ساری باتیں تھانے چل کر ہوں گی۔“ وہ سرد لہجے میں بولا۔ وہ وردی میں نہیں تھا، اس لیے مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کس رینک کا افسر ہے۔
”مگر آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ...“
”تم ہمیں بھاشن مت دو اور نہ ہی قانون سکھاؤ۔ بس چپ چاپ چلو ہمارے ساتھ۔ اور یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا نشانہ کتنا سچا ہے۔“

عمران مجھے دبا دبا سا نظر آرہا تھا۔ اس کی کیفیت مجھے بھی کمزور کر رہی تھی۔ ورنہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کمرے میں ان دونوں سادہ پوش پولیس والوں پر قابو پانا اتنا دشوار نہیں ہوگا۔

میں نے ایک بار پھر عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں سمجھایا کہ ہمیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو یہ سجاد نامی شخص کہہ رہا ہے۔

یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ تقریباً پانچ فٹ دس انچ قد والا ایک عام سے جسم والا، عام سا شخص ہمیں گن پوائنٹ پر یہاں سے لے جا رہا تھا اور عمران اس کی بات ماننے میں ہی عافیت سمجھ رہا تھا۔

ہم آگے پیچھے کمرے سے نکلے اور قالین پوش کوریڈور میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ کچھ آگے جاکر عمران نے سجاد سے کہا۔ ”اگر یہ معاملہ ہمارے درمیان طے ہوسکتا ہے تو...“
”ہمارے درمیان کچھ طے نہیں ہوسکتا... تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور اگر تم نے یہ بات دوبارہ کی تو میں لوگوں کی پروا کیے بغیر تمہارے منہ پر تھپڑ جڑ دوں گا۔ بس چپ چاپ چلتے رہو۔“ سجاد نے کہا۔

اس کا رویہ میرے ذہن میں چنگاریاں سی چمکا رہا تھا۔ ہم مار دھاڑ اور قتل و غارت کے ایک انتہائی سنگین دور سے گزر کر آئے تھے۔ زرگاں کی وہ خون آشام رات ابھی کل کی بات تھی جب پرانے قلعے کے سامنے نل پانی اور حکم کی فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا تھا... بارود کی بارش ہوئی

تھی۔ لاشوں کا فرش بچھا تھا۔ ہم بھی اس میدانِ جنگ کا حصہ تھے اور سرخرو ہو کر نکلے تھے... اور آج الٰہ آباد کا یہ چھریرے جسم والا پولیس اہلکار صرف اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ ہمیں ہانک کر لے جا رہا تھا۔ عمران ساتھ نہ ہوتا تو میں ہرگز اس صورتِ حال کو قبول نہ کرتا۔

ہوٹل کے پارکنگ لاٹ تک ہم اس طرح آئے کہ سجاد اپنا ہاتھ کالی جیکٹ کی پھولی ہوئی جیب میں ڈالے ہمارے عین پیچھے چل رہا تھا جبکہ اس کے نوجوان ساتھی نے اردگرد کی پروا کیے بغیر پستول اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اکا دکا راہ گیروں نے اس کے پستول کو دیکھا اور ان کے چہروں پر خوف و ہراس بھی نمودار ہوا تاہم کسی نے بھی اس صورتِ حال میں کسی طرح کی مداخلت کی ہمت نہیں کی۔

پارکنگ میں سفید رنگ کی ایک پرائیویٹ کار موجود تھی۔ کار میں ایک ڈرائیور پہلے سے موجود تھا۔ ”تم آگے بیٹھو۔“ سجاد نے تحکم سے عمران کو مخاطب کیا۔

عمران نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ مجھے پچھلی نشست پر بٹھایا گیا۔ سجاد اور اس کا نوجوان ساتھی میری دونوں جانب بیٹھ گئے۔ نوجوان نے اپنا سرکاری پستول باقاعدہ میرے پہلو سے لگایا ہوا تھا۔ یہ لوگ ذرا سی رعایت دینے کو بھی تیار نہیں تھے۔ اچانک ایک اور کارروائی ہوئی۔ میری بائیں طرف بیٹھے سخت گیر نوجوان نے ایک آہنی کڑا میری پنڈلی کے نچلے حصے میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ایک زنجیر بھی تھی۔ ایسے کڑے عام طور پر تھانوں میں پولیس والوں کے پاس موجود ہوتے ہیں۔

گاڑی میں پہنچنے کے بعد ان پولیس اہلکاروں نے آپس میں جو بات چیت کی، اس سے پتا چلا کہ کالی جیکٹ والا سجاد ڈی ایس پی ہے۔ نوجوان جس نے پستول میرے پہلو سے لگا رکھا تھا، سب انسپکٹر تھا اور یہ ڈی ایس پی سجاد کا قریبی عزیز بھی تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک دراز قد ہیڈ کانسٹیبل موجود تھا۔

گاڑی روانہ ہوئی اور الٰہ آباد کی بھری پُری سڑکوں سے گزرنے لگی۔ رات ہو چکی تھی۔ بازار جگمگا رہے تھے۔ ٹریفک رواں دواں تھا۔ راستے میں عمران نے ایک بار پھر ڈی ایس پی سجاد سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے سخت لہجے میں اسے خاموش کر دیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم جس جگہ پہنچے، وہ پولیس اسٹیشن نہیں تھی بلکہ ایک رہائشی علاقے میں درختوں سے گھری ہوئی ایک کوٹھی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ انڈیا اور پاکستان میں پولیس والوں کے نجی ٹارچر سیل اور تفتیشی مراکز بھی ہوتے ہیں۔ کہیں یہ کوئی ایسی جگہ ہی تو نہیں؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ گاڑی ایک نیم تاریک پورچ میں رکی۔ ایک چوکیدار نے پولیس والوں کے انداز میں سجاد کو سیلیوٹ کیا۔ ہمیں ایک اندرونی کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں دو بوسیدہ چارپائیاں اور لحاف پڑے تھے۔ ایک طرف پرانا سا جستی ٹرنک رکھا تھا۔ چھت سے لوہے کی دو زنگ آلود زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ایک دیوار میں دو آہنی کڑے نصب تھے۔ کمرے کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہاں لوگوں سے تفتیش ہوتی ہے اور انہیں ٹارچر کیا جاتا ہے۔ ہم دونوں کو اندر دھکیل کر کمرے کا وزنی آہنی دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔

میں اور عمران چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کمرے میں آہنی دروازے کے علاوہ صرف ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں اندر کی طرف مضبوط آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ کھڑکی کے تین چوبی پٹ گرل سے باہر لگے تھے اور باہر کی طرف ہی کھلتے تھے۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ کمرے میں ایک بڑا سا ایگزاسٹ فین بھی دکھائی دیا۔ کمرے میں بند کرنے سے پہلے ہماری اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ بہرحال، سگریٹ کا پیکٹ اور ایک لائٹر عمران کی جیکٹ کی جیب میں ہی تھے۔ عمران نے سگریٹ سلگایا اور دلیرانہ ٹیک لگا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”جی چاہتا ہے، تمہارا سر پھاڑ دوں یا اپنا پھاڑ لوں۔“
”خود کچھ پھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام یہ لوگ کر دیں گے۔“ عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

میری جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔ ”یار! یہ کوئی بات ہے۔ الٰہ آباد کے دو پلپلے ہمیں بکریوں کی طرح ہانک کر یہاں اس ٹارچر سیل میں لے آئے ہیں۔ کیا ہم...“
”معمولی پولیس والے نہیں۔“ عمران نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی۔ ”اگر تم نے اس سجاد موہل کو معمولی سمجھا تو بہت بڑی غلطی کرو گے۔ یہ شخص ہمیں اتنا نقصان پہنچا سکتا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم غور کرو، اگر میں اس شخص کو اتنی اہمیت دے رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔“
”یار! اگر کوئی وجہ ہے تو مجھے بھی بتاؤ نا۔ میری برداشت جواب دے رہی ہے۔ یہ نہ ہو میں دھوکے میں مارا جاؤں۔ تم سن ہی رہے تھے، وہ خبیث راستے میں کیا باتیں کر رہا تھا ہمارے بارے میں اور پاکستان کے بارے میں۔ لگتا

ہے کہ کُوٹ کُوٹ کر زہر بھرا ہوا ہے اس میں۔"

"آہستہ بولو یار! یہ جنونی شخص ہے۔ دو سال پہلے میرا اس سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ اور بہت بُرا پڑ چکا ہے۔ میرے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں الٰہ آباد میں اس سے یوں ملاقات ہو جائے گی۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، تین چار افراد دندناتے ہوئے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ ان میں سے صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل پولیس کی خاکی وردی میں تھا، باقی سادہ لباس میں تھے۔ دو افراد کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ انہوں نے اپنی انگلیاں لبلبی پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے عقب میں دبلے پتلے جسم لیکن نہایت کرخت چہرے والا سجاد موہل چلا آ رہا تھا۔ اس کے کان سے موبائل فون لگا ہوا تھا اور وہ اس پر کسی نامعلوم شخص کی ماں بہن ایک کرتا چلا آ رہا تھا۔

سجاد نے فون بند کیا۔ اس کے اشارے پر ہمارے کمرے کا دروازہ کھولا گیا۔ "منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" سجاد نے نہایت سخت لہجے میں کہا۔

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" عمران نے پوچھا۔

"تمہارے پیچھے گولی مارنا چاہتا ہوں تاکہ تم شہید نہ بن سکو۔ پتا چلے کہ تم بھگوڑے ہو اور تم نے بھاگتے ہوئے گولی کھائی ہے۔"

"لیکن..."

"لیکن کی ماں کی ایسی تیسی۔ جو میں بک رہا ہوں اس پر عمل کرو۔ ورنہ سچ مچ تمہارے اندر دو تین روشن دان کھول دوں گا۔" سجاد کا لہجہ جنونی ہو گیا۔

عمران چند لمحے ہچکچایا پھر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ حالانکہ میں ہرگز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پنڈلی والی زنجیر ابھی تک میرے ساتھ ساتھ رینگ رہی تھی۔

اب ہم دونوں کے سامنے سپاٹ دیوار تھی۔ کہیں کہیں سے پلاستر اکھڑا ہوا تھا۔ بلب کی زرد روشنی میں ہمارے ہیولے بائیں جانب دکھائی دے رہے تھے۔ "اپنے ہاتھ پیچھے موڑ دو۔" سجاد موہل کی طرف سے دوسرا حکم جاری ہوا۔

یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہمیں الٹی ہتھکڑی لگائی جانے والی ہے۔ عمران نے جیسے آخری کوشش کے طور پر اپنا رخ ڈی ایس پی موہل کی طرف پھیرا اور کہا۔ "اگر تم میری پوری بات سن لو گے تو شاید اپنی رائے بدلنے پر تیار ہو جاؤ۔"

سجاد موہل کا جواب بڑا سخت تھا۔ ایک غلیظ گالی بکتے ہوئے اس نے عمران پر اپنے سرکاری پسٹل سے گولی چلائی۔ یہ گولی عمران کے کان کو چھوتی ہوئی گزری اور میرے سامنے دیوار کا تھوڑا سا اور پلاستر اکھڑ کر نیچے گر گیا۔ سجاد موہل گرجا۔ "کمینے! اگلی گولی تیرے کھوپڑے میں ماروں گا۔ منہ دوسری طرف کر... دوسری طرف کر۔"

عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر رخ پھر دیوار کی طرف پھیر لیا... اور ہاتھ پیچھے کر دیے۔ میں نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ اس نے سر کی خفیف حرکت سے مجھے عندیہ دیا کہ میں سجاد کی ہدایت پر عمل کروں۔

میں نے بھی چار و ناچار ہاتھ پیچھے موڑ دیے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ایسا کرتے ہوئے مجھے خود پر بے پناہ جبر کرنا پڑا۔

دو افراد آگے بڑھے۔ انہوں نے بڑے کرخت انداز میں ہمارے ہاتھوں میں بخ بستہ ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ میں دل ہی دل میں اس وقت کو کوسنے لگا جب ہم چائے پینے کے لیے ہوٹل کی بالکونی میں آئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ اس موہل نامی بلا نے ہمیں نیچے سڑک پر سے ہی تاڑا ہو اور پھر اوپر آ گیا ہو۔

"چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔" موہل نے نیا حکم صادر کیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ ایک آٹومیٹک رائفل اب بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں موجود چاروں افراد کے چہروں سے سفاکی برس رہی تھی اور خاص طور سے موہل کا چہرہ بے رحمی کی تصویر تھا۔ "اب اپنی کس ماں کا بدلہ لینے آئے ہو یہاں؟" موہل دانت پیس کر بولا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو موہل۔ میں کسی ایسی نیت سے یہاں نہیں ہوں۔ میں اور میرا یہ دوست..."

"یہاں دلیپ کمار سے ملاقات کے لیے آئے ہیں..." موہل نے عمران کی بات درمیان سے ہی اچک لی۔ اس کا آہنگ زہر سے بھرا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر تک جگر پاش نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر بولا۔ "کاغذات کہاں ہیں تمہارے؟"

"ہمارے ٹریول ایجنٹ کے پاس ہیں۔"

"اور ٹریول ایجنٹ کون ہے؟"

"اس کا ایڈریس ہوٹل میں ہے۔" عمران نے جھوٹ بولا۔

"تم بکتے ہو۔ تم غیر قانونی طور پر انڈیا آئے ہو اور تمہارا ٹارگٹ وہی منوج ہے۔ تمہارے اندر ضد ہے اور وہ ضد یہ ہے کہ تم منوج کی ہتھیا کرنا چاہتے ہو۔ تمہاری یہی ضد تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے... اور میں تمہیں بتا رہا ہوں، اس مرتبہ تم پر دفعہ 326 نہیں دفعہ 302 لگنے والی ہے۔ تمہاری اس منحوس گردن میں پھانسی کا پھندا پڑنے والا ہے۔"

"کیوں، میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میں نے کسی کی جان نہیں لی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے جان نہیں لی تھی، تم نے منوج کو صرف گھائل کیا تھا۔ تم نے اس کی ٹانگیں ضائع کر دی تھیں۔ ٹانگیں ضائع ہونے کے بعد وہ مٹی کا ڈھیر ہو گیا۔ اس کا جیون اس کے لیے بہت بڑا بوجھ بن گیا۔ اس کے زخم بھی خراب ہوتے چلے گئے اور پھر ان زخموں کی وجہ سے اس کا دیہانت بھی ہو گیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ منوج مر گیا؟" عمران نے قدرے حیرت سے کہا۔

"مر نہیں گیا حرامزادے... تُو نے اسے مار دیا۔ تیرے دیے ہوئے زخموں کی وجہ سے اس کی جان گئی۔ اور یہ ہتھیا کا کیس بنتا ہے۔"

"اگر وہ واقعی مر گیا ہے تو... پھر اسے اس کے کرموں کی سزا ملی ہے۔ لیکن اگر تم یہ سمجھ رہے ہو موہل کہ میں اسے مارنے یا نقصان پہنچانے کے لیے یہاں آیا ہوں تو یہ تمہاری بہت بڑی غلط فہمی ہے۔"

"غلط فہمی ہے یا نہیں لیکن پھانسی کا پھندا تو اب تمہارے گلے میں پڑ گیا ہے... بچو جی... اگر کسی اندھے بہرے جج کے کارن تم بچ بھی گئے تو عمر قید تو کہیں نہیں گئی... ساری عمر یہاں انڈیا کی کسی جیل میں سڑنا پڑے گا۔ اور اس دفعہ تمہیں یہاں سے بھاگنے بھی نہیں دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو پہلے ریمانڈ سے پہلے ہی تمہاری ٹانگ توڑ دوں گا۔ نہ رہے گی ٹانگ، نہ بھاگے گا کنگو تیلی۔"

ہلدو ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ "میں تو کہتا ہوں جناب ابھی توڑ دیں۔ پُن (نیکی) کے کام میں دیری نہیں ہونی چاہیے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی رائفل ڈی ایس پی سجاد موہل کی طرف بڑھائی۔ اس نے رائفل کو الٹی طرف سے پکڑا اور بڑے زور سے عمران کی پنڈلی پر رسید کیا۔ آہنی دستے نے یقیناً عمران کو زبردست چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ دوہرا ہو گیا۔ پہلی چوٹ کے بعد سجاد موہل ایک دم عمران پر پل پڑا۔ اس نے عمران کو رائفل کے کندے سے پے در پے ضربیں لگائیں۔ ساتھ ساتھ وہ اسے ٹھوکریں بھی رسید کر رہا تھا۔ اب میرے لیے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر ایک زوردار لات سب انسپکٹر کے سینے پر رسید کی۔ وہ اچھل کر جستی ٹرنک پر گرا۔

حوالدار نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی تو میں نے اسے بھی ٹانگ رسید کر کے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ میرے جسم میں بجلی دوڑ گئی تھی۔ یہ وہی بجلی تھی جو جیکی کی خوفناک تربیت سے میرے رگ و پے میں سمائی تھی۔ یہ ایک ایسی توانائی تھی جس نے میری کایا پلٹی تھی اور مجھے میرے حریفوں کے لیے خطرناک بنا دیا تھا۔ مگر یہاں مسئلہ اسی الٹی ہتھکڑی کا تھا جس نے میرے اور عمران کے ہاتھ جکڑ رکھے تھے۔ میری زوردار مزاحمت نے پولیس والوں کو ہکا بکا کر دیا۔ انہیں سخت چوٹیں لگیں۔ خود ڈی ایس پی موہل بھی اچھل کر دیوار سے ٹکرایا لیکن پھر اس کے بعد کئی افراد دھڑا دھڑ کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے ہمیں بے بس کر دیا۔ کوئی دس افراد ہوں گے جو ہم سے کالی بھڑوں کی طرح چمٹ گئے۔ انہوں نے ہمیں بُری طرح زدوکوب کیا۔ پتا نہیں کہ یہ سلسلہ کتنی دیر چلتا اور اس کا حتمی نتیجہ کیا نکلتا کہ ایک نسوانی آواز نے صورتِ حال تبدیل کر دی۔ یہ آواز کوٹھی کے برآمدے کی طرف سے بلند ہوئی تھی۔ اس آواز کے سنتے ہی ہمیں مارنے والے ٹھٹک گئے۔ ڈی ایس پی سجاد موہل نے بھی اپنا ہاتھ روک لیا۔

آواز ایک بار پھر ابھری۔ کسی نے چلا کر کہا۔

"موہل! جلدی آؤ... پلیز۔"

موہل نے مڑ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ تب میری نگاہ بھی کھڑکی سے باہر باغیچے کی ایک روش پر پڑی۔ گارڈن لائٹ کی دودھیا روشنی میں ایک دراز قد عورت ذرا جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کی نارنجی ساڑی کا پلو زمین پر لٹک رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا پہلو دبایا ہوا تھا۔ وہ کسی طرح کے درد کا شکار تھی۔

سجاد موہل تیزی سے باہر نکل گیا۔ ہمیں زدوکوب کرنے والے اس کے ماتحت بھی تتر بتر ہو گئے۔ ہم دونوں ٹھنڈے فرش پر پڑے خون تھوک رہے تھے۔ عمران کے چہرے پر دو تین گومڑ ابھر آئے تھے اور نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ میری ناک سے خون رس رہا تھا۔ پسلیوں سے بھی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

کمرے کا دروازہ باہر سے پھر لاک کر دیا گیا۔ ڈی ایس پی سجاد کے ایک ماتحت نے ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور بکتا جھکتا ہوا باہر چلا گیا۔ "ہائے... اوئی... اُف۔" عمران نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "رانی خاں کے سالوں نے بالکل بھوئی سمجھ کر مارا ہے۔ مجھے تو لگتا

ہے کہ میرا گردہ زخمی ہوگیا ہے۔" اس نے پیٹ کے درمیان ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"گردہ یہاں نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"یار! جتنی اٹھک پٹخ ہوئی ہے ہمارے ساتھ، گردہ کہیں بھی ہوسکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ دماغ کے سوا تمہارے سارے اعضا اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ تم نے جان بوجھ کر یہ "چھیتی کھاؤ" پروگرام کیوں بنایا ہے۔ تم خود کہہ رہے ہو کہ یہ بندہ جنونی ہے اور میرا خیال ہے کہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ تو پھر کیوں پھنسے ہو اس کے شکنجے میں؟ کتنی فرماں برداری سے ہتھکڑی لگوائی ہے تم نے۔ اور ساتھ ساتھ مجھے بھی بندھوا دیا ہے۔"

"جب تمہیں اس بندے کی اصلیت کا پتا چلے گا تو تم میرا شکریہ ادا کرو گے۔ میں نے جو کیا ہے، ٹھیک کیا ہے۔"

"ٹھیک کیا ہے تو پھر ہائے ہائے کیوں کررہے ہو؟"

"یار! تم تو بن چکے ہو آئرن مین۔ چھوٹی موٹی چوٹ تمہیں کچھ کہتی ہی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مار تم نے ایسے ہی کھائی ہے جیسے دودھ جلیبی کھاتے ہیں۔ سوچو اگر میں بھی ہائے ہائے نہ کروں تو ان لوگوں کا پارا تو پہنچ جائے گا ساتویں آسمان پر۔ جو مارتا ہے وہ یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ مار کھانے والا ہائے ہائے بھی کرے۔" اس نے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر "اوئی اللہ" کہہ کر لیٹ گیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ کسی اندرونی چوٹ کی وجہ سے تمہاری جنس تبدیل ہوگئی ہے۔" میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"اتنی جلدی جنس تبدیل نہیں ہوتی۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اتنی جلدی جنس تبدیل ہونے لگے تو کوئی ماں اپنے بچے کو گھر سے باہر ہی نہ نکلنے دے... ادھر جھگڑا ہوا ادھر جنس تبدیل۔ ایک دفعہ پتا ہے کیا ہوا..."

"ہاں، مجھے پتا ہے۔" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن یہ پتا نہیں کہ آج کیا ہوا ہے۔ یہ انڈین پولیس والا کیوں تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے... اور یہ منوج کون ہے؟ کیا تم نے واقعی اس نام کے کسی بندے سے مار پیٹ کی تھی؟"

"ہاں یار! دو سال پہلے جب میں انڈیا آیا تھا تو یہاں بمبئی میں ایک ایسا جھگڑا ہوا تو تھا۔ لیکن وہ ایسا سنگین نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے اس بندے کی جان چلی جاتی۔ اس میں کوئی گڑبڑ گوٹالا ہے۔ شاید یہ بندہ ہمیں بلیک میل کرنا چاہ رہا ہے۔"

"اور مجھے لگتا ہے کہ تم خود بھی بلیک میل ہونا چاہ رہے ہو۔ راستے میں کئی موقع ایسے آئے تھے جب ہم گاڑی کے اندر ہی اس ڈی ایس پی صاحب کی طبیعت صاف کرسکتے تھے۔ کم از کم میں تو ایسا کرسکتا تھا۔"

"اور یہی تمہاری بھول ہے۔" عمران نے ترت کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی جیکٹ کی زپ ٹوٹ چکی تھی اور قمیص کا گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔ آئندہ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

"یہ ہم ہیں کس جگہ پر اور یہ جوان عورت کون تھی؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تمہیں یہاں پکڑ کر لانے والا میں ہوں اور ابھی تمہیں "گلوڈ کٹ" بھی میں نے ہی لگائی ہے۔ بھئی تمہاری طرح میں بھی یہاں ایک "معزز" مہمان کی حیثیت سے موجود ہوں اور تمہارے ساتھ ہی مہمان نوازی اور عزت افزائی کے مرحلوں سے گزر رہا ہوں۔"

"یار! کچھ اندازہ تو ہوگا تمہارا؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"اندازہ یہی ہے کہ یہ ڈی ایس پی موہل کی اپنی ہی رہائش گاہ ہے اور اس کے ایک حصے میں خاص ملزموں سے پوچھ گچھ کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ میرے دوسرے اندازے کے مطابق یہ عورت جو ابھی موہل کو آوازیں دے رہی تھی، اس کی گھر والی ہے یا پھر آدھی گھر والی یعنی سالی ہوگی... یا پھر دو تہائی گھر والی یعنی منہ بولی بیوی ہوگی۔"

تھوڑی دیر پہلے ہونے والی مار پیٹ کا عمران پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا... ہاں، موہل کے حوالے سے وہ اب بھی پریشان تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ موہل کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا تھا؟ ہمارے ہاتھ بدستور الٹی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور یہ خاصی تکلیف دہ صورت حال تھی۔ ہم اپنے چہرے سے رسنے والا خون بھی صاف نہیں کرسکتے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار کمرے کی دیوار کا وہ حصہ آرہا تھا جہاں گولی کا تازہ نشان موجود تھا۔ کچھ دیر پہلے یہ گولی عمران کے کان کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ یہ گولی اور گولی کا نشان اس امر کا ثبوت تھے کہ عمران ڈی ایس پی موہل کی جنونیت کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہمیں موہل پھر اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے دبلے چہرے پر بھاری مونچھیں زیادہ نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ اب اس کے ساتھ صرف سب

انسپکٹر تھا۔ دروازے پر کھڑے رائفل بردار حوالدار نے کمرے کا قفل کھولا اور موہل کے لیے ایک کرسی کمرے کے اندر رکھ دی۔ موہل اس کرسی پر براجمان ہوگیا۔ رائفل بردار بالکل چوکس حالت میں اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ موہل کا پارا جو آدھ پون گھنٹا پہلے ضرورت سے زیادہ اوپر چلا گیا تھا، اب قدرے نیچے محسوس ہوتا تھا۔ اس نے دانتوں میں ماچس کی تیلی چلاتے ہوئے آتشیں نظروں سے عمران کو گھورا اور کہا۔ "کیا ارادے ہیں؟ مزید مرمت کرانی ہے یا سب کچھ صاف صاف بتانا ہے؟"

"آپ لوگ یہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ میں کچھ چھپا رہا ہوں؟" عمران نے کہا۔

"ہمیں پتا چل چکا ہے۔ تم سات بندوں نے ہوٹل میں بکنگ کرائی تھی، چار مرد تین عورتیں۔ مجھے یقین ہے تمہاری طرح تمہارے ساتھیوں نے بھی فرضی نام لکھوائے ہیں۔ تم دونوں کے پکڑے جانے کے بعد تمہارے ساتھی موقع سے فرار ہوچکے ہیں۔ لیکن بھاگ کر حرامزادے جائیں گے کہاں؟ موہل انہیں زمین کی ساتویں پرت سے بھی نکال لے گا۔"

موہل کی باتوں سے ہمیں اندازہ ہوا کہ جب یہ پولیس والے ہمیں گن پوائنٹ پر ہوٹل سے باہر لا رہے تھے تو اسد یا اجے نے یہ منظر دیکھ لیا تھا اور فوری طور پر اپنا تحفظ کیا تھا۔ موہل نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "کہیں یہ کوئی دہشت گردی کی پلاننگ تو نہیں ہے؟"

"دہشت تو تم پھیلا رہے ہو موہل صاحب! ہم پر بھیانک قسم کے الزام لگا رہے ہو۔ ورنہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم فن کار لوگ ہیں۔ لوگوں کو تفریح فراہم کرکے روزی کماتے ہیں۔"

"بے شک... بے شک... تم جیسے آٹھ دس اور فن کار انڈیا میں آجائیں تو پورے ملک میں تفریح کی لہر لہر ہوجائے۔ دو سال پہلے تو صرف ایک منوج کمار کی ٹانگیں ٹوٹی تھیں... ایک بندہ زخمی ہوا تھا اور ایک گاڑی تباہ ہوئی تھی، اب تم لوگ اس سے کہیں بڑی تفریح فراہم کرنے کے قائل ہو۔ ویسے تم پاکستانیوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اپنے ملک کی مسجدوں میں تو خیر خیریت سے نماز بھی نہیں پڑھ سکتے ہو اور حج کے موقع پر ہم ہندوستانیوں سے پوچھتے ہو کہ انڈیا میں تم پر ظلم تو نہیں ہوتا؟ واہ! کیا شان ہے تمہاری؟"

"لیکن یہ بات کیوں بھولتے ہو کہ یہاں احمد آباد میں سیکڑوں لوگوں کو مسلم کش فسادات میں زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ کشمیر میں کیا ہورہا ہے... بمبئی میں کیا ہورہا ہے..."

"جو کچھ بھی ہورہا ہے لیکن یہاں ہم مسلمان تم لوگوں سے زیادہ محفوظ اور خوش ہیں۔ تم لوگوں نے حکومتیں بنانے اور توڑنے کے سوا کیا ہی کیا ہے اپنے ملک میں۔ اپنی ضرورت کی چھوٹی سے چھوٹی شے کے لیے تم باہر کی دنیا کے محتاج ہو۔ تم نے اس خطے کو کلاشنکوف کلچر، ہیروئن اور دہشت گردی کے تحفے دیے ہیں۔"

"مگر معاف کرنا موہل صاحب! بڑے سے بڑا ڈان تو تمہارے ملک میں بھرا ہوا ہے۔ تمہاری پوری فلم انڈسٹری پر ڈانوں کا راج ہے۔ تمہارے بڑے بڑے شہر ان دادا گیروں نے یرغمال بنا رکھے ہیں۔"

"اور وہاں پاکستان میں جو کچھ ہورہا ہے، اس کی جانکاری بھی ہم کو ہے۔ یہاں تو فلم انڈسٹری میں ڈان ہوں گے، وہاں تمہاری پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمہارے سرکاری محکموں میں بیٹھے ہوئے ہیں... اور تو اور تمہاری سرکس کمپنیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک منحوس سرکس کے ساتھ ایک حرامزادہ بازی گر یہاں آتا ہے اور سڑکوں پر دادا گیری کرتا ہے۔ لوگوں کی ٹانگیں توڑتا ہے، ان کے جیون برباد کرتا ہے۔ ان کو ان کے بال بچوں سمیت زندہ جلانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔" ڈی ایس پی موہل نے آخری الفاظ دانت پیس کر کہے اور عمران کو قہرناک نظروں سے دیکھا۔ چند لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ طیش میں آکر اس پر جھپٹ پڑے گا۔

اس نے حوالدار سے کہہ کر شراب کی چھوٹی بوتل منگوائی اور وہیں ہمارے سامنے بیٹھ کر اس کے تلخ گھونٹ بھرنے لگا۔ ذرا نشہ چڑھا تو اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے عمران کے پہلو میں لات رسید کی اور پھنکارا۔ "اگر تیرے دل میں کوئی ارمان ہے تو نکال لے۔ میں تیری یہ ہتھکڑی کھلوا دیتا ہوں۔ تجھے بھاگنے کے لیے سمے بھی دیتا ہوں۔ میں بیس سیکنڈ سے پہلے تیرے پیچھے نہیں بھاگوں گا۔ لیکن پھر اگر پکڑا گیا تو ننگا کرکے ماروں گا۔ ایک ایک انچ گوشت اڑا دوں گا تیرے پنڈے پر سے۔" اس نے باقاعدہ انگوٹھے اور انگلی کو ملا کر ایک انچ کا اشارہ بتایا۔

ابھی کچھ دیر پہلے عمران نے مجھے ڈی ایس پی موہل کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ موہل ماضی میں کبڈی کا نامور کھلاڑی بھی رہا ہے اور اسی کھیل کی بنیاد پر پولیس میں بھرتی بھی ہوا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی انور موہل بھی پولیس میں تھا اور وہ بھی کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ بعد ازاں اس

نے پولیس چھوڑ دی تھی اور امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا تھا۔

موہل وہاں پندرہ منٹ مزید ہمارے پاس بیٹھا۔ اس دوران میں اس نے بس زہر ہی اگلا۔ اس کے دل میں پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی۔ خصوصاً پاکستانی پولیس اور قانون نافذ کرنے والی دیگر ایجنسیوں سے وہ بہت متنفر تھا۔ اب پتا نہیں اس نفرت کی وجہ کیا تھی۔ عین ممکن تھا کہ عمران کو علم ہوتا مگر وہ کچھ بتاتا تو تب تھا۔ موہل کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ عمران کو ایک مفرور ملزم کی حیثیت سے اپنے اعلیٰ افسروں کے حوالے کرنا چاہتا ہے اور اپنی چھاتی پر کامیابی کا ایک یادگار تمغہ سجانے کا خواہش مند ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی شک تھا کہ عمران اب پھر کسی جرم کی نیت سے ہی یہاں الٰہ آباد میں موجود ہے۔ وہ اس نئے جرم کا کھوج بھی چاہتا تھا۔ ہم دونوں کے حوالے سے اس کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ ہمارے ساتھ گفتگو کے دوران میں ہی اس کے موبائل پر کال آگئی۔ یہ کال موہل کے کسی ماتحت کی تھی۔ اس ٹیلی فونک گفتگو سے ہمیں پتا چلا کہ الٰہ آباد میں اسد اور میڈم سمیت ہمارے ساتھیوں کی تلاش زور شور سے جاری ہے اور اس شخص کا بھی سراغ لگایا جا رہا ہے جس کی وساطت سے ہمارے لیے ہوٹل میں کمرے بک ہوئے تھے۔

سجاد موہل کے جانے کے بعد ہمارے کمرے کو باہر سے پھر وزنی تالا لگا دیا گیا۔ دو رائفل بردار اہلکار کمرے سے باہر چوکس حالت میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک حوالدار فیاض اور دوسرا ہندو ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

حوالدار فیاض ہماری طرف مسلسل تمسخر بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ گرل دار کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگتا۔ عمران نے اس سے کہا۔ ”میرے برادر! کہیں سے سبز چارا مل جائے گا تھوڑا سا؟“

”کیا کرو گے؟“

”کھائیں گے یار اور کیا کریں گے۔ تمہارے ڈی ایس پی نے ہمارے ہاتھ تو پیچھے باندھ دیے ہیں، اب روٹی اور برگر وغیرہ تو ہم کھا نہیں سکتے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چارا وغیرہ ہی کھانا پڑے گا۔“

وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ ”گھبراؤ مت۔ چارا وغیرہ بھی دیں گے۔ پہلے تم سے تھوڑا سا ہل تو چلوا لیں۔“

”یار! ہل چلوایا تو ہے تم لوگوں نے۔ دیکھ لو ہم دونوں کے تھوبڑے نیلو نیل ہو رہے ہیں۔“

”ابھی تو صرف تھوبڑے نیلو نیل ہوئے ہیں، کل شام تک تمہیں ہر جگہ نیل نظر آئیں گے۔ اور جو جگہیں تم خود نہ دیکھ سکو گے، ان پر ہاتھ لگانے سے پتا چل جائے گا کہ نیل پڑے ہوئے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے ہم شام تک یہیں رہیں گے؟“ عمران نے حیرت ناک صورت بنائی۔

”کل شام تک نہیں میرے ہیرے... اگلی پانچ چھ شاموں تک تم یہیں رہو گے... اور ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ شامیں لگ جائیں۔ ویسے شام پر تمہارے کسی پاکستانی کوی نے بڑا اچھا گانا بنایا ہے۔ وہ کیا کہتا ہے... میرا کوئی کام کر دو اور... شام کر دے۔“

عمران نے فوراً تصحیح کی۔ ”ہو سکے تو میرا ایک کام کر دو، شام کا ایک پہر میرے نام کر دو۔ ریاض الرحمٰن ساغر نے لکھا ہے۔ میری بڑی پکی یاری ہے ان سے... لیکن یار! تمہاری ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہارے ڈی ایس پی صاحب ہمیں اس کوٹھی میں کس طرح رکھ سکتے ہیں... یہ کوئی تھانہ تو نہیں؟“

”گھبراؤ مت۔ یہاں تم دونوں کو تھانے سے زیادہ ”سہولتیں“ ملیں گی۔“ وہ مونچھیں مروڑ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”باقی رہی یہاں رکھنے کی بات تو میرے ہیرے... تھانے تو تمہیں تب لے جایا جائے گا جب تمہاری گرفتاری ڈالی جائے گی۔ ابھی تو تمہارا کوئی اندراج ہی نہیں۔ کوئی کھوج کھرا، کوئی مائی باپ نہیں تمہارا۔ ڈی ایس پی صاحب تمہیں یہاں زندہ بھی گاڑ دیں گے تو کسی کو خبر نہیں ہوگی۔“

وہ دیر تک ہمیں ڈراتا دھمکاتا رہا اور بتاتا رہا کہ ڈی ایس پی صاحب اس چار دیواری میں مختارِ کل ہیں۔ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم پوچھ گچھ کے سلسلے میں ان سے پورا تعاون کریں ورنہ ہماری خیریت جو پہلے ہی مشکوک ہے، مزید خطروں میں گھر جائے گی۔

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ ہمیں بیدردی سے مارا گیا تھا۔ میرا جسم پھوڑا بنا ہوا تھا لیکن ایسی تکلیفیں اب مجھے مزہ دیتی تھیں۔ میں ایسی تکلیفوں کی گہرائی میں ڈوب جاتا تھا، ان سے دوستی کرتا تھا۔ اب مجھے ان کی ”شدت“ سے لذت کشید کرنا آگئی تھی۔ بوسیدہ لحاف ہمیں سردی سے بچانے کے لیے ناکافی تھے۔ ہاتھ پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ جسمانی اذیت میں بھوک کی بے چینی بھی شامل ہو گئی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ مجھے دکھ پہنچانے میں ناکام تھا۔ رہی عمران کی بات تو وہ بھی بلا کا سخت جان تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ڈی ایس پی موہل اپنی پرائیویٹ کار لے کر بڑی تیزی سے کہیں نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ایک حوالدار نے اندر آ کر میری ہتھکڑی کھولی۔ عمران کی ہتھکڑی بھی اسی نے کھولی۔ میرے پاؤں سے زنجیر بھی اتار لی گئی۔ جب تک حوالدار باہر نکل کر دروازہ لاک کر چکا تھا۔ اس کے نزدیک عمران ایک خطرناک شخص تھا کیونکہ وہ ماضی قریب میں، منوج نامی کسی شخص کی ٹانگیں توڑ چکا تھا اور پولیس کی حراست سے فرار ہو چکا تھا۔ لیکن میرے خیال کے مطابق یہ شخص عمران کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔

ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈی ایس پی موہل کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ شام کے بعد بھی اپنی رہائش گاہ پر نظر نہیں آیا۔ اس کی کار بھی دکھائی نہیں دی۔ دو رائفل بردار اہلکار مسلسل کمرے کے دروازے کے سامنے پہرا دے رہے تھے۔ صبح ہمیں واجبی سا ناشتا دیا گیا تھا مگر رات کا کھانا اچھا تھا۔ رات نو دس بجے کے قریب ایک عجیب سا واقعہ ہوا۔ وہی عورت برآمدے کی سیڑھیوں پر دکھائی دی جسے ہم نے کل شب موہل کو پکارتے سنا تھا۔ تب وہ شدید درد میں محسوس ہوتی تھی۔ تاہم اب وہ ٹھیک لگ رہی تھی۔ اس نے آج مختلف رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ قبول صورت اور متوازن جسم کی تھی۔ اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک چلتی وہ ہمارے کمرے کی طرف آئی۔ کانسٹیبل اور حوالدار نے اسے ادب سے سلام کیا۔ وہ کھڑکی میں سے ہمیں گھورتے ہوئے بولی۔ ”کیا کیا ہے انہوں نے؟“

اس کا یہ سوال حوالدار فیاض سے تھا۔ فیاض نے کہا۔ ”ابھی انہوں نے کچھ بتایا نہیں بیگم جی... مگر کل تک سب کچھ بک دیں گے۔ ویسے شاید آپ نے غور سے دیکھا نہیں۔ ان میں سے ایک کو آپ پہلے سے بھی جانتی ہوں گی۔ یہ سرکس کا وہی بازی گر ہے جس نے منوج صاحب کی ٹانگوں میں گولیاں ماری تھیں۔“

بیگم صاحبہ نے غور سے عمران کو دیکھا اور ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں سکیڑا۔ ”اوہ مائی گاڈ... تو یہ پھر پکڑا گیا۔“

”صاحب جی نے آپ کو اس کے بارے میں بتایا نہیں؟“ حوالدار نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ ان کو موقع ہی نہیں ملا۔ کل شام کو مجھے کڈنی کا شدید درد شروع ہو گیا تھا۔ آج صبح سویرے ان کو کسی چھاپے کے لیے جانا پڑ گیا۔ یہ تو بڑی اہم سماچار ہے۔ اگر انہیں موقع ملتا تو مجھے ضرور بتاتے۔“ اس نے ایک بار پھر غور سے عمران کو دیکھا پھر حوالدار سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”وشواس نہیں ہو رہا کہ یہ دوبارہ سلاخوں کے پیچھے ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ دوسرا کون ہے؟“

”یہ بھی ہوگا کوئی اٹھائی گیرا جی۔ یہ بھی پاکستان سے ہی تشریف لایا ہے۔“

بیگم صاحبہ نے تھانے داری لہجے میں کہا۔ ”اب کیا ارادے تھے تمہارے؟“

عمران نے مسکین صورت بنائی۔ ”ارادے تو بڑے نیک تھے جی۔ کسی ہندوستانی لڑکی کو جیون ساتھی بنا کر پاکستان لے جانا چاہتا تھا مگر آپ کے شوہر صاحب بڑی دور کی سوچتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب میں ہندوستانی لڑکی کو پاکستان لے کر جاؤں گا تو اسے ضرور تنگ کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ مار پیٹ بھی کروں۔ لہٰذا انہوں نے شادی سے پہلے ہی مجھے ایک ”سخت گیر داماد“ کا رتبہ بخش دیا بلکہ ہتھکڑی بھی لگا دی۔ دیکھیں کتنے ستم کی بات ہے، میں نے ابھی اس بیوی کی شکل بھی نہیں دیکھی جس پر میں نے ظلم کرنا ہے اور مرمت میری پہلے ہی ہو گئی ہے۔“

حوالدار نے کہا۔ ”اسے بکنے کی عادت ہے بیگم صاحبہ! آپ کو یاد ہوگا پچھلی دفعہ جب اسے عدالت میں ریمانڈ کے لیے پیش کیا گیا تھا، اس نے مجسٹریٹ صاحب کو اس لیے مجسٹریٹ صاحب کہہ دیا تھا کیونکہ ان کی آواز بہت

باریک تھی۔ ایک نمبر کا چرب زبان ہے۔"

بیگم صاحبہ نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ عمران سے ایک دو باتیں کیں۔ پھر حوالدار کو ایک ڈاکٹری نسخہ دیا اور اسے قریبی میڈیکل اسٹور سے دوا لانے کو کہا۔ حوالدار چلا گیا تو بیگم صاحبہ نے ہیڈ کانسٹیبل کو برآمدے کی لائٹ روشن کرنے کو کہا۔ جب ہیڈ کانسٹیبل رخ دوسری طرف پھیر کر لائٹ روشن کر رہا تھا، بیگم صاحبہ نے اچانک اپنی گرم شال کے نیچے سے ایک موبائل فون نکالا اور گرل دار کھڑکی میں سے عمران کی طرف بڑھایا۔ عمران ایک لمحے کے لیے چونکا پھر اس نے موبائل لے کر چارپائی پر پڑے لحاف کے نیچے رکھ دیا۔

ہیڈ کانسٹیبل لائٹ روشن کر کے واپس ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ بیگم صاحبہ نے انکشاف انگیز لہجے میں عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں جانکاری نہیں کہ منوج کمار مر چکا ہے اور اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی موت تمہارے دیے ہوئے زخموں سے ہی ہوئی ہے... اب تم انڈیا آ گئے ہو۔ نہ صرف آ گئے ہو بلکہ پکڑے بھی گئے ہو۔ شاید اسی کو کہتے ہیں جو کرو گے سو بھرو گے۔"

عمران نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی کی طرح دار بیوی واپس چلی گئی۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ اس نے عمران کو موبائل دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے پہلے سے جانتی ہے اور نہ صرف اسے جانتی ہے بلکہ رابطہ بھی کرنا چاہتی ہے۔ اس نے حوالدار وغیرہ کے سامنے ضرور کچھ کھردری باتیں کی تھیں مگر اندر خانے وہ عمران کی ہمدرد محسوس ہوتی تھی۔

"یہ کیا چکر ہے بھئی؟" میں نے عمران سے سرگوشی میں پوچھا۔

"یہ شریفانہ چکر ہے۔ تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

وہ ابھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں پتا چل ہی جانا تھا اور پھر یہی ہوا۔ موبائل فون نے "وائبریٹ" کیا۔ اس پر میسج آیا تھا۔ یہ ڈی ایس پی کی وائف ہی کی طرف سے تھا۔ اس طویل میسج کا ٹیکسٹ انگریزی میں تھا۔ عمران نے یہ میسج مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

"بھائی جان! آپ کو پھر سے پولیس کی کسٹڈی میں دیکھ کر مجھ پر جو گزر رہی ہے، بس میں ہی جانتی ہوں۔ ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ آپ کو تقریباً دو سال بعد دیکھا اور وہ بھی اس حالت میں۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ کل رات میں نے آپ کو اور آپ کے دوست کو گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا... پھر جب کمرے میں آپ دونوں سے مارپیٹ شروع ہوئی تو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ میں نے درد کا بہانہ کیا اور سجاد کو آوازیں دیں۔ میں نے وقتی طور پر تو آپ کی مصیبت ٹال دی لیکن یہ زیادہ دیر نہیں ٹلے گی۔ سجاد کے ارادے خطرناک لگتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ آپ کے لیے میری جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔"

جواب میں عمران نے لکھا۔ "تم بھائی جان کہہ کر سارا مزہ کرکرا کر دیتی ہو۔ تمہیں پتا ہے، میں کیا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اس جن زادے سے چھٹکارا دلانا چاہتا ہوں جس نے پچھلے سات آٹھ سال سے تمہیں قید کر رکھا ہے۔ بہرحال، یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو میں اس کی قید میں ہوں۔ جہاں تک تمہاری مدد کی بات ہے تو تم بس دعا کرو۔ ذاتی طور پر اس معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا معاملہ ہے، میں سنبھال لوں گا۔"

میسج کا جواب آیا۔ "یہ آپ کا نہیں سراسر میرا معاملہ ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا، میرے لیے کیا۔ میرے گھر کو بچانے کے لیے کیا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اگر آپ کی وجہ سے منوج کی ٹانگیں کٹیں تو وہ اسی لائق تھا۔ اس نے ایک گندا جرم کیا تھا... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ سجاد بھی آپ کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے صرف اور صرف میری وجہ سے گرفتاری دی۔ میں آپ کی بہت احسان مند ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اس بوجھ تلے اور نہ دبائیں۔ مجھے بتائیں، آپ دوبارہ کیوں سجاد کی کسٹڈی میں نظر آ رہے ہیں؟ اور میں آپ کے لیے کیا کروں؟"

عمران نے لکھا۔ "اگر تم میرے لیے کچھ کرنا چاہتی ہو تو خدا کے لیے اپنے اس ناہنجار... جن زاد شوہر سے چھٹکارا حاصل کر لو۔ میری دلی خواہش پوری ہو جائے گی۔ اگر مجھ سے کہو گی تو میں سر کے بل حاضر ہوں، ورنہ کوئی مناسب شخص ڈھونڈنے میں، میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔"

جواب آیا۔ "یہ مذاق کا موقع نہیں۔ میرا دل رو رہا ہے۔ آپ کو بری طرح مارا ہے انہوں نے۔ اور ابھی وہ اور سختی کریں گے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ سجاد آپ کے ان ساتھیوں کی تلاش میں گئے ہیں جو آپ کے پکڑے جانے کے بعد ہوٹل پارک ویو سے فرار ہو گئے تھے۔ کم از کم آپ مجھے یہ تو

بتا دیں کہ اس بار آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ یہ منوج والا معاملہ ہی ہے یا کچھ اور ہے؟"

"نہیں عاصمہ! اس دفعہ ہم اہم فلمی شخصیات کے انٹرویوز لینے آئے ہیں۔" عمران نے لکھا اور پھر مزید پیغامات سے بچنے کے لیے فون آف کر دیا۔

میں نے دیکھا کھڑکی سے باہر حوالدار فیاض رائفل گود میں رکھے کرسی پر بیٹھا تھا اور اونگھ رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نریندر کے قدموں کی چاپ برآمدے میں مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "عمران! مجھے سچ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟ ورنہ..."

"ورنہ کیا؟"

"یہاں سینڈ بیگ نہیں ہے اور میں سینڈ بیگ کی کمی تمہارے تھوبڑے سے پوری کر دوں گا۔ مکے مار مار کر تمہاری بتیسی کا ستیاناس کر دوں گا۔"

عمران کچھ دیر غور سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"یہ ڈی ایس پی کی بیوی عاصمہ کس گندے جرم کی بات کر رہی تھی؟ کیا کیا تھا منوج نے؟"

"اس نے ایک پاکستانی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اور لڑکی بھی وہ جو اس سے عمر میں بیس بائیس سال چھوٹی تھی۔ وہ ہمارے سرکس میں جمناسٹ تھی۔ ہمارے ساتھ ہی انڈیا کے شہروں میں شو کرنے کے لیے پاکستان سے آئی تھی۔ منوج نے اسے ورغلایا۔ اسے کوک میں نشہ آور دوا ملا کر پلائی اور اس سے دست درازی کی۔"

"یہ منوج کون تھا؟"

"بمبئی میں مرغ حلیم بیچتا تھا۔ راج کپور کی بہن کی ساس کی خالہ کا چھوٹا بہنوئی تھا۔" عمران پھر پٹری سے اترنے لگا۔

میں نے اس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ "یار! ایک بار مجھے شروع سے سب کچھ بتا دو پھر مجھے پریشانی ہوگی نہ تمہیں۔"

"کہاں سے بتاؤں؟"

"منوج سے بتا دو۔ یہ کون تھا؟"

"بمبئی کی فلمی دنیا کا بندہ تھا۔"

"ایک تو مشہور اداکار منوج کمار ہے؟"

"نہیں، یہ فلمسازی کرتا تھا۔ شاید ایک دو فلموں کی ڈائریکشن بھی دی تھی... کافی کھاتا پیتا شخص تھا۔ ایسے لوگوں کو لڑکیوں کی کیا کمی ہوتی ہے۔ لیکن پتا نہیں کیا ہوا۔ یہ بمبئی میں ہمارا شو دیکھنے آیا۔ وہاں اس کی ملاقات ہماری ٹیم سے ہوئی۔ ان میں زیب بھی شامل تھی۔ زیب لاہور کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکول کے زمانے میں اسے جمناسٹک کا شوق پیدا ہوا اور پھر شوق ہی شوق میں وہ ہمارے سرکس تک آ پہنچی۔ جان محمد صاحب نے اسے اچھے معاوضے کی پیشکش کی اور وہ باقاعدہ شوز میں حصہ لینے لگی۔ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ اس نے منوج سے بھی ہنس کر باتیں کیں۔ بعد میں منوج نے اسے فون کیا اور بتایا کہ اگر وہ کوشش کرے تو فلموں میں آ سکتی ہے۔ ان فلمی لوگوں میں ایک جادو ہوتا ہے یار... ان کی آفرز کو ٹھکرانا اور ان کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنا بڑا مشکل ہوتا ہے، خاص طور سے لڑکیوں کے لیے۔ اچھے بھلے گھرانوں کی لڑکیاں ان چکروں میں پھنستے ہوئے دیکھی گئی ہیں۔ بہرحال، یہاں جو کچھ ہوا، اس میں شاید تھوڑا بہت قصور زیب کا بھی تھا۔ ہم بمبئی میں قریباً پندرہ دن رہے تھے۔ وہ ہمیں بتائے بغیر منوج سے فون پر بات کرتی رہی اور اس سے ملتی بھی رہی۔ منوج نے اسے فلمی دنیا کی چکاچوند کی کچھ جھلکیاں دکھائیں۔ ایک روز اسے ساحل پر اپنے کاٹیج میں لے گیا۔ زیب کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ وہ چھتیس سال سے اوپر کا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اسے دھمکیاں دیں کہ اگر اس نے اس بارے میں اپنے ساتھیوں کو بتایا تو وہ اسے ذلیل و خوار کر دے گا۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ زیب نے یہ سب کچھ مجھے بتا دیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں نے اس سے پوچھ لیا۔ اس نے بہت زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزر سے لیے تھے۔ مرنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کسی کو کچھ بتاتی نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اپنی نادانی کے سبب وہ کسی حادثے کا شکار ہو چکی ہے۔ میں نے کوشش کی اور اس کا دکھ جاننے میں کامیاب رہا۔ اب میرے لیے برداشت کرنا مشکل تھا۔ میں جانتا تھا کہ منوج سنہا واقعی ایک "بڑا آدمی" ہے۔ اپنے تعلقات کے سبب وہ اپنا کچھ بگڑنے نہیں دے گا اور میں اسے یونہی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے گھیر لیا۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ رات کے وقت جب وہ اپنے ڈرائیور اور ایک فلمی دوست کے ساتھ نشے میں دھت اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا، میں نے اسے جا لیا۔ اس کا دوست زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ ڈرائیور نے بھی بھاگ کر جان بچائی۔ میں نے منوج کے گھٹنوں اور رانوں پر چھ گولیاں ماریں۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر جان بخشوائی۔ اس کے بعد کے واقعات کا تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔"

”میں تمہاری طرح جیمز بانڈ نہیں ہوں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ پوری بات بتاؤ۔ یہ ذلیل موہل تمہارے پیچھے کیسے پڑا؟“

”اوئے گھامڑ! میں مجرم تھا اور یہ پولیس والا۔ اس نے میرے پیچھے نہیں پڑنا تھا تو کیا جوہی چاولہ یا شبانہ اعظمی نے پڑنا تھا۔ ان دنوں یہ شرابی پلسیا بمبئی میں ہی تعینات تھا۔ اس نے مجھے پکڑنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ پاکستان اور پاکستانیوں سے تو اس خبیث کو خاص طور سے ”محبت“ ہے۔ منوج کو گولیاں مارنے اور اس کی مرسیڈیز کو آگ لگانے کے بعد میں اورنگ آباد کی طرف نکل گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اس کارروائی کی وجہ سے سرکس کے مالک جان محمد صاحب یا میرے دیگر دوستوں کو کوئی پریشانی ہو۔ منوج پر حملہ کرنے سے پہلے میں نے کسی سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ یہ بس مجھ اکیلے کی کارروائی تھی۔ اس کا نتیجہ بھی میں اکیلے ہی بھگتنا چاہتا تھا...“

میں نے عمران کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”پہلے ایک چیز کلیئر کرو۔ تم نے بتایا ہے کہ سجاد کو پاکستان اور پاکستانیوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”ہاں، خاص وجہ ہے۔“ عمران نے اپنے زخمی ہونٹ سے رسنے والے خون کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ سجاد کا ایک بھائی انور بھی تھا۔ وہ بھی کبڈی کا کھلاڑی تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے پولیس میں بھی رہا۔ بعد میں اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا مگر اس کام کی آڑ میں وہ غلط دھندے بھی کرتا تھا۔ وہ پاکستان کے قبائلی علاقوں سے ہیروئن اسمگل کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ انڈیا سے لاہور گیا ہوا تھا۔ وہ لاہور میں پکڑا گیا اور فرار ہونے کی کوشش میں اپنے ایک پاکستانی دوست سمیت پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ یہ کوئی چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ سجاد جس طرح کا بھی ہے لیکن اس نے اپنے اس چھوٹے بھائی کو باپ بن کر پالا تھا اور اس سے بہت پیار بھی کرتا تھا۔ اس کی موت نے سجاد کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ شراب تو وہ پہلے بھی بہت پیتا تھا لیکن اب پانی کی طرح پینے لگا۔ وہ کچھ جنونی سا ہو گیا تھا۔ اپنی بیوی عاصمہ سے کہتا تھا کہ پاکستان جائے گا اور ان پولیس والوں کو قتل کرے گا جنہوں نے اس کے بھائی پر گولیاں چلائیں۔ وہ ان لوگوں کو قتل نہ کر سکا اور نہ ہی پاکستان جا سکا لیکن اس کے دل میں روز بروز نفرت پروان چڑھتی رہی۔ شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے وہ دو تین بار نوکری سے معطل بھی ہوا۔ وہ چڑچڑا اور غصیلا بھی ہوتا جا رہا تھا... بات بات پر بیوی کو پیٹنے لگتا تھا۔ اس کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ اس کا ذمے دار بھی وہ اپنی بیوی عاصمہ کو ہی ٹھہراتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ایک چھوٹی سی بات سے ہو سکتا ہے۔ پاکستان اور انڈیا کا کرکٹ میچ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا۔ پاکستانی ٹیم جیت گئی۔ عاصمہ نے اتنا کہہ دیا کہ پاکستانی ٹیم اچھا کھیل کر جیتی ہے۔ اس بات سے سجاد بھڑک اٹھا۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ سجاد نے بیوی کو مار مار کر اسپتال پہنچا دیا۔ وہ تین مہینے کی حاملہ تھی۔ اس کی ابارشن ہو گئی۔ اسے کئی ہفتے اسپتال میں رہنا پڑا۔ انہی دنوں شدید ڈپریشن اور نوکری کی پریشانیوں کی وجہ سے سجاد نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔

”یہ وہ حالات تھے جن میں اسے میرا کیس ملا۔ میں ایک پاکستانی تھا اور میں نے یہاں بمبئی میں ایک بڑے پروڈیوسر کو جان کے لالے ڈالے تھے۔ سجاد موہل کی ساری خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو گئیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میری گرفتاری کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔ میری گرفتاری سے اسے دُہرا فائدہ ہوتا۔ ایک پاکستانی کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر اس کی انا کو تسکین ملتی، دوسرے اس کی ڈانواں ڈول نوکری کو سہارا مل جاتا۔ اور عین ممکن تھا کہ سبکدوشی کے خطرات کے بجائے ترقی کا پروانہ اس کے ہاتھ میں آ جاتا۔ بس یہی حالات تھے جن میں، میں نے سوچا کہ موہل کو اپنی گرفتاری دے کر اس کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانا چاہیے۔ سو میں نے یہ کر دیا۔“

میں نے کہا۔ ”یہاں تم شارٹ کٹ لگا رہے ہو۔ کوئی اہم واقعہ چھپا رہے ہو۔ سجاد کی بیوی عاصمہ کا اس معاملے میں کیا کردار ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ مجھے عنقریب... فساد پلس میں تمہیں نوکری دلانا پڑے گی۔ تمہاری ناک بہت لمبی ہوتی جا رہی ہے اور تم اسے ہر معاملے میں گھسیڑ رہے ہو۔ نیوز چینل میں نوکری کے لیے اصل کوالیفکیشن لمبی سے لمبی ناک ہی ہوتی ہے جو ہر جائز و ناجائز معاملے میں گھسیڑی جا سکے۔ اور اگر اسے گھسیڑنے میں تھوڑی بہت چوٹ بھی آ جائے تو اس کی پروا نہ کی جائے۔ میرا تو خیال ہے کہ بہت جلد نیوز چینل میں نوکریوں کے لیے جو اشتہار دیے جائیں گے، وہ اس طرح کے ہوں گے۔ نامہ نگار کے لیے ناک کی کم از کم لمبائی چھ انچ درکار ہے۔ رپورٹر کے لیے آٹھ انچ... سینئر رپورٹر اور اینکر پرسن کے لیے دس انچ تاہم اگر اینکر پرسن کے نتھنے آدھا انچ سے زیادہ کشادہ ہوں اور اس کی آنکھوں میں شکرے کی چمک ہو تو ناک کی لمبائی میں رعایت ہو سکتی ہے وغیرہ وغیرہ...“

”تم پٹری سے اتر رہے ہو۔ میں نے تم سے عاصمہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ اس سارے منظر میں کہاں سے آئی؟“

”بالکل، یہ صلاحیت بھی اینکر پرسن اور دانشور کے لیے ضروری ہے۔ ٹاک شو کے دوران میں بات کہیں بھی چلی جائے، وہ اسے پھر کان سے پکڑ کر وہیں لے آتے ہیں جہاں سے وہ بھاگی تھی۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ بات کو بھگاتے بھی وہ خود ہی ہیں۔ چلغوزوں کے بڑھتے ہوئے ریٹ کو وہ امریکا کی خارجہ پالیسی تک پہنچا دیتے ہیں اور پھر اچانک خارجہ پالیسی میں سے چلغوزے اور خستہ مونگ پھلی کی بات نکال لیتے ہیں... اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی ہوتا ہے کہ چلغوزوں کے مسلسل مہنگا ہونے میں ریوڑیوں کے کردار کا پتا چلا ہے تاہم اس بارے میں بریک کے بعد بتایا جائے گا۔“

”یعنی تم عاصمہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟“ میں نے جھلا کر کہا۔

میری جھلاہٹ دیکھ کر اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”وہ بڑی تناؤ بھری رات تھی تالی۔ مجھے آج تک وہ سب کچھ یاد ہے۔ میں نے تمہیں اپنی کہانی میں بتایا تھا نا، میں سرکس کے مالک جان محمد صاحب سے بہت محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔ ان کے بہت سے احسان ہیں مجھ پر۔ اس رات مجھے پتا چلا کہ بمبئی میں پولیس اہلکار جان محمد صاحب کو ہوٹل سے گرفتار کر کے لے گئے ہیں... اور سجاد موہل نے تھانے میں ان پر تشدد کیا ہے۔ وہ جان صاحب سے میرا اتا پتا پوچھنا چاہتا تھا۔ جان صاحب کو پہنچنے والی تکلیف اور ان کی بے عزتی نے میرے دماغ میں چنگاریاں بھر دیں۔ میں اسی وقت بمبئی واپس آیا۔ میں نے پتا ہے کیا کیا؟“

”کیا کیا؟“

”میں نے سجاد موہل کو سزا دینے کے لیے اس کے بیوی بچوں کو یرغمال بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ سجاد کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ مجھے بمبئی کے پوش ایریا میں سجاد کی کوٹھی کا پتا تھا۔ میں نے وہاں موجود چوکیدار سے اپنا تعارف سجاد کے دوست کے طور پر کرایا اور اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ سجاد گھر میں موجود نہیں تھا۔ گھر میں صرف عاصمہ اور اس کی ساس تھیں۔ عاصمہ کی ساس بیمار تھیں اور دوا کھا کر سوئی پڑی تھیں۔ رو رو کر عاصمہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ بھی چہرے سے بیمار ہی نظر آتی تھی۔ اس نے مجھے سجاد کا دوست ہی سمجھا اور مجھے دیکھ کر پھر رونے لگی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میں کسی بھی طرح سجاد کی جان بچاؤں... میرے پوچھنے پر اس نے بتایا... ڈی آئی جی صاحب سجاد سے بہت ناراض ہیں۔ نوبت سجاد کی نوکری ختم ہونے تک پہنچ چکی ہے۔ سجاد کی آخری امید پاکستانی ملزم والا کیس تھا۔ لیکن وہ ملزم بھی ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اعلیٰ افسروں نے سجاد کو دو ہفتے کی ڈیڈ لائن دی تھی۔ یہ ڈیڈ لائن پرسوں ختم ہو رہی ہے... سجاد پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ وہ نوکری ختم ہونے کا صدمہ سہہ نہیں سکے گا، وہ خودکشی کر لے گا... عاصمہ رو رو کر بے حال ہونے لگی...“

عمران اپنے جسم پر لحاف کو درست کرنے کے لیے چند سیکنڈ کے لیے رکا تو میں نے کہا۔ ”شاید تم یہ کہنے جا رہے ہو کہ تم نے عاصمہ کے کہنے پر اپنی گرفتاری دے دی اور یوں اس کا سہاگ اجڑنے سے بچا لیا۔ یہ تو ڈرامائی سی کہانی لگتی ہے۔“

”ہاں، یہ ڈرامائی کہانی ہے... ایک خوش شکل عورت کے کہنے پر ایک مفرور کا خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنا... لیکن جب تم اصل بات جانو گے تو تمہیں مزید حیرانی ہو گی۔ پتا نہیں کہ تم اس پر یقین کرو گے بھی یا نہیں۔“

”تم سچ بتاؤ گے تو میرے دل کو خود بخود یقین آنے لگے گا۔“ میں نے کہا۔

عمران نے گہری سانس لے کر اپنی ٹھوڑی کے خوب صورت گڑھے کو انگلی سے چھوا اور بولا۔ ”عاصمہ جس طرح بلک بلک کر میرے سامنے روئی، میرا دل پسیج گیا۔ تم جانتے ہی ہو، میں نے ہمیشہ بُرائی کا مقابلہ اچھائی سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ نفرت کا مقابلہ محبت سے، غصے کا تحمل سے، عداوت کا دوستی سے۔ میں نے اس رات اشک بار عاصمہ کے سامنے بیٹھے بیٹھے سوچ لیا کہ میں سجاد کی اس نفرت کا جواب ایک انوکھے طریقے سے دوں گا جو وہ پاکستانیوں کے خلاف رکھتا ہے۔ میں اس کی عداوت اور کم ظرفی پر ایثار اور ظرف کا وار کروں گا۔ مجھے اپنی قوتِ بازو اور اندر کی سچائی پر بھروسا تھا۔ مجھے یقین سا تھا کہ سجاد موہل کو گرفتاری دے کر بھی میں انڈین پولیس کی گرفت سے بچ نکلوں گا۔ میں نے روتی بلکتی عاصمہ کو یقین دلایا کہ پروڈیوسر منوج کمار کی ٹانگوں میں گولیاں مارنے والا پاکستانی ملزم ضرور گرفتار ہو گا اور سجاد ہی اسے گرفتار کرے گا۔ اب میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں جسے سننے کے بعد تم اس کہانی کو مزید ڈرامائی قرار دو گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی سچائی پر بھی تھوڑا بہت شک کرنے لگو۔“

"میں نے کہا ہے نا عمران کہ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو میرے دل کو یقین آنا ہی آنا ہے۔"

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "فلموں، ڈراموں میں لوگوں کی شکلیں ہو بہو ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور یہ ایک افسانوی بات ہوتی ہے۔ لیکن عام زندگی میں اکثر ایسے لوگ ملتے ہیں جن کی شکلیں آپس میں ملتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ عاصمہ کی صورت شبانہ سے ملتی ہے مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کے قد کاٹھ اور چہرے مہرے میں کچھ جھلکیاں ایسی ہیں جو مجھے شبانہ کی یاد دلاتی ہیں۔ اس کی ناک، اس کے ہونٹ، خاص طور سے اس کے بولنے کا انداز۔ اس کے اندر کی یہی جھلکیاں تھیں جنہوں نے اس رات میرے ارادے کو مزید طاقت دی... اور میں جو ایک خطرناک پلاننگ کے ساتھ سجاد موہل کے گھر میں گھسا تھا، ایک بالکل دوسرے رخ پر چل پڑا... میں نے انوکھا کام کیا اور ایسے انوکھے کام تمہارا یہ یار ہی کرسکتا ہے۔ اس رات میں نے انسپکٹر سجاد موہل کو گرفتاری دے دی... ہاں، ان دنوں وہ انسپکٹر ہی تھا۔ ڈی ایس پی تو اسے میری گرفتاری نے بنایا۔"

"لیکن پھر تم بھاگ گئے؟"

"تمہارا یہ یار بھاگنے میں بھی ماہر ہے۔ اگر میں سرکس کو جوائن نہ کرتا تو ضرور سیاست میں آجاتا۔"

"میں سجاد موہل کی حراست سے بھاگنے کی بات کر رہا ہوں۔"

"سجاد موہل کی حراست سے نہیں بھاگا تھا یار۔ اس کی حراست سے بھاگتا تو پھر وہ ڈی ایس پی کیسے بنتا اور آتما ہتھیا کا ارادہ کیسے بدلتا؟ یہ موہل بھی ایک عجیب کیس ہے یار۔ اصل میں یہ کھلاڑی تھا اور کھلاڑی ہونے کی وجہ سے پولیس میں بھی آگیا۔ لیکن اس میں اصلی پولیس والوں جیسا دم خم نہیں تھا اور نہ ہی شروع میں اس کا مزاج پولیس والوں جیسا تھا۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی کامیابی ملی اور نہ یہ خود کو محکمے میں اچھی طرح ایڈجسٹ کرسکا۔ بعد میں جب اس کا بھائی انور موہل پاکستان میں مارا گیا تو یہ بالکل ہی مایوس ہوگیا بلکہ دیوداس بن بیٹھا۔ یہ روزانہ تین بوتل شراب پی جاتا تھا اور یہ مقدار بڑھ رہی تھی۔ ایک دفعہ خودکشی کی کوشش کرچکا تھا اور دوسری دفعہ کرنے والا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں میں نے اسے اپنی گرفتاری کا سہارا دیا اور اس کے کیریئر کے ساتھ ساتھ شاید اس کی زندگی بھی بچائی۔"

"لیکن پھر اپنی زندگی کیسے بچائی تم نے؟"

"میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔ مجھے عدالت میں پیشی کے بعد واپس جیل لایا جارہا تھا۔ ایک موٹے تازے ہیڈ کانسٹیبل نے میری ہتھکڑی اپنی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ تین اور اہلکار بھی پولیس کی گاڑی میں ہمارے ساتھ تھے۔ شام کے وقت بمبئی کی سڑکوں پر رش بہت ہوتا ہے۔ ہماری گاڑی ایک پل پر رکی ہوئی تھی۔ نیچے سے نہر کا پانی رواں دواں تھا۔ میں نے اچانک موٹو کانسٹیبل کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اٹھایا اور کوئی چالیس فٹ نیچے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ پولیس والے اپنی رائفلیں کندھوں سے بھی نہیں اتار سکے۔ پانی تیز تھا۔ موٹا کانسٹیبل غوطے کھانے لگا۔ ہوسکتا ہے کہ اسے تیرنا آتا ہو لیکن وہ اتنا بدحواس تھا کہ ٹھیک سے تیر بھی نہیں سکا۔ پانی بھی بہت ٹھنڈا تھا۔ اوپر سے پولیس والے گولی بھی نہیں چلا سکتے تھے۔ ان کی فائرنگ سے ان کا اپنا ساتھی ہی سورگ باشی ہوسکتا تھا۔ جتنی دیر میں وہ پل سے اتر کر نہر کے کنارے پہنچتے، ہم سو ڈیڑھ سو میٹر آگے جاچکے تھے۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوچکا تھا۔ میں نے بے ہوش موٹے کو کھینچ کر پانی سے نکالا۔ کندھے پر لادا اور درختوں میں گھس گیا۔ خوش قسمتی سے قریب ہی ایک امپالا کار کھڑی تھی۔ اس میں ایک لڑکا لڑکی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی کے کپڑوں سے پتا چلتا تھا کہ دونوں میاں بیوی ہیں اور نوبیاہتا ہیں۔ میں نے لڑکے سے کہا کہ یہ کانسٹیبل صاحب پانی میں ڈوب کر بے ہوش ہوگئے ہیں۔ انہیں فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔ نوجوان جوڑے کے لیے شک کی گنجائش نہیں تھی۔ ڈھائی تین من کا کانسٹیبل پانی میں لت پت میرے کندھے پر بے سدھ پڑا تھا۔ نوجوان خدمت خلق کے لیے فوراً تیار ہوگیا۔ میں کانسٹیبل سمیت پچھلی نشست پر آگیا۔ گاڑی فوراً روانہ ہوگئی۔ اسی دوران میں مجھے پھل کاٹنے والی ایک چھری نظر آگئی جو پھلوں والے لفافے کے اندر رکھی تھی۔ میں نے چھری نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دی اور شوہر صاحب سے کہا کہ اگر وہ اپنے ہنی مون کو آج کی شام یہیں پر ختم کرنا نہیں چاہتا تو سیدھا چلتا رہے۔ صراطِ مستقیم۔"

اب یہ ساری روداد میری سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ میرا یار واقعی انوکھا شخص تھا۔ بظاہر چلبلا، کھلنڈرا لیکن اندر سے بہت حساس اور سنجیدہ بھی۔ ایک انجان عورت کے آنسو سیدھے اس کے دل پر گرے تھے اور اس نے عورت کے جنونی شوہر کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی جو ویسے بھی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی تھی۔

میں نے کہا۔ ”اگر کوئی مناسب موقع ہوتا اور میرے اندر حوصلہ بھی ہوتا تو میں جوتا اتار لیتا اور تمہارا سر پلپلا کر دیتا۔ بندہ پوچھے کہ اگر تم نے ایک بار اتنی بڑی نیکی کما ہی لی تھی تو دوسری بار اوکھلی میں سر دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اب خود پھنسے ہو اور مجھے بھی پھنسایا ہے۔“

”یار! تمہیں بتایا ہے نا کہ عاصمہ میں شبانہ کی تھوڑی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ بس یہ جھلک ہی لے کر بیٹھ گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنا یہ جنم اور اس سے اگلے سات آٹھ جنم بھی اس پر قربان کر دوں۔ اور کیا پتا کہ اسی جنم میں ہی کوئی کام بن جائے۔ میری یہ ڈبل قربانی کوئی رنگ لے آئے۔“ وہ پھر مذاق کے موڈ میں تھا۔

میں نے کہا۔ ”عمران! سچ کہتا ہوں۔ میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔ تم نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔ اب کیا ضرورت تھی اتنے بڑے پنگے کی۔ اب تو یہ بندہ خیر سے ڈی ایس پی بن چکا ہے اور اس کا خودکشی وغیرہ کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا، پھر تم کیوں اس کے ہتھے چڑھے ہو؟“

”یار! میں نے بتایا تو ہے تمہیں۔ یہ بڑا خطرناک بندہ ہے۔ جب اس پر غصے کا حملہ ہوتا ہے تو بالکل بدلا ہوا شخص نظر آتا ہے... ایک دم حیوان بن جاتا ہے...“

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گا عمران... اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ تم نے ایک بار پھر اس بندے کو فی سبیل اللہ گرفتاری دی ہے۔ اب شاید تم اسے ایس پی بنوانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں نفسیاتی ماہر کو دکھائے جانے کی ضرورت ہے۔“

”نفسیاتی مریض کو نفسیاتی مریض بڑی جلدی پہچان لیتا ہے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔“

”لعنت ہے تم پر۔“ میں نے کہا اور منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ مجھے واقعی اس پر تاؤ آ رہا تھا۔

کچھ دیر ایسے ہی گزری پھر میرے کان میں کھجلی ہوئی۔ وہ میرے کان کو کسی تنکے سے چھیڑ رہا تھا۔

”اب کیا چاہتے ہو؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

اس نے گہری سانس لے کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”یار! سچی بات بتاؤں گا تو تم اور ناراض ہو جاؤ گے۔ دیکھو، بات یہ ہے کہ میرے دل میں ان دونوں میاں بیوی کے لیے ہمدردی موجود ہے۔ خاص طور سے اس کی بیوی کے لیے۔ میں نے اس کی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے لیے اور اس کے شوہر کے لیے جو کچھ بھی ہو سکا، کروں گا اور میں نے کر کے دکھایا۔ یہ حقیقت ہے کہ میری گرفتاری ہی تھی جس کی وجہ سے سجاد موہل کی زندگی کی ڈوبتی کشتی کو سہارا ملا...

اب میری گرفتاری اس کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ وہ اسی کیس کی وجہ سے اپنے محکمے میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ وہ کیس اس کی ساکھ ہے۔ یہ ساکھ بنانے میں، میں نے موہل کی بہت مدد کی ہے۔ اب اسے اپنے ہاتھوں سے برباد کرنا نہیں چاہتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو یہ خبطی بندہ پھر اسی جگہ پر آ جائے گا جہاں دو سال پہلے تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا بھرم قائم رہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ ہمارے CLASH میں اسے کوئی نقصان پہنچ جائے گا۔ باقی اپنی اور میری رہائی کی فکر نہ کرو۔ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

”کس طرح بائیں ہاتھ کا کھیل ہے؟“

”یار! تم نے اپنا بھ یچن کا وہ مشہور ڈائیلاگ نہیں سنا جس میں وہ کہتا ہے... جیلر! تم اپنی جیل کی سلاخیں جتنی بھی مضبوط کر لو اور دیواریں جتنی بھی اونچی لے جاؤ، جب میں نے یہاں سے نکلنا ہو گا تو نکل جاؤں گا۔“

”کوئی گیدڑ سنگی ہے تمہارے پاس؟“

”نہیں، فی الحال تو صرف گیدڑ ہے اور وہ پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل میرا مورال ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے اسٹیل کا ایک جگ اسے مارنے کے لیے اٹھایا۔ اس نے فوراً بوسیدہ تکیے کو ڈھال بنا لیا۔

اس سے پہلے کہ ہم میں باقاعدہ دھینگا مشتی شروع ہو جاتی اور ہماری چوٹیں پھر تازہ ہو جاتیں، کوٹھی کے پورچ میں دو گاڑیاں تیزی سے داخل ہوئیں اور تیزی سے رک گئیں۔ ان میں سے ایک گاڑی تو وہی تھی جس میں سجاد موہل ہمیں ہوٹل سے پکڑ کر یہاں لایا تھا۔ دوسری گاڑی ایک ہیوی جیپ تھی۔ اس میں سے تین چار ہٹے کٹے افراد باہر نکلے... اور ہمارے کمرے کی طرف بڑھے۔ موہل اور اس کے دو اہلکار بھی ساتھ تھے۔ موہل کے اشارے پر حوالدار فیاض نے کمرے کی لائٹ آن کی۔ تمتمائے چہروں والے یہ سارے افراد ہمیں یوں دیکھنے لگے جیسے ہم کوئی عجوبہ ہوں۔ پھر شرابی آنکھوں والا ایک سانولا شخص بولا۔ ”تو تم ہو عمران دانش... تمہاری غائبانہ شہرت تو ہمارے محکمے میں خوب ہے۔ تم نے مشہور پروڈیوسر منوج صاحب کی ہتھیا کی اور پھر فلمی انداز میں چالیس فٹ اونچے پل سے چلتے پانی میں چھلانگ لگا کر غائب ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی تم یہاں بمبئی پولیس کو ٹھینگا کا ناچ نچاتے رہے۔ تمہاری اور موہل صاحب کی

کہانی میں تھوڑا سا مرچ مسالا اور شامل کر لیا جائے تو فلم بن سکتی ہے۔“

باقی افراد نے بھی حسبِ توفیق ہم پر ریمارکس پاس کیے۔ اندازہ ہوا کہ یہ تینوں چاروں افراد موہل کے قریبی دوستوں میں شامل ہیں اور موہل انہیں اپنی یہ حیران کن اچیومنٹ دکھانے کے لیے یہاں لایا ہے۔ یہ تینوں چاروں افراد نشے میں تھے اور سگریٹ بھی پھونک رہے تھے۔ وہ ہمیں گرل دار کھڑکی میں سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے چڑیا گھر میں بند جانوروں کو دیکھا جاتا ہے۔

ایک گھنی مونچھوں والے شخص نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”انور موہل ہمارے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا۔ وہ روزی روٹی کے لیے پاکستان گیا تھا۔ تم لوگوں نے اسے بدیش میں تڑپا تڑپا کر مار دیا۔ بتاؤ کیسے مارا تھا تم نے اسے... کیسے مارا تھا؟“

عمران نے کہا۔ ”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں اس بندے کو جانتا نہیں، میں نے کبھی زندگی میں اسے دیکھا تک نہیں۔ اس کے قتل سے میرا کیا تعلق ہے؟“

”تمہارا تعلق ہے... ہے تمہارا تعلق۔“ سجاد موہل شرابی لہجے میں گرجا۔ ”تم پاکستانی ہو۔ اور جن کتوں نے اسے مارا وہ بھی پاکستانی تھے۔ اب بتاؤ کیا سلوک کیا جائے تمہارے ساتھ؟“

گھنی مونچھوں والے نے کہا۔ ”سجاد بھائی! پچھلی دفعہ تمہارا مغز پھر گیا تھا جو تم نے اس کی گرفتاری ڈالی اور اسے کورٹ میں پیش کیا۔ اس دفعہ ایسا نہیں کرنا۔ کمینے کو مار کر یہیں اس کمرے کے فرش میں گاڑنا ہے۔“

”لیکن گاڑنے سے پہلے اس کی پوری پوری مہمان نوازی بھی کرنی ہے۔“ ایک دوسرا شخص بولا۔ ”جب مر جائے گا تو اس کی جان چھوٹ جائے گی مگر مرنے سے پہلے اسے جو حلوہ پوڑی ہم کھلائیں گے، اس کی یاد مرنے کے بعد بھی اس کے من میں تازہ رہے گی۔ جگدیش بھائی نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ یہاں سے نکل کر کورٹ کچہری کے چکر میں پڑے گا تو پھر بچ کر نکل جائے گا۔“

عمران نے کہا۔ ”میں آپ لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں کہ انور موہل کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

جگدیش بولا۔ ”انور موہل نہ سہی، منوج کمار سہی۔ منوج جی کو تو تم نے ہی مارا ہے نا؟“

”منوج نے ایک نابالغ لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا۔ وہ برے سے برے سلوک کا حق دار تھا لیکن میں نے پھر بھی اسے مارا نہیں، صرف زخمی کیا اسے۔“

”لیکن وہ تمہارے دیے ہوئے زخموں کی وجہ سے ہی مرا۔ یہ ہتھیا ہی کی شکل ہے۔“ سجاد نے دانت پیس کر کہا۔

”چھوڑو یار ان باتوں کو۔“ موٹی توند والے ایک شخص نے کہا۔ ”یہ بازی گر ہے، سرکس میں تماشے دکھاتا ہے۔ آج ہمیں بھی اس کا کوئی تماشا دیکھنے دو۔“

اسی دوران میں حوالدار فیاض اور اس کے ساتھی کانسٹیبل نے چار پانچ کرسیاں لا کر کھڑکی کے سامنے رکھ دی تھیں۔ سجاد موہل اور اس کے مہمان ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کا انداز واقعی تماشا دیکھنے والا ہی تھا۔ لیکن جب کھڑکی کے لکڑی کے پٹ باہر سے بند کر دیے گئے تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب یہ لوگ کوئی بھی تماشا کیسے کر سکیں گے۔

اچانک ایک انجن چلنے کی آواز آئی۔ غالباً یہ کوئی ڈیزل انجن تھا۔ ایسے انجن ٹیوب ویل وغیرہ چلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یکایک ہمارے بند کمرے میں گاڑھا دھواں بھرنا شروع ہو گیا۔ یہ دھواں چھت کے کسی سوراخ سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ہمارا دم گھٹنا شروع ہو گیا۔

”یہ کیا کر... رہے ہیں؟“ میں نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں ملیریا وغیرہ سے بچانا چاہتے ہیں۔ کمرے میں دھونی دے رہے ہیں۔“

دیکھتے ہی دیکھتے یہ دھونی ہمارے لیے عذاب بن گئی۔ ہم منہ پر کپڑے رکھے کھانستے جا رہے تھے۔ پھر دم گھٹنے لگا۔ ”دروازہ کھولو۔“ میں چلایا اور زور زور سے لاتیں آہنی دروازے پر رسید کیں۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

سنا تھا کہ آگ میں جل کر مرنے والے بہت تکلیف سے مرتے ہیں۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں کہا جاتا ہے۔ غالباً آگ کی جلن کے ساتھ ساتھ اس دھوئیں کی بے پناہ اذیت بھی مرنے والے کے حصے میں آتی ہے جو پھیپھڑوں کو چیرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ میں نے بہت دیر تک سانس روکنے کی کوشش کی۔ آخر بے بس ہو گیا... ڈیزل کا گاڑھا زہریلا دھواں سینے میں گھسا اور لگا کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ میں تکلیف کے سبب تڑپنے لگا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے کھڑکی کی گرل پر ٹانگیں رسید کیں۔ مگر یہ کوشش ”سعیِ لاحاصل“ کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے عمران کو دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ابھی تک اپنی سانس روکنے میں کامیاب ہے۔ کھانستے کھانستے مجھے زور کی ابکائی آئی، مجھے لگا میں بے ہوش ہو رہا

ہوں۔ اچانک ایک کونے میں لگا ہوا بڑے سائز کا ایگزاسٹ فین تیزی سے گھومنے لگا۔ اس فین نے چند سیکنڈ میں دھوئیں کو کھینچ کر باہر پھینک دیا۔

میں کھانستے کھانستے فرش پر گر گیا تھا۔ تکلیف اور اذیت برداشت کرنے کی ساری مشق آج دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ عمران کی حالت مجھ سے کافی بہتر رہی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنی سانس غیر معمولی وقت تک روکے رکھی تھی۔ بہرطور اس کا رنگ بھی بالکل زرد ہو رہا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ کھول دیے گئے۔ سجاد موہل اور اس کے ساتھی بڑے تمسخر سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جگدیش نامی شخص نے وسکی کا طویل گھونٹ لے کر الٹے ہاتھ سے اپنے سیاہی مائل ہونٹ پونچھے اور بولا۔ ”جی جناب! کیسا لگا فلم کا یہ ٹریلر؟“

”اچھا تھا۔“ عمران نے کھانستے ہوئے کہا۔

”فلم اور بھی اچھی لگے گی۔ بڑی مزاحیہ فلم ہے۔ ہنس ہنس کر برا حال ہو جائے گا تمہارا۔ پھیپھڑے، دل، جگر سب کچھ منہ کے رستے باہر آ جائے گا۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“ عمران نے میری بُری حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

سجاد موہل بولا۔ ”سب کچھ ایک ہی سانس میں بک دو… فنافٹ… کس چکر میں یہاں آئے ہو۔ تمہارے کتنے ساتھی ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ کیا کر چکے ہو اور کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

”میں سچ کہتا ہوں۔ میرے پاس تمہیں بتانے کو کچھ نہیں ہے۔ اور اگر میں کچھ بتاؤں گا تو وہ صرف وقت ٹالنے کے لیے اور تمہارے اس ڈیزل انجن سے بچنے کے لیے بتاؤں گا۔ ہاں، اگر تم مجھے منوج کو زخمی کرنے کی سزا دینا چاہتے ہو تو یہ اور بات ہے۔ مگر اس بارے میں بھی یہ ضرور کہوں گا کہ جرم کے مقابلے میں سزا بہت بڑی ہے۔“

سجاد گرجا۔ ”بکومت۔ کوئی سزا بڑی نہیں ہے تم لوگوں کے لیے۔ تم نے اپنے ملک میں میرے ننھے بھائی کو مارا ہے۔ اس کو چھلنی کیا ہے۔ میں بھی چھلنی کروں گا۔ مجھے جہاں کوئی سرحد پار کا بندہ نظر آئے گا، اسے جیون اور موت کے درمیان لٹکا دوں گا… یوں کر کے۔“ اس نے شراب کی خالی بوتل کو انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے الٹا پکڑ کر ہوا میں جھلایا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ کھڑکی کے پٹ پھر سے بند کر دے۔ اس نے پٹ بند کر دیے۔ ڈیزل انجن کی منحوس آواز پھر سے بلند ہونے لگی۔

عمران نے پکار کر کہا۔ ”ٹھہرو، میں بتاتا ہوں تمہیں۔ کھڑکی کھولو۔“

کھڑکی پھر کھل گئی۔ انجن کی آواز بھی تھم گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران اب ان لوگوں سے کچھ وقت لینا چاہتا ہے اور اس دوران میں ہی وہ کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔ کیا کرے گا؟ اس بارے میں وثوق سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہرحال، مجھے اس پر اعتماد تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب وہ کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو پھر کر ہی گزرتا ہے۔

اس سے پہلے کہ عمران اور سجاد موہل میں بات چیت شروع ہوتی اور عمران اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ان لوگوں کو اپنے ڈھب پر لاتا، ایک اور واقعہ رونما ہو گیا۔ ایک دراز قد شخص تیزی سے ہماری طرف آیا۔ یہ دراصل جگدیش کا ڈرائیور تھا جو نیرو گاڑی کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ جگدیش کے لیے کسی کی کال تھی۔

جگدیش موبائل لے کر کال سننے میں مصروف ہو گیا جبکہ لمبے قد والا ڈرائیور بڑے غور سے عمران کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جگدیش نے فون بند کیا تو ڈرائیور نے ادب سے جھک کر کہا۔ ”مالک… یہ اندر نیلی قمیص والا کون ہے؟“

”یہ بہت بڑے ہیرو نے جنم لیا ہے ہمارے پڑوسی ملک میں۔“ سجاد زہرخند انداز میں بولا۔ ”چالیس فٹ اونچے پل سے تین من کے بندے کے ساتھ پانی میں چھلانگ لگاتا ہے اور چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے فلمی ہیرو کیا دیول اور سنجے وغیرہ تو اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ تو نے کوئی آٹوگراف وغیرہ لینا ہے تو لے لے اس سے۔ پھر یہ لوگ بہت مصروف ہو جائیں گے۔ جناب نے بہت ٹھکائی کروانی ہے ہم سے۔“

ڈرائیور سمجھ گیا کہ یہ بات مذاق میں کی جا رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے عمران کو دیکھا پھر جگدیش کمار سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”مالک! اس بندے کی تو فوٹو چھپی ہے اخبار میں۔ کافی بڑی فوٹو تھی۔ شاید کل کے اخبار میں تھی۔ میں دیکھتا ہوں اخبار گاڑی میں پڑا ہو گا۔“

جگدیش بولا۔ ”کسی اور کی ہو گی… یہ تو ایک دم پردہ نشین قسم کے بندے ہیں۔“

”نہیں مالک… میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔“ ڈرائیور نے کہا اور تیزی سے واپس گاڑی کی طرف گیا۔

چند سیکنڈ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں انگلش کا اخبار تھا۔ وہ ورق گردانی کرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا۔ ”یہ دیکھیں مالک۔“ اس نے کہا اور اخبار کا ایک صفحہ جگدیش کمار کے سامنے پھیلا دیا۔

سجاد موہل سمیت سب نے سر جوڑ لیے۔ پھر ان کے تاثرات بدلے بدلے نظر آئے۔ انہوں نے اخبار کی تصویر کا موازنہ بار بار عمران سے کیا۔ آخر سجاد موہل معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بھئی، یہ تو سچ مچ اسی خبیث کی تصویر ہے۔“ تب اس نے اخبار ہماری طرف کرتے ہوئے عمران سے پوچھا۔ ”کیوں بے! یہ تو ہی ہے نا؟“

دھوئیں کی وجہ سے عمران کی آنکھیں ابھی تک اشک بار تھیں۔ اس نے آنکھیں صاف کر کے دھیان سے تصویر دیکھی۔ میں نے بھی غور کیا۔ یہ عمران ہی تھا۔ وہ نفیس کوٹ اور ٹائی میں دکھائی دے رہا تھا۔ یہ تلاش گمشدہ کا اشتہار تین کالمی تھا اور بیرونی صفحے پر تھا۔ انگریزی کے اس اشتہار کا متن کچھ اس طرح تھا۔

”اسٹار سرکس کمپنی کے اسٹاف ممبر اور معروف فن کار مسٹر عمران دانش پچھلے قریباً ڈیڑھ برس سے لاپتا ہیں۔ ان کے قریبی ذرائع کے مطابق وہ اپنے کسی ذاتی کام سے پاکستان سے بھارت آنے کا ارادہ ظاہر کرتے رہے تھے۔ سفری دستاویزات سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ پچھلے سال جون میں واہگہ اٹاری کے راستے بھارت میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی گمشدگی ان کے قریبی عزیزوں کے لیے سخت تشویش کا باعث ہے۔ کوئی ان کے بارے میں جانتا ہو تو اطلاع دے۔ وہ خود پڑھیں تو فوری طور پر رابطہ کریں۔“

”یہ کیا چکر ہے بھائی؟“ سجاد موہل اور جگدیش وغیرہ نے ایک دوجے کی طرف دیکھا۔

”فون لگا کر دیکھو۔“ موٹی توند والے سیٹھ نما شخص جنسی لال نے کہا۔

سجاد موہل نے جگدیش سے موبائل فون لیا۔ پھر اپنی جیکٹ کی اندرونی پاکٹ سے ایک دوسری سم نکال کر موبائل سیٹ میں لگائی اور اخباری اشتہار سے نمبر پڑھ کر ملانے لگا۔

اس کی پہلی ہی کوشش کامیاب ہوئی۔ رابطہ ہو گیا۔ دوستوں کو گفتگو سے آگاہ کرنے کے لیے سجاد نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔ ”ہیلو… کون؟“ دوسری طرف سے بھاری آواز میں پوچھا گیا۔

سجاد بولا۔ ”اخبار میں آپ کا دیا ہوا ”ایڈ“ دیکھا ہے، پاکستانی فن کار عمران دانش کے بارے میں…“

”جی جی… فرمائیں۔“

سجاد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”ہمارے پاس آپ کے لیے ایک اہم جانکاری ہے۔“

”جی… جی… بتائیں… اور آپ بول کون رہے ہیں؟“

”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“

”بالکل نہیں۔ اگر آپ اپنی شناخت چھپانا چاہتے ہیں تو آپ ایسا کر سکتے ہیں۔“

”اگر ہم آپ کو اس بندے کے بارے میں کوئی تصدیق شدہ جانکاری دیتے ہیں تو اس کے بدلے ہمیں کیا ملے گا؟“

”اس کے لیے نہایت معقول انعامی رقم ہے۔ اشتہار میں اس کا ذکر مناسب نہیں تھا۔“

”کیا رقم ہے؟“

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی جیسے بولنے والا سوچ رہا ہو کہ کہیں یہ کوئی فیک کال تو نہیں اور وہ اپنا وقت تو برباد نہیں کر رہا۔

موہل نے اپنا سوال دہرایا۔ ”آپ چپ کیوں ہو گئے؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اگر آپ کی جانکاری واقعی مصدقہ اور کارآمد ہے تو پھر انعامی رقم آپ کی توقع سے زیادہ ہو گی۔“

موہل نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بھوئیں اچکائیں۔

”آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”نہیں الہ آباد سے۔ ہم تھوڑی دیر بعد آپ سے پھر رابطہ کرتے ہیں۔“

”کتنی دیر تک؟“

”قریباً ایک گھنٹے بعد۔“ موہل نے کہا۔

اس نے فون بند کر دیا۔ ان سب کے چہروں پر سنسنی کے آثار تھے۔

”یہ کوئی لمبا چکر ہے بھیا۔“ جنسی لال نے توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

سجاد موہل نے اپنی عقابی نگاہیں عمران کی آنکھوں میں گاڑیں۔ ”ہاں بھئی بازی گر! یہ تیرے کون سے رشتے دار پیدا ہو گئے ہیں یہاں؟ کسی سے کوئی لمبی چوڑی ٹھگ بازی تو نہیں کی ہوئی تو نے؟“

جنسی لال بولا۔ ”یا ہو سکتا ہے کہ کسی کی لڑکی شرکی

بھگائی ہو۔ اس کی گندی آنکھ میں سور کا بال تو صاف نظر آتا ہے۔"

عمران نے کھانستے ہوئے کہا۔ "آپ کو کوئی صدمہ پہنچ چکا ہے شاید اس سلسلے میں۔"

اس کی چوٹ پر بنسی لال تلملا گیا۔ "اوئے... اوئے سور کے تخم۔" وہ پھنکارا۔ اس نے اپنے سفید کرتے کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے عمران پر گولی چلا دے گا۔

سجاد نے اس کا پستول والا ہاتھ تھاما۔ "اوئے کیا کرتا ہے بنسی! اگر اس کتے کو مارنا ہی ہے تو اتنی آسانی سے نہیں ماریں گے۔ اس کو ڈیزل کے دھوئیں والی مزاحیہ فلم دکھائیں گے اور ہنس ہنس کر اس کی ساری اندر کی چیزیں منہ کے رستے باہر نکل آئیں گی۔ چل آ میرے ساتھ۔ ابھی ذرا اشتہار کا پوسٹ مارٹم تو کرلیں۔"

سجاد اٹھ کھڑا ہوا۔ جگدیش، بنسی اور ان کا تیسرا ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بنسی لال جاتے جاتے بھی خونی نظروں سے عمران کو گھور رہا تھا۔ عمران نے سرگوشی کی۔ "لگتا ہے اس کی بیٹی واقعی کسی کے ساتھ بھاگی ہے۔"

"یہ گئے کہاں ہیں یار؟"

"ظاہر ہے کہ مشورہ کرنے ہی گئے ہیں۔"

دھوئیں کی آفت ابھی تک ذہن پر سوار تھی۔ سینہ جیسے اندر سے زخمی ہوگیا تھا۔ ایک انسان نے دوسرے انسان کو ایذا پہنچانے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کرلیے ہیں۔ کہیں زدوکوب کرنا، کہیں درد کے انجکشن اور کہیں یہ گاڑھا دھواں۔ اس دھوئیں سے دھیان ہٹانے کے لیے میں نے عمران سے کہا۔ "یہ کیا چکر چل گیا ہے؟ تصویر تو سو فیصد تمہاری ہی ہے... باقی تفصیل بھی درست ہے۔"

"اس کو کہتے ہیں سر منڈواتے ہی اولے پڑے بلکہ دو بار پڑے۔ ابھی راجواڑے کے طلسم سے نکل کر گھر بھی نہیں پہنچے کہ یہ سجاد والا سیاپا سامنے آگیا اور اب یہ اشتہار والا ٹنٹا کھڑا ہوگیا ہے۔"

"کہیں اس کا تعلق راجواڑے والے واقعات سے تو نہیں... میرا مطلب ہے جارج اور سرجن اسٹیل وغیرہ کی موت؟ یہ اشتہار انگریزی کے اخبار میں چھپا ہے۔ اس کی بھی کوئی خاص وجہ ہوسکتی ہے۔"

"نہیں تابی! میں نہیں سمجھتا کہ اس کا تعلق راجواڑے والی مار دھاڑ سے ہوگا۔ مجھے اس میں کسی اور معاملے کی بُو آرہی ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے باس... سرکس کے مالک جان محمد صاحب تمہاری تلاش میں سرگرداں ہوں؟"

"وہ ایسے اشتہاری انداز میں اتنی بھاری رقمیں خرچ کرکے مجھے تلاش نہیں کرسکتے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ اشتہار ایک اخبار میں نہیں کئی اخباروں میں آیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے اخباروں میں بھی دیا گیا ہو۔ اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ یہ اشتہار پہلی بار ہی آیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ گاہے بگاہے چند ہفتوں یا مہینوں سے دیا جارہا ہو۔"

"کہیں ہماری بے خبری میں ہمارا کوئی سودا وغیرہ ہی نہ ہوجائے۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"ہاں، اگر سودا کرنے والی کوئی ارب پتی بیوہ یا راجکماری وغیرہ ہو تو "بکنے" میں کوئی ایسا حرج بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس راجکماری کی کوئی بہت خوب صورت کزن بھی ہو۔ اس کا ٹانکا تم سے جڑ سکتا ہے۔ ہم دونوں، باقی زندگی عیش آرام سے گزار سکتے ہیں۔ ایسی عورتیں اپنے پیارے رکھیلوں کو بڑے مزے کرواتی ہیں۔ میں پہلے بھی ایک ایسے خوب صورت تجربے سے گزر چکا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس خوب صورت تجربے کے شوہر یا ابا وغیرہ نے تمہاری ایسی تیسی کرنے یا پھر جنس ہی تبدیل کروانے کے لیے یہ اشتہار چھپوایا ہو۔"

"کوئی اچھی بات منہ سے نہ نکالنا۔"

وہ بظاہر میرے ساتھ باتیں کررہا تھا مگر اس کی خوب صورت آنکھیں بتا رہی تھیں کہ مسلسل سوچ بھی رہا ہے۔ یہ معاملہ اس کے لیے بھی الجھا ہوا تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد سجاد موہل دوبارہ ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ صرف اس کے مسلح ماتحت ہی تھے۔ موہل کے چہرے پر دبا دبا جوش صاف دکھائی دیتا تھا۔ موہل کی ہدایت پر ہمارے ٹارچ سیل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ کم از کم تین رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ہم کسی طرح کی مہم جوئی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں ایک برآمدے سے گزار کر نہایت آرام دہ کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں فرش پر دبیز قالین تھا۔ ایک شاندار ڈبل بیڈ، فریج اور الیکٹرک ہیٹر وغیرہ کی سہولت یہاں موجود تھی۔ ڈیکوریشن پیس کے طور پر شیشے کی ایک برہنہ مورتی نظر آرہی تھی۔ ہمیں اس کمرے میں داخل کرکے دروازہ باہر سے لاک کردیا گیا۔ عاصمہ کا دیا ہوا موبائل عمران کی جیب میں تھا۔ ہم نے شکر کیا کہ دوبارہ ہماری تلاشی

نہیں ہوئی تھی۔

عمران نے بہت پوچھا کہ یہ لطف و کرم اور عنایت کس سلسلے میں ہے لیکن موہل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس معنی خیز نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔

ہمارے اگلے چوبیس گھنٹے بڑی اچھی طرح گزرے۔ نہ صرف ہمارے زخموں کی مرہم پٹی کا سامان کیا گیا بلکہ نئے کپڑے بھی دیے گئے۔ شیو اور غسل کے سارے لوازمات پہلے ہی کمرے کے واش روم میں موجود تھے۔

عمران بولا۔ "ہوسکتا ہے یہ واقعی کسی راجکماری کا چکر ہو یار۔ مجھے بڑے عرصے سے شوق ہے کسی راجکماری کے ہاتھوں اغوا ہونے کا اور اپنی تمام مردانہ دلکشیوں کے ساتھ اس کی "خدمت" کرنے کا۔"

"میں پھر وہی بات کہوں گا۔ اگر کوئی "راجکمارا" ہوا اور اس نے تم سے کوئی پرانا بدلہ چکانا ہوا تو پھر؟ میں تو یونہی مفت میں مارا جاؤں گا۔"

"تم مرنے کے پیسے لے لینا یار مگر اس طرح کی مایوس کن باتیں نہ کرو۔ اور کیا پتا تمہاری یہ ساری بدگمانیاں دور ہوجائیں اور ہم واقعی کسی اچھے مقصد کے لیے اشتہاری قرار پائے ہوں۔"

"تمہارے کرتوت تو کبھی ایسے نہیں رہے۔ تم نے خود بتایا ہے، سرکس میں آنے کے بعد تم ہر طرح کے لوگوں سے ہر طرح کے پنگے لیتے رہے ہو۔ کیا پتا، کوئی ایسا ہی پنگا پھر سے زندہ ہوگیا ہو۔"

"میڈم صفورا ایسے حالات میں بڑے صائب مشورے دیتی ہے لیکن افسوس وہ بھی نہیں ہے۔ کاش، ہم اس کو بھی اپنے ساتھ ہی یہاں لاسکتے۔"

"تو اب پھنسوا دو اسے۔ اس بندے کا پتا بتا دو جس کے ذریعے کپتان اجے نے ہوٹل میں ہمارے کمرے بک کروائے تھے۔ یہ تمہارا یار ڈی ایس پی چنگیز خاں نہ صرف میڈم بلکہ اسد اور نوری، صفیہ وغیرہ کو بھی یہاں لے آئے گا۔ پھر سارے مل کر رو دیں گے۔"

"بس ہر بات کو رونے کی طرف لے جانا۔" عمران نے بُرا سا منہ بنایا۔

اسی دوران میں عمران کی جیب میں پڑے موبائل سیٹ نے وائبریٹ کیا۔ عمران نے احتیاط سے موبائل نکالنے کے بعد میسج چیک کیا۔ یہ ڈی ایس پی کی جواں سال بیوی عاصمہ کی طرف سے ہی تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "بھائی جان! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کو باہر والے کمرے سے نکال کر

انیکسی میں لے آئے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا ہے۔ سجاد اس بات پر خوشی سے پھولے نہیں سمار ہے کہ انہوں نے آپ کو دوبارہ پکڑ لیا ہے۔ وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں لیکن مجھے سب پتا ہے۔ اگر آپ خود نہ چاہتے تو وہ آپ کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ آپ اپنے وعدے کا پاس کر رہے ہیں اور اس کے لیے آپ نے خود کو ایک بڑی مصیبت میں ڈال لیا ہے۔ کاش، یہ وعدہ ہمارے درمیان نہ آیا ہوتا۔ اور اگر آیا تھا تو پھر یہ صورتِ حال ہی نہ بنتی جواب بنی ہے۔ آپ کا اور سجاد کا آمنا سامنا ہی نہ ہوتا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ اللہ کرے میں ہی مرجاؤں اور آپ پر سے یہ بلا ٹل جائے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بتائیں میں کس طرح آپ کی مدد کروں؟''

عمران نے جواب میں لکھا۔ ''گھبراؤ مت۔ تمہاری مدد کے بغیر ہی مدد پہنچ رہی ہے اور اس کا ایک ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ ہم اس ٹارچر سیل سے اس آرام دہ مہمان خانے میں آگئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آگے اور ترقی کریں گے۔''

اس کے ساتھ ہی عمران نے ایس ایم ایس کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ میں اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ وعدے وغیرہ کا کیا معاملہ ہے؟ یہ کیسا وعدہ تھا جس کی وجہ سے تم نے اس مگرمچھ کے جبڑوں میں اپنا سر دیا ہے؟''

''عشق پر کسی کا زور نہیں غالب... تمہیں بتایا تو ہے اسے دیکھ کر میرے دل کو کچھ کچھ ہوتا ہے۔ وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو میں اب تک سہرا باندھ چکا ہوتا۔ اب بھی میں نے اسے آفر دے رکھی ہے کہ اگر وہ اپنے کھڑوس شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو سیکنڈ آپشن کے طور پر میں حاضر ہوں۔''

''میں جانتا ہوں یہ بات تم صرف مذاق میں کرتے ہو اور عاصمہ بھی یہ بات سمجھتی ہے۔''

''تمہارے جیسے دوست کے ہوتے ہوئے بندے کو کسی دشمن کی ضرورت نہیں ہوتی... شیکسپیئر نے اپنی ایک پنجابی نظم میں لکھا ہے کہ اے فرینڈ ان نیڈ از فرینڈ ان ڈیڈ... اس کا مطلب یہ ہے کہ...''

وہ پھر پٹری سے اتر گیا تھا لیکن اس بار میں بھی پٹری سے اتر گیا۔ میں نے اسے بے نقط سنائیں۔ میں نے کہا کہ وہ ہر بات کو ہوا میں اڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے ہر وقت مخمصے میں رکھنے کی اسے عادت پڑ گئی ہے۔ میں اب یہ عادت مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے جب واقعی غصہ آجاتا تھا تو وہ فوراً سنبھل جاتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے حسبِ عادت فوراً ہاتھ جوڑ دیے اور اتنے مسکین لہجے میں مجھے منانا شروع کیا کہ میں اپنا غصہ برقرار نہ رکھ سکا۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''تابی! یہ ہماری مشرقی عورتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بس جس کے پلّے بندھ گئیں، بندھ گئیں۔ ڈی ایس پی سجاد ہرگز اچھا شوہر نہیں ہے لیکن عاصمہ کے لیے تو سب کچھ وہی ہے۔ وہ اس کی ماریں بھی کھاتی ہے اور پوجا بھی کرتی ہے... اس کی ترقی اور بھلائی کی دعائیں اس کا معمول ہیں۔ جس رات میں سجاد کو سبق سکھانے کے لیے اس کے گھر میں داخل ہوا تھا، عاصمہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اسے بجا طور پر یہ خدشہ لاحق تھا کہ آج رات سجاد خودکشی کر لے گا یا کثرتِ شراب نوشی سے موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ عاصمہ کی گریہ زاری دیکھ کر پتا نہیں میرے دل میں کیا آیا کہ میں نے سجاد کو گرفتاری دے دی۔ یہ گرفتاری ایک ایسے بے بدل ٹانک کی طرح تھی جس نے سجاد کی ڈوبتی ہوئی نبضوں کو پھر سے ابھارا اور اسے اس کے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ میرے خیال میں تمہیں یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہوگا لیکن اس بات کو صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں کہ اس رات، ٹوٹے پھوٹے اور اپنی ہی آگ میں راکھ ہوتے سجاد کے لیے میری گرفتاری کتنی ضروری تھی... میری گرفتاری کے دسویں بارھویں روز عاصمہ برقع پہن کر رازداری کے ساتھ مجھ سے ملنے جیل آئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ روتے ہوئے میرے قدموں پر سر رکھ دیتی۔ وہ میری رہائی کے بارے میں بہت فکرمند تھی اور جاننا چاہتی تھی کہ میں اس سنگین معاملے سے کس طرح نکل پاؤں گا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا ایک مسئلہ بھی لے کر آئی تھی۔ اس نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ جھانسی کی ایک پیرزادی سیدہ جویریہ رضوی کی انتہائی معتقد ہے اور ان سے راہنمائی لیتی ہے۔ سیدہ جویریہ استخارہ کرتی تھیں اور فال وغیرہ نکالتی تھیں۔ انہوں نے عاصمہ سے سارے حالات معلوم کرنے کے بعد ایک خاص بات بتائی تھی اور وہ یہ کہ جس بندے کی بے لوث قربانی اور ہمدردی کی وجہ سے سجاد موہل خطرناک مایوسی اور ابتلا کے دور سے نکلا ہے، وہی بندہ کسی دوسرے موقع پر سجاد کی زندگی کے خاتمے کا سبب بھی بن سکتا ہے... اس لیے سجاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ آئندہ اپنے اس محسن سے دور رہے یا پھر وہ محسن اس بات کا خصوصی خیال رکھے کہ ان دونوں کی ملاقات دوبارہ نہ ہونے پائے۔ اور اگر ایسا ہو ہی جائے تو پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ محتاط رہیں...

''اپنی فال ہی کے ذریعے اس مستقبل بیں خاتون نے عاصمہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا اور میں چند دن کے اندر ہی خود کو قانونی گرفت سے بچانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مختصر یہ کہ جیل میں ہونے والی اس ملاقات میں عاصمہ نے رو رو کر مجھ سے فریاد کی کہ میں اس سے ایک وعدہ کروں۔ آئندہ اگر کبھی میرے اور سجاد کے درمیان تصادم یا ٹکراؤ کی کوئی بھی صورت پیدا ہوئی تو میں خود کو روک لوں گا اور اس تصادم سے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔

''میں سمجھ گیا تھا کہ یہ شوہر پرست عورت اس وقت شدید واہموں کا شکار ہے۔ میں نے اس کی تشفی کے لیے اس سے وعدہ کیا کہ بالفرض کبھی اس طرح کی کوئی صورتِ حال پیدا ہوئی تو میں پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ وہ اس طرح مانی نہیں تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا تھا... میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤں۔ اور میں نے اس کی خاطر قسم کھالی۔ حقیقت یہی ہے کہ میں اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ پیشین گوئیاں کبھی کبھی درست بھی ثابت ہو جاتی ہیں لیکن ان کی کوئی سائنسی بنیاد تو نہیں ہے یار۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سجاد موہل سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔ لیکن جب پارک ویو ہوٹل کی لابی میں بیٹھے ہوئے میں نے اچانک اسے دیکھا اور اس نے مجھے تو میرے ذہن میں وہ تمام باتیں تازہ ہوگئیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنا دیا ہوا قول بھی۔''

عمران نے ذرا سا توقف کیا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''وہ سچویشن تم نے بھی دیکھی تھی۔ سجاد موہل اس وقت غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ایسا شخص شدید تناؤ میں دوسروں کو یا پھر خود کو شدید نقصان پہنچا لیتا ہے۔''

عمران نے بات ختم کی اور پُرسوچ انداز میں سگریٹ کے لمبے کش لینے لگا۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ وہ انوکھا تھا اور اس کی باتیں بھی انوکھی تھیں۔

دو سال پہلے وہ بمبئی شہر کی ایک پُرفسوں رات میں ایک عورت کی حالتِ زار سے متاثر ہوا تھا... اس کے لیے ایک انوکھی قربانی دی تھی اور پھر اس سے ایک وعدہ کیا تھا۔ وہ عورت اس کی کچھ نہیں لگتی تھی۔ نہ ہی اس سے اسے کوئی مطلب تھا۔ وہ اس سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا فائدہ بھی لینا نہیں چاہتا تھا مگر اس سے کیا ہوا عہد اسے یاد تھا۔ اس عہد کی خاطر اس نے خود کو بے دریغ مشکل میں ڈال دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری منطق نرالی ہے یار... اور سچی بات یہ ہے کہ پوری طرح میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ تمہیں پتا تھا کہ تم ایک سنگین کیس میں ملوث ہو اور پولیس کی کسٹڈی سے بھاگے ہوئے بھی ہو پھر بھی۔''

''یار! میرا خیال تھا کہ ہم راستے میں کچھ نہ کچھ کر گزریں گے اور شاید کسی مناسب طریقے سے سجاد سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن تم نے دیکھ ہی لیا، اس نے گاڑی میں ہماری کوئی بات سنی اور نہ ہی کسی طرح کا کوئی موقع دیا۔ پھر تمہارے پاؤں میں بھی اچانک ہی زنجیر ڈال دی گئی۔ جہاں تک کیس کے سنگین ہونے کا تعلق ہے، میرا نہیں اندازہ تھا کہ یہ اتنا سنگین ہے۔ میں نے پروڈیوسر منوج کو صرف زخمی کیا تھا... جان سے نہیں مارا تھا۔ اب یہ لوگ اسے قتل کہہ رہے ہیں لیکن یہ کسی طور قتل نہیں بنتا... اور اب تو... یہ ویسے بھی کوئی دوسرا کیس بنتا جا رہا ہے۔'' عمران نے کش لے کر دھواں میرے منہ پر چھوڑا۔

''دوسرا کیس؟''

''جگر! یہی اشتہار والا معاملہ۔ جس طرح ہمیں ایک دم حوالاتی سے وی آئی پی بنا دیا گیا ہے، مجھے لگتا ہے کوئی بڑی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ یہ وہی ٹریٹ منٹ ہے جو بکروں کا مالک قربانی کے بکروں کو دیتا ہے۔''

کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ تھی۔ کوئی عورت ادھر آرہی تھی۔ امکان تھا کہ یہ عاصمہ ہی ہوگی۔ یہ امکان درست نکلا۔ وہ اس مختصر لاؤنج میں آگئی جو ہمارے کمرے کے سامنے واقع تھا۔ یہاں حوالدار فیاض چوکس حالت میں موجود تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگی لیکن اس کی توجہ ہماری ہی طرف تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور رنگت اڑی اڑی تھی۔ وہ دراز قد اور خوش شکل تھی۔ کھلی ہوئی رنگت، تھوڑے سے ابھرے ہوئے رخسار اور ستواں ناک میں ونگ کی مدھم چمک۔ وہ ہاتھ کا بنا ہوا لمبا اونی کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ گلابی رنگ کی گرم شال کوٹ کے ہم رنگ تھی۔ میں نے اسے خاصی توجہ سے دیکھا۔ عمران نے بتایا تھا کہ عاصمہ میں کسی حوالے سے شبانہ کی ہلکی سی جھلک موجود ہے۔ وہی شبانہ جس نے شبنم بن کر عمران کے دل پر راج کیا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

صاف پتا چلتا تھا کہ وہ ہم سے بات کرنا چاہتی ہے مگر حوالدار فیاض اور ہیڈ کانسٹیبل کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل تو قدرے دور تھا مگر حوالدار بالکل ہمارے سر پر موجود تھا۔ حوالدار کی توجہ ذرا دوسری طرف ہوئی تو عاصمہ نے بڑے التجائی انداز میں عمران کو اشارہ کیا۔ وہ اس سے درخواست کر رہی تھی کہ وہ موبائل فون آن کرے۔ عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ واپس چلی گئی۔

کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہنے کے بعد عمران نے

موبائل آن کرلیا۔ چند ہی منٹ بعد موبائل نے وائبریٹ کیا اور عاصمہ کا میسج آگیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''بھائی جان! آپ مجھے کیوں اتنی سخت سزا دے رہے ہیں۔ آپ صرف میری خاطر اس مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں اور مجھ سے بات بھی نہیں کررہے ہیں۔ سجاد پتا نہیں کس چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ کل سے تھانے بھی نہیں گئے۔ ایک لینڈ کروزر پر کچھ لوگ شام کے وقت سجاد سے ملنے آئے تھے۔ ان میں ایک ہندو کسی یورپی کنٹری کا لگتا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹا یہاں رہے۔ پھر سجاد کا دوست جگدیش ان کے ساتھ چلا گیا۔ یہ جگدیش مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اس کے رابطے غلط لوگوں سے ہیں۔ پلیز! مجھے جواب دیں۔''

عمران نے لکھا۔ ''تم خود کو خطرے میں نہ ڈالو اور اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ رہو۔ جب بھی کوئی خوب صورت لڑکی میری خاطر خود کو خطرے میں ڈالتی ہے، میں غلط فہمی کا شکار ہوجاتا ہوں۔ خاص طور سے منگل اور بدھ کو ایسا ہوتا ہے۔ اور آج منگل ہے۔۔۔ میں اپنی حفاظت کرلوں گا۔ پلیز! اب رابطہ نہ کرنا۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ خدا حافظ۔''

اس میسج کے بعد عمران نے فون حتمی طور پر بند کردیا۔

میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عاصمہ نے کسی غیر ملکی کی بات کی ہے۔''

''ہاں، یہ قابلِ غور بات ہے۔''

ابھی عمران کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ دو بڑی جیپیں کوٹھی کے ڈرائیووے پر نظر آئیں اور پورچ میں آکر رک گئیں۔ ان میں سے ایک شاندار لینڈ کروزر جیپ کے شیشے سیاہ تھے۔ گاڑیوں میں سے آٹھ دس افراد اترے۔ ان میں کچھ مسلح تھے اور کسی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کے اہلکار لگتے تھے۔ ان کمانڈو ٹائپ اہلکاروں نے تاریک شیشوں والی عینکیں لگا رکھی تھیں اور ان کے پاس جدید اسلحہ تھا۔ سادہ شیشوں والی لگژری جیپ میں سے دو سوٹڈ بوٹڈ افراد اترے۔ ان میں سے ایک کے بال سفیدی مائل تھے۔ بہرحال، ہم ان کی صورتیں ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے۔ سجاد موہل اور جگدیش پہلے سے پورچ میں موجود تھے۔ انہوں نے مہمانوں کا استقبال کیا اور انہیں کوٹھی کے اس حصے میں لے آئے جہاں ہم موجود تھے۔

''لگ رہا ہے کہ اب ہمارا چل چلاؤ ہے۔ یہ موبائل فون کہیں چھپا دینا چاہیے۔'' عمران نے کہا۔

میں نے جلدی سے ایک چھوٹے صوفے کو ترچھا کیا اور اس کے نیچے کا کپڑا بلیڈ سے ذرا سا کاٹ کر موبائل سیٹ اس میں گھسا دیا۔

دو تین منٹ بعد بھاری قدموں کی چاپوں سے کمرے کے سامنے والا لاؤنج گونج اٹھا۔ حوالدار فیاض نے کمرے کے دروازے کو ''ان لاک'' کیا۔ یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ ہماری طرف کوئی گن ''پوائنٹ'' نہیں کی گئی تھی۔ گنیں اہلکاروں کے ہاتھوں میں تھیں لیکن کسی بیرل کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ تھری پیس سوٹ والا ادھیڑ عمر شخص آگے آیا۔ اس نے ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور سپاٹ لہجے میں ہم دونوں سے ہمارے نام پوچھے اور ولدیت دریافت کی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ چھپانے سے فائدہ نہیں۔ ان لوگوں کے پاس ہمارے بارے میں مکمل معلومات موجود تھیں۔ عمران کی قمیص کی آستین اٹھا کر اس کے بازو پر پرانے کٹ کا ایک نشان دیکھا گیا۔ اسی طرح میرے کندھے پر، گردن کے قریب دو تل تلاش کیے گئے۔ یہ تل شناختی کارڈ میں علامت کے طور پر موجود تھے۔

ادھیڑ عمر شخص نے شستہ اردو میں کہا۔ ''امید ہے کہ آپ دونوں ہم سے تعاون کریں گے۔ اسی میں آپ کی بہتری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم آپ سے آپ کے بارے میں پوچھیں۔''

''آپ کو سب کچھ بتایا جائے گا لیکن فی الحال ہمیں یہاں سے جانا ہے۔ ہمیں عارضی طور پر آپ دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھنا ہوگی۔'' ادھیڑ عمر شخص نے پھر شائستہ لہجے میں کہا۔

''اگر ہم انکار کریں تو پھر؟'' عمران نے کہا۔

''ہمیں افسوس ہوگا کہ آپ ہمارے دوستانہ رویے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کررہے۔''

''اوکے۔'' عمران نے کہا۔

ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھی گئیں۔ دو افراد نے ہم دونوں کو بازوؤں سے پکڑا اور لے کر چل دیے۔ ہمارے عقب میں اور دونوں طرف کم و بیش آٹھ مسلح افراد موجود تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ زبردست تربیت یافتہ ہیں۔ ہمیں پورچ میں لاکر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ اگلی گاڑی تھی اور وہی تھی جس کی کھڑکیوں میں تاریک شیشے تھے۔

ہمارا سفر شروع ہوا۔ ہمارے گرد مسلح افراد موجود تھے اور وہ بالکل خاموش تھے۔ ادھیڑ عمر شخص بھی اسی گاڑی میں موجود تھا اور وہ اگلی نشست پر تھا۔ عمران نے راستے میں ایک دو سوال پوچھنے کی کوشش کی مگر ادھیڑ عمر شخص کا رویہ اب پہلے سے زیادہ خشک ہوچکا تھا۔ اس نے عمران کو فی الوقت خاموش رہنے کی ہدایت کی۔۔۔

ہم الٰہ آباد کی بھری پُری سڑکوں سے گزر کر قریباً پون گھنٹے میں اپنی منزل تک پہنچ گئے۔ یہ منزل بھی کوئی رہائشی عمارت ہی تھی۔ یہاں رکھوالی کے بڑے۔۔۔۔۔۔ کتے موجود تھے اور ماربل کے فرش پر لوگوں کے ٹھک ٹھک چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے ایک دو افراد کو انگریزی بولتے بھی سنا۔ ان میں سے ایک یقیناً کوئی غیر ملکی خاتون تھی۔ اس عورت نے عمران کو دیکھ کر حیرت اور دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔۔۔ اس کے الفاظ واضح طور پر میری سمجھ میں نہیں آسکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہمیں ایک اور گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ ٹرک نما گاڑی تھی۔۔۔ تاہم نشستیں نہایت آرام دہ تھیں۔ اس موقع پر عمران نے اپنی پٹی اتارنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک سکھ گارڈ نے پنجابی لہجے میں کہا۔ ''نہیں، ابھی نہیں جی۔ ابھی سر جی کا آرڈر آئے گا تو پٹی ہٹا لیجیے گا۔''

ہمارے اندازے کے مطابق گاڑی میں شاید گتے کے بہت سے ڈبے بھرے ہوئے تھے۔ گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ گاڑی پہلے سے یہاں ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔

دو تین منٹ بعد ایک انٹرکام جیسی آواز سنائی دی۔ ''اب آپ اپنی پٹیاں ہٹا سکتے ہیں۔''

ہم دونوں نے پٹیاں ہٹالیں اور چندھیائی ہوئی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ہم ایک چھوٹے سائز کے کنٹینر میں تھے۔ تاہم یہ کوئی عام کنٹینر نہیں تھا۔ اس کا انٹیریئر زبردست تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی ریل گاڑی کے اسپیشل لگژری کیبن میں سفر کررہے ہیں۔۔۔ ایک طرف ایک درمیانے سائز کا ریفریجریٹر بھی موجود تھا اور کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے آکسیجن کے سلنڈر بھی رکھے تھے۔

عمران نے کنٹینر کی دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ کنٹینر کی بیرونی دیواریں نہیں ہیں۔ یہ ڈبل دیواروں والا کیبن تھا۔ یعنی اگر ہم اندرونی دیوار کو پیٹنا بھی شروع کردیتے تو شاید باہر تک اس کے اثرات نہ پہنچ پاتے۔ اس چھ فٹ چوڑے اور قریباً آٹھ فٹ لمبے کیبن میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس کیبن کی ایک دیوار گتے کے اسٹائلش ڈبوں کی تھی۔ یہ ڈبے فرش سے چھت تک چنے ہوئے تھے۔ عمران نے ان ڈبوں پر لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھنا شروع کیا۔ ''کمپیوٹر ہارڈ ویئرز اینڈ ایسیسریز فاران کمپنی لمیٹڈ الٰہ آباد۔''

عمران نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ کمپیوٹرز کے پرزہ جات ہیں جو فیکٹری سے کسی مارکیٹ میں پہنچائے

جارہے ہیں۔''

''اور ہمیں ان کی آڑ میں پہنچایا جارہا ہے۔'' میں نے کہا۔

میری آواز ذرا بلند تھی۔ عمران نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے آواز دھیمی رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہماری آواز سنی جارہی ہے۔

دفعتاً انٹرکام نما آلہ پھر جاگ اٹھا۔ کسی مقامی شخص نے ریڈیو اناؤنسر کی سی آواز میں کہا۔ ''فریج میں آپ کے کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔ دائیں طرف شیلف پر اوون پڑا ہے جس میں آپ کھانا گرم کرسکتے ہیں۔ بائیں طرف جو چھوٹا دروازہ نظر آرہا ہے، وہ واش روم کا ہے۔ پانی محدود ہے اس لیے آپ کفایت سے استعمال کریں۔''

''لیکن ہم۔۔۔'' عمران کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ انٹرکام بند ہوچکا تھا۔

''ہیلو۔۔۔ ہیلو۔'' عمران نے ایک دو مرتبہ کہا پھر گہری سانس لے کر لچک دار بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔

''لگتا ہے ہمیں لمبا سفر کرنا ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

عمران نے ٹانگ سے فریج کا دروازہ کھولا اور اندر موجود کھانے پینے کی اشیا کو دیکھ کر بولا۔ ''ان چیزوں کو دیکھا جائے تو پھر چار پانچ دن کا سفر تو بنتا ہی ہے۔''

''لیکن اگر تمہاری بھوک کو دیکھا جائے تو پھر کچھ کم بنتا ہے۔''

''تمہیں زبان لگ گئی ہے۔ کوئی بات نہیں بچے۔ کھٹمنڈو پہنچ کر بولتی بند ہوجائے گی۔۔۔ وہاں کڑاکے کی سردی ہوگی۔''

''یہ کھٹمنڈو بیچ میں کہاں سے آگیا؟''

''بھئی جس جگہ سے ہم چلے ہیں اور جدھر کو ہمارا رخ ہے، ہم چار پانچ دن میں کھٹمنڈو تو پہنچ ہی جائیں گے۔۔۔ نہ ہوا تو تبت ہوگا یا پھر سن کیانگ وغیرہ۔ کیوں جی، ایسا ہی ہے نا برادرز۔'' عمران نے آخری الفاظ کنٹینر والوں کو مخاطب کرکے کہے تھے۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کنٹینر بڑی رفتار سے اڑا چلا جارہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی موٹروے جیسی سڑک پر جارہا ہے۔ عمران نے اداسی بھرے انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

مجھ پر بھی اداسی سوار ہورہی تھی۔ بالو بڑی شدت سے یاد آرہا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ وہ معصوم ماں

سے تو جدا ہو ہی چکا تھا، اب مجھ سے بھی دور تھا۔ بہر حال، مجھے میڈم صفورا کی ہوشیاری اور اسد کی دلیری سے خاصی توقعات تھیں۔ امید تھی کہ وہ حالات کا مقابلہ کر لیں گے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ انہیں اے جے کا تعاون بھی حاصل تھا۔

کپتان اے جے کا خیال آتے ہی وہ سارے واقعات ذہن میں اودھم مچانے لگے جو صرف چند روز پہلے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہمارے ساتھ پیش آچکے تھے... ایسا لگتا تھا کہ ہم 1857ء کی جنگِ آزادی کے دور سے ایک دم جدید دور میں لوٹ آئے ہیں۔ قاسمیہ کے پرانے قلعے کے اردگرد ہونے والی خوں ریز لڑائی، آگ، دھواں، بارود، تلواروں کی جھنکار... اور پھر اس سے پہلے اسٹیل اور غیارڈ کی موت، سولیاں چڑھائے جانے کے مناظر اور بازاروں میں ہونے والی قتل و غارت اور عصمت دری۔ وہ سب واقعات آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

وہ سب کچھ اب جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا لگتا تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''اسٹیٹ کی لڑائی کو یاد کر رہا ہوں... اور تم؟''

''میں لاہور کو یاد کر رہا ہوں۔ لگتا ہے اپنا ملک اور اپنا شہر دیکھنے کی حسرت پھر دل میں ہی رہ جائے گی۔ ہائے پاکستان... ہائے لاہور۔''

☆☆☆

ہمارے اگلے پانچ روز ایک انوکھے تجربے جیسے تھے۔ ہم نے یہ پانچ دن ایک چھ ضرب آٹھ فٹ کے کیبن میں گزارے تھے... اور یہ کیبن تقریباً دن رات حرکت کرتا رہا تھا۔ کبھی ہموار سڑکوں پر، کبھی ناہموار سڑکوں پر۔ ہم کہاں سے گزرتے رہے تھے، ہمیں کچھ خبر نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ باہر سے کوئی ہلکی سے ہلکی آواز بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی... نظر کا راستہ بھی یکسر مسدود تھا۔ باہر کی دنیا سے ہمارا واحد رابطہ وہ انٹرکام تھا جس کے ذریعے کبھی ایک مرد اور کبھی ایک عورت ہمیں مخاطب کرتے تھے اور یہ رابطہ بھی دن میں صرف ایک آدھ بار ہی ہو پاتا تھا۔ ہمارا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

خدا خدا کر کے پانچویں روز یہ سفر اختتام کو پہنچا۔ عمران کی رسٹ واچ شام ساڑھے پانچ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ پانچ روز بعد پہلی بار ہمارے لگژری کیبن کا دروازہ کھلا اور ہمیں کسی آدم زاد کی صورت نظر آئی۔ اس آدم زاد کے پیچھے ایک اور آدم زاد بھی تھا جس کے ہاتھ میں خطرناک قسم کا...

تھی... ہم سے بڑے شائستہ لیکن فیصلہ کن لہجے میں ایک بار پھر درخواست کی گئی کہ ہم اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوا لیں۔ اس درخواست کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہماری آنکھوں پر سیاہ ریشمی پٹی باندھ دی گئی۔ مسلح کمانڈوز ٹائپ افراد نے ہمیں بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارا۔ ہمارے اردگرد بہت سے بوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ موسم خاصا ٹھنڈا تھا۔ قریباً پچاس میٹر پیدل چلانے کے بعد ہمیں ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا اور آنکھوں سے پٹیاں ہٹا دی گئیں۔ کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ ہم باقی سب باتیں فراموش کر کے اندازے لگانے میں مشغول ہو گئے کہ ہم کس مقام پر ہیں۔ یہ انڈیا تو ہرگز نہیں تھا۔ کمرے کی ڈیکوریشن اور دیگر اشیا سے بھی کچھ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہمارے اردگرد موجود افراد تو کچھ بولتے ہی نہیں تھے۔ ورنہ ان کی زبان اور لہجے سے کوئی قیافہ لگایا جاتا۔

عمران نے پوچھا۔ ''کیا خیال ہے، انڈیا، نیپال یا چائنا؟ ویسے مجھے تو ماحول کچھ کچھ نیپال جیسا لگتا ہے۔ اور یہ پینٹنگ دیکھو۔ اس میں بھی کچھ ایسا ہی رنگ ہے۔''

''لیکن یہ فرش دیکھو... یہ ماربل ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق کھٹمنڈو وغیرہ میں اچھے ہوٹلوں کے فرش اکثر لکڑی کے ہوتے ہیں اور یہ پردوں کا اسٹائل... یہ بھی کچھ وکھری ٹائپ کا ہے۔''

اچانک عمران کی نظر ایک دیوار گیر الماری پر پڑی۔ وہ اس کے ہینڈلز پر پاؤں رکھتا ہوا بالائی سرے تک پہنچ گیا۔ یہاں ایک اسٹائلش ایگزاسٹ فین نظر آ رہا تھا۔ عمران نے اس فین کی پلاسٹک جالی سے باہر جھانکا۔ پھر بے اختیار پکار اٹھا۔ ''اوئے ہوئے ہوئے۔'' اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے تھے۔

''کیا ہوا؟'' میں نے کہا۔

''خود دیکھ لو اوپر آ کر۔''

میں نے عمران کی تقلید کی اور الماری کے ہینڈلز پر پاؤں رکھتا ہوا ایگزاسٹ فین کی جالی تک پہنچا۔ میں دنگ رہ گیا۔ اس دوسری منزل سے بلند درختوں کے پیچھے مجھے جو منظر نظر آیا، وہ مینارِ پاکستان کا تھا۔ مینارِ پاکستان کا اوپر والا حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہ لاہور کا جانا پہچانا آسمان تھا۔ یہ لاہور تھا... شام ڈوب رہی تھی۔ سرخ افق پر پتنگیں ڈول رہی تھیں...

عمران نے کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ "یار تابی!
یہ مینار پاکستان لاہور سے چل کر کھٹمنڈو کیسے پہنچ گیا؟"

میں کیا جواب دیتا۔ میں خود حیرت کے دریا میں بہہ رہا تھا۔ میری نگاہیں ایگزاسٹ فین کی جالی سے باہر مینارِ پاکستان کے بالائی حصے پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ بالائی حصہ سرسبز درختوں کی ہریالی کے درمیان سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ہم منٹو پارک کے آس پاس کہیں موجود تھے۔

میں نے گہری سانس لی۔۔۔ اور مجھے اس سانس میں اپنے پاکستان اور اپنے لاہور کی جانی پہچانی خوشبو صاف محسوس ہوئی۔ یہ خوشبو سینے میں اتری اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ میں حیران ہوا کہ اس جان فزا خوشبو کی طرف میرا دھیان پہلے کیوں نہیں گیا۔ بے شک ہمیں ائرٹائٹ اور تقریباً ساؤنڈ پروف کنٹینر سے نکال کر لایا گیا تھا اور ہماری آنکھوں پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی مگر ہوا تو ہمارے سینوں میں آ جا رہی تھی۔ تب یہ پتا کیوں نہ چلا کہ یہ اپنی دھرتی کی ہوا ہے۔

عمران بولا۔ "جلوا ب المارری سے نیچے آؤ اور میرے ہاتھ پر چٹکی کاٹ کر بتاؤ کہ میں کہیں جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا؟"

میں نیچے آ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ حیرت اور خوشی کی ملی جلی عجیب سی کیفیت تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "دیکھو، کیسا عجیب تماشا ہوا ہے۔ ہم لاہور آنا چاہتے تھے۔۔۔ اور ہمیں پکڑ کر زبردستی جس جگہ لایا گیا ہے، وہ بھی لاہور ہی ہے۔"

"فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ باقی لوگ نہیں ہیں۔ اقبال، میڈم اور بالو وغیرہ۔"

بالو کے ذکر نے مجھے ایک بار پھر پریشان کر دیا۔ کچھ پتا نہیں تھا وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

اچانک کہیں فاصلے سے رکشے کی جانی پہچانی پھٹ پھٹ ابھری اور اس کے چند ہی سیکنڈ بعد کسی چھت سے "بوکاٹا" کی بلند آواز سنائی دی۔ چھت پر چڑھی ہوئی کسی پتنگ باز ٹولی نے کوئی پتنگ کاٹی تھی۔ ان دو آوازوں نے ایک دم لاہور کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا۔ اس شہر ہزار رنگ کے سارے رنگ نگاہوں کے سامنے کھلتے چلے گئے۔ جانی پہچانی گلیاں، بازار، ریستوران، چوراہے، تفریح گاہیں۔۔۔ اور شام گہری ہو رہی تھی۔۔۔ روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ ایک اور جگمگاتی شب زندہ دلوں کے اس شہر پر وارد ہو رہی تھی۔ میرا دھیان ایک دم اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی اس شہر کی کسی چار دیواری میں موجود تھے۔ انہی فضاؤں میں سانس لے رہے تھے۔

عمران میرا چہرہ دیکھ رہا تھا، وہ بولا۔ "فرح اور عاطف کے بارے میں سوچ رہے ہو نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور میری آنکھوں میں نمی چمک گئی۔

عمران نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تسلی آمیز انداز میں بولا۔ "میں نے تم سے کچھ غلط نہیں کہا تھا، وہ دونوں یہاں بالکل خیریت سے ہوں گے۔ انشاءاللہ۔"

"میں۔۔۔ انہیں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

"یار! میں نے بہت صبر کیا ہے۔ پچھلے تین سالوں کا ایک ایک پل گن گن کر گزارا ہے۔ اب ان کے بالکل پاس آ کر ان سے دور نہیں رہا جاتا۔ جی چاہتا ہے کہ یہ دروازے توڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔ اڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاؤں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ اس طرح ہمیں یہاں سے نکلنے دیں گے؟ انہوں نے بہت بڑی رقمیں خرچ کی ہیں ہم پر۔"

"مگر پتا تو چلے کہ یہ ہیں کون؟ کیا چاہتے ہیں ہم سے؟"

"دیکھو، تم پھر خود کو ایڈیٹ ثابت کر رہے ہو۔ کیا پتا ہمارے ان مہربانوں نے اس کمرے میں ہماری باتیں سننے کا انتظام کر رکھا ہو۔" وہ سرگوشی میں بولا۔

میں نے کہا۔ "مجھے پروا نہیں۔"

"ٹھیک ہے اگر تمہیں نہیں تو پھر مجھے بھی نہیں۔" اس نے کہا اور بلند آواز میں بولا۔ "مہربانو، قدردانو! اگر ہماری آواز سن رہے ہو تو ازراہِ مہربانی سامنے آؤ۔ ہمیں بتاؤ کہ ہم اس زبردست مہمان نوازی کے بدلے آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

شاید عمران کو بھی توقع نہیں تھی کہ اس کی پکار کا جواب اتنی جلدی مل جائے گا۔ یکایک کمرے کے دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں اور وہ سلائیڈ کر کے کھل گیا۔ ایک درمیانی عمر کا خوش پوش شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی، ساتھ قیمتی کپڑے کا کوٹ تھا اور گلے میں مفلر کو اسکارف کی طرح باندھ رکھا تھا۔

اس شخص کو دیکھ کر عمران کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور گرمجوشی کی چمک نمودار ہوئی

دوسری طرف، اندر آنے والا شخص بھی ایک دم جذباتی نظر آنے لگا۔ وہ آگے بڑھا اور عمران سے لپٹ گیا۔ عمران نے کہا۔ ''امید نہیں تھی انکل کہ آپ سے اتنی جلدی ملاقات ہو جائے گی۔''

دونوں کچھ دیر گلے... گلے رہے اور ایک دوسرے کے کندھے تھپکتے رہے۔ تب عمران نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تابی! ان سے ملو، یہ ہیں انکل جان محمد۔ اور انکل، یہ تابش ہے۔ یہ سرکس میں تین چار بار میرے ساتھ آیا تھا مگر آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔''

میں پُرتجسس نظروں سے جان محمد صاحب کو دیکھتا چلا گیا۔ زرگاں میں جشن کی رات، عمران نے مجھے جو اپنی طویل روداد سنائی تھی، اس میں جان صاحب کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا تھا۔ یہ اسٹار سرکس کے مالک جان صاحب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عمران کی خداداد صلاحیتیں پہچانی تھیں اور اس کی قدر کی تھی۔ انہوں نے عمران کو ''راجا'' کے چکر سے نکال کر اپنی سرکس کمپنی میں معقول مشاہرے پر ملازمت دی تھی اور قدم قدم پر اسے سہارا دیا تھا۔ بعدازاں عمران نے بھی اپنے محسن کی خیرخواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اس کی کوششوں سے اس سرکس کمپنی نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی تھیں۔

جان صاحب مجھ سے بھی بغل گیر ہوئے اور میرے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ انہوں نے کہا۔ ''تابش! تم کسی تعارف کے محتاج نہیں ہو۔ تمہاری خاطر عمران ایک سال سے زیادہ عرصے تک ہماری نظروں سے غائب رہا ہے۔ خوشی کی بات ایک ہی ہے... اور وہ یہ کہ اس کی تلاش بیکار نہیں گئی۔ تم اس کے ساتھ ہو۔''

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جان صاحب نے عمران سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کہنے اور سننے کو تو بہت کچھ ہے عمران... اور ہم دونوں کے ذہنوں میں بہت سے سوال بھی ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں، تمہارے ذہن میں جو سب سے اہم سوال ہے، وہ یہی ہوگا کہ تمہیں اس طرح یہاں پاکستان لانے والا کون ہے اور کیوں لایا ہے؟''

''ہمیشہ کی طرح آپ کا خیال درست ہے انکل۔'' عمران نے جواب دیا۔ ''لیکن اس سے بھی پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آنٹی کیسی ہیں اور کہاں ہیں؟''

''وہیں خوشاب میں ہے اور میری طرح وہ بھی تمہیں بے حد بے حد مس کرتی رہتی ہے۔ تم بھی تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوئے۔ کوئی اتا پتا نہ خیر خبر۔ یہ کوئی پرانا دور تو نہیں ہے کہ بندہ اپنے بارے میں ایک اطلاع بھی نہ دے سکے...''

عمران دلکش انداز میں مسکرایا۔ ''جہاں ہم تھے، وہ پرانا دور ہی تھا انکل۔ سمجھ لیں کہ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے انگریزوں کا دور تھا۔ خچر، گھوڑا گاڑیاں، لالٹینیں اور تلواریں۔ ایک ایسی جزیرے جیسی جگہ تھی جہاں سے ہم باہر نہیں آسکتے تھے اور نہ ہماری خبر آسکتی تھی۔ یہ لمبی کہانی ہے، آپ کو آرام سے سنائیں گے۔''

''تم الہ آباد جیسے جدید شہر کو پرانے دور کا جزیرہ کہہ رہے ہو؟'' جان صاحب نے پوچھا۔

''الہ آباد اس کے مقابلے میں پیرس ہے جناب۔ میں کسی اور جگہ کی بات کر رہا ہوں... الہ آباد تو ہم بس آٹھ دس روز پہلے پہنچے تھے۔ وہاں پہنچ کر ٹھیک سے کمر بھی سیدھی نہیں کی تھی کہ اٹھا لیے گئے۔''

جان محمد صاحب کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ ان کے اندر تجسس بڑھتا جا رہا ہے، تاہم اس موقع پر وہ بات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے کرسی کی آرام دہ نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''عمران! میں تو پچھلے قریباً ایک سال ہی سے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر زور و شور سے تمہاری تلاش کوئی تین مہینے پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس تلاش کو شروع کرنے والا ایک ایسا شخص ہے جسے تم جانتے نہیں ہو۔ وہ پاکستانی بھی نہیں ہے۔ اس سے مل کر تمہیں ضرور حیرت ہوگی۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والا ہے۔''

''کوئی تھوڑا بہت اشارہ تو دیں؟''

''وہ بہت مال دار برطانوی باشندہ ہے لیکن وہ شکل سے تمہیں برطانوی نظر آئے گا اور نہ ہی مال دار... بلکہ اس کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا تمہارے لیے بہت مشکل ہوگا۔ اسے تمہاری بہت سخت ضرورت ہے اور یہ ضرورت ہی ہے جس کی وجہ سے اس نے پچھلے چند مہینوں میں تمہاری تلاش پر پانی کی طرح پیسا بہایا ہے۔ انڈیا کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کونے کونے میں تمہاری تلاش ہوئی ہے۔ پولیس اور انٹرپول کے علاوہ پرائیویٹ اداروں سے مدد لی گئی ہے۔ اخباروں میں بڑے بڑے اشتہار دیے گئے ہیں۔ ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا گیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اب بھی الہ آباد کی اس پارٹی کو قریباً پچاس لاکھ روپیا دیا گیا ہے جس کی تحویل میں تم دونوں تھے۔''

''اوہ گاڈ!'' عمران نے دیدے پھاڑے۔ ''یعنی ان کمزور الہ آبادی ڈی ایس پی اور اس کے چھندر یاروں کو میرے لیے پچاس لاکھ روپیا دے دیا گیا؟''

''مجھے زیادہ نہیں معلوم۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ کوئی مقامی پولیس والا تھا اور اس نے تم دونوں کو پکڑ کر کسی نجی جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ ابھی گرفتاری وغیرہ کہیں ڈالی تھی تمہاری۔ اس نے جو مانگا، اسے دے دیا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ڈبل بھی مانگتا تو دے دیا جاتا۔''

''اوہ گاڈ! یہ بالکل بیکار کا خرچہ کر دیا آپ لوگوں نے۔ ہم نے تو لاہور ہی پہنچنا تھا۔ اب نہ آتے تو دس پندرہ روز یا ایک مہینے بعد آجاتے۔'' عمران نے تاسف سے سر ہلایا اور کسی اداس بکرے کی طرح گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

جان صاحب نے شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور بولے۔ ''اصل قیمت تو ضرورت کی ہوتی ہے عمران... اور ریان صاحب کو تمہاری ضرورت ہے۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ پچھلے مہینے کے شروع میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر انڈیا گئے تھے۔ ہم کوئی دو ہفتے تک امرتسر، جالندھر اور چندی گڑھ کے علاقوں میں گھومتے رہے۔ کسی نے ریان صاحب تک یہ غلط اطلاع پہنچائی تھی کہ تمہیں اور اقبال کو وہاں دیکھا گیا ہے... پورے دو ہفتے... اور ریان ولیم وہ شخص ہیں جن کے لیے اپنے کام میں سے دو گھنٹے کا وقت نکالنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''اچھا تو ان کا اسمِ مبارک ریان ولیم ہے۔ میں نے یہ پہلی بار سنا ہے۔''

''تمہیں بتایا تو ہے کہ تم انہیں پہلے سے نہیں جانتے لیکن ان کے ساتھ جو دوسرا بندہ ہے، اسے تم ضرور جانتے ہو۔''

''کون ہے؟''

''وہی پروفیسر رچی جس نے تمہارا ٹیسٹ لیا تھا۔ اپنے بہت بڑے کتے سے تمہاری ملاقات کرائی تھی۔ تمہارا لمبا چوڑا انٹرویو بھی لیا تھا اور تمہاری ویڈیو بھی بنائی تھی۔''

''وہ کیا چاہتا ہے؟''

جان صاحب بولے۔ ''رچی صاحب تو کچھ نہیں چاہتے لیکن ان کے کہنے پر یہ ریان ولیم بہت کچھ چاہنے لگا ہے۔ اسے ''لک'' کی تلاش ہے اور یہ ''لک'' اسے تم میں نظر آئی ہے۔ وہ ایک بہت بڑا داؤ لگانا چاہتا ہے اور اس داؤ کے لیے اسے تمہاری ''خوش قسمتی'' کی ضرورت ہے۔''

''آپ پہیلیوں میں بات کر رہے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

جان صاحب نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر بولے۔ ''میرا خیال ہے کہ میں تابش کے سامنے ہر طرح کی بات کر سکتا ہوں۔''

''یہ میرا ہم زاد بن چکا ہے جناب... بلکہ ہم زاد سے بھی آگے کی چیز ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں فارسی میں... رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی... غالباً یہ مولانا رومی کا مقولہ ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ مولانا رومی کا نہیں ہے اور نہ ہی فارسی کا ہے اور یہ مقولہ بھی نہیں ہے۔ یہ مصرع ہے۔''

جان صاحب نے میری اور عمران کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ریان یورپ اور امریکا میں کیسینوز کی ایک بہت بڑی ''چین'' کا مالک ہے۔ ارب پتی شخص ہے لیکن دیکھنے میں وہ تمہیں ایسا نہیں لگے گا۔ جوا خانوں کے کچھ مالکان نے پچھلے دنوں ایک بڑا گیم کھیلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس گیم کے دو شوز اس سے پہلے ہو چکے ہیں اور خاص حلقوں میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ ان شوز کو اسپیشل ٹرانسمیشن کے ذریعے یورپ اور امریکا کے کئی علاقوں میں دکھایا بھی گیا تھا۔ مسٹر ریان ولیم ان شوز میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف انتظامیہ میں شامل ہیں بلکہ ان کے چھوٹے بھتیجے گیری نے پچھلے دنوں دوسرے شو میں حصہ بھی لیا تھا۔ وہ گیم کے پہلے تین مرحلے کامیابی سے طے کرنے کے بعد چوتھے مرحلے میں آچکا ہے۔ یہ فائنل مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں ہر سوال کے ساتھ انعامی رقم دگنی ہو جاتی ہے اور اگر کھیلنے والا صرف تین سوالوں کے درست جواب دے دیتا ہے تو وہ ایک بہت بڑا انعام جیتنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

''کچھ اندازہ تو بتائیں؟'' عمران نے ذرا دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

جان صاحب مسکرائے اور تھوڑا سا توقف کر کے بولے۔ ''اس وقت یہ گیم دو ملین ڈالرز پر رکا ہوا ہے۔ پاکستانی کرنسی کے مطابق یہ قریباً پندرہ کروڑ روپیا بنتا ہے۔ بنتا ہے یا نہیں؟''

''بالکل بنتا ہے۔'' عمران نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

''اب پہلے سوال کا درست جواب دینے سے یہ رقم دگنی یعنی قریباً تیس کروڑ روپے ہو جائے گی... اور صرف دو مزید درست جواب اسے کہاں پہنچا دیں گے اس کا اندازہ تم

آسانی سے لگا سکتے ہو۔"

عمران کی آنکھیں ذرا پھیل گئیں۔"... یعنی ایک سو بیس کروڑ؟"

"بالکل... اور یہ انعام اس سے پہلے بھی ایک بار دیا جا چکا ہے۔ پچھلے سال ہونے والے پہلے گرینڈ شو میں یہ آخری انعام فلپائن کے ایک انیس سالہ لڑکے نے حاصل کیا تھا۔ دوسرے شو میں دو امیدوار تیس کروڑ کے انعام تک پہنچے لیکن اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس سے آگے بڑھنے کے لیے بہت سی ہمت بھی درکار ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" عمران نے پوچھا۔

"اگر بندہ تیس کروڑ سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو پھر اسے ساٹھ کروڑ والے سوال کا جواب دینا ہوگا۔ لیکن اگر یہ جواب غلط ہوا تو پھر اسے تیس کروڑ سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسے صرف BASIC انعام ہی ملتا ہے۔ یعنی پچاس لاکھ روپیا... تقریباً 65000 امریکی ڈالرز۔ اس گیم کا "فارمیٹ" وہی ہے جو اکثر ٹی وی چینلز پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس میں انوکھی بات بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ آخری انعام نقد رقم کی صورت میں نہیں ہے۔"

"تو کس صورت میں ہے؟"

جان صاحب ذرا سا مسکرائے اور بولے۔"ایک خوب صورت ائر ہوسٹس کی شکل میں... آپ کی خدمت کے لیے چوکس۔ ہر بات پر لیس سر کہنے والی..."

"شاید آپ مذاق کر رہے ہیں۔ ایک ارب بیس کروڑ روپے میں ایک ائر ہوسٹس۔"

وہ پھر مسکرائے۔"تم نے ابھی پوری بات نہیں سنی۔ وہ ائر ہوسٹس جس لگژری جہاز میں سروس فراہم کرتی ہے وہ جہاز بھی آپ کو ملے گا۔ ایک شاندار فیلکن 900 سی... بڑا کمال کا پرائیویٹ طیارہ ہے۔ تقریباً 12 مسافروں کی گنجائش والا۔ اس کو مزید لگژری بنانے کے لیے اس کے انٹیریئر میں کئی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ایک بیڈ روم جس میں زبردست آسائشیں موجود ہیں۔ جدید سہولتوں سے آراستہ ایک نشست گاہ۔ کئی طرح کی ان ڈور تفریحات۔"

"زبردست... کون دے گا یہ لگژری جہاز؟" عمران کو ابھی تک پورا یقین نہیں آرہا تھا۔

"وہی لوگ جو میگا شو کرا رہے ہیں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ دنیا کے "معزز" اور مال دار ترین جواری ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے پاس اپنے پرائیویٹ طیارے اور تفریحی بجرے ہیں۔ ان لوگوں نے گیم کے گرینڈ پرائز کے لیے ایسے تین جہاز تیار کروائے ہیں۔ ان میں سے ایک تو سب سے پہلے شو میں ہینڈ اوور کیا جا چکا ہے۔ فلپائنی لڑکا اس کا مالک ہے۔ دو جہاز ابھی باقی ہیں۔ ان پر بہت سوں کی رال ٹپک رہی ہے۔ اپنے ریان ولیم صاحب بھی ان میں سے ایک ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کا بھتیجا گیری نہ صرف گیم میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے بلکہ پہلے تین مرحلے کامیابی سے طے کر چکا ہے۔ وہ پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً پندرہ کروڑ جیت چکا ہے۔"

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔"اس سلسلے میں، میں ان لوگوں کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"مسٹر رچی اور مسٹر ریان کا خیال ہے کہ تم کر سکتے ہو۔"

"یعنی آپ مجھے ارسطو اور بقراط کا ہم پلہ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے دنیا بھر کا جنرل نالج گھول کر پیا ہوا ہے۔ لہٰذا ٹھکا ٹھک تین جواب دے کر مسٹر زادے گیری کو فائنل انعام تک پہنچا دوں گا۔ اگر آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو یہ بھول ہے۔ میرے جیسے بندے تو کسی عام سے کوئز شو میں جائیں تو انہیں انعام ملنے کے بجائے جرمانہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہماری خاندانی "صلاحیت" ہے۔ ایک دفعہ میرے دادا جی طارق عزیز کے نیلام گھر میں گئے تھے، شرمندگی کے باعث آج تک گھر واپس نہیں آئے۔"

جان محمد صاحب نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔"ان لوگوں کو تمہارا جنرل نالج یا ذہانت درکار نہیں... تمہاری خوش قسمتی درکار ہے۔"

"وہ کس طرح؟" عمران نے پوچھا۔

جان محمد صاحب نے مہنگے برانڈ کے سگریٹ کا طویل کش لیا اور بولے۔"شاید تم نے اس طرح کا کوئی ٹی وی شو دیکھا نہیں۔ ان میں سے اکثر شو ایسے ہوتے ہیں جن میں سوالوں جوابوں کا سلسلہ بس رسمی طور پر رکھا جاتا ہے۔ ان "سوالوں جوابوں" کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ جنرل نالج کا پروگرام نظر آئے اور اسے جوئے بازی سے منسلک نہ کیا جا سکے۔ ہر سوال کے جواب کے چار آپشن دیے جاتے ہیں اور دراصل یہی قسمت آزمائی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جان صاحب! پچھلے دنوں الہ آباد کے ہوٹل میں، میں نے ایک ٹی وی چینل پر ایسا شو دیکھا تھا۔ بے معنی سے سوال تھے۔ مثلاً وسیم کا مریض کیا کھائے گا تو بیمار ہو جائے گا۔ آپشن نمبر 1... دہی پراٹھا... آپشن 2۔ اچار پراٹھا... آپشن 3۔ انڈا پراٹھا یا پھر ٹھنڈا پراٹھا۔"

"بالکل ٹھیک۔" جان محمد صاحب نے کہا۔"ایسے پروگراموں میں اکثر سوال تو صرف خانہ پُری کے لیے ہوتے ہیں۔ اصل چیز قسمت آزمائی ہی ہوتی ہے۔ اسے عام زبان میں تکا لگانا کہتے ہیں۔ جس میگا شو کی میں بات کر رہا ہوں، اس میں بھی اصل چیز قسمت آزمائی ہی ہے۔ مثلاً پچھلے میگا شو میں جس سوال پر ایک ڈچ خاتون نے تقریباً تیس کروڑ جیتے، وہ یوں تھا۔ مختلف پیش گوئیوں کے مطابق قیامت 2012ء میں آسکتی ہے۔ آپ کے خیال میں قیامت کب آئے گی؟ 2012 میں؟ 2013ء میں؟ 2090ء میں؟ 2113 میں؟ یہ سراسر قسمت آزمائی کا سوال تھا۔ مگر یہ بڑی اعصاب شکن قسمت آزمائی ہے۔ اندازہ اس بات سے لگا لو کہ اس کھیل کے ایک "پارٹی سی پینٹ" اور تین تماشائیوں کو باقاعدہ ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔"

"تو آپ کا کہنا ہے کہ مسٹر رچی اور مسٹر ریان یہ قسمت آزمائی مجھ سے کرانا چاہتے ہیں؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ اسی لیے پچھلے تین ماہ سے تمہاری تلاش زور و شور سے جاری ہے۔ مسٹر ریان کا یقین ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی طور پر بہت "لکی" ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کرامات ہوتی ہیں۔ وہ جو پانسا پھینکتے ہیں، وہ سیدھا پڑتا ہے... یا امکان ہوتا ہے کہ وہ سیدھا پڑے گا۔ مسٹر رچی یہاں تم سے پاکستان میں مل چکے تھے۔ انہوں نے سرکس میں تمہارے اسپیشل شوز کے بارے میں بھی سب کچھ سن رکھا تھا۔ پسٹل اپنے اوپر تان کر تم جو دو چھ اور تین چھ والا دیوانہ پن کرتے ہو، اس کے بارے میں بھی انہیں ساری معلومات حاصل تھیں۔ انہوں نے مسٹر ریان ولیم کو تمہارے بارے میں بتایا اور وہ تمہاری تلاش میں لگ گئے۔ دوسرے اور تیسرے شو کے درمیان تقریباً چھ سات مہینے کا وقفہ موجود تھا اور مسٹر ریان کو یقین تھا کہ وہ اس عرصے میں تمہیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کی یہ توقع پوری ہوئی بلکہ بالکل آخری وقت میں پوری ہوئی۔"

"عجیب کہانی سنا رہے ہیں آپ۔" عمران نے کھوپڑی سہلائی۔"یا تو یہ ریان نامی بندہ خبطی ہے یا بہت پہنچا ہوا بزرگ ہے۔ ایک انجان شخص کی "لک" پر اتنا زیادہ یقین کر رہا ہے۔ اسے کیا پتا کہ میں خوش قسمتی اور بدقسمتی کا کتنا بڑا رنگسچر ہوں..."

میں نے اس کی بات اچکتے ہوئے کہا۔"ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی جان صاحب! کیا عمران اس گیری نامی نوجوان کی جگہ یہ گیم کھیلے گا؟"

"نہیں... گیم تو گیری ہی کھیلے گا۔ عمران اس کی ہیلپ کر سکے گا۔ ایسے گیمز میں تین لائف لائنز ہوتی ہیں۔ اس میں بھی تین لائف لائنز ہیں۔ لیکن یہ تینوں لائف لائنز ایک ہی طرح کی ہیں۔ وہ یہ کہ کھیلنے والا تین بار اپنے کسی دوست سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے اس سے مدد لے سکتا ہے۔ اس کے ذریعے سوال کا جواب دے سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تکا لگا سکتا ہے۔ اب ریان ولیم صاحب یہ چاہتے ہیں کہ یہ تکا لگانے والی قسمت آزمائی عمران کرے۔"

"اور اس کے لیے انہوں نے میری تلاش پر لاکھوں لٹا دیے۔ پچاس لاکھ انڈین روپیا تو اس جنوبی الہ آبادی ڈی ایس پی کو ہی دے دیا گیا۔" عمران نے کہا۔

"یہ ریان صاحب کے لیے ہرگز مہنگا سودا نہیں تھا۔ وہ پولیس والے تمہارے لیے دگنا یا سہ گنا بھی مانگتے تو ریان صاحب دے دیتے۔ انہیں جب کسی بات کا یقین ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس یقین سے پیچھے نہیں ہٹتے... اور پروفیسر رچی انہیں یقین دلا چکے ہیں کہ تمہاری شان دار "لک" اس کھیل میں کام دکھا سکتی ہے۔"

"اور اگر اس نے کام نہ دکھایا تو پھر؟" عمران نے پوچھا۔

"ایسے کاموں میں یہ "اگر" ہی تو اصل تھرل ہوتا ہے۔ تم سرکس میں کیا کرتے رہے ہو عمران؟" جان صاحب نے پوچھا پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔"میرے بار بار منع کرنے کے باوجود تم ان اسپیشل شوز میں حصہ لیتے رہے ہو جن میں کسی بھی وقت جان کے لالے پڑ سکتے تھے... میں نے ایک حد تک تمہیں روکا پھر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا اور اب بھی جانتا ہوں کہ تم باز نہیں آؤ گے۔ تم یہ سب کچھ میرے سرکس میں نہیں کرو گے تو کسی اور جگہ کر لو گے... اور ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تماشے کرو۔ ان سب تماشوں میں "اگر" کے لفظ کی خاص اہمیت ہوتی ہے... دیکھنے والا سوچتا ہے اگر یہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اگر وہ ہو گیا تو کیا ہوگا... یہاں اس گیم میں بھی یہ "اگر" ہی سب سے بڑا تھرل ہے۔"

ابھی جان محمد صاحب کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر جدید دروازے نے بے آواز سلائڈ کیا اور مسلح محافظ کے ہمراہ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ وہ گوشت کے پہاڑ جیسا تھا۔ تاہم بہت فربہ لوگوں کی طرح اس میں سستی نظر نہیں آتی تھی... وہ تھری پیس سوٹ

میں ملبوس بڑی سہولت سے قدم اٹھاتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کی صورت دیکھ کر تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ برٹش ہے۔ وہ بالکل عام سے خدوخال کا شخص تھا۔ اگر اسے اس کے قیمتی لباس سے علیحدہ کر دیا جاتا تو اسے کسی ہوٹل کا ہیڈ خانساماں یا پھر کوئی ٹرک ڈرائیور سمجھا جا سکتا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی مسکراتی آنکھوں سے اس نے بغور عمران کو دیکھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے انداز میں گرم جوشی تھی۔ عمران کے بعد مجھ سے مصافحہ کیا گیا۔ ”میں ریان ولیم ہوں۔“ اس نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ میرا دوست اور میرا گارڈ یوراج سنگھ ہے۔“

یوراج سنگھ نے بھی ہم سے مصافحہ کیا۔ وہ ایک مضبوط جسم اور عقابی آنکھوں والا چھبیس ستائیس سالہ نوجوان تھا۔ ہم سب لوگ نشستوں پر بیٹھ گئے۔ معروف کاروباری لوگوں کی طرح ریان ولیم نے ایک اچٹتی سی نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر ڈالی اور عمران سے مخاطب ہو کر برٹش اسٹائل کی انگریزی میں بولا۔ ”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسٹر ایمران۔ میرے دماغ میں اس بارے میں بہت تجسس ہے کہ تم اچانک پاکستان سے غائب کیوں ہوئے اور اتنا عرصہ کہاں رہے۔ بہرحال، یہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں اور میں اپنے تجسس کی خاطر تمہارا اور اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ میرے لیے خوشی کی بات بس یہ ہے کہ تم ہمیں مل گئے ہو اور ہمارے سامنے بیٹھے ہو۔“

”میرے لیے بھی خوشی کی بات ہے کہ آپ مجھ ناچیز کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔“ عمران نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

”مجھے امید ہے کہ مسٹر جان محمد نے تمہیں کافی کچھ بتا دیا ہوگا اور تم نے سمجھ بھی لیا ہوگا۔۔۔ مسٹر ایمران! دراصل میں ان لوگوں میں سے ہوں جو تدبیر سے زیادہ ”لک“ پر یقین رکھتے ہیں اور آج اس چالیس سال کی عمر میں، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے اس یقین کی وجہ سے میں نے زندگی میں بہت سی کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ میرا اس بات پر ایمان ہے کہ قدرت نے اس دنیا میں کچھ لوگوں کو دوسرے لوگوں سے زیادہ خوش قسمت بنایا ہوتا ہے۔ اپنے اس خداداد وصف کی بدولت وہ بدترین خطرات سے بچ نکلتے ہیں۔ مشکل ترین حالات میں رستے ڈھونڈ لیتے ہیں اور کامیابیوں کو اپنی طرف کشش کرتے ہیں۔ اس مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو یہاں اس شہر میں جو میگا شو ہونے جا رہا ہے، اس میں بھی سارا کھیل خوش بختی کا ہے۔ جو سوال پوچھے جانے والے ہیں، وہ اتنے مشکل ہوں گے کہ فہم و فراست سے ان کا جواب دینا شاید ناممکن ہو گا۔ وہ صرف چوائس ہوگی اور دیکھنا یہ ہوگا کہ بہترین چوائس کون کرتا ہے۔“

”کیا اس گیم میں کوئی اور بھی حصہ لے رہا ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

مسٹر ریان نے اپنا بڑا سر اثبات میں ہلایا۔ ”پچھلا شو قریباً سات ماہ پہلے ہوا تھا۔ اس میں میرا بھتیجا گیری کھیل رہا تھا جب شو کا مقررہ وقت ختم ہو گیا تھا۔ اب اٹھائیس تاریخ کو جو شو ہونے جا رہا ہے، اس میں سلسلہ وہیں سے جڑے گا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ یعنی گیم کا چوتھا مرحلہ شروع ہوگا۔ اس مرحلے میں اگر تین سوالوں کے جواب درست ہو گئے تو ہم فائنل انعام تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد جس کھلاڑی کی باری آئے گی، وہ ایک امریکن لڑکی ہے۔ میرے کاروباری حریف مسٹر ہنیلے کی اکلوتی بیٹی ماریانی۔ بہت ہوشیار، بہت ذہین اور قسمت کی دھنی بھی۔ اس نے ہوٹلنگ اور کیسینوز کے کاروبار میں کئی ڈپلوے لے رکھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مقابلے میں میرا بھتیجا کچھ زیادہ لکی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ بھی پڑھا لکھا ہے اور اچھی ملازمت کرتا ہے لیکن لکی ہونا بالکل اور بات ہے۔“

”اور یقیناً آپ چاہتے ہوں گے کہ آپ کے کاروباری حریف کی بیٹی آپ کے بھتیجے سے آگے نہ نکل جائے۔“

”بالکل، میں اس حقیقت کو چھپا نہیں رہا۔ ایک طرح سے یہ گیم میرے لیے دُہری اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ایک اہمیت تو سولہ ملین امریکی ڈالرز کی ہے اور دوسری اپنے کاروباری حریف کو نیچا دکھانے کی۔“

عمران نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے مجھے بہت فکرمند کر دیا ہے جناب۔ اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا تو کیا ہوگا؟“

”تم اترو گے۔ ضرور اترو گے۔ مجھے یقین ہے۔“ ریان ولیم نے عجیب ہیجانی لہجے میں کہا۔ ”لک کا ہونا ایک بہت سالڈ چیز ہے۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں۔“

جان محمد صاحب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر ریان! عمران اور تابش ایک طویل عرصے کے بعد پاکستان آئے ہیں۔ تابش اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے بے چین ہوگا۔ کیا وہ ان سے ملنے کے لیے جا سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں۔“ ریان ولیم نے کہا۔ ”ان دونوں پر کوئی پابندی نہیں۔ خاص طور سے تابش پر تو بالکل بھی نہیں۔ آپ اسے جہاں چاہے لے جا سکتے ہیں۔ ہاں، آپ نے کہا تھا کہ ان کی دشمنی وغیرہ ہے۔ اگر کوئی سیکیورٹی کا مسئلہ ہے تو پھر آپ ذرا احتیاط کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ اٹھائیس تاریخ تک کسی بھی طرح کی گڑبڑ سامنے آئے۔“

”آپ بے فکر رہیں۔ میں ان کی ذمے داری لیتا ہوں۔“ جان محمد صاحب نے کہا۔

☆☆☆

لاہور سے ملنا۔۔۔ لاہور کے گلی کوچوں سے ملنا اور پھر عاطف اور فرح سے ملنا میرے لیے جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔ مجھے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ یہ بے بہا خوشی میرے حصے میں آ رہی ہے۔ میں ایک طویل مدت تک اپنے وطن کی فضاؤں اور خوشبو کے لیے تڑپا تھا۔ میں نے اپنے پنجرے میں پھڑ پھڑا کر اپنے پر زخمی کر لیے تھے۔ خود کو لہولہان کر لیا تھا اور آخر اپنے دوست عمران کی مدد سے یہ پنجرہ توڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ میں جان صاحب اور عمران کے ساتھ ایک ہنڈا اسٹیشن ویگن میں سوار تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ اسکول سے چھٹی کرنے والے بچے مختلف گاڑیوں میں یا پھر پیدل گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ بازاروں میں رونق تھی۔ سڑکوں پر زندگی رواں تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا، میں گاڑی سے اتر جاؤں۔ ان جانے پہچانے کوچوں میں پاپیادہ چلوں۔ شاہراہِ قائداعظم، میکلوڈ روڈ اور نسبت روڈ کی رواں دواں گہما گہمی میں گم ہو جاؤں۔ یوں اس زندگی کا حصہ بنوں کہ جان صاحب اور عمران مجھے ڈھونڈتے رہ جائیں۔

ہم لوئر مال روڈ سے گزرے۔ کچھ بھولے بسرے منظر نگاہوں میں تازہ ہو گئے۔ مجھے لگا میرا بدترین دشمن، میری ماں کا قاتل، میری ہنستی بستی زندگی تاراج کرنے والا سیٹھ سراج یہیں کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ ان فضاؤں میں سانس لے رہا ہے۔ اور وہ راشی تھانے دار اشرف اور ان کا سرپرست ایم این اے گورایا۔ میرے بدن میں چنگاریاں سی پھیل گئیں۔ بائیں طرف مڑنے والی یہی وہ سڑک تھی جو دو تین کلومیٹر آگے ایک چلڈرن پارک تک پہنچتی تھی۔ ساڑھے تین چار برس پہلے اسی چلڈرن پارک میں وہ واقعہ ہوا تھا جس نے میری زندگی کا رخ بدلا اور مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس چلڈرن پارک میں سیٹھ سراج اور اس کے غنڈوں نے ایک شریف کمزور نوجوان کو بیدردی سے مارا تھا۔ اسے نیم برہنہ کیا تھا، زمین پر گھسیٹا تھا اور وہ شرمیلا سا چپ چاپ سا نوجوان اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔ گھر واپس نہیں گیا تھا۔ ریلوے لائن کی طرف چلا گیا تھا۔۔۔ اپنا سر ریل کے پہیوں کے نیچے رکھنے کے لیے۔ خیر وہ ریل کے پہیوں سے تو بچ گیا تھا مگر گردشِ دوراں سے نہیں بچ پایا تھا۔ ہواؤں میں تنکے کی طرح اڑتا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اس کی ماں بچھڑی، بہن اور بھائی بچھڑے اور وہ عزیز ہستی بچھڑی جو اس کی رگِ جاں میں بستی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ بس آنکھوں میں آنسو لے کر ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ اپنی بربادی کا نوحہ کرتا رہا۔۔۔ لیکن آج۔۔۔ آج وہ نوجوان کمزور اور بے بس نہیں تھا۔ وہ بدل چکا تھا۔ حالات کی بے رحم بھٹی نے اسے پگھلا کر ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ وہ مرنا اور مارنا سیکھ گیا تھا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا تھا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پاس عمران جیسا بے مثل ساتھی اور غم خوار تھا۔ وہ اس کے کندھے سے کندھا ملا کر بڑی سے بڑی مصیبت کا رخ بدل سکتا تھا۔

میرا جی مچل اٹھا۔ میرا دل چاہا آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میرا سامنا سیٹھ سراج سے ہو جائے۔ اس کی تنی ہوئی گردن، اس کی مغرور پیشانی، اس کی کینے سے بھری ہوئی آنکھیں، سب کچھ میرے سامنے آئے۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں اور کہوں۔ ”میں آ گیا ہوں سراج! میرا نام تابش ہے اور میں ایک بیٹا ہوں۔“

عمران نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپکا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ ”حوصلہ رکھو جگر۔۔۔ وہ سب کچھ ہوگا جو تم سوچ رہے ہو۔“

بھاؤ نڈیل اسٹیٹ میں عمران نے مجھے بتایا تھا کہ میری والدہ کے قتل کے بعد اس نے عاطف اور فرح کو راولپنڈی میں رکھا تھا لیکن اب وہ ہمیں ان سے ملانے کے لیے لاہور ہی کے کسی علاقے میں لے جا رہا تھا۔ وہ ہمیں شہر کے جنوبی علاقے میں ایک جدید رہائشی بستی میں لے آیا۔ باؤنڈری وال اور سیکیورٹی انتظامات والی اس وسیع بستی میں بیشتر گھر دو اور چار کینال کے تھے۔ ہم دو کینال کے ایک خوب صورت گھر میں داخل ہوئے۔ یہاں باقاعدہ گارڈ موجود تھا۔ رہائشی حصے کے چاروں طرف خوب صورت ہریالی تھی۔ اس ہریالی کی تراش خراش دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں فرح موجود ہے۔ وہ ایسے ہی پودوں کی دیکھ بھال کا خاص شوق رکھتی تھی۔

پروگرام کے مطابق عمران نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس نے ابھی تک فرح اور عاطف کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر میں اچانک ان کے سامنے آتا تو انہیں شدید ذہنی شاک لگتا۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ جان صاحب باہر لان میں دھوپ سینکتے رہے۔ قریباً دس منٹ بعد ڈرائنگ روم کا

دروازہ کھلا۔ مجھے اپنی پیاری بہن فرح اور بھائی عاطف کی صورتیں نظر آئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر ہیجانی کیفیت تھی۔ پھر فرح چلاتی ہوئی بھاگی اور آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ عاطف نے بھی آگے بڑھ کر مجھے دیوانہ وار بانہوں میں جکڑ لیا۔

ملاپ کا وہ منظر دیدنی تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کھو کر پایا تھا اور درمیان میں بے یقینی کا ایک بہت طویل وقفہ تھا۔ یہ خوشی اور غم کی ایک ملی جلی یادگار کیفیت تھی۔ میں فرح اور عاطف کی پیشانیاں چومتا چلا گیا۔ ان کو اپنے ساتھ بھینچتا رہا۔

''بھائی! امی چلی گئیں۔ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئیں۔'' فرح روتے ہوئے بولی۔

عاطف بھی ہچکیوں سے رونے لگا۔ ہم کتنی ہی دیر اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ پھر آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو نظروں میں بھرتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ عمران کی مسکراتی صورت دروازے میں نظر آئی۔ ''چار بج گئے ہیں۔ چائے کا وقت ہو گیا ہے حاضرین۔'' اس نے کہا اور خود ہی چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔

فرح جلدی سے اٹھی۔ ''بھائی! آپ خود کیوں لے آئے؟ عبدل سے کہا ہوتا۔''

عمران نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں آج اتنا خوش ہوں کہ ٹی ٹرالی تو کیا ریت والی ٹرالی بھی آسانی سے دھکیل سکتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ خوشی سے الٹی قلابازیاں لگاؤں... بلکہ اگر تم کہو تو لگا کر دکھا بھی دیتا ہوں۔''

پھر اس نے ہمارے کہنے سے پہلے ہی دو قدم پیچھے ہٹ کر الٹی قلابازی لگائی۔ یہ دُہری قلابازی تھی لیکن وہ پاؤں کے بل گرنے کے بجائے کمر کے بل ایک صوفے کے ہتھے پر گرا اور کمر پکڑ کر ''اُف ہائے'' کرنے لگا۔

فرح کی اشک بار آنکھوں میں آنسو مسکرانے لگے۔ عاطف کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ عمران نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے ورنہ دُہری قلابازی اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھی۔ وہ مسخرہ پن کر رہا تھا۔

عمران نے عاطف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عاطف نے آگے بڑھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''لگتا ہے پریکٹس ختم ہو گئی ہے۔ ویسے بھی تمہارے بھائی کے ساتھ رہ رہ کر میری صلاحیتوں کا کباڑا ہو گیا ہے۔''

اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی مگر کمر دُہری ہی رہی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے سیدھا ہونے کی کوشش کر رہا ہے مگر سیدھا نہیں ہو پا رہا۔ وہ کراہا۔ ''اُف یہ کیا ہو گیا مجھے۔ اب میں اپنی ریما جی کو کیا کمر دکھاؤں گا۔''

میں نے بیزار لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ کبڑا عاشق فلم بنائیں اور اس میں تمہیں ہیرو لے لیں۔''

عاطف آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''تابش بھائی جان! اگر عمران بھائی نہ ہوتے تو شاید ہم بھی اس وقت آپ کو یہاں صحیح سلامت نظر نہ آتے۔ انہوں نے ہمارے لیے وہ سب کچھ کیا جو ہم سوچ سکتے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ آپ کی گمشدگی اور امی جی کی وفات کے بعد سیٹھ سراج کے بندے ہمیں بُو گیر کتوں کی طرح ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ہم کبھی ایک جگہ چھپتے کبھی دوسری جگہ۔ عمران بھائی ہماری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن گئے۔'' عاطف کی آواز بھرا گئی۔

''مجھے سب پتا ہے عاطف۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایک بات کا تجھے پتا نہیں۔'' عمران پھر چہکا۔ ''میں نے اپنی اور تیری اس بہن کے لیے بڑا اچھا بر بھی ڈھونڈ رکھا ہے۔ اگر مجھے تیری تلاش میں انڈیا نہ جانا پڑتا تو اب تک اس کے ہاتھ بھی پیلے ہو چکے ہوتے۔ بس بھانڈیل اسٹیٹ کے اس چکر نے سب کچھ لیٹ کیا ہے۔''

فرح کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرا گیا۔ عاطف نے پوچھا۔ ''یہ بھانڈیل اسٹیٹ ہے کیا؟''

''یہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی چھوٹی بہن ہے۔ تمہارے بھائی جان کھیلتے کھیلتے ادھر نکل گئے اور راستہ بھول گئے۔ اسٹیٹ کے ایک خدا ترس بزرگ نے انہیں گلیوں میں روتے ہوئے دیکھ لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ مسجدوں میں اعلان کرایا کہ ایک بچہ ملا ہے ''جن کا بچہ'' ہے آ کر لے جائیں۔ تو وہاں کے لوگ ڈر گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ ''جن'' کا بچہ ہے۔ انہوں نے خدا ترس بزرگ کو تمہارے بھائی سمیت ایک تہ خانے میں بند کر دیا۔ اس کے آگے لمبی کہانی ہے۔''

عمران نے ایک بار بولنا شروع کیا تو بولتا چلا گیا۔ فضا کی سوگوار سنجیدگی کسی حد تک کم ہو گئی۔ فرح اور عاطف میرے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتے تھے مگر اس کے لیے وقت درکار تھا۔ میں ان کے چیدہ چیدہ سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ ماں کی یاد ہم تینوں کی آنکھوں کو بار بار نم کرتی رہی۔ وہ منظر میں زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتا تھا۔ سراج کے غنڈے شیرے اور اس کے ساتھیوں نے ماں جی کے درد سے بھرے ہوئے ''فرو زن'' کندھوں کو بے رحم

طریقے سے جھنجوڑا تھا۔ وہ انہیں بار بار جھنجوڑتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ ماں جی نے برداشت کی آخری حدوں کو چھو لیا تھا۔ پھر اس ڈر سے کہ میں ان کی بے پناہ اذیت کو دیکھ کر حوصلہ نہ ہار جاؤں، عاطف اور فرح کے بارے میں نہ بتا دوں، انہوں نے خود کو دوسری منزل کی کھڑکی سے نیچے لڑھکا دیا تھا۔ ان کا پختہ فرش پر گرنا، ان کے سفید بالوں میں کھلا ہوا خون کا سرخ پھول... وہ سب کچھ میری تلخ ترین یادوں کا حصہ تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کی صعوبتوں میں اور زرگاں کے قاتل اندھیروں میں بھی میں ان مناظر کو بھول نہیں پایا تھا۔

ہم سب ماں جی کی قبر پر پہنچے۔ اس سفر کے لیے وہی تاریک شیشوں والی اسٹیشن ویگن استعمال کی گئی۔ میں قریباً ایک گھنٹا اپنی ماں کی قبر پر رہا اور اس کی مٹی اشکوں سے بھگوتا رہا۔ لوگوں کی نگاہ میں اور قانون کے کاغذوں میں میری پیار ماں حادثاتی طور پر کھڑکی میں سے گرنے سے مری تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کیسے مری تھی۔ جلتی آنکھوں اور سلگتے سینے کے ساتھ میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری آنکھوں میں سیٹھ سراج کی ''دید'' کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ رات، عمران اور میں نے اس گھر میں عاطف اور فرح کے ساتھ گزاری۔ جان محمد صاحب ہمیں چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ اس گھر میں ڈرائیور اور خانساماں وغیرہ بھی موجود تھے، تاہم فرح نے ہمارے لیے خود کھانا پکایا۔ اس نے میری پسندیدہ ڈش قیمہ کریلے اور شاشلک اپنے ہاتھوں سے تیار کیے۔ ہم ایک مزے دار کھانا کھا چکے اور پھر باتیں کرنے لگے۔ فرح مسلسل میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ گاہے بگاہے میرا کندھا چوم لیتی تھی اور میرے بازوؤں پر ہاتھ پھیرنے لگتی تھی۔ میرے ہاتھ پہلے سے بہت سخت ہو چکے تھے۔ مارشل آرٹ کی نہایت کرخت مشقوں نے ان پر چنڈیاں سی ڈال دی تھیں۔ وہ اپنی ملائم انگلیاں میرے ہاتھ کی پشت پر چلاتے ہوئے بولی۔ ''بھائی جان! آپ کے ہاتھ ایسے کیوں ہیں؟ اور آپ کے پاؤں بھی ایک دم کھردرے نظر آتے ہیں؟''

''برف باری کی وجہ سے۔'' عمران نے جھٹ جواب دیا۔ ''سخت ٹھنڈ میں ایسا ہو جاتا ہے۔''

''لیکن آپ نے تو بتایا تھا کہ بھانڈیل اسٹیٹ میدانی علاقہ ہے۔'' فرح نے فوراً نکتہ اٹھایا۔

''مگر وہاں کا موسم عجیب سا ہے۔ گرمیوں میں برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ سردیوں میں ایک دم لو چلنے لگتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور اس لُو کی وجہ سے عمران کو سرسام ہو گیا تھا۔ اب یہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔''

فرح نے ہماری نوک جھوک کو نظر انداز کیا اور میرے ہاتھوں کا معائنہ جاری رکھا، وہ بولی۔ ''بہت سخت ہو گئے ہیں آپ کے ہاتھ... بلکہ آپ پورے کے پورے بہت بدلے ہوئے لگتے ہیں۔''

عمران مسکرایا۔ ''تم اور عاطف ٹھیک اندازے لگا رہے ہو۔ تابش میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ شاید تمہیں بھروسا نہ ہو۔ اب تمہارا بھائی بھانڈیل اسٹیٹ کا ہر دلعزیز ہیرو ہے۔ ایک موقع پر اس نے بھانڈیل اسٹیٹ کے سب سے کڑک شخص کو دوبدو مقابلے کا چیلنج دیا اور نہ صرف چیلنج دیا بلکہ اسے ہرایا بھی۔ اگر اس نے یہ کارنامہ انڈیا یا پاکستان کے کسی بڑے شہر میں میڈیا کے سامنے انجام دیا ہوتا تو آج اس کے نام کا ڈنکا پورے ایشیا میں بج رہا ہوتا۔''

پھر عمران اس واقعے کی دیگر تفصیلات سے عاطف اور فرح کو آگاہ کرنے لگا۔ اس نے باروندا جیکی کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ کس طرح اس جاں بلب شخص نے مہینوں تک مجھے تربیت دی اور ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

یہ ساری روداد فرح اور عاطف کے لیے بے حد تعجب خیز تھی۔ عمران یہ سب کچھ تفصیل سے شاید اس لیے بھی بتا رہا تھا کہ وہ فرح اور عاطف میں حوصلہ جگانا چاہتا تھا۔ ان کو بتانا چاہتا تھا کہ بے شک انہیں بڑے بھائی کی چار سالہ جدائی سہنا پڑی ہے لیکن اب اس بھائی کی صورت میں انہیں ایک مضبوط اور ناقابلِ شکست سہارا میسر ہے۔

عاطف نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بھائی جان! باروندا جیکی کا نام تو کہیں میں نے بھی سنا ہوا ہے۔ وہ شروع میں ایکٹنگ وغیرہ کرتا تھا؟''

''شروع میں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ شروع سے ہی فائٹر تھا۔ ایکٹنگ وغیرہ میں تو اسے لوگوں نے بعد میں گھسیٹا۔ اور یقیناً اس نے دونوں میدانوں میں بڑا نام کمایا تھا مگر وقت اور زندگی نے اس سے وفا نہ کی۔''

''آپ نے ہمیں ایک دردناک کہانی سنائی ہے۔'' عاطف نے جیکی اور شاملا کی پوری روداد سننے کے بعد کہا۔

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ایک اور دردناک کہانی بھی ہے۔ لیکن وہ پھر کبھی سہی۔''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ یقیناً عمران کا اشارہ سلطانہ والے اندوہناک واقعے کی طرف تھا... سلطانہ کا خیال آتے ہی بالو کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں بھی میری

نگاہوں میں گھومنے لگیں۔

فرح کے معصوم چہرے پر اندیشے سے تھے۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”بھائی! آپ کہہ رہے ہیں کہ جارج گورا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ اس کے ساتھی اور رشتے دار بھی ایسے ہی ہوں گے۔ سنا ہے کہ وہ لوگ ایسی دشمنیوں کو بھولتے نہیں۔ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟“

”کس بات کا؟“

”وہ جارج گورا بھائی کے پیچھے یہاں آ جائے؟“

عمران نے جارج گورا والی روداد میں فرح اور عاطف کو یہ نہیں بتایا تھا کہ سامیر مقابلے میں جارج گورا کی انتڑیاں اکھاڑے میں بکھر گئی تھیں اور وہ ہلاک ہو گیا تھا۔ عمران نے فقط اس کے زخمی ہونے کا ذکر کیا تھا۔ فرح بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ جارج گورا ہی نہیں اور کئی افراد بھی میرے ہاتھوں راہیِ عدم ہو چکے ہیں۔ اور تو اور قاسمیہ کی خوں ریز لڑائی کا نقشہ ہی ہم کھینچ دیتے تو فرح اور عاطف ہکا بکا رہ جاتے۔ اب وہ ساری باتیں ایک خونچکاں افسانے کی طرح لگتی تھیں۔

عمران نے فرح کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں بھئی۔ تابش اور جارج کے درمیان کوئی دنگا فساد نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک مقابلہ تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ شرطیں لکھی گئی تھیں اور مقابلے میں کسی کی بھی ہار جیت ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی وہ باب اب بند ہو چکا ہے۔ اب بھانڈیل اسٹیٹ میں بھی چودہ اگست ہو چکا ہے۔“

”چودہ اگست؟“ فرح نے پوچھا۔

”بھئی، یومِ آزادی۔ گورے بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ لیے ہیں وہاں سے۔“

فرح اور عاطف ہم سے سوال کرتے رہے.... ہم جواب دیتے رہے۔ وہ تعجب میں ڈوب کر سنتے رہے۔ یہ سب کچھ ان کے لیے کسی قدیم کہانی جیسا تھا۔ ہیٹر روشن تھا۔ ہم سبز چائے پی رہے تھے اور کھڑکیوں سے باہر لاہور کی وسعت کو گہری دھند ڈھانپتی جا رہی تھی۔ ہم سب کچھ فرح اور عاطف کو نہیں بتا سکتے تھے۔ میں نے انہیں اپنی چار سالہ طویل کہانی کے مختلف ٹکڑوں سے آگاہ کیا۔ میرا ڈیفنس کی کوٹھی میں سیڑھیوں سے گرنا، اپنے ہوش و حواس کھونا اور اسی حالت میں بھانڈیل اسٹیٹ پہنچ جانا۔ میں نے سب کچھ فرح اور عاطف کو بتایا۔ وہ یہ سن کر حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے کہ یہاں سے اوجھل ہونے کے بعد میں تقریباً ڈھائی سال تک اپنے ہوش و حواس میں ہی نہیں رہا۔ یعنی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور کون ہوں۔ میں نے بھانڈیل اسٹیٹ کے حالات بھی ان دونوں کو بتائے۔ وہاں کی کہنہ رسمیں، وہاں کے تنازعے، انگریزوں اور مقامی لوگوں کی کشمکش۔ وہاں کے فرسودہ عقیدے اور مار دھاڑ۔ میں نے بہت کچھ فرح اور عاطف کے گوش گزار کیا۔ وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے رہے۔

رات گئے گفتگو کا رخ ایک بار پھر ماں جی اور ثروت کی طرف چلا گیا۔ شروع میں پولیس نے ماں جی کی موت کو حادثہ قرار دیا تھا مگر بعدازاں عمران کی کوشش سے مقامی تھانے میں ایف آئی آر درج ہوئی تھی۔ اس میں سیٹھ سراج، اس کے کارندے شیرے اور اکبر کے نام شامل تھے۔ تفتیش شروع ہوئی تھی تو سیٹھ سراج کے کئی اور جرائم بھی سامنے آئے۔ جن میں نوادرات کی ہیرا پھیری، ڈکیتی اور اغوا کے الزامات تھے۔ اس پر تین چار اور پرچے کٹ گئے۔ پرچوں کی بھرمار اور عمران کے بڑھتے ہوئے خوف سے وہ ایک دم زیرِ زمین چلا گیا تھا۔ شیرا اور اس کے دو چار قریبی ساتھی بھی روپوش ہو گئے تھے۔ اس سارے معاملے کا ایک اہم کردار سراج کا لفنڈر بیٹا واجد تھا۔ یہ واجد عرف واجی ہی تھا جس نے اس المناک کہانی کا آغاز کیا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اپنی غنڈا گردی کا نشانہ بنایا تھا۔ اسے سڑک سے اٹھا کر لے گیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ واجی کے بارے میں عمران نے بتایا تھا کہ سیٹھ سراج نے روپوش ہونے سے پہلے ہی بیٹے کو بیرونِ ملک فرار کرا دیا تھا۔ وہ یورپ ہی کے کسی ملک میں تھا۔

میں نے فرح اور عاطف سے پوچھا۔ ”تم دونوں کے پاس ثروت کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“

ثروت کے نام پر دونوں کے چہروں پر غم کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ فرح نے کہا۔ ”اس بارے میں بھی آپ کو عمران بھائی ہی کچھ بتا سکتے ہیں۔“

”یہ تو کچھ بھی نہیں بتاتا۔ بس یہی کہتا ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے تک وہ جرمنی میں تھی۔ یوسف نامی ایک لڑکے سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ شادی ہو چکی ہے یا نہیں، اس بارے میں یہ کچھ نہیں بتاتا۔“

”مجھے معلوم ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔ اب ہم آ گئے ہیں۔ جرمنی بھی ہم سے کون سا دور ہے۔ دیکھ لیتے ہیں کہ وہاں کیا حالات ہیں۔“ عمران بولا۔

پتا نہیں کیوں وہ جب بھی ثروت کے بارے میں

بات کرتا تھا، مجھے لگتا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ ہماری گفتگو کو اچانک بریک لگ گئے۔ عمران کے موبائل پر کال آ گئی تھی۔ یہ جان محمد صاحب کی کال تھی۔ جان محمد صاحب کی مدبر اور ہمدرد شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ عمران کی روداد سننے کے بعد ملں نے ایک بڑی سرکس کمپنی کے اس کرتا دھرتا کے بارے میں جو تصور قائم کیا تھا، وہ اس پر پورے اترے تھے۔ انہوں نے فون پر عمران کو بتایا کہ مسٹر ریان ولیم کا بھتیجا گیری بات کرنا چاہ رہا ہے۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے آٹھ دس روز بعد ایک زبردست ایونٹ میں حصہ لینا تھا۔ عمران اس سے باتیں کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں، فرح اور عاطف پھر اپنی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ فرح کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اسے میرے ملنے کی بے انتہا خوشی بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک فکر بھی گھیرتی جا رہی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اب میں ماں جی کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لیے خطرے مول لوں گا۔

وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ اگر مجھے کچھ کرنا ہی ہے تو قانونی طریقے سے کروں۔ عاطف ایک بڑے وکیل کا پتا بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کے ایک دوست کا والد ہے اور معقول فیس پر یہ کیس بڑے اچھے طریقے سے لڑ سکتا ہے۔

ان دونوں کی سنجیدہ گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ گزرے ہوئے ساڑھے تین چار برسوں میں وہ دونوں کافی میچور ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی طبیعت کا لاابالی پن اور شوخی اب ان کے اندر کہیں دب چکی تھی۔ ان کی اس تبدیلی نے نہ جانے کیوں مجھے آزردہ کیا۔ میں ان دونوں کی باتیں سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ میرے اندر کچھ اور طرح کی آگ جل رہی تھی۔

☆☆☆

سیٹھ سراج اور شیرا ابھی تک منظر سے اوجھل تھے۔ عمران نے اپنے ذرائع سے پتا کرایا۔ معلوم ہوا کہ آٹھ دس ماہ پہلے سیٹھ سراج کراچی میں دیکھا گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک سیاسی شخصیت کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی تھی۔ ایک خوب صورت تھائی خاتون بھی اس کے ساتھ تھی۔ قیاس تھا کہ وہ تھائی لینڈ سے آیا تھا اور وہیں واپس چلا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے پس پردہ رہ کر کراچی میں ہی اپنی جائز اور ناجائز سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہوں۔ میرے اور عمران کے درمیان طے تھا کہ ہم جلد سے جلد سیٹھ سراج اور شیرے کا کھوج لگائیں گے لیکن اس سے پہلے عمران کو وہ کام بھی سرانجام دینا تھا جس کے لیے مجھے اور اسے آنا فانا الٰہ آباد سے اٹھا کر یہاں لاہور پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ عجیب ڈرامائی طریقے سے ہوا تھا۔ ہم وہیں پہنچے تھے جہاں ہمیں پہنچنا تھا لیکن کسی اور ڈھنگ سے۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اقبال، میڈم صفورا اور بالو وغیرہ ابھی تک انڈیا میں ہی تھے۔ مسٹر ریان ولیم نے عمران سے وعدہ کیا تھا کہ ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور وہ جہاں بھی ہوئے، انہیں جلد از جلد پاکستان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں ریان ولیم نے اتر پردیش میں بہت سے مقامی لوگوں کو متحرک کر دیا تھا اور امید تھی کہ دو چار دن کے اندر اس سلسلے میں کوئی اچھی خبر مل جائے گی۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا، عمران بھی اس حوالے سے لاتعلق نہیں تھا، وہ اپنے طور پر بھی کوشش کر رہا تھا۔

اٹھائیس تاریخ سر پر تھی۔ وہ دن قریب آ رہا تھا جب عمران کو ایک بڑی آزمائش سے گزرنا تھا۔ ریان ولیم نے عمران کو وی وی آئی پی مہمان کی حیثیت دے رکھی تھی۔ وہ اسی شاندار ولا میں رہ رہا تھا جہاں ہم لاہور پہنچتے ہی اترے تھے۔ یہ جگہ مشہور منٹو پارک کے قریب واقع تھی۔ قریباً آٹھ کینال پر پھیلی ہوئی اس قدیم کوٹھی کی اندرونی آرائش زبردست تھی۔ بلند و بالا ستون، محرابی دروازے، اونچی چھتیں اور چاروں طرف احاطے میں اونچے درخت۔ یہ انگریزوں کے دور کی رہائش گاہ تھی۔ کبھی یہاں کوئی بڑا انگریز لارڈ رہائش پذیر تھا۔ اس نے گرم دوپہریں گزارنے کے لیے کمروں کے اندر ہی چھوٹے چھوٹے حوض بنائے ہوئے تھے۔

پچھلے دو روز سے میں بھی عمران کے ساتھ ہی تھا اور اس غیر معمولی مہمان نوازی کا تجربہ کر رہا تھا جو یہاں عمران کے حصے میں آئی تھی۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی عزت افزائی کبھی کبھی عمران کو بھی پریشان کر دیتی تھی۔ چھبیس تاریخ کی شام کو چند نہایت خوش پوش افراد عمران سے ملنے کے لیے آئے۔ ان کے چہرے ہی بتا رہے تھے کہ وہ مال و دولت کے انبار پر بیٹھے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں سے دو سفید فام تھے جن میں سے ایک کی ناک بالکل ٹماٹر کی طرح سرخ تھی۔ دو جاپانی تھے، ایک عربی اور ایک کا تعلق ملائیشیا یا سنگاپور وغیرہ سے تھا۔ ان کی توجہ کا مرکز عمران ہی تھا۔ انہوں نے کھل کر عمران سے باتیں کیں۔ ان کی دلچسپی ریوالور کے اس کھیل میں تھی جسے عمران کئی بار کامیابی سے کھیل چکا تھا۔ ایک چھ... دو چھ... اور تین چھ کا کھیل۔ ان افراد میں سے کئی ایک کے دل میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ عمران منہ مانگے معاوضے پر انہیں اس کھیل کی کوئی جھلک دکھائے مگر یہ خواہش کبھی کسی کی زبان پر نہیں آئی۔ وہ سب جانتے تھے کہ صرف دو دن بعد عمران کو ایک بہت بڑے شو کا حصہ بننا ہے۔ ایک بہت بڑا انعامی گیم۔ اس گیم میں شمولیت کی خاطر پچھلے مہینوں میں عمران کو انڈیا اور پاکستان کے طول و عرض میں دیوانہ وار ڈھونڈا گیا تھا اور اب ریان صاحب کی خوش قسمتی سے وہ یہاں موجود تھا۔

یہ لوگ واپس گئے تو عمران سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”یار! میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے ضرورت سے زیادہ بانس پر چڑھا رہے ہیں یہ لوگ۔ اگر بے عزتی خراب ہو گئی تو پھر؟ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں۔“

”بھاگ جاؤ گے تو بے عزتی خراب نہیں ہو گی؟“

”چلو، آنکھوں کے سامنے تو نہیں ہو گی۔ پیٹھ پیچھے تو بڑے بڑے لوگ بے عزت ہو جاتے ہیں۔“

”مگر تم تو میڈیا کے بندے ہو۔ تم تو بے عزتی کرنے والے طبقے سے ہو۔ بے عزتی ”کروانے“ کا تو کوئی تجربہ ہی نہیں ہے تمہیں؟“

”ہاں، یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ جب بے عزتی ہو رہی ہو تو کس طرح کا منہ بناتے ہیں۔ بے عزتی کے بعد کس طرح پیچھے پیچھے ہو کر کھسکتے ہیں اور پھر کیسے دوبارہ سے ڈھیٹ بن کر دکھاتے ہیں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ راہنمائی فرما سکتے ہو؟“

میں مسکرایا۔ ”تم ہاتھ دھو کر اپنی بے عزتی کے پیچھے ہی کیوں پڑ گئے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی تمہیں عزت مل جائے، جس سے تم پیدائشی طور پر محروم ہو۔ یار! صرف تین سوالوں کے درست جواب اور ایک بہت بھاری رقم ریان ولیم کے اکاؤنٹ میں۔ اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تمہیں بھی ملے گا۔“

”میں اس میں سے آدھا تمہیں دے دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ اگر بے عزتی ہوئی تو پھر آدھی تم کراؤ گے۔ دس دھکے پڑے تو پانچ تمہارے، پانچ میرے۔ بیس کلمہ ہائے لعنت و پھٹکار سننے پڑے تو آٹھ میرے، بارہ تمہارے۔“

”بھئی! یہ لعنتوں کے کھاتے میں ڈنڈی کیوں مار رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے پتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ تمہارے ان سوالوں کی وجہ سے ہی میرا دماغ پلپلا ہوا ہے۔ اب جو ناکامی بھی حصے میں آئے گی، اس پلپلے دماغ کی وجہ سے ہی آئے گی۔ تمہیں اس کی سزا تو ملنی چاہیے۔“

”سزا تو مل رہی ہے مجھے۔ رات دن تمہارے ساتھ رہ رہا ہوں۔“

”تو ٹھیک ہے، چلے جاؤ۔ میں نے تمہیں پکڑ رکھا ہے۔“

میں واقعی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا خدا حافظ۔“

”کبھی کبھی خط لکھتے رہنا۔“ وہ پکارا۔

”اس کی بھی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

”او تیری تو ایسی کم تیسی... بھاگڑ بلے... میری زندگی تباہ کر کے، مجھے دھوا بنا کر جانا چاہتے ہو؟“

اس نے جست لگا کر مجھے عقب سے چھاپ لیا۔ ہم دونوں اوپر نیچے قالین پر گرے۔ میں نے اس کی گدی پر گھونسا جڑا۔ جواباً اس نے میرے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا۔ ہم باقاعدہ کشتی لڑنے لگے۔ ڈرائنگ روم کی کئی بیش قیمت چیزیں ٹوٹ گئیں۔ باوردی ملازمین ہکا بکا ہمیں دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو دو گارڈز نے ہمیں چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ سمجھ گئے کہ یہ دوستانہ لڑائی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو نپی تلی ضربیں لگائیں۔ یہ ایسی چوٹیں تھیں جن سے شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ ایک طرح سے لہو گرم رکھنے کا بہانہ بھی تھا۔ ہم جب بھی اس طرح گتھم گتھا ہوتے تھے، یہ ایک طرح سے عمران کی مہارت اور میری برداشت کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اچانک عمران کی گردن میرے بازو میں آ گئی۔ اس نے عورتوں جیسی باریک آواز میں چلانا شروع کر دیا۔

”بچاؤ... بچاؤ... اس غنڈے سے بچاؤ۔“

”تم تو فرما رہے تھے، میں تمہارا شوہر ہوں؟“

”تو کیا شوہر زبردستی نہیں کر سکتے۔“ اس نے ترت جواب دیا اور ایک بار پھر چلانے لگا۔ ”بچاؤ... بچاؤ... مردانہ پولیس کو بلاؤ۔“

”مردانہ کو کیوں؟“ میں نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”زنانہ پولیس کا بڑا شوق ہے تمہیں۔“ اس نے کہا اور پھر اچانک مجھے اڑنگا لگا کر پیچھے کی طرف گرا دیا۔ اب میں اس کے شکنجے میں تھا۔ اس نے مجھے جوڈو کی تکنیک سے فرشی داؤ لگایا اور تقریباً بے بس کر دیا۔

”کیسا ہے؟“ اس نے پوچھا پھر خود ہی بولا۔ ”شوہر ہونے کا جھانسا دے کر کسی کو بھی اس طرح بے دست و پا کیا جا سکتا ہے۔ اب لگاؤ کانوں کو ہاتھ۔“

میں نے اس کے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”بڑے کھوچل ہو تم۔“ اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ ملازمین اس تفریح سے لطف اندوز ہوئے تھے۔

عمران کپڑے جھاڑ کر بولا۔ ”یہ مشرقی اور مغربی عورتیں اسی طرح پہلے اپنے شوہروں کو باتس پر چڑھاتی ہیں پھر چاروں شانے چت کر دیتی ہیں۔ ایسا فرشی داؤ لگاتی ہیں کہ بے چارہ ہل بھی نہیں سکتا... یہ جارج پنچم کا نام سنا ہوا ہے نا تم نے؟“

”ہاں، سنا ہے۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”وہ ایک ایسے ہی داؤ کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ بے چارہ خود بھی ساری عمر عورتوں سے ڈرتا رہا۔“

ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف تین چار منٹ کی دھینگا مشتی میں ہم نے اس کمرے میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا نقصان تو کر ہی دیا تھا۔ دو نہایت قیمتی گل دان، ایک اسپورٹڈ ٹیلی فون سیٹ اور شیشے کی ایک بڑی تپائی چکنا چور ہو گئے تھے۔

اسی دوران میں جان محمد صاحب اور مسٹر ریان ولیم بھی آن وارد ہوئے۔ شاندار ڈرائنگ روم کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ پھر ان کی نگاہیں ہمارے حلیے پر پڑیں۔ وہ سمجھ گئے کہ یہاں دھینگا مشتی ہوئی ہے۔

”کیا ہوا ایمران (عمران)۔“ ولیم صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

”میں تھوڑی سی مشق کر رہا تھا جی... مار کھانے کی۔“

”کیا مطلب؟“

وہ مسکرایا۔ ”اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا تو مجھے پتا ہے جان انکل نے میری بڑی درگت بنانی ہے۔“

”تم بہادر آدمی ہو۔ تمہیں منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔“ ریان ولیم نے کہا۔ ”اس کے علاوہ میں نہیں سمجھتا کہ جان صاحب تمہارے ساتھ کسی طرح کا برا سلوک کر سکتے ہیں۔ یہ تو تمہارے بہت بڑے مداح ہیں۔“

”مداح ہی درگت بھی بناتے ہیں جناب! آپ نے کرکٹرز کی شامت آتے نہیں دیکھی؟“

”تم دلچسپ آدمی ہو ایمران۔“ ولیم مسکرایا۔

”شکریہ جناب! مگر اس ٹوٹ پھوٹ کا مجھے واقعی افسوس ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”تم ہمارے قابلِ قدر مہمان ہو اور اس مقابلے کے بعد بھی رہو گے۔ رہی نقصان کی بات تو اس سے دس گنا بھی ہو جاتا تو پروا نہیں۔“

اس کے بعد سنجیدہ گفتگو شروع ہوئی۔ ولیم اور جان محمد صاحب نے عمران کو تفصیل سے آگاہ کیا کہ یہ کھیل کس طرح ہوگا۔ رول کیا ہیں اور کھیل کی ٹائمنگ وغیرہ کس طرح ہو گی... انہوں نے بتایا کہ امریکا، جنوبی امریکا، جاپان، انڈیا اور یورپ کے کئی ممالک میں یہ گرینڈ شو مخصوص ٹی وی چینلز پر دکھایا جائے گا۔ موقع پر بھی کافی لوگ موجود ہوں گے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق کیسینو کے کاروبار سے ہوگا۔

عمران نے پوچھا۔ ”جناب! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ امریکا یا یورپ کے کسی بڑے شہر میں ہونے کے بجائے یہ شو پاکستان میں ہو رہا ہے... اور لاہور میں ہو رہا ہے؟“

”یہ اچھا سوال کیا ہے تم نے۔“ ولیم صاحب نے کہا۔ ”... دراصل اس شو کے لیے شہر کے انتخاب کا طریقہ دلچسپ ہے۔ قرعہ اندازی سے پانچ شہر منتخب کیے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو سکتے ہیں۔ بعدازاں ان پانچ شہروں کے بارے میں ”فزیبلٹی“ رپورٹ تیار ہوتی ہے اور ایک کمیٹی ان میں سے ایک شہر کا انتخاب کثرتِ رائے سے کر لیتی ہے۔ اس دفعہ پانچ شہروں کی لسٹ میں صرف دو ہی نمایاں شہر تھے۔ کولمبو اور لاہور۔ لہٰذا لاہور کا انتخاب ہو گیا۔“

”یہ شو کس جگہ منعقد ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کو ابھی راز ہی رہنے دیا جائے تو اچھا ہے۔“ فربہ اندام ریان ولیم نے مسکرا کر کہا۔ مسکراتے ہوئے اس کے گالوں کا گوشت اوپر کی طرف سفر کرتا تھا اور اس کی آنکھوں کو مزید چھوٹا کر دیتا تھا۔

☆☆☆

شام سات بجے کے قریب ہمیں سیکیورٹی گارڈز نے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ یہ بڑے چاق و چوبند... تربیت یافتہ اور شائستہ لوگ تھے۔ نہایت معتبر سیکیورٹی ایجنسی سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک بار پھر بڑی معذرت کے ساتھ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی اور ہمیں ایک بڑی اسٹیشن وین میں بٹھا دیا گیا۔ جان صاحب نے ہمیں اس صورتِ حال کے بارے میں پہلے ہی مطلع کر دیا تھا۔

لاہور کی مختلف سڑکوں پر سفر کرنے کے بعد ہم ایک نسبتاً کشادہ علاقے میں نکل آئے۔ آوازوں کے ذریعے شہر کی گہما گہمی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ ہم ایک خاص ایونٹ میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ اس ایونٹ کے حوالے سے کئی طرح کا تجسس ذہن میں موجود تھا۔ ایونٹ میں حصہ لینے والے گیری گرانٹ کے حوالے سے عمران کو جو معلومات

حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق گیری... ریان ولیم کا سگا بھتیجا نہیں تھا۔ ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور یہ پڑھی لکھی فیملی تھی۔ اس انعامی مقابلے کے حوالے سے ریان ولیم کی نظرِ انتخاب گیری پر پڑی تھی۔ عمران کی معلومات کے مطابق گیری ”جلد ہی بیماری برص“ میں بھی مبتلا تھا۔

قریباً پندرہ منٹ کے مزید سفر کے بعد ہم ایک زمین دوز پارکنگ لاٹ میں رک گئے۔ ہماری آنکھوں پر اب بھی پٹیاں تھیں۔ ہمیں کسی نیم گرم کوریڈور سے گزار کر ایک وسیع جگہ پہنچایا گیا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں کافی لوگ موجود ہیں۔ ہماری آنکھوں سے پٹیاں ہٹائی گئیں۔ ہم نے خود کو ایک آرام دہ کیبن میں پایا۔ یہاں صوفے تھے۔ میز پر سافٹ ڈرنکس اور وہسکی وغیرہ موجود تھی۔ ایک طرف دو فون سیٹ بھی پڑے تھے۔ ایک سرخ، ایک سبز۔ کیبن میں سامنے کی طرف تقریباً آٹھ ضرب بارہ فٹ کا شیشہ لگا ہوا تھا۔

ہم نے ایک نیچی چھت والا گول ہال دیکھا۔ اس جدید ہال کے چاروں طرف آرام دہ نشستوں پر دو ڈھائی سو کے قریب افراد موجود تھے۔ یہ سب کے سب ایلیٹ کلاس کے خوش پوش لوگ تھے۔ دو درجن کے قریب خواتین بھی ان میں شامل تھیں۔ ان میں ہر رنگ کے افراد نظر آتے تھے۔ جاپانی، یورپین، مشرقِ وسطیٰ کے باشندے اور رشین وغیرہ۔ اس گول ہال کے بیچوں بیچ شیشے کا ایک شاندار چیمبر تھا۔ یہ چیمبر بھی گولائی میں تھا اور اس کے اندر دو نشستیں موجود تھیں۔ اس چیمبر کی اونچائی ہال کے فرش سے آٹھ دس فٹ زیادہ تھی۔ اس گول چیمبر کی لائٹنگ اس طرح سے کی گئی تھی کہ یہ ایک جاذبِ نظر روشنی میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ چیمبر کے اندر ایک ایسا اسکور بورڈ تھا جسے چاروں طرف سے بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

ہمارے کیبن میں جان محمد صاحب پہلے سے موجود تھے۔ عمران نے پوچھا۔ ”جان انکل! آپ کو بھی پٹی باندھ کر لایا گیا ہے؟“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہاں موجود سارے تماشائی اسی طرح لائے گئے ہیں۔“

”وجہ؟“ عمران نے پوچھا۔

”وجہ تو یہی لوگ بتا سکتے ہیں اور وہ بتائیں گے نہیں۔“ جان محمد صاحب نے کہا۔

موقع پر موجود لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ایک عجیب سی سنسنی نے ہر شخص کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ جدید قسم کے ٹی وی کیمرے ان تمام مناظر کی کوریج کر رہے تھے۔ تاہم ان کیمروں کو اس طرح ”انسٹال“ کیا گیا تھا کہ وہ منظر کی مجموعی دلکشی پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ موسیقی کی دھنیں دلوں کو گرما رہی تھیں۔ اسی دوران میں فربہ اندام ریان ولیم اور اس کے دو خوش پوش دوست بھی کیبن میں آ گئے اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں ٹماٹر کی ناک والا چالیس بیالیس سالہ شخص بھی تھا... اور پھر فل لائٹس کے ساتھ شو کا آغاز ہو گیا۔ ایک لمبا تڑنگا خوش لباس سفید فام، شیشے کے چیمبر میں داخل ہوا اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

جان صاحب نے سرگوشی میں بتایا۔ ”یہ مشہور امریکی چینل سی این این کا ایک سابق ہوسٹ ہے۔“

”ہاں، شکل کچھ کچھ پہچانی ہوئی لگ رہی ہے۔“ عمران نے کہا۔

امریکن کمپیئر اپنی خوب صورت پاٹ دار آواز میں بولا۔ ”خواتین و حضرات! آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ہم اس کا شو کا آغاز کرتے ہیں جس کے لیے آپ کی نگاہیں اور سماعتیں قریباً آٹھ ماہ سے منتظر تھیں۔ دنیا بھر میں موجود اپنے ان گنت ناظرین تک میرا سلام پہنچے۔“

اس تمہید کے بعد کمپیئر نے کہا۔ ”پچھلے شو کے آخر میں آپ نے دیکھا تھا کہ ہمارے ذہین و خوش قسمت دوست مسٹر گیری گرانٹ نے کامیابی سے کھیل کے پہلے تین مرحلے طے کر لیے تھے۔ بغیر کوئی لائف لائن استعمال کیے، وہ چوتھے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب تک کے اعصاب شکن مقابلے میں انہوں نے جو انعامی رقم اپنے نام کی ہے، اس کی مالیت دو ملین ڈالرز ہے۔ اب میں انہیں تشریف لانے اور پھر سے ”ہاٹ سیٹ“ پر بیٹھنے کی دعوت دیتا ہوں۔“

مسٹر ریان ولیم کا سینہ بھتیجا گیری گرانٹ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا چیمبر میں داخل ہوا۔ اپنے تایا کی طرح اس کا جسم بھی فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس نے فرنچ کٹ داڑھی رکھی ہوئی تھی، عینک لگا رکھی تھی اور تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک شائستہ نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شخصیت کی نمایاں بات اس کے چہرے کے سفید داغ تھے۔ پھلبہری کے یہ داغ زیادہ پھیلے ہوئے تو نہیں تھے پھر بھی اس کی شباہت کو داغ دار کرتے تھے۔

گیری ہاٹ سیٹ پر براجمان ہوا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ہینڈسم کمپیئر نے رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد گیری کا حال چال پوچھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اور سانسوں کی ہچکیں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پھر اس سنسنی خیزی کو

آگے بڑھاتے ہوئے وہ گیری کے سامنے آبیٹھا اور اناؤنسمنٹ کے انداز میں بولا۔ ''تو حاضرین! ہم اس سنسنی خیز مقابلے کا آغاز کرتے ہیں۔ اب مسٹر گیری کے سامنے صرف اور صرف تین سوال ہیں۔ ہر سوال کے صحیح جواب کے بعد ان کی انعامی رقم دگنی ہو جائے گی اور تیسرے سوال کے جواب کے بعد یہ پہنچ جائیں گے گرینڈ پرائز یعنی سولہ ملین ڈالرز تک۔ جی ناظرین! سولہ ملین ڈالرز۔ مقامی کرنسی میں قریباً ایک سو بیس کروڑ۔''

ہال ایک بار پھر زوردار تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس میگا شو کے حاضرین میں کئی اہم شخصیات موجود تھیں۔ فٹ بال کے ایک انٹرنیشنل کھلاڑی اور ہالی وڈ کے ایک ایکٹر کو ہم دور سے بھی پہچان سکتے تھے۔

کمپیئر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر کھیل کے کسی بھی مرحلے میں مسٹر گیری کو سوال مشکل محسوس ہو اور انہیں جواب دینے میں خطرہ نظر آئے تو وہ اس کھیل کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ جیتی ہوئی رقم کے حق دار ہوں گے۔ لیکن اگر وہ غلطی سے غلط جواب دے بیٹھے تو پھر انہیں اکتفا کرنا ہوگا ابتدائی انعامی رقم یعنی صرف پینسٹھ ہزار ڈالرز پر۔ اور یہی اس کھیل کی ساری خوب صورتی ہے۔''

ہال میں ایک بار پھر تالیاں گونجیں۔

کچھ دیر بعد کھیل کے اس اہم مرحلے کا پہلا سوال اسکرین پر نمودار ہوا۔ سوال کچھ یوں تھا۔ ''نیلا رومال، ایک معروف فن پارے کا نام ہے۔ اس کا تعلق دوسری جنگِ عظیم سے ہے۔ یہ فن پارہ کیا ہے؟''

آپشن نمبر ایک ناول... آپشن نمبر دو پینٹنگ... آپشن نمبر تین گیت... آپشن نمبر چار فلم۔''

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ہر نگاہ پچیس چھبیس سالہ گیری پر مرکوز تھی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ اس مشکل مرحلے کا پہلا سوال ہی اس کی سمجھ سے باہر کا نکلا ہے۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ کیبن میں ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے فربہ اندام ریان ولیم اور اس کے دونوں دوستوں کے چہروں پر بھی اضطراب صاف نظر آیا۔ ان دونوں دوستوں میں ایک تو وہی ٹماٹر کی ناک والا غصیلا سا شخص تھا۔ دوسرا کوئی پروفیسر ٹائپ نظر آتا تھا۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے کہ سرمنڈواتے ہی اولے پڑ گئے ہیں۔''

''جی مسٹر گیری!'' کمپیئر کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ''آپ کے ذہن میں کیا جواب آرہا ہے؟ آپ اگر چاہیں تو بلند آواز میں بھی سوچ سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے دلچسپ ہوگا۔''

گیری ایک بار پھر پریشان انداز میں مسکرایا۔ اس نے ''ہاٹ سیٹ'' پر پہلو بدلا اور اپنی فرنچ کٹ داڑھی سہلاتے ہوئے بولا۔ ''خاصا مشکل سوال ہے۔''

''انعام بھی تو بہت بڑا ہے مسٹر گیری! آپ کا انعام دگنا ہونے جارہا ہے۔ دو ملین ڈالرز سے چار ملین ڈالرز۔ آپ کے پاس چار آپشنز ہیں اور آپ کی تینوں لائف لائنز (فون کالز) آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ آپ اچھی پوزیشن میں ہیں۔ آپ اپنا وقت لیں اور تحمل سے غور کریں۔ آپ کے ذہن میں کیا آرہا ہے؟''

گیری ذرا ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''نیلا رومال... یہ بظاہر تو کسی ناول یا افسانے کا عنوان لگتا ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ کسی ناول کا نام ہو... فکشن پڑھنے میں مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی... جہاں تک فلم کا تعلق ہے... کم از کم میری نظر سے تو اس طرح کی کوئی فلم نہیں گزری۔ ایک فلم شاید سرخ رومال کے نام سے میں نے دیکھی تھی...''

''پینٹنگز کی طرف آپ کا دھیان جاتا ہے؟'' کمپیئر نے پوچھا۔ ''کیونکہ اکثر مصور اپنی پینٹنگز کو عنوانات بھی دیتے ہیں۔''

''جی ہاں، دھیان تو جارہا ہے۔'' گیری نے اپنا بڑا سا سر ہلایا۔ ''عنوان میں رنگ کو خاص اہمیت دی گئی ہے... اور پینٹنگز میں رنگ ہی سب کچھ ہوتے ہیں لیکن...'' وہ گڑبڑا کر چپ ہوگیا۔

گھڑی کی سوئیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ تقریباً پندرہ کروڑ یعنی دو ملین ڈالرز کے اس سوال کے لیے گیری کے پاس کُل آٹھ منٹ تھے۔ بے شک یہ ایک مشکل سوال تھا۔ ہمارے کیبن میں موجود کسی فرد کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس سوال کے جواب کے بارے میں کوئی قوی امکان ذہن میں رکھتا ہے۔ گیری کے لیے ایک آسانی موجود تھی۔ اسے کُل تین سوالوں کے جواب دینے تھے اور اس کے پاس تینوں لائف لائنز موجود تھیں... یعنی وہ تین فون کالز کرسکتا تھا۔

قریباً چار منٹ گزر گئے تو اس نے کمپیئر کو بتایا کہ وہ فون کال کرنا چاہتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہمارے کیبن میں رکھے ہوئے سرخ فون سیٹ کی مترنم گھنٹی بج اٹھی۔ پروگرام کے مطابق عمران نے ریسیور اٹھایا۔ گیری نے برٹش لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کہا۔ ''ایمران! سوال تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ نیلا رومال ایک فن پارے کا نام ہے... اس کا تعلق دوسری جنگِ عظیم سے ہے۔ ہمیں بتانا ہے کہ یہ فن پارہ کیا ہے۔ ناول؟ پینٹنگ؟ گیت یا فلم؟''

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں ناول اور فلم کو تو رد کرتا ہوں کیونکہ اگر یہ ایک مشہور فن پارہ ہے اور ناول یا فلم کی صورت میں ہے تو پھر اس ہال میں موجود کچھ نہ کچھ لوگوں کو ضرور اس کا پتا ہونا چاہیے۔ مگر جہاں تک میں جج کر رہا ہوں، میرے اردگرد موجود کسی شخص کا چہرہ یہ ظاہر نہیں کر رہا کہ وہ اس سوال کا حتمی جواب جانتا ہے۔ اب دو آپشن رہ جاتے ہیں۔ نیلا رومال کسی پینٹنگ کا عنوان ہے یا گیت کا عنوان ہے۔ میرے خیال میں یہ ففٹی ففٹی کا چانس بنتا ہے۔''

''تم کیا چانس لوگے ایمران؟'' گیری نے پوچھا۔

عمران نے چند سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر نمودار ہوا۔ مجھے یاد آیا، یہ وہی تاثر تھا جو ایک چھا اور دو چھ کا کھیل کھیلتے ہوئے اس کے چہرے پر آتا تھا۔ ریوالور کے ایک خانے میں گولی اور پانچ خانے خالی یا پھر دو میں گولی اور چار خانے خالی۔ ایک وجدانی سی کیفیت۔ اس نے کہا۔ ''میں آپشن نمبر تین کی طرف جاؤں گا۔ نیلا رومال ایک گیت ہے۔''

فون کال کا وقت صرف دو منٹ کا تھا اور یہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ لائن منقطع ہوگئی۔ اب گیری کو جواب دینا تھا۔ اس نے چند گہری سانسیں لیں۔ کمپیئر نے گیری کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اور سنسنی کو بڑھاوا دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں مسٹر گیری! آپ کیا جواب دینا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو گیم کا رول ایک بار پھر بتا دیتا ہوں۔ آپ دو ملین ڈالرز جیت چکے ہیں۔ آپ درست جواب دیں گے تو آپ کی انعامی رقم ہو جائے گی چار ملین ڈالرز... مقامی کرنسی میں یہ قریباً تیس کروڑ روپیا بنتا ہے۔ اگر آپ کا جواب غلط ہو گیا تو پھر آپ کو بنیادی انعام یعنی پینسٹھ ہزار ڈالرز پر جانا ہوگا۔ اگر آپ تذبذب میں ہیں اور رسک لینا نہیں چاہتے تو پھر یہ کھیل یہیں پر چھوڑ سکتے ہیں۔ اس صورت میں آپ اپنا جیتا ہوا انعام یعنی دو ملین ڈالرز یہاں سے لے جاسکیں گے اور یقیناً یہ ایک خاصی معقول رقم ہے۔''

گیری نے چند لمحے توقف کیا پھر اس نے جواب دیا۔ ''میں کھیلنا چاہتا ہوں اور میرا جواب ہے، آپشن نمبر تین۔ نیلا رومال ایک گیت کا عنوان ہے۔''

ہال میں سناٹا تھا۔ کمپیئر نے سسپنس کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کے جواب کو ''سیف'' کرلیا جائے؟''

''جی ہاں۔''

کمپیئر نے اناؤنسمنٹ کے انداز میں کہا۔ ''مسٹر گیری کے جواب کو محفوظ کیا جائے۔ آپشن نمبر تین۔'' الیکٹرانک اسکرین پر آپشن نمبر تین سیف ہوگیا۔

ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ کمپیئر جان بوجھ کر وقفے کو طول دے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں نوجوان گیری کی اضطرابی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر نگاہ ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''مسٹر گیری... چار ملین ڈالرز۔ آپ کا جواب درست ہے۔''

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے۔ ریان ولیم بھی جوش کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھا اور اس نے عمران کو گلے لگایا۔ ''مجھے یقین ہے... مجھے یقین ہے۔ تمہاری خوش بختی ضرور اپنا زور مارے گی۔''

گیری بھی شیشے کے چیمبر میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور اس نے ناظرین کے پُرجوش ردِعمل کا جواب دیا۔ پھر اپنے تایا اور عمران وغیرہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

کمپیئر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''نیلا رومال ایک گیت ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں یہ گیت روس میں بہت مقبول ہوا تھا اور آج بھی یہ گایا جاتا ہے۔ لوگ اسے سن کر روتے تھے اور دل ہی دل میں گنگناتے تھے۔ یہ ایک ایسے سپاہی کا واقعہ ہے جو لڑائی پر روانہ ہوتے ہوئے، اپنی محبوبہ کو ایک نیلے رومال کا تحفہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اسے یاد رکھے۔ وہ لڑکی برسوں اس رومال کو سینے سے لگائے رکھتی ہے اور اس خوب صورت چمکیلے دن کی منتظر رہتی ہے جب اس کا محبوب واپس آئے گا مگر وہ نہیں آتا۔ وہ کبھی نہیں آتا۔ وہ مر چکا ہے۔''

کمپیئر نے چار ملین ڈالرز کا چیک گیری کو دیا اور بولا۔ ''مسٹر گیری! یہ ایک کافی بڑی رقم ہے۔ آپ اس کے مالک ہیں اور ابھی امید ہے کہ آپ کی ملکیت میں اضافہ ہوگا۔ آپ اس خطیر رقم کو کس طرح استعمال کرنا چاہیں گے؟''

گیری کچھ کھویا کھویا نظر آیا۔ تب اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ ''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، مجھے یہ ظاہر کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں عالی جناب ریان ولیم صاحب کا ایک دور کا رشتے دار ہوں اور میری مالی حیثیت انکل ریان ولیم سے کہیں... کہیں کم ہے۔

یہ انکل کی عنایت ہے کہ انہوں نے اس انعامی رقم کا کچھ پورشن مجھے دینے کا وعدہ کیا ہے... اور مجھے اس قابل سمجھا ہے کہ میں ان کی طرف سے اس میگا ایونٹ میں حصہ لوں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں برص میں مبتلا ہوں۔ میری ایک بہن بھی برص کی مریضہ تھی۔ اس نے محبت میں ناکامی کے بعد زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزر لے کر اپنی جان دے دی تھی۔ خیر، یہ تو اب ماضی کا قصہ ہے۔ اگر میں ایک بڑی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو میں آسٹریا میں اپنا علاج کرواؤں گا اور اس کے علاوہ برص کے علاج پر تحقیق کرنے والے عالمی ادارے کو ''ڈونیشن'' دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ خدا آپ کو اپنے ارادے میں کامیاب کرے۔ اب ہم آتے ہیں اس اہم ترین مرحلے کے دوسرے سوال کی طرف۔ کیا آپ تیار ہیں؟'' کمپیئر نے پوچھا۔

''جی، میں تیار ہوں۔'' گیری نے جواب دیا اور ہاٹ سیٹ پر پہلو بدلا۔

کمپیئر بولا۔ ''ایک ہوسٹ اور کمپیئر ہونے کی حیثیت سے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ جواب دینے سے پہلے اپنا پورا وقت لیں۔ چار ملین ڈالرز کافی بڑی رقم ہے۔ اگر کسی مرحلے پر آپ کو محسوس ہو کہ آپ ایک بہت ''رسکی'' جواب دینے جا رہے ہیں تو آپ گیم چھوڑ دیں۔''

گیری نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

کمپیئر نے کہا۔ ''لیجیے ناظرین! اس مرحلے کا دوسرا سوال آپ کے سامنے اسکرین پر آرہا ہے۔ اس سوال کا درست جواب ہمارے دوست مسٹر گیری گرانٹ کی انعامی رقم کو ڈبل کرے گا، یعنی وہ چار ملین ڈالرز سے آٹھ ملین ڈالرز ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے۔'' سوال اسکرین پر نمودار ہوا۔ کمپیئر نے پڑھ کر سنایا۔ ''9 اگست 1945ء وہ المناک تاریخی دن ہے جب امریکن بمبار جہاز نے جاپانی شہر ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا... لیکن اصل میں یہ بم ایک اور شہر پر گرایا جانا تھا۔ اس شہر کا نام کیا ہے؟ آپشن نمبر ایک بیپو... آپشن نمبر دو یوکوہاما... آپشن تین اوساکا... آپشن چار کوکورا۔''

ہال میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ یہ ایک اور مشکل سوال آگیا تھا۔ ناگاساکی کا نام تو ہر کوئی جانتا ہے لیکن وہ شہر کون سا تھا جس پر اصل میں ایٹم بم گرائے جانے کا امریکی پروگرام تھا۔ اس بار گیری گرانٹ کے چہرے پر ہلکی سی کرن نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ مکمل طور پر اندھیرے میں نہیں ہے۔ اس نے ہاٹ سیٹ پر پہلو بدلا اور ایک بار پھر سوال کو نہایت توجہ سے پڑھا۔ تناؤ کی کیفیت ناظرین میں بڑھتی جا رہی تھی۔

''جی جناب... مسٹر گیری گرانٹ! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا ذہن میں کچھ آرہا ہے؟''

گیری نے دبے دبے جوش سے کہا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، آپشن نمبر دو اور تین تو ہرگز نہیں کیونکہ یہ دونوں شہر ناگاساکی سے ذرا فاصلے پر ہیں... اور میرے خیال میں اس شہر کو ناگاساکی سے زیادہ دور نہیں ہونا چاہیے۔''

''اس خیال کی وجہ؟'' کمپیئر نے دریافت کیا۔

''جہاں تک میری معلومات ہیں، اس دوسرے شہر پر بم اس لیے نہیں گرایا جا سکا تھا کہ وہاں بادل چھائے ہوئے تھے، ان بادلوں کی وجہ سے ہی امریکی بمباروں نے ایک قریبی ہدف یعنی ناگاساکی کا انتخاب کر لیا تھا۔''

کمپیئر بولا۔ ''اگر آپ کے ذہن میں اتنا کچھ آرہا ہے تو پھر اس شہر کا نام بھی آپ کے ذہن میں آنا چاہیے۔''

گیری نے بے چینی سے اپنی انگلیوں کے چٹاخے نکالے۔ نشست پر پہلے آگے جھکا پھر پیچھے کی طرف گیا۔ ''میرے اندازے کے مطابق یہ شہر بیپو ہوگا یا پھر کوکورا۔ لیکن ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''یعنی آپ کا خیال ہے کہ ابھی آپ کو چاروں آپشن ذہن میں رکھنے چاہئیں۔'' کمپیئر نے اسے مزید الجھانے کی کوشش کی۔

گیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس الیکٹرانک اسکرین کو دیکھتا رہا اور اپنی سوچ کے گھوڑے کو دوڑاتا رہا۔ ہال میں پن ڈراپ سائیلنس تھا۔

قریب ایک منٹ کے غور و فکر کے بعد اس نے اپنی دوسری لائف لائن استعمال کرنے کے لیے عمران سے رابطہ کیا۔ ''ہیلو ایمران... تم کیا مشورہ دیتے ہو؟''

عمران نے کہا۔ ''میرے ذہن میں بھی وہی کچھ آرہا ہے جو تمہارے ذہن میں آرہا ہے۔ آپشن نمبر ایک یا آپشن نمبر چار... اور تھوڑا بہت آپشن نمبر دو بھی۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''میرا خیال ہے کہ آپشن ایک اور آپشن چار پر ہی توجہ رکھنی چاہیے۔'' عمران نے کہا اور پھر کیبن میں موجود باقی افراد کی طرف دیکھا۔

مجھ سمیت کیبن میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس مشکل

سوال کے حوالے سے عمران اور گیری کی کوئی مدد کر سکتا۔ مسٹر ریان ولیم نے اپنے بھاری بھر کم کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی اور بے بسی کا اظہار کیا۔ ان کے دونوں دوستوں کے تاثرات بھی یہی تھے۔

کمپیئر کی آواز گونجی۔ ''ہاں مسٹر گیری... آپ کے پاس وقت کم ہو رہا ہے۔ فون کال کے حوالے سے آپ کے پاس اب صرف چالیس سیکنڈ بچے ہیں۔''

''بتاؤ ایمران... تمہاری چوائس کیا ہے؟'' گیری نے بے قراری سے کہا۔

''میری چوائس... کوکورا ہے۔'' عمران نے ذرا توقف کے بعد نہایت مضبوط اور دوٹوک انداز میں کہا۔

شاید اس کا یہی دوٹوک انداز ہوتا تھا جو اس کی خوش بختی کا وسیلہ بنتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہاں بھی یہ انداز کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے یا نہیں۔

یہ تھرل اور سسپنس سے بھرپور لمحے تھے۔ گیری کے چہرے سے اضطراب مترشح تھا...

''ہاں مسٹر گیری!'' کمپیئر نے اپنی آواز سے گیری کو ٹہوکا دیا۔ ''یہ بہت اہم مرحلہ ہے۔ آپ کا درست جواب آپ کو پہنچا سکتا ہے آٹھ ملین ڈالرز کے خطیر انعام تک۔ غلط جواب کی صورت میں آپ آجائیں گے بنیادی انعام صرف پینسٹھ ہزار ڈالرز پر... اگر آپ کھیل چھوڑنا چاہیں تو یہاں چار ملین ڈالرز کے انعام پر چھوڑ سکتے ہیں۔''

گیری کی پیشانی پر نمی چمکنے لگی۔ ایک طرف چار ملین ڈالرز یعنی تقریباً تیس کروڑ پاکستانی روپیا تھا اور دوسری طرف صرف انچاس لاکھ روپے کے لگ بھگ۔

گیری نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا اپنا ذہن تو آپشن نمبر ایک یعنی بیپو کی طرف جا رہا ہے لیکن میں اپنے دوست کے ساتھ جانا چاہوں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی ''لک'' میری مددگار ہوگی۔ میرا جواب ہے آپشن نمبر چار کوکورا۔''

''کوکورا۔'' سی این این کے کمپیئر نے معنی خیز انداز میں دہرایا پھر بولا۔ ''مسٹر گیری! کیا یہ آپ کا حتمی جواب ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا ہم اسے سیو کر لیں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کے پاس ابھی پچاس سیکنڈ ہیں۔ اگر آپ مزید سوچنا چاہتے ہیں تو سوچ لیں۔''

''سوچ لیا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے جی... آٹھ ملین یو ایس ڈالرز کے لیے مسٹر گیری کے جواب کو ''سیو'' کیا جائے۔''

اسکرین پر آپشن نمبر چار کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ کمپیئر نے اگلے تین چار منٹ میں اس جواب کے حوالے سے ہزاروں لاکھوں ناظرین کے تجسس کو خوب ابھارا۔ تجسس اور سنسنی کو یوں ابھارا جانا ان شوز کا خاصہ ہوتا ہے۔ کمپیئر کے چہرے اور باتوں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ اپنی ساری ہمدردیاں گیری کے ساتھ بتا رہا تھا اور کبھی کبھی اسے تاسف کی نظروں سے بھی دیکھنے لگتا تھا۔ ٹی وی کیمرے ناظرین کے ہجوم میں سے بار بار گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو دکھا رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھیں اور ان کے ہونٹ بے ساختہ، دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے...

آخر کمپیئر اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''مسٹر گیری! ہمیں خوش قسمتی پر یقین رکھنا چاہیے اور خوش بختی اکثر لوگوں کی مدد بھی کرتی ہے۔ مگر... خوش قسمتی نے اس دفعہ آپ کی مدد نہیں کی... بلکہ آپ کو... باقاعدہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر منزل تک پہنچایا ہے۔'' کمپیئر نے آخری چند الفاظ بے حد جوش کے عالم میں اور ڈرامائی انداز سے کہے۔

پورا ہال اپنے پنجوں پر کھڑا ہو گیا۔ حاضرین نے ایک پُرجوش آوازہ بلند کیا... گیری نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اور خوشی سے چلّا اٹھا۔ قیامت کے شور میں کمپیئر کی آواز گونجی۔ ''آپ کا جواب درست ہے مسٹر گیری۔ آپ اٹھ ملین ڈالرز جیت چکے ہیں۔ آپ اس رقم کے مالک ہیں۔''

گیری نے فون سیٹ کو چوما اور پکارا۔ ''تھینک یو ایمران... تھینک یو...'' گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو بڑے جذباتی انداز میں ایک دوسرے سے بغل گیر دکھایا گیا۔

تقریباً ایک منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ پھر کمپیئر کی آواز گونجی۔ اس نے جواب کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''کوکورا وہ شہر تھا جہاں امریکیوں نے دوسرا ایٹم بم گرانے کی پلاننگ کی تھی۔ امریکی بمبار جہاز کوکورا کے لیے ہی روانہ ہوئے تھے لیکن کوکورا والوں کی خوش قسمتی کہ اس روز شہر پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بہت دھواں بھی تھا جس کی وجہ سے بمبار، شہر کے تین چکر لگانے کے باوجود اپنا ٹارگٹ نہ ڈھونڈ سکے۔ یوں ایک بہت بڑے اسلحے کے ڈپو اور کارخانے والا یہ شہر بچ گیا۔ ان کے حصے کی موت

ناگاساکی پر برس گئی۔ 9 اگست 1945ء ۔۔۔ گیارہ بج کر دو منٹ۔ کوکورا کی جگہ ناگاساکی موت کے منہ میں چلا گیا۔“

شو اپنے کلائمیکس پر پہنچ گیا تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز تر ہو رہی تھیں۔ گیری پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً ساٹھ کروڑ کا انعام جیت چکا تھا۔ اب صرف ایک سوال کے عوض اس کی انعامی رقم ایک بہت بڑا جمپ لے سکتی تھی۔ سولہ ملین ڈالرز یعنی تقریباً ایک ارب بیس کروڑ روپے۔ یہ انعام ایک لگژری جہاز کی صورت میں تھا۔ اسے سپنوں کا جہاز کہا جا سکتا تھا۔ نہایت قیمتی، نہایت آرام دہ اور جدید ترین سہولتوں سے آراستہ۔ بتانے والے بتا رہے تھے کہ ”فیلکن 900 سی“ نامی اس جہاز کو کسی بھی وقت سولہ ملین بلکہ اس سے بھی زیادہ رقم پر فروخت کیا جا سکتا تھا۔ صرف ایک سوال کے جواب کی قیمت ساٹھ کروڑ روپے تھی اور یہ سوال گیری کے سامنے آنے والا تھا۔

آخر کمپیئر نے پروگرام کو اس فائنل مرحلے کی طرف بڑھایا۔ اس نے کہا۔ ”ناظرین! دل تھام کر بیٹھیں۔ مسٹر گیری اس مقابلے کی بلند ترین سطح پر پہنچ چکے ہیں۔ وہ آٹھ ملین ڈالرز جیت چکے ہیں اور اس رقم کا چیک انہیں دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ یہ چیک واپس کرنا چاہیں اور آگے بڑھنا چاہیں تو ہم آگے بڑھنے کے لیے تیار ہیں۔“

طے شدہ پروگرام کے مطابق گیری آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے چیک کمپیئر کی طرف واپس بڑھا دیا جو پہلے کی طرح شیشے کے ایک باکس میں رکھ لیا گیا۔ کمپیئر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر گیری! آپ کے دل کی دھڑکن کیا کہہ رہی ہے؟“

گیری کوشش کر کے مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کے برص زدہ ہونٹ کچھ اور نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ بولا۔ ”جناب۔۔۔ دھڑکن سولہ سولہ کی رٹ لگا رہی ہے۔ سولہ ملین۔“

کمپیئر نے کہا۔ ”آٹھ ملین بھی تو معمولی رقم نہیں ہے۔ کیا آپ اسے داؤ پر لگانے کو تیار ہیں؟“

”اس کا فیصلہ سوال آنے کے بعد کرتے ہیں۔“ گیری پھر نروس انداز میں مسکرایا۔

”سوال خاصا مشکل ہے مسٹر گیری۔ میں آپ کو پھر مشورہ دوں گا کہ جواب کے حوالے سے اگر آپ کے ذہن میں شکوک زیادہ ہیں تو پھر آپ جواب مت دیں۔ آپ ایک خطیر رقم کے مالک بن چکے ہیں۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ اب یہ رقم آپ سے دور نہ ہو۔“

”میری بھی یہی خواہش ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خواہش ہے کہ میں گرینڈ پرائز حاصل کروں۔“

”تو ٹھیک ہے جی۔ اب تیسرا اور آخری سوال آپ کے سامنے آ رہا ہے اسکرین پر۔“ کمپیئر نے کہا۔

اسکرین پر سوال جگمگایا۔ ”اب تک کی سائنسی تحقیق کے مطابق طاعون کا مرض پیدا کرنے والے جرثومے FLEAS کی کتنی اقسام سامنے آ چکی ہیں۔۔ 1000۔۔۔ 1400۔۔۔ 2400 یا پھر 850۔“

اسکرین پر سوال پڑھنے کے بعد گیری کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ یہ ایک نہایت مشکل سوال تھا یا شاید یہ ترتیب ہی اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کا جواب دیتے ہوئے صرف اور صرف اندازے سے کام لیا جا سکے۔ یعنی اس سوال کے حوالے سے یہ سراسر قسمت کا کھیل بن گیا تھا۔ بس ایک تکا لگایا جانا تھا اور یہ تکا کامیاب بھی ہو سکتا تھا اور ناکام بھی۔

کمپیئر نے متجسس نظروں سے گیری کے برص زدہ چہرے کو دیکھا۔ ”جی مسٹر گیری! سولہ ملین ڈالرز کا سوال آپ کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ آپ کے ذہن میں کیا آ رہا ہے؟“

”یہ بہت کٹھن سوال ہے۔“ گیری پھیکے انداز میں مسکرایا۔

”انعام بھی تو بہت بڑا ہے۔ آپ اپنے ذہن کو سوال پر مرکوز کریں اور پھر یہ بھی سوچیں کہ یہاں کوئی دس پندرہ یا بیس آپشن نہیں ہیں۔ صرف چار آپشن ہیں اور ان میں سے ایک درست ہے۔“

گیری کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا۔ یقیناً وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک سوال کے بدلے میں اس کی انعامی رقم تقریباً ساٹھ کروڑ سے قریباً ایک سو بیس کروڑ ہونے والی تھی۔ صرف ایک سوال کا درست جواب اور وہ جواب ان چار آپشنز میں موجود تھا۔ یہی اس کھیل کی خوب صورتی تھی۔ اب یہ بس ہمت کا کھیل تھا۔ درست جواب پر ساٹھ کروڑ روپے کا اضافہ اور غلط جواب پر جیتی ہوئی رقم سے بھی محرومی۔ اس صورت میں گیری کو فقط پینسٹھ ہزار ڈالرز یعنی تقریباً انچاس لاکھ روپے ملنے تھے۔ تیسری صورت یہ تھی کہ گیری اپنی انعامی رقم کو ڈبل کرنے کی بے پناہ کشش سے ہاتھ کھینچ لیتا اور اس کھیل کو یہیں پر چھوڑ دیتا۔

اگلے دو تین منٹ بے حد اعصابی تناؤ اور کشیدگی کے تھے۔ کمپیئر اس تناؤ اور سنسنی میں اضافے کے لیے مسلسل چھوٹے چھوٹے فقرے بول رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”مسٹر گیری! یقیناً کوئی ایک آپشن تو ایسا ہو گا جسے آپ دوسرے آپشنز سے بہتر سمجھتے ہوں گے۔“

گیری پھیکے انداز میں مسکرایا اور طویل سانس لے کر بولا۔ ”نہیں۔ یہ پہلا سوال ہے جس کے حوالے سے میرا ذہن بالکل ’بلینک‘ ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں کوئی بھی اندازہ قائم کرنے سے قاصر ہوں۔“

ہمارے کیبن میں ریان ولیم نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران کا چہرہ بھی سپاٹ تھا اور لگ یہی رہا تھا کہ اس بھرے پُرے ہال میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو اس سوال کا جواب جانتا ہو۔

”تو کیا آپ کھیل یہیں پر چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ کمپیئر نے گیری سے پوچھا۔

”جی۔۔۔ میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی آخری لائف لائن استعمال کروں گا۔“ گیری نے پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

”مسٹر گیری کے دوست کو فون لگایا جائے۔“ کمپیئر نے آرڈر جاری کیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”اور ہم امید کرتے ہیں کہ گیری کا یہ دوست ان کے لیے پہلے کی طرح بخت آور ثابت ہو گا۔“

چند سیکنڈ بعد ہمارے کیبن میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ عمران نے ریسیور اٹھایا۔ گیری نے کہا۔ ”ہیلو ایمران ڈیئر! تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

عمران نے کہا۔ ”اس سوال کے حوالے سے میری پوزیشن بھی وہی ہے جو تمہاری ہے۔۔۔ اور شاید اس ہال میں موجود تمام لوگوں کی ہے۔ اب یہ سراسر قیافے اور ”لک“ کا کھیل بن گیا ہے۔ یہ ففٹی کا نہیں سیونٹی فائیو اور ٹوئنٹی فائیو کا رسک ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ کسی ریوالور میں آٹھ خانے ہیں۔ چھ خانوں میں گولیاں ہیں اور دو خانے خالی ہیں۔ آپ کو چرخی گھما کر اپنی کنپٹی پر ٹریگر دبانا ہے۔“

”شاید تم نے ٹھیک مثال دی ہے۔“ گیری نے ٹھنڈی سانس بھری۔

چیمبر میں ایک بیل کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی برٹش کمپیئر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”ناظرین! جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ اس فائنل مرحلے میں ہم اپنے معزز PARTICIPANT کو سوچ بچار کے لیے جو وقت دیتے ہیں، وہ پانچ منٹ کے بجائے دس منٹ کا ہوتا ہے۔ فون کال بھی دو منٹ کے بجائے چار منٹ کی ہوتی ہے۔ مسٹر گیری! آپ اپنا پورا ٹائم لیں اور جو فیصلہ کریں، سوچ سمجھ کر کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں سے ایک بڑی اماؤنٹ لے کر جائیں۔ آپ نے اپنے علاج اور دوسروں کی صحت و تندرستی کے لیے جو ارادے ظاہر کیے ہیں، وہ پورے ہوں۔“

ناظرین بہت شور مچا رہے تھے اور ہاتھوں کے اشارے سے گیری کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ کھیل یہیں پر ختم کر دے کیونکہ ایک خطیر رقم اس کے حصے میں آ چکی ہے۔ ٹی وی کیمروں نے گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو دکھایا۔ وہ بھی زبردست کشیدگی کا شکار تھیں۔ گیری کی چھوٹی بہن بھی اشاروں سے بھائی کو کھیل QUIT کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

ہمارے کیبن میں عمران نے فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور ریان ولیم سے پوچھا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں جناب؟“

”میں صرف جیتنا چاہتا ہوں۔“

”یعنی آپ چاہتے ہیں کہ رسک لیا جائے؟“

”بالکل لیا جائے۔۔۔ لیکن یہ رسک تم لو۔“

”میں آپ کو پھر بتا دوں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ریوالور کے چھ خانوں میں گولیاں ہوں اور صرف دو خانے خالی ہوں۔“

”میں نے زندگی میں کبھی خانے نہیں گنے مسٹر ایمران! میں یہ داؤ کھیلنا چاہتا ہوں اور۔۔۔ تمہارے ذریعے کھیلنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کا فیصلہ حتمی ہے؟“

”ہاں حتمی ہے۔“ ریان ولیم نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ”تخت یا تختہ۔“

عمران کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے فون سیٹ کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ”گیری! میری رائے میں آپشن نمبر 2۔“

چند سیکنڈ کے بعد فون کال کا وقت ختم ہو گیا۔

اب سب کچھ گیری کرانٹ پر تھا۔ کمپیئر نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ”جی مسٹر گیری! آپ جواب دیجیے۔ اب تک کی سائنسی تحقیق کے مطابق طاعون کا مرض پیدا کرنے والے جرثومے FLEAS کی کتنی اقسام سامنے آ چکی ہیں۔ 1000۔۔۔ 1400۔۔۔ 2400 یا پھر 850۔“

گیری خاموش رہا۔ اتنے بڑے چیلنج کے سامنے وہ سکتہ زدہ نظر آ رہا تھا۔

کمپیئر نے دہرایا۔ ”جی مسٹر گیری! آپ کے پاس وقت کم ہو رہا ہے۔ آپ کے درست جواب کا مطلب ہے، سولہ ملین ڈالرز سے زیادہ مالیت کا بے مثال لگژری طیارہ۔ ایک سپنوں کا جہاز۔ آپ کے غلط جواب کا مطلب ہے، قریباً آٹھ ملین ڈالرز سے محرومی۔ آپ اب بھی کھیل چھوڑ سکتے ہیں۔“

گیری نے آخری بار ہمارے کیبن کی طرف دیکھا۔ ریان ولیم نے اپنا...... بڑا سر اثبات میں ہلایا۔ گیری نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”میں آپشن نمبر 2 کے ساتھ جانا چاہوں گا... 1400۔“

ہال میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ سب نگاہیں شیشے کے گول چیمبر پر اور الیکٹرانک اسکرین پر مرکوز تھیں۔

کمپیئر سنسنی خیز نظروں سے کبھی گیری کی طرف اور کبھی اپنے لیپ ٹاپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”مسٹر گیری! ابھی آپ کا جواب ”سیو“ نہیں کیا گیا۔ کوئز شوز کی تاریخ کے اس سب سے بڑے شو میں، میں آپ کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ اگر اب بھی آپ اپنا جواب بدلنا چاہیں تو بدل سکتے ہیں۔“

گیری نے متوحش نظروں سے کمپیئر کو دیکھا پھر ہمارے کیبن کی طرف نگاہ دوڑائی۔ عمران خاموش تھا اور ریان ولیم بھی۔ ریان ولیم کے دونوں دوست بھی یکسر خاموش تھے۔ ایسے شوز میں کمپیئرز اور ہوسٹ اپنے کھلاڑی کو اس طرح کی آفرز دیتے ہیں۔ ان آفرز کا مطلب کھلاڑی کے اعصاب ٹیسٹ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ آفر کبھی سودمند ہوتی ہے اور کبھی نقصان دہ۔ ریان ولیم نے گیری کی طرف دیکھا۔ پھر کھڑے ہو کر ایک بار پھر اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ جواب دے اور آپشن نمبر 2 کے ساتھ رہے۔

گیری نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”میرا جواب آپشن نمبر 2 ہی ہے۔“

آپشن نمبر 2 کو ”سیو“ کر لیا گیا۔

سینوں میں دھڑکنیں نقاروں کی طرح گونج رہی تھیں۔ ہر نگاہ الیکٹرانک اسکرین پر تھی۔ اگر جواب درست ہوتا تو اسکرین پر سبز رنگ نمودار ہوتا تھا... دوسری صورت میں سرخ رنگ۔ شاید کوئی بھی نگاہ سرخ رنگ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ان فیصلہ کن گھڑیوں میں یہ سرخ رنگ خوف کی علامت بن گیا تھا۔ سبز رنگ خوشی اور جوش سے منسلک ہو گیا تھا۔ ہال میں پن ڈراپ خاموشی تھی۔ گیری آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

... اور پھر ایک زوردار چھناکے کی آواز آئی۔ اس خاص قسم کے چھناکے کے ساتھ ہی الیکٹرانک اسکرین پر سرخ رنگ ابھرا۔ وقت کی گردش جیسے تھم گئی۔ گیری کا جواب غلط ہو چکا تھا...

ٹی وی کیمروں نے بار بار چہروں کے ردِعمل دکھائے۔ گیری سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ اس کی والدہ اور بہن نے اپنے سر گھٹنوں میں دے رکھے تھے۔ کمپیئر خاموش تھا۔ ریان ولیم خاموش تھا۔ دو سو سے زیادہ ناظرین خاموش تھے اور کچھ صدا ہائے تاسف بلند کر رہے تھے۔ کئی سیکنڈ بعد کمپیئر کی نہایت گمبھیر آواز ابھری۔ ”مجھے افسوس ہے مسٹر گیری! آپ کا جواب غلط ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے، آپ نے بہت دلیری سے مقابلہ کیا۔ آپ کے پاس کھیل سے پسپا ہونے کا آپشن موجود تھا مگر آپ نے اور آپ کے دوست نے فائٹ کرنے اور خطرہ مول لینے کو ترجیح دی۔ اس کے لیے آپ کی تعریف کرنا پڑے گی۔ زندگی خطرے مول لینے کا نام ہی تو ہے۔“

کمپیئر نے تالیاں بجائیں۔ آڈینز نے بھی مرے مرے انداز میں اس کا ساتھ دیا۔ کمپیئر نے کمپیوٹر سے کہا کہ اس سوال کا درست جواب بتایا جائے۔ جو جواب اسکرین پہ آیا، وہ آپشن نمبر تین تھا... یعنی 2400۔

کمپیئر نے قاعدے کے مطابق جواب کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”سائنسی تحقیق کی تازہ رپورٹ کے مطابق طاعون کے جرثومے کی کم و بیش 2400 اقسام سامنے آچکی ہیں۔ تاہم ان میں سے صرف 120 اقسام ایسی ہیں جو طاعون کا جرثومہ انسان میں منتقل کر سکتی ہیں۔ ان 120 اقسام میں سے تقریباً بیس بائیس قسمیں ایسی ہیں جو چوہوں کے ذریعے طاعون کے پھیلاؤ کا باعث بنتی ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں طاعون جیسی خطرناک بیماری پھیلنے کے امکانات ہمہ وقت موجود ہیں۔“

ہال میں ویسی ہی خاموشی طاری تھی جو طاعون سے برباد شدہ کسی بستی میں ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک کے کھیل میں اپنے رویے سے گیری نے قریباً سو فیصد ناظرین کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔ صدمے کی شدت سے گیری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھیں۔

کمپیئر نے گیری کو گلے سے لگایا اور تسلی دی۔ اس کے ساتھ ہی پینسٹھ ہزار ڈالرز کا چیک بھی اسے دیا گیا۔ یہ ایک

دل ہلا دینے والا اینٹی کلائمیکس تھا۔

... قریباً دس منٹ بعد کھیل کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ کھیل کا سارا پیٹرن وہی پہلے والا تھا... پہلے ایک ہاؤس وائف کھیلنے کے لیے آئی۔ اس کا تعلق انڈیا سے تھا۔ یہ بھی چند دیگر امیدواروں کی طرح پہلے مرحلے میں منتخب ہوئی تھی۔ یہ پچیس چھبیس سالہ خاتون صرف دوسرے مرحلے تک پہنچ سکی۔ اس نے فقط دس ہزار ڈالرز جیتے۔ پھر ایک جاپانی آیا۔ یہ بھی زیادہ آگے نہیں جا سکا۔ اگلے قریباً پون گھنٹے میں چار امیدوار ابتدائی مرحلوں میں فارغ ہو کر واپس گئے۔ صرف ایک شخص پانچ لاکھ ڈالرز یعنی قریباً تین کروڑ پچھتر لاکھ روپے کے انعام تک پہنچ سکا۔

چھٹے نمبر پر جو کھلاڑی شیشے کے چیمبر میں داخل ہوئی اور ہاٹ سیٹ پر بیٹھی، یہ وہی امریکن لڑکی تھی جس کا باپ ریان ولیم کا کاروباری حریف بھی تھا۔ اس لڑکی کا نام ماریانی اور اس کے باپ کا نام مسٹر بغداد بتایا گیا تھا۔ لڑکی دیکھنے میں پرکشش تھی اور کسی ماڈل ہی کی طرح نظر آتی تھی۔ اس نے نہایت ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ بالائی جسم کا لباس بھی ایسا تھا جو چھپا کم رہا تھا اور دکھا زیادہ۔ ریان ولیم نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ ”کہتے ہیں کہ خوب صورتی اور ذہانت عورتوں میں کم کم ہی اکٹھی ہوتی ہے لیکن اس خبیث میں یہ دونوں چیزیں اکٹھی آئی ہیں۔“

یہ فقرہ بولنے کے فوراً بعد ریان ولیم اپنے بھاری بھرکم جسم کو ہلکورا دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ غالباً وہ اس لڑکی کو کھیلتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دونوں دوست بھی بیزاری کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔

ریان ولیم کی ناپسندیدگی کو دیکھتے ہوئے ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس وقت ہم اس میگا شو میں سے باہر نکل رہے تھے، کمپیئر کی خوب صورت آواز ہال میں گونج رہی تھی۔ ”... تو جی ناظرین! اب کچھ اور نہایت سنسنی خیز لمحے آپ کے منتظر ہیں۔ مس ماریانی وہ ہونہار امیدوار ہیں... یا کہہ لیں کہ PARTICIPANT ہیں جن سے لوگوں نے مسٹر گیری ہی کی طرح بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ مس ماریانی اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک بڑی کامیابی سے کوئز شوز میں حصہ لیتی رہی ہیں... اور آج وہ اس میگا ایونٹ میں موجود ہیں جس میں یہ قریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر گرینڈ پرائز سولہ ملین ڈالرز تک پہنچ سکتی ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پچھلے میگا شو میں مس ماریانی نے تین مرحلے حیران کن تیزی سے پار کر لیے تھے۔ اب تک وہ دو ملین یو ایس ڈالرز جیت چکی ہیں اور چوتھے مرحلے میں ہیں...“

کمپیئر کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ ہم ایک بند کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں حسب سابق میری اور عمران کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں اور ہمیں ایک نیم گرم کوریڈور میں سے گزار کر اسٹیشن ویگن میں پہنچا دیا گیا۔

ہم واپس اسی رہائش گاہ میں پہنچ گئے جہاں سے ہمیں میگا شو میں حصہ لینے کے لیے لے جایا گیا تھا۔ یہاں ہمارا خدمت گار عملہ پہلے سے موجود تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اب ان لوگوں میں پہلے سی گرم جوشی موجود نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ مسٹر ریان ولیم اور ان کے دونوں دوست بھی اسی کوٹھی میں موجود ہیں مگر انہوں نے عمران کو یکسر نظرانداز کر دیا اور اپنے پورشن تک محدود رہے۔

جان محمد صاحب ہمارے پاس آئے۔ وہ بھی افسردہ تھے۔ انہوں نے بتایا۔ ”ریان ولیم صاحب دوستوں کے ساتھ مل کر غم غلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وسکی پی رہے ہیں۔“

”میرے بارے میں کچھ فرمایا ہے انہوں نے؟“ عمران نے پوچھا۔

”ابھی وہ فرمانے کی پوزیشن میں نہیں۔“ جان صاحب نے کہا۔

دس پندرہ منٹ بعد ایک اور اطلاع پہنچی اور یہ بھی پریشان کن تھی۔ وہی ہوا تھا جس کا ریان ولیم کو ڈر تھا۔ میگا کوئز شو کے حوالے سے یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ جان محمد صاحب کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ انہوں نے کال ریسیو کی اور ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی مایوسی گہری ہو گئی۔ انہوں نے فون پر پوچھا۔ ”یہ کنفرم اطلاع ہے؟“ دوسری طرف سے غالباً اثبات میں جواب دیا گیا تھا۔

جان محمد صاحب نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”امریکن ماریانی گرینڈ پرائز جیت گئی ہے۔ سولہ ملین ڈالرز کا لگژری پلین۔“

”اب تو ریان صاحب کا حال اور بھی برا ہو جائے گا۔ کہیں پریشر کی وجہ سے ان کا بھاری بھرکم جسم پھٹ ہی نہ جائے۔“ عمران نے تشویش ظاہر کی۔

ریان صاحب تو نہیں پھٹے لیکن ان کا ایک دوست ضرور پھٹ گیا۔ قریباً دس منٹ بعد وہ نشے میں ڈولتا ہوا دروازے پر نمودار ہوا۔ یہ وہی ٹماٹر کی ناک والا تھا۔ وہ بالکل ٹن ہو رہا تھا۔ اس نے عمران کو گھورا اور کرخت انگلش میں بولا۔ ”واہ... واہ بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے ہو

ہمارے لیے۔ ہمیں تو نہال کر دیا تم نے اور مالا مال کر دیا۔ تمہارا تھوبڑا چومنے کو دل چاہتا ہے... اور دل چاہتا ہے کہ تمہیں گائے کے گوبر میں تولا جائے اور یہ سارا گوبر گٹھری میں باندھ کر تمہارے سر پر رکھ دیا جائے۔ واہ... کہاں چھپے ہوئے تھے تم اب تک؟ کہاں سے ڈھونڈا ہے تمہیں ہمارے پیارے ریان نے؟"

"تمہارے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ تمہاری وائف کے بستر کے نیچے۔" عمران نے مدھم آواز میں کہا۔

"کیا بکا تم نے؟" ریان کے شرابی دوست نے آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میری صفائی تو آپ نے خود ہی پیش کر دی ہے۔ میں خود نہیں آیا بلکہ مجھے ڈھونڈ کر لایا گیا ہے اور بعد میں جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ آپ لوگوں کے... اصرار پر ہوا ہے۔ باقی قسمت کے کھیل میں تو کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

اس نے شرابی انداز میں ہاتھ لہرایا۔ "ہاں، قسمت کے کھیل میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب اگر میں تمہیں کوئی چیز اٹھا کر مارتا ہوں تو وہ تمہیں لگ سکتی ہے اور نہیں بھی لگ سکتی۔ قسمت کا کھیل ہی ہے نا؟" اس کے ساتھ ہی اس نے پتھر کا ایک چھوٹا گل دان اٹھایا اور طاقت سے عمران کے سر کو نشانہ بنایا۔ عمران نے جھک کر خود کو گل دان کی ضرب سے بچایا۔ گل دان اڑتا ہوا ایک قد آدم آئینے سے ٹکرایا اور اسے چکنا چور کر گیا۔

"واقعی قسمت کا کھیل ہے۔" ٹماٹر کی ناک والے نے سر اوپر نیچے ہلایا... "اس شیشے کی قسمت میں موت لکھی تھی۔ چچ چچ... کتنا قیمتی شیشہ تھا... میڈ اِن فرانس۔" اس نے کہا اور تاسف انگیز انداز میں جھک کر شیشے کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ یہ ٹکڑا عمران کے قدموں کے پاس پڑا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بہت برق رفتار تھا۔ اس شخص نے آئینے کے ایک بڑے ٹکڑے سے یکایک عمران کی رانوں کو نشانہ بنایا۔ یہ اتنا غیر متوقع حملہ تھا کہ عمران کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خود کو بچا نہ سکتا۔ پھر بھی نکیلا ٹکڑا اس کی ناف کے قریب لکیر ڈالتا ہوا نکل گیا۔

ٹُن حملہ آور سخت اشتعال میں تھا۔ شاید وہ مزید حملے کرتا مگر عمران نے اس کی کلائی دبوچ لی پھر اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر طاقت سے دھکا دیا۔ وہ اڑتا ہوا سا دیوار سے ٹکرایا اور ایک چھ فٹ اونچے آرائشی لیمپ پر گر کر اسے چکنا چور کر گیا۔ لیمپ کی روشن ٹیوب لائٹ ایک چھوٹے سے دھماکے سے چکنا چور ہو گئی۔ عمران نے ٹماٹر کی ناک والے کی فربہ گردن اپنے آہنی بازو میں جکڑ لی اور ٹوٹ جانے والے لیمپ کا الیکٹرک تار اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ امکان تھا کہ اس تار میں ابھی تک کرنٹ دوڑ رہا ہوگا۔ عمران نے تار کے ننگے سرے حملہ آور کے چہرے سے قریب کیے۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ تاہم اس کی چربی دار گردن پر عمران کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کا بالائی دھڑ بس مچل کر رہ گیا۔ عمران الیکٹرک تار اس کے چہرے کے بالکل قریب لے گیا۔ پھر فلم شعلے کے گبر سنگھ کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔ "ہم کو کچھ پتا ناہیں ٹھاکر... کہ اس میں کرنٹ ہے یا ناہیں... ہم کو کچھ پتا ناہیں۔ یہ سارا قسمت کا کھیل ہے۔ اگر کرنٹ ناہیں ہوا تو تمہیں زندگی مل جائے گی۔ اگر ہوا تو پھر ناک کی طرح تمہارا باقی کا تھوبڑا بھی بندر کی پیٹھ جیسا ہو جائے گا۔"

سرخ ناک والے حملہ آور کو اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس آفت میں آ گیا ہے۔ نہایت زوردار اور جسیم ہونے کے باوجود وہ اپنے بالائی جسم کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا نشہ یقیناً ہرن ہو چکا تھا۔ یہی وقت تھا جب ریان ولیم اپنے پہاڑ جیسے جسم کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوا...

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ریان چنگھاڑا۔

عمران نے چند لمحے توقف کیا پھر حملہ آور کی گردن چھوڑ دی۔ وہ بُری طرح کھانستا اور ابکائیاں لیتا ہوا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اتنے میں مسلح گارڈز بھی اندر داخل ہو گئے۔ وہ خطرناک ارادوں سے عمران کی طرف بڑھے مگر ریان ولیم نے گرج کر انہیں روک دیا۔

اس کے اشارے پر دو گارڈز، ابکائیاں لیتے اور گالیاں بکتے ہوئے سرخ ناک والے کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے سنبھالتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہ بُری طرح ڈول رہا تھا۔ ریان ولیم نے خشمگیں نظروں سے عمران کو گھورا اور بولا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ تمہیں پتا ہے اس کا نتیجہ کیا نکل سکتا تھا؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا جناب... اور میرے خیال میں آپ کے معزز دوست نے بھی کچھ نہیں کیا۔ یہ سب کچھ نشے کی زیادتی کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہوں نے زیادہ پی رکھی تھی۔"

عمران کے اس ڈپلومیٹک جواب نے ریان ولیم کا طیش قدرے کم کیا۔ وہ کچھ دیر عمران کو گھورتا رہا پھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے چلنے کا انداز اور اس کا لب و لہجہ دونوں بتا رہے تھے کہ وہ خود بھی کافی سے زیادہ پیے ہوئے ہے۔

ناکامی کا افسوس تو یقیناً سب کو ہوا تھا... اور ہار یا جیت کی کامیابی بھی یقیناً ریان اور اس کے ساتھیوں کو بہت کھلی تھی مگر اپنے جذبات کا ایسا بھونڈا اظہار سراسر غلط تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ریان ولیم بروقت آ گیا ورنہ بات بہت بڑھ سکتی تھی۔

☆☆☆

اسی روز رات بارہ بجے کے لگ بھگ ہم نے ریان ولیم کی مہمان نوازی کو خیرآباد کہا اور عاطف وغیرہ کے پاس واپس آ گئے۔ اگلے دن صبح جان محمد صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے رات والے واقعے پر افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے فورڈ (سرخ ناک والے) پر غائبانہ لعنت ملامت بھی کی۔

میں بہت پریشان تھا۔ اقبال، میڈم صفورا اور دیگر ساتھیوں کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔ میری پریشانی اور بے چینی کا اصل مرکز بالو تھا۔ وہ پتا نہیں کس حال میں تھا۔ اگر مجھے تسلی تھی تو صرف ایک بات کی۔ صفیہ اس کے ساتھ تھی۔ پچھلے چند ماہ میں وہ اس کے ساتھ بہت مانوس ہو چکا تھا۔

میں نے جان محمد صاحب سے پوچھا۔ "ریان صاحب سے کوئی بات ہوئی، ہمارے ساتھیوں کے بارے میں؟"

"پرسوں ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کا رابطہ الہ آباد میں موجود انٹرپول کے ایک اعلیٰ افسر سے ہے۔ کچھ سراغ ملے ہیں۔ ان پر پیش رفت ہو رہی ہے۔"

"اس کے بعد بات نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بعد تو یہ شو والا ہلا گلا شروع ہو گیا تھا۔ اور اب ویسے ہی ریان صاحب اور اس کے ساتھی بڑے خراب موڈ میں ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "جان انکل! یہ تو ساری وقت گزاری والی باتیں لگتی ہیں۔ سراغ مل گئے ہیں... پیش رفت ہو رہی ہے... ٹارگٹ کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ یہ تو وہی گھسے پٹے جملے ہیں جو ہر سنگین واقعے کے بعد ارباب اختیار کی طرف سے بولے جاتے ہیں۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" جان محمد صاحب نے پوچھا۔

"اس کا تو مطلب ہے کہ اب تک ہم نے وقت ہی ضائع کیا ہے... اور وقت بھی ایسا جو بڑا قیمتی تھا۔" عمران بولا۔

"خیر، ایسی بات بھی نہیں۔ ریان صاحب نے جس طرح ذمے داری لی تھی مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کچھ نہ کچھ کیا ہے۔"

"آپ ابھی اس سے رابطہ کریں اور صحیح صورتِ حال کا پتا کریں۔" عمران کا لہجہ دوٹوک تھا۔

جان محمد صاحب نے چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہنے کے بعد موبائل پر نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگے۔ چند لمحے بعد رابطہ ہو گیا۔ "ہیلو کون؟... ریان صاحب کہاں ہیں... کیا؟... لاہور سے چلے گئے... کب؟... لیکن انہوں نے انفارم ہی نہیں کیا۔ اچھا اچھا... چلو ٹھیک ہے... میں دیکھتا ہوں۔" جان محمد صاحب نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ جان محمد صاحب کی انگریزی بس واجبی سی تھی۔

ان کے چہرے پر مایوسی تھی۔ "کیا ہوا؟" عمران نے پوچھا۔

"ریان اور اس کے ساتھی آج صبح سویرے لاہور سے چلے گئے ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

"شاید اسلام آباد۔ میں دوسرے نمبر پر کوشش کرتا ہوں۔" جان محمد صاحب نے کہا اور دوسرا نمبر ملانے لگے۔ دوسری طرف بیل ہوتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی۔

عمران گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "جو کچھ کرنا ہوگا ہمیں خود کرنا ہوگا۔ اس گورے میں اتنا ظرف نہیں ہے کہ کوئز شو میں ہارنے کے بعد بھی اپنی کمٹ منٹ پوری کرے۔ وہ اب کچھ نہیں کرے گا ہمارے لیے۔"

عمران ایک یار باش شخص تھا۔ ہر جگہ اس کے دوست اور پرستار موجود تھے... وہ جہاں جاتا تھا، اپنی کچھ اچھی نشانیاں چھوڑ جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بمبئی اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی اس کے جاننے والے موجود ہیں۔ عمران نے لکھنؤ میں اپنے ایک شناسا سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس شخص کا تعلق سید گھرانے سے تھا اور یہ انڈیا کی وزارتِ خارجہ میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔

عمران ٹیلی فون پر مصروف ہو گیا۔ پہلی کوشش میں حسیب شاہ نامی اس شخص سے رابطہ نہیں ہو پایا لیکن دوسری کوشش میں ہو گیا۔ اس بندے سے عمران کی بڑی تپاک گفتگو ہوئی اور عمران نے اسے اپنے مسئلے کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کیں۔ ظاہر ہے کہ فون پر تفصیلی گفتگو ٹھیک نہیں تھی۔ رات کو انٹرنیٹ پر تبادلہ خیال کرنے کے بارے میں فیصلہ ہوا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ "کیا ہمیں دوبارہ انڈیا

جانا پڑے گا؟“

”اگر جانا بھی پڑا تو تم نہیں، میں جاؤں گا۔“

”تم نے خطرے مول لینے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟“

”ٹھیکیدار تو میں ہوں... اور تمہیں پتا ہے کہ بہت عرصے سے ہوں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس میں میرا اپنا لالچ بھی شامل ہے۔ یار! ادھر جاؤں گا تو عاصمہ سے پھر ملاقات ہونے کا موقع پیدا ہو جائے گا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ ایک بے کس پری ہے اور ایک جابر دیو کی قید میں ہے۔ یہ ڈی ایس پی سجاد موہل کسی دیو یا جن سے کم تو نہیں۔ ان جنات کی جان عام طور پر طوطوں میں ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں وہ طوطا ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں جس میں سجاد کی جان ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔ عاصمہ سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ تم صرف بے پر کی اڑاتے ہو...“

”یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔ اپنے دل کا حال تو مجھے معلوم ہے۔ آہ... اس میں جب مجھے شبانہ کی جھلک نظر آتی ہے تو لگتا ہے کہ ماضی کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں اور ”گردش صیام“ پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے۔“

”گردش صیام نہیں گردش ایام ہوتا ہے۔“

”اب تم بھی غلطی کر رہے ہو گردش ہوتا نہیں بلکہ ہوتی ہے۔ لیکن ہوتا یا ہوتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ میں وہ طوطا پکڑ سکتا ہوں یا نہیں جس کی ٹانگ توڑنے سے ڈی ایس پی سجاد کی ٹانگ ٹوٹ سکتی ہے...“

”اور فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ ہم اقبال، صفورا، نوری اور بالو وغیرہ کو واپس لا سکتے ہیں یا نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

میرے اس فقرے نے اسے پھر سے سنجیدہ کر دیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور لمبے کش لینے لگا۔ میں نے کہا۔ ”سچ پوچھو عمران، تو کبھی کبھی تم پر غصہ آنے لگتا ہے۔ کئی معاملوں میں تم حد سے گزر جاتے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ تمہیں خطروں میں رہنا پسند ہے اور یہ بھی مانتا ہوں کہ تم اپنی زندگی موت کی طرف سے بہت بے پروا ہو... اور یہ بے پروائی اب تمہارے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ پھر بھی عاصمہ جیسے معاملات سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مانا کہ اس کا شوہر مرنے کی حد تک مایوس ہو چکا تھا... لیکن اس کی مایوسی دور کرنے کے لیے تم نے خود کو اس کے لیے چارا بنا لیا۔ اور ایک بار نہیں دو بار۔“

”یار! دوسری بار تو میں نے صرف اپنی قسم پوری کی تھی... اور بات صرف موہل کی مایوسی کی نہیں تھی، وہ جونولی اپنی نقد جان دے رہا تھا۔ باقاعدہ راہیِ عدم ہو رہا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ دو سال پہلے میں نے جس رات اسے گرفتاری دی تھی، اگر نہ دیتا تو وہ شراب میں دس پندرہ نشہ آور گولیاں ڈال کر مرحوم ہو جاتا... یا پھر اپنے سرکاری پستول سے اپنی کنپٹی میں سوراخ کر لیتا۔ میں نے ایک انسان کی جان بچائی... اور ایک عورت کو بیوگی سے بچایا... بس... اور مجھے یہ کرنے میں کوئی پچھتاوا نہیں۔“

”اور اس کا صلہ کیا ملا ہمیں... ہمیں مارا پیٹا گیا۔ ڈیزل انجن کی دھونی دی گئی۔ ہمارے ساتھی دربدر ہوئے۔ بالو دربدر ہوا۔ اب وہ پتا نہیں کہاں اور کس حال میں ہیں؟“

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جگر! فکر نہ کرو۔ انہیں بہ خیریت یہاں لانا میری ذمے داری ہے۔ اور میں یہ پوری کروں گا۔“

اس کی آواز میں وہی یقین تھا جو سننے والے کی سماعت میں جذب ہوتا تھا اور اسے گہرائی تک متاثر کرتا تھا۔

ہم اس حوالے سے گفتگو کرتے رہے، تب عمران ایک بار پھر ٹیلی فون پر مصروف ہو گیا۔ وہ اپنی ڈوریاں ہلا رہا تھا۔ اس نے جہاں بھی فون کیا، وہاں سے گرم جوشی کے ساتھ جواب ملا۔ یہ فروری کی آخری تاریخیں تھیں لیکن سردی کا زور پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ ایک شفاف چمکیلی دوپہر تھی۔ کوٹھی کے خوب صورت لان میں پھول جھوم رہے تھے۔ تتلیاں منڈلا رہی تھیں اور پرندوں کی چہچہاہٹ تھی۔ یہ میری جانی پہچانی فضا تھی۔ یہ میرا جانا پہچانا لاہور تھا۔ میرے بچپن اور لڑکپن کی ان گنت یادیں ایسی ہی سہانی دوپہروں اور شاموں سے وابستہ تھیں۔

اچانک وہ ہوا جس کا ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مایوسی اور پریشانی کی گھٹن میں یکایک ایسی ہوا چلی جس نے سارے منظر ہی بدل دیے۔ میں دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ ہماری بائیں جانب والا دروازہ کھلا اور جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ میڈم صفورا، اقبال، نوری، صفیہ اور اس کی گود میں بالو۔

عمران ریسیور چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرح مجسم حیرت ان لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر ان سب کے پیچھے عمران کے ساتھی جیلانی کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ یقیناً یہ لوگ جیلانی کے ساتھ ہی یہاں تک پہنچے تھے۔ میں لپکا اور آگے بڑھ کر بالو کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ عمران اور اقبال ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ اقبال کے بعد عمران اور میڈم صفورا

ایک دوسرے کے گلے ملے۔ اقبال مجھ سے آچمٹا۔ یہ ایک جذباتی منظر تھا۔ صفیہ اور نوری بھی آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی تھیں۔ نوری کی کلائی پر پلاستر نظر آ رہا تھا۔

”یہ سب کیسے ہوا؟ کیسے پہنچے آپ لوگ یہاں؟“ میں نے حیران لہجے میں پوچھا۔

”یہ سب ان کی مہربانی ہے۔“ میڈم صفورا نے دروازے میں کھڑے ایک گندمی سے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان اچھی شکل وصورت کا تھا۔ اس نے جرسی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس نے ہمیں سلام کیا۔ اس کے سلام کے انداز سے ہی پتا چل گیا کہ وہ انڈیا سے آیا ہے۔ میڈم صفورا نے کہا۔ ”اس کا نام عطاالرحمان ہے۔ ائر انڈیا میں سروس کرتا ہے۔ یہ اپنی اسٹوری خود ہی سنائے گا تو زیادہ اچھی طرح تم لوگوں کی سمجھ میں آئے گی۔“

ہم نے عطاالرحمان سے مصافحہ کیا۔ اس سے گلے ملے۔ ”آپ سب لوگ خیریت سے تو ہیں نا؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل خیریت سے ہیں...“ اقبال نے کہا۔

”سوائے نوری کے۔“ عمران نے فقرہ مکمل کیا۔ ”اس کے بازو پر چوٹ لگی ہے۔“

نوری کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔ اقبال بھی چپ ہو گیا۔ میڈم صفورا نے کہا۔ ”ہمیں بیٹھنے کے لیے بھی کہا جائے گا یا کھڑے کھڑے ہی سب کچھ پوچھ لیا جائے گا؟“

ہم سب نشستوں پر بیٹھ گئے۔ بالو بدستور میری بانہوں میں تھا۔ اس کا معصوم لمس مجھے سلطانہ کی یاد دلانے لگا۔ وہ بھی دو چار منٹ کے اندر ہی میری گود سے مانوس سا ہو گیا۔ بالو اس لباس میں نہیں تھا جس میں بائیس دن پہلے ہم نے اسے الٰہ آباد میں چھوڑا تھا۔ باقی سب کے لباس بھی وہ نہیں تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ آج صبح ہی عطاالرحمان کے ساتھ نیو دہلی سے لاہور پہنچے ہیں۔ اقبال کو بھی ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ عمران سے کہاں اور کیسے رابطہ کیا جائے۔ ہاں، اپنے ساتھی جیلانی کا فون نمبر اسے معلوم تھا۔ اس نے جیلانی سے رابطہ کیا اور پھر یہ سب لوگ ایک زبردست سرپرائز کے طور پر ہمارے پاس یہاں اس کوٹھی میں پہنچ گئے۔

اس سارے معاملے میں عطاالرحمان کا کردار نہایت اہم محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کردار کیا تھا؟ میرے، عمران اور جیلانی کے ذہن میں بھی یہ سوال مچل رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کا سفری سامان دیکھ کر یہ پتا تو ہمیں چل ہی گیا تھا کہ یہ لوگ قانونی طریقے سے بذریعہ ائر لائن یہاں پہنچے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہو پایا، اس کا جواب ہمیں دوپہر کے کھانے کے بعد ملا۔

ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ عطاالرحمان، الٰہ آباد کی عاصمہ کا سگا بھائی ہے۔ عطاالرحمان لکھنوی لب و لہجے میں بڑی صاف اردو بولتا تھا۔ اس کی شکل و شباہت بھی اس کی گواہی دیتی تھی کہ ڈی ایس پی سجاد کی بیوی عاصمہ سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔

عطا نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ حضرات کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھیوں کو بحفاظت یہاں پہنچانے کے لیے جو بھی تھوڑی بہت کوشش کی ہے، وہ اپنی بہن عاصمہ کے کہنے پر ہی کی ہے۔ عاصمہ، عمران بھائی کی بے حد احسان مند ہے۔ اسے ہرگز ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ عمران بھائی کے قریبی ساتھیوں کو وہاں الٰہ آباد میں کسی طرح کی کوئی مشکل پیش آئے۔ وہ اس بارے میں بہت فکر مند تھیں۔ انہی دنوں وہ واقعہ ہوا جس کی وجہ سے عاصمہ بہن اس قابل ہوئی کہ وہ آپ کے ساتھیوں کی مدد کر سکے۔ وہ واقعہ آپ کی ساتھی نوری کے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا تھا۔“

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”عطا بھائی! بہتر ہے کہ آپ شروع سے ساری بات بتائیں تاکہ ہم اچھی طرح سمجھ سکیں۔“

عطا بولا۔ ”شروع میں جو کچھ ہوا، وہ تو آپ کو اقبال بھیا یا میڈم صفورا ہی بتا سکتی ہیں۔“

اقبال بولا۔ ”تابش اور عمران بھائی... جب ڈی ایس پی سجاد موہل نے آپ دونوں کو ہوٹل پارک ویو سے پکڑا تو ہم نے دیکھ لیا تھا۔ ہمیں حیرانی ہوئی کہ صرف دو پولیس اہلکاروں نے آپ دونوں کو بے بس کر کے گاڑی میں بٹھا لیا ہے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی معمولی پولیس والے نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوا کہ اب ہمارا ہوٹل پارک ویو میں رکنا ازحد خطرناک ہے۔ ہم نے فوراً ہوٹل چھوڑ دیا اور کرائے کی اسٹیشن ویگن کے ذریعے وہاں سے نکل گئے۔ کیپٹن اسے بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے پاس بھرا ہوا ماؤزر بھی تھا۔

”ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ہمیں ایک پولیس ناکے پر رکنے کا اشارہ کیا گیا... میرا خیال ہے کہ یہاں ہم

سے غلطی ہوئی۔ وہ معمول کی چیکنگ تھی۔ ہم رک جاتے تو سرسری جائزے کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی جاتی مگر اجے کی ہدایت پر وین ڈرائیور نے گاڑی کا رخ یک دم ایک بغلی گلی میں موڑ لیا۔ یہیں سے ایک پولیس موبائل ہمارے پیچھے لگ گئی۔ وین ڈرائیور خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے اجے کے ہاتھ میں بائز رد دیکھ لیا تھا۔ اجے نے اسے گاڑی تیز چلانے کے لیے کہا اور ہدایت کی کہ وہ پولیس موبائل سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے لیکن پولیس موبائل تو گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے پیچھے لگ چکی تھی۔ اجے نے چلتی وین میں ڈرائیونگ خود سنبھال لی اور کچھ آگے جا کر وین کو ایک تنگ سڑک میں گھسا دیا۔ یہاں ہماری تیز رفتار ڈرائیونگ کی وجہ سے کئی گاڑیوں کو نقصان پہنچا۔ دو تین افراد زخمی بھی ہوئے لیکن یہ فائدہ ہوا کہ ہم وقتی طور پر پولیس موبائل سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے وین ڈرائیور کو چلتی گاڑی سے نیچے اتار دیا۔ جلد ہی ہم الہ آباد کے مضافاتی علاقے میں پہنچ گئے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں مگر اتنا پتا تھا کہ پورے شہر میں پولیس حرکت میں آ چکی ہوگی اور وائرلیس پر پیغام چل رہے ہوں گے۔

''ہم نے وین کو ایک جگہ کھیتوں میں چھوڑ دیا اور دو ٹولیوں کی صورت میں اپنے درمیان کچھ فاصلہ رکھ کر آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی ہم ایک ویران خشت بھٹا پر پہنچ گئے۔ یہ خشت بھٹا ڈھے چکا تھا اور یہاں بھٹے کی بنیادوں میں نیچے کی طرف دو کھولیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ہم ان کھولیوں میں جا چھپے۔ اس طرف کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ چمگادڑیں اور بلیاں تھیں یا آوارہ کتے تھے۔ ہم پورے چار دن وہاں چھپے رہے۔ آخر بھوک سے بے بس ہو گئے۔ تھوڑے سے بسکٹ اور نمکو تھے، وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ پولیس اس علاقے میں بھی ہمیں ڈھونڈ رہی ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اجے اور نوری نے باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ سردی بہت تھی۔ اجے نے اپنا منہ سر ایک گرم چادر میں لپیٹ لیا۔ نوری نے بھی اپنی چادر سے نقاب کر لیا۔ وہ دونوں میاں بیوی کے روپ میں کھولی سے نکلے اور قریبی بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ قریبی بازار بھی وہاں سے قریباً تین کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی ریلوے کالونی کی تین چار دکانیں تھیں۔۔۔ اب آگے کی بات بتاؤ نوری۔'' اقبال نے نوری کو گفتگو میں شامل کرنا چاہا۔

نوری گم صم بیٹھی تھی۔ اس کے کانوں کے جھمکے بھی اس کی طرح اداس نظر آتے تھے۔۔۔ بھانڈیل میں وہ ہمیں گھاگرے اور کھلے گریبان والی چولی میں نظر آتی تھی۔ اس کی عریاں کمر نازک شاخ کی طرح لچکتی تھی اور اس کی چال میں ایک ''مشتعل کرنے والا لہراؤ'' ہوتا تھا۔۔۔ مگر آج وہ یکسر مختلف دکھائی دیتی تھی۔

کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولی۔ ''اجے بابو اور میں بازار کے پاس پہنچے تو وہاں پولیس کی ایک گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اجے بابو نے مجھ سے کہا کہ ہم دونوں کا اکٹھے آگے جانا ٹھیک نا ہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں ایک کھمبے کے پاس کھڑا کیا اور خود سودا لینے کے لیے آگے چلے گئے۔ ابھی ان کو گئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک جیپ میرے پاس آ کر رکی۔ اس میں بھی پولیس والے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔۔۔ بی بی! تم یہاں کیا کرت ہو؟ میں نے کہا، میرا گھر والا آگے گیا ہے، میں اس کا انتظار کرت ہوں۔ انہوں نے دو چار باتیں کیں اور ان کو مجھ پر شک ہو گیا۔ انہوں نے مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھایا اور وہاں سے لے گئے۔ مجھے ایک چوکی پر زنانہ پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس والیوں نے بھی مجھ سے بہت سوال جواب کیے۔ انہوں نے میرا پتا ٹھکانا پوچھا۔ میں کچھ بھی نہ بتا سکی۔ ان کا شک پکا ہو گیا کہ میں ان چھ لوگن میں سے ہوں جو پانچ دن پہلے ہوٹل سے غائب ہوئے تھے۔

''کوئی تین گھنٹے تک چوکی میں رکھنے کے بعد مجھے ایک کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ایک کمرا تھا جو دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا۔ یہاں مارنے پیٹنے کا سامان بھی پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بھاری مونچھوں اور سوجی سوجی آنکھوں والا ایک افسر کمرے میں آیا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی بندہ تھا جو آپ دونوں کو ہوٹل سے پکڑ کر لے گیا تھا۔ وہ بہت خراب بندہ تھا۔ اس نے مجھے گالیاں دیں اور بہت ڈرایا دھمکایا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کمرے میں دھواں چھوڑ دیوے گا اور میں کھانس کھانس کر مر جاؤں گی۔ وہ بہت برا بندہ تھا۔ اس نے مجھے بہت تھپڑ مارے اور دیواروں کے ساتھ پٹخا۔۔۔ میرا بازو ٹوٹ گیا اور۔۔۔''

نوری کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکنے لگی۔

میڈم صفورا نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی۔ میڈم صفورا نے باقی کی روداد انگلش میں بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ڈی ایس پی موہل بالکل جنونی بندہ تھا۔ یہ نوری سے ہمارا پتا ٹھکانا پوچھنا چاہتا تھا۔ اس نے نوری کو 'ریپ' کرنے کی کوشش بھی کی۔۔۔ مگر یہاں ہمیں موہل کی بیوی کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ اس کا نام عاصمہ ہے اور عطاالرحمان اس کا سگا

بھائی ہے۔ جب سجاد موہل نشے میں چور بے کس نوری سے زیادتی کی کوشش کر رہا تھا، وہ کمرے میں آگئی۔ اس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اپنے شوہر کے سر پر پیچھے سے ماربل کے وزنی گل دان سے ضرب لگائی۔ وہ بے سدھ ہو گیا۔ عاصمہ نے نوری کو کپڑے پہنائے اور اسے فوری طور پر اپنے بھائی عطا کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے سجاد موہل کی کوٹھی سے لے کر نکل گیا۔ سجاد موہل کو کچھ زیادہ ہی چوٹ لگ گئی تھی۔ عاصمہ نے اسے گاڑی میں ڈالا اور خود لے کر اسپتال پہنچی۔ اب پتا نہیں وہ کس حال میں ہے۔“

عطاالرحمان نے کہا۔ ”سجاد بھائی اب تک اسپتال میں ہیں۔ ان کے دماغ میں خون جم گیا تھا۔ آپریشن کے ذریعے خون کا لوتھڑا نکالا گیا ہے۔ اب وہ بہتر ہو رہے ہیں۔“

”کسی طرح کا شک تو نہیں ہوا انہیں؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں جی۔“ عطاالرحمان نے جواب دیا۔ ”ابھی تک تو کوئی شک نہیں ہے۔ آگے کا پتا نہیں۔ ویسے بھی چوٹ کے بعد بھائی صاحب کافی کمزور ہو گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ...“ وہ خاموش ہو گیا۔

”کیا لگتا ہے؟“ عمران نے استفسار کیا۔

”لگتا ہے کہ اب وہ پولیس کی سروس بھی چھوڑ دیں گے۔ بہت بدلے بدلے نظر آتے ہیں وہ۔“

میری آنکھوں کے سامنے عاصمہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ ایک وفا شعار بیوی تھی۔ ایک باہمت عورت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ احسان شناس بھی تھی۔ اپنی احسان شناسی میں وہ اس حد تک گئی تھی جہاں تک جا سکتی تھی۔ وہ ہمارے لیے تو کچھ خاص نہیں کر پائی تھی لیکن اس نے نوری کے لیے اور ہمارے دیگر ساتھیوں کے لیے اپنی ہمت کے مطابق سب کچھ کیا تھا۔

عطاالرحمان نے کہا۔ ”نوری میرے پاس تھی۔ میں نے اسے اپنے ایک سکھ دوست کے گھر ٹھہرا دیا۔ اب نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ نوری ٹھیک سے بتا نہیں سکتی تھی کہ باقی لوگ کہاں ہیں۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ لوگ جہاں پر ہیں، وہاں سے تھوڑی دور دو اور خشت بھٹے ہیں۔ یہ دونوں بھٹے 11 کے ہندسے کی طرح بالکل ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ یہ دونوں بھٹے چالو ہیں اور ان میں سے رات دن دھواں نکلتا رہتا تھا۔ اب ہم نے ان دونوں بھٹوں کی تلاش شروع کی۔ ہم بھٹے تلاش کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ ہمیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید نوری کے لاپتا ہونے کے بعد باقی لوگ اپنی پناہ گاہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہوں... ساتھ ساتھ جڑے ہوئے دونوں بھٹوں کی تلاش کسی جاسوسی کہانی کی طرح تھی جی۔“

عطا نے ذرا توقف کے بعد بات جاری رکھی۔ ”میں اور میرے دوست اس جانکاری تک پہنچے کہ الٰہ آباد کے آس پاس کم از کم آٹھ جگہ ایسے جڑواں بھٹے موجود ہیں۔ اب ان میں سے ہماری مطلوبہ جگہ کون سی تھی... پھر نوری نے ایک اور جانکاری دی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ یہ اور باقی ساتھی جہاں چھپے ہوئے تھے، وہاں سے دن میں تین چار بار ریل گاڑی بھی گزرتی تھی۔ ریلوے لائن زیادہ دور نہیں تھی۔ نوری کی اس دوسری جانکاری نے ہمیں صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیا۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق اقبال صاحب، اجے صاحب اور باقی خواتین مسمار بھٹے کی کھولیوں میں موجود نہیں تھے۔ نوری کے لاپتا ہونے کے بعد وہ یہ جگہ چھوڑ گئے تھے۔ مگر پھر قسمت نے یاوری کی۔ جب ہم دونوں دوست واپس جا رہے تھے، اچانک اجے صاحب گنے کے ایک کھیت میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ انہوں نے اپنی گرم چادر کے نیچے بھرا ہوا ماؤزر پکڑ رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ہم کوئی بھی حرکت کرتے تو وہ ہمیں اڑا دیتے۔ بہرحال، ہماری اور ان کی غلط فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ اجے صاحب کو پتا چل گیا کہ ہم دشمن نہیں دوست ہیں اور نوری ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے۔ ہمیں بھی یقین ہو گیا کہ ہماری ملاقات نوری کے ساتھی اجے صاحب سے ہی ہوئی ہے۔ اقبال، میڈم صفورا، صفیہ اور بچہ مال گاڑی کے ایک خراب ڈبے میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ میں ان سب کو لے کر اپنے سکھ دوست لال سنگھ کے گھر آ گیا... اور عاصمہ کو یہ خوش خبری سنائی۔ میں ائر لائن میں اسٹیوارڈ کے طور پر کام کرتا ہوں۔ میرے سسر بھی ائر انڈیا میں ہیں۔ عاصمہ بہن کی یہ پُرزور خواہش تھی کہ میں نہ صرف اقبال صاحب اور تینوں خواتین کے سفری کاغذات تیار کرواؤں بلکہ انہیں خود پاکستان چھوڑ کر بھی آؤں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ سفری کاغذات فرضی ناموں سے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بڑے ہی اچھے ڈھنگ سے تیار کیے گئے ہیں۔ ان کو VALID کرانے میں مجھے کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اللہ نے بھی مدد کی اور اب ہم آپ کے سامنے ہیں۔“

عمران نے کہا۔ ”عطا! ہم تو ان لوگوں کو ڈھونڈنے کے لیے لمبے چوڑے پلان بنا رہے تھے۔ تم نے ایک دم نمودار ہو کر ہماری مشکلیں آسان کر دیں۔“

عطا نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”میں نے اور عاصمہ نے کوئی احسان نہیں کیا آپ پر۔ احسان تو آپ نے کیا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے عمران بھائی۔“

پھر عطا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکال کر عمران کی طرف بڑھایا۔ ”عاصمہ نے یہ خط بھی دیا ہے آپ کے لیے۔“

عمران نے لفافہ کھول کر خط پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔

ہم لوگ نوری کی چوٹ پر تبصرہ کرنے لگے۔ اس کی کلائی کی بڑی ہڈی میں فریکچر ہوا تھا۔ یہ چوٹ اسے تب لگی جب ڈی ایس پی سجاد موہل اس سے مار پیٹ کر رہا تھا۔ پھر وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس کی چوٹ کی پروا کیے بغیر اس سے زیادتی کی کوشش کی۔ یہ کوشش عاصمہ نے ناکام بنائی اور سجاد کو اسپتال پہنچا دیا۔

ہم رات گئے تک باتوں میں مصروف رہے اور ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ اگلے روز ناشتے کے بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ ہم نے اقبال اور صفورا کو اس میگا کونسرٹ شو کے بارے میں بتایا جس کی وجہ سے ہماری جان ڈی ایس پی موہل اور انڈین جیل سے بچی تھی۔ میگا شو کی تفصیلات جان کر اقبال اور میڈم صفورا بھی حیران ہوئے۔

دوپہر کے وقت ذرا تنہائی ملی تو میں نے عمران سے عاصمہ کے خط کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جھٹ خط نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ عاصمہ نے لکھا تھا۔ ”عمران بھائی جان! مجھے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بس اندازہ سا ہے کہ آپ کی جان سجاد سے چھوٹ گئی ہے اور آپ شاید پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ اللہ کرے میرا یہ اندازہ درست ہو... اور میرا یہ خط بھی عطا کے ذریعے آپ تک پہنچ جائے۔ دو سال پہلے آپ نے میرے لیے جو کچھ کیا تھا، میں اسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ انوکھے ہیں عمران... اور آپ کی ہر ادا انوکھی ہے۔ آپ نے سجاد کی زندگی بچانے اور میری زندگی سنوارنے کے لیے خود کو بلا تردد پولیس کے حوالے کر دیا تھا جیسے یہ کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔ حالانکہ یہ بہت بڑی بات تھی۔ آپ کی ساری زندگی انڈیا کی کسی جیل میں گزر سکتی تھی۔ آپ کے اس احسان کا بوجھ کم نہیں تھا کہ پچھلے مہینے آپ نے اس احسان کو دہرا دیا۔ میرے سر کی قسم کو پورا کیا اور خود کو سجاد کی سختی اور بے حسی کے حوالے کر دیا۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میں سچ کہتی ہوں مجھے الفاظ نہیں ملتے۔

”دو سال پہلے جب سجاد کا چھوٹا بھائی اور میرا دیور انور پاکستان میں ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا تو میرے دل میں بھی پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف ایک میل سا آ گیا تھا۔ لیکن آج میں اپنی اس کیفیت کے بارے میں سوچتی ہوں تو شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ ایک پاکستانی ہیں... اور اس ایک پاکستانی نے میرے دل کا سارا میل دھو دیا ہے۔ مجھے ہر اس شخص سے محبت کرنا سکھا دی ہے جس کا تعلق سرحد کے اس پار سے ہے۔ آپ ہمیشہ میری دعاؤں میں رہتے ہیں اور رہیں گے۔ سخت بیمار رہنے کے بعد سجاد بھی اب کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں۔ کاش ایک وقت ایسا آئے جب میں انہیں آپ کے پاس لے کر آؤں۔ وہ آپ سے معافی مانگیں... اور اس انوکھے احسان کا شکریہ ادا کریں جو آپ نے دو سال پہلے ان پر کیا تھا۔“

میں خط پڑھ چکا تو عمران بولا۔ ”اس خط میں دو باتیں غلط ہیں۔“

”وہ کیا؟“

”ایک تو وہ امید غلط ہے جو عاصمہ نے اس کھڑوس سجاد موہل سے لگائی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ وہ سیدھا ہو سکے۔“

”اور دوسری غلط بات؟“

”اس نے پھر بھائی جان لکھا ہے۔“ عمران نے ٹھنڈی سانس لی اور کسی الو کی طرح اداس نظر آنے لگا۔

قریباً چوبیس گھنٹے ہمارے ساتھ گزارنے کے بعد عطاالرحمان جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہی کچھ دیر بعد جان محمد صاحب آ گئے۔ انہیں ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اقبال، میڈم صفورا اور نوری وغیرہ بخیریت واپس آ چکے ہیں۔ وہ پریشان تھے۔ انہوں نے قدرے پشیمان لہجے میں کہا۔ ”ریان سے یہ امید نہیں تھی۔ کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہے۔ اسے اپنی کمٹ منٹ پوری کرنی چاہیے تھی... یا ہمیں کم از کم اتنا ہی بتا دیتا کہ تلاش کا کام کس اسٹیج پر پہنچا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کا اس سے رابطہ نہیں ہو سکے گا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں... لیکن مجھے امید ہے وہ رابطہ کرے گا ضرور۔ شاید ابھی تک وہ اپنی شکست اور ناکامی کی تخ کے صدمے سے باہر نہیں آیا۔“

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ساتھ والے ٹی وی لاؤنج سے میڈم صفورا کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ”عمران... تابش... ادھر آؤ... دیکھو یہ کیا نیوز آرہی ہے۔“

ہم لپکتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں پہنچے۔ جان محمد صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ٹی وی چینل پر ایک سنسنی خیز بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

میڈم صفورا نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”جہاز گر گیا... پرائیویٹ جیٹ فیلکن 900 سی یہ وہی ہے جس کا تم نے بتایا تھا۔ او مائی گاڈ... یہ دیکھو نیچے پٹی میں تفصیل بھی چل رہی ہے۔“

ہم بھی سکتہ زدہ دیکھتے رہ گئے۔ یہ سی این این تھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا... ”ہمارے ذرائع کے مطابق یہ لگژری طیارہ چند ہی روز پہلے مسٹر بفیلو کی ملکیت میں آیا تھا۔ وہ اپنی ایک خاتون دوست مس امینڈا اور دو دیگر ساتھیوں کے ساتھ اس طیارے پر برمنگھم سے ہمبرگ جارہے تھے۔ ان چاروں کے علاوہ عملے کے تین افراد بھی اس لگژری طیارے میں سوار تھے۔ یاد رہے کہ مسٹر بفیلو ہوٹلنگ اور کیسینوز کے کاروبار میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ وہ کیسینوز کی ایک انٹرنیشنل چین کے مالک تھے جس کو نائٹ رائیڈر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسٹر بفیلو کی عمر پینتالیس سال تھی۔ انہوں نے اپنے پس ماندگان میں...“

عمران نے چینل بدلا۔ یہ ”وی او اے“ تھا۔ یہاں بھی یہ خبر موجود تھی۔ ایک پہاڑی پر طیارے کا سلگتا ہوا ملبا دکھایا جارہا تھا اور امدادی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ نیوز کاسٹر بتا رہا تھا کہ طیارے میں سوار سات افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ اس نے ہلاک شدگان کے ضمن میں طیارے کی ائر ہوسٹس کا ذکر بھی کیا جو ایک معروف ماڈل گرل بھی تھی۔

ہم قریباً آدھ گھنٹے تک سخت حیرت کے ساتھ اس حادثے کی خبریں سنتے رہے۔ پھر توقع کے عین مطابق وہ خبر بھی آگئی جو ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ایک انگلش نیوز چینل نے بتایا کہ اطلاعات کے مطابق مسٹر بفیلو بوائڈ نے یہ تین انجن والا جیٹ جہاز جوئے کی کسی بڑی بازی میں جیتا تھا۔ اس بازی یا کہہ لیں کہ انعامی بازی میں کئی ایسے معروف افراد نے حصہ لیا تھا جن کا تعلق کیسینو کے کاروبار سے ہے۔ ان میں مسٹر بفیلو کے کاروباری حریف مسٹر ریان ولیم بھی شامل تھے۔ اطلاعات کے مطابق مسٹر ریان ولیم کا بھتیجا تھوڑے سے مارجن کے ساتھ یہ مقابلہ جیت نہیں پایا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم نے ٹی وی بند کیا اور تبصرے میں مصروف ہو گئے۔ عمران بولا۔ ”اس کو کہتے ہیں بال بال بچے۔ ہمارا آخری جواب درست ہوتا تو آج یقیناً بفیلو کے بجائے وہ موٹا ریان ولیم آنجہانی ہو چکا ہوتا۔“

جان محمد صاحب نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کھوئی کھوئی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بولے۔ ”میرا خیال ہے... ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک بار پھر تمہاری ”لک“ کام کر گئی ہے۔ یعنی جس کو ہم بدقسمتی سمجھے تھے، وہ خوش قسمتی نکلی۔“

اقبال اور میڈم صفورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ جان محمد صاحب نے کہا۔ ”خبروں کے مطابق بظاہر یہ فیلکن تکنیکی خرابی کی وجہ سے تباہ ہوا ہے۔ کوئز شو کے روز یہ ”تکنیکی خرابی“ کسی کے حصے میں بھی آسکتی تھی۔“

میڈم صفورا نے کہا۔ ”مسٹر بفیلو کی اس طیارے میں یہ شاید دوسری پرواز تھی۔“

اقبال بولا۔ ”اسے پہلی ہی کہنا چاہیے۔ نیوز کے مطابق پہلی پرواز تو برمنگھم شہر کے اوپر تھی اور بالکل مختصر سی تھی۔ شاید دس پندرہ منٹ کی۔“

اس خبر نے ہمیں حیرت کے ساتھ ساتھ صدمے سے بھی دوچار کیا تھا۔ کچھ بھی تھا، یہ ایک المناک حادثہ تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ایک طمانیت کے احساس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ شاندار فیلکن 900 سی ریان ولیم کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ ریان ولیم، اس کا بھتیجا گیری یا پھر ہم میں سے بھی کوئی اس حادثے کا لقمہ بن سکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد جان محمد صاحب کے سیل فون پر مسٹر ریان ولیم کی کال آگئی۔ اس نے جان محمد صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے طیارے کے حادثے کی خبر سن لی ہے؟

جان محمد صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔

دونوں میں دس پندرہ منٹ تک اس بارے میں بات ہوئی۔ پھر جان محمد صاحب نے عمران سے کہا کہ ریان ولیم، اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ عمران نے بات کی۔ بات کرتے ہوئے اس نے فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ دوطرفہ گفتگو ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ ریان کی آواز آئی۔

”ہیلو مسٹر ایمران! تم کیسے ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں... اور آپ؟“

”میں بھی خیریت سے ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے بخیریت ہونے میں کچھ نہ کچھ تمہارا بھی ہاتھ ہے۔ بظاہر جو کچھ ہمارے نقصان میں نظر آرہا تھا، وہ دراصل فائدے میں تھا۔ ہمیں وقتی طور پر ضرور شاک پہنچا لیکن اب یوں لگ رہا ہے کہ ہم اس روز اپنی سلامتی جیت کر اٹھے تھے اور بفیلو اپنی زندگی ہار کر اٹھا تھا۔“

”بس جی، یہ اتفاقات ہیں زمانے کے...“

ذرا توقف کے بعد ریان ولیم نے کہا۔ ”تمہارے ساتھیوں کا کیا بنا؟“

”آپ کو ان کا خیال کیسے آگیا؟“ عمران نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں کچھ دن تک اس کام کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ لیکن اب میں پھر سے کوشش شروع کرتا ہوں۔“

”پھر سے کوشش کی ضرورت نہیں جناب... وہ لوگ پاکستان پہنچ گئے ہیں اور اس وقت میرے ساتھ ہیں۔ جو کام آپ اور ہم نہیں کر سکے، وہ ایک اکیلی عورت نے کیا ہے۔“

”زبردست مسٹر ایمران! یہ خبر تو تم نے بہت اچھی سنائی ہے۔ کیسے ہوا یہ سب؟“

”جیسے آپ ہمیں اچانک اٹھا کر الہٰ آباد سے لاہور لے آئے تھے، اسی طرح ان لوگوں کو بھی خدا کا ایک بندہ مل گیا۔ وہ انہیں یہاں لے آیا...“

عمران اور مسٹر ریان ولیم کے درمیان کچھ دیر تک مزید بات ہوئی۔ آخر میں ریان نے کہا۔ ”ایمران! ہمارے درمیان رابطہ رہے گا۔ مجھے اس واقعے پر بھی بہت افسوس ہے جو لاہور میں تمہارے اور میرے دوست فورڈ کے درمیان پیش آیا۔ میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔“

”اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں جی۔ جو ہو گیا، وہ ہو گیا۔“

☆☆☆

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ میں اور عمران ایک ہی کمرے میں سو رہے تھے۔ میں حسب معمول فرش کے سخت بستر پر تھا۔ سونے سے پہلے میں نے قریباً دو گھنٹے تک مارشل آرٹ کی کڑی مشق کی تھی۔ اس وقت تھک کر چور ہو رہا تھا۔ ایسی تھکن اب مجھے تکلیف کے بجائے راحت دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ میں اپنے اس جسم کو سزا دے رہا ہوں جس نے ماضی میں مجھے سستی، بزدلی اور ذلت کے تاریک غاروں میں پھینک رکھا تھا۔ بارونداجیکی کے فلسفے کے مطابق میں اپنی ذات سے لڑتا تھا، اپنے نفس کو مارتا تھا۔ میری خوراک بہت سادہ ہو چکی تھی۔ میں سادہ ترین لباس پہن رہا تھا اور موسم کی شدت سے نبرد آزما ہونا میرا مشغلہ بن چکا تھا... عاطف، فرح اور جیلانی میری تبدیلیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔

موبائل کی گھنٹی نے مجھے بیدار کیا۔ عمران بستر پر سو رہا تھا۔ یہ اسی کے موبائل کی گھنٹی تھی۔ میں نے اسکرین پر نام پڑھا۔ ریان ولیم کا نام دیکھ کر میں چونکا۔ میں نے عمران کو جگایا۔

”کیا ہوا؟“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”تمہارے ابا جی کا فون ہے۔“ میں نے اسے موبائل تھماتے ہوئے کہا۔

اس نے بھی اسکرین پر نام دیکھا اور بُرا سا منہ بنا کر کال ریسیو کی۔ ”ہیلو ایمران؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”جی میں بول رہا ہوں۔ کیا ملکہ الزبتھ قاتلانہ حملے میں ماری گئی ہے؟“ عمران نے آخری فقرہ اردو میں کہا۔

”کیا کہا تم نے؟“ ریان ولیم نے پوچھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں، اتنی رات گئے آپ کا فون؟“

”بات ہی کچھ ایسی ہے۔“ ریان کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔ موبائل فون کا اسپیکر آن تھا اس لیے اس کی آواز بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

”کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے؟“

ریان ولیم کی آواز ابھری۔ ”میں لک پر بھروسا کرنے والا شخص ہوں۔ اور میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے تمہاری لک پر بھروسا ہے۔ یہ بھروسا کیوں تھا؟ اس لیے کہ میں لکی بندے کو پہچان لیتا ہوں۔ میری اس صلاحیت نے مجھے کم کم ہی دھوکا دیا ہے۔“

عمران مسکرایا۔ ”کیا آپ نے مجھے یہی بتانے کے لیے آدھی رات کو فون کیا ہے؟“

”تمہارے لیے آدھی رات ہو گی لیکن یہاں امریکا میں دوپہر ہے۔ ایک بڑی چمکیلی اور خوش قسمت دوپہر۔“

”خوش قسمت دوپہر؟“ عمران نے پوچھا۔

”ہاں ایمران! تمہیں پتا ہے نا کہ آخری سوال کا جواب غلط ہونے کی وجہ سے ہم مقابلے کے ابتدائی انعام پر آگئے تھے۔ یعنی بنیادی انعام پینسٹھ ہزار ڈالرز۔ پتا ہے گیری نے ان پینسٹھ ہزار ڈالرز کا کیا کیا؟“

”کیا کیا؟“

”اس نے کیلیفورنیا میں یونہی راہ چلتے چلتے ان پینسٹھ ہزار ڈالرز کے لاٹری ٹکٹ خرید لیے۔ اس ریاستی لاٹری کے لیے چار بڑے انعامات نکلتے ہیں۔ گیری کا دوسرا بڑا انعام نکل آیا ہے۔ پتا ہے یہ کتنا ہے؟“

''کتنا ہے جناب؟''

''آٹھ ملین ڈالرز... پورے آٹھ ملین ڈالرز۔'' ریان کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ ''تم کئی ہو بھئی۔ مجھے پہلے بھی اس میں شبہ نہیں تھا، اب بھی نہیں ہے۔''

''آپ میرے لیے اس طرح کا گمان کرتے ہیں، اس کے لیے آپ کا شکریہ۔'' عمران کا لہجہ روکھا پھیکا تھا۔

''میں بہت جلد پھر پاکستان آرہا ہوں۔ پروفیسر ریگا بھی میرے ساتھ ہوگا۔ کچھ اور کام بھی ہیں لیکن سب سے اہم کام تم سے ملنا ہوگا۔''

کچھ دیر بعد یہ بات چیت ختم ہوئی تو عمران نے تکیے سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی اور بولا۔ ''دنیا مطلب دی او یار۔ مطلب ہووے تے پیار وی کردے ظالم دنیا دار۔''

''یہ تو واقعی چمتکار ہوا ہے عمران۔ جو بدترین ہار نظر آرہی تھی، وہ ایک مناسب جیت میں بدل گئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو پینسٹھ ہزار ڈالرز اس انعامی مقابلے میں جیتے گئے، وہ پینسٹھ ہزار ڈالرز نہیں تھے۔ وہ آٹھ ملین ڈالرز تھے قریباً ساٹھ کروڑ پاکستانی روپیا۔''

''کہنے کو تو اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر! خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نے کہا ہے نا کہ اتفاقات ہیں زمانے کے۔ اب پروگرام کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کل کا پروگرام۔''

''تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اپنی گرل فرینڈ سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟''

''کس کی بات کررہے ہو؟''

''شاہین کی اور کس کی؟ تمہاری سرکس کی ساتھی۔ موت کے کنوئیں کی ساتھی... اور شاموں اور راتوں کی ساتھی۔''

''یہ آخری بات تم نے بالکل غلط کی ہے۔ میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ تم پر 'توہین چینل' کا مقدمہ ہوسکتا ہے۔ شاموں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن وہ میری راتوں کی ساتھی نہیں ہے... بلکہ کوئی بھی راتوں کی ساتھی نہیں ہے۔ یہ باب اب ہمیشہ کے لیے بند ہوچکا ہے...''

''چلو جو بھی ہے لیکن کچھ تو خوف خدا کرو۔ تمہیں چوبیس روز ہوگئے ہیں لاہور میں قدم رنجہ فرمائے ہوئے لیکن ابھی تک اسے شکل بھی نہیں دکھائی۔''

''میں نے ابھی شکل دکھائی ہی کسے ہے؟ ابھی تو میں لاہور سے بھی ٹھیک طرح سے نہیں ملا۔ میرے گلی کوچے... میرے لوگ... میرے بازاروں کی رونقیں سب کچھ مجھ سے دور ہے۔ یہاں آتے ہی یہ ریان ولیم والا ٹینٹا کھڑا ہوگیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے سب کچھ۔''

''تو چلو ٹھیک ہے۔ کل لاہور سے ملیں گے۔''

''ضرور ملیں گے۔ اور میرے خیال میں یہ ایک تیر سے دوشکار والی بات ہوگی۔'' عمران نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''بچوں کے لیے ہر بات کا سمجھنا ضروری نہیں ہوتا۔ کئی باتیں اور فلمیں صرف اٹھارہ سال سے اوپر کے لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے تایا جی۔'' میں نے کہا۔

''یار! ایک بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ اٹھارہ سال کی حد کیوں رکھی گئی ہے؟ کیا اس عمر میں بندہ بہت مضبوط ہوجاتا ہے؟ یہ تو بہت طوفانی عمر ہوتی ہے۔ حد ہونی چاہیے پینتیس سال چالیس سال یا پھر اٹھاسی سال سے اوپر۔ یوں بے راہ روی کا کوئی خطرہ تو نہیں رہے گا۔''

''خطرہ تو پھر خطرہ ہوتا ہے۔'' میں مسکرایا۔

''تم اپنے آباؤ اجداد کا کوئی تجربہ بیان کررہے ہو۔ میں عام بات کررہا ہوں۔''

میں نے گھونسا تانا تو وہ اچھل کر بیڈ سے نیچے جا کھڑا ہوا۔

اب ہم میں خاصی بے تکلفی پیدا ہوچکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو بے دریغ لتاڑتے تھے۔ زبانی بھی اور جسمانی بھی۔ مجھے پھر اس لاٹری کا خیال آگیا جس کا دوسرا بڑا انعام برص زدہ گیری کو ملا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس خطیر انعامی رقم سے بہت سی ریان ولیم کے گنبد نما بیت میں چلی جاتی۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو گیری کے حصے میں آہی جاتا تھا۔ وہ اس ''کچھ نہ کچھ'' سے بھی اپنی بہت سی خواہشات پوری کرسکتا تھا۔ اسے ایک ڈیڑھ ملین بھی مل جاتا تو بہت تھا۔ میں نے تصور کی نظروں سے گیری گرانٹ کے افسردہ چہرے کو خوشی کی روشنی میں چمکتے دیکھا۔ میں اور عمران دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ میں اور عمران ایک موٹر سائیکل پر سوار لاہور کی سیر کے لیے نکلے۔ یہ وہی موٹر سائیکل تھی جو کئی برسوں سے موت کے کنوئیں میں عمران کی ساتھی تھی۔ ایک شیطانی چرخا۔ جب یہ چلتی تھی تو لگتا تھا کہ پوری دنیا میں بس اسی کی گونج ہے۔ عمران کی فرمائش پر جان محمد صاحب نے کل ہی یہ موٹر سائیکل سرکس سے منگوائی تھی۔ جان محمد صاحب نے عمران ہی کی فرمائش پر ابھی تک اس کے

شاہین کی ان میں خاص تھی۔

ہم دونوں ہیلمٹ پہن کر اس "تاریخی" موٹر سائیکل پر بیٹھے اور لاہور میں گم ہو گئے۔ عمران ایک گرمی میں جلتے ہوئے پیراک کی طرح تھا اور وہ لاہور کے ٹھنڈے تالاب میں غوطہ زن ہو گیا تھا۔ مال روڈ، لوئر مال روڈ، میکلوڈ روڈ، سر آغا خاں روڈ، فیروز پور روڈ۔ وہ کون سی سڑک تھی جس کے سکون کو اس موٹر سائیکل کے شور نے تہ و بالا نہیں کیا۔ وہ بلا کی رفتار سے چلاتا تھا اور اس کے پیچھے بیٹھنا بھی دل گردے کا کام تھا۔ جیل روڈ کے قریب ایک چوراہے پر وہ دائیں جانب سے آنے والے ایک ٹرک کے سامنے سے اتنی تیزی سے گزرا کہ مجھے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑیں۔ "یار! اب اتنے بھی شوخے نہ ہو۔ مانا کہ تمہاری جان ہتھیلی پر ہے لیکن دوسروں کی جان تو ہتھیلی پر نہ رکھو۔"

"یار! کبھی موٹر سائیکل کے نیچے آ کر بھی ٹرک تباہ ہوا ہے۔"

"یہ بالکل بیکار دلیل ہے تمہاری۔ ٹرک ڈرائیور گھبرا کر ٹرک کو گندے نالے میں بھی گرا سکتا تھا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ رفتار کچھ کم کر دیتے ہیں۔ اب ساٹھ سے اوپر نہیں جاؤں گا۔"

"یعنی تمہارے خیال میں ساٹھ کم ہے؟"

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، ٹریفک پولیس کی موٹر سائیکل کا ہوٹر سنائی دیا۔ وہ ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

"لو اب بھگتو... اشارہ کاٹا تھا تم نے۔ تمہارا چھوٹی زاد پیچھے لگ گیا ہے۔"

عمران نے بھی عقب نما آئینے میں ٹریفک سارجنٹ کو دیکھ لیا۔ پھر عمران نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ رفتار کم کرنے یا موٹر سائیکل روکنے کے بجائے اس نے رفتار مزید بڑھا دی۔ اگلے پانچ منٹ تک ٹریفک سارجنٹ اور عمران کے درمیان اچھی خاصی ریس ہوئی۔ ایک اور ٹریفک سارجنٹ بھی اس "کارِ خیر" میں شریک ہو چکا تھا مگر وہ عمران ہی کیا جو ان لوگوں سے پکڑا جاتا یا خوف کھا کر رک جاتا۔ وہ موت کے کنوئیں کا کھلاڑی تھا... بلکہ اس سے بھی آگے کی چیز تھا۔ کسی بھی گیم کو "گیم آف ڈیتھ" بنا کر اسے مزا آتا تھا۔ بہر حال، میرے کہنے پر اس نے بے چارے سارجنٹس کو زیادہ "خجل" نہیں کیا اور داتا دربار کے قریب اپنے شیطانی چرخے کو ایک تنگ گلی میں گھسا دیا۔ پھر ایک اور زیادہ تنگ گلی

آیا۔

یہ وہی علاقہ تھا جہاں عمران مجھے پہلے دن کی ملاقات کے بعد لایا تھا۔ ان واقعات کو چار سال سے اوپر کا وقت گزر چکا تھا مگر اب بھی یہاں زیادہ کچھ نہیں بدلا تھا۔ سڑک ویسی ہی شکستہ تھی۔ کھمبوں پر ویسے ہی بجلی کے تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ تھڑوں پر ویسے ہی سب نکمے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ عمران کی موٹر سائیکل کی آواز نے جیسے اس سارے علاقے میں صور... پھونک دیا۔ لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ ان گنت چہروں پر حیرت آمیز مسرت کی یلغار ہوئی۔ عمران نے ہیلمٹ اتار دیا اور اپنے پسندیدہ چوراہے میں جا کھڑا ہوا۔

بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہیرو بھائی، ہیرو بھائی کی آوازیں بلند ہوئیں... میں نے چار برس پہلے کے چاچے رفیق کو دیکھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا آیا۔ اس نے عمران کو گلے لگایا... پوپلے منہ سے بولا۔ "پتر کہاں رہے اتنی دیر؟ ڈیڑھ سال سے اوپر ہو گیا تمہیں شکل دکھائے ہوئے۔ بڑے برے برے خیال آتے تھے ہمیں۔ لگتا تھا کہ پورا محلہ ویران ہو گیا ہے۔"

"بس آ گیا ہوں نا۔ اب آپ کے آس پاس ہی رہوں گا۔ اور زاہد بھائی! یہ جھنڈیاں شنڈیاں کس سلسلے میں ہیں؟ کیا آپ کو پتا تھا کہ میں تشریف لا رہا ہوں..."

عمران کا پڑوسی زاہد بولا۔ "ہمیں پتا ہوتا تم آ رہے ہو تو پھر ان جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ ڈھول ڈھمکا اور باجا گاجا بھی ہوتا۔ یہ تو نذیرے کی شادی کی جھنڈیاں ہیں... چاچے نذیرے کی شادی ہو رہی ہے ہفتے کے دن۔ آپ بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔"

"بھائی زاہد! تم مذاق تو نہیں کر رہے؟ چاچا نذیرا اور شادی؟"

"ہاں، یہ لمبی کہانی ہے ہیرو بھائی۔" لمبے بالوں والا ایک لڑکا بولا۔ "جوانی میں چاچے نذیرے کی ایک منگیتر تھی۔ دو سال رہی تھی یہ منگنی پھر ٹوٹ گئی۔ لڑکی کی شادی کہیں اور ہوئی، ہمارے چاچے نذیرے کی شادی کہیں اور۔ اور پھر پینتالیس پچاس سال گزر گئے۔ اب دونوں اکیلے ہیں۔ دونوں کے جیون ساتھی دیر ہوئی، اللہ میاں کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ دونوں کو ساتھی کی ضرورت ہے۔ ہم سب محلے والے مل کر امام صاحب کے پاس گئے۔ ان کی اجازت اور رضامندی سے ہم لوگ چاچے نذیرے اور چاچی کلثوم کی

محلے نے ڈولی اٹھنی ہے۔"

"زبردست... یہ تو بڑی فائیو اسٹار قسم کی خبر سنائی ہے تم لوگوں نے۔" عمران نے کہا۔

عمران کی آمد پر لوگوں کی خوشی دیدنی تھی۔ ہم سب کے ساتھ ہی سیمنٹ کے تھڑے پر بیٹھ گئے۔ کوئی ہمارے لیے حلوہ پوری لے آیا، کوئی چائے، کوئی گاجر کا حلوہ۔ ایک لڑکی نے چوبارے کی تیسری منزل سے ٹوکری لٹکائی اور زور سے بولی۔ "عمران بھیا! گرم نہاری۔"

"شکریہ... شکریہ۔" عمران نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

کئی چھوٹے لڑکے عمران کے شیطانی چرخے کے اردگرد گھوم رہے تھے اور اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک موٹر سائیکل کے ہوٹر کی آواز سنائی دی۔ عمران کی تلاش میں بھٹکنے والے ٹریفک سارجنٹس میں سے ایک یہاں پہنچ گیا تھا۔ "لو کر لو تماشا۔" میں نے عمران سے کہا۔

سارجنٹ نے عمران کی کھٹارا موٹر سائیکل دور ہی سے دیکھ لی تھی۔ وہ غصے میں تپا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ لوگوں کے درمیان سے گزر کر وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ "السلام علیکم سارجنٹ بھائی۔" عمران نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔

"یہ تمہاری بائیک ہے؟" سارجنٹ نے کرخت لہجے میں کہا۔

"میں اس کا مالک ہونے پر شرمندہ ہوں۔ لیکن میں اس ملکیت سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا... موٹر سائیکل سمیت۔" سارجنٹ کو وردی کی موجودگی نے ایک دم پتھر کا بنا دیا تھا۔

عمران نے منت سماجت کی لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ وہ بار بار اپنے واکی ٹاکی کو اپنے منہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ غالباً اپنے ساتھیوں کو اپنی لوکیشن بتانا چاہتا تھا۔ یکایک ایک عمر رسیدہ باریش شخص آگے بڑھا اور اس نے سارجنٹ کے ہاتھ سے واکی ٹاکی چھین لیا۔ وہ گرج کر بولا۔ "ہم تمہیں کچھ نہیں کرنے دیں گے ہیرو پتر کے خلاف۔ یہ ڈیڑھ سال بعد آیا ہے یہاں۔ ہماری آنکھیں ترستی ہوئی ہیں اس کے لیے۔ تم اسے تھانے لے جانا چاہتے ہو؟"

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مظاہرے کی سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ ایک ادھیڑ عمر پھل فروش بولا۔ "ہماری یونین ہے ... ثبوت ہیں... ہم تمہارے خلاف کارروائی کرائیں گے۔ اخباروں کے دفتروں کے سامنے مظاہرہ کریں گے... تم کرو چالان۔ ہم سے بھی جو کچھ ہو سکا، کریں گے۔ یہاں کوئی بھی دودھ کا نہایا ہوا نہیں ہے۔"

سارجنٹ ذرا ڈھیلا پڑتا نظر آیا۔ لیکن وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ اتنی دیر میں ایک اور موٹر سائیکل کا ہوٹر گونجا۔ غالباً اس دوسرے سارجنٹ کو وائرلیس پر پیغام مل چکا تھا۔ اس نے طوفانی انداز میں اپنی ہیوی موٹر سائیکل موقع پر پہنچائی اور اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے عمران کی طرف بڑھا۔ عمران کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار ابھرے۔ پھر یہ آثار مسرت میں بدل گئے۔ "عمران بھائی آپ؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"بے شک میں ہوں۔ بقلم خود۔"

"اوہ گاڈ! آپ نے اتنا دوڑایا ہمیں۔ آپ نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا اس لیے پتا ہی نہیں چلا۔"

"میری بے شکل موٹر سائیکل نے تو ہیلمٹ نہیں پہن رکھا تھا۔"

"مجھے تھوڑا سا شک تو ہوا تھا لیکن...؟"

دوسرا سارجنٹ جو ذرا سینئر تھا، بدستور غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا ساتھی اسے ایک طرف لے گیا اور سمجھانے بجھانے لگا۔ وہ کبھی خاموش ہو جاتا، کبھی نفی میں سر ہلانے لگتا۔ اسی دوران میں بالا دودھ فروش، دو بڑے گلاس باداموں والے دودھ کے لے کر آیا۔ سب نے سینئر سارجنٹ کو گھیرا ڈال لیا اور زبردستی بٹھا کر دودھ پلایا۔ کوئی اس کے کندھے دبانے لگا۔ کوئی اس کی پینٹ سے مٹی جھاڑنے لگا۔ یہاں تک کہ سارجنٹ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

چاچے رفیق نے پوپلے منہ کے ساتھ پرخلوص دعا دی۔ "ہنستے ہوئے کتنا چنگا لگتا ہے۔ دیکھنا بڑی ترقی ہوگی تیری۔ وڈی عید سے پہلے پہلے "ہیڈ کانسٹیبل" بن جائے گا۔"

چاچے رفیق کی بات پر قہقہہ پڑا۔ ماحول خوش گوار ہو گیا۔ دونوں سارجنٹ ڈیوٹی پر تھے۔ وہ زیادہ دیر ہمارے ساتھ نہیں ٹھہر سکے اور واپس چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ بعد میں آنے والا سارجنٹ نواز احمد عمران کا شناسا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے کسی نئی ہنڈا گاڑی کا چالان کیا اور رجسٹریشن بک رکھ لی۔ لیکن یہ بک تھانے میں جمع کرانے سے پہلے ہی نواز احمد سے کہیں گم ہو گئی۔ نواز احمد کے لیے بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ گاڑی مالکان کا دعویٰ تھا کہ ڈپلی کیٹ بک کی وجہ سے

ان کا ڈیڑھ دو لاکھ کا نقصان ہو گیا ہے۔ نواز احمد کو نوکری کے لالے پڑ گئے۔ اس موقع پر عمران نے اپنی گرہ سے کچھ رقم دی تھی اور اس نوجوان ٹریفک آفیسر کی نوکری بچائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح کے ان گنت واقعات عمران سے منسوب ہیں۔ یہی واقعات تھے جنہوں نے بہت سی جگہوں پر لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔

عمران اور میں عمران کے پرانے گھر میں بھی گئے اور وہاں کچھ وقت گزارا۔ اس گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی زندگی کے وہ بدترین دن یاد آ گئے جب میں ہر گھڑی خودکشی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور عمران اپنی شخصیت کے تمام تر سحر کے ساتھ میرے اور میری موت کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔ تب میرا اور اس کا کوئی واسطہ، کوئی تعلق نہیں تھا مگر وہ اپنوں سے کہیں بڑھ کر میرے لیے فکر مند تھا۔

ہم نے اس شان دار ماحول میں قریباً چار گھنٹے گزارے۔ ہم نے لنچ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی کیا۔ لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ کر یہ ایک عوامی لنچ تھا۔ گرما گرم نان، انڈا چنے، سلاد اور آخر میں ملائی والی دودھ پتی۔ جوں جوں اردگرد کے لوگوں کو عمران کی آمد کا پتا چل رہا تھا، وہ اس سے ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ اس سے اپنے دکھ سکھ بیان کر رہے تھے۔ گفتگو کا ایک دلچسپ موضوع چاچے نذیرے کی شادی بھی تھا۔ عمران نے وعدہ کیا کہ وہ نذیرے کی شادی میں ضرور شرکت کرے گا اور چاچے، چاچی کو سلامی بھی دے گا۔

تین بجے کے قریب عمران کی موٹر سائیکل پھر اسٹارٹ ہوئی اور آدھے لاہور کو پتا چل گیا کہ پھر اسٹارٹ ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ "اس دفعہ مجھے چلانے دو۔ میں بھی تو اس کا مزہ چکھوں۔"

وہ بولا۔ "میں تمہاری استادی سمجھ رہا ہوں۔ گھبراؤ مت، میں آہستہ چلاؤں گا۔"

ہم نہر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے اچھرہ پہنچے۔ یہاں ہم نے عمران کے ایک پسندیدہ ریستوران میں چائے پی۔ اس ریستوران سے میری بھی ایک یاد وابستہ تھی۔ میرا دل بھر آیا۔ ایک عید کے موقع پر ہم سب گھر والے آئس کریم کھانے یہاں آئے تھے۔ کتنے سہانے دن تھے۔ میں، عاطف، فرح اور امی... ہم اصرار کر کے ثروت اور بھائی ناصر کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے... امی میرے سامنے اس کونے والی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ میں پانی پی رہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ "شاباش! تین گھونٹ میں پیتے ہیں۔"

وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں۔ میں آج بھی پانی پی رہا تھا لیکن وہ آواز کہیں نہیں تھی، وہ چہرہ کہیں نہیں تھا۔ میں نے گلاس نیچے رکھ دیا۔ آنکھیں جل اٹھیں۔ سینے میں انگارے سے دہکنے لگے۔ میری ماں کو مارنے والے کہاں تھے؟ وہ اسی شہر میں تھے شاید۔ اسی فضا میں سانس لے رہے تھے۔

میں نے عمران سے کہا۔ "عمران! ہم سیٹھ سراج کو کب ڈھونڈیں گے؟"

وہ مسکرایا۔ "بھئی، ہم ڈھونڈنا شروع تو کر چکے ہیں بلکہ... میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی حد تک کامیابی بھی مل چکی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

اس نے اپنے سر کو حرکت دیے بغیر ڈائننگ ہال کے بائیں گوشے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ راوی روڈ سے دو بندے مسلسل ہمارے پیچھے ہیں۔ نوّے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ان کا تعلق سراج وغیرہ سے ہے۔ نہ... نہ مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ انہیں شک ہوگا۔"

ایک دم مجھے یاد آیا۔ جب آج صبح ہم گھومنے پھرنے کے لیے نکلے تھے تو عمران نے ایک تیر سے دو شکار والی بات کہی تھی۔ تو کیا اس کا اشارہ اس طرف تھا؟ شاید... ایسا ہی تھا... وہ جانتا تھا کہ جب ہم اس طرح نکلیں گے اور جانی پہچانی جگہوں پر جائیں گے تو سیٹھ سراج کے کارکنوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ہمیں دیکھے گا، یا اسے ہمارے بارے میں پتا چلے گا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"جو کچھ بھی کرنا ہے لیکن اب گھر کا رخ نہیں کرنا۔ یقیناً یہ لوگ ہمارے ٹھکانے کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے۔ اور یہ ان کے نزدیک ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی۔"

ہم تقریباً پندرہ منٹ وہاں مزید بیٹھے۔ عمران سوچ میں تھا۔ اس نے دو سو روپے کے بل کے ساتھ بیرے کو پورے آٹھ سو روپے ٹپ دے دی۔ بیرے کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ آج صبح جب ہم گھر سے نکلے تو عمران کی جیکٹ کی جیب میں ایک موٹی رقم موجود تھی۔ اب اس رقم میں سے تھوڑی ہی بچی تھی۔ اس نے یہ روپے اپنی جان پہچان والے مختلف ضرورت مندوں میں تقسیم کیے تھے۔ بیس ہزار کی رقم موج میلے کی مد میں خرچ ہوئی۔ یہ بیس ہزار روپے اس نے چاچے نذیرے کی شادی کے انتظامات مزید بہتر کرنے کے لیے دیے تھے۔

ہم ریسٹورنٹ سے نکلے اور اپنے شیطانی چرخے پر آ بیٹھے۔ عمران نے عقب نما آئینہ درست کرلیا۔ اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ اس نے راوی روڈ سے روانہ ہونے کے بعد طوفانی رفتار اختیار کیوں نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جارہا ہے۔

یہ "پیچھا" ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ وہ دونوں افراد بھی بائیک پر تھے۔ واقعی اب گھر جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عمران یونہی اِدھر اُدھر موٹر سائیکل گھمانے لگا۔ "کیا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی سنسان سڑک پر چلتے ہیں۔ وہاں جاکر ان سجن پیاروں سے ہیلو ہیلو کرتے ہیں۔"

لیکن صرف ایک دو منٹ بعد عمران قدرے متفکر نظر آیا۔ وہ بار بار عقب نما آئینہ دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"یار! عجب اناڑی لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ لگتا ہے "پراپر" طریقے سے کسی شریف بندے کا پیچھا کرنے کا پتا ہی نہیں ہے انہیں۔ اب پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں۔"

"تم بھی تو موڑ پر موڑ کاٹ رہے ہو۔"

"لیکن یار، رفتار تو معمولی سی ہے۔ اتنی رفتار پر تو کوئی نابالغ بدمعاش بھی تعاقب جاری رکھ سکتا ہے۔"

اس نے جھلا کر موٹر سائیکل روک دی۔ ہم دونوں بدستور عقب نما آئینے میں دیکھ رہے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ دونوں بندے واقعی کوئی غلط موڑ کاٹ گئے ہیں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد عمران نے موٹر سائیکل واپس موڑ دی۔ ہم انہی راستوں پر واپس ہوئے۔ یہ دلچسپ صورتِ حال تھی۔ ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "اس کمینے سیٹھ سراج کے کارندے ایسے اناڑی نہیں ہوسکتے۔ کہیں یہ کوئی اور معاملہ نہ ہو۔"

"کبھی کبھی تم عقل کی بات کر ہی جاتے ہو۔" عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

ابھی ہم کچھ ہی آگے گئے تھے کہ دور فاصلے پر وہ دونوں افراد اپنی موٹر سائیکل سمیت ایک پان شاپ کے قریب کھڑے نظر آئے۔ ہماری طرف ان کی پشت تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھ رہے تھے۔ ہماری موٹر سائیکل کی آواز... ٹریفک کے شور کے باوجود دور ہی سے ان کے کانوں میں پڑگئی۔ وہ چونک کر ہماری جانب دیکھنے لگے۔ اس وقت یقیناً ان کی سٹی گم ہوگئی ہوگی جب عمران نے اپنی تجوبہ بائیک عین ان کے پہلو میں جا کھڑی کی۔

انہوں نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ وہ دونوں شلوار قمیص میں تھے۔ ایک نے سوئیٹر بھی پہن رکھا تھا۔ دونوں کی عمریں پچیس چھبیس سال رہی ہوں گی۔ دیکھنے میں وہ بالکل عام سے دکان دار ٹائپ افراد نظر آتے تھے۔ عمران نے موٹر سائیکل پر آگے بیٹھے ہوئے نوجوان سے پوچھا۔ "ماچس ہوگی تمہارے پاس؟"

"نن... نہیں۔" وہ ہکلایا۔

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔" عمران بولا۔ "تم اتنی دور سے ہمارے پیچھے پیچھے آرہے ہو۔ یقیناً تمہیں اپنا سگریٹ جلانا ہوگا۔ یہ لو۔" عمران نے اپنا سگریٹ لائٹر اس کی طرف بڑھایا۔

"کیا... مطلب... جی؟"

"مطلب کے بچے۔ پیچھا کیوں کررہے ہو ہمارا؟ کوئی لڑکی نہیں ملی تمہیں۔" عمران پھنکارا۔

"وہ تو... وہ جی... ہم تو..." وہ بُری طرح ہکلایا۔

"ہم تو... تم تو... چھوڑو۔ سیدھی طرح بتاؤ۔ ورنہ ابھی یہاں مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔ بھرکس سمجھتے ہو نا تم؟"

دونوں بندوں کے رنگ پیلے پڑ گئے۔ صاف پتا چلا کہ وہ اس قماش کے لوگ نہیں ہیں۔ یا تو چھوٹے موٹے جرائم پیشہ ہیں یا کسی اور چکر میں ہمارے پیچھے ہیں۔ عمران نے ان کی موٹر سائیکل کی چابی نکال لی۔ چند ہی منٹ بعد ہم دونوں ان دونوں کے ساتھ ایک سستے سے چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ اب بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ "کیا چکر ہے صاف صاف بتاؤ۔ اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔" عمران نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم... ہم آپ سے ملنا چاہتے تھے۔" ان میں سے ایک بولا۔

"کیوں، میں نے دیوتا لگتا ہے یا ہیری پوٹر میں کام کیا ہے؟"

"وہ جی... دراصل۔" وہ ہکلا کر بولا۔

"اور تمہاری شکل مجھے کچھ پہچانی سی لگ رہی ہے۔ تم راوی روڈ پر تو نہیں رہتے ہو؟" عمران نے قدرے فربہ نوجوان سے پوچھا۔

"جج... جی ہاں۔ میں ادھر ہی رہتا ہوں۔ در... دراصل کسی نے کہا تھا کہ آپ جب بھی مجھے نظر آئیں، میں آپ سے ملوں اور آپ کو اس کے پاس لے کر آؤں۔"

"یہاں لاہور میں مجھے سب سے زیادہ فلمسٹار ریما ہی چاہتی ہیں۔ دوسرا نمبر نرگس کا ہے لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی تم جیسے گاؤدی کندو کو ملازم نہیں رکھ سکتی۔ بتاؤ کون ہے وہ؟ اور کہاں رہتی ہے؟"

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ تصدیق کیے بغیر ہی مونث کا صیغہ استعمال کررہا تھا۔ یہ بھی اس کی ہلکی پھلکی گفتگو کا انداز تھا۔

"وہ ہمارے پیر جی ہیں جی۔ پیر شوکت تھانوی صاحب۔ یہاں لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ وہ کافی عرصے سے آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔"

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ "یار! مجھے تھانوی کے لفظ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کہیں یہ "تھانے" سے تو نہیں نکلا ہوا۔ اگر ایسا ہے تو پھر پیر تھانوی کا مطلب تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ ابھی الٰہ آباد والے پیر تھانوی سے بمشکل جان چھڑائی ہے۔"

"کس مقصد سے ملنا چاہتے ہیں تمہارے پیر صاحب؟" میں نے فربہ اندام شخص سے پوچھا۔

"انہوں نے بتایا نہیں۔ لل... لیکن آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوا ہوں؟" عمران نے دریافت کیا۔

"سچ پوچھیں جی تو میں پچھلے تقریباً آٹھ ماہ سے آپ کا انتظار کررہا تھا۔ میں آتے جاتے آپ کے خالی گھر پر نظر ڈالتا تھا۔ آج گھر میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ آپ کی موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ میں دوڑا ہوا باہر نکل آیا۔"

"تم چھپا رہے ہو۔" عمران نے کہا۔ "تمہارے پیر صاحب ہیں اور تمہیں ہی پتا نہیں کہ وہ کیوں اتنی بےقراری سے میرا انتظار فرما رہے ہیں۔"

وہ ذرا تذبذب میں رہ کر بولا۔ "مجھے زیادہ تو پتا نہیں جی۔ یہ کوئی ایسا مریض ہے جس کا وہ علاج کررہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے علاج کے لیے ان کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ پوری بات تو آپ کو پیر صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے، چلو ان کے پاس۔ ابھی ملاقات کر لیتے ہیں۔ لیکن جانا کہاں ہے؟"

"یہیں جی۔ شاہ جمال موڑ کے قریب۔" اُبھرے بدن والے نے جواب دیا۔

ہم چائے خانے سے باہر نکل آئے۔ عمران نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "تم اس موٹے لدو کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں اس کے ساتھی کو بٹھا لیتا ہوں۔"

ہم اسی ترتیب کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے۔ اب شام ہونے والی تھی۔ ہم مختلف سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے شاہ جمال کے علاقے کی طرف نکل آئے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی آستانہ نما جگہ ہوگی لیکن یہ تو ایک اچھی خاصی رہائشی کوٹھی تھی۔ ہم لان میں داخل ہوئے اور دونوں موٹر سائیکلیں بند کردیں۔ عمران کی جیکٹ میں بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ یہاں ہمیں کسی طرح کے حالات بھی پیش آسکتے تھے۔ ہمیں ایک ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ یہاں الماریوں میں بہت سی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

زیادہ تر مذہبی علوم کے بارے میں تھیں۔ کچھ تاریخی نوعیت کی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ پیر صاحب آرام فرما رہے تھے۔ انہیں جگا دیا گیا ہے۔ وہ ابھی دو چار منٹ میں تشریف لے آتے ہیں۔ اور پھر پیر صاحب جلوہ افروز ہوئے۔ پیروں، فقیروں اور عاملوں وغیرہ کے حوالے سے میرے ذہن میں جو بھی تصورات تھے، وہ ان سے مختلف نکلے۔ ان کا رنگ سرخ و سپید تھا۔ انہوں نے ایک لمبا سفید چغا پہن رکھا تھا۔ داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ عمر پچاس کے قریب تھی۔

انہوں نے نرم الفاظ میں ہم سے بات چیت کی اور حال احوال پوچھا۔ عمران سے مخاطب ہوکر بولے۔ "تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی بیٹا۔ مجھے کافی عرصے سے تمہارا انتظار تھا۔ تمہارا راوی روڈ والا مکان خالی پڑا تھا۔ کسی کو بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ جہاں تم کام کرتے ہو، وہاں سے بھی کچھ پتا نہیں چل سکا۔ یہ جمیل تمہارے ہی محلے میں رہتا ہے۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ جب بھی تمہارے بارے میں کچھ پتا چلے یہ مجھے بتائے۔"

عمران بھی شوکت احمد تھانوی کی شخصیت سے قدرے متاثر نظر آتا تھا۔ اس نے کہا۔ "مجھے بتائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

تھانوی صاحب کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ "میں تم سے معافی چاہتا ہوں بیٹے لیکن میں وقت سے پہلے تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"...اور وقت کب آئے گا؟" عمران نے پوچھا۔

"بہت جلدی۔ شاید دو چار دنوں میں۔" تھانوی صاحب نے کھڑکی سے باہر آسمان کو تکتے ہوئے کہا جو شام کے جھٹپٹے میں اوجھل ہوتا جارہا تھا۔

"آپ نے تجسس میں ڈال دیا ہے۔" عمران نے کہا۔

انہوں نے عمران کے شانے کو چھوا اور بولے۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بس تم یوں سمجھ لو کہ ایک مریض ہے جس کے علاج کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں انشاء اللہ تمہارا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا۔ بس ایک۔ آدھ گھنٹے کی بات ہوگی۔"

"کیا اس مریض سے میرا کوئی تعلق ہے؟"

"ہاں، پرانا تعلق بھی ہے... لیکن بیٹے، تم خود کو پریشان نہ کرو۔ بس چند دن میں سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔ اور یہ کوئی مجبوری کی بات بھی نہیں ہے۔ اگر تم چاہو گے تو مدد کرنا ورنہ منع کر دینا۔ مجھے ذرا سی بھی شکایت نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "حضرت! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ مدد کس طرح کی ہوگی؟"

"میں پھر معافی چاہتا ہوں۔ وقت سے پہلے بتانا مناسب نہیں۔ اگر کوئی عذر نہ ہو تو آپ مجھے اپنا رابطہ نمبر دے دیں۔ جیسے ہی موقع آیا، میں آپ کو بتا دوں گا۔ باقی مجھے پتا چلا ہے کہ تبیل اور اس کے ساتھی نے آپ کا پیچھا کیا تھا۔ اس کی وجہ سے آپ دونوں کو جو پریشانی ہوئی، اس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔ انہیں یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں جی۔" عمران نے کہا۔ "اگر ہمارے دل میں کچھ تردد تھا بھی تو آپ کی بات چیت سے دور ہوگیا ہے۔"

ہم تقریباً آدھ گھنٹا پیر صاحب کے ساتھ رہے۔ وہ بہت مختلف نظر آئے۔ لیکن ایک بات تھی، وہ بہت سی چیزیں پردۂ اخفا میں رکھ رہے تھے۔ عمران نے انہیں تھوڑا بہت کریدا لیکن زیادہ اصرار نہیں کیا۔ انہوں نے ہمیں پُرتکلف چائے پلائی۔ کھانے کے لیے بھی اصرار کیا لیکن ہم چلے آئے۔ ویسے بھی ان کے مریدوں اور مریضوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

ہماری واپسی موٹر سائیکل پر ہی ہوئی... پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ عمران کی پرانی روداد والا کوئی معاملہ ہے۔ اس وقت جب وہ عمران کے بجائے عمو تھا... گاؤں کے بااثر چوہدری نے اپنے اکلوتے بیٹے پر سے ایک آفت ٹالنے کے لیے عمو کو قربانی کا بکرا بنایا تھا۔ اسے اس کی روتی بلکتی بیوہ ماں سے جدا کیا گیا اور ایک بدقماش عامل کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اس موڑ پر سے عمو کی زندگی کے راستے بدلتے چلے گئے اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

"کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟" میں نے موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے بیٹھے عمران کے کان میں پوچھا۔

"میرا اندازہ تو یہی ہے کہ امریکا کو عراق سے نکلنا ہی پڑے گا۔"

"میں پیر صاحب کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔" میں نے سٹپٹا کر کہا۔

"پیر صاحب تو گوشہ نشین سے بندے ہیں یار! ان کا امریکا کی خارجہ پالیسی سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"بھاڑ میں جاؤ۔" میں نے کہا۔

یہی وقت تھا جب ہم پر پہلی گولی چلی۔ یہ رائفل کی گولی تھی اور سڑک کے کنارے کھڑی ایک ایف ایکس کار کے اندر سے ہم پر چلائی گئی تھی۔ یہ گولی موٹر سائیکل کے فریم میں کہیں لگی اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ دوسری گولی ہمارے سائلنسر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ عمران نے بریک لگائے۔ موٹر سائیکل لہراتی اور سلپ کرتی ہوئی ایک بس اسٹاپ کے شیڈ کے پیچھے چلی گئی۔ ارد گرد ٹریفک موجود تھا، کچھ لوگوں کو تو اس فائرنگ کا پتا ہی نہیں چلا مگر جن کو چلا، ان میں کھلبلی محسوس ہوئی... میں نے صاف دیکھا، ایف ایکس میں صرف ایک بندہ موجود تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ موٹر سائیکل زد سے نکل گئی ہے تو اس نے پوری رفتار سے گاڑی بھگا دی۔ عمران نے گری ہوئی موٹر سائیکل کو اٹھایا۔ ہم پھرتی سے اس پر بیٹھے اور تیز رفتاری سے کریم کلر ایف ایکس کے پیچھے لپکے۔

...اگلے دو منٹ میں ہم نے ایک بھری پُری سڑک پر ایف ایکس کا تیز رفتار تعاقب کیا۔ ہمیں تسلی تھی کہ گاڑی میں صرف ایک بندہ ہے۔ وہ چلتی گاڑی سے ہم پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک ایف ایکس نے ایک رکشا کو ٹکر ماری اور پھر ایک الیکٹرک پول سے جا ٹکرائی۔ اس کے بونٹ سے سیاہ دھواں نکلنے لگا۔ جب تک ہم گاڑی تک پہنچے، گاڑی سوار باہر نکل کر دوڑ لگا چکا تھا۔ وہ اکہرے بدن کا شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر ڈبل دار کوٹ پہن رکھا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ چھوٹی نال کی رائفل اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم خواتین و حضرات سے ٹکراتے، خوانچوں کو الٹتے، سائیکل سواروں کو گراتے اس کے پیچھے دوڑتے چلے گئے...

بازار کے پیچھے ایک قدرے سنسان گلی تھی ہم نے اسے جالیا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اس شخص کے کوٹ کا کالر پیچھے سے پکڑا اور پھر ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیا۔ حیرت تھی کہ اب تک اس نے رائفل استعمال نہیں کی تھی۔ اس بات کا پتا بعد میں چلا کہ اس کی رائفل میں بس دو ہی گولیاں تھیں جو وہ ہم پر چلا چکا تھا۔

میں نے دو تین زوردار ہاتھ اس کے چہرے پر رسید کیے۔ وہ اپنا ہاتھ قمیص کے نیچے لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے تاڑ لیا کہ قمیص کے نیچے کوئی ہتھیار وغیرہ موجود ہے۔ اس نے اس کی کلائی جکڑ کر اتنی زور سے مروڑی کہ وہ چلا اٹھا۔ عمران نے اس کی قمیص کے نیچے ہاتھ چلایا اور چمڑے کی بیلٹ میں لگا ہوا ایک تیز دھار چاقو نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔

کئی لوگ تیزی سے ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ کیا ہے؟ کون ہے؟ کیسے ہے؟ ایسے بہت سے سوال فضا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔

عمران نے مبہم سا جواب دیا۔ ”یہ پولیس کا معاملہ ہے۔ آپ اس میں دخل نہ دیں۔ اس نے گولی چلائی ہے۔ قاتلانہ حملہ کیا ہے۔“

عمران کے بارعب انداز نے لوگوں کو شک میں ڈال دیا کہ ہم شاید پولیس کے سادہ پوش یا کسی خفیہ ایجنسی کے لوگ ہیں۔

عمران کے اشارے پر میں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی اسکول وین کو روکا۔ عمران نے وین ڈرائیور سے کہا۔ ”اس بندے کو تھانے لے جانا ہے۔“ اور ڈرائیور کے جواب دینے سے پہلے ہی حملہ آور کی گردن پر دو ہتھڑ مار کر اسے وین میں پھینک دیا۔ اس کے منہ سے اب باقاعدہ خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی بائیں کلائی کو دائیں ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ رائفل اور چاقو دونوں چیزیں اس سے چھینی جا چکی تھیں۔

اس نے اضطراری طور پر وین سے نکلنے کی کوشش کی مگر عمران کے ایک اور زوردار گھونسے نے اسے دہرا کر رکھ دیا۔ ”چپکا بیٹھا رہ۔ نہیں تو اس سڑک کو ہی تھانے کا ڈرائنگ روم بنا دوں گا۔ مار مار کر ہڈیوں کا چورا کر دوں گا۔“ عمران پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تابی! تم موٹر سائیکل پر پیچھے آؤ۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عمران نے بھگوڑے حملہ آور کے چیک دار کوٹ کا خون آلود کالر پکڑا اور اس کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے واپس دوڑ لگائی۔ کھمبے سے ٹکرا جانے والی ایف ایکس گاڑی میں سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔ کئی افراد اردگرد جمع ہو چکے تھے۔ ہماری چرخہ موٹر سائیکل بھی قریب ہی کھڑی تھی۔ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سیدھی کی تو لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ ایک ٹریفک سارجنٹ بھی نپے تلے قدموں سے آگے بڑھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس ایکسیڈنٹ کے بعد میں بغیر کچھ کہے سنے موٹر سائیکل لے کر یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن پھر سارجنٹ کا چہرہ دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی۔ یہ وہی نواز احمد نامی نوجوان تھا جس سے راوی روڈ پر چند گھنٹے پہلے بھی دوستانہ ملاقات ہو چکی تھی۔ میرے سر پر ابھی تک ہیلمٹ موجود تھا لیکن چرخہ موٹر سائیکل کو نواز نے فوراً پہچان لیا۔

اسی دوران میں وہ اسکولی وین بھی موقع پر پہنچ گئی جس میں عمران نے زخمی حملہ آور کو بٹھا رکھا تھا۔ سارجنٹ نواز نے عمران کو پہچان کر کہا۔ ”یہ کیا ہوا ہے عمران بھائی؟“

”لمبا لفڑا ہو گیا ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”اس نے پیچھے اچھرہ موڑ کے قریب گولی چلائی ہے ہم پر... بلکہ دو گولیاں... تھانے لے جا رہے ہیں اسے۔“

سارجنٹ نواز نے ہمارے اردگرد لوگوں کی بھیڑ ہٹا کر ہمارے لیے راستہ بنایا اور ہم آگے پیچھے مزنگ چونگی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ عجلت میں ہوا۔ یہ خطرہ موجود تھا کہ ابھی کوئی پولیس موبائل یہاں پہنچ جائے گی اور نیا بکھیڑا شروع ہو جائے گا۔ مجھے ہرگز نہیں لگتا تھا کہ عمران اس زخمی شخص کو تھانے لے کر جائے گا۔ اسکول وین درمیانی رفتار سے چل رہی تھی، میں اس کے پیچھے پیچھے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ اونٹ کی طرح اس موٹر سائیکل کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں تھی۔ میں نے عمران کے سامنے دو تین بار اس موٹر سائیکل کو شاہجہانی جوتھ کا نام دیا تھا لیکن اب، جب میں اس پر سواری کر رہا تھا، یہ نام بھی کچھ زیادہ موزوں نہیں لگا۔ اس پر سواری کرتے ہوئے سیدھی سڑک پر توازن برقرار رکھنا مشکل تھا۔ پتا نہیں عمران اسے موت کے کنوئیں میں کیسے چلا لیتا تھا۔ موٹر سائیکل پر کنٹرول رکھنے کے ساتھ ساتھ میرا ذہن تیزی سے سوچ بھی رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا، بالکل آناً فاناً اور ڈرامائی تھا۔ ہم تو پیر شوکت احمد تھانوی صاحب سے ملنے کے لیے آئے تھے اور احمد تھانوی صاحب ہمیں کافی مناسب

شخص لگے تھے۔ مگر ان کی چار دیواری سے رخصت ہوتے کے فوراً بعد ہی ہم پر دو "قاتل فائر" کیے گئے تھے۔

تقریباً دو کلو میٹر آگے جا کر عمران نے اسکول وین جین مندر کے قریب ایک بغلی سڑک پر رکوالی۔ عمران کے اشارے پر میں بھی موٹر سائیکل سے اتر کر وین میں چلا گیا۔ عمران نے حملہ آور کے سر کے بال بے دردی سے مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ حملہ آور کے چوڑے تھوبڑے پر دو تین تازہ نیل بھی نظر آ رہے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ اس نے راستے میں بھی عمران سے زور آزمائی کی کوشش کی ہے۔ بہرحال، اب وہ مزید مار کھانے کے بعد بالکل شانت نظر آتا تھا۔

عمران نے مجھ سے پوچھا۔ "کہاں لے جانا ہے اسے؟ میرے خیال میں گھر تو لے جا نہیں سکتے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گھر میں فرح اور عاطف تھے اور فرح تو پچھلے چند دن سے مسلسل دہائی دے رہی تھی کہ ہم کسی خطرناک کام میں ہاتھ نہ ڈالیں۔ اگر ہم اس زخمی مچھندر کو رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں لے جاتے تو فرح اور عاطف کو بہت شاک لگتا۔

"تمہارے راوی روڈ والے گھر میں جا سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہاں پورے محلے کو پتا چل جائے گا۔"

"تو پھر؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "جیلانی بھی لاہور میں نہیں ہے... ہاں، ایک کام ہو سکتا ہے۔" اس کے چہرے پر تھوڑی سی چمک آ گئی۔

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"چلو بتاتا ہوں۔" اس نے کہا پھر وین والے سے کہا کہ وہ گاڑی چلائے۔ وین والا اب کچھ ہراساں بھی نظر آ رہا تھا۔ غالباً وہ سمجھ چکا تھا کہ ہم اس شخص کو تھانے لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے عمران سے معذرت کی ہو کہ وہ یہ "خدمت" انجام نہیں دے سکتا لیکن وہ عمران ہی کیا جو ایسی کسی معذرت کو خاطر میں لائے۔

میں وین سے اترا اور ایک بار پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے عمران اور حملہ آور کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

اسکول وین ایک رہائشی کالونی میں رکی۔ یہاں زیادہ تر گھر پانچ اور چھ سات مرلے کے تھے۔ ایک دو منزلہ گھر کے سامنے جا کر عمران نے وین رکوا دی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وین کے رکتے ہی گھر کا مین گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والا ایک دبلا پتلا نوجوان لڑکا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ عمران نے راستے میں ہی موبائل پر اس گھر کے مکینوں سے رابطہ کیا اور انہیں اپنی آمد سے آگاہ کر دیا تھا۔ دبلے پتلے نوجوان نے وین کو گیراج میں جانے کے لیے راستہ دیا اور پھر مین گیٹ بند کر دیا۔ عمران نے سو سو کے چھ سات نوٹ وین ڈرائیور کو دیے اور حملہ آور کو گردن سے دبوچے دبوچے نیچے اتر آیا۔ اب عمران کے ہاتھ میں پستول بھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی موٹر سائیکل گیراج میں ایک طرف کھڑی کر دی۔ موٹر سائیکل کے رکتے ہی جیسے ایک طوفان تھم گیا تھا۔

وین کا ڈرائیور اپنی وین سمیت یوں بھاگا جیسے تھوڑی دیر بھی یہاں رکا تو یہ مکان اپنی وزنی چھتوں سمیت اس کے اوپر آن گرے گا۔ یقیناً عمران نے راستے میں اس کی کافی برین واشنگ کی تھی اور اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہمارے بارے میں کسی طرح کی مخبری کرتا۔

ہم نے اندر جا کر حملہ آور کو ایک اسٹور نما تاریک کمرے میں بند کر دیا اور یہی وقت تھا جب ایک طرف سے عمران کی سرکس کی ساتھی شاہین تیزی سے برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی نمی تھی۔ شاید وہ آگے بڑھ کر عمران کے گلے ہی لگ جاتی مگر نوجوان لڑکے کی وجہ سے نہیں لگی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ شاہین کا چھوٹا بھائی ظفر تھا۔

"مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا کہ تم اس طرح اچانک آ گئے ہو۔" وہ لرزاں آواز میں بولی۔

"اور اکیلا نہیں ہوں۔ کسی کو ساتھ بھی لایا ہوں۔" عمران نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے ہیلمٹ اتارا۔ "اوہ گاڈ! تابش بھائی آپ؟" وہ پکاری اور بھاگ کر میرے گلے لگ گئی۔

عمران نے برا سا منہ بنایا۔ ظفر اندر جا چکا تھا۔ عمران، شاہین کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولا۔ "اگر گلے لگنے کے لیے چار سال باہر رہنا ضروری ہے تو میں ڈھائی تین سال اور گزار آتا ہوں۔"

شاہین کے ملیح چہرے پر شفق کا رنگ بکھر گیا۔ وہ کبھی حیرت سے عمران کو اور کبھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ پچھلے ساڑھے تین چار سال میں، میں جسمانی طور پر کافی تبدیل ہوا تھا۔ یہ تبدیلیاں شاہین کو حیران کر رہی تھیں۔ "آپ بہت بدل گئے ہو تابش بھائی۔ میں نے پہلے تو آپ کو پہچانا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو پہلے ایک لڑکا تھا، وہ مرد بن کر واپس آیا ہے۔ آپ کہاں تھے اب تک؟ پتا ہے ہم نے کتنا یاد کیا ہے آپ کو؟ پتا ہے کتنا پریشان ہوئے ہیں؟ میں نے بہت دعائیں کی تھیں آپ کے لیے۔"

"اچھا بھئی، میں تو چلتا ہوں۔ یہاں میرا کیا کام؟" عمران جلے بھنے انداز میں بولا۔

"تمہارے لیے بھی کی تھیں۔" شاہین جلدی سے بولی۔ "تمہارے لیے بھی سب پریشان رہے ہیں۔ میں تقریباً روزانہ جان انکل کو فون کرتی تھی۔ تمہیں کیا پتا..." اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

"لو بھئی، رونے دھونے کا پروگرام شروع ہونے لگا ہے۔ اچھا یار نہیں جاتا، بالکل نہیں جاتا۔ اگلے پندرہ بیس سال تک یہیں رہوں گا بلکہ یہیں اس گیراج میں کھڑا رہوں گا۔ ہلوں گا بھی نہیں۔" عمران نے کہا اور شاہین کے آنسوؤں کو مدھم مسکراہٹ کے بریک لگ گئے۔

اسی دوران میں ظفر واپس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "عمران بھائی! آپ کب آئے؟ آپ نے تو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ فون پر آپ کی آواز ہے۔"

عمران بولا۔ "اس طرح نہیں کہتے کہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ مجھے تو وشواس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ میں فون پر آپ کی آواج سنت ہوں... جب حیرانی والے فقرے میں یقین کے بجائے وشواس کا شبد استعمال کیا جائے تو فقرے میں بڑی شگفتگی آ جاوت ہے۔"

وہ دونوں مسکرانے لگے۔ شاہین بولی۔ "چلو، اس سے کم از کم اتنا پتا تو چلا کہ تم انڈیا سے ہی آ رہے ہو لیکن..." پھر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کا دھیان یقیناً اس بندے کی طرف چلا گیا تھا جسے ہم پکڑ کر یہاں لائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس بھی ہوا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ "یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں، اندر آ جائیں۔"

ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شاہین اور ظفر کے سوا اس چھوٹے سے گھر میں اور کوئی نہیں۔ اب اسٹور روم کے مقفل دروازے پر دستک ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یقیناً زخمی شخص بے چین ہو رہا تھا... عمران نے شاہین سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس بندے سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کرنی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا۔ اس دوران میں تم کچھ پکا دکا سکتی ہو۔ زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ دو تین ڈشیں کافی رہیں گی۔ میٹھے کے طور پر آئس کریم منگوا لیں۔ چھل دل تو ہوتا ہی ہے تمہارے فریج میں۔"

شاہین بولی۔ "ایک بات کا دھیان رکھنا۔ یہ زیادہ بڑا گھر نہیں ہے۔ یہ نہ ہو کہ تمہاری پوچھ گچھ کے دوران میں محلے والوں کو شک ہو جائے۔ ایک بار پہلے بھی تمہاری مہربانی کی وجہ سے مجھے ایک اچھے مالک مکان سے محروم ہونا پڑا تھا۔"

"گھبراؤ مت۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔ بس تم کچن میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لو۔ زور کس پر ہوا؟ کچن پر۔"

شاہین نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں گھر کے عقبی حصے کی طرف چلے گئے۔ میں اور عمران اسٹور روم کی طرف بڑھے۔ عمران نے اپنا پستول ایک بار پھر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسٹور روم کے اندر اب ہمارے "حوالاتی" نے چلانا شروع کر دیا تھا۔ "دروازہ کھولو۔ میں مر رہا ہوں۔ دروازہ کھولو۔" اس کی آواز میں کرب کی شدت صاف محسوس ہوتی تھی۔ بہرحال، اس کی آواز گھر کے برآمدے تک بمشکل ہی پہنچ رہی تھی۔

ہم اسٹور روم میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی کلائی دوسرے ہاتھ سے تھامے ایک گوشے میں کھڑا تھا۔ اس کا رنگ زرد نظر آ رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کلائی میں کوئی فریکچر وغیرہ ہو چکا ہے۔ عمران نے جاتے ہی اس کے سر پر چپت رسید کی۔ "اوئے! تم تو کہتے ہو، میں مر رہا ہوں۔ کیا اس طرح کھڑے کھڑے کوئی مرتا ہے؟ مرنے کے لیے لیٹنا پڑتا ہے۔ کھینچ کھینچ کر سانس لینی ہوتی ہے۔ آنکھیں اوپر اٹھانا پڑتی ہیں۔ اس طرح سے۔" عمران نے باقاعدہ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھا کر دکھائیں۔

"میری کلائی ٹوٹ گئی ہے۔ سخت درد ہو رہا ہے۔" وہ کراہا۔

"اپنی کلائی کی تمہیں بڑی فکر ہے۔ اگر ہمارے سر میں گولی لگتی تو ہمیں درد نہیں ہونا تھا؟ سر میں گولی لگے تو چلا چلا کر گلا بیٹھ جاتا ہے اور یہ گلا اس کا نہیں بیٹھتا جسے گولی لگی ہو بلکہ اس کے گھر والوں کا بیٹھتا ہے... ذرا دکھاؤ اپنی کلائی۔" عمران نے کہا۔

اس نے اپنی کلائی عمران کی طرف بڑھائی۔ اس نے ذرا دبا کر دیکھا۔ زخمی ایک بار پھر کراہ اٹھا۔ عمران مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ یہاں اسے الٹا لٹکانے کے لیے چھت پر کوئی کنڈا وغیرہ بھی نہیں ہے۔ یہ اپنی اس کلائی کی وجہ سے ہی ہمیں بہت کچھ بتا دے گا۔"

اس شخص کا رنگ کچھ مزید زرد ہو گیا۔ وہ کوئی کمزور شخص نہیں تھا۔ اس کی شکل و صورت گواہ تھی کہ وہ متعدد بار جیل یاترا کر چکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں شکرے کی سی سفاک چمک تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی قتل جیسی وارداتیں کر چکا ہو۔ لیکن اس وقت وہ خود کو بُری طرح گھرا

ہوا محسوس کر رہا تھا۔ عمران نے مجھے بتایا کہ اسکول وین میں اس نے خود کو چھڑانے اور چلتی گاڑی سے کودنے کی ایک زوردار کوشش کی تھی مگر عمران کے سامنے اس کا بس نہیں چلا۔ عمران نے وین میں ہی بری طرح اس کی دھنائی کر دی تھی۔

اگلے پانچ دس منٹ میں اس شخص نے ہمیں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ اس کا نام رشید عرف چھیدا ہے۔ وہ ہسٹری شیٹر ہے اور پیسے لے کر کام کرتا ہے۔ اس کام کے لیے اسے بہاولپور کے کسی بندے نے ایک واقف کار کے ذریعے ایک لاکھ کی رقم بھجوائی تھی۔ باقی دو لاکھ روپیا اسے کام ہونے کے بعد ملنا تھا۔ کام ہمیں قتل کرنا ہرگز نہیں تھا... بلکہ ڈرانا یا زخمی کرنا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

اس خبیث کی شکل ہی بتا رہی تھی کہ وہ بک رہا ہے۔ اس کی باتوں میں سچ اتنا ہی ہے، جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ پتا نہیں کیوں اس بندے کی شکل مجھے کچھ شناسا سی لگ رہی تھی۔ پھر ایک اور چیز سامنے آئی اور اس نے میرا دماغ چکرا کر رکھ دیا۔

اسکول وین میں عمران کے ساتھ زوردار کھینچا تانی کے دوران میں چھیدے کے کوٹ کی ایک آستین کہنی تک ادھڑ گئی تھی۔ یہ آستین ذرا سی اوپر ہوئی تو مجھے چھیدے کے بازو پر کٹ کا ایک لمبا نشان نظر آیا۔ یہ تیز دھار آلے کا ایک قوس نما پرانا زخم تھا، ٹانکے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ماضی میں یہاں سے گولی وغیرہ نکالنے کے لیے کوئی آپریشن کیا گیا ہو۔ بہرحال، یہ سب کچھ پوچھنے کی نوبت نہیں آئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیل گئی۔ چار سال پہلے کے مناظر میری نگاہوں کے سامنے شعلوں کی طرح پھیل گئے۔ میرے دل نے پکار کر کہا کہ یہ بندہ ان سفاک غنڈوں میں شامل تھا جنہوں نے ماں جی کو درد کے سمندر میں غرق کر کے مجھ سے فرح اور عاطف کا پتا پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ فلیش بیک میں وہ سین... وہ خونی سین آنکھوں کے سامنے چلنے لگے۔

ماں جی کے درد سے بھرے ہوئے کندھوں کو بے رحمی سے جھنجوڑا جا رہا تھا۔ وہ چلا رہی تھیں، تڑپ رہی تھیں۔ پھر ان کے ایک کندھے میں بریٹا پسٹل کی گولی اتار دی گئی تھی۔ جن افراد نے ماں جی کو دبوچا ہوا تھا، ان میں یہ زخمی بازو والا بندہ بھی شامل تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے زخم کا یہ نیم گول نشان ایک انمٹ ثبوت بن کر چمکنے لگا۔

میں نے ایک بار پھر دھیان سے چھیدے کی صورت دیکھی۔ اس کی صورت نے میرے اخذ کیے ہوئے نتیجے کو تقویت دی۔ میرے اندر تہلکہ سا مچ گیا۔ ایک سرخ چادر سی تھی جو میری نگاہوں کے سامنے تن گئی۔ میں دیوانگی کے عالم میں چھیدے پر جا پڑا۔ ”حرامزادے... کتے... قاتل!“ میرے منہ سے بے ساختہ پتا نہیں کیا کچھ نکل رہا تھا۔

اگلے ایک منٹ میں، میں نے چھیدے کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ وہ اچھل اچھل کر دیواروں سے ٹکرایا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ کر لٹک گیا۔ چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس کا ہاتھ کلائی سمیت خوفناک انداز میں جھولنے لگا۔ یہ وہی کلائی تھی جس میں کچھ دیر پہلے عمران کے مروڑنے کی وجہ سے فریکچر ہوا تھا۔ عمران خود بھی ہکا بکا تھا۔ وہ چھیدے کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بس کر تابی... یہ مر جائے گا... چھوڑ دے۔“

لیکن میرے سر پر جنون سوار تھا۔ پچھلے چار سال سے جو آگ سینے میں دہک رہی تھی، وہ شعلوں میں بدل گئی تھی اور اس کی ساری تپش رشید عرف چھیدے کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ میں نے چھیدے والا چاقو پکڑا تو عمران میرے سامنے دیوار بن گیا۔ ”کیا کرتے ہو تابی... اس کو مار دیں گے تو سراج تک کیسے پہنچیں گے؟ کیا دیوانہ پن ہے؟ پیچھے ہٹو...“ اس نے مجھے دھکیلا۔

”نہیں عمران... میں نہیں چھوڑوں گا اسے۔“ میں دہاڑا۔ اپنی آواز خود مجھ سے بھی پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

عمران نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا اور دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ”کیا کرتے ہو تابی! شاہین کیا سوچے گی؟ آواز باہر تک جا رہی ہے۔ ذرا تحمل کرو۔“

چھیدا کسی پھٹے پرانے خون آلود کپڑے کی طرح اسٹور روم کے فرش پر پڑا تھا۔ اس کی شکل میرے دماغ میں شعلے بھڑکا رہی تھی۔ میں نے اس کے منحوس سراپا کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔ آنکھوں میں آتشیں آنسو سرسراہٹ جگانے لگے۔ عمران مجھے اپنے گھیرے میں لے کر اسٹور سے باہر نکل آیا اور دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔

شاہین اور ظفر ساتھ والے کمرے میں کھڑے تھے اور ہراساں نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً اسٹور روم میں جو تہلکہ مچا تھا، اس کی آوازیں پورے گھر میں گونجی تھیں۔ کھلا ہوا چاقو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ شاہین اور ظفر کا ہراس دیکھتے ہوئے میں نے یہ چاقو جیکٹ میں رکھ لیا۔

عمران نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کتے کو پہچان لیا ہے۔ یہ ان غنڈوں میں شامل تھا جنہوں نے شیرے وغیرہ کے ساتھ مل کر ماں جی کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔

”تم نے شروع میں تو نہیں پہچانا تھا؟“ عمران نے پوچھا۔

”مجھے تھوڑا بہت شک تو پہلے سے ہو رہا تھا مگر اب اس کا زخمی بازو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے۔ یہ سراج اور شیرے کا ساتھی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سراج اور شیرا بھی ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ مجھے تو ایک اور خطرہ محسوس ہو رہا ہے...“ میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

عمران سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شاہین سے کہا کہ وہ میرے لیے پانی لائے۔ وہ چلی گئی تو میں نے عمران سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ہمارا پیچھا کیا گیا ہو اور چھیدے کے ساتھی یہاں آس پاس موجود ہوں۔“

”نہیں، اس بارے میں فکر نہ کرو۔“ عمران نے جواب دیا۔ ”میں وین والے کو کافی گھما پھرا کر لایا ہوں۔ ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا۔“

”عمران! یہ بندہ سراج کا ٹھکانا بتا سکتا ہے۔ اور ہمیں جلدی کرنی چاہیے، یہ نہ ہو کہ وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔“

”تم غم نہ کرو۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولے گا اور سب کچھ فر فر بتائے گا۔“

عمران دو چار منٹ مزید میرے پاس بیٹھا اور پھر چھیدے سے پوچھ گچھ کے لیے اسٹور روم کی طرف چلا گیا۔ اس نے شاہین کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ گھر کے سارے دروازے بند رکھے اور کیسٹ پلیئر پر اونچی آواز میں کوئی میوزک وغیرہ لگا دے۔

عمران اسٹور روم میں گیا اور پندرہ بیس سیکنڈ بعد ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ ”کیا ہوا؟“ شاہین نے پوچھا۔

”مر گیا۔“ عمران نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

”اس نے گلے پر بلیڈ پھیرا ہے۔ بازو کی نسیں بھی کاٹی ہیں۔ سارا فرش خوم خون ہو رہا ہے۔“

”اوہ گاڈ!“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ہم تیزی سے اسٹور روم میں آئے۔ عمران نے شاہین کو آنے سے منع کر دیا تھا... اسٹور روم کا منظر واقعی دہلا دینے والا تھا۔ چھیدا ٹھنڈے فرش پر چت پڑا تھا۔ اس کی گردن اور ٹوٹی ہوئی کلائی میں سے بڑی تیزی کے ساتھ خون کا اخراج ہوا تھا اور اب اس کی آنکھیں تارا ہو چکی تھیں۔ عمران نے اسے ایک بار پھر ہلا جلا کر دیکھا۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

”ہم سے غلطی ہوئی۔ ہمیں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس کا خودکشی کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ واقعی ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے تمہاری والدہ پر بہیمانہ تشدد کیا اور یقیناً یہ ہمیں سراج اور شیرے کا اتا پتا بھی بتا سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ ہم اس کی کھال اتار کر بھی اس کی زبان کھلوا لیں گے۔ اس نے مرنا آسان سمجھا۔“

ہم نے اسے گھسیٹ کر خشک فرش پر کیا اور اس کے اوپر ایک چادر ڈال دی۔ ”اب اس کا کیا کرنا ہے؟“ میں نے پریشان لہجے میں عمران سے پوچھا۔

”لاش غائب کرنا پڑے گی اور کیا؟“

”لیکن کیسے؟“

”سوچ لیتے ہیں، زیادہ پریشان صورت نہ بناؤ۔“ عمران نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

دروازے کو مقفل کر کے ہم باہر آ گئے۔ شاہین اور ظفر کے چہرے سے ہراس ہویدا ہو رہے تھے۔ عمران نے نارمل نظر آنے کی کوشش کی۔ اس کے رویے سے شاہین اور ظفر کو بھی کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ بولا۔ ”اس بندے کی موت پر زیادہ سوگوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک قاتل کی موت ہے۔ ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے اس کی لاش سے نمٹنے کے لیے... لہٰذا ہم پہلا کام پہلے کریں گے۔ بھوک میں دماغ بھی ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ اس لیے پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔“

میرے کانوں میں چھیدے کے الفاظ گونجنے لگے... اس نے شروع میں خود کو کرائے کا غنڈا ظاہر کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس نے کسی کے کہنے پر ہمیں صرف ڈرانے دھمکانے کے لیے فائر کیے تھے۔ لیکن اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ نہایت خطرناک شخص اور سراج کے قریبی کارندوں میں سے تھا۔ یقیناً آج اس نے ہم دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ہی ہمارے راستے میں گھات لگائی تھی... لیکن اب وہ خود موت کے اندھیرے میں اتر چکا تھا۔ عمران کو پورا یقین تھا کہ چھیدا، میر تھانوی صاحب کی کوٹھی سے ہمارے پیچھے نہیں لگا ہے۔ عمران کے خیال کے مطابق ہمیں راستے میں کہیں دیکھا گیا تھا اور ہمارا پیچھا شروع کیا گیا تھا۔ بعدازاں یہ اندازہ درست نکلا۔ یہ بھی پتا چلا کہ ہمارے پہچانے جاتے

میں عمران کی عجوبہ موٹر سائیکل نے بھی کردار ادا کیا تھا۔ گھر کے اسٹور روم میں ایک خون آلود لاش پڑی ہو تو اطمینان سے کھانا کیسے کھایا جا سکتا ہے۔ عمران کے اصرار کے باوجود ہم نے کھانے کا پروگرام کینسل کیا۔ میں نے علیحدگی میں جا کر عمران کو سمجھایا کہ ہمیں لاش سمیت جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

''بہت خوب۔ کتنی دلیری والی بات کی ہے تم نے۔ اور شاہین کو یہاں خطرے میں چھوڑ جانا چاہیے۔''

''خطرہ کیسا؟''

''تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ ممکن ہے یہ گھر سراج اور اس کے برخورداروں کی نظر میں آ چکا ہو۔'' عمران نے کہا۔

''اور تم نے میرے اس خیال کو بالکل رد کر دیا تھا۔''

''لیکن اندیشہ تو بہرحال اندیشہ ہی ہوتا ہے۔ پھر ہم اس اسکول وین والے کی طرف سے بھی پوری طرح غافل نہیں ہو سکتے۔ اس کی نیت میں کوئی فتور آ گیا تو پھر؟''

''تو کیا چاہتے ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔ ''شاہین اور ظفر کو یہاں سے لے جانا ہے؟''

''میرے خیال میں اب یہی مناسب رہے گا۔'' عمران بولا۔

اگلے پانچ منٹ میں عمران نے شاہین اور ظفر کے لیے یہ نادر شاہی حکم جاری کر دیا کہ وہ ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑیں گے اور ان کے ساتھ جائیں گے۔

''لیکن کتنی دیر کے لیے؟'' شاہین نے پریشان ہو کر پوچھا۔ اس کے نہایت چمکیلے بلوری رخسار قدرے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

''بس دو چار دن کے لیے۔'' عمران نے کہا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران جھوٹ بول رہا ہے۔ شاید وہ شاہین اور ظفر کو مستقل طور پر یہاں سے لے جا رہا تھا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں لے لیں اور گھر کو تالا لگا دیں۔ موجودہ صورتِ حال میں شاہین کا حوصلہ قابلِ ذکر تھا۔

ایک طرح سے ہم دونوں شاہین اور ظفر کے لیے بلائے ناگہانی ثابت ہوئے تھے۔ وہ اچھے بھلے سکون سے بیٹھے تھے۔ اب نہ صرف ان کے گھر میں ایک خونچکاں لاش پڑی تھی بلکہ انہیں فوراً گھر بھی چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود میں دیکھ رہا تھا کہ شاہین کے چہرے پر زیادہ تردد نہیں تھا۔ وہ عمران کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ اسے جیسے عمران پر بھروسا تھا کہ وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کا بھروسا اور اعتماد آسانی سے پروان نہیں چڑھتا لیکن جب ایک بار پروان چڑھ جائے تو بڑا پائیدار ہوتا ہے۔

عمران نے جیلانی کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے لاہور واپس آ چکا ہے۔ وہ پچیس تیس منٹ میں ایک ٹویوٹا کار لے کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ گاڑی کو گھر کے گیراج میں کھڑا کیا گیا۔ چھیدے کی لاش ایک بڑے پولیتھین میں لپیٹ کر ڈکی میں رکھی گئی۔ گھر کو تالے لگانے کے بعد جیلانی اور ظفر۔۔۔ ظفر کی موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے جبکہ میں، شاہین اور عمران ٹویوٹا کار پر روانہ ہوئے۔ عمران کا شیطانی چرخہ وہیں کھڑا رہنے دیا گیا۔ جیلانی موٹر سائیکل پر ہم سے تقریباً دو فرلانگ آگے تھا۔ اس نے اپنا موبائل مستقل آن کر رکھا تھا۔ دوسری طرف عمران کا موبائل بھی آن تھا۔ راستے میں کوئی بھی خطرناک پولیس ناکا دکھائی دینے کی صورت میں جیلانی نے ہمیں اطلاع دینا تھی اور ہمیں اس کی ہدایت کے مطابق راستہ تبدیل کرنا تھا۔

یہ شام سات بجے کا وقت تھا۔ پھر بھی لاش کو ڈکی میں رکھ کر شہر کی بھری پُری سڑکوں سے گزرنا ایک پُرخطر کام تھا۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی اپنی جگہ موجود تھا کہ شاید چھیدے مرحوم کے ساتھیوں میں سے کوئی ہمارا پیچھا کرے۔ بہرحال، یہ اندیشہ تو غلط ہی ثابت ہوا۔ تناؤ کی کیفیت کو ختم کرنے کے لیے عمران نے حسبِ عادت ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی۔ اس گفتگو کا آغاز شاہین کے ایک سوال ہی سے ہوا۔ شاہین نے رشید عرف چھیدے کے بارے میں عمران سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اور کیسے ہمارے پیچھے لگا۔۔۔؟

عمران نے کہا۔ ''اگر میں جھوٹ بولوں گا تو میرے دل پر بوجھ پڑے گا۔ اگر سچ بولوں گا تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔''

''نہیں ہوتی ناراض، بتاؤ تم۔''

وہ معصوم صورت بنا کر بولا۔ ''تم تو جانتی ہی ہو کہ ریما جی ایک عرصے سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ اب نرگس جی کے بعد یک نہ شد دو شد والی بات ہو گئی ہے۔''

''نرگس کون؟'' شاہین نے برا سا منہ بنایا۔

''وہی یار، اسٹیج دھاکوں۔۔۔ میرا مطلب ہے ڈراموں والی۔ میں نے تو صرف اس لیے اسے تھوڑی سی لفٹ کرائی تھی کہ شاید اس طرح ریما جی سے پیچھا چھوٹ جائے۔ ریما کا دل کھٹا ہو جائے اور شاید اس طرح میرا بھی ہو

جائے۔ لیکن وہ کیا مولانا سر سید احمد خاں کا پنجابی شعر ہے، الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ ریما کا دل تو پھر بھی کھٹا نہیں ہوا، الٹا نرگس کا دل بھی میٹھا ہو گیا۔ ایک دوست نے مجھے بتایا تھا کہ ریما نے شوٹنگ کے دوران میں کئی لوگوں کے سامنے یہ شعر پڑھا تھا۔ وہ جہاں بھی گیا میرے پاس آ یا۔۔۔ اک یہی بات اچھی ہے میرے ہرجائی کی۔ تو اب معاملہ یوں ہے کہ ریما اور نرگس میں میری وجہ سے ٹھنی ہوئی ہے۔۔۔ بات کافی آگے نکل چکی ہے۔۔۔''

''ہاں، مجھے بھی لگتا ہے کہ کافی آگے نکل چکی ہے۔ تمہیں اب کہیں داخل کرانا پڑے گا۔'' شاہین نے رواں لہجے میں کہا۔

عمران نے سنی ان سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے، یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ معاملہ بگڑ چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب نرگس کی سوچ یہ ہو گئی ہے کہ اگر میں اس کا نہیں بن سکتا تو کسی کا بھی نہ بنوں۔ یہ رشید عرف چھیدا یقیناً اسی کا بندہ تھا۔۔۔''

عمران کی گفتگو کو بریک لگ گئے۔ موبائل پر جیلانی نے اطلاع دی کہ آگے ایک ناکا ہے لہٰذا ہم سیدھا چوبرجی آنے کے بجائے سمن آباد کے اندر سے ہو کر نکل جائیں۔

ہم نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم رائے ونڈ روڈ کی اس شاندار کوٹھی میں موجود تھے جہاں فرح اور عاطف ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ فرح نے آج لان میں باربی کیو کا انتظام کیا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ ہم رات گئے تک باہر بیٹھیں گے اور گپ شپ کریں گے۔ لیکن یہاں ڈکی میں لاش موجود تھی اور ہم کسی طرح کی تفریح کے موڈ میں نہیں تھے۔ شام کے سائے طویل ہوتے ہوتے گہرے اندھیرے میں بدل چکے تھے۔ کوٹھی کے باغیچے کے پاس فرح اور عاطف باربی کیو کی طویل انگیٹھی میں کوئلے وغیرہ رکھ رہے تھے۔ ایک ملازم کرسیاں وغیرہ ترتیب دے رہا تھا۔ میڈم مغفورا ان انتظامات کی نگرانی کر رہی تھی۔ صفیہ بالو کو گود میں لیے ایک روش پر ٹہل رہی تھی۔ ان لوگوں کا موڈ کچھ اور تھا جبکہ ہمارا کچھ اور۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ''ان کو سنبھالو۔ یہ پروگرام ایک دو روز بعد کا رکھ لیا جائے۔''

''لیکن یہ لوگ کیسے مانیں گے؟ یہ تو کل سے انتظامات میں لگے ہوئے ہیں۔ جان محمد صاحب کو بھی بلایا ہے انہوں نے۔''

اس نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر بولا۔ ''ایسا کرو۔۔۔ ان سے کہو کہ شاہین کی نانی فوت ہو گئی ہے۔ وہ بہت پیار کرتی تھی اس سے۔ سوگ کی حالت میں یہاں آئی ہے۔''

''لیکن جب وہ پوچھیں گے تو؟''

''ان سے کہو کوئی نہ پوچھے۔ اس بارے میں کوئی ذکر ہی نہ کرے۔ وہ سخت ڈپریشن میں ہے اس وقت۔''

''لیکن۔۔۔''

''یار! جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' عمران نے جلدی سے کہا۔

ہم نے پورے گروپ کے سامنے شاہین کی نانی کو فوت کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ وہ سخت ڈپریشن میں ہے، کوئی اس سے اس بارے میں بات نہ کرے۔

بادلِ ناخواستہ کھلی فضا میں ''روسٹ ڈنر'' کا پروگرام کینسل ہو گیا اور اس پروگرام کو ان ڈور عام ڈنر میں بدل دیا گیا۔ کوٹھی کا لان اور عقبی لان خالی ہو گئے۔ ہمارے لیے ممکن ہو گیا کہ ہم چھیدے کی لاش سے نجات حاصل کر سکیں۔ عمران اور جیلانی ٹویوٹا کار کو دھکا لگا کر عقبی باغیچے کی طرف لے گئے۔ یہاں کھاد تیار کرنے کے لیے پہلے ہی ایک گڑھا سا بنایا گیا تھا۔ اس گڑھے کو مزید گہرا کیا گیا اور پھر چھیدے کی لاش کو اچھی طرح پولیتھین کی شیٹ میں لپیٹ کر دبا دیا گیا۔

میں رات دیر تک جاگتا رہا اور صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ ہمیں یہاں لاہور پہنچے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اور سیٹھ سراج کی طرف سے ہم پر پہلا وار ہو گیا تھا۔ اس سے یہ بھی شک ہوتا تھا کہ شاید سراج اور شیرا وغیرہ پاکستان میں ہی ہیں۔ میں باقی سب کچھ بھول بھال کر جلد از جلد شیرے اور سراج کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے لیے اب اور صبر ممکن نہیں رہا۔ اگلے روز میں نے عمران سے اس بارے میں تفصیلی بات کی۔ وہ تو ہر وقت ایکشن اور خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہی رہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، جو تم چاہتے ہو ویسا ہی ہو گا۔ ہم باہر نکلتے ہیں۔ سراج اور اس کے گماشتوں کو تلاش کرتے ہیں۔ ہم ان کو ڈھونڈ لیں گے یا وہ ہمیں ڈھونڈ لیں گے۔''

اگلے روز ہم نے وہی کیا جو ہمارے ذہن میں تھا۔ ہم دونوں جیلانی کی موٹر سائیکل پر نکلے اور شہر میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ ہم دونوں ہیلمٹ کے بغیر تھے۔ میری جیب میں ٹی ٹی پستول تھا اور وہی یادگار رام پوری خنجر تھا جس سے میں نے جارج گورا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ خنجر نما چاقو الٰہ آباد کے پارک ویو ہوٹل میں ہمارے سامان کے اندر موجود تھا۔ جب ڈی ایس پی سجاد نے ہمیں گرفتار کیا اور

ہمارے ساتھی ہوٹل سے فرار ہوئے تو وہ دیگر سامان کے ساتھ یہ خنجر بھی ساتھ لے گئے۔ بعدازاں میڈم عفورا اسے کسٹم کی نظر سے بچا کر یہاں لانے میں کامیاب رہی۔ میری طرح عمران بھی مسلح تھا۔ اس کی جیکٹ میں بارہ گولی والا ماؤزر موجود تھا۔

ہم شام تک شہر کے مختلف علاقوں میں چکراتے رہے۔ خاص طور سے ان جگہوں کے آس پاس بھی گھومے جہاں سیٹھ سراج کے ملنے کا امکان ہوسکتا تھا... یا اس کے ہرکاروں سے مڈبھیڑ ہوسکتی تھی۔ شام تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہم اس جگہ بھی گئے جہاں کل ہم پر فائرنگ ہوئی تھی۔ اس فائرنگ کے حوالے سے بھی کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ بس ایک دکان دار نے بتایا کہ یہاں کل دو تین گولیاں چلی تھیں... اور دو موٹر سائیکل سوار بڑی تیزی سے بڑے چوک کی طرف گئے تھے۔ اس نے ہمیں بس اسٹاپ کی دیوار پر ایک گولی کا نشان بھی دکھایا۔

بعدازاں ہم ایکسیڈنٹ والی جگہ پر پہنچے۔ کھمبے سے ٹکرانے والی ایف ایکس کو وہاں سے ہٹایا جاچکا تھا۔ یقیناً اب وہ کسی قریبی تھانے میں کھڑی اپنی مزید بربادی کا انتظار کررہی تھی۔ پچانوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ ایف ایکس کی نمبر پلیٹ جعلی ہوگی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ ہم بڑی احتیاط سے اپنے تعاقب کا دھیان رکھتے ہوئے رائے ونڈ روڈ پر واپس آگئے۔

شاہین غصے سے بھری بیٹھی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی یہ بات عمران کی سمجھ میں آگئی کہ نانی کی وفات والا جھوٹ کھل چکا ہے۔ بہرحال، کسی نے اس بارے میں بات نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہین نے عمران کی بات کا بھرم رکھا ہے اور نانی کی وفات والی بات کو جھٹلایا نہیں۔ کھانے کے بعد جب تنہائی ملی تو شاہین سیدھی ہمارے کمرے میں آئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ عمران پر برس پڑی۔ ''تم نے یہ غلط بات کیوں کی؟ تم ہمیشہ ''ہرٹ'' کرتے ہو۔''

عمران نے مسمسی صورت بنائی۔ ''بس مجبوری تھی یار! فوری طور پر کوئی بہانہ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''اس لیے نانی ماں کو مذاق بنادیا۔'' شاہین نے بات اُچکی۔

وہ بولا۔ ''شاہین! دیکھو، ہر بات میں کوئی پہلو اچھائی کا بھی ہوتا ہے۔ اسی بہانے تم نے بلکہ ہم سب نے تمہاری نانی ماں کو یاد کرلیا۔ ورنہ آج کل بزرگوں کو کون یاد کرتا ہے... تم سچ بتاؤ، کبھی تمہیں نانی یاد آئی ہے؟ میری وجہ سے ہی آئی ہے نا...؟''

''تم بہت بُرے ہو عمران... آتے ساتھ ہی دل دکھانا شروع کردیا ہے۔'' اس نے آنچل سے آنسو پونچھے۔

''اچھا چلو معاف کردو یار! جب تم کہو گی تمہاری نانی ماں سے ملنے چلیں گے۔ کہاں رہتی ہیں وہ؟''

''جہاں کوئی نہیں جاسکتا۔ وہ فوت ہوچکی ہیں، ایک سال پہلے۔''

''زبردست... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پھر تو مسئلہ ہی ختم ہوگیا۔'' وہ چہکا۔ ''تم... میرا مطلب ہے، اگر وہ فوت ہوچکی ہیں تو پھر تو ہم نے کوئی جھوٹ ہی نہیں بولا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے لیٹ خبر دی ہے اور لیٹ خبر آج کل کون سا چینل نہیں دیتا... بلکہ ہمارا ''فساد چینل'' تو اس میں نمبر ون ہے۔ وشواس کرو، صرف چار دن پہلے ہم نے اندرا گاندھی کے قتل کی خبر نشر کی ہے اور سب کو ہکا بکا کردیا ہے۔ بڑے بڑے چینلوں نے دانتوں میں انگلیاں دبائی ہیں۔''

''یعنی چینلوں کے دانت ہوتے ہیں۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے، چینل دانتوں کے بغیر ہی ہر قسم کا گوشت ہڈی سمیت چبا جاتے ہیں...''

''لگتا ہے کہ تمہیں کوئی خاص تکلیف پہنچی ہے کسی چینل سے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ ہمارا چینل کسی دوڑ میں شامل ہی نہیں ہے۔ یہاں تو جلد سے جلد خبر دینے کی دوڑ ہے جبکہ ہم لیٹ سے لیٹ خبر دینے کے چیمپئن بننا چاہتے ہیں۔ ہمارا ایک اپنا راستہ ہے، اپنا ٹارگٹ ہے۔ دیکھنا عنقریب ہمارے چینل سے اس طرح کی بریکنگ نیوز نشر ہوں گی... ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ اتحادی فوجوں نے جرمنی کے دارالحکومت برلن پر اپنا قبضہ مکمل کرلیا ہے۔ ہٹلر جو اپنے زمین دوز بنکر میں تھا، لاپتا ہے۔ ہمارے خصوصی نامہ نگار نے اپنے خاص ذرائع سے اطلاع دی ہے کہ ہٹلر زندہ ہے یا پھر مر گیا ہے۔ ہمارے نامہ نگار نے دو دن پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس آخری معرکے کے بعد ہٹلر مر جائے گا یا پھر زندہ رہے گا...''

شاہین پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں بھی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز ہماری آوارہ خرامی پھر شروع ہوئی۔ میں اور عمران لاہور کی سڑکوں پر موٹر سائیکل دوڑاتے رہے۔

اندرونِ شہر گئے۔ خاص اڈوں پر جاکر بھی اپنی صورت دکھائی۔ شہر میں عمران کو جگہ جگہ اپنے شناسا ملے۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ مشکل میں پھنسے ہوئے لوگوں کا مددگار، ضرورت مندوں کا خیال رکھنے والا۔ چاہنے والے اسے یونہی تو ہیرو نہیں کہتے تھے۔ وہ نگاہوں کے راستے دل میں اترتا تھا، ہر محفل کی جان بن جاتا تھا۔ ایک قہوہ خانے میں ایک سابق پولیس انسپکٹر سے عمران کی تلخ کلامی ہوئی تو عمران کی حمایت میں بولنے والے کئی افراد سامنے آگئے اور اس سابق انسپکٹر کی بولتی بند کردی... شام کے بعد ہم سیٹھ سراج کے اس پلازا میں بھی گئے جو وہ اب فروخت کرچکا تھا۔ پلازا میں بھی کسی مطلوبہ شخص سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوسکی۔

اس روز بھی ہم ناکام واپس آئے۔ مجھ پر عجیب سی مایوسی طاری ہورہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ تک پہنچنے کا موقع میں نے اپنے ہاتھوں گنوایا ہے۔ چھیدے کو پہچاننے کے بعد میں خود پر ضبط نہ رکھ سکا اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے خودکشی کرلی۔ اب ہم ایک بار پھر مکمل اندھیرے میں تھے۔ اپنی کیفیت کے زیرِاثر میں چھت پر چلا گیا۔ یہاں عاطف نے ہلکی پھلکی ورزش کے لیے چھوٹا سا جم بنا رکھا تھا۔ ایک سینڈ بیگ بھی یہاں جھول رہا تھا۔ میں سینڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ یہاں تک کہ سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں نہا گیا اور ہاتھوں کی پشت سے خون رسنے لگا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو عمران اور عاطف کھڑے تھے۔ عمران نے تو مجھے پہلے بھی ایسے دیوانے پن سے مشق کرتے دیکھا تھا مگر عاطف کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ وہ ششدر دکھائی دیا۔ میری آنکھوں کی نمی بھی اسے حیران کررہی تھی۔

عمران نے اشارے سے عاطف کو واپس بھیج دیا اور دھیمے قدموں سے میرے پاس آیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''تمہارا دکھ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جگر... لیکن ذرا انتظار... بس تھوڑا سا صبر۔ ہم ماں جی کی روح کو اب زیادہ دیر تڑپنے نہیں دیں گے۔''

اس کے لفظوں نے میرے اندر ایک حوصلہ سا بھر دیا۔ وہ جب بھی بولتا تھا، اسی طرح زخموں پر مرہم رکھ دیتا تھا۔

اگلے روز چاچے نذیرے کی شادی تھی۔ میں اور عمران حسبِ وعدہ وہاں پہنچے۔ عمران کی موجودگی نے اس انوکھی شادی کی رونق دوبالا کردی۔ عمران نے باقاعدہ گانا گایا اور ڈانس کرنے والے نوجوانوں کے ساتھ مل کر ڈانس بھی کیا۔ عمران کا دوست ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی خصوصی اہمیت دی جارہی تھی۔ حاضرین میں فربہ اندام نوجوان جمیل بھی موجود تھا... یہ وہی بندہ تھا جس نے چند روز پہلے ہمیں اپنے پیر شوکت احمد تھانوی سے ملایا تھا اور پیر تھانوی نے ہم سے کچھ الجھی سلجھی باتیں کی تھیں۔ میں نے جمیل سے اس کے پیر کا حال احوال دریافت کیا اور پوچھا کہ وہ ہم سے دوبارہ کب ملاقات کررہے ہیں؟

جمیل اس کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکا۔ اس نے بس یہ کہا کہ پیر صاحب کے پاس آپ کے موبائل نمبرز موجود ہیں۔ انہیں جیسے ہی ضرورت پڑے گی، وہ آپ کو کال کریں گے۔

چاچے نذیرے اور چاچی کلثوم کی انوکھی شادی کی کوریج کے لیے تین چار اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ دو ٹی وی کیمرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ چاچا نذیرا روایتی دیہاتی لباس تہبند اور کرتے میں تھا۔ سر پر رنگ دار پگڑی تھی۔ اس نے خود کو خوب چمکایا ہوا تھا۔

ایک اخباری نمائندے نے پوچھا۔ ''چاچاجی! اس شادی پر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟''

بہرے چاچے نے کہا۔ ''پیسا؟ شادی پر میرا پیسا تو نہیں لگ رہا۔ یہ میرے بجن بیلی ہیں جو لگا رہے ہیں۔''

نمائندے نے نذیرے کے کان کے پاس جاکر ذرا زور سے کہا۔ ''میں کہہ رہا ہوں کہ بچپن کی محبت کو پاکر آپ نے کیسا محسوس کیا ہے؟''

''جوس تو نہیں پیا ہے۔ پتر، جوس تو ٹھنڈا ہوتا ہے۔ میں نے سویرے گری بادام والا دودھ پیا تھا۔ اب تم سب کے ساتھ میٹھا حلوہ کھایا ہے...'' سب ہنسنے لگے۔

عمران نے کہا۔ ''چاچے! تم بڑے خوش قسمت ہو، شوہر کو سنائی نہ دے تو وہ بڑا ہی چنگا رہتا ہے۔''

''چنگا؟ نہیں عمران پتر! میرا تو کسی سے پنگا نہیں رہتا۔ اور کلثوم کے ساتھ تو ہو ہی نہیں سکتا۔''

محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

شام کے وقت چاچے نذیرے کی شادی سے فارغ ہوکر میں اور عمران ایک بار پھر لاہور کی سڑکوں کی پیمائش کرنے لگے۔ یہ ہفتے کا روز تھا۔ ہر طرف ویک اینڈ کی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ ہم اس ہوٹل کے پاس سے گزرے جہاں کبھی ثروت اور میں بیٹھا کرتے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ ہم ذرا چائے پینے کے لیے رک گئے۔ یہاں کی بہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ یہی

جگہ تھی جہاں سیٹھ سراج کے بیٹے واجی نے اپنے دوستوں کے ہمراہ مجھے اور ثروت کو زچ کیا تھا۔ ہم پر فقرے کسے تھے اور اپنی ہیوی موٹر بائیکس ہماری گاڑی کے پیچھے پارک کر کے ہمارا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد ہم کبھی اس جگہ نہیں آئے۔ آج قریباً چار سال بعد میں ان در و دیوار کو دیکھ رہا تھا اور ..... سینے میں دھواں بھر رہا تھا۔

"چلو عمران چلیں۔" چائے ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو ایک دبلے پتلے ویٹر مقبول نے مجھے جھک کر سلام کیا۔ میں نے جواب دیا۔ پرانے چہروں میں سے بس یہی ایک چہرہ مجھے یہاں نظر آیا تھا۔ "آپ بہت عرصے بعد یہاں آئے ہیں صاحب جی؟" وہ بتیسی نکال کر بولا۔

"ہاں، میں یہاں نہیں تھا۔ باہر تھا ملک سے۔" میں نے مبہم جواب دیا۔

وہ ذرا جھجکا پھر بولا۔ "مجھے یاد ہے جی، آپ جب بھی آتے تھے... وہاں اس کونے والی میز پر بیٹھتے تھے۔ اس وقت کافی دبلے پتلے تھے آپ... اور... اور آپ کے ساتھ وہ بی بی بھی ہوتی تھیں۔ آپ کی منگیتر تھیں نا شاید؟"

"ہاں۔" میں نے ایک بار پھر مختصر جواب دیا۔

"وہ کچھ مہینے پہلے بھی یہاں آئی تھیں۔ میں نے جس طرح آپ کو پہچانا، انہیں بھی فوراً پہچان لیا تھا۔"

ویٹر مقبول کے اس فقرے نے جیسے میرے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو زمین میں پیوست کر دیا۔ عمران بھی چونک گیا۔

"ک... کب کی بات ہے یہ؟" میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے یاد تو نہیں، میرا خیال ہے، یہی اگست، ستمبر کے دن تھے۔ اور ایک بار نہیں، وہ تین چار بار آئی تھیں یہاں۔ اکیلی ہی ہوتی تھیں۔ پہلے سے کمزور لگتی تھیں اور کچھ گم صم بھی۔ وہ اسی کونے والی میز پر بیٹھتی تھیں۔"

ویٹر مقبول نے ایک بار پھر ہال کے شمالی گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے تعجب سے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔ عمران کی اطلاع کے مطابق ثروت اور ناصر وغیرہ جرمنی میں تھے لیکن یہ ویٹر مقبول کچھ اور خبر دے رہا تھا۔ ویٹر مقبول کا یہ جملہ بھی میری دھڑکنوں کو زیر و زبر کر رہا تھا کہ ثروت یہاں آتی تھی اور فلاں میز پر بیٹھتی تھی۔

عمران نے ویٹر مقبول سے پوچھا۔ "کیا ہم کہیں اور بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں جی... میری ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے۔ میں تو واپس جا رہا تھا۔ اگر آپ دو سیکنڈ پہلے کاؤنٹر کی طرف نہ آتے تو میں نے تو سیدھا نکل جانا تھا۔"

"کہاں بیٹھیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کہیں باہر چلتے ہیں جی... یہاں آپ کے برابر بیٹھتے ہوئے شرم آئے گی۔"

بہتر یہی تھا کہ کہیں اور بیٹھا جائے۔ ہم ویٹر مقبول کے ساتھ باہر نکلے۔ اب آٹھ بجنے والے تھے۔ ان گنت نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ سڑک پر روشنی کا دریا سا بہہ رہا تھا۔ ہم نے سڑک پار کی اور کچھ فاصلے پر ایک پارک میں جا بیٹھے۔ میرے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں نے مقبول سے پوچھا۔ "تمہیں یقین ہے کہ وہ... میرا مطلب ہے کہ وہ ثروت ہی تھی؟"

"آپ کیسی بات کرتے ہیں جی... میں آپ دونوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ یوں تو ہمارے کیفے میں بہت سے جوڑے آتے ہیں لیکن آپ دونوں کی بات اور تھی۔ آپ کے میل ملاقات میں کوئی لوفرپن نہیں تھا۔ آپ دونوں کبھی کسی کیبن میں نہیں بیٹھے۔ اور بی بی جی کی تو شکل دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ کسی نیک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ آپ دونوں اکثر گرین ٹی پیتے تھے اور مجھے یاد ہے جس حساب سے بل بنتا تھا، اسی حساب سے مجھے ٹپ بھی دیتے تھے... ایک دفعہ آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ دونوں منگیتر ہیں۔ بی بی جی کا چہرہ اس بات پر بالکل گلابی ہو گیا تھا۔"

میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ "تم بتا رہے ہو کہ چند مہینے پہلے وہ تین چار بار یہاں آئی... تمہاری کوئی بات ہوئی ان سے؟"

"جی ہاں... مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کے ساتھ ان کی منگنی وغیرہ آگے نہیں چل سکی۔ ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے پوچھا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں رہی ہیں اور آج کل یہاں اکیلی کیوں آتی ہیں؟ انہوں نے بس گول مول سا جواب دیا۔ کہنے لگیں، میں پاکستان سے باہر تھی۔ یہاں کی چائے کی بہت یاد آتی تھی اس لیے آ جاتی ہوں... سوچتی ہوں شاید یہاں کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر آ جائے لیکن لگتا ہے کہ تمہارے سوا سب کچھ بدل چکا ہے۔ مجھے بعد میں افسوس ہوا کہ میں نے ان سے یہ سب کچھ پوچھا۔"

"کیوں؟"

"اس کے بعد وہ آئی ہی نہیں۔"

"تمہارا کیا اندازہ ہے، وہ عارضی طور پر لاہور میں تھیں یا یہاں رہ رہی تھیں؟"

"میں ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے ان کے پاس اپنی سواری نہیں تھی جی۔ وہ پیدل ہی آتی تھیں۔ ایک بار میں نے انہیں رکشا سے اترتے بھی دیکھا۔۔۔ ہاں، ایک بات یاد آئی۔ ایک دن میں نے انہیں انشورنس کمپنی والے دفتر کی سیڑھیاں اترتے بھی دیکھا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نوکری کی تلاش میں وہاں گئی ہیں لیکن اس کے بعد میں نے انہیں دوبارہ نہیں دیکھا۔"

انشورنس کمپنی کے دفتر والے ذکر نے مجھے چونکایا۔ یہ دفتر پاس ہی چوراہے پر تھا۔۔۔ ایک لحاظ سے یہ اس علاقے میں سب سے پرانا دفتر تھا۔ یہاں میرے کالج کی ایک ساتھی فائزہ کام کرتی تھی۔ فائزہ کسی حد تک ثروت کو بھی جانتی تھی۔ جب میں اور ثروت یہاں ویٹر مقبول والے کیفے میں ملنے آتے تھے تو کبھی کبھی یہاں فائزہ سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ثروت کو واقعی ملازمت کی تلاش ہو۔ وہ اس سلسلے میں فائزہ سے ملی ہو اور فائزہ اس کے بارے میں جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے۔

اگلے دن تک کا وقت میں نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ انشورنس کمپنی کے اس دفتر کے علاوہ میرے پاس فائزہ کا اور کوئی رابطہ نہیں تھا۔ علی الصباح میں اور عمران موٹر سائیکل پر سوار انشورنس کمپنی کے دفتر پہنچ گئے۔ یہ جان کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ فائزہ ابھی تک اسی آفس میں کام کرتی ہے اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر بن چکی ہے۔۔۔ جلد ہی میں اور عمران، فائزہ کے دفتر میں اس کے سامنے موجود تھے۔ فائزہ نے مجھے پہچان لیا اور بڑے تپاک سے ملی۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہو گئی تھی اور لڑکی کے بجائے خاتون نظر آتی تھی۔

وہ میری آمد پر بے حد حیران ہوئی۔ "تم اتنا عرصہ کہاں رہے تابش! مجھے تو لگتا تھا کہ تم سے اب کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میرے اندازے کے مطابق تم پاکستان میں تو ہرگز نہیں تھے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے فائزہ۔"

"میں نے تمہارے گھر بھی کئی بار فون کیے۔ پھر ایک بار خود وہاں گئی بھی لیکن پتا چلا کہ اس گھر میں اب کوئی اور رہتا ہے۔ فرح اور عاطف وغیرہ کا بھی کچھ کھوج نہیں ملا۔ بس ایک اڑتی اڑتی سی افسوس ناک خبر ملی کہ تمہاری والدہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہیں اور اس کے بعد سے تم بھی لاپتا ہو۔"

فائزہ نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے ہمارے لیے چائے منگوائی اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اپنی والدہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں مختصراً بتایا اور فرح عاطف کی خیر خیریت سے آگاہ کیا۔

"ثروت کہاں ہے آج کل؟" فائزہ نے چائے کا دوسرا دور شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم انجان بننے کی کوشش کر رہی ہو فائزہ! مجھے پتا چلا ہے کہ ثروت تمہارے پاس نوکری کے لیے آئی تھی اور تم نے اسے نوکری دلوا بھی دی تھی۔ وہ یہیں پر کام کرتی رہی ہے۔" میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

فائزہ گہری نظروں سے مجھے دیکھنے کے بعد بولی۔ "تمہیں یہ کس نے بتایا؟"

"اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

وہ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ "غلط نہیں کہہ رہے ہو تو درست بھی نہیں کہہ رہے۔ شاید تم قیافے سے بات کر رہے ہو۔"

"چلو تم خود بتا دو۔ میں نے کتنا درست کہا ہے اور کتنا غلط۔"

"چلو، کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔" فائزہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

ہم دفتر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سڑک پار کر کے اسی جانے پہچانے کیفے میں آ بیٹھے جو کبھی میری اور ثروت کی ملاقاتوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس کیفے کی فضا میں پہنچتے ہی میرے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو جاتی تھی۔ آج ویٹر مقبول آن ڈیوٹی نہیں تھا۔ ہم نے کولڈ کافی کا آرڈر دیا۔۔۔ اور ایک بار پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ عمران نے اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیا تھا۔ بہرحال، فائزہ سمجھ چکی تھی کہ عمران کی حیثیت میرے نہایت قریبی دوست کی ہے اور وہ عمران کے سامنے ہر طرح کی بات کر سکتی ہے۔

میں بے چینی سے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے گمبھیر آواز میں بولی۔ "تمہاری یہ بات درست ہے تابش کہ سات آٹھ مہینے پہلے ثروت یہاں نوکری کی تلاش میں آئی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے نہیں ملی۔ شاید اسے پتا ہی نہیں تھا کہ میں ابھی تک یہاں کام کر رہی ہوں۔ وہ ایک خانہ پری والا انٹرویو دے کر مایوس واپس جا رہی تھی کہ میری نظر اس پر پڑ گئی۔ میں اسے پکڑ کر دفتر کے کیفے ٹیریا میں لے گئی۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ بس مجھ سے جلد از جلد پیچھا چھڑا کر چلی جانا چاہتی تھی۔

"میں اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کن حالات سے گزر رہی ہے اور میرا یہی تجسس اسے مجھ سے دور جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے صاف کہا کہ اگر میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے بات کرے تو پھر میں اس سے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھوں۔ میں نے کہا کہ میں خود سے کچھ نہیں پوچھوں گی، اگر وہ اپنی مرضی سے کچھ بتانا چاہے تو اور بات ہے۔

"اس نے مجھے بتایا کہ وہ دو ماہ پہلے جرمنی سے پاکستان آئی ہے۔ یہاں ایک پرانی سہیلی کے پاس ماڈل ٹاؤن میں ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ شادی شدہ سہیلی ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں لیکن اب وہ مزید اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی۔ اسے نوکری کے ساتھ ساتھ ایک ٹھکانے کی تلاش بھی ہے۔

"میں نے کہا کہ ثروت یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمہارا اور میرا ٹاکرا ہو گیا۔ میرا گھر تمہارے لیے بہترین ٹھکانا ثابت ہو سکتا ہے۔ میرا بچہ کوئی نہیں ہے۔ ساس کے ساتھ رہتی ہوں۔ شوہر ملازمت کے سلسلے میں آج کل دبئی مقیم ہیں۔ ہمارا وقت بڑا اچھا گزرے گا۔ باقی رہی نوکری کی بات تو تم پڑھی لکھی ہو۔ اب جرمنی کی ڈگری بھی ہے تمہارے پاس۔ تھوڑی سی کوشش سے تمہیں کہیں بھی باوقار نوکری مل سکتی ہے۔ لیکن اگر تم میرے ساتھ انشورنس کمپنی کے دفتر میں کام کرو تو مجھے اچھا لگے گا۔ یوں میں نے ثروت کے لیے اپنے دفتر میں ہی بڑی مناسب جاب کا انتظام کر دیا۔ میں نے اپنے شوہر سے بھی اجازت لے لی اور وہ میرے ساتھ ہی میرے گھر میں رہنے لگی۔ وہ کوئی تین ماہ میرے ساتھ رہی اور ہم دونوں کا وقت اتنا اچھا گزرا کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی لیکن الجھن بس ایک ہی تھی۔ اس نے میری زبان کو تالا لگا دیا تھا۔ میں اس سے اس کے بارے میں کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ جو تھوڑا بہت مجھے معلوم ہوا، وہ بس یہی تھا کہ تمہارے ساتھ اس کی منگنی برقرار نہیں رہ سکی تھی اور وہ ڈھائی تین سال جرمنی میں اپنے بھائی کے ساتھ رہنے کے بعد کچھ ہی عرصہ پہلے واپس آئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "فائزہ! تمہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس نے شادی کی ہے یا نہیں؟"

"میں سچ کہتی ہوں تابش! مجھے اس بارے میں بڑا تجسس تھا لیکن یہ سوال ان نازک ترین سوالوں میں سے تھا جنہیں وہ کسی صورت سننا پسند نہ کرتی۔ میں جانتی تھی کہ میں نے اپنا وعدہ توڑا تو اسے ایک دم کھو دوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ صبح اٹھوں تو وہ میرے گھر میں موجود ہی نہ ہو۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ ایک بہت بھاری بوجھ سینے پر لیے پھر رہی ہے۔ اس بوجھ اور دکھ سے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے وہ گاہے بگاہے، ہنستی بھی تھی، باتیں بھی کرتی تھی، رات گئے تک دفتر کے کام میں بھی لگی رہتی تھی لیکن اس سب کے دوران میں بھی اس کا دھیان جیسے کہیں اٹکا رہتا تھا۔"

عمران نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "کیا کبھی اس نے آپ سے تابش کے بارے میں کوئی سوال کیا؟"

"نہیں۔۔۔ براہِ راست تو نہیں لیکن ایک بار اتنا ضرور پوچھا کہ کیا میری ملاقات کبھی فرح اور عاطف سے نہیں ہوئی؟ میں نے بتایا کہ نہیں۔ ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میں نے اسے تجویز دی کہ لاہور میں اس کے دو چار رشتے دار موجود ہیں، وہ ان سے ملے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ فرح اور عاطف کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔ اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے کسی رشتے دار سے ملنا چاہتی ہے اور نہ ماضی سے کسی طرح کا رابطہ رکھنا چاہتی ہے۔"

ہم باتیں کر رہے تھے۔ کیفے کی کھڑکیوں سے باہر ایک ابر آلود دوپہر گرد و پیش کو نیم روشن کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "فائزہ! تم نے کہا ہے کہ وہ دو تین مہینے تمہارے ساتھ رہی۔۔۔ پھر کہاں گئی؟"

فائزہ نے گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولی۔ "ایک دن میں فیلڈ ورک کے لیے دفتر سے باہر تھی۔ شام کے وقت واپس آئی تو پتا چلا کہ ثروت جلدی چھٹی کر کے چلی گئی ہے۔ اس کے ساتھی آفیسر نے بتایا کہ لمبے قد کا ایک شخص وہاں آیا تھا۔ اس نے کوریڈور میں کھڑے ہو کر ثروت سے آٹھ دس منٹ تک بات کی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں کوئی تلخ کلامی ہو رہی ہے۔ شاید وہ شخص ثروت کو کسی بات پر دھمکا بھی رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لیگل سائز لفافہ تھا جسے وہ بار بار ثروت کے سامنے کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد ثروت چھٹی لے کر اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں سمجھ رہی تھی

کہ جب میں گھر جاؤں گی تو وہ وہاں موجود ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں بے چینی سے اس کی کال کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا موبائل بند جارہا تھا۔ وہ ساری رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ اگلے روز بھی اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ شام کے وقت بس اس کا مختصر ٹیکسٹ میسج میرے موبائل پر آیا۔ وہ میسج ابھی بھی میرے پاس محفوظ ہے۔۔۔“

فائزہ نے اپنے شولڈر بیگ میں سے موبائل فون نکالا اور تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک میسج دکھایا۔ اس ٹیکسٹ میسج پر تقریباً پانچ مہینے پہلے کی ڈیٹ تھی۔ میسج کچھ یوں تھا۔

”فائزہ! مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہیں بتائے بغیر چلی آئی ہوں۔ میری کچھ ذاتی مصروفیات ہیں جن کی وجہ سے میں آنہیں سکتی۔ بہرحال، میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں آفس بھی نہیں آؤں گی۔ میرا استعفا آفس میں مل جائے گا۔“

فائزہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ثروت کے اس نمبر پر رابطے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نمبر کے علاوہ میرے پاس اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ آخر میں تھک ہار کر بیٹھ گئی۔“

عمران نے فائزہ سے اجازت لے کر سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ”اس بندے کے بارے میں آپ کا کیا اندازہ ہے جو ثروت سے ملنے آیا تھا؟“

”میں نے کہا ہے نا کہ ثروت نے مجھے اپنے بارے میں بالکل اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ میرے پاس اس کے رہنے کی پہلی شرط ہی یہ تھی کہ میں کچھ پوچھوں گی نہیں۔ جہاں تک اس بندے کا تعلق ہے۔۔۔ ہوسکتا ہے۔۔۔ وہ اس کا شوہر ہو لیکن اگر وہ شادی شدہ نہیں تھی تو پھر وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً میرا دھیان ثروت کی اس شادی شدہ سہیلی کی طرف بھی جاتا ہے جس کے پاس وہ جرمنی سے آنے کے بعد ٹھہری تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس سہیلی کا شوہر یا دیور وغیرہ ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ابتی اس سہیلی کا گھر چھوڑنے پر ”بہ وجوہ“ مجبور ہوئی تھی۔“

عمران نے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ سہیلی کے شوہر یا گھر کے کسی اور مرد کا رویہ ثروت سے ٹھیک نہ ہو؟“

”بالکل ایسا ہوسکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں عمران صاحب! ہماری سوسائٹی میں خوب صورت اکیلی لڑکی کے لیے زیادہ تر مرد تو شکاری ہی ہوتے ہیں۔ اچھے لوگوں کا ریشو کم ہے۔“

عمران نے سگریٹ کے روشن سرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس بندے کا پتا چلنا چاہیے جو آخری بار ثروت سے ملا تھا۔“

”یا پھر ثروت کی اس سہیلی سے کچھ پتا چل سکتا ہے جس کے پاس وہ جرمنی سے آکر ٹھہری تھی۔ لیکن اس کا بھی کوئی کھوج کھرا نہیں۔“ میں نے کہا۔

عمران نے پوچھا۔ ”دفتر میں جاب حاصل کرتے وقت ثروت نے جو کوائف لکھوائے، ان سے کوئی مدد نہیں ملتی؟“ فائزہ نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔

”اور وہ سامان جو وہ تمہارے پاس چھوڑ گئی تھی؟ ہو سکتا ہے اس سے کوئی کھوج ملے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے تو وہ کئی بار دیکھا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو تو تم بھی دیکھ لو۔“ فائزہ نے کہا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی موسم کافی ابرآلود ہو گیا تھا۔ دوپہر میں ہی لگ رہا تھا کہ شام ہوگئی ہے۔ لگتا تھا کہ ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔ عمران کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔۔۔ کون؟ جی جی تھانوی صاحب۔ میں بول رہا ہوں۔۔۔ ابھی؟۔۔۔ لیکن۔۔۔“

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا۔۔۔ پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو میں حاضر ہو جاتا ہوں۔۔۔ او کے۔“

فون بند کر کے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”پیر احمد تھانوی صاحب کی کال تھی۔ زور دے رہے ہیں کہ میں ابھی آجاؤں۔ مریض کی حالت خراب ہے۔“

”تو پھر؟“ میں نے پوچھا۔

فائزہ بولی۔ ”میرے خیال میں آپ کو کوئی ضروری کام ہے، آپ چلیں۔ میں بھی دفتر کا تھوڑا سا کام نمٹالوں۔ آج رات کا کھانا آپ میرے گھر کھائیں۔ تفصیل سے بات چیت بھی ہوگی۔ ابھی آپ کو بہت کچھ بتانا ہے اور آپ سے پوچھنا بھی ہے۔“

فائزہ نے اپنے گھر کا مکمل ایڈریس اور فون نمبر مجھے دیا۔ فائزہ سے رخصت ہو کر ہم جیلانی کی موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور شاہ جمال کے علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ راستے میں ہی زوردار بارش شروع ہوگئی۔ یہ اچھا خاصا طوفانِ بادوباراں تھا، ہم کہیں رکنے کے بجائے چلتے رہے۔ ساون میں تو سب ہی بارش میں نہانا چاہتے ہیں۔۔۔ اس جاتی سردیوں کی بارش میں نہانے کے لیے ہمت کی ضرورت تھی اور یہ ہمت ہم دونوں میں موجود تھی۔ عمران کی جیکٹ مکمل واٹر پروف تھی۔ اس کی پاکٹ

میں موجود ماؤزر اور ایمونیشن کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ تھانوی صاحب نے چند دن پہلے ہمارے اندر جو تجسس جگایا تھا، وہ اب عروج پر پہنچ چکا تھا۔ پیر صاحب فرماتے تھے کہ ایک مریض کے علاج میں عمران ان کی خاطر خواہ مدد کرسکتا ہے۔ لیکن انہوں نے ابھی تک مریض کے بارے میں کچھ بتایا تھا اور نہ اس کے علاج کے بارے میں۔

ہم جس وقت شاہ جمال کی اس کوٹھی میں پہنچے، بارش پورا زور پکڑ چکی تھی۔ ہمارے استقبال کے لیے فربہ اندام جمیل اور ایک باریش ادھیڑ عمر مزید پہلے سے برآمدے میں موجود تھے۔

جمیل نے کہا۔ ”اوہو عمران بھائی! آپ تو بھیگتے ہوئے آئے ہیں۔ آپ بتا دیتے، پیر صاحب آپ کے لیے گاڑی بھجوا دیتے۔“

عمران بولا۔ ”کسی ایک کو تو بھیگنا ہی پڑتا۔ ہم نہ بھیگتے تو گاڑی بھیگ جاتی بلکہ چیکو و چیکو ہو جاتی۔ پھر سروس کرانے پر کافی پیسے لگ جاتے۔ ہمارا کیا ہے، تھوڑے سے پانی سے نہائیں گے۔ اور پانی کی بچت بہت ضروری ہے۔ امریکا نے کہا ہے کہ اگلی ساری لڑائیاں پانی کی وجہ سے ہوں گی۔۔۔ جیسے پچھلی ساری لڑائیاں امریکا کی وجہ سے ہوئی ہیں۔۔۔“

عمران جب ایک بار زبان کو حرکت دے دیتا تھا تو پھر وہ جلدی رکتی نہیں تھی۔ لیکن یہاں بولتے کا زیادہ موقع نہیں تھا کیونکہ ہم جلد ہی۔۔۔۔ تھانوی صاحب کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ تھانوی صاحب نے اپنے کمرے میں ہمارا استقبال کیا، تپاک سے ملے۔ اس بات پر معذرت بھی کی کہ ہمیں بھیگتے ہوئے یہاں آنا پڑا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھے۔ کندھوں پر ایک سنہری شال تھی۔ انہوں نے ہمیں ساتھ لیا اور ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں کا منظر تعجب خیز تھا۔ ایک پلنگ پر ایک نہایت کمزور شخص لیٹا نظر آیا۔ اس کی عمر یہی کوئی چھبیس ستائیس سال دکھائی دیتی تھی۔ اس نے ٹھوڑی تک لحاف اوڑھ رکھا تھا۔ تاہم اس لحاف کے اوپر ایک سفید چادر بھی تھی۔ اس نے اپنا سر وغیرہ بھی ایک سفید کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ لحاف کا ایک کنارہ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس سے پتا چلا کہ اس شخص کے سینے پر کوئی زخم سا ہے جس پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ اس جوان سال شخص کی گدلی آنکھوں میں خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔ رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر عورت مدقوق شخص کے سرہانے بیٹھی تھی اور آنسو بہا رہی تھی۔ اندازہ ہوا کہ یہ مریض کی ماں ہے۔ ماں بیٹا نے جن نظروں سے عمران کو دیکھا، مجھے فوراً یقین ہو گیا کہ وہ اسے پہلے سے جانتے ہیں۔ دوسری طرف عمران کے چہرے پر بھی شناسائی کے آثار نظر آئے۔

عمران کو دیکھ کر ادھیڑ عمر عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور گھبرائے ہوئے انداز میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

احمد تھانوی صاحب نے عمران کی طرف اشارہ کر کے مدقوق شخص سے کہا۔ ”نیاز محمد! اسے پہچان رہے ہو نا تم؟ یہ عمران ہے۔۔۔ جسے تم نمو کہتے ہو۔“

مدقوق شخص نے اپنے سوکھے سڑے ہونٹوں پر زبان پھیری اور مزید ڈرا ہوا دکھائی دینے لگا۔ تھانوی صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔ ”بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر لایا ہوں اسے۔ اگر اب بھی تمہارے دماغ کا فتور نہ نکلا تو یہ بہت بڑی بدقسمتی ہوگی۔“

میرے دماغ میں ہلچل ہوئی۔ عمران کی روداد میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ نیاز اسی چودھری زادے کا نام تھا جس پر سے آفت ٹالنے کے لیے برسوں پہلے عمران کا انتخاب کیا گیا تھا۔ چودھری سجاول اور اس کی بیوی نے اپنے لاڈلے بیٹے کو آسمانی بجلی والی نحوست سے بچانے کے لیے عمران کو قربانی کا بکرا بنایا اور اسے شہنشاہ کے مزار پر خدمت کے لیے بھیج دیا تھا۔

میں نے حیرت سے دیکھا۔ یہ وہی نیاز تھا۔ خوف اور بیماری نے اسے اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔۔۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے باپ کی طرح اسے بھی ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور وہ یہیں اس پلنگ پر پڑا پڑا آخری ہچکیاں لینی شروع کر دے گا۔ باہر طوفانِ بادوباراں اپنے زور پر تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور بادل دہاڑ رہے تھے۔

تھانوی صاحب نے عمران کو اشارہ کیا اور ہم پیر صاحب کے ساتھ باہر آ گئے۔ دوسرے کمرے میں آکر پیر صاحب نے مجھے اور عمران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے تو وہ بولے۔ ”عمران بیٹا! انسان جو کچھ بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ اس میں دیر ہوسکتی ہے، اس کی شکل بدل سکتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے۔ نیاز کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ وہم کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔۔۔ اور یہ وہم نیاز اور اس کے گھر والوں کو جکڑ چکا ہے۔ یہ وہی وہم ہے جس کی وجہ سے تم پر مصیبتیں آئیں اور تمہیں اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔“

”آپ کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہی ہے۔“ عمران نے ہنکارا بھرا۔

تھانوی صاحب نے اپنی سفید براق داڑھی میں

انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں یہ بات کیسے ان لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ چکی ہے کہ آسمانی بجلی کچھ خاص لوگوں کا پیچھا کرتی ہے... اور انہیں مارے بغیر نہیں چھوڑتی۔ کئی برس پہلے جب اس وہم نے ان لوگوں کو جکڑا تو انہوں نے اپنی دانست میں اپنی بلا تمہارے گلے ڈالنے کی کوشش کی... اب ایک بندے کی وجہ سے یہ وہم پھر ان لوگوں کی طرف واپس آ گیا ہے کہ آسمانی بجلی نیازے کو کھا جائے گی۔ اب یہ بندہ رات دن جان کنی کے عذاب میں پڑا ہوا ہے۔ تم نے ابھی اسے دیکھا ہی ہے، کیا حال ہو رہا ہے اس کا۔ راتوں کو اٹھ کر چلّانے لگتا ہے۔ اونچی آواز میں روتا ہے۔ یہاں تک کہ چارپائیوں کے نیچے چھپتا ہے۔ نیم دیوانوں کی سی حالت ہو چکی ہے۔“

عمران پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ”لیکن یہ لوگ تو ساری مصیبت میرے سر... ڈال کر ”فارغ“ ہو چکے تھے۔“

”میں نے بتایا ہے نا کہ ایک بندے کی وجہ سے یہ وہم پھر ان کی طرف لوٹ آیا ہے... یا یوں کہہ لو کہ اس بندے کی خودغرضی اور طمع نیاز کو موت کے منہ میں لے آئی ہے۔ تم اس بندے کو جانتے ہو اور پہچان بھی لو گے۔“ احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک دراز کھولی اور ایک کتاب میں رکھی ہوئی تصویر نکال کر عمران کو دکھائی۔ عمران کے چہرے پر نفرت کا رنگ لہرا گیا۔ حالانکہ یہ رنگ کم کم ہی اس کے چہرے پر آتا تھا۔ میں نے بھی تصویر پر نظر ڈالی۔ یہ گول چہرے والا ایک شخص تھا۔ بال لمبے تھے۔ اس نے سیاہ شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ ایک رخسار اور کنپٹی پر گہرا زخم تھا جیسے کسی جانور کے پنجے کا کھرونچا ہو۔ اس کھرونچے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس شخص کی یہ آنکھ بھی سلامت نہیں ہے۔ میرا ذہن فوراً صادق شاہ کی طرف چلا گیا۔ وہی شیطان صفت عامل جو عمران کے انتقام کا نشانہ بنا تھا۔ ”نوجوان مردوں کی شکاری ماہجان“ کے بعد یہ دوسرا شخص تھا جسے عمران نے بڑی خوب صورتی سے اپنے انتقام کی تپش سے آگاہ کیا تھا۔ عمران نے مشتعل بنگال ٹائیگر کو صادق شاہ کے کمرے میں چھوڑ دیا تھا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ شیر اور صادق شاہ کی اس طوفانی ملاقات میں پیر صادق شاہ کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ دونوں ہنسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور ”خادم“ نے مخدوم کا ایک کندھا بھی چبا ڈالا تھا۔

تھانوی صاحب کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”نیاز اور اس کی ماں کے ذہن میں یہ بات اسی صادق شاہ نے ڈالی ہے کہ عمو چونکہ اب تک بجلی والی آفت سے بچا ہوا ہے، اس لیے اب یہ آفت عمو کے ساتھ ساتھ نیازے پر بھی آ گئی ہے۔ ان دونوں میں سے جو کوئی بھی پہلے آسمانی بجلی کے نشانے پر آئے گا، مارا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب کچھ چودھرائن اور اس کے اکلوتے بیٹے سے موٹی رقمیں بٹورنے کے لیے کیا تھا۔ اور وہ اپنی اس کوشش میں کافی کامیاب بھی رہا ہے۔ سنا ہے کہ نقد رقم کے ساتھ ساتھ وہ اب تک کافی اراضی بھی ماں بیٹے سے ہتھیا چکا ہے۔“

عمران نے اپنی ٹھوڑی کے گڑھے کو انگلی سے چھوا اور پُرسوچ انداز میں بولا۔ ”مجھے پتا تھا، ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہے۔ آپ صحیح کہتے ہیں کہ وہم کا کوئی علاج نہیں اور وہمی شخص کو کسی نئے وہم میں مبتلا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا آنکھیں بند کرنا اور کھولنا۔“

تھانوی صاحب نے کہا۔ ”دو تین ماہ پہلے یہ لوگ پیر صادق شاہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ کسی نے ان کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے انہیں تسلی تشفی دی۔ چودھرائن کو نماز، روزے کی طرف راغب کیا۔ وظیفے بتائے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ نیاز محمد پچھلے قریباً ڈھائی مہینے سے میرے پاس ہی رہ رہا ہے۔ دو تین روز کے لیے گاؤں جاتا بھی ہے تو فوراً پلٹ آتا ہے۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ میرے پاس زیادہ محفوظ ہے۔ لیکن میں نے بتایا ہے نا کہ یہاں بھی وہ مکمل سکون میں نہیں ہے۔ اس کی ذہنی صحت بہت بگڑ چکی ہے۔ میں مختلف طریقوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ اسے نارمل زندگی کی طرف لا سکوں۔ آج میں نے جو تمہیں یہاں آنے کی زحمت دی ہے تو اسی سلسلے میں دی ہے۔“

”جی، میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ عمران نے کہا۔

”یہ سب کچھ تمہیں عجیب تو لگے گا عمران... لیکن عجیب بیماریوں کے علاج بھی عجیب ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں عمران کہ آج تم اس برسوں پرانے خیال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو جو تمہارے آبائی گاؤں کے لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے... اور یہ بس تمہارے گاؤں کی بات نہیں ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ علاقے کے بہت سے لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آسمانی بجلی تمہاری دشمن ہے اور تم اس سے چھپتے پھرتے ہو۔ نیاز اور اس کی چودھرائن ماں کا خیال بھی یہی ہے۔ آج تم نیاز اور اس کی ماں کے سامنے اس خیال کو غلط ثابت کر دو۔“

”میں بالکل تیار ہوں جی... مجھے خوشی ہوگی اگر میرے اس چھوٹے سے کام سے ان لوگوں کا کچھ بھلا ہو جائے۔“

”میں جانتا ہوں عمران... تم بڑے دل کے مالک ہو۔ اپنے دشمنوں سے بھی اچھا کر سکتے ہو۔“ احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سچ پوچھیں جی تو میں نے تو اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنا رکھا ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ جاہلیت اور دقیانوسیت نظر آئے گی، اس کے خلاف اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق کوشش کروں گا۔ اور اس کام میں میرا یہ بھائی اور دوست تابش بھی میرے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا ہے۔“

تھانوی صاحب نے گہری نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولے۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں ہمارے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ بہرحال، اس بارے میں پھر بات کریں گے۔“

تھانوی صاحب ہمیں وہیں چھوڑ کر پھر نیازے اور اس کی ماں کے پاس چلے گئے... بارش اسی تسلسل سے جاری تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ تین چار منٹ بعد... تھانوی صاحب واپس آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک سیاہ لبادہ تھا... انہوں نے یہ لبادہ عمران کے بھیگے ہوئے کپڑوں کے اوپر سے ہی اسے پہنا دیا۔ پھر وہ عمران کو لے کر باہر صحن میں آ گئے۔ یہاں فائبر کی ایک کرسی پڑی تھی..... تھانوی صاحب کی ہدایت کے مطابق عمران جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ عمران کو کمپنی فراہم کرنے کے لیے فربہ اندام جمیل بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دونوں باتیں کرنے لگے اور بارش میں بھیگنے لگے... میں اور تھانوی صاحب اس کمرے میں آئے جہاں نیاز اور اس کی ماں ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ کمرے کی گرل دار کھڑکی میں سے صحن کا سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ بستر پر بیٹھے نیازے کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی ہیں۔ چودھرائن بھی سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ تھانوی صاحب کچھ دیر تک ان دونوں کے پاس کھڑے رہے پھر نرم لہجے میں گویا ہوئے۔ ”نیاز! مجھے پتا نہیں کہ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی تمہارے دماغ کا خناس دور ہوگا یا نہیں... لیکن جو حقیقت ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ یہ اس چمکتی بجلی اور برستی بارش میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑا ہے۔ اور میں تمہیں دعوے سے کہتا ہوں۔ یہ بندہ کبھی بھی ان چیزوں سے چھپا نہیں بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے بھی یہ اسی طوفان میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے یہاں پہنچا ہے۔“

”لیکن... یہ...“ نیاز ہکلا کر رہ گیا۔

”تم چاہو تو جب تک یہ بارش برس رہی ہے... عمران یہاں کھڑا رہے گا۔ اور صرف آج کی بات ہی نہیں ہے۔ اگر تم آئندہ بھی چاہو تو یہ تمہیں اس تجربے سے گزر کر دکھا سکتا ہے۔ اپنے اندر کے بے جا خوف اور واہموں کو دور کرو نیاز... جس طرح عمران عمو کے سر پر کوئی آفت نہیں، تمہارے سر پر بھی نہیں۔ جو کچھ ہے بس ایک زہریلا وسوسہ ہے...“

بجلی چمکی۔ ساتھ ہی ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ در و دیوار لرز گئے۔ نیازا بے ساختہ چلّا اٹھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔ اس کی ماں نے اسے اپنے کلاوے میں لے لیا، اسے پچکارنے لگی۔ ”کچھ نہیں پتر... کچھ نہیں ہوا۔ پیر جی ہمارے پاس ہیں۔ ان کے ہوتے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”میرے ہونے نہ ہونے کی بات نہیں چودھرائن۔ اصل میں کچھ ہے ہی نہیں۔ جو کچھ ہے بس ایک دھواں ہے، دھند ہے، وسوسہ ہے۔ وہ دیکھو، حقیقت تمہارے سامنے ہے۔ کالا چولا پہنے وہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور جب تک تم چاہو گے بیٹھا رہے گا۔“

نیازے نے ڈری ڈری نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ عمران اور جمیل باہر موجود تھے۔ نیازے کا سارا جسم کانپنے لگا... چودھرائن نے اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ خود بھی کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

قریباً آدھ پون گھنٹے بعد بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ عمران اب اندر آ چکا تھا۔ اس نے گیلے کپڑے اتار کر دوسرے پہن لیے تھے۔ یہ تھانوی صاحب کے کسی مرید کی شلوار قمیص اور جرسی تھی۔ ایک ہال کمرے میں.... تھانوی صاحب کے کئی مریض اور معتقدین موجود تھے۔ وہ بارش رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ سات بج چکے تھے۔ ہال میں موجود افراد میں سے بھی دو چار لوگوں نے عمران کے بارش میں بھیگنے کا منظر دیکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی حیران ہوئے تھے۔ انہوں نے شاید اسے کسی روحانی عمل سے تعبیر کیا ہو۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ تھانوی صاحب نے چند دن پہلے عمران سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ آج نہیں بلکہ پھر کسی اور دن اسے زحمت دیں گے۔ یقیناً انہیں کسی ابر آلود دن کا انتظار تھا... اور یہ انتظار آج ختم ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد فربہ اندام چودھرائن اندر داخل ہوئی۔

اس کے ہاتھوں میں سونے کے کڑے تھے۔ لباس دیہاتی طرز کا لیکن قیمتی تھا۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ کمرے میں صرف میں، عمران اور جمیل موجود تھے۔ چودھرائن ہم دونوں کی پروا کیے بغیر زمین پر بیٹھ گئی اور عمران کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ عمران نے جلدی سے چودھرائن کو اپنے پاؤں پر سے اٹھایا اور کوشش کر کے صوفے پر بٹھایا۔

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''عمو پتر... خدا کے واسطے ہمیں معاف کر دو۔ ہم نے تمہیں بڑے دکھ دیے ہیں۔ ہم کو اپنی کرموں کی سزا مل رہی ہے۔ میرا پتر جھلا ہو گیا ہے۔ وہ کسی کام جوگا نہیں رہا۔ دن رات کمرے میں بند رہتا ہے۔ کھڑکیاں، دروازے کبھی نہیں کھولتا۔ اس کا جینا حرام ہو گیا ہے پتر... تو ہمیں معاف کر دے۔ شاید اسی طرح اس کی مشکل آسان ہو۔''

عمران خاموش کھڑا تھا۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ وہ فوراً چودھرائن کی اشک شوئی کرے گا اور نیازے کو معاف کرنے کی بات کرے گا۔ عمران کے چہرے سے اس کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا کافی مشکل ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے اندرونی کرب کے اثرات اس کے چہرے پر بھی تھے۔

چودھرائن نے اپنی گرم شال کے پلو سے اپنا تر بتر چہرہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں مانتی ہوں عمو پتر! ہم نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں... پہلے تمہاری ماں کو تم سے دور کیا پھر تمہاری منگ بھی تم سے چھڑا دی۔ یہ ظلم شاید پہلے ظلم سے بھی بڑا تھا... اس دکھ نے تمہیں بالکل اجاڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنے سارے قصور مانتی ہوں پتر! تیرے سسرال والے تیرے بارے میں سن گن لینے کے لیے ہمارے پاس ہی آئے تھے۔ ہماری حویلی میں آئے تھے۔ اللہ بخشے نیازے کے پیو نے انہیں ڈرا دیا۔ ان سے کہا کہ عمو پر سایہ ہے۔ عاملوں نے کہا ہے کہ بجلی اس کی ویری ہے۔ وہ چھپ چھپا کر رہتا ہے۔ ہماری ان باتوں نے تمہیں اجاڑ دیا پتر... وہ کڑی بھی مر گئی... اس کی قبر بن گئی۔ اس سارے ظلم میں ہم حصے دار ہیں پتر... ہم حصے دار ہیں۔ خدا کے واسطے ہمیں معاف کر دو۔ میرے نیازے کی جان بچا لو...''

وہ ایک بار پھر عمران کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اس کے پاؤں تھام لیے۔ عمران نے اسے دوبارہ اٹھایا۔

وہ روتی رہی، بلکتی رہی۔ اپنے ایک ایک گناہ کا اعتراف کرتی رہی۔ اس نے یہ مانا کہ وہ اپنے اکلوتے بچے کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے عمران کو مشکلوں کی آگ میں پھینک دیا... اور آج اس کا پھل یہ ملا ہے کہ ان کا بیٹا موت کے منہ میں ہے۔ اس کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا کہ اس کے بیٹے کو سینے کی کوئی بیماری ہے۔

اسی دوران میں...... تھانوی صاحب بھی اندر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر چودھرائن ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ دہائی دینے لگی۔ ''پیر جی... آپ سفارش کریں۔ آپ عمو سے کہیں ہمیں معاف کر دے۔''

پیر صاحب نے چودھرائن کو ڈانٹا اور اسے کہا کہ وہ ان کے پاؤں سے اٹھ جائے۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر... تھانوی صاحب نے نرم لہجہ اختیار کیا اور اسے تسلی دی کہ عمران ان کے ساتھ وہ نہیں کرے گا جو انہوں نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ وہ انہیں معاف کر دے گا اور اس کی معافی انشاء اللہ نیازے کو ٹھیک ہونے میں بھی بہت مدد دے گی۔

چودھرائن سسکیاں لیتی رہی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ دوپٹے میں چھپا رکھا تھا۔ میں سوچنے لگا، انسان جب طاقت اور اختیار کے نشے میں سرشار ہوتا ہے تو فرعون اور شداد جیسے جابروں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے لیکن جب حالات کی چکی میں پستا ہے تو ذرے سے حقیر نظر آتا ہے۔

کچھ دیر بعد احمد تھانوی صاحب کے کہنے پر چودھرائن نے بتانا شروع کیا کہ پیر صادق شاہ نے کس طرح نیازے کو اور باقی گھر والوں کو اپنی باتوں میں جکڑا... کیسے ان کے دلوں میں ایک جان لیوا خوف کی بنیاد رکھی اور پھر کس کس طرح اس خوف کو بڑھاوا دیا۔ یہاں تک کہ چودھرائن اپنے بیٹے اور اس کے بچوں کی خاطر صادق شاہ کے شکنجے میں جکڑتی چلی گئی۔ چودھرائن کے پاس زیورات کی شکل میں ڈھائی تین کلو سے کم سونا نہیں تھا۔ نیازے کے علاج کے سلسلے میں وہ اپنا قریباً آدھا زیور وقتاً فوقتاً صادق شاہ کو دے چکی تھی... اس کے علاوہ کچھ اراضی بھی تھی...

عمران نے چودھرائن کی ساری گفتگو سنی۔ آخر میں اس نے پوچھا۔ ''چاچی! میری ماں کے بارے میں کوئی خیر خبر نہیں تمہارے پاس؟''

چودھرائن نے نفی میں سر ہلایا اور آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ ''پیر صاحب کی دعا سے اب میں پنج وقت کی نماز پڑھنے لگی ہوں۔ میں ہر نماز کے بعد رب سے دعا کرتی ہوں کہ ہمیں بھین شریفاں کا کوئی پتا چلے۔ ہم اس کے پاؤں میں

گر کر معافی مانگیں۔ پتا نہیں یہ دعا کب قبول ہوگی۔''

عمران نے کہا۔ ''چاچی! تو پچھلے چند مہینے سے جس طرح اپنے پتر کے لیے تڑپ رہی ہے، میری ماں پچھلے دس سال سے اسی طرح تڑپ رہی ہوگی۔ کیا کبھی تم نے سوچا ہے اس بارے میں کہ تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟''

وہ ایک بار پھر دوپٹے میں منہ چھپا کر آنسو بہانے لگی۔

بارش تھم گئی تھی... تھانوی صاحب کے عقیدت مند اب جانا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ کوٹھی کے سامنے سڑک پر قطار میں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کچھ گاڑیاں اسٹارٹ ہو رہی تھیں۔ موٹر سائیکلوں وغیرہ پر آنے ہوئے لوگ بھی نکل رہے تھے۔ ایک چادر پوش لڑکی رکشے والے کو ہاتھ کے اشارے سے روک رہی تھی۔ رکشا رک گیا۔ جب وہ اندر بیٹھنے کے لیے ذرا سا گھومی تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا... اور اپنی جگہ سے بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ چہرہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ یہ قد کاٹھ، یہ حلیہ... یہ ثروت کی چھوٹی بہن نصرت تھی... جو ثروت اور بھائی ناصر کے ساتھ ہی جرمنی چلی گئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں وہ چند سیکنڈ کے لیے مجھے پوری کی پوری دکھائی دی پھر رکشے میں اوجھل ہو گئی۔ میں تڑپ کر کھڑکی تک پہنچا۔ ایک بارش مزید مرا اور دھکا لگنے سے دور جا گرا تھا۔ میں کھڑکی سے منہ نکال کر دیوانہ وار چلایا... ''رکو... رک جاؤ۔''

تب تک رکشا سڑک کے موڑ پر اوجھل ہو چکا تھا۔

''عمران آؤ۔'' میں بلند آواز سے بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے باہر گیراج میں آئے۔ عمران جان چکا تھا کہ میں نے کسی کو دیکھا ہے اور اب اس کے پیچھے جانا چاہتا ہوں۔ اس نے لپک کر موٹر سائیکل سنبھالی۔ وہ بارش میں بھیگی ہوئی تھی۔ تین چار ککس سے پہلے اسٹارٹ نہیں ہو سکی۔ ہمارا انداز دیکھ کر اردگرد کے سارے لوگ ٹھٹکے ہوئے تھے۔ جونہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی، ہم طوفانی انداز میں احمد تھانوی صاحب کی کوٹھی سے نکلے۔

''کدھر؟'' عمران نے پوچھا۔

''رکشے کے پیچھے۔ ابھی دائیں طرف مڑا ہے۔ نیلے رنگ کا ہے۔''

''سارے رکشے نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ نمبر دیکھا ہے؟''

''نہیں۔''

عمران نے سڑک پر پھسلن کی پروا کیے بغیر خطرناک رفتار سے موٹر سائیکل کو دائیں طرف موڑا۔ رکشا قریباً سو میٹر سڑک کے موڑ پر اوجھل ہوتا دکھائی دیا۔ عمران ایکسلریٹر کو گھماتا چلا گیا۔ جب ہم موڑ پر پہنچے تو رکشا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ قریباً دو سو میٹر آگے جا کر ہم ٹھٹکے گئے۔ یہ ایک چوراہا تھا۔ تینوں اطراف میں خم دار سڑکیں تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ عمران نے اندازے سے ایک سڑک پر موٹر سائیکل ڈال دی۔

ہم قریباً پانچ منٹ تک ادھر ادھر چکراتے مگر مطلوبہ رکشے کا کھوج نہیں ملا۔ آخر ہم رک گئے۔ اس دس منٹ کی بھاگ دوڑ کے دوران میں میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو اپنی کنپٹیوں میں محسوس کیا تھا۔ ''کون تھا رکشے میں؟'' عمران نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''پورے یقین سے تو نہیں کہہ سکتا عمران... لیکن نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ رکشے میں ثروت کی چھوٹی بہن نصرت بیٹھ کر گئی ہے۔''

''یار! تمہیں وہم ہوا ہوگا۔ آج کل تمہارے ذہن میں رات دن یہی باتیں گردش کر رہی ہیں۔ ایسی کیفیت میں اس طرح کے ''نظری دھوکے'' ہوتے ہیں۔''

''لیکن یہ ایسی ناممکن بات تو نہیں ہے عمران! ہمارے پاس ثبوت ہے کہ چار پانچ مہینے پہلے تک ثروت یہاں پاکستان میں موجود تھی اور عین ممکن ہے کہ اب بھی ہو۔ اگر ثروت یہاں ہو سکتی ہے تو نصرت بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ناصر بھائی بھی ہوں...''

''تم نے کب دیکھا ثروت کی بہن کو؟''

''جب وہ رکشے میں بیٹھ رہی تھی۔ وہاں مرکری اسٹریٹ لائٹ ہے۔ مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں واپس تھانوی صاحب کے پاس چلنا چاہیے۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ بتا سکتے ہیں۔''

ہم واپس شاہ جمال کی اس کوٹھی میں پہنچے.... تھانوی صاحب کے بیشتر عقیدت مند اور مریض رخصت ہو چکے تھے۔ تھانوی صاحب کے دو مرید اور عمران کا منشی دار جمیل پریشان سے گیراج میں کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھا تو وہ لپک کر ہمارے پاس آئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم یوں آناً فاناً کس کے پیچھے گئے تھے۔

ہم نے ان لوگوں کو تو کچھ نہیں بتایا تاہم تھانوی صاحب کے سامنے ساری بات کھول دی۔ تھانوی صاحب نے سب کچھ توجہ سے سنا۔ آخر میں بولے۔ ''میں نے آج تقریباً پچیس تیس مریضوں کو دیکھا ہے۔ ان میں آٹھ دس

عورتیں بھی تھیں۔ اکثر بی بیاں اپنا نام بتا دیتی ہیں لیکن ان میں نصرت کا نام تو میرے سامنے نہیں آیا۔ لڑکی کا لباس کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "جہاں تک میں نے دیکھا ہے، اس نے گلابی رنگ کی کڑھائی دار شال لے رکھی تھی۔ سوئٹر شاید سفید تھا۔"

...تھانوی صاحب نے اپنے مرید خاص فرید کو آواز دی۔ "فرید! اندر آؤ۔"

درمیانی عمر کا ایک باریش شخص دست بستہ اندر داخل ہوا اور مؤدب کھڑا ہو گیا... تھانوی صاحب نے پوچھا۔ "آج نصرت نام کی ایک لڑکی یہاں آئی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس نے گلابی شال اور سفید سوئٹر پہن رکھا تھا شاید۔"

فرید نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی حضرت! گلابی شال والی ایک بی بی، عورتوں والے حصے میں بیٹھی ہوئی تو تھی لیکن میرا خیال ہے کہ آج اس کی باری نہیں آئی۔ جو آخری ٹوکن نمبر میں نے آپ کے پاس بھیجا، وہ تیس تھا۔ اس کے بعد بھی دس بارہ ٹوکن اور تھے لیکن پھر آپ کے مہمان آ گئے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" احمد تھانوی صاحب نے کہا۔

فرید الٹے پاؤں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھانوی صاحب نے کہا۔ "اگر آج اس کی باری نہیں آئی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کل آئے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہاں اس سے تم دونوں کی ملاقات ضرور ہوگی۔"

اگلے اٹھارہ گھنٹے میں نے اور کسی حد تک عمران نے بھی بے حد بے چینی میں گزارے۔ یہ احساس بے حد سنسنی خیز اور صبر آزما تھا کہ ثروت جرمنی میں نہیں بلکہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ وہ جس کے لیے میں پل پل تڑپا تھا جس کو میں کبھی بھی بھولا نہیں تھا۔ نہ اپنی خود فراموشی کے اندھیروں میں، نہ تل پانی کے ہنگاموں میں، نہ زندگاں کی قتل گاہوں میں... جوں جوں صبح ہوئی تھی، جوں جوں دن ڈھلا تھا، جوں جوں رات نے آنچل پھیلایا تھا، میں نے اسے یاد کیا تھا۔ اس سے ملنے کی آرزو کی تھی... اس رات میں بالو کو دیر تک گود میں اٹھائے کوٹھی کے پائیں باغ میں گھومتا رہا۔ اس کے نرم گال چومتا رہا۔ یہ بالو جیسے میرے لیے ماضی اور مستقبل کا سنگم تھا۔ بالو کے ایک طرف سلطانہ کی یادیں تھیں اور دوسری طرف ثروت کی۔

میڈم صنوبر اپنی لال کوٹھیوں میں واپس جا چکی تھی۔ اقبال بھی جا چکا تھا۔ تاہم نوری اور رعنا یہیں پر تھیں۔ شاہین کا بھائی ظفر اپنے ہاسٹل چلا گیا تھا۔ شاہین بھی جانا چاہتی تھی مگر عمران نے اسے جانے نہیں دیا۔ میری توقع کے عین مطابق عمران نے کرائے کا وہ گھر خالی کر دیا تھا جہاں شاہین اور ظفر احمد ہماری آمد سے پہلے رہ رہے تھے۔ جیلانی کے ذریعے شاہین اور ظفر کا سارا سامان بھی یہیں پر منگوا لیا گیا تھا۔ اب یہاں دن میں کئی بار عمران اور شاہین کی نوک جھونک دیکھنے کو ملتی تھی۔

اگلے روز میں اور عمران دوپہر ایک بجے ہی پیر احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ چودھرائن اور اس کے بیٹے نیازے سے بھی مختصر ملاقات ہوئی۔ چودھرائن ہم دونوں کے سامنے اور خاص طور سے عمران کے سامنے بچھی بچھی جا رہی تھی۔ کل والے واقعات کے بعد نیازے کی حالت کچھ بہتر لگتی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا دو تین تکیوں کے سہارے بیٹھا گندم کا دلیا کھا رہا تھا۔ اس نے عمران سے نظر نہیں ملائی... ہم جب تک وہاں رہے، وہ کچھ بولا اور نہ ہی اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کی چھاتی پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کئی ایلو پیتھک دوائیں قریبی میز پر پڑی تھیں۔

دوسرے کمرے میں آ کر میں نے عمران سے پوچھا۔ "یار! اس نیازے کی بیماری ہے کیا؟ کل تم نے کینسر کی بات کی تھی۔ چھاتی کا کینسر وغیرہ تو پھیپھڑوں میں ہوتا ہے نا۔ اس نے چھاتی کے اوپر پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "یہ چھاتی کے اندر کا نہیں پستان کا کینسر ہے... یہ بریسٹ کینسر عام طور پر عورتوں میں ہوتا ہے لیکن شاذ و نادر کوئی ایسا کیس بھی ہوتا ہے جس میں مریض "مرد" ہوتا ہے۔ یہ نیازا بھی اسی تکلیف کا شکار ہوا ہے۔ پیر صادق شاہ کے چکروں میں رہتا تو شاید اب تک عدم آباد کی تیاری شروع کر دیتا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ یہاں احمد تھانوی صاحب کے پاس آ گیا۔ انہوں نے روحانی علاج کے ساتھ ساتھ اس کا ڈاکٹری علاج بھی شروع کرایا۔ اب اس حوالے سے یہ کافی بہتر ہے۔"

احمد تھانوی صاحب ظہر اور مغرب کے درمیانی وقت میں اپنے عقیدت مندوں اور مریضوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ انہیں وظائف بتاتے... نماز، روزے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کے پاس حکمت کے حوالے سے کچھ مجرب نسخے بھی تھے جو وہ اپنے خاص مریضوں کو استعمال کراتے تھے۔ تاہم اگر انہیں ذرا سا بھی شبہ ہوتا تھا کہ فلاں مریض کو مناسب ڈاکٹری علاج کی ضرورت ہے تو وہ فوراً اسے کسی ڈاکٹر کی طرف "ریفر" کر دیتے تھے۔

مریض اور عقیدت مند آنے شروع ہو گئے تھے۔ ہم بہت بے قراری سے منتظر رہے لیکن جس کو نہیں آنا تھا، وہ نہیں آیا۔ یہاں تک کہ مغرب ہو گئی اور لوگ واپس جانا شروع ہو گئے۔ مایوسی کا دھواں میرے سینے میں بھرنے لگا۔ جس کے بغیر جیسے تیسے چار برس گزار دیے تھے، اب اس کے بغیر گھڑیاں گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

اگلے روز بھی یہی ہوا۔ میں اور عمران بارہ بجے ہی احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور ہم بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ پروگرام یہی تھا کہ اگر وہ آ گئی اور وہ نصرت ہی ہوئی تو ہم اس کے سامنے نہیں آئیں گے۔ ہاں، احمد تھانوی صاحب رسمی انداز میں اس کا پتا ٹھکانا پوچھ لیں گے۔ جب وہ یہاں سے واپس جائے گی تو ہم اس کا پیچھا کریں گے۔ لیکن یہ سب تو تب ہوتا جب وہ آتی۔ اور اس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

وہ رات بھی عالم بے قراری میں گزری۔ رات کے کھانے کے بعد میں اکیلا ہی باغیچے میں ٹہلتا رہا اور ثروت کے بارے میں سوچتا رہا۔ ان گنت سوالات ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ کیا وہ ابھی تک میرا انتظار کر رہی ہوگی؟ کیا اس نے شادی کر لی ہوگی؟ کیا اس کے دل میں اب بھی میری چاہت ہوگی؟ میں بالو کے بارے میں اسے کیا بتاؤں گا؟ سلطانہ کا ذکر کس طرح کروں گا؟

مجھے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو فرح تھی۔ اس نے بالو کو اٹھایا ہوا تھا۔ بالو مجھے دیکھ کر ہمکنے لگا۔ میں نے اسے پیار کیا اور اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ فرح میرے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگی۔ "بھائی جان! آپ پریشان ہیں۔ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھاتے۔ رات کو دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔ آپ بتاتے کیوں نہیں؟"

میں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور فرح کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "تو ہمیشہ کی طرح وہمی ہے۔ کسی نہ کسی مسئلے کی کھوج میں رہتی ہے۔"

"نہیں بھائی جان... میرا دل کہتا ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ کل عاطف بھی یہی کہہ رہا تھا۔ اسے ڈر ہے کہ شاید آپ نے سیٹھ سراج سے الجھنا شروع کر دیا ہے۔ کیا واقعی ایسی بات ہے؟"

"نہیں فرح! تم دور دراز کے اندیشوں کو دل میں جگہ دے رہی ہو۔ سیٹھ سراج کا تو ابھی کوئی کھوج کھرا ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں کہ وہ خبیث پاکستان میں ہے بھی یا نہیں۔"

"عاطف کہہ رہا تھا کہ عمران بھائی، شاہین باجی کو اس لیے یہاں لے کر آئے ہیں کہ انہیں سیٹھ سراج کی طرف سے کوئی خطرہ تھا۔ اب وہ بھی میری اور عاطف کی طرح اس چار دیواری میں رہنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فرحی! مجھے لگتا ہے تیرے اندر کسی اسی نوے سالہ بڑھیا کی روح گھس گئی ہے جو تجھے ہر وقت فکروں میں مبتلا رکھتی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ "بھائی جان! میرا دل چاہتا ہے کہ ہم سب پھر سے پہلے کی طرح ہو جائیں۔ ہماری کسی سے دشمنی ہو اور نہ زیادہ دوستی ہو۔ کہیں کسی انجان جگہ پر ایک چھوٹا سا گھر ہو... جہاں ہم سکون سے رہیں۔ عاطف اپنی پڑھائی مکمل کرے... آپ کہیں سروس کریں اور... اور..."

"...تمہاری شادی ہو جائے۔" میں نے اس کی بات اچکی۔

"نہیں بھائی جان۔" وہ ٹھنکی۔ "آپ شادی کریں۔ ہمارے گھر میں رونق آئے۔ ہماری اداسیاں دور ہوں۔"

وہ، رات کی رانی کے ایک پودے کے پاس کھڑی ہو گئی اور اس کے پھولوں پر نزاکت سے انگلیاں چلانے لگی۔ میں اس معصوم، بے خبر لڑکی کو کیسے بتاتا کہ وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ وہ جس خوشبودار زندگی کے سپنے دیکھ رہی ہے، وہ کچھ سانپ صفت لوگوں کی وجہ سے زہریلی ہو چکی ہے۔ اور یہ ایسا زہر ہے جس کا تریاق آسانی سے ملنے والا نہیں۔ وہ بے خبر کیا جانتی تھی کہ وہ اب بھی جس جگہ کھڑی پھولوں کو سہلا رہی ہے، وہاں چند دن پہلے ہم نے ایک لاش دبائی ہے۔ وہ چھیدے کے مدفن کے عین اوپر کھڑی تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کا سر چوم کر کہا۔ "فرحی! وہی ہوگا جو تم اور عاطف چاہتے ہو... لیکن اس کے لیے تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا..."

اچانک مجھے خاموش ہونا پڑا۔ میں نے شاہین کو دیکھا۔ اس کے کندھے سے بیگ جھول رہا تھا اور وہ مرے مرے قدموں سے بیرونی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ فرح نے بھی اسے دیکھ لیا۔ میں نے کہا۔ "لگتا ہے کہ آج پھر عمران سے اس کی لڑائی ہوئی ہے۔"

اتنے میں عمران بھی نظر آ گیا۔ وہ شاہین کے پیچھے گیا۔ وہی کھلنڈرا سا جانا پہچانا انداز تھا، اس کا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کالی سی چیز تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی چرمی تھیلا وغیرہ ہے۔ اس نے شاہین کو آواز دی۔ پھر اس کے قریب پہنچ کر یہ کالی سی

شے اس کے سامنے پھینک دی۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہ ایک کالی بلی تھی۔ وہ شاہین کے سامنے سے گزر کر درختوں میں اوجھل ہو گئی۔

ہم عمران اور شاہین کے پاس پہنچے۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو، یہ بالکل اچھا شگون نہیں ہے۔ کالی بلی تمہارے سامنے سے گزر گئی ہے۔ اب تو تمہیں بالکل بھی نہیں جانا چاہیے۔ اگر تمہارا جانا بہت ہی ضروری ہو گیا ہے تو میں تمہیں خود چھوڑ کر آؤں گا۔“

وہ تنک کر بولی۔ ”اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے ابھی جانا ہے۔“

”لیکن بلی؟“

میں نے قریب پہنچ کر کہا۔ ”بلی تم نے خود چھوڑی ہے عمران! اور جان بوجھ کر شاہین کے سامنے پھینکی ہے۔ کم از کم اس بھونڈی دلیل کے ذریعے تو تم شاہین کو نہیں روک سکتے۔“

وہ بولا۔ ”لیکن یار! یہ بھی تو دیکھو کہ بلی کسی اور طرف بھی بھاگ سکتی تھی۔ وہ شاہین کے سامنے سے ہو کر نکلی ہے۔ اسی کو شگون کہتے ہیں۔“

”اسے بے ہودگی کہتے ہیں اور مجھ سے یہ بے ہودگیاں اور برداشت نہیں ہوتیں۔“ شاہین نے کہا۔ وہ واقعی آزردہ تھی۔

”اب کیا کیا ہے اس نے؟“ میں نے شاہین سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی اور چھوٹی سی ناک سرخ ہوتی جا رہی تھی۔

عمران بولا۔ ”یار! بات بس اتنی سی ہے، میں نے کہہ دیا کہ شادی کے لیے لڑکیوں کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اب اسے شادی کر لینی چاہیے بلکہ میں نے اس کام کو مزید آسان بھی کر دیا ہے۔ ایک بڑا اچھا ”لڑکندہ“ ڈھونڈا ہے اس کے لیے۔“

”لڑکندہ کیا ہوتا ہے؟“ فرح نے پوچھا۔

”لڑکے اور بندے کی جمع ہے یہ۔ یعنی درمیانی عمر کا مرد۔ اچھا بھلا اسمارٹ ہے۔ ایک چینل میں اینکری بھی کرتا ہے۔ اوپر نیچے کی اچھی کمائی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے کہ بھلکڑ ہے۔ اتنا بھلکڑ کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ کئی دفعہ تو ٹاک شو کے دوران میں بریک لیتا ہے اور پھر واپس آنا ہی بھول جاتا ہے۔ قریب ہی اس کا گھر ہے... گھر چلا جاتا ہے۔ یوں گھنٹا اشتہار چلتے رہتے ہیں۔ پھر اچانک اسے یاد آتا ہے کہ واپس بھی آنا تھا۔ تب تک ٹائم ختم ہو چکا ہوتا ہے... اسکرین پر آ کر وہی گھسا پٹا فقرہ بولتا ہے۔ ناظرین!

وقت کم تھا اور موضوع بہت وسیع تھا... بہت ہی زیادہ وسیع تھا... ہم نے اسے زیادہ چھیڑا ہی نہیں۔ اب آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ خدا حافظ۔ اب سوچو تائی! ایسا بھلکڑ شوہر کہیں مل سکتا ہے؟“

”تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بھلکڑ شوہر بیوی کے لیے بہت بڑی نعمت خداوندی ہوتا ہے۔ اللہ کے بندے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ جیب میں کتنے پیسے تھے۔ کتنے نکلے اور کتنے رہ گئے۔ جمعرات کو ہونے والی بے عزتی جمعے کو بھول جاتا ہے۔ بیوی جو کہتی ہے مان لیتا ہے۔ جدھر چلاتی ہے چل پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ لڑکندہ بڑا آئیڈیل شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک ٹاک شو میں ایک تاریخی جملہ بول گیا۔ کہنے لگا... آج کل ٹی وی ڈراموں میں اتنی عورتیں ہوتی ہیں کہ میں دیکھ دیکھ کر ”سوچتی“ ہوں کیا دنیا میں بس عورتیں ہی رہ گئی ہیں... اندازہ لگاؤ۔ عورتوں کے بارے میں بات کرتے کرتے اپنی جنس بھی بھول گیا۔“

میں نے کہا۔ ”اگر اتنا بھلکڑ ہے تو کچھ اور بھی نہ بھول رہا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں بچے وچے نہ ہوں اس کے۔“

”یار! تم ہر بات کا منفی پہلو لیتے ہو۔ تم ضرور کسی بڑے چینل کو جوائن کرو گے۔“

”چلو، جو بھی ہے لیکن تم دانستہ کالی بلی شاہین کے سامنے سے گزار کر اسے روک نہیں سکتے۔ اس کے لیے تمہیں معافی مانگنی پڑے گی۔“

”معافی تو میں ہرگز نہیں مانگوں گا۔“ وہ اکڑ کر بولا۔ ”ہاں، کہو تو ہاتھ وغیرہ جوڑ دیتا ہوں۔“ آخری الفاظ اس نے مسکین لہجے میں کہے۔

پھر واقعی اس نے بڑی دل جمعی کے ساتھ شاہین سے معافی تلافی کی۔ یہاں تک کہ وہ بے ساختہ مسکرانے پر مجبور ہو گئی۔

فرح نے کہا۔ ”بھائی جان! باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہیں کہ اب شاہین باجی کے سامنے سے کبھی کالی بلی نہیں گزاریں گے۔“

اس نے جھٹ شاہین کے کانوں کو ہاتھ لگائے اور فقرہ دہرایا۔

شاہین اپنے کان چھڑاتے ہوئے بولی۔ ”اور اپنی نظر بھی ٹیسٹ کرواؤ جناب عمران صاحب! یہ شگون جو تم بتا رہے ہو کالی بلی کے لیے بنا ہوا ہے۔ کالے بلے کے لیے نہیں۔ جو آپ نے میرے سامنے سے زبردستی گزارا، وہ کالا بلا تھا۔“

”ہائیں، بلا تھا؟ نہیں نہیں یار۔“

اسی دوران میں وہ ”کالی بلی“ پھر سے چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر نکل آئی۔ ہم نے دھیان سے دیکھا، وہ واقعی بلا تھا۔ عمران نے کانوں کو ہاتھ لگا کر میری طرف دیکھا۔ ”دیکھو جگر! تم میری پرستاروں ریما اور نرگس کو یونہی بدنام کرتے ہو۔ آج کل تو ہر لڑکی طوفان ہے۔ اتنی تیز نظر رکھتی ہیں ان لڑکیوں کی کہ ایک سیکنڈ میں زنانہ، مردانہ مقتولوں کا پوسٹ مارٹم کر لیتی ہیں۔“

شاہین شولڈر بیگ پکڑ کر اس پر جھپٹی۔ وہ چھلاوے کی طرح برآمدے کی طرف نکل گیا۔

... اگلے روز ہم پھر بارہ بجے کے قریب پیر احمد تھانوی صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج عمران نے ایک مہران کار کا بندوبست بھی کیا تھا۔ ”کار پر جائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں یار! کار پر تم جاؤ گے۔ میں موٹر سائیکل پر رہوں گا۔“

”وہ کیوں؟“

”ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اگر وہ لڑکی آ جاتی ہے تو ہم دونوں اس کا پیچھا کریں گے۔ اگر کوئی ایک اسے مس بھی کر دے تو دوسرا تو پیچھے لگا رہے۔“

”لیکن ہو سکتا ہے کہ احمد تھانوی صاحب ہی اس سے ہمارا پتا ٹھکانا پوچھ لیں۔“

”دیکھو، جس فقرے میں ’ہو سکتا ہے‘ آ جائے، اس پر زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔“

اس دن ہم علیحدہ علیحدہ سواری پر احمد تھانوی صاحب کے گھر پہنچے اور اس روز ہم کامیاب بھی رہے۔ تین بجے کے قریب ایک رکشا کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے رکا اور اس میں سے اسی دن والی چادر پوش لڑکی اتری۔ اس کا نصف سے زائد چہرہ چادر کے پلو میں چھپا ہوا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نصرت ہی تھی۔ اس کا جسم اور چہرہ پہلے سے ذرا بھر چکا تھا۔ بہرحال، میں اسے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دوڑ کر نصرت کے پاس پہنچوں۔ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑوں اور پوچھوں کہ بتاؤ ثروت کہاں ہے؟

لیکن میں جانتا تھا، مجھے صبر کرنا ہے۔ نصرت سے براہ راست بات کرنے سے پہلے ہم جتنا بھی جان سکتے، وہ ہمارے لیے بہتر تھا۔

پانچ بجے کے لگ بھگ نصرت کی ملاقات احمد تھانوی صاحب کے ساتھ ہوئی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ واپس چل دی۔ حسب سابق اس نے ایک رکشے کا انتخاب کیا تھا۔ رکشا روانہ ہوا تو ہم دونوں مناسب فاصلے سے اس کے تعاقب میں تھے۔ عمران موٹر سائیکل پر آگے تھا، میں کار میں تھوڑا سا پیچھے تھا۔

رکشا مختلف سڑکوں سے گزر کر گارڈن ٹاؤن کے علاقے میں آیا اور پھر ایک شاندار کوٹھی کے سامنے رک گیا۔ نصرت اتری اور کرایہ ادا کر کے اندر چلی گئی۔ ہم تھوڑا آگے جا کر سروس روڈ پر کھڑے ہو گئے۔

عمران موٹر سائیکل چھوڑ کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ ”نیم پلیٹ پڑھی ہے تم نے؟“ عمران نے پوچھا۔

”ہاں کسی جمشید تاگی کے نام کی تھی۔“

”یہ تاگی صاحب کون ہو سکتے ہیں؟“

”اللہ جانے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مالک مکان کا نام ہو۔“

میرے ذہن میں مختلف سوالات سر ابھار رہے تھے۔ یہ تاگی صاحب کون ہیں؟ کیا یہاں ثروت سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ کیا بھائی ناصر سے یہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟

ہمیں وہاں کھڑے تقریباً پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک سوزوکی سوئفٹ کوٹھی میں سے نکلی۔ سوزوکی کار کو جوادھیڑ عمر شخص چلا رہا تھا، وہ شکل وصورت سے ڈرائیور ہی لگتا تھا۔ پچھلی نشست پر ایک اکیلی خاتون بیٹھی تھی۔ ہمیں فقط اس کے ہلکے براؤن لباس کی جھلک دکھائی دی۔ جب گاڑی ٹرن لے کر ہماری طرف آئی اور ہمارے پاس سے گزری تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ پچھلی نشست پر خاتون نہیں، ایک جواں سال لڑکی بیٹھی تھی... اور وہ کوئی اور نہیں ثروت تھی۔ وہ سو فیصد ثروت تھی۔ میری نظریں اس کے بارے میں دھوکا کھا ہی نہیں سکتی تھیں۔ میں نے اپنا چہرہ اخبار کی اوٹ میں کر رکھا تھا، ویسے بھی ثروت نے ادھر اُدھر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

جونہی سفید سوزوکی کار آگے نکلی، میں نے اخبار پیچھے رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور پیچھے روانہ ہو گیا۔ ”او ئے میری موٹر سائیکل۔“ عمران پکارا۔

”بھاڑ میں جائے موٹر سائیکل۔“ میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

”کون تھی؟“

”ثروت۔“ میں نے سنسنی خیز لہجے میں انکشاف کیا اور مہران کو سوئفٹ کار کے پیچھے ڈال دیا۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں

میں دھڑک رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ میں ہم گلبرگ کی لبرٹی مارکیٹ میں آگئے۔ گاڑی ایک شاپنگ مال کے عین سامنے پارک ہوئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر عقبی دروازہ کھولا اور ثروت باہر نکل کر شاپنگ مال میں داخل ہوگئی... وہ ہمیشہ کی طرح بالکل سادہ لباس میں تھی۔ چہرہ بھی میک اپ سے خالی تھا لیکن اس کی اندرونی خوب صورتی اور کشش اس کے چہرے پر روشنی بن کر بکھری ہوئی تھی۔ یہ میرے جانے پہچانے خدوخال تھے۔ یہ میری جانی پہچانی چال ڈھال تھی۔

"بھئی واہ! ان کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔" عمران نے بے تکلفی سے کہا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں یہیں بیٹھتا ہوں۔ تم جاؤ محترمہ کے پیچھے۔" عمران نے کہا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہر نکلا اور ثروت کے پیچھے چل دیا۔ پچھلے تین چار برسوں نے مجھے بہت بدلا تھا۔ میں اب کوئی کمزور شخص نہیں رہا تھا۔ خاص طور سے عمران کے ساتھ اور بجبر زرگاں میں ہونے والی ہارڈ ہاڑ نے میری پوری کیمسٹری ہی تبدیل کر دی تھی۔ پھر بھی آج یوں ثروت کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اور اب اس کے پیچھے آتے ہوئے مجھے اپنے جسم میں لرزش محسوس ہوئی۔

ثروت فرسٹ فلور پر پہنچی اور گارمنٹس وغیرہ دیکھنے لگی۔ اس دوران میں اس نے ایک چھوٹی سی موبائل کال بھی سنی۔ میں اس سے اپنا فاصلہ کم کرتا گیا اور بالکل قریب پہنچ گیا۔ ایک کاؤنٹر سے واپس مڑتے ہوئے اس نے رخ پھیرا تو میں اس کے سامنے تھا۔ چند لمحے کے لیے تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خالی پن کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ جیسے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ لیکن پھر دنیا جہان کی حیرت اور سنسنی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ چند لمحے کے لیے یوں لگا جیسے وہ ایک وہم اجنبیوں کی طرح گھومے گی اور دوسری طرف نکل جائے گی۔ لیکن میں اتنا پاس تھا اور وہ اس قدر وضاحت سے مجھے دیکھ چکی تھی کہ نظریں چرا لینا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ چار پانچ سیکنڈ کے اندر اس کے خوبرو چہرے پر کئی رنگ آئے... آخری رنگ آنسوؤں کا تھا۔ یہ آنسو اس کی جھیل آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

"ہیلو ثروت!" میں نے لرزاں آواز میں کہا۔ میری آواز میں صدیوں کا کرب سمٹ آیا تھا۔

"ہیلو۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور سر جھکا لیا۔ دو چمکیلے قطرے اس کے سیاہ شولڈر بیگ پر گرے۔

"کیسی ہو ثروت؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے عجیب آواز میں کہا۔

"اپنی نظروں پر بھروسا نہیں ہو رہا... کیا میں واقعی تمہیں دیکھ رہا ہوں؟" وہ کچھ نہیں بولی۔ بس جھکی پلکوں اور لرزاں جسم کے ساتھ کھڑی رہی۔

"ثروت! کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے اسکرین پر ایک نظر ڈال کر کال منقطع کر دی۔

"ثروت! کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے متوحش نظروں سے اردگرد دیکھا اور بولی۔ "نہیں، میرے ساتھ کوئی ہے۔"

"تو پھر کب؟"

"یہ بہت مشکل ہے۔" اس کی آواز میں کرب سمٹ آیا۔

"کیا... تم... بات بھی نہیں کرو گی؟" میری آواز ٹوٹنے لگی۔

وہ چند سیکنڈ تک جیسے فیصلے کی سولی پر لٹکتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ "آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔ میں آپ کو کال کر کے بتاؤں گی۔"

میں نے اسے نمبر دیا جو اس نے لرزاں انگلیوں سے اپنے موبائل میں ایڈ کر لیا...

"کیا تم اپنا نمبر نہیں دو گی؟"

"نہیں، میں خود کال کروں گی۔"

"کتنا انتظار کرنا ہوگا؟" میری آواز بھرا گئی۔

"ایک دو دن تک۔" اس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میرا منہ خشک ہو رہا تھا۔ سینے میں دھڑکن کی گونج تھی۔ کچھ دیر کے لیے مجھے بالکل یوں لگا جیسے میں ایک ٹین ایجر ہوں اور پہلی بار کسی لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

دو تین روز انتہائی بے چینی میں گزر رہے۔ میری نگاہ ہر وقت اپنے سیل فون پر رہتی تھی۔ کوئی ایس ایم ایس آتا، کوئی فون کال آتی تو میں بے طرح چونک جاتا۔ پھر مایوسی ایک سرد لہر بن کر رگ و پے میں اتر جاتی۔ بہت سے اندیشے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ کہیں وہ پھر پہلے کی طرح اچانک اوجھل تو نہیں ہو جائے گی؟ تیسرے روز مجھے محسوس ہونے لگا کہ شاید میں نے ثروت کی بات پر بھروسا کر کے غلطی کی ہے۔ وہ کبھی مجھ سے رابطہ نہیں کرے گی... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آناً فاناً اپنے گارڈن ٹاؤن والے ٹھکانے سے بھی لاپتا ہو جائے۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت ثروت کی کال آگئی۔ یہ کسی پی سی او کا نمبر تھا۔ میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے اس کی جاں فزا آواز سنائی دی۔ "ہیلو تابش! میں ثروت بول رہی ہوں۔"

"بہت انتظار کروایا تم نے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ میری بات اور میرے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کہاں ہیں؟"

"رائے ونڈ روڈ پر۔"

"اقبال ٹاؤن میں میز کافی شاپ پر آسکتے ہیں؟"

"آسکتا ہوں۔ کب تک پہنچوں؟"

"اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ آپ ٹھیک ڈھائی بجے پہنچ جائیں۔"

جونہی گفتگو ختم ہوئی، میں نے عمران کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ پروگرام بنا کہ عمران میرے ساتھ جائے گا لیکن ثروت کے سامنے نہیں آئے گا۔ بس میرے آس پاس موجود رہے گا۔ ہم پندرہ منٹ بعد ہی روانہ ہوگئے۔ عمران موٹر سائیکل پر تھا جبکہ میں گاڑی میں۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت کر رہی تھیں اور اس سے کئی گنا زفتار کے ساتھ میرا دل حرکت کر رہا تھا۔ پردۂ غیب سے جو کچھ ظہور میں آنے والا تھا، وہ میرے لیے بے حد اہم تھا۔ اسی پر میری آئندہ زندگی کا دارومدار تھا۔ جو کچھ بھی تھا، دل سے ایک گواہی بار بار آرہی تھی۔ وہ اب بھی مجھے پیار کرتی ہے۔ جس طرح میں نے اس کی یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے، اس کے دل میں بھی میری یادیں موجود ہیں۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد میں خوب صورت کافی شاپ کے نیم گرم ہال میں موجود تھا اور ثروت کا انتظار کر رہا تھا۔ عمران کافی شاپ سے باہر اوپن ایئر میں ایک کونے میں بیٹھا سہ پہر کے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں بے رحم ہوتی ہیں، اس کا اندازہ مجھے پہلے بھی تھا لیکن آج یہ بے رحمی شدید تھی۔ ثروت نے ڈھائی بجے پہنچنے کا کہا تھا مگر وہ تین بجے پہنچ سکی۔ حسب سابق اس کا نصف سے زائد چہرہ چادر کے نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آرہی تھیں... بلکہ آنکھوں پر بھی براؤن شیڈ کے سن گلاسز تھے۔ وہی خوش قامتی، وہی ہلکورا لیتی ہوئی دل نواز چال، وہی ایک جاں فزا خوشبو قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، وہ سیدھی میری میز پر چلی آئی۔ میں نے اٹھ کر اسے خوش آمدید کہا۔ وہ اپنا شولڈر بیگ میز پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ ہم کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر ان گنت شکوے شکایتوں کا بوجھ تھا۔ دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "تم ٹھیک تو ہو نا ثروت؟"

"ہوں..." اس نے کہا پھر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے ہولے سے بولی۔ "ہم، تم کتنے بدل گئے ہیں، تابش۔"

"لیکن جو کچھ دلوں میں تھا وہ تو نہیں بدلا نا۔ درمیان میں چار سال کا طویل وقفہ ہے لیکن مجھے یہی لگ رہا ہے کہ سلسلہ وہیں سے جڑا ہے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہے۔ میں امی اور فرخ کو لے کر تمہارے گھر آیا ہوں۔ تمہاری ناراضی دور کرنے کے لیے۔ تمہاری ڈھارس بندھانے کے لیے۔ تمہاری تپتی ہوئی چائے پینے کے لیے اور تم سے بہت سی باتیں کرنے کے لیے... ہاں، لگتا ہے کہ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ تم مجھے اچانک چھوڑ کر گئی ہو، نہ امی ہم سے جدا ہوئی ہیں، نہ ہم سب تتر بتر ہوئے ہیں... وہ بے رحم چار سال بھی ابھی ہمارے درمیان نہیں آئے جنہوں نے مجھے بار بار مارا اور زندہ کیا۔"

وہ پلکیں جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد دل گرفتہ آواز میں بولی۔ "آپ کہاں رہے اتنا عرصہ؟"

"یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں لیکن پہلے تم نے پوچھا ہے اس لیے بتا دیتا ہوں۔ تفصیلی جواب تو بہت لمبا ہے ثروت... اور شاید ابھی تمہارے پاس اتنا وقت نہ ہو... مختصر یہ ہے کہ میں پاکستان میں نہیں تھا۔ ایک ایسی جگہ تھا جہاں تمہیں میری خبر بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اتر پردیش کے دور دراز علاقے میں ایک خودمختار اسٹیٹ تھی۔ دنیا سے بالکل کٹی ہوئی جگہ تھی... اب ان سارے حالات کے بارے میں سوچتا ہوں تو جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا ہے لیکن... لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ اس سے پہلے تو یہ ہوا تھا نا ثروت کہ تم ایک دم، بغیر کچھ بتائے بغیر کوئی موقع دیے، مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہم تمہارے گھر پہنچے تو پتا چلا کہ تم اور نصرت، ناصر بھائی کے ساتھ پاکستان سے ہی چلے گئے ہو۔ میں حسرت سے تمہارے گھر کے بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا ثروت۔

اور پھر آنے والے دنوں میں، میں نے اس بند دروازے کو اتنی بار دیکھا... اتنی بار دیکھا کہ وہ سوتے جاگتے میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا ثروت کہ میں جس طرف بھی دیکھتا ہوں، وہ بند دروازہ ہی نظر آتا ہے...'' میرا گلا رندھ گیا۔

''ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا تابش! ہر طرف سے انگلیاں اٹھائی جا رہی تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کو لگتا تھا کہ ناصر بھائی کو کچھ ہو جائے گا، ہم انہیں بھی کھو دیں گی... اور ویسے بھی ناصر بھائی نے ہمیں کچھ بتایا نہیں۔ انہوں نے ساری تیاری خاموشی سے کی تھی۔ انہوں نے آخر میں مجھے قسم دے دی کہ میں آپ کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔ اور میں سمجھتی ہوں تابش ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔''

''ثروت! کیا یہاں سے جانے کے بعد بھی تمہارے دل میں نہیں آیا کہ ایک بار مجھ سے رابطہ کرلو؟ صرف ایک بار مجھے حالات کو سنبھالنے کا موقع دے دو؟ پھانسی پانے والے مجرم کو بھی پھانسی سے پہلے پانی پلا دیتے ہیں، تم نے تو مجھے اپنی شکل تک نہ دکھائی۔ آواز تک نہ سنائی...''

''آپ میری مجبوریاں نہیں سمجھ سکتے تھے تابش! کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا تھا... اپنی اس بے بسی نے مجھے بہت رلایا۔ پر میں کچھ کر نہ سکی...'' وہ بول رہی تھی اور اپنے دودھیا ہاتھوں کی حنائی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ ہاتھوں سے پیچھے اس کی کلائیوں میں کانچ کی خوش رنگ چوڑیاں تھیں۔ ان چوڑیوں کی مدھم کھنک مجھے کچھ بھولے بسرے نغمے یاد دلا رہی تھی۔ وہ نغمے جو کبھی ہماری تنہائیوں کے ساتھی رہے تھے۔ جن کے بولوں میں ملن کی گھڑیوں کی چاپ تھی۔ انتظار کی میٹھی میٹھی کسک تھی... اور ساتھ ساتھ شہنائیوں کی گونج بھی سنائی دیا کرتی تھی۔ میں نے پلکیں اٹھا کر ثروت کی طرف دیکھا۔ اس میں بہت کم تبدیلی آئی تھی۔ وہی سادگی، وہی ملاحت، آئینے جیسی وہی شفاف رنگت، جھیل آنکھوں پر گری ہوئی وہی لمبی پلکیں... ثروت کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے چند سیکنڈ تک اسکرین کو دیکھنے کے بعد کال ریسیو کی۔

''جی... جی... نہیں، اس کی ضرورت نہیں... غلط کہتا ہے وہ۔ صدقے کے لیے کالا رنگ ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گی۔''

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ''کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور پلکیں جھکا لیں۔

''میرے شوہر۔''

یہ دو الفاظ، دو ساعت شکن دھماکوں کی طرح تھے۔ مجھے لگا جیسے میرے اردگرد کی ہر شے ختم کر سکتے ٹل چلی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ میں بھی۔ ایک یخ بستہ لہری کانوں کے راستے میرے جسم میں اتری اور مجھے سرتاپا برفاب کر گئی۔ میں بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور وہ پلکیں جھکائے بیٹھی تھی۔

یہی وہ الفاظ تھے جو میں ثروت کے منہ سے سننا نہیں چاہتا تھا اور یہی وہ ''جواب'' تھا جس کا سوال پچھلے آدھ گھنٹے سے میری زبان پر تو تھا مگر ہونٹوں سے ادا نہیں ہوا تھا۔ اس سوال کی غیر معمولی سنگینی اسے میرے ہونٹوں تک آنے سے روک رہی تھی۔ بس یہ ڈر تھا کہ پتا نہیں اس سوال کا کیا جواب مل جائے گا۔ اور اب... یہ جواب بغیر میرے پوچھے ہی میرے سامنے آ گیا تھا۔ اور یہ ایسا جواب تھا جس نے چند لمحوں میں میرے سینے کے اندر ایک وسیع و عریض قبرستان آباد کر دیا۔ ہر قبر آرزوؤں اور امیدوں کا مدفن تھی۔

''مبارک ہو۔'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''اور آپ؟'' اس نے غمناک پلکیں اٹھائیں۔

میں نے گہری سانس لے کر بمشکل کہا۔ ''ثروت! شادی کا مطلب خوشی ہوتا ہے اور جہاں تک خوشی کی بات ہے، میں اس سے بہت دور ہوں۔''

اس کے موبائل سیٹ پر میسج ٹون ہوئی۔ اس نے اداسی سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ''میرا خیال ہے، اب مجھے جانا چاہیے...''

''ہاں، اب چلنا ہی چاہیے۔'' میری آواز انجانے بوجھ سے ٹوٹ رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دیجیے گا۔'' وہ عجیب سی آواز میں بولی۔

''ثروت! یہ نہیں پوچھو گی، میں اب تک کیسے جیا اور کہاں رہا؟''

اس کی جھیل آنکھوں پر ایک بار پھر گھنیری پلکوں کا سایہ ہو گیا۔ وہ ہولے سے بولی۔ ''جہاں بہت کچھ ''اَن کہا'' رہ گیا ہے، اس کو بھی رہنے دیں۔ میں جانتی ہوں، میں نے آپ کو ایک ایسا دکھ دیا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔ اسی لیے تو آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ سے ایک التجا بھی ہے تابش! آپ نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ امید ہے اب بھی نہیں کریں گے۔''

''کہو۔'' میں بمشکل بول پایا۔

''ہم دوبارہ نہیں ملیں گے تابش! اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔''

''کچھ اور؟'' میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''بس۔''

''اس سے تو بہتر تھا کہ شاپنگ مال میں تم سے ملاقات ہی نہ ہوتی۔ اور اگر ہو گئی تھی تو تم وہیں میرے لیے اجنبی بن جاتیں۔ اس طرح زخموں سے خون تو نہ رستا۔'' میرے لہجے کی شکستگی ناقابل بیان تھی۔

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکی۔ لب تھرا کر رہ گئے۔ آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بولی۔ ''اسی لیے تو اس ملاقات کو آخری ملاقات بنانا چاہتی ہوں۔ ہم دوبارہ بھی ملیں گے تو اسی طرح زخموں سے خون رسے گا۔''

ہم کتنی دیر خاموش بیٹھے رہے... جیسے قبرستان میں آمنے سامنے دو قبریں جن کے کتبوں پر اجل کی بے رحمی سے متعلق شعر لکھے ہوں۔ آخر میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے ثروت! جیسے تمہاری مرضی۔ جہاں اتنی خواہشیں مری ہیں، شاید میری یہ خواہش بھی آہستہ آہستہ مر جائے کہ تمہارے بارے میں کچھ جان سکتا۔ اگر زندگی میں کبھی میری ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے لینا۔ تمہارے لیے میرے رابطے کا نمبر ہمیشہ وہی رہے گا جو میں نے اس دن تمہیں دیا تھا۔''

اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ جب جدائیاں طے ہو چکی ہوں تو یہ نمبر اور یہ پتے تعلق کا ذریعہ نہیں بن سکتے...

ہم کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ جیسے کسی جانکاہ موت پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔

''مجھے اجازت ہے؟'' آخر اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہاں کہوں۔''

میرے ہاتھ دو بے جان پرندوں کی طرح میرے سامنے میز پر رکھے تھے۔ چند لمحے کے لیے لگا کہ وہ الوداعی انداز میں میرے ہاتھوں کو چھونا چاہتی ہے لیکن پھر اس نے اپنی انگلیوں کو میری طرف بڑھانے کے بجائے اپنے شولڈر بیگ کی طرف بڑھا دیا۔ ہم دونوں اٹھ گئے۔ ''خدا حافظ۔'' الفاظ نے کہا۔

''خدا حافظ۔'' میں نے جواب دیا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ کافی شاپ میں موجود ہر شے سے خون رس رہا ہے... تازہ سرخ خون۔ یہ خون دیواروں سے بہہ رہا ہے اور چھت سے ٹپک رہا ہے۔ اس خون کے اندر چلتے چلتے ثروت میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں آخر تک دیکھتا رہا، اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایسے جانے والے مڑ کر نہیں دیکھتے... ہاں، وہ کہیں آگے جا کر بہت روتے ہیں۔ یہ رونے والی شام تھی... ٹوٹ کر رونے والی۔

مجھے بھی تنہائی چاہیے تھی۔

میں کافی شاپ سے باہر آیا۔ تب تک ثروت جا چکی تھی۔ میرے اور عمران کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم خاموشی سے کار میں بیٹھے اور واپس روانہ ہو گئے۔ کار عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ ''شادی ہو چکی ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے بھی مختصر جواب دیا۔

''ناصر اور نصرت ساتھ ہی رہتے ہیں؟''

''پتا نہیں۔''

''دوبارہ ملے گی؟''

''نہیں۔''

گاڑی تیزی سے مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ عمران جانتا تھا کہ مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ وہ زیادہ مخل نہیں ہوا۔ میری عجیب سی کیفیت تھی۔ کوئی بھاری بوجھ دل کو پیس رہا تھا۔ عاطف نے مجھ سے بات کرنا چاہی لیکن میں اسے نظرانداز کرتا ہوا کمرے میں چلا گیا۔ میں نے دروازے بند کر لیے اور تاریک کمرے میں گم صم لیٹ گیا۔ آنسو اپنے آپ ہی چہرے کو بھگونے لگے۔ ایک خاموش بارش کی طرح جو تواتر سے برستی ہے اور سب کچھ بھگوتی چلی جاتی ہے۔ کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی دوبارہ ختم ہو گئی تھی یہ کہانی۔ شاید ایسے ہی ہونا تھا۔ شاید یہی لکھا ہوا تھا۔ آس کا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو رہتی ہی انہونیوں کی تلاش میں ہے... اور انہونیاں تو بس کبھی کبھار ہی ہوتی ہیں۔ معجزے عام ہو جائیں تو پھر وہ معجزے نہ رہیں۔ چار سال کا عرصہ کوئی کم تو نہیں ہوتا۔ میں چار سال اس سے دور رہا تھا... اسے میرا پتا تھا، نہ مجھے اس کا۔ پھر بھی میں نے یہ آس پالی تھی کہ اس نے شادی نہیں کی ہو گی۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ جب میں اسے ڈھونڈوں گا تو وہ مل جائے گی اور یوں ملے گی کہ میرے جسم اور روح کا حصہ بن جائے گی...

ایسا نہیں ہوا تھا۔ ایسا نہیں ہونا تھا۔

...لیکن یادوں کے کانٹے... ہاں، یادوں کے کانٹے تو شاید اس کے دل میں بھی تھے۔ انارکلی کیفے کے ویٹر مقبول نے مجھے بتایا تھا۔ وہ کیفے میں آتی تھی۔ اس میز پر بیٹھتی تھی جہاں کبھی ہماری سرگوشیاں گونجا کرتی تھیں۔ شاید وہ ان سب جگہوں پر گئی ہو جہاں جہاں ہم ملتے تھے۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دل سمندروں سے گہرے ہوتے ہیں۔ ان کی تہ میں کیا ہے، کوئی نہیں جان سکتا۔

رات ایک بجے کے قریب عمران نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ”کیا ہے عمران؟“ میں نے وہیں لیٹے لیٹے پوچھا۔

”کھانا نہیں کھاؤ گے یار؟“

”نہیں، بالکل بھوک نہیں۔“

”اچھا باہر تو آجاؤ۔ سب پریشان ہو رہے ہیں۔“

”سر میں درد ہے۔ آرام کرنا چاہتا ہوں یار۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ میرا مزاج شناس تھا۔ سمجھ گیا کہ میں ابھی دروازہ نہیں کھولوں گا۔ وہ چلا گیا۔

دکھ ایک مہیب طوفان کی طرح تھا جو مجھے اٹھا اٹھا کر پٹختا رہا۔ روندتا اور مسلتا رہا۔ پتا نہیں کہ وہ رات کیسے گزری۔

اگلے روز میں نے ناشتے کے نام پر چند لقمے لیے اور خاموشی سے موٹر سائیکل پکڑ کر نکل گیا۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ بزبانِ حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ میں کرب کے شدید ریلے سے گزر رہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ فرح اور عاطف مجھ سے ان گنت سوال کریں گے۔ میرا دکھ ان کے دل و دماغ تک میں بھی سرایت کر جائے گا۔ عمران اس وقت سویا پڑا تھا۔ میں نے وہی موٹر سائیکل لی جو اس کے زیرِ استعمال تھی۔ سیاہ ونڈ اسکرین والا ہیلمٹ اپنی شناخت چھپانے میں مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس رہائش گاہ سے باہر نکلتے ہوئے ہمیں بے حد محتاط رہنا پڑتا تھا۔ میری نگاہیں گاہے بگاہے عقب نما آئینے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اب بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جونہی میں گلشن اقبال کی طرف مڑا، چونک گیا۔ عقب میں ایک موٹر سائیکل سوار آرہا تھا۔ ایک دم ذہن میں وہ سنگین واقعہ گھوم گیا جب سیٹھ سراج کے ہرکارے چھیدے نے ہمیں فائرنگ کا نشانہ بنایا تھا اور پھر خود ایک اچانک موت کا شکار ہو گیا تھا۔

میں گلشن اقبال جانے کے بجائے سیدھا نکل گیا۔ ایک دو سڑکوں پر موڑ کاٹے۔ نیلے رنگ کی موٹر سائیکل بدستور پیچھے تھی اور اب کافی نزدیک آگئی تھی۔ دفعتاً میرے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوگئی۔ موٹر سائیکل پر عمران تھا۔ میں نے اسے لباس سے پہچانا۔ وہ میرے قریب آکر رک گیا اور ہیلمٹ اتار کر بولا۔ ”موٹر سائیکل چرانا جرم ہے۔ اس پر سزا ہو سکتی ہے۔ خاص طور سے نیوز چینل کے نمائندے کی موٹر سائیکل چرا کر کوئی کیسے خیر منا سکتا ہے۔ اس کی تو اگلی پچھلی موٹر سائیکلیں نکل آتی ہیں۔ وہ ایسی موٹر سائیکلیں بھی برآمد کرا دیتا ہے جو ابھی نے ابھی چرائی بھی نہیں ہوتیں۔“

میں نے کوئی جواب دیا اور نہ ردِعمل ظاہر کیا۔ میری گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”میرا خیال ہے تم گلشن اقبال میں بیٹھنا چاہ رہے تھے۔“ اس نے کہا۔

”بیٹھنا چاہ رہا تھا لیکن اکیلا۔“

”چلو تھوڑی دیر اکٹھے بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر اکیلے بیٹھ جانا۔“

میں جانتا تھا کہ اس کو قائل کرنا ناممکن ہے۔ میں نے خاموشی سے موٹر سائیکل موڑی اور گلشن اقبال کی پارکنگ میں روک دی۔ ہم دونوں اندر چلے گئے۔ سبزہ زاروں اور کوتاہ قامت درختوں پر خوش گوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی سی تمازت کو ہوا کی مدھم حرکت زائل کر رہی تھی۔ رش زیادہ نہیں تھا۔ ہم مصنوعی جھیل کے کنارے ایک چوبی بینچ پر بیٹھ گئے۔

عمران نے سگریٹ سلگا کر دھواں فضا میں چھوڑا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔ ”تابش! میں تمہارے دل کی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ لیکن سب کچھ پالینے کا نام ہی تو محبت نہیں ہے۔ محبت تو کسی سے دور رہ کر بھی کی جا سکتی ہے اور ساری عمر کی جا سکتی ہے۔“

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے جھیل کی چھوٹی چھوٹی لہروں کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ”وہ بے شک کسی اور کی ہو چکی ہے لیکن وہ تمہارے دل میں زندہ رہے گی۔ تم اس کو سوچو گے اور اس کا تصور بہت سے روپ بدل کر تمہارے سامنے آئے گا۔ اس کی یادیں سایہ بن کر تمہارے ساتھ رہیں گی۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”پچھتاوا یہی ہے عمران کہ میں جلدی نہ لوٹ سکا۔ پتا نہیں وہ کب تک میرا انتظار کرتی رہی۔ کیسی کیسی آسیں دل میں پالتی رہی...“

”لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تابی! ہم گئے وقت کو آواز تو نہیں دے سکتے نا۔ وہ کیا ایک بھلا سا شعر ہے۔ ہر سوالی پر یہ دروازہ سدا رہتا ہے بند... کب کسی کو گمشدہ لمحوں کی سوغاتیں ملیں... اب تو بس دل پر پتھر رکھنا ہے تابی...

اپنی آگ میں جلنا جھلسنا ہے... کڑھنا ہے... زندگی کے دن گزارنے ہیں۔“ وہ باقاعدہ رونے لگا۔ آنسو اس کی تھوڑی تک بہہ آئے۔ ”بس تابی! عشق نام ہی جلنے کڑھنے اور کوئلہ ہونے کا ہے۔ اپنی ہی تپش سے پک پک کر مرونڈا ہو جانا... مرونڈا سمجھتے ہو نا تم؟“

میں کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے روتے روتے ناک سے ’سوں‘ کی زوردار آواز نکالی اور ناک کا رقیق مادہ چٹکی میں پکڑ کر میرے کرتے کے دامن سے صاف کر دیا۔

”کیا کرتے ہو؟“ میں نے سخت ناگواری سے کہا۔

”اوہ سوری... سوری۔“ اس نے میرا کرتا پکڑ کر کھینچا اور پھر کھینچتا چلا گیا جیسے اسے جھیل کے پانی میں دھونا چاہتا ہو۔ میں نے رکنے کی بہت کوشش کی لیکن رک نہیں سکا۔ ہم دونوں دھڑام سے جھیل کے ٹھنڈے پانی میں گرے۔ ”عمران۔“ میں چلایا۔ جھنا کر میں نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔

اس نے جواباً میری گردن پر جھانپڑ مارا اور میرے اوپر چڑھ بیٹھا۔ ”اوئے کھوتے کے پتر! میرے ہوتے ہوئے بھلا تو بن سکتا ہے دیوداس۔ تیری تو ایسی تیسی۔“ اس نے میری گردن دبوچ لی۔

میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا اور خود کو چھڑانا چاہا۔ اس نے میری ٹانگیں پکڑ لیں اور مجھے پھر پانی میں گرا دیا۔ ہانپتی آواز میں بولا۔ ”اتنی جلدی پیچھا نہیں چھڑانے دوں گا اسے تجھ سے۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا یہ ہو سکتا ہے۔ پوری تحقیقات اور پوری تفتیش ہوگی۔ پورے حالات معلوم کرنے ہوں گے اس کے۔ اور اگر تو نے کبھی کوئی دلیپ کماری دکھائی نا تو دونوں کانوں میں سرکردوں گا تیرا۔ ایسا مکا ماروں گا کہ جبڑا کڑک ہو جائے گا۔“

”عمران! تو ہوش میں تو ہے؟“ میں دہاڑا۔

”ہوش میں ہوں اور تمہیں بھی ہوش میں لانا چاہتا ہوں۔ پانی سے نکلو۔ میں تجھے کچھ بتاتا ہوں۔ کچھ معلوم ہوا ہے مجھے۔“ اس کی آواز میں چمک سی تھی۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے کوئی خاص اطلاع دینا چاہتا ہے۔ ہم باہر نکل آئے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ گارڈز بھی سیٹیاں بجاتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ سخت نالاں تھے کہ ہم نے قواعد کو توڑتے ہوئے جھیل میں چھلانگ لگائی ہے اور اودھم مچایا ہے۔ عمران نے انہیں کسی نہ کسی طرح رام کر لیا اور مجھے لے کر بڑی جھیل کی جنوبی جانب ایک خاموش اور تنہا گوشے میں آن بیٹھا۔ ہمارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ عمران نے اپنے سویٹر اور قمیص وغیرہ اتار کر نچوڑے اور سنہری دھوپ میں اپنے کسرتی جسم کے مسلز دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح ایک جگہ دو ناکام عاشق بھی نہیں رہ سکتے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ میں ابھی تک اس کی بے ہودہ حرکت کی وجہ سے اپ سیٹ تھا۔

”یار! اس چھوٹے سے شہر لاہور میں کیا میں ایک ناکام عاشق کافی نہیں ہوں جو تم بھی پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں تمہیں یہ نامعقول حرکت نہیں کرنے دوں گا۔ آخر دم تک کوشش کروں گا کہ تمہارا نام رانجھا، مہینوال، پنوں اور عمران وغیرہ کی فہرست میں نہ آسکے۔ اور اگر تم نے اس کوشش میں میرا ساتھ نہ دیا تو تمہارا حشر نشر کر ڈالوں گا۔“

”عمران! میں سچ کہتا ہوں۔ تمہیں مار بیٹھوں گا۔ تم... تم ثروت کے بارے میں کیا بات کر رہے تھے؟“

اس نے سگریٹ سلگانے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پیکٹ، لائٹر وغیرہ سب کچھ بھیگ چکا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، کل جب تم کمرے میں گھس کر بیٹھ گئے تھے تو میں بھی کمبل اوڑھ کر سو گیا تھا؟ نہیں جگر! جب تیرے دل پر چوٹ پڑتی ہے تو ساتھ ہی میرے دل پر بھی پڑتی ہے۔ میرا وشواس کرو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ تم تڑپ رہے ہو اور میں شانتی سے سو تا رہوں۔ اگر تم ایسا سوچتے ہو تو یہ میرے لیے بڑی نراشا کی بات ہووے گی۔“ اس نے ہندوستانی اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کی۔

”تم نے کیا کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے کچھ چھان بین کرائی ہے اور مجھے ایک دو باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ان میں سے دو باتیں خاص طور پر اہم ہیں۔“

”کچھ بکو بھی۔“

”ان خاص باتوں سے پہلے یہ جان لو کہ ثروت کا شوہر وہی یوسف ہے جس سے جرمنی میں اس کی منگنی ہوئی تھی اور جس کے بارے میں ہم پہلے بھی جانتے ہیں۔ جو دو خاص باتیں پتا چلی ہیں، ان میں پہلی تو یہ ہے کہ ثروت اور یوسف کے درمیان کوئی خاص قسم کی ناچاقی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے ثروت، شوہر کا گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی... اور دوسری بات یہ ہے کہ یوسف کے گھر میں انیس بیس برس کی ایک دوسری لڑکی بھی موجود ہے جس کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ یوسف کی دوسری بیوی ہے۔“

”عمران! تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“ میں نے اسے

گہری نظروں سے دیکھا۔
''ایک سو دس فیصد سنجیدہ ہوں۔''
''یہ باتیں تمہیں کس طرح معلوم ہوئیں؟'' میں نے پوچھا۔
''جیلانی کے ذریعے۔ میں نے اسے اس کام پر لگایا تھا۔ اور تمہیں پتا ہی ہے، وہ ہر فن مولا بندہ ہے۔ اس نے بس دو تین گھنٹے کے اندر ایک ایسی عورت کا کھوج لگا لیا جو یوسف کے گھر میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل تک وہ اس بارے میں مزید معلومات فراہم کرے گی۔''
''تم ثروت اور اس کے شوہر کے درمیان کس طرح کی ناچاقی کی بات کر رہے ہو؟''
''ابھی وضاحت سے تو پتا نہیں چلا لیکن امید ہے کہ ایک دو دن میں چل جائے گا۔''
میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، ہمیں ان باتوں سے کیا لینا دینا عمران! ہر کسی کے گھریلو معاملات ہوتے ہیں۔ اب ثروت کی زندگی میں دخل دینا...''
''واہ... واہ کیا بات کی ہے تم نے۔'' عمران نے میری بات کاٹ دی۔ ''یہ ڈائیلاگ بہت سی فلموں میں بولا گیا ہے۔ چار پانچ فلموں میں تو دلیپ کمار صاحب نے ہی اس طرح کا ڈائیلاگ بولا ہے... نہیں، اب رادھا کا جیون اس کے پتی کے ساتھ ہے۔ اس کے بارے میں سوچنا بھی پاپ ہے۔ میں اب اس کے جیون پر اپنا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا... دور چلا جاؤں گا... بہت دور... بہت دور... ٹن ٹا ٹن... اور اس کے ساتھ ہی انٹرویل ہو جاتا تھا۔ بہرحال، دلیپ صاحب بہت دور نہیں جاتے تھے کیونکہ پرانی فلموں میں ''بہت بہت دور'' جانے سے مطلب گاؤں سے پچاس ساٹھ میل دور بمبئی آنا ہوتا تھا...''
''عمران! تمہاری بکواس میرے سر پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی ہے۔ آخر تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟''
''کچھ ثابت کرنا نہیں چاہ رہا۔ بس اتنی سی درخواست ہے کہ ہمیں رادھا کے بارے میں... مم، میرا مطلب ہے ثروت کے بارے میں کچھ معلومات تو حاصل ہونی چاہئیں۔ ہوسکتا ہے کہ اسے کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو... یا کوئی مشورہ درکار ہو۔ جیسا کہ اندازہ ہو رہا ہے، اس کے بھائی ناصر صاحب اس کے ساتھ نہیں ہیں... بس دونوں بہنیں ہیں یہاں۔ نصرت بھی پریشان ہے۔ احمد تھانوی سے اس کی جو ملاقات ہوئی تھی، اس کے بارے میں بتاتے نہیں؟''
''تم نے ہی بتایا تھا کہ نصرت نے پیر صاحب سے اپنی گھریلو پریشانیوں کا ذکر کیا تھا اور دعا وغیرہ کے لیے کہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لیے کسی اچھے رشتے کی خواہش رکھتی ہے۔''
''ہاں... لیکن کل احمد تھانوی صاحب نے کچھ اور بھی بتایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس کی اہم پریشانی اس کی بڑی بہن کی وجہ سے ہے۔ اس کی شوہر کے ساتھ ناچاقی ہے۔ اسی وجہ سے وہ نو دس ماہ پہلے جرمنی سے اکیلی ہی پاکستان آگئی تھی۔ بعد میں اس کا شوہر یوسف پاکستان آ گیا۔ اب دونوں میاں بیوی میں کچھ سلوک ہے مگر حالات ابھی بھی ٹھیک نہیں ہیں...''
''نصرت نے یوسف کی دوسری شادی کا کوئی ذکر بھی کیا؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں، اس بارے میں نصرت نے تو کچھ نہیں بتایا لیکن کل حمیدن نے یہ کہا ہے کہ گھر میں انیس بیس سال کی ایک انگریز لڑکی ہے جو یوسف صاحب کی بیوی ہی ہے۔ حمیدن اس نوکرانی کا نام ہے۔''
''اب تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''آج شام حمیدن سے ملنے کا پروگرام ہے۔ جیلانی اسے چھ بجے کے قریب گارڈن ٹاؤن کے ایک پارک میں لے کر آئے گا۔ ہم وہاں اس سے تفصیلی بات کر سکیں گے۔''
''اس سے کیا ہوگا عمران؟''
''ہوسکتا ہے کہ ہم اس کی کوئی مدد کرسکیں۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے یار... تمہاری اپنی ہے۔ ٹھیک ہے، اس کی شادی اور جگہ ہوگئی ہے لیکن باقی سارے رشتے اسی ایک رشتے کی وجہ سے ختم تو نہیں ہو سکتے۔ یہ ایک خاصا سنجیدہ معاملہ ہے یار! دیکھو کہ وہ جرمنی سے تن تنہا پاکستان چلی آئی۔ یہاں پہلے کسی سہیلی کے گھر ٹھہری... پھر فائزہ کے پاس رہی اور اسی کے ساتھ دو تین مہینے سروس بھی کی۔ اب اس کا شوہر پھر اسے اپنے پاس لے گیا ہے... اب یہ اندازہ بھی ہو رہا ہے کہ کوئی ٹین ایجر جرمن لڑکی اس کی دوسری بیوی ہے۔''
ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور اپنے کپڑے سکھاتے رہے۔ میں تو اتفاقاً اپنا موبائل لے کر ہی نہیں آیا تھا۔ عمران کا موبائل بھیگ گیا تھا۔ اس نے دھوپ میں رکھا ہوا تھا اور گاہے بگاہے موبائل کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا کہ وہ اسے داغ جدائی دینے کی کوشش نہ کرے۔ اچانک موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ عمران نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔ ''پیر احمد تھانوی صاحب، اتنی پہنچے ہوئے ہیں...

دیکھو، اس بھیگے ہوئے سیٹ پر بھی ان کی کال آگئی۔ اب یہ بچ جائے گا۔"

اس نے کال اٹینڈ کی اور اسپیکر بھی آن کر دیا۔ تھانوی صاحب کی آواز آئی۔ "ہیلو، کیسے ہو عمران؟"

"آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لڑکی نصرت یہاں پھر آئی تھی۔ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ ابھی اس کی باری نہیں آئی تھی کہ اچانک اسے واپس جانا پڑ گیا۔"

"وہ کیوں حضرت؟" عمران نے پوچھا۔

"فرید بتا رہا تھا کہ موبائل پر کوئی کال سنی تھی اس نے۔ پریشان ہو گئی اور ٹوکن واپس کر کے جلدی سے نکل گئی۔"

"کیا معاملہ ہو سکتا ہے جی؟" عمران نے پوچھا۔

"پتا نہیں لیکن یہ لڑکی کافی پریشان لگتی ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی ایسا رشتے دار مرد بھی اس کے آس پاس نہیں جو اس کی مدد کر سکے۔ اگر تم لوگ کچھ کر سکتے ہو اور مناسب طریقے سے کر سکتے ہو تو اس کے لیے کرو۔"

"بالکل ٹھیک ہے حضرت۔ ہم ابھی اسی بارے میں بات کر رہے تھے۔ تھوڑی سی پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ میں حاضر ہوں گا تو بتاؤں گا۔"

احمد تھانوی صاحب نے کہا۔ "اس روز ہم نے جو کوشش کی، وہ کافی کامیاب رہی ہے۔ نیاز بے کی حالت اب بہتر ہو رہی ہے۔ کل رات بھی بارش ہوئی ہے لیکن اس میں پہلے کی طرح جو شدید بے چینی پیدا ہوتی تھی، وہ نہیں ہوئی۔ وہ تم سے دوبارہ ملنا بھی چاہ رہا ہے۔"

"آپ جب کہیں گے، میں حاضر ہو جاؤں گا اور اگر اس کا وہم توڑنے کے لیے پھر بارش میں بھیگنا ضروری ہے تو میں اس کے لیے بھی حاضر ہوں۔"

احمد تھانوی صاحب کے ساتھ عمران کی گفتگو دو تین منٹ مزید جاری رہی۔ فون بند کر کے اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا خیال ہے تمہارا؟ کیا نصرت کسی گھریلو مسئلے کی وجہ سے آناً فاناً واپس گئی ہوگی؟"

میں نے کہا۔ "اگر ملازمہ حمیدن سے تمہاری ملاقات کنفرم ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ بتا دے۔"

عمران نے اثبات میں سر ہلایا...

حمیدن سے ہماری ملاقات طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوئی۔ گارڈن ٹاؤن کے ایک پارک میں شام سے تھوڑی دیر پہلے حمیدن اپنی آٹھ نو سالہ بیٹی کے ساتھ آگئی۔

بیٹی بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے لگی۔ حمیدن ہمارے پاس آبیٹھی۔ حمیدن کی عمر پینتیس برس کے قریب تھی۔ جسم فربہ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ جیلانی بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ جیلانی نے بتایا تھا کہ حمیدن کو شیشے میں اتارنے کے لیے اسے صرف تین ہزار روپے خرچ کرنے پڑے ہیں۔ ان تین ہزار کے عوض وہ یوسف کے گھر کی ہر "معلوم بات" بتانے کو تیار ہو گئی ہے۔

حمیدن نے کہا۔ "یہ ثروت بی بی یوسف صاحب کی پہلی بیوی ہیں جی۔ ہم ان کو بڑی بی بی جی کہتے ہیں۔ گھر کے سارے ملازم بڑی بی بی کی عزت کرتے ہیں۔ چھوٹی بی بی اور طرح کی ہے۔ ایک تو اس کو اپنی بولی نہیں آتی، دوسرے وہ کبھی کبھی بہت غصہ بھی کرتی ہے۔"

"تم کب سے ملازم ہو اس گھر میں؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کوئی چار مہینے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ باہر کے ملک سے آئے ہیں۔ ابھی کرائے کی کوٹھی میں رہ رہے ہیں لیکن ان کا اپنا بڑا شاندار مکان بھی بن رہا ہے جو ہربنس ٹاؤن میں ہے۔"

"یوسف صاحب کیسے بندے ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"ہم سے تو ٹھیک ہیں جی۔ بخششیں وغیرہ بھی دیتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی بڑی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ سنا ہے، کافی زیادہ تنخواہ ہے ان کی۔ شاید دس پندرہ لاکھ روپے۔"

"بڑی بی بی کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہے؟"

"بس ٹھیک ہے جی... جو چیز لاتے ہیں، دونوں بیویوں کے لیے لاتے ہیں۔ دونوں کو ٹائم دیتے ہیں مگر پھر بھی قدرتی بات ہے، چھوٹی بی بی کے ساتھ ان کا سلوک زیادہ ہے۔ وہ بھی ہر وقت ان کے ساتھ چمٹی رہتی ہے۔"

"گھر میں اور کون کون ہے؟"

"بس جی، ہم تین چار نوکر ہیں۔ ایک بڑی بی بی کی چھوٹی بہن نصرت بی بی ہے۔ ہاں، دو ڈھائی مہینے پہلے یوسف صاحب کے ابا جی 'بڑے صاحب' بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ کافی پیسے والے ہیں۔ باہر کے ملک میں ان کی بڑی پراپرٹی شراپرٹی بھی ہے۔ جب تک وہ یہاں رہے، بڑی بی بی ثروت کے ساتھ یوسف صاحب کا سلوک بڑا اچھا رہا۔ وہ ایک دوسرے سے ہنستے بولتے تھے۔ یوسف صاحب بڑی بی بی کو لے کر شاپنگ شوپنگ کرنے بھی جاتے تھے۔ لگتا تھا کہ یوسف صاحب اپنے ابا جی سے ڈرتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "تم بتا رہی ہو کہ ابا جی کے ہوتے ہوئے یوسف صاحب کا سلوک بڑی بی بی سے اچھا رہا ہے۔ یعنی اب اس کا سلوک اچھا نہیں ہے؟"

وہ ذرا توقف کر کے بولی۔ "آہو جی۔ بڑے صاحب کے جانے کے بعد ان دونوں میں پھر زیادہ صلح صفائی نہیں رہی ہے۔ کبھی کبھی جھگڑا شگڑا بھی ہو جاتا ہے دونوں میں۔ بلکہ... آج دوپہر کو بھی ہوا ہے۔"

میں چونک گیا۔ احمد تھانوی صاحب نے بتایا تھا کہ آج نصرت کو دوپہر کے وقت کوئی فون کال آئی تھی جس کے بعد وہ فوراً واپس چلی گئی تھی۔ کہیں یہ اسی جھگڑے کا شاخسانہ تو نہیں تھا۔

"آج کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ خرابی تو یوسف صاحب کی طرف سے ہی ہوتی ہے جی۔ بڑی بی بی تو کچھ بولتی ہی نہیں ہیں لیکن کبھی ان کو بھی تھوڑا بہت غصہ آ جاتا ہے۔ آج دوپہر کو چھوٹی بی بی نے کوئی واہیات سی فلم ٹی وی پر لگائی ہوئی تھی۔ آواز بھی بڑی اونچی کر رکھی تھی۔ بڑی بی بی نے کہا، میں نے نماز پڑھنی ہے، آواز ذرا کم کر دو۔ اس بات پر چھوٹی بی بی جھگڑا کرنے لگی۔ اتنے میں یوسف صاحب بھی چھت سے اتر کر آ گئے۔ انہوں نے بھی بڑی بی بی کو ہی جھڑکا اور کہا کہ وہ برداشت کرنا سیکھے، وہ اپنا دل تنگ سے تنگ کرتی جا رہی ہے۔ بڑی بی بی رونے لگیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ایک چھوٹا اٹیچی کیس لیا اور کہیں جانے کے لیے نکل پڑیں۔ یوسف صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے بی بی کو گیٹ پر روک لیا۔ وہاں پھر جھگڑا ہوا۔ بی بی جانا چاہتی تھیں اور یوسف صاحب انہیں روک رہے تھے۔ وہ بی بی کو کھینچ کر اندر لے گئے۔ بی بی کمرا بند کر کے روتی رہیں۔ نصرت بی بی بھی گھر میں نہیں تھیں۔ وہ کچھ دیر بعد آئیں اور انہوں نے بڑی بہن کو سنبھالا۔"

"اب کیا صورت حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس، ان میں جھگڑا ہوتا ہے اور پھر جلدی سے ٹھیک بھی ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یوسف صاحب نے بی بی ثروت کو منا لیا ہے۔ آج سویرے وہ بی بی ثروت کے کمرے میں ہی ناشتا کر رہے تھے اور باتیں شاتیں بھی ہو رہی تھیں۔"

جیلانی نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے حمیدن... کہیں اپنے باپ کے ڈر کی وجہ سے تو یوسف، بی بی ثروت کو اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور نہیں ہے؟"

"آپ کی بات ٹھیک بھی ہو سکتی ہے جی۔" حمیدن نے سر ہلایا۔

"بی بی ثروت سے یوسف صاحب کے ابا جی کا رویہ کیسا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"بہت چنگا جی... بہت ہی چنگا۔ وہ انہیں بہو نہیں، بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں۔ انگریز بی بی سے ان کو کچھ زیادہ پیار نہیں ہے۔ اس سے بس ضرورت کی بات ہی کرتے تھے۔"

صورت حال کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یوسف نے ثروت سے شادی اپنے ماں باپ کے دباؤ کی وجہ سے کی جبکہ جرمن لڑکی سے اس کا کوئی معاشقہ وغیرہ تھا۔ حمیدن کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ یوسف کا والد امیر کبیر اور صاحبِ جائداد ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ جائداد سے محروم ہونے کے ڈر سے یوسف، ثروت کو خود سے دور کرنا نہ چاہتا ہو۔ لیکن یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا تھا، اگر ایسی بات تھی تو پھر اس نے جرمن لڑکی سے شادی کیوں کی؟ اور اگر کی تھی تو پھر اسے منظرِ عام پر کیوں لایا؟ یا پھر ممکن تھا کہ یہ شادی خفیہ ہو اور خفیہ رہ نہ سکی ہو... یا جرمن بیوی نے ہی اسے مجبور کر دیا ہو کہ وہ اس شادی کا اعلان کرے...

جیلانی نے حمیدن سے پوچھا۔ "یوسف کی جرمن بیوی کیا خوب صورت ہے؟"

"ہاں جی، خوب صورت تو بہت ہے۔ نیلی آنکھیں، گولڈن بال۔ لگتا ہے کہ شیشے کی بنی ہوئی ہے۔ پر خوش شکل ہونا اور بات ہوتی ہے جی اور سوہنا ہونا اور بات۔ چھوٹی بی بی خوش شکل ہے، پر بڑی بی بی سوہنی ہے۔ اوپر سے بھی اور اندر سے بھی۔ ہمیں تو بڑی بی بی ہی چنگی لگتی ہے جی۔"

عمران نے جیلانی کی طرف دیکھ کر بھویں اچکائیں، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھو بھئی! حمیدن نے شیکسپیئر اور شیلے کے پائے کی بات کی ہے۔ خوش شکل ہونا اور بات ہے، سوہنا ہونا اور بات۔"

جیلانی نے کہا۔ "حمیدن! تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے، یہ دو شادیاں کیسے اور کیوں ہوئیں؟"

وہ بولی۔ "میں تو جی موٹی عقل کی غریب نوکرانی ہوں۔ سارا دن کھوتے کی طرح کام کرنے والی پھر بھی مہینے کے آخر میں رونے والی۔ بڑے لوگوں کی باتیں بڑے لوگ ہی جانیں۔ پر میرا اندازہ ہے کہ بی بی ثروت بزرگوں کی مرضی سے آئی ہے اور چھوٹی بی بی کے ساتھ یوسف صاحب کا کوئی چکر شکر تھا۔ میرا مطلب ہے، کوئی پہلے کا معاملہ۔ سنا ہے کہ وہ اس دفتر میں کام کرتی تھی جہاں یوسف صاحب کرتے تھے۔ دونوں کی عمروں میں کافی فرق بھی لگتا ہے جی۔ پر جب

مت ماری جائے تو ایسے فرق شرق کون دیکھتا ہے۔"

حمیدن کے ساتھ ہماری گفتگو کوئی ایک گھنٹا رہی۔ یہاں تک کہ شام کا اندھیرا پھیل گیا اور وہ واپسی کے لیے بے چین نظر آنے لگی۔

جیلانی... حمیدن کی مٹھی کو تھوڑا سا مزید گرم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ ایک دو دن میں کچھ مزید کارآمد باتیں بتائے گی۔

اس رات میں دیر تک اکیلا ہی چھت پر ٹہلتا رہا۔ موسم صاف تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ بالو گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا میرے بازوؤں میں تھا۔ وہ کبھی اپنے ننھے ہاتھ میرے منہ پر چلاتا، کبھی ناخنوں سے میری جلد کریدتا پھر ایک دم گردن گھما کر اوپر دیکھنے لگتا تھا۔ اس کی نگاہ تاریک آسمان کی بے کراں وسعتوں میں دمکتے ستاروں پر جا ٹکتی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مرنے والے ستاروں کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ کیا اناری رخساروں اور جھیل آنکھوں والی سلطانہ بھی ان ستاروں میں کہیں موجود تھی؟ پتا نہیں کیوں لگا کہ وہ موجود ہے۔ ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی گم گشتہ آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔"... مہروج! تم ثروت نام کی اس لڑکی سے بہت پیار کرتے ہو۔ شاید اتنا پیار جتنا تم خود بھی نہیں جانتے۔ اسے ڈھونڈنا ضرور... اس سے ملنا ضرور۔ اور مجھے یقین (یقین) ہے مہروج! وہ تمہیں ملے گی۔ اور جب وہ ملے گی تو اس سے کہنا..."

میں سلطانہ کی آواز سنتا رہا۔ میرے قدم چھت کے پتھریلے فرش پر اٹھتے رہے اور بالو میری بانہوں میں کھیلتا رہا... ہمکتا رہا۔

میں نے سوچا کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ثروت کے سلسلے میں اب بھی کوئی گنجائش موجود ہے؟ کیا اب بھی کوئی ایسی انہونی ہو سکتی ہے جو میری اور اس کی راہوں کو ملا دے؟

بالو کے دودھ کا وقت ہو گیا تھا۔ صفیہ آئی اور اسے نیچے لے گئی۔ میں اوپر ہی رہا۔ سرد ہوا کی کاٹ میرے لیے بے معنی تھی۔ میں برداشت کے معاملے میں اتنا ڈھیٹ ہو چکا تھا کہ شاید اس سے دس گنا سردی بھی جھیل سکتا تھا۔

عاطف نے چھت پر جو چھوٹا سا جم بنا رکھا تھا، وہ آج کل میرے استعمال میں تھا... میں رات کے وقت دیر تک یہاں مصروف رہتا۔ اپنے آپ کو جسمانی مشقت کے حوالے کر کے مجھے عجیب سا سکون ملتا تھا۔ جب سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹتے، جب مساموں سے پسینا دھاروں کی صورت میں بہتا اور سانس لوہار کی دھونکنی کی طرح چلتی،

میرے سامنے جگی کا مسکراتا ہوا چہرہ آ جاتا۔ اس نے کہا تھا... تکلیف کا صلہ ملتا ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ قدرت اپنے اس اٹل اصول سے انحراف کر ہی نہیں سکتی۔

میں جان توڑ ورزش میں مصروف ہو گیا۔ ایک خیالی دنیا میں چلا گیا... اپنے ارد گرد موجود ان بدزین لوگوں کے سامنے آ گیا جن سے مجھے نبرد آزما ہونا تھا۔

اسی دوران میں عمران بھی اوپر چلا آیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع ہے۔ وہ بولا۔ "ابھی احمد تھانوی صاحب کا فون آیا ہے۔ نصرت آج پھر ان کے پاس پہنچی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کھل رہی ہے۔ آج اس نے تھانوی صاحب سے بہت اہم ڈسکشن کی ہے۔"

"کس حوالے سے؟" میں نے پوچھا۔

"خاوند سے علیحدگی اور طلاق کے موضوع پر۔"

"کیا مطلب؟ نصرت کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

"اس نے یہ گفتگو اپنی بہن ثروت کے حوالے سے کی ہے۔ اس نے تھانوی صاحب سے اس بارے میں شرعی پوزیشن پوچھی ہے۔ بہت سے متعلقہ سوال کیے ہیں۔ تھانوی صاحب نے نصرت کو بتایا ہے کہ مذہب میں کسی بھی صورت میں زبردستی نہیں ہے۔ اگر ایک عورت سمجھتی ہے کہ وہ ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور شوہر کی اصلاح کا بھی کوئی امکان نہیں تو وہ اس کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں ہے۔ اس کے لیے طلاق کا راستہ ہے۔ جو بے شک ناپسندیدہ ہے لیکن موجود ہے۔ میں نے کہا تھا نا تابش! ثروت کے ازدواجی معاملوں میں کافی گڑبڑ ہے۔"

"نصرت کیا کہتی ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ اس کی بڑی بہن اور اس کے شوہر میں بہت فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ معاملے ایسی جگہ پر ہیں جہاں اس کی بہن کو شوہر سے علیحدہ ہو جانا چاہیے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں۔ وہ اسے ایک گناہ کی طرح سمجھ رہی ہے۔ اس کی یہ سوچ اس کی زندگی تباہ کر دے گی۔ نصرت کا کہنا ہے کہ ثروت کے شوہر نے جعلی اجازت نامے کے ذریعے خفیہ شادی کی۔ اب وہ دوسری بیوی کو گھر لے آیا ہے۔ وہ پرلے درجے کا مفاد پرست ہے اور صرف اپنے باپ سے جائداد کا باقی حصہ حاصل کرنے کے لیے ثروت کو اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ثروت اس کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہے۔"

عمران کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ "تمہارا کیا

خیال ہے، اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"جہاں تک میری چھٹی حس کہتی ہے جگر... اب موقع آ گیا ہے کہ ہم نصرت سے مل لیں۔"

"کہیں اس سے کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے کہ... ثروت مجھ کو خدا حافظ کہہ کر جا چکی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے راستے میں نہ آؤں... اب ہم نصرت سے ملے تو وہ سمجھے گی کہ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔"

"بالکل اصلی ناکام عاشقوں والا رویہ ہے تمہارا۔ یہی کرتوت تھے جن کی وجہ سے عظیم اداکار دلیپ کمار کو ہر فلم میں ہیروئن سے ہاتھ دھونے پڑے۔ وہی گھسی پٹی سوچ، میں اس کے رستے میں نہیں آؤں گا... میں اس کی زندگی پر اپنا منحوس سایہ نہیں پڑنے دوں گا۔ میں اندر ہی اندر جل کر خاک ہو جاؤں گا، راکھ ہو جاؤں گا، مرونڈا بن جاؤں گا... بندۂ خدا... یہ نیا دور ہے۔ خود اذیتی والی حرکتیں چھوڑو۔ منطقی انداز میں سوچو، ہم اس کی مرضی اور منشا کے خلاف کچھ کرنے نہیں جا رہے۔"

"اچھا کہو، کیا کرنا ہے؟"

"احمد تھانوی صاحب بتا رہے تھے کہ کل نصرت پھر آ رہی ہے۔ وہ جب تھانوی صاحب سے مل کر واپس جائے گی، ہم اس کے سامنے آئیں گے اور اس سے ملاقات کریں گے۔"

"لیکن..."

"لیکن کے آگے چھا نپڑ ہے۔ بس اب چپ ہو جاؤ۔" اس نے اپنی ہتھیلی میرے ہونٹوں پر جمائی اور میرا منہ بند کر دیا۔

اگلے روز سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح ہم نے سوچا تھا۔ نصرت، پیر احمد تھانوی صاحب سے مل کر اور ان سے وظیفہ جات وغیرہ لکھوا کر رکشا پر روانہ ہوئی تو ہم کار میں اس کے پیچھے تھے۔ وہ ابھی گارڈن ٹاؤن سے کافی دور تھی جب ہم نے کار رکشا کے پاس سے گزاری۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اتفاقاً میری نگاہ نصرت پر پڑ گئی ہے۔ نصرت نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ ایک دو سیکنڈ کے لیے وہ مجھے پہچان نہیں سکی پھر ہکا بکا رہ گئی۔ کچھ دیر تک رکشا ہماری کار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر میں نے رکشا ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ اس نے رکشا سائڈ پر روک دیا۔ میں کار سے اتر کر نصرت کی طرف بڑھا۔ وہ بھی رکشا میں سے باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔ چہرے پر کئی رنگ یک جا ہو گئے تھے جن میں

پریشانی کا رنگ بھی شامل تھا۔ "تابش بھائی آپ...؟" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ اس کے انداز نے ثابت کیا کہ ثروت نے ابھی تک اسے میری اور اپنی حالیہ ملاقاتوں کے بارے میں نہیں بتایا۔

میں نے کہا۔ "میں بھی تمہیں دیکھ کر اتنا ہی حیران ہو رہا ہوں جتنی تم۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا تھا کہ شاید اب کبھی..." اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

... تقریباً پندرہ منٹ بعد ہماری کار ایک اسنیک بار کے سامنے رک رہی تھی... عمران کار میں ہی رہا جبکہ میں اور نصرت اتر کر اندر چلے گئے۔ نصرت حیران تھی کہ اس نے اپنا تین چوتھائی چہرہ چادر کے پلو میں چھپا رکھا تھا پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا... اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں سے اس کے پیچھے تھے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھی کہ میں اسے بہت بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جسمانی لحاظ سے بھی اور بول چال کے اعتبار سے بھی۔ ہم چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ڈھیروں سوال جواب تھے لیکن نصرت کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے ہم اہم سوال و جواب کے دائرے میں ہی رہے۔ نصرت میری بہن فرح اور بھائی عاطف کے بارے میں جاننے کے لیے بہت بے چین تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ دونوں خیر خیریت سے ہیں۔ نصرت نے ہماری والدہ کی وفات پر جو نصرت کی خالہ بھی تھیں، گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے سپاٹ لہجے میں مجھے بتایا کہ ثروت باجی کی شادی ہو چکی ہے اور یہ وہیں ہوئی ہے جہاں ان کی منگنی طے تھی۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ اس کی ثروت باجی اپنے گھر میں خوش و خرم ہیں۔ انہیں ایک اچھا شوہر ملا ہے... اس نے اس "اچھے شوہر" کی دوسری شادی کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔

میں نے کہا۔ "نصرت! میں جتنا عرصہ انڈیا میں رہا ہوں، کچھ لوگ بہت ہی شدت سے یاد آتے رہے ہیں۔ ان میں ناصر بھائی بھی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟"

وہ چند سیکنڈ کے لیے چپ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے وہ بہت سی دیگر باتیں چھپا رہی ہے، ناصر بھائی کے بارے میں بھی چھپانا چاہ رہی ہے۔ لیکن پھر یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے ایک بار رونا شروع کیا تو روتی چلی گئی۔

"کیا ہوا نصرت! ناصر بھائی ٹھیک تو ہیں نا؟"

وہ ہچکیوں میں بولی۔ "وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تابش

بھائی۔ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔" میرے سینے میں جیسے کوئی شے چھنا کے سے ٹوٹی اور بکھر گئی۔ کئی سیکنڈ تک میں کچھ بول نہیں سکا۔ وہ روشن چہرہ میری نگاہوں میں چمکا اور پوری طرح چمک کر ایک دم بجھ گیا۔ میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔ "نصرت! کیا ہوا انہیں؟"

"ایکسیڈنٹ۔" وہ سسک کر بولی۔ "فرینکفرٹ سے ہمبرگ جاتے ہوئے ان کی کار کا حادثہ ہوگیا۔ ناصر بھائی کی بھی منگنی ہو چکی تھی۔ ان کی منگیتر اور منگیتر کا بھائی بھی اس حادثے میں ختم ہوگئے۔ دو سال ہوگئے ہیں لیکن ہم ابھی تک اس حادثے کے اثر سے نکل نہیں سکے۔"

ہم کتنی ہی دیر تک اس تکلیف دہ موضوع پر بات کرتے رہے پھر دھیرے دھیرے گفتگو میں دیگر موضوعات بھی شامل ہونے لگے۔ میں نے نصرت سے پوچھا۔ "جب یہ واقعہ ہوا، ثروت کی شادی ہو چکی تھی؟"

"جی تابش بھائی! صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ باجی نے تو اس کا اتنا غم لیا کہ بستر پر پڑ گئیں۔ ایک دفعہ تو ایسے لگنے لگا کہ ان کو بھی کچھ ہو جائے گا۔ بڑی مشکلوں سے دو تین مہینوں بعد کچھ سنبھل سکیں۔"

ناصر کے مرنے کی اطلاع نے ہمیں ایک دم سوگوار کر دیا تھا۔ کسی اور موضوع پر بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ دوسری طرف یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ نصرت اگر اب چلی گئی تو پھر شاید جلد ہی اس سے ملاقات نہ ہو سکے۔ اس کی باتوں اور اس کے انداز سے "گریز" صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ پتا چل رہا تھا کہ وہ اس ملاقات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہے کہ اس ملاقات سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھے سمجھا دیا کہ ثروت کی کچھ گھریلو مصروفیات ہیں۔ شاید ابھی اس کے لیے ممکن نہ ہو کہ وہ مجھ سے مل سکے۔ اس نے گارڈن ٹاؤن والے گھر کا ادھورا سا ایڈریس تو بتا دیا مگر ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی ثروت باجی اور یوسف بھائی کچھ دنوں کے لیے لاہور سے باہر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ "نصرت! کیا فرح اور عاطف وغیرہ سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا؟"

وہ بولی۔ "دل تو بہت کچھ چاہتا ہے تابش بھائی لیکن میں باجی اور یوسف بھائی کی اجازت کے بغیر تو کچھ نہیں کر سکتی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ثروت باجی ابھی کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتیں۔ پھوپی زینب، چچی کلثوم اور تایا شفیق سمیت کئی رشتے دار لاہور میں موجود ہیں لیکن ابھی تک کسی کو پتا نہیں کہ ہم یہاں ہیں۔ آپ سے بھی... بس اتفاقاً ہی ملاقات ہوگئی ہے..."

اس نے یوں کہا جیسے اس "ان چاہی" ملاقات نے اسے خوش تو کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ بہت پریشان بھی کیا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "ابھی تم کہاں سے آ رہی تھیں؟"

اس نے ایک اور غلط بیانی کرتے ہوئے کہا۔ "انارکلی گئی تھی، کچھ چیزیں لینے کے لیے۔"

میں کچھ دیر تک نصرت کی طرف دیکھتا رہا پھر طویل سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔ "نصرت! ناصر بھائی کی وفات کی اطلاع دے کر تم نے جو صدمہ پہنچایا ہے، اس کے بعد کوئی اور بات چھیڑنے کو دل تو نہیں چاہ رہا لیکن کچھ باتیں کرنا ضروری لگی ہیں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "نصرت! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک سچی لڑکی ہو لیکن اس وقت حالات کی مجبوری تمہارے سچ پر گہرا سایہ ڈال رہی ہے۔"

"مم... میں سمجھی نہیں تابش بھائی!"

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "نصرت! میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ چند دن پہلے میں ثروت سے مل چکا ہوں۔ شاید ثروت نے تمہیں یہ بات بتانی مناسب نہیں سمجھی۔"

"آ... آپ ملے ہیں؟" وہ ششدر رہ گئی۔

"ہاں نصرت! میں اس سے ملا ہوں اور میں نے اس کے بارے میں کافی کچھ جانا بھی ہے۔ اور جو کچھ میں نے جانا ہے، وہ اس سے بہت مختلف ہے جو تم بتا رہی ہو۔"

میز پر رکھے ہوئے نصرت کے ہاتھوں میں لرزش نمودار ہوگئی۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "آپ... کو... کیا پتا چلا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ثروت اپنے گھر میں بالکل بھی خوش نہیں ہے۔ یوسف کا کہیں معاشقہ تھا۔ اس نے خفیہ طور پر دوسری شادی کی اور پھر دوسری بیوی کو گھر بھی لے آیا۔ اس نے صرف اپنے امیر باپ کے خوف سے ثروت کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ان دونوں میں طلاق تک نوبت پہنچ چکی ہے لیکن ثروت اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ "آپ غلط نہیں کہہ رہے لیکن صحیح بھی نہیں کہہ رہے۔ شاید کسی نے آپ کو درست نہیں بتایا۔ تھوڑی بہت بات تو ہے میاں بیوی میں... لیکن ایسی باتیں تو گھروں میں ہوا ہی کرتی ہیں..."

"کیا یوسف کی دوسری شادی والی بات بھی غلط ہے؟"

"ہاں... یہ شادی ہوئی تو ہے... لیکن میں سمجھتی ہوں تابش بھائی، یہ سب کچھ عارضی ہے۔ وقتی جذبات کا نتیجہ ہے۔ یوسف بھائی کی اصل اور خاندانی بیوی تو باجی ثروت ہی ہیں۔ مم... مجھے یقین ہے کہ یوسف بھائی بہت جلد گریس کو چھوڑ دیں گے۔"

میں نے نصرت کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نصرت! کچھ لوگوں کے چہرے شیشے کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ جھوٹ بولنا چاہیں بھی تو نہیں بول سکتے۔ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔"

وہ روہانسی ہوگئی۔ غالباً وہ خوف زدہ تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کسی انکشاف کی وجہ سے ثروت کے مسائل میں اضافہ ہو اور وہ جو پہلے ہی دکھوں کے بھنور میں ہے، کچھ اور بھی بے حال ہو جائے۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں تابش بھائی! تھوڑی بہت رنجش ضرور ہے لیکن..."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ بھی غلط ہے کہ تم ابھی انارکلی سے نہیں بلکہ شاہ جمال سے آ رہی ہو۔ وہاں کسی پیر احمد تھانوی صاحب سے مل کر... اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہاں ثروت کی شدید گھریلو پریشانیوں کے سلسلے میں ہی گئی ہوگی۔"

نصرت کا رنگ کچھ اور بھی زرد ہوگیا۔ وہ سٹپٹائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تابش بھائی! میں آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں۔ آپ ثروت باجی کو ان کے حال پر چھوڑ دیں... وہ پہلے ہی بہت دکھی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نصرت! تمہاری بات میں کوئی وزن نہیں ہے۔ وہ بہت خوش ہوتی تو پھر اسے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا تھا۔ "بہت دکھی" کو اس کے حال پر چھوڑنا کیا مناسب ہوگا؟ جہاں تک تمہارا مسئلہ ہے نصرت! وہ بھی میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم ڈر رہی ہو کہ ثروت تمہیں مجھ سے ملنے اور صورتِ حال سے آگاہ کرنے پر موردِ الزام ٹھہرائے گی... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں نصرت! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس سارے معاملے میں کہیں تمہارا نام نہیں آئے گا۔ اور میں ایک بھائی کی حیثیت سے تمہیں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے ثروت کے مسئلوں میں کوئی چھوٹا سا بھی اضافہ ہو۔"

"لیکن تابش بھائی..."

"لیکن میری بہن! اگر تم کچھ نہ بھی بتاؤ گی تو صورتِ حال میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میں بہت کچھ جان چکا ہوں اور باقی بھی مجھے بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔"

وہ آبدیدہ ہوگئی۔ "تابش بھائی! آپ کیوں خواہ مخواہ خود کو مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ آپ خود کو اس سارے معاملے سے الگ کیوں نہیں رکھتے؟"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ یہ جملہ بے دھیانی میں بول گئی تھی لیکن اس جملے میں چھپے ہوئے اندیشے مجھ تک پہنچے تھے۔ میں نے کہا۔ "نصرت! ایک طرف تم کہہ رہی ہو کہ سب ٹھیک ہے۔ دوسری طرف مشکلوں کی بات بھی کر رہی ہو۔ جب سب کچھ ٹھیک ہے تو پھر ثروت کے بارے میں جاننے سے میں مشکل میں کیوں پڑوں گا...؟"

"آپ نہ پڑیں گے لیکن ان کے لیے تو مشکل ہو سکتی ہے نا۔ آپ کو اس معاشرے کا پتا ہی ہے۔ آپ سے زیادہ اور کون جانے گا کہ چار سال پہلے کیا ہوا تھا۔ باجی کچھ گھنٹوں کے لیے گھر سے باہر رہی تھیں اور خیریت سے واپس آگئی تھیں لیکن ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ اتنی باتیں بنی تھیں، اتنی انگلیاں اٹھائی گئی تھیں کہ ہم زندہ درگور ہو گئے تھے۔ آپ کچھ کر سکے تھے، نہ ناصر بھائی، نہ کوئی اور... تھانے دار اشرف اور گورایا جیسے لوگوں نے سراج کے ساتھیوں والا کردار کیا تھا اور ہمیں بے بس کر کے رکھ دیا تھا... آپ کے سامنے ہی تو ابا جی کی لاش اٹھی تھی تابش بھائی۔ ان کے جنازے کو آپ نے بھی کندھا دیا تھا... کس طرح ایک ہنستا بستا گھر اجڑا تھا تابش بھائی۔ یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ اس کی مار بڑی سخت ہے تابش بھائی۔ ہم اور طرح کے لوگ ہیں، ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے..."

میری اور ثروت کی گفتگو جاری تھی جب اچانک میں ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ ہال کے ایک گوشے میں گئی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ وہاں دھاری دار کوٹ والا ایک تیس پینتیس سالہ شخص موجود تھا۔ اس کی پھولی ہوئی ناک اس کے چہرے پہ خاص نمایاں تھی۔ میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص سیٹھ سراج اور شیرے کے ساتھیوں میں سے ہے۔ اور اگر وہ یہاں موجود تھا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے نصرت کا خیال ہی آیا۔ وہ میرے ساتھ یہاں موجود تھی اور کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھی۔

میں نے بائیں ہاتھ سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے دایاں ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف بڑھایا اور بڑی

آہستگی سے اعشاریہ دو پانچ کا پستول نکال لیا۔ ایک ہی ہاتھ سے میں نے اس کا میگزین علیحدہ کر کے اس میں گولیوں کی تعداد دیکھی اور پھر اسے دوبارہ اٹیچ کر کے سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

نصرت کو شک پڑ گیا تھا کہ میں ٹیبل کے نیچے کچھ کر رہا ہوں۔ اس کی نظر کا زاویہ بدلا اور اس نے میری گود میں سیاہ رنگ کا پستول دیکھ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی چہرے پر زردی چھا گئی۔ ''آ... آپ کے پاس پستول ہے بھائی؟''

میں اسے کیا بتاتا کہ اب میرے ہاتھوں میں پھول، کتابیں، خوشبوئیں اور امن آشتی کی لکیریں نہیں ہیں۔ اب یہ ہاتھ بہت بدل چکے ہیں۔ اب ان ہاتھوں کے اثاثے کچھ اور طرح کے ہیں۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''نصرت! ایک ایسا بندہ یہاں موجود ہے جو کوئی غلط حرکت کر سکتا ہے۔ اگر کوئی لڑائی جھگڑا ہوا تو تم...... پچھلے دروازے سے نکل کر چھوٹی سڑک پر چلی جانا۔ جو سواری بھی ملے، اس پر بیٹھ کر نکل جانا۔''

''لل... لیکن۔''

''اگر کوئی پیچھا کرے تو پولیس اسٹیشن سامنے ہی ہے۔ سو ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ ہوگا۔''

نصرت کا پورا جسم لرزنے لگا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ گوشے میں بیٹھا ہوا موٹی ناک والا الرٹ ہو گیا ہے۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اسے دیکھ کر چونکا ہوں۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ وہ اپنی میز چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے والا ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ نصرت کو وہیں پر چھوڑ کر میں عام سے انداز میں اٹھا اور گوشے کی طرف بڑھا۔ وہ شخص تاڑ گیا کہ میں اس کی طرف آ رہا ہوں۔ یکایک اس نے اپنا ہاتھ اپنے دھاری دار کوٹ کی جیب میں ڈالا اور پستول نکال لیا۔ یقیناً اس نے جو کرنا تھا، اس کا فیصلہ وہ پہلے سے کر چکا تھا۔ میں ابھی اس سے آٹھ دس قدم دور تھا کہ اس نے اپنا ہاتھ سیدھا کر کے بے دریغ مجھ پر فائر کیا۔ میں فائر کے دھماکے سے پہلے ہی جھک گیا تھا۔ گولی ایک میز پر رکھے ہوئے ایک خاتون کے سنہری شولڈر بیگ میں لگی۔ میں نے بیگ کو اچھل کر نصرت کے پاؤں میں گرتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص دوسرا فائر کرتا، میرے ہاتھ میں دبے پستول کی نال سے شعلہ نکلا۔ گولی حملہ آور کے کندھے میں کہیں لگی۔ وہ پیچھے کی طرف گرا لیکن گرتے ساتھ ہی اٹھا اور ایک خالی میز کو الٹاتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ پورے اسنیک بار میں کہرام مچ گیا تھا۔ میزیں الٹ رہی تھیں، برتن گر رہے تھے... لوگ بھاگ رہے تھے۔

میں پوری رفتار سے موٹی ناک والے شخص کے پیچھے لپکا۔ ابھی میں نے آٹھ دس قدم ہی اٹھائے تھے کہ میری بائیں جانب سے ایک پرچھائیں سی مجھ پر جھپٹی۔ یوں لگا جیسے رفتار سے بھاگتا ہوا کوئی ٹرک مجھ سے آن ٹکرایا ہے۔ میں ایک میز کے اوپر سے ہوتا ہوا اور ایک خاتون کو روندتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ شیشے کی ایک نہایت خوب صورت سائڈ ٹیبل میری ٹکر سے چکنا چور ہوئی۔ دیوار کے ساتھ میرے سر کا بھی زوردار تصادم ہوا تھا۔ یہ میری غیر معمولی قوتِ برداشت ہی تھی جس نے مجھے بے ہوش ہونے سے بچایا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ میں بھنا کر اٹھا، کرخت شکل و صورت والا ایک گرانڈیل شخص میرے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا لمبا چاقو تھا۔ بڑی بیدردی سے اس نے میرے پیٹ پر وار کیا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر خود کو بمشکل بچایا پھر بھی چاقو کی نوک میری چرمی جیکٹ کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے طوفانی مکا اس کے چوڑے جبڑے پر رسید کیا... وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ اسے جبڑے پر میری دوسری ضرب سہنا پڑی۔ غالباً اسے ایسی زوردار ضربوں کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنا توازن کھو کر شیشے کے طویل کاؤنٹر سے ٹکرایا۔ تب دوبارہ اچھل کر میری طرف آیا۔ اس مرتبہ میں نیچے جھکا، مہلک چاقو میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ میرے اردگرد سے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان میں خواتین کی آوازیں نمایاں تھیں۔ میں نے گرانڈیل شخص کے پہلو پر زوردار لات رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دور جا گرا۔ یقیناً اس کی ایک آدھ پسلی اپنی اصلی حالت میں نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے گرے ہوئے پستول کے لیے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ اس دوران میں میرے مدمقابل کو جو ایک سیکنڈ کا وقفہ ملا، اس میں اس نے بار کے عقبی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کھلا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ کس میں اتنی جرأت تھی کہ اسے روکتا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ بار سے نکلتے ہی وہ یوں اوجھل ہوا جیسے زمین میں کہیں سما گیا ہو۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، وہ کہیں نہیں تھا... یوں لگا جیسے وہ کسی قریبی دکان میں گھسا ہے اور پھر دوسری طرف سے نکل گیا ہے۔

اسنیک بار کے ملازمین اور مالک بھی میرے اردگرد موجود تھے اور چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن حملہ آور اوجھل ہو چکا تھا۔ پھر مجھے نصرت کا خیال آیا... وہ کہاں تھی؟ میرا اندازہ تھا کہ وہ میری ہدایت کے مطابق بھاگ گئی نہیں ہے بلکہ وہیں کہیں دبک گئی ہے۔ یہ اندازہ درست تھا۔ وہ بار ہی کے ایک گوشے سے نکلی اور روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس

کا سارا جسم لرز رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب مجھے عمران بھی نظر آیا۔ بار میں دو گولیاں چلی تھیں اور یقیناً یہ آوازیں پارکنگ میں عمران کے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ ''کیا ہوا تابی! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' اس نے مجھے سرتاپا دیکھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں... سیٹھ سراج کے بندے تھے۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

عمران کی نگاہ میری کٹی ہوئی جیکٹ پر پڑی اور اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ہمارے اردگرد ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہم واپس بار کے اندر آ گئے۔ میں نے سب سے پہلے اپنا پستول تلاش کیا اور جیب میں ڈالا۔ بار کے ہال میں کافی نقصان ہوا تھا۔ پتلون اور جرسی والی ایک جواں سال لڑکی ہنگامے کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھی، اسے ہوش میں لایا جا رہا تھا۔

کون تھے یہ لوگ؟ کیا چاہتے تھے؟ انہوں نے کیوں حملہ کیا؟ اس طرح کے بہت سے سوال مجھ سے پوچھے جا رہے تھے۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''تابی! تم نصرت کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ یہاں کا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

لیکن جب میں نصرت کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا تو اسنیک بار کے ''منیجر یا مالک'' نے مجھے روک لیا۔ ''جناب! آپ رکیں۔ میں نے پولیس کو بلایا ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''ان کو جانے دو۔ ان کے ساتھ خاتون ہے۔ ان کی جگہ میں ہوں یہاں۔''

مالک بولا۔ ''آپ بھی رک جائیں۔ پانچ دس منٹ کی بات ہے۔ وہ لوگ پہنچ ہی رہے ہوں گے۔'' مالک کو یقیناً زیادہ فکر توڑ پھوڑ سے ہونے والے اپنے نقصان کی تھی۔

عمران نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ دونوں یہاں کھڑے رہیں... اور ابھی کسی طرف سے کوئی اور حرامزادہ ان پر گولی چلا دے... ان کو جانے دو۔ ان کے سارے معاملات کے لیے میں جو ہوں یہاں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم نکلو تابش! یہ لو گاڑی کی چابی۔''

عمران کے تحکمانہ لہجے میں بار کے مالک کو چپ کرا دیا۔ میں ڈری سہمی نصرت کو لے کر پارکنگ میں آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے آ کر میں نے دیکھا کہ ایک پولیس موبائل جس میں ایک سست الوجود تھانے دار بھی بیٹھا تھا، اسنیک بار کی طرف جا رہی تھی۔ مجھے اس معاملے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسے مسئلوں کو عمران چٹکیوں میں حل کرتا ہے۔ ہر جگہ اس کے تعلقات تھے۔

ہم گلبرگ مین مارکیٹ کی طرف نکل آئے اور پھر ایک اور ریستوران میں جا بیٹھے۔ اپنی کٹی ہوئی جیکٹ میں نے گاڑی میں ہی رہنے دی تھی۔ نصرت کے چہرے پر اب تک حیرت جمی ہوئی تھی۔ اسے جیسے میرے اس روپ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یہ روپ اس روپ سے یقیناً بہت مختلف تھا جو وہ بچپن سے لے کر چار سال پہلے تک دیکھتی رہی تھی۔ دبلا پتلا، کم گو اور دل گرفتہ تابش بھائی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آج اس نے جس تابش کو دیکھا تھا، وہ نہ صرف مار دھاڑ کر سکتا تھا بلکہ آتشیں اسلحے کا استعمال بھی اس کے لیے معمولی بات تھی۔ نصرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ میں نے دو خطرناک غنڈوں سے ٹکر لی تھی بلکہ انہیں بھاگنے پر بھی مجبور کیا تھا۔ اس واقعے کی شدت نے اسے ابھی تک لرزہ براندام کر رکھا تھا۔

''آپ بہت بدل گئے ہیں تابش بھائی۔ بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں کسی اور شخص سے مل رہی ہوں۔'' وہ کانپتی سی آواز میں بولی۔

''یہ تم تعریف کر رہی ہو یا ناپسندیدگی ظاہر کر رہی ہو؟''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تابش بھائی! مجھے لگتا ہے کہ آپ... بہت خطرناک قسم کا وقت گزار رہے ہیں۔ آپ کے آس پاس جو لوگ ہیں، وہ بھی خطرناک ہیں۔ یہ آپ کا دوست کون ہے جس نے ذمے داری لے کر ہمیں وہاں سے نکالا ہے؟''

''یہ بھی ہے ایک۔ تم اسے جانو گی تو تمہاری یہ موجودہ حیرت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں نصرت جن کو دیکھ کر زندہ رہنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔''

نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ نصرت میں وہ جھجک اور وہ خوف کی کیفیت کم ہوئی ہے جو اس ملاقات کے شروع میں اس میں نظر آ رہی تھی۔ اور اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میری بدلی ہوئی شخصیت دیکھی تھی۔ عورت ایک کمزور صنف کا نام ہے۔ اس کے اندر فطری طور پر سہارے، تحفظ اور مضبوطی کی طلب ہوتی ہے۔ اور یہ صفات اسے جہاں بھی نظر آتی ہیں، کشش کرتی ہیں۔

میں گفتگو کے ذریعے اسے ہفتوں تک قائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تو بھی شاید کامیاب نہ ہوتا لیکن بار میں پیش آنے والے اس ایک واقعے نے نصرت کو اس کے سخت خول کے اندر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کرنے کے راستے پر گامزن ہو گئی تھی۔ وہ اب تفصیل سے جاننا چاہ رہی تھی کہ میں اتنا عرصہ کہاں اور کس حال میں رہا ہوں۔ کن کن مرحلوں سے گزرا ہوں۔ کن کن لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے... اور کیا ان لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے دونوں گھرانوں کی زندگیوں کو تباہ کیا۔

میں اسے گزرے ماہ و سال کے سارے حالات تو نہیں بتا سکتا تھا تاہم چیدہ چیدہ واقعات سے اسے آگاہ کیا... نصرت نے اپنے موبائل فون سے گھر میں ثروت کو فون کر دیا اور اسے بتایا کہ اسکول کے دور کی ایک دوست اسے مل گئی ہے، اس لیے وہ کچھ دیر بعد آئے گی۔ میں نے ایک بار پھر ثروت اور اس کے گھریلو حالات والا موضوع چھیڑ دیا۔ اس مرتبہ نصرت کی آنکھوں میں فوراً نمی جاگ گئی۔ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد گمبھیر آواز میں بولی۔ ''تابش بھائی! آپ ٹھیک سمجھتے ہیں۔ باجی کے گھریلو حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ یوسف بھائی نے اپنے مطلب کے لیے باجی کو کھلونا بنا رکھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کی حیثیت اس گھر میں بیوی کی ہے ہی نہیں۔ بیوی تو وہی گریس ہے۔ یوسف بھائی نے اس کا اسلامی نام حدیقہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ جب بندے کا دل نہ بدلے تو کچھ نہیں بدلتا۔ وہ صرف نام کی مسلمان ہے۔ اس نے یوسف بھائی پر پوری طرح قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ شاید بے دام کی غلامی اسی کو کہتے ہیں۔''

''کیا یہ گریس والا معاملہ ثروت سے شادی کے بعد شروع ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

نصرت نے آنسو پونچھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں تابش بھائی! یہ چکر پہلے سے چل رہا تھا۔ یوسف بھائی فرینکفرٹ کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں آفیسر تھے۔ یہ وہاں ان کی ماتحت تھی۔ وہیں سے یہ افیئر شروع ہوا۔ یوسف بھائی اس سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن اپنے والد فاروقی صاحب کی وجہ سے ان کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ جرمن لڑکی سے شادی کر کے وہ والد کی جائداد سے عاق ہو سکتے تھے۔ فاروقی صاحب اپنی جائداد کا تقریباً آدھا حصہ اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ آدھا حصہ بھی پندرہ سولہ لاکھ یورو سے کم کا نہیں تھا۔ یوسف بھائی نے باجی ثروت سے شادی کر لی اور کچھ ہی ہفتے بعد فاروقی صاحب نے پراپرٹی یوسف بھائی کے نام کر دی۔ پراپرٹی نام ہو گئی تو یوسف بھائی نے اپنا اصل کھیل کھیلا اور ایک فیک اجازت نامے کے ذریعے گریس سے میرج کر لی۔ نہ صرف میرج کر لی بلکہ اسے گھر بھی لے آئے۔ اس موقع پر باپ بیٹے میں تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے... لیکن آہستہ آہستہ یوسف بھائی نے فاروقی صاحب کو منا لیا... فاروقی صاحب نے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ لاہور میں اپنا پرانا گھر ثروت باجی کے نام کریں گے۔ اس کے علاوہ یوسف بھائی دونوں بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک کریں گے اور ثروت باجی کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری بات سمجھ میں آرہی ہے نصرت... کیونکہ ابھی فاروقی صاحب کی آدھی جائداد کا فیصلہ ہونا باقی ہے اس لیے یوسف اپنے باپ کی خواہش کے مطابق ثروت کو برداشت کرنے پر مجبور ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے تابش بھائی۔'' نصرت نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ''یوسف بھائی گریس کی محبت میں بری طرح گرفتار ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس گھر میں باجی کے لیے کوئی جگہ نہیں اور نہ کبھی ہوگی۔ ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ یوسف بھائی سے خلع حاصل کر لیں... اور انہیں فوراً مل بھی سکتا ہے۔ لیکن... وہ اس کے بارے میں سننا بھی پسند نہیں کرتیں۔ وہاں ہر دکھ سہہ رہی ہیں لیکن حالات کی اس ستم ظریفی کو سمجھنے کے لیے بالکل تیار نہیں کہ وہ ایک غلط جگہ پر، غلط لوگوں کے درمیان، غلط حیثیت سے آگئی ہیں۔''

نصرت کا چہرہ کرب کی آماجگاہ تھا۔ اپنی جواں سال من موہنی بہن کا دکھ اس کی آنکھوں میں جم کر رہ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اپنی انگلیاں مروڑتی رہی۔ پھر اپنایت کے انداز میں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تابش بھائی جان! میں آپ کو یوسف بھائی اور باجی کے بارے میں ایک اور خاص بات بتانا چاہتی ہوں۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن حقیقت وہی ہے جو میں آپ کو بتانے جا رہی ہوں...''

میں تجسس سے نصرت کی طرف دیکھنے لگا۔ نصرت نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی...

وہ انکشاف انگیز انداز میں بولی۔ ”ان کے درمیان میاں بیوی والا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یوسف بھائی جبری طرح گریس کی محبت میں گرفتار ہیں... انہوں نے والد کے مجبور کرنے پر اور اپنی بیمار والدہ کی خاطر باجی ثروت سے شادی تو کرلی مگر ان سے ہمیشہ دور رہے۔ باجی سے شادی کے صرف چھ مہینے بعد ہی انہوں نے گریس سے نکاح کرلیا تھا۔ ایک مہینا اس شادی کو خفیہ رکھنے کے بعد وہ گریس کو گھر لے آئے۔ اس کام کے لیے انہیں یقینا گریس نے ہی مجبور کیا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ یہ رشتہ چھپا رہے۔“

نصرت جو کچھ بتا رہی تھی، وہ واقعی چونکا دینے والا تھا۔ ثروت شادی شدہ تھی اور نہیں بھی۔ اسے ثانوی بیوی کی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی۔ اسے ایک شخص بڑی بے حسی سے صرف اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اسے صرف اس بات کا انتظار تھا کہ اس کے باپ کی طرف سے جائداد اس کے نام منتقل ہو جائے۔ ایک دو یا پھر تین چار سال بعد جب بھی جائداد اس کے نام منتقل ہو جاتی، وہ ثروت کو دھکا مار کر گھر سے نکال سکتا تھا۔

وہ اس گھر میں ایک بیکار شے کی طرح پڑی تھی جیسے کوئی ان چاہی مہمان... یا پھر کوئی بے ضرورت فرنیچر یا کوئی فالتو کپڑا۔ لیکن کیا وہ واقعی ان چاہی، بے ضرورت یا فالتو تھی؟ میرے سینے میں انگارے دہکے اور آنکھیں جل اٹھیں۔ اسے کیا پتا وہ کیا تھی؟ کسی کے لیے اس کی کیا اہمیت تھی؟ کوئی کس کس طرح اس کے لیے تڑپا تھا اور اب بھی تڑپ رہا تھا۔ وہ تو زندگی کا دوسرا نام تھی، وہ تو ہزار ہا روز و شب کا حاصل تھی۔ ان گنت دعاؤں کا گمشدہ ثمر تھی۔ میں نے چند روز پہلے اسے دیکھا تھا اور میری آنکھیں اب تک اس کی دید سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ اس کا صبیح چہرہ، اس کی آبگینہ آنکھیں، اس کی دل کی گہرائی تک اُتر جانے والی آواز، سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔

”آپ کس سوچ میں کھو گئے تابش بھائی جان؟“

نصرت کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

میرے اور نصرت کے درمیان ثروت کے موضوع پر طویل گفتگو ہوئی۔ نصرت کے خیالات وہی تھے جو وہ اس سے پہلے پیر احمد تھانوی کے سامنے بیان کر چکی تھی۔ اس نے احمد تھانوی صاحب کو بتایا تھا کہ وہ اپنی بہن کے سارے گھریلو معاملات کو بڑی گہرائی سے دیکھتی رہی ہے اور اس کے نزدیک یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی بہن اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لے۔

میں نے کہا۔ ”نصرت! اس بارے میں ثروت سے کبھی تمہاری کھل کر بات ہوئی ہے؟“

نصرت بولی۔ ”یہ کوئی ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ہم جرمنی میں ہی تھے۔ میں نے کئی دفعہ باجی کو کمرے میں بند ہو کر روتے دیکھا تھا۔ بے شک ناصر بھائی کی موت کا غم بھی ابھی پوری طرح بھولا نہیں تھا لیکن میں جانتی تھی کہ یہ اور طرح کا غم ہے۔ ایک دن جب وہ سوچی سوچی آنکھوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھیں، میں نے ان سے وجہ پوچھی تو وہ بولیں کہ پاکستان بہت یاد آ رہا ہے۔ پتا نہیں کہ فرح اور عاطف کہاں ہوں گے، کیا کر رہے ہوں گے اور پھوپی زینب اور ماموں عرفان۔ میں نے کہا باجی! آپ نے سب کا نام لیا ہے لیکن تابش بھائی کا نہیں لیا۔ ان کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ میں نے کہا مجھے پتا ہے باجی! آپ ان کو بہت یاد کرتی ہیں۔ وہ ہر وقت آپ کے خیالوں میں رہتے ہیں۔ آپ انہیں بھولی ہیں نہ کبھی بھول سکیں گی۔ وہ سسکنے لگیں۔ میں نے کہا، باجی! آپ دہری زندگی جی رہی ہیں۔ یہ کسی طور بھی مناسب نہیں۔ یوسف بھائی آپ کے نہیں ہیں اور نہ کبھی ہوں گے اور جو آپ کا ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ آپ کیوں یوسف بھائی سے طلاق نہیں لے لیتیں۔ کیوں کسی کے مفاد کے لیے خود کو برباد کر رہی ہیں۔

”تابش بھائی! ان دنوں میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ باجی شاید اس بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہیں۔ لیکن انہی دنوں میں بیمار پڑ گئی۔ سینے میں دائیں طرف ذرا نیچے درد شروع ہو گیا۔ تیز بخار اور رات کے وقت متلی کی شکایت بھی شروع ہو گئی۔ اسپتال داخل ہونا پڑا۔ میری تکلیف کے دنوں میں یوسف بھائی نے بھی کافی ذمے داری اٹھائی اور بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ایسے کاموں میں وہ کافی ماہر ہیں۔ ناراض دوستوں کو منا لینا، جہاں کوئی مطلب ہو وہاں اپنے لیے جگہ بنا لینا، ضرورت ہو تو نرم پڑ جانا، ضرورت نہ ہو تو پتھر کی طرح سخت ہو جانا۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید انہی دنوں میں باجی نے ایک بار پھر اپنا خیال بدل دیا۔ ویسے بھی ان کے پاس آپ کی کوئی خبر نہیں تھی، نہ ہی پاکستان میں ہمارے کسی اور عزیز کو آپ کے اور فرح، عاطف کے بارے میں کچھ پتا تھا۔ ایسے میں بندہ کتنی دیر تک جھوٹی آسوں، اُمیدوں کا سہارا لے سکتا ہے۔ پھر جو کچھ بھی تھا باجی کی حیثیت ”شادی شدہ“ کی تھی۔“ نصرت کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

اس نے بیگ سے ٹشو نکال کر آنکھیں صاف کیں اور قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تابش بھائی! پھر میں نے ایک دن دیکھا کہ باجی نے کئی پرانے کاغذ جلا کر پھینک دیے۔ وہ ڈائری بھی لکھا کرتی تھیں، وہ بھی پھاڑ کر جلا دی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس دن باجی نے آپ کے حوالے سے اپنے دل میں موجود ہلکی سے ہلکی امید بھی کھرچ کر پھینک دی۔ شاید انہوں نے اپنے حالات پر ہمیشہ صابر شاکر رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔“

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن نصرت... اس کے بعد وہ یوسف صاحب سے ناراض ہو کر اکیلی پاکستان آئی اور کئی ماہ اکیلی یہاں رہی بھی؟“

”وہ دوسرا معاملہ تھا تابش بھائی! گریس نے باجی سے بہت جھگڑا کیا تھا... اس نے یوسف بھائی کو بھی الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر دو مہینے کے اندر اندر انہوں نے باجی کو علیحدہ گھر لے کر نہیں دیا تو وہ خود گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ یہ شرط بھی لگا رہی تھی کہ یوسف بھائی، باجی سے برائے نام رابطہ بھی نہیں رکھیں گے۔ جب معاملہ بہت بڑھا تو باجی نے اپنی کچھ جیولری بیچ کر ٹکٹ کے پیسے اکٹھے کیے اور یوسف بھائی کے نام ایک طویل خط لکھ کر خاموشی سے پاکستان

آ گئیں۔"

"اور تم؟"

"میں ان دنوں یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

"پھر تم لوگ ثروت کے پیچھے یہاں کیسے آئے؟"

"میرے خیال میں اس کی ایک بڑی وجہ یوسف بھائی کے والد انکل فاروقی ہیں۔ وہ تیس چالیس سال جرمنی میں رہے ہیں لیکن اب ان کی خواہش ہے کہ یوسف بھائی یہاں پاکستان میں اپنا گھر بنوائیں اور وہ اپنی زندگی کے آخری سال اپنے وطن میں گزار سکیں۔ باجی کے خاموشی سے پاکستان آجانے کے بعد انکل فاروقی ازحد پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یوسف بھائی جلد از جلد پاکستان پہنچیں اور باجی کو تلاش کریں۔ نہ صرف تلاش کریں بلکہ یوسف بھائی اور گریس دونوں ان سے معافی بھی مانگیں۔"

"تو کیا یوسف آسانی سے پاکستان آنے پر راضی ہو گیا؟"

"آسانی سے تو نہیں تابش بھائی لیکن ظاہر ہے کہ کروڑوں کی جائداد کا معاملہ ہے۔ انہیں انکل فاروقی کی بات ماننا پڑ رہی ہے۔ شروع میں یوسف بھائی نے مزاحمت کی... انہوں نے فاروقی صاحب سے کہا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے ہمایوں کو پاکستان جانے پر آمادہ کریں مگر ہمایوں کی جاب کچھ اور طرح کی ہے۔ یوسف بھائی کے لیے یہ آسانی ہے کہ وہ پاکستان آ کر بھی جرمن کمپنی میں اپنی جاب بحال رکھے ہوئے ہیں۔ وہ یہیں پاکستان میں کام کر کے بذریعہ نیٹ جرمنی کے مین آفس میں بھیج دیتے ہیں۔ زیادہ ضرورت ہو تو وہاں کا چکر لگا لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "پاکستان آ کر یوسف نے ثروت کو کیسے ڈھونڈا... اور وہ معافی والی بات کیا ہوئی؟"

"یہ تو پتا نہیں کہ باجی کو کیسے ڈھونڈا... بہرحال وہ یوسف بھائی کو مل گئیں۔ وہ یہاں اپنی ایک پرانی دوست کے پاس رہ رہی تھیں اور اسی کے دفتر میں ملازمت بھی کر رہی تھیں۔ جہاں تک معافی کا تعلق ہے، ضرورت پڑنے پر یوسف بھائی معافی تلافی بھی کر لیتے ہیں لیکن یہ سب کچھ وقت گزاری کے لیے ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، گریس نے بھی ثروت سے معافی مانگی ہو گی؟"

"اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" نصرت نے فوراً کہا۔ "اس میں بہت زیادہ اکڑ ہے۔ ابھی دو دن پہلے بھی اس نے باجی سے بہت جھگڑا کیا ہے۔ معمولی سی بات تھی۔ اس نے ٹی وی کی آواز بہت اونچی کر رکھی تھی۔ باجی نے بس آواز کم کرنے کو کہا..."

میں یہ سارا واقعہ ملازمہ حمیدن کی زبانی سُن چکا تھا۔

میرے اور نصرت کے درمیان تفصیلی بات چیت ہوئی۔ نصرت کو اس سلسلے میں بہت تجسس تھا کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟ مجھے اس معاملے میں نصرت سے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں ابھی اس شادی کے بارے میں بتا کر نصرت کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایسی بات بھی نہیں تھی کہ میرا ارادہ مستقل طور پر اس شادی کو چھپانے کا ہو۔

نصرت اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ ثروت کو یوسف جیسے مطلب پرست اور حیلہ ساز شخص کی زندگی سے نکل جانا چاہیے۔ اس نے مجھ سے اس سلسلے میں مشورہ طلب کیا۔

میں نے کہا۔ "نصرت! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرا اور ثروت کا کیا رشتہ تھا۔ اگر اس سلسلے میں، میں ثروت سے ملوں گا یا کوئی بات کروں گا تو اس کا الٹا اثر ہو گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں اپنے مطلب کے لیے اس کی ازدواجی زندگی کے مسئلوں کو بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تو پھر کیا کیا جائے تابش بھائی! انہوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ان کے سامنے گہرا کنواں ہے۔ اگر وہ..."

"میری بات سنو نصرت۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں ایک بڑی اچھی تجویز دیتا ہوں۔ اگر تم واقعی سمجھتی ہو کہ معاملات "پوائنٹ آف نو ریٹرن" تک پہنچ چکے ہیں اور یوسف سے علیحدگی ہی ثروت کے لیے آخری حل ہے... تو پھر تم اس سلسلے میں احمد تھانوی صاحب سے مدد لو۔ وہ ایک بڑی متوازن روحانی شخصیت ہیں۔ تم ثروت کو ان سے ملواؤ۔ ساری بات کھول کر بیان کرو اور پھر ان سے مشورہ لو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ حالات کے مطابق بالکل ٹھیک مشورہ دیں گے۔ ان میں قائل کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جو مشورہ دیں، اس پر ثروت کو قائل بھی کر لیں۔"

نصرت گہری سوچ میں کھو گئی۔ پتا نہیں کیوں وہ کچھ مضمحل سی نظر آتی تھی۔ اس کے رنگ میں ایک پھیکا پن تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ صورتِ حال ان گھریلو پریشانیوں ہی کا نتیجہ ہے جن کا سامنا وہ اس وقت کر رہی ہے۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "اگر آپ سچ پوچھیں تابش بھائی تو آج آپ سے ہونے والی اس اچانک ملاقات نے میرے اندر بہت حوصلہ جگایا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ ناصر بھائی کے بعد میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ جو کچھ بھی جھیلنا ہے، مجھ اکیلی کو جھیلنا ہے مگر آج ایسا نہیں ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "تم اپنی ہر فکر، پریشانی مجھے دے دو۔ بالکل ریلیکسڈ ہو جاؤ۔ تمہارا یہ بھائی سب کچھ سنبھال لے گا۔ تم اپنی صحت کی طرف بھی توجہ دو۔ مجھے بہت تھکی ہوئی سی نظر آتی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ "ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ پھر ناصر بھائی بھی چلے گئے اور یہیں پر بس نہیں ہوئی۔ باجی پر جو گزر رہی ہے، وہ بھی آپ کو پتا چل گیا ہے۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی اس ہنستے بستے گھر کو۔"

"ہر رات کے بعد سویرا اور ہر اندھیرے کے بعد روشنی ہوتی ہے نصرت۔ انسان ہمت نہ ہارے اور انتظار کرے تو سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

وہ کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھنے کے بعد بولی۔ "تابش بھائی! آج آپ سے مل کر میں خوش ہوئی ہوں اور مجھے بہت ڈر بھی لگا ہے۔ ابھی اس اسنیک بار میں ہونے والی لڑائی نے مجھے بہت ڈرایا ہے۔ کہیں یہ معاملہ زیادہ سیریس تو نہیں ہو جائے گا۔ مم... میرا مطلب ہے وہاں گولیاں چلی ہیں۔ آپ نے بھی گولی چلا کر ایک بندے کو زخمی کیا ہے۔ اگر..."

"اس بارے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں نصرت۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہارا یہ بھائی بہت بدل چکا ہے۔ اب ان غنڈوں جیسے کن ٹٹے اس کی جیب میں رہتے ہیں۔" میں نے ایک مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

میری اس مسکراہٹ نے اس کی آنکھوں میں اطمینان آمیز حوصلے کی چمک کو نمایاں کر دیا۔

☆☆☆

میری توقع کے عین مطابق عمران نے اسنیک بار میں ہونے والے پھڈے سے بخوبی نمٹ لیا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس نے وہاں ہونے والے نقصان کے ضمن میں کوئی رقم بھی مالک کو نہیں دی تھی۔ صرف ایک زخمی ہونے والے ویٹر کی اشک شوئی کے لیے اس نے اپنی خوشی سے دو ڈھائی ہزار روپے دیے تھے۔ اس سارے واقعے میں ہمارے لیے مایوسی کا پہلو بس یہی تھا کہ سیٹھ سراج کا سراغ پھر لگتے لگتے رہ گیا تھا۔ دونوں حملہ آور گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ تاہم عمران کے کہنے پر جیلانی اپنے طور پر ان کا کھوج ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔

اس صورتِ حال میں عمران نے میرے ساتھ طویل مشورہ کیا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ سراج کے لوگ ہمارے اردگرد موجود ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی وقت خونی مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ہم فرح، عاطف، بالو اور شاہین وغیرہ کی حفاظت کا سوچیں۔ بے شک ہم رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں آتے جاتے ہوئے بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے مگر کسی بھی وقت یہ احتیاط دھری کی دھری رہ سکتی تھی۔

سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں عمران کے راوی روڈ والے پرانے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے اور اسی گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں گے۔ اقبال بھی اب چھٹی گزار کر بالکل فٹ ہو چکا تھا اور سیٹھ سراج اینڈ کمپنی کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ایک دن میں، عمران اور اقبال خاموشی سے راوی روڈ والے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ جیلانی کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ حفاظت کی غرض سے رائے ونڈ روڈ والی کوٹھی میں ہی موجود رہے گا۔

جس روز ہم شفٹ ہوئے، اسی روز نصرت نے ثروت کے ہمراہ پیر احمد تھانوی صاحب سے ملاقات بھی کی۔ یہ ایک تفصیلی ملاقات تھی۔ یقیناً ثروت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ملاقات نصرت نے میرے ایما پر کرائی ہے اور نہ ہی اس کے گمان میں یہ بات تھی کہ چند روز پہلے اتفاقاً میری اور نصرت کی ایک نتیجہ خیز ملاقات ہو چکی ہے۔

جس وقت نصرت اور ثروت ایک رکشے پہ سوار ہو کر احمد تھانوی صاحب سے ملنے کے لیے آ گئیں، میں اور عمران بھی وہیں موجود تھے۔ تاہم ہم ان دونوں کے سامنے نہیں آئے۔ ثروت زرد پھولوں والی ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ چادر کے نقاب میں سے بس اس کی پیشانی اور آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں... جیسے بادلوں میں چھپے ہوئے چاند کا ایک روشن کنارہ۔ وہ جب چلتی تھی تو ایک عجب جاذبیت سی اس کے گرد ہالہ سا بنائے رکھتی تھی۔ وہ انتظار گاہ میں چلی گئیں۔ ہم اس کمرے کے پہلو والے کمرے میں چلے گئے جہاں...، تھانوی صاحب اپنے مریضوں اور عقیدت مندوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ ایک قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے تھے۔ ان کے عقب میں ایک بہت بڑی الماری تھی جس میں یونانی طب کی مختلف دوائیں پڑی رہتی تھیں۔ وہ دوا کے ساتھ دعا بھی کرتے تھے۔ بعض

لوگوں کا عقیدہ اتنا پختہ ہوتا تھا کہ دوا سے پہلے دعا ان پر اثر کر جاتی تھی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد ثروت کی باری بھی آ گئی۔ نصرت باہر ہی رہی تھی۔ ثروت نے اکیلے میں احمد تھانوی صاحب سے ملاقات کی۔ ہم انہیں دیکھ تو نہیں سکتے تھے مگر چونکہ دروازے کے بالکل قریب موجود تھے اس لیے مدھم آوازیں ہم تک ضرور پہنچ رہی تھیں۔ ثروت کے بیشتر حالات تو احمد تھانوی صاحب پہلے ہی جانتے تھے۔ ثروت نے کچھ مزید تفصیلات بتائیں۔ تاہم اس نے یہ بات احمد تھانوی صاحب پر ظاہر نہیں کی کہ وہ یوسف کی بیوی ہونے کے باوجود بیوی نہیں ہے۔

ساری باتیں سننے کے بعد احمد تھانوی صاحب نے شرعی صورتِ حال بیان فرمائی۔ انہوں نے کہا۔ ”ہمارے دین میں طلاق... ایک ناپسندیدہ عمل ہے اور اس سے حتی الامکان بچنے کا حکم ہے... بہرحال، یہ ایک جائز عمل ہے اور بعض صورتوں میں تو ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک نیک خصلت لڑکی بدقسمتی سے ایک ایسے شوہر کے پلے بندھ جاتی ہے جو بعدازاں عادی شرابی، جواری نکل آتا ہے... تو ساری زندگی اس شخص کے ساتھ برباد کرنے کے بجائے اور اپنے ہونے والے بچوں کا مستقبل بھی تاریک کرنے کے بجائے اس بی بی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ناپسندیدہ عمل کو اختیار کر لے۔ اس قسم کی صورتِ حال میں بھی اگر کوئی کم فہم شخص اپنی بیٹی، بہن یا بچی سے یہ کہتا ہے کہ جس گھر میں اس کی ڈولی گئی ہے، اسی گھر سے اس کا جنازہ نکلنا چاہیے تو وہ بالکل غلط کہتا ہے۔“

ثروت نے دبی آواز میں کہا۔ ”حضرت! یہ حکم بھی تو ہے کہ اگر پہلی بیوی اپنے شوہر پر اپنا حق چھوڑ کر یا اس حق کو کم کر کے اس کے ساتھ رہنا چاہے تو ایسا کر سکتی ہے؟“

”بالکل، ایسا کہا گیا ہے لیکن عام طور پر ان عورتوں کے لیے ہے جو بڑی عمر کی ہوں، بال بچے دار ہوں یا اس قسم کی کوئی اور وجہ ہو۔ لیکن بیٹی! جو صورتِ حال تم بتا رہی ہو، وہ اور طرح کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ شک بھی ہو رہا ہے کہ تم طلاق کے حوالے سے کسی طرح کے وہم میں بھی جکڑی ہوئی ہو۔ تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے کھل کر بیان کرو۔“

جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ شاید ثروت اشک بار ہو گئی تھی۔ جب اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔ کوئی اڑتا اڑتا سا لفظ ہی ہمارے کانوں تک پہنچ پا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے والدین اور پھر ناصر بھائی کی موت کا ذکر کر رہی تھی اور احمد تھانوی صاحب کو بتا رہی تھی کہ ان پے در پے اموات نے اس کا دل بہت ہلکا کر رکھا ہے۔

یہی وقت تھا جب اچانک قریبی کمرے سے چلانے کی مردانہ آوازیں ابھریں۔ یہ چودھرانی کا بیمار بیٹا نیازا تھا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر تھا پھر بھی کسی وقت اس کا دیوانہ پن عود کر آتا تھا۔ اب بھی ہلکے ہلکے بادل موجود تھے۔ شاید اسے کہیں بجلی کی چمک نظر آئی تھی یا تھوڑی بہت گرج سنائی دی تھی۔ وہ پکار رہا تھا۔ ”یا اللہ کرم... یا اللہ کرم... حضرت جی بچاؤ... حضرت جی کہاں ہو...“

چودھرانی کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی... ”حضرت جی کہیں نہیں گئے۔ وہ یہیں ہیں۔ تم بس منہ میں پڑھتے رہو۔“

”کھڑکیاں بند کر دو۔ برآمدے کی کھڑکیاں بھی بند کر دو۔“ نیازا چلایا۔

میں اور عمران نیازے کے کمرے کی طرف گئے۔ یہاں کا منظر عبرت ناک تھا۔ نیازا پلنگ سے اتر آیا تھا اور اپنے لحاف سمیت کمرے کے ایک کونے میں سمٹا ہوا تھا۔ وہ پورے کا پورا لحاف سے ڈھکا ہوا تھا اور لحاف کے اندر سے ہی واویلا کر رہا تھا۔ پورا لحاف لرز رہا تھا۔ چودھرانی نے لحاف سمیت نیازے کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا اور اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ احمد تھانوی صاحب کا مرید خاص فرید بھی نیازے کو تسلی تشفی دینے لگا۔

کچھ دیر بعد نیازے کی بے چینی میں کمی آ گئی... ہم واپس پہلے والے کمرے میں آ گئے۔ دروازے کی دوسری جانب ثروت اور احمد تھانوی صاحب میں گفتگو جاری تھی۔ احمد تھانوی صاحب قدرے بلند آواز میں بول رہے تھے۔ ان کے بیشتر الفاظ ہماری سماعت تک پہنچ رہے تھے... وہ کہہ رہے تھے۔ ”... سمجھو، وہم بس گھن کی طرح ہوتا ہے۔ یہ آوازیں جو تم ابھی سن رہی تھیں، یہ بھی ایک ”ضدی وہم“ کا شاخسانہ ہیں۔ اس بندے کے دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ آسمانی بجلی اس کی جان لے لے گی۔ ذرا سے بادل آ جائیں تو خوف سے اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ یہ وہم اسی طرح بندے کے ذہن کو جکڑتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی طاقت اور شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اللہ پر اور اس کی قدرت پر ہمارا یقین جتنا پختہ ہوگا، ہمارے اندر واہموں اور وسوسوں سے لڑنے کی قوت اتنی ہی بڑھ جائے گی...“

ثروت اور احمد تھانوی صاحب کے درمیان یہ گفتگو پانچ دس منٹ مزید جاری رہی پھر اگلے مریض کی باری آ گئی۔

ہم شام کے بعد تک وہیں رہے۔ ثروت اور نصرت جا چکی تھیں۔ دیگر لوگ بھی رخصت ہو چکے تھے۔ احمد تھانوی صاحب رات کا کھانا بہت جلدی کھا لیتے تھے، یعنی شام کے فوراً بعد۔ انہوں نے مجھے اور عمران کو بھی کھانے میں شریک کیا۔ کھانا بالکل سادہ تھا۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا۔ احمد تھانوی صاحب نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اس لڑکی کے دل میں کوئی گہرا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کا شوہر یوسف بس اپنے مطلب کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ یوسف کے گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ پھر بھی وہ اس سے علیحدہ ہونے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ ایسا کر کے وہ اپنے لیے کسی بہت بڑی مصیبت کو دعوت دے لے گی۔“

”حضرت! اپنے اس خوف کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا اس نے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ شاید وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی کہ اس کے بارے میں کچھ کہہ سکے۔“

”کیا ایسا تو نہیں کہ یوسف نے درپردہ اسے کوئی خطرناک دھمکی دے رکھی ہو یا کسی اور طرف سے اسے دھمکایا جا رہا ہو؟“ عمران نے پوچھا۔

”یہ ہو بھی سکتا ہے لیکن بظاہر مجھے اس طرح کا امکان نہیں لگ رہا۔ وہ اپنے شوہر کے بارے میں جو تھوڑا بہت بتا رہی ہے، اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ وہ دھیمے مزاج کا شخص ہے۔ اپنی سوکن کے حوالے سے بھی اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔“

”اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے حضرت؟“

احمد تھانوی صاحب نے قہوے کا گھونٹ لے کر اپنی سفید براق داڑھی میں انگلیاں چلائیں اور ہولے سے بولے۔ ”کسی طرح اس خوف کا کھوج لگنا چاہیے جو اس کے اندر جگہ بنا کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا کوئی بہت قریبی عزیز اسے اپنے اعتماد میں لے اور اس کا اصل مسئلہ معلوم کرے...“

عمران نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نظر کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

ثروت سے رابطہ کرنا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تاہم ایک پلس پوائنٹ یہ تھا کہ میں نصرت کو اعتماد میں لے چکا تھا۔ میرے پاس اس کا موبائل نمبر بھی موجود تھا۔ میں دو تین بار رازداری کے ساتھ اس سے بات چیت بھی کر چکا تھا۔ میں نے اس سے ثروت کا موبائل فون نمبر لے لیا اور پھر ایک رات اس سے رابطہ کیا۔

میں نے تین بار کال کی۔ تیسری مرتبہ اس نے کال اٹینڈ کر لی۔ ”ہیلو... کون؟“ اس کی پریشان آواز سنائی دی۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! میں تابش بول رہا ہوں۔ پلیز فون بند نہ کرنا۔ مجھے تم سے ایک بہت خاص بات کرنی ہے۔ پلیز فون بند نہ کرنا۔“

دوسری طرف چند سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر ثروت کی گمبھیر آواز ابھری۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ... آپ مجھ سے رابطہ نہیں کریں گے۔“

”میں اپنے وعدے پر بالکل قائم ہوں ثروت... لیکن ایک ایسی بات ہے جسے کیے بغیر چارہ نہیں۔ اگر میں یہ بات نہیں کروں گا تو تمہارا نقصان ہوگا اور یقین کرو ثروت... میں تمہارا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“

”اس بارے میں بھی تمہیں بتا دوں گا... بس ایک بار... ایک آخری بار مجھ سے مل لو اور یہ ملاقات میں اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر بھروسا رکھنا ثروت... تمہاری عزت مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رہی ہے اور اب بھی ہے۔“

بے غیرتی

ایک شخص نے بھکاری سے نرمی سے پوچھا کہ وہ پیشہ ور ہونے کے ناتے دن بھر میں کتنا کما لیتا ہے۔

”پانچ، چھ سو تو آرام سے مل جاتے ہیں۔“ فقیر نے جواب دیا۔ ”لوگ یہ معاف کر دو بابا والی بے غیرتی نہ کریں تو دیہاڑی ہزار روپے سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتی۔“

کاشان یوسف، اسلام آباد

وہ جیسے سخت الجھن میں تھی۔ چند سیکنڈ بعد کراہتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”تابش! آپ کو جو کہنا ہے فون پر ہی کہہ لیں...“

”اگر ایسی بات ہوتی ثروت تو میں تمہیں کبھی زحمت ہی نہ دیتا۔ میں جانتا ہوں تم شادی شدہ ہو۔ تمہاری بہت سی مجبوریاں ہیں... لیکن ہمارا ایک بار ملنا بہت ضروری ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں پھر کبھی تمہیں ایسی تکلیف نہیں دوں گا۔“

”یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے تابش! پلیز آپ مجھے کسی امتحان میں نہ ڈالیں۔ آپ عورت کی مجبوریوں کی بات تو کر سکتے ہیں مگر ان مجبوریوں کو سمجھ ایک عورت ہی سکتی ہے۔ میرے شوہر کو کسی طور قبول نہیں ہوگا کہ میں انہیں بتائے بغیر کسی شخص سے ملوں، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔“

میں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ انکار کرتی رہی۔ آخر میرا دل بھر آیا۔ مجھے بڑا مان تھا اس پر۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں دل کی گہرائیوں سے کوئی التجا بھی اس کے سامنے کروں گا... وہ اسے رد نہیں کرے گی لیکن آج وہ رد کر رہی تھی۔ کتنی بدل گئی تھی وہ؟ کتنی سخت دل ہو چکی تھی۔ میرے بغیر ایک پل نہ گزارنے والی، میری ذرا سی تکلیف پر بے قرار ہو جانے والی، میری ایک آواز پر دس بار ”جی“ کہنے والی آج میرے کشکول میں ایک ملاقات کی خیرات بھی نہیں ڈال رہی تھی... حالانکہ وہ جانتی تھی، میں جو کچھ کہوں گا اس کے فائدے میں کہوں گا۔ میں اندر سے کراہ اٹھا۔ اپنی مجبوریوں کو جواز بنا کر کتنی جلدی اجنبی بنتی ہیں یہ عورتیں... کتنی سنگ دلی سے راہیں بدلتی ہیں... اور پھر مڑ کر بھی ان راہوں کی طرف نہیں دیکھتیں۔ میری آواز بھرا گئی اور میں نے فون بند کر دیا۔

ہم عمران کے راوی روڈ والے گھر میں ہی تھے۔ یہ گنجان آبادی تھی۔ قریب کی تنگ سڑک سے موٹر سائیکلوں اور رکشاؤں وغیرہ کا ہلکا شور سنائی دیتا تھا۔ کبھی کسی خوانچے والے کی آواز ابھرتی تھی اور اس شور میں دور تک سرایت کر جاتی تھی۔ رات کے تقریباً بارہ بج چکے تھے۔ عمران اور اقبال کافی دیر تک کارڈ کھیلنے کے بعد سو چکے تھے۔ بس میں جاگ رہا تھا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کہیں پڑوس کے کسی گھر میں ٹیپ ریکارڈر سے موسیقی کی لہریں ابھر رہی تھیں۔ سریلی آواز در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن... اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا...

اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ دل یک بارگی دھڑک اٹھا۔ یہ ثروت کا نمبر ہی تھا۔ ”ہیلو۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ثروت بول رہی ہوں۔“

”ترس آگیا؟“

”لیکن آپ وعدہ کریں کہ... یہ آخری بار ہوگی۔“ وہ غمناک آواز میں بولی۔ ”اس کے بعد چاہے کچھ بھی ہو جائے، آپ رابطہ نہیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے ثروت۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”اس کے بعد میں تمہیں ملنے پر مجبور نہیں کروں گا۔“

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ تب ثروت نے پوچھا۔ ”کہاں ملنا ہے؟“

”جہاں تمہیں آسانی رہے۔“

”میرے لیے تو گھر میں رہنے سے زیادہ آسانی کہیں نہیں ہے... آپ بتائیں۔“

”کینال روڈ کے ”کے ایف سی“ کے سامنے آ جانا۔ میں تمہیں وہاں سے پک کر لوں گا۔ اگر وہیں بیٹھنا ہوگا تو بھی ٹھیک ہے۔“

”وہیں بیٹھ جائیں گے۔“ ثروت نے کہا۔ ”میں تین بجے آ جاؤں گی اور... زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔ مجھے پانچ بجے تک گھر واپس پہنچنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے ثروت۔“ میں نے کہا۔

اگلے روز تین بجے سے پہلے ہی میں ریسٹورنٹ کے سامنے موجود تھا اور ثروت کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے پاس عمران والی مہران گاڑی تھی۔ میں اکیلا ہی آنا چاہتا تھا لیکن عمران اس پر ہرگز راضی نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیٹھ سراج کے ہرکارے ہمارے اردگرد موجود ہیں، ان حالات میں وہ مجھے شہر کی سڑکوں پر تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ جیلانی والی کار میں میرے آس پاس موجود تھا۔ ہم موبائل پر کسی بھی وقت ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے تھے۔

تین بجے کے فوراً بعد ایک رکشا ریسٹورنٹ کے سامنے آ کر رکا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ثروت اس میں سے نکلی۔ حسب سابق وہ ایک طویل چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف آنکھیں اور پیشانی دکھائی دیتی تھی۔ ہی بادلوں میں سے چاند کا روشن کنارہ۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی گاڑی کا دروازہ کھول کر میرے برابر بیٹھ گئی۔ گھبرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”یہاں سے چلیں۔“

”خیریت تو ہے؟“ میں نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”بس چلیں آپ۔“ وہ دوبارہ بولی اور چہرے پر چادر کا نقاب کچھ اور اوپر کر لیا۔

میں نے گاڑی موڑی اور بڑی سڑک پر آ گیا۔ ثروت نے کہا۔ ”وہاں چچا اختر گاڑی سے اتر رہے تھے۔“

”یہ تو پھر اچھا کیا کہ نکل آئے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دراصل میرا رخ دوسری طرف تھا۔ میں نے گاڑی ضرور دیکھی تھی لیکن اس میں سے کسی کو اترتے نہیں دیکھا تھا۔

”اب کہاں جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ اس نے کہا اور معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا۔

ایک دم میرے ذہن میں پھلجڑی سی چھوٹی۔ میں نے گاڑی کا رخ اپنے پرانے گھر کی طرف موڑ دیا۔ ہمارا یہ آبائی مکان پچھلے تقریباً چار سال سے خالی ہی پڑا تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد فرح یا عاطف کی کبھی یہ ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس گھر کا رخ کر سکتے۔ ہاں، عاطف نے اتنا ضرور کیا تھا کہ عمران سے کہہ کر ایک ادھیڑ عمر بے اولاد میاں بیوی کو یہاں رہائش دلوا دی تھی... سات آٹھ ماہ پہلے، بیوی فوت ہو گئی اور ادھیڑ عمر شخص یہاں اکیلا رہ گیا۔ وہ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت عمران تو یہاں موجود نہیں تھا تاہم جیلانی نے کوشش کی تھی اور ادھیڑ عمر شخص کو یہاں روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ یوں ہمارا یہ گھر... ہماری یادوں کا مرکز... بے آباد ہونے کے باوجود پوری طرح بے آباد نہیں ہوا تھا۔

میں ان گلی کوچوں میں داخل ہوا تو یادوں کا ایک سیلاب سا امڈ آیا۔ میں نے پی کیپ پہن رکھی تھی... سن گلاسز بھی لگا لیے۔ مجھے امید تھی کہ چلتی گاڑی میں سے کوئی فوراً ہی مجھے پہچان نہیں پائے گا۔ آخری بار ان گلی کوچوں میں میرے قدم کب پڑے تھے؟ آخری بار میرے قدم تب پڑے تھے جب میں سکون بخش دوا انگیز ٹانک کھا کر گھر سے نکلا تھا۔ ایک طرف ثروت کی یادوں نے مجھے بری طرح گھیرا ہوا تھا، دوسری طرف میری چچی کی بھتیجی آرسہ نے مجھ پر جذبات اور جنس کا جال پھینکا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے دوپہر کو گیارہ بجے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا اور یہ عندیہ بھی دے رکھا تھا کہ اس فیصلہ کن ملاقات میں وہ اپنی ”خود سپردگی“ کے ضمن میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔ میں گناہ کے اس ریشمی جال سے بچ کر نکلا تھا اور اس چلڈرن پارک کی طرف روانہ ہو گیا تھا جہاں سیٹھ سراج کی صورت میں میری زندگی کا بدترین المیہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ جب ماضی کی اس چمکیلی دوپہر میں میرے قدم اس تنگ سڑک پر پڑ رہے تھے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایک دو گھنٹے کے لیے نہیں، کئی برس کے لیے ان گلی کوچوں سے جدا ہو رہا ہوں... چلڈرن پارک میں وہی کچھ ہوا تھا جس کا ذکر میں پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوں۔ سیٹھ سراج کے بے رحم گماشتوں نے مجھے مار مار کر ادھ موا کیا اور میں گھر لوٹنے کے بجائے کہیں کا کہیں نکل گیا۔

آج میں پھر اسی دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا جس کی دوسری جانب میرا ماضی دفن تھا۔ ”یہاں کون رہتا ہے آج کل؟“ ثروت نے بے حد آراس لہجے میں پوچھا۔

”ہیں ایک انکل۔“ میں نے مبہم جواب دیا۔

میں نے رنگین شیشوں والی گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے دو تین بار ہارن دیا تو گھر کا چھوٹا گیٹ کھل گیا اور پچپن ساٹھ سال کا ایک شخص باہر نکل آیا۔ اس کی کھچڑی داڑھی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس کا نام حیات محمد تھا۔ چند دن پہلے جیلانی نے حیات کو فون پر بتا دیا تھا کہ اس گھر کا مالک گھر دیکھنے کے لیے آئے گا۔ حیات نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ یقیناً اس نے گھر کی دیوار پر میری تصویر دیکھی ہوگی۔ گھر کے کامن روم میں جو گروپ فوٹو تھا، اس میں بھی میں موجود تھا۔ حیات نے تھوڑی سی کوشش سے مجھے پہچان لیا اور فوراً گیٹ کھول دیا۔ میں کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری اور ثروت کی آنکھوں کے سامنے یادوں کا ایک جہان آباد ہو گیا۔ پچھلے چار ساڑھے چار سالوں میں گھر کے اندر بہت کم تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ حیات محمد اور اس کی مرحومہ بیوی نے بس ایک کمرا ہی اپنے استعمال کے لیے کھولا ہوا تھا۔ باقی کمرے مقفل رہتے تھے۔ ہاں، مہینے میں پانچ چھ بار ان کی صفائی ستھرائی حیات محمد اور اس کی بیوی ہی کیا کرتے تھے۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ فرح کی الماری، اس کے لکھنے کی میز... عاطف کا کمرا۔ اس کا جہازی سائز ٹیپ ریکارڈر، دیواروں پر آویزاں ٹینس ریکٹ... ماں جی کا کمرا، ان کا چوبی تخت جس پر جائے نماز بچھی تھی، قرآن مجید کے نسخے جو شیشے کی ایک الماری میں بڑی حفاظت سے رکھے تھے، بستر پر ان کا تہ کیا ہوا ایرانی کمبل اور پلنگ کے نیچے ان کی چپل اور جوتی۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ سب کچھ وہیں تھا لیکن ماں نہیں تھی۔ وہ آواز نہیں تھی جو بسم اللہ کہتی تھی اور وہ گود نہیں تھی جس میں، میں اپنا تھکا ہارا سر رکھتا تھا۔

ہم کمروں میں گھومتے رہے اور یادوں کو اپنے اندر

سمیٹتے رہے۔ حیات محمد نے ہماری کیفیت دیکھ کر ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا اور باہر لان میں بیٹھ گیا۔

ہم کچن میں آ گئے۔ کچن کی الماریوں کے خانوں میں سب کچھ ویسے کا ویسا دھرا تھا... چھوٹے چھوٹے خوش نما ڈبے... نمک، چینی، ہلدی، مرچیں، کالا زیرہ، سوکھا دھنیا... ان گنت پکوانوں کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ سارے لذیذ پکوان جو ہماری ماں نے اس کچن میں کھڑے ہو کر ہمارے لیے بنائے تھے اور پھر ہمیں کھاتے دیکھ کر خوشی سے نہال ہوئی تھیں... بہت ہی کم شدہ آوازیں سماعت سے ٹکرائیں، چپاتیاں بنانے کی آواز... دیگچی میں چمچے چلنے کی آواز، سلاد کاٹے جانے کی آواز... مجھے لگا میری ماں یہیں کہیں ہے۔ وہ ابھی کسی اوٹ سے نکلے گی اور ڈانٹ کر کہے گی۔ اتنی دیر گھر سے باہر رہتے ہو۔ میں نے کوئی پچاس بار فون کیا ہے۔ ایسے نواب زادے ہو کہ فون ہی نہیں اٹھاتے۔

میں نے آنسو پونچھے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ صرف ماں کی یادیں ہی نہیں تھیں، ان گنت یادیں تھیں جو گوشے گوشے سے نکل کر دل و دماغ پر یلغار کر رہی تھیں۔

کھڑکی کے سامنے ہی سرخ گلاب کے وہ خوب صورت پودے تھے جو فرح نے بڑی چاہت سے لگائے تھے۔ ایک دفعہ ثروت ہمارے گھر آئی تو میں نے بہت سی کلیاں توڑ کر ثروت کو دیں پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ فرح مصنوعی غصہ دکھاتی اور مجھ سے لڑا کرتی کہ اگر میں نے باجی سے اتنا زیادہ اور یوں بار بار اظہار محبت کرنا ہے تو پھر میں اپنے لیے لان میں ایک درجن علیحدہ پودے لگا لوں... اور سامنے ہی وہ گول ستون تھا جس کی اوٹ سے میں رات کے وقت کچن میں جھانکتا تھا۔ کچن میں روشنی ہوتی تھی۔ امی، فرح اور ثروت وہاں مصروف ہوتی تھیں اور صرف ثروت کو پتا ہوتا تھا کہ میں ستون کی تاریک اوٹ میں کھڑا ہوں اور اس کی ہر ہر حرکت دیکھ رہا ہوں۔

میں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''ثروت! وہ اوپر والی بالکونی دیکھ رہی ہو؟''

''ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پتا ہے، ایک کٹی پتنگ پکڑنے کی کوشش میں تم یہاں گر پڑی تھیں۔ میں تمہیں اٹھانے آیا تھا اور خود بھی پھسل گیا تھا... اور گرا بھی تمہارے اوپر تھا۔ امی نے بہت ڈانٹا تھا کہ بچاری کی کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی تو پھر...''

ثروت کی آبگینہ آنکھوں میں یادوں کی خوش نما چمک ابھری۔ یوں لگا کہ وہ بھی اس حوالے سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن پھر فوراً ہی یہ چمک بجھ گئی۔ وہ رخ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ سنہرے ماضی کی جلترنگ جیسی گونج نے اس کے دل و دماغ میں بھی ارتعاش پیدا کیا ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ثروت کو یہاں لا کر بہت اچھا کیا ہے۔ یہ در و دیوار، یہ ماحول، یہ یادوں کا جھرمٹ، یہ سب کچھ اسے متاثر کر رہا تھا۔ اس کی اندرونی کیفیت میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی تھی اور یہ تبدیلی اس بات کے لیے بہت مناسب تھی جو میں اس سے کرنا چاہ رہا تھا۔

ہم کامن روم میں آ کر بیٹھے تو حیات محمد نے کئی کھانے پینے کی اشیا لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ جوس، نمکو، چپس، کیک اور کوک وغیرہ۔ یقیناً یہ اشیا وہ ابھی سامنے والے جنرل اسٹور سے لے کر آیا تھا۔ وہ کچن میں چائے بنانے چلا گیا تو ہم باتوں میں مصروف ہو گئے۔

چھوٹی سی تمہید باندھنے کے بعد میں نے کہا۔ ''ثروت! تمہیں پتا ہے کہ ہم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو ہم اسی طرح جانتے ہیں جیسے اپنے آپ کو جانتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم ایک ایسے شیشے کی طرح ہو جس کے آر پار آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔ اور تمہیں پتا ہے کہ اس وقت میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''ثروت! جب پچھلے ہفتے میں نے تمہیں اس شاپنگ مال میں پہلی دفعہ دیکھا تو تمہیں دیکھنے کے چند ہی منٹ بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم کسی بڑی الجھن میں گرفتار ہو۔ کوئی ایسی پریشانی ہے تمہارے ساتھ جو تمہیں مسلسل ایک تیز آنچ دے رہی ہے۔''

''اگر میں کہوں کہ ایسا کچھ نہیں تو پھر؟''

''تم نے جتنی بار بھی یہ بات کہی ہے ثروت... مجھے تمہاری آنکھیں چہرے سے علیحدہ نظر آئی ہیں۔ اور تمہاری آنکھوں کی اس بے ساختہ ادا کو میں بہت اچھی طرح جانتا پہچانتا ہوں۔''

وہ بیزاری سے بولی۔ ''تابش! آپ ان باتوں کو چھوڑیں۔ آپ بتائیں کہ مجھے کیا خاص بات بتانا چاہ رہے تھے؟''

''وہ یہی بات تھی ثروت! میں پچھلے چند دنوں میں تمہارے لیے بہت پریشان رہا ہوں... اور میری نیت پر کسی طرح کا شک نہ کرنا۔ میں کسی ایسے عمل کا سوچ بھی نہیں سکتا جس کی وجہ سے تمہاری شادی شدہ زندگی اور تمہاری عزت پر ذرا سا بھی حرف آئے۔ لیکن مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میں تمہیں اس طرح کسی مصیبت میں دیکھوں اور منہ پھیر کر چلا جاؤں۔ ہمارے درمیان بس یہی ایک رشتہ تو نہیں تھا ثروت۔''

وہ بولی۔ ''ایک طرف آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کسی ایسے عمل کا سوچ بھی نہیں سکتے جس کی وجہ سے میری عزت اور میری شادی شدہ زندگی پر کوئی حرف آئے اور دوسری طرف ایسا کر بھی رہے ہیں۔''

''کیا مطلب ثروت؟''

''اگر میرے شوہر مجھے اس طرح آپ کے ساتھ اس گھر میں بیٹھے اور اس کمرے میں باتیں کرتے دیکھ لیں تو کیا وہ اسے برداشت کر لیں گے؟''

''تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو ثروت! کیا ہمارے درمیان کوئی اور تعلق نہیں ہو سکتا۔ کیا ہم نارمل انداز میں کوئی مسئلہ ڈسکس نہیں کر سکتے؟''

''بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے تابش۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''عورت بڑی کمزور شے کا نام ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتی ہے۔ آپ وہ چار سال پہلے کے واقعات بھولے تو نہیں ہوں گے۔''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے کہا۔ ''ثروت! پرانے زخموں کو چھیڑو گی تو خون رسے گا۔ تب جو کچھ ہوا، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا اور میرا بھی نہیں تھا۔ اس واقعے نے تو ہم دونوں کو ڈس سا تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، میں تمہارے ساتھ تھا ثروت۔ ساری دنیا ایک طرف ہو جاتی پھر بھی میں تمہارا ساتھ چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے تم سے تھوڑی سی مہلت مانگی تھی اور اس مہلت میں، میں نے امی کو بھی راضی کر لیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا تھا لیکن تم خاموشی سے سب کچھ چھوڑ کر چلی گئیں۔ تم نے مجھ پر بھروسا نہ کیا ثروت...'' میری آواز بھرا گئی۔

وہ خاموش رہی۔

میں نے کہا۔ ''اگر تم مجھے معاف کر دو ثروت تو میں کہوں گا کہ تم نے اس وقت کم ہمتی کا مظاہرہ کیا... اور یہی کچھ تم اب بھی کر رہی ہو۔ ہاں ثروت! تم ایک بار پھر کم ہمتی دکھا رہی ہو۔ میں تمہارے حالات کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ تمہاری پُرسکون اور بہت خوش گوار ازدواجی زندگی کا سارا ماجرا مجھے پتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس گھر میں تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

اس نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر سنبھل کر بولی۔ ''آپ کو جس نے بتایا ہے تابش، غلط بتایا ہے۔ اور اگر... اگر یہ صحیح بھی ہوتا تو میں ہرگز نہ چاہتی کہ آپ میرے ذاتی معاملوں میں اس طرح دخل دیں۔'' اس کی آواز لرزنے لگی۔

''ثروت... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس میں میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ میں تو...''

''پلیز تابش... پلیز!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹی۔ ''میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کے پاس مجھے بتانے کے لیے کچھ نہیں۔ آپ نے صرف مجھ سے ملنے کے لیے ایک بات گھڑی تھی... مجھے بہت افسوس ہے تابش... میں جا رہی ہوں...''

وہ تیزی سے واپس مڑی۔ ''ثروت! میری بات تو سنو۔'' میں نے اسے کندھوں سے تھاما۔

وہ ایک دم لرز گئی۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ''چھوڑ دیں مجھے۔ جانے دیں... جانے دیں۔''

''میری بات تو سن لو ثروت۔''

''نہیں۔'' اس نے مجھے زور سے جھٹکا۔ میرے گریبان کا بٹن ٹوٹ گیا۔ میں جو سخت ترین ضربیں سہہ لیتا تھا، بدترین درد بھی سہار لیتا تھا، اس نازک لڑکی کے دیے ہوئے جھٹکے سے اندر ہی اندر کراہ اٹھا۔ مجھے لگا جیسے میں مسمار ہو گیا ہوں۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ میرے بازو دو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح میرے اطراف میں جھول رہے تھے۔

اس نے اشک بار آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر مڑی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ حیات محمد بھی ہکا بکا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ کھٹکے پر رکھا مگر اس کو کھولا نہیں۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے ماتھا دروازے (گیٹ) کی آہنی چادر سے ٹکا دیا اور اشک بہانے لگی۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ باہر نہیں نکلے گی۔ میں دھیمے قدموں سے اس کے پاس پہنچا۔ ''ثروت! پلیز ایسے مت کرو۔'' میرا لہجہ دھیما اور ملول نگار تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر میرے ساتھ کامن روم میں بیٹھی تھی۔ حیات محمد اسے پانی کا گلاس تھما کر چلا گیا تو وہ اپنی تربتر پلکیں اٹھائے بغیر بولی۔ ''مجھے معاف کر دیں تابش...''

''معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ میں تمہیں زبردستی روکنے کی کوشش کررہا تھا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے گداز لبوں کی لرزش بتارہی تھی کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن بات اس کے لبوں تک نہیں آئی۔ ہاں، آنسو اس کی بلوری آنکھوں تک ضرور آگئے۔ اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اپنا چہرہ آنچل میں چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دل کا غبار تھوڑا کم ہوا تو بولی۔ ''تابش! میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے کہ... نصرت کو کچھ ہو جائے گا اور جو کچھ ہوگا اس کی ذمے دار میں ہوں گی... بس میں ہوں گی۔''

''تمہاری بات سمجھ میں نہیں آرہی... تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''نصرت... بیمار ہے تابش... مصیبت میں ہے... اور جو کچھ ہے میری وجہ سے ہے۔''

''کیا ہے اسے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''مجھے کچھ پتا نہیں لیکن جو کچھ ہے میری وجہ سے ہے۔ میں اس کی ذمے دار ہوں۔ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا بوجھ اس کے پیاروں پر ہی آتا ہے۔''

''تم نے کیا گناہ کیا ہے ثروت! تم نے کچھ نہیں کیا۔ تم صرف وہم کررہی ہو۔''

''گناہ نہیں کیا لیکن غلط سوچا تو تھا۔ ایسا خیال تو ذہن میں آیا تھا جو نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''کیا خیال ذہن میں آیا تھا؟'' میں نے اپنائیت بھرے نرم لہجے میں پوچھا۔

وہ آنچل کا کنارہ آنکھوں پر رکھ کر ان میں اپنے آنسو جذب کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ ''میں نے یوسف کو چھوڑنے کا سوچا تھا، ان سے طلاق لینے کا سوچا تھا... اور وہ سب کچھ سوچا جو مجھے نہیں سوچنا چاہیے تھا اور اس کی سزا مجھے فوراً ملی۔ میری نصرت...'' ثروت کا گلا رندھ گیا اور وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی۔

چند لمحے توقف کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''نصرت کو کوئی تکلیف ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار پھر آنچل کا کنارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

''کس قسم کی تکلیف ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''اس کو جگر کی تکلیف ہے۔''

''لیکن ہے کیا؟''

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں اور پتا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ لیکن وہ بہت بیمار ہے۔ دیکھنے میں زندہ نظر... آتی ہے لیکن بیماری اس کے اندر تک اتری ہوئی ہے...''

میں نے طویل سانس لی۔ میرے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے۔ میں نے کہا۔ ''ثروت! کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا آج کے دور میں علاج نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ قدرت نے بیماریاں بعد میں پیدا کیں، ان کے علاج پہلے بنائے۔ کیا تم نے اس کے کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرائے ہیں؟''

''ہاں... ٹیسٹ بھی ہوئے تھے۔''

''پھر؟''

''میری کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی... کہ ان کی رپورٹیں دیکھ سکوں۔ یہ رپورٹیں بس لفافوں میں بند پڑی رہ گئیں۔''

''یہ کیا بچپنا ہے ثروت! تم نے اس کے ٹیسٹ کرائے اور پھر رپورٹیں بھی نہیں دیکھیں اور کہہ رہی ہو کہ اسے جگر کی تکلیف ہے۔''

وہ سسک کر بولی۔ ''مجھے پتا ہے کہ تکلیف ہے... لیکن شاید میں اپنے اندر اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں پاتی۔ میں سوچتی ہوں کہ جو کچھ ہے... کم ہے یا زیادہ ہے، یا بہت زیادہ ہے بس چھپا ہی رہے... اور قدرت اسی طرح نصرت کو صحت دے دے۔ میں اس کا روحانی علاج کروا رہی ہوں... رات دن دعائیں بھی کررہی ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اوپر والا یہ دعائیں ضرور سنے گا۔ وہ اب پہلے سے کافی بہتر نظر آتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ثروت... مجھے روحانی علاج سے ہرگز انکار نہیں لیکن دعا اور دوا ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس دنیا کو اسی لیے دارالاسباب کہا جاتا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سبب مہیا کرتے ہیں... پھر اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے۔ رزق، شفا، خوشی، کامیابی ایسی سب چیزوں کے لیے دعا اور کوشش دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''لیکن... لیکن وہ تو قادر مطلق ہے نا۔ وہ تو سبب کے بغیر بھی جو چاہے کرسکتا ہے۔''

''اس کو معجزہ کہتے ہیں لیکن معجزے تو کبھی کبھی رونما ہوتے ہیں۔ اگر وہ عام ہوجائیں تو پھر معجزے ہی نہ رہیں۔ ہمیں معجزوں کی آس ضرور رکھنی چاہیے لیکن ہر وقت انہی کے انتظار میں نہیں رہنا چاہیے۔ اب... اب تمہاری یہ منطق بالکل میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ تم نے جگر وغیرہ کی کسی تکلیف کے لیے نصرت کے ٹیسٹ تو کرائے ہیں لیکن رپورٹوں کو کھول کر ہی نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے رابطہ کیا ہے...''

''بس... میں خود کو کسی بڑے وہم میں ڈالنا نہیں

چاہتی۔"

"بڑے وہم میں تو تم خود کو اب ڈال رہی ہو۔ ہوسکتا ہے ثروت کہ وہ رپورٹس صحیح ہوں یا اتنی خراب نہ ہوں، جتنا تم انہیں سمجھ رہی ہو۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہے بھی تو پھر وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ایسی بیماریوں کے علاج کے لیے وقت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ثروت! تمہاری یہ بات بھی بالکل منطق کے بغیر ہے کہ تم نے اپنے شوہر سے علیحدہ ہونے کا سوچا اور اس کے نتیجے میں نصرت بیمار ہوگئی۔ یہی واہمے اور "ILLUSIONS" ہوتے ہیں جو ہمیں آہستہ آہستہ حقیقت کی دنیا سے بہت دور لے جاتے ہیں۔"

"ہر کام کا پھل تو ہوتا ہے نا۔" وہ بدستور اشک بار تھی۔

"بالکل ہوتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا اور برے کا برا۔ لیکن تم نے ایسا کون سے برا کام کیا یا کرنے کا سوچا جس کے نتیجے میں نصرت پر کوئی بوجھ آیا۔ اگر تم نے بہ حالتِ مجبوری اپنے شوہر سے علیحدہ ہونے کا سوچا تو یہ گناہ نہیں ہے۔ مذہب، معاشرہ، قانون سب تمہیں اس کا حق دیتے ہیں...."

"لیکن... یہ فیصلہ کرنا بھی تو آسان نہیں کہ کیا اس طرح کے حالات پیدا ہوچکے تھے کہ میں ایسا سوچتی۔"

وہ اپنے موقف پر بہت مضبوط نظر آتی تھی... میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ثروت! یہ ایک لمبی بحث ہے اور شاید ہم اس قابل بھی نہیں کہ اس پر کوئی بہت معتبر رائے دے سکیں۔ اب جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے، وہ یہ ہے کہ نصرت بیمار ہے... زیادہ ہے یا کم ہے، یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ اگر ہم اس بیماری کی طرف سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے رکھیں گے تو یہ مسئلہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ تھوڑی سی ہمت دکھا کر تمہیں کم از کم وہ رپورٹس تو دیکھنی چاہئیں۔ کتنا عرصہ ہوا ہے وہ ٹیسٹ کروائے ہوئے؟"

"ایک سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ ان دنوں ہم جرمنی میں ہی تھے۔ نصرت کو تیز بخار ہوا اور ہاتھ پاؤں پر سوجن آگئی۔ میں نے اسے معمول کا بخار سمجھا لیکن جب وہ جلد ٹھیک نہیں ہوئی تو ایک جرمن معالج کو دکھایا۔ وہ ہومیو پیتھک ٹائپ کے تھے اور جڑی بوٹیوں کے عرق سے علاج کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اکیلے میں بتایا کہ مریضہ کا جگر بہت زیادہ خراب ہو چکا ہے۔ وہ بظاہر اتنی بیمار نظر نہیں آرہی جتنی اصل میں ہے اور انہیں یہ بھی شبہ ہے کہ یہ جگر کا کینسر ہے۔ ڈاکٹر کی اس بات نے میری دنیا اندھیر کر دی۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی لیکن پھر کسی نہ کسی طرح میں نے خود کو سنبھالا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جگر کا کینسر دنیا کے خطرناک ترین امراض میں سے ہے اور اس کے مریض شاذ و نادر ہی بچ پاتے ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے، ہماری ممانی شفقت بھی دبئی میں اسی مرض کے ہاتھوں اپنی زندگی ہاری تھیں۔ ڈاکٹروں نے واحد حل یہ بتایا تھا کہ ان کے جگر کی پیوند کاری ہوگی لیکن اس سے بہت پہلے ہی ان کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں، مجھے وہ واقعات یاد ہیں۔"

ثروت نے گمبھیر لہجے میں بات جاری رکھی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں... اس کے ساتھ ساتھ میرا دل یہ بھی کہہ رہا تھا کہ قدرت مجھے اتنے سخت امتحان میں نہیں ڈال سکتی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ناصر بھائی کے بعد نصرت بھی موت کے رستے پر چل پڑے۔ میں نے نصرت کو کچھ نہیں بتایا۔ اسے یہی معلوم ہے کہ اسے عام قسم کا یرقان ہے جو علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ دو ہفتے بعد میں... نصرت کو ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس نے ایک دو ابتدائی ٹیسٹ کرائے۔ اس کے بعد چند اہم ٹیسٹ لکھ کر دیے۔ یہ ڈاکٹر بھی ابتدائی ٹیسٹوں کی رپورٹ سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ نئے ٹیسٹ کافی مہنگے بھی تھے۔ قریباً پانچ ہزار یورو میں ہوتے... ان دنوں میں دروازے بند کر کر کے روتی تھی اور کوئی غم دل کو آرے کی طرح کاٹتا رہتا تھا۔ انہی دنوں فرینکفرٹ کی ایک مسجد کے امام عبدالحمید صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے وہاں باقاعدہ مدرسہ بنایا ہوا تھا... اور درس وغیرہ دیتے تھے۔ ان کی عمر چالیس سال کے قریب ہے... بڑے پرہیزگار بندے ہیں۔ میں اکثر ان کو مدرسے کے لیے پیسے وغیرہ دیتی رہتی تھی۔ زکوٰۃ کے پیسے بھی ان کو ہی دیتی تھی۔ ان کو میری اس مصیبت کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دواؤں اور ڈاکٹروں وغیرہ کے چکر سے بچ جاؤں تو اچھا ہے۔ یہ لوگ تو رائی کا پہاڑ بناتے ہیں۔ ایک بیماری ٹھیک کرتے ہیں تو ساتھ دس اور لگا دیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ وظیفے بتائے، اس کے علاوہ ایک خاص قسم کا معدنی پانی دم کر کے دیا۔ یہ پانی اردن اور فلسطین کے کچھ چشموں سے لایا جاتا ہے اور لوگ اس پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ امام عبدالحمید صاحب سے ملاقات کے بعد مجھے عجیب سا اطمینان حاصل ہوا۔ انہی دنوں نصرت کے ٹیسٹوں کی رپورٹس بھی آگئی تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں رپورٹس دیکھوں گی اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے ملوں گی... اب ان باتوں کو قریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ نصرت کا علاج اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح امام عبدالحمید صاحب نے کہا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ بہتر بھی لگتی ہے لیکن کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ بیماری اس کے اندر ہے اور کسی وقت ابھر کر سامنے آجائے گی۔"

میں نے پوچھا۔ "ثروت! اپنی بیماری کا نصرت کو کہاں تک پتا ہے؟"

"اسے کچھ پتا نہیں۔" ثروت نے بڑے دکھی انداز میں سر ہلایا۔ "وہ بس اتنا ہی جانتی ہے کہ اس کے معدے، جگر میں تھوڑا بہت نقص ہے جس کی وجہ سے کسی وقت ہاتھ پاؤں پر سوجن آتی ہے یا بخار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی مصیبت سے بے خبر ہر وقت میری پریشانیوں میں گھری رہتی ہے۔ یہاں شاہ جمال کے علاقے میں ایک اللہ والے ہیں... پیر احمد تھانوی صاحب۔ تین دن پہلے مجھے ان کے پاس لے کر گئی ہوئی تھی۔ میرے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے اور میں اس کی صحت کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرتی رہتی ہوں۔" ثروت کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

میں چند دن پہلے نصرت سے مل چکا تھا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اس کی آنکھیں خوب صورت ہونے کے باوجود بجھی بجھی سی تھیں۔ رنگت بھی زردی مائل تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا پورا وجود کسی اضمحلال کی زد میں ہے۔

میں نے ثروت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ یہ زیادتی تم اپنے ساتھ کر رہی ہو اور نصرت کے ساتھ بھی... اور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا ثروت۔ اگر تم میں وہ رپورٹس دیکھنے کا حوصلہ نہیں تو وہ مجھے دے دو۔ میں انہیں دیکھتا ہوں اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات ہوئی بھی تو میں ہر چیز کا سامنا کروں گا۔ آنکھیں بند کر لینے سے مصیبت دور نہیں ہوتی۔ اس کا ہمت سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔"

ثروت شدید ترین تذبذب میں نظر آرہی تھی۔ دوسری طرف اسے میرے بے لوث رویے اور جراَت مندانہ انداز سے کچھ حوصلہ بھی مل رہا تھا۔

آخر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے تابش! میں آپ کو وہ رپورٹس دکھا دیتی ہوں۔ لیکن مجھ میں کچھ بھی برا سننے کا حوصلہ نہیں۔ آپ مجھے فوری طور پر ان کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ نہ اچھا، نہ برا۔"

"ٹھیک ہے ثروت! میں کچھ نہیں بتاؤں گا بلکہ میں نصرت کی پوری ذمے داری بھی لیتا ہوں۔ اگر مجھے ڈاکٹروں وغیرہ سے مشورہ کرنا پڑا تو خود ہی کروں گا۔ اور اگر نصرت کو علاج کی ضرورت ہوئی تو پھر بھی میں ہر طرح کے تعاون کو تیار ہوں لیکن مجھے امید ہے ثروت کے حالات اتنے برے نہیں جتنے تم نے سمجھ لیے ہیں۔ تم نے ایک امکان کو ٹھوس حقیقت کی شکل دی ہے اور پھر اس "حقیقت" کے خوف کو اپنے اندر بڑھاتی چلی گئی ہو۔ مجھے نہیں لگتا کہ نصرت کی تکلیف اتنی سنگین ہوگی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ یوں چل پھر رہی ہوتی۔"

"جی؟" ثروت نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ثروت کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ میں نصرت سے ملا ہوں، نہ ہی نصرت نے اسے بتایا تھا۔ میں نے جلدی سے بات بدلی۔ "تم نے خود ہی بتایا ہے نا کہ نصرت بظاہر ٹھیک ہے اور روزمرہ کے کام بھی کرتی ہے۔"

ثروت نے کہا۔ "میں آپ کو وہ رپورٹس کس طرح پہنچاؤں؟"

"جیسے تم مناسب سمجھو۔ یہیں آکر دے جاؤ یا پھر ٹی سی ایس کردو۔ میں تمہیں ایڈریس لکھوا دیتا ہوں۔"

"میں ٹی سی ایس کردوں گی۔"

"لیکن فون پر مجھ سے رابطہ ضرور رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ میں کال کرتا رہوں اور تمہاری طرف سے جواب ہی نہ ہو۔"

وہ خاموش رہی۔ پھر ہولے سے بولی۔ "تم اگر بات کرنا ضروری ہو تو رات دس بجے کے بعد کال کیجیے گا۔"

ہمارے درمیان دس پندرہ منٹ مزید بات چیت ہوئی۔ میری حوصلہ افزا باتوں سے ثروت کو کافی ڈھارس ملی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نصرت کی رپورٹس ضرور بھجوائے گی۔

میرا یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ میں، عمران کے راوی روڈ والے گھر میں ہی موجود تھا۔ میں اور اقبال ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ عمران فون پر شاہین سے لڑائی کرنے میں مصروف تھا۔ اتنے میں دروازے پر بیل ہوئی۔ میں نے جا کر دیکھا۔ ثروت کی بھیجی ہوئی رپورٹس آگئی تھیں۔

لفافہ میرے ہاتھ میں تھا اور دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ اقبال اور عمران بھی اپنی اپنی مصروفیات چھوڑ کر میرے پاس آگئے۔ وہ دونوں بھی تمام تر صورتِ حال سے آگاہ تھے۔ پچھلے تین چار دن کی پریشانی اب نکتۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ یہ رپورٹس اچھی ہوں اور میں ابھی ثروت کو فون کر کے اسے خوش خبری سنا سکوں۔ ایسی سنگین نوعیت کی رپورٹس کو دیکھنا بھی کتنا اعصاب شکن عمل ہوتا ہے۔ میں نے لفافہ عمران کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔

''تم کھولو۔''

وہ بولا۔ ''یہ بھی تو ہم پرستی کی ایک قسم ہے۔''

بہرحال اس نے لفافہ کھولا۔ فرینکفرٹ کی کوئی لیب تھی۔ بہرحال رپورٹس انگلش میں تھیں۔ سب سے اوپر نصرت کا نام لکھا تھا... اور تاریخ درج تھی۔ نیچے دیگر CONTENTS تھے۔ اے سے زیڈ تک سارے حرف کاغذوں پر ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنے سیاق وسباق اور پس منظر کی وجہ سے یہ کبھی روشن پیشانیوں والے فرشتوں کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی زہریلے ناگ بن جاتے ہیں۔ نصرت کی میڈیکل رپورٹس پر نظر آنے والے حرف بھی زہریلے ناگوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ ہمیں پہلی رپورٹ دیکھنے کے ساتھ ہی پتا چل گیا کہ نصرت کو جگر کا کینسر ہے اور یہ کافی پھیلا ہوا ہے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عمران اور اقبال بھی گم صم نظر آرہے تھے۔ ہم نے دیگر رپورٹس بھی دیکھیں۔ ان میں سے کچھ خون اور پیشاب کے حوالے سے تھیں۔ ایک معدے کی کیمسٹری یالوجی کا رزلٹ تھا۔ ایک دوسری رپورٹ سے پتا چل رہا تھا کہ نصرت کے جگر کا تقریباً تین چوتھائی حصہ اور جگر تک پہنچنے والی دو نالیاں متاثر ہو چکی ہیں اور یہ نتیجے تقریباً ایک سال پہلے کے تھے۔ اب کیا پوزیشن ہے؟ یہ یقیناً ایک اور تشویشناک سوال تھا۔

عمران نے اپنے ایک واقف کار ڈاکٹر کو فون کیا۔ ان ڈاکٹر صاحب نے جگر کے ایک اسپیشلسٹ سرجن امتیاز علی سے عمران کی بات کرائی۔ عمران نے رپورٹس کے وہ حصے سرجن امتیاز کو پڑھ کر سنائے جن میں خاص میڈیکل اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں اور جن کو ہم سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

امتیاز علی صاحب نے یہ حصے سننے کے بعد ہم سے لیبارٹری اور بیتھالوجسٹ وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''دیکھیں بھئی، اگر یہ رپورٹس درست ہیں اور ایک سال پرانی بھی ہیں اور اس دوران میں مریضہ کا خاطر خواہ علاج بھی نہیں ہوا تو پھر اس کے لیے کافی مشکلات ہیں۔ وہ کسی بھی وقت COLLAPSE کر سکتی ہے۔ موجودہ صورتِ حال جاننے کے لیے آپ کو نئے ٹیسٹ کروانے ہوں گے اور فوری طور پر کسی اچھے اسپتال سے رجوع کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں آپ پہلے ہی کافی وقت ضائع کر چکے ہیں۔ اگر یہ رپورٹس آپ کے پاس موجود تھیں تو پھر آپ کو ہرگز تاخیر نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

اب میں سرجن صاحب کو کیسے بتاتا کہ یہ رپورٹس تو ابھی تک لفافے میں بند پڑی تھیں، انہیں پڑھا ہی نہیں گیا تھا۔

اگلے روز میں اور عمران نصرت کی انہی پرانی رپورٹوں کے ساتھ سرجن امتیاز علی سے ملے۔ انہوں نے مزید تفصیل سے رپورٹس کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے بتایا۔ ''یہ کینسر رسولیوں کی شکل میں ہے۔ قریباً سات سینٹی میٹر کی تین چار رسولیاں ہیں۔ جگر کا بہت تھوڑا حصہ کام کر رہا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے STAGING کرنا ہوگی۔''

''اس سے کیا مراد ہے جناب؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہم اندازہ لگائیں گے کہ بیماری اب کس مرحلے میں ہے۔ کیا وہ صرف جگر تک محدود ہے یا قریبی اعضا معدے اور پھیپھڑے وغیرہ بھی متاثر کر چکی ہے۔ اس کے لیے ہمیں مریضہ کا سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی وغیرہ کرنا ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ہم لیپرواسکوپی کے ذریعے جگر کا کوئی ٹشو بھی حاصل کریں اور اس کا معائنہ کریں۔''

''ان ٹیسٹوں پر اندازاً کتنا خرچ آئے گا؟'' عمران نے پوچھا۔

سرجن امتیاز علی نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ''یہ سارا علاج بہت مہنگا ہے۔ اگر آپ سارے ضروری ٹیسٹ کرائیں تو میرے اندازے کے مطابق ان ٹیسٹوں پر ہی چھ سات لاکھ روپیا خرچ ہوگا۔ پھر کچھ چیزیں بیماری کی نوعیت پر بھی منحصر ہیں۔ کئی صورتوں میں علاج پاکستان میں ممکن ہی نہیں ہے۔''

ڈاکٹر امتیاز سے ملاقات کے بعد ہم گھر واپس آئے اور تادیر سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ صورتِ حال ازحد تشویشناک تھی۔ میری نگاہوں میں نصرت کا خوب صورت چہرہ گھوم رہا تھا۔ وہ بے چاری اپنی حالت سے بے خبر تھی۔ اپنی تکلیف کو معمولی تکلیف سمجھ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب وہ پہلی بار احمد تھانوی صاحب سے ملی تو اس نے دیگر پریشانیوں کے علاوہ اپنے رشتے کی بات بھی کی اور تھانوی صاحب سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے اچھے بر کی دعا کریں۔

رات کے دس بجے تو میں نے، عمران اور اقبال کے مشورے کے مطابق ثروت کو فون کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ اس سے چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں نے اس سے نصرت کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ''ثروت! میں نے ساری رپورٹیں دیکھ لی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کو بھی دکھا دی ہیں۔ تم یقین رکھو، سب اچھا ہو جائے گا اور بہت جلدی ہو جائے گا۔ نصرت ایک دم فٹ ہو جائے گی۔''

''کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟''

''نصرت کے ایک دو مزید ٹیسٹوں کی ضرورت ہے۔ عام سے ٹیسٹ ہیں۔ وہ چند گھنٹوں میں فارغ ہو جائے گی۔''

''کہاں... جانا ہوگا؟''

''یہیں لاہور میں۔ جیل روڈ پر ایک کلینک ہے۔''

''کتنے پیسے لگیں گے؟''

''کچھ زیادہ نہیں ثروت... آٹھ دس ہزار میں کام ہو جائے گا۔ ایک دوست سے بات کی ہے میں نے۔ وہ رعایت سے کام کروا دے گا۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''لیکن... نصرت کو تو کل سے بخار ہے۔ کوئی چیز ہضم بھی نہیں کر رہی ہے۔''

''ایسا تکلیف کی وجہ سے ہے۔ علاج شروع ہوگا تو دنوں میں بہتر نظر آنے لگے گی۔''

ثروت شروع میں تو متذبذب نظر آئی لیکن پھر آمادہ ہو گئی۔ اس کا شوہر یوسف لاہور سے باہر تھا۔ طے ہوا کہ کل سہ پہر چار بجے وہ نصرت کو لے کر جیل روڈ کے پرائیویٹ کلینک میں پہنچ جائے گی۔

وہ اسی سوفٹ کار میں آئی جس پر میں نے اسے پہلی بار گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا... گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ دونوں بہنیں پچھلی نشست پر موجود تھیں۔ ثروت کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور انہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ نصرت واقعی لاغر نظر آرہی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے اور نصرت نے ثروت کے سامنے بالکل ظاہر نہیں کیا کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔ نصرت نے جذباتی انداز میں میرا حال احوال پوچھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے بھی تھوڑی بہت اداکاری کرنا پڑی۔ میری اور اپنی ملاقات کے بارے میں ثروت اسے بتا ہی چکی تھی۔ اس جدید کلینک میں نصرت کے مختلف ٹیسٹ شروع ہوئے تو ثروت کے چہرے پر نظر آنے والی پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ٹیسٹ عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ سی ٹی اسکین، ایم آر آئی اور لیپرواسکوپی وغیرہ کو عام ٹیسٹ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں نے ثروت سے کہا۔ ''آج کل یہی طریقہ کار ہے۔ ڈاکٹر صاحبان علاج شروع کرنے سے پہلے ہر طرح کی تسلی کر لیتے ہیں۔''

''میرے اندازے کے مطابق تو یہ کافی مہنگے ٹیسٹ ہوں گے۔'' ثروت منمنائی۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ سارا کام عمران اپنے کسی ریفرنس سے کروا رہا ہے۔''

ثروت کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ شاید وہ جان رہی تھی کہ صورتِ حال وہ نہیں جو اسے بتائی جا رہی ہے۔ لیکن وہ اس حوالے سے میرے ساتھ کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بس خشک لبوں پر زبان پھیرتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس کی ہر ہر ادا کو جانتا تھا۔ اس کی باڈی لینگویج کو اتنی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اسے ٹیلی پیتھی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ وہ میرے اندر رہتی تھی۔ میری روح میں مدتوں سے بستی تھی اور وہ ان گھڑیوں میں بے حد پریشان تھی۔

نصرت کے ٹیسٹ وغیرہ مکمل ہونے میں قریباً پانچ گھنٹے لگ گئے۔ وہ خود بھی کافی الجھن میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں زردی سی اتری ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''تابش بھائی! آپ لوگ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ کیا میں زیادہ بیمار ہوں؟''

میں نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''نصرت! اپنی حالت کا پتا مریض سے زیادہ کسی کو نہیں ہوتا۔ کیا تم خود کو بہت زیادہ بیمار محسوس کرتی ہو؟''

''بس... بھوک آج کل کم لگتی ہے اور دو چار دن سے بخار ہے۔''

''تو پھر وہم کیوں کر رہی ہو؟ تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ معدے کا پرابلم ہے تمہیں، یا پھر جگر کی معمولی سوزش ہے۔ یہ لیب عمران کے ایک دوست کی ہے۔ اس لیے احتیاطاً سارے ٹیسٹ کروا لیے ہیں۔''

''کتنا خرچ ہوا ہے؟'' ثروت نے مجھ سے پوچھا۔

''بس سمجھو... نہ ہونے کے برابر۔''

''نہیں، اس طرح نہیں ہوگا تابش! آپ بتائیں کتنے پیسے لگے ہیں۔''

میں نے نہیں بتایا لیکن جب ان دونوں نے بہت اصرار کیا تو میں نے ان سے پچیس ہزار روپے لے لیے۔ اصل خرچہ ڈھائی لاکھ کے قریب تھا۔

ثروت اس ساری صورتِ حال سے مطمئن نظر نہیں آتی تھی، بہرحال خاموش تھی۔ اس پرائیویٹ اسپتال کے ''لوڈ ایریا'' میں بیٹھ کر ہم نے قریباً ایک گھنٹا گفتگو کی۔ دس پندرہ منٹ کے لیے عمران بھی اس گفتگو میں شریک ہوا۔ عمران کی شخصیت اور اس کے مخلص و بے لوث انداز نے ثروت اور نصرت کو متاثر کیا۔ عمران کے جانے کے بعد بھی

میں ثروت اور نصرت سے باتیں کرتا رہا۔ ثروت نے نصرت کو سب بتادیا تھا کہ مجھ سے اس کی ملاقات کب اور کیسے ہوئی لیکن نصرت نے مجھ سے ملاقات کے بارے میں ثروت کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ایسا اس نے میرے کہنے پر ہی کیا تھا۔ بہرحال، ثروت کے ذہن میں ابھی تک یہ الجھن موجود تھی کہ میرے پاس اس کا موبائل فون نمبر کیسے پہنچا۔

وہاں قوڈ ایریا میں ہماری گفتگو زیادہ تر نصرت کی تکلیف اور اس کے علاج کے گرد ہی گھومتی رہی۔ میں نے ثروت اور نصرت سے کہا کہ وہ بے شک روحانی علاج بھی جاری رکھیں مگر اس کے ساتھ اگر ڈاکٹر کچھ دوائیں تجویز کرتا ہے تو نصرت انہیں بھی باقاعدگی سے استعمال کرے۔ نصرت اس پر آمادہ تھی۔

ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں ہم نے جان بوجھ کر کوئی بات نہیں کی۔

...اگلے چند روز سخت کشمکش کے تھے۔ نصرت کی کچھ رپورٹس کا نتیجہ کراچی سے بھی آنا تھا۔ ثروت دن رات دعاؤں میں مصروف تھی۔ وہ احمد تھانوی صاحب کے پاس بھی دو چکر لگا چکی تھی۔ میں، عمران اور اقبال راوی روڈ والے مکان میں تھے۔ گنجان آبادی میں گھرا ہوا یہ گھر ہماری دھینگا مشتیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا لیکن نصرت والی پریشانی کے سبب آج کل ہم سب سنجیدہ تھے۔ ہاں، عمران کسی وقت ضرور شاہین سے چھیڑ چھاڑ کرلیتا تھا۔ شاہین، رائے ونڈ روڈ والی شاندار کالونی میں فرح اور عاطف کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھی۔ اب بھی فون پر عمران اور شاہین میں کشمکش جاری تھی۔ عمران اسے بتا رہا تھا کہ اسے ایک فلم میں اسسٹنٹ مین کا کام ملا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ سیکنڈ ہیرو کا کردار بھی کرے گا۔ یہ فلم ریما پروڈیوس کررہی ہے اور اس کی ہیروئن بھی وہی ہے۔

شاہین نے جواباً اسے چڑانے کے لیے کہا۔ ”مجھے بھی اکشے کمار کا فون آیا تھا۔ اس نے انڈیا میں ہمارا شو دیکھا تھا۔ وہ سرکس کے موضوع پر فلم بنا رہا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ ہیروئن لینے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔“

”لیکن اکشے تو پیسے والا بندہ ہے۔ اسے گھٹیا اور زہریلی شراب پینے کی کیا ضرورت تھی؟“

”کیا مطلب؟“ شاہین کی آواز فون کے اسپیکر پر ابھری۔

”بھئی زہریلی شراب پینے سے ہی تو لوگ اندھے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اندھا ہوا ہے تو اس نے تمہیں ہیروئن کاسٹ کرنے کا سوچا ہے نا۔“

”اور تمہارا کیا خیال ہے، ریما اور نرگس کی آنکھیں سلامت ہیں جو وہ تم پر سوجان سے فدا ہوئی پڑی ہیں۔“

”میں تمہارے ساتھ بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے پاس اب ایسی باتوں کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں ایک ابھرتا ہوا ستارہ ہوں بالکل جیسے رنبیر کپور رائزنگ اسٹار ہے۔ تم دونوں کے شیڈول آج کل بڑے ٹائٹ ہیں۔ باقی فلم میں میرے کاسٹ ہونے کی اطلاع بالکل سچی ہے۔ اگر یقین نہیں تو کل کے اخبارات میں نیوز دیکھ لینا۔“

شاہین نے کہا۔ ”اگر ایسا ہے بھی تو... تم مجھے کیا بتانا چاہتے ہو؟“

”دیکھو، جو درمیانی عمر کا ”لوکنڈہ“ میں نے تمہارے لیے دیکھا ہے، لاکھوں میں ایک ہے۔ نیوز چینل میں ملازم ہے۔ تم دولت میں کھیلو گی اور رعب دیدبہ علیحدہ۔ پلیز، میرا خیال دل سے نکال دو۔ ہمارے ستارے کبھی نہیں ملیں گے۔“

وہ جل کر بولی۔ ”اللہ نہ کرے ہمارے ستارے ملیں۔ اس سے تو اچھا ہوگا کہ میں کنوئیں میں چھلانگ لگادوں۔“

”دقیانوسی باتیں مت کرو۔ آج کل کنوئیں کہاں ہوتے ہیں۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں ٹرین کے نیچے سر رکھ کر یا خود پر پیٹرول چھڑک کر یا بجلی کا جھٹکا کھا کر مرجاؤں گی۔“ اس نے ذرا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ویسے یہ سارے طریقے بھی کافی محال ہیں۔ یہ چیزیں اب ملتی ہی کہاں ہیں۔“

”جس نے مرنا ہو وہ کوئی نہ کوئی رستہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔“

”اسٹیج ڈراموں میں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مرجانا پر کسی غریب کے کام نہ آنا۔ اچھے لوگ اپنے اعضا عطیہ کر جاتے ہیں... تم تو پوری کی پوری عطیہ ہو۔ یہ خوب صورتی، یہ شباب، یہ چمک دمک... ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے ختم کردو گی تو یہ سخت قسم کا کفرانِ نعمت ہوگا۔ اگلی دنیا میں جاتے ساتھ ہی تمہاری مرمت شروع ہوجانے گی۔ فلسٹار زینت امان کا ایک مشہور فرانسیسی شعر ہے۔ اس کا ترجمہ فراق گورکھپوری نے کچھ اس طرح کیا ہے، اب تو گھبرا کے کہوت ہیں کہ مرجاویں گے... مر کے بھی شانتی نہ پائی تو کدھر جاویں گے۔ شاہین! میں تو اب بھی تم سے یہی کہتا ہوں کہ وہ لوکنڈہ...“

اس نے فون بند کردیا۔ عمران کے چہرے پہ شریر مسکراہٹ تھی۔

اقبال نے آنکھیں اوپر چڑھا کر کہا۔ ”یا اللہ... یہ کیسے کیسے انکشاف ہورہے ہیں۔ فلسٹار زینت امان شعر کہتی تھی اور ان کا ترجمہ بھی ہوتا تھا۔“

عمران بولا۔ ”تمہیں اعتراض کس پر ہے، زینت امان پر یا ترجمے پر؟“

”تمہیں تم پر اعتراض ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کچھ خدا کا خوف کرو۔ اتنے عرصے بعد ملے ہو... اور آتے ساتھ ہی اسے گھر سے بے گھر بھی کردیا ہے۔ اب اسے ستانے پر تلے ہوئے ہو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ چلو، اس کی محبت کا اقرار نہ کرو مگر اس طرح اس کی توہین تو نہ کرو۔“

”اس وقت تو بالکل شاہین کے بڑے بھائی لگتے ہو تم۔“ وہ مسکرایا۔

”چلو بڑا بھائی ہی سمجھ لو لیکن اگر میں نے عقل کی بات کی ہے تو اس پر غور کرو۔“

اسی دوران میں عمران کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس کے چہرے پر پھر شرارت کی چمک نمودار ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پھر شاہین کا فون آیا ہے لیکن دوسری طرف اس کا دوست ڈاکٹر فہد تھا۔ اس نے عمران کو بتایا کہ نصرت کی رپورٹس آگئی ہیں... اور یہ بھی بتایا کہ رپورٹس اچھی نہیں ہیں۔

وہ جو ماحول میں تھوڑی سی خوش گواری آئی تھی، ایک دم کافور ہوگئی۔ میں اور عمران ڈاکٹر فہد کے کلینک پہنچے اور وہاں سے سرجن ڈاکٹر امتیاز علی کے پاس پہنچ گئے۔ امتیاز صاحب نے ساری رپورٹس اور پرنٹ آؤٹ وغیرہ دیکھنے کے بعد چشمہ اتار کر ایک طرف رکھا اور بولے۔ ”اب سب کچھ سامنے ہے اور ایک مکمل تصویر بن رہی ہے... اور یہ تصویر اچھی نہیں ہے۔“

ہم سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے سی ٹی اسکین کا ایک پرنٹ ہمیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ”جگر تقریباً ختم ہوچکا ہے۔ پچھلے ایک سال کی تاخیر نے بیماری کو بہت پھیلا دیا ہے۔ یہ دیکھیں... یہ سارا ایریا متاثر ہوچکا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ متاثرہ حصے کو فریز کرنے سے یا پھر یہاں جراحی کے عمل سے کچھ فائدہ ہوجانے گا۔“

”تو پھر جناب؟“

انہوں نے طویل سانس لی۔ وہی سانس جو کوئی گمبھیر بات کہنے سے پہلے اعصاب کو کمپوز کرنے کے لیے لی جاتی ہے۔ نشست سے ٹیک لگا کر بولے۔ ”اگر کوئی چانس نظر آتا ہے تو وہ ٹرانسپلانٹیشن میں ہی ہے... جگر کی تبدیلی... اور یہ کوئی معمولی طریقہ کار نہیں ہے۔ یہ ہر لحاظ سے مشکل ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے جگر بیکار ہوچکا ہے؟“

”تقریباً ہوچکا ہے۔ بہت تھوڑا حصہ کام کررہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مریضہ کی ظاہری حالت اس کی اندرونی حالت سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن یہ زیادہ دیر بہتر نہیں رہے گی۔ اچانک ہی بریک ڈاؤن ہوگا۔ ایسے بریک ڈاؤن میں دو چار دنوں میں ہی سب کچھ ختم ہوجاتا ہے...“

”اوہ گاڈ۔“ عمران نے ہونٹ سکیڑے۔

میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑنے لگی۔ جواں سال نصرت کا چہرہ نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

امتیاز صاحب نے کہا۔ ”اس بدترین صورتِ حال میں اگر کوئی اچھا پہلو ڈھونڈا جاسکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے۔ بیماری ابھی جگر سے باہر نہیں گئی۔ نہ ہی اس نے اردگرد کے ٹشوز اور BLOOD VESSELS کو ٹچ کیا ہے۔ یہ صورتِ حال جگر کی ٹرانسپلانٹیشن کے لیے بہترین سمجھی جاتی ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے، اس کام پر کیا کاسٹ آسکتی ہے؟“

امتیاز صاحب بولے۔ ”یہ آپریشن انڈیا میں ہورہے ہیں اور وہاں کاسٹ بھی نسبتاً کم ہے لیکن وہاں باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور وہاں پہنچنے کا ”پروسیجر“ بھی لمبا ہے جبکہ مریضہ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر کسی مغربی ملک میں یہ آپریشن ہوسکے تو مناسب ہے۔ لیکن وہاں اخراجات بہت ہوں گے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ جگر کا عطیہ مل جائے۔“

”کیا اس کے لیے پورا جگر درکار ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ دو طرح کے آپریشن ہوتے ہیں۔ ایک کو جگر کی پیوند کاری کہہ سکتے ہیں، دوسرے کو جگر کی تبدیلی۔ یہ تو جگر کی حالت پر منحصر ہوتا ہے کہ کون سا آپریشن ہوگا...“

وہاں ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ خاصی پریشان کن اور گمبھیر تھی۔ ایک بہت بڑا امتحان تھا جو سامنے نظر آرہا تھا۔ نصرت کی زندگی خطرے میں تھی۔

ہم گھر واپس آئے تو چونک گئے۔ اندر کوئی مہمان موجود تھا اور اقبال سے مصروفِ گفتگو تھا۔ یہ ثروت تھی۔ وہ بذریعہ رکشا یہاں پہنچی تھی اور برقع میں آئی تھی۔ اس گھر کا ایڈریس اسے میں نے ہی بتایا تھا۔

”تم کب آئیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بس ابھی پانچ منٹ پہلے پہنچی ہوں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے؟ اقبال صاحب کہہ رہے تھے کہ کچھ بتا کر نہیں گئے۔“

"فرح کی طرف گئے تھے پھر راستے میں ایک دوست کے پاس ٹھہر گئے۔" میں نے بہانہ بنایا۔ "اور تم کہاں سے آرہی ہو؟"

"یہاں بھاٹی گیٹ کی طرف ایک خیراتی اسپتال ہے، وہاں کچھ پیسے دینے آئی تھی۔ سوچا آپ کی طرف سے بھی ہو جاؤں۔"

"نصرت اب کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے، بخار تو اترا ہوا ہے لیکن بھوک بالکل نہیں لگ رہی۔ بڑی مشکل سے ایک دو لقمے کھلاتی ہوں۔" اس نے ذرا توقف کیا اور پھر بولی۔ "آپ کہہ رہے تھے کہ جمعرات تک سب رپورٹیں آجائیں گی۔"

"ہاں میرا خیال ہے، آج شام یا کل دوپہر تک پہنچ جائیں گی۔"

"زیادہ فکر کی بات تو نہیں ہے نا؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں ثروت! تکلیف تو ہے لیکن اگر ہم ہمت سے کام لیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اقبال چائے بنانے چلا گیا۔ میں اور عمران کمرے میں رہ گئے۔ ثروت نے اپنے برقع کے اندر سے ایک سبز شاپر نکالا اور کانپتے ہاتھ سے میری طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے شاپر تھامتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میری کچھ جیولری ہے تابش! ناصر بھائی نے بنوا کر دی تھی۔ آپ اسے اپنے پاس رکھیں۔ نصرت کے علاج کا خرچہ اس سے کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کا اچھا علاج ہو اور وہ جلد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔"

میں نے زیورات لوٹاتے ہوئے کہا۔ "ابھی اس کی ضرورت نہیں ثروت! اگر ہوئی تو پھر میں بتا دوں گا..."

وہ مصر رہی کہ میں زیورات اپنے پاس رکھوں۔ میرے مسلسل انکار کے باوجود وہ نہیں مانی۔ وہ بہت دل گرفتہ ہو رہی تھی۔ اس نے ہمارا دل رکھنے کے لیے بس چائے کے بھی ایک دو گھونٹ ہی لیے۔ اس نے کہا کہ نصرت کی دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ اسے جلدی واپس جانا ہے۔ اقبال اس کے لیے رکشا لے آیا۔ وہ چلی گئی۔

وہ جو جیولری دے کر گئی تھی، ساری کی ساری طلائی تھی۔ مارکیٹ ریٹ کے مطابق اس کی قیمت چھ سات لاکھ سے کم نہیں تھی۔ لیکن جو مصیبت آئی تھی، وہ ثروت کے اندازے سے بہت بڑی تھی۔ نصرت کے علاج کے حوالے سے تو یہ رقم اونٹ کے منہ میں زیرے جیسی تھی۔

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر میں نے کہا۔ "عمران! ہم ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گی۔ میرے دل میں آرہا ہے کہ میں اپنا مکان بیچ دوں۔ تم کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کرو۔"

وہ بولا۔ "اتنی تیزی مت دکھاؤ۔ بریک پر تھوڑا سا پاؤں رکھو۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ویسے بھی وہ مکان تمہارے اکیلے کا نہیں ہے۔ عاطف اور فرح بھی اس میں حصے دار ہیں اور شاید تمہاری ایک پھوپی جان کو بھی کچھ حصہ دینے کے بارے میں تمہارے والد وصیت کر کے گئے ہوئے ہیں۔"

"یار! میں بعد میں دے دوں گا ان لوگوں کو حصہ لیکن اس وقت تو ایک انسانی زندگی کا معاملہ ہے۔"

"جب چیز اس طرح بیچی جاتی ہے تو لوگ کوڑیوں کے بھاؤ خریدنا چاہتے ہیں۔ تم اتنی جلدی مت دکھاؤ۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

میں کمرے میں بند ہو کر دیر تک سوچتا رہا۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ لیور کی ٹرانسپلانٹیشن کوئی معمولی آپریشن نہیں تھا۔ انڈیا میں بھی اس کے مکمل علاج پر پچاس لاکھ کے قریب خرچہ آرہا تھا۔ کسی مغربی ملک میں تو یہ دوگنا سے بھی زیادہ ہو جانا تھا... عمران کی مالی حالت کا مجھے پتا تھا۔ وہ ایک پرندے جیسی زندگی گزارتا تھا۔ آج جو کچھ ہے، وہ خرچ کر ڈالو... کل کی فکر نہ کرو۔ پیسا اس کے پاس آتا تو تھا لیکن ٹکتا نہیں تھا... آج کل بھی نصرت کے ٹیسٹوں کا بل دینے کے بعد وہ تقریباً قلاش تھا۔

اگلے روز میں، عمران کو بتائے بغیر خاموشی سے اپنے آبائی گھر پہنچا۔ وہاں سے مکان کی رجسٹری لی۔ اس کی فوٹو اسٹیٹ کرائی اور علاقے کے ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس پہنچ گیا۔ اس شخص نے مجھے فوراً پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں کچھ بھولے بسرے منظر اور کچھ سوال ابھر آئے۔ ان مناظر اور ان سوالوں کا تعلق یقیناً اسی تاریک دن سے تھا جب مجھے ایک قریبی پارک میں سراج کے غنڈوں نے لہولہان کیا تھا اور میں چہرہ چھپا کر ہر شناسا نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا۔

اس نے میری طرف انگلی اٹھائی۔ "تم... میرا مطلب ہے... آپ... وہی..."

"ہاں... تم نے ٹھیک پہچانا ہے۔ میں ذبی ہوں... میں نے ایک سیٹھ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا اور اس نے مار مار کر میرا حشر خراب کر دیا تھا... بہت سے لوگوں نے تماشا دیکھا تھا۔ شاید تم بھی ان میں شامل ہو گے۔ اب پلیز... مزید کوئی سوال نہ کرنا... یہ میرے مکان کے کاغذات ہیں۔ میں اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔"

پراپرٹی ڈیلر نے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میرے تاثرات دیکھ کر بند کر لیا۔

میں نے اسے مکان کی فروخت کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور واپس آگیا۔

ایک عجیب سی پریشانی نے مجھے گھیر رکھا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ مجھ سے زیادہ عمران پریشان ہے۔ اس کی یہی ادا تھی جو دلوں کو موہ لیتی تھی۔ وہ دوسرے کی پریشانی کو اپنی پریشانی بنا لیتا تھا اور پھر تن من دھن سے اسے رفع کرنے کی کوششوں میں لگ جاتا تھا۔ جب میں گھر پہنچا تو جان محمد صاحب آئے ہوئے تھے۔ عمران ان سے گفتگو میں مصروف تھا۔ عمران رات کو بھی اسسٹنٹ منیجر عباس کے ساتھ دیر تک ٹیلی فون پر بات کرتا رہا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ شاید وہ ایک بار پھر کسی خطرناک "سرکس شو" کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ میرے ذہن میں اسٹار سرکس کے وہ اسپیشل شو گھومنے لگے جن میں عمران اور اس کے ساتھی نہایت خطرناک کرتب دکھاتے تھے۔ بغیر حفاظتی جال کے جھولوں پر بازی گری، آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی زندہ ہدف پر چاقو زنی، اپنے پہلو یا پھر کنپٹی پر ریوالور وغیرہ رکھ کر گولی چلنے یا نہ چلنے والا رسک۔ اور ایسے بہت سے دیگر کام... عمران ایسی خطرناک حرکات کو کبھی کبھی پیسا کمانے کے لیے بھی استعمال کرتا تھا۔

بہر حال، میرا یہ شک... شک ہی رہا۔ مجھے اس بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں مذکورہ پراپرٹی ڈیلر سے ملا۔ اس نے مجھے یہ مایوس کن خبر سنائی کہ میرے مکان کی فوری فروخت ممکن نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے مکان کا رقبہ ان رقبوں میں شامل ہے جس کا ریکارڈ کچھ عرصہ پہلے جل کر ضائع ہو گیا تھا۔ اب میرے مکان کی "فرد" نہیں نکل سکتی اور فروخت کے لیے فرد کا ہونا بہت ضروری ہے۔

"اب کیا کرنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نئے سرے سے کاغذات کا ریکارڈ بنوانا ہوگا۔"

"اس میں کتنا وقت لگے گا؟"

"اگر آپ خود بنوائیں گے تو کئی مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر دے دلا کر کام کرائیں گے تو بھی ڈھائی تین مہینے تو کہیں نہیں گئے۔ اخبار میں اشتہار وغیرہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ بھی قانونی کارروائی ہوتی ہے۔ شاید آپ کو ڈی پی او کے سامنے بھی پیش ہونا پڑے۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

رات کو میں گھر واپس گیا تو میری توقع کے خلاف عمران بازار کے کسی تھڑے پر محلے داروں سے گپ شپ نہیں کر رہا تھا بلکہ کمرے میں خاموش بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں بھی خاموشی سے اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کی گمبھیر خاموشی کے بعد عمران نے کہا۔ "تم اپنا موبائل، گھر چھوڑ گئے تھے۔ ابھی ثروت کا فون آیا تھا۔"

"خیریت ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"نصرت کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ رات سے اسے تیز بخار ہے۔ پیٹ میں دائیں طرف درد بھی ہوتا ہے۔"

"ثروت کیا کہہ رہی تھی؟"

"اس کا خیال ہے کہ شاید کھانے پینے میں کچھ بد پرہیزی ہوئی ہے لیکن اصل بات وہی ہے جس کا ہمیں پتا ہے۔ بیماری تیزی سے اسے جکڑ رہی ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عمران بھی خاموش رہا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ گھر سے باہر بازار سے معمول کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ رکشے کا شور... خوانچے والے کی صدا، بچوں کی چہکار۔ میوزک سینٹر سے بلند ہونے والے نغمے کی آواز موسم حسیں ہے لیکن تم سا حسین نہیں ہے... میری نظر سے پوچھو، تم سا کہیں نہیں ہے...

لیکن موسموں کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے۔ انسان خوش ہو تو اسے چلچلاتی دھوپ میں بھی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ غمگین اور پریشان ہو تو چاندنی بھی جھلسانے لگتی ہے۔

اچانک عمران کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف جان محمد صاحب تھے۔ انہوں نے کہا۔ "عمران! کوئی تم سے ملنے آیا ہے، یہاں میرے دفتر میں۔"

"کون؟" عمران نے پوچھا۔

"لو خود ہی بات کرو۔" جان صاحب کی آواز موبائل کے اسپیکر میں سے ابھری۔

چند سیکنڈ بعد کوئی انگلش میں بولا۔ "ہیلو عمران! کیسے ہو؟ کہاں چھپے بیٹھے ہو برادر۔"

میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ بھاری بھرکم آواز مسٹر ریان ولیم کے علاوہ اور کسی کی نہیں تھی۔ عمران بولا۔ "گڈ ایوننگ مسٹر ریان! آپ کب آئے؟"

"میں نے کہا تو تھا کہ میں کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔ تم سے ملنے کے لیے... میں اور مسٹر ریچی بہت بے چین تھے۔"

"یعنی مسٹر ریچی بھی آئے ہیں؟"

"بالکل، وہ بھی موجود ہیں۔ انہیں بھی تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تم کتنی دیر میں پہنچ سکتے ہو یہاں؟"

"آپ دونوں اس وقت ہیں کہاں؟"

"جان محمد کے آفس میں۔ اگر تمہیں مشکل ہے تو ہم خود آجاتے ہیں۔"

"نہیں، نہیں۔ ایسی بات تو نہیں۔ کیا میں... ابھی آجاؤں؟"

"بالکل ابھی... یہاں ایک دلچسپ معاملہ تمہارا انتظار کررہا ہے..." ریان ولیم نے کہا۔

"ٹھیک ہے جی، میں لباس تبدیل کرکے تیس چالیس منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔"

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم جان محمد صاحب کے دفتر واقع میکلوڈ روڈ پر موجود تھے۔ گوشت کے پہاڑ مسٹر ریان ولیم نے بڑی گرم جوشی سے عمران کا استقبال کیا۔ پروفیسر ریچی بھی ہم دونوں سے بڑے تپاک کے ساتھ ملے۔ پروفیسر ریچی کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ان کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ سرخ و سپید تھا اور نفیس سی عینک لگا رکھی تھی۔

چائے کی میز پر ہماری گفتگو شروع ہوئی۔ پہلے تو ان حیران کن واقعات کا ذکر ہوتا رہا جو چند ہفتے پہلے پیش آئے تھے۔ سوال و جواب کا وہ بے نظیر مقابلہ جس کی انعامی رقم ایک سو بیس کروڑ کے قریب تھی۔ اس انعامی مقابلے میں عمران اور ہیری کا ہارنا لیکن پھر اس ہار میں سے سلامتی اور جیت کا پہلو نکل آنا۔ ایک طرف تقریباً ایک سو بیس کروڑ روپے مالیت کے شان دار "فیلکن 900 سی" طیارے کا تباہ ہو جانا اور دوسری طرف ہیری کا لاٹری کے ذریعے ایک معقول رقم جیت جانا۔ یہ سارے واقعات زیادہ پرانے نہیں تھے اور ابھی تک ہمارے ذہنوں میں تازہ تھے۔

پروفیسر ریچی تو پہلے ہی عمران کا گرویدہ تھا، اب ریان ولیم بھی نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے عمران کی ذہانت اور "لک" پر ایک وجدانی قسم کا بھروسا... ہو چکا ہے۔ اس نے عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ایمران! میں اور ریچی ایک بہت اہم کام تمہارے سپرد کرنا چاہتے ہیں اور پتا نہیں کیوں ہمیں یقین ہے کہ یہ کام تم بہت آسانی سے کرسکتے ہو۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے کسی لائق سمجھتے ہیں۔" عمران نے رسمی انداز میں کہا۔

پروفیسر ریچی اور مسٹر ریان کی نظروں کا تبادلہ ہوا۔ پھر ریان نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ایمران! یہاں ہمارا واسطہ ایک عجیب سے کریکٹر سے پڑا ہوا ہے۔ ایک ایسا بندہ جسے ہینڈل کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہوگیا ہے۔ ایک ایسا پیچیدہ بندہ ہے جو لالچ میں آرہا ہے، نہ پیار سے رام ہورہا ہے، نہ سختی سے۔"

پروفیسر ریچی نے اپنی گھنی بھوری مونچھوں کے نیچے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آنجہانی ہٹلر نے کہا تھا، جارحیت کا اپنا ایک جادو ہوتا ہے۔ جو کام پیار محبت کے ساتھ برسوں میں نہیں ہوسکتا، وہ میں طاقت کے استعمال سے چند گھنٹوں میں بخوبی کرسکتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہٹلر بھی ہوتا تو یہاں آکر ناکام ہوجاتا۔"

"کوئی بہت سخت جان بندہ ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"نہیں... اس کے الٹ ہے۔" مسٹر ریان نے جواب دیا۔ "سمجھو کہ سرکنڈے میں جان پھنسی ہوئی ہے۔ بالکل دبلا پتلا۔ عمر اسی سال سے اوپر ہے۔ بیماریوں نے گھیرا ہوا ہے۔"

جان محمد صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ "وہی جو کہتے ہیں نا کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔"

"لیکن جناب! ہم اس سے حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک اہم سوال ہے مگر فی الحال اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے یا کہہ لو کہ مکمل جواب نہیں ہے۔" مسٹر ریان ولیم نے کہا۔

"آپ کچھ وضاحت کرنا پسند کریں گے؟" عمران نے سوال کیا۔

مسٹر ریان ولیم نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "کچھ لوگ ہم سے یہ کام معاوضے پر کروا رہے ہیں ایمران۔ خاصا معقول معاوضہ دے رہے ہیں۔ ہمیں ابھی تک صرف اتنا ہی پتا ہے کہ کوئی بہت خاص چیز ہے جو کسی غلطی سے یا پھر اتفاقاً اس سنکی بڈھے کے قبضے میں آگئی ہے۔ وہ یہ "چیز" واپس کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس پر بہت سختی بھی نہیں کی جاسکتی۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ کئی طرح کی بیماریوں کا شکار ہے۔ تین دفعہ تو اس کا بائی پاس ہی ہو چکا ہے۔ کسی بھی جسمانی صدمے کی وجہ سے اس کی زندگی کی ڈور ٹوٹ سکتی

ہے۔ شاید تمہیں تھوڑا بہت اندازہ ہو کہ ایسے لوگ جو بالکل قریب المرگ ہوتے ہیں، اپنی زندگی موت کی طرف سے خاصے بے پروا ہوجاتے ہیں۔ یہ بڈھا بھی ان میں سے ایک ہے۔"

عمران نے کہا۔ "جناب! آپ کی بات ٹھیک ہے کہ ایسے کچھ لوگ اپنی زندگی کی طرف سے بے پروا ہوجاتے ہیں مگر ان کو کسی بات پر مجبور کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے قریبی عزیز... ان کے پوتے پوتیاں، ان کی ان محبتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔"

ریان ولیم نے کہا۔ "یہاں اس معاملے میں یہی تو مصیبت ہے، یہ بالکل لنڈورا شخص ہے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ بیوی پچیس تیس سال پہلے اللہ کو پیاری ہوچکی ہے۔ دو بیٹے تھے، وہ برسوں پہلے "اباجی" کی سخت مزاجی کی وجہ سے ان کو چھوڑ کر بیرون ملک جاچکے ہیں اور وہیں پر آباد ہیں۔ ان سے بزرگوار کا کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں ہے۔ ایک بیٹی تھی، اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ بھی کوئی بیس برس پہلے فوت ہو چکی ہے۔ اب جناب اکیلے ہیں اور اپنے پانچ ایکڑ کے فارم ہاؤس میں تن تنہا رہتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی تھوڑی بہت دلچسپی ہے تو وہ پرندوں اور جانوروں میں ہے۔ انہوں نے فارم ہاؤس میں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بنا رکھا ہے۔ اس چڑیا گھر کی دیکھ بھال کے لیے کچھ ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ اپنی دیکھ بھال کے لیے ایک ڈاکٹر ہے اور دو تین ملازمائیں ہیں۔ خاصے امیر کبیر ہیں۔ چاہیں تو نئے ماڈل کی دو تین گاڑیاں رکھ سکتے ہیں مگر ایک ستر ماڈل کی شیورلیٹ رکھی ہوئی ہے اور اگر کہیں آنا جانا ہو تو اسی پر سفر کرتے ہیں۔"

عمران نے ریان ولیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "جناب! آپ کے ذہن میں یہ بات کیوں آئی ہے کہ میں اس شخص کو ہینڈل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہوں؟"

ریان ولیم نے طویل کش لے کر سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور کہا۔ "اس کی دو وجوہات ہیں ایمران۔ پہلی وجہ تو وہی ہے جو میں تمہیں پہلے بتاچکا ہوں۔ میں تمہاری "لک" پر بہت بھروسا کرنے لگا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جس کام میں ہاتھ ڈالو گے، اس کا کوئی اچھا نتیجہ ہی نکلے گا اور دوسری وجہ تمہیں ریچی بتائے گا۔ بتاؤ ریچی۔" ریان نے پروفیسر ریچی کی طرف دیکھا۔

ریچی نے اپنے سرخ و سپید چہرے پر نفیس عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "ایمران! جیسا کہ تمہیں مسٹر ریان نے بتایا ہے... اس سنکی بوڑھے کا ایک ہی شوق ہے اور وہ

ہیں جانور۔ وہ دن رات ان میں گم رہتا ہے۔ اگر ملک کا صدر یا وزیراعظم بھی اس کے فارم ہاؤس پر چلا جائے تو وہ اس کو اتنی اہمیت نہیں دے گا جتنی اس عام شخص کو دے گا جو کسی جانور کی کسی خاص بیماری کے بارے میں اسے کچھ بتا سکتا ہو۔ وہ جانوروں سے پیار کرتا ہے اور ان لوگوں کو بھی اہمیت دیتا ہے جو جانوروں سے پیار کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے میرا ذہن تمہاری طرف گیا ہے ایمران... تم جانوروں سے بہت جلد ناتا جوڑ لیتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری یہ خاص صلاحیت اس سنکی کو ضرور متاثر کرے گی بلکہ حیران بھی کرے گی۔ تم ضرور اس کے قریب جانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "جناب! آپ نے ابھی تک اس بزرگ کا نام نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ یہ رہتے کہاں ہیں؟"

مسٹر ریان نے کہا۔ "یہاں لاہور کے قریب ہی کوئی قصبہ ہے، شاید شیکا ڈپورہ۔"

"شیکا ڈپورہ نہیں... شیخوپورہ۔" جان محمد صاحب نے تصحیح کی۔ "اور باباجی کا نام سہراب جلالی ہے۔ بڑے مشکل سے بندے ہیں۔ اب عمر رسیدہ ہونے کے بعد مزید مشکل ہوگئے ہیں۔ میں نے بھی تھوڑا بہت ان کے بارے میں سن رکھا ہے۔ کچھ عرصہ انگریز کی فوج میں بھی رہ چکے ہیں۔ یہ پاکستان، ہندوستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ ملازمت کے دوران میں ایک انگریز کرنل کا جبڑا توڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہ آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے۔ ہم نے جلالی صاحب سے اپنے سرکس کے لیے ریچھ کا ایک بچہ حاصل کیا تھا۔ تب ان سے واسطہ پڑا اور ہمیں پتا چلا تھا کہ وہ بڑے میلانی قسم کے بندے ہیں۔"

عمران نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "ریان صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے۔ اگر ہمیں کوئی غیر قانونی یا ناجائز کام نہیں کرنا پڑے گا تو ہم حاضر ہیں لیکن ہمیں تھوڑا بہت اندازہ تو ہوجائے کہ ہمیں کرنا کیا ہوگا؟"

"سب سے پہلے تو اس گھر میں داخل ہونا ہے اور دیکھنا ہے کہ وہاں کس قسم کی سرگرمی ہے۔ اگر اگلے چھ سات روز میں یہ پہلا مرحلہ طے ہوگیا تو پھر تمہیں مزید ہدایات دے دی جائیں گی۔ باقی رہی کام کے جائز یا ناجائز ہونے کی بات تو یقین رکھو کہ یہ سو فیصد جائز کام ہے۔ وہ خبطی بڈھا ایک ایسی چیز پر قبضہ جمائے ہوئے ہے جو ہرگز اس کی نہیں ہے اور جس کا اس کے پاس رہنا اس کے اپنے لیے بھی

خطرناک ہے۔ انڈر ورلڈ کے کئی لوگ ایسے ہیں جو اس شے کی خاطر اس کے جانی دشمن ہو سکتے ہیں۔"

اس انوکھے اور پُراسرار موضوع پر ریان ولیم اور پروفیسر ریچی سے ہماری گفتگو قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ ریان ولیم کہنے کو تو یہی کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ناجائز کام کروانا نہیں چاہ رہا لیکن اس کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا۔ یہ کام ناجائز بھی ہو سکتا تھا، غیر قانونی اور خطرناک بھی۔

ہماری بات اختتام پذیر ہوئی تو ریان ولیم نے ایک چیک کاٹ کر عمران کے حوالے کیا۔

"یہ کیا ہے جناب؟" عمران نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارا حصہ۔"

"کس چیز میں؟"

"اسی کوئز شو کے انعام میں جس میں تم نے حصہ لیا تھا۔" ریان مسکرایا۔

"لیکن وہ تو ہم ہار گئے تھے۔"

"مگر ہمیں بنیادی انعام کی تھوڑی سی رقم تو ملی تھی۔ اس رقم سے جو لاٹری خریدی گئی، اس نے ہیری کو قریباً 8 ملین ڈالرز دلا دیے۔ یہ سب قسمت کی کرشمہ سازی ہے۔ اس رقم میں سے یقیناً تمہارا بھی تھوڑا بہت حصہ بنتا ہے۔"

عمران انکار کرتا رہا لیکن ریان نے چیک زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے چیک پہ ایک ترچھی سی نظر ڈالی۔ یہ پچاس لاکھ روپے کا تھا...

اس چیک کے بعد ریان ولیم نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے ایک اور چیک کاٹا۔ یہ پانچ لاکھ روپے کا تھا۔ ریان ولیم نے کہا۔ "یہ اس کام کے لیے تمہارے ابتدائی اخراجات کے لیے ہے۔"

اس کے انداز سے اشارہ مل رہا تھا کہ اگر عمران کسی طرح ریان اور پروفیسر ریچی کی توقعات کے مطابق کام کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ خاصی بڑی رقم حاصل کر سکے گا۔

☆☆☆

اگلے دو تین روز میں کچھ واقعات تیزی سے رونما ہوئے۔ یہاں وہی محاورہ صادق آرہا تھا کہ قدرت جب دیتی ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ چند ہفتے پہلے کی کارکردگی کی بنیاد پر ایک معقول رقم عمران کے ہاتھ آگئی تھی... بلکہ آگے کے لیے بھی اچھے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ "تابش! یہ پچاس لاکھ روپے نصرت کا علاج شروع کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو چند ہفتوں میں مزید انتظام ہو جائے گا۔ تم ثروت سے بات کرو اور پروگرام طے کر لو۔"

"لیکن عمران! میں یہ رقم نہیں لے سکتا اور شاید ثروت بھی خود کو اس پر آمادہ نہ کر سکے۔"

"میں مکا مار کر تمہاری بتیسی ہلا دوں گا۔ تکلفات میں مت پڑو۔ یہ ایک انسانی زندگی کا سوال ہے۔ تم ابھی بات کرو ثروت سے۔"

"لیکن میں کس حیثیت سے اسے یہ رقم دوں اور وہ کس حیثیت سے قبول کرے گی؟ وہ اپنے شوہر کو کیا بتائے گی اس بارے میں؟"

"اس کا کوئی حل تمہیں خود ڈھونڈنا ہوگا۔"

"لیکن عمران... یہ رقم..."

"دیکھو تابی! زیادہ "تکلف حسین خاں" مت بنو۔ اگر زیادہ بات ہے تو اسے ادھار سمجھ لو۔ جب تمہارا مکان فروخت ہوگا، مجھے لوٹا دینا۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اس نے حسبِ عادت اپنی ہتھیلی سے میرا منہ ڈھانپ دیا اور تب تک نہیں چھوڑا جب تک میں ڈھیلا نہیں پڑ گیا۔

رات کو میں دیر تک سوچتا رہا۔ میری سمجھ میں ایک ہی طریقہ آرہا تھا۔ میں اپنے چچا احمد کو اس کام کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ وہ آج کل "ویانا" میں رہائش پذیر تھے۔ آرسہ ان کی بیوی سلطانہ کی بھتیجی تھی۔ یہ آرسہ وہی کزن تھی جو مجھے شادی کے لیے گھیرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ جب ثروت مجھ سے جدا ہو کر بھائی ناصر کے ساتھ جرمنی چلی گئی تو آرسہ نے کئی طرح سے مجھ پر جال پھینکنے کی کوشش کی۔ اب قریباً ڈھائی سال پہلے آرسہ کی شادی ہو چکی تھی۔ چچا احمد اور چچی سلطانہ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ دو سال پہلے ویانا چلے گئے تھے۔

اگلے روز میں نے ثروت کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ راوی روڈ والے گھر پر آجائے۔ مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ ثروت خاصی ذہین تھی۔ بے شک میں نے اسے نصرت کی حالت کے بارے میں کھل کر کچھ نہیں بتایا تھا مگر وہ جان چکی تھی کہ رپورٹس اچھی نہیں ہیں اور شاید وہ خدشے بھی درست ثابت ہوئے ہیں جو نصرت کے بارے میں شروع میں ظاہر کیے گئے تھے۔

وہ سہ پہر کے وقت آئی۔ میں اس سے اکیلے میں اور تفصیلاً بات کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا عمران اور اقبال اس کے آنے سے پہلے ہی گھر سے چلے گئے تھے۔ ثروت نے کبھی برقع نہیں پہنا تھا لیکن آج کل وہ اپنی آمد و رفت کو چھپانے کے لیے برقع استعمال کر رہی تھی۔ ہر لباس کی طرح برقع بھی اس کے جسم پر بہت جچتا تھا۔ حالانکہ وہ زینت کے لیے نہیں پردے کے لیے تھا۔ نقاب میں سے بس اس کی خوب صورت آنکھیں ہی نظر آتی تھیں اور یہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ آج کل دکھ کے سمندر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

میں نے کہا۔ "ثروت! آنکھیں بند کرنے سے حقیقت اوجھل نہیں ہو جاتی۔ اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جب بندہ ایک بار حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیتا ہے تو پھر بڑے بڑے مسئلوں کا حل بھی نکل آتا ہے۔ ہمیں اب یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نصرت بیمار ہے... اور خاصی بیمار ہے..."

ثروت نے ایک سرد آہ بھری اور دل کڑا کر کے پوچھا۔ "رپورٹس کیا کہتی ہیں؟"

"جگر کا کینسر۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھی رہی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرتے رہے...

میں نے تسلی بخش انداز میں کہا۔ "ثروت! ہم نصرت کا علاج کروا رہے ہیں اور تم دیکھنا وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"کیا دوائیوں سے علاج ہو جائے گا؟" اس نے مری مری آواز میں پوچھا۔

"نہیں ثروت! اس کے لیے سرجری کی ضرورت پڑے گی اور یہ سرجری باہر کے ملک میں ہو تو زیادہ اچھا ہے۔"

"لیکن... لیکن اس پر تو بہت زیادہ خرچا آئے گا۔"

"خرچے کی فکر نہ کرو۔ جس طرح فرح میری چھوٹی بہن ہے، اسی طرح نصرت بھی ہے۔ ہم اس کی بیماری سے لڑیں گے اور اللہ نے چاہا تو جیت کر دکھائیں گے۔"

"لیکن یہ کس طرح سے ہوگا تابش! میں یوسف کو کیا بتاؤں گی۔ میں تو پہلے ہی بہت ڈر رہی ہوں۔ میں یوسف کو بتائے بغیر آپ سے مل رہی ہوں۔ انہیں پتا چل گیا تو پتا نہیں وہ کیا سوچیں گے۔"

"میں اس سارے معاملے میں نہیں آؤں گا ثروت... یہ سب کچھ کسی اور طرح سے ہوگا۔ میں نے طریقہ سوچ لیا ہے۔"

"کیسا طریقہ؟"

"چچا احمد اور چچی جان آج کل آسٹریا میں ہیں۔ شاید ویانا میں ہی رہ رہے ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ ہم نصرت کو علاج کے لیے بھی ویانا ہی لے جائیں گے۔ میں چچا احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری پوری پوری مدد کریں گے۔ ویسے بھی وہ تم دونوں بہنوں سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ وہ یہی ظاہر کریں گے کہ وہی نصرت کو علاج کے لیے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ اور وہی اخراجات میں بھی تعاون کریں گے۔ بس یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب کچھ ارینج کر لوں گا۔"

ثروت نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں اور جیسے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے پلکیں جھکا لیں۔

اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ وہ بھی مجھ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر حیران ہے۔ میں جو ماضیِ قریب میں ہر طرح سے ایک ناتواں اور دبا ہوا شخص تھا، اب مشکل حالات کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا تھا اور میرے لب و لہجے کا اعتماد ثابت کرتا تھا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔

مجھے یہ جان کر از حد خوشی ہوئی کہ میرا اعتماد ثروت کو بھی اعتماد بخش رہا ہے۔ وہ جو نصرت کی بیماری کے متعلق بات کرنے سے بھی خوف زدہ رہتی تھی، اب بات کر رہی تھی۔ مجھ سے مختلف سوالات پوچھ رہی تھی۔ میں نے بجلی کی کیتلی کے ذریعے اسے چائے بنا کر دی۔ میرے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے اس کی نازک انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں۔ اس مختصر سے لمس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا اور میرے ذہن میں یادوں کے ان گنت دریچے وا ہو گئے۔ جب ہم قریب تھے، یک جان دو قالب کی طرح... شب و روز میں ایک جادو تھا۔ موسم حسین تھے۔ کانوں میں ہر وقت نغمے گونجتے تھے اور دلوں کی دھڑکنیں ایک ہی لے پر رقص کرتی تھیں۔

میں نے سوچا... کیا ثروت کو بھی وہ سب کچھ یاد ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ یاد نہ ہو؟ انسان کتنا بھی بدل جائے، رسم و رواج، مذہب اور معاشرے کے بندھن اسے کتنا بھی جکڑ لیں، دل و دماغ میں نقش ہو جانے والی سنہری یادوں کو کھرچا تو نہیں جا سکتا۔ ذرا سی ہوا چلے تو ماہ و سال کے در کھل جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ جنہیں کوئی گریز، کوئی وجہ روک نہیں سکتی۔

رات کو فون پر چچا احمد سے میری طویل بات ہوئی۔ میں نے انہیں ساری صورتِ حال بتائی اور یہ بھی بتایا کہ میں

کیا کرنا چاہتا ہوں...

نصرت کی بیماری کے معاملات نے چچا احمد کو بھی بہت پریشان کیا۔ وہ آبدیدہ ہو گئے۔ وہ دیانا کی کسی الیکٹرک کمپنی میں درمیانے درجے کی ملازمت کرتے تھے۔ چار پانچ افراد کی فیملی تھی۔ بس گزر بسر ہو رہی تھی۔ میں نے چچا احمد کو ثروت کے گھریلو حالات کے بارے میں بھی تھوڑا بہت بتایا اور انہیں آگاہ کیا کہ نصرت کے علاج کا کام انہیں کس طرح کرنا ہوگا۔ اس سارے کام میں میرا نام نہیں آنا تھا۔ چچا احمد کو خود ہی ثروت سے رابطہ کرنا تھا اور پھر نصرت کے علاج معالجے کی بات آگے چلانا تھی...

ایک دن بعد چچا احمد سے میری ایک اور ٹیلی فونک گفتگو ہوئی۔ اس میں مزید تفصیلات طے کی گئیں۔ میں نے قریباً پچاس لاکھ روپے دیانا میں چچا احمد کے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا انتظام بھی کر دیا۔

ایک طرف یہ کام ہو رہا تھا، دوسری طرف عمران مسٹر ریان ولیم کی ہدایت کے مطابق شیخوپورہ کے قریب سہراب جلالی کے فارم ہاؤس میں پہنچ چکا تھا۔ وہ وہاں باورچی کے روپ میں داخل ہوا تھا اور اس طرح مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ جہاں اور بہت سے کام کر لیتا ہے، وہاں کھانا پکانا بھی جانتا ہے۔ رات کو اس نے جلالی کے فارم ہاؤس سے ہی مجھے فون کیا۔ ”جگر! اب آجاؤ تم بھی۔ مجھ سے اکیلے یہ سارا کام نہیں سنبھالا جا رہا۔ پیاز کاٹ کاٹ کر میں نابینا ہونے والا ہوں۔“

”ایسے کام تو مجھ سے بھی نہیں ہوں گے۔“

”لیکن کچھ ایسے کام بھی ہیں جو تم کر لو گے۔ بس اب آجاؤ فٹافٹ۔ میں نے جلالی صاحب سے کہہ رکھا ہے کہ میرا اسسٹنٹ بھی ایک دو دن میں آنے والا ہے۔ پرسوں یہاں ایک دعوت بھی ہے۔ میں تو پیاز چھیل چھیل کر بینا کماری بن جاؤں گا۔“

”بینا کماری کیوں؟“

”بھئی میں رونے دھونے کی بات کر رہا ہوں۔ باقی یہاں کے حالات واقعی گڑبڑ ہیں۔ اندر خانے کچھ نہ کچھ ہے۔ ایک دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں جان کر میری کھوپڑی فیل ہو گئی ہے۔ تم آؤ گے تو کچھ مشورہ بھی ہو جائے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں، ایک ایک اور دو گیارہ۔“

”کس قسم کی باتیں ہیں؟“

”بس کچھ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں۔ لگتا ہے کہ یہاں کوئی فلم چل رہی ہے۔ تو پھر کب پہنچ رہے ہو تم؟“

”میں چاہتا ہوں کہ ثروت اور نصرت یہاں سے علاج کے لیے روانہ ہو جائیں تو پھر آؤں۔“

”جگر! وہ کام تو اب ہو ہی جانا ہے۔ ابھی جیلانی کا فون آیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آٹھ دس روز تک ویزا لگ جائے گا۔ اب وہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم بس آنے والی بات کرو۔“

”ٹھیک ہے، کل شام تک پہنچ جاؤں گا... لیکن آنا کس حیثیت سے ہے؟“

”تمہیں بتایا تو تھا، تم میرے معاون ہو۔ کچھ عرصہ پہلے ایک بڑے ہندوستانی صنعت کار نے لاہور میں ہمارے ہاتھ کا کھانا کھایا اور ہمیں اپنے ساتھ انڈیا لے گیا۔ انڈیا میں ہم دونوں کئی کھاتے پیتے گھرانوں میں خدمات انجام دے چکے ہیں جن میں مشہور فلمی ستارے بھی شامل ہیں۔ مثلاً راج کپور، سمیتا پاٹیل، امجد خان، دیویا بھارتی۔“

”جن ستاروں کے تم نے نام لیے ہیں، وہ سارے کے سارے دارِفانی سے کوچ کر چکے ہیں۔“

”تو یار! انہوں نے ہمارے کھانوں کی وجہ سے تو کوچ نہیں کیا ہے۔ اور اگر کیا بھی ہے تو اس میں اچھائی کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ ہمارے پکائے ہوئے کھانے اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ بندہ ان پر اپنی جان لٹا دیتا ہے۔“

”اچھا زیادہ زبان مت چلاؤ۔ مجھے وہاں کس نام سے پہنچنا ہے اور تمہیں کس نام سے بلاتا ہے؟“

”تم اپنے اصلی نام سے ہی آؤ گے اور مجھے جس طرح کی عزت چاہے دے لینا۔ استاد جی کہہ لینا، ماسٹر جی، جناب، سر، وغیرہ وغیرہ۔“

...وہ ایک شفق رنگ شام تھی جب میں ایک دیہاتی تانگے سے اترا اور فارم ہاؤس کے مین دروازے کی طرف بڑھا۔ میں عام سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اس وسیع فارم ہاؤس کو ایک دس فٹ اونچی پختہ دیوار سے محفوظ کیا گیا تھا۔ دیوار سے اوپر خاردار تار بھی تھے۔ گیٹ پر دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ انہیں میری آمد کے بارے میں پہلے ہی بتایا جا چکا تھا لہٰذا مجھے گیٹ سے گزرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک محافظ نے پکار کر کہا۔ ”فتح محمد! ان بھائی صاحب کو باورچی خانے میں عمران صاحب کے پاس پہنچا دو۔“

فتح محمد گھنی مونچھوں اور گہری رنگت والا ایک دراز قد شخص تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ ہونٹ سگریٹ نوشی کے سبب سیاہ تر تھے۔ اس کے کندھے سے پستول کا سیاہ ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس نے مجھے پرکھنے والی نظروں سے دیکھا پھر ایک لفظ کہے بغیر میرے آگے آگے چل دیا۔ فارم کی زمین کے بیچوں بیچ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک پرانی عمارت تھی۔ دیواروں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ عمارت کا رقبہ قریباً دو کنال ہوگا۔ عمارت تک ایک طویل ڈرائیو وے جاتا تھا۔ اس کی دونوں طرف کیاریاں تھیں اور سفیدے کے درخت تھے۔ سورج کا سرخ تھال ان درختوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ دائیں طرف ٹیڈی بکریوں کا ایک بہت بڑا باڑا نظر آرہا تھا۔ بائیں طرف ایک فش فارم تھا جس کے کنارے پر خشک گوبر وغیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم ڈرائیو وے پر چلتے ہوئے پورچ میں پہنچے۔ اس پیدل سفر کے دوران میں نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا رہا کہ کچھ نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ پورچ میں جلالی صاحب کی پرانی شیورلیٹ ایک نئی شان کے ساتھ موجود تھی۔ جلد ہی میں کوٹھی کے وسیع باورچی خانے میں عمران کے ساتھ موجود تھا۔

فتح محمد ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو عمران نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ”تم بڑے وقت پر آئے ہو تابی... یہاں زبردست مارکٹائی ہونے والی ہے۔“

”کس کے ساتھ؟“

”میرے ساتھ۔“

”کیا مطلب؟“

اس نے کھڑکی میں دور کھڑے ایک بیٹے کٹے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک کوتاہ قامت شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے انداز اور حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہے۔ ”یہ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں کا بڑا ویٹرنری ڈاکٹر۔ اس نے یہاں کے سارے جانوروں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔“

”لیکن یہ تم سے کیوں جھگڑے گا؟“

”بس اس کی دم پر میرا پاؤں آگیا ہے۔ اس کے سارے جسم میں مرچیں بھری گئی ہیں۔“

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے وسیع باورچی خانے پر ایک نظر ڈالی۔ تین، چار دیگچوں میں کھانا پک رہا تھا۔ عمران بڑی مہارت سے باری باری ان میں چمچہ چلا رہا تھا۔ خوشبو مزے دار تھی اور اس بات کا پتا دیتی تھی کہ وہ اس کام میں اناڑی نہیں ہے۔ باورچی خانے میں تمام جدید اور مہنگی سہولتیں موجود تھیں۔ ایک طرف ماضی کی مشہور فلم اسٹار جین فونڈا کی ایک بڑی تصویر لگی تھی۔ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں فلم اسٹار ”کک“ کا لباس پہنے کچھ پکانے میں مصروف تھی۔ ایک الماری میں کوکنگ سے متعلق بہت سی کتابیں رکھی تھیں۔

”لو جی، وہ پھڈے باز اسی طرف آرہا ہے۔“ عمران نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

درمیانی عمر کا ہٹا کٹا شخص غصے میں تپا ہوا باورچی خانے کی طرف آرہا تھا۔ اس کا انداز تشویشناک تھا۔

عمران نے دو چولہے بند کیے اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ مار کھانے کے لیے یہ جگہ بالکل مناسب نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”یار! دیکھو یہاں اتنی خوب صورت فلم اسٹار کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ کیسی LIVE تصویر ہے۔ لگتا ہے وہ باقاعدہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ اتنی حسین عورت کے سامنے بےعزت ہونے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔“

وہ نکلا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مار کھانے کی باتیں جان بوجھ کر کر رہا ہے۔ ایک ویٹرنری ڈاکٹر بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہیں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو، تم صرف خانساماں ہو اور وہ بھی اسسٹنٹ خانساماں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند سیکنڈ بعد ہٹا کٹا شخص دندناتا ہوا باورچی خانے میں داخل ہوا۔ پھر ہمیں ساتھ والے کمرے میں دیکھ کر ہماری طرف چلا آیا۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال ہوگی۔ ناک چوڑی اور پھولی ہوئی تھی۔ ماتھے پر کٹ کا پرانا نشان اس کی تند مزاجی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

وہ عمران کو دیکھ کر پھنکارا۔ ”میں نے کل کیا کہا تھا تم سے؟ کیا کہا تھا؟ میں نے بکواس کی تھی کہ میرے کام میں دخل مت دو۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب! وہ اتنی مہنگی بلی... وہ مر رہی تھی اور آپ لاہور گئے ہوئے تھے۔ مجھے لگا کہ اس کے اندر کچھ نہ گیا تو وہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں نکال سکے گی۔“

”وہ مر جاتی۔ ساری بلیاں مر جاتیں لیکن تم حرامزادے کون ہوتے ہو میرے معاملوں میں ٹانگ اڑانے والے۔ کون سی ڈگری ہے تمہارے پاس؟ کیا کوالیفکیشن ہے تمہاری؟ کس باغ کی مولی ہو؟“

اس نے عمران کو زور سے دھکا دیا۔ عمران دیوار سے ٹکرایا پھر غصے میں بولا۔ ”دیکھو ڈاکٹر راشد! زبان سے بات کرو، ہاتھ مت چلاؤ۔ ورنہ...“

اس نے ہاتھ گھما کر عمران کو تھپڑ مارا۔ ”ورنہ کیا... ورنہ کیا... کیا کرلے گا تو... کتے کے بچے... دو ٹکے کے باورچی... میں دانت توڑ دوں گا تیرے۔“ وہ عمران پر پل پڑا۔ عمران گر گیا۔ اس نے لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

میں نے عمران کو چھڑانے کی ادھوری سی کوشش کی۔ اس کوشش میں مجھے بھی ایک دو گھونسے پڑے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ عمران کی کوئی پلاننگ ہے۔

عمران پر غصہ اتارنے کے بعد ڈاکٹر راشد پھنکارتا اور گالیاں بکتا ہوا واپس چلا گیا۔ عمران کی ایک باچھ سے خون رسنے لگا تھا۔ رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔

عمران واپس باورچی خانے میں آگیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کسی صابر شاکر بیوی کی طرح پھر سے کھانا پکانے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ پچھلے چار پانچ دنوں میں اس ڈاکٹر راشد سے کافی یاد اللہ ہوگئی ہے تمہاری۔“

”تمہیں پتا ہے، اڑیل بندوں سے یاد اللہ ہو ہی جاتی ہے میری۔ یہاں جلالی صاحب کے چڑیا گھر میں ایک بڑی قیمتی ایرانی بلی ہے۔ دس پندرہ دن میں اس نے بچے بھی دینے ہیں۔ وہ بیمار ہے۔ دو ہفتے سے کچھ بھی کھا پی نہیں رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی ”ٹریٹ منٹ“ اس پر الٹا اثر کر رہی ہے۔ میں نے بلی کو پیار محبت سے سمجھایا۔ اسے گانا سنایا... کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے... بلی کا دل پسیج گیا۔ اس نے آج میرے ہاتھوں سے قریباً ایک پاؤ دودھ پیا ہے۔ بس اسی بات سے ڈاکٹر صاحب کو تپ چڑھ گئی ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں ”کارِ سرکار“ میں مداخلت کر رہا ہوں۔“

”لیکن اس اچھے کام کے لیے تمہیں اس ڈنگر ڈاکٹر سے مار کھانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”بس یہ معرفت کی باتیں ہیں۔“ اس نے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے باورچی خانے کے چوبی اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”فون پر تم نے بتایا تھا کہ یہاں فارم ہاؤس میں کچھ الٹی سیدھی باتیں ہو رہی ہیں۔“

”یار! تم بڑے گھامڑ ہو۔ ابھی جو کچھ تم نے دیکھا ہے، کیا وہ الٹا سیدھا نہیں ہے؟ ایک سانڈ نما ڈاکٹر نے تمہارے سامنے تمہارے یار کو مارا پیٹا ہے اور دندناتا ہوا واپس چلا گیا ہے۔ اور کیا یہ الٹا سیدھا نہیں ہے کہ تمہاری شکل میں ایک ایسا شخص یہاں باورچی کی خدمات انجام دینے آیا ہے جسے انڈا تلنا بھی نہیں آتا۔ اور اگر اس کے علاوہ بھی کچھ الٹا سیدھا دیکھنا چاہتے ہو تو وہ بھی دیکھ لینا۔ ابھی رات ہونے والی ہے۔“

”کیا مطلب، رات ہونے والی ہے؟“

”یار! اکثر الٹی سیدھی باتیں رات ہی کو تو ہوتی ہیں۔“ اس نے آنکھ میچی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ اس نے ایک نیپکن کی گدی بنائی اور اسے چولہے پر گرم کرکر کے اپنے رخسار کی چوٹ کی ٹکور کرنے لگا۔

میں عمر رسیدہ سہراب جلالی کو دیکھنا چاہتا تھا مگر رات گئے تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تاہم میں نے جلالی کے پرائیویٹ چڑیا گھر کا ایک حصہ ضرور دیکھا۔ وہ یقیناً جانوروں میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے ان کی رہائش اور خوراک وغیرہ کا بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ یقیناً اس کام پر لاکھوں خرچ ہو رہے تھے۔ اس نے بعض جانوروں کی ملکیت کے لیے باقاعدہ لائسنس لے رکھے تھے۔ کئی قسم کے ہرن، سانپ، ریچھ اور زیبرے وغیرہ اس کی کلیکشن کا حصہ تھے۔ حال ہی میں اس نے تیندوے کا ایک جوڑا بھی حاصل کیا تھا۔ ابھی وہ عارضی قیام گاہ میں تھا۔ اب اس جوڑے کے لیے ایک شایانِ شان رہائش گاہ تیار ہو رہی تھی۔ اس رہائش گاہ کے عقب میں نایاب اور کم یاب پرندوں کے بہت سے پنجرے تھے۔

عمران کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا، اس سے پتا چلا کہ جانوروں کا ایک ڈاکٹر چوبیس گھنٹے یہاں فارم میں رہتا ہے۔ اس کے ساتھ دو اسسٹنٹ بھی ہیں۔ سینئر ڈاکٹر راشد ایک دن چھوڑ کر یہاں وزٹ کرتا ہے۔ سہراب جلالی کی دو ذاتی معالج ہیں۔ دونوں نوجوان ڈاکٹرز ہیں۔ اس کے علاوہ فارم ہاؤس میں ملازمین کا ایک دستہ ہے جس کے ارکان کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ مرد ملازم فارم ہاؤس میں خدمات انجام دیتے ہیں جبکہ ملازمائیں کوٹھی کے اندر ہوتی ہیں۔

رات سکون سے گزری۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ سہراب جلالی سے میری پہلی ملاقات اگلے روز صبح سویرے ہی ہوگئی۔ عمران بڑی چابک دستی سے ناشتا تیار کر رہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھا۔ جیسے انڈا پھینٹنا، ٹماٹر اور پیاز کاٹنا، آئل گرم کرنا۔ اچانک ایک چھوٹے سے ٹیڈی کتے کی باریک آواز سنائی دی۔ کتا تیزی سے کچن کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک خوب صورت اسٹریپ تھا۔ یہ اسٹریپ جس شخص کے ہاتھ میں تھا، وہ سہراب جلالی تھا۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر میں حیران ہوا۔ اس کا وزن بمشکل پچاس کلو گرام رہا ہوگا۔ اس نے نیکر پہن رکھی تھی جس میں سے اس کی سوکھی سڑی ٹانگیں دو چوبی بیساکھیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ چہرہ جھریوں بھرا، مونچھیں سفید اور گھنی، آنکھیں گدلی تھیں۔ اپنے نیم گنجے سر کو اس نے پی کیپ سے چھپا رکھا تھا۔ عمران نے مجھے بتایا تھا کہ جلالی کا دل ٹھیک سے کام نہیں کرتا۔ اس کے سینے میں دل کی رفتار برقرار رکھنے کے لیے ”پیس میکر“ لگا ہوا ہے۔ اس پیس میکر کے علاوہ بھی جلالی کی ”بے مثال صحت“ کی کچھ نشانیاں اس کے لاغر جسم پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی ایک کلائی پر انجکشن وغیرہ لگانے کے لیے ”کینولا“ لگا ہوا تھا۔ جسم سے کسی فاسد مادے کے اخراج کے لیے لگائی جانے والی تھیلی بھی کمر سے جھول رہی تھی۔

ان ساری صعوبتوں کے باوجود وہ اکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ سب سے پہلے عمران کے رخسار کی چوٹ پر ہی پڑی۔ ”یہ کیا ہے بھئی؟“ اس نے قدرے باریک آواز میں پوچھا۔

”بس جی... کل کھڑکی کا پٹ لگ گیا تھا...“

جلالی بولا۔ ”کھڑکی کا پٹ لگنے سے ایسی چوٹ تو نہیں آتی۔ یہ تو لگتا ہے کہ کسی نے گھونسا مارا ہے۔ نیچے ٹھوڑی پر بھی نیل نظر آ رہا ہے۔“

”نن... نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”ڈاکٹر راشد سے تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا؟“

”نہیں جی۔ ان سے جھگڑا کیوں ہوگا؟“

”وہ اپنے کام میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا اور تم تین دن سے ایرانی بلی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہو۔“ جلالی کا لہجہ تھوڑا سا سخت تھا۔

”غلطی ہوگئی تھی جی... اب ایسا نہیں کروں گا۔“

”کیوں نہیں کرو گے تم ایسا؟ تم ایسا کرو گے بلکہ آج سے چاروں ایرانی بلیوں کی خوراک کی ذمے داری تمہاری ہے۔“

”مم... میں سمجھا نہیں جی۔“

”تمہیں پتا ہے، میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ ایرانی بلیوں کا وزن مسلسل کم ہو رہا ہے۔ انہیں کھانا پلانا تمہاری ذمے داری ہے۔“

”لیکن... جناب... ڈاکٹر راشد صاحب؟“

”ڈاکٹر راشد ملازم ہے، مالک نہیں ہے۔ مالک میں ہوں۔ اور تم وہی کرو گے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اور اس کو تم سے معافی بھی مانگنی پڑے گی۔“

”معافی... کس بات کی جی؟“

”زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔ میں جانتا ہوں یہاں کل جو کچھ ہوا ہے۔ اور اب اپنی چونچ بند کرو۔ وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔“

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ جلالی نے جیسے پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا اور انگلی اٹھا کر بولا۔ ”اور یہ کون ہے؟“

”تابش نام ہے جی اس کا۔ میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ یہ میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔“

جلالی نے ایک مرتبہ پھر مجھے گھورا پھر سر ہلا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، اسے یہاں کے اصول قاعدے اچھی طرح سمجھا دو۔“

”جو حکم جناب۔“ عمران نے ادب سے سر جھکایا۔ میں نے بھی گردن کو خم دیا۔ سہراب جلالی نے ٹیڈی کتے کے اسٹریپ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ شاہی سے واپس مڑا... سہراب جلالی اس کے پیچھے پیچھے چلتا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

سہراب جلالی کے جانے کے بعد عمران نے دائیں بائیں دیکھا پھر جلالی کی نقل اتارتے ہوئے اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ آنکھوں پر خیالی چشمے کو درست کیا... نیکر کے ”گیلوز“ کو اوپر کی طرف کھینچا اور بولا۔ ”برخوردار! دوپہر کا کھانا ٹھیک بارہ بجے اور رات کا کھانا ساڑھے آٹھ بجے کھایا جاتا ہے۔ نہ ایک منٹ زیادہ نہ کم۔ سونے کا وقت دس بجے ہے۔ دس بجے تک ساری روشنیاں بجھ جانی چاہئیں۔ سگریٹ نوشی ایک دم ممنوع ہے... بلکہ ہر طرح کی تمباکو نوشی۔ کوئی ملازم یا اس کا کوئی ملاقاتی ایسا کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے سزا کے طور پر فارم کے دو چکر دوڑ کر لگانے پڑیں گے اور تنخواہ کا چوتھائی حصہ کاٹ لیا جائے گا۔ ٹی وی دیکھنا بھی منع ہے... موسیقی دھیمی آواز میں سنی جاسکتی ہے لیکن وہ بھی پرانی۔ ”ویڈیو“ پر پرانی انگلش اور اردو فلمیں دیکھی جاسکتی ہیں... اسّی کی دہائی سے بعد کی فلمیں دیکھنے پر بھی خاطر خواہ جرمانہ ہوگا... اور تم... تم ایسے مسکرا کیوں رہے ہو؟ میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو؟ مذاق سمجھ رہے ہو؟“

اس نے غصے میں آکر کچن کی میز پر زور سے مکا مارا۔ جلالی کے انداز میں عینک کو درست کیا اور پھنکارا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے... دور ہو جاؤ میری نظروں سے... تمہاری

تنخواہ تمہارے ایڈریس پر بھیج دی جائے گی۔ گیٹ آؤٹ۔'' اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ جلالی کے انداز میں اپنی ذاتی ڈاکٹر کو آواز دیتے ہوئے بولا۔ ''مہناز... گولی لاؤ... سانس ٹھیک کرنے والی گولی لاؤ۔''

''یہ ڈراما بند کرو۔ میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ جلالی صاحب کس ٹائپ کی چیز ہیں۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ جلالی صاحب کو کل والے واقعے کا پتا کیسے چلا؟ یہاں بھی تم جی کے دربار کی طرح کوئی جادو وغیرہ تو نہیں چلتا؟'' میرا اشارہ کل ہونے والی مار پٹائی کی طرف تھا۔

''جادو تو ہر جگہ چلتے ہیں پیارے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ جدید جادو ہیں۔ انٹرنیٹ بھی ایک جادو ہے۔ یہ سیٹلائٹس بھی جادو ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر باسی کے گھر کا صحن تک دیکھ سکتے ہیں...''

''یہاں کون سا جادو ہے... انٹرنیٹ یا سیٹلائٹ؟''

''یہاں خفیہ کیمرے نصب ہیں۔''

''بہت خوب! مجھے لال کوٹھیاں یاد آ گئیں۔ وہاں بھی تو میڈم صفورا نے خفیہ نگرانی کا انتظام قائم کیا ہوا ہے... لیکن... ایک بات کی وضاحت فرما دو۔''

''ارشاد۔''

میں نے کچن میں دائیں بائیں دیکھا پھر ہولے سے کہا۔ ''اگر یہاں خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں تو پھر ابھی تم نے جلالی صاحب کی جو بھونڈی نقل اتاری ہے اور ان کے اسٹائل کی مٹی پلید کی ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟''

''اتنی کچی گولیاں میں نے نہیں کھیلی ہوئیں... بلکہ میں نے تو سرے سے گولیاں ہی نہیں کھیلیں... کیمرے ہر جگہ نہیں ہیں۔ بس خاص خاص جگہوں پر ہیں...''

''یعنی کل جس کمرے میں ڈاکٹر راشد نے تمہیں تھپڑ اور ٹھڈے وغیرہ مارے وہاں کیمرا نصب تھا؟''

''عقل مند ہوتے جا رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ کل جب عمران نے ڈاکٹر راشد کو غصے کی حالت میں کچن کی طرف آتے دیکھا تھا تو یہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں کیوں چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا... یار یہاں پری چہرہ جین فونڈا کی تصویر لگی ہوئی ہے، یہاں مار کھاتے اچھا لگوں گا۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتوں کے پیچھے اکثر کوئی وجہ ہوتی تھی۔

شام کے ٹھیک چار بجے جب میں اور عمران کچن میں چائے کی تیاری کر رہے تھے، میں نے ڈرائنگ روم میں سہراب جلالی کو دیکھا۔ وہ گداز صوفے میں دھنس کر بیٹھے ہوئے تھے اور صوفے کا حصہ ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ ڈاکٹر راشد سے گفتگو میں مصروف تھے۔ ان کا انداز سمجھانے بجھانے والا تھا۔ آج وہ بڑے تحمل سے بات کرتے نظر آ رہے تھے۔ مگر اڑیل ڈاکٹر راشد اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ تاہم کسی وقت وہ اپنی بات سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ موضوع گفتگو یقیناً کل والا واقعہ ہی تھا۔ شاید جلالی صاحب، ڈاکٹر راشد کو آمادہ کر رہے تھے کہ وہ اپنی جارحیت پر عمران سے معذرت کر لے۔

جب ملازم ان دونوں کو چائے سرو کر کے آیا، تب تک سب ٹھیک تھا۔ پھر پتا نہیں کیسے اچانک جلالی صاحب تھے سے اکھڑ گئے۔ ہم نے ان کے چلانے کی آوازیں سنی۔ ڈرائنگ روم میں جھانکا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے چنا رخ سے ایک زوردار تھپڑ ڈاکٹر راشد کے منہ پر مارا پھر ایک چھتری پکڑ لی۔ وہ بڑی تیزی سے اسے پیٹنے لگے۔ وہ ہکا بکا تھا۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن جلالی صاحب اسے موقع ہی کہاں دے رہے تھے... وہ الٹے پاؤں چلتا چلتا پشت کے بل گرا۔ جلالی صاحب نے اسے ٹھوکریں ماریں۔ ڈاکٹر کبھی شدید غصہ دکھاتا تھا، کبھی معذرت کا انداز اختیار کرتا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ دیدنی تھی۔ ''نکل جاؤ یہاں سے۔ اور یہ کپڑے بھی اتارو۔ یہ وردی میری دی ہوئی ہے... اتارو یہ وردی بھی۔''

جلالی صاحب نے ڈاکٹر راشد کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اس کی شرٹ اتارنے کی کوشش کی۔ جلالی صاحب کا رخ نظر سمجھ کر گارڈز ڈاکٹر راشد کی طرف لپکے۔ جلالی صاحب ڈاکٹر راشد کو مار رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس کے کپڑے اتارنے کا حکم بھی دے رہے تھے۔ دو منٹ کے اندر اندر ڈاکٹر راشد کے جسم پر چڈی اور بنیان کے سوا اور کچھ نہ رہا۔ جلالی صاحب دہاڑے... ''دو منٹ کے بعد تمہیں فارم کے اندر نظر نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ کتے چھوڑ دوں گا...''

ہم نے ڈاکٹر راشد کو بڑی بے توقیری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے اور راہ فرار اختیار کرتے دیکھا۔ جلالی صاحب کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ایک طرف سے تو جوان لیڈی ڈاکٹر مہناز اپنے سفید کوٹ میں دوڑتی ہوئی آئی۔ ایک ملازم وہیل چیئر لایا۔ جلالی صاحب بے دم ہو کر اس پر بیٹھ گئے۔ یہ قریباً ویسا ہی نقشہ تھا جو آج سویرے عمران نے مذاق مذاق میں کھینچا تھا۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کا بلڈ پریشر چیک کیا پھر فوراً انہیں ایک گولی کھانے کے لیے دی۔

وہ ساتھ ساتھ انہیں پُرسکون ہونے کی تلقین بھی کر رہی تھی۔ جلالی صاحب کا پارا بدستور چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل فون نکالا اور اپنے سیکریٹری ندیم سے کہا کہ وہ ڈاکٹر عقیل کا نمبر ملائے۔ ڈاکٹر مہناز اپنا خوب صورت ہاتھ جلالی صاحب کے سینے پر چلا رہی تھی اور انہیں آمادہ کر رہی تھی کہ وہ ابھی کسی سے بات نہ کریں۔ لیکن جلالی صاحب کی تیوریاں بتا رہی تھیں کہ وہ اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں۔

سیکریٹری ندیم نے نمبر ملایا تو انہوں نے فون پر گرجتے ہوئے کہا۔ اسے باریک آواز میں گرجنا کہا جا سکتا تھا۔ ''ڈاکٹر عقیل! کہاں ہو تم؟... ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ فوراً لاہور واپس آؤ... اور شیخوپورہ پہنچو۔ میں تمہیں ابھی اسی وقت اس بدمعاش راشد کی جگہ پر اپائنٹ کر رہا ہوں... ابھی اسی وقت... نہیں... نہیں... یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم ابھی شیخوپورہ پہنچو۔ یہ حکم ہے میرا۔''

جلالی کے مزاج کا یہ رخ دیکھنے کے بعد ان کی شخصیت کے بارے میں کافی کچھ پتا چل رہا تھا۔ جو ایک دوسری بات معلوم ہو رہی تھی، وہ یہ تھی کہ جلالی صاحب خوب صورتی کو پسند کرتے تھے۔ ان کی دونوں ذاتی معالج نوجوان اور خوب صورت تھیں۔ خاص طور سے مہناز۔ وہ ہمہ وقت ان کے ساتھ نظر آتی تھی۔ جلالی صاحب کی عمر اور صحت تو ایسی ہرگز نہیں تھی کہ وہ ایک مرد کی حیثیت سے خواتین کی خلوت سے روایتی فائدہ اٹھا سکتے۔ تاہم جس طرح خوب صورت پھولوں کی موجودگی طبع میں خوش گواری پیدا کرتی ہے، اسی طرح عین ممکن تھا کہ خوب صورت خواتین کی موجودگی سے جلالی صاحب کے دل و دماغ پر اچھے اثرات پڑتے ہوں۔ میں نے دیکھا تھا کہ فارم ہاؤس میں موجود بیشتر ملازمائیں جوان اور خوش شکل تھیں یا کم از کم قبول صورت تھیں۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ایک شان دار ہنڈا اکارڈ پورچ میں آکر رکی۔ اس میں سے اترنے والی ایک جواں سال خاتون تھی۔ عمر چھبیس ستائیس سال ہوگی۔ اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ شہد رنگ خوب صورت بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ ایک درمیانے قد کاٹھ کا سفید فام بھی اس کے ساتھ تھا۔ خاتون کے ہاتھ میں اسٹیل کا بنا ہوا ایک نہایت نفیس و دیدہ زیب پنجرہ تھا۔ اس پنجرے میں بالکل چھوٹے سائز کی دو رنگین چڑیاں تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ خاتون اور اس کا ساتھی چڑیوں کا یہ جوڑا جلالی صاحب کے لیے بطور تحفہ لائے ہیں۔

جلالی صاحب سے ان دونوں مہمانوں کا وقت طے تھا، اس لیے وہ سیدھے کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا، جواں سال عورت بڑی عاجزی اور لگاوٹ سے جلالی صاحب سے باتیں کر رہی تھی۔ جلالی صاحب نے نیکر پہن رکھی تھی۔ وہ گاہے بگاہے ان کے سوکھے سڑے گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگاتی تھی۔ نایاب چڑیوں والا پنجرہ شیشے کی تپائی پر رکھا تھا۔

میں کچن میں پہنچا۔ میں عمران کو ان مہمانوں کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر وہ بڑے انہماک سے ایک دیگچے میں چمچہ چلانے میں مصروف تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کچن کیبنٹ کے اندر رکھا ہوا ریڈیو بھی سن رہا تھا۔ میں نے سمجھا شاید وہ ''ایف ایم'' سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھنا چاہا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ''شی'' کی آواز نکالی۔

اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ریڈیو نہیں سن رہا۔ یہ کوئی نئی طرز کا ڈکٹا فون تھا۔ ڈکٹا فون کا ریسیور بڑی صفائی سے ایک ڈیکوریشن پیس میں چھپایا گیا تھا۔ یہ ڈیکوریشن پیس کچن کیبنٹ کے اندر پڑا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا تو ڈرائنگ روم میں ہونے والی گفتگو کی آوازیں وضاحت سے مجھ تک پہنچنے لگیں۔

عورت کی دلکش آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''بس جی، وہ خود بھی اپنی غلطی مان رہا ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ آپ کا سامنا کر سکے۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو وہ خود بھی آپ کے پاس حاضر ہو جائے گا۔''

''نہیں، کوئی ضرورت نہیں اس کے آنے کی۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا... اگر وہ آئے گا تو پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ اور ایک بات تم دونوں بھی اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ پیار محبت جتا کر اور نرم رویہ دکھا کر مجھے کسی غلط کام پر آمادہ کر لو گے تو یہ خیال بھی دل سے نکال دو۔ وہ باکس تمہارا نہیں اور نہ میرا ہے۔ ہم میں سے کسی کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ میرے پاس بھی وہ بس امانت کے طور پر ہے۔ اس کا اصل مالک مل جائے گا تو میں اسے ایک منٹ بھی اپنے پاس رکھنا بہت بڑا گناہ سمجھوں گا۔''

''پلیز سر... پلیز، اب اس کا ذکر مت چھیڑیں۔ وہ چیپٹر کلوز ہو گیا ہے۔ میں تو آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر یہاں آئی ہوں۔ یقین کریں آپ کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے کسی شان دار لائبریری میں بہت سا وقت گزارا ہے۔''

''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ مجھے لائبریری سے کتابیں چوری کرنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔'' جلالی صاحب نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

جواں سال عورت نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھی نوجوان کا قہقہہ بھی اس میں شامل تھا۔

نوجوان نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''انکل! خدا کرے باکس کا مالک مل جائے۔ آپ اس کے لیے پورا پورا انتظار کریں۔ دو مہینے، چار مہینے، چھ مہینے لیکن اگر وہ نہ ملا تو پھر وہ چیز آپ کے لیے تو بالکل بیکار ہوگی لیکن ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود آپ اس بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے، وہ ہمیں دل و جان سے قبول ہوگا۔ اور اگر...''

''تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟'' جلالی نے نوجوان کی بات کاٹتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔

''مائیکل جناب۔''

''مائیکل صاحب! کیا میرے ماتھے پر لکھا ہوا ہے کہ میں الو کا پٹھا ہوں...؟''

''جج... جی... میں سمجھا نہیں۔''

''میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔ کھڑے ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں کھڑے ہو جاؤ۔''

جواں سال عورت نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز جلالی کی پرجلال آواز میں دب گئی۔ وہ چلائے۔ ''تم بھی کھڑی ہو جاؤ۔ نیچے رکھو یہ چائے کا کپ... نیچے رکھو۔''

جلالی کی متلون مزاجی ایک بار پھر کام دکھا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی صورتِ حال ڈرامائی ہو گئی تھی۔ جلالی کی کڑکتی آواز سنائی دی۔ ''تم لوگ کیا سمجھتے ہو؟ جو کام مجھ پر سختی کرنے سے نہیں ہو سکا، وہ مجھے بہلا پھسلا کر اور بے وقوف بنا کر کروا لو گے...؟ تمہارے جیسے لونڈے لونڈیوں کو اپنے ازار بند سے باندھ کر رکھتا ہوں میں... میں نے تم سے کہا تھا کہ اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ اب پھر وہی بکواس کر رہے ہو تم؟''

جلالی صاحب کی آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ جواں سال خاتون گھبرا کر بولی۔ ''جلالی صاحب! مائیکل کا مطلب یہ نہیں تھا۔ وہ تو...''

''بند کرو بکواس۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے... فوراً نکلو۔'' غالباً جلالی صاحب نے جواں سال خاتون کو دھکا دیا تھا۔

نوجوان بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مسٹر جلالی! ہم تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے لیکن تم خود مشکل کو دعوت دے رہے ہو۔ اس طرح سے نہیں چلے گا...''

''آ گئے ہو نا اپنی اصلیت پر۔ تم گینگسٹر ہو، حرامزادے ہو۔ میں تمہیں قتل کر دوں گا، جان سے مار دوں گا۔''

''اپنے بڑھاپے پر رحم کھا جلالی۔ مرنا مشکل ہو جائے گا تیرا...''

''تو کر دو مشکل۔ الٹا لٹکا دو اپنے اس باپ کو... لیکن اس باپ نے تمہیں کچھ بتا کر نہیں دینا۔ آخری دم تک نہیں۔'' جلالی صاحب اتنے زور سے بولے تھے کہ انہیں کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ صورتِ حال دھماکا خیز ہوتی جا رہی تھی۔

عمران نے ڈکٹا فون کا ریسیور آف کر کے کچن کیبنٹ کا پٹ بند کیا اور مجھے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف آیا۔ تب تک جلالی صاحب جواں سال عورت اور اس کے سخت گیر ساتھی کو دھکے مار کر ڈرائنگ روم سے باہر نکال چکے تھے۔ ہمارے سامنے ہی رنگین چڑیوں والا قیمتی پنجرہ ڈرائنگ روم کے دروازے سے باہر گرا اور پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔ جلالی صاحب گرجے... ''آئی سے گیٹ آؤٹ... جسٹ ناؤ... یو باسٹرڈ... یو راسکل۔''

پھر ہم نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا۔ جلالی صاحب نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرا اور جھکتے جھکتے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کا رنگ زردی مائل ہو رہا تھا۔ ''ڈاکٹر مہناز!'' کسی نے زور سے پکار کر کہا۔

اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ ڈاکٹر مہناز بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ اس نے جلدی سے جلالی صاحب کو صوفے پر لٹایا۔ ان کی زبان کے نیچے ایک اسپرے کیا۔ پھر ایک انجکشن بھرنے لگی۔ جلالی صاحب نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ لگتا تھا کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر مہناز نے جلدی جلدی ان کی وین میں دوا انجیکٹ کی۔

میں نے دیکھا، جواں سال عورت کا چہرہ پریشانی اور گھبراہٹ کی آماجگاہ تھا۔ وہ اپنے ساتھی سفید فام نوجوان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے غصہ تھا کہ اس کی تلخ کلامی کی وجہ سے جلالی کا پارا چڑھا تھا اور اب وہ سنگین صورتِ حال سے دوچار تھے۔ جواں سال عورت نے آگے بڑھ کر جلالی کی حالت کا اندازہ لگانا چاہا۔ ڈاکٹر

مہناز طیش سے بولی۔ ”پلیز! آپ لوگ باہر چلے جائیں... آپ ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ آپ کو پتا بھی ہے سب کچھ۔“

جواں سال عورت باہر آگئی اور بے قراری سے ہاتھ ملنے لگی۔ ڈاکٹر مہناز کی ساتھی ڈاکٹر لائبہ بھی گھبرائی ہوئی پہنچ گئی۔ مہناز کی ہدایت پر ڈاکٹر لائبہ موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے لگی۔ غالباً اپنے کسی سینئر سے ڈسکس کرنا چاہ رہی تھی۔ ڈاکٹر مہناز ہی کی ہدایت پر سیکریٹری ندیم بھاگتا ہوا گیا اور آکسیجن کا سلنڈر اور ماسک وغیرہ لے آیا... جلالی صاحب کو فوراً آکسیجن چڑھا دی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ان لوگوں نے جلالی صاحب کو HOSPITALIZE کرنے کا بیشتر انتظام گھر پر ہی کر رکھا ہے۔

اس ساری افراتفری کے دوران میں ہی جواں سال عورت اور اس کا ساتھی، فارم ہاؤس سے کھسک گئے۔ میں نے ان کی نئی ہنڈا اکارڈ کو بیرونی گیٹ کی طرف جاتے دیکھا... جلالی صاحب مسلسل آنکھیں بند کیے لیٹے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑبڑا بھی رہے تھے۔ ان کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ ڈاکٹر مہناز انہیں طبی امداد دے رہی تھی۔ ساتھ ساتھ انہیں پُرسکون رہنے کی تلقین بھی کر رہی تھی۔ لیکن ”جلالی“ تو ماننے والے شخص کا نام ہی نہیں تھا۔ آخر ڈاکٹر مہناز نے انہیں ایک اور انجکشن دے دیا۔ غالباً یہ انہیں پُرسکون کرنے کے لیے تھا۔

میں اور عمران کچن میں واپس آگئے۔ ”یہ کیا گورکھ دھندا ہے یار! یہ کس باکس کی بات ہو رہی ہے یہاں؟“

”یہی معلوم کرنے کے لیے تو ہم یہاں ہیں۔“

”پھر بھی کچھ نہ کچھ تو اندازہ لگایا ہوگا تم نے... آخر جیمز بانڈ کے ہم زاد ہو تم۔ یہاں تم نے ڈرائنگ روم میں باقاعدہ ڈکٹا فون چسپاں کیا ہوا ہے۔“

خلاف توقع عمران سنجیدہ رہا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”یہ تو ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چیز کا باکس ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، خاصا قیمتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں رقم وغیرہ ہو یا کوئی قیمتی دھات، یا پھر نوادر قسم کی چیز۔ یہ باکس اتفاقاً ہی جلالی کے ہاتھ لگا ہے اور انہوں نے اسے کسی کی امانت کے طور پر سنبھال لیا ہے۔ جلالی صاحب سنکی شخص ہیں۔ ایسے لوگوں کے ذہن میں ایک بار جو بات بیٹھ جائے، وہ آسانی سے نکلتی نہیں۔ وہ اب اس باکس کو ایک امانت کا درجہ دے چکے ہیں اور اس سے پیچھے ہٹنے کو ہرگز تیار نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں انہوں نے اس باکس کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی ہو لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے اس کو کہیں چھپا دیا۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ خاصی محفوظ جگہ ہے اور اس کا پتا جلالی صاحب کے سوا اور کسی کو نہیں۔ اب جلالی صاحب سے اس باکس کو برآمد کروانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مشہور جاپانی فلاسفر میر تقی میر نے اپنی ”انگریزی کتاب“ کین عز خان جو نجو والے باب میں لکھا ہے۔ کبھی کبھی انسان کی کمزوری ہی اس کی طاقت بن جاتی ہے... یہاں حضرت جلالی صاحب کی ناتوانی ہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار بنی ہوئی ہے۔ درحقیقت جلالی صاحب پاکستان میں دوسرے نمبر کے اڑیل اور ضدی شخص ہیں۔“

”اور پہلے نمبر پر کون ہے؟“

”میں بتاؤں گا تو تم مجھ سے مارشل آرٹ شروع کر دو گے۔ یہ موضوع پھر کبھی سہی۔“ وہ شرارت سے بولا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”چند دن پہلے جلالی صاحب نے اپنی ان صلاحیتوں کو پوری طرح ثابت بھی کیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، کم از کم دو خطرناک پارٹیاں ایسی ہیں جو اس باکس کے پیچھے ہیں۔ ان میں سے ایک پارٹی تو وہی ہے جس کے دو ”معزز“ ممبران ابھی تھوڑی دیر پہلے جلالی صاحب سے مل کر گئے ہیں۔ کچھ دن پہلے یہ لوگ جلالی صاحب کو اپنا انتہائی خطرناک روپ بھی دکھا چکے ہیں۔ انہوں نے جلالی صاحب کے گھر میں ہی ان پر سختی کی بلکہ باقاعدہ تشدد کیا۔ جلالی صاحب کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اپنی زندگی موت کی طرف سے بھی وہ تقریباً بے پروا ہو چکے ہیں۔ وہ اس بدمعاشی کے خلاف ڈٹ گئے۔ تشدد کے دوران میں جب ان کی حالت خراب ہوئی تو تشدد کرنے والے خوف زدہ ہو گئے۔ انہوں نے بجا طور پر سوچا کہ اگر باباجی کی سانس کی ڈور ٹوٹ گئی تو وہ باکس ہمیشہ کے لیے ”گمشدہ“ ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ اس کوٹھی اور فارم ہاؤس کا چپا چپا چھان چکے ہیں۔ باباجی سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو بھی نچوڑ چکے ہیں لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔“

”اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اب باکس میں ہے کیا بلا؟ اور شاید اس سے بھی اہم یہ کہ وہ باباجی یعنی جلالی صاحب تک پہنچا کس طرح؟“

عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر مہناز اس سلسلے میں ہماری کچھ نہ کچھ مدد کر سکتی ہے مگر وہ بھی آج کل بہت ڈری ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہت پہلے ہی یہ فارم ہاؤس چھوڑ چکی ہوتی۔ یہ جلالی صاحب سے اس کا لگاؤ ہے جس نے اب تک اسے یہاں روکا ہوا ہے۔“

”لگاؤ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا وہ انہیں ایک بزرگ کی حیثیت دیتی ہے؟“

”نہیں یار! خود کو بزرگ کہنے والے کا تو جلالی صاحب منہ توڑ دیتے ہیں۔ یہ وہی ”لگاؤ“ ہے جو میر تقی میر کے شعروں میں ہوتا ہے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”فضول بول بول کر تمہارا دماغ چکرا گیا ہے۔ ابھی تم فرما رہے تھے کہ میر تقی میر ایک مشہور جاپانی فلاسفر کا نام ہے۔“

”میر تقی میر کے ننھیالی جاپان میں تھے اور ہر شاعر پارٹ ٹائم فلسفی بھی ہوتا ہے۔ تم بال کی کھال مت اتارا کرو۔ بس یہ بتاؤ کہ تم کسی طرح ڈاکٹر مہناز سے کچھ سن گن لے سکتے ہو یا نہیں؟“

”سن گن لینے والے کام تم مجھ سے بہتر کر لیتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”لیکن یہاں گڑبڑ ہے۔ پرسوں باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحبہ سے ذرا نوک جھوک ہو گئی تھی۔ وہ میری طرف سے ذرا بدگمان سی ہیں، تم کوشش کرو تو شاید بات بن جائے۔“

”کیا کیا تھا تم نے؟“

”بس وہی یار! زبان میں کھجلی سی ہو رہی تھی۔ میں نے تھوڑا سا پلول دیا۔ ان کو برا لگ گیا۔“ وہ معصومیت سے بولا۔

”یہ کھجلی کسی دن تمہیں بے طرح پٹوائے گی۔ ہر لڑکی کو شاہین سمجھنا چھوڑ دو۔“

”اچھا چچا جان! لیکن اب کیا کرو گے؟ مہناز سے بات کرنے کے لیے کوئی طریقہ ڈھونڈو۔“

... مجھے مہناز سے بات کرنے کا موقع اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ مل گیا۔ ٹھیک سات بجے ناشتا کرنے کے بعد جلالی صاحب اپنی چہیتی شیورلیٹ گاڑی میں لاہور چلے گئے تھے۔ ڈرائیور کے علاوہ عمران (باورچی) بھی ان کے ساتھ تھا۔ جلالی صاحب بہترین سبزی کے علاوہ بہترین دیسی مرغی کے گوشت کے بھی شوقین تھے۔ ان چیزوں کے انتخاب کے لیے وہ اپنی بیماری کے باوجود لاہور کی ٹولنٹن مارکیٹ تک جاتے تھے اور باورچی بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ میں اکیلا تھا۔ ذہن ثروت کی سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ نصرت کی بیماری کے حالات بھی پریشان کر رہے تھے۔ وہ ثروت کے ساتھ چچا احمد کے پاس آسٹریا پہنچ رہی تھی مگر علاج شروع ہونے تک ابھی کئی مرحلے باقی تھے۔ اتنے میں ملازم وحید نے آ کر بتایا کہ مہمان آئے ہیں۔ دو کپ چائے کی ضرورت ہے۔

شکر کا مقام تھا کہ انہیں ”ٹی بیگ“ والی چائے کی ضرورت تھی ورنہ میں کوئی ایسی خاص چائے بنانے کے قابل نہیں تھا۔ ”کون آیا ہے؟“ میں نے رسمی انداز میں وحید سے پوچھا۔

”ڈاکٹر مہناز کی والدہ ہیں۔“

کچھ دیر بعد وحید چائے لے کر چلا گیا تو میری رگِ تجسس پھڑکی۔ ڈاکٹر مہناز اور اس کی والدہ چھوٹے ڈرائنگ روم میں تھیں اور یہی وہ جگہ تھی جہاں عمران نے سینٹر ٹیبل کے نیچے ایک نہایت حساس مائیکروفون نصب کر رکھا تھا۔ میں نے کچن میں رکھے ڈیکوریشن پیس کے ساتھ تھوڑی سی کوشش کی اور ریسیور کو آن کرنے میں کامیاب رہا۔ ہلکی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان میں چائے کے برتن کھڑکھڑانے کی آوازیں بھی تھیں۔ میں نے ڈیکوریشن پیس کو کچن کیبنٹ کے اندر رکھا اور آواز کا حجم اپنی ضرورت کے مطابق کر لیا۔ ایک بڑی عمر کی عورت کی آواز ابھری۔ ”مہناز! سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ کسی بھی وقت دوبارہ مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟ میرا اور کون ہے تمہارا سوا؟“

”کچھ بھی ہے امی! میں ان حالات میں جلالی صاحب کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ انہیں میری ضرورت ہے۔“

”لیکن مہناز! یہ ضرورت کوئی اور ڈاکٹر بھی پوری کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر لائبہ یہاں موجود ہے۔ وہ اپنی مدد کے لیے کسی اور سینئر ڈاکٹر یا لیڈی ڈاکٹر کو یہاں بلا سکتی ہے۔“

”مگر امی! جس طرح میں ان کی طبیعت کو سمجھتی ہوں، کوئی اور نہیں سمجھے گا۔ اسے سمجھنے میں کافی وقت لگے گا۔“

بڑی عمر کی عورت کی تپی ہوئی آواز ابھری۔ ”کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ لوگ ٹھیک ہیں جو کہتے ہیں کہ تم جلالی میں بے وقوفی کی حد تک ”انوالو“ ہو چکی ہو... کچھ رحم کرو ہم پر مہناز... کیوں ہمارا تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ بھلا یہ کوئی بات ہے۔ وہ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں وہ ہر جگہ تمہیں اپنے ساتھ چپکا کے رکھتا ہے۔ وہ تمہارے...“

”پلیز امی... پلیز... خاموش ہو جائیں۔ میری اور اپنی توہین مت کریں۔ کیا مرد عورت کا بس ایک ہی تعلق ہوتا

ہے۔۔۔ایک ہی رشتہ ہوتا ہے۔۔۔؟“

”میں کب کہتی ہوں ایک ہی ہوتا ہے۔ بہت سے ہوتے ہیں لیکن تم اس رشتے کو کیا نام دو گی؟“ مہناز کی والدہ بھی بپھری ہوئی تھی۔

”ضروری نہیں کہ ہر رشتے کو نام ہی دیا جائے۔۔۔ اس کو کسی خودساختہ خانے میں ہی ”فٹ“ کیا جائے۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں، ان کی عزت کرتی ہوں۔۔۔ اور وہ محبت اور عزت کے قابل ہیں بھی۔ وہ ایک الگ طرح کے انسان ہیں۔ ان میں ایسی خوبیاں ہیں جو عام لوگوں میں نہیں ہوتیں۔۔۔“

”یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون سی عینک لگاتی ہو تم یہ خوبیاں دیکھتے ہوئے۔ ہمیں تو اس کھوسٹ میں رنگ برنگی بیماریوں، اکڑفوں اور غصے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔“

”پلیز امی۔۔۔ ان کے بارے میں ایسا مت بولیں۔ پلیز۔“ پھر ڈاکٹر مہناز شاید رونے لگی تھی۔

اس کی والدہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دیکھ مہناز! اگر تو نے میری بات نہیں مانی نا۔۔۔ تو پھر مجھے امی بھی مت کہنا۔ سمجھ لینا۔۔۔ کہ مر گئی ہے تمہاری امی۔۔۔ وہ بھی تمہارے باپ کے پاس چلی گئی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ اب نہیں آؤں گی۔۔۔“ وہ بات کرتے کرتے غالباً ٹیلیفون سے دور چلی گئی تھی لہٰذا اس کی آواز مدھم ہوتی گئی۔ میں نے پلٹ کر کچن کی ایک کھڑکی کھولی۔ مجھے چھوٹے ڈرائنگ روم میں سے ایک درمیانی عمر کی صحت مند عورت نکلتی نظر آئی۔ اس نے براؤن چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ غصے میں دکھائی دیتی تھی۔ تب ڈاکٹر مہناز دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر عورت کو روکنا چاہا۔۔۔ لیکن اس نے مہناز کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا اور کچھ کہتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

مہناز ہچکیوں سے روتی ہوئی جلدی سے ڈرائنگ روم کی طرف واپس چلی گئی۔ عورت پورچ میں کھڑی ایک گرے رنگ کی سوزوکی کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ کار میں ڈرائیور پہلے سے موجود تھا، وہ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ عورت ابھی مسلسل رو رہی ہے۔

میں کچھ دیر بعد چائے کے برتن لینے کے بہانے چھوٹے ڈرائنگ روم میں گیا تو ڈاکٹر مہناز کی آنکھیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ اس کے بالوں کی دو لٹیں برفی مائل چہرے پر جھول رہی تھیں۔ ایک سوگوار سی دلکشی نے اس کے نقوش کو ڈھانپا ہوا تھا۔

”کسی چیز کی ضرورت ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے آنکھیں ملائے بغیر پوچھا۔

”تابش! ایک گلاس پانی لے آؤ — مجھے گولی کھانی ہے۔“

”لیکن۔۔۔ آپ نے تو ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا۔ خالی پیٹ گولی؟“

”اوہ۔“ ڈاکٹر مہناز نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اچھی ڈاکٹر ہوں میں۔“

”کچھ لے آؤں؟“

”چلو، ڈبل روٹی کے دو پیس سینک لاؤ اور پانی۔“

میں دو تین منٹ میں پیس سینک کر لے آیا۔ میں نے پلیٹ میز پر رکھی تو وہ غور سے میرے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاہٹ کے انداز میں کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک سوال پوچھوں؟“

”ہاں کہو؟“

”مجھے یہاں آئے ہوئے بس دو چار دن ہی ہوئے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہاں فارم ہاؤس میں کچھ گڑبڑ ہے۔ سارے ملازم کچھ ڈرے ڈرے سے ہیں۔ ایک دوسرے سے زیادہ بات بھی نہیں کرتے؟“

”بس اس جگہ کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ یہاں بڑا سکون تھا، ہر چیز ایک روٹین کے مطابق تھی۔ پھول، پرندے، خوب صورت جانور، موسیقی، مزیدار کھانے سب کچھ تھا یہاں۔۔۔ لیکن اب سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ کسی ان دیکھے سے خوف نے ہر چیز کو جکڑ لیا ہے۔“

”خوف کی کوئی وجہ تو ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب؟“

”کوئی ایک وجہ تو نہیں ہے۔“ ڈاکٹر مہناز نے گول مول سا جواب دیا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”ابھی آپ نے کہا ہے کہ یہاں بہت سی اچھی چیزیں تھیں۔ پرندے، پھول اور مزیدار کھانے وغیرہ۔ آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہمارے پکائے ہوئے کھانے مزیدار نہیں ہوتے۔“

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”سچ پوچھو تو یہی مطلب ہے۔ پہلے دونوں باورچی بہت اچھے تھے۔“

”لیکن وہ چھوڑ کیوں گئے؟“

”اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں۔“ مہناز کا جواب پھر گول مول تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ جلالی صاحب کا ڈرائیور بھی چلا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو مالی بھی موجود نہیں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ یہاں کے حالات کی وجہ سے ملازمتیں چھوڑ گئے ہوں؟“

یکایک ڈاکٹر مہناز کو احساس ہوا کہ وہ میرے ساتھ ایک غلط موضوع چھیڑ بیٹھی ہے۔ میں ملازم کی حیثیت سے یہاں نیا نیا آیا تھا۔ وہ بولی۔ ”تم لوگوں نے جلالی صاحب کو بتایا ہے کہ تم اس سے پہلے انڈیا میں کام کرتے رہے ہو لیکن مجھے تم دونوں کے ہاتھوں میں کوئی خاص انڈین ذائقہ نظر نہیں آیا۔ اور سچ پوچھو تو۔۔۔“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”آپ نے بات ادھوری چھوڑ دی؟“ میں نے کہا۔

”سچ پوچھو تو مجھے تمہارا یہ استاد باورچی لگتا ہی نہیں۔ پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ اس نے روپ بدلا ہوا ہے۔“

میں اندر سے چونک گیا مگر تاثرات کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا کھانوں کے ذائقے میں کمی کی وجہ سے آپ کو ایسا لگ رہا ہے؟“

”یہ بات بھی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ باورچی اور خانساماں اس طرح کے نہیں ہوتے۔ یہ گہرا شخص لگتا ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ کام کرتے شاید زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“

”نہیں جی۔۔۔ چھ سات سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔“

”تم نے کچھ محسوس نہیں کیا؟“

”نہیں جی۔“ میں نے کہا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں نے کہا۔ ”ویسے۔۔۔ میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا میں بھی استاد عمران ہی کی طرح لگتا ہوں؟“

اس نے اپنی دھلی دھلائی آنکھوں سے مجھے مرتا پا دیکھا اور بولی۔ ”سچ بات یہ ہے کہ باورچی تو تم بھی نہیں لگتے۔ یا پھر یہ ہے کہ ماڈرن لوگوں کے ساتھ کام کر کر کے تم ذرا ماڈرن ہو چکے ہو۔ مجھے تمہارے ہاتھ پاؤں بھی کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ ان کی کھال بہت سخت ہے۔ جیسے مشقت۔۔۔“

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے دروازے کی نچلی درز میں سائے کی حرکت سی نظر آئی۔ یوں لگا کہ کوئی دروازے کے بالکل پاس موجود ہے۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ڈاکٹر مہناز کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ آہستگی سے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے کھول دیا۔ ایک تنومند شخص شاید ”کی ہول“ سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک دم ہکا بکا رہ گیا۔ غالباً اس نے دروازے سے ٹیک بھی لگا رکھی تھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور لڑکھڑا کر ایک قدم اندر آیا۔

وہ سفید شلوار قمیص میں تھا۔ میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا مگر اس نے مجھ سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے قمیص کے نیچے سے سیاہ پسٹل نکالا اور پھنکارا۔ ”خبردار! گولی مار دوں گا۔“

اس کے گول چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوکھلاہٹ میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر مہناز کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا۔ میں بھی جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ اس شخص نے ڈرائنگ روم کے دروازے کو اندر سے لاک کیا لیکن وہ ایک چیز بھول گیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ڈاکٹر مہناز کے کافی پاس آ گیا۔ ڈاکٹر خوف کے پہلے شدید حملے سے سنبھل چکی تھی۔ اس نے دلیری دکھائی اور تیزی کے ساتھ ماربل کے گل دان سے تنومند شخص کے ہاتھ پر چوٹ لگائی۔ گل دان ٹوٹ گیا اور پسٹل بھی حملہ آور کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اتنی مہلت میرے لیے کافی تھی۔ میں نے حملہ آور کے سینے پر ٹانگ جمائی۔ وہ صوفے پر گرا اور اسے الٹاتا ہوا قالین پر لڑھک گیا۔ میں اس پر جھپٹا لیکن راستے میں ہی بریک لگانے پڑے۔ اس شخص کے ہاتھ میں تقریباً ایک فٹ لمبے پھل والا خوفناک چھرا دکھائی دیا۔ وہ برق کی طرح مجھ پر آیا۔ اس نے پہلا وار گردن پر کیا۔ میں نے سرعت سے پیچھے ہٹ کر یہ جان لیوا وار بچایا۔ دوسرا وار پیٹ پر تھا۔ میں یہ وار بچانے میں بھی کامیاب رہا۔ میری کڑی مشقیں کام آ رہی تھیں، ورنہ میں ایسے بے رحم ”لڑاکوں“ کے مقابلے کی سکت کہاں رکھتا تھا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر مہناز دروازہ کھولنے کے لیے لپکی مگر قالین کے کنارے سے الجھ کر الٹے پڑے صوفے پر گری۔ حملہ آور کے قاتل چھرے کا تیسرا وار بچانے کے بعد مجھے جوابی حملے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس کی ناف میں ٹانگ رسید کی۔ وہ ڈکرایا اور تکلیف کی شدت سے جھکا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑا۔ اسے نیم دائرے کی شکل میں گھمایا اور دیوار سے دے مارا۔ یہ بڑا شدید تصادم تھا بلکہ میری توقع سے بھی شدید تھا۔ تنومند حملہ آور کا سر یقیناً پھٹ گیا تھا۔ وہ اوندھے منہ قالین پر گرا۔ چھرا اس کے ہاتھ سے نکل کر میز کے نیچے چلا گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر زوردار ٹھوکر رسید کرنے کے لیے پاؤں کو پیچھے کی طرف حرکت دی لیکن یہ حرکت وہیں رک گئی۔ حملہ آور کی آنکھیں بند تھیں۔ مجھے لگا وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔

اسی دوران میں دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ تیڑی

ڈاکٹر لائبہ کی آواز آئی۔ ''ڈاکٹر مہناز! کیا ہے؟ کون ہے اندر؟''

میرے اشارے پر ڈاکٹر مہناز نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر لائبہ اندر آئی تو میں نے دروازہ جلدی سے دوبارہ لاک کر دیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر نوجوان ڈاکٹر لائبہ کا رنگ بھی سفید پڑ گیا۔ صوفے پر گرنے سے ڈاکٹر مہناز کے بازو پر چوٹ آئی تھی اور اس کی پھول دار قمیص کا گریبان الٹے ہوئے صوفے کے پائے سے الجھ کر پھٹ گیا تھا۔ اس کا چمکیلا جسم خطرناک حد تک نظر آرہا تھا۔ اس نے اوڑھنی سے اپنے جسم کو ڈھانپا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور حملہ آور کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی ناک اور دائیں کان سے خون رسنے لگا تھا۔ یہ تشویشناک علامت تھی۔

اس کے جسم نے ایک خفیف سی جھرجھری لی اور ساکت ہو گیا۔ مجھے لگا وہ مر گیا ہے۔ صرف تین چار سیکنڈ بعد ڈاکٹر مہناز نے بھی دہشت زدہ انداز میں تصدیق کر دی۔ حملہ آور کی ایک کنپٹی پر نہایت سنگین چوٹ آئی تھی۔ ''او خدایا! یہ کیا ہو گیا؟'' ڈاکٹر مہناز لرزاں آواز میں بولی۔ لائبہ بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''کون تھا یہ؟'' میں نے ان دونوں سے پوچھا۔

''فارم کی ٹریکٹر ٹرالیاں چلانے والوں میں سے ہے۔ آٹھ دس دن پہلے ہی ملازم ہوا تھا۔'' ڈاکٹر مہناز نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''اب کیا ہوگا؟'' ڈاکٹر لائبہ روہانسی ہو کر بولی۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ اس شخص نے ہماری جان لینے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ یہ ملازم کے بھیس میں کوئی خطرناک مخبر تھا۔ لیکن... لیکن ابھی ہم نے اس خبر کو عام نہیں ہونے دینا۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

ڈاکٹر مہناز تھکی ہوئی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اب اس کے لیے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا کہ میں صرف ایک باورچی ہوں۔

میں نے تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اتفاقاً ارد گرد کوئی اور ملازم موجود نہیں تھا۔ نہ ہی ڈاکٹر لائبہ کے علاوہ یہاں کسی کو ڈرائنگ روم میں ہونے والی دھینگا مشتی کی خبر ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم کا صوفہ الٹا ضرور تھا مگر اس کی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صوفے کو سیدھا کر کے رکھا۔ باقی بے ترتیبی کو بھی درست کیا۔ پھر ڈاکٹر مہناز سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ اپنی اوڑھنی کو درست کر کے اپنے کمرے میں جائیں اور یہ قمیص بدل لیں۔ کسی کو ابھی کچھ نہیں بتانا۔ ہمارا مؤقف ہے کہ یہ بندہ ڈرائنگ روم کے سامنے والی سیڑھیوں سے گر کر مرا ہے۔ وہاں اوپر کسی نے پانی پھینکا ہوا تھا۔ یہ تیزی سے آیا اور لڑھک گیا... آپ دونوں میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟''

ڈاکٹر مہناز اور لائبہ جیسے ہپناٹائز ہو چکی تھیں۔ دونوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے حملہ آور کا پسٹل اور چھرا دونوں کپڑے میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیے۔ میں نے ڈاکٹر مہناز سے ایک بار پھر کہا کہ وہ حملہ آور کو چیک کرے۔ قریباً ایک منٹ بعد ڈاکٹر مہناز اور لائبہ دونوں نے تصدیق کی کہ وہ ''ایکسپائر'' ہو چکا ہے۔

''ٹھیک ہے، آپ دونوں جائیں۔ میں اس کی باڈی کو سیڑھیوں کے پاس رکھ دیتا ہوں۔ ایک بار پھر گزارش ہے کہ آپ ابھی اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ نہ جھوٹ بولیں، نہ سچ بولیں...''

ڈاکٹر مہناز بدستور مجھے گھور رہی تھی۔ اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ ''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ دونوں کون ہیں؟''

''میں وعدہ کرتا ہوں، میں آپ دونوں کو سب کچھ بتا دوں گا۔ اور سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو اور جلالی صاحب کو ہم سے فائدہ ہی پہنچے گا، نقصان نہیں...''

''کہیں تم... خفیہ پولیس سے تو...'' ڈاکٹر لائبہ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں نے کہا ہے نا۔ موقع ملتے ہی میں آپ دونوں کو سب کچھ بتا دوں گا۔ فی الحال صرف یہ گزارش ہے کہ مجھے دوست سمجھیں اور چند گھنٹے کے لیے مکمل خاموشی اختیار کریں۔''

دونوں ڈاکٹرز حواس باختہ تھیں۔ خاص طور سے ڈاکٹر لائبہ۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئیں تو میں نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔ متوفی کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے موبائل فون کے علاوہ ڈھائی تین ہزار کی نقدی، ٹریکٹر کی چابیاں اور اس قسم کی دوسری چیزیں برآمد ہوئیں۔ میں نے صرف موبائل فون نکالا۔ باقی ساری چیزیں دوبارہ اس کی جیبوں میں رکھ دیں۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر میں نے دھیان سے دائیں بائیں دیکھا۔ موقع اچھا تھا۔ میں نے لاش کو گھسیٹا اور سیڑھیوں کے آخری زینے کے سامنے ڈال دیا... اس کے بعد میں نے کچن تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

قریباً پانچ چھ منٹ مکمل خاموشی سے گزرے۔ بس فارم ہاؤس کے چڑیا گھر کی طرف سے بندروں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں یا طوطے ٹیں ٹیں کرتے رہے... کوٹھی کے اندر کسی کمرے میں دھیمی آواز سے ''ٹی وی'' بول رہا تھا۔ اچانک ایک ملازمہ سیڑھیوں کے قریب زور سے چلائی۔ اس کی آواز پوری کوٹھی میں گونجی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کہرام سا مچ گیا۔

☆☆☆

فارم ہاؤس میں اگلے آٹھ دس گھنٹے ہنگامہ خیز تھے۔ ڈاکٹر مہناز میری توقعات پر سو فیصد پوری اتری تھی۔ اس نے اور اس کے کہنے پر ڈاکٹر لائبہ نے بھی اپنی زبان بالکل بند رکھی تھی۔ اس ''حادثے'' نے وقتی طور پر جلالی صاحب کو بھی خاصا پریشان کیا۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ ہلاک ہونے والے اس مختار نامی شخص کے سر کے علاوہ کہیں کوئی اور زخم نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اس کے کپڑے پھٹے تھے، نہ ہی کسی طرح کی زیبی شہادت تھی۔ فارم ہاؤس میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ شخص ایک خطرناک قاتل ہے اور اپنے ایک خطرناک کرتوت کی وجہ سے موت کے گھاٹ اترا ہے۔ اس کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ وہ ایک سیدھا سادہ دیہاتی ڈرائیور ہے۔ محنتی ہے اور ایک قریبی مزار پر حاضری بھی دیتا ہے۔ کسی کو اس کے مہلک پسٹل کا پتا تھا اور نہ ایک فٹ لمبے چھرے کا۔ اس کا پورا نام مختار ملک تھا۔

عمران کی واپسی کے آدھ گھنٹے بعد ہی میں نے اسے اس واقعے کی پوری تفصیل بتا دی تھی۔ عمران کو بجا طور پر خدشہ تھا کہ فارم ہاؤس میں حملہ آور کا کوئی اور ساتھی بھی موجود ہو سکتا ہے۔

''ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''گھبراؤ مت۔ اللہ بخشے ''مختار ملک'' کا بھرا ہوا پسٹل میرے پاس ہے... اور اب مجھے ٹریگر دبانا بھی بڑی اچھی طرح آ گیا ہے۔ کہو تو تمہارے پاؤں کی طرف دبا کر دکھاؤں؟''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''بڑے پرزے نکل رہے ہیں تمہارے؟''

''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''ایک تو بیارج گورا لے تمہارے ہاتھوں مار کھا کر میرا مستقبل تاریک کر رہا ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

ہمارا اندازہ تھا کہ مختار کا تعلق لاہور سے تھا اور یہ بھی قیافہ تھا کہ چار پانچ بجے تک اس کے ورثا لاش وصول کرنے کے لیے پہنچ جائیں گے مگر شام کے بعد تک بھی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہمیں جلالی صاحب کے سیکریٹری ندیم کے ذریعے پتا چلا کہ مختار کو جس شخص کی ضمانت اور سفارش پر نوکری دی گئی تھی، وہ کوئٹہ میں ہے... اور فوری طور پر یہاں نہیں آ سکتا۔ مختار کی بیوی اور بھائی سے رابطہ ہو گیا ہے۔ ان کی خواہش پر میت کو بذریعہ گاڑی لاہور پہنچایا جا رہا ہے۔ ان اطلاعات سے بظاہر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شاید پوسٹ مارٹم وغیرہ کا خطرہ بھی ٹل گیا ہے۔ فارم ہاؤس میں بھی اس واقعے کو حادثاتی ہی سمجھا جا رہا تھا۔ اگر کسی کو کوئی شبہ تھا بھی تو اس نے زبانی اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں، میں نے ایک چیز نوٹ کی۔ کچھ ملازم اس واقعے کو پُراسرار رنگ بھی دے رہے تھے۔ دیہی علاقوں میں ایسے توہمات عام پائے جاتے ہیں۔ میں نے ایک ملازم کو یہ کہتے سنا کہ ان سیڑھیوں پر پہلے بھی ایک حادثہ رونما ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے جلالی صاحب کا ایک مہمان تیورا کر نیچے گرا تھا اور سر پر چوٹ لگنے سے اپنی یادداشت مکمل طور پر کھو بیٹھا تھا۔

رات نو بجے کے قریب ایک پرائیویٹ ایمبولینس پر مختار کی لاش لاہور کے لیے روانہ کر دی گئی۔ جلالی صاحب کا سیکریٹری ندیم اور ملازم خاص فتح محمد ایمبولینس کے ساتھ گئے۔

لاش کی روانگی کے بعد کوٹھی میں قدرے سکون ہو گیا۔ اس دوران میں عمران نے اپنے سیل فون سے ریان وسیم سے بھی بات چیت کی اور انہیں فارم ہاؤس کی صورتِ حال سے آگاہ کر کے نئی ہدایات طلب کیں۔

عمران سے مشورہ کر کے رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے چائے تیار کی اور چائے دینے کے بہانے ڈاکٹر مہناز کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ یقیناً جاگ رہی تھی۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''آپ سے ضروری بات کرنی ہے... اگر آپ چھت پر آ سکیں۔''

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔''

میں چھت پر چلا گیا۔ صاف ستھری وسیع چھت پر خوب صورت اور آرام دہ کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف فوم کا بیڈ پڑا تھا۔ اوس اور ہلکی بوچھار سے بچانے کے لیے اس پر

ایک چہیر کٹ تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خوش گوار خنکی تھی۔ جھونکوں کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ٹریکٹر چلنے کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک پھیل رہی تھی۔ چھت پر بھی پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ان کیاریوں کے درمیان چہل قدمی کے لیے ایک طویل روش تھی۔ دو دودھیا بلب اس وسیع چھت کو نیم روشن کر رہے تھے۔ میں چہل قدمی کے انداز میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز بھی ایک شال اوڑھے وہاں پہنچ گئی۔ صبح والے سنگین واقعے کے اثرات ابھی تک اس پر عیاں تھے۔

ہم دونوں پاس پاس کھڑے ہوگئے۔ ''یہ سب کیا ہے تابش! آپ دونوں کون ہیں؟'' وہ تقریباً روہانسی آواز میں بولی۔ وہ مجھ سے واضح طور پر مرعوب بھی نظر آتی تھی۔

''میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا لیکن آپ کو بھی کچھ بتانا پڑے گا۔ ہمارے درمیان یہ دوطرفہ انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تو یقین کریں کہ ہم سب کے لیے بہت اچھا ہوگا۔ جلالی صاحب بھی اس بحران سے صاف نکل آئیں گے جس نے ان کا جینا مشکل کر رکھا ہے۔''

''لیکن مجھے پتا تو چلے کہ میں دراصل کس سے بات کر رہی ہوں۔ ابھی تک تو سب کچھ اندھیرے میں ہے۔ جس طرح مجھے مختار ڈرائیور کے بارے میں پتا نہیں تھا کہ وہ اصل میں کون ہے، اس طرح آپ دونوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ یہاں فارم ہاؤس میں کوئی شخص بھی اپنے اصل چہرے کے ساتھ نہیں ہے۔''

...اگلے دس پندرہ منٹ میں میرے اور ڈاکٹر مہناز کے درمیان تفصیل سے بات ہوئی۔ اس گفتگو میں ہمارے درمیان اجنبیت کی کچی دیواریں گر گئیں۔ میں نے ڈاکٹر مہناز کو یہ باور کرا دیا کہ ہم یہاں صرف جلالی صاحب کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں اس باکس سے کوئی غرض نہیں جو جلالی صاحب کے پاس ہے اور جس کے پیچھے کچھ خطرناک لوگ دیوانے ہو رہے ہیں۔

مہناز کا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہمیں یہاں بھیجنے والا کون ہے؟

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر مہناز! وقت آنے پر میں اس کا جواب بھی پوری وضاحت سے آپ کو دے دوں گا۔ فی الحال آپ مجھے اس حوالے سے خاموش رہنے کی اجازت دے دیں۔ آپ کی الجھن کم کرنے کے لیے میں آپ کو صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ ہمیں یہاں بھیجنے والے جلالی صاحب کے نہایت مخلص دوست بلکہ پرستار ہیں۔ کسی وجہ سے وہ فی الوقت سامنے آنا نہیں چاہ رہے۔''

پتا نہیں کہ میری باتوں پر ڈاکٹر مہناز نے کتنے فیصد بھروسا کیا۔ تاہم اس کی چھٹی حس کافی توانا لگتی تھی۔ اس کے علاوہ شاید مردم شناسی کا قدرتی وصف بھی اس کے اندر موجود تھا۔ اس نے میرے کچھ اہم سوالوں کے جواب دیے جس سے صورتِ حال کی نہایت دھندلی تصویر قدرے وضاحت سے دکھائی دینے لگی۔

میرا سب سے اہم سوال اس باکس کے متعلق ہی تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے؟''

مہناز نے صاف گوئی کے انداز میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''نہیں تابش صاحب! اس بارے میں جلالی صاحب نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں نے دو بار پوچھا تھا۔ اب تیسری بار پوچھنے کی ہمت نہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ وہ بہت جلد غصے میں آجاتے ہیں۔ غصے میں آنے سے ان کی طبیعت تیزی سے بگڑتی ہے اور پھر سب کچھ مجھے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔''

''آپ کا اپنا اندازہ کیا ہے؟''

''ظاہر ہے کہ وہ کوئی بہت قیمتی چیز ہی ہے۔ نقدی یا پھر جم اسٹون یا قیمتی دھات وغیرہ۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق باکس کا سائز زیادہ بڑا نہیں اور نہ وہ زیادہ وزنی ہے۔ ورنہ اسے چھپانے یا کہیں لے جانے کے لیے جلالی صاحب کو کسی کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ اور اب تک جو معلومات سامنے آئی ہیں، ان سے بھی پتا چلتا ہے کہ اس سلسلے میں جلالی صاحب نے ندیم اور فتح محمد سمیت کسی کی مدد بھی نہیں لی ہے۔''

''کیا وہ کسی وقت گاڑی خود بھی ڈرائیو کر لیتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''انہیں نہیں کرنی چاہیے لیکن وہ موڈی بندے ہیں۔ انہیں کوئی کسی کام سے روک نہیں سکتا۔''

''آپ بھی نہیں؟'' میں نے ذرا معنی خیز انداز میں پوچھا۔

ڈاکٹر مہناز کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ ''نہیں، جب ان کی مرضی نہ ہو تو وہ میری بھی نہیں سنتے۔ حالانکہ طبیعت بگڑنے پر مجھے ہی آوازیں دی جاتی ہیں۔''

''اگر وہ کسی وقت خود بھی گاڑی ڈرائیو کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ باکس فارم ہاؤس کے اندر ہی کہیں موجود ہو۔''

''بالکل... یہ ضروری نہیں۔''

''ڈاکٹر مہناز! ایک اہم سوال ہے۔ اگر ممکن ہے تو پلیز، اس کا جواب ضرور دیجیے... یہ باکس جلالی صاحب تک پہنچا کس طرح؟''

ڈاکٹر مہناز کے چہرے پر تھوڑی دیر کے لیے ہچکچاہٹ نظر آئی۔ پھر اس نے اس ہچکچاہٹ پر قابو پایا اور بولی۔ ''یہاں پاس ہی ایک نہر ہے۔ جلالی صاحب کبھی کبھی چاندنی رات میں نہر کنارے جانا پسند کرتے ہیں۔ اس رات بھی وہ گاڑی پر وہاں گئے۔ ڈرائیور ریاض ان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ...'' وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''میں بھی تھی۔ ہم کوئی دو گھنٹے وہاں رہے۔ پھر بادل آگئے اور چاندنی ختم ہوگئی۔ ہم واپس آنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک کھلی چھت والی ایک جیپ بڑی تیزی سے آئی۔ وہ کچے راستے پر ہمارے سامنے سے گزری اور آگے نکل گئی۔ ڈرائیور ریاض نے اس میں سے کوئی شے جھاڑیوں میں گرتے دیکھی۔ کوئی آدھ منٹ بعد ایک اور گاڑی کی آواز آئی۔ یہ ایک ٹویوٹا 86 ماڈل تھی۔ وہ بھی اندھا دھند آرہی تھی اور کچے راستے پر بری طرح اچھل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ ڈرائیور ریاض نے جلالی صاحب کو بتایا کہ آگے جانے والی جیپ میں سے کوئی شے جھاڑیوں میں گری ہے۔ میں تو گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہی۔ ریاض اور جلالی صاحب آگے جنتر کی جھاڑیوں میں گئے۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا، وہ اندھیرے میں واپس آرہے تھے۔ ریاض کے ہاتھ میں ایک بڑا تھیلا سا تھا جس میں کوئی چوکور شے تھی۔ انہوں نے ڈکی کھولی اور تھیلا وہاں رکھ دیا۔ اس کے فوراً بعد ہم فارم ہاؤس واپس آگئے... راستے میں جلالی صاحب نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ یہ لکڑی کا ایک باکس ہے جسے لوہے کی پتریاں لگا کر سیل بند کیا گیا ہے...''

میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔ ''جلالی صاحب کا کیا خیال تھا... یہ باکس جیپ میں سے اتفاقاً... گرایا گیا تھا؟''

''دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ بہرحال، یہ بات تو بالکل صاف تھی کہ پچھلی گاڑی جیپ کا پیچھا کر رہی تھی۔ ڈرائیور ریاض کا اندازہ تھا کہ اگلی گاڑی میں صرف ایک یا دو بندے تھے جبکہ ٹویوٹا کار میں زیادہ افراد تھے۔''

''اس کے بعد جلالی صاحب نے آپ سے باکس کے بارے میں کچھ نہیں کہا؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میں نے دو بار اس حوالے سے بات چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ تیسری بار پوچھنے کی مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ہاں، اس بات کا اندازہ مجھے دو چار دن کے بعد ہی ہو گیا تھا کہ وہ کوئی بہت خاص قسم کا باکس ہے۔ جلالی صاحب بہت پریشان نظر آرہے تھے۔ پھر یہ پریشانی اس وقت مزید بڑھ گئی جب فارم ہاؤس میں کچھ اجنبی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ پہلے وہ مقامی بندے آئے، ان کے ساتھ ایک سفید پوش بھی تھا اور میرے خیال میں وہ مقامی پولیس کا کوئی بندہ تھا۔ اگلے روز ایک بہت بڑی لگژری جیپ میں ایک سیاست داں ٹائپ شخص آیا۔ اس کے ساتھ دو سوٹڈ بوٹڈ بندے تھے اور وہ نوجوان عورت بھی تھی جو کل جلالی صاحب کے لیے رنگین چڑیوں کا تحفہ لائی ہے اور تو لیکل ہو کر واپس گئی ہے۔ دو دن بعد پھر دو تین اجنبی چہرے نظر آئے۔ ان لوگوں نے قریباً تین گھنٹے تک بڑے ڈرائنگ روم میں جلالی صاحب اور ندیم سے بات چیت کی۔ ان میں سادہ کپڑوں والا وہی پولیس افسر بھی شامل تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ جان چکے تھے کہ باکس جلالی صاحب کے پاس ہے... اب وہ انہیں باکس کی واپسی پر آمادہ کر رہے تھے۔ لیکن جلالی صاحب نے انکار کر دیا تھا اور اپنے انکار پر اڑ گئے تھے۔''

''ڈاکٹر! ان لوگوں کو معلوم کیسے ہوا کہ باکس جلالی صاحب کے پاس ہے؟''

''میں صرف قیافہ ہی لگا سکتی ہوں... اور قیاس یہ ہے کہ جس جگہ باکس گرا، یا گرایا گیا وہ بالکل کچی زمین تھی۔ وہاں کچھ نشانات رہ گئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ باکس کے ساتھ کوئی اور چھوٹی موٹی چیز بھی وہاں گری ہو جس کی وجہ سے تلاش کرنے والوں کو کوئی سراغ ملا ہو۔ اس جگہ کے قریب ہی شیورلیٹ گاڑی کے پہیوں کے نشان ملے ہوں گے جو فارم ہاؤس تک آئے ہوں گے...''

''آپ بتا رہی تھیں کہ سادہ کپڑوں والے پولیس افسر اور دیگر دو بندوں نے قریباً تین گھنٹے تک جلالی صاحب سے بات چیت کی... اس کے بعد کیا ہوا؟''

ڈاکٹر مہناز کی شربتی آنکھوں میں دکھ آمیز خوف کے سائے لہرائے۔ وہ بولی۔ ''اس کے بعد یہاں فارم ہاؤس میں سب سے بری رات آئی۔ کچھ مسلح لوگوں نے پورے فارم ہاؤس کو یرغمال بنا لیا۔ پہلے جلالی صاحب سے بدتمیزی کی گئی پھر ان کی عمر اور بیماری کی پروا کیے بغیر ان پر بے رحمی سے تشدد کیا گیا۔ سب مرد و عورت ملازمین کو دو کمروں میں بند کر دیا گیا اور ان کے ساتھ بھی بدتمیزی کی انتہا کر دی گئی...''

بات کرتے کرتے اچانک ڈاکٹر مہناز کو خاموش ہونا پڑا۔ میں بھی چونک کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی تھی۔ شاید ایک بار پھر کوئی ہمارے آس پاس موجود تھا۔ میں اس قسم کی صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھا۔ مختار ملک کا پسٹل ابھی تک میری قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا تھا۔ میں پسٹل کی موجودگی کو کنفرم کرنے کے بعد جلدی سے ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ ڈاکٹر مہناز مسلسل چونکی ہوئی نظروں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ قدرے مطمئن نظر آئی اور سرگوشی میں بولی۔ ''تابش! میرے خیال میں جلالی صاحب ہیں۔ مجھے ڈھونڈتے ہوئے اوپر آرہے ہیں۔ آپ اس کونے میں چلے جائیں اور جب جلالی صاحب اوپر آجائیں تو آپ احتیاط سے سیڑھیاں اتر جائیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پانچ دس سیکنڈ بعد قدموں کی چاپ واضح ہوگئی۔ کوئی سست روی سے اوپر آرہا تھا۔ وہ جلالی صاحب ہی تھے۔ چھت پر نمودار ہوتے ہی انہوں نے آواز دی۔ ''مہناز... کہاں ہو مہناز؟''

مہناز تیزی سے ان کی طرف لپکی۔ اس نے انہیں کندھوں سے تھاما۔ ''سر! آپ اوپر کیوں آگئے؟ آپ کو سیڑھیاں نہیں چڑھنی چاہئیں۔''

وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولے۔ ''تم نے بتایا تو تھا کہ چھت پر ہواخوری کرنے جارہی ہو۔''

''میں نے سمجھا آپ سو رہے ہیں۔''

''پریشانی میں اتنی جلدی نیند کہاں آتی ہے۔'' وہ ڈگمگا رہے تھے۔ مہناز انہیں سہارا دیتی ہوئی چھپرکھٹ تلے لے آئی۔ وہ فوم کے بیڈ پر لیٹ گئے۔ اوپر تاروں بھرا آسمان تھا... میں زینون پر آگیا لیکن نیچے اترنے کے بجائے وہیں کھڑا رہا۔ جلالی صاحب اپنا بایاں بازو دائیں ہاتھ سے دبا رہے تھے۔ ''درد ہو رہا ہے؟'' مہناز نے پوچھا۔

''تھوڑا تھوڑا۔''

''آپ سیدھے لیٹ جائیں۔ آپ کو اس طرح سیڑھیاں نہیں چڑھنی چاہیے تھیں۔'' مہناز نے کہا۔ وہ چست انداز میں بھاگتی ہوئی نیچے گئی اور میڈیکل باکس لے آئی۔ اس نے بی پی آپریٹس سے جلالی صاحب کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ انہیں کھانے کے لیے ایک گولی دی اور بیڈ پر دوزانو بیٹھ کر ان کا بازو دبانے لگی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جلالی صاحب اپنے دوسرے ہاتھ سے مسلسل مہناز کے بالوں اور رخساروں کو سہلا رہے ہیں۔ یہ ایک میکانکی سی حرکت تھی۔ اس کو کوئی معنی دینے مشکل تھے۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھے، ان سے کسی شدید جذباتی کیفیت کی توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہیں دوزانو بیٹھے بیٹھے مہناز نے اپنا سر جلالی صاحب کے سینے پر ڈال دیا۔ جلالی صاحب نے اپنا بازو مہناز کے کندھوں پر رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے۔ اس سے اگلا منظر اس سے بھی تعجب خیز تھا۔ مہناز اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے اپنے بالوں کو سمیٹا اور سیڑھیوں کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کر دیا۔ میں نے کوشش کی اور چند سیکنڈ بعد چوبی دروازے کی سائڈ میں ایک باریک جھری ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ جواں سال ڈاکٹر مہناز، عمر رسیدہ سہراب جلالی کے ساتھ ہی فوم کے بستر پر لیٹ گئی ہے۔ جلالی صاحب نے آہستگی سے کروٹ بدلی اور اپنا رخ مہناز کی طرف کر لیا۔ اس نے کمال مہربانی سے جلالی صاحب کو اپنے جوان بازوؤں کے حلقے میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

میں مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔ دو تین منٹ بعد یوں لگا جیسے جلالی صاحب سو گئے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز کی ٹھوڑی ان کے نیم گنجے سر پر ٹکی ہوئی تھی اور ان کا چہرہ مہناز کے جسمانی گداز میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ سکڑے سمٹے کسی بچے کی طرح لگ رہے تھے۔ یہ باور کرنا مشکل تھا کہ یہ وہ جلالی صاحب ہیں، جن کے غصے سے بے شمار لوگ خوف کھاتے ہیں اور جن کو ان کی مرضی کے خلاف چلانا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بظاہر تو یہ روحانی تعلق تھا لیکن اگر یہ واقعی روحانی یا جنسی تعلق تھا تو پھر یوں سرِعام کیوں تھا؟ اس چھت پر کسی وقت کوئی بھی آسکتا تھا۔ جس طرح میں نے بند دروازے میں سے جھانکا تھا، کوئی دوسرا بھی جھانک سکتا تھا۔ برساتی میں ایک کھڑکی بھی موجود تھی جس کی چٹخنی کو تھوڑی سی کوشش سے کھولا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر مہناز کی والدہ کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ''کبھی تو مجھے لگتا ہے، لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تم جلالی میں بے وقوفی کی حد تک ''فنا فی اللہ'' ہو چکی ہو۔ کچھ رحم کرو ہم پر مہناز... کیوں ہمارا تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ بھلا یہ کوئی بات ہے۔ دو قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے...''

وہ جلالی صاحب کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے اسی طرح لیٹی رہی۔ مدھر ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ اس کی زلفوں کو ہوا میں اڑا رہے تھے۔ چھت پر مکمل خاموشی تھی۔ تاریک آسمان پر ستارے چمکتے تھے اور حیرت سے پلکیں جھپکتے تھے، جیسے وہ بھی اس منظر کو دیکھ کر ششدر ہوں... انسان بھی کیا چیز ہے۔ اس کے دل و دماغ کی گہرائی کو ناپنا ناممکن ہے۔

آٹھ دس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر شاید ڈاکٹر مہناز نے محسوس کیا کہ جلالی صاحب سکون سے سو گئے ہیں۔ اس نے بڑی آہستگی کے ساتھ خود کو جلالی صاحب سے جدا کیا۔ کوئی آواز پیدا کیے بغیر فوم کے بیڈ سے اتری۔ اپنایت بھری نظروں سے جلالی صاحب کو دیکھتی رہی۔ اپنے بال درست کیے۔ ایک بھاری چادر سے جلالی صاحب کا سکڑا سمٹا جسم کندھوں تک ڈھانپ دیا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں تاریک سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔

میں نے سارا ماجرا عمران کو سنایا۔ وہ بھی اس ساری صورتِ حال پر حیران نظر آیا... یہ باکس ایک معما بنا جا رہا تھا۔ دوسری طرف جلالی اور ڈاکٹر مہناز کا رشتہ بھی کچھ عجیب نوعیت کا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جلالی صاحب کے قیلولے کا ٹائم ٹھیک ایک بج کر پینتالیس منٹ پر شروع ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں کوٹھی کے اندر ہر طرف خاموشی کا راج ہوتا تھا۔ کسی کو کھانسی یا چھینک بھی آجاتی تو وہ لرز جاتا۔ ڈھائی بجے کے لگ بھگ مجھے ڈاکٹر مہناز سے پھر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھی۔ کل والے خوفناک واقعے کے اثرات ابھی تک اس کے سرخ و سپید چہرے پر عیاں تھے۔ مختار ملک کا اچانک ہمارے سامنے آنا اور پھر لڑائی کے دوران میں اس کے سر کا پختہ دیوار سے زوردار تصادم، یہ سب کچھ یقیناً مہناز اور لائبہ کے لیے دہلا دینے والا تھا۔ میں کچن سے ایک ”کک بک“ لے آیا تھا... میں ڈاکٹر مہناز کے صوفے کے پاس ہی ایک کشن پر بیٹھ گیا اور ”کک بک“ اپنے سامنے پھیلا لی۔ ہم دونوں کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ڈاکٹر مہناز میرے ساتھ کسی خاص ڈش کی کوکنگ پر بات چیت کر رہی ہو۔

میں نے اس امر کا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ میں نے کل رات جلالی صاحب اور مہناز کو ایک ہی بستر پر دراز دیکھا ہے۔ میں نے بات، وہیں سے شروع کی جہاں سے منقطع ہوئی تھی۔ جس وقت جلالی صاحب کے آنے سے ہماری گفتگو کو بریک لگے تھے، اس وقت مہناز مجھے بتا رہی تھی کہ تین چار ہفتے پہلے اس پُراسرار باکس کی خاطر کچھ سخت گیر لوگوں نے یہاں کوٹھی میں کیا اودھم مچایا تھا۔ انہوں نے نہ صرف عمر رسیدہ جلالی صاحب پر تشدد کیا بلکہ ان کے قریبی ملازموں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا۔

میں نے پکوانوں کی کتاب پر جھکے جھکے ڈاکٹر مہناز سے کہا۔ ”کیا اس رات ان لوگوں نے آپ سے بھی پوچھ گچھ کی تھی؟“

”آپ پوچھ گچھ کی بات کر رہے ہیں، ان خبیثوں نے باقاعدہ تشدد کیا۔ بال کھینچے، تھپڑ مارے... مجھے تین گھنٹے سردی میں ننگے پاؤں کھڑا رکھا گیا۔ خوفناک دھمکیاں دیں۔ لائبہ اور دوسری عورتوں کو بھی بری طرح ہراساں کیا گیا۔ ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں تھا، ہم کیا بتاتے؟ اور جس کو معلوم تھا، وہ بتا کر نہیں دے رہا تھا۔ میرا مطلب جلالی صاحب سے ہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ باکس ان کے پاس ہے لیکن اگر ان کے ٹکڑے بھی کر دیے جائیں تو وہ بتائیں گے نہیں۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جلالی صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ ان لوگوں کو لگا کہ جلالی صاحب کی صورت میں باکس کا جو واحد سراغ موجود ہے، وہ ناپید ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے لیکن یہ صرف ایک ہی بار نہیں ہوا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

”تین روز بعد یہ لوگ دوبارہ کوٹھی میں گھس آئے۔ اس مرتبہ جلالی صاحب پر تو ہاتھ ہلکا رکھا گیا لیکن ملازمین کی بہت کم بختی آئی۔ ڈرائیور ریاض کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ اس کے بچے کی کنپٹی پر بندوق رکھی گئی۔ مالی خورشید سے بھی برا سلوک کیا گیا۔ اس کی بیوی کے کپڑے پھاڑ دیے گئے۔ ملازموں کے ہاتھوں میں کدالیں اور کسیاں تھمائی گئیں اور ان سے کوٹھی اور فارم میں مشتبہ جگہوں پر کھدائی کرائی گئی۔ کوٹھی میں موجود سب لوگوں کے سیل فون ایک جگہ جمع کر لیے گئے تھے اور لینڈ لائن فون کے تار کاٹ دیے گئے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”لگتا ہے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اب شاید عارضی طور پر نرم ڈپلومیسی سے کام لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”ایسا ہی ہے۔“ ڈاکٹر مہناز نے کتاب پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ ”پرسوں جو فیشن ایبل عورت ایک یورپین کے ساتھ یہاں آئی تھی، اس کا نام وزیر شہوار ہے۔ یہ چار ہفتے پہلے بھی یہ اپنے ساتھی مائیکل کے ساتھ یہاں پہنچی تھی۔ تب ان کے ساتھ ان کا باس جاوا اور دیگر دس پندرہ بندے بھی شامل تھے۔“

”جاوا... یہ کون ہے؟“

”بڑا خطرناک بندہ ہے۔ قتل پہلے کرتا ہے، نام بعد میں پوچھتا ہے۔ سرحد کے آر پار آتا جاتا رہتا ہے۔ ابھی تک کسی کو ٹھیک سے پتا نہیں کہ یہ اصل میں انڈین ہے یا پاکستانی۔ انڈین فلم انڈسٹری میں جن دو چار لوگوں کے نام کا سکہ چلتا ہے، ان میں ایک یہ جاوا بھی ہے۔ شوبز کے بڑے بڑے گرو گھنٹال اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہیں اور اپنے مسئلوں کے حل کے لیے اس کی طرف دیکھتے ہیں۔“

”تو کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ یہاں جو باکس کا چکر چل رہا ہے، اس کا تعلق کسی طور فلم انڈسٹری یا شوبز وغیرہ سے ہے؟“

”ایسا ہو سکتا ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں۔ جاوا جیسے لوگ پیسے کی خاطر کسی بھی کام میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ اس سارے کام میں دو چار سفید فام لوگ بھی ملوث ہیں۔ اس سے شک ہوتا ہے کہ شاید اس باکس والے معاملے کا تعلق شوبز سے نہ ہو بلکہ... یہ کوئی اسمگلنگ وغیرہ کا چکر ہو۔“

”یہ جاوا نامی بندہ کتنی بار یہاں آیا ہے؟“ میں نے

پوچھا۔

''میرے علم کے مطابق تو دو بار آیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی آیا ہو لیکن مجھے خبر نہیں۔ جب یہ دوسری بار آیا تھا تو بڑے طیش میں تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ اس کا جلالی صاحب پر بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ان کے جسم کی بوٹی بوٹی علیحدہ کردیتا۔ طیش میں آکر اس نے ڈرائیور ریاض کو بُری طرح پٹوایا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مالی خورشید اور اس کے بھائی کی ایک ایک ٹانگ سے رسّی باندھ کر انہیں ایک گھنٹے تک الٹا لٹکائے رکھا، یہاں تک کہ خورشید بے ہوش ہوگیا۔ جادے کے کہنے پر خورشید کی جواں سال بیوی کے کپڑے پھاڑ دیے گئے۔ اسے بے عزت کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس موقع پر دُرِشہوار آگے آئی اور اس نے مالی کی بیوی کی جان بچائی۔ اس موقع پر انگریز مائیکل نے بھی اس کا ساتھ دیا بلکہ جادا سے ہلکا سا جھگڑا بھی کیا۔ اب سمجھ میں آرہا ہے کہ یہ سارا بھی ایک ڈراما تھا۔ ان لوگوں نے جادے کی نسبت نرم رویّہ دکھایا اور اس طرح یہاں واپس آنے کے لیے راستہ بنایا۔''

''آپ کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آرہی ہے۔ پرسوں دُرِشہوار اپنے ساتھ جلالی صاحب کے لیے نایاب چڑیوں کا تحفہ بھی لائی تھی۔''

''لیکن جلالی صاحب کی یادداشت اتنی کمزور نہیں اور نہ ہی وہ اتنے سیدھے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ خطرہ بدستور اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ لوگ اس باکس تک پہنچنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے آزما رہے ہیں۔''

''کیا اس حوالے سے جلالی صاحب نے پولیس میں رپورٹ وغیرہ بھی کروائی ہے؟''

''انہوں نے نہیں کروائی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ ان کا خیال ہے کہ مقامی پولیس کے دو چار لوگ بھی ان گینگسٹرز کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مقامی تھانے دار معاملہ پوچھنے کے لیے یہاں آیا تو جلالی صاحب نے اسے بے نقط سنائیں۔ وہ دُم دبا کر نکل گیا۔ بعد میں یہ بات اوپر تک پہنچی۔ لاہور میں دو تین اعلیٰ پولیس آفیسر ایسے ہیں جو جلالی صاحب کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایس ایس پی حمزہ صاحب ہیں۔ حمزہ صاحب چند دن پہلے خود یہاں آئے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ ایف آئی آر درج کروائی اور کوٹھی کی حفاظت کے لیے گارڈز مہیا کیے۔ بہرحال جلالی صاحب اس سلسلے میں بالکل بے پروا ہیں۔ کبھی کبھی وہ بالکل نوجوانوں کی طرح بے خوف اور پُرجوش ہوجاتے ہیں۔ پرسوں بھی وہ شام کی چائے کے بعد اکیلے ہی واک پر نکل گئے اور کوئی دو گھنٹے بعد واپس آئے۔ میرے منع کرنے سے بھی کوئی اثر نہیں لیتے۔''

''آپ نے کہا ہے کہ دونوں بار جادا اور اس کے ساتھی یہاں آئے تو ان کے ساتھ کوئی مقامی پولیس والا بھی تھا۔ اس کا پتا چلا؟''

''کہتے ہیں کہ وہ ایک ریٹائرڈ پولیس افسر ہے۔ مقامی پولیس والوں سے اس کی دوستی وغیرہ ہے۔ ایف آئی آر میں اس کا نام بھی آیا ہے۔''

اس دوران میں، میں نے دیکھا کہ عمران کوریڈور میں سے گزرا۔ اس نے دو ایرانی بلیاں اپنی بغلوں میں دے رکھی تھیں اور ان سے لاڈ کرتا ہوا لان کی طرف جارہا تھا... جلالی صاحب بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ نہایت قیمتی و نایاب بلیاں تھیں۔ ان کی آنکھوں کے رنگ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

''یہ کدھر جارہے ہیں؟'' میں نے مہناز سے پوچھا۔

''آپ کا یہ ساتھی چھپا رستم ہی لگتا ہے۔ بڑی تیزی سے جلالی صاحب کے قریب آتا جارہا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے جانوروں سے دلچسپی ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ جلالی صاحب بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔''

''ذرا دیکھیں یہ لوگ کیا کررہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

مہناز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دبے قدموں کوریڈور میں پہنچے اور پھر لان کی طرف چلے آئے۔ عمران اور جلالی صاحب جانوروں والے پورشن کی طرف موجود تھے۔ ایک ملازم نے ایرانی بلیوں والے پنجرے کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔ یہاں دو اور بلیاں بھی موجود تھیں۔ جلالی صاحب بڑی بے تکلفی سے آلتی پالتی مار کر پنجرے کے فرش پر ہی بیٹھ گئے۔ عمران نے بھی تقلید کی۔ وہ دونوں ایک موٹی تازی بلی کو کوئی دوا کھلانے میں مصروف ہوگئے۔ دوا کو دودھ میں ملایا گیا تھا۔ غالباً یہ وہی تندمزاج حاملہ بلی تھی جسے چند روز میں بچے دینے تھے۔ بلی عمران کی گود میں آکر مست ہوگئی تھی۔ یہ سب کچھ جلالی صاحب کے لیے خوشی اور اطمینان کا باعث تھا۔ بلیوں سے فارغ ہوکر عمران اور جلالی صاحب ایک قریبی پنجرے میں داخل ہوگئے۔ یہاں زیبرے کا ایک خوب صورت جوڑا تھا۔ مادہ جانور کے پاؤں میں شاید کوئی تکلیف تھی۔ وہ اپنے بندے پر ہاتھ نہیں لگانے دے رہی تھی۔ عمران نے آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ کو سہلایا... وہ رام نظر آنے لگی۔ تب عمران اور جلالی صاحب نے اس کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ جلالی صاحب نے ڈیجیٹل کیمرے سے پاؤں کی دو تین تصویریں کھینچیں اور کوئی مینڈیسن لگائی۔ وہ دونوں آپس میں بڑی محویت اور بے تکلفی سے باتیں کررہے تھے لیکن پھر اچانک صورتِ حال بدلی ہوئی نظر آئی۔ جلالی صاحب کا مخصوص چڑچڑاپن ان کے چہرے پر جھلک دکھانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مشتعل ہوگئے۔ وہ کسی بات پر عمران کو ڈانٹ رہے تھے۔ عمران صفائی پیش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ہم ذرا آگے گئے تو یہ آوازیں ہمارے کانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔

جلالی صاحب گرجے۔ ''اگر تم نے اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو چھٹی کرلو۔ ابھی کرلو چھٹی... جسٹ گیٹ آؤٹ۔''

عمران نے کہا۔ ''سر! میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے یہاں زیادہ ٹائم دیا تو کچن کا کام سست پڑ جائے گا اور...''

''کیوں سست پڑ جائے گا؟ کیوں پڑ جائے گا؟ کیا وہ تمہارا ساتھی، باورچی نہیں ہے؟ وہ اندھا اور اپاہج ہے؟ تم تو اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہو۔ کیا جھوٹ بولتے ہو تم؟''

''نہیں سر! وہ کر تو لے گا لیکن اسے میری ماتحتی میں کام کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔''

''یہاں عادتیں نہیں چلیں گی۔ وہی کچھ چلے گا جو میں کہتا ہوں۔ اور میں کہتا ہوں کہ کچن سے زیادہ یہاں ''ZOO'' میں تمہاری ضرورت ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک نیا ڈاکٹر ہمیں جوائن نہیں کرلیتا۔ اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو پھر تم فارغ ہو اور تمہارا وہ اسسٹنٹ بھی۔'' وہ ایک دم بھنّائے ہوئے تھے۔

''سوری سر! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آپ جیسا کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ میں کچن کا کام تابش کے سپرد کردیتا ہوں۔ وہ گزارہ کرلے گا۔''

جلالی صاحب تیوریاں چڑھائے ہوئے اٹھے اور واپس چلے گئے۔ ان کے جسم سے جیسے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ عمران کھوپڑی سہلا کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد میں اور وہ کچن میں موجود تھے۔ عمران نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''یہ تو مصیبت کھڑی ہوگئی ہے۔ بابا جی تو آگ کا گولہ ہیں اور تمہیں ننگا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اب تم سے کھانا پکوائیں گے اور تم ایسا کھانا پکاؤ گے کہ ہمارا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوٹے گا اور بابا جی اچھل اچھل کر چھت کو لگیں گے۔''

''یار! تم ضرورت سے زیادہ پریشان ہورہے ہو۔ تم مجھے پوری ترکیب کاغذ پر لکھ کر دے دو۔ میں کچھ نہ کچھ کرلوں گا۔''

''ارے باندر! کھانا پکانا پینٹنگ کرنے کی طرح ہوتا ہے۔ اگر میں تمہیں رنگ، برش، ایزل وغیرہ دے دوں اور انہیں استعمال کرنے کی پوری ترکیب بھی بتادوں تو کیا تم کوئی شاہکار تصویر بنالو گے؟''

''آلو بینگن اور مونا لیزا میں کافی فرق ہوتا ہے یار۔''

''یہ بڑا اڑیل بابا ہے۔ تم اس کو نہیں سمجھتے۔ اگر...''

اچانک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ڈاکٹر مہناز دلکش مسکراہٹ بکھیرتی ہماری طرف آرہی تھی۔ اس نے اپنے خوب صورت بال جوڑے کی صورت میں سمیٹے ہوئے تھے اور باقاعدہ ایپرن باندھ رکھا تھا۔ ''ہیلو! گڈ ایوننگ۔'' اس نے کہا۔

''آپ یہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ لوگوں سے کچھ سیکھوں۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں میں منفرد ذائقہ ہے۔ ایک دم کلاسیکل انڈین ٹچ۔ آج دوپہر ہم کک بک میں جو ڈش دیکھ رہے تھے، وہ بھی انڈین اسٹائل ہی کی تھی نا؟'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''یعنی آپ میری مدد کرنا چاہ رہی ہیں؟'' میں نے گہری سانس لی۔

''دراصل میں اپنی ہی مدد کررہی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔ ''اگر ہم دونوں مل کر کھانا نہیں بنائیں گے تو جلالی صاحب کا پارا ساتویں آسمان سے کافی اوپر چلا جائے گا۔ ان کی طبیعت بگڑے گی اور پھر بھگتنا مجھے ہی پڑے گا۔''

''تھینک یو۔'' عمران نے کہا۔

''ویسے آپ دونوں ابھی تک اپنی اصلیت کے بارے میں کچھ نہیں بتارہے۔'' مہناز کا لہجہ پھر معنی خیز تھا۔

میں نے کہا۔ ''پلیز ڈاکٹر! اس کے لیے تھوڑا سا انتظار کرلیں۔''

مجھ سے کوکنگ سیکھنے کے بہانے ڈاکٹر مہناز نے میرے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا اور یہ خاصا بہتر کھانا تھا۔ ہم نے آلو بینگن کے ساتھ، دیسی مرغ کی یخنی تیار کی اور فرنی بنائی۔ ڈاکٹر مہناز ایک خوش اخلاق اور معاملہ فہم لڑکی کے طور پر سامنے آئی تھی۔ پرسوں یہاں جو سنگین واقعہ رونما ہوا، اس میں مہناز کا کردار قابلِ ذکر تھا۔ اس نے مختار ملک کے ہاتھ پر

کل دان سے کاری ضرب لگائی اور یوں مجھے اس پر حملہ کرنے کا موقع ملا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہاں صورتِ حال کوئی بھی رخ اختیار کرسکتی تھی۔ ڈاکٹر مہناز قدرے مختلف لڑکی تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس کی منگنی ہوئی تھی۔ دو سال بعد یہ منگنی ٹوٹ گئی۔ اب ڈاکٹر مہناز تقریباً چھبیس سال کی تھی۔ اسے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ وہ اس حوالے سے کچھ بیزار سی ہے۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر مہناز! ایک بات کہوں، اگر آپ بُرا نہ مانیں تو؟''

''میں زیادہ تر بُرا نہیں مانتی۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ اپنی ہم عمر ڈاکٹرز کے مقابلے میں کافی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی گفتگو، آپ کا رہن سہن، آپ کی دلچسپیاں۔''

''آپ نے یہاں میری کون سی دلچسپی دیکھی ہے؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

میں کہنے کو تو بہت کچھ کہہ سکتا تھا کیونکہ میں نے بہت کچھ دیکھا تھا... کل رات والا واقعہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا جب وہ جلالی صاحب کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ مگر میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''آپ شہر میں جاب کرنے کے بجائے اور کوئی کلینک چلانے کے بجائے یہاں اس فارم میں جلالی صاحب جیسے مشکل بندے کے ساتھ وقت گزار رہی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''بس اتنی سی بات پر آپ نے مختلف کہہ دیا ہے حالانکہ خود آپ میں بھی کئی ایسی باتیں ہیں جن کی بنیاد پر آپ کو نہایت مختلف کہا جاسکتا ہے۔''

''میں ٹھیک سے سمجھا نہیں۔''

اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھاما اور اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے ایسے سخت بلکہ کرخت ہاتھ پاؤں بہت کم لوگوں کے دیکھے ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ نے اپنے جسم کے ان حصوں پر بہت ظلم کیا ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ آپ سخت فرش پر سوتے ہیں۔ شدید تکلیف کی صورت میں بھی دوا وغیرہ نہیں لیتے۔''

میں نے کہا۔ ''بس کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک استاد ملا تھا۔ یہ اسی کے دیے ہوئے اسباق ہیں ڈاکٹر صاحبہ! میرا استاد دردخور تھا۔ اس نے مجھے بھی دردخور بنا دیا۔''

''دردخور؟ یہ کیا لفظ ہوا؟''

''درد سہنے والا۔ درد کھانے والا۔ درد سے پیار کرنے والا۔ میں کچھ ایسے حالات سے گزرا ہوں جن میں بندہ مر جاتا ہے یا پھر انوکھا ہوجاتا ہے۔ شاید مجھ میں بھی انوکھاپن آگیا ہے۔ اپنے دل و دماغ اور خاص طور سے جسم کو اذیت دینا بہت عرصے سے میرا معمول بن چکا ہے۔ اب یہ سب کچھ مجھے بالکل نارمل سا لگتا ہے۔''

''شاید مارشل آرٹ وغیرہ کی بہت کڑی مشقیں کی ہیں آپ نے۔ جسمانی طور پر آپ گرانڈیل نہیں، یعنی نارمل ہی ہیں۔ لیکن پرسوں آپ نے جس طرح اس خونی کو گھمایا اور دیوار سے مار کر ٹھنڈا کر دیا، ایک دم حیران کر دینے والا تھا۔ وہ جسمانی طور پر آپ سے کم از کم ڈیڑھ گنا تو تھا۔''

''لیکن اس میں آپ کا کردار بھی تو ہے۔ اگر اس کے ہاتھ سے پسٹل نہ گرتا تو میرے لیے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا۔''

''مارشل آرٹ میں بیلٹس وغیرہ ہوتی ہیں۔ کیا آپ کے پاس بھی کوئی بیلٹ ہے؟''

''میرے اندر کے زخم ہی میری بیلٹس ہیں۔ کچھ زخم چھوٹے ہیں لیکن ایک دو بہت بڑے ہیں۔ ان بڑے زخموں کو آپ میری بلیک بیلٹس کہہ سکتی ہیں۔''

''آپ اچھی گفتگو کرتے ہیں اور آپ کی کہانی بھی دلچسپ لگتی ہے۔ اگر زندگی رہی تو تفصیل سے سنیں گے۔''

''زندگی رہی کیا مطلب؟ آپ اتنی پریشان اور مایوس کیوں ہیں؟''

''جو کچھ یہاں کے حالات ہیں، ان میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''آپ حالات کی فکر چھوڑیں۔ اس فکر کے لیے ہم جو ہیں یہاں۔ انشاءاللہ بال بھی بیکا نہیں ہوگا یہاں کسی کا۔ آپ آرام سے جا کر سوئیں اور یہ یقین رکھیں کہ ہم جاگ رہے ہیں۔''

میرے پُراعتماد لہجے نے اسے متاثر کیا۔ اس نے پُرتشکر نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''آپ دونوں اپنا بہت خیال رکھیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا... وہ مجھے کچن میں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ بہت متناسب جسم کی مالک تھی۔ پُرکشش بھی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ ڈاکٹر تھی۔ کوئی بھی نوجوان اس کے حصول کو اپنی خوش قسمتی سمجھ سکتا تھا۔

عمران کا کمرا تبدیل ہوگیا تھا۔ اب اسے ZOO کی طرف اپارٹمنٹ دے دیا گیا تھا۔ مجھے یہ اکیلاپن اچھا نہیں لگا۔ عمران کے ساتھ رہنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ میں دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ یہ بہار کی ایک پُرفسوں رات تھی۔ کھڑکیوں سے باہر رات کی رانی کے پھول مہک رہے تھے۔ چاند کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا... ثروت کی یاد نے دل کے دروازے پر دستک دی۔ وہ مل بھی تھی لیکن یوں کہ دل کے زخم کچھ اور گہرے کر گئی تھی۔ وقت کا دریا اسے بہا کر مجھ سے بہت دور لے گیا تھا... اور وہ ایک منجدھار میں پھنسی تھی۔ ایک سنگین منجدھار تھی لیکن وہ اس کی سنگینی کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ یہ بہار کا موسم تھا اور بہار میں تو پھولوں کے ساتھ ساتھ زخم بھی کھل اٹھتے ہیں۔ سوختہ جگری مہک جاتی ہے۔ مجھے بھی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آرہی تھیں۔ ایک دوسرے کے لیے ہمارا دیوانہ پن... کیلنڈر پر سے تاریخیں کاٹنا اور شادی کے دن کا انتظار کرنا۔ پھر وہ طوفان جس نے سب کچھ الٹ پلٹ دیا۔ ایک بظاہر چھوٹا سا واقعہ جو زندگی بھر کا ناسور بن گیا۔ وہ ایک شب جو ثروت کو گھر سے باہر گزارنا پڑی... اور وہ ایک شب ہماری ساری زندگی پر محیط ہوگئی۔ پھر وقت کا پُرشور ریلا ثروت کو بہا کر جرمنی لے گیا اور مجھے بھانڈیل اسٹیٹ۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے وہ ساڑھے تین برس یاد آئے جن کا ہر ہر پل حوادث اور بے چارگیوں سے عبارت تھا۔ اور وہ لڑکی بھی یاد آئی جو اپنی فطرت میں انوکھی تھی۔ جس نے بھانڈیل اسٹیٹ میں مجھے نئی زندگی دی۔ میرے مصائب کے سامنے ڈھال بنی اور میرے بچے کی ماں بھی۔ اور پھر کیا ہوا؟ پھر ایک دن وہ بھی بچھڑ گئی۔ مجھے بالو کی صورت میں ایک محبت بھری نشانی دے کر اور ایک پیغام دے کر... اسے تلاش کرنا مہرو... اس کا کھوج لگانا... وہ تمہیں ملے گی... کیونکہ تم اس سے بہت محبت کرتے ہو اور جب وہ کسی خوب صورت دن کی سنہری دھوپ میں تم سے ملے تو اس سے کہنا... ہندوستان کے ایک دور دراز راجواڑے میں تمہاری ایک بہن تھی...

الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ سلطانہ اور ثروت کے چہرے میری نگاہوں میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ اچانک میں چونک گیا۔ میری نظر سامنے دیوار پر ٹنگے کیلنڈر پر پڑی۔ آج تو میری پیدائش کا دن تھا۔ ہاں، یہ سالگرہ تھی میری۔ وقت کی دھول میں کیا کچھ گم ہوا تھا۔ اتنے اہم دن بھی اب پہچانے نہیں جاتے تھے۔ خاموشی سے آتے اور گزر جاتے تھے۔

میں کتنی ہی دیر نیم تاریک کمرے میں گم صم لیٹا رہا۔ زندگی مجھ سے کتنی دور ہوگئی تھی۔ بہار کے سارے رنگ بجھتے محسوس ہوئے اور ساری خوشبوئیں ماند پڑنے لگیں۔ جب ایسی مایوسی طاری ہوتی تھی تو مجھ پر وہی خود اذیتی کی خواہش غالب آجاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی صحرا ہو یا برفستان جس میں، میں برہنہ بدن بھاگتا چلا جاؤں۔ میرے پاؤں خون اگلنے لگیں، میرے پھیپھڑے چاک ہونے لگیں اور میں بے دم ہو کر گر جاؤں۔

میں لیٹا رہا، بالکل خاموش۔ اتھاہ سوچوں میں ڈوبا رہا۔ اچانک موبائل فون کی وائبریشن ہوئی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور بُری طرح چونک گیا۔ یہ آسٹریا کا نمبر تھا۔ میں نے کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ کو اچھی طرح بند کیا اور کمرے کے ڈریسنگ روم میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نصرت کی آواز آئی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو نصرت! کیسی ہو؟'' میں نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں بھائی... اور آپ کو سالگرہ مبارک۔'' اس نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

''تھینک یو نصرت کہ تم نے یاد رکھا۔''

''کاش، ہم ایک ساتھ ہوتے۔''

''گھبراؤ مت، انشاءاللہ وہ وقت بھی جلد آئے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور تمہاری ٹریٹ منٹ کیسی جا رہی ہے؟''

''ابھی تو ٹیسٹ ہی ہوئے جا رہے ہیں بھائی جان... روزانہ ایک لیٹر خون نکال لیتے ہیں میرا۔'' وہ ٹھنک کر بولی۔

نصرت کو اس کی بیماری کے بارے میں سب کچھ بتایا جاچکا تھا اور اس نے یہ سب کچھ جھیل بھی لیا تھا۔ اب وہ کافی حد تک نارمل محسوس ہوتی تھی اور اپنی بیماری سے لڑنے کے لیے پُرعزم بھی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ دل کڑا کر کے مریض کو اس کی تکلیف کے بارے میں بتا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔

نصرت کے بعد میری بات ثروت سے ہوئی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خوش گوار سا احساس موجود تھا کہ شاید نصرت کو میری سالگرہ کا دن یاد کرانے والی ثروت ہی ہے۔ اس سے پہلے تو نصرت کو کبھی یہ دن یاد نہیں رہا تھا۔ ثروت سے میری گفتگو سنجیدہ نوعیت ہی کی رہی۔ اس نے تھوڑا سا نصرت کے علاج کے بارے میں ڈسکس کیا پھر مجھے اپنے شوہر کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے بولی۔ ''یوسف بھی منگل تک یہاں آرہے ہیں۔ انہوں نے دو دن پہلے کچھ رقم بھی بھیجی ہے پاکستان سے۔''

''چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تقریباً روزانہ ہی فون کر رہے ہیں۔ یہاں ویانا میں ان کا ایک پاکستانی ڈاکٹر دوست بھی ہے۔ اس سے بھی

ڈسکس کر رہے ہیں۔" ثروت نے اطلاع دی۔

"نصرت کے علاج والی آزمائش کافی بڑی ہے ثروت! ہمیں یہ لڑائی مل جل کر لڑنا ہوگی۔ اللہ اسے جلد سے جلد صحت دے۔"

"جو کچھ بھی ہے تابش! اس کی شروعات تو آپ ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ میں اس کے لیے شکریے کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں۔" اس کی آواز قدرے بھرا گئی۔

"شکریہ غیروں کا ادا کیا جاتا ہے۔ کیا اب میں تمہارے لیے اتنا ہی اجنبی ہو چکا ہوں؟"

"لیجیے انکل احمد سے بات کیجیے۔" ثروت نے جلدی سے فون چچا احمد کو تھما دیا۔

"ہیلو تابی! کیسے ہو... سالگرہ مبارک۔" انہوں نے کہا۔

"تھینک یو انکل... نصرت کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟"

"لگتا ہے کہ ابھی وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ٹرانسپلانٹیشن کے حوالے سے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نصرت کو "اسٹے ایبل" رکھنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں اور لگتا ہے کہ اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ نصرت کی حالت اب کافی بہتر ہے۔ درد میں افاقہ ہے اور کھا پی بھی رہی ہے۔"

چچا احمد شاید باتیں کرتے کرتے نصرت کے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ اسی لیے کھل کر گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد گفتگو کا رخ ثروت کے شوہر یوسف کی طرف مڑ گیا۔ چچا احمد کو میں نے تقریباً وہ سارے معاملات بتا دیے تھے جو ثروت کے گھر میں چل رہے تھے۔ یوسف جس طرح اپنی ٹین ایجر جرمن بیوی کے عشق میں گم تھا اور جس طرح ثروت کا استعمال کر رہا تھا، وہ سب کچھ چچا احمد کے علم میں تھا اور جو میں نے نہیں بتایا تھا، اس کا اندازہ انہوں نے خود لگا لیا تھا۔

وہ فون پر گفتگو کرتے ہوئے بولے۔ "تابی! یہ یوسف کافی تیز بندہ لگتا ہے۔ دو تین دفعہ فون پر اس سے بات بھی ہوئی ہے میری۔ نصرت کے علاج اور صحت سے تو اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں لگتی لیکن وہ ثروت کو ہر صورت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ وہ دیکھ چکا ہے کہ نصرت کا علاج شروع ہو چکا ہے اور خرچے کا انتظام بھی ہوتا جا رہا ہے، اب وہ اس میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ روپے کا ایک ڈرافٹ بھیجا ہے اس نے۔ چند دن تک شاید خود بھی یہاں آ جائے گا۔"

"بس جو بھی ہے چچا جان! یوسف کو یہ شک نہیں ہونا چاہیے کہ نصرت کے علاج کا خرچہ کہیں اور سے ہو رہا ہے۔"

"لیکن وہ ہے بہت کائیاں... مجھ سے میرے کام کے بارے میں سوال جواب کر رہا تھا۔ جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میری انکم کیا ہے، اخراجات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ اس کے لیے کوئی معقول سا جواب تلاش کر چھوڑیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے حال ہی میں اپنا کوئی اثاثہ بیچا ہو۔"

"ہاں، میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔ اگر وہ بال کی کھال اتارنے پر آ گیا تو پھر ایسا ہی کوئی جواب دینا ہوگا۔"

چچا احمد سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے دیکھا۔ فون پر ایک بڑا اچھا میسج آیا ہوا تھا۔ یہ فرح اور عاطف کی طرف سے تھا۔ مجھے سالگرہ کی پرجوش مبارک باد دی گئی تھی اور بہت سی نیک تمناؤں کا اظہار کیا گیا تھا۔ آخر میں بالو کی طرف سے ایک فقرہ تھا... "پیارے ابو! آج کے دن آپ کو بہت یاد کر رہا ہوں۔ سالگرہ مبارک۔"

میں نے فرح اور عاطف کے اس میسج کو "ڈیلیٹ" کر دیا، اس کے علاوہ چچا احمد اور ثروت والی کال کا ریکارڈ بھی "ڈیلیٹ" کر دیا۔ اس کے بعد میں اپنے فرشی بستر پر لیٹ گیا۔ نہ چاہتے کے باوجود ثروت کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ رات عجیب سرور کی سی کیفیت میں گزری۔ اس سرور کی وجہ یقیناً یہ خیال تھا کہ نصرت کو میری سالگرہ کا دن یاد کرانے والی ثروت ہی تھی۔

صبح مجھے ناشتا اکیلے ہی تیار کرنا تھا اور ایک بار پھر اس کام کا میرے ذہن پر بہت بوجھ تھا لیکن ڈاکٹر مہناز میری مشکل آسان کرنے کے لیے پھر آن موجود ہوئی۔ اس نے میرے ساتھ مل کر ناشتا تیار کیا اور پورے سات بجے خود بھی ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گئی۔ جلالی صاحب ناشتا زیادہ تر ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ہی کرتے تھے۔ ان کا ٹیڈی کتا بھی عین اسی وقت ناشتے کی میز کے نیچے اپنا ناشتا کرتا تھا۔ وہ بڑا پھرتیلا کتا تھا اور جلالی صاحب اسے واکنگ اسٹک کی طرح استعمال کرتے تھے۔ جلالی صاحب اور ڈاکٹر مہناز کے تعلق کی کچھ اور گرہیں میرے سامنے کھلی تھیں۔ وہ اس کوٹھی میں جیسے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ جلالی صاحب کو لگتا ہے بگا ہے ڈاکٹر مہناز کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ اس کو آوازیں دیتے تھے اور کبھی کبھی بہت سخت بھی بولتے تھے۔ دوسری طرف مہناز بھی ہر وقت ان کی طرف سے باخبر رہتی تھی۔ وہ کیا کھا رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں؟ وہ کئی ایک دوائیں کھاتے تھے اور ان دواؤں کا طویل ٹائم ٹیبل مہناز کو ازبر تھا۔ جلالی صاحب اچھے موڈ میں ہوتے تو پاس بیٹھی مہناز کا ہاتھ تھام لیتے اور جیسے بے خیالی میں اس کے ہاتھ اور بازو کو سہلاتے رہتے۔ کسی وقت اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے اور نرمی سے اس کے کندھے کو مسلتے رہتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ سلسلہ صرف ڈاکٹر مہناز کے ساتھ ہی نہیں تھا۔ ایک دن میں نے انہیں اسی طرح ڈاکٹر لائبہ کا ہاتھ تھامے ہوئے دیکھا۔ پھر ایک دن جب وہ اچھے موڈ میں سیکریٹری ندیم سے باتیں کر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ ایک نوخیز ملازمہ مہرنخشی ان کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے اور جلالی صاحب کا بازو اس کے کندھوں پر ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مشکل "بزرگوار" تھے۔ ڈاکٹر مہناز کو اس لحاظ سے بھی جلالی صاحب کی قربت حاصل تھی کہ وہ ان کا علاج معالجہ کرتی تھی۔ ملازمین نے اپنی کوئی مشکل بات جلالی صاحب تک پہنچانا ہوتی تو اس کے لیے ڈاکٹر مہناز کا سہارا لیتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ جلالی صاحب دونوں ڈاکٹرز اور خاص طور سے ڈاکٹر مہناز کی بات تحمل سے سنتے ہیں لیکن مہناز بھی سو فیصد ڈانٹ ڈپٹ سے محفوظ نہیں تھی... کبھی کبھی جلالی صاحب کا خراب موڈ مہناز کی بھی ایسی تیسی کر ڈالتا تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد جلالی صاحب ڈاکٹر مہناز، ڈاکٹر لائبہ اور سیکریٹری ندیم کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ جلالی صاحب کو اپنا چیک اپ کرانا تھا۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد عمران آ دھمکا۔ اس کے کپڑوں سے وہی بو آ رہی تھی جو چڑیا گھر میں سے آتی ہے۔

میں نے کہا۔ "بس دم کی کسر رہ گئی ہے۔ ورنہ میں یہی سمجھتا کہ کمرے میں بن مانس گھس آیا ہے۔"

"مادہ بن مانس کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے۔" اس نے تیزی سے جواب دیا پھر اپنے موبائل کی اسکرین کو گھورنے لگا۔

"کیوں خیریت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ریان ولیم صاحب کا فون آ رہا ہے۔ وہاں اور لوگ بھی تھے۔ میں سن نہیں سکتا تھا۔ لگتا ہے کہ کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہے ہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کل اس نے ریان صاحب سے رابطہ کیا تھا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے دریافت کیا۔ "مختار ملک کے بارے میں بھی کوئی بات ہوئی؟"

"ہاں، میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارے زور بازو کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ شکر کرو کہ مختار ملک کا تعلق ریان اینڈ کمپنی سے نہیں نکلا۔ ورنہ اپنے ہی ساتھی کو مارنے کے جرم میں ہمیں لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ عمران مسلسل اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھا۔

کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے خود ریان صاحب کو کال ملائی۔ چند سیکنڈ بعد رابطہ ہو گیا۔

"ہیلو ایمران!" ریان ولیم کی آواز اس کے جسم ہی کی طرح بھاری بھرکم تھی۔

"جی سر... آئی ایم سوری۔ مصروف تھا اس لیے دو بار آپ کی کال کاٹنا پڑی۔" عمران نے انگلش میں کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" ریان نے جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "کل جو کچھ تم نے بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم حسب توقع بڈھے کے قریب جانے میں کامیاب رہے ہو۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق "زد" کے جانور تم دونوں کی مشترکہ دلچسپی ٹھہرے ہیں۔"

"جی ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔" عمران نے کہا۔ "میں ابھی زو میں ہی تھا۔ ایک زیبرے کے پاؤں کا زخم دھو رہا تھا۔"

ریان ولیم نے کہا۔ "میرا خیال ہے اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تمہیں اس معاملے کے بارے میں کچھ اور بتا دیا جائے۔ اس سے تمہیں اس سارے "ایشو" کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور تمہیں آگے کام کرنے میں بھی آسانی رہے گی۔ کیا تم فی الوقت ایسی محفوظ جگہ پر ہو کہ میں اپنی بات جاری رکھ سکوں؟"

"بالکل جناب! جلالی صاحب، ان کی دونوں ڈاکٹرز اور سیکریٹری ندیم فارم سے باہر ہیں۔ میں اس وقت علیحدہ کمرے میں موجود ہوں۔"

"تمہیں پتا ہے کہ یہاں کوٹھی میں دو تین جگہ سی سی ٹی وی کیمرے بھی ہیں؟"

"اس طرف سے بالکل تسلی رکھیں جناب۔ ہم اس کمرے کو اچھی طرح چیک کر چکے ہیں۔"

"ہاں، میں کہیں بھول نہ جاؤں۔ اس سیکریٹری ندیم کی طرف سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ جتنا ہوشیار نظر آتا ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے۔"

"ٹھیک ہے سر۔" عمران نے کہا۔

ریان ولیم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ذہن میں بھی یہ سوال بہت مرتبہ ابھرا ہوگا کہ اس باکس میں کیا ہے جس کے لیے یہ ساری جدوجہد اور بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ اس باکس میں ایک بہت قیمتی دھات ہے۔ صرف ''ایک دھات'' لیکن بہت قیمتی... کم از کم میں تو اسے دھات ہی کہوں گا کیونکہ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ تم سن رہے ہو؟''

''جی ہاں۔ پوری توجہ سے۔'' عمران نے کہا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''کہنے کو وہ ایک مورتی ہے۔ اسے آرا کوئے کہا جاتا ہے۔ آرا کوئے برما میں بولی جانے والی ایک زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے اپنی حفاظت خود کرنے والا۔

''اس مورتی کے حوالے سے مشہور ہے کہ یہ نہ صرف صدیوں سے اپنی حفاظت خود کر رہی ہے بلکہ یہ جس مقام پر موجود ہوتی ہے اس کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اب تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ یہ کس چیز کی مورتی ہے؟ یہ دراصل بدھا کا ایک دو ونٹ اونچا مجسمہ ہے...''

ریان ولیم بول رہا تھا۔ اس کے الفاظ موبائل فون میں سے نکل کر ہم دونوں کے کانوں تک پہنچ رہے تھے اور ان الفاظ نے جیسے ہم دونوں کو گھما کر رکھ دیا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ یہ ہم کیا سن رہے تھے؟ جو کچھ ریان ولیم بڑی رازداری کے انداز میں بتا رہا تھا، وہ ہمارے لیے نیا نہیں تھا۔ اس دھاتی مجسمے کے بارے میں ہم سے زیادہ کون جانتا تھا۔ یہی بدھا تو تھا جس نے ہمیں میڈم صفورا جیسی شاطر عورت اور صدیقی جیسے منافق بندے سے ٹکرایا تھا۔ اسی نایاب بدھا کی خاطر بھانڈیل اسٹیٹ کے رنجیت پانڈے جیسے خطرناک کمانڈوز پاکستان آئے تھے اور انہوں نے مار دھاڑ کی تھی۔ اسی بدھا کو چرانے کی سزا میں ہمیں یعنی مجھے، صفورا اور صدیقی کو پاکستان سے اٹھا کر انڈیا کی اس دوردراز اسٹیٹ میں پھینکا گیا تھا۔ اس اسٹیٹ میں حالات نے جو رخ بھی اختیار کیا اور جو واقعات بھی رونما ہوئے، اس کی اصل بنیاد تو یہی فاسٹنگ بدھا تھا۔ یہی نایاب مورتی جسے لوگ آرا کوئے کہتے تھے۔ یہ بات پورے یقین سے کہی جاتی تھی کہ آرا کوئے اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور اسے ناجائز طور پر اپنے قبضے میں رکھنے والے برباد ہوتے ہیں۔ ہماری آخری اطلاعات کے مطابق یہ بدھا بھانڈیل اسٹیٹ میں تھا۔ وہاں کے بڑے پگوڈا میں... لیکن اب یہ سفید فام ریان ولیم ہم پر انکشاف کر رہا تھا کہ وہ یہاں ہے۔ شیخوپورہ کے اس فارم میں یا کہیں آس پاس۔ ایک مستطیل چوبی ڈبے میں بند اور کچھ خطرناک لوگ اس کے پیچھے ہیں۔

عمران نے اپنے ''ری ایکشن'' سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ریان ولیم بدستور فون پر بول رہا تھا۔ ''...یہ مجسمہ آرا کوئے کچھ لوگوں کے لیے بے حد قیمتی ہے۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس مجسمے کے بہت سے مداح ابھی اس بات سے بے خبر ہیں کہ وہ یہاں پاکستان میں لاہور کے قریب موجود ہے۔ اگر یہ نیوز پھیل گئی تو یہاں بہت ہنگامہ ہو سکتا ہے۔ بہت سے ملکی اور غیر ملکی گروہ اس علاقے کا رخ کر سکتے ہیں۔ ہم اس کام کو جتنی جلدی نمٹا لیں، اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

عمران نے کہا۔ ''ذہن میں بہت سے سوال ابھرتے ہیں جناب! سب سے اہم سوال تو یہی ہے کہ یہ خاص بدھا یہاں پہنچا کس طرح اور یہ کس کی ملکیت ہے؟''

ریان بولا۔ ''میری معلومات بھی اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اس حوالے سے کسی ابرار صدیقی کا نام لیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہی شخص یہ بدھا انڈیا سے یہاں لایا ہے۔ اب یہ صدیقی کہاں ہے، اس کا بھی کسی کو کچھ پتا نہیں۔ تم نے بھی کل بتایا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کے بیان کے مطابق یہ بدھا ایک چاندنی رات میں ایک تیز رفتار گاڑی میں سے نہر کے کنارے جھاڑیوں میں گرا تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ صدیقی ہی اس بدھا کو لے کر کہیں جا رہا ہو اور کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ ان لوگوں سے مجسمے کو بچانے کے لیے اس نے اسے جان بوجھ کر پھینک دیا ہو۔''

شاید ریان ولیم کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر کسی وجہ سے سگنل خراب ہو گئے اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ہم سناٹے میں تھے۔ یہاں فارم ہاؤس میں آنے کے بعد ہم نے پُراسرار باکس کے بارے میں کئی بار سنا تھا لیکن ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس باکس کا تعلق نایاب مجسمے کی اسمگلنگ کے ان واقعات سے نکل آئے گا جن کو ہم تقریباً بھول چکے ہیں۔

عمران نے کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا گڑبڑ گھوٹالا ہو گیا ہے جگر! آرا کوئے کا بھوت پھر زندہ ہو گیا ہے۔ نہ صرف زندہ ہو گیا ہے بلکہ زونگاں سے ترت یہاں شیخوپورہ روڈ کے اس فارم میں بھی آ پہنچا ہے۔ تمہاری سوگند، میری تو بدھی چکرا گئی ہے۔ بدھی کا مطلب سمجھت ہو نا تم؟''

میں نے کہا۔ ''صدیقی کا نام آنے کے بعد اس معاملے میں شبے کی گنجائش کم ہی رہ گئی ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہاں صدیقی اور بدھا کا نام ساتھ ساتھ کیوں آ رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ صدیقی ہی بدھا کو پھر انڈیا سے پاکستان لے آیا ہو۔''

''بڑا مبارک دن ہے۔ کئی مہینوں کے بعد تم نے کوئی عقل کی بات کی ہے۔'' عمران نے کہا اور پریشان بکری کی طرح سر جھکا لیا۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''یار! وہی جو تم کہنا چاہ رہے ہو۔ تمہیں یاد ہوگا جب ہم اسٹیٹ سے واپس روانہ ہونے لگے تھے تو صدیقی کو بہت تلاش کیا تھا۔ میڈم صفورا نے پورے دو دن اس کو کھوجنے میں لگائے تھے۔ پھر ایسے شواہد ملے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ صدیقی ہم سے پہلے ہی اسٹیٹ سے نکل چکا ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر بولا۔ ''اگر سچ پوچھتے ہو تو مجھے اسی وقت شبہ سا ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ بندہ اگر واقعی یہاں سے گیا ہے تو پھر جاتے جاتے کوئی کارنامہ انجام دے گیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ صدیقی نے اسٹیٹ سے نکلتے نکلتے وہ بدھا پھر چرا لیا ہے جس کے لیے وہ وہاں سزا کاٹ رہا تھا اور جس کی چوری نے چار سال پہلے ہر جگہ تہلکہ مچا یا تھا۔''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔''

''لیکن یہ کام کچھ آسان تو نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''تم بھول رہے ہو کہ ایڈووکیٹ صدیقی ایک شاطر ترین شخص کا نام ہے۔ اس کے چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ ہے اور پھر ان دنوں اسٹیٹ میں جس طرح کے حالات تھے تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ حکم اور اس کے حواری گوروں کو شکست ہو چکی تھی۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ حفاظتی انتظام درہم برہم ہو چکے تھے۔''

''لیکن پھر بھی آرا کوئے کی بڑی اہمیت تھی یار! اگر اسے غائب کیا جاتا تو چند گھنٹوں کے اندر زونگاں میں تہلکہ مچ جاتا۔''

''تمہارے اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں جگر... یہ بھی تو ممکن ہے کہ پگوڈا کے اندر اصلی مورتی کی جگہ اس کی نقل رکھ دی گئی ہو۔''

عمران کی بات میں وزن تھا۔

ایک دم ہی صدیقی کا کردار ہماری نظروں میں زبردست اہمیت اختیار کر گیا تھا اور کسی حد تک صفورا کا کردار بھی۔ صفورا اور صدیقی نوادرات کے حوالے سے دو پرانے دوستوں کی طرح تھے۔

میں اور عمران اس بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ باکس والے معاملے میں ہماری دلچسپی ایک دم ہی بہت بڑھ گئی تھی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ 16 ملین ڈالرز کے انعامی مقابلے اور فربہ اندام ریان ولیم سے شروع ہونے والے واقعات کے ڈانڈے یوں اس فارم ہاؤس اور پھر آرا کوئے سے جا ملیں گے۔ ریان ولیم کو بھی کوئی خبر نہیں تھی کہ اس نے عمران کو جس کام پر مامور کیا ہے اور جس چیز کا کھوج لگانے کو کہا ہے، اس چیز سے عمران کا پہلے ہی گہرا واسطہ رہا ہے۔ بہرحال، اب بھی آرا کوئے کی یہاں موجودگی کے بارے میں ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

عمران اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ تیزی سے سگریٹ بھی پھونک رہا تھا۔ اپنی خوب صورت ٹھوڑی کا گڑھا کھجاتے ہوئے بولا۔ ''یار! یہ تو بڑا قضیہ شروع ہو جائے گا۔ سارے کے سارے حالات پلٹ آئیں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ انڈیا سے پھر خطرناک کمانڈوز آئیں گے اور آرا کوئے کو ڈھونڈیں گے؟''

''بالکل ایسا ہی ہو سکتا ہے... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں، ریان ولیم جیسے لوگ بھی اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر کیا ہونا چاہیے؟''

''یہ بدھا اگر واقعی جلالی کے آس پاس ہے تو پھر اسے جلد از جلد برآمد ہونا چاہیے اور ہماری حفاظت میں آنا چاہیے... لیکن یہ باباجی... اپنی ذات شریف میں خود ایک بہت بڑی مصیبت ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ آسانی سے کچھ بتا کر دیں گے۔''

''اور سختی کر کے ان سے پوچھنا ممکن ہی نہیں۔ یہ چلتا پھرتا مدعا ہیں... آناً فاناً اللہ کو پیارے ہو سکتے ہیں۔''

''اصل مسئلہ تو یہی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''ورنہ ریان اور جاوا جیسے لوگ دو گھنٹے میں ان کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیتے۔''

''کوئی ترکیب سوچو۔''

وہ کش لے کر بولا۔ ''شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید ڈاکٹر مہناز سے جلالی کا لگاؤ کچھ کام آ سکتا ہے۔ یعنی اگر مہناز کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو اسے بچانے کے لیے یہ حضرت اپنی زبان کھول دیں گے لیکن اب اندازہ ہوا ہے کہ ایسے معاملوں میں یہ بالکل بے حس ہیں۔ ان حضرت نے رشتوں ناتوں کے حوالے سے اپنے اندر کوئی کمزوری رہنے

بھی نہیں کی۔ مہناز اور دوسری جوان ملازماؤں کو یہ اپنے سکون اور راحت کے لیے استعمال ضرور کرتے ہوں گے لیکن ان کے لیے کوئی جذباتی وابستگی یہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔''

''پھر تو ایک ہی حل سمجھ میں آتا ہے۔ کسی طرح باکس کا اصل مالک سامنے آجائے۔ یعنی وہ بندہ جس نے چلتی گاڑی سے باکس پھینکا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی انجان شخص کو ساری بات سمجھا کر اور باکس کا مالک بنا کر جلالی صاحب کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ انہیں مطمئن کردے؟''

''یہ حضرت کچی گولیاں نہیں کھیلے بلکہ پکے گولے کھیلے ہوئے ہیں۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ کچھ عرصہ فوج میں رہے ہیں۔ انہیں الو بنانا آسان نہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ دس پندرہ دن پہلے ایک پینٹ کوٹ والا شخص ''مالک'' بن کر آیا تھا یہاں۔ پورا پورا ڈراما کیا اس نے۔ لیکن جلالی صاحب نے باکس کے بارے میں تفصیل پوچھی۔ باکس کا رنگ کیا ہے؟ تالا کس کمپنی کا لگا ہوا ہے؟ باکس کے اندر مجسمہ کس چیز میں لپٹا ہوا ہے؟ اس پر کوئی داغ ہے یا وہ بے داغ چیں ہے؟''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس بندے کو بھی ڈاکٹر راشد کی طرح صرف ایک چڈی میں یہاں سے بھاگنا پڑا۔ گرے ہاؤنڈ کتے اس کی گاڑی کو کافی دور تک ''سی آف'' کرنے گئے۔''

''واقعی یار! اگر یہ بابا جی کہیں اللہ کو پیارے ہو گئے تو... آرا کوٹ تو ایک معمّا بن کر رہ جائے گا۔''

رات کو کھانے کے بعد میں عمران کا کمرا دیکھنے چلا گیا۔ یہ شاندار کمرا تھا۔ ڈبل بیڈ، فریج، ٹی وی سب کچھ موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ کمرا اس سے پہلے چھوٹے ویٹرنری ڈاکٹر لطیف کا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''مجھے مبارک باد دو۔ میری ترقی ہوگئی ہے۔ میں باورچی سے ڈاکٹر بن گیا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''سنا ہے کہ نیا ڈاکٹر عقیل یہاں آنے سے مکر گیا ہے۔ اب جونیئر ڈاکٹر لطیف ہی جانوروں کی دیکھ بھال کا کام سنبھالے گا۔ مجھے اس کے اسسٹنٹ کا درجہ دے دیا گیا ہے اور اس کا کمرا بھی مجھے عنایت کر دیا گیا ہے۔ وہ خود جھگوڑے ڈاکٹر راشد کے کمرے میں منتقل ہو گیا ہے۔''

''ڈاکٹر عقیل کیوں نہیں آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے یہاں کے گڑبڑ حالات کا پتا چل گیا ہو۔ آج کل جو کچھ یہاں چل رہا ہے، وہ کسی کے لیے بھی پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن میرے لیے بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔''

کیوں؟ نہیں کسی... کس کا دودھ دھونا پڑتا ہے؟''

''نہیں یار! جب میں کسی اچھے آرام دہ کمرے میں ہوتا ہوں اور وہاں ڈبل بیڈ بھی ہوتا ہے تو مجھے کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی ساتھی ہو۔''

''تو صبح مجھ کو ساتھ سلا لیا کرو۔''

''حسِ لطافت تو تمہیں چھو کر نہیں گزری۔ کھوتے! میں کسی خوبرو لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔ چلو، وہ اس ڈبل بیڈ پر نہ آئے لیکن کم از کم کوئی آس امید تو ہو۔''

''تو کوئی یارانہ جوڑ لو یہاں بھی۔ یہ تمہارے لیے کون سا مشکل کام ہے۔''

''یہاں ڈاکٹر مہناز کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آتی اپنے اسٹینڈرڈ کی۔ اب سوچو تا جس نے ریما اور نرگس جیسی دل ربا خواتین کے ساتھ وقت گزارا ہو، اس کا کوئی معیار تو ہو گا نا۔ ویسے لڑکی یہ مہناز بھی ٹھیک ہے۔ کل لان میں ڈاکٹر لائبہ، سیکریٹری ٹریم اور کچھ دوسرے ملازموں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔ میں تو بس کھڑکی میں سے دیکھتا ہی گیا۔ اتنی خوب صورتی سے دوڑ کر رن بناتی ہے کہ فیلڈر گیند ہاتھ میں پکڑ کر تکتا رہ جاتا ہے۔ رن آؤٹ کرنا ہی بھول جاتا ہے۔''

''پھر کیا ارادے ہیں؟''

''یار! اسے باؤلنگ کرانے کو دل چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ کیچ پکڑا ہی دے۔''

''وہ باؤلر کو بیک ڈرائیو مارے گی اور تمہاری مڈل اسٹمپ اڑا دے گی... میں اس کے مزاج کو کچھ کچھ سمجھ گیا ہوں۔ لگتا ہے کہ اپنی منگنی ٹوٹنے کے بعد اسے ہر جوان سال مرد سے الرجی ہو گئی ہے۔ وہ جلالی صاحب کے ساتھ بڑی مطمئن ہے۔''

''لیکن جگر! جلالی صاحب نے تو زیادہ سے زیادہ رمضان شریف تک اللہ کو پیارے ہو جانا ہے۔''

''وہ ہو بھی گئے تو وہ ہم جیسوں کو گھاس نہیں ڈالے گی۔ کوئی اور ادھیڑ عمر ڈھونڈ لے گی اور شاید شادی بھی کر لے۔''

''اچھا، دوسری ڈاکٹر لائبہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ ذرا ماٹھی ہے لیکن گزارہ کر جائے گی۔ تھوڑی بہت لفٹ بھی کرا رہی ہے۔ کل اس نے...''

یکا یک وہ چپ ہو گیا۔ ایک دم اپنی چیسٹ پاکٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں موبائل فون موجود تھا۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ''اوئے، یہ کیا؟ یہ موبائل تو ابھی آن ہے...''

گانے... یہ تو بنا ہی نہیں ہوا۔"

اس نے جلدی سے موبائل آف کر دیا۔ میں نے دیکھا اسکرین پر شاہین کا نمبر تھا... وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔ اب یہ ساری گفتگو اس نے شاہین کو سنانے کے لیے کی تھی اور ظاہر یہ کیا تھا جیسے غلطی سے موبائل کھلا رہ گیا ہے۔

"تم بہت بے ہودہ اور خبیث شخص ہو۔ جو لوگ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے تمہیں ہیرو کہتے ہیں، اس لفظ کی توہین کرتے ہیں۔"

"اور تم کیا کر رہے ہو۔ تم "توہینِ چینل" کر رہے ہو۔ یاد رکھو بعض اوقات اس کی سزا توہینِ عدالت سے بھی کڑی ہوتی ہے۔"

"ماشاء اللہ! کیا سزا ہوتی ہے اس کی؟"

"تمہارا کارٹون بنایا جائے گا اور اسے انڈیا کے کسی آئٹم سانگ پر رقص کرایا جائے گا۔ وہ سانگ بھی ایسا ہوگا جس کے بول پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکیں گے۔ اور تمہیں پتا ہی ہے جب ایسے گانوں کے بول پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے تو سننے والوں کے ذہنوں میں کیسے کیسے گندے خیالات آتے ہیں... وہ گانا..."

عمران کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گیا۔ ایک دم اس کے چہرے کی ساری غیر سنجیدگی سمٹ کر اس کی آنکھوں میں کہیں غائب ہو گئی۔ وہ کچھ سن رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی سماعت کا تعاقب کیا۔ یہ چکور کی آواز تھی جو سناٹے میں بلند ہوئی تھی۔ یہ آواز فارم ہاؤس کی باؤنڈری کے باہر سے آئی تھی۔

"سن رہے ہو؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں، چکور کی آواز ہے شاید۔"

"چکور ہی کی ہے لیکن اصلی نہیں۔ کوئی یہ آواز نکال رہا ہے۔" وہ یقین سے بولا۔

جانوروں کے حوالے سے عمران کی معلومات کو جھٹلانا بہت مشکل تھا۔ یہ بالکل چکور کی آواز تھی لیکن عمران کہتا تھا کہ نہیں ہے۔ تو کیا درختوں کی تاریکی میں کوئی شخص کسی دوسرے کو کوئی اشارہ وغیرہ دے رہا تھا؟ یہ کوئی پہرے دار ہو سکتا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی غیر متعلق شخص ہو۔ میں اور عمران دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ میری شلوار کے نیفے میں ابھی تک وہ پسٹل موجود تھا جو مختار ملک سے لڑائی کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا۔ ہم تیزی سے باہر نکلے۔ جانوروں کے پنجرے کے درمیان سے ہوتے ہوئے فارم کے بڑے گیٹ کی طرف آئے... ابھی ہم گیٹ سے تیس چالیس قدم دور تھے کہ پہلا فائر سنائی دیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ پستول کا فائر تھا۔ فوراً بعد دو اور گولیاں چلیں، یہ رائفل کی تھیں۔ یہ شوٹنگ بھی سو ڈیڑھ سو گز دور ہو رہی تھی۔ ان آوازوں نے اکا دکا فارم ہاؤس میں تہلکہ سا مچا دیا۔ پنجروں میں پرندے پھڑپھڑانے لگے اور کئی چوپایوں نے چلانا شروع کر دیا۔ گارڈز بھی آوازوں کی طرف لپکے۔ ہم مین گیٹ سے نکلے اور درختوں کی طرف بڑھے۔ باؤنڈری وال کے اردگرد بیس تیس میٹر جگہ بجلی کی ٹیوبس سے نیم روشن تھی مگر اس کے بعد گہری تاریکی تھی۔ کوئی سو میٹر آگے جانے کے بعد ہمیں ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے دیکھ لیا، یہ سیکریٹری ندیم کی سفید مہران تھی۔ وہ کچے راستے پر آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ پھر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے ندیم بھی دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل صاف نظر آرہی تھی۔ وہ بدحواس یا خستہ تھا۔

"کیا ہوا ندیم صاحب؟" فتح محمد نے بلند آواز میں پوچھا۔

"وہ نکل گئے۔"

"کون تھے؟"

"پتا نہیں، انہوں نے مجھ پر گولی بھی چلائی ہے۔"

اس وقت ہم نے دیکھا کہ مہران کار راستے سے اتری ہوئی تھی اور اس کا ایک پہیا گڑھے میں تھا۔ غالباً ندیم نے کسی کے پیچھے جانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوا تھا۔

دو شخص اور گارڈز بھی دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ہمیں تھوڑے فاصلے پر لوہے کی چھوٹی سی ہتھ ریڑھی بھی نظر آرہی تھی۔ ایسی ریڑھیاں مزدور، تعمیراتی سامان ڈھونے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ فتح محمد نے ٹارچ کی روشنی میں ہانپتے کانپتے ہوئے ندیم کا معائنہ کیا۔ وہ زخمی ہونے سے محفوظ رہا تھا۔ ہاں، گاڑی کی ونڈ اسکرین میں گولی کا سوراخ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"ہوا کیا ہے ندیم صاحب؟" فتح محمد نے دوبارہ پوچھا۔

وہ اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولا۔ "میں ٹیل کی طرف سے آرہا ہوں۔ روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ دو بندے ہتھ ریڑھی میں سے کچھ نکال کر جیپ میں رکھ رہے تھے۔ یہ کوئی بڑا تھیلا سا تھا۔ بڑی جلدی میں نظر آرہے تھے وہ۔ میں نے آواز دے کر پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ وہ جواب دینے کے بجائے جلدی سے جیپ میں بیٹھ گئے۔ ہتھ گاڑی بھی وہیں چھوڑ دی۔ میں نے ان کی طرف جانا چاہا تو انہوں نے فائر کر دیا۔ یہ مجھے ڈرانے کے لیے تھا۔ میں نے بھی گاڑی سے رائفل نکال لی اور جیپ کے ٹائر کو نشانہ بنانا چاہا... اس کے بعد فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں اس بڑے درخت کے پیچھے تھا جو ہتھ گاڑی کے پاس نظر آرہا ہے۔ چار پانچ گولیاں چلانے کے بعد انہوں نے جیپ بھگا دی۔ میں نے مہران پر ان کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن ریورس کرتے ہوئے یہ ٹائر یہاں کھڈے میں چلا گیا۔" ندیم نے تاسف سے کہا۔

فتح محمد نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، اعشاریہ تین آٹھ... کی ایک گولی ونڈ اسکرین میں لگی تھی جبکہ ایک گولی نے پچھلے دروازے میں سوراخ بنایا تھا۔

ہم سب فوراً واپس کوٹھی میں پہنچے۔ جلالی صاحب سلیپنگ گاؤن میں تھے اور بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں ساری صورتِ حال بتائی گئی۔ دو گاڑیاں فوراً مشتبہ جیپ کی تلاش میں روانہ ہوئیں۔ جلالی صاحب نے دونوں گاڑیوں سے موبائل فون پر رابطہ رکھا ہوا تھا۔ قریباً ڈھائی گھنٹے بعد دونوں گاڑیاں گھوم پھر کر واپس آگئیں۔ مشتبہ جیپ کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

تنہائی ملی تو میں نے عمران سے پوچھا۔ "یہ کیا چکر چل رہا ہے؟"

"کافی سنگین چکر لگتا ہے۔ جلالی صاحب بھی پریشان ہیں۔"

"کہیں یہ وہی باکس والا معاملہ ہی تو نہیں؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ آرا کوئے والا باکس باباجی کے ہاتھ سے بھی نکل گیا ہے۔"

"کیا اسے اتنی آسانی سے ڈھونڈ لیا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا تابی! یار لوگوں نے صدام کو بھی ڈھونڈ نکالا تھا مگر ہم میں سے کچھ نکتہ چیں اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔ بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ صدام کے بجائے اس کے کسی ہم شکل کو پھانسی دی گئی تھی۔ انسان چاند پر قدم رکھ چکا لیکن ہم اسے اب بھی ڈراما قرار دیتے ہیں۔ نائن الیون کے حوالے سے بھی نئی نئی موشگافیوں کی فیکٹریاں ہم نے لگا رکھی ہیں۔ میرے اور ٹنڈولکر کے بارے میں بھی کئی بے ہودہ خبریں لوگ پھیلاتے رہتے ہیں۔"

"تمہارا اور ٹنڈولکر کا کیا میل ہے؟" میں مسکرایا۔

"اسی کو تو بے ہودہ اور بے بنیاد خبر کہتے ہیں۔" وہ دانائی سے بولا۔ "نہ میں ٹنڈولکر کی طرح کرکٹ کھیلتا ہوں، نہ وہ کسی نیوز چینل کا اینکر ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلی فرصت میں ریان ولیم کو فون کر کے یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہیے۔"

"ہاں، یہ تو ضروری ہے۔" میں نے تائید کی۔

اس نے سگریٹ سلگایا۔ پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ کچھ دیر تک کمرے میں گہری خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ "ویسے تابی! ہمیں اس صورتِ حال کا ایک اور پہلو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے... سچویشن کا ایک دوسرا اینگل بھی ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

اس نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا، تب دھیمے لہجے میں بولا۔ "یہ امکان بھی ہے کہ جلالی صاحب کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔"

"وہ کس طرح؟"

"ہم کچھ دیر کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ جلالی صاحب نے آرا کوئے والے باکس کو حفاظت کی غرض سے فارم ہاؤس کے اردگرد کہیں چھپا رکھا ہے۔ انہوں نے یہ کام اکیلے کیا ہے اور اس جگہ کی خبر ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر کچھ دیر پہلے جو واقعہ ہوا ہے، اس نے یقیناً جلالی صاحب کو بہت پریشان کیا ہوگا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جسے کچھ لوگوں نے ہتھ گاڑی سے نکال کر جیپ میں رکھا اور پھر بھاگ گئے۔ نہ صرف بھاگے بلکہ خود کو بچانے کے لیے باقاعدہ فائرنگ بھی کی۔"

"ہاں، بات سمجھ میں آرہی ہے۔ ان کا دھیان "باکس" کی طرف بھی جا سکتا ہے۔"

"بالکل جا سکتا ہے... بلکہ گیا ہوگا۔ اب سوچو... وہ کیا کرنا چاہیں گے؟ وہ تصدیق کرنا چاہیں گے کہ باکس اپنی جگہ پر موجود ہے یا نہیں۔"

میں نے تشفی محسوس کی۔ عمران کی بات میں زبردست منطق موجود تھی۔

میں نے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ جلالی صاحب کا پیچھا کیا جائے گا؟"

"اللہ تمہیں نرینہ اولاد دے۔ میرا مطلب بالکل یہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اگلے ایک دو دن میں ہمیں جلالی صاحب کی آمد و رفت پر نظر رکھنی ہوگی۔"

"یقیناً... خاص طور پر اس وقت جب وہ کہیں اکیلے

روانہ ہوں۔"

"فرض کیا وہ روانہ ہوتے ہیں اور ہمیں پتا بھی چل جاتا ہے، تو پھر؟" میں نے پوچھا۔

"پھر ان کا پیچھا کیا جا سکتا ہے۔ "زو" میں تین پک اپ گاڑیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک کی چابی میرے پاس موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک اسکوٹر بھی قابلِ استعمال حالت میں ہے۔"

"یہ لمبا چوڑا کھیل لگتا ہے عمران۔ جاوا جیسے لوگ اس میں ملوث ہیں۔ فرض کیا سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا ہم نے سوچا ہے۔ ہم نے جلالی صاحب کا پیچھا بھی کر لیا لیکن جب جلالی صاحب موقع پر پہنچے اور پندرہ بیس مسلح بندے وہاں آدھمکے تو پھر؟"

"یار! تم سب کچھ پہلے ہی تو مت سوچ لو نا۔ کچھ فیصلے موقع پر بھی کیے جاتے ہیں۔ اگر ہمیں محسوس ہوا کہ جلالی صاحب کے آس پاس زیادہ گڑبڑ ہے تو ہم انہیں آگے جانے سے روک بھی سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم انہیں بتا سکتے ہیں کہ انہیں ٹریپ کیا جا رہا ہے۔ وہ جہاں جا رہے ہیں، وہاں کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ لیکن ابھی تو یار یہ سب مفروضہ ہی ہے نا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی چکر ہی اور ہو۔"

وہ رات گزر گئی۔ اگلے دن بھی کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ فارم ہاؤس کے اردگرد چوکیداروں کی تعداد بڑھا دی گئی تھی۔ حسبِ سابق اس واقعے کی رپورٹ بھی جلالی صاحب نے پولیس میں درج نہیں کرائی۔ تاہم وہ پریشان نظر آتے تھے اور یہ پریشانی واضح طور پر محسوس ہوتی تھی۔ یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے۔ عمران ڈاکٹر لطیف کے ساتھ لاہور گیا ہوا تھا۔ ایک ایرانی بلی بھی ساتھ گئی تھی۔ اس کا کوئی چیک اپ ہونا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں جانوروں کے لیے کچھ ادویات بھی لے کر آنا تھیں۔ ان کی واپسی شام کے فوراً بعد ہو جانا تھی لیکن پھر عمران کا فون آیا کہ قیمتی ایرانی بلی کو مزید ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے اور وہ کل سہ پہر سے پہلے واپس نہیں آ سکیں گے۔ یہ وہی حاملہ بلی تھی جس کو بچے جنم دینے تھے۔

رات کوئی دس بجے کا وقت ہوگا۔ کوٹھی کی بیشتر روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ وسیع و عریض لان بھی خالی تھا۔ میں دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ یہاں سے مجھے کوٹھی کا پورچ صاف نظر آتا تھا۔ وہ شیورلیٹ بھی دکھائی دیتی تھی جسے جلالی صاحب زیادہ تر سفر کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پچھلے تین دن سے میں نے مسلسل پورچ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ عمران بھی یہی کر رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمیں جلالی صاحب کی آمد و رفت کی خبر رہے لیکن وہ ان تین دنوں میں کہیں نکلے ہی نہیں تھے۔ صرف ایک صبح پیدل نکلے تھے۔ طرح دار ڈاکٹر مہناز بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے واپس لوٹ آئے تھے۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے جلالی صاحب کی شیورلیٹ کے قریب ایک سایہ سا نظر آیا۔ شیورلیٹ کے قریب ہی چھوٹی پوٹھوہار جیپ کھڑی تھی۔ سائے نے جیپ کے گرد مشکوک انداز میں ایک چکر لگایا۔ چند سیکنڈ بعد نیچے جھکا جیسے اگلے پہیے کی ہوا چیک کرنا چاہتا ہو۔ وہ قریباً آدھ منٹ تک وہیں رہا۔ مجھے لگا کہ اس نے کچھ کیا ہے۔ پھر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شاید کوٹھی کے اندر چلا گیا تھا۔ بظاہر یہ عام سا واقعہ تھا لیکن موجودہ حالات میں اسے ہرگز نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں زیادہ الرٹ ہو گیا اور پورچ کو مسلسل اپنی نگاہ میں رکھا۔ تقریباً آٹھ دس منٹ بعد میرے دل کی دھڑکن اچانک بڑھنا شروع ہو گئی۔ میں نے پوٹھوہار جیپ کے قریب ایک اور سایہ دیکھا۔ یہ یقیناً جلالی صاحب تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے سے آئے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ وہ اکیلے کہیں جا رہے تھے۔ ان کی عمر اور ان کی جسمانی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ اس طرح رات کے وقت کہیں اکیلے نکلیں لیکن انہیں روکنے ٹوکنے کی جرأت کون کر سکتا تھا؟ ایک دم میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ یہاں کچھ ہونے والا تھا اور عمران یہاں نہیں تھا۔ مجھے اس کی بے وقت غیر موجودگی پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے چند سیکنڈ تک سوچا پھر سیڑھیاں اتر کر تیزی سے نیچے آیا۔ عمران نے کہا تھا کہ ہم اسکوٹر پر جلالی کا پیچھا کریں گے لیکن اس وقت تو اسکوٹر نظر آ رہا تھا اور نہ ہی وہ پک اپ جس کی چابی عمران کے پاس تھی۔ اب تو ایک ہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ جلالی صاحب کو جانے سے روکا جائے۔ وہ کسی جال میں پھنسنے والے تھے۔

میں احاطے میں پہنچا تو ان کی سفید پوٹھوہار جیپ مین گیٹ سے نکل رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف گیا۔ میں نے گارڈز کو پکار کر کہا کہ وہ جلالی صاحب کو روکیں لیکن انہوں نے میری بات نہیں سنی۔ جلالی صاحب نکل گئے۔ میں گیٹ پر پہنچا تو گارڈز نے مجھے روک لیا۔ وہ ششدر تھے۔

"کیا بات ہے؟" فتح محمد نے گرج کر پوچھا۔

"جلالی صاحب کو روکو۔ ان کے لیے مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔"

"کیا مسئلہ ہے؟" وہ جھلا کر بولا۔

"تم پہلے ان کو روکو۔" میں نے بھی جھلا کر کہا۔

"کیا تماشا لگا رہے ہو؟ کیا چاہ رہے ہو؟" اس نے مجھے دھکا دیا۔

میں نے بھی جواباً اسے دھکا دیا۔ اسے مجھ سے ایسے شدید دھکے کی توقع نہیں تھی۔ وہ ادھ کھلے گیٹ سے ٹکرایا اور پلٹ کر ایک اسٹول پر گرا۔ میں اندھا دھند جیپ کے پیچھے بھاگا۔ جیپ کافی آگے درختوں میں پہنچ چکی تھی۔ وہ رفتار پکڑ چکی تھی۔ شاید میرے لیے اسے روکنا ممکن نہ ہوتا مگر اسی دوران میں سامنے ایک ٹارچ چمکی، کوئی گارڈ موجود تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔ "جلالی صاحب کو روکو۔"

بات گارڈ کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے جیپ کے سامنے آ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ دھیمی ہوئی اور پھر رک گئی۔ میں ہانپتا ہوا دوڑ کر اس تک پہنچ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جلالی صاحب موجود تھے اور حیرت آمیز غصے سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے اجازت طلب کیے بغیر جیپ کا دروازہ کھولا اور ان کے برابر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ پھنکارے۔

"صاحب جی! آپ نہ جائیں۔ آپ کے لیے کوئی بڑا مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

"کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اور تم مجھے روکنے والے کون ہو؟"

"میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔ پلیز، آپ فارم میں واپس چلیں۔"

"میں سب سمجھ گیا۔ ڈاکٹر مہناز نے بھیجا ہے نا تمہیں؟ اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے۔ وہ کیا سمجھتی ہے... میں بڈھا ہوں، ناکارہ ہوں، اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتا؟ کون ہوتی ہے وہ مجھ پر پابندیاں لگانے والی؟ میری موت جب آنی ہے، وہ آ جائے گی۔ وہ اسے روک نہیں سکتی۔ بے وقوف کی بچی..."

"نہیں سر! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس معاملے سے ڈاکٹر مہناز کا کوئی تعلق نہیں۔ لگتا ہے کہ کچھ لوگ آپ کو ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں سب کچھ۔ آپ واپس چلیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے آپ کی جیپ میں کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔"

میرے آخری فقرے سے جلالی کا پارا تھوڑا سا نیچے آیا۔ اس نے عینک کے پیچھے سے گھور کر مجھے دیکھا۔ "تمہیں کیسے پتا ہے... کہاں دیکھا ہے تم نے؟"

میں نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا ہے جناب... اور مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ لوگ آپ کا پیچھا کرنا چاہ رہے ہیں۔ کیا آپ کسی خاص جگہ پر جا رہے تھے؟"

"کیا بک رہے ہو تم؟ میرا پیچھا کون کرے گا؟ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ گاڑی میں گڑبڑ کی گئی ہے۔ اب کہہ رہے ہو کوئی پیچھا کر رہا تھا؟"

"آپ گاڑی کو چیک کریں۔ اس کا بریک وغیرہ تو فیل نہیں یا اسٹیئرنگ میں کوئی مسئلہ ہو؟"

جلالی نے وہیں بیٹھے بیٹھے بریک پیڈل دبا کر دیکھا، وہ بالکل صحیح تھا۔ اندرونی لائٹ جلا کر اس نے اسٹیئرنگ کے نیچے کراس کو دیکھا۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔ اس دوران میں فتح محمد اور دیگر گارڈز بھی ہانپتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ فتح محمد کا ایک بازو چھلا ہوا تھا اور ناک سے خون رس رہا تھا۔ وہ مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے جلالی صاحب کو بتایا۔

"یہ مجھے دھکا دے کر آپ کے پیچھے بھاگا ہے۔ صادق تو اس پر گولی چلانے لگا تھا، میں نے روکا۔"

میں نے کہا۔ "جلالی صاحب! میں آپ کے سارے سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔ پلیز، آپ گاڑی واپس لے جائیں۔ اگر میرا کہا غلط نکلے تو جو سزا چاہیں مجھے دے لیں۔"

جلالی صاحب کچھ دیر تک مجھے گھورتے رہے۔ پھر انہوں نے جیپ کو یوٹرن دیا اور واپس فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ جلالی صاحب نے اپنی سیٹ کے قریب ایک شاندار "بیکال" رائفل بھی رکھی ہوئی تھی۔ اب پتا نہیں کہ وہ بوقتِ ضرورت اس کا گھوڑا دبانے کی طاقت اپنے اندر رکھتے تھے یا نہیں۔

جیپ واپس پورچ میں پہنچ گئی۔ کئی ملازم ہمارے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان میں سیکریٹری ندیم، ملازمِ خاص فتح محمد اور ہیڈ گارڈ صادق علی وغیرہ بھی شامل تھے۔ رکھوالی کے کتے اپنی دموں کو گردش دیتے ہمارے اردگرد چکرانے لگے۔

جلالی صاحب نے کڑکتے لہجے میں کہا۔ "ہاں بتاؤ، کیا بتانا چاہتے ہو؟"

میں جیپ کے اگلے پہیے کے پاس بیٹھ گیا اور مڈگارڈ کے نیچے اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ مجھے وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی۔ میں نے پہیے کے نٹ بھی دیکھے، وہ ٹھیک

کسے ہوئے تھے۔ میں نے خود کو پزل محسوس کیا۔ اگر میں کوئی خاص تبدیلی نہ ڈھونڈ سکتا تو میری بات غلط ثابت ہو جاتی۔ ایسے میں جلالی صاحب میری کم بختی لا سکتے تھے۔ یقیناً فتح محمد کا پارا بھی چڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے فتح محمد کے ہاتھ سے ٹارچ لی اور پشت کے بل جیپ کے نیچے لیٹ کر اس کے اگلے حصے کا معائنہ کرنے لگا۔ یکایک میں چونک گیا۔ مڈگارڈ کے پلاسٹک کور میں اندر کی طرف درز نظر آ رہی تھی، میں نے اس درز کو کھولا تو ایک چھوٹی سی براؤن ڈبیا گاڑی سے چپکی نظر آئی۔ میں نے یہ ڈبیا سیکریٹری ندیم کو بھی دکھائی اور پھر اسے اکھاڑ لیا۔

"یہ کیا ہے؟" جلالی صاحب بھی اب چونک گئے تھے۔

"مجھے کیا پتا جی۔ میں تو کھانا پکانا جانتا ہوں۔ بس میں نے جو دیکھا تھا، آپ کو بتا دیا ہے۔"

سیکریٹری ندیم نے اس "چھوٹی ماچس" کے سائز کی ڈبیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ "یہ تو کوئی الیکٹرانک ڈیوائس لگتی ہے۔ شاید اس سے کوئی سگنل وغیرہ نشر ہوتا ہو۔"

جلالی صاحب کو ایک دم صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے سیکریٹری ندیم کے سوا سب کو پورچ سے باہر نکال دیا۔ باہر نکلنے والوں میں فتح محمد بھی شامل تھا۔ وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا لیکن اس گھورنے میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔

"یہ کیا چکر ہے؟" جلالی صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "جناب! میرا کام تو باورچی کا ہے۔ ایسی باتوں کا مجھے زیادہ پتا نہیں لیکن مجھے شک پڑ رہا ہے کہ یہ سازش ہے۔ اس سازش کا تعلق اسی باکس سے ہے جس کے پیچھے کچھ لوگ ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس رات کو جو کچھ ہوا، وہ بھی ایک ڈراما ہی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ ندیم صاحب کو جان بوجھ کر ناٹک دکھایا گیا ہو۔ اس طرح آپ کو شک میں ڈالا گیا ہو کہ آپ نے جس جگہ باکس چھپایا ہے، شاید اب وہ وہاں موجود نہیں ہے..."

جلالی صاحب ایک دم گم صم نظر آئے۔ وہ بار بار اپنی عینک کو ناک پر درست کر رہے تھے۔ یقیناً بات ان کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ سیکریٹری ندیم بھی متحیر تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "اگر واقعی یہ سازش ہے تو بڑی گہری ہے جناب... ان لوگوں نے سوچا ہوگا کہ آپ باکس کے بارے میں فکرمند ہوں گے اور دیکھنا چاہیں گے کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں۔ وہ آپ کا پیچھا کریں گے اور لوکیشن دیکھ لیں گے۔ پیچھا کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے یہ سگنل دینے والا ٹریکر گاڑی پر لگا دیا۔"

جلالی صاحب بے دم سے ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی باڈی لینگویج گواہی دے رہی تھی کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہ درست ہے۔

"یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟" کچھ دیر بعد انہوں نے نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

"ظاہر ہے کہ کوئی گھر کا بھیدی ہی ہے۔" ندیم نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تابش! تم چشم دید گواہ ہو۔ تم نے بندے کو دیکھا ہے، کچھ اندازہ ہے تمہیں؟"

"نہیں جی، میں نے بس ہیولا سا دیکھا تھا۔ میں تو شاید یہ بھی ٹھیک سے نہ بتا سکوں کہ وہ مرد کا ہیولا تھا یا عورت کا۔"

ندیم نے ٹارچ جلائی اور گرد آلود فرش پر پاؤں کے نشان ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں روانگی سے پہلے پوٹھوہار جیپ پارک تھی۔ زمین پر بہت سے قدموں کے نشان نظر آ رہے تھے مگر گڈمڈ تھے۔ ان میں ایک دو نشان لیڈیز جوتے کے بھی تھے۔ جلالی صاحب بالکل گم صم تھے۔ شاید وہ میری تعریف میں کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن انہوں نے کہا کچھ نہیں۔ ماچس نما ڈیوائس لے کر اندر چلے گئے۔

اگلے روز میں نے ڈاکٹر مہناز کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کیا۔ ڈاکٹر مہناز نے کہا۔ "کل جو کچھ ہوا ہے، وہ ظاہر کرتا ہے کہ باکس کو ڈھونڈنے والے اس تک پہنچنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہے ہیں۔ جلالی صاحب آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ عقل دانش کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔ ایک باورچی کے دماغ میں وہ بات آ گئی جو ہم میں سے اور کسی کے دماغ میں نہیں آئی۔"

میں خاموش رہا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس ہوشیاری میں بھی مجھ سے زیادہ عمران کا عمل دخل ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ بول اٹھی۔ "میں نے جلالی صاحب کو بتا دیا ہے کہ آپ دونوں باورچی وغیرہ نہیں ہیں بلکہ ایک خاص مشن پر یہاں موجود ہیں۔ کچھ خاص لوگوں نے آپ کو یہاں بھیج رکھا ہے۔"

میں نے چونک کر ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ میرا پورا

جسم تھرا گیا تھا۔ پھر ایک دم میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ وہ ہنسی اور اس کے موتیوں جیسے دانت چمک اٹھے۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ایسا غضب نہ کرنا ڈاکٹر صاحب! سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔ جناب تھے سے اکھڑ گئے تو کھڑے کھڑے لات مار کر کوٹھی سے باہر کر دیں گے اور کیا پتا کپڑے بھی اتروا لیں۔"

"لیکن تابش صاحب! ایک بات ہے۔ آپ لوگوں کو کم از کم میرا سسپنس تو دور کرنا چاہیے۔ میں آپ پر اعتماد کر رہی ہوں، آپ مجھ پر نہیں کر رہے۔ مختار ملک والا کتنا بڑا واقعہ ہو گیا لیکن آپ نے مجھے ابھی تک اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ کون تھا؟ کیا یہاں اکیلا تھا یا اس کا کوئی بھی ساتھی ہے؟ اس کی ضمانت دے کر اسے یہاں نوکری دلانے والا کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "سچی بات یہ ہے ڈاکٹر مہناز کہ ابھی تک اس حوالے سے میں بھی اندھیرے میں ہوں۔ عمران پتا چلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ مختار کا ضامن کون تھا لیکن اس بارے میں بھی کوئی چونکا دینے والا انکشاف نہیں ہونے والا۔ مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ مختار کا تعلق جاوا سے ہی ہو گا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ ناشتے کا ٹائم شروع ہونے میں صرف آٹھ منٹ رہ گئے ہیں۔

مجھے اور ڈاکٹر مہناز کو تیزی سے ہاتھ چلانا پڑے۔ ناشتا تیار ہوتے ہی مہناز اپنا ایپرن اتار کر اور ہاتھ وغیرہ دھو کر کھانے کے کمرے کی طرف لپک گئی۔ ناشتے کی ٹیبل پر وہ روزانہ جلالی صاحب کے ساتھ ہوتی تھی۔ دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ وہی ملازم پھر آ گیا۔ اس مرتبہ وہ مجھے بلانے آیا تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں صاحب جی کھانے کے کمرے میں بلا رہے ہیں۔"

"یا اللہ خیر۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

جلالی صاحب کے روبرو جانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا تھا۔ ان کے موڈ کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشا والا معاملہ تھا۔ ایک دم بھڑک اٹھتے تھے اور پھر انہیں سنبھالنا دشوار ہو جاتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں ناشتے میں کوئی کسر رہ گئی ہے جس کے لیے یہ نادر شاہی حکم آیا ہے۔ میں کھانے کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے ایک عجیب آرڈر جاری کیا۔ "یہاں بیٹھو کرسی پر۔"

میں ٹھٹک گیا۔ وہ مجھے اپنے برابر، ناشتے کی میز پر بٹھا رہے تھے۔ میں تھوڑا سا تذبذب دکھانے کے بعد بیٹھ گیا۔

"ہمارے ساتھ ناشتا کرو۔" انہوں نے پھر حکم جاری کیا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے ویسا ہی کرنا ہوگا جیسا وہ کہہ رہے ہیں، ورنہ یہ عزت افزائی کسی بھی وقت زبردست تذلیل میں بدل سکتی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گئے۔ "مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں۔ کل تم نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔ ہم میں سے کسی کا دماغ اس طرف نہیں گیا جس طرف تمہارا گیا۔ شروع میں جب تم نے مجھے باہر جانے سے روکا تو مجھے بہت غصہ آیا تھا لیکن بعد میں وہی کچھ درست نکلا جو تم نے کہا تھا۔ وہ ڈبیا جو کل جیپ کے نیچے سے نکلی ہے، ایک الیکٹرانک ٹریکر ہے۔ قریباً سات آٹھ کلومیٹر کے ایریا میں اس کا سگنل آسانی سے ریسیو کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ یہ سب کچھ ایک سازش کا حصہ تھا۔ تم بہت دور کی کوڑی لائے ہو۔ میں پوچھنا پسند کروں گا کہ یہ سب کچھ تمہارے دماغ میں آ کیسے گیا؟"

میں نے انکساری کے انداز میں کہا۔ "سچ بات تو یہ ہے جناب کہ اس بارے میں بھی استاد جی نے ہی اپنا دماغ دوڑایا تھا۔ استاد عمران نے کافی عرصہ ایک بڑے انڈین پولیس افسر کے گھر میں بھی ملازمت کی ہے۔ شاید یہ وہاں کے ماحول کا ہی اثر ہے کہ انہیں ایسے معاملوں میں سوچ بچار کی عادت پڑ گئی ہے۔ شکل وصورت سے بندے کے کریکٹر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں اکثر اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ جس رات درختوں میں ندیم صاحب اور جیپ والوں میں فائرنگ ہوئی، اسی رات استاد جی نے مجھ سے کہا تھا کہ اس میں کوئی چکر ہو سکتا ہے۔"

جلالی صاحب نے لمبی سانس لیتے ہوئے اپنی اونچی ناک پر موٹے چشمے کو درست کیا اور بولے۔ "یہ تمہارا استاد ہرفن مولا شخص لگتا ہے۔ پتا نہیں کہ کس کس گھر میں کام کر چکا ہے اور کیا کیا سیکھ چکا ہے۔ جانوروں کے بارے میں بھی اسے کافی جانکاری ہے۔ بتا رہا تھا کہ مشہور شکاری تہور علی صندوقی صاحب کا باورچی بھی رہ چکا ہے اور ان کے شکار کیے ہوئے ہر طرح کے حلال جانوروں کا گوشت پکاتا رہا ہے۔ خاص طور سے ہرن کی ڈشیں تیار کرنے میں اسے خاص الخاص مہارت حاصل ہے۔"

"جی ہاں لیکن استاد جی کو جانوروں سے پیار بھی بہت

ہے اور جانور بھی ان سے بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔ آج کل ان کو یہ شوق چرایا ہوا ہے کہ ہوا میں اڑتی پھرتی چڑیاں ان کے ہاتھ سے لے کر دانہ کھائیں۔ یہ کوشش کر رہے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ اس میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔"

"ہاں، کچھ لوگ ایسا کر لیتے ہیں۔ میں نے خود ایک ڈاکومینٹری فلم میں دیکھا تھا۔ اٹلی کے شہر "پیسا" کا ایک سین دکھایا گیا تھا۔ ایک شخص ہوا میں اڑتی پھرتی چڑیوں کو اپنے ہاتھ سے "فیڈ" کر رہا تھا۔ بعض لوگوں میں جانوروں کے لیے خاص کشش پائی جاتی ہے۔ یہ تمہارا استاد بھی ان میں سے ایک ہے۔ میرے خیال میں تو اسے باورچی کا کام چھوڑ دینا چاہیے۔ ذہین بندہ ہے، یہ کام چھوڑ کر زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ ہماری قوم کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام نہیں کر رہے۔ جس کو موٹر مکینک ہونا چاہیے، وہ ڈاکٹر بننے کی کوشش کر رہا ہے، جس کو ڈاکٹر ہونا چاہیے، اس کے پاس وسائل نہیں... وہ کھڑکیاں ویلڈنگ کر رہا ہے۔"

"لیکن جناب! کھانا پکانا تو استاد عمران کا خاندانی کام ہے... ان کے والد..."

"یہ کیا بات ہوئی؟" جلالی صاحب نے تیزی سے میرا فقرہ کاٹا۔ "کسی کا باپ ڈکیت رہا ہے تو کیا اسے ڈکیتی ہی زیادہ راس آئے گی؟ چور سے قطب اور قطب سے چور پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کیا بات کہی تم نے کہ یہ اس کا خاندانی کام ہے۔ خاندانی کام کا مطلب کیا یہ ہوتا ہے کہ ایک نسل کے بعد دوسری اور پھر تیسری مکھی پر مکھی مارتی رہے۔ تمہارے باپ کا خاندانی کام کیا تھا؟" انہوں نے غصے سے پوچھا۔

ڈاکٹر مہناز نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ میں بحث میں الجھنے کی کوشش نہ کروں۔ میں نے ڈھیلے انداز میں کہا۔ "وہ تو باورچی نہیں تھے جی... وہ درزی کا کام کرتے تھے۔"

"تو پھر تم کیسے باورچی بن گئے اور ایک اچھے باورچی بنے۔ یہ ناشتا تم نے ہی بنایا ہے نا... یا کسی اور نے بنا کر دیا ہے تمہیں؟"

مہناز کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "میں نے ہی بنایا ہے جی۔"

"تو پھر...؟ اس میں خاندانی فن کاری کہاں سے آ گئی۔ یا پھر یہ ہوگا کہ تمہاری ماں باورچن ہوگی یا پھر تمہاری پڑ دادی یا لکڑ دادی بہادر شاہ ظفر کے لیے بریانی بناتی رہی ہو گی۔ یہ کس حساب سے تم نے کہا ہے کہ خاندانی کام خاندانی کام ہوتا ہے..."

مہناز نے آنکھ بچا کر مجھے پھر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں جی۔ الویں غلط بات کر دی میں نے... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..."

جلالی صاحب کچھ دیر تک تلملاتے رہے اور مجھے گھورتے رہے۔ یوں لگتا تھا کہ اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مہناز نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اب خالی برتن اٹھا کر باہر نکل جاؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

ویسے اندر ہی اندر میں بھی سٹپٹایا ہوا تھا۔ بابا جی کس وقت اور کس بات پر جھٹ سے اکھڑیں گے، اس کے بارے میں اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا۔ اب وہ چھوٹے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور ڈاکٹر مہناز کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے عمران کے لگائے ہوئے ڈکٹافون کا ریسیور آن کر دیا۔ واضح آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بالکل یوں لگا جیسے ریڈیو کے کسی ٹاک شو میں دو افراد بول رہے ہوں۔ ایک ایک لفظ پوری وضاحت کے ساتھ کانوں تک رسائی حاصل کر رہا تھا۔ میں نے آواز کا حجم اپنی ضرورت کے مطابق کر لیا۔ جلالی صاحب کا موڈ شاید اب تک آف تھا۔ وہ سخت لہجے میں مہناز سے کہہ رہے تھے۔ "جو کچھ بھی ہے، مجھے اس رات والا کام پسند نہیں آیا۔ وہ کھلی چھت تھی، کوئی کمرا تو نہیں تھا... کوئی بھی تمہیں میرے ساتھ لیٹے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ آئندہ ایسا نہ ہو تو اچھا ہے۔"

مہناز کی آواز ابھری۔ "معافی چاہتی ہوں۔ میری بات کا غصہ نہ کیجیے گا۔ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو کیا ہوتا۔ یہ کوئی پہلا واقعہ تو نہ ہوتا۔ سب جانتے ہیں کہ آپ پہلے بھی ایسا کرتے رہے ہیں۔ یہ بس آپ کی عادت ہے۔ اس میں کوئی خاص جذبہ تو نہیں ہوتا..."

"تم کیا جانتی ہو میری اس عادت کے بارے میں؟" جلالی کا لہجہ تلخ تھا۔

"کچھ زیادہ نہیں جی۔ بس اتنا پتا ہے کہ اس سے پہلے آپ رخشی کے ساتھ بھی اسی طرح لیٹتے رہے ہیں اور اس سے پہلے ایک استانی شائستہ آئی تھی یہاں... جو ملازموں کے بچوں کو پرائمری کے امتحان کی تیاری کراتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی آپ کا ایسا ہی تعلق تھا... اور شاید اس کے علاوہ بھی ایک دو ہوں گی۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ میں ایسا نہیں کرتا رہا ہوں... لیکن تمہاری وجہ سے یہ معاملہ کچھ اور رنگ اختیار کرتا جا رہا ہے اور مجھے اس وجہ سے پریشانی ہے۔"

"کیا آپ کچھ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟" مہناز نے کہا۔ لگتا تھا کہ آج وہ بھی اپنے خوف کو پس پشت ڈال کر کھلی باتیں کرنا چاہ رہی ہے۔

جلالی صاحب نے پُرطیش کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "دیکھو مہناز! میں تمہیں ایک بات بالکل صاف صاف بتا دوں۔ میں وہ ضدی گھوڑا ہوں جس نے کسی بڑے سے بڑے سوار کو بھی خود پر سواری نہیں کرنے دی اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کسی طرف سے کمزور نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں جس روز جلالی کی کوئی کمزوری دنیا والوں کے ہاتھ آ جائے گی، جلالی... جلالی نہیں رہے گا۔ تم جس طرح ہر وقت میرے آگے پیچھے پھر رہی ہو، میرے ذاتی معاملوں میں دخل دے رہی ہو، یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔"

چند سیکنڈ تک مکمل خاموشی رہی۔ پھر ریسیور پر ڈاکٹر مہناز کی آواز ابھری۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "سر! جب آپ کے دل میں کچھ ہے ہی نہیں تو پھر میری ذات آپ کی کمزوری کیسے بن سکتی ہے؟ میں بھی تو ان دوسری عورتوں کی طرح ہی ہوں جو آپ کے اردگرد ہیں، آپ کی خدمت گار ہیں اور جن کے ساتھ آپ کسی وقت ایک خاص قسم کے رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو اپنے ساتھ سلاتے ہیں یا انہیں اپنے بہت قریب رکھتے ہیں۔"

"تم مجھ سے بحث کرنا چاہتی ہو، زبان چلانا چاہتی ہو میرے ساتھ؟" ایک دم جلالی صاحب پوری طرح اکھڑ گئے۔

"میری اتنی جرأت کہاں سر! میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے یہ خاص اہمیت کیوں دے رہے ہیں جبکہ میری کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔"

"کیا اس طرح تم مجھ سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ تمہاری خاص اہمیت ہے؟" وہ بدستور بپھرے ہوئے تھے۔

"نہیں سر! میں ایسا نہیں چاہتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ بجھی بجھی سی آواز میں بولی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر جلالی صاحب نے قدرے بدلے ہوئے لب و لہجے میں کہا۔ "اور اگر میں کہوں کہ ایسا ہے یا ایسا ہو رہا ہے تو پھر؟"

"کک... کیا؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟" مہناز نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کپکپاہٹ کی تہ میں کہیں شاید خوشی کی ہلکی سی لہر بھی تھی۔

"وہی جو تم سن رہی ہو... اگر میں تمہارے ساتھ یہ ساری بکواس کر رہا ہوں اور اپنا مغز کھپا رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ ہے۔ میں تمہارے سلسلے میں پریشان ہوں۔ میں تم سے دو دفعہ پہلے بھی گزارش کر چکا ہوں کہ یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تم چلی جاؤ... کم از کم کچھ دنوں کے لیے ہی چلی جاؤ لیکن تم یہاں سے ٹل نہیں رہی ہو۔"

جلالی صاحب کے اندازِ گفتگو نے مہناز کو کچھ حوصلہ دیا۔ وہ ذرا اٹھلا کر بولی۔ "اور میں جاؤں گی بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جان ہی جائے گی نا... لیکن میں آپ کی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ کے پاس بہت پیسا ہے۔ زمین ہے، شہر میں کروڑوں کی پراپرٹی ہے۔ آپ کے قریب رہوں گی تو کچھ نہ کچھ فائدہ تو مجھے بھی ہوگا نا۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔

"میں جانتا ہوں۔ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، سب کچھ اس کے الٹ ہے۔ تمہیں ان چیزوں کا لالچ نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ تم کچھ علیحدہ ٹائپ کی لڑکی ہو۔ اپنے من کی موج میں بہنے والی۔ اپنے بنائے ہوئے رستے پر چلنے والی۔"

وہ پھر مسکراتے لہجے میں بولی۔ "لیکن کسی کے دل کا کیا پتا ہوتا ہے سر! ہو سکتا ہے کہ میرے دل میں کچھ ایسی باتیں ہوں جو آپ کی سوچ سے مختلف ہوں۔"

"میں نے یہ بال اور یہ بھویں وغیرہ دھوپ میں سفید نہیں کیں۔" جلالی صاحب نے اپنے مخصوص بھاری بھرکم انداز میں کہا۔

لگتا تھا کہ ان باتوں نے مہناز کو دل سے خوش کیا ہے۔ وہ بولی۔ "اچھا، اب آپ یہیں بیٹھیں۔ آپ کی معدے والی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے پاؤں کا مساج بھی کرنا ہے۔ کل بھی ناغہ ہو گیا تھا۔ میں ابھی آئنٹمنٹ لے کر آتی ہوں۔"

"لیکن جانے سے پہلے میری ایک بات ذرا دھیان سے سن لو۔" جلالی صاحب کے لہجے میں پھر گہری سنجیدگی آ گئی۔

"جی۔" مہناز نے کہا۔

"یہ جو تم میرا ایکسٹرا دھیان رکھتی ہو، یہ چھوڑ دو۔ اسی طرح نظر آؤ جیسے دوسرے نظر آتے ہیں۔ اسی میں میرا اور تمہارا بھلا ہے۔ اگر میری بات نہیں مانو گی تو پھر کچھ غلط ہوا تو اس کی ذمے دار تم خود ہو گی۔"

"ٹھیک ہے جی۔ میں احتیاط کروں گی۔" مہناز نے

کہا پھر اس کی اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ وہ چھوٹے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر جارہی تھی۔

جی چاہ رہا تھا کہ میں یہ ساری گفتگو ریکارڈ کرسکتا اور عمران کو سنا سکتا۔ یوں اسے بھی مہناز اور جلالی صاحب کے تعلق کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ عمران کا کہنا تھا کہ جلالی ایک سخت دل اور کسی حد تک ایک بے حس شخص کا نام ہے۔ وہ کسی شخص یا چیز کو اپنی کمزوری نہیں بننے دیتا۔ بعض اوقات وہ اپنی خوب صورت ملازماؤں کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق پیدا کرلیتا ہے۔ ان کو اپنے قریب رکھتا ہے۔ ان کے ساتھ لیٹتا ہے لیکن ان کے بارے میں کوئی نرم جذبہ کبھی اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس کے لیے بس اجرتی ملازم ہی رہتی ہیں اور ڈاکٹر مہناز بھی ان میں شامل ہے۔ لیکن آج جو گفتگو میں نے پوشیدہ مائکروفون کے ذریعے سنی تھی، وہ اشارہ کررہی تھی کہ اس صورتِ حال میں مہناز کے حوالے سے کچھ نہ کچھ چینج موجود ہے۔ "باباجی" کے نزدیک اگر وہ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت اہمیت ضرور رکھتی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا کسی طرح اس "اہمیت" کو باباجی کی زبان کھلوانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ یا پھر یہ اہمیت ابھی اتنی توانا ہی نہیں کہ اس سے کوئی کام لیا جاسکے؟

دو چھٹیاں ساتھ ساتھ آرہی تھیں۔ ان میں تیئس مارچ کی چھٹی بھی تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ جلالی صاحب کیلنڈر پر موجود ساری روایتی چھٹیاں بڑے اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں۔ اس موقع پر بھی انہوں نے خاص انتظام کروا رکھا تھا۔ فارم سے پانچ کلومیٹر دور ایک نہر گزرتی تھی۔ یہاں چکور کے شکار کا پروگرام بنا۔ شکار کے پروگرام سے پہلے کھلی فضا میں "باربی کیو" ڈنر کا اہتمام بھی تھا۔ نہر کے ساتھ ساتھ پانچ چھ خیمے لگائے جانے تھے اور جنریٹر بھی لے جایا جارہا تھا۔ آج پھر عمران کی صلاحیتوں کا امتحان تھا۔ ایک باورچی کی حیثیت سے ہم دونوں سہ پہر کے کچھ دیر بعد ہی موقع پر پہنچ گئے اور کھانے کا انتظام شروع کردیا۔ حسبِ معمول سارا کام عمران ہی کررہا تھا۔ وہ مجھے ثانوی حیثیت کے کام سونپ رہا تھا اور دیکھنے والے کو لگتا یوں تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ برابر کا مصروف ہوں۔

ایک بڑے دیگچے میں چمچہ چلاتے ہوئے وہ بولا۔ "اب تو جی چاہتا ہے کہ کسی کماؤ لڑکی سے شادی کرلوں۔ وہ باہر کا کام کرے، میں گھر میں کھانا پکاؤں اور بچوں کو سنبھالوں۔"

میں نے چکن کے ٹکڑوں کو دہی میں بھگوتے ہوئے کہا۔ "تو کماؤ لڑکی ہے نا تمہارے پاس۔ رات دن ریما جی کے قصیدے پڑھتے ہو یا نہیں۔"

"یار! وہ تو مجھے لگتا ہے کہ دو مولویوں میں مرغی حرام ہو چکی ہے۔ نرگس، ریما کو کچا کھا جائے گی یا ریما، نرگس کو شربت کرڈالے گی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی میرے حوالے سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اب تو کوئی تیسری ہی ڈھونڈنی پڑے گی۔" بولتے بولتے اس نے ایک دم چونک کر بائیں طرف دیکھا اور بولا۔ "لو، دیکھو وہ آگئی تیسری بھی۔"

ڈاکٹر مہناز پوٹھوہار جیپ سے اتر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی بلی اس کی گود میں تھی۔ وہ اسے بار بار سہلا رہی تھی اور اپنے ساتھ لگا رہی تھی۔ ڈوبتی شام میں اس کا چہرہ کچھ اور بھی گلابی نظر آتا تھا۔ براؤن من گلاسز چہرے پر سج رہے تھے۔

عمران نے سرد آہ بھری اور بولا۔ "کاش، میں ایک بلی ہوتا اور اس خوب صورت شام میں... میرا سر عین اس جگہ پر ہوتا... جہاں بلی کا ہے۔"

"حالانکہ میں تمہیں سب کچھ بتا بھی چکا ہوں۔ یہ لڑکی کسی اور کے کام کی نہیں رہی۔ جلالی صاحب کے بڑھاپے پر عاشق ہوچکی ہے۔ اس ناتے سے تم تو اس کے نزدیک کل کے بچے ہو بلکہ بلونگڑے ہو۔"

عمران نے آہ بھری۔ "یار! یہ عورت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ جلیبی کی طرح گول، پیاز کی طرح تہ در تہ اور امربیل کی طرح الجھی ہوئی۔ یہ کب کیا کر گزرے گی، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

میں نے کن انکھیوں سے ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ وہ کل سے بڑے اچھے موڈ میں تھی اور موڈ کی یہ تبدیلی اس گفتگو کے بعد سے دکھائی دے رہی تھی جو جلالی صاحب کے ساتھ اس نے ڈرائنگ روم میں کی تھی۔ سورج ڈوبنے میں ابھی آدھ گھنٹا باقی تھا۔ کافی روشنی تھی۔ کوٹھی کے نوجوان ملازم، ڈاکٹر لائبہ اور ندیم وغیرہ کے ساتھ کھلی جگہ پہ کرکٹ کھیلنے لگے تھے۔ ڈاکٹر مہناز بھی ان میں شامل ہوگئی۔ سب خوش گوار موڈ میں تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے ڈرائیور رشید کو ایک زوردار شاٹ مارا اور گیند نہر میں جاگری۔ گیند نکالنے کی کوشش میں مالی رمضان کا بیٹا سلیم نہر میں گر گیا۔ خوب ہنسی مذاق ہوا۔ کھیل دوبارہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر مہناز آؤٹ ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

عمران نے سرد آہ بھری۔ "کاش، میں اس ماہ جبیں کو باؤلنگ کراتا اور کلین بولڈ کرتا۔ لیکن افسوس اے حسن کی شہزادی! میں اس محل سرا کا ایک ادنیٰ باورچی ہوں۔ سرد

آہیں تو بھر سکتا ہوں لیکن تیرے ساتھ کرکٹ نہیں کھیل سکتا۔"

"تم کسی کے ساتھ بھی نہیں کھیل سکتے۔ تم بارھویں کھلاڑی بن چکے ہو جو بس فیلڈنگ کرسکتا ہے۔"

"چلو یار! فیلڈنگ ہی کروں لیکن کچھ تو ہو۔ ڈاکٹر مہناز جیسی لڑکی کا کیچ پکڑ لیا تو سمجھو پورا میچ جیت لیا۔"

میں اور عمران ایک بڑے چکن پیس کے چھوٹے ٹکڑے کررہے تھے۔ چھری عمران کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کراہ کر بولا۔ "یار! ذرا دھیان رکھنا، مہناز جی کے حسن میں کھو کر کہیں میں تمہاری انگلی ہی نہ کاٹ ڈالوں۔"

میں نے کہا۔ "بڑے کھوچل عاشق ہو۔ انگلی بھی کاٹو گے تو کسی اور کی..." پھر میں نے چونک کر اس کی چیسٹ پاکٹ کی طرف دیکھا۔ "کہیں آج بھی فون تو آن نہیں کررکھا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "شاہین کی بچی نے تو اس دن سے بات کرنا ہی چھوڑ دی ہے۔ صاف کہہ دیا ہے کہ اگر تمہیں ریما اور نرگس مل رہی ہیں تو مجھے بھی کوئی اکشے کمار یا عامر خان مل جائے گا۔"

"دیکھو عمران! وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے اور تم بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔ پیار کرنے والوں کو اس طرح ستایا نہیں کرتے۔ وہ تم کیا کہا کرتے ہو، مسجد ڈھا دے، مندر ڈھا دے پر دل نہ کسے دا ڈھائیں..."

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، ہوا کی زوردار آواز سنائی دی۔ مالی کے بیٹے قیوم نے ایک زوردار ہٹ لگا کر گیند جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ سب اسے تلاش کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اب اندھیرا اتر آیا تھا۔ میں نے کہا۔ "جلالی صاحب ہر جگہ اپنی مرضی کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی مرضی خطرناک بھی ہوتی ہے۔ اب جس قسم کے حالات یہاں چل رہے ہیں، اس آؤٹ ڈور پروگرام کی نیملا کیا تک تھی۔ سیکیورٹی کے لحاظ سے یہ کسی طور مناسب نہیں۔"

"تم یہی بات باباجی کے سامنے فرمانا۔ تمہیں نہر کے کنارے ساری رات کے لیے مرغا نہ بنادیں تو میرا نام بدل دینا۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے کہنے کی؟ مگر کوئی تو ان کو سمجھانے والا ہونا چاہیے۔"

"اب یہ سمجھنے سمجھانے کی حد سے گزر چکے ہیں۔ خوامخواہ دل جلانے سے فائدہ نہیں۔ بس ہوشیار رہو اور آنکھیں کھلی رکھو۔ کوئی گڑبڑ ہو تو ہمیں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

مختار ملک والا پسٹل ہے نا تمہارے پاس؟"

"ابھی تک تو ہے۔" میں نے قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے کو ٹٹولا پھر ذرا توقف سے کہا۔ "دیکھو، ابھی تک ہمیں یہ پتا بھی نہیں چل سکا کہ مختار ملک کا تعلق کس سے تھا اور وہ کس مشن پر یہاں موجود تھا۔"

"مشن کے بارے میں تو کوئی شبہ ہے ہی نہیں تابی ڈیئر۔ لکڑی کے باکس میں وہی دو فٹ کا فتنہ ساز آرا کوئی ہمارے آس پاس موجود ہے اور کچھ لوگوں نے اس کے پیچھے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دو پارٹیاں ہیں۔ ایک تو وہی پارٹی ہے جس نے ہمیں یہاں ہائر کیا ہوا ہے۔ یعنی ریان ولیم اور پروفیسر ریکی وغیرہ۔ دوسری پارٹی انڈین گینگسٹر جاوا کی ہے۔ اس میں دُرِ شہوار اور انگریز مائیکل وغیرہ شامل ہیں۔"

"لیکن مختار ملک کا تعلق کس سے تھا؟ ریان ولیم اینڈ کمپنی سے یا جاوا سے؟"

"یہ سوال ابھی جواب طلب ہے۔ لیکن ایک بات تو میرے نزدیک کلیئر ہے۔ شروع میں گوشت کے پہاڑ ریان ولیم نے ہمارے ساتھ سراسر جھوٹ بولا تھا کہ وہ باکس کو ڈھونڈنے والا کام کسی اور کے لیے کررہا ہے۔ دراصل وہ خود ہی باکس کے پیچھے ہے۔ شاید تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہ شخص نسل کے اعتبار سے یہودی ہے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ خالص کاروباری ذہانت بھی رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کو جس کام میں بھی پیسا نظر آتا ہے وہ اسے کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ چاہے وہ کوکر شو ہو، جوئے بازی ہو، بھتا خوری ہو یا کوئی بزنس۔"

"یار! یہ ساری معلومات تمہیں حاصل کیسے ہوجاتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، اقبال اور جیلانی وغیرہ کسی قبرستان میں بیٹھ کر بھنگ گھوٹ رہے ہیں۔ بھئی وہ کام کر رہے ہیں... اور اچھا کام کررہے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اطلاعات اکٹھی کرنے کے لیے تمہارا اپنا نیٹ ورک موجود ہے۔"

"بالکل۔ یہی وجہ تو ہے کہ فساد پلس اس وقت پاکستان کا نمبرون چینل ہے۔"

"تم ایک دم جلیبی کی طرح گول ہو۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تمہاری۔ مجھے تو پھر ابن صفی والی بات یاد آرہی ہے۔ اگر محترم حیات ہوتے تو تمہیں دیکھ کر ضرور حیران ہوتے... بلکہ دانتوں میں انگلی دباتے کہ ان کا تخیلاتی کردار زندہ حالت

میں آموجود ہوا ہے۔"

"تم ان رائٹرز لوگن کو نا ہیں جانتے۔ یہ انسپائر ہووت ہیں بھیا۔ پہلے کسی چیز کو دیکھت ہیں پھر اس کی نقل اتار کر کہانیوں میں پیش کر دیوت ہیں۔ ان ابنِ صفی صاحب نے بھی یقیناً میری نقل اتاری ہووے گی۔"

"تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔"

"یہی تو ہوشیاری ہوتی ہے ان لوگن کی۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی نقل اتار لیوت ہیں۔ ویسے بھی پیدا ہونے سے پہلے بندے کی آتما تو موجود ہوتی ہے نا۔ کسی رات میری آتما محترم لکھاری صاحب کے کمرے میں چلی گئی ہووے گی۔ انہوں نے جھٹ اس کا خاکہ اتار لیا ہووے گا۔" وہ بھانڈیل اسٹیٹ کے لہجے کی نقل کر رہا تھا۔

ایک باوردی گارڈ ٹہلتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ ہم خاموش ہو گئے۔

پروگرام کے مطابق نہر کے کنارے کافی ہلا گلا رہا۔ کوئلوں پر دیسی مرغی اور دیسی بکرے کا گوشت بھونا گیا۔ سیخ کباب بنائے گئے۔ پرانے طرز کے گراموفون پر سہگل، ثریا بیگم اور نور جہاں کے گانے سنے گئے۔ جلالی صاحب نے اپنے جدید تھیٹر میں قدیم فلم جگنو دیکھی اور کئی ساتھیوں کو بھی زبردستی دکھائی۔ ان میں ڈاکٹر مہناز، لائبہ، ندیم اور ڈرائیور رشید وغیرہ شامل تھے۔ چاندنی رات تھی۔ چکور کا شکار بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میں نے سحر انگیز چاندنی میں ڈاکٹر مہناز کو نہر کے پانی میں پاؤں ڈبو کر بیٹھے دیکھا۔ وہ ڈاکٹر لائبہ اور ندیم کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور جلدی سے جلالی صاحب کے ٹینٹ کی طرف دوڑ گئی۔ غالباً جلالی صاحب کی کسی دوا کا وقت ہو گیا تھا۔

رات ڈھیرے ڈھیرے کھسکتی رہی اور خیریت سے گزر گئی۔ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ رات کے آخری پہر سب لوگ سو گئے تھے۔ بس گارڈز ہی پہرا دیتے رہے۔ نو دس بجے تک یہ لوگ وہیں اوپن ایئر میں ناشتے سے فارغ ہو گئے اور واپس فارم ہاؤس روانہ ہوئے۔

جب ہماری گاڑیاں فارم ہاؤس کے سامنے رکیں، کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ گیٹ پر ہر وقت دو باوردی گارڈز موجود رہتے تھے جو اب نہیں تھے۔ جلالی صاحب کے ڈرائیور رشید نے تین چار بار شیورلیٹ کا ہارن دیا لیکن گیٹ نہیں کھولا گیا۔ پھر گارڈز جیپ سے اترے، انہوں نے گیٹ کھٹکھٹایا اور آوازیں دیں۔ کافی تاخیر سے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا اور ایک گارڈ نظر آیا۔ اسے دیکھ کر سب بری طرح چونک گئے۔ وہ شدید زخمی تھا۔ اس کے کندھے پر گولی لگی ہوئی تھی اور ایک ٹانگ بھی بری طرح گھائل تھی۔ دروازہ کھولنے کے بعد وہ وہیں لڑکھڑا کر گر گیا۔ سب گاڑیوں سے اترے اور اس کی طرف لپکے۔ ڈاکٹر مہناز پیش پیش تھی۔ ندیم نے زخمی کو سہارا دے کر بٹھایا۔ وہ مدھم آواز میں بولا۔ "انہوں نے سب کچھ برباد کر دیا۔ بہت ساروں کو زخمی کر دیا، کچھ کو مار ڈالا۔ ہم نے بڑی کوشش کی... مم... مگر..." اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ اس کی گردن سے خون بہنے لگا۔ تب ہم نے دیکھا کہ اس کی گردن میں بھی گولی لگی ہوئی تھی۔ یہ گولی اس کی گردن کے سائڈ مسلز کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ شاید اسی لیے وہ زندہ تھا۔

ہم اسے چھوڑ کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف لپکے۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور تھے، ہر طرف کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کمروں کے اندر تکیے پھٹے ہوئے اور گدے ادھڑے ہوئے تھے۔ قالین الٹ پلٹ کر دیے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھی کے ایک ایک انچ کی تلاشی لی گئی ہے اور یقیناً یہ کام دو چار بندوں کا نہیں تھا۔ یہاں کئی درجن افراد نے ہلا بولا تھا۔

"یار! کہیں ہماری چوری بھی نہ پکڑی گئی ہو؟" عمران نے میرے کان میں سرسراتی سرگوشی کی۔

ہم چھوٹے ڈرائنگ روم کی طرف لپکے۔ ڈرائنگ روم کے عین سامنے ایک ملازمہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سر پر کسی وزنی شے سے بڑی کاری ضرب لگائی گئی تھی۔ اس کے کھچڑی بال خون سے رنگین ہو رہے تھے۔ چھوٹے ڈرائنگ روم کی حالت بھی ابتر تھی۔ صوفے اور میز الٹے پڑے تھے۔ ہر طرف تباہی کا منظر تھا۔ جس سینٹر ٹیبل کے نیچے "ڈکٹا فون" نصب کیا گیا تھا، وہ بھی الٹی پڑی تھی۔ تاہم ڈکٹا فون محفوظ تھا۔ دراصل عمران نے اسے اس طریقے سے نصب کیا تھا کہ وہ لکڑی کے ایک دو انچ موٹے کالر کے پیچھے آگیا تھا۔ میز الٹنے کے باوجود وہ کسی کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ عمران نے میز کو سیدھا کر دیا۔ یکایک رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ ہم ڈرائنگ روم سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف آئے۔ یہاں کا منظر دہلا دینے والا تھا۔ نوجوان گارڈ مشتاق کی لاش سیڑھیوں کے آغاز میں پڑی تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے ہاتھوں پر ہلکی سی مہندی بھی نظر آرہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق مشتاق نامی اس گارڈ کی شادی پانچ چھ ہفتے پہلے ہی ہوئی تھی۔ مشتاق کو دیکھ کر ہی پتا چل گیا کہ وہ اپنی زندگی کا سفر پورا کر چکا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اسے سیڑھیوں کے اوپر سے دھکا دیا گیا ہے۔ اس کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور شاید رخسار کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی خون آلود چپل اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ دو عورتیں اس کی لاش پر بین کر رہی تھیں۔ یہ مشتاق کی قریبی رشتے دار ہی تھیں۔

بڑے ڈرائنگ روم کی حالت بھی ابتر تھی۔ ایک دیوار پر جلالی صاحب اور ان کے تین چار بزرگوں کی فریم شدہ تصویریں آویزاں تھیں۔ ان ساری تصویروں پر رائفل کی گولیاں برسائی گئی تھیں اور انہیں چکنا چور کر دیا گیا تھا۔

سیکریٹری ندیم نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جلالی صاحب یہ سارے اندوہناک مناظر دیکھیں اور اپنی حالت بگاڑ لیں۔ وہ انہیں فوراً لفٹ کے ذریعے فرسٹ فلور کے ایک کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر مہناز اور لائبہ زخمیوں کی طرف متوجہ تھیں اور انہیں ابتدائی طبی امداد دے رہی تھیں۔ شدید زخمیوں کو لاہور منتقل کرنے کے لیے انہیں پورچ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ابھی تک صرف ایک لاش ملی تھی مگر زخمی ہونے والے زیادہ تھے۔

ندیم دانش مندی کا مظاہرہ کر کے جلالی صاحب کو اوپر والے ایک علیحدہ کمرے میں تو لے گیا تھا مگر جلالی صاحب کو نارمل رکھنے کی اس کی یہ کوشش بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہی۔ جب ہم اوپر پہنچے تو جلالی صاحب کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور وہ ندیم سے بار بار پوچھ رہے تھے۔ "کیا کوئی اور بھی زخمی ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ، کسی کی جان تو نہیں گئی؟ تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم مجھے نیچے جانے دو۔"

"سر! سب ٹھیک ہے۔ چار پانچ بندوں کو چوٹیں آئی ہیں۔ دونوں ڈاکٹرز ان کی مرہم پٹی کر رہی ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

وہ دہاڑے۔ "تم کہہ رہے ہو چوٹیں آئی ہیں۔ وہ گارڈ اشرف تو آخری سانسیں لے رہا ہے۔"

"اشرف کے سوا کسی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا جناب۔ زخم ضرور لگے ہیں لیکن خطرے کی بات نہیں۔"

وہ مختلف ملازمین کے نام لے لے کر ان کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ندیم اور ڈرائیور رشید گول مول جواب دیتے رہے۔ پھر جلالی صاحب اپنے پالتو جانوروں کے بارے میں پوچھنے لگے۔ انہیں زیادہ پریشانی ایرانی بلیوں کی طرف سے تھی۔ عمران نے انہیں بتایا کہ دیگر جانوروں کی طرح بلیاں بھی بالکل محفوظ ہیں۔ اس نے جلالی صاحب کو بتایا کہ کل رات جانے سے پہلے وہ چاروں بلیوں کو حفاظت کی غرض سے بالائی منزل کے پنجرے میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں۔

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے اٹھک پٹخ کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگا جیسے کوئی بند دروازے کو دھکے دے رہا ہے یا ٹھوکریں مار رہا ہے۔ اس کے ساتھ "اوں اوں" کی منہ بند صدائیں بھی سنائی دیں۔ "یہ کیا ہے؟ یہ تو کوئی عورت ہے۔" جلالی صاحب نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔ دروازہ کھولا تو آنکھیں بند کرنا پڑیں۔ جلالی صاحب کی دو جوان ملازمائیں رخشی اور زرینہ بالکل برہنہ حالت میں موجود تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں ٹیلی فون کے تار سے باندھے گئے تھے اور نیلگوں نشان ان کے جسموں پر نظر آرہے تھے۔ انہیں بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ہم نے فوراً ان کے جسموں پر چادریں ڈال دیں۔ رخشی تو نیم بے ہوش تھی۔ وہ قالین پر کھڑکی کے قریب پڑی تھی۔ یہ زرینہ ہی تھی جس نے بند دروازے کو ٹانگیں رسید کر کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے گئے تھے۔ کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، شراب کے کوّے اور کٹے پھٹے زنانہ لباس پورے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔

زرینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے گندمی چہرے اور گردن پر گہری خراشیں نظر آرہی تھیں۔ عمران نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا۔ وہ بلکی۔ "انہوں نے ہمیں برباد کر دیا۔ کہیں کا نہیں چھوڑا۔ یا اللہ مجھے موت آجائے۔ میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔" زرینہ کی آہ و بکا دل دوز تھی۔

"کون تھے وہ؟" عمران نے زرینہ کا سر گود میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ان کتوں نے اپنے منہ کپڑوں اور ٹوپیوں میں چھپا رکھے تھے۔ ایک دوسرے کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ وہ ساری رات یہاں کمرے میں رہے ہیں۔ میرے کاکے کو دیکھو، وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ خدا کے لیے اس کو دیکھو۔" اس نے اپنے چہرے کی مدد سے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں ایک چھوٹی چارپائی پر ایک کھیس سا پڑا تھا۔ اس کے نیچے بچہ تھا۔ چھوٹا سا ایک بچہ۔ میں نے کھیس اٹھایا۔ قریباً ایک سال کا بچہ بالکل ساکت پڑا تھا۔ بہت گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ وہ زندہ تھا لیکن نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔ وہ میرے زور سے جھنجوڑنے کے

باوجود جاگا نہ دیا۔ اس کے ادھ کھلے منہ سے کسی دوا کی تیز بو آرہی تھی۔ پھر میری نگاہ اس دوا پر پڑی۔ یہ کھانسی کا ایک نہایت تیز اثر شربت تھا۔ بالغ شخص بھی اس کے دو چمچ پی کر چار پانچ گھنٹے کے لیے اتنا غفیل ہوسکتا تھا۔ بچے کو غالباً زیادہ مقدار میں یہ شربت پلا دیا گیا تھا۔

میں نے باہر جا کر اسے ڈاکٹر لائبہ کے حوالے کیا۔ وہ اسے فوراً طبی امداد دینے میں مصروف ہوگئی۔ کمرے میں واپس آیا تو زرینہ۔۔۔ کے ہاتھ کھولے جاچکے تھے۔ کمرے کے درمیان ایک چادر سی تان دی گئی تھی اور ہمارے ساتھ پکنک پر جانے والی دو ملازمائیں زرینہ اور بے ہوش رخشی کو کپڑے وغیرہ پہنا رہی تھیں۔ زرینہ کی آہ وزاری جاری تھی۔ اس کی اپنی حالت بھی بری تھی لیکن اسے زیادہ فکر اپنے بچے کی تھی۔

میں نے آواز دے کر اسے بتایا۔ ”زرینہ! تیرا بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر لائبہ نے اسے ٹیکا لگایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں جاگ جائے گا۔ کچھ نہیں ہوا اسے۔“

دونوں ملازماؤں کی حالت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کئی شرابی مردوں نے ان کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا ہے اور دیر تک اس کمرے میں رہ کر اپنے چہروں پر گناہ اور نحوست کی کالک ملتے رہے ہیں۔

رخشی کی حالت زیادہ بری تھی۔ اسے اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ گاہے بگاہے عجیب انداز سے کراہ اٹھتی تھی۔

عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”تابی! مجھے تو لگتا ہے، یہ سب کچھ ٹریکٹر ڈرائیور اور مخبر مختار ملک کا بدلہ لینے کے لیے کیا گیا ہے۔“

”یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟“

”مشتاق کی لاش سے۔“ عمران نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ لاش عین اس جگہ پڑی ہے جہاں تم نے مختار ملک کو مارنے کے بعد ڈالا تھا۔“ میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یہ قابل غور بات تھی۔

مشتاق کا چھوٹا بھائی اعجاز بھی زخمی ہوا تھا۔ اسے اس کے ایک ساتھی سمیت غسل خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھی کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ ان دونوں کی گھڑیاں، موبائل اور نقدی وغیرہ سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ تھپڑوں کے نشان ابھی تک ان دونوں کے چہروں پر واضح تھے۔ ان کے تین دیگر زخمی ساتھی بھی ایک غسل خانے کا تالا توڑ کر نکالے گئے۔ اعجاز نے روتے ہوئے کہا۔ ”وہ کوئی تین درجن بندے تھے۔ ڈکیتوں کی طرح ان سب نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے۔ ایک لمبے قد کے بندے کے سوا وہ سب پنجابی بولتے تھے۔ لمبے قد والا پٹھانی اردو بولتا تھا۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی سب سے پہلے مین گیٹ کے گارڈز کو بے بس کیا۔ جس نے بھی ان کو روکنا چاہا، اس کی ٹانگوں پر گولیاں ماریں اور ناکارہ کر دیا۔ جب انہوں نے زرینہ سے اس کا بچہ چھینا اور اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کی تو بھائی مشتاق ان کے سامنے آگیا۔ اس نے چاقو چلایا جس سے ان کے دو بندے پھٹڑ (زخمی) ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے بھائی کو پکڑ لیا اور بڑی بیدردی سے مارا۔ بابے طفیل نے بھائی کو چھڑانے کی کوشش کی تو اس کی داڑھی کھینچی گئی اور اس کی عمر کی پروا کیے بغیر اسے فرش پر لٹا کر جانوروں کی طرح مارا گیا۔ بھائی ادھ موا ہو کر گر گیا تو ان کا سرغنہ بولا۔۔۔ ختم اسے پار کردو۔ وہیں پہنچا دو جہاں ہمارا ساتھی گیا ہے۔“ ہم سمجھے تھے کہ وہ بھائی کو گولی مارنے لگے ہیں۔ لیکن وہ اسے سیڑھیوں پر لے گئے۔ غسل خانے کی کھڑکی میں سے ہم کو سب کچھ نظر آرہا تھا۔ بھائی آخر تک خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ انہوں نے اسے پندرہ سیڑھیوں سے نیچے پکے فرش پر پھینک دیا۔ وہ اسے سر کے بل گرانا چاہتے تھے مگر وہ کندھوں کے بل گرا۔ انہوں نے نیچے جا کر دیکھا۔ اس میں ابھی جان باقی تھی۔ اوکھے اوکھے سانس لے رہا تھا۔ وہ ظالم اسے اٹھا کر پھر اوپر لائے۔ پھر اسی طرح اسے اٹھا کر نیچے پھینکا۔ اس مرتبہ وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑا رہا۔ شاید اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا تھا۔ میرے بھائی کو بڑی تکلیف دی ہے انہوں نے۔۔۔“ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اسی دوران میں مالی کے بیٹے امین نے ہمارے کان میں بتایا کہ کوٹھی کے پچھواڑے اور چڑیا گھر کی پچھلی طرف دور تک کھدائی کی گئی ہے اور وہاں مٹی کے ڈھیر پڑے ہیں۔ میں اور عمران کوٹھی کی چھت پر گئے۔ فتح محمد اور ندیم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ امین کی بات درست تھی۔ کوٹھی کے پچھواڑے اور شمال کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ کئی جگہ کھدائی کی گئی تھی۔ یہ کھدائی باقاعدہ ”ڈگنگ مشین“ کے ذریعے ہوئی تھی۔ مشین کے بڑے بڑے ٹائروں کے نشان بھی جگہ جگہ دکھائی دیتے تھے۔

ندیم نے طویل سانس لی اور کہا۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ یہ اسی موٹے ریان ولیم اور اس کے ساتھیوں کی کارستانی ہے۔ ان میں مرجان خان نام کا ایک لمبے قد کا بدمعاش بھی تھا۔ وہ پٹھانی لہجے میں اردو بولتا ہے۔“

”یہ ریان ولیم کون ہے؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

”یہ وہ دوسری پارٹی ہے جو باکس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ایک رات یہ لوگ بھی ہمارے بن بلائے مہمان بنے تھے۔ ریان کوئی غیر ملکی جواری ہے۔ بہت موٹا شخص ہے اور صرف انگریزی بول سکتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ دو تین مقامی بندے بھی لایا تھا۔ یہ لوگ بھی پہلے نرمی سے جلالی صاحب کو گھیرنے کی کوشش کرتے رہے پھر سختی پر اتر آئے۔ اس ریان نامی شخص نے جلالی صاحب کو دھمکی دی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ باکس کے لیے اس سارے فارم ہاؤس کو کھود کر رکھ دے گا۔“ کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر ہم دوسری طرف متوجہ ہوگئے۔ سب سے اہم کام زخمیوں کو اسپتال پہنچانا تھا۔ ہم نیچے آئے اور اس سلسلے میں دیگر افراد کی مدد کی۔ ایک اسٹیشن ویگن، ایک ڈبل کیبن اور ایک جیپ اس کام کے لیے استعمال کی گئی۔ پانچ بندے ایسے تھے جن کی ٹانگوں میں گولیاں لگی تھیں۔ چھٹا شخص شدید زخمی تھا۔ یہ وہی گارڈ اشرف علی تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ دو عورتیں بھی شدید زخمی تھیں۔ ان میں سے ایک تو رخشی ہی تھی جسے زرینہ کے ساتھ زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت بھی درست نہیں لگ رہی تھی۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ بار بار عجیب انداز میں بڑبڑانے لگتی تھی۔

کوٹھی اور فارم ہاؤس میں عام طور پر چالیس پینتالیس ملازم ہر وقت موجود ہوتے تھے۔ ان میں سے بیس پچیس تو گارڈز ہی تھے۔ لیکن واردات کے وقت کچھ لوگ تو ہمارے ساتھ نہر کے کنارے خیموں میں موجود تھے اور کچھ چھٹیوں کی وجہ سے غیر حاضر تھے۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس واردات کی وجہ سے زیادہ جانی نقصان ہوتا۔ سیکریٹری ندیم نے جلالی صاحب کو بتائے بغیر ہی پولیس کو فون کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کوٹھی میں ایک لاش بھی موجود تھی اور اس کی فوری رپورٹ کرنا ضروری تھی۔ اس دوران میں عمران نے باریک بینی سے مختلف شواہد اکٹھے کیے، میں بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے عمران کی توجہ نیم بے ہوش رخشی کے ایک ہاتھ کی طرف دلائی۔ ناخنوں میں گوشت کے باریک ریزے سے پھنسے ہوئے تھے جیسے اس نے خود پر حملہ کرنے والے کو نوچا ہو۔ دوسری ملازمہ زرینہ نے روتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ رخشی نے زیر ہونے سے پہلے لمبے قد والے

پٹھان کی سخت مزاحمت کی تھی۔ جواباً اس شخص نے بھی رخشی کو اپنا خصوصی نشانہ بنایا تھا۔ رخشی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی تقریباً ساری ذمے داری اسی شخص پر آتی تھی۔

آدھے گھنٹے میں پولیس جیپ سائرن بجاتی کوٹھی میں پہنچ گئی۔ مقامی ایس ایچ او چوڑے جبڑوں اور موٹی توند والا ایک روایتی سا تھانیدار تھا۔ سب سے پہلے تو جلالی صاحب نے اس کی کلاس لی۔ انہوں نے اسے بے نقط سنائیں۔ بولے۔ ”تم زنانے بن کر تھانے میں گھسے رہتے ہو۔ کھڑکی کے پیچھے سے وارداتیں ہوتی دیکھتے ہو اور جب سب کچھ ہو جاتا ہے تو توندیں مٹکاتے پہنچ جاتے ہو۔ یہ چور، ڈاکو تمہارے بھائی بند ہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے، نکل جاؤ میرے گھر سے۔“

ندیم اور ڈاکٹر مہناز وغیرہ نے بمشکل جلالی صاحب کو سنبھالا لیکن وہ بدستور طیش میں تھے۔ فتح محمد تھانیدار اکرام خان کو ایک طرف لے گیا اور کچھ دیر تک کھسر پھسر کرتا رہا۔ مجھے کئی دفعہ فتح محمد پر عجیب سا شبہ ہوتا تھا۔ یہ شخص دوسرے ملازموں سے کچھ الگ تھلگ سا تھا۔ ایک طرح سے اس کی حیثیت انچارج گارڈ کی تھی مگر وہ ڈیوٹی پر کم ہی نظر آتا تھا۔ میرے ساتھ بھی اس کا رویہ بس لیے دیے والا رہتا تھا۔ کسی وقت شک ہوتا تھا کہ شاید اس رات جلالی صاحب کی پوٹھوہار جیپ کے ارد گرد گھومنے والا اور پھر گارڈ کے اندر ”ٹریکر“ چپکانے والا یہ فتح محمد ہی تھا۔ موقع پر اس کے گرگابی نما جوتے کے نشان بھی موجود تھے۔ پھر جب میں جلالی صاحب کو روکنے کے لیے جیپ کے پیچھے بھاگا تھا تو سب سے پہلے میرے راستے میں آنے والا یہ فتح محمد ہی تھا۔ عین ممکن تھا کہ کل رات ہونے والی خونی واردات میں بھی اس شخص کا کردار ہو۔ اسی نے حملہ آوروں تک اطلاع پہنچائی ہو کہ جلالی صاحب رات نہر کے کنارے گزاریں گے اور کوٹھی کے اندر کی دیگر معلومات بھی اسی نے دی ہوں۔

بہرحال، ایک بات تو طے تھی کہ کوٹھی اور فارم ہاؤس میں ایک دو افراد اب بھی ایسے موجود ہیں جو اندر کی خبریں باہر دے رہے ہیں اور باہر والوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔

کچھ دیر بعد پتا چلا کہ جلالی صاحب کے جلال سے بچنے کے لیے تھانیدار اکرام خان واپس چلا گیا ہے اور اب کوئی اعلیٰ افسر ہی جلالی صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے لاہور سے آئے گا۔ یہ افسر دو گاڑیوں کے ساتھ قریباً ایک گھنٹے میں پہنچ گیا اور یہ وہی حمزہ صاحب تھے جن کی حیثیت جلالی

صاحب کے پرانے دوست اور پرستار کی سی تھی۔ اعلیٰ سطح پر جلالی صاحب کا ایک حلقۂ احباب تھا۔ جلالی باقاعدہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھے۔ جنگلی حیات کے تحفظ پر لکھے ہوئے ان کے ریسرچ مقالے نے ماضی میں کافی شہرت پائی تھی۔ وہ امریکا میں وائلڈ لائف کی ایک ویلفیئر سوسائٹی کے بنیادی اور اہم رکن تھے۔ دس پندرہ برس پہلے تک جب ان کی صحت ٹھیک تھی، وہ اکثر بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے امریکا اور کینیڈا وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ انہیں بعض اوقات غیر ملکی یونیورسٹیوں میں لیکچر کے لیے بھی بلایا جاتا تھا۔

سہ پہر کے بعد جونہی موقع ملا، عمران نے موبائل فون پر ریان ولیم سے رابطہ کیا۔ میں بھی اس کے کمرے میں موجود تھا۔ ایسے رابطے کے وقت عمران موبائل کا اسپیکر آن کر لیتا تھا تاکہ میں بھی دوطرفہ گفتگو سن سکوں۔ عمران کے ذہن میں بھی یقیناً وہی سوال مچل رہا تھا جو میرے ذہن میں بھی موجود تھا۔ اگر واقعی کل رات ہونے والی خونی کارروائی ریان ولیم کے ایما پر ہوئی تھی تو پھر ہمیں اس سے بے خبر کیوں رکھا گیا؟ یہ تو کوئی بات نہیں تھی کہ ہم ریان ولیم کے لیے کام بھی کر رہے تھے اور اس کی منصوبہ بندی سے بھی لاعلم تھے۔ اس سے پہلے بھی ریان ولیم نے ہمیں آدھا سچ بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے خود "باکس" میں دلچسپی نہیں بلکہ وہ کسی اور کے لیے اسے ڈھونڈنا چاہتا ہے۔

رابطہ ہونے پر عمران نے ریان ولیم کو کل رات کے واقعات کے بارے میں بتایا۔ ریان اور رچی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ان واقعات کے بارے میں جان چکے تھے۔ بہرحال، ریان نے اس بات سے صاف انکار کیا کہ اس کارروائی میں ان کا کوئی عمل دخل ہے۔

عمران نے کہا۔ "سر! یہاں کچھ معاملات ہمیں الجھا رہے ہیں۔ اگر ہم اس الجھن میں رہے تو ہماری کارکردگی پر بھی اثر پڑے گا۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو ایک دو باتوں کی وضاحت کر دیجیے۔"

"ہاں ہاں، پوچھو ایمران! برا لگنے کی کیا بات ہے؟"

"کیا آپ کے مقامی ساتھیوں میں کوئی مرجان خان نام کا شخص بھی ہے؟"

"تم اسے ساتھی تو نہیں کہہ سکتے، بہرحال میں گاہے بگاہے اس سے کام لے رہا ہوں۔ بے خوف شخص ہے۔ ہر کام میں کود پڑتا ہے۔"

"کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے سر کہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر ہی یہاں شیخوپورہ پہنچے اور کسی کام میں کود پڑے؟"

"نہیں، وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"سر! کل یہاں جو خونی واردات ہوئی ہے، اس میں کم و بیش تین درجن بندے شامل تھے۔ ان سب نے شروع سے آخر تک اپنے چہرے منڈاسوں اور ٹوپیوں میں چھپائے رکھے۔ ان کا سرغنہ ایک خاصے لمبے قد کا شخص تھا اور پٹھانی لہجے میں اردو بولتا تھا۔"

ریان ولیم کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "اگر وہ شخص لمبے قد کا تھا اور خاص طرح کی اردو بولتا تھا تو اس سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ وہ مرجان خان ہوگا؟"

"میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں سر! میں نے تو وہ معلومات آپ تک پہنچائی ہیں جو مجھ تک پہنچیں۔ باقی آپ اس ساری صورتِ حال کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"نہیں ایمران! اگر مرجان خان کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی شک ہے تو وہ نکال دو۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا اور نہ میں کسی کو ایسا کام کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ میرے خیال میں تو کل رات جس نے بھی کارروائی کی ہے، اس نے حماقت کی ہے۔ ایسی کسی حماقت کا نتیجہ جلالی کے ہارٹ اٹیک یا اس کی موت کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ اور اگر یہ بڈھا عدم آباد روانہ ہو گیا تو سمجھو سب کچھ چوپٹ ہو گیا۔"

"پھر آپ کے خیال میں یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں سر؟" عمران نے پوچھا۔

"تمہیں بتایا تھا نا کہ کچھ اور لوگ بھی اسی راستے پر چل رہے ہیں۔ یقیناً ان میں سے ہی کسی نے یہ حماقت فرمائی ہے۔"

"لیکن سر! یہاں کوٹھی میں مرجان خان کا نام لیا جا رہا ہے اور اس حوالے سے آپ کا نام بھی آرہا ہے۔ پولیس تفتیش کا رخ آپ کی طرف مڑ سکتا ہے۔ آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"میری طرف سے فکر نہ کرو ایمران! میں محفوظ جگہ پر ہوں۔۔۔ مرجان خان بھی پچھلے کئی مہینے سے انڈر گراؤنڈ ہے۔ اس تک پہنچنا آسان نہیں۔ لیکن یہاں ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آرہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوسرے گروہ نے تفتیش کا رخ جان بوجھ کر غلط رخ پر موڑنے کی کوشش کی ہو۔ میرا مطلب اس لمبے قد اور پٹھانی لہجے والے شخص سے ہے۔"

"یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی آرہا ہے سر! بہرحال آپ بھی اس بارے میں غور فرمائیں، کل پھر بات کریں گے۔"

کچھ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد بات چیت کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ عمران کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

☆☆☆

اگلے روز سہ پہر کے وقت عمران نے مجھے بتایا۔ "لگتا ہے کہ ملازموں کی ہمت جواب دے گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"زیادہ تر ملازم کوٹھی چھوڑ کر جا رہے ہیں اور کچھ جا بھی چکے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر لائبہ اور ڈرائیور رشید وغیرہ۔ مجھے لگتا ہے کل تک یہ ساری جگہ بھائیں بھائیں کرنے لگے گی۔"

"ڈاکٹر مہناز کہاں ہے؟"

"وہ رکی ہوئی ہے۔ صبح سے جلالی صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ مسلسل ان کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لائبہ کی جگہ کسی اور کو یہاں بلا لے گی۔"

"پرسوں رات والی کارروائی کے بارے میں تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟ یہ ریان اینڈ کمپنی کا کام ہے یا جاوا اینڈ کمپنی کا؟"

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے کہ آج مبارک دن ہے۔ تم اچھے سوال کر رہے ہو۔۔۔ دراصل ہم کل سے ایک نکتہ فراموش کر رہے ہیں۔ پرسوں رات کے واقعات سے اس بات کے واضح اشارے ملتے ہیں کہ اس خونی کارروائی میں کسی حد تک انتقام کا جذبہ بھی شامل تھا اور وہ انتقام تھا مخبر مختار ملک کی موت کا۔ دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مختار ملک کا تعلق اپنے ریان ولیم صاحب سے نہیں تھا۔ کم از کم ریان صاحب نے تو یہی کہا تھا کہ مختار ملک کو وہ نہیں جانتے۔"

"ہاں، یہ پوائنٹ تو ہے لیکن یہ کس طرح ثابت ہوگا کہ مختار کے بارے میں ریان ولیم نے ہمارے ساتھ سچ بولا تھا؟"

"یار! میرا دل کہتا ہے کہ اس نے سچ بولا تھا۔ کم از کم اتنی سی رعایت تو دے دو میرے دل کو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "یعنی ہم پرسوں رات کی کارروائی کے لیے ریان ولیم کو اپنی "تفتیش" سے خارج فرما رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جاوا اور اس کے ساتھیوں کی کارروائی تھی۔"

"جاوا خود تو بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ پرسوں والی کارروائی میں وہ خود تو شریک نہیں ہوا ہوگا۔ یہ اس کے ساتھیوں کا کام ہوگا۔"

"بات پھر وہیں آجاتی ہے۔ وہ پٹھانی لہجے میں اردو بولنے والا کون تھا؟"

"ہوسکتا ہے کہ ریان ولیم کا شک درست ہی ہو۔ جاوا گروپ نے تفتیش کا رخ غلط سمت میں موڑنے کے لیے یہ "پٹھانی لہجے" والا چکر چلایا ہو۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ یہ بے ہودہ اور سفاک کارروائی جاوا جیسے اکھڑ مزاج شخص کے ذہن میں ہی ترتیب پا سکتی ہے۔ جلالی صاحب ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح ہیں۔ اگر اس کارروائی کے صدمے سے یہ چراغ گل ہو جاتا تو بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ جاوا کو بھی سر پیٹنا پڑتا۔"

"لیکن یار! اگر یہ جاوا کا کام ہے بھی تو اس نے جلالی صاحب کو براہِ راست تو نشانہ نہیں بنایا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے جان بوجھ کر کارروائی کے لیے پرسوں کی رات چنی تھی۔ انہیں پتا تھا کہ جلالی صاحب خود یہاں موجود نہیں۔ غالباً انہوں نے جلالی صاحب کو صرف ڈرایا ہے اور ان پر دباؤ بڑھایا ہے۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن جلالی صاحب کتنا دباؤ برداشت کر سکتے ہیں، یہ بھی تو کنفرم نہیں۔ ایسے شخص کا پتا کا کسی بھی وقت بول سکتا ہے۔ پتا کا سمجھتے ہو نا تم؟"

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری وہ سیڑھیوں والی تھیوری بھی درست ہی لگتی ہے۔ کارروائی کرنے والوں نے گارڈ مشتاق کو جان بوجھ کر دوبارہ سیڑھیوں سے گرایا اور جان سے مارا۔ وہ ہمیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ مختار ملک اتفاقاً نہیں گرا تھا، اسے قتل کر کے وہاں سے پھینکا گیا تھا یا وہاں ڈالا گیا تھا۔"

عمران بولا۔ "اب وہ سیڑھیاں خوف کا ٹریڈ مارک بن گئی ہیں۔ کچھ ملازم انہیں پُراسرار رنگ دے رہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہاں سے بھاگنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ان سیڑھیوں کے خوف سے فرار ہوئے ہیں۔ ابھی یہاں آتے ہوئے میں نے دیکھا ہے کہ سیڑھیوں کی طرف والا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ وہاں زینوں پر کسی کے پتے بکھیرے گئے ہیں اور ریلنگ کے ساتھ دو تعویذ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کارروائی بابے طفیل یا اس کی بیوی کی ہے۔"

”لیکن عمران! یہ سیڑھیوں والا چکر تو کافی پہلے کا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ باکس والے معاملے سے چند مہینے پہلے بھی یہاں کے ملازم ان سیڑھیوں سے خوف کھاتے تھے۔ ندیم نے خود مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ سب سے پہلے یہاں جلالی صاحب کا ایک لاڈلا طوطا مردہ پایا گیا تھا۔ کسی کو پتا نہیں چلا کہ وہ اپنے پنجرے سے کیسے نکلا اور کیسے یہاں پہنچ کر ختم ہوا۔ پھر وہ مہمان کے گرنے والا واقعہ ہوا جس میں وہ اپنی یادداشت بالکل کھول بیٹھا اور ابھی تک اسی حالت میں ہے۔۔۔ دو تین دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ملازموں نے ان سیڑھیوں پر خون کے باریک باریک چھینٹے دیکھے، جیسے کوئی پھوار پڑی ہو۔ رات کے وقت سیڑھیوں سے ایسی آوازیں سنی جاتی ہیں جیسے کوئی بھاری بھر کم شخص ٹھہر ٹھہر کر اتر رہا ہو۔ اب یہ اوپر نیچے دو اموات ہو گئی ہیں یہاں۔“

”یہ تم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہو تابش! ہمارے دیہی علاقوں میں ایسی سیڑھیاں، ایسی چھتیں، ایسے تالاب اور درخت ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ان سے کہانیاں وابستہ کی جاتی ہیں اور پھر انہیں بڑھایا چڑھایا جاتا ہے۔ یہ سادہ لوح لوگوں کے اندر کے وہم ہی تو ہوتے ہیں۔ بعض اوقات عیار لوگ اس کمزوری کو اپنے کسی مقصد کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ تمہیں جارج اور حکم جی کی ایک اہم کارستانی تو یاد ہوگی۔۔۔ وہ اپنے قیدیوں کے جسموں میں ”الیکٹرانک چپ“ نصب کرتے تھے اور پھر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ قیدی آزاد ہو کر بھی حکم کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا۔“

”لیکن ایک بات تو ہے عمران! بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم اپنی سائنس کے پیمانے پر نہیں تول سکتے۔ خود سائنس بھی یہ مانتی ہے کہ بہت کچھ ابھی انسان کے ذہن اور نظر سے اوجھل ہے۔“

”میں اس کو مانتا ہوں لیکن وہم اور ماورا میں بہت فرق ہے جگر۔۔۔ جوں جوں انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، وہم سکڑتا جاتا ہے اور ماورا کے لیے اس کی جستجو بڑھتی جاتی ہے۔ ہپناٹزم، مسمریزم، ٹیلی پیتھی، مستقبل بینی۔۔۔ پہلے یہ ماورا تھے، اب یہ سارے علوم ہیں۔“

”اچھا علامہ صاحب! اب یہ فرمایئے کہ ہمیں یہاں سے بھاگنا ہے یا نکلنا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ مبارک گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اب تم نے پھر بے وقوفی کی باتیں شروع کر دی ہیں۔ بھئی، ہم نے ریان ولیم صاحب سے ایڈوانس پکڑا ہوا ہے۔۔۔ کمٹمنٹ کی ہوئی ہے۔ اب ہم اپنا کام ادھورا چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟ کام پورا کریں گے تو باقی پیسے بھی ملیں گے اور پیسے ملیں گے تو نصرت کا علاج اچھے طریقے سے ہو سکے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تم نے یہ سوال بس برائے سوال ہی پوچھا ہے۔ تم بھی جانتے ہو کہ ہم بھاگنے والے ہیں، نہ جھکنے والے، نہ بکنے والے۔۔۔ تو نکلنے والے۔“

”یہ ”نکلنے والے“ کیوں شامل کر دیا؟“

”بھئی، سیاست میں کوئی بات بھی حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ ہر نعرے میں بچاؤ کا کوئی راستہ کھلا رکھنا چاہیے۔“

گفتگو مذاق کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ ”یار! تم عجیب گھن چکر ہو۔ ایک طرف تو اڑیل سے اڑیل اور غصیلے سے غصیلے جانور کو رام کر لیتے ہو، دوسری طرف جلالی صاحب کے ساتھ کچھ نہیں کر پا رہے۔“

”تم جلالی صاحب کو اڑیل جانور سے ملا رہے ہو۔ تمہارے ستارے گردش میں ہیں۔ اپنے اس ”طرزِ کلام“ کی وجہ سے تم نے عنقریب جلالی صاحب کے ہاتھوں مرحوم ہو جانا ہے۔“

”تو اس سے پہلے کچھ کر گزرو نا۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے پندرہ بیس دن ہو چلے ہیں لیکن ابھی تک کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔“

اس کی کشادہ پیشانی پر لکیریں نمودار ہوئیں۔ وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ”میرے خیال میں سرا ہاتھ آیا ہے اور تمہارے ہاتھ ہی آیا ہے لیکن تم غور نہیں کر رہے۔ ہم ایک ایسے پوائنٹ تک پہنچ چکے ہیں جو یہاں کسی کی نظر میں نہیں۔“

”کس پوائنٹ کی بات کر رہے ہو؟“

”جلالی صاحب اور مہناز کی وہی گفتگو جو منگل کے روز تم نے مائکروفون پر سنی ہے۔ جلالی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر مہناز کا تعلق بظاہر تو اس کوٹھی کے رواج کے مطابق عام ہی نظر آتا ہے لیکن وہ تھوڑا سا مختلف ہو چکا ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود عزت مآب جلالی صاحب کے دل میں اس نرم و نازک ڈاکٹر مہناز کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ گوشہ وسیع ہو رہا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہی وہ اہم پوائنٹ ہے جو ہمیں غیر متوقع فائدہ پہنچا سکتا ہے۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ گوشہ فائدہ پہنچائے گا؟“

”اس کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ اس گوشے کے بارے میں کسی دوسرے کو پتا نہ چلے اور دوسرا یہ

کہ یہ گوشہ واقعی وسیع ہو جائے۔ اگر ہم...“

بات کرتے کرتے اچانک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ کھانسی کی آواز سے اندازہ ہوا کہ جلالی صاحب ادھر تشریف لا رہے ہیں۔ عمران نے جلدی سے سگریٹ بجھایا۔ جلالی صاحب کی آمد پر ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان کا رنگ معمول سے زیادہ زرد نظر آ رہا تھا۔ ”بیٹھو بیٹھو۔“ جلالی صاحب نے کہا اور پھر ہمارے پاس ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے ہمیں یہ افسوس ناک اطلاع دی کہ زخمی گارڈ اشرف جانبر نہیں ہو سکا۔ اس کی میت لاہور سے اس کے آبائی علاقے ایمن آباد پہنچا دی گئی ہے۔ یہ واقعی دل گرفتہ کرنے والی اطلاع تھی۔

جلالی صاحب نے دوسری اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”گارڈ مشتاق کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی ہے۔ اس کے جسم پر ایسے نشان ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ سیڑھیوں سے گرانے سے پہلے بھی اسے بیدردی سے مارا پیٹا گیا تھا۔ اس کی ایک ران کا گوشت اندر سے پھٹا ہوا ہے اور پیٹھ پر ٹھڈوں کے نشان ہیں۔ مجھے نوّے فیصد یقین ہے کہ یہ اسی سفید کتے کی کارستانی ہے۔ وہ موٹا سور... اس نے خطرناک دھمکیاں دی تھیں۔ وہ لمبے قد والا قبائلی بدمعاش بھی اس کے ساتھ تھا۔“ جلالی صاحب نے بے حد مغموم لہجے میں کہا۔ وہ کافی پریشان تھے۔ موٹے سور سے ان کی مراد ریان ولیم ہی تھا۔

جن لوگوں سے وہ مشورہ وغیرہ کرتے تھے، ان میں سے کئی ایک انہیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ آج یہاں اس کمرے میں بیٹھے ہم سے دکھ سکھ بیان کر رہے تھے۔

اسی دوران میں ڈاکٹر مہناز بھی انہیں ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ گئی۔ جلالی صاحب کے اشارے پر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اور عمران بھی مؤدب بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ندیم کا فون آیا ہے سر... اس نے کہا ہے کہ دوسرے قتل کی ایف آئی آر بھی درج ہو گئی ہے۔ مشتبہ افراد میں انگلینڈ کے شہری ریان ولیم اور اس کے ساتھیوں کا نام شامل کیا گیا ہے۔ دوسری طرف جاوا اور دیر شہوار وغیرہ کا نام بھی شامل ہے۔ پولیس ان لوگوں کی تلاش میں مختلف جگہوں پر چھاپے مار رہی ہے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو۔“ جلالی صاحب نے سخت بیزار لہجے میں کہا۔ ”یہ گھسے پٹے فقرے بہت سن رکھے ہیں ہم نے۔ ہماری پولیس تو صرف شرفا کی پگڑیاں اچھالنے کے لیے ہے۔ مجرموں کے ساتھ ان کے یارانے ہوتے ہیں۔ مجھے بہت کم امید ہے ان کی طرف سے کسی اچھی خبر کی... باقی جہاں تک اپنی حفاظت کا تعلق ہے، یہ اب میں خود کروں گا۔ اس فارم کے ایک ایک انچ پر بہترین گارڈز کھڑے کر دوں گا۔ وہ جدید اسلحے سے لیس ہوں گے۔ دس پندرہ دن تک کوٹھی کی چھت پر واچ ٹاور بھی مکمل ہو جائے گا۔ وہاں سے فارم کے اردگرد چار پانچ کلومیٹر تک نظر رکھی جا سکے گی۔“

مہناز نے ہمت کر کے کہا۔ ”لیکن سر! ان قاتلوں کو بھی تو پکڑنا ہے جنہوں نے دو جانیں لیں۔ دو عورتوں کو بے آبرو کیا۔ درجن بھر افراد کو بری طرح زخمی کیا۔ پورے فارم میں توڑ پھوڑ کر کے کروڑوں کا نقصان کیا۔ ایرانی بلیوں کو...“

مہناز کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ عمران نے ٹھوکا دے کر مہناز کو فقرہ پورا کرنے سے روکا تھا۔ جلالی صاحب نے غالباً آخری الفاظ سنے ہی نہیں اس لیے انہوں نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

عمران نے مہناز کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں، حملہ آوروں کا کھوج لگنا ضروری ہے۔ ورنہ ان کے حوصلے بڑھتے جائیں گے۔“

”یہ سب بھی ہو گا... ضرور ہو گا۔“ جلالی صاحب نے وجدانی انداز میں سر ہلایا۔ ان کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ ڈاکٹر مہناز سمجھ گئی کہ اگر یہ موضوع تھوڑی دیر مزید چلا تو جلالی صاحب کا بلڈ پریشر شوٹ کر جائے گا۔ اس نے فوراً گفتگو کا رخ بدل دیا۔ وہ جلالی صاحب کو یہ بتانے میں مصروف ہو گئی کہ ڈاکٹر لائبہ کی جگہ کسی ڈاکٹر کا انتظام کر رہی ہے۔ اس طرح کی کچھ مزید حوصلہ افزا باتیں بھی اس نے جلالی صاحب کے سامنے کیں۔

اگلے روز صبح سویرے موقع ملا تو میں نے عمران سے کل والی گفتگو کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جب ڈاکٹر مہناز، جلالی صاحب کے سامنے ایرانی بلیوں کا ذکر کرنے لگی تھی تو اس نے مہناز کو روک کیوں دیا تھا؟

وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر مدھم آواز میں بولا۔ ”تم ان بلیوں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں، بس یہ سنا تھا کہ تم جلالی صاحب کو واردات کے روز بتا رہے تھے کہ بلیوں کو حفاظت کی غرض سے کسی بالائی منزل کے پنجرے میں رکھا گیا ہے۔“

”وہ غلط بات تھی۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”بلیاں اوپر والے پنجرے میں نہیں ہیں۔ اوپر والے پنجرے کا ذکر میں نے صرف اس لیے کیا تھا کہ جلالی صاحب دو منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا نہیں سکتے... بلیاں مر چکی ہیں۔“

”مر چکی ہیں؟“

”ہاں، یہ خونی واقعہ بھی ان واقعات میں شامل ہے جو بدھ کی رات یہاں فارم ہاؤس میں ہوئے۔“

”چاروں بلیاں؟“ میں نے سخت تحیّر کے عالم میں پوچھا۔

”ہاں چاروں ہی۔ ان خبیثوں نے ان پر افریقن جنگلی کتے چھوڑ دیے۔ جنگلی کتوں کا بڑا پنجرہ بلیوں والے پنجرے کے ساتھ ہی تھا۔ انہوں نے دونوں پنجروں کی درمیانی رکاوٹ ہٹا دی۔ آٹھ دس خونخوار کتوں کے گروہ نے منٹوں میں بلیوں کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ یہ بڑے ظالم کتے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے چرندے درندے پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اپنے شکار کو زندہ حالت میں ہی پھاڑنا اور کھانا شروع کر دیتے ہیں۔“

”اوہ گاڈ۔“ میں نے سر پکڑ لیا۔ وہ بڑی قیمتی اور نایاب بلیاں تھیں۔ جلالی صاحب کو ان سے خاص اُنس تھا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے وہ نہایت سفاک تماشا دیکھا۔ کالے دھبوں والے وہ خوفناک جنگلی کتے نرم و نازک بلیوں پر جھپٹ رہے تھے۔ انہیں چیر پھاڑ رہے تھے۔

حملہ آوروں نے بدھ کی رات اس فارم ہاؤس میں جو درندگی دکھائی، وہ ”یادگار“ تھی۔ اب اس درندگی میں ان بلیوں والے واقعے کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ بے مثل سفاکی تھی۔ جہاں بے گناہ ملازماؤں کی عصمت دری کی گئی تھی، وہاں بے زبان جانوروں کو بھی معاف نہیں کیا گیا تھا۔ دو افراد جان سے گئے اور ایک درجن کے قریب بے طرح گھائل ہوئے اور پولیس ابھی تک صرف ”چھاپے“ ہی مار رہی تھی۔ میرے خیال میں عمران نے اچھا ہی کیا تھا جو جلالی صاحب کو بلیوں والے واقعے سے ابھی تک بے خبر رکھا تھا۔ یہ اطلاع ان کے صدمے کو شدید تر کرنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ آج کل میرے ذہن میں رہ رہ کر ابرار صدیقی کا خیال بھی آ رہا تھا۔ اگر اس چاندنی رات میں واقعی اسی نے لڑکی کا بازو دیکھا اور پھر جھاڑیوں میں پھینکا تھا تو پھر وہ اس کی کھوج میں واپس کیوں نہیں آیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اس بھاگ دوڑ میں کہیں مارا ہی گیا ہو؟

مشتاق کی دردناک موت اور دیگر سنگین واقعات کو اب چوتھا روز تھا۔ کوٹھی اور فارم ہاؤس پر عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ بھاگ جانے والے ملازموں کا خلا پُر کرنے کے لیے جلالی صاحب کافی کوشش کر رہے تھے پھر بھی وہ پانچ چھ افراد سے زیادہ کا انتظام نہیں کر پائے تھے۔ درحقیقت یہاں رونما ہونے والے واقعات نے اردگرد کے سارے علاقے میں ہراس پھیلا دیا تھا اور فارم ہاؤس کے لیے زیادہ تر ملازم آس پاس ہی سے مہیا ہوتے تھے۔

ہاں، جلالی صاحب ایک اچھی سیکیورٹی کمپنی سے معاملہ طے کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کمپنی نے جدید اسلحے سے لیس کم و بیش چالیس گارڈز فارم ہاؤس کو مہیا کر دیے تھے۔ ان گارڈز نے بارہ بارہ گھنٹے کی دو شفٹوں میں فارم ہاؤس کی نگہبانی کرنا تھی۔ ان لوگوں کے پاس واکی ٹاکی، سرچ لائٹس، دو پیٹرولنگ گاڑیاں اور اس طرح کی دیگر سہولتیں موجود تھیں۔ اب جلالی صاحب اپنی ذاتی حفاظت کی طرف سے بھی چوکس ہو گئے تھے۔ پچھلے دنوں میں وہ صرف ایک بار فارم سے باہر گئے تھے۔ اس موقع پر گارڈز کی ایک گاڑی اور دو موٹر سائیکل سوار ان کی شیورلیٹ کے ساتھ موجود رہے تھے۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کے ذہن میں کچھ پک رہا ہے۔ وہ ظلم برداشت کرنے والا شخص نہیں تھا اور یہاں ظلم ہوا تھا۔ خاص طور سے دو بے بس عورتوں کو ایک ہی کمرے میں رات بھر بے آبرو کرنے والا واقعہ عمران کے ذہن کو مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔ میں بھی اپنے طور پر بہت ذہنی بوجھ محسوس کرتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ بدھ کی رات جو خونی واردات ہوئی، اس کی شروعات میری طرف سے ہی ہوئی تھی۔ مختار ملک سے میری لڑائی ہوئی اور وہ آناً فاناً مارا گیا۔ حملہ آوروں نے یہاں جو کچھ کیا، اس میں یقیناً مختار ملک کی موت کا غم و غصہ بھی شامل تھا۔

عمران اور میں اب بھی علیحدہ علیحدہ کمرے میں سوتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے عمران نے مجھے فون کیا۔ ”تابی! تیار ہو جاؤ، کل ہمیں کہیں جانا ہے۔“

”کہاں؟“

”وہ کام کرنے کے لیے جو ابھی تک پولیس نہیں کر سکی۔“

”پولیس نہیں کر سکی؟“ میں نے پوچھا۔

"یارا بڑی کمزور یادداشت ہے تمہاری۔ اسی کمزوری کے بارے میں پشتو فلموں کی مشہور ہیروئن مسرت شاہین نے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں لکھا تھا کہ جن قوموں کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، ان پر ہر کوئی کانٹی ڈال سکتا ہے۔"

"پتا نہیں کہاں کی بات کہاں جوڑ دیتے ہو۔ آج مسرت شاہین سے تحقیقی مقالہ لکھوا رہے ہو، کل کسی دانشور سے ڈانس کروا دو گے۔"

"تمہاری معلومات ناقص ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ کسی نامعلوم مضمون میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اس نے۔ علم الابدان کی ایسی ایسی تشریح کرتی تھی کہ لوگ سر دُھنتے تھے۔ خیر، چھوڑو اس موضوع کو۔ میں اس واردات کی بات کر رہا ہوں جو بدھ کی رات ہوئی۔"

"کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"یہ پوچھو، کیا کرنے کا ارادہ نہیں۔ تمہیں کل شام کے بعد جلالی صاحب سے رخصت لینی ہے اور تیار رہنا ہے۔"

وہ زبردست موڈ میں دکھائی دیتا تھا مگر اس نے زیادہ بات نہیں کی اور فوراً ہی فون بند کر دیا۔

رات کوئی تین بجے کا وقت ہوگا۔ میں کمرے میں اپنے فرشی بستر پر سو رہا تھا۔ اچانک نیند سے جاگ اٹھا۔ کچھ دیر بے حرکت لیٹا رہا پھر اندازہ ہوا کہ موبائل فون کی مدھم گھنٹی کی وجہ سے آنکھ کھلی ہے۔ چندھیائی ہوئی نظروں سے اسکرین کو دیکھا اور مزید چونک گیا۔ آسٹریا کا نمبر تھا۔ یہ کال نصرت کے سیل فون سے تھی۔ "ہیلو نصرت!" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

"ہیلو تابش بھائی!" وہ بھی بالکل مدھم آواز میں بولی۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم تو خیریت سے ہو... اتنی رات گئے فون؟"

"آپ بھول رہے ہیں جناب! یہاں بہت زیادہ رات نہیں ہوئی۔ صرف بارہ بجے ہیں، تقریباً تین گھنٹے کا فرق ہے ٹائم میں۔" وہ بدستور سرگوشیوں میں بول رہی تھی۔

"پھر بھی آدھی رات تو ہوگئی ہے۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یوسف بھائی اور چچا احمد تو چلے گئے ہیں۔ باجی آج میرے پاس اسپتال میں رہیں گی۔ یہاں اجازت تو نہیں ہوتی ہے ساتھ رہنے کی لیکن بعض اوقات مل بھی جاتی ہے۔ بہرحال، اس وقت باجی بھی ساتھ والے کیبن میں سو رہی ہیں۔"

"ہاں... کیسے فون کیا؟"

"بھائی جان! آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز، میری بات پر غور ضرور کرنا۔"

"نصرت! جب تم بات بتاؤ گی تو پھر ہی غور ہو سکے گا نا۔"

"بھائی جان! پتا نہیں کہ مجھے یہ بات آپ سے کہنی چاہیے یا نہیں لیکن اگر آپ کو بُرا بھی لگے تو مجھے چھوٹی بہن سمجھ کر معاف کر دیجیے گا۔ پلیز بھائی۔"

"دیکھو تم خوامخواہ الجھا رہی ہو۔ میں تم سے کبھی ناراض ہوا ہوں اور نہ اب ہوں گا۔ تم جو بھی کہنا چاہتی ہو بے دھڑک کہو۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ "تابی بھائی! بہت کچھ بدل چکا ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آپ ابھی تک نہیں بدلے۔ آپ... اب بھی وہی تابی بھائی ہیں جو باجی کو دیوانوں کی طرح چاہتے تھے۔ رات دن بس باجی کو سوچتے تھے۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے پروگرام بناتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے اور اپنے اس یقین کی وجہ سے میرے اندر ایک خوشی سی پیدا ہوتی ہے تابی بھائی... پتا ہے کیوں؟"

"تم اپنی بات مکمل کر لو، میں پھر جواب دوں گا۔"

"اس لیے تابی بھائی کہ میرے خیال میں آپ باجی ثروت کو اس دلدل سے نکال سکتے ہیں جس میں وہ گلے گلے دھنسی ہوئی ہیں۔ باجی نے ایک ایسے شوہر کے ساتھ اپنی زندگی برباد کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے جو اصل میں ان کا شوہر ہے ہی نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں تابی بھائی جان! میں یوسف بھائی کو دیکھتی ہوں تو میرے گلے میں دھواں سا بھرنے لگتا ہے۔ آج کل بھی یوسف بھائی ہر وقت باجی کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔ میری تیمارداری پر بھی بڑی توجہ دے رہے ہیں، روز گلدستے آ رہے ہیں لیکن میں سب جانتی ہوں۔ یہ باجی کے ساتھ بنائے رکھنے کی کوششیں ہیں اور یہ کوششیں بھی بس اس وقت تک ہیں جب تک یوسف بھائی کا مطلب نہیں نکل جاتا۔ جس روز انکل فاروقی نے پراپرٹی ان کے نام کر دی، یا پھر انکل فاروقی کی آنکھیں بند ہو گئیں، یوسف بھائی نے کسی کچرے کی طرح باجی کو اٹھا کر اپنے گھر سے باہر پھینک دینا ہے۔ میری ہیروں جیسی باجی کی کوئی قدر نہیں انہیں۔ آپ... میری بات سن رہے ہیں نا؟"

"ہاں میں سن رہا ہوں۔"

"یوسف بھائی کے دو چہرے ہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں باجی ثروت کو بس ایک چہرہ ہی نظر آتا ہے یا پھر نظر تو آتا ہے لیکن انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ وہ یوسف بھائی سے علیحدہ ہونے والا گناہ نہیں کریں گی اور اگر کریں گی تو کسی نہ کسی صورت سزا پائیں گی۔ وہ جانتی ہیں کہ طلاق ان کے لیے ضروری ہے لیکن وہ اس کو ایک گالی کی طرح سمجھتی ہیں۔"

"کیا اب کوئی نئی بات ہوئی ہے نصرت؟" میں نے پوچھا۔

"روز ہی نئی باتیں ہوتی ہیں تابی بھائی!" وہ بدستور سرگوشی میں بولی۔ "یوسف بھائی نے اب یہاں ایک نئی "ٹینشن" شروع کی ہوئی ہے۔ انہیں شک پڑ گیا ہے کہ میرے علاج کا خرچہ چچا احمد نہیں کر رہے بلکہ کہیں اور سے ہو رہا ہے۔ وہ اس بارے میں باجی کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ وہ اپنے والد... انکل فاروقی کو بھی باجی کی طرف سے بدظن کر دیں گے۔"

"یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو؟"

"پرسوں وہ انکل فاروقی سے فون پر بات کر رہے تھے... اتفاقاً ان کے ایک دو فقرے میرے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ انکل سے کہہ رہے تھے... کوئی رشتے دار ہے ثروت کا۔ شاید کوئی کزن ہے... کبھی کبھی اس کا فون بھی آتا ہے۔ جواب میں انکل فاروقی نے کچھ کہا۔ یوسف بھائی بولے، کچھ بھی ہے ڈیڈی... ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے... ہم نصرت کا علاج اچھی سے اچھی جگہ پر کرا سکتے تھے... کچھ اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔"

"تم نے یہ سب کچھ ثروت کو بتایا؟"

"تابی بھائی! ان کی آنکھوں پر تو جیسے پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ذرا سی بات کروں تو ڈانٹ دیتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ مجھے یوسف بھائی میں بس خامیاں ہی نظر آتی ہیں۔ میں جواب میں کہتی ہوں کہ آپ کو خوبیاں ہی نظر آتی ہیں جو کہیں ہیں ہی نہیں۔ دراصل تابی بھائی! باجی کے سارے مسئلوں کی جڑ وہ خوف ہے جو انہوں نے لفظ "طلاق" سے جوڑا ہوا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں، خوش قسمتی سے ہمارے خاندان میں طلاق کا کبھی کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ پچھلے چالیس پچاس سالوں میں ہمارے قریبی عزیزوں میں شاید ہی کہیں ایک آدھ طلاق ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب باجی اس بارے میں سوچتی ہیں تو ان کو یہ ایک بہت ہی بُرا اور گمبھیر واقعہ لگتا ہے۔ انہیں گناہ کا احساس ہوتا ہے۔ اس احساس نے ایک جادو کی طرح انہیں جکڑ رکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے تابی بھائی! اگر کوئی باجی کو اس "گھیرے" سے نکال سکتا ہے تو وہ..."

وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ پھر وہ سیکنڈ کے وقفے سے بولی۔ "میرے خیال میں تابی بھائی، وہ آپ ہیں جو باجی کو اس "گھیرے" سے نکال سکتے ہیں۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ آپ باجی کے لیے اور میرے لیے بھی ایک مسیحا کی طرح آئے ہیں۔ آپ کے آنے سے بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ ہاں تابی بھائی! بہت کچھ۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

"مجھے بتاؤ نصرت! میرے بس میں کیا ہے... میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ کوشش کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے تابی بھائی! گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا ہے... تابی بھائی! ایک عورت دوسری عورت کے دل کا حال زیادہ اچھی طرح جانتی ہے... اور باجی تو میری بہن ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ باجی کے دل کی گہرائی میں اب بھی آپ کی تصویر ہے۔ وہ آپ کو سوچتی ہیں لیکن ان کی سوچوں کے گرد دنیا اور رسم و رواج کے پہرے ہیں... آپ کو یاد ہے نا چند دن پہلے میں نے فون پر آپ کو سالگرہ کی مبارک باد دی تھی۔ آپ کی سالگرہ کا دن مجھے باجی نے ہی یاد کرایا تھا لیکن ساتھ ہی کہا تھا کہ میں آپ کے سامنے ان کا نام نہ لوں... یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے تابی بھائی! ایسی اور بہت سی مثالیں ہیں۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نصرت! ابھی تم اپنے ذہن کو ان فکروں میں نہ ڈالو تو اچھا ہے۔ اپنی ساری توجہ اپنی صحت پر رکھو اور ہمیں جلد سے جلد بھلی چنگی ہو کر دکھاؤ۔"

وہ بولی۔ "آپ باجی کو ٹھیک کر دیں تابی بھائی... میں وعدہ کرتی ہوں، میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"نصرت! میرے خیال میں تم بالکل الٹ بات کہہ رہی ہو۔"

"میں سمجھی نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ جب تم تندرست ہو جاؤ گی تو تمہاری باجی بھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ "نصرت! جہاں تک میں نے نتیجہ نکالا ہے، ثروت کے وہم کی بنیاد ہی تمہاری بیماری ہے۔ اس نے یوسف سے علیحدہ ہونے کا سوچا اور

انہی دنوں تمہاری بیماری ڈائیگنوز ہوئی۔ اس کے دماغ میں یہ بات گھر کر چکی ہے کہ اس کی ''غلط'' سوچوں کا بوجھ تمہاری صحت اور زندگی پر پڑا ہے۔ بس یہی وہ نفسیاتی گتھی ہے نصرت جس نے ثروت کو بے طرح الجھا رکھا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی، ثروت کی یہ نفسیاتی گتھی بھی اپنے آپ کھل جائے گی۔ اس کی سوچوں کے سارے جکڑ بند ٹوٹ جائیں گے۔ پھر وہ ایک آزاد عورت کی طرح سوچنا شروع کر دے گی۔''

وہ میری بات خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کا انداز گواہ تھا کہ وہ میری بات کو اہمیت دے رہی ہے۔

میں خاموش ہوا تو وہ دبی آواز میں بولی۔ ''آپ کے پاس باجی کا نیا موبائل نمبر ہے؟''

''نہیں۔''

''اچھا، میں ابھی آپ کو بھیجتی ہوں۔ آپ کسی وقت باجی کے نمبر پر بھی بات کیا کریں۔ یوسف بھائی پرسوں واپس چلے جائیں گے۔ پھر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ پلیز، اپنی اس پیار چھوٹی بہن کی یہ بات مان لیں۔ ان کو فون کریں۔'' اسی دوران میں کھٹ پٹ کی مدھم آواز آئی۔ وہ بولی۔ ''اچھا میں بند کرتی ہوں، باجی شاید جاگ گئی ہیں۔''

میں بے وقت جاگا تھا اور اس کے بعد جس طرح کی گفتگو ہوئی تھی، اس نے نیند آنکھوں سے اڑا دی تھی۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پہرے دار باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ گشت پر تھے۔ رکھوالی کے کتوں کی آوازوں کے سوا تقریباً سناٹا ہی تھا۔ یوسف کا کردار اب واضح ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ثروت کو ہر صورت اپنے ساتھ وابستہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے والد کو بھی ثروت کی غیر معمولی حمایت و تائید سے روکنا چاہتا تھا۔ نصرت نے جو کچھ بتایا، اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے والد فاروقی صاحب کو ان کی بڑی بہو کے حوالے سے بدظن کرنا چاہتا ہے... اس کی ہوشیاری بھی عیاں ہو رہی تھی۔ اس نے فقط چند دنوں میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ نصرت کے علاج کے لیے رقم چچا احمد نہیں دے رہے بلکہ کہیں اور سے مہیا ہو رہی ہے۔

ثروت کی تصویر میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ میرا عشق تھی، میرا وجدان، یقین، سب کچھ وہی تھی۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا تھا تو مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے بغیر میری زندگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ میں چار برس تک بیتا بن بیٹھے میں کسی جونت کی طرح جگا کر زندہ رہا تھا کہ ثروت میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ آس پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ شادی شدہ ہو چکی تھی لیکن اس صورت حال میں بھی ایک زبردست پھیر موجود تھا۔ اور اس پھیر نے مجھے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس موڑ پر گہری تاریکی تھی مگر تاریکی میں آس امید کی کچھ کرنیں بھی موجود تھیں۔ کیا اب بھی وقت میرے لیے پلٹ سکتا ہے؟ کیا اب بھی میں اور ثروت بیت جانے والے موسموں کو آواز دے سکتے ہیں؟ میں نے بڑی حسرت کے عالم میں سوچا اور سینے میں فروزاں آگ کچھ اور بھی تپش دینے لگی۔

☆☆☆

میں اور عمران فارم ہاؤس سے نکلے۔ یہ رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ ہم نے ایک مشترکہ عزیز کی شادی میں شرکت کا بہانہ بنا کر جلالی صاحب سے چھٹی لی تھی۔ گارڈز کی ایک گاڑی شیخوپورہ سے شاہدرہ تک جا رہی تھی۔ ہم اسی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ ایک محفوظ طریقہ تھا۔ اگر ہم اپنے طور پر سفر کرتے تو یہ اندیشہ موجود تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جائے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

ہم شاہدرہ موڑ پر گارڈز کی جیپ سے اتر گئے اور ایک رکشا میں بیٹھ کر لاہور کے وسطی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاہور جگمگا رہا تھا۔ زندگی عروج پر تھی۔ ہم مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کے قریب سے گزرے۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں پہلی بار عمران سے ملا تھا۔ وہ مجھے جان لیوا مایوسی کے گھیرے سے نکال کر اپنے آشیانے کی طرف لے جا رہا تھا۔ آج کی طرح تب بھی مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ آج بھی اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ ایک بندے کی دُم میں نمدہ فٹ کرنا ہے۔ ان الفاظ کی تشریح میں اس سے پوچھتا ہی رہ گیا تھا۔ میری پینٹ کی جیب میں چھوٹے سائز کا لیکن ایک طاقتور پستول موجود تھا۔ عمران کی پنڈلی سے بھی ایک لوڈڈ پستول بندھا ہوا تھا۔ یہ دونوں ہتھیار عمران نے فارم ہاؤس کے اندر سے ہی حاصل کیے تھے، کیسے کیے تھے؟ یہ اس نے نہیں بتایا۔

فارم ہاؤس سے تو عمران میری طرح پتلون قمیص میں ہی نکلا تھا لیکن رکشا میں بیٹھنے کے بعد اس نے جیب سے ایک ٹائی نکالی اور نفاست سے باندھ لی۔ ''خیر ہے، آج کسی فلم ایکٹریس پر بجلی گرانے کا ارادہ ہے؟''

''بھئی، اپنے یار کی شادی پر جا رہے ہیں، بن ٹھن کر جانا چاہیے۔''

''یہ بہانہ تو جلالی صاحب کے لیے تھا۔ اصل بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے ایک عجیب کام کیا۔ اپنی سیاہ پتلون کی جیب میں سے ایک نو دس انچ لمبا چاقو نکالا۔ اس چاقو کا دستہ پتلا لیکن مضبوط تھا۔ یہ چاقو اس نے اپنی ٹائی کے اندر کی طرف بنی پاکٹ میں اس طرح چھپا لیا کہ اسے سامنے سے دیکھنا ناممکن ہو گیا۔

اس نے تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''بتاؤ، کسی بالی لالی ووڈ فلم میں تم نے کسی ہیرو میں اس طرح کی ذہانت دیکھی ہے؟''

''میں واقعی متاثر ہوا ہوں۔ اچھا طریقہ ہے۔'' میں نے کہا۔

یہ پتلے دستے والا چاقو واقعی ٹائی کا حصہ بن گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''لیکن اتنی زیادہ احتیاط کی کیا ضرورت ہے؟ کہیں ہماری خصوصی تلاشی ہونے والی ہے؟''

''تلاشی جیسی تلاشی۔ تم دیکھتے رہنا، ہر چیز ٹٹول لیں گے تمہاری۔''

''لیکن کون؟''

''ہمارے دوست۔ بڑے محتاط قسم کے لوگ ہیں۔''

''یار! اب تو کچھ بتا دو۔ کیوں امتحان لینے پر تلے ہوئے ہو؟'' میں نے عاجز لہجے میں کہا۔

اس نے اچھلتے کودتے رکشے میں میری صورت دیکھی اور بولا۔ ''چلو کیا یاد کرو گے، کس مہربان سے پالا پڑا ہے۔ ہم جاوا صاحب کے ایک اڈے پر جا رہے ہیں۔''

''جاوا کا اڈا؟ تمہیں کیسے معلوم؟''

''ایک ڈان کو دوسرے ڈان کا ٹھکانا معلوم نہ ہوگا تو کیا تم جیسے شریفے کو ہوگا۔''

''خیر، اب اتنے ڈان بھی نہیں ہو تم۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اندھیرے میں کوئی تیر چلانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''اندھیرے میں نہیں اجالے میں... اور تیر بھی نہیں، توپ۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم جاوا سے ملنے جا رہے ہو؟''

''جاوا سے نہیں لیکن اس کے ایک بڑے گرگے سے۔ سلطان نام ہے اس کا... سلطان چیتا۔ خطرناک بندہ ہے۔ کچھ عرصے سے زیر زمین ہے لیکن آج کل لاہور میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم آج اس کے ساتھ چائے پی سکیں گے۔''

''کہیں زیادہ تیز تو نہیں جا رہے ہو؟''

''تم بھی تو اب دودھ پتی کے مرحلے سے گزر چکے ہو۔ کتنی بھی تیز ہوئی، جارج گورے سے تو تیز نہیں ہوگی۔''

''بڑی رمز یہ باتیں کر رہے ہو۔ اللہ ہی خیر کرے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

یقیناً ہم کسی خطرناک کام سے جا رہے تھے لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، اب خطرناکی میرے دل دماغ پر کچھ زیادہ اثر نہیں کرتی تھی۔ خاص طور سے عمران کا ساتھ ہوتا تھا تو یہ سب کچھ ایک سنسنی خیز انجوائے منٹ کی طرح ہو جاتا تھا۔

رکشا، مال روڈ کے علاقے میں ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رک گیا۔ عمارت کا مین گیٹ بند تھا۔ لان میں گھاس اُگی ہوئی تھی اور اسے مدت سے کاٹا نہیں گیا تھا۔ کھڑکیاں، دروازے بند اور فرش پر گرد و غبار تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بلڈنگ عرصے سے بے آباد پڑی ہے۔

ہم عمارت کے اندر جانے کے بجائے سیدھے نکلتے چلے گئے تو مجھے شک گزرا کہ شاید عمران حسب عادت مذاق کر رہا تھا۔ ایک چکر کاٹ کر ہم مال روڈ کے بارونق علاقے کی طرف نکل آئے۔ مین سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ ایک شاپنگ پلازا کے نیچے ایک نیم تاریک سا پارکنگ لاٹ تھا۔ ہم ڈھلوان اتر کر پارکنگ میں داخل ہو گئے۔ پارکنگ کی زیریں منزل پر بھی کافی تعداد میں گاڑیاں موجود تھیں۔ اِکا دُکا لوگ آ جا رہے تھے۔ ایک لاری نما بس کے عقب میں پہنچ کر عمران نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک چھوٹا سا دروازہ کھول کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہم ایک نیم تاریک کوریڈور سے گزرے۔ یہاں بھی زیادہ صفائی ستھرائی نظر نہیں آئی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے کھڑے ایک ہٹے کٹے شخص نے ہمیں کڑی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''

''سلطان چیتے سے کہو، تمہارا باپ ملنے آیا ہے۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ہٹے کٹے شخص کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''باپ کا مطلب باپ ہی ہوتا ہے۔ بیٹے کی ماں کا خصم۔ جاؤ اسے بتا دو، وہ سمجھ جائے گا۔''

ہٹا کٹا شخص جز بز نظر آ رہا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ وہ عمران پر پھٹ پڑے گا، کبھی خوف زدہ نظر آتا تھا۔ اس کے کندھے سے ریوالور جھول رہا تھا۔ عمران کو اور مجھے سرتاپا دیکھتا ہوا وہ دروازے کی دوسری طرف چلا گیا۔ بہرحال، جاتے ہوئے وہ دروازے کو دوسری طرف سے

مقفل کر گیا تھا۔

اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں عمران سگریٹ پھونکتا رہا اور میں موبائل فون پر میسج وغیرہ چیک کرتا رہا۔ ہٹا کٹا شخص اب قدرے مرعوب اور مؤدب نظر آ رہا تھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”عمران دانش۔۔۔ ابو سلطان چٹا۔“ عمران نے کہا۔

”آیئے۔“ اس نے تیوری چڑھائی اور ہمیں راستہ دیا۔

یہ بھی ایک راہداری تھی مگر خاصی صاف ستھری تھی، قالین بچھا ہوا تھا۔ ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس بھی ہوتا تھا۔ چند قدم آگے گھنگرالے بالوں والا ایک کرخت صورت مکرانی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی۔ ساتھ میں ایک درمیانی عمر کا فربہ اندام شخص نظر آتا تھا۔ وہ بھی شکل سے جرائم پیشہ لگتا تھا۔

”سوری۔“ اس نے کہا اور عمران کی جامہ تلاشی شروع کر دی۔ عمران کی پنڈلی سے لگا ہوا پستول نکال لیا گیا۔ بعدازاں میری تلاشی ہوئی اور میرا ٹیڈی پستول بھی ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ ”یہ دونوں ہتھیار واپسی پر آپ کو مل جائیں گے۔“ اس نے کہا۔

ہم آگے بڑھے۔ پندرہ بیس قدم آگے ایک پانچ چھ فٹ چوڑا سا گولائی دروازہ تھا۔ یہاں دو مسلح افراد نے پھر ہماری تلاشی لی۔ اس مرتبہ ہمیں موبائل فونز سے بھی محروم کر دیا گیا۔ ”سوری“ کے لفظ سے شروع ہونے والی یہ تلاشی خاصی باریک بینی سے کی گئی۔ پنڈلیاں اچھی طرح ٹٹولی گئیں اور جوتوں کو بھی شک کی نظروں سے دیکھا گیا۔ عمران کا چہرہ تمتما رہا تھا لیکن وہ بہ وجوہ خاموش تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ عمران کی ٹائی ابھی تک اس تلاشی سے محفوظ تھی۔ میں نے غور کیا اور اندازہ ہوا کہ عام طور پر سخت ”سیکیورٹی چیکنگ“ والی جگہوں پر بھی ٹائی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ عمران کی یہ ”ایجاد“ قابلِ غور تھی۔

ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہم تو اسی دو منزلہ بلڈنگ کے اندر آ گئے ہیں جو باہر سے مقفل اور بالکل بے آباد نظر آ رہی تھی۔

”یہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟“ میں نے سرگوشی کی۔

”آج کل ہر کام بیک ڈور سے ہو رہا ہے۔ اسے بیک ڈور ڈپلومیسی کہتے ہیں جگر۔“

بظاہر اجاڑ نظر آنے والی یہ عمارت اندر سے مکمل آباد تھی۔ ایک لمبا ترنگا گن مین قالین پوش راہداری میں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ہمیں ایک گول کمرے کے سامنے لے آیا۔ کمرے کا خوب صورت سا گولائی دروازہ بھی گولائی میں تھا۔ گن مین کی دستک پر جس خوبرو لڑکی نے دروازہ کھولا، وہ بھی سرتاپا خوب صورت گولائیوں کا مجموعہ تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دفعہ تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یقیناً عمران کو بھی حیرت ہوئی ہو گی۔ یہ لڑکی مشہور انڈین فلم اسٹار کرشمہ کپور تھی۔۔۔ یا پھر اس کی ہوبہو کاپی تھی۔

”آیئے جی۔“ اس نے اپنے نیم عریاں جسم کی نمائش کرتے ہوئے بازو لہرایا۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ بیڈ نما صوفے سے ایک چوڑا چکلا شخص اٹھا۔ لال پری کے نشے سے اس کی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ چند سیکنڈ تک عمران کو گھورتا رہا پھر پُرتپاک انداز میں بولا۔ ”اتنی دیر کہاں رہے ہو ہیرو صاحب! مدت بعد شکل دکھائی ہے۔“

”تم بھی تو ”گدھے“ کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھے۔“ عمران نے جان بوجھ کر غلط محاورہ بولا۔ دونوں نے زوردار مصافحہ کیا۔ شاید وہ عمران سے معانقہ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن عمران کنی کترا گیا۔ اس کی وجہ عمران کی ٹائی بھی ہو سکتی تھی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ ڈراؤنی آنکھوں اور چوڑے تھوبڑے والا یہی شخص جاوے کا گرگا سلطان چٹا ہے۔ سلطان چٹے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ عمران بولا۔ ”یہ میرا دوست تابش ہے۔ یہ بھی تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق رکھتا تھا۔“

”خوش آمدید، ویلکم۔“ سلطان نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ کی سختی سے آشنا کرنے کی کوشش کی لیکن جو ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا، وہ بھی کچھ کم پتھریلا نہیں تھا۔

کرشمہ کپور ایک طرف خاموش و مؤدب کھڑی تھی۔ جمناسٹک کرنے والی لڑکیوں کی طرح اس کی ٹانگیں اور بازو لباس سے بے نیاز تھے۔ بیڈ نما صوفے کے قریب ہی مساج آئل اور تولیا وغیرہ پڑا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری آمد سے تھوڑی دیر پہلے سلطان چٹا کرشمہ کپور کے نرم و نازک ہاتھوں سے اپنے کھردرے پنڈے کی مالش کروا رہا تھا۔ سلطان چٹا کتنا بھی بڑا بدمعاش سہی مگر اتنا بڑا نہیں تھا کہ کرشمہ کپور اس کی مٹھی چاپی کرتی پائی جاتی۔۔۔ اس بات کو دوسرے انداز میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کرشمہ کپور کی مارکیٹ ویلیو کتنی بھی کم ہو گئی تھی مگر اتنی بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ سلطان چٹے جیسے گرگے کی خلوت میں پائی جاتی۔ یہ یقیناً اس کی ہم شکل تھی۔ ذرا غور سے دیکھنے پر کرشمہ اور اس لڑکی کے خدوخال میں کچھ فرق بھی نظر آتا تھا۔ عام طور پر مشہور فلمی ستاروں کے دو چار ڈبلی کیٹ بھی ان کے اردگرد موجود رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اصل اداکاروں سے کافی مماثلت بھی رکھتے ہیں۔ یہ لڑکی بھی ان میں سے ایک تھی۔

سلطان نے کہا۔ ”ہاں جی، یہ تابش صاحب مجھ سے ملنے کا شوق کیوں رکھتے ہیں؟“ لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

”اس کو فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے اور تمہارا باس تو بڑے بڑے نکموں کو ہیرو بنا دیتا ہے۔ تابش تو پھر بھی اچھا بھلا ہے۔ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ ایڈوانس لے کر بھول جاتا ہے۔ ریل گاڑی کی طرح کبھی وقت پر نہیں پہنچتا۔ سمجھو فلم اسٹاروں کی ساری شرائط پوری کرتا ہے۔“

وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ”مسخری نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ ٹائم تمہارے پاس بھی زیادہ نہیں ہو گا اور میرے پاس بھی کم ہے۔“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“

”مجھے پتا ہے تم جیسے لوگ مرنے کے بعد بھی سنجیدہ نہیں ہوتے۔ ان کے تھوبڑے بہت دانت ضرور نظر آتے رہتے ہیں۔ لیکن اتنا عرصہ تم رہے کہاں ہو۔۔۔ اور تمہیں کیسے پتا تھا کہ میں یہاں ملوں گا؟“

”بس انڈیا میں تھا ایک لونڈیا کے چکر میں۔ اور تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔۔۔ بلکہ کبھی کبھی تو راہ کے بجائے موٹروے ہوتی ہے۔ جیسا، کتے کی بو کافی دور سے سونگھ لیتا ہے۔“

وہ پھر زہرخند انداز میں بولا۔ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ کتا، کتے کی بو سونگھ لیتا ہے۔“

”تم نے آدھی بات درست کہی ہے۔ چلو تمہارے جیسے کے لیے یہ بھی بڑی بات ہے۔“

سلطان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”میں اب یہاں سے نکلنے ہی والا تھا۔ مجھے بتاؤ، میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”کیا کیا خدمتیں ہیں تمہارے پاس؟“

”اچھا کھانا۔۔۔ شراب۔۔۔ لونڈیا۔۔۔ اور اگر کوئی پیچھے لگا ہوا ہے اور ایک دو راتیں یہاں گزارنا چاہتے ہو تو وہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں لونڈیا کے بجائے ایک لونڈے کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہارا وہ لمبو ساتھی۔ کیا نام ہے اس کا نادر ڈی ڈی یا نادر ٹی ٹی۔“

”نادر ٹی ٹی نے کیا کر دیا ہے تمہارے ساتھ؟“

”یہی تو پتا کرنا ہے۔“ عمران نے اطمینان سے کہا۔

سلطان کچھ دیر گہری نظروں سے عمران کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے کرشمہ کپور کی طرف دیکھ کر چٹکی بجائی۔ ”نیتو! جاؤ نادر کو بلاؤ یہاں۔“

نیتو اپنی کمر کو بل دیتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دیوار پر شاندار ایل سی ڈی موجود تھا۔ کوئی انگلش فلم چل رہی تھی۔ فٹ بال میچ کے دوران میں بار بار تالیوں کی آواز گونجتی تھی۔ سلطان کے سامنے میز پر تین سیل فون پڑے تھے۔ گاہے بگاہے کسی فون میں وائبریشن بھی ہو جاتی تھی مگر سلطان کوئی کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ سلطان کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ چٹانی جسم کا مالک، ایک خطرناک صورت بدمعاش تھا۔ خاص طور سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھنے والے کو ہراساں کرتی تھیں۔

عمران اور سلطان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو ”ہم پیشہ“ کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس سے پہلے بھی ان کی دو چار دھواں دھار ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ سلطان نے تین فرنچ گلاسوں میں انڈین بیئر انڈیلی۔ سلطان اور عمران تو غٹاغٹ پی گئے، میرا گلاس وہیں دھرا رہا۔ چند منٹ بعد خوبرو نیتو پھر کمر لچکاتی آ گئی۔ اس نے شاید اپنی آنکھوں کا رنگ کرشمہ کپور سے ملانے کے لیے نیلے لینسز لگا رکھے تھے۔ نیتو کے عقب میں ایک دراز قد شخص چلا آ رہا تھا۔ اس کا قد یقیناً ساڑھے چھ سے نکلا ہوا تھا۔ جسم اکہرا لیکن مضبوط تھا۔ اس نے گہرے رنگوں کی پینٹ قمیص پہن رکھی تھی۔

اس نے سپاٹ لہجے میں عمران کو سلام کیا۔ عمران نے جواب دیا۔ سلطان کی ہدایت پر یہ نادر نامی شخص ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ عمران نے نادر کی آنکھوں میں دیکھا اور بغیر کسی تمہید کے اچانک کہا۔ ”پچھلے بدھ کی رات دس بجے کے بعد تم کہاں تھے نادر؟“

نادر کے سانولے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ اس نے تعجب سے پہلے اپنے باس سلطان اور پھر عمران کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ نادر نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

”تم میری بات کا جواب دو نادر۔۔۔ اور دیکھو،

بالکل سچ بولنا۔ جھوٹ بولو گے تو مجھے پتا چل جائے گا اور پھر جو کچھ ہوگا، وہ اچھا نہیں ہوگا۔''

سلطان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم پولیس میں تو بھرتی نہیں ہو گئے ہو۔ بالکل تھانیداروں کی طرح باتیں کر رہے ہو۔ اگر حکم کرو تو ہم دونوں نیچے زمین پر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ تم اچھی طرح تفتیش کر سکو۔'' سلطان کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

''ضرورت پڑی تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کم از کم تمہارے اس نادرے کے ساتھ تو ضرور ہو سکتا ہے۔''

''تمہیں شبہ کیا ہے؟''

''شبے تو بہت سے ہیں سلطان جی۔ فی الوقت میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بدھ کی رات تمہارا یہ چمچہ کہاں تھا؟''

سلطان چٹے کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا مگر وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''تم بدھ کی رات کہاں تھے نادر؟''

نادر کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا ابھرا۔ وہ کچھ دیر تک سوچ کر بولا۔ ''بدھ کی رات کو تو فیروزہ بائی کی کوٹھی پر پروگرام تھا۔ چھوٹے وزیر صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ میں آپ کے ساتھ ہی تھا۔''

سلطان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، بدھ کی رات کو تو فیروزہ بائی کی چھوٹی بیٹی کا پہلا مجرا تھا۔ بڑے سکّے کھلنے والی محفل تھی۔ میں اور نادر وہیں تھے۔ صبح تین بجے کے قریب واپسی ہوئی تھی۔''

''تین کہاں جی، چار ساڑھے چار کا وقت تھا۔'' نادر نے کہا۔

''لیکن بات کیا ہے؟ نادرے نے کسی کی ماں، بہن کے ساتھ کیا کر دیا ہے؟'' سلطان خشک لہجے میں بولا۔

''کسی کی ماں، بہن والا معاملہ بھی ہے لیکن یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس سے کہو اپنی قمیص اتارے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! فرانسیسی تو نہیں بول رہا۔ نہ ہی فرانسیسی گلاس میں بیئر پینے سے کوئی فرانسیسی بولنے لگتا ہے۔ اس سے کہو قمیص اتارے۔''

نادرے کی آنکھوں میں چنگاریاں نظر آنے لگیں۔ سلطان کی آنکھیں بھی کچھ اور ڈراؤنی ہو گئیں۔ وہ بولا۔ ''دیکھو ہیرو! تم ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔ اس وقت تم میرے ڈیرے پر ہو۔ تمہیں برداشت کر رہا ہوں۔ برداشت کا زیادہ امتحان نہ لو۔ معاملہ بتاؤ کیا ہے؟''

''معاملے کا پتا تو قمیص اتارنے سے ہی چلے گا۔ اس لمڈھینگ سے کہو قمیص اتارے۔'' عمران کا لہجہ حیران کن حد تک بے باک تھا۔

نادرے کو دوسری بار چمچے کا خطاب ملا تھا۔ وہ بھڑک اٹھا۔ ایک قدم آگے آ کر بولا۔ ''اتار دیتا ہوں قمیص... کہو تو پینٹ بھی اتار دیتا ہوں۔ کیا کیا دیکھنا ہے تم نے؟''

''بڑے بے غیرت ہو۔ اپنی اس ہمشیرہ کرشمہ کپور کے سامنے ہی سب کچھ دکھا دو گے۔'' عمران اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

عمران کا خطرناک انداز دیکھ کر سلطان چٹا ایک دم عمران کے سامنے آ گیا۔ ''ایک منٹ... ایک منٹ۔'' سلطان نے اپنے بے پناہ طیش کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

عمران پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ دراز قد نادر وہیں ساکت کھڑا رہا۔ اس کا سانولا سلونا چہرہ مختلف رنگ بدل رہا تھا۔ سلطان چٹے کے محتاط انداز سے صاف عیاں تھا کہ اس سے پہلے عمران سے اس کا واسطہ پڑ چکا ہے... اور اسے پتا ہے کہ عمران کس ٹائپ کا بندہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بات کو بڑھنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس نے دھیمے انداز میں نادرے کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''کوئی بات نہیں نادرے، یہ مہمان ہے اپنا۔ چل کر ہمارے پاس آیا ہے۔ تو کون سی لونڈیا ہے۔ مان لے بات اس کی۔''

نادرا کچھ دیر خشمگیں نظروں سے عمران کو تکتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے تو لگا کہ وہ سلطان کی بات بھی نہیں مانے گا اور اچانک عمران پر حملہ کر دے گا۔ مجھے اپنے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی۔ یہاں ہمیں مار کر دفن کر دیا جاتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ یہ عمران ہی تھا جو جنگلی جانوروں کی طرح اس کچھار میں گھسا تھا اور اب بڑے اطمینان سے کشیدگی بڑھا رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد نادرے نے اپنا ہاتھ قمیص کی طرف بڑھایا۔ پہلے اسے پتلون کے اندر سے کھینچا پھر بٹن کھول کر اتار دیا۔

''بنیان بھی اتارو۔'' عمران نے تحکم سے کہا۔

اس نے بنیان بھی اتار کر پھینک دی۔

ایل سی ڈی پر چلتی ہوئی فلم میں تالیوں کی زوردار آواز گونجی۔ یوں لگا جیسے یہ تالیاں، نادرے کے بنیان اتارنے پر بجائی گئی ہوں۔

عمران اٹھا۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں اس نے گھوم پھر کر نادرے کے جسم کا معائنہ کیا۔ اس کا سانولا جسم جیسے فولادی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ کمر پر ایک ٹیٹو بھی دکھائی

نظر آجاتا ہے

اپنا تھا۔ عمران نے نادرے کی پتلون کے دونوں پائنچے پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچے اور گھٹنوں تک اس کی پنڈلیوں کا معائنہ بھی کیا۔ ایک دم مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے۔ اجتماعی زیادتی کا نشانہ بننے والی زرینہ نے بتایا تھا کہ رخشی نے دراز قد پٹھان کی زبردست مزاحمت کی تھی۔ رخشی کے ناخنوں میں اس کے گوشت کے ریزے بھی تھے۔ عمران شاید یہی ثبوت دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن یہ ثبوت یہاں موجود نہیں تھا۔

عمران واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ''پہن لو قمیص۔'' اس نے نادر لی سے کہا۔

وہ غصیلی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا پھر قمیص بنیان پہننے میں مصروف ہو گیا۔

''کچھ ہمیں بھی بتاؤ تھانیدار صاحب یہ کس چیز کی تفتیش ہو رہی ہے؟'' سلطان نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اسی چیز کی جو تم جلالی کے فارم ہاؤس میں ڈھونڈتے پھر رہے ہو اور جس کی خاطر تم نے بدھ کی رات فارم ہاؤس میں خون خرابا کرایا ہے۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''تمہاری سمجھ دانی اتنی چھوٹی نہیں۔ تم جتنے بن رہے ہو۔ جو کچھ تم اور تمہارا باس جاوا، فارم ہاؤس میں کر رہے ہو وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اپنے ایک بندے کی اتفاقیہ موت کا بدلہ لینے کے لیے تم نے فارم ہاؤس پر جو قیامت ڈھائی ہے، اس کا حساب بھی دینا ہوگا تمہیں۔ آج نہیں تو کل... کل نہیں تو پرسوں۔''

''تم ثبوتوں کے بغیر ایک بیکار بات کر رہے ہو ہیرو۔ اس طرح تو کسی پر کوئی بھی الزام لگایا جا سکتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ منگل کے روز سبزی منڈی میں جو ہنگامہ ہوا ہے، وہ تم نے کیا ہے... تمہارا باس جان محمد بھی تمہارے ساتھ تھا۔ اور اس سے پہلے کو پرروڈ پر مارے جانے والے تین پولیس اہلکار بھی تمہاری ہی گولیوں سے چھلنی ہوئے تھے، وغیرہ وغیرہ۔''

''میں ہوائی بات نہیں کروں گا۔ ثبوت دوں گا اور جب ثبوت آ جائے گا تو پھر تمہارے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہے گا اور نہ ہی کسی رورعایت کی توقع رکھنا۔''

''ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ تم جیسوں سے رعایت مانگوں۔ اور تم اتنی بڑی بات کرو جتنا تمہارا منہ ہے۔ زیادہ وزن اٹھا لینے سے بندہ کبھی کبھی وزن کے نیچے

''اس کا فیصلہ وقت کرے گا سلطانے... اور یہ بات اپنے گرو جاوے کو بھی بتا دینا۔ جلالی کی طرف آؤ گے تو سامنے مجھے کھڑا پاؤ گے۔''

''چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ہم جاوا صاحب کو تکلیف نہیں دیا کرتے۔ باقی تم نے اچھا کیا کہ بتا دیا کہ اب تم جلالی کے چوکیدار ہو۔'' سلطان نے کہا پھر ذرا وقفہ دے کر بولا۔ ''تم چل کر یہاں آئے ہو۔ تمہاری عزت کر رہے ہیں۔ ورنہ بہت سے لوگ یہاں آنے کے بعد کہیں جانے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ میں اب بھی تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ بدھ کی رات کو اگر کسی فارم ہاؤس میں کوئی واردات شارواردات ہوئی ہے تو اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ بدھ کی رات...''

''تم فیروزہ بائی کے بالاخانے میں تھے... اور وہاں نوٹوں کی گڈیاں چھت والے پنکھوں میں مار رہے تھے۔'' عمران نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا...

''یہ قصہ چہار درویش کسی اور کو سنانا سلطانے۔ تیرے جیسے وارداتیے واردات کی رات کو بھوت پریت بن جاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں دو دو تین تین جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ ایسے بھوت پریتوں کو ڈنڈے مار مار کر ایک ہی قالب میں گھسانے کا فن مجھے آتا ہے...''

سلطان چٹے کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے انگارہ ہو گیا۔ اس نے چٹکی بجائی اور گرانڈیل گن مین سے کہا۔ ''ان دونوں تھانیداروں کو عزت سے باہر لے جاؤ۔ ان کے ستارے گردش میں آ گئے تو بڑی مٹی پلید ہونی ہے ان کی۔''

عمران کچھ دیر تک سلطان چٹے کی ڈراؤنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا رہا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جا رہا ہوں لیکن اگلی ملاقات بھی جلد ہی ہوگی۔''

ہم واپس مڑے۔ واپس مڑتے ہوئے عمران نے کرشمہ کپور کی ہم شکل کو آنکھ ماری۔ اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ ہم دروازے سے نکل کر قالین پوش کوریڈور میں پہنچے۔ دائیں طرف سنگ مرمر کی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ انداز ہوتا تھا کہ اوپر بھی اِکّا دُکّا لوگ موجود ہیں۔ ویکیوم کلینر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اچانک ایک مدھم آواز نے عمران کو چونکا دیا۔ یہ بلی کی آواز تھی۔ چند سیکنڈ بعد آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ یوں لگا جیسے وہ بلی پکار رہی ہے۔ وہ کس کو پکار رہی تھی؟ یکایک میرے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بلی کی یہ خاص انداز کی آواز میرے لیے نئی نہیں تھی۔ میں

نے یہ آواز پہلے بھی فارم ہاؤس میں سنی ہوئی تھی۔ پکارتی ہوئی سی یہ آواز پھر بلند ہوئی۔ یہ نایاب ایرانی بلبلوں میں سے کسی ایک کی آواز تھی۔ مجھے عمران کے چہرے پر ہیجانی تاثرات نظر آئے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور دوبارہ سلطان کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب گرانڈیل گن مین نے عمران کی طرف گن سیدھی کرنا چاہی۔ میں گن مین سے قریب تھا۔ میں نے زور سے ٹانگ چلائی۔ گن اس شخص کے ہاتھ سے نکلی اور برابر والی الماری کا ایک شیشہ توڑتی ہوئی باہر جا گری۔ ایک دوسرے شخص نے اپنی کمر کے ہولسٹر سے پستول نکالنا چاہا مگر وہ عمران کی پھرتی کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ عمران چیتے کی طرح لپک کر اس پر جا پڑا۔ دونوں اوپر نیچے نیم عریاں لڑکی نیتو کے قریب گرے۔ وہ چلا کر صوفے پر چڑھ گئی۔ میں نے گرانڈیل گن مین کی ٹھوڑی کے نیچے بھرپور ٹکر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ دوسری ٹکر نے اس کے چہرے کا بھرتہ بنا دیا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ایک دل ہلانے والا منظر دیکھا۔ عمران اپنے مدمقابل کے اوپر تھا اور سلطان چیتا اسے اپنے پستول کی زد میں لے چکا تھا۔ کسی بھی وقت دھماکے کی آواز سے گولی عمران کی کمر میں داخل ہوسکتی تھی لیکن اس وقت عمران کی ''لک'' نے پھر کام دکھایا۔ صوفے پر چڑھی ہوئی نیتو عرف کرشمہ کپور کو پتا نہیں کیا ہوا، اس نے بدحواسی میں چھلانگ لگائی اور عمران کو پھلانگ کر دروازے کی طرف جانا چاہا۔ سلطان کی چلائی ہوئی گولی نیتو کی برہنہ ٹانگ میں لگی اور وہ چلا کر دھڑام سے شیشے کی تپائی پر گری۔ عمران کے لیے اتنا وقت کافی تھا۔ اس نے اپنے جسم کی پیشہ ورانہ لچک کا بھرپور استعمال کیا۔۔۔ بڑی تیزی سے خود کو قالین پر رول کیا۔ سلطان کے پاؤں سے ٹکرایا اور اسے اوندھے منہ گرا دیا۔ سلطان نے گرتے ہوئے جو دوسرا فائر کیا، وہ نہ جانے کس طرف گیا۔ ایل سی ڈی پر چلتی ہوئی فلم میں ایک بار پھر زوردار تالیاں گونجیں اور نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ یہ ایک اچھا اتفاق تھا۔

بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ مزید مسلح لوگ آرہے تھے۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ گن مین کے ہاتھوں سے جو رائفل نکلی تھی، وہ باہر جا گری تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عمران ایک بدلا ہوا شخص نظر آیا۔ ایک لرزا دینے والی سفاکی نے اس کے چہرے کو ہی نہیں، پورے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پتلے دستے والا چاقو اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا پھل سلطان چیتے کی شہ رگ پر دھرا تھا۔ عمران کے ہاتھوں میں سلطان چیتا یکسر بے بس نظر آیا۔ سلطان کا پسٹل بھی اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ ''خبردار!'' عمران کے لہجے میں درندگی تھی۔ ''کوئی آگے آیا تو یہ مارا جائے گا۔''

لپک کر آنے والے مسلح افراد جہاں کے تہاں رک گئے۔ ان میں نادر ٹی ٹی بھی تھا۔ عمران نے سلطان کو عقب سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا ایک کونے میں لے گیا۔ اس نے چاقو کا پھل اتنی سختی سے سلطان کی گردن پر رکھا ہوا تھا کہ وہاں کٹ لگ چکا تھا اور خون رسنا شروع ہوگیا تھا۔ تھوڑا سا دباؤ بھی بڑھتا تو یقیناً سلطان کی اہم رگیں کٹنا شروع ہوجاتیں۔ عمران عجیب انداز میں پھنکارا۔ ''دیکھو سلطانے! یہاں ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا لیکن تو اسے دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔ تیری زندگی کی ڈور بس کٹی کہ کٹی۔ اپنے ان پالتو کتوں سے کہہ، ہتھیار پھینک دیں اور چار چار قدم پیچھے ہٹ جائیں۔''

سلطان کو اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ ایک ''جنونی گرفت'' میں ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہوجائے گا۔ اس کی پیشانی پر پسینا نمودار ہوچکا تھا۔ اس کی نیتو عرف کرشمہ کپور قالین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ سلطان نے نادر ٹی ٹی کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ نادر نے رائفل قالین پر پھینک دی۔ اس کے دوساتھی گارڈز نے بھی تقلید کی اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ نادر کی حالت زخم کھائے ہوئے سانپ جیسی تھی۔ وہ دو تین قدم سے زیادہ پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ شاید اس کی نیت میں ابھی فتور تھا۔ عمران دہاڑا۔ ''اور پیچھے ہٹ۔ نہیں تو تیرا یہ باپ جارہا ہے۔'' اس نے سلطان کی گردن پر تیز دھار چاقو کا دباؤ کچھ اور بڑھایا۔ سلطان تلملایا۔ خون تیزی سے رسنے لگا۔ عمران کے تیور دہلا دینے والے تھے، چاقو کی کارکردگی بھی بے مثال تھی۔ نادر مزید پیچھے ہٹ گیا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا کہ میں نادر والی رائفل اٹھالوں۔

میں نے رائفل اٹھائی۔۔۔ اور باقی دو رائفلوں کو پاؤں سے دھکیل کر صوفے کے نیچے پہنچا دیا۔ رائفل کو چیک کرتا ہوا میں الٹے قدموں دروازے کی طرف گیا اور اسے اندر سے لاک کردیا۔

دروازہ بند ہوجانے کے باوجود ایرانی بلی کی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچتی رہی۔ شاید اس نے عمران کی خوشبو پالی تھی اور اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔۔۔

شاید اس نے عمران کی خوشبو سونگھ لی تھی اور اب اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ عمران نے سلطان کی جیب سے ایک اور پستول برآمد کرلیا تھا اور اب یہ پستول اس کی کنپٹی پر تھا۔ اپنا اسپیشل ڈیزائن کا چاقو اس نے بند کرکے پتلون کی سائڈ پاکٹ میں رکھ لیا تھا۔

کمرے میں گمبھیر سناٹا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ راہداریوں کے ساؤنڈ پروف دروازوں کی وجہ سے یہاں ہونے والے دو فائروں کی آواز باہر تک نہیں گئی۔ جن تین لوگوں تک یہ آواز پہنچی تھی، وہ یہاں آن موجود ہوئے تھے۔

عمران آتشیں لہجے میں بولا۔ ”سلطانے! لگتا ہے کہ جانوروں سے تجھے بھی تھوڑا بہت لگاؤ ہے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ شاید چاروں بلیاں، جنگلی کتوں نے پھاڑ ڈالیں۔ لیکن تو نے بڑی نیکی کی۔ ایک دو کو شاید بچا لیا۔ کتنی بچی ہیں... ایک یا دو؟“

سلطان بالکل خاموش رہا... پتھر کی سا کت ۔

اچانک ایک شخص نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ مجھ پر آنا چاہ رہا تھا۔ عمران نے گولی چلائی اور عین اس کی پیشانی میں سوراخ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عمران کا پستول دوبارہ سلطان کی کنپٹی پر آگیا۔ یہ سارا عمل شاید ایک سیکنڈ کے اندر

مکمل ہوا تھا۔ بدنصیب شخص پیٹ سے اوندھی پڑی نیتو عرف کرشمہ کپور کے اوپر گرا اور تب ہمیں علم ہوا کہ وہ نازک بدن تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکی ہے۔ عمران کی پھرتی اور نشانے کی سچائی نے باقی تینوں افراد کو مبہوت کر دیا تھا۔

عمران زہریلے انداز میں مسکرایا اور ”ایڈورٹائزمنٹ“ کے انداز میں بولا۔ ”استاد سرکس... لاجواب کھلاڑی... بے مثال کمالات... اور تمہارے لیے آخری وارننگ ٹی ٹی! کوئی حماقت نہ کرنا۔“

نادر ٹی ٹی جیسے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے سانولے رنگ میں ہلدی گھل گئی تھی۔ اس کے ساتھی کا حال بھی یہی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں نے موت کے فرشتے کو مجسم حالت میں اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔

”اپنی چینٹ نیچے کرو۔“ عمران نے سفاک لہجے میں نادر ٹی ٹی کو حکم دیا۔

وہ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہا۔ ہاں، اس کے رنگ میں ہلدی کی آمیزش کچھ اور بڑھ گئی۔ عمران نے مجھے اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا۔ ”جناب سلطان صاحب کے کھوپڑے پر رائفل کی نال رکھو اور چوں چراں کریں تو ایک سیکنڈ میں ان کا بھیجا فرائی کر دو... بلکہ ایک سیکنڈ بھی نہیں لگنا چاہیے۔ میں ذرا نادر جی کی خبر لے لوں۔“

میں نے عمران کی ہدایت پر عمل کیا اور ٹریل ٹو رائفل کی نال سلطان چٹا کے سر سے لگا کر چوکس کھڑا ہو گیا۔ انگلی ٹریگر پر تھی۔

عمران، نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”نادر جی! ذرا چینٹ اتار کر کچھ دکھایئے ہمیں۔ اب تو کرشمہ کپور صاحبہ بھی سو رہی ہیں۔ اب کون سی پردہ داری ہے؟“

نادر کا چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ سب کچھ بھول کر عمران پر جھپٹ پڑے گا، کبھی سکتہ زدہ نظر آنے لگتا۔ جب عمران نے دیکھا کہ نادر اپنے ہاتھ پتلون کی بیلٹ کی طرف نہیں بڑھا رہا تو اس نے پستول کا رخ نادر کی ٹانگ کی طرف کر کے بے دریغ گولی چلائی۔ دھماکے کے ساتھ ہی نادر لڑکھڑایا اور اپنی پنڈلی پکڑ کر جھک گیا۔ اس کی کریم پتلون دیکھتے ہی دیکھتے سرخ ہونا شروع ہو گئی۔

عمران کی سفاک آواز پھر کمرے میں گونجی۔ ”نادر جی! میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ اپنی پتلون اتاریئے۔ آپ کے یہ خادم کچھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ چلیے، جلدی کیجیے۔“

نادر ٹی ٹی مسلسل، کھا جانے والی نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا لمبوترا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ عمران نے دوسری بار گولی چلائی اور یہ اس کی دوسری ٹانگ میں گھٹنے سے تین چار انچ اوپر لگی۔ اس بار وہ درد سے چلا اٹھا۔ اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

”جناب عالی... آخری بار مؤدبانہ گزارش ہے۔ پتلون اتار دیجیے۔ اس بار آپ کا یہ خادم جو گولی چلائے گا، وہ آپ کے ناریل شریف میں لگے گی۔“ عمران نے پستول کا رخ نادر ٹی ٹی کے سر کی طرف کر دیا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ وہی کرے گا جو کہہ رہا ہے۔ نادر ٹی ٹی نے بھی شاید اس کی آنکھوں میں اپنی موت پڑھ لی تھی۔ اس نے تکلیف سے کراہتے اور بل کھاتے ہوئے اپنے ہاتھ بیلٹ کی طرف بڑھائے اور پتلون انڈرویئر سمیت گھٹنوں تک اتار دی۔ عمران کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ جو وہ دیکھنا چاہتا تھا، اس نے دیکھ لیا تھا۔ نادرے کی ناف سے ذرا اوپر پیٹ کی بائیں طرف دو کھرنڈ سے تھے۔ ایک بڑا تھا، دوسرا قدرے چھوٹا تھا۔ یہ دراصل کھرونچوں کے پانچ چھ دن پرانے نشان تھے۔ عمران نے ذرا قریب جا کر مزید دھیان سے ان کھرونچوں کو دیکھا۔

اب اس بات میں شبہے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ دراز قد ڈھاٹا پوش نادرے کے سوا اور کوئی نہیں تھا جس نے بدھ کی رات فارم ہاؤس میں خون خرابا کیا۔ رخشی کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا اور اسے زندگی موت کے درمیان لٹکا دیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ سلطان چٹا براہ راست اس واردات میں شریک نہیں تھا مگر سب کچھ ہوا اسی کی پلاننگ اور آشیرباد سے تھا۔ عمران کے اشارے پر نادرے نے اپنی پتلون اوپر چڑھا لی۔

عمران اب نفسیاتی طور پر کمرے میں موجود تینوں افراد پر حاوی ہو چکا تھا۔ وہ تینوں اس کے سامنے ساکت و جامد موجود تھے۔ فقط سلطان چٹا میں تھوڑا بہت دم خم نظر آتا تھا مگر ٹریل ٹو رائفل کی نال اس کی کھوپڑی سے لگی ہوئی تھی۔ نادر کو دو گولیاں لگ چکی تھیں اور خون اس کی دونوں ٹانگوں سے بہہ رہا تھا۔ قالین پر گل کاریاں کر رہا تھا۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ ”ذرا ہوشیار رہنا جگر! میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔“

میں نے سر ہلا کر عمران کو تسلی دی۔ وہ ساگوان کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آگیا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا۔ عمران کی گود میں وہی شاندار ایرانی بلی تھی جس کی آواز پر ہم رکے تھے اور یہ سارا نقشہ تبدیل ہوا تھا۔ یہ نایاب حاملہ بلی عمران کی گود میں آکر ایک دم شانت تھی، اس کے سینے سے اپنا سر رگڑ رہی تھی۔ اس کی ناکی سے کھیل رہی تھی۔

عمران نے زہرناک نظروں سے نادر کو دیکھا۔۔۔اور بولا۔ ”نادر صاحب! اسی لیے مشہور باکسر محمد علی کلے نے اپنی سرائیکی شاعری میں کہا ہے، جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا۔ ایسی خوب صورت سرائیکی میں نے کہیں نہیں پڑھی اور تم نے تو بالکل بھی نہیں پڑھی ہو گی ورنہ تم واردات کی رات یہ بلی اٹھانے کی غلطی نہ کرتے۔ اب تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے نادر صاحب! تم نے اس رات ہر وہ کام کیا ہے جو تمہیں سزائے موت دینے کے لیے کافی ہے۔ تو کیوں نا اس سلسلے میں جناب کی تھوڑی سی مدد کی جائے۔ کتنا لمبا سفر کرنا پڑے گا جناب کو! تھانہ، عدالت، جیل، وکیل، وکیل کی فیسیں، اپیلیں، دلیلیں۔۔۔اور پتا نہیں کیا کچھ؟ تو کیوں نا آپ کو شارٹ کٹ لگوا دیا جائے۔ آپ کے رتبے اور مرتبے کے لحاظ سے بھی آپ کو یہ آسانی ملنی چاہیے۔“

نادر کا رنگ یکسر ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ عمران کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے سلطان کی طرف دیکھا، جیسے بے زبان خاموشی اسے مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ لیکن سلطان کیا کرتا؟ وہ تو خود موت کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔۔۔وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اچانک نادرے کا پندار ٹوٹ گیا۔ اس کی ساری اکڑفوں دیکھتے ہی دیکھتے ایک دہشت زدہ عاجزی میں ڈھل گئی۔ موت کو سامنے دیکھ کر بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ اس کہاوت کی حقیقت میں آج پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ نادر گھگیایا۔ ”دیکھو۔۔۔مم۔۔۔میں بڑے کام کا بندہ ہوں۔ مجھے ایسے ضائع مت کرو۔ جو کچھ کر رہا ہوں روزی روٹی کے لیے کر رہا ہوں۔ میں۔۔۔تمہارے لیے کام کرنے کو تیار ہوں۔ وقت پڑنے پر جان دے سکتا ہوں۔“

”تو وقت پڑ گیا ہے نا جناب نادر صاحب! مجھے آپ کی روح قبض کروانی ہے۔“ عمران نے انگلی کا دباؤ پھر ٹریگر پر بڑھا دیا۔ نالی کا رخ نادرے کے سر کی طرف تھا۔ بہرحال، اس نے گولی چلائی نہیں۔ نادرا تڑپ کر اوندھے منہ عمران کے پاؤں میں گر گیا۔ ”میرا کوئی قصور نہیں۔ مم۔۔۔میں نے بس سلطان کا حکم مانا۔ یہ سامنے کھڑا ہے۔ پوچھ لو اس سے۔ بس یہی میری غلطی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لیے معاف کر دو۔“

عمران پھنکارا۔ ”تم نے سلطان کا حکم مانا لیکن اس ڈیوٹی میں سارا مزہ تو تمہیں ہی آیا نا۔ رات بھر تم نے فارم ہاؤس میں مفت کی شراب پی۔ لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے رہے۔ بے وجہ قیمتی چیزیں برباد کر کے اپنے اندر کے جانور کو تسکین دیتے رہے، یہ سب کچھ تم نے کیا یا نہیں؟“

”مم۔۔۔میں اپنا یہ قصور مانتا ہوں۔ میں نے یہ سب کیا۔ میں نے زیادہ شراب پی لی تھی۔۔۔میں اندھا ہو گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں سچے دل سے معافی مانگ رہا ہوں۔ تم جو کہو گے، میں وہ کروں گا۔ بس مجھے ایک موقع دے دو۔ خدا کے لیے۔۔۔میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

عمران پھنکارا۔ ”اس طرح کی منت سماجت اس ملازمہ نے بھی کی ہو گی جسے تم نے زخم زخم کر کے زندگی موت کے درمیان لٹکا دیا ہے۔۔۔اور شاید اعجاز نے بھی کی ہو جس کے نئے نئے دولہا بنے بھائی کو تم نے دو بار سیڑھیوں سے گرا کر موت کے گھاٹ اتارا۔“

عمران نے ٹریگر پر دباؤ اور بڑھایا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اب گولی کسی بھی وقت چل سکتی ہے۔ پستول کا رخ نادرے کے عین سر کی طرف تھا اور عمران کے نشانے کی سچائی تھوڑی دیر پہلے نادرا اور سلطان دیکھ ہی چکے تھے۔

سلطان ہمت کر کے بولا۔ ”دیکھ ہیرو! اتنا ہی بوجھ اٹھا جتنا جھیل سکے۔ اگر تم نے۔۔۔“

”چپ۔“ عمران دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گولی چلائی جو سلطان کے کان کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے کان پر رکھ لیا۔ خون کی ایک دھار اس کی انگلیوں کی درز سے نکل کر ہاتھ کی پشت پر بہنے لگی۔ اس کا چہرہ تکلیف اور زلزلے کی آماجگاہ بن گیا۔ عمران نے اسی لہجے میں کہا۔ ”اگر بکواس کرو گے تو دوسرے کان میں بھی جھمکا ڈالنے کی جگہ بنا دوں گا۔“

کمرے میں موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ نادرے کی موت اب یقینی ہے۔ نادرا آخری کوشش کے طور پر بولا۔ ”میں تمہیں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔ تمہارے کام کی باتیں۔۔۔بہت زیادہ کام کی باتیں۔“ اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

عمران نے کہا۔ ”تم کیا بتاؤ گے۔ تم دونوں تو خود اندھے کتے ہو اور ہرن کا شکار کر رہے ہو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے گولی چلائی۔ یہ گولی نادرے کی دائیں آنکھ اور ناک کے بانسے کے درمیان لگی، وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور پھر کروٹ کے بل گر کر ساکت ہو گیا۔ ایل سی ڈی پر چلنے والی فلم میں ایک بار پھر تالیوں کی گونج تھی۔

سلطان چنا جیسے گنگ ہو چکا تھا۔ بس متوحش نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا خون آلود ہاتھ بدستور اپنے زخمی کان پر تھا۔ قطرہ قطرہ خون اس کی بالوں بھری کلائی پر رینگ رہا تھا۔ اب کمرے میں ہمارے علاوہ بس دو افراد موجود تھے۔۔۔اور ان میں سے بھی ایک زخمی تھا۔ یعنی سلطان چنا۔ اس کا ساتھی صنم بیگم کی تصویر بنا دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اپنے بڑوں کا حال دیکھنے کے بعد اس کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ عمران کے ایک اشارے پر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ سامنے ہی ایک شوکیس کے بالائی خانے میں ایک ویڈیو کیمرا نظر آ رہا تھا۔ اس پر ایک بڑا سا لینس چڑھا ہوا تھا۔ سائز کے اعتبار سے بھی یہ کیمرا پروفیشنل ٹائپ نظر آتا تھا۔ عمران نے سلطان چنے کے ساتھی کو حکم دیا کہ وہ شوکیس پر سے کیمرا اتارے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ عمران نے کیمرے کی چارجنگ وغیرہ چیک کی۔ وہ ورکنگ پوزیشن میں تھا۔

”کیا کرنا ہے؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔

”یار دیکھو! اتنا زبردست رومانی سین ہو رہا ہے بلکہ ”رومانی“ بھی چھوٹا لفظ ہے۔ دیکھو تو سہی۔“ عمران نے بے ہوش پڑی کرشمہ کپور کی طرف اشارہ کیا۔ عمران کی پہلی گولی سے ہلاک ہونے والا مشٹنڈا اوندھے منہ نیتو عرف کرشمہ کپور کے اوپر ہی گرا تھا اور قدرتی طور پر یہ ایک عجیب سا اسٹائل بن گیا تھا۔ کوئی دور سے دیکھتا تو اسے یہی لگتا کہ جذبات سے مغلوب ایک جوڑا یہاں قالین پر ہی اپنی ’حسرتیں نکالنے‘ کا ارادہ رکھتا ہے۔

عمران نے میرے ہاتھ سے گن لے کر مجھے کیمرا تھما دیا اور بولا۔ ”چلو جگر! تم ریکارڈنگ شروع کر دو اور اوپننگ سین اسی کرشمہ کپور کا رکھو۔ چلو شاباش۔“

”لیکن۔۔۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اسی سے دنیا و آخرت میں بھلا ہو گا۔“

میں سمجھ گیا کہ اس ریکارڈنگ سے عمران کا کوئی خاص مقصد ہے۔ میں نے ریکارڈنگ شروع کر دی۔ بے سدھ پڑی نیتو عرف کرشمہ کا ایک شاٹ لیا پھر کیمرے کو پین کر کے سلطان چنا کو فوکس کیا۔ اس کی کنپٹی پر رائفل کی نال تھی اور عمران کی انگشت شہادت ٹریگر پر تھی۔ سلطان کے تاثرات کو ریکارڈ کرنے کے بعد میں کیمرے کو نادرے کی خونچکاں لاش پر لے آیا۔ وہ کروٹ کے بل پڑا تھا۔ چہرے کے علاوہ اس کی دونوں ٹانگوں سے بھی مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس کے صحت مند جسم میں خون کی خاصی فراوانی تھی۔ شاید یہ فراوانی اور حرارت ہی نادرے جیسے بدمعاشوں کو درندہ صفت بناتی ہے۔ وہ کرتا یا آتش بنتے ہیں۔ لوگوں کو جلاتے ہیں اور پھر دو چار سالوں میں خود بھی بھسم ہو جاتے ہیں۔

ایرانی بلی عمران کی ٹانگوں میں لوٹ رہی تھی۔ کبھی اس کے پاؤں سے سر رگڑنے لگتی، کبھی ایک دم رخ پھیر کر نادرے اور اس کے ساتھی کی لاشوں کو دیکھنے لگتی۔۔۔اور یوں محسوس ہوتا کہ یہ مناظر اسے حیران کر رہے ہوں۔

عمران نے بڑی تسلی سے سلطان چنے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اب تم بتاؤ سلطانے! تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟ میرے پاس کافی ورائٹی ہے اس حوالے سے۔“

”مجھے مار کر تم اچھا نہیں کرو گے۔“ سلطان چنے نے پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل کہا۔

”لیکن اگر تم کو چھوڑ دوں گا تو تم اچھا نہیں کرو گے۔ اس نادرے کا خون چہرے پر ملو گے اور مجھے مارنے کی قسم کھا لو گے۔“

”مم۔۔۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“ اس نے آخری الفاظ زور دے کر کہے۔

”تم سامنے نہیں آؤ گے تو تمہارا وہ باپ جاوا آئے گا۔ تم اس کی بات نہیں مانو گے تو لوگ تمہیں جاوے کی حرامی اولاد کہیں گے۔ کیا تم حرامی کہلوانا پسند کرو گے؟ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی لگے ہاتھوں مجھ سے اپنا قصہ پاک کروا ہی لو۔ یہاں بڑا لمبا چوڑا ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ تم بڑی مصیبتوں سے بچ جاؤ گے۔ بڑا افائیو اسٹار مشورہ دے رہا ہوں تمہیں۔“

سلطانے کی صورت دیکھ کر لگتا تھا کہ یا تو وہ خودکشی کر لے گا، یعنی نتائج سے بے پروا ہو کر عمران سے بھڑ جائے گا یا پھر اسے کوئی ہارٹ اٹیک قسم کی چیز ہو جائے گی۔

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا سلطانے! تمہیں ایک موقع دیتے ہیں۔۔۔امید ہے کہ تم خیر سگالی کے اس جذبے کی قدر کرو گے اور اپنے والد جاوے کو بھی ایسا کرنے کے لیے کہو گے۔ جب تک میں فارم ہاؤس میں ہوں، جاوے نے یا اس کے کسی کتے نے جلالی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو سمجھو جنگ چھڑ گئی۔ امید ہے کہ جاوا میرے بارے میں تھوڑا بہت تو جانتا ہو گا۔ مزید تفصیل اسے تم بھی بتا سکتے ہو۔ تمہارے ساتھ تو خاکسار کی دو چار ملاقاتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔“

سلطانے نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں جمی ہوئی موت کی زردی میں زندگی کی چمک نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی لیکن اسے اب بھی پورا یقین نہیں تھا کہ وہ موت کے اس ناگہانی گھیرے سے نکل گیا ہے۔

عمران نے کہا۔ ”میں اپنے الفاظ پھر دہرا رہا ہوں۔ جلالی کی طرف آؤ گے تو پہلے مجھ سے سامنا ہوگا... اور یہ سامنا معمولی نہیں ہوگا۔“ سلطان نے پھر مشینی انداز میں سر کو اثباتی حرکت دی۔ اس کی قمیص کا ایک کندھا خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

عمران نے ٹریل ٹو رائفل کی مہلک نال بدستور سلطان چیتے کی کھوپڑی سے لگا رکھی تھی۔ یہ بڑا ڈرامائی سا سین تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی لمحے کچھ بھی ہو جائے گا۔

عمران نے میری طرف دیکھا۔ ”چلو تگڑا! اب چلیں۔“

”لیکن کیسے؟ سلطان صاحب کے گرگے ہمیں نکلنے دیں گے؟“

”نہ نکلنے دیں گے تو سلطان جی کا بھیجا بھی نادر صاحب کی طرح فرائی ہو جائے گا۔“

”لیکن اس کو گن پوائنٹ پر کہاں تک لے جائیں گے؟“

”اپنی گاڑی تک۔ جب گاڑی پر بیٹھ کر ڈیڑھ دو سو فرلانگ آگے نکل جائیں گے اور یقین ہو جائے گا کہ کوئی کتی بلا ہمارے پیچھے نہیں آ رہا تو سلطان جی کی تشریف پر لات مار کر... نہیں... نہیں... یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ سلطان جی کو عزت کے ساتھ گاڑی سے اتار دیں گے اور خود شیخوپورہ پہنچ جائیں گے۔“

”شاید تم بھول رہے ہو۔ ہم گاڑی پر نہیں، موٹر رکشا پر تشریف لائے تھے۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا دماغ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔“ عمران نے مایوسی سے سر ہلایا۔ پھر سلطان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“

”پارکنگ میں پہلے فلور پر۔ ستون نمبر 18 کے پاس۔ کالے رنگ کی ٹویوٹا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، چلو... یہ گاڑی تمہارا ڈرائیور شیخوپورہ سے واپس لے آئے گا۔“

میں نے کہا۔ ”یار! کیا کر رہے ہو؟ پارکنگ لاٹ میں لوگ ہوں گے۔ دو چار پولیس والے بھی وہاں ٹہل رہے تھے۔ چوکیدار بھی ہیں۔ وہ اس کو گن پوائنٹ پر دیکھیں گے تو شور مچ جائے گا۔ اس کا چہرہ بھی لہولہان ہو رہا ہے۔“

”یار! تم دیکھنا سارے نابینا ہو جائیں گے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔“

”تم ضرورت سے زیادہ بے پروائی تو نہیں کر رہے؟“

”تم ضرورت سے زیادہ نا سمجھی دکھا رہے ہو۔ ذرا غور کرو یار! تمہارے ہاتھ میں اتنا بڑا ویڈیو کیمرا ہے۔ تم باقاعدہ ریکارڈنگ کر رہے ہو۔ شکل و صورت سے بھی تم کسی پرائیویٹ پروڈکشن کمپنی کے ناکام ڈراما ڈائریکٹر ہی نظر آتے ہو۔ آج کل لوگ ایسی ریکارڈنگز کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔“

”یعنی تم...“

”ہاں، یعنی یہی کچھ... تم بس کیمرا آن رکھنا۔ باقی سب میرا کام ہے۔“

دو منٹ بعد ہم بڑی شان کے ساتھ سلطان چیتا کے اس خفیہ اڈے سے باہر نکل رہے تھے۔ ہم کم از کم دو ساؤنڈ پروف سلائڈنگ ڈورز میں سے گزرے۔ یہاں چوکس مسلح محافظ موجود تھے مگر اپنے باس کے سر پر رائفل کی نال دیکھ کر اور اس کا اڑا ہوا رنگ اور رنگا ہوا کان دیکھ کر سب دم بخود رہ گئے۔ مزید احتیاط کے طور پر سلطان نے انہیں زبانی بھی کہہ دیا کہ وہ کسی طرح کی مہم جوئی نہ کریں۔ میں کیمرے کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ سلطان چیتا کے قدم کانپ رہے تھے اور اس کی گردن پر تیز دھار چاقو نے جو کٹ لگایا تھا، وہ بھی مسلسل خون افشانی کر رہا تھا۔

یہ بظاہر بے آباد کوٹھی اندر سے آباد تھی۔ یہاں ہر وہ انتظام کر دیا گیا تھا جس سے یہ بے آباد ہی نظر آتی۔ کچھ کھڑکیوں کے شیشوں پر گہرا سیاہ روغن پھیر دیا گیا تھا اور کچھ کھڑکیاں ویسے ہی بند کر دی گئی تھیں۔ مقصد یہی تھا کہ رات کے وقت یہاں ہونے والی روشنی سڑک پر سے نظر نہ آ سکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آخری دروازے میں سے نکلے اور انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں پہنچ گئے۔ ایرانی بلی عمران نے سلطان چیتے کو تھما دی تھی۔ وہ اس بلی کے ساتھ کسی انگریزی فلم کا زخمی ولن ہی نظر آ رہا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اب چہل پہل کافی بڑھ چکی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم آٹھ دس قدم آگے گئے تھے کہ لوگوں کی نگاہ ہم پر پڑنی شروع ہو گئی۔ دیکھنے والوں کو سب سے پہلے سلطان کے خونچکاں چہرے نے ہی متوجہ کیا ہوگا۔ پھر عمران کی رائفل پر نظر پڑی ہوگی۔ لوگ متحیر نظر آئے۔ عورتوں اور بچوں کے چہروں پر ہراس نمایاں تھا۔ پھر انہوں نے مجھے اور میرے کیمرے کو دیکھا۔ وہ متذبذب نظر آئے۔ ان میں سے زیادہ تر جلد ہی خود کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہے کہ یہ کسی ڈرامے وغیرہ کی ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ چند پولیس والے صرف دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑے تھے۔ انہوں نے

بھی بس دیکھنے... چونکنے... اور مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اس دن مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہم لوگ اپنے اردگرد کے حالات سے کتنے لاتعلق ہو رہے ہیں۔ بعض اوقات ہماری آنکھوں کے سامنے سنگین وارداتیں ہو جاتی ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں چلتا... یا پتا چلتا ہے تو ہم کوئی مناسب ردعمل ظاہر نہیں کر پاتے۔ عمران نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ سو فیصد درست تھا۔ لوگوں نے بس دور دور سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ پولیس والے بھی جوں کے توں کھڑے رہے۔ صرف ایک کیمرے نے واقعی ہر شخص کی نظر بندی کر دی تھی۔

سلطان کے ڈرائیور نے ٹویوٹا کار کا دروازہ کھولا۔ عمران اور سلطان پیچھے بیٹھ گئے۔ عمران نے رائفل بدستور سلطان کے سر سے لگا رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خطرناک ترین جگہ پر ہے۔ یہاں ہمارے اردگرد درجنوں قاتل موجود تھے۔ وہ ذرا سا موقع ملنے پر مجھے اور عمران کو چھلنی کر سکتے تھے۔ میں کیمرے سمیت اگلی نشست پر آ گیا۔ کیمرے کا رخ بدستور عمران اور سلطان چیتے کی طرف ہی تھا۔ سلطان کے ڈرائیور کی تلاشی ہم روانہ ہونے سے پہلے ہی لے چکے تھے۔ اب اس کے پاس گاڑی کی چابی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم روانہ ہو گئے۔ یہ رات کے کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا۔

”کیا میں سمجھوں کہ تم مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟“ سلطان نے پوچھا۔

”نہیں، ہم تمہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں مگر یہ رہائی مشروط ہے۔ میں نے تمہیں کوٹھی پر ہی بتا دیا تھا۔ اگر تیرے پالتو کتوں نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کی تو پھر ہمیں اپنا ارادہ بدلنا پڑے گا۔“

”میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ کوئی پیچھے نہیں آئے گا۔“ سلطان نے اپنا زخمی کان دباتے دباتے کہا۔

”لیکن تسلی تو ضروری ہے نا جناب عالی! ایک پچھلی ملاقات میں تم نے خود ہی تو ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارے پیشے میں اعتبار کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح عام لوگوں کے لیے شراب اور پرائی عورت۔“

سلطان چیتا دانت پیسنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکا۔ آج کا دن اس دبنگ شخص پر قیامت بن کر ٹوٹا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا پہلے جب وہ اپنے کمرے میں نیتو عرف کرشمہ کپور سے اپنے گورے چٹے جسم کی مالش کروا رہا تھا اور ایک پُرسکون شب گزارنے کی تیاری کر رہا تھا، اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ نہ صرف اپنے دو قیمتی ساتھیوں سے ہاتھ دھونے والا ہے بلکہ ایک داداگیر کی حیثیت سے یادگار رسوائی کا شکار بھی ہونے جا رہا ہے۔

عمران نے عقب پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ میں بھی گاہے بگاہے جائزہ لے رہا تھا۔ ہم مال سے گزر کر لوئر مال روڈ پر آ گئے، وہاں سے ہمارا رخ پہلے داتا دربار اور پھر راوی کے پل کی طرف ہو گیا۔ شیخوپورہ روڈ پر پہنچ کر عمران نے واقعی خیرسگالی کا مظاہرہ کیا۔ سلطان چیتے کو گاڑی سے اتار دیا۔

اب خطرے کی شرح کافی کم ہو چکی تھی۔ سلطان چیتا کسی پی سی او سے فون کر کے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرتا اور انہیں ہمارے پیچھے لگانے کی کوشش کرتا بھی تو اس میں آدھ پون گھنٹا تو لگ ہی جاتا تھا۔ تب تک ہم یقیناً شیخوپورہ اور فارم ہاؤس کے آس پاس پہنچ جاتے۔ بہرحال، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم بحفاظت فارم ہاؤس تک پہنچ گئے۔ حاملہ بلی عمران کی گود میں تھی... اور ویڈیو کیمرا میری گود میں۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے پاس ہی رہیں۔ ہم نے سلطان کے ڈرائیور کو گاڑی سمیت واپس بھیج دیا، یہاں تک کہ ٹریل ٹو رائفل بھی واپس بھیج دی۔

☆☆☆

ہم کوٹھی میں پہنچے تو وہاں ایک طوفان آیا ہوا تھا۔ ملازم سہمے ہوئے تھے۔ ملازم وحید کوریڈور میں بیٹھا رو رہا تھا۔ اسے جلالی صاحب کا تھپڑ سہنا پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی طرح جلالی صاحب کو ایرانی بلیوں کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ وہ جان گئے ہیں کہ اس سلسلے میں ان سے سفید جھوٹ بولا گیا ہے۔ بدھ کی رات کوٹھی میں جہاں اور بہت سے سنگین واقعات ہوئے ہیں، وہاں لاکھوں روپے مالیت کی ایرانی بلیاں بھی جنگلی کتوں نے پھاڑ کھائی ہیں۔ ڈاکٹر مہناز نے ہراساں لہجے میں کہا۔ ”بہت برا ہوا ہے۔ جلالی صاحب کا بلڈ پریشر ڈھائی سو سے اوپر چلا گیا تھا۔ ہارٹ بیٹ بھی دوگنا سے بڑھ گئی تھی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ آج کچھ ہو جائے گا۔ اور سچ بات یہ ہے کہ ابھی خطرہ ٹلا نہیں۔ میں نے انہیں سکون کا انجکشن دیا ہے اور بلڈ پریشر کنٹرول کرنے والا کیپسول منہ میں نچوڑا ہے۔ کچھ دیر کے لیے غنودگی میں چلے گئے ہیں لیکن دل کی تکلیف کے سبب انہیں زیادہ غنودگی بھی نقصان دے سکتی ہے۔“

کمرے میں میرے اور عمران کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ عمران نے کہا۔ ”لیکن انہیں پتا کیسے چلا ڈاکٹر... بلیوں کے بارے میں آپ کے اور ندیم کے سوا کسی کو خبر ہی نہیں تھی؟“

"میں نے تو کسی کو کچھ نہیں بتایا... اور مجھے یقین ہے کہ ندیم بھی ایسی حماقت نہیں کرسکتا۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے فتح محمد کسی کام سے اوپر گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دوسری منزل کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے۔ وہ اندر چلا گیا۔ وہاں تین پنجرے ہیں۔ تینوں خالی تھے۔ فتح محمد نے آکر جلالی صاحب کو بتا دیا۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا پھر جب یقین آیا تو قیامت آگئی۔ وہ اتنا گرجے برسے ہیں کہ کچھ نہ پوچھیں۔ خاص طور سے... عمران صاحب آپ پر انہیں بہت غصہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ آپ نے یا تابش صاحب نے بلیاں کہیں غائب کردی ہیں یا اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ وہ آپ کے پیچھے بندے دوڑانے لگے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ کام زیادہ بگڑ گیا ہے تو میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا..."

"آپ نے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو کہنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ بدھ کی رات جہاں اور بہت کچھ ہوا ہے، وہاں ان بلیوں کی بھی موت ہوگئی ہے۔ یہاں گھسنے والوں نے جنگلی کتوں کے غول کو بلیوں والے پنجرے میں گھسا دیا تھا۔ انہوں نے انہیں مار کھایا۔ پنجرے میں بس بلیوں کے بچے کھچے حصے ہی ملے۔ عمران نے اور ہم نے اس خوف سے کہ آپ کو صدمہ ہوگا، یہ خبر آپ سے چھپالی۔"

عمران سوچ میں پڑ گیا۔ "لیکن ڈاکٹر صاحب! دوسری منزل کا دروازہ کھولا کس نے؟ میں نے وہاں تالا لگایا تھا۔ وہ تالا کس نے کھولا اور فتح محمد کو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس نے کھلا ہوا تالا دیکھا ہے؟"

ڈاکٹر مہناز نے ایک ملازم سے کہا کہ وہ فتح محمد کو بلا کر لائے۔ کچھ دیر بعد فتح محمد آگیا۔ یہ شخص پہلے دن سے مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ ایک دم خاموش اور گہرا شخص تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی بولا۔ "آپ لوگوں کو مجھ پر غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہی کچھ نہیں تھا۔ مجھے تو بس یہ بتایا گیا تھا کہ ایرانی بلیاں دوسری منزل کے پنجرے میں ہیں۔ میں باربے طفیل کے حقے کے لیے سوکھی لکڑیاں لینے اوپر گیا تھا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر پنجروں کی طرف چلا گیا۔ تینوں پنجرے خالی پڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر صاحب جی کو بتا دیا۔"

"دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ وہ تالا تمہیں نظر نہیں آیا؟" عمران نے پوچھا۔

"نہیں، تالا دروازے میں تو نہیں تھا۔ آس پاس بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اگر اس کی چابی صرف آپ کے پاس ہے تو پھر ظاہر ہے کہ اسے کسی نے توڑ کر علیحدہ کر دیا ہوگا۔"

ہم نے دو چار سوال فتح محمد سے مزید پوچھے۔ اس نے جیسے سارے جواب پہلے سے تیار کر رکھے تھے۔

جلالی صاحب ابھی تو سوئے ہوئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ یہ طوفان بہت دیر تک سویا نہیں رہے گا۔ وہ جلد ہی جاگ جائیں گے اور ایک بار پھر بلیوں کے حوالے سے زبردست واویلا مچے گا۔ اس واویلے کے کئی نتیجے نکل سکتے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ "حضرت" کی حالت نازک ہو جاتی اور وہ اسپتال پہنچ جاتے۔ ذرا تنہائی ملی تو میں نے عمران سے پوچھا۔ "للی کہاں ہے؟"

"میرے کمرے میں؟"

"کیا یہ اکیلی للی جلالی صاحب کے غصے اور صدمے کو کم کرسکے گی؟" میں نے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔"

"لیکن یہ بچ کیسے گئی؟ ہمارا تو خیال تھا کہ چاروں کا صفایا ہوگیا ہے۔"

"یارا تمہیں محمد علی کلے کا سرائیکی شعر نہیں سنایا تھا جو چپ رہے گی زبانِ خنجر... یہی بات مشہور فلم ڈائریکٹر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اپنی ایک پشتو فلم میں ایک کردار سے کچھ اور طرح سے کہلوائی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قاتل اور چیچک کا دانہ اپنی نشانی ضرور چھوڑتا ہے۔ اور اگر قاتل کو چیچک بھی ہو تو پھر تو اس کا پکڑا جانا ایک دم یقینی ہے..."

"تمہاری معلومات پر اش اش کرنے کو دل چاہتا ہے۔ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہو تم۔"

"لیکن میں نے کبھی غرور نہیں کیا۔ اکبر اعظم نے اپنے بڑے بھائی سکندر اعظم کو غالباً پانی پت میں شکست دینے کے بعد کہا تھا... جو شاخ جتنی پھل دار ہوتی ہے، اتنی ہی جھکی ہوتی ہے۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سکندر اعظم کافی پہلے پیدا ہوا تھا... کوئی پونے دو ہزار سال پہلے۔"

"اسی بات پر تو لڑائی ہوئی تھی۔ اکبر اعظم کا کہنا تھا کہ پہلے اس نے پیدا ہونا تھا۔ اکبر کا تو مطلب ہی ہوتا ہے "بڑا" یعنی بڑا بھائی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اس کا نام اصغر اعظم ہوتا..." وہ بے تکان بولتا چلا گیا۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ صرف دو تین گھنٹے پہلے ہم نہایت سنگین حالات سے گزرے ہیں... اور ان حالات میں کم از کم دو افراد کا قتل بھی شامل ہے۔ وہ سیلانی روح تھا اور مجھے بھی اپنے ساتھ سیلانی بناتا چلا جارہا تھا۔ دو تین منٹ بعد وہ چڑیا گھر والے پورشن کی طرف چلا گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی کام سے گیا ہے

لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں۔

اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد کوٹھی کے اندرونی حصے سے جلالی صاحب کے گرجنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے کچھ آگے جا کر سنا۔ وہ اپنے ملازم وحید کو پھر سے بُری طرح لتاڑ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ واردات کی رات وحید اور اس کا ایک ساتھی ZOO کی نگہبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وحید پر جلالی صاحب کا غصہ بے وجہ تھا۔ واردات کے وقت جہاں پوری کوٹھی کے گارڈ بے بس ہو گئے تھے، وہاں وحید اکیلا کیا کرتا۔ حملہ آوروں نے رات بھر وہی کیا تھا جو ان کا دل چاہا تھا۔

آوازوں سے اندر کی صورتِ حال واضح ہو رہی تھی۔ جلالی صاحب گرج رہے تھے۔ گاہے بگاہے ڈاکٹر مہناز کی نرم ملائم آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ وہ جلالی صاحب کو نارمل رکھنے کی عاجزانہ کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جلالی صاحب کے غیظ و غضب کا رخ وحید سے جاوا وغیرہ کی طرف مڑ گیا۔ انہوں نے غائبانہ جاوا اور اس کے ساتھیوں کو بے نقط سنائیں۔ پھر اندازہ ہوا کہ وہ مقامی ایس ایچ او اکرام کے لتے لینے لگے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص مجرموں سے ملا ہوا ہے۔ اسے ہر اونچ نیچ کی خبر ہے۔ وہ دہاڑ رہے تھے۔

"یہ حرام خور... غدار ہے۔ جب تک یہ کتا اس تھانے میں موجود ہے، مجھے انصاف نہیں مل سکتا۔ اس نے میرا بیڑا غرق کیا ہے، میں اس کا بیڑا غرق کر دوں گا۔ میں... اسے ویسے ہی ختم کر دوں گا۔ میں ختم کر دوں گا۔" ان کی آواز غصے کی شدت سے اجنبی محسوس ہونے لگی۔

پھر شاید جلالی صاحب کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ دو تین منٹ بعد ڈاکٹر مہناز ہانپتی ہوئی میرے پاس پہنچی۔ "تابش! بہت گڑبڑ ہے۔ جلالی صاحب رائفل لوڈ کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ایس ایچ او اکرام خان کی طرف جا رہے ہیں... اور ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ بورچی تک بھی جا سکیں۔ وہ ضرور اپنا نقصان کرلیں گے۔ انہیں کسی بھی وقت برین ہیمرج یا ہارٹ اٹیک ہوسکتا ہے۔"

"کیا کیا جائے؟"

"ندیم کو بلاؤ۔ اس کے پاس ایس پی حمزہ صاحب کا فون نمبر ہے۔ شاید وہ جلالی صاحب کو سنبھال سکیں۔"

اس سے پہلے کہ میں ندیم کی تلاش میں بالائی منزل کی طرف جاتا، عمران کمرے میں داخل ہوا۔ مہناز کا متغیر چہرہ دیکھ کر وہ چونکا۔ "خیریت تو ہے؟" اس نے پوچھا۔

مہناز نے وہ سب کچھ عمران کو بھی بتا دیا جو مجھے بتایا تھا۔ آخر میں وہ بولی۔ "مجھے لگتا ہے کہ جلالی صاحب کا صبر اب جواب دے گیا ہے۔ وہ مرنے مارنے کی باتیں کر رہے ہیں اور یہ باتیں ان کی صحت کے لیے بہت خطرناک ہیں... کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے جناب ابھی تھوڑی دیر میں خود کو کافی بہتر محسوس کریں گے۔"

"لیکن کیسے؟" مہناز نے پوچھا۔

"اس ویڈیو کیمرے کے ذریعے۔ باقی جو تھوڑی بہت کسر رہ جائے گی، وہ میں ایک تازہ خبر سنا کر پوری کر دوں گا۔"

"تازہ خبر؟" ڈاکٹر مہناز نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں... آیئے، میرے ساتھ آیئے۔" وہ بڑے ایکشن سے بولا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آگ بگولا جلالی صاحب کے سامنے تھے۔ جلالی صاحب بوٹ پہننے کے لیے موزے چڑھا رہے تھے اور یہی "مشقت" انہیں بُری طرح ہانپنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، جلالی صاحب کی بوڑھی ناتواں آنکھوں میں عجیب سا اضطراب تھا جیسے کوئی پر بریدہ پنچھی بے قراری کی انتہا کو چھو رہا ہو اور پھڑپھڑا رہا ہو۔ اس اضطراب کا تعلق یقیناً بدھ کی رات والے خونی واقعات سے تھا۔ جلالی صاحب کو اپنے تین وفادار ملازموں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ ایک درجن کے قریب سخت زخمی ہوئے تھے۔ دو عورتوں کی عزت پامال ہوئی اور بے زبان جانوروں تک کو بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ جلالی صاحب کا غم و غصہ سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن شدید غم و غصہ جلالی صاحب کی جسمانی حالت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہے تھے اور ان کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ پریشان حال مہناز بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سب سے پیچھے تھی۔ اس سے آگے میں تھا۔ میرے آگے عمران۔

"کیا بات ہے؟" وہ عمران کو اپنے سامنے دیکھ کر دہاڑے۔ "کیا اب کوئی اور جھوٹ بولنا چاہتے ہو؟"

"نہیں سر! اپنے ایک پہلے جھوٹ پر آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"سر! میں نے اور تابش نے کل شام غلط کہا تھا کہ ہمیں ایک دوست کی شادی پر جانا ہے۔ ہم ایک اور کام سے گئے تھے اور مجھے امید ہے کہ آپ اس کام کے بارے میں

سن کر ضرور خوش ہوں گے۔ دراصل ہم اس شخص کی طرف گئے تھے جس نے بدھ کی رات یہاں فارم ہاؤس میں قیامت مچائی اور آپ سمیت ہم سب کو بے حد دکھی کیا۔ ہم اس سے دو دو ہاتھ کرنے گئے تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں جی۔"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

عمران نے گہری سانس لی اور مسکین لہجے میں بولا۔ "جناب! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ہم کو گھوم پھر کر کام کرنے کی عادت ہے۔ ہمیں نئے نئے لوگوں سے ملنے میں مزہ آتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں کئی طرح کے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا رہا ہے۔ دراصل میں ہم نے سات آٹھ ماہ ایک گینگسٹر کے گھر میں بھی نوکری کی تھی۔ مجبوری تھی جناب! وہ ایک مشہور انڈین ایکٹر کا ماموں تھا۔ ہم نے ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے جناب! اس گینگسٹر سے بھی بہت کچھ سیکھا اور جو کچھ سیکھا، وہ آج رات بہت کام آیا ہے سر۔"

جلالی صاحب پھنکارے۔ "اگر تم مسخری کر رہے ہو تو میں بہت بری طرح پیش آنے والا ہوں اور اگر سیریس ہو تو پھر... یقیناً تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

"میں آپ کا خادم، ہوش میں ہوں سر! میں آپ کو زبانی بتاؤں گا تو شاید آپ یقین نہ کریں اور آپ کو مزہ بھی نہ آئے۔ میں آپ کو اس ویڈیو کیمرے کے ذریعے کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

جلالی صاحب کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مہناز بھی حیران نظر آ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں تجسس گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اگر عمران اتنا بول رہا ہے تو پھر اس کے پاس کوئی ٹھوس وجہ بھی ہوگی۔

جلالی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عمران نے ویڈیو کیمرے کو سامنے شیشے کی ایک خوب صورت میز پر رکھ دیا۔ ویڈیو کیمرے کی اسکرین تقریباً چھ ضرب چار انچ کی تھی۔ عمران نے ریکارڈنگ چلا دی۔ پہلا منظر ہی چونکا دینے والا تھا۔ سلطان چیتے کے ساتھی کی لاش ٹیٹو عرف کرشمہ کے اوپر پڑی تھی اور بظاہر یوں لگتا تھا کہ کوئی جذبات انگیز کارروائی ہو رہی ہے۔ کیمرا پین کر کے عمران اور سلطان چیتے پر آیا... عمران نے رائفل کی نال سلطان کے سر سے لگا رکھی تھی اور کہہ رہا تھا کہ "دکھاؤ دکھاؤ اس کتے کو بھی دکھاؤ جس نے صاحب کے گھر گھسنے کی حماقت فرمائی۔"

کیمرے نے حرکت کی اور فرش پر پہلو کے بل پڑے نادرے کی لاش دکھائی۔ اس کا کھوپڑا ٹوٹ چکا تھا اور ٹانگیں خونچکاں تھیں۔ خون ابھی اس کے جسم سے بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ پس منظر میں عمران کی آواز ابھری۔ "اب تم بتاؤ سلطانے! کس طرح مرنا پسند کرو گے؟ میرے پاس کافی ورائٹی ہے اس حوالے سے۔"

"مجھے مار کر تم اچھا نہیں کرو گے۔" سلطانے نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ کیمرا اس کے تاثرات کو بڑی خوبی سے دکھا رہا تھا۔ سلطان چیتا کوئی معمولی بدمعاش نہیں تھا۔ جاوا جیسے شخص کا قریبی ساتھی تھا۔ ایسے لوگوں کو مرعوب کرنا آسان کام نہیں ہوتا مگر وہ مرعوب ہو چکا تھا اور اس کی وجہ یہ یقین تھا کہ عمران اس کو مار سکتا ہے۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔" سلطان چیتے کی ریکارڈ شدہ آواز ابھری۔

"تم نہ آؤ گے تو تمہارا باپ جاوا آئے گا..." عمران نے کرخت لہجے میں کہا۔

اس کے بعد اس کمرے میں دو خونچکاں لاشوں کے درمیان عمران اور سلطانے نے جو بات چیت کی، اس نے بہت کچھ واضح کر دیا۔

جلالی صاحب حیرت سے گنگ سن رہے تھے۔ مہناز کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ لگا ہے لگا ہے ہم دونوں کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ یہ ایک مکمل فلم بندی تھی۔ عمران نے سلطان کو گن پوائنٹ پر رکھا اور پھر پارکنگ لاٹ میں آ گیا۔ درجنوں لوگوں اور پولیس والوں کے سامنے اس نے زخمی سلطان کو گاڑی میں بٹھایا اور شاہراہِ قائداعظم کی جگمگاتی روشنیوں میں آ گیا۔

عمران نے ہاتھ آگے بڑھا کر کیمرا آف کیا تو جلالی صاحب چونک کر اس ریکارڈنگ کے سحر سے باہر نکل آئے۔ ان کا غیظ و غضب اب ایک طرح کی حیرت میں ڈھل چکا تھا۔

"یہ سب کیا تھا؟" وہ لرزاں آواز میں بولے۔

عمران نے انہیں بتا دیا کہ یہ سب کیا تھا اور کیسے تھا۔ یہ جان کر جلالی صاحب ششدر رہ گئے کہ ہم کل شام یہاں سے روانہ ہونے کے بعد سیدھے جاوا کے ایک اڈے پر پہنچے تھے اور ہم نے اس شخص کو کیفرِ کردار تک پہنچایا ہے جس نے بدھ کی رات یہاں زبردست خون خرابا کیا۔ عمران نے جلالی صاحب کو یہ نکتہ بھی وضاحت سے بتایا کہ وہ لمبا شخص نادرا ہی تھا جو پشتو لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس نے پشتو لہجے کا سوانگ رچایا تھا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ وہ تفتیش وغیرہ کا رخ ریان ولیم کے گروہ کی طرف موڑنا چاہتا تھا۔

ڈیلیوری کا وقت قریب ہے۔

ریکارڈنگ میں لگا ہے لگا ہے ایرانی بلی بھی جلالی صاحب کو نظر آئی تھی۔ ان بلیوں میں جلالی صاحب کی جان تھی۔ وہ بلی کو دیکھ کر جذباتی ہو گئے اور بہت سے دیگر سوالوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بولے۔ "یہ بلی بچ گئی ہے؟"

"جی سر! یہ اکیلی ہی بچی ہے۔"

"کہاں ہے؟" انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

"یہیں میرے پاس ہے۔"

"اور باقی؟"

"وہ اب نہیں ہیں۔" عمران کا لہجہ دکھ آمیز تھا۔ "جنگلی کتوں نے انہیں مار ڈالا۔"

جلالی صاحب کے چہرے پر ایک بار پھر گہرے کرب کے آثار نظر آئے۔

عمران نے کہا۔ "لیکن سر! میں نے آپ سے ایک اچھی خبر سنانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"کیسی... خبر؟"

عمران نے ڈاکٹر مہناز کی طرف دیکھا۔ "ڈاکٹر! کیا سر جی ہمارے ساتھ ZOO تک جا سکتے ہیں؟"

مہناز نے کہا۔ "ان کی طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ وہاں جانے سے سر جی کی طبیعت میں بہتری آئے گی۔"

مہناز کے اجازت دینے سے پہلے ہی جلالی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم انہیں آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے ZOO کے صاف ستھرے پنجروں تک لے آئے۔ رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا لیکن کوٹھی میں بیشتر لوگ جاگ رہے تھے۔ سیکیورٹی ایجنسی کے مسلح گارڈز پوری طرح چوکس تھے اور ان کی سائرن بجاتی ایک گاڑی فارم ہاؤس کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگا رہی تھی۔ ایک روشن پنجرے کے سامنے جا کر عمران رک گیا۔ خود مجھے بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھلوایا اور ہم اندر چلے گئے اور تب ہم سب بری طرح چونک گئے۔ پنجرے کے ایک گوشے میں نرم پرالی کا بچھونا سا بنا ہوا تھا۔ اس بچھونے پر نایاب ایرانی بلی کے چار خوب صورت بلونگڑے موجود تھے اور ان کی ننھی منی رنگ دار آنکھیں نگینوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایرانی بلی انہیں چومنے چاٹنے میں مصروف تھی۔ یہ ایک نہایت خوش کن منظر تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کچھ دیر پہلے عمران مجھ سے باتیں کرتے کرتے اچانک کدھر چلا گیا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بچوں کی

اس منظر نے واقعی جلالی صاحب پر حیران کن اثر مرتب کیا۔ ان کا جسم پھر کانپنا شروع ہو گیا لیکن اب یہ جسم غم و غصے کی شدت سے نہیں، خوشی سے کانپ رہا تھا... وہ بچوں کے قریب اکڑوں بیٹھ گئے۔ انہیں انگلی سے چھو چھو کر دیکھتے رہے۔ ان کی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ وہ بھی اپنا جسم جلالی صاحب کے بازوؤں سے رگڑتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے رنگ واقعی قابلِ دید تھے۔ ان رنگوں میں وہ اطمینان بھی تھا جو نئی زندگی کو وجود دینے کے بعد کسی ماں کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔

اچانک جلالی صاحب چونک گئے۔ وہ جیسے کسی سحر سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ بغور مجھے اور عمران کو دیکھنے لگے۔ ان کی نظریں خاص طور سے عمران کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ "آؤ چلیں۔" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور پنجرے سے نکل آئے۔

پنجرے کو بند کر کے ہم بھی جلالی صاحب کے ساتھ چل دیے۔ پورچ کی تین چار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ لڑکھڑائے تاہم ڈاکٹر مہناز نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ کمرے میں بیٹھ کر وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ ڈاکٹر مہناز ان کا بی پی چیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ہم دونوں ان کے سامنے کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولے۔

"دیکھو، مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ میں سچ سننا پسند کروں گا... تم کون ہو؟"

عمران نے کہا۔ "آپ کے... خادم سر۔"

"ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں لیکن تم دونوں باورچی تو ہرگز نہیں ہو۔"

"میں تو سمجھتا ہوں سر... ہم آپ جیسے بڑے آدمی کے باورچی بننے کے لائق بھی نہیں ہیں۔"

"بات کو گھماؤ پھراؤ مت... کیا تم بھی اسی چکر میں ہو جس میں دوسرے ہیں؟"

"میرا خیال ہے سر کہ آپ کا اشارہ موروثی والے باکس کی طرف ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے جناب! اگر ایسا ہوتا تو تابش اس رات آپ کے پیچھے بھاگ کر آپ کو روکتا نہ، جب آپ باکس چیک کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ ہم ان لالچوں میں نہیں ہیں سر اور نہ ہی کسی حوالے سے آپ کا برا چاہتے ہیں۔"

"تو پھر کون ہو تم؟"

عمران نے بڑے مطمئن انداز میں اپنی ٹھوڑی کو کھجایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم جلالی صاحب کو بتاؤ تابش!“

”نہیں، تم ہی بتاؤ۔“ میں نے جواب دیا۔

عمران نے ایک لمبی سانس لی اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ”سر! کہا جاتا ہے کہ دشمن کا دشمن، دوست ہوتا ہے۔ اس حوالے سے آپ ہم ناچیزوں کو دوست بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہمیں آپ کا خادم کہلانا زیادہ اچھا لگتا ہے اور آئندہ بھی لگتا رہے گا۔“

”تم میرے کس دشمن کی بات کر رہے ہو؟“

”انڈین گینگسٹر جاوا کی سر! ہم نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر چھلانگ لگائی ہوئی ہے۔ ایک عرصے سے اس حرامزادے کے ساتھ ٹکر لی ہوئی ہے۔“

جلالی کی سفید بھوؤں کے نیچے ان کی گدلی آنکھوں میں ایک بار پھر شدید حیرت ابھری۔ مہناز بھی حیران تھی اور توجہ سے یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔ ”اس حرامی سے تمہارا واسطہ کیسے پڑا؟“ جلالی صاحب نے پوچھا۔

”یہ ایک لمبی کہانی ہے سر! اگر آپ اجازت دیں تو یہ پھر کسی وقت آپ کو سنا دیں گے۔ فی الحال صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چند ہفتے پہلے ہمیں آپ کے اسمِ گرامی کا پتا چلا تھا اور باقی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ باقی باتوں سے میرا مطلب یہی باکس والا چکر ہے جناب! ہمیں اطلاع ملی تھی کہ جاوا اور اس کی پرانی رکھیل دیرِ شہوار کسی وجہ سے بار بار فارم ہاؤس کے چکر لگا رہے ہیں اور آپ پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ بس ہماری رگِ عداوت پھڑک اٹھی۔ میں سیدھے سچے لفظوں میں یہی کہوں گا جناب! ہمیں اس بندے سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ تین چار سال پہلے اس شخص نے ہمارا جینا حرام کیا تھا، اب ہم اس کا جینا حرام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

میں سمجھ گیا کہ عمران اس معاملے میں ریان ولیم کا نام لینا نہیں چاہتا اور اس نے جاوا کے حوالے سے جلالی کو سنانے کے لیے کوئی کہانی گھڑی ہوئی ہے۔ باتوں کے فن میں وہ یکتا تھا۔ اس نے فقط پانچ دس منٹ کے اندر جلالی صاحب کو بڑی حد تک شیشے میں اتار لیا۔ اس نے جلالی صاحب کو باور کرایا کہ ہم دونوں جاوے کی ٹکر کے لوگ ہیں اور اسے ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، فی سبیل اللہ کر رہے ہیں۔ ہمیں جلالی صاحب کے باکس یا کسی اور چیز سے کوئی لینا دینا نہیں۔ میں نے بھی وقتاً فوقتاً اس گفتگو میں حصہ لیا۔

جلالی صاحب اپنی پتلون کی گیلیس درست کرتے ہوئے بولے۔ ”تم دونوں کی باتوں پر یقین کرنا کافی مشکل ہے لیکن جو ثبوت تم دے رہے ہو، انہیں جھٹلانا بھی آسان نہیں۔ یہاں ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تم جو کچھ جاوے کے ساتھیوں کے ساتھ کر آئے ہو، اس کا ری ایکشن کیا ہوگا؟ اگر وہ وحشی ہو کر یہاں چڑھ دوڑے تو تم کیا کرو گے؟“

عمران نے جلالی صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سر! آپ اپنے اس خادم کا پچھلا ریکارڈ دیکھ لیں۔ پچھلے دو چار ہفتوں میں، میں نے جو کچھ کہا ہے، اللہ کے کرم سے درست نکلا ہے۔ اب یہ بات بھی درست نکلے گی کہ جاوا اور سلطان وغیرہ کوئی فوری ردِعمل ظاہر نہیں کریں گے۔ انہوں نے ہمارے بازو آزمائے ہوئے ہیں اور ہم نے بھی ان کے حوصلے دیکھے ہوئے ہیں۔ ہم چاہتے جناب تو جاوے کے ”خصوصی چمچے سلطان“ کے علاوہ پانچ چھ مزید بندے بھی پھڑکا سکتے تھے لیکن ہم نے انہیں اتنی ہی سزا دی ہے جو بہت ضروری تھی۔ اس بات کو سلطان اور جاوا بھی ضرور سمجھیں گے۔“

جلالی نے عمران کو گھورا۔ ”تم کیا چیز ہو؟ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ میں نے جب اخبار میں باورچی کے لیے اشتہار دیا تھا، مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس اشتہار کے نتیجے میں تم جیسا شخص میرے گھر میں گھس آئے گا۔ تم باورچی بھی ہو۔ جانوروں کے ٹرینر اور ڈاکٹر بھی ہو۔ میراثی بھی ہو اور گینگسٹر بھی... اور ابھی نہ جانے تمہارے کون کون سے روپ سامنے آنے ہیں۔“

عمران نے کمال بے تکلفی سے جلالی صاحب کے استخوانی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”سر! ہمارا جو روپ بھی ہوگا، وہ آپ کی بھلائی کے لیے ہوگا۔ آپ یقین کریں۔ خاص طور سے جاوا اور اس کے گینگ کے خلاف آپ جو بھی حکم کریں گے، ہم اس کے لیے حاضر ہیں۔ ہمارے اندر ان لوگوں کے لیے آگ ہے۔ ہم ان کے دانت انشاء اللہ اس طرح کھٹے کریں گے کہ ان کے پاس... دانت نکلوانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے گا۔“

جلالی صاحب کا پارا چڑھتے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگتا تھا۔ عمران نے جس طرح ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا، وہ بھڑک بھی سکتے تھے لیکن مجھے اور مہناز کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جلالی صاحب خاموش رہے۔ شاید وہ ٹھیک کہتا تھا کہ جس

کو چھوتا ہے، اسے موم کر دیتا ہے۔ اگر نہ کر سکا تو اس لڑکی کو نہ کر سکا جو اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ جلالی صاحب نے اپنا دوسرا ہاتھ عمران کے ہاتھ پر رکھا اور قدرے کمزور لہجے میں بولے۔ ”میں جانتا ہوں، تم بہت سی غلط بیانیاں کر رہے ہو مگر اوور آل تم بُرے نہیں ہو... کیونکہ جو بُرائی کو ختم کرتا ہے، وہ عموماً خود بُرا نہیں ہوتا۔ اس لیے شیطان کو مار کر تم نے ایک بڑی بُرائی کو ختم کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کام ان حرام خور پولیس والوں کے کرنے کا تھا، وہ تم نے کیا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میں اپنا کلیجا ٹھنڈا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اب میں اپنے ملازموں اور ساتھیوں کے سامنے سر اٹھا کر بات کر سکتا ہوں۔“

پھر جلالی صاحب ڈاکٹر مہناز سے مخاطب ہوتے۔ ”وہ کہاں ہے رخشی... اور دوسری زرینہ...؟“

مہناز نے کہا۔ ”سر! رخشی تو ابھی اسپتال میں ہے۔ تین چار دن تک ہی آسکے گی۔ زرینہ یہیں ہے اپنے کمرے میں۔ اس کا بخار ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اسے کافی زیادہ مقدار میں کف سیرپ پلایا گیا تھا۔ ابھی تک اس کا پیٹ خراب ہے۔“

جلالی صاحب نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یہ ریکارڈنگ ان دونوں لڑکیوں کو ضرور دکھانی ہے۔ کم از کم اس کے وہ حصے جن میں تم دونوں کی شکلیں نظر نہیں آتیں۔ اس سے ان بے چاریوں کے زخموں پر تھوڑا بہت مرہم رکھا جائے گا۔“

ہم ابھی تک کھڑے تھے، جلالی صاحب کو اس کا احساس ہوا۔ انہوں نے ہمیں اپنے سامنے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ ہم بیٹھ گئے۔ انہوں نے ملازم کو بلایا اور چائے کا آرڈر دیا۔ ملازم پریشانی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ جلالی صاحب بھول رہے تھے کہ وہ جن کے لیے چائے منگوا رہے ہیں، انہوں نے ہی تو چائے بنانی ہے۔

جلالی صاحب کے روکتے روکتے عمران اٹھا اور ملازم کے ساتھ کچن میں آگیا۔ چائے وغیرہ تیار کر کے اس نے ٹرالی میں رکھی اور اسے خود ہی دھکیلتا ہوا لے آیا۔ ایسے کاموں کے لیے اس میں بے پناہ انکساری موجود تھی۔

اس دوران میں جلالی صاحب نے سیکیورٹی گارڈز کے انچارج اور دو سیکنڈ انچارج کو فون کیے اور انہیں کوٹھی کی سیکیورٹی ہائی الرٹ کرنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے انچارج سے یہ بھی کہا کہ اے گریڈ کے کم از کم دس گارڈز کا مزید انتظام کیا جائے۔

چائے کے دوران میں جلالی صاحب نے ہمارے بارے میں کئی سوالات پوچھے۔ ان سوالات کے لیے ہم دونوں پہلے سے تیار تھے۔ دو تین سوالات کا جواب دینے سے عمران نے بڑی معذرت کے ساتھ احتراز کیا۔ جلالی صاحب زبردست موڈ میں تھے۔ انہوں نے اس معذرت کو قبول کیا۔

عمران نے کھنکھار کر گلا صاف کیا لیکن پھر خود بولنے کے بجائے ڈاکٹر مہناز کو بولنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی صاحب کو دیکھا۔ وہ اپنے ٹیڈی کتے کو پچکارنے میں مصروف تھے۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ ”سر! چند دن پہلے ایک اور اہم واقعہ ہوا تھا... ہم نے آپ کو اس کے بارے میں صرف اس لیے نہیں بتایا کہ آپ کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں تھی۔“

جلالی صاحب چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ”تم لوگوں نے جو جو کچھ چھپایا ہوا ہے، وہ آج بتا ہی دو تا کہ یہ ٹینشن ختم ہو۔“

مہناز نے کہا۔ ”سر! میں آپ کو مختار ملک کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔ وہ... وہ سیڑھیوں سے گر کر نہیں مرا تھا۔“

”تو پھر؟“

مہناز نے مدد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران اپنی جادو اثر آواز میں بولا۔ ”سر! مختار ملک دراصل جادے کا مخبر تھا۔ وہ چھپ کر تابش اور ڈاکٹر مہناز کی باتیں سن رہا تھا۔ تابش کو پتا چل گیا۔ اس خبیث نے ایک چھرے سے تابش پر قاتلانہ حملہ کیا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور اس کی جان چلی گئی۔“

عمران نے اس واقعے کی دیگر تفصیل بھی جلالی صاحب کے گوش گزار کی۔ آخر میں جلالی صاحب بولے۔

”بہت خوب بھئی، بہت خوب۔ تم لوگ میرے ہی گھر میں رہ کر مجھ سے رازداریاں برت رہے ہو۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے حکومت کے اندر حکومت قائم کر لی جائے۔“

”معافی چاہتے ہیں جناب۔“ عمران لجاجت سے بولا۔ ”ہمیں پتا تھا، آپ بڑے دل کے مالک ہیں۔ اس گستاخی کو درگزر کریں گے۔ ڈاکٹر مہناز تو ہر صورت آپ کو آگاہ کرنا چاہتی تھیں مگر ہماری پُرزور درخواست پر انہوں نے چند دن چپ رہنے کی ہامی بھری۔“

”کچھ اور بتانا ہے تو وہ بھی بتا ڈالو۔“ جلالی کا لہجہ نارمل ہی تھا۔

عمران مسکرایا۔ ”بس ایک چھوٹی سی بات اور تھی۔ تابش کو کنگ وغیرہ بالکل نہیں جانتا۔ اس حوالے سے ہماری درخواست پر ڈاکٹر مہناز، تابش کی مدد کرتی رہی ہیں۔“

جلالی نے چشمے کے پیچھے سے مہناز کو گھورا اور بولے۔ ”اس بات کا تو مجھے بھی شک تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ جو ہر وقت کچن میں گھسی رہتی ہے، اس میں کوئی چکر ہے۔“

جلالی صاحب کا اچھا موڈ دیکھتے ہوئے عمران نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے کہا۔ ”سر! ایک التجا ہے۔ یہاں ایک دو بندے ایسے ضرور موجود ہیں جو ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ فی الحال ہماری باورچیوں والی حیثیت برقرار رکھیے۔ اس حیثیت سے ہم زیادہ محفوظ رہیں گے اور زیادہ کارآمد بھی ثابت ہوں گے۔“

جلالی بولے۔ ”تمہاری اس آخری بات میں وزن ہے۔ تم لوگ ماردھاڑ کے ماہر لگتے ہو۔ اور ماردھاڑ کا ماحول یہاں کسی بھی وقت بن سکتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عمران کی ضرورت ZOO میں ہے۔ بہرحال، مجھے اس بارے میں سوچنے کا موقع دو۔ میں تمہیں کل صبح تک اپنے فیصلے سے آگاہ کروں گا۔“

مختار ملک والے واقعے کے بارے میں انہوں نے ہم تینوں سے مزید پوچھ گچھ کی اور اس واقعے پر حیرت آمیز غصے کا اظہار کرتے رہے۔ بہرحال، اس غصے میں ایک طرح کی ستائش بھی چھپی ہوئی تھی۔ درحقیقت ان کا موڈ بتدریج بہتر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ عام حالات میں بھی انہیں تھانے کچہری کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھے، جب بندہ اکثر اندیشوں اور خطروں کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔

باتیں کرتے ہوئے، جلالی صاحب کا ہاتھ... ڈاکٹر مہناز کے کندھے پر تھا۔ وہ جیسے بے دھیانی میں گاہے بگاہے اس کے گداز کندھے کو مسلنے لگتے یا اس کے بالوں کو سہلانے لگتے۔ جلالی صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو ہمارے لیے ابھی تک پُراسرار تھا۔ ان کے اندر جیسے کوئی خلا سا تھا، کوئی طلب، کوئی بھوک سی۔ وہ حسن پرست بھی تھے۔ اپنے اردگرد خوب صورت ملازماؤں کو جگہ دیتے تھے اور رخشی جیسی کچھ لڑکیاں ان کے بہت قریب بھی رہی تھیں۔ اس سب کے باوجود ان کے طرزِ عمل میں گناہ یا ہوس کاری کا عمل دخل نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے بھی وہ عمر کے اس دور میں تھے جہاں انسان کی کیمسٹری بہت حد تک بدل جاتی ہے۔

اس روز جلالی صاحب کافی حد تک مطمئن بلکہ خوش نظر آئے۔ انہوں نے اپنے ZOO میں جا کر تادیر عمران سے بھی ملاقات کی۔ بلّی کے بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ ناتوانی کے باوجود اپنے ٹیڈی کتے کے ساتھ شام کے وقت باغیچے کی روش پر چہل قدمی کرتے رہے۔ مہناز بھی ان کے ساتھ تھی۔ عام لوگوں کے سامنے وہ مہناز کے ساتھ کسی خصوصی لگاؤ کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر میں جان چکا تھا کہ یہ لگاؤ موجود ہے۔

اس رات میں نے ایک عجیب منظر دیکھا اور اس نے مجھے چونکایا۔ یہاں کے دستور کے مطابق ٹھیک نو بجے ڈنر کر لیا گیا تھا۔ کوٹھی کے اردگرد پہرے داروں کا گشت شروع ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا، ڈاکٹر مہناز معمول کے مطابق جلالی صاحب کو دوا وغیرہ کھلا کر ان کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اس نے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اور گورے چٹے بازو دودھیا بلب کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ اسٹیتھو اسکوپ اس کے گلے میں تھا۔ کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے وہ ذرا رکی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ جیب سے ایک رومال نکالا اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ دودھیا بلب دیوار پر قریباً سات فٹ کی بلندی پر لگا ہوا تھا۔ اس نے گرم بلب کو رومال کے ذریعے ہولڈر میں سے نکالا۔ کوریڈور میں تاریکی چھا گئی۔ مہناز کا ہیولا آگے بڑھ گیا۔

میں حیران ہوا۔ دو تین دن پہلے بھی ایسا واقعہ ہوا تھا۔ میں نے ایک ملازمہ کو یہ کہتے سنا تھا کہ کوریڈور کا بلب نہیں ہے۔ تو کیا وہ بلب بھی ڈاکٹر مہناز نے اتارا تھا؟ خیر، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ بلب چوری کرتی ہوگی۔ یہ یقیناً کوئی اور چکر تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ شاید رات کسی وقت اسی کوریڈور سے گزر کر مہناز کو پھر سے جلالی صاحب کے کمرے میں جانا ہو اور وہ اس آمد و رفت کو دوسروں سے چھپانا چاہتی ہو۔

ایک بار یہ بات میرے ذہن میں آگئی تو پھر تجسس بڑھتا چلا گیا۔ میں اپنے کمرے کی نیم تاریک بالکونی میں آگیا۔ یہاں بیٹھ کر میں ڈاکٹر مہناز کے کمرے کے دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا اور امید تھی کہ ڈاکٹر مجھے دیکھ نہیں سکے گی۔ دس بجے کے قریب ایک ملازمہ نے ڈاکٹر مہناز کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ مہناز نے دروازہ کھولا، اب وہ براؤن پھولوں والی ایک گلابی نائٹی میں نظر آرہی تھی۔ بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھ رکھے تھے۔ ملازمہ نے رات کی رانی اور نرگس کے پھولوں کا ایک چھوٹا سا دستہ مہناز کو تھما دیا۔ اس نے پھولوں کو سونگھا اور شکریہ ادا کر

کے دروازہ بند کرلیا۔

میں بالکونی کی تاریکی میں سمٹا بیٹھا رہا۔ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ رکھوالی کے کتوں کا شور تھا۔ دور فاصلے پر پیٹرولنگ گاڑی کی نیلی روشنی بھی حرکت کرتی نظر آتی تھی۔ ZOO کی طرف سے کسی بندر کی طویل آواز ابھرتی اور سناٹے کو چیر جاتی۔ میرے اردگرد مچھر منڈلا رہے تھے۔ میں بے سکونی محسوس کررہا تھا، اس کے باوجود اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ رات کا ایک بج گیا تو مجھے مایوسی ہونے لگی۔ شاید میرا اندازہ غلط تھا۔ میں دس پندرہ منٹ بعد اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر مہناز کے کمرے کی لائٹ آف ہوگئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کمرے کے دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور میں نے ڈاکٹر مہناز کا ہیولا دیکھا۔ وہ کہیں جارہی تھی۔

میں نے بھی بالکونی چھوڑی اور کمرے میں آگیا۔ اب میں نے آنکھیں کھڑکی کی اس درز سے لگا دیں جہاں سے نو بجے کے قریب میں نے مہناز کو گزرتے دیکھا تھا... کوریڈور تاریک تھا۔ بہت کوشش کرکے میں اس کا بس مدھم سا ہیولا ہی دیکھ پایا... وہ جلالی صاحب کے کمرے کی طرف جارہی تھی۔

میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ میرا شک درست نکلا تھا۔ میں نے تقریباً آدھ گھنٹا وہیں انتظار کیا۔ مہناز کی واپسی نہیں ہوئی۔ میں نے عمران کو فون کیا۔ وہ چڑیا گھر والے پورشن کے لگژری اپارٹمنٹ میں ہی سوتا تھا۔ شاید وہ سویا ہوا تھا۔ میری دوسری کوشش میں اس نے کال اٹینڈ کی۔ ''کیا کھایا تھا تم نے جو آدھی رات کو مروڑ اٹھ رہا ہے؟'' اس نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

''بکواس نہ کرو۔ ایک اہم اطلاع دے رہا ہوں تمہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''کیا ہوا؟ ریماجی نے نرگس کو شوٹ کردیا؟'' وہ بھی سرگوشی میں بولا۔

''وہ دونوں مل کر تمہیں شوٹ کریں گی۔ اس وقت یہاں ایک اور چکر چل رہا ہے...''

میں نے عمران کو ساری تفصیل سے آگاہ کردیا۔ وہ سنجیدہ ہوگیا، کہنے لگا۔ ''تمہاری سراغ رسانی تو اچھی جارہی ہے۔ کیا کچھ اور پتا چل سکتا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''کمرے کے اندر کے حالات۔ کسی بہانے تم بزرگوار کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے ہو یا کوئی اور طریقہ...''

''بہت مشکل ہے لیکن میں کوشش کرکے دیکھتا ہوں۔'' میں نے موبائل آف کیا اور ایک بار پھر کوریڈور کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں تاریکی اور سکوت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کہیں کوئی آہٹ، کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میرے کمرے میں وال کلاک کی ٹک ٹک کی آواز تھی۔

میں نے سلیپر پہنے اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ تاریک کوریڈور میں سے گزر کر جلالی صاحب کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ دروازے کی نچلی درز سے پتا چلتا تھا کہ اندر بہت ہلکی روشنی والا نیلگوں بلب آن ہے۔ گراموفون یا کیسٹ پلیئر پر سہگل کا کوئی بہت پرانا گیت دھیمی آواز میں پلے ہورہا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اس بیڈروم کا ایک چھوٹا دروازہ عقبی برآمدے کی طرف بھی ہے۔ اس دروازے کا مقصد غالباً یہ تھا کہ اگر جلالی صاحب کو کسی وقت فوری طبی امداد کی ضرورت ہو تو انہیں یہیں سے نکال کر فوراً گاڑی میں پہنچایا جاسکے۔

میں اس دروازے کی طرف بڑھا۔ کسی کمرے سے بابے طفیل کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ عقبی صحن میں کوئی آوارہ بلی کسی ساتھی کو آواز دے رہی تھی۔ میں برآمدے میں پہنچا، یہاں تاریکی تھی۔ میں نے محتاط انداز میں اردگرد دیکھا پھر دروازے کے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ مجھے کمرے کا ایک چوتھائی حصہ نظر آنے لگا۔ اس ایک چوتھائی حصے میں قالین اور ایک سینٹر ٹیبل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے ٹیبل پر وہی گلدستہ پڑا نظر آیا جو کچھ دیر پہلے ملازمہ نے ڈاکٹر مہناز کے کمرے میں پہنچایا تھا۔ پھر ایک اور چیز نظر آئی اور اس نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ بے شک میں کمرے میں اور کچھ نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس ایک ''چیز'' کی دید نے کمرے کا ایک غائبانہ نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا اور یہ نقشہ خاصا سنسنی خیز تھا۔

سینٹر ٹیبل کے ساتھ ہی نیچے قالین پر براؤن پھولوں والی گلابی نائٹی پڑی تھی۔ بابے طفیل کی کھانسی کی آواز پھر ابھری۔ ساتھ ہی اس کی بیوی کی مدھم آواز سنائی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے بابا طفیل اٹھ کر پانی وغیرہ پینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میرا یہاں رکنا اب مناسب نہیں تھا۔ میں دروازے کے سامنے سے ہٹا اور جس طرح یہاں آیا تھا، اسی طرح دبے پاؤں واپس چلا گیا۔

کمرے میں آکر میں بستر پر نیم دراز ہوا اور اس صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ براؤن پھولوں والی گلابی نائٹی آنکھوں کے سامنے کھلتی چلی گئی جس طرح کسی درخت کا ایک

پتا دیکھنے کے بعد سارے درخت کی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے، صرف اس ایک نائٹی کے منظر نے پورے کمرے کا ماحول آشکار کردیا تھا۔ اس کمرے میں ڈاکٹر مہناز اپنے انوکھے مریض کے ساتھ موجود تھی اور عجیب انداز سے موجود تھی۔

کیا ڈاکٹر مہناز اس حد تک جاسکتی ہے اور اگر جاسکتی ہے... اور چلی گئی ہے تو کیوں؟ وہ ہر لحاظ سے ایک معقول لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی اور دانش مند بھی تھی۔ اس کے کردار کی کوئی اور کمزوری ابھی تک میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ پھر وہ ایسا کیوں کررہی تھی؟ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ہر لحاظ سے غلط ہے؟ اس کے لیے کوئی جواز بھی پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کتنی بھی رعایت برتی جائے، بطور ڈاکٹر اور معالج بھی مہناز کو اس طرح کی کوئی ''گنجائش'' نہیں دی جاسکتی تھی۔ لیکن اس نے یہ گنجائش پیدا کی ہوئی تھی۔

مہناز کی واپسی رات کوئی ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ جس خاموشی سے آئی تھی، اسی خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ میں نے فون پر عمران کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی میری ہی طرح جاگ رہا تھا۔ صبح میں نے دیکھا تو کوریڈور میں بلب پھر سے موجود تھا۔

پچھلی رات کا بیشتر حصہ تناؤ اور سنسنی کی کیفیت میں ہی گزرا تھا۔ ایک تو یہ ڈاکٹر مہناز والی سنسنی تھی، دوسری اس کارروائی والی جو ہم پیر کی رات کو لاہور میں انجام دے کر آئے تھے۔ عمران نے نہایت دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جاوا کے قریبی ساتھی نادرے کو اس کے ایک ہمنوا سمیت ان کے ڈیرے میں گھس کر ہلاک کیا تھا اور باقاعدہ اس کی ویڈیو فلم بھی بنائی تھی۔ کچھ بھی تھا، میرے ذہن میں یہ شدید اندیشہ موجود تھا کہ جاوا کی طرف سے کوئی نہایت سخت ردِعمل ظاہر ہوگا لیکن عمران مطمئن تھا۔ کل رات بھی جب میں نے اسے مہناز کے بارے میں بتانے کے لیے موبائل پر کال کی تو وہ اطمینان سے سو رہا تھا۔ کوٹھی اور فارم میں سیکیورٹی ہائی الرٹ تھی۔ کوئی شخص بھی مکمل شناخت اور دو تین جگہ تلاشی دینے کے بعد ہی فارم کی حدود میں داخل ہوسکتا تھا۔

دوپہر گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے دیکھا، ڈاکٹر مہناز سبز رنگ کا سلکی سوٹ پہنے، خوش رنگ ربن میں بال باندھے، گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے، اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک چلتی چھوٹے ڈرائنگ روم کی طرف جارہی تھی۔ جلالی صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ میری اور مہناز کی نگاہیں ملیں۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ہم دونوں نے سر کے اشارے سے ایک دوسرے کو سلام کیا پھر وہ شڑاپ سے چھوٹے ڈرائنگ روم میں اوجھل ہوگئی۔

میں کچن کے اسٹول پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ انسان بھی کیا الجھی ہوئی پیچ در پیچ شے ہے۔ اب اس دھلے دھلائے چہرے والی ڈاکٹر مہناز کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ کل شب ایک اور ساڑھے تین بجے کے درمیان وہ کہاں تھی؟

جلالی صاحب پر یہ بات اب عیاں ہوچکی تھی کہ ہم دونوں باورچی نہیں ہیں بلکہ میں تو کوکنگ کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہوں اور اب تک ڈاکٹر مہناز میری مدد کرتی رہی ہے۔ اب جلالی صاحب نے بابے طفیل کی بہو رضیہ کو میری مدد کے لیے کچن کی ڈیوٹی سونپ دی تھی۔ کل سے کچن کا بیشتر کام وہی کررہی تھی۔ میں نے کندھوں میں اور دونوں کہنیوں میں شدید درد کا بہانہ کیا ہوا تھا اور ڈاکٹر مہناز کی ہدایت کے مطابق مکمل آرام ہی کررہا تھا۔ اس وقت بھی رضیہ دو عدد دیسی چوزوں کا گوشت بھوننے میں مصروف تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مائکروفون آن کرکے جلالی اور مہناز کی گفتگو سننے کی کوشش کروں۔ جونہی گوشت بھونا گیا اور رضیہ نے اس میں پانی ڈالا، میں نے اس سے کہا کہ وہ مٹن کا پیاز ابنانے کے لیے برآمدے میں بیٹھ کر پیاز وغیرہ کاٹ لے۔ میں مرغی کا سالن دیکھ لوں گا... وہ باہر چلی گئی تو میں نے کچن کیبنٹ کھول کر ڈیکوریشن پیس میں چھپائے ہوئے ریسیور کو آن کیا اور آواز کو مطلوبہ حد تک کھول لیا۔ کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں، پھر مائکروفون کے بالکل قریب سے مہناز کی نکھری ہوئی واضح آواز سنائی دی۔ ''سر! میں دعوے سے کہتی ہوں آپ بالکل ٹھیک ہوجائیں گے اور میرے ساتھ...''

''کیا، میرے ساتھ؟'' جلالی نے پوچھا۔

''میرے ساتھ ہنی مون پر کاغان اور ناران چلیں گے۔''

''تم ایک بے وقوف... احمق لڑکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔ ایک ایسے شخص کو زندہ کرنے کا دعویٰ کررہی ہو جو مدت ہوئی مرچکا ہے۔''

''محبت مردہ جسموں میں زندگی دوڑاتی ہے سر... ناممکن کو ممکن کرتی ہے۔''

''یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ جو درخت جڑوں سے اکھڑ کر ہزار سال تک ریت میں دبا رہے، اس پر ہرے بھرے پتے کون لگا سکتا ہے؟''

"جناب! آپ درخت نہیں ہیں اور نہ ہزار سال سے ریت میں دبے ہوئے ہیں..."

جلالی صاحب نے کھانستے ہوئے کہا۔ "اگر تم اس انوکھی شادی کے ذریعے اپنا نام گنیز بک آف ریکارڈز میں درج کرانا چاہتی ہو تو تمہیں زبردست ناکامی ہونے والی ہے۔"

"محبت کسی شہرت کی محتاج نہیں ہوتی سر! یہ تو اپنے آپ میں ایک اعزاز ہوتی ہے۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر جلالی صاحب کی بوڑھی آواز سنائی دی۔ "میرا خیال ہے کہ تم اپنی ماں کو اس نکاح کے بارے میں بتا ہی دو تو اچھا ہے۔"

وہ الھڑ انداز میں بولی۔ "سر! آپ کیوں اتنی جلدی رنڈوا ہونے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ وہ میرا سر توڑ دیں گی... لیکن مجھے اپنے سر کی اتنی پروا نہیں جتنی اس بات کی ہے کہ وہ آپ سے کوئی سخت بات نہ کہہ دیں۔ میں سچ کہتی ہوں سر! آپ کی ذرا سی... بالکل ذرا سی توہین بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تم ایک بے وقوف ضدی لڑکی کے سوا اور کچھ نہیں ہو۔"

"کیا ایک ڈاکٹر بھی نہیں ہوں؟"

خاموشی کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد جلالی صاحب کی آواز ابھری۔ "نہیں... وہ تو ہو۔"

"تو پھر جناب! چپ چاپ بیٹھ جایئے۔ میں نے آپ کا ٹمپریچر لینا ہے اور بی پی چیک کرنا ہے۔"

مائکروفون کے ریسیور پر خاموشی چھا گئی۔ میں ششدر تھا۔ اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جو کچھ سنا تھا، اس سے انکشاف ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر مہناز نے خفیہ طور پر جلالی صاحب سے نکاح پڑھوا لیا ہے اور یہ تعجب خیز واقعہ شاید پچھلے دو چار دن کے اندر ہی ہوا ہے۔ میں سناٹے میں تھا اور یہ سنسنی خیز خبر جلد از جلد عمران کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔

اسی دوران میں ریسیور سے پھر مدھم آوازیں ابھرنے لگیں۔ پہلے ڈاکٹر مہناز نے قدرے فاصلے سے کچھ کہا جو واضح سنائی نہیں دیا۔ پھر جلالی کی بالکل صاف آواز ابھری۔ "ان دونوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے مہناز؟"

مہناز نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "سر! جو کچھ انہوں نے کیا ہے، وہ تو واقعی حیران کن ہے۔ اگر ویڈیو ثبوت نہ ہوتا تو اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ نادر کے جسم پر وہ کھرونچے والی بات بھی انہوں نے بالکل درست بتائی ہے۔ میں نے خود رحشی کے ناخنوں میں خون اور گوشت کی آلائش دیکھی تھی..."

"اس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں اور اگر معمولی نہیں ہیں تو پھر ہمیں بھی ان کی طرف سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارے گھر میں ہیں اور ہر وقت ہمارے قریب موجود ہیں۔ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد مہناز نے کہا۔ "سر! پتا نہیں کیوں، اس بارے میں میری رائے بری نہیں ہے۔ اگر میری رائے بری ہوتی تو میں اسی روز آپ کو سب کچھ بتا دیتی جب مختار ملک کی موت والا واقعہ ہوا تھا۔ میرا دل کہتا ہے سر کہ یہ لوگ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔"

"تو کیا پھر ان کی یہ بات درست سمجھی جائے کہ یہ جاوے کے گروپ سے اپنی پرانی دشمنی کی وجہ سے یہاں موجود ہیں؟"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے۔" مہناز نے کہا۔

"لیکن اگر ایسا ہے تو پھر یہی مطلب ہوا نا کہ یہ بھی گینگسٹر ہی ہیں۔ پھر ان کی اس بات پر کیسے اعتبار کیا جائے کہ انہیں یہاں کے دیگر حالات سے کوئی دلچسپی نہیں... جن میں مورتی والے باکس کا معاملہ بھی ہے۔"

"ہاں، اس بات پر پوری طرح یقین کرنا تو مشکل ہے سر۔"

"میں نے آج بھی عمران سے دیر تک بات کی ہے۔ اس بندے میں بہت سے "کٹس" ہیں۔ اگر اس کے بارے میں بلکہ ان دونوں کے بارے میں "چھپے رستم" والی بات کہی جائے تو شاید غلط نہ ہو..."

اچانک رضیہ کے بھاری اور تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ مجھے مائکروفون کا ریسیور آف کرنا پڑا۔ وہ ایک بڑی ٹرے میں پیاز اور ٹماٹر وغیرہ کاٹ کر لے آئی تھی۔ پیاز کی وجہ سے اس کے آنسو نکل رہے تھے۔ مجھے عمران کی بات یاد آگئی۔ اس نے شروع میں کہا تھا کہ میں تو یہاں پیاز کاٹ کاٹ کر پیدا کماری بن گیا ہوں۔ یہاں پیاز واقعی بہت استعمال ہوتی تھی۔

موقع ملتے ہی میں نے عمران کو دھماکا خیز خبر سنائی جو تھوڑی دیر پہلے مجھ تک پہنچی تھی۔ عمران اور میں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اگر ایسا ہو چکا تھا تو پھر ڈاکٹر مہناز نے واقعی ایک انوکھا کام کیا تھا۔ ایک ایسی باغیانہ روش جو رسموں، روایتوں اور معاشرتی بندھنوں کو چیرتی ہوئی گزرتی تھی۔ شاید یہ سب کچھ ایک حادثے کا ردعمل تھا۔ اس کی جڑیں اس المیے میں تھیں جو منگنی ٹوٹنے کی صورت میں مہناز کے ساتھ ہوا تھا۔ ڈاکٹر لائبہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت خوبرو لیکن گھمنڈی نوجوان تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے علاوہ وہ تن سازی کا شوق بھی رکھتا تھا۔ پنجاب کی سطح پر اس نے کافی نام کمایا تھا۔ پھر وہ کراچی کے ایک مال دار سیٹھ کی بیٹی سے شادی کر کے کینیڈا چلا گیا...

شام تک کا وقت بخیریت گزر گیا۔ کوٹھی اور فارم ہاؤس کی سیکیورٹی بدستور ہائی الرٹ تھی۔ جاوا گروپ کی طرف سے فوری ردعمل کا خطرہ تو ٹل گیا تھا مگر اندیشے بدستور موجود تھے۔ ان میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ شاید کسی طرح پولیس میں دہرے قتل کی رپورٹ کر دی جائے گی اور متعلقہ پولیس نادرے کے "قاتلوں" کو پکڑنے کے لیے یہاں فارم ہاؤس میں آدھمکے گی۔ بہرحال، ان اندیشوں میں سے کسی نے ابھی تک حقیقت کا روپ نہیں دھارا تھا اور عمران کا سکون و اطمینان دیکھتے ہوئے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید یہ اندیشے حقیقت کا روپ دھاریں گے بھی نہیں۔ عمران نے ایک بات کی تاکید مجھے ضرور کی تھی اور وہ یہ کہ میں ابھی فارم ہاؤس کی حدود سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ خود بھی اس سلسلے میں محتاط تھا۔ شام کے فوراً بعد جلالی صاحب سے بڑے اچھے ماحول میں طویل گفتگو ہوئی۔ عمران کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر مہناز کے سوا کوٹھی میں موجود کسی شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اب ہماری حیثیت "باورچی" کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جلالی صاحب نے یہ میٹنگ ایک بند کمرے میں رکھی تھی اور کسی کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سیکریٹری ندیم ویسے ہی فارم ہاؤس میں موجود نہیں تھا۔ وہ بلی کے نومولود بچوں کے لیے کچھ ادویات اور ویکسین وغیرہ لینے کے لیے لاہور گیا ہوا تھا۔ ویٹرنری ڈاکٹر عدیل بھی اس کے ساتھ تھا۔

آج ہم جلالی صاحب کے برابر بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ جلالی صاحب کا موڈ اچھا تھا اور ان کا رویہ بھی ہمارے ساتھ دوستانہ تھا۔ انہوں نے عمران سے کہا۔ "جو کچھ میں کر رہا ہوں، وہ تم دونوں کی نظر میں کیسا ہے؟ میرا مطلب ہے باکس کے حوالے سے؟"

عمران نے کہا۔ "آپ کا رویہ سو فیصد قابلِ تعریف ہے۔ اور جناب! یہی وجہ ہے شاید کہ ہم ناچیز بھی اپنی ہمت کے مطابق آپ کی مدد کے لیے یہاں موجود ہیں۔ اس سارے کام میں آپ کا اپنا کوئی لالچ نہیں۔ آپ نے اس بات پر اسٹینڈ لیا ہے کہ وہ باکس آپ کے پاس کسی نامعلوم بندے کی امانت ہے اور جب وہ بندہ آپ سے رابطہ کرے گا تو آپ اسے لوٹا دیں گے۔"

مہناز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "لیکن سر! اس امانت کی حفاظت کے لیے آپ کو جو مشکلات اٹھانا پڑ رہی ہیں، وہ آپ کی صحت پر بہت بھاری ہیں۔ آپ... اپنی ہمت سے زیادہ... مزاحمت کر رہے ہیں۔"

"کیا ہوا ہے میری ہمت کو... کیا میں چلتے چلتے گر پڑا ہوں؟ کیا میں نے بستر پر پیشاب کر دیا ہے؟ تم بھی ان لوگوں جیسی باتیں کرتی ہو جو سمجھتے ہیں کہ میری ٹانگیں قبر میں جھول رہی ہیں۔"

"نہیں سر... خدانخواستہ ایسی بات نہیں لیکن آپ بیمار تو ہیں نا۔" مہناز نے جلدی سے کہا۔

لیکن جلالی صاحب جھٹے سے اکھڑ چکے تھے۔ گرج کر بولے۔ "بیمار... بیمار... بیمار! میں عاجز آچکا ہوں اس لفظ سے۔ تمہاری صورتیں دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ تم کفن اور صابن تولیا لے کر میرے سرہانے بیٹھے ہو۔ میری سانسیں گن رہے ہو۔ میں زندہ ہوں... ابھی میں زندہ ہوں۔ میں اپنے سارے فیصلے خود کروں گا۔ مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ نہ مجھے کسی سے مشورہ کرنا ہے..."

"سر! میں تو کہہ رہی تھی کہ..."

"میں جانتا ہوں تم کیا کہہ رہی تھیں۔ تم لوگ میرے منہ پر کچھ اور کہتے ہو، میرے پیٹھ پیچھے کچھ اور... مجھے ناکارہ اور سنکی سمجھتے ہو۔ منافق ہو تم لوگ، جھوٹے ہو۔ مجھے ایسے لوگوں کے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ... اٹھ جاؤ..."

مہناز کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میرے اور عمران کی طرف دیکھا۔ عمران جلدی سے بولا۔ "سر! ٹھیک ہے، ہم چلے جاتے ہیں لیکن بلیوں کے بارے میں جو ضروری بات میں نے آپ سے کرنی تھی... وہ تو رہ جائے گی۔"

جلالی صاحب کی دکھتی رگ پر ہاتھ آیا تھا۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر اب طیش کے ساتھ ساتھ الجھن اور تجسس بھی نظر آیا۔ وہ خاموش رہے۔

عمران نے کہا۔ "اگر آپ کی اجازت نہیں تو میں صبح آجاؤں گا۔"

جلالی صاحب نے عجیب تاثرات کے ساتھ عمران کو

دیکھا، جیسے نہ چاہنے کے باوجود کوئی کڑوی دوا پی رہے ہوں۔ ”کیا بات ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”سر! ہمارا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوگیا ہے کہ یہ چاروں بلونگڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک بلونگڑا ہے۔ میں پوری تفتیش کرکے آیا ہوں۔ اگر تھوڑا بہت شک ہے بھی تو صبح تک دور ہو جائے گا۔ یہ دیکھیں ذرا... یہ ڈیجیٹل کیمرے سے میں نے بلونگڑے کے پچھلے پورشن کی تصویریں بھی لی ہیں۔“ اس نے جیب سے کیمرا نکالا اور اسے آن کرکے ڈس پلے اسکرین (مانیٹر) پر جلالی صاحب کو تصویریں دکھانے لگا۔ ”یہ دیکھیں سر! اس تصویر کو زوم کریں... کچھ اور زوم کریں... یہ دیکھیں نر کی نشانی۔ کافی بڑی ہے لیکن سیاہ دھبے کی وجہ سے پتا ہی نہیں چل رہا تھا...“

”ہاں... یہاں سیاہ دھبا تھا نا۔“ جلالی صاحب نے اپنی مڑی ہوئی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

دو تین منٹ بعد یہ کیفیت تھی کہ جلالی صاحب اور عمران کندھے سے کندھا بھڑائے بیٹھے تھے۔ تصویریں دیکھ رہے تھے اور مہناز کی موجودگی میں ہی بلونگڑوں کی زنانہ مردانہ صفات پر سیر حاصل بحث کر رہے تھے۔ جلالی صاحب کے ماتھے کے بل بتدریج کم ہو رہے تھے... عمران کی جادو بیانی کام کر رہی تھی۔

باتیں کرتے کرتے عمران نے ایک دم پلٹا مارا اور بولا۔ ”سر! مجھے یقین ہے ایسی خوب صورت آنکھوں والی بلیاں تو ایران میں بھی اب شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہوں گی۔ آپ ان کی ملکیت پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی جب یہ باکس والی پریشانی دور ہو جائے گی تو آپ صحیح طور پر ان بلونگڑوں اور ان کی ماں کی محبت سے لطف اندوز ہو سکیں گے...“

باکس کے ذکر پر جلالی صاحب نے کیمرا ایک طرف رکھ دیا اور پھر سے گہری سنجیدگی نے ان کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ شاید چار پانچ منٹ پہلے کی ساری باتیں انہیں یاد آگئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ان کا غصہ پھر حرارت اور رفتار پکڑتا، میں نے ہمت کرکے کہا۔

”سر! میں باکس کے حوالے سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔“

”کیا ہے؟“ انہوں نے ماتھے کی تیوریاں برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

”سر! ہم جانتے ہیں کہ باکس کے حوالے سے آپ کے بہت سے اندیشے ہیں اور یہ بالکل بجا اندیشے ہیں۔ مثلاً انتظامیہ کی بات ہی لیں۔ پولیس کا حال ہی دیکھیں۔ ان پر کسی طرح کا اعتبار بھلا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان پر اعتبار کیا جا سکتا تو میرا خیال ہے کہ آپ کب کے اس باکس والی ذمے داری سے فارغ ہو چکے ہوتے لیکن اس کا کوئی درمیانی حل تو نکالا جا سکتا ہے۔“

جلالی صاحب کے تاثرات نارمل ہی رہے۔ اس کا مطلب تھا کہ خراب ماحول کے باوجود میری ایک آدھ بات ضرور ان کے دل کو لگی ہے۔ عمران نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے ”ویل ڈن“ کا اشارہ کیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب! میں صرف اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کچھ معزز لوگوں یا پھر میڈیا والوں کے سامنے یہ باکس کسی اہم حکومتی عہدے دار کے حوالے کر دیا جائے اور یہ تب تک وہاں رہے جب تک اس کا اصل مالک سامنے نہیں آ جاتا؟“

جلالی صاحب نے بُرا سا منہ بنایا۔ ”اہم عہدے دار کون ہوگا؟ کوئی وزیر، مشیر یا پھر کوئی بڑا پولیس افسر۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ لوگ اعتبار کے قابل ہیں؟ ہرگز نہیں، یہ لوگ گرم توے پر اپنی پیٹھ رگڑیں تو بھی ان کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور میڈیا میں بھی ابھی اتنی ذمے داری کہاں پیدا ہوئی ہے۔ یہ لوگ شکاری جانوروں کی طرح ایک خبر کے پیچھے بھاگتے ہیں، اس کو دبوچتے ہیں، اس کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ ابھی وہ ”خبر“ تڑپ پھڑک ہی رہی ہوتی ہے کہ انہیں کوئی اور خبر نظر آ جاتی ہے۔ وہ پہلی کو چھوڑ کر اس کے پیچھے لپک جاتے ہیں اور پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔“

”یہ بات تو آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ عمران نے فرمائشی انداز میں اوپر سے نیچے سر ہلایا۔

میں نے بھی تائیدی انداز میں کہا۔ ”آپ یقیناً اس معاملے کو ہم سے بہتر سمجھتے ہیں سر! اور یقیناً اس سلسلے میں آپ نے کوئی مناسب پلاننگ بھی کر رکھی ہوگی۔“

”پلاننگ کوئی نہیں ہے... کوئی پلاننگ نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں، بس اس پر قائم ہوں۔ وہ باکس میرے پاس امانت کے طور پر موجود ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک اس کا اصل مالک مجھ سے رابطہ نہیں کرتا۔ اس امانت کی حفاظت کرتے ہوئے اگر مجھے جان بھی دینا پڑے تو میں دے دوں گا۔“ جلالی کا لہجہ اٹل تھا۔

اب یہ بات ان سے کون کہتا کہ حضرت! اگر آپ نے واقعی جان دے دی اور داعیٔ اجل کو لبیک کہہ ڈالا تو سورتی

والے باکس کو کیسے ڈھونڈا جائے گا؟ وہ تو آپ کے ساتھ ہی لحد میں اتر جائے گا۔

میں اور عمران کچھ دیر تک اشاروں کنایوں میں یہ بات جلالی صاحب کو باور کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ انہیں کسی طرح کا کوئی لالچ ہی نہیں ہے تو پھر وہ کسی طرح اس باکس والی ذمے داری سے سبکدوش ہونے کی کوشش کریں۔ لیکن ڈاکٹر مہناز نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ”وہ اپنے موقف پر فولاد کی طرح سخت رہتے ہیں۔ کسی بھی طرح کے دلائل سے ان کے موقف میں لچک پیدا نہیں کی جا سکتی۔ اگر کبھی یہ لچک پیدا ہوتی ہو تو پھر ان کے اندر سے ہی ہوتی ہے۔“

اس ملاقات میں کچھ اور امور ضرور طے ہو گئے۔ جلالی صاحب نے اتفاق کیا کہ یہاں کوٹھی میں ہماری موجودہ حیثیت کو برقرار رکھا جائے۔ یعنی ہم یہاں باورچیوں کی حیثیت سے ہی موجود رہیں۔ ضرورت پڑنے پر رضیہ کے علاوہ عمران بھی کچن میں خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوٹھی میں موجود کالی بھیڑوں کا سراغ لگایا جائے اور یہ کام جلد سے جلد ہو۔ سیکریٹری ندیم کو بھی اعتماد میں لے لیا جائے اور اسے ہدایت کی جائے کہ وہ ہم دونوں کو بھی سیکیورٹی کے انتظامات اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رکھے۔ جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی، میں نے سانولی رنگت والے فتح محمد کی آواز سنی۔ وہ کسی ملازمہ کو آواز دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اردگرد موجود ہے حالانکہ جلالی صاحب نے کسی کو بھی اس طرف آنے سے منع کیا تھا۔ یہ فتح محمد اس کوٹھی اور فارم ہاؤس میں یقیناً ایک مشکوک شخص تھا۔ میں اور عمران جلد از جلد اس کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

اگلے روز دوپہر کو میں نے پھر ایک عجیب منظر دیکھا۔ ڈاکٹر مہناز اپنی والدہ سے ملنے لاہور گئی ہوئی تھی۔ عمران نے بابے طفیل کی بہو رضیہ کے ساتھ مل کر کھانا تیار کیا تھا اور اب وہ ڈاکٹر عدیل کا ہاتھ بٹانے کے لیے ZOO کی طرف چلا گیا تھا۔ بارہ بج چکے تھے اور جلالی صاحب کا کھانا لے جانے والا ملازم وحید ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پھر ایک ملازمہ نے مجھے بتایا کہ جلالی صاحب کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اس نے تفصیل نہیں بتائی۔ میں جلالی صاحب کو دیکھتا ہوا ایک اندرونی کمرے میں پہنچا تو یہاں ایک عجیب منظر دیکھا۔ جلالی صاحب ایک صوفے پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ اسے نیم دراز ہونا کہا جا سکتا تھا۔ بیس بائیس سال عمر والی دو قبول صورت ملازمائیں ان کے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دیگر لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ انہوں نے جلالی صاحب کو اپنی بانہوں میں لیا ہوا تھا۔ جلالی صاحب کے دونوں ہاتھ دونوں ملازماؤں کے ہاتھ میں تھے اور انہوں نے جلالی صاحب کی انگلیوں کو یوں دبا رکھا تھا جیسے وہ سن ہو چکی ہوں اور لڑکیاں انہیں اپنی مٹھی میں دبا کر حرارت پہنچانا چاہتی ہوں۔ جلالی صاحب کی آنکھیں بند اور چہرے پر عجیب سی بے چینی تھی۔ پھر میں نے ملازمہ زرینہ کو دیکھا۔ وہ ایک طرف سے آئی۔ جلالی صاحب کے پاؤں کے پاس قالین پر بیٹھ گئی اور ان کے پاؤں کی انگلیوں کو اپنے گداز ہاتھوں سے ہولے ہولے دبانے لگی۔

میں کچن میں واپس آ گیا۔ اس چار دیواری میں جلالی ایک ایسا معما تھے جو ابھی تک پوری طرح ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ صرف دو دن پہلے ہم پر یہ حیرت ناک انکشاف ہو چکا تھا کہ اس کوٹھی میں جلالی اور ڈاکٹر مہناز کے تعلق کی نوعیت یکسر بدل چکی تھی۔ وہ بڑی رازداری سے خفیہ شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ جلالی صاحب کے قریب ترین لوگ بھی اس نئے تعلق سے بے خبر ہیں۔ یقیناً میرے کانوں میں بھی اتنی جلدی اس تعلق کی بھنک نہ پڑ سکتی اگر ڈرائنگ روم میں مائکروفون نصب نہ ہوتا۔ آج کے بابا طفیل اور اس کی بیوی دو ایسے افراد تھے جن کے بارے میں شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ اس نئے تعلق سے آگاہ ہیں۔ کسی وقت تو مجھے شک ہوتا تھا کہ شاید جلالی اور مہناز کے نکاح کی کارروائی بھی بابے طفیل نے ہی انجام دی ہوگی۔

بابا طفیل بھی فتح محمد کی طرح اس کوٹھی کا ایک خاموش اور گہرا کردار تھا۔ وہ سفید ریش اور جھکی کمر والا شخص تھا۔ وہ اور اس کی بیوی پنج وقت کے نمازی تھے۔ اس کی بیوی کے ہاتھ میں اکثر تسبیح بھی نظر آتی تھی۔ ان کا بیٹا اور بہو رضیہ بھی یہاں ملازمت کرتے تھے۔ بہرحال وہ دونوں سرونٹ کوارٹرز میں رہتے تھے۔ اس کے برعکس بابے طفیل اور اس کی بیوی کو یہاں گھر کے افراد جیسی حیثیت حاصل تھی۔ سہ پہر کے وقت جلالی صاحب کی طبیعت سنبھل گئی۔ انہوں نے ZOO کا ایک راؤنڈ بھی لگایا۔ ایرانی بلی اور بلونگڑوں کی حفاظت کے لیے ایک مسلح گارڈ چوبیس گھنٹے موجود تھا۔ چار بجے کی چائے کی جگہ جلالی صاحب نے دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر لاہور ٹیلی فون کرکے اپنے زخمی ملازموں کی عیادت کرنے کے بعد سو گئے۔

ڈاکٹر مہناز کی واپسی پانچ بجے کے قریب ہوئی۔ وہ کچھ تھکی تھکی اور کچھ روئی روئی سی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا

نہ وہ والدہ سے مل کر آئی ہے اور حسبِ معمول والدہ سے اس کی جھڑپ بھی ہوئی ہے۔ بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ والدہ نے اسے الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ دو ہفتے کے اندر جلالی صاحب کے لیے کسی دوسرے ڈاکٹر کا انتظام کرکے کوٹھی چھوڑ دے، ورنہ وہ زندگی بھر اس کی شکل نہیں دیکھیں گی۔

والدہ بے چاری کو کیا پتا تھا کہ ڈاکٹر بیٹی اب کوٹھی نہیں چھوڑے گی کیونکہ وہ اس ملازمت کو باقاعدہ ایک رشتے میں بدل چکی ہے۔ ایک ایسا رشتہ جو آشکار ہوگیا تو زبردست قسم کی جگ ہنسائی اور طعنہ زنی کا سبب بنے گا۔ مطلع دوپہر سے ابر آلود تھا۔ شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور تیز بارش ہونے لگی۔ میں نے اپنے اور مہناز کے لیے چائے بنائی۔ چائے سے بھرے ہوئے مگ لے کر ہم ایک برآمدے میں آبیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ مجھے اور مہناز کو ساتھ دیکھ کر دیگر ملازموں کو حیرت نہیں ہوتی تھی۔ ان کا خیال یہی تھا کہ ڈاکٹر مہناز میری شوقیہ شاگرد بنی ہوئی ہے اور مجھ سے کوکنگ سیکھ رہی ہے۔

میں نے مہناز کو آج دوپہر والی صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ آج میں نے جلالی صاحب کو کس حالت میں دیکھا ہے۔

میرے اس بیان میں ایک طرح کا تجسس تھا اور کئی ایک سوالات تھے۔ میں اس تجسس کا اظہار پہلے بھی دو تین بار مہناز سے کرچکا تھا مگر وہ کنی کترا گئی تھی۔ آج میں چاہتا تھا کہ وہ کنی نہ کترائے اور مجھے کچھ نہ کچھ بتائے۔ میں کوشش کرتا رہا، آخر مہناز کو نیم آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جیسا کہ میں پہلے بتاچکا ہوں، اس کوٹھی میں دو تین جگہوں پر سی سی ٹی وی کیمرے موجود تھے مگر ہم جس جگہ بیٹھے تھے، وہاں اس طرح کا کوئی خطرہ موجود نہیں تھا۔

مختار ملک والے واقعے کے بعد سے مہناز مجھ پر خاصا بھروسا کرنے لگی تھی۔ وہ میری جسمانی فٹنس اور فائٹنگ اسپرٹ سے بہت متاثر تھی۔ اس کے اصرار پر میں نے بھی چند دن پہلے اسے اپنی کایا کلپ کے بارے میں تھوڑا بہت بتا دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں لڑکپن سے مارشل آرٹ کا اسٹوڈنٹ رہا ہوں لیکن کبھی اس میدان میں کامیابی حاصل نہ کرسکا۔ اولی کھلاڑیوں میں بھی شامل نہ ہوسکا لیکن پھر حالات کی سختیاں میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک ایسے شخص تک لے گئیں جو شاید مرنے سے پہلے میری آمد کا انتظار ہی کررہا تھا۔ میں نے مہناز کو باروندا جینی کی کہانی سنائی تھی اور اس کے بارے میں دیگر باتیں بتائی تھیں۔

... تو میں ذکر کررہا تھا ڈاکٹر مہناز کی نیم آمادگی کا۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ جلالی کے اسرار پر سے سارا نہیں تو تھوڑا بہت پردہ ضرور اٹھا دے گی۔ بادل برس رہے تھے اور ہوا کی سرسراہٹ میں اضافہ ہورہا تھا۔ وہ بولی۔ ”تابش صاحب! ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست اور ہم راز ہیں۔ آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ جو کچھ آپ کو بتاؤں گی، آپ صرف اپنے تک محدود رکھیں گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں ڈاکٹر مہناز۔“ میں نے خلوصِ دل سے کہا۔

کچھ دیر توقف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ”تابش! جلالی صاحب بچپن سے... سمجھیں کہ تین چار سال کی عمر سے زبردست اکیلے پن کا شکار رہے ہیں۔ ان کا یہ اکیلاپن زندگی کے کسی حصے میں دور نہیں ہوسکا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری دور میں داخل ہوگئے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں ڈاکٹر مہناز! آپ کس اکیلے پن کی بات کررہی ہیں؟ بابا طفیل بتارہا تھا کہ جلالی صاحب نے اپنا بچپن اور جوانی ایک بھری پُری فیملی میں گزارے ہیں۔ پھر ان کے والدین نے بڑے چاؤ سے ان کی شادی بھی کی۔ انہوں نے تیس سال تک ایک اچھی ازدواجی زندگی گزاری۔ ان کے تین بچے بھی ہوئے۔“

مہناز عجیب پھیکے انداز سے مسکرائی۔ ”اس کے باوجود تابش صاحب... جلالی ہمیشہ تنہا رہے، یکسر اکیلے۔ بابے طفیل نے آپ کو ایک خاص بات نہیں بتائی اور وہ بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے... جلالی صاحب تین چار سال کی عمر سے ایک بیماری کا شکار رہے ہیں۔ یہ جلد کا ایک متعدی مرض تھا۔ نہایت تکلیف دہ... نہایت ضدی۔ اس مرض نے جلالی صاحب کی زندگی تو اجیرن کی ہی، ان کے قریبی رشتوں کو بھی ہمیشہ ایک سخت امتحان سے دوچار رکھا۔ ماں سے زیادہ قریبی بھلا کون ہوتا ہے۔ اس ماں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی جو اپنے تین چار سال کے بچے کو چھو بھی نہیں سکتی ہو اور اس بچے کے دل کا کیا حال ہوتا ہوگا جو اپنے ماں باپ کے لمس کو ترستا رہتا ہو۔“

”یہ بیماری کب تک رہی؟“ میں نے پوچھا۔

”سمجھو ہمیشہ رہی۔“ مہناز نے افسردگی سے کہا۔ ”عام طور پر جلدی امراض کا دورانیہ طویل ہوتا ہے لیکن یہ بیماری تو جلالی صاحب کی تقریباً تین چوتھائی زندگی کو نگل گئی۔ اس نے قریباً قریباً ساٹھ سال تک جلالی صاحب کو اپنے

پنجوں میں جکڑے رکھا۔ جلالی صاحب کے پورے جسم پر بہت باریک باریک سے دانے نکل آتے تھے... گرمی دانوں جیسے... لیکن یہ گرمی دانوں کی طرح خشک نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سرخی اور گیلاپن ہوتا تھا۔ جلالی صاحب کی والدہ اور ان کی بڑی بہن کے ہاتھ بھی اس بیماری کا شکار ہوگئے تھے اور اگر وہ دونوں ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل نہ کرتیں تو شاید وہ بھی پوری طرح اس کی لپیٹ میں آجاتیں۔“

”جلالی صاحب کی بیماری کا علاج بھی ہوا؟“

”کیوں نہیں... جلالی صاحب چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور لاڈلے تھے۔ ان کا تعلق ایک خوش حال زمیندار گھرانے سے تھا۔ لاہور اور شیخوپورہ کے نواح میں ان کی سیکڑوں ایکڑ زرعی زمین تھی۔ جلالی صاحب کے والد ایک پڑھے لکھے شخص تھے۔ انہوں نے ننھے جلالی کا علاج اندرونِ ملک ہی نہیں، بیرونِ ملک بھی کرایا۔ انہیں انگلینڈ اور جرمنی تک لے کر گئے۔ جلالی صاحب کی تکلیف کنٹرول ضرور ہوجاتی تھی مگر ختم نہیں ہوتی تھی۔ یہ چھوت کے زبردست اثرات بھی رکھتی تھی۔ معالجوں کی ہدایت کے مطابق جلالی صاحب کو دوسروں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ چار پانچ سال کا بچہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لمس کو ترستا رہتا تھا لیکن ایسی کوئی راحت اس کے نصیب میں نہیں تھی۔“

”جلالی صاحب کے خاندان میں پہلے بھی یہ تکلیف موجود تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں... نہ پہلے تھی نہ بعد میں کسی کو ہوئی۔ یہ واحد کیس تھا۔ بابے طفیل اور اس کی بیوی کو ان وقتوں کا سارا حال معلوم ہے لیکن وہ دونوں کسی کو بتاتے نہیں۔ ایک طرح سے وہ دونوں جلالی صاحب کے پرانے رازدار بھی ہیں۔ بہرحال، میرے ساتھ انہوں نے کافی کچھ شیئر کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس بیماری میں چھوت کے اثرات اتنے شدید تھے کہ کوئی بھی جلالی صاحب کے قریب نہیں جاتا تھا۔ انہیں پیاز کا زیادہ استعمال کرایا جاتا تھا تاکہ چھوت کے اثرات کم ہوں اور بیماری میں بھی افاقہ رہے۔ وہ جلن کی وجہ سے ساری ساری رات تڑپتے رہتے تھے۔ ماں انہیں دو دو گھنٹے بعد دوا پلاتی تھی... اور دیگر تدبیریں کرتی تھی۔ کسی وقت وہ انہیں گلے سے بھی لگاتی تھی لیکن اس طرح کہ جلالی صاحب کے جسم کا کوئی ننگا حصہ اس کے جسم سے چھونہ پائے۔ خاص طور سے بیماری سے متاثرہ حصوں کو چھونا تو بہت خطرناک تھا۔ ان حصوں پر دوا وغیرہ لگاتے وقت دستانے استعمال کیے جاتے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن ڈاکٹر! ہم جانتے ہیں کہ جلالی صاحب کی شادی ہوئی۔ ان کے صحت مند بچے بھی ہوئے۔“

”مگر میں سمجھتی ہوں کہ شادی جیسا رشتہ بھی جلالی صاحب کی تنہائی اور اکیلے پن کو ختم نہ کرسکا۔ ان کی ازدواجی زندگی عام لوگوں سے بہت مختلف تھی۔ یہ ازدواجی زندگی ڈری سہمی اور کپڑوں میں لپٹی لپٹائی... پتا نہیں کس طرح گرتی پڑتی چلتی رہی... وہ بھی کسی متوسط گھرانے کی صابر شاکر عورت تھی، اس نے یہ سب کچھ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ اسے دنیا کی ہر خوشی نصیب تھی لیکن میاں بیوی کے بھرپور تعلق سے تو وہ ہمیشہ محروم ہی رہی ہوگی۔“

”پھر جلالی صاحب ٹھیک کیسے ہوئے؟“ میں نے پوچھا۔

”اسکن کی کچھ بیماریاں عجیب ہوتی ہیں۔ یہ سالہا سال مریض کو پریشان رکھتی ہیں لیکن عمر کے کسی دور میں یہ خود بخود مریض کا پیچھا چھوڑ دیتی ہیں یا پھر نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں۔ جلالی صاحب کی تکلیف کے بارے میں بھی ڈاکٹروں کا یہی کہنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کسی وقت خود ہی ٹھیک بھی ہوسکتی ہے اور ایسا ہی ہوا... لیکن بہت دیر سے ہوا۔ یہ انیس بیس سال پہلے کی بات ہے۔ جلالی صاحب کی وائف کو بھی فوت ہوئے پانچ چھ سال گزر چکے تھے۔ جلالی صاحب کی تکلیف بغیر کسی خصوصی علاج یا دوا کے کم ہونے لگی اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں ناپید ہوگئی۔ اب وہ اس حوالے سے بالکل صحت مند ہیں لیکن اس طویل ترین بیماری نے ان کی شخصیت پر جو منفی اثرات ڈالے ہیں، وہ موجود ہیں اور شدت سے موجود ہیں۔“

بارش برس رہی تھی لیکن اس کی ساری خوب صورتی تاریکی میں دفن تھی، بس مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہمارے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی یا پھر پانی کی بوچھاڑوں کی آواز۔ آسمان پر بجلی چمکی تو جیسے برآمدے میں بھی ایک بجلی چمک گئی۔ مہناز کا پُرشباب کمان کی طرح کسا ہوا جسم ایک لمحے کے لیے روشن ہوکر نیم تاریکی میں اوجھل ہوگیا... کہا جاتا ہے کہ بادوباراں میں عورت کا حسن نکھر جاتا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ جلالی صاحب کو اپنی بیماری کی وجہ سے عمر بھر لمس کی جو کمی رہی ہے، وہ اب انہیں نفسیاتی طور پر دق کررہی ہے؟“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ آج دوپہر آپ نے ان کی جو

کیفیت دیکھی ہے، وہ اکثر ہو جاتی ہے۔ ایسے میں اپنے وجود کا اکیلا پن بڑی شدت سے ان کے اندر ابھرتا ہے۔ ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں میں ایک تکلیف دہ سنسناہٹ جاگ جاتی ہے۔ رگ دپے میں بے چینی بھر جاتی ہے۔ ماتھے پر پسینا آتا ہے۔ میڈیکل زبان میں اس تکلیف کے لیے لمبے چوڑے اور مشکل نام ہیں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ شدید اعصابی بے قراری کی ایک شکل ہے۔ آپ کو میں ایک مثال دیتی ہوں۔ آپ نے پالتو جانوروں مثلاً بلیوں وغیرہ کو دیکھا ہوگا... وہ اپنے جسم کو کسی جان دار جسم کے ساتھ ٹچ کرنا پسند کرتی ہیں۔ پاؤں میں لوٹتی ہیں۔ اپنا آپ اپنے مالک کی ٹانگوں سے رگڑتی ہیں... یہ بھی اسی قسم کی اعصابی ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ پچھلے چالیس پچاس برسوں میں جلالی صاحب کو جانوروں سے جو خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی ہے، اس کی وجہ بھی شاید یہی اکیلا پن ہے... مگر کچھ بھی ہے تابش صاحب... اپنے جیسے انسان کی کمی پالتو جانوروں سے تو پوری نہیں ہو سکتی۔ یقیناً دیکھنے والوں کو بہت بُرا لگتا ہوگا کہ یہ عمر رسیدہ شخص جوان ملازماؤں کو اپنے اردگرد رکھتا ہے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ قریب ہونا اور لیٹنا بھی پسند کرتا ہے۔ وہ اسے ایک بوڑھے کی کج روی اور شاید رنگین مزاجی سے تعبیر کرتے ہوں گے لیکن وہ اس مسئلے کی دردناک بنیاد سے واقف نہیں ہیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر مہناز! آپ نے تو اس تصویر کا ایک بالکل دوسرا رخ پیش کر دیا ہے... آپ کا کیا خیال ہے، اس حوالے سے جلالی صاحب کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"شاید کچھ بھی نہیں۔ اب بڑھاپے کی کئی بیماریاں جلالی صاحب کو چمٹ چکی ہیں... آپ جانتے ہی ہو، ان کے تین بائی پاس ہو چکے ہیں۔ زندگی کا تو پل بھر کا بھروسا نہیں لیکن ظاہری حالت سے بھی پتا چلتا ہے کہ جلالی صاحب اب زیادہ عرصہ نہیں گزاریں گے۔ شاید دو تین سال... یا اس سے بھی کم۔ اب تو کوئی ایسا شخص ہو جو پورے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ جلالی صاحب کے ان آخری دنوں کو... خوش گوار اور کم اذیت ناک بنا سکے۔"

میں نے کن انکھیوں سے مہناز کی طرف دیکھا۔ ہوا کی وجہ سے اس کا آنچل سرک گیا تھا اور ملائم بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک ایسے شخص کا ذکر کر رہی تھی جو جلالی کی زندگی کے آخری حصے کو خوش گوار بنا سکے... اور وہ "شخص" وہ خود تھی۔ وہ بڑی راز داری سے ان کی زندگی میں آ چکی تھی۔

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر مہناز! شاید آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ کوئی ایسی عورت ہو جو جلالی صاحب کو قربت مہیا کر سکے۔ لیکن یہ قربت تو وہ اپنے اردگرد موجود عورتوں سے حاصل کرتے ہی رہتے ہیں۔"

"لیکن یہ بھی تو ادھوری قربت ہی ہوتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ... میاں بیوی والی قربت... مگر اس عمر میں اور اتنی بیماریوں کے ساتھ...؟"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" اس نے ہولے سے کہا پھر جلدی سے موضوع بدل کر بولی۔ "آپ کے اور میرے درمیان گہرے اعتماد کا رشتہ ہے تابش! میں پھر کہوں گی کہ ہمارے درمیان جو باتیں ہوں، وہ ہمارے درمیان ہی رہنی چاہئیں۔ یہی اعتماد ہے جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے کھل کر بات کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری یہ ڈسکشن جلالی صاحب کو ان کے مسئلوں سے چھٹکارا دلانے میں معاون ثابت ہو۔ کتنا اچھا ہو کہ کسی طرح ہم جلالی صاحب کو باکس والی ذمے داری چھوڑنے پر آمادہ کر لیں۔"

میں نے کہا۔ "مہناز! میں اپنی طرف سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس اعتماد کو ذرا سی بھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ بس اس حوالے سے میں عمران کی بات ضرور کرنا چاہوں گا۔ آپ اس معاملے میں مجھے اور عمران کو ایک "اکائی" سمجھ لیں تو آپ کی مہربانی ہوگی... میں حلفیہ کہتا ہوں ڈاکٹر مہناز! میں اس شخص پر اپنی ذات ہی کی طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔"

میرے اور ڈاکٹر مہناز کے درمیان کچھ دیر تک اس موضوع پر بات ہوئی اور میں اسے قائل کرنے میں کامیاب رہا۔ تب گفتگو کا رخ ایک بار پھر جلالی کے عجیب وغریب کردار کی طرف مڑ گیا۔ مہناز ان کی تعریفیں کرنے لگی... اور یہ تعریفیں بے جا بھی نہیں تھیں۔ جلالی صاحب ایک نہایت پڑھے لکھے، بین الاقوامی شہرت کے حامل شخص تھے۔ جنگلی حیات کے معاملات پر انہیں اتھارٹی مانا جاتا تھا۔ غیر ملکی اور ملکی سلیبس کی کتابوں میں ان کا ذکر موجود تھا۔ بے شک وہ غصے کے بہت تیز تھے اور اس کے علاوہ بھی ان کی شخصیت میں کج روی تھی مگر ان کے کردار کے اخلاقی پہلو بھی قابل ذکر تھے۔ انہیں غیر ملکی شہریت کی آفرز ہوئیں لیکن وہ سچے پاکستانی تھے، انہوں نے اپنی مٹی نہیں چھوڑی۔ وہ ماضی کی خوب صورتیوں میں زندہ رہنے والے شخص تھے۔ وہ جوانی میں اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے لیکن ان کا نام ہر قسم کی آلائش سے پاک رہا۔ وہ سچ کی حمایت میں بولنے والے اور

پھر ڈٹ جانے والے شخص تھے۔ ایک ایسا بندہ جس کے کمزور جسم کے اندر ایک طاقتور مزاحمت کار موجود تھا۔ مہناز نے ذہانت اور معاملہ فہمی کے حوالے سے بھی جلالی کی تعریف کی۔

میں نے کہا۔ "اس میں تو کوئی شک نہیں مہناز! اب ان کا یہ فیصلہ ہی دیکھو کہ انہوں نے "باکس" کے بارے میں اپنے سوا اور کسی کو بتایا ہی نہیں۔ اگر بتایا ہوتا تو باکس کب کا ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا۔"

"ہاں، انہیں معلوم تھا کہ یہ لوگ باکس کی خاطر فارم ہاؤس کے مکینوں پر تشدد کی راہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ خود ان پر بھی تشدد ہو سکتا تھا لیکن صرف ایک حد تک۔ تشدد کرنے والے انہیں زندگی سے محروم کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے اور وہ اب بھی نہیں لے سکتے... وہ اب جان چکے ہیں کہ جلالی صاحب کے سوا باکس کا علم اور کسی کو نہیں۔ اور وہ یہ بھی جان چکے ہیں کہ جلالی صاحب کئی بیماریوں کے نشانے پر ہیں، انہیں کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے اور اگر کچھ ہو گیا تو وہ باکس آرا کوئے سمیت ہمیشہ کے لیے لاپتا ہو سکتا ہے۔"

"بے شک۔" میں نے تائید کی۔ "ہم یہی فرض کر لیں کہ جلالی صاحب نے باکس، کسی درخت کی جڑوں میں گڑھا کھود کر دبا دیا ہے۔ اب فارم ہاؤس کے اردگرد ہزاروں درخت ہیں... کوئی کہاں تک ڈھونڈ سکتا ہے؟"

ڈاکٹر مہناز نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میں کل رات بھی دیر تک سو نہیں سکی۔ بار بار تم دونوں کی بنائی ہوئی ویڈیو کے منظر نگاہوں میں گھومتے رہے ہیں۔ ماننا پڑتا ہے، یہ واقعی دل گردے کا کام تھا۔ بغیر کسی حفاظتی انتظام کے تم لوگ جاوے جیسے شخص کے ٹھکانے میں گھسے اور اس کے دو بندوں کو قتل کر کے دندناتے ہوئے واپس آ گئے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ میں تم دونوں کے بارے میں الجھتی جا رہی ہوں۔ تم... بہت خطرناک لوگ ہو۔ کسی وقت ڈر لگنے لگتا ہے۔"

"دشمنوں کو تو ڈرنا چاہیے لیکن یہ ہمارے لیے بڑی شرمندگی کی بات ہے کہ دوست ہم سے ڈر رہے ہیں۔"

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ "انجانی چیز کا ڈر زیادہ ہوتا ہے۔ تم دونوں اپنے بارے میں کھل کر بتاتے بھی تو نہیں ہو۔"

"کیا تم نے اپنے بارے میں سب کچھ کھل کر بتا دیا ہے؟" میرے سوال پر وہ ایک دم چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ یقیناً اس کے چہرے پر رنگ بھی گزرا ہوگا جو نیم تاریکی کی وجہ سے نظر نہیں آیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے جلدی سے بات بدلی۔ "یہی کہ ہم ایک دوسرے پر جتنا زیادہ بھروسا کریں گے، اتنا ہی جلالی صاحب کا فائدہ ہوگا بلکہ یہاں موجود ہر شخص کا فائدہ ہوگا۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔"

مہناز کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ "ویڈیو کے منظر یاد آتے ہیں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ جاوے جیسا شخص چپکا بیٹھا رہے گا۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی بات کا ردعمل جتنا تاخیر سے ہو، اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔"

"ہاں ڈاکٹر! تمہاری بات کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔" اب ہم دونوں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے "تم" کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

ڈاکٹر مہناز نے آگے کو جھک کر اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے پیالے میں رکھی اور اس کی کلائیوں کی چوڑیاں، چھن چھنا کر کہنیوں کی طرف چلی گئیں۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ "کل تم نے یہ بات بالکل ٹھیک کہی تھی کہ ہمیں دیکھنا چاہیے... مختار ملک جیسی کوئی اور کالی بھیڑ تو کوٹھی یا فارم ہاؤس میں موجود نہیں۔"

"بالکل ڈاکٹر... سیانے یہی کہتے ہیں کہ کھلے دشمن سے چھپا دشمن کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

☆☆☆

نصرت نے فون پر مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ثروت سے ٹیلی فونک رابطہ رکھوں لیکن پتا نہیں کیوں ایک عجیب سی جھجک مانع ہوتی جا رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، میں اس کی بے رخی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی اور کی تھی مگر تصورات میں تو وہ میری ہی تھی۔ میں اپنے تصورات کا یہ شیش محل برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رات کا وقت تھا، موبائل فون میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ثروت کو کال کروں یا نہیں...

اچانک فون پر بیل ہوئی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا۔ یہ کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے "ہیلو" کہا۔

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایک جوان مردانہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو! آپ تابش صاحب بول رہے ہیں؟"

"آپ کون؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام یوسف ہے... یوسف فاروقی۔ میں آپ

کی کزن ثروت کا شوہر ہوں۔" دوسری طرف سے مسکراتی آواز میں کہا گیا۔

میں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں رہ گیا۔ پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ "جی... جی... میں نے آپ کے بارے میں سنا تھا لیکن آپ کے پاس میرا نمبر کیسے آیا؟"

"بس ایسے ہی آ گیا۔ دو تین دن پہلے تک میں آسٹریا میں تھا۔ ایک دن ویسے ہی نصرت کا موبائل دیکھ رہا تھا۔ "کال لوگ" میں دو تین جگہ "تابش بھائی" کی کال تھی۔ میں نے نصرت سے پوچھا لیکن وہ گول مول بات کر گئی۔ شاید آپ سے ملانا نہیں چاہتی تھی لیکن ہم تو جناب یاروں کے یار ہیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اچھے لوگوں سے ملتے ہیں۔ سوچا خود رابطہ کر کے دیکھتے ہیں۔"

مجھے نصرت پر غصہ آیا۔ اس سے بے پروائی ہوئی تھی۔ اپنے بہنوئی کی تجسس طبیعت کا اسے پتا ہی تھا۔ اسے میری کال DELETE کرنی چاہیے تھی۔ میں نے کہا۔ "خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے۔ نصرت کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میری تو چند دن سے بات نہیں ہوئی اس کے ساتھ۔"

"آپ کو تو باخبر ہونا چاہیے تابش صاحب! میرے اندازے کے مطابق تو آپ خاصے "انوالو" ہیں نصرت کے علاج میں۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں..."

"یہ تو آپ کا بڑا پن ہے نا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ ڈھنڈورا پیٹنے والوں میں سے نہیں۔ ورنہ یہ تو نمود و نمائش کا دور ہے۔ اور تو اور لوگ آٹے کی بوری ضرورت مند کے سر پر رکھتے ہیں اور تصویر کھنچواتے ہیں۔"

"لیکن..."

"میں سب جانتا ہوں تابش صاحب! آپ چھوڑیں اس موضوع کو۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ مجھے پتا ہے آپ ہی نے نصرت اور ثروت کو منع کیا ہوگا کہ اس سلسلے میں آپ کا نام نہ آئے۔ بزرگوں نے درست کہا ہے کہ کسی کے کام آیا جائے تو اس طرح کہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور ایک ہاتھ سے دیا جائے تو دوسرے کو پتا نہ چلے... ویسے آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا ہو تو اس کا کیا طریقہ ہے؟"

وہ واقعی چرب زبان شخص تھا۔ میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔ "آپ تو غالباً لاہور میں ہیں لیکن میں لاہور سے باہر ہوں اور ابھی مصروف بھی ہوں۔ چند دن بعد کوئی وقت رکھ لیتے ہیں۔"

"لیکن ملاقات ہونی بہت ضروری ہے۔" اس نے "ہونی" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کیونکہ آپ کو ایک دو غلط فہمیاں ہیں جو دور ہونی چاہئیں۔" میں نے مسکراتے لہجے میں جواب دیا۔

کچھ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

میں نے فوراً نصرت کو فون کیا۔ "ہیلو تابش بھائی، کیسے ہیں؟" اس کی بشاش آواز سنائی دی۔

"میں زیادہ ٹھیک نہیں ہوں۔" میں نے ناراض لہجے میں کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تمہارے یوسف بھائی جان کا فون آیا تھا۔"

وہ حیران رہ گئی۔ میں نے اسے تفصیل بتائی اور ساتھ ہی غصے کا اظہار بھی کیا کہ اس نے میری کالز کا ریکارڈ حذف کیوں نہیں کیا۔ وہ سٹپٹائی آواز میں بولی۔ "لیکن تابش بھائی! یہ بھی تو سراسر غلط ہے نا۔ یوسف بھائی کیوں جاسوسیاں کرتے پھر رہے ہیں؟ انہیں میری اجازت کے بغیر میرا موبائل دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں ابھی انہیں فون کر کے پوچھتی ہوں۔"

"یہ تم غلطی کے اوپر ایک اور غلطی کرو گی۔" میں نے کہا۔ "اب اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ تمہاری کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ یہ کوئی "ٹاپ سیکرٹ" تھا جو افشا ہو گیا ہے۔ یوسف اس بارے میں تم سے بات کرے گا لیکن تم نے ہرگز یہ تسلیم نہیں کرنا کہ میں نے علاج کے لیے کوئی رقم وغیرہ دی ہے۔ ہاں، تم یہ کہہ سکتی ہو کہ علاج کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ وغیرہ ہوتا تھا۔ میرے اور ثروت کے پرانے رشتے کے بارے میں بھی از خود کچھ نہیں بتانا۔ اگر اسے اپنے آپ پتا چل جائے تو اور بات ہے۔"

وہ بے پروائی سے بولی۔ "میں تو کہتی ہوں بھائی جان... یوسف بھائی کو جو پتا چلتا ہے، چل جائے۔ انہوں نے جو بم چھوڑنا ہے چھوڑ لیں۔ ہم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ گناہ وہ کر رہے ہیں۔ باجی کو اپنے مطلب کے لیے بیدردی سے استعمال کر رہے ہیں۔"

میں نے نصرت کو سمجھایا بجھایا کہ وہ جذباتی رویہ نہ اپنائے۔ اس کا پارا نیچے آ گیا۔ وہ مجھے اپنی صحت اور علاج کے بارے میں بتانے لگی۔ دیگر معاملات پر باتیں کرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "ثروت کہاں ہے؟"

وہ پورا نقشہ کھینچتے ہوئے بولی۔ "باہر لابی میں بیٹھی ہیں۔ میں کھڑکی سے انہیں دیکھ سکتی ہوں۔ سرخ سویٹر پہن رکھا ہے، کندھوں پر ہلکی گلابی شال ہے۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا کی وجہ سے ان کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ فیض احمد فیض کی شاعری پڑھ رہی ہیں۔ اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ کیا بتاؤں۔ وہ گریس، باجی کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہے۔ پلیز... پلیز! آپ ایک کام کریں۔ اسی وقت باجی کے نمبر پر کال کریں... پلیز۔" اس کے لہجے میں دنیا بھر کی التجا سمٹی ہوئی تھی۔

"لیکن اگر اس نے جواب نہ دیا تو؟"

"وہ دیں گی... ضرور دیں گی۔ اچھا، اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ آپ جلدی سے انہیں کال کریں۔" اس نے فون بند کر دیا۔

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر ہمت کر کے ثروت کا نمبر ملایا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جو ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھی۔ ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے لیکن اب اسے کال کرتے ہوئے میں اندر سے کانپ رہا تھا۔ بیل ہوئی اور پھر ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف سے کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔

میں نے پھر کوشش کی... پھر ناکامی ہوئی۔ تیسری کوشش بھی ناکام ہوئی تو میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ میں نے خود کو ایک دم معمولی اور بے وقعت محسوس کیا۔ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ نہ سن سکے گا تیری صدا... جو چلا گیا اسے بھول جا۔

تیس چالیس منٹ بعد پھر بیل ہوئی۔ میں نے دیکھا، نصرت کا نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ وہ سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ "کیا کر رہے ہیں بھائی جان؟"

"بیٹھا افسوس کر رہا ہوں کہ میں نے کیوں کال کی۔"

"ایسی بات نہیں ہے بھائی جان۔ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ آپ نہیں دیکھ رہے۔ جب آپ کی کال آ رہی تھی، باجی کے چہرے کے رنگ دیکھنے والے تھے۔ انہوں نے خود کو پتا نہیں کس طرح کال ریسیو کرنے سے روکا۔ پھر ساتھ والے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر نکلی ہیں تو آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے پتا ہے رو رہی ہیں لیکن کہہ رہی تھیں کہ الرجی ہو رہی ہے، چھینکیں آ رہی ہیں۔ بھلا کوئی آواز کے بغیر بھی چھینک مارتا ہے تابش بھائی جان؟" وہ ذرا شوخی سے بولی۔

"اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟"

"اس میں خوش ہونے کی بات نہیں ہے۔ خوش ہونے کی بات دوسری ہے۔" وہ اسی ترنگ میں بولی۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے لاہور سے یوسف بھائی کا فون آیا تھا۔"

"پھر؟"

"باجی نے ان کا فون بھی نہیں سنا۔" نصرت بہت خوش تھی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولی۔ "میرے خیال میں یہ پہلا موقع ہے تابش بھائی جان کہ باجی نے اس طرح یوسف بھائی کی کال ریجیکٹ کی ہے۔ دن میں کم از کم چھ کالیں تو کرتے ہیں وہ۔ پتا نہیں، آج کل کیا ہو گیا ہے انہیں۔ اتنی فکر کیوں پڑی ہوئی ہے باجی کی؟ مجھے شک ہو رہا ہے کہ ادھر لاہور میں کوئی گڑبڑ نہ ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ فاروقی انکل وہاں آئے ہوئے ہوں۔ کسی طرح وہاں کے حالات کا پتا چلے نا۔"

نصرت نے حالات کا پتا چلنے کی بات کی تو میرے ذہن میں فوراً ملازمہ حمیدن کی صورت ابھر آئی۔ اس سے پہلے لاہور میں عمران کے ساتھی جیلانی نے یوسف کی اس ملازمہ کو بڑی خوبی سے شیشے میں اتارا تھا اور گراں قدر معلومات حاصل کی تھیں۔ میں نے نصرت سے تو نہیں کہا لیکن دل میں سوچا کہ ضرورت پڑنے پر حمیدن کو پھر متحرک کیا جا سکتا ہے۔

نصرت کی صحت کے معاملات پر کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا۔ اس کوریڈور میں ایک بار پھر تاریکی چھائی ہوئی تھی جہاں سے گزر کر مہناز بڑی رازداری سے جلالی صاحب کے کمرے میں پہنچتی تھی۔ اپنی آمد و رفت سے پہلے وہ اس بلب کو یہاں سے اتار لیتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آج وہ پھر اپنے عمر رسیدہ شوہر کے پاس موجود ہے۔

اگلے روز جب سہ پہر کے وقت جلالی صاحب عمران کے ساتھ اپنے چڑیا گھر کا دورہ کرنے کے بعد فارم کے سیکیورٹی انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے، ڈاکٹر مہناز سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ اس نے خلافِ معمول ساڑی پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں میں ہفت رنگ چوڑیاں تھیں۔ تاہم وہ کچھ سست سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "کیا بات ہے ڈاکٹر! لگتا ہے کہ رات کو آپ کی نیند پوری نہیں ہوئی۔"

اس کے خوش نما چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا۔ تاہم فوراً بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو تابش! رات کافی دیر تک جاگتی رہی ہوں۔ وہ تمہاری خونخوار ویڈیو ذہن سے نہیں نکلتی۔

بہتر ہے کہ تم لوگ اسے ضائع کردو۔ وہ تمہارے خلاف دو بندوں کے قتل کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔"

"وہ بندے نہیں تھے مہناز... خونی جانور تھے۔ ایسے جانوروں کو جہنم داخل کرنے پر تو یار لوگوں کو انعام ملا کرتے ہیں۔"

"ویسے اندر سے جلالی بھی فکرمند ہیں۔ وہ سیکیورٹی مزید سخت کروا رہے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ جاوا نچلا نہیں بیٹھے گا۔"

میں نے کہا۔ "سیکیورٹی سے بھی زیادہ یہ بات اہم ہے کہ ہم اندر سے محفوظ ہوں۔ ہمیں پتا چلے کہ کوئی دوسرا "مختار ملک" تو یہاں موجود نہیں... اور... لگتا ہے کہ وہ ہے۔"

"مجھے بھی یہی پریشانی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہر وقت کوئی ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہے۔"

یہ وہی موضوع تھا جس پر ہم کل بھی "ڈسکس" کرتے رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "مہناز! اگر میں تم سے کہوں کہ کسی ایک شخص کا نام بتاؤ تو تم کس پر شک کرسکتی ہو؟"

اس کی چمکیلی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھریں۔ "کیا کہوں اس بارے میں... سیکریٹری عدیم تو ہر طرح بھروسے کا بندہ ہے۔ بابا طفیل اور فتح محمد وغیرہ خاندانی ملازم ہیں۔ ڈاکٹر عدیل کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ دیگر ملازموں میں وحید اور مصطفیٰ کے بارے میں، میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔"

میرے ذہن میں بار بار وہ ہیولا ابھر رہا تھا جسے میں نے چند روز پہلے جلالی صاحب کی پوٹھوہار جیپ کے پاس دیکھا تھا۔ وہ کس کا ہیولا تھا؟ یقیناً کسی ایسے شخص کا جو ہمارے اردگرد موجود تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی لاہور سے مہناز کی والدہ کی کال آگئی۔ یقیناً ماں اور بیٹی کے درمیان وہی موضوع شروع ہونے والا تھا جو اس سے پہلے بھی زیرِ بحث رہا تھا۔ لیکن ماں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ رسموں رواجوں سے باغی بیٹی اس حوالے سے انتہائی قدم اٹھا چکی ہے۔

وہ بہار کی ایک بڑی خوشبودار شام تھی۔ سہ پہر کو ہلکی پھوار پڑی تھی، اس کے بعد چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ اس دھوپ نے گل لالہ، گلِ عباسی، گلاب اور نرگس کے ان گنت پھول قرب و جوار میں مہکا دیے تھے۔ احاطے میں سفیدے اور سائپرس کے لاتعداد درخت تھے۔ ان دھلے دھلائے درختوں کے نیچے پھول دار بیلیں بہار دکھا رہی تھیں۔ ZOO کی طرف سے موروں کی "می آؤں" اور کوئل کی کوک سنائی دیتی تھی۔ ایک دم میرے سینے میں گھونسا سا لگا۔ یہ اپریل کی 18 تاریخ تھی۔ پچھلے چند سالوں میں یہ تاریخ مجھے کبھی نہیں بھولی تھی۔ یہی تاریخ تھی جب میں نے آخری بار ثروت کو چھوا تھا، اسے پیار کیا تھا۔ مجھے وہ منظر آج بھی پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ ثروت کے کپڑوں کا رنگ، اس کی لگائی ہوئی خوشبو، اس کی کی ہوئی باتیں، اس کا پیار، اس دن اسے کتنی بار چوما تھا، کتنی بار گلے لگایا تھا، کچھ بھی تو بھولا نہیں تھا۔ ان دنوں کتنے قریب آچکے تھے ہم۔ اپنے گھر کے لیے پردوں کے رنگ بھی ہم نے چن لیے تھے۔ وہ پکوان بھی منتخب کرلیے تھے جو ہمیں اپنے مہمانوں کو کھلانے تھے اور وہ تفریح گاہیں جہاں جہاں ہمیں پہنچنا تھا اور وہ موسم جو ہمیں دریافت کرنے تھے۔ مجھے آج بھی یاد تھا، 18 اپریل کو ہونے والی اس آخری ملاقات میں ہم نے ان پھولوں کے نام لیے تھے جو ہم نے اپنے باغیچے میں لگانے تھے۔ گلِ خیرو کے ذکر پر ہمارے درمیان تھوڑی سی پیار بھری لڑائی بھی ہوئی تھی۔ مجھے یہ پھول زیادہ پسند نہیں تھا مگر ثروت کو اچھا لگتا تھا... اور پھر وہ پھول رہا، نہ وہ پکوان، نہ وہ موسم جو ہم نے مل کر دریافت کرنے تھے۔ وہ ملاقات، پیار بھری آخری ملاقات ثابت ہوئی تھی۔ پیار کی کہانیوں میں یہ "آخر" کیوں آتا ہے...؟ کیوں آخری بار چھوا جاتا ہے؟ کیوں آخری نظر ڈالی جاتی ہے؟ کیوں آخری خط؟ کیوں آخری کال؟ کیوں آخری بوسہ؟ کیوں؟ ربِ کائنات نے پیار کے ساتھ جدائی کیوں لکھی ہے... یہ "آخری" کیوں لکھا ہے؟ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب پیار کرنے والوں کی زندگی میں یہ "آخری" آتا ہے، تو وہ اس کی موجودگی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ آخری ملاقات ہو رہی ہوتی ہے اور وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ آخری ہے۔ آخری کال ہو رہی ہوتی ہے اور پتا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد آوازیں دم توڑ جائیں گی۔ آخری بار چوما جا رہا ہوتا ہے اور خبر نہیں ہوتی کہ اب ہونٹوں کو عمر بھر ترسنا ہے... میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اس خوشبودار شام کو جانے نہ دیتا۔ اس شام کو اور اس میں موجود ساری دلکشیوں کو ثروت سمیت اپنے سینے میں چھپا لیتا اور کہیں دور نکل جاتا۔ واجی، تھانے دار اشرف اور سیٹھ سراج جیسے بدفطرت لوگوں کی دنیا سے بہت دور۔

سیٹھ سراج کا سراپا نگاہوں کے سامنے آیا تو میرا پورا وجود جلنے لگا۔ وہ میری محبت کا قاتل تھا، میری ماں کا قاتل تھا... اور وہ زندہ تھا۔ انہی گلی کوچوں میں کہیں دندنا رہا تھا۔

اپنی تمام تر خباثت اور فرعونیت کے ساتھ۔ اب وہ بونے سے دیو بن چکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کچھ اور پھیلا لیے تھے۔ اب وہ ایک ملک گیر شہرت کا حامل نہایت بااثر بدمعاش تھا۔ میرے اندر وہی شعلے دہکنے لگے جو مجھے اپنے آپ سے بیگانہ کردیتے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں بھاگتا چلا جاؤں، یہاں تک کہ بے دم ہوکر گر پڑوں۔ کوٹھی کے اردگرد مٹی کا ایک ٹریک موجود تھا۔ غالباً جب جلالی صاحب کی صحت قدرے بہتر تھی تو وہ یہاں چہل قدمی کیا کرتے ہوں گے یا پھر جاگنگ۔ میں شوز پہن کر اس ٹریک پر آیا اور بھاگنا شروع کردیا۔ میں بغیر دم لیے بھاگتا رہا... چکر پر چکر لگاتا رہا، یہاں تک کہ سانس نے سینے میں سمانے سے انکار کردیا۔ پسینا مساموں سے دھاروں کی صورت بہہ نکلا۔ یوں لگا کہ ٹانگیں بے جان ہوجائیں گی، میں لڑکھڑا کر گر جاؤں گا اور پھر اٹھ نہ سکوں گا۔ یہ برداشت کی انتہا تھی اور بارونداجیکی نے کہا تھا، جہاں برداشت کی انتہا ہونے لگتی ہے، وہیں سے کچھ حاصل ہونا شروع ہوتا ہے، وہیں سے معجزے پھوٹتے ہیں۔

ایک جگہ میرے قدم ڈگمگائے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی گر پڑوں گا۔ میں رک گیا اور سفیدے اور شیشم کے درختوں کے درمیان گھاس پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے فتح محمد نظر آیا۔ ہاں، وہ فتح محمد ہی تھا، وہ ایک دوسرے ملازم کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتا ہوا درختوں کے اندر سے گزر رہا تھا۔ میں نے اسے اس کے جثے اور چلنے کے انداز سے پہچانا۔ چند دن پہلے حملہ آوروں نے فارم میں گھس کر کھدائی کی تھی۔ مٹی کے وہ ڈھیر ابھی تک فارم میں موجود تھے۔ ایک ایسے ہی ڈھیر کے پیچھے ایک جگہ رک کر وہ دونوں رازداری سے باتیں کرتے رہے پھر فتح محمد نے اپنے ساتھی کا کندھا تھپتھپایا اور اس سے رخصت ہوکر آگے بڑھ گیا۔ گارڈز کے قریب پہنچ کر فتح محمد نے ان سے بھی تھوڑی سی بات چیت کی اور کوٹھی کے ایک عقبی دروازے کی طرف چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا دروازہ میں نے ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا لیکن آج یہ کھل گیا۔ اس کی چابی فتح محمد کے پاس موجود تھی۔ دروازے سے نکل کر اس نے باہر سے تالا لگا دیا۔ میرے ذہن میں ہلچل شروع ہوگئی۔ فتح محمد باہر جانے کے لیے یہ عقبی دروازہ استعمال کر رہا تھا اور اس کا انداز بھی مشکوک تھا۔ "وہ کہاں جا رہا ہے؟" یہ سوال شدت سے میرے ذہن میں ابھرا۔

میرا دل چاہا کہ اس کے پیچھے جاؤں لیکن سیکیورٹی ایجنسی کے نہایت چوکس گارڈز کی نظر میں آئے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی عمران نے اس سلسلے میں احتیاط برتنے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور گارڈز کے پاس پہنچ گیا۔ صرف تین چار دن پہلے جلالی صاحب ان گارڈز کے تین اہم افسران کو یہ ہدایات دے چکے تھے کہ سیکیورٹی کے حوالے سے مجھے اور عمران کو آگاہ رکھا جائے اور ہمارے ساتھ تعاون کیا جائے۔ یہ ہدایات اس وقت بہت کام آئیں۔ میں نے ایک سیکیورٹی انچارج فراست شاہ کو بتایا کہ میں فوری طور پر کوٹھی سے باہر جانا چاہتا ہوں اور عقبی دروازے سے جانا چاہتا ہوں... وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی اہم معاملہ ہے۔ اس نے نہ صرف کوٹھی کی چار دیواری پھلانگنے میں میری مدد کی بلکہ کوٹھی سے باہر موجود دوسرے سیکیورٹی انچارج کو بھی میرے بارے میں واکی ٹاکی کے ذریعے آگاہ کردیا۔ اب تک سیکیورٹی ایجنسی کے تقریباً سارے لوگ اچھی طرح جان چکے تھے کہ میری اور عمران کی اصل حیثیت باورچیوں کی نہیں ہے۔

میں نے باہر نکلتے ہی فارم ہاؤس کے سیکیورٹی انچارج قادر خان سے پوچھا کہ فتح محمد کس طرف گیا ہے۔ وہ فتح محمد کو اس کے نام سے نہیں جانتا تھا۔ تاہم اس نے کہا۔ "جو ملازم ابھی نکلا ہے، وہ ادھر فش فارم کی طرف گیا ہے۔"

یہ فش فارم بھی فارم ہاؤس کا حصہ ہی تھا۔ اس کے قریب ہی فارم ہاؤس کا بہت بڑا مرغی خانہ بھی تھا۔ میں فش فارم کی طرف لپکا۔ جلد ہی میں نے فتح محمد کو دیکھ لیا۔ وہ ایک ٹریکٹر ٹرالی کے پیچھے موجود تھا اور ایک پرانی موٹر سائیکل کو مسلسل ککیں مار رہا تھا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوکر نہیں دے رہی تھی اور اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسٹارٹ ہوگی بھی نہیں۔

میں فتح محمد سے کافی فاصلے پر تاریکی میں موجود رہا اور اس کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ وہ سخت جھلایا ہوا نظر آتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے موٹر سائیکل کو ایک طرف کھڑا کیا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا پیدل چلنے لگا۔ یہ صورتِ حال میرے لیے بہتر تھی۔ اگر موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوجاتی اور وہ آناً فاناً کسی طرف نکل جاتا تو میرے لیے مشکل کھڑی ہوجاتی۔ میں ایک محفوظ فاصلے سے فتح محمد کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس وہی یادگار چاقو تھا جس کی دھار نے چند ماہ پہلے جارج کورا جیسے فرعون صفت شخص کا خون چکھا تھا۔ اپنے پاس اس چاقو کی موجودگی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔

میری چھٹی حس نے کہا کہ آج کی رات فتح محمد کے لیے کچھ اچھی ثابت نہیں ہونے والی۔ آج میں بہت برے موڈ

میں تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے تک سیٹھ سراج کی منحوس صورت میری آنکھوں میں تھی اور میرا خون اچھالے مار رہا تھا۔ سیٹھ سراج تو نہیں ملا تھا تاہم اس کرنٹ چہرہ فتح محمد سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا اور اپنے تعاقب سے لاعلم تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایسے راستے اختیار کر رہا ہے جن پر سیکیورٹی گارڈز سے ملاقات ہونے کا امکان کم سے کم ہو... کچھ آگے جا کر اسے سیکیورٹی والوں کی پیٹرولنگ جیپ کی نیلی بتی نظر آئی تو وہ دو تین منٹ کے لیے گھنی جھاڑیوں میں ٹھہر گیا۔ جیپ آگے نکل گئی تو اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ آج میں اس بندے کی حقیقت جاننے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو اپنے سیل فون کے ذریعے عمران کو بھی آگاہ کر سکتا تھا اور ممکن تھا کہ وہ بھی میری اس کوشش میں شریک ہو جاتا لیکن پتا نہیں کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ شاید میرے اندر یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں ہر کام میں عمران کا سہارا نہ لوں، عمران خود بھی تو یہی چاہتا تھا۔

قریباً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد فتح محمد اچانک اس پختہ سڑک پر آ گیا جو آگے جا کر لاہور جانے والی مین روڈ سے مل جاتی تھی۔ اس تیس فٹ چوڑی سڑک پر زیادہ تر تانگے، ٹریکٹر ٹرالیاں اور سائیکل یا موٹر سائیکل ہی نظر آتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی کھٹارا لوکل بس بھی گزر جاتی تھی۔

مجھے پھر پریشانی لگ گئی۔ اگر یہاں فتح محمد کسی گاڑی پر سوار ہو جاتا تو میں اس کا تعاقب جاری نہ رکھ سکتا۔ ابھی اس اندیشے نے ذہن میں سر اٹھایا ہی تھا کہ اس کی عملی صورت سامنے آ گئی۔ فتح محمد نے ایک ٹریکٹر ٹرالی والے کو ہاتھ دے کر روکا۔ ٹریکٹر ٹرالی والا رک گیا۔ غالباً اس نے فتح محمد کو جلالی فارم ہاؤس کے ملازم کی حیثیت سے پہچان لیا تھا۔ اردگرد کے دیہاتی جلالی صاحب کے نام کی توقیر کرتے تھے۔ فتح محمد ٹریکٹر پر ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ٹرالی روانہ ہو گئی۔ میں نے تیزی سے سوچا، اب میرے پاس راست اقدام کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا، ایک موٹر سائیکل سوار آ رہا تھا۔ اس نے کیریئر پر کوئی وزنی شے باندھ رکھی تھی۔

میں اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور ہاتھ دے کر اسے روک لیا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک گوالا ٹائپ شخص تھا۔ قد ساڑھے چھ فٹ سے کیا کم ہوگا۔ اس نے موٹر سائیکل کی دونوں جانب دودھ والے برتن لٹکائے ہوئے تھے۔ ”کیا بات ہے بھئی؟“ اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

”دیکھو... میں پولیس والا ہوں۔ مجھے تمہاری موٹر سائیکل چاہیے... تھوڑی دیر کے لیے۔ نیچے اترو۔“

”اوئے تم کون سے پولیس والے ہو؟ یہاں کے پولیس والوں کو میں جانتا ہوں۔“

وہ لمبی بحث کرنے کے موڈ میں تھا اور خاصا اکھڑ مزاج بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں میرا جثہ تو عام سا تھا اس وجہ سے اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔ میرے پاس وقت نہیں تھا ورنہ شاید میں اس سے یہ سلوک نہ کرتا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور سخت جھلاہٹ کے عالم میں کھینچ کر سڑک سے نیچے نشیبی جگہ پر لڑھکا دیا۔ موٹر سائیکل پہلو کے بل گر گئی تھی۔ وہ مزاحمت کے موڈ میں تھا، گر کر فوراً ہی کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس پر جست لگائی اور جبڑے پر دو شدید ضربیں لگا کر اسے ناکارہ کر دیا۔ اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز بڑی واضح تھی۔

میں بھاگ کر واپس سڑک پر آیا۔ ایک برتن سے دودھ بہہ کر سیاہ سڑک پر لکیریں بنا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے سڑک خالی ہی تھی۔ دور اس ٹرالی کی عقبی بتیاں نظر آ رہی تھیں جس پر لفٹ لے کر فتح محمد بڑی سڑک کی طرف گیا تھا۔ گرنے کے باوجود موٹر سائیکل ابھی اسٹارٹ ہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور ٹریکٹر ٹرالی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ احتیاطاً میں نے ہیڈ لائٹ آف کر دی تھی۔

یہ تعاقب زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ بڑی سڑک سے ڈیڑھ دو کلومیٹر پہلے ہی ٹرالی رکی اور فتح محمد اس پر سے اتر آیا۔ میں نے بھی موٹر سائیکل درختوں کے نیچے روک دی۔ یہ فیکٹری ایریا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر چند ایک کوٹھیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ فتح محمد ان کوٹھیوں کی طرف چل دیا۔ میں نے موٹر سائیکل سڑک کی ڈھلوان پر جھاڑیوں کے اندر چھپائی اور فتح محمد کے پیچھے روانہ ہوا۔ اب مجھے فتح محمد سے اپنا فاصلہ کم کرنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ یکایک کہیں اوجھل ہو جاتا اور میں منہ دیکھتا رہ جاتا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا۔

فتح محمد کوٹھیوں کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر کافی آگے جا کر وہ درختوں میں گھری ہوئی دو تین کنال کی ایک کوٹھی کے پاس پہنچ گیا۔ کوٹھی کا زیادہ تر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بس ایک دو کھڑکیوں میں ہی روشنی دکھائی دیتی تھی یا پھر گیٹ کے قریب ایک بلب جل رہا تھا۔ فتح محمد کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ کوٹھی کی دس بارہ فٹ اونچی باؤنڈری وال پھلانگنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں کیکر کے

درختوں میں چھپ کر اس کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک کھیت میں پرالی کے گٹھے پڑے تھے اور ایک گدھا گاڑی بندھی ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے فتح محمد نے ساری منصوبہ بندی پہلے سے کر رکھی ہے۔ وہ پرالی کا ایک گٹھا اٹھا کر لایا اور کوٹھی کی چار دیواری کے پاس رکھ دیا۔ پھر وہ دوسرا اور تیسرا گٹھا اٹھا لایا۔ اس نے کل پانچ گٹھے دیوار کے قریب رکھے اور اوپر چڑھنے کا انتظام کر لیا۔ وہ قدرے بھاری جسم کا تھا اور فارم ہاؤس میں سستی کا شکار نظر آتا تھا مگر اب اس کی پھرتی قابل دید تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ دیوار پر چڑھ کر کوٹھی کے اندر اوجھل ہو گیا۔

میں اپنی جگہ جامد کھڑا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ فتح محمد کے پاس کوئی ہتھیار موجود ہے اور وہ اس کوٹھی کے مکینوں کو آڑے ہاتھوں لینے والا ہے۔ عین ممکن تھا کہ کوٹھی کے اندر فتح محمد کا کوئی ساتھی پہلے سے موجود ہوتا۔

ایک طرف سے دو بندے نمودار ہوئے۔ انہوں نے درخت سے گدھا کھولا اور اسے ریڑھی میں جوتنے لگ گئے۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ایک بولا۔ ”اب بتا فلم دیکھنی ہے کہ بازارِ حسن جانا ہے؟“

دوسرا بولا۔ ”تو تو اسٹیج ڈرامے کی بات کر رہا تھا۔“

پہلے نے کہا۔ ”اوئے بھوتنی دے۔ یہ اسٹیج ڈراما بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے نا۔“

دونوں گندے انداز میں ہنسنے لگے اور ان واہیات گالیوں کی بات کرنے لگے جنہیں لوگ غلطی سے جگت کہہ دیتے ہیں۔ اتنے میں ایک اور لڑکا بھی اس ”فلمی بحث“ میں شریک ہو گیا۔ اس نے بال بھن ایک کر دینے والی کچھ تازہ ”جگتوں“ کا ذکر کیا اور ایک ایسے گانے کی تشریح کی جسے سن کر بچہ بالغ اور بالغ آگ بگولا ہو سکتا تھا۔

ان تینوں نے وہاں سے ٹلنے میں دس پندرہ منٹ لگا دیے۔ میرے اندر جو چنگاریاں بھڑک رہی تھیں، انہوں نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں کوٹھی کے اندر جانا چاہتا تھا اور پرالی کے وہ گٹھے ابھی تک وہیں موجود تھے جنہیں فتح محمد چھوڑ گیا تھا۔ گدھا گاڑی پر تفریح کے لیے روانہ ہونے والے تینوں لڑکوں میں سے کسی کی نظر ان گٹھوں پر نہیں پڑی تھی۔ چند منٹ بعد میں اردگرد سے پوری طرح مطمئن ہو گیا اور پھر ان گٹھوں پر چڑھ کر کوٹھی کے احاطے میں کود گیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے اپنا سیل فون آف کر کے کبھی گھاس میں چھپا دیا تھا۔

دوسری طرف مکمل تاریکی تھی اور یوں لگتا تھا کہ کوئی متنفس موجود نہیں ہے۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اچانک پورچ کی طرف سے کتوں کی آواز سنائی دی اور دو عدد دیوہیکل کتے برق رفتاری سے میری طرف بڑھے۔ ان کے عقب میں مجھے چند افراد کے ہیولے بھی دکھائی دیے۔ مجھے لگا جیسے یہ لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔

کتوں کو اپنی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھنا ایک لرزہ خیز تجربہ تھا۔ مگر آج 18 اپریل کے حوالے سے میرے اندر جو آگ بھڑکی ہوئی تھی، اس نے میرے ہر خوف کو کیش کی دبیز تہوں کے اندر چھپا دیا تھا۔ میں بھاگنے یا پیچھے ہٹنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جارج گورا کے سینے میں اترنے والا چاقو میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ جونہی بھاری جسم والے بپھرے ہوئے کتے نے مجھ پر جست کی، میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے ساتھ ساتھ میں تھوڑا سا بائیں جانب بھی ہٹا۔ میں نے چاقو کو حرکت دی۔ وہ کتے کی گردن کو سینے تک چیرتا چلا گیا۔ ایک لرزہ خیز آواز کے ساتھ کتا، پکی زمین پر دور تک لڑھک گیا۔ دوسرا کتا میرے پہلو سے ٹکرایا۔ یوں لگا کہ کسی بھینسے نے اپنے سینگوں سے مجھے ضرب لگائی ہو۔ اس طاقتور دھکے نے مجھے کروٹ کے بل گرایا۔ کتا میرے اوپر تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے خارج ہونے والی تیز حیوانی بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس کی خونی آنکھیں ایک لمحے کے لیے میری نگاہوں میں چمکیں۔ مجھے ایک ساعت کی دیر ہوتی تو وہ اپنے دانتوں میں میرا نرخرہ دبوچ لیتا۔ میں نے تیز دھار چاقو کو افقی رخ پر حرکت دی اور تقریباً ایک فٹ تک کتے کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ پھر اسے اپنے پاؤں پر اچھالا اور دور پھینک دیا...

دو سائے مجھ پر جھپٹے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرے سر پر خون سوار ہے اور میرے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جو میری رگوں میں سیال آگ دوڑا دیتا ہے۔ آگے آنے والے شخص نے میرے سر پر رائفل کے دستے سے طوفانی ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور چاقو دستے تک اس کی ناف میں گھسا دیا۔ وہ دردناک آواز میں چلایا۔ پیچھے آنے والے شخص نے جو کچھ کیا اور جواب میں، میں نے جو کچھ کیا، وہ بالکل ایکشن ری پلے جیسا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس شخص کی رائفل پر سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سنگین سے نشانہ بنانا چاہا۔ میں نے جھک کر یہ وار خالی دیا اور اس کی ناف میں بھی دس انچ کا پھل

اتار دیا۔

ایک گولی چلی لیکن اس نے مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔ دو تین افراد مجھ پر جھپٹے... میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی تھی۔ مجھے یہ افراد مٹی کے پتلوں کی طرح نظر آئے۔ میں نے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میری وحشت ان پر حاوی ہو گئی۔ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بھاگتے ہوئے افراد کی ٹانگوں پر گولیاں چلائیں۔ ان میں سے ایک اوندھے منہ پورچ کے فرش پر گرا۔ پورچ میں کھڑی ہنڈا اکارڈ کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔

بھاگنے والے افراد نے کوٹھی میں گھس کر دروازے بند کر لیے۔ وہ جیسے مورچا بند ہو گئے تھے۔ میں نے بہت سنا تھا کہ سر پر خون سوار ہو جاتا ہے۔ آج سچ مچ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں مار دینا چاہتا تھا اور مر جانا چاہتا تھا۔ یہ دنیا زندہ رہنے کی جگہ نہیں تھی۔ سیٹھ سراج جیسے لوگوں نے اسے زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اور آج 18 اپریل تھی۔ میری موت تو شاید اسی دن واقع ہو گئی تھی۔ آج دوبارہ میں لاش میں تبدیل ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ سیٹھ سراج میرے سامنے نہیں تھا لیکن سیٹھ سراج جیسے لوگ تو تھے۔

پاس ہی ایک لینڈ روور جیپ کھڑی تھی، اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ غالباً میری آمد سے پہلے بوگیر کتے اور مسلح افراد اس جیپ پر بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے۔ اب بوگیر کتے باؤنڈری وال کے پاس نیم مردہ پڑے تھے اور تین افراد بھی شدید زخمی حالت میں تڑپ رہے تھے۔

میں جیپ کے اندر گھسا۔ اسے پہلے گیئر میں ڈال کر میں نے کلچ چھوڑا اور ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔ ایک برق رفتار یوٹرن لے کر میں نے بھاری بھرکم جیپ کا رخ کوٹھی کے اندرونی دروازے کی طرف کر دیا۔ یہ اندرونی دروازہ تقریباً سات فٹ چوڑا اور نہایت بیش قیمت دکھائی دیتا تھا۔ جیپ نے خوفناک رفتار سے پورچ کی دو سیڑھیاں طے کیں اور پھر ایک دھماکے سے ساگوانی دروازے سے ٹکرا گئی۔ دروازے کے پرخچے اڑے، شیشے کی سیکڑوں کرچیاں ہوا میں بکھرتی نظر آئیں۔ مجھے اپنے گھٹنوں اور کہنیوں میں درد کا احساس ہوا لیکن اس احساس میں ایک ہیجانی سا لطف تھا۔ اب جیپ کوٹھی کے شیش محل جیسے کامن روم میں تھی۔ میں نے ایک بندے کو رائفل تانتے ہوئے دیکھا اور اندھا دھند جیپ اس پر چڑھا دی۔ دو فیشن ایبل لڑکیاں چلاتی ہوئی دروازوں میں اوجھل ہو گئیں۔ جیپ ایک قیمتی صوفے کا کچرا بنا کر ایک شوکیس کو الٹاتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ ایک بیش قیمت فانوس پکے ہوئے پھل کی طرح چھت سے گرا اور چکنا چور ہو گیا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ اردگرد گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ یکا یک عقب سے کسی نے میرے سر پر رائفل کے کندے سے شدید ضرب لگائی۔ اس سے پہلے کہ میں گھومتا، ایک اور ضرب لگی۔ میں نے حملہ آور کی طرف رائفل گھمائی۔ دو افراد پہلو سے آئے اور بھیڑیوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ میں اوندھے منہ گرا۔ میں سنبھلنا چاہتا تھا مگر سنبھل نہیں سکا۔ کئی اور افراد مجھ سے لپٹ گئے۔ رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ کسی نے میری قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور خون آلود چاقو بھی نکال لیا۔ وہ مجھ پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کرنے لگے۔ میری قوتِ برداشت ان کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ میں بُری طرح گھرا ہونے کے باوجود زبردست مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ حیران تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ میں کسی بھی وقت ان کے ہاتھ سے نکل جاؤں گا۔ پھر میرے گھٹنے پر رائفل کے دستے کی ایک شدید چوٹ لگی۔ اسی جگہ پر لگنے والی یہ دوسری چوٹ تھی۔ مجھے اپنی ٹانگ سن ہوتی محسوس ہوئی۔ میں لڑکھڑا کر گرا۔ انہوں نے ہر طرف سے مجھے دبوچ لیا۔

جس شخص نے جارج گورا والا چاقو نکالا تھا، اس نے اسے کھولا اور دہاڑا۔ ”مار دو کتے کو۔“ وہ مجھ پر جھپٹا۔

ایک دوسرا شخص اس کے سامنے آیا۔ ”کیا کرتے ہو؟ ہوش میں تو ہو؟“

وہ مجھے بُری طرح پیٹنا چاہتے تھے لیکن پیٹنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ مجھے چھوڑتے۔ انہوں نے مجھے ہر طرف سے دبوچ رکھا تھا... اور دبوچے رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اسی طرح میرا سر پختہ فرش سے ٹکرانے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا کریں۔ میری ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ ایک آواز ابھری۔ ”اسے بھی اس کے یار کے پاس پہنچاؤ۔“

انہوں نے میرے ہاتھ پشت پر موڑ کر رسّی سے باندھے اور مجھے فرش پر اوندھے منہ گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے گئے۔ کامن روم میں گھسی ہوئی جیپ ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ احاطے کی طرف سے گاہے گاہے ایک زخمی کتے کی کربناک آواز ابھرتی تھی۔ وہ لوگ ایک کوریڈور سے گزرے۔ ایک دروازہ کھولا گیا اور مجھے نیچے جاتی ہوئی سیڑھیوں پر دھکا دے دیا گیا۔ تیرہ چودہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا میں پختہ فرش پر گرا۔ ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود میرا چہرہ مزید زخمی ہونے سے محفوظ رہا۔ بس کندھوں اور سینے پر

کچھ چوٹیں آئیں۔۔۔ سیڑھیوں والا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا گیا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اردگرد دیکھا۔ یہ بیسمنٹ ایک ہال کمرے جیسا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان ایک بڑی کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا اس جگہ دو افراد اور موجود تھے۔ ایک کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کافی دیر سے یہاں بند ہے۔ غالباً وہ کسی نشے کے زیرِ اثر سویا ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ میری دھماکا خیز آمد کے باوجود وہ اسی طرح پڑا رہا تھا۔ یہاں موجود دوسرے بندے کو دیکھ کر میں بے طرح چونکا۔ یہ فتح محمد تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اسے بُری طرح پیٹا گیا ہے۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا۔ سر پھٹ چکا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک شلوار تھی۔ وہ بھی نیچے کھسکی ہوئی تھی اور اس کے ستر کو بس جزوی طور پر ہی چھپا پا رہی تھی۔ فتح محمد نیم بے ہوش تھا اور اسی عالم میں اس کی سیاہی مائل تو ند، سانس کی ضرورت کے تحت بے ساختہ پھول پچک رہی تھی۔

میرے ہاتھ افراتفری میں باندھے گئے تھے۔ میں نے معمولی کوشش کے ساتھ انہیں کھول لیا۔ میں نے فتح محمد کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ ”اٹھو، ہوش کرو۔“

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اور کراہ کر رہ گیا۔ اس کے سر کی چوٹ شدید تھی، مسلسل خون رس رہا تھا۔ قریب ہی ایک ٹرے میں کھانے کے جھوٹے برتن پڑے تھے۔ اسٹیل کے ایک جگ میں پانی بھی تھا۔ میں نے فتح محمد کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے مگر اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

میرے کانوں میں تھوڑی دیر پہلے سنا ہوا وہ فقرہ گونجنے لگا جو کسی شخص نے بولا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”اسے بھی اس کے یار کے پاس پہنچا دو۔“

یعنی یہ لوگ مجھے اور فتح محمد کو ایک ہی سمجھ رہے تھے۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ اس کوٹھی میں گھستے ہی مجھے دھر کیوں لیا گیا تھا۔ فتح محمد کے پکڑے جانے کے بعد یہ لوگ پوری طرح الرٹ ہو چکے تھے۔ لہٰذا میں جونہی احاطے میں کودا، وہ مجھ پر پل پڑے۔۔۔ لیکن میں ان کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ میں نے دو اور چار ٹانگوں والے کم از کم چھ کتوں کو جان لیوا طور پر زخمی کیا تھا۔ آخری زخمی وہ تھا جس پر میں نے جیپ چڑھائی تھی۔ میں اس گنتی میں اسے شامل نہیں کر رہا۔

صورتِ حال نے عجیب پلٹا کھایا تھا۔ میں جب فارم ہاؤس سے چلا تو میری نظر میں فتح محمد ایک مشکوک شخص تھا اور اس کے لیے میرے اندر ایک طیش پرورش پا رہا تھا۔ مگر اب اس طیش کا رخ اس کوٹھی میں موجود غنڈا صفت لوگوں کی طرف ہو گیا تھا۔ یہ بات ابھی تک ایک معما تھی کہ فتح محمد چوری چھپے یہاں کیوں گھسا اور کیوں اسے یوں بُری طرح زخمی کیا گیا؟ کیا وہ کسی واردات کی نیت سے آیا تھا، یا یہ آپس کا کوئی گروہی جھگڑا تھا؟

اسی دوران میں سیڑھیوں کے دروازے کے قریب ہنگامے کے آثار نظر آئے۔ یوں لگا کہ کوئی شخص دہاڑ رہا ہے اور دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دوسرے اسے روک رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اوپر مجھ کو چاقو سے قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، انور ناتی یہ شخص اس زخمی کا بھائی تھا جس کی ناف میں، میں نے چاقو اتارا تھا۔ وہ اسپتال روانہ ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گیا تھا۔ اب یہ شخص غم و غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔

میرا جسم چوٹوں سے معمور تھا۔ خاص طور سے ٹانگ میں زبردست ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن یہ سب کچھ مجھے مزہ دے رہا تھا۔ میرے اندر چوٹوں اور تکلیف کی طلب بڑھ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں پکار رہا تھا۔ ”آؤ، میرے سامنے آؤ۔ دو دو تین تین ہو کر آ جاؤ۔ مجھ سے لڑو۔ تم مجھے مار دو یا میں تمہیں مار دوں۔“ ہاں، آج 18 اپریل تھی۔ آج کے دن وہ جدا ہوئی تھی مجھ سے۔ آج کے دن میں مرا تھا۔ آج کے دن دوبارہ مر جاتا تو کیا فرق پڑ جاتا۔

دو تین گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ رات کا تہ جانے کون سا پہر تھا۔ میں اونگھ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ پھر کہیں پاس سے ایک جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”میں خود دیکھ لیتا ہوں۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔“

میں دھوکا نہیں کھا رہا تھا۔ یہ آواز جلالی صاحب کے وفادار ساتھی ”سیکریٹری ندیم“ کی تھی۔ میرے اندر امید کی کرن روشن ہوئی۔ ”تو کیا عمران اور دیگر لوگ یہاں پہنچ گئے تھے؟ کیا پولیس بھی ان کے ساتھ تھی؟ کیا انہوں نے اس کوٹھی کے مسلح مکینوں کو زیر کر لیا تھا؟“ ایسے کئی سوال ذہن میں چمکے۔ بیسمنٹ کے ساتھ والے پورشن میں روشنی ہوئی پھر میں نے آہنی سلاخوں کی طرف سیکریٹری ندیم کو دیکھا۔۔۔ ہاں وہ ندیم ہی تھا مگر جس حلیے میں تھا، وہ چونکا دینے والا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک انڈرویئر تھا۔ ہاتھ میں وِسکی کا جام اور

ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ ایک پری پیکر اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس نے ایک ”نائٹ گاؤن“ پہن رکھا تھا۔ لیکن یہ اتنا باریک تھا کہ اپنے ہونے پر شرمندہ دکھائی دیتا تھا۔۔۔ اس کے اندر پری پیکر کا جسم اسی طرح دہک رہا تھا جیسے مہین چلمن کے پیچھے شمع دہکتی ہے۔ پری پیکر کے قد و خال میں ایک خاص بات تھی اور اس نے مجھے حیران کیا۔۔۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرانی مجھے سیکریٹری ندیم کے حوالے سے تھی۔ اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ جلالی صاحب کا وفادار ترین ساتھی یہاں ایک بالکل مختلف روپ میں موجود تھا۔ ہم جب فارم ہاؤس میں کسی کالی بھیڑ کے بارے میں سوچتے تھے تو بہت سے ملازمین کی طرف دھیان جاتا تھا لیکن سیکریٹری ندیم کی طرف کبھی دھیان نہیں گیا۔ اس کی دھیمی شخصیت، اس کا پُرخلوص انداز، اس کی ملنساری۔۔۔ یہ ایسی چیزیں تھیں شاید، جو اس کی طرف دھیان جانے ہی نہیں دیتی تھیں۔

ندیم نے ایک کرسی کھینچی اور آہنی سلاخوں کے عین سامنے میری طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ پری پیکر اس کے عقب میں کسی خدمت گار داشتہ کی طرح کھڑی تھی۔ ندیم کی آنکھوں میں نشہ تھا اور زہر تھا۔ اس نے انگلی سے اپنی ناک پر نظر کی عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔ ”جب کسی حرامی گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم خود ہی یہاں تشریف لے آئے ہو۔ ہمیں تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔“

میں خاموش رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت میرا چہرہ بڑا بدحال ہے۔ بال بکھرے ہوئے، ناک اور منہ سے بار بار خون رسنے لگتا تھا۔

ندیم کے عقب میں کھڑی لڑکی نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ میرے حوالے سے خوف زدہ ہے۔ وہ مجھے انہی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن سے پنجرے میں بند کسی خطرناک جانور کو دیکھا جاتا ہے۔ آہنی سلاخوں کی وجہ سے تحفظ کا احساس تو ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ ڈر بھی تحت الشعور میں رہتا ہے کہ سلاخیں نہ ہوں تو کیا ہو۔ اس لڑکی کے خد و خال نے مجھے چونکایا تھا اور یہ چونکنا بے وجہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے سلطان کے ٹھکانے پر میری ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوئی تھی جس کی شکل و صورت بہت حد تک انڈین فلم اسٹار کرشمہ کپور سے ملتی تھی۔ اب جو لڑکی میرے سامنے تھی، اس کا چہرہ کئی زاویوں سے ایک اور معروف اداکارہ ایشوریا رائے سے مشابہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں کے پاس معروف اداکاراؤں سے مشابہت رکھنے والی لڑکیوں کی ”کلیکشن“ ہے۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہو رہی تھی کہ یہ جاوا اور سلطان گروپ کے لوگ ہی ہیں۔۔۔

ندیم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں بادر بچے نہیں ہو، اس کا اندازہ تو مجھے تمہاری آمد کے دو چار روز بعد ہی ہو گیا تھا۔ پھر جب تم نے جلالی کی جیپ کے پیچھے بھاگ کر اسے روکا اور جیپ کے نیچے سے ٹریکر نکالا تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم بھیڑ کی کھال میں کوئی خطرناک اور پلید جانور ہو۔ مگر اتنا اندازہ پھر بھی نہیں ہوا کہ تم بھیڑیے وغیرہ سے بھی زیادہ خطرناک اور پلید ہو۔ تم نے پچھلے ہفتے سلطان جی کے ٹھکانے میں گھس کر نادر اور ایک ملازم کو جان سے مارا اور ریتو کو زخمی کیا۔۔۔ دراصل اس دن تم دونوں نے اپنی بدقسمتی پر مہر لگا لی تھی۔“

”بدقسمت کون ہے، یہ وقت بتائے گا۔ تم دور بیٹھے ہو، اگر پاس ہوتے تو میں تمہارے منہ پر ضرور تھوکتا۔ جلالی صاحب نے تمہیں بیٹوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ تم ان کی جڑیں کاٹتے رہے ہو۔ لعنت ہے تم پر۔“

”میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ جو کچھ تم بول رہے ہو اس کی سزا تمہیں تمہارے گمان سے زیادہ ملنے والی ہے۔ یہاں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے، وہ بہت بُرا ہے۔ جاوا صاحب فلمی آدمی ہیں۔ دنیا بھر کی فلموں میں آج تک جتنے بھی بڑے بڑے ولن تشریف لائے ہیں، ان کی ساری سختی اور گرمی یکجا ہو کر جاوا صاحب کے اندر آ گئی ہے اور اب تمہیں اس کا سامنا کرنا ہے۔“

اس نے ذرا توقف کیا۔ نیا سگریٹ ہونٹوں میں رکھا۔ ایشوریا کی ہم شکل لڑکی نے جھک کر لائٹر کا شعلہ سگریٹ کو دکھایا۔ اس کا جسم تو بے شکن تھا۔ ندیم سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر اچانک بولا۔ ”سلطانی گواہ بننا پسند کرو گے؟“

”کیا مطلب؟“

”یوں سمجھ لو کہ تمہاری ایک طرف دوزخ ہے اور دوسری طرف جنت۔ دونوں میں داخلے کا ٹکٹ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں مشروط معافی مل سکتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے نادر اور دیگر دو بندوں کو براہِ راست نہیں مارا۔ اصل قاتل، وہ ماں کا ہیرو عمران بازی گر ہے۔“

”میں ان باتوں کے جواب میں بھی تمہارے منہ پر بس تھوکنا ہی پسند کروں گا۔“

”بہت گرمی ہے۔۔۔ بہت گرمی ہے۔“

”تمہارے خیال سے بھی زیادہ۔“

''اسی لیے تو کہتا ہوں جنت میں آجاؤ۔ یہاں ٹھنڈی ہوائیں ہیں... زمین پر بہشت کا مزہ پاؤ گے۔'' اس نے بڑی ادا سے ایشوریا کا ہاتھ پکڑا اور اسے ذرا سا گھما کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے بالوں کو چومتے ہوئے بولا۔ ''یہ فلمی دنیا ایک بہت بڑا پری خانہ ہے... اور جاوا صاحب اس پری خانے کے چار داروغوں میں سے ایک ہیں۔ اور تم جانتے ہی ہو کہ پری خانوں میں کیا نہیں ہوتا۔''

میں خاموش رہا۔

وہ سمجھا شاید میں کچھ سوچ رہا ہوں لیکن میں تو وہ الفاظ ڈھونڈ رہا تھا جو اس کی شان کے مطابق ہوں اور اس کے منہ سے لے کر اس کی دُم تک آگ لگا دیں۔

وہ بولا۔ ''وہ ماں کا ہیرو بہت کھوچل اور خرانٹ بندہ ہے۔ دیکھو، وہ آپ تو بیٹھا ہوا ہے اس ٹھرکی بڈھے جلالی کے پاس۔ یعنی خود تو فارم ہاؤس سے باہر نہیں نکلا اور تم دونوں کو یہاں بھیج دیا ہے مرنے کے لیے۔''

''تم دونوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''تم اور یہ مُردہ بھیڑیا۔'' اس نے فتح محمد کی طرف اشارہ کیا۔

میں سمجھ گیا۔ ندیم اور اس کے ساتھیوں کو یقین تھا کہ میں اور فتح محمد اکٹھے فارم ہاؤس سے یہاں آئے ہیں۔ پہلے فتح محمد دیوار پھلانگ کر اندر گھسا، کچھ دیر بعد میں بھی کود پڑا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں فتح محمد کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہاں کوئی خزانہ دفن ہے جسے ڈھونڈتے ہوئے ہم یہاں پہنچ گئے ہیں؟''

''یہ تو تمہیں پتا ہوگا کہ کیا دفن ہے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، ہم کیوں آئے ہیں؟''

اس نے گہرا کش لے کر الکحل کی بُو والا دھواں ''ایشوریا'' کے عین منہ پر چھوڑا۔ ممکن ہے کہ اسے ناگوار گزرا ہو لیکن وہ اس کی ذاتی خدمت گار تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو ذرا سی حرکت بھی نہیں دی اور حاکم مرد کی دیگر دست درازیوں کی طرح اس دھوئیں کو بھی خوش دلی سے قبول کیا۔ ندیم بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، تم دونوں نے یہاں تُو گیر کتوں والا کردار ادا کیا ہے۔ شاید آج میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔ وہ ماں کا ہیرو دیکھنا چاہتا ہوگا کہ میں کہاں جاتا ہوں اور کیوں؟''

''اگر میں یہ کہوں کہ یہ غلط ہے اور تم خود کسی اندھے کتے کی طرح ٹاکٹ ٹوئیاں مار رہے ہو تو پھر؟''

''میں نے کہا ہے نا کہ میں تمہاری باتوں کا بُرا نہیں مانوں گا... کیونکہ اس بکواس کے بدلے میں جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے وہ زبانِ بیان سے باہر ہے۔ اگر تم اس ماں کے ہیرو کے ساتھ چپٹے رہو گے اور میری آفر سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو تم پر بھی موت کی مہر لگ جائے گی۔ جیسے اس ماں کے ہیرو پر لگی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

وہ عجیب زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ''جاوا صاحب کے بھرت وچن کا پتا ہے تمہیں؟''

''یہ کیا ہے؟''

وہ ہنسا اور ایشوریا رائے کو دوبارہ اپنی آغوش میں کھینچ کر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھا سویٹی! ان باسٹرڈز کو کچھ پتا نہیں۔ کچھ بھی پتا نہیں۔ وہ اس کتے کے پلّے عمران ہیرو کو زندہ سمجھ رہے ہیں جبکہ وہ مر چکا ہے۔ ایک سو دس فیصد مر چکا ہے۔ سمجھو ایک ایسا مرغا جس کا سر کٹا ہوا ہے لیکن وہ ابھی اچھل کود کر رہا ہے۔ ان احمقوں کو بتاؤ سویٹی کہ جاوا صاحب کا بھرت وچن کیا ہوتا ہے۔''

''جی... میں؟'' وہ ہکلائی۔

''ہاں تم...''

وہ ذرا سا جھجکی پھر سیکریٹری ندیم کی آغوش میں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی انگلی سے پہلے خود کو اور پھر وہسکی کے جام کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''جاوا صاحب کو اس سے اور اس سے بڑی محبت ہے۔ مطلب عورت اور وائن... لیکن کبھی کبھی وہ ان دونوں چیزوں کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا وہ اس وقت کرتے ہیں جب اپنے آپ سے کوئی کام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ مثلاً... مثلاً...'' وہ ہاتھ نچا کر رہ گئی۔ شاید اسے کوئی مناسب مثال نہیں سوجھ رہی تھی۔ اس نے مددطلب نظروں سے ندیم کی طرف دیکھا۔

ندیم بولا۔ ''مثلاً یہ کہ تین چار مہینے پہلے انڈیا کی ایک نئی ابھرتی ہوئی فلمی ہیروئن زیڈ نے جاوا صاحب کے آستانے پر حاضری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ دس پندرہ حاضریاں بخوشی لگوا چکی تھی۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے اکسانے پر ایسا کیا تھا۔ اس کا بوائے فرینڈ بھی ایک بہت بڑا بزنس مین ہے۔ بڑی اکڑ تھی اس میں بھی۔ اس اکڑ کی وجہ سے اس نے معاملہ خراب کر لیا۔ جاوا صاحب نے اپنا مشہورِ زمانہ بھرت رکھ لیا۔ اور بھرت یہی تھا جو ابھی تمہیں سویٹی نے بتایا ہے۔ انہوں نے سوگند کھائی کہ جب تک زیڈ ان کے گھر پر آکر ان کے پاؤں نہیں چومے

گی، وہ عورت اور شراب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ دیکھو، بڑے بندوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ اب کیا زبردست سائنس ہے اس بات میں۔ لیکن شاید یہ تم دونوں احمقوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ ان کو ذرا بتاؤ سویٹی۔''

''جی، آپ ہی بتائیں...'' وہ لجاجت سے بولی۔

ندیم نے کش لے کر دھوئیں کی ایک اور بدبودار پھوار سویٹی عرف ایشوریا کے منہ پر ماری جسے اس نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ ندیم اپنی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ ''بندے کی کمزوری ہے کہ وہ بھول جاتا ہے۔ مثلاً وہ کسی سے بدلہ لینا چاہتا ہے لیکن وقت کے ساتھ اس کے غصے میں وہ تیزی اور طاقت ہی نہیں رہتی۔ لیکن اگر اس غصے کو کسی دوسری چیز کے ساتھ نتھی کر لیا جائے تو پھر بھولنے کا عمل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ جاوا صاحب عورت اور شراب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان دونوں چیزوں کی دوری انہیں بُری طرح تڑپاتی ہے۔ ان کا ارادہ کمزور نہیں ہونے دیتی۔ جب جاوا صاحب عہد کر لیتے ہیں کہ فلاں کام کے ہونے تک وہ ان دونوں چیزوں سے دور رہیں گے تو پھر وہ کام ہر صورت ہوتا ہے اور جلد سے جلد ہوتا ہے۔ تمہارے اس ماں کے ہیرو کے لیے بھی بھرت وچن ہو چکا ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اب وہ ایک سر کٹا مرغا ہے۔ نہ دانہ کھا سکے گا، نہ کسی مرغی سے میل کر سکے گا، نہ بانگ دے سکے گا۔ ایسے مردہ مرغے کے لیے اپنی جان مت گنواؤ۔ سلطانی گواہ بن جاؤ۔ بہت فائدے میں رہو گے۔ ٹھنڈی ہوائیں، پری خانہ...'' اس نے ایک بار پھر گل بدن سویٹی سے رومانی چھیڑ چھاڑ کی۔

وہ ہمارے روبرو ان حرکات پر شرمسار تھی لیکن اس نے اپنے ردِعمل سے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ ذرا مسکرا کر بولی۔ ''آپ نے ہیروئن زیڈ والی پوری بات تو بتائی ہی نہیں۔''

وہ وہسکی کا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''پوری بات کیا ہونی تھی۔ بس دھوبی پٹکا مار دیا جاوا صاحب نے۔ دفعہ 302 کے ایک پرچے میں ہیروئن کے بوائے فرینڈ کا نام شامل ہو گیا اور ایسا شامل ہوا کہ جناب کے کڑاکے نکل گئے۔ دفعہ 302 کوئی معمولی چیز نہیں ہوتی۔ کینسر کی طرح بندے کو لگ جاتی ہے۔ دو ڈھائی مہینے میں ساری چوکڑی بھول گئی۔ ڈیڑھ دو کروڑ روپیا بھی لگ گیا۔ بھاگ دوڑ میں بزنس کی علیحدہ سے بینڈ بجی۔ آخر وہی ہوا جو جاوا صاحب چاہتے تھے۔ اپنے بوائے فرینڈ سے محبت نبھاتے ہوئے زیڈ نے چپکے سے جاوا صاحب کے پاس ''حاضری'' لگوا دی لیکن ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں۔ سب کو پتا چل گیا کہ ''بوائے فرینڈ'' کا نام

پرچے سے کس طرح اور کیوں خارج ہوا ہے۔“

بات کرتے کرتے ندیم خاموش ہو گیا۔ سیل فون کی مترنم بیل سنائی دی تھی۔ سویٹی عرف ایشوریا رائے نے اپنے نہایت باریک سلیپنگ گاؤن کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک سیل فون نکال کر ندیم کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ کس کی کال ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ندیم ہی کا سیل فون ہے۔ ندیم نے اسکرین پر نگاہ ڈالنے کے بعد کال ریسیو کی اور ایک دم مؤدب نظر آنے لگا۔ ”جی باس... جی ہاں... میں آپ ہی کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ جی سر... فارم ہاؤس سے نکلنے والے سارے راستوں پر ہمارے بندے پہنچ چکے ہیں... بالکل گھیرے میں ہے جی۔ تقریباً ایک گھنٹا پہلے گھیرا مکمل ہو گیا ہے... نہیں نہیں سر! آپ فکر نہ کریں، وہ نکل نہیں سکے گا۔ بالکل نہیں جناب... یہ جو اس کے دو یار پکڑے گئے ہیں، گھیرا مکمل ہونے سے پہلے ہی فارم سے نکل آئے تھے۔ بہرحال تسلی کی بات ہے جی کہ دونوں خود چل کر اپنے مرنے کی جگہ پر آ گئے ہیں۔ میرے سامنے پڑے ہیں دونوں پنجرے میں۔ ایک تو خاصا زخمی ہے جی۔“

وہ کچھ دیر تک دوسری جانب سے کی جانے والی بات کو غور سے سنتا رہا اور ادب سے سر ہلاتا رہا۔ اس دوران میں سویٹی چور نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میرے حوالے سے اس کی آنکھوں میں ابھی تک ہراس موجود تھا اور یہ ہراس مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ ندیم نے آخر میں کہا۔ ”جی باس... میں نے اسے آفر کر دی ہے۔ امید ہے اس کے کھوپڑے میں بات آجائے گی۔“

یہ آخری فقرہ غالباً میرے بارے میں کہا گیا تھا۔ میرا دماغ بُری طرح سنسنا رہا تھا۔ صورتِ حال ہماری توقع سے زیادہ گمبھیر تھی۔ پورے فارم ہاؤس کو جاودے کے لوگوں نے گھیر لیا تھا۔ راستوں کی ناکابندی کی ہوئی تھی۔

فون بند کر کے ندیم نے واپس سویٹی ایشوریا کو تھمایا اور اس نے اسے لائٹر اور سگریٹ کیس کے ساتھ ہی اپنے پیازی رنگ کے گاؤن میں رکھ لیا۔ ندیم نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی آفر کے سلسلے میں تمہیں کل بارہ بجے تک کا وقت دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو لیکن فیصلہ کرتے وقت دوزخ اور جنت والی بات ضرور ذہن میں رکھنا۔ اور ہاں، ایک بات اور... فریب نہیں چلے گا۔ اگر سلطانی گواہ بنو گے تو اس کا سالڈ ثبوت بھی دینا پڑے گا، بالکل سالڈ۔“

میں بس اسے گھورتا رہا۔ وہ بولا۔ ”یہ نہیں پوچھو گے کہ سالڈ ثبوت سے کیا مطلب ہے؟... اچھا چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں۔ سالڈ ثبوت یہ ہوگا کہ تمہیں اس ماں کے ہیرو کو کال کرنا ہوگی اور کال کر کے اسے ایک خاص جگہ پر بلانا ہوگا۔ ہمارے مطلب کی جگہ پر اور... اور اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ اپنے گرگوں کی فوج کے ساتھ آئے گا۔ ہمیں تو پھر بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اس کا بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کی کوئی فوج نہیں ہے... اور نہ اس نے جاودے کی طرح پالتو کتے رکھے ہوئے ہیں... وہ اکیلا تم جیسے جھکوڑوں سے نمٹ سکتا ہے۔“

”غلط فہمیاں ہیں تمہاری۔“ وہ کش لے کر بولا۔ ”اور یہ بھی غلط فہمی ہے کہ اس کی فوج نہیں ہے۔ وہ بہت کچھ چھپاتا ہے تم جیسے بچھوں سے۔ اس کے بہت سے گرگے ہیں جو اس کے اردگرد رہتے ہیں۔ اپنے تئیں ڈان شان بنتا ہے وہ... لیکن اب اونٹ پہاڑ تلے آ گیا ہے۔ اب اسے اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا اور یہ بھی خبر ہو جائے گی کہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک جانا کسے کہتے ہیں۔ اس کو تو اب مرنا ہی ہے لیکن اگر تم زیادہ خون خرابے سے بچنا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ وہ کسی طرح اکیلا چلا آئے۔“

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں واقعی اس خبیث کے منہ پر تھوک دوں لیکن میں معاملے کو مزید گرم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت چاہیے تھا... عین ممکن تھا کہ کوئی راستہ نکل آتا۔

کچھ دیر بعد ندیم نے ایشوریا رائے سے مشابہت رکھنے والی سویٹی کو اپنی بغل میں لیا اور ڈگمگاتا ہوا واپس چلا گیا۔

اس ساری بات چیت میں لکڑی کے باکس کا ذکر ہوا تھا اور نہ اس میں موجود آراکوٹے کا۔ یقیناً ندیم کو بھی پتا تھا کہ ہم جلالی صاحب کے دیگر ملازمین کی طرح آراکوٹے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اب یہاں جو کارروائی بھی ہو رہی تھی اور ہونے والی تھی، وہ خالصتاً انتقامی تھی اور اس کے ڈانڈے یقیناً چند روز پہلے ہونے والے نادر قی نی کے قتل سے مل رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ سلطان چیتا اور عمران ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں اور شاید ہاتھوں میں ہاتھ بھی ڈال چکے ہیں۔ دشمنی کی یہ دبی دبی چنگاریاں نادر قی نی کے قتل کے بعد ایک دم شعلوں میں تبدیل ہو گئی تھیں اور اب کھلی جنگ کی صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ جاوا گروپ کے درجنوں مسلح افراد فارم ہاؤس کے اردگرد موجود ہیں۔ یقیناً اسی علاقے میں جلالی صاحب کی سیکورٹی کے لوگ بھی موجود تھے، ان کے درمیان کسی بھی وقت ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

ندیم کے جانے کے بعد میں فتح محمد کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ اس کے سر سے خون رس رس کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں رائفل کے کندے سے زوردار چوٹ لگائی گئی ہے۔ میں نے سب سے پہلے ایک کپڑے کی پٹی بنائی اور سر سے بہنے والا خون بند کیا پھر اس کے چہرے پر گیلا کپڑا پھیرنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ اسے مدھم آواز میں پکارتا رہا۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد فتح محمد نے پلکوں کو حرکت دی اور اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدلنے لگی۔

آخر، میں اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ہمارے اردگرد کوئی موجود نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پورا ایسمنٹ سنسان پڑا ہے۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لے لیا تھا۔ بظاہر مجھے کوئی خفیہ کیمرا یا مائکروفون قسم کی شے دکھائی نہیں دی۔

فتح محمد مجھے دیکھ کر اور پہچان کر حیران ہوا۔ میں نے اس سے حوصلے تسلی کی باتیں کہیں اور اسے باور کرایا کہ میں اس کی مدد کے لیے یہاں پہنچا ہوں۔ اس نے نہایت نحیف آواز میں پانی مانگا۔ میں نے پانی پلایا۔ ایک ڈبے میں تھوڑا سا دودھ بھی بچا ہوا تھا۔ میں نے وہ بھی فتح محمد کے گلے میں ٹپکا دیا۔ اس کا خون کافی مقدار میں بہہ چکا تھا اور وہ سخت نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ ”باؤ تابش! میں نے جلالی صاحب کا نمک کھایا ہے۔ مجھے ان کا درد ہے۔ یہ... یہ سیکریٹری ندیم ایک دم غداری کر رہا ہے۔ جلالی صاحب کے دشمنوں سے ملا ہوا ہے... اسے معاف نہیں کرنا... بالکل نہیں کرنا۔“

”پر تم یہاں کیسے پہنچے؟“

اس نے کھینچ کر دو تین سانس لیے اور بولا۔ ”مجھے اس پر کئی دنوں سے شک تھا۔ دو دن پہلے میں نے اس کا پیچھا کیا۔ یہ اس کوٹھی میں گھسا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں کیا چل رہا ہے، پر... مجھے پتا نہیں تھا کہ یہاں اتنے سارے لوگ ہوں گے۔ میں... آہ... آہ۔“ وہ بُری طرح کراہنے لگا۔

اچانک مجھے اپنے بائیں بازو پر گیلے پن کا احساس ہوا۔ اس بازو سے میں نے فتح محمد کی کمر کو سہارا دے رکھا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ میرا یہ بازو خون سے گیلا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے گھوم کر نظر ڈالی اور لرز گیا۔ عقب سے فتح محمد کا پہلو کسی تیز دھار آلے سے چرا ہوا تھا۔ زیریں پسلیاں نظر آ رہی تھیں اور اندرونی چربی بھی۔ وہ میرے اندازے سے زیادہ زخمی تھا۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔

میں نے پکار کر کہا۔ ”کوئی ہے؟“

تیسری چوتھی آواز پر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر چوڑے جبڑوں والا ایک شخص برآمد ہوا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آیا تھا۔ یقیناً نیند سے بیدار ہوا تھا۔ ”کیا بات ہے وڑی؟ کیا لفڑا ہے؟“ وہ مکرانی لہجے میں بولا۔

”اس کی حالت ٹھیک نہیں... اسے اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت ہے... فوراً۔“ میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر تک کراہتے ہوئے فتح محمد کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ”تھوڑا صبر کرو وڑی۔ صبح ہونے والی ہے۔ اس کو درد کا ٹیکا لگا دیتے ہیں۔ آرام آ جائے گا۔ باقی کل دیکھا جائے گا۔“

”یہ ٹیکے کا معاملہ نہیں، اس کا زخم زیادہ بڑا ہے۔“

”ٹیکا بھی عام نہیں ہے۔ اس کو بالکل شانت کر دے گا۔ ایک دم فسٹ کلاس۔“ وہ واپس گیا اور تھوڑی دیر بعد آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک پتلی اونچی ناک والا کرخت سا شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا پسٹل تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”ٹیکا ہے۔ ابھی اس میں دوائی ڈالتے ہیں۔“ مکرانی نے کہا۔

اونچی ناک والے نے جیب سے اعشاریہ تین آٹھ کی گولی نکال کر پسٹل میں لگائی۔ میرے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ میں نے دیکھا کہ فتح محمد کا منہ کھلا رہ گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی تھی کہ یہاں کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ میں چنگھاڑا۔

”ٹیکا لگا رہے ہیں۔ تسلی سے سو جائے گا۔ ہمیں بھی سونے دے گا۔“ اونچی ناک والا سفاک لہجے میں بولا۔

”تم یہ نہیں کر سکتے۔“ میں نے پھر چنگھاڑتی آواز میں کہا۔

”کیوں نہیں کر سکتے؟ تم نادر صاحب کو مار سکتے ہو، فضلو اور راہی کو پار کر سکتے ہو تو ہمارے ہاتھوں میں کوڑھ تو نہیں ہے۔“

میں نے فتح محمد کو دیوار کے سہارے بٹھا دیا اور خود کو اس کے سامنے ڈھال بنا دیا۔

"میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ ندیم کو بلاؤ۔"

"وڑی اپنا مغز کھراب مت کرو۔ ندیم صاحب سینئر ڈاکٹر ہیں۔ ویسے بھی ابھی وہ ایک اور مریض کو دیکھ رہے ہیں بلکہ "مریضہ" کو۔ اب وہ صبح ہی "وارڈ" کا راؤنڈ لگائیں گے۔ وڑی، انہوں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ اگر یہ فتح محمد زیادہ درد بتائے تو پھر اسے یہ SOS انجکشن لگا دینا۔"

اونچی پتلی ناک والے نے سائیلنسر لگا پسٹل فتح کی طرف سیدھا کر لیا لیکن فتح تو مکمل طور پر میرے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اونچی ناک والا پھنکارا۔ "زیادہ ہمدرد مت بنو۔ یہ نہ ہو کہ مریض کے بجائے تمہارا علاج ہو جائے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔"

میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اگلے دو تین منٹ میں اس نے کافی کوشش کی مگر میرا ارادہ اٹل تھا۔ میں سامنے سے نہیں ہٹا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ کم از کم یہ لوگ فی الحال مجھے تو قتل نہیں کریں گے۔

اسی دوران میں اونچی ناک والے کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے مؤدب انداز میں کال اٹینڈ کی۔ "جی ندیم بھائی... جی ہاں... اس کی حالت خراب ہے... کافی خراب ہے... ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے جی۔" اس نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی پسٹل بھی دوبارہ اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "چلو کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر اور چھری کے نیچے سانس لے لو... بڑے "ڈاکٹر صاحب" نے کہا ہے کہ ابھی ٹیکا رہنے دو۔ لیکن اگر یہ زیادہ ہائے وائے کر کے ہم "ڈیوٹی ڈاکٹرز" کی نیند خراب کرے گا تو پھر ٹیکا لگانا ہی پڑے گا۔"

فتح محمد نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی کراہیں نہ نکل جائیں۔ نکرانی اور لمبی ناک والا ہمیں گھورتے ہوئے واپس چلے گئے۔

"پپ... پانی۔" فتح محمد نے خشک ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

میں کھانے کے برتنوں کی طرف بڑھا اور تب اچانک فائر ہوا۔ یہ سائیلنسر لگے پسٹل کا فائر تھا۔ گولی فتح محمد کی عین پیشانی پر لگی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا، اس کی کھلی آنکھوں میں وحشت تھی اور خشک ہونٹ وا تھے۔ اس کی پیشانی سے خون کی دھار بہنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا... لمبی ناک والا سفاک انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے فلمی اسٹائل میں پسٹل کو پھونک ماری اور اسے بیلٹ میں اڑس کر دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ "کتے... خنزیر کی اولاد! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں دیوانہ وار سلاخوں پر جھپٹا۔ میں نے سلاخوں کو جھنجوڑا۔ ان سے اپنا سر ٹکرایا، ان پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ میری آواز سارے در و دیوار میں گونج رہی تھی۔ مجھے وہی وقت یاد آ گیا جب بھاٹڑیلن اسٹیٹ میں سلطانہ کی دردناک موت کے بعد میں غم و غصے سے دیوانہ ہوا تھا۔ آج بھی کچھ ملتی جلتی کیفیت تھی۔

لمبی ناک والے بدمعاش نے ڈاج دیا تھا۔ مجھے زخمی فتح محمد کے سامنے سے ہٹانے کے لیے اس نے واپسی کا ڈھونگ رچایا تھا اور پھر اسے شوٹ کر دیا۔ یہ بڑی بے رحمی تھی اور یہ بے رحمی شاید اس لیے بھی دکھائی گئی تھی کہ میری اکڑفوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہو جائے۔ لیکن وہ غلطی پر تھے۔ اس اچانک موت نے مجھ پر الٹا اثر کیا تھا۔ میرے بدن میں شعلے بھڑک اٹھے تھے... یہ سلاخیں میرے رستے میں حائل نہ ہوتیں تو آج انڈسٹریل ایریا کی یہ کوٹھی بہت برا وقت دیکھتی۔

فتح محمد کا لہو فرش پر ایک نہایت افسردہ سی ماتمی لکیر بنا رہا تھا۔ سانس کے لیے اس کی مسلسل حرکت کرتی ہوئی توند اب بالکل ساکت ہو چکی تھی۔ میں نے ایک کپڑا اس کے چہرے پر ڈال دیا۔ بستر کی ایک کھیس نما چادر سے میں نے فرش پر بہنے والا خون صاف کیا۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود کچھ فاصلے پر لیٹا ہوا شخص بیدار نہیں ہوا تھا۔ نشہ آور نیند نے اسے اردگرد سے یکسر بیگانہ کر رکھا تھا۔

میں نے ٹھنڈے دل و دماغ سے غور شروع کیا۔ صورتِ حال میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ جاوا کے گروہ نے فارم ہاؤس سے نکلنے والے راستوں پر اپنے بندے مقرر کر دیے تھے۔ یہ لوگ پوری طرح مسلح اور ہر کارروائی کے لیے تیار تھے۔ ان لوگوں کا اولین مقصد عمران کے خلاف انتقامی کارروائی تھی۔ اب ان لوگوں کو صرف اور صرف عمران کے باہر نکلنے کا انتظار تھا۔

میری خوش قسمتی یا بدقسمتی کہ میں فتح محمد کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا اور گرفت میں آ گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ مجھے چارے کے طور پر استعمال کر کے عمران کو یہاں بلانا چاہ رہے تھے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے بہ آسانی تشدد کا نشانہ بنایا جا سکتا تھا... اور بیدردی سے قتل بھی کیا جا سکتا تھا۔ اپنی سفاکی کا ایک چھوٹا سا نمونہ مجھے ابھی دکھا بھی دیا گیا تھا۔ انسانی زندگی کی ان لوگوں کے نزدیک قطعاً کوئی اہمیت نہیں تھی۔ فتح محمد کو صرف اس لیے گولی سے اڑایا گیا تھا کہ وہ شدید زخمی تھا اور اس کی زندگی کی آس برقرار رکھنے کے لیے اسے لاہور کے کسی اسپتال میں پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں نے فتح محمد کی بے حس و حرکت لاش کو دیکھا جو مجھ سے فقط دو تین فٹ کی دوری پر پڑی تھی۔ میں فتح محمد کو مشکوک سمجھ کر اس کے پیچھے لگا تھا لیکن وہ میرے شک سے بالکل مختلف نکلا تھا۔ اور جس شخص کو ہم جلالی کا سب سے وفادار اور مستعد ملازم سمجھتے تھے، وہ غداری کا مثالی نمونہ بن کر سامنے آیا تھا۔ اب یقینی بات تھی کہ کچھ راتیں پہلے اس نے فارم کے نواحی درختوں میں بھی ڈراما ہی رچایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کچھ لوگ لکڑی کے ایک باکس کو ہتھ ریڑھی پر رکھ کر لائے اور جیپ پر لادا۔ اسے خبر تھی کہ اب جلالی صاحب باکس کی لوکیشن چیک کرنے کے لیے جائیں گے اور وہ ان کا پیچھا کرے گا۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد رات کے اندھیرے میں جلالی کی پوٹھوہار جیپ کے نیچے ٹریکر ڈیوائس لگانے والا شخص بھی یہی ندیم تھا۔ وہ ہمارے ساتھ مل کر بڑی سرگرمی سے مشکوک شخص کو ڈھونڈتا رہا اور ساتھ ساتھ اپنی کارروائیاں بھی ڈالتا رہا۔

...صبح تک کوشش کر کے میں نے خود کو کافی حد تک پُرسکون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ صبح سویرے فتح محمد کی نیم عریاں لاش وہاں سے ہٹا لی جائے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ لوگ اس لاش کی موجودگی کو میری زبان کھلوانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ میں جب فتح محمد کے پیچھے نکلا تھا تو میں نے عمران کو مطلع نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اندر خود بھی فیصلے کرنے کی قوت پیدا ہو... اور اب میں فیصلے کی سولی پر تھا۔ مجھے دوپہر تک کا وقت دیا گیا تھا مگر ٹھیک گیارہ بجے ہی ندیم آن دھمکا۔ اب وہ صاف ستھری پینٹ قمیص میں تھا۔ سرخ ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ وہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے والا محنتی اور تعلیم یافتہ شخص نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت خطرناک گروہ کا حصہ بن چکا تھا۔

وہ سگریٹ سلگانے کے بعد سلاخوں کی دوسری جانب رکھی ہوئی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بولا۔ "کیا ارادے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "پہلے یہ لاش یہاں سے ہٹاؤ۔"

"اٹھا لیتے ہیں، اتنی جلدی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو اکٹھی ہی اٹھانا پڑیں۔"

"ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔ تم نے غداری کی ایک زبردست مثال قائم کی ہے، اب تمہیں

دوسرے بھی اسی بے غیرتی میں غرق نظر آتے ہیں۔"

"اپنی جان بچانے کو بے غیرتی مت کہو۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں، اگر تم نے ہمارے مطابق عمل نہیں کیا تو تمہاری اور فتح محمد کی لاشیں تھوڑی دیر میں اکٹھے یہاں سے اٹھیں گی۔"

"باندھ کر مارنا کوئی بہادری نہیں۔ اگر ہمت ہے تو اپنے یہ دو چار کتے مجھ پر چھوڑ کر دیکھو۔ نظارہ نہ آ جائے تو پیسے واپس۔"

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور بولا۔ "رات رات میں کافی زبان لگ گئی ہے تمہیں۔ ویسے... کتے چھوڑنے والی بات تو تم نے اچھی کہی ہے۔ کل جو دو کتے تم نے قتل کیے ہیں، ان کے بھائی بند کافی غم و غصے میں ہیں۔"

میرے جسم میں لہر سی دوڑ گئی۔ وہ ایک خطرناک دھمکی دے رہا تھا۔ میں رات بھر یہاں پالتو کتوں کی آوازیں سنتا رہا تھا اور وہ بڑے جسیم کتے تھے۔

میرے اور ندیم کے درمیان دس پندرہ منٹ تک معنی خیز مکالمہ ہوا۔ مکالمے کا لب لباب یہی تھا کہ میرے پاس دو ہی راستے ہیں۔ عمران کو پھنسانے میں ان کی مدد کروں یا پھر نادرے اور دیگر دو افراد کے قتل کے جرم میں مرنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔

اسی دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ بیسمنٹ سے باہر پورچ کی طرف تین چار بڑی گاڑیاں آ کر رکی ہیں۔ ان گاڑیوں کی آواز سن کر ندیم نے ٹانگ پر سے ٹانگ اتاری اور الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی اہم شخص یہاں وارد ہوا ہے۔ رات والی سوئٹی ایشوریا رائے تیز قدموں سے اندر آئی۔ اب وہ بہتر لباس میں تھی۔ اس کے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی۔ ملازمہ نے فرش پر سے سگریٹ کے ٹکڑے اور دیگر فالتو چیزیں اٹھائیں۔ کرسیوں کو درست کر کے رکھا۔ سوئٹی نے جلدی جلدی لائٹس آن کیں اور ایک میز پر منرل واٹر کی بوتل سجائی۔ چند منٹ بعد بھاری بھرکم قدموں کی آوازیں آئیں۔ کئی افراد بیسمنٹ کی سیڑھیوں کی طرف آ رہے تھے، دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے مجھے ایک گرجتی برستی آواز سنائی دی۔ اس آواز نے ایک غلیظ گالی دی اور کسی پولیس افسر کی شان میں ایک زبردست قصیدہ پڑھا پھر دہاڑتے ہوئے کہا۔ "چھوڑو اس کی ماں کے خصم کو۔ لعنت بھیجو۔ تم اس کے بھائی سے رابطہ کرو۔ کسٹم میں ہے۔ اس سے میرا نام لو اور کہو کہ ایک بجے سے پہلے پہلے ہمارا سامان ائرپورٹ سے نکلنا چاہیے۔ ورنہ اس کی بیوی

جب ہری پلیٹ والی ہنڈا کار پر اپنے دونوں بچوں کو لینے اسکول جائے گی تو اسے کچھ نہیں ملے گا۔۔۔اور صدمے سے تیسرا بچہ جو اس کے پیٹ میں ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

قدم دھڑا دھڑ سیڑھیوں پر پڑ رہے تھے۔ سب سے پہلے مجھے آنے والوں کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ قریباً ایک درجن کے قریب تھے۔ ندیم اور سویٹی وغیرہ مؤدب کھڑے ہو چکے تھے۔ آنے والوں میں سب سے آگے پینتیس چالیس سال کا ایک جسیم و توانا شخص تھا۔ اس کا رنگ گندمی اور چہرے پر چیچک کے پرانے داغ تھے۔۔۔ لیکن یہ بہت نمایاں نہیں تھے۔ اس کی ناک چوڑی اور ہونٹ حبشیوں کی طرح موٹے تھے۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ آستینیں اڑسی ہوئی تھیں جن میں سے بازوؤں کی مضبوط مچھلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ ایک بدصورت اور ہیبت ناک شخص تھا۔ اس کے اردگرد مسلح گارڈز تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی جاوا ہے۔ اگلے دو تین منٹ میں یہ گواہی درست ثابت ہوئی۔ ایک سیل فون جاوا کے ہاتھ میں تھا، دوسرا اس کے گارڈ نے تھام رکھا تھا۔ دوسرے فون پر جاوا نے بات شروع کی تو پہلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جس دوسرے کالر سے جاوے نے بات شروع کی، وہ اس کی کوئی ساتھی عورت تھی مگر اس سے بات کرتے ہوئے بھی جاوا تواتر سے گالیاں دے رہا تھا۔

بات کرتے کرتے ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے میرے سیل کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ دروازہ ان لاک ہوا اور جاوا سمیت درجن بھر مسلح گارڈز اندر گھس آئے۔۔۔ عجیب دہشت اور سنسنی کی فضا تھی۔ ایک گارڈ تیزی سے جھکا۔ اس نے میری ٹانگ پر ٹخنے سے ذرا اوپر ایک آہنی کڑا پہنا دیا۔ اس کڑے کے ساتھ ایک موٹی زنجیر منسلک تھی۔ زنجیر کے آخری سرے پر بھی ایک کڑا تھا۔ اس کڑے کو سیل کی آہنی سلاخوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ یہ سارا عمل چار پانچ سیکنڈ میں مکمل ہوا۔ تین چار رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ سیل میں موجود تیسرا شخص نشے کے زیر اثر اب بھی سویا پڑا تھا۔ دو گارڈز اسے اسی حالت میں گھسیٹ کر بیسمنٹ کے دوسرے حصے میں لے گئے۔

جاوے نے فون پر بات ختم کی۔ سر تا پا مجھے گھورا۔ اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔ ندیم نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔ "جی باس! یہی ہے ہیرو کا ساتھی۔ تابش نام ہے اس کا۔ اور یہ فتح محمد ہے۔" ندیم نے فتح کے خون آلود چہرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ فتح کے خشک ہونٹ وا تھے اور آنکھیں پتھرا ہو چکی تھیں۔

جاوا پھنکارا۔ "جو سالا کمینہ مر گیا ہے اس کی بات چھوڑو۔ جو زندہ ہے اس کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ نکالو۔ کیا کہتا ہے یہ کتا؟"

ندیم نے کہا۔ "سر! میں نے اسے دوپہر تک کا وقت دیا تھا ہیرو کو کال کرنے کے لیے۔"

جاوا بھنائی ہوئی آواز میں بولا۔ "وقت تمہاری والدہ نے ایجاد کیا تھا جو ہر کسی کو دیتے پھرتے ہو؟ وقت نہیں ہے ہمارے پاس، بالکل نہیں ہے۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اس نے اپنی قیمتی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ پھر میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ "بچے! ہونے کو تو تیرے ساتھ بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن معاملہ جلدی کا ہے۔ میں دو ٹوک بات کرنا چاہتا ہوں۔ اور یاد رکھنا میرا نام جاوا ہے، میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔" جاوے کے عقب میں ملطان چٹا بھی نظر آیا۔ اس کے گلے اور "زخمی کان" پر پٹیاں بندھی تھیں۔ جاوے نے ایک گارڈ سے سیل فون لے کر میرے ہاتھ میں دیا پھر ایک دوسرے گارڈ کو اشارہ کیا۔ اس نے صرف چار پانچ فٹ کے فاصلے سے اپنی جدید رائفل کا رخ میرے سر کی طرف کر دیا۔ جاوا دو ٹوک لہجے میں بولا۔ "اس کتے کو کال کرو اور اسے صرف اتنا بتاؤ کہ تمہیں اس کی بڑی فوری ضرورت ہے۔ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔ اسے لاہور، شیخوپورہ روڈ کے تیسرے پل پر گورنمنٹ ہائی اسکول کے عین سامنے بلا لو۔ یہ لو مکمل ایڈریس۔" اس نے ایک پرچی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور آخر میں بولا۔ "میں صرف دس تک گنوں گا بچے۔ اس کے بعد میرے کہے بغیر ہی گولی چل جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر تم نے بات کے دوران میں کوئی غلط اشارہ دینے کی کوشش کی تو بھی گولی چل جائے گی۔"

جاوے کی آواز میں ایک ایسا فیصلہ کن آہنگ تھا جس نے مجھے اندر سے ہلا دیا۔ نہ جانے اس وقت کیوں اچانک ثروت کا چہرہ میری نگاہوں میں آ گیا۔ کیا اب میں اسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گا؟ کیا محبت کے راستے میں صدیوں کا سفر رائگاں گیا؟ کیا یہ اختتام ہے؟ مجھے عمران کو ہرگز نہیں بلانا تھا اور میرے دشمن کا چہرہ بتا تا تھا کہ وہ گولی چلانے سے ہرگز نہیں جھجکے گا۔ جاوا سفاک لہجے میں گنتی شروع کر چکا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔۔۔ ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ چار۔۔۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی
داستان کے بقیہ واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں